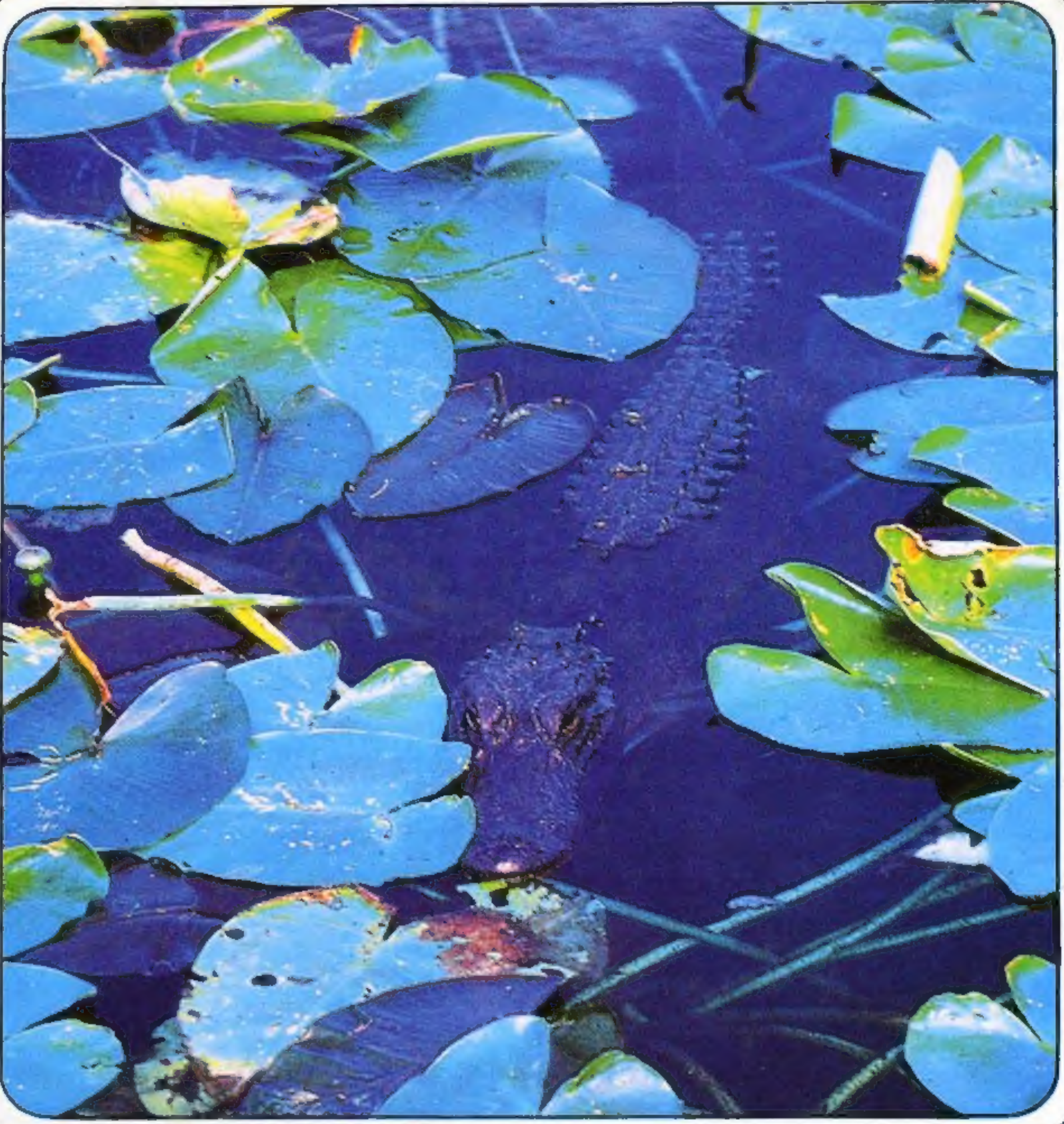
مُفتیانے



ممتاز مفتی

مُفتیانے

ممتاز مُفتی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی

بار اوّل ـــــــــــــــــ ۱۹۸۹ء

بار دوئم ـــــــــــــــــ ۱۹۹۶ء

مطبع ـــ فیروز سنز لاہور

مجلّد ـ ISBN 969 0 00949 4

قدرت اللہ شہاب کے نام
جس نے مجھے رُخ عطا کیا۔
کیا سے کیا بنا دیا
کہاں سے کہاں لے آیا۔

ممتاز مفتی

ترتیب

اَن کہی

اَن کہی

فہرست

جُھکی جُھکی آنکھیں

عذرا ان عورتوں میں سے ہے جن سے وصال میں بھی تکمیلِ حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ جو دلخراش حقائق سے دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے مگر عذرا میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ، حساس ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران موٹی موٹی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کی حیران خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوتِ تکلّم کا بیشتر حصہ سلب کر چکی ہیں نہ جانے کونسی دنیا میں رہتی ہیں بہرصورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ، اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں، رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہی خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذرا کچھ بُن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف احساس پیدا ہو گا کہ بیشک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھا کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اس وقت مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذرا مجھ سے کوسوں دور ہے یقین نہیں پڑتا کہ وہ زندگی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہے۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ یہیں سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کے انداز میں یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اس کی نگاہ میں بچھپنے ہی سے تھیں۔ شاید اس لئے کہ بچپن سے ہی

وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہو گئیں اور اب وہ ترنم سے بھیگ چکی ہیں ، اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اسکی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانپے رکھتی ہیں ۔

اُن دنوں جب سکول سے لوٹا کرتی تو اس کے انداز میں "بیگانہ روئی" پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی ۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی ۔ چلتے چلتے ٹھٹک جاتی یا آنکھ میں ہلکا سا تبسم لہرا جاتا ۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اسے زندگی سے دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں ۔ وہ اپنے انداز میں ایسی بیگانہ روئی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطۂ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہیے ۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداری دیکھنے کے کیوں متحمل نہیں ہو سکتے ۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ننھی کلیوں کی طرح سوئے سوئے ہی رہیں اور یونہی سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں ۔ اس لیے وہ ان میں بیداری پیدا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جو پیدا ہو جاتی ہے اسے نہ دیکھنے کا ۔ عذرا کے والد موخرالذکر قسم کے آدمی تھے ۔ گھر میں کھانے پینے کے لیے کافی تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا ۔ بیویوں کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو بہت بدنصیب سمجھتے تھے ۔ انہیں گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کی شادی کے فوراً بعد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے ۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسی بیوی ملے جو گوناگوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے ۔ اس لیے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے ۔ ان کے خیال میں بیوی کا یوں عام ہو جانا اس کی بدمذاقی کی دلیل ہے اور وہ اپنے خیال کو اکثر ظاہر کیا کرتے تھے ۔

انجینئر صاحب کی بیوی کو دیکھیئے ۔ اس کی آنکھوں میں بیسیوں نگاہیں ہیں ۔ ایک سے ایک نئی ۔ کبھی وہ اداسی میں ، تو کبھی سرخی میں ڈوبی رہتی ہیں ، کبھی ہم تمہیں جانتے ہی نہیں اور کبھی اب کہیئے مزاج کیسے ہیں کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی ادلتا بدلتا ہے ۔ کبھی گلابی گلابی ، گہری گہری ، گدری گدری ، میلی میلی یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے ، نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اسے کس قدر ملکہ ہے ۔ اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و پیچ

مضطرب رہتے ہیں ۔ ایک وہ عذرا کی ماں تھی کہ بیٹھ جاتی تو گھنٹوں اٹھنا محال ہو جاتا ۔ بس دن بھر آلو ہی چھیلتی رہتی تھی اور پھر وہ زمرد تھی کہ ایک مرتبہ ساڑھی کے لیے بگڑ بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھ رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصہ تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا ۔

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمۂ اجل ہو گئی ۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوا ۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں ۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا خود تو وہ عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے یا کبھی اندر آتے تو عذرا کو کوئی نصیحت کرنے کے لیے کہتے ۔

"عذرا دوپٹہ سنبھال لو ۔ بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا"۔

"حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے ۔ بند کرو اسے دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں"۔

"عذرا تم یہ مسز ملک ولک کے ہاں نہ جایا کرو ۔ لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی ہی اچھی لگتی ہیں"۔

ان نصیحتوں کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ بیٹی جوان ہو جائے تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آیا تھا ۔ نہ ہی انہوں نے اسے کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا ۔ کیونکہ گو وہ چالیس برس کے تھے لیکن ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے ۔ ان کے دوست اور احباب انہیں زینتِ محفل سمجھتے تھے ۔ باہر دیوان خانے میں جمگھٹا رہتا تھا اور قہقہوں سے در و دیوار گونجتے ۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنا محبوب نیلا سوٹ پہنے بال بنا رہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آکر خشمگیں انداز سے کہنے لگے ۔

"عذرا آج سے تم سکول نہ جایا کرو ۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں"۔

"مگر ابا امتحان" عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا ۔ اس کا چہرہ حیرانی

اور خوف سے بدنما ہو رہا تھا ۔

"مگر وگر کچھ نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا ۔ "امتحان دینے کی ضرورت نہیں"۔

ایک ساعت کے لیے عذرا کی آنکھیں اٹھیں ۔ شعلے کی طرح چمکیں مگر والد جا چکے تھے ۔ حشمت نے ان آنکھوں کو دیکھا اور ایسے محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھر تھرا رہا ہو پھر وہ جھک گئیں ۔ دو موٹے موٹے آنسو رخساروں سے ڈھلک کر لباس میں جذب ہو گئے ۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں ۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں ۔ اس دن سے عذرا کو ٹھمکتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا اور اسے بیگانہ روئی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی ۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھوئی ہوئی سی کھڑی رہتی ۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کر دیا ۔ غالباً اس لیے کہ عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا ۔ جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان ، چند ایک ساعت کے لیے ان خاموش مہیب چٹانوں میں ابھر ابھر کر خاموشیوں کے مسکن کو اور بھی خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے ۔

اس جھٹ پٹ پر خلقِ خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے ۔ چہ میگوئیاں ہوئیں دبی دبی آوازیں اٹھیں ۔ مگر آواز کسنے کی نوبت نہ پہنچی ۔ ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرحدار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلہ والیاں اس سے کینہ دوزی کرتیں ۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشر کرتیں ۔ بلکہ وہ تو ان کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان نگاہوں کی قدر دان تھیں ۔ چند ایک مثلاً انجینئیر کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آواز کسنے میں ملکہ تھا ۔ ان کا تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول ڈھمکا نہ چھم چھم ، نہ تاک نہ جھانک ، نہ تو تو میں میں ۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی ۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریبِ سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو اور مہمان بن کر جائیں ۔ حنا مالیدہ ہاتھ ہوں ، جھلملاتی ہوئی

ساڑھیاں ہوں ، کاجل ، جھمکے ، بندیاں چمکیں ، پلیٹوں سے چوڑیاں بجیں ، پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آ نکلے تو گھونگٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے ۔ کوئی گستاخ لٹ ، جھٹک کر منہ پر آگرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی گوری گوری انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں ۔ باریک تہوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں ۔ سفید سفید باہیں گھونگٹ سے نکل کر کچھ دیں کچھ لیں ۔ یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو ۔

آخر خلقِ خدا خلقِ خدا ہی ہے اور بات بات ہے جو نکل ہی جاتی ہے ۔ کسی نے کہا کسی سے آنکھ لڑ گئی ہو گی ۔ کوئی کہنے لگی "لو اب ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی" کوئی کہنے لگی "سنا ہے اس کے ابا نے خط پکڑ لیا"۔ کوئی بولی "ایلو بی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ۔ دفتر سے آ رہے تھے ۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لیے بیٹھا تھا ۔ توبہ کیسا زمانہ آیا ہے" غرضیکہ کئی باتیں نکلیں ۔ بلکہ کونسی بات تھی جو رہ گئی ۔ مگر دبی دبی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی ۔

اس بیچاری کا یہی قصور تھا کہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بت کا شبہ ہوتا اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اس بت کو دیکھ کر ایک مصور بیدار ہو جائے اور اسے اس بت میں محو کر دے تو عذرا کا اس میں کیا قصور ، ہاں سکول کی ویران سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا ۔

پوری تفصیلات سے مجھے واقفیت نہیں ہاں سلیم کا اونچا لمبا قد اور فراخ شانے اور اس کا اندازِ بے نیازی ۔ اس امر کا شاہد ہے کہ اسے تانک جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے ۔ غرضیکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے ، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں ۔ چند دن تو صبح چھ بجے وہ روز اس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا اسکول کے پھاٹک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ

رہی تھی تو سلیم آکر اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر اسے ایک طرف لے گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کو پوچھنے لگا "تم کون ہو ۔ تمہارا کیا نام ہے ؟ ۔۔۔ تم بولتی کیوں نہیں" ۔۔۔ "اچھا"۔ اس نے عذرا سے جھنجھوڑ کر کہا "تم چاہے کوئی بھی ہو تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا"۔ اور پیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے ۔ سلیم جا چکا تھا ۔ پھر اسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے آنے کے لیے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھاٹک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا رکنا پڑا بھی تھا یا نہیں ۔ اس روز اس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا ۔

اسے اس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہ آیا تھا ۔ مگر اس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے اور اس کے شانوں پر لذیذ سا درد ہو رہا تھا ۔

اس روز اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی "سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو ۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں" وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی پھر اس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اسے گدگدا دیا ۔ وہ ہنس پڑی "کیوں سولی ہے نا"۔

اس کے بعد ان کی دوچار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دوچار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس ۔ سلیم ہمیشہ کے لیے اس کے لیے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش ، چند ایک دل کی پُر کیف دھڑکنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور دل اور سینے کی چند مُبہم تھرتھراہٹوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا جس قدر یہ نقوش مدھم تھے اس کے دل میں ان کے متعلق حسیات اسی قدر گہری تھیں ۔

گاڑی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی وہ جا رہے تھے ۔ مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جا رہی ہے اس کا دل کہہ رہا تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔" وہ سمجھتی تھی کہ خواب دیکھ رہی ہے

جیسے قدرت اُسے چھیڑنے کے لیے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا ۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی ۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پھیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا ۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے ہیبت ناک دیو نما کھمبے گرد سے اٹے ہوئے کسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھنگنوں میں کوئی گلیور کھڑا ہو ۔ سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا ان جھلسے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں دھندلے خواب کی طرح آتا اور گذر جاتا ۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی ۔ اُسے ایسے معلوم ہوتا جیسے اس ٹیلے پر سلیم اسے بلا رہا تھا یا جیسے دور سڑک پر جو لاری جا رہی تھی اس میں سلیم بیٹھا ہے ۔ پھر اس کے شانے کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتے اور وہ سنتی ، تم میری ہو اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا اور وہ ٹھٹھک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سولی اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف تھی ۔ ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں ۔ اس کے برعکس سولی کی آنکھیں پرنم معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی ۔ وہ سوچ رہی تھی سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے ۔ اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش ہوئی ۔ نہ جانے کتنی بہاریں اس نے اس پنجرے میں گزاری ہیں ۔ کیا اس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے ، کیا اس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے ، پھر اس نے سنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی ۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی تھی ۔ ماں پوچھ رہی تھی "بیٹی عذرا ۔ نذر پوچھتا ہے کچھ پیو گی ؟ دیکھو نا کس قدر گرمی ہے ۔ تمہیں ضرور پیاس لگی ہو گی ، کیوں بیٹی"؟ اس کی آواز میں منت تھی ۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا ۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا ۔ اسے کنکھیوں سے بھی ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ پھر اس نے ایسے

محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا ہو ۔

اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا ہو "نہیں اماں تم کہو تو ۔ دیکھو کس قدر گرمی ہے" اس بھدی آواز میں کس قدر اداسی تھی ۔ ہاں اگر سلیم اس سے پوچھتا ۔ اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی ، مگر سلیم ، سلیم جانے کہاں ہو گا ۔ جانے اسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں ۔ شاید اپنی بیچاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو ۔ شاید ان رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی ۔ مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا نہیں نہیں یہ الزام ہے سلیم ایسا نہیں پھر دو اداسی بھری متبسم آنکھیں اس کے سامنے معلق ہو جاتیں ۔ نہیں وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں حقیقت سے لبریز ہیں ۔ اس کے دل میں یقین سا ہو جاتا وہ آئے گا ۔ وہ ضرور آئے گا وہ دنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا ۔ شاید وہ اسی گاڑی میں موجود ہو ۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو وہ ایک جھرجھری محسوس کرتی نہیں وہ بیمار نہیں ، بس نہیں عذرا اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں سلیم کے شانے ہیں وہ سمٹ کر ان شانوں پر جھک جاتی چاہے کچھ بھی ہو اب مجھ کو تم سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا ۔۔۔ کوئی بھی نہیں ۔

ساس نے اسے کمرے میں ایک فراخ پلنگ پر بٹھا دیا ۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی تمام مکان سنسان محسوس ہوتا تھا ۔ دوچار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں مگر چند منٹ ٹھہریں اور چلی گئیں ۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں ۔ اس رات لیمپ روشن نہیں معلوم ہوتے تھے اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا ۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا وہ محسوس کر رہی تھی جیسے سلیم کے انتظار میں بیٹھی ہو ۔

دور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اداس کالا درخت نظر آ رہا تھا ۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا ۔ لیمپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا ۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی جھریاں تھیں ۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی ۔ اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے ۔ سلیم کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ کیسا بیدار حسین خواب تھا ۔ اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں وہ اس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی ۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا ۔ یک لخت باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی "پہاڑی" کی تان اس کے کان میں پڑی ۔ تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لیے پہاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی ۔ اس کے سامنے سکول والی سڑک لہرا گئی ۔ جب وہ آزاد تھی ۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی ۔ جب پہلی مرتبہ اس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی ۔ سلیم کی پہلی ٹکٹکی ۔

اس کے بند بند میں درد ہو رہا تھا ۔ سولی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی ۔ بے چارہ سولی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا ۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہوا تھا ۔ جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو ۔ چہرے پر ایک تبسم سا تھا ۔ جیسے کوئی خواب میں اسے گدگدا رہا ہو ۔ باہر فضا میں دھیمی روپہلی روشنی پھیل رہی تھی ۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی ۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی ۔ "عذرا ۔ نذر ۔" نذر کی ماں بلا رہی تھی ۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا ۔ اس کے چہرے پر اضطراب چھا گیا ۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا ۔ اس کی نگاہیں عذرا پر آ رکیں پھر اس کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے ۔

"آیا اماں" کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا ۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں ہر کسی کو عذرا کے دیکھنے کا شوق تھا ۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لیے جوانی کے دن چند ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے ، عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے مگر کوئی دبی ہوئی آہ اس

مسکراہٹ کو اداس بنا دیتی وہ شوق سے آتیں مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتیں ۔ جس طرح کوئی اپنی گذشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کر کے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر کسک سی محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک اداسی اور مٹی ہوئی دنیا پاتا ہے ۔ دو ایک جوانی سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں ۔ لچکتی ہوئیں ٹھمکتیں ہوئیں ۔ مسکراتی ہوئیں "ہم جانتے ہیں" کی سی مسکراہٹیں "بس یہ ظاہر داری رہنے دو ۔" "ابھی تو اس نگری کی دہلیز پر بیٹھی ہو" کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئیں ۔ بنتی سنورتی ٹہلتی ہوئیں مگر عذرا اپنی نگری میں گم سم تھی ، لیکن جب کوئی نووارد اس کا منہ دیکھنے کے لیے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی پھر اسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھتا یا وہاں صرف سولی ہی ایسا متنفس تھا جو اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا ۔

سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے ازسرِنو قید کیا گیا ہو وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا ۔

شام کے وقت نذر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا ۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا ۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا ۔ عذرا نے سولی کی طرف دیکھا ۔ اس کی آنکھ میں چمک آگئی ۔ صرف سولی ہی اس کا رازدار تھا ۔ جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی ۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا ۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی "تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا ۔ عذرا کچھ تو کھاؤ ۔ اماں نے تمہاری اتنی منتیں کی ہیں" اس نے دھیمی منت بھری آواز میں کہا ، "یہ تمہارا اپنا گھر ہے عذرا ۔ تم اس کی مالکہ ہو ۔" اس کا حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا ۔ اس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ "عذرا تم چپ کیوں ہو ۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔ اس کی زبان کہنے والی زبان نہ تھی مگر اس کا ہاتھ خاموش اور مدھم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا ۔ اس وقت وہ بھدا گرم ہاتھ قوتِ گویائی سے زیادہ متکلّم تھا ۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم

سے بند بند میں سنا اور اس کی تمام قوت شل ہو گئی وہ اپنا ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی ۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی ۔ صرف دماغ کا کوئی نحیف حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھا رہا تھا ۔ جس طرح ڈراؤنا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے مگر جاگ نہیں سکتا ۔ اسی طرح عذرا بت بنی بیٹھی تھی ۔ اس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی اس نے ایک مخمور دھندلکے میں نذر کا ہاتھ دیکھا ۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم تھا ۔ ہاں سلیم کا ہاتھ متحرک تھا ۔ بلا کا شوخ ۔۔۔ اس کے دل میں خواہ مخواہ آرزو پیدا ہو گئی کہ وہ بھدا ہاتھ متحرک ہو جائے ۔ اس کی اپنی تمام قوت شوخی زندگی اس گھڑی کے لیے اس بڑے بھدے ہاتھ اور ان مضبوط بانہوں میں منتقل ہو جائے ۔ اس کا جسم اس بھدے ہاتھ کے لیے منتظر تھا ۔ بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم محسوس کر رہی تھی اور پریشان تھی مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھے ۔

اسنے آنکھیں بند کر لیں ۔ سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آ کھڑا ہوا ۔ تم ہو سلیم ! مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا ۔ اس کے شانے جھک گئے ۔ سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا ۔ سلیم کی دو مضبوط بانہیں اس کے گرد آپڑیں ۔ وہ سلیم کے پاس تھی ۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا ۔ اس کے والد نذر کے لیے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا رقمیں چھوڑ مرے تھے ۔ وہ عذرا کے والد کے بہت گہرے دوست تھے ۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے کہیں اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی نیچی نگاہوں اور اس کی لٹکی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنے خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازۂ ہستی پریشان کرنا ہے ۔ مرحوم دوست کے قلاش بیٹے کو کون خاطر میں لاتا ہے ۔ جب اسنے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا ۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ

اٹھے گا اور اسے احساس ہو گا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدہوش کن خوابیں ان لامتناہی فائیلوں کے سامنے کس قدر مہنگی پڑتی ہیں مگر شاید یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب صریحاً اس کی تھی ۔ نذر کے لیے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو ہر غیر متوقع خوشی میں ہم رکاب ہوتی ہے اس کی خواہشات میں جو صرف ضروریاتِ زندگی تک محدود تھیں ، ساڑھیاں جھلملانے لگیں ۔ پھول مہک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکار نغمہ زن ہوگئیں ۔ عذرا کے لئے حسین نازک چپل ہو ۔ عذرا کے لیے قد آدم آئینہ ہو ۔ عذرا کے لئے شربتی ریشم ہو ۔ عذرا کے لیے ۔۔۔ عذرا اس کی خواہشات میں بھنور بن کر آئی تھی ۔

اس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹائپ رائٹر خرید لیا ۔ تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے ۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے اور اس کی خاموشی حسرت بھری تشویش ہے ۔

عذرا کو پہلی مرتبہ ساڑھی میں دیکھ کر نذر کی آنکھ میں ایک مخمور چمک آ گئی ۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غسل خانے میں یا کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو ۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا پھر وہ نذر کی جرابوں میں آن ٹھہریں "بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو" اس نے کہا" دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں لاؤ انہیں دھو دوں "۔

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑھی سے چھڑاتے ہوئے کہا ۔ "نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں ۔ پرسوں ہی تو پہنی تھیں" نہیں بیٹا نہیں" ماں نے اصرار سے کہا کیا حرج ہے ! جرابیں لے کر ماں چلی گئی ۔ کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عذرا یہ نیلی ساڑھی تمہیں بہت زیب دیتی ہے ۔ میری طرف دیکھو نا عذرا "۔

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا ۔ عذرا نے آنکھیں جھکا لیں ، ہاں اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا ۔ ان کو بھی نیلی پوشاک بہت

پسند تھی ۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہے تھے ۔ کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں کس قدر پیاری آواز تھی ۔ عذرا تمہیں نیلا لباس کس قدر زیب دیتا ہے اور کس پیار اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا ۔ عذرا وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ نیلا لباس پہنا کرو گی ۔ میرے لیے ، میری خوشی کے لیے اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا ۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے ۔

اس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا ۔ سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا ۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سولی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی ۔ پوچھنا چاہتی تھی ، "تم میرے ہو نا سولی"؟ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لیے بولنے کی ضرورت نہیں ۔

انہیں نیلا رنگ پسند تھا نا سولی ؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے ۔ تم جانتے ہو نا ! اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے ۔ ان کے پیار کی سلوٹیں ہیں ۔ ان پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لیے توڑ کر لایا کرتے تھے ۔ کیوں سولی تم جانتے ہو نا ؟ ۔ ۔ ۔ مگر تم نہیں جانتے ۔ تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا ۔ تم صرف سمجھتے ہو ۔ اور سولی ان کے نچلے ہاتھ بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ بانہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے کندھوں کے گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے ۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی ۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا ۔ ۔ ۔

یوں ہی دن گذر گئے ۔ راتیں گزر گئیں ۔ مہینے گزر گئے ۔

یوں تو رہنے کو عذرا اس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چاردیواری قید نہ کر سکی ۔ یا شاید اس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دوربین ہو گئیں وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھکی ہوئی مژگاں پر اٹھائے پھرتی اور شائد جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی ان نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی ۔

گو نذر ان کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا کبھی کبھی ان نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اسے ڈر محسوس ہوتا مگر شاید وہ ہلکا ڈر ان نگاہوں کو نذر

کے لیے اور بھی جاذب بنا رہا تھا ۔ عذرا جب کبھی اپنی دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ آنکھوں کو جھکا لیتی وہ ایک تبسم نذر کے لیے پیامِ حیات بن جاتا ۔ وہ اس حیا سے لبریز تبسم کے لیے اپنی زندگی اپنا آپ سبھی کچھ دینے کے لئے تیار تھا ۔ پھر اس کی نظر نیلی ساڑھی پر پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی ہے ۔ اس میں وہ چمک نہ رہی تھی وہ سوچتا دیکھو کتنی جگہوں سے پھٹ رہی ہے ، بوسیدہ ہو چکی ہے چمک نہیں ، پھر بھی عذرا اسے میرے لیے پہنے پھرتی ہے ۔ اس لئے کہ میں اسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں صرف میری خوشی کے لیے ۔ حالانکہ اس کے پاس سرخ ساڑھی بھی تو ہے بلکہ سرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے کتنی پیاری ہے وہ عورت جس کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانی عورتیں ۔ ۔ ۔ ۔ دیویاں ہوتی ہیں ۔

مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں ۔ گوندارام کہہ رہا تھا ۔ ایسی ساڑھی چالیس روپے کی ملے گی ۔ چالیس روپے ! ساڑھیاں بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں اس کے منہ سے بیساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھتا ۔ اس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے وہ سوچتا تھا جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا ۔ عذرا دیکھے گی ۔ خوشی بھری ، تعجب بھری ، محبت بھری نگاہ ، اس لمحہ بھر کی نگاہ حاصل کرنے کے لیے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لیے تیار تھا ۔

عذرا اس کے پاس بیٹھی رہتی ۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نذر کے وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ تھی ۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی ۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی باقی خدوخال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی ۔ شاید اس لیے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی ۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے ۔ ۔ ۔ دن بھر وہ سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے

پاس پہنچنے کے لیے اسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی ۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا اماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی کوئی اجنبی عورت آکر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی ۔ پھر ماں جب نماز پڑھنے کے لیے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں لپٹا ہوا کاغذ کا گولا رکھ دیا اور اس کی مٹھی بند کر دی ۔ اس نے دبی ہوئی آواز سے کہا "یہ انہوں نے دیا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں" ۔

پہلے تو عذرا حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا ہوا لفافہ تھا اس نے لفافے کو غور سے دیکھا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی ۔ اس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر پیدا ہو گیا مگر وہ عورت جا چکی تھی ۔

غالباً وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو چکی تھی کہ اسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار نہ رہا تھا ۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا ۔ شاید اگر سلیم بذاتِ خود اس وقت اس کے سامنے آ موجود ہوتا تو اسے بیگانہ محسوس ہوتا ۔ بہر صورت اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لفافہ کس کا تھا ۔ اس کے دل میں اس لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ سخت پریشانی محسوس کر رہی تھی ۔ اس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر سے اپنی مٹھی میں دبا لیا ۔ اٹھ بیٹھی ۔ اندر چلی گئی پھر باورچی خانے میں گئی ۔ صحن میں آئی ۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لیے یہاں وہاں گھوم رہی ہے ۔ جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے ڈر کو محسوس کرتے ہوئے پرندے کالی اداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں ۔

وہ چاہتی تھی کہ مٹھی میں اس کاغذ کے گولے کو بھینچ بھینچ کر ناپید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے ۔ ۔ ۔ ۔ کمرہ گھوم رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے ٹرنک کے اوپر بیٹھے ہوئے پایا ۔ ٹرنک کھلا تھا وہ لپٹا ہوا لفافہ اس کی گود میں پڑا تھا ۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں اسے پھاڑ کر

کھولا ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے ، دل دھڑک رہا تھا ۔ نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں ۔ جیسے وہ مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو ۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے جانے پر مصر ہیں ۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہو بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا ۔ وہ بھاگی پھر رہی تھی مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا ۔ اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس پر غلبہ پا رہا تھا ۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ جانا ! چلے جانا ! ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا دل کانپ اٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ دماغ میں خلا سا پھیل گیا ۔ ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت کائنات اس کے لئے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی ۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی ۔ اس رات سلیم کی بجائے کئی اور خوفناک شکلیں اس کے خوابوں میں گھس آئی تھیں ۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی ڈراؤنی شکلیں نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا "کیا ہے عذرا "! اس کا چہرہ فکر اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا ۔ "آج تمہیں کیا ہے ۔ تم بیمار تو نہیں ' عذرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے میلوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو ۔ اس نے چاروں طرف دیکھا !۔ اس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی" ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں وہ عورت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوپہر ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خط ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا خط ۔ ۔ ۔ ۔ سلیم کا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں ۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں" اس نے جھرجھری لی ۔ نذر کسی سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا ۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا سر کسی کے شانوں پر جا ٹکا ۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا ۔ جانے تکئے پر تھا یا پتھر پر ۔ ۔ ۔ ۔ مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نذر کو فکر مند اور پریشان کر رہی تھی ۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا ۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھی ۔ ایک حصہ سولی کی شکل میں کہہ رہا تھا ۔ تم ان کی ہو عذرا اور اب ان سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا ۔ فراخ پیشانی اور

سفید سفید دانت کہہ رہے تھے ۔ عذرا تم بیمار تو نہیں ۔ تمہیں کیا ہے ۔ عذرا دو بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے تم آنکھیں جھکا لو ۔ عذرا تمہاری دنیا تو پاس ہے ، سامنے سلیم کھڑا تھا وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا ۔ ڈراؤنی ہنسی پیاری ہنسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شام کو وہ سولی سے کہہ رہی تھی ۔ سولی تم اکیلے رہ سکو گے ؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کرو گے ؟ مجھے برا تو نہیں کہو گے سولی ؟ کیا میں ان کے ساتھ چلی جاؤں وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر دکھائی دیتا ہے ۔ کیوں سولی میں ان کے ساتھ چلی جاؤں ؟ دنیا کیا کہے گی ؟ ابا جان کیا کہیں گے ؟ سولی : تم تو جانتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ تم تو سمجھتے ہو نا "!

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل بنا لیا ۔ اور اسے میز پر رکھ دیا ۔ اس کا دل ہلکا درد محسوس کر رہا تھا ۔ پھر وہ جلد ہی اپنے کمرے میں جا لیٹی ۔ اس روز وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی ۔ اس نے ایک پرانا رسالہ اٹھا لیا ۔ پڑھنے کی کوشش کی ۔ مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے ۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گھوم جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی ۔ اس روز اس کی قوتِ سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی ۔ اس نے نذر کو ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا ۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں ۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی ۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی ۔ سامنے بوڑھا شیشم کا درخت تھا ۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا ۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی ۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی سے باہر درخت پر جا جمتی ۔ اس وقت کھڑکی بند تھی ۔ مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا ۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی کوئی راہگیر گزرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا ۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی ۔ جیسے وہ درخت اس کے راز سے واقف ہو ۔ صحن والی کھڑکی میں سولی کا پنجرا تھا۔ سولی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا ۔ اسنے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سولی تمام دنیا سے بیزار

ہو چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی ۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک کر اٹھ بیٹھی ۔ اس نے پارسل اٹھایا وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے ۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے سنا ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے ۔

"تم نے تو اپنا آپ تباہ کر لیا ہے ۔ صبح شام کام ۔ دن رات کام ۔ ہر وقت کی ٹک ٹک ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ساڑھی کے لئے اپنا آپ حلال کر رکھا ہے "۔

" نہیں اماں یہ نہ کہو نذر بار بار کھانس رہا تھا ۔ جب سے وہ آئی ہے ۔ ہم نے اس کو دیا ہی کیا ہے ۔ مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا ۔ میں اسے دے ہی کیا سکتا ہوں ۔ تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا ہے ، مگر بیٹا ! اس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں ۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی ۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لئے کیوں اس قدر بیتاب ہے ۔ میں تو نہیں سمجھتی ۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے زمانے میں ۔ ۔ ۔ " اماں تم بھولتی ہو اس نے تو مجھے نہیں کہا ۔ ۔ ۔ مگر یہ تو معمولی بخار ہے تم فکر نہ کرو "۔

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا ۔ اسے تیز بخار تھا ۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی اس کے بھنچے ہوئی ہونٹ کسی چھپے ہوئے ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے " تم سو جاؤ عذرا نذر نے دھیمی آواز میں کہا ' تم کیوں میرے لئے بے آرام ہو میری فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں "وہ بخار کی شدت میں وہ کچھ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہا تھا جو وہ کبھی کہہ نہ سکا تھا ۔ اس لئے اپنے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا تم نہ ہوتیں عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی ۔ تم میری زندگی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا ۔ اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا ۔ اس قرب پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ بڑے پیار سے کھلونے سے کھیلتا ہے ۔ عذرا بت بنی بیٹھی تھی ۔ شائد وہ اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی ۔ پھر یکلخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا ۔ وہ چونک اٹھی کانپ اٹھی ۔ اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں ۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا اور پہلی

مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے ۔

رات بخار سے بے چین وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا ۔ چالیس روپے ۔ نیلی چالیس روپے وہ اکثر عذرا عذرا چیخ کر اٹھ بیٹھتا ۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا "تم میرے پاس ہو نا عذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ تم میرے پاس ہو" ۔ پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا ۔ "تم آرام کرو عذرا ۔ تم اب سو جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ تم بیمار ہو جاؤ گی ۔ میری فکر نہ کرو ۔ میں اب اچھا ہوں" ۔ اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی ۔ اس کا سر گھوم رہا تھا ۔ اس کا حلق خشک تھا ۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی ۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی ۔ عذرا بڑبڑا رہی تھی وہ آئے ہیں ۔ ہاں ! عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے ۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا ۔ عذرا اٹھ بیٹھی اسے پتہ نہ تھا ۔ کہ وہ کیا کر رہی ہے ۔ یا کیا کرنا چاہتی ہے ۔ باہر ہوا زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں ۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھا لی ۔ نذر بڑبڑا اٹھا ۔ نیلی چالیس روپے ۔ عذرا ڈر گئی ۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا ۔ سولی نے چیخ ماری ۔ دردناک چیخ ۔ عذرا نے اسے دیکھا غریب اپنے پنجرے میں یوں پھڑپھڑا رہا تھا ۔ جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو میز پر پنسل پڑی تھی ۔ دفعتاً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی ۔ وہ پارسل پر لکھ رہی تھی ۔ میں نہیں آسکتی ۔ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی ۔ اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے ۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھے بغیر ہی وہ پارسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو ۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی عذرا پیچھے ہٹ گئی اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں ۔ اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں اس کے کانوں میں ایک شورِ محشر سنائی دے رہا تھا ۔ ۔ ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چیخ کر اسے بلا لینا چاہتی تھی ۔ ۔ ۔ اس نے اپنے دل میں شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی میں گر گئی ۔ یہ میں نے کیا کر

دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ ہچکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا۔۔۔کیوں عذرا۔۔۔کیوں۔۔۔میں۔۔۔ تم روتی ہو؟ کیوں رو رہی ہو۔ عذرا میں یہاں ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ عذرا تم فکر نہ کرو سو جاؤ۔ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا سلیم تم نہ جاؤ۔ سلیم۔ سلیم! اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔

پھر اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا تھا۔ "عذرا میری وفا کی دیوی"۔

...........○...........

بیگانگی

رشید نے اُٹھ کر آنکھیں ملیں ، دو ایک انگڑائیاں لیں اور کھوئے ہوئے انداز میں سیڑھیوں کے قریب جا بیٹھا ۔ اس نے کوٹھے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تمام چارپائیاں خالی پڑی تھیں ۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے ۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سامنے اونچے اونچے مکانوں کا انبار دکھائی دیتا تھا ۔ اس کے لیے دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی ۔ اچھا اب تو صبح ہو چکی ہے اس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا ، جیسے وہ نہ ختم ہونیوالے دن کی کوفت کا بوجھ محسوس کر رہا ہو ۔ اس کے لیے دن ، ایک مسلسل کوفت تھی ۔ آج چھٹی کا دن تھا ۔ اسکے نزدیک چھٹی سے بڑھکر کوئی عذاب نہ تھا ۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اسکے وجود سے ہی منکر تھے اسلیے انہیں اپنے وجود اور عظمت کا احساس دلانے کے لیے اس پر لازم ہو جاتا کہ وہ آپا کے چٹکی لے یا محمود کا منہ چڑائے یا محمود کے پالتو طوطے کی دم کھینچ لے اور نہیں تو چیزیں اِدھر اُدھر کر دے ۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی ۔ اب مَیں کیا کروں ؟ وہ مبہم طور پر محسوس کر رہا تھا ۔ تمام گھر میں اسے کوئی ایسا کونہ تک نظر نہیں آتا تھا جسے وہ اپنا سکتا یا جہاں اسکی موجودگی سے بیگانگی نہ برستی اس نے اکتائے ہوئے انداز سے قمیض کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگا لیا ۔ زندگی اس کے لیے ناقابلِ فہم بیگانگی سے بھری ہوئی تھی ۔ وہ صرف یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو جائیگا ۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں رشید ہے اور محمود کیوں محمود ہے اور اس نے محمود کا سا برتاؤ کر کے آزما دیکھا تھا، مگر اسکے باوجود گھر والے اس پر "رشیدیت" ٹھونس رہے تھے ۔

اسکی نگاہیں اکتائے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھوم رہی تھیں ۔ سامنے محمود کا طوطا پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا ۔ اسکے ہونٹوں

پر حقارت کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ محمود کا طوطا محمود کا طوطا اسکے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا جیسے اسے چھیڑ رہا ہو پھر اسکی نظر سامنے کھڑکی پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی ۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ۔ صبح شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑکی ہی خوشی کی ایک امید گاہ تھی مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا ۔ دو روز سے نہیں گزرا تھا ۔ دو روز اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے ۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور لاشعوری طور پر اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے کسی طرف پھینک دیا ۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے اور ماں باپ نے اسے سسک سسک کر پایا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذاتِ خود کیا ہے آیا وہ باپ کا نام قائم کرنے یا ماں کا سہاگ مستحکم کرنے کے لیے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کے لیے ہے یا ویسے ہی ہے ۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اوّل تو وہ ہے ضرور اور دوسرے ، وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے ۔ گو ہستی اور نور کے متعلق اس کے احساسات واضح نہ تھے وہ جانتا تھا کہ بار بار "اگو" کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے اور ذرا سے بسورنے سے ماں باپ اور کئی ایک شکلوں کو اپنے گرد نچوا سکتا ہے ۔ یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے صرف ہونٹ نکالنے کی ضرورت تھی ۔ جب چھ سال کی مسلسل منّتوں کے بعد بیٹا پیدا ہو تو ماں باپ کے لئے اسے نظر انداز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے ۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اسے دودھ پینے، سونے اور باقی وقت نکمّے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو پکڑنے کی کوشش میں چنداں دلچسپی نہ رہی ۔ البتہ لوگوں کو نچانا ضرور باعثِ فرحت تھا ۔ اس دلچسپ شغل میں اس نے دو سال بسر کیے ۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اسپر یہ بھی آشکار ہوا کہ وہ بدصورت ہے ۔ ابتدا میں تو اسے بدصورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی ۔ پھر رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوتا گیا کہ اسکی ناک چپٹی ہے ۔ پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں ۔ مگر اسکے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ بدصورتی عیب سمجھی جاتی ہے

یا وصف ۔ وہ صرف یہی جان سکا کہ ماں باپ اسے بدصورت کہہ کر یا اسکے ناک ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کہہ کر فرطِ انبساط سے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے تھے ۔ اس لحاظ سے تو بد صورتی بہت پیاری خصوصیت تھی ۔

اس زمانے میں دنیا یوں بے معنی نہیں تھی ۔ بلکہ مخصوص اصولوں پر چلتی تھی ۔ اسکا ہنسنا رونا روٹھنا یقینی نتائج پیدا کر سکتا تھا ۔ وہ دو سال اسکی زندگی میں ایک گذشتہ مگر قابلِ حصول رنگینی سے سرشار تھے ۔ اُن دنوں زندگی اسقدر پیچیدہ اور لوگ اسقدر ضدی اور اندھے نہ تھے ۔ اُن دنوں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے اسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی ۔ مگر جلد ہی وہ دن آگیا جب وہ بات نہ رہی ۔

اس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھ کر حسبِ معمول اسے قواعد کروا رہا تھا کہ انکی ملازمہ رضیہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی "بی بی تمہیں مبارک ہو خدا نے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے ۔" سلیمہ نے یہ سنا تو رشید کو یوں پٹک کر بھاگ گئی جس طرح وہ خود نئے کھلونے کی آمد پر پرانے کھلونے پھینک دیا کرتا تھا ۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کی یوں تحقیر کی گئی تھی ۔ رشید کی تحقیر ۔ سلیمہ کی اتنی جرأت ! پہلے تو وہ حیران چپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے یکلخت رونا شروع کر دیا ۔ اسکی دانست میں رونے سے بڑھکر کوئی قوت نہ تھی مگر خدا جانے اس روز اسکے رونے میں کیوں اثر نہ تھا ۔ حتّٰی کہ آنسوؤں والا رونا بھی کام نہ آیا ۔ پھر اسے تازہ دم ہو کر رونا پڑا ۔

آخر رضیہ آئی ۔ اس نے رشید کو جھنجھوڑ کر اٹھا لیا ۔ اول تو رضیہ اسے منانے کو آئے ۔ رضیہ ایک ادنیٰ ملازمہ ۔ کس قدر بے عزتی کی بات تھی اور پھر وہ بھی اسے جھنجھوڑ کر اٹھائے ۔ اس روز اسکے خیال میں دنیا کے اصول ہی بدل رہے تھے ۔

ماں کے سامنے جا کر اس نے دو تین چیخوں سے آپا ، رضیہ اور دنیا بھر کے خلاف شکایت کی مگر ماں اسے گود میں اٹھانے اور جملہ لوگوں کو بُرا بھلا کہنے اور گھورنے کی بجائے نحیف سی آواز میں کہنے لگی "یہ کیا سر کھا رہا ہے ۔ اسے یہاں سے لے جا اور جو نعمت خانے میں مٹھائی پڑی ہے وہ اسے دے دے "۔۔۔۔

یہ تھی اسکی ماں ۔ اسکی اپنی ماں جس کی آنکھوں کو اس نے نور بخشا تھا ۔ وہ ماں ۔ اگر اسکی قوتِ اظہار اپنے باپ کی طرح وسیع ہوتی تو وہ یہ کہہ اٹھتا ۔ "بس چودھویں صدی آگئی ہے جبکہ ماں کو اپنے سگے بیٹے سے محبت نہیں رہی ۔ ماں کا خون بھی سفید ہو گیا" ۔۔۔ رضیہ اسے باورچی خانے میں تن تنہا چھوڑ جائے ۔۔۔ اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھانے کے لیے ۔۔۔ ماں سے دور ماں کی واری صدقے بغیر ۔۔۔ سوکھی مٹھائی اور ماں اس گوشت کے لوتھڑے کے پاس لیٹی ہے ۔ کیسی بے ہودہ شکل تھی ، نہ سر نہ منہ ۔ یقینی طور پر چودھویں صدی آچکی تھی جس کے متعلق اکثر اسکے ابا ذکر کیا کرتے تھے ۔

پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے اور اس نے اخذ کیا کہ بیمار اسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد بھیڑ لگی رہے ۔ جس کے لیے مٹھائیاں منگوائی جائیں اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو جتنی کسی زمانے میں اسکی اپنی ہوا کرتی تھی ۔ یعنی بیماری میں بھی وہی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اسکے رونے میں تھی اور اب دن بدن ضائع ہو رہی تھی ۔ بیمار بن کر اسکی حکومت شائد لوٹ آئے مگر اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس طرح بیمار پڑ جائے ۔ اس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اس امید پر لپٹ کر چوما کہ شائد اسطرح ماں کی بیماری اسے لگ جائے مگر اسکے باوجود گھر والے اسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے ۔ بہر حال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی انانیت حاصل کرنے کے لیے رونے روٹھنے اور ضد کرنے کے علاوہ اسکے پاس کچھ بھی نہ تھا اور انکے استعمال میں اس نے بڑی فراخدلی سے کام لیا ۔ مگر انکے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں ۔

مانا کہ ماں کے دودھ کے علاوہ وہ مٹھائی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا مگر ماں کے دودھ سے بالکل محروم کر دینا ۔ کھیلنے کو بھی نہ دینا کس قدر کمینہ پن تھا ۔ اس سے پہلے تو اسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی ۔

پہلے پہل تو اسے یہ آس رہی کہ صحت ہونے پر ماں وہی پہلی سی ماں ہو جائیگی ۔ مگر ماں نے بستر چھوڑ دیا ، چلنا پھرنا شروع کر دیا مگر اسے وہ محبت نصیب نہ ہوئی ۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ پیار مقابلتہً ظاہری اور پھیکا محسوس ہوتا ۔ ماں کا دھیان تو ہر وقت تھے کی طرف لگا رہتا تھا ۔ اسی کو ساتھ سُلاتی

اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تن تنہا کھٹولے پر پڑا ہے ۔ وہ بے چارہ اس اندھیر پر رو پڑتا اور چاہتا کہ ماں اسے پاس بلائے مگر ماں کس بیگانگی سے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپک دیتی جس طرح دور سے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں ۔

آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آکر احتجاجی حرکات کو جائز قرار دینے پر مجبور ہو گیا ۔ اسکی حرکات سے متاثر تو کیا، ماں باپ نے انہیں سمجھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی ۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ دردِ دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو بستر پر پیشاب کرنے کی قبیح عادت پڑ گئی ہے اور وہ رات کو بلبلا اٹھتا ہے اور اسے اسہال کی شکایت ہے وہ نہیں جانتے تھے کہ جو گالیوں، بددعاؤں یا لفظوں سے اپنے غصے اور دنیا کی بے وفائی کا اظہار نہیں کر سکتے ۔ وہ دردِ دل کا اظہار مثانے اور معدے سے کر سکتے ہیں ۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے ابا سے ازسرِنو رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے ۔ کیونکہ وہ ہر وقت سنتے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی اور بدصورتی تو خیر رشید کی شکل بالکل ان پر نہ تھی ۔ باپ کے لیے اس اہم تفصیل کو نظر انداز کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے وہ کس طرح محمود سے غداری کر سکتے تھے ۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر انکشاف ہو گیا کہ بلی کی دم کھینچنے اور مرغی کے پر نوچنے میں بھی راحت ہوتی ہے ۔ گو یہ راحت ماں باپ کا نورِ نظر اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں ہیچ تھی مگر راحت ضرور تھی ۔ ماں باپ تو اس گوشت کے لوتھڑے میں جسے وہ محمود کہہ کر پکارتے تھے اپنا وجود کھو چکے تھے ۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر ۔ محمود کی آنکھوں پیشانی اور ہونٹوں کے قصے ۔ محمود کی صحت مسکراہٹ اور کھیل کا رونا اور محمود بھی وہ جسے رونے تک کی تمیز نہ تھی ۔ کیسی بے سُری الاپتا تھا ۔۔۔ رشید نے کئی دفعہ محمود کا منہ تک چومنا گوارہ کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اسکا منہ چومنے سے وہ خود محمود بن جائے ۔ مگر والدین بھی پتھر کے بنے ہوتے ہیں اُن پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا ۔

ایک روز جب رشید ابا کی چھڑی کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا اور انکے کاغذات کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی ۔ جب رشید نے جواب میں چیخوں سے دردِ دل کا اظہار کیا تو انہوں نے دو ایک تھپڑ جڑ دیے اور جلال میں کہنے لگے ۔ "بہت بدمعاش ہوا جا رہا ہے کبھی آپا کو مار، کبھی ماں سے لڑ، گھر میں کہرام مچا رکھا ہے پاجی ۔" اس سرزنش کے دوران میں ماں محمود کا پوتڑا ٹھیک کرنے میں شدت سے مصروف رہی ۔ گو ادھر سے پیار کی کوئی امید نظر نہ آتی، پھر بھی اسے مجبوراً فریاد لیکر ماں کے پاس جانا ہی پڑا لیکن ماں نے بھی "ہر وقت سر کھاتا رہتا ہے" کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا ۔ اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے "یہاں مر" کہہ کر جھنجھوڑ کر اسے اٹھا لیا اور پاس لٹا لیا ۔ یہی تو اسکی خواہش تھی کہ وہاں مرے ۔ کسی سے تھپڑ کھا کر اسے وہاں مرنا نصیب تو ہوا ۔ اسکی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا ۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا ۔ چونکہ پچھلے سال وہ فیل ہو گیا تھا ۔ رشید کے والد کو یقین تھا کہ رشید فطری طور پر کند ذہن ہے بلکہ انکا خیال تھا کہ اسکے دماغ میں عقلِ سلیم کا خانہ خالی ہے ۔ اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا ۔ گھر میں وہ اپنے اس خیال کے متعلق اکثر بات کرنے کے عادی تھے یا وہ محمود کی ایسے انداز میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو ۔

"محمود سوالوں میں طاق ہے ۔ اگر رشید کا ذہن بھی اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی ۔ مگر یہ رشید کا قصور نہیں ۔۔۔ اسکی یادداشت ٹھیک نہیں ۔۔۔ بے چارے کو باتیں یاد نہیں رہتیں ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ محمود کی ماں ۔۔۔۔ تم نے سنا ۔۔۔ اِدھر آنا ۔۔۔ باہر محمود کا استاد آیا ہوا تھا ۔ کہتا تھا محمود تو فرفر سبق سنا دیتا ہے ۔"

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقبل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ اکثر کہا کرتے ۔ "محمود ۔۔۔ محمود ۔۔۔۔ کو تو انجینیئر بنائیں گے ۔ اسے رڑکی بھیجیں گے ۔۔۔۔ رڑکی ۔ رڑکی سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی انجینئرنگ کالج نہیں ۔ سنا تم نے محمود کی ماں ۔ ۔ رڑکی میں بہت بڑا کالج ہے ۔ شاندار ۔"

اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس زاویے سے دیکھتے جیسے کوئی مصور اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے ۔ پھر وہ چونک کر ایک موہوم سی آہ بھر کر رشید کی طرف دیکھتے ۔ "رشید محمود کے طوطے کو دق نہ کر ۔۔ تمہیں تو ہر وقت شرارت سوجھتی ہے ۔۔۔ محمود کی ماں ۔۔ دیکھا تم نے پنجرے کو بل دے رہا تھا شیطان ۔ محمود کی ماں اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو اسے بھی رڑکی بھیجتے ۔۔۔ مگر کوئی بات نہیں ۔۔۔ کوئی بات نہیں ۔۔۔ یہ تو قدرتی باتیں ہیں ۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں ۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے ۔۔ کیوں محمود کی ماں یہ تم کیا دھو رہی ہو ۔۔۔ تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے ۔ ہاں رضیہ کہاں ہے ۔ رشید میں کہتا ہوں اس پنجرے کو نہ چھیڑ سنتا نہیں ۔"

رشید باپ کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران جمائیاں لےلیکر تھک جاتا ۔ پھر دفعتاً اسکا جی چاہتا کہ زور سے مرغی کی دم کھینچے یا آپا کی ٹانگ میں چٹکی لے یا کسی رینگتی ہوئی چیونٹی کو پاؤں سے مسل دے ۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنما چیز اسکے نزدیک محمود کا طوطا تھا ۔

رشید اپنی جگہ سے اٹھا ۔ ایک اور انگڑائی لی ۔۔۔ "اچھا تو اب کیا کروں" اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اسکے لیے باعثِ دلچسپی نہ تھی ۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا کہ ماں آپا اور رضیہ باورچی خانے میں ہیں ۔۔۔ ابا اور محمود کی آوازیں بیٹھک میں سے آ رہی تھیں ۔۔۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا ۔ "اماں ۔" اس نے اکتائے انداز میں کہا ۔ "بھوک لگ رہی ہے ۔"

اماں بولی ۔ "آ گئے ۔ آنکھ کھل گئی ۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اٹھ کر سکول کا کام کیا کرو ۔"

آپا کہنے لگی ۔ "اماں ۔ محمود نے آج صبح ہی صبح دس سوال نکال لیے ہیں" ۔۔۔۔۔

رشید نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا ۔ اس نے چاروں طرف سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے لسی کا گلاس لے لیا ۔

ماں نے کہا ۔ "منہ ہاتھ تو دھو لیا کر ۔ کتنا گندا ہے"

مگر رشید لسی پی چکا تھا ۔ وہ اپنی قمیض سے منہ پونچھ کر گلاس صندوق پر رکھ کر باہر نکل آیا ۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا اس نے چاقو اٹھا لیا اور سرسری طور پر میز کا کونہ کھرچنا شروع کر دیا ۔ باہر بیٹھک سے ابا اور کسی مہمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔

"یہ بھی کیا عمر ہے ۔۔۔ بادشاہی عمر ۔۔۔ بچپن سے بڑھ کر زندگی میں کوئی خوشی نہیں ۔"

رشید سوچ رہا تھا ۔ بچپن سے بڑھ کر کوئی عمر نہیں ۔ یہی بچپن ۔ آخر وہ کیا بات ہے جسکی بناء پر لوگ بچپن کو اسقدر سراہتے ہیں ۔ کیا باقی ، بچپن سے بھی زیادہ اکتا دینے والی ہے ۔ اس نے ایک جھرجھری لی ۔۔۔ باہر ابا کہہ رہے تھے ۔

"محمود! محمود تو سوالوں میں بے حد طاق ہے ۔ رڑکی ! رڑکی سے بڑھ کر کوئی درسگاہ نہیں ۔ سو روپیہ ماہوار خرچ ۔ نصیب کی باتیں ہیں ۔ وہ ہمارا رشید ۔۔۔ دو سال اس سے بڑا ہے ۔ بالکل کند ذہن ، کام چور نکما" ۔۔۔۔ "اللہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیئے ۔"

رشید اٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا ۔ شاید اس لیے کہ وہاں ابا کی آواز نہیں پہنچتی تھی ۔ یا اسلیے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش اسے مجبور کر رہی تھی ۔

باورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی کہ "رضیہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے ۔۔۔ جا دیکھ تو کہیں میرے صندوق میں سے کپڑے نکال کر پھاڑ تو نہیں رہا ۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں ۔ صبح صندوق کھولا تو اسے بند نہیں کیا جا دیکھ تو ۔۔۔ توبہ میں تو اس لڑکے سے عاجز آ چکی ہوں ۔"

رضیہ کی آہٹ سن کر رشید چٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لوہے کے ٹکڑے سے ناخن کریدنے میں مشغول ہو گیا ۔ رضیہ اندر آئی اس نے نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی ۔ مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا ۔ پھر جب رضیہ صندوق کو تالا لگا رہی تھی تو نہ جانے رشید کو کیا ہوا ۔ اس نے اپنے بازو میں شدید اکڑ سی محسوس کی ۔۔۔ اسکا ہاتھ غیر ارادی طور پر لپکا اور

انگلیوں نے بڑھ کر رضیہ کی کمر میں چٹکی لے لی ۔ اس نے بھاگتے ہوئے "اوئی" سُنا اور پھر رضیہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی ۔ مگر وہ غسل خانے پہنچ کر بالٹی میں ہاتھ ڈبو رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا ۔ قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اسے وہ بوڑھا فقیر یاد آگیا ۔ جس پر وہ چوبارے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا ۔

بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ ۔۔۔ بے بسی ۔۔۔ اور بیچارگی ۔۔۔ اس روز جب اسکی آنکھوں سے پانی قطروں میں گر رہا تھا ، کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی ۔ اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا ۔ باہر ماں غصے سے پوچھ رہی تھی ۔

"رضیہ محمود کے طوطے کا پنجرہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے ۔"

رضیہ بولی ۔ "توبہ بی بی میں نے تو ابھی اسے چوبارے میں رکھا دیکھا تھا ۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی ۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں ۔"

ماں نے ہاتھ ہلا کر کہا "بس یہ اسی شیطان کی کارستانی ہے ۔ نہ جانے محمود کے طوطے سے اسے کیا بیر ہے ۔ اور بھائی ہوتے ہیں ۔ آپس میں پیار اور محبت سے رہتے ہیں ۔ اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھ کر بھوت سوار ہو جاتا ہے ۔ رضیہ ! لے! اسے چوبارے میں رکھ آ اور اسکی کٹوری میں پانی ڈال دے ۔"

رشید دروازے سے جھانک رہا تھا ۔ "محمود کا طوطا" اسکے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا "کیا ہوا ۔ کیا ہوا۔ محمود کے طوطے کو" ابا اندر آکر کہہ رہے تھے ۔ "ہاں بس ایسا کام کون کرے گا ۔ اس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں ۔ قصائی ہے قصائی ۔ صبح شام چیزیں الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں ۔ کل میرے دفتر کے کاغذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا ۔ نامعقول ۔۔۔۔ لے رضیہ اسے چوبارے میں لے جا ۔ محمود تو طوطے پر جان چھڑکتا ہے ۔ جب تک اسے کھلا نہ لے خود نہیں کھاتا ۔ اسے جانوروں سے کسقدر محبت ہے محمود کی ماں ! محمود کی ماں !"

"کیوں ابا جی ۔" محمود نے اندر آتے ہوئے کہا ۔

"کچھ نہیں بیٹا" باپ نے جواب دیا ۔ "رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں

رکھدیا تھا ۔ بیچارے کا گرمی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا ۔ تم کہاں چلے گئے تھے ۔"

اس پر محمود بولا ۔ "نہیں ابا جی ۔ میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا ۔ اس نے پانی کی کٹوری الٹ دی تھی اور پانی میں تربتر ہو رہا تھا ۔ میں نے اسے سکھانے کے لیے دھوپ میں رکھدیا تھا ۔ پھر اسے اٹھانا مجھے یاد نہیں رہا ۔"

"محمود کی ماں! محمود کی ماں!" باپ کہہ رہا تھا "تم نے سنا؟ محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا ۔ محمود کی یہ بہت اچھی عادت ہے ۔ دیکھو نا سچ سچ کہہ دینے سے بالکل نہیں گھبراتا ۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو چاہے کچھ ہی ہو جاتا وہ کبھی اقرار نہ کرتا ۔ رضیہ رضیہ کہاں ہے رشید ۔ رضیہ !"

"ابھی یہیں تھا" ماں نے کہا "جانے کہاں چلا گیا ہے ۔ گلی میں ہو گا ۔ مَیں تو اس لڑکے سے تنگ آ چکی ہوں ۔"

"خیر کوئی بات نہیں تم تو گھبرا جاتی ہو ۔ یہیں کہیں ہو گا" باپ نے اسے تسلی دی ۔

رشید دبے پاؤں غسلخانے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا ۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا مگر وہ بوڑھا دو دن سے نہیں آیا تھا ۔

رشید کے بدن میں ناامیدی سے سستی سی محسوس ہو رہی تھی ۔ اس واحد عشرت سے وہ گذشتہ دو دن سے محروم تھا ۔ اس نے چھ سات موٹے موٹے پتھر چن لیے اور کھڑکی میں بیٹھ گیا ۔ سامنے مکانوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا ۔ گلی میں خاک اڑ رہی تھی ۔ دھوپ سے آنکھیں چندھیائے جاتی تھیں ۔ مکانوں سے پرے ریت کے ٹیلے کھڑے تھے ۔ کہیں کہیں بگولے ناچ رہے تھے ۔ وہ ان بگولوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا ۔

آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ۔ اس نے جھر جھری لی ۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکا دی ۔ اور معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا ۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی مظلوم کے دکھ کو دیکھ کر وہ خدا سے اسکی نجات کے لیے دعا کر رہا ہو ۔

انتظار سے مایوس ہو کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ اسکی نگاہ سامنے والے مکان کے روشندان پر پڑی ۔ روشندان میں سرخ شیشے کو دیکھ کر ایک یگانہ سی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر آگئی ۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا ۔ پھر نہ جانے کیا سوجھی ۔ اسکے بازو نے زور سے جھٹکا کھایا ـــ۔ پتھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی ۔ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آ بیٹھا ۔ سامنے محمود کا طوطا پھڑ پھڑا رہا تھا ۔ محمود کا طوطا ! اسکے دل سے آواز آئی جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو ۔ محمود کا طوطا ۔ محمود کا طوطا ۔ تمام فضا آوازوں سے بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔ اس نے لپک کر پنجرا اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا ۔ اسکے لبوں پر مسکراہٹ آگئی ۔ چوکی پر ابا کا استرا دیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا ۔ اس نے استرا اٹھا لیا ۔ پتہ نہیں اسکے دل میں کیا خیال آیا ۔ منہ سرخ ہو گیا ۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں ۔ "محمود کا طوطا" اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا ۔ وہ پنجرے کے قریب ہو بیٹھا ۔ پنجرے کا دروازہ کھل گیا ۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔ حتیٰ کہ اسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا تھا ۔ کچ کچ کچ ـــ۔ لہو کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں ــــ۔ سرخ رنگین مخمل سا لہو ۔ کھڑکی سے باہر رنگین سنہری سرخی ناچ رہی تھی ۔ دو بگولے آسمان پر مخملی قوس بن کر جھوم رہے تھے ۔

"محمود کا طوطا" اسکے دل کا کوئی کونہ تمسخر سے کہہ رہا تھا ۔ "محمود ۔"

....O............

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو ۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تھے ، میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدّو بھاگتا ہوا آیا ۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا کہنے لگا امی جان میں بھی باہ کرونگا ۔

"اوہ ابھی سے" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ پھر کہنے لگیں ۔ "اچھا بدّو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں ؟"

"اونہوں" بدّو نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔

اماں کہنے لگیں ۔ "کیوں آپا کو کیا ہے ۔"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کرینگے ۔"

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں ۔ "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں ۔"

"میں بتاؤں کیسی ہے ؟" وہ چلّایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا ۔" اماں نے پوچھا ۔ بدّو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو ۔ پھر اسکی نگاہ چولہے پر آ رکی ۔ چولہے میں اُپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا ۔ بدو نے اسکی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی ۔" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا "اور چھاجو باجی ایسی ۔" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے ۔ اتنے میں تصدّق بھائی آ گئے ۔ اماں کہنے لگیں "تصدق بدّو سے پوچھنا کہ آپا کیسی ہیں ۔" آپا نے تصدّق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو ۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدّو" وہ بولے ۔ "بتاؤں" بدّو چلایا ۔ اور اس نے

اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا ۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لیکر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اسکا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی ۔ "اونہہ ۔" بدّو رونے لگا تو ماں کہنے لگی "پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے ۔ اسمیں چنگاری ہے ۔" "وہ تو جلا ہوا ہے اماں ۔" بدّو نے بسورتے ہوئے کہا ۔ اماں بولیں ۔ "میرے لال تمہیں معلوم نہیں اسکے اندر آگ ہے ۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی ۔" بدو نے بھولے پن سے پوچھا ۔ "کیوں آپا ۔ اسمیں آگ ہے کیا ؟ ۔" اسوقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی ۔ "میں کیا جانوں ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی ۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی ۔ اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی ۔ اس روز بدّو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی ۔ مگر میں کہا کرتی تھی ۔ آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو اور وہ مسکرا کر کہتی 'پگلی' اور اپنے کام میں لگ جاتی ۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی ۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کے لئے کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے ۔ ادھر بدّو چیختا "آپا میرا دلیا ۔" ادھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی ۔" بیچ میں اماں بول اٹھتی "بٹیا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی ۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اسکے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھکر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے ۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی ۔ اسکے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا ۔ زیادہ سے زیادہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس ۔ البتہ وہ اکثر مسکرایا کرتی ۔ جب وہ مسکراتی تو اسکے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں ۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا بیٹھی ہی رہتی ہے ۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو ۔ اسکے بر عکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی

تھی ۔ جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو ۔ اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھکر میں کبھی نہ اکتائی ۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے "ہیں جی ، کیوں جی ؟" اور اسکی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگے ۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی ۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں ۔ ۔دن بھر انکا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر میں جا رہوں ۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا ۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا ایک "یہ کرو وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑانے والے ابا ۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے سنا۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھے بے حد غصہ آیا ۔" ابا کہنے لگے ۔ "سجادہ کی ماں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں ۔"

"کیوں ۔" اماں پوچھنے لگی ۔

کہنے لگے ۔ "بس تمام دن برتن بجتے رہتے ہیں ۔ اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو ۔"

اماں تنک کر بولیں ۔ "مجھے کیا معلوم ۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں ۔"

ابا کہنے لگے ! "افوہ ۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی ۔ برتن بجنے لگے ۔ بازار کے موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں"۔ میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا ۔ بڑی آئی ہے سجادہ ۔ جی ہاں ۔ اپنی بیٹی جو ہوئی ۔ اسوقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی ۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں ۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہا

ہو ۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدّق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھدی آواز میں گایا بھی کرتے تھے:

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا افسانہ ہے

آپا انہیں گاتے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدّو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ۔ "بدّو رونا" اور پھر آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی ۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے تھے ۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے تھے ۔ کالج میں پڑھتے تھے ۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے ۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں میں انکا ذکر چھڑ گیا ۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں ۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے ۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں ۔ کہنے لگیں ۔ اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب ۔ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں ۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی بہت سی باتیں لے بیٹھتی ہے ۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے ۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدّو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے ۔ انکی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں ۔ بدّو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے ، البتہ آپا سے زیادہ باتیں نہ کرتے ، کرتے بھی کیسے ۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگٹ بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتیں ۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا انکی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی ۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے ۔ پوچھتے "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے ؟"

"آپا" بدّو لاپرواہی سے دہراتا "بیٹھی ہے ۔۔۔۔ بلاؤں ؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں اچھا بدّو آج تمہیں یہ دیکھو اسطرف تمہیں دکھائیں اور جب بدّو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا تو مدھم سی آواز میں کہتے ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو ۔ بدو چیخ اٹھتا ۔ کیا ہوں میں؟ اس پر وہ میز بجانے لگتے ۔ ڈمگ ڈمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے ۔ دیکھا جیسے ڈھول بھی کہتے ہیں ۔ ڈمگ ڈمگ سمجھے اور آپا اکثر چلتے چلتے انکے دروازے پر رک جاتی اور انکی باتیں سنتی رہتی ۔ اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی ، اُس وقت اسکے سر سے دوپٹہ سرک جاتا ۔ بالوں کی لٹ پھسل کر گالوں پر آگرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں ۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو ۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے ۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو آپا ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ' بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آگیا ہو ۔

ایک دن مَیں ، آپا اور اماں صحن میں بیٹھی تھیں ۔ اسوقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدّو سے باتیں کر رہے تھے ۔ میرا خیال ہے کہ بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے انکی باتیں سن رہے ہیں ۔ بھائی صاحب بدّو سے کہہ رہے تھے ۔ "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کرینگے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے ۔ کتابیں پڑھ سکے ۔ شطرنج ، کیرم اور چڑیا کھیل سکے ۔ چڑیا جانتے ہو ؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈز ٹن ڈز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے ۔ سمجھے ۔؟"

بدّو بولا ۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کرینگے ۔"

اونہہ ۔ بھائی نے کہا ۔

بدّو چیخنے لگا ، "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے ۔ ہاں ۔"

اسوقت اماں نے آپا کی طرف دیکھا ۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اسقدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو ۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے ۔ "واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی ۔ بالکل پھیکی ۔ آخ تھو ۔"

بدّو نے کہا "ابا جو کہتے ہیں کہ فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیئے ۔"

"تو وہ اپنے ابا کے لئے پکاتی ہے ہمارے لئے تو نہیں !"

"میں کہوں آپا سے ؟" بدّو چیخا۔

بھائی چلائے ۔ "اوہ پگلا ۔ ڈھنڈورا ۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں ، یہ دیکھو اس طرح ڈگمگ ڈگمگ" بدو پھر چلانے لگا ۔ "میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہو نا ؟ ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا" بھائی کہہ رہے تھے "کستیوں میں ۔ اچھا بدّو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے ۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں ۔ میں ہوا گاما اور تم بدّو پہلوان ۔ ذرا ٹھہرو جب میں تین کہوں تب ۔" اور اسکے ساتھ ہی انھوں نے مدھم آواز سے کہا ۔ "ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے ۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی ۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا ۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے اور کہنے لگے ۔ "کیا پڑھ رہی ہو ج بے نا۔" ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی ۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی ۔ نورجہاں کیسا پرانا نام ہے ۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا ہے ۔ میں تو نورجہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کوئی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سوٹنا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں ۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں کمال حاصل تھا ۔ انکے منہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں ۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے ۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی جب آپا چھوٹی تھی ۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اسکا پورا نام تک لیتے گھبراتے تھے ۔ خیر میں نے جواب دیا "سکول کا کام کر رہی ہوں ۔" پوچھنے لگے کہ تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا ؟"

میں نے کہا "نہیں ۔"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی ۔" وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے ۔

آپا نے آنکھیں اُٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم سی آواز میں کہا "نہیں" اور سویٹر بننے میں لگی رہی ۔

بھائی بولے ۔ "کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے ۔ نشہ ہے نشہ ۔ خالص شہد تم اسے ضرور پڑھو ۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے ۔"

میں نے کہا "ضرور پڑھونگی ۔"

پھر پوچھنے لگے ۔ "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا ؟"

میں نے چڑ کر کہا "مجھے کیا معلوم ۔ آپ خود ہی پوچھ لیجیئے ۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا ۔ میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو ۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی ۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو ۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی ۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے والی ہے ۔ کالج جانا نہیں چاہتی ۔ بڑی آئی تھی نکتہ چیں ۔

اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خوامخواہ چڑ جاتی ۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی ۔ اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں ۔ اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب ؟ میں کیا ٹیلیفون تھی ۔ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم سم آپا بھیگی بلی ۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے ۔ "آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے ؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں ۔ سجادہ ۔ سجادہ بیٹی ۔ کیا چینی اتنی سستی ہو گئی ہے ۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہو رہا ہے ۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں ۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا مگر اسوقت اسکے گال تمتما رہے تھے کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گئی ہو" یہ کہکر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس

رہی تھی ۔ شاید کیا خوب شاید ۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے ۔ "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے ۔" صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے انکی عادت ہے ۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں ۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں ۔ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے ۔ اسکا تو خیال کرنا چاہیئے ۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی ۔ کہنے لگے "اوہ یہ بات ہے ۔ مجھے بتا دیا ہوتا ۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں "۔۔۔ اور وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے ۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی ۔ تو میں بڑی حیران ہوئی ۔ آپا ان سے ملنا تو کیا بات تک کو ناپسند کرتی تھی ۔ بلکہ اسکے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی ۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں ۔ کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلۂ گفتگو قائم کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتیں کر کے اسے ٹال دیتی ۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں" یہ کہکر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی ۔ خیر اسوقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر آپا جب لوٹ آئی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی ۔ باتوں ہی باتوں میں مَیں نے ذکر چھیڑ دیا ۔ "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پالش لگاتے ہوئے کہا ۔ "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے ۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا ۔ ہارٹ بریک ہاؤس ۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی ۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا کہ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی ۔ اسے یوں مضطرب دیکھکر مَیں دو ایک چھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں لیٹ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں ۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی ۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں نے رضائی سے

منہ نکال کر پوچھ ہی لیا ۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے ۔ دل توڑنے والا گھر اسکے کیا معنی ہوئے ۔" پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی ۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئی مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا ۔ میں نے اسکی خاموشی سے جل کر کہا ۔ "اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے ۔" کہنے لگی "میں کیا جانوں ۔"

میں نے اسے جلانے کو کہا "ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے ۔" میرا خیال ہے یہ بات اسے ضرور بری لگی ۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھدی اور بتی بجھا کر سو گئی ۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے ۔ "جھینا اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے ۔" میں نے کہا ۔ "میں کیا جانوں جا کر آپا سے پوچھ لیجیئے ۔" ہنس کر کہنے لگے "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو ۔" میں نے انکی بات کا جواب نہ دیا ۔ پھر بولے "نہیں ۔ ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑاکا بن جاؤ ۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی ۔ وہ کہنے لگے ۔ "دیکھو جھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے ۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کرونگا جو باقاعدہ صبح سے شام تک مجھ سے لڑ سکے اور نہ اکتائے ۔" میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان" ۔

بولے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے ۔ سفید سفید ، لال لال ، کالا کالا، نیلا نیلا سا" میں انکی بات سن کر بہت ہنسی ۔ پھر کہنے لگے ۔ "وہ مجھے بے حد پسند ہے ۔ یہاں تو ہے نا ہم فیرنی کھا کھا کر اکتا گئے ۔"

میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہو گی ۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھیں ۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اسکے پاس جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی ۔

ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے پوچھا ۔ "بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے ۔ اسمیں کیا ہے ۔"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی

پڑی ۔ پھر میں نے بدّو کو اور بھی چمکا دیا ۔ مَیں نے کہا "بدّو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو ۔ اس کھانے کا کیا نام ہے ۔"

بدّو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا ۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے غصے سے گھورا تھا ۔

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی ۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے ۔ اسوقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی ۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے ۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہریں ۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی ۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا ۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں ۔ بدو چھاجو باجی ۔ چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کرینگے ۔

باجی کہتی "شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ" پھر وہ بھائی صاحب کیطرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکراتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی "ہے نا بھائیَ جان ۔"

باجی کے منہ سے "بھئی جان" ایسا بھلا سنائی دیتا تھا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی ۔ اسکے برعکس جب کبھی آپا بھائی صاحب کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا تھا گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر صاحب جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی صاحب کی جگہ جاآن کہکر وہ اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی ۔ جا آن کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے ۔ اسکے علاوہ بھئی جاآن کہکر وہ ایسی کالی کالی آنکھوں میں مسکراتی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے ۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے بھائی جان میں کتنا فرق تھا ۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہو گیا ۔ بدّو نے بھائی جان

سے کھیلنا چھوڑ دیا ۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج اور کبھی کیرم کھیلتی ۔

باجی کہتی "بھائی جان ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدّو سے کہتے "کیوں میاں بدّو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو"۔ باجی بول اٹھتی "آپا سے پوچھیے ۔" بھائی کہتے "اور تم ۔" باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی ۔ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی ۔ بھوئیں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی ہو جاتی ۔ پھر کہتی "اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے ۔" بھائی جان کھل کھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا ؟ وہ جواب دیتی میں نے کہا چلو بھئی جاآن کا لحاظ کر دو ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے" اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں ۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں بیٹھ گئے ۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی ۔ بدّو چھاجو باجی چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کا پلو پکڑے اسکے ارد گرد گھوم رہا تھا ۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی ۔ کہتی تھی ۔ بھئی جاآن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں ۔ اسکے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ کرّیں بھی کیا ۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں ۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا ۔ ہے نا بھئی جاآن ۔" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے ۔ پھر باجی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی ۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی ۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا ۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی "لیجیئے بھئی جاآن ۔" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا ۔ "آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں ۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے ۔ کس نے بنایا ہے؟" باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جاآن کے لئے ۔" بدّو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا ۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا ۔ بدّو چلا اٹھا "میں بتاؤں بھائی جان ۔"۔۔۔ آپا نے بڑھکر بدّو کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور اسے گود میں

اٹھا کر باہر چلی گئی ۔ باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی ۔ بھائی جان نے مدھم آواز میں کچھ کہا ۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑیے چھوڑیے" اور پھر خاموشی چھا گئی ۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے ۔ اسوقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے ۔ بدّو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا ۔ باجی حسبِ معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی "آج ایک دھندناتا بورڈ کر دکھاؤں ۔ کیا رائے ہے آپکی ؟" بھائی جان بولے "واہ یہاں لِک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو ۔" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہو گا ۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی ۔ "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں ۔" بھائی جان معاً بول اٹھے ۔ "تو کیا ہاتھ سے ۔" ۔ "چپ خاموش ۔" باجی چیخی ۔ اسکے بھاگنے کی آواز آئی ۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی ۔ پھر خاموشی چھا گئی ۔

اتنے میں کہیں سے بدّو بھاگتا ہوا آیا ۔ کہنے لگا "آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں چلو دکھاؤں تمہیں ۔ چلو بھی ۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا ۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔ وہ بت بنی کھڑی تھی ۔ بدّو نے آپا کو چھوڑ دیا وہ کہنے لگا۔ "اماں کہاں ہے ۔" اور وہ اماں کو بلانے کے لئے دوڑا ۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے باورچی خانے میں لے گئی ۔

اسی شام میں نے کتابوں کی الماری کھولی تو اسمیں آپا کی ہاٹ بریک ہاؤس پڑی تھی ۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھا یا ہو ۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ اسکے پیچھے فروٹ سلاد والی کشتی خالی پڑی تھی ۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے ۔

بھائی تصدّق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار انکے گھر جانے کا اتفاق ہوا ۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی ۔ اسکے وہ قہقہے بھی نہ تھے ۔ اسکا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی ۔ بھائی جان بھی چپ چپ رہتے تھے ۔ ایک شام اماں کے سوا ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے بھائی کہنے لگے ۔ "بدّو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے ۔"

"اونہہ" بدو نے کہا "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں ۔"

میں نے پوچھا "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کرینگے ۔" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں" تو کہنے لگا ۔ "بتاؤں آپا کیسی ہے ۔" پھر چولہے میں جلے ہوئے اپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "ایسی" اور چھاجو باجی روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے ایسی ۔ عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا ۔" "ہاں یاد ہے ۔" بھائی نے کہا ۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے جلتی بجھتی رہتی ہے ۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی ۔ بھائی جان نے مغموم آواز میں کہا ۔ "اف کتنی سردی ہے ۔" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے ۔ بولے "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے ۔ اوپر سے نہیں دکھتی ۔ کیوں سجدے" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو ۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے ۔ "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ ۔ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے ۔"

..............O..............

آپ بیتی

شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ آپ بیتی اس واقعہ کو کہتے ہیں جو اپنی ذات پر بیتے ۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ بیتی ایک ایسا واقعہ ہے جو آپ ہی آپ ، آپ کے علم کے بغیر ، آپ کی رضامندی کے بغیر ، آپکی خواہش کے بغیر آپ پر بیتنے کا فیصلہ کرے اور بیت جائے اور آپ کو قطعی سمجھ نہ آئے کہ کیا ہو رہا ہے ۔ کچھ ہو بھی رہا ہے یا نہیں ۔ اور پھر دفعتاً آپ پر انکشاف ہو کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اور آپکی اپنی ذات پر ہوا اور وہ کس قدر اہم واقعہ تھا ۔

اگرچہ وہ واقعہ مجھ پر بیتا لیکن میں اسکے وقوع سے قطعی بے خبر تھا گویا میں اس مریض کی طرح تھا جسے کلوروفارم سنگھا کر لٹا دیا گیا ہو ۔

یہ ناگہانی افتاد ایک بیوی تھی ۔ میری منکوحہ بیوی ۔ اگر پانچ منٹ پہلے مجھ سے کوئی بیوی کی بات کرتا تو میں اسے پاگل سمجھ کر ہنس دیتا ۔ لیکن اب ، اب وہ میرے سامنے چوکی پر برقعے میں لپٹی ہوئی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس میلی گٹھڑی کو کیا کروں اور یہ تمام واقعہ صرف اس لئے ہوا کہ مجھے اناروں سے محبت تھی میرا مطلب ہے کہ وہ انار جو کھائے جاتے ہیں ۔

اس واقعہ کی ذمہ داری زیادہ تر چار اصحاب پر عائد ہوتی ہے ۔ اس مسجد کا ملّا ، جس کی بغل میں مَیں رہتا تھا ۔ اس صحت افزا بستی کا میونسپل کمشنر قربان علی ، میرا بجنوری نوکر تھا اور وہ ۔۔۔۔ میری ہونے والی بیوی ۔ ان کے علاوہ ٹماٹو چٹنی کی اک ابلتی ہوئی بوتل ۔

نکونی ہمالیہ کے ایک اونچے ڈھلان پر آباد ہے جہاں چیل کے درخت اور انکے لمبے لمبے سائے میں تپ دق کے سینی ٹوریم بکثرت ملتے ہیں ۔ جہاں یا تو آٹھ آنے ایک روپیہ ماہوار کرایہ کے مکان ملتے ہیں یا تیس چالیس روپے والی

کوٹھیاں ۔ آٹھ آنے ماہوار پر جو مکان مجھے ملا وہ ایک گہری کھاڑی کے کنارے پر واقع تھا ۔ پتھر کی پانچ فٹ اونچی چاردیواری پر سلیٹوں کی محرابی چھت تھی ۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ مکان میں جانے آنے کا واحد راستہ تھا ۔

اس مکان کے متعلق تین باتیں دلچسپ تھیں ۔ ایک تو بکری بن کر داخل ہونا ۔ دوسرے چارپائی پر پڑے پڑے یاد رکھنے کی کوشش کرنا کہ کھڑے ہوئے تو سر پھوٹ جائے گا ۔ اور تیسرے یہ بھولنے کی کوشش کہ کمرے کے چاروں کونوں میں کیسے کیسے کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہیں ۔ تو صاحب دو ایک دن میں مجھ پر واضح ہوگیا کہ اگر اسی مکان میں رہائش رہی تو نگونی کے معلق پل کو تعمیر کرنے کے لئے کسی اور سب اوورسیئر کی خدمات کی ضرورت پڑے گی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دو ایک دنوں میں میری شکل و صورت میں نمایاں تبدیلی ہو گئی ورنہ خانصاحب کو کیا پڑی تھی کہ وہ مجھ پر ترس کھاتے بلکہ انہیں یہ معلوم ہی کیسے ہوتا کہ میں دکھی مسافر ہوں ۔ اللہ انکا بھلا کرے ۔ انہوں نے میرے لئے ایک ایسا کمرہ خالی کرا دیا جس میں سونے کے علاوہ اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن تھا ۔ وہ کمرہ محلہ کی مسجد سے ملحق تھا اور وہ مسجد اور کمرہ خانصاحب نے خود بنوائے تھے ۔

حسن اتفاق سے مجھے وہ بجنوری نوکر تھا مل گیا جسکا پہلا مالک تپ دق سے مرچکا تھا ۔ اس سے پہلے نہ تو مجھے کبھی ایسے کمرے میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا جو مسجد سے ملحق ہو اور مسجد کے نام پر وقف ہو اور نہ کسی باتونی بجنوری سے سابقہ پڑا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہنسی خوشی رہنے لگا اور نگونی کے معلق پل کی مرمت ہونے لگی اور مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ ایک انوکھی آپ بیتی کی بنیاد رکھ دی گئی ہے ۔

دو ایک دن کے بعد خانصاحب آئے ۔ وہ مسکرا رہے تھے ۔ دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرخ ابھرے ابھرے گالوں کے پیچھے غروب ہو رہی تھیں ۔ انکا بڑا سا سرخ چہرہ اور اس کے اوپر خضاب سے رنگی ہوئی دو ایک لٹیں جن کے تلے سیندوری کھوپڑی، تنگی نظر آتی تھی' دیکھکر بے اختیار مجھے وہ تصویر یاد آگئی جو

ٹماٹو چٹنی کی بوتل پر چسپاں ہوتی ہے ۔ ایک بڑے سے ابھرے ابھرے ٹماٹر کے چہرے پر دو لکیروں سی آنکھیں اور سر پر دو ہرے پتے ، خانصاحب کو دیکھکر بے اختیار مجھے ہنسی آگئی ۔ اسکے بعد خانصاحب کو دیکھکر ہنسی کو ضبط کرنا میرے لئے ناممکن ہوگیا اور اسی بات پر ہم دونوں گہرے دوست بن گئے ۔

خان صاحب نے اپنی موٹی موٹی انگلیاں ان دہرے پتوں میں پھیرتے ہوئے کہا "کیوں میاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ؟ جی لگ گیا تمہارا ۔۔۔ خوش تو ہو نا؟"

ان کے سرخ سرخ گالوں کو دیکھ کر مجھے اپنے من بھاتے انار یاد آ گئے ۔ میں نے اس نیت سے کہ کوئی دلچسپ بات کہوں ، جواب دیا ۔ "جی آپ کی نوازش ہے ۔ خانصاحب میری خوشی کا کیا ہے بس ایک خوشگوار مقام ہو ، ایک میں ہوں اور ایک انار" میں نے اپنے ہاتھ سے اس پلیٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں انار کے دانے پڑے تھے "اور بس میری جنت مکمل ہے" اگر انکے گال مسرت سے ابھرے نہ ہوتے اور آنکھیں غروب نہ ہوتیں تو یقیناً وہ میرا اشارہ دیکھ لیتے اور میری طرف دیکھکر تعجب سے انار نہ کہتے ۔

"جی ہاں مجھے انار سے محبت ہے ۔" میں نے پلیٹ میں پڑے ہوئے انار کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ لیکن انہوں نے میری بات نہ سمجھی ۔

"اوس ۔۔۔۔۔۔ محبت بھی ہو گئی" وہ بولے ۔ اس سیندوری سمندر میں مدوجذر اٹھا' دو آنکھیں ناؤ سی ڈولنے لگیں اور وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے ۔ ہنستے ہوئے انکا جسم یوں جھولتا اور جھومتا تھا جیسے سڑک کوٹنے والا انجن چل رہا ہو ۔ انار کی محبت کھی کھی کھی کھی کھی کیوں نہ ہو ایک انار صد بیمار ہا ہا ہا ہا ۔ انہیں ہنستے ہوئے دیکھکر میں بھی بے اختیار ہنس پڑا ۔ اب میں خوب جانتا ہوں کہ جہاں ہنسی آئی سوچ بچار مفقود ہوئی ۔ جس چیز پر آپ ایک بار ہنس لیں اسکے متعلق سوچنا ہمیشہ کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے وہ تو ہنستے ہوئے باہر چلے گئے لیکن صاحب انکی ہنسی کے انداز پر اس دلی مسرت پر جو انکی ہنسی سے عیاں تھی اور انکی بظاہر بے معنی بات پر میں بھی اسقدر ہنسا کہ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ آخر انار کی محبت پر ہنسنے سے انکا مطلب کیا تھا اور وہاں تو ایک انار کی بجائے اناروں کے ڈھیر

لگے ہوئے تھے ۔ جو تپ دق کے مریضوں کے لئے کافی سے زیادہ تھے ۔
اسی محلے میں نگونی کا وہ مشہور بوڑھا رہتا تھا ۔ جسکی پھلوں کی دوکان کے علاوہ ایک حسین بیٹی بھی تھی ۔ جس کا نام انار تھا اور وہ دوسرے پھلوں کے ساتھ ساتھ انار بھی بیچتا تھا ۔ جسے چھوٹے موٹے آدمی خریدنے کی توفیق نہ رکھتے تھے ۔ جسکا حُسن اس علاقے میں ضرب المثل بن چکا تھا ۔ جس کے کئی ایک بیمار تھے ۔ جسکے لئے کئی ایک صاحب حیثیت کنگال ہو چکے تھے ۔ وہ انار جو بڑے بڑے پیغام رد کر چکی تھی ۔ وہ انار جو ہر ایک کی ہونا پسند کرتی تھی اور کسی ایک کا ہو رہنا گوارا نہ کرتی تھی ۔۔۔ ان سب باتوں کے متعلق مجھے قطعی کچھ معلوم نہ تھا ، انار سے میں صرف یہی سمجھتا تھا کہ ٹکے ٹکے ملتے ہیں اور مریض کے لئے مہلک نہیں بلکہ مفرح ہیں ۔
مجھے ان باتوں کی خبر بھی کیسے ہوتی ۔ دن بھر تو میں کام پر رہتا ۔ شام کو ناگ کنٹھ سیر کو چلا جاتا ۔ اور شام ہی سے سانپوں کے ڈر کے مارے دروازے بند کر کے پڑ رہتا اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتا ۔
اس کے علاوہ چھٹی کے دن صبح سویرے اپنا تھیلا سنبھالے تھرموس بوتل لٹکائے اور سوٹی پکڑے قرب و جوار میں کسی قابل دید مقام کی طرف چل نکلتا اور شام کو تھکا ہارا واپس آ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑتا اور پھر اگلے دن آنکھ کھلتی ۔
اس کمرے میں مجھ سے کوئی ملنے نہ آتا تھا ۔ صرف خانصاحب کبھی کبھار دو ایک منٹ کے لئے آ جاتے لیکن انہیں دیکھکر تو بے اختیار مجھے ہنسی آ جاتی اور سوچ بچار غائب ہو جاتی اور وہ مسجد جسکے زیر سایہ میں رہتا تھا وہ تو گویا مجھ سے کوسوں دور تھی ۔ باقی رہا تتھا ۔ اس نے ایک دو مرتبہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے مذاق میں ٹال دیا ۔ تتھے میاں پہلے طعام پھر کلام اور پھر بافراغت سے انار کھانے اور کتاب پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ۔ تو جناب نگونی کے متعلق مجھے انار کے بھاؤ کے سوا اور کسی بات کا علم نہ تھا ۔ صبح سویرے تتھا میرے لئے دو انار خرید لاتا ۔ پھر وہ کھانا پکانے لگ جاتا اور میں اخبار پڑھ کر نگونی کے پل پر پہنچ جاتا ۔ دوپہر کو تتھا میرا کھانا وہیں لے

آتا شام کو میں ناک کنٹھ سے گھومتا ہوا واپس آتا اور کھانا کھا کر پڑھنے بیٹھ جاتا ۔۔۔ ان حالات میں بھلا گردونواح کی باتوں کے متعلق میں جان بھی کیا سکتا تھا ؟

پہلے پہل تھے نے مجھے اتنے انار کھاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا "بابو جی آپ انار بہت کھاتے ہیں" میں نے دو ایک دانے منہ میں ڈال کر ہنستے ہوئے جواب دیا "بھئی انار سے محبت جو ہوئی ۔" اسکے لمبوترے چہرے پر سلوٹیں سی پڑ گئیں ۔ آنکھیں ناچنے لگیں ۔ دو موٹے موٹے ہونٹ بٹوے کے منہ کی طرح سمٹے "چیز بھی تو لاجواب ہے" وہ یوں بولا گویا کچی گری چبا رہا ہو ۔ "لاجواب !" میں نے مسکرا کر جواب دیا "بالکل" اور پیار سے ان دانوں کی طرف دیکھنے لگا جو میں نے ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے پھر شاید اسلئے کہ کوئی دلچسپ بات کہہ کر ایک خوش مذاق آقا ہونے کا ثبوت دوں ۔ میں نے کہا "تھے میاں جسے انار سے محبت ہو وہ اسکے سوا کر ہی کیا سکتا ہے کہ انار خرید کر انہیں کھائے ۔ کیوں کیسی کہی ؟" وہ ہنسنے لگا "جی جی خوب طریقہ ہے موحبت جتانے کا ۔ انار کی محبت میں انار کھاؤ ۔ ہی ہی ہی ۔" اسکی بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو روکنے کے لئے میں نے کہا "تھے میاں اب تم کھانا تیار کرو' پہلے طعام پھر کلام ، کیوں ٹھیک ہے نا" "بالکل ٹھیک بابو جی ۔" وہ بولا اور ہی ہی ہی کر کے ہنستا ہوا باہر چلا گیا ۔ اگر میں تھے سے باتیں کرنے کا عادی ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ ان سستے اناروں کے علاوہ وہاں ایک مہنگا انار بھی قابلِ فروخت ہے ۔ اور وہ قندھاری انار سے بڑھ چڑھ کر ہے ۔ اس صورت میں یہ واقعہ ہوتا ہی نہ اور آج یہ آپ بیتی سنانے کی نوبت ہی نہ آتی ۔

خیر اس دن کے بعد جب بھی میں تھے کو انار لانے کو کہتا تو اسکے لمبوترے چہرے پر جھریاں پڑ جاتیں ۔ آنکھیں ناچتیں ۔ دو موٹے موٹے ہونٹ سمٹتے اور "خوب طریقہ ہے صاحب ! ہم سمجھتے ہیں ۔" اسکے منہ کی سلوٹیں سمٹ سمٹ کر کہتیں اور وہ بازار کی طرف چلا جاتا ۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ وہ کم بخت یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرا سستے انار خریدنا گویا اس مہنگے انار کو مائل کرنے کے لئے صرف ایک تمہید تھی ۔

دراصل وہ خود اس مہنگے انار کا بیمار تھا ۔ فرصت کا وقت اس پھل بیچنے والے بوڑھے کی دہلیز پر بیٹھ کر گزارتا ۔ اس کے ساتھ باتوں میں ہر وقت میرا ہی ذکر رہتا ۔ بات بات پر اناروں سے میری رغبت کا قصہ لے بیٹھتا اور اسے چھیڑتا رہتا اور وہ بھی اسکی باتیں خوب سنا کرتی اور میرے متعلق پوچھتی رہتی ۔ آتے جاتے مجھے اپنے دروازے کی درزوں سے دیکھا کرتی ۔ حیران ہوتی کہ میری محبت کا اظہار صرف سستے انار کھانے تک کیوں محدود تھا جبکہ وہ مہنگا انار بھی خریدا جا سکتا تھا ۔ لیکن میں ان باتوں سے قطعی ناواقف رہا ۔ شاید اسی بات پر وہ چڑ گئی کہ قندھاری کے ہوتے ہوئے لوگ سستے اناروں کو کیوں پسند کریں بات بھی تو ٹھیک تھی ۔ مختصر یہ کہ میری اس بے نیازی اور بے خبری سے خود انار کو بیمار کی جستجو ہو گئی ۔

انہی دنوں ایک پولیس والا برخاست ہو کر آیا اور اس مسجد کا ملّا بن گیا جسکے ملحقہ کمرے میں مَیں رہتا تھا ۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ اس واقعہ کو تکمیل دینے کے لئے ایک پولیس والے کو برخاست ہو کر ملّا بننا پڑا ۔ ایک تو تھا وہ پولیس مین، دوسرے مسجد کا ملّا اور تیسرے پیدائشی طور پر ذرا لنگڑاتا بھی تھا ۔ اب آپ خود ہی سمجھ لیں کہ وہ ظالم کیا شے تھا ۔ پولیس مین سے تو خیر میں بے حد ڈرتا ہوں البتہ مجھے ملّاؤں کے بارے میں یہ تجربہ نہ تھا کہ انہیں جھک کر سلام کرنا چاہئے ۔ اور اسلام علیکم کہتے ہوئے آواز زیادہ تر حلق کی گہرائی سے نکالنی چاہیئے اور اگر نماز کی عادت نہ ہو تو کچھ نہ کچھ مسجد میں تیل کے لئے پیش کرنا از حد ضروری ہے ۔ میری اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملّا صاحب بگڑ گئے ۔

پہلا نکتہ جو انہوں نے پیدا کیا وہ واقعی قابلِ داد تھا دیکھو بھئی دیکھو کیا زمانہ آیا ہے مسجد کے پہلو میں رہنا اور نماز کے پاس نہ پھٹکنا گویا چراغ تلے اندھیرا ۔ یہ بات قابلِ داد اس لئے تھی کہ اگرچہ چراغ تلے اندھیرا ہوا ہی کرتا ہے لیکن اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ واقعی یہ بات قابلِ نفرین تھی یعنی چراغ تلے اندھیرا قابلِ اعتراض مان لیا گیا ۔ اسکے بعد نہ جانے کیسے اس نے سن پایا کہ مجھے انار سے رغبت ہے ۔ چونکہ دل ہی دل میں وہ خود انار کا بیمار تھا گو لاحول پڑھ پڑھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کا عادی تھا کہ اسکے دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں

ہے اس لئے وہ مجھ سے اور بھی بگڑ بیٹھا اور اسقدر بگڑا کہ ایک دن تسبیح اٹھا کر خان صاحب کے پاس جا پہنچا اور کہنے لگا "کہ دیکھئے جناب کیا زمانہ آیا ہے کہ مسجد کے پہلو میں کافر بسنے لگے ہیں ۔" یہ کہتے ہوئے وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اسکا اپنا حجرہ بھی مسجد کے پہلو میں تھا ۔ خان صاحب کو اس بات پر ایسا مزا آیا کہ وہ ٹماٹو کی بوتل چھلکی ۔ آنکھیں بار بار غروب اور طلوع ہوئیں اور سڑک کوٹنے والا انجن جھولنے لگا ۔ غرضیکہ خانصاحب اس بات پر اتنا ہنسے کہ ملّا صاحب اپنا سا منہ لیکر چلے آئے ۔

اگر خان صاحب ہنسے بغیر اسکی بات سن لیتے تو یقیناً بات مجھ تک پہنچ جاتی اور یہ واقعہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اور یوں ناگہاں مجھ پر ایک جیتی جاگتی بیوی نازل نہ ہوتی ۔ لیکن ان باتوں کا مجھے علم نہ ہوا اور بات بڑھتے بڑھتے بڑھتی ہی گئی ۔

یُوں بڑھی بات کہ میرے کمرے کے پچھواڑے میں چالیس گز کے فاصلے پر جو کوٹھی ویران پڑی تھی اسمیں ایک نئے وکیل مسٹر رے آ بسے ۔ چونکہ تھے صاحبِ ذوق اس لئے انہوں نے چوری چھپے انار کی خریداری شروع کر دی ۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑوں میں مکانات یہاں وہاں نیچے اوپر ایک دوسرے سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور مکانوں کی چاردیواریاں ہوتی ہی نہیں اور ہر جگہ سے ایک نہ ایک پگڈنڈی یہاں سے وہاں چلی جاتی ہے ۔ میرے کمرے سے بھی ایک ایسی ہی ڈنڈی رے صاحب کی کوٹھی تک چلی گئی تھی ۔ اسی راستے انار مسٹر رے تک آیا جایا کرتی تھی ۔ ایک دن صبح سویرے جب وہ مسٹر رے کی کوٹھی سے آ رہی تھی تو غالباً اس شوق کے مارے کہ دیکھوں تو یہ ستے اناروں کا متوالا کس حال میں ہے وہ میرے دروازے کے پاس رک گئی اور درزوں سے جھانکنے لگی ۔ اس دوران میں کہیں ملّاں صاحب اذان دینے کے لئے چبوترے پر چڑھے تو انہوں نے انار کو وہاں کھڑے دیکھ لیا ۔ پھر کیا تھا ۔ انہوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور کئی من گھڑت چشم دید واقعات سنا دئے ۔ دوپہر تک انہیں خود بھی ان باتوں پر یقین ہو چکا تھا اور اس حد تک کہ جمعہ کی نماز میں مسجد کے پہلو میں حرام کاری کا مسئلہ خطبے میں لے بیٹھے اور اپنی چشم دید باتیں بطور مثال پیش کرنے لگے ۔ جن میں میری اور انار کی مثال پیش پیش تھی ۔ اس روز خان صاحب تو

وہاں تھے نہیں، اسلئے مسجد میں یہ قرار پایا کہ میرے افسر یعنی انجینیئر صاحب کو مل کر مجھے معطل کرایا جائے اور اگر انجینیئر صاحب کچھ نہ کریں تو قربان علی سے کہہ کر نکونی کے میونسپل حدود سے باہر نکال دیا جائے۔

اگرچہ اس روز سارے محلے میں اس بات کا چرچا تھا لیکن ایک میں تھا جو قطعی بے خبر رہا۔ البتہ یہ میں نے ضرور دیکھا کہ لوگ میری طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے ہیں۔ چند ایک نے طنزاً کچھ نہ کچھ انار کے متعلق کہا اور اسقدر زور سے کہا کہ میں سن سکوں۔ دو ایک نے تو کان پر ہاتھ رکھکر گانا شروع کر دیا۔

سوہنے دانے نے اناراں دے
عاشق ایوس پھردے نے جیویں کتے نے بزاراں دے

دو ایک مرتبہ یہ سن کر ٹھٹھکا لیکن پھر خیال آیا کہ بھلا ان ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے متعلق کوئی کیا طعنہ دے گا۔ اس لئے حسبِ معمول جھومتا ہوا پل سے گھر تک آ پہنچا۔ گھر آیا تو دیکھا کہ اناروں کی پلیٹ خالی ہے میں نے تتھے کو آواز دی "میاں دو انار تو لے آنا، سنا تم نے" اس روز اسکے لمبوترے چہرے پر ایک خوف طاری تھا کہنے لگا "بابو جی آپکو معلوم ہے ۔۔۔" اسکی گھبراہٹ کو دیکھکر یا شاید اس خیال پر کہ ادھر ادھر کی کوئی فضول بات نہ چھیڑ بیٹھے، میں نے کہا۔ "تتھے میاں معلوم ولوم سب کچھ ہے ہمیں۔ صرف ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ لپک کر دو انار لے آؤ" پہلے اس نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا پھر گھبرا کر کہنے لگا "لیکن بابو جی اس بڈھے دکاندار سے تو نہ لاؤں گا میں" اسے یوں گھبرائے ہوئے دیکھکر حسبِ عادت میں ہنس پڑا۔ جانے کونسی معمولی سی بات پر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے از راہ مذاق کہا۔ "ارے میاں کیا نہیں جانتے، ہم سبھی کچھ جانتے ہیں، یہ بھی جانتے ہیں کہ آج جمعہ ہے اور تم تتھے میاں ہو اور ہم ہم ہیں اور ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ بس تم دوڑ کر انار لے آؤ۔" یہ سن کر وہ مایوس ہو گیا لیکن اسکی آنکھیں یوں ناچنے لگیں گویا وہ اس مایوسی کا متمنی تھا کہنے لگا "تو صاحب وہاں سے لے آؤں۔ اس اوپر والے بازار سے۔" "چاہے قندھار سے لاؤ۔ لیکن لے آؤ" میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور وہ

مسکراتا ہوا باہر چلا گیا ۔

اتفاق سے اسوقت انار اپنے دروازے پر کھڑی تھی ۔ تتھے کو جاتے دیکھکر اس نے اسے گھر بلا لیا اور پوچھنے لگی ۔ "کہاں جا رہے ہو تتھے ۔" "انار لینے اور کہاں ۔" تتھے نے تن کر جواب دیا ۔ "ابھی انار کھانے کا شوق نہیں گیا ۔" وہ بولی ۔ تتھے میاں بھی اس انار کے دانے کو دیکھ کر چہکے اور اپنی ڈینگ مارتے ہوئے لگے اپنے آقا کی تعریف کرنے ۔ "جی ہمارے بابو صاحب کو سمجھا کیا ہے انہوں نے ۔ بڑے آئے ہیں شہر بدر کرنے والے ۔ واہ لیکن انہیں معلوم بھی ہے ۔" وہ بولی "لو یہ سنو ۔" تتھے نے جواب دیا ۔ کیا نہیں معلوم انہیں سب کچھ معلوم ہے ۔ پر وہ کیا پرواہ کرتے ہیں ان باتوں کی ؟ "سچ" وہ بولی "ہاں ہاں اور نہیں تو کیا جھوٹ ۔" اسکی نگاہیں جھک گئیں ، آواز مدہم ہو گئی ۔ "تتھے واقعی انہیں میرا خیال ہے؟" "اور تو کیا ویسے ہی تفریحاً صبح شام پیٹ میں انار دانہ بھرتے رہتے ہیں ۔" اس نے جواب دیا ۔

یہ جواب سنکر وہ بے تابانہ پوچھنے لگی ۔ "لیکن وہ مجھ سے ملتے کیوں نہیں ۔" اس بات پر تتھا گھبرا گیا ۔ اب کیا جواب دے ۔ اپنے آقا کی عزت کا سوال درپیش تھا ۔ وہ آقا جو اسکا اپنا آقا تھا ۔ لیکن آخر وہ بجنوری تھا ۔ کمبخت کو ایسی سوجھی کہ بس حد ہی کر دی ۔ ایک پراسرار انداز میں منہ پر انگلی رکھکر بولا ۔ "اسمیں بھی ایک بھید ہے ۔" اسکے اس فرضی خود ساختہ بھید نے انار کے دل میں ایک اور چنگاری سلگا دی ۔ ایک تو وہ بے نیاز نوجوان ، دوسرے ایک دلچسپ بھید ، بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس آپ بیتی کی آخری کڑی بھی مہیا ہو گئی ۔

اگلے دن مجھے صاحب نے بلا بھیجا کہنے لگے "ول ول بابو ۔ ٹم مسجڈ کے پاس رہتا ہے ۔" "جی صاحب مسجد کے پاس" میں نے جواب دیا ۔ "ول ٹم نے مسجڈ کو نپلاخ کیا مطلب یہ کہ مسجڈ کو بڑا کیا ٹم نے" مسجد کو بڑا کیا ۔ انکا عجیب سا سوال تھا ۔ میں نے جواب دیا ۔ "صاحب میں نے تو کبھی مسجد میں قدم بھی نہیں رکھا ۔" "شاباش ! شاباش ! رائٹ ! دیکھو مسجد کو بالکل بڑا نہ کرو ۔ سمجھا نہیں ہم رپورٹ کرے گا ۔" "سمجھا ۔" صاحب سے جان چھوٹی

تو میں سوچنے لگا کہ اس قلندر کو آج سوجھی کیا کہ مسجد کو ناپاک کرنے کا قصہ لے بیٹھا ۔ پھر خیال آیا کہ آج دو گھونٹ زیادہ پی لی ہوگی ۔ بے چارہ ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس خیال سے مجھے تسلی ہوگئی اور میں گھر جا کر اطمینان سے سو رہا۔

انجینئر صاحب سے مایوس ہو کر وہ قربان علی سے ملے ۔ قربان علی ایک صاحب ذوق تھے ۔ گورا چٹا جسم اور چھیڑ دینے والی آنکھیں ، ہنس کر کہنے لگے ۔ "بھائی جبتک محلے میں ایک قابلِ فروخت انار ہے ، لوگ خریدیں گے ۔ پس جھگڑا ختم ۔ بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ مسٹر رے اور گپتا کی بجائے ایک مسلمان کے گھر آتی جاتی ہے ۔ ارے میاں باپ کو کوئی اعتراض نہیں ۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے ۔ پھر اسمیں ہمارا تمہارا کیا نقصان ہے ۔ باقی رہا مسجد کے قریب کا قضیہ ۔ مان لیا کہ وہ دلیر سب اوورسیئر مسجد کے ملحقہ کمرے میں رہتا ہے لیکن وہ بھی تو مسجد کے پڑوس میں رہتی ہے اسے کیوں نہیں نکالتے ، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔"

اسوقت تقریباً نو بجے ہونگے ۔ وہ سب مسجد کے باہر چوگان میں کھڑے بحث کر رہے تھے ۔ انار بھی دروازوں سے لگی کھڑی تھی اور یہ تماشا دیکھ رہی تھی ۔ عین اسوقت حسبِ معمول میں بھی پُل پر جاتے ہوئے وہاں سے گزرا ۔ میں نے دور سے قربان علی کو دیکھا اور ایک اسلام علیکم پھینک کر آگے چل پڑا ۔ مجھے مطلق یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت وہ سب وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے اور مجھے دیکھکر سب خاموش کیوں ہو گئے تھے ۔ اور ملّا کی لنگڑی ٹانگ کھڑی کے پنڈولم کی طرح کیوں ہل رہی تھی ۔ میں نے دو ایک قدم اٹھائے تھے کہ قربان علی نے آواز دی ۔ "سب اوورسیئر صاحب ذرا بات تو سنئے ۔"

"فرمائیے" میں نے سوٹی گھماتے ہوئے پوچھا ۔

"آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے ؟"

"کس معاملے میں" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔

انکی آنکھیں ناچنے لگیں ۔ کہنے لگے "یعنی یوں سمجھ لیجئے ۔ میرا مطلب ہے فرض کر لیجیے کہ ایک خوبصورت لڑکی ہے اسے اعتراض نہیں، اسکے باپ کو اعتراض

نہیں ۔ اکثر لوگوں کے پاس آتی جاتی ہے ۔ لوگوں کو بھی اعتراض نہیں تو صاحب اگر وہ کسی مسلمان کے پاس آنے جانے لگے ۔۔۔ تو آپکو کوئی اعتراض ہو گا؟"
"مجھے ؟" میں نے کہا "مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔"
"صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ ۔" ملّا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو جھلاتے ہوئے کہا ۔ "کہہ تو رہا ہوں ۔" وہ بولے اور پھر مسکرا کر کہنے لگے ۔ "یہ سچ ہے کہ آپ انار خریدتے ہیں ۔"
"انار ؟" میں نے حیرانی سے کہا "ہاں ضرور خریدتا ہوں ۔ کیوں نہ خریدوں ۔" اس بات پر مجمع پر موت کی سی خاموشی چھاگئی ۔ غصے میں بھرا ہوا تو میں تھا ہی ۔ انہیں خاموش دیکھا تو اسلام علیکم کہکر پل کی طرف چل پڑا اور سوچنے لگا کہ یہ کیا بکھیڑا ہے ۔ چار ایک قدم کے بعد میں نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی ۔ قربان علی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا ۔ بہت دلیر نوجوان ہے خدا کی قسم ۔ تم اسی سلوک کے لائق ہو" وہ ہنسنے لگا ۔

اس روز قربان علی کی باتیں سن کر، ملّا کی لنگڑی ٹانگ جھولتی ہوئی دیکھکر اور دوسروں کی سرگوشیاں سن کر شاید میں یہ سمجھ لیتا کہ کوئی بات ضرور ہے ۔ شاید مجھے یہ بھی سوجھتی کہ ان ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے جسے انار کہا جا سکے اور اس نرالے انار کی خریداری مجھ پر تھوپی جا سکتی ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ پورے دو ماہ بعد گھر جانے کا خیال دل میں سما رہا ہو ۔ جب انار کلی اور مال روڈ کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہو ۔ جب دفتر کے وسیع کمرے کی خوش گپیاں کانوں میں سنائی دے رہی ہوں ۔ جب کوئی ملازم خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دینے کے بعد ترقی کے خواب دیکھ رہا ہو ۔ یعنی جب کوئی مستقبل میں کھویا ہوا ہو تو حال دھندلا پڑ جاتا ہے اور ایسی ویسی باتوں پر دھیان دینا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے اس روز میرے لئے ان عام روزمرہ کی تفصیلات کے متعلق کچھ سوچنا قطعی ناممکن تھا ۔ نگونی کا پل مکمل ہو کر معلق کر دیا گیا تھا اور اگلے روز میں واپس لاہور جا رہا تھا ۔ اس لئے قربان علی کی وہ خوبصورت لڑکی اور وہ دلیر نوجوان میرے لئے چنداں دلچسپ نہ تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں سیٹی بجاتا چھڑی گھماتا، جاگتے میں لاہور کے خواب دیکھتا پُل پر جا پہنچا ۔

دوسرے دن جب میں اپنا سلمان باندھ رہا تھا تو خانصاحب اور قربان علی کمرے میں داخل ہوئے ۔ خانصاحب کا سیندھوری چہرہ خوشی سے پھول رہا تھا اور آنکھیں گویا تھی ہی نہیں یعنی ٹماٹو چٹنی کی بوتل مزے میں چھلک رہی تھی ۔ کہنے لگے "ارے واہ میاں کیا کہنے ہیں تمہارے ۔ تم نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑے رئیس نہ کر سکے ۔ شیر آپ ہی پنجرے میں بند ہونا چاہتا ہے ۔" پہلے تو انکی بے معنی باتیں سن کر مجھے غصہ آیا لیکن پھر انہیں ہنستے دیکھکر میں بھی ہنس دیا ۔

بولے "میاں اب تو وہ خود چاہتی ہے ۔ پھر دیر کس بات کی ۔ آج ہی ہو جائے یہ نیک کام ۔ ہے بھی تو وہ انار کا دانہ ؟ انار کا دانہ !" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "کون انار کا دانہ؟" ہی ہی ہی ہی وہ قہقہہ مار کر ہنسے تمہارا من بھاتا انار ہی ہا ہا ہا ۔"

نہ جانے کیوں اسوقت مجھے وہ ٹماٹر کی چھلکتی ہوئی بوتل کڑوی لگی ۔ جی میں آیا کہ ان دونوں اصحاب کو دروازے سے باہر دھکیل دوں لیکن پھر خیال آیا کہ نکونی میں میرا آخری دن ہے ۔ جاتے ہوئے لوگوں سے بگاڑ ۔۔۔ میں خاموش ہو رہا ۔

قربان علی خان صاحب سے کہنے لگے ۔ "میں سمجھاتا ہوں انہیں ۔" لیکن خانصاحب ہنستے ہوئے چلائے ۔ "واہ میرے شیر' نکونی کا شیر" قربان علی بولے ۔ سب اوورسیئر صاحب بات یہ ہے کہ ۔۔۔ کہ یعنی فرض کر لیجئے کہ ایک حسین لڑکی ہے ۔

فرض کر لیجئے ! میں نے دل میں سوچا کیوں فرض کر لیں ہم ۔ ہم نے کوئی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی ۔ وہاں پھر فرض کرنے کا مطلب ۔ فرض کر لو گویا میں ایک طالب علم تھا اور وہ ریاضی کا پروفیسر ۔ لیکن اتفاقاً میری نگاہ گھڑی پر جا پڑی ۔ لاری چھٹنے میں صرف پانچ گھنٹے باقی تھے تو صاحب جان چھڑانے کے لئے میں نے "جی" کہہ دیا ۔

اس پر وہ بولے کہ ہاں اسکا باپ اسے بیچتا ہے اور وہ بخوشی بکتی ہے ۔ تو میں کیا کروں میں نے سوچا ۔ میں کوئی دلّال ہوں کہ ان باتوں سے واسطہ رکھوں ۔۔۔ لیکن جی میرے منہ سے خواہ مخواہ نکل گیا ۔ "حسن کا یہ عالم ہے کہ

سارا علاقہ اس پر مرتا ہے ۔" پڑا مرے ، میں نے سوچا "کئی لوگوں نے پیغام بھیجے ۔ بڑے بڑے رئیسوں نے لیکن اس نے کسی کا ہو رہنا پسند نہیں کیا ۔"

"ہوں" میں نے غصہ دباتے ہوئے جواب دیا ۔

وہ کہنے لگے "تو صاحب اس محلے میں ایک نوجوان آ بسا اور اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ۔ ہی ہی ہی ہی ہی ٹماٹو چٹنی کی بوتل چھلکی ۔ کیسے نہ ہوتا عاشق ۔ ادھر جوانی ادھر حسن اور خدا کی قسم وہ انار کا دانہ اور یہ انار کا دیوانہ ۔ ہا ہا ہا ہا۔" جب دو شنگرفی گال ابھر ابھر کر آپکو گدگدائیں ۔ دو آنکھیں مداری کے روپے کی طرح کبھی گم اور کبھی ظاہر ہوں تو چاہے آپ غصے سے بھرے بیٹھے ہوں' آپ کے لئے ہنسی کو ضبط کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائیگا ۔ میں بھی ہنس پڑا ۔

"دلیر نوجوان" قربان علی صاحب بولے "ہاں تو پھر ان دونوں کا یارانہ ہو جاتا ہے ۔ رات کو ملاقاتیں ہوتی ہیں ۔ لوگ آوازے کستے ہیں لیکن وہ دلیر نوجوان کسی کی پروا نہیں کرتا ۔"

"شیر دلیر نوجوان" خان صاحب چلانے لگے ۔

"ٹھیک" میں نے بھی بے سوچے سمجھے کہہ دیا ۔

"اب وہ لڑکی ۔" قربان علی بولے "اس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے ۔ یعنی صرف یہی نوجوان اسکو اس گنہگارانہ زندگی سے بچا سکتا ہے ۔ سوچئے اوورسیئر صاحب ذرا سوچئے ۔ آج تک اس نے نہ جانے کتنے بڑے بڑے آدمیوں کے پیغام رد کئے ہونگے ۔ بڑے بڑے رئیسوں کو اس سے محبت تھی لیکن وہ ان سب کو الو بنا کر ٹھکرا دیتی تھی لیکن اب ، اب وہ خود اس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے ۔"

اسکے بعد وہ دفعتاً خاموش ہو گئے ۔ اس گہری خاموشی اور ان دونوں کی معنی خیز نگاہوں سے میں کچھ گھبرا سا گیا "تو پھر" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر پوچھا ۔

"پھر ؟ ہا ہا ہا ہی ہی" دو شنگرفی تودوں میں آنکھوں کا جوڑا چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا ۔

"میرا مطلب ہے" قربان علی بولا "میرا مطلب ہے کہ آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے ۔"

"میری رائے ۔ میری رائے کا اس بات سے واسطہ ؟"

"کیوں نہیں ۔" خانصاحب بولے "سب کام تمہاری رائے سے کیا جائیگا ۔"

"لیکن رائے کا مطلب ۔ جب لڑکا راضی، لڑکی راضی !" عجیب معاملہ تھا ۔ بے ڈھنگ بکھیڑا ۔

"میرا مطلب ہے انکی شادی کے متعلق ۔" قربان علی نے کہا ۔

"لڑکے کو فوراً شادی کر لینی چاہیئے ۔ میرا مطلب ہے یعنی ۔ اگر اس نوجوان کی جگہ میں ہوتا تو فوراً بیاہ کر لیتا ۔"

"واہ واہ ۔ واہ واہ !!" خان صاحب چیخنے لگے ۔ "تم سے یہی توقع تھی ۔ واہ رے میرے شیر ۔"

قربان علی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے اور پھر "ابھی آئے ہم" کہکر خانصاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے ۔

انکے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور لاحول پڑھ کر بستر باندھنے لگا ۔ لاحول تو پڑھنا ہی تھا ۔ ایسی بے معنی باتیں میں نے کبھی نہ سنی تھیں ۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک قافلے کی صورت میں لوٹے ۔ قربان علی، خانصاحب وہ لنگڑا ملّا، دو ایک نوجوان محلے دار اور ایک برقعہ پوش عورت اندر آ کر بے تکلفی سے اس چٹائی پر بیٹھ گئے جو کمرے میں بچھی ہوئی تھی ۔ انہیں اسطرح آتے دیکھکر مجھے ازسرنو غصہ آگیا ۔ جی میں آیا کہ سب کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لوں لیکن ۔۔۔۔۔۔۔ کسی کو اپنے گھر سے نکالنا دل گردے کا کام ہے اور میں، خیر چھوڑیئے اس بات کو، اپنی بے بسی محسوس کر کے میں نے خاموش رہنا تو درکنار انکی آمد پر دلچسپی محسوس کرنے کا جواز پیدا کر لیا ۔ جانے کون ہے وہ دلیر نوجوان جس کا تذکرہ کر رہے تھے ۔ ادھر وہ لنگڑا ملّا نکاح کی رسم ادا کر رہا تھا ۔ ادھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ دیکھیں تو وہ دلیر نوجوان کون ہے ۔ انہی

نوجوانوں میں سے کوئی ایک ہو گا ۔

جب ایجاب قبول کا وقت آیا تو ملا نے آنکھوں میں مسکرا کر پوچھا ۔ "بابو جی ، آپکو فلاں کی بیٹی کو اپنی زوجیت میں لینا قبول ہے" تو میرے کان کھڑے ہوئے ۔ دیکھیں وہ نوجوان کون ہے ۔

عین اسی وقت خان صاحب کھی کھی کھی کر کے ہنسے ، "عجب تماشا ہے ۔" وہ بولے "لڑکی دل سے چاہتی ہے ۔ لڑکا تیار ہے تو اس سوال کا مطلب ہاہاہاہا" اس ٹماٹو چٹنی کی چھلکتی ہوئی بوتل سے ایسے چھینٹے اڑے کہ تمام صاحبان ہنسنے لگے ۔ یہانتک کہ وہ لنگڑا ملا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ۔ بس پھر کیا تھا ، چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں ۔ "بابو جی آپکو مبارک ہو ۔ خدا آپکو اس نیک کام کا صلہ دے ۔ مبارک ہو ۔" اسوقت مجھے ہوش آیا اور معلوم ہوا کہ وہ نوجوان میں ہی تھا اور وہ میرے نکاح کی رسم ادا ہو رہی تھی اور وہ برقع پوش میری ہی بیوی تھی ۔ غصے سے میرا منہ لال ہو گیا لیکن اپنا منہ لال کرنے کے سوا اور میں کر ہی کیا سکتا تھا ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا ۔ نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی ۔ خاموش رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا ۔

"صاحبان" صاحب بولے ۔ "دعا کیجئے خدا کرے انکی باہمی محبت یونہی قائم رہے اور یہ پھولیں پھلیں ۔" آمین ! وہ سب چیخنے لگے ۔ خان صاحب بولے ۔ "لڑکی کی طرف سے جہیز کے لئے میں ایک ہزار روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں ۔" چھن سے ایک تھیلی میرے سامنے آ گری ۔ "مرحبا خانصاحب زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے وہ سب چلے گئے ۔ صرف خانصاحب، میں اور وہ رہ گئے ۔

خان صاحب نے جھک کر میرے کان میں کہا "مبارک ہو انار اب تمہاری ہے ۔" "انار" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ انہوں نے مسکرا کر اس برقع پوش کی طرف اشارہ کیا اور خود باہر نکل گئے ۔ غصے سے میں پاگل ہوا جا رہا تھا ۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور وہ کمبخت برقعے میں لپٹی ہوئی چوکی پر گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس اجنبی سی میلی گٹھڑی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر کھاڑی میں پھینک دوں اور خود کہیں بھاگ جاؤں ۔ وہ لاری

جسمیں مجھے جانا تھا ، انارکلی اور مال روڈ سب باتیں میرے ذہن سے نکل چکی تھیں اور میں غضب میں آکر اس میلی سی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا ۔

معاً اس نے برقع اٹھایا۔رنگ و روپ کا ایک طوفان اٹھا ۔ دو کالی کالی آنکھوں نے میری طرف دیکھا ۔ ایک لطیف مسکراہٹ کمرے میں تیرنے لگی ۔ کمرے میں جو رنگین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں ، کالے نیلے دھبے دکھائی دینے لگیں ۔ میرے ہاتھ سے ٹائم ٹیبل چھوٹ کر زمین پر گر گیا ۔

مجھے پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھکر وہ مسکرانے لگی اور پھر اس نے شرما کر منہ پھیر لیا ۔ نہ جانے اسوقت تتھا کہاں سے آ ٹپکا ۔ اسکا منہ مسکراہٹوں سے لدا ہوا تھا ۔ آنکھیں ناچ رہی تھیں ۔ "مبارک ہو بابو جی" اس نے چوری چوری انار کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا ۔ "انار کھائیے بابو جی یہ لیجئے!" اس نے پلیٹ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا جس میں انار کے دانے پڑے تھے ۔ "انار کھائیے ۔" اس نے دہرایا اور پیشتر اسکے کہ میں دو دانے اٹھاتا ، پلیٹ میرے سامنے سے اٹھا کر" کھائیے بھی " کہتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا ۔ انار نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں ۔

..............O..............

اندھیرا

وہ مردانہ ٹوپیوں کی دکان تھی ۔ بلوری دروازے پر گہرے نیلے رنگ کا بورڈ آویزاں تھا ۔ اس پر ایک شیشے کی نلی بل کھاتی ہوئی "ٹوپی والا" بن گئی تھی ۔ رات کے وقت اس شیشے کی نلی سے بنے ہوئے حروف میں برقی چمک لپک کر یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور "ٹوپی والا" روشن ہو جاتا ۔ اور پھر آپ ہی آپ گل ہو جاتی ۔ دکان کی سامنے والی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی تاکہ دکان میں سجے ہوئے سامان کی نمائش ہوتی رہے ۔ اس بلوری دیوار کے دونوں جانب تہہ کیا ہوا آہنی جنگلہ تھا ۔ جسے رات کو کھینچ کر مقفّل کر دیا جاتا تھا ۔ اور اس کے قریب دکان کا چوکیدار رات بھر پہرا دیا کرتا تھا ۔

دکان میں ایک وسیع کمرا تھا ۔ دودھیا دیواریں اور ستون گہرے نیلے رنگ کی پھولدار چھت سر پر اٹھائے کھڑے تھے ۔ شیشے کی الماریوں میں گتے کے ڈبوں میں قسم قسم کی مردانہ ٹوپیاں رکھی ہوئی تھیں ۔ فرش پر نمائشی الماریوں میں رنگ رنگ کی ٹوپیاں چمک چمک کر آتے جاتے کو سر ڈھانپنے کی دعوت دے رہی تھیں ۔ قد آدم آئینوں پر سر اور ٹوپیوں کے متعلق دلچسپ ہدایات لکھی ہوئی تھیں "سولا ہیٹ پہنئے اور اپنے سر کو ٹھنڈا رکھئے ۔" "سر کو ایک ٹوپی میں قید مت کیجئے ۔" "ہر سمجھدار سر مناسب موقع پر مناسب ٹوپی پہنتا ہے" وغیرہ ۔

دکان میں یہاں وہاں چاروں طرف لکڑی کے بنے ہوئے روغنی پتلے سر پر ٹوپیاں رکھے کھڑے تھے ۔ وہ سب کے سب مردانہ پتلے تھے ۔ ہر پتلے کے سر پر مختلف قسم کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی ۔ سولا ہیٹ ۔ فیلٹ ۔ گاف کیپ ۔ نائٹ کیپ ۔ رومی کالی کرسٹی ۔ شکاری ٹوپی ۔ اونی ٹوپی وغیرہ تاکہ لوگوں پر

الماری میں رکھی ہوئی ٹوپی کا فرق واضح ہو جائے ۔ یا شاید اس لئے کہ یہ امر ان کے ذہن نشین ہو جائے کہ ٹوپی سر پر پہنی جاتی ہے ۔ اور ان کی قوتِ متخیلہ ناجائز طور پر پریشان نہ ہو ۔

ان پتلوں کے روغنی متبسم چہرے اور خوشنما لباس بہت جاذبِ نظر تھے رات کا وقت تھا ۔ کمرے کے وسط میں ایک لٹکتی ہوئی برقی قندیل روشن تھی ۔ آہنی جنگلے کے پرے چوکیدار کی پیٹھ دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی ۔ ایک بھاری سے اوور کوٹ پر ایک لپٹی ہوئی پگڑی دکھائی دے رہی تھی ۔

دکان کی دیوار گھڑی نے بارہ بجائے ۔

سولا ہیٹ والے پتلے نے انگڑائی لی ۔ آنکھیں ملیں ۔ "اُف"! اس نے دونوں باہوں کو سر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "یہ کمبخت ٹوپی جو میرے سر پر چڑھی ہوئی ہے میں اسے اٹھا اٹھا کر اکتا چکا ہوں ۔ خدا کی قسم ! یہ ملعون ٹوپی ! دن رات اسے سر پر اٹھائے کھڑے رہنا جیسے زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھا کر کھڑے رہنا ہی ہو !"

"کون ہے ؟" کاف کیپ والے نے آنکھیں کھول کر پوچھا ۔

"وہی دیوانہ ۔ سولا ہیٹ ۔ اور کون" رومی ٹوپی والے نے جواب دیا ۔

"کیا کہتا ہے؟"

"جانے کیا بکتا ہے"

خدا کی قسم! مجھے گمان ہے کہ زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم ٹوپیاں اٹھا کر کھڑے رہیں"۔

"ہاہا ۔ ہاہا ۔ ہاہا ۔" کاف کیپ والا اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے ہنسا ۔ خوب خوب! گویا زندگی کا مقصد صرف ٹوپی اٹھائے کھڑا رہنا ہے ۔"

پاگل! پاگل! ہاہا ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہوہو ۔ ہی ہی! قسم ہے اگر اس کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو بھی اسے گلہ ہوتا کہ اسے اپنے شانوں پر سر اٹھانا پڑتا ہے ۔ یقین جانو ۔"

"ہاں ۔ ہاں"! فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا "اس فلسفی سے بھلا کوئی پوچھے کہ بڑے میاں اگر زندگی کا مقصد صرف ٹوپی

اٹھائے کھڑا رہنا ہے تو تم نے اتنا لمبا اوور کوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"
"ہاں ہاں ' اوور کوٹ کیوں پہنا ہوا ہے؟"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔"
"اب کیوں نہیں بولتا ۔"
"ارے دیوانہ ہے دیوانہ ۔"
کمرے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں ۔
"اوور کوٹ"! سولا ہیٹ والے نے نفرت سے کہا ۔ "کس نے کہا تھا کہ مجھے اوور کوٹ چاہئے ۔ کون اوور کوٹ مانگتا ہے ۔ اوور کوٹ! ۔۔۔۔ شاید تمہیں یہ اوور کوٹ خوشنما نظر آتا ہو ۔ میرے لئے تو یہ محض ایک مجبوری ہے ۔ اوور کوٹ! ۔۔۔۔ جسے میں اتار نہیں سکتا ۔ خود پہن بھی نہیں سکتا جو خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار ہو رہا ہے ، میری لاچاری کا زندہ ثبوت ہے ۔ خدائی قسم یہ دیدہ دلیر ٹوپی ۔ آخ ۔"
فیلٹ والے نے اپنے مکلف کالر سمیت گردن موڑی اور اس دائمی مسکراہٹ کو جو اس کے ہونٹوں پر مہر کی طرح ثبت تھی ، بھینچ کر کہا ۔ "دیوانے تم زندگی کو کیا جانو چھوٹا منہ بڑی بات ۔ اتنی بڑی بات!۔۔۔۔ یہ دودھیا دیواریں ۔ وہ خوبصورت ستون پر رنگا رنگ ڈبے ۔ یہ روشنی کا فوارہ ۔ آئینے ، بلوری ساز و سامان ۔۔۔۔ انہیں دیکھو ۔"
"آہا!" سولا ہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا "انہیں دیکھو! کسے دیکھوں ؟ کیا دیکھوں یہ دھندلی دھندلی دیواریں جو یہاں سے چل کر نہ جانے کہاں جا ختم ہوتی ہیں یہ نیلے پیلے گتے کے ڈبے جن کے متعلق ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان میں کیا ہے اور یہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی جو اندھیرے سے جھگڑ جھگڑ کر اکتا چکی ہے ۔ اور اب ۔ اب اپنی تھکی ہاری کرنیں سمیٹ رہی ہے ۔ یہ سب کیا ہے ؟ یہ روشنی یہ اندھیر ؟ یہ کون سی جگہ ہے ؟ ہم کون ہیں ؟ کیوں ہیں ۔ ہمیں بنانے والا کہاں ہے ؟ اور ۔۔۔۔ اور یہ ٹوپی خدائی قسم! یہ ملعون ٹوپی"۔
"اس قدر کفرانِ نعمت ۔ نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!!" رومی ٹوپی والا بولا ۔
"یہ نعمتیں یہ جوانی ۔ اندھا ہے اندھا!"

"بھگوان دیا کرے" کالی ٹوپی والا زیرِلب بڑبڑایا۔
"میں کہتا ہوں۔ بے چارہ معذور ہے" فیلٹ والے نے مسکراتے ہوئے کہا "جسے یہ ٹوپی کا بوجھ سمجھتا ہے۔ وہ درحقیقت اس کے پراگندہ خیالات کا بوجھ ہے۔"
کالی ٹوپی والے نے سر اٹھایا "مگر مہاراج بنانے والے کے متعلق ایسے شبد کہنا۔ بھگوان دیا کرے۔ بھگوان دیا کرے"۔
"ہاں۔ ہاں۔ اس کے نور کے متعلق ایسی باتیں منہ پر لانا۔ استغفراللہ! استغفراللہ!" رومی ٹوپی والا بولا۔
"اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ جنٹلمین! یہ جگہ ہمارے رہنے کیلئے بنی ہے یہ سب خوشنما چیزیں ہمارے لئے ہیں۔ مجھے ۔۔۔ مجھے اس "کاف سٹک" کی قسم!" کاف کیپ والے نے اپنی سٹک گھماتے ہوئے کہا۔
"یہ سب کچھ ہمارے لئے ہے۔ یہ دھاریدار سوٹ یہ ۔۔۔۔"
"اس لئے کہ تم روشنی میں کھڑے ہو نا۔ یہاں آکر دیکھو۔ اس کونے میں" دائیں کونے سے نائٹ کیپ والے کی آواز آئی "جہاں اچھی طرح سے اُجالا، اندھیرے سے جدا نہیں ہوا۔ جہاں دودھیا دیواروں کی بجائے گدرے گدرے سائے گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ان دھندلی وسعتوں کو آکر دیکھو تو ۔۔۔ تمہیں کسی کا مذاق اڑانے کا حق نہیں۔ تم اپنے آپ کے سوا اور کسی کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔"
"خوب، اپنا آپ سمجھنا ۔۔۔ واللہ! کیا خوب! اپنا آپ کون سمجھتا ہے؟ کون؟ اتنا بھی نہیں کہ ہم اپنے آپ کو سمجھ سکیں۔ کیسا مذاق ہے۔ جیسے دنیا کسی مداری کا تھیلا ہو، خدائی قسم مداری کا تھیلا" سولا ہیٹ والا چیخنے لگا۔
گڈلارڈ۔ فیلٹ والے نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "کون کہتا ہے کہ اپنا آپ سمجھو، ضرورت ہی کیا پڑی ہے کہ ہم اپنے آپ سمجھنے میں اپنی زندگی حرام کر لیں۔ جینا بذاتِ خود ایک نعمت ہے۔ چاہے تم اسے سمجھ سکو یا نہ سمجھ سکو۔ یہ سانس لینا۔ یہ سونا۔ یہ جاگنا یہ چمکدار روشنی۔
"خدا گواہ ہے کہ مجھے جینے پہ ناز ہے۔ الحمدللہ کہ میں جیتا ہوں۔ الحمدللہ کہ

میں دیکھتا ہوں ۔" رومی ٹوپی والے نے کہا ۔

"کون کہتا ہے کہ زندگی کو سمجھو ، کون کہتا ہے ؟" کاف کیپ والا چمک کر بولا "میں کہتا ہوں ۔ تم یا تو کیک کو کھا کر اس کی لذت سے محظوظ ہو سکتے ہو اور یا اس کو سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کر سکتے ہو ۔ تمہاری اپنی مرضی ہے ۔ دونوں باتوں میں سے کوئی ایک چن لو ۔ مگر ایک ہی وقت میں اس پر غور و خوض کرنا اور اسے کھانے کی بھی خواہش رکھنا حماقت ہے ۔ زندگی کو سمجھنا اور جینا دو متضاد باتیں ہیں سنا آپ نے مسٹر ؟ ذرا غور کیجئے ۔"

فیلٹ والے نے ہاتھ جیب میں ڈالے اور اطمینان سے کہنے لگا ۔ جو کچھ ہم ہیں وہ تو ہیں ہی ، بدل نہیں سکتے ۔ پھر اس بات کے متعلق سوچنے سے فائدہ؟"

"حماقت! اور کیا؟"

"ایسے احمق بھی ہیں" رومی ٹوپی والے نے کہا "ایسے شرفا بھی ہوتے ہیں ۔ جو جب تک دانت ہوں ، بادام کو سامنے رکھ کر اس پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں ۔ اور جب دانت گر جائیں تو اسے کھانے کی ناکام آرزو پر ، اس حسرت پر کہ اسے کیوں نہ کھا لیا ، کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں ۔"

اللہ جانتا ہے ۔ یہ کفرانِ نعمت ہے ۔ استغفراللہ! استغفراللہ!

"غم خور!"

"دیوانے!"

"سب بھگوان کے روپ ہیں ۔ سب بھگوان کے روپ ہیں۔" کالی ٹوپی والا گنگنانے لگا ۔ "ایک سے ایک نہیں ملتا ۔ ایک سے ایک نرالا ہے ۔ بھگوان کے روپ کا کیا انت ہے ۔"

"گستاخی معاف ۔ بندہ تو جینے کا قائل ہے ۔"

"الحمدللہ! الحمدللہ!"

"بندہ بھی جینے کا قائل ہے۔"

"ہاں جیو ۔ تمہیں جینے سے کون روکتا ہے؟" نائٹ کیپ والا چلّایا ۔ "خوشی سے جیو مگر اس بھلے مانس کو سوچنے سے کیوں روکتے ہو ۔ تم جیو ۔ اسے سوچنے دو۔"

"ہاں ہاں سوچنے دو ۔"

"ہمیں کیا پڑی ہے کہ سارے جہان کا درد اپنے سر لیں ۔"

"ہماری بلا سے ۔"

"دیوانے کو کیا کہئے"

ہر کوئی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا ۔

"ہاہا ۔ ہاہا ۔ ہاہا" سولا ہیٹ والا دیوانہ وار ہنسا "گویا میں دیوانہ ہوں ۔۔۔۔ میں پوچھتا ہوں ۔ کون ہے جو دیوانہ نہیں ؟ کون ہے ؟ تم سب جینے کے دیوانے ہو اور میں سوچنے کا ۔ دیوانگی کیا ہے ؟ کون بتا سکتا ہے کہ دیوانگی کیا ہے ؟ خدائی قسم ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عقل کیا ہے ۔ اس رسمی دنیا میں نہ سوچنے والا احمق ۔ ڈر ڈر پھونک پھونک کر سوچنے والا عقل مند اور بے دھڑک سوچنے والا دیوانہ ہے ۔ خدائی قسم عجب جھمیلا ہے ۔"

"گڈلارڈ!" گاف ٹوپی والے نے اپنی چھڑی کو ہوا میں گھماتے ہوئے کہا "اس کمبخت نے ہماری زندگی بھی حرام کر رکھی ہے ۔"

"ہاں ہاں بالکل حرام !"

"قطعی حرام !"

"اللہ جانتا ہے! اُف !"

"میں کہتا ہوں ذرا سوچو تو" نائٹ کیپ والے نے کہا "اگر وہ چپ چاپ کھڑا رہے تو کیا تم سب گم صم کھڑے اکتا نہ جاؤ ۔ کیا اس کے ایک شک نے ہماری زندگی دلچسپ نہیں بنا رکھی ۔ شاید زندگی شکوک کی وجہ سے اتنی دلکش نظر آتی ہو ، کون جانتا ہے ؟"

"دلچسپ ۔ آخ"

"ہماری زندگی ۔۔۔"

"تمہاری زندگی ۔" سولا ہیٹ والے نے حقارت سے منہ بنا کر کہا "جسے تم زندگی کہتے ہو ، کیا ہے ؟ بارہ بجے جاگنا اور پھر چار بجے جب مشرقی دروازے میں سفید سفید دھواں سا اٹھتا ہے سو جانا ۔ دن رات ، دن رات ایک دوسرے سے دور یہ ملعون ٹوپی اٹھائے کھڑے رہنا ۔ اتنا بھی نہیں کہ دو قدم چل سکیں ۔

ان دھندلی دھندلی شکلوں کی طرح چل سکیں جو ساری رات جب ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں، ہمارے ارد گرد ناچتی ہیں۔ خدائی قسم ہم سے تو وہ بھتنے ہی اچھے ہیں جو ناچتے پھرتے ہیں۔ زندگی ہاہا۔ ہاہاہا۔ زندگی کے دیوانے۔ فرش میں گڑے ہوئے دیوانے۔"

"زندگی کی حقیقت سمجھنے والے، اگر تم اسے مصیبت سمجھنے پر مصر ہو تو پڑے سمجھو ہمارے لئے تو جینا ایک خوشنما مسکراہٹ ہے۔" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ سنوارتے ہوئے کہا۔

"مسکراہٹ" سولاہیٹ والے نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بھی خوب رہی۔ اس مسکراہٹ پر ناز کرتے ہو جو تمہارے ہونٹوں پر کھدی ہوئی ہے۔ جس طرح یہ فیلٹ تمہارے سر پر چڑھی بیٹھی ہے۔ تم اسے اتار نہیں سکتے۔ اپنے سوٹ کے علاوہ تمہیں اس مسکراہٹ کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور تم اسے ایک پھوڑے کی طرح اٹھائے پھرتے ہو۔ خدا کی قسم پھوڑے کی طرح ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا۔"

"پھوڑا ہی سہی" فیلٹ کیپ والے نے چمک کر جواب دیا "تمہاری نظروں میں پھوڑا ہے نا۔ ہر کسی کی مسکراہٹ دوسرے کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی ہے۔ یہ تو اصولی بات ہے۔"

"بھئی واہ کیا پتے کی بات کی ہے۔ مگر حضرت واضح ہو کہ بندہ تو جینے کا قائل ہے۔" کاف نے کہا۔

"علٰی ہٰذالقیاس" فیلٹ والا بولا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" نائٹ کیپ والا مدہم آواز میں کہنے لگا۔ "بھئی جیو۔ پیٹ بھر کر جیو۔" "تمہارے لئے جینا واقعی مسکراہٹ ہے۔ اس لئے کہ تم روشنی میں کھڑے ہو۔ اس لئے کہ تمہارے اردگرد بلوری سامان بکھرا ہوا ہے۔ روشنی میں بلور بلور نظر آتا ہے اور کپڑوں پر رنگدار دھاریاں ابھر آتی ہیں اور مسکراہٹیں خوشنما دکھائی دیتی ہیں۔ یہ رنگ یہ روپ یہ بلور، یہ سب روشنی کا دھوکا ہے۔ روشنی کا فریب۔"

"اس کے نور کو دھوکا سمجھنا۔ توبہ ہے توبہ" رومی ٹوپی والا کہنے لگا۔

"اسی کے روپ ہیں ۔ یہ اُجالا ، یہ اندھیرا ، سب اسی کے روپ ہیں ۔ بھگوان کے روپ کا کوئی انت نہیں" کالی ٹوپی والا گنگنانے لگا ۔

"کہاں ہے اجالا ؟ کہاں ہے اجالا؟" اوپر سے مدہم آواز سنائی دی جیسے دور دھندلی وسعتوں میں کوئی کراہ رہا ہو "یہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے بوجھل اندھیرا ۔ اس اندھیرے میں میرا دم رکتا ہے ۔ میں کہاں ہوں ۔ میری کالی ٹوپی اور ڈریس سوٹ کیا ہوئے ۔ تم سب کہاں ہو ؟ اُف یہ گہرا اندھیرا!"

کچھ دیر کے لئے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھاگئی ۔ گویا سب ڈر کے مارے گونگے ہو گئے تھے ۔

"کون ہے؟"

"کون بولا؟"

"سنا تم نے؟"

"چپ وہ کراہ رہا ہے!"

"سنو سنو!"

"آہ کبھی میں بھی روشنی میں تھا۔" اوپر سے آواز آئی ۔ "مگر اب --- میں اس اندھیرے کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں ۔ میرا دم رکتا ہے --- مالک ---"

"مالک!"

"سنا تم نے" نائٹ کیپ والے نے کہا ۔

"کون ہے؟" فیلٹ والے نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا ۔

"یہ وہ ہے جو کسی زمانے میں ڈریس سوٹ پہنے ، کالی ریشمی ہیٹ لگائے اس جگہ کھڑا تھا ۔ جہاں اب تم کھڑے ہو ۔" نائٹ کیپ والے نے طنز بھرے انداز میں کہا --- پھر اس کی وہ مسکراہٹ جس پر تمہیں ناز ہے، جاتی رہی ۔ اس کے چہرے کی سرخی اور چمک مدہم پڑ گئی --- پھر وہ یہاں سے اٹھوا دیا گیا اور اب نہ جانے کہاں پڑا ہے ۔ جہاں تم کو بھی ایک روز جانا ہو گا ۔"

"مجھے ؟" فیلٹ ہیٹ والا کالر اور گردن کے درمیان انگلی پھیرتے ہوئے چلایا ۔

"ہاں تمہیں!"

کاف والے نے اپنا تھیلا چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا۔

کالی ٹوپی والے نے خوف زدہ نگاہوں سے اوپر دیکھا "ہے بھگوان!"

شکاری نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چھاتی پر صلیب کا نشان بنایا۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سولا ہیٹ دیوانہ وار ہنسنے لگا "ڈر گئے؟ ــــ سوچتے کیا ہو؟ پیٹ بھر کر جیو۔ یہ دودھیا دیوارـیں، یہ بلوری سازوسامان، یہ روشنی کا فوارہ، خوب جیو ــــ جو کچھ بھی تم ہو وہ تو تم ہو ہی، بدل نہیں سکتے۔ پھر سوچنے سے فائدہ؟ بادام کھا لو ورنہ دانت گر جائیں گے تو کفِ افسوس ملو گے۔ آج روشنی میں کھڑے ہو کر کل آنے والے اندھیرے سے ڈرنا حماقت ہے۔ دیوانگی ہے۔ خدائی قسم دیوانگی! ہاہا۔ ہاہا۔ ہاہا۔ ڈر گئے!"

"چپ چپ" آہنی جنگلے کے پاس کھڑے شکاری نے کہا۔

"کون ہے؟"

"چپ۔ چوکیدار۔"

"چوکیدار ادھر دیکھ رہا ہے!"

"چوکیدار؟"

"ہاں ہاں۔ وہ ادھر دیکھ رہا ہے۔"

جنگلے کے باہر چوکیدار کی دھندلی شکل نظر آ رہی تھی۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں دو اندر دھنسی ہوئی آنکھیں جن پر دو بھاری بھوـیں ابھری ہوئی تھیں۔

"کون چوکیدار؟ جس چیز کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا، اس سے کیوں ڈروں؟" سولا ہیٹ بولا "اس کی شکل تو دیکھو جیسے کوئی بھیانک خواب ہو۔ جیسے یہ بھی کسی اندھیرے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔ خدائی قسم مجھے شبہ ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص ہم سے زیادہ دکھی ہے۔ وہ دیکھو اس کے سر پر ٹوپی سے بھی بھاری چیز چڑھی بیٹھی ہے۔ وہ دیکھو۔"

"اونہوں چیخو نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو۔" کاف کیپ والا ڈر سے کانپتے ہوئے بولا "سن لے۔ مجھے قطعی پروا نہیں۔ میں اس بھیانک شکل سے

نہیں ڈرتا ۔ بے چارہ بھوت ۔۔۔ بھوت ۔۔۔" سولا ہیٹ ہنسنے لگا ۔
"جنہیں تم بھوت کہتے ہو ۔ جو رات کو جس وقت ہم سو رہے ہوتے ہیں ہمارے ارد گرد پھرتے ہیں ۔ دن کے وقت وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے ؟ خدائی قسم مجھے شک ہے کہ یہ بھوت ہم سے بھی زیادہ معذور ہیں ۔ دکھی ہیں ۔ ان کو بھی سر پر ٹوپیاں اٹھانی پڑتی ہیں اُف یہ ملعون ٹوپی!"
سب چپ چاپ کھڑے تھے ۔
"انہیں کون نہیں جانتا ۔ کون نہیں جانتا ۔" فیلٹ والے نے چوکیدار کے جانے کے بعد کہا۔
"سبھی جانتے ہیں ۔"
"ہاں ۔ ہاں ۔ جانتے ہیں ۔"
"کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ اس بلوری دروازے کے پرے بھوتوں کی نگری ہے ۔"
"تم نے نہیں پڑھا مہاراج ؟ اندھیر نگری چوپٹ راج ۔"
"بھوتوں کی بات نہ کیجئے صاحب ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ راندے ہوئے ۔"
"پھر تم چوکیدار سے کیوں ڈرتے ہو ؟" سولا ہیٹ نے پوچھا ۔
"کون ڈرتا ہے ۔" کاف کیپ والا چھڑی گھما کر بولا ۔
"بے چارہ چوکیدار!" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ کو سنوارتے ہوئے کہا ۔
"ہاں ہاں بے چارہ ۔"
"ہماری خدمت کے لئے یہاں کھڑا رہتا ہے ۔"
"نوکر جو ہوا ۔"
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔"
سب بے دھڑک بولنے لگے ۔
"نان سینس" سولا ہیٹ حقارت سے چیخ اٹھا "ہمارا خدمت گار اور ہمارے سر پر ہی ڈنڈا لے کر کھڑا ہے ؟ خوب! آپ صاحبان کے کیا کہنے ہیں ۔ آپ کی خدمت کے لئے ایک بھوتوں کا جہان بنایا گیا ہے ۔ آپ کی آنکھوں کو چکا چوند

کرنے کے لئے یہ بلوری سلمان بنا ہے ۔ خدائی قسم آپ کے کیا کہنے ہیں ۔ اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سمجھنا ، اشرف المخلوقات خیال کرنا ، اپنی عظمت پر ایمان رکھنا ، یہی جینا ہے ۔ خدائی قسم جینا سب سے بڑا جھوٹ ہے ، دھوکا ہے ، فریب ہے ۔ تم واقعی جیتے ہو ۔ جیو ، پیٹ بھر کر جیو ۔ گھر کو آگ لگا کر تماشا دیکھو ۔ ہاہا ۔ ہا ۔ ہاہاہاہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ آخ ۔

"کون ہنستا ہے ؟ کون ہنستا ہے ؟ میرے دکھ پر کون ہنستا ہے ۔" اوپر سے آواز آئی ۔ "سنو ، سنو ۔"

"خدائی قسم یہ بھوت ہی ہم سے بہتر ہیں ۔" سولا ہیٹ والا اپنی دھن میں چیخ رہا تھا ۔ ان کے پاؤں میں حرکت ہے ۔ وہ چل پھر سکتے ہیں اور ہم ؟ اس رنگین فرش پر یوں گڑے ہوئے ہیں جیسے ستون ۔ ہم کیوں چل پھر نہیں سکتے ؟ کیوں ؟ خدائی قسم میں چلنا چاہتا ہوں ۔ میں اپنے بنانے والے کو ڈھونڈ نکالوں گا ۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ یہ اندھیرا کیوں ہے ۔ یہ دیواریں کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں ؟ اور یہ کمبخت ملعون ٹوپی ـــــ"

"خبردار حرکت نہ کرنا ۔ حرکت گناہ ہے ۔" رومی ٹوپی والا چیخنے لگا ۔

"شانتی ـــــ شانتی ـــــ" کالی ٹوپی والا گنگنایا "حرکت دھوکا ہے ۔ آنکھ کا دھوکا ۔ حرکت کے لوبھ میں نہ پڑو ۔ تم بھوت بن جاؤ گے ۔ تمہاری آتما کو شانتی نہیں ملے گی ۔ شانتی ـــــ شانتی ـــــ شانتی ـــــ ہے بھگوان! سب تیرے ہی روپ ہیں ۔ تو ہی حرکت ہے ۔ تو ہی شانتی ہے ۔ مگر ہمیں حرکت راس نہیں ۔"

"کون کہتا ہے حرکت گناہ ہے ۔ گناہ کیا ہے ؟ جو بات بس میں نہ ہو وہ گناہ ہے گناہ ؛ گناہ اور ثواب سب دل کی تسلیاں ہیں ۔ جینے کا سامان ـــــــ خدائی قسم میں حرکت کروں گا ۔ میں اپنے پاؤں پر چلوں گا ۔ میں اس سے ملوں گا ۔ پوچھوں گا ۔ یہ کیا کھیل کھیل رہے ہو! یہ کھلونے کیا ہیں ؟ کیوں ہیں ۔ اور یہ کمبخت ٹوپی کیوں میرے سر پر چڑھی بیٹھی ہے ۔"

"مجھے بچاؤ ۔ مجھے بچاؤ ۔" اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی ۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ میں بچاؤں گا ۔ میں آتا ہوں ۔ چاہے حرکت کرنے میں

میرا سارا عزم ہی کیوں نہ صرف ہو جائے ۔"

"کیا کہا ؟ چلنا چاہتا ہے ؟"

"میرے اللہ!"

"ارے ارے ارے!"

"ہے بھگوان؟"

سولا ہیٹ کا منہ سرخ ہو رہا تھا ۔ آنکھیں قوت کے تصرف سے پھول گئی تھیں ۔ وہ اپنی تمام قوت سے حرکت کی کوشش کر رہا تھا ۔

سب کی نگاہیں سولا ہیٹ والے پر جمی ہوئی تھیں ۔

"خدائی قسم اس کی ٹانگ ہل رہی ہے ۔"

"وہ دیکھو ۔ وہ دیکھو!"

"کہاں؟"

"وہ پھر ہلی ۔"

"میرے اللہ اس کی ٹانگ اٹھ رہی ہے ۔"

"کیا کہا ؟"

"وہ چل رہا ہے !"

"ہاہا ہاہا ہاہا" سولا ہیٹ والا ایک قدم چل کر خوشی سے چیخنے لگا ۔

"میں چل سکتا ہوں ۔ میں چل سکتا ہوں ! خدائی قسم میں چل سکتا ہوں ۔ میں مالک سے ملوں گا ۔ میں اس سے پوچھوں گا ۔ یہ اندھیرا کیوں ہے ؟ میں اسے ڈھونڈ لونگا ۔"

"ہاں ہاں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا" گاف کیپ والا گنگنانے لگا ۔

"ہاں ہاں ہم بھی پوچھیں گے ۔ یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"اگر مجھے بھی چلنا سکھا دو ۔ تو ۔۔۔۔" شکاری نے حسرت سے کہا ۔

"ٹھیک ہے ہمیں بھی چلنا سکھا دو بھائی ۔"

"میں سکھاؤں گا ۔ تم سب کو چلنا سکھاؤں گا ۔ بالکل آسان ہے ۔ خدائی قسم ۔ بالکل آسان ۔ اپنے تمام ارادے سے چلنے کا خیال دل میں جما لو ۔ اپنی تمام قوت کو حکم دو کہ وہ تمہارے پاؤں میں آجائے ۔ اپنے دل میں یہ ایمان پیدا

کرو کہ تم چل سکتے ہو ہاں ہاں کوشش کرو، کوشش ۔ چلو ۔۔۔ چلو ۔۔۔۔"

تمام پتلے اس کے کہنے پر عمل کرنے لگے ۔

"واللہ کیا خوب!" روی ٹوپی والے نے پاؤں اٹھا کر کہا ۔

"گڈ لارڈ!"

"ارے واہ!"

"بھئی خوب"

سب کے پاؤں آہستہ آہستہ ہلنے لگے ۔ انہوں نے ایک ایک قدم اٹھایا ۔

"ہاں ہاں ہم چل سکتے ہیں ۔"

"خوب ۔ خوب"

(کلاک نے ساڑھے تین بجائے)

"افوہ! ساڑھے تین" سولا ہیٹ بولا "ٹھہرو" وہ سب اپنی اپنی جگہ رک گئے "اب رات ہو چکی ہے ۔ آج نہیں ۔ کل ہم سب چلیں گے ۔ کل ہم اپنے مالک ، اپنے بنانے والے کو ڈھونڈ نکالیں گے ۔ اس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے ؟ خدائی قسم کل ۔۔۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلئے گا ۔"

"جی ہاں ۔ ہم سب کو ۔"

"پوچھیں گے یہ اندھیرا کیوں ہے؟"

"اور ۔ اور یہ بوجھل تھیلا ۔ میں اسے اٹھائے اٹھائے تھک گیا ہوں" کاف والے نے کہا ۔

"اور یہ ٹوپی ۔"

"اور یہ دائمی مسکراہٹ جو میرے ہونٹوں پر ثبت کی ہوئی ہے ۔ میری باچھیں اکڑ گئی ہیں ۔"

"خاموش" سولا ہیٹ بولا "اب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ ۔ رات ہونے کو ہے ۔ کل خدائی قسم" اس نے اپنی جگہ واپس جاتے ہوئے کہا "کل مالک سے ۔۔۔ اُف یہ کمبخت ٹوپی اس نے اپنی گرتی ہوئی ٹوپی کو سنبھالنے کی کوشش کی ۔

تڑاخ ۔ دھماکے کی آواز آئی ۔ سولا ہیٹ والا پتلا فرش پر گر کر چور چور ہو گیا ۔

"کیا ہوا؟"

"اُف!"

"ارے!"

"بھگوان!"

تمام چہرے خوف سے بھیانک ہو رہے تھے ۔

اگلی رات وہ سب یوں بیدار ہوئے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگے ہوں ۔ نائٹ کیپ والے کو سولا ہیٹ والے کے حادثے کا علم نہیں تھا ۔ وہ وہیں اپنی جگہ سے کھڑا چیخ رہا تھا ۔ "میں کہتا ہوں ۔ تم سب چپ کیوں ہو ۔ جواب دو ۔ کیا تم نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آج مالک کو ڈھونڈ نکالیں گے ۔ اس سے پوچھیں گے کہ یہ اندھیرا کیوں ہے ؟ بھول گئے کیا ؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"کون ہے؟"

"ارے وہی نائٹ کیپ والا ۔"

"کیا بکتا ہے۔"

"دیکھا سولا ہیٹ نے چلنے کی کوشش کی تھی ۔ احمق اپنی جان گنوا بیٹھا ۔"

"ارے دیوانہ تھا ۔ دیوانہ"

"میں نے تو کہا تھا ۔ حرکت گناہ ہے ۔"

"ہائیں! یہ کون" فیلٹ والے نے حیرانی سے چیخ کر کہا ۔

"کیا کہا؟"

"کون ہے ؟"

"کدھر ہے؟"

"وہ دیکھو" فیلٹ والے نے انگلی سے اشارہ کیا ۔ سب کی نگاہیں ادھر اُٹھ گئیں ۔

سولا ہیٹ کی جگہ پر ایک خاتون کا پتلا کھڑا تھا ۔ جس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا ۔ بچے کے سر پر تنکوں کی ٹوپی تھی ۔ بچے نے عورت کی انگلی پکڑ رکھی تھی ۔ عورت کے بدن پر زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی لپٹی ہوئی تھی ۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں مگر کالی کالی پتلیاں دوڑتی ہوئی کونوں میں آ آکر مسکراتی تھیں ۔

"گڈ لارڈ" شکاری نے کہا ۔

"کتنی حسین ہے !" کاف کیپ والے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

"ہے کون ؟"

"روشنی سے بڑھ چڑھ کر خوبصورت ہے ۔"

"دیوی ہے دیوی !"

"کہاں ہے روشنی؟" اوپر سے آواز آئی "میں خود آؤں گا ۔ میں آؤں گا مگر آہ یہ اندھیرا ، گھٹا ٹوپ اندھیرا۔"

"سنتے ہو؟" نائٹ کیپ والے نے کہا "اس کی مدد کرو ۔ جواب نہیں دیتے؟" اچھا نہ سہی ۔ میں آؤں گا ۔ اپنے پاؤں چلتا آؤں گا۔"

"آخا فیلٹ والا چلّا کر بولا ۔ "میں چل سکتا ہوں ۔ میں چل سکتا ہوں ۔"

"اور میں بھی ۔"

"ٹھہرو۔ میں بھی آرہا ہوں بھائی ۔"

"وہ سب چل کر عورت کے پتلے کے گرد آ کھڑے ہوئے ۔

"تم کون ہو؟"

"دیوی !"

"کتنی سندر ہے!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

عورت نے اپنی آنکھیں اور بھی جھکا لیں "میں ناری ہوں ۔" نئی لائن نے یوں محسوس کیا جیسے کسی منور وادی میں کوئی راہ گیر چلتے چلتے کوئی تان اڑا گیا ہو ۔

"آہ ناری ۔"

"کتنی پیاری ہو ۔"

"او ڈارلنگ ۔"

"دیوی!"

"اوہ میں بھی چل سکتا ہوں ۔ ہاں ہاں ۔ میں آتا ہوں ۔ میں آرہا ہوں ۔" نائٹ کیپ والے کی آواز آئی ۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ان کے روبرو آکھڑا ہوا ۔

"چلو چلو ۔ ہم سب جائیں گے ۔ چلو ۔ ہم اس سے پوچھیں گے ۔ یہ اندھیرا کیوں ہے ۔ تم نے وعدہ کیا تھا ۔ چلو ۔"

"ہاں ہاں ۔ تم جاؤ ۔ میں اور ناری یہاں ٹھہریں گے ۔" فیلٹ والے نے ناری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ۔

"ٹھیک ہے ۔ تم جاکر پوچھ آؤ ۔"

"ہاں ہاں ۔ آخر ہم سب کو جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ کیوں ناری؟"

"بالکل ۔"

"بھائی میں تو جینا چاہتا ہوں ۔ تم جاؤ ۔ مجھے جینے دو ۔ کیوں ڈیر ناری؟" کاف کیپ والا بولا ۔

"ناری ۔ ناری ۔ ناری کون ہے؟" نائٹ کیپ والے نے پوچھا ۔ پھر اس کی نگاہ عورت کے پتلے پر جا پڑی ۔ "ارے میرے اللہ! تم کون ہو ؟" وہ بھاگ کر آگے بڑھا "اوہ! میں سمجھا ۔ اب میں سمجھا تم زندگی کا بھید ہو" وہ عورت کے سامنے جھک گیا ۔

"ہاں ہاں زندگی کا اجالا!"

"سبحان اللہ سبحان اللہ" رومی ٹوپی والا اپنا پُھندنا سنوارتے ہوئے کہنے لگا ۔

"سب بھگوان ہی کے روپ ہیں ۔ یہ بالک یہ ناری ۔ یہ جیون یہ اجالا ۔" کالی ٹوپی والے نے کہا ۔

عورت نے سر اٹھایا اور ہنس پڑی ۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دور کوئی نقرئی گھنٹیاں بجا رہا ہو ۔

"کہاں ہے اجالا ؟ کہاں ہے اجالا ؟ اُف یہاں کتنا اندھیرا ہے ۔" اوپر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی ۔

"کہاں ہے اندھیرا ؟ کہاں ہے اندھیرا ؟" نائٹ کیپ والا بولا ۔

"ہاں ہاں ۔ اندھیرا کہاں ہے ۔ یہ روشنی یہ بلوری سازوسامان ۔ یہ سندر ناری ۔ زندگی کتنی دلکش ہے ۔" شکاری نے کہا ۔

"سب اُجالا ہی اُجالا ہے ۔ بھگوان تو اجالا ہی اجالا ہے ۔ تیرے روپ کا کوئی انت نہیں!" ٹوپی والا ناری کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا ۔

"جانتے ہو ؟ خدا نے کہا ۔ اُجالا ہو جائے ۔ دفعتاً سب اجالا ہی اجالا تھا ۔ مقدس کتاب میں یہی لکھا ہے۔" فیلٹ والے نے اپنی نکٹائی کی گرہ سنوارتے ہوئے کہا ۔

"ہاں ہاں اندھیرا کہاں ہے ؟ اندھیرا دل میں ہو تو ہو ۔ یہاں تو اجالا ہی اجالا ہے ۔" کاف کیپ والے نے چھڑی گھماتے ہوئے کہا ۔

"اُف یہ اندھیرا ۔ اُف یہ اندھیرا ۔۔۔" اوپر سے آواز آئی جیسے کوئی کراہ رہا ہو ان کی نگاہیں ناری پر جمی ہوئی تھیں ۔ اور وہ کنکھیوں سے بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی ۔

..........○..........

خلط ملط

منیر کے مکا مار کر مانی نے اپنے بدن میں شگفتگی محسوس کی ۔ اس نے سرسری طور پر زبیدہ کی طرف دیکھا جو گلی کے نکڑ پر سہمی کھڑی تھی ۔ "آؤ بیدی ۔ آؤ ہم اندر چل کر کھیلیں" اس نے اپنا دایاں بازو گھماتے ہوئے کہا ۔ زبیدہ نے منیر کی طرف دیکھا جو بسورتا ہوا اپنی جیب سے بلوری گولیاں نکال رہا تھا ۔ اور سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی ۔ منیر نے اپنی جیب سے نیلی بلوری گولی نکالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر آنسو پیتے ہوئے دیوار سے مخاطب ہو کر کہا "ہم یہ گولی مانی کو دیں گے ہی نہیں"۔

مانی نے کنکھیوں سے نیلی گولی کی طرف دیکھا ۔

زبیدہ دوڑ کر منیر کے پاس آگئی اور اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگی "آؤ ہم گھر گھر کھیلیں ۔ مانی نے بناوٹی فاتحانہ انداز سے اس ویران گلی کا جائزہ لیا اور گذشتہ فتح کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے بازو گھمانے لگا ـ ـ ـ ـ ـ پھر وہ بے نیازی سے گھر کی طرف چل پڑا "ہم گھر میں ربڑ کی گیند سے کھیلیں گے"۔

مانی کی بے نیازی اور اس کا متحرک بازو دیکھ کر زبیدہ اس نیلی بلوری گولی کو بھول گئی اور للچائی ہوئی مگر خائف نظروں سے مانی کو دیکھنے لگی ۔ منیر ایک منٹ کے لئے خاموش رہا ۔ پھر کہنے لگا میں بتاؤں بیدی ۔ ہمارے پاس دو سرخ گولیاں ہیں ـ ـ ـ ـ ـ لال سرخ ـ ـ ـ ـ ـ دکھاؤں ـ ـ ـ ـ ـ یہ دیکھو اور فاتحانہ انداز سے اپنی جیب ٹٹولنے لگا ۔ زبیدہ کی نگاہیں لوٹ آئیں اور وہ شوق سے لال سرخ گولیوں کی منتظر تھی ۔

مانی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے ٹھہر کر ایک نظر منیر اور بیدی کی طرف دیکھا وہ دونوں گلی میں بیٹھے کھیل رہے تھے ۔ ایک ساعت کے لئے وہ . کا جیسے واپس لوٹ جانا چاہتا ہو ۔ پھر اس کی نگاہ اپنے دائیں بازو پر پڑی جو اپنی گذشتہ

فتح پر ابھی تک پھولا ہوا تھا ۔ اس کی ایڑیاں اٹھیں ۔۔۔ بازو اکڑ گیا ۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو منیر سے افضل تر مخلوق سمجھ رہا تھا ۔

ڈیوڑھی میں داخل ہو کر وہ سوچنے لگا اب میں کیا کروں ۔۔۔ سامنے منڈیر پر ایک کوّا بیٹھا تھا ۔ اس نے لاشعوری طور پر کوّے کی سمت میں ایک گھونسہ چلا دیا "شست" کوّا اڑ گیا ۔ وہ اپنے آپ سے بہت خوش ہوا مگر یہ ہوائی گھونسہ بازی کا کھیل منیر اور بیدی کی عدم موجودگی میں چنداں دلچسپ نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اتفاقاً بیدی اور منیر وہاں آ جائیں پھر اس کی نگاہ بھائی جان کے کمرے کی طرف جا پڑی ۔ اس نے غور سے دروازے کی طرف دیکھا ۔ ایک پٹ بند تھا اور دوسرا تھوڑا کھلا ہوا ۔ بھائی جان نہیں ہیں ۔ اس نے اندازہ لگایا ۔ معاً اسے یاد آیا کہ بھائی جان کی دراز میں تصویریں تھیں جنہیں وہ اکثر تنہائی میں دیکھا کرتے تھے اور مانی کو دیکھنے سے منع کرتے تھے ۔ ان تصویروں کو چوری چوری دیکھنے کی کوشش میں وہ دو دفعہ پٹ بھی چکا تھا ۔ اس کے گال پر گذشتہ طمانچے کی یاد تازہ ہو رہی تھی ۔

مانی نے اپنا ہاتھ گال پر رکھ لیا ۔ اور کسی سوچ میں پڑ گیا مگر اس کے دل میں لذیذ سی دھڑکن ہونے لگی ۔ بھائی جان ان تصویروں کو چھپا چھپا کر کیوں دیکھا کرتے ہیں ۔ لمبے لمبے منہ والی عورتیں موٹی موٹی پنڈلیوں والی ، بھدّے جسم والے مرد ۔۔۔ کالے کالے بال ۔۔۔ اور چہروں پر وحشت ۔۔۔ گنواروں کی طرح اس نے منڈیر کی طرف دیکھا ۔ کوّا پھر آ بیٹھا تھا ۔ شاید ان تصویروں کو بھولنے کی کوشش میں یا اپنی کسی گذشتہ فتح کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ سمیٹ کر آنکھ کے قریب رکھ لیا اور پھر آنکھ بند کر کے بائیں آنکھ سے شست باندھ کر "ٹھش" کہہ کر بازو چلا دیا ۔ کوّا اڑ گیا ۔ وہ اپنی بندوق پر نازاں ہو رہا تھا ۔ مگر اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بھائی جان کی دراز میں ۔"

پھر دو بڑے بڑے بلوری گولے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے جو بھائی جان کی میز پر کاغذوں پر پڑے رہتے تھے ۔۔۔ اسے منیر کی گولی یاد آ گئی اور اس کے ہونٹوں پر حقارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی ۔

پھر وہ دروازے سے بھائی جان کے کمرے میں جھانک رہا تھا ۔ بھائی جان کی کرسی خالی پڑی تھی ۔ ان کی کتاب زمین پر گری ہوئی تھی ۔ میز پر وہ دونوں بلوری گولے پڑے تھے اور تصویروں والی دراز تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دراز اور دونوں گولے اسے اندر کھینچ رہے ہوں ۔ اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "بس صرف ایک دفعہ اس پھول والے گولے کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھوں گا ۔۔۔ اور دراز میں سب سے اوپر جو تصویر ہوگی ، اسے دیکھ کر واپس لوٹ آؤں گا" پھر وہ دبے پاؤں دراز کی طرف جا رہا تھا ۔ اس کے قدم خواہ مخواہ اٹھے جا رہے تھے ۔

دفعتاً کمرے کے دائیں کونے سے اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ سنی ۔ وہ رک گیا ۔۔۔ سامنے بھائی جان میز کی طرف پیٹھ کئے کھڑے تھے ۔ ان کے بازوؤں میں ایک رنگدار کپڑوں کا گٹھا سا تھا ۔ جو اوپر سے زمین تک پہنچتا تھا اور جس کے ایک سرے سے چوٹی لٹک رہی تھی ۔ بھائی جان اس کے چوٹی والے سرے پر جھکے ہوئے تھے ۔۔۔ بھائی جان کا سر جھکا ۔۔۔ اور وہ کپڑوں کا ستون اور بھائی جان آپس میں خلط ملط ہو گئے ۔۔۔ مانی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کی ٹانگیں گویا تھیں ہی نہیں ۔ وہ بھول گیا کہ وہ بھائی جان کے کمرے میں ہے ۔ یہ بھی بھول گیا کہ بھائی جان گال پر طمانچہ ماریں تو دو گھنٹے تک سُر سُر ہوتی رہتی ہے ۔ وہ حیران تھا کہ بھائی جان اس کپڑوں کے گٹھے سے کیا کر رہے تھے ۔ اور پھر اس کپڑوں کے گٹھے کی چوٹی ! ۔۔۔ پھر اس نے بھائی جان کی آواز سنی ۔۔۔ "ظالم" بھائی جان اس کپڑوں کے ستون سے باتیں کر رہے تھے ۔ پریشانی میں اس کا ہاتھ میز سے جا ٹکرایا ۔۔۔ دونوں شکلوں میں فوری جنبش ہوئی ۔ مانی نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں ۔۔۔ کچھ خاموش آوازیں سنائی دیں ۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔

"یہ رومال تو تم بھول ہی گئیں ۔" بھائی جان کی آواز آئی ۔ اس نے ڈرتے ہوئے آنکھ کھولی ۔ سامنے بھائی جان کھڑے تھے ۔ فرش پر ان کی ملازمہ بانو بیٹھی کپڑے سمیٹ رہی تھی ۔ "ہاں اور دھوبی کو تاکید کر دینا کہ یہ کالر مجھے شام تک تیار کر دے سمجھی؟" بھائی جان کی آواز میں گھبراہٹ تھی ۔

بانو نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کالر لے لیا ۔ اور مدھم آواز میں کہنے لگی "بہت اچھا۔"

مانی نے بھائی کو یوں مشغول دیکھا تو اسے نامعلوم سا احساس ہوا کہ وہاں سے ٹل جانا چاہیئے ۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے وہاں کیوں ٹھہرنا نہیں چاہیئے ۔ وہ حالات کیا تھے اور وہ شکلوں کا گنڈمڈ ہونا کیا تھا ۔ البتہ وہ یہ جانتا تھا کہ جب بھی بانو بھائی جان کے کمرے میں آتی تو بھائی جان یک لخت مانی میں دلچسپی لینا بند کر دیتے ۔ کندھے سے اتار دیتے یا باتیں کرنا بند کر دیتے اور بیگانگی سے کہتے "اچھا مانی اب تم باہر جا کر کھیلو مجھے اب پڑھنا ہے" اور بانو کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی ۔ اس وقت بانو نیچی آنکھوں سے کپڑے سے میز یا برش یا دری جھاڑنا شروع کر دیتی ۔ مگر مانی کو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہی ہو ۔ اس وقت اس کے گال سرخ نظر آتے اور وہ چلتے چلتے ٹھمکنے لگتی اور "جی اچھا" کہتے ہوئے اس کی آواز میں لوچ سا آجاتا ۔ حالانکہ اندر اماں سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز بھدی سنائی دیتی تھی ۔ اس کی آنکھیں پھیکی اور اس کا منہ زرد رہتا تھا ۔ جیسے وہ دنیا سے بیزار بیٹھی ہو ۔۔۔

ہاں تو مانی نے بھائی کو یوں مصروف دیکھ کر موقعہ غنیمت سمجھا اور سرک جانا چاہا ۔ مگر بھائی جان فوراً بول اٹھے ۔ "ٹھہرو مانی مجھے تم سے کام ہے ۔" مانی ٹھٹھک کر رہ گیا ۔ اس کا دل ازسرِنو دھڑکنے لگا ۔ کانپتے ہوئے اس نے بھائی کی طرف دیکھا ۔ مگر بھائی اپنی نکٹائی دیکھنے میں شدت سے مصروف تھے ۔ مانی نے معصوم سا منہ بنا لیا اور ایک اڑتے ہوئے پَر کو پکڑنے میں مصروف ہو گیا ۔ بظاہر وہ اس پَر سے کھیلنے میں مصروف تھا مگر کنکھیوں سے بھائی اور بانو کو تاڑ رہا تھا ۔ بھائی جان بانو کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے یہ "نکٹائی بھی لے جاؤ بانو ۔ یہ بھی اب میلی ہوگئی ہے ۔" بانو نے نگاہ اٹھائی ۔ اس کا منہ سرخ کیوں ہو رہا تھا ۔ اور اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں ۔ پھر آنکھوں کے اوپر جھکی ہوئی بھویں دوڑ کر ایک دوسرے کے قریب ہوگئیں ۔ پیشانی پر پھر شکن پڑ گیا ۔ جیسے وہ گھور رہی ہو ۔ مگر وہ پیشانی

گھورتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ مثلاً جس طرح اس کے ابا کی پیشانی گھورتی تھی ۔۔۔ بانو لچک کر مڑی ۔ اس کے گالوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے ہوئے تھے اور وہ اچھل کر کمرے سے باہر چلی گئی ۔ ایک ساعت کے لئے مانی یہ بھول گیا کہ اسے کھیل میں محو نظر آنا چاہیئے ۔

بھائی جان مڑے ۔ مانی نے اس مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کی جو خواہ مخواہ اس پر چھا رہی تھی اور وہ مزید معصومیت سے اپنے کھیل میں مشغول ہو گیا ۔

"مانی جاؤ ۔ میرے لئے ایک پانی کا گلاس لاؤ" بھائی نے کہا ۔

مانی نے یہ سنا اور اس کے دل سے ایک نامعلوم سا بوجھ اتر گیا ۔

باہر صحن میں بانو کھڑی کپڑے گن رہی تھی ۔ اس کا بدن ڈھیلا اور منہ زرد تھا ۔ وہ سوچ رہا تھا پتہ نہیں بانو کو بھائی جان کے سامنے جا کر کیا ہو جاتا ہے ۔ ان کے کمرے میں وہی بانو بالکل نئی بانو ہو جاتی ہے ۔ اس کا دل چوری چوری آرزو کر رہا تھا کہ بانو بھائی جان کے کمرے میں ہی رہے ۔ اور وہ چھپ چھپ کر دیکھتا رہے مگر بھائی جان تو ایسے وقت اسے گھور کر باہر نکال دیا کرتے تھے اور کہتے "تم جاؤ ۔ اب مجھے پڑھنا ہے ۔"

پانی کا گلاس لے کر بھائی نے مانی کا کان پکڑ لیا اور کہنے لگے "تم بہت شریر ہو گئے ہو ۔ یوں میرے کمرے میں چوروں کی طرح گھس آتے ہو ۔ بدمعاش ۔ پھر میں نے یوں آتے دیکھا تو بری طرح سے پیٹوں گا ۔ سمجھے ۔"

پہلے تو مانی سمجھتا رہا کہ بھائی جھوٹ موٹ کہہ رہے تھے مگر جب بھائی نے گھور کر اسے باہر نکال دیا تو بے چارہ سخت حیران ہوا ۔ اس وقت تو انہوں نے کچھ بھی نہ کہا تھا ۔ وہ سوچ رہا تھا ۔ یہ سب کیا ہے ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ وہ کیوں گڈمڈ ہو رہے تھے ۔ بانو کی آنکھیں کیوں چمکتی تھیں ۔ اس کا منہ سرخ کیوں تھا ۔۔۔

"یہ دیکھو مانی ہمارے پاس چاقو ہے" منیر نے آکر چاقو دکھاتے ہوئے کہا ۔

مانی نے للچائی ہوئی نظروں سے چاقو کی طرف دیکھا ۔۔۔ اس کی نگاہ منڈیر پر جا پڑی ۔ کوا بیٹھا تھا ۔ دفعتاً اسے کچھ یاد آگیا "چپ !" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منیر سے رازدارانہ انداز میں کہا "آؤ" اس نے اشارہ کیا وہ بیٹھ گیا ۔

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر دائیں آنکھ بند کر لی ۔ بازو سمیٹ کر بائیں آنکھ سے شست باندھی "ٹھس" کہہ کر اس نے اپنا دایاں بازو کوّے کی طرف ہوا میں چلا دیا ۔ کوّا اڑ گیا ۔

"دیکھا" مانی نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ بندوق ہے ۔ کوئی کوّا ہو ، کہیں بیٹھا ہو ، ایک منٹ میں مر کر اڑ جائے گا ۔"

منیر پہلے تو متاثر ہو کر دیکھتا رہا ۔ پھر وہ یک لخت اس بندوق سے بے نیاز ہو گیا ۔

"یہ دیکھو" اس نے چاقو کی دھار کی طرف اشارہ کر کے کہا "کوئی چیز ہو ایک جھٹکے میں کاٹ کر دو کر دوں گا ۔ یہ دیکھو ۔" اس نے ایک تنکے کو کاٹتے ہوئے کہا "یہ ایک یہ دو ۔۔۔ دیکھا ۔۔۔ اور مرغی کا پر کاٹ کر دکھاؤں ؟ آؤ باہر ۔ وہاں بیدی کے پاس میں نے بہت سے پَر رکھے ہیں ۔ بہت سے" ۔۔۔ اور وہ دونوں باہر نکل گئے ۔

منیر مرغی کا پَر کاٹ رہا تھا ۔ بیدی کا دل دھڑک رہا تھا ۔ شوق سے یا ڈر سے اور وہ منیر کے اوپر جھکی ہوئی تھی ۔ مانی نے بیدی کو منیر پر جھکے ہوئے دیکھا تو یک لخت اسے اس کاٹنے والے چاقو میں دلچسپی نہ رہی ۔ وہ لاپروائی سے اٹھ بیٹھا ۔ اس نے چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی کوّا نظر نہ آیا ۔ پھر فوراً اسے سوجھتی ۔ ہمارے بھائی جان کے پاس اتنی لمبی چھری ہے ۔" اس نے اپنا بازو اکڑا کر کہا "اتنی لمبی" مگر شاید اس ننھے سے جیتے جاگتے چاقو میں اس اتنی لمبی چھری سے جو ابھی تک محض ایک قصہ تھی ، زیادہ کشش تھی ۔ اس کی یہ بات بیدی کو منیر سے توڑ نہ سکی ۔ شاید اس لئے کہ مانی کی اتنی لمبی چھری کے وجود سے وہ منکر تھے ۔ اس کا وہاں ٹھہرنا صریحاً اس کی بے عزتی تھی ۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا ۔

سامنے دروازے میں ان کا نوکر شریف بیٹھا تھا ۔ اس نے اپنی قمیض اتار کر پیٹھ پر ڈال رکھی تھی ۔ سینے پر لمبے لمبے کالے کالے بال دیکھ کر مانی اپنی اتنی لمبی چھری بھول گیا ۔ ایسے ہی بال بھائی جان کی تصویروں میں تھے ۔ جنہیں وہ دراز میں چھپا کر رکھتے تھے ۔۔۔ اس کا ہاتھ چوری چوری اپنی قمیض کے اندر

گھس گیا ۔ وہاں ایک بال بھی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا بدن بھی شریف کی طرح موٹا موٹا اور میلا میلا ہو ، اور اس پر بہت سے کالے کالے بال ہوں ۔

اس نے سُنا ، شریف گا رہا تھا ۔

”ظالم لوکی شیریں ۔۔۔“

”ظالم!“ اس نے دل میں دہرایا ۔ بھائی جان اس کپڑوں کے ستون سے بھی یہی کہہ رہے تھے ۔ ظالم کون تھا ۔ کیا تھا ۔ معاً اس نے دیکھا کہ شریف کی آنکھ میں بھی وہی بھائی جان والی چمک لہرائی ۔۔۔ اس کی آنکھیں شریف کی نگاہوں کی سمت اٹھیں ۔ سامنے کنوئیں پر ایک عورت پانی بھر رہی تھی ۔ اس کا دوپٹہ بار بار سر سے سرک جاتا اور وہ بار بار اسے سنوارتی اور مڑمڑ کر شریف کی طرف دیکھتی ۔ اس کی کالی کالی آنکھیں کونوں میں آ آکر شریف پر مسکراتیں ۔ ادھر شریف مسکرا مسکرا کر اور جھوم جھوم کر گا رہا تھا ۔ مانی کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں ۔ بغیر بولنے کے بول رہی تھیں ۔۔۔ پھر اس نے دیکھا کہ عورت نے پانی کا گھڑا اٹھا لیا ۔ شریف کی طرف دیکھا ۔ گردن نے خم کھایا اور وہ چل پڑی اور شریف بھی اٹھ کر اسی طرف چل دیا جیسے وہ چلتے چلتے بلا گئی ہو ۔

مانی کے دل میں خیالات کا ایک چھتہ بھنبھنا رہا تھا ۔ چھوٹے بڑے کیوں ؟ کیسے ؟ کس لئے ؟ کیا ؟ اس کے ذہن میں آوارہ تھے ۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں باتیں کرتی ہوئی بھویں پیار سے گھورتی ہوئی پیشانی ظالم ۔ تمام اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے ۔

آپا کے کمرے میں سامنے آئینہ رکھا دیکھ کر اس کے دل میں اپنی آنکھیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ، اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آپا بال بنایا کرتی تھی ۔ اس نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ جب بھائی حمید اماں کو سلام کرنے آتا تو آپا کسی نہ کسی بہانے ایک دفعہ میز کے قریب جا کر آئینہ دیکھا کرتی تھی ۔

آئینہ میں موٹے سے منہ والا اور بکھرے ہوئے بالوں والا ایک لڑکا نظر آرہا تھا جس کی آنکھوں میں زرد زرد سے میل کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔ منہ پر یہاں وہاں دھبے پڑے تھے ۔ اس نے جھٹ منہ موڑ لیا ۔ سامنے وہی اتنی لمبی چھری

پڑی تھی ، مگر اس وقت وہ چھری بھی اسے تسکین نہ دے سکی ۔ اور وہ بے بسی اور پریشانی سے باہر نکل آیا ۔

باورچی خانے میں اماں بیٹھی کھانا تیار کر رہی تھیں اور بانو بیٹھی آلو چھیل رہی تھی "کیسی چپ چاپ بیٹھی ہے ۔" اس نے بانو کو دیکھ کر دل میں سوچا ۔ اس وقت اس کی آنکھیں بھی خالی خالی اور اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں "آنکھیں بھی کیا ادلنے بدلنے والی چیز ہیں " اس نے سوچا ۔ کبھی کچھ کبھی کچھ پتہ نہیں کیوں لوگوں کی آنکھوں میں کبھی چمک آ جاتی تھی اور کبھی کچھ بھی نہیں ۔ اس دنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہیں" اس وقت بانو کا منہ بھی زرد تھا پتہ نہیں کیا بھید ہے ؟" ایسے موہوم خیالات اس کے دل کی تہہ میں گھوم رہے تھے ۔

اس کی نگاہ بھٹک کر سامنے صحن میں جا پڑی ۔ وہاں مرغی چگ رہی تھی ۔ اس مرغی کو وہ "چتری" کہا کرتا تھا ۔ پھر اس نے دیکھا کہ پڑوسیوں کا مرغا "چتری" کو دق کر رہا ہے ۔۔۔ یک لخت مرغا چتری سے لڑ پڑا اور اس نے دوڑ کر چتری کے سر میں چونچ مار دی ۔۔۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے ۔ پتہ نہیں مرغی کیا ہوئی ۔ وہ حیران تھا کہ یہ چیزیں کس طرح ایک دوسرے میں الجھ جاتی ہیں ۔ کس لئے ؟

"اماں وہ دیکھو ۔" اس نے صحن کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "یہ مرغا خواہ مخواہ میری چتری سے لڑتا ہے ۔ مَیں اسے ماروں گا ۔ میرے پاس چاقو بھی ہے" ماں نے باہر دیکھا اور پھر مسکراہٹ روک کر بناوٹی غصے سے کہنے لگی "چپ رہ نالائق ۔ ایسی گندی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ۔ جا باہر جا کر کھیل" کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے دیکھا بانو کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں ۔

"خدا جانے باہر لڑکوں سے کیسی گندی گندی باتیں سیکھ آتا ہے" ماں کہہ رہی تھی ۔

گندی باتیں! اس نے سوچا ۔ گندی باتیں کیا مطلب اور وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا ۔ باہر جا کر اس نے اپنی دستی بندوق سے دو ایک کوّے اڑائے ۔ دو ایک اڑتے ہوئے پَر پکڑے اور مرغے کے دو ایک پر نوچے ۔ پھر وہ اکتا گیا اور یونہی گھومتا ہوا آپا کے کمرے میں جا نکلا ۔ آپا صندوق کے سامنے دروازے کی

طرف بیٹھ گئے بیٹھی تھی "چلو آپا کو چل کر ڈرائیں" اسے سوجھی اور وہ دبے پاؤں آپا کے پیچھے جا پہنچا۔

اس نے دیکھا آپا کے ہاتھ میں تصویر تھی۔۔۔ آپا اس تصویر کو سینے سے لگا کر بھینچ رہی تھی۔

"ہاؤ" اس نے ڈرانے کی غرض سے چلا کر کہا اور ہنس پڑا۔ آپا پہلے تو گھبرا گئی، مڑ کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگی "تم ہو مانی۔ شیطان" اور آپا نے جھٹ وہ تصویر صندوق میں رکھ کر قفل لگا دیا۔ آپا کو تصویر رکھتے ہوئے دیکھ کر مانی نے کہا، آپا بھائی جان کے پاس بھی بہت سی تصویریں ہیں۔ میز کی دراز میں پڑی ہیں اور آپا۔" اس نے منہ بنا کر کہا "ان تصویروں کے بھدے بھدے جسم اور لمبے لمبے بال ہیں۔ میں تم کو دکھا دوں گا۔"

"چپ" آپا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی بات نہیں کیا کرتے۔"

"نہیں آپا۔ سچ اتنے لمبے لمبے بال اور لمبے لمبے منہ والی عورتیں۔ موٹی موٹی ٹانگیں اور اتنی بڑی۔۔۔"

"چپ گدھا کہیں کا" آپا نے کہا "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اماں نے سن لیا تو پٹ جائے گا۔" یہ کہہ کر آپا باہر چلی گئی۔

"کیسی باتیں؟" وہ سوچنے لگا۔ کیوں نہ کروں۔ بھائی صاحب کے پاس تصویریں تو تھیں۔ اس نے خود کئی دفعہ دیکھی تھیں اور بھائی جان خود انہیں روز دیکھا کرتے تھے۔ آپا کیوں اسے منع کر رہی تھی۔ یہ کیا جھمیلا ہے یہ لوگ کیسے ہیں۔" وہ سخت پریشان ہو رہا تھا۔

رات کو آوازیں سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں مدھم لیمپ روشن تھا، اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے سنا ابا کہہ رہے تھے "امانت کی ماں تم ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتی ہو۔"

"مانی جاگ رہا ہے" ماں کی سرگوشی سنائی دی۔

"اس کا کیا ہے تم بڑی ظالم"

مانی نے کنکھیوں سے دیکھا۔۔۔ دو دھندلی شکلیں خلط ملط ہو گئیں۔

مانی سوچ رہا تھا ۔ کیا دنیا کے ہر شخص کو ظالم کہا جاتا ہے ۔ بھائی جان بھی ظالم کہہ رہے تھے ، شریف بھی ظالم گا رہا تھا اور اب وہاں رات کے وقت بھی اس کے قریب ہی کوئی ظالم تھا ۔ دیکھنے کے لئے اس نے کروٹ بدلی ۔ فوراً وہ آوازیں خاموش ہوگئیں ۔ ایک ہاتھ اونچا ہوا ۔ لیمپ کی طرف بڑھا ۔ کمرے میں بالکل اندھیرا ہوگیا ۔ مانی ڈر گیا ۔

" اماں ۔ اماں " وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا ۔

"سو جا بیٹا ۔ لیمپ میں تیل ختم ہوگیا ہے ۔ سارا دن دنگا فساد اور کھیل کود میں کٹ جاتا ہے ۔ رات کو بھی تجھے آرام نہیں ۔ رات کو تو سونے دیا کر ۔"

"سونے دیا کر !" اس نے سوچا کیا وہ سچ کہہ رہے تھے ۔ سونا تو اسے کہتے ہیں ۔ جب کوئی بالکل سو جائے ۔ ذرا بات نہ کرے ۔ وہ حیران تھا ۔۔۔ ظالم ۔۔۔ خلط ملط ۔ اندھیرے میں ماں کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا ۔

اگلے روز مانی زبیدہ سے کہہ رہا تھا "بیدی آؤ کوٹھے پر چل کر کھیلیں" وہ کوٹھے پر چلے گئے ۔

"یہ نیا کھیل ہے ۔" وہ بولا "چپ" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "میں ہوں ابا اور تم ۔۔۔ وہ سوچنے لگا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اس کھیل میں لیمپ بھی چاہیئے ۔۔۔ اچھا ۔" اس نے خوش ہو کر کہا "تم ہو بانو ۔۔۔ اور میں ہوں بھائی جان ۔۔۔ منیر کو بالکل نہ بتانا ۔۔۔ چپ" اس نے چاروں طرف مڑ کر دیکھا ۔ "ٹھیرو میں دروازہ بند کر آؤں"۔۔۔ اس نے دبی آواز سے کہا ۔ دروازہ بند کر کے وہ اسی طرح منہ پر انگلی رکھے دبے پاؤں واپس آیا ۔۔۔ "بانو" اس نے دبی آواز میں کہا "قمیض اتار دو" ۔۔۔ "اچھا"۔۔۔ بیدی نے شوق اور حیرانی سے کہا اور وہ انتہائی شوق اور تحیر سے بت بنی کھڑی تھی ۔

○

یہ دیوی

بابو بشمبر ناتھ کو دیکھ کر دیوی نے پنکھا اٹھا لیا اور چرنوں میں جا بیٹھی ۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں آپ ہی آپ مسکرا رہی تھیں ۔ بابو جی کیسے پریم سے اسے دیکھ رہے تھے ۔۔۔ ان دونوں کا سہاگ کتنا گہرا ہے ۔ میں نے جی میں سوچا ۔ گھر کا سکھ اور پھر دیوی جیسی استری ۔

محلے والے کہا کرتے ہیں "بابو جی کتنے بھاگوان ہیں جنہیں دیوی جیسی پتنی ملی ہے ۔ جتنی سندر ہے ، اتنی ہی بھلی ہے ۔ سچ مچ دیوی ہے دیوی" "بابو جی مسکرا کر کہا کرتے ہیں بھگوان کی دین ہے مہاراج ، بھگوان کی دین" اس سمے ان کی آنکھیں آنند سے بھر جاتی ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ دیوی کے پاس جا بیٹھیں اور بیٹھے اسے ہی دیکھتے رہیں ۔

حالانکہ دیوی ان کی دوسری بیوی ہے اور بابو جی عمر میں اس سے کہیں بڑے ہیں ۔ لیکن دیوی کو ہم نے کبھی آنکھ اٹھا کر چلتے نہیں دیکھا ۔ چلتی ہے تو پاؤں میں ہلکی سی پیاری سی روانی گویا کسی ساکن جھیل میں کوئی ناؤ آپ ہی آپ بہہ رہی ہو ۔ البتہ اگر آپ اس سے کچھ پوچھ بیٹھیں تو اک آن کے لئے اس کے ہونٹوں میں خم سا پڑ جائے گا ۔ آنکھوں میں چمک لہرا جائے گی اور نگاہیں جھک جائیں گی ۔ لیکن اس کا جواب مختصر ہوگا ۔ اور اس کی کومل آواز میں شوخی نہ ہوگی ۔

دیوی کو دیکھ کر مجھے نرملا یاد آجاتی ہے ۔۔۔ دیوی کے تصوّر میں نرملا کا خیال ۔ میرے دل میں جانے کیا ہوتا ہے اس سمے گویا چینی کی دوکان میں ہاتھی آ گھستا ہے ۔ پھر میرے دل میں دیوی کو دیکھنے کی خواہش اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ جی چاہتا ہے بس دیوی ہی کو دیکھتا رہوں ۔ اس سمے جیجی مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی ہے کہتی ہے "موہن بھیا ۔ صرف ایک ہی سہارے پر جینا نہ بھیا ۔

نہ جانے وہ سہارا کب ٹوٹ جائے ۔" جیجی نے مجھے دیکھنے سے کبھی منع نہیں کیا۔ وہ جانتی ہے کہ نرملا سے مجھے گھر کا سکھ اور پیار نہیں ملا ۔ نرملا صرف اپنے لئے جیتی ہے ۔ اپنے لئے ہی جینا جانتی ہے ۔ وہ جانتی ہے کہ میں دکھی ہوں ۔ اس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہتی ۔ بلکہ جب میں کھڑکی میں سے دیوی کے گھر میں جھانکتا ہوں تو وہ میرا ساتھ دینے کی خاطر میرے پاس کھڑی رہتی ہے ۔ اور اکثر دیوی کو دیکھتے ہوئے جب میری آنکھوں میں چمک لہراتی ہے تو وہ کہا کرتی ہے "اونہہ بھیا! ابھی پوجا کا وقت نہیں ہوا" پھر جب میں حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ناک پسینے سے تر ہو جاتی ہے ۔ اور وہ مدھم سی آواز میں کہتی ہے "یہ نہ بھولو موہن کہ وہ دیوی نہیں ناری ہے ناری۔" "پر جیجی میں کہتا ہوں ناری اور دیوی میں تھوڑا ہی فرق ہے ۔" اور وہ جواب دیتی ہے "ہاں! ۔۔۔ لیکن بھیا دیوی اور ناری میں اس سے بھی کم ۔"

میں اور جیجی دونوں کھڑے دیوی کو دیکھ رہے تھے ۔ بابو بشمبر چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور دیوی چوکی پر بیٹھی انہیں پنکھا کر رہی تھی ۔ بابو جی دورے سے واپس آئے تھے اور دونوں پتی پتنی اکھٹے باتیں کر رہے تھے ۔ میرے لئے یہ پہلا دن تھا کہ ان دونوں کو اکھٹے بیٹھے دیکھ رہا تھا چونکہ بابو اکثر دورے پر رہتے تھے گھر میں صرف دیوی ، پرکاش اور بابو بشمبر رہتے تھے ۔ پرکاش بابو جی کا چھوٹا بھائی تھا ۔ مگر میں نے پرکاش کو کبھی نہ دیکھا تھا چونکہ وہ اپنے کمرے ہی میں رہا کرتا اور اس کا کمرہ گھر کے دوسرے کونے میں تھا ۔

"یہ سامنے جو مکان خالی پڑا تھا ۔ اس میں نئے کرائے دار آ گئے ہیں" دیوی نے بابو جی کے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"بہت اچھا ہوا ۔۔۔ تمہارے لئے رونق ہو جائے گی ۔" بابو جی نے ہنس کر جواب دیا ۔

دیوی نے آنکھیں جھکا لیں اور پنکھے کی ڈنڈی سے زمین کو کریدتے ہوئے بولی "بھگوان نہ کرے میرا کیا پڑوسیوں بنا جی نہیں لگتا ۔ میری رونق تو آپ ہی ہیں ۔"

بابو جی کا منہ خوشی سے چمک اٹھا "تو خود ہی تو کہا کرتی تھی کہ پڑوس میں

کوئی آ بسے تو ۔۔۔ پر وہ تو کوئی عیسائی عورت ہے ۔ سنا ہے دایہ کا کام کرتی ہے ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوا" بابو جی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی "دایہ آ گئی ۔ تو بھگوان چاہے منّا بھی آجائے گا ۔"

دیوی کو لبھاتے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی ۔ "سنا تم نے جیجی" میں نے کہا "سن رہی ہوں" وہ بولی ۔

بابو جی کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے پھر کہنے لگے "پگلی تو نہیں جانتی ۔ ان عیسائیوں میں کئی باتیں سیکھنے کے قابل ہوتی ہیں ۔"

"بھگوان نہ کرے کہ میں اس سے کچھ سیکھوں ۔"

"کیوں خیر تو ہے ۔" بابو جی گھبرا سے گئے ۔

"کچھ نہیں ۔۔۔" دیوی بولی "جی پر کاش کو کیا معلوم کہ کیسی ہوتی ہیں یہ "کرنٹیاں"۔

"پر کاش!" بابو جی اٹھ بیٹھے "پر کاش کی کیا بات ہے ۔"

"بات کیا ہوگی ۔ آخر وہ ابھی نوجوان ہی ہے نا ۔ بس اس نرس کے جھانسے میں آگیا ہے ۔"

"تو بات تو کر ۔۔۔ کیا کیا ہے پر کاش نے ۔"

"آخر میں پر کاش کی بھابی ہوں ۔ میں نہ رکھوں اس کا خیال تو کون رکھے گا ۔ اگر بات نکل گئی تو کتنی بدنامی ہوگی ۔ لوگ کہیں گے آخر پرائی ہی تھی نا کہ لڑکے کا خیال نہ رکھا ۔"

"لیکن بات کیا ہے مجھے بتا تو سہی ۔" بابو جی چڑ کر بولے ۔

"کیا بتاؤں آپ کو ۔۔۔ آپ دورے پر چلے جاتے ہیں اور وہ بی بی بن ٹھن کر سارا دن پر کاش کے سامنے بیٹھی رہتی ہے ۔۔۔ آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے ہیں ۔ میں کہتی ہوں اگر کسی نے دیکھ لیا تو! دنیا کیا کہے گی ۔ ابھی کل ہی کی بات ہے ۔ اُدھر وہ بیٹھی تھی اِدھر پر کاش کھڑا تھا ۔ جانے کیا کر رہا تھا ۔ کوئی اشارہ ہو گا ۔ پہلے تو اپنی انگلیوں کو چومتا رہا ۔ پھر اس کی طرف یوں ہاتھ چلایا جیسے ہوا میں کبوتر چھوڑ رہا ہو ۔"

"ہوں ۔ تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے ۔" بابو جی سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئے ۔

"بھگوان جانے مجھے گمان بھی نہ تھا کہ پرکاش ایسا کرے گا میرے سامنے تو یوں آنکھیں جھکائے بیٹھا رہتا ہے جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو ۔"

"اور تو کیا تیرے سامنے بھی کبوتر چھوڑا کرے ۔" بابو جی نے غصے میں کہا ۔

"ایسی بات کہتے لاج نہیں آتی آپ کو ۔" دیوی نے آنکھیں جھکا کر پنکھے کی ڈنڈی سے زمین کریدتے ہوئے کہا ۔ اس کے منہ پر سرخی جھلملا رہی تھی ۔

"بابو جی جوش میں اٹھ بیٹھے "تو غصہ نہ کرو ، دیوی ۔ میرا مطلب اس نالائق سے ہے ۔ بالکل ہاتھوں سے نکل گیا ہے وہ۔"

چند ایک ساعت کے لئے وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ پھر دیوی آپ ہی آپ بولی "میں اگر کبھی اس سے کہوں ۔ پرکاش رسوئی میں آکر کھانا کھا لو تو کہا کرتا ہے نہ بھابی مجھے کھانا یہیں بھیج دو ۔ رسوئی میں عورتیں آتی جاتی ہیں ۔۔۔ جیسے اسے عورتوں سے نفرت ہو۔"

وہ رسیلی سی آواز سے ہنس پڑی ۔۔۔ "میرے پاس بیٹھنے سے یوں گھبراتا ہے جیسے میں اس کی بھابی ہی نہیں ۔ بات تک کرنے کا روادار نہیں ۔۔۔ اور اب اس نرس سے آنکھیں لڑانا! توبہ آج کل کے لڑکوں کا کیا اعتبار ۔"

جیجی نے میری بانہہ پکڑ لی ، کہنے لگی "چلو موہن اب چلیں بے چارے دکھ سکھ کی باتیں کر رہے ہیں ۔ کہہ سن لینے دو انہیں ۔ پھر آجانا تم ۔"

میں سوچ رہا تھا دیوی کی شکایت بھی کتنی رنگین ہے ۔ شکایت تو معلوم ہوتی ہی نہیں "ذرا ٹھہرو جیجی" میں نے کہا ۔

دیوی کے ماتھے پر پیاری سی تیوری بن گئی ۔ "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا پران ناتھ" اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے کہا "کہ آپ سے بات چھپاؤں ۔ جانے استریاں کیسے پتی سے دل کی بات چھپا رکھتی ہیں ۔۔۔ آپ کے سوا میرا ہے ہی کون ۔" اس نے آہ بھری ۔

"نہایت بری حرکت ہے پرکاش کی" بابو جی سوچتے ہوئے بولے ۔

"اسے کچھ میرا ہی لحاظ ہوتا ۔ میرے ہوتے گھر میں اس مشٹنڈی سے آنکھیں لڑانا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ۔ چاہے آپ میری بات کا برا مانیں ۔" دیوی بولی۔

"لیکن میں کب کہتا ہوں کہ وہ ایسی بیہودہ حرکتیں کرتا پھرے ۔۔۔ نالائق!"

"پھر ان محلے والیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں نا ۔ کسی نے دیکھ لیا تو ہزاروں باتیں بنائیں گی ۔ وہ گردھاری کی ماں تو ایسے موقعے کی انتظار میں ہے ۔ اسے تو بھگوان دے ایسی بات ۔ ایک ایک کی دس دس سنائے گی ۔ کہے گی ، آنکھیں لڑانے کے لئے گھر میں نہیں کوئی کہ محلے والیوں کو تاڑتا پھرتا ہے ۔ گھر میں جو جوان بھابی ہے ۔۔۔ آخر اس بات میں میری ہی بدنامی ہوگی نا ۔"

"دھرم سے کہتا ہوں اگر اب کے گردھاری کی ماں نے کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا ۔" بابو جی نے غصے میں کہا ۔

"پر فضول جھگڑا کرنے سے فائدہ ۔ اس بات کا کوئی انتظام کر دیجئے ۔ بس نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری ۔"

بابو جی غصے میں اٹھ بیٹھے "وہ ہے کہاں پرکاش ۔ میں اسے بلا کر ابھی ڈانٹتا ہوں نا، کہاں ہے وہ۔"

"اے ہے جوان لڑکا ہے ۔" دیوی نے گھبرا کر کہا "جوان لڑکے بھی کیا ڈانٹ ڈپٹ سہتے ہیں ۔ اگر لڑکا چڑ گیا تو ۔۔۔"

"چڑتا ہے تو بیشک چڑ جائے ۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ ماں کے پاس گاؤں چلا جائے گا ۔"

"چلا جائے گا!" دیوی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

"جانا چاہتا ہے تو بیشک آج ہی چلا جائے ۔"

"پر دنیا کیا کہے گی پر ان ناتھ ۔ یہ بھی تو سوچئے نا ۔"

"دنیا جو جی چاہے کہے ۔ ہمیں دنیا کی پروا نہیں ۔"

"لیکن سارا الزام تو میرے سر آئے گا نا ۔ ماں کہے گی بھابی نے لڑکے پر الزام لگا کر گھر سے نکلوا دیا ۔"

دو ایک ساعت کے لئے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر دیوی پنکھے کی ڈنڈی سے زمین کریدتے ہوئے بولی ۔ گویا اپنے آپ سے کہہ رہی ہو "وہ اور بھابیاں ہوں گی جو دیور کو دیکھ کر جل بھن جاتی ہیں ۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ لڑکے کو گھر بھجوا دوں ۔ توبہ مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا ۔ مجھ پر تو کھانا پینا حرام ہو جائے گا ۔"

"چلو بھیا اب چلو بھی ۔ چائے کا وقت ہو رہا ہے ۔" جیجی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا لیکن مجھے جانے سے انکار کرتے دیکھ کر وہ مایوس ہوگئی اور کہنے لگی "اچھا بھگوان تمہیں شکتی دے" اور پھر پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی ۔

"بھگوان کی دین" میرے دل سے آواز آئی اور میری آنکھیں شوق سے دیوی کو ڈھونڈنے لگیں ۔

وہ چپ چاپ بیٹھی تھی ۔ اسے یوں مغموم دیکھ کر میرے دل میں ہمدردی کی موج سی اٹھی ۔ میں مبہوت کھڑا رہا ۔

"بھگوان جانے مجھے پرکاش پر یہ امید نہ تھی ۔" بابو جی نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا ۔

"میں تو خود بڑی حیران ہوں ۔" وہ چونک پڑی "آخر اس کرنٹی میں ہے ہی کیا ۔ بھدے سے نقش اور بیٹھی سی ناک ۔ ذرا آنکھ موٹی ہے ۔ لیکن کیسی دھوئی دھائی آنکھ ہے اس کی اور بھگوان جھوٹ نہ بلوائے ہونٹ تو موٹائی میں مجھ سے تگنے ہوں گے ۔"

بابو جی کی آنکھیں چمک اٹھیں "تم اپنی بات نہ کرو ۔ روپ میں بھلا تمہاری برابری کون کر سکتی ہے ۔"

"آپ نہ کریں مذاق تو کون کرے" دیوی نے شرم سے آنکھیں جھکا کر کہا "روپ ہوتا تو ۔۔۔" اس نے ہلکی سی آہ بھری ۔

"میری آنکھوں سے کوئی دیکھے ۔۔۔" بابو جی چمک کر بولے ۔

"آپ کا کیا ہے ۔ آپ تو یونہی چھیڑتے رہتے ہیں ۔ ۔۔" دیوی نے لجا کر کہا ۔

دو ایک منٹ وہ دونوں خاموش رہے ۔ پھر بابو جی بولے "جانے پرکاش

کو کیا ہوگیا ہے ان دنوں ۔ معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں محبت ہی نہیں رہی ہماری ۔"

"مجھ سے تو ناراض معلوم ہوتا ہے ۔ پچھلے دنوں جب آپ دورے پر گئے ہوئے تھے ، مجھے بیٹھے بٹھائے کچھ ہوگیا ۔ پتہ نہیں کیا ہوا ۔ دل بیٹھنے لگا ۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا ۔ میں نے پرکاش کو آواز دی ۔ میں نے کہا دیکھو تو کیا ہوا ہے مجھے ، دل گھبرا رہا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے بخار ہو رہا ہے ۔ دیکھو تو میں نے نبض دکھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا پر وہ دور ہی سے کہنے لگا ۔ میں ابھی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں ۔ ہاتھ تک لگا کر نہ دیکھا مجھے ۔" دیوی یہ کہہ کر خاموش ہوگئی ۔

بابو جی نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا ، کہنے لگے ۔ "آج کل کے پڑھے لکھے لڑکے تو چھوٹی سی بات پر بھی ڈاکٹر کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں ۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے اور اپنی توند پر ہاتھ پھیرنے لگے ۔ ادھر دیوی گم سم بیٹھی تھی ۔ گویا خواب دیکھ رہی ہو ۔

"میرا خیال ہے" بابو جی بولے "اب ہمیں پرکاش کا بیاہ کر دینا چاہیئے ۔"

دیوی چونک پڑی ۔ ایک آہ بھر کر کہنے لگی "جانے کون سی روپ وتی لائے گا ۔"

"بھئی کیا خوب یاد دلایا تم نے ۔ اگر تمہاری سہیلی روپ وتی سے اس کا بیاہ ہو جائے تو لڑکی بھی اچھی ہے اور ذات کے بھی وہ کھتری ہیں ۔"

"پر پرکاش اسے کب پسند کرنے لگا ۔ بے چاری کی سیدھی سادی شکل ہے میری طرح اور اسے آج کل کی لڑکیوں کی طرح آنکھیں مٹکانا نہیں آتا ۔"

"میں کہتا ہوں تو اپنے متعلق کس بھول میں ہے ۔ یاد ہے جب تم دلہن بن کر آئی تھی ، محلے والیاں دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں ۔ دھرم سے آنکھ نہیں ٹکتی تھی ۔"

"ہاں یاد ہے" دیوی نے مسکرا کر کہا "ان دنوں پرکاش چھوٹا سا تھا ۔ سارا دن میرے ارد گرد بھابی بھابی کرتا پھرتا تھا ۔ لیکن اب تو مجھ سے بات کرنے کا روادار نہیں ۔"

"یہ تیری بھول ہے ۔ جوان لڑکا ہے ۔ تجھ سے شرماتا ہے ۔"
"کیوں شرمانے کے لئے کیا میں ہی رہ گئی ہوں ۔" دیوی کا منہ لال ہوگیا ۔ معاً مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ہو اور میں اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا ہوں ۔ "جیجی!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ جیجی نے بڑھ کر مجھے تھام لیا اور کہنے لگی "دیوی کو دیکھا کرتے ہیں موہن' اس کی باتیں نہیں سنا کرتے" دیوی پجاری کے من میں ہوتی ہے ، مورتی میں نہیں ۔۔۔ سنو تو ۔ وہ دیکھو ۔" اس نے بابو جی کی طرف اشارہ کیا ۔
بابو جی پیار بھری نگاہوں سے دیوی کو دیکھ رہے تھے "کیسی پگلی ہے تو ۔ سچ مچ دیوی ہے دیوی ۔"

...... ○ ....

نفرت

عجیب واقعات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک معمولی سا واقعہ نازلی کی طبیعت کو یک لخت قطعی طور پر بدل دے ۔ یہ میرے لئے بے حد حیران کن بات ہے ۔ اس کی یہ تبدیلی میرے لئے معمہ ہے ۔ چونکہ اس واقعہ سے پہلے مجھے یقین تھا کہ اس کی طبیعت کو بدلنا قطعی ناممکن ہے ۔ اس لئے اب میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ نازلی وہ نازلی ہی نہیں رہی ۔ جو بچپن سے اب تک میری سہیلی تھی ۔ جیسے اس کی اس تبدیلی میں انسان کی روح کی حقیقت کا بھید چھپا ہے ۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی معمولی واقعہ تھا یعنی کسی بھدّے بدنما آدمی سے خدا واسطے کا بغض محسوس کرنا ۔۔۔ کتنی عام سی بات ہے ۔

سہیلی کے علاوہ وہ میری بھابی تھی ۔ کیونکہ اس کی شادی بھائی مظفر سے ہو چکی تھی اس بات کو تقریباً دو سال گذر چکے تھے ۔ مظفر میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور جالندھر میں وکالت کرتے ہیں ۔

یہ واقعہ لاہور اسٹیشن پر ہوا ۔ اس روز میں اور نازلی دونوں لائلپور سے جالندھر کو آرہی تھیں ۔

ایک چھوٹے سے درمیانے درجے کے ڈبے میں ہم دونوں اکیلی بیٹھی تھیں ۔ نازلی پردے کی سخت مخالف تھی ۔ برقعے کا بوجھ اٹھانا اسے دوبھر ہو جاتا تھا ۔ اس لئے گاڑی میں داخل ہوتے ہی اس نے برقع اتار کر لپیٹا اور سیٹ پر رکھ دیا ۔ اس روز اس نے زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس پر طلائی حاشیہ تھا ۔ زرد رنگ اسے بہت پیارا تھا اور اس کے گورے جسم میں گلابی جھلک پیدا کر دیتا تھا ۔

اس کی یہ بے پردگی اور بے باکی مجھے پسند نہ تھی ۔ مگر اس بات پر

اسے کچھ کہنا بیکار تھا ۔ آتے جاتے لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے مگر وہ اپنے خیالات میں یوں مگن تھی جیسے جنگل میں تن تنہا بیٹھی ہو ۔ دو تین گھنٹے تو یونہی گذر گئے مگر لاہور کے قریب جانے کونسا سٹیشن تھا۔ جہاں سے دو نوجوان لڑکے سوار ہوئے ۔ مجھے تو کسی کالج کے طالب علم نظر آتے تھے ۔ ان لڑکوں نے ہر سٹیشن پر گاڑی سے اتر کر ہمیں تاڑنا شروع کر دیا ۔ ہمارے ڈبے کے سامنے آکھڑے ہوتے اور متبسم نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ، پھر آپس میں باتیں کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ۔ نازلی ویسے ہی بے باکی سے کھڑکی میں بیٹھی رہی بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ نوجوان اسے دیکھ رہے ہیں ۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہی تھی میرے لئے اس کی یہ بے نیازی بے حد پریشان کن تھی میں کچھ شرم اور کچھ غصہ محسوس کر رہی تھی ۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا ۔

میں نے کہا "نازلی برقع پہن لو ۔ دیکھو لڑکے کب سے تمہیں تاڑ رہے ہیں ۔"

"کہاں ہیں؟" اس نے چونک کر کہا پھر مسکرا دی "دیکھنے دو ، ہمارا کیا لیتے ہیں ۔ آپ ہی اکتا جائیں گے ۔۔۔ بچارے!"

"مگر برقع اوڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

"اگر برقع اوڑھنے سے لوگ گھورنا چھوڑ دیں تو شاید عورتیں برقع اوڑھنا ترک کر دیں ۔ برقع پہن لوں تو یہی ہو گا کہ سامنے کھڑے ہونے کی بجائے ادھر ادھر منڈلاتے پھریں گے ۔"

"تم بھی حد ہو ۔"

"میں کہتی ہوں نجمی ایمان سے کہنا کیا تم اپنے آپ کو چھپانے کے لئے برقع پہنتی ہو ۔" وہ مجھے نجمی کہا کرتی تھی چونکہ اس کے خیال کے مطابق نجم النساء گنگنا نام تھا ۔ وہ بے اختیار ہنس دی "اچھا مان لیا کہ تم واقعی اپنے آپ کو چھپانے کے لئے برقع پہنتی ہو ۔ چلو مان لیا برقع پہن کر تم لوگوں پر یہ ظاہر کرتی ہو کہ اس برقعے میں چھپانے کے قابل چیز ہے ۔ یعنی ایک خوبصورت لڑکی ہے ۔ یقین نہ ہو تو خود دیکھ لیجئے اور یہ برقع تو دیکھو" اس نے میرے برقعے کو

ہاتھ میں مسلتے ہوئے کہا یہ ریشمی بوسکی فیتے ، جھالر یہ تو برقعہ بذات خود خوبصورت ہے اور برقعے والی کیا ہوگی ، اندازہ کر لیجئے واہ کیا خوب پردہ ہے ۔"

"تم تو خواہ مخواہ بگڑتی ہو ۔" میں نے تنک کر کہا ۔ "بگڑنا تو خیر ہوگا ۔۔۔ مجھے تمہاری طرح بننا نہیں آتا ۔" "پگلی کبھی عورت بھی پردے میں رہ سکتی ہے ۔ دیکھتی نہیں ہو ۔ عورتوں نے پردے کو بھی زیبائش بنا دیا ہے ۔ آخر جو بات ہے اسے ماننے میں کیا حرج ہے ؟ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی ۔۔۔

"تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے ۔" میں نے بگڑ کر کہا ۔

"لو اور سنو ، جو ہم کہیں وہ تو ہوا مذاق اور جو آپ کہیں وہ حقیقت ۔"

"اچھا بابا معاف کرو بھول ہوئی ۔ اب برقعہ تو اٹھا لو کہ ان درختوں سے بھی پردہ کرو گی؟"

"تمہارے خیالات عجیب ہیں" میں نے برقعہ اتارتے ہوئے کہا۔ سٹیشن بہت دور رہ گیا تھا اور گاڑی ایک وسیع میدان سے گذر رہی تھی ۔

"عجیب ۔۔۔ ہاں عجیب ہیں ۔ اس لئے کہ وہ میرے اپنے ہیں ۔ اگر میں بھی تمہاری طرح سنی سنائی باتیں شروع کر دوں تو تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو۔"

"سنی سنائی ؟"

"ہاں سنی سنائی اس لئے کہ یہ باتیں ظہیر صاحب کو پسند ہیں اور تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں چاہیں تمہارے میاں جو ہوئے ۔ یہ سنہری چوڑیاں ہی دیکھو ۔ یاد ہے تم سنہری چوڑیوں کو کیسی نفرت کی نظر سے دیکھا کرتی تھیں ؟ مگر یہ انہیں پسند ہیں نا ؟ اس لئے یہ بوجھ اٹھائے پھرتی ہو ۔ ان کی محبت کی محتاج جو ٹھہریں ۔ ایمان سے کہنا کیا یہ غلط ہے ؟ مجھے تو ایسی محتاجی گوارا نہیں ۔ تم ہی نے تو مردوں کا مزاج بگاڑ رکھا ہے ورنہ وہ بے چارے ۔"

"تمہیں بھی تو زرد رنگ پیارا ہے نا ؟"

"ہاں ہے اور رہے گا ۔ میری اپنی پسند ہے ۔ میں اپنے میاں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں کہ جیسا ناچ چاہیں ، نچا لیں ۔ میں نے ان سے بیاہ کیا ہے ،

ان کے پاس اپنی روح گروی نہیں رکھی اور تم ؟ تمہاری تو مرضی ہے ہی نہیں ۔ تم تو ہوا کے رخ میں اڑنا جانتی ہو ۔"

دفعتاً گاڑی نے جھٹکا کھایا اور وہ لڑھک کر مجھ پر آگری ۔

"یہ جھوٹ بولنے کی سزا ہے" میں نے اسے چھیڑنے کو کہا اور ہم دونوں ہنس پڑیں ۔ گاڑی سٹیشن پر رک گئی ۔ دونوں جوان گاڑی سے اتر کر ہمارے سامنے آکھڑے ہوئے اور نازلی کو تاڑنے لگے ۔ اس نے دو ایک مرتبہ ان کی طرف دیکھا ۔ اسکے ہونٹوں پر نفرت بھرا تمسخر کھیل رہا تھا "بے چارے!" اس نے دبی آواز میں کہا مجھے تو ان پر ترس آتا ہے اور وہ ویسے ہی بیٹھی رہی ، نہ جانے اس کی بے باکی اور بے پروائی دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے وہ اور بھی دلیر ہوگئے پہلے توآپس میں باتیں کرتے رہے ۔ پھر ان میں سے ایک جو زیادہ دلیر معلوم ہوتا تھا ، ہمارے ڈبے کی طرف بڑھا ۔ مگر نازلی کے انداز کو دیکھ کر گھبرا گیا ۔ کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا ۔ ہاتھ سے اپنی نکٹائی سنواری ، بالوں پر ہاتھ پھیرا، رومال نکالا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھا ۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا اور آخر ہمت کر کے نازلی کے قریب آکھڑا ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو ۔۔۔"

میں تو ڈر کے مارے پسینہ پسینہ ہوگئی ۔ مگر نازلی ویسے ہی بیٹھی رہی اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی ۔ "ہاں صرف اتنی مہربانی فرمائیے کہ یوں سامنے کھڑے ہو کر ہمیں گھوریئے نہیں ۔ شکریہ ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا ۔ اس وقت نازلی کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں حیران ہو رہی تھی ۔ اس میں کتنی ہمت تھی ۔ خیر نوجوان کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کھسیانا ہو کر واپس چلا گیا ۔ اس کے بعد وہ دونوں ہمیں کہیں نظر نہ آئے ۔

ان دنوں نازلی کی طبیعت بے حد شوخ تھی مگر شوخی کے باوجود وہ کبھی کبھی ایسی سنجیدگی سے کوئی بات کہہ دیتی کہ سننے والا پریشان ہو جاتا ۔ ایسے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نسوانی جسم کی تہہ میں کوئی مردانہ روح جی رہی ہو ۔ مگر اس کے باوجود اس کو مردوں سے دلچسپی نہ تھی ۔ یعنی وہ مردوں کی طرف آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنے والی عورت نہ تھی ۔ اس کے علاوہ اسے جذبۂ محبت کے

خلاف بغض تھا ۔ مظفر بھائی دو سال کے عرصہ میں بھی اسے سمجھ نہ سکے تھے ، شاید اسی لئے وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے ۔ نازلی انہیں اس قدر پیاری تھی حالانکہ وہ ان کے روبرو ایسی باتیں کہہ دینے سے کبھی نہ جھجکتی تھی جو کسی عام خاوند کو سننا گوارا نہیں ہوتیں مگر وہ نازلی کی باتیں سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے ۔

لاہور پہنچنے تک میں نے منت سماجت کر کے اسے برقع پہننے کے لئے منا لیا ۔ رات کو ۸ بجے کے قریب ہم لاہور پہنچ گئے ۔ وہاں ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ جالندھر جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا تھا ۔ ہم اس پلیٹ فارم پر جا بیٹھے جہاں سے ہماری گاڑی کو چلنا تھا ۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا ۔ یہاں وہاں کہیں کہیں کوئی مسافر بیٹھا اونگھ رہا تھا یا کبھی کبھار کوئی وردی پوش بابو یا قلی تیزی سے اِدھر سے اُدھر گذر جاتا ۔ مقابل کے پلیٹ فارم پر ایک مسافر گاڑی کھڑی تھی اور لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے ۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھی رہیں ۔ "لاحول ولاقوۃ" میں نے نازلی کو کہتے ہوئے سنا ۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا ۔ "کیا ہے؟" میں نے پوچھا ۔

اس نے انگلی سے ساتھ والے بنچ کی طرف اشارہ کیا ۔

بنچ پر بجلی کی بتی کے نیچے دو جوان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ۔

"توبہ! جانگلی معلوم ہوتا ہے ۔" نازلی نے کہا ۔

سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی ہیئت واقعی عجیب تھی جیسے گوشت کا بڑا سا لوتھڑا ہو ۔ سوجا ہوا چہرہ، سانولا رنگ ، تنگ پیشانی پر دو بھدی اور گھنی بھوئیں پھیلی ہوئی تھیں جن کے نیچے دو اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سانپ کی سی آنکھیں چمک رہی تھیں ۔ چھاتی اور کندھے بے تحاشا چوڑے تھے جن پر سیاہ لمبا کوٹ یوں پھنسا ہوا تھا ۔ جیسے پھٹا جا رہا ہو ۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تنگ جسم میں بہت سی جسمانی قوت ٹھونس رکھی ہو ۔

چہرے پر بے زاری چھائی ہوئی تھی ۔ اس کی حرکات بھدی اور مکروہ تھیں ۔ "دیکھو تو" نازلی بولی "اسکے اعضٰے کس قدر بھدے ہیں ۔ انگلیاں تو دیکھو ۔" اس نے جھرجھری لی اور اپنا منہ پھیر لیا ۔

"تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو ۔ جانگلی ہے تو پڑا ہو ۔" میں نے کہا کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ پھر اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک کر اسی شخص پر جا پڑیں جیسے وہ اسے دیکھنے پر مجبور ہو "اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا، توبہ ہے ۔" نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو ۔

"صرف ایک گھنٹہ باقی ہے" میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تاکہ اس کا دھیان کسی اور طرف لگ جائے مگر اس نے میری بات نہ سنی اور ویسے ہی گم سم بیٹھی رہی ۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔ ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے ۔

میں نے اسے کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا ۔ اس کے برعکس کئی بار جب مظفر بھائی کسی دہشت ناک قتل کی تفصیلات سناتے اور ہم سب ڈر اور شوق کے مارے چپ چاپ بیٹھے سن رہے ہوتے ، اس وقت نازلی بے زاری سے اٹھ بیٹھتی اور جمائی لے کر کمرے سے باہر چلی جاتی ۔

مگر اس روز اس کا ایک اجنبی کی انگلیوں اور کھانے کے انداز کو یوں غور سے دیکھنا میرے لئے باعثِ تعجب تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی شکل دیکھ کر مجھے خود ڈر محسوس ہو رہا تھا "دیکھا نا" میں نے بات بدلنے کی غرض سے کہا "تم جو بھائی مظفر کی انگلیوں پر ہنسا کرتی ہو ۔ یاد ہے تم کہا کرتی تھیں ، یہ انگلیاں سوئی کا کام کرنے کے لئے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ یاد ہے نا؟"

"توبہ ہے" نازلی نے نحیف آواز میں کہا "اس کا بس چلے تو سب کو کچا ہی کھا جائے ۔ کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے ۔" وہ اپنی ہی دھن میں بیٹھی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو ۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ کہنے کا خیال چھوڑ دیا ۔ دیر تک میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی حتٰے کہ میں نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا ۔

"نجمی چلو کہیں دور جا بیٹھیں ۔ ضرور یہ کوئی مجرم ہے ۔"

"پگلی" میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر جانگلی کو دیکھتے ہی مسکراہٹ خشک ہوگئی ۔ جانگلی اپنے دھیان میں بیٹھا ہاتھ دھو رہا تھا ۔ واقعی اس کی انگلیاں سلاخوں کی طرح موٹی اور بے تکی تھیں ۔ میرے دل پر نامعلوم خوف چھا رہا

تھا ۔ پلیٹ فارم میری آنکھوں میں دھندلا دکھائی دینے لگا پھر دونوں نے آپس میں باتیں شروع کر دیں ۔

"شادی؟" جانگلی نے کہا اور اس کی آواز یوں گونجی جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو ۔ نازلی نے جھرجھری لی اور سرک کر میرے قریب ہو بیٹھی ۔ مگر اس کی نگاہیں اس شخص پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے جنبش کی طاقت سلب ہو چکی ہو ۔

"کچھ حالات ہی ایسے ہوگئے کہ شادی کے متعلق سوچنا میرے لئے نہایت ناخوشگوار ہو چکا ہے ۔ میری شادی ہوتے ہوتے رک گئی ۔ اسی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ۔"

"آخر کیا بات تھی ، ہم بھی سنیں" اس کے ساتھی نے کہا ۔

"کچھ بھی نہیں ۔ بس میری اپنی بے ہنگم طبیعت" وہ ہنس پڑا ۔ اس کی ہنسی بہت بھونڈی تھی ۔

نازلی سرک کر میرے قریب تر ہوگئی ۔

"میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں" جانگلی نے کہا "تمام جھگڑا میری طبیعت کی وجہ سے ہی تھا ۔ میری منگیتر میرے دوست ظہیرالدین صاحب کی لڑکی تھی ۔ ظہیرالدین ہماری فرم کے مینجر تھے اور ان کا تمام کام میں ہی کیا کرتا تھا ۔ چونکہ ان کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے میں نے ان کی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ میرے حالات کچھ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ شادی کا بکھیڑا میرے لئے چنداں مفید نہ تھا ۔ خیر میں نے سنا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور سچ پوچھو تو خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا میں قطعی ناپسند کرتا ہوں ۔"

"عجیب انسان ہو" اس کے ساتھی نے کہا ۔

"عجیب ہی سہی مگر یہ ایک حقیقت ہے ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بدصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ نہیں یہ بات نہیں ۔ مگر کسی حسین لڑکی کو بیاہ لانا مجھے پسند نہیں ۔"

"اوہ بڑا گھمنڈ ہے انہیں ۔" نازلی نے میرے کان میں کہا ۔

"خیر" جانگلی نے بات جاری کی "ایک دن کی بات ہے کہ مجھے بے موقع

ظہیرالدین کے مکان پر جانا پڑا ۔ یاد نہیں کہ کیا بات تھی ۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ کوئی ضروری کام تھا ۔ چونکہ عام طور پر میں ان کے مکان پر جانا پسند نہیں کرتا تھا ۔ بہرحال ایک چھوٹی سی لڑکی باہر آئی اور کہنے لگی ، آپ اندر چل کر بیٹھیئے وہ ابھی آتے ہیں ۔ خیر میں ملاقاتی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً دروازہ آپ ہی کھل گیا اور کچھ دیر کے بعد ایک جوان لڑکی کھلے منہ دروازے میں آکھڑی ہوئی ۔ پہلے تو وہ یوں کھڑی رہی گویا اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو ۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے لڑکیاں مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں ۔ پھر میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر چلی گئی ۔ میں اس کی بے باکی اور بناؤ سنگار کو دیکھ کر غصّے سے کھول رہا تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی ۔ مجھے اب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ کسی کو ۔" اس نے گھونسا لہراتے ہوئے کہا ۔ پھر وہ ہنس پڑا ۔

نازلی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر چیخ سی ماری مگر ڈر یا نقاہت سے اس کی آواز ان دونوں تک نہ پہنچ سکی ۔ ورنہ خدا جانے وہ کیا سمجھتے ۔

جانگلی نے بات پھر شروع کی ۔ بولا "وہ یوں بن سنور کر وہاں کھڑی تھی ۔ گویا اپنی قیمت چکانے آئی ہو ۔ ایک زرد رنگ کا رسّے کی طرح بل کھایا ہوا دوپٹہ اس کے شانوں پر لٹک رہا تھا ۔ سر ننگا تھا اُف! تمہیں کیا بتاؤں اس کے بعد میں نے ظہیرالدین صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپکی بیٹی کو خوش نہیں رکھ سکتا ۔ یعنی میں نے رشتے سے انکار کر دیا ۔ اس بات پر وہ بہت بگڑے اور مجھے کوئی اور نوکری تلاش کرنی پڑی ۔ مہینوں بغیر نوکری کے رہا ۔ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ۔ راجپوتانے میں نوکری آسانی سے نہیں مل سکتی ۔"

"مگر اس میں انکار کرنے کی کیا بات تھی ؟" اس کے ساتھی نے کہا ۔ "آخر منگیتر تھی ۔"

"بس یہی کہ مجھے بے پردگی سے بے حد نفرت ہے اور آج کل کا بناؤ سنگار مجھے پسند نہیں ۔۔۔ ہاں ایک بات اور ہے ۔ کوئی لڑکی جو زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے ، میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا ۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے ۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ گھر کے کام کاج کو عار سمجھتی تھی ۔ یہ آج کا

فیشن ہے ۔ تم جانتے ہو آج کل لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ بن سنور کر مردوں کو لبھانے کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں اور برتن مانجھنے سے ہاتھ میلے ہو جاتے ہیں ۔ جیسے ہاتھ دکھلاوے کی چیز ہوں ۔ یہیں دیکھ لو کتنی بے پردگی ہے ۔ عورتیں یوں برقعے اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں اٹھائے پھرتے ہیں ۔"

اس کا ساتھی ہنس پڑا ۔ اور پھر ہنستے ہنستے کہنے لگا "یار تم تو راجپوتانے میں رہ کر بالکل بدل گئے ہو ۔"

"اونہہ ہوں ، یہ بات نہیں ۔ جانگلی نے کہا "پردے کا تو میں بچپن ہی سے بہت قائل تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ گھر میں دو عورتیں مہمان آئیں ۔ ایک تو خیر ابھی بچی تھی ۔ دوسری یہی کوئی پچیس سال کی ہو گی ۔ ان دنوں میں خود آٹھ نو سال کا تھا ۔ خیر وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی ۔" وہ رک گیا ۔ پھر آپ ہی آپ بولا "مجھے اس بات پر بے حد غصہ آتا تھا اس لئے میں اکثر باہر مردانے میں ہی بیٹھا رہتا یعنی میں نے ان کے روبرو جانا بند کر دیا ۔ ایک دن ابا نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ پیغام اندر لے جاؤ ۔ خدا جانے کیا پیغام تھا مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے کوئی زیور دیا تھا کہ انہیں دکھا دوں ۔ شاید ان مہمانوں نے وہ زیور دیکھنے کے لئے منگوایا ہو ۔ میں نے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت صحن میں اماں کے پاس بیٹھی تھی ۔ اماں کہنے لگی حمید اندر چلے آؤ ۔ اے ہے تم اندر کیوں نہیں آتے تم سے کوئی پردہ ہے؟ میں یہ سن کر ابا کے پاس واپس چلا آیا ۔ میں نے کہا ابا جی میں نہیں جاؤں گا ۔ وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی ۔ یہ بات میں نے اس قدر جوش اور غصے میں کہی کہ ابا بے اختیار ہنس پڑے ۔ اس کے بعد دیر تک گھر والے میری اس بات پر مجھے چھیڑتے رہے البتہ زرد رنگ سے مجھے ان دنوں نفرت نہ تھی ۔ طبیعت بھی عجیب چیز ہے ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"تمہاری طبیعت تو ایسی ہے جیسے مداری کا تھیلا ۔" اس کے ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے ۔ پھر وہ اٹھ بیٹھے ۔

اس وقت پہلی مرتبہ جانگلی کی نگاہ نازلی پر پڑی جو اس کی طرف دیکھ رہی

تھی ۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی اور آنکھیں نفرت یا خدا جانے کس جذبے سے سرخ ہو گئیں ۔ نازلی کا دل دھڑک رہا تھا ۔ اس کی نگاہیں جانگلی پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ انہیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو مگر ہٹا نہ سکتی ہو اور تمام بدن کانپ رہا تھا ۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نازلی میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی ہو ۔

یک لخت جانگلی مڑا اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے ۔ اس وقت نازلی عجیب بے بسی کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی ۔ گویا اس میں بالکل جان نہ ہو ۔ کچھ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا عین اسی وقت اس کے قریب سے ایک قلی گذرا ۔ وہ ٹھٹھک گئی اور اس نے اپنا برقعہ منہ پر ڈال لیا ۔

"اگر مجھے ایک خون معاف کر دیا جائے تو میں اسے یہیں گولی مار دوں" نازلی نے کہا ۔

"کسے ؟" میں نے پوچھا ۔

"کتنا بنتا ہے !"

"اوہ تمہارا مطلب اس شخص سے ہے مگر تم خواہ مخواہ اس سے چڑ رہی ہو ۔ اپنی اپنی طبیعت ہے ۔ اپنے اپنے خیالات ہیں ۔ تمہیں اپنے خیالات پیارے ہیں ، اسے اپنے ۔"

"بڑی طرفداری کر رہی ہو ۔" وہ بولی ۔

"اس میں طرفداری کی کیا بات ہے ۔" میں نے کہا "تمہیں تو آپ سنی سنائی باتوں سے نفرت ہے ۔ اس کے خیالات بھی مانگے کے نہیں ۔ باقی رہی شکل وہ تو اللہ میاں کی دین ہے ۔۔۔ ایمان کی بات پوچھو تو مجھے تو تم دونوں میں چنداں فرق دکھائی نہیں دیتا ۔"

"جی ہاں تمہارا بس چلے تو ابھی میری بانہہ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دو ۔"

"لاحول ولا" میں نے کہا ۔

"لاحول ولا کی اس میں کیا بات ہے ؟ ۔۔۔ میں کہتی ہوں اس کی بیوی اس کے ساتھ کیسے رہ سکے گی ؟"

گاڑی پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی ۔ ہم دونوں اٹھ بیٹھے ۔ ہم نے انٹر کا ایک چھوٹا سا زنانہ ڈبہ تلاش کیا اور اس میں جا بیٹھے ۔ نازلی نے برقعہ اتار کر پلیٹ کر بنچ پر رکھ دیا ۔ اور خود کونے میں بیٹھ گئی ۔ حالانکہ ڈبے میں بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی پھر بھی اس نے کھڑکی کا تختہ چڑھا دیا ۔ میں دوسرے پلیٹ فارم پر ہجوم کو دیکھنے میں محو ہو گئی ۔ میرا خیال ہے ہم بہت دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے ۔

"توبہ ہے ۔"

نازلی کی آواز سن کر میں چونک پڑی ۔ دیکھا تو میرے پاس ہی وہ جانگلی ہاتھ میں سوٹ کیس لئے کھڑا تھا ۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ اسی لمحے میں نازلی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔ سامنے اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا ۔ بس مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نے لپک کر دوپٹہ میرے سر سے کھینچ لیا اور ایک آن میں خود کو اس میں لپیٹ کر گٹھڑی سی بن کر پڑ گئی ۔

"لاحول ولاقوت" جانگلی کی بھدی آواز سنائی دی اور وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا ۔ میرا خیال ہے کہ وہ غلطی سے ہمارے ڈبے میں چلا آیا تھا ۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اپنی غلطی کو جان کر واپس چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک نازلی اسی طرح منہ سر لپیٹے پڑی رہی ۔ میرے دل میں عجیب عجیب ہول اٹھنے لگے ۔ میرا خیال تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا ۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے ۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے ۔ خیر جوں توں ہم خیریت سے جالندھر پہنچ گئے ۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی میرے کمرے میں آئے ۔ ان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار تھے ۔ کہنے لگے ۔ "نجمہ! نازلی کو کیا ہو گیا ہے ۔ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں ۔" میں نے جواب دیا ۔ "کیا ہوا ۔"

"خدا جانے کیا بات ہے ۔ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں ۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں جی ہاں! جی ہاں! جی ہاں! نازلی اور جی ہاں ؟ میں نے سمجھا شاید مجھ سے ناراض ہے ۔"

"نہیں ویسے ہی اس کی طبیعت ناساز ہے ۔"

"طبیعت ناساز ہے ؟" انہوں نے حیرانی سے کہا ۔ اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ بیٹھی باورچی خانے کا کام کرتی ۔ وہ تو صبح سے حشمت کے پاس باورچی خانے میں بیٹھی ہے ۔ کہتی ہے میں کھانا پکانا سیکھوں گی ۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھویا ۔ عجیب معاملہ ہے ۔"

"وہم نہ کیجئے ۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی ۔" میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا ۔

"وہم کی اس میں کیا بات ہے ۔ تم جانتی ہو اس کی طبیعت خراب ہو تو اس گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور باورچی خانے کے کام سے تو اسے چڑ ہے ۔ آج تک وہ کبھی باورچی خانے میں داخل نہیں ہوئی تھی ۔ خدا جانے کیا بھید ہے ۔"

وہ دو قدم چل کر لوٹ آئے ۔

اور مزے کی بات بتانا تو میں بھول ہی گیا ۔ جانتی ہو نا کہ اسے زرد رنگ کتنا پیارا ہے ۔ میں نے اس مرتبہ ایک نہایت خوبصورت زرد دوپٹہ اس کے لئے خریدا تھا میرا خیال تھا کہ وہ زرد دوپٹے کو دیکھ کر خوشی سے ناچے گی ۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ۔ وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے ۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی ۔ اچھا ہے ۔ آپ کی مہربانی ہے ۔"

"نازلی کے منہ سے یہ بات نکلے سوچو تو ۔ عجیب معاملہ ہے کہ نہیں" وہ بولے ۔

نازلی کی مکمل اور فوری تبدیلی پر ہم سب حیران تھے ۔ مگر وہ خود بالکل خاموش تھی ۔ اسی طرح ایک دن گذر گیا ۔ اسی شام بھائی مظفر تار ہاتھ میں لئے باورچی خانے میں آئے ۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے تھے ۔ کہنے لگے جانتی ہو یہ کس کا تار ہے ۔ خالہ فریدہ کا بڑا لڑکا حمید تھا نا ؟ جو پندرہ سال کی عمر میں راجپوتانے بھاگ گیا تھا ؟ وہ واپس آ گیا ہے ۔ اب وہ بہن کو ملنے دہلی جا رہا ہے ۔ یہ تار اس کا ہے ۔ کل صبح نو بجے یہاں پہنچے گا ۔ چند ایک گھنٹوں کے لئے یہاں ٹھہرے گا ۔"

"کون حمید؟" میں نے پوچھا۔

"تم کو یاد ہوگا میں اور حمید اکھٹے پڑھا کرتے تھے۔"

نازلی کے ہونٹ ہلے اور اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ ہاتھ سے پیالی گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

اگلے دن نو بجے کے قریب میں اور نازلی باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ چائے کے لئے پانی گرم کر رہی تھی مگر یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات کا دھیان ہی نہ ہو۔ پاس ہی کھونٹی پر اس کا زرد دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ بھائی مظفر نے زبردستی اسے وہ دوپٹہ لینے پر مجبور کر دیا تو اس نے لے تو لیا لیکن پہننے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے میلے تھے۔ اس وقت وہ میری طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔

باہر برآمدے میں بھائی صاحب کسی سے کہہ رہے تھے۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ نہایت ادب سے بھابی کو سلام کرنا۔"

"اچھا تمہاری مرضی" کسی نے بھدی آواز میں کہا جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔

"وہی" میرے دل میں کسی نے کہا اور جانگلی کی شکل میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لئے دبے پاؤں اٹھی۔

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اسی وقت بھائی صاحب حمید سے کہہ رہے تھے آؤ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

نازلی نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی۔ کھونٹی سے لپک کر دوپٹہ اتار لیا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اسے چولھے کی طرف پھینک دیا جیسے کوئی بچھو ہو۔ اور دوڑ کر حشمت کی چادر کو پکڑ لیا جو دوسرے دروازے کے پٹ پر لٹک رہی تھی۔ اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا۔ زرد دوپٹہ چولھے میں جلنے لگا۔ اسی وقت بھائی صاحب اندر داخل ہوئے مگر وہ اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموشی سے

کھڑے رہے ۔ آخر انہوں نے مجھ سے پوچھا نازلی کہاں ہے ۔

میں نے نازلی کی طرف اشارہ کیا جو منہ لپیٹ کر کونے میں بیٹھی ہوئی تھی ۔

"نازلی" انہوں نے حیرانی سے دہرایا ۔

وہ نازلی کے قریب گئے "یہ کیا حماقت ہے ؟ چلو ــــ باہر حمید انتظار کر رہا ہے ۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ پھر نحیف سی آواز میں کہنے لگی "نہیں میں نہیں جاؤں گی !"

"کیوں؟" وہ بولے ۔

اتفاقاً بھائی جان کی نظر جلتے ہوئے دوپٹے پر پڑی ۔

"نازلی!" انہوں نے دوپٹے کی طرف دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

نازلی نے سر ہلا دیا اور چمٹے سے دوپٹے کو پوری طرح چولھے میں ڈال دیا ۔

بھائی نازلی کی اس تبدیلی پر بہت خوش دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ نازلی کی طبیعت بہت سنور گئی ہے ۔ بات ہے بھی درست چونکہ اس کی طبیعت میں وہ ضد اور بے باک شوخی نہیں رہی مگر کبھی کسی وقت انہیں اکھٹے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں گویا وہ نازلی کو ہمیشہ کے لئے کھو چکے ہیں!

.... ○ ....

محلّہ

"میں کیا پروا کرتا ہوں محلے والوں کی" منظور نے غصے میں کہا "وہ ہمارا اپنا محلہ ہے اور ہمیں وہاں جانا ہی ہوگا۔"

جواب میں ثریا نے سر جھکا دیا اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

لیکن اس کے باوجود وہ ثریا کو محلے میں لے جانے سے گھبراتا تھا۔ چونکہ وہ محلے کی لڑکی نہ تھی۔ اور چوگان میں کھیل کھیل کر، کھڑکی میں چوکی پر بیٹھ کر محلے والیوں کی باتیں سن سن کر جوان نہ ہوئی تھی۔ محلے کی لڑکیاں! گورے چٹے بدن سے بھری ہوئی چوکیاں، چوری چوری تاکنے والی سادہ نظریں، چڑھے ہوئے پائنچے، منظور نے جھرجھری لی۔ پھر اس کی نگاہ ثریا پر جا پڑی۔ گویا ہوا میں مختصر مگر رنگدار جالا تنا ہوا تھا۔ حیران آنکھیں، معصوم ہونٹ۔ زرد و اداس چہرا۔ پتلا صراحی دار جسم گویا کسی زرد بوتل میں جان پڑگئی ہو یا مرقع غالب کی کوئی تصویر چپکے سے کتاب سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہو۔ ثریا محلے کی لڑکیوں سے کس قدر مختلف تھی اور پھر شادی پر اس نے محلے والوں کی رضامندی پوچھنا تو درکنار انہیں بلاوا تک نہ بھیجا تھا۔ بہن نے آکر جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا تھا۔ یوں محلے میں اک نئی لڑکی لا بسانا، بیوی کے چناؤ میں انہیں قطعی نظر انداز کر دینا گویا وہ محلے والے ہی نہ ہوں، محلے والیوں کے لیے یہ اَن سنی بات تھی۔ اس کے علاوہ اپنی سگی چچی کی بات کو جو محلے کی پردھان تھی، کو یوں رد کر دینا! محلے میں ایسا کون شخص تھا جو یہ نہ جانتا تھا کہ چاچی باتوں ہی باتوں میں کئی ایک بار اپنی بیٹی زبیدہ کو منظور کے نام کر چکی تھی۔ انہیں باتوں کی وجہ سے وہ ثریا کو محلے میں لے جانے سے گھبراتا تھا۔ لیکن مجبور تھا۔ دو ماہ کی چھٹی کہاں بسر کرتا۔ اس لئے انہیں محلے میں آنا ہی پڑا اور وہ دونوں وہاں آگئے۔

محلے کے درمیان میں چوگان تھا ۔ جس میں سے چار ایک تنگ و تاریک گلیاں بل کھاتی ہوئی اِدھر اُدھر نکل گئی تھیں ۔ چوگان کے اردگرد کالی کالی خمیدہ سہ منزلہ دیواریں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں ۔ جو صدیوں کے بوجھ تلے جھک گئی تھیں اور یہاں وہاں کئی جگہ سے اینٹیں نکل آئی تھیں ۔ لیکن وہ خم اور شگاف عرصۂ دراز سے ان دیواروں کے جزو بن چکے تھے چوگان میں چند ایک چھوٹی چھوٹی محراب دار کھڑکیاں کھلتی تھیں ۔ جن پر میلے سے ٹوٹے پھوٹے سرکنڈے لٹک رہے تھے جو شاید کسی زمانے میں چقیں ہوں ۔ چوگان کے بیچ میں ایک کبڑی لالٹین کھڑی تھی اور رات کو ٹمٹما کر اندھیرے کو اور بھی واضح کیا کرتی تھی ۔ دائیں طرف مسجد کا سلیٹی گنبد ابھرا ہوا تھا جو کبوتروں اور چمگادڑوں کی آوازوں کو اچھال کر محلے میں نشر کیا کرتا تھا ۔

دن کے وقت محلے والیاں اپنا اپنا کام لے کر چوگان میں آبیٹھتیں ۔ چرخوں کی روئیں روئیں میں کوئی نہ کوئی بات چھڑ جاتی ۔ بیاہ ، بیماری یا موت کی بات یا کوئی پرانا شکوہ کسی کے زخموں کو ہرا کر دیتا ۔ ایک ہاتھ مٹکا مٹکا کر کچھ کہتی ، دوسری ناک پر انگلی رکھ کر سنتی ۔ کوئی بیچ میں بول اٹھتی ۔ اس وقت چاچی کی کرخت آواز ان دیواروں سے ٹکرا کر گنبد میں سوئے ہوئے کبوتروں اور چمگادڑوں کو جگا دیتی اور وہ چیخنے لگتے ۔ چرخوں کی مدھم گنگناہٹ میں وہ کرخت اور بھیانک آوازیں گونجتیں ۔

کھڑکیوں میں چوکیوں پر بیٹھی ہوئی جوان لڑکیاں غور سے بوڑھیوں کی باتیں سنتیں اور کبھی کبھی وہیں سے کوئی نہ کوئی لقمہ دیتی رہتیں ۔ چوگان میں بچے کھیلتے رہتے اور یا تھک جاتے تو کسی دہلیز پر بیٹھ کر ان کی باتیں سنتے اور آپس میں کچھ نہ کچھ کہہ کر چوری چوری ان کا منہ چڑاتے ۔ کبھی کبھار کسی محلے والے کی کھنکھار سنائی دیتی اور کوئی مرد سر جھکائے دبے پاؤں چوگان سے گزر جاتا ۔ یونہی دن گزر جاتا ۔ سال بیت جاتے ۔ چوگان میں کھیلنے والی لڑکیاں جوان ہو کر کھڑکی میں چوکی پر جا بیٹھتیں اور محلے والیوں کی باتیں سننے میں لگ جاتیں ۔ دلہنیں پرانی ہو کر نیچے چوگان میں اتر آتیں ۔۔ لڑکے جوان ہو کر کھنکھارنا اور سر جھکا کر دبے پاؤں چلنا سیکھ کر اندر گھروں میں جا بیٹھتے چھوٹے چھوٹے بچے

گھسٹ گھسٹ کر دہلیزوں سے نیچے اتر آتے اور چوگان میں آ پہنچتے ۔ کالی کالی دیواروں میں ایک آدھ خم اور پڑ جاتا اور وہ اور بھی کالی ہو کر اس کبڑی لالٹین کو کچھ اور اندھا کر دیتیں ۔ مسجد کے گنبد میں سے نئی نئی کرخت آوازیں گونجتیں ۔ لیکن محلے کی زندگی میں کوئی فرق نہ آتا ۔ یونہی دن گزر جاتے ، سال بیت جاتے ۔

محلے والوں نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا ۔ چاچی نے دوڑ کر دہلیز پر تیل ٹپکایا اور ثریا کو گود میں اٹھا کر اوپر لے گئی ۔ محلے والیوں نے بڑھ کر اس کے گرد حلقہ ڈال لیا ۔ چوگان میں بچے شور مچانے لگے ۔ چاچی بولی "بسم اللہ دلہن اپنے گھر آئی ۔" محلے کے مکین باری باری سلام کرنے کو آئے ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود منظور دو ایک دن پریشان رہا ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کالی کالی دیواروں نے اس کے گرد ناچ ناچ کر ، چرخوں نے گا گا کر اور چوگان کی کبڑی لالٹین نے مسکرا مسکرا کر نہ جانے اس کے کان میں کیا کہہ دیا ۔ اسکی گردن جھک گئی اور وہ اندر باہر دبے پاؤں یوں چلنے پھرنے لگا جیسے کسی بطخ کو جوہڑ مل گیا ہو ۔

ثریا کو تو چاچی نے اس قدر اپنایا کہ وہ سہم گئی ۔ اس کے ہر قدم پر بسم اللہ اور چھینک پر الحمد للہ پڑھتی اور بات بات پر بول اٹھتی "کیوں بیٹی خیر تو ہے ۔ کیا ہے تمہیں ۔ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے کیا" یا محلے والیوں کو اسکے اردگرد بیٹھے دیکھ کر کہتی اے ہے تم نے بیچاری کو گھیر کر پریشان کر رکھا ہے ۔ ذرا ہوا تو لگنے دو ۔ لڑکی کی طبیعت اچھی نہیں ۔ دیکھو تو کیا ذرا سا منہ نکل آیا ہے ۔ سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے ۔" پھر وہ غصے میں ہاتھ چلا کر کہتی "توبہ ان جوان لڑکوں پر خدا کی سنوار ، بس بیاہ کرنے کے ہی بھوکے ہوتے ہیں دیکھو تو بھابی ایک ہی سال میں لڑکی کو کیا کر دیا ہے ۔ منہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا ہے اور چلتی ہے بہن تو جھٹکے لگتے ہیں ۔ اب آپ تو آرام سے اندر بیٹھ رہتا ہے ۔ نہ دوا نہ دارو اللہ کرے میری بچی کو آرام ہو جائے ۔ توبہ ، ماں کا دل کیسا ہوتا ہے ۔ ہاں آخر میرے لئے تو اپنا ہی بیٹا ہے نا اور جیسے میری زبیدہ ویسے ہی دلہن!"

چاچی کے منہ سے یہ بات سن کر کئی ایک نے ہاں میں ہاں ملائی ۔ ایک

بولی ، بیچاری کو چار دن بھی دلہن بن کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا ۔ تند تو چار کلمے پڑھا کر سرخرو ہو گئی اور اپنے میاں کے پاس جا بیٹھی ۔" دوسری کہنے لگی "آج منظور کی ماں زندہ ہوتی تو کیسے نازوں سے رکھتی بہو کو ۔"

تیسری نے کہا "میں کہتی ہوں چاچی بس اپنی زبیدہ کی ہم عمر ہو گی پر اُسے دیکھو اللہ رکھے اس "پھیر" میں ہے ۔ ذرا ہنسے تو گالوں پر لہو جھلکتا ہے لیکن دلہن ۔"

چاچی بات کاٹ کر بولی "نہ بہن ایسی بات نہ کہو ۔ اللہ چاہے گا تو بالکل راضی ہو جائے گی ۔"

"میں صبح و شام یہی دعائیں مانگتی ہوں ۔ منظور کی بہن چاہے جانے نہ جانے پر مجھے ان سے بڑھ کر اور کون عزیز ہے ۔ کیوں بھابی تو اپنے ایمان سے کہیو ہے نا یہ بات ۔" ثریا کے لئے وہ محلہ ، وہ کالی کالی دیواریں اور ان عورتوں کی باتیں عجیب تھیں ۔ ان کے جھرمٹ میں وہ اور بھی پریشان ہو جاتی اور اس کے اداس چہرے پر حیرانی چھا جاتی ۔ اس وقت اسے دیکھ کر محسوس ہوتا گویا کوئی پرائیویٹ بات عام کر دی گئی ہو ۔

منظور نے اندر بیٹھ کر جملہ محلے والیوں بالخصوص چاچی کی باتیں سنیں اور بہت خوش ہوا کہ وہ ثریا کو یوں اپنا رہی ہیں ۔ چاچی تو بالکل اس پر جان دیتی تھی حالانکہ اس کا خیال تھا کہ چاچی ان سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گی ۔ آخر اسے دکھ تو ہوا ہو گا ۔ لیکن کیسی اچھی چاچی تھی وہ ۔ اس نے بات جتائی بھی نہ تھی اسے ۔ منظور یوں دل ہی دل میں اپنے گذشتہ شکوک پر نادم ہو رہا تھا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جا کر چاچی کے پاؤں پڑ جائے اور اس سے معافی مانگ لے ۔ بہر حال اسے ثریا کے متعلق ایک اطمینان ہو گیا ، گو اس کے علاوہ چچی کی کسی بات نے اس پر اثر نہ کیا ۔ بیماری کے متعلق سن کر وہ مسکرا دیا ۔ عورتیں جو ہوئیں ، چھوٹی سی بات پر گھبرا جاتی ہیں ۔ شاید ثریا سفر کی کوفت سے پریشان دِکھتی ہو ۔

لیکن اس روز جب چاچی ثریا کے لئے منظور سے لڑی ، اسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ واقعی ثریا کو کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہئیے ۔ چاچی کہنے لگی "یہ بھی کوئی

طریقہ ہے بیٹا کہ پرائی بیٹی کو گھر لا کر اس کا یہ حال کر دو ۔ دیکھو تو ہلدی کی طرح زرد ہو رہی ہے ۔ بس اسی لئے بیاہ کر لائے تھے ۔ اپنا مطلب نکل گیا تو بیوی گئی بھاڑ میں ۔ پر میں تو ایسا نہ ہونے دونگی ۔ آخر وہ بھی کسی کی بیٹی ہے ۔ اس کی ماں کا بھی دل ہے ۔ اسے کتنا صدمہ ہوگا اور پھر دوا نہ دارو میری اپنی زبیدہ ہے ، دلہن کی عمر کی ہوگی ۔ مگر دیکھو تو کیسی جوان نکلی ہے ۔ محلے والیوں کو نہیں جانتے تم ، وہ تو پہلے ہی شغلوں کی بھوکی بیٹھی ہیں ۔ زبانیں قینچی سی چلتی ہیں ۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں گی ، آخر پرائی لڑکی تھی نا ، ان کو کیا پڑی تھی کہ اس کا خیال رکھتے ۔ مر گئی چلو چھٹی ہوئی ۔ جان چھوٹ گئی ۔ پر بیٹا مجھ سے تو یہ نہ سنا جائے گا ۔ اگر میرے بیٹے ہو تو اب بھی ہوش میں آؤ ۔ ابھی تک ہاتھ سے کچھ نہیں گیا ہے ۔ ہاں ۔ اس حالت میں اسے کام کاج نہ کرنے دوں گی ۔ سنا تم نے ۔ مجھے برادری میں اپنی ناک نہیں کٹوانی ۔ جب تک اسے صحت نہیں ہوتی ، زبیدہ یہاں رہے گی ۔ آخر تمہاری بہن ہی ہے ۔ گھر کا کام بھی کر دیا کرے گی اور دلہن کا خیال بھی رکھے گی ۔"

اس روز منظور سارا دن بے چین رہا ۔ بار بار ثریا کی طرف دیکھتا اور جانے کیا سوچتا رہتا ۔ پھر ثریا کو اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر موہوم سی آہ کھینچ کر کہتا "ثریا ، زیادہ چلو پھرو نہیں، یاں ابھی آرام نہ کیا تم نے تو ہو گا کیا ۔" اس وقت ثریا کا اداس چہرہ اور بھی اداس ہو جاتا اور وہ آہ بھر کر لیٹ جاتی ۔ رات کو جب وہ سوگئیں تو منظور اٹھ کر صحن میں گھومتا رہا گویا کچھ کھو بیٹھا ہو ۔ چاندنی میں ثریا کا رنگ زرد دکھائی دیتا تھا اور وہ بچوں کی طرح چارپائی پر گٹھڑی بنی پڑی تھی ۔ پتہ نہیں کیا ہے اسے ؟ پھر اسے چاچی کی وہ بات یاد آگئی ۔ "یہ شہر کی لڑکیاں ، بس دیکھتے رہو انہیں ، ہاتھ لگایا اور چھوئی موئی ہو گئیں ۔" واقعی چاچی سچ کہتی تھی ۔ سال ہی میں کس قدر لاغر ہو گئی ہے ۔ اب کیا ہو گا ۔ ۔ ۔ اُسنے جھرجھری لی اور نگاہیں پھیر لیں ۔ دوسری چارپائی پر زبیدہ پڑی تھی ۔ گلابی گلابی بدن سے چارپائی بھری ہوئی تھی ۔ شلوار کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے اور قمیض کا گلا کھلا تھا ۔ "لاحول ولاقوۃ" کہہ کر وہ اٹھ بیٹھا اور ادھر ادھر گھومنے لگا ۔ چاچی نہ ہوتی تو مجھے

اس کی بیماری کا پتہ ہی نہ چلتا ۔ اُس نے سوچا میں بھلا کیا جانوں کیا ہوتی ہیں عورتوں کی بیماریاں ۔ بیچاری علاج کے بغیر ہی ۔ ۔ توبہ ہے اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا چوگان میں کوئی بڑھیا سر پر دیا رکھ کر ناچ رہی تھی ۔ ارد گرد کالی گہری دیوار۔ س ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھوم رہی تھیں ۔ ثریا ثریا کوئی سیاہ سی چیز چیخ چیخ کر گنبد کے گرد پھڑ پھڑا رہی تھی ۔

زبیدہ نے آکر گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ اگر ثریا اس کا ہاتھ بٹانے کیلئے کچھ کرنے لگتی تو وہ جھٹ بول اُٹھتی "نہ بہن ، اماں کو معلوم ہوگیا تو ۔ ۔ میں اسے کیا جواب دونگی ۔" یا تو ثریا سارا دن لیٹی رہتی یا کبھی کبھار اکتا کر کوٹھے پر چڑھ جاتی ۔ اس وقت دفعتاً زبیدہ کو اس الماری سے کوئی برتن نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ۔ جس کے قریب منظور کرسی پر بیٹھا ہوتا تھا ۔ اسے دیکھ کر منظور سوچ میں پڑجاتا ۔ کیسی اچھی صحت ہے ۔ صحت کے سوا زندگی میں ہے کیا ۔ پھر اسے خیال آتا کہ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے ۔ وہ گھبرا کر آنکھیں جھکالیتا ۔ زبیدہ مسکرا کر اسکی طرف دیکھتی ۔ اس کا پلّہ یا ہاتھ یا جسم کا کوئی حصہ اتفاقاً اس سے چھو جاتا ۔ خوشبو کی ہلکی سی لپٹ اسے گھیر لیتی ۔ زبیدہ تو برتن لیکر مڑ کر مسکرا کر چلی جاتی لیکن وہ دیر تک خیالات میں گم رہتا ۔ جب بھی ثریا آجاتی تو اس کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں ترس جھلکتا اور وہ دل ہی دل میں سوچتا ۔ ثریا کے چہرے تلے ایک گورا گورا بھرا ہوا جسم آلگتا ۔ ان پتلی پتلی باہوں کی جگہ دو بھری بھری باہیں اس کی طرف اُٹھتیں ۔ اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ آہ بھر کر کہتا "ثریا تم زیادہ چلا پھرا نہ کرو، ہاں اور وہ دوائی پی تھی کیا؟"

جب سے وہ محلے میں آئے تھے محلے والوں کو گویا کسی اور بات میں دلچسپی ہی نہ رہی تھی ۔ چوگان میں بیٹھے ہوئے کوئی نہ کوئی ثریا کی بات چھیڑ دیتی یا چاچی خود کچھ نہ کچھ کہہ دیتی اور جب چاچی آپ کوئی بات چھیڑے تو کس کی مجال تھی کہ اس کی ہاں میں ہاں نہ ملائے یا بات کو کاٹ کر کوئی اور قصہ چھیڑے ۔ وہ منظور کی چاچی نہ تھی بلکہ سارا محلہ اسے چاچی کہہ کر بلاتا حتّٰی کے محلے کے بوڑھے بھی اسے چاچی کہتے تھے ۔ کوئی جھگڑا ہو، خوشی ہو یا غم، ہر معاملہ چاچی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا ۔ چاچی ہونٹ پر انگلی رکھ کر غور سے سنتی رہتی اور پھر ہاتھ چلا

چلا کر اپنا فیصلہ سناتی اور تمام چپ چاپ بیٹھی سنتیں یا رہے محلے والے ، انہیں تو ایسی باتوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ گھروں کی باتیں عورتیں ہی جانیں اور عورتوں کے معاملے میں ان کا بس یہی کام تھا کہ کھنکھار کر سر جھکا لیں اور دبے پاؤں پاس سے گزر جائیں یا کما کر لائیں تو ان کی جھولی میں ڈال دیں یا بوقت ضرورت لڑائی میں یا بیاہ پر یا کسی مشکل کے وقت انہیں بلا کر پوچھیں کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیئے اور ان کے بزرگ کیا کرتے تھے ۔

ہاں تو چاچی کی بات کو رد کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ محلے والیوں کا خیال تھا کہ چاچی منظور کو منہ نہ لگائے گی ۔ اس نے جو سلوک چاچی سے کیا تھا وہ کسی سے چھپا ہوا نہ تھا ۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ شروع سے ہی منظور کو اپنا ہونے والا داماد سمجھتی تھی ۔ اس کے باوجود منظور کی بہن نے اسے یوں نکال کر رکھ دیا جیسے دودھ کی مکھی ۔ ان باتوں کے باوجود جب وہ چاچی کی باتیں سنتیں اور دیکھتیں کہ وہ ثریا کے نام پر بسم اللہ پڑھتی ہے تو دل ہی دل میں اسے سراہتیں ۔

"تو نہیں جانتی بی بی" چاچی نے رازدارانہ انداز میں کہا "یہ آج کل کے نوجوان بھلا عورتوں کی بیماریاں کیا جانیں ۔ یہ تو بس کنگھی پٹی کر کے ٹہلنا ہی جانتے ہیں ۔ بس جانے دے تو اس بات کو ہاں" لیکن وہ بات کو جانے کیسے دیتیں ۔ وہ جانتی تھیں کہ جب چاچی جانے دے اس بات کو کہے تو اسے جاری رکھنا اشد ضروری ہو جاتا ہے ۔ بی بی بولی "لے چاچی مردوں کو کیا پڑی کہ وہ جانیں ۔ ان کی بلا سے ایک نہ سہی دوسری سہی ۔ بیویوں کا کیا کال ہے" "نہ بی بی یہ نہ کہہ" چاچی نے زبان ہونٹوں میں دبا کر کہا ۔ "اللہ نہ کرے ہمارے منہ سے ایسی بات نکلے ۔ مردوں کا کیا قصور خود اللہ میاں نے چار کرنے کی اجازت دی ہے ۔ اس لئے تاکہ ایک بیمار ہو جائے یا بچہ بالا نہ ہو ۔ آخر ہزار باتیں ہوتی ہیں ۔ شریعت کی بات پر نکتہ چینی کرنا ، توبہ ، میری ہزار بار توبہ"، اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ۔ "لیکن چاچی دلہن کو ہے کیا" کسی نے پوچھا ۔ چاچی رازدارانہ انداز میں کہنے لگی "وہی اپنی برکت والی بیماری ۔ دیکھا نہیں رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوتا جا رہا ہے ۔ ۔ وہ بھی تو اسی طرح ۔" اس نے انگلی کھڑی کر

کے کہا "سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی ۔ چھ مہینے بمشکل نکالے ہوں گے ۔ کیوں بی بی ۔ پر توبہ میری ۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے ، کون سی بیماری ہے جس کا علاج نہیں لیکن اب تُو وہاں جا کر اس سے نہ کہہ دینا یہ بات ۔ مریض سے ایسی بات چھپا کر رکھتے ہیں ۔"

اندر منظور نے سنا تو وہ گھنٹوں گم سم بیٹھا سوچتا رہا ۔

گو محلے والیاں ثریا سے وہ بات نہ کہتی تھیں ۔ پھر بھی آپ جانتے ہیں جب محلے میں کوئی بیمار ہو تو دن میں ایک مرتبہ اس کی عیادت کے لیے جانا ہی پڑتا ہے ۔ اور وہاں جا کر پوچھنا ہی پڑتا ہے کہ بیٹی کا کیا حال ہے اور اپنی ولی ہمدردی جتانے کیلئے دیکھو اتنا سا منہ نکل آیا ہے کہنا لازم ہو جاتا ہے ۔ محلے والیاں اپنے اس فرض میں کوتاہی نہ کرتی تھیں ۔ دن بھر گھر میں آنا جانا لگا رہتا ۔ ثریا تو چپ چاپ لیٹی رہتی تھی لیکن زبیدہ جو تھی وہ ہر آنے جانے والی کے سوال کا جواب دیتی یا اکثر چاچی آپ بیٹھی ہوتی اور کوئی پوچھنے آتی تو وہ جھٹ بول اٹھتی ۔ "ابھی تو کوئی افاقہ نہیں پر اللہ اپنا فضل کرے گا ۔ اس کے فضل سے مایوس ہونا سب سے بڑا کفر ہے ۔ آخر ہوتے ہوتے ہی آرام ہو گا نا ۔" اندر منظور یا تو چاچی کی باتیں سنتا رہتا یا اپنی صحت ٹھیک کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ورزش کرتا اور یا کسی بھرے ہوئے جسم کے قرب کی آرزو کرتا ۔ ثریا کا نمکین حسن اس کی نگاہ میں کسی بیماری کی علامت کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا ۔ یوں ہی دن گزرتے گئے ۔ حتّٰی کہ منظور کی چار ایک چھٹیاں باقی رہ گئیں ۔

چاچی کو چپ چاپ بیٹھے ہوئے دیکھ کر منظور نے پوچھا "کس فکر میں ہو چاچی" اس نے آہ بھری، کہنے لگی "بیٹا مجھے کیسی فکر" بس یہی سوچ رہی ہوں کہ اب کیا ہو گا ۔" "کیا ہو گا" منظور نے حیرانی سے پوچھا ۔ چاچی بولی "دلہن کو آرام آجاتا تو مجھے فکر نہ رہتی ۔ وہاں تم جانے سارا دن کہاں پھرتے رہتے ہو گے ۔ اللہ مارا دفتر کا کام بھی تو ختم ہونے میں نہ آتا ہو گا ۔ اور گھر وہ اکیلی بیٹھی رہا کرے گی ۔ اتنا بھی نہیں کہ کسی سے بات کرے ۔ ایسے بھرے گھر سے جا کر وہاں ویرانے میں پڑ جانا ۔ مجھے خیال آتا ہے تو ہول اٹھتا ہے ۔ خدا کرے تمہاری ترقی ہو جاتی تو نوکرانی ہی رکھ لیتے پر چالیس روپے میں کیا بنتا ہے آج

کل ۔ پھر پردیس کا معاملہ ہے اور کال کے دن ۔ میں تو زبیدہ کو ساتھ ہی بھیج دوں ، پر تم جانتے ہو محلے والیوں کی گز بھر زبان ہوئی ۔ جانے کیا کیا کہتی پھریں ۔ اللہ کے فضل سے تمہارے گھر کوئی بچہ بالا ہوتا تو بھی تھا ۔ کہتے ہیں اکیلا ایک دو گیارہ ۔ پر بچے کی ہوس تو ساری عمر لگی رہے گی ۔ اس بیماری میں بچہ کہاں ۔ برکت کو بھی یہی بیماری تھی ساری عمر بچے کو ترستی رہی ۔ بس اس گھر کا نام بھی باقی نہ رہا ۔ مجھے تو یہ دکھ کھائے جاتا ہے ۔ پھر خیال آتا ہے" یہ کہہ کر وہ رک گئی ۔ پھر بولی ۔ "چلو چھوڑو اس بات کو جو اللہ کو منظور ہو گا ۔ وہی ہو گا ۔ فضول فکر کرنا ۔۔۔"

"تم بات تو کرو چاچی" منظور کہنے لگا ۔

"بات کیا کروں ۔ ماں کا دل تو تم جانتے ہی ہو ۔ آخر میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں ۔ سوچتی ہوں کہ اور نہیں تو کم از کم بچے کے لئے ہی دوسری شادی کر لیتے ۔ کم از کم گھر کا نام تو رہتا ۔ اس کے علاوہ وہ تمہاری بیوی کا بھی خیال رکھتی ۔ بیمار کی جتنی خدمت ہو کم ہے بیٹا ۔"

"بات ٹھیک ہے چاچی" منظور نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" مجھے سوچ لینے دو ""چل پگلا" چاچی بولی "خواہ مخواہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کرنا ۔ پر یاد رکھو جو ہونا ہے وہ نہ تیرے بس میں ہے نہ میرے بس میں ۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا ۔ ویسے اگر یہی بات ٹھہر گئی تو بیٹا سوچ لو وہ کونسی ماں ہوگی جو اپنی بیٹی کو سوکن کے بھاڑ میں جھونک دے گی ۔ کس کا جی چاہتا ہے ۔ میں نے مان لیا ، اللہ رکھے تیری بیوی مزاج کی بری نہیں ، پر لوگ تو سوکن کے سائے سے دور بھاگتے ہیں ۔ ہاں البتہ کوئی اپنا عزیز گوارا کرے تو کر لے ۔ برادری کے لوگ کہاں ایسی قربانی کرنے لگے ۔ قربانی ہی ہے نا ۔ کیوں بیٹا تو آپ سیانا ہے ۔ پھر وہ محلے کی لڑکی بھی نہ ہوئی ۔ میں تو بس تیرے ہی فکر میں گھل رہی ہوں ۔" چاچی نے آہ بھری ۔ "ایمان سے منظور ، جی چاہتا ہے ، جس طرح بھی ہو تجھے سکھی دیکھوں ۔ اگر تجھے ضرورت ہو تو میں اپنے کلیجے کی بوٹی بھی کاٹ کر دے دوں ۔"

رات کو اسے نیند نہ آتی تھی "کوئی بچہ نہ ہو گا" اس کے کانوں میں گونجتا

اور معاً اسے وہ دیوارں اور مکان بے معنی پھیلاؤ نظر آتا ۔ گویا اس مکان کی روح پرواز کر چکی ہو اور چونے کا اک بے جان ڈھیر رہ گیا ہو ۔ وہ کھڑکی میں جا بیٹھا ۔ نیچے چوگان یوں منہ کھولے پڑا تھا ۔ جیسے کوئی عمیق غار ہو ۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس غار میں گرا جا رہا ہے ۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا ۔ زبیدہ کا سفید سفید چہرہ اور بابیں اندھیرے میں جھلملا رہی تھیں ۔ ثریا تو چادر اوڑھ کر پڑی ہوئی تھی ۔ وہ ثریا کی پائنتی پر جا بیٹھا ۔ زبیدہ کی چارپائی پر کوئی بھرے جسم کا بچہ اپنے ہاتھ اٹھا کر رو رہا تھا ۔ ابا ۔ ابا ۔ آں ۔ آں ۔ گنبد سے کبوتر چلایا ۔ اس نے اس طرف دیکھا ۔ گنبد پر کبوتروں کا ایک جوڑا بیٹھا ہوا دکھائی دے رہا تھا ۔ پھر اس کی نگاہ زبیدہ پر جا پڑی ۔ عین اسی وقت زبیدہ نے کروٹ لی اور اس کی بانہہ منظور کی گود میں آگری ۔ گوری گوری ۔ گرم گرم بانہہ ۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ ہونٹ اس بانہہ پر جھکے ۔ پھر وہ رک گیا اور اٹھ کر دیوار پھلانگ کر چاچی کے پاس چلا گیا ۔ اس وقت یہی دس گیارہ کا وقت ہو گا ۔ چاچی بیٹھی آزاربند بن رہی تھی ۔ "کیوں خیر تو ہے ۔" اسے دیکھ کر گھبرا کر بولی "نہیں بات تو کوئی نہیں" منظور نے جھجک کر جواب دیا "ویسے چاچی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" "ہاں ہاں شوق سے کہو" چاچی بولی "میرا مطلب ہے" اس نے کہا "تم جانتی ہی ہو چاچی ، اس حالت میں ثریا کو ساتھ کیسے رکھ سکتا ہوں ۔ لیکن ساتھ نہ لے جاؤں تو مجھے روٹی کیلئے بے حد تکلیف ہوگی" "ہاں ہاں بیٹا" چاچی کہنے لگی ۔ "بازار کی روٹی کس کام کی ۔ توبہ اس سے تو بھوکا رہنا بہتر ہے ۔" "تو چاچی میرا مطلب ہے اگر تم برا نہ مانو تو ۔۔۔" "لے پگلا میں کیا تیری بات کا برا مان سکتی ہوں ۔ تو جو جی میں آئے کہہ" ۔ میرا مطلب ہے ۔" منظور نے دہرایا ۔ "اگر چاچی تم مجھے اپنی غلامی میں ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا ۔ چاچی بھی یوں چپ بیٹھی رہی جیسے کسی سوچ میں پڑی ہو ۔ "تمہارا مطلب زبیدہ کے رشتے سے ہے ۔" چاچی نے کہا ۔ "چاچی میں ساری عمر تمہارا احسان مند رہوں گا" منظور نے جھکی آنکھوں سے جواب دیا "خیر احسان تو جانے دے" چاچی بولی "مجھے تو شاید اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا ۔ آخر تم سے بڑھ کر مجھے کون عزیز ہے ۔ پر بیٹا محلے والے کیا کہیں گے ۔"

"محلے والے" منظور نے سر اٹھا کر غصے سے کہا "محلّے والوں کی مَیں کیا پروا کرتا ہوں ۔ سنا تم نے چاچی" "محلے والے" مسجد کا گنبد چیخا ۔ نیچے چوکان میں کوئی بوڑھی جادوگرنی سر پر دیا رکھے چرخے کی لَے پر ناچ رہی تھی ۔ اس کے ارد گرد کالی خمیدہ دیوارہ‌س ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جھوم رہی تھیں ۔ کوٹھے پر اندھیرے میں چاچی کے سفید دانت چمک رہے تھے ۔

..............○..............

غسلِ آفتابی

سورج کی شعاعیں میرے بند بند میں کھبی جا رہی تھیں جیسے کچھ کرید رہی ہوں ۔ میری نس نس دھنکی کی طرح بج رہی تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک گویا اس کے ساتھ تال دے رہی تھی ۔ میں یُوں اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اٹھا کر بٹھا دیا ہو ۔ میرے میلے میلے پنڈے پر کانس سی پھیلتی جا رہی تھی ۔ یہ پہلا دن تھا کہ میں جھجکے بغیر اپنے جسم کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اسے اپنا جسم سمجھ رہا تھا ۔ جیتا جاگتا جسم ۔ مٹی کا پتلا نہیں ۔ میں نے آنکھ اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا چاروں طرف بوسیدہ دیواریں کھڑی تھیں ۔ ان کالی چھوٹی چھوٹی اینٹوں پر گزری ہوئی بیتی ہوئی داستانیں کھدی ہوئی تھیں اور وہ دیواریں اَن کہی کہانیوں کے بوجھ تلے ٹیڑھی ہو گئی تھیں ۔ اس وقت میرے میلے پنڈے اور ان کالی دیواروں میں مناسبت دکھائی دے رہی تھی ۔ میں نے پیار سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا میرا جسم ۔ میرا اپنا ۔۔ جیتا ۔۔ گرمایا ہوا جسم ۔۔ میرا ہاتھ لمبی داڑھی پر جا رُکا ۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ داڑھی کوئی چادر تھی جو میں نے اوڑھ رکھی تھی ۔ جو میرے بدن اور سورج کی کرنوں میں حائل ہو رہی تھی اور مجھے اپنے جسم کو جاننے سے روک رہی تھی ۔ نہ جانے کیوں مگر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اس داڑھی سمیت غسل آفتابی ممکن ہی نہ تھا ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے تو کہا تھا کہ تمام کپڑے اتار کر دھوپ لینا ۔ لیکن وہ لمبی داڑھی ۔ میں نے اٹھ کر کپڑے پہن لئے اور نیچے اتر آیا ۔

غسل آفتابی کرتے ہوئے مجھے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے مگر اس سے پہلے یہ بات مجھے نہ سوجھی تھی ۔ مجھے یاد ہے کہ میں آنکھیں بند کرکے دھوپ میں پڑا رہتا تھا ۔ اکثر منہ پر ہاتھ پھیرتا حتےٰ کہ میرا ہاتھ اپنی لمبی داڑھی پر جا کر رکتا اور بے ساختہ میرے منہ سے آہم ، آہم نکل جاتا ۔ اس وقت مجھ پر واضح ہوتا

کہ میں کون ہوں ۔ اور کون سی باتیں مجھے گوارا نہیں ہیں ۔ مجھے کس طرح رہنا سہنا چاہیئے ۔ کونسی بات پر لاحول پڑھنا چاہیئے ۔۔۔ اس وقت میں زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ۔ البتہ چوری چوری گھڑی کی طرف دیکھتا رہتا جو میں سرہانے رکھ لیا کرتا تھا ۔۔ کس قدر آہستہ چلتی تھی وہ جیسے جان ہی نہ ہو ۔

مجھے ڈاکٹروں پر قطعی اعتبار نہیں وہ تو صرف یہی جانتے ہیں کہ ربڑ کی ٹوٹیاں جیب میں ڈالیں ۔ ٹھک ٹھک کرتے ہوئے چلے ۔ گویا بڑے عدیم الفرصت ہوں ۔ دور کھڑے ہو کر مریض کی طرف دیکھا ۔ ناک بھوں چڑھا کر جیسے وہ کوئی مجرم ہو، شارٹ ہینڈ میں باتیں کیں اور فیس جیب میں ڈال کر چلے آئے ۔ شاید انہیں مرض سے لگاؤ ہو شاید مریض سے نہیں ۔ حالانکہ میں دو مہینے بیمار پڑا رہا تھا ۔ لیکن میں نے کسی ڈاکٹر کا منہ تک نہ دیکھا تھا ۔ اور وہ حکیم صاحب جو میرا علاج کرتے تھے ! بھئی کیا خوب آدمی تھے ۔ آ کر پہروں میری چارپائی پر بیٹھ رہتے ۔ بلکہ میرے ساتھ حقہ پیتے رہتے اور ایسی ایسی باتیں سناتے جن میں لطیفے، حکمت ، تشخیص اور چٹکلے ملے جلے ہوتے ۔ ان کی باتیں سن کر جی ہلکا ہو جاتا تھا بلکہ کئی دفعہ تو مجھے محسوس ہوتا ۔ گویا وہ باتوں سے ہی میرا علاج کر رہے ہوں ۔

خیر وہ بیماری تو جاتی رہی ۔ لیکن ابھی نقاہت باقی تھی ۔ میں بیحد لاغر ہو چکا تھا ۔ انہیں دنوں میرا پرانا دوست ظفری ولائت سے ڈاکٹری پاس کر کے آیا ۔ لوگ تو اسے ڈاکٹر قریشی کہا کرتے لیکن میرے لئے تو وہ سیدھا سادھا ظفری تھا ۔ وہی پرانا ظفری ۔ تو ظفری نے مجھ سے کہا "ابے او بڈھے یہ کیا دوائیوں کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے تم نے فضول ۔ بس روز بلاناغہ کپڑے اتار کر دھوپ لیا کرو ۔ ایک مہینے میں ہٹے کٹے نہ ہو جاؤ تو کہنا ۔ آزما دیکھو اور اس نے مجھے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھ کر کہا "یہ داڑھی دھوپ کھا کر سوکھے گی نہیں ۔ ایسے ہی ہری بھری رہے گی ۔ فکر نہ کرو بھائی ۔"

دوائیوں سے تو واقعی میں اکتا چکا تھا ۔ چونکہ حکیم صاحب کی دوائیاں کٹوروں کے حساب سے پینی پڑتی تھیں ۔ بالکل ان کی باتوں کی طرح ۔

تو بیس دن غسلِ آفتابی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی داڑھی سے منکر

ہوگیا کیسا بیہودہ خیال ہے ۔ میں نے چھاؤں میں بیٹھ کر سوچا اور پیار سے داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ میرا ہاتھ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی مردہ چیز کو چھو رہا ہو ۔ یہ تھا میرا اپنا ہاتھ اور میرے جسم کا بند بند "دھنک دھنک" کر رہا تھا ۔ گویا میں کوئی روئی کا پرانا گالا تھا اور وہ مجھے صاف کر رہا تھا ۔ میرا جسم اس ہاتھ کے لئے منتظر بلکہ بیقرار تھا۔ روشندان سے سورج کی کرن اندر گھس آئی تھی اور فرش پر ناچ رہی تھی ۔ وہ چمک چمک کر مجھے بلا رہی تھی ۔ "لاحول ولاقوۃ" میں نے باآواز بلند پڑھا ! اور داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ۔ مگر اس وقت میری آواز یوں تھی جیسے کسی "دھنک دھنک" کے نقار خانے میں کوئی طوطی چیخ رہی ہو ۔ اور لاحول پڑھنے کے باوجود میری نگاہیں سورج کی اس شعاع پر جمی ہوئی تھیں ۔

ذرا سوچئے تو یوں بیٹھے بٹھائے اپنی اتنی لمبی داڑھی سے منکر ہو جانا یعنی اپنے آپ سے منکر ہو جانا اپنے مخصوص خیالات اور دلچسپیوں کو کھو دینا اپنے آپ سے بیگانہ ہوجانا کیسی قیامت تھی ۔ مسلسل دس سال سے میں نے اس داڑھی کو پالا تھا ۔ اس کی دیکھ بھال کی تھی ۔ جو بذات خود میری دیکھ بھال کیا کرتی تھی اور میری روح کا ایک حصہ بن چکی تھی وہ داڑھی!

میں روز سویرے اٹھ کر اسے تیل لگاتا ، کنگھی کرتا ۔۔ اور پھر جب اس بالوں کے ملائم گچھے پر ہاتھ پھیرتا تو میری دنیا نکھر کر واضح ہو جاتی ۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ زندگی کیا ہے ۔ میں کیا ہوں مجھے اس زندگی میں کیا کرنا ہے ۔ میری بیوی کی طبیعت کس قدر چڑچڑی ہے ۔۔۔ مگر خیر ۔ آہم ۔ اور محلے والے مجھے کس عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور میری رائے کی قدر کرتے ہیں ۔ گو وہ دقیق مسائل کو نہیں سمجھتے ۔۔ مگر خیر آہم ۔ عقل تو اللہ کی دین ہوئی ۔ دے ، دے ، نہ دے نہ دے اس کی مرضی ہے ۔ راضی بر رضائے تو ۔۔۔ آج کل کیسا زمانہ آیا ہے ۔ چودھویں صدی جو ہوئی ۔ لا مذہبی مغربیت لا حول ولا قوۃ ۔ سب شیطان کی چالیں ہیں ۔ استغفر اللہ ۔ لیکن میں عاجز ۔ آہم ۔ شکر الحمد للہ ۔۔ خیر خیر ۔۔ یعنی ایک داڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے میری دنیا یوں قائم ہو جاتی ہے ۔ جیسے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا اور کن کہہ دینا ایک ہی بات ہو ۔

اس کے علاوہ جب کبھی جاجی کی ماں ۔۔ جاجی میرا بیٹا ہے یہی آٹھ نو سال کا ہوگا ۔ بڑا شریر ہے وہ آہم خیر ۔۔ ہاں تو جب کبھی جاجی کی ماں مجھ سے اپنی فضول باتیں چھیڑ لیتی ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں عورتوں کی عادت ہے اور اسکی باتیں مجھے ناگوار گزرتیں ۔ تو معاً میرا ہاتھ داڑھی کو ڈھونڈتا ۔ گویا اس کا سہارا لینا چاہتا ہو فوراً مجھے یہ احساس ہوتا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے اور عورتوں کی باتوں پر دھیان دینا ۔۔ فضول ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ آہم ۔ خدا جانے کیا کہہ رہی ہے ، بیچاری بالکل نہیں سمجھتی ۔ تحقیق نہیں سمجھتی ۔ جاہلِ مطلق ۔ خیر آہم پھر اس کی باتیں نری باتیں ہی رہ جاتیں بے مطلب باتیں ۔ یعنی یہ سب اس داڑھی کا اعجاز تھا ۔ اسوقت میری داڑھی میری لاج رکھ لیا کرتی تھی ۔ اور جاجی کی ماں کی باتوں کے باوجود میں وہی رہتا جو مجھے ہونا چاہیے تھا یعنی جسے لوگ شاہ صاحب کہا کرتے تھے ۔ ویسے تو میں قریشی ہوں اور اپنے آپ کو سیدوں کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتا ۔ مگر جسے اللہ عزت دے ۔ خیر آہم آپ سمجھتے ہی ہیں نا ۔

جاجی کبھی دنگا یا ضد کرتا تو میں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اسے آواز دیتا آہم ۔ جاجی یہاں آؤ بیٹا میری آواز میں روحانیت سی پیدا ہو جاتی ۔ میرے حلق کے نچلے پردے گونجتے اور جاجی شرمندہ ہو کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا ۔ اُسے دیکھ کر میں اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور خودبخود میری زبان سے ایسی ایسی نصیحتیں نکلتیں کہ میں خود سن کر حیران ہوتا ۔ کئی باتیں تو میرے لئے بھی قطعی نئی ہوتیں جیسے الہام ۔ خیر خیر ، اہم میرا مطلب ہے ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے زبان کے بجائے میری داڑھی بول رہی ہو ۔ یعنی جیسے میری زبان حلق کی بجائے داڑھی سے تعلق رکھتی ہو تو خیر ۔ آہم ۔

شام کو جب گاؤں کے معزز لوگ میرے پاس دیوان خانے میں بیٹھے ہوتے اور حقہ پیتے پیتے کوئی مسئلہ چھڑ جاتا تو مَیں خاموشی سے سنتا رہتا ۔ جب سب اصحاب اپنی اپنی رائے سُنا دیتے تو وہ متوقع نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ۔ اس وقت میں ایک احساسِ فراغت سے حقے کے دو ایک لمبے کش لیتا ۔ میرا ہاتھ داڑھی پر پڑ جاتا آہم ۔۔ اور معاً میرے دل میں زیرِ بحث مسئلے کے متعلق عجیب

عجیب انکشاف آ جمع ہوتے اور اس الہام کے زیر اثر میں انہیں ایسے ایسے نکات سمجھا دیتا جو مجھے اکیلے میں کبھی نہ سوجھے تھے ۔ اس کے علاوہ اس خشک مسئلے کو دلچسپ بنانے کیلئے مجھے کئی ایک چٹکلے اور پرانے اولیاء کی مثالیں یاد آجاتیں مختصر یہ کہ داڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے مجھے سارا تذکرۂ اولیاء یاد آجاتا ۔ گویا ذہن کی جگہ میری داڑھی نے اسے حفظ کر رکھا ہو ۔ غرضیکہ میری داڑھی الہ دین کے چراغ سے کم نہ تھی ۔

اکثر صبح سویرے جب میں اکیلا دیوان خانے میں بیٹھا ہوتا تو زینب دروازے میں آکھڑی ہوتی ۔ وہ سامنے کنوئیں سے پانی بھرنے آیا کرتی تھی ۔ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی ۔ دیوان خانے کے متصل ۔ ویسے تو بیوہ تھی مگر تھی ابھی نوجوان ہی ۔ اکثر شہر میں اپنے بھائی کے پاس جایا کرتی تھی ۔ مہینے میں ایک مرتبہ خرچ لینے تو ضرور ہی جاتی اور آپ جانتے ہیں شہر والیوں کی صحبت ــ لٹھے کی شلوار پہننا ، آنکھوں میں کاجل لگانا اور فضول اِدھر اُدھر دیکھتے رہنا ۔ چڑیا کی طرح پھدکتے پھرنا ـــ اہم خیر ۔ خیر مجھے اس کی یہ باتیں پسند نہ تھیں ۔ پھر جب میں اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو مجھے خیال آتا کہ بیچاری اچھی ہے ۔ آخر لڑکی ہی ہے نا ۔ سارے گاؤں نے منتیں کیں کہ نکاح کرو ۔ مگر وہ نیک لڑکی اپنی ضد پر قائم رہی ۔ سبحان اللہ اہم ۔ ابھی عمر ہی کیا ہے ۔ یہی اٹھائیس کی ہوگی ۔ زمانہ ہی فیشن کا ہوا ، بیچاری کرے کیا ــ اہم ہاں تو شہر کب جاؤ گی زینب۔ میں جھکی جھکی آنکھوں سے پوچھتا "اور تو سب خیریت ہے نا ۔ کیوں لڑکی خرچ بھیجا ہے بھائی نے ؟ اہم اہم ــ اچھا تو بھر لے پانی ۔ دیر ہو جائیگی تجھے ۔ لسی منگوا لیا کر سنا لڑکی"۔ ۔ ۔ اس وقت میں یہ قطعی بھول جاتا کہ میری اپنی عمر پنتیس سال سے زیادہ نہ تھی ۔ جب میرا ہاتھ اپنی داڑھی کی لمبائی کو محسوس کرتا تو میرے منہ سے بار بار لڑکی نکل جاتا اور میں سمجھتا کہ میں ایک بڈھا آدمی ہوں اور اپنے آپ کو یقین دلانے کیلئے اسے لڑکی کہتا ہوں تو خیر میرا مطلب ہے داڑھی ہر مشکل میں میری لاج رکھ لیا کرتی تھی ۔ آپ جانتے ہیں کسی نوجوان شوخ بیوہ سے بات کرنا کوئی سیدھی سادھی بات نہیں ۔ خیر ۔ اہم ۔

آپ ہی کہئے ۔ ایسی داڑھی سے منکر ہو جانا خود کشی کی دلیل نہیں تو کیا

ہے ۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ تھا کہ اس روز سے مجھے اپنی داڑھی پر ایمان نہ رہا تھا ۔ اور داڑھی بھی میری مدد کرنے اور لاج رکھنے سے منکر ہوگئی تھی جیسے الہ دین کا پرانا چراغ کسی نئے چراغ سے بدل گیا ہو ۔

خیر غسلِ آفتابی کے بعد میں کمرے میں بیٹھا تھا کہ جاجی کی ماں داخل ہوئی اور مجھے دیکھ کر حسبِ معمول وہی قصہ چھیڑ بیٹھی ۔"یہ اور سنو ۔ دھوپ میں نہانا ، آج تک تو ہم نے کبھی سُنا نہ تھا ۔ ننگے دھڑنگے کوٹھے پر پڑے رہنا ۔۔۔ میں کہتی ہوں اگر کوئی دیکھ لے تو ۔۔۔ ؟ ڈاکٹروں کی باتیں !! وہ تو ولایت جاکر پاگل ہو جاتے ہیں جو ایسی بے حیائی کو علاج کہتے ہیں؟ ۔۔۔۔ مگر آپ ہی کو کچھ عقل کرنی چاہیے ۔ اس داڑھی کا ہی لحاظ کرو ۔ جاجی کے ابا آپ نے تو بس حد کردی ۔" "اسکی باتیں سن کر میں نے حسبِ معمول داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرا ۔۔ آہم مگر وہ بالوں کا ملائم گپھا مجھے چبھ رہا تھا ۔ اور ہاتھ پھیرنے سے مجھے وہ سکون وہ مٹھاس میسر نہ ہوئی ۔ اس کی باتیں مجھے چبھ رہی تھیں ۔ میری نس نس دھنک دھنک کر رہی تھی ۔ اس وقت میں یہ قطعی بھول گیا کہ عورتیں ایسی باتیں کیا کرتی ہیں ۔ فضول باتیں ۔ حجت ۔ تکرار ۔ لاحول ولا قوۃ ۔۔ آہم ۔۔۔ خیر خیر میں نے پگڑی سر پر رکھی اور باہر نکل گیا ۔

باہر چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی ۔ شفاف روپہلی دھوپ اور تیز ہوا چل رہی تھی کہ میرے کپڑے اڑے جاتے تھے ۔ گویا وہ مجھے کپڑے اتار کر دھوپ میں لیٹ جانے کی دعوت دے رہی تھی ۔ کھیتوں میں ہرے بھرے بوٹے لہک رہے تھے ۔ درخت دھوپ میں کھڑے انگڑائیاں لے رہے تھے ۔ ننھے ننھے پودے دھوپ لینے کے لئے سورج کی طرف جھانک رہے تھے ۔ میرے بدن میں ایک عجیب سرسراہٹ ہونے لگی ۔ دلچسپ سرسراہٹ ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ میں نے باآواز بلند پڑھا مگر میرا ہاتھ داڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے رک گیا ۔ اور قمیض کے اندر داخل ہوکر چھاتی پر کھجلانے لگا ۔

گھر واپس پہنچ کر میں نے تذکرۂ اولیاء پڑھنا شروع کردیا ۔ عام طور پر جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں گویا وہ واقعات نہایت مانوس ہوں اور شخصیتیں مجھ سے مناسبت رکھتی ہوں جیسے ان کی دنیا میری اپنی

دنیا ہو اس وقت اولیاء کرام میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو کر میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھے اپنایا کرتے ہیں مگر اس روز مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کے قصے ہوں کوئی بلند اور برتر دنیا کے جیسے مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو یعنی اس روز ان کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہ رہی تھی ۔ گویا وہ سورج تھے ۔ اور میں کسی کنوئیں کی تہہ ۔ اور ہمارے درمیان کچھ حائل تھا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے اس کی لمبائی پر سکون کے بجائے غصہ محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے وہ لمبی داڑھی میرے اور کتاب کے درمیان رکاوٹ ہو ۔ بہر حال میں شدت سے اسے پڑھتا رہا ۔ حتٰی کہ الفاظ مفہوم سے خالی ہوگئے ۔ اور اپنی آواز مجھے یوں سنائی دینے لگی گویا کوئی مکھی بھنبھنا رہی ہو ۔ اندر جاجی کی ماں چیخ رہی تھی ۔ "اس لڑکے نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے ۔ ذرا اس سے پوچھئے تو سہی" ۔۔۔ جاجی میرے سامنے کھڑا تھا مگر مجھے کوئی نصیحت نہ سوجھی "بچہ جو ہوا ۔ بچے یونہی کیا کرتے ہیں ۔ جاؤ بیٹا دنگانہ کرو" میں نے کہا ۔

دروازے میں زینب آ کھڑی ہوئی پتہ نہیں ہونٹوں پر کیا ملا ہوا تھا ۔ گلابی ہونٹ اور نوکیلی آنکھیں جیسے ڈولتی ہوئی کشتیاں جھکی جھکی گھنی پلکیں ۔ میرا ہاتھ قطعی بھول گیا کہ اس وقت اسے داڑھی پر ہونا چاہیے ۔ زینب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ لہرا گئی ۔ وہ ڈولتی ہوئی کشتیاں جھوم جھوم کر چمکیں ۔ اور وہ ٹھمک کر چلی گئی "لا حول و لا قوۃ" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا ۔ میرا ہاتھ لپک کر داڑھی پر آ پڑا ۔۔۔ مگر کیا ہونا تھا وہ تو جاچکی تھی ۔ اب لاحول پڑھنے سے فائدہ اور داڑھی ۔۔۔ وہ تو میرے خلاف ہو چکی تھی ۔ گویا مجھ سے انتقام لے رہی ہو ۔

شام کو جب لوگ دیوان خانے میں اکٹھے ہوئے تو اتفاق دیکھئے اس روز داڑھی کا مسئلہ چھڑ گیا ۔ میں خاموش بیٹھا رہا ۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا تھا ۔ یوں محسوس کر رہا تھا میں گویا میری زبان حلق سے اکھڑ گئی ہو اور اگر میں نے منہ کھولا تو وہ پُھر سے اڑ جائے گی ۔ وہ سب متوقع نگاہوں سے میرا منہ تک رہے تھے ۔ آخر انہوں نے اصرار کیا تو مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑا "داڑھی ۔۔۔ اہم

آخر داڑھی کیا ہے ، محض ایک عادت ، ایک دستور ، شریعت نمائی کا طریقہ اور کیا ۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے ۔ اہم ۔۔۔ جیسے سبز عینک جسے پہن کر انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے ۔۔ جو دھوپ کی کرنوں اہم سے آنکھوں کو بچاتی ہے ۔ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور ۔۔ لوگوں کے لئے سبز پیراہن ۔۔ اہم ۔ یعنی مطلب یہ کہ دیکھئے نا ۔ فرض کیجیے میں آج ہی اپنی داڑھی منڈوا دوں تو میری شخصیت میں تو کوئی فرق نہ آئے گا ۔۔ اہم ۔۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ حاضرین کے منہ کی طرف دیکھتا ۔ اس لئے میں نے لپک کر حقہ پکڑ لیا اور کش لینے کے بہانے خاموش ہوگیا ۔

”شاہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں“ ان میں سے کسی نے کہا دیوانے وہ مجھے اپنی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جو انہیں پسند تھی ۔ جو انہوں نے میرے لیے وضع کر رکھی تھی ہیں ۔۔ کٹ پتلی، قیدی ۔۔ میرا سر گھوم رہا تھا ۔

اگلے روز بیٹھے بٹھائے مجھے سوجھی کہ چلو شہر ہو آؤں ۔ شہر ہمارے گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر تھا ۔ یعنی فقط آٹھ میل کا سفر اور میں یوں جا رہا تھا جیسے کسی نے بلایا ہو ۔ حالانکہ مجھے وہاں کوئی کام نہ تھا ۔ البتہ ایک لالٹین خریدنی تھی ۔ لیکن وہ تو چھ مہینے سے مَیں سوچ رہا تھا کہ لیمپ بہت چھوٹا ہے ۔ لالٹین لے آؤں ۔ پھر خیال آتا کہ چلو گزارا ہو ہی رہا ہے ۔ لیکن اس رات تو مجھے وہ لیمپ بالکل ہی اندھا دکھائی دینے لگا تھا ۔ حتٰے کہ میں نے محسوس کیا کہ لالٹین کے بغیر زندگی ہیچ ہے اور میں حیران تھا کہ اتنی دیر لالٹین کے بغیر ہم کیسے گزارا کرتے رہے تھے ۔ تعجب کی بات تھی ۔

شہر پہنچ کر لالٹین خریدنے سے پہلے اِدھر اُدھر آوارہ پھرتا رہا ۔ اس سے پہلے جب کبھی میں شہر جاتا تو سیدھا حکیم رفیع الدولا کی دوکان پر پہنچتا اور وہاں بیٹھ کر دن بھر حقہ پینے اور باتیں کرنے میں بسر کرتا مگر اس روز رفیع الدولہ کی دوکان پر جانا میرے لئے دوبھر تھا ۔ اتنی دور چل کر جاؤں ۔ یہ ایک محض اتفاقیہ بات تھی کہ جس دوکان پر بیٹھ گیا وہ حجام کی دوکان تھی ۔ وہاں بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ چلو حجامت ہی بنوا لوں میرا ہاتھ داڑھی پر پڑ گیا ۔ کیسی بے ڈھب داڑھی

ہے ۔ میں نے سوچا دوکان میں دو آدمی بیٹھے حجامت بنوا رہے تھے ۔ اُسترے اور قینچیاں چرچر چل رہی تھیں میں نے ایسا محسوس کیا گویا وہ میرے راز سے واقف تھے اور اپنی زبان میں میرے متعلق باتیں کر رہے تھے ۔ چر چر چر چر ۔ چراؤں ۔ خرچ ۔ خرچ ۔ خرچ" میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں ۔ عین اس وقت حجام نے مجھ سے کہا ۔ آئیے مولوی صاحب بال بنوائیں گے ۔ آپ بیٹھئے میرا ہاتھ داڑھی پر جا پڑا ۔ خیر میں حجام کے آگے جا بیٹھا ۔

واپسی پر میں غصے سے لالٹین ہلاتا آرہا تھا ۔ شکر ہے کمبخت نے میری داڑھی نہیں کاٹ دی ۔ ورنہ گاؤں آنا مشکل ہو جاتا ۔ لوگ طعنے دیتے ۔ تمسخر کرتے ۔۔۔ احمق کہیں کا نام کو شہر کا حجام اور بال کاٹنے تک کی تمیز نہیں ۔۔۔ اہم ۔

ان باتوں کے باوجود میں نے غسلِ آفتابی کرنا نہ چھوڑا ۔ حالانکہ چھاؤں میں بیٹھ کر مجھے اپنی حماقت پر غصہ آتا تھا ۔ میرا اپنا بدن دھنک دھنک کر کے مجھے مذاق میں اڑا دیتا اور اگلے روز وقتِ مقررہ پر گھڑی بغل میں دبا کر دھوپ لینے کے لئے کوٹھے پر چڑھ جاتا ۔

اگلے دن دھوپ لیتے ہوئے مجھے ایک نئی بات سوجھی ۔ میں نے پڑے پڑے فرض کر لیا کہ میں شہر سے داڑھی منڈوا آیا ہوں تو میں یہ تصوّر کرتا رہا کہ اب میری شکل کیسی ہوگی ۔ ایک نوجوان کلین شیو چہرہ میرے روبرو آکھڑا ہوا ۔ مسکرانے لگا ۔ اس روز مَیں نے یہ محسوس کیا کہ سورج اور میرے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں اور میرے جسم کا بند بند اور بھی زور سے "دھنک دھنک" کرنے لگا ۔

نیچے آکر اتفاقاً میری نظر دیوان خانے کے آئینے پر پڑی ۔ میں چونک پڑا ۔ گویا کسی نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو ۔ سامنے کوئی اجنبی کھڑا حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا ۔ یہ تو مصنوعی داڑھی ہے ۔کسی نے میرے کان میں کہہ دیا ۔ معاً مجھے یاد آیا کہ مَیں شہر سے داڑھی منڈوا آیا تھا اور اس لئے کہ گاؤں والے میرا مذاق نہ اڑائیں ، مَیں نے ایک مصنوعی داڑھی خرید کر لگا لی تھی اور اب ۔ جب بھی مَیں چاہوں اسے اتار سکتا ہوں ۔ اور ضرورت کے وقت لگا بھی سکتا ہوں

جبھی تو اس صبح دھوپ لیتے ہوئے میں نے اسے اتار لیا تھا اور میرے بدن اور سورج کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہی تھی یہ بات یاد کر کے بے اختیار میری ہنسی نکل گئی ۔ خوب مزا رہے گا ۔ تمام گاؤں والوں کو الو بناؤں گا ۔ بس اس وقت سے میری دنیا پھر سے آباد ہو گئی ۔ میری باتوں میں رَس پیدا ہوگیا ۔ میرے مسائل پھر چلنے لگے ۔

اسی روز زینب دروازے میں آکھڑی ہوئی میں نے اسکی طرف دیکھا پھر خفیہ طور پر میں نے اپنی داڑھی اتار دی ایک نوجوان ، دمکتا ہوا کلین شیو چہرہ میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہوگیا ۔

اپنے اس راز کے متعلق سوچ کر میری رگ رگ "دھنک دھنک" ناچنے لگی میں ہوا میں جھول رہا تھا ۔ زینب کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا گویا سورج اور میرے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ۔ فرش پر پہلی کرن ناچ رہی تھی "دھنک دھنک" میرا بدن تال دے رہا تھا ۔ زینب کے ہونٹ بٹوے کی طرح بند ہوگئے ۔ جیسے کچھ کہہ رہے ہوں اس کی آنکھیں کشتیوں کی طرح ڈولنے لگیں ۔ گویا میں ان میں بیٹھا جھول رہا تھا۔ اس کے آنچل تلے موجیں اُٹھ رہی تھیں ۔ ان جھکی جھکی پلکوں سے کرنیں نکل رہی تھیں ۔ میرے جسم میں کانس لہرانے لگی ۔۔ وہ چلی گئی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے چلتے چلتے بلا گئی ہے ۔

اب وہ روز آتی ہے ۔ دبے پاؤں جیسے صبح کی پہلی کرن اور میں داڑھی اتار کر بلاناغہ دھوپ لیتا ہوں ۔

شام کو جب گاؤں والے دیوان خانے میں آبیٹھتے ہیں تو میں مصنوعی داڑھی لگا لیتا ہوں ۔ میرا ہاتھ داڑھی سے کھیلتا رہتا ہے ۔ جیسے کسی راز کی حفاظت کر رہا ہو ۔ میرے دل میں زیر بحث مسئلے کے متعلق عجیب عجیب انکشافات اٹھتے ہیں اور گاؤں والے حیرانی اور عقیدت سے میری باتیں سنتے ہیں ۔ لیکن وہ نہیں جانتے ۔ میرا راز نہیں جانتے ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میری داڑھی اصلی ہے ۔۔۔ احمق ۔

..........○..........

کرن محل کا بُھوت

کرن محل کو کون نہیں جانتا ۔۔۔ وہ ہیبتناک اور عظیم الشان محل جو ساون گڑھ کے جنوب مغرب میں اس کچی سڑک پر واقع ہے جو گرپور کو جاتی ہے ۔ ساون گڑھ سے کوسوں دور ہی کرن محل کے سیاہ ٹھوس اور ڈراؤنے مینار اور گنبد نظر آنے لگتے ہیں اور راہگیر محسوس کرتے ہیں کہ الف لیلیٰ کا کوئی منظر اپنے دیوؤں اور جنّوں سمیت ان کا انتظار کر رہا ہے ۔ دل پر ایک بوجھ پڑ جاتا ہے ۔ جسم کی نسیں تن جاتی ہیں اور سینے میں دھک دھک ہونے لگتا ہے ۔

محل کا مہیب رُخ اس تاریک محرابی صدر دروازے سمیت ایک عظیم الجثہ حبشی سا دکھائی دیتا ہے جو ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان کھڑا ہو ۔ دروازے کے دونوں جانب نانک چندی اینٹوں کی مسلسل دیواریں ، سیاہ رینگتی ہوئی دیواریں جن میں کہیں کہیں عجیب وضع کی تنگ کھڑکیاں یوں لگتی ہیں جیسے دیواروں پر بڑی بڑی چمگادڑیں لٹکی ہوئی ہوں اور ان دیواروں پر چھایا ہوا گنبد اور اس پر منڈلاتی ہوئی چیختی ہوئی چیلیں اور گدھ ۔

ہاں ۔۔۔ کرن محل کو کون نہیں جانتا ۔

حالانکہ محل کا بیشتر حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے لیکن اس سے اس کی عظمت میں ذرا فرق نہیں آیا ۔ بلکہ اس وجہ سے وہ اور بھی مہیب دکھائی دیتا ہے اور بڑے بڑے صاحب دُور دُور سے اسے دیکھنے آتے ہیں ۔ وہ سارا سارا دن ان کھنڈرات میں گھومتے پھرتے ہیں اسکی بناوٹ دروازوں ، محرابوں ، گنبدوں کی گولائیوں اور اس کے حمام کی پراسرار تعمیر کو دیکھتے اور سراہتے ہیں اور پھر ساون گڑھ کے واحد فوٹوگرافر گھسیٹامل کی دوکان سے محل کی تصاویر خرید کر لے جاتے ہیں ۔ گھسیٹامل کی دوکان پر ان تصاویر کے کارڈ نمائش کے لئے لٹکے رہتے ہیں ۔ چھوٹے چھوٹے چمکدار کارڈ ۔ بڑی بڑی تصاویر ۔ کرن محل کا بیرونی

منظر ۔ پچھواڑے کے کھنڈرات حمام کا اندرونی حصہ وہ پراسرار حمام جو صرف اک دیئے کی مدد سے گرم رہتا تھا ۔۔

کرن محل مدتوں سے ویران پڑا تھا اس کا مالک عرصۂ دراز سے برما میں مقیم تھا ۔ سنا تھا کہ کئی ایک سرداروں نے وہاں رہنے کی کوشش کی کیونکہ محل کے مالک چاہتے تھے کہ وہ آباد رہے ۔ لیکن کوئی بھی محل میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکا ۔ اکثر لوگ تو ایک ہی دن کے بعد وہاں سے بھاگ آئے اور اگر کوئی کچھ دیر رہا بھی تو اسے کسی نہ کسی بدقسمتی سے دو چار ہونا پڑا ۔ سردار اندر سنگھ جو ساون گڑھ کے چودھری تھے ۔ ان کا تو تمام کنبہ دو ماہ کے اندر اندر تباہ ہوگیا ۔ دو بیٹے ، ایک بیٹی اور بیوی ۔جبھی تو یہ مشہور ہوچکا تھا کہ کرن محل میں رہنا موت کو دعوت دینا ہے کہ محل میں جنات اور دیو رہتے ہیں جو اپنی آزادی میں خلل اندازی گوارا نہیں کرتے اس بارے میں کئی ایک روایات اور چشم دید واقعات مشہور تھے ۔ محل میں آدھی رات دیئے جلتے ہیں دیگیں کھڑکتی ہیں کفگیر چلتے ہیں ۔ گانا اور ناچ ہوتا ہے ۔ چیخوں کی آواز آتی ہے ۔ اور جانے کیا کیا ۔

محل کے پچھواڑے میں ایک پھوس کے جھونپڑے میں محل کا چوکیدار رہا کرتا تھا ۔ اس بڈھے کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی ۔ گویا کرن محل کی دہشت اس کے دل سے نکل کر چہرے پر کندہ ہوگئی تھی ۔ ماتھے پر جھریوں کے گنبد ۔ بھوؤں تلے گہری اور سیاہ محرابیں اور گالوں پرنانک چندی لینٹوں کی درزیں! وہ بڈھا بذات خود جیتا جاگتا اسرار تھا ساون گڑھ والے اس کا نام تک نہ جانتے تھے ۔ پتہ نہیں وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا ۔ ساون گڑھ میں مہینے میں صرف ایک مرتبہ آتا اور شام کے دھندلکے میں سودا لے کر چلا جاتا۔اس کی کسی سے میل ملاقات نہ تھی ۔ سال میں صرف ایک مرتبہ چٹھی رساں کو اس کا منی آرڈر لیکر اس کے جھونپڑے تک جانا پڑتا ۔ اس کی سالانہ تنخواہ برما سے آتی تھی ۔ گاؤں والوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اسے چوکیداری کیلئے کیا معاوضہ ملتا ہے ۔ لوگ اس محل کی نسبت اس بڈھے چوکیدار سے زیادہ خائف تھے البتہ صاحب لوگ جو دور دور سے محل دیکھنے کے لئے آتے تھے بڈھے کو ساتھ لیکر محل میں گھومتے رہتے اور پھر بخشیش دے جاتے ۔ گاؤں بھر میں اگر کوئی محل کے آسیب کے متعلق

خاموش تھا تو وہی بڈھا ۔ کرن محل کا چوکیدار ۔

حالانکہ میں نے دس سال ساون گڑھ کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی ۔ لیکن اس عرصے میں مَیں نے کبھی بڈھے چوکیدار کو قریب سے نہ دیکھا تھا ۔ البتہ کبھی کبھار ہم مدرسے کی گراونڈ میں سے بڈھے کو محل کے مینار یا کوٹھے پر دیکھتے تھے ۔ ایک کبڑا سایہ متحرک ہوتا ۔ اس وقت لڑکے چلّا اٹھتے "وہ دیکھو کرن محل کا بھوت کرن محل کا بھوت ، ارے وہ تو چوکیدار ہے چوکیدار" لیکن عجیب بات تھی کہ جب لڑکے اسے دیکھتے تو وہ سب جوش میں چلّاتے اور جب تک وہ سایہ آنکھ سے اوجھل نہ ہو جاتا ہم اپنی نگاہیں ادھر سے ہٹا نہ سکتے تھے ۔ اس وقت میری نگاہیں جھک جاتیں ۔ دل دھک دھک کرنے لگتا اور جسم پر غموں کا بوجھ محسوس ہوتا۔گُرپور سے گاؤں آتے جاتے ہوئے محل میرے راستے میں پڑتا تھا ۔ ہر روز مدرسے جاتے آتے دو مرتبہ مجھے محل کے مقابل سے گزرنا پڑتا تھا ۔ اوّل تو میں اس کچی سڑک سے کبھی گزرا ہی نہ تھا ۔ اس کی بجائے کھیتوں میں کسی پگڈنڈی سے ہو کر گھر آیا کرتا ۔ گو اس طرح مجھے آدھ ایک میل کی مسافت زائد پڑ جاتی ۔ بہرحال محل کے سامنے پہنچ کر میری نگاہیں جھک جاتیں دل دھڑکنے لگتا اور ماتھا پسینے سے بھیگ جاتا ۔ اور میں کوشش کرتا کہ ہمجولیوں سے اِدھر اُدھر کی بات کرکے محل کے قرب کے احساس کو بھلا سکوں ۔ شام کے بعد تو مَیں کبھی ادھر سے گزرا ہی نہ تھا اور اسی بات سے بچنے کے لئے میں نے سکول کے کھیلوں میں کبھی حصہ نہ لیا تھا ۔

ایک روز کسی وجہ سے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں مدرسے میں روک لیا شاید انسپکٹر صاحب کی آمد کے لیے تیاری کرنا تھی یا میٹریکولیشن کے لئے زائد لکچر دینا تھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ۔ میں نے کئی ایک بہانے کئے منتیں کیں ۔ لیکن وہ نہ مانے اس روز ہمیں اندھیرے میں اس سڑک سے گزرنا پڑا ۔ اندھیرے میں اس کچی سڑک سے کرن محل کے مقابل سے گزرنے کا وہ میرا پہلا دن تھا ۔

اس رات ہوا زوروں پر تھی محل کے آس پاس کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے ۔ اور دور ساون گڑھ کی چکی سسکیاں بھر رہی تھی ۔ پتہ نہیں کیا

ہوا ۔ محل کے پاس پہنچ کر میں نے اک وحشت سی محسوس کی ۔ میری نگاہیں اوپر اٹھیں معاً محل کی ایک کھڑکی کھلی اور اک گوری چٹی شکل نے باہر جھانکا کرن سنگھ ۔ کرن سنگھ ۔ وہ مجھے آوازیں دے رہی تھی ، بلا رہی تھی ۔ آپ شاید اسے میرا وہم سمجھیں لیکن میں نے ان کانوں سے وہ آوازیں سنی تھیں ۔ اسکی آواز میں تڑپ تھی ۔ تڑپ ۔ ہوس اور ڈر پھر وہ کراہنے لگی اور پھر ۔۔۔ پھر مجھے معلوم نہیں مَیں سر پر پاؤں رکھ کر گاؤں کی طرف بھاگ رہا تھا ۔ بھاگ رہا تھا اور آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں "کرن سنگھ ۔ کرن سنگھ نہ جاؤ ۔۔۔۔ نہ جاؤ" حالانکہ میں نے مڑ کر نہ دیکھا ۔ مڑ کر دیکھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہ تھی ۔ لیکن پھر بھی اس کے خدوخال مکمل تفصیلات سمیت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے ۔ گویا وہ میرے سامنے کھڑی تھی ۔ پریشان حال لمبی حساس ناک ۔ پتلے پتلے بھنچے ہونٹ ۔ اداس چہرا اور گہری سیاہ نیم وا آنکھیں ۔ میں ڈر کے مارے بھاگ رہا تھا ۔ مگر اس کے باوجود محسوس کر رہا تھا کہ وہ ابھی آکر مجھ سے لپٹ جائے گی ۔ ابھی ۔ اور اسی احساس پر میرے بدن میں دہشت کے علاوہ عجیب سی کیفیات رواں دواں تھیں ۔ اک بے نام پُر کیف وحشت ، اک پُر لذت تناؤ ۔ جسم میں چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں ۔ گویا میں کسی رنگین "چاٹی" میں بلویا جارہا تھا ۔ اُف وہ رات ۔ اس رات سے پتہ نہیں کیا ہوگیا ۔ گویا مجھ میں کوئی رنگین فتنہ جاگ اٹھا ۔ میرے سوئے ہوئے جسم میں یوں بیداریاں جاگ اٹھیں جیسے برکھا کے بعد دھنک' جیسے دھوئیں کے بعد شعلے ۔

اس کے بعد کرن محل اور اس کی حسینہ میرے دماغ پر مسلط ہو گئے ۔ میں نے مدرسے جانا بند کر دیا ۔ ویسے ہمیں امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ہونے والی تھیں ۔ میں نے اپنے گھر کے کوٹھے پر چڑھنا بھی بند کر دیا تاکہ مجھے وہ بھیانک گنبد دکھائی نہ دے مگر اس کے باوجود ہر وقت محل میری آنکھوں کے سامنے منڈلاتا ۔ اور اس لڑکی کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی ۔ گاؤں بھر کی لڑکیوں کے کسی نہ کسی خدوخال میں مجھے کرن محل کی حسینہ کی جھلک دکھائی دیتی ۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کی تصاویر کسی طلسم کے زیرِ اثر کرن محل کے بیرونی منظر میں بدل جاتیں حتےٰ کہ محل کی ہر معمولی تفصیل بھی واضح ہو جاتی اور

پھر کوئی کھڑکی کھلتی اور کرن محل کی حسینہ اپنا سر نکال کر مجھے اشارے کرتی۔ ہوسناک اشارے اور پھر اک اضطراب سے کراہنے لگتی۔ کتاب کے صفحات اس وقت آہوں اور کراہوں کی آوازوں سے گونجتے گویا کوئی فاحشہ کراہ رہی ہو۔ پتہ نہیں اس کی کراہ کو سن کر مجھے فاحشہ کا خیال کیوں آتا تھا۔ مگر آتا تھا اک واضح خیال۔ اس خیال پر میرا جسم دھنکی کی طرح دھنک دھنک کرنے لگتا۔ سوئے ہوئے فتنے بیدار ہو جاتے میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا۔ مجھے یقین نہ آتا کہ آیا خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت۔ ایک دن اسی وحشت میں شاید یہی آزمانے کے لئے میں نے اپنا سر دیوار سے دے مارا۔ پھر آپ ہی آپ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔

ایک روز جب میں مرحوم پتاجی کے کاغذات کی پڑتال کر رہا تھا مجھے ان کی بڑی صندوقچی میں سے ایک تصویر ملی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کرن محل کی تصویر۔ حیرانی کی بات تھی کہ تصویر پر کھڑکی میں ایک لڑکی کی تصویر کاٹ کر چسپاں کی ہوئی تھی گویا کسی نے اخبار سے کتر کر گوند سے لگائی ہو، وہی لڑکی کرن محل کی حسینہ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی اور عمارت ہے جسے میں زبردستی کرن محل دیکھ رہا ہوں۔ عین اسی وقت ماتاجی آگئی۔ انہوں نے اس تصویر کو دیکھ کر آہ بھری اور نمناک آنکھوں سے آپ ہی آپ بولیں "بڑے شوق سے خریدی تھی انہوں نے یہ تصویر۔" "کس نے؟" میں نے شوق سے پوچھا "تمہارے پتاجی نے اور کس نے" وہ آہ بھر کر بولیں۔ "ماتاجی کس جگہ کی تصویر ہے یہ۔" "اسے اسی کرن محل کی جو اپنے ساون گڑھ میں ہے۔ کھسیٹا مل کی دوکان سے خرید کر لائے تھے۔"

"اور یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "بڑے چودھری کی بیوی ہے۔"

"بڑے چودھری؟" میں نے تعجب سے پوچھا ہاں ہاں کرن محل کے سردار کرن سنگھ جنہوں نے محل بنوایا تھا۔" "کرن سنگھ" میں نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔

"واہ! وہ بولی کرن سنگھ کیا صرف تیرا ہی نام ہے۔" "لیکن ماتاجی یہ چھوٹی

تصویر محل پر لگائی کس نے تھی ۔۔" "تونے ہی لگائی تھی" ماتا جی نے کہا ۔ اس بات پر وہ بڑے ناراض ہوئے تھے ۔ بلکہ میں نے ہی کہا تھا انہیں ، اسے بے جانے دیجئے بچہ ہے تصویر پر کچھ کاٹ کر لگا دیا تو کونسی قیامت آگئی ۔۔۔ پھر میں اسے اتارنے لگی تو انہوں نے منع کردیا کہنے لگے "چلو جانے دو اب اگر کرن کی خوشی اسی میں ہے کہ محل کی کھڑکی میں سے یہ لڑکی جھانکتی دکھائی دے تو میرا کیا حرج ہے ۔ رہنے دو ۔ اکھیڑو نہیں ۔"

یہ کہہ کر ماتا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ تصویر اٹھا کر چلی گئیں ۔

اگلے روز اسی تصویر کو کمرے میں لٹکا ہوا دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ لیکن میں نے ماتا سے اُسے اتارنے کے لئے نہ کہا ۔ اگر ماتا کی خوشی اس بات میں ہے تو میرا کیا حرج ہے ۔ میں نے سوچا آخر کرن محل کو سامنے ٹنگا ہوا دیکھ کر کیا فرق پڑتا ہے جب ہر صورت میں کرن محل میری آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا ہے ۔"

اسکے بعد اٹھتے بیٹھتے میں اس تصویر کو دیکھتا رہتا ۔ گھر والوں کے لئے وہ تصویر تو ساکن منظر تھا لیکن میرے لئے وہ متحرک تصاویر کی چادر سے کم نہ تھی اکثر پڑے پڑے جب اس تصویر کو غور سے دیکھتا تو تصویر کا کرن محل پھیلنا شروع ہو جاتا اور سامنے دیوار پر چھا جاتا اور پھر ۔ پھر وہ کمرہ اور اس کے مکین میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ۔ محل کی حسینہ کی آوازیں صاف سنائی دیتیں گویا مجھے بلا رہی ہو ۔ محل کا صدر دروازہ کھل جاتا اور میں اس میں داخل ہو جاتا اور اندھیرے راستوں ، برآمدوں اور کمروں میں کسی کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ۔ اس وقت میرے بدن میں وہی وحشت موجیں مارتی ۔ وہی پُرلذت تناؤ ۔

میری رگ رگ کسی رنگین نشتر کے زیرِ اثر پھڑکتی ۔ اس پر ماتا جی پریشان ہو کر کہتی ، کرن تمہیں کیا ہے بیٹے ۔ کیسی خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہو تم ۔ ضرور پی آئے ہو کہیں سے اور میں چونک اٹھتا ۔ اور اپنی وحشت کو چھپانے کی کوشش میں لگ جاتا ۔

اُن دنوں کرن محل کا سایہ مجھ پر مکمل ہو چکا تھا ۔

ایک رات میری وحشت اس حد تک پہنچ گئی کہ میرے دل میں خوف نام

کو نہ رہا ۔ میں آپ اُٹھ بھاگا ۔۔۔ اُف وہ خوفناک رات جب کبھی مجھے وہ رات یاد آتی ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

وہ ویران اور مہیب کرن محل کے کھنڈرات اور گنبد ۔ گویا کسی مہیب اژدہا کا جھولتا ہوا پھن اور چاروں طرف پھیلے ہوئے سہمے ہوئے کھیت جیسے ساون گڑھ کی عمارتوں کا ڈھیر ۔ دہشت کے مارے سمٹا ہوا ڈھیر ۔ اُف !

میں اس کبڑی لالٹین تلے تن تنہا کھڑا تھا ۔ محل سے ایک چیخ سنائی دی ۔ ہوس کی دھار میری رگ رگ پر چل گئی ۔ پتہ نہیں کیا ہوا ۔ کوئی میری بغل سے نکل کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا ۔ شاید میں اُسے راہ گیر سمجھ کر کھڑا رہتا مگر جب اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو چیخ میرے حلق میں سوکھ کر رہ گئی ۔ ہے بھگوان وہ کون تھا ۔ اگر وہ میں تھا تو میں کون تھا ۔ اس کا منہ ہوس اور حقارت سے سوجا ہوا تھا اور اس کا وہ فاتحانہ قہقہہ ۔ پھر وہ محل کی طرف چل پڑا ۔ جس کی کھڑکیاں فاحشہ عورت کی طرح ڈرا رہی تھیں بلا رہی تھیں ، صدر دروازے کے پٹ کھل گئے ۔ اور وہ اس میں داخل ہوگیا ۔ اس گاڑھے اندھیرے میں اک گونج پیدا ہوئی ۔ کھڑکیوں میں دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں اور دور ساون گڑھ کا ڈھیر لرز رہا تھا ۔ پھر اس محل سے ایک مدھم چیخ سنائی دی ۔ گویا کوئی فاحشہ کراہ رہی تھی ۔ چلا رہی تھی ۔ پھر مجھے یاد نہیں ۔ گاڑھے اندھیرے نے لپک کر مجھے دبا لیا ۔ لپیٹ لیا ۔

اس واقعہ کے کئی ایک ماہ بعد مجھے اپنے دوست نارنجن سنگھ کا خط ملا ۔ وہ اپنے دوستوں سمیت کرن محل دیکھنے کے لئے ساون گڑھ آ رہے تھے ۔ لازماً وہ مجھے کرن محل میں لے جائیں گے ۔ میں نے سوچا ۔ اور اسی ڈر کے مارے میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا ۔ لیکن جوں جوں ان کے آنے کا دن قریب آتا جاتا میرے دل میں بے چینی بڑھتی جاتی ۔

تعجب کی بات ہے کہ میں اس روز ٹھیک وقت پر سٹیشن پر کیسے پہنچ گیا ۔

جوں جوں ہم محل کے قریب پہنچتے گئے میرے بدن کے بند بند کا تناؤ بڑھتا گیا ۔ پُر لذت تناؤ حتٰے کہ میری وحشت جنوں کی حد تک پہنچ گئی ۔ پھر میں بھاگ اٹھا ۔ ”ضرور پی کے آئے ہو تم کرن سنگھ“ نارنجن نے چیخ کر کہا مگر

مَیں جواب دینے کے لئے نہ رُکا۔ سامنے محل کا دروازہ کھلا تھا۔ گویا کسی ڈراؤنے محبوب کی آنکھ میں رضامندی کی سیاہی لہریں لے رہی تھی۔ میری رگ رگ تن گئی۔ بھویں سر کے بالوں کو چھونے لگیں۔ درو دیوار میری نظر میں سرخ ہو گئے۔ وہی تنگ و تاریک راستے۔ وہی ہال۔ اور ہال میں اس کی قد آدم تصویر ـــ محل کی حسینہ ـــ وہی بکھرے ہوئے بال، بھنچے ہوئے ہونٹ اور ـــ ہوس گیر اداس آنکھیں۔ تصویر میں حرکت ہوئی۔ آنکھیں خوشی، تعجب یا خواہش سے چمکیں "تم آگئے کرن سنگھ۔ تم آگئے۔"

معاً کوئی مجھ سے لپٹ گئی ـــ

وہ محل جھول رہا تھا۔ دیواریں گری جا رہی تھیں۔ ٹکرا رہی تھیں۔ کَسی تنی ہوئی ـــ سارنگی کے ٹوٹتے ہوئے تاروں میں سے نغمے چیخ رہے تھے۔ پُرکیف بھیانک نغمے۔ پھر مَیں دھم سے نیچے گر پڑا گویا کسی مدہوش کن کیف نے مجھے پچھاڑ دیا ہو۔

سیڑھیوں میں پاؤں کی چاپ سن کر گھبرا کر مَیں اٹھ بیٹھا۔ سیڑھیوں میں وہ باتیں کر رہے تھے۔ "چوکیدار کیا تم نے کرن محل کے بھوت کو دیکھا ہے۔" جی مَیں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے۔ مَیں اسے اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ وہ یہاں کسی کو رہنے نہیں دیتا۔ وہ اس محل کا واحد مالک ہے اور ـــ اور بڈھا چوکیدار نارنجن سنگھ سمیت ہال میں آپہنچا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ منہ زرد پڑ گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے "بھوت ۔ ۔ ۔ کرن محل کا بھوت" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر بصد مشکل کہا اور پھر دھم سے گر پڑا "کرن سنگھ؟" نارنجن نے چیخ کر کہا اور وہ سب سیڑھیوں میں گڈمڈ ہو گئے۔

"بھوت" میرے دل میں وہ آوازیں گونجیں۔ ایک وحشت بھرا قہقہہ میرے منہ سے نکل گیا۔ ہا ہا ہا سارا محل میرے آنے پر ہنس رہا تھا۔ خوش تھا۔

............O............

مہندی والا ہاتھ

عجیب طبیعت تھی بھائی جان کی ۔ گپیں ہانکنے پر آتے تو وہ وہ باتیں سناتے کہ ہم سب حیرانی سے انکا منہ تکتے رہتے ۔ اس وقت کسی نہ کسی بہانے اماں بھی پاس آ بیٹھتی پان لگانے یا آس پاس کچھ ڈھونڈنے ، اگرچہ انکی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرنا اماں کو گوارا نہ تھا بلکہ وہ تو جان بوجھ کر اُنہیں چڑانے کیلئے کچھ کہہ دیا کرتی شاید اسلئے کہ وہ اور بھی چمکیں ۔ توبہ اس لڑکے کی باتیں تو سنو کیسی باتیں بنانی آتی ہیں اسے اور اگر ہم میں سے کوئی تعجب سے بول اٹھتا سچ تو اماں چولہے کے پاس بیٹھی آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتی تم سنتے جاؤ اس کی باتیں اور بس ۔۔۔ ہاں!

بڑے منطقی واقع ہوئے تھے بھائی جان ۔ دلیلیں اور نکات پیدا کرنے میں تو انہیں کمال حاصل تھا ۔ حالانکہ میرے دل میں ان کی باتوں کا زبردست احترام تھا انکی عقل پر مجھے ناز تھا ۔ اُن کی نکتہ دانی پر میرے دل میں کوئی چپکے سے کہتا "میرے بھائی ۔ جان میرے ۔۔۔ لیکن کبھی کبھار انہیں کسی کے جذبات کو اپنے دلائل کے پاؤں تلے روندتے دیکھ کر بہت غصہ آتا "اونہہ ۔ بڑی دلیلیں لئے پھرتے ہیں ۔۔"

ابا تو بھائی کی باتیں سن کر چپ چاپ بیٹھے مسکرایا کرتے ۔ چھوٹا اصغر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھتا اور آپا ۔۔ اُف کس قدر بنتی تھی آپا ۔ یوں سیانی بن کر بیٹھ رہتی گویا سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہو ۔ اماں ، چولہے کے پاس بیٹھی ناک منہ چڑھایا کرتی اور لقمہ دیتی رہتی اور پھر کسی نہ کسی بات پر بھائی اور اماں کی تکرار ہو جاتی بھائی کہتے "اگر ماموں صاحب کو ہم سے ہمدردی ہوتی ۔۔۔"

اماں جھٹ بول اٹھتی "شرم تو نہیں آتی اِسے ایسی بات منہ سے نکالتے

ہوئے ۔ ماموں تو اس گھر پر جان دیتا ہے اور یہ کہتا ہے ہمدردی نہیں" بھائی اماں کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "اماں تم سمجھتی ہو نہیں اور ۔۔۔" اور اماں زبردستی لکڑی کو چولہے میں ٹھونس کر کہتی "بس میں تو ہوئی بیوقوف ۔ شکر ہے تم تو سیانے ہو" یہ سن کر چھوٹا اصغر چپکے سے باہر نکل جاتا اور ابا کھڑکی کی طرف منہ کر کے آپ ہی آپ مسکراتے ۔ آپا بھائی جان سے اشارہ کرکے چپکے سے کہتی "بھائی جان کی اس بات سے تو ہمیں بھی اتفاق نہیں ۔" اس پر اماں اور بھی چمکتی ۔ ادھر بھائی بھی غصے میں آ جاتے اور چیختے "خواہ مخواہ لڑتی ہو اماں ۔ میں تو کہہ رہا تھا اگر ۔۔۔" "میں نہیں جانتی تمہارے اگر مگر" اماں پرات کو دیوار سے دے مارتی اور جلتی آگ میں پھونکیں مارنا شروع کر دیتی اور بھائی جان اٹھ بیٹھتے بس اماں کو تو اگر سے بیر ہے ۔ عورت اثبات کے سوا کچھ نہیں سن سکتی ۔ نہ کے سوا کچھ کہنا نہیں جانتی اور اگر سے تو چڑ رکھتی ہے چڑ ۔ عجیب بات تھی کہ اگرچہ بھائی جان کے خیالات اور کردار میں عقل کو اس قدر دخل تھا یا کم از کم وہ اپنی باتوں اور برتاؤ سے اس بات کا اظہار کیا کرتے تھے ، انکی طبیعت میں انوکھے بھنور تھے جنہیں عقل اور منطق سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ مثلاً دہی کے نام سے انہیں سخت چڑ تھی گوشت میں دہی پڑا ہوتا تو ہڈیاں تک چبا جاتے ۔ دہی والی مچھلی پنیر اور مکھن بڑے شوق سے کھاتے ہیں ۔ لیکن خالص دہی ۔۔۔ توبہ ۔۔۔ گھر میں کسی برتن میں پڑا نظر آجائے تو سب کی شامت آجاتی ۔ دہی کو چھوڑو ۔ کوئی دہی والا برتن دیکھ کر یا کسی کے منہ سے دہی کا نام سن کر منہ کا نوالا تھوک دیتے اور ہاتھ کا وہیں رکھ کر غصے سے اُٹھ بیٹھتے ۔ پھر ان کا اور اماں کا جھگڑا ہوتا ۔ اس پر آپا بڑے مزے لے کر ان کی باتیں سنتی اور پھر الماریوں میں منہ دے دے کر ہنستی اور چھوٹے اصغر کو اشارہ کرکے چٹکی مار کر کہتی "گدھے کے سر سے سینگ" اور اصغر یہ سن کر ہنس کر وہاں سے ٹل جاتا ۔ چونکہ جب کبھی اماں اور بھائی جان کی تکرار ہوتی تو اماں کسی نہ کسی طرح اصغر کو کوئی نہ کوئی ایسی بات کرتے یا کہتے پکڑ لیتی جو بچوں کو کرنا یا کہنا نہ چاہیئے اور اصغر مفت میں پٹ جاتا ۔ ابا جو اس جھگڑے کے دوران میں دور بیٹھے مسکرا رہے ہوتے ، اس وقت کچھ اس انداز سے اماں

کی طرفداری کی بات کرتے کہ مجھے بچاری اماں پر ترس آنے لگتا۔

یہی تو خیر اک معمولی سا جھگڑا تھا ہمارے گھر میں۔ مگر مہندی اور انگوٹھی۔ کیا مجال تھی کسی کی کہ انگلی میں انگوٹھی پہن لے یا ہاتھوں پر مہندی لگالے۔ لگانا تو اک طرف رہا۔ اگر کوئی مہندی گھول کر سات پردوں میں چھپا کر رکھتا تو بھی بھائی کو فوراً اسکی بو آجاتی۔ اُف پھر تو قیامت آجاتی گھر میں۔ بھائی جان قے کرنے کے لئے غسل خانے کی طرف بھاگتے۔ گھر بھر میں خشک بے بے کی آوازیں گونجتیں۔ ادھر اماں بڑبڑاتی پھرتی۔ اُف!

آپا تو خیر بھائی جان پر اس قدر ریجھی ہوئی تھی کہ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتی۔ انکا ہر خیال اس کے لئے فیشن بن جاتا۔ اور اس کا انداز گفتگو، چال ڈھال بھائی کی باتوں کے مطابق ادلتے بدلتے رہتے۔ اُسے یوں بنتے دیکھ کر مجھے بے حد غصہ آتا۔ جب وہ کہتی نہ جی ہمیں تو ہاتھ رنگنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا کہ اس کا منہ نوچ لُوں دوپٹہ تار تار کر دوں۔ ہاتھ رنگنے میں دلچسپی نہ تھی تو بھلا بات بات پر رنگوں کا تذکرہ۔ رنگوں کے مذاق کا پاکھنڈ۔ بھائی جان یہ جرابیں اس سوٹ کے ساتھ کیسی رہیں گی اور اس ہلکے کاسنی دوپٹے کے ساتھ پراندہ۔ اور شام کو کوٹھے پر کھڑی ہو کر چلاتی وہ دیکھو بھائی جان شنگرفی بادلوں میں خاکستری دھاری۔ اُف آسمان پر قیامت کا سماں ہے۔ بھلا وہ منہ پر غازہ اور سرخی کیوں ملا کرتی تھی اور پھر وہ اللہ مارا ناخون پالش۔ اس کے باوجود مہندی کے رنگ سے نفرت جتانا اور انگوٹھی کو چکیلا پٹا کہنا اور اک انداز سے ہاتھ چلا کر کہنا "نہ جانے یہ انگلیوں کو ہتھکڑی پہنانے کی رسم کس نے ایجاد کی تھی۔"

ہائے ... کس قدر پاکھنڈ مچا رکھا تھا آپا نے۔

مصیبت یہ تھی کہ اماں بھی بھائی جان کے سامنے گم سم بیٹھ رہتی تھی۔ لڑتی بھی تو نکمی باتوں پر اور جو کام کی باتیں تھیں، ان پر دبک کر بیٹھ رہتی۔ اور ابا۔ ابا کی بات تو کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ کچھ کہتے ہی نہ تھے۔ کہتے بھی تو اماں یوں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی گویا ادھار کھائے بیٹھی ہو۔

بڑے منطقی بنے پھرتے تھے بھائی جان۔ اونہہ! بھلا انگوٹھی یا مہندی سے

نفرت کرنا کونسی عقل کی بات ہے ۔ انگوٹھی میں کیا پڑا ہے ۔ نازک سی گول گول اور چمکیلی ۔ انگلی پر پہنی ہوئی کیسی پیاری لگتی ہے ۔ یوں بیٹھ جاتی ہے گویا پیار سے بغلگیر ہو رہی ہو ۔ اور رنگیلی مہندی اُف ۔۔۔ ہلکی ہلکی خوشبو ۔۔۔ سفید سفید ہاتھوں پر شنگرفی دھاریاں گویا دھنک آسمان سے ہاتھ پر اُتر آئی سعیدہ کے ہاتھ ہمیشہ ہلکے گلابی رہتے تھے ۔ ان سفید سفید ہاتھوں پر ہلکا رنگ کیسی بہار دکھاتا تھا ۔ جی چاہتا تھا پکڑ کر چوم لوں ۔ اس کے ہاتھ دیکھ کر مجھے اپنے ہاتھوں پر شرم آنے لگتی ۔ اور میں انہیں چھپائے چھپائے پھرتی ۔ اگرچہ میرے ہاتھ بھی سعیدہ کی طرح سفید تھے ۔ لیکن کیسے روکھے پھیکے ہاتھ تھے میرے ۔ اسی لئے تو میں نے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک نازک سی انگوٹھی بنوا رکھی تھی جسے میں چھپا کر صندوق میں رکھا کرتی ۔ اور جب کبھی سعیدہ کی طرف جاتی تو اسے صندوق سے نکال کر ساتھ لے جاتی اور راستے میں پہن لیتی ۔ اسے پہن کر میرے ہاتھ میں کیسی چمک پیدا ہو جاتی تھی ۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ہاتھ چلا چلا کر بات کروں ۔۔ دوسرے ہاتھ سے انگوٹھی کو گھماتی رہوں ۔

انگوٹھی تو میں کبھی کبھار پہن ہی لیتی تھی لیکن ہاتھوں کو مہندی لگانا مجھے نصیب نہ تھا ۔ توبہ بھائی جان کے فضول وہم کی خاطر ہمیں انگوٹھی اور مہندی سے محروم رکھنا کتنی بری بات تھی ۔ خوب صورت انگوٹھی اور رنگ دار مہندی کو دیکھ کر کسی کی طبیعت کا مالش کرنا میری تو سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ بھائی جان یا تو بنتے تھے اور یا ہم سب کو بناتے تھے ۔ اُف کس قدر پاکھنڈ مچانا آتا تھا انہیں ۔ مہندی یا انگوٹھی کا نام سن کر یوں کانپ جاتے گویا واقعی ان کے بدن کا تار تار لرز رہا ہو ۔ بھلا نام لینے یا سننے میں کیا حرج تھا ۔ اس وقت ان کی حالت دیکھ کر ایک ساعت کیلئے مجھے بھی یقین ہو جاتا کہ واقعی انہیں اذیت ہو رہی ہے مجھے ان پر ترس آجاتا ۔ لیکن جلد ہی مَیں سمجھ جاتی ۔ اک ڈھکلاوا تھا اور کیا ۔ پھر میرا جی چاہتا کہ اپنے ہاتھوں کو مہندی لگا کر انگوٹھی پہن کر بھائی جان کی ہر کھانے پینے والی چیز کو چھوتی پھروں ۔

اک روز میں نے ویسے ہی اماں سے کہا ۔ اماں کیا واقعی بھائی کو دور سے مہندی کی بو آجاتی ہے ۔ ایک بار آزماؤں میں ۔ مجھے یقین نہیں پڑتا اُف اماں

تو اس بات پر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑگئی ۔ بولی ”تجھے معلوم بھی ہو بڑی آئی ہے بھائی کا امتحان لینے! توبہ! اسے تو سات پردوں سے بھی مہندی کی خوشبو آجاتی ہے ۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب میں نے یہی بات آزمانے کے لئے اس کے ہاتھ پر مہندی لگا دی تھی ۔ اُن دنوں ابھی بچہ ہی تھا ۔ نہ جانے پانچویں میں پڑھتا تھا یا چھٹی میں ۔ صبح جب جاگا اور اپنا ہاتھ دیکھا ۔۔ میرے اللہ سارا دن تے پر تے ۔ لڑکے پر کھانا پینا حرام ہوگیا ۔ مجھے تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے ۔ بس اللہ نے رکھ لیا ورنہ حالت تو بہت بُری تھی ۔ پھر لڑکے نے مہندی والا ہاتھ قمیض کے نیچے بغل میں دبا لیا ۔ تین مہینے اس نے وہ ہاتھ بغل میں دبائے رکھا پُورے تین مہینے ۔“

اس روز میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ بھائی جان کی ناک پر مہندی لگا دوں ۔ پھر دیکھوں وہ کیسے چھپا رکھتے ہیں اُسے اپنی بغل ۔

انہیں دنوں ہمارے ہاں آصفہ آگئی ۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ دو دن کے لئے خالہ نے اماں کو بلا بھیجا ۔ آصفہ تو گھر میں تھی ہی ۔ اماں جاتے ہوئے آپا کو بھی ساتھ لے گئی اور گھر میں ابا ، بھائی آصفہ ، مَیں اور اصغر رہ گئے ۔ اگرچہ آصفہ بھائی سے پردہ نہ کرتی تھی ۔ پھر بھی اس کے ہوتے ہوئے بھائی زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتے تھے ۔ اس لئے اس دن میں نے چپکے سے صندوق سے نکال کر اپنی انگوٹھی پہن لی اور یوں اِدھر اُدھر گھومتی پھری گویا گھر کی بیگم تھی یا شاید جیسے مَیں کسی دشمن سے انتقام لے رہی تھی ۔ انہیں ہاتھوں سے مَیں نے آٹا گوندھا ۔ روٹیاں پکائیں ، پانی بھرا اور کیا کیا نہ کیا میں نے ان ہاتھوں سے ۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ مہندی لگا کر بیٹھ جاؤں ۔ نری انگوٹھی پہننے سے میری تسلی نہ ہوئی گویا بغیر شکر کی کھیر کھا رہی تھی مَیں ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ مہندی کا رنگ دھل نہیں سکتا تھا ۔ کیا مصیبت تھی اگر لگا لیتی تو کیا اماں کے آنے پر اُسے انگوٹھی کی طرح اتار کر صندوق میں چھپا سکتی تھی مَیں ۔ اماں میرے ہاتھ دیکھ کر ! توبہ ہے ۔ اماں سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ۔ اور مَیں تو بہن تھی ۔ مجھے تو بھائی کان سے پکڑ کر باورچی خانے سے باہر نکال دیتے ۔۔۔ لیکن آصفہ! مجھے معاً خیال آیا ۔

خوش قسمتی سے آصفہ کو معلوم نہ تھا کہ بھائی جان مہندی اور انگوٹھی سے نفرت کرتے ہیں ۔ ورنہ شاید وہ میری بات میں نہ آتی ۔ چونکہ آپا کی زبانی وہ بھائی کی باتیں سن سن کر بھائی جان پر بہت ریجھی ہوئی تھی ۔ خیر میں نے رات کو اسے لگا ہی دی مہندی ۔ اُف کیسی رنگیلی تھی ۔ صبح آصفہ کے ہاتھ انگارہ سے چمک رہے تھے ۔ کیسے پیارے لگتے تھے اس کے ہاتھ اور کس خوشی سے مَیں نے انہیں دھلایا اور پھر اپنی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کر یوں گھر میں گھومتی پھری گویا اس روز میری زندگی کی واحد خواہش پوری ہونے والی تھی ۔

"اُف ! کیسے خوبصورت لگتے ہیں تمہارے ہاتھ" میں نے پیار سے تڑپ کر آصفہ سے کہا ۔

"سچ" آصفہ بولی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی ۔

پھر مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیار سے دیکھنا شروع کیا ۔ بڑی خوش نصیب ہو تم آصفہ ۔

"مَیں" وہ بولی ۔

"ہاں تم" میں نے کہا یہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں ظاہر کرتی ہیں ۔

"وہ کیسے" وہ خوشی سے اچھل کر بولی بتاؤ بھی نا کیسے نصیب ہیں میرے ۔"

"مجھے نہیں معلوم میں نے کہا بھائی صاحب جانتے ہیں ۔ بس ہاتھ دیکھ کر سب ہونے والی باتیں بتا دیتے ہیں ۔

"سچ" وہ بولی "ہاں جا کر انہیں ہاتھ دکھا کر آزما لو ۔ سب باتیں بتا دیں گے ۔"

"نہ جی مجھے تو شرم آتی ہے ۔"

میں بولی "واہ شرم کی اس میں کیا بات ہے ۔ تم کیا ان سے پردہ کرتی ہو ۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہیں ۔ چپکے سے جا کر ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے کر دینا ، وہ آپ ہی سمجھ لیں گے اور سب کچھ بتا دیں گے ۔ سبھی دکھاتی ہیں انہیں ہاتھ ۔"

"اچھا ۔" اس نے شوق سے تڑپ کر کہا ۔ تو تم بھی میرے ساتھ چلو ۔"

میں نے اسے ٹالنے کیلئے کہا ۔ میں ساتھ گئی تو بھائی ساری باتیں نہ بتائیں

گے ۔ میرے سامنے وہ بیاہ کی بات کیسے کریں گے ۔"

رضا مند تو وہ تھی ہی ۔ میں نے اسے گھسیٹ کر بھائی کے کمرے میں داخل کر دیا اور آپ دروازے کی درز سے دیکھنے لگی ۔ نہ جانے اس وقت مجھ پر یہ احساس کیوں طاری تھا کہ میری اپنی زندگی میں کوئی اہم واقعہ ہونیوالا ہے ۔ میرے بدن میں عجیب لہریں رواں دواں تھیں ۔ دل دھڑک رہا تھا اور رگیں گویا پھڑک رہی تھیں ۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا ۔

بھائی جان چپ چاپ کرسی پر بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے ۔ آصفہ پہلے تو کچھ دیر تک کرسی کے پیچھے کھڑی رہی ۔ پھر اس نے پیچھے سے اپنا مہندی والا ہاتھ بڑھا کر انکی آنکھوں کے سامنے کر دیا ۔ اور بولی "میرا ہاتھ دیکھئے بھائی جان" پتہ نہیں مہندی کی بھینی بھینی خوشبو یا اس کے شنگرفی رنگ کی وجہ سے بھائی یوں تڑپ کر اٹھے گویا انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو ۔ ان کی آنکھیں لال ہو گئیں ۔ منہ سوج گیا ۔ جانے غصے سے یا کیوں انہوں نے تڑپ کر پیچھے دیکھا ۔ جہاں آصفہ لجائی ہوئی کھڑی اپنا آپ سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی ۔

مڑنے کی وجہ سے آصفہ کا ہاتھ ان کے منہ پر جا لگا ۔ انہوں نے اک وحشت سے وہ ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اُسے چومنے لگے ۔ یہ دیکھ کر میں نے محسوس کیا گویا کسی نے زور سے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو اور میرے بدن سے یوں جان نکل رہی ہو جیسے نچوڑنے پر دُھلے ہوئے کپڑے سے پانی ۔۔۔ اُف!

..............○..............

اندھا

زینت بیگم کو صفائی کا کچھ ایسا جنون تھا کہ مکان میں ایک سرے سے دوسرے تک ایک تنکا یا بال تک ڈھونڈے سے نہ ملتا اور مکان بھی وہ جس میں دو صحن اور ایک برآمدۂ غسل خانہ اور ڈیوڑھی کے علاوہ پورے نو کمرے تھے۔ صبح اٹھتے ہی وہ نوکروں سے تمام فرش دھلواتی، فینائل چھڑکواتی دوپہر اور شام کو بھنگن کے سر پر کھڑی ہو کر سارے مکان میں جھاڑو دلواتی۔ صحن چھت اور برآمدے میں جا بجا کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے ٹین رکھے ہوئے تھے اور ہر دروازے میں جوتے صاف کرنے کا پیڈ۔ ہر روز کئی کئی مرتبہ غسل خانے کی اشیا کو قرینے سے لگایا جاتا اور باورچی خانے میں ڈبوں کو قد وار چنا جاتا اور ہفتے میں ایک بار ان ڈبوں پر نئے لیبل لگائے جاتے۔

کھڑونچیوں کو ہفتہ وار صابون سے دھویا جاتا اور برتنوں کو دن میں تین مرتبہ دھو کر پوٹاشیم پرمنگنیٹ میں ڈبو کر سکھایا جاتا۔ استعمال کرنے کے بعد چمٹے کو مخصوص کھونٹی سے لٹکا دیا جاتا۔ بالٹیاں کاسٹک سے مانجھی جاتیں اور دروازوں کی آہنی زنجیریں برش سے دھوئی جاتیں۔ بیگم دن میں اتنی مرتبہ ہاتھ دھوتی کہ دیکھنے والوں کو شبہ پڑتا کہ اسے ہاتھ دھونے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔

بیگم کے میاں موسےٰ خاں کی عمر بیگم کے والد سے بھی زیادہ تھی۔ اگرچہ دیکھنے میں پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ تھے۔ منہ پر جھریاں نام کو نہ تھیں اور چلتے تو اکڑی ہوئی چھاتی، مونچھ پر ہاتھ اور چمکتی آنکھیں۔ بات کرتے تو انکے ہم کے تم کے سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

زینت بیگم خاں صاحب کی چوتھی بیگم تھی۔ بیوی کے متعلق انہیں بڑی شکایت تھی۔ "میاں بیویوں کا اعتبار ہی کیا۔ مرنے لگتی ہیں تو دھڑا دھڑ مرتی

چلی جاتی ہیں اور جینے پر آجائیں تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے ۔ آخر عورت ذات ہے نا ۔ اس کا بھروسہ ہی کیا اگرچہ وہ یہ کہہ کر ہنس پڑتے ۔ لیکن بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا گویا نفرت کی شدت سے لرز رہے ہیں ۔ ویسے ان کا یہ گلہ جائز بھی تھا ۔ چونکہ پہلی بیوی تپ دق سے مر گئی تھی ۔ دوسری مرنے سے پہلے پورے دو سال پاگل رہی ۔ تیسری نے البتہ کافی دم دکھایا تھا اور اس دوران میں ایک زبردست عابدہ بن گئی تھی حتےٰ کہ وہ سارا سارا دن جائے نماز پر بیٹھی رہتی اور ایک دن وہیں بیٹھی ڈھیر ہوگئی تھی اور نوکر یہی سمجھتے رہے کہ سجدے میں پڑی ہیں ۔ زینت بیگم کو بھی ہسٹیریا ہو چکا تھا ۔

زینت بیگم بڑے خاندان سے تھی ۔ جس کی لڑکیاں رسمی اور روایتی طور پر حیا پاکیزگی اور وفا کی پابند تھیں ۔ شاید اسی لئے بیگم اس قدر صفائی پسند تھیں ۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے اسے صفائی کا جنون نہ تھا ۔ شاید اس وقت اسے اس کی ضرورت ہی نہ ہو ۔ بہرحال اسے غلاظت کا شدید احساس اس وقت ہوا جب اس نے دیکھا کہ میاں دن رات دیوان خانے میں نوجوان لڑکوں کی محفل لگائے راجہ اِندر بنے بیٹھے رہتے ہیں ۔ بے معنی باتیں فضول کھی کھی --- الٹے سیدھے مذاق اور لایعنی کھسر پھسر --- لیکن آہستہ آہستہ یہ کھسر پھسر اس کے لئے بامعنی ہوتی گئی ۔ حتیٰ کہ اس کا مفہوم تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا اور وہ کانپ گئی ۔

اس نے محسوس کیا کہ تمام گھر غلاظت سے اٹا پڑا ہے ۔ پھر وہ اسے صاف کرنے کی کوشش میں لگ گئی ۔ فرش کھرچے ۔ دھوئے ۔ دیواریں صاف کیں یعنی تمام گھر کو مانجھ کر رکھ دیا ۔ لیکن دیوان خانے کی کھسر پھسر جوں کی توں رہی اور اسی لئے اس کا احساسِ غلاظت روز بروز ترقی کرتا گیا ۔ اُس کے سوا اسے کچھ کام بھی نہ تھا ۔

گھر میں چار نوکر تھے ۔ رحمت ۔ دتا ۔ نواب بی بی اور برکتے ۔ باقی رہے اس کے میاں وہ تو دن رات دیوان خانے میں رہتے اور کبھی کبھار دن میں ایک آدھ دفعہ اندر آتے بھی تو جلد ہی واپس چلے جاتے ۔ بال بچہ کوئی تھا نہیں اور ہوتا بھی کیسے بیگم کو اس احساسِ غلاظت اور صفائی نے بچا رکھا تھا ۔

زینت بیگم دل کی بے حد نرم واقع ہوئی تھی ۔ اب تو رحم کا احساس اس میں اور بھی بڑھ گیا تھا ۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتی تھی کہ لوگ کس قدر مظلوم ہیں ۔ کوئی غربت کا مارا ہے تو کوئی بیماری کا ستایا اور کوئی غلاظت سے دکھی ۔ محلے والیاں بے حد غلیظ تھیں ۔ لڑکوں کو زنانے میں آنے کی اجازت نہ تھی ۔ صرف رحمت اور دتہ دو لڑکے گھر میں آجا سکتے تھے چونکہ انہیں بیگم نے چھوٹی عمر سے ہی نوکر رکھا تھا ۔

بیگم نوکروں کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ۔ ہر سال کے بعد ہر نوکر کے لئے خود آٹھ جوڑے سلواتی دونوں لڑکوں کو دیوان خانے میں جانے کی سخت ممانعت تھی ۔ البتہ جب خاں صاحب نوکری پر چلے جاتے تو وہ سب نوکروں کو لے کر دیوان خانے میں گھس جاتی ۔ اس وقت وہ اپنی ناک پر رومال رکھ لیا کرتی ۔ اور پھر سب مل کر دیوان خانے کو جھاڑتے ۔ فرش کھرچتے ۔ دیواریں صاف کرتے ۔ لیکن دو گھنٹے کی جھاڑ پونچھ کے بعد بھی وہ برا سا منہ بنا کر کہتی ۔ چلو چھوڑو اسے یہ کمرہ کبھی صاف نہیں ہو سکتا ۔ تمہارا قصور نہیں رحمت ۔

رحمت جب بیگم کے پاس آیا تھا تو وہ بچہ ہی تھا ۔ شاید ان دنوں اس کی عمر دس گیارہ سال کی ہوگی لیکن اس کی شکل بالکل بچوں کی سی تھی ۔ لیکن اب نہ جانے اسے کیا ہوا تھا ۔ ایک سال کے اندر اندر ہی اس پر جوانی مکمل طور پر چھا گئی تھی بڑے بڑے ہاتھ اور یہ چوڑی چھاتی ۔

کئی بار جب بیگم کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوتی اور رحمت آجاتا تو وہ ٹھٹھک جاتی اور کبھی کبھی تو دوپٹہ سنبھالنے کی کوشش بھی کرتی ۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا پڑتی ۔ یا جب وہ کوئی چیز اسے دیتا تو اس کا بڑا سا ہاتھ دیکھ کر خواہ مخواہ جھینپ جاتی اور پھر دیر تک دور بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہتی ۔ واقعی کتنا بڑا ہو گیا ہے ۔ پھر اس روز جب اس نے کہا تھا کہ رحمت سب نوکروں کو بلا لو تاکہ مل کر یہ آٹے کی بوری اندر رکھ دیں اور رحمت نے دونوں ہاتھوں سے بوری کو پکڑ کر یوں اٹھا لیا تھا جیسے بوری نہ ہوئی چوہا ہوا ۔ اس وقت اس کے بازو کس قدر پھول گئے تھے ۔ ہاں واقعی خاں صاحب ٹھیک کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا ہو گیا ہے

اور اسے اب گھر میں نہ رکھنا چاہیئے ۔ لیکن جب رحمت نے یہ بات سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بیگم کہنے لگی ۔ "کون نکالتا ہے تمہیں ۔ اسی گھر میں تو پلے ہو ۔ بڑے ہو گئے تو کیا ہوا ۔ دو ایک سال اور رہ لو ، پھر کہیں نوکری دلوا دیں گے تمہیں ۔"

کئی ایک بار جب بیگم اچانک باورچی خانہ میں داخل ہوتی تو ایک لمحے کے لئے اسے محسوس ہوتا کہ رحمت اور نواب بی بی دور بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں ۔ اگرچہ بولتے نہیں ۔ اسے ایک لمحے کے لئے محسوس ہوتا گویا اس کے آنے سے کوئی گونگا مگر رنگین سلسلہ منقطع ہو گیا ہو ۔

ایک روز رحمت سیڑھیوں پر سے گر پڑا ۔ بے چارے کو کئی ایک جگہ خراشیں آئیں نہ جانے کیا ہوا ۔ اس کی آنکھیں خون ہو گئیں ۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ آنکھوں کی کوئی رگ کٹ گئی ہے اور بینائی پر اثر پڑا ہے "اچھا ہو جائے گا" ڈاکٹر بولا ۔ "لیکن کچھ دیر لگے گی ۔ بہتر ہے کہ آرام کرے ۔"

"اندھا ہو گیا ہے" بیگم نے چیخ کر کہا ۔ "نہیں نہیں ۔ ان ڈاکٹروں کا کیا ہے ۔ جانے کیا بکتے رہتے ہیں ۔ دیکھو تو اچھی بھلی آنکھیں ہیں ۔ رحمت بس تم آرام کرو آرام خبردار جو کام کو ہاتھ لگایا ۔"

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا ۔

رحمت کی خراشوں کو بالکل آرام آگیا ۔ لیکن اس کی بینائی بحال نہ ہوئی اول تو وہ تمام دن لیٹا رہتا اور اگر کہیں چل کر جانا بھی پڑتا ۔ تو بے چارا راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلتا ۔ اس رات جو وہ رفع حاجت کے لئے اٹھا تو غلطی سے چھوٹے کوٹھے کی بجائے بڑی چھت کی طرف چلا آیا ۔ جہاں بیگم سوتی تھیں ۔۔۔ اس کا ہاتھ بیگم کی چارپائی سے لگا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا ۔۔۔ "نواب" اس نے مدھم آواز میں پکارا ۔ اتفاق سے عین اسی وقت بیگم حسبِ عادت نیند میں بڑبڑائی "ہوں"۔

رحمت مسکرایا اور دو مضبوط باہوں نے بڑھ کر کسی کو بھینچ لیا ۔۔۔ وہ جاگ اٹھی ۔ دو بڑے بڑے ہاتھ اور مضبوط بازو اسے تھامے ہوئے تھے ۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی ۔ مگر حلق میں آواز نہ تھی ۔ اس کا جسم جو احتجاج کی

وجہ سے پھڑکنا چاہتا تھا اس کے بس سے نکلا جا رہا تھا ۔ ڈھیلا پڑ رہا تھا ۔

آخر بصد مشکل وہ دبی آواز میں چلائی ۔ رحمت! ۔۔۔ اور پھر بے ہوش ہوگئی ۔ دورہ پڑ چکا تھا ۔

اگلے روز رحمت چارپائی پر بیٹھا رو رہا تھا "اب رو رہے ہو تم" بیگم غصے میں چلا رہی تھی ۔" شرم نہیں آتی تمہیں ۔ بدمعاش ۔"

بی بی جی ۔۔۔ مجھے معاف کر دو وہ عاجزی سے چلانے لگا "میں اندھا ہوں اندھا، مجھے کچھ سوجھائی نہیں دیتا بی بی جی ۔۔۔ مجھ سے بڑا گناہ ہوا ۔ مجھے معاف کر دو ۔ بی بی جی ۔ خدا کے لئے صرف ایک بار میں نے سمجھا وہ چارپائی میری ہے"۔۔۔

"چپ جھوٹا ۔" بیگم چیخی ، اس پر وہ اور بھی شدت سے رونے لگا ۔۔۔ آخر بیگم بولی "ہائے رحمت تو نے کیا کیا ۔ کیا کیا تو نے" یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہوگئی ۔۔۔

اس کے بعد بیگم کو بار بار دورے پڑنے شروع ہوگئے ۔ جب ہوش آتا تو اسے رحمت کی اس حرکت کا خیال آتا ۔ اس وقت دو مضبوط باہیں ، دو بڑے بڑے ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور جسم پر چاروں طرف سے دباؤ پڑ جاتا اور وہ چیخ کر بے ہوش ہو جاتی ۔

ایسے حالات میں بھلا وہ صفائی کی طرف دھیان کیسے دیتی ۔ لیکن نوکر آپ ہی آپ سارا دن جھاڑ پونچھ میں لگے رہتے ۔ لیکن آخر وہ نوکر تھے ۔ گھر میں صفائی کا وہ عالم نہ رہا ۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اس بات پر حسبِ معمول نوکروں کو ڈانٹنے اور جھڑکنے کی بجائے وہ کبھی کبھی نحیف سی آواز میں کہتی "چلو چھوڑو اب ، یہ گھر اجلا ہو ہی نہیں سکتا ایسا میلا گھر ہے یہ ۔ اُف!"

دیوان خانے میں کھسر پھسر سن کر خواہ مخواہ اس کے ہونٹوں پر تبسم آجاتا ۔ پھر اس کی نگاہ رحمت کے بڑے بڑے ہاتھوں پر جا پڑتی اور وہ حیرانی سے اس کے اعضاء دیکھتی رہتی ۔ اور آخر میں جھرجھری لے کر کہتی توبہ ہے ۔ پھر اٹھ کر کسی کام میں لگ جاتی ۔ لیکن چلتے چلاتے وہ رحمت کے پاس جا پہنچتی ۔ اس وقت اسے غصہ آجاتا ۔ ہائے رحمت تمہیں شرم نہ آئی تم نے کیا کیا ۔

رحمت ازسرِنو رونے لگتا ۔ تمام نوکر حیران تھے کہ غیر از معمول رحمت کو جھڑک کر رُلا دیتی ۔

ایک دن سونے سے پہلے اس نے رحمت کو بلایا وہ بے چارا گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور راستہ ٹٹولتا ہوا آیا "رحمت" وہ دبی آواز میں بولی "اپنا ہاتھ دو مجھے ۔" وہ بڑا سا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور چارپائی سے لگا دیا "اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لو اور سمجھ لو ۔ یہ میری چارپائی ہے ۔ میری ۔ بھول نہ جانا ۔۔۔ پھر جب وہ جانے لگا تو بولی رحمت تم نے کیا کیا ۔"

ایک روز نواب اس کے پاس دوڑتی آئی ۔ "بیگم صاحب رحمت کی نظر اچھی ہوگئی ہے ۔ بالکل ٹھیک نظر آتا ہے اسے سب کچھ ۔" یہ سن کر بیگم اٹھ بیٹھی ۔ "نظر اچھی ہوگئی ہے ؟" وہ چلائی "اچھی ہو گئی ہے ! نہیں نہیں ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا"۔ اور وہ رحمت کی طرف دوڑی ۔" دیکھو تو آنکھوں میں کس قدر لالی ہے ۔ اسے تم اچھی کہتے ہو ۔ نہیں نہیں ابھی وہ بالکل اچھا نہیں ہوا ۔"

"لیکن بی بی" بڑکتے بولی ۔"چل دفع ہو" بیگم چیخنے لگی ۔

"پر بی بی" ڈاکٹر رحمت گنگنایا۔

"اسے کیا پتہ ہے ہونہہ ڈاکٹر! خاک اچھی ہوئی ہے نظر" اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی غش کھا کر دھڑام سے گر گئی ۔ پھر دورہ پڑ گیا تھا ۔

اب بیگم کا مکان عام مکانوں جیسا ہے ۔

اور نوکروں کو صفائی کے لئے جان مارنی نہیں پڑتی ۔ البتہ بیگم ابھی تک اس بات پر مصر ہے کہ رحمت کی نظر ٹھیک نہیں ہوئی ۔ اور وہ ابھی تک اندھا ہے ۔ اگر گھر میں کوئی ایسی بات کرے جس سے یہ ظاہر ہو کہ رحمت کو سبھی کچھ سجھائی دیتا ہے تو وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے ۔ بے چارے رحمت کو بیگم کو خوش رکھنے کے لئے اس کی موجودگی میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے ۔ نوکر سمجھتے ہیں کہ وہ پاگل ہوئی جا رہی ہے ۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی لمبی بیماری کاٹ کر روبصحت ہو رہی ہے ۔

اب بھی وہ شام کو رحمت کو بلاتی ہے ۔ رحمت! اور وہ بیگم کو خوش کرنے کے لئے راستہ ٹٹولتا ہوا آتا ہے ۔ "جی!" اپنا ہاتھ دو ۔ اور پھر اس کا بڑا سا گرم

ہاتھ ہاتھ میں لے کر اسے اپنی چارپائی ٹٹولنے میں مدد دیتی ہے ۔ رحمت یہ میری چارپائی ہے دیکھ لو خبردار جو بھول کی ۔ سنا تم نے اور ۔ اور ۔ اپنا دوسرا ہاتھ دو نا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اور ۔ اور یہ میں ہوں ۔۔۔ میں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ اندھے ۔ سمجھ لو ۔

.........O.........

ماتھے کا تِل

"میں آگیا بھابی" سعید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "السلام علیکم" طبیعت تو اچھی ہے نا"۔

"اوہ! تم ہو سعید" بھابی نے آنکھ اٹھا کر کہا "کیسے آئے ہو"؟

"بس آگیا ہوں ۔ دو دن کی چھٹیاں تھیں ۔ میں نے کہا چلو بھابی سے مل آؤں بھائی جان کہاں ہیں"۔

"دفتر گئے ہوں گے ۔ کہو خالہ کا کیا حال ہے"؟

"بہت بہت پیار دیتی تھیں ۔ کہتی تھیں کسی روز ہم سب ملنے کو آئیں گے"۔

"وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی تمہیں"۔

""تکلیف! کیا بتاؤں بھابی بے حد تکلیف ہوئی مجھے" سعید دیوار کی طرف منہ پھیر کر مسکرا دیا ۔

بھابی مشین چلاتے چلاتے رک گئی ۔ ""تکلیف ہے تو وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے ۔ واپس بورڈنگ میں چلے جاؤ ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ان کے گھر میں اتنے لوگ ہیں اور اتنا سا مکان ہے پھر تمہارا آخری سال ہوا ۔ تمہیں تو علیحدہ کمرہ چاہیئے ۔"

"عجب مصیبت ہے" سعید نے منہ پکا کر کے کہا اور آہ بھری ۔

"آخر ہوا کیا ۔ میں بھی تو سنوں"۔

"نہیں تم خفا ہو گی"۔

"تم کہو بھی"۔

"وعدہ کرو کہ ناراض نہ ہوگی"۔

"ہاں ۔ اب بتاؤ"۔

وہ اٹھ بیٹھا اور بے تابانہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا "یعنی بالکل ہی بتا دوں کیوں بھابی"۔

"کچھ بتاؤ گے بھی یا نہیں ۔ کیسی عجیب عادت ہے تمہاری" بھابی چڑ کر بولی ۔

"کہہ تو رہا ہوں ۔ تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو ۔ مجھ جیسے فرمانبردار سے ناراض ہونا اچھی بات نہیں بھابی ، بات یہ ہے کہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی مل گئی ہے"۔

"کیا کہا ۔ کون مل گئی ہے"۔

"میری بیوی یعنی میرے گھر اور مجھ پر راج کرنے والی"۔

"بس تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے"۔ بھابی مسکراتے ہوئے بولی ۔

"ایمان سے بھابی مذاق نہیں "تمہاری قسم"۔

"کون ہے وہ"؟

"تسلیم"۔ سعید نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا ۔

"کون تسلیم! خالہ کی لڑکی! ۔۔۔ پر یہ بھی جانتے ہو کہ خالہ نے سن لیا تو جوتے مار مار کر گھر سے نکال دے گی"۔

"جبھی تو کہتا ہوں ۔ عجب مصیبت ہے"۔

"پر وہ تو ابھی بچہ ہے ۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا ، بالکل چھوٹی سی تھی ۔

"اب بہت بڑی ہو گئی ہے ۔ بس تمہارے جتنا قد ہو گا ۔ جب میں نیا نیا وہاں گیا تھا تو ایک عجیب واقعہ ہوا تھا ۔ پہلے تو میں عام طور پر بیٹھک میں ہی رہتا تھا البتہ چھوٹا مانی اور جاجی باہر میرے پاس آجایا کرتے تھے ۔ مانی تو دو ہی دن میں میرا دوست بن گیا ۔ بڑا تیز لڑکا ہے وہ ۔ دوسرے دن خالہ آگئیں ۔ کہنے لگیں ۔ چلو بیٹا اندر چلو تم تو بیٹھک کے ہی ہو رہے ہو ۔ تمہارا اپنا گھر ہے ۔ تم سے کیا پردہ کرے گا کوئی ۔ اس روز تو میں چار ایک منٹ اندر بیٹھا پھر باہر آگیا ۔ اگلے دن خالہ نے بلا بھیجا ۔ کچھو مانی اور جاجی بھی آ گئے ۔ خالہ

بھی بیٹھی رہیں ۔ بڑی باتیں ہوئیں اس روز ۔ پھر جب میں دیوان خانے کی طرف جا رہا تھا تو وہ میز کے پاس کھڑی بال بنا رہی تھی ۔ بالکل تمہاری طرح ذرا سی بائیں طرف کو جھکی ہوئی ۔ ایسے ہی لانبے بھورے بال تمہارے جیسے ، خدا کی قسم میں تو حیران رہ گیا ۔ میں سمجھا شاید بھابی آگئی ہے اور جیسے میری عادت ہے ۔ میں نے قریب جا کر کہا "ہم نے پہچان ہی لیا نا ۔ کیوں بھابی"؟ اس نے جو مڑ کر دیکھا تو میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔ وہ تو شکر ہے ۔ اس وقت اس کمرے میں کوئی نہ تھا ۔ ورنہ بہت بے عزتی ہوتی ۔ پر بھابی حیرانی ہے کہ اس کی شکل بالکل تمہارے جیسی ہے ۔ ایسے ہی چوڑا ماتھا ۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ یعنی بالکل ہی تمہارے جیسی ۔ بس صرف اتنا فرق ہے کہ تمہارے ماتھے پر کالا تل ہے ۔ اس کے ماتھے پر نہیں ۔ باقی ہوبہو گویا تم ہی ہو"۔

"بڑی گپیں مارنی آتی ہیں تمہیں ۔ چھوڑو اب یہ قصے اور جا کر نہا لو ۔ معلوم ہوتا ہے سفر کی کوفت سے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں رہا"۔

"اوہ بھابی ۔ بس تم میری ہر بات کو مذاق سمجھتی ہو"۔ بھابی خاموش بیٹھی مشین چلاتی رہی ۔

اب تو میری صرف ایک آرزو ہے بھابی ۔ دنیا میں صرف ایک تم ہو جس کے لئے میرے دل میں بے حد عزت ہے اور ایک وہ جس سے مجھے محبت ہے ۔ صرف اتنی آرزو ہے کہ تم ، مَیں اور وہ اکٹھے رہیں"۔

"تم اور وہ تو ہوئے نا ۔ میرا نام خواہ مخواہ"۔ بھابی مسکراتے ہوئے بولی ۔

"تم بڑی وہ ہو بھابی ۔ جو مجھے ستاتی رہتی ہو ۔ دیکھو نا تمہارے سوا میرا کون ہے ۔ اماں تو میں نے دیکھی ہی نہیں ۔ چھوٹا سا تو تھا ان دنوں ۔ بس تم ہی تم ہو اور ہے کون ۔ مجھے یاد ہے جب تم نئی نئی آئی تھیں اور مجھے گود میں بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا تھا ۔ پھر اکثر رات کو جب تم مجھ پر رضائی ڈالنے کے لئے جھکتی تھیں تو میری آنکھ کھل جایا کرتی ۔ آنکھ کھولتا تو تمہارا بڑا سا چہرہ اور چوڑا ماتھا اور اس کے درمیان میں کالا تل دکھائی دیتا ۔ وہ نقشہ اب بھی میری آنکھوں تلے پھرتا ہے گویا دل پر نقش ہوگیا ہے ۔ کیوں بھابی یاد ہیں تمہیں وہ

دن"۔

"ہاں یاد ہیں ۔ ان دنوں تم اتنے سے تھے ۔ لیکن اب تو ایک دم اتنے بڑے ہوگئے ہو"۔

"تمہارے لئے تو اتنا سا ہی ہوں نا"

"بڑے شیطان ہوگئے ہو تم"

"یہ کیا نئی بات ہے ۔ بچے ہوتے ہی شیطان ہیں ۔ کیوں بھابی ہے نا یہ بات"۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو جاؤ جاکر نہا لو ۔ دیکھو تو جب سے آئے ہو ذرا کام نہیں کرنے دیا تم نے"۔

"اچھا بھابی جیسے بھی تم کہو" سعید نے بھابی کو فوجی سلام کیا اور پھر ملحقہ کمرے میں جاکر کپڑے بدلنے لگا ۔ کپڑے بدل کر وہ وہیں سے چیخنے لگا ۔ ایک بات یاد آگئی ۔ سناؤں بھابی بڑے مزے کی بات ہے"۔

کیا ہے" بھابی نے مشین چلاتے ہوئے سرسری طور پر کہا ۔ سعید دروازے کی چوکھٹ پر آکھڑا ہوا ۔

ایک دن میری طبیعت خراب تھی ۔ اس لئے میں چادر لپیٹ کر برآمدے میں سوگیا ۔ شاید اس نے سمجھا کہ خالو پڑے ہیں ۔ شاید خالہ نے کچھ کہنے کے لئے بھیجا ہو اسے وہ آئی ، جھک کر میرے منہ سے چادر ہٹائی ۔ میری آنکھ کھل گئی ۔ اس کا بڑا سا چہرہ اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھ کر معاً میرے منہ سے نکلا "کیوں بھابی" اور مَیں اٹھ کر بیٹھ گیا اس بات پر بڑا مزہ رہا ۔ اس کا منہ لال ہوگیا اور وہ بھاگی ۔ ادھر خالہ نے سنا تو ہنس ہنس کر لوٹ ہوگئیں ۔ اندر مانی چیخنے لگا "اماں دیکھو تو باجی کو کیا ہوا ہے ۔ الماری میں منہ ڈال کر آپ ہی آپ ہنس رہی ہے ۔ ضرور میرا گیند چھپا دیا ہوگا ۔ پھپھو بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور عجیب سے انداز میں کانپتی ہوئی ہاتھ پھیلا کر گھومنے لگی "بہت بری ہوئی بھائی جان سے" خالہ ہنسی کے مارے منہ میں پلو ٹھونس رہی تھیں یعنی واقعی بڑی بری ہوئی ہم سے اس روز"۔

"اچھا اب باتیں ہی بناتے رہو گے ۔ یا نہاؤ گے بھی"۔ بھابی نے اپنے

ماتھے پر نہ کھورنے والی تیوری چڑھا کر کہا ۔

اچھا تو لو چلے جاتے ہیں ہم اور وہ غیر کے پاؤں پڑ گیا بے خودی نیاز میں گنگناتا ہوا غسل خانہ میں جا داخل ہوا ۔

بھابی کام کرتے ہوئے آپ ہی آپ کہنے لگی "میں کہتی ہوں تسلیم کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے ۔ نہ جانے میں نے کہاں سے سنا تھا"۔ اس نے بآواز بلند سعید کو آواز دی "سعید"۔

"مجھ سے کہا ہے کچھ" سعید نے غسل خانے سے شور مچایا ۔

"کہہ رہی ہوں کہ تسلیم کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے"۔

"سچ"۔ سعید نے گھبرا کر کہا ۔ "نہیں ، ناحق مجھے ستا رہی ہو بھابی"۔

"ایمان سے سچ کہتی ہوں یاد نہیں کس نے بتایا تھا مجھے ۔ ہاں تمہارے بھائی ہی کہہ رہے تھے ۔ جب وہ بمبئی سے آئے تھے ، ان دنوں خالو بمبئی میں کام کرتے تھے نا اور تمہارے بھائی انہیں کے ہاں رہتے تھے"۔

"مجھے تو معلوم نہیں مجھ سے تو انہوں نے بات نہیں کی"۔

"شاید بات بنی نہ ہو ۔ ہم نے بھی تو اڑتی اڑتی سنی تھی"۔

"میں جانتا ہوں" سعید ہنستے ہوئے کہنے لگا "تم بڑی وہ ہو بھابی"۔

"بہت گستاخ ہو گئے ہو تم ۔ آلیں تمہارے بھائی ۔ ان سے کہہ کر پٹواؤں گی"۔

"اونہہ وہ ضرور مانیں گے تمہاری بات"۔

"اُنہیں بتاؤں گی نا"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ چھوٹے میاں لاہور میں اک اپنی "وہ" بنا آئے ہیں"۔

"خدا کے لئے بھابی یہ نہ کہنا ان سے ۔ بڑی اچھی ہے بھابی میری"۔

سعید نہاتے ہوئے بھابی کی منتیں کرتا رہا ۔ لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہی ۔

نہا کر وہ سیدھا بھابی کے پاس گیا "بڑی اچھی بھابی ہے ہماری ۔ ذرا رعب چھانٹتی ہے ۔ ویسے بڑی اچھی ہے"۔

"اوں ہوں ، میں تو ضرور کہوں گی ان سے" بھابی نے منہ پٹکا کر کے کہا ۔

"نہیں ، خدا کے لئے" سعید ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔
وہ ہنس پڑی ۔ "یہ لڑکا تو اس کے دھیان میں اپنے آپ سے بھی جاتا رہا"۔
"یہی تو مصیبت ہے"۔ سعید نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔
"لیکن سعید اسے بھی کچھ خبر ہے یا صرف تم ہی مجنوں ہو رہے ہو"۔
"تمہیں کیا پتہ بھابی کہ اسے کیا ہے ۔ بس کچھ نہ پوچھو"۔ وہ اٹھ کر بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا ۔
"میں بھی تو سنوں"۔ بھابی مشین چلاتے ہوئے بولی ۔
"مثلاً کل ہی کی بات ہے"۔ اس نے بھابی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا ۔
"میرے جی میں آئی کہ کوئی شرارت کروں ۔ وہ باہر دھوپ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی ۔ جاجی اور مانی بھی پاس بیٹھے تھے ۔ کیچھو کچھ بُن رہی تھی اور خالہ اندر برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ میں نے توے کی سیاہی انگلی پر لگا لی اور اس کے پاس آ کھڑا ہوا "یہ تمہارے ماتھے پر کیا لگا ہے" میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے پونچھنے کے بہانے اس کے ماتھے کے درمیان میں انگلی سے کالا ٹیکا لگا دیا ۔ یہ دیکھ کر مانی چلّایا "باجی ہندو" کیچھو اور جاجی ہنسنے لگے ۔ باہر آ کر میں دروازے سے دیکھتا رہا ۔ خالہ نے نماز سے فارغ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور لگی مسکرانے ۔ پھر مانی کو ڈانٹ کر بولیں "کیا شور مچا رکھا ہے تم نے"۔
مانی بولا "اماں دیکھو تو باجی کے ماتھے پر"۔
"کیا ہے اس کے ماتھے پر"۔ خالہ نے منہ پکا کر کے کہا "کچھ بھی تو نہیں ۔ فضول"۔
پھر شام کو جو مَیں اندر گیا تو وہ بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی ۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں ۔ ماتھے پر وہ کالا ٹیکا جوں کا جوں لگا تھا اتنے میں مانی دوڑتا ہوا آیا "بھائی جان مجھے بھی ہندو بناؤ ۔ میں بھی ہندو بنوں گا"۔
"ہندو بناؤں"؟ میں نے بناوٹی تعجب سے کہا "وہ کیسے"؟

وہ ماتھے پر انگلی رکھ کر کہنے لگا "یہاں لگا دو۔ وہ جیسے باجی کو لگایا ہے۔"

اس نے نیچی نظروں سے گھور کر مانی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا کر یوں بیٹھ گئی کہ ٹیکا صاف دکھائی دے یعنی اس روز وہ سارا دن ویسے ہی چلتی پھرتی رہی اگرچہ سارے گھر والے اس پر ہنستے رہے۔ لیکن اس نے وہ ٹیکا نہ مٹایا۔ کیسے مٹاتی ہمارے ہاتھ کا لگا ہوا ٹیکا" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا "اب بولو بھابی مزاج کیسے ہیں"۔

"رہنے دو یہ گپتیں۔ جانتی ہوں میں تمہاری باتوں کو"۔

"اچھا لو اور سنو"۔ سعید نے بھابی کی بات اَن سنی کر کے کہا "ایک دن مانی بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا "بھائی جان باجی چوڑیاں پہن رہی ہے چوڑیاں"۔ میں نے ویسے ہی مذاق سے منہ بنا دیا۔ چوڑیاں آخ تھو"۔ میں نے کہا چوڑیاں تو گاؤں کی لڑکیاں پہنتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے میری بات سن لی ہوگی۔ کیونکہ اگلے دن مَیں نے دیکھا کہ اس کی کلائیاں بالکل خالی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا میں نے سوچا کس چاؤ سے چوڑیاں پہنی ہوں گی۔ مجھے اپنی بیہودگی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کیچھو سے مخاطب ہو کر کہا "کیچھو، تم چوڑیاں کیوں نہیں پہنتیں۔ دیکھو تو ہاتھ کیسے خالی خالی سے ہیں"۔

"کل آئی تو تھی چوڑیاں والی" وہ بولی "باجی نے پہنی بھی تھیں"۔ اس نے بہانے بہانے اپنی کلائیاں چھپا لیں۔

"پھر"؟ میں نے کیچھو سے پوچھا۔

"باجی کو پسند نہ آئیں وہ، اس لئے اتار دیں"۔

"اوہ یہ بات"۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں لا دوں چوڑیاں۔ چوڑیاں خریدنے میں تو مجھے کمال حاصل ہے۔ ایسی لا کے دوں گا کہ بیٹھی اپنی کلائیوں کو دیکھتی رہو۔ گھر میں جب بھی کسی کو منگوانی ہوتی ہیں تو مجھ سے ہی کہا کرتے ہیں۔ بس اپنے ناپ کی چوڑی دے دو، پھر دیکھنا"۔

اگلے دن جب مَیں اور مانی بیٹھک میں باتیں کر رہے تھے تو مانی چلّانے لگا "یہ دیکھو بھائی جان"۔ اس نے مجھے ایک چوڑی دکھا کر کہا۔ "یہ کس کی چوڑی

ہے"۔

"اچھا بھابی بھلا بوجھو کہ وہ کس کی چوڑی تھی"؟

"میں کیا جانوں" بھابی نے کام کرتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو بتا رہا ہوں تمہیں۔ یعنی کوئی وہ چوڑی چپکے سے وہاں رکھ گیا تھا کہ میں اس ناپ کی چوڑیاں لا دوں۔ کیوں بھابی سمجھیں۔ اب بولو"۔

"شاید وہ کیچھو کی ہو"۔ بھابی نے کہا۔

"اونہوہ" سعید نے سر ہلا دیا۔ "میں نے کیچھو کی کلائی سے ملا کر دیکھا تھا۔ اسے بہت بڑی تھی وہ۔ میں اسے ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اب بھی ہے میرے پاس۔ دکھاؤں وہ اٹھ بیٹھا اور سوٹ کیس سے ایک چوڑی نکال کر بھابی کو دکھا کر کہنے لگا "یہ دیکھو بھابی"۔

"بھابی اسے ہاتھ میں لیکر کچھ دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی توبہ کتنا جھوٹ ہے گپ مارنے میں کمال حاصل ہے تمہیں۔ یہ چوڑی تو وہ ہے جو پچھلے مہینے مَیں نے تمہیں دی تھی۔ کہ اس ناپ کی چوڑیاں لے آنا۔ دیکھو تو بالکل وہی ہے تسلیم کے تو بہت ڈھیلی ہوگی۔ میرے اور اس کے ہاتھ میں بڑا فرق ہے"۔

"کب دی تھی مجھے تم نے"۔ وہ حیرانی سے کہنے لگا۔

"یاد نہیں جب تم دس دن کی چھٹیوں میں آئے تھے۔ پچھلے مہینے۔ ہاں۔ بلکہ تمہارے بھائی نے آپ کہا تھا کہ لاہور سے چوڑیاں منگوا لو۔ یاد آیا"۔

"اوہ" سعید نے دانتوں تلے زبان لے لی لیکن بھابی پھر یہ میری میز پر کیسے پہنچ گئی۔

"کسی بچے نے صندوق سے نکال کر وہاں رکھ دی ہوگی"۔

"لاحول ولاقوۃ میں بھی کیا احمق ہوں"۔

"آج پتہ چلا ہے تمہیں" بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور بھابی مزے کی بات یہ ہے کہ میں اسے چھپا چھپا کر رکھتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے اور"۔

"بس رہنے دو یہ گپتیں"۔

"خدا کی قسم سچ کہتا ہوں ایک دن کی بات ہے کہ"۔
"نہ میں نہیں سنتی"۔ بھابی نے مسکرا کر کانوں میں انگلیاں دے لیں ۔
"خدا کی قسم آج تو بری ہوئی ہم سے"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھا اور ملحقہ کمرے میں جا کر سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا ۔ کاغذات میں سے اس نے دو تصویریں نکالیں اور بھابی کے پاس آکر کہنے لگا "یہ دیکھو بھابی ، میرے پاس اس کی تصویر بھی ہے"۔
"سچ"۔ بھابی بولی "دیکھوں تو"۔ "اوہ بہت بڑی ہوگئی ہے"۔ بھابی نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا "تم تو کہتے تھے ۔۔۔ لیکن ۔ دیکھو تو اس کی اپنی ہی شکل ہے"۔
"لیکن ماتھا تو بالکل تمہارا ہے"۔
"لیکن ماتھے پر یہ کالا تل کیسا ہے"۔ بھابی غور سے تصویر دیکھتے ہوئے کہنے لگی ۔
"نہیں اس کے ماتھے پر تل تو نہیں"۔ سعید بولا ۔
"تو یہ کالا سا کیا ہے"؟ بھابی نے اسے تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا ۔
"پتہ نہیں کیسے لگ گیا ہے ۔ مجھے تو معلوم نہیں شاید کسی نے لگا دیا ہو"۔
"آخر لگانے ہی سے لگا ہوگا نا ۔ اپنے آپ تو نہیں آلگا اور تم تو اسے چھپا چھپا کر رکھتے ہوگے ۔ پھر اور کوئی کیسے لگا سکتا ہے"۔
"تمہاری قسم بھابی بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں اسے ۔ روز سرہانے رکھ کر سوتا ہوں ۔ پھر صبح سویرے ہی اٹھ کر دیکھتا ہوں"۔
"اچھا تو اب چھوڑو ان باتوں کو اور اس کے ماتھے سے یہ نقطہ کھرچ دو کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا"۔
"ابھی کھرچ دیتا ہوں بھابی"۔
"نہ ۔ ابھی میرے سامنے ۔ ورنہ تم بھول جاؤ گے ۔ اور اگر تم بھول گئے تو میں ناراض ہو جاؤں گی"۔
"اچھی بھابی تم اتنی سی بات پر خفا ہو جاتی ہو"۔

بھابی سعید کے ہاتھ میں ایک اور تصویر دیکھ کر بولی "یہ دوسری کس کی تصویر ہے"۔

"یہ ہے ہماری بھابی کی تصویر"۔

"کونسی"؟

"وہی جو پچھلے سال بھائی جان نے کھنچوائی تھی"۔

"لیکن یہ تمہارے پاس کیسے پہنچی ۔ اور ۔۔۔ میں بھی سوچتی تھی کہ صندوق میں تو میں نے تین کاپیاں رکھی تھیں ۔ لیکن اب وہاں صرف دو پڑی ہیں یعنی تم نے صندوق میں سے چرالی ہوگی"۔

"کیسے نہ چراتا ۔ اس کے بغیر میری زندگی مکمل نہیں ہوتی نا ۔ بس ایک تم ہو بھابی جس کے لئے میرے دل میں بے حد عزت ہے ۔ بس تم ، میں اور یہ" ۔۔۔ اس نے تسلیم کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ تمہاری بہو رانی ، تینوں اکٹھے ہوں تو میرے لئے جنت بن جائے"۔

"اچھا چھوڑو ان گپوں کو اور تسلیم کے ماتھے کا تل کھرچ دو ۔ سنا تم نے"۔

"او کے بھابی"۔ اس نے ایک فوجی سلام کرتے ہوئے کہا اور ملحقہ کمرے میں جا کر چاقو ڈھونڈنے لگا ۔

شام کو جب سعید باہر گھومنے گیا ہوا تھا تو اس کے بھائی حمید دفتر سے واپس آئے ۔

میاں بیوی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے ۔ باتوں ہی باتوں میں تبسم نے سعید کی بات چھیڑ دی کہنے لگی "اللہ رکھے سعید اب جوان ہوگیا ہے ۔ آپ کو اس کی بھی فکر ہے ۔ اب بھی اگر آپ اس کی شادی کی فکر نہ کریں گے تو کریں گے کب"؟

"ابھی اسے بی اے تو کر لینے دو" حمید نے لاپروائی سے کہا ۔

"آخر آپ کی نگاہ میں کوئی لڑکی ہے بھی یا نہیں"۔

"تم پگلی ہو بسمی" حمید مسکرا کر کہنے لگا ۔ آج کل وہ زمانہ نہیں رہا کہ جسے بھی چاہے لڑکے کے سر منڈھ دیا"۔

تبسم ان کی بات اَن سنی کر کے بولی "خالہ کی لڑکی تسلیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔

"حد ہے ۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو ۔ کوئی میرا بیاہ کرنا ہے تمہیں ۔ پوچھو لڑکے سے ۔ ہم تو صرف یہی چاہتے ہیں کہ کوئی باعزت گھرانا ہو"۔

"جبھی تو کہہ رہی ہوں ۔ خالہ کا گھر تو جانتے ہی ہیں آپ ۔ اور لڑکا بھی راضی ہے بلکہ باتوں ہی باتوں میں اس نے آپ مجھے کہا ہے"۔

"بس تو پھر مجھ سے پوچھنے کا مطلب ۔ لیکن ہاں ، تمہاری خالہ کا کیا خیال ہے اس بارے میں"۔

"جبھی تو کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ اجازت دیں تو ایک دن کے لئے لاہور چلی جاؤں اور خالہ سے بات کروں ۔ ویسے بھی مجھے ان سے ملے چھ سال ہو گئے ہیں ۔ میری شادی پر آئے تھے وہ ۔ اس کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی"۔

جب سعید نے سنا کہ بھابی اس کے ساتھ ایک دن کے لئے لاہور جا رہی ہیں تو وہ خوشی سے ناچنے لگا ۔ "اوہ بھابی میری تو عید ہو جائے گی ۔ ہم تینوں ایک ہی جگہ ہوں گے تم ، میں اور وہ"۔

خالہ اور تبسم بڑے تپاک سے ملیں ۔ مانی تو تبسم کے گلے کا ہار ہو گیا ۔ کیچھو بھی دن بھر آپا آپا کرتی پھری اور تسلیم بھی آنکھوں آنکھوں میں مسکراتی رہی چونکہ سعید بھی پاس ہی بیٹھا تھا ۔

رات کو جب خالہ اور تبسم اکیلی بیٹھی تھیں ، تو تبسم نے سعید کی بات چھیڑ دی ۔ کہنے لگی "خالہ جی تسلیم کے متعلق بھی سوچا ہے آپ نے ۔ اللہ رکھے اب تو جوان ہو گئی ہے"۔

"میں نے کئی بار تمہارے خالو سے کہا ہے ۔ پر تم جانتی ہو بیٹی ۔ ان کی اپنی ہی طبیعت ہے ۔ کہتے ہیں لڑکی سیانی ہو جائے تو دیکھا جائے گا ۔ ان کا خیال ہے کہ لڑکی کی مرضی پوچھے بغیر کام نہیں کرنا چاہئے ۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی نہیں لگتی ۔ تم ہی بتاؤ بیٹی بھلا ماں باپ لڑکی سے ایسی بات پوچھتے ہوئے اچھے لگتے ہیں کیا ۔ توبہ ہمارے زمانے میں تو بڑا عجیب سمجھا جاتا تھا ۔ ہم ہوئے نا پرانے زمانے کے لیکن وہ تو میری بات سنتے ہی نہیں"۔

"اس بارے میں ایک بات کہوں خالہ اگر آپ برا نہ مانیں"
خالہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی "اے لو میں کیوں برا ماننے لگی ۔ تم سے بڑھ کر مجھے کون عزیز ہوگا"۔
تبسم جھینپ کر بولی "میرا مطلب ہے سعید ماشاءاللہ جوان ہے اس سال بی اے کر لے گا ۔ بڑا اچھا لڑکا ہے ۔ اگر ـ ـ ـ آپ کی کیا رائے ہے"۔
"لو بیٹی وہ تو اپنا ہی لڑکا ہوا ۔ مجھے تو اس بات میں بڑی خوشی ہوگی ۔ میں آج تمہارے خالو سے بات کروں گی ۔ میرا خیال ہے انہیں اس بات پر کیوں اعتراض ہونے لگا ؟ اپنی لڑکی اپنے گھر میں رہے تو اچھا ہوتا ہے ـ ـ ـ"
اگلے دن خالہ ہنستے ہوئے کہنے لگیں ۔" میں نے کہا نا تھا کہ انہیں بالکل اعتراض نہ ہوگا ۔ کہنے لگے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ۔ بشرطیکہ تسلیم ——— برا نہ مانتا بیٹی ۔ آج کا رواج جو ہوا ۔ اب مصیبت یہ ہے کہ تسلیم سے میں تو بات کر نہیں سکتی ۔ مجھ سے تو نہ ہو سکے گا"۔
"میں خود پوچھ لوں گی خالہ جی ، آپ بے فکر رہیں ۔" تبسم نے ہنستے ہوئے کہا ۔
دوپہر کے وقت بہانے بہانے تبسم ، تسلیم کو بیٹھک میں لے گئی ۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ کیسے بات شروع کرے ۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے ۔ چند ایک منٹ تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی ۔ پھر اس کی نگاہ سعید کے بستر پر جا پڑی ۔ بستر لگا ہوا تھا اور سرہانے کے نیچے سے تصویر کا ایک کونا دکھائی دے رہا تھا ۔ معاً اسے وہ بات یاد آ گئی!"ایمان سے بھابی میں اس کی تصویر بڑی احتیاط سے رکھتا ہوں ۔ روز سرہانے رکھ کر سوتا ہوں اور صبح سویرے اٹھ کر دیکھتا ہوں"۔
——— وہ مسکرا پڑی اور کہنے لگی ۔ "تسلیم ، میرا ایک کام کرو گی ۔ بڑی مشکل آن پڑی ہے ۔ تمہاری کوئی سہیلی ہے ، جانے کیا نام ہے اس کا ۔ سعید کو اس سے بڑی محبت ہے ۔ بے حد"۔ اس نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا "ہمارا ارادہ ہے کہ اب سعید کی شادی کر دیں ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کے ماں باپ سے بات کرنے سے پہلے لڑکی کی مرضی پوچھ لیں ۔ اگر اسے منظور

ہو تو پیغام بھیجیں۔ کیوں تسلیم ہے نا ٹھیک"؟

تسلیم کا منہ زرد پڑ گیا۔

تبسم مسکرا کر بولی "تم اگر اس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھ لو تو میرے دل سے یہ فکر جاتا رہے"۔

"مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہے آپا"۔ تسلیم نے بصد مشکل کہا۔

"میں بتاتی ہوں تمہیں" تبسم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھو نا، سعید کو اس لڑکی سے اتنا پیار ہے کہ روز اس کی تصویر سرہانے رکھ کر سوتا ہے۔ اور صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے اسے دیکھتا ہے، یہ دیکھو، اب بھی تکئے کے نیچے پڑی ہے۔ آج شاید وہ اسے اٹھانا بھول گیا ہے۔ یہ دیکھو" تبسم نے تکئے کے نیچے سے تصویر نکال کر تسلیم کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

تبسم کی نگاہ تصویر پر پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ رنگ زرد پڑ گیا اس کے ہاتھ میں اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ ماتھے کا تل چاقو سے کھرچا ہوا تھا۔

تسلیم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مجھ سے مذاق کرتی ہو آپا ـــ مذاق" ہنستے ہنستے اس کی ہچکی نکل گئی۔ اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ عین اس وقت سعید داخل ہوا۔ جاجی جو پتہ نہیں کب سے دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا، سعید کو دیکھ کر چلانے لگا "دیکھو بھائی جان باجی کو کیا ہو گیا ہے۔ منہ سے ہنستی ہے اور آنکھوں سے رو رہی ہے"۔

..............○..............

مورا

جب وہ کسی محلے دار مٹیار کو کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہوں اور وہ دفعتاً جھینپ کر آنکھیں جھکا لے جیسا کہ مٹیاروں کی عادت ہے تو شائد آپ کو یہ شبہ ہو کہ مولوی صاحب کی آنکھ میں سے چنگاری اڑی ہے ۔ یا جب وہ کسی نوجوان لڑکی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر رہے ہوں تو اس کانپتے ہوئے خمدار ہاتھ کو دیکھ کر یہ گمان ہو کہ یہودی ہاتھ سونے کی ڈلی سے کھیل رہا ہے ۔ یا شاید اس وقت اس ہاتھ میں کمان سا جھکاؤ دیکھ کر تعجب ہو کہ آخر ہموار جگہ پر پھیرنے کیلئے ہاتھ میں کمان سے خم کی کیا ضرورت تھی ۔

بہرحال یہ تو اک مسلمہ امر ہے کہ کسی پردہ دار عورت کے قریب پہنچ کر جب وہ کھنکارہیں گے تو آپ کو گمان غالب ہو گا کہ اس کھنکھار سے اس نیک بخت کو چھپنے کی بجائے چونک اور مڑ کر دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے ۔ آپ کے ایسے شبہات آپ کے اپنے روحانی فقدان کے شاہد ہیں ۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شخصیت ایسی ویسی باتوں سے کہیں بلند تر ہے اور ان کی گہری روحانی زندگی کو سمجھنا ہمارے لئے ممکن نہیں ۔

اونہوہ ۔ مولوی صاحب کو ایسی باتوں میں چنداں دلچسپی نہیں ۔ جبھی تو محلے والیاں انکی اس قدر معتقد ہیں اور محلے والے ان کی بزرگی پر اس قدر نازاں۔"

اعظم کو مجھ سے اتفاق نہیں لیکن ۔

اعظم کی بات چھوڑیئے ۔ مولوی صاحب کی آنکھیں دیکھ کر کبھی کبھار مجھے خود شبہ ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر شوخی ان کے چہرے سے نکل کر آنکھ میں جا چھپی ہو ۔ یا جب وہ کسی ایسی ویسی بات کو دیکھ کر "لاحول ولاقوۃ" چلا اٹھتے ہیں تو اس وقت الفاظ کے سوا کوئی بات ان کے انداز سے یہ ظاہر نہیں کرتی کہ وہ لاحول بھیج رہے ہیں ۔ اس روز جب مولوی صاحب نے خان صاحب کی بیوی کے

منہ پر پاؤڈر، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں کاجل دیکھ کر لاحول پڑھا تھا تو اعظم چپکے سے بولا ۔ بھئی واہ کیسا واضح "سبحان اللہ" ہے اور ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اک ساعت کے لئے مجھے بھی یہی گمان ہوا تھا ۔

جب مولوی صاحب دھول پورہ سے نقل مکان کر کے نور محلہ میں آبسے تو حسبِ عادت اعظم بولا "اونہہ ۔ اس لئے نہیں کہ مولوی صاحب کا دستِ مبارک دھول پورہ کے سَروں سے اس قدر مانوس ہو چکا ہے کہ اس مشغلے میں دلچسپی نہیں رہی یا پورہ کی مٹیاروں نے جھینپ کر آنکھیں جھکا لینے کی دلچسپ عادت چھوڑ دی ہے بلکہ اس لئے کہ اس ہاتھ اور آنکھ کو نئے سَروں اور نئے چہروں کی تلاش ہے ۔

اعظم کی یہ خوش خیالیاں محض نمائشی حیثیت رکھتی ہیں ۔ درحقیقت نقل مکانی کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب کو نور محلہ کی مسجد سے عشق تھا عشق ۔ وہ ٹائلوں والا فراخ صحن ، چھوٹا سا خوشنما تالاب اور جابجا خوبصورت پودے ۔ جب کبھی وہ جمعہ کی نماز کیلئے وہاں جاتے تو دیر تک بیٹھے کچھ پڑھتے رہتے حالانکہ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ان کے دیر سے آنے پر ناک منہ چڑھاتا تھا لیکن مولوی صاحب نے کبھی اس بات کی پروا نہ کی تھی چونکہ وہ اپنی برانچ کے ہیڈ اسسٹنٹ تھے اور ان کا کام ہمیشہ قابلِ تحسین قرار دیا گیا تھا ۔ انہیں اس بات کی کیا پروا تھی ۔ اس کے علاوہ وہ نیا مکان دفتر کے قریب تر تھا ۔

نور محلہ دفتر کے پچھواڑے میں تھا اور برآمدے سے ہمارے نئے مکان کی چھت صاف دکھائی دیتی تھی ۔ لیکن مصیبت یہ تھی اس طرف سے نور محلہ میں جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ۔ اس لئے آدم آباد سے گھوم کر جانا پڑتا ۔ اگرچہ آدم آباد سے گھوم کر نور محلہ میں پہنچنے میں مقابلتاً اتنی مسافت نہ پڑتی ۔ لیکن جب آپ کو اپنا مکان سامنے کھڑا دکھائی دے لیکن وہاں پہنچنے کے لئے آدھ میل کا چکر کاٹنا پڑے تو وہ آدھ میل دو میل سے بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے گویا آپ کو دھوکا دیا گیا ہو ۔

"لاحول ولاقوۃ" مولوی صاحب چلائے ۔ کیا اس مکان تک پہنچنے کے لئے

آدم آباد کا چکر کاٹنا پڑے گا ۔

"جی نہیں" فقیر چند منہ پکا کر کے بولا "یہ مورے کا "شارٹ کٹ" جو ہے سامنے ۔"

"جی ہاں" رام لال ڈسپیچر نے قلم کان پر اٹکا کر کہا "پکا مورا ہے ۔ ساری دنیا آتی جاتی ہے ۔"

مولوی صاحب کے جانے کے بعد حمید دبی آواز میں گنگنایا "ارے مورے میں داڑھی سمیت ۔"

"تو کیا اتار کر سیف میں رکھ جائیں ۔" فقیر چند بولا ۔

"کیا مضائقہ ہے ؟"

"لیکن آڈیٹرز ۔۔۔ کیوں اعظم ؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔ بشرطیکہ گورنمنٹ پر زائد اخراجات نہ پڑیں ۔" اعظم لکھتے لکھتے دفتری انداز میں بولا ۔

دفتر سے فارغ ہو کر ہم نئے مکان کی طرف چل پڑے لیکن جب مورے پر پہنچے تو مولوی صاحب جلال میں بولے "لاحول ولاقوۃ" ان کا منہ نفرت سے لال ہوگیا ۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مورے کو گھورتے رہے ۔ پھر بولے ۔

"شارٹ کٹ ۔ استغفر اللہ" اور انہوں نے منہ پھیر لیا ۔

سامنے چار ایک فٹ چوڑا اور تقریباً اتنا ہی اونچا مورا منہ پھاڑے کھڑا تھا جس میں ایک چھوٹی سی گندی نالی بہہ رہی تھی ۔ "شارٹ کٹ" مولوی صاحب پھر چلائے ۔ خدائی قسم اگر ہمیں ساری عمر چلنا پڑے تو بھی ہم ایسا شارٹ کٹ نہ کریں ۔ یہ تو سراسر غلاظت اور تعفن ہے ۔ لاحول ولاقوۃ" ۔

اگر کسی مولوی کی طبیعت ایک بار حقیقی طور پر لاحول سے پراگندہ ہو جائے تو سارا سارا دن اس کی کھنکھار اور آخ تھو سے محلہ گونجتا رہتا ہے ۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ ہمارا اپنا گھر بذاتِ خود مورے سے کم نہ تھا ۔ اگرچہ دیکھنے میں پرانے مکان سے کہیں صاف ستھرا تھا ۔

شام کو وہ آئی اور میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ اس لئے نہیں کہ اس کا چوڑا چکلا چہرہ دمک رہا تھا اور چالیس سال کے واضح نشانات کے باوجود چہرے کی

"میک اپ" اس قدر عریاں تھی اور ہونٹ یوں بنے ہوئے تھے گویا کسی کو چومنے کی ترغیب دے رہے ہوں ۔ بلکہ اس لئے کہ اسے دیکھ کر دفعتاً میں نے محسوس کیا گویا میں ننگا تھا اور وہاں ہم دونوں کے سوائے اور کوئی نہ تھا میں یہ بھول گیا کہ مولوی صاحب وہیں تھے اور وہ مولوی صاحب سے کچھ کہہ رہی تھی ۔ پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ وہ مولوی صاحب کو ویسی ہی نگاہ سے دیکھ رہی تھی معاً میرا جوش اور حیرانی غصہ میں بدل گئے ۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ سے ایسی گستاخی سے پیش آنا ۔ اتنی جرأت اور بے باکی ۔ میں اٹھ کر باہر نکل گیا مولوی صاحب کہہ رہے تھے "نہیں بی بی ہم نے انتظام کر لیا ہے"۔

جب وہ چلی گئی تو میں نے ان سے پوچھا ۔ "کون تھی یہ" اور ان کے جواب پر حیرانی سے میرے منہ سے نکل گیا "تنور والی؟"

"ہاں میاں یہ سامنے اس کا تنور ہے نا ۔"

"اوہ ۔۔۔ میں سمجھا شاید بازار کی ہے ۔"

"ہاں وہیں کی ہے واحد میاں ۔ پر وہاں بیٹھتی نہیں ۔۔۔ تم نہیں جانتے کیا ؟"

"سارا شہر جانتا ہے ییگاں کو ۔"

"ییگاں" معاً مجھے یاد آگیا اچھا تو یہی وہ ییگاں ہے ۔ یعنی یہ ییگاں تھی ۔ جب کبھی دفتر میں کوئی ضرورت سے زیادہ جوش دکھاتا تو کوئی نہ کوئی بولتا "ییگاں سے ملا دو ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ سنا تھا کہ جو اک بار ییگاں کے ہاتھ چڑھ جائے بس پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا ۔

"کس لئے آئی تھی۔" میں نے مولوی صاحب سے پوچھا ۔

کہتی تھی ہمارے کھانے کا بندوبست تنور پر ہی رہے گا ۔ لیکن ہم نے جواب دے دیا ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ شہر سے ہی کھایا کریں گے ۔ بہانے بہانے سیر بھی ہو جایا کرے گی ۔ کیوں واحد میاں؟"

"شہر سے اتنی دور۔"

"ہاں ہاں ۔ کیا حرج ہے ۔"

"لیکن ۔۔۔"

"واحد میاں یہ عورت اچھی نہیں ۔ ہمیں اس کے ہاتھ سے کھانا پسند نہیں بس تم یہ سمجھ لو کہ یہ شہر کا مورا ہے مورا ۔ سارے شہر کی غلاظت یہیں اکٹھی ہوتی ہے ۔ "لاحول ولاقوۃ" کہہ کر انہوں نے ازسرِ نو کھنکھارنا اور تھوکنا شروع کر دیا ۔

اعظم آیا تو بابر تنور کے پاس ہی کھڑا ہو کر چلانے لگا ۔ اب تو مزے ہو گئے نا یار ، جب چاہو پکی پکائی ملے ۔ پھر وہ بیگاں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بولا "یہ تنور جو ہے ۔ کیا تنور ہے ۔ سارے شہر کی روٹیاں لگ سکتی ہیں اس میں ، کیوں بیگاں" وہ مسکرایا ۔ بیگاں جھکی جھکی آنکھوں سے کام میں لگی رہی ۔ لیکن وہ مسکرا رہی تھی پھر وہ مجھے آتا دیکھ کر بولی "روٹی کھا لیجئے بابو جی ۔" میں نے اعظم کی طرف دیکھا ۔ چونکہ کھانے کا وقت تو تھا ہی اور مولوی صاحب مسجد سے واپس نہ لوٹے تھے ۔ "اونہوہ" بیگاں نے روٹی لگاتے ہوئے کہا "یہ تو کلچے کھاتے ہیں کلچے ۔" "اونہوہ" اعظم کھسیانا ہو کر بولا "ہم تو توے کی کھاتے ہیں تنور کی نہیں ۔"

"ایک بار کھاؤ تو معلوم ہو ۔" بیگاں نے مسکرا کر کہا اور پھر جب ہم وہاں سے چل پڑے تو کسی کو آواز دے کر بولی "شیرا یہ لو روٹی ۔ آجکل کے بابو تو پرہیزی پھلکیاں ہی کھانا جانتے ہیں ۔ یہ تنوری روٹی تو ہوئی شیروں کا کھاجا ۔"

میں نے کہا "اعظم بہت جھینپتے ہو تم بیگاں سے ۔"

"اونہوہ جھینپتا نہیں اس نے جواب دیا ویسے ہی گھن آتی ہے مجھے ۔ کم بخت بالکل ہی ننگی ہے ۔"

گھن تو مجھے بھی آتی تھی مگر عجیب سی گھن تھی ۔ تنور کے پاس سے گذرتا تو منہ موڑ کر مسجد کی طرف کر لیتا گویا مسجد کی محرابیں اچنبھے کی چیز ہوں ۔ بیگاں کی آواز سن کر دل ہی دل میں کچھ گنگنانے لگتا ۔ شاید اس لئے کہ اپنے گیت سے فرصت نہ ملے ۔ لیکن اس روز ظالم نے مجھے بلا ہی لیا ۔ کہنے لگی ۔ بابو جی "مرغی پکائی ہے آج ذرا چکھ کر تو دیکھئے ۔ بھیج دوں ۔" میں نے مڑ کر دیکھا تو سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی ۔ گویا موم کا بنا ہوا بت تھا ۔ جس میں فنکار نے بیداری کی پہلی کرن دکھائی تھی ۔ معصومیت کے تاروں پر احساسِ بلوغت کی وہ

ہلکی سی چھیڑ ۔ حیران سی آنکھوں میں شرم و حیا کی مدھم شفق ۔ سادہ انگلیوں میں بے تابی کی پہلی جنبش ۔ میں حیران کھڑا دیکھ رہا تھا "میری بیٹی آشاں ہے" ییگاں فاتحانہ انداز میں بولی ۔ "آج ہی گاؤں سے آئی ہے۔" "آشاں" میرے ہونٹوں نے دہرایا اور دل میں ساز سا بجنے لگا ۔

حمید نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور مدھم آواز میں بولا "اب تو تنور پر روٹی کھانا لازم ہوگیا ۔"

"بشرطیکہ تنور پر بیٹھ کر کھائی جائے ۔" اعظم فائلوں کے پلندے سے سر نکال کر بولا ۔

"میرے یار" رام لال ڈسپیچر نے قلم کان پر اٹکا کر کہا "اب تو ییگاں بوڑھی ہوگئی ۔"

"کیوں" حمید نے ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے پر رکھ کر کہا ۔

"حمید کو بہت دکھ ہے اس بات پر" فقیر چند ہنسا ۔

رام لال نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا "جو اپنے جال تلے مانگے کا دانہ رکھے سمجھ لو اس نے ہار مان لی ۔"

"دانے کو چھوڑو ۔" فقیر چند غرایا "جال تو ابھی جال ہی ہے نا۔"

"پر دوست دانہ غضب کا ہے ۔" ڈسپیچر نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا اور نام ۔ کیا نام ہے آشاں منشی جی چھت کی طرف دیکھ کر گنگنائے "لاحول ولاقوۃ" مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور ہم سب خاموش ہوگئے ۔

آشاں کے آنے پر نور محلہ کی اقتصادی زندگی میں انقلاب آگیا ۔

دفعتاً لوگوں نے محسوس کیا کہ روزانہ دودھ پینے کی بجائے گھر کے گھی کا استعمال صحت کے لئے کہیں بہتر ہے اور جلدی انہیں معلوم ہوگیا کہ گھی کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تنوری پراٹھا بنا لیا جائے یا تنوری روٹی کی چوری ۔ اس انکشاف کے بعد پھتہ دودھ والے کی کڑاہی میں دودھ کی سطح اترنا شروع ہوئی حتےٰ کہ نچلے کیل تک ظاہر ہوگئے ۔ ادھر تنور میں رکھے ہوئے گھی کے ڈبوں کی قطار لمبی ہوتی گئی اور آخر ایک اور قطار لگانے کے لئے لکڑی کا ایک اور تختہ دیوار سے لگایا گیا ۔ پھر تنور کے دائیں کونے میں گھی کا ایک بڑا ٹین آ کھڑا

ہوا جس میں خالص گاؤں کا گھی تھا اور گاؤں بھی وہ جہاں آشاں پل کر جوان ہوئی تھی ۔ تنور میں آٹے کے مٹکے چار سے چھ اور چھ سے آٹھ ہو گئے ۔ حتٰی کہ آٹا گوندھنے کے لئے نوکرانی رکھنا پڑی ۔ اور تنور دن میں دو وقت کی بجائے تین بار گرم ہونے لگا ۔

محلے کے حکیم صاحب نے نیا بورڈ لکھوا کر دوکان پر ٹنگوایا جس پر جلی حروف میں "ماہرِ امراضِ پوشیدہ" لکھا ہوا تھا ۔ کئی ایک دن تو محلے کے لوگ اسے کنکھیوں سے دیکھتے رہے ۔ پھر دفعتاً لوگوں پر یہ انکشاف ہوا کہ حکیم صاحب کا تمباکو لاجواب ہے اور وہ خود خلیق اور ہمدرد ہیں اور ان کے ہاتھ میں شفا ہے ۔ کبھی کبھار اگر بیگاں اُدھر سے گذرتی تو زیرِلب مسکراتی اور حکیم صاحب آہستہ سے کہتے "اچھی تو ہو بیگاں" اور وہ "آپ کی دعا سے" کہہ کر آگے بڑھ جاتی ۔ پھر دیر تک حکیم صاحب اُدھر دیکھتے رہتے ۔ اس وقت ان کی آنکھ جذبۂ شکرگذاری سے چمکتی ۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے پھتہ دودھ والے پر انکشاف ہوا کہ اس کی دوکان بے حد میلی تھی اور چونکہ مسجد سے اس قدر دور تھی ، اسی لئے اس کا سودا اللہ تعالٰی کی برکت سے محروم تھا ۔ اس نے اسی روز وہ کوٹھڑی کرائے پر لے لی جو مسجد کی بغل میں تنور کے عین مقابل تھی ۔ اور جس میں عیدو نے بھوسہ بھر رکھا تھا ۔ اگرچہ سفیدی کرانے ، تختہ رکھنے پر اس نے جی کھول کر خرچ کیا لیکن پھر بھی اس کی شکل نہ نکلی خیر مطلب تو یہی تھا تاکہ مسجد کے قریب ہو ۔ سو اللہ نے پورا کیا اور اس کی کڑاہی ازسرِنو چھلکی ۔ اس کے علاوہ تنور میں روٹی کھانے والوں نے وہاں سے لسی اور دہی منگوانا شروع کر دیا اور محلے کی وہ گلی جہاں تنور اور مسجد تھے محلے کا بازار بن گئی اور چھوٹے چھوٹے بچوں نے گلیوں کے شارٹ کٹ چھوڑ کر بازار سے گھوم کر جانا شروع کر دیا اور نوجوانوں نے تنور کے سامنے سے گذرتے ہوئے فلمی گیت گنگنانا سیکھ لیا "چھوٹی عمر یارے ۔"

تنور سے گزرتے ہوئے دوکان پر جمگھٹا دیکھ کر اور کنکھیوں سے حکیم صاحب کا نیا بورڈ پڑھ کر مولوی صاحب لاحول پڑھتے ۔ بار بار پڑھتے یا جب وہ گھر پر مصلے پر بیٹھے ہوتے اور کوئی باہر "چھوٹی عمر یارے" گنگناتا ہوا گذر جاتا ۔

تو ان کے منہ سے استغفر اللہ نکل جاتا ۔ یہ سن کر اعظم چپکے سے میرے کان میں کہتا بہت مشکل میں جان آئی ہے ان کی ۔ شیطان سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا ہے ۔

ابتدا میں انہیں آشاں کی حالت پر ترس آتا تھا ۔ چونکہ وہ آپ ہی آپ کہا کرتے "کس کیچڑ میں آپھنسی ہے ۔بیچاری" یا نماز سے فارغ ہو کر مصلے پر بیٹھے بیٹھے تنور کی طرف منہ موڑ کر پھونکیں مارتے رہتے اور یا بیٹھے بٹھائے بول اٹھتے ۔ "میاں کیسی معصوم بچی ہے ۔ اللہ عمر دراز کرے ۔ کیوں واحد میاں ۔" نہ جانے اس وقت میں کیوں چپ رہتا ۔ پھر وہ آپ ہی بولتے "واحد میاں سو گئے ۔ بہت متوالے ہو نیند کے سبحان اللہ! سبحان اللہ" ۔

ایک دن انہوں نے بیگاں کو بلایا بھی تھا ۔ کہنے لگے "بی بی! بچی کو قرآن کیوں نہیں پڑھاتی ہو ۔" بیگاں یوں مسکرائی کہ چہرے کی سلوٹیں سمٹ کر دی بن گئیں ، بولی بیچاری کو کام سے بھی فرصت ملے یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں مولوی جی ۔"

"تم اسے تنور پر نہ بٹھایا کرو بی بی ۔ یہ بات اچھی نہیں ۔" مولوی صاحب نے کہا ۔

"تنور پر نہ بٹھاؤں تو کیا تخت پر بٹھاؤں اسے ۔" بیگاں نے جواب دیا "ہر کوئی اپنے کام پر ہی اچھا لگتا ہے جی ۔"

اگلے روز صبح سویرے مولوی صاحب نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کے بعد کہا "واحد میاں! اس کھڑکی پر اک چق پڑ جائے ۔ ہم سے یہ غلاظت کا مورا دیکھا نہ جائے گا ۔ تم سمجھے اس نکتے کو واحد میاں ۔"

ایک روز مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں نے ان سے پوچھا "آپ کیا آشاں کے متعلق پریشان ہیں ؟"

"نہیں نہیں" وہ چونک کر بولے ۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں واحد میاں ۔ پریشانی حضوری سے دور کر دیتی ہے اور میاں جو حضوری تک نہ پہنچے وہ بھلا راز اور تخلیہ تک کیسے پہنچ سکتا ہے ۔ واحد میاں تم اتنا سا نکتہ بھی نہیں سمجھتے۔۔۔؟ "

"ہاں ویسے بڑی شریف بچی ہے ۔ سبحان اللہ ۔ اس اللہ کی بندی نے کبھی آنکھ اونچی کر کے نہیں دیکھا ۔ اور معصومیت کی انتہا ہے واحد میاں ۔ غور کرنے کی چیز ہے ۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے ۔ اور اس کی اپنی ماں کیا کھیل کھیل رہی ہے سبحان اللہ ۔۔۔ اللہ کے رنگ ہیں واحد میاں کہیں چراغ تلے اندھیرا اور کہیں اندھیرے کی گود میں چراغ ۔ سبحان اللہ" اس رات دیر تک وہ سبحان اللہ، سبحان اللہ گنگناتے رہے ۔

اگلے دن شام کو اعظم آگیا ۔ ہم دونوں صحن میں بیٹھے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب مسجد میں ہیں ۔ اس لئے اس روز میں نے حسبِ معمول اعظم سے بیگاں کی بات چھیڑ دی ۔ اس کے سوائے ہمارے پاس کرنے کو بات ہی کون سی تھی ۔

اعظم اپنی عادت کے مطابق آنکھیں چمکا کر بولا "ارے بھائی اس مورے کی مورنی نے محلے بھر میں قیامت بپا کر رکھی ہے ۔ بیچارے محلے والے ۔"

"تم اپنی بات کہو ۔" میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"اپنی بات! ہمارا کیا شمار و قطار ۔ یہاں تو قبلہ مولوی صاحب کا شفقت بھرا ہاتھ بھی فیل ہوگیا ۔"

"وہ کیسے؟"

وہ اک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا "مولوی صاحب کا ہاتھ اس سر کو چھونے کے لئے کب سے کس قدر بیقرار ہے ۔"

"ان کے ہاتھ کی بات چھوڑو ۔ تمہاری گرم نگاہ کیا ہوئی ۔"

"گرم نگاہ تو کبھی نہیں چوکتی ۔ مصیبت یہ ہے کہ مورنی کو پکڑنے کے لئے مورے میں سے گذرنا پڑے گا ۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں، مجبوری ۔"

"تو ارادہ کیا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"بس یہی سوچ رہا ہوں ۔"

اعظم کے جانے کے بعد اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب چارپائی

پر پڑے ہیں ۔ بہت نادم ہوا مَیں ۔ مولوی صاحب کیا کہتے ہوں گے دل میں کہ خاک عقیدت ہے اِسے مجھ سے ۔ میرے متعلق ایسی ایسی خرافات سنتا رہتا ہے ۔ اگرچہ وہ یوں لیٹے ہوئے تھے ۔ گویا کبھی کے سوئے ہوئے ہوں ۔ لیکن رہ رہ کر مجھے شبہ پڑتا تھا ۔ ان کا اتنی جلدی سو جانا ، مجھے یقین نہ آتا تھا ۔

صبح سویرے وہ کہنے لگے ۔ واحد میاں تم نے رات کو ہمیں جگا ہی دیا ہوتا ۔ ہماری عشاء کی نماز قضا نہ ہوتی ۔ غفلت کی بھی انتہا ہوتی ہے ۔ وہ بولے "کیا واقعی آپ سو رہے تھے"۔ مَیں نے پوچھا ۔ "تو کیا ہم لیٹ کر وظیفہ پڑھ رہے تھے ۔ وہ بولے اچھا نہیں کیا تم نے واحد میاں ۔"

اس وقت مجھے یقین آیا کہ واقعی وہ سو رہے تھے اس وقت ۔

دو ایک دن کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا ۔ دفتر سے فارغ ہو کر مَیں اور مولوی صاحب دونوں حسبِ معمول گھر کی طرف چلے ۔ برآمدے سے باہر نکلنے سے پیشتر ہی مولوی صاحب نے خلافِ معمول ایک مسئلہ شروع کر دیا ۔ مسئلے کا موضوع صراطِ مستقیم تھا ۔ وہ گرم جوشی سے مجھے سمجھاتے رہے اور مَیں نیازمندی اور عقیدت سے سنتا رہا ۔۔۔ دفعتاً میں نے نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہم آدم آباد کی بجائے اس سمت کو جا رہے ہیں جس طرف مورا تھا ۔ "واحد میاں صراطِ مستقیم یعنی "شارٹ کٹ" ان کی نگاہ اٹھی ۔۔۔

"لاحول ولاقوۃ" وہ مورے کو دیکھ کر چلّائے "عجب حماقت ہے ۔ واحد میاں تم نے بتایا ہوتا ہمیں کہ ہم غلط ۔۔۔ خیر خیر ۔ کوئی بات نہیں ۔ آخر یہ بھی تو اک راستہ ہے ۔ ہاں ۔ ہمیں یاد آیا واحد میاں ہم تمہیں آج کچھ بتائیں گے ۔" مَیں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا ۔ چونکہ وہ بدستور مورے کی طرف چلے جا رہے تھے ۔ "اوہ ۔ تم مورے سے ڈرتے ہو میاں ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ کیا یہ دنیا بذاتِ خود غلاظت کا مورا نہیں ۔ کیا کہتے ہو ۔ ہےَ تو پھر اس مورے کا کیا ہے ۔ دیکھو ، پاکیزگی اسے نہیں کہتے یعنی ہمارا مطلب ہے ، پاکیزگی غلاظت کے عدم وجود سے نہیں بلکہ غلاظت کے باوجود قائم ہوتی ہے ۔" یہ کہہ کر وہ مورے میں داخل ہوگئے ۔

جب ہم مورے کے پرلے سرے سے نکلے تو چند ایک عورتوں نے غور

سے انہیں گھورا اور پھر ہنس پڑیں ۔ بچوں نے انہیں داڑھی سمیت مورے سے نکلتے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانی شروع کر دیں "بیچاری" مولوی صاحب نے عورتوں کی طرف دیکھ کر زیرِلب کہا "کیا سمجھیں گی یہ" اور پھر بچوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے "دیکھا واحد میاں یہ شیطان سمجھتے ہیں ۔ ابھی دنیا سے تعلق پیدا نہیں ہوا نا ۔ ہاں ہم نے تمہیں کہا تھا نا کہ آج ہم تمہیں ایک خاص بات بتائیں گے ۔ ادھر آؤ یہاں" اور پھر میرے کان سے منہ لگا کر بولے "آج سے ہم کھانا تنور پر ہی کھائیں گے ۔ ہاں ذرا اس بات کو سمجھو ، گہرا نکتہ ہے ۔ یہ دنیا غلاظت کا مورا ہے اور بنانے والے نے اپنے آدمی کس لئے بھیجے ہیں ۔ غلاظت سے ڈرنے کے لئے نہیں ، اسے صاف کرنے کے لئے ۔ ہاں واحد میاں آج سے ہمارا کھانا تنور پر ہی رہے گا ۔ لیکن اسے کہہ دینا کسی کے ہاتھ گھر بھیج دیا کرے ۔"

"سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔"

............O............

انعام

"انعام ۔ انعام" وہ اضطراب سے اٹھ بیٹھا ۔ "اوہ"۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا ۔ اور پھر لیٹ گیا ۔

"کیوں ۔ کیا ہے تمہیں اسلم" ؟

نہ جانے کیا ہے انہیں ۔ آصفہ کچھ کوٹتے ہوئے ساتھ والے کمرے سے بولی ۔ یونہی گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور بہکی بہکی باتیں بڑبڑاتے ہیں ۔ توبہ! ۔۔۔۔۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں ۔ ان چھ ماہ میں کیا کیا سہنا پڑا ہے مجھے ، بس میرا اللہ ہی جانتا ہے ۔

اسلم چھ ماہ سے بیمار تھا ۔ عجیب سی بیماری تھی ۔ کوئی کہتا تھا کہ تپ دق ہے ۔ کوئی کہتا کہ صرف خشک کھانسی ہے ۔ حکیم صاحب کی رائے میں وہ چور بخار کا شکار تھا ۔ جو جسم کے کونوں میں دبک جاتا ہے ۔ اور پھر سیدھا دماغ کو چڑھ جاتا ہے ۔۔۔۔۔ جبھی تو جسم دیکھنے میں چنگا بھلا محسوس ہوتا تھا ۔ چور بخار کے متعلق انہوں نے ایک بلیغ اور جامع نظریہ ایجاد کر رکھا تھا ۔

اسلم مضطرب رہتا ۔ ٹانگیں آپ ہی آپ ہلتی رہتیں ۔ نگاہیں آوارہ رہتیں اور پھر وہ چوری چوری اس ٹنڈ منڈ درخت کی طرف جو صحن میں استادہ تھا یا اس کالے ٹنگنے کی طرف جو باورچی خانے کے دروازے کے پاس لٹکتا تھا۔ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ۔ پھر وہ گھبرا کر منہ پھیر لیتا ۔ اور کھانس کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا ۔ چند ساعتوں کے بعد گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ۔ "آصفہ ، آصفہ" ۔۔۔۔۔

"انعام ۔ انعام" ۔۔۔۔۔ گویا کسی کا سہارا ڈھونڈ رہا ہو ۔ شاید انہیں تفصیلات کی وجہ سے آصفہ کا خیال تھا کہ اسے بیماری ویماری کچھ نہیں ۔ سایہ ہے ۔ سایہ ۔ چاہے کچھ بھی تھا ۔ وہ بیماری عجیب بے ڈھنگ سی تھی۔

"انعام ـــــ انعام"۔ وہ گھبرا کر اٹھا ۔

"تمہیں کیا ہے بھائی" ؟ میں نے پوچھا "کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔ اِکھیں ۔ اِکھیں ۔ کھڑوم ۔ وہ کھانسنے لگا اور پھر نحیف آواز میں بولا "انعام مَیں اس مکان میں نہیں رہونگا میری طبیعت گھبراتی ہے"۔

"کیوں ـــــ ؟ اس مکان کو کیا ہے" ؟ میں نے پوچھا ۔

"میں نے ہزار بار کہا ہے"۔ آصفہ جھک کر ساتھ والے کمرے میں بولی "انہیں بیماری ویماری نہیں ۔ انہیں تو سایہ ہے سایہ ۔ لیکن یہاں کوئی میری سنے بھی ۔ چیخ چیخ کر تھک گئی ہوں ۔ یہ اللہ مارے ڈاکٹر میری بات سننے بھی دیں"۔ یہ کہتی ہوئی وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی ۔

"اسلم بھائی کیا ہے تمہیں" ؟ میں نے اسے پوچھا ۔

اس نے آنکھیں کھول دیں ۔ پھر ایک پُراسرار انداز سے منہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کر کے دھیمی آواز میں بڑبڑایا ۔ "وہ درخت ہے نا صحن میں ۔ مجھے ، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا ۔ گویا اس میں جان ہے اور ، اور اس کی ٹہنیاں مجھ سے کچھ کہنے کے لئے بیقرار ہیں اور وہ کالا ٹنگنا کٹا ہوا سر ۔ جھومتا ہوا ۔ اف! ـــــ اور ـــــ اور"

"زوں ،اوں ،اوں" کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ ہوا سے کھل گیا ۔

"اُف یہ چیختا ہوا دروازہ ۔ وہ دیکھو"۔ وہ ڈر کے مارے اٹھ بیٹھا "وہ صندوق کے پیچھے سفید بلی ۔ توبہ اکھیں اکھیں کھڑوم ۔ وہ کھانستا ہوا نڈھال ہو کر لیٹ گیا ۔ کمرے پر خوفناک خاموشی چھا گئی ۔

"میں کہتی ہوں آسیب ہے آسیب"۔ آصفہ آپ ہی آپ بڑبڑاتی ہوئی ساتھ والے کمرے سے داخل ہوئی ۔ نہ جانے کونسی بدروح ہے جو سر پر سوار ہو گئی ہے ۔ انطحام ۔ کیسا برا سا نام ہے ۔ مجھے یاد ہے اس دن جب مجھ سے لڑ پڑے تھے اور میں دو گھڑی کے لئے کریم کی ماں کے ہاں جا بیٹھی تھی ۔ یہی دوپہر کا وقت ہو گا ہاں دوپہر ہی تو تھی ۔ واپس جو آئی تو چلّا رہے تھے ۔ انطحام ۔ انطحام ۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ بس اس دن سے یہی حالت ہے ۔ اسی دن سے ۔

اس دن چاروں طرف مٹیالی گھٹا چھائی ہوئی تھی وہ صحن میں بیٹھا ہوا تھا ۔ شاید اس لئے کہ آصفہ ابھی ابھی اس سے لڑ کر پڑوس میں کریم کی ماں کے پاس چلی گئی تھی ۔ وہ مکان ، وہ صحن اور وہ فضا عجیب سے دکھائی دے رہے تھے ۔ صحن میں وہ ٹنڈ منڈ سوکھا ہوا درخت پیچ و تاب کھا رہا تھا ۔ باورچی خانے کے پاس کونے میں ٹنگا ہوا سر اس کے اضطراب پر طنزاً جھوم رہا تھا ۔ اور ٹنگنے میں سفید بلی ۔۔۔۔۔ نہ جانے ہر وقت اسے ٹنگنے میں سفید بلی کیوں گھورتی ہوئی دکھائی دیتی تھی ۔ "میں آ ۔۔۔۔۔ وں"

اس نے جھرجھری لی اور منہ پرلی طرف پھیر لیا ۔ پتہ نہیں کونسی الجھن اسے بیقرار کر رہی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کسی سے کچھ کہے ۔ رو رو کر کہے ۔ چیخ چیخ کر کہے یا آپ ہی آپ چیخیں مار مار کر رو پڑے ۔

چوں کر کے کمرے کا دروازہ پھر آپ ہی آپ کھلا ۔

وہ چونک پڑا ۔ کس قدر منحوس آواز تھی اس دروازے کی جو یوں بے موقعہ آپ ہی آپ کھلتا اور بند ہوتا رہتا تھا ۔

پڑوس کی گھڑی نے ایک بجایا ۔ وہ چونکا ۔۔۔۔۔ اب مجھے کرنا کیا ہے ۔ باآواز بلند وہ اپنے آپ ہی بڑبڑایا ۔ گویا اپنی آواز کا سہارا لے رہا ہو ۔ اس ویران مکان میں اکثر اسے اپنی آواز کا سہارا لینا پڑتا تھا خصوصاً جب آصفہ اس سے جھگڑا کرنے کے بعد روٹھ کر پڑوسن کے ہاں چلی جاتی تب ۔

کرم آباد کی چہل پہل کو چھوڑ کر اس کا یہاں نئی آبادی کے ویرانے میں آ رہنا ۔۔۔۔۔ ہمیں تو اس تبدیلی کی وجہ سمجھ ہی میں نہ آئی تھی ۔ ایک روز میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھا ۔ پہلے تو وہ چونک پڑا ۔۔۔۔۔ پھر کچھ دیر کی پریشانی بھری خاموشی کے بعد کہنے لگا ۔ "انعام بھائی ۔ اصل میں بات یہ کہ ۔۔۔۔۔"

تجربے کی بنا پر میں یہ جانتا ہوں کہ جب کوئی بات بتانے سے پہلے ایسی تمہید شروع کر دے اور بات کو لمبی سُروں میں چبا چبا کر کہے تو اول تو اصل بات اسے خود معلوم نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا ۔ میں

نے موضوع بدلنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ اپنی ہی دھن میں کھویا رہا ۔ اور پھر اپنے کوٹ سے مٹی جھاڑتے ہوئے بولا ۔ "ہاں تو اصل بات یہ ہے ------ یار یہ صبح و شام کا شور مسلسل چیخ پکار ۔ میں تو ان آبادیوں سے اکتا گیا ہوں ------ خدا کی قسم !"

اس کی بیوی آصفہ تار سپتک میں بات کرنے کی عادی تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ اگر چیخ کر کوئی بات کر سکتا ہو تو پھر مدھم آواز میں بولنا بے معنی ہے ۔ اس کے علاوہ اونچی سُروں میں بات کرنے والی کی جھلک بھی دور تک جاتی ہے اور بات کرنے والی کی جھلک پڑ جائے تو بات آپ ہی آپ بامعنی اور رنگین ہو جاتی ہے ۔ شاید آصفہ کی باتوں کی رنگینیاں خود تک محدود رکھنے کے لئے اس نے اس ویرانے میں ڈیرا لگایا تھا جبھی تو آصفہ کے ہوتے ہوئے اسے اس ویران مکان میں اپنی آواز کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی ۔ چونکہ آصفہ صرف "تار" سُروں ہی میں بات کرنے کی عادی نہ تھی بلکہ "تار" سروں میں بات کئے بغیر اک گھڑی بھی نہ رہ سکتی ۔ میاں بیوی کی پرانی محبت کو دائمی قرب نے جھگڑے کی شکل دے دی تھی ۔

اسلم نے اپنی خاموش الجھن کا راز آپ فاش کر دیا تھا ۔ وہ بھلا اس راز کو کب تک چھپا کر رکھ سکتا تھا ۔ جب آصفہ کی تکرار کچھ بڑھتی تو وہ یوں محسوس کرتا گویا وہ مکان گھوم رہا ہو ۔ اس وقت وہ ٹنڈ منڈ درخت دیوانہ وار ناچتا اور اس کی شاخیں اضطراب اور شوق سے بڑھ بڑھ کر آصفہ کی باتیں سنتیں اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتیں ۔ اور وہ ٹیکا ہوا سر جھومتا "سن لے سن لے" منڈیر پر بیٹھا کوا چیختا ۔

"تم آہستہ بھی بولو گی یا نہیں" ۔ اسلم کے منہ سے چیخ نکل جاتی "میں کہتا ہوں لوگ سن کر کیا کہیں گے" اور آصفہ چمک کر جواب دیتی ۔ "آہستہ بولوں ۔ کیوں میں نے کیا جرم کیا ہے کسی کا ، جو آہستہ بولوں ۔ بڑے آئے ہیں آہستہ بلوانے والے ۔ بس میاں کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے ۔ پر کب تک میرا منہ سی رکھو گے تم ۔ کب تک چپ چاپ سہتی رہوں گی میں ۔ سنتے ہیں تو

پڑے سنیں ۔ میں تو کہتی ہوں اللہ کرے سبھی سنیں ۔ میاں کی کرتوت سنیں تو پتہ لگے ۔" اسلم چپ ہو جاتا پھر وہ باتیں اس کے ماتھے پر شکن بن جاتیں ۔ پاگل ہے پاگل ۔ اس وقت کوئی اس کے دل میں کہتا اور اسلم کھولتے ہوئے غصے سے جان بچانے کے لئے دہراتا پاگل ہے پاگل ۔ اس طرح غصہ ترس میں بدل جاتا اور اک جھوٹا احساس برتری اسے تھپکنے لگتا ۔

ہاں تو میاں کی خاموشی کا بھید بیوی نے پا لیا تھا یا شاید میاں نے خود نشر کر دیا تھا جبھی تو آصفہ ان کی ہر مدھم بات کا جواب تیور سروں میں دیتی تھی ۔ اب تو خیر آصفہ بات ہی وہاں سے شروع کرتی تھی جہاں اسلم کی برداشت کی حد تھی ۔ اس کے گذشتہ چھ سال کے تجربے کا یہ نچوڑ تھا ۔

ان کی شادی ہوئے چھ سال ہو چکے تھے ۔ لیکن اسلم اور آصفہ یوں محسوس کرتے تھے ۔ گویا وہ صدیوں سے اکٹھے رہ رہے ہوں صدیوں سے ۔ اور اکٹھے رہنا اک خاموش ، مسلسل اور مہلک حادثہ ہو جو چھ سال پہلے ان پر واقعہ ہوا تھا جب وہ آپس میں پہلی مرتبہ ملے تھے ۔ صدیوں سے بچھڑوں کا ملاپ ہوا تھا ۔

ان دنوں اسلم اور آصفہ کو اک دوسرے سے محبت تھی ۔ کم از کم ان دونوں کا ایمان تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہے ۔

ان دونوں کی محبت کی تہہ میں بھی "پڑوس" ہی کی سازش تھی ۔ اس کے علاوہ آصفہ کی وہی تار سپتک میں بولنے کی عادت لیکن اس زمانے کی باتیں اسلم کو اچھی طرح یاد نہ آتیں ۔ دھندلی سی باتیں ۔ مختصر یہ کہ پڑوس میں کہیں سے ایک روز ایک آواز آئی ۔ مُنے ۔ کوئی تنی ہوئی سارنگی مینڈھ بجا رہی تھی ۔ وہ مینڈھ اس کے کانوں کی راہ اندر جا گھسی ۔ اندر دھنکی سی بجنے لگی ۔ اس میں اک تنھا بیدار ہو گیا اور ہاتھ پھیلا کر چلانے لگا ۔ گویا کسی نے اسے بلایا ہو "ارے ۔۔۔۔۔" وہ حیرانی سے چلایا ۔ اٹھ بیٹھا ۔ لیٹ گیا اور پھر اٹھ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا ۔

سامنے کھڑکی میں اک لمبی سیاہ چوٹی سنہری پراندے سمیت ہوا میں لہرائی ۔۔۔۔۔ کوٹھے پر پردوں کے پیچھے گلابی انگلیوں نے ہلکے کاسنی دوپٹے کو

اوپر اٹھایا ۔۔۔۔۔ دروازے کے پیچھے اک شربتی آنکھ چمکی ۔ پھر اک دبا ہوا قہقہہ اور پھر وہی منے ۔۔۔۔۔ کب سے بلا رہی ہوں ۔ کہاں چلا گیا ہے تُو ۔

اسلم کے کان اس سریلی پنچمی آواز سے بھر گئے ۔ نگاہیں ڈھونڈنے لگیں ۔ اندر گویا میلا لگ گیا ۔ پتہ نہیں کیا ہوا ۔ ابھی وہ آصفہ کو غور سے دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس پر انکشاف ہوا کہ اسے آصفہ سے محبت ہو چکی ہے اور اس کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے ۔

ادھر آصفہ کو جب معلوم ہوا کہ دو شوق بھری آنکھیں اسے ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور کوئی اس کی آواز سن کر مست ہو جاتا ہے تو آناً فاناً اس کی زندگی میں عجیب سی تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ یہ تبدیلی بڑی خوشگوار تھی ۔ اس نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ دالان میں چنبیلی کے پھولوں کا پودا اس قدر پھیل چکا تھا اور اتنے پھول بہت ہی پھول لگے ہوئے تھے اس پر ۔

اب اس کے لئے ایک جگہ بیٹھ رہنا مشکل ہو گیا ۔ کبھی کوٹھے پر ۔ کبھی کھڑکی میں کبھی دروازے کی اوٹ میں ۔ نہ جانے کہاں کہاں ۔ وہ مستانوں کی طرح آوارہ پھرنے لگی ۔

اسی طرح پھرتے پھراتے وہ اسلم کے گھر آ پہنچی ۔ اور دونوں گھروں کا اِدھر اُدھر آنا جانا ہو گیا ۔۔۔۔۔ پھر بوڑھی عورتوں نے بیٹھ کر ہاتھ چلا چلا دبی دبی باتیں کیں ۔ مردوں نے کھانس کر سر ہلائے اور پھر ایک روز اسلم اور آصفہ کے بیاہ کی بات طے ہو گئی ۔ شادی ہوئی تو انہوں نے محسوس کیا جیسے صدیوں کے بچھڑے ہوئے ملے ہوں کئی ایک ماہ تک تو وہ اس قدر کھوئے رہے کہ انہیں اس بات کو سمجھنے کی فرصت نہ ملی کہ وہ میاں بیوی ہیں اور شادی اک مسلسل بندھن ہے اور انہیں تمام عمر اکٹھے رہنا ہے ۔ تا ۔۔۔۔۔ مگر ۔

اسلم کے انداز میں اطمینان پیدا ہوتا گیا ۔ راحت بھرا اطمینان کہ آصفہ اس کے پاس ہے اور جب بھی وہ چاہے ، آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ سکتا ہے اور بن دیکھے بھی اس کی موجودگی کی راحت بند بند میں محسوس کر سکتا ہے ۔ آواز سننے کے لئے کان کھڑے کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور ہاتھوں سے اشارے کرنا تو بالکل بے معنی ہے ۔

لیکن آصفہ کی خواہش تھی کہ چاہے وہ آلو چھیل رہی ہو یا آٹا گوندھ رہی ہو ، دو متبسم آنکھیں اٹھیں اور اسے حیرانی اور پیار سے دیکھیں اور دیکھتی ہی رہیں ۔ پہلے تو وہ اسلم کے بڑھتے ہوئے اطمینان کی طرف دیکھ کر حیران ہوئی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہلکا تربوزی دوپٹہ اور چاکلیٹ قمیض پہنے ہوئے بیٹھی ہو اور کمرہ اس کی تار سروں سے گونج رہا ہو لیکن اسلم سامنے دری پر دفتر کے بے معنی کاغذوں کے انبار میں کھویا رہے ۔ یونہی کاغذوں میں کھوئے رہنا تھا تو بھلا شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ کسی کو بیاہ کر اس کی زندگی یوں حرام کر دینا ! بیاہ سے پہلے تو اتنی بیقراری تھی اتنا جوش تھا ۔ کس قدر فریب دیتے ہیں یہ مرد ۔ بیچاری معصوم لڑکیوں کو پھنسانے کے لئے کیسے رنگین جال بچھاتے ہیں ۔

اسلم نے اس کے شکووں کو محسوس کر کے کہا ۔ "پگلی تم نہیں جانتیں ۔ یہ بے پروائی نہیں یہ خوشی بھرا اطمینان ہے تمہیں پا لینے کی خوشی ۔ سمجھیں"۔

"جی ہاں میں تو پاگل ہوئی نا ۔ پگلے پن کا ثبوت تو یہ ہے کہ اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے ہاں چلی آئی" "اوہ! اسلم چڑ کر بولا ۔ تم سمجھتی نہیں آصفہ" لیکن آصفہ الماری کی طرف متوجہ تھی ۔ وہ اپنی فائلوں کو ایک طرف رکھ کر اس کی طرف آیا لیکن عین اسی وقت آصفہ کو یاد آیا کہ باورچی خانے میں اسے کام کرنا تھا ۔ کوئی کام تھا ۔ پر تھا بہت ضروری ۔ بہر حال یہ آصفہ کی معلومات میں اضافہ تھا ۔ وہ کوئی ایسی بات کر کے ان کاغذوں کے پلندوں کو اک طرف پھینکوا سکتی تھی اور اس کا اطمینان توڑ سکتی تھی ۔ اگرچہ اس بات پر وہ چڑ جاتا تھا ۔ لیکن چڑنے میں بھی تو اک دلچسپی ہوتی ہے ۔

اس کے علاوہ تھوڑی سی دیر کی چڑ کے بعد وہ منایا بھی کرتے تھے ۔ "آصفہ بھئی واہ آج کریلے تو خوب جی لگا کر پکائے ہیں ۔ خوب ہیں ۔۔۔۔۔ بولتی نہیں ناراض نظر آتی ہے ۔ کیوں آصفہ ناراض ہو تم ؟ بھئی بڑی ضدی ہو ۔" لیکن حقیقت یہ تھی کہ جوں جوں تکرار بڑھتی گئی ، اس کا منانا پھیکا پڑتا گیا ۔ بہر حال اس کا وہ اطمینان تو برباد ہو جاتا تھا ۔ کسی کی زندگی برباد کرنے

کی یہی سزا تھی ۔ جو اپنے اطمینان کا خواہاں ہو وہ بھلا کسی سے محبت کرنا کیا جانے ۔

پہلے تو اسلم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا پھر اسے معلوم ہوا کہ سمجھانے کی کوشش مزید الجھنیں پیدا کرتی ہے اور وہ خاموش ہو گیا اور وہ خاموشی اضطراب بن کر چھا گئی ۔

پھر اس نے جھاڑ جھڑپ کر آصفہ کی تکرار کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن آصفہ جانتی تھی کہ اس کے گلے کی سُریں اسلم کی آواز سے کہیں بلند تھیں ۔ "میں پوچھتا ہوں تم آہستہ نہیں بول سکتیں کیا ۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا"۔ وہ گھبرا کر کہتا ۔ اس انکشاف کے بعد آصفہ کی ابتدا ہی اسلم کی انتہا سے شروع ہوتی اور بے چارہ اسلم سر پر ہاتھ پھیر کر خاموش ہو رہتا ۔ پھر مضطرب ہو کر دفتر کے کاغذوں کو الٹتا پلٹتا رہتا گویا کام میں مصروف ہو ۔ آصفہ اسے مضطرب دیکھ کر خوش ہوتی تھی ۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوتا ۔ گویا وہ اسلم سے انتقام لے رہی ہو ۔ ویسے بظاہر وہ اس کی مضطرب خاموشی پر اور بھی چڑ جاتی ۔ اس لئے کہ وہ اس کی بات کا جواب دے کر اس کے لئے بات بڑھانے کا جواز کیوں نہیں پیدا کرتا ۔ بے چاری کو آپ ہی آپ بول بول کر ہلکان ہونا پڑتا تھا ۔

ان حالات کے باوجود وہ دونوں اکٹھے رہتے تھے ۔ شاید اس لئے کہ انہیں اکٹھے رہنے کی عادت ہو چکی تھی ۔ آصفہ کو تو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ کسی اور جگہ رہ سکتی ہے ۔ شاید اس لیے کہ اس کا انتقام ابھی مکمل نہ ہوا تھا ۔ میاں کا جرم بھی تو اس قدر بڑا تھا ۔ اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے کسی کو محبت کا فریب دے کر لے آنا اور اک حسین عورت کے پاس بیٹھ کر یوں بے معنی کاغذ کے پلندوں میں کھوئے رہنا گویا وہ کاٹھ کی پتلی ہو ۔ خاص طور پر جب اس نے ہلکے تربوزی دوپٹے تلے چاکلیٹ قمیض پہن رکھی ہو جو کسی زمانے میں اسلم کی رائے کے مطابق قیامت تھی قیامت ۔ البتہ اسلم نے کئی بار مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے ۔ کسی اور دنیا میں بھاگ جائے ۔ جہاں بن بولے لوگ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں ۔ لیکن جب اسے خیال آتا کہ اس کے چلے جانے کے بعد آصفہ کو کون سنبھالے گا تو وہ اپنا ارادہ ترک کر

دیتا ۔ یا شاید اس لیے کہ کہیں سے بھاگ جانے کی خواہش کو برقرار رکھنے کے لئے وہاں رہنا لازم ہو جاتا ہے ۔

شاید اسلم اس ویرانے میں اسی لئے جا مقیم ہوا تھا کہ آصفہ کی بات کا جواب دل کھول کر دے سکے ۔ وہاں کوئی سننے والا تو نہ تھا ۔ لیکن وہ کم بخت ٹنڈ منڈ درخت کس طرح سرک سرک کر اس کے پاس آ کھڑا ہوتا اور کان اٹھا اٹھا کر سنتا اور وہ کالا ٹنگنا اور وہ بلی !

"جانے کب آئے گی" ۔ وہ بڑبڑانے لگا ۔ گویا اپنی آواز کا سہارا لے رہا ہو ۔ آئے گی تو صاف صاف سن لے گی مجھ سے ۔ ہاں آج میں صاف کہہ دوں گا کہ بیگم بول بول کر پڑوسیوں کے گھر جا بیٹھنا ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ مجھے جوتا پہن کر گھر سے نکل جانا پڑے گا ۔ چلا جاؤں گا اور آپ ہی بھوکی مرے گی ۔ اسے بھی میری قدر معلوم ہو گی ۔ بہت سر چڑھ گئی ہے ۔ لوگ ، لوگ جو جی چاہے کہیں ۔ مجھے کیا پروا ہے ۔ میں مرد ہوں ۔ جو جی چاہے کر سکتا ہوں ۔ خدا کی قسم اس کی باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں اب میں بدلہ نہ لوں تو میرا نام اسلم نہیں ۔ ہاں ۔ انتقام ! انتقام !!

عین اسی وقت آصفہ داخل ہوئی ۔ نہ جانے کس خیال کے زیر اثر اس نے لپک کر چادر اٹھا لی اور اسے اوڑھ کر لیٹ گیا ۔ شام ہونے کو آئی ہے اور میاں اطمینان سے خراٹے لے رہے ہیں ۔ کچھ کھانے پکانے کی بھی فکر ہے ۔ کیا پروا ۔ بس کھایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سو رہے ۔

اسلم کا غصہ بڑھ رہا تھا ۔ اٹھ کر ایسا تھپڑ دوں کہ بیبی کو ہوش آ جائے ۔

"میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی"۔ وہ بڑبڑا رہی تھی ۔

"پگلی ہے پگلی" اسلم کے دل میں کوئی کہنے لگا ۔ اس نے چادر کا کونہ سرکا کر باہر جھانکا ۔ ہلکا تربوزی دوپٹہ ۔ چاکلیٹ رنگ کی صراحی پر لہرا رہا تھا ۔ معاً اس کے جی میں آیا کہ اٹھ کر اسے گلے لگا کر چیخیں مار مار کر رو پڑے ۔ لاحول ولا قوۃ وہ بڑبڑایا اور پھر نقاہت محسوس کر کے کھانسنے لگا ۔

"آخر کب تک بے ہوش ہونے کا بہانہ چلے گا ۔۔۔۔۔ جاگتے کو بھلا

کون جگائے ۔ توبہ کیسی چپ سادھ رکھی ہے ۔ آخر کیا بیماری ہے یہ ۔ میں کیا بیگانی ہوں ۔ مجھے بتانا عیب ہے کیا ۔۔۔۔۔ توبہ اس گرمی میں چادر اوڑھ کر پڑے رہنا لیکن یہاں کوئی ہو تو بات کرے نا ۔ میں تو پگلی ہوں جو آپ ہی آپ بولتی بکتی رہتی ہوں ۔۔۔۔۔" وہ رک گئی ۔

"میں پوچھتی ہوں آخر کیا تکلیف ہے تمہیں"۔ ہار کر اس نے قریب آ کر کہا "اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو"۔

معاً اسلم نے محسوس کیا کہ وہ بیمار ہے ۔ اسے کھانسی ہے ، بخار ہے اور جانے کیا کیا ہے ۔ وہ کھانسنے لگا ۔ اکھیں ، اکھیں ، اکھوم ۔

آصفہ نے اسلم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ "دیکھو تو بدن تپ رہا ہے ۔ بانو ۔ بانو ۔ اری کہاں مر گئی ہے تو"۔

"پانی ۔۔۔۔۔" اسلم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔ پیاس ۔۔۔۔۔ لگی ہے"۔

"میں کہتی نہ تھی کہ طبیعت اچھی نہیں تمہاری ۔ اچھی بھی کیسے ہو ۔ کم بخت کاغذ بھی جان چھوڑیں ۔ سارا دن اللہ مارے کاغذوں پر نگاہ جمائے رکھنا ۔ بس وہی بات ہوئی نا جس کا مجھے ڈر تھا ۔ میں تو کہتے کہتے ہار گئی ۔ مگر میری کوئی سنے بھی ۔۔۔۔۔ توبہ کھانسی اور بخار ۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے"۔

معاً اسلم کا بدن واقعی کانپنے لگا ۔ سردی سے یا جانے خوشی سے ۔

"ہاں اسی دن سے" آصفہ بولی ۔ "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے ۔ میں تو اب اس مکان میں رہنے کی روادار نہیں ۔ توبہ کس قدر منحوس مکان ہے ۔ مجھے تو یہ سوکھا ہوا درخت یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی بھوت کھڑا ہو"۔

اکھاؤں ۔ اکھاؤں ۔ اسلم کھانسنے لگا ۔

ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر مجھے محسوس ہوا گویا وہ کھانسنے کی اوٹ میں قہقہے مار کر ہنس رہا تھا ۔ اور اس کی کانپتی ہوئی ٹانگیں گویا ناچ رہی ہوں ۔

دفعتاً اس کی نگاہ اس لٹکتے ہوئے منگنے پر جا پڑی ۔ اور وہ سہم گیا ۔ جیسے کوئی چور پولیس مین کو دیکھ کر سہم جاتا ہے ۔

"انعام بھائی ۔ میں یہاں نہیں رہوں گا ۔۔۔۔۔ میں اس مکان میں نہیں رہوں گا ۔ آصفہ ۔ آصفہ تم اس درخت کے پاس مت جایا کرو ۔ اف !"

وہ پھر لیٹ گیا ۔

"دیکھا تم نے ۔ میں نے کہا نہ تھا ۔ انہیں بیماری ویماری نہیں ۔ سایہ ہے سایہ ۔ آصفہ دبی آواز میں بولی ۔ ہاں ! ہاں ! سایہ ۔۔۔۔۔ لیکن میری کوئی سنے بھی"۔

..........O..........

سیانی

ساحرہ کے آنے پر شریف نگر میں اک اضطراب سا پیدا ہوگیا ۔ گویا کسی نے تالاب کے ساکن پانی میں پتھر دے مارا ہو ۔ محلے کی بوڑھیوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئیں ۔

"اللہ رکھے بڑی طرح دار دلہن آئی ہے"۔

"چاچی ایمان سے کہنا کبھی کسی کو اپنے بیاہ پر ناچتے گاتے سنا تھا"۔

"اے ہے ! نہ کسی سے گھونگٹ نہ پردہ"۔

"وہ تو یوں گھل مل گئی ہے جیسے اپنے محلے کی ہی ہو"۔

"بوا زمانہ ہی ایسا آیا ہے ۔ ابھی کیا ہے ۔ تم دیکھتی جاؤ" اور وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں ۔

جوان سہاگنیں زیر لب مسکرائیں ۔ "نیا نیا شوق ہے نا"۔

"بہن یہ چار دن تو گدھی پر بھی آجاتے ہیں"۔

"ابھی تو بچہ ہے"۔

"اونہہ ! بچہ ۔ ۔ ۔ ۔ منہ کا کیا ہے ۔ ویسے تو پکّی ہے"۔

"بس چار دن ٹھہر جاؤ ۔ پھر پوچھوں گی اس سے بی بی دو اور دو کتنے ہوئے"؟ اور وہ سب مسکرا مسکرا کر خاموش ہوگئیں ۔

نو عمر لڑکیوں نے مسرت آمیز تعجب سے دیکھا اور ان کے لئے چقوں کی اوٹ میں چوکیوں پر بیٹھ رہنا محال ہوگیا ۔ انہوں نے اس کے ارد گرد جھرمٹ بنا لیا ۔ کچھ دور کھڑی ہو کر دیکھنے لگیں ۔

کوئی بولی "میں لاؤں گی پانی اپنی آپا کے لئے"۔

"آپا ڈھولک نہیں بجاؤ گی ؟ کیسی اچھی بجاتی ہو"۔

"ہائے اماں میرا تو گھر جانے کو جی نہیں چاہتا"۔

نوجوانوں نے دیکھا تو دھک سے رہ گئے ۔ انہوں نے حیرانی سے ساحرہ کی طرف دیکھا ۔ پھر زبیدہ اور رشیدہ کو دیکھا اور دیکھ کر منہ پھیر لیا اور پھر ساحرہ کی طرف دیکھنے لگے ۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا ۔ لیکن اسے دیکھنا بھی تو آسان معلوم نہیں ہوتا تھا ۔ نگاہیں آپ ہی آپ جھک جاتیں اور پھر اس کے پاؤں ہاتھ انگلیوں کو گھورنا شروع کر دیتیں ۔ وہ خواہ مخواہ دبا دبا اضطراب محسوس کرتے ۔ اٹھ کھڑے ہوتے اور نگر کی گلیوں میں چھوٹی سی جھلک دے کر میری عید بنا جا گنگناتے پھرتے اور یا ایک دوسرے کے کان میں وہ باتیں دہراتے جو وہ کئی بار باآواز بلند سنا چکے تھے ۔ گویا کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں ۔ گویا راز کی بات کہنا چاہتے ہوں ۔ لیکن اس پر بھی انہیں تسکین نہ ہوتی ۔ زبیدہ کو دیکھا ۔ "اونہہ زبیدہ ! چوکی پر رکھا ہو میدے کا تھیلا"۔

ساحرہ کے میاں ادھیڑ عمر کے تھے اور زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہ تھے ۔ کرتے بھی تو پہلے تول کر ۔ اگرچہ ساحرہ کے آنے پر ان کے چہرے پر خواہ مخواہ کی شگفتگی پھیل گئی تھی لیکن وہ حسبِ عادت علیحدہ بیٹھ کر حقہ پینے پر مجبور تھے ۔ بہرحال ان کے حقے کی گڑگڑ کی بدلی ہوئی سُرتال کی آواز دور تک جاتی تھی اور خلافِ معمول حقے کی نڑی کو مٹھی میں لے کر پینے کی بجائے سگریٹ کی طرح سے منہ سے لگا لینا بذات خود اس بات کی علامت تھی کہ ان کی زندگی میں اک زبردست تبدیلی واقع ہو رہی تھی ۔ اس کے علاوہ حقہ پیتے ہوئے کھانسنا تو انہوں نے بالکل ہی ترک کر دیا تھا ۔ بات بات پر مسکرانا اور کسی نہ کسی بہانے ساحرہ کو آواز دینا ۔ واقعی ان کی زندگی میں اہم تبدیلیاں ہو رہی تھیں ۔ ایسی جن کا وہ پورے طور پر اظہار بھی نہ کر سکتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ساحرہ تم نے اپنے چچا کو سلام نہیں کیا"۔ "سلام کرتی ہوں چچا جی" ساحرہ جھک کر آداب بجا لاتی اور ہنس کر کہتی "بڑی دیر کے بعد چچا آئے ہیں لیکن کیا کریں" چچی جان اجازت دیتی تو چچا جان آتے نا"۔ اور پھر باہر چلی جاتی "ہی ، ہی ، ہی" چچا ہنستے "جیتی رہو بیٹی ۔ تمہاری چچی نے تو بلکہ کئی بار کہا تھا لیکن فرصت نہیں ملی ۔ یہ گھر کے دھندے ۔ ۔ ۔ میاں تمہیں مبارک ہو ۔ بڑی اچھی لڑکی ہے"۔

"ممانی جان" ساحرہ اس کے کان سے منہ لگا کر کہتی "ماموں جان نے ہونٹوں پر یہ مونچھوں کا چھجا سا کیا بنا رکھا ہے ۔ تم بھی انہیں نہیں سمجھاتیں"۔ پیشتر اس کے کہ ممانی حیرانی سے اس کی طرف دیکھیں اور ان کی انگلی ان کے ہونٹوں پر آ ٹکے ، وہ آگے نکل جاتی ۔

فیروز کو چوری چوری اپنے پاؤں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر وہ اپنا پاؤں آگے بڑھا دیتی اور پھر مسکرا کر جھکی جھکی آنکھوں سے کہتی ۔ ذرا غور سے دیکھ لو بھائی ۔ ایسا نہ ہو کہ جوتا چھوٹا لے آؤ ۔ ہاں اور بادامی رنگ کا ہو ۔ بادامی رنگ اور اونچی ایڑی ۔ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور بیچارہ فیروز شرمندہ ہو جاتا ۔

میاں کی موجودگی میں زبیدہ کا گھونگٹ دیکھ کر وہ مسکرا دیتی اور بولتی "زبیدہ گھونگٹ کاڑھنا ہے تو اماں سے کہو کہ کھدر کا دوپٹہ منگوا دیں ۔ یہ اللہ مارا کریپ تو سب کچھ لٹا دیتا ہے ۔ یہ سن کر زبیدہ سمٹتی اور یوں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی گویا یہ بات اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوئی ہو ۔

ایسی باتیں شریف نگر میں انوکھی تھیں اور شاید اسی لئے دلچسپ بھی ۔ لیکن نگر والیاں اپنی رسم کے مطابق انہیں سن کر حیران ہونے پر مجبور تھیں ۔ اس لئے ساحرہ کی باتوں پر مزید انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں ۔ سر ہلائے گئے ۔ ہاتھوں سے سینے تھام لئے گئے ۔ بوڑھوں نے سنا تو یوں کھانسنے لگے گویا درپردہ قہقہے لگا رہے ہوں ۔ نوجوانوں کی آنکھوں میں بجلی سی دوڑ گئی ۔ نئے ریشمی رومال خرید کر ہاتھوں میں لئے گئے ۔ لونڈر کی سستی شیشیاں اور ایک ایک آنے والی گیتوں کی کتابیں خریدی گئیں ۔ سر کے بال کچھ اور لمبے ہو گئے ۔ لیکن اس اہتمام کے باوجود جب کبھی وہ ساحرہ کے سامنے جاتے تو آنکھیں خود بخود جھک جاتیں ۔ رنگ اڑ سا جاتا دل دھڑکنے لگتا ۔ پھر جب ساحرہ چلی جاتی تو ہاتھ بڑھ کر بالوں کو سنوارنے اور ریشمی رومال لہرانے لگتے ۔ اور ہونٹ آپ ہی آپ کوئی شعر گنگنانا شروع کر دیتے ۔

عجیب بات تھی ۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ زبیدہ اور ثریا اور نگر کی دوسری لڑکیوں کے سامنے تو وہ بے دھڑک کھڑے ہو کر بالوں پر ہاتھ پھیرا کرتے ۔ رومال سے

منہ پونچھتے اور اس دوران ہاتھ ماتھے پر جا کر رک جاتا اور زبیدہ اور ثریا مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتیں اور اگر اس وقت چھوٹا بھائی گود میں ہوتا تو شوخی سے اس کا منہ چوم لیتیں یا نخرے سے کسی کو آواز دیتیں اور پھر چوکی سے اٹھ بیٹھتیں اور چلمن میں سے اک بڑی سی آنکھ دکھائی دیتی ۔ اور دو گوری گوری انگلیاں باہر نکل کر چق کو تھام لیتیں ۔ لیکن ساحرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ساحرہ سامنے آ کھڑی ہوتی تو انہیں اس طرح دیکھتی گویا وہ میدان میں گڑی ہوئی لالٹین ہوں اور پھر بے دھڑک باتیں کرتی ۔ جیسے نگر کے نوجوان نہ ہوئے پلیٹ فارم کے خوانچے والے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی عجیب بات تھی ۔

اگرچہ فیروز اس وقت سترہ سال کا تھا ۔ لیکن وہ ان نوجوانوں میں سے نہ تھا جن پر جوانی یوں آتی ہے جیسے برسات میں گھٹا ۔ مسیں بھیگ جاتی ہیں ۔ جسم بھر جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر کچھ کریں ۔ گائیں ناچیں ۔ اس کے علاوہ فیروز کو ریشمی رومال لہرانا اور بالوں پر ہاتھ پھیرنا قطعی طور پر نہ آتا تھا ۔

اگرچہ نگر کی کئی لڑکیاں حسن میں ساحرہ سے بڑھ چڑھ کر تھیں ۔ لیکن وہ سب نگر کے ماحول میں چوکیوں پر بیٹھ بیٹھ کر ہاتھ چلا چلا کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر جوان ہوئی تھیں ۔ اسی لئے تو ساحرہ نگر بھر میں نرالی دکھائی دیتی تھی اور شاید اسی لئے وہ نگر والوں کی نگاہوں پر چڑھ گئی تھی اور نگر والوں کی نگاہوں پر چڑھ کر اس کی شوخی اور بھی چمک اٹھی تھی ۔

فیروز نے بھی ساحرہ کے سحر کا متعدی اثر محسوس کیا تھا اور کئی بار چوری چوری آنکھیں بند کر کے اس کے جسم کا اندازہ لگایا تھا اور اس دلچسپ مشغلے میں کئی ایک دلچسپ جھرجھریاں لیں تھیں ۔ لیکن محبت !! ۔ ۔ ۔ ۔ توبہ ہے ساحرہ سے محبت کرنے کا خیال بھی اسے پیدا نہ ہوا تھا ۔ بلکہ وہ تو اس نرالی دلہن سے بہت جھینپتا تھا ، ڈرتا تھا اور اسے اپنے آپ سے بے حد بلند تر سمجھتا تھا ۔ لیکن وہ ڈر کس قدر لذیذ تھا ۔ ساحرہ کے پاس بیٹھنے اور اس سے باتیں کرنے اور چوری چوری اس کے پاؤں دیکھنے اور اندازے لگانے میں اسے فرحت ہوتی اور پھر ساحرہ کے دوپٹے پر سلوٹیں ۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اور لمبی لمبی انگلیاں ۔

ساحرہ عام طور پر اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اور اس سے یوں سلوک کرتی جیسے وہ بچہ ہو ۔ دلچسپ بچہ ۔ حالانکہ دونوں کی عمر میں چنداں فرق نہ تھا ۔ لیکن آخر وہ ایک مستند بیوی تھی جو جاتے کی بنا پر قابلِ عزت تھی اور فیروز وہ تو محض اک بیٹا تھا ۔ ایک بوڑھی ماں کا بیٹا ۔

دل ہی دل میں فیروز کو ساحرہ پر غصہ آتا کہ وہ اسے بچہ کیوں سمجھتی ہے ۔ اور اس کے آنے پر دوپٹہ کیوں نہیں سنبھالتی جیسے وہ اوروں کے آجانے پر کیا کرتی تھی اور یوں بیٹھی رہتی ہے جیسے کوئی آیا ہی نہیں ۔ دو ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا تھا کہ فیروز کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ ٹھٹکی اور لگی دوپٹہ سنبھالنے لیکن پھر اسے دیکھ کر بولی "اوہ تم ہو ۔ میں سمجھی کوئی آیا ہے"۔

اس پر اسے غصہ آیا ۔ کیوں وہ کیا کوئی بھی نہیں ۔ اس وقت اس کا جی چاہا کہ گھر لوٹ جائے مگر پیازی موروکین کے پائنچوں سے نکلے ہوئے پاؤں ۔ وہ یوں بیٹھ گیا گویا کسی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا ہو ۔ لیکن ساحرہ کو مشین کے کام سے فرصت ہوتی تو وہ دیکھتی ۔ یا شاید فیروز کے آ جانے پر بھی اس کا احساسِ فرصت قائم رہتا تھا ۔ چونکہ فیروز اس کے پڑوس میں رہتا تھا ۔ ایسا پڑوس جس کے ایک نہیں دو دروازے ساحرہ کے گھر میں کھلتے تھے ۔ یا شاید کسی اور وجہ سے بہرحال وہ مگن بیٹھی رہتی یا کبھی کبھار ویسے ہی کچھ کہنے کی غرض سے یا نہ کہنے کے ڈر سے پوچھتی "کیا کرتے آئے ہو" اور وہ جواب دیتا کچھ نہیں "کیسے آئے" وہ پوچھتی "ایسے ہی" اور وہ پھر کام میں یوں منہمک ہو جاتی کہ اسے قطعی بھول جاتا کہ پاس ہی چارپائی پر کوئی بیٹھا اس کے پاؤں ، انگلیوں دوپٹے اور بالوں کو دیکھ رہا ہے چھو رہا ہے یا احترام کے اور ڈر کے ملے جلے احساسات سے پسینہ پسینہ ہو رہا ہے ۔

کئی ایک بار اس وقت ساحرہ کے میاں آ جاتے ۔ پھر فیروز کے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا اور وہاں سے چلے آنا اور بھی مشکل ۔ ساحرہ صرف ایک بار آنکھ اٹھا کر میاں کی طرف دیکھتی اور پھر کام میں مصروف ہو جاتی ۔ میاں چولہے، مٹکے اور حمام کو گھور کر اندر جا بیٹھتے اور ٹھنڈے حقے کے کش لگانے میں مصروف ہو جاتے ۔

اس وقت فیروز اٹھ کر اپنے گھر آ جاتا ۔

ایک روز وہ ساحرہ سے کہنے لگا ۔ "ساحرہ تمہارا فیروز سے یوں آزادانہ ملنا اچھا معلوم نہیں ہوتا"۔

"کیا کہا" ساحرہ تنک کر بولی ۔

"میرا مطلب ہے یعنی تم فیروز کے پاس نہ بیٹھا کرو ۔ لوگ کیا سمجھتے ہوں گے"۔

"کیا سمجھتے ہیں لوگ"۔

"افوہ ! تم تو بال کی کھال اتارتی ہو ۔ جوان لڑکا ہے ۔ اس کا سارا سارا دن اس گھر میں گھسے رہنا ٹھیک نہیں"۔

"تو یہاں آنے سے روک دو اسے"۔

"روکنے کی کیا ضرورت ہے۔تم ہی نہ لگایا کرو منہ"۔

"ہوں ! تو میں منہ لگاتی ہوں"؟

"افوہ ۔ ساحرہ تم تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں شک ہے"۔

"نہ نہ مجھے تو نہیں ۔ پر دنیا کیا کیا کہتی ہے"۔

"کہتی ہے تو پڑی کہے"۔

"لیکن آخر اس میں برائی کیا ہے"۔

ساحرہ چپ ہو گئی ۔

اگلے دن جب فیروز ادھر گیا تو ساحرہ نے اٹھ کر دوپٹہ لے لیا اور اپنے آپ کو کچھ اس انداز سے سنبھال کر بیٹھ گئی کہ فیروز حیران رہ گیا ۔

"آج تو معلوم ہوتا ہے جیسے واقعی کوئی آگیا ہے"۔

"شاید" وہ مشین چلاتے ہوئے بولی ۔ لیکن پھر فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔

ساحرہ کی اس تبدیلی پر فیروز بے حد حیران ہوا ۔ اس کی وہ شوخ اور دلچسپ باتیں غائب ہو گئیں اور وہ بھی نگر کے رواج کے مطابق پردہ کرنے لگی ۔ لیکن اس کے پردے میں شوخی نہیں بیزاری تھی ۔ اس کی شگفتگی ایک موہوم سی

مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی ۔ لیکن فیروز اس دبی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ۔

ایک روز فیروز نے ویسے ہی دبی زبان سے ساحرہ سے کوئی مذاق کیا تو وہ بولی "نہ فیروز ایسے مذاق نہ کیا کرو تم"۔

"کیوں" وہ شرمندہ ہو گیا ۔ "اور آپ جو کیا کرتی ہیں مذاق بھول گئیں"۔

"اب وہ بات نہیں رہی" ساحرہ نے دوپٹہ کاڑھتے ہوئے نیچی نظروں سے کہا ۔

"وہ بات ؟ کیا بات نہیں رہی ۔ ضرور آپ مجھ سے خفا ہو بھابی" ۔ اس کی آواز میں ایک ملتجیانہ کپکپاہٹ تھی ۔

"نہیں تو" ساحرہ نے روکھی آواز میں کہا ۔

"نہیں بھابی تم مجھ سے خفا ہو"۔

"نہیں فیروز" ساحرہ نے سر اٹھانے کی کوشش کی "لوگ نہ جانے کیا کہیں" اس کے گلے میں آواز خشک ہو گئی ۔ سر جھک گیا ۔

"لوگ ۔ لوگ ۔ کیا" وہ ایک اصرار آمیز جوش میں اس کے مقابل میں پلنگ پر جا بیٹھا "بتاؤ بھابی ۔ میں آپ کو رومال کاڑھنے نہیں دوں گا ۔ جب تک بتاؤ گی نہیں"۔

اس نے ساحرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ۔ ۔ ۔ ساحرہ نے سر اٹھایا ۔ سرخ سرخ نمدار آنکھیں دکھی ہوئی نگاہیں ۔ اداس پژمردہ چہرہ ۔ ساحرہ کے گرم ہاتھوں نے زبانِ خاموش میں کچھ کہا ۔ اُن نگاہوں نے اسے اکسایا ۔ پژمردہ چہرے نے تسلیاں دیں ۔

نہ جانے اس ایک منٹ میں فیروز پر کیا گزری ۔ دل دھڑک رہا تھا ۔ دبا ہوا جوش لہریں لے رہا تھا ۔ اِن گرم ہاتھوں کے ذریعے تیز تیز سی لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں ۔

"آپ خفا ہیں"۔ اس کا حلق سوکھا ہوا تھا ۔ سر گویا کٹ کر چھت سے جا لگا تھا ۔

ساحرہ چپ بیٹھی تھی گویا کوئی خواب دیکھ رہی ہو ۔ ڈراؤنا دلچسپ خواب ۔

قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور پرے سرک گیا اور پلنگ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھا ۔ ۔ ۔ ۔

میاں نے دونوں کو ایک پلنگ پر بیٹھے دیکھ کر حمام کو گھورنا شروع کر دیا اور پھر جوتے اتار کر یوں پھینک دیئے گویا کسی کا نشانہ کیا ہو ۔

فیروز کے جانے کے بعد وہ ساحرہ کے پاس آ کھڑا ہوا ۔ "ساحرہ تمہیں میری بات کی ذرا پروا نہیں کیا"؟

"کونسی بات" وہ رومال کاڑھتے ہوئے بولی "بھولی کیوں بنتی ہو ۔ مجھے بتاتی ہو کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ تم اس سے ملنا ترک کرو گی یا نہیں" وہ گرجنے لگا ۔

"نہیں" وہ بولی ۔

"کیوں نہیں"

"میری مرضی"

"صاف کیوں نہیں کہتی کہ تمہارا اس سے تعلق ہے" ۔ میاں کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی ۔

ساحرہ کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکیں اور پھر جھک گئیں ۔

"ہاں ہے" اس نے دانت پیس کر کہا ۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ساحرہ" ان کی آواز مدھم پڑ گئی ۔

"کہہ جو رہی ہوں" یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی ۔

پھر کیا ہوا ۔ یہ مجھے معلوم نہیں ۔ البتہ نگر کے لوگ جو ان کے پڑوس میں رہتے ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ رات بھر ان کے مکان سے گلوگیر ، بھاری اور مدھم آوازیں سنائی دیتی رہیں ۔ جیسے کوئی اپنے گذشتہ گناہوں سے توبہ کر رہا ہو ، دھمکیاں دے رہا ہو ۔

اگلے روز جب فیروز ادھر گیا تو ساحرہ اسے دیکھتے ہی بولی "فیروز تم اب یہاں نہ آیا کرو"۔

"کیوں"۔ فیروز کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "بھابی مجھے معاف کرو نہ جانے کل میں نے کیا کیا کہہ دیا تھا"

"اونہہ" وہ بات کاٹ کر بولی "یہ بات نہیں"۔

"تو پھر" اس نے منت بھری آواز میں کہا ۔

"اب یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"ضرورت نہیں" اس نے دہرایا ۔

"ہاں" وہ بولی ۔ دو آنکھیں اس کی طرف اٹھیں ۔ چمکتی ہوئی آنکھیں متبسم شوخ بولتی ہوئی آنکھیں اور وہ مسکرا دی ۔ "اب میں خود آیا کروں گی"۔ ان آنکھوں نے جانے کیا کہا ۔ فیروز کا جی چاہا کہ اٹھ کر ناچنے لگے ۔ "سچ" وہ چلایا ۔

"ہاں ۔ ۔ ۔" اس ایک ہاں میں لاکھوں ہاں جھلک رہی تھیں ۔ وہ ہاں ہونٹوں سے نکل کر ساحرہ کی آنکھوں میں جا گونجی اور سینے میں ہلکورے لینے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اف وہ ہاں ۔ فیروز کو گویا کسی نے بادشاہی سونپ دی تھی ۔ وہ ناچتا ہوا اٹھا ، مڑ کر دیکھا اور یوں چلا آیا گویا اس روز اسے ساحرہ نے گھر نہ آنے کی بجائے گھر آنے کی دعوت دی تھی ۔

ساحرہ اور پردہ !

ساحرہ اور خاموشی

نگر والے ساحرہ کی اس تبدیلی پر حیران تھے ۔

بوڑھوں نے دیکھا اور کھانسنے لگے گویا کسی پوشیدہ تاسف کو چھپا رہے ہوں ۔

نوجوانوں نے ازسرِنو ساحرہ کے سامنے کھڑے ہو کر ریشمیں رومال لہرانا اور بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ۔

عورتیں اسے دیکھ کر مسکرائیں اور بولیں ۔

"میں نے کہا نہ تھا ۔ چار دن ٹھہر جاؤ ۔ پھر دیکھنا"

"میں نہ کہتی تھی کہ ذرا نگر میں رہ لینے دو ۔ آپ ہی سمجھ آ جائے گی"۔

"تمیز تو یہاں آکر ہی آئی ہے نا ۔ ماں باپ نے تو ایسی الہڑ بنا رکھا تھا"۔

"اب تو بوڑھیوں کے بھی کان کترتی ہے وہ چاچی"!

"اللہ رکھے اب سیانی ہو گئی ہے نا"!

..........○..........

چُپ

چُپ

فہرست

نیلی

ہائے ری کیسا پیارا بچہ تھا آپا کا ۔ بھورا بھورا ۔ جیسے زرد روئی کا گالا ۔ چھوٹے چھوٹے گدے سے ہاتھ اور اتنا بڑا سر ۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لگائے پھروں ۔ پر توبہ ! بھائی جان کی امّاں نے کتنا پاکھنڈ مچایا تھا ۔ بڑی آئی تھی تھے کی مالکہ ۔ ہونہہ ! گویا اپنی گرہ سے خریدا تھا اُسے ! توبہ اس بڑھیا کی باتیں ! مجھے تو ہنسی آ جاتی سُن کر ۔ دانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے ۔ یوں بولتی تھی جیسے بگڑی ہوئی چکی پھپھ پھپھ ۔ بولی "پھیضہ کو نہ دو ۔ گرا نہ دے" ۔ بڑی آئی تھے کی رکھوالی ۔ نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے ۔ جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں ۔ ہونہہ ! بھائی جان نے بہتیرا کہا ۔ لینے دو فیضو کو ذرا ۔ کیا حرج ہے ۔ لیکن وہ بڑھیا ! ! ۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ تھے کو اٹھا کوٹھے پر چڑھ جاؤں اور ۔۔۔ اور ۔ ۔ ۔ ہائے میں کیوں پھینکتی اسے ، کلیجے سے نہ لگائے رکھتی ۔ ایسا پیارا بچہ ہے نیلی نیلی کانچ سی آنکھیں ۔ زعفرانی رنگ اور پھر لالکھے سنہری بال جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتی ہی رہوں ۔ گڈا تھا گُڈا ۔ ذرا نہ روتا تھا بس رونی صورت بنائی ہونٹ نکالے اور آنکھیں ! ! ۔ ۔ ۔ اس وقت اس کی آنکھیں ! ! ۔ ۔ ۔ جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو ۔ اور پُھول سی آنکھیں ۔ جیسے کوئی سبز پھول کِھل گیا ہو ۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا ۔

تھے کی آنکھیں تو اک تماشا بنی ہوئی تھیں ۔ جو کوئی آتا اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا ۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ تھا ۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کی آنکھ نیلی نہیں اور پھر ایسی نیلی ۔ ۔ ۔ یہ بات بھی سچی تھی ۔ آپا کا بیاہ اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا ۔ بھائی جان ، آپا اور میرے پھوپھی زاد تھے ۔ اور ہمارے گھروں میں تو سب "کل نینے" تھے ۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شربتی جھلک مارتی تھی وہ بھی صرف مسکراتے وقت ، مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے ۔

آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ ! اور توبہ ! ۔ ۔ ۔ کیسی موٹی موٹی !! آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا ۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا میں تو سُن ہو جاتی تھی ۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ جاتا ۔ اور میں چیختی ۔ ہم پر تو نہ نکالا کرے کوئی آنکھیں ۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے ۔ "نہ بھئی صفّی ۔ فیضو کو نہ دکھایا کرو آنکھیں" ۔ "واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں" ۔ میں کہتی ۔ اور وہ بن کر کہتے توبہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہے تو اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے ۔ اور تم ! تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے ۔ "اوں" میں چڑ کر کہتی "کہاں پڑتی ہے پھوار ۔ میں جانتی ہوں بناتے ہیں آپ" پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا ۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی ۔ اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے ۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی ۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دلہن سے کیا کرتا ہے ۔ پھر وہ کچھ اور کہتے تو میں چیختی "بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی" ۔ پر میرے دل میں ذرا بھی غصہ نہ آتا ۔ ویسے میں یوں منہ موڑ لیتی جیسے ۔۔۔۔ پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لئے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا ۔ میں جانوں ۔ ۔ ۔ مجھے نہیں پتہ کیوں ۔ ۔ ۔

توبہ ! بھائی جان کی اماں نے ننھے کی آنکھوں پر کیا پاکھنڈ مچایا تھا ۔ بولی "یہ انگریچ کہاں سے آگیا ۔ اوئی اماں دیکھو تو" نجمہ چلاتی "اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں ۔ توبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ! اور آپا بولتی "آنکھیں نہ ہوئیں گرگٹ ہوا" ۔ ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی "دیکھو تو بی بی کیسا جافرانی رنگ ہے ۔ اور بال تو سونے کی تار۔سی ہیں" ۔ "اونہوں" بڑھیا بڑبڑاتی ۔ "یہ تو لاکھے سنہری ہیں" ۔ آپا ان کی باتیں سُن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی ۔ شرمانے کی بات ہی کیا تھی اس میں ۔ آخر سبھی کے ہاں بچے ہوتے ہیں ۔ پر آپا کا پہلا ننھا تھا نا ۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں جیسے گھٹا چھا جائے ۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چہرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی ۔ آپا بھی عجیب ہے ۔ پر میں جانوں گھبرانے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی ۔ لیکن چھپ چھپ کر ۔ پھر کوئی نہ کوئی چلا اٹھتی ۔ "نہ جانے کس پر گیا ہے ننھا ۔ پورا انگریچ ہے انگریچ" ۔ یا

کوئی ناواقف آتی تو وہ تھمے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی ۔ اور پھر تھمے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو ۔جبھی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا ۔ اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی "توبہ یہ میرا سر کھا جاتی ہیں" ۔

تھمے کی آنکھوں ۔ رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی خاموش تھا ۔ تو وہ بھائی جان تھے ۔ ۔ کسی نے تھمے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ بہانے بہانے اٹھ کر وہ گئے ۔ جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں ۔ بات سن کر اَن سنی کر دیتے تھے ۔ اور گھر میں تو بس یہی اک بات چلتی تھی ان دنوں تھمے کی آنکھیں رنگ اور بال سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے ۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا تھمے کی طرف ۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا ۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں ۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید جانتے ہوں ۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے ہوں ۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سُن کر دکھی کیوں ہو جاتے تھے ۔ جیسے پھوڑے کو چھیڑ دیا جائے ۔ اور اس وقت مسکراتے بھی تو وہ کیا مسکراہٹ ہوتی ۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی !!

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب اماں کہنے لگیں "بھیضہ کس پر گیا ہے تتھا" ۔ اور کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی ۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے ۔ پھر آپا بولی ۔ "مجھے کیا معلوم انہیں سے پوچھیئے" ۔ اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکرانے ۔ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا ۔ بڑی اماں کب چھوڑنے والی تھی ۔ بولی "کیوں جلیل کس پر گیا ہے تتھا ۔ دیکھ تو ذرا" بھائی بولے "اماں میں پوچھتا ہوں وہ میرا پن کہاں گیا ۔ جانے کس نے اٹھا لیا ہے ۔ کیا مصیبت ہے" ۔ "اے ہے جائے گا کہاں مل جائے گا ۔ تو ذرا اپنے بیٹے کو تو لے ۔ دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے" ۔ "لیکن گیا کہاں میرا پن" بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

"توبہ یہ آج کل کے لڑکے" ۔ بڑی اماں بڑبڑاتی ۔ "بیٹے کے نام سے

تو چڑے انہیں اور اس کی اماں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھریں ۔ آپا تڑپ کر مڑی ۔ اس نے نگاہ بھر کر بڑی اماں کی طرف دیکھا ۔ توبہ وہ ایک نگاہ ! جیسے چیخیں بھری ہوئی ہوں ۔ پھر آپا نے منہ موڑ لیا ۔ بھلا بڑی اماں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ ۔ آپا بھی تو پگلی ہے ۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے مٹی کی ۔ وہ تو کہی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیٹو ۔ نہ جانے سبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں ۔ ہائے ۔ مجھے تو موت آ جائے بڑھاپا نہ آئے ۔ میں تو جیتے جی مرجاؤں ۔ یوں مرکر جینے کا مزہ ؟

آپا کے دکھ کو کون نہیں جانتا ۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کرے تو ؟ پر جانتے سبھی ہیں ۔ گو آپا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے ۔ بس یہی ہے نا ، کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹا کو چھپا لیا ۔ اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی ۔ یا بھائی جان نے آپا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھیڑ دیا اور آپا کا سوال اَن سنا کر دیا ۔ اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے ۔ تو ایک آن کے لئے آپا کی آنکھیں چھلکیں اور پھر تیرنے لگیں ۔ اور اُس نے منہ موڑ کر اس چھوٹی جوڑے کو چھپا لیا ۔ اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھی ۔ وہ سمجھتی ہو گی میں بچہ ہوں ۔ مجھے ان باتوں سے کیا ۔ کیوں میں کیا بچہ ہوں ۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور ابھی بچہ ۔ وہ تو خود بچہ ہے ۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی ۔ ۔ ۔ سبھی اندھے ہیں ۔ ۔ ۔ کیا آپا اور کیا کوئی اور ۔ امی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات ۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی ۔ کیوں رہوں ؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے ؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں ۔ آپا تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے ۔ جبھی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے ۔ فیضو تو بھی کریدے بنا نہ رہ سکی ۔ توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دینا ۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ ۔ کیا امی اور کیا ابا ۔ کہتے ہیں کھاؤ پیو ہنسو کھیلو لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو بہرے بن جاؤ ۔ اندھے ہو جاؤ ۔ اور سُن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی بلی بنی بیٹھ رہو ۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔

نا بھئی ۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی بلی ۔ اس سے تو ویرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے ۔ نہ بھئی ہم سے تو جیتے جی مرا نہ جائے گا ۔ کہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو ۔ سُن لینا پر نہ جاننا ! تو بھی !! یہ بھی ہو سکتا ہے کیا ۔ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے ۔ مزا تو جب ہے کہ بات سُن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ بیتی ہو ۔ پھر پتہ چلتا ہے بات کا ۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر ناچنے نہ لگے ۔ یا کچھ توڑ پھوڑ نہ دے ۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے ۔ وہ نجمہ ہی ہے ۔ بھیگی بلّی !! : جو سنتی بھی رہتی یوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کہیں کی !! ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپا سے بیاہ کرنے پر راضی نہ تھے ۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپا سے جوڑ دیا ۔ جیسے ٹانگے میں ٹٹو جوڑ دیتے ہیں ۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے ۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے ۔ جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں ویسی ہی ہے یہ شادی ۔ بھائی جان بھی تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر ۔ جیسے بڑے اصیل

ہوں ۔ توبہ ! کیسے مکار ہوتے ہیں مرد ۔ کتنے بہروپ دھار سکتے ہیں ۔ پر اُڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی ۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات ۔ جو بھی آتی امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی ۔ اور جب بھی کوئی امی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی اور پھر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی ۔ اور مجھ سے کہتی "اے ہے لڑکی تم اب کھیلو نا جا کر" ۔ اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی ۔ "فیضہ بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر" تو میں جھٹ تاڑ جاتی کہ کوئی بات ہوگی ۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چیونٹیاں چلنے لگتیں ۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو ۔ سُر سُر کر رہی ہو ۔ بات، بات ، بات ، اور دل یوں بجتا ۔ سن ! سن ! سن ! پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لئے ۔ دیوار کے پیچھے کھڑکی کی اوٹ میں ۔ باورچی خانے کی ڈولی کے پیچھے ۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں ۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھڑکی کی درز میں سے ۔ وہاں سے تو کہنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے

بات سن لینا پر کہنے والی کو نہ دیکھنا !! نہ جی ہم تو کبھی نہ سنیں روکھی بات جو صرف کان میں بھنبھنائے اور بس ۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی بغیر کھائے حلوہ نگل لے ۔ جب وہ ہاتھ چلاتیں ۔ منہ بناتیں آنکھیں چمکاتیں اور انگلی ہونٹ پر رکھ لیتیں تو بات میں جان پڑ جاتی تھی ۔ اور بن دیکھے سوکھی بات ۔ جیسے مری ہوئی ہو ۔ جیسے کھٹائی بنا چٹنی !

ایک بولی ۔ "لو سنا تم نے بی بی ۔ یہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ لیکن وہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔ آئے ہائے ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ سُنا ہے لڑکا تو مانتا ہی نہیں ۔ کہتا ہے میں تو ساری عمر کنوارا ہی رہوں گا ۔ لو بی بی بھلا یہ بھی سنا ہے کبھی ساری عمر بھی کنوارا رہ سکتا ہے کوئی ۔ توبہ بی بی آج کل کے لڑکے ! جب تک بیاہ نہ ہو "تو کنوارا رہوں گامیں" اور ہو جائے تو بیگم کے بغیر دم نکلتا ہے" ۔

دوسری نے کہا ۔ "چاہے تم بُرا ہی مانو پر سبھی کہتے ہیں لڑکے کو کسی سے محبت ہے ۔ اسکول کی ہے کوئی ۔ ہائے ری یہ اسکول کی ۔ توبہ ان کے ہتھے نہ چڑھے کوئی لسوڑی کی گٹھلی کی طرح چپک جاتی ہیں" ۔

تیسری ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولی ۔ "میں تو سچی کہوں گی چاہئے خوئی مانے نہ مانے ۔ ہاں میں نے تو نخ خایا ہے اس گھر خا ۔ لڑخے خے چھن اچھے نہیں دخیں ہیں مجھے" ۔

اور امی کہتی ۔ "اچھا جو لڑکی کے نصیب میں لکھا ہو گا ہو جائے گا ۔ اب تو ہم نے ہاں کہہ دی ہے بہن ۔ اُگلی بات کو پھر کیسے نگل جاؤں ۔ اب بس اللہ ہی کارساز ہے بہن" ۔

ہونہہ کارساز ! جیسے اللہ کو کوئی اور کام ہی نہ ہو ۔ توبہ ایسے سمے امی یوں بن جاتی تھی ۔ جیسے کسی فرشتے کے پر اکھڑ گئے ہوں ۔ بڑی حاجن تو دیکھو ۔ اور ویسے ابا سے بات ہو تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں ۔ اس وقت اس کے کارساز اللہ کہاں ہوتے ہیں ۔ توبہ کیا مکر بنانے آتے ہیں بڑوں کو ۔

آپا نے بھی سن لی تھی بات ، نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا تھا اسے بیٹھے بٹھائے ۔ پر سن بھی لی تو کیا ۔ اس کے منہ میں زبان بھی ہو ۔ بس آنکھیں چھلکانا ہی جانتی ہے ۔ دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور آنسو گرا دیا یا پی گئی ۔ اور پھر اٹھ کر کوئی کام لے بیٹھی جیسے کام بُھلا سکتا ہو بات کو ۔ ہم سے تو نہیں بھولتی چاہے ہزار کام لے بیٹھیں ۔ اور ہزار تو کیا ایک بھی لے بیٹھیں تو ستیاناس کر کے رکھ دیں ۔ مجھے تو بات کا بخار چڑھ جاتا ہے ۔ پھر کام کیسے کروں ۔ کام کونین تو ہے نہیں اگرچہ کڑوا ضرور ہوتا ہے ۔ پر آپا !

ابا بولے ۔ "آپ ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں یہ لڑکے ۔ بیاہ ہو لینے دو" ۔ ابا تو بس مونچھوں کو تاؤ دینا ہی جانتے ہیں ۔ تاؤ دیا اور سگار سلگا کر بیٹھ گئے ۔ یا ہم پر رعب چھانٹ لیا اور امی کے سامنے چوہے کی طرح دبک گئے ۔ وہاں چلے بھی رعب ان کا ۔ اور امی ! توبہ اسے کیا کیا گر یاد ہیں ۔ صبح و شام بیسیوں سنی اور یوں پی گئے جیسے شربت کے گھونٹ ہوں ۔ اور پھر چوٹ تبھی لگائے گی ۔ جب لوہا لال ہو ۔ جب موقعہ آیا تو بیگم بن ٹھن کر بیٹھ گئی ۔ ہائے کیسی پیاری لگتی ہے امی جب وہ بن ٹھن تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہے ۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں اُس کے ۔

پہلی مرتبہ جب آپا سسرال آئی تو امی نے مجھے بھی بھیج دیا ساتھ ۔ آئی تو بڑی چاؤ سے تھی پر توبہ ہے پرائے گھر میں یوں آ بیٹھنا ۔ میرا جی چاہتا تھا چیخیں مار کر رو پڑوں ۔ میں تو پھر بھی نجمہ سے کھیل کر وقت کاٹ لیتی ۔ اور دن میں چار چار بار اپنے گھر سے ہو آتی پر آپا !! یوں گٹھڑی بن کر پڑی رہی گویا جان نکل چکی ہو ۔ کسی نے پلہ اٹھا دیا تو منہ دیکھ لیا ۔ کسی نے ہاتھ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا تو وہیں پڑا رہا ۔ جیسے مسالے کی بنی ہوئی جاپانی گڑیا ہو ۔

توبہ ! اس روز گھر میں ایک قیامت دبی ہوئی تھی ۔ بڑی اماں بھائی جان کے ابا کے کان میں منہ دیئے بیٹھی تھی ۔ نجمہ بانو سے پوچھ رہی تھی اور بانو مسکرا کر کہتی "چپ کوئی سن لے گا ۔ اور بھائی جان چارپائی پر پڑے تھے ۔ اور ان کے بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں دبی زبان میں چیخ رہے تھے ۔ "اگر تمہیں گھر کی

لاج کا خیال نہیں تو پھر یہاں رہنے کا مطلب" ۔ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی منتیں کر رہی تھی ۔ "آپ ہی سمجھ جائیے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ اے ہے جوان لڑکا ہے ۔ اگر ۔ ۔ ۔ !!" پھر ماں بیٹے کے پاس گئی ۔ منتیں کرتی رہی ۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے ۔ اور لگے گھورنے ۔ بہت چھپا چھپا کر کر رہے تھے بات ہونہہ ! ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی بگڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے ۔ میں سب سمجھتی تھی ۔ آپا کو زبردستی اس ڈھول پر منڈھ دیا تھا ۔ اور آپا ۔ دم پخت دیگ کی طرح ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی ۔ جیسے لجائی ہوئی ہو ۔ ہونہہ لجائی ۔ ۔ ۔ میں کیا جانتی نہیں ۔ سبھی یونہی بھیگی بلی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سسرال میں ۔ جیسے بہت لجا رہی ہوں ۔ بڑی لجانے والی !! چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں ! اس لئے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مزا آتا ہے انہیں ۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ناچنے نہ لگیں خوشی سے ۔ ۔ ۔ پر آپا !! آپا کس بات پر لجاتی ۔ میں نے ایک بار پلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو ! اتنا بڑا آنسو ۔ ۔ ۔ ہائے میرا دل بیٹھ گیا اور میں لپٹ گئی آپا سے ۔ اپنے اپنے انداز ہیں کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں ۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی ۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے ! میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی کبھی ڈولی کے پیچھے کبھی میز کی اوٹ میں تب کہیں جا کر پتہ چلتا کہ بات کیا ہے ۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کان میں ریڈیو لگا ہو ۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور ایسی ویسی ہو تو چھلکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی ۔ بیٹھے بٹھائے بات پا لینے میں اُسے کمال حاصل تھا ۔ ایک دن مجھ سے بولی ۔ "فیضی یہ کیا عادت ہے تیری ۔ یوں لوگوں کی باتوں پر کان لگائے رکھنا ۔ کسی کی بات میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا" ۔ مجھے غصہ آگیا میں نے کہا ۔ "پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے ۔ بڑی مکے سے آئی ہوئی تو دیکھو" اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا ۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرایوں کی طرح پیش آئے ۔ ایک جگہ بھی

تو نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں ۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے ۔ اور وہ باہر آ گئی تو یہ کمرے میں چلے گئے ۔ بہانے بہانے ۔ ہائے بیچاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی تھی اس کے بعد آپا کو چپ لگ گئی نہ جانے کیا ہو گیا اسے ۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی ۔ "اوہ ۔ میں تو بھول ہی گئی ۔" اور باہر نکل گئی ۔ اور وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی ۔ لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے لیکن توبہ آپا ۔ ۔ ۔ آپا جل جانے والی کہاں وہ تو سلگنا جانتی ہے اور بس ۔ بھئی ایسا بھی نہ ہو کوئی ۔ اٹھتی اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی انہیں ۔ جیسے جی چاہتا ہو ۔ اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں ۔ نہ جانے کے لئے بہانہ ڈھونڈتی تھی ۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے ۔ عورتیں کیوں مر مٹتیں ہیں ۔ ریجھ جاتی ہیں ۔ اور ویسے دیکھنے میں چھوئی موئی ۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے ۔ نخرو ۔ بھئی میں تو کبھی نہ یوں مر مٹوں کسی پر ۔

آخر بھائی جان کی اکڑفوں ٹوٹ ہی گئی ۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی ۔ جیسے بڑی آپا کے گھر میں ۔ ۔ ۔ ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میلا لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈپو کھلا ہو ۔ یہ آئی ۔ وہ گئی ۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں ۔ اک تماشا لگا رکھتے ہیں ۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھاگی اب وہ پکڑ رہے ہیں ۔ اب چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹ رہے ہیں ۔ اور اُس نے چیخ ماری ۔ جیسے کوئی مر رہا ہو ۔ ادھر پڑوس میں دیوار پر سے اماں نصیبن جھانکی ادھر چوبارے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آ کھڑی ہوئی ۔ کیا ہوا کیا ہوا ۔ اور یہ ہیں کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں ۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تکئے کیوں پسند ہیں ۔ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے ۔ اور وہ چلائے گی کیوں میں کیا تکیہ ہوں ۔ نہیں نہیں گاؤ تکیہ نہیں میں تو چھوٹے سے تکئے کی بات کر رہا ہوں ۔ اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا ۔ اور میں ان کے کہنے پر ٹنچر کی پھریری لائی تھی تو بولے ۔ "فیضی یہ

کیا مذاق ہے ۔ اس پھریری سے کیا بنے گا ۔ بیٹی بوتل ہی اٹھا لاتی" ۔ "بوتل ۔ کیوں ؟" میں نے ویسے ہی پوچھا ۔ بولے "اوہ نہیں سمجھتی یہاں تو پہاڑ لینا ہے پہاڑ" ۔ اور بڑی آپا غرائی ۔ ۔ ۔

توبہ اُس گھر میں قہقہوں کے پٹاخے چھوٹتے ہیں ہر وقت اور یہ گھر ۔ بس برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ ٹوٹی ہوئی پچکی پھپ پھپھ ۔ پھپھ ۔ پھپھ ۔ اور بس ۔ آپا نے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا مٹر گوشت بنا لوں ۔ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے ۔ بنا لو ۔ یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ رومال تو بہت میلا ہوگیا ہے ۔ اور آپا بولی "ابھی دھوئے دیتی ہوں" ۔ پر ہزار شور ہو ۔ چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا اکٹھی باتیں کر رہی ہوں ۔ لیکن بھائی نے ہونٹ ہلائے اور آپا کے کان کھڑے ہوئے ۔ وہ آپس میں بات کر بھی لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا ۔ آپا تو شائد اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو ہلی بات کرنے کو ۔ بولنا تو سیکھ لیا ۔ اور آپا ۔ ۔ ۔ حد کر دی آپا نے تو ۔ بھائی نے بات کر دی تو سن لی ۔ نہ کی تو نہ سہی ۔ ان کے ہونٹوں کی طرف تکتے رہنا ۔ ہائے کیا غلامی ہے ۔ آپا تو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی ۔ آپا کی اس بات پر یا نہ جانے کیوں کئی بار بھائی جان ٹھٹھک جاتے اور پھر اک بھرپور نگاہ ڈالتے اس پر ۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آپا مسکراتی ۔ چھپی چھپی مسکراہٹ ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے ۔ بس ہاں جی ۔ جی ہاں ۔ اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی ۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آپا پر ۔ اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پہاڑی کے اندر ہی اندر راستہ بنا رہا ہو ۔ ہائے ری مکّار آپا ۔

اس روز بھائی جان کسی قدر پریشان تھے ۔ میں نے انہیں کبھی یوں بیقرار نہ دیکھا تھا ۔ کبھی لیٹ جاتے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے پھر آپا کے کمرے میں جھانکتے اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لئے ادھر ادھر دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے "تم ہو فیضو ۔ اچھا ۔ اچھا" ۔ اور پھر چلے

جاتے ۔ آپا بھی تو حیران تھی ۔ ۔ ۔ آخر شام کے قریب وہ بولے ''صفی کل مہمان آئیں گے ۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی ۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں ۔ اچھا میں پھر بات کروں گا تم سے'' ۔ اور وہ چلے گئے ۔ آپا نے آنکھیں کھولیں ۔ میرا مطلب ہے اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرا دی ۔ عجیب مسکراہٹ تھی وہ ۔ تعجب خوشی اور غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ وہ چلے گئے تو آپا بڑبڑائی ۔ ''ہوں ۔ ۔ ۔ میں جانتی تھی کہ ایک نا ایک دن آئیں گے ۔ آہی جائیں تو اچھا ہے'' ۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی ۔ ''تو یہیں بیٹھی ہے فیضو'' ؟ ''کون آئیں گے'' ۔ میں نے آپا سے پوچھا'' ۔ ''ہوں گے نا کوئی ۔ تم بھی دیکھ لینا'' ۔ وہ مسکرائی ۔ میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا ۔ ''ہوں تمہاری سہیلی ہوگی کوئی'' ۔ آپا بہت ہنسی ۔ ہنستی ہی گئی ۔ توبہ ایسا بھی کیا ہے خواہ مخواہ دوسرے کو شرمندہ کر دینا میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی ۔ پھر بولی ''ہاں میری ہی تو ہے'' ۔ میں چڑ گئی تھی ۔ میں نے کہا ''چاہے کوئی ہو تمہاری سہیلی ہو یا ان کی دوست ۔ ہمیں اس سے مطلب'' ؟ اور آپا پھر ہنسنے لگی ۔ کہنے لگی ''میری سہیلی جو ہوئی سو ان کی بھی تو ہوتی ہوئی کچھ'' ۔

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ ہمارے کمرے میں جھانکا ۔ اس کمرے میں آپا اور میں سوتے تھے پہلے بانو بھی سویا کرتی تھی یہیں آپا کی چارپائی اور تتھے کے کھٹولے سے پرے اس کونے میں ۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی ۔ پھر آپا نے کہا ۔ ''بانو اب میں اچھی ہوں ۔ جب ضرورت پڑے گی بلا لیا کروں گی'' ۔ بس پھر ہم دونوں رہ گئے یہاں ۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا ۔ دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا ۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی ۔ ''بھائی جان کب آئیں گی وہ مہمان'' ۔ بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی مسکراتی ہوئی ۔ پھر بھائی جان بولے فیضو کو الہام بھی ہونے لگا اب ۔ بڑی مشکل ہو گئی'' ۔ ''میں نے کہا ۔ میں کیا جانتی نہیں آپا کی سہیلی آئی'' ۔ ''تو پھر پوچھ اپنی آپا سے'' وہ بولے ۔ پھر وہ آپا سے بولے ۔ ''صفی تمہیں نیند تو نہیں آئے گی'' ۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرائی ۔ اور وہ بولے ۔ ''نہیں اگر تمہیں نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں'' ۔

اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا پھر آپا کی طرف میں سمجھ گئی ۔ کہ بس اس بات کی انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں ۔ پھر کیا تھا ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ لگی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھر سی پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی ۔ توبہ ! ایسے سمے کیا مجال کہ ذرا سی بھی ہل جاؤں ۔ چاہے لاکھ چیونٹیاں رینگیں ۔ کھجلی ہو ۔ اونہوں ۔ ۔ ۔

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا ۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درز رکھ لی تھی ۔ جس میں سے دیکھ بھی سکوں ۔ وہ بولے ۔ "فیضو سو گئی" ۔ "فیضو" آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی ۔ میں چپ ۔ بھائی نے اطمینان کا سانس لیا ۔ بولے "یہاں بیٹھ جاؤں میں" آپا ذرا پرے سرک گئی ۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ میں جانوں وہ گھبرا رہے تھے ۔ شائد اس لئے کہ کیسے شروع کریں بات ۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے ۔ آپا بھی تاڑ گئی ۔ اور آپ ہی چھیڑ دی اس نے ، بولی "کب آئیں گے مہمان فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ" "نہیں نہیں ٹھیک ہے" وہ بولے ۔ "تم نے سچ کہا تھا ۔ وہ کل آ رہی ہے ۔ کل رات کو ۔ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا صفی ۔ ۔ ۔ نہ جانے وہ کیوں آ رہی ہے" ۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے ۔ "کسی گاؤں میں جانا ہے ۔ ضروری کام ہوگا ۔ کل رات یہاں پہنچے گی ۔ پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی ۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی ۔ لیکن وہ ویٹنگ روم میں ٹھہر سکتی تھی ۔ نہ جانے کیوں یہاں گھر آکر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے ۔ اف اس کی ضد ۔ ۔ ۔ !!!" بھائی نے کہا ۔ "اس کی ضد کون توڑے گا ۔ اس کی ضد نے تو کیا کیا توڑ کر رکھ دیا ۔ اُسے بھی توڑ دیا ۔ لیکن" وہ غصے میں بڑبڑائے "اب آنے کا مطلب ۔ یہ میں پسند نہیں کرتا ۔ نہ جانے کیوں آ رہی ہے وہ" ۔ "بلکہ اچھا ہوا" ۔ آپا بولی ۔ "مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی" ۔ یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے ۔ "تم نہیں جانتیں صفی" ۔ "میں جانتی ہوں" ۔ وہ بولی "مجھے معلوم تھا وہ آئے گی ۔ ضرور آئے گی ۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی" "تم" بھائی جان نے آپا

کی طرف دیکھا ۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو ۔ وہ گھبرائے ۔ ''صفی ۔ تم جانتی نہیں ۔ ''ہاں ہاں میں جانتی ہوں'' میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا ۔ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گا صفی'' ۔ ''میں جانتی ہوں'' آپا بولی ۔ اسنے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی ۔ ''صفی'' بھائی نے حیرانی سے دیکھا ۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبریز تھی ۔ ''کچھ دن کیلئے یہاں ۔ ۔ ۔'' وہ زیادہ کچھ نہ کہ سکے ۔ آپا بولی ۔ ''انہیں روک لیجیئے گا'' ۔ کچھ دیر اکٹھے رہیں گے ۔ مجھے مدت سے آرزو تھی'' ۔ ''نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو صفی ۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ۔

بس وہ تمہاری طرح ہے ۔ تمہاری طرح'' بھائی بولے ''میری طرح ۔ ۔ ۔ ؟ میری طرح'' ! آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا ۔ طنز کی دھار تھی اور چیخ پکار بھی ۔ ہائے ۔ آپا کی وہ ہنسی ۔ میں تو کانپ کانپ گئی ۔ ''ہاں'' بھائی بڑبڑائے ۔ ''تمہاری طرح بے داغ ۔ اجلی ۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے ۔ وہ سب سے الگ تھی ۔ باقی لڑکیاں تو چاؤ چونچلے کرنے میں لگی رہتیں ۔ لیکن نیلی اس کا نام ہے عیسائی ہے نا وہ ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں ۔ نیلی''۔ بھائی مسکرائے ۔ معاً آپا نے تنھے کی طرف دیکھا ۔ ''نیلی کسی سے نہ ملتی تھی اس میں اک آن تھی ۔'' بھائی نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا ۔ ''مجھے اس کی یہی بات بھاگئی ۔ ہم اکثر اکٹھے بیٹھے رہتے ۔ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا ۔ گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے لیکن کیا مجال جو کوئی حرکت ہو ۔ فضول بات ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے'' ۔ ''میں سمجھتی ہوں'' ۔ آپا نے کہا ۔ بھائی ہنسنے لگے ۔ ''ایک دفعہ میں نے کچھ کہہ دیا تھا ۔ ویسے ہی مذاق میں اُف کس قدر بگڑی ۔ بولی ۔ مسٹر جلیل ۔ میرے خیال میں آپ یہاں آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ہفتہ بھر تک اس کا غصہ نہ گیا ۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پیغام دے دیا ۔ شادی کرنے میں تو اسے اعتراض نہ تھا ۔ لیکن بڑی کڑی شرط تھی اس کی ۔ کہنے لگی ۔ ''مسٹر جلیل ''پروپوزل'' دینے سے پہلے یہ جان لیجیئے کہ میں شادی اپنے ہم مذہب ہی سے کروں گی ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس کے لئے وہ کام بھی کر سکتا تھا جو کسی کے لئے کرنے کو تیار نہ ہوتا ۔ لیکن مذہب بدلنا ! یہ مجھے

گوارا نہ تھا ۔ ہزار منتیں کیں ۔ کہا "نیلی تم میری ہی نہیں اپنی زندگی بھی برباد کرو گی" ۔ پر ۔ ۔ ۔ اس کی بات اٹل تھی ۔ کہنے لگی "میں جانتی ہوں ۔ اس سے زیادہ جانتی ہوں ۔ شائد ۔ شائد میں کبھی کسی سے بیاہ نہ کر سکوں ۔ لیکن مسٹر جلیل محبت سبھی کچھ نہیں ہے اس دنیا میں ۔ محبت ایک جہان ضرور ہے۔ لیکن اس کائنات میں اس سے بڑے بڑے جہاں بھی ہیں۔

چھ مہینے کے بعد جب میں پھر اس سے ملا تو کہنے لگی ۔ "بہتر ہے کہ اب یہ چنگاری یا تو بجھ جائے یا بھسم کر ڈالے ۔ اب بار بار مل کر اسے بھڑکانا اچھا نہیں ۔ ان دنوں وہ کس قدر لاغر ہو رہی تھی ۔ اس کی ماں کہتی تھی اسے دق نہ ہوا تو کہنا ۔ لیکن اپنی ضد کی پکی ہے ۔ یہ بات اس نے سن لی ۔ کہنے لگی ۔ "اماں ۔ دق نہ بھی ہو تو کیا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا ۔ ۔ ۔ ۔ بس ایک ہی افسوس ہے مجھے ۔ صرف ایک بچہ" ۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں "بھائی نے بہانے بہانے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔ توبہ میں تو بھائی کی حالت دیکھ کر سن ہو رہی تھی ۔ نہ جانے لوگوں کو آپ جلنے اور کسی کو جلانے میں کیوں مزہ آتا ہے ۔ مجھے معلوم نہ تھا بھائی اس قدر دکھی ہیں ۔ "نہ جانے اب وہ کیوں آ رہی ہے" ۔ بھائی اٹھ بیٹھے ۔ "ضد ۔ اور کیا ۔ لیکن صفی ۔ یہ نہ بھولنا کہ اب ۔ اب بے سود ہے ۔ اب میں تمہارا ہوں ۔ صرف تمہارا ۔ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں آ سکتا" ۔

بڑی اماں نے سنا تو پھپھ پھپھ کر کے بولی ۔ "نہ جی میں نہیں جانتی سہیلی وہیلی ۔ توبہ ۔ ۔ ۔ کیا زمانہ آیا ہے" "یہ ویسے ہی چھیڑ رہے ہیں سہیلی تو میری ہے" ۔ آپا بولی "چاہے کسی کی ہو" ۔ بڑی اماں بولی ۔ "پر ہے تو کافر میں تو کسی کافرہ کو منہ نہ لگنے دوں گی بچہ زچہ کے ۔ نہ بھئی ۔ یہ شگن اچھا نہیں ہوتا ۔

اس روز میں نے دوپہر کو جی بھر کر سو لیا ۔ جانتی تھی نا کہ رات کو وہ آنے والی ہے ۔ ہائے کس قدر چاؤ تھا مجھے اسے دیکھنے کا ۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ دیکھوں تو کیسی ہے ۔ بڑی پھبن ہو گی ۔ کالج کی جو ہوئی ، ہائے میری تو جان

جاتی ہے ان کالج والیوں پر ۔ کس طرح بات کرتی ہیں ۔ جیسے شربت کے گھونٹ پی رہی ہوں اور پھر ان کا چلنا پھرنا ۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے لے اور رنگ !! رنگوں کے چناؤ میں تو حد کر دیتی ہیں ۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے عشق ۔

اپنا کمرہ خالی کر دیا ۔ وہاں اس بیگم کی چارپائی ڈلوا دی اور اپنی چارپائی ہمارے کمرے میں لے آئے ۔

توبہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے ۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے ۔ اور آپا کروٹیں لے رہی تھی ۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو ۔ ۔ ۔ نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے ۔ اور میرا دل لگا دھک دھک کرنے ۔ میں نے رضائی میں سے دیکھا ۔ پر ۔ ایسی جگہ پر تھی میری چارپائی کہ وہ نظر نہ آئی ۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی ۔ لیکن ہلتی کیسے ۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی ۔ جیسے نیند میں بیہوش ہو کوئی ۔ ہلتی تو آپا کو پتہ چل جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ اُدھر اُن دونوں کا جھگڑا شروع تھا ۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی ۔ کیسا لوچ تھا ۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس گلے ہوں ۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے ۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے ۔ "اگر کچھ ہو گیا اسے تو سب سمجھیں گے کہ بس تم ہی کچھ کر گئی ہو" وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی پر میں جانوں اسے آپا اور ننھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا ۔ توبہ ! اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے وہ کہ سنی نہ جاتیں ۔ کبھی کوئی لفظ کان میں پڑ جاتا ۔ آپا بھی تو بار بار کان سے بال ہٹاتی تھی ۔ گو دیکھنے میں چپ پڑی تھی وہ یوں کھوئی ہوئی تھی کہ ننھے کو تھپکنا بھی بھول گئی تھی ۔

"ہاں" ۔ اس کی آواز آئی ۔ "اب میں نے جان لیا ہے" ۔ اس نے اک آہ بھری ۔ "اس بات میں مذہب کو لانا یہ میری بھول تھی ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں" بھائی جان تڑپ کر بولے ۔ "اب ۔ اب اس بات کو ۔"

"ہاں ۔ اب !!" وہ ہنسی ۔ دھار سی تیز ہنسی ۔ گویا وہ دھار اپنے آپ کو کاٹ رہی ہو ۔

"یہ تم نے کیا کیا" بھائی اٹھ بیٹھے ۔ "اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ ۔ اوہ ۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا نیلی ۔ پھر سے مجھے ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر سے" وہ ہنسی ۔ "ہاں ۔ آپ کے لئے تو پھر سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہاں جب اور اب سب ایک تار سے بندھے ہیں ۔ پھر تو ہوا ہی نہیں" ۔

"نیلی" بھائی چلائے ۔ "تم اب آرام کرو ۔ تھکی ہوئی ہو" ۔

"ہاں ۔ چُور ہوں چُور ۔ ۔ ۔ لیکن میں مسز جلیل سے ضرور ملوں گی چاہے کچھ ہو ۔ میں آپ اندر چلی جاؤں گی" ۔

"نہیں نہیں آج نہیں" ۔ بھائی بولے "اگر صفی کو اعتراض نہ ہوا تو کل بڑی اماں سے چوری ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور بچہ ۔ وہ تو مجھے دے دیجئیے ۔ وہ میرا ہے ۔ مسٹر جلیل !!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" ۔ بھائی بولے ۔

"آخر میں کیسے گذار سکوں گی" ۔

"لیکن ۔ وہ نہ مانے گی" ۔

"میں منا لوں گی اُسے" ۔

بھائی جان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے ۔

صبح جب میں جاگی تو مہمان جا چکی تھی ۔ بھائی جان اسے پہلی موٹر میں بٹھا آئے تھے ۔

سارا دن میں دعائیں مانگتی رہی کہ بھائی جان اسے آپا سے ملانے پر راضی ہو جائیں ۔ وہ آپا سے نہ ملتی تو میں اسے کیسے دیکھتی اور اسے دیکھنے کے لئے تڑپ رہی تھی میں ۔

شام کو میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بگڑی بیٹھی ہے ۔ غصے میں

کہہ رہی تھی "میں ضرور ملوں گی ۔ چاہے آپ مانیں نہ مانیں میں آپ ادھر چلی جاؤں گی" ۔ بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا اور آپا کو چپ کرا دیا ۔ میں بھی وہاں سے سرک گئی ۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ۔ لیکن بھائی جان کی میز کے پیچھے بیٹھ کر سننے لگی ۔ وہ سمجھے میں باہر چلی گئی ہوں ۔

آپا پھر چمک کر بولی ۔ اف ۔ آپا ۔ اس روز آپا لڑ رہی تھی ۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا ۔ آپا اور بھائی جان سے لڑے ۔ وہ آپا جو جی ہاں کے سوا کچھ کہنا جانتی نہ تھی بولی "اس میں ہرج ہی کیا ہے ۔ آخر لوگ چار چار کرتے ہیں ۔ میں اس کی خدمت کروں گی ۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہ ہو گا" ۔

"لیکن کیوں" بھائی نے بات کاٹ دی ۔

"بس میرا جی کہتا ہے" ۔ آپا بولی ۔ "ایسی اچھی ہے وہ ۔ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ ۔"

"لیکن تمہاری زندگی" بھائی بولے ۔

"میری زندگی" آپا نے دہرایا ۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بجتا ہے ۔ "میری زندگی کو جانے دیجیئے ۔ گئی آئی چیز کا کیا ہے" ۔

"نہیں نہیں" ۔ بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے "یہ نہیں ہو سکتا اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا" ۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا ۔ جسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے ۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی ۔ ایسی جیسے نیا نیا سہاگ ملا ہو ۔

شام کو نیلی لوٹ آئی ۔ ہم سب اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے ۔ چونکہ بھائی جان نے کہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دیں گے تم سے ! اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی ۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی ۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو ۔ توبہ اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا ۔ ۔ ۔ نہ جانے

کس وقت اماں نے نماز شروع کی ۔ اس نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی ۔ چونکہ نئی پڑوسن سیدانی کو آنا تھا نا ۔ بچے کو دیکھنے کے لئے ۔ لیکن سیدانی نہ آئی ۔ آخر اماں نے انتظار کے بعد شروع کی نماز ۔

ہائے ری ۔ وہ نیلی ۔۔۔ کیا پھبن تھی ۔ کس شان سے وہ اندر آئی گویا میم ہو میم ۔ سنہرے بال ۔ زرد مخملی رنگ اور نیلی آنکھیں ۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور یوں چونکی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو ۔ پھر بے اختیار پلا اٹھا کر تتھے کی طرف دیکھا ۔ اور پھر پاگلوں کی طرح نیلی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی "آئیے بیٹھیئے" ۔

آپا نے تتھے کو اٹھا کر نیلی کی گود میں ڈال دیا ۔ اور مسکرا کر بولی ۔ آپ ہی کا تو ہے ۔ چاہے ابھی لے لیں یا جب جی چاہے ۔ میں تو دایہ ہوں اس کی" اف آپا کی وہ بات ۔

نیلی پہلے تو حیران بت بنی بیٹھی رہی پھر چونک کر بولی ۔ "آپ کے مزاج تو اچھے ہیں" کیا ٹھکانے ہیں آپا ہنسی ۔ بھائی جان گھبرا گئے ۔ نیلی نے کہا ۔ کیسا پیارا تتھا ہے ۔ اور اس نے تتھے کی طرف دیکھا ۔ اف ۔ اس کا تو رنگ اڑ گیا ۔ شرم سے یا نہ جانے کیوں پانی پانی ہو گئی ۔ پھر بھائی بولے ۔ "نیلی ۔ صفی جانتی ہے" ۔ "مجھے تو بہت خوشی ہے ۔" آپا کہنے لگی ۔ "کہ گھر والی گھر آ گئی" "نہیں نہیں" نیلی چلائی "آپ نہیں جانتیں ۔ ۔ ۔" "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔" "آپا مسکرائی ۔ "ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہا کریں گی ۔" میں خدمت کروں گی ۔ "آپا کی آواز بھرا گئی" ۔ نہیں نہیں بھائی جان چیخنے لگے ۔ اب نہیں ۔

عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا اندر آ گئی "میں پڑوس سے آئی ہوں بیٹی" ۔ وہ بولی ۔ "برا نہ ماننا ۔ میرا جی چاہتا تھا تتھے کو دیکھ آؤں" ۔ بھائی سرک کر کونے میں ہو گئے ۔ نیلی نے کرسی کھینچ کر بڑھیا کو بٹھا لیا ۔ میں جانوں وہی سیدانی تھی ۔ بڑی اماں انتظار کرتی رہی تھی جس کا ۔ سلام کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی ۔ پھر بولی "کہاں ہے تتھا ۔ تتھے کو دیکھا اور پھر غور سے نیلی

کی طرف دیکھ کر مسکرائی ۔ اس وقت اس کی گود میں تھا ناوہ ۔ "اللہ عمر دراز کرے" وہ بولی "کیسا پیارا ہے ۔" نیلی کی طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگی ۔ بالکل اپنی ماں پر گیا ہے ۔ بھائی جان کا منہ فق ہوگیا ۔ نیلی تو تصویر بنی بیٹھی تھی ۔ پر وہ اپنی ہی دھن میں بولتی رہی ۔ اے ہے لڑکی ۔ اس نے نیلی سے کہا ۔ یوں کرسی میں بیٹھنا ۔ توبہ آج کل کی لڑکیاں تو زچہ بننا جانتی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ تجھے تو پلنگ پر لیٹ جانا چاہیئے !!

میں نے کہا ۔ "نانی ۔ تھے کی اماں تو یہ رہی" میں نے آپا کی طرف اشارہ کیا ۔ بڑھیا نے غور سے آپا کی طرف دیکھا پھر وہ ہنسی ۔ "اے ہے لڑکی ۔ مذاخ کرتی ہو ۔ یہ بال دھوپ میں تو نہیں سفید کئے ۔ پھر وہ تھے سے مخاطب ہوئی ۔ "چاہے تھے سے پوچھ لو ۔ کہ کون ہے اس کی اماں ۔ ۔ ۔ نیلی بت بنی بیٹھی تھی ۔ ادھر آپا گنگنانے لگی ۔ نہیں اب ہمارے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا" ۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسی ۔

بڑھیا اپنی ہی دھن میں بولتی گئی ۔ "کہتے ہیں ۔ سچ کہتے ہیں سیانے بلپ کی نظر میں جو دلھن کی صورت بچ جائے تو بچے کو تو ماں پر جانا ہی ہوا ۔"

بڑھیا بولی ۔ "کیا ہنستی ہے بیٹی ۔ بچہ حائل کہاں ہوتا ہے ۔ وہ تو بلکے دونوں میں بندھن بن جاتا ہے" ۔ بڑھیا نے بھائی اور نیلی پر معنی خیز نگاہ ڈال کر کہا ۔ "اور پھر جب ماں پر شکل ہو اس کی ۔"

...... ○ ......

چُپ

"چُپ"

جیناں نے چچی کی نظر بچا ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا۔ اور پھر نشے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پائنچے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور ازسرِنو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چارپائی پر پڑے ہوئے رومال پر کاڑھی ہوئی بیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل خواہ مخواہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ گویا اس نے کسی جُرم کا ارتکاب کیا ہو۔ قاسم کئی بار یوں چوری چوری جیناں کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا۔ جیناں کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی نگاہیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتیں۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جیناں کے جسم کے پیچ و خم یا اُبھار پر جا پڑتی۔ اور وہیں گڑ جاتی۔ اس وقت وہ قطعی بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے مصیبت یہ تھی کہ بات تبھی وقوع میں آتی جب جیناں کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی بیٹھی ہوتی۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی۔ "کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی"؟ میں "میں نہیں تو" وہ گھبرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی۔ "کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلّو"۔ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پائنچہ اکثر اوپر اُٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ ساٹن میں ملبوس ابھار نمایاں ہو جاتے۔ لیکن اس وقت قاسم کو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جیناں بظاہر شدت سے کام میں منہمک ہوتی۔ لیکن قاسم بیقرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اب میں جاتا ہوں۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی۔ "بیٹھو بھی۔ جاؤ گے کہاں"۔

"کام ہے ایک" قاسم کی نگاہیں کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتیں ۔
"کوئی نہیں کام وام پھر کر لینا" ۔ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جانے پر مجبور ہو اور وہ آپ ہی آپ میٹھی مسکاتی رہتی ۔

اس روز جب وہ جانے لگا تو وہ مشین چلاتے ہوئے بولی ۔ "قاسی ذرا یہاں تو آنا" ---------- ایک بات پوچھوں بتاؤ گے ۔ "کیا ہے" وہ رک گیا ۔ "یہاں آؤ بیٹھ جاؤ ۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی ۔ وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا ۔ وہ زیرِ لب مسکرائی ۔ پھر دفعتاً اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے سر کو اپنی رانوں پر رکھ کر تھپکنے لگی ۔ "سچ سچ بتانا قاسی" ۔ دو ایک مرتبہ قاسم نے سر اٹھانے کی کوشش کی ۔ لیکن نشے کی ریشمیں نرمی ۔ خس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور جسم کی مدہم مخملی گرمی ---------- اس کی قوت حرکت شل ہو گئی ۔ "تم میری طرف اس طرح کیوں گھورتے رہتے ہو ۔ ہوں" ؟ اس نے ایک پیار بھرا تھپڑ مار کر کہا ۔ بتاؤ بھی ---------- ہوں"۔ قاسم نے پورا زور لگا کر سر اٹھا لیا ۔ وہ انجانے جذبات کی شدت سے بھوت بنا ہوا تھا ۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں منہ نبات کی طرح سُرخ اور سانس پھولا ہوا تھا ۔ "ہیں ! یہ تمہیں کیا ہوا" ؟ وہ منہ پکا کر کے پوچھنے لگی ۔ "کچھ بھی نہیں" قاسم نے منہ موڑ کر کہا ۔ "خفا ہو گئے ہو کیا" ؟ اس نے ازسرِنو مشین چلاتے ہوئے پوچھا اور دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسی روکنے لگی ۔ "نہیں نہیں کچھ بھی نہیں" ۔ وہ بولا "اچھا اب میں جاتا ہوں" ۔ اور باہر نکل گیا ۔

اس کے بعد جب وہ اکیلے ہوتے قاسم اٹھ بیٹھتا ۔ " اچھا اب میں جاتا ہوں ۔ لیکن اس کے باوجود منہ موڑ کر کھڑا رہتا اور وہ مسکراہٹ بھینچ کر کہتی ۔ "اچھا ۔ ایک بات تو سنو" ۔ اور وہ معصوم انداز سے پوچھتا ۔ "کیا بات ہے" ۔ یہاں آؤ ۔ بیٹھ جاؤ وہ منہ پکا کر کے کہتی ۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اور بھی معصومانہ انداز سے پوچھتا ۔ "کیا ہے" معاً حنائی ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور قاسم کا سر مخملی ، معطر تکیہ پر جا ٹکتا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکنے لگتے ۔ اس کے تن بدن میں پھلجڑیاں چلنے لگتیں ۔ نسوں میں دھنکی بجنے لگتی ۔ آنکھوں

میں سرخ ڈورے دوڑ جاتے سانس پھول جاتا ۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا ۔ ایک رنگین اضطراب اسے بیقرار کر دیتا اور وہ اٹھ بیٹھتا ۔ "اب میں جاتا ہوں" ۔ اور وہ نیچی نگاہ کئے مسکاتی ۔۔مسکائے جاتی ۔

پھر نجانے اسے کیا ہوا ۔ ایک رنگین بیقراری سی چھا گئی ۔ وہ چارپائی پر بیٹھا دعائیں مانگتا کہ وہ اکیلے ہوں ۔۔اس وقت آنکھیں یوں چڑھی ہوتیں جیسے پی کر آیا ہو ۔ جسم میں ہوائیاں چھوٹتیں جیناں نیچی نظر سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی ۔ اور پھر آنکھ بچا کر کوئی نہ کوئی شرارت کر دیتی مثلاً جب چچی یا بڑی بی کی نظر ادھر ہوتی تو جیناں جیسے بے خبری میں کوئی کپڑا اپنی گود میں ڈال لیتی اور نیچی نگاہ سے قاسم کی طرف دیکھ کر اسے تھپکنے لگتی اور قاسم ۔ اُف وہ بے چارہ تڑپ اٹھتا اور جیناں منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتی ۔ یا وہ دونوں ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر پھر اپنی گود کی طرف اشارہ کرتی گویا بلا رہی ہو ، اور جب چچی یا بڑی بی کا دھیان ادھر ہوتا تو جیناں بڑی سرگرمی سے کپڑا سینے میں مصروف ہو جاتی اور مزید چھیڑنے کے خیال سے اپنے دھیان میٹھی پوچھتی ۔ قاسم آج اس قدر چپ بیٹھے ہو ۔ لڑ کر تو نہیں آئے اماں سے ؟

پھر جب وہ اکیلے رہ جاتے تو قاسم چپکے سے اٹھ کر آپ ہی آپ جیناں کے پاس آ بیٹھتا ۔ دو ایک مرتبہ ملتجی نگاہوں سے اس حنائی ہاتھ کی طرف دیکھتا ۔ جو شدت سے کام میں مصروف ہوتا اور پھر آپ ہی آپ اس کا سر جھک کر اس معطر سرہانے پر ٹک جاتا ۔ یا جب وہ اس کے پاس آکر بیٹھتا تو وہ منہ پکا کر کے کہتی ۔ "کیوں ؟ کیا ہے" اور پھر جب اس کا سر وہاں ٹک جاتا تو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ۔ "بہت شریر ہوتے جا رہے ہو ۔ کوئی دیکھ لے تو ۔ کچھ شرم کیا کرو" ۔

ایک دن جب وہ سر ٹکائے پڑا تھا وہ بولی ۔ قاسی کیا ہے تمہیں ۔ یوں پڑے رہتے ہو ۔ گم سم ۔ مزہ آتا ہے کیا" اس روز سر اٹھا لینے کی بجائے نہ جانے کہاں سے اسے زبان مل گئی ۔ بولا "مجھے تم سے محبت ۔۔۔۔۔۔" معاً جیناں نے اس کا سر دبا کر اس کا منہ بند کر دیا ۔ "چپ" وہ بولی ۔ کوئی سن لے

تو ۔ پیابتنا سے پیار نہیں کرتے ۔ انہیں پتہ چل جائے تو میری ناک چوٹی کاٹ ، گھر سے نکال دیں ۔ سنا بلو" ۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن اس روز دوڑتے ڈوروں کی بجائے اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ "اب میرا کیا ہوگا" ۔ آنسوؤں نے اس کا گلا دبا دیا ۔ اور جیناں کے بلانے کے باوجود وہ چلا گیا ۔ اور حسبِ معمول چوری چوری غسل خانے میں منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا ۔

نہ جانے ان مخملی ، معطر رانوں نے کیا کیا ۔ چند ماہ میں ہی وہ قاسی سے قاسم بن گیا ۔ گردن کا منکا اُبھر آیا ۔ آواز میں گونج پیدا ہو گئی ۔ چھاتی پر بال اگ آئے ۔ اور دونوں جانب گلٹیاں سی ابھر آئیں ۔ جن پر ہاتھ لگانے سے میٹھا سا درد ہوتا ۔ منہ پر موٹے موٹے دانے نکل آئے ۔

پھر ایک دن جب وہ ادھر جانے کی خاطر اٹھا تو ماں بولی ۔ "کدھر جا رہا ہے تو ؟" کہیں بھی نہیں ۔ وہ رک کر بولا ۔ "ادھر جیناں کی طرف اور کہاں منہ پر داڑھی آچکی ہے پر ابھی اپنا ہوش نہیں تجھے ۔ اب وہاں جا کر بیٹھنے سے مطلب نہ جانے لوگ کیا سمجھنے لگیں ۔ مانا کہ وہ اپنی ہے پر بیٹا اس کی عزت ہماری عزت ہے اور لوگوں کا کیا اعتبار' قاسم دھک سے رہ گیا اور وہ چپ چاپ چارپائی پر جا لیٹا ۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو پڑے ۔

شاید اس لئے کہ قاسی نہ آیا تھا یا واقعی اسے کالے دھاگے کی ضرورت تھی ۔ جیناں مسکراتی ہوئی آئی "بھابھی" اس نے قاسم کی ماں کو مخاطب کر کے کہا ۔ "کالا دھاگا ہوگا تھوڑا سا" ۔ اور پھر باتوں ہی باتوں میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی ۔ قاسم کہاں ہے نظر نہیں آیا آج ۔ کہیں گیا ہو گا ۔ "اندر بیٹھا ہے" ۔ قاسم کی ماں نے جواب دیا ۔ "ادھر نہیں آیا آج" ۔ جیناں نے جھجک کر پوچھا ۔ "خیر تو ہے" "میں نے ہی منع کر دیا تھا ۔ بھابھی بولی "دیکھ بیٹی اللہ رکھے اب وہ جوان ہے ۔ نہ جانے کوئی کیا سمجھ لے ۔ بیٹی کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا اور محلے والیوں کو تو تم جانتی ہو ۔ وہ بات نکالتی ہیں جو کسی کی سدھ بدھ میں نہیں ہوتی ۔ اور پھر تمہاری عزت ہوئی ۔ کیوں بیٹی ۔ کیا برا کیا میں نے جو اسے جانے سے روک دیا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ چپ سی ہو

گئی ۔ لیکن جلد ہی مسکرا کر بولی ۔ "ٹھیک تو ہے بھابھی ۔ تم نہ کرو میرا خیال تو کون کرے تم سے زیادہ میرا کون ہے ۔ تم بڑی سیانی ہو بھابھی" ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ "کہاں چھپا بیٹھا ہے" ! اور اندر چلی گئی ۔ قاسی کا منہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں اسے یوں چپ دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے بولی ۔ "چپ" پھر باآواز بلند کہنے لگی ۔ "مجھے ڈی ۔ ایم سی کا ایک ڈبہ لا دو قاسی ! سبھی رنگ ہوں اس میں" اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر کاٹ لیا ۔ قاسی ہنسنے لگا تو منہ پر انگلی رکھ کر بولی ۔ "چپ" اب تو زندگی حرام ہو گئی ۔' قاسی نے اس کے کان میں کہا ۔ اب میں کیا کروں گا میرا کیا بنے گا" "ہونہہ زندگی حرام ہو گئی ۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئے" پھر وہ باآواز بلند کہنے لگی ۔ "ڈبے میں لال گولا ضرور ہو مجھے لال تاگے کی ضرورت ہے ۔ جیناں نے یہ کہہ کر اس کے کان سے منہ لگا دیا ۔ "رات کو ایک بجے بیٹھک کی تیسری کھڑکی کھلی ہوگی ضرور آنا" ۔ ایک آن کے لئے وہ حیران رہ گیا ۔ "ضرور آنا" ۔ وہ اس کا سر اپنے بدن سے مس کرتے ہوئے بولی ۔ اور پھر باآواز بلند اسے ڈبے کے لئے تاکید کرتی ہوئی باہر نکل آئی ۔ "آج نہ سہی ، کل ضرور لانا" ۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی ۔

اس رات محلے بھر کی آوازیں گلی میں آ کر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بجتیں عجیب سی ڈراؤنی آوازیں اس رات وہ آوازیں ۔ ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہ رہی تھیں ۔ بہے جا رہی تھیں ۔ محلہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا ۔ بچے کھیل رہے تھے ، ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا ۔ نہ جانے مائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آوازیں مدہم ہوتی گئیں ۔ پھر دور محلہ کی مسجد میں ملا کی اذان گونجی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی چیخیں مار مار کر رو رہا ہو ۔ کس قدر اداس آواز تھی جیسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا ۔ ایک ساعت کے لئے خاموشی چھا گئی ۔ کراہتی ہوئی خاموشی ۔ دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے ۔ اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے گویا رینگ رینگ کر شکایت کر رہے ہوں ۔

کیا کھڑکی بھی کھلتے وقت شور مچائے گی ۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ نمازی واپس آ رہے تھے ۔ ان کے ہر قدم پر اس کے دل میں "دھک" سی ہوتی توبہ ! اس گلی میں چلنے سے محلہ بھر گونجتا ہے "چرر" ۔ چوں ۔ "دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے ۔ نجانے کیا ہو رہا تھا اس روز گویا تمام محلہ تپ دق کا بیمار تھا ۔ "اکھڑ کھڑدم" اہم ۔ اہم ۔ آہہیم ۔ تھو ۔ "یا شاید وہ سب تفریحاً کھانس رہے تھے ۔ تمسخر بھری کھانسی جیسے وہ سب اس بھید سے واقف تھے ۔

"ٹن ٹن ۔۔۔۔۔۔ بارہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا ۔ لیکن آوازیں تھیں کہ تھمتی ہی نہ تھیں ۔ کبھی کوئی بچہ بلبلا اٹھتا ۔ اور ماں لوری دینا شروع کر دیتی ۔ کبھی کوئی بڈھا کھانس کھانس کر محلے بھر کو ازسرِنو جگا دیتا ۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے ، یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے ۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کروٹوں سے چارپائی چیخ رہی تھی ۔ اماں کیوں یوں کروٹیں لے رہی تھی ۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں ۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں اس کا دل دھک سے رہ جاتا ۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا ۔ اف وہ کتے کیسی بھیانک آواز میں رو رہے تھے ۔

شاید اس لئے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا ۔ مجھے تجھ سے محبت ہے ۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا ۔ اور وہ حنائی ہاتھ پیار سے اسے تھپکتا رہا ۔ اور وہ آوازیں گونجتی رہیں یا شاید اس لئے کہ وہ سارا سارا دن آہیں بھرتا ۔ کروٹیں بدلتا ۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا رات کو علیحدہ کمرے میں سونے پر ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی ایم سی کا گولا منگواتے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ آنکھیں جھومتیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس محلے والیاں بیٹھی ہیں ۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے ۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا اتنا رکھ رکھاؤ کرتی تھی پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی ۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا ۔ گویا وہ توجہ صرف دکھلاوا تھی اور وہ روز بروز ان سے بے پروا ہوتی جا رہی تھی ۔ ممکن ہے

اس کی وجہ محلے کی دیواریں ہوں جو اس قدر پرانی اور وفادار تھیں کہ جیناں کا یہ رویہ برداشت نہ کر سکتی ہوں ۔ اس لئے انہوں نے وہ راز اچھال دیا ۔ بہر حال وجہ چاہے کوئی ہو بات نکل گئی ۔ جیسا کہ اسے نکل جانے کی بری عادت ہے ۔

پہلے دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں ۔ "یہ اپنا قاسم ، نواب بی بی کا لڑکا ! اے ہے ایسا تو نہیں دکھے تھا" ۔ "پر چاچی جیناں تو راہ چلتے کو لپیٹ لیتی ہے ۔"

نہ بڑی بی ! میرے من تو نہیں لگتی یہ بات ۔ ابھی کل کا بچہ ہی تو ہے اور وہ اللہ رکھے ، بھری مٹیار ! اونہوں" ۔ "میں کہتی ہوں بی بی ، جب بھی جاؤ اتنی آؤ بھگت سے ملتی ہے کہ کیا کہوں ۔ لوگوں کا کیا ہے جسے چاہا اچھال دیا" ۔ پر بھابھی ! ذرا اسے دیکھو تو ، اللہ مارے نشے کی شلوار ہے ۔ ساٹن کی قمیض ہے اور کیا مجال ہاتھوں پر مہندی خشک ہو جائے ۔ "ہاں بہن رہتی تو بن ٹھن کر ہے ۔ یہ تو مانتی ہوں میں ۔ اللہ جانے سچی بات منہ پر کہہ دینا میری عادت ہی ایسی ہے" ۔ تو اس کے میاں کی بات چھوڑ ، میں کہتی ہوں ۔ وہ تو بدھو ہے بدھو ، وہ کیا جانے کہ بیوی کو کیسے رکھا جاتا ہے ۔ "ائے ری کیا ہو گیا زمانے کو" ۔

قاسم نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں پہلے تو وہ شرمندہ سا ہو گیا ۔ پھر اسے خیال آیا ۔ کہیں بیٹھک کی تیسری کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند نہ ہو جائے ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔ لیکن جُوں جُوں محلہ میں بات بڑھتی گئی ۔ جیناں کی مسکراہٹ اور بھی رسیلی ہوتی گئی ۔ اور اسکی "چپ" اور بھی دلنواز ! "بس ڈر گئے" وہ ہنستی ۔ ہم کیا ان باتوں سے ڈر جائیں گے ؟" اس کا حنائی ہاتھ اور بھی گرم ہوتا گیا ۔ اور اس کا سنگار اور بھی معطر ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود قاسم کے دل میں ایک پھانس سی کھٹکنے لگی ۔

جب کبھی کسی وجہ سے بیٹھک کی تیسری کھڑکی نہ کھلتی تو معاً اسے خیال آتا کہ وہ اپنے میاں کے پہلو میں پڑی ہے اور وہ معطر گود کسی اور کو گھیرے ہوئے ہے ۔ وہ حنا آلود ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے ۔ اس خیال سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رات کاٹ دیتا ۔ پھر جب کبھی وہ ملتے تو

شکوہ کرتا رو رو کر گلہ کرتا ۔ لیکن وہ ہاتھ تھپک تھپک کر اسے خاموش کر دیتا ۔

ادھر قاسم اور جیناں کی باتوں سے محلہ گونجنے لگا ۔ مدہم آوازیں بلند ہوتی گئیں ۔ سرگوشیاں دھمکی کی صورت میں ابھر آئیں ۔ اشارے کھلے طعنے بن گئے ۔ "میں کہتی ہوں چاچی ، رات کو دونوں ملتے ہیں ۔ مسجد کے ملا نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔" "تم اس کے میاں کی بات چھوڑو بی بی "آنکھ کا اندھا نام چراغ دین" اسے کیا پتہ چلے گا کہ بیوی غائب ہے ۔ سنا ہے چاچی ایک روز میاں کو شک پڑ گیا پر جیناں ؟ توبہ اس کے سر پر تو حرام سوار ہے نہ جانے کیسے معاملہ رفع دفع اور ایسی بات بنائی کہ وہ بدھو ، ڈانٹنے ڈپٹنے کی جگہ الٹا پریشان ہو گیا پیٹ میں درد ہے کیا تم چلو ، میں ڈھونڈ لاتا ہوں دوا ۔ اب طبیعت کیسی ہے ہونہہ ! وہاں تو اور ہی درد تھا بھابھی ۔ جبھی تو پھاہا رکھوانے آئی تھی ۔ مسجد کا ملا کہتا ہے بڑی بی ـ ـ ـ ـ اے ہے اس کا کیا ہے ، اپنی حمیداں کہتی ہے بی بی ! میں تو ان کی آوازیں سنتی رہتی ہوں کان پک گئے ہیں ۔ پڑوسن جو ہوئی ان کی اور پھر دیوار بھی ایک اینٹی ہے ـ ـ ـ ـ ـ توبہ ، اللہ بچائے حرام کاری کی آوازوں سے ۔ نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں دونوں ؟ کبھی ہنستے ہیں ، کبھی روتے ہیں ۔ اور کبھی یوں دنگا کرنے کی آواز آتی ہے جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو ۔" "پر ماسی !" اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب ۔ "تو چھوڑ اس بات کو ۔ میں کہوں چوری کا مزہ چوری کا ۔ سر پر حرام چڑھا ہے" ۔ "پر ماسی تو چھوڑ اس بات کو دلہن ! تجھے کیا معلوم کیا مزہ ہے اس "چپ"، میں اللہ بچائے ۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے ، پر میں کہوں یہ "چپ" کھا جاتی ہے بس اب تو سمجھ لے آپ ہی ۔"

پھر یہ باتیں مدہم پڑتی گئیں ، مدہم تر ہو گئیں ۔ حتےٰ کہ بات عام ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔ غالباً لوگوں نے اسے ایک کھلا راز تسلیم کر لیا ۔ اور ان کے لئے مزید تحقیق میں دلچسپی نہ رہی نہ جانے جیناں کس مٹی سے بنی تھی اس کی ہر بات نرالی تھی ۔ جوں جوں لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے گئے ۔ اس کی مسکراہٹیں اور بھی رواں ہوتی گئیں ۔ حتےٰ کہ وہ محلے والیوں سے اور بھی ہنس ہنس کر ملنے لگی ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرتی

ہیں اور قاسم ؟ قاسم سے ملنے کی خواہش اس پر حاوی ہوتی گئی ۔ ہنس ہنس کر اسے ملتی ۔ اس کے خدشات پر اسے چڑاتی ۔ مذاق اڑاتی ۔ اس کی ریشمیں گود اور بھی گرم اور معطر ہوتی گئی ۔

مگر جب بات عام ہو گئی اور لوگوں نے اس میں دلچسپی لینا بند کر دی تو نہ جانے اسے کیا ہوا؟ اس نے دفعتاً قاسم میں دلچسپی لینا بند کر دی ۔ جیسے لوگوں کی چپ نے اس کی "چپ" کو بے معنی کر دیا ہو ، اب بیٹھک کی تیسری کھڑکی اکثر بند رہنے لگی ۔ آدھی رات کو قاسم اسے انگلی سے ٹھوکتا ۔ اور بند پاتا تو پاگلوں کی طرح واپس لوٹ آتا اور پھر بار بار جاکر اسے آزماتا ۔ اس کے علاوہ اب جیناں کو ڈی ۔ ایم سی کے تانگے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ۔ اس لئے وہ قاسم کے گھر نہ آتی ۔ جب سے کھڑکی بند ہونا شروع ہوئی قاسم پاگل سا ہو گیا ۔ وہ رات بھر تڑپ تڑپ کر گزار دیتا ۔ اور جیناں کا میاں تو ایک طرف ، اسے ہر چلتا پھرتا راہ گیر جیناں کے نشے کی شلوار کی تہوں میں گیند بنا ہوا دکھائی دیتا ۔ تعجب یہ تھا کہ اب جب اسے جیناں کی لاپروائی کا شکوہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ بے پروائی سے کہتی "کوئی دیکھ لے گا تبھی چین آئے گا تمہیں ۔ مجھے گھر سے نکلوانے کی ٹھان رکھی ہے کیا ؟ کیا کروں میں وہ ساری رات جاگ کر کاٹتے ہیں" ۔

دو ایک مرتبہ ڈھیٹ بن کر کسی نہ کسی بہانے وہ جیناں کی طرف گیا بھی ۔ اول تو وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھی ہوتی اور جب نہ ہوتا تو بھی جیناں سینے کے کام میں اس قدر مصروف ہوتی کہ آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھتی ۔ ایک دن جب وہ ادھر گیا ۔ تو دیکھا کہ جیناں کے پاس اس کا اپنا ماموں زاد بھائی مومن بیٹھا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کبھی وہ خود بیٹھا کرتا تھا ۔ اس نے محسوس کیا کہ مومن کا سر بھی کسی ریشمیں ، معطر تکیہ سے اٹھا ہے ۔ اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا اور جیناں کے بلانے کے باوجود چلا آیا اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کھمبے سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لے ۔

ناگاہ وہ واقعہ پیش آیا ۔ نہ جانے ہوا کیا ؟ آدھی رات کو جیناں کی چیخیں سن کر محلے والیاں اکٹھی ہو گئیں ۔ دیکھا تو جیناں کا خاوند پسلی کے درد سے

تڑپ رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی آنسو بہا رہی ہے ۔ ڈاکٹر بلوائے گئے حکیم آئے ۔ مگر بے سود صبح دس بجے کے قریب میاں نے جان دے دی ۔ اور جیناں کی پُر درد چیخوں سے محلہ کانپ اٹھا ۔ لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی سرگوشیاں از سرِ نو جاگ پڑیں ۔ کوئی بولی ۔ "اب قدر جانی ہے جب وہ مرگیا" ۔ کسی نے کہا ۔ "ابھی کیا ہے ابھی تو جانے گی ۔ بیچارہ ایسا نیک تھا ۔ اُف تک نہ کی اور یہ بی بی ہولی کھیلنے میں مصروف لگی رہی" ۔ چاچی نے سر پیٹ لیا کہنے لگی ۔ "ہائے ہائے ری ۔ تم کیا جانو ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے لچھن ، میں کہتی ہوں ۔ نہ جانے کچھ دے کر مار دیا ہو ۔" "ہیں چاچی بس" تو چپ رہ ۔ ہائے ری ، جوان میاں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ۔ وہ کیا منع کرتا تھا ۔ اسے ۔ اس کے سامنے تو کھیلتی رہی اپنے کھیل ۔ پھر جان لے لینا ! ؟" یااللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے ہم تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے محلے کی ناک کاٹ دی ۔ میں کہتی ہوں اگر سرکار کو پتہ چل گیا تو ۔ وہ تو قبر بھی کھود لیں گے ۔" "بس بھابھی بس تو چھوڑ اب اس بات کو ، دفع کرو ۔ سمجھ ! کچھ ہوا ہی نہیں ۔"

جب قاسم کی ماں نے سنا کہ بیٹا جیناں سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا ۔ اپنا سر پیٹنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی ۔ قاسم اب جوان تھا ۔ اپنی نوکری پر تھا ۔ ہر ماہ سو پچاس اس کی جھولی میں ڈالتا تھا ۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی ۔ مگر بیٹا تو گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار تھا ۔ اس لئے وہ چپ ہو گئی ۔ اگرچہ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور جیناں کے متعلق ایسی دعائیں مانگنے لگی کہ اگر وہ پوری ہو جاتیں تو قاسم سر پیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتا ۔

جب محلے والیوں نے سنا کہ قاسم کا پیغام جیناں کی طرف گیا ہے تو چاروں طرف پھر سے چرچا ہونے لگا ۔ "کچھ سنا تم نے چاچی ۔" ۔۔۔۔۔ ۔ "بس تو چپ کر رہ ۔ آج کل تو آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہو کر بیٹھ رہو تب گزارہ ہوتا ہے ۔" پر چاچی کبھی سننے میں نہ آیا تھا ۔ کہ بیوہ کو کنوارہ لڑکا پیغام بھیجے ۔ ۔۔۔۔۔ ۔ میں کہتی ہوں بیوہ مر جاتی تھی ، مگر دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی ۔ اور اگر کوئی پیغام لاتا بھی تو اس کا منہ توڑ دیتی ۔

لیکن آج نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے ۔ پر چاچی وہ تو لڑکے سے ساتھ آٹھ سال بڑی ہو گی ۔ اے اپنی فاطمہ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔" آئے ہائے کیا کہتی ہو تم ۔ دکھنے کا کیا ہے بہن ۔ ہار سنگار کر کے بیٹھ جاؤ ۔ منہ پر وہ اللہ مارا کیا کہتے ہیں اسے آٹا لگا لو ۔ تو تم بھی چھوٹی دکھو گی ۔ دکھنے کا کیا ہے ۔ اس سے تو عمر چھوٹی نہیں ہو جاتی ۔

قاسم کا خیال تھا کہ جب جیناں بیاہ کا پیغام سنے گی تو اٹھ کر ناچنے لگے گی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ وہ سوچ میں پڑ گئی ہے تو جل کر راکھ ہو گیا پھر۔۔۔۔۔ اسے مومن کا خیال آیا ۔ اور غصے سے منہ لال ہو گیا ۔ صاف انکار کیوں نہیں کر دیتی تم ، اس نے گھور کر جیناں کی طرف دیکھا ۔ جیناں مشین چلانے میں لگی رہی ۔ پھر آنکھ اٹھائے بغیر کہا ۔ "تم تو قاسی ہی رہے" ۔ "قاسی رہتا تو تم اس قدر لاپرواہ کیوں ہو جاتیں ؟" وہ بولا "میں تو لاپرواہ نہیں" اس نے سوئی میں دھاگا پروتے ہوئے کہا ۔ مجھے جواب دو ۔" وہ بولا اس کی آواز میں منت کی جھلک تھی ۔ "جواب دو ۔ میں یوں انتظار میں گھل گھل کر مرنا نہیں چاہتا ۔" "اچھا" جیناں نے آہ بھر کر کہا کہ تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی ۔" جیناں ۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ !! اس کا سر اس ریشمیں تکئے پر جا ٹکا ۔ اے ہے کوئی دیکھ لے گا ۔" وہ بولی "دیکھ لے" اس نے جیسے نیند میں کہا ۔ "کہیں مومن نہ آجائے ۔" جیناں نے سرسری طور کہا ۔ "مومن" !! اس کے دل پر تیر سا لگا ۔ اور وہ اٹھ بیٹھا ۔ "مومن آ جائے تو اسے جان سے نہ مار دوں" ۔ وہ غرایا ۔

اس کے نکاح پر محلے والیوں نے کیا کیا نہ کہا ۔ کوئی بولی ۔ لو "یہ یوسف زلیخاں کا قصہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ۔" کسی نے کہا ۔ "ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے ۔ ابھی تیل دیکھو ، تیل کی دھار دیکھو ۔"

کسی نے کہا ۔ "اے ہے جیناں کیا اسے گود میں کھلائے گی ۔ میاں نہ ہوا ۔ لے پالک ہوا" ۔ چاچی ہنسی ، بولی "تو چھوڑ اس بات کو بی بی ۔ آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چسکا پڑا ہوا ہے ۔ جورو کو ماں بنا لیتے ہیں ،

ہاں ! ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ " کوئی کہنے لگی ۔ "خیر چاچی حرام سے تو اچھا ہے کہ نکاح کر لیں ۔ کیوں بڑی بی ! ہے نہ یہ بات ؟ میں تو سچی کہوں گی ۔ ہاں بہن نہ جانے کب سے کٹے ہوئے تھے ایک دوسرے سے ۔"

نہ جانے بیاہ کے بعد کیا ہوا ۔ انہیں ، جیناں تو گویا گھر گرہستی عورت بن گئی ۔ اس کے نشے کے پاجامے عام پاجامے نظر آنے لگے جو محض جسم ڈھانپنے کے لئے پہنے جاتے ہیں ۔ اور خس کی خوشبو تو گویا اڑ ہی گئی ۔ حالانکہ اب بھی وہ خس کا عطر لگاتی تھی اس کے اٹھے اور گرے ہوئے پائنچوں میں چنداں فرق نہ رہا ۔ البتہ جب کبھی قاسم اس کا پائنچہ اٹھا ہوا دیکھتا تو معاً اس کی آنکھوں تلے مومن آ جاتا اور پھر جیناں کا حنائی ہاتھ اٹھتا ۔ پھر وہ بے قرار ہو کر اندر چلا جاتا ۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا ۔ شروع میں وہ اکثر جیناں کے پاس آ بیٹھتا ۔ لیکن اب جیناں کا حنائی ہاتھ شدت سے کام میں لگا رہتا اور اس کی گود بند رہتی ۔ اگر کبھی قاسم کا سر وہاں تک بھی جاتا تو وہ اپنے کام میں یوں مگن بیٹھی رہتی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو کبھی چڑ کر کہتی "کیا بچوں کی سی باتیں ہیں تمہاری" اس پر وہ محسوس کرتا ۔ گویا وہ گود کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی ہو اور تھپکنے والا حنائی ہاتھ کسی اور کا منتظر ہو ۔

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگتا کہ دونوں بیٹھے ہیں ۔ وہ اور مومن اور اس کا سر ریشمیں تکئے پر ٹکا ہوا ہے ۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو ڈھونڈتا تو دیکھتا کہ جیناں یوں مگن بیٹھی ہے ۔ گویا پرانے خواب دیکھ رہی ہو ۔ کسی رنگین ماضی کے دھیان میں مگن ہو یا شاید کسی متوقع مستقبل کے ۔ وہ چپ ہو جاتا ۔ اسے یوں دیکھ کر جیناں مسکرا کر کہتی "کیا ہے آج سرکار کو ؟" اور وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ۔ "ہماری جیناں کھو گئی اب کیا ہو گا ؟" اور وہ ہنسنے لگتی "پائی ہوئی چیز کو کھونے کا بہت شوق ہے سرکار کو ؟ پائی ہوئی" وہ ہنستا ۔ جسے رنگین خواب میسر ہوں وہ بھلا تلخ حقیقت کو کیوں دیکھے ۔ اسے جاگنے کی کیا ضرورت ۔ جاگ کر دکھتا ہی کیا ہے بس چپ چپ سنائی دیتا ہے ۔ ان دنوں تو "چپ" میں بہت مزہ تھا ۔ اب ہماری چپ بھی پسند نہیں ۔ اور وہ چڑ کر جواب دیتی "کہاں وہ "چپ""

اور کہاں یہ ــــــــــــ، وہ غصہ میں آ جاتا "نہ جانے کس کس سے "چپ" کا کھیل کھیلا ہو گا" "بس" کھا لیا شک نے "وہ جل کر کہتی "جی !" قاسم طنزاً جواب دیتا۔ "ہم تو ٹھہرے شکی اب مومن کیسے بنیں ! ؟"

یا کسی روز دفتر سے واپسی پر وہ کہتا "کس کے انتظار میں بیٹھی تھی ؟ اور وہ جل کر بولتی "کوئی بھی جو آ جائے" اوہو ! وہ سنجیدگی سے چھیڑتا "ہم تو غلطی سے آ گئے" "تو واپس لوٹ جاؤ" وہ جل کر کہتی۔

اس طرح مذاق ہی مذاق میں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ جیناں کام میں منہمک رہنے لگی۔ لیکن شاید کام تو محض ایک دکھاوا تھا۔ ایک پس منظر، ایک اوٹ جس میں ماضی کے خواب دیکھتی تھی۔ اس کے خواب قاسم کو اور بھی پریشان کرتے اسے اس بات پر غصہ آتا کہ وہ خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دے رہی ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ شاید کوئی اور خواب ہوں۔ جن کا اس سے تعلق نہ ہو۔ اس خیال پر اسے جیناں کے خوابوں میں مومن کی تصویر نظر آنے لگتی

البتہ ان دنوں جب قاسم کے ماں باپ چند دن کے لئے ان کے پاس آئے تو قاسم نے محسوس کیا کہ جیناں وہی پرانی جیناں تھی۔ اس روز جب اماں سے باتیں کر رہا تھا تو جیناں نے آکر اندھیرے میں اس کی کمر پر چٹکی بھر لی۔ اور جب وہ گھبرا کر کچھ بولنے لگا۔ تو بولی "چپ" اور ایک حنائی ہاتھ نے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر اس دن جب وہ ابا کے پاس دیوان خانے میں سویا ہوا تھا کسی نے اس کے کان میں تنکا چبھو کر اسے جگا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ دو ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل گئے۔ اور پھر ایک ہلکا سا پیارا تھپڑ گال پر پڑا ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں پر آ رہی۔ "چپ" اس معطر اندھیرے میں سے پیاری سی آواز آئی۔ پیشتر اس کے کہ قاسم اسے پکڑ سکتا وہ جا چکی تھی ــــــــ۔ پھر ایک روز غسلخانے میں جب وہ نہانے لگا تو معاً کوئی دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر اس سے چمٹ گیا۔ وہ گھبرا کر چلانے لگا۔ مگر دو حنائی ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ "چپ" وہ دیوانہ وار ان حنائی ہاتھوں کو چومنے لگا پھر جب اس نے جیناں کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ منہ پکا کر کے

بولی ۔ "شور مچا دوں گی ، تو ابھی اماں آکر سمجھ لے گی تم سے ۔" جب اس کے والدین نے جانے کی تیاری کی تو قاسم نے اس خیال سے انہیں نہ روکا کہ ان کے چلے جانے پر اس کی کھوئی ہوئی جیناں مکمل طور پر اسے مل جائے گی ۔ حالانکہ جیناں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں روکنے کی کوششیں کی ۔ اس کی منتیں سن کر یوں گمان ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا ہو ۔ مگر وہ چلے گئے ۔ اور جیناں ہار کر بیٹھ گئی ۔

ان کے چلے جانے کے بعد قاسم نے ہزار کوششیں کیں ۔ لیکن اپنی جیناں کو پانے کی جگہ اور بھی کھوئے چلا گیا ۔ اس بات پر قاسم کے شکوک ازسرِنو چمکے ۔ ان شکوک نے جیناں کو اور بھی چڑا دیا ۔ جیناں کے چڑنے نے اس کے شبہات کو ہوا دی اور وہ چپ چپ رہنے لگا ۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے سے اور بھی بیگانہ ہو گئے ۔ پھر ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس نے دیکھا کہ جیناں بن ٹھن کر مشین پر کام میں لگی ہوئی ہے اور پاس مومن بیٹھا ہے ۔ جیسے اس نے ابھی اس معطر گود سے سر اٹھایا ہو ۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی ۔ مومن کے جانے کے بعد وہ غرایا ۔ مومن اس مکان میں نہیں آئے گا سنا تم نے ! اس مکان میں کوئی جوان لڑکا نہ آئے ؟" تمہارا ہی لگتا ہے کچھ ۔ میں کیا جانوں کون ہے ؟" وہ بولی ۔ "اپنی گود سے پوچھ لو کہ کون ہے ۔" اس نے غصے سے کہا "بس جی!" ۔ وہ غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔ "پھر نہ کہنا یہ بات" ۔ کہنے کی کیا ضرورت" وہ بولا ۔ "اب کے آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا ۔" وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی ۔ "ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو ۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے کون ہو؟" قاسم کی نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔ اس کا ہاتھ اٹھا ـــــــ محلے والوں نے جیناں کی چیخیں سنیں ۔ کوئی گرج رہا تھا ۔ "مومن ! مومن" !! وہ چیخ رہی تھی ۔ "بس میں اس گھر میں ایک منٹ نہ رہوں گی" ۔

"سنا تم نے اب مومن کا جھگڑا ہے ۔ توبہ" یہ عورت کسی لڑکے کو لپٹے بنا چھوڑے گی بھی" ـــــــ میں کہتی ہوں اس کے سر پر حرام سوار ہے ۔ ہاں ۔" "میں کہتی ہوں ، اچھا کیا جو میاں نے ہڈیاں سینک دیں ذرا" ـــــــ پر چاچی ، کہاں مومن کہاں جیناں ۔ مومن تو اس کے بیٹے

سمان ہے ۔" "اللہ تیرا بھلا کرے ! جبھی چھاتی پر لٹا رکھتی ہو گی نا" ؟ "اب خاوند سے لڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی ہے" ۔ ۔ ۔ "نہ جانے وہاں کیا گل کھلائے گی ؟ ۔۔۔ "میں جانوں اچھا ہوا ۔ خس کم جہاں پاک مرد ہوتا تو جانے نہ دیتا ۔ کمرے میں بند کر دیتا ۔ اچھا نہیں کیا جو اسے جانے دیا ۔" "بلکہ وہ تو اور بھی آزاد ہو گئی" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنا ہے چاچی خط آیا ہے ہاں ! طلاق مانگتی ہے" "بڑی آئی طلاق مانگنے والی" میری مانے تو ۔۔۔۔۔ ساری عمر بٹھا رکھے" ۔۔۔۔۔۔ "خیر بی بی یارانے کے بیاہ کا مزا تو پا لیا" ۔ میں پوچھتی ہوں ۔ اب اور کسے پھنسائے گی ۔ تمہیں کیا معلوم ۔ اسی روز سے اپنا مومن غائب ہے ۔" "جبھی تو قاسی سر جھکائے پھرتا ہے ۔ دنیا کو منہ کیسے دکھائے" ۔۔۔ میں کہتی ہوں بس ایک طلاق نہ دے اور جو جی چاہے کرے" ۔۔۔۔۔۔ ہونہہ ! ان تلوں میں تیل نہیں ۔ اپی فاطمہ بتا رہی تھی کہ کاغذ خرید لیا ہے" ۔

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا ۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئی ۔ محبت پر اعتبار نہ رہا "عورت ؟" وہ دانت پیس کر کہتا "عورت کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں ۔ ناگن صرف ڈسنا جانتی ہے صرف ڈسنا ! اگر اس نے طلاق لکھ بھیجی تھی ۔ تو صرف اس لئے کہ محلہ کے لوگ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتیں تھیں ۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے اور اپنی زندگی ازسرِ نو شروع کرے ۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جیناں نے مومن سے نکاح کر لیا ہے ۔ تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جیناں کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا ۔ تڑپ کر رہ گیا ۔ حالانکہ وہ ہر وقت جیناں سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا ۔ اسے برا بھلا کہتا ۔ بے وفا فاحشہ سمجھتا ۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گود آ کر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر ٹکا دے ۔ وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکے اور وہ تمام دکھ بھول جائے پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آ کھڑا ہوتا ۔ دو ہونٹ کہتے "چپ" اگرچہ اس وقت وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تھا ۔ لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں اور وہ اور بھی کھو جاتا ایک سال کے بعد جب جیناں اور مومن محلے میں آئے تو

پھر چرچا ہونے لگا۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلہن کو دیکھنے لگیں۔ اگرچہ ان کی مبارکباد طعنہ آمیز تھی۔ لیکن آخر مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھی۔

اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جیناں محلے میں داخل ہوئے۔ عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کیلئے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا۔ "ہاں چاچی سرکاری کام ہے کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔" پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کیا دیکھتا ہے۔ جیناں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ بھاگا۔ حتیٰ کہ اسٹیشن پر جا کر دم لیا۔

اس روز دن بھر وہ جیناں کے بارے میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا۔ مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لئے بے تاب ہو۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بجنے کی آواز آئی "ٹن" معاً وہ دبے پاؤں چلنے لگا۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسم تھا۔ دفعتاً ایک ریشمیں معطر گود اس کی نگاہ تلے جھلملائی۔ دیکھوں تو بھلا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا دل دھڑکنے لگا۔ نگاہ بیٹھک کی تیسری کھڑکی پر جا کر ٹکی۔ انگلی سے دبایا تو پٹ کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ معاً سامنے سے اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی۔ "ہاں وہی" سیڑھیوں میں جیناں کھڑی مسکرا رہی تھی "تم ؟" وہ غصے سے چلایا۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آ چکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا۔ "چپ" جیناں نے منہ پر انگلی رکھ لی۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو نوچ لے۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ بڑھا۔ "میں جانتی تھی تم آؤ گے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی"۔ قاسم کا سر ایک رنگین معطر گود پر جا ٹکا۔ جس کی مدہم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھپکنے لگی۔ قاسم نے ایک دو مرتبہ جوش

میں آکر اٹھنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ خوشبو ریشمیں بدن ، مدہم گرمی اور حنائی ہاتھ ۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ اس کا غصہ ، آنسو بن کر بہہ گیا ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اور خوشبو اسے تھپک رہے تھے

"چپ" جیناں منہ پر انگلی رکھے مسکرا رہی تھی !

پُل

آپ پُل کو نہیں جانتے ۔ بھلا جانیں بھی کیسے جب کہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے ۔ اور نہ ہی کوئی گاؤں ۔ بس دریا پر اک عام سا پل بندھا ہے ۔ جس پر ریل کی لائن بچھی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے ۔ وہ ایک عام سا پل ہے ۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالا نظر آتا ہے ۔ البتہ اگر غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتھاہ گہرائی کا غماز ہے ۔ لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو ۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالتے ہیں گاڑی پل کے پار جا چکی ہوتی ہے ۔

اول تو کوئی پل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا ۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز نہیں کھلتا کہ پل ایک ریلوے سٹیشن ہے ۔ سٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں ۔ نہ آہنی جنگلہ نہ پلیٹ فارم ۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے ۔ باتوں کے باوجود ایک اہم سٹیشن ہے ۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے ۔ وہ دو حدود کا "سنگم" ہے ۔ گاڑی رکتی ضرور ہے چاہے رکتے ہی چل دے ۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے ۔ بفرض محال آپ محسوس بھی کرلیں تو آپ سمجھیں گے۔ گاڑی محض رک گئی ہے کھڑی نہیں ہوئی ۔ نہ جانے کیوں ۔ کوئی بات ہو گئی ہے ۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں ۔ میرا مطلب ہے وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں ۔

مصیبت یہ ہے کہ سٹیشن ایک بڑے جنکشن کے قریب ہے ۔ اس .. قریب کہ آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک سٹیشن دوسرے سٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے ۔ جنکشن کی افراتفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے ۔ تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ

کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ پل آتا ہے گزر جاتا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک اہم سٹیشن گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے اور آپ غیر علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں ۔

پل سے دو فرلانگ ورے دو مختصر سے کوارٹر گال سے گال جوڑے بیٹھے ہیں ۔ جیسے تیز جھکڑ میں مرغیاں بیٹھ جایا کرتی ہیں ۔ لیکن جنکشن کی گذشتہ افراتفری کے اثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو ان کوارٹروں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی ۔ دیکھ بھی لیں تو انہیں کوارٹر نہیں سمجھتے آپ ، اور سمجھ بھی لیں تو آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ آباد ہیں اور پل سے متعلق ہیں ۔

ان کوارٹروں میں سٹیشن کے ماسٹر اور نائب رہتے ہیں ۔ موجودہ سٹیشن ماسٹر اقبال کو وہاں رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں ۔ لیکن نائب کو صرف مہینہ گزرا ہو گا ۔ اسی طرح چار سال پہلے اقبال نائب ہو کر آیا تھا ۔ ان دنوں بس ایک وہ خود اور ایک اس کی نئی بیاہتا بیوی برجیس تھی ۔ برجیس اس ویرانے میں آکر کس قدر ڈر گئی تھی ۔ کہاں سکول کی رونق پھر بیاہ پر سکھیوں کا سنگ اور کہاں یہ ویرانہ ۔ لیکن آہستہ آہستہ جی لگ ہی گیا ۔ چونکہ پڑوس کا کوارٹر بچوں سے یوں بھرا پڑا تھا جیسے مٹر کی پھلیاں دانوں سے ۔ پھر ان کی ماں بڑی ملنسار تھی ۔ اس کے علاوہ دونوں کوارٹروں کے درمیان ایک کھڑکی تھی ۔ جس کی وجہ سے دونوں کنبے ایک گھر نظر آتے تھے ۔ چونکہ کھڑکی زمین سے اونچی تھی اس لئے بچوں کی خاطر دونوں طرف سیمنٹ کی سیڑھیاں بنی تھیں اور کھڑکی کا نچلا حصہ سیمنٹ کی محراب سی بن گیا تھا ۔ سب ازراہ مذاق اس کھڑکی کو پل کہا کرتے ۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ وہ کھڑکی دونوں گھروں کے درمیان پل کا کام دیتی تھی ۔

پڑوسیوں کی تبدیلی پر برجیس نے پریشان تو ہونا ہی تھا ۔ لیکن اس کی پریشانی ایسی شدید نہ تھی ۔ ایک تو اب اس مقام سے مانوس ہو چکی تھی اور دوسرے اب ان کے دو ننھے منے بچے تھے ۔ سعیدہ اور انور ۔

چق کی اوٹ میں نئے نائب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی ۔ ریل کا بابو تو وہ دکھتا ہی نہ تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کا کوئی لڑکا ہو ۔ بھرا ہوا

جسم ۔ سانولا رنگ ۔ کنڈل والے بال اور شربتی آنکھیں ۔ جو دور۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہیں تھیں ۔ خواب آلود آنکھیں ۔ جیسے کسی اور دنیا میں رہتی ہوں ۔ نہ جانے برجیس کو کیا ہوا ۔ بڑھ کر چق کا کونا سرکا لیا اور شگاف بنا کر دیکھنے لگی ۔

اس روز سلائی کا کام کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی ۔ لٹ کھسک کر ماتھے پر آ پڑی ۔ دوپٹہ سر سے سرک گیا ۔ کان کا آویزہ یوں لرزاں رہا گویا ۔ پل کے نیچے گہرے دریا میں کشتی ڈول رہی ہو ۔ مشین کی آواز میں ایک نغمہ رقصاں رہا ۔ شائد اس لئے کہ نائب اور اس کی نئی نویلی بیوی کو دیکھ کر اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ آپ نئی نئی پل پر آئی تھی ۔ وہ بھی کیا دن تھے ۔

اقبال گاڑی پاس کر کے جلدی جلدی گھر آتا ۔ اسے یوں کھوئی کھوئی دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا ۔ کہاں ہو" ؟ وہ پوچھتا ۔ "کہیں بھی نہیں" وہ مسکراتی "اونہوں" وہ قریب تر سرک آتا "کہیں دور ۔ دور ۔ برج" وہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے قریب تر کھینچ لیتا ۔ "تم تو یوں کھوئی رہتی ہو جیسے کوئی اکیلا جزیرہ ۔ کھلے سمندر میں" "تو پھر میں کیا کروں" وہ شرما سی جاتی ۔ "اچھا" وہ ہنس کر کہتا "تو مجھے ہی کرنا پڑے گا" ؟ کیا "وہ بھولی بن کر پوچھتی" اس اکیلے جزیرے کو کھے کر کنارے لگانا پڑے گا اور کیا ۔ چھوڑو بھی نا اب یہ کام" وہ اس کے ہاتھ سے کپڑا یا سویٹر چھین کر پرے پھینک دیتا ۔ کھویا کے بے تکلف ہاتھ پتوار بن جاتے اور ناؤ ڈولنے لگتی ۔ ۔ ۔ ڈولتی ڈولتی نہ جانے کس کنارے کی طرف بہہ نکلتی ۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔ زن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔۔۔۔ ۔۔ ۔ !! ۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔ گاڑی پل سے گزر جاتی ۔ اور مسافروں کو شبہ تک نہ ہوتا کہ دو سرحدیں مل رہی ہیں ۔

"تو یہ ہے نیا نائب" ۔ برج نے اقبال سے کہا ۔

"تم نے دیکھا ہے اسے' اقبال نے پوچھا

"معلوم نہیں" ۔ وہ مشین چلاتے ہوئی بولی ۔ "سٹیشن کی طرف سے آ رہا

تھا ۔ ریل کا بابو تو دکھتا ہی نہیں ۔ کنڈیالے بال ۔ سانولا رنگ کھوئی کھوئی نگاہیں" ۔ "ہاں" اقبال مسکرایا ۔ وہی شاعر سا ۔ نیا نیا ہے نا ۔ آپ ہی بن جائے گا بابو ۔ بابو بنتے دیر لگتی ہے کیا" ۔

"عجیب سی جوڑی ہے" وہ مسکرائی

"کیوں" ۔

"اس کی بیوی کی بات کر رہی ہوں" ۔

"کیا ہے ، اسے ۔ بنتی تو نہیں ؟"

"اونہوں ۔ ابھی تو بچی ہے ۔ بنے گی کیا ۔ بالکل لڑکی ہے وہ تو" ۔

"تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی" ۔

"عجیب تو کچھ نہیں ۔ ویسے بات کر رہی ہوں ۔ لڑکی کو دیکھو تو گلابی پنڈے کی چوکی بھری ہے اور میاں ۔۔۔۔۔۔ ۔ جیسے دور نہ جانے کونسی نگری میں بھٹک رہا ہو ۔ ۔۔ ۔۔۔ ۔ ۔ ۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا ۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا" ۔

وہ ہنسنے لگا ۔ "تمہاری تو عادت ہے برج ۔ تمہیں کوئی جوڑی ، جوڑی معلوم ہی نہیں دیتی ۔ یاد ہے مجھے کہا کرتی تھی تم ۔ ۔ ۔ آپ کو تو ہر وقت کنارے لگانے کی ہی فکر رہتی ہے ۔ کبھی جزیرے کو اپنی جگہ ڈولنے بھی دیا کیجیئے ۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔ پگلی اسی کو شادی کہتے ہیں ۔ شادی پل ہے پل ۔ دو مختلف علاقے جوڑنے والا پل ۔ جیسے تم ۔ ۔ ۔"

"میں ۔ ۔ ۔" وہ شرما گئی ۔

"ہاں ۔" تم بھی تو برج ۔۔۔ "میرے دل کے زخموں کو جوڑ دیتی ہو نا ۔"

"لگے بھرمانے ۔ ۔ ۔" وہ ہنسی ۔

"شادی اور ہے ہی کیا ۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا ۔ ایک دوسرے کو

بھرمانا ۔ اسی بندھن کا نام ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا بندھن ہے" ۔ وہ ہونٹ نکال کر بولی "کہیں میاں حاضر اور بیوی کا کوسوں پتہ نہیں ۔ کہیں بیوی حاضر پر میاں نہ جانے کہاں" ۔

"پگلی" وہ قریب تر ہو بیٹھا۔ "اگر دونوں غیر حاضر ہوں تو بات کیسے چلے" ۔ اس نے بات چلاتے ہوئے کہا ۔

"کوئی ایک بھی حاضر نہ ہو تو ۔ ۔ ۔ چھوڑو بھی" وہ اپنا آپ چھڑا کر بولی ۔

"اونہوں ۔ حاضر ہونا ہی پڑے گا" ۔ وہ ازسرنو پاس ہو بیٹھا ۔

ہائے میرے اللہ ۔ ایسی حاضری سے تو غیر حاضری ہی بھلی' ۔

"برج" ۔ وہ اس کے کان سے منہ لگا کو بولا ۔ "تم میری زندگی کے دکھی پانیوں پر ایک پل ہو ۔ نہ جانے کہاں رہتی ہو تم ۔ پاس ہوتے ہوئے بھی اتنی دور ۔ ۔ ۔ دور" ۔

"دور رہنے والوں کو آپ کیا جانیں" ۔ اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا ۔

"تمہیں قریب لانے کے لئے مجھے اتنی دور سے آنا پڑتا ہے" ۔ وہ ہونٹ قریب تر لاتے ہوئے کہنے لگا ۔

"کون آتا ہے" وہ دبی زبان سے گویا اپنے آپ سے بولی ۔

"میں جو آتا ہوں"۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے ۔

"خود آنے کے لئے نہیں دوجے کو صرف اپنے پاس لانے کے لئے" وہ پیچھے سرک کر گنگنائی ۔

لیکن اس کی آواز گاڑی کے شور میں دب گئی ۔ جو نہ جانے کسے لانے کے لئے آ رہی تھی ۔ جا رہی تھی ۔ پل ریل گاڑی کے پہیوں تلے جھول رہا تھا نیچے دکھی پانی کا گہرا بہاؤ جھوم رہا تھا ۔

اس واقعہ کے بعد ان کے گھر میں نئے پڑوسیوں کی بات چل نکلی ۔ جب کبھی وہ اکٹھے بیٹھتے اور کوئی بات شروع ہوتی تو پتہ نہیں کیسے بات ہی بات میں نائب یا اس کی بیوی کا تذکرہ چھڑ جاتا ۔ مثلاً اسی روز شام کو برجیس بولی "آپ نے سنا" ۔ اور مسکرا دی ۔

"کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"اس کا نام نظر ہے نظر ۔ ویسے کہتے ہیں نظراں"

"کس کا" وہ حیرانی سے پوچھنے لگ ۔

"اپنے نائب کی بیوی کا اور کس کا ۔ وہی بات ہے آنکھوں کی اندھی نام ۔ ۔ ۔"

"کیوں بیچاری کو ۔ ۔ ۔" وہ بات کاٹ کر بولا ۔

"ایمان سے بالکل بیچاری ہے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ "سبھی باتیں ہیں اس میں بس ایک نظر نہیں" ۔

"اور جانتی ہو میاں کا کیا نام ہے ؟ شاعر ہے نا" ۔

"کیا نام ہے ؟"

"عجیب سا ہے ۔ نہاں رومانی" ۔

نہاں ۔ ۔ ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی "بی بی نظر میاں نہاں ۔ سبحان اللہ کیا جوڑی ہے" ۔

"کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہو" ۔

"خدا کی قسم مذاق نہیں ۔ آیئے نا ذرا ۔ دکھاؤں آپ کو ۔ برج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا ۔

"میں دیکھوں ؟ لاحول ولا قوۃ" ۔

"لاحول کی کیا بات ہے ، ویسی نظروں سے نہ دیکھنا بس" ۔

"وہ دیکھیے چولہے کے سامنے چوکی پر" ۔ برج نے کھڑکی کی درز سے لگ کر

کہا ۔۔۔۔ "ہے نا مجسم انتظار ۔ منتظر بیٹھی ہے ۔ توبہ ۔ خالص گوشت پوست ہے ۔ جیسے قدرت نے عورت کو تنگ کر دیا ہو"۔

"ہاں" ۔ وہ مسکرایا ۔ اب چھوڑو بھی ۔" اور وہ واپس کمرے میں آ گئے ۔ 'ہاں واقعی عجیب جوڑا ہے'، اقبال ہنسا

"یہ بیچاری جیسے راہ تکنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ ہو اور وہ جیسے راہ کھو کر سرگرداں ہو"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میاں کسی اور سے لَو لگائے بیٹھے ہیں ۔" اقبال مسکرایا ۔

"خواہ مخواہ کسی پر الزام دھرنا ۔ آپ تو" ۔ وہ چڑ کر بولی ۔

"شائد یہی بات ہو" ۔

"ہاں شائد ۔۔۔۔۔۔ لیکن بی بی تو علانیہ منتظر بیٹھی ہے ۔"

"ہاں میاں کی منتظر ۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔" وہ مسکرایا ۔

"ہوں میاں کی ؟" اس نے بات کاٹ کر کہا ۔ "کسی کی بھی کیوں نہیں ؟"

"بھئی پھر کرے کیا ؟ میاں کسی اور جگہ لو لگا لیں تو بیوی کو بھی حق حاصل ہے کہ کسی کے انتظار میں بیٹھ جائے"۔

"واہ" ۔ وہ تڑپ کر بولی "شادی نہ ہوئی مذاق ہوا" ۔

"میرا یہ مطلب نہیں کہ ضرور لو لگا لے کسی سے ۔ لیکن لگا لینے کا جواز تو مل جاتا ہے ۔ اخلاقی طور پر" ۔

"سچ ؟"

"ہاں ہاں انصاف تو یہی ہے" ۔ وہ سنجیدگی سے بولا ۔

"بڑے منصف تو دیکھو ۔ اپنے آپ پر بیتے تو ۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ ۔"

"اللہ نہ کرے میں کسی سے لو لگاؤں" ۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔

"بڑے بگلا بھگت ! نہ جانے کس کس سے لگائی ہو گی" ۔ اس نے ہونٹ

نکال کر کہا :

"نہیں برج ۔ صرف تم ہو ۔ صرف تم" ۔ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا ۔

"اچھا" ۔ "مان لیا لیکن کل کی بات کون جانتا ہے" ۔

"ہاں کل کی تو کہہ نہیں سکتا لیکن آج تک ایک تم ہو ۔ تم" ۔ وہ پیار سے بولا ۔

"اچھا وہ مسکرائی آپ کو یقین ہے کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ؟"

"کیا" اس نے پوچھا ۔

"کہ میاں لگا لے تو بیوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں وہ بولا ۔ انصاف کی بات تو یہی ہے

"مردوں کے انصاف کو" وہ ہنسی ۔ "کون نہیں جانتا مردوں کے انصاف کو"

"ٹھیک ہے ۔ ٹھیس تو لگتی ہے لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا ۔

چلو چھوڑیئے اس قصے کو کیا واہیات بات ہے ہمیں کیا غرض ۔ وہی جانیں بی بی منظراں اور بابو نہاں" وہ ہنسنے لگی ۔

پہلے چند روز تو اقبال حیران رہا ۔ بات ہی ایسی تھی ۔ کیونکہ اس سے پہلے برجیس کا برتاؤ قطعی طور پر مختلف تھا ۔ اگر اقبال کسی پڑوسن میں دلچسپی ظاہر کرتا تو وہ نیچے جھاڑ کر اس کے پنجے پڑ جاتی "خیر تو ہے بہت چمک رہے ہیں آپ" اگر کسی غیر عورت کی بات چھڑ جاتی تو اسے اجازت نہ تھی کہ اس کے متعلق دلچسپی کا اظہار کرے ۔ گھر میں کوئی آ جاتی تو اسے باہر جا کر ٹہلنا پڑتا ۔ صحن میں جانے کی تو بالکل اجازت نہ تھی اسے ، کیونکہ صحن میں کھڑکی کھلتی تھی ۔ اور پڑوسیوں کی بے پردگی کا احتمال رہتا تھا ۔ لیکن اب وہی برجیس اکثر آپ دعوت دیتی کہ وہ درز میں سے منظر کو دیکھے ۔ دوڑی دوڑی پاس آتی ۔ "آیئے آپ کو

کچھ دکھاؤں" اور اس کا بازو پکڑ کر لے جاتی ۔ آج تو حد ہو گئی ۔ آپ کی قسم ۔ "اگر وہ عذر پیش کرتا تو طنزاً چلاتی" ۔ بس اتنی ہمت ہے ۔ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کیا ۔ ایک آنکھ دیکھ کر چھلک جاتے ہیں یہ مرد ۔ ہم بھی تو پردے میں سے مردوں کو دیکھتی ہیں ۔ پر مجال ہے جو پاؤں ڈگمگا جائیں ۔

"اوہ میں سمجھی ---------- ۔ فکر نہ کریں آپ" "فکر کیسا" وہ پوچھتا ۔ "بس ۔" وہ جواب دیتی ۔ "آخر کوئی ہوگا ہی نا ۔" حتٰی کہ وہ ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتا ۔ پھر وہ درز سے لگے کھڑے رہتے ۔ اس دوران میں برج زبان کی بجائے کہنی سے باتیں کرتی ---- پھر ایک دن جب وہ برج کے کہنے پر کھڑکی سے جھانکنے کے لئے گیا اور درز میں سے دیکھا تو بوکھلا سا گیا ۔ "حد ہو گئی" اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا ۔ چونکہ سامنے نتظر صحن میں نہا رہی تھی ۔ شربتی پنڈا ۔ جو چٹا سفید ہونے کے علاوہ جوانی سے بھرا ہوا تھا ۔ بوٹا سا قد ۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا لیکن دیکھا تو برج وہاں تھی ہی نہیں ۔ ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر اردگرد دیکھ ازسرنو شست باندھ کر کھڑا ہوگیا اور دیر تک دیکھتا رہا ۔

پھر وہ آپ ہی آپ موقعہ کی تلاش میں رہنے لگا ۔ جب کبھی موقعہ ملتا چپکے سے درز سے لگ کر نتظر کو دیکھتا رہتا ۔ ایسی دلچسپی ہو گئی اسے ۔ بلکہ کئی مرتبہ وہ بھاگا بھاگا برج کے پاس جاتا "آؤ برج تمہیں کچھ دکھاؤں" ۔ ایک ساعت کے لئے برج کی آنکھ میں چمک لہراتی "آؤ بھی وہ چلاتا ۔ دیکھو تو چولہے کے سامنے بیٹھی ہونٹوں پر سرخی لگا رہی ہے ایک وہ ہے کہ بچاری کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں ۔ اور ایک تم ہو ۔ ---------- ۔ آؤ بھی نا ۔

"آپ ہی دیکھیئے" وہ لاپروائی سے کہتی ۔ "وہ چلاتا ۔ "اونہوں --------- سرخی لگانے سے کیا بنتا ہے وہ مشین چلاتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جاتی" ۔ جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا ؟"

"بہت جانتی ہو تم اس کی روح کو" وہ طنزاً کہتا ۔

"جانتی تو نہیں پر سمجھتی ضرور ہوں" ۔

"بہت روحانی طاقت ہے تم میں" ۔

"آپ کیا جانیں" وہ ہنستی ۔

"اب اٹھو بھی نا" وہ کھسیانا ہو کر کہتا ۔

"میں تو روز دیکھتی ہوں ۔ آپ ہی دیکھیئے جا کر" ۔

"نہیں برج" ۔

"اوسان کھونے کی کیا ضرورت ہے" ایک دن وہ لاپروائی سے طنزاً بولی ۔ "ایسا شوق ہے تو ملا دوں دونوں کو" ۔

"تم" وہ چلایا ۔ "تم اور ایسی بات ۔ پہلے تو ــــــــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا" ۔

"کیوں ؟"

"پہلے تو تم ایسی بات پر غصے سے بھوت بن جایا کرتی تھیں ۔ یاد ہے رحمت کی ماں کے متعلق کتنا پاکھنڈ مچایا تھا تم نے" ۔

وہ مسکرا دی ۔

"اب بھی مذاق کر رہی ہو ۔ میں جانتا ہوں لیکن پہلے تو ایسا مذاق سہا نہ جاتا تھا تم سے" ۔

"ہاں" وہ ہنسی ۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ جسم کے میل سے کیا ہوتا ہے ؟" اس کی ہنسی میں مایوسی اور طنز کی جھلک تھی ۔

"لیکن اس کی عزت کا خیال نہیں کیا" ۔ وہ نںظراں کے گھر کی طرف ہاتھ چلا کر بولا ۔

"آپ ہی تو کہتے تھے ۔ میاں کسی اور سے لو لگالیں تو بیوی ــــــــ ۔" وہ رک گئی ۔

"اچھا تو اب تم ہم دونوں میں پُل بنو گی" وہ ہنسنے لگا ۔

"میں کیوں بنوں ۔ پل تو وہ ہے ۔ آپ کی منظراں" ۔

"ہوں تو تمہارے حساب سے میں گاڑی ہوا ۔ مگر پل اور گاڑی ملائے گی کیسے ۔ دو علاقے بھی تو ہوں" ۔ اس نے مذاق سے کہا ۔

"بیچاری" وہ اپنی ہی دھن میں بولی ۔ "سارا سارا دن انتظار میں بیٹھی ہے ۔ کب گاڑی آئے اور اوپر سے گزرے" ۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ پھر قریب ہو بیٹھا ۔ "برج" ۔ اس نے پیار بھری آواز میں کہا ۔ "برج" اس کے بے تکلف ہاتھ کسی پل نما ابھار کو ناپنے لگے ۔

"اونہوہ" ۔ وہ چلائی ۔ "نہ جانے آپ تو ہر سمے ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔"

اقبال نے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی ۔ وہ آواز اس کے کانوں میں پڑی ۔ کنپٹیوں میں تھرکنے لگی ۔

"برج" وہ چلایا ۔ وہ جھجک کر اُٹھ بیٹھی ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ "کیا کرتے ہیں آپ" ۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ اور سامنے کھڑی گاڑی کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔ "دیکھیئے نا" ۔ اس نے اقبال سے کہا ۔ "سب مسافر اپنی اپنی دھن میں لگے ہیں ۔ کسی کو احساس نہیں کہ گاڑی رک گئی ہے" ۔

"ہاں وہ ہنسا" ۔ لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے "ان کا مطلب تو پہنچنے سے ہے ۔ آخر پہنچ ہی جائیں گے" ۔

"کون جانتا ہے" ۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی ۔

"پگلی وہ ہنسا ۔ "جو چل پڑے وہ پہنچ ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی ۔"

"سچ ؟" وہ کھوئی کھوئی بولی ۔

"ہاں" ۔ وہ پاس آ کھڑا ہوا ۔ اس کے بے تکلف ہاتھ پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے ۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی ۔ اور اس کی پہنچ سے دور ہو کر بولی ۔ "اونہوں ۔ اُدھر" اس نے نظر کے گھر کی طرف اشارہ کیا ۔

باہر سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکی اور کھڑکی میں سے دیکھ کر مسکرا دی ۔

"کون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نائب ہے" اس نے پوچھا ۔

"ہاں ۔ سیٹی کی آواز سنی آپ نے ۔ دور دیس کا رہنے والا بجا رہا تھا" ۔

بیچارہ پرائے دیس گیا ہے نا" ۔

"ہاں" وہ ہنسی اور پھر اقبال کی بات دہرانے لگی "جو چل پڑے آخر پہنچ ہی جاتا ہے نا" ۔

ہاں تو دن رات وہ دونوں نظر اور نہاں باتیں کیا کرتے ۔ روز بروز اقبال کا شوق بڑھتا جاتا ۔ اور وہ درز میں سے نظر کو دیکھتا رہتا ۔ ادھر نظر میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ کوئی اسے چوری چوری دیکھتا ہے ۔ شائد اسی وجہ سے اسے احساس تنہائی اور انتظار کم ہوتا گیا ۔ روز بروز برجیس کی نگاہیں اور بھی پرے ہٹتی گئیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔۔۔۔

پھر نظر نے ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا ۔ حتیٰ کہ وہ سارا سارا دن برج کے پاس رہنے لگی ۔ اقبال کے ذکر پر نظر کی آنکھ میں چمک لہراتی ۔ برج منہ موڑ کر مسکراتی اور پھر نظر کی طرف ایسے معصوم انداز سے دیکھتی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔ نہاں کی بات ہوتی تو برج انہماک سے کام میں مصروف ہو جاتی ۔ یا نہ جانے کیوں عین اس وقت مشین کی سوئی میں سے تاگا نکل جاتا اور اسے جھک کر تاگا پرونا پڑتا ۔ اگرچہ یوں کرنے سے اس کا کان نظر کے منہ کے قریب تیز ہو جاتا ۔ پھر دوپٹہ سر سے ڈھلک کر نیچے گر جاتا اور نیلا آویزہ ڈولتا ۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی ڈول رہی ہو ۔

اکثر جب ایسے سمے اقبال آ جاتا تو نظر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنا آپ چھپانے کی کوشش میں لگ جاتی ۔ "لاحول ولا قوۃ" اقبال کے منہ سے بیساختہ

نکل جاتا یا شائد خود ساختہ ۔ بہرحال وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا ۔ پھر نظر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی "توبہ باتوں میں پتہ ہی نہ چلا ۔ ان کے آنے کا ۔ نہ جانے مجھے یوں بیٹھے دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے دل میں" ۔ اور برج مسکراہٹ بھینچ کر کہتی ۔ "واہ اس میں کیا برائی ہے ۔ انہوں نے دیکھ لیا تو کیا یوں گھبرانے لگیں تم تو گزارہ کیسے ہو گا ۔" ایک دن وہ چڑ کر بولی ۔ "تو کیا سامنے آ جایا کروں ان کے ۔ پھر تم کیوں پردہ کرتی ہو اُن سے" ۔

"کہاں کرتی ہوں میں" ۔ وہ مشین میں تاگا پروتے ہوئے بولی ۔ اور مسکرائی ۔

"لیکن وہ تو کبھی آئے ہی نہیں ۔ تمہارے سامنے نظر آپ ہی آپ بولی ۔

"تو یہ میرا قصور ہے کیا" ۔ برج ہنسی ۔

"وہ آ بھی جائیں تو نہ آنے کے برابر ۔" نظر ہنستے ہوئے بولی ۔

"کیوں ؟"

"ان کی عادت ہی ایسی ہے ۔ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں ۔ نہ جانے کیا ہے انہیں" وہ منہ بنا کر گویا اپنے آپ سے گنگنائی ۔ اور پھر کسی گہرے خیال میں ڈوب گئی ۔

اس روز شام کو برج اداس بیٹھی کچھ سی رہی تھی ۔ پاس سعیدہ کھیل رہی تھی ۔ اقبال ابھی سٹیشن پر ہی تھا کہ نظر آئی اور بولی ۔ "ذرا سی شکر ہو گی ۔" برج کام کرتے ہوئے کہنے لگی ۔ "اندر باورچی خانے میں ہے ۔ سبز سا ٹین ہے ۔ خود ہی لے لو جا کر ۔" اس کے جاتے ہی اقبال آ گیا ۔ پیٹی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی ۔ آتے ہی پوچھنے لگا ۔ "میری دھوتی کہاں ہے ۔" ۔ عین اس وقت سوئی میں سے تاگا نکل گیا ۔ برج جھک کر تاگا ڈالنے لگی ۔ اس کا ہاتھ کانپا ۔ لٹ منہ پر گر پڑی ۔ کان میں نیلا آویزہ لرزنے لگا ۔ بولی "اندر باورچی خانے میں کھونٹی پر ہو گی ۔" "اچھا کہہ کر وہ باہر صحن میں نکل گیا ۔

برج نے منہ اٹھایا تو آنکھیں بھیگی سی تھیں ۔ منہ پر سرخی کی جھلک تھی ۔

"اماں" سعیدہ چلائی ۔ "روتی ہو تم" ۔

"اوں ہوں" اس نے مسکرا کر کہا ۔

"پھر یہ آنچھوں" ۔ سعیدہ نے اس کی گال پر انگلی رکھ کر کہا ۔

برج نے پیار سے سعیدہ کی انگلی چوم لی ۔

"نہیں نہیں ------"

"نظر -------"

اندر سے آوازیں سنائی دیں ۔ برج کے کان میں نیلا آویزہ اور بھی لرزنے لگا ۔

"اوں آنچھو ہیں" سعیدہ تتلا کر بولی ۔

"کہاں ہیں ؟"

"کھوشی کے ہیں ؟" سعیدہ نے پوچھا ۔

برج سر ہلا کر مسکرا دی ۔

آبا ۔ "گاڑی "------ سعیدہ گاڑی کو آتا دیکھ کر چلائی

برج نے اسے اٹھا لیا اور دروازہ میں جا کھڑی ہوئی ۔ اس وقت اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ دروازہ کی چک لپٹی ہوئی ہے ۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں ۔ ------ اور نجانے کہاں دیکھ رہی تھیں ۔ دور ---

"امی -----بابو" سعید نائب کو آتے دیکھ کر چلائی ۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی ۔

گاڑی میں مسافر منزل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ پُل ایک سٹیشن ہے ۔ ایک اہم سٹیشن جو دو سرحدوں کو ملاتا ہے ۔ بلکہ وہ سٹیشن کے وجود ہی سے منکر تھے ۔ اور انہیں پتہ نہ تھا ۔ کہ ایک اہم

منزل گزر رہی ہے ۔ گزر چکی ہے یا وہ غیر علاقہ میں داخل ہونے والے ہیں ۔

التبہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا ۔

"ہائے میرے اللہ" وہ دفعتاً نائب کو دیکھ کر چلائی ۔ اور پیچھے ہٹی ۔

"ہائے میرے اللہ" باورچی خانے سے مدھم آواز سنائی دی ۔

"ہائے میرے اللہ ۔ ہائے میرے اللہ" گاڑی شور مچاتی ہوئی غیر علاقہ میں داخل ہو گئی ۔

.......O.......

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی ۔ احسان علی کی ۔ محلے میں کون تھا ۔ جو ان کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا ۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے ۔ جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی ۔ تو کھانسی کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے ۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا ۔ محلے کے کنوئیں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی ۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں ۔ مٹیار عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ۔ خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ کوئی بات کریں ۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں ۔

مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی ۔ "یہاں کھڑے کسے تاڑ رہے ہو احسان علی ؟"

"یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے ۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا ۔

"اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو ۔" بھابی کہنے لگی ۔ "اللہ رکھے جوان ہوگیا ہے ۔"

"اور تو کیا اپنے لیے دیکھ رہا ہوں بھابی" احسان علی مسکرایا ۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا ۔ احسان ہنس کر بولا ۔ "دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی چاچی اپنے لئے دیکھوں تو لوگ گھورتے ہیں کسی اور کے لئے دیکھوں تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں ۔"

جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا ۔ ایسا جواب دیتے کہ سنکر مزا آ جاتا ۔

شاداں نے یہ سنکر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی ۔ "چاچی اس عمر میں اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا ۔"

احسان علی نے آہ بھری ۔ بولے ۔ "کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں ۔"

"اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی ۔" شاداں مسکرائی ۔ "ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں ہٹی ۔"

"اچھا شاداں ایمان سے کہنا ۔" وہ سنجیدگی سے بولے "کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے ۔ ؟"

"ہائیں چچا ۔" شاداں ہونٹ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی ۔ "میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے ۔" وہ ہنسے ۔ "جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں ۔ لیکن جب جوان تھی تو بہ جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں ؟ ۔"

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے ۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا ۔ "توبہ بہن ، احسان علی اور بات کرنے سے چوکے ۔"

چاچی بولی ۔ "ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی ۔ اب تو باتیں ہی باتیں ہیں ۔"

"لے بہن" شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ "اب کونسا حاجی بن گیا ہے اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے ۔"

"لیکن شاداں" بھابی نے کہا ۔ "شاباش ہے ۔ اس کو ۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی نظر سے نہیں دیکھا ۔"

"یہ تو میں مانتی ہوں ۔" شاداں نے ان جانے میں آہ بھری ۔

"یہ وصف بھی کسی کسی میں ہوتا ہے۔" چاچی نے کہا۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سنی تھی تو بولے۔

"اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں"

"کیوں"۔ چاچی نے ہنس کر کہا۔" یہ کیا جھوٹ ہے۔ تمہاری یہ بات واقعی خوب ہے۔ میں تو منہ پر کہوں گی احسان علی۔"

"لو چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا۔"

احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔"چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلّی کنوئیں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی بہن آج کی رات یہیں بسر کریں گے۔"

"یہ بلّی کا قصہ کیا ہوا۔" چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔" شاداں بولی۔

"بس تو چھوڑ اس بات کو۔" بھابی نے کہا۔ "احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا؟"

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے۔"چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے۔ بیچاری ایسی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟"

"ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟" شاداں چلائی۔

"سمجھی بھی ہو اس کی بات؟" بھابی مسکرائی۔

"سب سمجھتی ہوں۔" چاچی نے ہنس کر کہا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔"شاداں بولی "کہ محلے والیاں ایسی ہیں، پر میں پوچھتی ہوں۔ چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی ریجھ جاتے اس پر؟"

"تم اس کی باتیں سنو۔" بھابی نے کہا۔

"توبہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے" چاچی ہنسی ۔

"کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزا چکھا دیتی تمہیں چچا ۔" شاداں آنکھیں چمکا کر بولی ۔ "جوتا دکھا دیتی میاں کو ۔ کیوں بھابی ؟"

"واہ" احسان علی مسکرائے ۔ "شاداں جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی ۔"

"ہائے میں مرگئی ۔" شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔

"احسان علی تم پر خدا کی سنوار" چاچی نے ہاتھ چلایا ۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے ۔ ان کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے ۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی ۔ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں ۔ جوان مٹیار۔بس تو اب بھی پلا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔

جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا ۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا ۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی ۔ "ہائے میں مرگئی ۔ یہ تو اپنا احسان علی ہے ۔" ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی اسے مخدوش نگاہوں سے گھورتی تھیں ۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھالیتے ۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے ۔ اور یوں ہمکلام ہوتے جیسے فراخدلی کیوجہ سے ان کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے ہوں ۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں اکثر کہا کرتے ۔ "بوڑھا ہوگیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی ۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے ۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی"

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے ۔ باباجی ۔"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے ۔"

"دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے ۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے کیا ؟ وہی چھیڑ خانی ۔ لاحول ولاقوۃ ۔"

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہو چکے تھے ۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبسّم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں ۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی ۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو کر واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا ایمپائر بن کر کھڑے ہو جاتے ۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصّہ لینے پر مجبور کرتے ۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے ۔ چچا جی ہمارے آڑی بنیں گے ۔" نہیں ہمارے ۔" ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں ۔"لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں ۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی ۔ "بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے" سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی "ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی ۔ شاہ نشین سے چاچی بولتی ۔ "توبہ شاداں تو بھی کسی رخ چین لینے نہیں دیتی ۔ شکر کرکہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے ۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے ۔" مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انہیں دیکھ کر ہنستا "کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے ۔ اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو ۔" احسان علی ہنس کر گنگناتے "وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار ۔" دوسرا آ کر کہتا "دنیاداری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی ؟ صوم و صلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو ۔" احسان علی کہتے "باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا ۔" "لاحول ولاقوت ۔" باباجی بڑبڑاتے "لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آگیا ۔" احسان علی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ ویران دکھائی دیتا تھا ۔ اگرچہ سردیوں میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر آزار بند بنا کرتی تھیں دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں ۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے ۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں ۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا ۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آواز سی

پیدا کرتے ۔ تیلیاں ٹکراتیں ۔ آزار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی گلے ہوتے شکائیتیں کی جاتیں ۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے ۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی ۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی ۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے ۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے ۔ اولیا کرام کی حکایت سنائی جاتیں ۔ ہنگامہ تو رہتا مگر اس میں مزاح کی شرینی نام کو نہ ہوتی عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا ۔

پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آبسے ان کے بعد محلے کا رنگ ہی بدل گیا ۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آنکلتے اور آتے ہی ایسی بات کہہ دیتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا ۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے ۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سننے لگتے ۔ لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے ۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا ۔ اس پر احسان کھلکھلا کر ہنس پڑتے ۔ "بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔" احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی ۔

پھر ۔۔۔۔۔۔ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا ۔

چوگان میں عورتیں حسبِ معمول جمع تھیں ۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی ۔ کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو دیکھ لیا ۔ چاچی کو اشارہ کرکے با آواز بلند بولی "چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے

بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں ۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں ۔"

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا ۔ "تم تو خواہ مخواہ اس بیچارے ـــــ۔"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا ۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی" شاداں نے پھر سے بات شروع کی ۔ "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی ۔"

"ہاں شاداں چچی نے منہ پکا کر کے کہا ۔ "زمانہ ہی ایسا آیا ہے ۔"

اس کے بعد مجمع پر خاموشی چھاگئی ہر کوئی احسان علی کی بات سننے کی منتظر تھی ۔ اگرچہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو ۔

احسان علی آئے اور چپ چاپ ان کے پاس سے گزر گئے ۔

انہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران رہ گئیں ۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہے ؟" چاچی زیر لب بولی ۔

"میں تو آپ حیران ہوں"۔ شاداں ہاتھ ملنے لگی ۔

"کہیں گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے تھے ۔" شاداں نے پوچھا ۔

"لو ـ۔" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا ۔" جس روز نواب بی بی سے لڑے ۔ اس روز تو اور بھی چمکا ہوا ہوتا ہے ۔ کیوں بھابھی یاد ہے ۔ کل کیسے ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سنا رہا تھا ۔

"ہاں " بھابی مسکرائی جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا ۔

"اس کا کیا ہے" چاچی بولی "اس کے لیے تو ہر بات تماشہ ہے چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی ۔"

"ہائے چاچی کیسی اچھی طبعت ہے ۔ احسان علی کی ۔ کبھی ماتھے پر

تیوری نہیں دیکھی ۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا ۔"

"پر میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے ۔" بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی ۔

شاداں آزار بند لپیٹتے ہوئے بولی "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں ۔"

"اے ہے دو جوڑے تو چڑھا لینے دے" بھابی نے کہا ۔

"ہونہہ دو جوڑے اتنا لوبھ بھی کیا ۔" اس نے اٹھ کر بھابی کے آزار بند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی ، کہنے لگی ۔ "خیر تو ہے ۔ احسان علی کو کیا ہے آج ؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا ۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا ۔ اسے باہر جاتے ہوئے" بھابی نے کہا

"میں نے تو انہیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا ۔" شاداں بولی ۔ "میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا ۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی ۔ کہیں میری بات کا بُرا نہ مان لیا ہو ۔ توبہ میں نے بات ہی کیوں کی ۔

"اونہوں ۔" نواب بی بی نے کہا ۔ "برا ماننے والا نہیں وہ ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا ۔ جو یوں پاس سے گزر گیا ۔" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے" نواب بی بی نے کہا ۔ "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج "لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے ۔"

ہائیں میں مر گئی" شاداں چلائی ۔ آپ اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے کیا ۔۔۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔"

اس میں حرج ہی کیا ہے ۔" چاچی بولی اللہ رکھے جوان لڑکا ہے ۔ آپ کماتا ہے لکھدیا تو کون سی قیامت آگئی ۔"

"میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔ اس بات میں ۔"

"اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی ۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامرد کر دو ۔ لیکن ان کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں اتنی عمر ہو چکی ہے ۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی ۔"

"نہ بہن" چاچی بولی "مجھ سے تو آپ اس نے کئی بار کہا کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا اس کی شادی کر دیں گے ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ آج کل یہ کام لڑکے کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتے ، بات بھی سچی ہے ۔"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے ؟ شاداں چلّائی

"سچ ؟" بھابی ناک پر ہاتھ رکھ کر بولی ۔

"ہاں بھابی ۔" نواب بی بی بولی ۔" پہلے تو لڑکے کو اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اس نے اپنی بیوی کا چناؤ کرلیا ہے تو جزبز ہو رہے ہیں ۔"

کون ہے وہ ؟ چاچی نے پوچھا ۔

مجھے کیا معلوم ۔ اسکول میں استانی ہے ۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اسکی ۔" ہم بھی تو دیکھیں" شاداں نے منت کی ۔

"نواب بی بی اٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی ۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم ۔" شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی ۔

"اے ہے ۔" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں ۔"

توبہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے ۔"بھابھی ہنسی ۔

کتنی خوبصورت ہے ۔"شاداں بولی ۔ "احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی ہے بھلا ۔

عین اس وقت احسان علی آگئے ۔ شاداں کی بات سن کر وہ گھبرا گئے ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے ۔ پھر کمرے سے باہر جانے لگے ۔ لیکں شاداں کب

چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چچا ۔" وہ بولی نئی بہو مبارک ہو محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں ۔ اللہ رکھے لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ۔"

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا چہرہ فق ہوگیا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولا ۔"وہ تو بے وقوف ہے بے وقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں ۔ بیاہنے کے لئے نہیں بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا ؟"

"کیوں اس کو کیا ہے ؟" شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے ۔"

یہی تو مصیبت ہے ۔"وہ سر کھجلاتے ہوئے بولے ۔

"آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو ۔ احسان علی ۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا ۔"بھابی بولی ۔

""پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں ناں بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو یہ دیکھو لو یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے "وہ جوش میں بولے ۔ "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے ۔

"کیوں نواب بی بی کو کیا ہے ۔" چاچی ہنسی ۔

میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے ۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی ؟"

"آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت بیوی ہو ۔ اس میں حرج ہی کیا ہے ؟"

شاداں مسکرائی۔

میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے ۔ لیکن چاچی یہ ستریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں ۔ بیاہنے کیلئے نہیں ۔"

"ہائیں ۔"شاداں نے ناک پر انگلی رکھ لی ۔ "احسان علی تم نے تو حد کر دی ۔"

"کوئی محلے کی بیاہ لیتا ۔ پھر چاہے جہاں مرضی ہے یارانے لگاتا پھرتا ۔"

احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے ۔

"توبہ میری ۔ احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے ۔" چاچی بولی ۔

"لو اسے دیکھو نا ذرا" احسان علی نے پھر تصویر ان کے سامنے رکھ دی ۔ "یہ آنکھیں !! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں ۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا ۔"

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا ۔ بھلی اچھی تو ہے" شاداں مسکرائی ۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہوتا ۔" احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگے ۔

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو ۔" چاچی ہنسی

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا ۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں ۔ آخر مجھے بھی تو اس گھر میں رہنا ہے ۔" وہ مسکرائے ۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی ۔ "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا ۔"

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اسی طرح گم سم ہوگئے ۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے ۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھے ۔" حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہیئے ۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے ۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھدے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں ۔"

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی ۔ چٹکلے سنائے ۔ اپنے تجربے اور مشاہدہ کو پیش کرنے کے لیے آپ بیتیاں بیان کیں ۔ لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا ۔ تو وہ دلیلوں پر اتر آئے ۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اس دھمکانا شروع کر دیا ۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی ۔ اس پر حمید بولا ۔ "ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں ۔" اس

وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا لگتا تھا ۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو ۔

دفعتاً وہ پھر جلال میں آگئے بولے ۔ "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اسے لیکن وہ ہمارے ہاں کبھی نہ آئے کبھی نہیں ۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے ۔" اس پر حمید اٹھ بیٹھا بولا ۔ "آپ کی مرضی ۔" "لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو ؟" انہوں نے پوچھا ۔ "میں مجبور ہوں ابا جی ۔" حمید نے کہا ۔ "ہماری شادی ہو چکی ہے ۔" "ہو چکی ہے ؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے ۔ "ہو چکی ہے ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"یہ حقیقت ہے ۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے ؟" "ایک ہفتہ" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا

"یہ بات ہے تو پھر جھگڑا کیسا ۔" وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اس کی ہنسی بے حد کھسیانی تھی ۔

حمید اٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا ۔ "لدس !"

احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "تم تو کہتے تھے یہ کمرا پڑوسیوں سے متعلق ہے ۔" "اور کیا کہتا ابا جی ۔" حمید مسکرایا اور پھر با آواز بولا ۔ نسرین ۔ آجاؤ ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں ۔" "اوہ !" احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی "تو یہ بات ہے ۔"

نسرین بڑے پُر وقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی ۔ "سلام عرض کرتی ہوں ۔" سریلی آواز کمرے میں گونجی ۔ وہ ایک ساعت کیلئے وہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے ۔ "بیٹھیے تشریف رکھئے ۔ تشریف رکھئے ۔" وہ گھبرا کر بولے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے ۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے ۔ اب کیا ہو سکتا ہے خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا ۔ فضول ۔ "ہاں بھئی ۔" وہ حمید سے مخاطب ہوئے تم انہیں محلے میں لاؤنا ۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا ۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے ۔" "سچ ؟" حمید بولا "کیا واقعی

آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں ؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں ۔ تمہیں چھٹی لینی چاہئیے ۔ ہاں ۔" چھٹی میں نے پہلے ہی لے رکھی ہے ۔" حمید مسکرایا ۔ "تو پھر یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ۔ کیا حماقت ہے ۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی ۔ "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں ۔ اچھا میں اب جاتا ہوں ۔ نسرین کو ساتھ لانا سمجھے ؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوگان میں جمع تھیں نسرین نے کالا ریشمیں برقع اتارا تو ایک ساعت کے لئے وہ جھجھک گئیں ۔ رسمی سلام ہوئے دعائیں دی گئیں ۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے ۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی ۔ ایک بولی ۔"لے بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل ۔" شاداں بولی ۔ "کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے ۔" تیسری نے کہا ۔" منہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو انگل چڑھا ہوا ہے ۔" چوتھی نے کہا ۔"ویسے تو چودھویں کا چاند ہے ۔ احسن علی کا گھر تو منور ہوگیا ۔" "ہاں بہن" شاداں نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے محلے والیاں پسند نہ تھیں ۔" شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے ۔ بھابی بولی ۔"سنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے ۔" "لاحول ولاقوۃ ۔" احسان علی کے منہ سے بیساختہ نکل گیا ۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں بولی "لو چاچی آج تو چچا کے منہ سے بھی لاحول سن لیا ۔"احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سرکنے وہاں سے شاداں نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا ، بولی "اب کہاں جاتے ہیں آپ ۔ میں تو گن گن کے بدلے لوں گی ۔ چاچی ہنسی بولی "کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے قرآن کے لفظ نکلے ۔ "پر چاچی" شاداں چلائی "ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی انہیں ۔" اے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو ؟۔" "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں ۔" شاداں چمکی 'اس دن میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا ۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا ۔" "اب تو اسے جانے بھی دے گی یا نہیں ۔" چاچی چڑ کر کہنے لگی "گھر بہو آئی ہے اور تو نے اسے یہاں پکڑ رکھا ہے ۔"

اسی شام کو جب دولہا دلہن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسب معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا ۔ "خیر سے دلہن گھر میں آئی ہے آپ کو تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی ۔" جب کبھی شاداں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نا کوئی فقرہ چست کردیا کرتے لیکن اس روز وہ بولے ۔" سچ ۔۔۔۔۔ اچھا شاداں تو بھی تو کیا کہے گی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی ۔ آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں ۔" یہ کہہ کر وہ حمام کے پاس جا بیٹھے اور وضو کرنے لگے پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی ۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی کہ احسان علی نے نفل پڑھے "سچ" چچی بولی۔

"کیا واقعی ۔" بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ۔ "نہیں نہیں میں نہیں مانتی ۔"

"تمہاری قسم" شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

"مبارک قدم ہے دلہن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے" محلے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو اس پر بحث ہونے لگی ۔

"اجی ہر بات کے لئے وقت مقرر ہے۔"

"میں کہتا ہوں کہ شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا ۔"

"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ ۔"

احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا " آخر آگئے نا راہ راست پر ۔"

"ہاں بھئی اب تو چھپ چھپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں ۔"

"احسان علی تو کہا کرتا تھا جب غلاظت کا احساس ہو تب ۔"

"آگئے نا عورتوں کی باتوں میں ۔" احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی کون ہے بابا جی جو عورت کی بات میں نہیں آتا ۔ سب مجھ سے ہیں ۔"

"لیکن اس میں بُرا کیا ہے ۔" باباجی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا ۔"

دو دن تو احسان علی کے گھر ہنگامہ رہا ۔ عورتیں آتی جاتی رہیں ۔ محلے کے کمین میراثی ڈوم او بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آموجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب نے کہا ۔ "اب کیا دلہن کے لئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے ۔ اور محلے والے ، انہیں تو ولیمہ کی دعوت دینی ہی ہوگی ۔"

پہلے تو احسان علی شہر جاکر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے ۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہوگیا ہے تو وہ گھبرا گئے ۔ "بولے حمید کا جانا ٹھیک نہیں ۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں ۔" "تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا ؟ "نواب بی بی نے چڑکر پوچھا "تو میں چلا جاتا ہوں ۔" وہ بولے ۔ اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابا جی ۔ آپ جو گھر ہیں نسرین اکیلی تو نہ رہے گی ۔" احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جاکر نہ جانے کیا کیا اٹھا لائیں گے ۔" "اوہ یہ بات ہے ۔" احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ اس بات پر نواب بی بی چلائی "اے ہے

دلہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں لوگ کیا کہیں گے ۔" احسان علی خاموش ہوگئے ۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لیکر دو روز کے لئے شہر چلا گیا ۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے ۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے لگے ۔ پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے ۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دلہن اور ان کے شغلوں کی بات چھڑ گئی ۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے ۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا تو لگے شور مچانے ۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے میں کھلتی تھی ۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آکھڑے ہو گئے چوگان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا ۔ اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز

انہیں کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی بار بار کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی "بولی رات کے لئے کیا بنواؤں۔" "جو تم چاہو۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ "اوہ" ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ نسرین چونک پڑی "کیا چاہیئے آپ کو۔" "میں تو بھول ہی گیا۔" وہ اپنی دھن میں بولے۔ "کیا۔" نسرین نے پوچھا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں وہ بڑبڑاتے" میرا مطلب ہے۔" انہیں خود سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں ان کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جاپڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو۔ "میرا مطلب ہے۔" وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جارہا ہے۔" انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھا دی۔ اور آپ پاس والی کرسی پر بیٹھ کر سوئیٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آکھڑے ہوئے۔ ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے "میرا مطلب ہے یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی مسجد ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے وہ باہر نکل گئے اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں انہیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک بولا "اس کو بھولا نہ جانیئے جو صبح گیا گھر آوے شام۔" دوسرا کہنے لگا۔ "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ یہ سن کر معاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں۔ عین اس وقت بابا جی آگئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا "آکر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی۔" وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے اس بات پر انہیں اطمینان سا ہوگیا بولے " یہ دیکھو میں تو نہیں آیا۔ لایا جارہا ہوں۔ "چلو یونہی سہی۔" بابا جی نے کہا۔ تیسرا بولا۔ " آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جانا ہے نئی بہو کے دم قدم کو دعا دو بھئی۔" چوتھے نے کہا "ورنہ کہاں احسان کہاں

مسجد ۔" اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت ۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر بچھا لیا ۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی ۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے ۔ لیکن بار بار نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں ۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سرخ چپلی ان کی آنکھوں تلے ناچتی ۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا ۔ اف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے واہیات بو تھی ۔۔۔ ہاں وہ میری کتاب" آپ ہی آپ گنگاتے "کتاب ؟" نسرین کی آواز کمرے میں گونجی میں دیتی ہوں آپ کی کتاب ۔" "نہیں نہیں" وہ چلائے "میں خود لے لوں گا۔" وہ اٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی ۔ "لاحول ولاقوۃ" بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا ۔ دور ہی رک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں ۔" وہ نیلی کتاب بائیں طرف والی ۔" وہ چلائے "وہاں رکھ دو" انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا ۔ "وہاں ۔"

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے ۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں ۔ دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں ۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے ۔ انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں ۔ اور پھر چونکے "کیا پھتے نائی کی ماں نہیں آئی ۔" وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے ۔ کوئی کام ہے کیا ؟" نسرین نے پوچھا ۔ "نہیں نہیں ؟" وہ گھبرا گئے "ویسے ہی وہ سونے کو تو آئیگی نا یہاں" "اس کی کیا ضرورت ہے ؟" نسرین بولی "میں جو ہوں ۔" "اوہ" وہ از سرِ نو گھبرا گئے "میں جو ہوں ۔ میں جو ہوں" دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں ۔ ۔۔۔۔۔۔ "اوہ گیارہ بج گئے" انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں ۔" نسرین نے جواب دیا ۔ وقت ہی نہیں گزرتا ۔"

"وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا" گھڑی کراہنے لگی ۔

"وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے ۔

رات کو وہ گھبرا کر اٹھے ۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی ۔ چاروں طرف عجیب سی بُو پھیلی ہوئی تھی ۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی ۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے ۔ چینی چینی کسی نے تمسخر سے ان کے کان میں کہا سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں ۔ جن پر روغن چمک رہا تھا ۔ "فضول" انہوں نے منہ بنایا ۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے ۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی ۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں ۔ بال گوری دے بچھیر کالے ۔ نہ جانے انہوں نے کیوں محسوس کیا ۔ جیسے ان کی زندگی کی تمام تر رنگینی ختم ہو چکی ہو ۔

اندر آکر وہ سوچنے لگے ۔ "ہوں تو دو بجے ہیں ۔" "وقت گزرتا ہی نہیں وقت گزرتا ہی نہیں" گھڑی چلانے لگی ۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ جو ہونا تھا ہو گیا جو ہونا تھا ہوگیا ۔ انہوں نے سوچا ۔ حمید نے کس قدر فاش غلطی کی ہے ۔ بیوقوف انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا ۔ اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے ۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد نہ تھی ۔ میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آرہی تھیں ۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے ۔

عین اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اتری ۔ "چپ ۔" شاداں زیرِ لب بولی "وہ سو رہے ہوں گے آج تو چچا احسان علی سے وہ مذاق کرکے رہوں گی کہ یاد کرینگے ۔" چاچی ہنس پڑی بولی ۔ "تجھے بھی تو ہر وقت شرارتیں سوجھتی ہیں ۔" "اور وہ کیا لحاظ کرتے ہیں میرا ۔" شاداں نے کہا ۔

"ہائیں" انہیں سجدے میں پڑتے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا "میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کی جارہی ہے ۔"

"نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے ۔"

"بچ ۔" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔

"اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔"

احسان علی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔

"ہائے میرے اللہ" شاداں نے پھر اپنے آپکو سنبھالا۔

احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرے پر جھریاں لٹک آئیں جیسے یکلخت بوڑھے ہو گئے ہوں۔

"احسان علی" ۔۔۔۔۔۔۔ شاداں چلائی۔

احسان علی سجدے میں گر گئے۔

.........○.......

شائستہ

"کمرہ نہ سہی کوئی کونہ ہی ہو جس میں ایک چارپائی بچھائی جا سکے"۔ میں نے امید بھری نظر سے ہوٹل والے کی طرف دیکھا۔ "جی نہیں"۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔ "ذرہ بھر جگہ نہیں ہمارے یاں شاید کل تک ہو جائے"۔ یہ چھٹا ہوٹل تھا

مینجر کی بات سُن کر میرا دل ڈوب گیا۔ کسی اور ہوٹل تک جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شکر ہے میں اپنا سامان سٹیشن پر کلوک روم میں رکھوا آیا تھا۔ ورنہ کس قدر مشکل ہوتی ہوٹل سے باہر نکل کر کچھ دیر تو میں حیران کھڑا رہا۔ کدھر جاؤں مجھے تو کراچی کے رستوں سے بھی واقفیت نہ تھی۔ پہلی مرتبہ تو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی جیسے تمام مشکلات یکلخت دور ہوگئی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میری پریشانی اور بے بسی حد سے گذر چکی تھی۔ تو صاحب نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میں بازار اور کوچوں میں یوں ٹہلنے لگا۔ گویا کوئی بے فکرا سیر کو نکلا ہو۔ اف کیا خوبصورت کوچہ ہے میں نے اس گلی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ایک جانب فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف پارک تھا۔ جس میں بچے کھیل رہے تھے "کبیر ....!"

دفعتاً میرے کان میں آواز پڑی میں نے مڑ کر دیکھا گلی خالی پڑی تھی۔ یہاں میرا واقف کون ہوگا۔ میں نے سوچا۔ آخر اس نام کے اور لوگ بھی ہوں گے "کبیر ....!" پھر آواز آئی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ فلیٹ کے چھجے پر وہ کھڑی مسکرا رہی تھی .... میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ "یہ رہا زینہ" وہ بولی۔ اس طرف دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف پہلا دروازہ میں نوکر بھیجتی ہوں"۔

شائستہ میرے چچا زاد بھائی سکندر کی بیوی تھی میں جانتا تھا کہ وہ کراچی رہتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ سکندر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے ۔ لیکن کراچی کو روانہ ہوتے وقت اماں نے مجھے تاکید کی تھی کہ سکندر سے نہ ملوں ۔ اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے ۔ اور وہ میرے وہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں ۔ تو کسی بہانے ٹال دوں ۔ مجھے سکندر کے ہاں ٹھہرنے کی قطعی ممانعت تھی ۔ جبھی تو آتے ہوئے میں نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہ کی تھی ۔ کہ وہ کس محلے میں رہتے ہیں ۔

محلے میں ایک نہیں تین لڑکے ایسے تھے جنہیں کراچی میں سکندر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ اسلم تو وہاں صرف چند ایک دن ٹھہرا ہوگا ۔ پھر کسی بات پر وہ سکندر سے ناراض ہوکر چلا آیا یہ خبر جب محلے میں پہنچی ، تو بڑی باتیں ہوئیں ۔ عزیز کو سکندر نے وہاں ملازمت دلوائی تھی ۔ اس نے صرف ایک مہینہ ملازمت کی ہوگی ۔ پھر انہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگ آیا ۔ محلے میں آکر ماں سے کہنے لگا ۔ "میں ان کے یہاں نہ رہوں گا" ۔ "کیوں ان کے یہاں رہنے میں کیا تکلیف تھی" ۔ اس کی ماں نے پوچھا ۔ "نہیں اماں تکلیف تو نہیں تھی لیکن میرا ان کے پاس رہنا نا ممکن ہے" ۔ چاہے ان کے پاس نہ رہتا ۔" اماں نے کہا ۔ "پر نوکری چھوڑ کر تو نہ آتا" ۔ "تو رہتا کہاں ؟" اس نے چڑ کر جواب دیا ۔ ہر کوئی وہاں سے واپس آکر کانوں پر ہاتھ رکھتا اور کہتا ان کے گھر رہنا تو قیامت ہے ۔ قیامت ۔ صبح و شام لڑائی لگی رہتی ہے ۔ مہمان کی شامت آجاتی ہے ۔ اسلم عزیز اور سید تینوں کا خیال تھا ۔ کہ سکندر کی طبیعت شکی ہے ۔ بات بات پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ۔ عورتیں سمجھتی تھیں ۔ سارا فساد شائستہ کا ہے کس قدر بن ٹھن کر رہتی ہے ۔ ہر وقت اللہ مارا پاؤڈر کریم اور کاجل مسکرا مسکرا کر بات کرتی ہے ۔ نوجوان لڑکوں کا کیا ہے انہیں تو اللہ دے یہ بات ۔ ایسی عورت کے فریب میں پھنستے ہوئے دیر لگتی ہے کیا ۔ پھر خاوند نے تو جلنا ہی ہوا ۔ کیسے نہ ہو شکی مزاج نوجوان جہاں سکندر کے مزاج میں نقص نکالتے وہاں شائستہ کی محبت ، اخلاق

اور مہمان نوازی کی تعریفیں بھی کیا کرتے ۔ یہ سن کر عورتیں زیرِ لب مسکراتیں اور آپس میں اشارے کرتیں ۔ پھر جب وہ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو کوئی نہ کوئی کہتی ۔

"بس باہر کی کوئی آجائے سبھی اس کے سبھاؤ کی دھوم مچا دیتے ہیں"۔

"نہ جانے باہر والیاں کیا جادو کرتی ہیں"۔

"آنکھیں مٹکانا جو جانتی ہیں وہ"۔

"ہمیں تو نہ آیا آنکھیں مٹکانا ۔ کوئی آہ بھر کر کہتی"۔

"اللہ نہ کرے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اس کے بغیر ہی اچھی ہیں"۔ ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتی ۔ محلے کے بڑے بوڑھے شائستہ یا سکندر کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیتے اور کہتے اصل میں بات یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نے مل کر شک کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے ۔ تاکہ مہمانوں سے جان بچی رہے بھئی خوب طریقہ ہے ۔

نہ جانے کس کی بات سچی تھی ۔ آیا لڑکوں کا خیال درست تھا ۔ عورتوں کا یا بڑے بوڑھوں کا ۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی ۔ کہ اب کوئی محلے دار سکندر کے پاس ٹھہرنے کو تیار نہ تھا ۔ اگر کسی کو کراچی جانا ہوتا تو سبھی یک زبان ہو کر اسے نصیحتیں کرتے ۔ "مانا کہ وہ اپنے ہیں پر ان کے گھر نہ ٹھہرنا بھئی میں تو تمہیں یہ مشورہ نہ دوں گی"۔

"آخر ہوٹل بھی تو ہیں وہاں"

"کیا نہیں وہاں ۔ ہوٹل ہیں سرائے ہیں ۔ سنا ہے بڑا بھاری شہر ہے"۔

"تو تو آپ سیانا ہے کبیر ۔ بھلا دو ہنستے کھیلتے رہتے بستے میاں بیوی کی خوشی کو حرام کر دینا ۔ کیا یہ اچھی بات ہے"۔ آپ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے ۔ کہ اُن کی نصیحتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کی وجہ سے سفر کے دوران بار بار میرے دل میں سکندر سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی اگر وہ مجھ سے مل گیا تو ؟ ۔۔۔۔ اس پر میں گھبرا کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش

کرتا ۔ لیکن خواہ مخواہ مجھے شائستہ کا خیال آ جاتا ۔ بدن میں سنسنی دوڑ جاتی اور میرے لئے کسی اور بات کے متعلق سوچنا بھی ناممکن ہو جاتا خوبصورت تو وہ تھی ۔ لیکن اس کا حسن اکسانے کی بجائے مبہت کر دینے والا تھا ۔ اس کے انداز میں خوشی کی جگہ وقار جھلکتا تھا ۔ وقار خلوص اور سنجیدگی ۔ یہ تینوں وصف میرے لئے چنداں دلفریب نہ تھے پھر نہ جانے کیوں محلہ والیوں کی باتیں سُن سُن کر دل میں ایک انجانا عزم پیدا ہو چکا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ مجھے ان کے یہاں رہنے کا موقعہ ملے ۔ اتفاقاً یہ دبی دبی خواہش کسی وقت مجھ پر حاوی ہو جاتی ۔۔۔۔۔۔ پھر میں پوری کوشش سے اسے اور بھی دبا دیتا ۔

شاید اسی لیے ہوٹلوں میں جگہ نہ پاکر میرے دل میں اطمینان پیدا ہوگیا تھا۔

شائستہ کے یہاں رہنے کا جواز تو مل چکا تھا ۔ اب صرف ان سے اچانک ملاقات ہو جانے کی کسر باقی تھی ۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی بر سبیل تذکرہ سن پایا تھا ۔ کہ وہ ایک انگریزی وضع کے فلیٹ میں رہتے ہیں ۔ جس کے مقابل میں بچوں کے کھیلنے کا پارک بنا ہوا ہے ۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک صاف ستھرا شہر ہے اور آخری ہوٹل والے کا انکار سن کر پھرتے پھراتے دفعتاً وہ کوچہ میری نظر پڑا ۔ جس کے مقابل پارک بنا تھا ۔ اس کی بناوٹ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں بازار کو چھوڑ کر کوچے میں گھومنے لگا ۔ اس کی آواز میرے کان میں پڑی تو حیرت سے میں بھونچکا رہ گیا دل ڈر یا شوق کی شدت سے تڑپ کر جیسے گلے میں آ اٹکا اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی لبا لب ہو کر چھلکنے لگا ہو ۔

شائستہ مجھے بڑے تپاک سے ملی ۔ بار بار میری طرف دیکھ کر مسکراتی ۔ ماما کو میری تواضع کے متعلق ہدایات دیتی ۔ پھر مجھ سے باتیں کرنے لگتی ۔ "کس قدر خوشی ہے مجھے کہ تم آئے ہو ۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری ۔ اُف اتنی دیر ہوچکی ہے ۔ کوئی ہمارے یہاں نہیں آیا ۔ کوئی نہیں آتا ہمارے پاس ۔ جیسے محلّے والوں نے ہمارے یہاں نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہو ۔ سنا ہے رضا اور محبوب کراچی آئے تھے ۔ ہمیں صورت تک نہیں دکھائی ۔ نہ جانے کیا قصور ہوگیا ہم سے کہ محلّے والوں نے ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے ۔ رفیع کو کئی بار کہا ۔

ان سے لکھوایا ۔ لیکن وہ بھی نہ آیا ۔ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے سیر کو آجاتا تو کیا حرج تھا ۔ نہ جانے بات کیا ہے کوئی بھی نہیں آتا ۔ کوئی بھی نہیں"۔ وہ آہ بھر کر چپ ہوگئی ۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔ "شکر ہے تم آئے ہو بڑی مہربانی ہے تمہاری"۔ اس کی آنکھیں پُر نم تھیں ایسا معلوم ہو تھا جیسے ابھی آنسوؤں کا تار بندھ جائے گا ۔ لیکن مجھے دیکھ کر ان پرنم آنکھوں میں مسکراہٹ چمکتی اور نمی جذب ہو جاتی ۔ شکر ہے تم آگئے تمہارے بھائی تو ہر وقت مطالعے میں کھوئے رہتے ہیں ۔ آدھی آدھی رات تک لائبریری میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ مجھے تنہائی نے مار دیا ۔ کبیر" اس نے مسکرانے کی کوشش کی کتنا ویران ہے ۔ یہ شہر کوئی ملنے ملانے والا نہیں ۔ اگر اپنے ہی نہ آئیں تو بیگانوں کو کوئی کیا کہے اور ان کا آنا بھی کس کام کا ۔ آئے بھی تو دو گھڑی باہر بیٹھ کر چلے گئے گھر میں اپنوں کے سوا کون آسکتا ہے ۔ خیر اب تو تم آہی آگئے ہو"۔ وہ مسکرائی میری طرف دیکھ کر اس کی اداسی اور مایوسی کافور ہوجاتی مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی ڈوبتی ناؤ کو پتوار مل گئے ہوں اور وہ بہہ نکلی ہو ۔

شائستہ کی باتیں سن کر وہ امیدیں اور بھی استوار ہوگئیں جو محلے والیوں کی باتیں سُن سُن کر خواہ مخواہ میرے دل میں پیدا ہوچکی تھیں ۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اداسی ہونٹوں کی سنجیدگی اور وقار بھرا انداز مجھے پریشان کئے ہوئے تھا سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ بے جھجک ایسی باتیں کیوں کئے جارہی تھی ۔ کیا اپنی ملازمہ شمو کا بھی ڈر نہیں ؟ ۔ اگر سکندر آجائے تو ؟ باہر کا دروازہ بھی تو کھلا تھا لیکن وہ ان باتوں سے قطعی بے نیاز تھی ۔ اس بے نیازی کی وجہ سے مجھ پر خواہ مخواہ رعب چھائے جارہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کروں ۔ مذاق کروں ۔ چھیڑوں ۔ کوشش تو کرتا تھا ۔ لیکن بات گویا میری زبان پر آکر خشک ہو جاتی ۔ بدن میں چیونٹیاں رینگتیں اور میں چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہ جاتا ۔ اس وقت میری صرف ایک آرزو تھی کہ اسکی توجہ مجھ پر مرکوز ہو جائے ۔ اس کے قریب تر ہو جاؤں اس سے متعلق بے نام اُمیدیں میرے دل میں بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا رہی تھیں ۔ اور میں اس کے اشارے کا منتظر تھا ۔ صرف ایک اشارہ ۔ نوکرانی کے آنے پر دفعتاً چپ ہو جانا

یا دروازے کی طرف دیکھ کر کہنا اوہ ۔ دروازہ تو کھلا پڑا ہے ۔ شمو اسے بند کردے ۔ یا میرے کچھ کہنے پر مجھے پیار سے گھور کر ہونٹوں سے چپ کا اشارہ کر دینا ۔ کراچی آتے ہوئے گاڑی میں کئی مرتبہ میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا ۔ اس وقت میں یوں چپ چاپ نہ تھا ۔ میں نے کئی ایک دلچسپ باتیں کی تھیں ۔ اور باتوں ہی باتوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا ۔ "شائستہ ۔" اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا مجھے جیسے کسی ہوائی کو آگ دکھا دی گئی ہو ۔ لیکن اب میرا ہاتھ آگے بڑھنے کی بجائے کوٹ کی جیب میں گھسا ہوا تھا ۔ اور میری زبان کچھ کہنے کی بجائے منہ میں ٹنگی ہوئی تھی ۔

اوہ کبیر آیا ہے سکندر اندر داخل ہو کر چلّائے وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک مجھ محلے والوں کے متعلق پوچھتے رہے اس دوران میں ، شائستہ گھر میں چاروں طرف گھومتی پھری ۔ شمو تم نے کبیر کے کمرے میں بلب نہیں لگایا" " شمو میں نے کہا ۔ یہاں ایک سائیڈ ریک رکھدونا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید کبیر سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کا عادی ہو ۔ ان انتظامات کے دوران میں وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آتی اور کوئی نہ کوئی بات پوچھتی ۔ سکندر کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر مسکراتی اس کا سکندر کی موجودگی میں مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا میرے لیے بے حد پریشان کن تھا ۔ میں خواہ مخواہ جھینپ رہا تھا ۔ گھبرا رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ شائستہ کو اپنی طرف متوجہ کرکے ایسا اشارہ کروں کہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ سکندر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ۔ لیکن مجھ میں ہمت نہ پڑی ۔ اور وہ بار بار کہے جا رہی تھی ۔ شکر ہے تم آئے ہو کبیر ۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری ۔ میں محسوس کر رہا تھا ۔ کہ کوئی پرائیویٹ بات عام کی جارہی تھی ۔ سکندر کے سامنے اس کے وہ دلنواز اور رنگین فقرے اپنا مفہوم اور رنگینی کھوئے جارہے تھے ۔ اس بات سے تنگ آکر میں نے تھکاوٹ کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گیا ۔

اگلے دن سکندر دفتر سے آئے تو ہم دونوں بالکونی میں کرسیاں جوڑ کر بیٹھے ہوتے تھے ۔ شائستہ بیٹھی کچھ بُن رہی تھی ۔ بُنتے ہوئے وہ مجھ سے مسلسل

باتیں کئے جاتی تھی ۔ جن کے دوران میں اکثر کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ۔ اس وقت میں سُر کئے ہوئے ساز کیطرح محض ایک ہلکی سی چھیڑ کا منتظر تھا ۔ شائستہ کی پتلی پتلی رنگین انگلیاں ایک اضطراب سے چل رہی تھیں ۔ میں انہیں متوقع نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ ابھی وہ روغنی انگلیاں بڑھتے بڑھتے مجھ تک پہنچ جائیں گی ۔ اور فضا میں دلنواز نغمے گونجنے لگیں گے ۔ وہ نغمے جو مجھ میں تڑپ رہے تھے ۔ جنہیں سننے کی مجھے توقع تھی ۔ امید تھی ۔ لیکن وہ انگلیاں اپنی ہی جگہ پیچ و تاب کھائے جا رہی تھیں ۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں ۔ میرا ہاتھ اٹھتا ۔ کہ ان مضطرب اور بھٹکی ہوئی انگلیوں کو اس بھنور سے چھڑا لے ۔ لیکن نہ جانے کیوں رک جاتا ۔ پھر خفت کے مارے جیب کے کونے کریدنے لگتا ۔

سکندر نے ہمیں یوں بیٹھے دیکھا تو ٹھٹھکے ۔ کچھ دیر کیلئے تو چپ رہے ۔ پھر کچھ کہنے کی خاطر بولے تم سیر کو نہیں گئے کبیر ۔ بس ابھی جانے کو تھا ۔ میں نے گھبرا کر کہا ۔ "میں نے ہی روک رکھا تھا اسے ۔" شائستہ بولی "میں نے کہا وہ آئیں گے تو تمہیں ساتھ لے جائیں گے ۔ اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا ۔ "کبیر کوئی بچہ ہے کیا"۔ ان کی ہنسی طنز آلود تھی ۔ "جو کھو جائے گا" ۔ اس بات پر شائستہ گھبرانے کی بجائے اور بھی چہکنے لگی ۔ سکندر کمرے میں چلے گئے ۔ اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے ۔ شائستہ پہلے تو مجھ سے یوں چہک چہک کر باتیں کرتی رہی ۔ جیسے سکندر کو سُنا رہی ہو ۔ تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں کس قدر رونق ہو گئی ہے کبیر ۔ گھر بھرا بھرا نظر آتا ہے ۔ آج کا دن تو آنکھ جھپکتے ہی بیت گیا ۔ پھر وہ دوڑی دوڑی سکندر کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی ۔ اور مسکرا مسکرا کر ان سے کچھ پوچھتی اور پھر وہیں سے کبیر کبیر چلاتی ہوئی میرے پاس آجاتی "یہ سُنا تم نے آج یہ باہر جانے سے بھی منکر ہیں ۔ تم بھی نہ جاؤ باہر ۔ جب یہ جائیں گے تبھی جانا ۔ کیوں ۔ پھر بھاگی بھاگی سکندر کی طرف جاتی ۔ سنا آپ نے کبیر کیا کہتا ہے ۔ کہتا ہے میں موٹی ہو گئی ہوں ۔ کیا واقعی موٹی ہو گئی ہوں ۔ میری طرف دیکھئے نا وہ ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے بچے کی طرح چلاتی ۔ دیکھئیے بھی نا ۔ پھر چلا کر کہتی

ان کی بات سنی تم نے کبیر کہتے ہیں کسی کے منہ سے تعریف کی بات سن کر تمہاری باچھیں کھلنے لگتی ہیں ۔ پھر ان سے مخاطب ہوکر مسکراتی ۔ آپ بھی کیجئے نا میری تعریف اور متوقع اور مسحور کن نگاہوں سے انہیں دیکھتی ۔ اس سمے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے دو زمینوں کے درمیان ایک منوّر چاند ڈول رہا ہو۔ شائستہ کا یہ رویہ دیکھ کر میرا دل بجھا جا رہا تھا ۔ امیدیں خاک میں ملی جا رہی تھیں ۔ اُف میں اُٹھ بیٹھا ۔ میں ذرا باہر ہو آؤں" ۔ مجھے جانے پر تیار دیکھ کر وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی ۔

"باہر ہو آؤں ۔۔۔۔ وہ زیر لب گھورنے لگی ۔ ذرا ٹھہرنا پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے چھپا کے بات کی تھی ۔ میرا دل از سر نو دھڑکنے لگا ۔ اور آنکھ امید کی روشنی سے چمکنے لگی ۔ "میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں" ۔ میں نے رازدارانہ انداز سے کہا ۔ اور سکندر کی طرف اشارہ کیا ۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھ کر منہ بنایا اور لا پرواہی سے زیر لب بولی ۔ "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے ۔ بُرا مان گئے کیا" ۔

بازار میں گھومتے ہوئے بار بار مجھے وہ باتیں یاد آتیں جو شائستہ نے زیرِ لب مجھ سے کی تھیں ۔ نہ جانے ان باتوں میں کیا تھا۔ کس قدر مفہوم سے لبریز تھیں وہ زیر لب باتیں ۔ اسکی باتیں ہر لحظہ اور بھی زیر لب ہوتی گئیں ۔ سرگوشیاں بن گئیں پھر ان پر وعدوں کے رنگین پھول پھوٹ نکلے ۔ ان کی مہک سے مسحور ہو کر میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹ آیا ۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدید احساس ہوا کہ آج کچھ ہونے والا ہے ۔ رنگین انگلیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں ۔ آنکھیں میری طرف دیکھ کر ڈولتیں ۔ ہونٹ بولے بغیر کچھ کہتے ۔

اندر وہ دونوں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر بولی" ۔ "لو سنو کبیر مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ بسکٹی سویٹر مجھے بہت اچھا لگتا ہے ۔ کیوں کبیر کیا یہ رنگ مجھے سجتا ہے دیکھو بھی نا ۔۔۔۔" پھر وہ ان سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی ۔ اور وہ دیر تک ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے رہے کبھی کبھار وہ مجھے وہیں سے آواز دیتی ۔ لیکن میرا جواب سُنے بغیر پھر سے اُن سے

باتوں میں لگ جاتی ۔ ادھر میں اپنی خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی توقع میں بیٹھا تھا منتظر تھا کہ وہ آئے اور دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ کہے ۔ "ان کی عادت ہی ایسی ہے" یا کچھ اور لیکن وہ نہ آئی ۔ حتٰی کہ میں ہار کر لیٹ گیا ۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہوگیا ۔ سکندر کی غیر حاضری میں وہ کرسی سے کرسی جوڑ کر بیٹھ رہتی ۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہنستی ۔ میں بار بار اُٹھ بیٹھتا ۔ میں سیر کر آؤں ۔ وہ پیار سے مجھے گھورتی "بیٹھو نا شام کو چلے جانا ۔ بس کوئی نہیں جانا وانا ---- چائے پی لو ۔ جب وہ آجائیں گے تو چلے جانا ۔ بیٹھو بھی نا کبیر ۔ میرے پاس بیٹھنے سے ڈرتے ہو کیا ؟" ---- ہر بار میں مجبور ہو کر بیٹھ جاتا ۔ اسی طرح شام ہو جاتی اور سکندر آجاتے وہ ہمیں یوں بیٹھے دیکھ کر باری باری دیوار دروازے اور ملما کو گھورتے اور پھر اپنے کمرے میں جا داخل ہوتے ۔ان کی خشمگینی دیکھ کر شائستہ مسکراتی ۔ پھر ان کے پاس جا بیٹھتی ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کرتی ۔ اس کی باتیں سن کران کا غصہ اور بھی چمکتا حتیٰ کہ وہ اعلانیہ ہماری بے تکلفی پر آوازے کسنے شروع کر دیتے ۔ ان کی باتیں سن کر شائستہ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی ---- پھر کسی نہ کسی بہانے وہ چپکے سے میرے کمرے میں آکر کہتی "تم چپ کیوں ہوگئے کبیر ۔ ناراض تو نہیں ہو گئے ۔ خُدا کے لئے برا نہ مان لینا ۔ اُن کی تو عادت ہی ایسی ہے بات کئے بغیر نہیں رہ سکتے" ۔ اس کی باتیں اس قدر رازدارانہ ہوتیں ۔ کہ میری امیدوں کے خشک دیئے میں تیل پڑ جاتا ۔ سکندر بُرا مانتا ہے تو پڑا مانے میں لا پروا ہو جاتا ۔ اگرچہ اس کی باتوں کے جواب میں میں صرف یہ کہا کرتا ۔ "اچھا ۔ تمہاری مرضی" ۔ اور پھر سیر کو نکل جاتا ۔

جب میں سیر سے لوٹتا تو دیکھتا کہ سکندر غصے کی بجائے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے ۔ اور شائستہ اسے بھرما رہی ہے ۔ صبح سویرے وہ اٹھتے ہی پیار محبت کی باتیں شروع کر دیتے ۔ پھر سکندر دفتر چلا جاتا ۔ اس کے چلے جانے کے بعد دفعتاً شائستہ کو احساس ہوتا کہ میں ابھی وہیں ہوں اور وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آتی اور ایسی گرمجوشی سے ملتی گویا اپنی گزشتہ لاپرواہی کی تلافی کر رہی ہو۔ اپنی کرسی میرے پاس کھینچ لیتی ۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی ۔

وہی ترچھی نگاہیں ، وہی مسکراہٹ ، وہی بے تکلفی اُف وہ مسکراہٹ ہر بار میں محسوس کرتا کہ منزل آپ میری جانب بڑھے آرہی ہے ۔ شام کو جب میں سیر کو نکلتا تو دن بھر کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ۔ خواہ مخواہ مجھے احساس ہونے لگتا ۔ کہ منزل پر پہنچنے کے لیے صرف ایک قدم رہ گیا ہے ۔ ایک قدم اور ۔ لیکن واپسی پر میں محسوس کرتا کہ ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے ۔ اس احساس کی وجہ سے ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ۔ میں نے کہا ۔ آج میں واپس جا رہا ہوں ۔ "جا رہے ہو" اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا ۔ نہیں نہیں وہ چلّائی یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ابھی تو تمہیں یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں ۔ "آج پانچواں دن ہے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا ۔ "تو پھر کیا "ہوا وہ بولی"۔ نہیں آج مجھے جانا ہی ہوگا میں نے جواب دیا ۔ "کبیر اس نے سویٹر کو پرے پھینک دیا ۔ نہیں نہیں تم مذاق کر رہے ہو ۔ تم ابھی نہیں جاؤ گے ؟ میں نے فیصلہ کر لیا ہے"۔ میں نے لاپرواہی سے کہا "فیصلہ کر لیا ہے ؟ وہ چلّائی ۔ کبیر اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئیے ۔ جونہی وہ گرم اور روغنی انگلیاں مجھ سے مس ہوئیں ڈز !! ------ کسی بوتل کا کاک اڑگیا ۔ سرخ شراب کے چھینٹے چاروں طرف اڑنے لگے ۔

عین اس وقت سکندر داخل ہوئے ۔ ہمیں دیکھ کر آنکھیں انگارہ ہوگئیں ۔ شائستہ نے انہیں دیکھا لیکن وہ جوں کی توں کھڑی رہی ۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ چھڑالئے تھے ۔ ورنہ شاید وہ میرے ہاتھوں کو پکڑے رہتی ۔ شائستہ کی آنکھوں سے گھبراہٹ کی جگہ فتحمندی کی جھلک لہرا رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے شکاری پرندے کو اپنے آپ دام میں پھنسے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو ۔

"جانا وانا کوئی نہیں" ۔ وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر آہستہ سے بولی ۔ اور پھر سکندر کے کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ "اسے گود میں لے کر بیٹھ رہتی ہو شرم نہیں آتی تمہیں"۔ سکندر غرایا ۔ "کیا کہے گا گھر جاکر ----- یہاں سیر کے لئے آیا ہے ۔ یا تمہارے دام میں پھنسنے کے لئے"۔ میں نے سُنا تو میرے

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ سچ کہتی تھیں محلے والیاں ۔ میں نے کس قدر بھول کی جو یہاں آ ٹھہرا ۔ معاً میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کئے ۔ اور ٹائم ٹیبل لے کر بیٹھ گیا ۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ صبح گیارہ بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہ جاتی تھی ۔ لاچار میں چارپائی پہ پڑ گیا ۔ اندر نہ جانے وہ ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ رہے تھے ۔ ان کی باتیں سننے میں اب مجھے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی ۔

اگلے دن صبح سویرے وہ میرے پاس آئی سرہانے کھڑی ہو کر ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کر لیں ۔ "بوجھو کون ہے" ۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو چھڑا لیا ۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی ۔ "افوہ یہاں تو غصے سے بھوت بنے بیٹھے ہیں" ۔ پھر منت سے کہنے لگی خدا کے لئیے آج نہ جانا صرف آج اور کل کا دن اور رک جاؤ ۔ پرسوں میں تمہیں نہ روکوں گی ۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے ۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ ان رنگین انگلیوں کے چنگل سے نکل جاؤں لیکن میری کوشش ناکام رہ گئی ۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں طرف وہ روغنی انگلیاں گھیرا کئے ہوئے تھیں ۔ میری طرف بڑھ رہی تھیں ۔ حتی کہ میں ان کی گرفت میں آگیا ---- پٹاخ !! کسی بوتل کا منہ پھٹ گیا ۔ کھولتا ہوا سرخ پانی چھلکا ۔ آنکھوں تلے سبھی کچھ سرخ دکھائی دینے لگا ۔ میرا سر جھکا ہونٹ ان انگلیوں پر چسپاں ہو گئے ۔ شائستہ -----!! مجھے زبان مل گئی ۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لیئے ۔ سرخ ابلتی ہوئی لہریں ریت بن کر رہ گئیں میں ٹھٹھک کر بیٹھ گیا ۔ اس نے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر اور بھی قریب آ بیٹھی ۔ ہنسنے لگی ۔ بڑی بہن سے مذاق کرتے ہو ہنستے ہنستے اس کے گال پر آنسو ڈھلک آئے ۔ بڑے مسخرے ہو تم کبیر !!

پہلے تو میں شرم سے پانی پانی ہوا بیٹھا رہا ۔ لیکن جب وہ میرے پاس آ بیٹھی اور معصومیّت اور محبت سے بولی ۔ صرف ایک دن اور رک جاؤ ۔ تمہیں تکلیف تو ہو گی ۔ لیکن میری خاطر اسے سہہ لینا ۔ کل بے شک چلے جانا ۔ اس کی معصومیت خلوص اور بے بسی کو دیکھ کر میری شرمندگی یک قلم کافور ہو گئی ۔ میں اس کی طرف دیکھ کر محسوس کرنے لگا ۔ جیسے اس روز میں نے اسے پہلی

مرتبہ دیکھا ہو ۔ نہیں میں نہیں جاؤ گا میں نے ہنس کر کہا اور پھر پیار سے اس کا سر تھپکنے لگا ۔

دوپہر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا ۔ گویا ہمارے درمیان کا آخری پردہ اٹھ چکا ہے ۔ میں اس سے ایک پراسرار قرب محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے میں منزل تک پہنچ چکا تھا ۔ میرا دل دھڑک نہیں رہا تھا ۔ زبان بند نہ تھی ہاتھ جیب کے کونے تلاش نہیں کر رہا تھا ۔ اس کی رنگین انگلیاں رنگین تو تھیں مگر مکڑی کی ٹانگوں کی طرح چاروں طرف سے میری طرف بڑھنے کی بجائے اپنے ہی اردگرد رینگ رہی تھیں ۔ یوں محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے میں کسی بے نام قید سے آزاد ہو چکا تھا ۔ اس روز میری گپیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ۔ مجھے نئی نئی باتیں سوجھ رہی تھیں ۔ میں نے کہا ۔ شائستہ سکندر کی طبیعت کو کیا ہے ؟ "ہے نا" وہ مسکرائی بڑی شکی طبیعت ہے ۔ جانے کیوں" ۔ تمہارا دل تو نہیں کڑھتا" میں نے پوچھا ۔ اس نے آہ بھری ۔ " ان دنوں بھی ایسے ہی تھے ۔ ابھی تک اپنی عادت کا احساس نہیں انہیں ۔ "کن دنوں" ۔ میں نے ویسے ہی بات کو لمبا کرنے کے لئے پوچھا ۔

"جب ہماری شادی ہوئی تھی ۔ ان دنوں کی یاد آتی ہے تو میں بے ساختہ ہنس دیتی ہوں" ۔۔وہ ہنس کر بولی تم سے کیا چھپانا ہے ۔ میری اپنی خواہش تھی کہ میری ان سے شادی ہو جائے ۔ "سچ ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ "ہاں" وہ جھینپ کر بولی ۔ ان دنوں سکندر صاحب اور میرے پھوپھی زاد بھائی کرامت دونوں ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ رہنے کو مکان نہ ملتا تھا ۔ اس لئے مجبور تھے ۔ میرے بھائی کی سکندر صاحب سے بڑی دوستی تھی ۔ اس لیے ہم سب ان کو اپنا ہی سمجھتے تھے ۔ ان سے پردہ بھی اٹھا رکھا تھا ۔

"تمہیں سکندر سے محبت تھی ؟ میں نے شرارت سے پوچھا ۔

وہ شرما کر چپ ہوگئی ۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولی ۔ تم جانتے ہو مجھے ادب سے عشق تھا عشق اور یہ پورے ادیب تھے ۔ مجھے پڑھایا کرتے تھے ان دنوں بس جی ہم تو ان سے پڑھنے ہی میں لٹ گئے اف کس قدر قابل ہیں ۔ یہ

میں تمہیں کیا بتاؤں مجھ پر تو پہلے دن ہی ان کا رعب پڑ گیا ۔ چوری چوری انہیں دیکھا کرتی تھی ۔ یہ پڑھانے میں مشغول ہوتے اور میں ان کے منہ کی طرف دیکھا کرتی ۔ ان کی عادت تھی ۔ کہ پڑھاتے ہوئے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے
پھر میں نے بامعنی انداز سے پوچھا ۔ "پھر کیا ہوا ؟"

وہ مسکرائی ۔ "ان کی بلا سے یہ تو ہر وقت اپنی کتابوں اور مطالعہ میں کھوئے رہتے تھے ۔ ان کی مصروفیات لامتناہی تھیں ۔ اس بات پر میرا دل جلتا تھا ۔ جی چاہتا تھا کسی طریق سے ان کی کتاب چھین لوں لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی ۔ خیر جتن تو میں نے بھی بہت کئے" وہ مسکرائی "لیکن کوئی بات نہ بنی اور یہ اپنے شغل میں منہمک رہے ۔۔۔ پھر اتفاق سے ایک ذریعہ نکل آیا"۔

"وہ کیا" میں نے شوق سے پوچھا ۔

"میری عادت تھی کہ کرامت بھائی سے روز کھیلتی ، کہیں مارتی اور لڑتی جھگڑتی رہتی ۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا نا ۔ چھ ایک ماہ چھوٹا ہوگا ۔ ہم دونوں بہت بے تکلف تھے ۔ ایک روز ہم دونوں حسب معمول بیٹھے ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے ۔ کہ سکندر صاحب آگئے ۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا ۔ لیکن سنبھل کر جلد ہی واپس اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ شام کو جب میں سبق پڑھنے کے لیے ان کے پاس گئی تو دیکھتی ہوں کہ منہ سوج کر کپا بنا ہوا ہے ۔ خیر انہوں نے پڑھانا شروع کر دیا ۔ لیکن ایسی بے دلی سے پڑھا رہے تھے ۔ میں تاڑ گئی ۔ ایک روز پڑھاتے ہوئے انہوں نے مجھے بے توجہ پایا ۔ تو تنک کر بولے "بس جی میں نہیں پڑھا سکتا تمہیں ۔ اب اسی سے پڑھا کرو ۔ اپنے کرامت سے جس سے سارا سارا دن خوش گپیاں ہانکتی ہو" میں نے ان کی طرف دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ۔ ہونٹ کانپ رہے تھے ۔ بس جی پھر کیا تھا ۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اس روز ۔ پانی گرم تھا ۔ صرف ایک جوش دینے کی ضرورت تھی ۔ صرف ایک ، کس قدر چوکھا رنگ آئے گا چائے کا ۔ میں نے سوچا ۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے اور بھی بے تکلفی شروع کر دی ۔ یہاں تک کہ اماں مجھے گھورنے لگیں ۔ بھائی جان بھی گرم

ہوگئے ۔ اماں بولیں "بیٹی چاہے وہ اپنا ہے ۔ لیکن کرامت سے یوں دھینگا مشتی کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا"۔ میں نے اماں کے طعنے سنے ۔ بھائی کی نصیحتیں سنیں اور انہیں پی گئی ۔ پھر میں نے بڑی کوشش سے وہ کمرہ لے لیا ۔ جس کی ایک دیوار سکندر صاحب کے کمرے سے ملحق تھی ۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا ۔ ہماری آوازیں دیوار کے پار پہنچتی تھیں ۔ یہ تو بس آگ بگولہ ہوگئے کئی دن مجھے پڑھانے نہ آئے ۔ مجھ سے بول چال بند کردی ۔

ایک دن میں ان کے کمرے میں جا نکلی اور چھیڑنے کے لئے بولی ۔ "بھائی جان آپ چپ چاپ کیوں رہتے ہیں"۔ میں انہیں بھائی جان کہا کرتی تھی ۔ تمہیں اس سے کیا غرض ؟" یہ تلملائے ۔ "چاہے میں کیسا بھی ہوں ۔۔۔۔ "آپ سے پڑھتی جو ہوں"۔ نہیں ، میں نہیں پڑھاؤں گا تمہیں" ۔ یہ غرائے ۔ "اچھا نہ سہی لیکن آپ میرے بھائی جان تو ہیں" ۔ نہیں میں نہیں بنتا "بھائی جان ، جل کر بولے ۔ "ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے ۔ تمہیں کیا چاہے میں مروں یا جیوں"۔ انہوں نے اپنی کتاب اٹھا کر دیوار سے دے ماری ۔ "بڑا اچھا کیا آپ نے"میں نے لاپرواہی سے کہا ۔ یہ کتابیں تو آپ کی جان کھا گئی ہین ۔ " یہ کتابیں جان کھا گئی ہیں یا ۔ یا۔۔۔۔ دفعتاً وہ چپ ہوگئے ۔ "یہ پنسل بھی پھینک دیجئیے نا ۔ میری انگلیاں ان کے ہاتھوں سے مس ہوئیں ۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اب جو دیکھتی ہوں تو گالوں پر آنسو ۔ شائستہ انہوں نے مشکل سے کہا ۔ "مجھے اس قدر عاجز نہ کرو" ۔

"پھر" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا !" شائستہ ہنسی ۔ مصیبت یہ تھی کہ کرامت بھائی کو اکثر دورے پر جانا پڑتا تھا ۔ ایک بار وہ پندرہ دن کے لئے دورے پر چلے گئے ۔ تو سکندر صاحب پھر ویسے ہی برف ہو کر رہ گئے ۔ اف کس قدر اداسی میں کٹے وہ دن ۔ میں بیٹھی کرامت کا انتظار کیا کرتی کہ کب وہ آئے اور اور ۔۔۔ " وہ مسکرا پڑی ۔ "آتے بھی تو وہ چند دنوں کے لیے ۔ اور پھر جب جانے لگتے تو میں ان کی منتیں کیا کرتی ۔ کرامت بھائی نہ جاؤ ۔ خدا کے لئے آج نہ ۔ " دفعتہ وہ چپ ہوگئی ۔

"اُف یہ میں نے کیا کردیا ہے"۔ وہ چلائی۔ "یہ دیکھو" اس نے سویٹر میرے سامنے رکھدیا۔ "سارا الٹ بُن گئی ہوں۔ میں بھی پاگل ہوں"۔ باتوں ہی باتوں میں کھوگئی۔ نہ جانے کیا بکتی رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عین اس وقت باہر سے سکندر کی آواز آئی۔ وہ چونکی۔ "وہ آگئے"۔ اور پھر میری طرف متوجہ ہوکر بولی "کبیر بھائی! ؛ کوئی نہیں جانا وانا۔۔۔۔۔"

'پرسوں میں نہ روکوں گی تمہیں، پرسوں!"

نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہوا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ میں پھیل رہا ہوں پھیلے جارہا ہوں۔ تمام فضاؤں پر چھائے جارہا ہوں۔ اردگرد کی چیزیں سمٹ رہی تھیں۔ سمٹی جارہی تھیں۔ وہ صحن۔ دیواریں گڑیا کے گھر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ گڑیا میرے سامنے کٹ پتلی کی طرح بیٹھی تھی۔ سامنے دروازے میں ایک گڈا دیوار۔ صحن اور زمین کو گھو رہا تھا۔۔۔۔۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا مجھے جیسے وہ ایک تماشا گاہ ہو۔ جہاں کٹ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔

"پرسوں چلے جانا"۔ گڑیا نے ماتھا ٹیک کر کہا۔

"پرسوں" میں ہنسا۔ "نہیں پرسوں نہیں۔"

"توکب؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"اونہوں۔ میں تو یہاں ایک مہینہ ٹھہروں گا۔ تمہارے پاس"۔ یہ کہہ کر میں باہر سیر کے لیے نکل گیا۔ گڈا اندر بیٹھا غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔

○

باجی

کچھ دیر اچھا باجی کو متوقع نظروں سے دیکھتا رہا ۔

باجی کام میں مصروف تھی ۔ دوپٹہ شانوں پر گرا ہوا تھا ۔ بکھرے ہوئے بالوں میں کیوپڈ کی شکل کا کلپ لگا ہوا تھا ، اور وہ نیچی نگاہوں سے مسکرائے جا رہی تھی ۔ باورچی خانے کے دروازے میں بھائی جان کھڑے تھے ۔ ایک نظر باجی کے کلپ کی طرف دیکھتے اور پھر گھبرا کر اپنی عینک صاف کرنے لگتے ۔ اماں روٹی پکانے میں مصروف تھی ۔

"باجی ! اچھا چڑ کر چلایا ۔

"کیا ہے تجھے"۔ اماں بولی ۔

"مجھے تو نہیں باجی کو ہے"

"کیا ہے مجھے"۔ وہ ہنسی ۔

نہیں نہیں ۔ اچھا چمک کر بولا

بھائی جان جھینپنے لگے

"کچھ پتا ہی نہیں چلتا تمہارا ، کبھی کچھ ، کبھی کچھ ۔ ۔۔۔۔ ۔ آپ ہی کہا تھا بھائی جان کو باورچی خانے لے آ اور اب"۔۔۔۔۔ ۔ ۔

"کب کہا تھا میں نے ، باجی کا منہ سرخ ہوگیا ۔

"اوں کہا نہیں تھا"۔

"لو اماں ، میں نے تو کہا تھا کھانا تیار ہو جائے تو انہیں اطلاع دے دینا"۔

"اوں ۔ اطلاع دے دینا ۔ اور جو مجھے مٹھائی ۔ ۔ ۔۔۔"

"اچھے !! ، باجی نے شور مچایا"۔

"دو ، پھر مٹھائی مجھے"۔

بہت برا ہے تو ۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور اچھے کو گود میں لے کر اسے پیار سے پیٹنے لگی ۔

بھائی جان گھبرانے کے ساتھ مسکرا بھی رہے تھے ۔

"بہت باتیں بناتا رہتا ہے تو" ، باجی نے اچھے کو پیار سے گھورا اور ایک آڑی نظر بھائی پر ڈال کر بولی ۔ چاہے بھائی جان باورچی خانے آئیں نہ آئیں مجھے کیا ۔

اماں نے منہ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا ۔ تم آ بھی گئے نذیر ؟

"نہیں نہیں" ، بھائی جان چونک کر بولے ۔ "نہیں نہیں ۔ میں تو ویسے ہی آیا تھا"۔

جھوٹ ، اچھا باجی کی گود میں سے چیخنے لگا ۔

اماں چولھے میں منہ دے کر ہنسنے لگی ۔

"کیوں اماں میں نے بلایا تھا بھائی جان کو" ؟

"نہ ، میں نہیں دیتی تمہاری باتوں میں دخل"۔ وہ بولی ۔ تم جانو اور تمہارے بھائی ۔

"آپ اس شیطان کی باتوں میں نا آیا کریں بھائی جان"۔ باجی اپنے کلپ کو سنوارتے ہوئے بولی ۔

"نہیں نہیں" ، بھائی گھبرا گئے ۔

"نہیں نہیں"۔ اچھے نے ان کی نقل اتاری ۔

"نہیں نہیں ۔ اچھے" باجی اچھے کو گھور کر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

انہیں نہیں نہیں کرتے دیکھ کر اماں بھی مسکرانے لگی ۔ وہ جانتی تھی گھر میں سبھی بھائی نذیر کو نہیں نہیں کہا کرتے ہیں ۔

باجی چپکے سے اچھے سے پوچھتی ۔ "اچھے وہ کہاں ہیں ؟" "وہ ؟" اچھا ، آنکھیں چمکا کر راز دارانہ انداز سے کہتا ۔ "نہیں نہیں ؟" باجی ہنس پڑتی ۔ تو اچھا اس سے پوچھتا ۔ "بلا لاؤں" نہیں ، نہیں" باجی اسے پیار سے گھورتی "ہاں ہاں" وہ جواب دیتا "نہیں نہیں کو"۔ "نہیں" باجی ہنستے ہوئے اسے ڈانٹتی اس پر اچھے کا منہ لٹک جاتا اور وہ جل کر کہتا ۔ "تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا باجی ، کبھی کچھ کبھی کچھ" اور باجی ہنستی ، ہنسے جاتی ۔

اچھا ، سچ کہا کرتا تھا ۔ "باجی کا کیا اعتبار ۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ اور"۔ باجی کی اس عادت پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے ۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتی ہوں ۔ اسی وجہ سے مجھے باجی ذرا اچھی نہیں لگتی ۔ وہ اچھے سے مل کر سارا دن شور مچایا کرتی ۔ یہ دیکھ کے میں چپکے سے بھائی جان کے کمرے میں جا بیٹھتی اور کتاب پڑھنے لگتی ۔ بھائی جان میری طرف دیکھتے اور مسکرائے جاتے ۔ ان کی خاموش مسکراہٹ کس قدر پر اثر ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے ۔ صرف ہونٹ ہی نہیں جیسے کہ باجی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا ۔ بھائی جان اپنی کرسی کھینچ کر میرے پاس آ بیٹھتے ۔

"بہت جی لگتا ہے تمہارا پڑھنے میں سگی" ۔ میری ہنسی نکل جاتی ۔ اس پر وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتے ۔ "عجیب انداز سے ہنستی ہو تم سگو ۔ بہت خطرناک ہوتی جا رہی ہو۔" بھائی جان کی عادت ہی ایسی ہے چپ چاپ بات کر دیتے ہیں ، نہ بھی کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ بن بولے باتیں کر رہے ہوں ۔ اس کے باوجود باجی یہ سمجھتی ہے کہ وہ بات نہیں کرتے ۔ اور کریں بھی تو گھبرا جاتے ہیں ۔ میرے سامنے تو وہ ذرا نہیں گھبراتے ۔ ان کے کمرے میں چلی جاتی ہوں ، تو آپ ہی آپ بات چھیڑ دیتے ہیں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ توبہ ۔ میں ان کا مذاق نہیں اڑاتی نا ۔ اس لئے ۔ اور باجی ؟ باجی کو تو ہر وقت یہ فکر رہتا ہے کہ انہیں پریشان کرے ۔ پھر بھائی جان گھبرا جائیں تو ان کا قصور ؟ لیکن بھائی جان بھی تو حد ہیں باجی کے سامنے جا کر گویا سدھ بدھ نہیں رہتی ، منہ سے بات نہیں نکلتی ۔

اس روز جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے ۔ اماں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی کہ یکایک میں اور باجی اسکول سے آپہنچیں ۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا اور یوں گھبرا گئے جیسے کسی غیر کے آنے پر کوئی لڑکی گھبرا جاتی ہے ۔ ہم بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئیں ۔ اور جلدی سے باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں ۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ہم نے اماں کی ہنسی سنی ۔ "اے ہے اپنی منیر اور صغیر ہیں" ۔ "منّی ؟" بھائی جان نے حیرانی سے دہرایا ۔ "اتنی بڑی ہوگئی ہے ؟ ۔ اماں ہنس کر بولی "دسویں میں ہے ۔" پھر اس نے باجی کو آواز دی "منیر بیٹی یہاں آ ۔ تیرے بھائی آئے ہوئے ہیں ۔" باجی باورچی خانے میں داخل ہوئی تو بھائی جان پھر سے گھبرا گئے ۔ "السلام علیکم ۔" وہ مسکرائی جیسے کہ اس کی عادت ہے ۔ "ایک دم اتنی بڑی ہوگئی ہو ۔" وہ عینک صاف کرتے ہوئے بولے "ان لڑکیوں کو بڑھتے ہوئے دیر لگتی ہے کیا ؟" اماں کسی کام سے باہر جاتے ہوئے بولی ۔ اماں کے جانے کے بعد بھائی جان اور بھی گھبرا گئے ۔ کچھ کہنے کی خاطر بولے "دسویں میں ہو ؟" "ہوں" باجی نے شان سے کہا ۔ "اور تم ؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ۔ "آٹھویں میں" میں نے جواب دیا ۔ پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے ۔ بار بار عینک صاف کرتے ۔ چوری چوری باجی کی طرف دیکھتے اور گھبرا کر مجھ سے کوئی سوال پوچھ لیتے ، باجی ان کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے جاتی ۔ اس کی مسکراہٹ کو محسوس کر کے بھائی جان اور بھی پریشان ہو جاتے ۔

"سکّو" انہوں نے آہستہ سے کہا ۔ "تمہاری باجی تو ایک دم منّی سے منیر بن گئی اور تم وہی سکّی کی سکّی رہیں ۔" اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا ۔ میں نے کہا کیوں میں کیا بچہ ہوں ؟ تیرھویں میں ہوں "نہیں نہیں" وہ ہنسے ۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا ، کیوں مون انہوں نے باجی کی طرف دیکھا ۔ "میں کیا مون ہوں ؟" باجی نے گھور کے کہا ۔ "تو اور کیا" ؟ بھائی جان کے ماتھے پر پسینہ آگیا "اے ہے ، ملتے ہی لڑنے بھی لگے" اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ۔ "دیکھ لو چاچی ۔" بھائی جان چمک کر بولے اس کی عادت ہی ایسی ہے ۔" اماں ہنسی "نہیں نہیں" بھائی جان گھبرا کر بولے "نہیں نہیں" اس پر باجی کھلکھلا

کر ہنس پڑی ۔ اتنے میں اچھا دوڑا دوڑا آیا اور اچک کر بھائی جان کی گود میں بیٹھ گیا ۔ باجی نے منہ پکا کر اچھے کو گھورا ۔ "نہیں نہیں اچھے ۔ نہیں نہیں" ۔ اور ہم سب ہنس پڑے ۔ "دیکھا بھائی جان یہ ہے میری باجی یہ سکول گئی ہوئی تھی اچھا آنکھیں چمکا کر بولا اچھی ہے نا ۔ یہ سن کر باجی گھبرا کر باہر نکل گئی ۔ دو ایک منٹ کے لئے تو وہ بیٹھے عینک صاف کرتے رہے پھر پسینہ پونچھ کر بولے "تمہاری باجی تو قصائی ہے" "قصائی ؟" اچھے نے دہرایا بھائی جان نے اچھے کو پچکار کر کہا ۔ "اونہوں چیخو نہیں" ۔ "چیخیں تو کیا ہوتا ہے ؟" وہ بولا ۔ "قصائی بگڑ جاتا ہے" بھائی جان نے جواب دیا ۔ "پڑی بگڑے ، ہمیں کیا پروا" ۔ اچھے نے بے پروائی سے کہا ۔ "ہمیں تو ہے" بھائی جان مسکرائے ۔ "کیوں کیا بکرے ہو؟" اور چیختا ہوا باجی کی طرف بھاگا ۔ "باجی باجی بھائی جان بکرا ہیں" ۔ باجی یہ سن کر ہنسنے لگی "اور تم ؟" اچھے نے منہ پر انگلی رکھ کر کہا ۔ "تم قصائی" ۔ "چپ شیطان کہیں کا" ۔ باجی نے پیار سے اسے گھورا ۔ بھائی جان کو پاس سے گذرتے ہوئے دیکھ کر وہ اچھے سے کہنے لگی "ہمیں نہیں چاہیئے ایسا دبلا پتلا بکرا" "کیسا چاہیئے" ۔ اچھے نے پوچھا ۔ "موٹا ہو چربی والا ہو" وہ مسکرائی اچھا بھائی جان کی طرف بھاگنے لگا تو باجی نے ہنستے ہوئے اسے پکڑ لیا ، جیسے واقعی اسے روکنا چاہتی ہو ۔ توبہ باجی کو کیسے ڈھونگ رچانے آتے تھے ۔ میں کیا سمجھتی نہیں ۔ وہ تو بلکہ آپ چاہتی تھی کہ اچھا جا کر ساری باتیں بھائی جان سے کہہ دے ۔ اسی لئے تو وہ اچھے سے ایسی ایسی باتیں کیا کرتی ۔ اچھے سے کچھ کہنا اور پھر توقع رکھنا کہ وہ چیخ چیخ کر اسے دہرائے گا نہیں ۔

اگر اماں ولائیت کا ذکر نہ کرتی ، تو بات نہ بگڑتی ۔ لیکن اماں ! اماں کو کون سمجھائے !! وہ تو بن سوچے سمجھے بات کر دیتی ہے ۔ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے ۔ اماں بولی "نذیر اپنی شادی کا بھی کچھ فکر ہے" ۔ "شادی !" بھائی جان کا رنگ اڑ گیا ۔ باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "مجھے فکر کرنا ہے" ؟ "اے ہے" اماں بولی ۔ "ولایت اب جوان ہے ۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے" "ولایت !" باجی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔ "ہاں ہاں" اماں نے کہا ۔ "تمہارے پھوپھا کی لڑکی ۔ اس سے نذیر

کی شادی ہوگی نا" "ولایت !" باجی کھلکھلا کر ہنس پڑی ولایت سے باجی کو چڑ تھی نا۔ اس لئے ولایت کا نام آجاتا تو ایسا منہ بناتی جیسے کوئی پھس پھسی چیز منہ میں آپڑی ہو۔ بات بھی ٹھیک ہے، واقعی ولایت پھوہڑ اور بد مذاق ہے۔ سارا سارا دن مصلّے پر بیٹھ رہتی ہے، مصلے سے اٹھی تو برتن دھونے لگی۔ کپڑے دھونے سے تو اسے عشق ہے۔ بات کرو تو مسئلے چھیڑ دیتی ہے اور چپ بیٹھی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تسبیح کر رہی ہو۔

بھائی جان نے بہتیرا کہا کہ منگنی کوئی نہیں ہوئی۔ ویسے ہی لوگوں نے بات چلا دی ہے۔ لیکن اماں کب ماننے والی تھی بولی "مانا ڈھولک نہیں بجی باجے نہیں بجے۔ لیکن بات تو پکی ہو چکی ہے"۔ ادھر باجی ہنس ہنس کر چیخنے لگی۔ "میں نے بھی کہا۔ بھائی جان کو ولایتی چیزوں سے عشق کیوں ہے"۔ اچھا چلایا۔ "بھائی جان کا بیاہ ہوگا۔ ابا بھائی جان کا بیاہ ہوگا"۔ "نہیں نہیں"۔ بھائی جان گھبرا کر بولے۔ اور پھر دفعتاً چپ ہوگئے۔ "نہیں نہیں"۔ باجی نے اچھے کو مذاق سے گھورا۔ "نہیں نہیں" دولھا بنیں گے میں جانتا ہوں" اچھا چیخنے لگا۔ "گھوڑے پر چڑھیں گے"۔ توبہ ان سب نے مل کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس پر بھائی جان کھسیانے ہو کر چلے گئے۔

اگلے روز کھانے کے وقت حسب معمول اچھا باجی کے پاس آکر کہنے لگا۔ "باجی بلاؤں بھائی جان کو" اوں ہوں" باجی نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا۔ "وہ تو اپنے کمرے کو ولایت بنا کر بیٹھ رہتے ہیں"۔ عین اس وقت بھائی جان آپہنچے۔ باجی کی بات سن کر انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اُف وہ ایک نظر جیسے گھور رہے ہوں، فریاد کر رہے ہوں۔ میرے بدن میں تو سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ لیکن باجی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے۔ وہ اور بھی چمکی۔ ہنستے ہوئے اچھے سے پوچھنے لگی۔ "کیوں اچھے تم دیسی ہو یا ولایتی" "ولایتی ؟"۔ اچھا سٹپٹا کر بولا "وہ کیا ہوتا ہے باجی ؟"۔ "وہ جو ولایت میں بنے" باجی نے ایک انداز سے کہا۔ "بھائی جان کیا ہیں ؟" اچھے نے پوچھا"۔ "باجی نے ایک آڑھی نظر بھائی جان پر ڈالی۔ "اور تم" اچھے نے پوچھا "ہم تو دیسی ہیں" باجی

مسکرائی ۔ ایک بار بھائی جان نے پھر اسی نظر سے باجی کی طرف دیکھا ۔ اف کتنی التجا تھی ، اس ایک نظر میں عین اس وقت اندر سے اماں کی آواز آئی ۔ ”تم اب آؤ گے بھی یا وہیں جھگڑتے رہو گے“۔

اس روز کھانے پر سبھی خاموش بیٹھے تھے ۔ بھائی جان پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ۔ باجی بھی کچھ سوچ رہی تھی ۔۔۔۔۔۔ اور اچھا ؟ حیرانی سے کبھی بھائی جان کی طرف دیکھتا ، اور کبھی باجی کی طرف ۔ ”کچھ اچھا بھی بنا ہے ؟“ اماں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔ اور پیشتر اس کے کہ بھائی جان جواب دیں ۔ باجی بولی ”اوں ہونہہ ۔ یہ شلغم کیوں پکا لئے اماں ۔ پکانے ہی تھے تو ولایتی پکاتیں“ ”ولایتی ؟“ اماں نے حیرانی سے باجی کی طرف دیکھا ۔ وہی جو پیلے سے ہوتے ہیں“۔ باجی نے کہا ۔ بھائی جان نے تڑپ کر باجی کی طرف دیکھا ، اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ ”تو کہو نا انگریزی“ اماں باجی سے کہنے لگی ۔ ”ایک ہی بات ہے“ باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا ۔ ”بالکل اچھے نہیں لگتے تمہیں ؟“ اماں نے پوچھا ۔ ”مجھے ؟“ وہ معنی خیز نگاہوں سے بھائی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔ ”میں تو مزے سے کھا رہی ہوں بھائی جان سے پوچھئے“۔ بھائی جان کھسیانی ہنسی ہنسے اور پھر اور بھی چپ ہوگئے ۔

اگلے دن میں کئی ایک بار بھائی جان کے کمرے میں گئی ۔ دیر تک بیٹھی رہی لیکن انہوں نے مجھ سے بات تک نہ کی ۔ جیسے واقعی پڑھنے میں شدت سے مصروف تھے ۔ میں سب سمجھتی ہوں صاف دکھائی دے رہا تھا ۔ کہ وہ کھوئے کھوئے ہیں ۔ آنکھیں بھری بھری سی ۔ ماتھے پر تیوری ۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز کھائے جا رہی ہو ۔ میں نے چل کر پوچھا ”کیا ہے بھائی جان“ ؟ ”بھائی جان چونکے ”سگی ! کچھ نہیں ۔ مجھے تو کچھ نہیں“۔ انہوں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا ۔ ”ٹپ“ کتاب پر کچھ گرا ۔ ”بھائی جان !“ انجانے میں میرے منہ سے نکلا ”نہیں نہیں“ وہ چلائے ”میری آنکھیں خراب ہیں ، پانی گرتا ہے“۔ اچھا جو اس دوران میں اندر آچکا تھا ۔ چلا کر بولا ۔ ”جھوٹ آنکھ میں سے تو آنسو گرتا ہے“ بھائی جان نے بے بسی سے اچھے کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر خاموش ہوگئے ۔ اچھا غل مچاتا ہوا باہر کی طرف بھاگا ۔ ”باجی باجی ۔۔۔۔۔“ ”تو پھر میں کیا کروں“۔

کچھ دیر بعد باجی کی آواز آئی اور بھائی جان کرسی سے اٹھ کر اوندھے منہ پلنگ پر لیٹ گئے۔

اس کے بعد بھائی جان نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا۔ وہیں کھانا منگوا لیتے۔ اور پھر وہیں پڑھنا شروع کر دیتے۔ شام کو اندر آکر گپیں مارتے اچھے سے کھیلنے کی بجائے وہ باہر سیر کو چلے جاتے اور آکر سو جاتے۔ اندر آتے بھی تو اس وقت جب ہم دونوں اسکول میں ہوتیں۔

ایمان کی بات ہے بھائی جان کی اس تبدیلی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اچھا ہوا وہ باجی سے الگ تھلگ ہو گئے۔ باجی سے انہیں بھونڈے مذاق اور طعنوں کے سوا مل ہی کیا سکتا تھا۔ ہر وقت کی کھی کھی اور شور شرابا۔ لیکن مصیبت یہ تھی۔ کہ بھائی جان نے باجی سے بات کرنا کیا چھوڑا انہوں نے تو بالکل ہی چپ کا روزہ رکھ لیا۔

ایک دن میں ان کی چپ سے تنگ آکر کمرے سے باہر نکل رہی تھی، کہ باجی آگئی۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ کیوں کہ اس سے پہلے باجی کبھی بھائی جان کے کمرے میں نہ آئی تھی۔ نہ جانے کیا کہنے آئی ہے۔ میں نے سوچا۔ مذاق کی بات تو نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ اس کے منہ پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی کے ساتھ میں بھی اندر جاؤں۔ مگر کیسے جاتی۔ باجی کیا کہے گی۔ بات سنے بغیر بھی تو نہ رہ سکتی تھی میں -------- باہر نکل کر میں ادھر سے گھوم کر ادھر جا پہنچی۔ جس طرف بھائی جان کے کمرے کی کھڑکی تھی اور لگی درز میں سے جھانکنے۔ باجی بھائی جان کے سامنے طمطراق سے کھڑی تھی۔ بھائی جان گھبرائے ہوئے کرسی پر بیٹھے چابیوں کے گچھے سے کھیل رہے تھے۔ "لیکن اماں تو یہی سمجھتی ہے" باجی نے کہا۔ بھائی جان کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"اماں!"

"ہاں۔ وہ کیا دیکھتی نہیں کہ آپ الگ الگ رہتے ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ میری وجہ سے ناراض ہیں"۔

"نہیں نہیں" بھائی جان چلائے اور پھر دفعتاً خاموش ہو گئے ۔ باجی کی ہنسی نکل گئی ۔ "آپ مجھے خواہ مخواہ ہنسا دیتے ہیں"۔ وہ بولی "چلو بھائی جان غصہ تھوک دو اب"۔

"تم سمجھتی ہو میں غصہ میں ہوں ۔ تم سے غصے میں ؟"۔ بھائی جان نے بصد مشکل کہا ۔

مجھے کیا پتہ ؟" باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا

"تمہیں پتہ نہیں مون ؟" بھائی جان کی آواز میں آنسو تھے ۔

"مجھے مون نہ کہا کیجئے"۔

"تو کیا کہا کروں" بھائی جان نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"مجھے نہیں معلوم"۔

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے منیر ۔ کبھی معلوم بھی ہو گا"۔

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ یہ ولایتی بولی ہماری سمجھ میں نہیں آتی"۔

"منیر !" بھائی جان تڑپ کر بولے "کیا تم کبھی نہ سمجھو گی ؟" انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں منت سے کہا ۔

"بھائی جان ! چپ !" وہ مسکرائی ۔ اتنے میں اچھا کہیں سے آنکلا اور اونچی آواز میں چلانے لگا ۔ "اماں دیکھو بھائی جان رو رہے ہیں ۔ اور باجی انہیں چپ کرا رہی ہے ۔ اتنے بڑے ہو کر روتے ہیں"۔ "اچھے ۔ اچھے" باجی اچھے کے پیچھے بھاگی ۔

شام کو جب ہم پڑھ رہی تھیں تو بھائی جان آئے اور چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھ گئے ۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے میری طرف دیکھا ۔ اور باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ایمان کی بات ہے مجھے بے حد غصہ آیا ۔ آخر ایسی بھی کیا بات تھی جو میرے سامنے کہی نہ جا سکتی تھی ۔ بھائی جان تو بیکار باجی کے لئے دیوانے ہو رہے تھے ۔ اور

باجی ؟ باجی کو ان کی خاک پرواہ نہ تھی ۔ میں غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی ۔

جب میں اندر آئی تو باجی کے پاس ایک عجیب سا چمکدار پلاسٹک پڑا تھا ۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ۔ اس پر ایک خوبصورت بچے کی شکل بنی ہوئی تھی ۔ جس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا ۔ میں نے پوچھا باجی یہ کیا ہے "کیا ؟" باجی نے تنک کر پوچھا "یہ" میں نے پلاسٹک کی طرف اشارہ کیا ۔ بولی "یہ کلپ ہے" کلپ ؟ میں حیران ہو گئی "ہاں" باجی نے لاپرواہی سے کہا ۔ "میں نے بھائی جان سے کہا تھا ایک کلپ لا دو"۔ اس پر یہ تصویر کیسی ہے ۔ میں نے پوچھا ۔ "پتہ نہیں"۔ وہ مسکرائی ۔ "بس تصویر ہے"۔ توبہ باجی کو کتنے مکر کرنے آتے ہیں ۔ میں کیا جانتی نہیں کیوپڈ کی تصویر تھی ۔ میں نے کئی بار اسکول میں دیکھی تھی ۔ ہماری استانی نے سب کچھ بتایا تھا ہمیں ۔

اس کے بعد باجی ہر وقت وہ کلپ اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ۔ بھائی جان اسے دیکھتے اور مسکرانے لگتے ۔ اچھے نے کلپ کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہنے لگا ۔ "یہ کیا ہے باجی ۔ مجھے دو ۔ میں دیکھوں" اوں ہونہہ" باجی مسکرا کر بولی "یہ کھلونا نہیں" اچھا بسورنے لگا ۔ تو بھائی جان نے اسے پکڑ لیا بولے "آؤ ہم تمہیں ایسا اچھا کھلونا دیں گے"۔ "نہیں نہیں میں تو یہی لوں گا"۔ اچھا مچل گیا جیسے اس کی عادت ہے "واہ" بھائی جان بولے "یہ بھی کوئی چیز ہے ۔ بالکل بیکار ۔ اسے تو زمین پر لڑھکا بھی نہیں سکتے ۔ ہم تمہیں موٹر لا دیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے ، بھائی جان اچھے کو اٹھا کر باہر لے گئے ۔

اگلے روز جب باجی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ اماں بھاگی بھاگی آئی ۔ کہنے لگی ، منیر بیٹی اٹھ کے چاء تو بنا دے ۔ تیرا بھائی دلاور آیا ہے"۔ "دلاور"۔ باجی نے حیرانی سے پوچھا "ہاں ! تیری خالہ اور خالو بھی آئے ہیں "سچ ؟" وہ مسکرائی ۔ "ہاں" اماں بولی "دو ایک مہینے یہاں رہیں گے"۔ 'افریقہ والی خالہ ؟" میں نے پوچھا"۔ افریقہ والی نہیں تو اور کونسی" ؟ اماں نے کہا ۔ شکر ہے بہن آئی ہے ۔ توبہ آٹھ سال وہیں افریقہ میں بیٹھ رہی ۔ مل تو لے مجھ سے ۔ "ہماری ایک باجی بھی ہے" باہر سے اچھے کی آواز آئی ۔ "پڑی

ہو"۔ دلاور بھائی کی بھدی آواز سنائی دی ۔ "پڑی ہو نہیں" اچھا چلایا "ہے"۔ "ہوگی" وہ بولے ۔ اتنے میں اچھا بھاگتا ہوا آیا "باجی باجی" وہ بولا "بھائی جان آئے ہیں وہ کہتے ہیں تمہاری باجی ہے ہی نہیں چلو" وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا ۔ "چلو بھی نا" "نہیں نہیں اچھے" باجی چڑ گئی "نہیں نہیں ، نہیں" اچھا اونچی آواز میں بولا ۔ "دوسرے بھائی جان"۔ "کون بھائی جان ؟" باجی نے ستک کر باآواز بلند کہا ۔ "وہ باہر بیٹھے ہیں" اچھے نے کہا ۔ "بیٹھے ہوں گے" وہ ہنسی ۔ "واقعی بیٹھے ہیں آؤ دکھاؤں" اچھا بولا "پڑے بیٹھے ہوں"۔ یہ سن کر اچھا باہر بھاگ گیا اور کہنے لگا ۔ "باجی مانتی ہی نہیں کہ آپ بیٹھے ہیں"۔ "نہ مانے" وہ ہنسے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔

اماں کو آتے دیکھ کر اچھا پھر سے چیخنے لگا ۔ اماں دیکھو یہ بھائی جان میری باجی کو مانتے ہی نہیں"۔ اماں ہنسنے لگی ۔ تُو تو پاگلوں کی سی باتیں کرتا رہتا ہے" اچھا بھائی جان سے مخاطب ہو کر بولا ۔ "ہماری باجی دسویں میں ہے دسویں میں" "دسویں میں ؟ بھائی دلاور نے منہ بنا کر کہا ۔ "پہلے کیوں نہ بتایا تم نے ؟" "آپ تو مانتے ہی نہ تھے"۔ اچھے کی آواز میں فتح کی گونج تھی ۔ "تم تو کہتے تھے وہ باجی ہے" بھائی جان نے اماں کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ "باجی ہی تو ہے" وہ بولا "جو دسویں میں ہو اسے تو منی کہتے ہیں ۔ باجی نہیں" "منی ؟ "دلاور نے کہا" اچھا سٹپٹا گیا ۔ اماں نے انہیں مشغول دیکھا تو بولی "میں چاء لاتی ہوں"۔ اور باورچی خانے کی طرف چل دی ۔ "منی کیا ہوتی ہے ؟" اچھے نے دلاور بھائی سے پوچھا ۔ "بھئی منی وہی ہوتی ہے نا ۔۔۔۔۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ منی کیا ہوتی ہے ؟" "بتاؤ نا" اچھا شوق سے بے تاب ہو رہا تھا ۔ "منی ہوتی ہے وہ جو دبلی پتلی ہو ۔ اتنی میلی میلی اور گندی کہ دیکھنے کو جی نہ چاہے ؟" اچھا چمک کر بولا"۔ باجی تو اتنی چٹی گوری ہے ۔ ایسے اچھے کپڑے پہنتی ہے"۔ "ہونہہ منہ پر آٹا لگاتی ہوگی" دلاور بھائی نے کہا ۔

"آٹا نہیں وہ تو پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر"

"وہی نا ولایتی آٹا ۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے ۔ ولائیتی آٹا وہی لگاتی ہیں جو میلی ہوں ۔ ورنہ ضرورت ہی کیا ہے"۔

"نہیں نہیں" اچھا چڑگیا ۔ باجی کو تو ولائیتی چیزیں ذرا پسند نہیں ۔ وہ تو دیسی ہے دیسی"۔

"دیسی ؟" دلاور بھائی نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا ۔ "دیسی ؟" آخ تھوہ"

اچھا بھاگا بھاگا باورچی خانے آیا ، بولا "باجی باجی تم آتی کیوں نہیں" باجی آپ ہی آپ بیٹھی ہنس رہی تھی ، اچھے کو دیکھ کر وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی ۔ "اچھے"۔ اس نے گھور کر اسے خاموش کر دیا ۔ پھر کچھ سوچ کر گود میں اٹھا لیا اور پیار سے بولی ۔ "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے" وہ حیرانی سے باجی کی طرف دیکھنے لگا ۔ "ہم اچھے کو چاء پلائیں گے ۔ بسکٹ دیں گے ۔ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی اور بسکٹ دے کر اسے بہلا لیا ۔

بھائی دلاور مجھے ذرا پسند نہ آئے ۔ موٹے موٹے نقش ، بھدا سا جسم اور دو گھورنے والی آنکھیں جو کبھی کبھی شرارت سے چمکتیں ۔ ان کے انداز میں لاپرواہی جھلکتی تھی ۔ بھائی نذیر کے مقابلے میں تو وہ پہلوان نظر آتے تھے نذیر بھائی کی کیا بات تھی ۔ نگاہوں میں مٹھاس ، برتاؤ میں نرمی ، گویا چیزیں اور لوگ بلور کے بنے ہوئے ہوں ، جنہیں وہ بڑی احتیاط سے چھوتے تھے ۔ دلاور بھائی تو سپاہی تھے سپاہی' تھے بھی تو فوج میں کپتان ۔ پہلے پہلے تو باجی نے اپنی عادت کے مطابق تیز باتیں چلانے کی کوشش کی ۔ مگر توبہ ہے جی ۔ ان کے سامنے ایسی باتیں کیسے چل سکتی تھیں پھر باجی چپ ہوگئی ۔ حتیٰ کہ اس کی مسکراہٹ بھی جاتی رہی ۔ ایمان سے مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ۔ بڑی بنی پھرتی تھی ۔ ہر کسی کو دبا لیتی تھی ، لیکن ہر کوئی بھائی نذیر سا تو نہیں ہوتا ۔

چاء پینے بیٹھے تو دلاور بھائی نے باجی کے سلام کے جواب میں کہا ۔ "منیر تم تو ویسی کی ویسی ہو جیسے پہلے تھیں" "کیوں ؟" اماں بولی "اب تو ماشاءاللہ جوان ہے ، اتنا بڑا قد ہوگیا ہے ۔" "قد بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے" بھائی نے جواب دیا "باقی تو بالکل وہی ہے"۔ باجی کا منہ لال ہوگیا ۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ اماں نے شاید بات بدلنے کے لئے کہا ۔ "اب کیا ہمیشہ کے لئے افریقہ بیٹھ رہو گے تم سب ؟" "افریقہ ؟ میں تو نہیں رہتا وہاں"۔ بھائی نے کہا "وہ

تو رہتے ہیں نا" اماں نے جواب دیا۔ "تو ان سے پوچھ لینا جب وہ آئیں گے"۔ بھائی نے ہنس کر کہا، خالہ میں تو سپاہی ہوں سپاہی۔ دو سال سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں" اماں بولی "میں کہتی ہوں تم نے یہ نوکری کی ہی کیوں جان کو آرام نہ ہو تو پیسے کو کیا کرنا ہے۔" "جان کو آرام کیوں نہیں"۔ بھائی نے اماں کی طرف دیکھا۔ "آپ ہی تو کہتا ہے تو۔ مارا مارا پھرتا ہوں"۔ اماں بولی "جسے مارا مارا پھرنے میں ہی مزہ آئے، وہ کیا کرے خالہ"۔ بھائی مسکرا دیئے۔ "اپنا گھر نہ بساؤ گے کبھی؟" اماں نے پوچھا "گھر بسانے میں دیر لگتی ہے کیا۔ چار کلمے پڑھے اور گھر بس گیا۔ پھر کوئی جہاں جی چاہے بھٹکتا پھرے"۔ وہ بولے "تو کیا بیوی کو بھی ساتھ ساتھ لئے پھرو گے؟" اماں نے پوچھا۔ "اور کیا اسے کوٹھڑی میں بند کر جاؤں گا"۔ دلاور بھائی نے قہقہہ لگایا "پھر تو دلاور" ہاتھ ملتے ہوئے اماں نے کہا۔ "کوئی فرنگن ہی کرو گے۔ یہاں کی لڑکیاں تو باہر نہیں پھرتیں"۔ "نہ سہی کوئی زبردستی ہے؟" دلاور بھائی ہنسے "ہائے ہائے" اماں نے ناک پر انگلی رکھ لی۔ "فرنگن میں کیا برائی ہے خالہ" بھائی نے ہنس کر پوچھا۔ کیوں سکو؟" "فرنگن کیا ہوتی ہے" اچھا بولا۔ "یہی جو ولایت کی ہوتی ہے" اماں نے جواب دیا "ولایت کی"۔ اس نے دہرایا "جو بنا سپتی ہوتی ہے؟" اس پر ہم سب کی ہنسی نکل گئی۔ لیکن اور اچھا کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا "دوسرے بھائی جان سے جو پوچھ رہی تھی" باجی۔

عین اس وقت میں نے مڑ کر دیکھا بھائی نذیر دروازے میں کھڑے تھے دلاور بھائی سے رسمی ملاقات کرنے کے بعد وہ ابھی عینک لگانے نہ پائے تھے۔ کہ اچھا چلانے لگا۔ "بھائی جان یہ سب ہنس رہے ہیں۔ یہ نئے بھائی جان اور، اماں اور سبھی، یہ کہتے ہیں باجی باجی نہیں۔ منی ہے"۔ "اچھے" اماں اسے گھورنے لگی۔ "سارا دن نہ جانے کیا بکتا رہتا ہے"۔ "بچہ جو ہوا" دلاور بھائی نے اماں کو خاموش کر دیا اور لگے اس سے باتیں کرنے۔ "جھوٹ تو نہیں کہتے ہم اچھے پوچھ لو اپنی باجی سے" باجی نے تیکھی نظر سے دلاور بھائی کی طرف دیکھا اور منہ موڑ کر مسکرانے لگی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں پریشانی کی جھلک تھی۔

اگلے روز ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ نذیر بھائی، باجی، اچھا اور

میں ۔ اچھے نے بہت کوشش کی کہ باجی کو بات کرنے پر مائل کرے ۔ مگر وہ خاموش رہی ۔ اسے نذیر بھائی کو چھیڑنے کی بھی نہ سوجھی ۔ بھائی عینک صاف کرتے ہوئے بولے ، اچھے آج تمہاری باجی کو کیا ہے ۔ اچھا بولا ۔ "اونہہ ، باجی کا کیا ہے ، کبھی کچھ کبھی کچھ"۔ "کیوں منیر اچھا کیا کہہ رہا ہے ؟ "انہوں نے بات چھیڑنے کی کوشش کی ۔ "اس کا کیا ہے ۔ جو منہ میں آیا بک دیا"۔ باجی نے شانے جھٹک کر کہا ۔ "میں بتاؤں باجی کیوں چپ ہے ، نئے بھائی جو نہیں مانتے ؟ کیا نہیں مانتے ۔ "کچھ بھی نہیں مانتے ۔ کہتے ہیں منی بے منی"۔ "مجھے کیا؟" باجی چڑ کر بولی ۔ "لوگ مانیں نہ مانیں" بھائی جان نے ہولے سے آہ بھر کر کہا ۔ "کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا"۔ باجی نے غصہ سے مڑ کر دیکھا ۔ "مان نہ مان میں تیرا مہمان "۔ اچھا چلانے لگا ۔ ؟'وہ کیا ہوتا ہے باجی ؟" "اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ" باجی نے ہنس کر کہا ۔ بھائی کا رنگ فق ہوگیا ۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری اور چپکے سے باہر چلے گئے ۔ بھائی کے چلے جانے کے بعد اچھا باجی سے لڑنے لگا ۔ "تم تو بھائی جان سے لڑتی ہو باجی"۔ "میں لڑتی ہوں" اس نے غصے سے کہا ۔ "ہم نہیں بولتے تم سے" اچھے نے کہا ، کچھ دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

باجی نے بال سنوارنے کے لئے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا ہاتھ کلپ سے چھوا تو وہ یوں چونکی جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو ۔ اس نے کلپ اتار کر اچھے کی طرف بڑھایا "یہ لو ۔ اب تو بولو گے مجھ سے" "لے لوں ؟" اچھا حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ "ہاں" باجی بولی "واپس نہیں دوں گا پھر" اچھا بولا ۔ "نہ دینا" باجی نے لاپرواہی سے جواب دیا "مجھے کیا کرنا ہے اسے"۔

"یہ دیکھو بھائی جان"۔ اچھے نے بھائی دلاور کو کلپ دکھتے ہوئے کہا ۔ "نہیں دیکھتے ۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو"۔ بھائی جان نے مذاق سے کہا ۔ "خواہ مخواہ کیا ہوتا ہے بھائی جان ؟ ابھی ابھی باجی بھی کہہ رہی تھی ۔" "تو پھر پوچھو اس سے" بھائی مسکرانے لگے ۔" وہ نہیں بتاتی ۔ آپ بتائیے نا"۔ اچھے نے منت سے کہا ۔ "تمہیں کہہ رہی تھی ؟" انہوں نے پوچھا۔ "نہیں نہیں ان

کو ۔۔۔۔۔۔" اچھے نے بات شروع کی "اچھے" باجی غصہ میں چلائی ۔ اچھا خاموش ہوگیا ۔ بھائی ہنس کر کہنے لگے ۔ "دیکھا اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ" "اسے کیسے ؟" اچھا حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ بھائی اسے سمجھانے لگے ۔ "اگر تم اور میں باتیں کر رہے ہوں اور بیچ میں کوئی بول اٹھے تو اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ"۔ "جیسے باجی بولی ہے ؟" "کوئی بھی ہو"۔ انہوں نے مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا ۔ "نہیں نہیں"۔ اچھا چلایا "باجی تو نذیر بھائی کو خواہ مخواہ کہہ رہی تھیں"۔ "دونوں ہی خواہ مخواہ ہیں"۔ یہ کہہ کر دلاور بھائی ہنسنے لگے ۔ باجی کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا ۔ "یہ دیکھا"۔ وہ اچھے سے کہنے لگے ۔ "اب اسے غصہ آرہا ہے"۔ باجی سے نہ رہا گیا ۔ غصے سے بولی ۔ "ہمیں تو نہیں آرہا غصہ"۔ "پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے ۔" انہوں نے جواب دیا ۔ "ایلو میاں اچھے دیکھ لو ۔ تمہاری باجی کو غصہ بھی نہیں آتا تت تت تت تت !!!" باجی کی ہنسی نکل گئی ۔ "بڑے مغرور ہیں آپ بھائی جان"۔ باجی گھور کر بولی "ہر سپاہی کو ہونا چاہیئے"۔ بھائی جان نے جواب دیا ۔ "سپاہی کو صرف دو باتوں کا خیال ہوتا ہے ۔ آن اور شان"۔ "اونہہ" باجی نے منہ بنا کر کہا ۔ "بڑی شان ہے کیا شان ہے ؟ اور باہر نکل گئی ۔

رات کو جب اماں اچھے کو لے کر پڑوس میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھی اور ہم دونوں پڑھ رہی تھیں ، بھائی دلاور آگئے ۔ باجی انہیں دیکھ کر یوں بیٹھ گئی ۔ جیسے پڑھنے کے سوا اسے کسی کا دھیان ہی نہیں ۔ لیکن بھائی جان کب ٹلنے والے تھے ۔ سیدھے باجی کے پاس جا بیٹھے ۔ "کیا پڑھ رہی ہو منو ؟" انہوں نے پوچھا ۔ "کچھ بھی نہیں"۔ وہ تنک کر بولی ۔ "ٹھیک تو ہے"۔ بھائی جان نے کہا "انسان غصہ میں ہو تو کچھ پڑھا نہیں جاتا"۔ "کیوں میں کیا غصے میں ہوں" ؟ باجی کا منہ لال ہوگیا ۔ "پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے"۔ بھائی جان مسکرائے ۔ "تمہاری عمر کی لڑکی ہو اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ نہ کھائے"۔ "کیوں ؟" باجی نے ان کی طرف دیکھا ۔ "جوانی پر غصہ سہاگے کا کام دیتا ہے" بھائی نے کہا "میں نہیں سمجھتی آپ کی باتیں"۔ باجی نے منہ پکا رکھنے کی کوشش کی ۔ "سمجھ لو تو تمہیں دلچسپی ہی نہ رہے"۔ بھائی نے جواب دیا ۔ باجی کھلکھلا

کر ہنس پڑی "یعنی مجھے دلچسپی ہے آپ کی باتوں سے اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے انسان کیا کیا نہیں سوچتا"۔ باجی نے کہا۔ سپاہی کی بے عزتی ہو تو بدلہ لینے سے نہیں چوکتا"۔ انہوں نے باجی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ باجی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، مگر وہ اپنا آپ چھڑا نہ سکی۔ بھائی نے اسے چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "بڑا غصہ ہے تم میں منو" "بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی"۔ باجی چیخی۔ "تمہیں آئینہ دکھائیں" بھائی بولے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ذرا آئینہ تو لے آنا" "صغیر"۔

جب میں آئینہ لے کر واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے جیسے وہاں کوئی ہو ہی نہیں میں دروازے میں رک گئی۔ ------۔ کچھ دیر بعد بھائی آہستہ سے بولے "مینو" میرے دل کو دھکا سا لگا۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان دنوں میری عمر ہی کیا تھی۔ اگرچہ میں سمجھا کرتی، کہ میں سبھی کچھ سمجھتی ہوں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ سارا گھر، باجی، بھائی سبھی گندے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار کر گھر سے باہر نکل جاؤں۔

اگلے دن باجی کا رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ منہ پر ملائمت سی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی، ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گذشتہ یاد سے متعلق ہو۔ بھائی نذیر پہلے تو اسے دیکھ کر خاموش کھڑے رہے پھر آہستہ سے بولے "منیر" باجی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور بے پرواہی سے منہ پھیر کر اپنا کام کرنے لگی۔ بھائی نذیر باجی کے بالوں میں کچھ تلاش کر رہتے تھے۔ بھائی بھی احمق ہیں ان کا کلپ تو چولہے کے پاس راکھ میں پڑا تھا، "اوہ" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پاؤں لڑکھڑائے۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سہم کر پیچھے ہٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی دلاور بھائی آکر بے تکلفی سے چوکی پر بیٹھ گئے۔ باجی نے دو ایک مرتبہ چوری چوری ان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں، اتنے میں اچھا آگیا۔ بولا "باجی، نہیں نہیں کہاں ہیں"۔ "نہیں نہیں کون"؟ دلاور

بھائی نے پوچھا ۔ "باجی" اچھے نے باجی کو چپ دیکھ کر بلانا چاہا ۔ "باجی !" بھائی جان ہنسنے لگے"۔ تمہاری باجی تو "ہاں ہاں" ہے"۔ باجی نے تڑپ کر ایک نظر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ "باجی نہیں ، نہیں نہیں"۔ "افوہ اچھے میاں" بھائی جان کہنے لگے "بات یہ ہے کہ جب تمہاری باجی کہے نہیں نہیں تو مطلب ہوتا ہے ہاں ہاں"۔ "بھائی جان" باجی منت سے چلائی ۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ "اور اگر ہاں ہاں کہے تو ؟" اچھے نے کہا ۔ "ہاں ہاں کہے تو وہ تمہاری باجی ہی نہیں ۔ بھائی جان بولے "مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ"۔ اچھا باہر جاتے ہوئے چلایا ۔ "ہمیں تو سب معلوم ہے کیوں منی"۔ بھائی جان باجی کے قریب تر ہوگئے ۔ "آپ کو کبھی معلوم بھی ہوگا ؟" باجی نے آہ بھر کر کہا ۔ "اوہ غصے ہوگئیں"۔ وہ بولے "آپ سے غصے ؟"۔ باجی گنگنائی ۔ بھائی دلاور اس کے قریب تر ہوگئے ۔ "اس لئے روٹھتی ہو کہ کوئی منائے ؟" باجی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں ۔ لیکن بھائی نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔ میرا خیال تھا ۔ کہ باجی ان کے منہ پر تھپڑ مار دے گی ۔ لیکن اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ۔ ہاتھ لٹک گئے آنکھیں جھک گئیں ۔

راکھ میں کلپ پڑا دیکھ کر وہ یوں چونکی ، جیسے اسے پہلی مرتبہ وہاں دیکھا ہو ۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے کئی مرتبہ چلتے پھرتے اسے اپنے پاؤں سے ٹھکرایا تھا جیسے ٹھیکرا ہو ۔ مگر اس وقت اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی عین اس وقت اچھا آگیا ۔ باجی کے بالوں میں کلپ لگا ہوا دیکھ کر بولا ۔ "یہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا باجی"۔ "نہیں اچھے یہ دینے کی چیز نہیں"۔ باجی نے کہا ۔ "اب پتہ چلا تمہیں ؟"۔ اچھے نے شور مچایا ۔ "ہاں" باجی کی آواز میں ہچکی سی تھی "تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا"۔

اگلے روز جب اماں خوشی خوشی سے دوڑی دوڑی آکر کہنے لگی ۔ "منیر بیٹی تمہارے خالو کا خط آیا ہے انہوں نے دلاور کے لئے تمہارا رشتہ مانگا ہے"۔ "تو میں کیا کروں" باجی نے چڑ کر کہا "اے ہے" اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی ۔ "آخر تو پڑھی لکھی ہے ، سمجھ دار ہے تجھ سے پوچھے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں" باجی نے یہ سن کر سر جھکا لیا ۔ "تو تجھے منظور ہے نا ؟" اماں خوشی سے

اٹھ بیٹھی ۔ باجی نے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آہ بھری اس کا ہاتھ کلپ سے جا لگا ۔ اس نے اسے یوں مٹھی میں دبا لیا جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لے رہا ہو "ٹپ" نہ جانے کتاب پر کیا گرا ۔ اچھا جو اندر آگیا تھا بولا "باجی تو رو رہی ہے"۔ "چپ" اماں نے کہا ۔ "یہ تو خوشی کے آنسو ہیں"۔ باجی نے تڑپ کر اماں کی طرف دیکھا ۔ اف ، وہ ایک نظر ! باجی کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا ۔" اچھا چلآیا ۔ "ایک ساتھ ہنستی بھی ہو اور روتی بھی"۔

○

دوراہا

"یہ سراسر مینجمنٹ کا قصور ہے ۔ ناحق پسنجرز کو تکلیف ہوتی ہے ۔" بیگم غصے میں چلائی ۔

سٹیشن ماسٹر نے بغور اس کی طرف دیکھا ۔ اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر بولا ۔ "لیکن میڈم ! کیا آپ وہی صاحبہ ہیں جو اس روز غلطی سے پریم نگر کیری اُور ہو گئی تھیں ؟"۔

"نانسنس !" وہ چلائی ۔ "آپ کا مطلب ؟ میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا ؟ یہ صریحاً انسلٹنگ ہے ۔ میں سپرانٹنڈنٹ کو لکھوں گی"۔ اور وہ ہاتھ کا بٹوا جھٹکاتی ہوئی باہر نکل گئی ۔

"ڈیش اٹ" سٹیشن ماسٹر نے بجھے ہوئے سگار کے کش لینے شروع کر دیئے "جی ہاں جی ہاں"۔ نہالچند نے اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر رکھ کر اوپر سے دیکھا ۔

کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ"۔ ٹکٹ کلکٹر داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا ۔

"جی ہاں" ۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ "کہہ رہا ہوں کوئی ثبوت نہیں کہ یہ وہی شریمتی تھیں"۔

"اوہ مسٹر نہالچند" ۔ سٹیشن ماسٹر بولا

"جی ہاں ۔ وہ شریمتی تو ۔ تو ۔ یعنی جوان تھی ۔ اور یہ دیوی ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن پریم نگر کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے میرا مطلب ہے ۔ میں نے

سنا ہے" ٹکٹ کلکٹر گھبرا گیا ۔ "میں نے سنا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ وہی بیگم ہو ۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ وہی بیگم تھیں"۔

"آب و ہوا" کیبن مین ہنسا ۔ ٹیشن ماشٹر جی آپ جانیں ہیں ۔ وہاں کی آب و ہوا عورتوں کو راس آئے ہے ۔ جیادہ تر عورتیں لوٹیں ہی نہیں ہیں واں سے"۔

"زیٹ از اٹ"۔ گارڈ نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا ۔ "وہاں کا کلائی میٹ لیڈیز کو سوٹ کرتا ہے ۔ جبھی وہاں کا آباڈی نوے پرسنٹ زنانہ ہے"۔

"او ڈیئشن اٹ آل ، ہمیں وہاں کا جغرافیہ نہیں لکھنا"۔ سٹیشن ماسٹر نے سگار پھینک کر دل ٹھنڈا کیا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ، وہاں کی آب و ہوا دل کے لئے اچھی ہے , لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ان کے منہ پر جھریاں کیوں پڑ جاتی ہیں ؟"

"مسٹر نہالچند ! جنٹلمین بات یہ ہے کہ یہ ایک امپارٹنٹ جنکشن ہے" سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ، ارجنٹ ٹرمینل"۔ نہالچند مسکرا کر بولا ۔

"ٹرمینل ؟ ہاں ہاں ٹرمینل بھی"۔

"زیٹ از دی ٹربل" ۔ گارڈ بولا ۔ "بوتھ ٹرمینل اینڈ جنکشن" ۔

" رائیٹ ۔ ٹرمینل بھی ہے اور جنکشن بھی ۔

"جی ہاں ، یہی میں کہہ رہا ہوں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"اینی ہاؤ"۔ گارڈ بڑبڑایا ۔۔۔۔۔ "یہ ہے ضرور"۔

"ہاؤ ایور ۔ کرانتی پور سے بھی"۔ سٹیشن ماسٹر نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی ۔

"جی ہاں ، اور پریم نگر سے بھی ۔ سبھی " ۔

"بالکل ؟" سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا ۔ "خیر خیر ۔ کراتتی سے گاڑی ای نمبر پر آتی ہے ۔ اور پھر وہ سائڈنگ میں لگا دی جاتی ہے ۔ پھر وہ نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے" ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ، نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے" ۔ نہالچند بڑبڑایا ۔

" اونو ۔ نمبڑ چاڑ سے چلتا ہے شٹل تھری اپ" ۔ گارڈ چلایا ۔

"جی ہاں ، یہی کہہ رہا تھا میں شٹل تھری اپ" ۔ نہالچند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا ۔

لاحول ولا قوۃ" ۔ ٹکٹ کلکٹر نے منہ بنا کر کہا ۔

صرف گڑ بڑیشن اور کیا ۔ ٹیشن ماسٹر صاحب ۔ ایک بات ہے کہ کبھی وہ آتی ہے دو پر اور کبھی چار پر" ۔ کیبن مین نے وضاحت کی ۔

"نو نو" گارڈ اٹھ بیٹھا ۔ "کوسچن یہ ہے ۔ کہ لوگ بھول کڑ پریم نگر ہی کیٹرڈاور ہوتے ہیں ۔ عقیل پوڑ نہیں"۔

"خدا آپ کا بھلا کرے ۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں ۔ لوگوں کا ہے ۔ لوگوں کا"۔ ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا ۔

"زیٹ از اٹ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ گرین ہے کھوبصوڑت ہے اوڑ عقیل پوڑ ریت ہی ریت ۔"

"لیکن حضرت سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کراتتی سے آتی ہے وہ سیدھی عقیل پور کیوں نہ چلی جائے ۔ رن تھرو ۔۔۔۔۔۔۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا"۔

"جی ہاں ، جی ہاں"۔ نہالچند بڑبڑایا اور پھر چونک کر بولا ۔ "لیکن میں کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔۔"

"سلی" لیڈی ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی ۔ "یہ بات نہیں چلے گی ۔ مینجمنٹ کے لئے صرف ایک راستہ ہے ۔ صرف ایک"۔

"لیکن ۔ لیکن راستے تو دو ہیں"۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ "دوراہا دو راستے جی ؟"

"نانسنس" وہ بولی ۔ "آئی مین کراسنگ سے گاڑی پہلے یہاں آئے ۔ پھر وہی گاڑی پریم نگر چلی جائے ۔ پریم نگر سے لوپ لائن عقیل پور کو چلی جائے اور یہاں سے عقیل پور کی کارڈ لائن اکھیڑ دی جائے ۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی نہ رہے گا"۔

"لیکن محترمہ ! یوں ہو جائے تو پھر پریم نگر جائے گا کون"۔ مسٹر امجد داخل ہوتے ہوئے بولے ۔

"واٹ ؟" سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"غلطی سے جانا اس نگر کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے سٹیشن ماسٹر صاحب!" امجد مسکرایا ۔

"اونہوں ، اس بات سے ہمیں کوئی کنسرن نہیں مسٹر امجد ۔ مطلب ہے کہ ہم مینجمنٹ چاہتا ہے مینجمنٹ"۔

"لیکن صاحب سوال یہ ہے کہ جو مسافر نگر میں جانا نہیں چاہتے"۔ ٹکٹ کلکٹر بولا۔

"جی ہاں ، یہی کہہ رہا تھا میں"۔ نہالچند نے اپنی عینک سنواری ۔

"وہ وہاں نہ اتریں ۔ سرکار کا راج ہے مہاراج ۔ جبردستی نہیں"۔ کیبن مین بولا ۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ نہیں ہو سکتا"۔ ٹکٹ کلکٹر کا منہ لال ہوگیا ۔

"نہیں ہو سکتا تو رول نمبر ۹۲ کے مطابق وہ بریک جرنی کر سکتے ہیں ۔ گڈ ایوننگ جنٹلمین میں ذرا چائے پی آؤں"۔ لیڈی ٹکٹ چیکر مسٹر امجد کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی ۔

"استغفراللہ"۔ ٹکٹ کلکٹر نے داڑھی جھاڑ کر کہا ۔ "کیا حماقت ہے"۔

"جی ہاں"۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ "رول نمبر ۹۲ "۔ اِن

"حضرت آپ کو لیڈی ٹکٹ چیکر کو متنبہ کرنا چاہیئے ۔ ریلوے ہینڈ ہو کر وہ مسافروں کو گمراہ کرتی ہے"۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا ۔

"گمراہ کرتی ہے ؟" سٹیشن ماسٹر نے سر کھجلا کر دہرایا ۔

"جی ہاں جیسے آپ کو کمپلین کرنے والی بیگم نے کہا تھا ۔ ایل ۔ ٹی ۔ سی نے اسے غلط اطلاع دے کر بہکایا ورنہ وہ کبھی پریم نگر کیرڈاور نہ ہوتی"۔

"لیکن ۔ اس سے کیا ہو گا ؟" نہالچند نے عینک سنوار کر کہا ۔

"ہمارے پاس ایسے بیسوں ثبوت ہیں"۔ ٹکٹ کلکٹر بامعنی انداز سے مسکرانے لگا ۔

"اس بات پر ایل ۔ ٹی ۔ سی کو انام ملنا چاہئیے ۔ اور کیا ؟" کیبن مین بولا ۔

"جی ہاں" نہالچند بولا ۔۔۔۔۔۔ "لیکن انعام ؟"

"لاحول ولاقوۃ"۔ ٹکٹ کلکٹر نے شانے ہلاتے ہوئے کہا ۔

اس لئے کہ وہ ریلوے کی انکم جیادہ کرتی ہے"۔ کیبن مین چلایا ۔

انکم کا کیا سوال ہے یہاں"۔

"آئی سی" گارڈ بولا ۔ "ہی از رائیٹ ۔ فرض کرو ایک پسنجر غلطی سے پریم نگر جاتا ہے ۔ وہاں ہم اسے چارج کرے گا ۔ تین رُوپیہ پھر وہ واپس دوڑاہا کو آئے گا ۔ ڈیڑھ رُوپیہ ۔ اب اسے پھر نیا ٹکٹ خریدنا پڑے گا ۔ دوڑاہا ٹو عقیل پور ۔ پرانہ ٹکٹ نہیں چلے گا ۔ زیٹ از کل ۔ چھ روپیہ اکسس فیئر دے گا ۔ سیتوڑ انکم" ۔

"انکم نہیں یہ دھوکا ہے ۔ مسافروں کے ساتھ دھوکا"۔ ٹکٹ کلکٹر چلایا" ۔

"جی ہاں ۔ روپیتہ روپیتہ ہے مہاراج ۔ دھن ہے مہاراج دھن"۔ نہالچند متاثر ہو کر بڑبڑانے لگا ۔

"لیکن پبلک کو لوٹنا ۔۔۔۔۔۔"

"پر سوال اسے ہے کہ ہم پبلک ہینڈ ہیں یا ریلوے۔"

"زیٹ از اٹ۔ زیٹ از اٹ"۔ گارڈ چلایا۔ "ریلوے نے صاف بول دیا ہے۔ ٹریول لائٹ"۔

"نانسنس" سٹیشن ماسٹر غصے سے چلایا۔ "یہاں ہلکا بھاری کا سوال نہیں انکم اور خرچ کا سوال ہے۔ ہمارا ریپوٹیشن خراب ہو رہا ہے۔ چاہے پسنجر غلطی سے پریم نگر کیرڈ اوور ہو جائیں۔ یا عقیل پور۔ ہمارا کنسرن نہیں۔ لیکن ہمارا ریپوٹیشن خراب نہ ہو۔ اتنے بڑے جنکشن کا ریپوٹیشن خراب نہیں ہونا چاہئے۔ آج کل سب سے بڑی کوالیفیکیشن گڈ ریپوٹیشن ہے"۔

"یہی میں کہہ رہا تھا حضرت لیڈی ٹکٹ چیکر کی ریپوٹیشن اچھی نہیں" ٹکٹ کلکٹر نے جھرجھری لی۔

"اوڈیم اٹ ۔۔۔۔۔۔ جنٹلمین ہمیں روز شکائتیں موصول ہوتی ہیں اس کو بند ہونا چاہیئے جو پسنجر اپنی غلطی سے پریم نگر کیرڈ اوور ہو جاتا ہے وہ واپس آکر ہمارا قصور بتاتا ہے۔ ہمیں ڈانٹتا ہے۔ دِس از ہینڈ"۔

"جی ہاں، ویری، ویری"۔

"یہ تو قدرتی بات ہے حضرت۔ لوگ اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اس میں ناظم صاحب کا کیا قصور ہے"؟

"لیکن سپرانٹنڈنٹ خود موقع پر کیوں نہیں آتا؟ ہم نے بار بار لکھا ہے۔ کوئی جواب نہیں، کوئی جواب نہیں"۔

ٹرررررن۔ ٹرررررن گھنٹی بجی۔۔ "اوہ۔" سٹیشن ماسٹر نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ "یہ کس گاڑی کی گھنٹی ہے؟"

"جی ہاں، یہی سوچ رہا ہوں میں"۔ نہالچند بڑبڑایا۔

"ول"۔ گارڈ اٹھ بیٹھا۔ یہ ٹیلیفون کال ہے"۔

"اوہ ڈیش اٹ۔ پھر کوئی کمپلینٹ۔ ہمارے کان پک گئے ہیں"۔ سٹیشن ماسٹر نے ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے کہا "ہیلو! سٹیشن ماسٹر دوراہا۔ کون نہیں پہنچے

عقیل پور ؟ آپ کے ہسبنڈ ؟ ہاں شاید غلطی سے کیرڈ اور ہو گئے ہوں ، نہیں پریم نگر سے ان کا کوئی تار نہیں آیا ۔ کیا نام بتایا آپ نے ؟ مسٹر رے ؟ نہیں کوئی تار نہیں ۔" انہوں نے فون رکھ دیا ۔

"جی ہاں"۔ نہالچند نے ایک کاغذ پڑھتے ہوئے کہا ۔ "بالکل ٹھیک ہے ۔ مسٹر رے کا تار یہ رہا ۔ پریم نگر سے آیا تھا"۔

"اوہ"۔ سٹیشن ماسٹر گنگنانے لگے ۔ اچھا تو تم ان مسافروں کی لسٹ رکھتے ہو جو غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جاتے ہیں "۔

"لسٹ؟" نہالچند نے سر کھجلایا ۔ "لسٹ ! لیکن"۔

"امپاسیبل"۔ گارڈ نے کش لگا کر کہا ۔ "اتنی لمبی لسٹ"۔

"جی ہاں یہی کہہ رہا تھا میں ۔ اس کے لئے ایک الگ دفتر چاہیئے ۔

"زیٹ از اٹ ۔۔۔۔۔۔۔"

"سب گڑبڑیشن ہے"۔ کیبن مین چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ ٹکٹ کلکٹر بڑبڑایا اور اٹھ کر چل پڑا ۔

"ڈیش اٹ آل"۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔

"عین اس وقت پروفیسر نجمی داخل ہوئے ۔ "اے صاحب ۔ یعنی یعنی مسجر امٹد کہاں ملیں گے؟"

"مسجرامنڈ؟" نہالچند نے سر کھجاتے ہوئے غور سے پروفیسر کی طرف دیکھا ۔

"سلّی!" پروفیسر چلائے ۔ اور باہر جاتے جاتے رک گئے ۔ "آپ سٹیشن ماسٹر ہیں ؟ میرا مطلب ہے پریم نگر سے گاڑی کب آئے گی ۔ یعنی مسٹر ایس۔ ایم ۔ مطلب یہ ہے کہ فرض کرو میں غلطی سے کل عقیل پور کی بجائے پریم نگر چلا گیا تھا ۔۔۔۔۔۔۔"

"اوہ ۔۔۔۔۔۔۔" نہالچند نے سر کھجایا ۔ ۔ "جی ہاں ، جی ہاں آپ چلے گئے تھے"۔

پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "تو مطلب ہے آج میں

کون سی گاڑی سے واپس آسکوں گا؟"

گارڈ مسکرایا۔ "لیکن شاید آپ ریٹرن کرنا پسند نہ کریں"۔

"میں ـــــــــ کیوں نہ کروں؟"۔ پروفیسر چڑ گیا۔

"جی ہاں، ضرور آئیں گے آپ، ضرور، آپ مرد جو ہوئے"۔

"مرد ـــــــــ" پروفیسر چلایا۔ "اور فرض کرو میں عورت ہوں"۔

"گڈ نس" سٹیشن ماسٹر ہنسا۔

"شور"۔ گارڈ بولا۔ "پھر تو مشکل ہے"۔

"نانسنس۔ وہ ضرور آئے گی۔ اُسے آنا ہی پڑے گا"۔ پروفیسر غصے میں چیخا۔

"سوال یہ ہے کہ آپ وہ ہیں یا وہ آپ ہے"۔ نہالچند نے سر کھجلا کر اپنے آپ سے پوچھا۔

"پریم نگر کے معاملہ میں جنڈر جانے کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جنڈر ـــــــــ" پروفیسر نے دہرایا۔ "نان سنس"۔

"اوہ۔ یعنی نان سنسیکل جنڈر"۔ نہالچند بڑبڑایا۔ "پھر تو واقعی کچھ نہیں کہا جا سکتا آپ کے بارے میں"۔

"مسٹر نہالچند۔" سٹیشن ماسٹر نے گھور کر نہالچند کو چپ کرا دیا اور پھر پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "جنٹلمین آپ آدھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ رات وہاں بسر کرنا نہ چاہیں ـــــــــ"

"میں پریم نگر میں ؟" پروفیسر غصے میں بڑبڑایا۔ "لاحول ولاقوۃ"۔

"آخاہ پروفیسر نجمی"۔ مسٹر امجد مسکراتا ہوا داخل ہوا۔ اور ان کا تعارف کروانے لگا۔ آپ ہمارے ایس۔ ایم ہیں۔ یہ مسٹر ڈیوڈ گارڈ، اور یہ ہیں نہالچند۔ اور یہ صاحبان میرے عزیز دوست پروفیسر نجمی عقیل پور کالج میں نفسیات کے پروفیسر"۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو پروفیسر ۔ لیکن پروفیسر یہاں اکثر ایسے کیسز ہو جاتے ہیں ۔ پسنجر غلطی سے پریم نگر۔۔۔۔۔۔"۔

"زیٹ از اٹ"۔ گارڈ ہنسا ۔ چیر اپ جنٹلمین"۔ اور وہ باہر چلا گیا ۔

"غلطی"۔ پروفیسر چلایا ۔ "غلطی بہانہ ہے بہانہ ۔ ایسی ویسی خواہشات پر ڈھکنا ۔ اور جو گاڑی پر اتنا بڑا بورڈ ٹنگا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس کا فائدہ ؟ ہوں ؟"

"جی ہاں ، بورڈ باقاعدہ لگا دیا جاتا ہے ۔ جی ہاں ۔۔۔۔۔" نہالچند چلانے لگا ۔

"ہم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے"۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔ اور پھر اچھا جنٹلمین خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا ۔

"باریکیاں"۔ پروفیسر نے امجد کو گھور کر کہا ۔ "میں کہتا ہوں اس سے موٹی بات اور کیا ہوگی ۔ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور عقیل پور کی بجائے پریم نگر پہنچ کر وہاں سے تار دے دیا ۔ غلطی سے یہاں آگئی ہوں ۔ اونہہ ، میں کیا سمجھتا نہیں"۔

"تار ۔۔۔۔۔۔؟" نہالچند بڑبڑایا ۔۔۔۔۔۔اور سٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا ۔

"میں نے تو تار نہیں دیا تھا"۔ امجد بولا ۔ "پچھلی اتوار کو تمہارے پاس آرہا تھا میں ۔ لیکن ۔۔۔۔۔۔"

"جی ہاں"۔ پروفیسر نے طنزاً کہا ۔ "غلطی سے پریم نگر چلے گئے ۔۔۔۔۔"

"پھر میں مسٹر امین کے یہاں ٹھہر گیا"۔ امجد اپنے ہی دھیان میں کہے گیا ۔

"مسٹر امین!" پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا ۔

"تم جانتے ہو اسے ۔ وہی گورا چٹا نوجوان"۔

"ہاں گورا چٹا ۔ جانتا ہوں ۔ نہ جانے تم لوگ صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہاں آشنائی ہے ۔ مسٹر امین!"۔

"نہیں نہیں ، مس امین کے بارے میں ایسا نہ کہو ۔ میرے دل میں اس کی بیحد عزت ہے"۔ امجد نے متاثر ہو کر کہا ۔

"مس امین ؟ مس امین کس نے کہا ہے ------۔ ہائیں دفعتاً اسے بات سمجھ میں آگئی ؟ اوہ یہ بات ہے"۔ پروفیسر مسکرانے لگا -------۔ "عزت" ! پروفیسر غصے میں بولا ۔ "پہلے جذبات کی ہنڈیا پر عزت کا ڈھکنا رکھ دیا ۔ تاکہ اندر کھچڑی پکتی رہے ۔ اور اوپر عزت ہی عزت نظر آئے ۔ اونہوہ ۔ عزت ۔ نانسنس ------۔ وہ بھی یونہی کہا کرتی تھی ------" پروفیسر نقل اتارتے ہوئے بولا ۔ "میرے دل میں مسٹر امین کی بڑی عزت ہے ۔ اور اب جا کر وہاں سے تار دے دیا -------۔ غلطی -------۔ نانسنس"۔

"کس نے تار دے دیا ۔ کس کی بات کر رہے ہو ؟" امجد جھلا اٹھا ۔

"فیروزہ ، اپنی بیوی کی اور کس کی"۔ پروفیسر گھورنے لگا ۔

امجد نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "میں سمجھا نہ جانے کیا ہوگیا ہے"۔

"ایک دم احمق"---------۔ پروفیسر چلایا ۔ "اگر ایک جنٹلمین کی بیوی جو میٹریکولیٹ ہو ۔ اور جس کی آنکھوں پر اتنے بڑے بڑے شیشوں کی رولڈ گولڈ عینک ہو وہ گاڑی پر لکھے ہوئے دوراہا ٹو پریم نگر کو عقیل پور پڑھ کر اس نگر میں جا پہنچے جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے جس کے لئے بیگم کے دل میں بے حد عزت ہے ۔ تو تمہارے خیال میں کچھ ہوا ہی نہیں ۔ ایڈیٹ ۔ تم سمجھتے ہو یہ دنیا سیدھی سادی چیز ہے ۔ سرخ جھنڈی دکھا دی تو گاڑی ٹھہر گئی ۔ سبز ۔ چل پڑی ۔ یہ گاڑی نہیں بیوی کا معاملہ ہے ۔ بیوی کا ------۔ یہ گاڑی کیا جانتی ہے جھنڈیوں کو -------۔ کیا سمجھے ؟ ہیں"۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ یعنی اب تم مجھے گھور کر دل ٹھنڈا کر رہے ہو ۔ لیکن اس سے کیا ہوگا ۔ بیگم کا وہاں جانا تو امر واقعہ ہو چکا ۔ بلکہ اس کا واپس آ جانا تو بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہاں گئی تھی"۔

"یعنی اُسے آنے سے روک دوں ۔ نانسنس ۔ مسجرامٹڈ تم قطعی طور پر شادی نہ کرنا ۔ تم عورت کو نہیں سمجھتے"۔

"میں کیا اسے سمجھنے کے لئے بیاہوں گا ۔ میں تو اس سے جرابیں دھلواؤں گا ۔ کھانا پکواؤں گا اور ۔۔۔۔۔۔۔"

"اور اگر وہ اس نگر میں چلی گئی ۔ جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے؟"

"تو سمجھوں گا کہ وہ لوٹ آنے کو گئی ہے ۔ اوہ پروفیسر تم پریشان ہو کر اس نگر کو اور بھی اہمیت دے رہے ہو"۔

"بالکل ریل کا اثر ۔ حرکت ۔ موومینٹ ۔ بوہیمین بنا دیتی ہے ۔ مثلاً ٹانگہ والا ۔ کوئی ٹانگہ والا دیکھ لو ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پکنک پر آیا ہوا ہو ۔ ریل میں تو مسافر کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے ۔ غریب آدمی بھی آنے کی گنڈیریاں چوستا ہے اور چار بیویوں والے لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں ۔ سلّی ۔ اور ۔ اور ایک میٹریکولیٹ پریم نگر ۔۔۔۔۔۔"

"تم تو وہمی ہو پروفیسر ۔ یہی بات ہے تو بیگم کو پردہ میں ڈال دو"۔

"پردہ میں ؟ اوہیونز ۔ جوانی میں تو وہ ننگے منہ پھرتی رہی اور اب برقعہ میں چھپا کر ازسرنو خوبصورت بنا دوں ۔۔۔۔۔۔ ؟ تم برقعہ کو پردہ سمجھتے ہو کیا؟"

"پردہ ہی تو ہے اور کیا"۔ امجد چڑ گیا ۔

"بس ریل ہی بانکنی آتی ہے ۔ یہ رنگ دار برقعے ، یہ پردہ ہیں کیا نانسنس ، جیسے رنگدار بوتلیں چل پھر رہی ہوں ۔ ہر کوئی دور سے بتا سکتا ہے یہاں ابھار ہے ۔ یہاں ڈھلان ۔ ہونہہ ، پردہ ! مسجرامٹڈ بس شادی نہ کرنا بڑے سکھی رہو گے"۔

"لیکن نجمی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات ۔ آج سے پانچ سال پہلے ۔

"اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پیاری ہوتی ہیں نا"۔

"فیروزہ میری کمزوری ہے"۔

"پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی ۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر گئی ہے اور بھی پیاری ہوگئی ہے ۔ اس کمرے میں یوں سرگرداں پھر رہے ہو جیسے یہ صحرا ہو"۔

"کیا کہا؟" پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا ۔ "نانسنس ، یعنی تمہارے نزدیک ٹہلنا محبت کی دلیل ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ڈیش اٹ ۔۔۔۔۔۔۔" وہ جھنجھلایا "کیا بے معنی کرسی ہے"۔

"آرام کرسی جو ہوئی"۔ امجد مسکرایا ۔

"ہائیں؟" پروفیسر جھلا کر بولا ۔

"میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لئے بامعنی ہے ۔ جو آرام کرنا چاہتا ہو ۔"

ٹرررن ۔ ٹرررن ۔ گھنٹی بجی ۔ پروفیسر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ "کیسی گھنٹی ہے؟"

"گھبرائیے نہیں"۔ سٹیشن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا ۔ "دو منٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے ۔"

"اوہ" پروفیسر چونکا ۔ "تو میں ریسیو کر آؤں ۔ امجد تم چائے منگوا لو ۔ اتنی دور سے آرہی ہے ۔ اتنی دور سے ۔"

"جی ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ ہیں؟" نہالچند رک گیا ۔ "یعنی اپنے آپ کو ریسیو کرنے جا رہے ہیں ۔

"نانسنس"۔ وہ گھورنے لگا ۔ "بیگم کو ۔ بیگم کو ۔"

"اوہ" نہالچند نے آہ بھری ۔

"سوری کیٹ از آؤٹ آف دی بیگ"۔ گارڈ دروازے سے چلایا ۔ "صاحب وفادار بیوی سے عمر بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔"

"کیوں ۔۔۔۔۔۔۔ ؟" امجد نے پوچھا ۔

"وہ خود بھی بیٹھ رہتا ہے ۔ کھاونڈ کو بھی بٹھا ڑکھتا ہے ۔ کبھی اس کا ویٹنگ ڑوم میں انتظاڑ کڑنا تازگی دیتا ہے تازگی"۔ وہ ہنسا ۔

"آپ کا مطلب ہے پروفیسر یہاں بیٹھے تازگی پیدا کر رہے تھے ۔ ان کی تازگی نے تو گھنٹہ بھر سے مجھے باسی بنا رکھا ہے"۔ امجد نے شانے ہلائے ۔

"تازگی اور جوش ایک ہی بات ہے ۔ پانی کھڑا رہے تو گندا ہو جاتا ہے"۔

بوائے کو چائے اور پیسٹری لاتے دیکھ کر ۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔

"اوہ یہ دعوت" ۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیا پریم نگر سے آنے کی رشوت ہے"۔

پروفیسر صاحب نے آڈر دیا ہے ۔ جناب کینٹین کا لڑکا بولا ۔

"پرہیپس وہاں جانے کا ریوارڈ "۔ گارڈ ہنسا ۔

"جی ہاں"۔ نہالچند چلایا ۔ "نہ جاتی تو آتی کیسے؟"

"اُف ۔ پروفیسر نے کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے ۔ ایک معمولی شہر کو خواہ مخواہ اہم بنا رکھا ہے ۔ میز پر رکھ دو بوائے"۔

"گھبرا گئے مسٹر امجد ۔ اچھا تو آؤ چلیں ۔ وہ ابھی یہاں آئیں گے ، بیچارے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر کے بعد لڑائی جھگڑے کی دلچسپی نصیب ہوئی ہے ۔

"زیٹ از اٹ" گارڈ ہنسا ۔ "میں پرپوز کڑتا ہوں کہ ایوری ناؤ اینڈ ون ہر وائف کو نگر کا ایک ٹرپ ضروڑ لگانا چاہیئے ۔ آئی مین ، بائی مسٹیک کیرڈ اور ہو جانا چاہیئے ۔ لٹ اس موو آن"۔

ان کے جانے کے بعد جلد ہی پروفیسر اور فیروزہ داخل ہوئے ۔

"اوہ" پروفیسر چلایا ۔ "سب چلے گئے ۔۔۔۔ مگر یہ چائے"۔

"میرا تو پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے"۔ فیروزہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ۔

"ہوں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہری تھی کیا؟" پروفیسر نے پیالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل بازی سے نفرت ہے۔ مسٹر امین کی بیوی ------"

"اوہ تو مسٹر امین بازی کرتی آتی ہیں آپ؟"

"میں تو پہلے ہی کوفت سے چور ہوں لیکن آپ ------"

"کوفت؟ تم تو بنگلہ میں آرام کرتی رہیں۔ مصیبت تو میرے لئے تھی۔ جو دوراہے کا پلیٹ فارم ناپتا رہا"۔

"بس جی یہ آپ کی کتابی نفسیات نہیں چلے گی"

"بس کتاب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور نام کو آپ ہیں فیروزہ میٹریکولیٹ"۔

"مجھے میٹریکولیٹ نہ کہا کریں آپ"۔ وہ غصے میں چلائی۔

"تو اور کیا گریجوایٹ کہوں؟"

"میں آپ کا لکچر روم نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتتا"------

"آج کل کی گاڑیاں تو آپ چلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ دیکھ لیجئے گاڑی تو پریم نگر جا پہنچی اور بیچارہ گھوڑا دوراہا ناپتا رہا"۔

"تو یہ قصور کس کا ہے؟ وہ مسکرائی۔

"گھوڑے کا، اور کس کا۔ دوسرا پیالہ بناؤں"۔

"بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اَب ------" اس نے ترچھی نظر سے گھور کر لاڈ سے کہا۔

"کیا ------ میری قلعی؟"

"جی ہاں، بہت بنا کرتے تھے۔ میں۔ میں مس امین کو نہیں جانتا"۔

وہ نبقل اتارتے ہوئے بولی ۔

"نہیں نہیں ۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں"۔ پروفیسر پریشانی سے بولا ۔

"جی ہاں اندھیرے میں ملی ہوگی نا"۔ وہ اور بھی سنجیدہ ہوگئی ۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ آخر بات کیا ہے ؟"

"بات کیا ہونی تھی ۔ بس وہی ایک بات ۔ بات بات پر پوچھتی تھی ۔ مسٹر نجمی کو کیوں نہ لائیں آپ ۔ مسٹر نجمی کو ضرور لائیے گا آپ ۔ میں ان کے افسانوں کو بہت اڈمائیر کرتی ہوں ۔ ہونہہ ، بڑی ایڈمائیرر"۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ پروفیسر نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا ۔

"اونہوں ۔ یہ شیطان لاحول پڑھنے سے نہ جائے گا"۔ وہ بولی ۔

"لیکن فیروزہ ــــــ"

"اور پھر ـــــــ آپ بڑی خوش قسمت ہیں مسز نجمی ۔ آپ ایسے قابل رائٹر کی بیوی ہیں ـــــــ سر کھا لیا میرا چڑیل نے"۔

"اوہ" پروفیسر مسکرائے ۔ "عجیب معاملہ ہے"۔

کمرے میں چار ایک آدمی آگئے ۔ اور وہ دونوں چپ ہوگئے ۔

"کیا مصیبت ہے"۔ پگڑی والے پٹھان نے دستانے اتارتے ہوئے کہا ۔ "پریم نگر ، خاک نگر ، وہاں تو دھول اڑتی ہے دھول"۔

"آپ پریم نگر سے آئے ہیں"۔ نوجوان نے پوچھا ۔

"جانا تو نہیں تھا لیکن جا پہنچا ۔ پھر وہی ٹائیں ٹائیں فش ۔ سنا تھا بڑا اچھا شہر ہے ۔ لیکن خاک ۔ بس عورتیں ہی عورتیں ہیں"۔

"اچھا جی"۔ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ "عورتیں"۔

"اور مرد ۔ اکا دکا مرد ۔ بوکھلایا ہوا ۔ جیسے شیش محل میں جاٹ"۔

"اچھا جی"۔ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ "سب عورتیں"۔

"تیسری میز پر بیٹھا ہوا سردار بولا"۔ بس جی پریم نگر کو جانے والی گاڑی کی صرف ایک پہچان ہے صرف ایک"۔

"وہ کیا" بنگالی بابو نے بیڑی کو سلگاتے ہوئے شوق سے پوچھا ۔

"آپ پریم نگر نہیں جانا چاہتے نا ؟"

"اونہوں"۔ بنگالی بابو نے سر ہلایا ۔ "بالکل نہیں ۔ آپ اطمینان رکھیں ۔ بالکول نہیں"۔

"تو صاحب اس گاڑی پر نہ بیٹھیں ۔ جس کے ساتھ دو انجن لگے ہوں ۔ ایک آگے ایک پیچھے"۔

"دو انجن ۔ ایک آگے ایک پیچھے"۔ بنگالی نے یوں دہرایا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو ۔

"پہاڑی علاقہ ہے نا ۔ ایک انجن سے کام نہیں چلتا"۔ سردار بولا ۔

"پہاڑی علاقہ"۔ بنگالی بابو نے دہرایا ۔ "ہلز ۔۔۔۔۔"

"کان کھول کر سن لو بیگم"۔ پروفیسر نے جھک کر فیروزہ کے کان میں کہا ۔ "دو انجن ۔ آخر تمہیں کئی بار کراتی سے عقیل پور آنا ہوگا"۔

ٹرررررن ۔ ٹرررررن گھنٹی کی آواز آئی ۔ اور وہ سب اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی باہر نکل گئے ۔

"بس ایک پیالہ اور ۔ تھینک یو"۔ فیروزہ بولی ۔

"لیکن گاڑی"۔ پروفیسر بڑبڑایا ۔

"ابھی بہت وقت ہے ۔ ۵ منٹ رکے گڈی یہاں"۔ وہ کرائی ۔

"سٹیشن ماسٹر صاحب ۔ سٹیشن ماسٹر صاحب"۔ نہالچند گھبرایا ہوا داخل ہوا ۔ "اوہ یہاں نہیں نہیں ۔"

"وٹ از دی ٹربل"۔ گارڈ دروازے میں کھڑا ہو کر غور سے نہالچند کو دیکھنے لگا ۔

"سپرانٹنڈنٹ ۔ سپرانٹنڈنٹ"۔ نہالچند چلایا ۔ "جی ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ وہ آئے ہیں"۔

"کیا کہا ؟" سٹیشن ماسٹر نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا ۔

"جی ہاں ۔ وہ آئے ہیں ۔ ۳۲ ڈاؤن میں ۔ سپرانٹنڈنٹ"۔

"گڈ لارڈ"۔

"میں ان سے ملوں گا"۔ پروفیسر اٹھ بیٹھا ۔ "میں انہیں یقین دلاؤں گا ۔ کہ انتظام میں خرابی ہے ۔ اور پسنجر کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی ہے"۔

"اونہوں ۔ وہ نہ مل سکیں گے ۔ اونہوہ ۔ بہت گڑبڑیشن ہے"۔ کیبن مین نے داخل ہو کر کہا ۔ سیلون کا دروازہ بند ہے ۔

"نانسنس" سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ،" نہالچند بڑبڑایا ۔ "وہی نانسنس"۔

"یہ نہیں ہو سکتا"۔ ٹکٹ کلکٹر بھاگا بھاگا آیا ۔ "ضرور کوئی غلط فہمی ہے"۔

"ڈیش اٹ بات کیا ہے ؟" سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا ۔

"حضرت آرڈر یہ ہے کہ ان کی سیلون عقیل پور کو جانے والی گاڑی سے لگا دی جائے"۔

"جی ہاں"۔ نہالچند بولا ۔ "عقیل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے ۔ آپ نے سنا"۔ امجد نے داخل ہو کر کہا ۔ "لیڈی ٹکٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنا دیا گیا ہے"۔

"نانسنس"۔ سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"ابھی سپرانٹنڈنٹ صاحب کا حکم ملا ہے ابھی ۔ ایل ۔ ٹی ۔ سی ۔ ابھی بوگی میں ہے"۔ ٹکٹ کلکٹر چلایا ۔

"کون سی بوگی میں ؟" سٹیشن ماسٹر نے پوچھا ۔

"جی ہاں"۔ نہالچند بولا ۔ "سپرانٹنڈنٹ کی بوگی میں"۔

"ہیونز ۔" پروفیسر چلایا ۔ "بیگم تم چلو میں ابھی آیا ۔" مسٹر امجد فیروزہ کو لے چلئے"۔

"شوق سے"۔ امجد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا ۔ "جلدی آنا پروفیسر گاڑی چلنے والی ہے"۔

"زیٹ از آل ویری سٹرینج"۔ گارڈ ہنسا ۔

"ول ول" سٹیشن ماسٹر بولا ۔ "مسٹر کیبن مین ان کی بوگی عقیل پور سے لگانے کا انتظام کرو ـــــــ۔ اچھا تو گڈ بائی پروفیسر"۔ وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا ۔

"رائیٹ" ـــــــ۔ پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ۔ "سولانگ جنٹلمین سولانگ" اور وہ دو انجن دو انجن بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا ۔

"پروفیسر کہاں ہے سٹیشن ماسٹر صاحب"۔ امجد دوڑتا ہوا آیا ۔ "وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور ان کا پتہ نہیں"۔

"پروفیسر تو چلا گیا"۔ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ۔

"جی ہاں ۔ میں نے خود دیکھا ہے ۔ خود"۔

"کہاں"۔ امجد چلایا ۔ "لو عقیل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی"۔ امجد نے کوک سنکر کہا ۔

"پریم نگر کی گاڑی میں ۔ جی ہاں ، دو انجن ، دو انجن کہتے ہوئے وہ اندر جا بیٹھے تھے"۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ کیا مصیبت ہے ۔ اب بیگم عقیل پور جا پہنچے گی ۔ اور میاں پریم نگر" امجد ہنسنے لگا ۔

"ڈیش اٹ آل"۔ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا ۔

"بالکل گڑبڑیشن ہے ٹیشن ماسٹر صاحب ـــــــ۔" کیبن مین بھاگتا

ہوا آیا ۔۔۔۔۔۔۔ "وہ بوگی"۔

"خدا خبر کس نے غلط کانٹا موڑ دیا اور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔۔"

"وہ بوگی پریم نگر والی تھری اپ سے لگ گئی"۔

"گڈ لارڈ"۔ سٹیشن ماسٹر چلایا ۔ اب کیا ہوگا ؟"

"اب ، جی" نہالچند بڑبڑانے لگا ۔ "یعنی میں کہہ رہا ہوں ۔ اگر وہ مرد ہے تو واپس یہاں آجائے گا ۔ اور اگر عورت ہے تو ۔۔۔۔۔۔۔"

"وہ کون ؟" امجد نے پوچھا ۔

"سپرانٹنڈنٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔ جی ہاں سپرانٹنڈنٹ"۔ نہالچند بولا ۔

"شٹ اپ"۔ سٹیشن ماسٹر چیخ کر بولا ۔ نانسنس

"جی ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ یہی کہہ رہا تھا میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ نانسنس ہے پھر تو شٹ اپ ۔ مطلب ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔۔۔۔۔۔ !"۔

.. ....○ ..

پریم نگر

شاید آپ نے پہلے بھی پریم نگر کی کہانی سنی ہو، کچھ مضائقہ نہیں ۔ کیونکہ آپ اسے بار بار سننا پسند کریں گے ۔ یہی اس نگر کا جادو ہے ۔ بڑا جادو ہے اس نگر کا ۔ آپ کی آنکھیں کٹورہ سی کھل جاتی ہیں، اٹھ بیٹھتے ہیں ۔ "ہوں ۔ پھر کیا ہوا ۔" واقعی اس نگر پر جادو کا اثر ہے ۔ اس بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہیں ۔ لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا ۔ کہ آیا وہ سادھو نگر کے باشیوں سے ناراض ہو کر سراپ دے گیا تھا ۔ اس لئے وہ اندھے ہو گئے ۔ یا خوش ہو کر آشیرباد دے گیا تھا ۔ "جیو ۔" اور وہ جینے لگے جب ہی سے وہاں کا سبزہ اور بھی مخملی ہوگیا ۔ پھول مہک اور رنگ سے اور بھی لد گئے ۔ ٹہنیوں نے بال کھول کر خوشی کے مارے حال کھیلنا شروع کر دیا ۔ ان کے تلے چشمے خوشی سے ٹپ ٹپ رونے لگے ۔ اور ان پر بیٹھ کر کوئل نے پی کو بلانا شروع کر دیا ۔ اور پگڈنڈیاں دوڑ دوڑ کر نگر کو آنکلیں ۔ اور آسمان نے بڑھ کر اسے ستاروں بھرے نیلے دامن میں چھپا لیا ۔ کہ فرشتوں کی عبادت میں خلل نہ پڑ جائے ۔ چاہے یہ بات سچی ہو یا وہ ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ بہر حال جادو نگری ہے وہ ---------!

ذونو اس نگر کا باشی تھا ۔ اس کا گھر ایک چشمے کے کنارے تھا ۔ جو ہر سمے ٹپ ٹپ رویا کرتا ۔ جس پر ٹہنیاں بال جھٹکائے سوگ مناتیں ۔ جن پر کوئل بیٹھ کر "نز ۔ زی ۔ نز ۔ زی" کوکتی ۔ ذونو پڑے پڑے ان کی آوازیں سنتا ۔ کروٹ بدلتا ۔ ٹھنڈی آہ بھرتا ۔ اور پھر سننے لگتا ۔ ذونو کو نزی سے محبت تھی ۔ وہ دن بھر شعر گنگناتا ٹھنڈی آہیں بھرتا ۔ اور دنیا کی ساری چیزوں کو فانی سمجھنے میں وقت کاٹتا ۔ رات کو کروٹیں بدلتا ۔ اور سوچتا ۔ اب وہ بیٹھی ہوگی ۔ بال کھلے ہوں گے، ہونٹ کھلے ہوں گے ۔ اف وہ کھور کالی آنکھیں

اف ـ ـ ـ ـ ـ ـ ! حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ جاتی ـ اور وہ لگی آنکھ دیکھنے لگتی ـ کھلے بال کِھلے ہونٹ ، گھور کالی آنکھیں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تصویر کھو جاتی ـ وہ تڑپ کر اِدھر دیکھتا ـ چشمہ ٹپ ٹپ روتا ـ ٹہنیاں لٹک لٹک کر فریاد کر رہی ہوتیں دور گھاٹی میں ہوا کراہتی اور کوئل بلا بلا کر جتاتی ـ کہ وہ نہ آئے گی ـ نہ آئے وہ ـ کتنی محبت تھی اسے نزّی سے لیکن نزّی کو اس سے محبت نہ تھی ـ چھٹپنے ہی میں وہ آجو سے کھیلا کرتی تھی ـ اور کھیل ہی کھیل میں وہ آجو کی ہوگئی تھی ـ جب اسے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کسی کی ہو چکی ہے ـ بیچاری ـ اب کیا کرتی وہ ـ اس لئے اس نے آجو کو اپنا لیا ـ لیکن اسے اپنا نہ بنا سکی ـ اور آجو نگر چھوڑ کر شہر چلا گیا ، اور وہاں سے "ایٹی کیٹ" پسند کرنا سیکھ آیا ـ اور اسے ایٹی کیٹ اتنا بھایا ـ کہ نزّی اور اس کے کھیل دل سے اتر گئے ـ نزّی کو تو ذرا ایٹی کیٹ نہ آتا تھا ـ لیکن مس فلّی کیا تھی گویا ایٹی کیٹ میں جان پڑی ہوئی تھی ـ آجو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور مر جانے کی آرزو کرتا ـ اس میں کوئی ہرج نہ تھا ـ اس لئے آجو کے گھر والے آجو پر نگاہ نہ رکھتے تھے کیونکہ مر جانے کی آرزو کرنے کے لئے جیتے رہنا ضروری ٹھہرا ـ اس لئے وہ اس کی رکھوالی نہ کرتے تھے ـ ان کی آرزو تھی کہ وہ جیتا رہے عمر دراز ہو ـ آپ جانتے ہیں گھر والے بیری نہیں ہوتے ـ

آجو فلّی کو ماڈل گرل سمجھتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مس فلّی کو اس بات کا ذرا لحاظ نہ تھا کہ آجو اسے کیا سمجھتا ہے ـ پڑا سمجھے ! ـ سمجھے نہ سمجھے !! بات یوں تھی ـ کہ ہر ماڈل گرل کی طرح اسے بھی ماڈرن گرل بننے کا شوق تھا ـ اور ماڈرن گرل بننے کا شوق نہ جانے کیا کیا بننے کا شوق ہوتا ہے ـ فی الحال فلّی کو وائلن بجانے کا شوق تھا ـ اس لئے وہ وائلن بجاتی رہتی ـ لیکن وہ بجتی نہ تھی ـ جبھی تو وہ اور بھی شدت کے ساتھ بجاتی تھی ـ

وائلن کے سُر وادی میں گونجتے ـ آجو کے دل پر تیر سا لگتا ـ اور وہ لحاف میں منہ ڈال کر "آئی لو یو" گنگناتا ـ اور نزّی چھم چھم روتی ـ اور ذونو آہ بھرتا اور کروٹ بدلتا اور جنگل کے درخت سر لٹکا لٹکا کر سنتے ـ اور پھر ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرتے ـ اور چشمے دبے دبے پاؤں آکر انہیں دیکھتے

اور سرک جاتے ۔ دیکھتے اور سرک جاتے ۔ ان کی باتوں کو دیکھ کر کوئل اونچی ٹہنیوں پر بیٹھ کر بتا دینے کی دھمکی دیتی ۔ لیکن کوئل کی بات کون سنتا ہے ۔ لوگ تو پیہو پیہو سنتے ہیں اور پیہو تو دردِ دل دھمکی نہیں ۔

یہ سب پریم نگر کے باشی تھے ۔ ذونو ۔ نزّی ۔ آجو ۔ فلی اس کی وائلن ، درخت چشمے اور کوئل ۔

ان کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے تھے وہاں نگر میں ۔ مثلاً ذونو کی منگیتر دینا تھی ۔ جسے نگر کی وینس سمجھا جاتا تھا ۔ ایسی حسین تھی وہ ۔ اس کا حسن دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بیراگی ہو جائیں ۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سب کچھ تو چھوٹ جاتا تھا پر دینا نہ چھوڑی جا سکتی تھی ۔ مگر وہ ظالم تو آپ سبھی کچھ تھی ۔ بلکہ سبھی کچھ اسی سے تھا ۔ اور وہ آپ اس سے بھی زیادہ ۔ ایسا حسن تھا اس کا اداس اداس رویا رویا اور وہ آپ چپ چپ سی تھی ۔ نہ جانے وہ سب کی پیاری ہونے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی ۔ یا چپ ہونے کی وجہ سے پیاری ۔ بہر حال نگر کے سبھی لوگ اسے چاہتے تھے ۔

کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کسے چاہتی ہے کچھ لوگ کہتے وہ کسی کو نہیں چاہتی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جوان لڑکی ہو اور کسی کو نہ چاہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسے چپ کیوں لگی تھی ۔ اور وہ روئی روئی سی کیوں تھی ۔ کوئی کہتا اسے ذونو سے محبت ہے ۔ جبھی تو اس نے ذونو کے گھر کے سامنے گھر بنوایا ہے ۔ اور ذونو کی کھڑکی کے سامنے کھڑکی رکھی ہے ۔ کوئی کہتا ۔ اونہوں محبت نہیں اسے تو صرف یہ چڑ ہے کہ جب نگر کے سب جوان اسے دیکھ کر دیوانے ہوئے جا رہے ہیں ۔ تو بھلا ذونو کیوں بالا بالا رہتا ہے ۔ بہر حال چاہے اسے ذونو سے محبت تھی یا نہ تھی ۔ نگر کے جوان واقعی دینی کی محبت میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے ۔ اور اس قدر دیوانے کہ دینا کی بات بات کا ہوش تھا انہیں ۔ اب کھڑکی میں بیٹھی ہے ۔ اب سیر کے لئے تیار ہو رہی ہے ۔ اب سبز سوٹ پہنا جا رہا ہے ۔ اف ۔ وہ سبز سبز کونپلوں میں دودھیا سا پھول ۔ شبنم سے بھیگا بھیگا سا ۔ اف ۔ وہ گلیوں میں نکل جاتے ۔ اور دینا کے گیت گاتے پھرتے ۔ اور بالآخر

کھاڑی میں جا کر مرلی بجا بجا کر دردِ دل کا اظہار کرتے ۔ اگرچہ مرلی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر سناتی ۔ لیکن کون جانتا تھا ۔ کہ وہ سنا جاتا تھا یا نہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ دردِ دل کا اظہار جبھی ہوتا ہے ۔ جب کوئی اسے سنے ۔ چاہے سن کر مسکرا ہی کیوں نہ دے "ہونہہ"۔ یہ ہونہہ تو اور بھی اچھا رہتا ہے ۔ اتنا تو پتہ چل جاتا ہے ۔ کہ بات پہنچ گئی ان تک ، لیکن نرینا کو تو چپ لگی تھی ۔ اگر وہ ہنسنا شروع کر دیتی تو شاید کھاڑی میں درد دل کا اظہار ہی نہ ہوتا ۔ اور مرلی رونے کی بجائے گانا شروع کر دیتی ۔ لیکن انجانی باتیں کون جان سکتا ہے ۔

بہر حال یہ تو سبھی جانتے تھے ۔ کہ ہر کوئی چاہتا تھا ۔ کہ ڈینا اسے چاہے ۔ اور ہر کوئی ڈونو کی خوش قسمتی پر جلتا تھا ۔

لیکن ڈونو اپنی بد قسمتی پر روتا تھا ۔

جب اس نے سنا کہ ڈینا اسے اس قدر چاہتی ہے ۔ تو اسے اور بھی دکھ ہوا ۔ کہ نزی اسے کیوں نہیں چاہتی ۔ اور نزی کو اپنی محبت کی شدت جتانے کے لئے اس پر لازم ہوگیا کہ وہ ڈینا کی چاہت کو نزی کی محبت پر قربان کر دے جس قدر وہ قربانی کرتا اسی قدر اسے نزی پر گلہ بڑھ جاتا ۔ نزی کی بے وفائی اس میں اور بھی وفا پیدا کر دیتی ۔ اور اس کی وفا سے نزی اور بھی چڑ جاتی ۔ لاپروا ہو جاتی ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وفا جبھی قابلِ قدر ہوتی ہے ۔ جب وہ دوسرے کی بے وفائی کے باوجود قائم رہے ۔ تو ڈونو نزی سے اور بھی محبت کرنے لگا ۔ اور ڈینا سے اور بھی بالا بالا رہنے لگا ۔ اور ڈینا اس بات پر اور بھی چڑنے لگی ۔ اور نگر کے نوجوان کے اظہار دردِ دل میں اور بھی درد بڑھا ۔ اور مرلی کے بین اور بھی لمبے ہوتے گئے ۔

جس روز ڈینا سے ڈونو کی منگنی ہوئی اس دن وہ کھاڑی میں بیٹھ کر اس قدر رویا اس قدر رویا کہ گھگی بندھ گئی ۔ پھر اپنے دوست منجو کے شانے پر سر رکھ کر بولا ۔ "ہائے منجو اب کیا ہوگا"۔ منجو نے دلاسا دیا بولا ۔ "ہو گا کیا ۔ بیاہ ہوگا"۔ "لیکن منجو" ڈونو بولا میں تو جیتے جی مر جاؤں گا ۔ نہیں نہیں منجو یہ کبھی نہ ہوگا ۔ میں ڈینا کی زندگی کو تباہ نہ ہونے دوں گا ۔ بیچاری ڈینا ۔ "لیکن

ذونو"۔ منجو نے کہا ۔ "دینا کو تم سے اتنی محبت ہے"۔ "یہ اس کا پاگل پنا ہے منجو"۔ ذونو چیخنے لگا۔ میں نزی کا ہو چکا ہوں ۔ چاہے وہ جانے نہ جانے منجو ۔ کاش کہ وہ جانتی منجو ۔ کاش !!! پھر جانتے کا کیا فائدہ جب میں نہ رہا ۔ منجو"۔ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ "ذونو" منجو بولا ۔ "کیا دینا سے بیاہ کرنے سے انکار کر دو گے"۔ اف ۔ یہی تو میں سوچتا ہوں منجو ۔ کتنی بدنامی ہوگی میری نزی کی ۔ اف ۔ نہیں نہیں میں دینا سے بیاہ نہ کروں گا ۔ میں بیاہ کروں گا ہی نہیں مجھے برباد رہنا ہی راس ہے ۔ منجو "لیکن"۔۔۔۔۔۔ منجو نے کچھ کہنا چاہا ۔ لیکن ذونو نے اسے کاٹ دیا"۔ میں مجبور ہوں ۔ ذونو میں مجبور ہوں ۔ اور وہ زار زار رونے لگا ۔

نزی کو پتہ نہ تھا کہ ذونو اتنا مجبور ہو چکا ہے اور یوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہا ہے ۔ شاید وہ جانتی بھی ہو لیکن جانتا چاہتی نہ ہو ۔ اس لئے ان جانا کر دیتی ہو ۔ کون جانتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے ۔ بہر حال کیسی بری تھی وہ سارا قصور نزی کا تھا ۔

نزی سے کوئی پوچھتا تو ایسا معلوم ہوتا ۔ جیسے سب ذونو کی غلطی تھی ۔ اسے نزی سے محبت نہیں کرنا چاہئے تھا ۔ چونکہ چھٹپنے میں وہ آپ نزی کے رقعے آجو تک پہنچایا کرتا تھا ۔ وہ خوب جانتا تھا ۔ کہ وہ آجو کی ہو چکی ہے ۔ اگر نزی سے محبت کرنی ہی تھی ۔ تو اتنی دیر کیوں لگائی اس بات میں اگر شروع شروع میں نزی کو محبت جتا دیتا یا کم از کم آپ ہی جان لیتا ۔ اس بات کو تو بات نہ بگڑتی ، اور کچھ نہ کرتا تو کم از کم رقعہ لے جانے سے ہی انکار کر دیتا ۔

پتھر کا دل ہو تو کوئی ذونو سے اس بارے میں بات کرے ۔ وہ ایک آہ مار کر آپ کی طرف یوں دیکھے گا ۔ کہ آپ کا دل خون ہو کر بہہ جائے گا ۔ اور جی چاہے گا ۔ کہ اس کے گلے لگ کر رو دیں ۔ اور آپ معاً سمجھ جائیں گے ۔ کہ وہ نزی کا رقعہ کیوں نہ آجو کے پاس لے جاتا ۔ جبکہ اس کی خوشی نزی کی خوشی سے وابستہ تھی اور وہ کیسے جانتا کہ اسے کیا ہے ۔ یہ بات بھی جانی جاتی ہے کیا ۔ یہ تو انجانے میں آکر روئیں ، روئیں میں بس جاتی ہے ۔ اور بس پھر

ہوش آتا ہے ۔ جب ہوش نہیں رہتا ۔ اور جان بھی لیتا تو کیسے کہتا نزی سے ۔ جب جان لو تو کہنے کو زبان بھی ملے ۔ اور زبان مل بھی جائے تو کیا وہ دل سے جڑی ہوتی ہے ۔ اونہوں ۔ کہاں دل منہ کہاں دونوں کا میل بھی ہو ۔ پھر جب آپ رو رو کر تھک جائیں گے تو اسے تسکین دینے کی خاطر بات بدلنا چاہیں گے ۔ مگر آنسوؤں کے روبرو بات بدلنا ، آخر آپ دل والے ٹھہرے ۔ پھر آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا ۔ کہ کیا کریں ۔ اور آپ کسی بہتر صورت کو نہ جانتے ہوئے ازسرنو اسے گلے لگا کر رو پڑیں گے ۔ اور نزی کو گالیاں دینے لگیں گے ۔ گالی دینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے ۔ آخر ہر کسی کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی نزی سے واسطہ پڑتا ہی ہے ۔ آپ کا دل بھی ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ چاہے وہ پھر سے گرم ہونے کے لئے ہی ٹھنڈا ہو ۔ آخر اس بے ثبات دنیا میں دل کے ٹھنڈے اور گرم ہونے کے علاوہ کس بات کو ثبات ہے ۔

ادھر نزّی اس بات پر روتی کہ آجو نے کس کے لئے سب کچھ بھلا دیا ۔۔۔۔۔۔۔ وہ بالپن کے کھیل ۔۔۔۔۔۔۔۔ جب وہ خوشی خوشی دولھا بنتا تھا ۔ اور وہ شرما شرما جاتی تھی ۔ اور پھر منہ بنا کر رخ بدل کر کھڑی ہو جاتی ۔ نا بھئی ہم نہیں کھیلیں گے ۔ تاکہ وہ منائے تو مان جائے ۔ کس کی خاطر سب کچھ بھلا دیا ۔۔۔۔۔۔ اس کے لئے ۔۔۔۔۔۔ اللہ ماری جو سارا سارا دن سارنگی چھاتی سے لگا ۔ ”آئی لَو یُو“۔ چلّاتی رہتی ہے بے حیا کہیں کی ۔ محبت نہ ہوئی اشتہار ہوا ۔ نہ جانے کیا سمجھا ہوا ہے اس نے ۔ آخر ایک نہ ایک دن وہ سمجھیں گے ہی آجو کو سمجھاتا کون ۔ سمجھاتا بھی تو کیا سمجھا دیتا اسے ۔ جو آپ ہی نہ سمجھے تو کون سمجھائے ۔

آجو کو دکھ تھا تو صرف یہ کہ فلّی سمجھتی نہیں ۔ بھلا دردِ دل کے بغیر نغمہ پیدا ہوا ہے کبھی ۔ اور دردِ دل محبت کے بغیر ۔۔۔۔۔۔ کبھی سنا ہے ۔ ہو بھی جائے پیدا تو کیا وہ محبت پیدا کرے گا ۔ لیکن ہر ماڈرن گرل کی طرح فلّی سمجھتی کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے ۔ ایک دن وہ بولی ۔ ”جیون ناؤ میں پریم لاد کر پتوار پھینک دینا ۔ اونہوں ۔ مسٹر آجو۔ یہ بات نہیں چلے گی“۔ آجو بولا ۔

"مس فلّی جب کنارا ہی پرے سرکتا جائے پرے سرکتا جائے تو پتوار کس کام کے"۔ فلی بولی ۔ مسٹر آجو جب ہر موج کنارا ہو جائے اور ڈوبنا منزل تو خواہ مخواہ ساحل کو بدنام کرتے پھرنا"۔ "بدنام"۔ آجو مسکرا دیا ۔ "مس فلّی کیا دیوی پجاری کے سجدوں سے بدنام ہوتی ہے ۔ "دیوی"۔ وہ طنز سے مسکرائی ۔ "دیوی کا کیا ہے ۔ پتھر سے بنی ہوئی دیوی"۔ "ہاں" وہ گنگنایا ۔ "پتھر سے نہ بنی ہوتی تو ایسی سنگدل نہ ہوتی"۔ "مسٹر" آجو فلی تڑپ کر مڑی ۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں چپ ہوگئی ۔ دراصل اسے آجو کی باتیں پسند نہ تھیں ۔ کیسی عام باتیں تھیں اس کی ۔ اور آجو کی نگاہیں اف وہ نگاہیں ۔ یوں منڈلائی تھیں ۔ دھنس جاتی تھیں توبہ ! جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ۔ ایسا مشکل ہو جاتا کہ پھر جان چھڑانے کو جی نہ چاہتا ۔ بلکہ جی چاہتا کہ دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے اور جی چاہتا کہ اسے اور دکھائیں ۔ اور دکھائیں ۔ خدا نخواستہ اگر وہ دیکھنا بند کر دیتا تو کیا ہوتا ۔ بہر حال بڑی ہی عام نگاہیں تھیں اس کی ۔ آجو منت سے چلایا۔ "مس فلّی ۔ خدا کے لئے ۔ خدا کے لئے مس فلّی ۔ مس فلّی یوں نہ تڑپاؤ ۔ یوں مر مر کر جینا مس فلی"۔ نہ جانے کیا ہوا ۔ ایک خوشی کی لہر دوڑی ۔ مس فلی کو گویا کسی مضراب نے چھیڑ دیا اور چھیڑنے کے لئے وہ چمک کر بولی ۔ "ہم نے تو کسی کو مرتے نہیں دیکھا"۔ اس نے ایک آہ بھری ۔ "مرگیا تو ایک دن تمہیں بیٹھ کر روؤ گی"۔ وہ جلال میں آگیا تھا ۔ "اس میں کیا بُرا ہے"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا ۔ "آپ ہی کا کہنا ہے نا ۔ بجانے والا روئے تو وائلن بجتی ہے ۔ نہیں تو نہیں ۔ پھر تو میری وائلن بجے گی وہ ہنسی ۔ اور آجو کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر رو دے ۔

وہ گھر جا کر رو رو کر نڈھال ہوگیا ۔ پھر دفعتاً مسکرا دیا ۔ ہنسنے لگا ۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ "ہاں اس کی وائلن بجے گی ۔ دینا اسے سنے گی ۔ او سر دھنے گی ۔ ہاں میں اسے نغمہ سناؤں گا ۔ میں آپ اس کی وائلن میں راگ بن کر رہوں گا ۔ میرا دل تار بن کر لرزے گا ۔ اور وہ اسے چھیڑے گی ۔ اپنے ہاتھوں سے چھیڑے گی ۔ ہاں اس کی وائلن بجے گی ۔ وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ۔ سانس اکھڑ گئی اور وہ لیٹ گیا ۔ بالکل

ہی لیٹ گیا ۔ حتیٰ کہ فلی کی وائلن بجی تو بھی اسے خبر نہ ہوئی ۔

لوگوں کو اس کی موت کی خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گئے "نہیں نہیں وہ مرا نہیں"۔ وہ تو چلا گیا ۔ نگر چھوڑ کر چلا گیا ۔ نگر میں سنسنی دوڑ گئی ۔

نگر کو چھوڑ کر چلا جانا نگر کے قانون کے خلاف تھا ۔ اور آپ مر جانا نگر چھوڑ جانے کے برابر تھا ۔ چاہے کوئی روز مر جانے کی دھمکی دیتا اس میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن واقعی چلے جانا یا مر جانا بالکل ہی مر جانا نگر کا قانون اسے جرم سمجھتا تھا ۔ اس لئے آجو کے گھر والوں نے یہ بات چھپا رکھی ۔ لیکن پتہ نہیں فلی کو کس نے بتا دیا ۔ شاید وہ جانے سے پہلے رقعہ لکھ کر آپ ہی بتا گیا ہو ۔ ورنہ فلی کو کیسے معلوم ہوا ۔ کہ وہ اس کی وائلن میں نغمہ بن کر رہنے کے لئے چلا گیا ہے اس کے دل میں درد بن کر رہنے کے لئے ۔ ایسا درد جو انگ انگ میں بستا ہے اور جان بن جاتا ہے ۔ اور پھر انگلیوں کی راہ تاروں میں بکھر کر فضا میں لہریں لیتا ہے ۔

نہ جانے فلی کو کیا ہوا وہ وائلن کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ گئی ۔ اور وہ بجنے لگی ۔ رونے لگی ۔ بین کرنے لگی ۔ اور آسمان نے اپنے نیلے دامن کو دوہرا کر دیا ۔ تاکہ آواز اوپر نہ نکل جائے ۔ ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آواز فرشتوں کے کان میں پڑ جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ فرشتے گھبرا کر سجدوں سے اٹھ جائیں ۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کرشن مہاراج بن کر ازسرنو گوکل کے بن میں آنے پر مچل جائے ۔

جب لوگ پوچھنے آئے تو فلی غصہ میں اٹھ بیٹھی ۔ "کون کہتا ہے وہ آپ مرا ہے کون کہتا ہے وہ مرا ہے ۔ جھوٹ ۔ سب جھوٹ ۔ وہ جیتا ہے وہ ہمیشہ جئے گا ۔ وہ کبھی نہ مرے گا ۔ ہاں وہ میری وائلن میں نغمہ بن کر جیتا ہے ۔ اب میں جانتی ہوں اس نے کہا تھا اپنے چاہنے والے کو جانو"۔

نہ جانے دینا نے اس کی بات کہاں سے سن پائی ۔ "اپنے چاہنے والوں کو جانو"۔ یہ بات اس کی نس نس میں دھنس گئی ۔ وہ بھاگ اٹھی ۔ اور معاً اپنے

چاہنے والوں کو جاتے لگی ۔ کھاڑی میں روتی ہوئی مرلی کے بین گونجے ۔ اس نے انہیں سنا ۔ اور سن سی رہ گئی ۔ پھر اسے مزید جاتنے کے لئے وہ چل کھڑی ہوئی ۔ منجو نے اسے آتے دیکھا ۔ اور مرلی بجانا بند کر دیا ۔ بولا ۔ "دھن بھاگ ہیں میرے"۔ دینا شرما گئی ۔ اس نے اسے جان لیا تھا نا ۔ اس لئے وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلے گئے ۔ ایک دوسرے کو اور جاتنے کے لئے یا اپنے آپ کو بھولنے کے لئے ۔ نگر چھوڑ کر چلے گے ۔

دینی چلی گئی ۔ دینی نگر چھوڑ کر چلی گئی ۔ نگر میں چرچا ہوا ۔ کھاڑی میں مرلیوں نے بڑھا چڑھا کر دینا کے چلے جانے کا دکھڑا رویا شاید بڑھا چڑھا کر نہ رویا ہو ۔ دکھ کو کون بڑھا چڑھا سکتا ہے ۔

ادھر نژی نے اپنے آجو کا آخری پیغام سنا ۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو"۔ وہ گویا چونک کر بھاگ اٹھی ۔ کس کے لئے جان سے چلے گئے ۔ کس کی خاطر اپنی جوانی لٹا دی ۔ اپنا بلیدان دے دیا ہائے کیا ہوگیا ۔ اب کیا ہوگا ۔ نہیں نہیں وہ گئے نہیں ۔ وہ تو مجھے پریم کرنا سکھا گئے ہیں ۔ پریم اپنا بلیدان ہے مٹ کر جینا ۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو"۔ میں پالن کرونگی میں ذونو سے پریم کی بھیک مانگوں گی ۔ وہ مجھے معاف کر دیں گے ۔ نہ کریں تو میں پراشچت کروں گی ۔ میرا سر نہ اٹھے گا ۔ اور وہ چھم چھم رونے لگی ۔ چھم چھم روتی رہی ۔

ذونو نے سنا کہ دینا چلی گئی نگر چھوڑ کر چلی گئی ۔ اسکی آنکھ کھل گئی ۔ ہاں میں جانتا تھا ۔ مجھے معلوم تھا ۔ وہ میری خاطر نگر چھوڑ گئی ہے ۔ میرے لئے اپنا آپ کھو دیا ۔ ہاں میرے لئے ۔ اسے مجھ سے پریم تھا نا ۔ ہائے میں کس قدر اندھا رہا ۔ میں نے اسے نہ جانا وہ چلی گئی ۔ تاکہ مجھے بیاہ سے انکار نہ کرنا پڑے ۔ میری نژی بدنام نہ ہو ۔ اس نے اپنا آپ قربان کر دیا ۔ واقعی وہ دیوی تھی اور میں اندھا دیوانہ ۔ یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ اور اس چلی گئی دیوی کے سامنے محبت کی جوت جلا کر بیٹھ گیا ۔

فلی اپنی وائلن اٹھا کر آجو کی قبر پر جا بیٹھی ۔ اسے اپنے مرے ہوئے پریمی

سے محبت ہو چکی تھی نا ۔ اس کی وائلن سے براہ کے بین نکلے ۔ نزی نے یوں محسوس کیا جیسے وہ گیت اس کے اپنے آجو کا سندیس ہو ۔ میں پالن کرونگی ۔ وہ بڑبڑائی ۔ میں نے ذونو کو جان لیا ۔ اور وہ از سرِنو ذونو کے لئے چھم چھم رونے لگی ۔ ذونو کو ایسا محسوس ہوا جیسے دینا جاتے ہوئے اپنے دل کا درد ہوا میں بکھیر گئی ہو ۔ جو دینی کی قربانی کا شاہد تھا ۔ نہیں نہیں وہ گئی نہیں وہ یہیں ہے جسم کے جانے سے بھی کوئی جاتا ہے بلکہ وہ تو نگر میں آگئی ہے میرے من کے نگر میں ۔ میرے من کی دیوی ۔ اور دینا کی خاطر وہ کروٹیں بدلنے لگا اور آہیں بھرنے لگا ۔

پتّوں نے سنا اور وہ سمٹ سمٹ کر ایک دوسرے سے لگ گئے ۔ ٹہنیوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیا چشمے ٹپ ٹپ رونے لگے ۔ کوئل نے بچھڑے باسیوں ۔ کو یوں آوازیں دینا شروع کر دیا ۔ جیسے وہ آجائیں گے ۔ پگڈنڈیاں اِدھر ادھر دوڑیں جیسے "کھوئے ہوئے" ابھی مل جائیں گے ۔ آسمان نے اپنا پردہ اور بھی گاڑھا کر دیا تاکہ گئے ہوئے باشیوں کی یاد آسمانوں پر نہ پہنچ جائے ۔ کہیں فرشتے بھی نہ چاہنے لگیں کہ اللہ میاں چلے جائیں اور آسمانوں پر بھی جستجو کی رنگینی کا چرچا ہو کہیں وہاں بھی ایک نگر نہ بس جائے ۔

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے ۔ مبالغہ ہے ۔ حقیقت یوں ہے کہ وائلن سے براہ کے بین نکلتے ہیں ۔ ٹہنیاں سر دھن دھن کر سنتی ہیں ۔ چشمے چھن چھن ناچتے ہیں ۔ نگر کے باشی خوشی کے آنسو روتے ہیں ۔ ڈنڈیاں اِدھر اُدھر ناچتی ہیں ۔

لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ چاہے کوئی سی بات سچی ہو ۔ بہرحال نگر اور بھی بستا ہے اور نگر کے باشی اور بھی جیتے ہیں ۔

..........○..........

تین خدا

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے ۔

چہرے اظہارِ جذبہ یا خیال سے خالی ۔ منہ اطمینان کی شدت سے یوں سوجے ہوئے گویا پیٹ بھر کر کھا لینے کے بعد کوئی بے حسی کا تودہ بن کر رہ گیا ہو ۔ آنکھیں کھلی محض کھلی ۔ نظر سے عاری ۔ سامنے جہاں تک نظر کام کرتی تھی ایک وسیع ویرانہ اونگھ رہا تھا ۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ بے نیاز ۔ بے خبر ۔

لمبی داڑھی والا لمبی چوڑی کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا ۔ رسیوں کے درمیان وسیع خلا تھے ۔ اُونچائی اور چوڑائی کو دیکھ کر محسوس ہوتا گویا کسی "سائیکلوپ" کیلئے بنی ہو ۔ اُس کی پتلی دُبلی دھوتی سے ادھ لپٹی ٹانگیں اس بڑی چارپائی کے کونے میں بے بسی سے پڑی تھیں ۔ دونوں بازو اس کے بڑے سر کو تھامے ہوئے تھے ۔ پیٹھ تلے ایک میلا اور بھدا گاؤ تکیہ سہارا دے رہا تھا ۔ منہ چقندر سا سُرخ تھا جس کے تلے سے رنگی داڑھی سینے تک چلی گئی تھی ۔ موٹے موٹے ہونٹ ۔ پھولی ہوئی ناک ۔ اور دھنسی ہوئی آنکھیں ۔ جو اس پھیلے ہوئے ویرانے سے پرے دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھیں ۔ کبھی کبھی وہ ۔ چونک اُٹھتا جیسے اس دنیا میں آگیا ہو ۔ دائیں ہاتھ سے داڑھی کی وسعت کو محسوس کرتا ۔ اور پھر اس کے گلے کے نچلے پردوں سے "اہم ۔۔ ! !!" کی آواز پیدا ہوتی ۔ جو اس ویرانے میں گونجتی ۔۔۔۔۔۔ !!" اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک اور تہ چڑھ جاتی ۔ پھر وہ از سرنو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کائنات کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ۔

دوسرا بوسیدہ موڑھے پر بیٹھا تھا ۔ لمبا چہرہ ۔ چھوٹی اور شوخ آنکھیں، پچکے ہوئے گال ۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ جو اکثر طنز یا تمسخر سے کھل جاتے اُس

سے آنکھوں میں حقارت کی دھار لہراتی ۔ لمبی نوکیلی انگلیاں ان جانے اضطراب سے پیچ وتاب کھاتیں ۔ وہ پیار بھری نگاہ سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتا گویا انہیں آنکھوں سے چھو رہا ہو ۔ چوم رہا ہو ۔ پھر کنکھیوں سے اپنے کسی ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرانا تمسخر آمیز ادھوری مسکراہٹ ۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا اور بالآخر آسمان کے پار دیکھنے میں کھو جاتا ۔ !

تیسرا لکڑی کے تخت پوش پر دو زانو بیٹھا کنگھے سے گیسو سنوارنے میں لگا تھا ۔ اس کے تیل سے بھیگے ہوئے سیاہ لمبے بال شانوں پر پڑے تھے ۔ گول ابھرے ہوئے چمکدار گال گویا بے حسی سے پھولے ہوئے تھے ۔ شرعی مونچھوں تلے منڈی ہوئی داڑھی ۔ موٹے موٹے ہونٹ آپ ہی آپ ہلنے لگتے گویا ورد کر رہے ہوں ۔ وہ اپنے گیسو ، کنگھے اور اپنے آپ میں مگن بیٹھا تھا ۔ بالوں سے کنگھا نکالتا ۔ بال بناتا پھر کنگھے کو کلپ کی طرح بالوں میں اٹکا کر ۔ دونوں ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے ۔ "سبحان اللہ" گنگناتا سامنے رکھی ہوئی پگڑی یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھ دیتا ۔ اپنے ننگے گھٹنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ۔ چھاتی کے بالوں کو محسوس کرتا ۔ اور پھر اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ، از سرِنو کنگھا نکال کر بال بنانا شروع کر دیتا ۔

چوتھا جو ایک عام نوجوان دکھائی دیتا تھا ، ان کی طرف باری باری عقیدت سے دیکھتا ۔ اور مسکراتا ۔۔۔۔۔ گویا ان سے قرب حاصل ہونے پر مسرّت سے پھولے نہ سماتا ہو ۔۔۔۔۔ اور پھر از سرِ نو امید افزا نگاہوں سے باری باری ان کا منہ تکتا ۔۔وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے ۔ اور وہ نوجوان ان تینوں میں ۔

ان تینوں کے عقب میں ایک بوسیدہ اور کبڑا دالان بوسیدہ دیوار کے سہارے کھڑا ہونک رہا تھا ۔ سیاہ نانک چندی اینٹوں کی دیوار۔س ہڈیوں کے پرانے ڈھانچے کی طرح رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ۔

ان کے سامنے ایک بیٹھا سا ٹیلا اس وسیع ویرانے کے تسلسل کو توڑ رہا تھا ۔ جو سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا ۔ ٹیلے پر قبریں اوٹ پٹانگ ڈھیریوں کی

طرح بکھری ہوئی تھیں ۔ ارد گرد بگولے خاک اڑا رہے تھے ۔ ٹنڈ منڈ ٹہنیاں چاروں طرف نکل گئی تھیں ۔ گویا پتوں کی ہوس میں سرگرداں ہوں ۔ اردگرد چاروں طرف ریت کی لہریں رینگ رہی تھیں ۔

لمبی داڑھی والے نے ایک انگڑائی لی ۔ اور گہری اہمیت بھری آواز سے کھنکارا ۔ "اہم ۔۔۔ !!" تھوک کی پچکاری چلائی ۔ اپنی آواز کی گونج سن کر اطمینان سے وہ از سرِ نو خلا میں گھورنے لگا ۔

تراشی ہوئی داڑھی والے نے حقارت سے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا ۔ ہونٹ تمسخر سے کھل گئے ۔ اس نے اپنی سیاہ اچکن کے بٹن کھول دیئے ۔ گویا کسی جذبے کی شدت سے پُھکا جارہا ہو ۔ بے خبری میں دو ایک لمبے سانس لئے ۔ اور بالآخر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے میں محو ہوگیا ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے کنگھا بالوں میں اٹکا دیا ۔ منہ پر ہاتھ پھیرا ۔ اور پھر سامنے دھرے ہوئے بجھے ہوئے حقے کی نے کو منہ میں لے کر اسے چومنا شروع کردیا ۔

نوجوان نے باری باری ان تینوں کی طرف عقیدت سے دیکھا اور پھر دالان کی بوسیدہ دیوار کی طرف گھورتے ہوئے آہیں بھرنے لگا ۔

دفعتاً منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقہ چھوڑ کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا ۔ اور پھر چھاتی کے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا ۔

تراشی ہوئی داڑھی والا چونکا ۔ "استغفراللہ ربی" ۔ وہ دبی زبان میں گنگنایا ۔ آنکھ میں وہی چمک لہرائی ۔ ہونٹ کھلے ۔ پھر وہ اچکن سے گرد جھاڑنے لگا ۔

لمبی داڑھی والے نے کروٹ بدلی اور ٹانگوں کو کھجاتے ہوئے بولا ۔ "مولا ہی مولا ۔ سب رولا ہی رولا" ۔

تراشی ہوئی داڑھی واے نے چونک کر ادھرادھر دیکھا ۔ جیسے لمبی داڑھی والے کے نعرے کی تصدیق کر رہا ہو ۔

نوجوان کی نگاہ عقیدتمندی سے بھیگ رہی تھی ۔ مولا ہی مولا"۔ اس نے دہرایا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے نوجوان کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا ۔ مسکرایا اور پھر بامعنی نگاہ سے اردگرد دیکھ کر ازسرنو نوجوان کی طرف دیکھ کر یوں مسکرا دیا ۔ گویا داد طلب کر رہا ہو ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنی پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی ۔ پھر کچھ سوچ کر اسے اتار یہاں سے وہاں رکھنے میں مصروف ہوگیا ۔ "اللہ الصمد"۔ اس کی آواز گونجی ۔

تراشی ہوئی داڑھی والا جو ٹیلے کی قبروں کو دیکھنے میں مصروف تھا ۔ چونک کر منڈی ہوئی داڑھی والے کی طرف متوجہ ہوگیا ۔ پھر اُس نے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا جو ڈھیر کی طرح پڑا تھا ۔ اس کی آنکھ چمکی ۔ اور ہاتھ کی انگلیاں اچکن کے بٹنوں سے کھیلنے لگیں ۔

نہ جانے کب تک وہ خاموش بیٹھے رہے ۔

ویرانے میں دھول اُڑنے لگی ۔ بگولے ناچنے لگے ۔ ریت کی لہریں رینگنے لگیں ۔ لمبی داڑھی والے کی دھوتی پھڑاتی ۔ اس کا لمبا سا ہاتھ دھوتی کو رانوں میں دبانے میں لگ جاتا ۔ اور پھر وہیں مٹھی سی بن کر پڑا رہتا ۔ "مولا ہی مولا"۔ اس کے منہ سے نعرہ نکل کر گونجتا ۔ "سبحان اللہ" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والا اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چلاتا جیسے سامنے آئینہ پڑا ہو ۔ پھر وہ حقے کی نے کو پکڑ کر یوں چوسنے لگتا گویا وہ سنترے کی مٹھائی کی پھانک ہو اور چھاتی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا اردگرد دیکھ کر مسکراتا جیسے وہ چیزوں کی اہمیت اور حقیقت سے کماحقہ واقف ہو ۔ کالی اچکن سے گرد جھاڑتا ۔ نوجوان سے داد طلب کرتا اور پھر سامنے ٹیلے کی قبروں کی طرف نظر ڈال کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا اور مسکراتا ۔

نوجوان باری باری ان کی طرف عقیدت بھری نگاہ سے دیکھتا آہ بھرتا اور پھر دالان کی بوسیدہ دیواروں کو گھورنے لگ جاتا ۔

"والسلام علیک"۔ ایک بوڑھا کسان داخل ہوتے ہوئے بولا ۔

"وعلیکم السلام"۔ وہ تینوں بآواز بلند چلائے لیکن بوڑھے کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

لمبی داڑھی والا عربی گنگنانے میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ افق کے پار دیکھنے میں لگی رہی۔ اور منشی دھوتی سنبھالنے میں۔ تراشی ہوئی داڑھی والا اپنے ہاتھ دیکھنے میں شدت سے مصروف رہا اور منڈی ہوی داڑھی والا کنگھا نکال کر بال بنانے میں لگ گیا۔ نوجوان نے بوڑھے چودھری کی طرف دیکھا۔ سلام کا جواب ہونٹوں میں دب کر رہ گیا۔ لیکن وہ سرک کر چارپائی کی پائنتی کی طرف ہو بیٹھا تاکہ چودھری کے لئے بیٹھنے کی جگہ بنا دے۔

چودھری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی رکھ کر ان تینوں کیطرف دیکھا اور کئی بار بولنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے۔

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ گاؤں میں تشریف لائے ہیں"۔ بڈھا بالآخر کہنے میں کامیاب ہو گیا۔

لمبی داڑھی والے نے کھنکھارا۔ "اہم ــــــ" اور پھر تھوک کی پیک چلا کر خاموش ہو گیا۔ ہم۔ ویرانے میں آواز گونجی۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا۔ اور پھر پگڑی کو یہاں سے اٹھا وہاں رکھ کر چھاتی کے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

"خدا کرے گاؤں والے ہدایت حاصل کریں!" بڈھا چودھری گنگنایا۔

"اللہ کرے!" اچکن والا اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"آمین"۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقے کی نے کو منہ میں لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر خاموش ہو گئے۔

"جب سے یہ نئی چیزیں نکلی ہیں"۔ چودھری نے ان تینوں کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بائیکوپ اور راڈیو"۔

"استغفر اللہ ربی !" لمبی داڑھی والا چونک کر جلال میں بولا" ۔ "میاں ان شیطانی ہتھکنڈوں سے کون لڑے" ۔ اس نے کروٹ لے کر تھوک کی پیک چلائی ۔

"ہم تو دامن بچاتے پھرتے ہیں" ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے اچکن کو انگلیوں سے جھاڑتے ہوئے کہا ۔

"ہم جانیں اللہ میاں آپ عاجز آچکے ہیں" ۔ لمبی داڑھی والا ہنسا اور پھر عجز بھرے انداز سے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا ۔

"زمین اپنی خبریں دے رہی ہے"۔ منڈی ہوئی داڑھی والا بال بناتے ہوئے بولا ۔

"میاں خبر لینے والا بھی ہو کوئی" لمبی داڑھی والا باخبر انداز سے بولا ۔ اور پھر زور سے کھنکھارا ۔ "اہم ------" اہم کی گونج سن کر اطمینان سے داڑھی کو ہاتھ میں لے کر اس کی وسعت محسوس کرنے لگا ۔

"قیامت کے آثار ہیں" ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے ٹیلے پر قبروں کو گھورتے ہوئے کہا ۔

آثار ----- ؟" لمبی داڑھی والے نے مٹھی کی گرفت کو مضبوط تر کرتے ہوئے دہرایا" ۔ اس سے بڑھ کر قیامت اور کیا ہوگی ؟"

"سبحان اللہ" ۔ نوجوان گنگنایا ۔

"اللہ کرے لوگوں کو ان باتوں کی تمیز ہو جائے" ۔ چودھری دعائیہ انداز سے بولا ۔

"لوگ ----- ؟" لمبی داڑھی والے نے یوں پیک چلائی گویا نشانہ کیا ہو -----

"لوگوں کی ذہنیت ----- کس قدر تعفن ہے ۔ جہالت اور غلاظت ۔ نعوذ باللہ" ۔

"آپ جو تشریف لائے ہیں" چودھری بولا ۔ "ایسی وعظ ہو جائے کہ لوگوں

کی آنکھیں کھل جائیں"۔

"میاں جھگڑا تو یہی ہے کہ ہر کوئی آنکھیں پھاڑے دیکھنے میں لگا ہے ۔ آنکھیں موندھ کر دیکھنے کا زمانہ گزر گیا ۔ لمبی داڑھی والے نے آنکھیں موندھ کر کہا ۔

منڈی ہوئی داڑھی والا چونک اٹھا ۔ اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔ "سبحان اللہ" کیا بات کی ہے مولانا نے "۔

کچھ دیر تک وہ سب خاموش بیٹھے رہے ۔

لمبی داڑھی والا آنکھیں بند کئے پڑا تھا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا پلکیں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے میں لگا تھا اور منڈی ہوئی داڑھی والا آنکھیں بند کئے حقے کی نے چوس رہا تھا ۔

"آپ کی واعظ سنیں گے ۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا" چودھری نے از سر نو بات چھیڑی ۔

بڈھوں کی بات کون سنتا ہے میاں ۔ لمبی داڑھی والے نے ہاتھ سے اپنی داڑھی کی لمبائی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ تو آپ کی کسرِ نفسی ہے" چودھری بولا ۔

"میاں نفس رہا بھی ہو" ۔ بڑی داڑھی والے نے اپنی دھوتی ٹانگوں میں دباتے ہوئے کہا ۔ "پھر کسرِ نفسی کیسی ؟"

"سب نفس ہی کا جھگڑا ہے "۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے چھاتی کے بالوں کو سہلانا بند کرتے ہوئے کہا ۔

"لیکن واعظ تو ہو گا ۔ سارا گاؤں منتظر ہے"۔ چودھری بولا ۔

"ہاں وعظ تو ہو گی"۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے ہاتھوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

"ہاں میاں" بڑی داڑھی والا ہنسا "بین تو بجے گی کوئی ناچے نہ ناچے"۔

"وہ تو اب کسی اور بین پر ناچتے ہیں"۔ اچکن والا بولا ۔

"آخر کب تک میاں"۔ بڑی داڑھی والا جلال میں آگیا "خدا کی لاٹھی بے آواز ہے"۔

"بے شک" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے ٹانگ اکڑا کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور محسوس کرنے لگا گویا وہ لکڑی کی بنی ہو ۔

"لیکن حضرت!" چودھری بولا ۔ "اللہ تعالی ہدایت دینے کے لئے اپنے بندے بھیجتا ہی ہے"۔

"سبحان اللہ" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔ "بڑی بڑی انمول ہستیاں آئیں" ۔

"بڑے بڑے بزرگ" ۔ لمبی داڑھی والا اپنی داڑھی کی وسعت کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولا ۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آگیا"۔ لیکن میاں کوئی جانے بھی ۔ یہ لوگ ۔۔۔!!" اس نے تھوک کی پیک چلائی "اللہ تعالیٰ نے ان کی عقل پر تالے لگا دیئے ۔ آنکھوں میں بُھس بھر دی ۔ اب کوئی کیا کرے" ۔

پھر بھی اللہ کے بندوں نے کیسے کیسے کام سر انجام دیئے ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا ۔

"مولانا نے اعظم گڑھ میں وعظ کی تھی" ۔ نوجوان نے لمبی داڑھی والے کی طرف اشارا کیا اور دبی آواز میں چودھری سے مخاطب ہوکر کہنے لگا ۔ "وعظ ختم ہونے پر کوئی آنکھ خشک نہ تھی"۔

"ان کی واعظ کی تاثیر کون نہیں جانتا ؟" چودھری گنگنایا ۔

"سب مولا ہی مولا" لمبی داڑھی والا کروٹ لیتے ہوئے چلّایا ۔

"اللہ کی دین ہے"۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔

"زبان کا جادو ہے" ۔ اچکن والا گنگنایا ۔

"خیر خیر" ۔ لمبی داڑھی والا بیتابی سے کہنے لگا ۔ زبان بیچاری کیا کریگی جب

تک سننے والوں کے مردہ دلوں میں وہ ذات کریم قبولیت پیدا نہ کرے ، بیچارے ۔۔۔۔۔!!" وہ ہنسا ۔ تفریح کے لیے آتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں ۔

"آپ سے برگزیدہ اصحاب نہ ہوں تو مُردوں میں جان کیسے پڑے ؟" چودھری بولا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے بڑی داڑھی والے کی طرف دیکھا ۔ آنکھ میں وہی چمک لہرائی ہونٹ کھل گئے ۔

"اہم" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے غیرازمعمول کھنکھارا اور وہ اطمینان سے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔

"میاں ! جان ڈالنے والے کو آپ دار پر چڑھانا پڑتا ہے"۔ لمبی داڑھی والا ہنس کر بولا ۔ اور پھر یوں اکڑ کر انگڑائی لی گویا دار پر چڑھا ہوا ہو ۔

"اللہ تعالےٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش جو منظور ہوئی" ۔ چودھری نے نوجوان سے کہا ۔

"کیا ٹھکانہ ہے آزمائش کا"۔ بڑی داڑھی والا ہنسا ۔

"اپنوں ہی کی آزمائش ؟" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرا ۔

"قادر مطلق جو ٹھہرا"۔ اچکن والا گنگنایا ۔

"اچھا بھئی" ۔ لمبی داڑھی والا چلّایا ۔ "کرلے آزمائش ۔ اس کی مرضی ۔ ہماری مرضی کیا اس کی مرضی سے جدا ہے ۔ ہم تو میاں وعظ کرنے سے باز نہیں آنے کے"۔

"جبھی تو لوگ واعظ سن کر اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں" ۔ نوجوان بولا ۔

"ہاں بھئی" ۔ چودھری بولا ۔ "کیا مجال جو اس کی مرضی بغیر پتہ بھی ہل سکے"۔

"اعظم گڑھ میں مولانا نے غازہ اور پاؤڈر کی خوب بات کی"۔ نوجوان ہنسنے لگا ۔

"ہاں ۔ وہ اعظم گڑھ ۔۔۔۔۔" بڑی داڑھی والا ہنسا ۔۔۔۔۔ "ہاں

ہاں ۔ میاں جب ہم نے کہا کہ آج کل کا حسن بھی کیا ہے ۔ منہ پونچھو تو مٹ جائے ۔ ہمارا مطلب سرخی پاؤڈر سے تھا ۔ پھر دیکھا تو عورتیں منہ پونچ رہی ہیں ۔ گویا پسینے سے بُرا حال ہو رہا ہو ۔ حالانکہ گرمی نام کو نہ تھی"۔

"خجالت کا پسینہ!" نوجوان مسکرا کر خاموش ہو گیا ۔

"معظم پورہ میں میں نے اسی موضوع پر تقریر کی تھی"۔ منڈی ہوئی داڑھی والا بال بناتے ہوئے کہنے لگا ۔

"خیر خیر میاں !" لمبی داڑھی والا گنگنایا اور پھر اٹھ کر جوش میں کہنے لگا ۔ "موضوع تو وہی پرانا ہے ۔ ہاں تاثیر اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے"۔ اس کا ہاتھ داڑھی پر جا پڑا ۔ اور وہ محسوس کرنے لگا ۔ گویا وہ تاثیر سے بھیگ رہی ہو ۔

اچکن والے نے کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا ۔

"معظم پورہ میں ۔۔۔۔۔" منڈی ہوئی داڑھی والے نے ازسرنو بیان کرنے کی ناکام کوشش کی ۔

"مولا ہی مولا ۔ سب رولا ہی رولا ۔۔۔۔" بڑی داڑھی والے نے نعرہ لگا کر معظم پورہ کی بات ان سنی کر دی ۔

"ایسا مسئلہ چھیڑئیے آج"۔ چودھری بولا ۔ "کہ مولا ہی مولا ہو جائے"۔

"گاؤں والے آپ بے تاب ہیں"۔ نوجوان نے کہا ۔

"بے تاب تو ہیں" ۔ لمبی داڑھی والے نے پُرتاب انداز سے کہا ۔ "پر تاب بھی لا سکیں"۔

"تاب والوں سے ڈر جاتے ہیں یہ لوگ!" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔

"اب تو دنیا میں بے تابی کا دور ہے"۔ اچکن والا گنگنایا اور پھر مسکرا دیا ۔

"واہ صاحب کیا بات کی ہے ۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے کہا ۔

"ارے میاں!" لمبی داڑھی والا بولا ۔ نکتہ کیا کرے گا ۔ نکتہ چین پیدا کرے گا

اور کیا ؟"۔

"ہوں" ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا بولا ۔ "نکتہ دانی تو کب کی مفقود ہو چکی"۔

"میاں! یہ عوام تو بھیڑیں ہیں"۔ لمبی داڑھی والے نے کہا ۔ "یہ کیا جانیں نکتہ شناسی ؟"

"بھیڑیں ہی سہی"۔ چودھری بولا ۔ "جو کچھ بھی ہیں آپ ہی کا سرمایہ ہیں"۔

"ہمارا سرمایہ ؟" وہ ہنسا "میاں ہمیں سرمایہ کی لعنت سے پاک ہی رہنے دو"۔ لمبی داڑھی والے نے جواب دیا ۔

"یہ وہ سرمایہ نہیں حضرت!" چودھری نے کہا ۔ "اگر ایک آدمی کے دل میں بھی حقیقی چنگاری پیدا ہو جائے تو سبحان اللہ"۔

"خیر خیر یہ تو ٹھیک ہے"۔ لمبی داڑھی والے نے داڑھی ہاتھ میں لے کر کہا : "لیکن ایسا گڈریا بھی کیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی نہ ہو"۔

"اس کی لاٹھی بے آواز پڑی بھی تو کیا مزا"۔ لمبی داڑھی والا ہنسا ۔ اس نے اپنی لمبی داڑھی کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے کہا ۔ "اس کی لاٹھی میں جان بھی رہی ہو ۔ وہ زمانہ گیا ۔ جب قہر نازل ہوتے تھے ۔ ورنہ آج ہی سے یہ بھیڑ خانہ اپنے بوجھ سے آزاد ہو جائے" ۔ معاً اس کی نگاہ سامنے ٹیلے پر پڑی اور وہ جلال میں ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔ "یہ کا مٹی ٹیلا ان اُجڑی ہوئی قبروں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے"۔

دالان کے پاس ہی پنڈال بنا ہوا تھا ۔ سفید چادروں کے فرش پر تین کرسیاں پڑی تھیں جن کے پاس ایک میٹھی سی میز لگی ہوئی تھی ۔ میز پر گلاسوں میں بدو گلدستے سجے ہوئے تھے ۔ نیچے دو ایک پھٹی ہوئی دریاں بچھی ہوئی تھیں ۔ جن پر گاؤں کے لوگ بیٹھے تھے ۔

وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے ۔ لیکن ہر گھڑی ایک

نظر دالان کی طرف دیکھ لیتے جہاں سے مولانا تشریف لانے والے تھے ۔ ان کے انداز سے شوق اور جوش کی شدت ظاہر ہو رہی تھی ۔ کئی ایک کپڑے سے ٹانگیں اور پیٹھ باندھے ہوئے بیٹھے تھے ۔ کسی نے اپنی لاٹھی کو گھوڑا بنا رکھا تھا ۔ آنکھ میں زندگی کی چمک لہرا رہی تھی ۔

دفعتاً وہ خاموش ہو گئے ۔۔۔۔۔ مولانا تشریف لا رہے تھے ۔

تینوں اصحاب دالان سے نکلے اور ایک وقار سے پنڈال کی طرف آئے ۔ بڑی داڑھی والے نے لوگوں کی طرف دیکھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھنکھارا ۔ آہم ۔۔۔۔۔ !!" اپنی آواز کی گونج سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کا ایک اور غلاف چڑھ گیا ۔

اچکن والے نے مجمع پر نگاہ ڈالی اور محسوس کیا گویا وہ کسی بھیڑ خانے میں آگھسا ہو ۔ معاً اس کے ہاتھ کی چھڑی اُبھر کر عصا بن گئی ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سوٹا یوں آہستہ سے ٹیکنا شروع کر دیا گویا وہ بے آواز ہو ۔

وہ تینوں پنڈال پر بیٹھ گئے ۔

"لمبی داڑھی والے نے قرآن کریم کی آیت پڑھتے ہوئے سامنے مجمع کی طرف دیکھا ۔ کیڑوں کا ایک بڑا سا ڈھیر چھوٹی چھوٹی ڈھیروں میں بٹا جا رہا تھا ۔۔۔۔۔ بھیڑیں سر جھکائے ادھر ادھر سرک رہی تھیں ۔ گویا پناہ مانگ رہی ہوں ۔ اس نے نگاہ اٹھائی سامنے اس بیٹھے سے ٹیلے پر ڈھیریاں بکھری پڑی تھیں ۔ رینگ رہی تھیں ۔ جیسے ان درختوں کی پناہ میں آجانے کی خواہاں ہوں اور درخت شاخیں پھیلائے کھڑے تھے ۔ کسی جذبہ سے مسحور ہو کر وہ جلال میں بولا ۔ "اے مسلمانو ! اے مردہ مسلمانو ! تم ۔۔ تم اس ملّت کے افراد ہو جو کسی زمانے میں دُنیا بھر کے لئے پیام حیات بن کر آئی تھی ۔ لیکن آج تم ۔ مردہ بھیڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے"۔

اس نے تم پر زور دیتے ہوئے کہا ۔ اور پھر جلال میں آہم کھنکھارا "ہم"

" ۔ آواز گونجی اور وہ اطمینان سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ جیسے تم اور ہم کا فرق واضح کر چکا ہو ۔

"بھیڑوں سے بڑھکر حیثیت نہیں رکھتے"۔ اس نے دہرایا ۔

معاً اچکن والے نے محسوس کیا گویا اس کے ہاتھ میں چھڑی کی جگہ عصا تھا ۔

"آج تم ایک مردہ قوم ہو ۔ اپنے اپنے نفس میں مدفون ۔ آج تم محض مٹی کی ڈھیریاں ہو ۔ قبروں کی سی ڈھیریاں اُس نے ایک نظر ٹیلے کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "ان مزاروں پر بھی روشنی کے بگولوں نے یورش کر رکھی ہے ۔ لیکن اللہ تعالی کی رحمت ! وہ ٹیلے کی طرف انگلی اٹھا کر خاموش ہوگیا ۔ وہ دیکھو ٹیلے کی قبریں بگولوں کی زد میں آئی ہوئی ہیں ۔۔۔۔۔ لیکن وہ درخت ۔۔۔۔۔ وہ درخت ۔۔ بوڑھے ہو چکے ہیں پتے جھڑ گئے ہیں پسلیاں نکل آئی ہیں" ۔ اچکن والے نے اپنی چھاتی پر ہاتھ پھیرا ۔ لیکن وہ درخت ۔ اللہ کی رحمت کی طرح اپنی شاخیں پھیلائے قبروں کو پناہ دے رہے ہیں ۔ وہ دیکھو" اس نے ازسرنو ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ ٹہنیوں کی طرح پھیلا دیئے ۔

معاً اس کے دونوں ساتھی اٹھ بیٹھے "خاموش" منڈی ہوئی داڑھی والا اپنا سوٹا ہجوم کے سر پر کھڑا کر کے چلّایا ۔ بیٹھ جاؤ ۔ بیٹھ جاؤ تراشی ہوئی داڑھی والے نے اپنا ہاتھ اور چھڑی پھیلاتے ہوئے کہا ۔

وہ تینوں ہاتھ پھیلائے اس ٹیلے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ جہاں تین درخت ٹہنیاں پھیلائے کھڑے تھے ۔ پنڈال تلے ان تینوں کے زیر سایہ بھیڑیں مٹی کی ڈھیروں کی طرح دبکی بیٹھی تھیں ۔

"ہاں ۔۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ابھی تمہاری محافظ ہے" لمبی داڑھی والا جلال میں بولا"۔ "لیکن تم اپنے نفوس میں مدفون ہو ۔ تم ۔ اہم ۔۔۔۔۔ اس نے گلا صاف کیا ۔ ہم ۔۔۔۔۔" ویرانے نے تمسخر بھری آواز میں جواب دیا ۔

لیکن وہ تینوں باہیں پھیلائے کھڑے رہے اور بھیڑیں رینگتی رہیں ۔ رینگتی رہیں ۔

پاگل

میں پاگل ہوں ۔ میرا پاگل پنا صرف اس لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ اب میں جان گئی محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں ۔ ہاں ۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا ۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی ۔ لیکن اب پچھتانے سے حاصل ۔ وقت بیت چکا ۔ جو ہونا تھا ہو چکا ۔

کون ہے جو میری کہانی سے واقف نہیں ۔ میں وہ بدنصیب عورت ہوں جو دنیا بھر میں بدنام ہے ۔ جسے دیکھ کر کہنیاں چلتی ہیں ۔ انگلیاں اٹھتی ہیں ۔ آنکھوں میں عریاں اشارے جھلکتے ہیں ۔ لوگ دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں ۔ تمسخر بھری مسکراہٹ وہ یوں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں ۔ گویا میں دنیا کی حسین ترین عورت ہوں ۔ جھوٹ ہے! سراسر جھوٹ !! میں ایک دبلی پتلی اداس عورت ہوں اور بس گورا رنگ حسن نہیں ہوتا ۔ سُتے ہوئے لمبے چہرے کو خوبصورتی سے کیا تعلق ۔ البتہ میری آنکھ ۔ لیکن نہیں ان آنکھوں میں اداسی اور بے بسی کے سوا کیا ہے شوخی نہیں ۔ چمک نہیں خمار نہیں تبسم نہیں ۔ پھر ان کی نگاہیں میری آنکھوں کو تلاش کیوں کرتی ہیں ۔۔۔۔۔ کیوں ؟ ان چھلکی ہوئی کٹوریوں میں غم کے سوا کیا ہے ۔ پھر بھی انہیں چھپا چھپا کر رکھتی ہوں ۔ شکر ہے کہ میری پلکیں اتنی لانبی ہیں ۔ شاید میرے اِن ہی ۔ آنسو بال بن کر اگ آئے ہیں ۔ لیکن لوگ کسی صورت چین نہیں لینے دیتے ۔ پلکیں اٹھا کر دیکھوں تو یوں ٹھٹھکے جاتے ہیں ، جیسے سدھ بدھ نہ رہی ہو ۔ پلکوں سے ڈھانپے رکھوں تو یوں جھانکتے ہیں گویا میں چغتائی کا عمل ہوں ۔ آوازے کستے ہیں ۔۔۔۔۔ اُف ان کی وہ عریاں باتیں ۔ ننگی نگاہیں ۔۔۔۔۔ وہ مجھے ایسی عورت سمجھتے ہیں جس کے بارے میں جو جی چاہے جہاں جی چاہے کہا جا سکتا ہے ۔ اور یہ سب اس دیوانے رضا کی مہربانی ہے ۔۔ وہ ہوشیار دیوانہ ۔۔۔۔۔ اُف اس کی گھناؤنی

شکل ۔ سوچا ہوا چہرہ ۔ اورخاموش وحشت بھری نگاہیں ۔ میں جانتی ہوں وہ دیوانہ نہیں ۔ دیوانگی کے پردے میں مجھ سے انتقام لے رہا ہے ۔ اُف کس قدر خوفناک انتقام ہے اس کا ۔ ہوس کار فریبی !! کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ میں نے اُس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اپنا شریک حیات آپ چُننے کا مجھے حق نہیں کیا ؟

ہاں اسے مجھ سے محبت تھی ۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ میں نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ لیکن کیا مجھے اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل نہیں ؟ اگر مجھے وعدہ کرنے کا اختیار ہے تو اسے توڑنے کا کیوں نہیں ؟ اور ۔ کیا وہ وعدہ میں نے توڑا تھا ۔ میں!! میری حقیقت ہی کیا ہے ۔ حالات کے ہاتھوں میں کٹ پتلی ! یہ حالات جن سے میں گذر رہی ہوں ۔ کیا یہ میرے بنائے ہوئے ہیں ۔ اُف یہ حالات!! یہ بھوکی نگاہیں ۔ چلتی ہوئی کہنیاں ۔ جیسے لوگوں کو مجھے گھورنے کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو ۔ جیسے بھوک سے بلبلاتے وحشی مردوں کے جہاں میں صرف میں ہی ایک عورت ہوں ۔

کیسے اچھے تھے وہ دن جب میں لاہور کی بھیڑ میں تنہا تھی ۔ جب میں بے فکر جہاں جی چاہے بھاگی دوڑی پھرتی تھی ۔ کوئی میری طرف گھورتا نہ تھا ۔ سرسری نگاہیں اور بس ۔ پھر میں اور رضا اکٹھے سیر کرنے لگے ۔ لیکن کوئی ہمارے اکٹھے گھومنے پر معترض نہ تھا ۔ ان دنوں لوگ ہماری راہ سے ہٹ کر اپنی راہ ناپا کرتے تھے ۔ ان دنوں بھی تو میں میں تھی ۔ یہی میں ۔ یہی رنگ ۔ یہی آنکھیں ۔ پھر ۔۔۔۔۔۔ ؟ آہ!! ان دنوں میری زندگی میری اپنی زندگی تھی ۔ لیکن اب ۔ اب وہ گویا عوام کی ملکیت بن چکی ہے ۔ لیکن کیوں ؟ ۔۔۔۔۔ ہر راہ گیر مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے وہ میرا راز جانتا ہو ۔ جیسے میں ان کے ہاتھ کا کھلونا ہوں ۔ جیسے میں ان کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی ہوں ۔ گویا میں نے صرف دکھاوے کے لئے کپڑے پہن رکھے ہیں ۔ جیسے وہ نگاہوں سے میرے کپڑے ۔۔ اُف!! میں سمجھتی ہوں میری حالت ان عورتوں سے بدتر ہے ۔ جو علانیہ طور پر لالٹین جلا کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ لوگ انہیں گھورتے ہیں جانچتے ہیں ۔ پرکھتے ہیں ۔ لیکن ان کی نگاہیں ان کے کپڑوں میں دھنسنے کی

کوشش نہیں کرتیں ۔ جیسے ۔ جیسے کوئی پلپلا گھناؤنا کیڑا رینگ رینگ کر سوراخ کر رہا ہو ۔ لوگ انہیں دیکھ کر راز افشا کرنے کی خاموش دھمکی نہیں دیتے ۔ سودا کرتے ہیں ۔ ناک چڑھا لیتے ہیں یا منہ موڑ کر چل دیتے ہیں ۔

ہاں میری حالت اخلاق سے گری ہوئی ان عورتوں ۔۔۔۔۔ لیکن نہیں ۔ کون جانتا ہے کن حالات نے گھسیٹ کر انہیں وہاں لا بٹھایا ہے ۔۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے ۔ نہ جانے میں ۔۔۔۔۔ لیکن نہیں میں آپ سے کچھ نہ چھپاؤں گی ۔۔۔۔۔ چھپانا ؟ میں اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے رہی ہوں ۔ کہ میرے پاس اب بھی چھپانے کو کچھ باقی ہے ۔ جھوٹی تسلی میں تسلیم کرتی ہوں کہ بارہا میرا جی چاہا کہ میں لالٹین جلا کر بیٹھ جاؤں ۔ اور اپنے آپ کو ان عریاں اشاروں اور نگاہوں سے محفوظ کر لوں ان دھنس جانے والی ٹٹولتی ہوئی نظروں کی زد سے بچ جاؤں ۔ ایسا کرنے سے جسم روندا جائے گا ۔ روح تو بچ جائے گی ۔ اب وہ میری روح کو لتاڑ رہے ہیں ۔ ۔۔ لیکن مجھ میں جرأت بھی ہو ۔ ہاتھ کا کھلونا بننے لئے جرأت ہونی چاہئیے اور مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ برقعہ پہن لیتی ۔ ڈرتی رہی کہ لوگ کہیں گے ۔ غیر مسلم ہو کر برقعہ پہنتی ہے ۔ ڈرتی رہی کہ مزید چرچا ہوگا ۔ فقرے کسے جائیں گے ۔ پہن لیتی ۔ تو نہ جانے وہ دیوانہ کیا کرتا ۔ لوگ نگاہوں سے نوچ لیتے ۔ دھجیاں اڑا دیتے جب ننگے منہ کی بے نمائش عمومیت مجھے چھپا نہ سکی تو پردہ کیا چھپا سکتا تھا ۔ وہ پردا جس کی اوٹ لے کر ایک عام عورت بھی حسین بن سکتی ہے اور راہ چلتے لوگوں کے لئے سنگار کئے ہوئے چہرے سے زیادہ پر جوش دعوت بن جاتی ہے

خیر اب تو میں بڑی حد تک اس جیتی جاگتی بدنامی سے بے نیاز ہو چکی ہوں ۔ جو قدرت نے میرے ماتھے میں کیل بنا کر ٹھونک رکھی ہے ۔ لیکن جب سوچتی ہوں ۔ کہ میں نے کیا سہا ہے تو دل پر ٹھیس لگتی ہے ۔ بچ ۔ بچ ۔ سمٹ سمٹ کر جھکی جھکی آنکھوں سے چلنے کے باوجود میں یوں محسوس کیا کرتی گویا زمین کی بجائے نگاہوں پر پھسل رہی ہوں ۔ نگاہوں کا تانتا بند جاتا ۔ ایک تار ٹوٹنے سے پیشتر دوسرا بندھ جاتا ۔ ایک دھنس کر دیکھتا ۔ دوسرا مسکرا مسکرا کر برماتا ۔ تیسرا گلیڈ آئی کی جونک لگا دیتا ۔ ہونٹ ہلتے ۔ آوازے کسے

جاتے ۔ "وہ ہے"۔۔۔ "وہ ۔" "دیکھا" ۔۔ "اسے جانتے ہو" ۔۔۔۔۔ "بانکی ہے بانکی" ۔ گلیوں میں دروازے کھلتے ۔ "اچھا ۔ یہ ہے وہ" ۔ "ہائے ری یہ کافرہ" ۔ ہاں ۔ ہاں یہی ۔ کوئی مسکراتا ۔ کوئی ناک چڑھاتا ۔ عورتیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حیران کھڑی ہو جاتیں ۔ آپ چاہے کسی سے آنکھیں لگائے ہوئے ہوں ۔ لیکن مجھے دیکھ کر ہاتھ کانوں پر رکھ لیتیں جیسے ابھی ابھی حج کر کے آئی ہوں مجھے دیکھ کر ناک سکوڑ لیتیں اور پھر میاں یا دیور کی طرف دیکھ کر مسکراتیں ننگی مسکراہٹ ۔ برہنہ دعوت ۔ بھوکے ساتھی کے ہونٹ لیسدار جونک کی طرح لٹک آتے اور ہوس سے اندھے گوشت کے لوتھڑے قریب ہی کچھ ڈھونڈنے لگتے ۔ یہ ہیں وہ لوگ جو مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ کوئی انتقامی جوش سے بھرا ہوا مرد میری محبت میں دیوانہ ہو جانے کا ڈھونگ رچائے بیٹھا ہے ۔ گلی کوچوں میں میرے نام کے نعرے لگاتا پھرتا ہے ۔ دیوانہ ہونے کے باوجود اس قدر ہوشیار ہے کہ ہر سمے عشق پیچاں کا پھول اٹھائے اس سے باتیں کرتا رہتا ہے ۔ میرا نام "آئی وی" ہے نا اس لئے ۔ دیوانہ ہونے کے باوجود مجھ سے عشق کرنے کے دعوے کو نہیں بھلا سکا ۔ اتنا نہیں بھولتا کہ میں کس راہ سے ہسپتال جاتی ہوں ۔ وہ دیوانہ جو جگہ جگہ میرے پیچھے سایہ کی طرح لگا رہتا ہے ۔ شہر شہر میرا پیچھا کرتا ہے ۔ مجھے اس کی ہوشیاری اور ضد پر حیرانی ہوتی ہے ۔ اُف وہ ہوشیار دیوانہ جس کا وجود محبت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔

لوگ سمجھتے ہیں میں اس کی دیوانگی کا باعث ہوں ۔ اُف یہ لوگ اور ان کی باتیں وہ اس خبطی کو عشق کا پیغامبر سمجھتے ہیں ۔ اس کی ہر حرکت ان کی نگاہ میں محبت اور وفا کا مرقع ہے ۔ وہ میری ہر بات سے بے وفائی اور ستم کیشی اخذ کرتے ہیں ۔ اور پھر ان اخذ کی ہوئی تفصیلات کو اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دے کر خوش ہوتے ہیں ۔ یہاں سے کاٹ چھانٹ کی ، وہاں بڑھایا چڑھایا تاکہ کہانی سنسنی خیز ہو جائے انہیں سنسنی پیدا کرنے سے لطف آتا ہے ۔ ان کی سن سن کر میں آپ اپنے قصے کی حقیقت پر شک کرنے لگی ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا ، آیا میری بات سچی ہے یا وہ جو زبان زد خلق ہے ۔ لیکن ایک بات زبان زد خلق

ہو ۔ تو بھی سمجھ میں آئے ۔ ہر کوئی اُسے یوں ترتیب دینے پر تلا ہوا ہے ۔ کہ رضا کی محبت بلند تر دکھائی دے ۔ اس کی دیوانگی قربانی نظر آئے اور میری خاموشی بے حسی ظلم اور نہ جانے کیا ۔ بات یوں ڈھالی جاتی ہے ۔ جس سے ظاہر ہو کہ مجھ سے بڑی فاحشہ کوئی نہیں ۔ ابھی تک مجھ میں تمیز باقی ہے ۔ چھوٹی موٹی تفصیلات تو خلط ملط ہو چکی ہیں ۔ لیکن اہم تفصیلات یاد ہیں مجھے ۔

آپ رضا کو نہیں جانتے ۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دیوانہ رضا ہے تو آپ کی بھول ہے ۔ وہ رضا کچھ اور تھا ۔ مجھے وہ دن یاد ہے ۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ۔ اس روز میری ڈیوٹی ڈی وارڈ میں لگی ہوئی تھی ۔ نائٹ ڈیوٹی ۔ دس کے قریب وہاں پہنچی ۔ اور حسب معمول راونڈ کرنے لگی ۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا ۔ اور پھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ اکثر مریض ہمیں دیکھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جیسے اس فانی دنیا میں کوئی غیر فانی مخلوق کو دیکھ کر اوسان کھو رہا ہو ۔ لیکن اس کے باوجود رضا کا انداز نرالا تھا ۔ اس کی نگاہ میں بناوٹ کی بجائے بے ساختگی کی جھلک تھی ۔ شاید اسی وجہ سے میں جھینپ گئی ۔ میں نے جلدی سے اس کا ٹکٹ دیکھا اور دوائی بنا کر لے آئی ۔ دوائی پیتے ہوئے بھی وہ میری طرف تکتا رہا ۔

اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی ۔ جو کھیل کے میدان میں ٹوٹی تھی ۔ اس کے سوا اُسے کوئی تکلیف نہ تھی ۔ چوکور چہرہ ۔ سانولا رنگ کشادہ پیشانی پر کنڈل دار بال اور مست آنکھیں ۔ جن پر گہری بھوئیں تنی ہوئی تھیں ۔ نہ جانے انہیں دیکھ کر یہ احساس کیوں ہوتا کہ کوئی سانپ کنڈلی مار کر بیٹھا ہے ۔ شاید اس لئے کہ ان بھووں میں بلا کا اضطراب تھا ۔ راونڈ کے بعد میں اپنی نشست پر آبیٹھی ۔ اسے دیکھے بغیر میں محسوس کر رہی تھی ۔ کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے ۔ اس احساس کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں نے آنکھ بچا کر ادھر دیکھا ۔ اس کی نگاہیں میرے منہ پر لگی ہوئی تھیں ۔ میں نے آنکھیں جھکالیں ۔ اور یوں بیٹھ رہی ۔ جیسے کوئی شدت سے کام میں مصروف ہو ۔ لیکن آخر کب تک یوں بیٹھ رہتی ۔

تمام مریض سو گئے یا چپ چاپ پڑ رہے ۔ وارڈ کے پرلے سرے پر دو ایک کراہ رہے تھے ۔ لیکن وہ گردن موڑے میری طرف تک رہا تھا ۔ مجھ سے رہا نہ گیا ۔ نیند نہیں آتی تمہیں ۔ میں نے پاس جا کر اسے کہا ۔ وہ چونکا ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے نا ۔ میں نے لاپرواہی سے سرسری طور پر کہا ۔ میں بڑے مزے میں ہوں" ۔ وہ مسکرایا ۔ لیکن اس طرح صحت پر برا اثر پڑے گا ۔ "صحت ۔۔۔۔ تمہاری قسم میں تو جینے لگا ہوں ۔ کب سے مردوں کی طرح پڑا تھا ۔ مگر اب ۔۔۔۔۔"

دو ایک دن تو میں نے کوشش کی کہ رضا سے بے نیاز رہوں ۔ لیکن میں کیا کرتی ۔ ساری ساری رات وہ میری طرف تکتا رہتا ۔ حتٰی کہ اس احساس کی وجہ سے مجھے کام میں مشغول دکھائی دینا مشکل ہوگیا ۔ پہلے پہل میں بہانے بہانے سارے وارڈ میں پھرا کرتی تھی ۔ لیکن دو ہی دن میں مجھے اِدھر اُدھر جانا دوبھر دکھائی دینے لگا ۔ جلدی جلدی جاتی اور پھر کام ختم کر کے واپس آجاتی ۔ نہ جانے کیوں میں نے کرسی کو بھی ایسے مقام پر سرکا لیا تھا ۔ جہاں سے وہ میرا سارا چہرہ دیکھ سکے ۔ بہت جلد ہم اچھے خاصے دوست بن گئے ۔ اس کا بات کرنے کا انداز انوکھا تھا ۔ تکلف سے عاری ۔ بات کرتے ہوئے جھجکتا بھی نہ تھا ۔ اس کے علاوہ اظہار محبت کے سوا اسے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی ۔ ہر بات میرے ذکر پر ختم ہوتی ۔ پوچھتی ہوں ۔ آپ کو چوٹ کیسے آئی ۔ جواب ملتا ہے ۔ "کیوں نہ آتی چوٹ نہ آتی تو تم سے کیسے ملتا" ۔ لیکن اس روز جب اس نے سنا کہ میں دوسرے وارڈ میں لگنے والی ہوں ۔ تو نہ جانے اسے کیا ہوا ۔ ایک ساعت کے لئے اس کا منہ لال ہوگیا ۔ "بس اتنی سی بات پر" میں نے ازراہ مذاق کہا ۔ "اتنی سی بات !" وہ ہنسا ۔ اف وہ ہنسی ۔ اسی کی ہنسی میں دیوانگی کی جھلک تھی ۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا ۔ جی چاہا ادھر ادھر ہو جاؤں ۔ "اتنی سی بات !" وہ پھر ہنسا ۔

نہ جانے کیوں اتنی سی بات پر میں کیوں اس قدر پریشان ہوگئی ۔ نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ میں نے اپنی ڈیوٹی بدل لی ۔ یہ میری غلطی تھی ۔ اگر میں اپنی ڈیوٹی ایکسچینج نہ کرتی تو حالات نہ بگڑتے ۔

چند ہی دنوں میں وہ مجھ سے بے تکلف ہوگیا ۔ اصل میں اس کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی تھی ۔ کہ اس سے باتکلف رہنا ممکن نہ تھا ۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ چند ہی باتوں میں وہ دوسرے کو مانوس کر لیتا ۔ اس کی ہر بات گھونگھٹ اٹھا دینے والی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ امید نہ تھی ۔ کہ وہ ایسی جلدی مجھے شادی کا پیغام دے دیگا ۔ آپ جانتے ہیں ۔ نرس کی ڈیوٹی دوا پلانے اور پٹی کرنے تک محدود نہیں ہوتی ۔ ہمیں ہر مریض کا دل بہلانا پڑتا ہے ۔ ہماری حیثیت مریض کے ہاتھ کے کھلونے سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ تو میں رضا کا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی لیکن مجھے یہ وہم بھی نہ تھا ۔ کہ میری ہر بات کسی ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ہو رہی ہے ۔ مجھے واضح طور پر شعور نہ تھا ۔ کہ میری باتوں میں محبت کی جھلک ہے ۔ ہر مریض نرس سے اظہار محبت کرنا چاہتا ہے ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ نہ جانے کیوں نرس ، کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا اس پر عاید ہو جاتا ہے ۔ چاہے جان جسم سے نکل کر ہونٹوں پر اٹکی ہوئی ہو ۔ نہ جانے اس وقت وہ اس دیئے کی طرح مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں ۔ جس کا تیل ختم ہو چکا ہو ۔

اس وقت لیٹا ہوا وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور میں اس کے ٹکٹ پر اندراج کر رہی تھی ۔ اس نے مجھے بلایا اور پاس آنے کا اشارہ کیا ۔ میں سرسری طور پر اس کے پلنگ پر جھکی ۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا ۔ بولا "ایک بات پوچھوں" ۔ ہاں ہاں میں نے لاپرواہی سے کہا ۔ اس نے بلا تکلف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اور کہنے لگا ۔ "مجھ سے شادی کرو گی ۔ آئی وی" میں چونک پڑی لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر مذاق سے بولی ۔ "شادی ؟" "ہاں" ۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا ۔ "اور اگر میں "نہ" کہہ دوں تو ؟" میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی تو ۔۔۔۔۔ تو وہ پریشان ہوگیا ۔ جیسے یہ امکان اس کے خواب و خیال میں ہی نہ تھا ۔ "تو نہ جانے کیا ہو جائے" ۔ وہ گنگنایا ۔ کیا ہوگا میں مسکرائی "کیا ہوگا" ۔ اس نے اردگرد دیکھ کر کہا ۔ یہ بتیاں بجھ جائیں گی ۔ اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا ۔ "وہ چاند ٹوٹ کر نیچے گر پڑے گا ۔ تارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گل ہو جائیں گے ۔ اور یہ دنیا ۔۔۔۔۔"

بہت کچھ ہو گا پھر تو" ۔ میں ہنسی ۔ "ہاں" اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہوگیا ۔ بھویں سکڑیں ۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا ۔۔۔۔۔ مذاق نہ سمجھو آئی وی ۔ مذاق میں اڑاؤ" ۔ میں اس کے سنجیدہ اور وحشیانہ انداز کو دیکھ کر گھبرا گئی ۔ "اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔ مجھے سوچنے دو" "اچھا" وہ تیوری چڑھا کر بولا "انکار نہ کرنا ورنہ ۔۔۔" اس کا انداز دیکھ کر میں کانپ گئی ۔ "جوش میں نہ آؤ مسٹر رضا ٹانگ ہل جائے گی" ۔ ٹانگ "وہ چلّایا" اگر یہ ٹانگ تمہارے اور میرے درمیان حائل ہے ۔ تو تمہاری قسم میں اسے اکھاڑ کر پھینک دوں گا"۔

اس دن سے مجھے رضا سے ڈر آنے لگا ۔ اس کے جوش اورشوق کی شدت کو دیکھ کر میں سہم جاتی ۔ اس کی تنی ہوئی گھنی بھویں یوں ابھرتیں جیسے طوفان میں گرداب اٹھ رہے ہوں ۔ اس سے میل ملاپ بند کر لینے کی ہمت نہ تھی ۔ سو بات بڑھ گئی ۔ اس کی توقعات بڑھ گئیں ۔ اس کی نگاہیں میرے لئے مخصوص ہوگئیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ۔ کہ وہ صرف میرے لئے جیتا تھا ۔ صرف میرے لئے ۔ جس قدر ڈرتی اسی قدر اسے جھٹلانا مشکل ہوتا جاتا ۔ میری خاموشی اس کی توقعات کو ہوا دیتی ۔ خوف کے باوجود یا شاید اسی لئے میرا دھیان اس کی طرف لگا رہتا ۔ جیسے کبوتری شکاری کی بندوق کو دیکھ کر دہشت سے بے حس و حرکت بیٹھی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے ۔

جلد ہی وہ دن آگیا ۔ جب وہ خود چلتا ہوا میرے گھر آیا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب ہمارے تعلقات میں مریض اور نرس کی سی بات نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس نے خود کو فریب دے دے کر اپنے آپ کو مریض بنا رکھا تھا ۔ ایسا مریض جس کی صحت کا دارومدار مجھ پر تھا ۔ میں ہمیشہ کے لئے اس کے نزدیک نرس بن چکی تھی ۔ میرے گھر وہ صرف دو ایک مرتبہ آیا ۔ اس کے بعد مجبوراً مجھے حقیقت کا اظہار کرنا پڑا ۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ۔ کہ اسے انکار کے لئے تیار کر دوں ۔ لیکن اب ان تفصیلات سے فائدہ ؟

انکار سن کر وہ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپا ۔ اس کی بھویں سمٹیں منہ سرخ ہوگیا ۔ پھر دفعتاً اُس نے ایک قہقہہ لگایا ۔ کرخت اور بھیانک قہقہہ ۔

اس کے بعد ہر روز ہسپتال جاتے ہوئے راہ میں کہیں نہ کہیں وہ قہقہہ گونجتا ۔ وہی کھوکھلی آواز جس میں تمسخر اور طنز بھرا ہوتا ۔ جیسے دور ۔ دور کوئی بدروح اس دنیا کی جھوٹی مضحکہ خیز باتوں پر تمسخر اڑا رہا ہو ۔ پھر وہ قہقہہ ہمارے ہسپتال کی دیواروں میں سے رسنے لگا اور بالآخر میرے مکان کے گرد امنڈ آیا ۔ ایک دن جب میں کھڑکی میں کھڑی نہ جانے کس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی ۔ میری نگاہ اس پر پڑی ۔ وہ گلی کی نکڑ پر کھڑا تھا ۔ سُوجا ہوا منہ اکڑی ہوئی بھویں ۔ بلوری پھٹی پھٹی آنکھیں ــــــ اُف وہ منظر !! میں نے ڈر اور نفرت بھری پھریری محسوس کی اور جھجک کر پیچھے ہٹی ــــــ پھر وہی قہقہہ ۔ اف وہ کھڑا ہنس رہا تھا ۔ چہرے کے خطوط یوں ابھر سمٹ رہے تھے ۔ جیسے جانکنی کے عذاب میں مبتلا ہو ۔ بصد مشکل میں نے اپنے آپ کو اس منظر سے علیحدہ کیا ۔ اور دھڑام سے چارپائی پر آگری ۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا ۔ ہر جگہ وہی قہقہہ گونجنے لگا ۔ حتٰی کہ تمام دنیا اس کی گونج کی لپیٹ میں آگئی ۔ پھر حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ وہ میرے مکان تلے کھڑا میرا نام لے لے کر پکارتا ۔ چیختا ۔ قہقہہ مار کر ہنستا ۔ میرے نام کا نعرہ گلی کوچوں میں گونجنے لگا ۔ ہسپتال کی دیواریں آئی ۔ وی آئی ۔ وی کی صداؤں سے گونجنے لگیں ۔ باغ کی روشیں ۔ سڑکیں ۔ بازار ۔ اف !! لوگ میری طرف گھورنے لگے ۔ مسکرانے لگے ۔ کہنیاں چلیں ۔ آنکھیں چمکیں ۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔

اِن حالات نے مجھے دیوانہ بنا دیا ۔ میں زخمی پرندے کی طرح تڑپتی دبک کر کونوں کی طرف کھسک جاتی ۔ میری پلکیں اور بھی جھک جاتیں ۔ میرا جسم سمٹ کر معدوم ہونا چاہتا ــــــ لیکن بے سود!! میں نے مکان بدلے ہسپتال بدلے ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے میں چلی گئی ۔ لیکن وہ دیوانہ ہر جگہ جا پہنچتا ۔ ہر جگہ وہ میرا مکان ڈھونڈ لیتا ۔ اور ایک روز میں دیکھتی کہ وہ میری دہلیز پر بیٹھا ہاتھ میں آئی ۔ وی کا پھول لئے اس سے باتیں کر رہا ہے ۔ ہر نئے شہر میں نئے سرے سے چرچا ہوتا ۔ نئے جوش سے باتیں ہوتیں ۔ نئی نگاہیں ــــــ اف ! اب میں نے شہر بدلنے کا خبط چھوڑ دیا ہے ۔ کیا

فائدہ ۔

انہیں دنوں مسٹر ظہیر مجھ سے ملے وہ پہلے شخص تھے جنہیں مجھ سے ہمدردی تھی ۔ ورنہ لوگ تو مجھے ڈائن سمجھتے تھے ۔ وہ ڈائن جس نے جس نے اپنے جادو سے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا ۔ اور اپنے اس شہکار پر نازاں تھی ۔ نہ جانے لوگوں کو دیوانوں سے ہمدردی کیوں ہوتی ہے ۔ ان کی ہر بات میں نکتہ پیدا کر لیا جاتا ہے ۔

میں سمجھتی ہوں لوگوں کو انوکھے واقعات سے عشق ہے ۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ کہ عشق و محبت کی کوئی کہانی معمولی واقعات سے بنی ہو ۔ اس لئے وہ ہر آپ بیتی میں انوکھے پن کا رنگ بھرتے رہتے ہیں ۔۔۔۔۔ زبان زدِ خلق ہو کر ہماری کہانی میں کیا کیا رنگ نہ بھرے گئے ۔ نئی انوکھی تفصیلات جوڑی گئیں ۔ رضا کی قربانیاں میرے ظلم حتیٰ کہ ہر قصہ ایک عجیب سا قصہ بن گیا ۔ ایک ان سنا قصہ اب تو بارہا مجھے خود شک پڑ جاتا ہے ۔ کہ شاید وہ قصہ صحیح ہے ۔ مجھے اپنی یادداشت پر اعتبار نہیں رہا ۔ ہاں تو ظہیر پہلا شخص تھا ۔ جس سے دلی ہمدردی تھی ۔ اس کے دل میں اس دیوانے کے خلاف بغض تھا ۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جاتی جس سے ظاہر ہوتا ۔ کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں رضا کی مظلومیت اور میری بے وفائی کے تاثرات دبے ہوئے ہیں ۔ میں سن کر چونک پڑتی ۔ دھک سے میرے سینے میں کچھ ڈولنے لگتا گردوپیش دھندلا جاتے ۔ مثلاً اس روز وہ ازراہ مذاق بولا ۔ "وہ دیوانہ سچا ہے ۔ آئی ۔ وی تمہارا انداز ہی کچھ ایسا ہے ۔ کہ پاگل ہوئے بنا رہا نہیں جاتا" "کیوں" ۔ میں چڑ گئی "میں کیا بے وفا ہوں"۔ "نہیں" ۔ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا ۔ "بے وفا نہیں لیکن تمہاری وفا بذات خود دیوانہ کن ہے"۔ پھر وہ ہنس پڑا لیکن یہ بات میرے دل پر پتھر کی لکیر بن گئی ۔ میں ایک حساس لڑکی ہوں ۔ بات میرے دل میں کھب کر مجھے غم کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے ۔ اور میں یوں محسوس کرنے لگتی ہوں ۔ جیسے نشے میں ہوں ۔ سدھ بدھ نہیں رہتی ۔۔۔۔۔ ہاں

یہ بات ظہیر کے دل کی گہرائیوں میں گڑی ہوئی تھی ۔ ورنہ مذاق میں بھی وہ ایسی بات کھول کر نہ کہتا ۔۔۔۔۔ اکثر بیٹھے بٹھائے ایک آہ بھر کھینچ کر وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتا ہے ۔ "آئی ۔ وی ۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دو تو ۔۔۔۔۔" میرے دل پر ایک ٹھیس سی لگتی ہے ۔ مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی پوچھتی ہوں "تو" ۔۔۔۔۔ "تو" ۔۔۔۔۔ شاید میں بھی کسی دہلیز پر آئی ۔ وی کا پھول لے کر بیٹھ جاؤں ۔ "مسٹر ظہیر ۔۔۔ !" میں غصے میں چلاتی ہوں ۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مگن کہے جاتا ہے ۔ "کس قدر نشہ ہے اس احساس میں کہ کوئی میرے لئے دیوانہ ہو چکا ہے" ۔ "ہاں" میں جل کر کہتی ہوں" ۔۔۔۔۔ بہت ۔۔۔۔۔ ایک ہو چکا ہے ۔۔۔۔۔ ایک ہو رہا ہے" ۔ میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں ۔ اس لئے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ لیکن اس نے مجھے غلط سمجھا ۔ اُف محبت میں کیا کیا برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ اس روز جب اس نے کہا ۔ "آئی ۔ وی ۔ مجھے خیال سے آتا ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا ۔ تو میرے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی ۔ "کیوں ۔۔۔۔۔" "شاید میں اس بات پر فخر محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ میں اُس کا محبوب ہوں ۔ جسے شہر کے لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں ۔ اور بس" "اچھا" میں زبردستی مسکرائی اور چھیڑنے کی خاطر بولی ۔ "لیکن یہ نہ بھولئے صاحب کہ ہر بلندی کو سر چکرا دینے کی بری عادت ہے" ۔ وہ ہنسا ۔ "ہاں رضا نے دیوانہ بن کر اپنا تحفظ کر لیا ہے ۔ تمہاری مہربانی بے اعتنائی دونوں دیوانہ کن جو ہوئے کوئی کیا کرے" ۔ تو آپ بھی اپنا تحفظ کر لیں" میں چڑ گئی ۔۔۔۔۔ "شاید" وہ بولا ۔ تمہاری بلندی کو قائم رکھنے کے لئے مجھے قربانی دینا پڑے" ۔

اف ظہیر کی وہ باتیں ۔ مگر ان باتوں کے باوجود یا شاید انہیں باتوں کی وجہ سے میں اس کی طرف کھچی جاتی ہوں ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے اس کا ایک جزو مجھ سے نفرت کرتا ہے ۔ ڈرتا ہے مجھ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ نہ جانے کیوں مجھے سوچنے سے بیر ہے ۔ اسے سوچ بچار میں دیکھ کر میں چڑ جاتی ہوں ۔ مشتعل ہو جاتی ہوں ۔ لیکن اس کے باوجود مسحور ہو کر بیٹھ رہتی ہوں ۔ ایسے محسوس کرتی ہوں جیسے مجھے اپنے آپ پر قدرت نہ ہو ۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں

نہیں آتا ۔۔۔۔۔ لیکن مجھے ظہیر سے والہانہ محبت ہے ۔ پاگل ہوئی جارہی ہوں ۔۔۔۔۔ اس کے باوجود لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے پاگل کرنے سے لگاؤ ہے ۔ دیوانہ بنانے سے دلچسپی ہے ۔۔۔۔۔ اف یہ لوگ!!

آخر وہ دن آ پہنچا ۔۔۔۔۔ اف وہ دن !! گویا مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ۔ میری دبی دبی دیوانگی طوفان بن کر اٹھی اور چھاگئی ۔

میں ہسپتال سے واپس آرہی تھی ۔ حسب معمول وہ دیوانہ مجھ سے دس پندرہ قدم پیچھے ہاتھ میں آئی ۔ وی کا پھول لئے اس سے باتیں کرتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا ۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے پیچھے آیا کرتا تھا ۔ جب میں گھر یا ہسپتال میں داخل ہو جاتی ۔ تو وہ وہیں سڑک کے کنارے دہلیز پر بیٹھ جاتا ۔ لوگ اسے دیکھتے ہی سمجھ جاتے کہ میں کہیں آس پاس ہی ہوں ۔ نگاہیں اٹھتیں آنکھوں میں چمک لہراتی کہنیاں چلتیں ۔ انگلیاں اٹھتیں ۔ جھکی جھکی آنکھوں سے سمٹ سمٹ کر چلنے کے باوجود خواہ مخواہ مجھے یہ احساس ہوتا کہ بونوں کے بازار میں گلبور چل پھر رہا ہے ۔۔۔۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میں فضا پر چھائے جا رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ چھائے جا رہی ہوں ۔

بھوں ۔۔۔۔ بھوں!! دفعتاً بازار میں چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں ۔۔۔ پھر ایک چیخ ۔۔۔۔ "آئی ۔ وی ۔۔" میں نے پہلی مرتبہ مڑ کر دیکھا وہ سڑک کے درمیان موٹر تلے چت پڑا تھا ۔ بایاں بازو آئی ۔ وی کے گرے ہوئے پھول کی طرف بڑھا ہوا تھا ۔ جیسے اسے اٹھانے کے لئے پھیلا رکھا ہو ۔ اب تک وہ بازو اسے اٹھانے کی آرزو سے تڑپ رہا تھا ۔۔۔ اف وہ منظر' ہونٹ ہل رہے تھے ۔ "آئی وی ۔۔" آنکھیں پھول کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں ۔۔۔۔ کسی نے پھول اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا ۔ ایک بار اس کی آنکھیں شکر گذاری کے جذبہ سے بھیگ گئیں ۔ میں حیرانی سے بت بنی کھڑی تھی ۔ چیخ مار کر بھاگ جانا چاہتی تھی ۔ مگر پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے جب وہ اسے موٹر میں ڈال کر ہسپتال لے گئے تو دفعتاً وہ طلسم ٹوٹا اور میں گھر کی طرف بھاگی چاروں طرف ایک ہنگامہ بپا تھا ۔ لوگ ایک دوسرے باتیں کر

رہے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس روز میں نے محسوس کیا ۔ جیسے میں کسی ویرانے میں چل پھر رہی تھی ۔ کسی وسیع کائنات میں حقیر کیڑے کی طرح رینگ رہی تھی ۔

اس دھندلکے میں میں نے سُنا وہ مرگیا ۔ میں نے ایک دھچکا محسوس کیا ۔ میری دنیا ڈولی ۔ نہ جانے کیوں بارہا میں نے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ مرجائے میرے ماتھے سے بدنامی کا ٹیکا مٹ جائے میں سمجھتی تھی اس کے مرنے پر مجھے مسرت ہوگی ۔ میں آزاد ہو جاؤنگی دنیا میرے لئے اس قدر وسیع ہو جائے گی ۔ جیسے کسی زمانے میں تھی ۔ لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے ۔ گو مجھے اُس کی موت پر غم نہ ہوا ۔ لیکن خوشی بھی نہ ہوئی ۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں سمٹ کر معدوم ہوگئی ہوں ۔ اور ارد گرد کی اشیاء ابھر کر بلند ہوتی جا رہی ہیں ۔ وہ اس قدر پھیل گئیں کہ میں ان میں دفن ہو کر رہ گئی ۔ دفعتاً دنیا نے انگڑائی لی اور میں سمٹی ۔ میں نے محسوس کیا ۔ جیسے میں دیوؤں کے ملک میں ایک بالشتیا تھی ۔

اسی شام کو ظہیر آیا نہ جانے وہ اس قدر مضطرب کیوں تھا، بولا ۔ ”میں چاہتا ہوں آئی ۔ وی ۔۔ میں چاہتا ہوں جلد ہماری شادی ہو جائے“ ۔ نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہو ۔ شاید چھیڑنے کی غرض سے میں نے کہا“ اور اگر نہ ہو سکے تو ۔۔۔۔“ معاً اس کا چہرہ غصے یا نہ جانے کس بات سے سوج گیا ۔ اف وہ چہرہ! مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے رضا دوبارہ جنم لے رہا ہے ۔ ”تم چاہتی ہو میں بھی پاگل ہو جاؤں“ ۔ وہ چلایا میرے دل میں ایک وحشت بھرا جذبہ کھولنے لگا ۔ میں ہنسی ۔ دیوانہ وار ہنسی ۔ اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہوتا گیا ۔ میں اٹھ بیٹھی میری نظر کھڑکی سے باہر تھی ۔ وہ وسیع پھیلاؤ سمٹنے لگا ۔ لوگ کبڑے ہوتے گئے ۔ بالشتیوں کے ملک میں کوئی کھیور آکھڑا ہوا ۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ میں پاگل ہوئی جارہی ہوں ۔ دیوانی ہوں ۔ ان حالات میں ظہیر کی زندگی برباد کرنا ۔ ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا“ ۔ میں چلائی ”یہ کبھی نہ ہوگا ۔ “میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی خوشی ظہیر کے لئے قربانی کر رہی ہوں ۔ وہ جوں کا توں کھڑا تھا ۔ آنکھوں کی چمک بُجھ گئی تھی ۔ منہ سوج گیا

اور چہرے پر وحشت چھا گئی تھی ۔۔۔ شاید یہ میری آنکھوں کا دھوکا تھا ۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کا کوئی حصہ تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے ۔ لیکن مجھے تسکین تھی ۔ کہ میں نے اپنے محبوب کو ایک دیوانی سے محفوظ کر لیا ہے ۔ مجھے اپنا خیال نہیں ۔۔۔۔۔ میرا کیا ہے ۔۔۔۔۔ اپنے آپ کو محبوب کے لئے قربان کر دینا، کیا یہ محبت کی انتہا نہیں ۔۔۔۔۔ ؟ لیکن لوگ !! وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے ۔۔۔۔۔ نہ سمجھیں! مجھے اس سے کیا ۔۔۔۔ !؟

ہاں میں پاگل ہوں ۔ میرا پاگل پن صرف اسی لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ اب میں نے جان لیا کہ محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں ۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا ۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی !! لیکن اب پچھتانے سے حاصل!!؟

.....○.....

دروازہ

"یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے ۔ رینا ۔ او رینا !! ۔ اور یہ کھڑکیاں بھی ۔ اور کون ہو گا ۔ بس وہی رینا ۔ اور کون ۔ جانے کہاں چلا گیا ہے ۔ اب کیا ہو گا ۔ اس کا بس چلے تو سب دروازوں پر تالے لگ جائیں"۔ وہ اپنے آپ ہی بڑبڑاتے رہے اور پھر دفعتاً ان کی نگاہ ہم پر پڑی ۔ "اوہ ! تم ہو پرکاش ۔ تم آ گئے بہت اچھا کیا تم نے ۔ بہت اچھا کیا ۔ اچھا ہوا تم آ گئے"۔

"میرے ہم جماعت ہیں"۔ پرکاش نے میری طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "بلراج"

"اچھا اچھا ۔ بہت اچھا ہوا ۔ بڑی مہربانی ہے"۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ۔ آپ آگئے ۔ اچھا ہوا ۔ پھر انہوں نے حسرت سے بند دروازے کی طرف دیکھا ۔ "مگر یہ دروازہ"۔ ! ؟ اور پھر میری طرف معذرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بولے ۔ "دیکھو نا ۔ سبھی دروازے بند کر دیتا ہے ۔ رینا آدمی بہت اچھا ہے ۔ بہت بھلا آدمی ہے ۔ بس دروازے بند کر دیتا ہے ۔ گویا ہم قیدی ہیں ۔ دیکھا آپ نے ۔" اور ان کے ہونٹوں پر مایوس مسکراہٹ چھا گئی ۔ "اچھا ہوا آپ آ گئے"۔ وہ از سرنو بڑبڑانے لگے ۔ گویا کچھ کہنے کیلئے بول رہے ہوں ۔ اپنی آواز کا سہارا لے رہے ہوں ۔ "پرکاش نے میرا نام دہرایا"۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ۔ نہیں رہتے ۔ آپ بیٹھ جائیں ۔ آپ مسٹر راج ۔ بیٹھ جائیے ۔ اور پرکاش ! ان کے لئے چائے بھول گئے ۔ اچھا اچھا ۔ کوئی بات نہیں ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ پر وہ رینا ۔ نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے ۔ بس چلا جاتا ہے ۔ اور دروازہ ، یہ دیکھو نہ جانے کیوں بند کر جاتا ہے ۔ لیکن وہ آ جائیگا ۔ وہ ہمیشہ آجایا کرتا ہے ۔ آپ بیٹھئے سب

ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب "۔

میں نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا ۔ ان کی آنکھوں میں بے بس چمک کو دیکھکر میں نے کیوں ایسا محسوس کیا گویا کسی کال کوٹھڑی میں کوئی دروازہ کھلنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ شدت احساس سے میں اٹھ بیٹھا اور میں نے دروازہ کھول دیا ۔ مجھے دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ خوشی سے چلانے لگے ۔ "ہاں ہاں کھول دیجئے بہت مہربانی ہے ۔ بڑا اچھا کیا آپ نے"۔ اور پھر مجھے کھڑکی کی طرف جاتے دیکھ کر بڑبڑانے لگے ۔ "اچھا تو یہ بھی سہی ۔ بڑی اچھی بات ہے مہربانی ہے ۔ بڑا اچھا ہوا ۔ بڑا اچھا ہوا آپ آگئے ۔ اچھا تو میں جائے ۔۔۔۔۔ لیکن وہ رینا ۔ وہ نہیں آئے گا"۔ ان کی نگاہ میں یوں حسرت جھلکی گویا وہ رینا کے نہ آنے کے خلاف مجھ سے اپیل کر رہے ہوں ۔ گویا رینا کے نہ آنے سے پتہ نہیں کیا ہو جائے گا ۔ پھر اس گہری نیلگوں جھیل میں ایک طوفان جھولنے لگا ۔ اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے ۔ "اچھا تو میں ہو آؤں مجھے جانا ہی ہو گا ۔ آپ بیٹھیں مجھے جانا ہے ۔ میں ہو آؤں ذرا"۔ انہوں نے گویا مجھ سے اپیل کی ۔ "پرکاش بیٹے ! تم مسٹر ۔۔۔۔۔۔ مسٹر ۔۔۔۔۔۔ کے لئے چائے بنوا لینا ۔ میں ہو آؤں "۔

"جی ، چچا جی میں بلراج کے لئے چائے بنوا لوں گا ۔ آپ فکر نہ کریں"۔ پرکاش نے کہا ۔

"ہاں ، ہاں" وہ خوشی سے بڑبڑانے لگے ۔ "چائے بنوا لینا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ گویا اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہوں ۔ "رینا ضرور آ جائے گا"۔ وہ آ تو جایا کرتا ہے ۔ لیکن ۔۔۔۔۔۔ اچھا میں جاتا ہوں ۔ میں ذرا ہو آؤں"۔ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے ۔

"اولڈ گوز"۔ پرکاش انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دبی آواز سے بولا ۔

"دماغ ۔۔" پرکاش نے انگلی سے سر کو بجاتے ہوئے معنی خیز انداز سے کہا ۔ "چکر"

"چکر ؟"۔ میں نے چونک کر پوچھا ۔

لیکن وہ پھر بڑابڑاتے ہوئے اندر آگئے ۔ "لو !" وہ نہایت یاس بھرے انداز میں بولے ۔ " دروازہ بھی بند ہوگیا ۔ اب کوئی کیا کرے ؟" انہوں نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ دروازہ جو ہے"۔ پرکاش نے طنزاً بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا ۔

"اوہ"۔ یہ تو میں بھول ہی گیا وہ چونک کر بولے ۔ "ہاں یہ دروازہ جو ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ بھول جاتا ہوں میں" انہوں نے معذرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا ۔ "بھول جاتا ہوں مسٹر ۔۔ مسٹر ۔۔"

"مسٹر بلراج" پرکاش نے طنزاً دہرایا ۔

"مسٹر بلراج ! میں بھول جاتا ہوں ۔ اچھا تو آپ بیٹھیں آپ"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے ۔

"اف یہ دروازے کا مینیا ۔ پرکاش نے منہ بنا کر کہا ۔ "کریک ہے کریک ۔ تم چپ کیوں ہو" ۔ وہ مجھے گھورنے لگا ۔

"ہاں ہاں کریک" میں چونک کر بولا ۔ نہ جانے اس وقت میرے دل پر بوجھ کیوں پڑا ہوا تھا ۔ نہ جانے مجھے اس وقت تمام دنیا ایک بند دروازے کی طرح کیوں دکھائی دے رہی تھی۔ " نہیں نہیں میں خاموش تو نہیں"۔ میں نے کہا ۔

"خاموش نہیں تو یہ گیان دھیان کی تصویر کیوں بنے ہوئے ہو" ۔ وہ بولا میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ۔

" اس سڑی بڈھے کی باتوں پر نہ جاؤ"۔ وہ بولا ۔ نہ جانے بوڑھا ہو کر انسان سڑی کیوں ہو جاتا ہے"۔

"شاید ہم بھی ہو جائیں" ۔

"میں! ؟ میں تو اس سے پیشتر اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا"۔

"چھوٹے بابو جی آئے ہیں"۔ رینا اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا "میں نے کہا تھا بڑے بابو جی سے کہا تھا میں نے ۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا ۔

جرور آئے گا کوئی میں نے کہا ۔ سو آ گئے چھوٹے بابو ۔ پھجول میں تو نہیں پھرکی میری آنکھ کبھی ۔ کل سے جو پھرک رہی تھی ۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا ۔ اور سب اچھے ہیں نا ۔ پر آپ تو کالج سے آئے ہیں نا ۔ اور چائے نہیں پی کیا ۔ ابھی تو نہیں پی ہوگی ۔ پیتے بھی کیسے میں تو اب آرہا ہوں ۔ ابھی لائے دیتا ہوں ۔ ابھی ــــــ" یہ کہ کر وہ اندر جانے لگا ۔ لیکن دفعتاً رک گیا اور دیوار کی طرف دیکھ کر بولا ۔ "بڑے بابوجی کہاں گئے ۔ اندر تو نہ ہوں گے وہ"۔

پرکاش بولا ۔ "ابھی باہر گئے ہیں"۔

وہ ہماری طرف مخاطب ہو کر شکایت کرنے لگا ۔ "نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں ۔ کہاں مارے مارے پھرتے ہیں ۔ بس میں ہو آؤں ہو آؤں میں جیسے دھپتر جانا ہو"۔ وہ ہنسا ۔ "چھوٹے بابو دیکھو نا ہر سمے گھومتے رہتے ہیں ۔ جیسے کوئی چھوکرا سکول سے بھاگ رہا ہو ۔ اب کوئی کہاں تک ان کے پیچھے مارا مارا پھرے ۔ پھجول میں ۔ کل باگ میں بیٹھے تھے ۔ دیکھا مجھے تو اٹھ بیٹھے ۔ اچھا تو اب گھر ہی جانا ہے نا ۔ جانا جو ہوا گھر ۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے ہے چھوٹے بابو ۔ پر آپ کی چائے"۔ دفعتاً وہ چونک کر بولا ۔ "ابھی لاتا ہوں چھوٹے بابو ابھی"۔ یہ کہ کر وہ اندر داخل ہو گیا ۔

پرکاش کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ "دیکھا یک نہ شد دو شد"۔

لیکن نہ جانے مجھے ہنسی کیوں نہ آئی ۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ "یہاں ڈاکٹر کا تو پتہ ہی نہیں ۔ دونو ہی مسٹر ہائیڈ ہیں"۔ پرکاش مسکرایا ۔ "ایک دروازے بند کرتا پھرتا ہے اور دوسرے انہیں کھولنے کے لئے ترستا ہے ۔ مگر اتنا نہیں کر سکتا کہ خود تکلیف کر کے کھول لے ۔ عجب تماشا ہے ۔"

"ہاں" میں نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"چپ کیوں ہو تم"۔ وہ مجھ سے بگڑا ۔

"چپ کہاں ہوں"۔ میں نے چمک کر کہا ۔

"چپ تو ہو تم"۔ وہ بولا ۔ "تم بھی تو یہاں آکر بند کھڑکی بن گئے ہو"۔

"چلو تم ہی کھلا دروازہ ، سہی"۔ میں نے اسے چڑانے کیلئے کہا ۔

"ہم تو ہیں ۔" وہ بولا ۔ اور اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا ۔ "آخر ہمیں کوئی کھلی کھڑکی مل ہی جائے گی نا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر دیکھنے لگا ۔

"ارے" وہ چلایا "یہ سنا تم نے"۔

"نہیں تو" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ "کیا ہے ؟"

"یہ آواز"۔۔۔۔۔۔ بڑی سریلی ہے"۔

"آواز" میں نے پوچھا ۔

"سنتے نہیں" وہ بولا ۔ یہ بغل کے کمرے سے آواز آ رہی ہے اس دیوار سے اس طرف ۔ "میں دیکھ آؤں ذرا" پرکاش باہر نکل گیا ۔ اور میں پھر اپنے خیالات میں کھو گیا ۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش ہنستا ہوا لوٹا ۔ "بھئی واہ کیا چیز ہے اس ساتھ والے کمرے میں"۔

"چاہے اپنے گھر ہی سے کوئی ہو"۔

"واہ"۔ وہ ہنسا چچا تو اکیلے رہتے ہیں ۔ اور یہ کمرے کرائے پر ہیں ۔ کیا سمجھے ؟ جانتے ہو ۔ کون ہے سلاخدار کھڑکی کے پیچھے ؟ یوں بیٹھی ہے ظالم ، جیسے کوئی کماری قید ہو ۔ لیکن دوست ! یوں معلوم ہوتا ہے گویا پہلے ہی سے کوئی نگاہ پر چڑھا ہوا ہے ۔ منتظر بیٹھی ہیں آپ ۔۔۔۔۔ تم نے آواز نہیں سنی تھی ۔ اچھا اب بولی تو بتادوں گا ۔ ارے یار صاف آواز آتی تھی ۔ یہ ساتھ والا کمرہ تو ہے ذرا دھیان رکھنا"۔

"لو ۔ سارے دروازے کھل گئے ہیں"۔ رینا بڑبڑاتا ہوا چائے لے کر داخل ہوا ۔ "اب کوئی کیا کرے ۔ بابوجی تو حد کر دیتے ہیں ۔ حد ۔ میں پوچھوں اگر ٹھنڈ لگ جاوے تو ۔ اور ٹھنڈ نہیں تو ہجار باتیں ہیں ۔ کتا بلی آجاوے تو اس نے چائے میز پر رکھ دی اور آپ بھی تو اتنی جماعتیں پاس ہیں چھوٹے بابو ! بھلا ایسی بات بھی سنی ہے کبھی ۔ یہ درواجہ کھول دو ۔ گھر نہ ہوا دُکان ہوئی ۔ اور

سچ پوچھو چھوٹے بابو ! تو دکان بھی ایسے نہیں ہوتی"۔

"رِینا" پرکاش بولا ۔ "یہ دروازے کھولنے کا خبط ہے کیا ؟"

"کون جانے چھوٹے بابو ۔ میری سمجھ میں تو نہ آوے ہے یہ بات ۔ جوانی میں تو اچھے بھلے تھے ۔ ان کی طرح" اس نے میری طرف اشارہ کیا ۔

"جی !" رِینا چمکا ۔ "بڑے ٹھاٹھ تھے جب تو ۔ بڑا مجاج تھا ۔ رام کا دیا کاپھی تھا مہاراج ۔ پھر جوانی بھر کر آئی تھی ۔ ہجاروں میں ایک تھے ۔ یہ اونچا لمبا قد اور درد بھری آنکھیں مست دکھیں تھی ۔ پر چھوٹے بابو جب بھی چھپ چھپ کے رہتے تھے ۔ اکیلے میں بیٹھ رہتے ۔ نہ ہنسی نہ مجاک ۔ چُپ سی لگی رہتی تھی ۔ پر پھیشن میں پیچھے نہ رہتے ۔ یہ گلے میں بندھنے والی اور مہاراج سوٹ ۔۔۔۔۔ بڑی ٹس پھس تھی" ۔ اس نے ایک آہ بھری ۔ میں بھی تو جوان تھا ان دنوں ۔ چھوٹے بابو بس سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا"۔

"ہوں تو بڑے مزے میں رہتے تھے چچا جی"۔ پرکاش مسکرانے لگا ۔

رِینا نے آنکھ سے ایک ان بہا آنسو پونچھا ۔ "جی بڑے مجے میں ۔ یہیں اسی سڑک پر مکان لیا ہوا تھا ۔ ادھر چوک کی طرف چوبارہ تھا ایک ۔ سڑک پر ہی ہے وہ بس بابو جی اور میں ۔

"نسبت روڈ پر" ۔ پرکاش چلایا ۔ "یہاں تو میلا لگا رہتا ہے نا لڑکیوں کا۔"

"اونہوہ چھوٹے بابو"۔ اس نے سر ہلایا ۔ "ان دنوں تو یہ جگہ کھالی پڑی تھی ۔ اکا دکا مکان تھا ۔ ہاں کالج کے سمے گجرتی تھیں ۔ بس دو ایک"۔

"دو ایک"۔ پرکاش نے پوچھا ۔ "لیکن رِینا ! یہ بھی کیا کم ہے ۔ ہمیں تو ایک بھی میسر نہیں آتی"۔

"ہی ہی ہی" ۔ وہ ہنسا ۔ "چھوٹے بابو تو مجاک کرتے ہیں" اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ۔ "پر آپ جانیں ہیں ۔ "رسوئیہ کو کون پوچھے ہے مہاراج ۔ ہاں بابو جی"۔ وہ پھر ہنسا ۔ بڑا رنگیلا مجاج تھا ان دنوں بابو جی کا ۔ پر چھوٹے

بابو کے سمان تیج نہ تھے ۔ بس بھیتر ہی بھیتر کُھش ہو جاتے تھے ۔

"اچھا تو ہم تیز ہیں"۔ پرکاش مسکرایا ۔

"چھوٹے بابو" اس نے آہ بھر کر کہا ۔ "جوانی سبھی کو تیج بنا دیوے ہے ۔ پر سچ بتاؤں ۔ بابو جی میں یہ بات نہ تھی ۔ بس چپکے سے دیکھا اور پی گئے ۔ پر وہ جالم ! توبہ ہے چھوٹے بابو وہ تو آپھت تھی آپھت"۔

"وہ کون" ۔ پرکاش نے مزید دلچسپی سے پوچھا ۔

رسنا اپنے ہی خیال میں کہتا گیا ۔ "اب بھی جو یاد آوے ہے تو جی بیٹھ جاوے ہے"۔ اس نے ایک آہ بھری "پر چھوٹے بابو ! دل کی بڑی اچھی تھی وہ"۔

"ارے یہی تو نہیں جو اس کمرے میں رہتی ہے"۔ پرکاش نے دیوار کی طرف اشارہ کرکے پوچھا ۔

"لو چھوٹے بابو ! میں تو جب کی بات کر رہا ہوں" رسنا بولا ۔

"بھئی ساری بات بتاؤ تو پتہ چلے نا" پرکاش نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا ۔

"کیا بتاؤں چھوٹے بابو ۔ جب وہ سڑک پر سے گجرتی تو کھانچے والے سودا دینا بھول جاتے"۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "وہ بھی کیا دن تھے میں جو سبجی بنا رہا ہوں اور وہ گجرے ، تو چھوٹے بابو یوں سدھ بدھ ماری جائے کہ چاکو سے انگلی کٹ جائے ۔ یہ دیکھو ! اس نے بائیں انگلی دکھاتے ہوئے کہا ۔ کئی بار کٹی یہ انگلی ۔ اسے دیکھ کر تو بڈھے بھی ٹھوکر کھا جاتے تھے ۔ اور وہ مسکراتی اور یوں چلے جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ بڑی تیج تھی وہ ۔ چھوٹے بابو کی طرح ۔ پر منہ دیکھو تو بھولا بھالا ۔ اور جو وہ نجر اٹھا کر دیکھے تو دم نکلے تھا ۔ ایسا روپ تھا اس کا ۔ بڑا روپ تھا ۔ چھوٹے بابو ! ۔ اور چلتی تھی ۔ ہوا میں چلتی تھی وہ ، پیٹھ پر مہاراج ، دو چوٹیاں ۔ یوں پھدکتی تھیں ۔ وہ چوٹیاں ۔ کیا بتاؤں چھوٹے بابو ۔ بڑے گھر کی تھی ۔ یہی اپنے گوبند لال سیٹھ کی بٹیا ۔ اکیلی بٹیا تھی ۔ لاڈلی تو ہونا ہی تھا ۔ پر ان دنوں ہمیں کیا کھبر تھی سیٹھ گوبند لال کی ۔ ہمیں کیا معلوم

کہ وہ لکھ پتی ہیں ۔ ہمیں تو یہ بھی کھبر نہ تھی بھئی ، وہ سیٹھ گوبند لال کی بیٹی ہے ۔ اور چھوٹے بابو !" وہ پھر ہنسنے لگا ۔ "ہمارے بابو جی چھپ چھپ کے دیکھیں تھے اُسے ۔ کبھی رسوئی میں آجاتے ۔ بہانے بہانے ۔ رتنا کیا بناؤ گے آج ۔ رتنا چائے تو بڑی اچھی بنائی تھی آج ۔ رتنا کیا حال چال ہے ۔ پر چھوٹے بابو میں جانتا تھا ، سب جانتا تھا کہ وہ کھڑکی میں دیکھنے کو آئے ہیں ۔ میں نے بھی کبھی نہ جتایا تھا اُنہیں ۔ پر انہیں یوں بہانے بناتے دیکھ کر گُسہ آتا تھا مجھے"۔

"غصہ تو آنا ہی تھا پرکاش بولا ۔ تمہیں دیکھنے کا موقعہ جو نہ ملتا تھا"۔

"ہی ہی ہی ہی ۔ رتنا ہنسا ۔ "لو چھوٹے بابو بھی کیا بات کرتے ہیں ۔ حد کرتے ہیں یہ بھی ۔ بھلا مجھے کون پوچھے تھا وہاں ۔ میں ویسے ہی دیکھتا تھا ۔ مجاک مجاک میں ۔ گُسہ تو مجھے یوں آوے تھا کہ بابو جی کو دیکھنا تھا تو کھل کے دیکھتے یوں چھپ چھپ دیکھنے سے پھائدہ ۔ آپ ہی بتائیں"۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا ۔ "یہ آج کل کی چھوریاں بھلا چھپ چھپ کر دیکھنے کو کیا جانیں ہیں ۔ آپ ہی بتائیں مہاراج ۔ وہ تو چاہیں ہیں کہ کوئی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روکے ۔ وہ جمانے گئے چھوٹے بابو جب چھپ چھپ کر رونا چلے تھا ۔ پر ہمارے بابو جی نے تو حد کردی ۔ کالج جانا چھوٹ گیا ۔ بس پڑے رہتے ۔ گاتے رہتے ۔ اور اس کا انتجار کرتے رہتے ۔ آنے کا وکت ہوا تو اٹھ بیٹھے ۔ منہ ہاتھ دھو ، کپڑے پہن ، آکھڑے ہوئے ۔ رتنا کیا بن رہا ہے ــــــ آکھر میں نے سمجھایا ۔ میں نہ سمجھاتا چھوٹے بابو تو سمجھاتا کون ۔ میرا سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا ۔ اسی گھر میں ۔ میں نے کہا ۔ بابو جی جو چاہیں کریں آپ ۔ میں کچھ نہیں کہتا پر کالج نہ جائیں آپ تو کیسی بُری بات ہے ۔ لالہ جی ناراج ہوں گے ۔ مجھے ڈانٹیں گے ۔ کہ رتنا تم نے ہمیں کھبر کیوں نہ کی ۔ میں نے کہا وہ بھی تو جاتی ہی ہے کالج ۔ اس بات پر چھوٹے بابو ۔ بابو جی کا رنگ ہلدی ہو گیا ۔ پر وہ بولے نہیں پی گئے ۔ یہ ان کی آدت ہے ۔ پھر انہوں نے کالج جانا شروع کر دیا چھوٹے بابو پر ــــــ میں بھی دیکھتا رہا ۔ چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ۔ کہ کیا

کرـ س ہیں ـ تو مہاراج کپڑے پہنے ، چائے پی ـ جلدی جلدی اور پھر نیچے اتر گئے اور پان والے بھیئے کے پاس جا کھڑے ہوئے ـ بہانے بہانے ، کبھی پان کھا ، کبھی سگرٹ پی ـ کھڑے رہے ـ پھر جب اُسے دور سے آتے دیکھا تو اُسی طرح چل دیئے ـ ان کا کالج اسی طرح تھا نا ـ وہ اس پٹڑی پر ہوتی اور یہ اس پٹڑی پر ہو لیتے اور پھر بہانے بہانے دیکھتے چھپ چھپ کر ـ میں کھڑکی سے سب دیکھتا رہتا ـ چھوٹے بابو ہر بات کو دیکھتا تھا میں ـ اپنے بابوجی ہولے ہولے چلتے ـ وہ تو پہلے ہی مجے سے چلتی تھی ـ اس کی چال ہی ایسی تھی چھوٹے بابو ـ مجے مجے چلتی تھی وہ"ـ

"اور وہ بھی تو بابو جی کو دیکھتی ہوگی ـ کیوں ریتا"ـ پرکاش نے پوچھا ـ

"اس کا کیا تھا چھوٹے بابو وہ تو کسی کو بھی نہ دیکھے تھی ـ پر سب کو دکھتی وی مالوم ہووے تھی"ـ

"تمہیں بھی" ـ پرکاش مسکرایا ـ

"ہی ہی ہی" ـ وہ ہنسنے لگا ـ "مجھے دیکھتی تو تھی وہ ـ پر چھوٹے بابو وہ تو اس نل کو بھی دیکھے تھی ـ جو پٹڑی پر لگ رہا تھا" ـ اس نے اک آہ بھری اور بولا اس کے دیکھنے کی کیا پوچھیں میں آپ ـ وہ تو ہوا ہیں چلے تھی ـ ہوا میں ـ پر میں نے دیکھا تھا ، بابو جی کہ دیکھ کر اس کے منہ پر ہنسی آجاوے تھی ـ ہلکی سی ، پر کیا مجال جو وہ ہنس جائے کھل کر ـ بڑا روب تھا اس کا جی ـ" اس نے ایک اور آہ بھری اور خاموش ہوگیا ـ پھر وہ آپ ہی آپ چونک کر بولا ـ "پھر یوں ہوا ـ کہ وہ پان والا بھیا جسکی دکان سے بابو جی پان کھاتے اور انتجار کرتے تھے ـ کہنے لگا ـ کیوں بابوجی ! کیا چھوکری ہے ـ بڑی تیج ہے تیج ـ اور چھوٹے بابو کیا پوچھو ہو ـ سڑک پر کون تھا جو یہ نہ جانے تھا کہ بابو جی اس کی انتجار کرتے ہیں ، سبھی جانتے تھے مہاراج سبھی ـ پر ہمارے بابوجی یہ سمجھتے تھے کہ سبھی اندھے ہیں ـ اندھے ـ لو مہاراج" وہ مجھ سے مخاطب ہوا ـ "بھلا لگن کی بات بھی چھپ سکے ہے کہیں ـ اور پھر یہ بات ـ مہاراج یہ بات تو جی میں آئی اور یوں اُچھلی جیسے ربٹ کا گیند" وہ ہنسنے لگا ـ "تو جھوٹے بابو اس

روج سے بابو جی نے دکان پر کھڑے ہونا چھوڑ دیا ۔ اور وہ اور بھی نکو بن گئے ۔ اس بات کو ہنس کر ٹال دیتے تو وہ کیا منع کرتے انہیں ۔ تو جی ۔۔۔۔۔ انہوں نے وہاں کھڑے ہونا چھوڑ دیا ۔ پھر پرلی پٹڑی پر نل کے پاس جا کھڑے ہوتے ۔ اور جب وہ دور سے نجر پڑتی تو اس کی طرف چل دیتے"۔

"اسی پٹڑی پر جس پر وہ آتی تھی ؟" پرکاش نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا ۔

"جی ، اسی پٹڑی پر" رینا چمک کر بولا ۔

"بڑی ہمت پیدا ہو گئی تھی"۔

"جی ! پہلے تو یہ بات نہ تھی پر آپ جانیں ہیں ۔ دھیرے دھیرے آس بندھ ہی جاتی ہے چھوٹے بابو ۔ پھر بھی جب دونوں میں تھوڑا سا پھاسلہ رہ جاتا تو بابو جی پٹڑی کو چھوڑ ، سڑک پر اُتر آتے اور پھر سڑک پار کر کے دوسری پٹڑی پر آجاتے ۔ پر مہاراج وہ مگن چلے جاتی ۔ ویسے ہی اسی پٹڑی پر ۔ میں دیکھتا تھا جب بابو جی سڑک پر اُترتے تو وہ پرلی طرف منہ کر کے ہنس دیتی ۔ لیکن کیا مجال جو منہ سے کچھ پتہ چلے ۔ ایسی تیج تھی وہ ، اور میں دیکھتا رہتا چھوٹے بابو ۔ بابو جی کو ۔ دونوں کو ۔ عجب دن تھے وہ بھی ، چھوٹے بابو" ۔ رینا خاموش ہو گیا ۔ یوں کھو گیا ۔ گویا خواب دیکھ رہا ہو ۔ لیکن اس سہانے خواب کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں ۔ گویا کسی ساکن اور گہری جھیل میں تیر رہی ہوں ۔ "ہاں چھوٹے بابو" اس نے اک بے بسی اور حسرت سے بات شروع کی ۔ کیا دن تھے وہ ۔ میں ان کو دیکھنے میں اپنا کام کاج بھی بھول جاتا ۔ بس صبح وشام کھڑا ان کو دیکھتا رہتا ۔ پر یہ اپنے آپ میں مگن تھے ۔ انہیں کیا مالوم کہ رینا دیکھ رہا ہے ۔ وہ سب جانتا ہے ۔ انہیں تو اپنی بھی سدھ بدھ نہ تھی ۔ پر وہ ۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا نام تھا اس کا ۔ بھلا سا نام تھا ۔ بل ۔ بل ۔ بل" اور وہ سوچ میں پڑ گیا "بلراج ۔۔۔۔۔ ؟" پرکاش بولا اور اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا ۔

شاید اس نے پرکاش کی بات نہ سنی ۔ "بل ۔ بلبیر کماری ۔ وہ بولا ۔ ہاں

ہاں بلبیر کماری ۔ وہ کماری بڑی پرکھ والی تھی ۔ میں جانوں اسے سب پتہ تھا اسے"۔ مالوم تھا میں دیکھ رہا ہوں ۔ جب وہ میری رسوئی کی کھڑکی کے سامنے آتی تو جرور ایک نجر اٹھا کر دیکھتی ۔ گور سے دیکھتی تھی ۔ جانتی ہوگی وہ کہ میں بابو جی کا رسوئیہ ہوں ۔ جرور جانتی ہوگی ۔

"تم بھی تو جوان تھے"۔ پرکاش مسکرانے لگا ۔

"آپ تو مجاک کریں ہیں ۔ اس نے حسرت بھری آواز سے کہا ۔ جوانی تو چھوٹے بابو اُنہیں ہی آوے ہے جنہیں رام نے دیا ہے ۔ رسوئیہ کی جوانی بھی کیا جوانی ہے ۔ چھوٹے بابو ۔ وہ تو رسوئیہ ہوا ۔ چاہے بڈھا ہو یا جوان ۔ اور پھر مہاراج وہ لکھ پتی کی بٹیا ۔ آپ تو مجاک کریں ہیں مہاراج ! ۔ اس نے ایک آہ بھری اور مجھے مخاطب کرکے کہا ۔ پھر اک دن بابو جی ادھر سے جا رئیے تھے ۔ اور کماری اُدھر سے آ رئیی تھی ۔ جب دونوں میں تھوڑا پھاسلہ رہ گیا اور بابو جی روج کے سمان پٹڑی سے سڑک پر اُترے تو وہ بھی پٹڑی چھوڑ سڑک پر اُتر آئی ۔ شاید وہ بھی اس ورلی پٹڑی پر آنا چاہے تھی مہاراج ! بابو جی یہ دیکھ کر یوں گھبرائے کہ ایک بھینس جو جا رئیی تھی اس سے جا ٹکرائے اور وہ مسکرائی ۔ پر چھوٹے بابو ۔ بابو جی کو بہت چوٹ آئی ۔ اور وہ دیوی مسکرا کر اپنی راہ چلی گئی مڑ کر بھی نہ دیکھا اُس نے"۔

اگلے روج بابو جی کالج جانے کی جِد کرنے لگے ۔ پر چھوٹے بابو میں نے جانے نہ دیا ۔ اتنا بڑا جھکم ہوگیا تھا ٹانگ پر ! میرے کہنے سے گئے تو نہ پر جی ، دیکھے بنا نہ رہ سکے ۔ گسلکھانے کی کھڑکی سے دیکھتے رئیے ۔ ادھر میں بھی دیکھ رہا تھا کہ دیکھوں آج بابو جی کو پٹڑی پر نہ پا کر کیا کرتی ہے وہ ۔ میرا کھیال تھا چھوٹے بابو ، کہ اس رانی کا کیا گیا تھا ۔ اس کی بلا سے چاہے کوئی مرے یا جئے ۔ پھر وہ آئی اور اس نے دور سے دیکھا چاروں طرپھ دیکھا ۔ اور پھر یوں چپ چاپ چلے گئی جیسے مٹی کی بنی ہو ۔ نہ وہ لٹک ، نہ ہنسی ۔ دوسرے دن بھی وہ یونہی گجری ۔ پر تیسرے دن وہ نل کے پاس آکر رُک گئی ۔ نل رسوئی کی کھڑکی کے سامنے تھا ۔ بالکل سیدھ میں ۔ رکی ، پھر چلنے لگی ۔ پھر رُک گئی اور سر اٹھا کر اوپر

دیکھا ۔ میری طرپھ ۔ اور چھوٹے بابو میرا تو جی بیٹھ گیا ۔ ایک تو اس کا روپ اور دوسرے اس کی آنکھیں لال سی ہو رئیی تھیں ۔ پھر ہاتھ اٹھا کر انگلی سے مجھے بلالیا ۔ اور چھوٹے بابو ! میں گولی سمان اڑ کر پہنچا اور پاس جا کھڑا ہوا ۔ بولی ۔ تم رسوئیہ ہو ۔ میں نے سر ہلایا ۔ کہنے لگی تمہارے بابو کیسے ہیں ۔ جیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔ چوٹ تو آئی ہے پر اچھے ہو جائیں گے ۔ میں نے جواب دیا پھر بولی ۔ تم یہاں اکیلے رہتے ہو ۔ میں نے سر ہلا دیا اور کہا میں اور بابوجی ۔ بس چھوٹے بابو پھر وہ چلی گئی"۔ اس نے اک آہ بھر کر کہا ۔ "واپس آیا تو بابوجی رستہ روکے کھڑے تھے ۔ بولے ۔ کہاں گیا تھا رینا ۔ جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں ۔ مجھے مالوم تھا چھوٹے بابو کہ وہ گسلکھانے میں چھپ کر دیکھ رئیے ہیں ۔ میں نے آپ دیکھا تھا انہیں ۔ میں نے منہ پکّا کر لیا ۔ اور کہا ۔ جری بھیّا کے پاس گیا تھا ۔ پھر بابو جی منتیں کرنے لگے ۔ نہیں نہیں رینا سچ بتاؤ کیا کہتی تھی وہ ۔ مجھے مجاک سوجھا ۔ کیوں نہ سوجھتا" ۔ وہ چمک کر بولا ۔ "وہ کیوں چھپ چھپ کر کرتے تھے بات ! میں نے کہا ۔ کہتی تھی تمہارے بابو جی بیاہ کرینگے مجھ سے ۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں ۔ میری جُبان ہی ایسی ہے ۔ بس جو کہدوں پورا ہو جاوے ہے ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یونہی ہو جائے گا"۔ اس نے آہ بھر کر کہا ۔ "اچھا ؟ ۔۔۔۔۔ تو یونہی ہوا کیا ۔ بڑے دھرماتما ہو تم" ۔ پرکاش بولا ۔

رینا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا ۔ "جی دھرماتما کیا بنوں کا میں ، میری جُبان ہی ایسی کالی ہے ۔ اِدھر بات نکلی ادھر پوری ہوگئی ۔۔۔۔۔ بس جی کیا بتاؤں مہاراج ۔ دوسرے دن وہ کماری آپ ہی آپ اوپر آگئی ۔ گھر میں ۔ میں آلو چھیل رہا تھا ۔ اور بابو اندر پلنگ پر پڑے تھے ۔ وہ تو پڑے ہی رہتے تھے نا ۔ ابھی جکھم اچھا نہ ہوا تھا ۔ ہو بھی جاتا چھوٹے بابو تو دل کا جکھم تو تھا ہی ۔ دل کا جکھم کب اچھا ہووے ہے چھوٹے بابو" ۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "کبھی نہیں کبھی نہیں"۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں بھی کوئی دل کا زخم لگا ہے" ۔ پرکاش اُسے چھیڑنے لگا ۔

"اجی مہاراج" ۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا ۔ "کون ہے جسے دل کا جکھم نہ ہووے ہے ، چاہے رسوئیہ ہی کیوں نہ ہو ۔ سبھی کو ہووے ہے چھوٹے بابو ۔ کیا بھاگوان کیا نردھن"۔

"اچھا تو وہ تمہارے گھر آگئی" ۔ پرکاش نے اسے یاد دلایا ۔

"جی ہاں تو آلو چھیل ریا تھا میں ۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو کماری جی کھڑی ہیں ۔ میں تو کھڑا رہ گیا اور چھوٹے بابو ، چاقو اتنا سا انگلی میں چلا گیا ۔ اور مجھے مالوم بھی نہ ہوا ۔ اور کھون بوند بوند گرے ہے اور وہ حیران ، دیکھے ہے میری طرپھ ۔ ادھر بابو جی نے دیکھ لیا ہوگا ۔ اور وہ جکھم والی ٹانگ سمیت اٹھ کر درواجے میں آ کھڑے ہوئے ۔ اور میں حیران کھڑا بابو جی کو دیکھوں ہوں ۔ اور بابوجی کماری کے منہ پر نجر جمائے حیران کھڑے دیکھیں ہیں ۔ چھوٹے بابو اس روج تو "وہ ہنسنے لگا ۔ "اس روج تو بائیسکوپ ہو ریا تھا ۔ ہمارے گھر میں ، پھر مہاراج نہ جانے کماری جی کو کیا ہوا ۔ مڑ گئی جیسے جا رہئی ہو اور میں حیران کہ آئی بھی اور چل بھی دی ۔ اُدھر بابو جی بڑبڑائے اور پیچھے دوڑے ، پر دو کدم رک کر کھڑے ہو رہے ۔ پھر میں ہی بولا ۔ چائے تو پی جاتے دیوی جی ۔ تیار ہی ہے اور وہ بن دیکھے بولی ۔ آج نہیں پھر سہی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اترتی گئی ۔ اور بابوجی نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہے ، انہیں پوری بات کرنے کی ہمت بھی ہوئی ؟ پھر وہ آپ ہی نچلی سیڑھی پر پہنچ کر رکی ۔ ہم دونوں تو کٹہرے سے لگے نیچے جھانک رہے تھے ۔ نجر بھر کر اوپر دیکھا اور بولی اب تو تمہارے بابو جی اچھے ہیں نا رسوئیہ ! جی جی ۔ بڑی مہربانی ہے بابوجی بڑبڑائے اور میں بھاگ کر نیچے اتر گیا ۔ میں نے کہا دیوی جی چائے تو پی جائیے ۔ اور وہ مسکرا کر کہنے لگی ۔ نہیں رسوئیہ ، پھر سہی ۔ پھر آؤں گی میں ۔ اور جی ، یہ کہہ کر پھر اوپر دیکھا بابوجی کی طرپھ اور مسکرائی "رینا ایک آہ بھر کر خاموش ہوگیا ۔

کچھ دیر کے بعد اس نے آپ ہی سلسلۂ کلام جاری کر دیا ۔ "اگلے روج وہ پھر آئی ۔ اس روج تو میں نے بٹھا ہی لیا ۔ میں نے کہا دیوی آج تو چائے پلائے بنا نہ جانے دوںگا میں ۔ یہ آپ کا گھر ہے ۔ یہ سن کر وہ مسکرائی اور نیچی

نجر سے بابوجی کو دیکھا وہ بھی مسکرائے ۔ بڑی تیج تھی وہ ۔ بڑی"۔

"جب میں چائے لے کر آیا چھوٹے بابو ! اور انہیں ایک میج پر بیٹھے دیکھا ۔ تو میرا جی بہت کھش ہوا مہاراج ۔ بہت ۔ مجھے دیکھ کر بولی رسوئیہ تمہاری انگلی کیسی ہے ۔ اور چھوٹے بابو نہ جانے میں نے انگلی کیوں چھپالی ۔ بس چھپالی میں نے اور کہنے لگا ۔ انگلی کو تو کچھ نہیں ہوا دیوی جی ۔ وہ مسکرائی ۔ کل کٹ جو گئی تھی ۔ میں نے کہا دیوی یہ انگلیاں تو روج ہی کٹتی ہیں ۔ رسوئیہ جو ہوا ۔ چاکو کا کام ہے دیوی ۔ ان انگلیوں کا کیا ہے ۔ اور چھوٹے بابو جی پھر جو میں نے چائے رکھ کر سیب چیرنے کو چاکو اٹھایا تو اس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا ۔ اونہوہ ۔ انگلی کٹ جائے گی اور مسکرائی ۔ میں نے کہا نہیں دیوی جی روج تو نہیں کٹتی ۔ اور میں سرما کی رسوئی میں آگیا ۔ پھر وہ اکیلے بیٹھے رہئیے ۔ بابوجی کو تو بس چُپ لگی تھی ۔ ہاں وہ کبھی کبھی کچھ کہہ دیتی ۔ میں نے تو صرف اتنا ہی سُنا کہتی تھی اس روج آپ گر کیوں گئے ۔ پھر بولی ۔ پٹڑی سے اتر کیوں آتے تھے آپ ۔ پھر نہ جانے کیا کہا اس نے اور وہ کیا بولے ، مجھ سے تو سُنا نہ گیا ۔ چھوٹے بابو ۔ پھر وہ جور سے ہنسی "یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔ اور مجھے آواج دے کر بلایا ۔ رسوئیہ یہ دیکھو تو کیا کرئیے ہیں تمہارے بابو جی ۔ اور میں بھاگا بھاگا گیا دیکھوں ہوں بابوجی شکر والی پیالی میں چائے ڈال چکے ہیں ۔ شکر والی پیالی میں چائے بنانے لگے تھے ۔ بابو جی بولے میں بھی پاگل ہوں ۔ رسوئیہ وہ مسکرائی تمہارے بابوجی کو کیا ہو گیا ہے اور نیچی نجر سے ادھر دیکھا میں نے کہا ۔ دیوی آپ جانیں ۔ وہ بولی کیوں میں کیوں جانوں ۔ میں نے کہا ۔ آپ نہ جانیں تو کون جانیں اور وہ سرما سی گئی ۔ میں اور لاتا ہوں شکر میں نے کہا اور ٹل گیا وہاں سے ، مہاراج ۔ اس سمے تو میں کھاسکھا تھا چھوٹے بابو ۔ پر نہ جانے جلدی میں مجھے کیا ہوا شکر والے پیپے کو چھوڑ سوجی کی پیالی بھر لایا ۔ میں پیالی لے کر کھڑا ہو گیا ۔ اور اس نے چمچہ بھرا اور مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی ۔ میں حیران ۔ ادھر بابو جی حیران پر وہ کھش تھے ۔ بڑے کھش ۔ یہ کیا ہے وہ بولی ۔ شکر ہے ۔ میں نے کہا ۔ اچھی شکر ہے یہ ، وہ ہنسی اب میں جو دیکھ رہا ہوں تو سوجی تھی ۔ اوہ میں چلایا ۔ بالکل پاگل ہے ، بابوجی بات سمجھ کر چلائے ۔ دیکھ

کر کام نہیں کرتا ۔ اور وہ اس شکر کی پیالی کیطرف دیکھ کر ہنسی جاوے تھی ۔ جس میں بابو جی نے چائے ڈال دی تھی ۔ پھر بابو جی نہ جانے سمجھ کریا ویسے ہی چپ سے ہوگئے پر مہاراج ان کی اپنی سدھ بدھ ماری دی تھی ۔ بھلا بات کیا کرتے ۔ ویسے آج کل کے لڑکے تو اتنی باتیں کرےہں ہیں کہ لوگ منہ دیکھتے رہ جائیں ہیں ۔ پر چھوٹے بابو ان کی باتیں جبھی تک چلیں ہیں ۔ جب تک کوئی دور جارئیی ہو ۔ اور ہمارے بابو جی تو بس پی جانا ہی جانیں تھے ۔ وہ چلی گئی تو پھر وہ لگے مجھے گھورنے رہنا یہ کیا کیا تو نے سوجی لا دی وہ کیا کہتی ہوگی مجاک کیا ہے مجھ سے ۔ اور چھوٹے بابو میں چپ ۔ اور کرتا بھی کیا ۔ آکھر رسوئیہ ہی ہوں نا چاہے وہ کیسا اچھا ہی کیوں نہ جانیں ۔ پھر بھی رسوئیہ ہی ہے"۔

"ہوں ۔ ٹھیک ہے رہنا" ۔ پرکاش بولا ۔ "اچھا تو پھر بھی کبھی آئی وہ"۔

"ہاں چھوٹے بابو صرف ایک دپھہ" ۔ وہ چپ ہوگیا ۔ آنکھیں بھر آئیں اور چند ساعت کے لئے بت بنا بیٹھا رہا ۔

"دن ڈھلا ہوا تھا اور میں رسوئی میں بیٹھا تھا ۔ بابو جی اندر لیٹے دے تھے ۔ وہ آئی اور منہ پر انگلی رکھ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا ۔ پھر پاس آئی اور میرے کان سے منہ لگا کر بولی ۔ کہاں ہیں ۔ میں نے انگلی سے بتایا کہ اندر لیٹے دے ہیں ۔ بولی چپ پھر ایک لپھاپھہ نکال کر دیا مجھے یہ دے دو انہیں ۔ پر اُنہیں یہ نہ بتانا کہ میں لائی ہوں ۔ کہنا کوئی دے گیا ہے ۔ اور کہنا جواب مانگا ہے ۔ میرا بتایا تو میں ناراج ہو جاؤں گی ۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں ۔ وہ کچھ کہے اور اُسے نہ کرنا مشکل ہو جائے تھا ۔ ایسی اچھی تھی وہ ۔ وہ تو کونے میں لگ، چھپ کر کھڑی ہوگئی اور میں سمجھا کچھ مجاک ہے ۔ سو میں بھاگ کر بابوجی کے پاس لے گیا وہ لپھاپھہ ۔ مجھے کیا مالوم کیا بھرا ہے اس میں ۔ بابو جی نے کھولا ۔ پڑھا اور رنگ ہلدی سا ہوگیا ۔ بولے کس نے دیا ہے تمہیں ۔ میں نے کہا بابوجی ایک لڑکا آیا تھا اُس دیوی نے بھیجا ہے ۔ اور جواب کو کہا ہے ۔ بولے کب آیا تھا ۔ میں نے کہا جب آپ پڑھنے گئے دے تھے ۔ اوہ ۔ اوہ وہ پاگلوں کی طرح

پھرنے لگے ۔ اب میں کیا کروں ۔ کیا کروں میں ۔ اب کیا ہوگا رینا ! اور میں حیران میں نے پوچھا کیا لکھے ہیں ۔ بولے کچھ نہیں ، کچھ نہیں ، تم اب جاؤ ۔ جاؤ تم ۔ اب جو میں رسوئی میں آیا تو وہ کونے سے لگی کھڑی تھی ۔ منہ پر ہنسی پر چھوٹے بابو جافران کی سمان جرد رنگ ۔ پھر میرے کان سے منہ لگا کر بولی ۔ پوچھو ، جب وہ لڑکا آئے تو کیا جواب دوں ۔ مجھے تو ڈر لگتا تھا بابو جی کے سامنے جاتے دے ۔ پر اس نے کہا ۔ تو کیسے نہ جاتا میں ۔ چلا گیا اور وہ جواب کا سن کر کھینچنے لگے ۔ رینا ، رینا سچ بتا یہ انہوں نے بھیجا ہے ۔ سچ بتا رینا ۔ جی ، میں نے کہا ۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولے ۔ اب کیا ہوگا ۔ اچھا رینا مجھ سے ایسا مجاک نہ کرو ۔ میں نے کہا ، بابوجی میں کیوں کرنے لگا آپ سے مجاک ۔ لیکن میرے ماتا پتا ، وہ بولے کیا کہیں گے ۔ رینا ۔ ماتا تو مان جائے پر پتاجی کیسے مانیں گے اور ۔ اور رینا جانے وہ کون ہے ۔ نہ جانے کیا جات ہے اسکی ۔ میں پتاجی کو کیا بتاؤں گا ۔ نہیں نہیں میں پتاجی سے کیسے کہہ سکتا ہوں رینا میں نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا ۔ میں حیران چھوٹے بابو ۔ اب میں کھڑا ان کا منہ دیکھ رہا ہوں ۔ اور پھر جو سر اٹھایا میں نے تو دروازے میں وہ آپ کھڑی ہے ۔ لال ، لال آنکھیں اور ہونٹ گسے سے بھرے دے ۔ ایک نجر اس نے بابو جی کی طرپھ دیکھا ۔ اور بابوجی بُت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ وہ بولی ۔ آپ کو مجھ سے کرج ہے یا جات سے ۔ وہ چل پڑی ، اب بابوجی پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگے ۔ اور بولے نہ جاؤ بلبیر!! ۔ یہ اس کا نام تھا نا نہ جاؤ گسے نہ ہو جانا بلبیر ! ۔ میرے ماتا پتا ۔ میں ان کی مرجی بنا کیا کر سکتا ہوں ۔ تم نہ جاؤ ۔ آکھر چھوٹے بابو وہ کھڑی ہوگئی اور بولی اچھا تو پوچھ لیجئے اپنے مات پتا سے ۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے ملنا ۔ اگلے بدھ کو باگ میں ملوں گی میں ۔ اسی وقت ۔ اور اور وہ ہونٹ کاٹ کر بولی ۔ اگر نہ ملے آپ تو بس میں سمجھ لوں گی کہ وہ نہیں مانے ۔ پھر میں کبھی نہ ملوں گی ۔ یہ کہکر وہ چلی گئی ۔

"چھوٹے بابو مجھے کیا کھبر تھی کہ یہ بات ہے ۔ میں تو مجاک سمجھتا رہا ۔ پر اس سمے مجھے مالوم ہوگیا کہ مجاک نہیں ۔ اور بابوجی تو پھر بالکل اپنے آپ سے

بھی گئے ۔ کبھی روتے کبھی لیٹ رہتے اور کبھی آپ ہی آپ ادھر ادھر پھرتے اور بڑبڑاتے ۔ پتا جی کیا کہیں گے ۔ نہیں نہیں میں تو پتا جی سے نہ کہوں گا ۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اور پھر چپ ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد پھر بولتے ۔ نہیں نہیں میں جاؤں گا ۔ مجھے جانا ہی ہوگا ۔ میں جاؤں گا جرور جاؤں گا چاہے کچھ ہو ۔ رینا ۔ رینا میں جاؤں گا اور چھوٹے بابو ساری ساری رات نہ سوئے ۔ سوتے بھی تو آپ ہی آپ اٹھ بیٹھتے اور یہی چلاتے ۔ پھر مجھے مالوم ہوا کہ اس نے بیاہ کے لئے لکھا تھا ۔ پر چھوٹے بابو کبھی سنا ہے ۔ آپ نے کہ لڑکی آپ اپنے بیاہ کی بات کرے ۔ توبہ ۔ پر وہ کالج کی تھی نا ! بارہوس میں تھی ۔ کالج کی لڑکی کا کیا ہے چھوٹے بابو چاہے جو بھی کہہ دے ۔ اس کا کیا ہے ۔ اور وہ تھی بھی ایسی تیج"۔

"اس روج کے بعد" اسنے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "میں نے اس کو اس سڑک پر سے گجرتے نہ دیکھا ۔ میں سارا سارا دن کھڑا رہتا ۔ چھوٹے بابو پر وہ آتی تو دکھتی نا ۔ ادھر بابو جی بھی انتجار کرتے پر وہ نہ آئی ۔ اور بابو جی کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جائے تھی ۔ سو چھوٹے بابو میں نے بابو جی کو دلاسہ دیا ۔ اور آپ بڑے لالہ جی سے بات کرنے کے لئے گاؤں چلا گیا ۔ پر چھوٹے بابو وہاں میری بات کون سنے تھا ۔ بڑے لالہ جی سے بات کی تو وہ ہنس پڑے بولے کس کی لڑکی ہے وہ کتنی جائداد ہے اس کے پتا کی ۔ اور ان کی جات کیا ہے ۔ اب میں کیا بتاؤں بابوجی ۔ بس چپ ہو رہا میں ۔ پر ماتا جی سے میں نے ساری بات کہہ دی ۔ ساری بات سُنادی انہیں ۔ اور ماتا جی تو سن کر مجھ پر ٹوٹ پڑیں ۔ بولیں اچھا اب ایسا ہوگیا ہے وہ ۔ نرلج کہیں کا ۔ رینا اگر اس نے ایسی ویسی سے بیاہ کر لیا تو میں جہر کھا لوں گی جہر ! نہ جانے کیا کیا بولتی رہی وہ رینا نے آہ بھری ۔ بس مہاراج میں اپنا سامنہ لئے آگیا واپس ۔

بابو جی نے مجھے دیکھا اور جھٹ سمجھ گئے ۔ بولے ۔ میں تو پہلے ہی جانوں تھا ۔ میں جانتا تھا وہ نہیں مانیں گے ۔ رینا ، رینا تم بولتے نہیں ۔ بولو کیا کہا ہے انہوں نے ، پتا جی کیا کہتے تھے ۔ تو چھوٹے بابو اب میں کیا کہتا ۔ میں

نے چپکے سے سر ہلایا ۔ پھر وہ بولے لیکن ماتا جی ۔ ماتا جی نے تو نہ ، نہ کی ہو گی ۔ رینا بتاؤ مجھے ۔ تم چپ کیوں ہو ۔ میں نے کہا ۔ جی وہ کہیں تھیں ۔ جو ایسا کیا اُس نے تو میں جہر کھا لوں گی ۔ جہر! ؟ وہ بولے ، اور پھر دھم سے پلنگ پر گر پڑے ۔ اب بابو جی کا اور بھی بُرا حال ہوگیا ۔ ہر سمے بولتے ۔ نہیں نہیں رینا میں نہیں جاؤں گا ۔ میں نہیں جاؤں گا رینا ۔ کیا ماتا جی سچ مچ جہر کھالیں گی ۔ رینا سچ بتاؤ ۔ اب میں کیا بتاتا بابوجی ۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولتے رینا میں جرور ملوں گا ۔ میں جرور ملوں گا ۔ میں جیوں گا ۔ مجھے جینا ہے رینا ۔ مجھے بھی کئی بار کھیال پڑتا ہے چھوٹے بابو کہ نہ جانے وہ کون دیوی ہے ۔ نہ جانے کیسے لوگ ہیں وہ ۔ بڑے لالہ جی سچ کہتے ہیں ، پر مجھے پوچھتا ہی کون تھا ۔ ہاں بابو جی کی حالت دیکھی نہ جائے تھی ۔

پھر بدھ کا دن آگیا جب اس نے باگ میں ملنا تھا بابو جی سے پر اس روج تو بابو جی نڈھال پڑے تھے ، مہاراج آٹھ دن نہ کھایا نہ پیا اور ہر سمے اٹھ اٹھ کر پاگلوں کی سمان بھاگتا ۔ مجھ سے بولے رینا پتا جی کی اور بات ہے پر ماتا جی ، ماتا جی نے جہر کھا لیا تو ۔ لیکن رینا میں جاؤں گا ۔ مجھے جانا ہی ہوگا ۔ پھر آپ ہی آپ سوچ میں پڑ جاتے ۔

جب دو گھنٹے رہ گئے تو مجھے بلایا ۔ بولے رینا ۔ مجھے ڈر ہے میں چلا نہ جاؤں ۔ رینا ماتا جی کو بچالو ۔ تم ماتا جی کو بچا سکتے ہو رینا! ۔ ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رینا ۔ میں بچا لوں ۔ میں حیران ، چھوٹے بابو میں بھلا ماتا جی کو کیسے بچا سکتا تھا ۔ بولے ہاں تم بچا سکتے ہو ماتا جی کو رینا ۔ بچاؤ گے ؟ میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا اور کیا کرتا میں چھوٹے بابو ۔ بولے سوگند کھاؤ ۔ میں نے کہا بھگوان جانتا ہے ۔ جو آپ کہیں گے کروں گا ۔ بولے اچھا تو ایک تالہ لے آؤ ۔ پھر وہ میرے ساتھ پچھلے کمرے میں چلے گئے اس کمرے کا ایک دروازجہ تھا ۔ بولے رینا یہ لو دو روپے آج دونو شو دیکھنے ہیں تم نے ۔ میں حیران ۔ بولے اور جاتے دے ہیں کمرے کو باہر سے تالہ میں نے پوچھا ، بولے اور جاتے دے اس کمرے کو باہر سے تالہ لگا دینا ۔ تالہ میں نے پوچھا ، بولے ہاں کہیں

میں چلا نہ جاؤں مجھے ڈر ہے میں چلا جاؤں گا رینا میں چلا جاؤں گا ۔ ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رینا ۔ جاؤ ۔ ابھی تالہ لگا کر چلے جاؤ ۔ چلے جاؤ ۔ اور مہاراج وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑے اور رو رو کر حال بیحال کر لیا ۔ اب میں کیا کرتا مہاراج میں نے درواجے کو باہر سے تالہ لگا دیا اور آپ چلا گیا"۔

"تو پھر وہ کبھی نہ آئی"۔ پرکاش نے پوچھا ۔

رینا نے سر ہلا کر انکار کر دیا ۔ اس سے اس کی آنکھوں میں ان بہے آنسو چھلک رہے تھے ۔

"اور دروازہ بند ہی رہا" پرکاش گنگنایا ۔

"جی" رینا بولا ۔

عین اس وقت ساتھ والے کمرے سے کسی کی آواز آئی ۔ "ساوتری ۔ تم پھر کھڑکی میں آبیٹھی ہو ۔ ساوتری ۔ تم سے جو کہا ہے دروازہ کھول کر نہ بیٹھا کرو"۔

پرکاش چونکا ۔ اور مجھ سے کہنے لگا ۔ "سنا تم نے یہ کمرا ہے اس کا ۔ غالباً اس کا پِتا گھور رہا ہے ۔ ساوتری ۔ اچھا نام ہے ۔"

"چل اٹھ یہاں سے" آواز آئی پھر آئی "راجو یہ کھڑکی بند کر دو بند کر دو اسے"۔

معاً بابوجی کمرے کے بیرونی دروازے کے پیچھے بڑبڑائے "لو یہ دروازہ بھی بند ہوگیا ۔ یہ بھی بند ھوگیا ۔ اب کوئی کیا کرے ۔ رینا او رینا"۔ رینا نے جلدی اٹھ کر دورازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے ۔ "تم آ گئے رینا ۔ بڑا اچھا ہے"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے ہماری طرف آئے "تم آجایا کرتے ہو ، رینا ضرور آجایا کرتا ہے ۔ مسٹر ۔ مسٹر ۔"

"مسٹر بلراج" ۔ پرکاش نے انہیں یاد دلایا ۔

" مجھے نام یاد نہیں رہتے ۔ مسٹر راج ۔ اچھا ہوا تم نے چائے پی لی ۔

بڑا اچھا ہوا ۔ مہربانی ہے ۔ مہربانی ۔ رینا اب دروازہ بند نہ کرنا وہ بولے ۔ ہم قیدی نہیں ۔ نہیں ہم قیدی نہیں ہیں ۔ اچھا تو میں چلتا ہوں ۔ مجھے جانا ہے ۔ میں ذرا ہو آؤں ۔ رینا ۔ اوہ پھر چلا گیا“ ۔ وہ شکایت کرنے لگے ۔ لیکن ان کی آنکھیں ۔ حسرت ، یاس اور بے بسی سے بھری تھیں ۔ اچھا میں ہو آؤں ؟“ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئے ۔

○

گہرائیاں

ویسے تو شیخ صاحب محلے بھر میں نہائت شریف آدمی سمجھے جاتے تھے ۔ مگر بیویوں کے حق میں لوگ دل ہی دل میں انہیں مہلک سمجھتے تھے ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اور ثبوت یہ تھا ۔ کہ ان کی تینوں بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہو چکی تھیں ۔ انہیں بیویاں ادلنے بدلنے کا شوق نہیں تھا ۔ بلکہ اسی بات پر وہ اکثر مغموم رہا کرتے تھے ۔ اور جب کبھی وہ شہزادہ سے بات چیت کرتے تو خواہ مخواہ ان کی گردن جھک جاتی ۔ ان کے منہ سے بیساختہ "جی ہاں جی ہاں" نکل جاتا اور ان کے انداز سے ایسا ظاہر ہوتا جیسے وہ اسے بیاہ کر لانے کی تلافی کر رہے ہوں ۔

شہزادہ ان کی چوتھی بیوی تھی ۔ اور ان کے دوست مولوی محمد عثمان کی بیٹی ۔ مولوی صاحب نہایت پاکباز آدمی تھے ۔ ان کا ایمان تھا کہ جسم نجات کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے ۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو اسی اصول کے ماتحت روحانی تربیت دی تھی ۔ مگر وہ روحانی تربیت شہزادہ کے جسم کی نشوونما کو روک نہ سکی تھی ۔ حتیٰ کہ اس کے متناسب جسم کے پیچ و خم کو شباب نے سانچے میں ڈھال دیا تھا ۔ اور شہزادہ اس اصول سے ابھر کر ایک حسین مجسمہ بن گئی تھی ۔ جیسے وہ جسم اس اصول پر طنزاً مسکرا رہا ہو ۔ شہزادہ کی طرف دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی مخملیں گلابی جسم ابھر ابھر سمٹ کر آپ سے کچھ کہہ رہا ہو ۔ جسے سن کر یا محسوس کر کے آپ کا جی چاہتا کہ اٹھ کر کچھ پھوڑ دیں یا کسی سے لڑ پڑیں ۔ اور اگر شہزادہ کی گہری عنابی آنکھیں مسکرا کر دیکھ لیں تو ـ ـ ـ ـ ـ مگر شہزادہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں ۔ اور وہ تسلیم کی کالی کالی موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتی تھی ۔

تسلیم شیخ صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ اور ان کی پہلی بیوی جہاں آرا سے

تھی ۔ تسلیم کو دیکھ کر شہزادہ خواہ مخواہ غصہ محسوس کرتی ۔ شائد اس لئے کہ تسلیم کی آنکھیں اسے بہت پسند تھیں ۔ یا اس لئے کہ وہ آنکھیں اس کے اپنے چہرے پر نہ تھیں ۔ یا شائد اس لئے کہ شیخ صاحب تسلیم کے متعلق شہزادہ کی کوئی بات نہ سنتے تھے ۔ بہرصورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو ۔ شہزادہ بات بات پر تسلیم کو "اندھی ہے کیا ۔۔۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا" کہنے کی عادی تھی ۔ تسلیم سن کی پی جاتی اور اس کی آنکھیں ان بہے آنسوؤں سے بھیگ کر اور بھی جاذب نظر ہو جاتیں ۔ تسلیم کی عمر کوئی سولہ برس کی ہو گی ۔ مگر اس کا شباب ان خاموش ، نمناک آنکھوں نے جذب کر لیا تھا ۔ اور اس کے اعضاء ان لطیف حرکات سے ناواقف رہ گئے جن سے شباب اپنا اظہار کرتا ہے ۔

البتہ جب کبھی تسلیم کا خالہ زاد بھائی ان کے گھر آ جاتا تو خدا جانے کہاں سے ایک ہلکی سے سرخی آ کر اس کے چہرے پر جھلکی دکھا جاتی ۔ اور کرامت کی کسی نہ کسی بات پر اس کے ہونٹ تبسم سے کھل جاتے اور وہ تبسم اس کی آنکھوں میں جا جھلکتا ۔ شہزادہ کرامت سے باتیں کرتے ہوئے تسلیم کی وہ حرکات بن دیکھے محسوس کرتی ۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کیا کہنے والی تھی ۔ ادھر کرامت کی نگاہیں بھی ان کی گفتگو سے بیگانہ رہتیں ۔ اور کرامت کی نگاہوں کو دیکھ کر اور تسلیم کی متبسم آنکھوں کو محسوس کر کے اس کے دل میں ان جانا غصہ کھولنے لگتا ۔

پھر جب کرامت چلا جاتا تو شہزادہ یوں محسوس کرتی جیسے اس گھر کی دیواریں بہت اونچی ہوں ۔ اندر لوگ یوں چل پھر رہے ہوں جیسے کسی ویرانے میں بھوت اور وہ خود ایک پریشان ، نہ ختم ہونے والا خواب ہو ۔ اس وقت تسلیم کی نمناک آنکھوں کو دیکھ کر اسے ان کا گذشتہ تبسم یاد آ جاتا ۔ اور وہ کسی نہ کسی بات پر کہتی ۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ ابا کا کوٹ جھاڑ دینا ۔ مگر تم سنتی ہی نہیں ۔۔۔۔۔ اور یہ دیکھو میز پوش پر دھبہ لگا کر ناس کر دیا ہے ۔ لکھتے وقت تمہیں دکھائی نہیں دیتا" ۔

اس روز کرامت کے جانے کے بعد شہزادہ بہت ہی پریشان تھی ۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ لمبی لمبی دیواریں آپس میں ملی جا رہی ہوں ۔ وہ دو

ایک مرتبہ اندر گئی باہر آئی اور پھر اندر چلی گئی ۔۔۔۔۔ آئینہ دیکھ کر اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس خوبصورت سی تصویر سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو ۔ جیسے وہ چہرہ اس کا منہ چڑا رہا ہو ۔ پھر وہ باہر صحن میں آ بیٹھی ، اس کے سر پر ایک پھیکا سا اداس آسمان پھیلا ہوا تھا ۔۔۔ ۔۔ بانو کو آتے ہوئے دیکھ کر اس نے مُسکرانے کی کوشش کی ۔

"میں کہتی ہوں بانو ، دو روز سے پڑوس میں زبیدہ کے متعلق کیا جھگڑا ہو رہا ہے" ۔ اس نے بات شروع کرنے کے لئے کہا ۔

"لو بی بی وہ ویسے ہی باتیں بناتی ہے ۔ محلے میں کون نہیں جانتا ۔۔۔۔۔ میں نے ان آنکھوں سے انہیں ملتے دیکھا ہے" ۔

"سچ کہتی ہو" ۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر کہا ۔

"اور تو کیا بی بی مجھے اس سے کوئی لاگ ہے کہ اسے برا کہوں" ۔

"مگر بانو ۔ لوگوں کو یوں ملنے ملانے کی جرأت کیسے ہوتی ہے ۔ توبہ ۔ میں تو اس خیال سے ہی کانپ اٹھتی ہوں" ۔ اس نے کانپ کر کہا ۔

"سچ پوچھو بی بی مجھے تو اس بیچاری پر ترس آتا ہے ۔ جوان لڑکی ہے ۔ وہ بھلا اپنی جوانی برباد کیوں کرے ، بیاہ کے وقت ماں باپ کہاں تھے ۔ جو اسے اس بڈھے کے سر تھوپ دیا ۔ اب لوگ خواہ مخواہ اس بیچاری کے سر ہوتے ہیں" ۔

"چلو چھوڑو ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو برا کہیں ۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں اس مقابل والے مکان میں کون آئے ہیں ؟"

"یہی بات تو میں کہنے آئی تھی ۔ مگر جو تم برا مانو بی بی تو میں کہوں گی ہی نہیں" ۔

"آخر بات کیا ہے ؟" شہزادہ نے متفکر انداز سے پوچھا ۔

بانو قریب تر ہو بیٹھی اور بولی "بات کیا ہونی تھی ۔ یہی جو سامنے والے گھر میں آئے ہیں نا ۔ ایک بڑھیا ہے اور ایک جوان مشٹنڈا سا لڑکا ۔ ابھی کل

ہی تو آئے ہیں مگر وہ لڑکا کسی وقت بھی تو کھڑکی سے نہیں سرکا ، ہر آتے جاتے کو یوں آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنا ۔ چاہے تم کچھ بھی کہو ۔ مگر مجھے تو یہ بات پسند نہیں ۔ تمہارے گھر میں اللہ رکھے جوان لڑکی ہے ۔ اور پھر اس کے کمرے کی کھڑکیاں بھی تو ان کھڑکیوں کے مقابل کھلتی ہیں ۔ اس میں بڑی بے پردگی ہے بی بی" ۔

"اس میں برا ماننے کی کون سے بات ہے ؟" شہزادہ نے جوش میں کہا ۔ "یہ تو الٹی ہمارے ہی بھلے کی ہے ۔ میں کہتی ہوں اگر تمہیں ہمارے برے بھلے کا خیال نہ ہو تو پھر ہو گا کسے ۔ تسلیم کے ابا کو تو ان باتوں کا خیال ہی نہیں ۔ کئی دفعہ ان سے کہہ چکی ہوں کہ لڑکی اب جوان ہے اس کی کوئی فکر کیجیئے ۔ مگر لڑکی کے متعلق تو وہ میری بات تک سننے کے روادار نہیں" ۔

"یہ بھی کوئی بات ہے بی بی ۔ لو تمہیں لڑکی کا فکر نہ ہو تو کسے ہو ۔ آخر ایک روز شادی کرنی ہی ہے" ۔ بانو نے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا ۔

"تم نہیں جانتی بانو" ۔ شہزادہ نے بڑھ کر رازدارانہ انداز میں کہا ۔ "ویسے دیکھ لو ہر بات میں میں جو چاہوں کروں ۔ مگر لڑکی کے متعلق وہ کچھ سنتے ہی نہیں ۔ وہ حمید کا جھگڑا ہوا تھا نا ۔ تم تو جانتی ہو ۔ توبہ ۔ لڑکی منہ پر مکر گئی ۔ اور کتنا پاکھنڈ مچایا ۔ اس کے ابا تو صاف کہنے لگے کہ میں نے لڑکی پر جھوٹا بہتان لگایا ہے" ۔

"مگر بی بی ، سچ پوچھو تو تم نے بھی بن سوچے سمجھے بات کہہ دی"۔ بانو آنکھ چمکا کر بولی ۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات میرے ہی سر چڑھے گی ۔ میں نے تو ان کے بھلے کی بات کی تھی ۔ ورنہ ایک روز جگ ہنسائی ہوتی" ۔

بانو قریب تر سرک آئی اور کان میں منہ دے کر کہنے لگی ۔ " تم بھی سیدھی سادی ہو ۔ یہ کوئی شرافت کا زمانہ تھوڑا ہی ہے ۔ تمہیں تو چاہیئے تھا کہ کوئی خط پکڑ کر ان کے سامنے جا رکھتیں" ۔

"یہی تو مجھے افسوس ہے ۔ مگر بانو اب تو وہ بات ہاتھ سے گئی ۔ شہزادہ

کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں ۔ بانو ایمان سے میری کوئی بری نیت نہیں ۔ تمہارے سر کی قسم میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ لڑکی اب اپنا گھر بسائے ۔ جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا ۔۔۔۔۔"

" لو بی بی ، یہ بھی کوئی بات ہے" ۔ بانو نے بات کاٹ کر کہا ۔ "تم چاہو تو دو ہی دن میں ان کے سامنے سرخرو ہو جاؤ ۔ خط سامنے جا رکھنا" بانو نے ایک اسرار بھری مسکراہٹ سے شہزادہ کی طرف دیکھا ۔

"خط ! وہ کیسے ؟" شہزادہ دل تھام کر رہ گئی ۔

"واہ بی بی تم بھی بھولی ہو ۔ یہ تو کمبخت رشتہ ہی ایسا ہے ۔ یہاں لاگ لپیٹ کے بغیر کام نہیں چلتا ۔ اور تم کوئی بری نیت سے تھوڑا ہی کرو گی ۔ اس میں تو اُسی کا بھلا ہے" ۔

"ایمان سے بانو مجھے اس لڑکی سے بَیر نہیں ۔ میں تو ۔۔۔۔۔"

"لو بی بی میں بھلا سمجھتی نہیں" ۔

"اچھا تو بانو یہ کیسے ممکن ہے ۔ بس انہیں میری بات کا ثبوت مل جائے ۔ اور لڑکی اپنا گھر جا بسائے ۔ بس میں تو یہی چاہتی ہوں" ۔

"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ۔ دو دن کا کام ہے" ۔ بانو نے لاپرواہی سے کہا ۔

"مگر کرو گی کیسے ؟"

بانو کچھ سوچ کر بولی ۔ "یہ جو سامنے مکان میں لڑکا ہے بس اسے ہی لپیٹ لو ۔ اپنی بہن سے خط لکھوا کر اسے پہنچا دوں گی ۔ وہ سمجھے گا ۔ کہ تسلیم نے بھیجا ہے ۔ ان لونڈوں کا کیا ہے ۔ ان کو تو ایسی بات اللہ دے ۔ فوراً جواب لکھے گا ۔ بس وہ خط سنبھال کر رکھ لینا" ۔

"ہائیں" ۔ شہزادہ نے خوشی بھری حیرانی سے کہا ۔۔۔۔۔ "مگر بانو بات نکل گئی تو ؟"

"میرا ذمہ بی بی ۔ تم بے فکر رہو ۔ تم پر آنچ نہ آنے دوں گی" ۔

"مگر بانو ۔ خط کا جواب کون لائے گا ۔ اس بات میں کسی اور کو نہ لانا چاہیئے" ۔

"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں ۔ تم بے فکر رہو ۔ بی بی ۔ یہ کہہ کر بانو سوچ میں پڑ گئی ۔ پہلا خط میں کسی لڑکے کے ہاتھ بھجوا دوں گی ۔ لکھ دینا اور میں اپنی بہن سے نقل کروا لوں گی ۔ وہ اچھی خاصی اردو لکھ لیتی ہے ۔ تین جماعتیں پاس ہے تم خط اس طرح لکھنا جیسے تسلیم کا ہو ۔ اور اس میں لکھ دینا کہ اس بیٹھک کی کھڑکی میں رکھ جائے اور پھر اگلے روز وہیں سے اس کا جواب لے جائے ۔ کھڑکی میں سلاخیں تو ہیں ہی ۔ رات کو کھڑکی کھلی رکھا کرنا ۔ نو دس بجے آکر وہ خط پھینک جایا کرے گا ۔ اور اٹھا کر بھی لے جایا کرے گا ۔ بس دو خطوں کی ضرورت ہے"

"ترکیب تو خوب ہے" ۔ شہزادہ نے سوچ کر کہا ۔ "مگر تسلیم اس کے سامنے تو ہوگی نہیں ۔ وہ بھی دل میں کیا کہے گا کہ خط تو آرہے ہیں مگر لکھنے والی کا پتہ ہی نہیں چلتا" ۔

"کیوں ۔ اسے بھلا کیا پتہ کہ تسلیم ہے کون ۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی بھی تو گلی ہی میں کھلتی ہے ۔ وہاں گھڑی دو گھڑی کھڑے ہو کر بال بنا لیا کرنا ۔ اسے کیا خاک پتہ چلے گا ۔ کہ تم کون ہو ۔ وہ یہی سمجھے گا ۔ کہ تسلیم کھڑی ہے" ۔

"ہائیں ۔ میں" ۔ شہزادہ بھونچکی رہ گئی ۔

لو بی بی اس میں کیا بات ہے ۔ تمہیں کیا اس سے آنکھیں ملانی ہیں ۔ اور پھر دو ایک دن کی تو بات ہے ۔ اور اس بات کا پتہ بھی تو کسی کو نہ چلے گا ۔ آخر ایسی باتوں میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے نا ــــــ"

"نہ بانو ۔ مجھ سے تو ایسا ــــــ" شہزادہ نے گھبرا کر کہا ۔

"اللہ نہ کرے تمہاری کوئی بری نیت ہے بی بی ، بانو نے کہا ۔ "اور ڈر کس بات کا ہے ۔ تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو وہ تمہیں کھا جائے گا" ۔

بانو چلی گئی تو کچھ دیر شہزادہ چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ پھر وہ بیساختہ اٹھ

بیٹھی ۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ توبہ ہے ! خدا جانے لوگ ایسی باتیں کیسے کر لیتے ہیں" ۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔۔۔ وہ کوٹھے پر چلی گئی ۔ سامنے بیڈھب سے مکانوں کا تسلسل دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے زندگی ایک بے معنی سا پھیلاؤ ہو ۔ گُل عباسی کا پودا دیکھ کر اس نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ پودا گرد آلود ہو رہا تھا ۔۔۔۔۔ اس نے وہ گلدان اٹھا لیا اور نیچے اتر گئی ۔

"تسلیم دیکھو خدا جانے کتنے دنوں سے تم نے اسے پانی نہیں دیا ۔ بیچارہ سوکھ گیا ہے" ۔ تسلیم کی آنکھیں جھک گئیں ۔۔۔۔۔ شہزادہ کو یوں چپ دیکھ کر وہ حیران سی ہو رہی تھی ۔ شہزادہ نے اس پیڑ پر پانی چھڑکا ۔ پھر غسلخانے میں چلی گئی ۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے تسلیم کو آواز دی ۔ "مجھے ذرا اپنا دوپٹہ تو دینا ۔ تم جب تک اس کھونٹی سے میرا ہوائی ڈوپٹہ لے لو" ۔ تسلیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا ۔

"میرا دوپٹہ تو میلا ہے" ۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا ۔

"کوئی بات نہیں" ۔ شہزادہ مسکرا دی ۔

شہزادہ نے کمرے میں جا کر اپنے بال سنوارے اور پھر پلنگ پر یوں جا بیٹھی جیسے اسے کوئی کام ہی نہ ہو ۔۔۔۔۔ کمرے میں اس نے اندھیرا سا محسوس کیا ۔ اس کی نگاہیں پھر کر کھڑکی پر جا ٹھہریں ، کھڑکی بند پڑی تھی ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔ کھڑکی کھولتے ہوئے اسے مقابل والا مکان یاد آ گیا ۔ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی ۔ "افوہ میں تو بھول ہی گئی" ۔۔۔۔۔ مجھ سے تو ایسی بات نہ ہو سکے گی ۔۔۔۔۔ "مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے" ۔ کوئی اُس کے دل میں کہہ رہا تھا ۔ "تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو ؟"

اس نے کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھولے ۔

سامنے کھڑکی میں ایک جوان لڑکا کچھ پڑھ رہا تھا ۔ اس کی چوڑی چھاتی ۔ گویا یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور فراخ ماتھے پر دو گھنے ابرو تنے ہوئے تھے ۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹھوڑی پکڑے ہوئے وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا ۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں" ۔ شہزادہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے سامنے گوالن دودھ دوھ رہی تھی ۔ خدا جانے کتنی دیر وہ غور سے اس گوالن کو دیکھتی رہی ۔ "عباس" ۔ کسی نے گلی سے آواز دی ۔ شہزادہ کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی ۔ وہ لڑکا اٹھ بیٹھا ۔ "کون ہے ؟" اس نے بھاری آواز میں پوچھا ۔۔۔۔۔ شہزادہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا ۔ اس کی آنکھوں میں عجیب تبسم جھلک گیا ۔۔۔۔۔ شہزادہ کی آنکھیں جھک گیئں ۔ اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں اس کا دوپٹہ سرک گیا ۔

"کیسا ہرا بھرا پودا ہے" ۔ شہزادہ نے گل عباسی کے پیڑ کو دیکھ کر کہا ۔ "اب اس میں پھول لگیں گے" ۔ اس نے پیار سے ایک سرخ پھول کو چھوا "گل عباسی ۔۔۔۔۔ عباس اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ پھول اس کی انگلیوں کو دبا رہا ہو ۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں" ۔ وہ مسکرا دی ۔ "اتنا کام پڑا ہے اور میں سب کچھ بھولی جا رہی ہوں" ۔

شہزادہ بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کے بال پریشان تھے ۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں ۔ اور وہ بیٹھی عباس کا خط پڑھ رہی تھی ۔ وہ عباس کا تیسرا خط تھا اس کے بے تکلف الفاظ شہزادہ کے روئیں روئیں میں ناچ رہے تھے ، اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی ۔ کہ وہ خط "میری تسلیم" سے مخاطب ہے ۔ "میری" اس کے دل میں میری کا ایک دلچسپ اور نیا مفہوم پیدا ہو رہا تھا "میری ۔۔۔۔۔"

سامنے گل عباسی کے پھول لہرا رہے تھے ۔ سرخ سرخ پھول ۔ باہر آسمان پر صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی ۔ گلی دُور سے دوڑ کر کسی کے آنے کے لئے راستہ بنا رہی تھی ۔ مکانوں کی قطاریں خاموش تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں ۔ وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ کوئی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ "تمہاری آنکھیں کس قدر شوخ ہیں" ۔ کسی کاغذ سے حروف نکل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے ۔ اور وہ مسکرا دی ۔ ایک ساعت کے لئے اس کے سامنے

تسلیم کی آنکھیں آ گئیں ۔ بڑی بڑی سی اندھی آنکھیں ۔ آئینے میں کوئی مسکرا مسکرا کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا ۔

دوپہر کے وقت شہزادہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا ۔ ٹرنک کھولا ۔ اور زیور کی ڈبیا میں سے تین کاغذ نکالے ۔ ان کو ایک بار پڑھا ۔ پھر کاغذ لیا اور کچھ لکھا ۔ اور بانو کے انتظار میں بیٹھ گئی ۔

"یہ لو" اس نے بانو کو وہ رقعہ دیتے ہوئے کہا ۔ "اسے اپنی بہن سے لکھوا کر مجھے شام تک پہنچا دینا" ۔

بانو نے وہ رقعہ لے کر پلے میں باندھ لیا ۔

"میں کہتی ہوں بی بی ۔ اس کے خطوں میں کیا لکھا ہوتا ہے" اس نے شہزادہ سے پوچھا ۔ اور اس کی آنکھ میں نقرئی چمک جھلکنے لگی ۔

"کچھ بھی نہیں ۔ بس ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں ۔ ابھی تک اس نے ہمارے مطلب کی کوئی بھی بات نہیں لکھی ـــــ میرا تو خیال ہے کہ اب کے بار اس کا جواب آئے تو یہ قصہ ختم ہی کر دیں" ۔

"مگر بی بی اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے ۔ دو ایک خط اور لکھ دیکھو ـــــ میں تو حیران ہوں بی بی ۔ ایسے جوان لڑکے تو جھٹ بات کا بتنگڑ بنا لیا کرتے ہیں ۔ خدا جانے اس کو کیا ہوا ـــــ میں کہتی ہوں بی بی تم وہ خط مجھے تو سناؤ ۔ کچھ پتہ تو چلے ۔

"اچھا" ۔ شہزادہ نے جھجک کر کہا ۔ "تم سے کیا پردہ ہے" ۔ پھر سوچ کر اس نے کہا ۔ "اس وقت تو ان کے آنے کا وقت ہے ، کل سہی" ۔

رات کو نو بجے جب شیخ صاحب نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو شہزادہ نے اپنے ٹرنک سے وہ رقعہ نکالا ۔ اسے ایک بار پڑھا اور بیٹھک میں رکھنے چلی گئی ۔ کھڑکی میں اس نے ایک لکڑی کی خالی صندوقچی رکھ چھوڑی تھی ۔ جس میں وہ رقعہ رکھ دیا کرتی اور عباس اٹھا کر لے جایا کرتا تھا اور جواب ڈال دیا کرتا تھا ۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صندوقچی کھولی ۔ اس کے اندر ایک رقعہ پڑا ہوا دیکھ کر

وہ گھبرا گئی ۔ آج تو مجھے جواب دینا تھا ۔ یہ رقعہ کیسا ہے اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے وہ رقعہ اٹھا لیا ۔۔۔۔۔ عین اس وقت اس کے منہ پر برقی روشنی پڑی اور وہ گھبرا گئی سامنے عباس کی کھڑکی میں سے کوئی اس پر روشنی ڈال رہا تھا ۔ اس کے دل میں کئی ایک شبہات پیدا ہونے لگے ۔

"شہرو سعید میں ابھی آیا" ۔ اس نے عباس کو کہتے ہوئے سنا ۔

"کہیں وہ یہاں تو نہیں آ رہے ۔۔۔۔۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔ ۔۔۔۔" اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر زنانے میں چلی جائے ۔ مگر وہ مبہوت کھڑی تھی ۔ بدن میں سکت نہ رہی تھی ۔ گلا خشک ہو رہا تھا ۔ کوئی آوارہ دھڑکن سینے میں لہریں لے رہی تھی ۔

ایک گرم سے ہاتھ نے سیخوں سے نکل کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

"خدا کے لئے تسلیم ۔ انکار نہ کرنا ۔ مجھے یوں پاگل نہ بناؤ ۔ مجھے تم سے محبت ہے" ۔

اس ہاتھ کی گرمی سے اس کا تمام جسم پگھل کر خدا جانے کیا ہو گیا ۔

"کچھ تو کہو ۔ خدا کے لئے ایک بار ہاں کہہ دو" ۔

شہزادہ کے منہ پر پھر برقی روشنی پڑی ۔ دور گلی میں پاؤں کی چاپ سنائی دی ۔

"چھوڑیئے چھوڑیئے کوئی دیکھ لے گا" ۔ اس کے منہ سے بیساختہ نکلا ۔ عباس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ شہزادہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ اور اندر بھاگ آئی ۔

وہ رقعہ اس کی مٹھی میں تھا اور وہ بھینچ بھینچ کر اسے محسوس کر رہی تھی ۔ خدا جانے وہ اسے بھینچ بھینچ کر معدوم کر دینا چاہتی تھی یا اسے محسوس کر کے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ رقعہ اس کے پاس موجود ہے بہرصورت وہ اسے پڑھنے سے ڈرتی تھی ۔ مگر وہ رقعہ دہکتے ہوئے کوئلے کی طرح اس کے بدن کو جلا رہا تھا ۔

وہ اٹھ بیٹھی اور کتنی دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی ۔ پھر اندر جا کر اس نے بتی جلائی اور جلدی جلدی اسے پڑھنا شروع کیا ۔ جیسے وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھنا چاہتی ہو ۔ مگر وہ الفاظ اس کی نس نس میں کھب کر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے ۔ اس نے وہ رقعہ ٹرنک میں پھینک دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی ۔ اپنا دھیان ادھر ادھر لگانے کی کوشش کی ۔ مگر اس رقعے کے الفاظ ٹرنک سے نکل نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے ۔ "اچھا تو دو ماہ کے لئے گوجرانوالہ جانا ہے ـــــــ دو ماہ ـــــــ مجھے ایک نظر دیکھنے کا شوق ہے ـــــــ رات کو دو بجے بیٹھک کے دروازے پر میرا انتظار کریں گے ۔ یعنی میں وہاں جا کر ان سے ملوں ۔ محبت ہے ۔ عشق ۔ اُف ـــــــ لاحول ولا قوۃ" ۔ اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا ۔ "یہ کیا حماقت ہے ۔ جانے دو ۔ مجھے کیا ہے ۔ میرے پاس اس کے تین خط ہیں ۔ کل ہی تسلیم کے ابا کے سامنے رکھ دوں گی ۔ کرامت ، کرامت سے منہ دھو رکھے ۔ اپنے گھر چلی جائے گی تو یہ روز کا قصہ ختم ہو گا ۔ "غیر آدمیوں سے ملنا ۔ توبہ ، کیسی بے حیائی کی بات ہے" ۔ اس نے ایک جُھرجُھری لی ۔ "میری تسلیم" ـــــــ "میری ـــــــ" اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا ۔ "میں بھی کیسی احمق ہوں ۔ خواہ مخواہ یہ قصہ چھیڑ بیٹھی ۔ آج کل کے لڑکے بھی کیسے نڈر ہوتے ہیں ـــــــ زبردستی ہاتھ آپکڑا ۔ کیسی منہ پھٹ باتیں کیں ـــــــ اس کے ہاتھ پر کوئی گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہا تھا ـــــ توبہ کیسا گرم ہاتھ تھا" ۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھ کر کہا ۔ "ان لڑکوں کا کیا اعتبار ہے ۔ آج کسی کے ، کل کسی کے ۔ بعد میں خواہ مخواہ بدنام کرتے پھرتے ہیں" ۔

اس نے ٹرنک کھولا ۔ اس کا ہاتھ زیور کی ڈبیا کی طرف بڑھا "لاحول ولا" کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ لو یہ قمیض عرصے سے ادھوری پڑی ہے ۔ اسے سی لوں ۔ یونہی نکمے بیٹھنے سے فائدہ ۔ نکما انسان بھی کس کام کا ۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچنا چاہتی تھی ۔ شائد وہ "نہ سوچنے" سے ڈرتی تھی ۔ اس کی نگاہ گل عباسی کے گلدان پر جا پڑی ۔ دو کملائے ہوئے پھول لٹک رہے تھے ۔ سوکھنے دو ۔ صبح و شام ان پودوں کی دیکھ بھال کون کرے ۔ اب تو ان کی بہار

ہی ختم ہونے کو ہے ۔ اس میں گلاب لگا لیں گے ۔

وہ قمیض لے کر سینے بیٹھ گئی ۔ دالان میں تسلیم سو رہی تھی ۔ منہ کھلا ہوا تھا ۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں تھی ہی نہیں ۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ۔

"یہ رہی آپ کی تسلیم ، آکر دل بھر کر دیکھ لیجئے" ۔ اور وہ ہنس پڑی ۔

گھڑی کی ٹک ٹک اسے یوں سنائی دے رہی تھی ۔ جیسے کوئی چکی چل رہی ہو ۔ ساڑھے دس بج گئے ۔ "توبہ وقت کیسے گزرتا ہے ۔ دو بجے ، دو بجے آپ بیٹھک کے دروازے پر کھڑے سوکھیں گے ۔ اور آپ کی تسلیم یہاں خراٹے لے رہی ہوگی ۔۔۔۔۔ خدا جانے کس کس دروازے پر انتظار کیا ہوگا ۔ ان لڑکوں کا کیا اعتبار ۔۔۔۔۔ توبہ ہے ۔ خدا جانے میں باتو کی بات میں کیسے آ گئی ۔ شکر ہے بات یہیں ختم ہو گئی ۔ ورنہ نکل جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا ۔ اور ابا کو پتہ چل جاتا تو بس کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا ۔ اللہ نے بچا لیا ۔

"اب سو جاؤں" ۔ اس نے ایک انگڑائی لے کر کہا ۔

ٹرنک کھول کر اس نے قمیض رکھی ۔ زیور کو دیکھ کر اس نے اپنے جسم میں ایک سرسراہٹ محسوس کی ۔ "کیسی بے حیائی کی باتیں لکھتے ہیں ۔ وہ نماز پڑھ کر آئیں تو ابھی ان کو دکھلا دوں اور جھگڑا ختم ہو ۔ مگر وہ اپنی پیاری بیٹی کے خلاف ایسی بات کب ماننے لگے ۔ اور مان بھی گئے تو مجھے سچا ماننا ناممکن ہوگا ۔ یہ قصہ شروع سے ہی فضول تھا ۔ اور اس تسلیم کے لئے اتنا کچھ کرنا ۔ آخر بہتری تو اسی کی ہے نا ۔ اپنا گھر جا بسائے گی ۔ یہ خط ان کو دکھانا ! ۔۔۔۔۔ فضول ۔ ان تلوں میں تیل نہیں ۔ ان کے وظیفے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے ۔ بیٹی ہے ان کی ۔ بیاہیں یا نہ بیاہیں ۔ مجھے کیا ۔ میری بلا سے ۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں کہ اس چھوکری کی بہتری کے لئے خود کو خوار کر رہی ہوں ۔

اس نے زیور کی ڈبیا سے وہ کاغذ نکال لئے ۔ دیا سلائی لی اور ان کو آگ لگا دی ۔ "بھاڑ میں جائے تسلیم اور اسے چاہنے والے" ۔ اور وہ چارپائی پر جا لیٹی ۔ دو ایک کروٹیں لیں پھر تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر سینے پر پھونک

ماری اور سو گئی ۔

"شہزادہ ، شہزادہ "۔

اس کی آنکھ کھل گئی ۔ شیخ صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے ۔ مگر اسے ایسا دکھائی دیا جیسے کوئی ڈراونی شکل اسے دبا رہی ہو ۔ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی ۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ، شہزادہ " شیخ صاحب نے کہا ۔ "ڈر گئی تھی کیا ۔ بیمار تو نہیں تم "۔

"کچھ بھی نہیں" ۔ اس نے شیخ صاحب کو پہچان کر کہا ۔

"بار بار میری تسلیم میری تسلیم بڑبڑاتی ہو کیا ہے تمہیں ؟"

"مجھے ؟ ــــــ میں"

" تم مجھ سے چھپا رہی ہو ۔ تم مجھے معاف کر دو شہزادہ ۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ تمہیں تسلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ یہ میری بھول تھی" ۔

"نہیں آپ ــــــ میں ــــــ " وہ حیرانی سے ان کا منہ تک رہی تھی ۔

"نہیں شہزادہ ، میں تم سے شرمندہ ہوں ۔ اب تم جانو اور تمہاری بیٹی تسلیم آئندہ سے میں کسی بات میں دخل نہ دوں گا ۔ جو جی چاہے کرو" ۔

شیخ صاحب کے دل میں کئی ایک وہم پیدا ہو رہے تھے ۔ وہ بار بار شہزادہ کی نبض دیکھ رہے تھے ۔ ان کے ہاتھ اسے تھپک رہے تھے ۔ خدا جانے اسے سلا رہے تھے ۔ یا اپنی دنیا قائم رکھنے کے لئے مضطرب تھے ۔

شہزادہ پھر جاگ اٹھی ۔ جیسے اسے کسی نے جگا دیا ہو ۔ وہ کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی تھی ۔ گھڑی کی آواز دنیا بھر میں گونج رہی تھی ۔ ڈیڑھ بجا تھا ۔ گھڑی کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال اٹھنے لگے ۔ " ہاں دو بجے وہ آئیں گے ۔ میری تسلیم" ۔ اس نے تسلیم کی طرف دیکھ کر کہا اور مسکرا دی ۔ باہر نگاہ دوڑائی ۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ۔ " اس اندھیرے میں کون گھر سے نکلتا

ہے ۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں ۔ محبت ۔ " وہ طنزاً مسکرا دی ۔ " لوگ بھی کس قدر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے اس نے کروٹ لے کر کہا ۔ اور آنکھیں بند کر لیں ۔ اس نے اپنے ہتھ پر ایک گرم سا دباؤ محسوس کیا ۔ ٹھٹک گئی ۔ ہاتھ جھٹک دیا ۔ "توبہ میں بھی کیسی پاگل ہوں ۔ یہاں کون آسکتا ہے ؟"

گھڑی نے دو بجا دیئے "لو دو بج گئے ۔ وہ تو اپنے بستر میں سو رہا ہوگا ۔ اور یہ رہی ان کی تسلیم ۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہوں" ۔

"اس اندھیرے میں بھلا دو بجے کون نکلتا ہے" ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ "تو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا" ۔ بالکل اس کے دل میں کسی نے کہا" چاہے جا کر دیکھ لو ۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ "لاحول ولا قوۃ ۔ تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو تمہیں کھا جائے گا ۔" کسی نے اس کے دل میں کہا ۔

اس نے باہر دیکھا ۔ برآمدے میں تسلیم اور اس کے ابا سو رہے تھے ۔ مکان میں بالکل خاموشی تھی ۔ نہ جانے کیوں ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ باہر گئی ، باورچی خانہ میں گئی ۔ پھر واپس آئی ۔ برآمدے سے گزری ۔ مگر تسلیم اور اس کے ابا گہری نیند سو رہے تھے ۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یوں پریشان کیوں پھر رہی ہے ۔ اس خیال پر وہ بیٹھ گئی ۔ نقاہت ، ڈر یا بے بسی کی وجہ سے اس کا دل بیٹھنے لگا ۔ عین اس وقت اس نے دیکھا کہ وہ بے خبری میں کہیں سے ایک تالا اٹھا لائی ہے ۔۔۔۔۔ تالہ ۔۔۔۔۔ وہ مسکرا دی ۔ نہ جانے تالا کیوں اٹھا لائی ہوں ۔۔۔۔۔ معاً اس کی نگاہ بیٹھک کے دروازہ کی زنجیر پر جا پڑی ۔۔۔۔۔ لگا دو اس کے دل میں کسی نے چپکے سے کہا ۔ اسی وقت اس کا دل پھر سے بیٹھ گیا ۔۔۔۔۔ ڈوبنے لگا ۔ اس نے شرم کی ایک رو محسوس کی ۔ ٹن ٹن ۔۔۔۔۔ گھڑی نے دو بجائے ۔ جوش کی شدت میں وہ اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔ منہ لال ہو گیا ۔ گویا غصے کا سہارا لے رہی ہو ۔ آپ ہی آپ بولی ۔ میں کیوں تالا لگا دوں ۔ میں کیوں

ڈروں کسی سے ۔ میری بلا سے ۔ کس کی ہمت ہے جو یہاں آئے اور آ بھی جائے تو کیا ہے ۔ شیخ صاحب جو ہیں ۔ میں کیا اکیلی ہوں یہاں ۔ اسے خیال آیا کہ شیخ صاحب کو جگا دے ۔ پھر وہ رک گئی ۔ خواہ مخواہ جگا دوں ۔ کوئی بات بھی ہو ۔ بڑا آیا ہے وہ ہماری دیوار پھاند کر آنے والا ۔ یہاں آئے تو وہ کروں اس سے کہ پھر بھولے سے ایسی بات کا خیال نہ لائے ۔ کیا سمجھا ہے مجھے ۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تن کر بیٹھک کی طرف چل پڑی ۔ مذاق سمجھ رکھا ہے اس نے ۔ میں کیا کھانڈ کا کھلونا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھک میں داخل ہو گئی ۔

( )

سہارا

"صفو یہ کیا کر رہی ہے تو ۔ دیکھ تو سارا کرتہ ناس کر دیا ۔ یاں آ ۔ آ ادھر ۔۔۔۔۔" صفیہ نے نانی اماں کی آواز سنی ۔ اس کے ناچتے ہوئے پاؤں رک گئے ۔ گیت ہونٹوں پر خشک ہو گیا ۔ بایاں ہاتھ جو وہ جھلا رہی تھی نیچے گر گیا ۔ چہرے پر مسرت کی جگہ زردی چھا گئی ۔ لیکن اس کے باوجود دایاں ہاتھ شدت سے جھولی کو تھامے رہا ۔ بلکہ اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی ۔

"کبھی کسی نے جھولی میں بھی جامن ڈالے ہیں کیا ؟" بڑھیا اس کا شانہ جھنجھوڑ کر بولی ۔ "دیکھ تو سارا کرتہ نیلا ہو رہا ہے ۔ جیسے دوات میں ڈبو کر نکالا ہو ۔ اب کیا یہ رنگ جائے گا ۔ اونہوں ؟" ۔۔۔۔۔ نانی اماں نے صفو کو کندھے سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا ۔

"لے ڈال اس میں" ۔۔۔۔۔ بڑھیا تھالی کو آگے بڑھا کر بولی ۔ ڈال اب ۔ ڈال ۔۔۔۔۔" اس نے پھر اسے جھنجھوڑا ۔ صفیہ کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور جامن تھالی میں گر گئے ۔ "توبہ کیسی ضدی لڑکی ہے" ۔ نانی اماں نے اسے آخری مرتبہ جھنجھوڑ کر تھپڑ دیا ۔ جامنوں کو تھالی میں گرتا دیکھ کر صفیہ کے چہرے کا تناؤ ٹوٹ گیا ۔ آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رونے لگی ۔

"بس" بڑھیا چلائی ۔ "کوئی عقل کی بات کرو تو بنّو لگی بسورنے ۔ دیکھو تو کیسے گلا پھاڑ رہی اے ۔ جیسے کسی نے مار مار کر حلال کر دیا ہو ۔ توبہ ہے ۔ ادھر آ میں تیرا کرتہ اتار دوں ۔۔۔۔۔" نانی اماں نے نرم لہجہ سے اسے بھرمانے کی کوشش کی ۔

"اوں ۔ ہوں" ۔۔ صفو اکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔ بڑھیا نے یہ دیکھ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولی ۔ "نہ بیٹی ۔ ضد نہیں کیا کرتے ۔ یہ تو میری

پیاری بیٹی اے ۔ ایسی اچھی اے یہ لڑکی آ میں تیرا کرتہ اُتار دوں ۔ لے دیکھ ہو ریا اے نا سارا پنڈا نیلا ۔ میں نے کہا نہ تھا"۔ وہ اس کا کرتہ اتارتے ہوئے بولی ۔ اور پھر پیار سے باتیں کرنے لگی ۔

"اوں ۔ ہوں ۔ میں اپنے جامن لوں گی"۔ صفیہ روٹھے انداز سے بولی ۔

"نہ میری بچی ۔ زیادہ جامن نہیں کھاتے ۔ اللہ مارے خشک"۔

"اوں کھشک ۔ اور مانی بھائی جو کھاتے ہیں"۔

"دفع کر"۔ نانی اماں نے ہاتھ چلا کر منہ بنا کر کہا ۔ "اسے تو سر پر چڑھا رکھا ہے ۔ لنڈور کہیں کا ۔ اللہ نہ کرے تو اس جیسی ہو ۔ توبہ ہے ۔ تو تو میری پیاری بچی ہے نا ۔"

"اور آپا نے بھی تو کھائے تھے"۔ صفو بسورنے لگی ۔

"بڑی آئی ہے وہ ۔ آپا ۔ لٹکو کہیں کی ۔ تو اس کی بات چھوڑ ۔ لے جا ۔ یہ کرتہ غسل خانے میں رکھ آ ۔ اری تو ننگے پاؤں پھرتی ہے ؟ ـــــ" بڑھیا اس کے پاؤں کی طرف دیکھ کر ازسرِنو چیخی اور پھر غصے میں ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھ گئی ۔ "ہائے ری کتنی بار کہا اے تجھے نہ پھرا کر ننگے پاؤں ۔ نہ پھرا کر پر ۔ یہاں کوئی سنے بھی کسی کی ۔ یہاں تو سبھی کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے اہیں"۔ بڑھیا باآواز بلند بڑبڑانے لگی ۔ جیسے گھر کے جملہ لوگوں کو سنا رہی ہو ۔ "ہزار بار کہا ہے بچے کو ننگے پاؤں نہ رہنے دو ۔ بیمار ہو جاتے ہیں ـــــ کہاں ہے تیرا جوتا"۔ وہ پھر لڑکی سے مخاطب ہوئی ـــــ "پھر کھو آئی ہے کہیں ۔ توبہ کیسی نت کھٹ اے یہ چھوکری ۔ اب کون تجھے نت نئے جوڑے خرید کر دے ۔ ابھی چیز لے کر دی ۔ ابھی گم ۔ نہ جانے کرتی کیا اے یہ ۔ جا اب ڈھونڈ اپنا جوڑا ۔ جا ۔" بڑھیا نے ایک اس کی کمر میں دی ۔

"اوں ۔ اوں ۔ میں کہاں سے لاؤں"۔ صفو رونے لگی

"جہاں رکھا تھا ۔ اور کہاں سے"۔

"میں نے تو غسل خانے میں اتارا تھا" ـــــ "تو دیکھ وہاں جا کر"۔

"وہاں تو نہیں ہے"۔

"دیکھے بغیر ہی ۔ توبہ ۔ کیسے بہانے بنانا آتے ایں ۔ کیا زمانہ آیا اے ۔ منہ میں دانت نہیں پر باتیں سنو باتیں ۔ جا دیکھ جا کر وہاں ۔ اتنی بڑی ہو گئی اے نہ جانے کب سمجھ آئے گی ۔

"دیکھ تو آئی ہوں" ۔۔۔۔۔۔ "تو پھر زمین کھا گئی کیا ؟"

"مجھے کیا معلوم" ۔۔۔۔۔ "تجھے نہیں تو ہو گا کسے ؟"

" مانی بھائی نے اٹھا لیا ہو گا ۔ وہ اٹھا لیا کرتا ہے میری چیزیں ۔ کل اس نے ۔۔"

"بس وہ لڑکا تو گیا ہاتھوں سے" ۔ بڑھیا نے بات کاٹ کر غصے میں کہا ۔ "ہزار بار کہا میں نے ۔۔۔۔۔ بچے کی خبر لو ۔ پر تمہاری ماں تو آنکھیں موند کر بیٹھی اے ۔ اب کوئی کیا کرے ۔۔۔۔۔ لو ۔ سنا تم نے ۔" وہ ساتھ والے کمرے سے لڑکیوں کی ہنسی سن کر بولی ۔ یہاں تو دن بھر ہی ہی کے سوائے کچھ ہوتا ہی نہیں ۔ جیسے میلے پر آئی ہوئی ہوں ۔ بات کرو تو منہ کو آتی ایں ۔ کیوں نہ آئیں ماں کی شہ جو ہوئی ۔ اس نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے عقل کی بات بتاؤ تو اللہ ماری آزادی ۔ نہ جانے کیا بلا ہے یہ آزادی ۔ آج کل تو ہر کوئی آزادی کی دیوانی ہے نہ شرم نہ حیا ۔ یہ دیکھ لو آزادی کے لچھن" ۔ ملحقہ کمرے سے دبی دبی ہنسی کی آواز نے اسے پھر ادھر متوجہ کر دیا ۔ "یہ کیا جوان لڑکیوں کے سے لچھن ہیں ان کے ۔ توبہ ہے !!" معاً اس کی نگاہ رضو پر پڑی ۔ بڑھیا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ "اللہ رکھے اک یہی میری بیٹی ہے ۔ بڑی ہو کر ایسی تمیزدار ہو گی دنیا دیکھے گی ۔ ہاں"۔ بڑھیا نے صفو کا ماتھا چوما ۔۔۔۔۔ "جا میری بنو ۔ اپنا جوتا لے آ ۔ وہیں غسل خانے میں پڑا ہو گا ۔ حمام کے پیچھے ۔ جا میری بیٹی ۔ بڑی پیاری بیٹی ہے یہ"۔

رضو کے جانے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ کر پرانی جراب ادھیڑنے لگی ۔ اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی" ۔ چاہے ادھر ہنڈیا جل رہی ہو ۔ لیکن ماں کی لاڈلیاں اپنے کمرے میں مگن بیٹھی ہیں ۔ نہ جانے کیا جادو ہے اس کمرے میں ۔

باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا ، ان کا ۔ اور پوچھو تو کتاب کا بہانہ ۔ چاہے کتاب کو ہاتھ بھی نہ لگائیں ۔ نُنھ کتاب کتاب کا ہوش بھی ہو ۔ باہوں میں باہیں ڈالیں اور لگیں کانوں میں کُھسر پُھسر کرنے ۔ پھر کِھی کِھی کِھی کِھی " ۔

بغل والے کمرے سے ہنسی کی آواز سن کر ۔ اس کی آواز اور بھی بلند ہو گئی ۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ اس پر ہنس رہی تھیں ۔ "میری طرف سے چاہے ناک پر انگلی رکھ کر ناچیں ۔ ہاں ۔ میری بلا سے ۔ انہیں کے بھلے کی کہتی ہوں نا ۔ پر کوئی جانے بھی ۔ میری بھی کیا بُری عادت ہے ۔ چپ نہیں رہ سکتی ورنہ مجھے کیا اے ۔ یہ جانیں اور ان کے کام ۔ کسی کو کیا واسطہ ۔ پر دل ہی ایسا برا اے میرا ۔ کسی کا برا ہوتے دیکھا نہیں جاتا ۔ پھر اوپر سے یہ ہنستی ہیں ۔ لاڈو کہیں کی پڑی ہنسیں ۔ مجھے کیا ۔ کوئی لینا دینا ہے ۔"

"لو ــــــــ نانی اماں ہم کیا تم پر ہنس رہی ہیں" ۔ صادقہ نے دروازے سے سر نکال کر کہا ۔ اس پر اندر سے پھر کِھی کِھی کی آواز آنے لگی ۔

"ہنستی ہو تو میرا کیا لیتی ہو" ۔ بڑھیا سیخ پا ہو کر بولی ۔ "اپنا ہی بگاڑو گی کچھ ہاں کہے دیتی ہوں میں ۔ اس کی آواز اور منہ کی جھریوں میں ان کہی دھمکی تھی ۔ پھر وہ خاموش ہو گئی ۔ اس کا غصہ منہ کی جھریوں سے نکل کر ہاتھوں میں اُتر آیا ۔ نہ جانے جوش سے یا بے بسی سے اس کے ہاتھ کانپنے لگے ۔ وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی تاگا ادھیڑتی رہی جیسے اپنی بے بسی کو بھولنے کی اشد کوشش میں لگی ہو ۔

ملحقہ کمرے سے انگریزی پڑھنے کی آواز سن کر وہ چونکی ۔ چہرے کی جھریاں گویا جاگ اٹھیں ــــــــ "بس" اس انگریزی نے نہ گھر کا رہنے دیا نہ گھاٹ کا ۔ دو حرف پڑھ لو دماغ بگڑ جائے ۔ یہ کیا تعلیم ہے ۔ نہ اللہ کا خوف نہ بڑوں کا لحاظ ۔ آنکھیں دھل کر کوری ہو جاتی ایں ۔ منہ جیسے ہنڈیا میں ڈال کر پکایا ہوا ہو ۔ بھولا پن تو نہ جانے کہاں اُڑ جاتا اے ــــــــ اس انگریزی سے تو اللہ ہی بچائے بائے کیا زمانہ آیا ہے ۔ اب پکانے کھانے کا وقت آیا تو لے بیٹھیں انگریزی ۔ توبہ ان کے بہانے ــــــــ میرا بس چلے تو سب کو اٹھا لوں سکول

ہے ۔ نخرے کے سوا وہاں دھرا ہی کیا ہے !" اس کی نگاہ صحن میں پڑی "یہ لو"۔ وہ غرائی ۔ "صفو ۔ تو پھر کھیل میں لگ گئی ۔ نہ جانے کب عقل آئے گی تجھے" ۔۔۔۔۔ معاً باہر خاموشی چھا گئی ۔ صفو کے ساتھیوں نے نانی اماں کو دیکھا اور چپکے سے ادھر ادھر ہو گئے ۔ صحن میں صرف صفو کھڑی رہ گئی ۔ "صفو" نانی اماں پھر چلائیں منہ میں انگلی لئے دیوار سے سہارا لگائے وہ یوں معصوم بنی کھڑی تھی ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ "یہ کیا کھیل کا وقت ہے" ۔ بڑھیا اٹھ بیٹھی جس وقت دیکھو کھیل میں لگی ہے ۔ میں کہتی ہوں کبھی دو حرف پڑھ بھی لیا کر"۔

نانی اماں نے دروازے میں کھڑی ہو کر کہا ۔ "ادھر آ تو اور پھر ہاتھ لمبا کر کے شانے سے پکڑ اسے اندر گھسیٹ لیا ۔ "بیٹھ یہاں" ۔ بڑھیا نے اسے جھٹکا ۔ کہاں ہے تیری کتاب ۔ ہر گھڑی کا کھیلنا اچھا نہیں" ۔

"اوں ۔۔۔۔۔ اور وہ جو کھیلتے ہیں" ۔ صفو بولی ۔

"بھاڑ میں گئے وہ ۔ تجھے ان سے کیا ۔ ان کی بات پر گئی تو گدھی کی گدھی رہ جائے گی ۔ ہاں بیٹھ جا یہاں ، یہ تو میری پیاری بچی ہے ۔ کیا مجال جو شوخی یا ضد کرے" ۔ بڑھیا نے اسے پچکارا ۔ "آج کا پڑھا کل تیرے کام آئے گا ۔ پڑھنے کے بغیر تو آدمی جاہل رہ جاتا ہے ۔ جاہل ۔ پڑھ جائے گی تو تمیزدار بہو بنے گی ۔ لوگ عزت کریں گے ۔ اور یوں لنڈور رہی تو کوئی بات کرنے کا روادار نہ ہو گا ۔ کہیں گے پھوہڑ ہے پھوہڑ ۔ آ میری بیٹی ۔ یہاں میرے پاس بیٹھ کر یاد کر لے اپنا سبق "۔

"اچھا ؟ ۔۔۔۔۔ صفو چلائی لیکن جلد ہی بولی ۔"پر میں پڑھوں کیسے نانی اماں ؟"

"اے ہے اپنے منہ سے پڑھے گی اور کیسے" ۔

"نہیں ۔ مجھے پڑھائے گا کون" ؟

"اے ہے" ۔ بڑھیا نے جواب دیا ۔ "ہر وقت پڑھا نہیں کرتے ۔ کبھی پڑھا ہوا یاد بھی کرتے ہیں" ۔

"تو میں آپا سے پڑھ لوں" ۔ صفو بولی ۔

"بس تجھے تو آپا کی لگن لگی ہے۔ نہ جانے وہاں کیا ملے گا تجھے۔ نہ بیٹی یہاں بیٹھ کر پڑھ لے میرے پاس"۔

"اوں تمہارے پاس۔ تمہیں تو آتی ہی نہیں انگریزی۔ آتی ہے کیا؟"

"اے ہے اس میں آنے نہ آنے کی کیا بات ہے۔ تو پڑھیو میں پاس بیٹھی تاگا ادھیڑوں گی۔"

صفو نے ہونٹ لٹکا لئے۔

"بس کوئی بات نہ کرے"۔ نانی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "بات کی اور بسورنا شروع کر دیا۔ میری طرف سے پڑھ یا نہ پڑھ۔ تیرا ہی بگڑے گا کچھ۔ میرا کیا اے جاہل رہ جائے گی۔ اور آج کل جاہل کو جانتا ہی کون اے۔ پڑھ لے گی۔ تو اللہ اچھا گھر ملے گا لے جا بیٹی لے آ اپنی کتاب۔ میری بیٹی کیسی اچھی ہے۔ جا میری بنّو۔"

کتاب لا کر صفو پڑھنے لگی اور نانی اماں اطمینان سے تاگا ادھیڑتی رہی۔ اگرچہ صفیہ نے "اے مین رہن" کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لیکن اس کا دھیان کتاب کی طرف نہ تھا۔ نگاہیں دیوار پر لٹکے ہوئے کلنڈر پر جمی تھیں۔ انگلیاں ورق سے کھیل رہی تھیں۔ اور زبان اے مین رہن کا ورد کر رہی تھی۔

ملحقہ کمرے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ دبی دبی باتیں ہوتیں پھر دبا دبا قہقہہ سنائی دیتا لیکن نانی اماں کا دھیان کسی اور طرف لگا تھا۔ ہاتھ تاگا ادھیڑنے میں مصروف نگاہیں دور۔ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خوش کن خواب دیکھ رہی ہو۔ منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی چمک۔

صفیہ نے بے خبری میں اپنی چوکی گھسیٹی۔ آواز سن کر بڑھیا بیدار ہو گئی۔ صفیہ کی طرف دیکھا اور چڑ کر بولی۔ "اے ہے ذرا خیال سے پڑھ۔ کتاب کہیں دھیان کہیں۔ غلط تو پڑھنا ہی ہوا۔ کیسی بُری عادت ہے تیری"۔

"ٹھیک تو پڑھ رہی ہوں" صفو بولی۔ "اور کیسے پڑھوں"۔

"ٹھیک طور پر پڑھے بھی تو" ـــــ بڑھیا گھورنے لگی ۔

"اوں ۔ جیسے تمہیں پتہ ہو" صفو نے ایک انداز سے کہا ۔ "یہ انگریزی ہے نانی اماں ، انگریزی" ـــــــ "معلوم ہے مجھے" ـــــ ؟' تمہیں آتی تو ہے نہیں" ۔

"اے ہے آتی نہیں تو کیا میں سمجھتی بھی نہیں کہ ٹھیک پڑھ رہی ہے تو کہ نہیں ۔ ہوں ؟ آخر اتنی دیر سے جو سُن رہی ہوں اللہ ماری یہ زبان" ۔

"لو میں تو کہہ رہی ہوں ۔ اے مین رہن ۔ اے مین رہن یہ کیا غلط ہے ؟"

"ہاں ہاں اب تو ٹھیک ہے ۔ جب نہ جانے کس طریقہ سے کہہ رہی تھی ـــــ لے اب دیکھ تو اپنی انگلیوں کی طرف ۔ اس ورق نے کیا بگاڑا ہے ترا جو اسے مروڑ رہی ہے" ۔

"میں کیا توڑ رہی ہوں اسے ۔ میں تو ـــــ"

"بس اب لگی بہانے بنانے" ـــــ "بہانے کہاں کرتی ہوں ۔ نانی اماں" ۔

"بہت زبان کھل گئی ہے تری" ـــــ "اوں ۔ اوں"

"اوں ہوں کیا ہوا ۔ وہ جلال میں بولی ـــــ "اور یہ ٹانگیں کیوں جھلانے لگی تو ۔ توبہ ۔ نہ جانے کب عقل آئے گی تجھے ۔ سنا نہیں تو نے" ۔ بڑھیا نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا ۔ نہ جھلا ٹانگیں ۔ کہہ جو رہی ہوں ۔ سیدھی ہو کر بیٹھ ـــــ اور یہ پلیلہ ـــــ اے ہے سب خاک میں لت پت کر دیا ۔ صفو !! ـــــ"

"اے ہے" ۔ نانی اماں بیٹھی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھیں ۔ "نادان بچی اسے نہ جانے کہاں بھیج دیا ہے اسے ۔ انہیں تو ذرا خیال نہیں آتا ۔ لو اور سنو لڑکیوں کو بھی میلے میں بھیجتا ہے کوئی آج تک تو سننے میں نہ آیا تھا ۔ لیکن اب تو ایسا الٹا زمانہ آیا ہے کہ توبہ میری ۔ میں پوچھتی ہوں یہاں نہیں آئی بسنت

کیا ۔ جو چچا کے ہاں بھیج دیا صفو کو ۔ یہیں دیکھ لیتی یہ اللہ ماری پتنگیں ۔ یہاں بھی تو گننے میں نہیں آتیں ۔ نہ جانے وہاں کیا خاص بات تھی اللہ رکھے جوان ہونے کو آئی ہے ۔ جوان لڑکیاں اچھی لگتی ہیں کوٹھے پھلانگتی ہوئی ۔ پوچھے کوئی ۔ لیکن اس گھر میں کوئی سنے بھی کسی کی ۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے ان کی سمجھ کو اور بھیجنا ہی تھا تو دوپہر کو بھیج دیتے دو گھڑی دیکھ کر چلی آتی واپس ۔ اتنی سویرے لڑکی کو بھیج دینا ۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے ٹھنڈ لگ جائے تو ۔ نہ جانے کب آئے گی وہ ۔ نہ کھانا نہ پینا ۔ اور پھر کوئی اسے نگاہ میں رکھے نہ رکھے ۔ اللہ نہ کرے اگر کوٹھے سے گر پڑے تو ۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی ۔ ڈور سے ہاتھ کاٹ لے ۔ ہاں ۔ اسے سمجھ بھی ہو ۔ بالکل بچی ہے وہ تو ۔ اور اللہ ماری یہ ڈور ۔ کم بخت دھار کی طرح تیز ہوتی ہے ۔ لڑکی کی ماں نے تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں ۔ پھر مجھے کیا پڑی ۔ میری بلا سے ۔ غصے میں وہ دیوار کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی ۔ جیسے دیوار سے روٹھ گئی ہو ۔ صادقہ اور عقیلہ باتیں کرتی ہوئی پاس سے گذریں تو اس کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو گئی ۔ اس نے صادقہ کو آواز دی ۔ "صادقہ" لیکن دونوں لڑکیاں باتوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہوں نے بڑھیا کی آواز نہ سنی ۔ "صادقہ" وہ جلال میں بولی ۔ "کون ہے" ؟ عقیلہ نے کہا ۔ "کوئی بھی نہیں نانی اماں ہے" ۔ صادقہ نے جواب دیا ۔ اور وہ ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں ۔

نانی اماں کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا ۔ "کانوں میں روئی ٹھونسے پھرتی ہیں دڑنگ دڑنگ ۔ اُدھر سے اِدھر ۔ دڑنگ دڑنگ اِدھر سے اُدھر اور کیا ۔ چاہے کسی کا گلا خشک ہو جائے آوازیں دے دے کر ۔ کیا مجال جو انہیں خبر ہو ۔ کیا زمانہ آیا اے ۔ مزاج ہی ٹھکانے نہیں ان کے ۔ توبہ یہ آج کل کی لڑکیاں !! "

مانی نے بڑھیا کے پاس آ کر زور سے سیٹی بجائی تو وہ چونک پڑی ۔ مانی کِھلکھلا کر ہنسنے لگا ۔ "ڈر گئی نانی اماں ڈر گئی ۔" "چل دور ہو" ۔ وہ غرائی ۔ "شیطان کہیں کا ۔ وہاں جا کر بجا اسے اپنی ماں کے کان میں ۔ ہاں ۔ شرم نہیں آتی ۔ مجھ سے مذاق کرتے ہوئے" ۔ مانی بڑھیا کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور سیٹی بجانے لگا ۔ " میں کہتی ہوں ۔ جائے گا تو یا کہوں تیری اماں

سے ؟" مانی نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا ۔ "اچھا ٹھہر تو" بڑھیا نے دھمکی دی لیکن مانی نے چلے جانے کی بجائے جھک کر اس کے کان کے قریب سیٹی بجانی شروع کر دی ۔ "اچھا پڑا بجا" ۔ وہ بولی ۔ "اپنے کان بہرے کرے گا ۔ میرا کیا لے گا"۔ اور وہ شدت سے تاگا ادھیڑنے میں مصروف ہو گئی ۔

جب صادقہ کمرے سے باہر نکلی تو بڑھیا اس پر برس پڑی ۔ "میں کہتی ہوں ۔ تم نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے کیا ــــــ ؟"

"ہم نے تو کوئی نہیں ٹھونسی ۔ تمہارے ہی مزاج ٹھکانے نہیں نانی اماں" ۔

"میرے مزاج ۔ کیوں کیا ہے مجھے ؟ صبح سے چلا رہی ہوں کہ ــــــ"

"تمہاری تو عادت ہو گئی ہے نانی" ۔ صادقہ یہ کہہ کر چلی گئی ۔

"صفو کی ماں ذرا یہاں تو آ ۔ بات سن کر جا میری ۔" اس نے اسے آتے ہوئے دیکھ کر کہا ــــــ "ابھی آئی اماں ۔" اس نے جواب دیا اور بغل والے کمرے میں داخل ہو گئی ۔ یہ دیکھ کر مانی دبے پاؤں آیا اور پیچھے کھڑا ہو کر بڑھیا کا منہ چڑانے لگا ۔

بڑھیا نے حسرت بھری نگاہ اٹھائی ۔ چاروں طرف دیکھا اور ایک لمبی آہ بھر کر کام میں لگ گئی ۔ اس کا سر جھک گیا ۔ چہرے پر جھریاں یوں سمٹ گئیں ۔ جیسے بے بسی کی لہریں چل رہی ہوں ۔ کمرے میں لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں ۔ باہر دیوان خانے میں قہقہے گونج رہے تھے ۔ صحن کے ایک کونے میں مرغیاں چوں چوں کر رہی تھیں ۔ چھتوں پر بچے شور مچا رہے تھے ۔ وہ کاٹا ۔ اس گہما گہمی کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھی جیسے کوسوں دور تک ویرانی چھائی ہوئی ہو ۔ جیسے صور پھنک جانے کے بعد لوگ نفسا نفسی میں کھوئے ہوئے ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ارد گرد کی دنیا کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کی اپنی دنیا بے سہارا اوندھی پڑی ہو ۔ اس نے تاگا ادھیڑنا بند کر دیا اور گٹھڑی سی بن کر کھٹولے پر دھوپ میں لیٹ گئی ۔ دیوان خانے میں مردوں کے قہقہے بے معنی سنائی دیتے تھے ۔ ملحقہ کمرے میں لڑکیوں

کی کھی کھی ارد گرد کی اداسی کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی ۔

"اماں" ۔۔۔۔۔ صفو کی آواز سن کر وہ چونک پڑی ۔ اٹھ بیٹھی ۔ "تو آگئی بیٹی ۔ آ میرے لال ۔ آجا" ۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے "اے بے اتنی دیر رہی وہاں ۔ جی لگ گیا تیرا ۔ میری طرف دیکھ ۔ منہ کیوں نیچے کر رکھا ہے تو نے ۔ خیر تو ہے ۔ بولتی نہیں" ۔

صفو کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر نانی اماں نے اسے گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا ۔ "تُو تو میری جان کا سہارا ہے ۔ میں تو صرف تیرے لئے جیتی ہوں ۔"

لیڈی ڈاکٹر

"ہوں ۔ نروس بریک ڈاؤن"۔ ڈاکٹر نے میرا بیان سن کر کہا ۔ "کب سے آنکھ لگی ہے"۔

"پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے"۔ میں نے جواب دیا ۔

"ہوں ۔ جگانا مناسب نہیں ۔ میں انتظار کروں گا ۔ کوئی محبت و حبت کا قضیہ تو نہیں"۔

"معلوم نہیں"۔ میں مسکرایا ۔ "غالباً جوان ہے ۔ خوش شکل ہے ۔ جاذب نظر ہے"۔

"گذشتہ ہسٹری کیا ہے ۔ وہ ڈاکٹرانہ انداز سے پوچھنے لگے ۔

"دیکھئے نا"۔ میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔ "میں آپ کو اپنی پوزیشن سمجھاتا ہوں ۔ "نہیں نہیں" وہ چلائے ۔ "آپ کی پوزیشن نہیں چاہئے ۔ مریض کی گذشتہ ہسٹری"۔

"دیکھئے نا ڈاکٹر صاحب ۔ بات یہ ہے کہ میں مریضہ سے قطعی ناواقف ہوں"۔

"بالکل نہیں جانتے آپ ـ ـ ـ ـ ـ ہوں"۔ انہوں نے بے معنی نگاہ سے میری طرف دیکھا ۔ "جوان ہے ۔ خوش شکل ہے" ۔ اس سے پہلے بھی تو آپ کے پاس آتی جاتی ہو گی"۔

"ڈاکٹر صاحب !!! میں چلّایا ۔ "غضب کر رہے ہیں آپ"۔

"لیکن جب تک آپ مجھے حالات نہ بتائیں گے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا"۔

غصے سے میرا منہ لال ہوگیا ۔ "لاحول ولا قوۃ ۔۔۔۔۔ کس غلط فہمی میں ہیں آپ ۔ سنئے بھی نا ۔ مریضہ میری بیوی کی سہیلی ہے ۔ میری بیوی گھر پر نہیں ہے ۔ مریضہ اس سے ملنے کے لئے آئی تھی ۔ کہیں باہر سے آئی ہیں آپ ، چونکہ ہمیں آج شام کو نجمی کا انتظار تھا ۔ خیال تھا کہ وہ شام کی سروس سے آجائیں گی ۔ اس لئے مریضہ اس کے انتظار میں بیٹھی رہی ۔ پھر وہ واقعہ ہوگیا جو میں بیان کر چکا ہوں ۔ ان حالات میں میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو بلا لوں"۔

"ہوں"۔ ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا ۔ "تو آپ مریضہ سے بالکل ناواقف ہیں"۔ پھر وہ ربڑ کی ٹوٹیوں سے کھیلنے میں مشغول ہوگیا ۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔ دفعتاً وہ بولا "مریضہ سے دریافت کئے بغیر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا ۔ آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے ہوش نہیں"۔

"جی ہاں"۔ میں نے جواب دیا ۔

"اچھا تو میں انتظار کروں گا ۔ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ۔ آدھ گھنٹہ تک انتظار کر سکتا ہوں میں"۔

باہر ہوا زوروں پر تھی ۔ درختوں کے پتے شائیں شائیں کر رہے تھے ۔ کبھی کبھار بجلی کے چمکنے سے آنکھیں چندھیا جاتیں ۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خوفناک کڑک گونجتی جسے سن کر دل پر منوں بوجھ پڑ جاتا ، پھر ہوا ٹہنیوں سے لپٹ کر چیختی اور تھک کر کراہنے لگتی ۔ اف وہ رات ۔ کمرے میں ایک طرف وہ خوب صورت اجنبی مریضہ یوں منہ ڈھانپے پڑی تھی جیسے کل کی مری ہوئی ہو ۔ میز کے پاس ڈاکٹر ربڑ کی ٹوٹیوں سے کھیل رہا تھا ۔ اس وقت وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ۔

"کیوں ڈاکٹر کیا آپ اس عجیب بیماری کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جسے محبت کہا جاتا ہے ۔" میں نے بات چھیڑنے کی غرض سے کہا ۔

"کیا"۔ ڈاکٹر چونکا ۔

"کیا میٹریا میڈیکا میں محبت کا بیان ہے" میں نے پوچھا ۔

"نہیں"۔ وہ خشک انداز سے کہنے لگا ۔ "لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ

محبت واقعی ایک بیماری ہے ۔ جیسے یرقان یا پائیوریا"۔

"تو آپ اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں نا"۔ میں نے ازراہِ مذاق سوال کیا ۔

"بالکل"۔ وہ بولا ۔ "تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے"۔

"کیا آپ کو بھی یہ مرض ہوا ہے کبھی" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ۔

"مجھے ؟" وہ مسکرا دیا

"ہاں آپ کو"۔

"میں بھی تو آخر انسان ہوں"۔ ڈاکٹر کے چہرے پر بشاشت چمکی ۔

"کوئی نرس ہوگی"۔ میں نے اسے چھیڑا ۔

"نہیں"۔ وہ ہنسا اور سٹیتھو سکوپ پھینک کر آگ تاپنے لگا ۔

"بہت خوبصورت ہوگی وہ ؟" میں نے بات چلائی ۔

"کون ؟" ایک ساعت کے لئے وہ چونکا ۔ اچھا "وہ ۔ پھر مسکرانے لگا ۔ شاید خوبصورت ہو ۔ میں نے سنا تھا کہ وہ واقعی بے حد خوبصورت ہے"۔

"سنا تھا ؟" میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔

وہ میری حیرانی کو سمجھ کر ہنسنے لگا ۔ "ہاں سنا تھا ۔ دیکھا نہیں"۔

آپ نے اسے دیکھا تک نہیں ۔

"نہیں" وہ بولا ۔ "دیکھنے کی نوبت نہ آئی"۔

"اور آپ کو اس سے محبت تھی"۔ میری ہنسی نکل گئی ۔

"محبت نہیں عشق عشق"۔

"بن دیکھے عشق ہوگیا تھا کیا"؟۔

"ہاں"۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز ہنسی کھیلنے لگی ۔ "ایسے حالات

میں صرف عشق ہو سکتا ہے عشق ، محبت نہیں ہو سکتی"۔

"یہ محبت اور عشق کا فرق بھی خوب رہا ۔ اگر بُرا نہ مانیں آپ تو میں بھی سنوں وہ واقعہ"۔

"میری زندگی کا عجیب ترین واقعہ ہے" اس نے کرسی آگ کے قریب تر سرکاتے ہوئے کہا ۔ "عجیب ترین واقعہ"۔

"تو آپ بھی اس مرض کے ہاتھوں لاچار ہو چکے ہیں کبھی"۔ میں گنگنایا ۔

"اب تک ہوں"۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"سچ ؟" واقعی ۔ دو سال ہو چکے ہیں دو سال"۔ اس نے ایک آہ بھری ۔

ہنستے ہنستے میری نظر مریضہ پر جا پڑی ۔ رضائی ہلتی دیکھ کر خیال ہوا کہ وہ جاگ پڑی ہے ۔ ڈاکٹر سے کہنے والا ہی تھا کہ وہ بولا ۔ "وہ ایک عجیب ترین واقعہ تھا"۔ اس عجیب ترین واقعہ کو سننے کے لئے میں بے تاب ہو رہا تھا اگر میں ڈاکٹر کی توجہ مریضہ کی طرف دلا دیتا تو اس واقعہ کو سننے کا کوئی امکان نہ رہتا ۔ اس لئے خاموش ہو رہا ۔

"ان دنوں میں رضا پور ڈسپنسری سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ جا رہا تھا ۔ رضا پور ایک چھوٹی سی ڈسپنسری ہے ۔ جہاں میں انچارج کی حیثیت سے کام کر رہا تھا ۔ لیکن سیالکوٹ کے ہسپتال میں مجھے سب انچارج کے فرائض سر انجام دینے تھے ۔ قدرتی بات تھی مجھے یہ تبدیلی پسند نہ تھی سب انچارج کی حیثیت کون پسند کرتا ہے ۔ رضا پور میں سب سے پہلے تھانے دار نے مجھ سے اس کا ذکر کیا بولا ۔ ڈاکٹر صاحب ۔ سیالکوٹ میں جا کر مزے کرو گے نا"۔

"مزے ؟" میں نے حیرانی سے دہرایا ۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا ۔ جیسے کچھ پتہ ہی نہ ہو ۔ "آخر بات کیا ہے" میں نے پوچھا ۔ کہنے لگا ۔ "اس ظالم پر تو سارا سیالکوٹ مرتا ہے ۔ اُف کیا چیز ہے ۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے"۔ "بھئی وہ کون ہے" میں نے حیرانی سے پوچھا"۔ "وہی لیڈی ڈاکٹر"۔ وہ مسکرایا ۔ "جو زنانے ہسپتال میں ہے وہاں ۔

لیکن ڈاکٹر ایسی شاطر ہے وہ کہ کسی کے ہتھے نہیں چڑھتی ۔ اچھا بھئی سیالکوٹ جا کر ہمیں یاد رکھنا۔"

پھر کواپریٹو انسکپٹر آ گئے ۔ وداع ہوتے وقت وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے ۔ "برا نہ مانئے لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کو آگاہ کر دوں"۔ "فرمائیے" ملک صاحب میں نے کہا ۔ ملک صاحب اپنے طبعی بزرگانہ انداز سے کہنے لگے ۔ "نزہت سے بچ کر رہئے گا ۔ وہاں سیالکوٹ میں"۔ نزہت ، کون ملک صاحب"۔ وہی لیڈی ڈاکٹر ۔ برے بھلے کے متعلق تو خدا جانتا ہے لیکن وہ بدنام ہے"۔ ان کی باتیں سن کر میں نے اس موضوع میں دلچسپی لینی شروع کر دی ۔ میں نے کہا ۔ "کیا وہ آوارہ ہے"۔ "نہیں نہیں"۔ وہ بولے ۔ "آوارہ نہیں"۔ پھر میں نے پوچھا ۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بری عورت نہیں لیکن چونکہ خوبصورت ہے ۔ اس لئے ہر ایک کی نظر پر چڑھی ہوئی ہے ، کیا افسر ، کیا چپڑاسی ، ذرا خیال رکھنا"۔

سیالکوٹ دفتر میں پہنچا تو ایک کلرک بولا ۔ "لو جی یہ آگئے ہسپتال کے سب چارج" ہیڈ کلرک نے اپنی عینک سنواری اور مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی سائینسدان کسی نئی قسم کے جرثومہ کو دیکھتا ہے ۔ کونے میں سے ایک صاحب چلائے ۔ "بھئی واہ یہ جوڑا ٹھیک رہے گا ۔ پہلا سب انچارج تو انچارج کی طرح قابل پنشن تھا" ۔ لالہ جی ہنسے ۔ "یہ تو بہت چست معلوم ہوتے ہیں ۔ ہم تو جب مانیں گے ۔ لالہ جی کلرک بولا ۔ جب ان کی چستی کا نتیجہ نکلے گا ۔ خیر بھئی جوڑا برابر کا ہے"۔ دوسرا گنگنایا ابھی نہیں ۔ تیسرا مجھے گھور کر کہنے لگا ۔ وہ تو بجلی ہے بجلی"۔ اس بات پر میں سمجھ گیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کا ذکر کر رہے تھے ۔

لیڈی ڈاکٹر کے متعلق باتیں سن کر میرے دل میں اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ۔ جب کبھی اکیلا بیٹھا ہوتا مجھے اس کا خیال آجاتا ، ایک خوبصورت مجسمہ میری آنکھوں تلے آ کھڑا ہوتا ۔ یا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا یا برآمدے میں ٹہلنے لگتا اور میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہتا ۔ غرضیکہ میں نے لوگوں کی باتیں سن سن کر اکیلے میں اندازے لگا لگا کر اپنی خواہشات کو بھرما بھرما کر دل

ہی دل میں لیڈی ڈاکٹر سے عشق پیدا کر لیا ۔ اب میں بے تابی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب میں اسے دیکھنے والا تھا ۔ آخر ایک روز ہمیں ملنا ہی تھا نا ۔ کب تک سامنے نہ آئے گی ۔ لیکن سیالکوٹ آئے مجھے پانچ دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اسے ملنے کا موقع نہ ملا تھا ۔

میری زندگی میں ایک عجیب بات واقعہ ہوتی رہی ہے ۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا جب کبھی میرے دل میں کسی خاص عورت کی محبت یا آرزو پیدا ہوتی ہے عین اس وقت کوئی اجنبی عورت خواہ مخواہ میری زندگی میں داخل ہو جاتی ہے اور ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ نہ میں ادھر کا رہتا ہوں اور نہ اُدھر کا"۔

"عجیب بات ہے ۔" میں نے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔

"ہاں"۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا ۔ "بارہا ایسا واقعہ ہو چکا ہے ۔ ایک دن شام کے وقت میں صحن میں ٹہل رہا تھا ۔ گھر کی بتیاں تک روشن نہ کی تھیں ۔ نہ جانے کس خیال میں کھویا ہوا تھا میں ۔ مختصر سا کوارٹر تھا وہ ۔ درحقیقت میرا مکان کوارٹر نہ تھا بلکہ مریضوں کا ایک کوارٹر مجھے دے دیا گیا تھا ۔ اس کا ایک دروازہ ہسپتال میں کھلتا تھا اور دوسرا باہر گلی میں"۔

"مریض کہاں ہے ؟" سُریلی آواز میرے کان میں پڑی ۔ شام کے دھندلکے میں میرے روبرو دروازے میں ایک چٹا سفید چہرا جھلملا رہا تھا ۔ نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے کیا ہوا ۔ میں نے سمجھا شگفتہ آ گئی ہے ۔ شگفتہ میری ایک پرانی آشنا ہے ۔ کبھی کبھی وہ یونہی اطلاع دئے بغیر آجایا کرتی ہے اور دو ایک دن میرے پاس ٹھہر کر چلی جاتی ہے ۔ ہر بار وہ نیا بہانہ بنا کر آتی ہے ۔ کبھی مریضہ بن کر اور کبھی ڈاکٹر ۔ اسے دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ شگفتہ ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنی جگہ کھڑا رہا ۔ میں نے کہا ۔ کون مریض ؟"۔

"میرا مطلب ہے" وہ بولی ۔" اس وقت تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ شگفتہ ہے ۔" میں نے کہا ۔ "میں جانتا ہوں تمہارا مطلب" اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے میں نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا ۔ "صاحب؛" وہ چلائی "میں بتاتی ہوں آپ کو"۔ تم کیا بتاؤ گی میں خود بتاتا ہوں تمہیں"۔ اس نے دو ایک

ہلکی ہلکی چیخیں ماریں ۔ لیکن میں قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ "کس غلط فہمی میں ہیں آپ"۔ وہ چلائی "لو سب غلط فہمیاں دور کئے دیتا ہوں"۔ میں نے اسے بے تحاشا چومنا شروع کر دیا ۔ پھر وہ خاموش ہوگئی تو میں نے بتی جلائی اور کہنے لگا ۔ "لو اب کہو مزاج کیسے ہیں"۔ ارے ۔ اسے دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ شگفتہ کی جگہ ایک اجنبی عورت میرے بستر پر گٹھڑی بنی پڑی تھی ۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ "مجھے بے حد افسوس ہے ۔ معاف کیجیئے گا"۔ میں نے معذرت کی لیکن معاً مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے اسے ذرا بھی احساس دلایا کہ میں نادم ہوں یا ڈر گیا ہوں تو وہ بپھر جائے گی ۔ ڈاکٹر بن کر عورت کی نفسیات سے کچھ واقفیت ہو ہی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا ۔

یعنی آپ کا مطلب ہے اگر آپ گھبرا جاتے تو ۔۔۔۔۔ میں نے اپنا خیال الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔

بالکل ۔ وہ بولا اگر میں گھبرا جاتا تو وہ بپھر جاتی ۔ اف ۔ کس قدر بدنامی ہوتی ۔

"عجیب بات ہے" میں نے کہا ۔

بالکل حقیقت پر مبنی وہ بولا ۔ اتنی زیادتی کر دینے کے بعد یہ کہنا کہ مجھ سے غلطی یا بھول ہوئی ۔ عورت کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہوتا ہے ۔ ایسے حالات میں اسے اپنانے کے سوا چارہ نہیں ہوتا ۔ تو صاحب میں نے جھٹ کہہ دیا ۔ ان پیاری گستاخیوں کا افسوس نہیں مجھے بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ اتنی جلدی بتی جلا دی"۔

"عجیب انسان ہیں آپ"۔ غصے سے اس کا منہ لال ہو رہا تھا ۔

"تم بھی تو عجیب ترین عورت ہو ۔ عجیب اور بے حد پیاری" میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا ۔

اب میں کیا کہوں ۔ اس کے ہونٹوں پر موہوم مسکراہٹ جھلکی ۔

"کہنے کی ضرورت بھی ہو" میں چلایا ۔ "نیچی نظر سے دیکھنا ہی کافی ہے ۔

اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنا کھویا ہوا توازن حاصل کر سکے ۔ میں نے اسے پھر سے چومنا شروع کر دیا ۔ پہلے تو اس نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی ۔ لیکن صاحب میری گرفت بھی تو ڈوبتے کی گرفت کے مصداق تھی"۔

"ڈوبتے کی گرفت ؟" میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ۔

"ہاں صاحب" وہ مسکرایا ۔ اگر وہ ذرا بھی بگڑ جاتی تو کس قدر بدنامی ہوتی ۔ میرا سارا کیریر برباد ہو جاتا ۔ یقینی طور پر وہ مجھے نوکری سے برطرف کر دیتے ۔ ہاں ۔ تو جلدی ہی اس کی کوششیں ڈھیلی پڑ گئیں حتیٰ کہ اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ۔

پھر تو آپ نے من مانی کی ہوگی"۔ میں مسکرا دیا ۔

"قطعی نہیں"۔ وہ بولا ۔ "اسے یوں پا کر میں نے اس سے دوستی گانٹھنی شروع کر دی"۔

"وہ کیسے ؟"

"باتیں" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ عورت کو بھرمانے کے لئے باتوں سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ۔

"آپ نے تو میری سدھ بدھ مار دی ہے" ۔ وہ مسکرائی ۔ "سدھ بدھ تو مجھے نہیں رہی جب سے تمہیں دیکھا ہے"۔ میں نے جواب دیا ۔

"کیوں مجھے کیا ہے" وہ بولی "مجھے کیا معلوم" میں نے کہا "دیکھ لو ایک پڑھا لکھا سمجھدار ڈاکٹر ایک جھلک سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے" "ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے آپ نے غلط فہمی سے ایسا کیا ہے" وہ بولی ۔

"غلط فہمی ؟ کیسی غلط فہمی ۔ میں انجان بن گیا ۔ "شاید آپ کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے ۔ جب میں آئی آپ سمجھے میں وہ ہوں"۔

"پگلی" میں ہنسنے لگا ۔ "ساری عمر تمہارے انتظار میں بیٹھا رہا ۔ آخر تم آہی گئیں ۔ میں جانتا تھا تم آؤ گی ۔ ضرور آؤ گی ۔ اس میں غلط فہمی کا سوال

پیدا ہی نہیں ہوتا"۔

"اچھا" وہ مسکرانے لگی ، "بھلا بتاؤ تو میں کون ہوں"۔ اس بات پر میری ہنسی نکل گئی ۔ میں نے کہا مجھے نام سے کیا واسطہ ، مجھے تو تم سے غرض ہے چاہے تم کوئی بھی ہو تم میری ہو ۔ تم وہ ہو جس کا مجھے انتظار تھا ۔ یہ سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔ کہنے لگی "بات بنانا ختم ہے آپ پر" میں نے کہا ہاں بشرطیکہ تم سن رہی ہو ۔ اچھا اسی بات پر اپنا نام بتا دو ۔ نام کا کیا ہے ۔ وہ بولی ۔ "آپ کو تو مجھ سے غرض ہے ۔ چاہے کسی نام سے بلا لیا کرو"۔ تو تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں"۔ میں نے بگڑ کر کہا ۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی ۔ وہ میری طرف دیکھ کر چلائی"۔ ناراض نہ ہو جانا کہیں ۔ میرا نام صندلی ہے ۔ "صندلی" میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "فی البدیہہ معلوم ہوتا ہے ۔ خوب نام تجویز کیا ہے"۔ قسم ہے جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا"۔ وہ بولی ۔ پھر تو میں بڑا آدمی ہوں"۔ میں نے بن کر کہا "نہ جانے کیا ہیں آپ" وہ مسکرائی ۔ لیکن ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے آپ کے سامنے کوئی پردہ ٹھہر نہیں سکتا ۔ صندلی میرا نام نہیں لیکن بالپن میں مجھے سب ہی صندلی کہا کرتے تھے"۔ اس کی آنکھوں میں صداقت جھلک رہی تھی ۔ بس صاحب مختصر یہ ہے کہ میں نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ دھاک بٹھا دی ۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی تو میں محسوس کرنے لگتا کہ اس کے انداز میں تفریح کی جگہ سنجیدگی کی جھلک ہے ۔ لیکن یہ تو صرف وقت کٹی کر رہا تھا ۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور انگیٹھی میں اٹھتے ہوئے شعلوں کو غور سے دیکھنے لگا ۔ گویا ان شعلوں میں اسے کسی کی تصویر نظر آرہی تھی ۔

میری نظر مریضہ پر جا پڑی ۔ یقینی طور پر وہ جاگ رہی تھی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی لیکن اب وہ بائیں پہلو پر پڑی تھی ۔ منہ ہماری طرف تھا ۔ اگرچہ لحاف سے ڈھانپا ہوا تھا ۔ شاید وہ بھی ڈاکٹر کی آپ بیتی سن رہی تھی ، یا ویسے ہی لیٹی ہوئی ہو ۔

"اگر وہ اس قدر خوبصورت اور پیاری نہ ہوتی تو شاید میں اس کی محبت کا

دم بھرنے لگتا" ڈاکٹر گنگنایا ۔

خوبصورت نہ ہوتی تو؟" میں چونکا ۔

"ہاں" وہ بولا "ہم رسمی خوبصورتی یا حسن کی ہلکی سی جھلک سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی کا حسن آنکھیں خیرہ کر دینے والا ہو تو دل میں جھجک اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے حسن کو ہم شک کی نظر سے دیکھتے ہیں یا شاید اس کی وجہ وہ انوکھی ملاقات ہو ۔ بہر حال میرے دل میں صندلی کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے ۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ ایک عام عورت ہو ۔ میرا مطلب ہے ہر ہاتھ کا کھلونا ۔ حالانکہ اس کی باتیں اور انداز نہایت مہذب اور پاکیزہ تھے لیکن اس کا حسن ۔ اُف

حسن بذات خود ایک بد قسمتی ہے ایک افتاد ۔ اگر میں صندلی کو دور سے دیکھتا ۔ چند دن اسے پاس سے دیکھنے کی آرزو لئے پھرتا ۔ چند مرتبہ وہ بے پروائی اور بے نیازی سے میرے پاس سے گذر جاتی تو میرے دل میں اس کے لئے عزت پیدا ہو جاتی ۔ اور شاید میں لیڈی ڈاکٹر کا خبط چھوڑ دیتا ۔ لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا ۔ صندلی کو دیکھ کر معاً مجھے لیڈی ڈاکٹر کا خیال آجاتا ۔ کس قدر مختلف تھی ۔ خاموش اور شرمیلی ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس روز تک میرے روبرو نہ آئی تھی ۔ اس کے بعد صندلی اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آجایا کرتی تھی ۔ عموماً وہ شام کو آتی اور آدھی رات کے قریب لوٹ جاتی ۔ پہلے دن تو اس بات کی ضرورت تھی کہ میں اس سے اظہارِ محبت کروں ۔ لیکن اس کے بعد مجھے ایسا ڈھونگ رچانے میں کوئی دلچسپی نہ رہی ۔ تو صاحب اس کے آنے پر ہم دونوں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتے وہ چائے بناتی اور ہم دونوں مل کر چائے پیتے اور ریڈیو سنتے یا تاش کھیلتے ۔ اور نہیں تو رضائی میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے رہتے شاید آپ سمجھتے ہوں کہ میں بات چھپا رہا ہوں ۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا "نہیں نہیں"۔ میں نے کہا" اس کی کیا ضرورت ہے ۔ ویسے بات کر رہا ہوں ۔" وہ بولا ۔ "اس کے حسن کو دیکھ کر ولولہ تو اٹھتا تھا لیکن اس کا یوں آپ ہی آپ آجانا ۔ مجھ سے بے تکلف لڑتے جھگڑتے رہنا ۔

اس کا بے پناہ حسن یہ سب باتیں مجھے روک لیتی تھیں ۔ نہ جانے کون ہے ۔ کہاں سے آتی ہے ۔ شاید یہ اس کا کام ہو ہزاروں خیال دل میں آتے"۔

"ہچ" ! ایک گھٹی ہوئی ہچکی کی آواز آئی ۔ ڈاکٹر چونکا اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا ۔ مریضہ بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ "کیسی آواز تھی"۔ وہ بولا ۔ معلوم نہیں"۔ میں نے کہا ۔ عین اس وقت باہر بجلی کڑکی ۔ پہاڑوں میں وہ کڑک گونجی ۔ گونجتی چلتی گئی ۔ اُف کس قدر طوفانی رات ہے ۔ ڈاکٹر بولا ۔ ہوا کس قدر زوروں پر ہے" میں نے کہا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑیاں طوفان کی زد میں آکر کراہ رہی ہوں"۔ ہوں وہ خاموش ہوگیا ۔ مریضہ کا لحاف آہستہ آہستہ ہل رہا تھا ۔ جیسے اس کے تلے لہریں اٹھ رہی ہوں ۔ عجیب سی حرکت ہے ۔ میں نے سوچا ۔ جیسے وہ ہچکولے کھا رہی تھی ۔ ہاں تو وہ لیڈی ڈاکٹر کیا ہوئی میں نے آہ بھر کر کہا ۔ "آپ تو صندلی کے بھنور میں پھنس گئے ۔"

"ہاں" ڈاکٹر مسکرایا ۔ "واقعی وہ ایک بھنور تھی ایک حسین پراسرار بھنور جس میں بالآخر ہم دونوں ڈوب گئے ۔ لیڈی ڈاکٹر اور میں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے کہ قدرت نے التزاماً وہ بھنور میری راہ میں پیدا کر دیا تھا ۔ اف کس قدر زبردست چیز ہے قدرت ۔ ڈاکٹر نے آہ بھری ۔ نہ جانے وہ اس کی آہ تھی جو کمرے میں چاروں طرف گونجنے لگی یا باہر کی ہوا تھی ۔ بہر حال میں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کمرے کا کونہ کونہ آہیں بھر رہا تھا ۔ "لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق تو ہوا ہوگا ؟" میں نے بات چلانے کی خاطر کہا ۔

"ہاں" وہ مسکرایا "جلد ہی وہ دن آگیا ۔ اس روز مجھے اپریشن کرنا تھا ۔ یا شاید کوئی اور بات تھی ، میں بھاگا بھاگا اپریشن روم کی طرف جا رہا تھا ۔ راہ میں مجھے کمپاؤنڈر ملا ۔ میں نے ویسے ہی اس سے پوچھا"۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں کیا" "جی نہیں"۔ وہ بولا ۔ "اندر لیڈی ڈاکٹر ہیں"۔ لیڈی ڈاکٹر ؟ میں اور بھی تیز چلنے لگا ۔ ابھی دروازے کے پاس ہی تھا کہ اندر سے ایک چپڑاسی آیا کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھہریئے ذرا"۔ کیوں" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ "اندر

لیڈی ڈاکٹر ہیں"۔ وہ بولا ۔ "پھر کیا ہے"۔ میں نے غصے سے کہا ۔ وہ سہم کر ایک طرف ہو گیا ۔ "جی انہوں نے کہا تھا"۔ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دو اندر نہ آئیں"۔ یہ کیا مذاق ہے میں نے سوچا ۔ "لیڈی ڈاکٹر کیا مجھ سے پردہ کریں گی ۔ کیا کر رہی ہیں وہ"۔ میں نے اپنے آپ کو مشکل سے روکا ۔ آپریشن کا سامان لے رہی ہیں ۔ ہم خود دیں گے انہیں سامان ، یہ کہہ کر میں اندر داخل ہو گیا ۔ دیکھتا ہوں کہ وہ دوسرے دروازے سے باہر جا رہی ہے ۔ لیڈی ڈاکٹر ۔ لیڈی ڈاکٹر میں چلایا لیکن وہ نہ مڑی ۔ میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ۔ اُف کس قدر بے عزتی ہوئی ۔ ہسپتال کے ملازمین بغلوں میں منہ ڈال کر ہنس رہے تھے ۔ "کیوں کمپاؤنڈر" میں نے برسبیل تذکرہ پوچھا کیا لیڈی ڈاکٹر پردہ کرتی ہیں ؟ نہیں تو وہ بولا"۔

اس روز مجھ سے ذرا کام نہ ہوا ۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ بات کیا تھی ۔ رہ رہ کر خفت کا احساس ہوتا ۔ شام کو صندلی آ گئی ۔ اُف کس قدر غصہ آیا مجھے صندلی کو دیکھ کر لیکن پی گیا ۔ جس قدر مغموم تھا میں اسی قدر بشاش تھی وہ ۔ اس روز بات بات پر ہنستی ۔ چھکتی مجھے چھیڑتی ۔ اس کی باتوں سے مجھے خواہ مخواہ شک پڑنے لگا ۔ ایسا محسوس ہونے لگا ۔ جیسے وہ میرا راز جانتی تھی ۔ مجھے کھوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی ۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے ۔ صاف بات تھی ۔ پہلے روز میرا وہ رنگین اور دلیرانہ رویہ وہ دلچسپ اظہار محبت اور پھر یہ شان بے نیازی ۔ ایسے حالات میں کوئی عورت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی"۔ وہ ہنسا ۔ "جب ہم اکٹھے بیٹھے ہوتے ہیں اس کے خوبصورت پاؤں یا ہاتھ سے کھیلتا رہتا ۔ اس وقت وہ میرے منہ کی طرف تکتی رہتی ۔ حیران ہوتی ہوگی کہ یہ متوالا اپنی دلچسپ کھیل پاؤں اور ہاتھ تک محدود کیوں رکھتا ہے ۔ میں سب سمجھتا تھا ۔ اس کی بے قراری اور شوق کو خوب سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود بوکھلا بن کر بیٹھ رہتا ۔ اس کے اشارے اور کنائے رنگین اور واضح ہوتے ۔ لیکن میں ظاہر کرتا کہ میں کچھ نہ سمجھتا تھا ۔ مثلاً وہ چائے کا پیالہ اٹھانے کے لئے اس طریقہ سے جھکتی کہ اس کا چہرہ میرے منہ سے ٹکرا جاتا یا اس کا جسم مجھ سے چھو

جاتا ۔ یا وہ اپنا ہاتھ مجھے دکھا کر کہتی دیکھو تو میری قسمت میں کیا ہے ۔ میں جھوٹ موٹ ہاتھ دیکھتا رہتا اور پھر سوچ سوچ کر کہتا ۔ رسوائی ، بدنامی ، بہت سے مجنوں اور ، اور ہنگامے ۔ اُف تمہاری قسمت تو ایک مسلسل جھمیلا ہے ۔ جھوٹ کہتے ہو وہ ہنستی ۔ جھوٹ کیسے میں جواب میں پوچھتا ۔ جسے قیامت کا حسن ورثہ میں ملا ہو اس کی قسمت میں اطمینان کہاں ۔ جو دیکھے گا عقل و خرد کھو بیٹھے گا ۔ ہر کوئی قرب کی آرزو کرے گا ۔ قرب سے ڈرے گا ۔ ہر کوئی محبت اور شک کی نظر سے دیکھے گا ۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ۔ کاش وہ آہ بھر کر کہتی ۔ کاش کہ میں ایک سیدھی سادی عام عورت ہوتی"۔

ہچ ۔۔۔۔۔ کمرے میں ایک گھٹی ہوئی ہچکی گونجی ۔ معاً نظر مریضہ پر پڑی ۔ لحاف تلے گویا ربڑ کا گیند بار بار ابھر رہا تھا ۔ نہ جانے مریضہ کو کیا ہے ۔ میں نے سوچا ۔

ڈاکٹر نے بات جاری کی "اس روز بار بار مجھے خیال آتا اگر یہ ہاتھ صندلی کے بجائے لیڈی ڈاکٹر کا ہوتا ۔ اگر اس کی جگہ لیڈی ڈاکٹر میرے پاس بیٹھی ہوتی"۔

لحاف تلے مریضہ نے مدھم سی چیخ ماری ۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ "کیوں کیا بات ہے"۔ ڈاکٹر نے مجھے گھبرائے ہوئے دیکھ کر کہا ۔ آپ نے نہیں سنی آواز ۔ "ہاں" وہ ہنس دیا ۔ "ان پہاڑیوں کے طوفان ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنڈورا کا صندوق کھل گیا ہو"۔ لیکن مریضہ" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا "مریضہ" ڈاکٹر چونک پڑا ۔ پھر مریضہ کے بستر کو دیکھ کر بولا ۔ "ہاں مریضہ کو سونے دیجئیے"۔ وہ بولا "آرام علاج سے بہتر ہے ۔ ڈاکٹر نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی ۔

"اس روز صندلی کی باتیں مجھے بڑی بامعنی معلوم ہوتی تھیں ۔ کہنے لگی ۔ آج آپ اس قدر کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں ۔ نہیں تو میں نے ہنسنے کی کوشش کی ۔ یوں گھور رہے ہیں آپ جیسے مجھ میں کسی اور کو دیکھ رہے ہوں ۔ تمہارا وہم ہے میں مسکرایا ۔ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف دیکھنا ۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی ۔ اسی طرح پریشانی میں چند ایک

دن گذر گئے ۔ پھر ایک روز پیغام آیا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں ۔ آپریشن روم میں آجائیے ۔ میں فوراً تیار ہو کر ہسپتال چلا گیا ۔ اپریشن روم کے دروازے میں اسسٹنٹ سرجن کھڑے تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی بولے ۔ آپ آرام کیجئے ڈاکٹر ۔ آپریشن ہو گیا ہے ۔ ہوگیا ہے ؟ میں نے حیرانی سے پوچھا بولے نہیں ہوا نہیں لیکن میرے ساتھ لیڈی ڈاکٹر ہیں جب تک آپ راؤنڈ کر لیجئے ۔ کیسا آپریشن ہے ۔ میں نے پوچھا ۔ جسم میں رسولی ہے وہ بولے ۔ تو مجھے بھی اجازت دیجئے میں نے منت کی ۔ آپ کے تجربے سے میں بھی فائدہ حاصل کروں جو ۔ نہیں وہ بولے پھر سہی کبھی ۔ حرج ہی کیا ہے ۔ میں نے کہا ۔ لیڈی ڈاکٹر کا شامل ہونا ضروری ہے ۔ وہ بولے ۔ بیشک شامل ہوں میں نے کہا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ پلیز ڈاکٹر اندر سے آواز آئی ۔ ڈونٹ کم ان ۔ میں تو کٹ کر رہ گیا ڈاکٹر مسکرانے لگے ۔ برا نہ ماننا اور وہ دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے ۔ اسی شام کو میں زخمی شیر کی طرح صحن میں ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا ۔ عجیب تماشا ہے ۔ ساری دنیا کے سامنے تنگے منہ پھرتی ہے لیکن مجھ سے پردہ ہے ۔ حرام زادی !!

اوہ ، آپ تو گالیاں دینے لگے صندلی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ۔

اس روز صندلی کا آنا مجھے ناگوار گذرا ۔ اس حد تک ناگوار گذرا کہ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی ۔

لوگوں کے منہ سے لیڈی ڈاکٹر کی تعریفیں سن سن کر میں پہلے ہی شوق سے بھرا بیٹھا تھا ۔ اس کے میرے روبرو آنے سے انکار کرنے پر وہ شوق دفعتاً عشق کے درجہ تک پہنچ گیا ۔ آپ جانتے ہیں ۔ نیا نیا عشق ہو تو دلچسپ باتیں نہیں سوجھتیں ۔ پہلے تو صندلی مجھ سے خاموشی کی وجہ پوچھتی رہی ۔ پھر وہ بھی ہار کر چپ ہو رہی ۔ مجھے خیال آیا کہ صندلی کو راز بتا کر اس سے کام لوں تو صاحب میں نے تمام واقعہ اسے سنا دیا ۔ وہ ہنسی کھلکھلا کر ہنسی ۔ بولی مرد بھی عجیب مخلوق ہے جو سامنے آجائے اس سے لاپروا ہو جاتے ہیں جو چھپ جائے اس سے عشق لگا لیتے ہیں ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے بات کرنے

کی خاطر کہا یہ تو محض دل لگی ہے ۔ تم ہی سوچو ، صندلی اس کمبخت نے مجھ سے چھپ کر مجھے کتنی اہمیت دے دی ہے ۔ ہاں ، وہ مسکرائی بات تو ٹھیک ہے ۔ میں نے کہا ۔ اچھا کیسی ہے وہ لیڈی ڈاکٹر ۔ صندلی نے منہ بنا دیا ۔ عام سی ہے وہ بولی ۔ جیسے آپ اور میں ۔ تم سی ہے میں نے دہرایا ۔ پھر تو قیامت ہوگی قیامت ۔ اس کے بعد صندلی کو چپ لگ گئی ۔ اگر میں لیڈی ڈاکٹر کی بات کرتا تو وہ جل بھن جاتی ۔ بات بات پر آہیں بھرتی اور میری طرف دیکھتی ۔ ہوں تو آپ کو اس سے محبت ہے ۔ وہ کہتی شکر ہے آپ کو بھی کسی سے محبت ہوئی ۔

"چند ہی دنوں کے بعد ایک اور واقعہ ہوا ڈاکٹر ازسرنو مسکرانے لگا ۔ "چپڑاسی آکر کہنے لگا ۔ سول سرجن صاحب پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں آپ کو بلایا ہے ۔ میں وہاں پہنچا تو ڈاکٹر پہلے ہی سے موجود تھا ۔ ہم نے تیاری مکمل کر لی تو سول سرجن بھی آ گئے ۔ آتے ہی پوچھا ۔ لیڈی ڈاکٹر نہیں آئی ؟ میرا دل سینے میں اچھلا ، اس کا آنا ضروری ہے وہ بولے ۔ خاتون کی لاش ہے بڑا اہم کیس ہے ۔ اس نے چپڑاسی کو دوڑایا ، جاؤ انہیں بلا لاؤ ۔ ابھی آجائیں ابھی ۔ چپڑاسی کو دوڑاتے دیکھ کر خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں ۔ کیسے نہ آئے گی آج ؟ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے چند ہی منٹ کے بعد چپڑاسی لوٹ آیا ۔ بولا ۔ وہ کہتی ہیں ۔ میری طبیعت اچھی نہیں ۔ بیمار ہیں کیا سول سرجن نے پوچھا ۔ جی ۔۔۔۔۔ چپڑاسی کہتا کہتا رک گیا ۔ کیا بات ہے صاحب بولا ۔ جی وہ تو آرہی تھیں ۔ پھر صاحب نے پوچھا ۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کون کون ہیں وہاں ۔ میں نے کہا حضور بڑے صاحب ہیں ۔ انچارج ہیں اور سب انچارج ہیں ۔ یہ سن کر وہ رک گئیں ۔ بولیں کہہ دو ہماری طبیعت اچھی نہیں ۔ اسسٹنٹ مسکرائے اور سول سرجن کے پاس جا کر زیر لب کچھ کہا ۔ نہیں ، نہیں صاحب چلّایا انہیں آنا پڑے گا ۔ ہم اس کے بغیر یہ کام نہ کر سکیں گے ۔ چپڑاسی جاؤ ان سے بولو صاحب کہتے ہیں جس حالت میں بھی ہیں آپ آجائیے ۔ جاؤ ۔

"کچھ دیر کے بعد چپڑاسی واپس لوٹا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا ۔

یہ دیا ہے انہوں نے وہ بولا ۔ صاحب نے کاغذ کی طرف دیکھا ۔ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی ۔ پڑھو ڈاکٹر کیا ہے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا ۔ پڑھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ۔ استعفیٰ بھیجا ہے صاحب ۔ مجھے دو وہ غصّے میں چلّایا اور پن نکال کر اس پر لکھنے لگے ۔ چپڑاسی' ہیڈ کلرک سے بولو ۔ یہ استعفیٰ آج ہی منظور کیا جائے ۔ لیڈی ڈاکٹر کو اطلاع کر دی جائے ۔

"اس واقعہ پر میرے رہے سہے اوسان بھی کھو گئے ڈاکٹر نے بات جاری کی ۔ اس نے میری خاطر استعفیٰ دے دیا ہے ۔ سارے ہسپتال میں باتیں ہو رہی تھیں ۔ میری طرف انگلیاں اٹھتیں ۔ میری آمد پر لوگ چپ ہو جاتے ۔ اک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھتے ہوں گے ۔ نہ جانے وہ مجھ سے چھپنے پر مصر کیوں تھی ۔ نہ جانے وہ کون تھی ۔ شاید وہ مجھے جانتی ہو ۔ لیکن چھپنے سے مطلب ۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا ۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا میں کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔ کون ہے میں نے پوچھا ۔ لڑکے نے ایک بڑا سا لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا ۔ کہنے لگا ۔ یہ انہوں نے بھیجا ہے یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔ میں سمجھا کوئی سرکاری کاغذ ہوگا ۔ اندر آیا بجلی جلائی ۔ لفافے میں اس کی تصویر تھی ۔ نیچے انگریزی میں لکھا تھا ۔ گڈ بائی ڈاکٹر زینت"۔

کیا لیڈی ڈاکٹر کی تصویر تھی وہ ؟" میں نے پوچھا ۔

"ہاں" ڈاکٹر ہنسا ۔ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "تصویر !"

"خوبصورت تھی کیا ۔"

"خوبصورت" وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا بے حد خوبصورت تصویر تھی صرف اس کا منہ پرلی طرف تھا"۔

"پرلی طرف تھا ؟" میں نے پوچھا ۔

میں نے کئی بار اس کا چہرہ دیکھنے کی امید پر تصویر کو الٹایا بھی ۔ یہ حماقت کی انتہا تھی" وہ پھر ہنسنے لگا ۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔ "یہ بھی عجب مذاق تھا اس کا ۔ وہ تصویر اب بھی میرے پاس موجود ہے ۔ میں نے اسے

انلارج کر کے کمرے میں لٹکا رکھا ہے ۔ یار دوست اسے دیکھ کر ہنسا کرتے ہیں ۔ چوڑے شانے پتلی کمر اور لمبی چوٹی اس تحفہ کو دیکھ کر ہنسی نہ رکتی تھی ۔

کچھ دیر کے بعد صندلی آگئی ۔ اس روز اسے دیکھ کر مجھے غصہ نہ آیا ۔ لیڈی ڈاکٹر تو ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ چلو چند دن کی دل لگی ہی سہی"۔

قریب ہی کوئی کراہنے لگا ۔ میں نے مریضہ کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی پڑی تھی ۔ منہ کی طرف سے رضائی کا کونہ اوپر اٹھا رکھا تھا ۔

"ڈاکٹر نے پھر بات جاری کی بولا "اس روز میں نے صندلی کو بھرمانے کی بہت کوششیں کیں ، لیکن ظالم بے حد سنجیدہ تھی ۔ کہنے لگی اس کے بعد شاید میں آپ سے مل نہ سکوں ۔ ابھی تو تمہاری ضرورت پڑی ہے مجھے ، میں نے اسے چھیڑا ۔ اچھا اس نے آہ بھری ، میں ایک ضروری بات پوچھنے آئی ہوں وہ بولی ۔ بصد شوق میں نے ہنس کر کہا ۔ نہیں وہ کہنے لگی ۔ مذاق نہیں ڈاکٹر بے حد اہم بات ہے ۔ اہم اور سنجیدہ ۔ کہو میں نے منہ پکا کر لیا ۔ بولی ۔ میرے جیون ساتھی بنو گے ؟ میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اور کس کا جیون ساتھی بنوں گا ۔ وہ شیطان تو استعفیٰ دے کر چلی گئی ۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس سے محبت ہے ۔ وہ بولی ۔ ہاں معاً میری شوخی معدوم ہوگئی ۔ مجھے اس سے محبت ہے لیکن تم سے بھی تو ہے ۔ "ڈاکٹر" وہ غصہ میں چلّائی ، کیا تم مجھے بازاری عورت سمجھتے ہو ؟ تم میری توہین کر رہے ہو"۔ میرا مطلب ہے"۔ مجھے پھر شرارت سوجھی ، میں جانتا ہوں تمہارا مطلب" میں نے اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور اندر لے جا کر چومنے لگا ۔ ڈاکٹر ، وہ چلّائی ۔ اس کی چیخ سن کر میں گھبرا گیا"۔ محبت نہیں نہ سہی لیکن میری توہین نہ کرو"۔ پھر جو میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے میری طرف ایک گتا سا پھینکا ۔ گتے کا سخت کونہ میری آنکھ میں چبھ گیا ۔ کچھ دیر کے بعد میں نے آنکھ کھولی تو وہ جا چکی تھی ۔ میرے سامنے ایک تصویر پڑی ہوئی تھی ۔ نیچے اردو میں لکھا تھا بصد شوق و محبت ۔ صندلی ۔ بالکل ویسا ہی انداز ۔

چہرہ کدھر تھا میں نے پوچھا ۔

میری طرف ۔ وہ مسکرایا ۔ "بس وہ آخری دن تھا ۔ اس کے بعد وہ بھی کہیں گم ہوگئی ۔"

"آپ نے صندلی کا پتہ نہ لگایا ۔" میں نے پوچھا ۔

"اس کی کیا ضرورت تھی ۔" وہ طنزاً مسکرایا ۔

"اس کی تصویر ؟" میں نے پوچھا ۔

"اس کی تصویر اب بھی میرے پاس ہے"۔ وہ ہنسا دونوں تصویروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں ۔ غالباً ایک ہی فوٹوگرافر سے کھنچوائی ہوں گی ۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا ۔

دفعتاً مریضہ کے بستر میں حرکت ہوئی ۔ مریضہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ سیاہ لحاف میں اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا تھا ۔ نہ جانے کیسے ۔ میرے منہ سے ان جانے میں نکلا ۔ "صندلی کی تصویر بھی انلارج کروائی ہوگی"۔ اونہوں"۔ ڈاکٹر بولا ۔ "اسے نہیں لٹکایا"۔ وہ منہ بنا کر ہنسا ۔ "میرا گھر پان والے کی دوکان نہیں"۔ قریب ہی سے ایک چیخ سنائی دی ۔ مریضہ دھم سے بستر پر گر پڑی ۔ کون تھا ڈاکٹر چلّایا ۔ "ہائے کتنی مصیبت ہے"۔ نجمی کمرے میں داخل ہو کر بولی ۔ اسے دیکھ کر ہم اٹھ بیٹھے ۔ "اوہ ڈاکٹر" نجمی بولی"۔ آپ باہر چلئے ذرا"۔ ڈاکٹر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا ۔ "اچھا میں جاتا ہوں"۔ وہ گنگنایا ۔ تم ہو نجمی مریضہ کو دیکھ کر خوشی سے چلائی ۔ مریضہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا ۔ باہر بجلی کی روشنی میں ڈاکٹر اپنا ہینڈ بیگ سنبھالے واپس جا رہا تھا ۔ مریضہ کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں ۔ گال آنسو سے تر تھے ۔ پاس نجمی حیران کھڑی تھی ۔ باہر ہوا ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر چیخ رہی تھی ، کراہ رہی تھی ۔

............○............

پیارا پالتو

سلیمان نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھا ۔ وہ بوٹ سمیت کاؤچ پر پڑا تھا ۔ سر تلے دو ایک گدیاں رکھی تھیں ۔ کمر تلے کاغذ اور کتابیں پڑی تھیں ۔ فرش پر جابجا کتابوں اور کاغذوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں ۔ پرلی طرف دو تین کرسیاں گڈ مڈ ہو رہی تھیں ۔ دو ایک کرسیوں پر کپڑے پڑے تھے ۔ ایک کرسی پر گدیاں یوں نیچے اُوپر رکھی تھیں جیسے چنگیر میں روٹیاں ۔

اس نے کاؤچ پر پڑے پڑے کمرے کا جائزہ لیا ۔ اور اس گھما گھمی کو دیکھ کر مسکرا دیا پھر ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے اپنے نوکر کو آواز دی ـــــ تھے ـــــ او تھے !" پھر کوئی فلمی دُھن گنگناتے ہوئے وہ مٹھو کو دیکھنے میں کھو گیا ۔ مٹھو سفید رنگ کا جانور تھا ۔ جو اس نے کسی دوست سے بطور تحفہ لیا تھا ۔ اگرچہ اسے جانور رکھنے کا شوق نہ تھا ۔ لیکن اس سفید طوطے کو دیکھ کر اس کا دل للچا گیا ۔ اس نے طوطے کے لئے ایک پنجرہ بنوایا ۔ جو کسی ہلکی ، سفید اور چمکیلی دھات کا تھا ۔ اس روز سے وہ اور مٹھو ساتھی بن گئے ۔ اکثر بیٹھے بٹھائے وہ مٹھو کو دیکھنے یا اس سے باتیں کرنے لگتا ۔ مصیبت یہ تھی کہ مٹھو کو بولنا نہ آتا تھا ۔ وہ کبھی کبھار چیخ مار کر سلیمان کی توجہ مبذول کر لیتا اور پھر خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنا کرتا ۔ سلیمان کو طوطے کا نہ بولنا اور بھی پسند تھا ۔ کیونکہ اس نے کئی ایک ایسے طوطے دیکھے تھے جو ہر وقت میاں مٹھو چلا چلا کر سر کھا جاتے تھے ۔ اس طوطے کی سب سے بڑی خصوصیت جو سلیمان کو پسند تھی' یہ تھی کہ اس کی نشست کے انداز تھے ۔ کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی کسی فلاسفر کی طرح سوچ بچار میں کھویا ہوا ۔ یا اسے بیٹھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا گویا وہ ابھی اٹھ کر ناچنے لگے گا ۔ اس کا ہر انداز اظہار کیفیت سے بھرا ہوا تھا ۔ سلیمان اکثر کہا کرتا ۔ یہ طوطا تو آل ایکسپریشن ہے" ۔ اس کے علاوہ اس کے ہر انداز

نشست میں جبلی کیفیت موجود رہتی ۔ شائد اسی لئے طوطے کو دیکھنے سے اس کے دل میں راحت سی پیدا ہوتی ۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا گویا یہ طوطا صحیح معنوں میں جی رہا ہے ۔ اس بات پر وہ اپنے آپ میں وہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور شاید اسی لئے ہر سمے خوش باش رہنے کا عادی ہو گیا ۔

ایک موٹا سا آدمی کشتی نما ٹوپی سنبھالتا ہوا دروازے میں آ کھڑا ہوا ۔

"ہجور ـــــــ !"

وہ چونک پڑا اور تھمے کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر بولا ۔ "ہوں ـــــــ کیا ہے ـــــــ ؟"

"ہجور !" تھمے نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا ـــــــ "ہجور ، آپ ہی نے بلایا ہے" ۔

"اوہ !" وہ مُسکرایا ۔ "اچھا تو میں نے بلایا ہے ۔ ہوں ۔ اچھا ، اچھا ـــــــ تو چائے ہی بنا لاؤ ۔

"چائے" ۔ تھمے نے سر کھجاتے ہوئے کہا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا ۔ "ابھی تو تین ہی بجے ہیں" ۔

"ہوں ۔ تو تین بجے ہیں" سلیمان نے مُسکرا کر گھڑی کی طرف دیکھا ۔ "ابھی تین بجے ہیں ۔ اچھا تو ہم سوا تین بجے چائے پیئں گے ۔ جاؤ ۔"

تھما سر کھجاتا ہوا باہر نکل گیا ۔ سلیمان کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہو ۔

سلمان کی طبیعت بلا کی آزاد تھی ۔ رسموں ، تکلفوں اور اصولوں سے بے نیاز ۔ متواتر آٹھ سال اس نے آزاد فضا میں گذارے تھے ، چھ بورڈنگ میں جب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور دو سال جب سے وہ پروفیسر تھا ۔ اب اسے صرف کالج جانے کی پابندی تھی ۔ وہ بھی کڑی نہیں ۔ کیونکہ پڑھانا یا نہ پڑھانا اس کی اپنی مرضی پر منحصر تھا اور طبعاً اس کی طبیعت میں پابندی کا احساس قطعی مفقود تھا ۔ جب جی چاہتا پڑھنے لگ جاتا ۔ کئی کئی دن وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہتا ۔ صبح و

شام ، صبح و شام اور بعض اوقات ہفتوں کتاب تک نہ کھولتا ۔ چائے پینے پر طبیعت آ جاتی تو دن میں چھ چھ چائے دانیاں پی جاتا ۔

وہ چائے چائے دانیوں کے حساب سے پیا کرتا تھا ۔ اسے ایسی آزاد زندگی بے حد پیاری تھی ۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار یہ بے مہار آزادی اس کے دل کے کسی کونے میں کھٹکتی ۔ اس کا جی چاہتا کہ گھر میں کوئی ایسا فرد ہو جو اس کی زندگی میں دلچسپی پیدا کرے جس کی رفاقت اس کی آزادی کو اور بھی رنگین بنا دے ۔ بسا اوقات جب اس کا احساس آزادی مسرّت کی لہریں بن کر اس پر چھایا ہوتا تو اس کے دل کے کسی کونے میں ایک ٹھیس سی اُٹھتی اور اسے پریشان کر دیتی ۔ وہ اس مبہم احساس کو بھلانے کے لئے اٹھ بیٹھتا ۔ کتاب کھول لیتا یا ویسے ہی کمرے میں ٹہلنے لگتا ۔ ورنہ مٹھو سے باتیں کرنے میں لگ جاتا اور ان جانے تھے کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتا ۔ کچھ گنگناتا اور جب تھا چائے کا ٹرے لے کر آتا تو حیران ہو کر پوچھتا ۔ ”ہیں ، ابھی سے چائے ۔ ابھی تو تین ہی بجے ہیں ۔۔۔۔۔“ تھے کی پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آ جاتی ۔ اور ساتھ ہی یاد آتا کہ اس نے خود ہی چائے کے لئے آواز دی تھی ۔ ”اوہ“ وہ مسکراتا ۔ ”اچھا تھے میز پر رکھ دو“ ۔

اس روز وہ خاص طور پر خوش تھا کیونکہ زندگی میں پہلی مرتبہ اماں اس کے پاس رہنے کے لئے آ رہی تھی ۔ اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ اماں سے منت کی تھی کہ اس کے ساتھ رہے لیکن بوڑھی ماں کو اتنی دور جانا گوارا نہ ہوا ۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے سلیمان کے لئے ایک خوبصورت سی دلہن لائے ۔ اسے چاؤ چونچلے سے بیاہے ۔ اس لئے وہ اکیلی اتنی دور جانے پر رضامند نہ ہوئی تھی ۔ سلیمان کو فی الحال بیاہ کرنا منظور نہ تھا کیونکہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا اور اماں دھوم دھڑاکے کا بیاہ کرنا چاہتی تھی ۔ قرض لینا اسے گوارا نہ ہوا اور روپیہ جمع کرنا اس کی سرشست میں نہ تھا ۔ ان حالات میں وہ بیاہ نہ کر سکتا تھا ویسے بھی اسے بیاہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی ۔ اس روز وہ خوش تھا کہ ماں نے اس کے ساتھ رہنا منظور کر لیا ہے ۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اماں کے آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح بیٹے کو بیاہ پر مائل کرے اور اس مقصد کے لئے کچھ

روپیہ جمع کر سکے ۔

اگلے دن صبح سویرے اس کی آنکھ کھل گئی ۔ باورچی خانے میں شور سن کر اسے غصہ محسوس ہوا اس نے ایک انگڑائی لی اور ستھے کو آواز دے کر پوچھنے ہی والا تھا کہ سرہانے ماں کی شکل دکھائی دی ۔ لمبا سا جھریوں بھرا چہرہ گویا بے بسی کی تصویر تھا ۔ انداز میں دکھ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ۔ آواز میں لجاجت تھی ۔ اس کی ہر جنبش پر محسوس ہوتا گویا چینی کی پیالی چور چور ہو گئی ہے ۔

"سلیمان بیٹے تھوڑا سا ناشتہ کر لو" ۔ اماں نے منت سے کہا ۔ معاً وہ اُٹھ بیٹھا ۔ روز صبح اسے ستھے پر چیخنا پڑتا ۔ جب کہیں چائے نصیب ہوتی ۔ اور اسی چیخ پُکار میں اسے کالج سے دیر ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن اس روز اتنے سویرے سبھی کچھ تیار تھا بس اس کے اٹھ کر بیٹھ جانے کی دیر تھی ۔ واقعی گھر میں جان پڑ گئی تھی ۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس بڈھی جان کو گلے لگا لے ۔

چائے پیتے ہوئے اس کی نگاہ طوطے پر جا پڑی جو بڑے مزے سے کٹوری میں سے کچھ کھانے میں مصروف تھا ۔ "اوہ ۔۔۔۔۔ یہ تو ساری دنیا جاگ اٹھی ہے اور اتنے سویرے دیکھ اماں"۔ اس نے ماں سے کہا ۔ "ذرا مٹھو کو دیکھنا کیسے انداز سے کھا رہا ہے ۔ خدا کی قسم اماں پیرس کی میم کو بھی مات کر دیا ہے ظالم نے ۔ تمہارے آنے پر اسے کس قدر خوشی ہوئی ہو گی ۔ ورنہ اسے کچھ کھانے کو مل جائے ۔ روز بار بار ستھے کو یاد دلانا پڑتا تھا پھر کہیں جا کر بے چارے کو کچھ نصیب ہوتا لیکن اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے ۔"

چائے سے فارغ ہو کر وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے ۔ کیونکہ اس سے پہلے تو چائے پیتے ہی کالج سے دیر ہو جایا کرتی تھی ۔ اور وہ ادھر ادھر سے کوئی پتلون اٹھا ، کوٹ پہن جلدی میں تیاری کرنے کا عادی تھا ۔ شائد اسی لئے اگرچہ اس کے کپڑے صاف ہوتے لیکن پہناوٴ میں وہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی ۔ جو اچھے کپڑے پہننے والے پیدا کر لیتے ہیں ۔ خیر اب تو اسے بے پروائی سے کپڑے پہننے کی عادت ہو چکی تھی اور ایسا لباس پسند تھا ۔ جس میں تزئین سے بے نیازی کی جھلک واضح رہے ۔ خیر وہ صوفے پر بیٹھ گیا ۔ کتاب کے ورق الٹتا پلٹتا

رہا۔ اور طوطے کو غور سے دیکھتا رہا۔ "کیوں مٹھو اب تو مزے ہو گئے نا دوست۔ بڑی سوچ میں پڑے ہو"۔ وہ مٹھو کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "دیکھا دنیا بدل گئی نا۔ ہیں ؟" اس نے مٹھو سے باتیں کرنے کے دوران میں کپڑے بدلنا شروع کر دیا۔

ابھی اس نے پہننے کے لئے کوٹ اٹھایا تھا کہ اماں آگئی۔ "اوہ بیٹا تم نے تو پہن بھی لئے کپڑے۔ میں سمجھی ـــــ" یہ کہہ کر وہ یوں مڑی گویا واپس جا رہی ہو۔

"کیا بات ہے اماں" ؟ اس نے ماں کو آواز دی۔ "میں نے تو نہیں پہنے کپڑے ابھی۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ کیوں کیا بات ہے۔"

"کچھ بھی نہیں بیٹے"۔ ماں نے کہا۔ "یہ کپڑے کچھ خراب سے تھے میں نے کہا ذرا صاف کر دوں۔ برش کر کے لائی تھی یہ"۔ اس نے ایک جوڑا دکھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ اماں !" وہ خوشی سے چلایا۔ "یہ تو بہت صاف ہو گیا"۔

اگرچہ وہ سوٹ سلیمان کو پسند نہ تھا اور وہ اسے پہننے سے احتراز کیا کرتا تھا۔ اماں سے سوٹ لے کر اس نے پہنا۔ اس روز وہ سوٹ بھی نیا نیا سا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے محسوس کیا گویا اس سوٹ کو خواہ مخواہ ترک کر رکھا تھا۔ حالانکہ ایسا اچھا سوٹ تھا وہ۔

کالج سے واپسی پر اماں بیٹھی راہ دیکھ رہی تھی کھانا تیار تھا۔

"بہت دیر لگا دی بیٹا"۔ اماں بولی۔ "اتنی دیر تک لگتا ہے تمہارا کالج۔ تم تو کہتے تھے کالج دو ایک گھنٹے لگتا ہے اور بس ـــــ اچھا بیٹا"۔ اس نے سلیمان کو خاموش دیکھ کر کہا ـــــ "اب نہا لو تو کھانا اتار دوں۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا بیٹے"۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حسب معمول کاؤچ پر دھم سے جا پڑے۔ کوٹ

اتار کر کسی کرسی پر پھینک دے ۔ پڑا پڑا ٹوپی کھونٹی پر ٹانگنے کی کوشش کرے اور اس دوران میں تھے کو آوازیں دے اور کھانا نہ تیار ہونے پر بُرا بھلا کہے ۔ اور طوطے سے کھانا تیار نہ ہونے کی شکائت کرے ۔ نہا کر کھانا کھاتے ہوئے اسے خوشی تو ہوئی لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں افسوس سا ہوا کہ اس کا بہترین مشغلہ اس سے چھین لیا گیا ہے ۔

"بس ؟" اماں نے اسے کھانے سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا ۔ "کیوں بیٹا ؟ تمہیں بھوک نہیں لگتی کیا ؟" اسکی آواز میں فکر نمایاں تھا ۔ "صبح چائے کے ساتھ بھی تم نے کچھ نہ کھایا تھا" ۔ ایک نظر اس نے اماں کی طرف حیرانی سے دیکھا ۔ چونکہ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس روز اس نے بڑی اشتہا سے کھانا کھایا تھا اور یقیناً روز سے زیادہ کھا گیا تھا ۔ پھر وہ مسکرا پڑا ۔ اماں کے چہرے پر تشویش اور پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی ۔

"میں جانوں تمہیں پسند نہیں آیا" ۔ اماں نے دکھ بھری آواز سے کہا ۔ اس کی آواز لجاجت بھری تھی "کیوں بیٹے ؟"

"نہیں اماں" ۔ وہ ہنسا ۔ " میں تو روز پھوٹ پھوٹ کر کھاتا ہوں اور آج بھی میں نے ٹھونس کر کھایا ہے ۔ تم تو ویسے ہی گھبرا گئی ہو اماں " ۔ اس نے ہنستے ہوئے اٹھ کر کلّی کی اور پھر کرسی پر آ بیٹھا ۔

اس روز کمرے میں ہر چیز سلیقے سے پڑی تھی ۔ تمام کتابیں الماری میں رکھی ہوئی تھیں ۔ کرسیاں مناسب مقامات پر لگی تھیں ۔ میزوں پر دھلے ہوئے میز پوش پڑے تھے ۔ نہ جانے کیوں خواہ مخواہ اسے محسوس ہوا گویا وہ کتابیں بیکار ہو چکی ہوں اور مر جانے کے بعد الماری میں دفن کر دی گئی ہوں اور وہ کمرا بے جان پڑا ہو ۔ اگرچہ کمرے کی صفائی پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اسے رہ رہ کر خیال آتا گویا وہ کمرا کسی غیر آدمی کا ہو ۔ جیسے سلیمان سے دور کا بھی تعلق نہ ہو ۔ اس نے اٹھ کر الماری سے ایک کتاب اٹھا لی ۔ گویا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا واقعی وہ کتابیں مر چکی تھیں یا ابھی جان باقی تھی ۔ تفریحاً وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا ۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکا ۔ سامنے اماں یوں کھڑی تھی ۔ گویا حزن و ملال کی ایک تصویر ٹنگی ہو ۔

"بیٹے !" ماں نے منت سے کہا ۔ "ابھی کھانا کھایا ہے ۔ ذرا آرام کر لے ۔ اللہ ماری یہ کتابیں ، تو نے تو پڑھ پڑھ کر جان ہلکان کر لی ہے ۔ آرام کر لے ذرا بیٹا" ۔

وہ زبردستی مسکرایا ۔ "تو کیا بے آرامی کر رہا ہوں ۔ ہیں اماں ؟"

"نہیں بیٹے ۔ میں کہہ رہی تھی ۔ ابھی تو سر کھپا کر آیا ہے ۔ اور پھر کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام تو بہت ضروری ہوا بیٹے ، ویسے تو آپ سیانا ہے ۔ اللہ رکھے سمجھدار ہے ۔ جو جی چاہے کر ۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی" ۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔ "دیکھو تو کیسا لاغر ہو گیا ہے ۔ نہ کھانا ، نہ پینا اور کام ہی کام ۔ اللہ ماری یہ کتابیں" ۔ اس نے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "ایک دو ہوں تو بھی ہے ۔ یہاں تو پورا کباڑ خانہ اترا ہوا ہے" ۔

"واہ اماں !" وہ ہنسا ۔ "میں کیا دبلا پتلا ہوں یہ دیکھو" اس نے چھاتی کے بٹن کھول کر اماں کو دکھایا ۔ دیکھا اماں پورا پہلوان بن گیا ہوں ۔ کھایا پیا اور پھر سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہا ۔ اور یہ کتابیں ، میں کیا پڑھتا ہوں انہیں ہونہہ ! اماں تو تو ویسے ہی فکر کرتی رہتی ہے" ۔

"آخر یہ کتابیں پڑھی ہی ہوں گی نا" ۔ وہ بولی ۔ "اب نہیں پڑھتا تو کیا ہوا ۔ یہ ایک ہی کتاب سر پھرا دینے کے لئے کافی ہے ۔ توبہ کتنی بڑی بڑی ہیں ۔ اچھا بیٹا ذرا آرام کر لے ۔ دو گھڑی سو لے تو کیا حرج ہے تیرا ؟ اماں نے مزید لجاجت سے کہا ۔

سلیمان بادل ناخواستہ اٹھ کر چارپائی پر جا پڑا اس روز گویا اس کی آنکھیں نیند سے قطعی خالی تھیں ۔ لیکن اس خیال پر کہ اماں کا دل نہ دکھے وہ چپ چاپ پڑ گیا ۔ اور سوچنے لگا کہ اماں کو کس قدر خیال ہے میرا ۔ بے چاری ہر گھڑی میری

بہتری سوچتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود چوری چوری اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلے ۔ مٹھو سے باتیں کرے یا کچھ گنگنائے ۔ اور پھر تیھے سے چائے کا مذاق رہے ۔ لیکن اس روز تو کمرے کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کتابیں ادھر ادھر پھیلا دے ۔ کرسیاں گڈ مڈ کر دے ۔ حتیٰ کہ وہ کمرہ اس کا اپنا کمرہ ہو جائے ۔

نہ جانے کب تک وہ انہی خیالات میں کھویا پڑا رہا ۔ پھر اماں کی آواز سن کر چونک پڑا ۔۔۔۔۔ "کیوں بیٹے ؟ تمہیں نیند نہیں آتی ۔ پنکھا کروں ؟"

"نہیں نہیں اماں ۔ پنکھا کرنے کی ضرورت بھی ہو ۔ میں تو بالکل آرام کر رہا ہوں" ۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ "تم کیوں فکر کرتی ہو" ؟

"میں فکر تو نہیں کرتی بیٹے ۔ ویسے ہی دیکھنے آئی تھی کہ تم سو گئے ہو یا نہیں ۔ بس اب میں جاتی ہوں تم آرام کرو" جاتے ہوئے وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی ۔ "ناحق بے آرام کیا میں نے" ۔

اماں کے چلے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ بیمار ہو ۔ اماں کے انداز کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مہلک بیماری کا شکار ہو اور صرف اماں اس بھید کو جانتی ہو ۔ اس خیال پر وہ مسکرا دیا ۔ "یہ عورتیں ! وہ بنسا انہیں بچوں اور بیماروں سے کس قدر لگاؤ ہوتا ہے ۔ کسی بے بس کی دیکھ بھال کرنے سے کس قدر دلچسپی ہوتی ہے" ۔

"تم جاگتے ہو بیٹا" ۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد وہ پھر آگئی ۔ "چائے منگواؤں" ۔

"کیوں نہیں اماں" ۔ سلیمان اٹھ بیٹھا ۔ "میں تو چائے کے انتظار میں بیٹھا ہوں" ۔

چائے پیتے ہوئے اماں نے غور سے سلیمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ سلیمان اس محبت اور بے بسی کو دیکھ کر گھبرا گیا ۔ نہ جانے اماں اس قدر دکھی اور بے بس کیوں نظر آتی تھی ۔ وہ جانتا تھا ۔ کہ اماں کی زندگی میں بڑے بڑے

مصائب آئے تھے ۔ وہ کثرت ازدواج کی شکار تھی ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اب تو ایک عرصہ سے اسے کوئی تکلیف نہ تھی ۔ کسی کی محتاج نہ تھی ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا موجودہ غم گزشتہ زندگی کی تمام تر تکلیفوں سے زیادہ جانگسل ہو ۔ سلیمان کا شادی سے یوں بے نیاز ہونا اس کے لئے سب سے بڑا دکھ تھا ۔ چونکہ اس کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں بیٹے کو آباد دیکھے ۔ بہرحال اس وقت وہ اماں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا ۔ اس لئے خواہ مخواہ اپنی توجہ ادھر ادھر مبذول کرنے میں لگ گیا ۔ تاکہ ماں کی طرف نہ دیکھ سکے ۔

جب سلیمان نے تیسرا پیالہ بنایا تو اماں بولی ۔ "بیٹے تو بُرا نہ مانے تو کہوں ۔ اتنی چاء پینا اچھا نہیں ۔ یہ اللہ ماری ۔۔۔۔۔" اس نے چاء دانی کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "بدن کی ساری چربی پگلا کر رکھ دیتی ہے ۔ دیکھ تو منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں تیرے" ۔

"نہیں اماں" ۔ وہ خواہ مخواہ چڑ گیا ۔ "میں تو چھ چھ پیالے پی جاتا ہوں ۔ اس میں کیا ہے ؟"

"اچھا بیٹے !" ماں نے آہ بھر کر کہا ۔ "جیسے تیری خوشی ۔ پر یہ گرمی خشکی تیرے لئے اچھی نہیں ۔ آگے تو آپ سمجھدار ہے ۔ میں تو پاگل ہوں جو تجھے ایسی بات کہہ دیتی ہوں" ۔ اس وقت اس کی آواز پئے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی بھیگی سنائی دے رہی تھی ۔ سلیمان نے زبردستی طوطے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ وہ ان تاثرات سے بچنا چاہتا تھا جو اماں کی آواز اور جھریوں بھرا چہرہ پیدا کر رہے تھے ۔ خوش قسمتی سے باورچیخانے سے تڑاخ کی آواز آئی ۔ "دیکھنا تو اماں نہ جانے تجھے نے کیا توڑ دیا ہے" ۔ سلیمان نے بے پروائی سے کہا ۔

اماں کے جانے کے بعد دو ایک ساعت وہ خاموش بیٹھا رہا ۔ گویا چائے کا پیالہ پینے سے ہچکچا رہا ہو ۔ پھر اس نے دل کڑا کیا اور چائے کا تیسرا پیالہ غٹ غٹ پی گیا ۔ اور پھر جلدی جلدی چوتھا بنا کر معصوم انداز سے یوں طوطے کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

"لو بیٹے" ۔ اماں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی ۔ تھوڑا سا مکھن کھا

لو۔"

"مکھن؟" سلیمان نے تعجب سے اماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹے"۔ وہ بولی۔ "چائے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ مکھن کا استعمال کر لیا کرو تو اچھا رہے۔ ورنہ یہ کم بخت تو انتڑیاں سکھا دیتی ہے۔ رس بسکٹ پر لگاؤ گے یا ٹوسٹ بنا دوں"۔ اس وقت نہ جانے سلیمان کو وہ مکھن کا ٹکڑا اس قدر ڈراؤنا کیوں دکھائی دیا۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔

"لیکن اماں ــــ" وہ رک گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ اماں کا دل دکھانا اچھا نہیں۔ بادل ناخواستہ اس نے وہ ٹکڑا اماں کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ "نہیں اماں ٹوسٹ کی کیا ضرورت ہے"۔ اس نے تھوڑا سا مکھن رس بسکٹ پر لگا لیا۔

"ذرا سا اور لگا لو"۔ اماں نے لجاجت سے کہا۔ "اتنے سے مکھن سے کیا ہو گا؟" سلیمان نے محسوس کیا۔ گویا اس وقت دنیا کی چیزوں میں صرف ایک مکھن ہی تھا۔ جس کے خلاف اسے اس قدر نفرت تھی۔ اسے پسینہ آ گیا۔ پھر اسے سوجھی۔ چھری یوں چلائی گویا مکھن لگا رہا ہو لیکن سارے کا سارا مکھن چھری پر اتر آیا۔ جھٹ چھری والے ہاتھ کو میز تلے چھپا کر وہ ایک نوالے ہی میں بسکٹ نگل گیا۔ ماں سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی معصوم کو دھوکا دیا ہو۔ گویا وہ چور ہو۔ ایسی معمولی سی بات پر فریب کرنا، یہ احساس اس کی نظر میں اس کے جرم کو اور بھی قبیح بنا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ وہ بودا آدمی ہے۔ اس میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ ماں سے دل کی بات کہہ دے۔

چائے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ ٹوسٹ اس کے معدے میں پھول پھول کر آفت بنا رہا ہو۔ پہلے تو وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مگر وہ اس مکھن کے ٹکڑے کو بھلا نہ سکا۔ پھر ماں سے کہنے لگا۔ "اماں میں ذرا سیر کر آؤں"۔

"ہاں ہاں بیٹے" ۔ وہ بولی ۔ ذرا ٹہل آؤ ۔ لیکن جلدی لوٹ آنا ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا ۔

کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا سے اسے چڑ تھی ۔ وہ یہ بات سن کر اکثر طنزاً ہنسا کرتا ۔ یہ عورتیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا کا پاکھنڈ کرنا خوب جانتی ہیں وہ اپنے دوست سے اکثر کہا کرتا تھا مسٹر نعیم ، بیگم صاحبہ کا مطلب ہے کہ تم آوارہ گردی نہ کرو ۔ ورنہ کھانے کا کیا ہے ۔ ٹھنڈا ہو بھی جائے تو کیا کھایا نہیں جاتا ۔ اور سچ پوچھو مسٹر نعیم تو بیگم صاحبہ کا تمہیں آوارہ گردی سے بچانے کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ تم جلدی واپس آکر بیگم گردی کر سکو ۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا تو محض بہانہ ہے ۔ مطلب تو صرف اپنی طرف متوجہ کرنا ہے ۔ پھر وہ ہنس پڑتا ۔ "کس قدر چالاک ہیں یہ عورتیں !" اور وہ ہنسے جاتا لیکن اس روز اماں کی بات پر وہ ہنس بھی نہ سکا ۔ بیگم گردی کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ وہ تو اماں تھی ۔ اس کی اپنی ماں ۔

عام طور پر وہ سیر کا عادی نہ تھا ۔ اگرچہ سینما جایا کرتا تھا ۔ لیکن سیر ـــــ سیر سے اُسے نفرت تھی اگر اس کا کوئی دوست اس سے پوچھتا مسٹر سلیمان تم سیر کو نہیں جاتے تو وہ ہنس پڑتا اور کہتا ۔ "بھئی میرے لئے تو صرف یہ احساس ہی ضروری ہے کہ میں ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں اتنی سیر گاہیں ہیں ۔ جب اور جہاں چاہوں جا سکتا ہوں لیکن چل کر جانا ـــــ نہ بھئی کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو یا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگا جا رہا تھا ۔ لیکن جلد ہی وہ مکھن کا ٹکڑا اس کے پیٹ میں گرہ سی بن گیا اور ناچار اسے واپس آنا پڑا ۔

"کھانا کھاؤ گے ؟" اماں نے پوچھا ۔ "طبیعت تو اچھی ہے تم اس قدر چپ کیوں ہو ؟ سلیمان" ۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اماں" ۔ وہ بولا اور نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑا ۔

"دیکھا ، میں نے کہا تھا نا" ۔ اماں دکھی انداز سے بولی ۔ "یہ اللہ ماری چائے ، بس چائے چائے چائے نہ کھانا نہ پینا ۔ تمہارے دشمنوں کی انتڑیاں سوکھ

گئی ہیں اور کیا ہے گرمی اور خشکی"۔

سلیمان کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ چپ چاپ پڑا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اماں کی باتیں نہ سنے۔ لیکن وہ باتیں اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔ پھر اسے سوجھی بولا۔ "اماں! تم فضول فکر کرتی ہو ادھر نعیم کی ہاں چلا گیا تھا انہوں نے کھانا کھلا دیا"۔

"اوہ یہ بات ہے"۔ اماں بولی۔ "تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ خیر کھانے کی بات نہیں۔ مجھے تیری طبیعت اچھی نہیں دکھتی بیٹا"۔

اگلے دن سویرے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اماں سرہانے کھڑی ہے۔ اور ہاتھ سے اس کا ماتھا محسوس کر رہی ہے۔ پہلے تو وہ چونک پڑا۔ پھر انگڑائیاں لینے لگا۔

"نہ بیٹے اٹھو نہیں"۔ وہ بولی۔ "یہیں ناشتہ لے آتی ہوں میں۔ دیکھو تو سر تنور کی طرح تپ رہا ہے۔ میں جانتی تھی تیری طبیعت اچھی نہیں"۔ اس نے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ "نہ جانے کتنا بخار ہے"۔

"نہیں اماں!" اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی "ویسے ہی گرمی ہے۔ بخار کہاں" اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر حسب معمول کمرے میں گھومے۔ کوئی کتاب اٹھا کر یہاں سے وہاں رکھ دے۔ طوطے سے گپ شپ اڑائے لیکن اماں کے خیال سے وہ پڑا رہا۔ اگرچہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا چارپائی پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔

ماں ناشتہ لینے گئی تو وہ طوطے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جو پنجرے میں بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت اُسے طوطے کی انداز نشست میں وہ جمالی کیفیت نظر نہ آئی۔ اس کے اطمینان بھرے انداز کو دیکھ کر پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ شائد وہ اطمینان محض ظاہری ہو۔ اسے خواہ مخواہ شک پڑنے لگا۔ کہ طوطا خوش نہیں ہے۔

جب وہ چائے کا پیالہ بنانے لگا تو ماں لجاجت سے بولی۔ "بیٹے سلیمان!

آج چائے نہ پیو تو کیا ہرج ہے ۔ دودھ کا پیالہ پی لو ۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری

"دودھ" اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ۔ اسے دودھ سے چڑ تھی ۔ اس روز تو اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا کا سارا پاٹ دودھ بغیر پی جائے ۔ اتفاق سے اماں نمک لینے چلی گئی ۔ سلیمان نے قہوہ کا پیالہ بھرا اور اسے طشتری میں ڈال کر پی گیا ۔ پھر اس نے جلدی جلدی منہ پونچھا ۔ اور یوں بیٹھ گیا گویا اماں کا انتظار کر رہا ہو ۔ پھر آپ ہی آپ وہ غصے میں آگیا ۔ اس کا جی چاہا کہ اماں آ جائے تو اس کے روبرو دودھ ڈالے بغیر ایک پیالہ بنا کر پیئے لیکن اماں کو دیکھ کر اس نے اپنی خواہش دبا لی اور ازسرِنو اماں کا دل نہ دکھانے کا ارادہ کر لیا ۔

ابھی اس نے مربہ کی پھانک اٹھائی ہی تھی کہ وہ بولی ۔ "نہ بیٹے ! آج میں تمہیں یہ کھانے نہ دوں گی ۔ اللہ مارا کس قدر کھٹا ہے اور تم ساری رات کھانستے رہے ہو" ۔

سلیمان شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا پھر وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی ۔ "اچھا بیٹے جیسی تمہاری مرضی ۔ اگر ضرور ہی پینی ہے چائے تو دودھ زیادہ ڈال لو ۔ خشکی نہ کرے" ۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "دودھ ہی سے چائے کی خشکی کم ہو جاتی ہے ۔ لیکن آج کل تو لوگ چائے میں دودھ ڈالنا حرام سمجھنے لگے ہیں ۔ بس بوند گرائی رنگ بھی نہیں بدلتا اور پی گئے" ۔

سلیمان ہنسنے لگا ۔ لیکن اس کی ہنسی وحشت بھری سنائی دے رہی تھی ۔ "اچھا اماں" ۔ وہ بولا ۔ "یہ دیکھو" اور آدھ پیالہ دودھ سے بھر لیا ۔ "ٹھیک ہے نا ؟"

"جیسے تیری مرضی بیٹے !" ماں نے مسکرا کر کہا ۔ "میں تو تیری خوشی میں خوش ہوں ۔ میرا کیا ہے ؟"

"نہیں نہیں" وہ چلایا ۔ "ٹھیک تو کہہ رہی ہو تم ۔ میں کیا بچہ ہوں جو اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ چائے خشکی کرتی ہے اور کھانسی کی وجہ سے مجھے مارملیڈ نہ

کھانا چاہیئے" ۔

"نہیں بیٹے ۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں تو میری بات کا برا نہ مان جائے" ۔

اس روز کالج سے چھٹی تھی ۔ سلیمان نے کتاب اٹھائی تو اماں نے اسے پڑھنے سے منع کر دیا ۔ وہ لیٹے لیٹے تھک گیا پر دن تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو تیھے کو آواز دے کر چاء کے لئے ہی کہہ دے لیکن اماں کے خیال سے رک جاتا ۔ کچھ گنگنانا چاہتا تو نہ جانے کیوں آواز حلق میں اٹک جاتی ۔ پھر وہ چپ چاپ طوطے کو دیکھنے میں لگ جاتا لیکن اس روز طوطا بھی یوں بیٹھا تھا جیسے طنزاً اس پر ہنس رہا ہو ۔ آخر اکتا کر اس نے کتاب اٹھا ہی لی ۔ نہ جانے کون سی کتاب تھی وہ اور اس میں تصویریں دیکھتے دیکھتے پڑھنے لگا ۔

"بیٹے سلیمان !" اماں کی لجاجت بھری آواز سنائی دی ۔

"اف ۔۔۔۔۔ !" وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا ۔

اماں گھبرا گئی ۔ "نہیں نہیں بیٹے تو آپ سمجھدار ہے ۔ جو تیرا جی چاہے کر میری تو ویسے ہی بری عادت ہے کہ تجھ سے تیرے بھلے کی کہتی رہتی ہوں ۔ جو جی چاہے کر ، اللہ رکھے آپ سمجھدار ہے" ۔

"کیا کروں اماں ۔ میں تو لیٹے لیٹے تھک گیا" ۔ اس نے طبیعت کو قابو میں کرتے ہوئے کہا ۔

"نہیں نہیں جو تیری خوشی ہو کر" ۔ اماں بولی ۔

"میری خوشی" وہ ہنسا ۔ "اماں میری خوشی تو رہی ہی نہیں ۔ میرا مطلب ہے ہے ہی نہیں ۔ ویسے میرا جی چاہتا ہے ۔۔۔۔۔" اور وہ چپ ہو گیا ۔

"کیا جی چاہتا ہے بیٹے ؟" اماں نے پوچھا ۔

"بتاؤں ؟" وہ مذاقاً کہنے لگا ۔ "جی چاہتا ہے اپنے کمرے میں چلا جاؤں" ۔

"اپنے کمرے میں ؟" اماں نے حیرانی سے دہرایا ۔ "یہی تو ہے تیرا کمرہ ۔۔۔۔۔ !"

"ہے تو یہی ــــــ لیکن رہا نہیں" وہ اٹھ بیٹھا۔ "دیکھو اماں میں دکھاؤں اپنا کمرہ تمہیں ؟"

اس نے الماری میں سے سب کتابیں نکال کر انہیں ڈھیریوں میں ادھر ادھر بکھیر دیا۔ دو ایک کرسیاں الٹ پلٹ کر دیں گدیاں ایک طرف پھینک دیں اور پھر بوٹ سمیت صوفے پر گر کر ہنسنے لگا۔ "دیکھا اماں یہ ہے میرا کمرہ !"

اس کی ہنسی میں دیوانگی کی جھلک محسوس کر کے اماں نے چیخ سی ماری۔ "سلیمان ــــــ کیا ہے تمہیں بیٹا۔ ذرا تیرا سر دیکھوں"۔ اس نے سلیمان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں جانوں بخار دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ ہائے اللہ ماری یہ چائے کی خشکی۔ کیوں بیٹے۔ کیسی ہے طبیعت ؟" وہ بولی۔

طوطے نے یوں چیخ ماری جیسے وہ سلیمان پر ہنس رہا ہو۔ سلیمان نے محسوس کیا جیسے طوطا اسے طعنہ دے رہا ہو۔ وہ اماں سے کہنے لگا۔ "میرا جی چاہتا ہے ــــــ اس طوطے کو اڑا دوں" ہنستے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور لپک کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ طوطے نے پر پھڑپھڑائے اور بیٹھا رہا۔

"شی شی ــــــ شی"۔ سلیمان نے تالی بجا کر اُسے اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہے سلیمان، کیا ہے تجھے"۔ اماں لجاجت سے بولی۔ "ایسے پیارے پالتو کو اڑاتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا تمہیں ؟ ہائے ہائے کیسا پیارا ــــــ"

"پیارا پالتو ــــــ" وہ کھلکھلا کر دیوانہ وار ہنسا ــــــ "پیارا پالتو ــــــ"

"سلیمان ــــــ !" اماں نے ڈر سے چیخ ماری۔ "میرے اللہ کیا ہے میرے بیٹے کو ؟"

"پیارا پالتو !" ــــــ وہ ازسرِنو جوش سے ہنسنے لگا ــــــ "پیارا پالتو ــــــ !!"

○

گھمی

گھما گھمی

فہرست

"بدماش"

وہ جھجک کر پیچھے ہٹی ۔ عقب سے دو مضبوط بانہوں نے اسے آغوش میں لے لیا اور اس کا سر اک چوڑی سی چھاتی سے جا ٹکرایا۔

اُس کے بدن میں اک ہوائی اڑی ۔ اور حلق میں آ اٹکی ۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں ۔ جسم سن ہو گیا ۔ چیخ گلے میں اٹک گئی ۔ لیکن اس خاموش چیخ کی تھرتھراہٹ چاروں طرف گونجنے لگی ۔ سانس اکھڑ گیا ۔ کوٹھی کا ویران برآمدہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا دور آسمان پر ستارے ایک دوسرے سے ٹکرائے پھلجھڑی کی چنگاریوں کی طرح گرے اور گل ہو گئے ۔ ایک بڑے سے ہاتھ نے اس کا منہ موڑا ۔ چڑھی ہوئی پتلیوں میں اک مونچھوں والا بارعب چہرہ جھلکا ۔ پھر وہ چہرہ پھیلتا گیا ۔ چاروں طرف چھا گیا ۔ اس کے جسم اور روح پر منوں بوجھ پڑ گیا ۔ ہڈیاں چلچلانے لگیں ۔ بند بند کلبلانے لگا ۔ پھر وہ کلبلاہٹ اور بھی گہری ہو گئی ۔ اور دھیرے دھیرے اس میں ربط پیدا ہوتا گیا ۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کا بند بند تال دے رہا ہے ۔ دور کہیں نغمے نے کروٹ لی ٹن ٹن ۔ ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگیں ۔ گڑوم ۔۔۔۔۔ مندر کا نقرئی گھنٹہ تھرتھرایا ۔۔۔۔۔ وہ تھرتھراہٹ رقص کرنے لگی ۔ ٹِک ٹِک ۔ ٹِک ٹِک پجارن نے نغمے کی لے پر تالی بجانا شروع کر دیا ۔ رگ رگ میں طوفان اٹھا ۔ بڑھا جس کی شدت نے اسے ادھموئی کر کے پھینک دیا ۔ اور وہ یوں اس گرم چھاتی سے چمٹ گئی جیسے کوئی طوفان زدہ ناؤ ساحل سے جا چمٹتی ہے ۔

جھجک کر وہ سمٹی ۔ لیکن اس کے باوجود اس کا جسم یوں سہم کر شل ہو گیا تھا جیسے اپنے آپ کو حوالے کر رہا ہو ۔ لیکن اس خاموش سپردگی کے باوجود کہیں سے ایک گردباد ابھر رہی تھی ۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ کسی رنگین ساحل

سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی ۔ آخر آج اس کی آرزو پوری ہو جائے گی ۔ وہ طوفان اس کے لئے پیغام تکمیل تھا ۔ اس کے جسم و روح کا ذرّہ ذرّہ منتظر تھا ۔۔۔۔

وہ ہمہ گیر طوفان یکلخت رکا ۔ اور صابون کے جھاگ کی طرح گھل گیا اسے ایک دھچکا لگا ۔ وہ چونکی اور یوں بیدار ہو گئی گویا کسی بھیانک حقیقت نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو ۔ وہ اٹھتی ہوئی گردباد دفعتاً ریت کا تودا بن کر رہ گئی تھی ۔ جس میں حرکت کی طاقت ناپید ہو چکی ہو اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ دیوانے کی طرح چیخے ایک ایسی چیخ ۔۔۔۔۔ لیکن اسے زبان نہ ملی ۔ پھر وہ چیخ دیوانہ وار اس کی نس نس میں جا تھرائی ۔ حلق میں آکر کانٹا بن گئی ۔ اور پھر آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک پڑی اس کا جی چاہا کہ دیوانہ وار قہقہہ لگا دے لیکن ہمت نہ تھی ۔ وہ مسکرا دی ۔ زہر آلود مسکراہٹ اور پھر منہ پر دوپٹہ لے لیا ۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ اسے دھوکا دیا گیا تھا ۔ بپھرے ہوئے شیر کی بجائے مٹی کا بالک ! ۔۔۔۔۔ دور وہ مونچھوں والا بچہ ہونک رہا تھا ۔ گویا زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ضد کر رہا ہو بچہ !! ۔۔۔۔۔ اس کا ہاتھ بڑھ کر بچے کو تھپکنے لگا ۔۔۔۔۔ بیچارا !!!

گھر پہنچ کر اس نے گھگری اور بنڈی اتار کر پھینک دی ۔ کپڑے بدلے ۔ چارپائی سے بستر اٹھا کر دے مارا اور دھم سے گر پڑی ۔ ازسرِنو چھوٹی چھوٹی لہریں بند بند سے اُٹھ رہی تھیں ۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کسی سے پوچھے ۔ آخر کیوں ۔ کیوں ؟ اس کی رگ رگ میں اک تھرتھری کیوں ناچتی ہے ؟ کیوں ؟ کیوں طوفان جمع ہوتا رہتا ہے ؟ جمع ہوتا رہتا ہے !! اور پھر ہر دفعہ یوں ریت کا تودہ بن کر رہ جاتا ہے اور پھر وہی ہلکی ہلکی لہریں ۔ اُف ! اس وقت اس کی نگاہ میں وہ مخملی گدے اور نرم غالیچے کھٹک رہے تھے ۔ وہ اس کھردری چارپائی پر اپنا جسم مل رہی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ چارپائی کی رسیاں ابھر کر اسے چاروں طرف سے لپیٹ کر کس دیں اور وہ نڈھال ہو کر پڑ جائے ۔ شاید اسی لئے اس نے نواڑ کا پلنگ اپنے کمرے سے اٹھوا دیا تھا ۔ وہ پلنگ جو اسے جہیز میں ملا تھا ۔ اسے آرزو تھی کہ وہ کسی بھدے سے مٹی کے مکان میں رہتی ہو ۔ جس

میں ملائم سازوسامان کی بجائے کھردری اور بھدی سی لسّی بلونے والی مٹکی ۔ اور وہ روز صبح سویرے لسّی بلو بلو کر ہار جایا کرے حتیٰ کہ اس کے جسم کی وہ پریشان کن ہلکی تھرتھراہٹ ختم ہو جائے ۔ اور پھر وہ آیا کریں ۔ داڑھی سے بھرا ہوا چمکتا ہوا منہ، بے پروا سی غصیل نگاہ ، بے رحم سے سخت ہاتھ اور چھپتے بال !!!

دل آرا اکثر چارپائی پر پڑے پڑے سوچا کرتی تھی ۔ اس وقت اس کی نگاہ میں وہ پُر تکلف ڈرائینگ روم دھندلا پڑ جاتا اور ایک کچا مکان ابھرتا۔کھردرے گھاٹ اور لسّی بلونے والی مٹکی ۔ پھر دو مضبوط بازو اسے بلونا شروع کر دیتے اور وہ محسوس کرتی گویا وہ خود بلوئی جا رہی ہو ۔ گویا وہ خود اک رنگین مٹکی ہو اور بڑے بڑے ہاتھوں کی منتظر ہو ۔ اس وقت اس کا جسم سن ہو جاتا ۔ کوئی پھانس حلق میں اٹک جاتی دم اکھڑ جاتا ۔ بھویں تن جاتیں اور بازوؤں تلے جنگلی کبوتروں کا جوڑا پر پھیلا دیتا گویا اس قید سے چھٹکارا پانے کے لئے اڑ جانا چاہتا ہو ۔ کئی مرتبہ یونہی پڑے پڑے وہ ان کے پاؤں کی چاپ سنتی اور محسوس کرتی جیسے وہ پاؤں اُسے لتاڑ رہے ہوں اس کی ہڈیاں چرچراتیں ۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوتی کہ ان کی آنکھوں سے شعلے نکلیں ۔ شرارے اڑ کر اسے جھلس دیں ۔ اس کے اذیت دہ جمود کو پاش پاش کر دیں ۔ پھر وہ سامنے آکھڑے ہوتے ۔ دل آرا میری جان ملائم آنکھیں ۔ گورے چٹے نازک ہاتھ ! دور اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی دیوانی چلّاتی ۔ یہ آنکھیں !! یہ ہاتھ !!! اس وقت وہ محسوس کرتی کہ ان کی آنکھیں بلوری تھیں ۔ بلوری اور شربتی ۔ گویا وہ صرف اس لئے بنی تھیں کہ کوئی انہیں دیکھے ۔ خود دیکھ نہ سکتی تھیں ۔ وہ صرف اس امید پر روشن تھیں کہ کوئی اپنی آنکھیں ان میں ڈال دے ۔ اور پھر وہ آنکھیں لجاتی تھیں ۔ اور وہ ہاتھ جو لپٹ سکتے تھے ۔ لیکن لپیٹ نہ سکتے تھے ۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے اٹھ بیٹھتی ۔ جی ۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر کہتی ، نہ جانے اس کے دل میں وہ کون دیوانی تھی جو اسے ایسے خیالات پر مائل کر دیتی تھی ۔ اسے اپنے ان خیالات پر اور خواہشات سے قطعی ہمدردی نہ تھی بلکہ بسا اوقات وہ ان خیالات پر آپ ہی نادم ہوتی ۔ لیکن ان خیالات کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لینا بھی تو اس کے بس کا روگ نہ تھا ۔

اسے رشید سے لگاؤ تھا ۔ اور اس سازوسامان اور ٹھاٹھ سے بیحد دلچسپی تھی ۔ وہ مکان ۔ لسی بلونے والی مٹکی اور مونچھوں والا جوان !! لاحول ولا قوت ۔ کیسے بیہودہ خیالات دل میں سما جاتے تھے ۔ وہ ان خیالات سے عاجز آ چکی تھی ۔

رشید اور دل آرا کا بیاہ ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا ۔ اگرچہ اسے رشید سے ویسی محبت نہ تھی ۔ جیسے عام طور پر لڑکیوں کو نوجوانوں سے ہوتی ہے مگر وہ خوش تھی کہ وہ رشید کی بیوی بنے گی ۔ رشید کی نفاست ۔ خوش پوشی اور اخلاق اسے پسند تھے اس کے علاوہ اسے ٹھاٹھ میں رہنا پسند تھا ۔ اور رشید کے گھر میں یہ سب کچھ میسّر آسکتا تھا ۔ وہ خوشی خوشی ڈولی سے اتری تھی ۔ رشید سے وہ پہلی بے تکلف ملاقات ۔ اس کی رنگین باتیں ۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا ۔ جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو ۔ وہ نفاست اخلاق اور خوش پوشی اس کے لئے اذیت دہ ہو گئے تھے ۔ رشید کی نفاست اخلاق اور خوش پوشی نے جس کی وہ دلدادہ تھی گویا اس کے اردگرد سلاخیں کھڑی کر دی تھیں ۔

اگرچہ وہ اپنے بیہودہ خیالات پر بہت خشمگیں ہوئی تھی ۔ لیکن خشمگیں ہونے کے باوجود ان خیالات کا تار نہ ٹوٹا تھا ۔ وہ حیران تھی کہ دفعتاً اسے کیا ہو گیا ہے وہ امیدیں آرزوئیں اور جوش جو وہ ساتھ لے کر آئی تھی یوں ٹھس کیوں ہو گئے تھے کیوں ؟ اس کے جسم میں کسمساہٹ جوں کی توں لہریں لے رہی تھی ۔ پھر اس نے کس شوق سے رشید کو ابھارا تھا ۔ اس امید پر اپنی روح کی تڑپ عریاں کر دی تھی کہ شاید وہ ایسا طوفان بن جائے جو اسے ساحل سے ٹکرا کر چکنا چور کر دے ۔ لیکن ساحل کے قریب پہنچ کر وہ تموج گویا ریت کا تودہ بن کر رہ جاتا تھا ۔ جس میں کوئی ناؤ ٹھس ہوئی کھڑی تھی ۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دے ۔۔۔۔۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ہنس پڑی تھی اف وہ ہنسی کتنی اذیت ناک تھی اس نے اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا ۔ اور خواہ مخواہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ ایک کھلونا ہے ۔ بچے کا کھلونا ! اس دھندلکے میں ایک بڑا سا بچہ کپڑے جھاڑ رہا تھا ۔ اس کا دم اکھڑا ہوا تھا ۔ چہرہ بھوت بنا ہوا

تھا ۔ گویا وہ مرد کا کارٹون ہو ۔ "دل آرا میری جان" ۔۔۔۔۔ دلارے بچے کے پیچھے ایک مونچھوں والا گبرو طنزاً مسکرا رہا تھا وہ شرم سے پانی پانی ہوتی جا رہی تھی دھوکا ۔۔۔۔۔ اس کی نس نس میں چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی تھیں ۔ اسے چڑا رہی تھیں بہلایا گیا ہے کھلونہ ! ۔۔۔۔۔ بچے کا کھلونہ !

لیکن بسا اوقات وہ رشید کو دیکھ کر دل ہی دل میں ناز کرتی ۔ رشید کی خوش پوشی ۔ اخلاق اور مغربیت میں ایک آسودگی محسوس کرتی ۔ رشید کی محبت کی مدھم لو کی گرمی دل آرا کے تن بدن میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی اور وہ اپنے آپ پر خشمگین ہوتی کہ کیوں ایسے بیہودہ خیالات دل میں آئے ۔ لیکن یہ طلسم دیر تک نہ رہتا پھر رشید کا قرب گویا اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ۔ اور وہ بے بس ہو کر تڑپتی ۔

کئی بار اسی وحشت کے زیر اثر اس کا جی چاہتا کہ کہیں بھاگ جائے ۔ کسی ویرانے میں ، یا کسی میلے کی بھیڑ میں کھو جائے ۔ جہاں کھوے سے کھوا چھلے ۔ اور اس ریلے میں دھکے کھا کھا کر نیم جان ہو کر گر پڑے اور سونٹے والے بھدّے دہقان اسے لتاڑتے ہوئے چلتے جائیں ۔ اسی طرح گاتے ہوئے جھومتے ہوئے فحش بکتے ہوئے اُف ۔۔۔۔۔ لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں ان لمبے تڑنگے مُچھ مروڑوں کے لئے حقارت کا جذبہ بیدار ہو جاتا اور وہ اُس جذبہ کے زیرِ اثر ہچکولے کھاتی ۔ اُس وقت وہ اُس جذبہ کے ہاتھ میں جھنجھنا بن جاتی ۔ اس تمسخر بھرے احساس برتری سے تو یہ جذبۂ حقارت ہی اچھا تھا جو اسے جھلاتا تو تھا ۔ اگرچہ اس جذبے میں بھی لہر کے اتار چڑھاؤ کی طرح حرکت نہ تھی ۔ بلکہ محض ایک سراب ۔ پھر بھی وہ ریت کا تودہ تو نہ بنتی تھی ۔ لیکن مصیبت یہ تھی ۔ کہ دہقانوں کے منہ پر بھی مونچھیں اکڑ جاتیں ۔ اور پھر دفعتاً وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی ۔ اس کی آنکھوں تلے ابآ کا چہرہ پھرنے لگتا ۔ گھٹے ہوئے گھنگھریالے بالوں سے بھرے ہوئے جسم پر اک بارعب مونچھوں والا چہرہ ۔ ابا کا خیال آتے ہی اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی حلق خشک ہو جاتا اور دل دھڑکنے لگتا ۔ ابآ کا ڈر ابھی اس کے دل سے نہ گیا تھا ۔ گھر میں ابا کا کس قدر رعب تھا ۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا مجال تھی کہ اونچی آواز میں سرگوشیاں

کرتی ۔ بلکہ زیادہ تر بات تو اشاروں ہی میں ادا ہو جاتی اور اماں کو اشارہ کرنے میں کیا کمال حاصل تھا ۔ سب کا دھیان ابا کے کمرے کی طرف لگا رہتا ۔ جب کبھی ان کی آواز آتی تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے اور گھر پر سناٹا چھا جاتا ۔ جب تک وہ کھانا نہ کھا لیتے تھے اماں اور خادمہ گھبرائی ہوئی پھرتیں ۔ کھانا چنا جاتا تو گھر پر ایک خاموش پریشانی چھا جاتی حتیٰ کہ ابا کے کھانسنے کی آواز آتی اور اماں مسکرا دیتی ۔ چونکہ ان کی کھانسی اس بات کا اعلان سمجھی جاتی تھی کہ کھانا قبول کر لیا گیا ہے اور وہ کھا رہے ہیں ۔

ابا کے غصے سے سبھی ڈرتے تھے ۔ حالانکہ انہوں نے کبھی کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا ۔ نہ ہی وہ اماں سے لڑنے کے عادی تھے ۔ البتہ ان کی للکار سن کر خون جم جاتا تھا ۔ جب وہ کہتے ۔ "دل آرا کی ماں" ۔ توان کی آواز کا انداز ہی اس بات کا شاہد ہوتا کہ حالات بگڑ رہے ہیں ۔ ابا کے مقابلے میں رشید تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی مٹیار کشمیرن نے کوٹ پہن رکھا ہو ۔ شاید اسی لئے دل آرا کو رشید بے حد پسند تھا ۔ اور اسی لئے اسے خوشی تھی کہ رشید کے گھر جائے گی ۔ توبہ ! اپنا گھر تو اک قیامت تھی ہر وقت دل پر اک بوجھ چھایا رہتا اور پھر اماں کے پر معنی اشارے اس چھائے ہوئے خوف کو اور بھی بھیانک بنا دیتے ۔ کیا مصیبت تھی ! اماں کو تو ڈر ڈر کر رہنا کچھ ایسا پسند تھا کہ خواہ مخواہ سہمی ہوئی رہتی اور بات بات پر ابا کو "ہوّا" بنا کر پیش کیا کرتی ۔ توبہ !! اس گھر میں تو اطمینان کا سانس بھی مشکل تھا ۔ اور پھر اس دن ــــــ اُف وہ دن !!

اس روز وہ زبیدہ سے ملنے گئی تھی ۔ نہ جانے کس لئے اسے سارا دن وہاں رہنا پڑا تھا اور رات گئے گھر پہنچی تھی ۔ پھر ابا نے اسے بلایا تھا ۔ دل آرا ۔ یہاں آؤ ۔ توبہ ! کیسی بھیانک آواز تھی ان کی ۔ دل آرا کا خون جم گیا تھا ۔ اور وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ پاؤں میں اتنی سکت نہ تھی کہ قدم آگے بڑھائے ابا کا منہ غصے سے انگارہ ہو رہا تھا ــــــ انہوں نے اسے شانے سے پکڑ لیا ۔ اس ایک ہاتھ کے دباؤ سے دل آرا پر منوں بوجھ پڑ گیا ۔ نہ جانے کیا ہوا بدن میں اک ہوائی چل گئی ــــــ جیسے وہ اڑی جا رہی.

ہو ۔۔۔۔۔ اوپر ۔۔۔۔۔ پھر وہ اک زناٹے سے گری ۔۔۔۔۔ سُن ۔ اور پانی پانی ہو گئی ۔ ماتھا تک پسینے سے بھیگ گیا ۔ اور وہ چیخیں مار مار کر رونے لگی ۔ اور ابا نے اسے چھوڑ دیا ۔ پھر وہ گٹھڑی کی طرح اپنی چارپائی پر جا گری اور یوں کانپنے لگی ۔ جیسے کوئی برفیلا چھپڑ پار کر کے آئی ہو ۔ نہ جانے وہ اس واقعہ کو کیوں نہ بھول سکتی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود ابا اسے بہت پیارے تھے ۔ وہ جی ہی جی میں ان پر ناز کیا کرتی ۔ لیکن جب بھی وہ ابا کا خیال کرتی تو اس کی آنکھوں تلے غصے سے بھرے ہوئے ابا کی تصویر آ جاتی ۔ اور وہ جھینپ جاتی ۔ بلکہ اکثر مرتبہ تو اُس تصویر سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ۔ اسوقت وہ کوئی نہ کوئی کام دھندا لے بیٹھتی لیکن دل کی یہ کیفیت ہو تو کام میں جی کیسے لگے ۔

ادھر رشید صاحب تھے کہ انہیں غصہ آتا ہی نہ تھا ۔ کبھی کبھار جب چڑ جاتے تو منہ بنا کر تو بیٹھ جاتے لیکن آنکھیں درپردہ ہنستی رہتیں ۔ گویا مذاق کر رہے ہوں ۔ ایک دو مرتبہ نہ جانے کیوں ۔ دل آرا نے ویسے ہی تفریحاً ان کے غصے کو ابھارنا چاہا تھا اور بظاہر بڑی سنجیدگی سے دو ایک ایسی باتیں کی تھیں جن کے متعلق اسے یقین تھا کہ انہیں گوارا نہیں پہلے تو وہ خاموش ہو گئے تھے پھر شام کو جب دونوں اکٹھے بیٹھے اور دل آرا نے ازسرنو ان باتوں کو دہرایا تو وہ چونکے اور ایک ایسی نگاہ سے دل آرا کی طرف دیکھا جیسے شاید دوسرے غصہ کا اظہار نہیں سمجھتے ۔ لیکن دل آرا یہ جانے بنا نہ رہ سکی کہ وہ خشمگیں نگاہ غصہ کا اظہار نہیں بلکہ آنسو تھامنے کی کوشش تھی ۔ اس کے بعد دل آرا نے کبھی ان سے مذاق نہ کیا تھا ۔ البتہ وہ کہا کرتی ۔ آپ تو ایسے نازک ہیں کہ مذاق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے ۔

اور رشید صاحب ایک لمبی آہ بھر کر کہتے ۔ خوبصورت بیوی بھی کیا مصیبت ہے ۔ ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر آتا ہے کہ کہیں میلی نہ ہو جائے ۔ اس بات پر دل آرا چڑ جاتی واہ کبھی ہیرا بھی میلا ہؤا ہے کیا ۔ چاہے پاؤں سے لتاڑو ۔ ہم کیا بد مذاق ہیں ۔ کہ پاؤں میں لتاڑیں ۔ ہم تو انگشتری میں جڑوا کر پہننے کے قائل ہیں ۔ رشید صاحب اپنی انگوٹھی دکھا کر کہتے ۔ اس وقت نہ جانے دل آرا کو

کیا ہوتا ۔ جی چاہتا کہ بپھری ہو جائے ۔ خواہ مخواہ زبردست خواہش پیدا ہوتی کہ ان سے لڑ پڑے ۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا گویا اس کی زبان کٹ چکی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے گونگی ہو گئی ہے غصے میں وہ اٹھ کر چلی جاتی اور بے چارے رشید صاحب چینختے ۔ اوہ ناراض ہو گئی دل آرا ۔ بیوی کیا ہوئی نیم چڑھا کریلا ہوا ۔

البتہ ایک دن انہیں واقعی غصہ آگیا تھا ۔ وہ اندر بیٹھی تھی کہ اچانک میاں باہر غصے سے چلائے ۔ وہ اٹھ بیٹھی گویا کوئی خوشخبری سنی ہو ۔ دیر تک مضطربانہ اِدھر اُدھر پھرتی رہی ۔ آئینہ دیکھا ۔ بال کھول کر پریشان کر دیئے ۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی اور پھر دوپٹہ لٹکائے ٹہلنے لگی ۔ معاً اسے خیال آیا کہ اسے کچھ کرنا چاہئیے ۔ سوچنے لگی ۔ اسے خوب معلوم تھا کہ انہیں دل آرا کا پرشیان حال میں پڑے رہنا ناگوار ہوتا ہے ۔ جھٹ بستر لپیٹ دیا اور پھر گٹھڑی سی بن کر نہ جانے کس آس پر پڑ گئی حتیٰ کہ وہ اندر آ پہنچے ۔ وہ مسکرائی ۔ آنکھوں تلے جوالا مکھی سا شعلہ ۔ دل دھک دھک کر رہا تھا ۔ اوہ دل آر وہ اسے دیکھ کر بولے ۔ اور پھر گھبرا کر پوچھنے لگے ۔ "تمہاری طبیعت تو اچھی ہے ۔" دفعتاً وہ جوالا مکھی ٹھس ہو کے رہ گیا ۔ وہ لہر تڑپ کر مٹی کی ڈھیری ہو گئی ۔ اس کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ گئے ۔ "کچھ نہیں" وہ بولی ۔ اور پھر معاً محسوس کیا گویا کچھ بھی نہ ہو ۔ کچھ بھی نہیں ۔ وہ مکان وہ ملائم میاں وہ خوبصورت چہرا جو کچھ دیر پہلے آئینے میں مسکرایا تھا ۔ وہ جہان ، سورج چاند ستارے کچھ بھی نہ تھے ۔ بس اک خلا تھا وسیع بسیط گونگا خلا ۔

اگلے دن خادمہ نے رشید کے غصے کا راز دل آرا کو بتایا ۔ "توبہ بی بی اس کمبخت شیرے نے تو آفت مچا رکھی ہے جبھی تو کل سردارے کو ڈانٹ رہے تھے" ۔

"بات کیا ہوئی تھی ۔ رحیمن ۔" اس نے لاپرواہی سے پوچھا ۔

"اے ہے بی بی" ۔ "وہ بولی "کیا بتاؤں آپ کو وہ اللہ مارا شیرا تو مانا ہوا بدماش ہے اور یہ سردار بھیگی بلی ہے ۔ اسے چپ چاپ دیکھ کر بے زبان نہ سمجھ لینا تم ۔ ہاں ۔ اس کی چپ بھی ایک راز ہے ۔ میں سب جانتی ہوں ۔ مجھ سے کیا چھپا ہے ان کا ۔ ایک ایک کرتوت جانتی ہوں ۔ بھلا پوچھو تو کہ بھلے

میاں شیرے کا تمہارے پاس آنے جانے کا مطلب ۔ جب صاحب نے ایک مرتبہ کہہ دیا کہ خبردار جو شیرا کوٹھی میں آیا تو ۔۔۔۔۔ پھر یہ کیوں اسے روز بُلا لاتا ہے ۔ اسی بات پر تو وہ خفا ہو رہے تھے میں سمجھتی ہوں ۔ بہت اچھا کیا صاحب نے ۔ اور بی بی ۔۔۔۔۔"

رحیمن کو چھیڑ دینا تو آسان تھا لیکن پھر ۔۔۔۔۔ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا ۔ دل آرا یہ بات جانتی تھی ۔ جبھی اسے زیادہ منہ نہ لگاتی تھی ۔ نہ جانے اس روز دل آرا کو کیا ہوا ۔ وہ رحیمن کی باتیں غور سے سن رہی تھی اور رحیمن رازدارانہ انداز میں کہے جا رہی تھی ۔

اور بی بی وہ بدماش ہے بھی تو لمبا تڑنگا ۔ اور یوں مونچھیں اکڑائے پھرتا ہے ۔ جیسے ساری دھرتی کا مالک ہو ۔ بس دیکھ کر دہشت آتی ہے ۔ منہ کالا ہو مردود کا ۔ آنکھ میں ذرا شرم نہیں ۔ دیکھتا یوں ہے جیسے کچا کھا جائے گا ۔ توبہ ہے ۔۔۔۔۔ !!!

دل آرا یوں ساکن بیٹھی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ۔ آنکھیں رحیمن کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھیں ۔ دل دھک دھک کر رہا تھا اور کوئی پھانس ابھر کر حلق میں اٹک گئی تھی ۔ رحیمن بھی اس انداز سے بات کرنے کی عادی تھی ۔ جیسے کوئی آپ بیتی سنا رہی ہو ۔

"اللہ بچائے اس مردود سے ۔ بی بی ایک دفعہ جو اس کی آنکھ میں چڑھ جائے بس اس اللہ کی بندی کا اللہ ہی بیلی ہے ۔ وہ بے چاری نرس ۔ نہ جانے اس کی کون سی بات بھا گئی ۔ اس مردودے نے لاکھوں جتن کئے ۔ لیکن بی بی آفرین ہے اس عورت پر اس نے ایک نہ چلنے دی ۔۔۔۔۔ آخر ۔ توبہ! ایک روز اسے ڈیک کے پُل سے اٹھا کر لائے ۔ میرے اللہ سب کی عزت تیرے ہاتھ ہے ۔ بے ہوش پڑی تھی بی بی اور اللہ جھوٹ نہ بلائے" ۔ یوں ۔ اس نے انگلی کھڑی کر کے کہا ۔ "بدن پر ایک چیتھڑا بھی نہ تھا ۔ نہ جانے بے چاری پر کیا بیتی ہو گی ۔ توبہ ۔ اللہ بچائے اب اس "پُوربن" پر ریجھا ہوا ہے ۔ اے لو بی بی ۔ وہی نا جو کل میرے پاس آئی تھی جوان سی ۔ اپنی بندی

اور گھگرا لینے آئی تھی نا ۔ تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی ہوں ۔ تب جا کر گذر ہوتی ہے ۔ بڑی نخرے والی ہے یہ پورن ۔ میں جانوں ۔ وہ تو آپ راہ چلتے کو چھیڑتی ہو گی ۔ ایسی عورتوں کا کیا ہے بی بی ۔"

دل آرا اٹھ بیٹھی ۔ چلو چھوڑو رحیمن تم تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہو ۔ بدماش ہے تو ہوا کرے ۔ ہمیں کیا اس بات سے ۔ لیکن جب رحیمن جانے لگی ۔ تو دل آرا بولی ۔ رحیمن وہ گھگرا اور بنڈی تو دکھانا ۔ دیکھوں کیسے سیتی ہو تم ۔

"لو بی بی ۔ اب اس عمر میں کیا سیوں گی میں ۔ کبھی سیا ہی کرتی تھی ۔ اب تو ٹانکے مار لیتی ہوں بس ۔"

اس روز دل آرا سارا دن گھر میں یوں پھرتی رہی جیسے بہت مشغول ہو ۔ اور شام کو جب رشید صاحب آئے تو اس کا جی چاہتا تھا کہ باتیں ہی کرتی رہے ان سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بولی ۔ "ہمیں تو ڈر لگتا ہے آپ سے ۔ بڑے افسر جو ٹھہرے ابھی کل ہی سردار پر برس رہے تھے ۔ کیا بات کی تھی اس نے ۔"

رشید کو غصہ آگیا ۔ "دفع کرو اس شیطان کو ۔ اب کے اگر میں نے اسے بدماشوں سے ملتے دیکھا تو برطرف کر دوں گا ۔"

"اوہ ۔ بالکل برطرف کر دیں گے ۔" وہ بولی ۔

"تم بہت شریر ہو گئی ہو ۔" رشید نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ۔

"تو پھر کر دیجئے برطرف ۔"

"کرنا ہی پڑے گا ۔" وہ بولا ۔ اور اس نے نگاہوں سے اسے گھیر لیا ۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی ۔

عین اس وقت باہر رحیمن کی آواز سنائی دی ۔ بیگم صاحبہ ۔ "رشید اسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ دل آرا نے کہا ۔" آ جاؤ رحیمن ۔" اور رشید چونک کر پیچھے ہٹ گیا ۔ مسکرایا اور پھر سگریٹ سلگانا شروع کر دیا ۔ رحیمن صاحب کو دیکھ کر گھبرا گئی ۔ "جی جی یہ کپڑے دکھانے آئی تھی بیگم صاحبہ کو ۔"

"یہ کپڑے !!" رشید نے وہ دیہاتی جوڑا ، گھگری اور بنڈی دیکھ کر کہا ۔

"رکھ دو رحیمن ۔" بیگم کی مسکراہٹ بھری آواز سنائی دی ۔

"بڑے ٹھاٹھ ہیں ۔ رشید گنگنایا ۔

رحیمن بولی ۔ "ایک عرض کروں صاحب جی ۔"

"کیا ہے ۔" رشید نے پوچھا ۔

رحیمن کی آواز بیٹھ گئی بولی "جی آپ کے کہنے پر بھی سردارے نے شیرے سے ملنا نہیں چھوڑا ۔ اب بھی دونوں کوارٹر میں بیٹھے ہیں ۔ ہم تو ڈر کے مارے کچھ کہہ نہیں سکتے صاحب ۔"

یہ سنتے ہی رشید کا منہ سرخ ہو گیا ۔ "اچھا تم جاؤ ۔ ہم ابھی انتظام کریں گے ۔ بدماش کو وہ مزا چکھاؤں گا ۔ کہ یاد رکھے گا ۔" انہوں نے ہاتھ کی چھڑی ڈھونڈتے ہوئے کہا ۔

دل آرا کی نگاہ اس پوربی جوڑے پر پڑی ۔ اور وہ دروازہ روک کر کھڑی ہو گئی ۔ "چلو چھوڑو بھی اب ۔" دل آرا نے منت اور مسکراہٹ سے کہا ۔

"نہیں دل آرا تم نہیں سمجھتی ۔ ایسے بدماش کا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں ۔"

"بدماش ہے تو پڑا ہو ۔ ہمارا کیا لیتا ہے ۔" وہ مسکرا کر بولی ۔

"تم جانتی ہو میں تو اکثر دورے پر چلا جاتا ہوں اور تم یہاں اکیلی رہ جاتی ہو ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے"۔ وہ مسکرائی ۔

"ہیں ؟" رشید کی بھویں تن گئیں ۔

"ہاں ۔ ہاں ایسے بدماش نوکروں کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی ہمت کسے ہو سکتی ہے ۔" اس نے ہنس کر کہا ۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ۔۔۔۔۔" رشید نہ جانے کس خیال پر رک گیا ۔

"میں نہیں جانتی لیکن ویکن ۔" اس نے اک ترچھی نگاہ سے رشید کو زیر کر لیا ۔

"بڑی زبردست ہو تم" رشید مسکرایا ۔ اور پھر متبسم پیغامی نگاہ سے

اسے گھیر لیا ۔ نہ جانے کیوں اس وقت وہ یوں محصور ہو گئی گویا اک زمانے سے منتظر تھی ۔ رشید کا گورا چٹا کلین شیو چہرہ دھندلا پڑ گیا ۔ اس دھندلے چہرے کے پیچھے اک اونچا لمبا مونچھوں والا جوان مسکرایا ۔ پُر معنی مسکراہٹ وہ کسی رو میں بہنے لگی ۔۔۔۔۔۔ سامنے ساحل کی بھیانک مگر دل کش چٹانیں اس کی منتظر تھیں ۔

اگلے روز سارا دن وہ اکیلی پڑی رہی ۔ رشید دورے پر جا چکا تھا ۔ اس روز نہ جانے کیوں وہ بے حد اداس تھی ۔ شام کو اٹھ کر اس نے کپڑے بدلے اور پھر اندھیرا ہوتے ہی باہر باغیچے میں نکل گئی ۔ جیسے وہ اکثر باغیچہ میں نکل جایا کرتی تھی ۔ لیکن اس روز سامنے پلاٹ کی بجائے وہ کوٹھی کے عقب میں جا نکلی ۔ جس طرف نوکروں کے کوارٹر تھے ۔

کوارٹر میں بھدّی سی آواز سن کر وہ چونکی ۔ اف کیسی بھیانک آواز تھی لیکن اس کے باوجود وہ وہاں کھڑی رہی ۔ اندر کوئی ہنس رہا تھا ۔ "ہاہاہاہا ۔ ہی ہی ۔۔۔۔۔ میں بھی شیرا ہوں ۔ شیرا ۔ سنا تم نے ۔ جان جائے لیکن منہ سے کہی ہوئی بات نہ جائے ۔ محلے والیاں تو ہماریاں ماں بہنیں ہوئیں کسی سے پوچھ لو تم کیا مجال ہے جو کبھی محلے میں آنکھ اونچی کی ہو ۔۔۔۔"

"ماں بہنیں ۔ اونہہ ۔ بڑا پرہیزگار بنتا ہے ۔" دل آرا کے دل میں حقارت کی ایک رو اٹھی ۔ وہ طلسم گویا ٹوٹ کر رہ گیا ۔ اندر وہی آواز گونجنے لگی ۔ "لیکن یہ پورن ہاتھ سے نکل جائے تو لعنت ہے مجھ پر ۔"

"اس کا کیا ہے ۔" دوسرا بولا ۔ آپ مونڈھے مارتی پھرتی ہے ۔"

"اونہہ ۔" شیرا چلایا ۔ "مونڈھے یوں چھل جائیں گے کہ کنی کتراتی نہ پھرے تو کہنا ۔ہاہاہا ۔" وہ ہنسا ۔ یہ سن کر دل آرا چپکے سے واپس لوٹ آئی ۔

خواب گاہ میں اسے رہ رہ کر خیال آتا ۔ "بڑا بگلا بھگت بنا پھرتا ہے ۔ جو محلے والیوں کو ماں بہن سمجھتا ہے ۔۔۔۔۔ بدماش ، کہیں کا ۔ وہ برطرف ہی کر دیتے تو اچھا ہوتا ۔ ان لوگوں کا اعتبار ہی کیا ہے ۔ بڑا بدماش تو دیکھو۔"

اگلے روز خلاف معمول وہ سارا دن رشید کا انتظار کرتی رہی ۔ ذرا سی

آہٹ پر بھی چونک اٹھتی ۔ وہ آ گئے ۔ لیکن وہ نہ آیا ۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ رات کی گاڑی سے آئیں گے ۔ جو آٹھ بجے کے قریب پہنچتی تھی ۔ شام کو وہ نہائی ۔ سنگار کیا ۔ لیکن نہ جانے کیوں کپڑے نہ بدلے ۔ اور حسب عادت بال بھی نہ کھولے ۔ جیسے وہ اکثر کیا کرتی تھی ۔ آٹھ بجے کے قریب اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ نہ جانے اس روز اسے رشید کے انتظار میں کیوں مزا آ رہا تھا ۔ نو بج گئے لیکن وہ نہ آیا ۔ شاید گاڑی لیٹ ہو ۔ ضرور لیٹ ہو گی ۔

باہر کسی کی آواز آئی ۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی ۔ آ گئے ۔ آ گئے ۔ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑی ہو گئی ۔ اس کی نگاہ اس بنڈی اور گھگرے پر پڑی آنکھیں چمک اٹھیں ۔ بڑا مزا رہے گا ۔ اُف اک رو اٹھی ۔ ابھری ۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑے اتار کر پوربی جوڑا پہن لیا ۔ اف کس قدر بنیں گے وہ ۔ آئینہ دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی ۔ چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں وہ رو طوفان بنتی جا رہی تھی ۔ بازوؤں تلے جنگلی کبوتروں کا جوڑا پر پھیلا رہا تھا ۔ پھڑپھڑا رہا تھا ۔

کچھ دیر تک وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی رہی لیکن کوئی نہ آیا ۔ پھر اس نے باہر جھانکا ۔ باغیچہ ویران پڑا تھا ۔ وہ برآمدے میں نکل آئی ۔ چاروں طرف تارے مسکرا رہے تھے ۔ گویا کچھ کہہ رہے ہوں ۔ سرگوشیاں کر رہے ہوں ۔ دور تک بتیوں کی قطار چلی گئی تھی اور وہ دھندلی سڑک بھاگتی ادھر آ رہی تھی ۔ گویا کسی کا پیغام لا رہی ہو ۔ وہ مڑی اور نہ جانے کس دھن میں کوٹھی کے عقبی برآمدے کی طرف چل دی ۔ برآمدے کے پاس اس نے آہٹ سنی ۔ ایک دم اس کے دل پر دہشت چھا گئی ۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹی ۔ پیچھے سے دو مضبوط باہوں نے اسے آغوش میں لے لیا ۔ اس کا سر ایک چوڑی چھاتی سے جا ٹکرایا بدن میں اک ہوائی اڑی ۔۔۔۔۔

وہ اس کھردری چارپائی پر اپنا جسم رگڑ رہی تھی ۔ اف ۔ وہ کمبخت رسیاں بھی اس قدر ملائم تھیں ۔ پھر اس کی آنکھوں تلے اک مونچھوں والا چہرا آ کھڑا ہوا ۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ آنکھوں میں آنسو آ جھلکے ۔

کھڑکی سے پاؤں کی چاپ سن کر وہ سمجھی شاید رشید آ گئے ۔ لیکن اس وقت اسے رشید کے آنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ آ گئے تو آ جائیں نہیں آئے تو نہ سہی ۔

باہر کوئی باتیں کر رہا تھا ۔ "لیکن میرے یار حد ہو گئی ۔ وہ سالی پوری تو یوں پی گئی ۔ گویا شیرا نہ ہوا پانی کا گلاس ہوا" ۔

"ارے یار میں جو کہتا تھا ۔ وہ تو چھٹی ہوئی بدماش ہے بدماش ۔

"اچھا اب کے جو ملے تو ۔۔۔۔۔ بھئی ساری عمر یاد نہ کرے تو میرا نام شیرا نہیں ۔ تمہاری قسم !!"

"بیچارہ بیچارا" ۔ وہ پڑے پڑے مسکرائی ۔ اور ہاتھ سے پلنگ کے کونے کو یوں تھپکنے لگی ۔ گویا وہ کسی بچے کا سر ہو ۔۔۔۔۔ بیچارا !!"

..........○..........

میاں کی مرضی

"توبہ! اس گھر میں کوئی کسی کی سنے بھی ۔ یہاں تو بس انہیں کی چلتی ہے ۔ چاہے کوئی چیخ چیخ کر مر جائے ۔ انہیں اپنی مرضی سے کام" سعیدہ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے چلائی ۔ اور پھر حشمت کی مستفسرانہ نگاہ کو دیکھ کر بولی ۔ "کہتے ہیں فرنی ضرور ہوگی ۔ کل کھانے پر ۔ اور ٹکڑے !! ٹکڑے تو آخر ٹکڑے ہی ہیں ۔ چاہے ڈبل روٹی کے ہی ہوں ۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ نہ سنیں گے کسی کی ۔ بس لے لیا مزہ پوچھنے کا ؟ ـــــ میں تو اس گھر کی رگ رگ سے واقف ہوں ۔ مجھ سے کیا چھپا ہے ـــــ ابھی تو کل ہی ان کی منہ چڑھی کا رونا ختم ہوا ۔ اورآج دعوت کا جھگڑا لا کھڑا کیا ۔ اب کوئی کیا کرے ۔ اور وہ چڑیل !! ـــــ توبہ ! گھر میں کہرام مچا رکھا تھا اس نے ۔ گئی ہے تو آرام کا سانس لیا ہے ۔ دن بھر کبھی نیچے کبھی اوپر ۔ گھر کی دیواریں بھی کانپ اٹھی تھیں ـــــ اب ایک مہینہ تو آرام سے کٹے گا" ۔

سعیدہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر دروازے پر لٹکا دیا اور ہنڈیا کی چپنی اتار کر بولی "حشمت ذرا سا پانی تو دے ۔ دیکھ تو بالکل ہی سوکھ گئی ہے ۔ نہ جانے کہاں سے گوشت لے آتا ہے یہ رحیما ۔ اللہ مارا گلنے میں نہیں آتا" ۔ پانی کا گلاس لے کر اسے ہنڈیا میں چار ایک چھینٹے دیئے اور چمچہ ہلانے لگی ۔

"ایک مہینے کے لئے گئی ہے کیا" ۔ حشمت نے کہہ کر اسے ازسرِ نو چھیڑ دیا ۔

"کیوں؟" سعیدہ چونکی ۔ "ایک مہینہ زیادہ ہے کیا ؟ ـــــ ایمان سے کہنا حشمت ۔ ایسے لچھن تو نے دیکھے ہیں کسی کے ۔ آخر ہمارے زمانے میں بھی پڑھا کرتی تھی لڑکیاں ۔ میں نے بھی پوری سات جماعتیں کی ہیں ۔ پر ہم کو تو باتیں بنانا نہ آیا ۔ کہیں آئینہ دیکھا جا رہا ہے ۔ اب بال بنائے جا رہے

ہیں ۔ اب اس کھڑکی میں سے لٹک رہی ہے پھر اس منڈیر سے جھانکا جا رہا ہے ۔ دوپٹہ ٹکتا نہیں سر پر کبھی اوپر کبھی نیچے ۔ ادھر لٹک ادھر مٹک ۔ توبہ ہے !!"

"توبہ بی بی آجکل کی لڑکیاں" ۔ حشمت نے داد طلب نگاہ سے دیکھا ۔

"آج کل کی لڑکیاں کیوں ؟ ــــــ میری بہن ہے ۔ خدا کے فضل سے نویں جماعت میں ہوئی ہے ۔ کیا مجال ہے ۔ کبھی آنکھ اوپر اٹھائے ۔ اسکول سے آئی ہو ۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر پڑھ پڑھا لیا ۔ پھر گھر کے کام میں لگ گئی ــــــ اماں کو تو بیٹھے کھانا ملتا ہے ــــــ بھئی حشمت ایمان سے کہتی ہوں ان کی لاڈلی خالدہ سی لڑکی میری نظر سے تو نہیں گذری ــــــ ہوں گی ۔ اللہ میاں نے ہر رنگ پیدا کیا ہے لیکن حشمت اللہ پناہ میں رکھے ۔ میری اپنی بیٹی ہو تو کھال ادھیڑ دوں !!"

"لو بی بی اب تو بہت بدل گئی ہے وہ تمہاری نصیحتیں سن کر" ۔

"کیوں ــــ میں کیوں نصیحت کرنے لگی میں تو ہوئی سوتیلی ــــــ میری تو وہی بات ہے نیکی برباد گناہ لازم ۔ لڑکی کی عادتیں بگاڑیں اس کی ماں نے پر لوگ تو یہی کہیں گے کہ سوتیلی تھی ۔ لڑکی کو سلیقہ کیا سکھاتی ۔ اور اگر کچھ کہوں تو اور تو اور ۔ اس کے ابا ہی جتا دیں گے ــــــ"

"ہاں یہی تو بات ہے بی بی" ۔ حشمت نے جھک کر کہا ۔ "ورنہ لڑکی تو دو دن میں سُدھر جائے" ۔ "میں تو سچی کہوں گی ۔ چاہے تم برا ہی مانو بی بی" ۔

"برا ماننے کی کیا بات ہے اس میں ۔ میں تو آپ منہ پر کہہ دینے والی ہوں ــــــ ہاں" سعیدہ سرک کر حشمت کے قریب ہو بیٹھی اور رازدارانہ انداز سے بولی ۔ "تمہیں کیا معلوم ۔ باپ پر تو اس لڑکی نے جادو کر رکھا ہے ۔ جادو ، وہ تو جان دیتے ہیں ۔ بھیگی بلی جو بنی رہتی ہے ان کے سامنے ۔ گویا منہ میں زبان نہ ہو ــــــ پر چھوٹی سے چھوٹی بات ان سے جا لگاتی ہے ۔ میں کیا نہیں جانتی ــــــ توبہ ــــــ اللہ بچائے ۔ ہم نے تو کسی جوان لڑکی کو

یوں باپ کے کندھوں پر چڑھتے نہیں دیکھا ۔۔۔۔۔ کیا زمانہ آیا ہے ۔ ایمان سے حشمت ۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی تو یکلخت ابا کے پاس جانا بند کر دیا ۔ توبہ مجھے تو شرم آتی تھی ۔ بس دور ہی سے جو کہنا ہوا کہہ دیا ۔ لیکن یہاں تو بات ہی اور ہے ۔ شرم نہیں آتی اسے ابا کے سامنے سینہ چھلکاتے ہوئے ۔ ہائے ری کیا زمانہ ہے ۔۔۔۔۔ وہ تو اپنے آپ کو دودھ پیتی بچی سمجھتی ہے ۔۔۔۔۔ توبہ ہے !!"

"بچی !! حشمت چلائی ۔۔۔۔۔ کوئی ناواقف دیکھ پائے تو سمجھے کہ گود میں بچہ ہے ۔ ہاں ۔۔۔۔۔ پر میں پوچھوں ہوں بی بی کیا یونہی گھر بٹھا رکھیں گے اسے" ۔

"ہائے ری یہی تو میں کہہ رہی ہوں" وہ اٹھ کر حشمت کے قریب تر ہو بیٹھی ۔ تو ہی بتا حشمت ۔ ایمان سے کہیو ۔ جواں لڑکی کا یوں جھلکتے رہنا ۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کوئی بات نہ نکل آئے ۔ میں کیا دیکھتی نہیں ۔ سبھی کچھ دیکھتی ہوں ۔ پھر چپ کیوں ہوں ۔ میں ؟ ۔۔۔۔۔ بس حشمت چھوڑ اس بات کو تو ۔ چپ ہی بھلی ۔ ایک چپ میں سو سُکھ" ۔

حشمت بھی گرم ہو گئی ۔ "آخر کب تک رہو گی چپ ۔ جب کسی کے ساتھ ۔۔۔۔۔"

"اے ہے ۔ تو نے تو وہی کہہ دی ۔ میرے دل کی بات ۔ اسی ڈر سے تو میں مری جا رہی ہوں ۔ لوگ تو یہ کہیں گے سوتیلی ماں تھی ۔ بیچاری تنگ آکر نکل گئی ۔ اور تو اور خود وہی سارا الزام مجھ پر دیں گے ۔ اے ہے ۔ اپنی بچی کو کون برا کہتا ہے ۔ اس گھر میں بس ایک میں ہی پرائی ہوں نا ؟ سچ بتا تو ۔ تجھے میری جان کی قسم" ۔

"پر میں پوچھتی ہوں ۔ اس کا رشتہ کیوں نہیں کر دیتے ۔ ایک بار اپنا گھر جا کر بسائے تو پھر تمہاری بلا سے" ۔

"یہی تو کہتی ہوں میں حشمت ۔ میری طرف سے تو کل کا ہوتا آج ہو ۔ پر میری کوئی سنے بھی ۔ میں تو اس روز شاہ سلیمان کے مزار پر گھی کا دیا

جلاؤں گی ۔ کھی کا ۔" ـــــ۔ سعیدہ نے پر معنی انداز سے دیکھا اور پھر اس کے کان میں منہ دے کر بولی ۔ "لڑکی کی پھوپھی ۔ وہ کالے منہ والی چڑیل ۔ اس کا بڑا لڑکا اسلم ہے نا"۔

"اسلم ؟" حشمت بڑبڑائی ۔ "اسے تو جواب دے دیا ہے بابو جی نے" ۔ "جواب دے دیا ہے ۔ کب ؟"

"یہی سات آٹھ دن ہوئے ہوں گے ۔ اس روز کی بات ہے جب تم اُدھر گئی ہوئی تھی ۔ بی بی نہ جانے کیا کہتے ہیں ـــــ۔ انہیں ۔ ڈفٹی صاحب کہ کیا ؟ ـــــ۔ لڑکی کی پھوپھی آپ آئی تھیں ۔ بھائی بہن اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے" ۔

"کیا کرتے رہے ۔ باتیں" ۔

"اسلم کے لئے کہہ رہی تھی ۔ کہتی تھی کھالدا اللہ رکھے جوان ہو گئی ہے اب ۔ اس کے بارے میں کیا ارادہ ہے" ۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

بس حیلے حوالے کر کے ٹال دیا ۔ اور کیا کہتے ۔ کہنے لگے ابھی بچہ ہے ۔ بڑی ہو جائے گی تو دیکھا جائے گا" ۔

"ہونہہ بچی !!"

"پھر بولے ۔ ہم تو اسے بیئا کرائیں گے ۔ نہ جانے کیا ہوتا ہے وہ ۔ مجھے کیا معلوم" ۔

"ہوں بی اے کرائیں گے ـــــ۔ آخر لڑکے کے بارے میں بھی کچھ کہا ہو گا" ۔

"بس یہی کہہ رہے تھے کہ لڑکا صرف دس جماعت پاس ہے ۔ اس سے کیا بنتا ہے آج کل" ۔

"کیوں بنتا کیوں نہیں ۔ آپ بھی تو یہی دس ہی پاس کی تھیں ۔ اب خان صاحب کے بغیر کوئی بلاتا نہیں ۔ یہ تو نصیب کی بات ہے ۔ اور کیا بولے ؟"

"بس اور کیا کہنا تھا ۔ بات بات پر بچی بچی کر رہے تھے" ۔

"ہائے ری حشمت باپ تو آپ اندھا ہو رہا ہے ۔ اب کوئی کیا کرے اور وہ چھوکری !! توبہ کس قدر پکی ہے ۔ بال پن آیا ہی نہیں کبھی ۔ میں تو دو سال سے یہی حالت دیکھ رہی ہوں ۔ تمہیں یاد ہے پچھلے سال جب اس نے کہیں سے سن پایا تھا کہ اسلم کی بات ہو رہی ہے توبہ !! لڑکی نے پورا ہفتہ منہ سجائے رکھا اور میرے منہ پر تو صاف جتا دیا ۔ میں دیکھوں گی ۔ میرے متعلق کون ایسی ویسی باتیں کرتا ہے ۔ دو کوڑی کا آدمی میرے لئے رہ گیا ہے کیا ؟ پر انشاءاللہ دو کوڑی کا ہی ملے گا ۔۔۔۔۔"

"میں کہتی ہوں اسلم نہیں تو اور سہی کوئی رشتوں کا کیا کال ہے ۔ بی بی ۔ وہ ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے" ۔ حشمت بات سمجھے بغیر بڑبڑائی ۔

"کیوں اسلم کو کیا ہے ۔ کوئی لولا لنجا ہے کیا ۔ اللہ رکھے پڑھا لکھا ہے ۔ اور پھر ہوا بھی اپنا قریبی اس کے لئے اس سے بہتر رشتہ ملے گا کہاں ۔۔۔۔۔ اور وہ ڈپٹی صاحب ۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہے ۔ اللہ رکھے لڑکا ایم اے میں ہے ۔ پر تو جانتی ہی ہے نا ۔ ؟ سعیدہ نے اک معنی خیز نگاہ سے دیکھا اور پھر ہاتھ چلا کر بولی ۔ "ہائے ری ۔ تیری سمجھ کو کیا ہوا ۔۔۔۔۔ ایمان سے کہیئو یہ لڑکی گھر بسائے گی کیا ۔ تو میں کیوں آؤں اس بات میں ۔ مجھے اپنی ناک چوٹی کی لاج نہیں کیا ؟ ۔۔۔۔۔ ہیں ؟"

"نہ ۔ نہ بی بی ۔ تجھے کیا پڑی ۔ تیری بلا سے ۔ پر مصیبت تو یہ ہے کہ ایک بار انکار کرنے کے بعد وہ کب اسلم کی بات ماننے لگے ۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے ۔ یہی تو مصیبت ہے ۔"

"پھر ہو گا کیا ؟"

"ہونا کیا ہے ۔ بس وہی ہو گا جو ہوا کرتا ہے اس گھر میں ۔ ان کی مرضی اور کیا ۔ یہاں کون سنتا ہے کسی کی ؟"

"آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیئے تمہیں ۔ تم کیا برا چاہو گی اس کا ۔ تم تو بلکہ لڑکی کی بھلائی ہی سوچتی ہو نا ۔"

"ہائے حشمت میرا تو جی ہی ایسا برا ہے کہ کسی کی تکلیف دیکھی نہیں

جاتی ۔ اپنے دل کو کیا کروں ۔ کسی دشمن کو بھی نہ دے ایسا دل ۔ نہ جانے لوگ کسی کی برائی کیسے کرتے ہیں ۔ ہم سے تو نہ ہو سکی یہ بات ۔"

"پر بی بی ۔ یوں نہ بنے گی بات ۔ تم ان سے بات تو کرو ۔"

"اچھا تو جو کہتی ہے تو کہہ دیکھوں گی میں ۔۔۔۔۔"

"نہ میں مجبور نہیں کرتی بی بی ۔ تیری اپنی مرضی ہے ۔ نہیں مانتے تو تیری بلا سے ۔ دفع کر۔

"اچھا تو دیکھ تو سہی ۔" سعیدہ بولی ۔ "اور پھر چولہے کی طرف منہ پھیر کر مسکراہٹ بھینچنے لگی ۔ لیکن کوئی اَن جانا تبسّم خواہ مخواہ اس پر چھائے جا رہا تھا۔ گوشت بھوتتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے اس کی بغل میں کچھ پھڑپھڑا رہا ہو ۔ قمیض تنگ ہوئی جا رہی تھی ۔ اور بدن پر چیونٹیاں چل رہی تھیں ۔ نہ جانے وہ راز کیا تھا جو یوں اس کے بدن میں لہریں لینے لگا تھا جیسے وہ اپنی رازدان حشمت سے تو کیا اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی ۔

پکانے سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ بال بنائے غازہ مل کر کاجل کی دھار لگائی اور پھر نیا چنا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈال انتظار میں بیٹھ گئی ۔

میاں کے سامنے کھانا چن کر سعیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی ۔

"بہت دیر ہو گئی آج ۔" وہ بولی ۔

"ہیں ؟۔۔۔۔۔" خان صاحب چونک کر بولے ۔۔۔۔۔۔ "ہاں کچھ کام تھا ۔" انہوں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا ۔

"کچھ اچھی بھی بنی ہے ۔ کچنار" سعیدہ خواہ مخواہ مسکرائی ۔

"ہوں ۔ اچھی ہے ۔"

"آج کل تو ملتی ہی نہیں ۔" میں نے حشمت کو سبزی منڈی بھیج کر منگوائی ہے میں نے کہا دو ایک دفعہ تو پکا لوں ۔ آپ کو پسند جو ہوئی ۔"

"ہوں ؟ ۔۔۔۔ ہاں ۔" انہوں نے ہڈی چباتے ہوئے جواب دیا ۔

"پانی ۔"

"توبہ دو دن سے گھر ویران پڑا ہے !!" سعیدہ نے پانی دیتے ہوئے گویا

اپنے آپ سے کہا ۔

ہوں ؟ ان کے ماتھے پر تیوری بن گئی ۔

"خالدہ جو چلی گئی ہے ۔ توبہ اکیلا بھی کوئی نہ ہو ۔"

"ہاں ۔ اس کی نانی اصرار کر رہی تھی نا ۔ یہ عورتیں !! ۔۔۔۔۔ ہونہہ"

"اللہ رکھے اس سال دسویں کرے گی ۔ اب تو جوان ہو گئی ہے ۔ آپ کو بھی فکر ہے اس کی ۔"

"ابھی بچہ ہے ۔ دیکھا جائے گا ۔" وہ بھرے ہوئے منہ سے مشکل سے بولے ۔

"واہ میں کیا یہ کہتی ہوں کہ ابھی کر دو شادی ۔" سعیدہ نے لاڈ سے کہا ۔ "پر نامزد تو کر دینا چاہیئے ۔ کوئی کھاتا پیتا شریف خاندان ہو ۔ آج کل لائق لڑکا تو ملتا نہیں ۔ لوگ پہلے ہی سے بات چیت طے کر لیتے ہیں ۔ ورنہ شادی کی جلدی ہی کیا ہے ؟"

"ہوں ۔" وہ بولے ۔ "پھر ہے کوئی لڑکا نگاہ میں ؟"

سعیدہ سوچ میں پڑ گئی ۔ ابرو تن گئے ۔ پلکیں جھکیں ۔ آنکھوں میں اک بے تعلق چمک لہرائی ۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئے ۔ اور بولے "کیا کہتی ہے ۔"

"مجھے تو کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا " سعیدہ نے مزید معصومیت سے کہا ۔ "وہ صدیق تھا اس کا تو نکاح بھی ہو چکا ۔ اور انور ، وہ تو مدتوں سے منسوب ہے اور کوئی لائق لڑکا تو ہے نہیں ۔ البتہ اسلم ۔۔۔۔۔"

"ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے ۔ تمہارا تو وہاں بہت آنا جانا ہے" ۔

"ہاں ہے تو سہی ۔ لائق بھی ہے لیکن ۔۔۔۔۔ "

"لیکن کیا" ۔ وہ بولے ۔

"بس کیا بتاؤں ۔ کل ہی اس کی ماں رو رہی تھی ۔ سعیدہ رازدارانہ انداز میں ان کی طرف جھکی اور متبسم آنکھوں سے بولی ۔ کہتی تھی ۔ کالج کی کسی کرنٹی

ہے ۔" اس کی آنکھیں چمکیں اور پھر پلکیں جھکیں گویا کسی راز پر پردہ ڈال رہی ہوں ۔ پھر وہ از سرِ نو مسکرانے لگی ۔

ایک ساعت کے لئے خان صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی ۔ لیکن پھر اسی خشک لہجے میں بولے ۔ "جوانی میں لڑکے کیا کیا نہیں کرتے ۔ بڑا ہو کر آپ سُدھر جائے گا" ۔

"پر معاملہ تو حد تک پہنچ چکا ہے" ۔ اس نے دوبارہ جھک کر کہا ۔ "سنا ہے دونوں نے چوری چوری بیاہ بھی کر لیا ہے ۔ جبھی تو ماں اندر ہی اندر گھل گھل کر کانٹا ہوتی جا رہی ہے ۔

"اوہ ۔۔۔۔۔" وہ کھانسنے لگے ۔۔۔۔۔ "ہاں وہ تمہاری ہمشیرہ کا لڑکا منور جو ہے" ۔

سعیدہ نے برا سا منہ بنا لیا ۔ "اب آپ سے کیا چھپانا ہے" ۔ وہ بات کاٹ کر بولی اور پھر رک گئی ۔

"کیا بات ہے" ۔ انہوں نے پانی پی کر گلاس رکھتے ہوئے کہا ۔

"لڑکا تو اچھا ہے ۔ اللہ کے فضل سے لائق بھی ہے لیکن ۔۔۔۔۔" وہ پھر رک گئی ۔

"لیکن کیا؟"

وہ آب دیدہ ہو گئی ۔ "کیا بتاؤں ۔ اللہ کی مرضی ہے ۔ ہم تو ہر طرف سے دکھی ہیں ۔ نہ جانے یہ سب کس گناہ کی سزا ہے ۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔

"آخر بات کیا ہے"۔ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"بیچارہ منور !!" اس نے اک آہ بھری ۔ "لے دے کر یہی ایک لڑکا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا ۔ آج تین سال ہونے کو آئے ہیں لڑکے کی چھاتی سے خون آتا ہے" ۔

"ہیں ۔ تم نے مجھ سے تو نہیں کہا کبھی" ۔

کہنے والی بات بھی ہو ۔" وہ روئی روئی آواز میں بولی ۔ وہ تو سب یہ

بات چھپائے بیٹھے ہیں ۔ بہن کو تو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گئی یہ بات“ ۔ سعیدہ ازسرِنو آبدیدہ ہو گئی ۔

”تم کیوں مفت میں اپنا دل دکھاتی ہو ۔۔۔۔۔۔ تمہارا دل بہت نرم ہے ۔“ وہ مسکرائے ۔

”اے ہے کل اسلم کی ماں آئی تھی اسے وقت سے دل بھرا بھرا ہے ۔ جی چاہتا ہے رو دوں“ ۔

”کیوں ؟“

”بس خیال آگیا اسلم کیسا اچھا لڑکا ہے ۔ اتنا فرماں بردار ۔ کتنی عزت کرتا ہے وہ آپ کی ۔۔۔۔۔۔“

”میری عزت ۔“ وہ چونکے ۔

”پھر منور کا خیال آیا ۔ بس کلیجے میں چھری لگی ۔ نہ کرتا ایسے کام تو ایسی بیماری تو نہ لگتی“ ۔

”کیسے کام ؟ ۔۔۔۔۔۔“

”نہ جانے کیا کیا گل کھلاتے ہیں کالج میں ۔ یہ بیماری ایسے نہیں لگتی ۔ کل اسلم کی ماں سے مل کر جی خوش ہوگیا ۔ اپنے بیٹے کی طرف سے کتنی سکھی ہے ۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے“ ۔

”کس لئے آئی تھی وہ“ ۔ وہ خشمگیں انداز میں بولے ۔

”کچھ نہیں ۔ وہ خالدہ کے بارے میں کہنے آئی تھی“ ۔

”ہونہہ ۔ وہ تو پاگل ہے“ ۔ انہوں نے کھانا ختم کر کے کہا ۔ ”ہم نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا ۔ کہ یہ خیال چھوڑ دے ۔ اگر ایسا ہی خیال تھا اس کا تو لڑکے کو ۔ بی ۔ اے تو کرایا ہوتا ۔ وسعہ‌س کو تو آج کل ۔۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں ۔ میں نے تو اُسے صاف کہہ دیا“ ۔ سعیدہ بات کاٹ کر بولی ۔ ”یہ رہا حقہ ۔ بھرا ہوا ہے“ ۔

”ہوں“ ۔ انہوں نے حقے کا کش لے کر کہا ۔ ”کیا کہا تھا“ ۔

کہنے لگی بہن ہم بیچارے غریب ٹھہرے ۔ میں نے کہا بہن یہ نہ کہو ویسے رشتے کے متعلق تم جانو اور تمہارے بھائی ۔ وہ آپ سمجھ دار ہیں ۔ میں بیچاری کس شمار میں ہوں"۔

"نہیں ۔ نہیں ۔ تم اس سے کہیں زیادہ سمجھدار ہو ۔"

"آپ کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے ۔"

"خیر خیر ۔ پھر کیا بولی وہ"

"اُس نے کیا کہنا تھا ۔ میں نے ہی کہا بہن ان کے دل میں اُونچ نیچ نہیں ہے حالانکہ اللہ رکھے برادری میں ان کے برابر کون ہے ۔ لیکن ان کی طبیعت میں امیری کی بو نہیں ۔ اونچ نیچ کا خیال نہیں ۔"

"ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔ ہمارے دل میں یہ خیال تو کبھی نہیں آیا کہ وہ چھوٹے ہیں ۔ یہ پڑوس میں رمضان کی ماں رہتی ہے ۔ بیچاری کتنی غریب ہے ۔ وہ سارا سارا دن آکر بیٹھ رہتی ہے ۔ لیکن ہمارے دل میں کبھی خیال نہیں آیا ۔"

"اور پھر اسلم ۔ میں نے کہا ۔ اسلم کو تو وہ اپنا بیٹا سمجھتے ہیں ۔ اور مردوں کے دل میں ایسی ویسی باتیں ہوں گی ۔ لیکن ان کے دل میں نہیں ۔"

"میں نے کہا بہن تم اسلم کی نوکری کی فکر نہ کرو ۔ وہ چاہیں تو آج ہی کروا دیں اسے نوکر ۔ انکا رسوخ کیا کم ہے ۔ بڑے بڑے افسر آپ ان سے ملنے آتے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ ابھی کل ہی رمضان کو نوکر کروایا ہے ۔ فی الحال بیس لے گا پھر بائیس ہوں گے پھر تیس اسی طرح اک دن مرتبے والا ہو جائے گا ۔ اور میں نے کہا صرف آٹھ جماعتیں پاس ہے وہ ۔ تمہارا بیٹا تو اللہ رکھے دس پاس ہے ۔ افسر نہ بنوا دیں تو کہنا ۔ ان کی بات کون ٹال سکتا ہے بہن ۔ ہاں ۔"

"ہی ہی ہی ۔" وہ ہنسے ۔ "بیچارے بڑی اچھی طرح پیش آتے ہیں ۔ ابھی کل ہی مسٹر صدیقی کہہ رہے تھے بھئی کوئی کام بتایا کرو ۔ ریلوے کے افسر ہیں وہ یہ سب ریلیں انہیں کے حکم سے چلتی ہیں ۔ مالک ہوئے ریلوں کے رمضان کا کام بھی انہوں نے کیا تھا ۔ میں نے ویسے سرسری بات کی تھی ۔

سارے ہی لحاظ کرتے ہیں ۔" وہ حقہ پینے لگے ۔

"ہر روز دیکھتی جو ہوں ۔ بڑے بڑے افسر گھر پر آتے ہیں ۔ اکٹھا کھانا پینا ہنسی مذاق ۔"

"ہاں ہاں ۔ بڑے اچھے ہیں بیچارے ۔۔۔۔۔ اور اسلم کو نوکر کروانا کیا مشکل ہے ۔"

"میں نے کہا بہن تم جو چاہو سو کہو ۔ جو چاہو سمجھو ۔ پر میں نے ان جیسا بھائی نہیں دیکھا ۔ میرا اپنا بھائی ہے ۔ کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا اس نے ۔ پر تمہارے بھائی کو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے ۔"

"ہاں ۔۔۔۔۔" وہ حقے کا کش لے کر بولے ۔ "آخر بہن ہے ۔ لیکن بہت بے وقوف ہے ۔ ہاں ۔ پھر کیا بولی ؟"

"کہنے لگی بھائی تو چاہتا ہے ۔ پر بیچارے کا بس بھی چلے ۔"

"ہیں ؟" وہ چونکے ۔ "بس کیسا؟"

"میرے متعلق کہہ رہی تھی ۔" وہ ایک رسیلی مسکراہٹ سے بولی ۔ "ان کا خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ نے رشتے سے انکار کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کا رشتہ میں اپنے رشتہ داروں کو دینا چاہتی ہوں بلکہ یہ بات تو وہ کئی بار میرے منہ پر جتا چکی ہے ۔ یہ خیال تو آنا ہی ہوا انہیں ۔ قدرتی بات ہے ۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہیں ۔" اس کے دانت سرخ ہونٹوں تلے چمکے ۔

"لاحول ولا قوۃ ۔ کیا بیہودہ خیال ہے ۔ پاگل ہے پاگل !!"

"میں نے تو صاف کہہ دیا ۔ میں نے کہا بہن مجھے جو جی میں آئے کہہ لو ۔ لیکن ان پر جھوٹا الزام نہ دھرو ۔ وہ کوئی زن مرید نہیں ۔ اللہ رکھے اپنی عقل کے مالک ہیں ۔ بڑے بڑے افسر ان کی صلاح لئے بغیر قدم نہیں اٹھاتے ۔ ہاں وہ بھلا عورت کے پیچھے بھیڑ کیوں بنیں ۔ ان کی ایسی عادت نہیں ۔"

"ہاں سچ کہہ رہی تھی وہ ۔ اپنے میاں کی بات کررہی تھی نا ۔ میں جانتا ہوں خدا جانے مرد عورتوں کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو بے وقوف کیوں

بناتے ہیں ۔"

"بس یہی بات ہے ۔ وہ سمجھتی ہے جیسے اس کا مرد ہے ویسے ہی دوسرے بھی ہوں گے ۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔۔۔۔۔ تمہارے متعلق تو اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ تم تو الٹا ہمیں آپس میں مل بیٹھنے کی ترغیب دیتی رہتی ہو ۔"

"ان سے نہ ملیں ہم تو کس سے ملیں ۔ ان سے زیادہ عزیز کون ہے ہمیں آپ ہی بتائیں ۔ ویسے میرا آپ کی باتوں میں دخل ہی کیا ہو سکتا ہے توبہ میں کیا آپ کی عقل تک پہنچ سکتی ہوں ؟"

"نہیں نہیں ۔ تم بڑی سمجھدار ہو ۔ بے وقوف تو وہ ہے ۔ پاگل ہے ۔ پاگل !!"

"میں نے بھی اسے لاجواب کر دیا تھا ۔ میں نے کہا بہن خالدہ کے لئے تم سے بہتر ساس کون ہوگی ۔ ویسے تو انہیں ہزاروں رشتے ملتے ہیں ۔ ان کے دوست کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں ۔ ابھی تو ڈپٹی صاحب کی بیوی کل ہی رشتے کے لئے کہہ رہی تھی ۔ اور پھر وہ ریلوں کے مالک نہ جانے کیا نام ہے ان کا ۔ لڑکا ولایت پاس ہے ۔ آخر انہیں اپنے عزیزوں کا خیال ہی تھا نا کہ لڑکی منسوب نہ کی ۔ ورنہ آج تک ۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ۔ ہاں وہ تو اب بھی ۔۔۔۔۔"

"یہی تو میں نے بتایا اسے ۔ میں نے کہا بہن سچ کہنا ۔ آخر وہ کیوں نہیں کر دیتے رشتہ ۔ ایمان سے کہنا کیا تم نے ان سے کبھی بات بھی کی ہے ۔ مجھے ہی کہتی ہو نا ۔ میں ایسی باتیں ان سے کیسے کروں ۔ میری تو جرأت نہیں" اس نے لجا کر آنکھیں نیچی کر لیں ۔ "تم خود کہو ان سے ۔" میں نے کہا ۔ "تمہاری بات کیوں رد کرنے لگے وہ ۔"

"نہیں ۔ اس نے کہا تھا مجھ سے ۔۔۔۔۔"

"تو آپ نے کون سا توڑ کر جواب دے دیا تھا ۔ بس اتنا ہی کہا تھا نا کہ لڑکی تعلیم سے فارغ ہو لے ۔ اور لڑکا صرف دس پاس ہے ۔"

"ہاں ہاں ۔ یہی کہا تھا ہم نے ۔ اور ۔۔۔۔۔"

"اور میں نے کہا ۔ یہ کیا جھوٹی بات ہے ۔ سچ کہتے ہیں وہ ۔"

"پھر کیا بولی ۔"

"میں نے ہی کہا ۔ میں نے کہا بہن وہ خالدہ کو اس لئے تو نہیں پڑھا رہے کہ اللہ نہ کرے اس سے نوکری کروانی ہے توبہ کرو بہن وہ تو آپ پڑھی لکھی استانی لڑکی کے لئے نوکر رکھ سکتے ہیں ۔ بھلا خالدہ سے نوکری کیوں کروانے لگے وہ ۔"

"اونہوں ۔ یہ کس نے کہہ دیا ان سے ، ہمارا تو قطعی یہ ارادہ نہیں ۔۔۔ پاگل ہے ۔۔۔۔"

"میں نے کہا بہن لڑکی کو جو پڑھا رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ پڑھ کر اچھی بیوی بنے ۔ اس میں تو تمہاری ہی بھلائی ہے ۔ پڑھی لکھی بہو ہوگی ۔ اور ماشاءاللہ وہ پہلے ہی ایسی اچھی لڑکی ہے ۔ کیوں نہ ہو ۔ وہ آپ بیٹی کی تربیت کا خیال رکھتے ہیں ۔"

"ہوں ۔۔۔ پھر کیا بولی ۔"

"پھر کیا بولتی لگی بغلیں جھانکنے اور پھر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔ بولی ۔ آخر مجھے بھی تو اپنے بھائی ہی سے امید بس ہیں ۔ اسی پر ناز ہے مجھے اور میرا ہے ہی کون اک بھائی ہے نا جس کے آسرے جیتی ہوں ۔ چاہے اُٹھا لے یا ٹھکرا دے اس کی مرضی ۔"

خان حقے کا کش لینا بھول گیا ۔ "بولا پاگل ہے پاگل ۔۔۔۔۔"

"میں نے کہا وہ بھائی ایسا نہیں جو ٹھکرا دے گا ۔ تم نے تو اسے سمجھا ہی نہیں ۔"

"ہاں ہاں ۔ وہ بے چاری کیا سمجھے گی ۔"

"اور میں نے کہا ۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ اسی بات پر اڑے رہیں گے کہ اسلم بی ۔ اے کر لے ۔ اونہوں ۔"

"کیا جواب دیا اس نے ۔" وہ پھر چمک کر بولے ۔

"میں نے کہا وہ ایسی نوکری دلوا سکتے ہیں اسے ۔ جو بی ۔ اے کو بھی نصیب نہ ہو ۔ میں نے کہا بہن آج کل جماعتوں کو کون پوچھتا ہے ۔ کئی بی ۔ اے دھکے کھا رہے ہیں ۔ بیس روپے کی نوکری کو ترستے پھرتے ہیں ۔ اللہ نے چاہا توان کی سفارش پر سو روپے کی نوکری نہ ملی تو کہنا ۔ تو نے سمجھا کیا ہے ؟"

"ہاں بی اے کو کون پوچھتا ہے آج کل ۔"

"یہی تو میں نے کہا تھا ۔"

"پھر کیا بولی ۔"

"بولی ۔ میں تو بھائی کے قدموں پر جا گروں گی ۔ ایمان سے ------"

"اوہ ------ پاگل ہے پاگل !!"

"یہ تو خیر آپ ہی جانیں ۔ پر جس قدر اُسے پیار ہے آپ سے میں جانوں شاید ہی کسی بہن کو ہو گا ۔ بس وہ آپ کو سمجھی نہیں ۔"

"ہاں بے وقوف جو ہوئی ۔"

"اتنی عقل لائے بھی کہاں سے ۔ وہ تو ظاہر کو دیکھ کر اسے اصل سمجھ لیتی ہے جبھی تو کہتی ہے کہ بھائی ملتے بھی ہیں تو کس رکھائی سے اسے کیا معلوم کہ رُوکھی نگاہوں کے نیچے یہ دال کس قدر گرم ------" اس نے ہاتھ سے ان کا سینہ تھپکا اور پھر اک دلنواز طریقے سے مُسکرا دی ۔

"سعیدہ ۔" ان کی آنکھ چمکی ۔ "ہی ہی ہی ۔ تم بات تاڑ جاتے ہو ------ حد ہو ادھر آنا ذرا ۔ میری طرف دیکھو تو ۔"

"چلو ہٹو ۔" وہ لاڈ سے بولی ۔ "خواہ مخواہ میرا نام بدنام کر رہے ہیں ۔ وہ سمجھتی ہے میں ہی ورغلا رہی ہوں جیسے کوئی ورغلا سکتا ہے آپ کو ۔"

"خدا کی قسم بڑی شریر ہو تم ۔ اچھا میری بات تو سنو ۔"

"میں جانتی ہوں ۔" وہ بولی ۔

"سعیدہ ۔" انہوں نے سنجیدگی سے للکارا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ سہم گئی ۔ پھر منہ موڑ کر ان کے روبرو ہو بیٹھی ۔ "بات تو سنو تم وہ بولے ۔

میرا مطلب ہے تم ٹھیک کہتی ہو ۔ لیکن اسلم اچھا لڑکا ثابت نہ ہوا تو“

”نہ ہوا تو ۔“ وہ بولی ۔ ”منگنی چھڑانے میں کیا دیر لگتی ہے ۔“

”ہاں ہاں یہی ہمارا خیال ہے ۔ اچھا تو تم کل اسے بلا کر بات کر لینا ۔

”واہ میں کون ہوں ایسی بات کرنے والی ۔ آپ کے ہوتے ہوئے میرا بات کرنا ـــــــ!!“

”لیکن مجھے اتنی فرصت کہاں ہوگی ۔“

”تو نہ سہی ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔ پھر ہو جائے گی کبھی ۔“

”سعیدہ ۔“ وہ بگڑے ۔ ”تم نہیں سمجھتی ان باتوں کو ۔“

”مجھے کیا پتہ ۔“ وہ بولی ـــــــ ”لیکن اگر آپ نے اسلم کو نوکر کروا دیا تو پھر شاید وہ جلد نکاح کے لئے زور دیں ۔“

”اس کی نوکری کے لئے تو میں آج ہی خان بہادر سے کہہ دوں گا ۔ آخر لڑکی کو عمر بھر بٹھا نہیں رکھنا ہم نے اور بیاہ سے ہمیں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے ہم نے لڑکی سے نوکری تو کروانی نہیں ۔ بی ۔ اے نہ ہوئی تو کیا ہوا ۔“

”جیسے آپ کی مرضی ۔“ وہ بولی ۔ ”آپ کی خوشی میں مَیں بھلا کیا عذر کروں گی ـــــــ لیکن آپ اپنی زبان سے کہہ دیتے بہن کو تو بہتر ہوتا ۔ ویسے میں بھلا انکار کر سکتی ہوں کیا ؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ بات تمہارے ذریعے ہو ۔ سمجھی ۔ اِن کو تمہارے متعلق غلط فہمی نہ رہے ۔“

”میرا کیا ہے ۔ لیکن ـــــــ“

”ہم جو کہہ رہے ہیں ۔“

”بہت اچھا ۔ مگر آپ ـــــــ“

”بس سعیدہ تمہیں ہی کہنا ہو گا ۔ سنا تم نے ۔“

”میں کہتی ہوں کسی کی سنیں گے بھی آپ یا اپنی ہی کریں گے ۔“

”بس ہماری مرضی ۔“

"اچھا بابا تمہاری مرضی ہی سہی ۔" وہ مسکرائی ۔ دو بڑی بڑی باہوں نے اسے گھیر لیا ۔ "بڑی گستاخ ہوتی جاتی ہے ۔" وہ مسکرائے ۔ "ہونہہ گستاخ ۔" وہ بڑبڑانے لگی ۔ "اتنی فرمانبردار تو ہوں ۔" اُس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا ۔

..........○..........

وہ کمرا

بڑی بی کو آتے دیکھ کر سرور نے وہ قد آدم تصویر دیوار سے لگا دی اور رازدارانہ انداز سے کہنے لگا ۔ "بڑی بی ۔ تمہاری بی بی آئی تھی آج اس کمرے میں ؟ تم تم اسے یہاں نہ آنے دیا کرو" ۔

"خیوں ۔ اس خمرے میں خیا ہے ۔ اچھا بھلا خمرا ہے" ۔ بڑی بی نے جواب دیا ۔

"اونہوں ۔ یہ کمرا اس کے لئے ٹھیک نہیں ۔ تم نہیں جانتی بڑی بی ۔ یہاں اجمل ۔۔۔۔۔۔"

"خون نہیں جانے ۔ ساری دنیا جانتی ہے ۔ وہ لونڈا ۔۔۔۔۔۔ ! پھر ہوا خیا ۔ وہ خونسا خمرا ہے ۔ جہاں خوئی مرا نہ ہو ۔ سبھی خمروں ہی میں مرتے ہیں ۔ بڑی بی نے بے نیازی سے کہا ۔

"نہیں نہیں" ۔ سرور بڑبڑانے لگا ۔ "تم نہیں جانتی ۔ یہاں اجمل نے خودکشی کی تھی" ۔

"خودخشی" ۔ بڑی بی نے دہرایا۔ "نہ جانے ایسی خیا پڑی تھی اس چھوخرے خو ۔ اسے ہے یوں جوان نخلا تھا ۔ اور بیاہ ہوئے سال ہوا ہو گا ۔ خودخشی خس بات پہ خر لی اس نے ۔ اس حبشی نے مار دیا ہو گا ۔ بڑا دوست بنا پھرتا تھا ۔ توبہ خیا زمانہ آیا ہے" ۔ یہ کہتی ہوئی وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑی ۔

"نہیں ۔ نہیں" ۔ سرور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا ۔ "اسے ایڈی سے محبت تھی ۔ ایڈی اس کا دوست تھا ۔ اسے ایڈی سے عشق تھا عشق" ۔

"اشخ" بڑھیا چونک کر بولی ۔ "یہ اچھا اِشخ ہے ۔ لونڈے دوستوں سے

اِشغ خرنے لگے" ۔ یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں میں داخل ہو گئی ۔

سرور کو ٹھیس لگی ۔ "کوئی نہیں سمجھتا" ۔ وہ آپ ہی آپ چلایا اور مضطربانہ کوٹھے پر ٹہلنے لگا ۔ "میں جانتا ہوں ۔ جانتا ہوں ۔ ہاں ہاں اس نے ایڈی کو پلا دی ہو گی ۔ شاید ۔ شاید ۔۔۔۔۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ ہوش میں آنے پر ایڈی ہمیشہ کے لئے اس سے نفرت کرے گا ۔ ہمیشہ کے لئے جبھی اس نے جان دے دی ۔ کوئی کسی کی بات کیا جانے ۔ کوئی نہیں جانتا ۔"

اُس نے نگاہ اٹھائی اور محسوس کیا گویا اردگرد ایک وسیع ویرانہ پھیلا ہوا تھا یہاں وہاں درخت گڑے کھڑے تھے ۔ سڑکیں اپنی اپنی سمت دوڑی جا رہی تھیں ۔ مکان ایک دوسرے سے منہ موڑے کھڑے تھے ۔ پھر اس کی نگاہ اس تصویر پر جا پڑی جو دیوار سے لگی کھڑی تھی ۔ ایک لمبا تڑنگا گھونسے باز دستانے پہنے کھڑا تھا ۔ چڑھی ہوئی آنکھیں ۔ سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے مٹیالے جسم پر یہاں وہاں ابھرے ہوئے پٹھے دیکھ کر اس پر عجیب سا تاثر چھا گیا ۔ ہاں جب وہ ذاکر کے گھر جایا کرتا تھا ۔ اور اُس کے چھوٹے بھائی صفدر کے ساتھ سکول کا کام کیا کرتا تھا اور ذاکر آ کر چلاتا ۔ کوئی ہے ۔ جو گامے پہلوان سے کشتی لڑے ۔ اور صفدر اٹھ بیٹھتا ۔ ہاں ۔ ہم دونوں ۔وہ سرور کی طرف اشارہ کر کے چیختا ۔ اور پھر سرور کو گھسیٹ کر لے جاتا ۔ دونو مٹی کے ذاکر چلاتا ۔ اور پھر دونوں کے ساتھ کشتی لڑنا شروع کر دیتا ۔ اور آن کی آن میں سرور کو پٹخ کر اس پر بیٹھ جاتا ۔

سرور نے اپنے بدن پر دباؤ محسوس کیا ۔ اسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔ دھن دھن کنپٹیوں میں دھنکی بجنے لگی اور جسم میں یوں چیونٹیاں رینگنے لگیں گویا پھلجھڑی چل رہی ہو ۔

"توبہ کیسی ڈراؤنی تصویر ہے یہ" ۔ پیچھے سے مسرت کی آواز سن کر وہ چونکا ۔

"توبہ" ۔ وہ بولی ۔ "ایسے معلوم ہوتا ہے گویا کسی پر جھپٹنے لگا ہو جیسے سینما میں انجن آتا ہے ۔ توبہ ۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ابھی ہمارے اُوپر سے گزر جائے گا ۔"

"پگلی"۔ وہ ہنسا۔ "یہ تو باکسنگ کی تصویر ہے۔ باکسنگ گھونسہ بازی تم تو خواہ مخواہ ڈر جاتی ہو"۔

"کیوں۔ میں کیا ڈرپوک ہوں"۔ وہ چڑ گئی۔

"نہیں بابا تم تو بہت بہادر ہو"۔ اس نے پیار سے کہا۔

"بس چھوڑو"۔ وہ لاڈ سے بولی۔ "جبھی مجھے اس کمرے ۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں"۔ وہ چونک پڑا۔ "وہ بات اور ہے۔ بالکل اور"۔

"کیوں اور کیوں۔ دیکھیئے تو کیسا اچھا کمرا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اسے بیڈ روم بنا لیں۔ سارے گھر میں اس سے بہتر کوئی کمرا نہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ"۔ وہ چلایا۔ "کسی روز ڈر گئی تو"۔

"تو آپ خود کیوں آ بیٹھتے ہیں یہاں"۔

"میں کیا روز بیٹھتا ہوں۔ کبھی آ بیٹھا۔ میں مرد ٹھہرا۔ میری اور بات ہے"۔

"جی"۔ وہ بولی۔ جب یہاں سے باہر نکلتے ہیں ۔۔۔۔۔ توبہ کبھی آئینہ دیکھا ہے۔ اس وقت۔ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ جیسے خون اتر آیا ہو۔ اور منہ سوجا ہوا شرابیوں کا سا۔ اس وقت تو آپ بالکل ڈاکر دکھائی دیتے ہیں"۔

"لاحول ولا قوۃ" اس نے اپنی نگاہیں تصویر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیوں میں کیا جھوٹ کہتی ہوں۔ کسی سے پوچھ لیجیے۔ بڑی اماں سے پوچھ لیجئے ایسا معلوم ہوتا ہے اُس وقت کہ سر پر بھوت سوار ہے۔ پر میں نے تو کبھی نہیں روکا آپ کو یہاں آکر بیٹھنے سے"۔

سرور کی نگاہوں میں وہ تصویر پھیلنے لگی۔ پھیلنے لگی انجن آ رہا تھا۔ آ رہا تھا اس پر سے گزرنے والا تھا۔ اس کے بدن میں ہڈیاں چلچلانے لگیں وہی دباؤ۔ بوٹی بوٹی تھرکنے لگی۔ گویا حبشیوں کا اک انبوہ ناچ رہا ہو۔ پُر لذت بھیانک ناچ۔

"توبہ" مسرت بڑبڑائی۔ تو یہ تصویر اس کمرے میں لگے گی۔ ہوں سونے پہ سہاگا ہوا"۔

وہ چونک کر بیدار ہو گیا ۔ ہاں اسی کمرے میں ۔ تمہیں پسند جو نہ ہوئی ۔ تو کہاں لگ سکے گی یہ" ۔

"جی" ۔ وہ طنزاً بولی ۔ "جو مجھے پسند نہیں وہ اس کمرے میں ۔"

"ہاں ہاں" وہ کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا ۔ یہ کمرا تمہارے متعلق نہیں نا اس لئے" ۔

"جی" وہ چڑ کر بولی ۔ "جہاں آپ کے دوست کی بات آئی ۔ وہاں میری جگہ کہاں" ۔

"نہیں نہیں ۔ یوں نہ کہو" ۔ سرور کی آواز میں منت تھی ۔

"اب چھپانے سے کیا ہو گا" ۔ وہ بولی ۔ اس کے بغیر آپ کس کام کے وہ تو یوں ہے جیسے چراغ میں تیل ۔ ہر وقت اسے کندھوں پر بٹھائے پھرتے ہیں اپنی بھی سدھ بدھ نہیں اوروں کی کیا بات ۔ ہم بیچارے کس شمار میں ہیں ۔۔۔۔۔"

"مسرت!!" سرور منت بھری آواز سے چلایا ۔ لیکن وہ اپنی دھن میں بولتی گئی ۔

"میرے پاس آکر بھی آپ یوں کھوئے کھوئے رہتے ہیں جیسے کوئی راستہ بھول گیا ہو جیسے کسی کی تلاش میں کھو گیا ہو ۔ لیکن وہ آ جائے تو سب کچھ مل جاتا ہے ۔ نہ جانے اس میں کیا ہے ۔ شراب پئے بغیر میاں کا ایک دن نہیں کٹتا ہر وقت آنکھیں چڑھی ہوئی منہ سوجا ہوا ۔ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے ۔ وحشت" ۔

"نہیں نہیں مسرت" وہ چلایا "یوں نہ کہو ۔ تم نہیں جانتی ۔ اس کے دل میں تمہارے لئے کس قدر احترام ہے ۔ کس قدر عزت کرتا ہے وہ تمہاری ۔ آنکھ نہیں اٹھاتا ۔ کبھی پی کر یہاں نہیں آتا ۔ اس خیال سے کہ تمہیں تکلیف نہ ہو" ۔

"میں سب جانتی ہوں" ۔ وہ غرائی ۔ "توبہ کس قدر بنتا ہے ۔ آنکھیں نہیں اٹھتیں ۔ ہر وقت چڑھی ہوتی ہے ۔ جبھی آنکھیں نہیں اُٹھتیں ۔ مزا تو

جب تھا اگر میرے کہنے پر پینا چھوڑ دیتا ۔ توبہ ۔ نہ جانے لوگ کیوں بدمست رہتے ہیں اور پھر آپ تو اُس کی بغل میں ۔"

"مسرت" ۔ وہ چیخا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو" ۔

"میرا کیا ہے" ۔ وہ بولی میری طرف سے کوئی جہاں جی چاہے گھسا رہے میں تو آپ تنگ آگئی ہوں ۔ میں تو اس مکان میں نہیں رہوں گی" ۔ یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑی ۔

مخان میں نہ رہو گی تو رہو گی کہاں ۔" بڑی بی بڑبڑانے لگی ۔ "خون سے مخان میں نہیں ہے یہ خمرا ۔ ہر جگہ ہے ۔ ہر مخان میں ہے ۔ اس مخان میں نہ رہوں گی ۔ کتنی بھولی ہے یہ بیٹی ۔

سرور کی آنکھوں تلے وہ تصویر پھیل رہی تھی اور تمام چیزیں اس کی اوٹ میں آتی جا رہی تھی ۔

دروازے پر دوبارہ دستک سن کر وہ چونکی ۔ "بڑی اماں ۔ دیکھ تو کون ہے" اس نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا ۔ جواب نہ ملنے پر وہ آپ اٹھی اور ڈیوڑھی میں چلی گئی ۔ "کون ہے"۔ اس نے دروازے کو کھول کر درز میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا ۔

"سلام کہتا ہوں" ۔ ذاکر کی بھدی آواز سنائی دی ۔ "سرور" کہاں ہے" ۔

مسرت نے دروازہ کھول دیا ۔ "آئیے"۔ معاً اس نے بو کا اک بھبھکا محسوس کیا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ۔ ذاکر نے اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر سر جھکا لیا اور کہنے لگا ۔ "نہیں نہیں ۔ مجھے آنا نہیں بس اس سے کہہ دیجیئے کہ آج میں نہ مل سکوں گا ۔ انتظار نہ کرے"۔

"خود ہی کہہ دیجئے گا" ۔ وہ بولی ۔

"نہیں میں اندر نہیں آسکتا"۔ وہ چلانے لگا۔

لیکن وہ یہیں ہیں ۔ اوپر اس کمرے میں ۔"

"اس کمرے میں ؟" وہ چلایا ۔ "کس کمرے میں" ۔ اس کا رنگ فق ہو گیا ۔ گھبراہٹ میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ آنکھیں اٹھا کر مسرت کی طرف گھورنا

مناسب نہیں ۔ اور اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی جس سے مسرت کو سخت نفرت تھی اور اپنے اصول کے مطابق وہ اس مکان میں پی کر جانا نہ چاہتا تھا ۔

" اسی کمرے میں ۔ اوپر" مسرت نے پر معنی انداز سے کہا ۔ اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی ۔

وہ گویا تڑپ کر اندر آ گھسا ۔ "اس کمرے میں ۔ اس وقت ۔ آپ اُسے اس کمرے میں نہ جانے دیا کیجئے ۔ خدا کے لئے اُسے اِس کمرے سے لے آیئے ۔ اس کا وہاں جانا ٹھیک نہیں ۔ آپ اسے منع کر دیں نا !! ۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں ۔ مسرت کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ چلایا" آپ نہیں جانتی ۔ مجھے معلوم ہے ۔ اسے علم ہے ۔ وہ جانتا ہے ۔ نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے آپ میری طرف یوں نہ دیکھیئے ۔ جایئے" ۔

وہ حیران کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس وقت وہ قطعی بھول چکی تھی کہ وہ شرابی تھا اور اس کے منہ سے بو آ رہی تھی ۔

"اوہ آپ نہیں جانتی ۔ کہیں وہ اجل کی طرح" دفعتاً وہ رک گیا اور پھر دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

چند ساعت کے لئے وہ حیران کھڑی رہی ۔ وہ ذاکر کے انداز پر حیران تھی ۔ وہ کمرا ۔ نہ جانے اس کمرے کو ان سے کیا تعلق تھا وہ چونکی اور پھر نہ جانے کیوں ذاکر کے پیچھے پیچھے کوٹھے پر جا پہنچی ۔

"شکر ہے ۔ وہ یہاں نہیں ہے" ۔ ذاکر بڑبڑایا ۔ "کہیں چھپ نہ گیا ہو" ۔ وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر بولی ۔ "موم بتی جلا لیجئے"۔

"اوہ آپ ہیں" ۔ وہ چونکا ۔ "موم بتی کہاں ہے" "یہ رہی"۔ اس نے دیا سلائی جلا کر کہا ۔" نہیں نہیں وہ یہاں نہیں ۔ اف آپ نے مجھے خواہ مخواہ ڈرا دیا ۔ لیکن آپ نہیں جانتی ۔ سرور کو یہاں آنے نہ دیا کیجئے ۔ خدا کے لئے ۔ نہ آنے دیا کیجئے ۔ وہ جانتا ہے ۔ وہ جانتا ہے ۔ نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے' نہ جانے کیا ہونے والا ہے' میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں اسے یہاں نہ آنے دیا کرو ۔ تم

بولتی نہیں ۔ اوہ ۔ میرا مطلب ہے آپ معاف کرنا"۔

"اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں آپ" وہ مسکرائی ۔ وہ ٹمٹماتی ہوئی بتی ۔ ڈرے ڈرے سے تارے ۔ اور چاروں طرف گاڑھا اندھیرا اور وہ کمرہ اور اس کمرے میں وحشت زدہ شرابی ۔ مسرت پر ایک کیفیت طاری تھی ۔ گویا کچھ ہونے والا تھا ۔ دلچسپ پراسرار واقعہ ۔

"اوہ آپ نہیں جانتی" ۔ وہ بولا "اس کمرے میں ۔ یہاں اجمل نے خودکشی کر لی تھی ۔ ہاں وہ جانتا تھا ۔ ذاکر یوں بڑبڑانے لگا گویا خواب میں ہو ۔ وہ جانتا تھا وہ اپنے دوست ایڈی کے راز سے واقف تھا ۔ ایڈی کو اس کی بیوی سے محبت ۔ لیکن آپ نہیں جانتیں ۔ یہاں اس جگہ اُس نے اپنے دوست کی خاطر جان دے دی" ۔

"لیکن" وہ بولی ۔"اس بات کو اُن سے کیا تعلق" ۔ معاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ بیدار ہو گئی ہو ۔

"اوہ تمہیں نہیں معلوم ۔ لیکن وہ جانتا ہے ۔ نہ جانے وہ کسی دن کیا کر بیٹھے" "نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ وہ غرائی ۔ آپ کے حواس ٹھکانے نہیں ۔ فضول باتیں میں نہیں جانتی ایسی ویسی باتیں ۔ اجمل نے یوں کیا ۔ ایڈی نے یہ کیا ۔ فضول ہمیں کیا ان باتوں سے شراب کے نشے میں ہوش نہیں" ۔ وہ کراہت سے پیچھے ہٹ گئی ۔

"ذاکر نے محسوس کیا گویا کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو ۔ وہ چونک پڑا "ٹھیک ہے ۔ آپ سچ کہتی ہیں ۔ میں نے پی ہوئی ہے ۔ نہ جانے کیا کیا بکے جا رہا ہوں مجھے معاف کرنا ۔ اسی لئے میں کبھی پی کر یہاں نہیں آیا ۔ نہیں نہیں سرور کچھ نہیں جانتا کچھ ہو تو جانے ۔ کچھ بھی نہیں ۔ کوئی بات ہی نہیں میں جاتا ہوں" ۔ وہ آگے بڑھا اور مسرت کو جھجک کر پیچھے ہٹتے دیکھ کر چلانے لگا ۔ "نہیں نہیں ۔ مجھ سے نہ ڈریئے ۔ مجھ سے ڈرتی ہیں آپ ؟ وہ ہنسا ۔ "نہیں نہیں مجھے آپ سے محبت نہیں ۔ نہیں نہیں بالکل نہیں ۔ آپ میرے دوست کی بیوی ہیں ۔ آپ میری ماں ہیں ماں ۔۔۔۔۔"

نہ جانے وہ ماں کے لفظ پر کیوں تلملائی ۔ وہ اس شرابی سے خائف تھی اس کی پراسرار باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن اس کی بے معنی باتوں میں اک کرن خواہ مخواہ ناچ رہی تھی ۔ اس کی خرافات میں صداقت کی جھلک محسوس ہو رہی تھی اس نفرت کے باوجود جو وہ محسوس کر رہی تھی وہ اس ملاقات کو ختم کرنا نہ چاہتی تھی بلکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ یونہی بولے جائے بکے جائے بے معنی بیہودہ باتیں اور وہ کھڑی سنتی رہے کوستی رہے ۔ "نیچ شرابی" وہ بڑبڑائی۔

"ہاں میں شرابی ہوں ۔ نالی کا گندا پانی پیتا ہوں" وہ چلایا ۔ "مجھے معاف کرو نہیں نہیں مجھے معاف نہ کرو ۔ تھوکو ۔ میرے منہ پر تھوکو" ۔

"لیکن تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے" ۔ خواہ مخواہ اس کی آواز میں منت کی جھلک پیدا ہو گئی ۔ "نہیں نہیں میں پیوں گا ۔ اور پیوں گا ۔ حتیٰ کہ آپ کے دل میں میرے لئے اتنی نفرت ہو جائے اور نفرت ۔ تم میری ہو ماں میرے دل میں تمہارے لئے اتنی عزت ہے ۔ لیکن یہ کافی نہیں ۔ نہیں ۔ میں کمینہ ہوں ۔ کمینہ ۔ میں جانتا ہوں ۔ وہ ہنسا ۔ آپ کی نفرت کے بغیر کچھ بھی نہیں بنے گا ۔ تھوکو میرے منہ پر تھوکو ۔"

نہ جانے مسرت کو کیا ہوا ۔ اس کے سامنے وہ موم بتی لپک لپک کر ناچ رہی تھی ۔ آسمان پر تارے جھوم رہے تھے اور ہوا اس کے بالوں کو چھو کر اس کے کان میں نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی ۔ سامنے ذاکر کھڑا تھا ۔ معاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ اک بے برگ و بار درخت ہو ۔ مرجھایا ہوا درخت ۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ پھیلتی جا رہی ہو اور تمام کائنات سمٹ کر اس کے دامن میں سمائے جا رہی ہو ۔

تم اِسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے ۔ تم کیوں پیتے ہو" ۔ وہ چلائی

"میں میں" وہ پھر مشتعل ہو گیا ۔ "میں تمہارے لئے نہیں پیتا ۔ تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ۔ تمہیں ایسی گندی چیز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ۔ بس ویسے ہی پیتا ہوں نشے کے لئے ۔ نشہ !" وہ ہنسا "کہتے ہیں شراب بھلانے میں مدد دیتی ہے جھوٹ بکتے ہیں یہ تو الٹا سامنے لا کھڑا کرتی ہے ۔

تمہاری طرح نہیں" وہ ہنسا "انہوہ ۔اور قریب اور قریب اتنا قریب کہ سب کچھ اوٹ میں آ جاتا ہے سب کچھ ۔ دوست بھی ۔ ہاں ۔ ایڈی سے پوچھ لو ۔ ایڈی سے" وہ یوں بڑبڑا رہا تھا گویا اکیلا کھڑا ہو ۔ سامنے پردے کے پیچھے ایڈی اور اجمل کے سائے چھپ چھپ کر اس کی طرف جھانک رہے تھے ۔

وہ گھبرا گئی ۔ "اوہ آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں ۔ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ۔ یہ کمرا ۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں ۔ اسے اس کمرے میں نہ آنے دیا کیجئے ۔ خدا کے لئے ۔ میں اور کچھ نہیں کہتا بس اسے یہاں آنے سے روک دیجئے ۔ میں وعدہ کرتا ہوں میں کبھی نہیں آؤں گا ۔ کبھی نہیں آؤں گا" ۔

"لیکن کیوں ۔ کون کہتا ہے کہ آپ نہ آئیں یہاں" ۔ خواہ مخواہ اس کے منہ سے نکل گیا ۔ "آپ ان کے دوست ہیں ۔ آپ چاہیں تو روز آئیں یہاں ۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ آپ جانیں اور آپ کے دوست مجھے کیا واسطہ ان باتوں سے" ۔

"دوست" ۔ وہ چلایا ۔ "دوست" اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ ہاں آپ میرے دوست کی بیوی ہیں ۔ لیکن میں شرابی ہوں ۔ شرابی ۔ مجھ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا" ۔ نہیں کیا جا سکتا ۔

"مجھے اس سے کیا" وہ بولی ۔ اس کے دل میں غصہ لہریں لینے لگا ۔ "چاہے آپ روز پئیں ۔ چاہے آپ یہاں بیٹھ کر پئیں ۔ مجھے کیا ۔ میں تو بلکہ اپنے ہاتھ سے پلانے کو تیار ہوں" ۔

"آپ" وہ حیرانی سے چیخا ۔ "آپ مجھے ۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں اگر وہ کہہ دیں تو میں کیا عذر کر سکتی ہوں ۔ میں دوستوں میں آنے والی کون ہوں ۔ میں بیچاری کس شمار قطار میں ہوں ۔ آپ نہیں جانتے انہیں آپ سے کس قدر اُنس ہے" ۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر حسرت بھرے انداز سے کھڑی ہوگئی ۔" ان کے دل میں صرف آپ ہی بستے ہیں ۔ آپ کے خیال پر وہ جی اٹھتے ہیں ۔ ورنہ جیسے کوئی کھویا ہوا ہو اور میرے پاس ہوں تو

جیسے کوئی رستہ بھول گیا ہو ۔ اور دیس میں آ نکلا ہو ۔ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہوتے ہیں" ۔

"اوہ" وہ پھر چونکا ۔ "ہاں ہاں وہ جانتا ہے ۔ وہ ضرور جانتا ہے"۔

"کیا جانتے ہیں وہ ۔ آپ مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہتے"

"کچھ نہیں کچھ نہیں کچھ ہو تو وہ جانے ۔۔۔۔۔ ہو بھی کیسے سکتا ہے ۔ کچھ نہیں ہو سکتا اور دیس ۔ کیسے ہو سکتا ہے ۔ اونہوں ۔ دیس تو کسی نے نہیں اپنایا ۔ کوئی اپنا بھی لے تو اس سے کیا ہوتا ہے ۔ کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔ منزل چل کر راہی کی طرف نہیں آتی بکتے ہیں ۔ شاعری کرتے ہیں ۔ لوگ منزل بنا لیتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ راہی بھی بن جائیں ۔ میں راہی نہیں ہوں ۔ میں راہی نہیں بنوں گا ۔ میرے پاؤں نہیں اٹھیں گے ۔ میری آنکھیں نہیں اٹھیں گی ۔ نہیں نہیں ۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ" وہ غصے سے غرائی ۔ "چلے جایئے یہاں سے چلے جایئے ۔ آپ ہوش میں نہیں ہیں" ۔

"نہیں نہیں میں ہوش میں ہوں ۔ ہوش میں ہوں میں" ۔

"مجھے ایسا ہوش نہیں چاہیئے ۔ چلے جایئے" ۔ وہ دیوانہ وار بھاگی ۔ اور نیچے آکر پلنگ پر اوندھے منہ گر کر نہ جانے کیوں رونے لگی ۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے نیچے اُترا لیکن باہر جاتے جاتے رک گیا ۔ اندر سامنے وہ پلنگ پر گٹھڑی سی بنی ہچکیاں لے رہی تھی ۔ وہ چپ چاپ اس کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ "آپ نہ روئیں میں اب کبھی پی کر نہ آؤں گا ۔ کبھی نہ پیوں گا" ۔

"مجھے کیا" وہ از سر نو جوش میں آ گئی ۔ "میری طرف سے پئیں یا نہ پئیں ۔ مجھے کیا واسطہ چاہے روز پی کر آ جائیں چاہے یہاں بیٹھ کر پئیں ۔ میرے لئے سب ایک ہے" ۔

"اچھا اچھا" وہ بھونچکا رہ گیا ۔ "میں نہیں آؤں گا ۔ آپ ناراض نہ ہوں" ۔

"مجھے کیا پڑی ہے کہ ناراض ہوں ۔ میرے لئے چاہے آپ آئیں نہ

آئیں ۔ آپ ان کے لئے آتے ہوں گے ۔ ان کے لئے ۔ میرے لئے آپ کے آنے نہ آنے میں کیا فرق ہے"۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے ۔ وہ بولا ۔ "اچھا میں پیوں گا میں اتنی پیوں گا کہ سدھ بدھ نہ رہے ۔ کچھ نہ رہے ۔ کچھ بھی نہیں ۔"

"لیکن مجھے کیوں سناتے ہو ۔ جانا چاہتے ہو تو جاؤ ۔ تمہیں کون روکتا ہے ۔ کوئی نہیں روکتا ۔ پیو ۔ جتنی چاہے پیو ۔ آگے ہی کون سی سدھ بدھ قائم ہے ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی ۔

"نہیں نہیں ۔ ابھی میں جانتا ہوں ۔ سب کچھ جانتا ہوں ۔ ابھی مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا نہیں کرنا چاہیے ۔"

"پھر کیا ہوگا" ۔ اس کی آواز تمسخر سے بھری تھی ۔

"پھر کیا ہوگا ۔ پھر ۔ پھر کہیں گر کر ڈھیر ہو جاؤں گا" ۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ۔ اس کے ہونٹ نفرت سے پھڑپھڑائے ۔ "پھر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے" ۔

"نہیں نہیں ۔ یہاں نہیں ۔ میں پی کر یہاں نہیں آؤں گا" ۔

"ہوں" ۔ وہ مسکرائی ۔ "تو یہ سدھ بدھ رہ جائے تو ۔ پھر پینے سے فائدہ"

"ٹھیک ہے ۔ لیکن نہیں ۔ پھر ہر نالی وہ بن جائے گی ۔ وہ" ۔

"وہ کون ؟" وہ چلائی ۔

"وہی جو ہے جو سبھی کچھ ہے ۔ نہیں نہیں ۔ تم نہیں وہ ۔"

"نہیں نہیں میں جانے نہ دوں گی" ۔ وہ چلائی ۔ "میں اس حالت میں نہ جانے دوں گی ۔ وہ کہیں گے تم نے ایسی حالت میں کیوں جانے دیا ۔ میں خود پلاؤں گی ۔ وہ برانڈی لائے تھے ۔ بڑی بی کے لئے ۔ میں ابھی آئی ۔ ابھی" ۔

اس نے الماری میں سے شیشی اٹھائی اور گلاس میں ڈال کر لے آئی ۔ یہ لو بس یہی ہے ۔ صرف اتنی سی ۔"

"نہیں نہیں" وہ چلایا ۔ "میں تمہارے ہاتھ سے نہ پی سکوں گا ۔ میں نہ پیئوں گا مجھے مجبور نہ کرو ۔ تمہارے لئے تو میرا پینا نہ پینا ایک ہے ۔"

"کیوں ؟" وہ غصے سے چیخی ۔

"کیوں !" اس نے حیرانی سے دہرایا ۔

نہ جانے کیوں ندامت سے مسرت کا منہ لال ہوگیا ۔ اس نے وہ گلاس ذاکر پر انڈیل دیا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ اوراندر سے دروازہ بند کر لیا ۔

"کیوں ! میرا پینا نہ پینا تمہارے لئے ایک نہیں؟" وہ وہیں سے چلایا ۔

"مجھے نہیں معلوم" ۔ وہ اندر سے باآواز بلند بولی ۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ معاً اس نے محسوس کیا گویا اس میں نشے کی اک رو دوڑ رہی ہو ۔ "اندھا شرابی ۔" وہ بڑبڑایا ۔ "اندھا ۔" اور پھر آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر ہنسنے لگا ۔ "ہوں" ۔ وہ آئینے میں کسی کو دیکھ کر بولا ۔ "بہت خوش ہو تم ۔ ناچو ناچو اندھے شرابی ۔ ہنسو ہنسو" ۔

وہ اس وقت اپنے آپ میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے دروازہ کھلنے اور سرور کے پاؤں کی چاپ نہ سنی ۔ سرور اسے دیکھ کر رک گیا اور دروازے میں کھڑا ہو کر اس کی باتیں سننے لگا ۔ "ہوں" ذاکر چلایا ۔ عمر بھر کی آرزو پوری ہو گئی ۔ اسے تم سے محبت ہے ۔ محبت ۔ ناچو ۔ اندھے شرابی ۔ آج تک نہ سمجھ سکے ۔ وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے پلانے کو تیار ہے ۔ اپنے ہاتھ سے ۔ اب بھی کیا پینے کی ضرورت ہے ۔ اب بھی کیا شراب کے محتاج رہو گے ۔ نہیں نہیں کمینے وہ تمہارا دوست ہے دوست۔دوستی ہم دونوں میں حائل ہے ۔ منزل سہی ۔ راہی نہیں ۔ دور کھڑا تکنے والا راہی ۔ چلنے والا نہیں ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ اسے تم سے محبت ہے محبت ۔ اپنے ہاتھ سے پلانے کے لئے تیار ہے ۔ اس نے اک اور قہقہہ لگایا ۔

سرور پر اک کیفیت طاری تھی ۔ گویا وہ سرتاپا کھولتا ہوا جام بن گیا تھا ۔ حتیٰ کہ چپ رہنا اس کے لئے ناممکن ہوگیا ۔ "ہاں ہاں" وہ چلایا ۔ "میں اپنے ہاتھ

سے پلانے کے لئے تیار ہوں ۔ اپنے ہاتھ سے۔"

"اوہ تم" ذاکر کا رنگ اڑ گیا ۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے ۔ کہو ۔ بولو ۔ ذاکر ۔ تم نے تو آپ پی کر نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی ۔ ورنہ مجھے کیا اعتراض تھا ۔ مجھے تو ہر حالت میں منظور ہے سب کچھ منظور ہے" ۔

"ہاں" وہ بڑبڑایا ۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم جانتے ہو ۔ تم سے چھپانا بے سود ہے بیوقوف ہوں جو چھپائے پھرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں خدا کے لئے مجھ سے نہ چھپاؤ ۔ ہماری دوستی کبھی حائل نہ ہوگی ۔ کبھی نہیں" ۔

"نہیں نہیں" ذاکر بات کاٹ کر بولا ۔ "میں کمینہ نہیں ہوں ۔ میں راہی نہیں بنوں گا مجھ پر یقین کرو سرور ۔ میرے پاؤں نہیں اٹھیں گے ۔"

"کیوں نہیں" ۔ سرور نے چیخ کر کہا ۔ "تم جو چاہو مجھے منظور ہے جو چاہو" ۔

ذاکر شدّت جذبات سے تڑپ کر مڑا اور جوش میں سرور سے بغلگیر ہو گیا ۔ سرور پگھل کر تمام کائنات پر بہہ گیا یا نہ جانے سمٹ کر معدوم ہو گیا ۔

"لیکن سروری تم اجمل کی طرح ۔۔۔۔۔۔"

معاً وہ ہوش میں آگیا ۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ذاکر کا منہ بند کر دیا ۔ چپ وہ سنتی ہے۔"

"اچھا" ۔ ذاکر نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا ۔ "میں جاتا ہوں ۔ میں پیوں گا ۔ میں پیوں گا" ۔

سرور نے پھر اس کا منہ بند کر دیا ۔ "چپ وہ سن نہ لے ۔ تم جتنی جی چاہے پی آؤ لیکن تم آؤ گے نہیں ۔ ذاکر مجھے ڈر ہے" ۔

"نہیں نہیں میں ضرور آؤں گا ۔ میں آؤں گا ۔ ضرور آؤں گا ۔ میں" ۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔" سرور یوں بولا ۔ جیسے راز کی بات کہہ رہا

ہو ۔" اوپر اُس کمرے میں ۔ ضرور آنا" ۔

" ہاں ہاں ضرور آؤں گا" ۔ ذاکر نے اس کی بات اَن سنی کر کے کہا ۔

"آؤں گا ۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا ۔

"اوہ چلے گئے" مسرت چلاتی ہوئی آئی ۔ آپ نے کیوں جانے دیا انہیں ۔ کیوں جانے دیا آپ نے اس حالت میں ۔ نہ جانے کہاں گر پڑیں ۔ یہ آپ نے کیا کیا ۔"

سرور بھونچکا رہ گیا ۔ اوہ تم مسرت ۔ میں ۔ میں تو ۔ وہ"

"ایسی حالت میں کوئی جانے دیتا ہے کسی کو ۔ اپنی سدھ بدھ تو تھی نہیں ۔

"لیکن ۔ تم ناراض ہو گئی مسرت ۔ خدا کے لئے ناراض نہ ہونا" ۔

"کیوں ۔ آپ کیا خود نہیں پلا سکتے انہیں " ۔

"مسرت " ! سرور حیرانی سے چیخا ۔ "تم" ۔

"میں جانتی ہوں" ۔ وہ بولی " پینے گئے ہیں نا ۔ لیکن آپ خود جا کر نہ لا سکتے تھے اب اگر وہ نہ آئیں تو" ۔

"مسرت" وہ حیرانی سے بھوت بن گیا ۔" تم جانتی ہو ۔ تم اُف ۔ مجھے معلوم نہ تھا ۔ مجھے معاف کر دو ۔" وہ دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں جھکا لیں ۔ گویا تنکا ہو گیا ہو ۔ تم کس قدر اچھی ہو ۔ مجھے معلوم نہ تھا ۔"

اس میں میری کیا بات ہے ۔" وہ بولی "نہیں نہیں ۔ وہ آپ کے دوست ہیں میرا اچھا برا ہونا کیا معنی ۔

"ہاں ہاں میرا دوست ہے وہ" ۔ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے بولا ۔ "بس اب کچھ نہ کہو تمہارا احسان مند ہوں" ۔

"تم پی آئے ہو کیا ۔ احسان کیسا" ۔

"اوہ" وہ گھبرایا ۔ "اچھا میں اب جاتا ہوں ۔ اوپر اس کمرے میں ۔ لیکن" ۔

"اُس کمرے میں" ۔ وہ چلائی ۔

"میرا مطلب ہے" وہ اپنی ہی دھن میں کہے گیا۔ تم دروازہ بند نہ کرنا۔ اسے آنے دینا"۔

"دروازہ بند نہ کروں"۔ وہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"ہاں ہاں۔ میری خاطر" یہ کہہ کر وہ اوپر چڑھ گیا۔

"میری خاطر" وہ بڑبڑائی "اف انہیں معلوم ہے نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنے منہ سے کہہ دیں گے۔ دروازہ بند نہ کرنا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور بھاگ کر اپنے کمرے میں جاکر رضائی میں منہ ڈال کر رونے لگی" نہ جانے مجھے کیا سمجھا ہے انہوں نے" وہ بڑبڑائی "دروازہ بند نہ کرنا۔ اف" وہ دیوانہ وار اٹھی اور اٹھ کر دروازے کی زنجیر لگا دی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ اف" اور پھر رضائی پر گٹھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

دروازہ بند کرنے کی آواز سن کر سروری اٹھ بیٹھا۔ تم آ گئے ہو ذاکر میں جانتا تھا تم آؤ گے۔ وہ اٹھ کر دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ کوٹھا سنسان پڑا تھا۔ سامنے پردے پر ایڈی کا سایہ لہرا رہا تھا گویا اندھیرے میں کوئی انجن آ رہا ہو۔ آ رہا ہو۔ اس نے اپنی نگاہ ادھر سے ہٹا لی۔ نیچے مسرت کے کمرے کے دروازے بند تھے۔ جن میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ "مسرت !!" اس کے دل میں احسان مندی کا جذبہ اٹھا۔ اف میں نے کس قدر غلط سمجھا تھا اُسے" اس کی نگاہیں دروازے کے شیشے میں سے مسرت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے جی میں آئی کہ مسرت کے پاس جاکر اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دے۔ لیکن دروازہ بند تھا۔ اور ذاکر۔ نہ جانے وہ کب آ جائے۔" وہ واپس کمرے میں لوٹ آیا۔ اور لیٹ کر اس انلارجمنٹ کی طرف دیکھنے لگا جو اس نے اس کمرے میں لگائی تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ تصویر پھیل رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ حتیٰ کہ تمام کمرا اس کی اوٹ میں آ گیا تھا ذاکر کے پٹھے پھولتے جا رہے تھے اور حبشیوں کے سے بال لہرا رہے تھے۔ باہر ایڈی قہقہے لگا رہا تھا۔

سرور چونک کر بیدار ہوگیا ۔ سامنے ایک بڑا سا سایہ اس پر کودنے کو تیار تھا ذاکر آرہا تھا ۔ آرہا تھا ۔ دھم اس پر اک بوجھ آگرا ۔ ایڈی ۔ وہ چلّایا ۔

مسرت نے وہ چیخ سنی ۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی ۔ "کون ہے ۔ بڑی بی" اور پھر دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھ گئی ۔

سرور چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا ۔ آنکھیں سرخ ہو کر ابل آئیں تھیں منہ پر بھیانک وحشت چھا رہی تھی جیسے کسی نے پی کر سدھ بدھ بھلا دی ہو اور گر کر ڈھیر ہوگیا ہو اس کی چھاتی پر وہ قد آدم تصویر گری پڑی تھی ۔ جو اس نے کمرے میں خود لگائی تھی ۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سرور کو ہلایا لیکن اس کے جسم میں سکت نہ تھی ۔ مسرت نے اپنا ہاتھ اس کے دل پر رکھا لیکن دل کی حرکت بند تھی ۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی پھر خوف طاری ہوگیا ۔ اور وہ بھاگتی ہوئی نیچے اتر آئی "بڑی بی" وہ چیخی ۔ "بڑی بی ۔ذاکر" کو زمین پر بیٹھے دیکھ کر وہ رکی پھر ذاکر سے چمٹ گئی ۔ "ذاکر" ۔

ذاکر لڑکھڑا کر اٹھ بیٹھا ۔ "نہیں نہیں ۔ میں ہوش میں ہوں ۔ میری سدھ بدھ نہیں گئی ۔ نہیں گئی ۔ نہیں جائے گی ۔ تم میری ماں ہو ماں" ۔

وہ گھبرا کر بھاگی ۔ "اوہ شرابی ۔"

"نہیں نہیں ۔ وہ چیخا ۔ "میں شرابی نہیں ہوں ۔ نہیں ۔ نہیں ہوں ۔ میں ہوش میں ہوں۔"

"میں اس مکان میں نہیں رہوں گی" ۔ وہ چلائی ۔ نہیں رہوں گی ۔ وہ اُس کمرے میں ۔"

"خیوں" بڑی بی اپنی کوٹھڑی سے نکل کر بولی ۔ "خیا ہے اس خمرے کو ۔ اس مخان میں نہ رہو گی تو جاؤ گی خہاں ۔ خہاں نہیں ہے وہ خمرا ۔ ہر مخان میں ہے ۔ ہر جگہ ہے" ۔

لیکن وہ ! اُس کمرے میں ، مسرت نے ایک ہچکی لی اور دھڑام سے گر پڑی ۔

○

حد ہو گئی

مجھے طاہر کی چھلکتی ہوئی متبسم آنکھوں کو دیکھ کر تعجب نہ ہوا ۔ کیونکہ اس کی نیلی آنکھیں یا تو چھلکنا اور یا پی جانا ہی جانتی ہیں ۔ اور اس کا مدھم آواز میں کہنا ۔ "بھئی حد ہو گئی امجد ۔ اوپر چلو نا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔" بھئی کوئی نئی بات نہ تھی اس لئے کہ وہ اکثر مجھ سے کچھ نہ کچھ کہنے کا عادی ہو چکا تھا ۔ تعجب تو مجھے اس بات پر ہوا کہ اس نے خلاف معمول میرے ہاتھ سے کتاب چھین لی اور بانہہ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا مجھے کوٹھے پر لے گیا ۔ حالانکہ وہ اکثر کہا کرتا تھا ۔ تمہیں پڑھتے دیکھ کر میرے دل میں رشک پیدا ہوتا ہے ۔ اور جی نہیں چاہتا کہ تمہارے مطالعہ میں حارج ہوں ۔ کوٹھے پر پہنچ کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھڑکی کھولی ۔ "وہ مکان ہے نا وہ نیلی کھڑکیوں والا ۔ وہ سامنا، وہ ۔۔۔۔۔۔ اس مکان میں رہتی ہے وہ ۔۔۔۔۔۔" نہ جانے مجھ میں وہ کون سی خصوصیت ہے کہ ہر شخص جسے چار ایک دن میرے ساتھ رہنے کا اتفاق ہو مجھے کسی نہ کسی وہ ۔۔۔۔۔ کا گذشتہ یا تازہ قصہ سنانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سناتے ہوئے کچھ ایسا انداز اختیار کر لیتا ہے ۔ جس سے ظاہر ہو کہ مجھ پر خاص احسان کر رہا ہے ۔ حالانکہ اس کے انداز سے واضح ہوتا ہے کہ وہ راز مجھ سے نہیں کہا جا رہا بلکہ صرف کہا جا رہا ہے ۔

یقین جانئے مجھے کسی وہ ۔۔۔۔۔ سے سابقہ پڑنے کا شوق نہیں ہے ۔ اور نہ کبھی تھا ۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ خوش قسمتی سے زندگی کی پچیس منزلیں طے کر لینے کے باوجود مجھے کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا ۔ جسے یا تو میں راز سمجھ کر چھپا سکوں یا کسی محفل میں فاتحانہ انداز سے سنا سکوں ۔ جبھی تو مجھے شبہ پڑتا ہے کہ بیشتر "وہ" ۔۔۔۔۔ کے قصے جو مجھے یا میری موجودگی میں سنائے گئے ہیں ۔ محض قصے ہیں ۔ جنہیں نوجوانوں نے فرصت

کے اوقات میں لوگوں کی تفریح یا اپنی خوشی یا "دیکھا ہم وہ ہیں جو ایسی محفلوں سے نکالے گئے ہیں" کے لئے تراش لئے ہیں ۔ کئی بار میرے جی میں آتا ہے کہ میں کوئی دلچسپ قصہ گھڑ لوں جسے بوقت ضرورت سنایا جا سکے ۔ تاکہ لوگ مجھے اس قدر پیر نگ نہ سمجھیں ۔ آپ نے دیکھا ہو گا ہر محفل میں کوئی نہ کوئی صاحب ایک نہ ایک وہ ۔۔۔۔۔ کے متعلق کوئی کارنامہ اس انداز سے سنانا شروع کر دیتے ہیں گویا سنانا چاہتے نہ ہوں ۔ مگر دوستی کا حق ادا کرنے کی خاطر مجبور ہوں اور قصے کے اختتام پر کوئی اور صاحب دل پر ہاتھ رکھ کے مبہم سی آہ بھر کر کہتے ہیں ۔ "اپنے نصیب ہی ایسے ہیں" ۔ اور پھر آنکھیں چمکا کو بول اٹھتے ہیں ۔ "بالکل ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا" ۔ زیادہ سنجیدہ لوگ آہ بھر کر حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر چپ ہو جاتے ہیں گویا دل پر صبر کی سل رکھے بیٹھے ہیں ۔ ایسے ہر موقعہ پر میں پختہ ارادہ کر لیتا ہوں کہ اپنی اولین فرصت میں کوئی ایسا قصہ جوڑوں کا جو مزے لے لے کر سنایا جا سکے ۔

وہ اصحاب جنہیں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکتا۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا خیال غلط ہے کیونکہ اگر ان کا اندازہ ٹھیک ہوتا تو بھلا امین جو مجھ سے کہیں کالے رنگ کا ہے اور سلیم جس کا قد مجھ سے پورے دو انچ چھوٹا ہے ۔ انہیں ایسے واقعات کیسے پیش آتے یقین کیجئے اس کمبخت وہ ۔۔۔۔۔ کی پسند کسی اصول پر مبنی نہیں ۔

مجھے اس بات کا گلہ نہیں بلکہ خوشی ہے کہ مجھ پر کسی وہ کی نگاہِ کرم نہیں ہوئی مگر اس بات کی شکایت ضرور ہے کہ ہر شخص جس کے سر پر ٹوپی رکھی جا سکتی ہے مجھے اپنا رازداں بنانے پر تل جاتا ہے ۔ حالانکہ مجھے رازدانی کے فرائض سے بیحد نفرت ہے ۔ جب کوئی صاحب اپنا قصہ سناتے ہیں تو مجھے بیحد غصہ آتا ہے لیکن ان کا اضطراب اور بیچارگی دیکھ کر دل میں ترس پیدا ہو جاتا ہے اور میں بڑے غور سے ان کی بات سننے پر مجبور ہو جاتا ہوں ۔ اسے میری کمزوری سمجھ لیجئے یا شرافت' میری حماقت کی انتہا یہ ہے کہ ازراہِ ہمدردی میں ہزار تکالیف جھیل کر بھی اُن کی مدد کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں ۔

شاید آپ کو کبھی عام رازداں ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا ۔ ورنہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ ہر وہ ۔۔۔۔۔ دنیا کی حسین ترین خاتون ہوتی ہے ۔ اور اتنی بے عیب کہ عام فانی شریف مرد پر قطعی حرام ہو جائے ۔

طاہر مجھ سے اپنی تازہ وہ ۔۔۔۔۔ کا قصہ بیان کر رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ دور کوئی پرانا دقیانوسی ریکارڈ بج رہا ہے ۔ اگرچہ طاہر نے اپنا قصہ "بھئی حد ہو گئی" سے شروع کیا تھا ۔ مگر قصے کا لب لباب یعنی وہ حد ہو گئی تھی یہ تھا کہ طاہر کو کسی گوری چٹی لڑکی نے سلام کیا تھا ۔ میرا مطلب ہے ۔ اُس کے ایک تفریحی سلام کے جواب میں چوبیس گز کے فاصلے سے بہانے بہانے اشاروں کی مدد سے ادا کیا گیا تھا ۔ گوری نے اپنا ہاتھ زور سے ماتھے پر دے مارا تھا اور پھر ہنس کر بھاگ گئی تھی ۔ ویسے حد ضرور ہو گئی تھی ایک الھڑ لڑکی کے ماتھے پر ہاتھ مارنے پر ایک بی اے کا طالب علم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا ۔

عین اُس وقت جب ہم دونوں کھڑکی میں کھڑے تھے وہ اپنے کوٹھے پر آ گئی ۔ طاہر نے فوراً مجھے دھکا دے کر کھڑکی کی اوٹ میں کر دیا ۔ "کہیں اُس نے دیکھ لیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا" ۔ اُس نے معذرت کے طور پر کہا ۔ پھر اطمینان سے کھڑکی میں کھڑا ہو کر بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ اور جلد ہی میری موجودگی سے بے خبر ہو گیا ۔ میں ایک کہنہ مشق رازداں ہوں اس لئے خوب جانتا ہوں کہ "تیمم برخاست" کب ہوتا ہے ۔ چنانچہ میں نیچے اُتر آیا ۔

پھر یہ حد ہوئی کہ کوٹھے پر سے ایک کالا رومال دکھایا گیا جس پر سنہری تاگے سے موٹے حروف میں "فارگٹ می ناٹ" لکھا ہوا تھا ۔ اور پھر روز ایک نہ ایک حد ہونے لگی ہر حد ہونے پر یا تو مجھ سے داد طلب کی جاتی اور یا مشورہ لیا جاتا ۔

ان مفید مشوروں کے صلے میں طاہر نے مجھے اپنی وہ ۔۔۔۔۔ کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ مجھے کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا کر دیا گیا اور وہ خود کھڑکی میں کھڑا ہو کر اشارے کرنے لگا ۔ پہلے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھے ۔ پھر انہیں میری طرف بڑھایا اور پھر یوں ان کا دائرہ سا بنایا گویا کسی سے بغل گیر

ہو رہے ہوں ۔ اس کے بعد مجھے پکڑ کر کھڑکی میں اپنے پاس کھڑا کر لیا گیا ۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا ۔ ایک گوری چٹی الہڑ لڑکی ہنس رہی تھی ۔ مجھے دیکھ کر اُس نے لپک کر اپنی کھڑکی بند کر لی اس پر "بھئی حد ہو گئی" طاہر چلایا ۔

اُسی شام جب لاج کے سب لڑکے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ایک لڑکا کوٹھے پر چڑھ آیا ۔ جہاں میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہنے لگا ۔ "جی وہ کہاں ہیں ۔ مجھے ان سے ملنا ہے" ۔ وہ کون ۔" میں نے پوچھا "وہ ۔۔۔۔۔" وہ بولا ۔ "وہ اونچے لمبے سے نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والے ۔" میں سمجھ گیا کہ اس کا مطلب طاہر سے ہے ۔ ضرور اُسے ان لڑکیوں نے بھیجا ہو گا ۔ "کیا کہنا ہے تمہیں اُن سے" "جی ایک بات ہے انہیں سے کہنا ہے ۔" "واہ" میں نے ازراہ مذاق کہا ۔ ہم ہی تو ہیں وہ ۔۔۔۔۔۔ غور سے دیکھو تو پتہ چلے نا تمہیں" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔

نہ جانے کیوں مجھے شرارت سوجھی میں نے رازدارانہ انداز سے کہا ۔ دیکھو لڑکے ہمیں معلوم ہے تم کہاں سے آئے ہو ۔ تم اُس مکان سے آئے ہو نا جس کی کھڑکیاں نیلی ہیں اور تمہیں اُسی نے بھیجا ہے نا ۔ جس نے آج نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی اب آیا یقین تمہیں ۔ اب بتاؤ کہ تم کیا پیغام لائے ہو ۔ ایک ساعت کے لئے وہ ہچکچایا پھر مسکرا کر خاموش ہو گیا ۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کچھ نہ بتائے گا ۔ اس لئے جب وہ جانے لگا تو میں نے کہا ۔ "ہاں ہاں بے شک پوچھ آؤ اُن سے ۔ ہاں ہاں" ۔

طاہر واپس آیا تو اُس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ ظاہر تھا کہ وہ لڑکا اس سے مل چکا تھا ۔ "امجد میرے یار حد ہو گئی ۔ اوپر چلو نا" ۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے بولا چلو نا ۔ کوٹھے پر جا کر اُس نے میرے سامنے رقعہ رکھ دیا ۔ لکھا تھا ۔ "واہ صاحب واہ آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے ۔ یہاں کوئی نمائش لگی ہے کہ ہر راہ چلتے کو دکھلاتے پھرتے ہو ۔ نہ جانے وہ کون تھا کالا سا جسے آج آپ دکھا رہے تھے ہمیں ، لاحول ولا قوۃ ۔"

اگلے روز ایک اور رقعہ آ پہنچا ۔

"معلوم ہوتا ہے وہ آپ کے ٹھگنے دوست کالے ہی نہیں بلکہ بہروپئے

بھی ہیں کل ہمارے نوکر سے انہوں نے کیا کیا کچھ کہا ۔ ذرا پوچھئے تو اُن سے معلوم ہوتا ہے ۔ اُنہیں کوئی اپنا کام کاج نہیں ہے ۔ جبھی خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کے شوقین ہیں ۔ ہماری طرف سے ان کی خدمت میں یہ ملفوف آئینہ بطور تحفہ پیش کر دیجئے !

لفافے میں ایک آنے والا آئینہ ملفوف تھا ۔ "بھئی حد ہو گئی" ۔ طاہر چلایا۔" نفسِ مضمون میں ہماری تو گنجائش ہی نہیں ۔ حد ہو گئی یار" ۔

ریحانہ بلا کی لکھنے والی تھی اُس کے خطوط معمولی قسم کے نہ تھے ۔ سرنامہ اور خطاب لکھنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی اول سے آخر تک دیکھ لو کیا مجال جو کوئی محبت بھرا لفظ خط میں مل جائے اگرچہ خط میں بین السطور اَن کہی محبت کو چھپانے کی کوشش نمایاں ہوتی ادھر طاہر کے حصے کی قوتِ اظہار تمام تر اس کی نیلی چھلکتی ہوئی آنکھوں ، بھُورے بالوں اور متناسب خدوخال میں کھپ گئی تھی ۔ اُسے خط و کتابت سے چنداں دلچسپی نہ تھی طاہر صاحب کا بہترین اور واحد خط جو اُنہوں نے دنیا بھر کی عورتوں کے نام لکھ رکھا تھا اُن کی نیلی آنکھیں ، بھورے بال اور خوبصورت خدوخال کی صورت میں واضح تھا ۔ جبھی تو وہ اس بات کے لئے بیقرار تھے کہ اُس شاہ پارہ کو لے کر ریحانہ کے پاس جائیں اسی لئے تو ریحانہ کے خطوط کا جواب بھی مجھے لکھنا پڑتا تھا ۔ جسے وہ نقل کر کے اپنی طرف سے بھیج دیتے تھے ۔ خط میں ملاقات کی بات تو میں نے چلا دی ۔ لیکن جواب ملا کہ ہمیں طاہر صاحب سے دلچسپی ہے ملاقات سے نہیں ۔ اس جواب نے مجھ پر بے حد اثر کیا ۔ خوب لڑکی ہے میں نے سوچا ۔ اس سے پہلے بھی اُس کی تحریر دیکھ کر میں اس کا معترف تھا اگرچہ ابتدا میں میرا خیال تھا بیچاری نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں کے جال میں پھنس گئی ہے ۔ بھئی واہ طاہر ہنسنے لگا بڑی تیز ہے یار پھر ۔ آہ بھر کر بولا اب کر،س کیا ۔ میں نے کہا بھائی یہاں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا ۔" "سیدھی سے نکلے یا ٹیڑھی سے مطلب تو یہ ہے کہ گھی نکل آئے اُس نے سر کھجلاتے ہوئے بے پرواہی سے کہا ۔" اچھا"میں نے کہا"میں سوچوں گا"طاہر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "خدا کے لئے امجد وہ گڑگڑانے لگا سوچو وچو نہیں ۔ بس ایک بار ملا دو ۔ ایک بار!" وہ میری منتیں کرنے لگا ۔

سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ریحانہ کو اپنی طرف سے خط لکھوں محبت کی باتیں تو اس پر کچھ زیادہ اثر نہ رکھتی تھیں شاید احمقانہ اناپ شناپ سن کر متاثر ہو جائے اور اس کے دل میں خیال پیدا ہو کہ دیکھیں تو کالا کلوٹا کون ہے ۔ تو جناب میں نے اپنی طرف سے اُسے ایک خط لکھا ۔

"گوری ۔ کیا یہ بے انصافی نہیں کہ کسی اچھے خاصے شریف آدمی کو دیکھے بغیر کالا ، ٹھنگنا اور بہروپیا قرار دیا جائے اُس پر لاحول بھیجا جائے ہم ایک بار گوری کو اس بات کا موقعہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی غلط فہمی دُور کر لے یعنی ہمیں قریب سے دیکھے تاکہ اُسے اپنی گذشتہ غلطی پر صدق دل سے توبہ کرنے کا موقعہ ملے ۔۔۔۔۔۔"

ان سطور نے اس کی دلچسپی کو گدگدایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے ایک بجے وہ ہم سے ملی ۔ اس وقت وہ اپنے مکان کے نچلے کمرے میں آگئی تھی جس کی ایک سلاخ مار کھڑکی گلی میں کھلتی تھی ۔ ملاقات سے پہلے طاہر کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا ۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتا ۔ امجد کیا واقعی وہ ہمیں ملے گی ۔ کہیں بنا تو نہیں رہی ۔ یعنی میں اس سے ملوں گا ۔ بھئی حد ہو گئی ۔ لیکن جب وہ میرے ساتھ کھڑکی تک پہنچا تو اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا ۔ اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی ۔ میں نے اُسے اس حالت میں دیکھا تو لگا اناپ شناپ بکنے اور وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہنستی رہی ۔ طاہر نے مجھے کہنی ماری اور مدھم آواز میں کہنے لگا "بھئی واہ حد ہو گئی یہ سلاخیں ۔ ان سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہو کر ملنے کا فائدہ ۔۔۔۔۔ " اس پر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔ اور بات کاٹ کر بولی "سلاخوں کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں یہ ؟" "انہیں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہونا پسند نہیں ہے ۔" میں نے ہنس کر کہا ۔ "اوہ ۔" وہ مسکرائی ۔ "لیکن مجرم کو سلاخوں کے پیچھے ہی کھڑا ہونا چاہیئے" ۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ۔ آپ بھی حد ہیں امجد صاحب ، طاہر صاحب کے پاس رہنا اور پھر کالا اور ٹھگنا نظر آنے سے پرہیز ۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔" "بھئی حد ہو گئی" طاہر ہنسا اور ریحانہ نے مسکرا کر کھڑکی بند کر لی ۔

اُن کی چار ایک مختصر ملاقاتیں ہوئی ہوں گی کہ دفعتاً ایک شام کو ریحانہ کا

آخری رقعہ آ پہنچا ۔ طاہر اُسے پڑھ کر ہکا بکا رہ گیا ۔ لکھا تھا ۔

"گھر میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ میرا یہاں رہنا ناممکن ہو چکا ہے اگر آپ آج رات دو بجے مجھے لینے نہ آئے تو ہم کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے ۔"

وہ پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ۔ "امجد میں کیاکروں ۔ ریحانہ کے بغیر زندگی حرام ہو جائے گی ۔ لیکن میری ماں ۔۔۔۔۔ بدنامی !!!"

سارا دن وہ پاگلوں کی طرح پھرتا رہا۔ کبھی اپنے کمرے میں جا بیٹھتا پھر بھاگا بھاگا میرے پاس آتا ۔ امجد اب کیا ہو گا ۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی پھر بھاگ کر کوٹھے پر چڑھ جاتا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر ان کے کوٹھے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ۔ مگر ان کا کوٹھا ویران پڑا دیکھ کر وہ پھر بھاگا بھاگا میرے پاس آتا ۔ نہ جانے آج کیا ہو گیا ہے وہاں تو کوئی بھی نہیں نہ جانے کیا بات ہوئی ہے ۔

شام کو جب میں سیر سے لوٹا تو وہ چپ چاپ میرے کمرے میں بیٹھا تھا اس کی اشک آلود آنکھیں دلی کشمکش کی شاہد تھیں ۔ "میری مدد کرو امجد" اُس نے میری منتیں کرنا شروع کر دیں ۔ "مجھے جانا ہی ہوگا ۔ میں جاؤں گا ۔ لیکن ۔۔۔۔۔ اُف !!"

وہ رات کس قدر بھیانک تھی ۔

گلی ویران پڑی تھی ۔ گلی کی بتی یوں ٹمٹما رہی تھی جیسے کوئی مریض دم توڑ رہا ہو ۔ دور ۔۔۔۔۔ بازار میں کتے رو رہے تھے ۔

اس ویرانی کے باوجود چاروں طرف عجیب و غریب آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ چوں ۔۔۔۔۔ کوئی دروازہ بند ہوتا ۔ خُرررر ۔۔۔۔۔ کسی سوئے ہوئے بڈھے کے خراٹے کی آواز آتی ۔ گلی میں ہوا کا جھونکا آتا اور شلس شلس کرتا ہوا گزر جاتا دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ بجتے ۔ بلّیاں غرّائیں اور کتے روتے ۔ اف وہ رات ۔

طاہر اور میں سہمے ہوئے دیوار کے سائے میں چپ چاپ کھڑے تھے دروازہ بجنے کی ہر آہٹ سن کر ہم چونک اٹھتے ۔ طاہر خاموشی سے میرا ہاتھ دباتا ۔اور مدھم آواز میں کہتا ۔ پھر ۔۔۔۔ وہ خاموش ہو جاتا دو بجے کے قریب دروازہ کھلا ۔ امجد طاہر نے ڈراؤنی آواز میں کہا ۔ اب ۔ اب وہ طاہر کا حلق سوکھ گیا ۔ ریحانہ میں نے جرأت کر کے آہستہ سے آواز دی ۔ چپ وہ بولی ۔ وہ سب جاگ رہے ہیں ۔ جلدی جلدی کرو ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔ ابھی وہ اتنا کہنے پائی تھی کہ اندر ایک کہرام مچ گیا ۔ کوئی بڑھیا باآواز بلند چیخیں مار رہی تھی ۔ کئی ایک بچے چلّا رہے تھے ۔ کھٹ کھٹ دروازے کھل رہے تھے۔ دھپ دھپ ۔ سیڑھیوں میں سے بھاری قدموں کی آوازیں آ رہی تھی ۔

ہم تینوں گلی میں حیران کھڑے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں "حدہوگئی" طاہر کی آواز ڈر سے بیٹھ گئی ۔ دفعتاً چار ایک لمبے تڑنگے جوان دیوانوں کی طرح بھاگتے ہوئے باہر نکلے ۔ ریحانہ کے منہ سے دبی ہوئی چیخ نکلی جسے سن کر طاہر اٹھ بھاگا انہوں نے اسے بھاگتے دیکھا۔ "وہ ہے وہ ہے" وہ چلائے ۔ نہ جانے اس ایک پل میں مجھے کیا ہوا ۔ میرے دل میں ایک جوش پیدا ہوگیا ۔ میں نے محسوس کیا گویا میں ہی اس ڈرامے کا ہیرو تھا جس کا ایک سین وہاں کھیلا جا رہا تھا ۔ اور بھاگنے کی بجائے میں نے بغیر سوچے سمجھے چلانا شروع کر دیا ۔ "میں یہاں ہوں ۔۔۔ ! مجھ سے کہو ۔ میں یہاں ہوں ۔ وہ نہیں ہے میں ہوں ۔ میں ۔"

جوں جوں میں چلّا رہا تھا میری مَیں غبارے کی طرح پھولتی جا رہی تھی ۔ اور میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں پھیل کر سارے جہاں پر چھائے جا رہا ہوں لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک نہ رہ سکا ۔ میری طرف کئی ایک ہاتھ بڑھے اور میں کھڑا یوں اطمینان سے پٹ رہا تھا گویا پٹنا میرا پرانا شغل تھا پھر میں نالی پر گرا ہوا تھا ۔ میری ہڈیاں چلچلا رہی تھیں ۔ ایک گورا چٹا چہرہ دہلیز کے پاس حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ پھر انہوں نے مجھے مرے ہوئے چوہے کی طرح اٹھا لیا اور گھسیٹ کر اندر لے گئے ۔

"تم چور ہو" ۔ ایک نے کہا ۔ "یہاں چوری کرنے آئے تھے" ۔

"ہاں"۔ میں نے چلّا کر کہا ۔

"سالے کو پولیس کے حوالے کر دو ۔"

"کوئی بدمعاش ہے ۔ دس نمبر بدمعاش ۔"

میرے ارد گرد ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی ۔ گھر کی عورتیں تکے منہ سامنے کھڑی تھیں اور ریحانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت نہ رہی ہو اس کی آنکھیں صرف اِس لئے کھلی تھیں کہ وہ بند نہ ہو سکتی تھیں ۔

پھر ایک بزرگ نے تڑاخ سے میرے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا اور پیشتر اس کے کہ میں لڑکھڑاتا ریحانہ نے ایک چیخ مار دی اور بے ہوش ہو گئی ۔ اس بات پر انہیں اپنی پڑ گئی اور کسی نے مجھے دو ایک دھکیاں اور جھڑکیاں دے کر باہر نکال دیا ۔

میں دس دن کی چھٹی لے کر گھر چلا آیا ۔ جہاں اکثر بیٹھے بٹھائے مجھے اس رات کے واقعات پر رونے کی بجائے ہنسی آ جاتی تھی گویا اُس رات کا واقعہ ایک دلچسپ کارنامہ تھا ۔ نہ جانے کیاہوا تھا مجھے اس رات؟ میں یوں محسوس کرتا ہوں گویا اس رات میں الہ دین تھا اور مجھے کوئی طلسماتی چراغ ہاتھ لگ گیا تھا ۔

مجھے گاؤں آئے بہ مشکل آٹھ دن ہوئے ہوں گے کہ لاج کے ایک دوست نے مجھے تار سے بلا بھیجا ۔ لکھا تھا ۔ "فوراً چلے آؤ ۔ بیحد ضروری کام ہے ۔"

واپسی پر معلوم ہوا کہ طاہر لاج کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکا ہے اور دماغی امراض کے اسپتال کا ڈاکٹر مجھ سے ملنے کا خواہاں ہے ۔ اُس کے کہنے پر مجھے وہ تار دیا گیا تھا ۔ پاگل خانے کا ڈاکٹر! مجھ سے ملنا چاہے ------ تعجب کی بات تھی ۔

ڈاکٹر سے ملنے پر معلوم ہوا کہ ریحانہ اُسی رات سے بیمار تھی اور اسپتال میں اُس کے زیر علاج تھی ۔ ڈاکٹر کو واقعات سے مطلع کر دیا گیا تھا ۔ اسی لئے اُس نے مجھے طلب کیا تھا ۔ "نوجوان" ۔ وہ مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہنے لگا ۔

"تم جانتے ہو ریحانہ بیمار ہے ۔ اُسی رات سے اُس کا ذہنی توازن تباہ ہو چکا ہے ۔ شاید تمہاری مدد کے بغیر وہ اچھی نہ ہو سکے ۔ اس لئے ہم نے تمہیں تکلیف دی ہے ۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے" ۔

ڈاکٹر کی بات سن کر میں حیران رہ گیا ۔ "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب میں چلایا وہ جوان میں نہیں ہوں ۔"

کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں ۔" ڈاکٹر بامعنی انداز سے مسکرانے لگا۔ محبت کوئی بری چیز نہیں ۔ قطعی نہیں ۔ ہر نوجوان کو محبت کرنے کا حق ہے" ۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔

"گھبراؤ نہیں" وہ مسکرایا ۔ "تم میرے دوست ہو ۔"

اس وقت تو میں خاموش ہو رہا لیکن اسپتال پہنچ کر موقعہ پا کر میں نے ڈاکٹر کو تمام واقعہ سنا دیا ۔

واقعہ سن کر ڈاکٹر حیران رہ گیا ۔ "عجیب بات ہے" ۔ وہ بولا ۔ "وہ لوگ تو تمہیں ہی ریحانہ کا عاشق سمجھتے ہیں ۔ خیر ۔ خیر" وہ اپنے آپ بڑبڑاتا رہا ۔ "تو وہ نوجوان کوئی اور ہے۔ بہرحال تم ایک دلچسپ جوان ہو مسٹر امجد ۔ بے حد دلچسپ مگر میرا خیال ہے تم اُس جوان کو یہاں بلا سکو گے ۔ اس سلسلے میں ہماری مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔" "ہاں ڈاکٹر صاحب" میں نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی "میں ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد کروں گا ۔"

اگلے روز ہی میں نے طاہر کو ڈھونڈ نکالا ۔ "بھئی حد ہو گئی ۔" اُس نے مجھے دیکھ کر کہا ۔ "ہاں جبھی تو تجھے اسپتال چلنا ہو گا ۔ " میں نے اس سے کہا اور پھر سارا واقعہ سنا دیا ۔

ڈاکٹر نے غور سے طاہر کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر بولا ۔ "اچھا ہوا تم آ گئے ۔ مسٹر طاہر تم نے واقعات تو سن ہی لئے ہوں گے ۔ لڑکی کے دل پر گہرا اثر ہوا ہے اور اسی رات سے وہ نہ بات کرتی ہے نہ کسی کو پہچانتی ہے ۔ ہمارا خیال ہے تمہیں دیکھ کر شاید اس کا ذہنی جمود ٹوٹ جائے اور دماغی توازن بحال

ہوجائے ۔ لیکن معاملہ بیحد نازک ہے ۔ اگر معمولی سی بے احتیاطی بھی ہوئی تو شاید وہ ذہنی طور پر کبھی ٹھیک نہ ہو سکے ۔"

ڈاکٹر نے طاہر کو کئی ایک ہدایات دیں اور پھر ریحانہ کے کمرے میں ایک کرسی پر بٹھا دیا ۔ ریحانہ نے ایک دو مرتبہ سرسری نگاہ سے اس کی طرف دیکھا بھی لیکن اس کی آنکھیں ویسی ہی پتھرائی ہوئی رہیں اور انداز میں وہی بے خبری ۔ اس روز دو تین مرتبہ طاہر کو وہاں بٹھایا گیا ۔ لیکن ریحانہ پر کوئی اثر نہ ہوا یہ بات دیکھ کر ڈاکٹر پریشان ہوتا چلا گیا ۔ "تعجب ہے" ۔ وہ بڑبڑایا اور پھر بڑی دیر تک ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈال کر ٹہلتا رہا ۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے ۔ اکثر چلتے چلتے وہ آپ ہی بڑبڑانے لگا ۔ "عجیب بات ہے" ۔ پھر گہری سوچ میں کھو جاتا ۔ دفعتاً وہ رکا اور ریحانہ کے کمرے کی کھڑکی کھلی دیکھ کر گھبرا گیا ۔ "مسٹر وہ کھڑکی بند کر دو ذرا جو مریضہ کے کمرے میں کھلتی ہے ۔"

میں سمجھا شاید ڈاکٹر نے مجھے کھڑکی بند کرنے کو کہا ہے اور پہلی مرتبہ دھڑکتے ہوئے دل سے میں ریحانہ کے کمرے میں داخل ہو گیا ۔ اس کا منہ سوجا ہوا آنکھیں پتھرائی ہوئی اور بھویں کھنچی ہوئی تھیں ۔ اُس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا معاً اُس کے چہرے میں ایک تبدیلی سی ہوئی

"تم" ۔ وہ بڑبڑائی ۔ "طاہر صاحب !! طاہر صاحب !!" دفعتاً وہ جوش میں چیخی اور اٹھ کر میری طرف بھاگی ـــــ پھر اُس نے ایک چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گئی ۔

ڈاکٹر اور طاہر دروازے میں کھڑے اندر جھانک رہے تھے ۔ ڈاکٹر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا ۔ پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا ۔

"ہوں ـــــ اب اچھی ہو جائے گی کوئی خطرہ نہیں اب" ۔
ڈاکٹر نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ "مسٹر طاہر ـــــ"
"نہیں نہیں ۔ طاہر نہیں میرا نام امجد ہے صاحب" ۔

"جو کچھ بھی ہے تمہارا نام مسٹر۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ البتہ آپ۔"
اُس نے طاہر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ اب جا سکتے ہیں مسٹر امجد"۔

"جی میرا نام طاہر ہے۔" وہ بولا۔

"خیر ۔۔۔۔۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔ ہم آپ کے بہت شکر گذار ہیں۔" وہ زبردستی طاہر سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"بھئی حد ہو گئی۔" طاہر بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔

..............○..............

جب اور اب

رات کے نو بجے تھے۔سلیمہ کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی ۔ باورچی خانے میں ان کی ملازمہ بانو برتن مانجھ رہی تھی ۔ ملحقہ دیوان خانے میں اس کے میاں عبدالمجید کچھ گنگنا رہے تھے ۔ ان کا گنگنانا سلیمہ کو اور بھی اداس کر رہا تھا ۔ باہر ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی ۔ دور کوئی انجن ہونکتا ہوا اپنا بوجھ کھینچتے جا رہا تھا۔

وہ بیکار بیٹھنے سے ڈرتی تھی ۔ اس کے دل میں بار بار خیال آتا "اب میں کیا کروں ؟" ـــــ سارا دن وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ـــــ مگر آخر کار گھر کے کام بھی ختم ہو جاتے اور پھر ـــــ پھر وہ محسوس کرتی کہ زندگی اکتا دینے والا تسلسل ہے ۔ ایک دھندلا بے معنی پھیلاؤ ۔

ملحقہ دیوان خانے سے مجید کی آواز "بانو ! بانو !! ـــــ میز پر "شیو" کا سامان رکھ دو" ـــــ

"اوہ"!! سلیمہ کا دل بیٹھ گیا ۔ آج پھر!! وہ بڑبڑائی اور پھر نڈھال ہو کر لیٹ گئی ۔ میز کا چراغ جھلملا کر مدھم پڑ گیا اس کے گرد وہ دھندلی دیوارں سی گھیرا ڈال کر ناچنے لگیں ۔ دفعتاً زور سے کوئی گریموں فون چیخنے لگا جیسے اُسے چڑا رہا ہو ۔ پیا ملن کو جانا ـــــ ہے ـــــ اے اے اے

سلیمہ اور مجید کی شادی کو یہی دو سال ہوئے ہوں گے ۔ پہلا سال کتنی جلدی بیت گیا تھا ۔ اور اب ـــــ اب وہ اس گذرے ہوئے سال کی دھندلی مگر زندگی بخش یاد کی گود میں جیتی تھی اس امید پر کہ شاید وہ گزرا ہوا زمانہ پھر لوٹ آئے ۔ اور مجید پھر اس کا اپنا مجید ہو جائے ـــــ اسے سمی کہنے والا مجید ۔ اور اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے ـــــ "سمی !! ان

آنکھوں میں سرمے کی گنجائش نہیں ۔ پگلی یہ آنکھیں سنگار سے بے نیاز ہیں ۔ مجھے بناوٹ سے نفرت ہے ستّی !"

مگر اب مجید وہ مجید نہیں تھا ۔ اس لئے سلیمہ کی زندگی میں مجید کی گذشتہ بے تکلفیوں کی یاد کے سوائے کچھ بھی نہ تھا ۔ اور وہ صبح و شام ان گذرے ہوئے لمحات میں ازسرِ نو جیتی اور جب مجید رات کے نو بجے حجامت کا سامان مانگتا اور باہر جانے کی خوشی میں گنگناتا تو سلیمہ کے سپنوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ۔۔۔۔ "اب" اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا اور اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ۔۔۔۔ اس "جب" کے پہلو میں یہ "اب کیسا" بھیانک دکھائی دیتا تھا ۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے لمپ جھلملا کر مدھم ہو جاتا اور کمرے کی دیواریں گھومتیں اور دور کوئی چکی ۔ "اب ۔ اب" چیختی جیسے اسے چڑا رہی ہو !

اب مجید ساری ساری رات گھر سے باہر رہتا تھا ۔ وہ جانتی تھی کہ گھر میں اس کا جی نہیں لگتا ۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ راتیں کہاں بسر کرتا ہے ۔ دو ایک مرتبہ اس نے مجید سے پوچھنے کی جرأت بھی کی تھی ۔ مگر مجید "تم فضول شک کرتی ہو !" کہہ کر ٹال دیتا یا اگر وہ اصرار کرتی تو وہ چڑ جاتا ۔ اُسے جھڑک کر بٹھا دیتا ۔ ویسے تو مجید نے اپنی زبانی یہ راز اُسے کبھی نہ بتایا تھا ۔ کہ وہ راتیں کہاں گذارتا ہے ۔ مگر وہ "اَن کہا راز" کسی نہ کسی شکل میں اس کے انداز سے ظاہر ہو جاتا ۔ مانا کہ سلیمہ مجید کے برتاؤ کی تفصیلات کا تجزیہ نہ کر سکتی تھی ۔ لیکن جب مجید کو روز ایک نئی دھن اور ایک نیا گیت گنگناتے ہوئے سنتی تو اس کے دل میں شکوک بھنبھنانے لگتے "وہ محبت خریدنے جاتے ہیں ۔ جہاں محبت بکتی ہے ۔ بکتی ہے"۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پاؤڈر سے تھپے ہوئے چہرے ۔ رنگے ہوئے ہونٹ ، مٹکتی ہوئی آنکھیں آجاتیں ۔ اور اس کا دل ڈوبنے لگتا ۔ پھر دور ۔۔۔۔ دُور کسی دھندلی خوابوں کی بستی سے مدھم آواز سنائی دیتی ۔ "ستّی ! ان آنکھوں میں سرمے کی گنجائش نہیں ۔ یہ آنکھیں سنگار سے بے نیاز ہیں مجھے بناوٹ سے نفرت ہے"۔

اس وقت سلیمہ محسوس کرتی کہ زندگی محض ایک خواب ہے اور کسی چیز

کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا ۔ کہ وہ کیا ہے اور ابھی کیا سے کیا ہو جائے گی ۔ اگر اس وقت مجید سمیٰ ! سمیٰ !! کہتا ہوا اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ۔ تو اسے تعجب نہ ہوتا ۔ شاید وہ اس امید پر جیتی تھی کہ کسی روز مجید پھر اس کا اپنا مجید ہو جائے گا ۔ اور وہ دھندلے دھندلے خواب ایک دفعہ پھر حقیقت بن کر اس کے سامنے آموجود ہونگے ۔ اور "اب" اور "جب" میں کوئی فرق نہ رہے گا ۔

دیوان خانے سے مجید کی آواز آئی ۔ "بانو ــــــ بانو"

'جی آئی' باورچی خانے سے بانو نے جواب دیا ۔

سلیمہ نے بانو کی لوچ دار آواز سنی ۔ اس کے ہونٹ تمسخر سے کھل گئے ۔ وہ سوچنے لگی ۔ اُن سے بات کرتے ہوئے بانو کی آواز میں کتنا لوچ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور مجھ سے یوں ۔ 'اچھا بی بی'۔ جیسے اکتائی ہوئی ہو ۔

دیوان خانے سے دبی دبی آوازیں آرہی تھیں ۔ مجید بانو کو کہہ رہا تھا ــــــ گھر جانے سے پہلے میرے پلنگ پر مسہری لگا دینا ــــــ تالا کہاں ہے ــــــ اچھا میں خود ڈھونڈوں گا ۔ اگر بی بی پوچھے تو ــــــ کہہ دینا یہیں ــــــ کہہ دینا سینما گئے ہیں ۔ بانو ــــــ آج تو" ــــــ بی بی جی جاگتی ہیں ــــــ!'

آوازیں مدھم ہوگئیں ــــــ گھس پھس ہونے لگی ــــــ کچھ چُرمر ہو رہی تھی جیسے کپڑے ایک دوسرے سے گھس رہے ہوں ــــــ 'مُچ ــــــ مُچ ــــــ مچ'

سلیمہ کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا ۔ اس نے پلنگ کے چوکھٹے کو زور سے پکڑ لیا گویا اس کا سہارا لے رہی ہو ۔ اب وہ خوب سمجھتی تھی کہ مجید نے پرانی ملازمہ کو کیوں نکال دیا تھا ۔ اور بانو کو نوکر رکھنے کے لئے اتنا اصرار کیوں کیا تھا ۔ بانو ابھی جوان تھی نا ۔ اور اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ باتیں بھی کر سکتی تھیں ۔ بانو کو منہ سے بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ مجید کے کمرے میں جاتی تو اس کی آواز تک نہ آتی ۔ ہاں کبھی کبھار اُسے باآواز بلند بات کہنی ہی پڑتی

تاکہ تمام گھر میں سنی جا سکے اور بی بی یہ جان کر کہ بابو صاحب اسے صرف کام کاج کے متعلق ہدایات دے رہے ہیں اور کچھ نہیں ۔ وہ نمایشی آواز بھڑوں کی طرح اُسے کاٹتی سلیمہ کی آنکھوں تلے اندھیرا آجاتا ۔ چاہے وہ ساری رات باہر رہتے ۔۔۔۔۔ مگر گھر کی ملازمہ سے ایسی بات ۔۔۔۔۔ یہ سلیمہ کے لئے ناقابلِ برداشت تھا ۔

باہر صحن میں بیری کی شاخیں شائیں شائیں کر رہی تھیں آسمان پر پیلا سا چاند چھوٹے چھوٹے سیاہ بادلوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا ۔۔۔۔ دور کوئی چکی ہونک رہی تھی ۔ اور دیوار کی گھڑی کی دھک دھک اس کے دل میں گونج رہی تھی ۔

نہ جانے سلیمہ کتنی دیر یوں ہی چپ چاپ پڑی رہی ۔ پھر بانو کے پاؤں کی چاپ سن کر چونک پڑی ۔ بانو اندر داخل ہوئی کہنے لگی ۔ "لو بی بی ! اب میں جاتی ہوں آپ ڈیوڑھی کی کُنڈی لگا لیجئے ۔ بابو جی تو سینما گئے ہیں ۔ دیوان خانے کے دروازے کے باہر تالا لگا گئے ہیں ۔۔۔۔۔ آپ ہی آجائیں گے"۔

ڈیوڑھی کی کُنڈی لگا کر سلیمہ دیوان خانے میں آبیٹھی ۔ دیواروں پر کئی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں ۔ متبسم ہونٹ ، شوخ نگاہیں ۔ اسے ان تصویروں سے کس قدر نفرت تھی ۔۔۔۔۔ اس کی نگاہ اس فوٹو پر جا پڑی جس میں مجید اور حمید اکھٹے کھڑے تھے۔حمید مجید کا بھائی تھا جو عمر میں اس سے دو سال چھوٹا تھا ۔ یہ تصویر حمید کی شادی پر کھنچوائی گئی تھی ۔ جسے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا ۔ خدا جانے حمید اور انوری کی آپس میں کیسی گزرتی ہوگئی ۔ اس کے دل میں خیال آیا اور وہ مسکرانے لگی پھر اسے حمید کی شادی کا دن یاد آگیا ۔۔۔۔۔ جب شام کے دلچسپ دھندلکے میں اماں' مجید اور وہ کھڑے تھے اور اندھیرے میں کسی شوخ ہاتھ نے بڑھ کر اس کے شانوں پر چٹکی بھر لی تھی اور اس کے منہ سے 'اُف' نکل گیا تھا ۔ ماں نے کہا تھا ۔ یہ کیا بیہودگی ہے مجید اور انہوں نے کس معصومیت سے جواب دیا ۔ کچھ بھی نہیں اماں اسے تو تفریحاً اُف اُف کرنے کی عادت ہے اور یہ کہتے ہوئے سلیمہ کے ہاتھ پر ناخن چبھو دیا تھا ۔

سلیمہ کے ہاتھ پر لذیذ سا درد ہونے لگا ۔ وہ تصویر اور دھندلے ہوتے گئے ۔ ایک مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے آگیا ۔۔۔۔۔ 'ستّی ! تم یہاں بیٹھی ہو ۔ میری طرف دیکھو ستّی'۔ اور وہ پھر اُس رنگین 'جب' میں کھو گئی ۔

دروازے پر دستک کی آواز سُن کر وہ چونک پڑی ۔ 'جانے کس کا دروازہ ہے' ۔۔۔۔۔ اس نے دل میں سوچا ۔۔۔۔۔ 'کوئی ہوگا ۔۔۔۔۔ ہمارے گھر میں اس وقت کون آئے گا ۔۔۔۔۔ شاید اسی طرح کسی روز وہ لوٹ آئیں ۔ اور مجھ سے پوچھیں ۔ 'ستّی تم ابھی جاگ رہی ہو'۔ وہی دن لوٹ آئیں ۔ اس کے بدن میں لہریں اُٹھنے لگیں ۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی ۔ وہ اُٹھ بیٹھی ۔ کھڑکی کھول کر باہر دیکھا نیچے کوئی دروازے پر کھڑا تھا ۔ خدا جانے کون ہے ۔ اس کے دل میں تشویش پیدا ہوگئی لالٹین اٹھائی اور دروازہ کھولنے کے لئے چل پڑی ۔ کُنڈی کھولی تو لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس نے اپنے سامنے مجید کو کھڑا پایا ۔ جانے ڈر یا خوشی سے اس کے منہ سے دبی ہوئی چیخ نکل گئی ۔ مگر اس کے حلق میں آواز نہیں تھی ۔

"سلام بھابی"۔ نووارد نے کہا ۔

"بھابی" وہ حیران تھی ۔

"میں ہوں بھابی حمید !" نووارد نے کہا ۔ "بھائی کہاں ہیں ؟"

"اوہ" اس نے اپنی غلطی کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی "ہاں وہ باہر گئے ہیں سینما دیکھنے ۔ آؤ ۔۔۔۔۔!" وہ تیزی سے چل پڑی ۔ وہ دونوں دیوان خانے میں جا بیٹھے ۔ حمید کی شکل بالکل ویسی ہی تھی جیسی ایک سال پہلے مجید کی تھی ۔ اب تو مجید کا چہرہ مسلسل شب بیداری کی وجہ سے سوج سا گیا تھا ۔ شائد اسی وجہ سے سلیمہ حمید کے منہ کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے سے اپنی آنکھیں ہٹا نہ سکتی تھی ۔ وہ کھوئی کھوئی بیٹھی رہی ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے ۔

حمید کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی اور وہ کچھ کہہ رہا تھا ۔ کسی

اضطراب کی وجہ سے یا اس لئے کہ خاموشی سے ڈرتا تھا ۔ خدا جانے وہ کیا کہہ رہا تھا ۔ شاید اپنے سفر کا حال سنا رہا تھا یا کیا ۔ سلیمہ اسے دیکھ رہی تھی ۔ ”ہاں بالکل ان کی سی شکل صورت ۔۔۔ وہی ہنسنے کا طریقہ ۔۔۔۔۔ بیٹھا بھی تو اسی طرح ہے ۔۔۔۔۔ آگے کی طرف جھکا ہوا ! ماتھے پر ویسا ہی شکن ہے ۔ جب وہ سوچا کرتے ہیں تو ان کے ماتھے پر ایسا ہی شکن پڑ جایا کرتا ہے اور ان دنوں اگر ایک دو دن کے لئے مجھ سے دور رہنا پڑ جاتا تھا تو آنکھیں سرخ سرخ سی ہو جاتی تھیں ۔

”تم اچھی ہو نا بھابی ۔ بھائی کی ترقی ہوئی“؟ حمید نے پوچھا ۔

سلیمہ چونک پڑی ۔ ”اوہ میں بھی کیسی پاگل ہوں ۔ تم نے کچھ کھایا بھی تو نہ ہوگا“ وہ اٹھ بیٹھی ۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیئے ۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ بھابی!“ حمید چلایا ۔

”نہیں تکلف کی کوئی بات نہیں ۔ تمہارا اپنا گھر ہے“۔ اور وہ باورچی خانے کی طرف چلنے لگی ۔

حمید نے لپک کر سلیمہ کو شانوں سے پکڑ کر کرسی میں بٹھا دیا ۔ ”نہیں بھابی ! میں کھانا وانا کھا چکا ہوں ۔ آپ بالکل فکر نہ کریں مجھے کسی چیز ۔۔۔۔۔“

ان ہاتھوں کے سرسری دباؤ سے سلیمہ کے جسم میں نہ جانے کیا ہونے لگا کمرے کی دیواریں گھوم رہی تھیں ۔ میز پر بتّی ناچ رہی تھی ۔ دیوار پر گھڑی تال دے رہی تھی ۔ باہر ہوا میں بیری کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں ۔۔۔۔۔ بالکل ویسے ہی بازو ۔ اور کتنے بڑے بڑے ہاتھ شانوں پر یہاں سے وہاں تک پھیل گئے تھے ۔ بالکل انہی کی طرح جیسے وہی ہاتھ ہوں ۔

سلیمہ کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہو رہے تھے ۔ حمید بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا ۔ کچھ کہہ رہا ہوگا۔ سلیمہ کو صرف دو ہلتے ہوئے ہونٹ نظر آرہے تھے ۔

”اچھا بھابی ! اب آپ آرام کیجئے میں بھائی کا انتظار کروں گا“۔ حمید

نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

سلیمہ پھر چونکی۔ "اوہ! اچھا! میں پوچھتی ہوں۔ انوری کا کیا حال ہے۔"؟ بصد مشکل اُسے کہنے کیلئے بات سوجھی۔

حمید کے ابرو تن گئے۔ ہونٹ بھنچ گئے۔

"اسے ساتھ کیوں نہ لائے؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"انوری۔ انوری چلی گئی ہے بھابی!" حمید کی آواز میں دبی ہوئی ہچکی سن کر سلیمہ بالکل جاگ پڑی۔

"چلی گئی ہے ـــــ کہاں؟" سلیمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"اوہ بھابی! وہ چلی گئی ہے۔ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے"۔ حمید غصے سے بانہیں ہلاتا ہوا بولا۔

"چھوڑ کر۔" سلیمہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم اس کی بات ہی نہ کرو بھابی!" حمید کا چہرہ تن گیا۔ "جانے دو۔ اچھا ہوا چلی گئی۔ اس قصّے کو ہی چھوڑو۔"

"چھوڑ کر چلی گئی ہے؟" سلیمہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیسے ہو سکتا ہے کیسے؟" ـــــ اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلے جانا یہ بات اسے کبھی نہ سوجھی تھی۔

"اوہ بھابی! یہ سب اماں کی مہربانی ہے۔ اماں نے زبردستی اسے میرے سر تھوپ دیا تھا۔ انوری کو میرے ساتھ بیاہ کرنا پسند نہیں تھا ـــــ اب میں سمجھتا ہوں۔ مجھ سے کتنی بھول ہوئی ـــــ مگر اماں کہتی تھی کوئی بات نہیں شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سمجھ جائے گی میں تو کہتا تھا۔ اماں لڑکی کی مرضی پوچھ لیجئے۔ اماں کہنے لگی۔ لو بھلا کوئی لڑکیوں کی مرضی بھی پوچھتا ہے تم پگلے ہو پگلے"۔ حمید نے زہر خند ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "واقعی میں پگلا تھا۔ بالکل پگلا ـــــ مگر اب کیا ہو سکتا ہے بھابی! خیر اس نے چلے ہی جانا تھا۔ اچھا ہوا، مجھے اپنے پگلے پن کا صلہ مل گیا۔ خیر خیر!"

سلیمہ چپ چاپ بیٹھی حیرانی سے حمید کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ حمید کا اضطراب اسے بیحد مانوس دکھائی دیتا تھا ۔ وہی اضطراب مجید کا سا ۔

"اور بھابی ایک سال وہ میرے پاس رہی ، پورا ایک سال ، اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک سال ایک صدی کے برابر تھا ۔۔۔۔۔۔ خیر حیرانی یہ ہے کہ جب میں دفتر جاتا ۔ تو مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے انوری کی باتیں یاد آتیں ۔ اور بھابی میں دل میں بے حد غصہ محسوس کرتا ۔ اس کی باتیں ہی ایسی تھیں ۔۔۔۔۔ چڑانے والی باتیں ۔ مگر جب میں غصّے سے بھرا ہوا گھر لوٹتا تو اسے دیکھ کر سب غصہ وصہ بھول جاتا ۔ اور ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہ رہتا ۔ اس کی ضد پوری کرنے میں مجھے لطف آتا تھا کیسی حماقت تھی ۔ مگر بھابی ! وہ نہایت ضدّی اور خود غرض عورت تھی ۔ چلو اچھا ہوا چلی گئی ۔ جادوگرنی ۔ میرا تو جی بھی نہیں چاہتا کہ اس کا نام لوں!"

حمید اٹھ بیٹھا ۔ پہلے تو وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیوانہ وار گھومتا رہا ۔ پھر باہر صحن میں نکل گیا ۔ کچھ دیر تک سلیمہ ویسے ہی گُم صم بیٹھی رہی ۔۔۔۔۔!

سامنے کھڑکی میں پیلا چاند جھول رہا تھا ۔ ہوا درختوں کی ٹہنیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی ۔

وہ اٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اس کے دل میں بیتی ہوئی باتیں تازہ ہو رہی تھیں ۔ وہ سوچ رہی تھی :۔

"ہاں بالکل اُسی طرح ۔ ان کی طرح کتنی تیزی سے بات کرتا ہے ۔ انوری تو اندھی تھی جو چھوڑ کر چلی گئی ۔۔۔۔ اچھا ہوا چلی گئی ۔ جان چھٹی ۔۔۔ خدا جانے عورتیں کیسے بھاگ جاتی ہیں!"

اس نے ایک جھرجھری لی ۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا ۔ اندھیرے میں دو ہاتھ آگے بڑھے ۔ سلیمہ نے اپنے شانوں پر دباؤ محسوس کیا ۔ وہ چونک پڑی ۔ مڑ کر دیکھا ۔ حمید باہر صحن میں ٹہل رہا تھا ۔ سلیمہ مسکرا

دی ۔ "میں بھی کیسی پاگل ہوں" یہ کہہ کر اس نے منہ موڑ لیا ۔ بالکل ویسی ہی چال ہے ۔ بالکل اور پھر وہ اپنے خیالات میں کھو گئی ۔

حمید باہر صحن میں ٹہل رہا تھا ۔۔۔۔۔ انوری انوری اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا ۔ اس کی نگاہ اندر سلیمہ پر جا پڑی ۔ ہاں وہ بھی یونہی کھڑکی میں کھڑی رہا کرتی تھی بالکل یونہی دوپٹہ شانوں پر اٹکا ہوا ، چوٹی کمر تک لٹکتی ہوئی ۔۔۔۔۔ خدا جانے اسے کیا خیال آیا ۔ اس نے اوہ کہہ کر منہ دیوار کی طرف موڑ لیا ۔ "میں بھی کیسا پگلا ہوں ۔۔۔۔۔ بھابی کہے گی دیوانہ ہے ۔ باہر دیوانوں کی طرح پھر رہا ہے" یہ سوچ کر وہ اندر چلا گیا ۔۔۔۔۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سلیمہ کے شانوں پر رکھ دیئے ۔ "بھابی!" اس نے مدھم آواز میں کہا ۔

"سمی!" ۔۔۔۔۔ سلیمہ نے کسی کو کہتے سُنا ۔ "وہ آ گئے"۔ سلیمہ کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ۔۔۔۔۔ پاؤں لڑکھڑا گئے ۔

سامنے ستارے ڈگمگا گئے ۔۔۔۔۔ جیسے ایک دوسرے پر گِر رہے ہوں ۔ اس کا سر حمید کی چھاتی پر جا اٹکا ۔۔۔۔۔

حمید نے اپنے جسم پر دباؤ محسوس کیا ۔۔۔۔۔ اس کی چھاتی پر انوری کا سر ٹک گیا ۔۔۔۔۔ ایک خوشبو کا لپٹا آیا ۔۔۔۔۔ انوری کی خوشبو ، وہی نیم وا آنکھیں !

"انوری !" حمید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔

"انوری!" ۔۔۔۔۔ سلیمہ کے دل پر ٹھیس لگی ۔ گویا وہ جاگ پڑی اور کھڑی ہو گئی ۔۔۔۔۔ "تم ۔۔۔۔۔ تم ۔" اس نے حمید کی طرف گھورتے ہوئے کہا ۔۔۔۔۔

…… …… ..○…… . .

چِڑ

"ارے میاں محبّت کی اوٹ میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے ۔ کئی صرف اس لئے محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی میں کھو کر اپنا آپ بُھلا دیں ۔ یا کسی کی بے وفائی کے بہانے غم کھا سکیں ۔ مر جانے کی آرزو کر سکیں ۔ ایسے بھی ہیں جو کسی سے انتقام لینے کے لئے اُسے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں ۔ اکثر تو محبت سے محبت کرتے ہیں محبوب سے نہیں مثلاً تم میرے دوست ہو؟" زاہد نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا "لیکن تم مجھے اس قدر پیارے نہیں ۔ میرا مطلب ہے مجھے دوستی زیادہ پیاری ہے ۔ تم سے زیادہ ۔ بُرا نہ ماننا ویسے بات کر رہا ہوں"۔

اگر میں زاہد کی باتوں کا بُرا مانتا تو یہ کہانی لکھنے کی نوبت نہ آتی ۔ میرا ایمان ہے اس کی باتوں کو ماننا یا بُرا ماننا اپنے آپ سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے وہ تو ایک ایسا کتابی آدمی ہے جو کتاب میں جیتا ہے زندگی سے وہ قطعی بے بہرہ ہے ۔ اتنا بھی نہیں جانتا کہ محبت ایک عجیب سی کیفیت ہے جو وقت اور وجہ سے آزاد ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ پہلی نظر میں محبت ہو جانا ناممکن ہے ۔ خیر چھوڑیئے زاہد کی باتوں کو ۔۔۔۔۔۔ فضول باتیں !!

اس وقت میں اور زاہد دفتر سے آرہے تھے ۔ راہ میں مسٹر جناح کے متعلق بات چھڑ گئی تھی ۔ پھر خدا جانے وہ بولتے بولتے پردے اور محبت تک کیسے پہنچ گیا تھا ۔ نہ جانے وہ کیا کیا بکتا رہا اور میں کیا کیا سوچتا رہا ۔ تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی باتونی آدمی کی باتوں کو شوق تعجب یا توجہ سے نہیں سننا چاہیئے ۔ ورنہ آپ ہمیشہ کے لئے اُس کے تختۂ مشق بن جائیں گے ۔ ہم موڑ پر پہنچ چکے تھے ۔ "اچھا تو میں کھانا وانا کھا کر آؤں گا ۔" اُس نے مجھ

سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اور چلا گیا۔

اُن دنوں اُس کا میرے پاس آنا میرے لئے چنداں خوش گوار نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فلسفہ چھانٹنے کے سوا اور کس لئے آئے گا۔ یہ تھا میرا دوست' راز دان جو میری سُننے کے بجائے اپنی کہنے کا دیوانہ تھا۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

گھر پہنچ کر میں دھم سے کرسی میں جاگرا۔ چائے بنانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میز پر گلدان کے قریب وہ ناول پڑا تھا جو میں نے اُن دنوں پڑھنے کے لئے خریدا تھا۔ "انتقام"۔ کیسا بیہودہ نام ہے۔ سرورق پر کیسا بھدا چہرہ بنا تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں ــــــ۔ دروازے کے قریب ایک بند لفافہ پڑا دیکھ کر میں نے اُٹھ کر وہ لفافہ اُٹھا لیا۔ اور اس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ ہاں وہ خط نزہت کا تھا۔ میری عادت ہے جب میں خط سے سمجھ لوں کہ فلاں شخص کا ہے تو مجھے اسے کھول کر پڑھنے کا چنداں شوق نہیں رہتا۔ یا شاید اس لئے کہ نزہت کے خط میرے لئے ناخوشگوار تھے میں نے کھولے بغیر اُسے میز پر رکھ دیا۔ میں خوب جانتا تھا خط میں کیا لکھا ہے۔ "امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور بس۔ گذشتہ تین سال سے ہفتہ وار وہ مجھے اسی مضمون کا خط لکھتی ہے اور اب تو میں اُس کے خط پڑھ پڑھ کر اکتا گیا ہوں شاید میں چاہتا ہوں کہ اُس کے خط میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوں جن سے یہ ظاہر ہو کہ وہاں بالکل خیریت نہیں یا کم از کم اُسے رات بھر نیند نہیں آتی یا وہ پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ مگر خیریت !! خدا کی قسم جی چاہتا تھا میز پر پڑا ہوا گلدان اُٹھا کر زمین پر دے ماروں۔ لیکن غصے میں بھی میں یہ نہیں بھول سکتا کہ وہ گلدان میں نے چودہ آنے کا خریدا ہے۔ اور چودہ۔ دس جمع چار آنے ہوتے ہیں خدا کی قسم مجھے یہ آرزو ہے کہ میں احمق ہوتا۔ میں عقل سے تنگ آچکا ہوں۔

اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے میں نے کتاب اُٹھا کر میز پر دے ماری۔ "امید جتانے کے لئے ڈیڑھ آنہ ضائع کر دینا۔ کیسی حماقت تھی، فضول دکھلاوا میری خیریت کے متعلق اتنا ہی فکر ہے تو میرے پاس کیوں نہیں آجاتی ضدی

عورت ! وہ مجھے نہیں سمجھتی خدا کی قسم میں بالکل خوش ہوں ۔ ہاں ہاں بل کول۔ کون کہتا ہے میں خوش نہیں ؟"

کتاب کا سرورق پھسل کر زمین پر گر چکا تھا اور زمین سے رگھسر رگھسر کر سَر سر آواز پیدا کر رہا تھا ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ "سراسر" کہہ رہا ہو ۔ اور ورق پر وہ بھدّا چہرہ میرا منہ چڑا رہا ہو ۔ پھر چھت میں بیٹھی ہوئی چڑیا چیخنے لگی ۔ "چڑ چڑ چڑ چڑ"۔ کمبخت نے میرے سر پر گھونسلا بنا رکھا تھا ۔ مجھے اس چڑیا سے نفرت تھی ۔ وہ ہمیشہ بے موقع چیختی ۔ جیسے چھیڑ رہی ہو ۔ اس کے علاوہ اس کے گھونسلے کی وجہ سے میرا گھر اور بھی ویران نظر آتا تھا اور اُس کی چڑ چڑ سے میرے گھر کی ویرانی اور واضح ہوتی رہتی تھی ۔

نزہت کا خط دیکھ کر میں اکثر پہروں گم سم بیٹھ رہتا ہوں ۔ اور میری خموشی میں ایک ہنگامہ چھپا ہوتا ہے ۔ میرا دل کئی ایک حصّوں میں بٹ جاتا ہے اور وہ چھوٹے موٹے حِصّے آپس میں یوں لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے دفعتاً مکھیوں کے چھتّے میں احساسِ رفاقت مفقود ہوگیا ہو ۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے نزہت سے محبت ہے ۔ اور محبت میں جو جو دل پر گذرتی ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں ۔

پانچ سال ہوئے نزہت میری خالہ زاد بہن تھی ۔ اُن دنوں بی ۔ اے پاس کرنے بعد میں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا ۔ اور اسی سلسلہ میں میں اپنی خالہ کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اُن دنوں میں ناول پڑھنے اور سونے میں وقت بسر کرتا تھا آپ جانتے ہیں بیکار نوجوان وقت کاٹنے کے لئے ایک خیالی دنیا قائم کر لیتے ہیں تاکہ اس خیالی دنیا میں جی کر اپنی آرزوئیں پوری کر سکیں ۔ میں بھی پڑے پڑے یہ تصور کر لیتا کہ میں ڈپٹی کمشنر کا سٹینو ہوگیا ہوں ۔ میری ٹائپ ٹک ٹک چل رہی ہے اور تمام دفتر کے لوگ حیرانی سے میری انگلیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ مجھے یہ بات کبھی نہ سُوجھی تھی کہ مجھے دیوار کی گھڑی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے ۔ جو میری خیالی ٹائپ کو چلانے میں مدد دے رہی ہے ۔ یہ ٹائپ کا شغل میں نے شاید اس لئے ایجاد کیا تھا کہ خالہ کے گھر میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ خالو تو اکثر باہر دورے پر رہتے تھے ۔ خالہ صبح و شام مصلّے پر

بیٹھی رہتیں باقی رہی نزہت وہ دن بھر کھانے پکانے میں لگی رہتی۔

خیر کھانے پکانے کی بات تو ٹھیک تھی۔ چونکہ مجھے ایسی لڑکیاں قطعی پسند نہیں، جو ناخن پالش کرنے اور آئینہ دیکھنے میں لگی رہتی ہیں۔ مصیبت یہ تھی کہ نزہت کے چلنے پھرنے اور بات کرنے کا کچھ ایسا انداز تھا کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ غصہ آتا تھا نہ جانے کیوں۔

"تناسب کے لحاظ سے شاید اُس کے نقش خوبصورت ہوں پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ۔ سادہ آنکھیں۔ نوکیلی ناک اور سانولا رنگ۔ مجھے اعضا کے تناسب کی تمیز نہیں۔ میں تو متکلّم اعضا سے متاثر ہوتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ایسے اعضا جو جذبات کا اظہار کر سکیں جو کبھی اُداس ہوں تو کبھی متبسّم اور کا ہے غصّے کی جھلکی دکھا سکیں۔ لیکن اس لحاظ سے اس کا چہرہ قطعی گونگا تھا۔ جذباتی مدوجزر سے وہ یوں بیگانہ تھی۔ جیسے کسی نے کلف لگا کر استری کر دی ہو۔ جوانی کے باوجود اس میں ایک کرختگی تھی۔ جیسے "کھوئے والی" میں ہوتی ہے جو گلی کوچوں میں پیسے پیسے بکتی ہے۔ اور جس میں کھویا قطعی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اس کے گلے میں کومل سریں گویا تھیں ہی نہیں، بات کرتی ہوئی یوں سنائی دیتی جیسے کوئی اک تارا بجا رہا ہو۔ یوں گردن اٹھا کر چلتی تھی۔ گویا ارد گرد کی چیزوں سے اُسے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اور کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہو۔ یعنی نجمہ کے مقابلے میں تو وہ بالکل ہی بدصورت تھی۔

نجمہ میری منگیتر تھی چھٹپنے ہی میں ہماری منگنی ہوگئی تھی ـــــ ہماری برادری میں کوئی لڑکی نجمہ کی سی خوبصورت نہ تھی ـــــــ بولتی تو اس کے گلے میں گھنگرو بجتے۔ چاہے وہ سی رہی یا پکا رہی ہو اس کے کالوں میں گڑھے سے پڑ جاتے اور ہونٹ کِھلے رہتے گویا ابھی کوئی لطیفہ سن کر بیٹھی ہو۔ وہ بیٹھی ہو اور اتفاقاً میں جا نکلوں تو اس کا دوپٹہ لینا! ـــــ وہ حیا اور نمائش کی تکرار جیسے کالی بدلیوں میں چاند جُھول رہا ہو۔

نزہت چاہے کیسی تھی، آخر تھی میری خالہ زاد بہن۔ میں نے دو ایک دفعہ اس سے بات چھیڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے جواب اس قدر مختصر

ہوتے جیسے شارٹ ہینڈ میں بولتی ہو ۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کوئی ایسی بات سناؤں کہ حیرانی سے اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے ۔ میں نے کہا ۔ "سنا آپ نے خالہ جی ۔ ایک سائنسدان نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے کہ ہمارے خط دو دن کی جگہ گھنٹے میں کراچی پہنچ جائیں گے ۔ ساری ڈاک کو توپ کے گولے میں بند کر دیا جائے گا ۔ پھر اُسے توپ میں رکھ کر چلا دیں گے ۔ پندرہ منٹ میں وہ کراچی جا گرے گا ۔ پھر ڈاک نکال کر تقسیم کر دیں گے"۔

"کیا کہا ۔ دو گھنٹے میں کراچی ـ ـ ـ ـ ـ" خالہ کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر مصلّے پر جا پڑی ۔ "سُنا تم نے نزہت"۔ وہ بولیں ۔

نزہت اُس وقت آلو چھیل رہی تھی خشک سی آواز میں کہنے لگی ۔ "جی ـ ـ ـ ـ ـ اماں وہ نیا چاقو کہاں ہے مجھے تو نہیں ملتا"۔ اور پھر آلو چھیلنے میں مصروف ہوگئی مجھے اُس کی بات پر بیحد غصہ آیا ۔ ۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا اور اپنے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ٹائپ چلانے میں مصروف ہوگیا ۔ رہ رہ کر مجھے خیال آتا ۔ کیسی بیہودہ لڑکی ہے ، بدتہذیب ۔ بات سننے کی بھی تمیز نہیں میری بات کو یوں اڑا دیا جیسے اس کے باپ دادا ہمیشہ سے اپنی ڈاک توپ کے گولے میں بند کر کے بھیجا کرتے تھے ۔ اُس دن سے اسے دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ غصہ آجاتا ۔ "دیکھو تو کس قدر بنتی ہے"۔ چلتی یوں ہے جیسے کسی نے دھکیل دیا ہو"۔ "بڑی آئی کہیں سے"۔ "کھوٹے والی"۔ پیسے کی دو دو اُونہہ"۔ !!

چند ایک دن بعد بد قسمتی سے میں ایک نیا ناول خرید لایا خدا جانے کیا نام تھا اُس کا ۔ میں نے تو پوری طرح سے اُسے پڑھا بھی نہیں ۔ اُس میں بار بار "گلیڈ آئی" کا ذکر آتا تھا ۔ میں نے ڈکشنری دیکھی مگر اچھی طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ گلیڈ آئی کیسی ہوتی ہے ۔ اس دن سے جب مجھے پڑھنے اور ٹائپ چلانے سے فرصت ہوتی تو میں بیٹھا گلیڈ آئی کی مشق کیا کرتا مگر آپ جانتے ہیں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مشق کرنا چنداں حوصلہ افزا نہیں ہوتا اڑوس پڑوس میں کوئی لڑکی بھی نہ تھی ۔ البتہ میرے کمرے کی کھڑکی کے مقابل پڑوسیوں کی کھڑکی تھی ، شمیم کا گھر تھا وہ ، شمیم نزہت کی پیاری سہیلی تھی ۔ مگر شمیم کی

کھڑکی بہت دور تھی اتنی دور سے گلیڈ آئی چمکانا ۔ اور میں ایک مبتدی ۔ پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آیا کہ نزہت !

مطلب یہ نہ تھا کہ نزہت سے سچ مچ آنکھیں لڑاؤں یہ تو ایک سرسری خیال تھا ۔ ورنہ میں تو اس کے جمود اور بے نیازی پر غصہ محسوس کیا کرتا تھا ۔ البتہ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرے ۔ میری گپتیں تعجب اور دلچسپی سے سُنے بار بار بھائی جان کہہ کر مجھے پکارے "جیسے چھوٹی بہن رضو کہا کرتی تھی ۔

"ہمارے بھائی جان بے حد مزیدار باتیں کیا کرتے ہیں ۔ بھائی جان گھر میں آجائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئٹے کا بھونچال آگیا ۔ بیحد شور مچاتے ہیں"۔ "ہمارے بھائی جان ـــــ" یا کم از کم مجھے دیکھ کر نجمہ کی طرح شرما شرما جاتی ۔ اور میری باتیں سن کر ہنسی روکنے کے لئے منہ میں پلہ ٹھونستی پھرتی ۔ مگر اس کے برعکس اُسے تو میری موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا گویا وہ میرے وجود سے ہی منکر تھی ۔

مجھے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ دنیا سے اکتائی اکتائی سی کیوں رہتی ہے ۔ اگر وہ اکتائی ہوئی رہتی تو یقیناً اس کے انداز میں کچھ عجز کچھ نیاز اور اُداسی کی جھلک ہوتی ۔ اُداس حسن مجھے بہت پیارا لگتا ہے ۔ حسن کی بے نیازی اور اُداسی کا نیاز ! مصیبت یہ تھی کہ اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ ہماری دنیا سے اکتائی ہوئی ہو ۔ اپنی دنیا سے نہیں جیسے وہ کسی برتر دنیا میں جیتی ہو اور کبھی کبھار حقارت سے مسکرانے کے لئے ہماری دنیا پر نظر ڈالتی ہو ۔

یقین کیجئے مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ اس سے محبت کی جا سکتی ہے یا وہ عورت ہے ۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ میری خالہ زاد بہن ہے اور بس البتہ میں یہ چاہتا تھا کہ اگر وہ مجھے ایک دلچسپ اور رنگیلا بھائی نہیں سمجھتی تو کم از کم ایک حسین لڑکی کا منگیتر ہی سمجھے اور نہیں تو ایک ہٹا کٹا نوجوان ہی سہی ۔ مگر ایک جیتے جاگتے دلچسپ نوجوان کے وجود ہی سے منکر رہنا ۔ کیسی بے عزتی تھی گلیڈ آئی کی مشق کے لئے میں نے جو اسے نشانہ بنایا صرف اس خیال سے کہ جب وہ مجھے احمقانہ طور پر آنکھیں چمکاتے ہوئے دیکھے گی تو مسکرا دے گی ۔ مختصر یہ کہ

میں اپنی کامیابی اسی بات میں سمجھتا تھا کہ اسے ایک بار ہنسا دوں بس میرا خیال تھا اُس کے ہنس دینے سے میری گذشتہ بے عزتی دھوئی جائے گی ۔

تو کئی ایک دن بڑی محنت سے متبسّم آنکھیں بنا بنا کر میں اس کی طرف دیکھتا رہا ۔ حتیٰ کہ میرے سر میں درد ہونے لگا مگر اس اللہ کی بندی نے آنکھ اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا ۔ دیکھتی بھی تو ایسے ناموزوں موقع پر جب میری آنکھیں بالکل صاف ہوتیں اور جب تک میں اپنی آنکھوں کو متبسّم بناتا اُس سے پہلے ہی وہ کسی کام میں لگ جاتی ۔

ایک دن مجھے اس قدر غصہ آیا کہ میں نے منہ بنا کر زبان نکال دی اُس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی ۔ اُس نے ناک حقارت سے یوں سکیڑی جیسے کراہت محسوس کر رہی ہو ۔ بہر صورت میرا دل ٹھنڈا ہوگیا ۔ اگلے دن جب ہم دونوں باورچی خانے میں بیٹھے تھے ، مجھے ایک نئی بات سُوجھی خیال آیا کہ اُس کی پیاری سہیلی شمیم کے متعلق کوئی ایسی بات بناؤں کہ سُن کر جل ہی جائے۔میں نے نہایت معصوم انداز سے کہا ۔ ”نزہت یہ جو پڑوس میں تمہاری سہیلی رہتی ہے اس کا کیا نام ہے ؟“

”شمیم“۔ اس نے بے پروائی سے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا ۔

میں نے کہا ۔ ”بھئی شمیم نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے جب تک وہ مجھے دیکھ نہ لے اسے روٹی ہضم نہیں ہوتی ۔ ہر وقت بن سنور کر کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے کیا مصیبت ہے“۔

وہ روٹیاں پکانے میں لگی رہی اور میری بات کا جواب نہ دیا میں نے تنگ آکر پھر پوچھا ۔ ”بتاؤ نا ۔ اب میں کیا کروں“۔

”مجھے کیا خبر“۔ وہ بولی ۔

سوائے اس کے کہ میں کمرے میں جا کر اپنے ڈپٹی کمشنر کے علّے کو اپنی انگلیوں کی تیزی سے حیران کرتا میرے لئے اور کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا ۔ وہ ناول تو میرے دل سے اتر گیا تھا ۔ ”گلیڈ آئی“۔ کیا بکواس تھی ۔ لچر ۔!!

ایک روز شمیم، نزہت سے ملنے کے لئے آئی۔ دیر تک دونوں سر جوڑ کر بیٹھی رہیں۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا۔ آخر شمیم میں ایسی کون سی بات ہے کہ نزہت کا اُس کے دیکھے بنا دم نکلتا ہے۔ جب شمیم واپس چلی گئی تو میں اندر جا بیٹھا۔ نزہت بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا "نزہت لو بھئی آج تمہاری شمیم سے بات بھی کر لی ہم نے جب وہ میرے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ بڑی شریر ہو تم۔ میری بات سن کر وہ ٹھمک کر مسکرا کر باہر نکل گئی اور گھر جا کر سیدھی کھڑکی میں جا پہنچی۔ اب وہ وہاں کھڑی نہ جانے کیا اشارے کر رہی ہے۔ آنکھیں مٹکاتی ہے اور خواہ مخواہ ہنسے جاتی ہے"۔

نزہت کے ماتھے پر ہلکا سا شکن پڑ گیا۔ وہ یوں دانتوں سے تاگہ توڑنے لگی جیسے دانتوں تلے تاگے کی بجائے کسی کی گردن ہو۔ میری بات کا کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے اسے جلانے کے لئے "بس دیکھ لیا تمہاری شمیم کو، بیچاری!!"

آخر اُس سے نہ رہا گیا، بولی۔ "اگر میں ہوتی تو ـــــ" پھر وہ دفعتاً رُک گئی۔ "تم ہوتیں تو ـــــ" میں نے دہرایا۔ "کیا کرتیں تم؟"

اُس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ "میں ہوتی تو تھپڑ دیتی ایک" اُس نے کہا ویسے بظاہر وہ سینے میں لگی رہی۔ معاً میں نے ایسا محسوس کیا گویا اس نے واقعی میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو بے خبری میں میرا ہاتھ اپنے گال پر جا ٹکا۔

اِس کے بعد کئی ایک دن مجھے نزہت سے بات کرنے کی جرأت نہ پڑی البتہ جب کبھی میں اس کے سامنے جاتا تو اسے چڑانے کے لئے اپنا ہاتھ گال پر رکھ لیتا۔

اِس کے بعد وہ دن آ گیا ـــــ اُس روز اتفاقاً صبح سویرے میں کوٹھے پر چڑھ گیا۔ دیکھتا ہوں کہ نزہت پردے کے پاس کھڑی دُور ریت کے ٹیلوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے دھیان میں اس قدر محو تھی کہ میرے

پاؤں کی چاپ نہ سنی میں دبے پاؤں اُس کے قریب جا کھڑا ہوا ۔ میرا خیال ہے، اس وقت مجھے رضو یاد آگئی ہو گی ۔ جب کبھی رضو کو میں یوں بے خبر کھڑے دیکھ لیتا تو دبے پاؤں اُس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کی آنکھیں بند کر لیتا اور رضو میرے ہاتھ ٹٹولتی اور آپ ہی آپ کہتی ۔ اُف اتنے بڑے بڑے اوہ میں سمجھی ۔۔۔۔۔ بھینس"۔ اور وہ شریر لڑکی ہنس ہنس کر لوٹ جاتی ۔۔۔۔۔ نزہت کے قریب جا کر مجھے اُس کی آنکھیں بند کرنے کی ہمت نہ پڑی ۔ اِس لئے میں چپ چاپ کھڑا رہا ۔ حتیٰ کہ اس کے بالوں کی خوشبو سے میرا دماغ بھر گیا ۔۔۔۔۔ پھر مجھے معلوم نہیں نہ جانے کیا ہوا ۔ تمام چیزیں میری نظر میں دھندلی پڑ گئیں ۔ میرا سر ہوا میں لٹکنے لگا ۔ آنکھیں یوں اکڑ گئیں ۔ جیسے پھٹی جا رہی ہوں ۔ میری دونوں باہیں اُٹھیں اور ۔ اور اُس کے جسم کے ارد گرد لپٹ گئیں ۔ اور میرے ہونٹ اُس کے بالوں پر جا ٹکے ۔

وہ تڑپ کر مڑی ۔ خدا جانے اُس کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا یا نہیں "اس کا مطلب"۔ اُس نے کہا ۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی ۔ ایک ساعت کے لئے تو میں خود اپنے کئے پر حیران کھڑا رہا ۔ پھر میں نے آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا ۔۔۔۔۔ اُس کے ہاتھ پکڑ لئے ۔ "مجھے تم سے محبت ہے نزہت ۔ خدا کے لئے تمہارے بغیر میری زندگی ویران رہے گی ۔۔۔۔۔"

نہ جانے جوش میں مَیں نے کیا کہہ دیا ۔ آپ تو جانتے ہیں ۔ اکثر مرتبہ ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کسی جوان لڑکی کے قریب ایک عرصے تک رہتے ہیں ۔ مگر آپ کو یہ شبہ بھی نہیں پڑتا ۔ کہ کسی روز جب آپ جاگیں گے اور ایک نظر اُسے دیکھیں گے تو آپ یوں محسوس کریں گے گویا اُسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں ۔ اُسی وقت آپ کو اُس سے محبت ہو جائے گی اور پھر آپ سوچیں گے ۔ "اُف آج تک میں کس قدر اندھا تھا"۔

میں نے یہ تمام واقعہ زاہد کو سُنایا تھا ۔ میرا ہمراز جو تھا وہ، مگر آپ جانتے ہیں کتابی آدمیوں کی باتیں ہی الٹی ہوتی ہیں ۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے بدنامی سے بچنے کے لئے محبت ایجاد کر لی تھی ۔ کیسا بیہودہ خیال ہے کہنے لگا

جب کسی نوجوان لڑکی کے بالوں کی خوشبو سے دماغ بھر جائے اور اس کی بانہیں پکڑ لی جائیں تو اُس سے محبت جتانے کے علاوہ کچھ اور کہنا قطعی ناممکن ہو جاتا ہے زاہد کے خیالات کس قدر پراگندہ ہیں ۔ آنکھوں کا اندھا اور نام چراغ دین ۔ مگر آپ تو سمجھتے ہیں نا ۔

اُس شریف آدمی سے کوئی پوچھے کہ بھلے میاں اگر وہ محبت نہیں تھی تو اس واقعہ کے بعد میری حالت ایسی کیوں ہوگئی ۔ دن بھر پڑا رہتا ۔ آہیں بھرتا' رات جاگ کر کاٹتا اور مرنے کی آرزو کرتا ۔ وہ ٹِک ٹِک کرنے والی ٹائپ تو مجھے بھول ہی گئی تھی ۔ جی چاہتا تھا نزہت کی طرف دیکھتا رہوں دیکھتا رہوں ۔ حتیٰ کہ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹ ایک موہوم مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کریں ۔ "مانو لزا" سی مسکراہٹ ۔

اب میں نے جان لیا جسے میں جمود اور بے نیازی سمجھتا تھا ۔ وہ درحقیقت وقار اور تمکنت تھے۔کس قدر اندھا تھا میں گذشتہ کفر کو محسوس کر کے میری جبیں میں محبت بھرے سجدے تڑپ اُٹھے ۔ حتیٰ کہ میری دنیا ہی بدل گئی اور میں نزہت میں کھو گیا ۔ زاہد کا خیال تھا کہ میں اپنے کہے ہوئے الفاظ کو پال رہا ہوں اصل میں زاہد کا دماغ ٹھیک نہیں ۔ اس لئے اُسے کسی سے محبت نہیں ہوئی اُسے یہ معلوم نہیں کہ دل کی دنیا دماغی دنیا سے قطعی مختلف ہے جو باتیں دماغ میں چمکتی ہیں دل میں آکر ماند پڑ جاتی ہیں ۔ خیر زاہد کی باتیں بس سن لیا کیجئے ۔ دو ایک منٹ دلچسپی میں کٹ جاتے ہیں ، بس ۔

برادریوں کے معاملے تو آپ جانتے ہی ہیں ۔ جب ماں اپنے بیٹے کے لئے ایک حسین لڑکی منتخب کر لے ۔ میرا مطلب ہے جسے وہ حسین سمجھتی ہو ۔ اور دھوم دھڑاکے سے منگنی کی رسم ادا کر چکے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ وہ کتنی اونچی ناک والی ہے اور گھر والے اُس ہونے والی حسین بہو پر ناز کریں کہ ہم وہ ہیں جنہوں نے محلے میں سب سے بڑے گھر کی لڑکی کو اپنی بہو بنایا ہے ۔ تو اس منگنی کو توڑنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے ۔

جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نزہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ تو

انہوں نے کیا کیا نہ کیا ۔ تمام دنیا کے بیٹوں کو بے نقط سنائیں ۔ اولاد کی بیوفائی پر آنسو بہائے ۔ اور بالآخر گاؤں چھوڑ کر ہمشیرہ کے پاس چلی گئیں خدا جانے کس محنت سے اماں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اب زندگی میں اس کے لئے رونے' آہیں بھرنے اور تقدیر کو برا بھلا کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ۔ مگر اس کے باوجود وہ نزہت کے خلاف ایک حرف بھی نہ کہہ سکی ۔ آخر وہ ان کی سگی بہن کی بیٹی تھی ۔ مختصر یہ کہ جب میں نوکر ہوگیا تو میری اور نزہت کی شادی ہوگئی ۔

ہماری شادی پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں ۔ بے شمار باتیں ہوئیں ۔۔۔۔۔ "اتنی خوبصورت لڑکی کو چھوڑ کر اس مٹی کی مورت کو بیاہ لیا ۔۔۔۔۔"

"لڑکے کا دوش نہیں لڑکی والوں نے تعویز کرائے تھے"۔

"لڑکے کا دماغ صحیح نہیں ۔"

لوگ مجھے یوں گھورتے تھے جیسے میں کوئی دیوانہ تھا ۔

شادی کے بعد میں اور نزہت دو سال اکٹھے رہے ۔ ان دنوں میں نہایت خوش تھا اور نزہت کی محبت اُسی طرح میرے دل میں موجزن تھی ۔ دل میں میٹھا میٹھا اضطراب رہتا ۔ حالانکہ مضطرب رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ ایک اچھی اسامی مل گئی تھی ۔ ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے ۔ البتہ دفتر والے حیرانی سے میری اُنگلیوں کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور صاحب کو تو اکثر میری انگلیوں سے شکایت رہتی کہ وہ اتنی تیز نہیں چلتیں ، اور ٹائپ چلانے میں راحت کی بجائے کوفت ہوتی تھی ۔ کمر میں درد رہتا مگر یہ باتیں تو ہوا ہی کرتی ہیں ۔

ساٹھ روپے ہم دونوں کے لئے کافی تھے ۔ گھر کا کام کرنے میں نزہت کو کمال حاصل تھا ۔ ساڑھے چار بجے جب دفتر سے آتا تو میز پر چائے لگی ہوتی ۔ کھانا وقت پر ملتا ۔ اور میرے سلیپر عین مناسب جگہ پر پڑے ہوتے ۔ اس کے علاوہ میری قمیضوں کے بٹن پورے ہوتے گویا دھوبی انہیں دھوتا ہی نہ تھا ۔ مختصر یہ کہ ہمارا گھر ٹِک ٹِک کئے بغیر گھڑی کی طرح چلتا تھا ۔ اور سچ پوچھئے تو ٹِک ٹِک سے مجھے نفرت ہو چکی تھی ۔ نزہت اُسی طرح نیم سوئی جاگی چلتی پھرتی یا

بیٹھ رہتی ۔ اسے دیکھ کر میں محسوس کرتا گویا وہ مجھ سے کوسوں دور تھی ۔ کئی دفعہ اسے یوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا کہ ابھی تک وہ میری خالہ زاد بہن ہے اور اگر میں نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو منہ پر تھپڑ مار دے گی ۔ معاً میں اپنا ہاتھ گال پر رکھ لیتا ۔ اور پھر اپنی اس حماقت پر آپ ہی آپ ہنستا رہتا ۔ شاید اُس کی بظاہر دوری کی وجہ ہی سے میں دل ہی دل میں اضطراب محسوس کرتا تھا ۔ کبھی کبھار جب وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتی کہ یوں بے تابانہ اُس کی طرف دیکھ رہا ہوں ۔ تو اس کے ہونٹ ہلتے اور وہ منہ موڑ کر اُدھر دیکھنے لگتی اس کے باوجود وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکتی ۔ بس میری انتہائی خوشی یہی تھی کہ وہ مسکرائے اور میں دیکھتا رہوں ۔ اب تو اُس کی آنکھوں نے بھی مسکرانا سیکھ لیا تھا مگر وہی دبی دبی مسکراہٹ ۔ کبھی کبھار میں یہ محسوس کرتا کہ وہ مسکراہٹ متاثر ہونے کے بجائے متاثر کرنا ہی جانتی ہے فضول وہم ۔ خدا کی قسم یہ عقل اور اُس کے وہم ۔ خدا کرے میں قطعی طور پر احمق بن جاؤں مجھے خوشی چاہیئے عقل نہیں ۔ میں نے زاہد سے اپنے اضطراب کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی ۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گا ۔ "ارے بھائی محبت تو ایک میٹھا سا سکون ہے ۔ بیتابی نہیں"۔ احمق اتنا بھی نہیں جانتا کہ سکون کیا ہے ۔ سکون موت ہے ، محبت کی موت زندگی کی موت ۔ آپ تو یہ باتیں جانتے ہی ہیں ۔

ایک دن میں دفتر سے واپس لوٹا تو نزہت بیٹھی کچھ بن رہی تھی ، برآمدے میں میری میز لگی تھی ۔ میز پر چائے تیار رکھی تھی ۔ میں دھڑام سے کُرسی پر بیٹھ گیا ۔ بہت تھکا ہوا تھا ۔ خدا جانے اُس روز مجھے کیا ہوا ۔ میں نے نزہت کی طرف دیکھا جی میں آئی کوئی چھیڑ خانی کروں ، میں نے تمہید کے طور پر ایک لمبی آہ بھری ۔ اور کہنے لگا ۔ "وہ بھی کیا دن تھے ۔ اب تو زندگی میں کوئی بات ہی نہیں رہی"۔ نزہت خاموش بیٹھی بنتی رہی ۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ اُس کے کان میری طرف لگے ہوئے ہیں ۔ میں نے کہنا شروع کر دیا ۔ "اُن دنوں زندگی میں کیسی کیسی دلچسپیاں تھیں ، دفتر سے آتا ۔ دیا سلائی ڈھونڈتا پھرتا ۔ چائے بنانے کے لئے آگ سُلگاتا ۔ پھونکیں مار مار کر ہار جاتا اُڑ اُڑ کر راکھ آنکھوں میں پڑتی ۔ دھوئیں سے دم رُکتا ۔ پھر کہیں جا کر چائے تیار

ہوتی اور وہ چائے پینے میں کیسی لذیذ ہوتی تھی ، پیتے ہوئے محسوس ہوتا جیسے دارجلنگ چائے کا اشتہار پڑھ رہا ہوں ، لیکن اب ۔۔۔۔۔ یہ بنی بنائی چائے وہ بات ہی نہیں وہ مزا ہی نہیں ۔ جیسے بیر کھالئے ۔ بیر"۔

نزہت ویسے ہی خاموش بیٹھی رہی ۔ میں نے پھر کہا " وہ بھی کیا دن تھے ۔" اور ایک سرد آہ بھری ۔ "اب تو ہماری زندگی اُبلے ہوئے چاولوں کی طرح پھیکی پڑ گئی ہے ۔"

معلوم ہوتا ہے میری بات اُسے چبھی ہو گی ۔ جھکی جھکی آنکھوں سے کہنے لگی ۔

"مگر اب تو آپ چار دن بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے"۔

نہ جانے کیوں لیکن میں نے محسوس کیا جیسے اُس نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو ۔ دو ایک منٹ تو میں گم سم بیٹھا رہا ۔ پھر مجھے ہنسی آگئی ۔ تمسخر آمیز ہنسی ۔ "یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دیجئے بیگم"۔ میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا ۔

"آزما کر دیکھ لیجئے"۔ وہ بولی ۔

میں نے سوچا دیکھیں تو کہاں تک ہمت ہے ۔ اٹھا ۔ لپک کر ٹائم ٹیبل اٹھا لایا ۔ اُسے دیکھ کر کہنے لگا ۔ "تو آپ کی گاڑی چھ بجے جائے گی اماں کو میرا سلام کہنا ۔ چند ایک دن رونق میں رہ آؤ گی"۔

میرا خیال تھا کہ وہ ہنس پڑے گی اور کہے گی ہم نہیں جاتے ۔ بس بات ختم ہو جائے گی ۔ لیکن ہم دونوں اسٹیشن پر بھی پہونچ گئے ۔ گاڑی بھی آگئی مگر اُس نے بات نہ کی ۔ میرا خیال ہے چونکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہے اس لئے وہ خاموش رہی ۔ سمجھتی ہو گی آخر آپ ہی منّت کرے گا ۔ گاڑی چلنے لگی تو وہ بولی ۔ "وعدہ کیجئے کہ خط ضرور لکھو گے"۔ ہونٹوں پر وہی ادھوری مسکراہٹ تھی ۔

"ہاں لکھوں گا"۔ میں نے کہا ۔ "اور اور ۔۔۔۔۔" میرا جی چاہتا تھا

کہ اسے گاڑی سے اتار لاؤں مگر جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا ۔ میرا یہ کہنا ۔ "چلو جانے دو ۔ گھر چلو"۔ مشکل تر ہوتا جا رہا تھا ۔

"اور ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔" میں نے کہا ۔ "جب بھی میرے پاس آنے کو جی چاہے شوق سے آجانا ۔"

"ضرور آؤں گی ۔" اُس نے جواب دیا ۔ "جب آپ بُلائیں گے تب ۔۔۔۔۔۔"

گاڑی چلی گئی تو میں نے اپنی اِس حماقت پر اپنے آپ کو جی بھر کر کوسا ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ۔ یہ ہے محبت کرنے کا نتیجہ ۔ ہر وقت کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم رہے وہ جانتی ہے میں اُس کے بغیر نہ رہ سکوں گا ۔ وہ جانتی ہے کہ مجھے اُس سے محبت ہے ۔ وہ نہیں آئے گی ۔ خدا کی قسم وہ نہیں آئے گی ۔ اور میں بھی اُسے بلاؤں گا نہیں ۔۔۔۔۔ چاہے میرے مکان میں چڑیاں ہی چڑیاں کیوں نہ آبسیں ۔

اندر داخل ہوتے ہی زاہد چپ چاپ میری طرف دیکھنے لگا ، پھر دفعتاً بولا "ارے بھائی یہ سب کیا جھگڑا ہے"۔

"جھگڑا کیسا ؟" میں نے چونک کر کہا ۔

"یہ اُلٹی ہوئی کتاب یہ گرا ہوا سرورق ، یہ بند کا بند لفافہ اور تمہارا یہ اضطراب سے ہلتا ہوا پاؤں ، یہ سب باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تم اپنے آپ سے جھگڑ رہے ہو ۔ اور کیا"۔ وہ بولا ۔

"اس سے کون سر کھپائے" میں نے دل میں کہا ۔ پھر نہایت سرسری طور پر جواب دیا ۔ "یہ نزہت کا خط ہے ابھی آیا ہے"۔

"تم اسے کھولتے کیوں نہیں ؟"

"اس میں خیریت ہی خیریت ہے اور کیا ؟"

"یعنی تم چاہتے ہو کہ وہاں خیریت نہ ہو ؟"

"اوہ ۔ زاہد"۔ میں نے جل کر کہا ۔ "تم نہیں جانتے' مجھے اس سے

محبت ہے محبت ۔ سمجھے ۔۔۔۔۔ خاک سمجھے !!"

"میں کہتا ہوں تم اس بے چاری کی زندگی تلخ کر رہے ہو ۔ محبت اسے نہیں کہتے میرے بھائی ۔ محبت تو ایک سکون ہے ۔ اطمینان اور خوشی بھرا سکون ۔ تمہارا یہ اضطراب ظاہر کرتا ہے کہ تم اسے تسخیر کرنا چاہتے ہو، تم اُس کے محبوب بننا چاہتے ہو ۔ تم اُسے نیچا دکھانا چاہتے ہو ۔ تم ۔۔۔۔۔"

اُس کی باتیں سُن کر میں آگ بگولا ہوگیا "سراسر احمق ہو ۔ آخر میں کیوں چاہتا ہوں کہ اُس کے خط میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوں جن سے ظاہر ہو کہ وہ خیریت سے نہیں ۔ اُسے نیند نہیں آتی ۔ وہ پاگلوں کی طرح پھرتی ہے تین سال ہو چکے ہیں ۔ وہ مجھے صرف ایک فقرہ ہفتہ وار لکھتی ہے ۔ "اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے"۔ اور میں مہینے میں صرف ایک بار جواب لکھتا ہوں ۔ "یہاں بالکل خیریت ہے"۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ بالکل کو بل کُول لکھوں تاکہ اور بھی واضح ہو جائے ۔ کیوں کیا بالکل بذاتِ خود واضح نہیں تین سال سے اماں سے ملنے بھی نہیں گیا ۔ یہ سب باتیں محبت کی دلیل نہیں تو کیا ہے ۔ تم محبت کو کیا جانو یہی اضطراب یہی کشمکش محبت کا ثبوت ہیں ۔

ناول کا سرورق ہوا کے جھونکے سے زمین سے گھس کر آواز پیدا کرنے لگا ۔"سراسر ۔ سراسر"۔ میری نگاہیں اُس گرے ہوئے سرورق کی طرف اُٹھ گئیں ۔ سرورق کا بھدّا چہرہ میرا منہ چڑا رہا تھا اُس کے اُوپر سرخ روشنائی اور جلی قلم میں لکھا تھا ۔ "انتقام"۔ کیسا بیہودہ سرورق تھا۔میں نے اپنی نگاہیں ہٹا لیں ۔

"ایسا بُرا بھی نہیں ۔" زاہد نے مجھے منہ پھیرتے ہوئے دیکھ کر کہا ۔ "حقیقت ذرا تلخ ہوتی ہے ۔"

"احمق"۔ کتابی جانور ۔ میری دل میں زاہد کے لئے نفرت کھولنے لگی ۔ "محبت نہیں تو کیا ہے"۔ میں غصّے میں چلّایا ۔ "جواب دو"۔

چڑ چڑ ۔ چڑ چڑ، چڑیا چیخنے لگی ۔

زاہد مسکرایا اور پھر چھت کی طرف دیکھ کر بولا ۔ تھینک یو ۔

دامِ خیال

نہ جانے اس روز سیر کرتے کرتے میں اس غیر آباد راستے پر کیسے جا نکلی ۔ بائیں طرف وسیع سر سبز ڈھلان کے نیچے کھائی میں جھکری کا جھرنا کراہ رہا تھا ۔ دائیں جانب داڑی کی پہاڑی پر چیل کے بلند درختوں میں ہوا سِسکیاں بھر رہی تھی دور ۔۔۔۔۔ سامنے پہاڑ کی بلند چوٹی پر سورج کانسی کے تھال کی طرح لٹک رہا تھا کتنی اداس تھی وہ شام !

موڑ پر ایک غیر آباد سنسان بنگلہ دیکھ کر میں رک گئی ۔ وہ مقام مجھے مانوس دکھائی دیتا تھا ۔ پہاڑیوں میں پھرتے پھراتے اکثر مقامات مجھے اس قدر مانوس نظر آتے ہیں گویا میں نے اپنا بچپن وہیں گذارا ہو ۔ میرے گذشتہ تخیل کا کوئی ٹکڑا حقیقت کے لباس میں میرے روبرو آکھڑا ہوتا ہے ۔ اور میں چونک پڑتی ہوں ۔ یہ کوئی نیا احساس نہ تھا ۔ وہی پرانا فریبِ خیال ۔

بنگلے کے دروازے پر پُرانے پتھر میں "کاشانہ" کھدا دیکھ کر میرے دل پر ٹھیس لگی ۔ دس سال کے بیتے ہوئے واقعات میرے آنکھوں تلے پھر گئے ۔ ہاں دس سال ہوئے میں اور جمیلی اُسی بنگلے میں ٹھہری تھیں ۔ جمیلی میری بہترین سہیلی تھی ۔ اُس سے مجھے کس قدر محبت تھی ۔ سات سال ہوئے ۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگئی ۔ وہ اس کی خالہ کا بنگلہ تھا ۔ ایک آن میں اس ویران بنگلے نے میرے دل میں ایک چھوٹی مگر رنگین دنیا آباد کر دی ۔ وہ بنگلہ جو ایک ساعت پہلے میری نظر میں ایک میلی بوسیدہ عمارت سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا ۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی وہ اداس حسین منظر، جمیلی اور اس کی محبت ، صرف میرے، تخیل کی ایک، شوخی تھی ۔ محض فریبِ خیال ۔

اُن دنوں میں اور جمیلی دسویں جماعت میں تھیں ۔ وہ میری ہم عمر تھی یہی کوئی اٹھارہ سال کی ہوگئی ۔ لیکن اس کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی جبھی تو سکول کی لڑکیاں اسے "بانکی" کہا کرتی تھیں ۔ تمام لڑکیاں چاہتی تھیں کہ جمیلی انہیں سہیلی بنا لے استانیوں کی بھی یہی آرزو تھی ۔ لیکن جمیلی کو ان سے ملنے یا عام لڑکیوں کی طرح آنکھوں پر بٹھانے میں چنداں دلچسپی نہ تھی ۔ اگرچہ جب وہ برآمدے یا باغیچے میں ٹہلتی ۔ تو ہر کوئی محسوس کرتا ۔ کہ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے ۔ اکثر اُستانیاں اس کی اس شانِ بے نیازی پر دل ہی دل میں جلتی تھیں ۔ وہ چاہتی تھیں کہ جملہ لڑکیوں کی طرح وہ بھی انہیں پیار اور تحسین بھری نظروں سے دیکھے ۔ اور ان کے انداز گفتگو کی تقلید کرے ۔ لیکن جمیلی کی ہر بات میں اپنا ہی رنگ ہوتا تھا ۔

اُن دنوں ہمارے سکول میں کوئی نہ کوئی لڑکی کسی نہ کسی اُستانی کی شمع یا پتنگا سمجھی جاتی تھی ۔ ریسیس میں ، یہاں وہاں روشوں پر برآمدے میں یا گراؤنڈ میں کئی ایک "شعلے" اور "پتنگے" کھڑے باتوں میں مشغول ہوتے ۔ اور لڑکیاں دور سے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں میں مسکراتیں ۔ گویا کہہ رہی ہوں ۔ ہم جانتے ہیں ۔ لیکن انداز میں حسرت واضح ہوتی ۔ اور کوئی شوخ چپکے سے آکر کان میں کہتی ۔ "اے کاش کہ میں ہوتی"۔ اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑتیں ۔ یا کوئی امیدوار بناوٹی بے نیازی سے ۔ ان میں سے کسی کے پاس سے یوں ٹھمک کر گزرتی ۔ کہ جسم کے خم و پیچ نمایاں ہو جائیں ۔ لیکن اگر اُس وقت جمیلی آنکلتی ۔ تو ایک ساعت کے لئے شعلے اور پتنگے میں بے ربطی پیدا ہو جاتی ۔ استانیاں چوری چوری اس کی طرف دیکھتیں اور نہ دیکھنے کی آرزو کرتیں ۔ لیکن جمیلی اپنی ہی دھن میں ٹہلتی رہتی ۔ یا دیوار کے قریب اکیلی جا بیٹھتی ۔ اور کوئی گیت الاپنے لگتی ۔ اُسے گانے کا بہت شوق تھا ۔

وہ دیوار صرف قدآدم اونچی تھی ۔ دوسری طرف لڑکوں کا سکول اور بورڈنگ تھا ۔ لڑکے اکثر درختوں پر چڑھ جایا کرتے تھے ۔ اور پتوں میں چھپ کر لڑکیوں کو تاڑتے رہتے جبھی ہیڈ مسٹرس مس موہنی نے ہمارا اُس طرف آنا

جانا بند کر دیا تھا لیکن جمیلی مس موہنی سے ڈرتی تھوڑا تھی ۔

ایک روز ، پاربتی، شیلا اور میں تینوں نے پیپل پر جھولا ڈالا ۔ جب میں مس صاحبہ سے اجازت لینے لگی تو وہ کہنے لگیں ۔ "ساحرہ جھولے کو زیادہ نہ چڑھانا ۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکے کوئی شرارت کریں ۔"

ہم تینوں باری باری جھول رہی تھیں کہ جمیلی آگئی ۔

"دیکھوں تو کیسا ہے یہ جھولا تمہارا" اُس نے کہا ۔

اسے بھلا کون انکار کرتا ۔ اُس نے جھولتے ہوئے گانا شروع کر دیا اور اس قدر محو ہوگئی کہ جھولے کو بہت چڑھا لیا ۔ حتیٰ کہ وہ ملحقہ دیوار سے بھی اونچا جانے لگا اودھر لڑکوں نے اُسے دیکھ کر غل مچانا شروع کیا ۔ شوروغل سن کر ہم نے اسے بہتیری آوازیں دیں ۔ "بانکی ----- جمیلی" لیکن وہ بدستور گاتی رہی ۔ اور جھولا چڑھاتی رہی ۔ اُسی وقت مس موہنی آگئیں ۔ اور ہم پر بے حد ناراض ہوئیں جمیلی پر ان کے غصے کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ وہ جھولے سے اتر آئی ۔ اور اپنی طبعی بے نیازی سے گنگناتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی ۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا ۔ دیوار کی دوسری طرف لڑکے باآواز بلند مل کر گا رہے تھے ۔ "بانکی جمیلی ۔ سجیلی جمیلی من موہنی" مس موہنی اُس روز بڑے غصے میں تھیں ۔ لیکن جانے کیوں وہ جمیلی کے سامنے گھبرا جایا کرتی تھیں اس روز بھی انہوں نے مجھے ہی گھورنا شروع کر دیا ۔

میرا خیال ہے ۔ جمیلی کو لڑکوں کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا ۔ وہ چاہتی تھی ۔ کہ کِسی مرد کے سامنے ادا بے نیازی سے یوں گزر جائے کہ اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے اس روز بھی شام کے وقت جب کہ بہت سے لڑکے درختوں پر چڑھ کر ہمیں تاڑ رہے تھے ۔ وہ باغیچے میں آئی ۔ اور دیوار کے پاس بیٹھ کر دھیمی آواز میں گانے لگی ۔ حالانکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا ۔ کہ لڑکے جھانک رہے ہیں اور ہیڈ مسٹرس آگئی تو ----- اسی وقت واقعی مس موہنی آگئی ۔ جمیلہ نے اپنا گانا جاری رکھا جیسے دیکھا ہی نہ ہو ۔ "جمیلی ----- یہ کیا مذاق ہے ۔ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو"۔ مس موہنی نے غصے میں کہا جمیلی

اٹھ بیٹھی اور لاپرواہی سے ایک جمائی لے کر سرسری طور پر کہنے لگی ۔ ویسے ہی بیٹھی تھی ۔ !!

"اور وہ لڑکے درختوں پر بیٹھے کیسے تک رہے ہیں"۔ مس موہنی نے طنزاً پوچھا "مجھے کیا معلوم"۔ جمیلی نے سرسری طور پر درخت کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "وہ جانیں یا آپ" اور پھر خراماں خراماں اپنے کمرے کی طرف چل پڑی ۔

گرمی کی چھٹیوں میں جمیلی اپنے خالو کے ہاں دھرم سالہ جانے کو تیار ہوئی ۔ مجھ سے کہنے لگی ۔ "سحری اگر تم بھی ساتھ چلو تو بڑا مزا رہے"۔ میں نے کہا ۔ "پگلی تجھے کون جانے دے گا ۔ اماں کب مانتی ہیں" ۔ "اماں کو منانا میرا ذمہ"۔ اُس نے کہا ۔ اور واقعی اُس نے اماں کو منا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک مہینے کے لئے دھرم سالہ چلی آئیں اسی پیلے ویران بنگلے میں ۔

جمیلی کے خالو اور خالہ دونو عمر رسیدہ تھے ۔ لے دے کر گھر میں صرف نزہت تھی ۔ تقریباً اکیس بائیس سال کی ہوگی ۔ لیکن چہرے سے یوں دکھتا تھا گویا تیس برس کی ہو ۔ بھاری جسم منجمد گونگا چہرا ۔ اکتائی ہوئی سی ۔ چلتے ہوئے اتنی بھدّی دکھائی دیتی ۔ کہ توبہ بھلی ۔ معلوم ہوتا ۔ جیسے اُسے کسی جگہ سے چلے جانے یا کسی جگہ پہنچنے کا شوق تو کیا ۔ خیال تک بھی نہ تھا ۔ البتہ اُس کی آنکھیں ضرور جاذب نظر تھیں ۔ دو بڑی بڑی تخیلی آنکھیں اگر آپ اُسے برتن مانجتے یا ہنڈیا پکاتے دیکھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے ارد گرد کی چیزوں کو دیکھ نہیں رہی ۔ بلکہ دیوار کے پار کسی ایسی چیز کو دیکھ رہی ہے ۔ جو میلوں دور ہے ۔ یا جو کہیں بھی موجود نہیں ۔ ہمیں دیکھ کر ایک ساعت کے لئے اس کی خوابیدہ آنکھیں جاگ اٹھیں، چمکیں اور پھر اپنی دنیا میں لوٹ گئیں ۔ اور وہ اسی بے حِسی سے کام کاج میں لگ گئی ۔

رات کو جب میں اور جمیلی اکیلی تھیں ۔ میں نے کہا ۔ "جمیلی یہ تمہاری خالہ زاد بہن کیا ہے ۔ نہ سر نہ منہ' بس دیکھ لو ۔" اُس نے کہا ۔ "جو کچھ ہے حاضر ہے سر اور منہ اور بس"۔

"لیکن اتنی عمر ہوگئی ۔ اس کا بیاہ کیوں نہیں کرتے تمہارے خالو"۔

"بیاہ کس سے کریں ۔ کوئی رشتہ بھی ملے ۔ امیر آدمی ہیں چھوٹے رشتے کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟" کئی ایک بار لوگ دیکھنے آئے ہیں اسے، پر دیکھ لیا ہے نا تم نے ــــــ۔ اب کوئی کیا کرے؟" جمیلی نے ہونٹ نکالے۔

"سارا دن یونہی چلتی پھرتی رہتی ہے ۔ جیسے نیند میں ہو ۔ جانے کس خیال میں گم رہتی ہے"۔ میں نے کہا ۔

"اونہو"۔ وہ بولی ۔ "کسی کا خیال نہیں صرف خیال ہی خیال ہے جاگتے میں خواب دیکھتی ہے ۔ بیچاری ۔ خواب نہ دیکھے تو کرے کیا تعبیر تو نصیب نہیں۔

شام کو نزہت کے ابا آگئے ۔ بڑے تپاک سے ہمیں ملے ۔ جمیلی سے گھر والوں کے متعلق پوچھتے رہے ۔ پھر مجھ سے بھی کئی ایک باتیں کیں ۔ آخر خالہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔ "نزہت کی ماں ۔ خاں صاحب نے آج کیا پتے کی بات کی خوب آدمی ہیں ۔ کہتے ہیں بالوں کے لئے کوئی تیل رجسٹر کر لو ۔ چھ سات ہزار اشتہار پر خرچ کر دو بتیس کروڑ ہندوستانیوں میں سے کیا تم ایک لاکھ کو بھی بیوقوف نہیں بنا سکتے تمہارے تیل کی ایک ایک شیشی خرید لیں ۔ بھئی کیا آئیڈیا ہے ۔ کیوں نزہت کی ماں ہی ہی ہی ہی ــــــ۔ ہی ہی ۔ اہم اہم ۔ اور وہ کھانستے ہوئے باہر چلے گئے ۔

ان کے جانے کے بعد جمیلی میری طرف دیکھ کر مسکرا پڑی ۔ "سنا تم نے سحری ابا تو لاکھوں کو بیوقوف بنانے کے فکر میں ہیں اور بیٹی سے اتنا بھی نہیں ہو سکا ۔ کہ کسی ایک کو بیوقوف بنا لیتی"۔

"لیکن بیٹی کی خالہ زاد تو کروڑوں کو بیوقوف بنا سکتی ہے"۔ میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"بڑی وہ ہو تم"۔ اُس نے بناوٹی غصے میں کہا ۔

"میں کہتی ہوں جمیلی تمہیں کیا ہے ۔ تم مردوں کو ایسا کیوں سمجھتی ہو"۔ میں نے پوچھا ۔

"بیچارے"۔ اُس نے منہ بنا کر کہا ۔ "جانے کیوں مجھے اُنہیں بیوقوف

بنانے میں مزا آتا ہے ۔ وہ بنے ہی کس لئے ہیں"۔ نہ بناؤ تو بگڑتے ہیں اُن کی یہی خواہش جو ہوئی ۔ پھر کوئی کیا کرے"۔

"کسی روز بناتے بناتے خود نہ بن جانا"۔ میں نے چڑ کر کہا ۔ جانے کیوں کہہ دیا۔

"جب! بن جاؤنگی تو بن جاؤنگی ۔ جب تک تو بنا لوں"وہ ہنس پڑی ۔

اُن دونوں ہم باغیچے میں ٹہلتی یا اِدھر اُدھر سیر کرنے میں وقت کاٹتی تھیں اس ویران سی پگ ڈنڈی پر کوئی آتا جاتا تو تھا نہیں ۔ کبھی کبھار کوئی گڈی یا گوالا گزر جاتا یا کوئی شکار کی دھن میں مست جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا ۔ اس لئے پردے کے متعلق اہتمام کرنے کی ہمیں چنداں ضرورت نہ تھی ۔ ایک روز کمرے میں بیٹھے ہوئے اتفاقاً میری نظر سامنے جا پڑی ۔ سامنے چٹان پر ایک نوجوان بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا ۔ مجھے تو کالج کا کوئی طالب علم دکھائی دیتا تھا ۔ میں نے جمیلی کو آواز دی ۔ "دیکھو تو جمیلی وہ سامنے حضرت نے پڑھنے کے لئے کیسی جگہ چُنی ہے ۔ اس سے تو بہتر تھا ۔ کہ کسی درخت سے لٹک جاتے"۔

جمیلی کی آنکھ میں ایک چمک لہرائی ۔ "بیچارہ" اس نے زیر لب کہا ۔ اور ایک انداز سے با آواز بلند ہنس پڑی ۔ اُس کی آواز سُن کر نوجوان ٹھٹکا اور ہماری طرف دیکھ کر بھونچکا رہ گیا ۔ جمیلی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا بولی ۔ "چلو سحری باغیچے میں چلیں اُس وقت وہ اور بھی بانکی ہوگئی تھی ۔ آنکھوں میں شرارت چھلک رہی تھی ۔

ٹہلتے ہوئے اُس نے باآواز بلند باتیں کرنی شروع کر دیں ۔ آواز میں لوچ تھی ۔ چال میں لطافت ۔ اُس کے انداز سے یوں دکھائی دیتا تھا ۔ گویا اُسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ سامنے چٹان پر بیٹھا ہوا نوجوان منہ کھولے اُس کی طرف دیکھ رہا ہے ۔

اُس دن کے بعد وہ نوجوان روز وہیں آبیٹھتا ۔ اور کتاب سامنے رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتا رہتا ۔ ادھر جمیلی ایک شانِ استغنیٰ سے

ٹہلتی ۔ یا کوئی گیت گنگناتی رہتی ۔ کیسے مزے میں گاتی تھی ۔ کہ کوئی سنے تو تڑپ ہی جائے ۔ اس وقت جمیلی کے انداز میں گھبراہٹ کا نشان بھی نہ ہوتا ۔ بلکہ ایسے اطمینان سے ٹہلتی رہتی جیسے مچھلی پانی میں تیر رہی ہو ۔

ایک دن جب ہم حسبِ معمول باغ میں ٹہل رہی تھیں ۔ ایک لفافہ اُڑتا ہوا آیا ۔ اور ہمارے پاؤں میں آگرا ۔ جمیلی نے اُسے پاؤں سے ٹھکرا دیا ۔ اور ویسے ہی ٹہلتی رہی ۔ میرا دل تو اچھل کر حلق میں اٹک گیا ۔ میں نے بصد مشکل آہستہ سے کہا ۔

"اٹھا لو اسے ۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا"۔ جواب میں وہ ہنس پڑی ۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ "دیکھو تو سہی کیا لکھا ہے"۔ میں نے گھبرا کر کہا ۔

"لکھا کیا ہے"۔ اُس نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر جواب دیا ۔ "یہی کہ مر رہے ہیں"۔ اور پھر بولی ۔ "ذرا اور مر لینے دو"۔

میں نے لفافہ اٹھا لیا ۔ رات کو ہم نے اُسے کھولا ۔ حسن و عشق سے بھرے ہوئے چار ورق تھے ۔ جابجا شعر لکھے ہوئے تھے ۔ اور کاغذ معطّر تھا ۔

اگلی شام وہ نوجوان بہت دیر سے آیا ۔ اُس کا چہرہ بے حد اُداس تھا ۔ چال میں مایوسی تھی ۔ وہ منڈیر کے پاس آکھڑا ہوا "خدا کے لئے مجھے ایک بار مل لو خدا کے لئے ۔ مجھے کل یہاں سے چلے جانا ہے ۔ صرف ایک بار"۔ اُس نے بھدّی آواز میں کہا ۔

یہ دیکھ کر میں تو گھبرا گئی ۔ "چلو جمیلی اندر چلیں ۔ اتنی دیر ہو گئی ہے"۔ میں نے اُسے گھسیٹتے ہوئے کہا ۔ جمیلی نے ایک نگاہِ غلط انداز سے اُس کی طرف دیکھا ۔ اور گلاب کے پیڑ سے مخاطب ہو کر بولی ۔ "ہمت ہے تو کوئی آکر مل جائے"۔ میں نے اُسے اور کچھ نہ کہنے دیا اور گھسیٹ کر اندر لے گئی ورنہ جانے وہ کیا کیا کہہ دیتی ۔

رات کو ہم کھانے سے فارغ ہو کر کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب اپنے کمرے میں پہنچیں ۔ تو میری نگاہ کھڑکی پر پڑی ۔ سیخوں کے پیچھے وہی نوجوان

کھڑا تھا ۔ میں وہاں سے بھاگی ۔ بمشکل چارپائی تک پہنچی اور دھم سے گر پڑی ۔ جمیلی نے میری طرف حیرانی سے دیکھا ۔ "کیا ہے"۔ اُس نے پوچھا ۔ میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا ۔ اُسے کھڑکی میں دیکھ کر وہ مسکرا دی ۔

"میں آجاؤں"۔ کسی نے مدھم مگر بھاری آواز میں کہا ۔

"ذرا مشکل کام ہے"۔ وہ بولی اور بڑھ کر کھڑکی کا دروازہ بند کر دیا نہ جانے میں کتنی دیر ویسے ہی آنکھیں بند کئے پڑی رہی پھر جو آنکھ کھولی تو دیکھتی ہوں ۔ کہ وہی نوجوان اندر دروازے میں کھڑا ہے ۔ اُسے وہاں دیکھ کر میری تو جان ہوا ہو گئی ۔ ہمارے کمرے میں کوئی دروازہ باہر باغیچے میں نہ کھلتا تھا ۔ البتہ ملحقہ کمرے میں جہاں اُن دنوں نزہت سویا کرتی تھی ۔ تین دروازے تھے ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا تھا ۔ ایک ہمارے کمرے میں اور ایک اُدھر برآمدے میں ۔ وہ نزہت کے کمرے سے گزر کر ہمارے کمرے میں داخل ہوگیا ۔ اُس وقت پونے گیارہ بجے ہوں گے باہر صحن کے پرے باورچی خانے میں برتن بجنے کی آواز آرہی تھی ۔ غالباً نزہت برتن دھو یا سنبھال رہی تھی ۔ خالہ اور خالو کا کمرہ مکان کے پرلی طرف تھا ۔ وہ تو شام ہی سے اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے ۔ شاید اُس نوجوان نے کسی نوکر کو کچھ دے دلا کر ساتھ ملا لیا تھا ۔ ورنہ توبہ پرائے گھر میں گھس آنا ۔۔۔۔۔

جمیلی نے اُسے دیکھا تو اس کے ماتھے پر تیوڑی چڑھ گئی ۔ میرا خیال ہے ، وہ اس کی دلیری پر چڑ گئی تھی ۔

"آپ کا مطلب"۔ اُس نے غصے سے پوچھا ۔ وہ گھبرا کر اندھیرے کونے میں دبک گیا ۔ "خدا کے لئے"۔ وہ کہنے لگا ۔ "خدا کے لئے"۔

جمیلی نے گھور کر کہا"۔ میں کہتی ہوں ۔ اس کا مطلب ؟"

"بس دو گھڑی دیکھ لینے دیجئے ۔ مجھے یہاں سے کل چلے جانا ہے"۔ وہ بولا ۔

" مہربانی کر کے ابھی چلے جائیے ۔ ورنہ"۔ جمیلی نے آنکھیں دکھاتے

ہوئے کہا ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ عین اُسی وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کُھلا اور نزہت اپنے کمرے میں داخل ہوئی ۔ جمیلی نے جھٹ اُٹھ کر بتی بجھا دی۔جانے ہم تینوں کتنی دیر اُس وسیع کمرے کے اندھیرے میں ایک دوسرے سے دور بیٹھے رہے مجھے تو یوں معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے صدیاں گزر گئی ہوں ۔ صرف اس احساس نے کہ ہمارے قریب ایک اجنبی نوجوان موجود ہے ۔ اُس اندھیرے کو کس قدر خوفناک بنا دیا تھا ۔

دور صحن سے پاؤں کی چاپ سنائی دی ۔ اور خالو کی آواز آئی ۔ "جمیلی بیٹی جمیلی اہم اہم"۔

"اوہ خالو آگئے"۔ جمیلی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ۔

"مہربانی کر کے آپ چلے جائیے"۔ اُس نے اس اندھیرے کونے سے مخاطب ہو کر کہا ۔ جہاں وہ کھڑا تھا ۔

"اچھا تو میں جاتا ہوں ۔ لیکن خدارا مجھے اپنا نام تو بتا دیجئے"۔

"میرا نام"۔ جمیلی نے چونک کر کہا ۔ "میرا نام نزہت ہے ۔ اب آپ جائیے"۔

"کیا میں آپ کو صرف ایک خط لکھ سکتا ہوں ۔ صرف ایک"۔ اُس نے دروازے میں پہنچ کر کہا ۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ لیکن اس وقت آپ چلے جائیے ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔"

اُس نے ملحقہ دروازہ کھولا اور پیشتر اس کے کہ ہم اسے روکیں وہ نزہت کے کمرے میں داخل ہوگیا ۔ ایک آواز آئی ۔ جیسے کوئی چیز کسی سے ٹکرا گئی ہو ۔ ایک دبی ہوئی چیخ "خدا کے لئے"۔ کون ہے "چُپ"۔ پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی ۔ خوش قسمتی سے عین اُسی وقت خالو نے دروازہ کھڑکھڑانا شروع کر دیا ۔ اور ساتھ کے کمرے کی وہ آوازیں دروازے کی کھڑکھڑاہٹ میں دب گئیں ۔

"سو گئی بیٹی"۔ خالو نے باآواز بلند پوچھا ۔

"کیا ہے خالو جی"۔ جمیلی نے بناوٹی خواب آلود آواز میں کہا ۔

"کچھ نہیں ۔ تمہیں ناحق بے آرام کیا میں نے ۔ میرا مطلب ہے ۔ کہ کل صبح چھ بجے نکوئی جانا ہے ۔ تمام انتظام کر لیا ہے ۔ بھول نہ جانا بیٹی ۔ دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ۔ ناحق بے آرام کیا میں نے"۔ خالو واپس جاتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے ۔

ڈر کے مارے رات بھر مجھے قطعی نیند نہ آئی ۔ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ نوجوان کیا ہوا ۔ اور نزہت ۔ نزہت نے اُسے ہمارے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر کیا سمجھا ہوگا ۔ اف ۔ صبح سویرے ہم انگوٹھی چلے گئے ۔ میں جمیلی اور خالو دس بجے کے قریب لوٹے ۔ تو میں اپنے کمرہ میں جا لیٹی ۔ اُس روز مجھے نزہت کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی ۔ کچھ دیر کے بعد جمیلی دوڑتی ہوئی آئی ۔ اور کہنے لگی ۔ آؤ سحری تمہیں ایک نئی دلہن دکھاؤں ۔ اور مجھے گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے گئی ۔

"یہ دیکھو"۔ اُس نے نزہت کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ واقعی نزہت دلہن بنی بیٹھی تھی ۔ نیلا کریپ کا دوپٹہ جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے ۔ اور سفید ساٹن کا سوٹ ۔ اُس نے ہماری طرف مڑ کر دیکھا ۔ اور جھینپ گئی ۔

"آج کیا بات ہے"۔ جمیلی نے اُسے چھیڑ کر کہا ۔

"بات کیا ہوگی"۔ نزہت نے گھبرا کر جواب دیا ۔ اور شدّت سے ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوگئی ۔ جمیلی نے میرے بازو پر چٹکی بھری اور دھیمے سے کہنے لگی ۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا ۔ ان کی دنیائے خیال میں بھی ایک چاند نکل آیا"۔

اُس روز کے بعد وہ نوجوان ہمیں نظر نہ آیا ۔ اور ہمیں تسلی ہوگئی ۔ پانچ سات دن کے بعد خالہ آئی ۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا ۔ کہنے لگیں ۔ "دیکھو بیٹی یہ خط کس کا ہے ۔ انگریزی لکھی ہے ۔ شاید تمہارے خالو کا ہو"۔ پتے پر نزہت کاشانہ دیکھ کر وہ خط جمیلی نے لے لیا ۔

"میرا ہی ہے خالہ جی"۔ اُس نے کہا۔

رات کو ہم نے اُسے کھولا ۔ "بیچارے نے اپنے دل کا دکھڑا رویا ہوا تھا جمیلی نے خط پڑھتے ہوئے مسکرا کر کہا ۔ "کیا محبت اور غم کی داستان لکھی ہے"۔

اس کے بعد جمیلی نے لفافہ اُسی طرح بند کر دیا ۔ اور صبح سویرے نزہت کو دکھا کر کہنے لگی ۔ "دیکھو تو نزی شاید یہ تمہارا خط ہے ۔ نوکر نے غلطی سے مجھے دے دیا ہے ۔ تمہاری کسی سہیلی کا ہے"۔

اُس روز نزہت کی چال میں ایک لے تھی ۔ وہ بات بات پر مسکراتی ۔ اور پھر آپ ہی آپ شرما جاتی ۔ اُس کی دنیا ہی بدل گئی تھی ۔

ہاں یہ وہی بنگلہ ہے نہ جانے اب یہاں کون رہتا ہے ۔ نزہت کے ابا اور اماں تو مدت سے مر کھپ گئے ہوں گے ۔ اور نزہت نے جانے کس کا گھر جا آباد کیا ہوگا ۔ میرے دل میں شوق گدگدی کرنے لگا ۔ جی میں آیا چلو دیکھتی چلوں ۔ میں بے دھڑک اندر چلی گئی ۔ کمرے میں ایک بڑھیا بیٹھی تھی ۔ میں نے فوراً پہچان لیا ۔ کہ وہ جمیلی کی خالہ تھی میں نے سلام عرض کیا ۔ اور بیٹھ گئی پہلے تو اُس نے مجھے نہ پہچانا ۔ پھر بتانے پر وہ مجھے بڑے تپاک سے ملی ۔ اور ہم کچھ دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں ۔ بیچاری اپنا دکھڑا روتی رہی ۔ نزہت کے ابا فوت ہو چکے تھے ۔ اور اب وہ اکیلی وہاں رہتی تھیں ۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھا ۔ "خالہ جی نزہت کہاں ہے آج کل"۔

"نزہت"۔ اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا ۔ "ادھر بڑے کمرے میں بیٹھی ہوگی"۔

"لیکن خالہ جی میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ اُس کی شادی نہیں کی آپ نے؟"

بڑھیا نے ایک آہ بھری ۔ "شادی!" اُس نے تڑپ کر کہا ۔ "نہ کوئی اچھا رشتہ ملا اور نہ شادی کی ۔ رشتے تو کئی آتے تھے ۔ مگر ان دنوں ہماری نگاہ میں چھوٹے موٹے رشتے جچتے ہی نہ تھے ۔ جب خیال آتا ہے بیٹی کہ یہ میری ہی غلطی تھی تو دل پر ٹھیس لگتی ہے ۔ بیچاری کے نصیب پھوٹ گئے ۔ ساری عمر بیٹھی میری جان کو روئے گی"۔ "اچھا تو میں اُسے مل آؤں" کہہ کر میں اُٹھ بیٹھی

اور بڑے کمرے کی طرف گئی ۔ نزہت چارپائی پر بیٹھی تھی ۔ سامنے دو بوسیدہ ورق پڑے تھے ۔ وہ اپنے ہی دھیان میں لگی ہوئی تھی ۔ اسلئے اُس نے مجھے نہ دیکھا ۔ اُس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا ۔ اور کاغذ پر پھیل گیا ۔ "نزہت" میں نے آواز دی وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی اور آنسو پونچھ کر مجھ سے لپٹ گئی ۔ بڑی دیر تک ہم آپس میں باتیں کرتی رہیں ۔ لیکن ہر لفظ جو اُس کے منہ سے نکلتا تھا ۔ یوں سنائی دیتا ۔ جیسے ایک دبی ہوئی کراہ ہو ۔ میں نے کہا ۔ "نزہت" تمہارے ماں باپ نے یہ کیا ظلم کیا ۔ کہ ساری عمر تمہیں کنوارا بٹھا رکھا ۔ پہلے تو جھجک گئی پھر کہنے لگی ۔ "تم سے کیا چھپانا ہے سحری بہن ۔ اماں کا اِس میں کوئی قصور نہیں ۔ بیسیوں رشتے آئے ۔ اماں نے بھی بہت زور دیا ۔ "تم جانتی ہو"۔ اُس کے ہونٹ حسرت بھری مسکراہٹ سے کِھل گئے ۔ لیکن تم نہیں جانتی سحری میں کیسے اُن سے بے وفائی کر سکتی تھی ۔ اُنہیں مجھ سے بہت محبت تھی ۔ میں بھی اُنہیں چاہتی تھی ۔ میں تو انہی کی ہو چکی تھی ۔ شادی تو ایک دنیاوی رسم ہے نا"۔ اُس نے آہ بھر کر دہرایا ۔ "بھلا اُن سے کیسے بے وفائی کرتی ۔ اِس لئے میں نے شادی سے انکار کر دیا ۔ یہ دیکھو"۔ اُس نے دونوں ورق اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیئے ۔ "یہ اُن کا آخری خط ہے ۔ بہت سے خط بھیجے تھے انہوں نے ۔ الماری میں ڈھیر لگ گیا تھا ۔ لیکن میں نے سب جلا ڈالے ۔ صرف یہی ایک رکھ لیا تھا ۔ یہ اُن کا آخری خط تھا"۔

میں نے سرسری طور پر خط کی طرف دیکھا ۔ وہی خط !! جو اُس دن جمیلی نے مجھے دکھایا تھا ۔ میں حیران رہ گئی ۔

میرے دل پر ایک ٹھیس لگی ۔ بے ساختہ آہ نکل گئی جی بھر آیا ۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا ۔ سامنے اُسی کالی چٹان پر ایک سوکھا ہوا ، درخت بل کھا رہا تھا ۔ بائیں طرف داڑی کی پہاڑی پر ہوا چیل کے درختوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی ۔ اور گھاٹی میں جھکری کا جھرنا کراہ رہا تھا ۔

....○....

زندگی

عطیہ نے اکتا کر کتاب کو رکھ دیا ۔

سامنے میز پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ انگیٹھی پر الماریوں میں کتابوں کی قطاریں کھڑی تھیں ۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم آگیا ۔ ناک پر ہلکی سی سرخی جھلک گئی ۔ بھویں سمٹیں اور ماتھے پر شکن پڑ گئی ۔۔۔۔۔ وہ محسوس کرنے لگی ۔ جیسے وہ خود کسی کتاب کا ایک جزو ہو ، یا کوئی اکھڑا ہوا ورق یا جیسے وہ کتاب میں جی رہی ہو ۔

پھر وہ اُٹھ بیٹھی اور سامنے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔

باہر کالے کالے دھندلے مکانوں میں مدھم بتیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔ گدرے گدرے آسمان پر میلا اور بھدا چاند ٹنگا ہوا تھا ۔ نیچے ایک تنگ سی سڑک یوں گھومتی ہوئی نکل گئی تھی جیسے چلتے چلتے کھو گئی ہو ، دور کوئی چکی ہونک رہی تھی ۔

بائیں طرف ایک بھدا مکان کھڑا تھا ۔ چوبارے میں کوئی ٹوٹے ہوئے ہارمونیم پر انگلیاں پھیر رہا تھا ۔ عطیہ کی ناک حقارت سے سکڑی بھویں تن گئیں ۔

پڑوسی نے بھدی آواز میں گانا شروع کر دیا ۔

"آگ لگی اِس من میں ۔ آ ۔۔۔۔ گ"

عطیہ نے اپنا منہ موڑ لیا "اِس سے زیادہ اور کیا آگ لگے گی" ۔ اُس نے جی میں سوچا ۔ "وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ نہ جانے بال بنانے کے لئے یا آگ لگانے والی کو دیکھنے کے لئے ۔ آئینے میں دو کالی شوخ آنکھیں مسکراتے ہوئے اُسے کہہ رہی تھیں ۔ "تم کتنی حسین ہو !"

"ہاں بہت"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔ "ایک معمولی کلرک کی زندگی حرام کر رکھی ہے ۔۔۔۔۔۔ آگ لگی ہے ۔۔۔۔۔۔ اور جلنے کی تمنا ہے ۔ اس کے منہ سے بیساختہ ایک نقرئی قہقہہ نکل گیا ۔ "بے چارہ شام کو باہر آنے جانے سے بھی رہا"۔

گلی میں پاؤں کی چاپ سن کر وہ لپک کر کھڑکی میں گئی ۔ نیچے کوئی راہ گیر جا رہا تھا ۔ "پگلی"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔ "پروفیسر صاحب تو آرٹ پر لکچر دے رہے ہوں گے اور تو یہاں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے ۔۔۔۔۔۔ نہ جانے یہ ادبی جلسے کب ختم ہوں گے کبھی مشاعرہ ہے کبھی بحث اور کبھی جانے کیا"۔ اس نے کنکھیوں سے پڑوسی کی طرف دیکھا ۔

دونوں کہنیاں باجے پر ٹیکے ٹھوڑی ہاتھ میں لئے وہ اُداس بیٹھا تھا ۔ چہرے پر کالے گھنگھریالے بال لپٹے ہوئے تھے ۔ دو موٹی موٹی آنکھیں اُسے چق کے پیچھے ڈھونڈھ رہی تھیں ۔

عطیہ نے جھجک کر اپنی آنکھیں پھیر لیں ۔ "کیا یہاں بیٹھ کر گھورنے اور آہیں بھرنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں ؟ ۔۔۔۔۔۔ اس طرح آنکھیں پھاڑ کر لوگوں کو گھورتے رہنا ! جاہل ! ۔۔۔۔۔۔ کیسی گنواروں کی سی نگاہیں ہیں ۔۔۔۔۔۔ کلرک ہے نا ؟" اُس کے ہونٹوں پر نفرت کی لہر دوڑ گئی ۔۔۔۔۔۔ "سمجھتا ہو گا یوں دیکھنے سے نہ جانے کیا ہو جائے گا ؟ ۔۔۔۔۔۔ بیوقوف ۔۔۔۔۔۔ میں اُسے کیا سمجھتی ہوں ؟" ۔۔۔۔۔۔

عطیہ نے چق اُٹھا کر نیچے دیکھا ۔ گلی سنسان پڑی تھی ۔ کبھی کبھار کوئی راہ گیر یوں گزر جاتا جیسے کسی پرانے کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں ۔

"تم کیا اس سے ڈرتی ہو ۔ کسی نے عطیہ کے کان میں کہا ۔ "میں بھی پگلی ہوں" ۔

وہ مسکرا دی ۔ اُس نے بڑھ کر چق کو لپیٹ کر باندھ دیا ۔۔۔۔۔۔ لو اب جی بھر کر من میں آگ لگاؤ"۔ آئینہ میں دیکھ کر اُس نے کسی سے کہا ۔ "بے چارے کو صرف ایک ہی گیت آتا ہے"۔

عطیہ نے کتاب میز پر رکھ دی ۔ اس کا سر گھوم رہا تھا ۔ الفاظ آنکھوں تلے ناچ رہے تھے ۔ کوئی تڑپ اُداسی بن کر اُس پر چھائے جا رہی تھی ۔

سامنے آرام کرسی پر اکرام بیٹھا پڑھ رہا تھا ۔ اُس کی آنکھیں کتاب پر جمی ہوئی تھیں ۔ کتاب کی پشت پر "کیوپڈ اور سائکی" لکھا ہوا تھا ۔ وہ سنہری الفاظ بتّی کی روشنی میں جھلملا رہے تھے ۔ عطیہ کا جی چاہتا کہ ان کتابوں میں سے نکل کر کوئی اُس کے پاس آبیٹھے اور اُس سے باتیں کرے ۔ مگر وہ گونگے الفاظ ناچ ناچ کر اُسے پریشان کرنا ہی جانتے تھے ۔

اُس نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا ۔ کھڑکی کی چق بندھی ہوئی تھی ۔ پاس ہی دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر ہوا سے ہولے ہولے جھول رہا تھا ۔

"آگ لگی اس من میں آگ"

"آگ لگی اس من میں آ ۔۔۔۔۔۔۔ گ"

پروفیسر نے اپنا سر اٹھایا اور ناک چڑھا کر بولا ۔ "اُف ! کتنی جہالت ہے ؟ ان لوگوں کو من میں آگ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ۔ اندھے کہیں کے !!"

"اپنے گھر بیٹھا گا رہا ہے ۔ ہمارا کیا لیتا ہے ؟" بیگم نے بے پرواہی سے کہا اُس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح میاں کو چھیڑے ۔

"نہیں ؟" ویسے بات کر رہا ہوں ۔ یہ لوگ بالکل عقل کے اندھے ہیں ۔ بد مذاق بازاری گانے گائے اور سو رہے ۔ احمق ۔۔۔۔۔ حسن کو تو یہ لوگ پہچانتے ہی نہیں"۔ اُس نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ "تم نے کیوپڈ اور سائکی پڑھی ہے عطی ؟"

عطیہ کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر اکرام نے کتاب میز پر رکھ دی ۔

"یہ دیکھو"۔ اس نے ایک تصویر نکال کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "یہ سائکی ہے ۔۔۔۔۔ کتنی حسین ہے ۔۔۔۔۔ ایک ایک خم سے

حسن ٹپک رہا ہے کتنی مؤثر آنکھیں ہیں ۔ تم سے ملتی جلتی"۔ اکرام غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے گنگنایا ۔ گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ۔

"مجھ سے !" عطیہ نے مسکراتے ہوئے دہرایا ۔

عطیہ اکرام کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اکرام کی آنکھیں کتاب سے اٹھیں اور شوخی بھری چمک سے اُسے اُس بات کا یقین دلا دیں ۔ مگر اکرام کی آنکھیں سائکی کے جسم کی گولائیوں میں کھوئی ہوئی تھیں ۔

"ہاں تم سے"۔ اکرام نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ۔ "دیکھو تو !" اکرام نہ جانے کتاب سے کہہ رہا تھا یا تصویر سے ۔ اس کے الفاظ منہ سے نکلتے ہی یوں گم ہوگئے جیسے شرم کے مارے کمرے کے کونوں میں چھپ گئے ہوں اور عطیہ نے محسوس کیا جیسے کوسوں دُور کوئی کچھ کہہ رہا ہو ۔ پھر بھی ایک ہلکی سی سرخی عطیہ کے رخساروں پر جھلک گئی ۔

آئینے سے نکل کر ایک مسکراتا ہوا چہرہ اس کے روبرو آ کھڑا ہوا ۔ دو شوخ آنکھیں مسکراتے ہوئے کچھ کہنے لگیں ۔

دور بھدّی آواز میں کوئی گا رہا تھا ۔

"آگ لگی اس من میں آ ۔۔۔۔۔ گ"

"سب زبانی باتیں ہیں"۔ کسی نے اس کے دل میں کہا عطیہ کی نگاہ خواہ مخواہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی ۔ سامنے پڑوسی بیٹھا گا رہا تھا ۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں آنکھیں چمک چمک کر اُسے کچھ کہنا چاہتی تھیں ۔ وہ جھینپ گئی ۔ اپنا منہ پھیر لیا ۔ سامنے اکرام بیٹھا غور سے تصویر دیکھ رہا تھا ۔

"یہ دیکھو یہ کیوپڈ ہے"۔ اکرام نے ورق الٹتے ہوئے کہا ۔ "کتنا خوبصورت سر ہے ! جیسے خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو ۔"

"اپنے ہاتھوں سے"۔ بے اختیار وہ پڑوسی کے گھنگریالے بالوں کی طرف دیکھنے لگی گھنگریالے بالوں تلے دو مشتاق آنکھیں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں ۔

عطیہ بولی ۔ "اپنے ہاتھوں سے تو خدا نے سبھی کو بنایا ہے"۔

"ہاں ہاں سبھی کو"۔ اکرام نے تصویر کو دیکھتے ہوئے دُہرایا ۔

"تو پھر آپ کتاب میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں ؟" عطیہ نے پوچھا ۔

"اوہ تم نہیں سمجھیں"۔ وہ چونکا ۔ "میرا مطلب ہے ۔ یہ انسانی تخیل کا بہترین نمونہ ہے دیکھو کتنا حسین مجسمہ ہے"۔

"تخیل"۔

"ہاں ۔ ہاں تخیل ۔ اکرام نے ایک نگاہ غلط انداز عطیہ پر ڈالی ۔

کل تو آپ کہہ رہے تھے ۔۔۔۔۔"

"کیا ؟" پروفیسر کے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی ۔

"کہہ رہا تھا کہ دنیا اتنی حسین ہے اتنے دکھ اور اتنی تکلیفوں کے باوجود اتنی حسین ہے کہ اگر میں خدا ہوتا تو بھی اس سے بہتر دنیا نہ بنا سکتا"۔

"ہاں ۔ ہاں ۔ یہ ماتھر لینٹ کا خیال ہے ۔ کتنا اچھوتا خیال ہے ۔ ہے نا ؟"

"آگ لگی اس من میں آگ ۔۔۔۔۔" پڑوسی کی آواز آئی ۔

"اوہ ۔ کیسی بے سری الاپتا ہے ۔ کتنا گندا پڑوس ہے ۔ بات کرنا مشکل ہے ۔ گنوار !! ۔۔۔۔۔ یہ لوگ حُسن سے واقف نہیں ۔ جانتے ہی نہیں زندگی کیا ہے جہالت میں اپنی عمر گنوا رہے ہیں ۔۔۔۔۔"

عطیہ حیرت سے اکرام کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ مگر اُس کے کانوں میں "آگ لگی اس من میں" سنائی دے رہا تھا ۔ پروفیسر صاحب کچھ کہہ رہے تھے ۔ باہر ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی ۔ جیسے کسی کا منہ چڑا رہی ہو ۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے کلنڈر کی تصویر جھول رہی تھی ۔ گویا عطیہ کو کسی بات پر اکسا رہی تھی ۔

عطیہ چونک پڑی ۔۔۔۔۔

"میں پوچھتی ہوں ۔ اگر زندگی بذاتِ خود حسن سے بھری ہوئی ہے تو آپ حسن کو ان نیلی کالی جلدوں میں کیوں ڈھونڈ رہے ہیں ؟"

"اوہ" پروفیسر نے سر کھجلاتے ہوئے کہا ۔ "خوب ۔۔۔۔۔ اگر زندگی بذاتِ خود حُسن سے بھری ہوئی ہے تو لوگ حسن کو کتابوں میں کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ۔ کیسا اچھوتا خیال ہے ۔۔۔۔۔ خوب ۔۔۔۔۔ ہوں ! ۔ ۔۔۔ کیسا اچھا موضوع ہے ۔ بہت اچھا ۔ اب کے میں اس موضوع پر افسانہ لکھوں گا ۔۔۔۔۔ کیسا بلند خیال ہے !"

"افسانہ ۔۔۔۔۔ خیال ۔۔۔۔۔" عطیہ کا جی چاہتا تھا کہ ایک بلند قہقہہ لگائے تمسخر بھرا قہقہہ ۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک قہقہہ لگانے سے اُس کی تمام اداسی اور تنہائی دور ہو جائے گی ۔

ایک ساعت کے لئے اس نے محسوس کیا جیسے وہ پاگل ہوئی جا رہی ہو اس کا دم گھٹنے لگا ۔ کانوں میں عجیب عجیب آوازیں سنائی دینے لگیں ۔ کوئی قہقہہ مار کر ہنس رہی تھی ۔ آئینے میں کوئی چلا رہا تھا تم کتنی حسین ہو ۔ زندگی ! زندگی ! اُس کے جسم کے بند بند میں لہریں اٹھ رہی تھیں آگ لگی اس من میں آگ ۔ کلنڈر جھول جھول کر گا رہا تھا ۔ کیوپڈ کیوپڈ ۔ سائکی کی تصویر گنگنا رہی تھی ۔ گھبرا کر وہ کرسی میں دھم سے گر گئی ۔

"۔۔۔۔۔ سائکی" ۔۔۔۔۔ کسی نے اُس کے کان میں کہا ۔ اُس کے ہونٹوں پر خواہ مخواہ تبسم جھلک گیا ۔ مسکرا دی ۔ "تم کتنی حسین ہو"۔ آئینے میں سے کسی نے کہا ۔۔۔۔۔

"زندگی کتنی حسین ہے"۔ اُس کے جسم کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا ۔

"میں بھی کیسی پگلی ہوں"۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر مسکرا دی ۔

سامنے پروفیسر صاحب کاغذ پنسل سے کچھ لکھ رہے تھے ۔ ان کے ماتھے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہے تھے" خوب ہے بہت خوب"۔

پروفیسر نے اُسے مخاطب کر کے کہا" ! کیسا اچھوتا تخیل ہے ۔۔۔۔۔ افسانہ پڑھو گی تو معلوم ہو گا"۔

عطیہ کے ہونٹوں پر نفرت کی رَو دَوڑ گئی ۔

آگ لگی ! آگ لگی !! پڑوسی گویا منتیں کر رہا تھا ۔

عطیہ نے ایسے محسوس کیا جیسے اُس کے دل کے تاروں کو کوئی چھیڑ رہا ہو ۔ اُس کی آنکھیں کسی اثر سے چمک اُٹھیں ۔ پڑوسی کی نگاہیں عطیہ کے جسم کے بند بند میں کھبی جا رہی تھیں ۔ بند بند میں لہریں اٹھ رہی تھیں اس کی نگاہ پروفیسر پر پڑی ۔ ہونٹ نفرت سے بھنچ گئے ۔ بیچارا ! پروفیسر دھندلا پڑتا گیا ۔ دھندلا پڑتا گیا ۔ اس کی جگہ گھنگریالے بالوں میں لپٹا ہوا چہرہ ابھرنے لگا ۔ ابھرتا گیا ۔

عطیہ کے چہرے پر سُرخی کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ اس نے اپنی نگاہ ہٹا کر دائیں طرف پھیر لی ۔ باہر گھنگریالے پھیلاؤ میں ننھی ننھی بتیاں چمک چمک کر جل رہی تھیں ۔ آسمان پر سنہری چاند میں کوئی بیٹھا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ آگ لگی ! آگ لگی ! نیچے روپہلی چاندنی میں ایک پتلی سی سڑک دوڑتی ہوئی کہیں جا رہی تھی جیسے اُسے کوئی راستہ دکھا رہی ہو ۔ دور کہیں کوئی چکی اُسے بلا رہی تھی ۔ "عطی ۔۔۔ عطی ۔۔۔!!"

……… ○ ………

شرابی کا راز

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کر دیا کہنے لگا ۔ میں تمہاری باتیں سننے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لایا تمہاری باتیں بہت سن چکا ہوں بہت ۔ تم ہر وقت اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہو، مگر شاید میں یہ بات پھر کبھی نہ کہہ سکوں۔

پانچ سال میں نے تمہارا انتظار کیا ہے کہ تم ملو اور میں اپنے دل کا راز تم سے کہوں ، میرے اللہ ۔ یہ پانچ سال میرے لئے پچاس سال ہوگئے ۔ اوہ میں اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہہ سکتا تھا، لوگ مجھے پاگل سمجھتے ۔۔۔۔۔ خدا جانے کیوں ؟" ان کا خیال ہے کہ حقیقت پھول کی طرح رنگین اور خوشگوار ہوتی ہے ۔ میں نے یہ پانچ سال پی کر بسر کر دیئے اور آج تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کیوں پیتا ہوں۔"

مہجور نے میز سے بوتل اُٹھالی، تھوڑی سی وسکی گلاس میں ڈالی اور چند منٹوں تک اس کی طرف بغور دیکھتا رہا ۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم کھیل رہا تھا ۔

"پی کر میں اپنے سامنے آئینہ رکھ لیا کرتا تھا تاکہ مجھے تنہائی کا احساس نہ رہے وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنے عکس سے باتیں کیا کرتا تھا جیسے وہ ایک ساتھی ہو ۔ ساتھی ! وہ پھر ہنسا ۔ پھر میں گھنٹوں خدا جانے کیا کیا بکتا رہتا ۔ لیکن دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے آئینے میں کوئی حقارت سے میرا منہ چڑا رہا ہو پھر میں آئینے کو اُٹھا کر زمین پر دے مارتا"۔

اُس نے دوچار بڑے بڑے گھونٹ لئے اور گلاس خالی کر دیا ۔ رومال سے منہ پونچھا اور مسکرا کر کہنے لگا ۔

"فرنگی نے سب کچھ کیا مگر اس کی بُو اور ذائقہ نہ بدل سکے۔"

اس نے گلاس میں کچھ اور وسکی ڈالی ۔

"شاید تم سمجھتے ہو ۔ ہم لطف حاصل کرنے کے لئے پیتے ہیں ۔ انہیں دیکھو" اُس نے اپنے اردگرد ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ۔

ہم دونوں ایک گندے شراب خانے میں بیٹھے تھے ، جو ایک تنگ صحن اور میلے برآمدے پر مشتمل تھا ، یہاں وہاں ٹین کی کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ دائیں طرف ایک شخص میز پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا، اس کا ساتھی ترنگ میں جھوم جھوم کر کہہ رہا تھا ۔ "میں اُسے سمجھتا کیا ہوں ۔ وہ میرے متعلق ایسی باتیں کرنے والا کون ہے ۔ کون ہے وہ ہاں ۔ میں پیتا ہوں ۔ میرے سامنے آکر بات کرے ۔ میرے سامنے ۔"

سامنے میز پر دو تین صاحبان میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے، ایک لڑکا بھدی آواز میں گا رہا تھا اور وہ سب جھوم رہے تھے ۔

بائیں طرف ایک شخص گلاس ہاتھ میں لئے کھڑا کہہ رہا تھا ، تم خرچ کی پروا نہ کرو تم پر ہزاروں روپئے قربان کردوں ، خدا کی قسم قربان کردوں ۔ اُس کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے کچھ کہے ۔ ہیں ؟ چلو ابھی چلو ۔ نہیں نہیں میں نشے میں نہیں کون کہتا ہے میں نشے میں ہوں"

مہجور نے زہر خند قہقہہ لگایا ۔ "دیکھ لیا، ان کی شکلیں دیکھو، ان کی باتیں سنو ، یہ ایک دوسرے سے باتیں نہیں کر رہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں ۔ بیچارے ایک دفعہ کہنے سے یقین نہیں آتا ، بار بار اپنے الفاظ دُہرانے پڑتے ہیں، بآوازِ بلند کہنا پڑتا ہے ، جیسے ان کے دل میں کوئی ان کی باتوں پر ٹھٹھا اڑا رہا ہو۔ یہی وہ عیش پرستی ہے، جس کے لئے ہم سب بدنام ہیں ۔ عیش ۔ اُس نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی ۔ زہر خند قہقہہ ۔ انہیں اپنی آواز سُن کر خوشی ہوتی ہے ۔ جس طرح کوئی بچہ پہلی مرتبہ اپنے منہ سے ابا کا لفظ سن کر خوشی سے حیران رہ جاتا ہے ؟ بیچارے انہیں صرف جینے کی تمنا

ہے ۔ صرف اسی بات کا یقین حاصل کرنے کے لئے کہ یہ بھی جی رہے ہیں باتیں کر سکتے ہیں ، انہیں ان لال ہیلی بوتلوں پر اتنے پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں !! ان سب کے دلوں میں ایک راز ہے جسے یہ چھپانا یا کہنا چاہتے ہیں ۔ اس لئے پیتے ہیں ۔ سنا تم نے ۔ اِس لئے پیتے ہیں ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر دفعتاً سنجیدہ ہو کر بولا ۔

"ہاں ۔۔۔۔۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں ، اس لئے نہیں پیتا کہ بلندیوں پر اڑ سکوں ۔ صرف اس لئے کہ ایک کیڑے کی طرح زمین پر رینگ سکوں، جی سکوں۔"

مہجور خاموش ہوگیا، اور وسکی کی بوتل کو گھورنے لگا، بوتل سے کچھ وسکی گلاس میں ڈالی اور اسے بغور دیکھتا رہا ۔

"میرے خیال میں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا ۔ وہ چونک پڑا اور میری طرف دیکھ کر بولا ۔

"تمہارا خیال ۔۔۔۔ تم سمجھتے ہو ، ہم خیال سے خالی ہیں ، وہی خیالات جو تم اپنے سمجھتے ہو، میرے ذہن میں بھی پیدا ہوتے ہیں "یہاں" اس نے اپنی کھوپڑی کو انگلی سے بجاتے ہوئے کہا "یہاں وہ سب باتیں موجود ہیں جو آج تک تم مجھ سے کہتے رہے ہو، اور ۔اور وہ بھی جو ابھی تمہیں کہنا ہے، صرف یہ فرق ہے کہ تم اپنے خیالات کہہ سکتے ہو ۔ اور کہہ کر انہیں اپنا سکتے ہو ، خیالات کی دنیا میں بھی لاٹھی اور بھینس کی بات چلتی ہے ، جو کہہ سکتا ہے وہ اپنا لیتا ہے ، جو کہہ نہیں سکتا ، اسے اپنانے کی اجازت نہیں ۔ سوچو تو کوئی برسوں دل ہی دل میں ایک خیال محسوس کرتا رہے مگر کہہ نہ سکے ۔۔۔۔۔۔ الفاظ میں نہ کہہ سکے اور پھر کسی دن کوئی اور اُسے وہی خیال یوں سنائے، جیسے وہ ایک نیا اچھوتا خیال پیش کررہا ہو ۔ داد طلب انداز میں ، اُس نے ایک حقارت بھرا قہقہہ لگایا ۔ اس وقت اُس کے چہرے کی لکیریں یوں سمٹ گئی تھیں جیسے وہ اپنے آپ سے نفرت محسوس کر رہا ہو ۔

"یونہی اپنے خیالات سننے کے لئے لوگوں کے ہونٹوں کی طرف دیکھتے رہنا،

اس نے بات جاری کی دفعتاً وہ پھر سنجیدہ ہوگیا ، خدا جانے تم میری بات سمجھ بھی رہے ہو یا نہیں اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں ۔ نہ جانے کیا بک رہا ہوں ۔" اس نے گلاس اٹھایا ، دو تین گھونٹ پئے اور اُسے میز پر رکھ کر کہنے لگا "یہ دماغ ایک پھوڑا ہے ، ایسا پھوڑا ہے ،جس کا منہ نہیں بنا ، جو بہہ نہیں سکتا ۔ میرے اللہ !! ـــــ۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا ۔ اپنے شانوں پر ایک کم پھوڑا اُٹھائے پھرنا، جو بہہ نہ سکے ۔ کتنا دکھ ہے ، جیسے کسی آہنی پنجے نے مٹھی میں دبا رکھا ہو ۔ خدا جانے کیا چیز ہے یہ ـــــ۔ جس طرح وہ زرد سی بیل جو درختوں پر چھا جاتی ہے اور انہیں پھیلنے پھولنے نہیں دیتی ، تم کہنا چاہو مگر کہہ سکو اور اَن کہی بات اندر ہی گھُٹ گھُٹ کر پھڑکتی رہے ۔ مگر تم کہنے والے لوگ اس حالت کو کیا سمجھو، تمہارا پھوڑا بہتا ہے ، تمہارے خیالات چلتے ہیں ۔ مگر یہاں اُس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "اک بھنور سا بنا ہے جو انہیں بہنے نہیں دیتا ۔ پھر تم کہتے ہو ۔ پینا چھوڑ دو ۔" اُس نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگایا پھر گلاس کی طرف دیکھا اور اُسے اُٹھا کر غٹاغٹ پی گیا ۔

"اسے چھوڑ دوں ،بیچاری ۔ بدنام، اس لئے کہ اس کا نشہ عریاں ہے چھپ نہیں سکتا اور دنیا والے عریانی سے نفرت کرتے ہیں ۔ شاید ڈرتے ہیں، دولت ، حسن اور حکومت کا نشہ عریاں نہیں، وہ تو خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہوئیں ، یہ بیچاری لنگڑوں اور اپاہجوں کی لاٹھی ، جس کے سہارے وہ دو ایک قدم چل کر خوش ہو لیتے ہیں ، ذرا کمر سیدھی کرلیتے ہیں، ریاض خیر آبادی کا شعر ہے ۔
سنو گے؟ اور پھر آپ ہی آپ بھدّی سی بے سری آواز میں گانے لگا۔

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں
عصا ٹیکتے کیا ریاض آرہے ہیں

اُس نے بوتل میز پر دے ماری ، صرف ایک شعر ، صرف ، ایک ، اگر میں صرف ایک شعر ہی گا سکتا تو آج اس بوتل کے رحم پر نہ پڑا ہوتا ۔ اس تلخ بدبودار گھونٹ کے سہارے نہ جیتا ، صرف ایک شعر یا تھوڑا سا الاپ جو دل کی

دھڑکن کو آواز میں لا سکتا ۔ آخر گانا یہی ہے نا سُر کے پردے میں ہچکیاں لینا، آہیں بھرنا بین کرنا ۔ کس قدر معمولی سی آرزو ہے مگر کس قدر نا ممکن۔

"تمہیں کون سا دُکھ ہے" میں نے جھلا کر پوچھا ۔

"یہی وہ راز ہے جو میں آج تم سے کہنا چاہتا ہوں"۔

"مگر تم اپنا دھیان کسی اور طرف کیوں نہیں کر لیتے ۔ تم پڑھ سکتے ہو ۔ لکھ سکتے ہو ۔ شراب کے علاوہ اور سہارے بھی تو ہو سکتے ہیں ۔

"لکھنا ـــــ ہاں تم بھی تو لکھتے ہو، میں نے تمہاری کہانیاں پڑھی ہیں ، جیسے وہ کسی اور دنیا کے متعلق ہوں محبت کے قصّے قربانیاں ـــــ نہ جانے کیا کیا لکھتے ہو، جسے اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ، یہ خوبصورت پہلو جو تم دیکھتے ہو، دل کی تسلّی کے لئے ہیں اپنے آپ کو لوریاں دیتے ہو جیسے مجھے یہ بدبودار سرخ پانی ۔ اُس نے گلاس کو ہلاتے ہوئے کہا ـــــ حقیقت !! ۔ حقیقت کو دیکھنا !۔ انسان نے ابھی تک اپنے آپ میں اتنی ہمت پیدا ہی نہیں کی ، کہ حقیقت کو دیکھ سکے ، ان جھوٹی تسلیوں اور لوریوں کے بغیر ہم جی ہی نہیں سکتے ـــــ

"کبھی فرصت کے وقت یہاں آبیٹھا کرو، ان اپاہجوں کی باتیں سُنا کرو، اس سے زیادہ حقیقت تمہیں اور کہیں نہیں مل سکتی ، ان کی باتوں میں پردہ داریاں نہیں ، یہ لوگ افسانہ نویسوں کی طرح اپنی باتوں کو آراستہ کرنا نہیں جانتے ۔ کسی روز ان لوگوں میں سے کوئی افسانہ نویس پیدا ہو گا ۔ حقیقت کو ظاہر کرنے والا جو انسان کے دل کی پیچیدگیاں پیش کرے گا ـــــ تم ۔ تم تو واقعات کی دنیا میں بھٹک رہے ہو تم دل کی دنیا سے واقف نہیں ۔ تم لکھنے کے محتاج ہو جس طرح میں پینے کا"۔

"تم اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا ۔

"تم خوش ہو؟ کوئی بھی ہے؟ خوشی کیا ہے؟ دل کو بہلانے کا نام ۔ تم لکھ کر بھلاتے ہو، میں پی کر"۔

مگر تمہارے بچے ہیں ۔ حسین بیوی ـــــ"

"حسین بیوی" ــــــ اُس نے زہر خندہ قہقہہ لگایا اور پھر گلاس اٹھا کر کچھ دیر تک اُسے چھلکاتا رہا۔ پھر دو چار بڑے بڑے گھونٹ پئے اور کہنے لگا۔

"ہاں ـــــــ واقعی وہ حسین ہے ــــــ بیحد حسین اس قدر حسین ہے کہ میں اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میلی ہو جائے گی۔ جب وہ صبح سویرے آنکھوں میں سرمہ لگا کر بال بناتے ہوئے مسکرا کر میری طرف دیکھتی ہے۔" اُس نے کانپ کر کہا۔ "تو میرا جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر جنگل کی طرف بھاگ جاؤں، جہاں کوئی خوبصورت عورت نہ ہو۔ ہنسو نہیں۔ اس نے مجھے گھورا۔ "خدا جانے کیا وجہ ہے، تم حسن سے متاثر ہو کر اس کے حصول کی آرزو کرتے ہو، میں حسن سے متاثر ہو کر اس سے دُور بھاگنا چاہتا ہوں، شاید اس لئے کہ تمہارے جسم کے کسی غدود میں حسن کے لئے قبولیت ہے مگر میرے جسم میں کوئی ایسا غدود نہیں۔ مینڈک کا بہشت چھپر کے گندے پانی ہی میں ہے، سائنسدان کے بلوری مرتباں میں نہیں۔" وہ خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔

"ہاں اگر وہ اس قدر حسین نہ ہوتی تو شاید مجھے پینے کی عادت بھی نہ پڑتی، اس کے حسن میں میرے پینے کا بھید ہے۔"

"یہ سنکر مجھے حیرانی ہوئی، کیا وہ تم سے اچھا سلوک نہیں کرتی؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا سلوک" ــــــ اس نے ایک تمسخر بھرا قہقہہ لگایا ــــــ "پاگل !!" اگر وہ مجھ سے نفرت کرتی تو میں اس قدر پریشان نہ پھرتا، حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس قدر اچھا سلوک کرتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں بلکہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دل کی بات چھپانے کے لئے مجھ سے ظاہر داری کر رہی ہو۔

وہ گھنٹوں بیٹھی میرا انتظار کرتی رہتی ہے، میری صورت دیکھو ـــ میرا انتظار کرتی ہے، جیسے میں بھی کوئی دیکھنے کے قابل چیز ہوں ـــ اس نے ایک

وحشیانہ قہقہہ لگایا، پھر وسکی کے دو گھونٹ پئے اور کچھ دیر کے لئے چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریوں سے ظاہر ہوتا تھا، کہ وہ کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہے ۔۔۔۔۔ اگر وہ صرف اتنا کہہ دے مجھے تم سے نفرت ہے، تم میرے قابل نہیں۔ تو مجھے اطمینان ہو جائے میرے لیے زندگی آسان ہو جائے۔

"ہاں اگر وہ بدصورت ہوتی۔ تو میں اپنے گھر میں یوں داخل ہوتا۔ جیسے گھر کا مالک مگر اب ۔۔۔۔۔۔ اب مجھے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، جھجک محسوس کرتا ہوں اکثر ڈیوڑھی سے واپس لوٹ آتا ہوں، اور ایسے ایسے گندے میخانوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں، اپنا آپ چھپائے پھرتا ہوں ۔۔۔۔۔"

"خدا کی قسم مجھے یہ آرزو نہیں کہ وہ مجھ سے پیار کرے۔ مگر مجھ سے فریب ۔۔۔۔۔ کیوں ۔۔۔۔۔ اس نے بوتل کو میز پر مار کر کہا ۔۔۔۔ مجھ سے فریب کیوں ۔۔۔۔۔

"صرف مجھے اتنا بتا دے کہ وہ کون شخص ہے"۔ وہ خاموش ہو گیا، اسکے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات پر آپ ششدر رہ گیا ہو۔

"تو کیا ۔۔۔۔۔ کیا تمہیں اُس پر شک ہے" ۔۔۔۔۔۔ میں نے جھجک کر کہا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا، گلاس بھرا اور غٹا غٹ پی گیا، ہاں مجھے اس پر شک ہے ۔۔۔۔۔ شک نہیں، یقین ۔۔۔۔۔۔ سوچو تو، وہ اتنی حسین ہونے کے باوجود مجھ جیسے بدصورت شرابی سے خوش رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا، میرا خیال ہے میری غیر حاضری میں ضرور وہ کسی سے ملتی ہے۔ ضرور۔ اُس نے قہقہہ مارنے کی ناکام کوشش کی۔

"اچھا تو یہی تمہارے پینے کا راز ہے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں یہی ۔۔۔۔ جسے میں کسی سے کہہ نہیں سکتا جسے کہنے کے لیے میں تمہیں آج کھینچ کر یہاں لایا ہوں"۔

"دیوانہ" میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"دیوانہ" وہ ہنسا ـ ـ ـ ـ ـ "ہاں دیوانہ ہوں یہ دیوانگی ہی سہی مگر حقیقت ہے ۔ میرے دل کی حقیقت ۔ کون ہے جو دیوانہ نہیں ہر کسی کے دل میں کوئی راز ہے جسے وہ کہنا یا چھپانا چاہتا ہے ۔ اور ۔ اور جب وہ راز اندر ہی اندر پھیل کر بوجھل ہو جاتا ہے اور برداشت نہیں ہو سکتا تو وہ کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈھتا ہے ۔ کوئی پینا شروع کر دیتا ہے کوئی لکھنا ۔ تم ۔ تم مجھے اس ذلیل زندگی سے بچا سکتے ہو ۔ ہاں تم اُس نے میری طرف انگلی اٹھائی ۔ ایک بار مجھے یقین دلا دو ۔ صرف ایک بار یقین ہو جائے تو میں یوں گندے میخانوں میں نہ بھٹکتا پھروں اور اس تلخ گھونٹ کے سہارے نہ جیوں ۔" اُس نے گلاس کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ میری دیوانگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جب میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے میں چھٹی لے کر رات بھر چوروں کی طرح مکان کے اردگرد گھومتا رہتا ہوں ۔ اُف آج تک میں نے کسی کو مکان سے آتے جاتے نہیں دیکھا جب میں گھر جاتا ہوں اور اُس کی بے بس منتظر آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر اس قدر غصہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے چیخ مار کر بھاگ جاؤں اور کسی دیوار سے سر ٹکرا کر مر جاؤں۔"

اُس نے ایک گلاس اور بھرا اور پینے لگا ۔

مگر جلد ہی میرے دل میں وہی شکوک پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔ اور مجھے خیال آتا ہے کہ اس کے کمرے کی کھڑکی گلی میں کھلتی ہے ، شاید وہ کھڑکی سے آتا ہو میں دروازے اور کھڑکی کو ایک وقت میں اپنی نظر میں نہیں رکھ سکتا ۔

"وہ صرف یہی چاہتی ہے کہ میں پینا چھوڑ دوں" اس نے ایک تمسخر بھرا قہقہہ لگایا ۔ "پگلی !! ـ ـ چلاک عورت!! ـ ـ خدا جانے کیا بھید ہے ـ ـ ـ پینا چھوڑدوں ، یعنی اُسے اپنے آپ پر حرام کر لوں بن پئے میں اسے چھو بھی نہیں سکتا ، صرف پی کر مجھ پر اس کے حسن کا خوف نہیں رہتا ۔ تمیز نہیں رہتی ۔ اور میں خدا جانے کیا کیا کہتا اور کرتا ہوں ـ ـ ـ ـ اِس کے باوجود وہ چاہتی ہے

کہ میں پینا چھوڑ دوں ؟ ۔۔۔ کیا کوئی عورت یہ چاہتی ہے کہ اس کا خاوند اُسے پیار کرنا چھوڑ دے ؟ کیا یہ کافی ثبوت نہیں؟ میرے اللہ کیا مصیبت ہے" وہ ایک ساعت کے لیے چپ ہوگیا ۔

"کاش وہ بدصورت ہوتی وہ بولا اور میں گڑیا سمجھ کر اُسے پاؤں سے ٹھکرائے پھرتا" ۔ مگر میری وحشت کی یہ حد ہے کہ کئی دفعہ نیند میں اپنے گھر کے باہر گھومتا رہتا ہوں، کئی دفعہ میرے ملازم نے مجھے دیکھا ہے، پہلے تو میں اس کی بات غلط سمجھتا رہا ۔ پھر ایک رات میری بیوی نے خود مجھے باہر دیکھا وہ گھر سے باہر نکل آئی اور اس نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا ، میں نے اپنے آپ کو گلی میں چادر لئے کھڑا پایا اور وہ حیران اور خوفزدہ انداز سے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی ، اس روز مجھے یقین ہوگیا کہ میں نیند میں چلتا ہوں، نیند میں بھی دیوانوں کی طرح گھومتا پھرتا ہوں ۔ کس قدر دیوانگی ہے، نہ جانے اسے کیا کہتے ہیں ۔۔۔ سامنیبولزم ۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوگیا ۔

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں" اُس نے منت بھرے انداز سے کہا ، جیسے لاچار ہو چکا ہو مجھے دیکھو اتنی پی کر ابھی تک ہوش میں ہوں ابھی میں گھر نہیں جا سکتا اس لئے کہ ابھی مجھے یہ احساس ہے کہ چھونے سے وہ میلی ہو جائے گی، اور تم کہتے ہو کہ پینا چھوڑ دوں ۔ اُس نے قہقہہ لگایا تمسخر بھرا قہقہہ ۔

"اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ محض تمہارا وہم ہے تو کیا تم پینا چھوڑ دو گے ؟"

میں نے پوچھا ۔

"پاگل ہو" وہ چلایا اگر مجھے یقین ہو جائے تو پینے کی کیا ضرورت ۔ چھوڑ دوں گا ۔ بالکل چھوڑ دوں گا ۔ مگر تم مجھے کیسے یقین دلاؤ گے؟"

"میری باتوں کا جواب دو"۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا ۔

"کہو" اُس نے ایک اور گلاس چڑھا کر کہا ۔

"کیا تمہارا مکان کسی گنجان آباد علاقہ میں ہے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ۔۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا ۔۔ مجھ سا ایک کم

تنخواہ کا فرد میرا مکان نئی آبادی کے ایک کونے میں ہے بالکل تن تنہا، اردگرد کوئی مکان نہیں اُس طرف بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں ۔"

"یعنی کوٹھے سے کوئی آ جا نہیں سکتا"۔

"قطعی نہیں میں نے اُسے بڑی تلاش کے بعد چُنا تھا"۔

"تمہاری رات کی ڈیوٹی کب ہوگی ؟"

"کل سے ۔ ایک ہفتہ کے لئے"۔

"اچھا تو تم ایک ہفتے کی چھٹی لے لو، ہم دونوں تمہارے گھر کے قریب کسی ہوٹل میں جا رہیں گے ۔ تم رات وہاں رہا کرنا اور دن کو حسب معمول گھر چلے جایا کرنا تاکہ تمہاری بیوی پر ظاہر نہ ہو کہ تم چھٹی پر ہو ۔۔ رات کو دس بجے ہم تمہارے گھر کے دروازے اور اُس کھڑکی کے سامنے زمین پر نیل بچھا دیں گے ، تاکہ کوئی اندر جائے یا باہر نکلے تو اس کے پاؤں کا نشان بچھے ہوئے نیل پر پڑ جائے، صبح سویرے پانچ بجے کے قریب جاکر دیکھ لیا کریں گے اگر نیل پر پاؤں کا نشان نہ ہوا تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ تمہارا خیال غلط ہے، اگر مسلسل آٹھ دن تک کوئی نشان نہ ملا تو کیا تمہیں یقین آجائیگا"۔

"واللہ کیا تجویز ہے ۔ مجھے یہ بات کبھی نہ سوجھی تھی وہ چلّایا ۔

"کیا دروازے اور کھڑکی کے علاوہ تمہارے گھر میں آنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے" ۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا ۔

"نہیں تو ۔ کوئی نہیں"۔۔۔ واللہ کیا تجویز ہے وہ پھر ہنسنے لگا ۔ مانتا ہوں اُس نے گلاس میں شراب انڈھیلنا شروع کر دیا ۔

ہم نے ہوٹل میں ایک ایسا کمرہ لے لیا جس کا دروازہ باہر سڑک پر کھلتا تھا نیل کے ڈبے خریدے ، رات کو دس بجے مہجور کے گھر کے دروازے اور کھڑکی کے سامنے زمین پر نیل کی پتلی سی تہہ بچھا دی ، چار بجے کا الارم لگایا اور سو گئے ۔

اُس رات مجھے نیند نہ آئی ۔ نہ جانے کیوں ۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زبردست واقعہ ہونے والا ہے ۔ ایسا واقعہ جسے براہ راست مجھ سے

تعلق تھا ۔ عجیب احساس تھا یہ ۔

جب بھی سونے کے لئے آنکھ بند کرتا ۔ تو آنکھوں کے سامنے نیل ہی نیل بچھا دکھائی دیتا ۔ اور اس نیل کے پھیلاؤ کے عین درمیان میں ایک حسینہ دکھائی دیتی جیسے اُس نیلے ساگر میں ڈوبی جا رہی ہو ۔ معاً میری آنکھ کھل جاتی اور میں پھر کروٹیں لینے لگتا ۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا گویا میری تمام تر خوشی کا انحصار اس بات پر ہے کہ نیل پر کوئی نشان نہ لگے ۔

مہجور اُس رات خاموش تھا ۔ نیل بچھاتے وقت اُس نے صرف اتنا کہا ۔ کون جانتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے ۔" اُس رات اُسے پینے کا خیال نہ آیا ۔ نہ جانے کیوں وہ سرشام ہی چادر اوڑھ کر سوگیا اور جلد ہی خراٹے لینے لگا ۔

تین بجے کے قریب میری آنکھ کُھل گئی ۔ اس وقت مہجور گہری نیند سو رہا تھا ۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیل رہا تھا، مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ پہلی مرتبہ اطمینان کی نیند سو رہا ہے "بیچارہ ۔"

نہ جانے کیوں میرا دل شوق سے اچھل رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ جا کر دیکھوں نیل پر کوئی نشان تو نہیں ۔ مہجور کو جگانا بے کار تھا اس لئے میں اکیلا ہی اس کے مکان کی طرف چل دیا جیسے اسے یقین دلانے کی بجائے میں اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے مضطرب تھا ۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے ٹارچ جلائی ۔ نیل کی تہہ اُسی طرح جمی ہوئی تھی نہ جانے کیوں میرے دل کو دھکا سا لگا دل میں مبہم سا افسوس پیدا ہوا ۔ میں کھڑکی کی طرف چل دیا ۔ شاید یہاں کوئی نشان ہو ۔ دل میں امید پھر سے چٹکیاں لینے لگی ۔ نہ جانے کیوں ۔ کھڑکی کے سامنے بچھے ہوئے نیل پر ننگے پاؤں کے نشانات پڑے تھے ۔ نشانات کو دیکھ کر میرے دل میں عجیب سی کپکپی پیدا ہوئی ۔ جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ نشانات میرے پاؤں کے تھے اور میں ۔ میں اُس حسینہ سے مل کر آرہا تھا ۔ لاحول ولا قوت میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ جذبہ مجھ پر چھائے جا رہا تھا ۔ میرا دماغ شل ہو چکا تھا ۔

پاؤں ڈگمگا رہے تھے جیسے میں نے پی ہوئی ہو ۔

ہوٹل میں اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر مجھے ٹھوکر لگی ۔ میں نے ٹارچ جلائی ۔ میری نگاہ اپنے بوٹ پر پڑی ۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ نیل پر ننگے پاؤں کے نشان تھے ۔ وہ پاؤں ننگا کیوں تھا ۔ وہ پاؤں ننگا کیوں تھا ؟ جاڑوں میں ننگے پاؤں ــــــــ مزدور !!

سامنے مہجور سو رہا تھا ، میں نے ٹارچ جلائی ، اُس کے منہ پر وہی اطمینان بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی ــ بیچارہ ـــ ابھی جانتا نہیں ـــ میں نے اُسے دیکھ کر کر آہ بھری ـــ اُس نے کروٹ لی، رضائی اتار دی ۔ دایاں پاؤں پھیلایا ۔ جیسے انگڑائی لے رہا ہو ۔

ہائیں ۔ حیرانی سے میرے منہ سے چیخ نکل گئی ۔

اُس کے پاؤں کا تلا نیلا ہو رہا تھا ۔ نیچے فرش پر پاؤں کے نیلے نشانات پڑے ہوئے تھے ۔

اُس کوچے میں

بازار میں مظفر کی دکان اُس کوچے کے عین مقابل میں تھی جہاں شام کو مزدور لوگ کھانے کمانے اور کمانے کھانے کے چکر سے اکتا کر تھوڑی سی دلکی خریدنے جاتے ہیں ۔ دُوکان پر ایک بورڈ پر ڈاکٹر ایم مظفر لکھا ہوا تھا دروازوں اور دیواروں پر مختلف سائز کی تصاویر لٹک رہی تھیں ۔ جن میں دانت ہونٹ اور مسوڑوں کے ڈراؤنے منظر تھے ۔ اندر دو چار الماریوں میں دانتوں سے متعلقہ سامان چنا ہوا تھا ۔ بائیں طرف چند ایک خوفناک مشینیں کھڑی تھیں ۔ جن کو دیکھ کر درد سے سلسلاتے ہوئے دانت فوراً دکھنا بند کر دیتے ۔

مظفر شیشے کی الماری کے پاس کھڑا زنبور صاف کر رہا تھا ۔ حمید کرسی پر بیٹھا بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔بازار میں دُھندلی غبار آلود چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔

سامنے گھر سے ایک مدھم چیخ سُنائی دی ۔

مظفر کے ہاتھ سے زنبور گر گیا ۔ ایک دھماکے سے الماری کا شیشہ چُور چُور ہو کر بکھر گیا ۔

حمید چونک پڑا ۔ "کیوں کیا ہوا"۔

"کچھ نہیں ۔۔ مظفر نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی ہاتھ سے زنبور پھسل گیا ۔" اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا ۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی ۔

"تم یہ آواز سن رہے ہو؟" ۔ مظفر نے رُکتے ہوئے پوچھا ۔

"شاید کوئی چیخ رہا ہے"۔

"ہوں ۔ یہ سامنے والے مکان میں" مظفر نے سر ہلایا ۔

"وہی دُبلی پتلی لڑکی جو اس نکڑ پر بیٹھی ہے؟" حمید نے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہاں وہی"۔

"بیمار ہے کیا؟"

"نہیں ـــــ کوئی پیٹ رہا ہے"۔

"ہاں"۔

"کیوں ؟"

"نہ جانے کیوں؟"

کمرے پر پھر خاموشی چھا گئی۔

ہوا درختوں کی ٹہنیوں میں چیخ رہی تھی۔ فضا غبار سے بھری ہوئی تھی۔ چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے پنواڑی کی دکان پر دو ایک لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی اور ان مدھم چیخوں کو اور بھی بھیانک بنا دیتی۔ حمید بیٹھا غور سے سُن رہا تھا۔

"یہ انسان کی انتہائی ذلت ہے پیٹ بھرنے کی خاطر لوگوں سے پٹنا کس قدر ذلت ہے" مظفر اپنے آپ ہی بڑبڑانے لگا اس کا منہ نفرت اور غصے سے دھمک رہا تھا۔ جو کوئی آتا ہے اس کو پیٹتا ہے۔ مجھے تو اس عورت پر ترس آتا ہے۔"

"ترس" حمید نے حیرانی سے مظفر کی طرف دیکھا "اگر تم یوں لوگوں پر ترس کھانے لگے تو تمہارا کوئی علاج نہیں! ترس کھانا خودکشی سے کم نہیں"

تم نے اُسے دیکھا بھی ہے؟" مظفر اپنی دھن میں بولا۔

"اس لڑکی کو؟" حمید نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"ہاں"۔ مظفر کے انداز میں اضطراب نمایاں تھا۔

"بے بس نیم جان سی ہے"۔

"ہوں"۔

مقابل کے مکان کا دروازہ کھلا ۔ ایک دُبلا مرد باہر نکلا ۔ اور لاپرواہی سے دکان کے سامنے سے گذر گیا ۔ اُس کی بھوئیں تنی ہوئیں تھیں چھاتی بھینچی ہوئی ۔

"دیکھا تم نے ؟" مظفر نے اس دبلے پتلے مرد کی طرف اشارہ کیا ۔

"یہی پیٹ رہا تھا اُسے؟"

"ہاں کس قدر مکروہ شکل ہے" ۔ مظفر نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا ۔ "شاید اسی نے اُسے یہاں بٹھا رکھا ہے ۔ کیا نام ہے اُس کا ؟" حمید نے پوچھا ۔

"چندا" ۔ مظفر کی آواز بھرائی ہوئی تھی ۔

مظفر کو اُس کوچے سے سخت نفرت تھی ۔ جب اُس نے وہ دکان بنوائی تھی تو اُس کوچے کا وہاں وجود تک نہ تھا ۔ پھر نہ جانے وہ کہاں سے آگئیں حتےٰ کہ وہ جگہ اُن کے لئے مخصوص ہو گئی ۔

شروع شروع میں جب کبھی اُس کی نظر اُدھر پڑجاتی تو وہ "لاحول" پڑھ کر الماری میں اپنے اوزاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ۔ حمید اُسے اس بات پر چھیڑتا تو وہ غصے سے لال ہو جاتا ۔ پھر اُسے یہ سوجھی کہ اُس صراط مستقیم سے گری ہوئی مخلوق کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنا چاہئیے ۔ مگر اس کے باوجود اس نے کبھی آنکھ بھر کر اس کوچے کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ وہ ڈرتا تھا کہ عبرت حاصل کرنا چاہئیے ۔ مگر اس کے باوجود اس نے کبھی آنکھ بھر کر اُس کوچے کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ وہ ڈرتا تھا کہ عبرت حاصل کرتے کرتے وہ یہ نہ بھول جائے کہ وہ محض عبرت حاصل کرنے کے لیے دیکھ رہا ہے ۔ یا وہ نفرت جو اُس کوچے کے متعلق اُس نے دل میں پال رکھی تھی ختم نہ ہو جائے ۔

کوچے کے علاوہ اُسے کوچے والیوں سے بھی سخت نفرت تھی ۔ جو شام کو بھولے بھالے مزدوروں کو دام میں پھنساتی تھیں ۔ جو صبح کی روٹی کے لئے مزدوروں کا کھلونا بننا گوارہ کرتی تھیں ۔ جو دُکھے ہوئے دلوں کے لئے ہمدردی بیچتی تھیں ۔ اور مظلوم مزدوروں کی تشدد کرنے کی آرزو کو پورا کرتی تھیں ۔

شام کو صراط مستقیم سے گری ہوئی اس مخلوق کے کوچہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے اور جاذبیت پیدا کرنے کی امید پر وہ لٹی ہوئی شکلیں اپنے ڈھانچوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیتیں ۔ پھر جب سورج چھپ جاتا جیسے بلا امتیاز ہر چہرے پر تنقید کرنے کے بے درد عادت ہے تو وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی چوکیوں پر لالٹین کی دھندلی مگر ہمدرد روشنی میں جو بوسیدہ کپڑوں میں بھی ایک دھندلی دمک پیدا کر دیتی ہے ۔ مزدوروں کے انتظار میں آ بیٹھ جاتیں ۔

مزدور دن بھر کی مشقت کے بعد وہاں آ جاتے اور یوں ہنستے بولتے اور آنکھیں چمکاتے ہوئے وہاں سے گذرتے جیسے کسی برات کیساتھ جا رہے ہوں ۔ جیسے وہ غم و فکر سے واقف ہی نہ ہوں ۔ اُنہیں یہ قطعی بھول جاتا کہ زندگی اُن کے لئے مسلسل مشقت ہے ۔ یا شاید مشقت اور بے بسی کے احساس کو بھولنے کے لئے وہ وہاں آتے تھے ۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اللہ کی دُنیا میں وہ بھی کچھ حیثیت رکھتے ہیں ۔ اُن سے گری ہوئی مخلوق بھی ہے ۔ جسے وہ حقارت کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں ۔ خرید سکتے ہیں ۔ اپنی خواہشات کے پاؤں تلے روند سکتے ہیں ۔ جن کے وہ رزاق بن سکتے ہیں ۔

اکثر بیٹھے بٹھائے مظفر کو احساس ہوتا کہ وہ اُدھر دیکھ رہا ہے ۔ اُس وقت اُس کا چہرہ نفرت سے سُرخ ہو جاتا ۔ اور اُس کے ماتھے پر تیوری پڑ جاتی اور وہ "لاحول" پڑھ کر زنبور کو صاف کرنے یا تصویر کو سیدھا کرنے میں شدت سے مصروف ہو جاتا ۔ یا وہ آپ بولنے لگتا ۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے ہاں ٹھیک ہے ۔ توبہ کس قدر گرمی ہے" ۔ اس وقت اُس کا جی چاہتا کہ دکان بند کر کے دور بھاگ جائے ۔ دور

پھر وہ دکان میں چاروں طرف ٹہلنے لگتا ۔ الماریاں کھولتا بند کرتا ۔ قلم کو یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتا ۔ اور آخر کار پھر کرسی پر آ بیٹھتا اور سامنے دیوار پر سینما کا اشتہار غور سے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ۔ حتیٰ کہ اُسے پھر احساس ہونے لگتا کہ وہ اُدھر دیکھ رہا ہے ۔

چندا پھر اپنی چوکی پر آ بیٹھی تھی ۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گیند سی تھی ۔ جسے وہ اُچھال رہی تھی ۔ اور دبی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی ۔ شاید وہ

اُس گیند اور گیت کی مدد سے کچھ بھولنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ اُس کے چہرے پر انتہائی بے بسی چھائی ہوئی تھی ۔ کوئی اسے دیکھتا تو وہ سہم جاتی ۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سہم کر اور بھی حسین ہو جاتی ہیں ۔ شاید اسی لئے وہ بات بات پر سہم جاتی تھی ۔

اُسے دیکھ کر ایک معمولی سے تھکے ہارے مرد کے دل میں بھی یہ احساس بیدارہو جاتا ہے کہ میں ایک زبردست مرد ہوں ۔ چھاتی تن جاتی اور ماتھے پر شکن پڑ جاتے ۔

مظفر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے میں شدت سے مصروف تھا ۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے حمید کی موجودگی تمام کمرے پر چھائی ہوئی ہو ۔ وہ اُس کا بوجھ اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا اسی لئے اسے اپنی گردن اس قدر اکڑی اکڑی محسوس ہو رہی تھی ۔

حمید بیٹھا غور سے چندا کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اُس کے ہونٹ خود بخود تبسم سے کھل رہے تھے ۔ جیسے وہ کوئی لطیفہ سُن رہا ہو۔

"ابھی جوان ہی ہے" حمید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ۔

"کون؟"

"یہی نکڑ والی لڑکی ۔ کیا نام ہے اُس کا ۔۔۔ چندا"

جوان ۔ یہ بات اسے کبھی نہ سوجھی تھی ۔ "بیچاری" اس نے حقارت سے کہا اور چپ ہوگیا ۔ اُسے سمجھ میں نہ آتا تھا وہ چندا کے متعلق کیا کہے چندا کے ذکر پر گھبراہٹ محسوس کرنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتا تھا ۔

"تم نے کبھی اُس سے بات بھی کی ہے کیا" حمید نے پوچھا ۔

"میں نے؟" ایک ساعت کے لئے مظفر حیران رہ گیا ۔

"کیوں اس میں کوئی بری بات ہے"

"بری بات!" اس نے دہرایا خواہ مخواہ اس پر پریشانی چھائے جارہی تھی ۔

"واہ اچھی ہمدردی ہے" حمید مسکرایا جو الماریوں کے شیشے پھوڑنے کے

سوا کچھ نہیں کر سکتی"۔

مظفر نے پھوٹے ہوئے شیشے کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کی ۔

"چلو چل کر اُس سے پوچھیں تو سہی ۔ چلو گے؟" حمید نے مدھم آواز میں کہا۔

مظفر نے بیساختہ سامنے پنواڑی کی دکان کی طرف دیکھا ۔ جہاں ایک دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے "یہ کیا دیوانگی ہے؟" اُس نے حمید پر ملامت بھری نگاہ ڈالی ۔

"اُس سے ڈرتے ہو؟"

"میں ـ۔ میں کیوں ڈرنے لگا؟" مظفر نے جُھرجُھری لی ۔

"چلو تو" حمید نے اُٹھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر باہر لے گیا ۔

"ارے؟ ارے پاگل تو نہیں ہوگئے ؟" مظفر گھبرا کر بولا ۔ "میں کہتا ہوں حمید" اُس نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ لیکن حمید بولے بغیر اُسے گھسیٹتا ہوا لئے جا رہا تھا ۔ "اچھا' اچھا میں آپ چلتا ہوں ۔" مظفر نے پنواڑی کی دوکان کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔

"ہاں تو چلو پھر" حمید بولا ۔

"لیکن فائدہ" مظفر بادل ناخواستہ قدم اٹھاتے ہوئے بولا ۔

"بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟" حمید نے کہا ۔

"اہم!!" پنواڑی کی دکان سے بآواز بلند با معنی کھنکھار کی آواز سنائی دی ۔ مظفر کا دل ڈوب گیا ۔ لیکن اس وقت وہ چندا کے قریب پہنچ چکے تھے اور وہ عجیب انداز سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی نگاہ میں تمسخر اور شک کا امتزاج تھا ۔

"تم بیمار تو نہیں ہو" ۔ حمید نے چندا سے پوچھا ۔

چندا کی دعوتی مسکراہٹ تیوری میں بدل گئی ، مگر وہ تیوری گھور نہیں سکتی تھی ۔

مظفر نے حمید پر غصے اور ملامت بھری نگاہ ڈالی ۔

"نہیں نہیں" حمید نے مسکراتے ہوئے کہا "تم ابھی ابھی چیخ رہی تھیں میرا مطلب ہے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ۔ اگر ہم تمہاری مدد کر سکتے ہوں تو"

"مہربانی ہے" وہ بولی ۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں ۔ "بیٹھیئے" چندا اٹھ بیٹھی ابھی تک اس کی آنکھوں میں شکوک جھلک رہے تھے ۔ "آئیے" حمید اندر آنے لگا تو مظفر ازسرنو گھبرا گیا ۔ "نہیں نہیں" وہ چندا کے بلاوے کے جواب میں گنگنایا ۔ پھر حمید سے مخاطب ہو کر بولا "اندر جانے کی کیا ضرورت ہے کیا حرج ہے" حمید نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ۔ "لیکن لیکن" مظفر نے گھبرا کر چوری چوری چندا کی طرف دیکھا جو دروازے میں کھڑی اداس انداز میں مسکرا رہی تھی ۔ جیسے اس کی گھبراہٹ پر ہنس رہی ہو "جیسے آپ کی مرضی" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی اور پیشتر اس کے کہ مظفر کچھ کہتا حمید نے اُسے گھسیٹ کر کمرے میں دھکیل دیا ۔

کمرے میں پہنچ کر وہ اور بھی گھبرا گیا ۔ پھر چاروں طرف دیکھنے میں مصروف ہو گیا ۔ اور پھر چندا کے قرب کو محسوس کر کے حمید کی طرف جھک گیا ۔

"یہ کون آدمی تھا جو ابھی یہاں سے گیا ہے؟" حمید نے آنکھوں میں مسکراتے ہوئے چندا سے پوچھا" تمہیں اس بیدردی سے کیوں پیٹتا ہے؟"

"جانے دیجئے" چندا نے آہ مار کر کہا ۔

"پھر بھی بتاؤ تو سہی" حمید نے اپنی نگاہیں چندا کے چہرے پر گاڑ دیں ۔

"میں اُس کی باندی ہوں ۔ اپنی اپنی قسمت ہے" چندا نے آنکھیں بنا کر حمید کی طرف دیکھا ۔

"مگر وہ تمہیں پیٹتا کیوں ہے؟"

"اُس کا خیال ہے کہ میں پیسے چراتی ہوں" اس کے ہونٹوں پر حسرت بھری مسکراہٹ آگئی ۔

مظفر بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"تم اپنی کمائی اُسے دیتی ہو۔" حمید نے پوچھا۔

چندا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر تم ایسی زندگی کس طرح گوارہ کرتی ہو؟" حمید کی آواز میں غصے اور نفرت کی جھلک تھی۔

چندا کی آنکھوں میں بے بسی جھلک رہی تھی۔ "ہاں لوگ سمجھتے ہیں۔ ہمیں یہ زندگی پسند ہے ------ مگر ------" اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

"ہمیں آپ سے بہت ہمدردی ہے۔" مظفر نے پہلی بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔

اس کا دل دھڑک دھڑک کر تمام کمرے میں گونج رہا تھا۔ اور نگاہیں چندا کے چہرے کی بے بسی پر جمی ہوئی تھیں۔

چندا نے مسکرانے کی کوشش کی "آپ کی بڑی مہربانی ہے -----"

حمید نے مظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں جانتی ہو۔ یہ میرے دوست ڈاکٹر صاحب ہیں چندا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کو تم سے بہت ہمدردی ہے"۔

مظفر نے حمید کو ملامت بھری نگاہ سے دیکھا۔

"تمہیں چلاتے ہوئے سُن کر یہ ہمدردی کے مارے دکان کے شیشے پھوڑتے رہتے ہیں"۔

چندا مسکرا دی۔ وہ چپ چاپ مظفر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی بے بسی چپکے چپکے کسی بات کی دعوت دے رہی تھی۔ مظفر سخت پریشان تھا سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے "آپ چپ کیوں ہیں ڈاکٹر صاحب" چندا نے مظفر سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور پھر اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"میں۔ میں۔ میرا مطلب ہے" مظفر نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ آئے" وہ زیر لب مسکرا دی۔

مظفر کی گھبراہٹ محسوس کر کے حمید نے گفتگو کا موضوع بدل دیا ۔ میرا مطلب ہے ۔ کیا واقعی تم اس زندگی کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو ۔ اگر"

"اگر ۔۔ " چندا نے زہر خند مسکراہٹ سے دوہرایا "اگر ۔۔" اُس نے مظفر کی طرف ایک مظلوم نگاہ ڈالی ۔ اُس نگاہ کو دیکھ کر مظفر نے یوں محسوس کیا جیسے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو برداشت کر سکتا تھا ۔ وہ جوش میں آگیا ، نہ جانے کیوں ۔ "چلو حمید چلیں دیر ہو چکی ہے ' چلو" اُس نے حمید کا بازو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا ۔

"اگر تم کو ہماری مدد کی ضرورت ہو" حمید نے اپنی چھڑی سنبھالتے ہوئے کہا ۔

"آپ کی مہربانی ہے"۔ چندا نے مسکرا کر اُس کی بات کاٹ دی اور انہیں راستہ دکھانے کے لئے لالٹین اُٹھانے کو ہاتھ بڑھا دیا ۔ اُس کے بازو پر بید کا ایک بڑا نشان تھا جس سے خون رِس رہا تھا ۔

"ہئیں؟" حمید اپنی بات کو مکمل کرنا بھول گیا ۔

"چوٹ لگ گئی تھی" ۔ چندا نے نشان کو چھپاتے ہوئے کہا ۔

مظفر کی نگاہوں میں وہ کمرہ گھومنے لگا ۔۔ میں جاتا ہوں ۔ آپ ٹھہرئیے ابھی ٹنچر لے آتا ہوں ۔۔ میرا مطلب ہے دوائی ۔۔ یہاں ۔۔ دکان سے"

اچھا تو میں چلتا ہوں ۔ حمید نے مظفر سے مصافحہ کرنے کی کوشش کی مگر مظفر کو اُس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ حمید جا رہا ہے یا پنواڑی کی دکان پر بیٹھے ہوئے لوگ اُسے یوں بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہے ہیں ۔ یا وہ صراط مستقیم سے گری ہوئی مخلوق سے عبرت حاصل کر رہا ہے ۔ اس کا دماغ شل ہو چکا تھا ۔ اور سوچنے کی قوت مفقود ۔

چندا کے بازو پر دوائی کا لیپ کرتے ہوئے مظفر کی انگلیاں اُس دبلے بازو کی گرمی محسوس کر رہی تھیں ۔ نگاہیں بازو سے پھسل کر اُس کے جسم پر جا پڑتیں جہاں قمیض کی سلوٹیں اُبھر اُبھر کر کسی چھپے ہوئے مدوجزر کا اظہار کر رہی تھیں ۔

چندا اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی ۔ جیسے اُس چہرے کے اتار چڑھاؤ میں اپنا مستقبل دیکھ رہی ہو ۔

بہت تکلیف ہے آپ کو مظفر اپنے آپ ہی بڑ بڑانے لگا ۔

ویسے ہی خراشیں سی ہیں ۔ چندا نے بے پرواہی سے کہا ۔

"مگر تم اس زندگی کو چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟"

"چھوڑ کیسے سکتی ہوں؟" اُس نے آہ بھری ۔

"تم اس کی زرخرید ہو کیا ۔ مظفر نے پہلی مرتبہ جھجکے بغیر چندا کی طرف غور سے دیکھا ۔

"ہاں" وہ بولی "دو سو روپیہ"۔

"دو سو روپے !" وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ۔۔ اچھا اگر تمہیں دو سو روپے مل جائیں تو؟ پھر تم آزاد ہو جاؤ گی؟"

"مگر میں کوئی کام بھی تو نہیں جانتی" چندا کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔

"اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی جانا" ۔ مظفر نے امید بھری نگاہ سے اُسے دیکھا ۔

" کوئی بھی نہیں ۔ چندا نے ہونٹ نکال کر کہا ۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ۔ بس یہی ایک جان ہے ۔ جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں"۔ اُس نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔

اُس کے پاؤں میں ایک سیاہ بلّی بیٹھی غرا رہی تھی ۔

کچھ دیر مظفر خاموش رہا ۔"کسی سے شادی کر لینا" اُس نے بھرائی آواز میں کہا ۔

وہ ہنس پڑی ۔ "مجھ سے شادی کون کرے گا؟"

مظفر کا دل خواہ مخواہ پیچ و تاب کھانے لگا جیسے کسی نے اُسے چڑا دیا ہو "تم ایسی ذلیل زندگی کیسے بسر کر سکتی ہو ۔ تمہارے دل میں احساس نہیں کیا ۔ یہ ذلّت کی انتہا ہے" ۔ غصّے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں ۔

چندا اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی ۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ خوف سے یا خُدا جانے خوشی سے ۔ مظفر کو غصہ چڑھ رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں ۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس رذیل عورت کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے ۔

"میں جاتا ہوں ۔ وہ غصے سے غرایا اور چندا کو لالٹین اٹھاتے ہوئے دیکھ کر بولا ۔ نہیں نہیں ۔ بتی کی ضرورت نہیں میں چلا جاؤں گا"۔

"آپ کی مرضی" ۔ چندا نے چونک کر کہا ۔ جیسے کوئی رنگین خواب دیکھنے کے بعد جاگ اُٹھی ہو ۔ مگر مظفر جا چکا تھا ۔

اگلی شام کو مظفر سخت پریشان تھا ۔ بن دیکھے وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ نکڑ پر چندا بیٹھی ہے اور اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے ۔ وہ اٹھ بیٹھا ۔ اُس نے تیسری دفعہ دوکان میں تصویروں کو ٹھیک کیا ۔ زنبور کو صاف کیا ۔ الماریوں کو کھولا اور بند کیا ۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اہم بات بھول چکا ہو ۔ جسے یاد کرنا اشد ضروری تھا ۔ بے خبری میں اُس نے اپنی کُرسی کو موڑ لیا اور کتاب پڑھنے کے لئے بیٹھ گیا ۔ لیکن جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ سامنی دیوار پر سینما کے اشتہار کو گھور رہا ہے ۔

دفعتاً اس کی نظر سڑک پر پڑی اور گھبرا گیا ۔ سامنے وہی دُبلا پتلا مرد چندا کی طرف جا رہا تھا ۔

مظفر اُٹھ بیٹھا ۔ اوہ! مجھے تو حمید کے ساتھ سینما جانا ہے ۔ دوسرے شو میں بہت تھوڑا وقت باقی ہے ۔ دوکان بند کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سہمی ہوئی شکل آکھڑی ہوئی ۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اُسے اشارے کر رہی ہے ۔ "لاحول ولاقوت ۔ ذلیل ہے تو ہوا کرے ۔ مجھے کیا لینا دینا ۔" وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا ۔ جیسے خاموشی سے ڈرتا ہو ۔ "توبہ کس قدر گرمی ہے ۔۔۔۔ یہ کتے خدا جانے کیوں بھونکتے ہیں؟ ۔۔۔ کتنے کتے ہیں ۔ اس شہر میں! اف!!"

"حامد تو کہتا ہے کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے تمہیں وہاں سے نکلتے دیکھا ہے ۔" مظفر کے باپ نے حقے کی نے کو ایک طرف کر کے زمین کو گھورتے

ہوئے کہا ۔

" میں کب کہتا ہوں کہ میں وہاں نہیں گیا ۔ مظفر نے جواب دیا ۔ بیچاری کو تکلیف تھی ۔ میں اُسے دوائی دینے گیا تھا ۔ اس میں برا کیا ہے "۔

"مگر بیٹا لوگوں کو تو معلوم نہیں کہ تم وہاں دوائی دینے گئے تھے ۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ تم وہاں گئے تھے ۔" مظفر کے والد نے الماری میں سلمان کو گھورتے ہوئے کہا ۔ اُن کی نگاہیں فرش پر ادھر اُدھر آوارہ تھیں جیسے سہارا لینے کے لئے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہوں ۔

"لوگ !" مظفر نے دانت پیستے ہوئے دہرایا "لوگ تو اندھے ہیں کمینے ۔ آپ حمید سے پوچھ لیجئے ۔"

"نہیں بیٹا"۔ باپ نے یوں کھانستے ہوئے کہا جیسے وہ مظفر کے الفاظ اپنی کھانسی سے ناپید کر دینا چاہتے ہو ۔ جیسے لوگوں کے متعلق ایسے کلمات سننا انہیں گوارا نہ تھا ۔ شاید اس لئے کہ انہیں لوگوں سے اتفاق تھا ۔ حمید کی اور بات ہے ۔ تم اپنی ہمشیرہ کے سسرال والوں کو تو جانتے ہی ہو ۔ وہ تو صرف بہانہ ہی چاہتے ہیں ۔ ایسی عورتوں سے ہمدردی کرنا بھی گناہ ہے ۔"

"آپ لوگوں کی باتوں پر یقین کرتے ہیں ۔ مظفر غصے میں آگیا ۔ لیکن میری بات پر یقین نہیں کرتے ۔ تو کیا کسی سے ہمدردی کرنا گناہ ہے "۔

" لیکن ایسی عورت" وہ بولے ۔

"کیوں" ۔ مظفر نے بات کاٹ کر کہا "وہ انسان نہیں کیا ۔ کیا ایسی عورت سے نکاح جائز نہیں؟"

"لیکن دنیا" باپ نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔

" مجھے دنیا کی پروا نہیں ہے" مظفر چلایا ۔ اور پھر غصے میں اٹھ کر چلا گیا ۔

اُس شام کو وہ سکون محسوس کر رہا تھا ۔ سامنے چندا یوں بیٹھی تھی جیسے وہ مظفر کو قطعی طور پر نہ دیکھ رہی ہو ۔ اتنی دور ہونے کے باوجود اس کے انداز کی بے بسی اس قدر نمایاں تھی کہ مظفر دل ہی دل میں آن جانے میں اُس پر ترس کھا رہا تھا ۔ عین اس وقت ایک چھوٹا سا لڑکا اُس کے پاس آیا ۔ بولا "چندا

دوائی مانگتی ہے کہتی ہے ۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔

ہائیں ۔ وہ یہ سنکر ٹھٹھک گیا ۔ دوائی اسے تکلیف ہے کیا؟ اچھا اچھا وہ اُٹھ بیٹھا ۔ لیکن آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا ۔ اچھا میں خود آ کر لگا دوں گا ۔ سمجھے تم جاؤ"

دوائی کی شیشی اور روئی کی پھریری اٹھا کر وہ چل پڑا ۔

پنواڑی کی دوکان پر لوگ اُس کی طرف گھور رہے تھے ۔" پھر کیا ہے ۔ اُس نے دل میں کہا ۔ دیکھتے ہیں تو دیکھا کریں" مگر اس نے ٹنچر کی شیشی یوں پکڑ رکھی تھی ۔ کہ دکان کے لوگ اُسے واضح طور پر دیکھ سکیں ۔

"دوائی لگانے کا فائدہ؟" مظفر نے دوائی لگاتے ہوئے کہا ۔ یہ زخم تو پھر کھل جائیں گے ۔"

"میرا نصیب" چندا نے بے بسی اور حسرت سے آہ بھری ۔

"نصیب؟ مظفر کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکیں ۔۔ تم خود آزاد ہونا نہیں چاہتی"۔

"ڈاکٹر صاحب لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ !" وہ غصے اور تمسخر سے چلایا" مجھے لوگوں کی کچھ پروا نہیں ۔ میرے ساتھ چلو گی؟" خواہ مخواہ اس کے منہ سے نکل گیا اس کے باوجود وہ اپنی بات پر نادم نہ تھا ۔ ایک ساعت کے لئے چندا کی آنکھ میں فاتحانہ چمک لہرائی۔ ساتھ ہی اس نے مصنوعی تعجب سے کہا" مگر مجھ بدبخت کو ساتھ لے جا کر آپ کیا کریں گے" ۔ چندا نے آہ بھر کر کہا ۔ جیسے وہ مظفر سے کچھ کہلوانا چاہتی ہو ۔

"یہ میری مرضی ہے" ۔ وہ جلال میں آگیا ۔

اچھا چندا نے نگاہیں جھکالیں ۔ اس کا بدن ڈھیلا پڑگیا ۔ بازو دونوں طرف لٹکنے لگے ۔

"تیار رہنا میں کل اسی وقت آؤں گا ۔ مظفر نے محسوس کیا گویا تمام حجابات کافور ہو چکے ہوں ۔ مسکرا کر چندا کی طرف دیکھا اور بولا" اچھا تو کل ۔ اسی وقت" اور کمرے سے باہر نکل آیا ۔

مظفر کو جاتے دیکھ کر چندا گویا جاگ پڑی ۔ اُس کا وہ سنہرا خواب بکھر گیا ۔ اس کا بدن اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑنے پر خود ہی چڑگیا ۔ وہ شرم سی محسوس کر رہی تھی ۔ یا شاید غصہ ۔

ہم جا رہے ہیں مانو" ۔ چندا اپنی بلی سے کہہ رہی تھی "یہ دیکھو ۔ یہ دو سو روپے ہیں ۔ یہ انہوں نے بھیجے ہیں ۔ اُن کی بڑی مہربانی ہے"۔

"جا رہی ہو ۔ چندا" اُس کی پڑوسن نے آکر پوچھا ۔

"ہاں بانو ۔ میں جا رہی ہوں ۔ تم مجھے یاد کیا کرو گی ؟"

"پگلی ۔۔ تمہارے سوا میرا یہاں ہے ہی کون" بانو کی آنکھیں بھر آئیں ۔ تم خوش ہونا "کتنی خوشی ہے تجھے کہ تم جا رہی ہو"۔

"ہاں" وہ مسکرا دی ، لیکن اُس کی مسکراہٹ میں حسرت جھلک رہی تھی "اس روز روز کے جھگڑے سے تو چھوٹ جاؤں گی"۔

"ایک بات کہوں" ۔ بانو رازدارانہ انداز سے بولی ۔

"کہو" ۔ چندا نے لاپرواہی سے جواب دیا ۔

"تمہیں اس پر بھروسہ بھی ہے؟ ان کی عادتیں جانتی ہی ہو تم' ان کا کوئی اعتبار نہیں ۔ وہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ ہم اس کوچے میں رہ چکی ہیں ۔ ان کے دل میں ہماری عزت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ یہاں ہمارے پاس آتے ہیں ۔ تو اُنہیں یاد نہیں ہوتا کہ کس کے پاس آئے ہیں ۔ مگر ایک دفعہ گھر لے جائیں تو اُن کے لئے یہ بات بھولنا مشکل ہو جاتی ہے ۔ شمو بھی گئی تھی ۔ چھ مہینے پٹ پٹ کر واپس لوٹ آئی "۔

"ہاں نہ جانے قسمت میں کیا کیا لکھا ہے ۔ کہتی ہوں چلو یہ بھی آزما ہی دیکھوں" ۔ چندا نے آہ بھر کر کہا ۔

"نہیں نہیں' میں یہ نہیں کہتی کہ وہ ڈاکٹر بُرا ہے ۔ وہ تو شریف دکھائی دیتا ہے ، ویسے تم خود سوچ لو ۔ بس میں یہ کہتی ہوں ۔ ۔" یہ کہہ کر بانو چلی گئی ۔

سارا دن چندا چیزیں اکٹھی کرتی رہی ۔ اور اس کا دل کسی نا معلوم توقع

سے دھڑکتا رہا ۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا ملنے والا تھا ۔

"تم جا رہی ہو کیا؟" چندا نے اس کی کرخت آواز سنی ۔ اور اُس کا دل ڈوب گیا ۔

"ہاں" ۔ اُس نے ایک مصنوعی لاپرواہی سے جواب دیا ۔

دُبلا پتلا مرد کھل کھلا کر ہنس پڑا "جا رہی ہو" وہ تحقیر سے بولا اور پھر دفعتاً اس کے سامنے آکھڑا ہوا ۔ "تم کہیں نہیں جا سکتیں" ۔

"کیوں نہیں جا سکتی" ۔ چندا سینہ تان کر سامنے کھڑی ہوگئی ۔ "میں تمہاری باندی نہیں ہوں ۔"

مرد نے لپک کر چندا کے بال پکڑے اور اُسے گھسیٹتے ہوئے بولا ۔ "باندی تو ہے ۔"

"چھوڑو ۔ چھوڑو" ۔ وہ چیخنے لگی اور جب دبلے پتلے مرد نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ سیدھی ٹرنک کی طرف بھاگی ۔ "یہ لو اپنا دو سو روپیہ" اُس نے ٹرنک سے نوٹ نکال کر اُس کے پاؤں میں پھینک دیئے ۔ اور فاتحانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا ۔

"کہاں سے لیا ہے ۔" وہ غصے میں چلانے لگا "بولو" پھر کونے میں پڑے ہوئے بید کو اٹھاتے ہوئے دانت بھینچ کر بولا ۔ "میں جانتا تھا تم پیسے کاٹ رہی ہو ۔ یہ روپیہ میرا ہے ۔ تمہارا نہیں ۔ خدا کی قسم میں تمہیں اس جُھوٹ کی سزا دوں گا" ۔ اور بیدردی سے اُسے پیٹنے لگا ۔

چندا درد سے چیخنے لگی ۔ پھر بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی "اور مارو اور مارو ۔ تم مجھے جانے سے روک نہیں سکتے ۔" وہ چلانے لگی ۔

اُسے بار بار اور مارو ۔ جان سے مار دو چلاتے ہوئے سن کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زدوکوبی سے قطعی طور پر نہ ڈرتی ہو لیکن جب اُسے بید لگتا تو بلبلا کر چلاتی ۔ اس کی چیخیں سنکر دل تڑپ جاتا لیکن جلد ہی وہ پھر اُس کے سامنے آکھڑی ہوتی ۔ "تم مجھے روک نہیں سکتے ۔ تم مجھے روکنے والے ہو کون؟" اُس پر وہ غراتا ۔ "ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ۔"

"کیوں" وہ چلائی "میں تم سے نہیں ڈرتی قطعی نہیں" اور وہ پھر اُسے پیٹنے لگتا۔

آخر وہ ہار کر بیٹھ گیا۔ چندا دھم سے چارپائی پر جا گری۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ دیر وہ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چپ چاپ اٹھ کر چندا کے پاس آ بیٹھا اور کچھ کہے بغیر اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ کر یوں پڑ گیا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں سر رکھ دیتا ہے پھر وہ ہچکیاں لینے لگا۔

وہ دونوں دیر تک یونہی لیٹے رہے۔ چندا چھت کی طرف دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ وہ دُبلا پتلا مرد چندا کے سینے پر گٹھڑی بن کر پڑا رہا۔ ان کے پاؤں میں سیاہ بلی بیٹھی غراتی رہی۔ چندا کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ اسکی چھاتی پر پڑی ہوئی گٹھڑی ہر چند منٹ کے بعد ربڑ کے گیند کی طرح اُچھلتی۔ سیاہ بلی اُن دونوں کی طرف دیکھتی اور بامعنی آواز میں غراتی۔

پھر وہ پڑی پڑی سوگئی۔ اس کے چہرے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ ضد کرتے کرتے سو گیا ہو۔ سوتے میں اس کا ہاتھ مرد کے سر پر آ ٹکا اور بالوں سے کھیلنے لگا۔

"مگر کیوں" مظفر حیران رہ گیا۔

آپ کی بدنامی ہوگی" چندا نے آہ بھر کر کہا۔

"بدنامی؟" ۔ مظفر پریشان تھا۔

"میری خاطر آپ کی زندگی برباد ہو۔ نہیں"۔

"نہیں نہیں"۔ وہ تڑپ کر بولا "تم کو یہ ذلیل زندگی چھوڑ دینی چاہئیے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا"

"مگر کیوں۔ میری خاطر اتنا کچھ کیوں"۔ وہ مظفر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

اُسے یوں کھڑے دیکھ کر مظفر کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور بے بسی کا عجیب امتزاج تھا۔ غصے اور وحشت سے بیتاب ہوکر وہ چلایا۔ "تم اس رذیل زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتی"۔ "کمینی عورت!!" "فاحشہ"۔

اُس نے زور سے چندا کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ "رذیل کسی"۔

ایک ساعت کے لئے چندا حیران رہ گئی مگر اس حیرانی میں ایک عجیب سی چمک تھی جیسے وہ کسی غیر متوقع خوشی سے دوچار ہو رہی ہو۔ "تم!!" اس نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم بھی ڈاکٹر" جیسے وہ پہلی مرتبہ مظفر سے روشناس ہوئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے رونے کی بجائے مسکرا رہی ہو۔ جیسے وہ آنسو خوشی کے آنسو ہوں۔

یہ دیکھ کر مظفر کا غصہ اور بھی چمکا۔ بھلے مانسوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتی ہو۔ وہ چلایا۔

"نہیں نہیں" چندا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"بکو نہیں۔" وہ غرایا۔ اور اُس نے بڑھ کر چٹاخ سے اُس کے منہ پر ایک اور طمانچہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہائیں" وہ حیرانی سے چلائی۔ "ٹھہرو تو۔ ڈاکدار صاحب۔ ٹھہرو ذرا"۔ چندا کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوئی ــــــ۔ مسرور، حیران کُن چمک۔

اُس نے تڑپ کر منت اور اضطراب سے کہا "میں چلوں گی۔ میں تیار ہوں"۔

مگر مظفر سیڑھیاں اُتر چکا تھا۔

...............○...............

خواب

کھانے کے بعد خوابوں کی بات چھڑ گئی ۔

ہر کسی نے کچھ نہ کچھ کہا ۔ دو ایک اصحاب نے چند انوکھے اور دلچسپ خواب سنائے ۔ شاید کچھ کہنے کی غرض سے صاحب خانہ نے اس دبلے پتلے کتابی چہرے والے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا ۔ جو میرے پاس بیٹھا ہوا خاموشی سے سگرٹ پی رہا تھا ”کیوں صاحب خوابوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟“

”میری رائے! ـ ـ ـ ـ ـ اس موضوع پر میری کوئی رائے نہیں“۔

”کوئی رائے نہیں؟“ صاحب خانہ نے حیرانی سے پوچھا ۔

”کوئی نہیں ۔ اس نے لمبی آہ کھینچ کر کہا ۔ کون جانتا ہے کہ خواب کیا ہے اور ہم اسے کیوں دیکھتے ہیں ۔ آج سے دو سال پہلے اس بارے میں میری بھی ایک رائے تھی ـ ـ ـ ـ ـ مگر اب ـ ـ ـ ـ ـ اب نہیں“ ۔ وہ افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا ۔

اس کی بات سن کر ہم سب حیران ہوئے ۔ دو ایک صاحب تو طعنے کے طور پر مسکرا دیئے ۔ آخر ایک بزرگ کہنے لگے:۔

”صاحب وہ کیسے ہوا کہ آپ نے اپنی رائے کھو دی؟“

”اس لئے کہ دو سال ہوئے ۔ میرے ایک دوست نے خواب دیکھنا شروع کیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں جاگا“۔

”دو سال؟“

”ہاں تقریباً دو سال“

محفل پر سناٹا چھا گیا ۔

”ممکن ہے آپ اسے من گھڑت قصہ سمجھیں ۔ ٹھیک ہے ۔ اگر آج سے

دوسال پہلے کوئی شخص مجھ سے یہی واقعہ بیان کرتا تو میں خود اسے گپ سمجھتا ۔

ہاں تو ۔ اگر آپ چوک متی سے ریلوے اسٹیشن کیطرف جائیں تو راستے میں بھنڈی بازار پڑتا ہے ۔ اس بازار کے درمیان میں دائیں ہاتھ بوٹوں کی ایک بہت بڑی دوکان سے دس قدم کے فاصلے پر ایک چوڑی سی گلی دائیں ہاتھ کو نکل جاتی ہے ۔ گلی کے نکڑ پر بورڈ لگا ہے ۔ جس پر پارک لین لکھا ہے ۔ اس گلی کے اختتام پر ایک میدان ہے ۔ میدان کے درمیان ایک سہ منزلہ مکان ہے ۔ محراب دار ڈیوڑھی اور سبز رنگ کا جنگلہ ۔ اس مکان کی دو خصوصیات ہیں ۔ اس مکان کے صدر دروازے پر ایک فقیر بیٹھا ہو گا ۔ وہ صبح شام وہیں بیٹھا رہتا ہے ۔ آپ کو دیکھ کر وہ فوراً اٹھ بیٹھے گا ۔ اور آپ کے پاس آکر کہے گا ۔

"میری بات سنئے ۔ میری بات سنئے ۔ میرا نام مظہر ہے ۔ ہاں ہاں میرا نام مظہر ہے میں ریلوے گارڈ ہوں ۔ اور ۔ اور یہ سبز چھجے والا مکان ہے نا ۔"

لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں ۔ کوئی شخص بھی اس کی بات نہیں سنتا ۔ شائد اس لئے کہ دو سال سے کسی نے اس کی بات نہیں سُنی ۔ وہ اپنی بات خود بُھول چکا ہے دوسال ہوئے اُس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ مظہر ہے اور آج تک وہ اپنے آپ کو مظہر ریلوے گارڈ سمجھتا ہے ۔ اور صاحبان جس کا وہ خواب دیکھ رہا ہے وہ میں ہوں ۔۔۔۔۔ میں

"ہائیں" صاحب خانہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔

"آپ" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

"ہاں میں" وہ بولا ۔ "میں ہی وہ مظہر ریلوے گارڈ ہوں "۔

لیمپ کی دھندلی روشنی میں حاضرین کے چہرے تعجب سے بھوت بنے ہوئے تھے ۔

"ہاں تو اس شخص کا نام ظہور ہے ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بیان کرنا شروع کیا میں اور ظہور کالج میں ہم جماعت تھے ۔ اس کے خدوخال کچھ ایسے خوبصورت نہ تھے موٹے موٹے ہونٹ اور بھدی سی ناک ۔ مگر اس کا رنگ اس

قدر سفید تھا کہ جب کبھی وہ شرما جاتا تو سرخی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ۔ اور وہ بات بات پر شرما جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھیں بہت جاذب تھیں ۔ اُن میں شوخی نہ تھی وہ ایسی آنکھیں نہیں تھیں جو ایک نگاہ سے کسی کو چھیڑ دیتی تھیں ۔ اس کے برعکس وہ چھڑ جانے والی آنکھیں تھیں ۔ ان میں تاثرات کی اتنی قبولیت تھی کہ ہر وقت وہ کسی نہ کسی اثر سے بھیگی بھیگی رہتیں ۔

ایف ۔ اے میں بھی وہ اس قدر شرمیلا تھا کہ اگر محلے کی کوئی لڑکی چھیڑنے کے لئے یا ویسے ہی اُسے دیکھ کر مسکراتی تو وہ آکر اپنی والدہ سے شکایت کرتا ۔

دیکھ لو اماں جی مجھے دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے ۔ یہ بات ٹھیک نہیں ۔ آپ اس کے گھر کہلوا بھیجیں کہ ایسی حرکت مجھ سے نہ کیا کرے ۔ اگر کوئی دیکھ لے تو؟

مگر اس کے باوجود حسن کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا تھا ۔ اکثر راہ چلتے چپکے سے مجھ سے کہتا ۔ مظہر اس بھکارن کو چلتے دیکھنا اس کی چال میں کتنی لے ہے ۔ ظہور کو جھکی جھکی نگاہوں سے دیکھنے کی عادت تھی ۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھنا یا کسی کو مڑ کر دیکھنا اسے قطعی پسند نہ تھا ۔ اس کے علاوہ اسے ان سلوٹوں سے عشق تھا ۔ جو عورتوں کے دوپٹے پر پڑ جاتی ہیں ۔ اور ان سلوٹوں کو دیکھنے کے لئے وہ روز تفریح کے وقت مجھے ساتھ بازار لے جاتا ۔ جب کبھی میں اس سے پوچھتا کہ بھئی ان سلوٹوں کو دیکھنے سے حاصل ۔ تو وہ مسکرا کر جواب دیتا ۔ یہ سلوٹیں نہیں ۔ یہ تو کسی چھپی ہوئی مدوجزر کی لہریں ہیں روح کی دھڑکنیں جو کپڑے پر اپنا عکس ڈال رہی ہیں ۔

کئی بار میں اس سے کہتا ۔ لو ظہور ، اب دیکھو اب تو صاف نظر آرہی ہیں تو وہ مڑ کر نہ دیکھتا ۔ اور گھبرا کر کہتا ۔ نہیں نہیں مڑ کر نہ دیکھو، لوگ دیکھیں گے ۔ تو کیا کہیں گے میں اس سے پوچھتا ۔ بھائی تم مڑ کر دیکھنے سے کیوں ڈرتے ہو ۔ تو جواب میں نہایت معصومیت سے کہتا ۔ ہاں میں ایک نگاہ ہی

میں اس قدر دیکھ لیتا ہوں کہ دوبارہ دیکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔

بی اے کرنے کے بعد ہم دونوں نوکر ہو گئے ۔ وہ ریلوے کے دفتر میں کلرک ہو گیا ۔ اور میں ریلوے میں گارڈ ۔

چونکہ اس کے والد یہاں سے تبدیل ہو چکے تھے ۔ اس لئے ہم دونوں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا ۔ نوکر ہونے کے قریباً ایک سال بعد وہ واقعہ ہوا جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور واقعہ پیش آیا ۔ ایسا واقعہ جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا ۔

اُس روز میں لاہور سے گاڑی لایا تھا ۔ گیارہ بجے کے قریب میں یہاں پہنچا ۔ رات کا وقت تھا ۔ چارج دے کر میں گھر کی طرف چل پڑا ۔ ہمارا گھر قاضی واڑہ میں واقع تھا ۔ عام طور سے میں اسٹیشن سے چل کر بھنڈی بازار سے ہوتا ہوا سیدھا اکبری منڈی پہنچتا ہوں اور وہاں سے قاضی واڑہ میں داخل ہو جاتا ہوں ۔ اس رات نہ جانے کیا ہوا ۔ شاید اس لئے کہ میں کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا میں بھنڈی بازار سے پارک لین کی طرف مڑ گیا ۔ اس محرابی ڈیوڑھی اور سبز جنگلے والے مکان کے پاس پہنچا تو کتا بھونکا ۔ میں چونک پڑا اپنے آپ کو ایسی جگہ پا کر حیران ہوا ۔ سامنے محرابی ڈیوڑھی کا دروازہ تھا ۔ چاندنی میں سبز جنگلہ صاف نظر آرہا تھا ۔ میں نے سمجھا کہ وہ غوری کا مکان ہے ۔

غوری میرا پرانا دوست ہے ۔ اسکا مکان ہمایوں چوک کے قریب ایک گلی میں واقع ہے ۔ ہمایوں چوک تو آپ جانتے ہی ہوں گے ۔ مکان بالکل اسی طرف کھلے میدان کے درمیان میں واقع ہے ۔ ویسی ہی محرابی ڈیوڑھی اور سبز جنگلہ ۔ میں سمجھا کہ غلطی سے ہمایوں چوک جا پہنچا ہوں ۔ مجھے اپنی دیوانگی پر بہت ہنسی آئی میں نے سوچا کہ چلو غوری کو اپنی بے وقوفی کا قصہ سناتا جاؤں ۔ میں غوری سے اکثر ملا کرتا تھا ۔ اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی بیوی اور بچے ان دنوں اس کے پاس نہیں تھے ۔ اس لئے میں بے دھڑک اندر چلا گیا ۔ غوری کو ہم بچپن ہی سے مذاق سے "اوری" کہا کرتے تھے ۔ میں نے حسب معمول اوری اوری چلّانا شروع کر دیا ۔ صحن میں اندھیرا تھا ۔ سامنے کمرے میں بتی جل

رہی تھی ۔ پیشتر اس کے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ۔ "کون، موہن؟" اندر سے ایک باریک سریلی آواز سنائی دی ۔ ایک عورت اندر سے بھاگتی ہوئی آئی ۔ اور مجھ سے لپٹ گئی ۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا ۔ میری سدھ بدھ ماری گئی اور منہ سے صرف ایسے مہمل الفاظ نکل سکے ۔ معاف کرنا ۔ میں آپ ۔۔۔۔ شاید اُس نے میری آواز سن کر اپنی غلطی محسوس کرلی ہو ۔ بہر حال وہ مجھے اندر لے گئی ۔

روشنی میں اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ اس کے چہرے پر بیحد معصومیت تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی ۔ کمرے کا سازوسامان دیکھ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ ایک رقاصہ تھی ۔ دو میراثی بیٹھے تھے ۔ جو ہمیں دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے ۔ معاف کرنا مجھ سے غلطی ہوئی ۔ اس نے مجھ سے کہا ۔ میرا نام زہرہ ہے اور میں کل ہی یہاں آئی ہوں۔"

نہ جانے اس لئے کہ وہ بیحد خوبصورت تھی یا شاید اس لئے کہ ہم دونوں وہاں اکیلے تھے ۔ میرے منہ سے نکل گیا ۔ "کیسی پیاری غلطی تھی"۔

وہ ہنس پڑی اور مجھ سے کہنے لگی ۔ "ہاں بڑی" ۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگی "آپ کا کیا نام ہے؟"

میں نے کہا ۔ "موہن ہی سمجھ لیجئے"۔

"موہن" اس نے غمگین انداز میں کہا "موہن مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں آپ مجھے" "اوری" کہہ کر بلایا کریں گے تا اس نے منت کرتے ہوئے کہا ۔ "موہن بھی مجھے اوری کہا کرتے تھے"۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ دہلی کی رہنے والی تھی ۔ اور موہن اس کا دوست تھا ۔ موہن بھی میری طرح ریلوے گارڈ تھا اور زہرہ کو پیار سے اوری کہا کرتا تھا ۔ کسی وجہ سے وہ آپس میں لڑ پڑے اور زہرہ دہلی چھوڑ کر یہاں آگئی مگراس کے باوجود اس کا جی چاہتا تھا کہ موہن اسی طرح آکر اسے "اوری اوری" کہہ کر منالے ۔ اوروہ اسی امید کے سہارے جی رہی تھی ۔ اس نے اندھیرے میں مجھے گارڈ کی وردی میں ملبوس دیکھ کر "اوری اوری" پکارتے سن کر سمجھا کہ

موہن آگیا۔ اور مجھ سے لپٹ گئی ۔

یہ تمام واقعہ کتنا عجیب تھا ۔ ایک تو غوری کو اوری کہنا اور موہن کا زہرہ کو ۔ دوسرے زہرہ اور غوری کے مکانوں کا ایک دوسرے سے مشابہ ہونا اور میرا راستہ بھول کر اُدھر جا نکلنا ۔

حاضرین یوں چپ چاپ بیٹھے تھے جیسے کسی مندر میں پتھر کے بت ہوں۔تو مختصر یہ ہے کہ میں اور اوری دوست بن گئے ۔ میں نے روز ملنے کا وعدہ کیا اور گھر جا کر تمام قصہ ظہور کو سنایا ۔

میری بات سن کر ظہور خاموش بیٹھا رہا ۔ پھر ایک نامعلوم سی آہ بھر کر کہنے لگا ۔ عجیب سی بات ہے خدا معلوم لوگوں کی زندگی میں ایسے واقعات کیسے پیش آتے ہیں ۔ تعجب ہے ۔۔۔۔ مگر دوست خدا جانے اس کا کیا انجام ہو ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ کتنی بدنامی ہوگی ۔

ظہور کی نصیحتوں کے باوجود میں روز اوری سے ملا کرتا تھا ۔ شکل و صورت سے وہ بے حد بھولی بھالی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ بننا جانتی ہی نہیں ۔ یہ بات اُسے اور بھی حسین بنا دیتی ۔

چند ہی ملاقاتوں میں پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا ۔ کہ اوری کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا ۔ اس سے ملے بنا رہ نہ سکتا ۔ ظہور نے میری حالت دیکھ کر مجھے سمجھانا شروع کر دیا ۔ کہنے لگا ۔" بھائی تم ان عورتوں کو نہیں جانتے ۔ عورتیں دام میں پھنسا کر پھر علیحدہ ہو جاتی ہیں ۔ یوں اپنا آپ نہ گنواؤ ۔ ورنہ کسی روز دیوانے ہو کر اسی کی دہلیز پر جا بیٹھو گے ۔"

میری دلی خواہش تھی کہ ظہور ایک دفعہ اوری کو دیکھ لے ۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی مگر ظہور نے اوری سے ملنے سے قطعی انکار کر دیا ۔ آخر مجھے ایک تدبیر سوجھی ۔ میں نے اوری سے کہا کہ شام کو بارہ دری میں سیر کرنے چلی جانا ۔ مگر مجھے دیکھ کر یہ ظاہر نہ کرنا کہ تم مجھے جانتی ہو ۔ یہ بات طے کر کے میں مقررہ وقت پر ظہور کو بارہ دری میں سیر کے بہانے لے گیا ۔ کچھ دیر تو ہم دونو وہاں ٹہلتے رہے ۔ پھر میں نے دور سے اوری کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا ۔

اس وقت اوری کے دوپٹے میں ان گنت سلوٹیں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں ۔ میں نے ظہور کو کہنی مار کر کہا ۔ وہ دیکھو ظہور ۔ ظہور کا رنگ زرد پڑ گیا ۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی ۔ اوری قریب آ پہنچی ۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی ۔ دوپٹہ کسی ہیجان سے ابھر سمٹ رہا تھا ۔ جیسے اس کے تلے تار چھپے ہوں ۔ اور کوئی انہیں چھیڑ رہا ہو ۔

اوری ہمارے پاس سے گذری تو ظہور کی آنکھیں جھک گئیں ۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ اس کی گردن مڑ گئی ۔ اور وہ اسے مڑ کر دیکھ رہا تھا اوری پھول توڑنے کے بہانہ کھڑی تھی ۔ اور نیچی نگاہوں سے مسکرا رہی تھی ۔

گھر پہنچ کر میں نے ظہور سے کہا "کیوں ظہور آج تو تم نے اوری کو دیکھ لیا نا؟"

"کب؟" ظہور نے حیرانی سے پوچھا ۔

"بارہ دری میں" میں نے ہنستے ہوئے کہا ۔ ظہور کا رنگ زرد پڑ گیا ۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ اس کے منہ پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے ۔

"وہ اوری ہی تو تھی جو گلاب کا پھول توڑ رہی تھی ۔ نیلا دوپٹہ تھا ۔ بھول گئے؟"

میں نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی ۔ مگر وہ ہٹ دھرمی سے میری بات کو مذاق سمجھنے پر یوں مصر رہا جیسے اسے تسلیم کر لینے سے دکھ ہوتا ہو جیسے میری بات اسے ناگوار گزر رہی ہو ۔

آخر وہ خاموش ہو گیا ۔ اور لاپرواہی سے کہنے لگا ۔ "ہو گی پھر کیا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ اوری کو دیکھنے کے بعد وہ مجھے اس سے ملنے سے باز رکھنے کی کوشش چھوڑ دے گا ۔ مگر میرا خیال غلط نکلا ۔ اس روز اس نے مجھے اور بھی سمجھانا بجھانا شروع کر دیا ۔ حتیٰ کہ اس کی نصیحتوں میں منت کی جھلک پیدا ہو گئی ۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اوری سے ملنا جلنا چھوڑ دوں ۔ اس کے باوجود مجھ سے پوچھتا رہتا ۔ سناؤ آج اوری سے کیا کیا باتیں ہوئیں ۔ اور انہیں سن کر مجھ

سے پوچھتا میں کہتا ہوں مظہر جب تم اس کے گھر جاتے ہو تو تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے ۔ کتنی بدنامی ہوگی ۔

اس دن کے بعد ظہور میرے ساتھ سیر کرنے نہ گیا ۔ اول تو وہ گھر پر ہی بیٹھ رہتا اور کبھی جاتا تو اکیلا ہی چلا جاتا ۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے ۔ تعجب کی بات تھی جب کبھی میں اسے کہتا چلو ظہور تمہیں سلومیں دکھا لاؤں تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ۔ اور وہ لاپرواہی سے کہتا ۔ نہیں بھائی ہمت نہیں رہی ۔

آخر اس کی نصیحتیں مجھ پر اثر کر گئیں ۔ میں نے اس سے پوچھا ۔ ظہور بھائی یہ بتاؤ کہ میں اسے کیسے چھوڑوں ۔ جب میں گاڑی کا چارج دے کر کتاب میں اپنے دستخط کرتا ہوں ۔ ”مظہر“ لکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے وہ بلا رہی ہے میرا انتظار کر رہی ہے ۔ ۔ جیسے میرا نام موہن ہے ۔ پھر میرے پاؤں آپ ہی مجھے اس کے گھر لے جاتے ہیں بتاؤ میں کیا کروں ۔

ظہور نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ۔ کہنے لگا ۔ اس میں کیا مشکل ہے ۔ اگر مظہر کا نام لکھنے سے تم وہاں جانے پر مجبور ہو جاتے ہو تو گارڈ بک میں دستخط کرتے ہوئے تم یہ سمجھ لیا کرو کہ تم ظہور ہو ۔ ایم ظہور میں کچھ زیادہ فرق تو نہیں ۔ اور راہ میں بھی تم سمجھا کرو کہ تم ظہور ہو ۔

سات آٹھ دن کے بعد ایک روز میں گھر آیا تو دیکھا کہ ظہور چپ چاپ بیٹھا ہے میں نے کہا ظہور تمہیں کیا ہے اتنے پریشان کیوں ہو؟ کچھ بھی نہیں ۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ مجھے روز بلاناغہ ایک عجیب خواب آتا ہے ۔ اور ہر رات میں وہی خواب دیکھتا ہوں ۔ پتہ نہیں کیا بات ہے خواب بھی معمولی سا ہے ۔ مگر مجھے بیحد دہشت ہوتی ہے ۔

دیکھتا ہوں کہ میں گارڈ ہوں ۔ یعنی میں ظہور نہیں بلکہ کوئی اور ہوں ۔ گاڑی چل رہی ہے ۔ پھر دفعتاً گاڑی رک جاتی ہے ۔ اور میں گاڑی سے نیچے اترنے سے ڈرتا ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا گاڑی کے پائیدان کے نیچے لامتناہی گہرائیاں ہیں ۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ابھی گرا ابھی گرا ۔ ڈر

سے میں جاگ اٹھتا ہوں۔

چند ہی دنوں کے بعد جنگ چھڑ گئی اور ریلوے کو مزید ضرورت گارڈوں کی پڑ گئی۔ اس لئے دفتر کے وہ کلرک جو گارڈ کا امتحان پاس کر چکے تھے عارضی طور پر گارڈ بنا دیئے گئے۔ ظہور کو بھی حکم آگیا۔ سوموار کو رات کے گیارہ بجے اسے مال گاڑی کے ساتھ بک کر دیا گیا۔ چونکہ ظہور کو یہ کام پہلی مرتبہ کرنا تھا اس لئے وہ ڈر محسوس کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ گاڑی سے رہ نہ جائے۔ ظہور کی تسلی کے لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ شام ہی سے گارڈ روم میں جا رہیں تاکہ دقت نہ ہو۔

سوموار کو شام کے قریب ظہور نے اپنی وردی پہن لی اور ہم دونوں اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ریلوے روڈ پر دیکھا کہ اوری تانگے میں بیٹھی کہیں جا رہی ہے اوری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ پر خفگی کا اظہار کیا۔ اس لئے کہ دو دن سے میں اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اوری گذر گئی تو میں نے ظہور کی طرف دیکھا اس کا رنگ زرد تھا۔ اور وہ یوں چل رہا تھا۔ جیسے خواب میں ہو۔ خیر۔ ہم گارڈ روم میں پہنچ گئے۔

میں نے ظہور سے کہا بھائی اب آٹھ بجے ہیں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ تم سو جاؤ۔ جب کال بوائے آئے گا تو میں تمہیں جگا لوں گا۔ ظہور اسی طرح وردی سمیت سو گیا۔ اور میں کتاب پڑھنے لگا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ چونک کر جاگ اٹھا۔ جیسے ڈر گیا ہو۔ کیوں کیا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔

کچھ دیر تک وہ ویسے ہی گم سم بیٹھا رہا پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ بس وہی خواب' گاڑی سے اُترتے ہوئے ڈرنے کا قصہ۔ میں نے کہا پاگل نہ بنو۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ آج گارڈ تو بن ہی گئے ہو۔ ابھی دو گھنٹوں میں اس خواب کی تعبیر دیکھ لو گے۔ اور تم ڈرے بغیر گاڑی سے اتر سکو گے۔ ہاں اس نے مسکرا کر کہا۔ خواب کی تعبیر اور پھر سو گیا۔

پونے گیارہ بجے کال بوائے آیا۔ میں نے ظہور کو آواز دی۔ وہ جاگ

پڑا ۔ اٹھ بیٹھا مگر ایسے معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے ابھی نیند میں ہو ۔ اس نے کال بوائے کی کتاب میں دستخط کئے ۔ ٹوپی سر پر رکھی ۔ اور مجھ سے بات کئے بغیر باہر نکل گیا ۔ کال بوائے میرا واقف تھا ۔ وہ ویسے ہی میرے پاس چلا آیا ۔ اس کے ہاتھ میں کتاب تھی جس پر ظہور نے دستخط کئے تھے ۔ دو ایک منٹ تو ہم باتیں کرتے رہے ۔ پھر دفعتہً میری نگاہ کتاب پر جا پڑی ۔ اور میں حیران رہ گیا ۔

کتاب پر ایم ظہور کی بجائے مظہر لکھا ہوا تھا ۔ حیران تو ہوا ۔ لیکن میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی ۔ شاید اس لئے کہ مجھے نیند نہ آتی تھی ۔ اور سگرٹ ختم ہو چکے تھے ۔ میں سگرٹ خریدنے باہر پلیٹ فارم پر چلا گیا ۔ وہاں جی میں آئی کہ چلو ظہور سے مل لوں ۔ لیکن دیکھا کہ ظہور گاڑی پر پہنچا ہی نہ تھا ۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی خیر ۔ اسٹیشن والوں نے مال گاڑی کسی اور کے سپرد کردی تھی ۔

اگلے روز صبح سویرے اوری کا آدمی میرے گھر آیا کہنے لگا چلئے وہ بلاتے ہیں ۔ بہت ضروری کام ہے ۔

وہاں پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ دروازہ پر ظہور بیٹھا ہے ۔ اس کے منہ پر وحشت برس رہی ہے اور شکل بالکل بدلی ہوئی ہے ۔

اس روز سے ظہور وہیں بیٹھا رہتا ہے ۔ اور ہر آتے جاتے کا ہاتھ تھام لیتا ہے ۔ "میرا نام مظہر ہے میں ریلوے گارڈ تھا ۔ یہ دیکھئے یہ سبز چھجے والا مکان ہے ۔" اور لوگ اسے پاگل سمجھ کر ہاتھ چھڑا کر چلے جاتے ہیں ۔ وہ مکان اب ویران پڑا ہے ۔ اور لوگ اسے آسیب زدہ سمجھتے ہیں ۔ مظہر چپ ہوگیا ۔ کمرہ میں گہری خاموشی چھا گئی ۔

"اس بات کو خواب سے کیا تعلق؟" صاحب خانہ نے حیرانی سے پوچھا ۔

"اسے گاڑی سے نیچے اُترتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا تھا ۔ مگر اس روز وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا"۔

"یعنی"۔

"یعنی وہ گاڑی سے اُتر گیا اتھاہ گہرائیوں میں۔"

"آپ کا مطلب ہے، اس نے سمجھا کہ وہ مظہر ہے۔"

"ہاں اور وہ اوری کے گھر چلا گیا۔ جیسے مظہر ڈیوٹی سے فارغ ہو کر وہاں جایا کرتا تھا۔"

"تو کیا ابھی تک وہ خواب دیکھ رہا ہے؟"

"کون جانتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا کسی خواب کی تعبیر۔ کون کہہ سکتا ہے۔ شاید اس وقت ہم سب کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ یا کسی خواب کی تعبیر۔ کون جانتا ہے۔"

....○... ....

الصّدف

خط کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا گویا کسی نے میرے کلیجے میں چھری بھونک دی ہو ۔ میرے دل میں بیگم کے متعلق شکوک رینگنے لگے ۔ اسد کے اِن چار لفظوں نے ایک قیامت برپا کر دی تھی کس قدر مختصر خط تھا ۔ فوراً واپس چلے آؤ ۔ اُس کو بھلا میری واپسی کی کیا ضرورت تھی ۔ مجھے گھر سے دورے پر آئے ہوئے ابھی چار دن ہی ہوئے تھے ۔ اگر گھر میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوتی تو کیا وہ مجھے مفصل خط نہ لکھ سکتا تھا ۔ ضرور اُس نے مجھے بیگم کے متعلق بلایا ہے ۔

بیگم کا بے پناہ حسن میرے لئے کبھی سکون یا خوشی کا باعث نہیں ہوا ۔ اس کا حسن ایسا نہ تھا جسے دیکھ کر دل میں راحت یا خوشی پیدا ہو یا یہ احساس ہو کہ میں جی رہا ہوں ۔ جینا چاہتا ہوں ۔ اس کے برعکس اسے دیکھ کر میں یوں محسوس کرتا گویا کسی رنگین بے قراری نے ڈس لیا ہو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں ۔ میں دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومنے لگتا۔ " اب میں کیا کروں !کیا کروں میں ؟"

اِس کی نیم وا نوکیلی آنکھیں در پردہ مسکرایا کرتیں بھنچے ہوئے خمدار پتلے ہونٹ زیر لب کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے کمان سے ابرو اشارے کرتے رہتے رخساروں میں نیم رضا مندی کی سلوٹ نمایاں رہتی ۔ اُف وہ دھار کی طرح چبھ جانے والا حُسن سُریلی چیخ کی طرح چونکا دینے والا۔

ہماری شادی ہوئے پورے دو سال ہو چکے تھے ۔ مجھے بیگم سے عشق تھا عشق ۔

میرے دل میں ایک بھٹی سلگتی رہتی تھی ۔ اسے دیکھ کر رگ رگ میں تڑپ اُٹھتی اور یوں دیوانہ وار جھومتی جیسے کوئی موت کا ناچ ناچ رہا ہو۔

ہر مرتبہ جب میں بیگم سے ملتا تو مجھے محسوس ہوتا گویا ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں اس کے انداز میں کچھ ایسا نیا پن تھا جو اکثر بے گانگی یا بے نیازی میں بدل جاتا تھا ۔ لیکن وہ اُسے خوب پھبتا تھا ۔ جب وہ معصومیت سے گردن موڑ کر کہتی ۔ "کہئے ' آیئے ، آگئے آپ" اس وقت اسے یہ قطعی احساس نہ ہوتا ۔ کہ قریب ہی کوئی تڑپ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیا کرے ۔

ہمارے نوجوان پڑوسی نواب ظفر علی کے آنے پر تو اُس کی آنکھیں اور بھی مترنم اور ہونٹ اور بھی متکلم ہو جاتے ۔۔۔۔۔۔ بھوں رمز سے تن جاتیں گالوں کی نیم رضا سلوٹ اور بھی واضح ہو جاتی ۔ اس وقت میں محسوس کرتا کہ وہ دُور بیٹھ کر بھی بن بولے باتیں کر رہے ہیں ۔ مجھ پر ہنس رہے ہیں نواب کی مست آنکھیں اور بیگم کی بے نیازی میرے شکوک کو ابھارتے اور میں تڑپتا ۔ ضرور وہ ملتے ہونگے ۔ ان کی نگاہوں میں شوق اور بے تکلفی جھلکتی ہے ان کے انداز میں گذشتہ ملاقاتوں کے متعلقہ اشارات نمایاں ہیں ۔ اس وقت میرا جی چاہتا کہ نوکری سے استعفےٰ دے کر گھر بیٹھ رہوں ۔ مہینے میں بیس دن باہر دورے پر رہنا اُف ! کیا مصیبت تھی ۔

انہی دنوں میرا پرانا دوست اسد مجھ سے ملنے کے لئے آگیا دو ایک دن خوب کٹے ۔ لیکن وہ فوراً تاڑ گیا کہ میرے دل میں گھن لگا ہوا اس کے اصرار پر مجھے اپنے شکوک کا قصہ سنانا ہی پڑا ۔ "واہ ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے ۔" وہ ہنس کر بولا ۔

"بڑی بات ۔" میں نے آہ بھر کر کہا ۔ "اس بات پر میری زندگی کا دارومدار ہے ۔ اسد میں صرف جاننا چاہتا ہوں ۔ حقیقت جاننا چاہتا ہوں ۔"

"لیکن" ۔۔ وہ کہتے کہتے رُک گیا ۔

"میں سمجھتا ہوں ۔ میں بڑی سے بڑی بات برداشت کر سکتا ہوں ۔ لیکن شبہات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے ۔"

"ہوں ۔" وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ "اچھا تم دورے پر چلے جاؤ ۔ میں یہیں رہوں گا جلد ہی سب بھید معلوم ہو جائے گا ۔ حقیقت کا انکشاف ہوگیا

تو میں تمہیں بلا لوں گا ۔ تم فوراً آجانا دیر نہ کرنا ۔ ممکن ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو ۔ میں کوشش کرونگا ۔"

نہ جانے اسد مجھے کیا دکھانا چاہتا تھا ۔ بس اور کیا ہوگا ۔ وہی جس کا مجھے ڈر تھا وہ میری نہیں، وہ کسی کی بھی نہیں ۔ اُف !! میرا دل عجیب خدشات سے بھرا تھا ۔

نوکروں نے جب سنا کہ میں اکیلا جارہا ہوں تو حیران رہ گئے ۔ مجھے نوکروں کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا وہ سارے اس بھید سے واقف ہیں ۔ ان کا زیر لب تبسم مجھے کس قدر کھلتا تھا ۔

"ہاں اکیلے ۔" میں نے چلّا کر کہا ۔ "گھوڑا تیار کرو ۔"

گھورگھاٹ سے چل کر میں نے رات کے دس بجے تک پچاس میل کا سفر طے کر لیا ۔ اور بھورپور کے ریسٹ ہاؤس میں آدھ گھنٹہ سستا کر آگے چل پڑا ۔ اس رات میرے نصیب میں آرام کہاں تھا ۔ دل میں الجھن لگی ہوئی تھی ۔ کوئی کلیجہ مل رہا تھا !!

بھور مندر سے کاش گڑھ کو دو راستے جاتے ہیں سڑک سے جاؤ تو کاش گڑھ پنتیس میل سے کم نہیں ۔ مگر پگڈنڈی کے راستے بیس میل ہوگا ۔ میرا ارادہ تھا کہ آدھی رات تک گھر پہنچ جاؤں ۔ اس لئے میں نے گھوڑے کو پگڈنڈی کی طرف موڑ دیا ۔

یہ پگڈنڈی ایک جھاڑی دار جنگل میں سے نکل گئی ہے اگرچہ راستہ قطعی سنسان ہے ۔ لیکن یہاں وہاں کہیں کہیں کسانوں یا سلیٹ کویئری کے مزدوروں کے جھونپڑے ہیں جنگل میں درندے کثرت سے ہیں ۔ لیکن اس روز درندوں کا خوف میرے دل میں نام کو نہ تھا ۔ دل میں بس یہی لگن تھی ۔ نہ جانے آج مجھے کیا دیکھنا ہے ؟

رات کس قدر اندھیری تھی ۔ آسمان پر ستارے بھی یوں ٹمٹمارہے تھے گویا گاڑھے اندھیرے میں دم توڑ رہے ہوں ۔ ہوا جھاڑیوں میں کراہ رہی تھی ۔۔۔۔ وہ جھاڑیوں کا رکھ گویا زندگی سے بھرپور تھا ۔ پگڈنڈی یوں بل کھا

رہی ، لہرا رہی تھی جیسے کوئی مہیب اژدھا رینگ رہا ہو ۔ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں ۔ کوئی قہقہہ مار رہا تھا ۔ کوئی بڑھیا چیخ رہی تھی ۔ بچہ رو رہا تھا ۔ کوئی گھنگرو پہنے ناچ رہی تھی عجیب سی بے معنی آوازیں ۔ یہاں وہاں کوئی دیا جھلملاتا ۔ پھر وہ شعلہ بن جاتا اور لپک کر ٹہنیوں پر جا بیٹھتا ۔ دفعتاً آگ روشن ہو جاتی اور اس کے گردسائے ناچتے ۔ جنگل نہ جانے چیخوں ، یا قہقہوں سے گونج اٹھتا ۔ لیکن میں ایک ہی دھن میں چلا جا رہا تھا ۔ چلا جارہا تھا ۔۔ گویا گھوڑے پر خود ایک بھوت سوار ہو جس پر کسی ڈائن کا سایہ ہو ۔ میری بغل میں ٹارچ تھی ۔ بایاں ہاتھ لگام تھامے اور دایاں پستول پر جو میری پیٹی میں لٹک رہا تھا ۔

میں یونہی دو تین گھنٹے چلتا رہا ۔ دفعتاً پگڈنڈی پر روشنی نمودار ہوئی سامنے ایک بڈھا وردی پہنے لالٹین لئے کھڑا تھا ۔ گویا میرا ہی انتظار کر رہا ہو گھوڑا آپ ہی آپ رک گیا ۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آپھنسا ۔ اِس ویران پگڈنڈی پر آدھی رات کے وقت ایک بڈھا ! کچھ دیر تک میرے منہ سے بات تک نہ نکل سکی ۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔

"جمعدار یہاں سے کاش گڑھ کتنی دُور ہے ۔" میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے بات کی ۔

بڈھے نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا ۔ اِس کے منہ پر اس قدر جھریاں تھیں جیسے مکڑی نے جالا تن رکھا ہو ۔ دو بلوریں آنکھیں چمک رہی تھیں ۔

بڈھے نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر لالٹین کی طرف دیکھنے لگا "ہائیں یہ راستہ کاش گڑھ کو نہیں جاتا ۔؟" بڈھے نے پھر نفی میں سر ہلا دیا ۔

عین اس وقت زبردست گرج کی آواز سنائی دی اور ہوا زور سے چلنے لگی ۔

"راستہ بھول گئے ۔" بڈھے نے مدھم آواز میں کہا ۔

"راستہ بھول گئے ۔ راستہ بُھول گئے ۔ بھول گئے ۔" ہر جھاڑی میں اس کی بات گونجنے لگی ۔ "بُھول گئے ۔" بادل گرجا ۔

بڈھے نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی ۔ پھر انگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا ۔ میں نے ادھر آنکھ اٹھائی دیکھتا ہوں کہ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک قلعہ نما مکان کھڑا ہے ۔ مکان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ کیونکہ کاش گڑھ کے راستے میں کوئی ایسا مکان نہ تھا ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی میں راستہ بُھول چکا ہوں ۔

میں گھوڑے سے اُترا ۔ اور بڈھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا، قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک وسیع و عریض مگر ویران نانک چندی قلعہ ہے ۔ دروازہ پر پتھر میں ''الصدف'' کندہ تھا ۔

'' تمہارے آقا ناراض تو نہ ہوں گے ؟'' میں نے بڈھے سے پوچھا ۔

''نہیں ۔'' اُس نے سر ہلا کر کہا ۔ ''خوش ۔''

پھر وہ گھوڑا لے کر چلا گیا ۔ اور میں تن تنہا وہاں کھڑا رہ گیا ۔ عین اسی وقت بالائی منزل میں ایک کھڑکی کھلی ایک بتّی روشن ہو گئی ۔ کھڑکی میں ایک دبلی پتلی اداس حسینہ آکھڑی ہوئی ۔ گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو ۔

''آئیے ۔'' بڈھے نے واپس آکر مجھے چونکا دیا میں اس کے ساتھ چل پڑا ۔

اب میرے تمام شبہات مٹ چکے تھے ۔ بلکہ میں خوش تھا کہ رات کاٹنے کے لئے ایک محفوظ جگہ مل گئی ۔ دو ایک اندھیرے کمروں کے بعد زینے سے ہوتے ہوئے ہم دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں میں نے حسینہ کو دیکھا تھا ۔ وہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کا ایک حصّہ باریک پردے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا ۔ بڈھا مجھے اس پردے کے پیچھے لے گیا ۔ اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا ۔ کمرے کے بڑے حصّے میں ایک مدھم سی بتّی جل رہی تھی پلنگ اور پلنگ پوش دونوں پرانی وضع کے تھے مگر تھے دونوں ہی قیمتی ۔ بچھونے پر گردوغبار کی تہہ جمی ہوئی تھی ۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی ۔ بڈھے کا آقا مہمان نواز تو تھا لیکن اسے رکھ رکھاؤ کا طریقہ مطلقاً نہ آتا تھا ۔ اس غبار آلود پلنگ پر سونا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے مڑ کر بڈھے کی طرف دیکھا ۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا ۔ بڈھے کی اس عجلت پر مجھے حیرانی ہوئی ۔ مایوس ہو کر پھر کمرے کا جائزہ لیا تمام کمرہ گرد آلود تھا گویا برسوں سے کسی نے جھاڑا نہ ہو بستر کے علاوہ کمرے

کا سارا فرنیچر بے حد پُرانا تھا ۔ اگرچہ تھا قیمتی ۔ فرش پر کشمیری قالین بچھے ہوئے تھے ۔ دو ایک چوکیاں جو یہاں وہاں رکھی تھیں ۔ بہت بھاری اور بھدّی تھیں ۔ پرلے کونے میں لکڑی کا جالی دار پردہ کھڑا تھا ۔ جس کے پاس ہی دیوار پر ایک عجیب سی شکل کا کلاک ٹنگا ہوا تھا ۔ جس کے پنڈولم کی رفتار اِس قدر سست تھی کہ اِس کے چلنے کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی شمعدان پر ایک بڑا کتبہ رکھا ہوا تھا جس پر جلی اور خوشخط قلم سے "بیگم آصف الدولہ" لکھا تھا ۔ پاس ہی ایک کلنڈر ٹنگا ہوا تھا ۔ جس پر ۳۱ ۔ دسمبر کی تاریخ لگی ہوئی تھی ۔ ۳۱ دسمبر !! میں نے حیرانی سے اُسے دوبارہ دیکھا اُس دن تو جون کی گیارہ تھی ۔

بائیں میں نے دیکھا وہی حسینہ چپ چاپ چوکی پر بیٹھی تھی اسے دیکھ کر میں ۳۱ ۔ دسمبر کو قطعی بُھول گیا ۔ حسینہ اُٹھ بیٹھی ۔ اِس کے ہونٹ ہلے ۔ کمرے میں مدھم آہ تیرنے لگی ۔

اس کی آنکھیں موٹی تھیں اور جسم لچکدار ۔ اگرچہ لباس پرانی وضع کا تھا لیکن اس لباس میں وہ کس قدر پیاری لگتی تھی نہ جانے بیچاری کو کیا دکھ تھا کہ اس قدر اداس تھی ۔

باہر دروازے پر مدھم دستک سنائی دی "سعیدہ"

حسینہ نے اپنا سر اٹھایا ۔ "اسفند !۔" اُس کا چہرہ خوشی سے چمکا ۔

ایک خوشرو جوان کمرہ میں داخل ہوا ۔ سعیدہ اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے

"تم آ گئے اسفند" ۔

"ہاں میں آگیا ۔"

"میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے ۔"

"تمہارے میاں ؟"

"اونہہ ۔" وہ گنگنائی ۔

"کیوں ؟"

"چلے گئے ۔"

"اوہ ۔۔" جوان مسکرایا ۔

دونوں چوکی پر بیٹھ گئے ۔ جوان نے اپنی مرصع پگڑی اتار کر رکھ دی ۔

سعیدہ !! جوان نے آہ بھری ۔

"اسفند ۔"

"اوہ سعیدہ !!"

کمرہ میں دو مبہم آہیں تیرنے لگیں ۔

"اگر وہ آگئے تو ؟"

"ایسا نہ کہو ۔" سعیدہ نے اُس کے منہ پر انگلی رکھ دی جوان نے اس چوم لیا ۔

"تم میری ہو ؟"

"ہاں ۔" ایک بار پھر وہ لپٹ گئے ۔

میں حیران بیٹھا دیکھ رہا تھا ۔ وہ پردہ جو ہمارے درمیان حائل تھا ۔ اس قدر باریک تھا کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا ۔ ان کی معمولی سی جنبش بھی پورے طور پر دکھائی دے رہی تھی ۔ اگر انہوں نے مجھے دیکھ پایا تو ۔ اس خیال سے میں گھبرا گیا ۔ نہ جانے وہ سڑی بڈھا مجھے وہاں کیوں بٹھا گیا تھا ۔ پھر دفعتاً میرا خیال اپنی بیگم کی طرف چلا گیا ۔ نہ جانے اس وقت کس سے مل رہی ہوگی ۔ اُف میرا راستہ بُھول جانا کِس قیامت کی غلطی تھی ۔

پھر سیڑھیوں کی طرف سے آوازیں سنائی دیں ۔ مدھم آوازیں ۔ اور میرا سِلسلۂ خیال منقطع ہوگیا ۔

"بیگم کہاں ہیں ؟" ایک بارعب مگر مدھم آواز آئی ۔

"بڑے کمرے میں حضور ۔"

"اس وقت ؟"

"جی"

"کیا کر رہی ہیں ؟ ۔۔۔۔۔ آرام کر رہی ہونگی !"

"جی ۔"

"اچھا تم جاؤ ۔"

پھر ایک مدھم مگر گہری آہ کی آواز آئی جو کافی دیر تک میرے اردگرد منڈلاتی رہی ۔ پھر کوئی بڑ بڑانے لگا ۔

"وہ بے آرام ہوگی ۔ کل ہو جانے کی اطلاع ۔ ہمارے آنے کی ۔ چلو ۔ لیکن ۔ اوہ !!! ۔ اِس سے دور رہنا کتنا مشکل ہے ۔"

پھر بڑے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی وہ دونوں چونک پڑے

"کون ہے ؟" وہ بولی ۔

"بیگم ۔۔۔۔۔"

"اوہ ۔" کمرہ میں ایک آہ تیرنے لگی ۔ دونوں خوف سے بُھوت بن گئے سعیدہ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا پھر مسکرا کر جالی دار پردے کی طرف اشارہ کیا ۔ اور وہ پردے کے پیچھے جا کر چھپ گیا ۔

"بیگم ۔ ہم ہیں ۔" پھر دستک ہوئی ۔

سعیدہ نے جاکر دروازہ کھول دیا "آپ ؟ ۔ اس وقت ۔"

"ہاں اس وقت ۔ آرام کر رہی تھیں کیا ؟"

"آپ آگئے ۔"

"ہاں تم سے دور رہنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے بیگم ۔"

"اوہ" کمرہ میں دو آہیں گونجیں ، مدھم اداس آہیں ۔

"یہ پگڑی ؟" آصف الدولہ نے چوکی سے نوجوان کی پگڑی اٹھا کر خیرانی سے کہا بیگم بے پرواہی سے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔

"بیگم ۔۔۔۔۔"

"بیگم ۔۔۔۔ کوئی آیا تھا ؟"

"نہیں تو ۔" وہ وہیں سے بولی ۔

"اوہ !! "

آصف الدولہ نے کمرہ میں چاروں طرف دیکھا ۔ اس کی نگاہیں لکڑی کے پردے پر جم گئیں ۔ کمرہ کے ہر کونہ سے آہیں سنائی دینے لگیں ۔

"آپ کو شک ہے کیا ؟ بیگم نے چتون چڑھا کر پوچھا ۔

"نہیں تو !"

"پھر -----"

آصف الدولہ پردہ کی طرف بڑھا بیگم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ "اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو -----"

"تو ؟" وہ رُک گیا ۔

بیگم شمعدان سے وہ گتہ اٹھا لائی جس پر بیگم آصف الدولہ لکھا تھا ہوا اور اسے یوں پھاڑ دیا کہ بیگم اور آصف الدولہ الگ الگ ہوگئے "تو" کہہ کر اس نے وہ ٹکڑے الگ الگ میاں کو دکھا دیئے ۔ اور پھر آپ نہایت متانت سے باہر نکل گئی ۔ اور باہر دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی ۔

"اوہ -- !"

"ہوں !" کمرے میں اداس سی آہیں گونجنے لگیں آصف الدولہ بے تابانہ ادھر اُدھر ٹہلتا رہا ۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔

"آؤ" بیگم نے آہستہ سے پکارا ۔

"ہوں ۔" وہ چونک پڑا ، اور پھر اس چوکی پر بیٹھ گیا جو اس کونے میں اندھیرے میں پڑی تھی ۔ اِس کے بعد ایک عرصے تک خاموشی چھائی رہی ۔

پھر وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑانے لگا ۔ "اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو ؟"-----

اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو ؟ "کمرہ میں ہلکی ہلکی مدھم آوازیں سنائی دیں ۔ گویا وہ چوکیاں قالین اور کلاک باری باری اُسے دوہرا رہے تھے ۔

"اور اگر کوئی ہوا تو ۔" اس کا چہرہ ایک ساعت کے لئے نہ جانے خوف یا غصہ سے چمکا ۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ چاپ آہستہ سے بیٹھ گیا ۔

"ہوں -----" وہ بڑبڑایا جیسے کوئی خوفناک فیصلہ کر چکا ہو ۔

"اب آ بھی جاؤ ۔" بیگم باہر سے بولی ۔ "آؤ بھی نا!"

نوجوان لکڑی کے پردے سے باہر نکل آیا بیگم نے اُسے دیکھا اس کا رنگ فق ہوگیا ۔

نوجوان نے سر اٹھا کر آصف کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔

آصف الدولہ نے کنکھیوں سے اُسے دیکھا ۔ لیکن سر جھکائے رکھا ، پھر وہ بڑبڑایا ۔

"کوئی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ خدمت گار ہے ۔ خدمت گار ! جاؤ ہمارے لئے حمام تیار کرو اور بیگم کو یہاں بھیجدو ۔" ان لفظوں کو کہتے ہوئے آصف الدولہ کے ماتھے پر کرب کی ایک لہر پیدا ہوئی ۔ اور اس کی روح میں ڈوب گئی ۔ ایک ساعت کے لئے اس کا چہرا اذیت سے بھیانک ہوگیا ۔

نوجوان پہلے تو ڈرا اور حیرانی سے ٹھٹکا لیکن پھر جلدی سے باہر نکل گیا دروازہ میں پہنچ کر اس نے بیگم کی طرف پُر معنی نگاہ ڈالی لیکن سعیدہ نے منہ موڑ لیا اور اندر آگئی ۔

کمرہ میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی ۔ کراہ زدہ خاموشی ۔

"تم آگئیں سعیدہ ۔" آصف شوق سے اُٹھ بیٹھا ۔

بیگم کی آواز میں شرمساری کی جھلک تھی ۔

"مغموم کیوں ہو آؤ یہاں" آصف بولا ۔ بیگم ۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں ۔"

"میں میں" پریشانی کی وجہ سے بیگم کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی ۔

کمرہ میں ایک قہقہہ گونجا ۔ "یہ میں میں کیا ہوا مذاق کر رہی ہو سعیدہ ؟"

"مجھے افسوس ہے "سعیدہ گنگنائی ۔

"الٹا ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے تم پر شک کیا ۔ ہمیں معاف کر دو سعیدہ !"

اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے ۔

انہیں تخلیے میں دیکھنا مجھے گوارہ نہ تھا ۔ میں نے جھٹ آنکھیں نیچی کر

لیں ۔ لیکن رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ وہ عورت کس قدر چالاک تھی اور وہ مرد سب کچھ جانتے کے باوجود ۔۔۔۔ سارا قصہ ہی عجیب تھا ۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا ۔ کمرے میں کوئی نہ تھا ۔ انگھیٹی پر ایک کی بجائے دو دیئے جل رہے تھے ۔ دونوں شعلے ابھر رہے تھے ۔ دیکھتے دیکھتے وہ شعلے بہت بلند ہوگئے اور اُوپر جا کر یوں خم کھا کر مل گئے ایک محراب بن گئی ۔

ڈر کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ لیکن حلق میں آواز نہ تھی ۔ میں بھاگا اور نہ جانے کیسے ٹھوکریں کھاتا ہوا سیڑھیوں میں جا پہنچا ۔ وہاں وہی بڈھا لالٹین اٹھائے سڑک کی طرف چل دیا ۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا ۔ دروازہ پر میرا گھوڑا کھڑا تھا "چلئے" اُس نے مجھے گھوڑا پکڑاتے ہوئے کہا ۔ اور ہم دونوں چپ چاپ پگڈنڈی کی طرف چل دیئے ۔

میرے دائیں بائیں چاروں طرف سے مدھم اور مبہم آوازیں آرہی تھیں ۔

"اب ہم آزاد ہیں بیگم آزاد ' ہم چاہتے ہیں کہ سب کو آزاد کرادیں ۔ سب قیدیوں کو آزاد کر دو ۔ قیدیوں کو آزاد کر دو ۔"

پگڈنڈی پر آصف الدولہ کھڑا گنگنا رہا تھا ۔ "سب قیدیوں کو آزاد کر دو ۔" قیدیوں کو ۔ "تم آزاد ہو ، آزاد ۔" خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی "بھوت !"

"بھوت ۔" بڈھا چلایا اور اپنی بلوریں آنکھیں میری طرف اٹھائیں ۔ اس کا چہرہ ڈر سے بھیانک ہوگیا ۔ اور وہ کانپ کانپ کر گر پڑا ۔ لالٹین گل ہوگئی ۔

میں نے فوراً ٹارچ جلائی ۔ پگڈنڈی ویران پڑی تھی ۔ وہاں نہ بڈھا تھا اور نہ اُس کی لالٹین میں نے ٹارچ کی روشنی اپنے گرد چاروں طرف پھینکی ۔ اردگرد کسی مکان کا نام و نشان نہ تھا ۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی جھاڑیوں کا ایک وسیع پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا ۔

۔۔۔ سامنے دور دو ایک میل پر کاش گڑھ کی مسجد کے گنبد صبح کے

دھندلکے میں جھلملا رہے تھے۔

"آزاد ۔۔۔۔!" کوئی مؤذن مینار پر کھڑا چلا رہا تھا۔ "آزاد۔"

نہ جانے کیا ہوا مجھے دفعتاً میرے دل کا ڈر دور ہوگیا اطمینان سا پیدا ہوگیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ تمام زنجیریں کٹ گئی ہوں جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ کاش گڑھ کو جانا بے کار ہے۔ نہ جانے کیوں۔ حقیقت حال جاننے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کا منہ واپس بھورگھاٹ کی طرف موڑ دیا۔ اور اُسے ایڑ لگا دی۔

کئی ایک سال کے بعد مجھے پہلی مرتبہ کشمیر جانا پڑا۔ پہاڑیوں میں پھرتے پھراتے ایک دن میں جھن وادی کی طرف جا نکلا۔ راہ میں ایک ویران سے دروازے پر جو نظر پڑی تو میں ٹھٹکا۔ دروازے کے پتھر پر "الصدف" کندہ تھا۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ اُف! میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نکٹائی گویا گلے میں پھندہ بن گئی۔ بالکل وہی۔ وہی الصدف جہاں میں نے وہ رات بسر کی تھی وہی سیڑھیاں، وہی دروازہ اور چوبارہ۔ وہی الصدف۔ جہاں میں نے وہ رات بسر کی تھی وہی سیڑھیاں، وہی دروازہ اور چوبارہ۔ وہی الصدف جو اس رات بھور مندر سے کاش گڑھ جانے والی ویران پگڈنڈی پر آگیا تھا۔

وہ قلعہ نما مکان ویران پڑا تھا۔ صرف چار دیواری کھڑی تھی۔ چھتیں بوسیدہ ہو کر گر گئی تھیں۔

"یہ مکان کس کا ہے؟" میں نے ایک بیرے سے پوچھا جو ملحقہ کوارٹر میں رہتا تھا۔

"معلوم نہیں جناب!" وہ بولا۔ "یہ تو برسوں سے یونہی ویران پڑا ہے۔"

عین اُس وقت وہ بڈھا عیسائی وہاں آگیا جو پڑوس میں رہتا تھا۔

"یہ مکان ؟" اُس نے کھانستے ہوئے کہا ۔ اُس کی آنکھ میں چمک لہرائی ۔

"ہاں یہی ۔"

"یہ مکان کسی نواب صاحب کا تھا ۔"

اب کیا اس کا کوئی والی وارث نہیں ؟"

"اونہوں ۔" اُس نے سر ہلا کر کہا ۔ "مکان پر بجلی کوندی اور اور وہ سب مرگئے ایک قیامت بپا ہوگئی تھی یہاں اس روز کوئی ساٹھ سال ہوئے ہوں گے ۔ صاحب ساٹھ سال ۔ میرا مکان پاس ہی ہے وہاں ۔ ہاں وہ رات ۳۱ ۔ دسمبر کی رات تھی ۔ ہم نئے سال کی خوشی میں لگے ہوئے تھے ۔ کہ نواب صاحب کا سارا کنبہ تباہ ہوگیا ۔

تباہ ہوگیا میں نے دہرایا ۔

"ہاں جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے ؟"

صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ و پکار سنائی دیتی ہے ۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیختا ہے کبھی میگم میگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کردو ۔" میرا بولا ۔

"اس نواب کا کیا نام تھا ؟ بڑے میاں تمہیں یاد ہے کیا" میں نے شوق سے مبہوت ہوکر پوچھا ۔

ایک منٹ کے لئے بڈھا خاموش رہا ۔

"ہاں ایسا ہی تھا کچھ ۔ نواب دولا ۔ آصف دولا ۔"

"آصف الدولہ ۔" حیرانی سے میری چیخ نکل گئی ۔

"آزاد کردو ۔ مکان سے کوئی چمگادڑ چیختی ہوئی اڑی ۔۔۔۔۔ "آزاد کردو"۔

.........○.........

ڈاکٹر کا استعمال

"ہاں یقین کیجیئے ۔" حامد نے سگار کا ایک کش لے کر بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا ۔ "ہماری نظروں میں حقیقت، خدا، مذہب کوئی وقعت نہیں رکھتے ۔ ہم ان کو تصرّف میں لاتے ہیں ۔ حقیقت کے ذریعے ہم قتل کر سکتے ہیں ۔ خدا کو لیجئے "خدا" کو بھی حسبِ ضرورت موڑ توڑ لیا جاتا ہے ـــــ مختلف سانچوں میں ڈھال لیا جاتا ہے ۔ مذہب کی مختلف تعبیریں تراش لی جاتی ہیں ۔ محض ذاتی مفاد کے لئے یا اپنے یقینوں اور ایمانوں کی دنیا کو برقرار رکھنے کے لئے یا کسی ایسی ہی ذہنی اُلجھن کو تسکین دینے کے لئے ۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب ۔" طارق نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا ۔ "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ تمام بیماریاں بھی "ذریعے" ہیں اور حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں ؟"

حامد نے سگار کی راکھ طشتری میں جھاڑتے ہوئے کہا ۔ "ہاں زیادہ تر بیماریاں خود ساختہ ہوتی ہیں اور تقریباً ہر بیماری میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ مریض کو مرض کے ہونے سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں ۔ مثلاً عورتوں کو لیجئے ان کی بیماریاں عموماً کسی نہ کسی مقصد کے لئے ہوتی ہیں ۔ خاوند کو خوش رکھنے، نچانے، مٹھی میں لینے یا ٹالنے کے لئے، یا ساس کی خفگی سے نجات پانے کے لئے یا پڑوسیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اور تقریباً یہی حال بچوں اور بوڑھوں کا ہے، ہاں بالکل یہی ۔" اُس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا ۔ "اور پھر ایسے مریض ڈاکٹر سے علاج نہیں کراتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق ڈاکٹر کا استعمال کرتے ہیں جیسے دانتوں کا بُرش ۔"

اس بات پر حاضرین کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔

"اچھا تو ڈاکٹر ۔" طارق نے طعنے کے طور پر کہا ۔ "کیا کبھی کسی مریض

نے آپ کو استعمال کیا ہے ۔"

"ہاں ۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر میز پوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ "کیوں نہیں اس کے متعلق مجھے ایک واقعہ یاد آیا ۔" ڈاکٹر حامد نے سگار کا ایک کش لیا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔ لیکن جلد ہی وہ کسی نامعلوم گہرے خیال میں ڈوب گیا ۔

حاضرین کے اصرار پر حامد نے وہ واقع یوں بیان کیا:۔

"ایک روز میں اپنے مطب میں بیٹھا تھا ۔ کوئی نو بجے کا وقت ہوگا ۔ کہ ایک دُبلا پتلا آدمی آیا ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں شائد وہ جوہری تھا ۔ یا عام سوداگر ۔

بہر حال وہ کوئی امیر دوکان دار تھا ۔ اس کی دوکان مال روڈ پر تھی تیس پنتیس برس کا سن ہوگا ۔ سیدھی سادی شکل و صورت سمجھ لیجئے ۔ مگر اُس کی آنکھیں خوابی تھیں ۔ جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جاگتے میں خواب دیکھنے کا عادی ہے اور اس نے زندگی میں بہت دُکھ سہا ہے ۔ اُس نے زندگی میں بہت دُکھ سہارے ہیں اور حقائق کی تلخیوں سے گھبراتا ہے ۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے آپ کے مشورے کی سخت ضرورت ہے ۔ میں سخت دُکھی ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ مَیں وحشت سے دیوانہ ہو جاؤنگا ۔ اتفاقاً آپ کا بورڈ دیکھ کر اندر چلا آیا ہوں ۔ آپ فرمائیے کہ میں کس وقت آپ کی خدمت میں مشورہ کے لئے حاضر ہو جاؤں ۔

جواب میں مَیں نے کہا "میں آپ کو صبح نو بجے سے بارہ بجے تک مل سکتا ہوں ۔ ہاں کوئی اور مریض ہو تو آپ کو انتظار کرنا پڑے گا ۔۔۔۔ یا جب بھی آپ کو فرصت ہو ۔" میں نے اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر کہا ۔

اُس نے دو ایک بار گھڑی کو گھورا اور پھر یوں گنگنانا شروع کیا ۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ۔ "خیر کوئی بات نہیں ! کوئی بات نہیں ! ابھی سہی ۔" اُس کے الفاظ سے سسکیوں کی بُو آرہی تھی ۔ مگر اُس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ جیسے کسی نا معلوم دبی ہوئی مسرت سے لبریز ہوں ۔

"ایک منٹ ٹھہریئے ۔" میں نے نوٹ بک تلاش کرنے کے لئے معذرت کی "کیا میں یہ تصاویر دیکھ سکتا ہوں"۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ جیسے کرسی میں اُس کا دم گھٹ رہا ہو ۔

"شوق سے ۔" میں نے دراز سے نوٹ بک تلاش کرتے ہوئے جواب دیا ۔

"اخاہ!! ۔" مینٹل پیس سے پتھر کا کتا اٹھاتے ہوئے وہ خوشی سے چلایا "بہت اچھا ! نہایت خوب ! ڈاکٹر صاحب" اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا "میں آپ کے چُناؤ کی داد دیتا ہوں ۔"

اُن دنوں میں نے اپنے کمرے کو مختلف تصاویر اور نادرات سے سجایا ہوا تھا ۔ تاکہ مریض کی بھٹکتی ہوئی نگاہوں میں اُس کے دِل کی ان کہی بات کا اظہار ہو سکے ۔ وہ کتا میں نے ڈبی بازار سے خریدا تھا ۔ وہاں ایک میلی کچیلی کباڑی کی دکان میں متفرقات کے ڈھیر تلے پڑا تھا بہت سستا مل رہا تھا اِس لئے میں نے خرید لیا ۔ مگر اس وقت میں نہ سمجھ سکا کہ وہ تحلیل نفسی کے عمل میں کیا کام دے سکتا ہے ۔"

وہ کتا پتھر کا بنا تھا ۔ کوئی پانچ چھ اِنچ اُونچا ہوگا ۔ مگر اُس کی صورت بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی ۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے ۔ یعنی ــــــ ہاں اُس نے کچھ سوچ کر کہا ۔ اُس کی صورت اُس کتّے کی تھی جو عام طور پر سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا پایا جاتا ہے اور ہر راہگیر کو مظلوم اور ملتجی نگاہوں سے اس اُمید پر دیکھتا ہے کہ وہ اسکی دُم کو پاؤں تلے روند جائے ۔ پھر وہ چیختا ہوا ، چلاّتا ہوا ایک طرف سرک جاتا ہے ۔

ڈاکٹر نے سلسلۂ بیان جاری کیا ۔

"میرے دکھ کا باعث میری بیوی ہے ڈاکٹر ۔" اُس کی آواز یک دم کسی اندرونی ٹھیس سے پھٹ گئی ـــ "ہاں ہماری شادی کو چھ برس ہو چکے ہیں ڈاکٹر اور مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے بلکہ عشق لیکن اُس نے کبھی حقیقی معنوں میں میری پرواہ نہیں کی مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھ میں چمک نہیں رہتی ۔

بلکہ ایک غبار سا آجاتا ہے اور اُس کے ہونٹوں میں ایسا شکن پڑجاتا ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں جیسے جیسے وہ مجھے بنا رہی ہو لیکن ....

"چھ سال پہلے" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے واقعی مجھ سے محبّت تھی۔ یا شاید وہ میری نظر کا دھوکا ہو یا شاید ایسا ہی ہو مگر میرا خیال ہے کہ اُسے مجھ سے محبت تھی۔ مگر شادی کے بعد وہ بات نہ رہی۔

مثلاً میرے دوستوں کی موجودگی میں جب بھی وہ کسی سے بات کرتی ہے تو اس کی نگاہوں میں چمک لہرا جاتی ہے، خمار سا، تڑپ سی یا روشنی سی نہ جانے کیا" اُس نے جھر جھری لے کر کہا۔ "اُس کی ہر حرکت اور ہر ادا میں کچھ ایسی بات جھلکتی ہے جس سے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے دوستوں کو مسحور کر رہی ہے۔ اُبھار رہی ہے ... مائل کر رہی ہے یعنی جیسے وہ آنکھ سے کوئی وعدہ کر رہی ہو ... مگر ... جب وہ میری طرف دیکھے تو اُس کی نگاہوں کی چمک بُجھ جاتی ہے۔ اور وہ ایسی پھیکی نظروں سے مجھے دیکھتی ہے جیسے مجھ سے اکتا چکی ہو۔

"جمشید کے ساتھ تو اُس کا برتاؤ بالکل رازدارانہ تھا۔ میرا مطلب ہے جیسے اُن کے درمیان کوئی راز ہو۔ جمشید میرا پُرانا دوست ہے۔ وہ ریلوے میں اے ٹی۔ او تھا اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہایت خوبصورت جوان تھا اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اب تو خیر عرصہ سے ہمارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔" اُس نے موہوم آہ بھر کر کہا۔ "اِس کا باعث میری بیوی تھی ... خیر ... خیر .. اُس نے کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "جس روز جمشید کو ہمارے ہاں آنا ہوتا میری بیوی خاص طور پر چُن کر لباس پہنتی' بڑی بے صبری سے اُس کا انتظار کرتی۔ جمشید کے آنے پر بات کرتے وقت اُس کی عموماً اکتائی ہوئی آواز میں لوچ پیدا ہو جاتا اور باتوں ہی باتوں میں وہ ایسے لفظوں پر زور دے جاتی یا ہاتھ، ہونٹ اور سر کی ہلکی سی جنبش سے اُس سے ایسی باتیں کہہ جاتی کہ جمشید کی آنکھ میں سُرخ ڈورے دَوڑ جاتے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ پی کے آیا ہو۔ مگر میرے لئے اُس کی ایک ایک حرکت برچھی بن کر کلیجے سے نکل جاتی تھی حتیٰ کہ میں رقابت کی جلن سے بے حال ہو کر کمرے سے باہر چلے جانے

پر مجبور ہو جاتا ۔

"دکان میں بیٹھے بٹھائے ان کی وہ ایک ایک حرکت میری آنکھوں تلے پھرتی اُن حرکات کا مطلب مل جل کر میرے سامنے ایک واضح تصویر پیش کر دیتا ایک نازیبا تصویر ۔ میرے دل میں عجیب سے خیالات اٹھتے ہاں اُس نے دو مرتبہ جمشید کو ہاتھ دکھایا تھا ۔ یعنی دس بجے چوری ملاقات ۔۔۔ یعنی وہ اس وقت مل رہے ہیں ۔۔ اکٹھے بیٹھے ہیں ۔۔۔ میرے سامنے اُن کی ملاقات کی تصویر آ کھڑی ہوتی میں بے قرار ہو جاتا ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے اِس سے بڑھ کر اور کوئی جلن نہیں ہو سکتی ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر پڑا تڑپ رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔ میرے دل کے کونے سے آوازیں آتیں ۔ "چلو چل کر دیکھ لو ۔ چل کر دیکھ لو چلو ۔" ۔۔۔۔ حتیٰ کہ میں دیوانہ وار دکان سے اٹھ بھاگتا ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے اِس نے مجھے کبھی موقع نہ دیا کہ میں اُس کو جھٹلا سکتا ۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ وہ حقیقت تھی ۔۔۔ میرا وہم نہ تھا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ وہم کیسے ہو سکتا ہے" اُس نے شاید اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے دہرایا ۔

"یہ اُس کی چالاکی کی انتہا ہے کہ جب کبھی میں اپنے شکوک اُس پر ظاہر کرتا ہوں تو وہ اُلٹا بگڑتی ہے اور ایسے مظلوم انداز سے اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنی محبّت اور میری ناقدری کا قصہ سناتی ہے کہ ایک لمحے کے لئے میں اُسے مظلوم اور اپنے آپ کو ظالم سمجھنا شروع کر دیتا ہوں ۔۔۔ کئی دفعہ میں نے اُس کی بات پر اعتبار کر کے اُسے موقع دیا ہے ۔ مگر اُس کے انداز میں فرق نہیں آیا ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے میری طبیعت میں کبھی کمینے شکوک پیدا نہیں ہوئے ۔ میں نے کبھی اپنی بیوی کو پردے کی قید میں نہیں ڈالا ۔ اس کے برعکس میں نے اُسے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے ۔ مگر وہ میری شرافت کا ناجائز فائدہ حاصل کرنے سے ذرا نہیں شرماتی ۔ بس میں یہ چاہتا ہوں ڈاکٹر کہ مجھے حقیقت معلوم ہو جائے ، میں دھوکے میں نہ رہوں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اُسے کس قدر چاہتا ہوں ۔ ورنہ ایک دن ایک دن کے لئے بھی اُسے اپنے پاس نہ رکھتا ۔ وہ بہت پیاری ہے ڈاکٹر بہت

پیاری ۔ کاش کہ وہ پیار کرنے کے لئے یوں غیروں کو نہ چنتی ۔ جمشید کے بعد نوشیرواں اور اب " اُس نے ایک تمسخر بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا ۔ "اب اُس کی آنکھیں میرے دوست مسٹر منیر سے کھیلتی ہیں ۔ مگر میں ضرور کھوج نکالنے میں کامیاب ہوں گا ۔ میں اُسے عین موقع پر ثابت کروں گا کہ میں وہمی اور خبطی نہیں ہوں ۔ خواہ مخواہ اُس پر الزام نہیں تھوپتا ۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے ، بہت چالاک ہے وہ ۔" اُس نے بے بسی سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ۔

پھر وہ تڑپ کر کُرسی سے اُٹھ بیٹھا ۔" اچھا ڈاکٹر صاحب مجھے اب جانا ہے ۔ آج ہم نے مسٹر منیر کو چائے پر بُلایا ہے ۔ مجھے نو بجے وہاں پہونچ جانا چاہئے تھا ۔ پونے دس ہو چکے ہیں ۔" اُس نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ "دیکھئے نا میں اُس پر کس قدر بھروسا کرتا ہوں ۔" اُس نے مظلومیت بھرے انداز سے مجھ سے اپیل کی ۔

حامد نے ایک نیا سگار سلگایا اور دیا سلائی بجھا کر چاروں طرف دیکھا ، تینوں دوست خاموش بیٹھے تھے ۔ صرف طارق کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔ حمید چپ چاپ بیٹھا اپنی انگلیوں سے کھیل رہا تھا ۔

"اچھا تو کیا تم نے اُس کی بیوی سے ملاقات کی ۔" حمید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا ۔ اور اپنے ہونٹوں کو یوں بھینچ لیا جیسے بچے انگریزی مٹھائی چوستے ہیں ۔

"ہاں ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔" میرا یہ انوکھا مریض اس بات پر مصر تھا کہ میں اُس کی بیوی سے ملوں اور تحلیل نفسی کے ذریعے یہ معلوم کروں کہ آیا واقعی وہ بے وفا بیوی تھی جیسا کہ اُس کا خیال تھا یا نہیں پہلے تو میں نے جمشید کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن آخر کار مجھے اُس کی بات ماننی ہی پڑی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں میرے پاس مریضوں کی بہت قلت تھی کیونکہ میں نے ابھی پریکٹس شروع ہی کی تھی ابھی لوگ تحلیل نفسی کے طریقہ علاج سے واقف نہ تھے بلکہ اس طریقہ علاج کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور بُغض اُن کے دلوں میں بھرے ہوئے تھے ۔ خیر ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لگایا جانے سے

پہلے وہ نہایت منت اور عاجزی سے کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی کو یہاں بھیجنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ اُس کا بیان میں اپنے کانوں سے سُنوں۔ آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر مجھے حقیقت سے آگاہی ہو جائے گی۔ میرے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے میں صرف جاننا چاہتا ہوں۔ صرف جاننا' یقین جانئے میں کوئی جھگڑا پیدا نہیں کروں گا۔ میں خاموشی سے اُس پردے کے پیچھے بیٹھا رہوں گا۔" اُس نے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر غالباً میری ہچکچاہٹ دیکھ کر چلّایا۔ "میری بات سُن لیجئے خدارا میری بات سُن لیجئے۔ میں جانتا ہوں۔ ہاں ـــ۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ یوں چھپنے کی اجازت دینا آپ کے اُصول کے خلاف ہے مگر خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔" اُس کی کیفیت اس بچے کی سی تھی جو ممانعت کے باوجود موقع پاکر چوری چوری باپ کی صندوقچی سے استرا نکال کر خوف' حیرانی اور اضطراب بھری لذت سے اُس کی دھار محسوس کرتا ہے۔

اگلے روز شام کے چار بجے میرا مریض آیا چہرے پر ایک پُر کیف خمار چھایا ہوا تھا آنکھیں یوں مسرت سے چھلک رہی تھیں جیسے پہلی مرتبہ حقیقت آشنا ہونے کی امید سے منور ہو رہی ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب وہ ابھی آرہی ہے۔" اُس نے آتے ہی اضطراب سے کہا۔ "اُس کا کوئی بچّہ نہیں۔ اُسے ایک بچے کی بہت آرزو ہے۔ میں نے اُسے آپ کا کارڈ دے کر کہا تھا کہ آپ تحلیل نفسی کے ذریعے عورتوں کا علاج کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ ضرور آئے گی۔ وہ آرہی ہوگی۔ خدا کے لئے آپ اُسے اِس موضوع پر ضرور پوچھئے وہ ضرور سچ سچ کہہ دے گی۔" اُس کی آنکھ میں پراسرار چمک لہرا رہی تھی۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔

میں نے پردے کے پیچھے اُس کے لئے آرام کرسی رکھوادی اور خود اُس کی بیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ سچ پوچھئے تو میں خود اس پراسرار عورت کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ گو بظاہر میں اپنے آپ سے یہ شوق ملاقات چھپا رہا تھا۔" ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لے کر کہا۔

ساڑھے چار بجے وہ آئی میں اُسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا ۔ کیونکہ وہ ایک نہایت حسین اور وجیہہ عورت تھی ۔ ڈاکٹر چند ساعت کے لئے خاموش ہو گیا ۔ ایسے معلوم ہوا تھا جیسے وہ سگار کے دھوئیں میں کچھ دیکھ رہا تھا ۔ حمید نے اپنی نکٹائی کی گرہ درست کی ہونٹوں کو چبایا اور پھر ہمہ تن توجہ بن کر بیٹھ گیا ۔ طارق کے چہرے سے مسکراہٹ مفقود ہو چکی تھی ۔ غور سے سننے کے لئے وہ آگے کی طرف جُھکا ہوا تھا نسیم جو کسی کالج میں پروفیسر تھا ، اپنے بدن کو یوں بھینچ رہا تھا جیس کسی ضدّی انگڑائی کے خلاف جدوجہد کر رہا ہو ۔

اُس کی آنکھیں بہت جاذبِ نظر تھیں ڈاکٹر نے کھوئے ہوئے انداز سے بیان کرنا شروع کیا ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پانی میں تیر رہی تھیں ۔ اور اُس کی نگاہیں بھیگی بھیگی سی تھیں ۔ ' جیسے وہ ابھی رو کر آئی ہو ۔ ہلکی ہلکی سُرخی میں غم کی جھلک تھی ۔ جیسے وہ آنکھیں پی جانے کی عادی ہوں ۔

اُس کے گلابی پتلے پتلے ہونٹ ۔ اُنہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو یا کہنا چاہتی ہو ۔ اِس کے علاوہ اُس کے نازک گالوں کی سرخی دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی کلی کھل رہی ہو ۔ جیسے وہ مسلسل جھینپ یا شرما رہی ہو ۔ اُس کی حرکت رسیلی تھی ۔

پھر وہ بیٹھ گئی ۔

"فرمائیے ۔" میں نے اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کرتے ہوئے پردے کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔

"میرے خاوند نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا ۔" اُس نے شرم سے لال گلال ہو کر آنکھیں جھکا لیں "چھ سال شادی کو ہوئے ہیں ۔ مگر کوئی بچہ نہیں ۔"

ڈاکٹر نے سگار کی راکھ جھاڑ کر ایک گہرا سانس لیا ۔

"ہاں تو کوئی بیس منٹ میں اس سے اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں کرتا رہا ۔ ایسے سوال کرتا رہا جو عام ڈاکٹر کیا کرتے ہیں ۔ آخر جرأت کر کے میں اُسے مطلوبہ موضوع پر لے آیا ۔

"ہاں بیگم صاحبہ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ خاوند سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں ۔" میں نے ہمت کرکے پوچھا ۔

معاً اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ بھوِیں تن گئیں ۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے ان آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں۔ اُس نے موہوم سی آہ بھری ۔

"ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں ۔" اُس نے میز کو حسرت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا ۔

آپ گھبرائیے نہیں محترمہ" میں نے اُسے یقین دلانے کی غرض سے کہا ۔ "آپ جب تک پوری آزادی سے دل کی بات نہیں کہیں گی ۔ ہم اس بات کا کھوج نہیں لگا سکیں گے ۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ آپ کی آرزو پوری ہی نہ ہو سکے گی ۔ آپ بالکل بے فکر رہیئے ۔" میں نے پردے کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے کہا ۔" آپ کا راز ہمیشہ راز رہے گا ۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے"

"کوئی خاص بات تو نہیں ۔ ہاں وہ طبعاً بے حد شکی ہیں ۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح شک کی صورت پیدا کر لیتے ہیں ۔" اُس نے اپنی انگلیوں سے "پیپر ویٹ" گھماتے ہوئے جواب دیا ۔" وہ اپنے خیالی شک کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں ۔ اسی لئے میں بہت دکھی رہتی ہوں ۔" کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہی پھر بولی" حیرانی کی بات ہے کہ میرے میاں آپ ہی مجھے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے پر مجبور کرتے ہیں اگر میں اُن سے خندہ پیشانی سے نہ ملوں تو اُلٹا مجھ سے بگڑتے ہیں اور اگر ملوں تو میری چھوٹی چھوٹی حرکتوں اور باتوں کو موڑ توڑ کر کیا سے کیا بنا لیتے ہیں ۔ اور الٹا مجھ پر الزام دیتے ہیں ۔" اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں ۔

مثلاً کل کی ہی بات ہے اُنہوں نے میرے پُر زور انکار کے باوجود اپنے ایک دوست مسٹر منیر کو نو بجے چائے پر بُلایا اور آپ دس بجے گھر آئے ۔ اسی طرح وہ مجھے اکثر پریشان کرتے ہیں ۔ اُن کا کوئی دوست ملنے آتا ہے تو اُنہیں کوئی بُھولا بِسرا کام یاد آجاتا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔" اور پھر اُس نے شرم سے یا نہ جانے غصہ سے لال ہو کر کہا ۔" پھر وہ پردوں کے پیچھے

چھپ چھپ کر ہمیں دیکھتے ہیں ۔"

میری نگاہ بے اختیار پردے کی طرف اُٹھ گئی ۔ اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے بھید کو عریاں دیکھا ہو ۔

جیسے دفعتاً میں نے خوشی اور غم کا راز پا لیا ہو میں چپ چاپ بیٹھا تھا اور محترمہ حیرانی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔اُس نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"اور تو کوئی بات نہیں ۔"

"ہاں معاف کرنا ۔" میں نے اپنے کو سنبھال کر کہا ۔ "میں سمجھ گیا ۔ میں آپ کو اپنی تشخیص کل لکھ کر بھیجدوں گا ۔"

" ایک منٹ کی اجازت دیجئے ۔" کہہ کر میں اُٹھ بیٹھا اور کسی بہانے پردے کے پیچھے چلا گیا ۔ اور صاحبان میں نے کیا دیکھا ... ڈاکٹر خاموش ہو گیا میرا مریض آرام کرسی میں گہری نیند سو رہا تھا ۔ اُس کے کوٹ کے بٹن کھلے تھے اور قمیض کا کلا ڈھیلا تھا ۔ اور انتہائی خوشی یا کرب کے بعد جو تھکن سی ہو جاتی ہے اُس کے چہرے سے عیاں تھی یعنی یوں سمجھ لیجئے جیسے کوئی بچّہ جو کسی کھلونے کے لئے رو رو کر اپنا آپ بے حال کر لے ۔ اور پھر جب اُسے کھلونا مل جائے تو وہ سسکیاں بھرتا ہوا اطمینان سے سو جاتا ہے اور نیند میں اُس کے ہونٹوں پر ایک سسکی قائم رہتی ہے ۔ کرب بھری خوشی ، خوشی بھری سسکی۔ اور اُس کے ہاتھ میں جو کرسی سے نیچے لٹک رہا تھا وہی پتھر کا کتا تھا ۔ جو اُس نے انگیٹھی پر سے اٹھا لیا ہو گا ۔

"ڈاکٹر صاحب ۔" حمید نے کالر ڈھیلا کرتے ہوئے پوچھا ۔ "تو کیا وہ بیگم پھر کبھی آپ کے مطمل میں آئی ۔"

ڈاکٹر خاموش بیٹھا دھوئیں کے مرغولے کو دیکھتا رہا ، اس نے حمید کو جواب نہ دیا ۔

..........○..........

وہ انجم

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب امرتسر میں انجم کا چرچا تھا ۔ آوارہ لڑکے اور تانگے والے انجم کی تانیں الاپتے پھرتے تھے ۔ عورتیں ڈھولک کے ساتھ انجم کی طرزیں اڑاتیں ۔ پڑھے لکھے لوگ زیرِ لب انجم کے باندھے ہوئے گیت گنگناتے اور گھروں میں میاں بیوی کی انجم پر تکرار ہو جاتی ۔

ادھر انجم کے چوبارے تلے بڑی بڑی کاریں کھڑی رہتیں ۔ بانکے ترچھے ڈرائیور حسرت بھری نگاہوں سے چوبارے کی طرف دیکھتے ۔ آتے جاتے پنواڑی کی دوکان پر پان کھا کر انجم کے چوبارے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ۔ شہر کے معزز لوگ چوبارے کے پاس پہنچتے تو آنکھیں جھکا لیتے ۔ اور اتنی تیزی سے قدم اٹھاتے گویا کسی خطرے کی گرفت کو محسوس کر کے بھاگ رہے ہوں ۔

ویسے تو انجم ایک رقاصہ تھی ۔ مگر اسے دیکھ کر آپ کے دل میں یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ رقاصہ ہے یہی اس کی جاذبیت کا راز تھا ۔ لوگ اس کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ۔ پھر دیکھتے اور نہ دیکھنے کی آرزو کرتے ۔ لیکن پھر چوری چوری دیکھتے ۔ لاحول پڑھتے اور لاحول پڑھ پڑھ کر دیکھتے اور اگر کوئی بن دیکھے اس کے پاس سے گزر جاتا تو اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ۔ "دیکھا میں وہ ہوں جو انجم کو دیکھے بنا گزر سکتا ہوں"!

اظہر نے بھی انجم کو کئی بار چوری چوری بہانے بہانے دیکھا تھا ۔ لیکن اس روز جانے کیا ہوا اسے ۔ اس روز جب وہ باغ میں بیٹھا تھا اور انجم وہاں آئی تھی ۔ چھلکی ہوئی آنکھیں ۔ اڑتی ہوئی لٹ اور معصوم سے ہونٹ ۔ اس کے ہاتھ کا رومال اڑ کر اظہر کے قریب آگرا ۔ خوشبو کی ایک لپٹ نے اسے چاروں طرف

سے گھیر لیا ۔ اور وہ جیسے کھو گیا ۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کا خیال تک نہ رہا ۔ وہ رومال اٹھانے کے لئے اٹھا ۔۔۔۔۔ جھجک کر بیٹھ گیا ۔ رومال کے قریب آکر انجم ایک ساعت کے لئے رک گئی ۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں نے نگاہ غلط انداز سے اظہر کی طرف دیکھا ۔ اظہر نے محسوس کیا جیسے کوئی رنگین قوس اسے گود میں لئے جھلا رہی ہو ۔ "شکریہ" ۔ اس نے مسکرا کر کہا اور چلی گئی ۔ "شک ۔ ریا" دور کوئل چیخنے لگی ۔ "شک ۔ ریا"

جب آپ کا دل دھڑک دھڑک کر انجم انجم کہہ رہا ہو ۔ کانوں میں کوئی چھیڑ دینے آواز "شکریہ ، شکریہ چلا رہی ہو اور آنکھوں تلے ایک حسین متبسم چہرا پھر رہا ہو ۔ ایسے وقت اگر آپ کا کوئی دوست آنکلے ۔ تو ۔

مانا کہ سعید اظہر کا پیارا دوست تھا اور وہ چار سال کالج میں اکٹھے رہے تھے ۔ مانا کہ وہ ایک مدت کے بعد اسے ملنے کے لئے امرت سر آیا تھا ۔ مگر اظہر کو اس وقت اس کا آنا ناگوار ہوا ۔ سعید کی طبیعت ہی ایسی ہے اس سے درد دل کہنا بے حد مشکل ہے ۔ اور پھر ایک رقاصہ کے متعلق توبہ! وہ ایک روکھا پھیکا فلسفی ہے ۔ اگر آپ اس سے کوئی بات پوچھ بیٹھیں تو وہ جھٹ اس موضوع کے متعلق ایک اصول اخذ کر کے سنا دے گا ۔ وہ ہمیشہ اصولوں میں سوچتا ہے اس کے خیال کے مطابق ذاتی یا انفرادی باتیں سوچنا تنگ دلی کی نشانی ہے اس کی سب سے بڑی آرزو ہے کہ وہ ذاتیات سے بے نیاز ہو جائے اور زندگی کو ایک دیوتا کی بے نیاز آنکھ سے دیکھ سکے ۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھ میں علمی بے نیازی کے باوجود لگاؤ کی چمک لہرا جاتی ہے اور یہ شبہ ہوتا ہے کہ بوجھل فلسفے کی بے تعلقی کے باوجود اس کے دل کی گہرائیوں میں جینے کی آرزو ابھی زندہ ہے ۔

بہرحال سعید کا ایسے موقع پر آجانا ایک امر واقعہ تھا ۔ اور اظہر کو یہ امر تسلیم کرنا ہی پڑا ۔ اس نے بظاہر بڑی خوشی سے اسکا استقبال کیا ۔ دو ایک رسمی سوالات کئے اس اچانک ملاقات پر خوشی ظاہر کرنے کی کوشش کی ۔ اور پھر اپنی اس کوشش کی وجہ سے تھک کر چپ ہو گیا ۔

سعید نے ایک انگڑائی لی ۔ "ہوں ۔ تو خوب وقت گزر رہا ہے آجکل"

"ہاں خاصا" ۔ اظہر نے بے دھیانی سے کاپی پر اپنا نام لکھتے ہوئے کہا ۔
"یعنی آج کل اپنے آپ میں نئی دلچسپیاں پیدا ہو رہی ہیں" ۔

"کیوں؟"

کاپی پر مسلسل اپنا نام جو لکھے جا رہے ہو" سعید نے وہ کاپی اٹھالی اور اسے بغور دیکھنے لگا ۔ "اوہو ۔ اپنے دستخط بدلنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ اور ۔ اور یعنی اظہر کے پردے میں کچھ اور لکھنے کی مشق کی جارہی ہے ۔ اَن ،انجر" ۔

اظہر نے محسوس کیا سعید سے بھید چھپانا کس قدر مشکل ہے ۔ اس لئے اس نے فضول ٹال مٹول کی کوشش ہی نہ کی ۔ اور انجم کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دئے ۔

اظہر کی آپ بیتی سن کر سعید مسکرانے لگا ۔

"ہوں ۔ تو وہ بیحد خوبصورت ہے ۔ رقاصہ ہے ۔ اور ۔ اور متبسم آنکھوں سے تمہارا شکریہ بھی ادا کر چکی ہے ۔ خیر خوبصورتی تو وہی پرانا قصہ ہے لیکن تمہارے دل کی بات کو سمجھ کر تمہارا شکریہ ادا کرنا ۔ یہ چیز خوب پیدا کی ہے تم نے ۔ واقعی آرٹ ہے ۔ آرٹ" ۔

مذاق نہیں کرتا ۔ تمہاری قسم ۔ اظہر چلایا ۔

"اظہر ۔ چڑو نہیں ۔ اصولی بات ہے جس چیز پر تم ایک بار ہنس لو گے ۔ وہ چیز تمہاری جان کا روگ نہ بن سکے گی ------ خیر ------ اب تم چاہتے کیا ہو ؟"

"کچھ بھی نہیں ۔ ویسے ہی ۔ یعنی اسے دیکھ سکوں کیسی حماقت ہے ۔ مگر ہے کیا کیا جائے" ۔ اظہر کچھ جھینپ گیا ۔

"لیکن مشکل کون سی ہے آخر وہ ایک رقاصہ ہے نا ۔ گھڑی دو گھڑی جا کر دیکھ آیا کرو ۔ وہ کیا تم سے پردہ کرے گی" ۔ سعید مسکرانے لگا ۔ خواہ مخواہ روگ نہ بناؤ اسے گھڑی دو گھڑی کے لئے دیکھ آیا کرو ۔

اظہر ہنسا ۔

بڑے بڑے سیٹھ اس کے لئے سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں ۔ اسے اپنانے کے لئے لوگ اپنی تمام دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینے کو تیار ہیں ۔ مگر انجم ۔ انجم کو حاصل کرنا آسان بات ہے کیا ۔ میرے تمہارے جیسے لوگوں کی پرواز سے پرے رہتی ہے وہ بہت پرے" ۔

"دیکھو اظہر" سعید کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی ۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو رقاصہ ہی سہی ۔ ایک بہت بڑی رقاصہ ۔ لیکن آخر وہ عورت ہے ۔ مانا کہ وہ ایک دلچسپ جذباتی اضطراب میں رہنے کی عادی ہے اور اسے عورت کی زندگی حاصل نہیں ۔ مان لیا لیکن ضرور اس نے اپنی نسائیت کو اپنے دل کے کسی کونے میں سنبھال رکھا ہو گا ۔ جیسے کوئی ۔ جیسے کوئی شرابی توبہ کرنے کے بعد اپنا بلوریں جام طاق میں سنبھال کر رکھتا ہے اسے توڑ نہیں دیتا ۔

"ارے اظہر قہقہہ مار کر ہنسا تم تو سوفیصدی کتابی آدمی ہو ۔ بھائی میرے ۔ زندگی اصولوں سے بے نیاز ہے ۔ بالکل بے نیاز" ۔

سعید کا منہ لال ہو گیا ۔ اس نے ہونٹ کو زبان سے کاٹا اور جوش میں کہنے لگا "ہو سکتا ہے کہ میرا خیال محض خوش فہمی ہو کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے اظہر کی بات کا برا مانا ہے ۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی میں اسے کتابی علم کا طعنہ دیتا تھا تو اس کا منہ لال ہو جاتا تھا اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ غصے میں ہے ۔ اگرچہ اس میں غصہ دبانے کی صلاحیت ہے ۔ اس کے باوجود اس روز وہ اپنے غصے کو چھپا نہ سکا اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور جبڑے مقفل تھے ۔

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا ۔ پھر اٹھ بیٹھا ۔ میں تمہاری انجم سے ملوں گا اسنے ایک عزم سے کہا ۔ ضرور ملوں گا ۔

تم انجم کو ملو گے بے اختیار اظہر کے منہ سے نکل گیا ۔ تم انجم سے ملو گے ۔ اسکی آواز میں تحقیر تھی ۔ ہاں وہ بولا ۔ بخدا اگر میرا خیال غلط نکلا تو میں اپنا موجودہ زاویۂ نظر ہمیشہ کے لئے ترک کر دوں گا ۔ یہ کہہ کر وہ چپ چاپ گردن جھکائے باغیچے میں ٹہلنے لگا جیسے گہری سوچ میں پڑا ہو ۔

اظہر کا خیال تھا کہ سعید نے ویسے ہی جوش میں بات کہہ دی ہے اسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ سعید اپنی تخیلی بے نیازی چھوڑ کے عملی ہنگامے میں پڑنا گوارہ کرے گا ۔ اور پھر ایک رقاصہ سے ملنا ۔ یہ بات "سعید" کو کبھی گوارا نہ ہوگی ۔ اسے ایسی عورتوں سے سخت نفرت تھی ۔

اگلے روز سعید نے پھر انجم کی بات چھیڑ دی ۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے انجم کے متعلق کئی ایک باتیں پوچھیں اور پھر کہنے لگا ۔ کیا تم مجھے اپنا کالا اچکن دے سکو گے ۔ اچکن؟ اظہر نے حیرانی سے دوہرایا ۔ ہاں وہ بولا ۔ میں اچکن پہننا چاہتا ہوں ۔ یہ بھی اچنبھے کی بات تھی کیونکہ سعید نے کبھی اچکن نہ پہنا تھا ۔ میں اچکن پہن کر اسے ملوں گا سعید نے وضاحت کی ۔

اوہ ! اظہر چونکا ۔ کیا واقعی تم اس سے ملو گے اس نے سعید سے پوچھا ایک رقاصہ سے ملو گے ۔

نہیں سعید گنگنایا رقاصہ سے نہیں ۔ انجم سے ملوںگا ۔ مجھے یقین ہے وہ صرف رقاصہ ہی نہیں بلکہ عورت بھی ہے ۔ اگر میں اس کا نسائی پہلو بیدار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ۔ پھر وہ خاموش ہو گیا ۔ اس کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں بھانپ گیا کہ اسنے انجم کو ملنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے ۔ اس لئے سمجھانا بجھانا بے کار ہے ۔ میں نے اسے اپنا اچکن دے دیا ۔ اور انجم سے ملنے کے متعلق کوئی بات نہ کی ۔

شام کو اچکن پہن کر وہ اس بازار کی طرف چل پڑا جہاں انجم کا چوبارہ تھا ۔ وہ بازار سعید کی نگاہوں میں دھندلا دھندلا پھیلاؤ سا دکھائی دے رہا تھا ۔ یہاں وہاں مدھم بتیاں جلنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ آتے جاتے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے ۔ گو وہ یوں چلنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ جیسے کوئی خاص بات نہ ہو ۔ انجم کے چوبارے کے نیچے ایک "سلون" کار کھڑی تھی ۔ اس نے دو ایک لمبے لمبے قدم اٹھائے اور دروازے میں داخل ہو گیا ۔ سیڑھیوں میں وہ ایک ساعت کے لئے رک گیا ۔ سامنے نشستگاہ میں قالین پر وہ بیٹھی تھی ۔ مقابل میں ایک دوہرے جسم کے صاحب للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے وہ

ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ۔ سعید نے کوشش کر کے دو قدم اور اٹھائے ۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔

انجم نے مسکرا کر سعید کی طرف دیکھا ۔ "آئیے تشریف لائیے ۔ اس کی آنکھیں دیدہ دلیری سے اس کی شخصیت کو تول رہی تھیں ۔ لیکن معصوم شگفتہ ہونٹ آنکھوں کی رندانہ جرأت کو جھٹلا رہے تھے ۔ سعید کو جھجکتے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی اور اس کے پاس آکھڑی ہوئی ۔ "آئیے نا" ۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا حسین جسم فضا میں رنگدار جالے کی طرح تنا ہوا تھا ۔ سعید کی زبان بند ہو گئی ۔ اور پاؤں بوجھل ۔ گویا وہ ایک ناؤ تھا جس کا پتوار ٹوٹ گیا ہو ۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" ۔ سعید نے جھجکتے ہوئے مدھم آواز میں کہا ۔ "فرمائیے" ۔ وہ ایک دلنواز انداز میں کھڑی ہو گئی ۔

"میرا مطلب ہے یعنی اجازت ہو تو یہاں بیٹھ کر میں آپ کو دیکھ لوں ۔ مدت سے آپ کو دیکھنے کی آرزو ہے" ۔

ایک ساعت کے لئے شوخ آنکھیں گھبرائیں ۔ معصوم ہونٹ کھل گئے ۔ "شوق سے آئیے بیٹھئے ۔ اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر بظاہر پان لگانے میں مصروف ہو گئی ۔

سعید کا دل دھڑک رہا تھا ۔ وہ یہ قطعی بھول چکا تھا کہ وہ ایک رقاصہ تھی اور وہ اسکے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی عورت کو جگانے آیا تھا ۔ اور وہ چند ایک فقرے کیا تھے جو اس نے انجم سے کہنے کے لئے سوچ رکھے تھے ۔ اس کی آنکھیں انجم کے چہرے پر گڑی ہوئیں تھیں ۔ بے معنی سے دھندلے پھیلاؤ میں مدھم سی شمع جل رہی تھی ۔ دو کالی کالی حیران آنکھیں چوری چوری کونوں میں آ آکر اسے دیکھتی تھیں ۔ دور کوئی بھدی سی آواز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا ۔ "پان کھائیے" ۔ انجم بولی ۔

سعید حیرانی سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ۔ اسنے انجم کی بات کا جواب نہ دیا ۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرائی ۔ لیکن اسکی مسکراہٹ میں پریشانی کی واضح جھلک تھی ۔

نیچے کوئی تانگے والا اداس لَے میں گاتاہوا گزر رہا تھا ۔

"تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیہوں دسنا"

انجم نے چونک کر سعید کی طرف دیکھا اور پھر جانے کیوں اس کی آنکھیں جھک گئیں ۔

نہ جانے کتنی دیر تک انجم پان کی طشتری اٹھائے بیٹھی رہی ۔ پھر اس نے طشتری کو فرش پر رکھ دیا اور آپ سیٹھ سے باتیں کرنے لگی ۔ لیکن باتوں کے دوران میں وہ یہ نہیں بھول سکی کہ وہ نوجوان دیوانوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے تمام کائنات کو بھول چکا ہو ۔

دفعتاً وہ سنبھل کر بیٹھ گیا ۔ گویا جاگ اٹھا ہو ۔ "اچھا تو مجھے اجازت دیجئے ۔ اسنے حسرت بھری نگاہ ڈالی ۔

"اوہ ! ابھی سے" انجم چونکی ۔

مجھے جاناہی ہو گا "سعید اس کے منہ پر ٹکٹکی لگائے گنگنایا ۔

لیکن ۔ انجم کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے ۔ یہ تجربہ اس کے لئے نیا اور انوکھا تھا ۔

"اماں جانے دیجئے کوئی ضروری کام ہو گا" ۔ سیٹھ جی نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔

انجم اٹھ بیٹھی اور سعید کے ساتھ سیڑھیوں تک آئی "۔ کچھ دیر اور بیٹھتے" وہ بولی ۔

"نہیں ۔" وہ حسرت بھری مدھم آواز میں بولا ۔ کہیں دیکھ کر پاگل نہ ہو جاؤں ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ واقعی پاگل ہوا جا رہا ہو ۔

انجم نے سعید کی طرف دیکھا ، سیڑھیوں کے دھندلکے میں بھی اس کی آنکھوں میں وہی خلوص بھری حیرانی چمک رہی تھی ۔ نہ جانے انجم کو کیا ہوا اس نوجوان کی نگاہیں اتنی پُراثر کیوں تھیں ۔ اس کا اظہار محبت ایسا کیوں تھا ۔ عام طور پر تو وہ اظہار محبت کے جواب میں ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا کرتی

تھی ۔ ایسا انداز جس میں بے نیازی اور التفات کا امتزاج ہوتا ۔ لیکن اس جوان کے روبرو اسے اپنی تمام باتیں بھولی جا رہی تھیں حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ انجم ہے ۔

سامنے سعید کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی زندگی کا مقصد صرف دیکھنا ہو ۔

آپ کی تعریف انجم نے پوچھا ۔

سعید اس سوال کے لئے تیار نہ تھا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر بولا ۔ "پریم" ۔

مجھے اپنا نام بھی نہ بتائیں گے آپ انجم کی آواز میں منت تھی ۔

مجھے پریم کہتے ہیں وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔

انجم نے آہ بھری ۔ اچھا ۔ پریم ہی سہی ۔

بہت دور سے آیا ہوں ۔ دور سے ۔ صرف تمہیں دیکھنے کے لئے۔سعید جذبات طاری کر کے بولا ۔

اتنی دور سے آئے اور پھر اتنی جلدی چل بھی دئے ۔ انجم نے حسرت بھری نگاہ ڈالی ۔

"آخر جانا ہی پڑے گا ۔ میں ایک غریب آدمی ہوں ۔ اور آپ ۔"

وہ ہنس پڑی ۔ تو کیا مضائقہ ہے ۔ جواب میں وہ خاموش رہا ۔

"میری ایک بات مانیں گے آپ" ۔ انجم نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ۔

"فرمائیے"

"ایک دفعہ پھر ملیے گا ۔ صرف ایک بار ۔ اگلی اتوار کو سہی" ۔

"ہاں" اس نے سر ہلا کر اشارہ کیا ۔

"ضرور آئیے گا" انجم کی آواز میں خلوص بھرا شوق تھا ۔

اظہر نے سنا تو حیران رہ گیا ۔ اسے یقین نہ آتا تھا ۔ شاید وہ یقین کرنا چاہتا ہی نہ تھا ۔ لیکن اسکے باوجود دل ہی دل میں وہ جانتا تھا کہ سعید جھوٹ نہیں بول رہا ۔ اگلے اتوار کو جب سعید انجم کی طرف جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو اظہر خواہ مخواہ غصہ محسوس کر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ سعید انجم سے ملے ۔ آخر اس نے دل کی بات جتا ہی دی بولا ۔ اب وہاں جانے کا فائدہ ۔ تمہاری بات تو ثابت ہو چکی ہے ۔ سعید نے محسوس کیا کہ اظہر کی بات درست تھی ۔ اس کے باوجود انجم سے ملنے کی خواہش اسے جانے پر اکسا رہی تھی ۔

اس روز چوبارے کے نیچے کوئی کار نہ تھی ۔ اوپر نشستگاہ خالی پڑی تھی نہ کوئی میراثی نہ ساز اور نہ وہ چاندنی ۔ دہلیز پر ایک لڑکا بیٹھا تھا ۔ سعید کو دیکھکر وہ اٹھ بیٹھا اور اس کی طرف دیکھنے لگا ۔

"میرا نام پریم ہے" ۔ سعید نے اس کی گھبراہٹ کو سمجھ کر کہا ۔ آئیے ۔ وہ لڑکا سعید کو مکان کے اندر لے گیا ۔ دو تین کمروں میں سے گزر کر وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں جا پہنچے سامنے چارپائی پر بیٹھی وہ میلے رومال پر سفید تاگے سے کچھ کاڑھ رہی تھی ۔ ساڑھی کی بجائے ایک میلا سا جوڑا پہنا ہوا تھا ۔ قمیض ۔ شلوار اور دوپٹہ ۔ اوہ آپ آ گئے ۔ اس نے مسکرا کر کہا ۔ اور پھر کام میں مشغول ہو گئی ۔

سعید نے محسوس کیا گویا مدتوں کے بعد وہ اپنے گھر آ گیا ہو ۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں" ۔ سعید نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا ۔

"کیا ٹھکانا ہے" ۔ اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے کاڑھتے ہوئے جواب دیا ۔

"مجھے انجم کہہ کر بلایا کیجئے ۔"

سعید کی نگاہیں انجم پر گڑی ہوئی تھیں اور انجم کاڑھنے میں مصروف تھی ۔ اگرچہ وہ خاموش بیٹھے تھے مگر خاموشی سعید کے دھڑکتے ہوئے دل میں مسرت بن بن کر چھا رہی تھی ۔

"کہیں جا رہی ہیں آپ" ۔ اس نے پوچھا ۔

"کیوں"

"مکان کا سامان جو اٹھوا دیا ہے ۔ نشستگاہ خالی پڑی ہے اور رقص و سرود" ۔

آج میرا جنم دن ہے ۔ اس نے مسکرا کر سعید کی طرف دیکھا ۔ آج میں انجم ہوں ۔ یہ انجم ۔ وہ انجم" ------

وہ انجم ۔ سعید نے سوالیہ انداز میں دہرایا ۔

"کچھ بھی نہیں" ۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا ۔ وہ آنکھیں جو روز بام پر آکر اپنے عریاں جلووں کی نمائش کیا کرتی تھیں ، اس روز گویا گونگی ہو چکی تھیں ۔

"یہ انجم ۔ اور وہ انجم"؟ سعید نے دہرایا ۔

"ہاں یہ انجم اور وہ انجم" وہ بولی ۔

"تو میری انجم کون ہوئی" ۔ سعید نے پوچھا ۔

اپنی چیز آپ پہچانا کرتے ہیں ۔ وہ مسکرائی ۔

سعید کا جی چاہتا تھا کہ کچھ کہے لیکن اسے کوئی بات نہ سوجھتی تھی ۔

"ایک بات مانو گے" ۔ انجم نے اس دلچسپ اور اضطراب بھری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔

"کیوں نہیں" ۔ وہ ہنس کر کہنے لگا ۔

"تمہاری ایک تصویر کھینچ لوں میں ۔ میرے پاس ایسا اچھا کیمرہ ہے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا کر اٹھی اور کیمرا اٹھا لائی ۔ تصویر کھینچنے کے بعد وہ پھر کام لے کر بیٹھ گئی ۔ اور جھکی آنکھوں سے باتیں کرتی رہی ۔

یونہی بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر کی باتوں میں شام ہو گئی ۔ سعید اٹھ بیٹھا ۔

"اچھا تو اب میں جاتا ہوں"۔

"ابھی سے ------ اچھا جیسے تمہاری خوشی"۔ اس نے اداس آواز میں کہا ۔ پھر مسکرا پڑی اور دانتوں سے تاگا توڑ کر کہنے لگی ۔ یہ لو میرا سہاگ

بھی ختم ہو گیا"۔ نیلے رومال کے درمیان میں سفید تاگے سے "سہاگ" کاڑھا ہوا تھا سعید کا دل اچھلنے لگا۔

"پھر کبھی آؤ گے کیا"۔ انجم نے پوچھا۔

"شاید" وہ بولا۔

کبھی جی چاہے تو آجانا۔ جب بھی تمہارا جی چاہے۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک عورت جینے کے لئے بیقرار ہے۔ گھریلو عورت۔ ایک ایسی عورت جسے دیکھ کر تم سہم جاؤ گے اور اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگو گے"۔ سعید نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ اور خاموش ہو گیا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور بے تابانہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ بھی نہیں"۔

"کیا اب پھر اس سے ملو گے"۔ اظہر نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ میں اسے ملوں اور میں اس خواہش سے ڈرتا ہوں۔ شائد مجھے ملنا ہی پڑے۔ کون جانتا ہے۔

"اب بھی پریم بن کر جاؤ گے کیا۔ میرا مطلب ہے اگر ملے تو"۔ اظہر نے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اسے پریم بن کر ملا اور پریم ایک تخیلی کردار تھا سعید کی مسکراہٹ میں اداسی بھی تھی"۔

لیکن ملے تو۔

"ملا تو پریم نہیں۔ سعید ملے گا۔ بیچارہ سعید"۔ یہ کہہ کر سعید خاموش ہو گیا۔

سنا ہے اس کے بعد سعید کئی مرتبہ انجم سے ملا۔ مگر اسے انجم نہ ملی۔ وہی رقاصہ جو آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھتی تھی۔ وہی آنکھیں جو چمک چمک کر پیام

نشاط دیتی تھیں جنہیں دیکھ کر سدھ بدھ ماری جاتی اور دل میں ایک اضطراب کھول اٹھتا ۔ وہی تانیں وہی گیت جنہیں سن کر بڑے بڑے سیٹھ جھومتے تھے ۔ وہی نرت شوخ و شنگ اشارے عریاں مفہوم سے چھلکتے ہوئے ۔ سنا ہے وہ پی پی کر اسے ملنے جاتا تھا شاید اس لئے کہ اس تلخ گھونٹ کی مدد سے اس مصنوعی مستی کے دھندلکے میں وہ اپنے آپ کو دھوکا دے سکے کہ وہ انجم سے ملتا ہے حتیٰ کہ اس کی تمام جائیداد انجم کے پان دان کی نذر ہو گئی اور ایک دن انجم کے حواریوں نے اسے گھسیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا اور دروازہ بند کر لیا ۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کہے ۔ میں پریم ہوں ۔ انجم کا پریم مگر اس میں کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی ۔

سعید کی ایسی بری حالت دیکھ کر اظہر بھونچکا رہ گیا ۔ "تم سعید ہو وہ چلایا تم"۔

"ہاں میں سعید ہوں"۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ۔ "ایک بھکاری"

"لیکن یہ حالت؟" اظہر نے بے تابی سے پوچھا ۔

اپنا ماجرا سنا کر سعید دیوانہ وار ہنسا ۔ ہاں پریم نے سعید کا گلا گھونٹ دیا ۔ تم سچے تھے ۔ منجدھار میں کیسے گذرتی ہے ۔ منجدھار میں کودے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا ۔ فلسفہ!" اس نے ایک اکتایا ہوا قہقہہ لگایا ۔ فلسفے کا ایوان کنارے پر کھڑا ہے ۔ زندگی اصولوں پر حاوی ہے ۔ آج میں اپنی ہار مانتے آیا ہوں"۔

سعید اب وہ سعید نہ تھا ۔ اظہر اس پر ترس محسوس کر رہا تھا ۔ وہی اظہر جسے اُس فلسفی سے اس قدر عقیدت تھی ۔

"لیکن اس دوران میں انجم نے تمہیں پہچانا بھی نہیں"۔ اظہر نے پوچھا ۔

مجھے معلوم نہیں ۔ وہ انجم تو تھی ہی نہیں ۔ اس انجم کو پہچانتے کی فرصت کہاں ☆

"یہ انجم ۔ وہ انجم ۔ یہ سب کیا ہے"۔ اظہر نے پوچھا۔

"ہاں یہ انجم ۔ وہ انجم ۔

یہ نہیں اس ایک انجم میں کتنی انجمیں ہیں ۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسنے اپنے پلو میں نیلا آسمان باندھ رکھا ہے ۔

"جانے کیا کہہ رہے ہو"۔ اظہر چڑ گیا ۔

"دراصل تم سے مخاطب ہو کر اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں"۔ وہ ہنسنے لگا حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

کچھ عرصہ تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر دفعتاً سعید چلایا۔ کیا تاریخ ہے آج؟ ۔۔۔ کل اس کا جنم دن ہے ۔ اظہر مجھے ایک دن کے لئے اپنا اچکن دو گے ۔ بس اب صرف ایک بار پریم انجم سے مل لے ۔ شاید انجم مل جائے وہ انجم ۔ اچکن دو گے سعید نے منت بھری آواز میں کہا ۔

اگلے دن وہ دونوں انجم کے مکان پر پہنچے ۔ نشستگاہ خالی پڑی تھی ۔ شاید وہ اسی کمرے میں ہو ۔ سعید بڑبڑایا ۔ انجم اندر چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ میلے سے کپڑے ۔ قمیض شلوار اور دوپٹہ کھلے بال سامنے کرسی پر ایک چوکھٹا کھڑا تھا ۔ وہ نیلے رومال پر سفید تاگے سے کچھ کاڑھ رہی تھی اور نہ جانے پرے صحن میں بیٹھی ہوئی بڑی بی یا کس سے باتیں کر رہی تھی ۔ اگرچہ بڑھیا کی آواز پوری طرح سے سنائی نہ دیتی تھی ۔

وہ میں کیا یہاں اکیلی بیٹھی ہوں ۔ یہاں تو محفل لگی ہوئی ہے"۔ اونہوں آج کام نہیں کروں گی میں ۔ میرا جنم دن ہے آج"۔ تُو تو کہتی تھی تیرے پاس کوئی آیا ہوا ہے ۔ بڑھیا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی ۔

"ٹھیک تو کہتی تھی ۔

"یہ تو تصویر ہے"۔ بڑھیا ہنسی ۔

"ہو گی ۔ تمہارے لئے تصویر ہی ہو گی"۔

"کس کی ہے"۔ بڑھیا نے پوچھا ۔

"جو بہت دور سے آئے تھے ۔ مجھے دیکھنے کے لئے ۔ آئے اور چلے گئے" انجم نے کہا ۔

بڑھیا چلی گئی ۔ تو انجم چپ چاپ رومال کاڑھنے میں مصروف ہو گئی اور پھر زیرِلب گنگنانے لگی ۔

سعید نے اظہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور واپس چل پڑا ۔

"لیکن" اظہر نے حیرانی سے زیر لب پوچھا ۔ تم اسے ملتے کیوں نہیں ۔

"اونہوں" سعید نے سر ہلا دیا ۔ "کہیں سعید پریم کا گلا نہ گھونٹ دے ۔"

"اب میں جانتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ اب میں جی سکتا ہوں"۔

............O............

کالے سلیپر

وہ شام اُن شاموں میں سے تھی جب دل پر خواہ مخواہ نا معلوم بوجھ محسوس ہوتا ہے اور محفل پر عجیب سی ویرانی چھائی رہتی ہے۔ جب کوئی بات نہیں ہو سکتی جب قہقہے کھوکھلے سنائی دیتے ہیں اور دل میں چھپی ہوئی باتیں خواہ مخواہ ہونٹوں پر آجاتی ہیں۔

میاں پاؤں سے اپنے چمکدار کالے سلیپروں سے کھیل رہا تھا سعید نے اپنا بایاں ہاتھ بنیان میں ڈال رکھا تھا اور آپ یوں گم صم بیٹھا تھا۔ جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔
کبھی کبھی وہ چونک کر جاگتا اور پھر اپنا بایاں ہاتھ بنیان سے نکال اسے سونگھتا۔ جیسے وہ گلاب کا پھول ہو اسعد تو خیر حسبِ معمول اونگھ رہا تھا۔ ہاں ظفر بہت چمکا ہوا تھا۔ نہ جانے ایسے اُداس ماحول میں ظفر میں شوخی کیوں ہے۔ باقی رہا میں پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دوں۔
سامنے سڑک پر بجلی کی بتیاں ٹمٹما کر اس میدان پر چھائے ہوئے دھندلکے کو اور بھی اداس بنا رہی تھیں۔ سڑک پر تانگے والے کی اداس تان نے میاں کو چونکا دیا۔ کچی جہاں دیہی گلاں گھر جادتیاں نی

میاں نے چونک کر اپنے گورے چٹے پاؤں سلیپروں پر رکھ دیئے۔ گویا وہ انہیں چھپا دینا چاہتا تھا۔ سعید نے اپنا بایاں ہاتھ بنیان سے کھینچ لیا اور اُسے سونگھنے کی بجائے جیب میں ٹھونس دیا۔
"اوں۔ ہیں۔ کیا بات ہے۔" اسعد جاگ کر بڑبڑایا۔ اور میرے منہ سے خواہ مخواہ آہ نکل گئی۔ "بات!!" ظفر کھوکھلی ہنسی ہنس کر بولا۔ "جب تک میاں کے پاس کھیلنے کو سلیپروں کی جوڑی ہے اور سعید کے جسم پر بنیان پڑی

ہے اور یہ صاحب " اُس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ۔ " آہ مارنے کے ڈھنگ سے واقف ہیں ۔ تب تک یہاں بات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں "

"اوہ ۔ میں سمجھا صوفی آیا ہے ۔" اسعد نے ناامیدی سے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا ۔

"صوفی کے آنے سے کیا ہوگا ۔ وہ آ کر اپنا قصہ چھیڑ دیتا ہے اور اس گمان پر مگن رہتا ہے کہ اُس کی باتیں توجہ سے سنی جا رہی ہیں ۔ بے وقوف !!" ظفر نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا ۔

"واہ صاحب واہ ۔" اسعد اُٹھ بیٹھا ۔" میں سُنا کرتا ہوں صوفی کی باتیں ۔"

"تم ؟" ظفر طنز بھرے انداز سے بولا ۔" تم سنا کرتے ہو۔اُس کی باتیں تو یہ لکڑی کا کھمبہ بھی سنا کرتا ہے ۔"

"ہاں ہاں ۔" اسعد بولا ۔ بالکل ایسے کسی کی بات دُہرانے کی مجھے عادت نہیں ۔"

"دہرانا تو جبھی ممکن ہے جب بات سنی ہو ۔" ظفر بولا

"شاید صوفی کو اس بات کی ضرورت ہی نہ ہو میں نے کہا وہ شام مجھے کچھ نہ کچھ کہنے پر خواہ مخواہ مائل کر رہی تھی ۔

"کس بات کی ضرورت ۔" ظفر نے پوچھا ۔

"یہی کہ اُس کی بات سنی جائے ۔" میں نے جواب دیا ۔

"یہ بھی ایک رہی ۔ یعنی وہ جو چار میل کا چکر کاٹ کر یہاں آتا ہے ۔ اُسے رستے میں کھمبے نہیں ملتے کیا ۔"

"ارے یار چھوڑو بھی صوفی تو اک بکھیڑا ہے ۔" میاں نے پاؤں کے انگوٹھے سے سلیپروں کو سنوارتے ہوئے کہا ۔

"بکھیڑا ۔" ظفر ہنسا ۔ "بھلے میاں وہ تو اک کھلا راز ہے چاہے تاجو تمباکو

فروش سے پوچھ لو جا کر۔"

سعید نے اپنا ہاتھ بنیان سے کھینچ لیا۔

"شاید" میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

"شاید کیا۔" ظفر نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے۔" درحقیقت میرا کوئی مطلب نہ تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے لیکن اِس کے باوجود نہ جانے کیا کیا کہتا جارہا تھا۔ "میرا مطلب ہے کسی راز کو چھپانا ہو تو اُسے کھول دو۔"

"بھلے میاں صوفی افسانہ نہیں۔" ظفر چڑ کر بولا۔" وہ زندگی ہے زندگی۔ عریاں زندگی۔ افسانوی دلچسپی پیدا کرنے کیلئے تم اُسے جس قدر جی چاہے پُراسرار سمجھ لو۔"

"اسرار میں کیا دلچسپی ہے خاک۔" اسعد نے کہا۔" ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے قائل ہیں۔"

"جبھی آنکھیں بند کرکے پڑے رہتے ہو۔" ظفر ہنسا۔

"شاید جو کچھ ہم بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے" میں نے آنکھیں بند کرکے کہا۔

"جی لیکن میں عام لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ مہاتما بدھ کی نہیں۔" ظفر بولا

"نروان۔" میاں زیرلب بڑبڑایا اور پاؤں کے انگوٹھے سے اپنے سلیپروں کو متوازی کرکے اپنے گورے چٹے پاؤں ان میں ٹھونس دیے۔

"ہم تو یہ جانتے ہیں کہ صوفی کی زندگی میں صرف دو دلچسپیاں ہیں۔" "دو؟" سعید نے بنیان سے ہاتھ نکال کر اُسے سونگھتے ہوئے دُہرایا

"ہاں دو۔" ظفر بولا۔" بیوی کو پیٹنا اور اُلٹی سیدھی باتیں کرنا۔"

"بیوی کو پیٹنا۔" سعید بڑبڑایا۔" یہ بھی دلچسپی ہے کیا اور اُس نے اپنا

بایاں ہاتھ بنیان میں ڈال کر اپنے پنڈے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

میرے منہ سے اک آہ نکل گئی۔

محفل پر خاموشی چھا گئی۔ سڑک پر ایک اور تانگے والا الاپتا ہوا گزرا۔ "ہر موج کے دامن میں افسانہ تمہارا ہے۔ ہر موج کے ----- سڑک کی بتیاں پر معنی انداز میں ٹمٹمانے لگیں۔ گویا آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں سے کنایتاً کچھ کہہ رہی ہوں بجلی کے کھمبے حیرانی سے بت بنے کھڑے تھے۔ لیکن نیم کا بوڑھا درخت جھوم رہا تھا۔

"عجیب دلچسپی ہے۔" سعید آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

"بس یہی دو ایک دلچسپیاں ہیں نا۔ کسی کو پیٹنا کسی سے پٹنا۔ کسی کو پیار کرنا اور کسی کے محبوب بننا۔" ظفر بولا۔

"اور۔" میاں کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اور اُس کے گورے چٹے پاؤں سلیپروں میں داخل ہو گئے۔

ظفر نے طنز بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "اور ---- شاید تمہیں معلوم ہو۔"

میاں چونک پڑا۔ اُس نے جلدی سے اپنے پاؤں سلیپروں سے نکال لئے

"اور تانک جھانک۔" اسعد چلّایا۔ خدا کی قسم ہمیں تو دیکھنے میں وہ مزا آتا ہے کہ ---"

"خیر یہ تو تفصیلات کی کلیاں ہیں۔ چاہے کتنی ٹانک لو۔" ظفر نے جواب دیا۔

"ہاں ---- لیکن اگر کوئی جزُو ہی شرارت کر کے کُل بن جائے تو ---؟" میں نے سعید کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"جزو۔" سعید بوکھلا گیا۔" وہ بے چاری کیا شرارت کرے گی۔"

"ہاں ہاں صوُفی کہا کرتا ہے۔" اسعد بولا۔ جب بیچارگی شرارت کرے تو انتہا ہو جاتی ہے۔ چالاکی کی انتہا۔"

میرے منہ سے آہ نکل گئی ۔ "شاید شرارت کرنے اور سہنے والا دونو ہی مظلوم ہوں ۔"

میاں نے ٹھنڈی آہ بھری اور انگوٹھے سے سلیپر متوازی کر دیئے ۔

سعید ناک پر ہاتھ رکھ کر یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی مجسمہ ہو ۔

دور ۔۔۔ سامنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے زرد رو چاند جھانکنے لگا تھا ۔ سڑک کی شوخ بتّیاں مدھم پڑگئیں ۔ آسمان پر تاروں نے اشارے کرنے بند کر دیئے بوڑھا نیم چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا ۔ دور کوئی ریل گاڑی ہونکتی ہوئی آرہی تھی ۔

"بہت لدی ہوئی معلوم ہوتی ہے یہ گاڑی ۔" اسعد نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔

"شاید" بے اختیار میرے منہ سے آہ بن کر نکل گیا ۔

"اُف !" ظفر غصّے میں چلّایا ۔ اِس مہاتما کے شاید اور آہ نے ہماری زندگی بھی حرام کر رکھی ہے ۔"

یعنی دلچسپ بنا رکھی ہے ۔" اسعد بولا ۔

میاں مسکرانے لگا ۔" خوب سوجھی ہے تمہیں ۔"

"لیکن تم تو دیکھنے کے قائیل ہو ۔ آنکھوں سے دیکھنے کے ۔" سعید نے اسعد سے کہا ۔

"ہاں ۔۔۔ صوفی کہا کرتا ہے ۔"

"کیا کہتا ہے وہ ۔"

"کچھ نہیں ۔ ابھی پرسوں ہی کہہ رہا تھا ۔ غصّے میں بیٹھا تھا وہ میں بھی خاموش تھا پھر دفعتاً آپ ہی آپ بڑبڑایا ۔ ارے یار اس بیوی نے میری زندگی حرام کر رکھی ہے میں نے کہا تو کوئی اور کر لو تم ۔ اس میں کیا مشکل ہے ۔ اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ میں نے پوچھا ۔" کیوں ہنسے ؟" کہنے لگا ۔

"میں سوچتا ہوں بیوی سے جھگڑے کے سوا اور میری زندگی میں دھرا ہی کیا ہے ۔ یہ بھی نہ رہا تو ۔ عجب جھمیلا ہے ۔" اِس بات پر وہ دیر تک ہنستا رہا ۔ پھر اٹھ کر اندر چلا گیا ۔۔۔

"میں کہتا ہوں وہ تو دیوانہ ہے دیوانہ ۔" ظفر ہنسا ۔

"دیوانہ" میاں زیر لب بڑبڑایا اور پھر گھبرا کر اپنے پاؤں سلیپروں سے نکال لئے ۔

"ہاں ۔ دیوانگی ہی ہے نا ۔" سعید نے اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا ۔

"دیوانگی !" میں نے زیرِ لب دہرایا ۔

"پہلے میری بات سن لو ۔" اسعد بولا ۔ "پہلے تو میں نے سوچا کہ چلو اب چلیں لیکن پھر نہ جانے میں وہاں کیوں بیٹھا رہا ۔ تم نے صوفی کی بیٹھک تو دیکھی ہی ہو گی جہاں کپڑے پر تاگے سے کاڑھی ہوئی چڑیاں چوکھٹوں میں لگی ہیں نا ۔ اُنہیں دیکھنے میں لگا رہا میں ۔ نہ جانے اُن شکلوں میں کیا ہے جب بھی وہاں جاتا ہوں ۔ بس انہیں دیکھنے ہی میں محو رہتا ہوں ۔"

"پر میں پوچھتا ہوں ۔" ظفر بولا ۔ "صوفی کو یہ عورتوں کا سا شوق کیوں ہے دھاگے سے چڑیاں کاڑھتے رہنا۔کسی مرد کو ایسا شوق نہیں ہوتا ۔"

"ہاں ۔" سعید بڑبڑایا ۔ "جب پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ چڑیاں اُس نے بنائی ہیں تو میں نے جانا کہ وہ کس قدر صبر و تحمل کا مالک ہے ۔"

"صبر و تحمل ۔" میاں ہنسا ۔ "وہ تو اک چنگاری ہے ۔"

"پھر وہ چڑیاں ۔ تعجب ہے ۔" اسعد بولا ۔

"اور وہ چڑیاں ۔ یوں بنی ہیں ۔ جیسے ابھی اُڑنے کے لئے تیار ہوں ۔" میں نے کہا ۔

ہاں ہاں اسعد چلایا ۔ "گویا زندہ ہوں ۔"

"اُڑان ۔" میاں اپنے آپ ہی بڑبڑایا ۔ اور پیار سے اپنے پاؤں پر ہاتھ

پھیرنے لگا۔

چند ایک ساعت کے لئے ہم سب خاموش بیٹھے رہے۔ اُس وقت مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ ہم پاس ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ کس قدر دور ہر کوئی اپنی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ میاں اپنے سلیپروں میں نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا تھا۔ سعید آنکھیں بند کئے ناک کو ہاتھ سے ڈھانکے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اسعد دور سڑک کی بتیوں کو گھورنے میں کھویا ہوا تھا۔ اور ظفر کسی اَن کہی مسرّت سے چھلک رہا تھا۔

"پھر۔" دفعتاً ظفر بے تابانہ چلّایا۔

"پھر !!" میاں چونک پڑا اور اپنے پاؤں اٹھا کر کرسی پر رکھ لئے۔

"پھر ؟" اسعد حیرانی سے بولا ۔۔۔۔"ہاں پھر اندر سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ صوفی چلّا رہا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو اُس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ کیوں کیا بات ہوئی کمینی عورت وہ چلّایا رذیل!! اوہ عجیب وحشت طاری تھی اُس پر۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ تم اُسے منانے جا رہے ہو۔ ہاں منانے ہی تو گیا تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں اس پر ترس آجاتا ہے۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ وہ لاتوں کا بھوت ہے ۔۔ تم تو ایک تماشا ہو میں نے ہنس کر کہا۔ ہاں وہ پھر ہنسا اِسی بات پر تو غصہ آتا ہے مجھے کہ میں تماشا کیوں بنتا ہوں۔ ارے یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر آپ ہی آپ آواز دے کر بولا۔ طارق کی ماں ذرا چائے رکھ دینا۔

"بھئی واہ یہ بھی خوب رہی۔" ظفر اٹھ بیٹھا۔

"خوب آدمی ہے۔ ایمان سے پوری محفل ہے وہ ایک۔"

"جھمیلا کہو۔" ظفر نے جواب دیا۔

"لیکن وہ تو اِک کھلا راز ہے کھلا راز چاہے تاجو تمباکو فروش سے پوچھ لو جا کر۔" سعید نے طنزاً کہا۔

میاں نے اپنے پاؤں سلیپروں میں ٹھونس دیئے۔

پتہ نہیں کیوں اس وقت میں نے میاں کے سلیپروں سے چڑ سی محسوس کی ۔ "اِس طرح تو میاں کے سلیپر بھی اک کھلا راز ہیں ۔"

سعید نے جھٹ اپنا ہاتھ بنیان سے نکال لیا ۔

"میں ۔ میں ۔ میں کب ۔ مجھے اِس بات سے اِنکار کب ہے ۔"

میاں نے بصد مشکل جملہ پُورا کیا ۔

"اگرچہ ذرا لکنت بھرا اقرار ہے ۔" ظفر ہنسا ۔

"لاحول ولا قوت ۔" میاں جوش میں آگیا ۔ "میں کیا مکرتا ہوں ۔ یہ سلیپر میرے لئے زندگی ہیں ۔"

"زندگی !" اسعد اُچھل کر بیٹھ گیا ۔

میاں نے غور سے اُن کالے سلیپروں کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہار کر کرسی سے ٹیک لگالی ۔ جب تک یہ مناسب مقام پر نہ پڑے ہوں مجھے قرار نہیں آتا ۔ پلنگ تلے متوازی اور گرد سے صاف چمکتے ہوئے ۔ عجیب بات ہے ۔ کئی بار میں رات کو گھبرا کر جاگ اٹھتا ہوں ۔"

"پھر" اسعد چلّایا ۔

"مجھے وہم سا ہو جاتا ہے کہ میرے سلیپر مناسب جگہ پر نہیں ہیں پھر اُنہیں دیکھ کر مجھے اطمینان ہو جاتا ہے اور میں سو جاتا ہوں ۔

"اوہ" ۔ اسعد نا اُمیدی سے چلّایا ۔

"ہوں ۔" سعید نے اپنا ہاتھ سونگھ کر آہ بھری ۔

"عجب تماشا ہے ۔" ظفر نے کہا ۔

"ہاں ۔" میاں اپنی ہی دُھن میں بول رہا تھا ۔ "کئی بار مجھے دفتر میں وہم ہو جاتا ہے ۔"

"کیا ۔" ظفر نے پوچھا ۔

"بس یہی کہ میرے سلیپر اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں ۔ پھر میں بے تاب پھرتا

ہوں ۔ اُس وقت مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا ہے۔"

"بھئی واہ ۔" ظفر بولا "جب تو یہ سلیپر تمہارے لئے کُن سے کم نہیں ۔ یہ ہوں تو تمہاری دنیا قائم ۔"

"تعجب ہے ۔" سعید بڑبڑایا ۔

میاں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ۔" لیکن تماشا یہ ہے کہ سلیپر میرے ہوں اور کالے کروم کے ہوں ۔"

"بڑی مصیبت ہے ۔" میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا ۔

"مصیبت ۔" ظفر نے دہرایا ۔" یہ تو بلکہ ان کے لئے راحت ہوئی ۔"

"راحت ۔" سعید گنگنایا ۔" راحت بھی تو مصیبت سے کم نہیں ہوتی ۔"

"لیکن ان کی بیگم ۔" اسعد بولا ۔" اُس کے ہاتھ میں تو میاں کی کل ہوئی ۔ جب چاہے متوازی کردے اور ۔۔۔۔"

"متوازی کرے نہ کرے ۔" میں نے کہا ۔

"ہاں ۔۔۔۔" سعید ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔

"آخر انہیں ۔ ان کی بیگم سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا ۔" اسعد بولا ۔

"ہوگا کیوں نہیں ۔" ظفر مسکرایا ۔ "آخر وہی ان کا رکھ رکھاؤ کرتی ہے نا۔"

"اور پالش ۔۔۔" میاں کے ہونٹ ہلے ۔

سب کی نگاہیں میاں کے ہونٹوں پر جم گئیں ۔

چاند نے بدلی سے سر نکالا ۔ اُس کے چہرے پر اک شریر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی ۔ بوڑھے نیم کی ٹہنیوں میں ہلکی سرگوشیاں ہورہی تھیں ۔ بتیوں کی دھندلی روشنی میں سڑک بوکھلائے ہوئے دیہاتی کی طرح منہ اٹھائے چلی آرہی تھی ۔ چوگان میں کھڑی دھندلی عمارت میں اندھیرا سمٹ سمٹ کر کونوں کی حفاظت کر رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ اُٹھ کر میاں کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں تاکہ وہ اپنے کالے سلیپروں کا راز کہہ نہ دے ۔

"اس وقت میری نگاہ میں میاں کے سلیپر پھیل کر گویا تمام چیزوں پر چھائے جا رہے تھے ۔"

"پھر" اسعد نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ۔

"پھر؟" میاں گھبرا گیا ۔

"جب وہ ان پر پالش کرتی ہے ۔" ظفر نے زبان گال میں دے کر کہا ۔

"اس روز!" میاں بڑبڑایا ۔

"اس روز ۔۔۔۔۔۔ کیا" ۔ سعید نے ہاتھ سونگھتے ہوئے وحشت سے پوچھا ۔

"ہاں اُس روز ۔۔۔۔۔۔" میاں نے ہنسنے کی کوشش کی ۔

اس روز میاں بھی وہی کرتا ہو گا ۔ جو صوفی کو کرنا پڑتا ہے جب وہ بیوی کو پیٹتا ہے ۔

"کیا" ۔ اسعد نے پوچھا ۔

"اس روز صوفی اسے مناتا بھی ہو گا" ظفر نے جواب دیا ۔

"ہوں ۔۔۔۔۔۔" سعید نے ہاتھ بنیان میں ڈالدیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔

"لیکن یہ کیا روٹھے ہوتے ہیں" ۔ اسعد چیخا ۔

"میاں اس میاں بیوی کی دنیا میں روٹھے ہی کو نہیں، مانے ہوئے کو بھی منانا پڑتا ہے" ۔ میں نے کہا ۔

"ہاں ۔" میاں ہنسنے لگا ۔ "منانا پڑتا ہے" ۔

"ارے" ۔ اسعد کا منہ لال ہو رہا تھا ۔ "پھر" ۔

"بھئی اس بھلے آدمی کو بتا دونا ۔ دیکھو تو بیچارہ ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر تھک گیا ہے ۔"

میاں ہنسا ۔ "اس روز میں بے تاب پھرتا ہوں ۔ گویا میرا بند بند ٹوٹ

رہا ہو ۔ گویا مجھ میں اک طوفان لہریں لے رہا ہو" ۔

"پھر" ۔ اسعد چیخا ۔

میاں نے غور سے اپنے سلیپروں کی طرف دیکھا ۔ دور کوئی گراموفون چیخ رہا تھا ۔ تیرے بغیر زندگی درد ہے' زندگی نہیں ۔ میاں نے اپنے گورے چٹے پاؤں سلیپروں میں ٹھونس دئیے ۔

سعید نے آہ بھری اور گلاب سونگھنے لگا ۔ ظفر کی زبان منہ میں ناچ رہی تھی ۔ اور نیم کا درخت کسی آن جانی مستی سے جھول رہا تھا ۔

"ہوں" ۔ اسعد نے خاموشی توڑی ۔ "اک کالا سلیپر اور اک طوطا مارکہ ڈبیہ اور ان کے گھر کی خوشی مکمل ہے ۔

"اور ایک پالش کرنے والی" ۔ ظفر نے لقمہ دیا ۔

"جب جی چاہے چمکا کر رکھ دے" ۔ اسعد مسکرایا ۔

"کسی کے ہاتھوں کی طرف امید سے تکتے رہنا ۔ کب ڈبیا اٹھائے اور کب سلیپر چمکائے" ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میاں کے گلے لگ کر چیخ چیخ کر رو پڑوں ۔ نہ جانے کیوں ۔

"ہاں ۔ سعید بڑبڑایا ۔ سوٹا تو صوفی کے بس کی بات ہے ۔ جب چاہا اٹھا لیا ۔

"اوہ تو آپ بھی بے بس ہیں" ۔ ظفر نے مذاق سے کہا ۔

"میں ۔ میں ۔ بھئی واہ" سعید بوکھلا گیا ۔

"شاید ان کے بھی سلیپر ہوں!" اسعد چیخنے لگا ۔

"لاحول ولاقوت" سعید نے اپنا آپ سنبھال کر کہا ۔

"شاید ان کے پیر ہی نہ ہوں" اسعد ہنسا ۔

"ہاں بھئی جس کے پیر ہوں گے اس کے سلیپر بھی ہونگے ۔" میں نے سوچے بنا کہا ۔

میاں نے غور سے اپنے پیروں کو دیکھا ۔

"عجب حماقت ہے" ۔ سعید چڑ گیا ۔ اس نے اپنا ہاتھ زبردستی جیب میں ٹھونس دیا ۔

"حماقت کی بھی حد ہو گئی یار ۔" صوفی نے دور ہی سے چیخنا شروع کر دیا ۔

"اوہ ۔ تم آ گئے صوفی ۔" اسعد بولا ۔ خوب آئے ہو ۔ سعید صاحب ابھی اپنے سلیپروں کی بات بتانے لگے تھے ۔

"سلیپر" صوفی ہنسا ۔ "وہاں سلیپروں سے کیا بنتا ہے ۔ میں نے ڈنڈے سے وہ پیٹا ہے بس مار مار کر تختہ بنا دیا ہے ۔ ہفتہ بھر ہڈیاں نہ سینکے تو کہنا" ۔

"بھئی واہ" ۔ ظفر نے شور مچایا ۔ ہم یہاں سعید صاحب کے اسرار کی ٹوہ میں لگے ہیں اور تم خواہ مخواہ ڈنڈا چلا رہے ہو" ۔

"چھوڑو یار مجھے نہیں اچھی لگتی تمہاری دل لگی" صوفی نے منہ بنا لیا ۔

"عجب حماقت ہے" ۔ ظفر بولا ۔

صوفی کی آنکھ میں چمک لہرائی " اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو گی ۔ کمبخت کو کہا کہ ذرا چائے بنا دے ۔ قمر آیا ہوا تھا نا ۔ ظالم نے ٹی پاٹ میں پتی کی جگہ پان کا زردہ ڈال دیا ۔ پان کا زردہ ۔ بھئی حد ہو گئی ۔ یہ ہیں ہماری بیگم صاحبہ ، اپنے اپنے نصیب ہیں ۔"

"عجب احمق ہو ۔" ظفر بڑبڑایا ۔ "کسی کی سنو گے بھی یا نہیں ۔"

"سنوں کیا خاک ۔ لو بھلا ایسی بات بھی سنی ہے کبھی ۔ پتی کی جگہ پان کا زردہ بات ہی ایسی کرتی ہے کہ بھلے سے بھلے آدمی کو غصہ آ جائے" ۔

"ہاں ہاں" ۔ ظفر بولا ۔ تمہارا کیا قصور ۔ یہ تمہارے سلیپر ہیں نا" ۔

"اور پالش" ۔ اسعد نے پوچھا ۔

"پالش" صوفی کا منہ لال ہو گیا ۔ "اس نے تو میرے منہ پر سیاہی مل رکھی ہے ۔ زمانے بھر میں رسوا کر رکھا ہے" ۔

"لیکن ۔ انوری نے کیا کیا تھا" ۔ اسعد بولا ۔

"انوری" صوفی نے حیرانی سے اسعد کی طرف دیکھا ۔

"اسے بھی تو مارمار کر تختہ بنانے کی دھمکی دیا کرتے تھے تم" ۔ اسعد مسکرانے لگا ۔

لیکن تمہیں ۔ میرا مطلب ہے ۔ تمہیں انوری کا پتہ کیسے چلا ۔ بھئی حد ہو گئی" ۔

صوفی ہنسنے لگا ۔

"آخر بات نکل ہی جاتی ہے نا" ۔ اسعد نے جواب دیا ۔

"لیکن ۔" پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ اور کرسی سے ٹیک لگا کر کہنے لگا "ارے یار نہ جانے میری حماقتیں کیا کیا رنگ لائیں گی ۔ عجیب بات تھی ۔ جب بھی میں اس بازار سے گزرتا تھا تو انوری کو کھڑکی میں بیٹھے دیکھ کر مجھے کچھ ہو جاتا تھا ۔ مجھے وحشت سوار ہو جاتی اور اس بات پر غصہ آتا کہ وہ وہاں بازار میں کیوں بیٹھی ہے ۔ لو پوچھو ۔ خوامخواہ کا نواب ۔ حالانکہ وہ شہر کی مانی ہوئی طوائف تھی اور وہاں بڑے بڑے آدمیوں کے سوا کسی کی رسائی نہ تھی ۔ لیکن میں یوں چوبارے پر چڑھ جاتا گویا وہ میری داشتہ ہو اور اسے خوامخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتا ۔ لاحول ولا قوت ۔ پھر نیچے اتر کر دفعتاً مجھے احساس آتا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ اور اس قدر شرم آتی مجھے اُف ۔ اب تو خیر شکر ہے وہ کہیں چلی گئی ہے ۔ ورنہ میرا گھر سے نکلنا بھی مشکل ہو جاتا" ۔

"گھر سے نکلنا" ۔ ظفر نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں ہاں ۔ گھر سے نکلنا ۔ تماشا یہ ہے کہ میں کبھی جان بوجھ کر اسکے چوبارے کی طرف نہ گیا تھا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کمپنی باغ میں سیر کرتے کرتے میں وہاں کیسے جا پہنچتا تھا حالانکہ کمپنی باغ اس سے متضاد سمت میں واقع ہے ۔ یہ گتھی بھی آج تک نہیں سلجھی ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ۔"

"وہ کیا" ۔ ظفر نے پوچھا ۔

"وہ کمبخت تھی بھی اک تماشا ۔ وہ مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتی اور خوامخواہ جی جی کرتی رہتی گویا میں واقعی کوئی نواب تھا ۔ اور میں اسے دھمکاتا ۔"

"لیکن کس بات پر ۔" سعید نے ہاتھ سونگھتے ہوئے پوچھا ۔

کہ وہ بازار میں کیوں بیٹھی تھی ۔ جی چاہتا کہ اسے مار مار کر ادھ مُوا کر دوں ۔ ادھر وہ میری دھمکیاں سن کر آنکھیں جھکا لیتی ۔ اُف! اس وقت اس کی آنکھوں میں رضامندی چھلکتی ۔ اس بات پر میرا غصہ اور بڑھتا ۔ اور مجھے غصے میں دیکھ کر اس کا بند بند جھولتا ۔ آف ۔ صوفی وحشت میں اٹھ بیٹھا ۔" اس کے تصور ہی سے میں غصے سے کھولنے لگتا ہوں ۔ کیا مصیبت ہے ۔"

"صوفی ۔ اک بات تو بتاؤ ۔" میاں نے مدھم آواز میں کہا ۔

وہ رک گیا اور چونک کر بولا ۔ "کیا"۔

"جس روز تم اپنی بیوی کو پیٹتے ہو"۔

"اک حرام خور ہے وہ حرام خور" ۔ صوفی بولا ۔

"سوال تو یہ ہے کہ حرام کون ہے اور خور کون" ۔ ظفر چلایا ۔ "تم؟"

"میں! ۔ لاحول ولاقوت" ۔

"بھی واہ" ظفر چیخنے لگا ۔ "اپنے آپ پر لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو اور حرام کر رہے ہو ۔"

"میرا مطلب ہے" ۔ میاں نے سلیپروں کو گھورتے ہوئے کہا ۔ "پھر تمہاری صلح کیسے ہوتی ہے" ۔

"ہماری صلح" ۔ صوفی نے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ "ارے یار پھر مجھے اُس پر ترس آ جاتا ہے ۔

"ہوں ۔۔۔۔۔۔" سعید نے ہاتھ سونگھتے ہوئے لمبی آہ بھری ۔

"ہاہاہاہا" ظفر ہنسا ۔ "ترس!!"

"پھر" ۔ اسعد نے صوفی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا" ۔ صوفی نے حیرانی سے دہرایا ۔

"پھر ترس ۔ اور کیا" ۔ ظفر نے قہقہہ لگایا ۔

"ہوں .... صوفی سوچ میں پڑ گیا" ۔ پھر کے متعلق میں نے کبھی سوچا نہیں ۔

شاید تمہارا خیال ٹھیک ہو" ۔

اوہ .... سعید نے اپنے ہاتھ کو بنیان میں ڈال کر آہ بھری ۔

"ارے بھئی عجب بکھیڑا ہے ۔" صوفی سر کھجلاتے ہوئے بولا ۔

عین اس وقت میرا ملازم غفور آگیا کہنے لگا ۔ "جی ایک بیگم آئی ہے" ۔

"بیگم" ۔ میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ چونکہ میری بیوی مدت سے نہ آنے کا فیصلہ کر چکی تھی ۔

"جی ۔" آپ کو پوچھتی ہے ۔" غفور نے جواب دیا ۔

"مجھے" ۔ صوفی غصے میں کانپنے لگا ۔ یہاں آگئی ہے کمینی عورت ۔ اب میرا پیچھا کرنے لگی ہے کیا ۔ اچھا" ۔ اسنے بانہیں چڑھانا شروع کر دیں ۔ "وہ مزا چکھاؤں گا کہ یاد کریگی" ۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا محفل پر مکمل خاموشی چھا گئی ۔ پُراضطرب خاموشی ۔ شرم نہیں آتی تمہیں ۔ صوفی زنانے میں غرا رہا تھا ۔

"اُف" میاں بڑبڑایا"بیچاری!!"

"خوامخواہ پٹتی ہے" ۔ اسعد نے پھٹی آواز میں کہا ۔

"لیکن لیکن" ظفر بے تابانہ ٹہلنے لگا ۔

مکان سے صوفی کی بیوی کی چیخ سنائی دی ۔

اسعد اچھل کر اٹھ بیٹھا "بھلے میاں چلو چھڑائیں ظالم کہیں جان سے ہی نہ مار دے " ۔

"بے وقوف" میں نے لپک کر اسعد کو پکڑ لیا ۔ "کون جانتا ہے" ۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کون جانتا ہے!" اسعد چلایا۔ ارے جناب میں کہتاہوں وہ اسے پیٹ رہا ہے"۔

کون جانتا ہے کہ وہ پیٹ رہا ہے یا وہ پٹ رہی ہے"۔

"تمہارا مطلب ہے پالش کر رہی ہے" ظفر بولا۔

"ہاں پالش"۔ میں نے اسعد سے کہا۔

"مارو مارو۔ اور مارو۔ وہ چیخ رہی تھی۔ دعوت دے رہی تھی۔

"بیچارہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مارو۔ اور مارو"۔ وہ کراہ رہی تھی۔

دور ٹانگے پر بیٹھے کوچوان کی آواز بلند ہوئی۔ کچنی جہان دیئی گلاں گھر جا دسیاں نی میاں نے اپنے گورے چٹے پاؤں سلیپروں میں ٹھونس دیئے۔ سعید نے سر جھکا کر اپنی ناک بنیان میں ڈالدی۔ بوڑھا نیم جھومنے لگا۔ دور سڑک پر بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں گویا اشارے کر رہی ہوں۔ اور ستارے مسکرا رہے تھے۔

..............○..............

اسمارائیں

اسما رائیں

فہرست

سمیع اور اسمارہ

سمیع اور اسمارہ کا واقعہ ایک معمولی سا واقعہ ہے ایسا واقعہ جو اکثر ہمارے گردو پیش چپ چاپ وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ بار بار وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ ہم اسے دیکھتے ہیں ۔ سنتے ہیں ۔ مگر نہیں دیکھتے ، نہیں سنتے ۔

سمیع اور اسمارہ کوئی عجیب و غریب کردار نہیں ہیں ۔ وہ بار بار مختلف کوائف سے مختلف ناموں میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں ۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں ، ان سے ملتے ہیں اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں ۔

سوچتا ہوں کہ آخر میں سمیع اور اسمارہ کا واقعہ کیوں قلمبند کر رہا ہوں ۔ واقعات کے لحاظ سے یہ ایک اکتا دینے والا واقعہ ہے ، افسانے کے لحاظ سے ۔۔۔؟ افسانویت اس میں قطعی طور پر مفقود ہے ۔ پھر سمیع اور اسمارہ کے کردار بھی تو ہماری زندگی کا کوئی انوکھا پہلو پیش نہیں کرتے ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔

ویسے تو جگہ جگہ سمیع اور اسمارہ ملتے ہیں لیکن ان مخصوص سمیع اسمارہ کو دیکھنا ہو، جنکا ذکر کرنے پر میں خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں اور جن میں کوئی خصوصی امتیاز نہیں تو کسی روز جبشی باغ کے مغربی حصے میں چلے جائیے ۔ اس مقام سے ذرا دور جہاں تراشے ہوئے پودے ، پھولوں کے تختے اور تراشیدہ گھاس کے ہموار پلاٹ ختم ہو جاتے ہیں اور باغ جنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ جہاں بیٹھے بیٹھے سے سرسبز درختوں سے بھوری ٹہنیاں خم کھاتی ہوئی بے تابانہ باہر نکل آتی ہیں ، جیسے کسی سے کچھ کہنے کے لئے بیقرار ہوں ۔ اور پھر کچھ کہے بغیر بل کھائے جاتی ہیں ۔ جہاں اونچی اونچی گھاس میں خار دار جھاڑیوں کے درمیان سرخ پتھر کا ایک فوارہ ہے جس کے گرد پتھر میں دو معصوم بچے مغموم ہیں اور نیچے ایک کتبہ کندہ ہے :۔

"ہم دونوں کے سوا ساری دنیا عجیب ہے پیاری!"

"ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب ۔"

اس فوارے کے گرد چند ایک ٹوٹے ہوئے بنچ پڑے ہیں ۔ فوارے کے پاس شاید آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے کیونکہ وہ دن ڈھلے وہاں آتے ہیں ۔ لیکن اگر انہوں نے آپ کو دیکھ پایا تو وہ چپ چاپ آگے نکل جائیں گے اور آپ کو معلوم ہی نہ ہو گا کہ وہی دونوں سمیع اور اسمارہ تھے ۔

اسمارہ عمر میں پچیس کے لگ بھگ ہو گی اور سمیع تیس کے قریب ان کے خدوخال اور بشرہ سے کوئی خصوصیت نمایاں نہ ہو گی ۔ اسمارہ کی شکل و صورت ایسی ہو گی ۔ جیسے تمام اسماراؤں کی شکل و صورت ہوتی ہے ۔ کتابی چہرہ ستواں ناک ، پتلے ہونٹ ، تنگ دہن اور اداس ، نیم وا ڈولتی آنکھیں ۔

اس کے چہرے پر ایک مخملی سی زردی ، ایک غم زدہ تازگی نمایاں ہو گی ۔ جیسے کوئی پھول اوس کی نمی تلے اور بھی شگفتہ دکھائی دیتا ہے ۔ آزردگی کی اس گہری اور شگفتہ تہہ کے علاوہ اس کے چہرے پر کوئی اظہار نہیں ہوتا ، جیسے اُس حُسن افزاء غازے نے اُسے باقی جملہ اظہار سے محروم کر دیا ہو ۔ اور اس کے جذبات اظہار کے راستے مسدود پا کر چہرے سے ہاتھوں میں اتر آئے ہیں ۔

سمیع کی شکل عام سی ہے ۔ جیسے آپ کی ، میری یا کسی اور کی ۔ اور سچ پوچھئے تو ہم اور سمیع میں فرق ہی کیا ہے ۔ یہی نا کہ ہمیں کوئی اسمارہ نہیں ملی ، جو ہمارے خوابیدہ سمیع کو چونکا دیتی اور پھر اسے تھپک تھپک کر پالتی پوستی ۔ اس سمیع کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ کھو گیا ہو کسی کی تلاش کرتے ہوئے خود کھو گیا ہو ، جیسے اس کے گردو پیش کی تمام چیزیں سو گئی ہوں اور فاصلے انگڑائیاں لینے لگے ہوں ۔ اور ہواؤں نے چلنا چھوڑ کر تھپکنا شروع کر دیا ہو ۔

فوارے کے قریب آ کر وہ دونوں رک جائیں گے ۔ سمیع کھوئی ہوئی ، تھکی ہوئی نگاہ ادھر ادھر ڈالے گا ۔۔۔۔ اسمارہ کے سیاہ برقعے سے دو زرد مخملی سانپ نکل آئیں گے اور یوں مضطربانہ لہرانے لگیں گے جیسے کچھ ٹٹول رہے ہوں ۔

"اسمارہ!" سمیع کی کراہ سنائی دے گی ۔

"جی ۔" فضا میں ایک ہلکی سی آہ تیرنے لگے گی ۔

"اسمارہ"!

"جی"۔

"تم تھک گئی ہو اسمارہ؟"

"نہیں تو" اور اس کے تھکے ہوئے بے جان ہاتھ، بینچ کا سہارا لینے کے لئے آگے بڑھیں گے۔

"ضرور، تم تھک گئی ہو۔ کچھ دیر بیٹھ جائیں۔"

"اچھا" ۔۔۔۔۔ اسمارہ دھم سے بینچ پر گر جائے گی جیسے وہ تھک کر چور ہو چکی ہو۔ سمیع ارد گرد کھوئی ہوئی نگاہ ڈالے گا، سرد آہیں بھرے گا اور پھر اسی بینچ پر اسمارہ سے پرے ہٹ کر بیٹھ جائے گا۔ اور وہ دونوں خاموش بیٹھے رہیں گے۔ اسمارہ برقع اٹھا کر فوارے کی طرف منہ موڑ لے گی اور کچھ اس انداز سے فوارے اور کتبے کی طرف دیکھے گی۔ جیسے وہ فوارے کے وجود سے ہی واقف نہ ہو، جیسے وہ کتبہ فوارے کی بجائے اُفق پر رنگین بادلوں میں کندہ ہو۔ سمیع ان بل کھاتی ہوئی مضطرب شاخوں کی طرف چوری چوری دیکھتا رہے گا جو اس سیاہ جھاڑی سے نکل کر فضا میں ایک جالی انداز سے معلق ہو گی۔ سمیع کی مضطربانہ نگاہوں کو دیکھے بغیر محسوس کر کے اسمارہ کی انگلیاں تن کر اور بھی لمبی ہو جائیں گی اور قریب ہی مخملی زرد سانپوں کی زبانیں یوں لہرائیں گی جیسے کسی ضحاک کے شانے ٹٹول رہی ہوں۔

یہ دیکھ کر سمیع اور بھی سمٹ جائے گا۔ اور اسمارہ سے ذرا پرے سرک کر آہ بھرے گا۔

"اسمارہ!"

"جی"

"اسمارہ میں گردن زدنی ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی۔"

"نہیں تو"۔

"سب میرا قصور ہے، سب میرا قصور ہے۔"
باغ کے اس ویران ٹکڑے میں ایک آہ اور ایک کراہ تیرنے لگیں گی ۔
میری محبت تمہاری تباہی کا باعث ہوئی ۔"
"نہیں تو"۔ پتھر کے معصوم بچے کو دیکھ وہ پیار سے مسکرا دے گی ۔
پھر وہ اٹھ بیٹھے گا اور مضطربانہ ٹہلنے لگے گا ۔ اور اسمارہ کی زرد شاخیں بل کھائیں گی ۔ اور اس کے چہرے کی آزردگی اور بھی شدید ہو کر اسے ایک نئی تازگی بخش دے گی ۔

پھر نہ جانے کہاں سے راز آ نکلے گا ۔ وہ حیرانی سے سمیع اور اسمارہ کی طرف دیکھے گا ۔ "ہیں ! تم تم یہاں؟!"

"ہاں" سمیع اسمارہ سے اور بھی دور ہٹ جائے گا ۔ اور دوسرے بینچ پر بیٹھ کر اسے اپنی طرف بلائے گا ۔" راز آؤ ، تم جانتے ہو ۔ سب قصور میرا ہے ۔ سب قصور میرا ہے ۔ میں نے اسمارہ کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا ۔ میں نے اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا ۔ میں گردن زدنی ہوں راز"۔

"گردن زدنی !!" یہ کہتے ہوئے وہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لے گا ۔

"راز ۔۔۔" اسمارہ اسے اشارے سے بلائے گی ۔ "ان کا قصور نہیں ۔ ان کا قصور نہیں راز ! سب میری بد قسمتی ہے ۔ میری بد قسمتی ! میں کتنی بد نصیب ہوں راز! تم جانتے ہو ۔ ان سے جا کر کہہ دو ۔ وہ میرا غم نہ کھائیں ۔ میرے لئے ۔ اپنی زندگی تباہ نہ کریں ۔"

سمیع راز کو پاس کھڑا دیکھ کر چونکے گا ۔ "راز کتنی اچھی ہے وہ کتنی پاکیزہ !!" لیکن میں، میں اس کے قابل نہیں ، قطعی نہیں ، اس نے اپنی پاکیزگی سے میری زندگی سنواری ۔ اور میں نے اسے کیا دیا ، کچھ بھی نہیں ۔ تباہی بربادی ، تنہائی ، جاؤ راز اسے کہہ دو کہ سمیع ساری عمر آنسو بہاتا رہے تو بھی اس گناہ کی تلافی نہیں ہو سکتی !!"

پھر اُس سیاہ جھاڑی سے دو زرد شعلے سے نکل کر راز کو جھلس دیں گے ۔ زن ایک پٹاخہ سا چھوٹے گا اور راز کا سر کٹ کر درخت کی شاخ سے جا لٹکے گا ۔

ایک کراہ اور ایک آہ ان بینچوں کے گرد آنکھ مچولی کھیلیں گی ۔ اور شاخیں بل کھا کھا کر سبز پتوں سے جھانکیں گی اور شام اپنا دھندلا پردہ کھول دے گی ۔

حبشی باغ کے اس ویران کونے میں سمیع اور اسمارہ ہر اتوار کو آتے ہیں اور فوارے کے قریب رک جاتے ہیں ۔ "اسمارہ" ! سمیع آنسو پی کر کہتا ہے ۔ "جی" ایک مخملی آہ فضا میں تیرتی ہے اور اسمارہ کی نیم واکشتیاں ڈولتی ہیں ، ہاتھ بل کھاتے ہیں ۔ اور اس کے چہرے پر آزردگی کی تہ اور بھی گاڑھی ہو کر اسے ایک انوکھی تازگی بخش دیتی ہے اور پھر اتفاق سے سمیع کا دوست راز ادھر آ نکلتا ہے اور سمیع اُٹھ کر دوسرے بینچ پر جا بیٹھتا ہے ۔ "راز اسے جا کر کہہ دو ۔۔۔۔"

اور سیاہ جھاڑی سے دو زرد سانپ نکل کر راز کے شانے چاٹتے ہیں اور اس کا سر شاخ سے لٹکنے لگتا ہے اور فوارہ اچھل اچھل کر جھانکتا ہے ۔ اور بچے مسکراتے ہیں اور ان کے نیچے وہ کتبہ پھیلنے لگتا ہے ، اور شام کے دھندلکے میں اس کے حروف خون آلود سرخی سے چمکتے ہیں اور دُور افق پر اُن کا عکس پڑتا ہے اور بادلوں کو آگ لگ جاتی ہے اور فضا میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں گونجتی ہیں ۔

"ساری دنیا عجیب ہے پیاری!"

"ہاں پیارے ، اور تم بھی کچھ کچھ عجیب!!"

دس سال گزرے جب سمیع نے پہلی بار اسمارہ کو دیکھا تھا ۔ دس سال! اسمارہ اس وقت حسبِ معمول باورچی خانے میں بیٹھی تھی ۔ اس کے ہاتھ مصروف کار تھے ۔ اس کی نگاہیں یُوں کھوئی ہوئی تھیں جیسے کائنات کے خلا اور وسعتیں ان آنکھوں ، دو آنکھوں میں جذب ہو چکی ہوں ۔ اس کے ہونٹ یوں بھنچے ہوئے تھے جیسے کراہ کو دبائے ہوئے ہوں ۔ اس کے رخساروں پر مخملی زردی کی تازگی تھی وہ یوں بیٹھی تھی جیسے سبھی اسمارائیں بیٹھتی ہیں ۔ مگر سمیع نے کبھی کسی اسمارہ کو نہ دیکھا تھا ۔ اس لئے وہ اسے دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔ اسمارہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی خالہ کی نند کے بھائی کا نووارد بیٹا قریب ہی حیرانی سے اُسے دیکھ رہا ہے ۔ لیکن اسمارہ نے دوپٹہ سنبھالنے یا گھبرا کر پیچھے

ہٹنے یا ہائے اللہ کہہ کر بھاگنے کی کوشش نہ کی تھی ، جیسے نوجوان لڑکیاں کیا کرتی ہیں ۔ بلکہ سمیع کی موجودگی کے احساس پر اُس کے رخسار اور بھی شبنمی ہو گئے تھے ۔ اس کی آنکھوں کی کشتیاں اور بھی ڈولنے لگی تھیں اور اس کے ہونٹ اور بھی کراہنے لگے تھے ۔

اس روز کے بعد سمیع میں ایک اضطراب سا جاگ اٹھا ۔ بے نام اندھا اضطراب دفعتہً وہ پڑھتے اُٹھ بیٹھتا اور کتاب میز پر دے مارتا ۔ "نہیں ۔ نہیں ، یہ نہیں ہو سکتا ۔"

راہ چلتے ہوئے وہ چونک پڑتا ۔ "نہیں نہیں ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

گھر آکر وہ چپکے سے گھومتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ جاتا اور باورچی خانے کی اس کھڑکی کے قریب جو اندر دالان میں کھلتی تھی ۔ دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اسمارہ کو دیکھتا رہتا ۔

نہ جانے کیسے اس کی آمد پر کھڑکی کی طرف دیکھے بغیر اسے احساس ہو جاتا کہ وہ آگیا ہے ۔ اس پر اس کی بھنویں اور بھی تن جاتیں ، چہرا اور بھی تُتا ہوا دکھائی دیتا اور ہاتھ دلفریب خم کھا کر جمالی انداز سے ہوا میں معلق ہو جاتے ، پھر روز بروز اسمارہ کی اس چوکی کا زاویہ بھی بدلتا جا رہا تھا جس پر وہ بیٹھا کرتی تھی اور اس کا چہرہ گلی کی کھڑکی کی سمت غروب ہوتا ہوا دالان کی کھڑکی پر طلوع ہوتا جا رہا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اسمارہ نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کھڑکی کی طرف نہ دیکھا تھا ۔ جس کی اوٹ میں سمیع کھڑا ہوتا تھا ۔

سمیع چوری چوری اسمارہ کی طرف دیکھتا ، آہیں بھرتا ، دیکھتا ، آہیں بھرتا اور ہلکی سی آہٹ پر دیوار پر لگے بجلی کے سوئچ کی مرمت میں یوں مشغول ہو جاتا ۔ جیسے اُسے کچھ خبر ہی نہ ہو ۔ اور اسمارہ آلو چھیلتی ، ٹماٹر کاٹتی ، چائے بناتی اور پھر جیسے تھک کر انگڑائیاں لیتی اور بیٹھتے ہوئے یوں دیواروں کے پار خلاؤں کو گھورتی جیسے اس کائنات سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ سمیع آہیں بھر بھر کر تھک جاتا تو چپکے سے سیڑھیاں اُتر جاتا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کتابوں کو گھورتا ، میز سے لڑتا اور جملہ چیزوں کے خلاف شکایتیں کرتا ۔ " اب میں کیا کروں ؟ اب

میں کیا کروں "؟ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں صحرانوردی کرتے ہوئے چلاتا ۔
"مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا ۔"

اسمارہ کے والد کالج میں پروفیسر تھے ۔ جنہیں کتابوں کے علاوہ جیتے جاگتے مطالعوں میں دلچسپی تھی ۔ لیکن اسمارہ کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی دلچسپی صرف کتابوں تک ہی محدود رہ گئی ۔ شاید اس خیال سے کہ گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں ۔ انہوں نے مطالعے کو پس پشت ڈال دیا تھا ۔ لیکن کسی پلے ہوئے توارثی رجحان کو پس پشت ڈالنے سے وہ انتقامی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایسا شبخون مارتا ہے کہ انسان کا ذہنی توازن تباہ ہو جاتا ہے ۔ پروفیسر قائم علی بھی ایک ایسے ہی شبخون کا شکار ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی سب جج کی بیگم عشرتی ہمیشہ کے لئے اپنا گھر چھوڑ کر پروفیسر صاحب کے گھر میں آبیٹھی تھی اور اس کی آمد پر پروفیسر صاحب نے کتابیں پڑھنے کا شغل ترک کر دیا تھا ۔ اور وہ اپنی تازہ فتح ، بیگم عشرتی میں کھو گئے تھے ۔

سمیع جب گاؤں سے شہر آیا تاکہ تھرڈ ایئر میں داخل ہو تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہوا کہ ایک حساب سے وہ ان کا رشتہ دار ہے اور انہوں نے اسے رسمی دعوت دی ۔ "سمیع ! جب تک رہائش کا مناسب انتظام نہ ہو تو ہمارے ہاں آ ٹھہرو ۔" اور جب سمیع کتابوں کا سوٹ کیس اٹھائے وہاں پہنچ گیا تو پروفیسر صاحب اس کے وجود ، اس مکان میں اس کی موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ ہو گئے ۔ ایک تو وہ ویسے ہی نسیان کا شکار تھے جیسے عام طور پر پروفیسر ہوتے ہیں اور دوسرے بیگم عشرتی کی فتح نے انہیں عام فانی انسانوں کی باتوں اور واقعات سے بے نیاز کر دیا تھا ۔ انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ خواب گاہ کے قریب ہی باورچی خانے میں ان کی دو جوان لڑکیاں آلو چھیلنے ، منہ پر کوئی چھڑکنے اور بے کام کئے تھک کر انگڑائیاں لینے اور معصومانہ انداز میں کھڑکیوں میں لٹکنے میں مصروف ہیں اور دالان میں ساری دوپہر ان کا نو وارد مہمان بجلی کا سوئچ بنانے میں مصروف کار رہتا ہے جسے دیکھے بغیر اسمارہ اس کی موجودگی محسوس کر کے ٹماٹر کاٹنے میں شدت سے مصروف ہو جاتی ہے اور پھر اس کی نگاہیں اس چار دیواری سے باہر خلاؤں کو گھورتی ہیں ۔ اس کے گالوں پر گذشتہ آنسوؤں کی نمی عود کر آتی

ہے ۔ اس کے ہونٹ یوں بند ہو جاتے ہیں جیسے ہچکی روک رہی ہو ۔ اور سمیع کا بند بند شدید اذیت کے زیر اثر تڑپتا ہے ۔ اس کی نسیں تن جاتی ہیں اور رگیں پھڑ پھڑاتی ہیں ۔۔۔ اور پھر وہ گھبرا کر نیچے کو بھاگتا ہے اور اپنے کمرے میں پہنچ کر چلاتا ہے ۔ "اب میں کیا کروں ؟ اب میں کیا کروں ؟" اور پھر اسمارہ چلتے چلتے رُک جاتی ہے اور کان لگا کر سمیع کی آوازیں سنتی ہے اور اس کے ہونٹوں کی کراہ مسکراہٹ میں بدل جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں خلاؤں کی جگہ آبادیاں نظر آتی ہیں ۔ اور مخملی زردی میں اطمینان کی ہلکی سی سُرخی اس کے رخساروں میں جھلکتی ہے ۔

پھر ایک روز جب سمیع اپنے کمرے میں صحرانوردی کرتے کرتے اور "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا ۔" کہتے کہتے ہار گیا تو وہ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ آیا اور دالان میں سوئچ بنانے کے لئے رُکنے کی بجائے سیدھا باورچی خانے میں داخل ہو گیا اور اسمارہ کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ اسمارہ کی چھوٹی بہن حسن آرا نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا ۔ وہ ٹھٹھکی اور پھر لپک کر کھڑکی میں لٹک گئی اور جھک کر ، نہ جانے کیا دیکھنے میں یوں کھو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے سمیع اسمارہ کے روبرو کھڑا ہی نہ ہو ۔

ایک ساعت کے لئے اسمارہ کے ہاتھ کانپے، نہ جانے تعجب یا خوشی سے ۔۔۔ پھر وہ اٹھ بیٹھی اور منہ موڑ کر میز کے قریب کھڑی ہو گئی ۔

"نہیں اسمارہ! نہیں ، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔ برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں یہاں نہیں رہوں گا ۔ میں جا رہا ہوں ۔ یہاں سے جا رہا ہوں ۔ ہمیشہ کے لئے ۔" وہ غصّے میں چلایا ۔ "اچھا ۔۔۔" وہ بولی اور اس کی نگاہوں میں تمام خلا ازسرِنو جذب ہو گئے ۔ اس کے ہونٹ اور بھی بند ہو گئے ۔ اس کا چہرہ اور بھی ست گیا ۔ اور بال منہ پر ڈھلک آئے اور سیاہ بالوں میں وہ مخروطی چہرا یوں دکھائی دینے لگا ۔ جیسے کوئی چراغ سحری جھلملا رہا ہو ۔

خدا کے لئے اسمارہ ! خدا کے لئے ! اس گھر کو چھوڑ دو ۔ چلی چلو ۔ بھاگ چلو ، اس گھر سے جہاں باپ کو بیٹی کے وجود کا بھی احساس نہیں ، جہاں کسی کو احساس نہیں کہ لڑکی کی جوانی ٹاٹر کاٹنے میں بیتی جا رہی ہے ۔ جہاں تغافل حکمران

ہے ۔ بھاگ چلو اسمارہ!"

"کہاں ؟" وہ بولی جیسے دور کسی نے ہچکی لی ہو ۔

"کہیں ۔ جہاں بھی جگہ ملے ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں اس تغافل کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ نہیں کر سکتا ۔ بولو ۔ اسمارہ!"

"برداشت" اس کے ہونٹ ہلکی مسکراہٹ سے ہلے ۔

"نہیں نہیں" وہ چیخنے لگا ۔ "تم یہاں نہیں رہ سکتیں ۔ بالکل نہیں ۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ۔ ورنہ میں چلا جاؤں گا ۔ ہمیشہ کے لئے ۔ یہاں سے چلا جاؤں گا ۔"

"ہوں !" باورچی خانے میں ایک آہ تیرنے لگی ۔ "آپ کسی کے لئے کیوں دکھی ہوں ۔۔ جائیے ۔"

یہ سن کر سمیع خاموش ہو گیا ، جیسے اُس کے منہ میں زبان نہ رہی ہو ۔ جیسے اس کی طاقت گویائی چھن گئی ہو ۔ اس کے گرد ایک دھندلکا پھیل گیا ۔۔۔ پھر وہ دھندلکا صاف ہو رہا تھا ۔ باورچی خانے کی دیواریں واضح ہوئی جا رہی تھیں ۔ چولہا ۔ نعمت خانہ کھڑکی میں لٹکی ہوئی حسن آرا ۔ اور بالآخر میز کے پاس کھڑی اسمارہ اور وہ چونکا ۔ "میں کہاں ہوں ۔ میں ، میں ۔۔۔ معاف کرنا میں" اور پھر چپ چاپ باورچی خانے سے باہر نکل ، سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں بستر پر گر کر بڑبڑانے لگا ۔ "نہیں نہیں ۔ میں نہیں جاؤں گا ۔ میں اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا ۔ نہیں جا سکتا ۔"

"اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے ۔ دالان میں محراب تلے ۔ سیڑھیوں میں ۔ کوٹھے پر دودکش کی اوٹ میں اور بالآخر سمیع کے چھوٹے کمرے میں ہر بار ملاقات پر وہ دیر تک انتظار کرتا رہتا اور جب مایوس ہو جاتا تو ہاتھ میں کشیدہ اٹھائے یا کوئی چیز سنبھالے اسمارہ چپکے سے ادھر آنکلتی جیسے اتفاق سے آگئی ہو ۔ وہ یوں خاموش اور دبے پاؤں آتی تھی جیسے سورج کی پہلی کرن چپ چاپ کھڑکی کی درز سے داخل ہو کر اپنی آمد کا اعلان کئے بغیر فرش پر کھیلنے لگتی ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ داخل ہو چکی ہے ۔

دفعتاً سمیع کو احساس ہوتا کہ وہ آچکی ہے اور اس کے اس قدر قریب کھڑی

ہے ۔ اس پر وہ سرک کر پرے ہٹ جاتا ۔ "اسمارہ تم؟"

"جی" ایک آہ اس کے کانوں پر منڈلاتی ۔

"تم کتنی دکھی ہو اسمارہ"۔

اسمارہ کے ہونٹ اور بھی سمٹ جاتے ۔

"میں تمہیں اس مصیبت سے کس طرح بچا سکتا ہوں ۔ اسمارہ ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" قریب ہی کوئی کلی چٹکتی اور بند ہو جاتی اور ایک مدہوش کن خوشبو چھوڑ جاتی ۔

"میں کیا کروں ، اسمارہ کیا کروں ؟" وہ گویا اپنے آپ سے کہتا اور پھر اس کے جسم کا بند بند چٹختا اور اس کی نسیں انگڑائیاں لیتیں ۔

"آپ میرے لئے اتنے دکھی ہیں ؟ "

"نہیں نہیں" وہ چونک پڑتا ۔ "میں دکھی نہیں ہوں ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے مجھے ۔"

"جیسے جیسے ۔ ۔۔؟ اب میں تمہیں کیا بتاؤں ۔ اسمارہ کیسے بتاؤں سمجھ میں نہیں آتا "

"جیسے جیسے تمہارا دکھ میری ۔۔۔ میری ۔۔۔ جیسے وہ میری زندگی ہو ۔۔۔ نہیں نہیں جیسے ، جیسے مجھے معلوم نہیں مجھے معلوم نہیں تم اتنی پیاری کیوں ہو اسمارہ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" اس کی کمانیں تن جاتیں ۔ کشتیاں ڈولتیں ۔

"میری زندگی میں ایک روشنی سی ہو گئی ہے ۔ زرد چاندنی سی مخملی سنہری روشنی ؟ کیوں؟" وہ رک گیا ۔ جانتی ہو ۔

"میں کیا جانوں" اُس کی ناک افق کی طرف اشارہ کرتی اور آن جانے میں سرک کر وہ اس کے قریب تر ہو جاتی ۔۔۔ اگر اس وقت وہ دونوں سمیع کے کمرے میں ہوتے تو اس قدر قریب ہو جاتی کہ سمیع کے گرد ایک زرد مخملی ہالہ بن جاتا گھبرا کر سمیع پیچھے ہٹنے لگتا تو الٹا اس کا گال مخملی زردی پر ٹک جاتا ۔

" تم کس قدر دکھی ہو اسمارہ؟"

"میں کیا کروں ؟" اسمارہ کے بازو دوپٹہ سنبھالنے کی کوشش میں اُلجھ جاتے ۔ "میں اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔" سمیع کی گردن تھک کر لٹک جاتی ۔

"اسمارہ ؟ ایک کراہ اُبھرتی ۔

"جی" ایک مخملی آہ تیرنے لگتی اور ڈولتی کشتیاں ڈوب جاتیں ایک بند کلی چٹک جاتی ۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں ۔ اور پھر کھل کر پھول بن جاتی اور خوشبو کا ایک ریلا نکلتا ۔ اور کمرے کی دیواریں زرد ہو کر دھندلا جاتیں اور چیزیں زرد مخملی دھاریوں میں بدل جاتیں ۔ اور بالآخر ایک زرد مخملی قوس طلوع ہو جاتی ۔

حالانکہ وہ دونوں پروفیسر قائم علی کے گھر کے وسیع ویرانے میں ایک دوسرے سے ملتے تھے ۔ حالانکہ گھر کے اس حصے میں حسن آرا کے سوا اور کوئی نہ تھا اور حسن آرا بھی وہ جو مناسب وقت پر کھڑکی میں لٹک کر باہر گلی میں دیکھنے کے مہذب فن سے پورے طور پر واقف تھی ۔ حالانکہ احساسِ تقدس کی وجہ سے سمیع نے اسمارہ کے دکھی ہونے کی بات کسی سے نہ کہی تھی اور بالخصوص یہ کہ وہ سمیع اسمارہ تھے ۔ جو ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں جیتے ہیں ۔ پھر بھی بات نکل گئی جیسے اسے نکل جانے کی عادت ہے ۔ اور سمیع کو گھر سے تار آگیا ۔ جلدی پہنچو ، والدہ بیمار ہے ۔" وہ گھبرا گیا اور اس قدر گھبرایا کہ اس روز سے اسے دالان کا مرمت طلب سوُنچ بھی یاد نہ رہا ۔ اور اسمارہ ٹماٹر کاٹ کاٹ کر ہار گئی ۔ اور خلافِ معمول وہ کمان ڈھیلے پڑ گئے ۔ اور کشتیاں قائم ہو گئیں ۔ اور بند کلی کی پتیاں بکھر گئیں ۔ اور وہ اُٹھ کر باورچی خانے میں گھومنے لگی اور گھومتی پھرتی سیڑھیاں اُتر گئی ۔ اور پھر سمیع کے کمرے سے ہچکیاں اور آہیں سنائی دیں ۔ "اماں بیمار ہے ۔" اور پھر ایک مخملی تھپک گونجی ۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں" ۔۔۔۔ "میرا غم نہ کھائیں" ۔۔۔۔۔ اور پھر سمیع کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سمیع اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے باہر نکل گیا ۔ اور حسن آرا کھڑکی سے لٹکتی ہوئی اسے دیکھتی رہی اور نعمت خانے کے قریب کھڑی اسمارہ کا ہاتھ لرزتا رہا ۔

جب سمیع گھر پہنچا تو وہ گھبرا گیا ۔ ماں چارپائی پر پڑی ہونے کے بجائے

ہاتھوں پر مہندی لگائے تخت پوش پر بیٹھی تھی ۔ بہنیں ڈھولک بجانے اور گانے میں مصروف تھیں اور والد انتظامات کرنے میں لگے تھے ۔ انہوں نے سمیع کو دیکھا ۔ "تم آ گئے بیٹا ۔ اچھا ہوا تم آ گئے ۔ جاؤ اندر بیٹھو ۔ آج تمہارا نکاح ہے ۔"

دفعتاً بہنوں کا گیت بین میں بدل گیا ۔ ماں کے ہاتھوں سے خون رسنا شروع ہوگیا ۔ اس نے بصد مشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر گرا دیا ۔ اور پھر ایک دھندلکا ۔ ایک خونی دھندلکا ، اور اس دھندلکے میں دو ڈولتی کشتیاں ، دو زرد پتوار آپ میرا غم نہ کھائیں ۔ ۔ ۔ میرا غم نہ کھائیں میں آپ" ۔

نکاح کی رسم کے اختتام کے بعد وہ واپس آگیا ۔ لیکن اب وہ قائم علی کے گھر نہ جا سکتا تھا ۔ کیونکہ رخصت کرتے وقت ماں نے صاف کہہ دیا تھا ۔ "وہاں نہ ٹھہرنا بیٹا ، لوگ کیا کہیں گے ۔ گاؤں والوں نے تو پہلے ہی ہمارا جینا محال کر رکھا ہے ۔" اماں نہ بھی کہتی تو بھی وہ وہاں نہ جاسکتا تھا ۔ کس منہ سے جاتا وہاں ۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مکان ، وہ دالان ، وہ زینہ اور وہ کمرہ اس پر انگلیاں اٹھا رہے تھے "۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔وہی ہے وہ !"

اسٹیشن سے اُتر کر وہ سیدھا بورڈنگ پہنچا اور اپنے کمرے میں دھم سے چارپائی پر گر گیا ۔ "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"۔ اور برداشت کرنے کی شدید کوشش میں اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ۔

ایک روز جب وہ کتابوں ، الماریوں اور کھڑکیوں کو بہ آواز بلند برداشت نہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا ۔ تو اس کا پڑوسی دوست راز چپکے سے اطلاع کئے بغیر اندر آگھسا ۔

"تمہاری قوت برداشت کے کیا کہنے ہیں ، سمیع !" راز نے ہنس کر کہا۔

"ہائیں تم ؟" سمیع گھبرا گیا ۔

"اس احتجاج کے باوجود تم برداشت کئے جا رہے ہو"۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ"۔ وہ چلایا ۔ "میری اجازت کے بغیر تمہیں اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی ؟"

"تمہاری قوتِ برداشت پر مجھے اعتماد ہے"۔ راز کی آواز میں بلا کی طنز تھی سمیع اس کی طرف جھپٹا اور پھر، پھر نہ جانے کیا ہوا۔ دفعتاً وہ رکا اور راز کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ "اس نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ راز۔ پاگل کر دیا ہے۔ لیکن کتنی پیاری ہے وہ، کتنی پاکیزہ راز !! ۔ ۔ ۔ صرف ایک بار راز۔ صرف ایک بار۔ ایک بار مجھے اس سے ملا دو۔ ۔ ۔ صرف ایک بار"۔ اور پھر کئی دن تک سمیع کے کمرے میں منتوں کی آواز آتی رہی "صرف ایک بار ۔ ۔ ۔"

اور راز کی وساطت سے وہ دونوں ایک بار ملے۔ اسی حبشی باغ میں۔ فوارے کے قریب۔

اس روز مطلع غبار آلود تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادلوں کی دھول اڑ رہی تھی۔ ہوا میں مٹی کے ذرات آوارہ تھے۔ زرد ٹہنیاں سرسبز پتوں کو تھپک رہی تھیں۔ فوارہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہا تھا۔ اور وہ پتھریلے معصوم بچے ایک دوسرے سے منہ موڑے بسور رہے تھے۔ ۔ ۔ اور فوارے تلے اسمارہ کمان تانے بیٹھی تھی اور دوسرے بینچ پر سمیع بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اور دونوں بینچوں کے درمیان راز سرگرداں تھا اور خمیدہ ٹہنیاں مڑمڑ کر جھانک رہی تھیں اور لمبی گھاس کے زرد ڈنٹھل سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور باغ کی روشیں دور دور سے آکر ان کے گرد حلقہ کئے ناچ رہی تھیں۔

"اس سے کہہ دو راز میں گردن زدنی ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ گنہگار ہوں۔ لیکن نہیں اس سے کچھ نہ کہو۔ مجھے اب اسے پیغام بھیجنے کا کوئی حق نہیں"۔ ۔ ۔ "نہیں نہیں راز اس سے کہہ دو میری صرف ایک بات مان لے۔ میری آخری التجا۔ آخری اسے کہہ دو کہ وہ مجھ سے نفرت کرے۔ نفرت ! میں اسی قابل ہوں اسی قابل۔ سمیع نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اور راز حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دو کھنچی ہوئی کمانیں۔ ڈولتی کشتیاں۔ ایک بجھا بجھا سا زرد مگر جھلس دینے والا شعلہ۔ اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں ہے کون ہے، کیوں ہے۔ ایک مدہوشی۔ ایک مسلسل دھنکی۔ مدھم مگر مبہم اور وہ ٹپ ٹپ کرتے آنسو۔ پتھر کے سرخ کٹورے سے گرتے ہوئے آنسو اور وہ

درختوں پتوں ، ٹہنیوں کا دھندلکا اور اس میں کمان کی طرح کھنچی ہوئی وہ زرد مخملی پُرنم قوس ۔ دفعتاً دو زرد بازو سیاہ ریشمیں درخت سے بل کھاتے ہوئے نکلے اور اس کی طرف بڑھے ۔ ۔ ۔ اس کے شانے چاٹنے لگے جن کے لمس سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور گردن سے تڑاخ سی آواز آئی ۔ ۔ اور اس کا سر کٹ کر اڑا اور شاخ سے لٹکنے لگا ۔ ۔ ۔ اور دفعتاً اس حیران کن طلسمی منظر میں ایک مفہوم پیدا ہوگیا ۔ وہ ویرانہ آباد ہوگیا ۔ اور اس گھٹے گھٹے ماحول میں کائنات کی وسعتیں انگڑائیاں لینے لگیں ۔

پھر فضا میں ایک رنگین آہ گونجی ۔ "ان سے کہہ دو راز وہ میرا غم نہ کھائیں"۔ "نہیں نہیں" پاس ہی سمیع کی آواز گونجی ۔ راز نے بصد مشکل سر اُٹھایا ۔ اسمارہ پر سمیع جھکا ہوا تھا ۔ "نہیں نہیں میں تمہارے سامنے نہیں آسکتا ۔ تمہیں منہ نہیں دکھا سکتا ۔ میں مجرم ہوں ۔ تمہارا مجرم ۔ ۔ ۔ ان آنکھوں کو نکال دو اسمارہ !" اس نے اس کا بازو کھینچ کر اپنے منہ پر رکھ لیا ۔ نکال دو اس سر کو کاٹ دو جو تسلیم میں خم ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ سمیع کا سر جھک کر اسمارہ کی گود میں ڈھیر ہوگیا جیسے کٹ گیا ہو ۔

پتھر کے معصوم بچے تالیاں بجانے لگے ۔ زرد مخملی قوس نے بھورے بادل کو تھام لیا اور شام نے اپنے سیاہ پردے کھول دیئے ۔ پھر وہ دونوں باغ میں ملنے لگے ۔

اسمارہ سیر کی غرض سے اتفاقاً ادھر آنکلتی اور فوارے کے قریب پہنچ کر تھک جاتی اور بینچ پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگتی اور سمیع دوسرے بینچ پر بیٹھ کر فلکیات کی کتاب کھول لیتا ۔ پھر اتفاق سے راز آ پہنچتا جسے دیکھ کر اسمارہ کی انگلیاں اور بھی تیز ہو جاتیں ۔ اور کمانیں اور بھی تن جاتیں اور سمیع حیرانی سے چلاتا "تم راز ، تم یہاں ؟" اور راز کے شانوں کو سانپ چاٹتے اور اس کا سر بُھن سے اُڑ جاتا جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو ۔ اور پھر درخت کی بل کھاتی ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے وہ پتھر کے ان معصوم بچوں کی مدھم سرگوشیاں سنتا ۔

" ۔ ۔ ۔ ہاں پیارے ، اور تم بھی کچھ کچھ عجیب"۔

پھر وہ دونوں چپ چاپ بورڈنگ پہنچتے ۔ راز اور سمیع ۔ اور سمیع چلانے

لگتا ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ، مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا ۔ اس کی ویرانی ۔ اس کی تنہائی ۔ ۔ ۔ میں خود تلاش کروں گا ۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا ۔ جسے اسمارہ حاصل ہو جائے گی ۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا !! ۔ ۔ ۔ کتنی پاکیزہ ہے وہ کتنی بلند ، کتنی معصوم !!!"

بالآخر وہ دن آگیا جب وہ اس خوش نصیب کو دیکھ سکتا تھا ۔ جسے اسمارہ حاصل ہو رہی تھی ۔ وہ اس کے بدن کو چھو سکتا تھا اس کی زرنگار چپلی کو تھام سکتا تھا جو رکاب میں ٹکی ہوئی تھی ۔ کتنی خوبصورت چپلی تھی وہ اور اس کے دو بڑے بڑے سے ہاتھ جن میں گھوڑے کی لگام تھامی ہوئی تھی ! ان ہاتھوں کو اسمارہ کو چھونے ، اسے تھامنے اور تھپکنے کا حق حاصل ہونے والا تھا ۔ ان پاؤں کو اس کی طرف چل کر جانے کی آزادی مل رہی تھی ۔ لیکن وہ اس کا چہرا نہ دیکھ سکتا تھا جسے پھولوں کی لمبی لمبی لڑیاں ڈھانپے ہوئے تھیں ۔ "شکر ہے راز ! وہ چلایا شکر ہے ۔ نغمے کو سامع مل گیا ۔ کتنی خوشی کی بات ہے ! کاش میں اس خوش نصیب کا چہرہ دیکھ سکتا !"

لیکن چہرا دیکھ کر وہ مایوس ہوگیا ۔ اس نے ایک جھرجھری محسوس کی ، ایک نفرت بھری جھرجھری ۔ اور وہ راز کی طرف بھاگا ۔ ۔ ۔ "راز ! وہ وہ۔" وہ ہانپ رہا تھا۔ "وہ تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے ۔ خون سے بھرا ہوا لوتھڑا ۔ ایک روغنی طنبورہ جس میں کوئی تار نہیں جو تاروں سے واقف ہی نہیں ۔ ۔ ۔ وہ ایک ہجوم ہے راز ایک شوروغل سے بھرا ہوا ہجوم ، وہ تنہائی اور خاموشی کے نغمات سے بے بہرہ ہے ۔ راز میں مجرم ہوں ۔ میں مجرم ہوں ۔ میں نے اسے تباہ کر دیا ۔ تباہ کر دیا۔" اور پھر کئی ایک دن اس کے کمرے سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں آتی رہیں ۔ پھر کمرے سے بہ آواز بلند فلکیات کا ورد سنائی دینے لگا جیسے کوئی رو رہا ہو ، چیخ رہا ہو ۔ کائنات سے شکایت کر رہا ہو اور پھر اس کے لئے کمرے میں بند رہنا ناممکن ہوگیا اور وہ حبشی باغ کے اس کونے میں بیٹھ کر فلکیات کا ورد کرنے لگا ۔ ۔ ۔ "ہائیں" مخملی آہ سن کر وہ چونکا سامنے بینچ پر اسمارہ بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی ۔ وہ اٹھ بیٹھا ۔ "تم ! تم یہاں !!! تم چلی جاؤ ۔ یہاں سے چلی جاؤ"۔ وہ اس کی طرف جھپٹا ۔ "چلی جاؤ ۔ تم کسی اور کی ہو ۔

تمہیں یہاں آنے کا کوئی حق نہیں"۔ اور اسمارہ کی کمانیں تنی رہیں، کشتیاں ڈولتی رہیں اور وہ چپ چاپ سویٹر بننے میں مصروف رہی۔۔۔ وہ چلاتا رہا۔ حتّٰی کہ تھک گیا۔ اس کی گردن جھک گئی اور لٹکتے لٹکتے مخملی زردی کی جھیل میں ڈوب گئی اور دو سنہرے بازو نکل کر اسے تھامنے میں مصروف ہوگئے۔ "آپ میرا غم نہ کھائیں، میرا غم نہ کھائیں آپ" اور پھر آہستہ آہستہ فضا پر خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی کے نغمے سے بے خود ہو کر پاس والی جھاڑی سے راز باہر نکل آیا اور اس تنی ہوئی کمان کے روبرو مجرم کی طرح بیٹھ گیا۔۔۔ "تم ان سے کہہ دو راز"۔ ایک سنہری آواز گنگنائی۔۔۔ اور سیاہ جھاڑی سے زرد سانپ نکلے اور راز ضحاک بن گیا۔ پھر ایک پٹاخہ۔۔۔ اور راز فضا میں تحلیل ہوگیا۔ اور سبز درختوں میں بھوری شاخیں بل کھانے لگیں۔ اور فوارے نے اپنے بال بکھیر کر "حال" کھیلنا شروع کر دیا۔

ہاں حبشی باغ کے اس ویران حصے میں اب بھی آتے ہیں۔۔۔ فلکیات کا وہ طالب علم جواب فلکیات کے محکمہ میں ملازم ہے اور اس کا دوست راز جسے ضحاک بننے کی لت پڑچکی ہے اور گلابی، اضطرابی انگلیوں والی اسمارہ!

اور ان کے وہاں آتے ہی بھوری ٹہنیاں بل کھا کر باہر نکل آتی ہیں۔ جھاڑیاں دب کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور سرخ پتھر کا فوارہ اچھل اچھل کر جھانکتا ہے اور معصوم بچے سرگوشیاں کرتے ہیں۔

"۔۔۔ ہاں پیارے اور تم بھی کچھ کچھ عجیب!"

..○..........

راں ٹڑیاں

"ہائیں" پھولدار لہنگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا ۔ "سچ ؟"
"ہاں۔" بڈھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا ۔ "سب کا رکھ رکھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدراں"۔
"گھر میں کوئی نہیں کیا؟"
"سبھی کھیت پر رہیں ہیں ۔ بھائی ، باپو ، چاچا ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے ۔ ویسے آتے جاتے رہتے ہیں ہفتے میں ایک بار"۔
"اچھا" نوجوان ہنسا ۔ ۔ ۔ " مالوم ہوتا ہے ۔ انہیں کوئی ملا نہیں"۔
بڈھا قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "میاں یہ راں ٹڑیاں ہے راں ٹڑیاں سمجھے ۔ ۔ ۔ وہ پھر ہنسنے لگا ۔ اپنے چوہدری کا گھر سونے سے بھرا ہے ۔ پریوں سمجھو جیسے مندر میں مورتی ۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے ۔ لو وہ رہا کنواں ۔ درختوں کے اُس جھنڈ میں ہے ۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں ۔ اللہ بیلی ۔" یہ کہہ کر بڈھا ڈنڈی پر اتر گیا ۔
"بدراں ۔ ۔ ۔" نوجوان مسکرا دیا لہنگا سنوار کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے زیرِ لب بولا ۔ "راں ٹڑیاں کی بدراں"۔
"راں ٹڑیاں ۔ ہو اوراں ٹڑیاں آں آں ۔
دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی ۔
جس جاں ٹڑیاں ، اوس نہ ماں ٹڑیاں ۔ جس ماں ٹڑیاں ۔ آن جانڑیاں ۔
"راں ٹڑیاں ۔ ہو اوراں ٹڑیاں ۔ آں آں ۔
چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو پتن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے اور قد چھوٹا ۔ درختوں کے جھنڈ اور گاؤں سرک سرک کر دور ہٹتے جاتے ہیں ۔ زمین پتھریلی ہوتی جاتی ہے اور مٹی کا رنگ لاکھا ۔ یہ علاقہ پلچھی کا

ہے ۔ جس کے عین وسط میں راں ڑیاں کا گاؤں آباد ہے ۔

گاؤں کے ارد گرد خود رو کلا بڑی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑتا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لئے اس قدر مشقت کی ضرورت پڑتی ہوگی ۔ لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لئے رک جاتے ہیں ۔ اونچا لمبا قد ۔ ابھری چھاتی ۔ فراخ شانے ۔ پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تناؤ ۔ آنکھ میں رد عمل کی جھلک ۔ شاید کامیابی ۔ اور عورتوں کو دیکھ کر سبھی دیکھتے انہیں ۔ چونکہ وہ پردہ وردہ نہیں جانتیں ۔ لیکن وہی تناؤ قدو قامت ۔ شاہانہ چال ۔ نڈر نگاہیں جو شرما کر کسی کو دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا مٹیار جسم گھبرا کر یا سمٹ کر راہگیر کی توجہ اکسانے سے بے نیاز ہے ۔ ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود چھلکتی نہیں ۔ سرخ ہونے کے باوجود گال شرم سے تمتماتے نہیں ۔ شاید راں ڑیاں کے مردوں نے ان کے نسائی پہلو کو عریاں دیکھا ہو ۔ لیکن اجنبی ۔ ۔ ۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں ۔ جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبہ ۔ شاید اسی لئے اُس علاقے کی عورتوں کو راں ڑیاں کہتے ہیں ۔ بہر حال پلچھی کی عورتیں واقعی راں ڑیاں ہیں اور راں ڑیاں کی ہر عورت ملکہ ۔

وہ سُرمہ سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں ۔ رنگدار کپڑوں کی دلدادہ اور خشبو ۔ ۔ ۔ خشبو سے تو انہیں عشق ہے عشق ۔ حتیٰ کہ لونگ ابالے پانی بغیر نہاتی نہیں ۔ شاید اسی لئے انہیں راں ڑیاں کہا جاتا ہے ۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں دعوت نہیں ۔ جیسے مندر ہو ۔ مورتی ہو ۔ پوجا کا سامان ہو ۔ سیس نوانے کی آگیا نہ ہو ۔

شاید ان کا "عورت" کو چھپائے رکھنا تلاش پرمائل کرنے کا انوکھا انداز ہو ۔ لیکن راں ڑیاں کے مرد متلاشی دکھائی نہیں دیتے ۔ ان میں جستجو کی بیتابی نہیں بلکہ پالینے کا نشہ ہے ۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں ۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی رنگین مگر سنگین راں ڑیاں پر بھروسہ ہے ۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا ۔ ویسے تو بیلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا ۔ لیکن عموماً پو پھوٹنے سے پہلے

وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جایا کرتا تھا جا کھڑاں کے گردو نواح میں کون تھا جو قاسو اور بیلی کو نہ جانتا تھا لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہارِ خیال کرنے سے گریز کرتے تھے بہر حال ہر کوئی کوشش کرتا کہ قاسو کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرے ۔ آدھی رات کو لوگ بیلی کا ہنہنانا سنتے ٹھٹک جاتے اور پھر معاً بات ٹالنے کے لئے کوئی موضوع چھیڑ دیتے پو پھٹتے وقت ہل چلاتے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے ”تاتا ۔ تتاتا“ چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے ۔ عورتیں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور بالآخر مسکرا کر دہی بلونے میں مصروف ہو جاتیں ۔

اس روز قاسو اور بیلی نوسار کی جانب آئے بھیبلی پورہ کے پاس جہاں سے نوسار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے ، قاسو نے بیلی کو موڑنے کے لئے لگام کھینچی ۔ لیکن خلافِ معمول بیلی اڑ کر کھڑا ہوگیا ۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رُک گیا ۔ قاسو نے غصے میں ایڑ لگائی ۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سر کا پھر نہ جانے کیا خیال آیا ۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا ۔ ”اچھا بیلیا تیری مرضی نہیں تو نہ سہی ۔ آج قاسو بیلی کی مرضی پر چلے گا ۔“ یہ کہہ کر اُس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور بیلی ہوا ہوگیا ۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے ۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بیلی اسے واپس لے آئے گا ۔ اس لئے وہ بے پرواہی سے بیٹھا رہا حتٰے کہ وہ راں ڑیاں آپہنچے بیلی رُک گیا اور قاسو نے پگڑی سر تلے رکھی اور سو گیا ۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی ۔ پانی پینے کے لئے خشک درختوں کے اُس ویران جھنڈ سے باہر نکلا تو اس بڈھے سے ملاقات ہوگئی ۔

”راں ڑیاں ۔ ۔ ۔ ہو راں ڑیاں ۔

کن جاں ڑیاں نے کن ماں ڑیاں“۔

پانی پینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل پڑا ۔

قاسو ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا ۔ ”چوہدری“۔ اُس نے آواز دی ”کون ہے“۔ بدراں نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کاتتے

میں لگی رہی ۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاکا اور حرکت میں بے نام سی لچک ۔ نسائیت کا پتہ دے رہے تھے ۔ سر اٹھائے بغیر بدراں نے دوپٹے کو سرکا کر ماتھا ڈھانپ لیا اور بولی "کون ہے ؟"

"پیاس لگی ہے"۔ قاسو دروازے میں کھڑا ہوگیا ۔

وہ اٹھ بیٹھی ۔ "لسی پیو گے ویر یا دودھ"۔

"لسی" قاسو نے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا ۔

بیٹھ جاؤ ویر ۔ بدراں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سرکا دی اور گڑوا اٹھا چاٹی کے قریب جا بیٹھی ۔ اس نے اتنی بڑی چاٹی کو یوں اٹھا لیا گویا وہ تنکوں کی بنی ہو ۔ "میٹھا گراؤں یا نمک ۔ کیوں ویر"۔ "نہیں نہیں ۔ نمک نہیں" وہ چونک کر بولا ۔ اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اُس کی طرف دیکھا ۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس بات پر بدراں کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی ۔ "میٹھا ڈال دوں"۔ وہ منہ موڑ کر بولی ۔ "نہیں" قاسو نے جواب دیا ۔ " ایسے ہی دے دے"۔ بدراں نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر بڑھا دیا ۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لئے کھڑی رہی ۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا ۔ بدراں نے مڑ کر دیکھا وہ حریص نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی ۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی "لے ویر لسی"۔ وہ بولی گڑوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آنکھ بچا کر اسے دیکھنے لگی ۔ وہ گڑوے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا ۔

"پردیسی ہو ویر" بدراں نے سرسری طور پر پوچھا ۔

"کہیں دُور جانا ہے"۔

"نہیں نہیں ۔ ادھر ہی کام تھا"۔

"راں ڑیاں میں ؟"

"ہاں ہاں یہاں پاس ہی اُدھر"۔

"اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر"۔

"روٹی ۔ نہیں نہیں ۔ مجھے جلدی ہے"۔ غٹاغٹ لسی پی کر وہ کھڑا

ہوگیا"۔ یہ لو ۔ اس نے گڑوا بڑھایا ۔ وہ بیٹھی رہی ۔ غالباً وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گڑوا زمین پر رکھ دے لیکن اُسے منتظر دیکھ کر بدراں کو اٹھنا ہی پڑا ۔

گڑوا پکڑتے ہوئے اُس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی ۔

"پسند ہیں ویر؟" وہ خشک لہجے میں بولی ۔

"کیا ؟" وہ چونکا ۔

وہ کڑے اتارنے لگی ۔ "یہ کڑے ۔ میری طرف سے اپنی گھر والی کو دے دینا ۔ میری بھابی کو"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ "تکلیف نہ کرو ۔ کڑوں کی کیا کمی ہے ۔ گھر والی بھی ہو"۔

"کمی نہیں ویر تو اس کام کا فائدہ ؟"

"کونسا کام ؟"

"میری مانو تو یہ کام چھوڑ دو"۔

وہ پھر ہنسا ۔ "ہم باکھڑاں والے دان نہیں لیتے ۔ ہاتھ کا کمایا کھاتے ہیں"۔ اس نے بازو دکھاتے ہوئے کہا ۔

"اسے ہاتھ کا کمایا نہیں کہتے ویر"۔

"اپنا اپنا کام ہے ۔ اپنی اپنی بولی ۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی"۔ اس نے معنی خیز انداز سے کہا ۔ "پھر تو تسلی ہو جائے گی"۔

بدراں کی آنکھیں انگارہ ہوگئیں ۔ میں راں ڑی ہوں ویر ہم تسلی نہیں چاہتے ۔ تسلی دیتے ہیں ہم میں نے تجھے ویر کہا ہے میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راں ڑیاں میں اور کسی نے تجھے ویر نہیں کہا ۔ ٹھہر ذرا ۔ ۔ ۔ ادھر آ ۔ اُس نے قاسو کو للکارا ۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ۔ بدراں نے صندوق کھولا ۔ "یہ دیکھ یہ چوڑیاں ۔ چوک ۔ ہنسلی تعویذ" اور اُس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے ۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا چابی طاقچہ میں رکھ کر بولی۔ "یہاں ہوگی چابی ۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں ۔ دروازے کھلے ہوں گے ۔ میں وہاں سوتی ہوں ۔ اس پلنگ پر ۔ ۔ ۔ اکیلی جب تیرا جی چاہے آجائیو ویر ۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگا دینا ۔ پھر اگر تو

گٹھڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہوگا ۔ سنا تو نے"۔

"عورت کے ساتھ شرط باندھوں"۔ وہ ہنسا ۔

"عورت" وہ ہنسی ۔ "یہ راں ڑیاں ہے ویر ۔ راں ڑیاں"۔

"راں ڑیاں ۔ ۔ ۔ اوراں ڑیاں"۔

دور کسی کے گانے کی آواز آئی ۔ وہ چونکا ۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو للکارا ہو ۔

بدراں نے سر اٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہوگئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر کوئی سورما ۔ جب تیرا جی چاہے آجائیو"۔

دیوار پھاندنے سے پہلے اسے خیال آیا ۔ بھلا آزماؤں تو سہی ، کیا وہ سچ کہتی تھی کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا آیا ۔

اُف کس قدر اندھیری ہے یہ رات اس نے سوچا ۔ آخر عورت ہے نا ۔ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا ۔ دروازہ کھلا تھا ۔ ہوں ۔ کتا ہوگا ۔ کتا !! وہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہوگیا ۔ آہٹ کرنے کے باوجود کوئی آواز نہ آئی ۔ اونہوہ اس نے سر ہلایا ۔ طاقچہ پر دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ پلنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی ۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا ۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی ۔

گٹھڑی باندھ کر وہ بدراں کے سرہانے آ کھڑا ہوا ۔ فضول بے آرام کرنا اس نے سوچا ۔ جگا بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا ۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈر تھی ۔ ورنہ یوں بے فکر گہری نیند میں پڑے رہنا آسان کام نہیں ۔

قاسو نے بدراں کی بائیں کلائی پکڑ کر اُسے ہلایا ۔ بدراں نے کروٹ بدلی ۔ لیکن اُس کی آنکھ نہ کھلی ۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔ ایک ساعت کے لئے جوں کی توں پڑی رہی ۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ بولی ۔ "اب اگر تو کلائی چھڑا لے تو وہ گٹھڑی تیری ہے"۔

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیا ۔ لیکن بدراں کی گرفت اور بھی آہنی ہوگئی ۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدراں نے کلائی مروڑ کر اُسے چارپائی پر گرا لیا ۔ "آرام سے بیٹھ کر ویر" وہ بولی "لے اب چھڑا" اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا ۔

قاسو غصے سے آگ بگولا ہوگیا ۔ لیکن بدراں کی گرفت بلا کی تھی ۔

ایک بار پھر وہ چلائی ۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے اُسے پکڑنے کی کوشش کی ۔ اِس بات پر وہ بھوکی شیرنی کی طرح اُٹھ بیٹھی ۔ "افسوس ہے کہ میں نے تجھے ویر کہا ہے ورنہ" ۔ ۔ اُس نے قاسو کو دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا ۔

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش کھڑا رہا ۔

"میں تو تجھے آزما رہا تھا ۔" قاسو نے اپنا انداز بدلا ۔

"تو آزما دیکھا" وہ اکڑ کر بولی ۔

"تو نے مجھے ویر کہا ہے" وہ مسکرایا ۔

"ہاں ۔" وہ بولی "ورنہ ۔ ۔"

بیلی کے ہنہنانے کی آواز سن کر وہ چونکا ۔ "اچھا میں جاتا ہوں ۔"

"قول دے پہلے ۔" وہ مسکرائی ۔

"اوہوں" اس نے سر ہلایا ۔ "مجھ سے نبھایا نہ جائے گا ۔"

"اچھا ۔" وہ سوچ کر بولی ۔ "نہ سہی ۔"

"ادھر نہ آؤں گا کبھی راں ڑیاں کو ۔"

"تو دودھ پی کر جا ۔"

"ضروری ہے کیا ؟"

"ہاں" وہ بولی یا قول دے یا دودھ پی کر جا ۔ یہاں کی ریت ہے ۔"

"اچھا" وہ بیٹھ گیا ۔ "لا دودھ ۔"

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی ۔ ڈول میں دودھ ڈالا ۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی شکر کے علاوہ وہ دودھ میں سبز سا سفوف گھول کر لے آئی ۔

قاسو نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔
"اوہوں ۔ زہر نہیں ۔" وہ بولی ۔ "ویر کو زہر نہیں دیتے ۔"
"اچھا راں ڑی"۔ وہ بولا ۔ "جو چاہے دے دے اب کیا ہے" اور غٹاغٹ پی گیا اور پھر ۔
"اللہ میلی" کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہوگیا ۔

جاکھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے ۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہوگئیں ۔ کسی نے کہا ۔ "میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ ۔ اب تو میلی ساری ساری رات گلیوں میں ہنہناتا رہتا ہے" کوئی بولی "اچھا نہ ہوگا ۔ اللہ مارا تیسری نے کہا ۔ "اوں ۔ اچھا نہ ہوگا ۔ بھلا چنگا پھرتا ہے"۔

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ پھر کوئی بول اُٹھتا "اوہ ۔ ۔ ۔ یہ تو پگلی چلا رہی ہے صبح سویرے پوپھوٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر وارے میں جا کر چہ میگوئیاں کرتے ۔ "چھوڑ دیا اپنا کام"۔ "بھئی اللہ ہی جانے" کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سویا تھا"۔ "بس یہ تو پتے کی کہی تو نے اجی بڑی کرامت والے ہیں وہ"۔

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی ۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر چل نکلتا ۔ قاسو کے متعلق ۔ پہلے جس قدر چپ رہتے تھے وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے ۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا ۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اُسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو ۔ یا شاید اُسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی ۔

"لیکن آخر تھا کیا اُس دُودھ میں"۔ ماجو نے پوچھا ۔
"معلوم نہیں ۔ قاسو نے آہ بھر کر کہا ۔ جب سے بدن میں جان نہیں رہی ۔ ہمت نہیں رہی"۔
"ہمت نہیں رہی ؟"
"ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے"۔ وہ زہر خند ہنسی ہنسا ۔

"کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟"

"اس سے بھی بد تر"۔ قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"قاسو۔۔۔؟" ماجو حقیقت حال جان کر چلایا۔

"ہاں ماجو"۔ قاسو یوں خاموش ہو گیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ"۔۔۔

"اوہوں"۔ وہ بولا۔ "میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا"۔

"پر کیوں"۔

"پتہ نہیں"۔

"تعجب ہے تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرامزادی۔ میں۔۔۔ میں"۔۔۔ دفعتاً وہ رُک گیا اور خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً ایک چھری تیز کرنے لگا اور گھر آتے ہوئے ان جانے میں وہ چھری ہاتھ میں لئے چلا آیا۔۔۔ "اونہوں" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ یہ چُھری۔ اس نے چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ چھری کام نہ آئے گی" اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹانے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ "مادو کوئی ایسی چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے"۔

"کیوں"۔ مادو نے پوچھا۔

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"۔

"صمدو کے پاس ہے۔ صمدو نائی کے پاس"۔ مادو بولا۔" فوراً بیہوش ہو جائے بس سونگھنے کی دیر ہے۔" "کیا چیز ہے۔" اس نے پوچھا۔" پتہ نہیں۔" مادو نے کہا۔" سرکاری چیز ہے کوئی۔ دواخانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صمدو۔"

رات کو چار پائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب

قاسو نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔

"اوہوں ۔ زہر نہیں ۔" وہ بولی ۔ "ویر کو زہر نہیں دیتے ۔"

"اچھا راں ڑی"۔ وہ بولا ۔ "جو چاہے دے دے اب کیا ہے" اور غٹاغٹ پی گیا اور پھر ۔

"اللہ بیلی" کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہوگیا ۔

جاکھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے ۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہوگئیں ۔ کسی نے کہا ۔ "میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ ۔ اب تو بیلی ساری ساری رات گلیوں میں ہنہناتا رہتا ہے" کوئی بولی "اچھا نہ ہوگا ۔ اللہ مارا تیسری نے کہا ۔ "اوں ۔ اچھا نہ ہوگا ۔ بھلا چنگا پھرتا ہے"۔

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ پھر کوئی بول اُٹھتا "اوہ ۔ ۔ ۔ یہ تو پگلی چلّا رہی ہے صبح سویرے پوپھوٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر وارے میں جاکر چہ میگوئیاں کرتے ۔ "چھوڑ دیا اپنا کام"۔ "بھئی اللہ ہی جانے" کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سویا تھا"۔ "بس یہ تو پتے کی کہی تو نے اجی بڑی کرامت والے ہیں وہ"۔

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی ۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر چل نکلتا ۔ قاسو کے متعلق ۔ پہلے جس قدر چپ رہتے تھے وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے ۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا ۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اُسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو ۔ یا شاید اُسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی ۔

"لیکن آخر تھا کیا اُس دُودھ میں"۔ ماجو نے پوچھا ۔

"معلوم نہیں ۔ قاسو نے آہ بھر کر کہا ۔ جب سے بدن میں جان نہیں رہی ۔ ہمت نہیں رہی"۔

"ہمت نہیں رہی ؟"

"ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے"۔ وہ زہر خند ہنسی ہنسا ۔

"کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟"

"اس سے بھی بدتر"۔ قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"قاسو۔۔۔؟" ماجو حقیقت حال جان کر چلایا۔

"ہاں ماجو"۔ قاسو یوں خاموش ہوگیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیا تم نے اس پر ہاتھ"۔۔۔

"اوہوں"۔ وہ بولا۔ "میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا"۔

"پر کیوں"۔

"پتہ نہیں"۔

"تعجب ہے تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرامزادی۔ میں۔۔۔ میں"۔۔۔ دفعتاً وہ رُک گیا اور خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً ایک چھری تیز کرنے لگا اور گھر آتے ہوئے ان جانے میں وہ چھری ہاتھ میں لئے چلا آیا۔۔۔ "اونہوں" وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ یہ چُھری۔ اس نے چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ چھری کام نہ آئے گی" اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹانے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ "مادو کوئی ایسی چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے"۔

"کیوں"۔ مادو نے پوچھا۔

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"۔

"صمدو کے پاس ہے۔ صمدو نائی کے پاس"۔ مادو بولا۔" فوراً بیہوش ہو جائے بس سونگھنے کی دیر ہے۔" "کیا چیز ہے۔" اس نے پوچھا۔" پتہ نہیں۔" مادو نے کہا۔" سرکاری چیز ہے کوئی۔ دواخانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صمدو۔"

رات کو چار پائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب

میں ایک اونچی لمبی عورت بیہوش پڑی تھی ۔ اور وہ غصے میں اپنے بھائی قاسو سے کہہ رہا تھا ۔ " یہی ہے نا وہ ؟"

اور قاسو منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ وہ جاگ اٹھا ۔ " جاؤں گا ضرور جاؤں گا ۔ "

اندھیرے میں دبے پاؤں سرک سرک کر وہ بدراں کے مکان کے دالان تک جا پہنچا سامنے پلنگ پر کوئی سویا ہوا تھا ۔ اس نے ایک بڑی سی ڈبیا لہنگے کے پلّے سے نکالی ۔ اسے مضبوطی سے تھام کر وہ پھر چوپائے کی طرح چلنے لگا ۔ چارپائی کے پاس پہنچا تو بدراں نے کروٹ لی ۔ ماجو چارپائی تلے چھپ گیا ۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے سر باہر نکالا ۔ بدراں دائیں پہلو پر یوں پڑی تھی کہ اس کی ناک چارپائی کے سرے کے قریب تھی ۔ وہ سرک کر قریب ہو بیٹھا اور ڈبیہ کھولنے لگا ۔ پیشتر اس کے کہ وہ ڈھکنا کھولتا ۔ ۔ اس کے دونوں ہاتھ بدراں کی گرفت میں تھے ۔

"ہوں" ۔ ۔ ۔ وہ اُٹھ بیٹھی ۔ "مجھے معلوم تھا تو آئے گا" ۔ ۔ ۔ لیکن ماجو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹھکی ۔ ۔ ۔ تو ۔ ۔ ۔ تو کون ہے" وہ بولی ۔ ۔ ۔ "اونہوں" ۔ ۔ ۔ اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر وہ گنگنائی ۔ ۔ ۔ " چوری کرنے آیا تھا کیا کر لے چوری ۔ کس لئے آیا تھا تو"۔ بدراں نے پوچھا ۔ ماجو کو جوش آگیا ۔ بولا ۔ "تیرے لئے"۔

"میرے لئے"۔ وہ حیران ہوگئی ۔

"ہاں تجھے لینے کے لئے" اس نے دانت پیسے ۔

"تو"۔ بدراں نے نفرت سے ہونٹ نکالے ۔ "اپنی جان کی خیر نہیں کیا"۔

"اونہوں" ماجو نے نفی میں سر ہلا دیا ۔ ایک روز مرنا تو ہے ہی"۔

"حرام موت"۔

"نہیں حرام کیوں ۔ نہ چلے گی میرے ساتھ تو تجھے مار ڈالوں گا۔ آپ مر جاؤں گا ۔ "

"بڑا بہادر ہے تو ۔ پر یہ ڈبیا کیا ہے ہُوں ؟"

"کچھ ہے ہی نا۔"

"زہر ہے کیا۔"

"زہر۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر" وہ بولی۔

"دوائی ہے اور کیا۔"

"دوائی"۔ [illegible]

"ہاں تجھے بے ہوش کرنے کو۔ تو سونگھ لیتی تو میں کب سے تجھے اُٹھا کر چل دیتا"۔

"اچھا۔" مجھے بے ہوش کر کے لے جانا تھا تو نے۔ بڑا بہادر مرد ہے"۔ بدراں نے اسے دیوار پر دے پٹخا ماجو کھسیانا ہو کر اُٹھ بیٹھا۔

"بس یہی ہمت ہے تیری۔ گھر سے راں ڑی لینے آیا تھا۔ ہمت بھی ہے تجھ میں"۔

"نہ سہی"۔ وہ بولا، "خواہش تو ہے"۔

"تیرے جیسے تو ہمارے کمین ہیں کمین"۔ وہ غرائی۔

"کمین ہی سہی"۔

"چل دفعہ ہو"۔ وہ بولی۔ "دُور ہو جا یہاں سے۔ جاتا ہے یا نہیں"۔ بدراں نے اُسے پھر دھکا دیا۔ اور وہ دہلیز پر گر پڑا۔ منہ پر خراش آئی۔ لیکن جلد ہی سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔

"جائیگا یا نہیں"۔ وہ پھر غرائی۔

"اچھا" وہ کھڑا ہوگیا۔ "پھر سہی"۔

"تو۔۔۔" وہ غصہ سے چلائی اور اُسے پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔

"کون ہے۔" پڑوس سے دتا بھاگتا ہوا اندر آیا"۔ کون ہے بدراں۔

"کون ہے یہ" دِتے نے ماجو کو دیکھ کر بدراں سے پوچھا۔

"پتہ نہیں"۔ وہ بولی۔

"چور ہے؟" دِتے نے پوچھا۔

"پوچھو اِس سے کہتا ہے تجھے لینے آیا ہوں"۔ وہ ہنسی۔

"تجھے"۔

"ہاں"۔

"حرام خور"۔ ۔ ۔ دِتے نے اس کی گردن پر ایک دی ۔ اور وہ چکرا کر بدراں کے پاؤں میں آگرا ۔

"پاگل ہے کوئی"۔ وہ بولی ۔

"خون پی لوں گا اس کا ۔ ۔ ۔ میں"۔ دِتا ایک بار پھر اُس کی طرف بڑھا ۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا ۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا گویا بچہ ماں سے پناہ مانگ رہا ہو ۔ "دِتے" بدراں چلّائی "تو کچھ نہ کہہ اسے میں کر لوں گی ٹھیک ، دِتے ۔" وہ پھر چیخی لیکن دِتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا "راں ڑی"۔ ماجو نے اعلانیہ اس سے پناہ مانگی ۔ "رہنے دے بہادری تو"۔ وہ دِتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی ۔ "تو جا" اس نے دِتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی ۔

یہ دیکھ کر دِتا ہنسا ۔ بولا ۔ "اچھا جیسے تیری خوشی"۔

"کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی ۔ سر پھرا"۔

دِتا ہنسا اور باہر نکل گیا ۔

اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی ۔ "مجھے لے جانے کا خبط نہیں گیا"۔

"اب تو باندھ دیا ہے مجھے تُو نے"۔ ماجو بولا "بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری ہے"۔ اس نے دکھلاوے کی محبت جتائی ۔

"اوہ"۔ وہ ہنسی اور اُسے کھولنے لگی ۔ "اچھا ۔ اگر میں سونگھ لیتی اسے تو کیا ہوتا ۔" اس نے ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا ۔

"بیہوش ہو جاتی تو"۔

"پھر"۔

"پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تجھے"۔

"سچ"۔ وہ بولی ۔ "پھر"۔

"پھر ۔ ۔ ۔ ۔" وہ گھبرا گیا ۔ "بس" ۔ ۔ ۔ لیکن عین اس وقت اسے سوجھی ۔ "تو نے میرے بھائی کو نہ جانے کیا پلا دیا ۔ اس میں ہمت نہیں رہی ۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے ۔ ہم کیا کریں"۔

"اچھا"۔ وہ بولی "تو اس کا بھائی ہے"۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے ۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں"۔

"میں وہاں چلی جاتی ۔ پھر کیا ہوتا"۔ وہ بولی ۔

"پھر ۔ ۔ ۔ پھر ہمیں کیا پروا تھی"۔ وہ جوش میں اُٹھ بیٹھا ۔ "تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی جرأت نہ ہوتی"۔

"اچھا"۔ وہ مسکرائی ۔ "کیا اس ڈبیہ کو سونگھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی"۔ اُس نے ڈبیہ سے کھیلتے ہوئے کہا اور کھیل ہی کھیل میں اِسے کھول کر ناک کے قریب لا کر بولی ۔ "دیکھوں ۔ ۔ ۔ ہائے میں نہیں دیکھتی ۔" وہ رک گئی "ہائے بیہوش ہو گئی تو تم لے جاؤ گے ۔ ۔ ۔ لے جاؤ گے نا ؟" وہ ہنسی ماجو خاموش بیٹھا رہا ۔

"تلخ سی بُو ہے"۔ اُس نے ڈبیہ کو ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا ۔ ۔

"اوئی"۔ ایک چیخ سی سنائی دی اور بدراں دھڑام سے ماجو کے پاؤں پر بیہوش ہو کر گر پڑی ۔

ماجو حیران کھڑا دیکھ رہا تھا ۔

دُور ۔ ۔ ۔ دُور ۔ ۔ ۔ کہیں کوئی گا رہا تھا ۔

راں ٹریاں ۔ ۔ ۔ ہو راں ٹریاں ۔
کن جاں ٹریاں تے کن ماں ٹریاں
راں ٹریاں ۔ ۔ ۔ !

.........○.........

ہائے یہ نوجوان

اس روز چودھری غلام حسین کے گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا ۔

ایک طرف بند کمرے میں میاں بیوی اور خالہ منور سرگوشیاں کر رہے تھے ۔ دوسری طرف ملحقہ کمرے میں فرخ پیچ و تاب کھا رہا تھا ۔ پیشانی پر تیوری چڑھی تھی ۔ نتھنے پھولے ہوئے تھے اور مٹھیاں بند تھیں ۔ وہ ان جانے میں گھونسے چلاتا ہوا کمرے میں یوں گھوم رہا تھا جیسے پنجرے میں شیر ہو ۔ اس کے پاس آصفہ بیٹھی کچھ بُن رہی تھی ۔ کان ملحقہ کمرے میں سرگوشیوں پر لگے تھے ہونٹوں پر زیر لب مسکراہٹ تھی ۔ لطیف تمسخر گالوں کے گڑھوں سے نمایاں ہو رہا تھا ۔ آصفہ ،امی ابا اور خالہ کی سرگوشیاں سنتی ایک نظر بھائی کی طرف دیکھ کر مسکراتی جو پاس ہی عالمِ بے بسی میں ہوا کو گھونسے مار رہا تھا ۔ کچھ گنگناتی اور پھر الجھی ہوئی لٹ ہٹا کر ازسرِنو کان دیوار سے لگا کر بننے میں مصروف ہو جاتی ۔

بند کمرے سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں ۔ پہلے تو سرگوشیاں ہوتی رہیں ۔ پھر اگرچہ باتوں کا انداز رازدارانہ رہا ۔ مگر وہ سب اس قدر بلند آواز میں بولنے لگے جیسے اِس راز کو اچھالنا چاہتے ہوں ۔

پہلے تو خالہ منور اور آصفہ کی ماں کی روئی روئی آوازیں سنائی دیں پھر کوئی سسکیاں بھرنے لگی اور غلام حسین منتیں کرنے لگے ۔ جیسے سمجھا بجھا رہے ہوں ۔ دلاسے دے رہے ہوں ۔ پھر خالہ منور کی سسکیاں مدھم پڑتی گئیں ۔ آصفہ کی ماں کی آواز بھی سنبھلتی جا رہی تھی ۔ اور اس کی باتوں میں تسلسل پیدا ہوتا جا رہا تھا ۔ اس پر غلام حسین کی آواز میں منت کا عنصر خارج ہونے لگا ۔ جیسے دفعتاً انہیں اپنے وقار کا خیال آگیا ہو ۔ ان کے لہجے میں کرختگی پیدا ہونے لگی ۔ اور ان کی آواز بلند ہوتی گئی ۔ وہ بیگم کی بات کاٹنے کی ناکام کوشش میں

لگے تھے۔ کیونکہ بیگم کے روبرو ان کی کوششیں جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بیگم یوں بولے جا رہی تھی جیسے ویرانے میں ندی بہہ رہی ہو۔ عادی طور پر اسے کہنے سے غرض تھی۔ سننے سے نہیں۔

ملحقہ کمرے میں آصفہ یوں بیٹھی تھی۔ جیسے اسے بات سننے سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس کے باوجود بند کمرے کی سرگوشیوں کی تال پر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ان دھڑکنوں کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کندھوں پر مالٹے کا رنگ کا ہلکا دوپٹہ بے پرواہی سے لٹک رہا تھا۔ جس میں سفید پھول چمک رہے تھے۔ شنگرفی ناخنوں پر سفید تاگہ لپٹ کھل رہا تھا۔ نگاہیں اگرچہ سفید سینڈل کی نوک پر ٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر وہ کنکھیوں سے بھائی فرخ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا کر یوں ہونٹ ہلا رہی تھی۔ جیسے کچھ گنگنا رہی ہو۔ فرخ کو اشارۃً کچھ سمجھا رہی ہو۔

"سج لے اے اے بنرا سج لے"

آصفہ کو گیتوں اور ٹھمریوں کے بول بے حد پسند تھے وہ کہا کرتی ہائے امی کتنے پیارے بول ہیں جیسے دل سے نکلے ہوں۔ اور امی ہاتھ چلا کر کہتی تُو تو پاگل ہو گئی ہے لڑکی واہی تباہی نہ بکا کر۔ اور جب آصفہ اس کا جواب دینے لگتی تو امی ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیتی چپ کر اب۔ آصفہ ہنسے جاتی۔

غلام حسین کے گھر میں بچوں کو کافی آزادی حاصل تھی اور یہ سب امی کی طبیعت کی وجہ سے تھا۔ اگرچہ میاں کے ساتھ اس کا برتاؤ سخت گیر قسم کا تھا۔ مگر بچوں کے ساتھ وہ اکثر بچہ بن جاتی۔ جب غلام حسین باہر چلے جاتے تو ماں چپکے سے آصفہ کے پاس آ بیٹھتی۔ "کیا کر رہی ہے میری آسو" وہ پیار سے کہتی۔ آصفہ کی زیر لبی مسکراہٹ ہونٹوں سے نکل کر گالوں پر پھیل جاتی۔ کیا گنگنا رہی ہے تو۔ "ماں پوچھتی" اے ہے منہ ہی منہ میں گنگناتی ہے۔ ذرا اونچی آواز سے کہہ تو کیا بول ہے۔ "کچھ نہیں امی" آصفہ منہ پکا کر لیتی۔ "اے ہے کہہ تو سہی" ایک بار۔ توبہ تُو تو نخرے کرتی ہے۔ کیا ہے "وہ ڈیرے والا گیت"۔ اس پر صادقہ چلاتی۔ امّی میں بتاؤں۔ مانڈے ڈیرے آجا۔ "ہاں وہی" ماں کی باچھیں کھل جاتیں۔ "مانڈے ڈیرے آجا۔ سنا دے"۔

آصفہ ہنستی ۔ "امی وہ تو ڈیرے پر ہی ہیں پھر بلانے سے فائدہ ۔"

"چل دُور ہو"ماں ہنس کر گھورتی ۔ ہر بات کا مذاق اڑاتی ہے "شرم نہیں آتی"۔ آصفہ گیت سنانے لگتی تو صادقہ سلیٹ رکھ کر ٹکٹکی باندھ کر آصفہ کی طرف دیکھتی ۔ آصفہ کے چہرے پر ایک پر کیف اداسی جھلکتی ۔ صادقہ کا دل چاہتا کہ آپا گاتی رہے اور وہ اسے دیکھتی رہے ۔ اس وقت آصفہ کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا گویا واقعی کوئی ڈیرے کی طرف آ رہا ہے ۔

ایسے وقت فرخ آ جاتا تو وہ چھپ کر اس کا گانا سنتا رہتا اور اپنی آمد کا اظہار نہ کرتا ۔ پھر جب گانا ختم ہو جاتا تو وہ بھدّی آواز میں مینڈک کی طرح ٹرانے لگتا ۔ اس پر آصفہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتی ۔ ہائے امی یہ مینڈک کیوں ٹرانے لگے ابھی تو برسات نہیں آئی اور فرخ چلاتا اور کیا ہر وقت کوئلیا ہی کوکتی رہے ۔ مینڈک کو ٹرانے کا حق نہیں کیا ۔ "ہائے بھائی جان صادقہ سلیٹ اٹھا کر منہ بناتی ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا ۔ "میں کہتی ہوں ۔ ماں ہاتھ چلا کر کہتی ۔ سارا دن گھر میں ہی گھسا رہتا ہے ۔ کبھی باہر بھی جایا کر ۔ ۔ واہ اماں وہ غصّے میں گھونسا چلاتا ۔ مجھے تو باہر جانے کو کہتی ہو اور اپنی لاڈلی سے "ماندے ڈیرے آ جا"سنتی ہو ۔ "توبہ ماں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی ۔ "کیسے منہ پھٹ ہو تم جو منہ میں آیا بک دیا ۔"

"میں بتاؤں امی صادقہ چلانے لگتی ۔ اصل میں بھائی کو یہ گیت پسند نہیں ۔ ان کو تو یہ شکایت ہے کہ ان کی پسند کا گیت کیوں نہیں گایا جاتا ۔

"میں بتاؤں امی آصفہ مسکراتی اور پھر گانے لگتی ۔

"سج لے اے اے بنرا سج لے"

اور فرخ اس کا منہ چڑانا شروع کر دیتا ۔ بڑی گوئیا تو دیکھو ۔ ہونہہ"

یہ دلہن اور بنرا سجنے کی بات بھی بہت پرانی تھی ۔ بہن اور بھائی دونوں کو شادی کے نام سے چڑ تھی ۔ فرخ رشتہ داروں میں ناطہ کرنے کے خلاف تھا اور آصفہ شادی کرنے سے ہی منکر تھی ۔ گھروں میں بچوں کے بیاہ شادی کی بات ہوا ہی کرتی ہے ۔ آصفہ کی شادی کی بات چھڑ جاتی تو فرخ دوڑ کر اس میں جا حصہ لیتا اور بات کو ہوا دیتا اور پھر چوری چوری آصفہ کی طرف دیکھ کر مسکراتا ۔ فرخ

کے بیاہ کا ذکر ہوتا تو آصفہ چپکے سے ان کے پاس آ بیٹھتی ۔ ہائے اماں خالہ منور کی بیٹی رعنا کی سی لڑکی تو ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اس پر فرخ دانت پیستا اور غصے میں ہوا میں گھونسے چلاتا ۔ لیکن آصفہ گویا اپنی دھن میں بات کئے جاتی جیسے فرخ کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو ۔

ادہر فرخ بھی موقعے کے انتظار میں رہتا تھا ۔ موقعہ ملتا تو جھٹ رشتہ داروں میں شادی کرنے کے قبیح اثرات پر لکچر جھاڑنے لگتا ۔ اماں بات سمجھے بغیر ہی ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی کیا واقعی رشتہ داروں میں شادی کرنا بُرا ہے فرخ ۔ اس پر فرخ فاتحانہ انداز سے آصفہ کی طرف دیکھتا جو چپ چاپ بیٹھی بننے میں مصروف ہوتی اور فرخ تفصیل سے ماں کو بات سمجھانے لگتا ۔ اور جب فرخ کو یقین ہو جاتا کہ اس نے اس مسئلے پر پورے طور پر روشنی ڈال دی ہے اور ماں اس کی بات کو مکمل طور پر سمجھ چکی ہے ۔ تو آصفہ چپکے سے کہتی ۔ ای عزیزوں میں شادی نہ ہو تو کیا غیروں میں ہو ۔

"اللہ تیرا بھلا کرے ماں" جھٹ بول اٹھتی یہی تو میں سوچ رہی تھی ۔ آخر خدا رسول نے جائز کی ہے رشتہ داروں میں شادی"۔

فرخ کا بنایا ہوا قلعہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا ۔ اور وہ دانت بھینچ کر ہوا میں مکے مارنے لگتا ۔ لیکن آصفہ چپ چاپ بننے کے کام میں محو رہتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

لیکن اس روز جب گھر والوں نے پہلی مرتبہ سج ری دلہن ساجے کا بول سنا تھا ۔ اس روز حالات مختلف تھے ۔ ماں نے برسبیل تذکرہ آصفہ کے بیاہ کی بات چھیڑ دی ۔ اسے بھی تو ان دونوں سے الجھنے میں مزا آتا تھا ۔ آصفہ بیاہ کی بات سن کر غصے میں لال ہو گئی ۔ بولی "دماغ چل گیا ہے ؟ ہر وقت بیاہ کی بات کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں ۔ عین اس وقت فرخ گھر میں داخل ہوا اس نے ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا کہ بات کیا تھی ۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ جب وہ بازار سے گذر رہا تھا تو کوئی ریڈیو پر گانا گا رہا تھا جو عین موقعہ کی چیز تھی ۔ اس نے چپکے سے ریڈیو کا بٹن کھول دیا ۔

آخر کسی روز دلہن بننا ہی ہے تمہیں ۔ اماں بولی ۔

آصفہ نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر بال بنانے لگی عین اس وقت ریڈیو چیخنے لگا ۔

"سج لے دُلہن سج لے"

اور فرخ تالی بجانے لگا ۔ واہ واہ واہ واہ کیا گیت ہے ۔"

آصفہ یہ سُن کر تڑپ کر مڑی اور پھر کنگھی پھینک کر سنگار میز سے دور ہو گئی ۔ جیسے اسے سجنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو ۔

فرخ اپنی ہی دھن میں چلاتا رہا ۔ واہ واہ کیا گیت ہے سج ری دلہن سج لے ۔ واہ واہ ۔ صادقہ آج تو کمال ہو گیا ۔ واہ واہ واہ ۔

پھر چند دنوں بعد جب ماں باپ بیٹھے فرخ کے بیاہ کی بات کر رہے تھے اور فرخ اپنے کمرے میں شیو کرتے ہوئے ان کی باتیں سن کر چیں بجبیں ہو رہا تھا تو آصفہ دبے پاؤں فرخ کے کمرے میں گھس گئی اور ادھر ادھر یوں گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو ۔ پھر اس نے گنگنانا شروع کر دیا ۔

"سج لے بنرا سج لے"

فرخ نے آصفہ کی طرف دیکھ کر غصے سے مکا چلایا ۔ مگر آصفہ یوں معصومیت سے بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ بھائی جان میری پنسل تو نہیں دیکھی ۔ آپ نے اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہی گیت گنگناتے ہوئے پھر تلاش میں مصروف ہو گئی ۔

دوڑ جا یہاں سے فرخ غصے میں چلایا ۔ اور وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور وہ دونوں میز کے گرد دوڑنے لگے ۔ یہ سج لے کا مذاق بہت پرانا تھا ۔

لیکن اس روز تو حالات بہت ہی بگڑے ہوئے تھے ۔ گھر میں سبھی جانتے تھے کہ بند کمرے میں فرخ کے بیاہ کی بات ہو رہی ہے ۔ حالات کی سنجیدگی کو مدنظر رکھ کر آصفہ کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ باآواز بلند گنگنائے اس لئے وہ دیوار کے پاس بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی ۔ اور فرخ غصے سے بھوت بنا ہوا تھا ۔

ماں چاہتی تھی کہ فرخ کا بیاہ اس کی خالہ کے گھر ہو ۔ خدا کے فضل سے اس کی ایک نہیں چار خالائیں تھیں اور ہر خالہ کے ہاں چار چار بیٹیاں تھیں ۔ جیسے خالاؤں کے گھر ہمیشہ ہوتی ہیں ۔ جبھی تو ماں بیٹے سے کہا کرتی تھی ۔ بس تو کوئی

سی چن لے ۔ جونسی تیرا جی چاہے ۔ تجھے پوری آزادی ہے ہاں ۔ میں تجھے مجبور نہ کروں گی ۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ فرخ کو سرے سے بنتِ ام سے نفرت تھی ۔ عام سی بھدی صورتیں ۔ گھریلو انداز پھس پھسی طبیعتیں اور پھر اس کی اپنی خالہ زادیاں لاحول ولا قوۃ ۔ مانا کہ ان کا رنگ گورا تھا ۔ لیکن رنگ کا کیا ہے ۔ کسی کی طبیعت میں ذرہ بھر چمک نہ تھی ۔ کئی ایک تو نمازیں بھی پڑھتی تھیں ۔

وہ تو سمجھئے اس کی خوش قسمتی تھی کہ تمام خالائیں دور دراز مقامات پر رہتی تھیں ۔ پھر بھی ان میں سے کسی کے آنے کا امکان ہوتا تو وہ گھبرا جاتا ۔ نہ جانے کیا آفت آنے والی ہے ۔ ان دنوں خالہ منور آئی ہوئی تھی ۔ اگرچہ فی الحال وہ اکیلی ہی آئی تھی ۔ مگر سننے میں آیا تھا کہ باقی قافلہ بھی آنے والا ہے ۔ خالہ منور کے میاں ۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ۔ خالہ کے آنے پر فرخ گھبرا گیا تھا ۔ گھبرانے کی بات تو تھی ۔ کیونکہ اس کی آمد فرخ کے لیے خطرے کی جھنڈی سے کم نہ تھی ۔ جب سے وہ آئی تھی ماں کے کمرے میں ان تینوں کی پرائیویٹ ملاقاتیں ہو رہی تھیں ۔ اور گھر بھر میں سرگوشیوں کی آوازوں کا گویا سیلاب اُمڈا ہوا تھا ۔ ان آوازوں سے صاف ظاہر تھا کہ فرخ کی شادی کی بات زیرِ غور ہے ۔ یہ تو خیر پھر بھی قابل برداشت تھا ۔ اپنا ہی مغز کھاتے تھے ۔ لیکن خالہ زادیوں کا قافلہ ان کے گھر آ کر ٹھہرا تو کیا ہو گا ۔ فرخ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے کہیں باہر چلا جائے اور طوفان چل کر تھم جائے تو واپس آئے ۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا ۔ اگر بھائی صمد کے ہاں ملتان چلا جاؤں تو ۔ ۔ ۔ دفعتاً بند کمرے سے خالہ منور کی آواز سنائی دی ۔ وہ تو ٹھیک ہے بہن۔ مانتی ہوں ۔ مانتی ہوں ۔ میں تو خود یہ چاہتی ہوں ۔ میرے لیے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے ۔ "لیکن بہن میں مجبور ہوں ۔ میری مجبوری کا بھی خیال کرو ۔ میرا بس بھی چلے کچھ۔"

فرخ رُک گیا اور خالہ کی بات سننے لگا۔

آصفہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اُڑ گئی ۔ اس کی وہ بے آواز گنگناہٹ ختم ہو گئی ۔

خالہ منور جوش میں کہنے لگی ۔ بہن میں تو فرخ کو رعنا سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہوں میرا بس چلے تو فرخ پر اپنی جان تک نثار کر دوں ۔ ایک چھوڑ کلیجے کی دس بوٹیاں کاٹ دوں ۔ مگر رعنا کے ابا نہیں مانتے ۔ وہ کہتے ہیں ۔ آخر فرخ خالی بی ۔ اے ہی ہے نا اور بی ۔ اے آج کل ہوتا ہی کیا ہے ۔ انہوں نے تو بڑے بڑے رشتے رد کر دئے ہیں ۔ ہاں ۔

فرخ نے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کی ۔ دیواریں دھندلی پڑ گئیں ۔ وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا چلو مخلصی ہوئی ۔ جان بچی سو لاکھوں پائے ۔ اس نے خوشی محسوس کرنے کی کوشش کی ۔ "وہ مار لیا میدان"۔ وہ آصفہ کے سامنے چٹکی مار کر چلایا ۔ "وہ مار لیا" لیکن اس کے باوجود اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو ۔ جیسے اس کا مذاق اڑایا گیا ہو ۔

آصفہ کی مسکراہٹ کافور ہو گئی ۔ اس کے ہاتھ رک گئے اور انگلیاں بے جان ہو کر لٹکنے لگیں ۔

"اور پھر تم سے کیا پردہ ہے بہن خالہ منور کی آواز پھر سنائی دی ۔ اپنی رعنا کے عجیب سے خیالات ہیں ۔ نہ جانے آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوا ہے ۔ الٹی الٹی باتیں سوچنے لگے ہیں ۔ تمہیں کیا بتاؤں بہن مجھے تو شرم آتی ہے بات کرتے ہوئے۔ رعنا کہتی ہے مجھے رشتے داروں میں شادی کرنا پسند نہیں ۔ لو کبھی سنی تھی ایسی بات ۔

فرخ نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا اور خالی الذہن ہو کر چھت کو گھورنے لگا ۔

آصفہ اٹھ بیٹھی جیسے کھو گئی ہو ۔

"میری بات کا یقین نہ ہو" خالہ منور بولی ، "تو رعنا کے ابا سے بات کر دیکھو آج ہی آ رہے ہیں وہ ۔"

"آج آ رہے ہیں" آصفہ کی ماں کی آواز میں گھبراہٹ تھی ۔

ہاں ۔ "منور بولی ۔ سبھی آ رہے ہیں۔ رعنا حسن آرا اکبرا اور جمیل سبھی ۔ مگر وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے ۔

یہاں نہیں ٹھہریں گے ۔ ماں نے دہرایا ۔

"ایک دو دن کی بات ہوتی تو وہ یہیں آ پڑتے پورے دو مہینے یہاں رہنا ہے ۔ پچھواڑے میں مظفر علی کے گھر کی اوپر لی منزل کا انتظام کر لیا ہے ۔ مظفر علی کا بھائی کراچی گیا ہوا ہے ۔ جگہ خالی پڑی ہے ۔ تم جانتی ہو مظفر علی ان کے چچا زاد ہیں ۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں ۔ اب ذرا جگہ ٹھیک ٹھاک کرا دوں ۔"

خالہ منور کے جانے کے بعد غلام حسین کے گھر پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی ۔ آصفہ کی ماں چپ چاپ چولہے کے پاس جا بیٹھی ۔ غلام حسین اندر حقے سے غم غلط کرنے لگے ۔ آصفہ خاموش چارپائی پر جا پڑی اور فرخ کتاب پڑھنے کی کوشش میں مشغول ہو گیا ۔

شام کے وقت فرخ مال روڈ پر گھومتے ہوئے اس مخلصی پر خوشی محسوس کرنے کی شدید کوشش کر رہا تھا ۔ چلو ایک خالہ زاد سے تو جان چھٹی ۔ اللہ کارساز ہے بھائی ۔ وہ چھاتی ابھارے آگے بڑھے جا رہا تھا ۔ اخاہ اس ہوٹل میں کس قدر رونق ہے ۔ ارے یہ سنیما ہال ابھی سے فل ہو گیا ہائیں ۔ کیا نام ہے اس کھیل کا ۔ سارا ہوٹل ۔ عجیب سا نام ہے ۔ ایسی باتوں کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے دل میں ایک کانٹا سا لگ گیا ہے ۔ پھر وہ اپنا آپ سنبھالتا اور ادھر ادھر کی باتوں پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا ۔ ہائیں بھئی واہ کتنے خوبصورت ہیں یہ نئے ریڈیو سیٹ نہ جانے روسی ساخت کے ہیں یا فرانسیسی اور وہ شوونڈوز کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ۔ لیکن جلد ہی اس کا خیال رعنا کی طرف مبذول ہو جاتا جسے گذشتہ چار سال سے اس نے نہ دیکھا تھا ۔ بڑی مغرور لڑکی ہے ۔ رشتے داروں میں شادی نہیں کرنی چاہیے ۔ معلوم ہوتا ہے سمجھدار بھی ہے ۔ لیکن خیر ہے تو وہی نا بے جان آنکھیں ، پیشانی پر تیوری جلی کٹی شکل چھی ۔ ۔ ۔ ممکن ہے اب جوان ہو گئی ہو ۔ مگر جوانی تو ہر کسی پر آتی ہے ۔ جوانی کا کیا ہے ۔ ارے یہ نیا پوسٹر کیسا خوبصورت ہے ۔ کپ و چائے ۔ واہ واہ کیا عنوان ہے ۔ ٹی اینڈ تماشہ سے بھی بہتر ہے یہ تو ۔ واہ واہ ۔ انہیں سوجھتی ہیں خوب خوب ۔

اگلے روز جب فرخ کوٹھے پر گیا تو معاً اسے یاد آیا کہ وہ سب آ چکے تھے ۔ رعنا، حسن آرا اور کبرا ۔ اور ان کے ابا جان جو بی اے کو خالی بی ۔ اے سمجھتے ہیں ۔ وہ مسکرایا اور مظفر علی کے چوبارے کی طرف دیکھے بغیر سیٹی بجاتے ہوئے ٹہلنے لگا۔

جمی ای ای ای ل ۔ ۔ ۔ ۔ قریب ہی کسی نے آواز دی ۔

فرخ چونکا ۔ اس نے محسوس کیا گویا کوئی سانپ لہرا رہا تھا ۔ نہ جانے کون ہے ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر سوچا کوئی کالج کی معلوم ہوتی ہے ۔ ان کالج والیوں کو آواز لہرانے کی عادت ہوتی ہے ۔ یوں گولائی سی پیدا کر دیتی ہیں بات میں جیسے بات چاکلیٹ کی ڈلی ہو ۔

جمی ای ای ای ل ۔ ۔ ۔ " پھر آواز آئی ۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ آواز مظفر علی کے چوبارے سے آ رہی تھی ۔

وہ مڑا ۔ ۔ ۔ مظفر علی کے چوبارے کی کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی ۔ اور اسے ایک لہراتے ہوئے رنگین آنچل کے سوا کچھ نظر نہ آیا ۔ لاحول ولا قوۃ وہ مسکرایا ۔ وہی بات ۔ تانک جھانک کا کھیل ۔ فضول اب مطلب یہ ہے کہ ہمیں ڈھونڈو ۔ ہم یہاں چھپے ہیں ۔ نہ بابا نہ وہ ہنسا ۔ ہمیں اس کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں ۔ آپ شوق سے کھڑکیاں بند کرنے کا شغل فرمائیے خاکسار کو کوئی دلچسپی نہیں ۔ اور وہ بے پرواہی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر آیا ۔

اگلے روز مظفر علی کے چوبارے پر نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ دونوں کھڑکیوں پر چقیں پڑی ہیں ۔ ایک ننھی سی بچی چق اٹھائے کھڑی تھی ۔ اس کے عقب میں سیاہ بالوں کی لٹوں کے درمیان کوئی سفید سی چیز چمکی ۔ "کبرا" کسی کی آواز بجلی کی طرح لہرائی ۔ چق گر گئی ۔ کھڑکی بند ہو گئی ۔ فرخ کو ایک دھچکا لگا ۔ اس نے محسوس کیا کہ اس سے ناقابل برداشت سلوک کیا جا رہا ہے ۔ اسے بیگانہ سمجھا جا رہا ہے ۔ چاہے وہ رعنا سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ اس کا خالہ زاد بھائی نہیں ۔ وہ اس کا دشمن تو نہ تھا ۔

اس روز جب وہ ان کے گھر آئی تھیں ۔ اس روز بھی رعنا نے فرخ سے بڑی بے اعتنائی برتی تھی ۔ وہ اس کے روبرو نہ ہوئی تھی ۔ اور پھر خالہ منور

حسب عادت باتیں بنانے لگی تھی ۔ اے ہے لڑکی اللہ رکھے جوان ہو گئی ہے ۔ اس لیے فرخ کے سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے ۔ اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی تھا مگر رعنا جھٹ بولی ۔ شرمانے کی کیا بات ہے ۔ امی ۔ اس پر آصفہ کہنے لگی ۔ توپھر بھائی جان کے سامنے کیوں نہیں آتی ۔ تو "بس نہیں آتی ۔ وہ بولی۔ اور اگر سامنے جاؤں تو کیا ہے ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ اس نے یہ جملہ ایسے انداز سے کہا تھا جیسے فرخ کو کاٹ کر رکھ دیا ہو ۔

فرخ ڈٹ کر مظفر علی کے چوبارے کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ بہت بنتی ہے ۔ وہ دانت پیسنے لگا ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ ہونہہ فرق نہیں پڑتا تو کبرا کو چق گرانے کے لئے کیوں ڈانٹتی ہے ۔ ہونہہ فرق نہیں پڑتا ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ کیا فرق پڑتا ہے وہ بآواز بلند چلانے لگا تاکہ وہ سن لے ۔

ارے وہ گھبرا گیا ۔ کوئی بڑی بے پرواہی سے چق کو لپیٹ رہا تھا ۔ لمبی لمبی نوکدار انگلیاں دو گلابی باہیں ۔ سرخ پھولدار قمیض ۔ نوکیلی ٹھوڑی ۔ پتلے حساس ہونٹ اور شربتی آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں ۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آٹکا ۔ مگر وہ بے پرواہی سے ممتاز منزل کی طرف دیکھنے لگا ۔ سیٹی بجاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا ۔ خاصی خوبصورت ہے ۔ قد بھی موزوں ہیں اور انداز ۔ ۔ ۔ خیر خیر سبھی خوبصورت ہوتی ہیں یہ ۔ ایسیوں کے قد ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی اور چیز کے متعلق سوچے ۔ بھئی واہ ۔ اس عمارت کی بناوٹ کیسی اچھی ہے ۔ اور یہ زرد رنگ ۔ اونہہ ۔ ذرا شوخ ہے ۔ وہ بھی تو شوخ ہے چق اٹھاتے ذرا نہیں گھبرائی ۔ میرا طعنہ سن لیا ہو گا ۔ جل گئی ہو گی ۔ ایسیوں کے ساتھ ایسا سلوک ہی کرنا چاہیے ۔ ہوں تو ممتاز منزل کی پانچ منزلیں ہیں ۔ بڑی اونچی بلڈنگ ہے یہ ۔ وہ بھی تو اونچی لمبی ہے ۔

اس کے بعد جب بھی فرخ کوٹھے پر جاتا تو منڈیر کے پاس جا کر بے نیازی سے ادھر ادھر یوں دیکھتا جیسے اسے مظفر علی کے چوبارے کی کھڑکیوں سے قطعی دلچسپی نہ ہو ۔ اور کھڑکی کے عین وسط میں کرسی پر بیٹھی ہوئی رعنا اس وقت مطالعے میں اس حد تک مصروف ہو جاتی کہ اسے احساس ہی نہ ہوتا کہ فرخ وہاں کھڑا ہے ۔

ایک روز جب فرخ منڈیر کے پاس کھڑا بڑی احتیاط سے مظفر علی کے چوبارے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا تو چپکے سے آصفہ نہ جانے کہاں سے آ موجود ہوئی اور بھائی کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس کھڑی ہو گئی ۔ اس نے رعنا کو آواز دی ۔ رعنا ۔ فرخ نے حیرانی سے آصفہ کی طرف دیکھا ۔ مگر وہ یوں کھڑی تھی جیسے فرخ کے وجود کا احساس ہی نہ ہو ۔ عجیب بات تھی ۔ فرخ تو اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں کھڑے دیکھ کر آصفہ فتنہ کھڑا کر دے گی ۔

کھڑی سے رعنا کا سرخ و سپید چہرہ نکل آیا ۔ تم ہو آصفو ۔ فرخ رعنا کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جائے گی ۔ لیکن رعنا نے اسے در خورِ اعتنا ہی نہ سمجھا ۔ جیسے وہاں اکیلی آصفہ ہی کھڑی ہو ۔

"آؤ گی آج" ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

"جی چاہا تو وہ بولی ۔

"تو میں آ جاؤں ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

"جی چاہے تو ۔ وہ ہنسی اور پھر ہنستی ہوئی غائب ہو گئی ۔

اس پر آصفہ بھی مسکرائی اور مسکراتی ہوئی فرخ کی طرف دیکھے بغیر نیچے اتر گئی ۔ خواہ مخواہ فرخ کا منہ غصے سے لال ہوتا گیا ۔ ہوں تو اب ہم کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ۔ بھئی واہ ۔ بڑی بے نیاز ہیں ۔ وہ ہنسا ۔ ایک تو اللہ میاں بے نیاز ٹھہرے اور دوسرے جنابہ ۔ کسی کی خبر ہی نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔

مجھے کیا معلوم ، نیچے آصفہ چلائی ۔ یہیں کہیں ہوں گے بھائی فرخ ۔

"اے ہے" اماں بولی "ابھی تو کوٹھے پر گیا تھا ۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا ۔ آصفہ نے بے پرواہی سے کہا ۔

فرخ یہ سن کر غصے سے غرانے لگا ۔ "یہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے لگی ۔" پھر وہ دوڑ کر نیچے اتر آیا ۔

ماں اسے دیکھ کر مسکرائی ۔ لو یہ آصفی کہہ رہی تھی تمہاری کچھ خبر ہی نہیں ۔

"جی ، وہ طنزیہ انداز سے بولا ۔ جب سے اس کی چہیتی سہیلی آئی ہے اسے تو اپنی بھی خبر نہیں ۔ بنتی ہے یہ اس کی طرح"۔

" وہ کون ؟" آصفہ نے مسکرا کر پوچھا ۔

"وہی خالہ منور زادی ۔ رعنا صاحبہ ۔"

"دفعہ کر"ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔ نام نہ لے میرے سامنے ۔ ہائے میں کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا نکلی ۔ وہ تو چھوٹے موٹے کو خاطر میں ہی نہیں لاتی ۔

"یہ تو ٹھیک ہے" آصفہ مسکرا کر بولی ۔ واقعی وہ چھوٹے موٹے کو خاطر میں نہیں لاتی ۔ اس نے بامعنی انداز سے فرخ کی طرف دیکھا ۔ ہے نا بھائی جان ۔ صفو ۔ وہ چلایا ۔

مگر آپ کے لیے کیا فرق پڑتا ہے ۔ آصفہ کے الفاظ میں دھار تھی ۔

لو سنا تھا کبھی ۔ کہتی ہے میں رشتہ داروں میں شادی کرنا پسند نہیں کرتی ۔ جیسے رشتہ دار منتیں کر رہے ہوں ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

لو اماں یہ تو اپنی اپنی مرضی ہے ۔ بھائی فرخ بھی تو یہی کہتے ہیں ۔ صفو بولی ۔

صفو ۔ ۔ ۔ فرخ نے اس کی طرف گھونسا چلایا ۔

جھوٹ کہہ رہی ہوں کیا ۔

بس آج سے خبردار جو رعنا کو یہاں بلایا ۔ فرخ غرانے لگا۔

آصفہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی ۔ جناب کو کیا تکلیف ہے ۔

میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئے ۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے سامنے آئے ۔

ڈیوڑھی میں سے ہنسی کی آواز آئی ۔ صفو ۔ رعنا کی آواز سنائی دی فرخ صاحب سے کہو کہ وہ پردہ کر لیں ۔ میں آ رہی ہوں ۔

فرخ کا دل ڈوب گیا ۔ وہ کرسی کو ٹھوکر سے گرا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا ۔

رعنا ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئی اور صفو اور صادقہ اسے لے کر اندر جا بیٹھیں ۔

ابھی وہ بیٹھی ہی تھیں ۔ کہ خالہ منور اندر داخل ہوئی ۔ اے ہے بیٹی تو یہاں ہے ۔ وہ باآواز بلند کہنے لگی ۔ برا نہ ماننا صفو لیکن رعنا کے ابا پسند نہیں کرتے کہ لڑکی کہیں جائے ۔

تو کیا ہمارے ہاں آنے پر بھی اعتراض ہے ۔ آصفہ کی ماں غصے میں چلائی ۔

اے ہے ۔ خالہ منور بولی چاہے اپنا ہی بیٹا ہے پر اللہ رکھے جوان ہے ۔ یہ کہہ کر منور نے مسکرا کر بامعنی انداز سے بہن کی طرف دیکھا ۔

لو فرخ بھائی تو آپ رعنا سے پردہ کرتے ہیں ۔ آصفہ نے باآواز بلند کہا ۔

ہاں ان کا کیا ہے ۔ رعنا نے مسکرا کر کہا ۔ جیسے آصفہ ویسے ہی فرخ صاحب ۔

یہ سن کر فرخ کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں ۔ اور وہ دیوانہ وار گھر سے باہر نکل گیا ۔

اگلے روز فرخ بار بار سیڑھیاں چڑھتا اور کوٹھے پر آصفہ اور ماں کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر واپس آ جاتا ۔ نہ جانے اس روز ماں آصفہ کو کیا سمجھا رہی تھی ۔ ضرور کوئی پرائیویٹ بات تھی ۔ تبھی تو سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں ۔ اور صفو مسکرائے جاتی تھی ۔

ماں نیچے اتری تو وہ بھاگا بھاگا اوپر پہنچا ۔ صفو بڑے مزے میں بیٹھی گنگنا رہی تھی ۔ آج کئی ایک دن کے بعد اس نے صفو کو گنگناتے سنا تھا ۔ بلکہ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ آصفہ نہ جانے کیوں اداس رہتی ہے ۔ لیکن آصفہ نے یک دم گویا رنگ بدل لیا تھا کتنی مسرور تھی وہ ۔ اس کے باوجود وہ جان بوجھ کر فرخ کے وجود سے منکر تھی ۔ اور یوں ماننڈے ڈیرے آ جا گا رہی تھی جیسے واقعی کوئی ڈیرے پر آگیا ہو ۔

"صفو"۔ فرخ اس کے قریب بیٹھ کر بولا ۔

"اوہ ۔ آپ ہیں ؟" آصفہ نے بناوٹی تعجب سے کہا ۔

"صفو وہ چلایا صفو تم بھی ۔ اس کی نگاہ میں التجا تھی۔ تم تو ایسے نہ کرو ۔ صفو تمہارے لیے تو فرق پڑتا ہے ۔

میرے لیے تو بہت فرق پڑتا ہے بھائی جان ۔

سچ ۔ فرخ کی آنکھیں گویا بڑی بڑی جھیلوں میں تیر رہی تھیں۔

اس لحاظ سے وہ بڑی بری ہے ۔

صفو ۔ اس نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔

نہیں صفو ۔ نہیں یہ نہ کہو۔

آصفہ نے فرخ کی طرف دیکھا ۔ ۔ ۔ لیکن فرخ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر نیچے لے گیا ۔ ماں نے کنکھیوں سے انہیں آتے دیکھا اور یوں بے خبر بیٹھی رہی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔ لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دبی دبی مسرت سے بھرپور تھی ۔ جب فرخ اور آصفہ دونوں نے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا تو ماں چپکے سے غلام حسین کے کمرے میں داخل ہو گئی ۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر میاں سے کہا ۔ "چپ ، کچھ آصفہ سے کہہ رہا ہے ۔ ابھی ابھی کوٹھے سے آیا ہے ۔ میں نے آصفہ کو سب بات بتا دی تھی ۔" "اور اگر آصفہ نے بھانڈا پھوڑ دیا تو" وہ بولے ۔ لو توبہ کرو اس نے کلیجہ تھام لیا ۔ کبھی ایسا ہو سکتا ہے ۔ صفو تو بلکہ آپ چاہتی ہے ۔ اس کے لیے اس سے بڑی خوشخبری کیا ہو گی ۔ ذرا سنیں تو کیا باتیں کر رہے ہیں ۔

کچھ دیر تک وہ دیوار سے کان لگائے سنتے رہے ۔

"دیکھا ۔ میاں تنک کر بولے ابھی سے منتیں کرانے لگا ہے ۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ۔"

"ہائے مجھے کیا معلوم تھا ایسا ہوتا ہے ۔"

"تجھے معلوم نہیں تو کسی اور کی بات مان لیا کر ۔"

"میں ادھر جا کر سنتی ہوں ان کی باتیں ۔"

"اونہہ ۔ وہ بولے ادھر نہ جانا ۔ آصفہ سے پوچھ لینا ۔ بعد میں ۔

اے ہے اللہ کرے جلد خوشخبری سنوں ۔"

فرخ اور آصفہ کمرے سے باہر نکلے تو آصفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔ اور وہ گنگنا رہی تھی ۔

"سج رے بنرا سج نے"

جب غلام حسین باہر گئے تو آصفہ ماں سے کہنے لگی ۔ امی ۔ کئی بار کہا ہے ہمیں گملے منگوا دو ۔ دیکھو تو پھولوں کے بغیر گھر کس قدر سُونا ہے ۔

"کہوں گی تیرے ابا سے" ماں بولی ۔

"اور یہ دیکھو سفیدی بالکل اتر گئی ہے امی ۔ کتنا گندا ہے ہمارا گھر ۔"

"یہ گھر ہے کیا ؟" فرخ آکر چلانے لگا ۔ "یہ تو کباڑ خانہ ہے کباڑخانہ ۔"

"بیٹا اب تو بہو آئے گی تو گھر کی شکل نکلے گی ۔ میں تو اب بوڑھی ہو گئی ۔

"ہونہہ بوڑھی" فرخ نے پیار سے ماں کو شانوں سے پکڑ لیا ۔

"لیکن بہو کیسے آئے ۔ تم تو میری بات سنتے ہی نہیں ۔ تمہیں تو بیاہ کرنے سے نفرت ہے ۔ ماں نے فرخ سے کہا ۔

خواہ مخواہ آصفہ ہنسی ۔ فرخ بھائی تو کب سے چاہتے ہیں۔

"صفو" فرخ نے اسے گھورا ۔

"لو دیکھ لو ۔" ماں بولی ۔ بیاہ کی بات کرو تو گھورنے لگتا ہے ۔

"واہ" آصفہ ہنسنے لگی ۔ اب کیا وہ دکھانے کو بھی نہ گھوریں ۔

"آصفہ" فرخ پھر چلایا ۔

"اماں تو یہ سمجھتی ہے فرخ بھائی جو منہ سے کہتے ہیں وہی دل سے چاہتے ہیں ۔"

"توبہ ہے ۔ اماں بولی ۔ جب سے اس کی خالہ آئی ہے ، صفو کی زبان ڈیڑھ گز لمبی ہو گئی ہے ۔

"ہاں ، وہ ہنسی لیکن بھائی فرخ کو کیوں چپ لگ گئی ہے ۔ کہہ دو بھائی جان ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی ۔ کہہ دو "

صفو ۔ وہ اس کی طرف جھپٹا ۔

"بھائی تو خواہ مخواہ بگڑتے ہیں مجھ سے ۔ اچھا اماں تو مَیں رعنا کی طرف سے ہو آؤں ۔ آصفہ نے پوچھا ۔

نام نہ لے اس کلمونہی کا ۔ ماں بولی ۔ شکر ہے ابھی بات پکی نہ ہوئی تھی ۔ ورنہ اس گھر میں آ جاتی وہ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اماں ۔" فرخ بے تابانہ چلایا ۔
"سچ کہتا تھا فرخ ۔" ماں نے اپنی ہی دھن میں کہا ۔
لیکن اماں فرخ بولا اور پھر چپ ہو گیا ۔
کچھ کہے گا بھی یا ۔ ۔ ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔
آصفہ ہنسنے لگی پھر گنگنا کر بولی ۔ کا سے کہوں جی کی بتیاں ۔
میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری باتیں ۔
سمجھنے کی ضرورت کیا ہے ۔ آصفہ نے کہا ۔ بس ایک بھابی لا دو ہمیں ۔
سچ ، وہ چلائی کیوں فرخ ۔"
اب وہ کیا اپنے منہ سے ہاں کہہ دیں ۔ آصفہ ہنسی ۔
اے ہے اب مجھ سے شرمانے لگا ہے کیا ۔
کبھی کبھی آ ہی جاتی ہے شرم صفو نے منہ پکا کر کے کہا ۔
رعنا سے ہی کر دو اماں ان کا بیاہ قصہ ختم ہو ۔
فرخ کی آنکھیں گویا سرخی میں ڈوب گئیں ۔
نام نہ لے اس کا ۔ ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔
اماں ۔ فرخ کی آواز میں منت تھی ۔
کچھ کہو گے بھی ۔ وہ بناوٹی غصے سے بولی ۔
دراصل اماں ۔ تم مجھ سے ناراض ہو ۔ اس لیے کہ میں نے تمہارا کہا نہیں مانا ۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم ناراض ہو جاؤ ۔
لہذا آصفہ بولی ۔ بھائی جان اپنی پیاری ماں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں ۔
لو میں کیا ناراض ہوں تم سے ماں نے کہا ۔
جھوٹ آصفہ چلائی جب تک بھائی رعنا سے شادی نہ کریں گے اماں کبھی ان سے خوش نہ ہو گی ۔
لیکن میں تو نہیں چاہتی کہ فرخ کا بیاہ رعنا سے ہو ۔
"میں جو چاہتا ہوں" ۔ فرخ کے منہ سے نکل گیا ۔
"ہائیں ۔ ۔ ۔" وہ گویا حیران رہ گئی ۔ لیکن کیوں ۔

ہماری مرضی کہہ کر فرخ لپک کر اپنے کمرے میں جا داخل ہوا ۔

اس شام کو بند کمرے میں پھر خالہ منور آصفہ کی ماں اور باپ کی سرگوشیاں ہو رہی تھیں ۔

"میں نے تم سے کہا نہ تھا یہی ایک طریقہ ہے" ۔ غلام حسین نے حقے کا ایک لمبا کش لیا ۔

"لو مجھے کیا معلوم تھا ۔" خالہ منور نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔

"یہ آج کل کے نوجوان اپنی مرضی کے متوالے ہیں" ۔ غلام حسین ہنسے ۔

"لو یہ بات سنی تھی کبھی" ۔ آصفہ کی ماں بولی ۔

"شکر ہے بیل منڈھے چڑھی بہن ۔" خالہ منور نے کہا ۔

"آہستہ بولو ۔ وہ سن رہے ہیں ۔ غلام حسین نے اشارہ کیا ۔ پھر باآواز بلند کہنے لگے ۔ بھئی میں اس معاملے میں دخل نہیں دیتا ۔ تم جانو اور تمہاری بہن ۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا" ۔ منور اونچی آواز سے بولی ۔ لیکن ۔"

"لیکن ویکن کوئی نہیں" آصفہ کی ماں نے شور مچایا ۔ میرے بیٹے کا بیاہ ہو گا تو رعنا سے ورنہ ہو گا ہی نہیں ۔ سن رکھو میں بھی بات کی پکی ہوں ۔"

ملحقہ کمرے میں فرخ نے ماں کی بات سنی تو اس کا منہ مسرت سے دمک اٹھا ۔ ورنہ ہوگا ہی نہیں اس نے دہرایا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا ۔

عین اس وقت آصفہ داخل ہوئی وہ گویا انجانے میں گنگنا رہی تھی ۔

"سج لے بنرا سج لے"

فرخ نے مڑ کر دیکھا مگر آصفہ کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھی ۔

"بھائی جان وہ بولی میری پنسل تھی یہاں ۔"

"ٹھہر تو شیطان ۔" وہ اس کی طرف لپکا ۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ اور وہ دونوں میز کے گرد بھاگنے لگے ۔

ہائے ان نوجوانوں کی مرضی ، بند کمرے میں خالہ منور ہونٹوں پر انگلی رکھے کہہ رہی تھی ۔

جوار بھاٹا

جوار بھاٹا ختم ہو چکا تھا اور اپنے عقب میں ایک سیّال کیفیت چھوڑ گیا تھا ۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی لہریں رواں تھیں ۔ چاروں طرف سے یہ لہریں اس نامعلوم مرکز کی طرف بڑھتیں ۔ اور اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں ، دور بہت دور ڈولتا ہوا مرکز جسم کی گہرائیوں میں پیراک پیپے کی طرح ڈول رہا تھا تیر رہا تھا ۔ اور لہروں کے تھپیڑوں سے یوں دھپ دھپ بج رہا تھا جیسے جنگل کے گھنے پراسرار سایوں تلے جنگلی اقوام دف پر ضرب لگا رہی ہوں ، ناچ رہی ہوں ۔

دھپ ۔ دھپ ۔ دھپ ۔

گول مٹول سی مبہم اشکال ناچتیں ۔

ابھار رقص کرتے ۔

اور پھر وہی کیفیت ، وہی طوفان ، وہی جوار بھاٹا گویا کوئی بارود کو آگ دکھا دیتا انگاروں کا فوارہ چھوٹتا ۔ اور چاروں طرف پھول جھڑیاں پھیل جاتیں ۔ پھر مہیب دف کی آواز ابھر آتی ۔ گونجتی جس کے عقب میں وہی سیّال کیفیت وہی لہریں ، وہی ڈولتا ہوا پیراک پیپے کا مرکز ۔

ہاں وہ جوار بھاٹا ختم ہو چکا تھا ۔

مرجانہ کی نگاہوں میں گردو پیش کا دھندلکا نکھرتا جا رہا تھا ۔

بنچ کے نیچے لمبی لمبی گھاس کھڑی تھی ۔ گھاس کے ڈنٹلوں میں کس قدر تناؤ تھا ۔ جیسے ہریاول نےاپنے دشمن کو تباہ کرنے کے لیے تیر تان رکھے ہوں ۔ اس نے ایک نظر اپنے بادامی سوٹ کی طرف دیکھا ۔ ان جانے میں اس کے ہونٹوں سے ایک دبی ہوئی آہ نکلی ۔ پھر نہ جانے کیوں وہ تڑپ کر بنچ سے اٹھ بیٹھی اور گھاس پر دھم سے گر پڑی ۔ ڈنٹل صابون کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے ۔ گویا ریشم کے تاگوں کے بنے تھے ۔ مرجانہ پر ایک بے نام سی مایوسی چھا

گئی ۔

مرجانہ کا جی چاہتا تھا کہ سامنے کی خاردار جھاڑی پر جاکر لیٹ جائے ۔ اس نے جھاڑی پر نگاہ ڈالی ۔ کانٹے ریشم کے ریشوں کی طرح لٹکے ہوئے محسوس ہونے لگے ۔

کیوں ؟ اس کے دل میں مبہم سا سوال ابھرا ۔ اس کی زندگی میں ایسے طوفان کیوں آتے تھے ۔ وہ جوار بھاٹے کیا تھے ! ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک تانگے والا !!

قحبہ ۔ قحبہ ۔ درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلایا ۔

وہ تڑپ کر مڑی ۔

ہاں آں آں آں ۔ سڑک پر آتا ہوا چھکڑا اسے چھیڑنے لگا ۔

کہیں دور ڈھولک چلا چلا کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی ۔

"لاریاں توں پُچھ چن وے ۔"

گیت کے بول اس کے دل میں چٹکیاں لے رہے تھے ۔

فاحشہ ۔ ۔ ۔ ۔ فاحشہ

مہیب دف پھر سے گونجنے لگی ۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگی ہے ۔ اس ریشمی بادامی سوٹ کے باوجود ننگی ہے ۔ اس چلتی ہوئی سڑک کے کنارے ننگی ۔ دفعتاً گویا ایک پردہ سا اٹھ گیا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔ جیسے اپنی عریانی پر نازاں ہو ۔ جیسے صدیوں کی تاریکی نکل کر دفعتاً روشنی میں آگئی ہو ۔ جیسے وہ خود ہی روشنی کی ایک کرن میں تبدیل ہو گئی ہو ۔ اس نے شدید خواہش محسوس کی کہ اٹھ کر کولہے مٹکاتی ہوئی ، ابھاروں کو تان کر سڑک پر جا کھڑی ہو ۔ اور پھر آنکھیں مٹکا کر اُس جاٹ کی طرف دیکھے جو ستانے کے لیے درخت تلے بیٹھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ بائیں ہاتھ پر موٹر ڈرائیور سے شانہ لڑائے اور دیکھے کہ اس کی کھڑی مونچھ کہیں ریشم کے تار کی تو نہیں بنی ہوئی ۔

اُس کی نگاہ گھوڑے پر جا پڑی ۔

فضا میں ایک سرخ فوارہ چھوٹا ۔ سرخ خونیں فوارہ ۔

دھپ ، دھپ ، دھپ ۔
دف کی گونج ابھری ۔
گھبرا کر اس نے اپنی نگاہ دوسری طرف پھیر لی ۔
جاٹ کا ننگا پاؤں کس قدر بھدا تھا ۔ اور اس کا انگوٹھا بڑھنے لگا ۔ بڑھتا گیا ۔
پریشان ہو کر اس نے نگاہ پھیر لی ۔
گھاس کے تیر تنے ہوئے تھے جھاڑی کے کانٹے لپک رہے تھے ۔
اس نے محسوس کیا گویا اس کا جسم ان کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ بڑھے جا رہا تھا۔
دھپ دھپ
ڈھکی چھپی دھکنی ہوا دینے لگی ۔ مخروطی غبارے پھٹے جا رہے تھے جیسے اڑا کر جھاڑی پر جا پھینکیں گے اور وہ ان نوکیلے خاروں سے چھد کر لہولہان ہو جائے گی ۔
یہ احساسات اس کے لیے بالکل نئے تھے اور وہ اپنی جرأت اور بے شرمی پر حیران تھے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ احساس نیا محسوس ہونے کے باوجود پرانا ہے بے حد پرانا ۔ اور وہ ہمیشہ دل ہی دل میں اس کیفیت سے مانوس تھی ۔ اگرچہ اس نے ذہنی طور پر کبھی تسلیم نہ کیا تھا ۔ آج تو اسے اس ڈھکے چھپے جذبے کو اپنانے میں لذت محسوس ہو رہی تھی ۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی مدتوں کا بھولا بھٹکا ہوا راہی گھر پہنچ گیا ہو ۔
دفعتاً اسے منصب کا خیال آگیا ۔ منصب جس سے آج اس کا نکاح ہونے والا تھا اور جس مقصد کے لیے وہ تانگے پر بیٹھ کر جا رہی تھی ۔ جبکہ گھوڑا بدک گیا اور تانگے والے نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا تھا کہ وہ گر نہ جائے ۔
اور وہ سمجھتی تھی اسے منصب سے محبت ہے ۔
اس کا سر شرم سے جھک گیا ۔ اور وہ گہری سوچ میں پڑ گئی ۔

دو مرتبہ اس کی زندگی میں اس قسم کے جوار بھاٹے آ چکے تھے ۔ دو مرتبہ ایک اس روز جب وہ پہلی مرتبہ منصب سے ملی تھی ۔ اس کا خیال تھا کہ وہ محبت کا جوش تھا۔ پہلی نظر پر ہی اسے منصب سے محبت ہو گئی تھی ۔ اگرچہ اس ملاقات میں "نظر" کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ کیونکہ اس وقت کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ۔ لیکن اس وقت تو اس کا بند بند گویا آنکھ بنا ہوا تھا ۔ ایسی آنکھ جسے اندھیرے میں دیکھنے کی قوت حاصل ہوتی ہے ۔ پھر منصب کی شخصیت کی چمک جس نے اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا ۔ وہ تو روحانی جوار بھاٹا تھا ۔ اسی لیے وہ اس کی نوعیت سے واقف نہ ہو سکی تھی ۔

ان دنوں جے ۔ اے ۔ وی پاس کرنے کے بعد وہ نئی نئی شگوفہ پور کے سکول میں معلمہ کی حیثیت سے آئی تھی ۔ شگوفہ پور کا سکول دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی ۔ چار دیواری کے اندر وسیع میدان میں جب وہ پہلی مرتبہ داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں پر گلابی پنکھڑیاں جھول رہی تھیں ۔ کیاریوں میں ۔ روشوں پر گراؤنڈ میں ، گملوں میں حتیٰ کہ دیواروں اور چھتوں پر بھی ۔ اس طوفان رنگ و بو نے اسے حیران کر دیا ۔ پہلے تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی ۔ پھر رنگ و بو کے اس طوفان سے وارفتہ ہو کر دیوانہ وار اس وسیع میدان میں ٹہلنے لگی ۔

اور مدرسوں میں بھی اس نے پھولوں کے تختے دیکھے تھے ۔ لیکن شگوفہ پور تو تمام کا تمام پھولوں بھرا ایک وسیع خطہ دکھائی دیتا تھا ۔ گلیوں میں ، بازاروں میں ، ڈھلانوں پر ، کھنڈروں میں ، ہر جگہ گلابڑی کی جھاڑیاں رینگتی ہوئی چلی گئی تھیں ۔ وہ تو واقعی شگوفہ پور تھا ۔ بنفسِ نفیس ۔ وہاں پر ہر چیز پھوٹ کر شگوفہ بن جاتی تھی اور ہر شگوفہ بھینی بھینی مہک اور گلابی گلابی رنگ سے لد جاتا تھا۔ اور پھر یوں دکھائی دیتا جیسے ان بلندیوں اور نچانوں پر رنگ و بو کا میلہ لگا ہو ۔

شگوفہ پور میں پھول اگانے کی بجائے انہیں ۔ ۔ ۔ جگہ جگہ اگنے سے روکنے کے لیے محنت کرنی پڑتی تھی ۔ لوگ انہیں روشوں ، چھتوں اور آنگنوں سے صاف کرتے ۔ لیکن جلد ہی وہاں نئی جھاڑیاں اگ آتیں ۔

سڑکوں کی ہی بات نہیں ۔ جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں بھی شگوفے پھوٹ آتے تھے ۔ گڑیوں سے کھیلتی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتیں ۔ بدن انگڑائی سی لیتا ۔ اعضاء پھوٹ کر نکل آتے گالوں پر شگوفے پھوٹ آتے اور گھر والوں کو بیٹھے بٹھائے ایک جوان لڑکی کے بیاہ کی فکر پڑ جاتی ۔

جب مرجانہ شگوفہ پور پہنچی تو بلوغت کے باوجود اس کا جسم لڑکوں سا تھا ۔ پتلا دبلا بدن جس پر شباب نے کوئی نقش کاری نہ کی تھی ۔ دو ماہ کے قیام کے بعد دفعتاً نہ جانے کیا ہوا شگوفہ پور نے گویا اس پر اپنا افسوں پھونک دیا ۔ جسم کے خم و پیچ نمایاں ہونے لگے ۔ پتلے دبلے اعضاء میں رنگ اور اس کی لہر دوڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی سے مٹیار بن گئی ۔

اس کے ساکن جسم میں ان جانے فوارے پھوٹنے لگے ۔ زمین دوز چشمے ابلنے لگے ۔ عجیب سی لہریں رینگنے لگیں ۔ ڈھیلی تاریں گویا تن گئیں ۔ اس تناؤ میں ایک کرب تھا ۔ ۔ ۔ ایک مظلوم اور مبہم لذت ۔ پھر کوئی ان جانا ہاتھ ان تاروں کو چھیڑنے لگا ۔ نغمے لہرانے لگے جیسے چاندنی رات میں پہاڑی کے دامن پر کلابڑی کی جھاڑی کے وسیع پھیلاؤ میں سانپ رقص کر رہے ہوں ۔ خواہ مخواہ دل میں انوکھی خواہشات ابھر آئیں ۔ ایسی خواہشات جنہیں وہ پسند نہ کرتی تھی ۔ ایسی خواہشات جو اس کے ضمیر میں کانٹا بن کر چبھی رہتیں ۔ مرجانہ کی کیفیت ایک ایسے حاکم کی سی ہو گئی ۔ جس کے اہلکاروں اور عوام نے اس کے خلاف بغاوت کر رکھی ہو ۔

پھر وہ واقعہ رونما ہوا ۔

اس واقعہ کی تمام تر ذمہ داری مس سمائلز کی مسلسل مسکراہٹوں پر عاید ہوتی ہے۔ مس سمائلز مرجانہ کی ہم کار تھی ۔ ملیح رنگ اور بھدّے خدوخال کے باوجود اس کی شخصیت بیحد جاذب تھی۔ اس کی رگ و پے میں تازگی اور بشاشت رواں دواں رہتی تھی ۔ ہونٹ مسلسل مسکراہٹ میں کھلے رہتے تھے ۔

مرجانہ اور مس سمائلز کا آپس میں گہرا دوستانہ تھا۔ یہ دوستانہ اس قسم کا نہ تھا جو عام طور پر زنانہ مدرسوں میں پایا جاتا ہے ۔ ان دونوں کو اس قسم کے تعلق

سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی ۔ دن بھر وہ دونوں سکول میں پڑھاتیں ۔ شام کو سکول کے میدان میں کھیلتیں اور جب سورج اپنی سرخ شعاعوں سے مغربی وادی میں آگ سی لگا دیتا تو وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتیں ، مسکراتیں اور زیرِ لب کوئی گیت گنگناتیں ۔

پھر جب چاند ادھر کی پہاڑی سے سر نکال کر ڈولتا ار نچان پر بچھے ہوئے پھول چاندنی میں جھلملاتے تو دفعتاً مس سمائلز اس کا ہاتھ جھٹک دیتی ۔ لو بھئی ہم تو چلے ۔ اس وقت اس کے انداز میں بیگانگی پیدا ہو جاتی اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا بیٹھتی ۔ اس کا کمرہ بورڈنگ کے مین بلاک سے ہٹ کر تھا ۔ چاردیواری کے قریب چیڑ کے درختوں کے جھنڈ تلے ۔

گئی رات تک بورڈنگ کے مین بلاک میں ہنگامہ مچا رہتا ۔ لڑکیاں روز کوئی نہ کوئی سوانگ بھرتیں یا دیر تک استانیوں اور لڑکیوں کی محفل لگی رہتی یا گانے کی مجلس منعقد ہو جاتی ۔ سمائلز نے اس شور شرابے میں کبھی حصہ نہ لیا تھا ۔ دو ایک مرتبہ لڑکیاں اکٹھی ہو کر اس کے پاس گئیں بھی ۔ اسے محفل میں شرکت کرنے کی دعوت دینے کے لیے لیکن اس کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر اور آواز میں درشتی محسوس کر کے وہ سب چپ چاپ لوٹ آئیں ۔ وہ سب حیران تھیں کہ یہ مس سمائلز ہیں جس کی موجودگی سے دن بھر مدرسے میں زندگی اور بشاشت کی لہر رواں دواں رہتی ہے ۔ جس کی باتوں پر قہقہے لگتے ہیں ۔ جس کے معمولی اشارات بھی رنگینی سے بھرے ہوئے ہیں ۔ وہ حیران تھیں آخر کیا بات ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی مس سمائلز مس فراونز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ Miss Frowns میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ اس انکشاف کے بعد لڑکیوں نے صبح کے وقت اسے سمائلز اور رات کو مس فراونز کہنا شروع کر دیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود رات کی تیوریوں کا راز سربستہ ہی رہا ۔

اگر اس رات مرجانہ کی طبیعت خراب نہ ہوتی تو وہ بھی اس راز سے آشنا نہ ہوتی ۔ نہ جانے اس رات اسے کیا ہو گیا تھا ۔ طبیعت میں بے وجہ اداسی امڈی چلی آتی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ تنہائی میں جا بیٹھے ۔ اور منہ پر لحاف ڈال کر رو پڑے ۔ لیکن بورڈنگ کی گہما گہمی میں تنہائی اور سکون ممکن نہ تھا ۔ دفعتاً اسے

خیال آیا ۔ مس سمائلز کا کمرہ ۔ اس روز مس سمائلز ایک دن کے لیے شہر گئی ہوئی تھی ۔ اور اس کا کمرہ خالی پڑا تھا جس کی دوسری چابی مرجانہ کے پاس تھی ۔

لڑکیوں کی نظریں بچا کر وہ چپ چاپ بغلی دروازے سے نکل کر چاردیواری کے سائے تلے چھپتی ہوئی سمائلز کے کمرے تک جا پہنچی ۔ کچھ دیر تک وہ برآمدے میں کھڑی ہو کر باغیچے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی ۔ پھر تالہ کھول کر اس ڈر کے مارے اندر چلی گئی کہ کوئی لڑکی اسے دیکھ نہ لے ۔ بستر بچھا دیکھ کر وہ سوچے بغیر اس میں گھس گئی ۔

دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے گویا کافور ہو چکی تھی ۔ لحاف اوڑھ کر رونے کے باوجود اسے سکون حاصل نہ ہوا ۔ بلکہ ان دو ایک آنسوؤں نے اور مضطرب کر دیا ۔ اور وہ گھبرا کر پھر اٹھ بیٹھی اور دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی ۔

اس کے روبرو بے حد خوبصورت منظر پھیلا ہوا تھا ۔ اوپر چاند چھوٹی چھوٹی بدلیوں میں جھول رہا تھا ۔ نیچے ایک سبز کٹورہ ڈول رہا تھا ۔ دور کوئی گا رہا تھا ۔ "گھونگھٹ میں گوری جلے ۔" اور وہ بغیر گھونگھٹ کے جل رہی تھی ۔ جانے کیسی جلن تھی جو رینگتی ہوئی لہروں کی طرح اس کے جسم میں ابھر سمٹ رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کلابڑی سے کوئی ناگ پھن پھلائے نکل آئے اور اس کے بدن کے گرد لپٹ کر ، بل ڈال کر اس شدت سے دبائے کہ اس کی ہڈیاں چلچلانے لگیں ہائیں ۔ اس نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی ۔ لیکن گرفت اور بھی شدید ہو گئی ۔ مضبوط باہوں کے دباؤ تلے اس کی ہڈیاں چلچلانے لگیں ۔

پیشتر اس کے کہ وہ چیخ مارے وہ چلچلاہٹ جوار بھاٹے میں تبدیل ہو چکی تھی ۔ کشتی کے بادبان تن گئے اور وہ ڈولنے لگی ۔ رقص کرنے لگی ۔ جیسے وہ اسی رقص کے لیے طوفان کی آمد کی متمنی تھی ۔ منتظر تھی ۔ طوفان کے تھپیڑے اسے تھپکنے لگے ۔

دھپ ، دھپ ، دھپ ۔

دور ڈھولک کی آواز اس کے دل میں گونج رہی تھی ۔ اور یہ گونج ہر ساعت بلند ہوئی جا رہی تھی ۔

"طوفان میں کشتی چلے ۔"
گیت کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی ۔

دہپا دہپ ۔ دہپا دہپ ۔
کنڈھ کھوہ کے نانگے رقص کر رہے تھے ۔

پھر اسے معلوم نہیں ۔ ایک ارغوانی دھندلکے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ۔ ایک ان جانی پرکیف اذیت نے اسے پچھاڑ دیا ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر کائنات کا ربط ٹوٹ رہا تھا ۔ شیرازہ بکھر رہا تھا ۔ اس طوفانِ نوح کی تندی سے دنیا فنا ہو چکی تھی ۔ اندھیرے اجالے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے ۔ شور اور نغمے خلط ملط ہو گئے تھے ۔

پھر اس کے پہلو سے ایک حسین خالق ابھر آیا اور اس تباہ شدہ کائنات کو ازسرِ نو ترتیب دینے لگا ۔ اس کی حرکات میں زندگی تھی۔ آواز میں تعمیری لے تھی ۔ لمس میں جادو تھا ۔ نگاہوں میں تجدید کی امنگ تھی ۔ کمرے کی فضا اس قادر مطلق کے وجود سے بھری ہوئی تھی ۔ اس کی رگ و پے میں اس کا لمس لہریں لے رہا تھا ۔ ہوا میں خوشبو کا روپ دھارے جھوم رہا تھا ۔

پھر وہ رنگین تموج رک گیا ۔ ناؤ کنارے لگ گئی ۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نئی کرن کھیلنے لگی اور پھیل کر مسکراہٹ میں بدل گئی ۔

اور خالق انسان کے روپ میں اس کے روبرو جلوہ گر ہو گیا ۔

پھر اسے یاد آیا کہ وہ مرجانہ تھی ۔ شگوفہ پور کے سکول کی مرجانہ سمائلز کے کمرے میں ۔ اور وہ انسان وہ اجنبی ۔ ۔ ۔ ؟

ٹک میز کا لمپ روشن ہو گیا ۔

"بائیں ۔ ۔ ۔ ۔" منصب حیرانی سے چلایا ۔

مرجانہ نے منہ چادر میں لپیٹ لیا ۔

کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی ۔

"بولو ۔ ۔ ۔ ۔ بولو !" باہر پرندے چہچہانے لگے ۔

"کتنی حسین ہو تم ۔" منصب مسکرایا ۔

"وحشی جانگلی ۔" وہ پیچھے ہٹ گئی ۔ غصے سے اس کے گال تمتما گئے ۔
"کس قدر پیاری ہو ۔" وہ قریب آ بیٹھا ۔
"جاؤ ۔ چلے جاؤ۔" وہ چلائی ۔ "چور ۔ بدمعاش" پھر وہ رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ وہ روتی رہی ۔ وہ مناتا رہا ۔ وہ گھورتی رہی وہ مسکراتا رہا ۔ پھر دفعتاً جیسے کسی بھولے کو راستہ مل گیا ۔ وہ محبت جتانے لگا ۔ اس پر اور بھی جھنجھلائی ۔ اور وہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا ۔ مرجانہ کا رونا سسکیوں میں بدل گیا ۔ اور اس نے منصب کے شانے پر سر رکھ کر سسکیاں لینا شروع کر دیں ۔ ۔ ۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے ۔
"مجھے تم سے محبت ہے ۔" وہ بولا۔
وہ مسکرا دی ۔ آنسوؤں بھری مسکراہٹ ۔
وہ ہنس پڑا ۔ "تفریح کے لیے آنا اور محبت کے جال میں پھنس جانا ۔ عجیب تماشہ ہے ۔"
"محبت ۔" وہ زیر لب بولی۔ اس کی آواز میں طنز تھی ۔ "اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو یا مجھے ۔"
"کتنا رنگین دھوکا ہے ۔" وہ ہنسا ۔ "خدا کرے دھوکا ہی ہو ۔"
"اب اس کے علاوہ اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے ۔" وہ بولی ۔
"بڑی حقیقت شناس ہو تم" وہ مسکرایا مگر جلد ہی سنجیدہ ہو گیا ۔
"تمہارا نام کیا ہے ۔ بتاؤ"
"اب نام پوچھ کر کیا کرو گے ؟"
"اس میں ہرج کیا ہے ؟"
"اپنے دوستوں کو اپنے کارنامے سنانے کے لیے ہے نا !"
"نہیں نہیں ۔ تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ لیکن میں ۔۔۔ اب میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں ۔ کاش ۔ ۔ ۔ لیکن چاہے تم کوئی بھی ہو تم بے حد پیاری ہو ۔ اچھا پھر ملیں گے ۔ ہاں ضرور ملیں گے ۔ پھر ممکن ہے میں تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا سکوں ۔"
"خدا کے لئے اب جائیے ۔ جائیے ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔" وہ بولی ۔

"صرف ایک بار کہہ دو تم مجھ سے ناراض نہیں ۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ۔

"ناراض" ! مرجانہ کی مسکراہٹ میں طنز تھی ۔ میری ناراضگی کر ہی کیا سکتی ہے ۔ اب خدا کے لیے جائیے ۔"

"کتنی صاف گو ہو تم ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "اچھا الوداعی ہاتھ تو ملا لو ۔" اس کا ہاتھ پیار سے دبا کر وہ چپکے سے باہر نکل گیا ۔ اور دیوار پھلانگ کر باہر چلا گیا ۔ اور مرجانہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہ گئی ۔ حتّٰی کہ صبحِ کاذب کی دھندلی روشنی نے پھیل کر اس خوبصورت منظر کو دھندلا دیا ۔ اور شگوفے سر جھلا جھلا کر اشارے کرنے لگے ۔ پتّیاں سمٹ سمٹ کر مسکرانے لگیں ۔ اور کوئل چلّانے لگی ۔ کہہ دوں ؟ کہہ دوں ؟

اور وہ ٹھٹھک کر اُٹھ بیٹھی ۔ اور چپکے سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی ۔

اس روز کے بعد شگوفہ پور کے سکول کی روزمرہ زندگی میں عجیب و غریب انقلاب پیدا ہو گیا ۔

چند ایک روز تو مس سمائلز کھوئی کھوئی رہی ۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی مسکراہٹ کو قائم رکھے ۔ اسے قائم رکھنے کی شدید کوشش ہی اسے فنا کئے جا رہی تھی ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ کوشش ایک مسلسل تیوری بن کر اس کے ماتھے پر کنڈل مار کر بیٹھ گئی ۔ اور دن کی مس سمائلز خالصتاً مس فراونز میں تبدیل ہو گئی ۔ پھر اس کی رات کی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو گیا ۔ اُسے تنہائی سے وحشت ہونے لگی ۔ رات کو وہ اپنے کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ میں آ جاتی اور دیر تک لڑکیوں کے جمگھٹ میں باآواز بلند قہقہے لگاتی رہتی ۔ جیسے قہقہوں کا سہارا لیے بغیر بات نہ بنتی ہو ۔ لڑکیاں حیران تھیں ۔ کہ رات کی مس فراونز مس سمائلز میں کیسے تبدیل ہو گئی ۔

ادھر مرجانہ کو چپ لگ گئی تھی ۔ سمائلز کو قہقہے لگاتے دیکھ کر اس کے ہونٹ مبہم مسکراہٹ میں کھل جاتے اور آنکھوں میں دو تھے سے شگوفے پھوٹ آتے ۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگی رہتی ۔

وہ سبز پیالہ رو پہلی چاندنی تلے ڈولتا رہا ۔ دُور پہاڑیاں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر جھانکتی رہیں ۔ آبشار اپنا اپنا گیت گنگناتے رہے اور شگوفے جھولتے رہے ۔

دن گذرتے گئے اور ان کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مرجانہ کے دل کا مبہم اضطراب یاس بھرے سکون میں بدلتا گیا ۔

کئی بار وہ لڑکیوں کے ہنگامے سے اکتا کر چپکے سے باہر نکل جاتی اور سمائلز کے کمرے کے عقب میں چاردیواری کے قریب سامنی پہاڑیوں کے منظر میں کھوئی دیر تک کھڑی رہتی ۔ پھر دفعتاً وہ مڑ کر چاردیواری کی طرف دیکھتی ۔ ڈر سے اس کا دل دھک سے رہ جاتا ۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ۔ کوئی دیوار پھلانگ کر آ جائے تو ! اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے واپس لوٹ آتی ۔

پھر ایک اور واقعہ رونما ہوا ۔

ہیڈ معلّمہ نے مرجانہ کا ٹائم ٹیبل بدل دیا ۔ بڑے سکول کے علاوہ اب اسے چھوٹے سکول میں بھی پڑھانا پڑا ۔ چھوٹا سکول بڑے سکول سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقعہ تھا ۔

کئی بار چھوٹے سکول کو جاتے ہوئے راہ میں وہ ٹھٹھک جاتی ۔ اسے شبہ ہوتا ۔ جیسے سامنے آتا ہوا راہ گیر منصب ہے ۔ اس کے قدم لڑکھڑا جاتے اور دل دھڑکنے لگتا ۔ اس وقت وہ بھول جاتی کہ اس کی ہم کار استانیاں جو اس وقت اس کے ساتھ ہوتیں ۔ کیا کہہ رہی تھیں ۔ اس کی اس کھوئی کھوئی کیفیت پر استانیاں حیران تو ہوتیں لیکن انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ مرجانہ کی خاموشی کی وجہ کیا تھی ۔

پھر آہستہ آہستہ یہ کیفیت بھی ختم ہوتی گئی ۔ اب اسے خواہ مخواہ اپنی نگاہیں جھک جانے اور دل دھڑکنے پر غصہ آنے لگا تھا ۔ لیکن وہ بے بس تھی ۔

ایک روز جب وہ اکیلی چھوٹے سکول کو جا رہی تھی ۔ تو سڑک کے اس ویران ٹکڑے پر جہاں گھنے درخت کھڑے تھے ۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے ۔ مگر اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور چپ چاپ ادھر ادھر دیکھے بغیر چلتی گئی ۔

مردانہ آواز سن کر مرجانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ پاؤں کی چاپ اس کی طرف تیزی سے بڑھی ۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس کے پہلو میں چل رہا تھا ۔ "مرجانہ" وہ پر معنی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔

مرجانہ کا دل دھڑک رہا تھا ۔ لیکن اس نے اپنی چال تیز کر دی ۔

"صرف ایک بار مجھے ملنے کا موقعہ دو" ۔ منصب کی آواز میں منت تھی ۔

مرجانہ کے پاؤں میں چلنے کی طاقت مفقود ہوئی جا رہی تھی ۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ عین اسی مقام پر مسافروں سے بھری ہوئی موٹر لاری رک گئی اور لوگوں کو موٹر سے نکلتے دیکھ کر منصب وہیں رک گیا اور چھوٹے مدرسے کے پھاٹک میں داخل ہو گئی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ۔

مدرسے میں پہنچ کر وہ دہم سے صوفے پر جا گری ۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ پیشانی پر قطرے نمودار تھے ۔

اس کے بعد جلد ہی وہ ایک دوسرے سے ملے ۔

اس رات مرجانہ استانیوں کے ساتھ سینما دیکھنے کے لیے گئی تھی ۔

دفعتاً اس کے منہ پر خوشبو کی ہلکی سی پھوار پڑی ۔ وہ اچک کر بیٹھ گئی ۔ شاید حمیدہ نے اس سے مذاق کیا تھا لیکن ہال میں پھیلے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا ۔ حمیدہ سینما ہال میں تو مذاق نہ کرے گی ۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ نرگس کے پھولوں کا ایک گچھا اس کی گود میں آ گرا ۔

عین اسی وقت فلم ٹوٹ گیا اور ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں ۔

بائیں ہاتھ کی کرسی پر منصب بیٹھا مسکرا رہا تھا ۔

غصے سے اس کے کان سُرخ ہونے لگے اور احساس بے بسی کی وجہ سے وہ غصہ اور بھی شدید ہو گیا ۔

مرجانہ نے پھولوں کا گچھا پرے پھینک دیا اور یوں حمیدہ سے باتیں کرنے میں منہمک ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

فلم شروع ہونے کے بعد وہ چپکے سے اٹھی اور ہال سے باہر نکل گئی ۔ سینما ہال سے نکل کر وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ منصب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آ پہنچا ۔ اسے دیکھ کر مرجانہ کا دل دھک سے رہ گیا ۔

"مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سکول تک پہنچا آؤں ۔" منصب نے کہا ۔ وہ خاموش رہی اور منصب بلا تکلف اس کے پہلو میں چلنے لگا ۔

"خدا کے لیے وہ چلائی اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔"

"تو کیا ہے۔" وہ سنجیدہ ہوگیا ۔

"کمال کرتے ہیں آپ ۔" وہ غصے سے چلائی ۔

"کمال تو آپ ہی کا ہے ۔ ورنہ منصب تو اچھا خاصہ سمجھدار آدمی ہوا کرتا تھا۔"

"نہیں نہیں" ۔ ۔ ۔ بازار کے چوک کی طرف دیکھ کر گھبرا گئی ۔ مہربانی کر کے اب جائیے ۔"

"صرف ایک شرط پر وہ بولا ۔" اگر آج رات تم مس سمائلز کے کمرے کے پچھواڑے ملنے کا وعدہ کرو ۔ صرف ایک بار ۔ مرجانہ صرف ایک بار مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے وہ منتیں کرنے لگا ۔

"اچھا" وہ بولی ۔"اب جائیے ۔"

"ملو گی نا ؟"

"ہاں ۔" اس نے سر سے اثبات میں اشارہ کیا ۔

"ضرور ملنا مرجانہ ۔ ۔ ضرور"۔ اور وہ اس ویران سڑک کے اندھیرے میں گم ہوگیا ۔

بورڈنگ میں پہنچتے ہی وہ لڑکیوں کے جمگھٹے میں جا بیٹھی ۔ میری طبیعت اچھی نہ تھی ۔ اس نے کہا ۔ اس لیے میں تو فلم ادھورا ہی چھوڑ آئی ۔ اس کے بعد وہ چمک چمک کر باتیں کرنے لگی ۔ اس روز وہ مسلسل باتیں کئے جا رہی تھی ۔ جیسے چپ چاپ بیٹھنے سے ڈرتی ہو ۔ "اچھی طبیعت خراب ہے ۔" سعیدہ نے کہا ۔ "خدا کرے آپ کی طبیعت روز ہی خراب رہے ۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ پھر دفعتاً چپ ہو گئی ۔ گالوں پر دو قطرے ڈھلک رہے تھے ۔ "نہیں نہیں ۔ وہ آپ ہی آپ بولی ۔ میرا مطلب ہے ۔" اور پھر مطلب بتائے بغیر ہی خاموش ہو گئی ۔ جیسے وہ مطلب قابلِ اظہار نہ ہو ۔

جب استانیاں سینما سے واپس آئیں تو وہ چپ چاپ جھولا کرسی میں بیٹھی

جھول رہی تھی۔

"عجیب ہو تم" حمیدہ غصے سے چلائی چُپ چاپ ہی چلی آئی ۔

"ہاں وہ بولی میری طبیعت خراب تھی ۔ "

"تمہاری طبیعت کا کچھ پتہ بھی چلے ۔"

"نہیں نہیں "وہ چلائی ۔ میرا مطلب ہے" اور پھر خاموش ہو گئی ۔

"تمہارا مطلب تم ہی جانو یا خدا جانے "وہ ہنسیں ۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی ۔ نہیں نہیں ۔ میں اسے نہیں ملوں گی کبھی نہیں اور پھر دھم سے چارپائی پر گر پڑی ۔

ٹن ۔ ۔ ۔ ۔ گھڑی کی آواز سن کر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ۔ اوہ ۔ ایک ۔ ۔ ۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس کا کمرہ بھی تو سمائلز کے کمرے سے زیادہ دور نہ تھا ۔ اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اسے خیال آیا کہ وہ ہسپتال کے کمرے میں کیوں نہ چلی جائے ۔

ہسپتال کا کمرہ بورڈنگ کے پرلی طرف تھا ۔ مس سمائلز کے کمرے سے دور جہاں پرنسپل کی کوٹھی تھی ۔ اس کمرے میں بستر بھی موجود تھا۔ ہاں اس نے سوچا اور پھر اٹھ کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی ۔

منصب کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی ۔ اور منصب نے بڑھ کر اسے اپنے آغوش میں لے لیا ۔

دھمپ دھمپ

ڈھکی چھپی دف کی گونج اُبھرنے لگی ۔

پھر جب دیوتا نے انسان کا روپ دہار لیا ۔ تو پہلی مرتبہ گردو پیش کو پہچان کر وہ چلائی ۔ لیکن میں یہاں کیسے چلی آئی ۔"

"تم کسی اور طرف جا بھی سکتی تھیں کیا ؟" وہ مسکرایا ۔

"میں تو ہسپتال کی طرف جا رہی تھی ۔"

"لیکن مریض تو یہاں تھا ۔" وہ بولا۔

"عجیب بات ہے ۔" وہ اپنے آپ ہی کہنے لگی ۔

"تو مجھ سے ملنے کا ارادہ نہیں تھا ۔" منصب نے پوچھا ۔

"نہیں ۔" وہ بولی ۔
"مجھ سے محبت نہیں تمہیں ۔"
"محبت" وہ ہنسی ۔
"پھر مجھے تم سے اس قدر محبت کیوں ہے ۔ بتاؤ۔"
"اس کے سوا اب کہا ہی کیا جا سکتا ہے ۔" وہ مسکرائی ۔
"تو کیا میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں ۔"
"اپنے آپ سے ۔"
"ارے" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔
"کتنا پیارا جھوٹ ہے ۔ اور تم ۔ کتنی منہ پھٹ ہو تم ۔ تمہاری راست گوئی نے تو مجھے بالکل ہی ڈبو دیا ۔"

اس ملاقات کے بعد وہ کئی مرتبہ آپس میں ملے ۔ اور بالآخر منصب نے مرجانہ کو شادی کا پیغام دے دیا ۔ اس حقیقت گوئی کے باوجود جو وہ شاید اپنی شخصیت کو جاذب بنانے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی ۔ مرجانہ کے دل میں بھی منصب کے لیے گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا ۔ اگرچہ وہ اپنے رویئے سے منصب سے شادی کو ناممکن سمجھتی تھی ۔ صرف اس لیے کہ اسے یقین نہ پڑتا تھا کہ وہ منصب کی ہو سکے گی۔ اسے ڈر تھا کہ ایسا نہ ہوا تو اسے صدمہ ہو گا ۔

جب اسے معلوم ہوا کہ منصب کے والدین حقیقی نارضامندی کے باوجود نکاح میں شریک ہونے پر آمادہ ہو چکے ہیں تو اس کا وہ بظاہر بے حسی اور بے پرواہی کا پردہ پھٹ گیا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔

پھر وہ واقعہ ہوا ۔ جس پر پہلی مرتبہ اپنی طبیعت کی افتاد سے واقف ہوئی ۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی ارشد کو بلا بھیجا تھا تاکہ منصب کے پیغام کے متعلق بھائی سے بات چیت کر سکے ۔ ارشد مرجانہ سے دو سال چھوٹا تھا انہیں ایک دوسرے سے ملے چار سال گذر چکے تھے ۔ کیونکہ فوج میں کمیشن حاصل کر لینے کے بعد اسے فوراً کسی دور دراز مقام پر جانا پڑا تھا ۔ جہاں سے وہ حال ہی میں واپس آیا تھا ۔

جب وہ ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے سامنے ایک اونچا لمبا فوجی افسر مسکرا رہا تھا۔ وہ سمجھی کہ شاید وہ غلطی سے ملاقاتی کمرے میں آگئی ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کمرے سے باہر نکل جاتی ارشد نے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

شڑاک۔۔۔ کوئی ہوائی بجلی کی طرح اس کے جسم سے نکل کر فضا میں پھیل گئی

دھپ دھپ۔ دھوکنی ہوا دینے لگی۔

پیراک پیپا جھولنے لگا۔

ڈر سے اس کی چیخ نکل گئی اور وہ شدت سے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ حتیٰ کہ جب اسے یہ معلوم بھی ہوگیا۔ کہ وہ اس کا اپنا بھائی ارشد ہے تو بھی غبارے معلق ہی رہے اور دف بجتی ہی رہی۔ اس رات پہلی مرتبہ اسے اپنے آپ پر شکوک پیدا ہوئے تھے۔ جب بھی اسے اس واقعہ کی یاد آتی تو دل میں اپنے سے بیزاری پیدا ہو جاتی لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔۔۔ آج جب وہ نکاح کی رسم کے لیے منصب کے گھر جا رہی تھی۔ ایک معمولی سے ٹانگے والے نے۔۔۔ آج کے واقعہ نے تو گویا اسے بالکل ہی تنکا کر دیا تھا۔

کیوں؟ اس کی زندگی میں ایسے جوار بھاٹے کیوں آتے تھے۔ اپنا بھائی۔۔۔ ایک معمولی ٹانگے والا۔

اس کی نگاہ سامنے بازار کی نکڑ پر پڑی جہاں ایک معمولی سی میلی دوکان میں سفیدے اور سرخی سے تھپی ہوئی ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ جیسے وہ اس کا راز جانتی ہو۔ جیسے وہ اس کی ڈھارس بندھا رہی ہو۔

نفرت کی شدت کی وجہ سے مرجانہ نے ایک جھرجھری محسوس کی اور اپنی نگاہ پھیر لی۔

درخت تلے بیٹھا ہوا جاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں کیسی عریاں چمک تھی۔ اور اس کے پاؤں کا

انگوٹھا ہل رہا تھا جیسے وہ کسی نامعلوم لپٹی ہوئی دف کے تموّجات کا شاہد ہو ، گھبرا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی ۔

تانگے والا اسے گھور رہا تھا ۔ اور ساتھ ہی اپنی مونچھ کو مروڑے جا رہا تھا ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ باغ میں بنچ کی جگہ بازار میں کرسی پر بیٹھی ہو ۔ دفعتاً اس کی نگاہ پھر بازار کے موڑ پر جا پڑی ۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت یوں جھول رہی تھی ۔ جیسے وہ کوئی ڈھکی چھپی دف ہو ۔ یا پیراک پپیا ۔

جیسے وہ دہقان کے انگوٹھے کی جنبش پر ناچ رہی ہو ۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا پاؤں ہوا میں اسی تال پر جنبش کر رہا ہے ۔

سامنے وہ اجنبی فوجی لیفٹیننٹ آ رہا تھا ۔ نہیں نہیں اس نے شدت سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی ۔ اس کے بازو پر فوجی افسر کی بانہوں کا لمس جلتے ہوئے کوئلوں کی طرح محسوس ہونے لگا تھا۔

گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر وہ اپنے خوابوں سے چونکی اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔

کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کھلکھلا کر ہنس رہی تھی ۔

اس کے سامنے دیوار سے لٹکی ہوئی لالٹین آپ ہی آپ روشن ہو گئی ۔ پھر وہ فضا میں معلق ہونے لگی ۔ اور آپ ہی آپ مرجانہ کی طرف بڑھنے لگی حتیٰ کہ وہ اس کے سامنے آ رکی ۔ اس کا شعلہ لرز رہا تھا ۔

دھپ دھپ دھپ ۔

دف کی مدہم گونج گویا اس لالٹین کو خوش آمدید کہہ رہی تھی ۔ نہیں نہیں ۔ وہ دیوانہ وار اٹھ بیٹھی ۔ میں اُس کی ہوں ۔ اس جاٹ کی ، اس کوچوان کی ، اس فوجی افسر کی ، ہر کسی کی ، منصب کی ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تانگہ ۔ تانگہ ۔ تانگے والا ۔ وہ چلائی ۔ ادھر آؤ ۔

منصب کی کوٹھی کے دروازے پر ہی اس نے تانگہ چھوڑ دیا اور چپکے سے اندر گھس گئی ۔

سامنے کمرے میں ارشد دو ایک دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنے میں مصروف

تھا ۔

منصب کہاں ہے ؟ اس نے پوچھا ۔ شاید دوسرے کمرے میں ہو ۔ اور وہ چپکے سے دوسرے کمرے کی طرف گھوم گئی ۔

"یہ آزاد عورتیں کسی کی نہیں ہوتیں ۔" منصب کے والد کی آواز سن کر وہ رک گئی ۔

"وہ ہر کسی کی ہوتی ہیں۔" وہ بولے ۔ "ہر کسی کی ۔"

"لیکن آپ مرجانہ کو نہیں جانتے ابا جی ۔"منصب ہنسا ۔

"اچھا ۔ جیسے تمہاری مرضی ۔ تم تو اسے جانتے ہو نا ۔" ان کی آواز میں طنز تھی ۔

"ہاں میں اسے جانتا ہوں اور آپ کو معلوم ہے وہ کون سا وصف ہے جس کی وجہ سے وہ مجھے اس قدر پیاری ہے ۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا ۔

"صاف گوئی" ۔ وہ بلا کی صاف گو ہے ۔ منصب مسکرانے لگا ۔

ٹھن سے مرجانہ کے دل میں نہ جانے کیا ٹوٹ کر گر گیا ۔

"یقین جانئے ۔ منصب جوش میں چلایا ۔" "اگر اسے ذرا بھی شک ہو کہ وہ میری نہیں ہو سکتی تو وہ مجھ سے شادی نہ کرے گی ۔

مرجانہ کے پاؤں رک گئے ۔ جیسے وہ لکڑی کے بنے ہوں ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔

صاف گو ۔ صاف گو ۔ سڑک پر چلتی ہوئی موٹر چیخنے لگی ۔

ہا ہا ہا ۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دونوں بازو اس کی طرف پھیلا دیئے جیسے اسے بلا رہی ہو ۔ آ جاؤ ۔ اپنی جگہ آ جاؤ ۔

سڑک پر جلتی ہوئی بتی نیچے اتر آئی اور لالٹین بن کر اس کے قریب آ معلق ہو گئی ۔

دھپ دھپ ۔ صاف گو ۔

دُور کوئی دف بجنے لگی ۔

مرجانہ نے اپنا رخ موڑ لیا اور چپ چاپ کوٹھی سے باہر نکل گئی ۔

دھپ دھپ ۔ دف کی گونج بلند ہوتی جا رہی تھی ۔ دھونکنی ہوا دے رہی

تھی ۔ غبارے معلق ہوئے جا رہے تھے ۔ اور اس کے سامنے فضا میں ٹنگی ہوئی لالٹین گویا اُسے بازار کی اُس نکڑ کا راستہ دکھا رہی تھی ۔

............○.... ....

اُوئی اللہ

اگر شیخ اجمل کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی ۔ اگر خدا بخش کو صمد وکبابئے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی ۔ اگر اسلم کو مس رنگلی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی ۔

اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی اور وہ اپنے بڑے بیٹے جمیل کے اس جواب پر اندر عورتیں بیٹھی ہیں جی ، مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے ۔" اس قدر شدت سے نہ ہنستے اور حرکت قلب بند ہوجانے سے ان کا انتقال نہ ہوتا اور جملہ متعلقین ان کی وفات کے بعد بے یارومددگار نہ رہ جاتے تو اس صورت میں جمیل ۱۸ہارڈنگ روڈ کی کوٹھی چھوڑ کر ایور گرین لاج میں ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا ۔ اگر خدا بخش کو صمد کبابئے کے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی تو وہ ایڈورڈ ہوسٹل کو نہ چھوڑتا ۔ ایور گرین لاج میں آنے سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ صمد وکبابئے کی دوکان کے پڑوس میں رہ سکے ۔

اگر اسلم کو رنگلی سے عشق نہ ہوتا اور وہ دن رات رنگلی کے بال روم کے گرد چکر نہ لگاتا اور یہ خبر لاہور سے چل کر ان کے گاؤں راج کوٹ تک نہ پہنچتی اور اُس کے والد موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے اس کا عقداس کی بنتِ ام زینب سے نہ کروا دیتے تو اسلم کے سسر سیّد حبیب اللہ نئے محلے میں وہ مکان ہمارے لئے خالی نہ کرواتے اور ایور گرین لاج کی بنیاد ہی نہ پڑتی ۔

اگر میں چغتائی سے متاثر ہو کر دنیا کے مشہور نقوش سے چند نیم برہنہ نمونے اپنے کیوبیکل کی دیواروں پر نہ سجاتا اور سپرنٹنڈنٹ میرے خلاف پرنسپل سے شکایت نہ کرتے تو میں بورڈنگ سے سزا کے طور پر نکالا نہ جاتا ۔ اس صورت میں ایور گرین لاج بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ۔ اور یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا ۔

اس واقعے کی اہمیت کا اندازہ لگائیے ۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لئے شیخ اجمل حسین کو ہنستے ہنستے جامِ اجل پینا پڑا اور توارثی طور پر جمیل کی ساخت ایسی بنائی گئی کہ وہ عورت سے دلچسپی کا اظہار شرما کر کرے ۔

اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لئے اسلم اور مس رنگلی کے عشق پر دائمی بندش قائم کی گئی خدا بخش کو کباب کھانے پر اکسایا گیا اور صمدو کو ایسے کباب بنانے اور نئے محلے میں کباب کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا گیا ۔

اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لئے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا ۔ اور پھر جمیل ، اسلم ، خدا بخش اور میرے علاوہ وہ ربڑ کی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا ، اس کی پوتی مینا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا ۔ اور بلاضرر ہمارا نوکر بدھو جو برائے نام بدھو نہ تھا ۔

اور ان سارے واقعات کو مجتمع کرنے کے لئے مجھے ہوسٹل سے نکالے جانے کا حادثہ رونما ہوا ۔ جب میرے سپرنٹنڈنٹ مولانا نے ان نیم برہنہ تصویروں کے پیش نظر جو میں نے اپنے کیوبیکل میں ٹانگ رکھی تھیں ، پرنسپل سے شکایت کر دی ۔

شام کو جب ہم اکٹھے ہوئے تو اسلم مولانا کے حکم کے متعلق سن کر غصے سے بل کھانے لگا ۔ انہیں گالیاں دینے لگا ۔

"ٹھیک ہے بیٹا"۔ خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا ۔ "مولانا کو بُرا بھلا کہہ کر دل ٹھنڈا تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے ۔ اب یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے ۔"

اسلم نے سر کھجلا کر کہا ۔ "یار ایک مکان تو مل سکتا ہے ۔ سالے سسر سے یہ فائدہ بھی نہ اُٹھایا تو ۔۔"

"تو لعنت ہے تم پر"۔ خدا بخش تہہ بند جھاڑتے ہوئے بولا ۔

"کہاں ہے وہ مکان؟" جمیل نے مسکرا کر پوچھا ۔

"نئے محلے میں"

"بھئی واہ ۔۔۔" خدا بخش بولا ۔ اپنے صمدو کی دوکان کے پاس ہوا نا ۔ پھر تو دوست میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا ۔"

اور جمیل بھی تو کوٹھی چھوڑ رہا ہے ۔ اس کی والدہ جا چکی ہیں نا ۔" اسلم نے کہا اور اس طرح ایورگرین لاج کی بنیاد پڑی ۔

آپ جانتے ہیں آج کل نوکر کا ملنا کس قدر مشکل ہے ہم نے بورڈنگ کے باورچیوں سے بات چیت کی تھی بھئی کوئی نوکر منگوا دو ۔ غلام علی نے یہ سن کر ہاتھ کا چمچہ دیگچی کے ڈھکنے پر رکھ دیا تھا "اوہ نوکر ۔۔۔۔؟" کہہ کر یوں سوچ میں پڑ گیا تھا جیسے اُسے کوہِ ندا کی خبر لانے کو کہا گیا ہو ۔ احمد حسین بولا علیا تو میڈیکل کالج میں لگ گیا ہے اور گاما کلکتہ دفتر والے صاحب کے ہاں چلا گیا ہے اور وہ ہندوستانی ، اُسے کسی میجر نے پنڈی بلالیا ہے ۔۔۔۔ اچھا بابو جی میں دیکھوں گا ۔"

ایورگرین میں چار ایک دن تک ہم نوکر کے بغیر ہی رہے ۔ پھر ایک روز جب خدا بخش صمدو کبابیے کی دوکان سے واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے بدھو تھا ۔ جیسے کوئی پالتو کتا ہو۔

"لو جناب" خدا بخش نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا ۔ "یہ دیکھ لو آپ کو ، آپ ہیں بدھو ۔ خالص بدھو"۔

"جی ہاں، جی ہاں" ۔ بدھو کی لمبوتری ٹھوڑی کُھل گئی ۔

"اب آیا یقین ۔" خدا بخش نے خطیبانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کر کہا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ۔" بدھو کا منہ کھلا اور اس میں سے تھوک کے چھینٹے دور دور تک اڑے ۔

اس کے بعد بدھو جب بھی کام کاج سے فارغ ہوتا تو چپکے سے کوٹھے پر جا بیٹھتا ۔ بلکہ چھوٹے موٹے کام بھی وہ وہیں بیٹھ کر کیا کرتا ۔ اس پر سبھی اسے ڈانٹتے ۔

"ارے بدھو" اسلم چیختا ۔ "تو بھاگ کر کوٹھے پر کیوں چڑھ جاتا ہے ۔"

"جی ہاں بابوجی" اس کی باچھیں یوں کھل جاتیں جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو ۔

"ابے بدھو ۔" خدا بخش ہنستا ، کوٹھے پر کیا دھرا ہے ؟ دھرا ہے کچھ؟"

"جی ہاں" بابوجی کچھ بھی نہیں دھرا "جی ہاں بابو جی"

بدھو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاہے اس کی تعریف کرو چاہے اُسے لتاڑو ۔ چاہے اُس پر رعب جمانے کی کوشش کرو چاہے ہاتھ اٹھانے کی ہر صورت میں اُس کی باچھیں کھل جاتیں ۔ منہ روزن کی طرح یہاں سے وہاں تک کھل جاتا ۔ تھوک کے قطرے ہوا میں اڑتے اور وہ خوش ہو کر چلاتا ۔ "جی ہاں بابوجی ، جی ہاں ۔"

اگر بدھو کو کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھنے کی عادت نہ ہوتی تو یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا ۔ کیونکہ اس صورت میں ہمیں کوٹھے کے جملہ اسرار کا علم ہی نہ ہوتا ۔

بدھو کی دھوپ کھانے کی عادت کو چھوڑیئے ۔ اگر وہ بڑھیا عادی طور پر ربڑ کی گڑیا کی طرح نہ چیختی تو ہماری توجہ پڑوس کے مکان کی طرف مبذول نہ ہوتی ۔

"اے ہے لڑکی سر پر دوپٹہ لے ۔" ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمارے کان کھڑے ہو جاتے اور ہمیں شدت سے احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی موجود ہے ۔ ایک ایسی لڑکی جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے ۔

"اے ہے مینا ذرا سنبھل کے بیٹھ تجھے اپنا ہوش بھی ہے ۔" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گذر رہی ہے ۔ جب اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اور سنبھلنا مشکل ہوتا ہے ۔

وہ ربڑ کی گڑیا چیختی اور جمیل خواہ مخواہ شرمائے جاتا اور اسلم کے دل میں مس رنگلی کی یاد تازہ ہو جاتی اور وہ وہ دھن گنگنانے لگتا جو اس نے مس رنگلی سے سیکھی تھی ۔ فالنگ ان لو اگین اور خدا بخش تہہ بند جھاڑ کر کہتا ۔ یار بڑے گرم مصالحے ڈالنے لگا ہے صمدو کبابوں میں ، گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ اور میرے دل میں مینا بدوش کا عمل ابھرتا اور ہلکے دھلے دھلے رنگ دھاریاں بناتے اور خطوط ڈھلکتے اور سیاہ آنکھیں ڈولتیں ۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے کوٹھے کا راز جمیل پر کھلا تھا ۔ وہ صبح سویرے ہی لوٹا لے کر کوٹھے پر چلا جایا کرتا تھا اور پھر دیر تک نہ جانے وہاں کیا کرتا رہتا اور جب واپس آتا تو اس قدر دبے پاؤں زینے سے اترتا کہ چاپ تک سنائی نہ دیتی زینہ اُترتے ہوئے وہ آپ ہی آپ شرماتا اور مسکاتا ، شرمائے

جاتا اور مسکائے چلا جاتا ۔

اس زمانے میں مَیں اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ جھینپ جھینپ کر بھی اظہارِ محبت کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے برعکس میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جھینپنا اور نیچی نگاہوں سے مسکرانا نسائی خصوصیات ہیں اور عورتوں کے دل میں الٹا نفرت پیدا کرتی ہیں ۔

ان دنوں مجھے زندگی کا تجربہ نہ تھا اور میرا علم چند سستی کتابوں کے اوراق تک محدود تھا جیسے ہر کالج کے لڑکے کا ہوا کرتا ہے ۔ اس لئے میں نے جمیل کے شرمانے کو کبھی اہمیت نہ دی تھی ۔ میں سمجھتا تھا کہ عورت کی بات پر جمیل کا جھینپنا اس بات کا شاہد ہے کہ اسے عورت سے قطعی طور پر دلچسپی نہیں ۔

جمیل اونچے لمبے قد اور درمیانہ جسم کا لڑکا تھا ۔ اس کی جلد کا رنگ سنہری تھا، اس کی آنکھیں شربتی تھیں جو جھینپنے کے علاوہ نیم وارہتی تھیں ۔ اس کے سنہری بال شاعرانہ انداز میں پریشان رہتے تھے ۔ اس کے ہاں ہر بات کا ایک ہی جواب تھا ۔ دبی دبی مسکراہٹ اور بھیگی بھیگی نظر سے وہ دل کے بڑے بڑے پیچیدہ جذبات کا اظہار کرنے کی قدرت رکھتا تھا ۔ اور نہ ہی میں اس حقیقت سے واقف تھا کہ وہ تکلّم جو نگاہ اور ہونٹوں کی لطیف جنبشوں سے پیدا کیا جاتا ہے اپنا مفہوم دور دور تک نشر کر سکتا ہے ۔

جمیل کے بعد کوٹھے کے اسرار کا راز اسلم پر کھلا ۔ اس روز جب وہ نیچے آیا تو غیر از معمول کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا تھا ۔ اور ان جانے میں "فالنگ ان لواگین گنگنا رہا تھا ۔ لیکن اس کے گیت کی دھن سراسر بدلی ہوئی تھی ۔ بول تو انگریزی تھے لیکن دھن میں لوک گیت کا رنگ نمایاں تھا ۔ سب سے پہلے خدا بخش نے اس بدلی ہوئی دھن کو محسوس کیا ۔ حالانکہ خدا بخش کو علم و ادب اور راگ رنگ کی باریکیوں کا احساس نہ تھا ۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ دہقانی انداز میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ بن سمجھے مزا آ جاتا ۔ بولا۔ "یار اسلم آج مس رنگلی کو ہیر کا روپ دے رہے ہو تم ۔ خیریت تو ہے ۔" اسلم نے ایک لمبی آہ بھری اور بولا ۔ مغربی رقص میں مجھے ایک ہی چیز کھٹکتی ہے ۔ اور وہ ہے اس کی تشنگی اگر ٹانگوں میں مغربی رقص ہو اور نگاہوں میں مشرقی جھکاؤ تو مزا آ جائے ۔ ہی

ہی ہی" خدا بخش ہنسا ۔ لو بھئی مس رنگلی کے جسم کا اوپر کا حصہ تو غائب ہوا ۔ کیوں بدھو؟

"جی ہاں بابوجی ۔" بدھو کی باچھیں کھلیں ۔

جمیل کے سنہرے رنگ پر زرد دھبے تیرنے لگے اور آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگی ۔

اسی شام اسلم مرقع چغتائی کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا ۔ "یار کالے یہ جھکی جھکی آنکھ بھی کیا چیز ہے ۔ میرے سانولے رنگ کی وجہ سے وہ سب مذاق سے مجھ کالا یا نیگرو کہا کرتے تھے ۔

"لیکن مس رنگلی کی تو کٹورہ سی کھلی رہتی ہیں ۔" خدا بخش ہنسا ۔

"ارے یار اس کا مزہ اور ہی کچھ ہے۔" اسلم نے ایک آہ بھری ۔

"جی ہاں جی ہاں بابوجی ۔" بدھو نے سمجھا کہ اسے مخاطب کیا جا رہا ہے ۔

"نیم وا۔" جمیل مسکرایا اور پھر آنکھیں جھکا لیں ۔

"نیم وا ہو یا کٹورا سی ۔" خدا بخش نے تہہ بند جھاڑتے ہوئے کہا ۔

"سب ایک ہیں ۔ وقت آنے پر کٹورا سی نیم وا ہو جاتی ہیں ۔ اور نیم وا کٹورا سی کھل جاتی ہیں ۔ وقت وقت کی بات ہے ۔"

"جی ہاں بابوجی" بدھو کے پھٹے ہوئے منہ سے چھینٹے اڑے ۔ اور دو خالی کٹورے ہمیں گھورنے لگے ۔

سب سے آخر میں ان نیم وا آنکھوں کی بات خدا بخش تک پہنچی اور اس روز وہ دبا دبا سا رومان منظر عام پر آگیا ۔ خدا بخش نے کس بے دردی سے کشتیوں کا بھانڈا صحن میں پھوڑ دیا ۔

"ارے یار" وہ کوٹھے سے ہی چلایا "کالے ، اسلم جمیل بھئی یہاں تو مس رنگلی کا پاکستانی ایڈیشن کھلا پڑا ہے ۔ بھاگ کے آنا بھاگ کے ۔"

اور ہم سب یوں کوٹھے کو بھاگے جیسے ہمیں اس پاکستانی ایڈیشن کے متعلق کوئی علم ہی نہ ہو ۔ سب سے آگے اسلم تھا ۔ اس کے پیچھے میں اور سب سے پیچھے جمیل ایک عجیب انداز سے مسکراتا ہوا آ رہا تھا ۔

اس روز کے بعد کوٹھے کے اسرار کی حقیقت ایک کھلا راز بن گئی اور سب

نے مل کر کوٹھے پر بیٹھنا شروع کر دیا ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ کوٹھے کے اسرار سے کما حقہٗ واقف ہو چکے تھے ۔ اگرچہ ہر کوئی اس راز کو یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا، جیسے وہ اس کا اپنا راز ہو ۔ ہر کوئی اس راز کو اپنانے کی دھن میں شدت سے مصروف تھا ۔ کاش یہ بات مجھے ان دنوں معلوم ہوتی ۔

پہلی مرتبہ جب میں نے مینا کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا ۔ اس روز اتفاق سے میں کالج سے جلدی آگیا تھا ۔ گھر پہنچا تو بدھو کے سوا وہاں کوئی نہ تھا ۔ بلکہ بدھو نے مجھے کہا بھی ۔ "بابوجی ! آج تو آپ سب سے پہلے آگئے ۔" کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اتفاق سے میں سیڑھیوں میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جمیل سیڑھیوں کے بالائی حصے میں کھڑا مسکائے جارہا ہے میں بہت حیران ہوا کہ میاں جمیل دیوار سے لگ کر مسکرائے کیوں جاتے ہیں ۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا اور پھر معمول کے خلاف اونچی آواز میں کہنے لگا ۔ "آؤ رُک کیوں گئے ۔" اوپر جاکر میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں جمیل کے سوا کوئی نہ تھا ۔ اور وہ اسی طرح کھڑا مسکرائے جا رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں میں کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ اور اس نے مسکرانا چھوڑ لجانا شروع کر دیا ۔ اور پھر جلد ہی لوٹا اٹھا کر نیچے اتر آیا ۔

کچھ دیر تک میں بے مصرف ٹہلتا رہا ۔ ایورگرین صرف ایک منزلہ مکان تھا ۔ اس کے ایک طرف گلی تھی ۔ دو جانب تین منزلہ مکانات کی اونچی لمبی دیواریں کھڑی تھیں ۔ اور ایک طرف پرانی ساخت کی نانک چندی اینٹوں کی ایک منزلہ دیوار تھی جس میں ایک بند کھڑکی تھی ۔ جس کے اردگرد جالی دار اینٹیں لگی ہوئی تھیں ۔ لیکن پرلی جانب سے جالیوں کے سوراخ پلستر سے بند کئے ہوئے تھے ۔

جب میں اکتا کر نیچے اترنے لگا تو دفعتاً ایک حرکت ہوئی اور جالی کے سوراخ روشن ہوگئے جیسے کسی نے ان کی پشت کا پلستر توڑ کر وہاں گیس جلا دیا ہو ۔ میں رُک گیا اور غور سے ان سوراخوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ان سوراخوں میں دھندلے رنگدار دھبے سے دکھائی دینے لگے ۔ دو سوراخوں میں سبز دھبے چمکنے لگے ۔ ایک سیاہ دھبہ واضح ہونے لگا اور دو تین سنہری دھبے

جھلملائے ۔ سنہری دھبوں میں جنبش سی ہوئی ۔ ایک دھندلی سی مسکراہٹ جھلملائی اور گھنی پلکوں کا چھتر گرنے لگا ۔

دفعتاً ربڑ کی گڑیا بھاری آواز میں بھیں بھیں کرنے لگی ۔

"اے ہے لڑکی تو پھر یہاں کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی ، ہزار بار کہا ہے کہ ہر وقت کتاب لے نہ بیٹھ جایا کر ۔"

"اوئی اللہ ، کہیں بیٹھنے بھی دیں گی آپ ۔" ایک رنگین آواز گونجی ۔

اف وہ اوئی اللہ سارے جہاں کا حسن رنگینی ، اکتاہٹ ، نزاکت اور زندگی سمٹ کر اس اوئی اللہ میں سما گئی تھی ۔

میرا دل بیٹھ گیا ۔

کھٹ سے کوئی دروازہ بند ہوا اور جالی کے سوراخوں پر پھر سے ظلمت چھا گئی جیسے کسی نے پلستر کر کے اندر سے انہیں بند کر دیا ہو ۔

میں مبہوت کھڑا تھا ۔ دور تک ، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ۔ چھتوں ، منڈیروں اور دیواروں کا انبار لگا ہوا تھا جن میں مندر کا ایک سنہرا کلس بھی شام کی گلابی روشنی میں چمک رہا تھا ۔ جس پر چند ایک چیلیں خاموشی سے اڑ رہی تھیں ۔ پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے ہوئے سجدے میں گری ہوئی تھی ۔ آسمان پر گلابی بدلیاں یوں چمک رہی تھیں جیسے اس اوئی اللہ کی تمام تر رنگینی انہوں نے جذب کر لی ہو ۔

پھر وہ دھبے آہستہ آہستہ مجھ پر مسلط ہوتے گئے ۔ میرے ادراک میرے خیالات ، میرے جذبات پر حاوی ہوتے گئے ۔ کتاب پڑھتے پڑھتے دفعتاً چھپے ہوئے حروف میں ایک جنبش ہوئی اور عبارت میں کچھ سوراخ کھل جاتے اور پھر رنگین ، سیاہ اور سنہری دھبے ناچتے اور گھنے بالوں کا ایک چھتر گرتا ۔۔۔ ایک سیاہ کشتی ڈولتی حتیٰ کہ میں کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا اور ان جانے میں کوٹھے پر جا چڑھتا اور سیڑھیوں کے مٹیالے اندھیرے میں کھڑا انتظار کرتا کہ کب سوراخوں کا پلستر اکھڑے اور وہ دھبے نمودار ہوں ۔ اور اس سنہرے مندر میں ناقوس بجے اوئی اللہ میں کدھر جاؤں اور اس اوئی اللہ کی رنگینی بادلوں میں منعکس ہو ۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ ایورگرین لاج میں میرے علاوہ اور بھی ایسے تھے جن کی کتابوں میں سوراخ کھل جاتے تھے اور نگاہوں تلے رنگین دھبّے ناچتے تھے۔ لیکن ان دنوں نہ جانے کیوں میں اس بات سے قطعی واقف نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان دھبّوں کی حقیقت مجھی تک محدود ہے۔ وہ رنگین امریکہ صرف میری ہی دریافت ہے۔

مجھے اس بات کا اندازہ بھی کیسے ہوتا۔ جب کبھی چھٹی کے دن ہم سب کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان جالیوں سے دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا۔ کوئی نگاہ بھر کر ادھر دیکھتا ہی نہ تھا۔ میں تو خیر اس بات کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے ادھر نہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ میری بات چھوڑیئے۔

اسلم عام طور پر اپنے محبوب رسالہ لائف کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی اِن لَوَّاگین" گنگنانے لگتا۔ اور گنگناتے وقت سرسری طور پر ادھر دیکھ بھی لیتا۔ لیکن یہ تو معمولی بات تھی۔ جمیل تو ہمیشہ ادھر پیٹھ کر کے بیٹھتا تھا۔ اگرچہ وہ گھسیٹ کر اپنی کرسی احتیاط سے اس مقام پر کرلیا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ جالیوں میں سے بخوبی نظر آسکے۔ یہ بات قابل توجہ نہ تھی۔ کیونکہ دلچسپی تو دیکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اپنا آپ دکھانے سے نہیں۔ اور خدا بخش تو زیادہ تر اوپر بیٹھتا ہی نہ تھا۔ چند ایک منٹوں کے لئے کوٹھے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں گھومتا جیسے شیر پنجرے میں قید ہو۔ اور پھر نیچے اتر جاتا اور کچھ دیر کے بعد ازسرنو اوپر آکر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومنا شروع کر دیتا۔ تہہ بند جھاڑتا۔ بدن کھجاتا اور آپ ہی آپ گنگناتا۔ بہت ہی مصالحے ڈالنے شروع کردیئے ہیں صمدو نے گرمی ہوگئی ہے کچھ کچھ۔۔"

البتہ جب کبھی اس مندر میں اوئی اللہ کا ناقوس بجتا تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اسلم کے ہاتھ سے پرچہ چھوٹ جاتا۔ جمیل کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ جاتا، آنکھوں میں بوندا باندی ہونے لگتی۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اور خدا بخش گرمی سے بے حال ہو کر تہہ بند جھاڑتا اور صمدو کبابئے کو گالیاں دیتا۔ وہ بھیں بھیں کرنے والی ربڑ کی گڑیا چیختی اور دھپ سے دروازہ بند کرنے کی آواز آتی اور ان جالیوں پر ظلمت چھا جاتی، اور پھر۔۔۔۔ پھر مجھے لوگوں کی طرف

دیکھنے کا ہوش نہ رہتا اور میری نگاہ میں مکانوں ، منڈیروں اور دیواروں کا وہ انبار کانپتا اور مندر کا کلس چمکتا، چیلیں منڈلاتیں اور بادل رنگ چھلکاتے ۔۔۔ اور ربڑ کی گڑیا چیختے چلی جاتی ۔

ان حالات میں کیسے شک کر سکتا تھا کہ ان رنگین سنہرے دھبوں کا راز ان پر آشکار ہے اور اگر آشکار بھی تھا تو وہ اس میں دلچسپی لیتے تھے ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے میں اس راز کے تحفظ کے خیال سے ان جالیوں میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہ کیا کرتا تھا ۔ لیکن میرا دل دھک دھک بجتا رہتا اور کیفیت ایسی ہوتی جیسے کوئی ہمہ تن گوش ہو ۔ صبح اور شام کے وقت جب بھی موقع ملتا میں دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ جاتا اور سیڑھیوں کے اختتام پر سائے میں کھڑا ہو کر سگریٹ سلگالیتا ۔

سائے میں کھڑے ہونے سے میرا مقصد اپنے آپ کو اس نقش چغتائی سے نہیں بلکہ اس چیختی ہوئی بڑھیا سے چھپانا ہوتا تھا ۔ جو چیل کی طرح اس سنہرے کلس پر چھائی رہتی تھی ۔ اس کی حفاظت کے لئے چوکس رہتی تھی ۔ دو ایک بار میں نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی جسارت بھی کی تھی ۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی دھپ سے عقبی دروازہ بند اور جالی کی وہ آنکھیں بے نور ہو کر رہ گئی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ مینا یہ پسند نہ کرتی تھی کہ میں روشنی میں کھڑا ہو کر اس سنہرے مندر کے سامنے سیس نواؤں ۔ اس لئے میں سیڑھیوں کے اندھیرے ہی میں کھڑا رہتا اور اسے اپنی دھندلی موجودگی کا احساس دینے کے لئے سگریٹ سلگا لیتا ۔ اور سگریٹ سلگتے ہی جالیاں روشن ہو جاتیں اور وہ "جگسا پزل" منظرِ خاص پر آ جاتا ۔ پھر میں اس تصویر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا ۔ اب تو وہ ٹکڑے بے حد روشن اور رنگین ہو چکے تھے ۔ یا میری نظر مشاق ہو چکی تھی ۔ بہرحال میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی روز دیوار کی وہ بند کھڑکی کھلے اور مینا چند ساعت کے لئے وہاں آ کھڑی ہو ۔ وہ گھنی پلکیں جھلکیں اور آنکھوں کے سیاہ کونوں میں چمک لہرائے گوری بانہیں لٹکیں لمبی لمبی انگلیاں ایک شان بے نیازی سے کائنات پر چھا جائیں ۔ اور مینا کی گھومتی بل کھاتی لکیریں کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیں ۔

ایورگرین والوں کو قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ میں کسی حسین راز سے واقف ہوں ۔ یا ان گھومتی ہوئی لکیروں کی لپیٹ میں آگیا ہوں بلکہ وہ تو کہا کرتے تھے ۔ "کالے تیرا کوئی چانس نہیں ۔ پنجاب کی لڑکی افریقی رنگ اور نقوش پسند نہیں کرتی ۔ سمجھے نیگرو "۔ اور وہ ہنستے ۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ لڑکیاں سانولے رنگ کو پسند نہیں کرتیں ۔ بیوقوفوں کو معلوم نہ تھا کہ رنگوں کا تضاد سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوتا ہے ۔ کرشن کنھیا کی ہی مثال لیجئے ۔ انکا رنگ سانولا پیش کیا جاتا ہے اور پھر گوپیاں بار بار انہیں سانورے کنھیا کیوں کہتی تھیں ۔ لیکن میرے ساتھی ان باتوں کو کیا جانتے ۔بیچارے میں نے اپنے کئی ایک دوستوں سے اس بارے میں تحقیق کی تھی مثلاً رفعت حسین کو ہی لے لیجئے ۔ کتنا گورا چٹا رنگ ہے اس کا ، سارے کا سارا خاندان ہی فیس پاؤڈر سے لت پت ہورہا ہے لیکن جب اس کے ابا نے ایک گوری چٹی حسینہ سے اس کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو وہ میرے پاس آکر رو دیا ۔ "یار تباہ ہوگیا میں ، سفید پھٹک رنگ ہے اس کا ۔ اتنا چوڑا اور سُرخ منہ جیسے چقندر ہو ۔" اور بالآخر اس نے ایک کالی کلوٹی چھوکری سے محبت لگالی ۔ جو عشق کے درجے تک جا پہنچی تھی ۔

لیکن ایورگرین کے ساتھیوں کی یہ غلط فہمی میرے حق میں بڑی مفید تھی ۔ لہٰذا میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی بحث نہ کی تھی ۔ بحث کرنا تو الگ رہا ۔ حالت یہ تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی میرے لئے دوبھر ہوتا جارہا تھا ۔ جی چاہتا کہ تنہائی میسر ہو ۔ اور میں سگریٹ سلگا کر سیڑھیوں میں کھڑا ہو جاؤں ۔۔۔۔۔ اب تو مینا میری موجودگی محسوس کرکے بار بار مسکراتی اور بہانے بہانے ایسی ایسی باتیں کر جاتی کہ میں دل مسوس کے رہ جاتا ۔ وہ اپنی چھوٹی بہن پینا سے کھیلتی ، باتیں کرتی ، اسے چھیڑتی اور ذرا خاموش نہ ہوتی ۔ جب تک وہ آفت کی پرکالہ بڑھیا خدا اُسے غارت کرے بھیں بھیں شروع نہ کر دیتی اور وہ بڑھیا تو یہ ہے جب بات کرنے پر آجاتی تو گویا گھر میں زلزلہ آجاتا ۔ جیسے بگڑا ہوا ریڈیو شائیں شائیں کررہا ہو ۔ "اے لڑکی تجھے کسی کا خیال نہیں کسی کا لحاظ نہیں" اس پر مینا مسکرا کر مدھم آواز میں کہتی ۔ اوئی اللہ اتنا خیال تو ہے ، ہر

دم لگا رہتا ہے" اور میری طرف معنی خیز انداز سے دیکھتی اور وہ بڑھیا اور بھی بگڑتی "توبہ کتنی باتیں بنانی آگئی ہیں۔ اور پھر مندر کا کلس نئے انداز سے چمکتا اور وہ چیل اس کے گرد چکر لگاتی اور میرا دل بلّیوں اچھلتا۔ اچھلے جاتا۔

پھر وہ واقعہ جس نے ہماری محبت کو ہمیشہ کے لئے استوار کردیا اور اس کی تابانی کو دوام بخش دیا۔

ایک روز جب ہم سب کوٹھے پر بیٹھے تھے اور ہوا زوروں پر تھی اور جالی کے سوراخ منور تھے تو نہ جانے کدھر سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑتا ہوا آیا اور میں نے تفریحاً اسے دبوچ لیا وہ رسالے کا ایک ورق تھا۔ جس پر ایک رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اس کاغذ کو اس بند کھڑکی کے نیچے دیوار کے ابھرے ہوئے حصے پر رکھ کر اس پر ایک اینٹ رکھ دی۔ ایسا کرنے سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔ اور نہ ہی مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ چھوٹی سی تفصیل ہمارے رومان میں اتنی بڑی حیثیت اختیار کرے گی۔

اگلے روز جب میں کوٹھے پر گیا تو کچھ دیر کے بعد میری نگاہ اس اینٹ پر پڑی جس کے نیچے میں نے کاغذ تہہ کرکے رکھا تھا لیکن اینٹ تلے کاغذ دکھائی نہ دیا۔ خیر میں نے اس بات کو قطعی اہمیت نہ دی۔ لیکن جب میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے ہوکر حسب معمول سگرٹ جلایا اور وہ جالی بقعۂ نور ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مینا وہی کاغذ تھامے ہوئے بیٹھی تھی۔ کیونکہ اس پر وہی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کاغذ کی طرف اشارے کرکے مسکرا رہی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ وہ بند کھڑکی کھل سکتی ہے' کھلتی ہے اور مینا نے اسے کھول کر وہ کاغذ اٹھایا ہے، اور ۔۔۔ اور کاغذ بھی اسی طریق سے مینا کے پاس پہنچائے جاسکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی میں نیچے اُتر آیا اور اندر سے کمرا بند کرکے مینا کو خط لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ میں چند ایک سطریں لکھ کر ختم کردوں گا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا مجھے نہ جانے کہاں سے جذبات امڈتے چلے آئے اور میں ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا۔ خط ختم کرنے کے بعد مجھے اپنے جذبات کی شدت کا احساس ہوا۔ ایک تفریحی کھیل ایک محض دل لگی

میرے لئے کس قدر اہمیت حاصل کرچکی تھی ۔ اس روز پہلی مرتبہ میں اپنے جذبات کی حقیقت اور شدت سے واقف ہوا ۔

سیڑھیوں کے سائے میں کھڑے ہوکر سگریٹ کے سلگتے انگارے کی روشنی میں مَیں نے مینا کو وہ خط دکھایا اور پھر شام کے جھٹپٹے میں اُسے اسی اینٹ کے نیچے چھپا دیا جو بند کھڑکی تلے بنے ہوئے چھجے پر رکھی تھی ۔ اگلے روز صبح سویرے میں کوٹھے پر چڑھا ۔ اینٹ اٹھائی ۔ خط غائب تھا ۔ میرے دل میں انبساط کی لہر دوڑ گئی ۔

میرے لئے وہ دن گذارنا مشکل ہوگیا ، رہ رہ کر خیال آتا ، کیا مینا جواب دیگی ، اگر اس نے جواب نہ دیا تو ، اگر وہ ناراض ہوگئی تو، اگر اس نے عقبی دروازہ کھولنا بند کردیا تو ۔ سارا دن مجھے اسی قسم کے خیال ستاتے رہے۔ رات بھر نیند نہ آئی ۔ اور میں نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی پھر صبح سویرے ہی میں لوٹا لے کر اوپر بھاگا ۔۔۔۔۔ اینٹ کے نیچے کاغذ کا ایک کونا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔

کمرے میں واپس پہنچ کر دروازہ بند کرکے میں نے وہ کاغذ کھولا ۔ کاغذ پر صرف ایک لائن لکھی ہوئی تھی ۔ اوئی اللہ اگر یہ کسی اور کے ہاتھ پڑ جاتا تو ؟"

اس کے بعد اس کے خط آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور ایک مہینے کی خط وکتابت کے بعد تو وہ دبے دبے الفاظ میں اظہارِ محبت بھی کرنے لگی ۔ لیکن ہمارے خطوں میں نہ تو عنوان ہوتا تھا اور نہ ہم ایک دوسرے کا نام لکھا کرتے تاکہ اگر وہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو بھی حقیقتِ حال کا پتہ نہ چلے ۔

ہم باری باری خط لکھا کرتے تھے ایک روز وہ لکھ کر اینٹ تلے رکھ دیتی اور اگلے روز میں اس کا جواب لکھ کر وہیں چھپا دیتا جسے وہ رات کے وقت کھڑکی کھول کر اٹھا لیتی تھی ۔ کیسے پیارے دن تھے وہ ، ان رنگدار دھبّوں نے اس جھکی جھکی آنکھ نے اس نغمہ ریز اوئی اللہ نے اور ان اشارات بھرے خطوط نے زندگی کے سادہ ورق کو سنہری بنا دیا تھا ۔ یہ کیفیت صرف مینا کے خطوط کا نتیجہ نہ تھی ۔ میرے اپنے جذبات میرے لیے انوکھے اور پر کیف معلوم ہوتے ۔ جب میں اُسے خط لکھتا تو میرے دل سے نئے نئے انوکھے خلوص بھرے جذبات ابھرتے

اور میں ان کی سنجیدگی اور خلوص پر حیران ہوتا ایسے جذبات جن کے وجود کا مجھے خود علم نہ تھا جو نہ جانے دل کی کن گہرائیوں سے ابھرتے تھے ۔ ان ہی جذبات کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں اس دور کے تعلق میں جو محض وقت کٹی اور تفریح کے لئے پیدا ہوگیا تھا ۔ ایک بے نام سنجیدگی اور پاکیزگی پیدا ہوتی گئی ۔ نہ جانے کیا وجہ تھی ۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ایورگرین کے تمام افراد سنجیدہ ہوچکے تھے ۔ جمیل نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی ۔ اگرچہ وہ طبعی طور پر خاموش لڑکا تھا اور اس کا بڑا سے بڑا اظہار بھی ایک خاموش مسکراہٹ یا ایک مدھم سرگوشی تک محدود ہوتا تھا ۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی سی ہونے لگتی تھی ۔ لیکن اب تو وہ بالکل ہی خاموش ہوچکا تھا ۔

وہ صبح سویرے بیدار ہوتا اور ہمارے جاگنے سے پہلے ہی تمام ضروریات سے فارغ ہوکر بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی کے بعد وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ کر مطالعے میں مصروف رہتا ۔ اسلم نے کرکٹ کھیلنے کی نئی مصروفیت پیدا کرلی تھی اور زیادہ تر وقت اسی میں بسر کرتا تھا ۔ خدا بخش حسبِ معمول یا تو صمدو کی دوکان پر چلا جاتا اور یا بدھو سے باتیں کرنے میں مشغول رہتا اور اوئی اللہ کی آواز سن کر تہبند جھاڑتا اور کہتا "میاں بدھو کچھ سنا جناب نے" اور بدھو کی پھوٹ پھُس سے کھِل جاتی اور چھینٹوں کا فوارہ چلتا ۔ "جی ہاں جی ہاں بابوجی ۔" "لیکن بدھو ۔" خدا بخش کھجاتے ہوئے جواب دیتا ۔ "یہ تو پیڑ گننے کا بکھیڑا ہے اور ہم ٹھہرے آم چوسنے والے" اور بدھو بے سوچے سمجھے ہنستا اور ربڑ کی گڑیا چیختی اور میری نگاہوں میں سنہرے کلس پر چیلیں منڈلاتیں ۔

پھر وہ منحوس دن طلوع ہوا ۔

اس روز جب میں کالج سے واپس آرہا تھا تو گلی میں مینا کے مکان کے صدر دروازے پر وہ بڑھیا برقعہ پہنے کھڑی چلا رہی تھی ۔ "لڑکی ذرا خیال رکھنا پینا کو باہر نہ جانے دینا میں شام تک لوٹ آؤں گی ۔"

بڑھیا کو باہر جاتے دیکھ کر میں سمجھا کہ مطلع صاف ہے اور بھاگ کر سیدھا کوٹھے پر جا چڑھا اور سیڑھیوں کے دھندلکے میں کھڑا ہونے کے بجائے باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا ۔ جالی کے سوراخ روشن تھے ۔ اور مینا حسب معمول کرسی

پر بیٹھی پینا سے کھیل رہی تھی ۔ اس کے بال کھلے تھے ۔ حسب معمول گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور نگاہیں جھکی جھکی تھیں ۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا ۔ پہلی مرتبہ سورج کی روشنی میں مَیں دیوی کو سیس نوانے کے لئے جھک گیا ۔

عقبی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور میں چونکا ۔ جالیوں پر ظلمت طاری تھی ۔ چند لمحوں کے لئے تو میں حیران کھڑا رہا ۔ پھر چپ چاپ نیچے چلا آیا ۔

پھر بیٹھے بٹھائے دفعتاً مجھے خیال آیا ۔ شاید بڑھیا کے علاوہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہو ۔ جس کے سامنے مینا کو تشہیر گوارا نہ ہو ۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہوئی ۔ لپک کر کوٹھے پر گیا ۔ لیکن میرے سگریٹ سلگانے کے باوجود جالیاں روشن نہ ہوئیں اس روز میں کئی ایک مرتبہ کوٹھے پر گیا لیکن بے سود ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں سے اُسے ایک خط لکھوں لیکن اس روز مینا کی باری تھی اگلے روز مجھے اس کا خط ملنا تھا ۔

نہ جانے اگلی صبح میں نے مینا کا خط اینٹ تلے سے نکال کر مٹھی میں کیوں دبا لیا ۔ مجھے ایک نامعلوم سا ڈر محسوس ہو رہا تھا ۔ ایک گھٹن سی تھی جو میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی تھی میں نے بند کمرے میں اسے کھولا ۔ غیر از معمول صرف چند ایک فقرے لکھے ہوئے تھے ۔

"آپ کا یہ کالا کلوٹا دوست کون ہے ۔ خواہ مخواہ مجھے اشارے کرتا ہے ۔ کل اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ اسے منع کر دیجئے ۔"

میری نگاہوں تلے دھند لکا چھا گیا اور دل ڈوب گیا ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے ۔ کون ہے وہ کال کلوٹا ۔ سلام تو میں نے کیا تھا ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔

اس گتھی کو سلجھنے کے لئے میں باہر نکل گیا اور دیر تک آوارہ پھرتا رہا ۔ حتٰی کہ میں خود اس میں الجھ کر کھو گیا ۔

آہستہ آہستہ میرے شکوک تقویت پکڑتے گئے ۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خطوط محبت کے جذبات سے دہکتے ہوئے خطوط نہیں ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا لیکن پھر وہ کال کلوٹا ۔۔ وہ خوش نصیب گورا کون ہو سکتا ہے ۔ کون ہو سکتا ہے وہ ۔ کون ۔ ضرور وہ کوٹھے پر جاتا

ہوگا ۔ ضرور ۔

اس راز کو جاننے کے لئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ ایک دن چھپ کر کوٹھے پر بیٹھا رہوں وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تو تھا ہی جو خالی پڑا تھا اور جہاں چھپ کر میں درزوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا ۔

وہ رات میں نے جاگ کر گذاری پھر تین بجے کے قریب چپکے سے کوٹھے پر چڑھ کر میں اس کمرے میں جا بیٹھا اور طلوع آفتاب کا انتظار کرنے لگا ۔ سات بجے کے قریب نیچے سے آوازیں سنائی دیں ۔ کوئی جاگ چکا تھا اور میں چوکس ہو کر دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا ۔ کوٹھے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی اور اس مقام سے قطعی طور پر دکھائی نہ دیتا تھا کہ آیا مینا کے کمرے کا عقبی دروازہ کھلا ہے اور جالی کے سوراخ روشن ہیں یا نہیں ۔

پھر دبے پاؤں کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی ۔ سیڑھیوں میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی ۔ کوئی اوپر آرہا تھا ۔ سیڑھیوں کے بالائی حصے میں وہ رک گیا عین اسی جگہ جہاں میں کھڑا ہوا کرتا تھا ۔

اس نے سگریٹ سلگایا ۔ دیا سلائی کی روشنی میں جمیل کی دبی دبی مسکراہٹ واضح ہوئی اس کی آنکھوں میں وہی بوندا باندی ہو رہی تھی ، پھر وہ کھڑا ہو کر مسکرانے لگا ۔

ناگاہ میری نظر جالیوں کی طرف پڑی ۔ اس سوراخ سے ایک پتلی لمبی گلابی انگلی باہر نکلی ہوئی تھی ۔ اور یوں لہرا رہی تھی جیسے پاس بلا رہی ہو ۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیوں گردوپیش پر ایک دھندلکا چھا گیا ۔ چاروں طرف سے ایک خلا نے مجھے گھیر لیا اور پھر بوند بوند گر کر دل میں غم کی ایک جھیل پھیلتی گئی ۔

تو میں ہی وہ کالا کلوٹا ہوں ۔ یہ خیال آتے ہی کلیجے پر سانپ لوٹ گیا ۔ لیکن پھر وہ خط ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور آ بھی جاتا تو کیا ہوتا ۔ اب تو زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی چاروں طرف ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا ۔ جس میں نہ تو امید کی کرن تھی اور نہ آرزو کی حرکت ۔

ان حالات میں لاہور رہنا بے کار تھا ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند دنوں

کے لئے گھر چلا جاؤں لیکن جانے سے پہلے جمیل سے تمام واقعہ بیان کر دوں ۔

جمیل سے مختصر طور پر تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد میں نے کہا ۔ "جمیل مینا تمہاری ہے میری نہیں، مجھے افسوس ہے کہ غلطی فہمی کی وجہ سے میں نے اسے تم سے چھیننے کی کوشش کی ۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے سامنے مینا کے تمام خطوط رکھ دئے ۔ جمیل حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی نے کوئی اور ہی رنگ اختیار کرلیا تھا ۔ جیسے بوندیں بڑی ہوگئی ہوں اور ان کا تواتر ٹوٹتا جا رہا ہو اور ان میں دکھ کی جھلک پیدا ہوگئی ہو ۔ دفعتہً ایک بوند اس کے گال پر آکر گری اور اس نے منہ موڑ لیا اور میں وہ خطوط وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا اور سوٹ کیس اُٹھا کر بس کے اڈے کی طرف چل دیا ۔

بس جارہی تھی ۔ ویرانے میں درخت سر جھکائے پیچھے سرکتے جارہے تھے زرد کھیتوں میں پودوں نے سرجھکار کھے تھے خوشوں کی مڑی ہوئی انگلیاں اشارے کر رہی تھیں ۔ جاؤ چلے جاؤ ۔ دور ، اور گدلے آسمان پر اداس دھند لکا چھایا ہوا تھا ۔

گاؤں میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر پڑے پڑے میری نگاہ پتوں کی طرف منعطف ہو جاتی ۔ سبز پتوں میں سوراخ سے روشن ہو جاتے اوئی اللہ ۔ دور دور کوئی پرندہ چلاتا ۔ اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ۔ اور اندر گھر میں جا کر تھے سے کھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ۔ باہر دادی اماں چلاتی ۔ "اے ہے لڑکیو ۔ ابھی ہنڈیا نہیں چڑھائی تم نے اور مجھے محسوس ہوتا کہ ربڑ کی گڑیا چیخ رہی ہے ۔ پھر نگاہوں کے سامنے رنگین دھبے ناچنے لگتے ۔ اور میں گھبرا کر باہر نکل آتا ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جمیل کو مجھے بلانے کی کیا ضرورت پڑگئی ۔ وہ جالیوں والا واقعہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوچکا تھا ۔ اس کے بارے میں تو اب بات کرنا بے کار تھا ۔ وہ بات تو ہو ہی نہ سکتی تھی ۔ نہ جانے پھر کیا وجہ تھی ۔ بہر حال میں نے سوچا ، جانا ضرور چاہیے ورنہ جمیل کیا کہے گا اور جمیل کا قصور بھی تو کوئی نہیں ۔ اگر مینا جمیل سے محبت کرتی ہے تو اس میں جمیل کا کیا قصور ۔ جب جمیل ایورگرین پہنچا تو گھر میں بدھو کے سوا کوئی نہ تھا ۔ بدھو نے میری طرف دیکھا اور وہ پھوٹ کھلی ۔" ہی ہی ہی بابو جی آ گئے ۔" میں

نے پوچھا ۔ "بدھو گھر میں کوئی نہیں ؟"

"جی ہاں کوئی بھی نہیں ۔" وہ بولا ۔

اتفاق سے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا ۔ دروازے میں جمیل کھڑا مسکرا رہا تھا ۔

"ارے بدھو ! جمیل صاحب تو یہ رہے ۔"

"جی ہاں ۔" بدھو ہنسنے لگا ۔" جمیل صاحب یہیں ہیں ۔"

"کیوں خیریت تو ہے ؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جمیل سے پوچھا ۔

"ہاں" جمیل نے کہا ۔ "میں جا رہا ہوں ۔" ساتھ ہی اس نے بدھو کو آوازدی ۔" بدھو جا کر تانگا لے آؤ ۔"

"کہاں جا رہے ہو ؟"

"اماں نے بلایا ہے !"

"کب آؤ گے ؟"

"معلوم نہیں ۔ جب اماں اجازت دے گی ۔" اور کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

"آخر کیا بات ہے جس کے لئے مجھے بلایا ہے"۔

"بہت ضروری بات ہے۔ بے حد ضروری وہ مسکرانے لگا ۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بہار نہیں بھادوں کا سا عالم تھا ۔

"بتاؤنا ۔" میں نے بیتابی سے پوچھا ۔

" ذرا ٹھہرو ۔" وہ بولا ۔ "بڑا اچھا کیا تم آ گئے بہت اچھا کیا ۔ مجھے معلوم تھا تم میری بات نہ ٹالو گے ۔"

اس کی آواز عجیب سنائی دے رہی تھی جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو ۔ اور اسکی مسکراہٹ میں مجبوری کی واضح جھلک تھی ۔

"تانگہ آگیا بابوجی ۔" بدھو چلایا ۔

جمیل نے سوٹ کیس اٹھا لیا ۔

"لیکن وہ بات ۔" میں نے بے تابانہ پوچھا ۔

"میرے ساتھ آؤ ۔" اس نے چاروں طرف حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ آجاؤ ۔۔۔۔"

تانگے میں بیٹھ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا ۔ یہ لو
اس میں سب کچھ تحریر ہے ۔ اور پھر آخری بار مسکرانے کی شدید کوشش کی ۔

تانگے کے روانہ ہونے کے بعد میں لاج کی طرف بھاگا اور کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی بند کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور جمیل کا وہ مختصر خط پڑھنے لگا ۔

"مینا تمہاری ہے، میری نہیں ۔ اسے تمہارے جذبات سے عشق ہے ۔ شکل وصورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ۔

میں نے تمہارے جانے کے بعد صرف ایک خط اسے لکھا تھا اس کا جواب ملفوف ہے پڑھ لو ۔"

میں نے جلدی سے ملفوف خط نکالا ۔ لکھا تھا ۔

"آپ اس کالے کلوٹے کو منع کیوں نہیں کرتے ۔ دیکھئے آج اس نے مجھے خط لکھنے کی جسارت کی ہے ۔ اس کی اتنی ہمت ۔ ایسا خط لکھتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی ۔ جیسا اس کا رنگ ہے ۔ ایسے ہی اس کے خیالات ہیں ۔ آپ اسے منع کر دیجئے ورنہ ۔۔۔۔۔۔"

میں نے پھر سے جمیل کا خط پڑھنا شروع کیا ۔

مینا تمہاری ہے ، میری نہیں ، میں جارہا ہوں ہمیشہ کے لئے ۔ مینا کے سب وہ خطوط جو تم مجھے دے گئے تھے، ملفوف ہیں ۔ خدا حافظ ۔"

"مینا میری ہے ۔" مجھے یقین نہ آتا تھا ۔ وہ ایک کالے کلوٹے کی کیسے ہو سکتی ہے ! نہیں وہ میری نہیں ۔ ان خیالات کے باوجود میں کوٹھے پر چڑھتا چلا گیا اور سیڑھیوں کے بالائی حصے کے اندھیرے میں پہنچکر رک کر جالیوں کی طرف دیکھنے لگا ۔۔۔۔ ہائیں ! مینا کو بیٹھے دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ اس کا چہرہ زرد تھا ۔ منہ ستا ہوا، بال پریشان تھے اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے

ہوئے ادھر دیکھ رہی تھی ۔ جیسے کسی کے انتظار میں تباہ حال ہو ۔

نہ جانے شدت شوق سے یا آزمانے کے لئے میں سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کر باہر دھوپ میں جا کھڑا ہوا ۔ دفعتاً اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار بجلی کی طرح چمکے اور وہ اُٹھ کر باہر نکل گئی ۔

یہ دیکھ کر میں پھر سے سیڑھیوں کے اندھیرے میں جا کھڑا ہوا اور سوچنے لگا ۔ وہ میری نہیں ہو سکتی کبھی نہیں میرے اردگرد چھتوں دیواروں اور مکانوں کا وہی ویرانہ پھیلنے لگا ۔ وہی یاس وہی مردنی کتنا بدنصیب تھا میں' میں نے ہنسی کھیل میں اپنی زندگی تباہ کرلی تھی ۔

جمیل، میں اور ۔۔۔۔ دفعتاً مجھے خیال آیا ۔ ایک نیا خیال ۔ میرے ذہن میں تصویر کا ایک نیا رُخ اُبھرنے لگا ۔ ہم دونوں سے زیادہ تباہ حال مینا ہے ۔ جسے ایک شخص کی شکل و صورت اور دوسرے کے جذبات سے محبت ہے ۔ اور جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں ۔

میری نگاہ جالی کی طرف منعطف ہو گئی ۔ مینا پھر وہیں عقبی دروازے کے پاس اسی طرح تباہ حال پریشان بیٹھی تھی پلکیں جھکی ہوئی نگاہیں کھوئی ہوئی جیسے مینا خالی ہو چکی ہو ۔" اے لڑکی تو یہاں کیا کررہی ہے ۔" دفعتاً ربڑ کی گڑیا چیخنے لگی ۔ "نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے ۔"

"اوئی اللہ میں کیا کروں ۔" مندر کا ناقوس یوں بجا جیسے ٹوٹ چکا ہو ۔

..............○..............

احمق

"رفی" احمد نے مبہم آہ بھر کر کہا ۔ "بہت خاموش ہو تم ؟ ۔۔۔۔۔ ہے نا؟" احمد نے اسے اپنے قریب تر کھینچ لیا ۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا ۔ "نہیں تو" وہ مسکرائی ۔ "دیکھو نا وہ اپنی ہی دھن میں بولتا گیا ۔ ۔ میں نے تمہیں کس قدر افسردہ بنا رکھا ہے ۔ یاد ہے جب میں پہلے روز تمہارے پاس آیا تھا ۔ "ہاں ۔ وہ بولی ۔ کتنی شوخی تھی تم میں ۔ دبی دبی شوخی اور اب جیسے ڈال جھک کر پھول کو سرنگوں کر دیتی ہے ۔ سمجھتی ہو نا ؟"

رفی نے نیم نگاہ سے اسے دیکھا اور اس کی مژگاں ڈھلک گئیں ۔

"لیکن فکر نہ کرو ۔ اب تو قصہ ختم ہوگیا ۔ آج میرا آخری دن ہے ۔ کل میں چلا جاؤں گا اور تم وہی رفعت بائی بن جاؤ گی ۔ وہی ریشمی جوڑا وہی گھنگھرو وہی "اکیلی ڈرلاگے" فکر نہ کرو ۔"

احمد نے آہ بھری ۔

رفی نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا ۔

کاش ! میرے پاس روپیہ ہوتا ۔ صرف پانچ سو اور ایک مہینہ اور صرف ایک مہینہ ۔

رفی نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں اس کے انداز سے عجیب سی گھبراہٹ ہویدا تھی پھر وہ صندوق پر پڑے ہوئے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی ۔ جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی ۔

"لیکن بے کار ہے ۔ ایک مہینہ اور بھی کیا ۔ اس سے تو بہتر ہے کہ پانچ سو کا بالائی کا برف کھا لوں ۔ کھا کھا کر یخ بستہ ہو جاؤں جیسے برف کا ڈلا ۔ بے حس و حرکت ڈلا ۔ جیسے تم ہو ۔ تم"

"میں" ۔ وہ مسکرائی ۔

"جیسے ناچنے والیاں ہوتی ہیں ۔ نہیں ہوتیں کیا؟"

اس نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں ۔ "شاید" اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

ہائیں ۔ اس نے حیرانی سے رفی کی طرف دیکھا ۔ "کہاں چل دی؟"

"ابھی آئی" وہ رومال اٹھاتے ہوئے بولی اور باہر نکل گئی ۔

"ہوں ۔" احمد نے جھرجھری لی ۔ اور اپنے خیالات میں غرق ہوگیا ۔

احمد کو تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا ۔ صبح کو سیکرٹریٹ کو جاتے ہوئے یا پانچ بجے کے قریب وہاں سے لوٹتے ہوئے یا شام کے وقت کسی ہوٹل کے کسی ایک کونے میں چائے کے پیالے کو گھورتے ہوئے یا دیوار کے پار دیکھنے میں کھوئے ہوئے دفتر سے نکلتے وقت بھی اس کا انداز عام کلرکوں سے قطعی مختلف ہوتا ہے ۔ چپ چاپ ۔ اکیلا ۔ چھاتی ابھارے ۔ گردوپیش کو گھورتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے انداز سے چلے جاتا ہے ۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ ایک مختصر سا مکان اس محلے کے قریب اسے الاٹ ہوگیا تھا جہاں رقاصائیں رہتی تھیں ۔ ورنہ وہ تو شاید کبھی بھی اس کوچے کی طرف نہ جاتا ۔ اگر رفعت بائی کا مکان اس کی راہ میں نہ پڑتا تو وہ کبھی رفعت سے روشناس بھی نہ ہوتا یا اگر رفعت عام رقاصہ ہوتی تو بھی اسے رفعت سے ملنے کا خیال نہ آتا ۔ مگر رفعت تو رقاصہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی ۔ رقص کا لباس پہننے اور ساز کے ساتھ گانے کے باوجود اس کے چہرے کے خطوط میں احمد کو غم کی مبہم سی جھلک محسوس ہوتی ۔ اس کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی دکھائی دیتی ۔ قریب ہونے کے باوجود وہ دور نہ جانے کہاں کھوئی نظر آتی ۔

رفعت بائی کا مکان اگر محلے کے وسط میں ہوتا یا اس کوچے کی بڑی گلی کی طرف ہوتا ۔ جہاں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔ تب بھی احمد وہاں جانے کی جرأت نہ کرتا ۔ مگر وہ مکان بھی تو گویا رفی کی طرح چپ چاپ خاموش اور کھویا کھویا سا تھا ۔ محلے سے دور تماش بینوں کی نگاہوں سے دُور ۔ ان کے قہقہوں سے دور ۔

اسی وجہ سے یا شاید اسے احمد کے شدید احساسِ تنہائی سے بھی تعلق ہو ۔ ایک روز وہ آن جانے میں ادھر مڑ گیا ۔ اور دروازے پر جا کر پریشان ہوکر رک

گیا۔

"آئیے" رفی نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا۔ اندر تشریف لائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بڑبڑانے لگا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔"

"بات تو سنئے۔" وہ یوں بولی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

وہ رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ باہر آگئی۔ "آئیے نا"۔ وہ بولی۔ اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔

"بسم اللہ" اندر میراثی اُسے دیکھ کر بڑبڑایا۔ گانا سنئے گا۔ اور وہ سارنگی بجانے لگا۔

"نہیں نہیں۔" وہ زیر لب بولا۔ "میں تو وہ" اس نے بے کسی سے رفی کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹھہریں گے کیا" وہ بولی۔

احمد نے کونے میں بیٹھے ہوئے میراثیوں کی طرف دیکھا۔

"آئیے اوپر چلیں۔" اور وہ اسے کوٹھے پر لے گئی۔

کچھ دیر تک تو وہ اس کی باتیں سنتی رہی۔ عجیب باتیں تھیں اس کی جن سے وہ بالکل واقف نہ تھی۔ رفی کے ہونٹوں میں تمسخر انگیز مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کی متبسم آنکھیں گویا رقص کر رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ اشارے کر رہے تھے۔ مگر وہ ان باتوں سے بے خبر اس کی کمر میں ہاتھ دیئے باتیں کئے جارہا تھا۔ اور اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے جھول رہا تھا۔ جیسے سکول سے بھاگا ہوا بچہ ہو۔

"لیکن آپ تو ٹھہرنے کے لئے آئے ہیں نا"۔ وہ اکتا کر بولی۔

"ہاں" وہ مسکرایا۔ "ٹھہرا ہوا تو ہوں۔ یہ جھولنا پسند نہیں آپ کو تو نہ سہی۔" اس نے جھولنا بند کر کے پلنگ سے لٹکتی ٹانگوں کو جھلانا شروع کر دیا۔

"لیکن آپ تو یہ باتیں کر رہے ہیں۔" اس نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"ہاں ہاں مجھے تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" مثلاً آپ کی مسکراہٹ بھیگی بھیگی سی کیوں ہوتی ہے۔ آپ کے رقص میں غم کی لہریں کیوں ہیں۔ آپ کے ہونٹوں میں کراہ سی کیوں دبی رہتی ہے۔"

وفعتاً رفی کی آنکھیں ساکن ہوگئیں "تو کیا' اس نے چتون چڑھا کر کہا ۔ آپ رات بھر ٹھہریں گے ۔"

"تو کیا ابھی چلا جاؤں ۔" وہ بولا ۔

"چالیس روپیہ ہوں گے ۔" وہ بے رُخی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

"اوہ ۔" وہ بولا ۔ "ٹھیک تو ہے ۔ تمہارے لئے تو میں چالیس روپے کی تھیلی ہوں ۔ اور بس ۔"

وہ تڑپ کر مڑی ۔ اُس نے یہ بات اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی ۔ لیکن وہ نوٹ گننے میں مصروف تھا ۔ تیس چالیس ۔ اس نے چار نوٹ میز پر پھینک دئے ۔

وہ پھر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی ۔

"میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ تم رقاصہ ہو ؟" اس نے ہنسنے کی کوشش کی ۔ "کیا بے وقوف ہوں میں ۔"

"اب چھوڑیئے بھی" رفی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دئیے ۔

"لیکن میں بھی کیا کروں ۔ تم رقاصہ دکھتی بھی تو نہیں جیسے رقص کے آسمان پر چاندنی میں ایک بادل کھویا ہوا تیر رہا ہو ۔"

وہ اسی طرح چارپائی تلے پاؤں لٹکائے ، رفی کی کمر میں ہاتھ دیئے جھولتا ہوا باتیں کرتا رہا ۔ باتیں کرتا رہا ۔ وہ ہنستی رہی ۔ اس کے ساتھ سمٹی ہوئی چپکے بیٹھی سنتی رہی ۔ اس کے لئے یہ ایک عجیب تجربہ تھا پہلے تو وہ اکتا گئی تھی ۔ لیکن پھر اس مسلسل پیار بھری گرفت نے نہ جانے اسے کیا کردیا ۔ یہ تسلسل اس کے لئے ایک انوکھی چیز تھی ۔ وہ تو صرف شدید جذبے سے واقف تھی ۔شدید لمس اور بے رُخی ۔ اس کے لئے یہ تسلسل بھری مٹھاس انوکھی تھی ۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کے بکھرے ہوئے پھول ایک دھاگے میں پروئے جارہے ہوں جیسے اندھیرے اور اجالے کے دھبے مل کر ایک روپہلی سحر کی تعمیر کررہے ہوں ۔ اس نے حیرانی سے اس خبطی کی طرف دیکھا ۔ جو اسے پہلو سے بھینچے رکھنے کے باوجود دُور نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا ۔

"یہ خوشبو بہت تیز ہے ۔ یہ تمہارے جسم سے ہم آہنگ نہیں اور یہ

سرخی اونہوں اسے تمہارا جزو بدن ہونا چاہیے ۔ یہ انداز تمہاری طبیعت سے ہم رنگ نہیں ہے ۔ "اور یہ"

رنی نے جمائی لی ۔ ہمیں نیند آئی ہے ۔" وہ بولی ۔

" تو سو جاؤ" احمد نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا ۔ "تمہارے جسم میں رقص ہے ۔ لیکن" وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا ۔ "تم نے اسے اپنے اعضا میں منجمد کر رکھا ہے ۔ تمہارے انداز میں رقص نہیں، روانی نہیں ، جیسے تم نے اسے زبردستی روک رکھا ہو ۔"

جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر اکیلی پڑی ہے ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ معاً اسے یاد آیا ۔ ہاں وہ آیا تھا ۔ وہ اسے جُھلا رہا تھا ۔ تمہارے جسم میں رقص ہے ۔ ۔ یہ سرخی اونہوہ ۔

جب اسے معلوم ہوا کہ احمد جاچکا ہے تو اسے ہلکا سا صدمہ ہوا ۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ۔ بائیں صرف ساڑھے بارہ ۔ مایوسی میں وہ یوں لیٹ گئی گویا کسی نے اس کے جسم کے ہار سے تاکا کھینچ لیا ہو ۔ اور پُھول یہاں وہاں بکھر گئے ہوں ۔

اگلے دن جب وہ ہونٹوں پر سرخی لگارہی تھی ۔ کسی نے چپکے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا رنی یہ تمہارے جزو بدن نہیں ہوگی ۔ وہ رک گئی اور لپ سٹک میز پر رکھ دی ۔

رات کو جب وہ پلنگ پر بیٹھی تو یوں جھولنے لگی جیسے کوئی اسے جھلا رہا ہو ۔ میز پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ انجانے میں دائرے میں چننے لگی ۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی ۔

آپ کی مسکراہٹ بھیگی سی ہے ۔

وہ لیٹ گئی ۔ سرہانہ کھسک کر اس کی بغل میں پھسل گیا ۔ اُس نے اپنا منہ سرہانے میں گاڑ دیا ۔ کوئی اسے تھپکنے لگا ۔

پھر ایک شام کے جھٹپٹے میں جب وہ کھڑکی میں کھڑی ارد گرد پھیلے ہوئے مکانوں کو دیکھ رہی تھی ۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے دور تھے بہت دور ۔

"رفی ۔" اندھیرے میں سے اس کی آواز سن کر وہ چونک پڑی ۔
پچھلے چند ایک دنوں میں اُس نے وہ آواز کئی مرتبہ سنی تھی ۔ وہ گھبرا گئی ۔ کیا وہ آواز اس کے ذہن پر اس قدر مسلّط ہوچکی تھی ۔ اَن جانے میں اس نے ہونٹ نکال کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی ۔ نہیں آج اس نے سرخی تو نہ لگائی تھی ۔

رفی ۔ سایہ اس کے قریب آگیا ۔
اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی "آئیے آئیے" وہ بولی ۔
"میں سوچ رہا تھا اگر کوئی آپ کے ساتھ ایک مہینہ ٹھہرنا چاہے تو ۔"
"ایک مہینہ" رفی کے ماتھے پر پسینہ آگیا ۔
"کیوں اس میں کیا برائی ہے" ۔ احمد نے پوچھا ۔
"آپ اندر آئیے نا" وہ بولی ۔
"میرے پاس صرف پانچسو روپیہ ہے ۔ صرف پانچسو ۔"
"اندر تو آئیے آپ ۔"
"بسم اللہ ۔ بسم اللہ ۔" میراثی پانچسو کا نام سن کر چلانے لگا ۔
نہ جانے کیوں رفی کے دل پر ٹھیس لگی ۔ آپ آئیں بھی تو وہ بولی لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کھڑکی سے کود کر اُسے ڈھونڈے ۔ مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی حتیٰ کہ بتیاں روشن ہوگئیں ۔ اور بڑے کوچے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر دفعتاً اس کا سر چکرانے لگا ۔ اور وہ سر درد کا بہانہ بنا کر اوپر چلی گئی ۔
"مجھے بے حد افسوس ہے ۔" پاس ہی کوئی بڑبڑایا ۔ احمد کی آواز سن کر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی ۔
"آپ ہیں ۔"
"نہیں نہیں آپ آرام کیجئے ۔ میں پھر آجاؤں گا ۔"
"آئیے نا ۔" اس نے لپک کر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا ۔
"اچھا" ۔ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ۔ اور پھر جیب سے نوٹ نکال کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہنے لگا ۔ "صرف پانچسو ہیں ۔ بس یہی ہیں ۔ صرف ایک

مہینہ ۔"

اور آج اس کا آخری دن تھا ۔

سارا مہینہ اس نے رفی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے میں بسر کر دیا تھا ۔ وہ اس کے بازو سے کپڑا سرکا کر اسے چھوتا ۔ کتنا ملائم اور کس قدر شفاف ۔ خون کی جھلک صاف نظر آرہی ہے ۔ اور گوشت کس قدر جاندار ہے کتنی گرفت ہے اس میں" ۔ وہ مسلسل باتیں کرتا رہا تھا ۔ رفی کی باتیں اپنی باتیں زندگی خوشی اور غم کی باتیں ۔ شاید رفی اس کی بے تکی باتوں سے اکتا جاتی ۔ لیکن اس کا بازو رفی کو کمر سے تھامے ہوئے اسے اپنے پہلو سے چمٹائے رکھتا ۔ یا اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر اس کا گال تھپکتا رہتا ۔ " سمجھتی ہو رفی " ۔۔۔۔ وہ اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے پوچھتا ۔ "لیکن تم کیسے سمجھ سکتی ہو ۔ کیسے سمجھ سکتی ہو ۔ یہ زندگی بھرا جسم ۔ تم اس کی گرفت میں ہو ۔ تمہیں کیا پڑی کہ سمجھو ۔ سمجھنے کی لذت سے جینے کی لذت کہیں زیادہ ہے ۔ "

یونہی اس نے ایک مہینہ بسر کردیا تھا ۔ اور آج اس کا آخری دن تھا ۔

"رفی" وہ چلایا ۔ "کہاں چلی گئی ہو ۔"

"آگئی میں ۔" رفی چائے کا ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی ۔

"چائے ؟"

" وقت ہوگیا ہے نا ۔"

"اوہ "۔ وہ ہنسا ' تم نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں ۔ بیٹھو یہاں مجھے پریشان کرنے کے لئے تم میری عادتیں بگاڑ رہی ہو ۔" احمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ۔ "یہ چائے ہے ۔ اب کھانا ہے یہ مخملی جسم ہے ۔ یہ مخروطی ابھار ہیں ۔ یہ سب میری عادتیں بگاڑنے کے سامان ہیں ۔ تمہیں معلوم نہیں ۔" وہ ہنسنے لگا ۔ "تمہیں معلوم نہیں اور، اور تمہارے پاس ٹھہرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی ۔ اسی لئے میں یہاں آیا تھا ۔ اور وہی بات میں نے تم سے آج تک نہیں کی ۔ کوئی انتہا ہے حماقت کی ۔۔۔۔۔۔ جانتی ہو وہ کیا بات ہے ۔" اس نے آہ بھری" آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی کسی نے بھی نہیں ۔ مجھ میں وہ بات نہیں جو لڑکیوں کو مائل کرتی

ہے ۔ وہ جو ہر نہیں ۔ وہ چمک نہیں ۔ اسے جو چاہو کہہ لو ۔ وہ مجھ میں نہیں ۔ میری خالہ زاد تھی ۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہیں تھی ۔ اس میں کوئی بات ہی نہ تھی ۔ سارا دن چوکی پر بیٹھ کر سویٹر بننے میں لگی رہتی تھی ۔ اور میں پاس چلا جاتا تو بالکل ہی نگاہیں سویٹر میں گاڑ لیتی کمبخت کو سر اٹھانا بھی گوارا نہ تھا ۔ ایک دن میں نے اسے کہہ دیا ۔ میں نے کہا ۔ ثریا تمہارا جسم کس قدر خوبصورت ہے ۔ جیسے بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہوں ۔ وہ سمٹ گئی ۔ اور پھر گھور کر میری طرف دیکھا ۔ جیسے میں نے نہ جانے کتنا بڑا گناہ کر دیا تھا ۔ اس کے بعد وہ میرے پاس کبھی نہیں بیٹھی کبھی نہیں ۔ اور پھر سعید آگیا ۔ سعید میرا ماموں زاد ہے ۔ اور دو ہی دن میں نہ جانے اُس نے کیا کر دیا ۔ کہ وہ دونوں الگ بیٹھ کر سرگوشیاں کرنے لگے ۔ نہ جانے سعید میں کیا ہے ۔ اسے لڑکیوں کو راغب کر لینے میں کمال حاصل ہے ۔ اس میں وہ چیز ہے جس سے میں بالکل محروم ہوں ۔ اگرچہ دیکھنے میں اس کی شکل بے حد عامیانہ ہے بے حد عامیانہ کبھی کبھی تو گھن آتی ہے ۔ اسے دیکھ کر ۔

پھر وہ کالج میں مس اختر تھی ۔ اسے تو مجھ سے چڑ تھی جانے کیوں میں نے کئی ایک مرتبہ اسے غور سے دیکھا تھا ۔ اس پر وہ بہت بپھرتی ۔ غصے سے اس کا منہ لال ہو جاتا ۔ پھر وہ نفرت سے منہ موڑ لیتی ۔ آخری دنوں میں تو اس نے میری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا ۔ کسی دوسرے لڑکے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے نیچی نظر سے میری طرف دیکھتی ۔ جیسے مجھے جلانے کی کوشش کر رہی ہو ۔" وہ ہنسنے لگا ۔

"عجیب ہوتی ہیں یہ لڑکیاں ۔ نفرت جتانے میں کس قدر تیز ہوتی ہیں ۔" اس نے آہ بھری ۔

"لیکن تم ان باتوں کو کیسے سمجھ سکتی ہو ۔ تمہیں کیا معلوم ۔"

"کیوں" اس نے نیچی نگاہ سے اسے دیکھا ۔

"تمہارے لئے تو ہر مرد بٹوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔"

"اچھا ۔" رفی کی آواز مدھم پڑ گئی ۔

"مجھے تو محبت بھرا لمس چاہئے جذباتی لمس ۔ ذہنی لمس ۔ جسمانی لمس ۔"

"اچھا۔" وہ اس کے قریب تر ہوگئی۔

"لیکن مجھ میں وہ بات نہیں۔ جس سے لڑکیاں متاثر ہوتی ہیں۔" وہ خاموش ہوگیا۔

"اور" دفعتاً وہ بولا۔ "بہت تنگ جگہ ہے۔ تمہارے لئے وہ پیچھے سرکتے ہوئے کہنے لگا۔ ادھر سرک لو۔ اور ادھر اطمینان سے بیٹھ کر میری کتھا سنو۔ بڑی لمبی کتھا ہے ۔۔۔۔۔۔ اچھا رفی پہلے یہ بتاؤ بات کیا ہوتی ہے جو لڑکیوں کو متاثر کرتی ہے۔ میرا مطلب ہے مرد میں ۔۔۔"

وہ بے پروائی سے سبز رومال کی طرف دیکھنے لگی۔

"بڑی بے پروائی سے بیٹھی ہو۔ وہ گنگنایا۔ ہاں تمہیں ان باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں مجھے کیا رفی کی آواز میں تلخی تھی ۔۔

"جو خوشی بیچے اسے غم سے کیا تعلق۔ اور جو غم سے آشنا نہیں۔ اسے خوشی سے کیا واسطہ" وہ خاموش ہوگیا۔

وہ پچھے سے کھیلنے میں مصروف ہوگئی۔

"رفی" وہ بولا۔ "اس دھندے میں پڑ کر نسائیت کیوں ختم ہو جاتی ہے۔"

رفی نے آن جانے میں پلنگ سے لٹکتے ہوئے ہار کا تاگا توڑ دیا۔ اور گرتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"ہنستی کیوں ہو" اس نے رفی کو قریب تر کھینچتے ہوئے کہا۔

"اور کیا روؤں۔ رفی نے مسکرا کر کہا۔

"رفی کیا تم رو سکتی ہو۔"

رفی نے نگاہ بھر کر اس کیطرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔ اور پھر دوسری طرف منہ موڑ لیا۔

"بہت کم لوگ رو سکتے ہیں۔ بہت کم لوگ۔"

"آپ؟" رفی کی نگاہ میں نفرت کی ہلکی سی جھلک تھی۔

"میں"۔ ایک ساعت کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"شکر ہے میں رو نہیں سکتا ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔"

"ہاں"۔ اس نے لمبی آہ بھری ۔

"ہے نا ۔" احمد چمکا ۔

رفی نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

"شکر ہے تم اتنا تو سمجھتی ہو ۔ لیکن اس میں تمہارا کیا قصور۔ ماحول ۔ شور مچاتا ہوا طبلہ ، چیختی ہوئی سارنگی اور "ماندڑے ڈیرے آجا۔" بلاتی ہوئی آنکھیں ۔ دیا بجھانے والا پلو ۔ اس کے بعد گھپ اندھیرا تو ہونا ہی ہوا ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جھولنے لگا ۔

"عجیب بات ہے ۔" وہ آپ ہی بڑبڑانے لگا ۔ "اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس پانچسو اور ہو ۔"

رفی بے تابی سے سبز رومال کو گھورنے لگی ۔ جس میں نہ جانے کیا لپٹا ہوا تھا ۔

"حماقت" وہ ہنسا ۔

"اور کیا"۔ وہ مسکرانے لگی ۔ حماقتیں تمہیں پیاری ہوں گی ۔ وہ روپے کا روپ دھار لیتی ہیں نا ۔"

"اوہ" وہ اٹھ بیٹھی اور سبز رومال کو اٹھا کر اس سے کھیلنے لگی ۔

میں نے کہا۔ بائی ۔ باہر سے میراثی کی آواز آئی ۔

"کون ہے" رفی نے پوچھا ۔

"میں نے کہا" میراثی اندر داخل ہوتے ہوئے بولا ۔ "سیٹھ صاحب آئے ہیں ۔ دو گیت سننے کے لئے کہتے ہیں وہ" میں نے تو کہا تھا پر وہ تکرار کئے جا رہے ہیں ۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو ۔ وہ رک گیا ۔ اوہ رفی چونک کر بولی ۔ اور پھر احمد کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ۔ طبیعت اچھی نہیں ۔ "

اوہ ۔ احمد اٹھ بیٹھا ۔ "میری طبیعت کی فکر نہ کرو ۔ میں اچھا بھلا ہوں ۔ ہمیشہ یہاں رہتا تو نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں ۔" وہ چلائی

"ٹھیک ہے ۔" وہ ہنسا کیسے ممکن ہے ہمیشہ یہاں رہنا پھر پانچسو

روپیہ ۔

"اوہ ۔" رفی نے وہ سبز رومال احمد کی طرف بڑھا دیا ۔ میری طرف سے" وہ رک گئی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو ۔

"ہوں ۔ وہ ہنسا یہ نشانی ہے ۔ تاکہ پھر آنے پر اکسائے ۔ پانچسو جمع کرنے پر مائل کرے ۔"

رفی نے رومال پلنگ پر پھینک دیا ۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

"اچھا میں جاتا ہوں ۔" احمد نے آہ بھری ۔

"مگر ۔۔۔۔" وہ رک گئی ۔

"ایک دن اور رہ لوں تو بھی کیا ۔ کاش تم سمجھ سکتیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے" وہ پھر ہنسنے لگی ۔

"ہاں ہاں ہنسو"۔ وہ مسکرایا ۔ "ہنسنے سے ہی تو ہوتا ہے نا ۔" اور وہ سیڑھیاں اترنے لگا ۔

اندھیری گلی میں چلتے ہوئے احمد کو دور سے ساز کی آواز سنائی دی ۔ اور پھر کوئی چیخ چیخ کر گانے لگی ۔ "ہنستے ہنستے جینا"۔ وہ مسکرایا ۔ "اور میں محبت خریدنے گیا تھا ۔ احمق !"

○

موقعہ

قاسم اور شہزاد پہلے دو روز تو جام کے منظر کی دلفریبی میں کھوئے رہے ۔ قاسم بے اختیار کھڑکی سے سر نکال کر دیکھتا ۔ اُف یہ سبز بلوری جام !! ضدی! ذرا دیکھو تو جھیل کا پانی آبِ حیات کی طرح چمک رہا ہے ۔ آؤ نا ضدی ۔ وہ دیکھو ۔ چاروں طرف ٹیلوں پر دیودار کے اونچے ، لمبے درخت یوں استادہ ہیں جیسے آب حیات کی حفاظت کے لئے دیو چوکیدار کھڑے ہیں ۔ اُف! ــــــــ کیوں ضدی !؟" ــــــ وہ شہزاد کے شانے جھنجھوڑ کر اضطراب سے پوچھتا ۔ "ہاں" وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی ۔ اس کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی جھلکتی ۔ اور ۔ وہ ۔۔ وہ دیکھو جھیل کے کنارے پر چینی ساخت کا چھوٹا سا محل دیکھ رہی ہو نا ؟" "ہاں" وہ سرسری نظر ڈال کر پھر اپنی جگہ پر سرک جاتی ۔ اور قاسم اپنی ہی دُھن میں کہے جاتا ۔ "جیسے دیوتاؤں نے زندگی کی دوشیزہ کو لا کر محل میں قید کر رکھا ہو ۔" جذبات کی شدت سے مضطرب ہوکر وہ دیوانہ وار کمرے میں گھومنا شروع کر دیتا ۔ جیسے وہ مختصر سا کمرا ایک لق و دق صحرا ہو ۔ "اب میں کیا کروں! اب میں کیا کروں !!" وہ بڑبڑاتا ۔ اور بالآخر دروازے سے باہر نکل کر پھر سے منظر کو دیکھ کر چلانے لگتا ۔ اف ! یہ سبز پیالہ ۔ رنگ بھرا پیالہ ، ضدی ضدی !! "وہ شہزاد کو پیار سے ضدی کہا کرتا تھا ۔" ضدی کیا بن رہی ہو تم ۔ فضول ۔ اٹھو بھی نا !!"

انہیں جام آئے ہوئے ابھی صرف دو دن ہوئے تھے ۔

ڈلہوزی سے جام کی طرف آتے ہوئے اس گھبرائی ہوئی ، کھوئی ہوئی ڈنڈی پر چلتے چلتے سر سبز مگر سنسان ٹیلوں تلے تنگ گھاٹیوں کو رینگتے دیکھ کر ڈھکے چھپے کوہستانی چشموں کی مسلسل کراہ سن سن کر ان ٹیڑھی ، بل کھاتی ہوئی چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر جو پہاڑی سے شاخوں کی طرح پھوٹ کر اِدھر اُدھر نکل جاتی تھیں ۔

اور جن کے پیچ و خم میں نگاہ مقید ہو کر رہ جاتی تھی، قاسم اور شہزاد پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی ۔ ایک بے نام اضطراب ایک غم زدہ مسرت ، ایک تکلیف دہ ہیجان ۔

شہزاد پالکی میں بے حد مضطرب تھی ۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ۔ پھر سہم کر اپنا سر ٹیک دیتی اور ان قلیوں کو گھورنے لگتی جو پالکی اٹھائے جارہے تھے ۔ اُن کی رفتار میں پُراسرار روانی تھی ۔ چہرے خیال یا جذبے کی چمک سے کورے تھے ۔ منہ کی کرختگی اور جھریوں کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا جیسے انہیں زندگی سے دور کا تعلق بھی نہ ہو ۔ جیسے وہ کوئی غول بیابانی ہوں ۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ شہزاد کے دل میں خیال پیدا ہوتا کہ وہ مر چکی ہے اور وہ عجیب و غریب شکلیں اسے اٹھائے نہ جانے کہاں لئے جارہی ہیں ۔ زمان ومکان سے دور ۔ حیات وممات سے دور ۔ اس خیال پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور کسی اور طرف دیکھنے لگتی ۔

سامنے عجیب و غریب پودوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں پر پگڈنڈیاں ہونک ہونک کر چڑھے جارہی تھی ۔ اونچے لمبے درختوں تلے پُر اسرار سائے دبکے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے ۔ دوسری طرف بے پناہ گہرائیاں محسوس کرکے اس کے دل میں ہول سے اٹھتے ۔ دل دھک دھک کرنے لگتا ۔ اور ہتھیلیوں میں وہی پرانی سرسراہٹ محسوس ہونے لگتی ۔ ہتھیلی کو ہاتھ سے دباتے ہوئے وہ چوری چوری قاسم کی طرف دیکھتی اور ہاتھوں کو چھپائے رکھنے کی کوشش میں لگ جاتی ۔ قاسم اپنے خیال میں مگن چلا جارہا تھا ۔ وہ محسوس کررہا تھا ۔ جیسے وہ بے ڈھب اور ویران پہاڑیوں کے چکر میں پھنس گیا ہو ۔

دفعتاً ڈنڈی نے چکر کھایا ۔ اور وہ پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے ۔ "ہائیں !!" فرطِ حیرت سے قاسم کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ چوٹی کی وسیع پیالہ نما کوکھ پر مخملی گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا ۔ جس کے عین درمیان میں ایک چھوٹی سی جھیل کا نقرئی پانی یوں چمک رہا تھا جیسے وہاں سے سورج طلوع ہونے والا ہو ۔ جھیل کے اردگرد چاروں طرف سبز پیالے کی دیواروں پر دیوودار نشے سے سرشار گویا جھوم ناچ رہے تھے ۔ "ضدی" قاسم چلّایا "ضدی" وہ ۔ وہ دیکھو ۔ ادھر !! اف !!!"

جام کو دیکھ کر وہ اچنبھے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا ۔ اُسے بھول گیا تھا ۔ کہ وہ سات بہنوں کا واحد بھائی ہے ۔ اور اس کے والد نو افراد کی کفالت کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر راہیٔ ملک عدم ہو چکے ہیں ۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کی بڑی بہنوں اور ماں کو دل کا روگ لگا ہوا ہے اور وہ شہزاد کو وہاں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے لایا ہے تاکہ چیلوں اور دیوداروں کے پتوں میں چھنی ہوئی ہوا اسکے دل کو تقویت پہنچائے ۔ تاکہ کہیں شہزاد بھی زبیدہ اور ثریا کیطرح دائم المریض نہ ہو جائے ۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیاری بہن شہزاد مریضہ ہے ۔

شہزاد کو مریضہ سمجھنا ، ایسا ہی ناممکن تھا جیسے سورج کو داغدار سمجھنا ۔ اگر آپ شہزاد کو دیکھ پاتے تو چلتے چلتے رک جاتے ۔ ایک ساعت کے لئے قطعی بھول جاتے کہ آپ کہاں جارہے ہیں ۔ یا۔۔۔۔۔ لیکن شہزاد کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے رک جانے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ۔ کیونکہ وہ ایسے خاندان کا چشم و چراغ ہے ۔ جس کے افراد عورتوں کے بازار میں چلنے پھرنے کو باعث ننگ سمجھتے ہیں ۔ شاذونادر کہیں باہر نکلنا بھی ہوتا ۔ تو برقعے میں لپٹ لپٹا کر اور برقع بھی جو خیمہ نما ہونے کے علاوہ جسم کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتا ہے ۔ اس کے خم و پیچ کو واضح نہیں کرتا ۔ پہاڑوں کے اس ویرانے میں بھی شہزاد کو یہ نہ سوجھا تھا کہ یہاں برقعہ اٹھا کر چلنے کا امکان ہے ۔ برقعہ اٹھانا تو الگ رہا ۔ اسے تو کوئی ایسی حرکت بھی گوارا نہ تھی جو آنے جانے والوں کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ ایسی صورت میں اگر آپ اسے سڑک کے کسی کنارے پر چلتے ہوئے دیکھ پاتے تو ایک نگاہ غلط انداز کے بعد منہ موڑ کر پرلی طرف اٹھلاتی ہوئی مس صاحبہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ۔

کوٹھے پر سے بھی شہزاد کو ایک نظر دیکھنا آسان نہ تھا ۔ ان کا مکان بہت اونچا تھا ۔ اور چاروں طرف قد آدم پردے تھے ۔ کھڑکیاں تو گویا تھیں ہی نہیں ۔ کیونکہ مکان کی کھڑکیوں کو کسی نے کبھی کھلتے نہ دیکھا تھا ۔ بالفرض محال اگر آپ کوٹھے پر سے اسے دیکھ بھی پاتے تو پیشتر اس کے کہ آپ اسے غور سے دیکھنے کے لئے سنبھلتے ، وہ آپ کی طرف دیکھے بغیر نظریں جھکائے گزر جاتی ۔

دیکھنا تو جب ہوتا ہے جب وہ بھی آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے ۔ لیکن چاہے ایک ثانیہ کے لئے ہی ہو ۔ چاہے عدم توجہی کی اوٹ سے ہی دیکھا جائے ۔ چاہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھے ۔ لیکن دیکھے ضرور ۔ اور خود نہ بھی دیکھے تو کم از کم اسے یہ احساس تو ہو کہ اسے دیکھا جارہا ہے ۔ اس کے بغیر آپ قد دیکھ لیں گے ۔ رنگ دیکھ لیں گے ۔ خدوخال دیکھ لیں گے شاید آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں بھی دیکھ لیں ۔ لیکن آپ کو یہ احساس نہ ہوگا ۔ کہ آپ نے کسی کو دیکھا ہے ۔

گذشتہ چند ماہ کے اندر اندر شہزاد پر یوں جوانی چھاگئی تھی جیسے ساون میں دیکھتے دیکھتے آسمان پر گھٹائیں چھا جاتی ہیں ۔ دیکھتے دیکھتے اس کے جسم میں اک جوار بھاٹا اٹھا اور جسم کے پیچ و خم نمایاں ہوگئے ۔ بند بند میں شگفتگی دوڑ گئی ۔ سفیدی میں سرخی کی جھلک آگئی ۔ اعضاء میں تناؤ لہریں لینے لگا ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی نگاہیں جھکی جھکی اور انداز گھٹا گھٹا ہی رہا ۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا صبر آزما شباب اس سے انتقام لے رہا ہو ۔

پھر ایک روز جب قاسم اتوار کی چھٹی پر گھر آیا اور چپ چاپ رہائشی کمرے میں جا گھسا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ "ضدی" وہ حیرت سے چلایا ۔ لتاں ۔"

شہزاد چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ماں ، زبیدہ اور ثریا اس کے اردگرد بیٹھی تھیں اور اس کے ہاتھ دبا رہی تھیں ۔ ماں قاسم کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی ۔ پھر سنبھل کر بولی ۔ "کچھ بھی نہیں ، ذرا دل کمزور ہے ۔"

"دل کمزور ہے" قاسم نے حیرانی سے دہرایا ۔ سبھی کا دل کمزور ہے کیا ۔

دل کی کمزوری سے اسے چڑ تھی ۔ دل کی کمزوری کی بات سن کر وہ غصے میں آجاتا تھا ۔ اور ماں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتا ۔ نہ جانے ماں کیا سازش کررہی ہے ۔

قاسم کے بدلے ہوئے تیور بھانپ کر ماں اٹھ کھڑی ہوئی اور کھینچ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی ۔ اور حسبِ عادت بولی "تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ۔ کہا جو ہے لڑکی کو دل کی کمزوری کی شکایت ہے ۔"

"لیکن کیوں، وہ چلایا میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں ۔"

"نہ نہ !" ماں نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔" میں اس گھر میں ڈاکٹر نہ آنے دوں گی ۔"

"لیکن ضدی جو بیمار ہے ۔" قاسم جھلا کر بولا ۔

"ڈاکٹر کیا جانیں عورتوں کی بیماریوں کو ۔" ماں نے پُراسرار تبسم سے کہا ۔ اور ان کی دوائیاں اللہ ماری خالص گرمی اور خشکی ۔ لڑکی کا مزاج تو پہلے ہی صفراوی ہے ۔"

"لیکن اماں علاج نہ کراؤ گی تو ۔۔۔۔۔"

"اپنے حکیم صاحب کا علاج جو کروا رہی ہوں ۔" ماں نے قاسم کی بات کاٹ کر کہا ۔

"حکیم صاحب کا" قاسم نے برا سا منہ بنا لیا ۔

"تم تو خواہ مخواہ فکر کرتے ہو" وہ ہنسی ۔ ذرا سی تکلیف ہے ابھی آرام آجائے گا ۔ اس روز قاسم نے شدت سے محسوس کیا کہ ماں واقعی کوئی چال چل رہی ہے ۔ اس سے کوئی راز چھپا رہی ہے لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا ۔ گھر میں صرف ماں کی چلتی تھی ۔ بہنیں بھی تو صرف ماں کی ہاں میں ہاں ملانا جانتی تھیں ہر بات پر ماں کا ساتھ دیتی تھیں چاہے قاسم انہیں کے بھلے کی بات کہتا ۔ لیکن وہ اسکی بات کو خاطر میں نہ لاتی تھیں ۔ ان حالات میں ماں کے خلاف شکائت کرنا بے کار تھا ۔ اس لئے قاسم کسمسا کر چپ ہو رہا اور پھر دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ قاسم جانتا تھا کہ ماں لڑکیوں کے معاملات پر یوں پردہ ڈال دیتی ہے جیسے مرغی بچوں کو پروں تلے چھپا لیتی ہے ۔ قاسم کو اس بات پر ماں کے خلاف غصہ محسوس ہوتا ۔ اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ماں نہیں بلکہ جادوگرنی ہے ۔ جس نے جادو کے زور سے اس کی بہنوں کو بکریاں بنا رکھا ہے ۔ یہ محسوس کرکے وہ غصے سے پیچ وتاب کھاتا ۔ پھر گھبرا کر باہر نکل جاتا اور کوئی نہ کوئی دل بہلاوے کا سامان پیدا کر لیتا ۔ اور پھر چھٹی ختم ہو جانے پر واپس لاہور جا کر دفتر کے کام میں کھو جاتا ۔ اور اس دلخراش احساس سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ۔

اپنی ماں کے خلاف پہلی مرتبہ اس نے اس روز غصہ محسوس کیا تھا ۔ جب زبیدہ کی شادی کا پیغام آیا تھا ۔ اس روز اتفاق سے وہ گھر آیا ہوا تھا ۔ جب اس نے سنا کہ ظہیر صاحب کی طرف سے زبیدہ کے رشتے کے لئے پیغام آیا ہے تو اسے بے حد خوشی ہوئی ۔ اس کی خواہش تھی کہ جلدازجلد دونوں بہنوں کی شادیاں کردی جائیں ۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ماں نے بات ٹال دی ہے تو وہ غصے سے تڑپ اٹھا ، اور ماں پر برس پڑا ۔ ماں نے بات ہنسی میں ٹالنا چاہی ۔ "اے ہے آنکھیں کیوں دکھاتے ہو مجھے ۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کا ایسا شوق بھی کیا ۔ اس کی عمر ہی کیا ہے ؟"

"اماں!" وہ چلایا "تم نے خواہ مخواہ عمر کا ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ کیا میں جانتا نہیں کہ وہ ۲۵ سال کی ہوچکی ہے ۔"

ماں یہ سنکر جلال میں آگئی بولی ! "توکیا لڑکی کو چار کپڑوں میں گھر سے نکال دوں ۔ برادری والے کیا کہیں گے ۔ سسرال میں کیا عزت رہ جائے گی ۔ عمر ضائع ہونے کا اتنا ہی خیال ہے تو کہیں سے کما کر کیوں نہیں لاتے ۔ آخر تمہیں نے ان سب کے بیاہ کرنے ہیں ۔ ایک پر چار ہزار کا خرچ ہو تو کل ۲۸ ہزار روپیہ چاہیئے ۔ اللہ رکھے سات بہنوں کے اکیلے بھائی ہو وہ تو کچھ چھوڑے بغیر چپکے سے سدھار گئے ۔ ان سات چڑیلوں نے مجھے دن رات روگ لگا رکھا ہے ۔ ہر گھڑی ان کی فکر میں گھلتی رہتی ہوں ۔ اس پر تم بھی آنکھیں دکھاتے ہو"۔

"اٹھائیس ہزار ۔۔۔۔۔۔۔۔ !" قاسم سکتے میں رہ گیا ۔

اس نے ہر ممکن طریقے سے ماں کو سمجھانے کی کوششیں کیں ۔ دلیلیں اور مثالیں دے کر اسے سمجھایا ۔ مسلے مسائل بیان کرکے اسے یقین دلانے کی ترکیب نکالی ۔ سیرۃ النبیؐ میں سے کئی ایک ٹکڑے پڑھ کر سنائے اس پر بھی ماں کی رائے نہ بدلی تو منتیں کرنے لگا کہ ناک کی خاطر لڑکیوں کی زندگی تباہ نہ کرے ۔ لیکن ماں نے اس کی ایک نہ سُنی ۔ پھر وہ مایوس ہو کر خاموش ہو گیا ۔ اس کی نگاہ میں ماں کی شکل بدلنے لگی ۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ ماں کے رویے میں وہ جادوگرنی ہے اور وہ جادو کی بکریاں اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہوں ۔ اسے اپنی ماں سے نفرت ہوگئی ۔ زبیدہ اور ثریا کو وہ شک کی

نظر سے دیکھنے لگا ۔ اس روز سے اس کی تمام تر محبت شہزاد پر مرکوز ہوگئی ۔ جو ان دنوں محض ایک بھولی بھالی بچی تھی ۔ اور زبیدہ اور ثریا کی طرح ماں کے کال سے کال جوڑ کر گھسر پھسر کرنے کی عادی نہ تھی ۔

جب کبھی وہ گھر آتا تو ماں، زبیدہ اور ثریا میں سے کسی نہ کسی کو ضرور چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھتا اور باقی دونوں کو اس کے پاس بیٹھ مٹھی چاپی کرنے میں مصروف پاتا ۔ کمرے کے دروازے بند ہوتے ۔ وہ تینوں سر جوڑ کر باتیں کیا کرتیں ۔ جیسے کوئی سازش کر رہی ہوں ۔ ایسے وقت میں بچوں کو خاص ہدایت ہوتی کہ کمرے میں داخل نہ ہوں اور کوئی ملنے والی آجائے تو اسے دوسرے کمرے میں بٹھا کر ماں کو اطلاع کر دیں ۔۔۔۔۔۔۔ دو ایک بار قاسم نے کوشش کی تھی کہ اس انوکھی پُراسرار تیمارداری کی حقیقت معلوم کرے ۔ ماں نے پہلے تو رازدارانہ انداز سے منہ پر انگلی رکھ کر کہا ۔ "لڑکی کی طبیعت اچھی نہیں ۔" قاسم کے مزید اصرار پر وہ چڑ کر بولی ۔ "اب میں تمہیں کیا بتاؤں کیا ہوتی ہیں عورتوں کی تکلیفیں ۔" یہ کہہ کر وہ پھر بند کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ دو ایک مرتبہ اس نے زبیدہ اور ثریا سے پوچھنا چاہا ۔ لیکن وہ دونوں اس کی بات سن کر مسکرا دیتیں ۔ اور پھر کام میں لگ جاتیں ۔ ان کی مسکراہٹ میں تمسخر کی جھلک ہوتی جسے محسوس کرکے اس کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ۔ حتٰی کہ اس کے لیے ان دونوں سے بات کرنا بھی ناگوار ہوگیا تھا ۔ جوں جوں وہ ان تینوں سے مایوس ہوتا گیا ، توں توں اس کے دل میں شہزاد کی محبّت بڑھتی گئی ۔

لیکن اس روز شہزاد کو چارپائی پر لیٹے اور ان تینوں کو اس کے گرد حلقہ ڈالے دیکھ کر وہ سر پیٹ کر رہ گیا ۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایک دن شہزاد پر بھی ماں کا جادو چل جائیگا اسے یقین تھا کہ شہزاد زبیدہ اور ثریا کی طرح بھیگی بلی نہیں ہے ۔ اس کی طبیعت سازشوں سے پاک ہے ۔ اس کی نفسیت میں کوئی الجھاؤ نہیں ۔

اس روز اس کے دل میں ایک خاموش ارادہ قائم ہوگیا ۔ وہ شہزاد کو ماں کے ہاتھ کی کٹ پتلی نہیں بننے دے گا ۔ اُسے اس جادوگرنی کی گرفت میں نہیں

آنے دے گا ۔ چونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ماں کے خلاف آواز اٹھانا بیکار ہے ۔ اس لئے وہ خاموش ہو رہا ۔ اس خاموشی نے اس کے ارادے کو اور بھی تقویت پہنچائی ۔ اور وہ شہزاد کو بچانے کے لئے تجویزیں سوچنے لگا ۔

اس کے بعد قاسم نے شہزاد کو اپنے اثر میں لینے کی کوششیں شروع کردیں ۔ بہانے بہانے اس نے شہزاد کو لاہور لے جانے کی کوشش کی لیکن وہ رضامند نہ ہوئی ۔ اس کی نارضامندی اس قدر مبہم ہوتی کہ اسے انکار سمجھنا بھی ممکن نہ ہوتا ۔ ہنس کر کہتی ۔ "ہم سب کو لاہور لے چلئے نا ۔ صرف مجھے ہی کیوں ۔" اس بات پر قاسم نے مناسب عذر پیش کئے ۔ لاہور میں اتنا بڑا گھر کہاں سے ملے گا ۔ جس میں ہم سب سما سکیں ۔ مناسب جگہ ملنے پر سبھی کو لے جاؤں گا لیکن اس وقت تو تم چلو نا ۔ صرف تم" "تو صرف اماں کو بھی ساتھ لے جائیں ۔" وہ ہنستی "اماں کو لے جانے سے فائدہ ۔" قاسم نے جواب دیا ۔ "کیوں؟ کیا وہ کھانا نہ پکا سکے گی ۔" شہزاد بولا ۔ "بوڑھی جان کو تکلیف دینا؟" اور وہ ہنسنے لگی ۔ "یہاں تو پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہے ؟" قاسم چڑ گیا ۔ "بڑی ضدی ہو تم ۔ ضدی میں تمہاری ضد توڑ کر رہوں گا ۔" قاسم اس کے شانے جھنجھوڑنے لگا ۔ اور وہ ہنسنے لگی ۔ اس کے بعد اس نے شہزاد کو سیرو تفریح اور کھیلوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ۔ شاید اس کے بعد وہ شہزاد سے مایوس ہو جاتا ۔ مگر اس کے انکار کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہوتی کہ اسے انکار سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا ۔ اس کی لطیف اور خاموش مسکراہٹ ۔ قاسم کے دل میں امید کی ان جانی کرن روشن کر دیتی تھی ۔ اسی لئے اس کے مسلسل انکار کے باوجود قاسم کے دل میں شہزاد کی محبت جوں کی توں قائم رہی ۔

پھر ایک مرتبہ جب وہ گھر آیا تو باتوں ہی باتوں میں ماں کے منہ سے وہ بات نکل گئی ۔ "حکیم صاحب نے کہا ہے اگر لڑکی کو پہاڑ پر لے جایا جائے تو شاید طبیعت سنبھل جائے ۔" یہ کہتے ہوئے ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ "یہاں مشکل سے گزارہ ہوتا ہے ۔ پہاڑ پر جانے کی توفیق کہاں ۔" قاسم کے دل میں مرجھائی ہوئی امید پھر سے لہلہا اُٹھی ۔ شہزاد سے ماں کا اثر دور کرنے کی امید پر

وہ بلا سوچے سمجھے بولا ۔ "میں اسے پہاڑ پر لے جاؤں گا میں ۔۔۔۔۔ !" ماں کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی بہن کو پہاڑ پر لے جانے کے لئے تیار ہو جائے گا ۔ کل ایک سو روپیہ تو اس کی تنخواہ تھی ۔ جس میں سے پچاس روپے وہ اپنی ذات پر خرچ کرتا تھا ۔ اور پچاس روپے گھر دیا کرتا ۔ پچاس روپے میں اس کا اپنا گزارہ نہ ہوتا تھا ۔ وہ تو شکر ہے اسے فضول خرچی کی عادت نہ تھی ورنہ نہ جانے ان کا کیا حال ہوتا ۔ اس صورت میں وہ بہن کو پہاڑ پر کیسے لے جاسکتا تھا ۔ ماں کی حیرانی بجا تھی ۔ بولی "آخر مجھے بھی معلوم ہو ۔ کہ روپیہ کہاں سے آئے گا ؟"

"روپے کا انتظام ہو جائے گا ۔" وہ بے پروائی سے بولا ۔

"لیکن ہو گا کیسے"

"روپے کی تو ضرورت ہی نہیں ۔" قاسم نے پینترا بدلا ۔ صرف کرایہ چاہیئے ۔

"تو کیا وہاں جا کر بھیک مانگو گے ۔" ماں ہنس پڑی ۔

"وہاں میرا دوست رہتا ہے ۔" معاً اسے سوجھی ۔

"دوست ۔" ماں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ "بہن کو دوست کے ہاں لیجاؤ گے ؟"

اسے دوست کے لفظ سے چڑ تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی ۔ کہ دوست بدمعاش کا دوسرا نام ہے ۔

"واہ! ماں ۔" قاسم نے اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔ "وہ اکیلا رہتا ہے کیا وہاں ؟ گھر بار ہے بال بچے ہیں ۔"

یہ سنکر ماں نے بھی پہلو بدلا ۔ "تو پھر میں بھی ساتھ چلتی ہوں"

قاسم گھبرا گیا ۔ "نہیں نہیں اماں ! کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا اچھا نہیں ۔

ماں لڑکی کو بھائی کے ساتھ اکیلے بھیجنے سے گھبراتی تھی ۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ انکے ہمراہ جائے ۔ جب اس نے دیکھا کہ قاسم رضامند نہیں ہوتا تو سرے سے بات ٹالنے کی کوشش کی ۔ لیکن قاسم اپنی ضد پر بدستور اڑا رہا ۔ آخر وہ چاروں بند کمرے میں جا بیٹھیں اور سر سے سر جوڑ کر نہ جانے کیا کیا

باتیں کرتی رہیں ۔ یہ دیکھ کر قاسم غصے سے بھوت بن گیا ۔ اس نے باآواز بلند گھر والوں کو صلواتیں سنانا شروع کردیں ۔ شور سن کر ماں بھاگی بھاگی آئی ۔ خدا کے لئے ساری دنیا کو تو نہ سناؤ ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ اڑوس پڑوس والے سُن کر کیا سمجھیں گے ؟"

"میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ سنیں" قاسم غرّایا ۔ انہیں معلوم ہو کہ تم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو ۔ تم ان ناسوروں میں پیپ بھر رہی ہو ۔"

یہ سن کر ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اس پر بے حد ہنگامہ برپا ہوا اور بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ ماں شہزاد کو پہاڑ پر بھیجنے پر تیار ہوگئی ۔ قاسم چھٹی لینے کے لئے لاہور چلا گیا اور وہ سب شہزاد کو لے کر بند کمرے میں داخل ہوگئیں ۔ اور اسے مناسب ہدایات دینے لگیں ۔

کچھ دیر تک تو قاسم اس شاندار فتح پر خوشی سے پھولا نہ سمایا ۔ پھر دفعتاً اسے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ بہن کو لے جائیگا کہاں ۔ وہ گھر بار اور بال بچوں والا دوست تو محض بہانہ تھا ۔ پہاڑ پر جانے کے لئے روپے کی ضرورت تھی ۔ اور اس کے پاس تو صرف بارہ آنے کی بچی ہوئی رقم تھی ۔ قرض ! اس نے سوچا ۔ اتنا قرض اسے کون دے گا ۔ دو روپے مانگنے کی بات اور تھی ۔ لیکن اتنی رقم ۔ اور اگر انتظام نہ ہوا تو ۔ ماں کیا کہے گی ۔ گھر والے اس کا مذاق اڑائیں گے ۔ لیکن انتظام کیسے ہوگا ۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ لاہور جا پہنچا ۔

لاہور پہنچکر وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومتا رہا ۔ کسی سے براہِ راست صاف بات کرنے کی اُسے ہمت نہ پڑی ۔ ہاں سرسری طور پر کسی سے ہل سٹیشن کے اخراجات کے متعلق پوچھتا ۔ بہانے بہانے پہاڑ کی بات چھیڑ دیتا ۔ اور پھر غفور سے سنتا رہتا ۔ وہ ہل سٹیشن کے اخراجات سنکر یقیناً مایوس ہوگیا ہوتا ۔ اگر اتفاق سے اختر سے ملاقات نہ ہو جاتی ۔

اختر سے نہ رہا گیا بولا ۔ "بات کیا ہے آخر ؟ یہ جو تم ہل سٹیشن کا قصہ لئے بیٹھے ہو ۔ وہاں جانے کا ارادہ ہے کیا ؟"

"نہیں نہیں !" وہ گھبرا گیا ۔ "میرا مطلب ہے ممکن ہے کبھی جانا

پڑے ۔"

"ممکن ہے جانا پڑے ۔ کیا مطلب ہے تمہارا بھئی صاف بات کرو تو کچھ پتہ بھی چلے ۔"

"میرا مطلب ہے میرا مطلب یعنی ۔ ہمشیرہ بیمار ہے ۔"

"ہمشیرہ بیمار ہے ؟" اختر فکر میں پڑگیا ۔ "تو پھر فوراً لے جاؤ اُسے ۔ جام میں اپنا گھر جو خالی پڑا ہے ۔ والد صاحب نے اسی سال خریدا ہے۔ بڑی اچھی جگہ ہے ۔ اگرچہ پہلے وہاں ایک آوارہ سی عورت رہتی تھی ۔ لیکن ہم نے اسے نکال دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ جام بڑی اچھی اور سستی جگہ ہے ۔ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس روپے ماہوار خرچ آئے گا وہاں ۔"

"ہاں ہاں ۔ جام میں بس چار ایک مکان ہیں اور دو ایک دوکانیں ۔ ریاست کا گاؤں ہے جہاں آج گھی دو روپے سیر بکتا ہے ۔"

"دو روپے" وہ بڑ بڑایا ۔ "لیکن پھر بھی خرچ تو ہو گا ہی نا ۔" قاسم نے آہ بھر کر کہا ۔

"تو تنخواہ پر مجھے ادا کر دینا" یہ کہہ کر اختر چپ چاپ اندر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد ساٹھ روپے کے نوٹ اور مکان کی چابی لاکر قاسم کے ہاتھ پر رکھ دی ۔

اس طرح وہ جام پہنچا تھا ۔ اور وہاں پہنچکر سبھی کچھ بھول گیا تھا ۔ اچنبھے سے اس سبز پیالے کی طرف دیکھتا ۔ پھر جھیل کی طرف اٹھ بھاگتا ۔ اس معلق پل پر جا کھڑا ہوتا جو جھیل کے آرپار جھولے کی طرح ڈولتا رہتا تھا ۔ جھیل کے پانی کو ہاتھوں میں اٹھالیتا' چینی محل کو غور سے دیکھنے لگتا اور پھر چاروں طرف استادہ دیواروں کو دیکھ کر ان جانے میں انگڑائیاں لینے لگتا ۔ پھر شدت جذبات سے گھبرا کر گھر کی طرف اٹھ بھاگتا ۔ "ضدی ، ضدی!" شہزاد اسے مضطرب دیکھ کر سہم جاتی ۔ چونک کر اپنے ہاتھ چھپا لیتی ۔ اور منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ۔ اس کے دل میں بھائی کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے تھے ۔

ویسے تو شہزاد بھی اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر متاثر ہوئی تھی ۔ سبز پیالے کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی خوشی کی ایک رَو اٹھی تھی ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ خوشی محسوس کرنے پر خواہ مخواہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں ۔ دل پر

ٹھیس لگتی ۔ سینے پر بوجھ پڑ جاتا اور ہتھیلیوں میں سرسراہٹ ہونے لگتی ۔ اور وہ چونک کر بھائی سے ہاتھ چھپالیتی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی کوشش کرتی ۔ اسی لئے تو وہ جام کو بغور دیکھنے سے ہچکچاتی تھی ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی طبیعت قابو سے نکل نہ جائے ۔ بھائی کے سامنے اسے دورہ نہ پڑ جائے ۔ شاید اسی لئے اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی مشرقی کھڑکی پر چق ڈال دی تھی ۔ اور اپنے آپ کو جام کے منظر سے محفوظ کرلیا تھا ۔ پھر وہ کونے میں جا بیٹھی تھی اور کچھ بُننے میں مصروف ہوگئی تھی ۔ قاسم اپنے آپ اور جام میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس نے شہزاد کی خاموشی اور مصروفیت کا خیال نہ کیا ۔ اگرچہ وہ اسے باربار بلاتا ۔ بار بار بھاگا بھاگا اس کی طرف آتا ۔ لیکن پھر جلد ہی منظر کے طلسم میں ازسرنو کھو کر اسے بھول جاتا ۔

آہستہ آہستہ قاسم کا وہ خوشی بھرااچنبھا معدوم ہوتا گیا ۔ مسرت تو وہ اب بھی محسوس کرتا تھا ۔ لیکن اس کے جذبے میں وہ شدت نہ رہی تھی وہ اضطراب نہ رہا تھا ۔ پھر آہستہ آہستہ طبیعت پر اداسی چھانے لگی ۔ ضدی کی موجودگی کے باوجود شدید تنہائی کا احساس اس کی رگ وپے میں سرایت کرتا گیا ۔ قاسم اس سبز پیالے کی طرف دیکھتا اور چلانے یا دوڑنے کی بجائے آہ بھر کر گھاس پر بیٹھ جاتا ۔ اور پھر ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے پر رکھ کر جام کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ۔ پھر آہستہ آہستہ تنہائی کا یہ احساس کرتا گیا اور ایک روز دبے ہوئے طوفان کی طرح پھوٹ نکلا ۔ ایک بار پھر اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی ۔ یہ کیفیت پہلی کیفیت سے کسی قدر مختلف تھی ۔ اپنی شخصیت کے اخراج سے مسرت حاصل کرنے کی بجائے اس کی توجہ گردوپیش سے سمٹ کر اپنے آپ پر مرکوز ہونے لگی ۔ بند بند میں الجھنیں محسوس ہونے لگیں ۔ نا قابل برداشت تناؤ کی وجہ سے اعضاء درد کرنے لگے ۔ اور وہ شہزاد کے قریب جانے سے ہچکچانے لگا ۔

پہلے تو قاسم نے اس کیفیت سے بے نیاز رہنے کی کوشش کی ۔ لیکن جذباتی اضطراب ہر ساعت واضح سے واضح تر ہوتا گیا ۔ قاسم نے اسے دبانے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم کی نسیں پھڑک پھڑک کر اسے جھٹلانے لگیں ۔

آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر آئے ۔ جسم سے شرارے پھوٹنے لگے حتیٰ کہ مجبور ہو کر وہ اٹھ بیٹھا ۔ اوران جانے میں جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپوں کو انگلیوں میں پھیرتے ہوئے جام کی دوکان پر جا پہنچا اور پوچھنے لگا :

"لالہ یہاں سے شہر کتنی دور ہوگا ۔"

"شہر" لالہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا ۔ "کونسا شہر؟"

"کوئی بھی ہو ۔" وہ بولا "نزدیک ترین شہر !"

لالہ نے مٹھائی تولتے ہوئے جواب دیا ۔ مہاراج ! اس طرف دس میل دور چنبہ ہے اور اس طرف دس میل دور ڈلہوزی ۔

دس میل !! قاسم نے حیرانی اور یاس سے دہرایا ۔ دس میل !! اور پھر مایوسی بھرے انداز سے کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھتا رہا ۔ اور ہاتھوں میں دونوں روپوں کو گھماتا رہا ۔

لاہور میں کبھی کبھار ایسی کیفیت اس پر طاری ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن وہاں اس نے کبھی ایسا طول نہ پکڑا تھا ۔ شاید اس لئے کہ وہاں اس کا مکان شہر سے بالکل قریب تھا ۔ شاید وہ دس میل کی مسافت طے کرنے سے بھی گریز نہ کرتا ۔ لیکن شہزاد کو اس مکان میں اکیلا چھوڑنا جو اس تن تنہا ٹیلے پر واقع تھا ۔ اور جس کے اردگرد دور تک کوئی مکان نہ تھا ۔ اور جہاں ایک آوارہ عورت رہ چکی تھی ۔ مناسب نہ تھا ۔

اس کی نگاہ اپنے مکان پر جا پڑی ۔ سامنے جنوب کی طرف ٹیلے پر وہ چھوٹا سا مکان اداس کھڑا تھا ۔ چمنی سے دھواں نکل رہا تھا ۔ جیسے مکان ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہو ۔ اس تن تنہا مغموم مکان کو دیکھ کر اسے اپنی تنہائی کا خیال آگیا ۔ اور اس پر پھر سے وہی کیفیت شدت سے طاری ہوگئی ۔

قاسم کی سادہ اور پاکیزہ زندگی میں صرف یہی ایک الجھاؤ تھا ۔ شروع میں تو اس اضطرابی کیفیت کے زیر اثر وہ بے حد پریشان رہا تھا ۔ اس جذباتی اضطراب کے چنگل سے مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک تدبیریں کیں جو کارگر نہ ہوئیں ۔ وقتی طور پر سکون حاصل ہو بھی جاتا تو اس کے عقب میں بے پناہ اداسی کا ریلا چلا آتا ۔ ندامت اور تحقیر کے ملے جلے جذبات سمٹ کر ایک

بھنور بن جاتے ۔ گردوپیش حریفانہ شکل اختیار کر لیتا ۔ ۔۔۔۔۔ پھر اس نے شہر جانا سیکھ لیا ۔ اور اس کی شخصیت میں پھر سے توازن پیدا ہوگیا ۔

اس کے بعد اضطرابی کیفیت نے کبھی طول نہ پکڑا تھا کبھی کبھار چھوٹی موٹی دقتیں پیش آجاتی تھیں لیکن ایسی نہیں ۔ جن کا تدارک نہ ہو سکے ۔ کبھی کبھار اسے کسی دوست کے پاس جانا پڑتا ۔ بھئی دو ایک روپے ہونگے ۔ اس وقت اس کا اندازہ معمول سے کسی قدر مختلف ہوتا تھا ۔ اضطراب ، جھجک اور پریشانی کی وجہ سے اطمینان سے بیٹھنا اور بات کرنا ناممکن ہو جاتا تھا ۔ مثلاً پہلی مرتبہ جب وہ قرضہ لینے اختر کے ہاں گیا تو اسے دیکھ کر بھاگا بھاگا اندر گیا اور دس روپے لاکر معذرت کرنے لگا ۔ ''بھئی اس وقت تو صرف دس ہی ہیں ۔''

''نہیں نہیں ۔'' قاسم گھبرا کر بولا ۔''صرف اتنے ۔'' اس نے دو روپے اٹھا لئے ۔ ''میرا مطلب ہے صرف دو ۔ اچھا تو میں جاتا ہوں ۔''

''ارے'' اختر حیران رہ گیا ۔ ''ٹھہرو تو!''

''مجھے کام ہے ۔ شہر جانا ہے ۔''

''دو روپے '' اختر حیران تھا ''دو روپے کے لئے اتنی پریشانی ۔'' اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔

اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر وہی واقعہ پیش آیا ۔ اختر متعجب ہوتا تھا کہ دو روپے قرض مانگنے والا قاسم اُس قاسم سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو عام طور پر اسے ملا کرتا ہے ۔ اُس نے دو ایک مرتبہ اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش بھی کی ۔ لیکن قاسم نے ٹال دیا ۔ نہ جانے کب تک قاسم دو روپے مٹھی میں دبائے ڈوبتے ہوئے سورج اور اس اکیلے آہیں بھرتے ہوئے مکان کی طرف دیکھتا رہا ۔ پھر دفعتاً سرائے سے گانے کی آواز سن کر وہ چونکا ۔

ڈولے ہرونے کی تیا ۔ ڈولے

اس نے سرائے کی طرف دیکھا ۔ ان کے مکان تلے شمال کی طرف سو گز کے فاصلے پر سرائے کا برآمدہ صاف دکھائی دے رہا تھا جس میں بہت سے وردی پوش جوان گراموفون کے ارد گرد ہلڑ مچا رہے تھے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ لوگ اس کے راز سے واقف ہوں ۔ اور اس کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ انہیں دیکھ

کر قاسم گھبرا گیا اور گردن جھکائے اپنے مکان کی طرف چل پڑا ۔
"ہائیں!" شہزاد کو یوں پڑے دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔
"ضدی ضدی" وہ چلایا ۔ شہزاد کا آدھا جسم چارپائی پر تھا اور آدھا نیچے لٹک رہا تھا ۔ سر چارپائی کے پاس پڑی ہوئی میز پر ٹکا ہوا تھا ۔ بانہیں نیچے لٹک رہی تھیں اور مٹھیاں بند تھیں ۔ "ضدی ! ضدی" اس نے شہزاد کو جھنجھوڑا لیکن وہ بے جان پتلے کی طرح لڑھک کر ایک طرف جاگری ۔ قاسم نے لپک کر پانی کا گلاس اٹھایا ۔ لیکن شہزاد کے جبڑے مقفل تھے ۔ منہ پر پانی کا چھینٹا دینے کے بعد اس نے شہزاد کے دل پر ہاتھ رکھا ۔ دل کی حرکت محسوس کرکے اسے قدرے اطمینان ہوا ۔ پھر وہ جام کی طرف بھاگا ۔

"لالہ ۔ لالہ" اس نے دوکاندار سے پوچھا ۔ "یہاں کوئی ڈاکٹر ہو گا ۔"
"ڈاکدار ۔" دوکاندار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔ نہ ماراج یہاں ڈاکدر کہاں ۔ البتہ ویدجی ہیں ۔
"ڈاکٹر نہیں ؟" وہ گھبرا کر بولا ۔
"نہیں ماراج ۔" دوکاندار نے دانت نکال کر معذرت کی ۔
"بات کیا ہے" دوکان پر کھڑا ہوا ایک فوجی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا ۔
"مریض ہے ۔" قاسم نے بے پروائی سے جواب دیا اور چل پڑا ۔
"ٹھہرو! میں چلتا ہوں" فوجی چلایا ۔
"آپ ؟" قاسم رک گیا ۔
"ہاں" فوجی بولا ۔ "میں ڈاکٹر ہوں ۔" اور دوسرے لمحے وہ دونوں مکان کی طرف تیزی سے قدم اٹھانے لگے ۔

سرسری معائنے کے بعد ڈاکٹر بڑبڑایا ۔ "ہوں شادی شدہ ہے یہ لڑکی یا ۔۔۔۔"
"نہیں شادی نہیں ہوئی ۔"
"اوہ!" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔ "کوئی فکر کی بات نہیں ۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی ۔ کسی دوائی کی ضرورت نہیں ۔"
"دوائی کی ضرورت نہیں ۔" قاسم نے حیرانی سے دہرایا ۔

"قطعی نہیں ۔"

"لیکن ڈاکٹر ۔" وہ چلایا ۔ "اسے دل کی کمزوری ہے پرانی بیماری ہے ۔"

ڈاکٹر مسکرا دیا ۔

"دل کی کمزوری کے لئے میں اسے پہاڑ پر لایا ہوں ۔"

"اوہ"۔ اس کی آنکھ میں چمک لہرائی ۔

"دل کی کمزوری کے لئے کوئی دوائی تجویز کر دیجئے ۔"

"فوراً شادی کر دو ۔" ڈاکٹر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا ۔

"شادی !"

"ہاں ۔ دل بالکل تندرست ہے ۔ کوئی خطرہ نہیں ۔ صرف ہسٹریا ہے ۔ خدا حافظ ۔" اور وہ باہر نکل گیا ۔

دل بالکل تندرست ہے ۔ شادی کردو ۔ قاسم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا ۔ وہ حیرانی سے شہزاد کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ چہرہ سُوجا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ گالوں پر سرخ دھبے پھیلے ہوئے تھے ۔ قاسم کی نگاہ شہزاد کے جسم پر جا پڑی ۔ بدن پر قمیض یوں تنی ہوئی تھی ۔ جیسے ابھی پھٹ جانے والی ہو ۔۔۔۔۔۔ گھبرا کر قاسم نے اپنی نگاہ دوسری طرف پھیرلی ۔ چرررر ۔۔۔۔ رر ۔۔۔ پاس ہی کوئی جھینگر ٹرایا ۔ قاسم چونک گیا ۔ اس کی نگاہوں تلے کوئی ریشمیں قمیض پھٹ گئی ۔ اور گلابی گلابی بدن سے چارپائی بھر گئی ۔ گھبرا کر قاسم نے نگاہیں دروازے کی طرف پھیر لیں ۔

"ہوں ۔ اوں"۔ شہزاد گنگنائی ۔

"ضدی ۔ ضدی !" وہ مڑ کر شہزاد کی طرف دوڑا ۔ اور اس کے منہ پر جھک کر بولا ۔ "ضدی ضدی کیا حال ہے ۔ کیسی طبیعت ہے ۔" شہزاد نے آنکھیں کھول دیں ۔ سرخ سرخ ڈورے ۔ سوجا ہوا منہ ۔ نیم وا پلکیں ۔ قاسم نے گھبرا کر نگاہ پھیر لی ۔ شہزاد کی چھاتی اتھل پتھل ہو رہی تھی ۔ اور وہ قمیض ۔۔۔ گھبرا کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کی طرف گھورنے لگا ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ کہ کس طرح شہزاد کو اٹھا کر بٹھائے کیسے اسے تسلی دے ۔

"اوہ" شہزاد گنگنائی ۔ "میرے ہاتھ !!"

وہ تڑپ کر اس کی طرف مڑا ۔ "ضدی ! کیوں کیا ہے ؟"
"کچھ بھی نہیں ۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ جیسے اس سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی ہو ۔

"کیا ہے تمہیں ۔" وہ دور ہی سے بولا ۔

"کچھ نہیں بھائی جان ۔" وہ سہم کر بیٹھ گئی ۔

"لیکن تمہارے ہاتھ ؟" قاسم بولا ۔

"میرے ہاتھ ؟" شہزاد نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر انہیں چھپا لیا ۔

قاسم نے دو ایک بار شہزاد کے پاس جانے کی کوشش کی ۔ لیکن اس کے پاؤں منوں بھاری ہو رہے تھے ۔ نگاہیں شہزاد کی طرف نہیں اٹھتی تھیں ۔

"کیا ہے تمہیں ۔" اس نے پوچھا ۔

"مجھے !؟ کچھ بھی نہیں مجھے "۔

شا۔۔۔۔۔۔۔ دی ۔ شا ۔۔۔۔۔۔۔دی ۔ دور کوئل چیخی ۔

"اچھا اچھا ۔" وہ گھبرا کر بولا ۔ میں باہر دروازے پر ہوں ۔ ضرورت ہو تو آواز دے لینا ۔" یہ کہکر وہ دروازے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگا ۔

کچھ دیر تک وہ دروازے کے پاس ٹہلتا رہا ۔ پھر وہ ان جانے میں ٹیلے سے نیچے اتر کر سرائے کی طرف جا پہنچا ۔ اور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جام کی طرف دیکھنے لگا ۔

شام کی دھندلی روشنی میں جام یوں ویران دکھائی دیتا تھا جیسے آب حیات سے خالی ہو چکا ہو ۔ چینی محل اجڑا ہوا تھا ۔ چاروں طرف استادہ دیودار جام کی طرف پیٹھ کئے دور کی پہاڑیوں کی طرف آس لگائے تک رہے تھے۔ شا ۔۔۔۔ دی ۔ شا۔۔۔۔۔دی ۔ پیڑ پر کوئل چیخنے لگی ۔ اس کی نگاہوں تلے نیم وانشیلی آنکھیں طلوع ہو رہی تھیں پر ررر۔۔۔۔۔رر ۔۔۔۔ قریب ہی کوئی ریشمیں قمیض پھٹی ۔ گرد و پیش گلابی جسم سے بھر گیا ۔ تناؤ سے بھرپور اعضاء ابھرنے لگے ۔ قاسم نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں ۔ ان جانے میں اس کا ہاتھ جیب میں جا پڑا اور انگلیاں روپوں کے کناروں کو محسوس کرنے لگیں ۔ ہاتھ ۔ ہاتھ ۔ میرے ہاتھ

کوئی پہاڑی جانور چیخا ۔ قاسم کے بدن کو عجیب سے کچوکے لگنے لگے ۔ اسے اپنے آپ اور اس پھٹی ہوئی قمیض سے نکل کر چھائے ہوئے بدن میں اک مناسبت سی محسوس ہونے لگی ۔ اور وہ گھبرا کر گھاس پر لیٹ گیا ۔ جیسے اس کا آخری سہارا ٹوٹ چکا ہو ۔

"ہی ہی ہی ہی ۔" سرائے کے قریب کوئی قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا ۔

"جوان لڑکی تھی ۔ بیحد جوان ۔"

"جوان ؟" دوسرے کی روح حلق میں آ اٹکی ۔

"ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا تھا ۔" پہلا بولا ۔ "یہ لوگ لڑکیوں کو گھر بٹھا رکھتے ہیں ۔ شادی نہیں کر سکتے تو انہیں موقعہ دیں ۔"

"موقعہ" دوسرا بولا ۔ "لیکن ۔۔۔۔۔"

"لیکن ویکن کوئی نہیں ۔" قاسم نے ڈاکٹر کی آواز پہچان لی ۔ "ایک نہ ایک قربانی دینی ہی پڑتی ہے ۔ چاہے لڑکی کی زندگی کی قربانی دو یا ناموس کی ۔"

"ناموس ۔ ناموس" کوئل چلائی ۔

قاسم دیوانہ وار اٹھ بیٹھا اور لاحول پڑھ کر ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا ۔ مبہم طور پر وہ محسوس کر رہا تھا ۔ کہ اس تھوڑے سے وقت میں گردوپیش کی ہر چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے ۔ لیکن گھر گھر بھی تو اس حریفانہ گلابی جسم سے بھرا پڑا تھا ۔ وہ گھر کے دروازے پر جا کر رک گیا ۔ اندر داخل ہونے کو جی چاہتا تھا ۔ ایک ڈر سا درودیوار سے لپکا چلا آرہا تھا ۔

گھر کے دروازے کے پاس جاکر وہ چپ چاپ کھڑا ہوگیا ۔ اس کے جسم میں ازسرنو وہی سرسراہٹ ہونے لگی ۔ اس کا ہاتھ پھر سے جیب میں داخل ہو گیا ۔ شہر ۔۔۔۔۔ ۔ جھینگر نے شور مچایا ۔ وہ چونک پڑا ۔

لاحول ولا قوۃ ۔ اپنی توجہ کو ان مسخرے پرندوں سے ہٹانے کے لئے وہ ہاتھ کے روپوں سے کھیلنے لگا ۔ اسے شہزاد کا خیال آگیا ۔ کہیں وہ پھر بے ہوش نہ پڑی ہو ۔ اس کی آنکھوں تلے شہزاد کی باہیں لٹکنے لگیں ۔ مٹھیاں بند تھیں ۔ وہ گھبرا گیا ۔ نہیں ضدی بے ہوش نہیں ۔ شہزاد نے آنکھیں کھول دیں ۔ سُرخ ڈوروں میں تبسم کی جھلک تھی ۔ شہزاد نے اپنا بازو اٹھایا اور ہاتھ یوں پھیلا دیا

جیسے اس کے ہاتھ والے روپے مانگ رہی ہو ۔ لاحول ولا قوۃ ۔

قاسم نے جھرجھری لی ۔

"ہی ہی ہی ہی ۔" پاس ہی اندھیرے میں کوئی ہنسا ۔ "شہر تو دس میل ہے ۔ دس میل سنا تم نے !؟"

اس کی زبان میں نشے کی لکنت تھی ۔

"شہر جانے کی جرورت ۔" دوسرا بولا ۔ "یہیں مل جائے تو ۔"

"یہاں ۔ ہم سے مجاک کرتا ہے ۔"

"تمہاری قسم یہاں اس ٹیلے پر ۔"

"جھوٹ !"

"میں جھوٹ بولتا ہوں ۔ جو تم بھائی نہ ہوتے مہارے تو دانت نکال کر رکھ دیتا ۔ پر تم بھائی ہو ۔"

"بھائی ۔ اور بھائی پر ہاتھ اونہوں ۔ ہم نہ اٹھائیں گے ۔ چنے جان سے چلے جائیں ۔۔۔۔ وہ دیکھو ۔ وہ دیکھا ۔ٹیلے کا مکان ۔"

"وہ"

"ہاں پچھلی بار ہم یہاں آئے تھے جام میں تو ٹیلے والی سے معاملہ ٹھہرایا تھا ۔ ہاں ۔ پٹاخہ ہے پٹاخہ ۔"

"موقعہ اچھا ہے نا ؟"

موقعہ ۔۔۔۔۔۔۔ موقعہ ۔ کوئل چیخنے لگی ۔ نہ جانے اس وقت قاسم کو کیا ہوا ۔ ان شرابیوں سے نفرت محسوس کرکے یا شاید ڈاکٹر کی بے ہودہ باتیں سن کر اس کا دماغ شل ہوگیا ۔ اسے قطعی یاد نہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے ۔ اور وہ شرابی اس کے اپنے گھر کی طرف جارہے ہیں ۔ جہاں شہزاد اکیلی پڑی ہے ۔ پھر دفعتاً اسے خطرے کا احساس ہوا ۔ اوہ گھر میں وہ اکیلی ہے ۔ لیکن اس نے محسوس کیا جیسے وہ سرائے کے پاس کھڑا ہے ۔ جہاں وہ فوجی ہلڑ مچارہے تھے ۔ ضدی اکیلی ہے !! اس نے سوچا اور گھر کی طرف جانے کی بجائے غلطی سے دوسری سمت کو بھاگا ۔ ٹیلے سے نیچے کی طرف بگٹٹ بھاگا ۔ خدا کرے ضدی صحت مند ہو جائے ۔ خدا کرے اس کی بیماری دور ہو جائے ۔" وہ شمال کی طرف ڈھلان پر بھاگا جا

رہا تھا ۔ دور ٹیلے پر فوجی قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے لاحول ولا قوۃ ۔ اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کردی ۔ سرائے کے پاس ڈاکٹر نے اسے بھاگتے ہوئے پہچان کر پوچھا ۔ "کیا مریضہ کی حالت پھر خراب ہوگئی ہے ۔"

"نہیں نہیں" وہ چلایا ۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے ۔"

"ہائیں"اس نے سرائے کو پہچان کر اپنی غلطی کا احساس کیا ۔ میں تو گھر سے دور جا رہا ہوں ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ اچھا اچھا شکریہ ڈاکٹر شکریہ ۔ اُسے پوری صحت ہو جائے گی ۔ شکریہ ! اور وہ دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔

..............O..............

وہ ہاتھ

"وہ ہاتھ" عصمی نے کہا ۔ "اس سے پہلے کبھی مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ ہاتھ جذبات کا اس وضاحت سے اظہار کر سکتے ہیں اور پوری شخصیت کے مظہر ہو سکتے ہیں ۔ ہاتھوں کے مسمری اثر سے مجھے انکار نہ تھا ۔ لیکن دوسرے کو متاثر کر دینا اور چیز ہے اور کسی اثر سے بھیگ جانا اور ۔ ان دنوں میں سمجھتا تھا کہ جسمانی اعضا میں جذبات کا اظہار کرنے والا سب سے اہم عضو آنکھ ہے ۔ اور شخصیت کے بنیادی رجحانات زیادہ تر چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں ۔ اس بات کو کچھ دیر بھی تو نہیں ہوئی تقریباً ڈیڑھ سال ۔

پھر وہ واقعہ ظہور میں آیا جس نے میرے نقطۂ نظر کو بدل دیا ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ آنکھ سے زیادہ جھوٹ بولنے کی صلاحیت اور کسی عضو میں نہیں ۔ اظہار تو وہ کرتی ہے ۔ مگر بسا اوقات یہ اظہار محض دکھاوے کا ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس گونگے ہاتھ شخصیت کے اظہار سے بھیگے بھیگے رہتے ہیں ۔ خلوص بھرا اظہار ۔ ان کے خم میں پھیلاؤ میں ، سطحی جلد میں، اور بناوٹ میں شخصیت کا مدھم دیا جلتا رہتا ہے ۔"

"اوہ" انور مسکرا کر بولا ۔ "آرٹسٹ ہونے کے علاوہ تم تو شاعر بھی بن گئے جمیل ۔"

"نہ جانے ان ہاتھوں نے مجھے کیا کیا بنا دیا ہے ۔" عصمی نے جواب دیا ۔

"آرٹسٹ تو تم پہلے بھی تھے ۔" انور نے کہا ۔

عصمی مسکراتے ہوئے بولا ۔ "آرٹسٹ ہونا ایک کیفیت نہیں بلکہ عمل ہے ۔ جس میں ارتقا کے منازل ہوتے ہیں ۔ اس زمانے میں مجھے صرف خطوط سے دلچسپی تھی ۔ میرے لئے شخصیتیں اور چیزیں مختلف اشکال کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ حسن میرے نزدیک ایک رنگدار پیمانہ تھا ، جام نہیں ، رعنائی محض پیکر

تھی ۔"

"تعجب کی بات ہے ۔" انور نے کہا ۔ "اتنی سی بات نے تمہارا نقطۂ نظر بدل دیا ۔"

"ہاں" عصمی بولا ۔ "کس قدر تعجب کی بات ہے ۔" اور پھر چپ چاپ بیٹھا انگیٹھی میں جلتے ہوئے شعلوں کو گھورنے لگا ۔

"نہ جانے زیب کہاں چلی گئی ہے ۔ زیب ! انور نے باآواز بلند اسے پکارا ۔

"ابھی آئی ۔۔۔" اندر سے نسائیت سے بھیگی ہوئی آواز آئی جسے سن کر عصمی چونک پڑا ۔

"بھئی چائے لاؤ نا ۔ تم سے ملنے بھائی آیا ہے ۔" انور باآواز بلند چلایا ۔

"صرف دس منٹ" وہ بولی ۔ اس کی آواز میں عجیب لوچ تھا ۔

"نہ جانے عورتیں نہانے میں اتنی دیر کیوں لگاتی ہیں ۔" انور نے کہا ۔

"اسے معلوم نہیں کہ جمیل آیا ہے ورنہ ممکن ہے وہ ادھ نہائی بھاگ آتی ۔ اسے تم سے ملنے کا بے حد شوق ہے ۔ میں نے تمہاری باتیں اسے بتائی ہیں ۔ ہم تو بلکہ بیاہ کے دن بھی تمہارا انتظار کرتے رہے ۔ تمہیں خط لکھا تھا ۔ لیکن تم نہ آئے ۔ میں نے زیادہ زور نہ دیا تھا ۔ میں نے کہا شاید تم بھی آنا پسند نہ کرو ۔"

"کیوں" عصمی نے پوچھا ۔

"ہائیں تمہیں معلوم نہیں ؟" وہ مسکرایا ۔ "میری شادی میں کوئی عزیز شریک نہ ہوا تھا ۔ انہیں میرے زیب سے شادی کرنے پر اعتراض تھا ، ایک تو وہ اپنی برادری میں سے نہیں، دوسرے وہ مہاجر لوگ تھے ۔"

"اس میں کیا عیب ہے ؟"

"عیب تو کوئی نہیں" وہ بولا ۔ "ویسے تو بڑے خاندان سے ہیں ۔ لیکن پاکستان آتے ہوئے راستے میں باپ اور بھائی دونوں ہی لقمۂ اجل ہوگئے ۔ یہاں پہنچے تو ماں کے سوا اور کوئی تھا نہیں۔زیب پڑھی لکھی تو ہے گو زیادہ نہیں صرف دس جماعتیں ۔ ماں نے لڑکی کا بڑا خیال رکھا ۔ بڑی مشکل سے ایک اچھی نوکری

حاصل کی تاکہ عزت سے گزارہ ہو سکے ۔ لیکن نوکری کرنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ راست روی سے کام نہیں چلتا ۔ ان دنوں ان سے میری واقفیت ہوگئی ۔ وہ مجھے پسند آگئی ۔ اس لئے میں نے اس کے ساتھ نکاح پڑھا لیا ۔"

"اوہ یہ بات ہے ۔" جمیل مسکرایا ۔ "یہیں لاہور میں رہا کرتی تھیں وہ ان دنوں ۔"

"ہاں ہاں یہیں ۔" انور بولا ۔

"کس جگہ ؟" عصمی نے پوچھا ۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" انور بولا ۔ "یہیں کہیں نئے محلے کے قریب ۔ تم جانتے ہو ایسے حالات میں لوگ کسی کو گھر کا پتہ نہیں دیا کرتے اور محلّے میں بڑی وضع داری سے رہتے ہیں ۔ اور پھر وہ تو وضع داری کے بے حد قائل ہیں ۔"

"ٹھیک" عصمی نے کہا ۔

"زیب سے نہ کہنا ۔" انور بولا ۔ "بات اشارتاً بھی ہوگئی تو وہ سمجھ جائے گی ۔ بے حد ذہین ہے وہ ۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا ہے ۔ بس دیکھ لینا ۔ بلکہ مجھے بتانا کہ میں نے چناؤ میں غلطی تو نہیں کی ۔ تم تو ہاتھ دیکھ کر ہی بتا سکو گے ۔"

وہ دونوں ہنس پڑے ۔

"یہی تو مصیبت ہے ۔" عصمی چلایا ۔ "وہ علم جو حسیات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ۔ انسان کے بند بند میں رچ جاتا ہے ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کو اور بھی گونگا چھوڑ جاتا ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔" "تو کیا ۔" انور چلایا ۔ "یہ فلسفہ ہمیں اس واقعہ سے محروم رکھنے کے لئے سنایا جا رہا ہے ۔ میں تو چاہتا تھا کہ زیب کے آنے پر تم ہمیں اپنی ہاتھ بیتی سناؤ ۔"

"نہیں نہیں" ۔ عصمی نے کہا ۔ "یہ بھابھی کے سامنے سنانے کے قابل نہیں ۔"

"نہیں بھئی" انور بڑبڑایا ۔ "وہ ایسی کہنہ خیال نہیں ۔"

"یہ بات نہیں" عصمی نے کہا۔ "مجھے یہ بات سناتے ہوئے شرم محسوس ہوگی۔ اس کے علاوہ واقعہ درحقیقت بے حد معمولی سا واقعہ ہے۔ میرا مطلب ہے خارجی طور پر اس کی چنداں اہمیت نہیں ـــ۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی بات ہے۔" عصمی شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان دنوں میرا مکان شہر کی ایک بند گلی میں تھا۔ یہ گلی کافی فراخ تھی۔ لیکن اس میں صرف چار مکان تھے۔ نئی طرز کے بنے ہوئے کشادہ اور خوبصورت، مکان کی بند نکڑ پر میرا مکان تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا سائن بورڈ تھا۔ عصمی۔"

"عصمی؟" انور نے حیرانی سے دہرایا۔ "عجیب سا نام ہے۔"

"ہاں" عصمی مسکرایا۔ "یہاں سبھی لوگ مجھے عصمی کہتے ہیں۔ وہ اس بات سے واقف نہیں کہ میرا نام جمیل ہے۔ دراصل ابتدا میں میں نے خود یہ نام اپنے لئے تجویز کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک فن کار کا نام انوکھا اور آرٹسٹک ہونا چاہئے۔"

"انوکھا تو بے حد ہے۔" انور نے کہا۔ "آرٹسٹک کے متعلق مجھے معلوم نہیں۔"

"گلی کے تمام مکانات کی کھڑکیوں پر جالی لگی ہوئی تھی۔ تم نے میرا مکان نہیں دیکھا۔" عصمی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

"اونہوں" انور نے سر ہلایا۔

"دیکھتے بھی کیسے" عصمی مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس زمانے میں تم ہم سے گویا قطعی طور پر الگ ہوگئے تھے۔"

"ہاں" انور مسکرایا "ان دنوں تمہیں ہاتھ کا روگ لگا تھا اور مجھے نین روگ۔ پھر رہنے کے لئے مجھے مکان بھی ماڈل ٹاؤن میں ملا تھا۔ سارا دن شام کے انتظار میں کٹتا تھا۔ شام کو وہ آجاتیں، اور تم جانتے ہو۔ ہاں تو پھر تم وہ واقعہ سنا رہے تھے نا۔"

"ہاں" عصمی بولا۔ "وہ کمرا جو گلی میں کھلتا تھا۔ اسے میں نے کام کرنے کا کمرا بنا رکھا تھا۔ پہلے کئی ایک دن تو میں اس کمرے کو سجانے میں لگا رہا۔ دیواروں پر تصاویر لٹکاتا رہا۔ ادھر "خالق" جو رنگوں سے اپنے جہان کی

تحقیق میں مصروف تھا ۔ اس طرف "کاتلات" جو وسیع پھیلاؤ میں عورت کی طرح جالی انداز سے پڑی تھی ۔ دائیں ہاتھ "مستی کا دیوتا" بشاشتے ۔ اس کے سامنے آصفی کی "امید اور مایوسی" ڈسک کے پاس ہی "وینس ڈی میلو" کا مجسمہ تھا ۔ اس کے پاس مہاتمابدھ اور پرے "کیوپڈ" اور "سائکی کی اوّلین بیداری ۔"

"چھ سات دن کے بعد ڈسک پر بیٹھے ہوئے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ سامنے مکان کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں ۔ شاید یہ مکان غیر آباد ہے ۔ میں نے سوچا ۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ کہ لاہور میں کوئی مکان غیر آباد رہے ۔ دفعتاً آواز آئی ۔ ٹپ ٹپ ٹپ میں نے غور سے باہر کی طرف دیکھا ۔ اسی مکان کے آہنی پرنالے سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں ۔ ٹپ ٹپ ٹپ بوندوں کی آواز اس چھائی ہوئی خاموشی کو اور بھی بھیانک بنانے لگی ۔ اِس مقام پر جہاں آہنی پرنالہ لگا ہوا تھا ۔ دیوار دو دو فٹ تک بھیگی ہوئی تھی ۔ گلی کے فرش پر بھی دور تک نمی کے اثرات واضح تھے ۔ دیوار پر کائی جمی ہوئی تھی جو اس ٹپ ٹپ کے تسلسل کی مظہر تھی ۔ میں نے پھر غور سے مکان کا جائزہ لیا ۔ صدر دروازہ بند تھا ۔ کھڑکیاں تمام کی تمام مقفل تھیں ۔ اوپر بالکونی پر چقیں پڑی تھیں ۔ جن کے پیچھے تمام دروازے صاف طور پر بند دکھائی دے رہے تھے ۔ مکان پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا ۔ اور وہ مسلسل ٹپ ٹپ اس سکوت کو عجیب سی گہرائی اور اسرار بخش رہی تھی ۔ اس کے بعد جب بھی میں ڈسک پر بیٹھ کر کام کرنا شروع کرتا تو وہ ٹپ ٹپ کی آواز بتدریج بلند ہوتی جاتی ۔ اور بھی بلند ، حتٰی کہ میں محسوس کرنے لگتا کہ کوئی پر اسرار ہتھوڑا اٹھائے میرے سر میں کیل ٹھونک رہا ہے ۔ میں ہی نہیں بلکہ کمرے میں ٹنگے ہوئے تمام نقوش گویا اس پر اسرار ٹپ ٹپ سے متاثر ہو رہے تھے ۔ "سائکی کی اوّلین بیداری" میں بے نام سی تلخی واضح ہوئی جارہی تھی ۔ "امید" کی تڑپ اور بے قراری تو بے حد نمایاں تھی ۔ "مستی کے دیوتا" کا نشہ ترشی کے اثرات لئے ہوئے تھا ۔ کمرے کے جملہ نقوش میں اضطراب پیدا ہوچکا تھا ۔ صرف مہاتما بدھ ویسے کے ویسے گیان دھیان میں مصروف تھے اور شریر "کیوپڈ" زیر لبی مسکراہٹ سے مجھے دیکھ رہا تھا ۔ جیسے کلی پتنگے کو دُور سے دیکھ کر امید بھرے انداز سے مسکراتی

ہے ۔"

"بہت خوب، بہت خوب" انور چلّایا ۔ "خدا کی قسم بے حد دلچسپ ہے ۔"

"ایک ہی دن میں مَیں تو پاگل سا ہوگیا ۔ آخر تنگ آکر میں نے کام وام بند کردیا ۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس مکان کو گھورنے میں وقت بسر کرنے لگا ۔"

"شام کے وقت گلی میں ایک لڑکا آیا ۔ اس کی عمر نو سال سے زیادہ نہ ہوگی ۔ بدن پر ایک موٹا سا کرتا اور نیچے گاڑھے کی چادر ۔ سر اور پاؤں دونوں ننگے ۔ وہ چپ چاپ اس مکان کے صدر دروازے پر کھڑا ہوگیا ۔ نہ تو اس نے آواز دی اور نہ دروازہ کھٹکھٹایا ۔ دفعتاً دروازے کا ایک پٹ آپ ہی کھل گیا ۔ ڈیوڑھی کی جگہ ایک پتلی سی گلی بنی ہوئی تھی جس کے پرلے سرے پر موٹے کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا ۔ وہ لڑکا چپ چاپ اندر داخل ہوگیا ۔ اور پھر وہ پٹ آپ ہی آپ بند ہوگیا ۔ نہ جانے اس دروازے کے پیچھے سپرنگ لگے ہوئے تھے جو بجلی کا بٹن دبانے سے خود بخود حرکت میں آتے تھے یا کوئی سم سم تھا جو کسی طلسم کے زیرِ اثر کھلتا اور بند ہوتا تھا، اس مسلسل ٹپ ٹپ کے علاوہ یہ ایک تازہ اسرار تھا ۔"

"مختصر یہ کہ چار پانچ دن میں نے اس مکان کی طرف گھورنے میں بسر کئے ۔ لیکن بے فائدہ بلکہ اسرار کا احساس اور بھی بڑھ گیا اور میری وحشت روز بروز ترقی کرتی گئی ۔ دن میں چار پانچ مرتبہ وہ لڑکا صدر دروازے سے باہر نکلتا اور کچھ دیر کے بعد واپس اندر چلا جاتا ۔ اس کے باہر نکلنے سے پہلے دروازے کا ایک پٹ کھل جاتا اور پھر آپ ہی بند ہو جاتا ۔ اسی طرح جب وہ واپس آتا تو جونہی دروازے کے پاس پہنچتا دروازہ آپ ہی آپ کھل جاتا اور اس کے اندر داخل ہونے پر خود بخود بند ہو جاتا ۔"

"ایک روز مجھے اپنی اس دیوانگی پر بے حد طیش آیا ۔ رات کے دس بجے ہوں گے ۔ اس وقت بھی کوٹھے پر لیٹے ہوئے میرے کان اس مکان کی طرف لگے ہوئے تھے ۔ میں یہ سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ممکن ہے کوٹھے سے کوئی

آواز آئے ۔ مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی ۔ دیوانگی نہیں تو اور کیا تھا ۔ صبح شام ایک بند مکان کی طرف آنکھیں اور کان لگائے بیٹھے رہنا ۔ نہ جانے شہر میں کتنے مکان ایسے ہیں جہاں ویرانی برستی ہے ۔ اور جن کے پرنالوں سے ٹپ ٹپ کی آواز آتی ہے ۔ ایک عام بے کیف مکان کو خواہ مخواہ کا اسرار بخش دینا اور گرتے ہوئے قطروں کی ٹپ ٹپ پر اپنی زندگی حرام کر لینا ۔۔ غصے سے میرا سر کھولنے لگا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ سے میں ڈسک پر بیٹھ کر پوری توجہ سے کام کیا کروں گا ۔ ٹپ ٹپ ہوتا ہے تو پڑا ہو ۔

اگلی صبح سویرے سے ہی میری آنکھ کھل گئی ۔ اور کام کرنے کے ارادے کو عملی صورت دینے کے لئے خلاف معمول میں صبح سویرے ہی ڈسک پر جا بیٹھا اور کام میں مشغول ہو گیا ۔

دفعتاً قریب ہی چی لس لس ۔۔۔۔۔۔ ٹھک سی آواز سنائی دی ۔ جیسے کوئی دروازہ کھلا ہو ۔ میں نے بے ساختہ مڑ کر اُدھر دیکھا تمام دروازے اور کھڑکیاں بند پڑے تھے ۔ نہ جانے کیسی آواز تھی ۔ دو ایک ساعت کے لئے میں حیران بیٹھا رہا ۔ ٹک ، ٹک ، ٹک، کوئی چل رہا تھا جیسے قریب آرہا ہو اور قریب ، پھر آواز رک گئی ۔ ٹھک ! جیسے کوئی دریچہ کھلا ۔ جالی کی وجہ سے کھڑکیاں دکھائی نہ دیتی تھیں ۔ اس لئے میں حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے میں لگا رہا ۔

"دفعتاً سامنے کھڑکی کے اندھیرے میں ایک چمک سی ابھری اور پھر دو حصوں میں منقسم ہو کر دونوں پہلوؤں کی طرف محراب سی بناتی ہوئی گم ہو گئی ۔ پھر ایک گلابی سی چیز معلق ہونے لگی اور ۔۔۔۔ اور ایک ہاتھ جالی میں چمکا ۔ جیسے وہ میدے اور حنا کی آمیزش سے بنا ہو ۔۔۔ اُف وہ ہاتھ ۔۔۔۔۔ میں تمہیں کیا بتاؤں ۔ وہ ہاتھ کیا تھا ۔ صرف یہی نہیں کہ کھڑکی میں ایک نور کا چشمہ ابل رہا تھا ۔ یا انگلیوں کے خطوط میں بلا کی مناسبت اور ترتیب تھی ۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا مجھے جیسے اس ہاتھ میں ایک رنگین دل دھڑک رہا ہو ۔ جذبات سے بھیگا ہوا زندگی کے تاثر سے بھیگا ہوا ، دل ۔ انگلیوں کی بناوٹ میں فنی حس کا اشارہ نمایاں تھا ۔ پوروں میں ذہانت اور ذوق جمیل واضح تھے ۔ انگلیوں کی درنہس فراخ دلی کی مظہر تھیں ۔ ان کی لچک مقبولیت کی صلاحیت کی غماز تھی اور گدا سی ہتھیلی

میں گویا گداز و گرم دل دھڑک رہا تھا۔" عصمی خاموش ہوگیا۔
انگیٹھی کے شعلوں کے ساتھ ساتھ عصمی کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی۔ جیسے وہ ان شعلوں میں لپکتی ہوئی انگلیاں دیکھ رہا ہو۔

"خوب تو تمہیں پامسٹری سے بھی دل چسپی ہے۔" انور چلایا۔

"نہیں نہیں" عصمی چونک کر بولا۔ "پامسٹری سے میں قطعی واقف نہیں۔ یہ تو محض مشاہدے کی باتیں ہیں جو میں نے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر اخذ کی ہیں۔ درحقیقت یہ واقعہ بذاتِ خود اس قدر عظیم نہیں۔ لیکن اس کے نتائج دُوررس تھے۔ اس واقعہ نے گویا میری روح کے خوابیدہ نغموں کو چھیڑ دیا اور میرے احساسات میں نئی حسیات بیدار کر دیں۔۔۔۔ اس گلابی ہاتھ نے گویا میری روح کے تاروں کو چھو دیا۔۔۔۔ پھر وہ ہاتھ جالی کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ ٹک ٹک ٹک کوئی جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ٹھک! مخفی دروازہ بند ہوگیا۔

اس روز سارا دن میں دیوانہ وار کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ ہر آہٹ پر چونک پڑتا۔۔۔۔ اور کھڑکیوں کی جالی کی طرف دیکھتا۔ مگر بیکار۔ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالے سے گرتے ہوئے قطرات گویا میرا مذاق اڑا رہے تھے۔

اس کے بعد روز میں علی الصبح جاگ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھتا۔ کچھ دیر کے بعد چراؤں۔۔۔۔ ٹھک! کوئی مخفی دروازہ کھلتا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی آواز آتی۔۔۔۔ اور جالی کے اندھیرے میں بجلی سی، قوس بناتی ہوئی لہراتی اور پھر ایک حسین و جمیل ہاتھ جالی میں آویزاں ہو جاتا۔ ہر مرتبہ وہ ایک انوکھے انداز سے معلق ہوتا تھا اور ہر چند لمحات کے بعد ہلکی سی جالی حرکت سے ایک نیا انداز قیام پیش کر دیتا۔ پھر ایک نئی جمالی حرکت کے بعد ایک جدید روپ میں ساکن ہو جاتا۔ کبھی انگلیاں یوں لٹک جاتیں جیسے کوئی برہا میں بال بکھیرے کھڑی ہو۔ کبھی وہ یوں اوپر کی طرف اٹھتیں جیسے شعلے لہرا رہے ہوں کبھی وہ پھول کی لانبی پتیوں کی طرح کٹورہ سی کھل جاتیں۔ کبھی بید مجنوں کی طرح جھولنے لگتیں۔ کبھی وہ قوس بنا کر اوپر کی طرف اُٹھتا۔ اور ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے کُن کہہ دیا ہو۔ اک جہاں رنگ و بو آباد ہو جاتا۔ میرے دل میں امید بھرا اضطراب پیدا ہو جاتا۔ لیکن جب وہ قوس بناتے ہوئے نیچے کی طرف گرتا تو کنول مرجھا کر

گر پڑتے ۔ رنگینیاں ایک دھندلکے میں غروب ہو جاتیں ۔ دل مایوسی سے بھر جاتا اور دور دور ایسے سنائی دیتا جیسے کسی نے برہا کا راگ چھیڑ دیا ہو ۔۔ گویا ان ہاتھوں میں زندگی اور موت کی تاریں تھیں ۔ گویا زندگی ان ہاتھوں میں کھیل رہی تھی ۔"

"پھر دفعتاً وہ ہاتھ نظر سے اوجھل ہو جاتا اور کھڑکی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ۔ یا جیسے کسی آنکھ سے زندگی کی روشنی گل ہو جاتی ۔ ٹک ٹک ٹک ۔۔۔۔ چراوں ، ٹھک ، اور پھر وہی ہو کا عالم اور وہی ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ ۔"

"پھر جب مجھے ہوش آتا اور کمرے میں ٹنگے ہوئے نقوش کی طرف دیکھتا تو وہ سب دھندلائے ہوتے اور دیر تک اس دھندلکے سے مخلصی پانے کے لئے جدوجہد میں کھوئے رہتے آخر جب مدھم سے نقوش ابھرتے تو میں دیکھتا کہ "امید" پر مایوسی چھا رہی ہے اور نشے کے دیوتا پر مردنی ، وینس آف میلو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر آنسو بہا رہی ہوتی ، کائنات خالق کی طرف مایوس نگاہوں سے تک رہی ہوتی ۔ لیکن وہ شیطان کیوپڈ ۔۔۔ میرا جی چاہتا تھا اُسے اٹھا کر باہر پھینک دوں ۔ پلاسٹر کے اس ننھے منے بچے کی اتنی جسارت !! ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔" عصمی نے مسکرا کر انور کی طرف دیکھا ۔

"میں اس بدمعاش ننھے منے کی شرارت سے واقف ہوں ۔ اچھی طرح سے واقف ہوں ، ۔۔۔۔۔ پھر ۔۔"

"تو صاحب" عصمی نے بیان کرنا شروع کیا ۔ "مختصر یہ کہ اس رنگین ہاتھ نے میری زندگی حرام کر رکھی تھی ۔ مجھے زندگی عطا کر رکھی تھی ۔ اس نے میری کام کرنے کی اہلیت سلب کر رکھی تھی اور مجھ میں آرٹ کی انوکھی اور تازہ صلاحیتیں بیدار کر رہا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے پرانے نقوش حرف غلط کی طرح مٹا دوں ۔ وہ "خالق" جسے میں ان دنوں مکمل کر رہا تھا ۔ وہ تو بالکل میرے دل سے اتر گیا تھا ۔ بلکہ اب اکثر مجھے خیال آتا ہے کہ وہ واقعہ صرف اسی لئے پیش آیا تھا کہ فطرت کو مجھے خالق کا بہتر تصور دینا مقصود تھا ۔ ہیولے کے دھندلکے میں ایک رنگین اور منور ہاتھ ۔"

"کبھی کبھی بیٹھے بیٹھائے اس ہاتھ کی جمیل حرکات اور حسین انداز کا خیال کرتے ہوئے مجھے شبہ ہوتا کہ وہ حرکات بے مقصد نہ تھیں ۔ بلکہ شاید کوئی خالق ان جمالی حرکات کے ذریعے نرت کے انداز میں کائنات کی تخلیق کا راز سمجھا رہا تھا ۔ یا جیسے کوئی کتھا کلی کا فنکار مخصوص "مدھرا" کی مدد سے کوئی کتھا سنا رہا تھا جس کا مرکزی خیال بنیادی حقائق سے متعلق تھا ۔ کیونکہ حرکات کے جمالی ہونے کے باوجود ان میں ایک ان جانی گہرائی محسوس ہوتی تھی ۔"

"تو صاحب" عصمی نے آہ بھر کر کہا ۔ "کتھا کلی کا فن کار فسانہ کہتا رہا ۔ اور میں اسے سنتا رہا ۔ اور بن سمجھے سمجھتا رہا ۔ اگرچہ میرا ذہن اس کے حسین مدھرا کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہو جاتا تھا کہ مجھے اپنی خبر نہ رہتی ۔ مگر میری حیات میں عجیب سی بیداریاں پیدا ہو جاتیں اور میرے دل میں عجیب انوکھی دھڑکنیں بیدار ہوتیں ۔"

"پھر دفعتاً مجھے سوجھی اور میں نے ایک کاغذ پر خونیں دل کی تصویر بنا کر رکھ لی تاکہ جب کھڑکی میں وہ رنگین ہاتھ معلق ہو تو میری کھڑکی میں دل دھڑکتا ہوا دکھائی دے ۔ اس سے میرا کوئی خاص مقصد نہ تھا ۔ تم جانتے ہو جذبات کا اظہار بذاتِ خود ایک مسرت ہے ۔ بے لاگ بے پایاں مسرت ۔"

اگلے دن جب وہ ہاتھ نمودار ہوا تو میں نے جھٹ دل کی تصویر اپنی کھڑکی میں ٹانگ دی ۔ دفعتاً کھڑکی کے دھندلکے میں جنبش ہوئی اور ایک کی بجائے دونوں ہاتھ معلق ہوگئے ۔

پتلی لمبی انگلیاں اوپر کو ابھریں اور ایک دلفریب لچک سے جھک کر محراب کی شکل اختیار کر گئیں ۔ پھر ایک لمبی سی انگلی اٹھی ۔۔۔ ہائیں ! دفعتاً مجھے خیال آیا اور میرا دل دھڑکنے لگا ۔ ۔۔۔۔۔ تیر کمان ! تیر کھڑکی میں آویزاں دل کی طرف جھک رہا تھا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب اس ہاتھ کی حرکات جمالی ہونے کے علاوہ اظہاری بھی تھیں ۔"

"اس کے بعد روز بروز وہ حرکات پُر معنی اور پیامی ہوتی گئیں ۔ اور انہوں نے گویا میری زندگی پر خاموش مگر جامع تبصرہ کرنا شروع کر دیا ۔ اب وہ کھڑکی کے دھندلکے تک محدود نہ رہا تھا ، بلکہ اس کا وجود اس دو منزلہ مکان پر یُوں چھا

گیا تھا جیسے اس نے زمان و مکان پر مکمل قدرت حاصل کرلی ہو ۔ ابھی وہ جالی دار کھڑکی کے اندھیرے کو پُر نور کرتا تو ابھی صدر دروازے سے نکل کر گلی کی شفاف روشنی کو دھندلا دیتا ۔ پھر وہ اوپر چوبارے میں سے نکل کر چق کو ایک انداز سے تھام لیتا اور جلد ہی منڈیر سے ابھر کر فضا کو ایک انوکھا مفہوم بخش دیتا ۔ پھر تو مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ویران کھڑکیاں درحقیقت دُور رس آنکھیں ہیں ۔ کیونکہ میری کوئی حرکت بھی ان دیکھی نہ رہتی تھی ۔ کوئی بات پوشیدہ نہ رہتی تھی ۔ ہر واقعہ کے بعد وہ ہاتھ حرکت میں آجاتے اور نرت کی زبان میں اس پر تبصرہ کرتے اور میرے ماحول ، میرے دوست ، ساتھی اور عام ملاقاتیوں پر گونگے مگر جمیل انداز میں اپنی رائے پیش کردیتے ۔

”مثلاً ایک روز میجر حسن مجھ سے ملنے کے لئے آگیا ، میجر حسن کو تو تم جانتے ہی ہو ۔ وہی دوہرے جسم کا لمبا تڑنگا جوان جو ہمیں کافی ہاؤس میں ملا تھا۔ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ”انا“ گویا ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی ہے ۔ اور گفتگو کے دوران میں تو وہ اپنی ذات کا بھنور بنا کر اس میں ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے ۔ میری کتاب ، میرا لباس ، میرا افسر، اس کی کوئی بات میں اور میرا سے خالی نہیں ہوتی ۔“

”تو صاحب اس روز وہ مسلسل دو گھنٹے تک اپنے قصے سناتا رہا اس دوران میں مَیں چوری چوری ان جالی دار کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا ۔ لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا ۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے اشارتاً بات کی کھڑکی کی طرف منہ کرکے عظیم سے کہا ۔ عظیم میرا شاگرد تھا اور اس وقت ایک کونے میں بیٹھا کام کر رہا تھا ، میں نے کہا بہت بڑا آدمی تھا یہ میجر ۔ بہت بڑا ، بے حد پڑھا لکھا اور قابل ۔۔۔۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟ درحقیقت عظیم سے بات ختم نہ کی تھی کہ صدر دروازہ کھلا ۔ وہ ہاتھ آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع ہوا ۔ انگشت شہادت اور انگوٹھا ملے ہوئے تھے ۔ گویا ، ان میں کچھ پکڑا ہوا ہو اور باقی انگلیاں یوں پیچھے کی طرف سمٹی ہوئی تھیں ۔۔ جیسے کراہت سے مڑی ہوئی ہوں ۔ پھر وہ بازو اندر چلا گیا ۔۔۔ دروازے کی درز میں کوئی دونوں ہاتھ جھاڑ رہا تھا ۔“

”میجر حسن کے متعلق اس کی رائے کس قدر جامع اور مکمل تھی اور پھر اس

کا انوکھا اندازِ اظہار ۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس پلپلے کیڑے کو پھینکنے کے اشارے نے مجھے کس قدر متاثر کیا ۔ نہ جانے کب تک میں اس کے تخیئل کی پختگی اور اظہار کی رنگینی سے مبہوت بیٹھا رہا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب میں اس کی ذہانت کی بلندی سے مسحور ہو کر اسی کے وجود سے بے نیاز ہو گیا تھا ۔ اس بات سے غالباً وہ سیخ پا ہو گئی ۔ کیونکہ پھر جو مجھے ہوش آیا تو کھڑکی کے دھندلکے میں وہ ہاتھ گیان دھیان کا آسن دھارے قائم تھا ۔ میرے سوچ بچار میں کھو جانے پر کیسا واضح اور رنگین شکوہ تھا ۔ مسرت کے مارے میں جھومنے لگا ۔ لیکن بات بڑھانے کے لیے میں واقعی مہاتما بدھ کا سا گیان دھیان کا آسن جما کر بیٹھ گیا کہ دیکھوں اب وہ کیا کرتی ہے ۔ اور جانتے ہو اس نے کیا کیا ؟"

"کیا ؟" انور نے وفورِ شوق سے پوچھا ۔

"کھڑکی کے دھندلکے میں ایک زخمی کبوتر تڑپنے لگا ۔"

"واہ واہ واہ" انور چلّایا ۔ "حد ہے ذہانت کی ۔"

"ذہانت کی ہی نہیں ۔ وہاں تو ہر بات کی حد ہو رہی تھی ۔" عصمی چلایا ۔

"اس کے اس اشارے پر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ لیکن خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے کوئی موزوں اشارہ سمجھ میں نہ آیا ۔ بصد مشکل میں نے دونوں ہاتھ یوں اٹھائے جیسے ملکہ کو تاج پہنا رہا ہوں ۔ لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ بات نہیں بنی ۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں پھول والا آنکلا ۔ پھول والے ۔ پھول والے وہ چھوٹا لڑکا صدر دروازے سے باہر نکل کر چلانے لگا ۔ جب پھول والا دروازے کے قریب پہنچا تو لڑکا چپکے سے اندر گم ہو گیا اور دروازے کی درز سے ہاتھ نکل آیا ۔ ہار تھام کر وہ ہاتھ وہیں قائم رہا اور جب پھول والا چلا گیا تو دونوں ہاتھوں نے باہر نکل کر ہار کو یوں قوسی جنبش دی جیسے کسی کے گلے میں ڈالا جا رہا ہو ۔ خراجِ تحسین پیش کرنے کی آرزو سے میرا سر جھک گیا ۔"

"خوب ہے ، خوب ہے ۔" انور چلّایا ۔

"اب میں تمہیں کیا کیا بتاؤں ۔ اس کا ہر اشارہ مکمل اور موزوں ہوتا تھا اور اس کی رائے تعمیری تنقید سے بھرپور ہوتی تھی ۔ مثلاً ایک روز جب شفیق

میرے پاس بیٹھا تھا ۔ شفیق کو تم نہیں جانتے وہ میرا بڑا بے تکلف دوست ہے ۔ سرخ و سفید رنگ ، بھرا بھرا جسم اور نفیس اور رنگین مزاج ۔ اس وقت میں ڈسک پر بیٹھا تھا اور وہ دروازے میں کرسی پر دراز تھا اور ہم باتیں کر رہے تھے ۔ دفعتاً مجھے شرارت سوجھی ۔ میں نے باآواز بلند کہا ۔ سمجھ میں نہیں آتا لڑکیوں کو تو ایک نظر دیکھتے ہی تم پر مرمٹنا چاہئے ۔ تمہارا یہ سرخ و سپید رنگ ، یہ چوڑی چھاتی ۔ مضبوط شانے آخر تم میں کس بات کی کمی ہے ؟ کس بات کی کمی ہے ؟ میں نے ان کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا ۔ معاً دروازے میں جنبش ہوئی ۔ اور بازو نے سیاہ جالی دار دوپٹہ تھامے باہر نکل کر یوں گولائی میں حرکت کی جیسے کسی کے سر پر دوپٹہ پہنا رہا ہو ۔ ہائیں ! مسرت اور تعجب سے میری چیخ نکل گئی ۔ تو کیا دوپٹہ کی کسر ہے ! شفیق شوق بھرے اضطراب سے مڑا ۔ مگر دروازہ بند ہو چکا تھا ۔ کس سے بات کر رہے تھے ۔ وہ چلّایا ۔ "خالق" سے میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا ۔ "نقّادِ خالق" سے ، میں نے جھوٹ موٹ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ اس کی پیشانی پر قطرے تیرنے لگے ۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالے سے پانی کے گرتے ہوئے قطرے گویا اس پر فقرے کس رہے تھے ۔"

"بھئی واہ" انور پیشانی کو پونچھتے ہوئے اور ہنستے ہوئے بولا ۔ "تم نے تو اس ہاتھ کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے ۔

"الٹا اس ہاتھ نے مجھے زندۂ جاوید کر دیا ہے ۔" عصمی نے ایک آہ بھری ۔

"تو کیا" انور بولا ۔ "اتنی گہری دوستی کے باوجود تم اس ہاتھ والی کے متعلق مزید کچھ نہ جان سکے ۔"

"نہیں" عصمی نے آہ بھری ۔ "اس ننھے لڑکے اور چنچل ہاتھ اور پانی کے گرتے قطرات کی ٹپ ٹپ کے سوا وہ مکان میرے لئے مکمل اسرار ہی رہا ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" وہ بولا ۔

"معلوم نہیں ۔" عصمی نے جواب دیا ۔ "اگرچہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس مکان کا عقبی دروازہ بھی ہے جو پچھواڑے کی گلی میں کھلتا تھا ۔ لیکن میں

اس ہاتھ کے ساحرانہ اشارات میں اس قدر کھو چکا تھا کہ میں نے کبھی کسی بات کا خیال ہی نہ کیا کہ پچھلی گلی میں جاکر مکینوں کا اتا پتا دریافت کروں یا آنے جانے والوں پر نگاہ رکھوں ۔ بلکہ مجھے تو سارا دن ڈسک پر بیٹھ کر اس دھندلی کھڑکی کو دیکھنے سے فرصت نہ ملتی تھی ۔"

عصمی چپ ہوگیا اور کچھ دیر آگ کے شعلوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا ۔ پھر دفعتاً وہ لمبی آہ بھر کر بولا ۔ "پھر جلدی ہی وہ دن آگیا ۔ آخری دن ۔"

"اس روز دن کے تین بج گئے ۔ لیکن صدر دروازے یا کھڑکی میں کوئی چمک نہ لہرائی ۔ میں تو گھبرا گیا ، نہ جانے کیا بات ہے ۔ کہیں گئے ہوئے ہیں یا طبیعت ناساز ہے ۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ سنگار کی چیزیں بیچنے والا خوانچہ فروش آگیا ۔ اور بلا تکلف ان کے صدر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا ۔ جلد ہی دروازے میں حرکت ہوئی اور ہاتھ نمایاں ہوگیا ۔

ہائیں میں تو حیران رہ گیا ۔ انگلیاں مڑی ہوئی تھیں ۔ ہتھیلی کھلی تھی اور کلائی جیسے کسی نے مروڑ کر چھوڑ دی ہو ۔ مہندی کی پڑیا تھامنے کے بعد وہ وہیں قائم رہا ۔ بلکہ خوانچے والے کے جانے کے بعد وہ اور بھی ڈھلک گیا ۔ پڑیا کھل گئی اور اس میں سے مہندی گرنے لگی ، گرتی رہی ۔ حتیٰ کہ ہاتھ میں صرف کاغذ رہ گیا ۔ کچھ دیر کے بعد پھول والے سے ہار خریدنے کے لئے وہ نکلا اور ویسے ہی ٹوٹے ہوئے انداز میں وہیں لٹکتا رہا ۔ حالانکہ روز ہار خریدتے ہی وہ یوں حرکت کیا کرتا تھا ۔ جیسے ہار کسی کے گلے میں ڈال رہا ہو ۔ اس وقت دونوں ہاتھ باہر ہوتے تھے لیکن اس روز پھول تھامے ہوئے وہ یوں لٹک رہا تھا ۔ جیسے کفن سے باہر نکلا ہوا ہو ۔ پھر نہ جانے کیسے ہار کا تاگا ٹوٹ گیا اور پھول ایک ایک کر کے گرنے لگے ۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ پرنالہ گویا رو رہا تھا ۔ پھول گر رہے تھے ۔"

"اگلے دن شام پڑگئی مگر مکان میں ذرا حرکت نہ ہوئی، نہ تو دروازہ کھلا اور نہ کوئی خوانچے والا وہاں ٹھہرا ، اس روز مجھے خواہ مخواہ کا غم گھیرے ہوئے تھا ایسے محسوس کر رہا تھا میں جیسے کچھ ہونے والا ہے ۔ ہائیں میرا دل گویا تھم گیا اور دفعتاً

میں نے محسوس کیا کہ اس روز پرنالے سے پانی کے قطرے بھی نہیں گر رہے تھے ۔ دیوانہ وار میں باہر کی طرف بھاگا ۔ صدر دروازے پر تالہ لگا دیکھ کر میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا ۔" عصمی خاموش ہوگیا ۔ انور نے ایک لمبی آہ بھری ۔

اس وقت انور کا نوکر چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے داخل ہوا ۔ اس نے میز پر چائے کے برتن چن دئے لیکن وہ دونوں کسی گہرے تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ انہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ۔

"ہاں" عصمی لمبی آہ بھر کر بولا ۔" نہ جانے میں نے کتنے دن امید وبیم کی مدوجزر میں کاٹے لیکن روز بروز "امید" دھندلی پڑتی گئی اور "مایوسی" کی گرفت شدید ہوتی گئی "نشے کے دیوتا" کے خدوخال میں غم کی جھلک واضح ہوگئی تھی ۔ مہاتما بدھ کے گیان دھیان کے آسن میں "شانتی شانتی" کا سندیس واضح ہوتا گیا ۔ اور کیوپڈ کی نگاہوں میں شرارت کی بجائے اطمینان اور فتح کی چمک لہرانے لگی تھی ۔"

"پھر مایوس ہو کر میں گھر سے باہر نکل گیا ۔ اور دیوانہ وار گلیوں ، بازاروں باغوں اور چورستوں میں گھومنے لگا ۔ میری نگاہوں میں اشکال نہیں بلکہ ہاتھ تیرتے تھے ۔ ہاتھ سے ہاتھ ، جذبات سے بھیگے ہوئے ہاتھ ، خشک کھلے ہوئے ہاتھ، گرم اور نیم واہاتھ ، بھدی کھردری انگلیاں، مخروطی حساس انگلیاں، مضطرب انگلیاں، مخمور پورءیں، بڑھتے ہوئے، کھنچتے ہوئے، لبھاتے ہوئے ہاتھ ، بھیگی ہوئی ہتھیلیاں ، لٹی ہوئی ، دبی ہوئی ، سوئی ہوئی ہتھیلیاں اور حساس خشک اور جھری دار جلد ۔ میری نگاہوں کے سامنے ہاتھوں کا ایک طوفان تھا اور میں اس میں ڈبکیاں کھا رہا تھا ۔"

"اوہ تم آگئیں ۔ "زیب" انور چونک کر بولا ۔

عصمی کو گویا کسی نے جھنجھوڑ کر جگادیا ۔

"یہ میرے بھائی جمیل ہیں تم تو انہیں جانتی ہی ہو ۔" انور نے زیب سے کہا ۔

"اسلام علیکم ۔" عصمی نے مڑکر زیب کی طرف دیکھا ۔

زیب اُس کے پیچھے ہاتھ جیب میں ڈالے گویا سہمی ہوئی کھڑی تھی ۔ اس

کے کھلے بال شانوں پر لٹک رہے تھے ۔
زیب نے آہستہ سے سر جھکا کر اس کے سلام کا جواب دیا ۔
"واہ زیب" انور چلّایا ۔ "تم نے تو کھو دیا ۔"
زیب نے تعجب بھری نگاہ سے انور کی طرف دیکھا ۔
"اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم نے کیا کھویا ہے۔" انور بولا ۔ "ابھی ابھی جمیل اپنی ہاتھ بیتی سنا رہا تھا ۔ کس قدر دلفریب واقعہ تھا ۔ بیٹھ جاؤ نا ۔"
"جمیل کے لئے چائے بھی بناؤ گی یا کھڑی منہ دیکھتی رہو گی ؟"
زیب مسکرا دی اور کرسی پر بیٹھ گئی ۔
"اچھا جمیل تو کیا تمہیں وہ ہاتھ پھر کبھی دکھائی دیئے ؟"
عصمی نے سر نفی میں ہلایا اور شعلوں کی طرف دیکھنے لگا ۔
"سنا تم نے زیب جمیل کو کسی کے ہاتھوں سے عشق ہو گیا تھا ۔"
"ہاتھوں سے ؟" وہ پیالی بناتے ہوئے بولی ۔
"ہاں" وہ آہ بھر کر مسکرایا ۔ "جمیل نے اس کے ہاتھوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا ۔"
"اوہ" وہ دلفریب انداز میں ہنسی ۔ "انہوں نے دیکھا نہیں یا اس نے دکھایا ہی نہیں" زیب نے کنکھیوں سے عصمی کی طرف دیکھتے ہوئے انور سے پوچھا ۔
اس نے دکھایا ہی نہیں" انور نے جواب دیا ۔
"بیچاری!" وہ جمیل کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی ۔
" اچھا جمیل یہ بتاؤ کہ اگر تم وہ ہاتھ ایک نظر دیکھ پاؤ تو کیا پہچان لو گے انہیں ۔" انور نے پوچھا ۔
"چائے پیجئے ۔" زیب نے پیالی عصمی کی طرف بڑھائی ۔
"پہچان لوں گا ؟" عصمی تڑپ کر بولا ۔ "ان کے ہاتھوں کو نہ پہچانوں ۔۔۔۔ ان ہاتھوں کو ، ان کی خوبصورتی ، ان کی پاکیزگی ۔۔۔۔"
زیب کے ہاتھوں سے پیالی گر کر چور چور ہو گئی ۔

.........○.........

سوپور کی کھڑکی

دفعتاً شاہ صاحب کے گول مٹول چہرے میں حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ۔ ان کے ابھرے ابھرے ڈنلوپی گال یوں پچک گئے جیسے ان میں سے ہوا خارج ہوگئی ہو ۔ اور غروب شدہ آنکھیں از سرِ نو طلوع ہوگئیں ۔ چہرے کی گولائیاں ہموار ہوگئیں ۔ رنگ زرد ہوگیا ۔ گول بٹنوں کی سی آنکھیں ساکن ہوگئیں ۔ پھر وہ پُراسرار انداز میں میری طرف بڑھے ۔ چہرہ کلوز اپ میں آتا گیا ۔

"اونہوں" نادر صاحب" وہ بولے "السار میں نہ جانا ورنہ پچھتاؤ گے ۔ مظہر ایک مرتبہ وہاں گیا تھا ۔ صرف دو ایک مرتبہ اور پھر ، پھر وہ سوپور سے غائب ہوگیا اور آج تک ہمیں اس کی خبر نہیں ملی اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا ورنہ ہمیں تو اس کی جان کے لالے پڑگئے تھے ۔ السار میں انسان نہیں رہتے ، اونہوں ۔" ایک ساعت کے لئے وہ رکے چہرے پر عجیب تاثر کھدا تھا ۔ گول آنکھیں جیسے بے جان ہوچکی تھیں ۔ مژگان سمٹ کر نہ جانے کہاں گم ہوچکی تھیں ۔ "میری طرف دیکھو" ۔ وہ بولے اور یوں رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ۔ جیسے بہت بڑا راز فاش کر رہے ہوں "جنات کی سب سے بڑی نشانی جانتے ہو ۔ ان کی آنکھ گول ہوتی ہے ۔ گول اور وہ اسے جھپکتے نہیں ۔" یہ کہہ کر انہوں نے کرسی سے ٹیک لگالی اور اپنی گول بادامی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں ۔

شاہ صاحب کی وہ نگاہ وہ انداز دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ ایسے محسوس ہوا مجھے جیسے وہ مجھے آپ بیتی سنا رہے تھے ۔ اور اپنی مخصوص نشانی کا عملی طور پر اظہار کر رہے تھے ۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ ابھی قہقہہ مار کر ہنس دیں گے ۔ وہ سُرخ گال ابھریں گے، وہ گول آنکھیں جو آہنی پیچوں کی طرح مجھ میں دھنسی جا رہی تھیں ۔ ان گالوں میں غروب ہو جائیں گی ۔ اور پھر دفعتاً میرے سامنے وہ کرسی خالی پڑی ہو گی اور کمرے میں ان کا پُراسرار قہقہہ گونج رہا ہو گا ۔

گھبرا کر میں اٹھ بیٹھا ۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں ۔ اجازت دیجئے ۔"
"ہاں" وہ اپنی دھن میں کرسی سے اٹھ بیٹھے ۔ "صرف یہی ایک نشانی ہے سمجھے نادر صاحب تم نے السار کے موجودہ مالک غفران کو نہیں دیکھا ۔ تم نہیں جانتے ، اس کی آنکھیں گول ہیں ۔ قہوے کی پیالیوں کی طرح گول ۔ نیلے طلسم سے لبریز پیالیاں جو ہر وقت کھلی رہتی ہیں جنہیں جھپکنے کی قوت نہیں ۔ وہ تمہیں جذب کر لیتی ہیں ۔ تمہاری قوتِ ارادی کو شل کر دیتی ہیں ۔ اور تم گویا ان نیلی جھیلوں میں ڈوبے جاتے ہو ۔ ڈوبے جاتے ہو ۔ بلکہ ڈوبنے کی خواہش تمہارے اپنے دل سے ابھرتی ہے اور پھر السار سے غفران کا قہقہہ سنائی دیتا ہے ۔ مدھم بھیانک قہقہہ ۔ کوئی انسان اس قسم کا قہقہہ نہیں مار سکتا ۔ اور وہ قہقہہ سن کر اس کی بیوی مغیرہ کراہتی ہے ۔ سسکیاں لیتی ہے ۔ وہ غفران سے ڈرتی ہے ۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ اِنسان نہیں ۔ وہ جنات میں سے ہے ۔ اور اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے اس لڑکی مغیرہ کو یہاں اٹھا لایا ہے ۔ اور دکھانے کے لئے اس نے انسان کا روپ دھار رکھا ہے اور وہ کھڑکی ۔"

دفعتاً مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی ، وہی جو اس روز السار کی بغلی بند گلی میں مجھ پر طاری ہوئی تھی ۔

نہ جانے میں السار کی بغلی بند گلی میں کیسے پہنچ گیا تھا ، اگر میرا مقصد بیگم فیروز کے ہاں جانا تھا ۔۔۔۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ سوپور میں آتے ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بیگم فیروز چند ایک دنوں کے لئے سوپور سے باہر گئی ہوئی ہے بیگم فیروز کے ہاں جانا ہوتا تو بھی بند گلی میں جانے کا سوال پیدا نہ ہوتا ۔ بیگم فیروز کے مکان کا دروازہ تو سڑک پر ہے ۔ گلی میں تو صرف کھڑکیاں کھلتی ہیں ۔

بیگم فیروز کے ہاں میں کبھی کھڑکی کے راستے سے گیا بھی تو نہ تھا ۔ پھر اس روز میں نے وہاں جانے کے لئے وہ نیا راستہ کیوں اختیار کیا ۔ اور اس روز میری کیفیت بھی تو عجیب سی تھی ۔ سر پر نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا ۔ نیچے السار کی نیلی دیوار اور گہری نیلی کھڑکیاں اور دروازے جیسے نیلا سمندر لہریں لے رہا ہو ۔ جیسے میں ان اُٹھتی ہوئی نیلی لہروں میں ڈوبا جا رہا تھا ۔

پھر دفعتاً اندر سے مغیرہ کی آواز سنائی دی ۔ "سارہ، سارہ دروازے بند کر دو ۔ اب کوئی نہیں آئے گا ۔ کوئی نہیں آئے گا ۔" نہ جانے اس کی آواز نے کیا جادو کردیا ۔ میں یوں تڑپ کر رک گیا ۔ جیسے مجھے سانپ نے سونگ لیا ہو ۔ معاً نیلا آسمان پھٹ گیا اور شنگرفی ناگ دیوتا نے پھن اٹھایا ۔ ایک رنگین قوس لپکی، ایک محراب ، ایک کھڑکی ۔۔۔۔ اور وہ آواز "سارہ ، سارہ" جیسے صحرا کے لق و دق ویرانے میں کسی کارواں کی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ جیسے یخ کے نیلے تودوں میں آگ کا ایک سنہری شعلہ ناچ رہا ہو ۔ جیسے دم گھونٹنے والے گھور اندھیرے میں ایک ننھی سی قندیل روشن ہوگئی ہو ۔ نیلے آسمان پر رنگین ہوائیاں چل رہی تھیں ۔ اشارے کر رہیں تھیں ۔ مجھے بلایا جا رہا تھا ۔ جیسے دور کوئی میرا منتظر تھا ۔ زندگی آپ مجھے بلا رہی تھی ۔ اس نیلے سمندر سے بچنے کے لئے وہ محرابی کھڑکی مجھے اشارے کررہی تھی ۔ ایک آتشی چپو میری ڈگمگاتی کشتی کی طرف بڑھا اور میرے جسم کے بند بند میں ایک رنگین دھنکی بجنے لگی ۔

نہ جانے اس وقت میری کیا حالت تھی ۔

اس بند گلی میں بیٹھا ہوا وہ پاگل فقیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اس کی کرخت آواز نے وہ طلسم توڑ دیا اور میں چونک پڑا ۔ اور یوں بھاگا جیسے میں نے جرم کیا ہو ۔

ممکن ہے السار کی عجیب و غریب داستان سنکر مجھے اس بغلی کھڑکی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہو ۔ سوپور میں آئے مجھے دو دن ہوچکے تھے اور دو دن میں میں اس پراسرار کھڑکی کے متعلق سب کچھ سن چکا تھا ۔

یہ وہی سوپور تھا ۔ جس میں میں نے اپنا بچپن بسر کیا تھا ۔ جہاں عنفوان شباب میں میں اکثر آیا کرتا تھا ۔ لیکن جب سے میں نے فرخ آباد میں کاروبار شروع کیا تھا ۔ میں سوپور کے سحر سے آزاد ہوچکا تھا ۔ ویسے سوپور وہی سوپور تھا ۔ السار کے نئے مکینوں کی آمد کے علاوہ وہاں کوئی تبدیلی واقعہ نہیں ہوئی تھی ۔ اسی طرح دو کانوں میں چہ میگوئیاں ہوتیں ، ہونٹ رازدارانہ طور پر ہلتے ۔ بھوئیں پُراسرار اشارات کرنے کے لئے جنبشیں کرتیں ۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک

لہراتی ۔ پھر وہ بات چلتی ایک پراسرار انداز سے ایک دوکان سے دوسری دوکان تک دوسری سے تیسری تک، اور بالآخر گھروں میں سرگوشیاں ہوتیں ۔ باورچی خانے میں ملیا سے کی ہوئی باتیں کھانے کے ساتھ ساتھ دسترخوان تک آپہنچتیں ۔ پنکھے کی ڈنڈی کے ساتھ ساتھ سرگوشیاں گھومتیں ، اور پھر کھڑکیاں کھلتیں "بہن سکینہ سنا تم نے ہائے بہن سکینہ میں تمہیں کیا بتاؤں" اور بہن سکینہ دونوں ہاتھوں سے ابھرتا ہوا سینہ تھامتی اور پھر جب رات کا اندھیرا چھا جاتا تو خاموشی کے پھیلے ہوئے آسمان پر مخملی سرگوشیوں کے تارے چمکتے ۔ محبت بھری آوازیں سنائی دیتیں ۔ "اور ثریا پیاری وہ کھڑکی ۔۔۔۔" اور ثریا، ساحرہ، سارہ کی رنگین انگلی بڑھ کر کسی کے ہونٹوں کو بند کردیتی ۔ اور پھر اس اندھیرے میں رنگ کی دھاریاں ناچتیں ۔

کسی زمانے میں مَیں بھی اسی سوپور کا رہنے والا تھا ۔ وہ سرگوشیاں مجھے بھی مشتعل کر دیتی تھیں اور وہ خونیں چھینٹے مجھے بھی رنگ دیتے تھے ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں ذہنی طور پر سوپور کا ایک جزو تھا ۔ لیکن آٹھ سال ہوئے جب سے فرخ آباد میں مَیں نے کاروباری زندگی شروع کی تھی ۔ جب سے مَیں نے وہاں پنسلوں کی فیکٹری چالو کی تھی ۔ میں سوپور کے سحر سے آزاد ہوچکا تھا ۔ فرخ آباد میں لوگ اونچی آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں ۔ وہاں دوکانوں میں کاروبار ہوتا ہے ۔ اور لوگ اس قدر مصروف ہیں کہ انہوں نے کبھی غور سے آسمان کی نیلاہٹ کا جائزہ نہیں لیا ۔ اور انہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا ۔ کہ مغرب میں افق پر خون کے چھینٹے اڑ رہے ہیں ۔

گذشتہ آٹھ سال سے میں سوپور میں کام یا آرام کے لئے آیا کرتا تھا اور سوپور کی اس نیلی جھیل میں کنول کی طرح چند روز گزار کر واپس چلا جاتا ۔ لیکن اس مرتبہ نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا ۔ دفعتاً میری شخصیت میں فرخ آباد کا صدر دروازہ بند ہو کر سوپور کی کھڑکی کھل گئی تھی ۔ فرخ آباد کی شاہراہ سے بھٹک کر میں سوپور کی بند گلی میں کھو گیا تھا اور مغیرہ کی اس اداس نا امید آواز نے نہ جانے کیسے میرے دل میں کسی پراسرار امید کا چراغ روشن کردیا تھا ۔

"سارہ اب کوئی نہیں آئے گا ، کوئی نہیں ۔"

اور میں نے محسوس کیا جیسے مجھے آنے کے لئے کہا گیا ہو ۔ جیسے ایک کھڑکی کھل رہی ہو ۔ مسکرا رہی ہو ۔ سرگوشیاں کر رہی ہو ۔

آپ جانتے ہیں ایک کاروباری آدمی کے لئے اس قسم کی رومانی فضا میں رہنا یا رنگین ہیجان میں مبتلا ہو جانا کس قدر تکلیف دہ بات ہے ۔ لیکن جوں جوں میں ان تاثرات کو اپنے ذہن سے مٹانے کی کوشش کرتا توں توں وہ مجھ پر اور بھی مسلّط ہوتے جاتے ۔ اس رنگین جال سے نکلنے کی کوشش الٹا مجھے اس میں جکڑ دیتی اور پھر میں گھبرا کر باہر نکل جاتا اور بیگم فیروز، شاہ صاحب، مسٹر زیڈ احمد ، فقیر دین یا عثمان جاہ کے پاس جا بیٹھتا تاکہ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت کٹ جائے ۔

لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی بہانے السار کی بات چھڑ جاتی اور پھر شاہ صاحب کے ڈنلوپی گال پھدکنا چھوڑ کر دفعتاً ہموار ہو جاتے ، گول بادامی آنکھیں طلوع ہو جاتیں اور رازدارانہ انداز سے ان کا چہرہ کلوز اپ میں آتا ۔ اور پھر ان کی آنکھیں جھپکنے کے بغیر مجھے گھورتیں ۔ اور گویا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے شاہ صاحب گنگناتے ۔ "کوئی نہیں سمجھتا ، سوپور میں کوئی نہیں جانتا غفران انسان نہیں وہ جنات میں سے ہے ۔ ہاں جنات میں سے اور وہ اس لڑکی کو اٹھا لایا ہے تاکہ اپنی ہوس ۔۔۔۔۔۔ تم سمجھتے ہو نا نادر ۔ یہ چیز ہے یہ ۔۔۔۔۔۔ اور اور وہ کھڑکی ۔" شاہ صاحب کے سرخ چہرے میں وہ دو سیاہ کھڑکیاں کھلنے کی کوشش کرتیں ۔ " روز اس کھڑکی کو پلستر سے بھر دیا جاتا ہے ۔ صاف آواز آتی ہے جیسے معمار اینٹیں لگا رہا ہو ۔ سیمنٹ جما رہا ہو ۔ سارا دن آوازیں آتی ہیں ۔ اور پھر رات کو اس کھڑکی پر دستک ہوتی ہے ۔ عجیب غیر مرئی دستک اور وہ کھڑکی کھل جاتی ہے اور اگلے روز وہ گرجتا ہے ۔ چیختا ہے چلاتا ہے ۔ بیگم ، بیگم اور بیگم روتی ہے کراہتی ہے اور معمار اینٹیں ٹھونکتا ہے اور کھڑکی کو بند کرنے میں مصروف رہتا ہے ۔ السار میں انسان نہیں بستے ۔ " شاہ صاحب کی آواز میں خوف کی نسبت شوق کا عنصر نمایاں ہوتا ۔ "تم ہی کہو نادر کیا یہ باتیں انسانوں سے متعلق ہو سکتی ہیں ۔ اور وہ بے چاری مغیرہ سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہے "آؤ آؤ" شاہ صاحب اٹھ بیٹھتے آؤ اپنے کانوں سے سن لو

اس مغربی کمرے میں اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے ۔ آؤ ۔"
دفعتاً مجھے چاروں طرف سے رنگین چھیڑ دینے والی سسکیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتیں ۔ اور میں اٹھ بیٹھتا ۔ "نہیں نہیں پھر سہی کبھی ۔ اب میں جاتا ہوں ۔"

بیگم فیروز چائے بناتے ہوئے حسب معمول بڑے غور سے پیالی کی طرف دیکھ رہی تھی اور حسب معمول اس کا ریشمیں دوپٹہ سر سے سرک کر نیچے گر چکا تھا اور حسب معمول بالوں کی ایک لٹ آہستہ آہستہ نیچے گری جا رہی تھی ۔ چینی ہلاتے ہوئے اسکا دایاں بازو جس پر آستیں ڈھلکی ہوئی تھی ۔ یوں جھول رہا تھا جیسے وہ کسی کی گردن کے گرد حائل ہو ۔

بیگم فیروز نے سر اٹھایا اور مسکرا کر بولی ۔ "نادر صاحب آپ کو پنسل سازی سے کیسے فرصت ہوگئی جو سوپور میں آ گئے ۔"

بیگم فیروز کو مجھ سے ہمیشہ یہی گلہ تھا ۔ "نادر صاحب آپ سوپور کیوں نہیں آتے کیا پنسلوں کی فیکٹری آپ کے بغیر چل نہیں سکتی ۔"

بیگم فیروز کی شخصیت سوپور کی اونچی سوسائٹی میں ایک حیثیت رکھتی تھی ۔ کوئی مجلسی اجتماع اس کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا ۔ وہ ایک مٹیار حسینہ تھی ۔ ایک ایسی حسینہ جسے اپنی ہر جمالی حرکت پر بھروسہ تھا ۔ جسے سرسری التفات اور سرسری بے نیازی کو کام میں لانا آتا تھا ۔ اگرچہ اس کا شباب ڈھل چکا تھا ۔ لیکن اس کے گذشتہ جسمانی حسن نے اب جمالی حرکات کی شکل اختیار کرلی تھی ۔ وہ ان بارعب عورتوں میں سے تھی جن کا جمال دوسروں کو متاثر کرنے کے بعد ان میں قوت تحریک شل کر دیتا ہے ۔ لیکن ایک روز نہ جانے کیا ہوا ۔ تفریح کے طور پر جب میں اس کی تصویر کی طرف لپکا ، اور اس نے اسے چھپانے کی کوشش کی تو اتفاقاً بجلی فیل ہوگئی ۔ اور میں نے اپنی مٹھی بھینچ لی ۔ "نادی" وہ چلائی اور دفعتاً مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا ۔ لیکن نہ جانے کیوں معذرت کرنے کی بجائے میں ویسے ہی بیٹھا رہا ۔ حتیٰ کہ آہستہ آہستہ مجھ پر ایک معطر بوجھ پڑگیا اور اندھیرے سے ایک مخملی سرگوشی سنائی دی ۔ "نادی تم ۔"

اس واقعہ کو پورے چار سال گزر چکے تھے ۔ اور اس واقعہ کے بعد ہمیشہ

بیگم فیروز کو میری پنسل فیکٹری سے شکایت تھی ۔ میری مصروفیتوں سے گلہ تھا ۔ اور سچی بات یہ ہے ۔ کہ مجھے سوپور آتے وقت بیگم فیروز سے ملاقات کا خیال پیش پیش رہتا تھا ۔

اس روز مجھے خاموش دیکھ کر اپنی گری ہوئی لٹ سلجھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا ۔ "فرخ آباد میں کوئی کھڑکی تو نہیں کھل گئی کیا ۔"

اس موقعے کی انتظار میں تو تھا میں ۔

"میں نے کہا جمیلہ یہ کھڑکی کا کیا قصہ ہے ۔" میں اسے جمیلہ کہا کرتا تھا ۔

"تم نے نہیں سنا"۔ وہ مسکرائی ۔ سوپور میں گذشتہ تین ماہ سے اور کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔ جہاں بیٹھو السار کی کھڑکی کھل جاتی ہے ۔ کوئی بات چھیڑو ۔ ایران کے تیل کی بات کرو یا عثمان جاہ کی نئی شادی کی نہ جانے کس طرح ہر بات کھڑکی پر آ ختم ہوتی ہے ۔"

"لیکن وہ کھڑکی کونسی ہے ۔" میں نے اپنی لا علمی کا اظہار کرنے کے لئے بات بڑھائی ۔ "یہی کھڑکی جو السار کی بغلی گلی میں ہے ۔ جس پر ہر رات دستک ہوتی ہے ۔ خاموش مدھم پراسرار دستک اور پھر ایک سرگوشی سنائی دیتی ہے ۔ غیری ، میں ہوں ۔" اور پھر وہ کھڑکی کھلتی ہے ۔ اور بند ہو جاتی ہے ۔"

"لیکن جمیلہ ، کیا سوپور میں کسی نے اس شخص کو نہیں دیکھا ، میرا مطلب ہے وہ جو کھڑکی پر دستک دیتا ہے ۔"

وہ ہنس پڑی ۔ "اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کون ہے تو بات اس قدر نہ بڑھتی ، اب تو یہ حالت ہے کہ سوپور کی بیویاں آدھی آدھی رات کو اُٹھ کر خاوندوں کی چارپائیوں کا جائزہ لیتی ہیں ۔ کہ میاں موجود ہیں یا چپکے سے گھر سے باہر تو نہیں نکل گئے ۔ ہر کسی کو دوسرے پر شک ہے ۔ مائیں جوان بیٹوں کی رکھوالی کرتی ہیں ۔ بیویاں خاوندوں پر نگاہ رکھتی ہیں ۔ ہر محبوبہ اپنے حبیب کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے ۔ عجیب کیفیت ہے سوپور کی ۔ صرف اس لئے کہ کسی بند گلی میں آدھی رات کے وقت ایک کھڑکی کھلتی ہے ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔

"جمیلہ تم السار کے مکینوں سے نہیں ملی۔ کون لوگ ہیں وہ "

"نہیں ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔" وہ بولی ۔ "وہ ملنا پسند نہیں کرتے دونوں میاں بیوی ۔ ایک بار بیوی کو چھت پر کھڑے دیکھا تھا ۔ پتلی دُبلی زرد عورت ہے ۔ جیسے خلا میں زرد سا جالا تنا ہوا ہو ۔ ایسی خوبصورت بھی نہیں ۔ لیکن اس کا جسم گہرا زرد ہے ۔ جیسے زرد رنگ کی کھمبی ہو ۔ کھمبی کی زردی کو جانتے ہو ۔ مخملی زردی چمکیلی گہری زردی ۔ اور اس کی آواز میں عجیب سی اُداسی ہے اُداسی ۔ مایوسی اور دکھ ، اب تو اس نے کوٹھے پر چڑھنا بھی بند کردیا ہے ۔ اصل میں وہ ایک مظلوم عورت ہے ۔"

"نہ جانے کیوں ۔ اس کے چہرے پر خدوخال میں مظلومیت کی داستان کندہ ہے ۔ اسکا خاوند جابرانہ طبیعت کا مالک ہے ۔ سارا دن اس کی غصے بھری آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔ بیگم بیگم ۔ وہ بار بار کتے کی طرح بھونکتا ہے اور پھر السار سے چیزیں گرنے اور برتن ٹوٹنے کی آوازیں آتی ہیں ۔ پھر بیوی روتی ہے ، کراہتی ہے جیسے اس کے زخموں پر کوئی نمک پاشی کر رہا ہو ۔ وہ چلاتا ہے چیختا ہے اور وہ روتی ہے ۔ وہ دھاڑتا ہے اور وہ کراہتی ہے ۔ پھر شام کے قریب دروازے بجتے ہیں اور ایک آخری دھاڑ کے بعد وہ خاموش ہو جاتا ہےاور بیگم دیر تک کراہتی رہتی ہے ۔ روتی رہتی ہے ۔ پھر کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے اور غسلخانے سے پانی کی شپاشپ سنائی دیتی ہے ۔ پھر ٹرنک کھلتے ہیں ۔ ریشمیں کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے اور خوشبو کے لپٹے یہاں تک پہنچتے ہیں اور پھر السار پر موت کا سا سکوت طاری ہو جاتا ہے ۔ اور پھر وہی آدھی رات کے وقت کھڑکی پر دستک ہوتی ہے ۔ "میں ہوں غیری ۔ میں" کھڑکی کھلتی ہے اور بند ہو جاتی ہے اور پھر دیر تک خوابگاہ سے محبت بھری سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں ۔"

"عجیب بات ہے ۔"

"عجیب کیوں" وہ غصے میں بولی ۔ "میں سمجھتی ہوں اُسے حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچائے ۔ خاوند کی مسلسل اذیت دہی پر کیا وہ مجبور نہیں کہ اپنے جذباتی سکون کے لئے کھڑکی کھول لے مظلومیت کی گھٹن کو دور کرنے کے لئے وہ کھڑکی کھولتی ہے ، اچھا کرتی ہے وہ ، تم تو اس کے خاوند کی

طرف داری کرو گے نا ۔ مرد جو ہوئے ۔"

"نہیں نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں ۔"

"تم مردوں کا مطلب کون نہیں جانتا ۔" بیگم فیروز نے مجھ سے قریب تر ہوتے ہوئے کہا ۔ "تم مردوں کو کھڑکیوں سے بیر ہے کیونکہ وہ عورتوں کی گھٹن کو دور کر سکتی ہیں ۔" وہ میرے قریب تر ہو گئی ۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے قریب ہی کوئی کھڑکی کھلتی جا رہی ہو ۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی ۔ اور ایک رنگین سی گھٹن میری رگ و پے میں لہریں لینے لگی ۔

"سارہ ۔ سارہ ۔ دروازے بند کر دو ۔" دور سے آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا ۔

وہی آواز وہی ۔ جیسے دور کوئی کراہ رہا ہو ۔ بیگم فیروز میری نظر میں دھندلا گئی ۔ وہ رنگین کھڑکی جو میرے قریب کھلی پڑی تھی ۔ بند ہو گئی ۔ اور اس کی جگہ نیلے آسمان میں ایک سنہری قوس لپکی ۔

"اب یہاں کوئی نہ آئے گا ۔ کوئی نہیں" کسی نے ہچکی سی لی میں اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے مجھے بلایا ہو ۔ "میں جاتا ہوں ، میں جاتا ہوں ۔" مجھے اپنی آواز بھیانک سنائی دے رہی تھی ۔ اور میں چل پڑا یوں چل پڑا جیسے مجھے کہیں جانا تھا ۔ جیسے مجھے کسی نے بلایا ہو ۔ بیگم فیروز تو جیسے اس رنگین صوفے میں تحلیل ہو چکی تھی ۔

عثمان جاہ نے اگالدان میں پیک تھوک کر میری طرف دیکھا ۔ نادر صاحب اُسے کون نہیں جانتا ، کسی دلّی والے سے پوچھ لیجئے ۔ وہ دلّی کی طوائف ہے ۔ سمجھے آپ ، دلی میں وہ زعفرانی کے نام سے مشہور تھی ۔

زعفرانی اور نیلی دونوں بہنیں تھیں ۔ اس کا رنگ گہرا زرد تھا ۔ جیسے سورج مکھی کے پھول کی زرد کٹوری کا ہوتا ہے ۔ اور اس کی بہن کی آنکھیں نیلی تھیں ۔ گہری نیلی ۔ بڑی مشہور تھیں دونوں ۔ بھئی وہی زعفرانی جس کا چوبارہ زری پنواڑی کے اوپر تھا ۔ اماں وہی سبز جنگلے والا ۔ کون نہیں جانتا اسے بھئی ۔ نام بدل لینے سے شخصیت تو نہیں بدلتی نا ۔ اپنی وہی زعفرانی ہے ۔ اگرچہ اب مغیرہ بنی بیٹھی ہے لیکن صاحب واہ واہ کیا آواز پائی ہے ۔ واہ واہ واہ ،

ایک مرتبہ نواب حشمت جاہ کے ساتھ ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا ۔ نواب صاحب کو آپ جانتے ہی ہوں گے ۔ راگ کے دیوانے تھے ۔ خصوصاً ٹھمری کے ۔۔ بولے عصمی ، وہ ہمیں ہمیشہ عصمی کہا کرتے تھے ۔ کیا خوب دن تھے وہ ، دلی یاد آتی ہے نادر صاحب تو اللہ جانتا ہے کہ سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے ۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے نواب صاحب بولے عصمی آج تو کچھ سننے کو جی چاہتا ہے ۔ ہم نے کہا ۔ شوق سے چلئے ۔ بائی کا چوبارہ کچھ دور نہیں ۔ اور نادر صاحب اس وقت اتفاق سے ہم زرّی پان فروش کی دوکان کے قریب تھے ، اور صاحب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نواب صاحب زرّی کے ہاتھ کا بنا ہوا پان کا بیڑہ کھائے بغیر آگے چل دیں ۔ ہیں ؟ ہی ہی ہی ہی ۔" وہ ہنسنے لگے ۔ کیا دن تھے وہ ۔ واہ واہ واہ ۔ ۔۔ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہوگئے ۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولے تو صاحب نواب صاحب نے کہا عصمی یہیں کیوں نہ ہو جائے کچھ ، اس سبز بنگلے والے چوبارے میں کون رہتی ہے ۔"

"واہ واہ واہ ۔۔۔۔ نادر صاحب ۔۔ زندگی میں کئی باتیں ایسے موقعے پر ظہور میں آتی ہیں ۔ اور وہ مفہوم پیدا کرتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ، صاحب حیرت ،نواب صاحب نے منہ سے یہ بات نکالی ہی تھی کہ میاں اس چوبارے میں کون ہے کہ دفعتاً اوپر چوبارے سے اس نے ٹھمری کا بول کہا ۔ وہی استاد چاندوخان کی چیز ۔ وہ مشہور بھیرویں کا بول ۔

میں داسی بھئی تمہاری

اب نواب صاحب حیرت سے ہمارا منہ تک رہے ہیں ۔ اور ہمیں پان منہ میں ڈالنے کا ہوش نہیں اور زرّی پان فروش ہماری اس بات پر مسکرا رہا ہے ۔ لو صاحب اس کے بعد چوبارے پر نہ جانا ۔ ایسی بدذوقی ہم سے تو نہ ہو سکتی تھی ۔ صاحب اور حضور اوپر جاکر کیا دیکھتے ہیں ۔ دونوں بہنیں بیٹھی ہیں ۔ سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ واہ واہ واہ جیسے ایک ہی ڈال پر دو مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوں ۔ ناک نقشہ ایک ، جیسے جڑواں ہوں ۔ لیکن انداز مختلف ۔ رنگ اپنا اپنا " اور تاثر ۔۔۔۔ واہ واہ اب نواب صاحب کبھی ایک بہن کی طرف دیکھتے

ہیں کبھی دوسری کی طرف ۔ توبہ ہے ۔" عثمان جاہ خاموش ہوگئے ۔ لیکن اُن کی کیفیت ان کے دل کے اضطراب کی غماز تھی اور آنکھوں میں وہ حسرت بھری چمک تھی جو ماضی کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے ۔

"ہاں صاحب وہی زعفرانی ہے ۔ کسی بے فکرے امیر کو پھانس لیا ہے اور یہاں چلی آئی ہے ۔ سوپور میں کیا نام ہے اس کا غفران وہ کسی اچھے خاندان سے نہیں معلوم ہوتا ۔ ورنہ صاحب یوں السار میں منہ چھپا کر نہ بیٹھے رہیں ۔ نہ کسی سے ملنا نہ کسی کو بلانا ۔ آپ ہی کہئے یہ طور اطوار کیا اچھے خاندان سے متعلق ہو سکتے ہیں ۔ آج تک ہمارا ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ لیکن صاحب وہ کہتے ہیں نا خدا قدرتوں سے پہچانا گیا ہے ۔ کسی نے دیکھا نہیں ۔ بس تو ۔۔۔ اور حضرت ہم تو اولین افواہ پر ہی تاڑ گئے تھے ۔ کہ وہی ظالم ہے لیکن صاحب زرد ناگن ہےوہ جس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا ۔ اور دیکھو تو معصومیت اور غم کی تصویر سبحان اللہ کیا تصویر ہے ۔ تو صاحب وہ غفران صاحب پھنس گئے ہوں گے ۔ اب گذارہ تو غفران صاحب سے لے رہی ہیں اور رومانی تسکین کھڑکی سے " وہ قہقہہ مار کر ہنسے، "پہلے دلی میں چاہنے والے صدر دروازے سے آتے تھے ۔ اس سوپور میں وہ کھڑکی سے آتے ہیں ۔ راگ وہی ہے بندش وہی ہے ذرا تال بدل کر آڑی کر لی گئی ہے ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ یہ چیز ہے بس لیکن صاحب واہ واہ واہ کیا انداز سبحان اللہ ۔ تفصیلات قائم کرنا ختم ہے ان پر ۔ رکھ رکھاؤ بھی رہے اور بات بھی ۔ تو صاحب کیا طریقہ قائم کر رکھا ہے ۔ داد دینے کو جی چاہتا ہے واللہ ۔ یعنی بالکل وہی بات ہے مکڑی والی ۔ وہ آپ نے سنا ہی ہوگا مکڑی کا قصہ ہی ہی ہی ہی کیا انداز ہے ۔ واہ واہ واہ واہ ، جب مکھی جال میں پھنس جاتی ہے حضور تو یہ نہیں کہ اسے دبوچ لیا ۔ نہ صاحب اسے گدگدی کی جاتی ہے ۔ ہی ہی ہی ہی " وہ ہنسنے لگے جیسے انہیں کوئی گد گدا رہا ہو ۔" اور شکار ہنستا ہے ، ہنسے جاتا ہے اور صاحب اتنا ہنستا ہے اتنا ہنستا ہے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے ۔" وہ ہنستے ہنستے تھک کر خاموش ہوگئے ۔" اسے کہتے ہیں رکھ رکھاؤ ۔" اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی جارہی ہو ۔

"اہم اہم" کچھ دیر کے بعد وہ کھانسنے لگے اور پھر سنبھل کر بولے ۔ "تو نادر صاحب سننے میں آیا ہے کہ سارا دن وہ مخملی ناگن اپنے زہریلے حسن سے غفران کو ڈستی رہتی ہے ۔ حتٰی کہ شام تک وہ جذبات کی شدت سے بے حال ہو کر دیوانہ وار باہر نکل جاتا ہے ۔ اجی صاحب کون دیوانہ ہو کر باہر نہ نکلے گا ۔ آخر برداشت کی حد ہوتی ہے ۔ اور صاحب غفران نے اس ناگن سے بچنے کے لئے سوپور کے ڈاک بنگلہ کے قریب ایک کوٹھی لے رکھی ہے ۔ تاکہ وہاں وہ اس زرد ناگن سے دور سکون سے وقت کاٹ سکیں ۔ تو صاحب ہوتا یہ ہے کہ زعفرانی انہیں سر شام ہی وہاں چلے جانے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ پھر وہ احساسِ فراغت سے اٹھ کر بناؤ سنگار کرتی ہے اور اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھ جاتی ہے کہ کب کھڑکی پر دستک ہو اور کب "میں داسی بھئی تمہاری" "ہی ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگے ۔

صمدو حجام چمڑے پر استرا چلاتے ہوئے راز دارانہ انداز میں کہنے لگا ۔ "اجی بابوجی اس پٹھے کو ساری بات مالم ہے ۔ رئیس زادہ ہے وہ کیا نام ہے اسخا ۔ ارفان یا عرفان ، بجھے تو آجتخ اسخا نام سمجھ میں نہیں آیا ۔ پانی کی طرح اس پر روپیہ بہاتا ہے بابوجی ۔ ڈیڑھ سو دو سو خابل ہوتا ہے اور پھر باخی چونچلے جو ہوتے ہیں امیروں خے ۔ اس لڑخی خو سینے سے لگا خر رخھا ہے ۔ پھر بابوجی وہ خیسے گوارا خرے گا خہ وہ رات خے وخت خسی سے ملے ۔ سوچ خی بات ہے ہاں ۔ پٹھا عیشی آدمی ہے اور جناب یہ عیشی آدمی ، خیا بات چھپی ہے ان سے ۔"

"تو تمہارا مطلب ہے اسے اس کھڑکی کا بھید معلوم ہے ۔" میں نے پوچھا ۔ واہ بابوجی الٹا خڑخی خی غلی تو اس نے خود لغار رخھی ہے ۔ پٹھا سارا دن عیش خرتا ہے اس لونڈیا خے ساتھ اور جب شام پڑتی ہے تو چپخے سے دوسرے بنغلے میں چلا جاتا ہے ۔ خس منہ سے رات غھر غزارے ۔"

صمدو نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ۔

"تم تو جانتے ہو بابوجی تم سے خیا چھپا ہے ۔"

"نہ بھئی مجھے نہیں معلوم" ۔ میں نے اسے اکسایا ۔

"بات یہ ہے" ۔ وہ میرے قریب تر ہو کر بولا ۔ "خہ ان رئیس زادوں خے ہاتھ پلے خچھ نہیں ہوتا ۔ بس حرص ہی ہوتی ہے بابو جی ۔ تو وہ سارا دن

اپنی حرص پوری کرتا ہے اور شام کوٹل جاتا ہے اور جناب وہاں سے اپنے خسی نوکر کو بھیج دیتا ہے کہ اس لونڈیا کا دل بہلا آئے ۔"

"ہائیں ۔۔۔۔۔ خود بھیجتا ہے ۔"

"ہاں بابو جی" اس کی آنکھوں میں روشنی چمکی ۔ "ہم ان امیر زادوں کے لچھن اچھی طرح جانتے ہیں ۔ وہ اپنا نواب عظمت بیگ تھا نا اسکا بھی یہی طریقہ تھا ۔ بڑا دلچسپ آدمی تھا بابو صاحب" اور وہ ہنسنے لگا ۔ ہی ہی ہی ہی ۔

صمدو حجام کے جانے پر جب دروازہ بند ہوا تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ ایسے محسوس ہوا مجھے جیسے قریب ہی کوئی کہہ رہا ہو دروازہ بند کردو سارہ اب کوئی نہیں آئے گا ۔

چند ایک ساعت کے لئے تو میں کمرے میں مضطرب گھومتا رہا ۔ پھر چپکے سے ان جانے میں کھڑکی کھول کر باہر نکل گیا ۔

چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ اور اس اندھیرے میں دور روشنی کی ایک درز سی چمک رہی تھی ۔ ایک مخملی رنگین سرگوشی مرتعش تھی ۔ اور میں دبے پاؤں چلا جا رہا تھا ۔

"کون ہے "۔ بغلی بند گلی کے فقیر کی آواز سن کر میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میں مغیرہ کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوں ۔

بڈھے فقیر نے ایک قہقہہ لگایا ۔

"دوسروں کی کھڑکیوں کو کیوں گھورتے ہو میاں ۔ تمہارے اپنے گھر کوئی کھڑکی نہیں کیا ۔"

"میں ۔۔۔ میں ۔۔۔" میں فقیر کی بات سن کر گھبرا گیا ۔

بوڑھے فقیر نے پھر قہقہہ لگایا ۔ "پاگل ہیں ۔ سبھی پاگل ہیں ۔ کھڑکی کے دیوانے کوئی دوسرے گھر کی کھڑکی کھولتا ہے کوئی اپنے کی ۔"

میں گھبرا کر مڑا ۔ دیوار کے ساتھ ایک لپٹا ہوا سایہ دیکھ کر میں ہچکچایا ۔ کون ہو تم میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔ لیکن میری قوت گویائی گویا سلب ہو چکی تھی ۔

بڈھے نے پھر قہقہہ لگایا ۔ "جاؤ بابا وہ بولا، جاؤ ۔ گھر والا چاہے دروازے

سے آئے یا کھڑکی سے کیا فرق پڑتا ہے ۔"

"غفران" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ وہ سایہ جھجھک کر پیچھے ہٹ گیا ۔ ایک ساعت تک گلی میں موت کی سی خاموشی طاری رہی ۔ پھر کھٹ مغیرہ کی کھڑکی کھل گئی اور وہ سایہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف لپکا اور پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا اور کھڑکی بند ہوگئی ۔

بڈھے کے بھیانک قہقہے سے گلی گونجنے لگی ۔

بڈھے نے چلا کر کہا ۔ "گھر والے کیا نہیں کرتے ۔ کیا نہیں کرتے ۔ کون ہے جو گھر میں کھڑکی نہیں بناتا ۔ یہ دروازے ، یہ کھڑکیاں ! اس نے ازسرنو قہقہہ لگایا ۔

میری نگاہوں تلے ایک سرخ فوارہ پھوٹ نکلا ۔ ایک رنگین قوس ایک خونیں محراب جس کے بازو ملے جارہے تھے ۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے میں اس گھور اندھیرے میں کھڑا رنگین قوس کی ایک کھڑکی تعمیر کر رہا تھا ۔

"نہیں نہیں میں چلایا ۔ مجھے فرخ آباد جانا ہے فرخ آباد ــــ" اور میں بھاگا ۔ دور رات کی اکسپرس کا وسل سنائی دے رہا تھا ۔

اور پیچھے بڈھے فقیر کے قہقہے کی آواز گونج رہی تھی ۔

○

لکھ پتی

شیخ عبدالصمد اُٹھ بیٹھے ۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے ۔ دل میں گویا ایک اضطراب سا لہریں لے رہا تھا ۔ دل کی دبی دبی حسرت کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھے ۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ کریں ۔ باآواز بلند کسی سے باتیں کریں ۔ سر پر پگڑی رکھ کر بازار میں چکر لگائیں ۔ ادھر سے اُدھر چلے جائیں ۔ اُدھر سے اِدھر آئیں ۔ لوگوں کے سلام کا جواب بڑے وقار سے دیں ۔ گردن اٹھا کر یوں چلیں جیسے سیٹھ ارجن داس چلا کرتے ہیں ۔ بات کرتے وقت کھنکھار کر گلا صاف کریں ۔ حتیٰ کہ لوگ محسوس کرنے لگیں کہ وہ اب چچا صمدو نہیں بلکہ شیخ عبدالصمد ہیں ۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا دیں کہ اب وہ معمولی دوکاندار نہیں بلکہ ایک لکھ پتی ہیں ۔ لاکھ پتی ! شیخ عبدالصمد نے خوشی کی اٹھان کو دباتے ہوئے زیرِ لب اپنے آپ سے کہا ۔ اور جھاڑن اٹھا کر اپنی مختصر سی دوکان میں پڑی ہوئی چیزوں کو جھاڑنے لگے ۔ آج وہ بار بار دوکان کو جھاڑ رہے تھے ۔ شاید ان جانے میں دوکان کی غلاظت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے ۔ یا اس مختصر سی منیاری کی دوکان پر دل ہی دل میں شرما رہے تھے ۔ دوکان کو جھاڑ کر وہ بیٹھ گئے ۔ لیکن جلد ہی گھبرا کر اُٹھ بیٹھے ۔ جیسے اس چھوٹی سی دوکان میں اُن کا دم گھٹ رہا ہو ۔ آخر وہ جوتا پہن کر اُٹھے اور چل پڑے ۔ بڑی دیر کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ بازار میں جا رہے ہیں ۔ اِس احساس پر دفعتاً اُن کی گردن اکڑ گئی ۔ انہوں نے پگڑی کو سرکا کر ماتھے کی طرف کر دیا ۔ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے سیٹھ ارجن داس کی تصویر آ گئی جو بازار سے گزرتے ہوئے لوگوں کے سلام کا جواب دیا کرتے تھے ۔ دل میں ایک خاموش ارادہ قائم ہو گیا اور وہ ایڑیاں اٹھا کر چلنے لگے ۔ لیکن اس کے باوجود بازار کے لوگ اس قدر بے حس تھے کہ شیخ صمد کی اس تبدیلی کا ذرا احساس نہ ہوا ۔

"چچا صمدو ہے ۔ سلام علیکم"! شیخ اعظم نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا ۔ "اچھے تو ہو نا چاچا"۔ ؟ "اللہ کا شکر ہے"۔ ان جانے میں خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ "آپ کی مہربانی ہے" گردن آپ ہی آپ جھک گئی ۔ ایڑیاں زمین میں گڑ گئیں ۔ اعظم کے جانے کے بعد انہیں شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ طبیعت میں غصے کی دبی دبی سی لہر پیدا ہوئی ۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا ۔ "خیر خیر"! اُنہوں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور پھر گھر کی ڈیوڑھی میں جا داخل ہوئے ۔ دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ کر وہ چارپائی پر جا بیٹھے اور بجھے ہوئے حقے کے کش لگانے لگے ۔ ثانیہ بھر کے لئے وہ یونہی کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے ۔ پھر شاید بڑھتے ہوئے اضطراب سے چھٹکارا پانے کے لئے یا اُسے تسکین دینے کے لئے غیر معمولی طور پر کھنکھار کر اُنہوں نے واحد کی ماں کو آوازیں دینی شروع کیں ۔

واحد کی ماں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولی ۔ "خیر تو ہے"۔ "خیر" انہوں نے حقے کا کش لگا کر دُہرایا ۔ "گھر میں تیسرا پھیرا ہے آج"۔ وہ بولی ۔

"اوہ" وہ گھبرا گئے ۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا ۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ واحد کی ماں سے وہ راز کہہ دیں جس نے اُن کے اندر کھلبلی مچا رکھی تھی ۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ۔ لیکن معاً ان کی نگاہ واحد کی ماں کے پاؤں پر جا پڑی ۔ اور اُنہیں یاد آیا کہ بیگم کب سے زری کی جوتی کے لئے تقاضہ کر رہی ہے اور پھر اُنہیں یاد آیا کہ بیگم سے گلے کا ہار بنوا دینے کا وعدہ بھی تو کر رکھا ہے ۔ "یعنی بات یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رک گئے ۔ "یعنی" انہوں نے پھر کچھ کہنے کے لئے بات شروع کی ۔ لیکن اُنہیں خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں یا انہیں کیا کہنا چاہئے ۔ بجھے ہوئے حقے کے ایک لمبے کش نے ان کی ڈھارس بندھائی ۔ "میں نے کہا"۔ وہ بولے ۔ "ایک دن کے لئے شہر چلا جاؤں" "شہر؟" واحد کی ماں چلّائی ۔ "ابھی تو شہر سے آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ۔ "ہاں ہاں" وہ پینترا بدل کر بولے ۔ "سوچتا ہوں کچھ مال لے آؤں"۔ "مال؟" واحد کی ماں نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔ "مال کیا کرنا

ہے ۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے لے آنا"۔ "نہیں نہیں" خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ "تمام چیزیں ختم ہو رہی ہیں ۔ بی مارکہ خضاب کے صرف دو ڈبے ہیں ۔ پشم کی بھی صرف ایک لچھی رہ گئی ہے ، اور تھوک فروش سے حساب بھی کرنا ہے"۔ "تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں ؟" وہ بولی جو جی میں آئے کیجئے لیکن واحد کی ماں کا انداز اس کی بات کو جھٹلا رہا تھا ۔ "اچھا؟" انہوں نے بیگم کے تیور چڑھے دیکھ کر اپنے آپ کو اس مشکل سے بچانے کے لئے کہا ۔ "ایک گلاس پانی تو دینا۔" اور پھر بجھے ہوئے حقے کو چُوسنے لگے ۔

شیخ صمد قصور میں معمولی سی منیاری کی دوکان کیا کرتے تھے ۔ معمولی سی ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا ۔ بڑی دوکان کے لئے اُن کے پاس سرمایہ نہ تھا ۔ کیسے ہوتا سرمایہ ان کے والد فخر الدین نے مرتے وقت عبدالصمد کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑی تھی ۔ لے دے کر ایک مکان تھا جس میں وہ رہتے تھے ۔ اور زیور بھی تھا ۔ زیور تو خیر مالیت میں کافی تھا ۔ لیکن عبدالصمد کی والدہ نے وہ سب اپنے قبضے میں لے لیا تھا تاکہ صمد اُسے ضائع نہ کر دے ۔ حتیٰ کہ اُس نے صمد پر یہ ظاہر ہی نہ کیا تھا کہ اس کے پاس اتنا زیور ہے ۔ دراصل وہ بچاری ڈر گئی تھی ۔ ڈرنے کی بات تو تھی ہی ۔

قصور میں فخر الدین کی اچھی خاصی دوکان تھی ۔ دس پندرہ روپے روزانہ کی بکری ہو جاتی تھی ۔ گھر میں کھانے پینے کو کافی تھا ۔ قصبہ بھر میں فخر الدین کی ساکھ تھی ۔ حتیٰ کہ قصور کا مشہور ساہوکار عظمت رائے بھی ضرورت کے وقت بغیر کسی تحریر کے ہزاروں روپے دے دیا کرتا تھا ۔ فخرالدین نے بھی ساہوکار کے ساتھ خوب نباہی تھی ۔ وعدہ پورا کرنے میں کبھی ایک دن کے لئے بھی نہ چوکے تھے ۔ عظمت رائے ان کی ایسی ہی عزت کیا کرتا تھا جیسی شیخ احمد علی یا شیخ عارف کی ۔ اگرچہ ان کے مقابلے پر شیخ فخرالدین کی کوئی حیثیت نہ تھی ۔ شیخ احمد علی مشہور کارخانے والے تھے اور عارف چمڑے کا بیوپار کرتے تھے ۔ اس کے باوجود فخرالدین خوش نہ تھے ۔ حالانکہ گھر میں کھانے پینے کو بہت تھا ۔ بیگم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتی تھی ۔ بچہ باقاعدہ سکول میں پڑھتا تھا ۔ مانا کہ برادری میں ان کی عزت تھی ۔ بلکہ تمام قصبے میں خاصہ وقار تھا ۔

لیکن اس کے باوجود انہیں اطمینان حاصل نہ تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی احمد علی کی طرح کارخانے کے مالک ہوں یا محمد یوسف کی طرح ان کی بھی لاہور میں بڑی دوکان ہو اور اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپے کی ضرورت تھی ۔ بڑا کاروبار شروع کرنے کے لئےایک لاکھ کیا چیز ہے ۔ بہرحال ایک لاکھ سے کم میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا ۔ اگر فخرالدین احتیاط سے کام لیتے تو شاید ایک لاکھ بھی جمع ہو ہی جاتا ۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہ شیخ ہوتے ہوئے بھی خرچ کرنے میں کافی دلیر تھے ۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ بیگم میلی میلی رہے یا اُس کی حیثیت محمد علی کی بیوی سے کم سمجھی جائے یا وہ گرمیوں میں چولھا جھونکے ۔ اگر بیگم کبھی چولھے پر بیٹھی دکھائی دیتی تو وہ پریشان ہو جاتے ۔ "میں نے کہا صمد کی ماں یہ کیا کر رہی ہو تم کسی محلے والی نے آکر دیکھ لیا تو کیا کہے گی ۔ میں پوچھتا ہوں کیا عارف کی بیوی کبھی چولھے پر بیٹھی ہے؟" میں تو آگ تاپنے بیٹھی تھی ذرا"۔ بیگم بات ٹالنے کی کوشش کرتی ۔ "آگ تاپنا ہے تو انگیٹھی لے کر پلنگ پر بیٹھو جیسے قاعدہ ہے"۔

فخرالدین کو بس ایک ہی ڈر تھا کہ اس کا رہن سہن عارف اور احمد علی سے کم تر نہ ہو ۔ جبھی تو اچھی خاصی دوکان چلانے کے باوجود فخرالدین کے پاس بیس تیس ہزار سے زیادہ سرمایہ جمع نہ ہو سکا تھا ۔

آخر ایک دن تنگ آکر فخرالدین نے لکھ پتی بننے کی عملی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اپنا تمام تر سرمایہ کسی کام پر لگا دیا جائے کوئی ایسا کام ہو انہوں نے سوچا جو چند دنوں ہی میں ہزاروں کو لاکھوں میں بدل دے ۔

بڑی چھان بین کے بعد انہوں نے اپنا سارا سرمایہ چمڑے کے بیوپار میں لگا دیا ۔ لیکن اس وقت فخرالدین یہ بات قطعی طور پر بھول گئے کہ جو بیوپار چند دنوں میں ہزاروں کو لاکھوں میں بدل سکتا ہے ، وہ لاکھ کو آن کی آن میں خاک بھی بنا سکتا ہے ۔ دراصل لاکھ روپیہ پیدا کرنے کی خواہش اُن پر اس قدر مسلّط ہو چکی تھی کہ انہوں نے خسارے کے پہلو پر سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں فخرالدین کا تمام تر سرمایہ ڈوب گیا ۔ اور خسارہ پورا کرنے کے لئے انہیں اپنی دوکان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ۔ بد قسمتی

کا یہ تھپیڑا فخرالدین کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

اگر صرف سرمائے کے ضائع ہونے کا سوال ہوتا تو شاید وہ اُسے برداشت کر لیتے۔ لیکن اپنے وقار کو مٹی میں ملتا ہوا دیکھ کر انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ بیگم نے بہتیری کوشش کی کہ انہیں سمجھائے۔ لیکن "بیگم" وہ چلائے "لوگ کیا کہیں گے۔ بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی۔ اُف!"

اس اُف نے انہیں صاحب فراش کر دیا۔ اسی شام کو خون کی ایک قے ہوئی۔ اور شام کے دھندلکے میں ان کے عزیز اور رشتہ دار حکیم، ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ڈاکٹروں کی دوائیاں اس صدمے کا سدِ باب نہ کر سکیں۔ آدھی رات کے وقت اُن کے مکان سے ایک دبی سی چیخ کی آواز اُٹھی اور چند ہی ساعتوں میں کہرام مچ گیا۔

اگرچہ فخرالدین کی موت پر بیگم غم سے دیوانی ہوگئی تھی لیکن اس قدر ہوش باقی تھا۔ کہ وہ تمام زیور اکٹھا کر کے صحن کے ایک کونے میں زمین تلے دبا کر اُسے محفوظ کر سکے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زیور فخرالدین کے کسی قرض خواہ کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ ہاں ڈرنے کی بات تو تھی ہی۔

باپ کی وفات کے بعد گھر کا تمام بوجھ عبدالصمد پر آپڑا۔ وہ اس زمانے میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اس حادثے کے بعد پڑھائی سے اُس کا جی اچاٹ ہوگیا لیکن بیکار بیٹھنا بھی تو مشکل تھا۔ آخر گھر چلانا کوئی آسان کام تھوڑا ہے۔

چنانچہ عبدالصمد نے ماں کی مدد سے کئی ایک کام شروع کئے۔ لیکن سرمائے کی کمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ سب سے پہلے انہوں نے دودھ دہی کی دکان کھولی۔ لیکن گوالوں سے نپٹنا۔ کڑاہیوں کو رگڑ رگڑ کر مانجنا، دودھ میں مناسب مقدار میں پانی اور ماش کا آٹا ملانا اور دہی تولتے ہوئے چابکدستی سے ترازو کو جُھلانا۔ شیخ صمد جیسے ناتجربہ کار نوجوان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے بعد ماں نے انہیں پان سگریٹ کی دوکان کھول دی۔ مگر اس میں بھی وہ کتھے سے ہاتھ رنگنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ بالآخر اُنہوں نے منیاری کو آزمایا۔ اگرچہ منیاری کی دوکان میں اُنہیں خاص فائدہ نہ ہوا۔ لیکن

اتنا ضرور ہوا کہ اصل زر کھائے بغیر گھر کی روٹی چلنے لگی ۔

اُن دنوں جب کبھی وہ دوکان سے گھر آتے تھے تو ماں اُنہیں ان کے والد کی باتیں سنایا کرتی ۔ بیتی ہوئی باتیں سناتے ہوئے وہ دوپٹے سے گال پر گرا ہوا آنسو پونچھ کر کہتی ۔ "واحد بیٹا ! تیرے ابا کی بڑی ساکھ تھی یہاں ۔ بڑی عزت کرتے تھے لوگ اگرچہ دوکان کچھ ایسی بڑی نہ تھی ۔ لیکن اس گھر کا ٹھاٹھ کسی شیخ کی حویلی سے کم نہ تھا ۔ مجھے چولہے پر بیٹھنے نہ دیتے ۔ کبھی بیٹھ جاتی تو کہتے کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا"۔ یہ تفصیل سناتے ہوئے بیگم کا دل بھر آتا ۔ آواز بھرا جاتی ۔ کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو جاتی ۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کر کہتی ۔ "بس ! ان کی صرف ایک خواہش تھی کہ ان کا بھی کارخانہ ہو ۔ لیکن اس کے لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ چاہئے تھا ۔ ایک لاکھ روپیہ پیدا کرنا اُن کے لئے کیا مشکل تھا ۔ اگر وہ میری بات مانتے تو نہ جان سے جاتے نہ ہماری یہ حالت ہوتی ۔ لیکن خرچ کرتے وقت اُنہیں کون روک سکتا تھا ۔ اب باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنا تمہارا فرض ہے بیٹا"۔

ماں کو روتے دیکھ کر ان کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ وہ ایک لاکھ روپیہ پیدا کریں اور اپنا کارخانہ بنائیں ۔ لیکن یہ خواہش شدید ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکی اور ان کی غربت کو اور بھی واضح کرتی چلی گئی ۔ اس احساسِ غربت نے ان کی خواہش کو اور بھی شدید کر دیا اور یہ چکر یونہی چلتا رہا ۔ حتےٰ کہ امید مایوسی میں بدل گئی ۔

پھر ایک زمانے کے بعد جب بوڑھی ماں کی وفات پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ بیس ہزار کی مالیّت کے زیور کے واحد مالک ہیں تو ان کے دل میں وہ دبی دبی یاس آمیز امید ازسرِنو بیدار ہوگئی ۔ "ایک لاکھ"! انہوں نے تھیلی کو انگلیوں سے کھجلاتے ہوئے دبی زبان میں کہا ۔ "ایک لاکھ!" ان کی آنکھوں کے سامنے کارخانے کی چمنیاں ابھرنے لگیں ۔ لیکن اس کے باوجود مدت تک انہیں زیور بیچ کر کاروبار میں لگانے کی ہمت نہ پڑی ۔ جب کبھی وہ اس بارے میں منصوبے بناتے تو ان کے دل میں والد صاحب کے کارخانے کی یاد تازہ ہو جاتی ۔ اور وہ ڈر جاتے ۔ بہرحال انہوں نے زیور کی بات کو بیگم سے چھپا کر رکھا تاکہ وہ اُس

پر قبضہ نہ جما بیٹھے۔

پھر حالات خود بخود سدھرنے لگے۔ لڑائی چھڑنے پر ان کی چھوٹی سی دوکان کے مال کی قیمت دُگنی ہوگئی۔ اور انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ زیور چالیس ہزار روپے کی مالیت کے ہیں۔ یہ واقعہ اُن کی زندگی میں بے حد اہم تھا۔ کیونکہ اگر یہ بات واقع نہ ہوتی تو شاید انہیں زیور کو مصرف میں لانے کی کبھی ہمت نہ پڑتی اس کے علاوہ رام لال صراف انہیں زیور بیچنے پر اکسا رہا تھا اور سونے کی قیمت روز بروز بڑھ رہی تھی اور انہیں ڈر تھا کہ وہ پھر گر نہ جائے۔ اس لئے انہوں نے رام لال کی معرفت سارا زیور چالیس ہزار میں بیچ دیا۔ جن میں سے بیس ہزار تو انہوں نے امپیریل بنک میں جمع کروائے۔ باقی روپوں سے موٹر کے پُرانے پُرزے خرید لئے۔ کئی ایک ماہ بعد جب انہیں رام لال کا تار ملا کہ ان کا مال چوگنی قیمت پر بک سکتا ہے تو وہ سناٹے میں آگئے۔ اُنہیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ وہ بھی اسی ہزار روپے کے مالک ہو سکتے ہیں۔ جب وہ سودا کرنے کے لئے لاہور گئے تو ان کی آنکھوں تلے تمام دنیا گویا دھندلا گئی۔ نگاہوں کے سامنے گویا ایک رنگین سا دھندلکا چھا گیا تھا۔ گردوپیش کی تمام چیزیں مبہم ہوئی جا رہی تھیں۔ اجسام پھیل کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آوازیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر مسلسل شور میں تبدیل ہوئی جا رہی تھیں۔ اس روز ہر چیز اور ہر بات غیر یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ "لاکھ پتی!" اُن کے دل میں دبی دبی سی آواز گونجتی۔ لیکن وہ محسوس کرتے گویا کوئی انہیں چڑا رہا ہو۔ ان سے مذاق کر رہا ہو۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اس تذبذب کے باوجود اُن پر ایک اضطراب چھائے جا رہا تھا جیسے وہ کسی خطرناک لیکن رنگین ہنڈولے میں جھول رہے ہوں۔

پھر دھیرے دھیرے گردوپیش کا دھندلکا نکھرنے لگا۔ چیزیں پھر سے واضح ہونے لگیں "ہوں! تو واقعی میں اب لکھ پتی ہوں"۔ نہ جانے اس لئے کہ انہیں اِس حقیقت پر یقین ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے دل میں لکھ پتی ہونے کی اہمیّت کم تر ہوتی جا رہی تھی۔

رام لال سے ملنے کے بعد وہ قصور لوٹ آئے۔ لیکن ابھی تک وہ نفسی

جھنجھناہٹ کی کیفیت قائم تھی ۔ گو اِس میں وہ شدت نہ تھی ۔ اب ان کے دل میں یہ خواہش بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اپنی اس تبدیلی کے بارے میں کسی سے بات کریں ۔ لوگوں پر واضح کر دیں کہ اب وہ عبدالصمد نہیں جو وہاں چھوٹی سی منیاری کی دوکان کیا کرتا تھا ۔ اور جسے قصبے والے چچا صمد کہا کرتے تھے ۔ شاید وہ اپنی بیوی سے تمام باتیں کہہ کر اس راز کے بھنور سے مخلصی پا لیتے ۔ لیکن اُنہیں ڈر تھا کہ راز فاش کرتے ہی اُنہیں بیگم کے لئے ہار بنوا کر دینا پڑے گا ۔ اگرچہ ہار تو ایک ہزار روپے ہی میں بن جاتا ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایسا کرنے سے لاکھ روپے میں ایک ہزار کی کمی واقع ہو جاتی اور نہ جانے کمی کبھی پوری ہوتی بھی کہ نہیں ۔ اسی لئے اُن کے لئے کسی چیز پر خرچ کرنا اب اور بھی مشکل ہوگیا تھا ۔ اس سے پہلے جب وہ محض چند سو روپوں کے مالک تھے ، تب بھی وہ خرچ کرنے سے ہچکچاتے تھے ۔ لیکن مجبوری کی حالت میں انہیں اپنی پونجی کا بیشتر حصہ بھی خرچ کرنا پڑتا ۔ تو اُنہیں یہ خیال نہ آتا کہ پونجی میں کمی واقع ہو جائے گی ۔ کیونکہ ان کی پونجی تو ویسے ہی اِس قدر قلیل تھی کہ اس میں مزید کمی کے خدشے کی گنجائش ہی نہ تھی ۔ شاید اسی لئے انہوں نے اس زمانے میں اپنے بیٹے عبدالصمد کو لاہور میں ٹائپ سیکھنے کے لئے بھیج دیا تھا ۔ ورنہ چالیس پچاس روپے ماہوار کا بوجھ اٹھانا ان کے لئے ناممکن تھا ۔ اور ممکن ہوتا بھی تو وہ طبعاً اتنا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے ۔ کیونکہ لکھ پتی ہونے کی مسلسل خواہش کے باعث ان میں فراخدلی نام کو نہ رہی تھی ۔

بجھے ہوئے حقّے کو چُوستے ہوئے ان کے سامنے ایک عظیم الشان کارخانے کی چمنیاں بلند ہونے لگیں ۔ بڑی چمنی کے پاس ہی بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چلتے چلتے فخرالدین کی شکل اختیار کر گیا ۔ وہ عبدالصمد کو حیرت اور تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ "اہم" عبدالصمد کی کھنکھار گونجی اور آن جانے میں انہوں نے اپنی پگڑی کو پیشانی پر سرکا لیا ۔ آ ۔ آ ۔ آ ۔ آ چمنی سے چکّی کی کوک سنائی دی ۔ وہ چونک پڑے ۔ جیسے انہیں کوئی بلا رہا ہو ۔

"میں نے کہا" بیگم انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے بولی ۔ "اب کے شہر گئے تو واحد کو گرم کوٹ کے لئے روپے دیئے بغیر نہ آنا ۔ بیچارہ کب سے کوٹ

کے لئے کہہ رہا ہے"۔ "گرم کوٹ!" انہوں نے حیرانی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "اب تو دسمبر بھی گذر گیا ہے۔ اب تو اس کیلئے ٹھنڈے کپڑوں کی فکر کرنا چاہئے"۔ توبہ! تم تو حد کر دیتے ہو ایسا بھی کوئی نہ ہو۔ اللہ مارے چند پیسوں کے لئے اولاد کو سردی میں ٹھٹھرتے دیکھنا؟" "لیکن واحد کی ماں۔۔۔" شیخ صمد نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں نہیں جانتی لیکن ویکن۔ توبہ ایسا پیسہ بھی کیا جو کسی کے کام نہ آئے۔ تمہیں تو بس دن رات جمع کرنے کی پڑی ہے۔ میں کیا جانتی نہیں۔ آگ لگے ایسی دولت کو جو باپ کا کلیجہ پتھر کر دے"۔

"اچھا۔ اچھا!" وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ "دے آؤں گا بابا! دے آؤں گا"۔

"اور میرا ہار" وہ مسکرا کر بولی۔ "میرے ہار کی بھی فکر ہے یا وعدوں ہی میں ٹالے جائیں گے" "اچھا۔ اچھا"! وہ مزید گھبراہٹ سے بولے "تو میں جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

"توبہ ہے"! بیگم کی آواز سنائی دی۔ "چار پیسے آجائیں تو انسان کی آنکھیں ہی بدل جاتی ہیں۔ دوسرے کی تکلیف کا تو خیال ہی نہیں رہتا۔ اللہ کرے کسی کے پاس چار پیسے نہ ہوں"۔

اگرچہ شیخ صمد کی بیوی کے منہ سے ایسی ایسی باتیں سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن نہ جانے کیوں اُس روز انہیں اس کی بات بُری لگی۔ شاید اس لئے کہ اس روز واقعی اُن کے پاس روپیہ تھا۔ اس روز وہ لاکھ پتی تھے۔ "آنکھیں ہی بدل جاتی ہیں۔ دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں رہتا"۔ ان کے کانوں میں بیوی کے فقرے بار بار گونجے۔ اور وہ اپنے آپ کو دکھی محسوس کرنے لگے۔ اس سے پہلے بیوی کی باتوں پر اُنہیں کبھی ایسا شدید احساس نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس کی باتیں سن کر وہ چپکے سے ہنس دیتے۔ "پگلی ہے!" ان کی نگاہ اپنے بوٹ پر جا پڑی۔ یہ بوٹ انہوں نے چھ برس ہوئے نیلامی میں خریدا تھا۔ چھ برس میں وہ کئی بار اُس کی مرمت کروا چکے تھے۔ حتےٰ کہ اب اس کی کھیسیں تک نکل آئی تھیں۔ جابجا سوت کے موٹے ٹانکے دکھائی دینے لگے تھے۔ "ٹو" جو کسی زمانے میں بلبلے کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ اب پچک کر رہ گئی تھی کنارا تمام کا تمام

خردبرد ہو رہا تھا ۔ تلاکئی ایک مقامات پر کھلا ہوا تھا ۔ اس کے باوجود وہ اُسے پہنے پھرتے تھے ۔ ان کا گرم کوٹ بھی تو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا ۔ آستینوں کے کنارے تو بالکل ہی گھس گئے تھے ۔ حالانکہ انہوں نے کئی بار اُسے خود مرمت کیا تھا ۔ جیبوں کے کنارے کا کپڑا بھی گھس گیا تھا اور تاگے نکل آئے تھے ۔ کالر کی بھی یہی حالت تھی ۔ اس کے باوجود اُسے پہنے پھرتے تھے ۔ انہیں نیا کوٹ بنوانے کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا ۔ اگر وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے لگتے تو گھر کا کیا حال ہوتا ۔ "دوسرے کی تکلیف کا احساس نہیں رہتا"۔ ان کے دل میں بیوی کی آواز گونجی ۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری ۔ اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے ۔ نہ جانے کیوں اس روز خواہ مخواہ ان پر مظلومیّت کا احساس چھائے جا رہا تھا ۔

سٹیشن پر گاڑی سے اُترنے کے بعد شہر کی گہما گہمی کو دیکھ کر وہ واحد کی ماں کی بات بھول گئے ۔ دھیرے دھیرے اپنی اہمیت کا احساس ازسرِنو ابھرنے لگا ۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے دوکانوں میں سجے ہوئے مال کی طرف دیکھ کر یہ احساس اور بھی نکھرنے لگا ۔ پہلے وہ شہر کی چیزوں کو دیکھ کر حسرت آمیز آہیں بھرا کرتے تھے ۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ تمام چیزیں اُن کی پہنچ سے باہر ہیں ۔ لیکن اس روز وہ چیزیں حقیر سی دکھائی دے رہی تھیں ۔ کوئی خوش پوش جوان پاس سے گذرتا تو اپنے پھٹے ہوئے کوٹ پر شرم محسوس کرنے کے بجائے اُن کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ اِک شانِ استغنا سے آگے نکل جاتے ۔

اخبار والے کو دیکھ کر ان جانے میں ان کا ہاتھ جیب ٹٹولنے لگا ۔ اس سے پہلے وہ ریڈنگ روم میں چلے جایا کرتے تھے ۔ اور چند سرخیاں دیکھ کر لوٹ آتے ۔ خبروں میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ وہ ایسا محسوس کرتے جیسے وہ باتیں کسی اَن دیکھی دنیا سے تعلق رکھتی ہوں ۔ لیکن اب گویا وہ اخبار خریدنا اپنا حق سمجھتے تھے ۔ انہیں اخباری دنیا سے ایک گہرا تعلق سا محسوس ہونے لگا تھا ۔ جیسے اب وہ خود اخباری دنیا میں آ داخل ہوئے ہوں ۔ حتیٰ کہ مطالعہ کے دوران میں اخبار میں کہیں نہ کہیں اپنا نام دیکھنے کی چھپی چھپی امید لگی رہتی ۔ اگرچہ ابھی

تک یہ امید پوری نہ ہوئی تھی ۔ لیکن اس بات پر اُنہیں دُکھ محسوس نہیں ہوا تھا ۔ سماج کا سرمایہ دارانہ نظام بدل دو ۔ کامریڈ عاصمی کی قرار داد"۔ اخبار کی پہلی سُرخی پڑھ کر وہ بھونچکے رہ گئے "نظام بدل دو ؟ سماج کو بدل ڈالو ۔ آج شب کو جنتا ٹاکیز میں پرجا مندر کی پیشکش" ان کے پاس ہی گذرتے ہوئے ٹانگے پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر چلّایا ۔ وہ پھر ٹھٹھکے ۔ جھٹ اخبار کو لپیٹ کر جیب میں ٹھونس لیا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگے ۔ جیسے اس چیختے چلاتے ہوئے متحرک ٹانگے سے دور بھاگ رہے ہوں ۔ جلدی سے انہوں نے چاروں طرف دیکھا ۔ سامنے دو آدمی پنواڑی کی دوکان پر کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ اُدھر دودھ والا تمسخر آمیز انداز میں ہنس رہا تھا ۔ چوک میں کھڑا ہوا سپاہی انہیں گھور کر دیکھ رہا تھا ۔ انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ سب ان کے راز سے واقف تھے ۔ اس احساس پر اُنہوں نے اپنی رفتار کم کر دی لیکن اس کے باوجود وہ اس چوک سے دور چلے جانا چاہتے تھے ۔ دُور دُور ۔ اپنے کارخانے کی طرف ۔

سامنے شیخ احمد علی کا کارخانہ دیکھ کر وہ رُک گئے ۔ دونوں چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا ۔ نیچے سفید چار دیواری میں بڑے پھاٹک پر ایک پٹھان لاٹھی لئے کھڑا تھا ۔ اندر چار ایک روئی سے بھرے ہوئے چھکڑے کھڑے تھے جن کے اردگرد مزدوروں کے گروہ تھے ۔ احمد علی کا کارخانہ دیکھ کر انہیں اپنا کارخانہ یاد آیا ۔ گردن ازسرِنو اکڑ گئی ۔ دل میں احمد علی کا سا وقار پیدا ہوگیا ۔ اور وہ خراماں خراماں آگے بڑھنے لگے ۔ کونے میں چھپی ہوئی سگرٹ کی دوکان دیکھ کر وہ ادھر ہوئے اور ٹکہ دے کر بولے ۔ "دو سگرٹ"! ابھی وہ سگرٹ سلگانے بھی نہ پائے تھے کہ دوکان پر رکھا ہوا سیٹ چلّانے لگا ۔ زمینوں اور کارخانوں کو قوم کی ملکیت قرار دینے کی تجویز پر حکومت غور کر رہی ہے ۔" سلگتی ہوئی رسّی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ۔ دوکاندار مسکرانے لگا ۔ اُس کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وہ عجلت سے آگے بڑھے ۔ "لاحول ولاقوۃ" نہ جانے کس بات پر وہ ان جانے میں لاحول پڑھنے لگے ۔ پھر دفعتاً انہوں نے محسوس کیا کہ سگرٹ بجھا جا رہا ہے ۔ اسے چمکانے کے لئے انہوں نے دو لمبے لمبے کش لگائے ۔

دفعتاً اُن کی نگاہ دیوار پر پڑی ۔ سامنے موٹے حروف میں لکھا تھا ۔ "جنتا

جاگی ۔ عوام کا اپنا روزنامہ" نیچے ایک بھاری بھر کم مزدور پھاوڑا اٹھائے یوں کھڑا تھا ۔ جیسے کارخانے کو گرانے آرہا ہو ۔ "لاحول ولاقوۃ"! وہ گھبرا کر آگے نکل گئے ۔ نہ جانے اس روز رام لال کی دوکان اس قدر دور کیوں ہوگئی تھی ۔

"کیسا بے ہودہ راستہ ہے"۔ انہوں نے قریب ہی ایک بچے کو پھسلتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ سے کہا ۔ عین اس وقت ان کی نظر دائیں طرف کے مختصر سے پارک میں ایک تن تنہا بنچ پر پڑی ۔ اس تن تنہا خالی بنچ کو دیکھ کر انہیں تھکن محسوس ہونے لگی ۔ اور وہ ستانے کے لئے بنچ پر جا بیٹھے ۔

بنچ پر بیٹھے ہوئے اُنہوں نے دور سے واحد کو آتے دیکھا ۔ اس وقت اُسے دیکھ کر انہوں نے خوشی بھرا اطمینان محسوس کیا ۔ جیسے پردیس میں بیگانوں کے درمیان کسی ایسے عزیز کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے جس پر بھروسہ کیا جاسکے ۔ "واحد واحد"! انہوں نے باآواز بلند پکارا ۔ آواز سن کر واحد ٹھٹھکا اُس نے بڑھ کر ادھر دیکھا ۔ والد کو پہچان کر ایک ساعت کے لئے رکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو ۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے ۔ "واحد"! وہ بولے "کہاں جا رہا ہے تو"

"جہاں میری مرضی"! وہ غصے میں چلّایا ۔ "آپ کو اس سے کیا ؟"

"ہائیں !" وہ حیران رہ گئے ۔

"کیا کہہ رہا ہے تو؟" "میری بات سُننے کی تکلیف آپ کیوں کرنے لگے"۔ وہ قریب آکر بولا۔ "یہ دیکھئے"! اُس نے اپنے کوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ تین مہینے سے منتیں کر رہا ہوں کہ مجھے ایک کوٹ بنوا دیجئے ۔ لیکن آپ نے پرواتک نہیں کی ۔ اتنا خیال بھی نہ آیا آپ کو کہ میں یہاں سردی میں ٹھٹھر رہا ہوں ۔ یہ دیکھئے"۔ اس نے پھٹی ہوئی آستینوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "کیا یہ کوٹ کسی شریف آدمی کے پہننے کے لائق ہے ۔ لیکن آپ کو میری تکلیفوں کی کیا پرواہ ۔ آپ کو تو صرف روپیہ جمع کرنے کی فکر لگی ہے ۔ آپ تو لکھ پتی بننا چاہتے ہیں"۔ وہ رُک گیا ۔

"لکھ پتی" !!! انہوں نے محسوس کیا جیسے واحد نے اُن کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو ۔ جیسے وہ بھی اُن کے راز سے واقف ہو ۔ "لعنت ہے ایسی دولت پر" وہ چلّایا ۔ "جو اپنوں کا پیٹ کاٹ کر جمع کی گئی ہو"۔ معاً ان کی نظر اپنے

پھٹے ہوئے بوٹ پر پڑی ۔ پھر اُنہوں نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کی طرف دیکھا ۔ اور واحد سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی زبان گویا منہ میں معلق رہ گئی تھی ۔ "واحد" !! کہہ کر وہ رُک گئے ۔ آنکھیں بھیگ گئیں ۔ واحد کو جاتے دیکھ کر ۔ وہ تڑپ کر لپکے ۔ "واحد" ٹھیرو تو"۔ "ٹھیروں کیسے"۔ وہ بولا "نوکری کر لی ہے"۔ وہ حیران رہ گئے ۔ "کب تک آپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا۔" اور وہ چل پڑا ۔ اُنہوں نے گھبرا کر اس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی لیکن ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ کینوس کا ایک بڑا سا متحرک تختہ واحد اور ان کے درمیان آکھڑا ہوا ۔ تختے کے نیچے پیتے لگے ہوئے تھے اور ایک چھوٹا سا لڑکا اسے دھکیل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رُک گئے ۔ پھر جو اُنہوں نے تختے کی طرف غور سے دیکھا تو اس پر موٹے حروف میں "لکھ پتی" لکھا تھا ۔ لڑکا اُنہیں ٹھٹکے ہوئے دیکھ کر دانت نکالنے لگا ۔ جیسے انہیں چڑا رہا ہو ۔ "آج شب کو کراؤن ٹاکیز میں "لکھ پتی" اشتہار کی طرف غور سے دیکھ کر اُن کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی ۔ لیکن لڑکے کی زیر لب ہنسی کو محسوس کر کے کھسیانے سے ہوگئے ۔ عین اُس وقت کسی نے اُنہیں پکارا ۔ "چچا صمدو ! چچا صمدو !" اور وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگے ۔ حتےکہ شیخ عظمت اللہ نے پیچھے سے آکر اُن کا بازو پکڑ لیا ۔ "میں نے کہا تم یہاں کہاں" ؟ عظمت اللہ چلّائے ۔ "اس شہر میں آنا تو مصیبت ہے ۔ دیکھو تو میلا لگا ہوا ہے ۔ میلا ۔ ہی ہی ہی ہی !" وہ ہنسے ۔ "یہاں آکر لکھ پتی اور مجھ سافاقہ مست سب ایک ہو جاتے ہیں ۔ سب ایک ہو جاتے ہیں ۔ ہی ہی ہی ہی !!"

"تم کیسے آ گئے یہاں" وہ کچھ کہنے کی خاطر بولے ۔ "یہ دیکھو یہ"۔ عظمت اللہ نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پنجرا بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "اخاہ کیا بٹیر ہے یہ ۔ اصلی لڑاکا نسل کا ہے ۔ اجی کیا کہنے ہیں ۔ میدان کا سورما ہے ۔ سورما ۔ یہ دیکھو ۔" انہوں نے چابکدستی سے بٹیر کو پنجرے میں سے نکال کر اُنہیں دکھاتے ہوئے کہا گردن کی یہ دھاریاں اور چھوٹی تیز چونچ دیکھا اصلی نسل کی یہی نشانی ہے ۔ ہاں ۔ پورے پچیس روپے میں خریدا ہے ۔ کیا چیز ہے ۔ اُف"۔ "پچیس روپے"؟ عبدالصمد نے حیرانی سے دہرایا ۔" اجی پچیس روپے کیا

چیز ہیں ۔ اسے تو میں پچاس روپے پر خریدنے کے لئے راضی تھا ۔ وہ تو سمجھو رورعایت میں پچیس لے لئے اس نے مجھے جانتے ہیں نا یہاں ۔ ہاں یہ سمجھ لو کوڑیوں کے مول ہاتھ آگیا ہے ۔" "لیکن پچیس ! روپے" شیخ عبدالصمد بڑبڑائے ۔ ہی ہی ہی ہی" شیخ عظمت ہنسنے لگا "تم سے لکھ پتی تو صرف روپے کی قدر جانتے ہیں ۔ چیز کی نہیں ۔ ہی ہی ہی ہی ۔" عبدالصمد کا رنگ پیلا پڑ گیا ۔ دل ڈوب گیا ۔ "ویسے بات کر رہا ہوں"۔ شیخ عظمت ہنستے ہوئے بولے ۔ "وہ دھن وان کیا جانیں جینے کی لذت کو ۔ بیچارے"!! آج شیخ محمد علی کرخنتے والے کے پاس گیا تھا ۔ وہاں معلوم ہوا کہ لوہے کے سٹے میں انہوں نے آدھا لاکھ کمایا ہے ۔ آدھا لاکھ سوچنے کی بات ہے ۔ پر شیخ نے یہ خبر یوں سنی گویا کچھ ہوا ہی نہیں ۔ اجی ایک لاکھ آجائے یا چلا جائے کیا فرق پڑتا ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ پچھلے چھ مہینے سے یہ بٹیر خریدنے کو جی تڑپ رہا تھا ۔ کل ۲۵ روپے کہیں سے ہاتھ لگے تو سیدھا یہاں چلا آیا ۔ جب سے خریدا ہے ایمان سے ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے قارون کی دولت مل گئی ہو ۔ جی چاہتا ہے سڑک پر کھڑا ہو کر ناچوں ۔ یہ خوشیاں ہم قلاشوں کو ہی نصیب ہیں ۔ دھن وانوں کو نہیں ۔ اب تم احمد علی کو دس ہزار کی موٹر دے دو ۔ کیا فائدہ اُسے کیا خوشی ہوگی اِس بات پر ۔ اونہوں ۔ اجی خوشی تو ہمیں ہوگی جب اس پنجرے کا ریشمیں غلاف بنائیں گے ۔ میں کہتا ہوں بھائی بڑا رحیم و کریم ہے وہ ۔ جسے پیسہ دیا ہے اس کے دل سے خوشی چھین لی ہے ۔ اب یہی دیکھو ۔" عظمت نے لکھ پتی والے پوسٹر پر بنی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا ۔ ویسے لکھ پتی ہے لیکن جیسے تپ دق کا مریض ہو ۔ ہی ہی ہی ہی"۔ وہ ہنسے ۔ بے چارا تماشہ بنا ہوا ہے ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ اجی آج تو وہ دن آیا ہے کہ بے چارے لکھ پتی کاروں میں منہ چھپائے جان بچانے کے لئے بھاگے پھر رہے ہیں ۔ نہ لوگوں کی ہمدردی نصیب ہے ۔ نہ دل کی خوشی ۔ ہی ہی ہی ہی ۔ اچھا تو میں چلتا ہوں" عظمت نے عبدالصمد سے زبردستی ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ۔ "کب آؤ گے واپس بھئی جلدی آجانا ۔ کہیں کھو نہ جانا ۔ یہاں" ہی ہی ہی ہی ۔ اور وہ ہنستے ہوئے چلا گیا ۔

لمحہ بھر کے لئے تو وہ حیران کھڑے رہے ۔ ویسے تو شیخ عظمت مانا ہوا باتونی تھا ۔ قصور میں سب اُسے گپی کہا کرتے تھے لیکن اس روز اس کا ایسی باتیں کرنا !! نہ جانے اُن سب کو شیخ عبدالصمد کے لکھ پتی ہونے کا کیسے علم ہو چکا تھا ۔

لکھ پتی !! ہا ہا ہا ہا ۔ پاس ہی کوئی قہقہہ مار کر ہنسا ۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا ۔ وہ لفنگے پوسٹر کے پاس کھڑے تصویر کا منہ چڑا رہے تھے ۔ "اچھا تماشہ ہے یہ لکھ پتی"۔

"سالے کو وہ پڑتی ہیں کہ سمجھ آجاتی ہے"۔ دوسرے نے تصویر کی طرف پاؤں چلاتے ہوئے کہا ۔

عبدالصمد نے محسوس کیا جیسے وہ اس سے مخاطب ہیں ۔ وہ جلدی جلدی آگے چلنے لگے ۔ لیکن سڑک پر بھیڑ دیکھ کر اُن کا دل مارے خوف کے بیٹھنے لگا ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا ۔ گویا تمام دنیا لکھ پتیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو ۔ خالی تانگہ دیکھ کر وہ بھاگ کر اُس پر جا بیٹھے ۔ یوں تانگے پر بیٹھنے کا پہلا موقعہ تھا ۔ اول تو وہ تانگے پر بیٹھا ہی نہ کرتے تھے ۔ اور کبھی بیٹھنے پر مجبور بھی ہو جاتے تو دیر تک تانگے والے سے جھگڑتے رہتے ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ بھئی ہم تو دو آنے دیں گے ۔ لیکن آج اُنہیں کرایہ چکانے کا خیال تک نہ آیا تھا ۔

رام لال سے اُنہوں نے اپنے بنک کی کاپی لی اور اسی تانگے پر لوٹ آئے ۔ رام لال بھی حیران تھا کہ آخر ان کی پریشانی کی وجہ کیا تھی ۔ لیکن اُس نے اِس بارے میں بات چھیڑنا مناسب نہ سمجھا ۔ کاپی لے کر اُنہوں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لی اور اُسے اپنے بازوؤں میں دبا لیا ۔ اِس طرح شاید وہ اپنے اس راز کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے ۔

راستے میں ہر قدم پر اُن کی جیب میں کاپی بوجھل ہوئی جا رہی تھی ۔ وہ بازو جس سے انہوں نے کاپی کو سینے سے لگا رکھا تھا ۔ سُوجا ہوا محسوس ہوتا تھا ۔ اُن کی خواہش تھی کہ ایک بار گھر پہنچ جائیں ۔ پھر وہ اس کاپی کو صحن کے اس کونے میں دبا دیں گے ۔ جہاں کبھی ان کی والدہ نے زیور دبایا ہوا تھا ۔ بس صرف گھر پہنچنے کی دیر ہے ۔ پھر وہ راز محفوظ ہو جائے گا ۔

لیکن گھر پہنچ کر نہ جانے اُنہیں کیا ہوا ۔ اک اضطراب سا چھا گیا ۔ دم گھٹنے لگا ۔ اور دفعتاً انہیں محسوس ہوا ۔ جیسے وہ اکیلے اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ جو ہر لمحہ ان کے دل کو کچلے جا رہا تھا ۔ اُس خوفناک راز سے چھٹکارا پانے کی خواہش ان پر حاوی ہوئی جا رہی تھی ۔ یہ راز اُنہیں پاگل بنا دے گا ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل کی خوشی کو کچل دے گا ۔

"واحد کی ماں" وہ بولے ۔ "واحد کی ماں"۔ ان کی بھرائی ہوئی آواز سن کر بیوی چونکی ۔ "ہائیں کیا ہے تمہیں ۔ میں نے کہا ۔ لاکھ روپیہ ۔ ایک لاکھ"۔ اُن کا حلق سُوکھ گیا ۔

"لاکھ روپیہ !! کیا کہہ رہے ہو ۔ شہر سے پی تو نہیں آئے ۔" "نہیں ۔ نہیں"۔ وہ بولے "نہیں ایک لاکھ روپیہ ملا ہے ۔ ایک لاکھ روپیہ !!" میں کہتی ہوں وہاں شہر میں روپے بٹ رہے تھے کیا ۔" "نہیں نہیں۔" وہ بولے ۔ "تو کیا سٹّہ لگایا تھا ۔" وہ ازراہِ مذاق کہنے لگی ۔ "ہاں ہاں" وہ بے خبری میں گنگنائے ۔ "یہ لو" اُنہوں نے وہ کاپی نکال کر اُس کی طرف پھینک دی ۔ "واحد کے ابا"۔ وہ چلائی ۔ "سچ کہہ رہا ہوں"۔ "ایک لاکھ ۔" واحد کی ماں نے چیخ ماری ۔ "نہیں ، تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو ۔" "اب چاہے جتنے ہار بنوالو ۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولے ۔ "ہار" وہ کتاب کو سینے سے لگا کر بولی ۔ "میں کیا پاگل ہوں کہ ہار بنواؤں ۔" "واحد نے ہم سے خفا ہو کر نوکری کر لی ہے ۔" وہ بولے ۔

"واحد ملا تھا ؟" واحد کی ماں نے سرسری طور پر پوچھا ۔ "ہاں ۔ اب تم ہی بنوا کے دو اسے گرم کوٹ ۔"

"پھر سردیاں آئیں گی تو دیکھا جائے گا" وہ بے پروائی سے بولی ۔ "پسر وہ تو خفا ہوگیا ہے ۔" اُنہوں نے کہا ۔ "ہونے دو ۔ ایسی بھی کیا ضد ہوئی ۔" وہ چلائی ۔ "تم نے تو اسے سر پر چڑھا رکھا ہے"۔

معاً انہوں نے محسوس کیا جیسے ان کے دل سے بوجھ اُٹھ گیا ہو ۔ جیسے انہوں نے کسی آفت سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہو ۔

واحد کی ماں نے دیوانہ وار کاپی کو دوپٹے میں لپیٹ کر یوں سینے سے لگا

لیا جیسے وہ کوئی خوفناک راز ہو ۔ ”کسی سے بتایا تو نہیں“ وہ اُن کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ۔ یہ کہتے ہوئے اُس کا حلق خشک ہوگیا ۔ جیسے ڈر سے گھگی بندھ گئی ہو ۔ ”واحد کے ابا“ وہ اُن کی طرف دیوانہ وار دیکھتے ہوئے خوفناک آواز میں چلّائی ۔ ”دروازہ بند ہے نا ۔ واحد کے ابّا ۔“ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں ۔ منہ سوج گیا تھا ۔ ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ جیسے رعشہ کی مریض ہو ۔ عبدالصمد نے اُن کی طرف دیکھا ۔ ”تت تت“ خواہ مخواہ اُن کے منہ سے نکل گیا ۔ بیچاری ۔

........○........

ماں

بڑھیا کا دوپٹہ شانوں پر گرا ہوا تھا ۔ گرد آلود بالوں کی ایک لٹ منہ پر آپڑی ۔ وہ قہر بھری نگاہوں سے نیچے چوگان کی طرف گھور رہی تھی ۔ سلاخ دار کھڑکی میں اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے وہ جگہ پاگل خانے کا ایک حصّہ ہے ۔

ریاض کی چیخ سن کر وہ دیوانہ وار اُٹھی ۔ "ہائے اللہ ۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ "کیا ہوا میرے لال کو ؟" ریاض کو بسورتے ہوئے آتے دیکھ کر ایک ساعت کے لئے بڑھیا نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "توبہ !! میں نے کہا نہ جانے کیا ہوگیا ۔ توبہ !!" بیٹے کی خیریت سے مطمئن ہو کر بڑھیا غصے میں غرانے لگی ۔ "کس نے مارا ہے تجھے ؟ جاجی ۔ تو بتائے گا بھی یا نہیں ؟ میں کہتی ہوں کیوں رو رہا ہے تو ؟ گر پڑا تھا کیا ؟ دھکا دیا ہے کسی نے ؟ ادھر آ ۔" اُس نے لڑکے کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور سر پر ہاتھ پھیر کر لاڈ سے بولی ۔ "ایک بار تو اپنی ماں کو بتا دے پھل دیکھیو ۔ تو تو میلے جگر کا ٹکڑا ہے ۔ ہاں ہاں کچھ بول تو سہی ۔" ریاض نے دو ایک جھوٹی ہچکیاں لیں اور بولا ۔ "بیدی نے میرا گھر ۔" "کیا کیا ہے بیدی نے" بڑھیا چلّائی ۔ میرا گھر ۔" جاجی بسورنے لگا ۔ "کیا کیا ہے اس نے تیرے گھر کو ؟ " "توڑ ۔ دی ۔ یا ۔ ہے ۔" جاجی ہچکیاں لیتے ہوئے بولا ۔ "کونسا گھر ؟" بڑھیا نے پوچھا ۔ "تو کچھ بتائے گا بھی یا نہیں ۔" "جو میں نے بنایا تھا ۔" جاجی زیرِ لب بڑبڑایا ۔ "اینٹوں سے ۔" "میں پوچھتی ہوں ۔" بڑھیا اُٹھ بیٹھی ۔ تیرا گھر توڑنے والی وہ ہے کون ناک کٹی ! مردود !! آ تو لے یہاں وہ چھوکری میں نے اُس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں تو ۔ بڑی بنی پھرتی ہے نواب زادی ۔ بچوں کے گھر توڑتے ہوئے شرم تو نہیں آتی" جوں جوں وہ کھڑکی کے

قریب آتی گئی ۔ اُس کی آواز بلند تر ہوتی گئی ۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر اُس نے جاجی کو چٹائی کی طرف دھکیل دیا جو کمرے کے ایک طرف بچھی ہوئی تھی اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ "دہائی خدا کی" اس نے دایاں ہاتھ چلا کر یوں بات شروع کی جیسے نیچے چوگان میں سامعین کا مجمع جمع ہو ۔ "جب بھی لڑکا کھیلنے نکلتا ہے یہ چھوکری اُسے تنگ کرتی ہے چڑیل کہیں کی ۔ اب اماں کی گود میں جا چھپی ہے دوڑ کر ۔ کوئی پوچھے تجھے اس بات سے مطلب ؟ چاہے وہ گھر بنائے یا حویلی ۔ تو کیوں جل کٹ جاتی ہے ۔ میرا بیٹا تو یہیں کھیلے گا ۔ اسی میدان میں ہاں ۔ یہیں گھر بنائے گا ۔ اور میں دیکھوں گی کون توڑتا ہے اُسے ۔ بڑی لاڈو تو دیکھو جو لوگوں کے گھر توڑتی پھرتی ہے ۔ لاڈو ہے تو اپنی ماں کی ہوگی ۔ جا بیٹھا کرے اس کی گود میں ۔ یہاں میدان میں تو بچے کھیلیں گے ۔ کیوں نہ کھیلیں ہاں ۔ یہ میدان ہے کسی کا اجارہ نہیں اس پر ۔" بولتے بولتے بڑھیا کا دم چڑھ گیا ۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا ۔ اس دوران میں کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو کر چاروں طرف دیکھتی رہی ۔ اردگرد کے گھروں پر خاموشی طاری تھی ۔ چاروں طرف ویرانہ معلوم ہوتا تھا ۔ کھڑکیاں خالی پڑی تھیں ۔ کوئی شخص یا جانور حرکت کرتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا ۔ دُور سامنے دھوئیں کا ایک ستون سا لہرا رہا تھا اور چکی یوں ہونک رہی تھی ۔ جیسے دبی آواز میں اُس کا منہ چڑا رہی ہو ۔ یہ چھائی ہوئی خاموشی بڑھیا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی ۔ وہ چاہتی تھی ۔ کہ کوئی اس کے روبرو آکر اُس کی باتوں کا جواب دے جیسے ۔ یا جواب نہیں دے تو اس کی باتیں سنے ۔ لیکن وہ خاموشی ۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی وہ خاموشی اسے چڑا رہی ہو ۔ محلے والے خاموشی کی اوٹ میں اس پر ہنس رہے ہوں ۔ اُس کی باتوں کا مذاق اڑا رہے ہوں ۔ یہ محسوس کر کے غصے سے اُس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں ۔ اور وہ تازہ دم ہو کر پھر سے غرانے لگی ۔ "اب کیوں نہیں بولتی ۔ سچی ہے تو سامنے آئے نا ۔ کہتے ہیں جھوٹے کے پاؤں نہیں ہوتے ۔ جبھی تو سامنے آکر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ پر میں بتائے دیتی ہوں ۔ اب کے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی تو ناک چوٹی کاٹ لوں گی ہاں ۔"

آہستہ آہستہ بڑھیا کی گرج دھیمی پڑتی گئی ۔ حتیٰ کہ غرانے کی بجائے اس

نے بڑبڑانا شروع کر دیا ۔ کھڑکی کے ساتھ والی الماری سے کٹورے میں دال ڈالی اور کھڑکی میں بیٹھ کر اس میں سے کنکر چننے شروع کر دیئے ۔ اس کے باوجود اس کی بڑبڑاہٹ میں کوئی فرق نہ آیا ۔ حتےٰ کہ اُسے یہ احساس بھی نہ رہا کہ وہ بڑبڑا رہی ہے اور بیدی کی ماں ہی نہیں ، بلکہ سارے محلے کو کوس رہی ہے ۔

بڑھیا کا دوپٹہ شانوں پر گر گیا ۔ گرد آلود بالوں کی ایک لٹ منہ پر آگری ۔ سلاخدار کھڑکی میں اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مکان پاگل خانے کا کوئی حصہ ہو ۔

دفعتاً بڑھیا نے مڑ کر چٹائی کی طرف دیکھا ۔ وہاں ریاض کا نشان تک نہ تھا ۔ "ہائے رے اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ لو پھر غائب ہوگیا ۔ ہزار بار کہا ہے اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا کر ۔ پر اس کی قسمت میں آرام سے بیٹھنا ہو بھی ۔ ان شیطانوں سے ملے بنا چین نہیں پڑتا ۔" اس نے دال کا کٹورا کھڑکی میں رکھ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ "نہ جانے کہاں گم ہوگیا ہے ۔ ہائے کتنا پیار ہے اُسے اپنے ساتھیوں سے ۔ چاہے وہ اُسے پیٹتے ہی کیوں نہ رہیں ۔ ان کے بغیر پل بھر نہیں رہ سکتا ۔ اُسے کیا معلوم کہ لوگ کیسے بیری ہیں ؟ اس کی جانے بلا ۔ جاجی ۔ او جاجی" بڑھیا نے سیڑھیوں کے قریب جا کر آواز دی ۔ اور پھر وہ ایک ساعت کے لئے خاموش کھڑی رہی ۔ "اب وہ کہیں ہو تو جواب دے ۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے ۔ توبہ یوں دبے پاؤں پاس سے نکل جاتا ہے کہ آہٹ تک نہیں ہوتی ۔ اب میں کیا انتظام کروں اس لڑکے کا ۔" بڑھیا نے سیڑھیوں میں جھانکتے ہوئے کہا ۔ ابھی روتا ہوا آجائے گا ۔ کوئی دھکا دے گا ۔ یا منہ پر تھپڑ مار دے گا ۔ اس محلے کے بچوں کا کیا اعتبار ہے ۔" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی ۔ "ایسے چالاک ہیں یہ سب ۔ اور جاجی اُسے تو کچھ پتہ ہی نہیں دنیا کا ۔"

کوٹھے پر پرلے کونے میں جاجی، بھپو اور نجو کو کھیلنے میں منہمک دیکھ کر ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکی ۔ پھر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی ۔ لیکن جلد ہی اُس کے چہرے پر خونخوار سنجیدگی چھاگئی ۔ بھوئیں تن گئیں اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر وہ یوں کھڑی ہو کر بچوں کی طرف دیکھنے لگی ۔ جیسے کوئی

پولیس والا کسی کو جرم کرتے ہوئے دیکھ کر فاتحانہ انداز سے اُسے گھورتا ہے ۔
کونے میں بھپو بیٹھی تھی ۔ اس کے سر پر ٹاٹ کا پرانا ٹکڑا گھونگھٹ کی طرح لٹک رہا تھا ۔ نجو گھٹنے ٹیکے اس کے گھونگھٹ کو سنوار رہا تھا ۔ اور جاجی سیاہی سے اپنے منہ پر مونچھ بنا رہا تھا ۔ "بس اب ٹھیک ہے" نجو بولا ۔ "ہے نا بھئی ؟ تم ہو گھر والی اور میں گھر والا ۔" یہ سن کر جاجی نے وہ ٹھیکرا پھینک دیا ۔ جس میں توے کی سیاہی پڑی تھی ۔ "اوں" وہ بسورنے لگا ۔ "گھر والا تو میں ہوں ۔" نجو ہنستا ۔ "تم ؟ " اس نے تحقیر آمیز انداز سے جواب دیا ۔ "کیوں بھپو" ججی نے جھک کر اس کا گھونگھٹ اٹھایا ۔ "یہ دیکھو میرے منہ پر مونچھ بھی ہے ۔ ہے نا بھئی ۔ اور نجو کے منہ پر تو کچھ بھی "نہیں" مونچھ کا کیا ہے ۔" نجو بے پروائی سے بولا ۔ "یہ لو" اُس نے انگلی سے ہونٹ پر سیاہی لگاتے ہوئے کہا ۔ "جاجی تو مہمان ہے مہمان ۔ جو گھر میں آیا کرتے ہیں ملنے کے لئے ۔ وہ مہمان" "یہ گھر تو ہمارا ہے ۔" جاجی چیخنے لگا ۔ "ملنے تو تم آئے ہو ۔ کیوں بھپو ۔" اُس نے دلہن سے پوچھا ۔ "ہاں" وہ بولی ۔ "ہم دونوں ملنے آئے ہیں ، میں اور بھپو ۔" نجو نے فاتحانہ انداز سے بھپو کی طرف دیکھا ۔ "ہم دونو مہمان ہیں تمہارے ۔" نجو نے کہا ۔ "تو پھر ہم نہیں کھیلتے ۔" جاجی بسورنے لگا ۔ گھر والی نے اپنا گھونگھٹ اتار کر پرے پھینک دیا ۔ معاً اس کی نگاہ بڑھیا پر پڑی اور وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی ۔ نجو نے جاجی کی ماں کو دیکھا تو نظر بچا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا ۔ جاجی سہما ہوا کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ماں کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ "ہزار بار کہا ہے تجھ سے" بڑھیا غرائی ۔ "کہ بھپو اور نجو سے نہ کھیلا کر ابھی تو کل ہی بھپو نے تیرا پیسہ چرا لیا تھا ۔ چوٹی کہیں کی ! گھر والی بن کر تیرے پیسے چرا لیتی ہے ۔ مکار !! توبہ ذرا سی لڑکیوں کو کتنے فریب کرنے آتے ہیں ۔ کیا زمانہ آیا ہے ۔ اور وہ نجو !! اللہ بچائے اس سے ۔" بڑھیا نے لپک کر جاجی کا بازو پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹ کر سیڑھیوں تک لے آئی "کہتی ہوں یہ جوڑا دور ہی رہے تو اچھا ہے ۔ لیکن تو سنے بھی کسی کی ۔ آ اب چل نیچے ۔" اُس کی آواز میں غصے اور پیار کے امتزاج کی عجیب سی جھلک تھی ۔
"نجو کی ماں تجھے اپنے گھر جانے دیتی ہے کیا ۔ ہوں؟ ابھی تو کل ہی کہہ رہی تھی

اسے ہے کتنا گندا ہے تو جا گھر جا کر منہ دھو آ کیوں ؟ میرے لال کا منہ دیکھا نہیں جاتا کیا ۔ اپنے کا تو منہ دیکھے کبھی پانی تک نہیں چھوا ۔ اللہ ماری ناک بہتی ہے ۔ چھلکے جم جاتے ہیں ۔ اور وہ بھپو کی بہن ناک چڑھائے بغیر بات نہیں کرتی ۔ لے بیٹھ یہاں ۔" بڑھیا نے ریاض کو چٹائی پر دھکیلتے ہوئے کہا ۔ ریاض رونے لگا ۔ اُسے روتے دیکھ کر بڑھیا کا غصہ یکدم کافور ہوگیا ۔ پیار سے دونوں ہاتھ اُس کے منہ پر پھیر کر بولی ۔ "نہ میرے لال رو نہ تو ۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہتی ہوں ۔ تو نہیں جانتا ۔ نجو اور بھپو تو دونوں بھتنے ہیں بھتنے اور تو ۔ تُو تو اس گھر کا روشن دیا ہے ۔ تو کیا جانے انہیں ، یہ تو سب چالاک ہیں مطلب کے وقت آجاتے ہیں ہاں ۔ ان کے ساتھ نہ کھیلا کر تو ۔"

"میں تو نہیں کھیل رہا تھا ان کے ساتھ" جاجی منہ لٹکا کر بولا ۔ "وہ کھیل رہے تھے ۔ میرے ساتھ" نجو نے مجھے بلایا تھا اور میں اس کے ساتھ اوپر چلا گیا ۔ "ہاں میرے لال" بڑھیا اُسے پچکارنے لگی ۔ "تجھے کیا معلوم جو بھی پیار سے بلائے تو اس کے پاس چلا جاتا ہے ۔" "پیار سے تو نہیں بلایا تھا ۔" جاجی چمک کر بولا ۔ "ویسے ہی بلایا تھا ۔"

بڑھیا کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ بڑھ کر ریاض کو سینے سے لگا لیا ۔ "تیری جانے بلا ۔" ریاض نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولا ۔ "اماں اس وقت تو کوئی نہیں بلا رہا مجھے ۔" "اب تو دفع ہوگئے ہیں ۔" ماں نے جواب دیا ۔ "تو اب میں جاؤں ۔" ریاض نے شوق سے پوچھا ۔ "کہاں جاؤ گے تم" وہ مسکرا کر بولی ۔ "باہر" ریاض نے بازار کی طرف اشارہ کیا ۔ "کیسی اچھی دوکانیں سجی ہیں وہاں ۔ نجو کہتا تھا ۔ ۔ ۔" دفعتاً اپنی غلطی محسوس کر کے وہ رُک گیا ۔ "بس تو پھر اُس کالے منہ والے نجو سے جا ملے گا ۔" بڑھیا نے پھر غصے سے کہا ۔ "نہیں اماں" ریاض بولا ۔ "وہ مجھے گھر والا بننے نہیں دیتا ۔ میں اس سے نہیں کھیلوں گا ۔" یہ سن کر بڑھیا پھر ہنسی ۔ ابھی سے گھر والا بننے کا شوق ہے تجھے ۔ آخر اپنے باپ کا بیٹا ہے نا ۔" بڑھیا کی مسکراہٹ میں دبی دبی آہ جھلک رہی تھی ۔ "تین بیاہ کئے" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "پر دل نہیں بھرا" "گھر والے کا تو گھر ہوتا ہے اماں ۔" ریاض اپنی ہی دھن میں بولا ۔ "اور مہمان کا تو گھر بھی نہیں

ہوتا ۔" "گھر !!" بڑھیا نے اس ویران کمرے کا جائزہ لیکر لمبی آہ بھری ۔ ریاض نے اُسے اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر الماری میں سے ٹوٹا ہوا کبوتر اٹھا لیا اور چپکے سے سیڑھیوں کی طرف چل پڑا ۔ دفعتاً بڑھیا کو احساس ہوا کہ وہ جا رہا ہے ۔ پلو سے آنکھیں پونچھ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ "جاجی ۔ کسی سے کھیلو نہیں جاجی اور دیکھیو موٹر تانگے کا خیال رکھیو ۔" لیکن ریاض جا چکا تھا ۔ ایک لمبی آہ بھر کر وہ واپس کھڑکی میں آبیٹھی ۔ ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور ہاتھ سے سر تھام کر بیٹھ گئی ۔

"گھر !!" بڑھیا کی آنکھ میں آنسو آگئے ۔ ریاض کی چھوٹی سی بات نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا ۔ بیتی ہوئے باتیں اس کے دل میں تازہ ہو رہی تھیں ۔ ۔ ۔ جب وہ گھر گھر تھا اور وہ گھر والی تھی ۔ جب گھر میں گھر والا اس کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔ اب تو وہ گھر ویرانے سے بھی بدتر تھا ۔ پھٹی پرانی ٹوٹی ہوئی چیزیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں ۔ گھر والا نہ ہو تو گھر گھر نہیں ہوتا ۔ اس نے سوچا ۔ یہی جگہ پہلے کس قدر صاف ستھری ہوا کرتی تھی ۔ یہاں جاجی کے ابا کی چارپائی ہوتی تھی ۔ وہاں اس کا حقہ پڑا ہوتا ۔ اور اس کھونٹی پر پگڑی ۔ اُس نے ایک لمبی آہ بھری ایک بار پھر پلو سے آنکھیں پونچھیں، کرتے سے ناک صاف کی اور پھر ٹھوڑی ہاتھ پر رکھ کر بیٹھ گئی ۔

کمرے میں چاروں طرف ٹوٹی پھوٹی چیزوں نے اودھم مچا رکھا تھا ۔ جیسے ان چیزوں کو احساس ہو چکا تھا کہ اب گھر گھر نہیں رہا، اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے ۔ بڑھیا نے غور سے الماری میں پڑے کھلونوں کی طرف دیکھا ۔ ایک ساعت کے لئے اُس کی آنکھ میں مسرت کی چمک جھلکی ۔ اس کے ذہن سے سوکن کا خیال اتر گیا ۔ "اپنی جان کھائے ۔" وہ بولی ۔ "چاہے کہیں رہے ۔ مجھے کیا ۔ میرا اپنا لال جیتا رہے خدا زندگی دراز کرے ۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے کس چیز کی کمی ہے ۔ اللہ رکھے جوان ہوگا ۔ چاند سی بہو لائے گا ۔ پھر سے گھر گھر بن جائیگا ۔ میں بھی پاگل ہوں جو خواہ مخواہ گھر والے کے بارے میں سوچتی ہوں ۔ ۔"

نچلی سیڑھیوں سے دبی ہوئی چیخ کی آواز سن کر وہ چونکی اور بھاگ کر اُدھر

گئی ۔ "یا اللہ فضل !! کون ہے ۔" اُس نے سیڑھیوں میں منہ ڈال کر پوچھا ۔ کوئی جواب نہ ملنے پر وہ نیچے اُتر گئی ۔ سب سے نچلی سیڑھی پر بیدی گری پڑی تھی ۔ اُسے دیکھ کر بڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا ۔ "توبہ میں سمجھی ۔ ۔ ۔" دفعتاً وہ رُک گئی ۔ اور اطمینان کا سانس لے کر بولی ۔ "ہزار بار سمجھایا ہے تمہیں کہ دھیان سے سیڑھیوں پر پاؤں دھرا کرو ۔ لیکن تم سنو بھی کسی کی ۔ ہر بات میں شرارت ہر بات میں شوخی ۔ اچھا ہوا اپنے کئے کی سزا پالی ۔ صبح تمہیں نے جاجی کا گھر توڑا تھانا ۔ اسے دھکا دیا تھا نا تو نے ۔ اب معلوم ہوا کہ گر کر کیسی چوٹ لگتی ہے ۔ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا تمہارے ساتھ ۔ جو اوروں کو دھکے دے اس کا یہی حشر ہوتا ہے ۔ اللہ بڑا انصاف والا ہے ۔ ہاں ۔"

بڑھیا کو دیکھتے ہی بیدی کو رونا بھول گیا ۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور پھر اُٹھ کر بھاگ گئی ۔

"توبہ" بڑھیا اسے بھاگتے ہوئے دیکھ کر چلائی ۔ "یہ سب بھتنے ہیں بھتنے ۔ کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ان پر ، ڈھیٹ کہیں کے ۔ چوٹ کھا کر بھی آرام نہیں آتا انہیں ۔ ان پر خدا کی مار ۔ یوں دور بھاگتے ہیں مجھ سے جیسے میں کوئی ڈائن ہوں ۔ کہتے ہیں کوئی نصیحت کی بات نہ کرے ۔ جیسے جی میں آئے کریں کوئی روکنے والا نہ ہو ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ کوٹھے پر چڑھ آئی ۔ "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کو نصیحت کرنے کی ۔ چاہے ہر روز سیڑھیوں میں گریں ۔ مجھے کیا ۔ لیکن گرنے کے لئے کیا ہماری سیڑھیاں ہی رہ گئی ہیں ۔ گرنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر گریں ۔ لیکن اُنہوں نے تو میرے ماتھے پر ہی کلنک لگانے کی قسم کھا رکھی ہے ۔ اب اللہ کرے وہ لڑکا خیر خیریت سے گھر آجائے ۔ نہ جانے کہاں سیر سپاٹے کرتا پھرتا ہے ۔ ایسا شوق چڑھا ہے اُسے سیر سپاٹے کا آخر اپنے باپ پر ہی جانا تھا نا ۔ اور یہ بھتنے اُسے دم لینے دیتے ہیں کیا ۔ وہ بیچارا کیا کرے جس کے چاروں طرف شیطان بستے ہوں ۔ وہ کب تک اُن کے اثر سے بچا رہے گا ۔ ابھی تو خیر معصوم ہے ۔ لیکن آخر یہیں جوان ہو کر ۔ توبہ اللہ نہ کرے اس پر ان کا اثر ہو ۔ توبہ ۔"

"پکڑیو ۔ پکڑیو ۔ ارے ٹھہر جا تو ۔" نیچے بازار میں دینے سبزی فروش نے شور مچایا ۔

شور سن کر بڑھیا کاماتھا ٹھنکا اور وہ بازار کی کھڑکی کی طرف بھاگی ۔ "باپو باپو ۔ ۔ ۔" نیچے دینا اپنے باپ کو آوازیں دے رہا تھا ۔ "ارے کیا ہوا ہے تجھے ۔" رحیم قصائی نے پوچھا ۔ "کاجر اٹھا کر لے گیا ہے یہاں سے ۔" دینے نے جواب دیا ۔ "کہوں گا نامیں اس کی ماں سے دوکان سے چیزیں اٹھاتا رہتا ہے ۔" "کاجر لے گیا ہے تو کیا ہوا ۔" رحیم بولا ۔ "پر یہ انڈا بھی تو توڑ گیا ہے ۔" دینا چلّایا ۔ "باپو آکر مجھے مارے گا ۔"

"اے ہے کون لے گیا ہے اس کی کاجر" کھڑکی میں سے اس نے سر نکال کر پوچھا ۔ دینے نے اُسے دیکھا تو لگا چلّانے ۔ "یہ دیکھ لے مائی تیرے لڑکے نے انڈا توڑ دیا ہے ۔ یہ دیکھ ۔ یہ ۔"

"اے ہے ۔" وہ چلّائی ۔ "کیا کہہ رہا ہے تو ۔ میرا بیٹا کیوں توڑنے لگا کسی کا انڈا ۔ کسی پر بہتان لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی تجھے ؟"

"بہتان کون لگاتا ہے ۔ میں کہتا ہوں ابھی ابھی وہ یہاں سے کاجر اٹھا کر بھاگا ہے چاہے پوچھ لو رحیم سے ۔ کیوں چاچا ۔؟"

"بڑے آئے ہو تم اور تمہارا چاچا ۔ اے ہے ان بازار والوں پر خدا کی مار ۔ ایک نا ایک جھگڑا چھیڑے رہتے ہیں ۔ فساد کئے بغیر جی نہیں لگتا ان کا ۔ توبہ ۔ جاجی تو کب سے باہر گیا ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو انڈا توڑ گیا ہے ۔ دوپہر کے وقت بھی دکھتا نہیں تمہیں ۔ کوئی اور ہو گا وہ جس نے تمہارا انڈا توڑا ہے ۔ خواہ مخواہ میرے بیٹے کا نام لگا دیا ۔ تمہیں تو اِس سے بیر ہے بیر ۔ سمجھتے ہوں گے لاوارث لڑکا ہے ۔ جو چاہیں کہہ دیں ۔ پر میں بتائے دیتی ہوں ۔ میرے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں نوچ لوں گی ہاں "کیوں کیا ہوا ۔" دینے کا باپ بھاگا بھاگا دوکان پر پہنچا ۔ "بڑھیا کے لڑکے نے انڈا توڑ دیا ہے یہ رہا ۔ جھپٹ کر گاجر اٹھا کر بھاگا تو انڈا ٹوٹ گیا ۔" دینا بسورنے لگا ۔

"اے ہے پھر وہی بات ۔ کیڑے پڑیں تیری اس زبان میں ۔" بڑھیا چلّائی ۔

"چلو کیا ہوا پھر ۔" دینے کے باپ نے سر کھجلا کر کہا ۔ "تو دھیان رکھا کرنا اپنی چیزوں کا ۔ اچھا مائی جانے دے اب ۔" دینے کے باپ نے ہاتھ جوڑے ۔ یہ اور سنو ۔ جانے دے ، اچھا مائی معاف کر اب ۔ دینا تو بچہ ہے ۔" اس کے باپ نے کہا ۔ "اسے ہے بچہ ۔" بڑھیا چلائی "یہ بچہ ہے ذرا باتیں تو سنو اس بچے کی ۔ قینچی کی طرح چلتی ہے زبان ۔ بچہ ہے !! میرے بیٹے پر اتنا بڑا بہتان لگا دیا اس بچے نے ۔ چاہے انڈا اپنے ہاتھ سے ہی چھوٹ گیا ہو ۔ اور تم کہتے ہو ابھی بچہ ہے ۔" دینا بولنے لگا تو اس کے باپ نے زن سے اس کے منہ پر چپت رسید کی ۔ "بیٹھ اب یہاں خبردار جو منہ سے بات کی ۔" "ارے بھئی" رحیم قصائی نے جالی دار دروازے سے منہ نکال کر کہا ۔ "یہ ریکاٹ والا باجہ کیوں چھیڑ دیا تو نے ۔" "اب تو جلتی کو ہوا دے رہا ہے" دینے کے باپ نے ہنس کر کہا ۔ "ہوا دینے کی ضرورت نہیں یہاں ۔ چابی بھری ہوئی ہے ۔" وہ ہنسا ۔

ان کی باتیں سن کر بڑھیا نے سر پیٹ لیا ۔ اور لگی تمام بازار والوں کو صلواتیں سنانے ۔ بازار والے اس کی باتیں سن کر ایک دو مرتبہ دبی آواز سے ہنسے ۔ پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے وہ بڑھیا نہ جانے کس سے باتیں کر رہی ہو ۔

چلا چلا کر بڑھیا کی گھگھی بندھ گئی ۔ لیکن وہ وہیں کھڑی رہی اور رُکے بغیر بڑبڑاتی رہی ۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی بات نہیں سن رہا تو پلّے کی گرہ سے ایک گھسی ہوئی اکنی کھولی اور کھڑکی میں اُسے پھینک کر بولی ۔ "یہ لے اپنے انڈے کی قیمت" زن سے اکنی دینے کے سر پر آلگی ۔ "کیا سمجھا ہے تم نے" وہ چلائی ۔

عین اس وقت بازار کے پرلے سرے پر بڑے زور سے موٹر کا ہارن سنائی دیا ۔ اور پھر پہیے بریک تلے چیخے ۔ غوں اوں ۔ ۔ ۔ ارے ، دوڑو ۔ پکڑو پکڑو ۔ اوہ" پھر ایک لمبی چیخ سنائی دی ۔ "ہائے میرے اللہ ۔" بڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔ اس کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوگئی اور دل ڈوب گیا ۔

آسمان پر مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی ۔ لوگ کھڑکیاں بند کر کے کمروں میں بیٹھے تھے ۔ بازار میں دوکان داروں نے بھی دوکانوں کے پٹ بند کر رکھے تھے ۔ جاجی کی ماں ، گھر پر چھائی ہوئی خاموشی سے گھبرا کر باورچی خانے میں جا بیٹھی ۔ چولھے میں آگ ٹمٹما رہی تھی ۔ لیکن گویا اس میں گرم کرنے کی طاقت نام کو نہ تھی ۔ کمرے میں چاروں طرف دھواں بھرا ہوا تھا ۔ آگ کو دیکھ کر بڑھیا نے اور بھی ٹھنڈ محسوس کی اور پھر سے بڑے کمرے میں آگئی ۔ اس تنہائی اور خاموشی میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ کسی سے کوئی بات کرے ۔ لیکن گھر میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے بات کی جا سکے ۔ الماری میں پڑے ٹوٹے ہوئے طوطے کو دیکھ کر اس کے دل پر اک ٹھیس لگی ۔ اَن جانے میں پلو سے وہ آنسو پونچھا جو کب سے خشک ہو چکا تھا ۔ اس نے طوطے کے سر پر پیار دیا ۔ اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ پہلے اس ٹوٹے ہوئے طوطے سے باتیں کیا کرتی تھی ۔ لیکن اب اُسے دیکھ کر کوئی بات نہ سوجھتی تھی اسے شاید اب اسے کھلونے سے باتیں کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی ۔ وہ بیچارا تو آپ چونچ جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے پرواز کی طاقت نہ رہی ہو ۔ اس سے دل کی بات کہنے سے کیا فائدہ تھا ۔ وہ تو آپ دکھی معلوم ہوتا تھا ۔

معاً بڑھیا نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ جائے گا ۔ اُس نے لپک کر کھڑکی کھول دی اور پھر اس میں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی ۔ تمام گھر گویا ویران پڑے تھے ۔ آسمان پر بے پناہ اُداسی چھائی ہوئی تھی ۔ دور کوئی چکی ہونک رہی تھی ۔ بڑھیا اس چھائی ہوئی اُداسی سے گھبرا اُٹھی اور پیالے میں دال ڈال کر اس میں سے کنکر چننے میں مصروف ہوگئی ۔ شاید اس غرض سے کہ اس کی توجہ کسی کام میں لگ جائے ۔ لیکن اس کی آنکھوں تلے دال کے دانے دھندلائے جا رہے تھے ۔ اس کی نگاہ میں وہ پھیل رہے تھے ۔ پھیل رہے تھے ۔ اور پیالے کی دیواریں ناچ رہی تھیں ۔ اکتا کر اس نے پیالا پرے رکھ دیا اور سیخوں سے سر ٹیک کر چپ چاپ بیٹھ گئی ۔

"آ ۔ آ ۔ جا آ ۔" نیچے میدان سے بیدی کی آواز سُن کر وہ چونکی ۔ ایک لمبی آہ بھری ۔ پھر مسکرانے لگی ۔ "توبہ ۔" وہ بڑبڑائی ۔ "چاہے بارش ہو یا

طوفان اِن بچوں کی بلا سے ۔ انہیں اپنے کھیل سے غرض ۔" بڑھیا نے پھر دال کا پیالہ سامنے رکھ لیا ۔ دال کے دھندلے دانے واضح ہونے لگے ۔ کٹورے کی دیوار۔یں مناسب خم کھائے کھڑی تھیں ۔ "بچے بھی کیا چیز ہیں ۔" وہ بڑبڑانے لگی ۔ پھر کھڑکی سے نیچے کی طرف جھانکنے لگی ۔ میدان میں کوئی نہ تھا ۔ "نہ جانے کہاں چھپے بیٹھے ہیں ۔" وہ بولی ۔ سامنے مینہ کی بوندیاں خلا میں ناچ رہی تھیں ۔ مٹیالے بادل گلابی دکھائی دے رہے تھے ۔ پرے دھنک کا ایک مبہم ٹکڑا واضح ہوا جا رہا تھا ۔ چند لمحوں کے لئے وہ ایسے ہی بیٹھی رہی ۔ جیسے کوئی خوش کن امید رچائے بیٹھی ہو ۔ کچھ دیر تک تو وہ کھڑکی کی طرف کان لگاکر سنتی رہی ۔ لیکن میدان سے کوئی آواز نہ آنے پر پھر سے اس کے انداز میں وہی پرانی حسرت اور اداسی عود کر آئی اور وہ سیخوں سے سر ٹیک کر چپ چاپ بیٹھ گئی ۔

سیڑھیوں میں دھڑام کی آواز سُن کر وہ چونکی ۔ "یا اللہ توبہ ۔ نہ جانے ۔ ۔ ۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی ۔ چوتھی سیڑھی پر بھپو گری پڑی تھی ۔ "یا میرے اللہ ۔" بڑھیا اسے دیکھ کر چلائی "اُٹھ میری بچی" وہ اُسے اٹھاتے ہوئے بولی ۔ "ہائے رے یہ سیڑھیاں ۔" نہ جانے کس منحوس نے بنایا تھا انہیں ۔ جو آتا ہے گر پڑتا ہے ۔ جو اوپر چڑھنے لگتا ہے نیچے پھسل جاتا ہے ۔ پاؤں دھرنے کے لئے جگہ بھی ہو یہاں ۔ اللہ ماری پل صراط کھڑی کر دی ہے ۔ اُٹھ میری بچی ۔ آمیں کپڑے جھاڑ دوں ۔ کیوں میں واری کہاں لگی ہے چوٹ ۔ ہائے میں مرجاؤں ۔ سارا گھٹنا لہولہان ہو رہا ہے ۔ آمیں ہلدی کی پٹی باندھ دوں ۔ آ بھی نا ۔" لیکن بھپو پیچھے ہٹ گئی ۔ دو ایک منٹ کے لئے اُس نے بڑھیا کی طرف دیکھا ۔ پھر سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی ۔ بڑھیا اُسے جاتے دیکھ کر ہنس پڑی ۔ "ڈرتی ہے تو پٹی بندھوانے سے ۔ اچھا تو نہ سہی ۔ نہ سہی ۔ جیسے تیری مرضی ۔ میں تو بیٹی تیرے ہی بھلے کی کہتی تھی ۔ اچھا جا ۔ جا کر آگ کے سامنے بیٹھیو ۔ چوٹ کو ٹھنڈ نہ لگ جائے ۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی ۔ "کیوں نہ گریں بچے ان سیڑھیوں سے ۔ دیکھو تو قطب منیار کی طرح گھومتی ہیں ۔ توبہ ایسے گھر سے تو جھونپڑے میں رہ لینا کہیں اچھا ہے ۔" کمرے میں اس کی نگاہ ٹوٹے ہوئے مٹی کے طوطے پر پڑی ۔ ہاں

اس روز جب جاجی طوطے سمیت سیڑھیوں میں گر پڑا تھا اور اُٹھتے ہی طوطے کے ٹوٹ جانے پر روتا رہا تھا ۔ اپنی چوٹ کا خیال نہ آیا تھا اسے ۔ بڑھیا کی آنکھوں کے خشک آنسو ازسرِنو بہنے لگے اور وہ منہ پر دوپٹہ لے کر کھڑکی میں بیٹھ گئی ۔ نہ جانے وہ کب تک وہاں بیٹھی رہی ۔ بادل پھٹ گئے ۔ آسمان پر پڑی ہوئی رنگین قوس فضا میں تحلیل ہوگئی ۔ سُورج نکلنے پر سارا میدان دھوپ سے منور ہوگیا لیکن بڑھیا کو گویا خبر ہی نہ ہوئی ۔ وہ چپ چاپ جوں کی توں بیٹھی رہی ۔

بازار سے دینے سبزی فروش کی چیخ سن کر وہ گویا جاگ اُٹھی ۔ "ہائیں" اُس نے اپنا سینہ تھام کر کہا ۔ اللہ خیر کرے اور پھر بازار کی کھڑکی کی طرف گئی ۔ "پھر چرائے گا تو ؟" دینے کا باپ ہاتھ میں جوتا اُٹھائے دینے کے سر پر کھڑا تھا ۔ دینا دونوں ہاتھ سر پر رکھے رو رہا تھا ۔ "جانے بھی دے چودھری ۔" کریم قصائی چلایا ۔ "جانے دوں ؟" آج چونی ہے کل نہ جانے کیا چیز چرائے گا ۔" یہ کہہ کر چودھری نے پٹاخ سے ایک جوتا چلایا اور دینا ازسرِنو چیخنے لگا ۔ "اے ہے" بڑھیا چلائی ۔ "اتنے سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی ۔ اے لوگو تمہارے سامنے لڑکا پٹ رہا ہے اور تم مزے سے دیکھ رہے ہو جیسے تماشہ ہو ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ سگے باپ کا خون سفید ہوگیا ۔"

"میں تو اس کا لہو پی لوں گا ۔" دینے کا باپ اوپر بڑھیا کی طرف دیکھ کر غرایا ۔ "یہ کہتے ہوئے شرم تو نہیں آتی تمہیں ۔" وہ چلائی ۔ "تمہیں نہیں معلوم بی بی ۔" وہ بولا ۔ "اس لڑکے نے چونی چرائی ہے ۔" "چونی چرائی ہے تو کیا خون کر دو گے اس کا ۔ چونی کی خاطر لڑکے کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا ہے تم نے ۔" "لیکن چوری ۔ ۔ ۔" چودھری نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔ "اے ہے بچہ ہے پیار سے سمجھاؤ تو آپ ہی سمجھ جائے گا ۔" "اونہہ بچہ" وہ بولا ۔ "منہ پر داڑھی آنے کو ہے اور ابھی بچہ ۔" "بچہ نہیں تو اور کیا ہے ۔" وہ بولی ۔ "اس کی ماں سے پوچھو جاکر" "ہونہہ" وہ ہنسا ماں نے ہی تو سر چڑھا رکھا ہے اسے ۔" بڑھیا ۔ نے قمیص کے پلّے سے چونی نکل کر چودھری کی طرف پھینکتے ہوئے کہا ۔ "یہ لے اپنی چونی اور خبردار جو لڑکے پر ہاتھ اٹھایا ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ ہاتھ اٹھاتے وقت خدا کا خوف نہیں آتا انہیں ۔ ننھی سی جان کو یوں

پیٹ رہا ہے جیسے لڑکا نہ ہوا دھان کا مٹھا ہوا ۔" "لیکن اماں ، اس نے چوری جو کی ہے ۔" رحیم قصائی بولا ۔ "چوری کی ہے تو اسے سمجھا ۔ یوں اٹھ کر پیٹنا شروع کر دینا ۔ آخر وہ تیرا بیٹا ہے ۔ توبہ توبہ ۔"

کچھ دیر تک تو بازار والے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے پھر جلد ہی وہ اپنے اپنے کام میں لگ گئے ۔ لیکن وہ کھڑکی میں کھڑی بولتی رہی ۔ بولتی رہی ۔ حتیٰ کہ شام ہوگئی ۔ اگلے روز جب اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو آپ ہی آپ بولی ۔ "شکر ہے آج آسمان صاف ہوا ہے دو دن سے اللہ ماری بارش نے پریشان کر رکھا تھا ۔ بچوں کو کھیلنے کے لئے جگہ نہ ملتی تھی ۔ آج تو میدان میں کھیلیں گے ۔" وہ اطمینان سے کھڑکی میں بیٹھ گئی ۔ لیکن بچے میدان میں نہ آئے ۔ کچھ دیر تک تو وہ انتظار کرتی رہی ۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہنے لگی ۔ "آجائینگے ابھی ۔ ابھی تو سارا دن پڑا ہے ۔" لیکن اس کے باوجود بچوں کی غیر حاضری کی وجہ سے وہ اک خلا سا محسوس کر رہی تھی ۔ "نہ جانے کیا ہوا ہے اُنہیں" وہ مسکرانے لگی ۔ "چھپ چھپ کر کونوں میں کھیلتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ باہر دھوپ میں آکر کھیلیں پر وہ بھی کیا کریں ۔ کوئی کھیلنے بھی دے اُنہیں ۔ ماں کو پتہ چلے تو جھٹ جھڑکیاں دینا شروع کر دیتی ہے ۔ اور باپ ۔ توبہ باپ تو اپنے بچوں کے دشمن ہو رہے ہیں آج کل ۔"

دروازے میں آہٹ سن کر وہ اُٹھ بیٹھی ۔ "کون ہے ؟ اوہ تم ہو ۔" اس نے نجو اور ییدی کو دیکھ کر کہا ۔ "آجاؤ ۔ اے ہے تمہارے ساتھ کھیلنے والا نہیں تو کیا یہاں آؤ گے بھی نہیں تم ؟" بڑھیا نے پلّو سے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔ "نہ جانے کیوں نہیں آتے تم ۔ کوٹھے پر کھیلنے کے لئے ایسی اچھی جگہ بنی ہے ۔ ایسی اچھی جگہ ہے گھر گھر کھیلنے کے لئے ۔ ہے نا ییدی ۔" اس نے ییدی کے دونوں ہاتھ پیار سے پکڑ کر انہیں جھلاتے ہوئے پوچھا ۔ "تم تو جانتی ہو نا ۔ جب تم گھر والی بنا کرتی تھی ۔ اور ۔ اور ۔ وہ" اس کا گلا جذبات کی شدت سے رُندھ گیا ۔ "اتنی جلدی بُھول گئی ۔ اے ہے کیا زمانہ آیا ہے ۔ ساتھی ساتھی کو بھول جاتا ہے ان دنوں ۔"

"آؤ ییدی ۔" نجو نے اشارہ کیا ۔ اور وہ دونوں کوٹھے پر چڑھ گئے ۔ "کیا

زمانہ آیا ہے ۔" بڑھیا اپنی ہی دھن میں کھڑی بڑبڑاتی رہی ۔ "پر ان کا کیا قصور یہ عمر ہی ایسی ہے ۔ ان کیلئے تو بس آج ہی آج ہے ۔ کل تو ہے ہی نہیں ۔ اچھا جیتے رہیں ۔ ہائیں ۔" اس نے مڑ کر دیکھا اور دونوں کو غائب پا کر مسکرا دی ۔ "چپکے سے یوں دبے پاؤں کھسک جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں لگتا ۔ وہ بھی یوں ہی نکل جایا کرتا تھا اور میں بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی تھی ۔" وہ ہنسی ۔

بڑھیا دبے پاؤں کوٹھے پر چڑھ گئی ۔

کوٹھے پر پرلے کونے میں نجو چٹائی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر بیٹھا تھا ۔ اس کے پاس دونوں بھپو اور بیدی کھڑی تھیں ۔ "کیوں نجو" بیدی پوچھ رہی تھی ۔ "بھپو تو مہمان ہے نا ۔" "نہ بھئی ۔" بھپو چلائی "ہم نہیں کھیلتے ۔" بڑھیا یہ دیکھ کر سیڑھیوں میں کھڑی ہوگئی ۔ اور چوری چوری انہیں دیکھنے لگی ۔ وہ ڈرتی تھی کہ بچے اسے دیکھ نہ پائیں ورنہ وہ بھاگ جائیں گے ۔ نہ جانے وہ اس خیال سے ڈرتی کیوں تھی ۔ اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے ان کے چلے جانے پر آسمان پر پھر سے مٹیالے بادل چھا جائیں گے اور گھر پر گہری خاموشی طاری ہو جائے گی ۔ وہ ڈرتی تھی کہ بچے اُسے دیکھ نہ لیں ۔ اس لئے وہ چپ چاپ وہیں کھڑی رہی ۔ سر دیوار پر ٹیک دیا اور غور سے بچوں کا کھیل دیکھنے لگی ۔ لیکن اس کی نگاہیں دور نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھیں ۔

کھیلنے کے بعد جب وہ سب اس کے قریب سے گزرنے لگے تو وہ چونکی ۔ قمیض سے آنکھیں پونچھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ۔ بس اور نہیں کھیلو گے کیا ۔" "اونہہ" نجو نے گال میں زبان دے کر کہا اور وہ تینوں سیڑھیاں اُترنے لگے ۔ اُنہیں جاتے دیکھ کر بڑھیا نے ایک کسک محسوس کی ۔ اس کا جی چاہتا تھا ۔ کہ کسی بہانے انہیں واپس بلا لے ۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی ۔ اس نے دیوار سے سہارا لگا لیا ۔ پھر دفعتاً اسے کچھ یاد آیا ۔ "بیدی نجو" وہ چلائی "ٹھہرنا ذرا ۔ ذرا ٹھہرنا ۔" بڑھیا بے تحاشا سیڑھیاں اُترنے لگی ۔ "نہ جانے کیا ہوگیا ہے میری یاد کو دو دن سے میں نے تمہارے لئے لڈو سنبھال رکھے ہیں ۔" "لڈو !!" بیدی نے منہ کا پانی نگلتے ہوئے دہرایا ۔ "ہاں لڈو"۔ وہ بولی ۔ "بیاہ والے گھر سے آئے تھے ۔ میں نے تمہارے لئے رکھ چھوڑے "یہ لو" بڑھیا نے

مٹی کی ہنڈیا سے چار لڈو نکالے ۔ "یہ لو نجو ۔ یہ تم لو بھپو اور بیدی یہ تم اور یہ"
اس نے چوتھے لڈو کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری ۔ پھر آنکھ پونچھ کر کھڑکی کی طرف
چلی گئی اور سر سیخوں پر ٹیک کر غور سے اس چوتھے لڈو کی طرف بھری ہوئی
آنکھوں سے دیکھنے لگی ۔ نیچے میدان میں کلما کھڑا تھا جو کئی روز کے بعد گاؤں سے
واپس آیا تھا ۔ کامے نے بھپو کو دیکھ کر دانت نکالے پھر منہ بنا کر پوچھنے لگا ۔
"وہ یہیں ہے دانتوں والی ۔" "ہاں" نجو نے دانت دکھاتے ہوئے کہا ۔ "وہ"
"نہیں نہیں" بھپو چلائی ۔ "اب وہ وہ نہیں ۔" "وہ نہیں" کامے نے حیرانی
سے بھپو کی طرف دیکھا ۔ "اوہ ۔ ۔ ۔ لڈو ۔" کامے نے ان کے ہاتھ میں لڈو
دیکھ کر حیرانی سے پوچھا ۔ "چرائے ہیں ؟" "اونہوں" بیدی نے سر ہلایا ۔ "تو"
کلما پوچھنے لگا ۔ نجو نے دانت نکال کر اشارہ کیا ۔ "اُس نے دیئے ہیں" "اُس
نے" کامے نے پھر دانت نکالے "جھوٹ" "سچ" نجو بولا ۔ "اُسی نے دیئے
ہیں" "دانتوں والی نے ؟" کامے نے دہرایا ۔ "ہاں ۔ پر ۔ ۔ ۔" بیدی نے
کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ۔ "جھوٹ" کامے نے شور مچایا۔ "وہ کیا دیگی ۔ مجھے
دو" "چپ" بیدی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سلاخدار کھڑکی کی طرف اشارہ کیا
"ماں ۔"

کھڑکی میں سلاخوں پر سر ٹکائے بڑھیا ایک لڈو ہاتھ میں پکڑے ہوئے ،
دور افق کی طرف کھوئی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی ۔ اسے اس سلاخ دار کھڑکی
میں بیٹھے دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی پنچھی پنجرے میں دم توڑ رہا
ہو ۔

....○............

مسز کٹلے کا خاوند

مسٹر کٹلے کی کہانی کو کہانی نہیں کہا جا سکتا نہ ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے نہ ان کی روزمرہ زندگی میں کوئی نئی بات ظہور پذیر ہوئی ہے ۔ محبت تو ایک عام سا واقعہ ہے جو ہر کسی کی زندگی میں رونما ہوتا ہے ۔ البتہ مسٹر کٹلے کی محبت کی ایک تفصیل محبت کی عام تفصیلات سے ذرا مختلف تھی ۔ یعنی مسٹر کٹلے کی اسمارہ سے پنتیس سال کی عمر میں محبت ہوئی تھی ۔ اس میں مسٹر کٹلے کا کوئی قصور نہ تھا ۔ اس کے باوجود لوگ اکثر مسٹر کٹلے سے پوچھتے ہیں "مسٹر کٹلے! تو آپ کو جوانی گزارنے کے بعد محبت کا آزار ہوا ۔" اور یہ سوال کرنے کے بعد معنی خیز انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔ لوگوں کی یہ زیرِ لب مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر یا نہ جانے کیوں اب تو مسٹر کٹلے بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جوانی گنوا کر محبت کرنے میں انہوں نے ایک جرم کیا ہے ۔ یہ احساسِ جرم مسٹر کٹلے کے انداز میں روز بروز اجاگر ہوتا جاتا ہے اور وہ بات کرتے کرتے جھینپ جاتے ہیں ، چاہے بات محبت کے بجائے کوریا کی جنگ کے متعلق ہو رہی ہو اور چاہے مخاطب اس بات سے قطعی طور ناواقف ہو کہ انہوں نے اسمارہ سے محبت کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ کی بھی تھی یا نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مسٹر کٹلے کا کوئی قصور نہ تھا ۔ اوّل تو عشق کرنا اپنے بس میں نہیں تھا دوسرے عشق عمر اور زمان و مکان سے بے نیاز ہے ۔ اس کے علاوہ وہ جوانی میں اسمارہ سے کیسے محبت کر سکتے تھے ۔ جب وہ جوان ہوئے تھے اس وقت اسمارہ اپنی ماں کی گود میں پڑی انگوٹھا چوستی تھی ۔ اس صورت میں مسٹر کٹلے کا جوانی میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا ۔ قصور تو اسمارہ کا تھا ۔ جس نے جوان ہونے میں اتنی دیر لگا دی ۔ اور پھر مسٹر کٹلے سے ملاقات کرنے میں اتنی تاخیر کی ۔ مسٹر کٹلے اسمارہ سے ملے اور اُسے دیکھے بغیر کیسے محبت کر سکتے تھے ۔ ویسے اور لڑکیاں تو کئی تھیں ۔ مسٹر

کٹلے پورے پنتیس سال دنیا کے مختلف ممالک میں آنکھیں کھول کر گرد و پیش کو دیکھتے ، رہے تھے ۔ لیکن جو لڑکیاں اُن سے ملیں اُن میں وہ بات نہ تھی جو اسمارہ میں تھی ۔ پھر وہ اُن سے کیسے محبت کر سکتے تھے ۔

اسمارہ کو دیکھئے تو اس میں کوئی خصوصیّت نہیں ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عورت ہے ۔ ایک بھرپور عورت ۔ لمبا قد چوڑا چہرہ ، مضبوط جسم ۔ اُسے دیکھ کر آدمی سوچنے لگے گا کہ وہ کس لحاظ سے عورت سمجھی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ اس کے تمام تر اعضاء مردانہ دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ عورت ہے بھرپور عورت اور کوئی اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا ۔ مسٹر کٹلے خود بھی اس بات کا فیصلہ آج تک نہیں کر سکے کہ "اسمارہ میں وہ خصوصیت" کونسی ہے ۔ وہ بات کونسی ہے جو اسمارہ میں ہے اور دوسری لڑکیوں میں نہیں ہے ۔ مسٹر کٹلے اسمارہ کی اس انفرادیت کو شدت سے محسوس کرتے ۔ اگرچہ بیان نہ کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں اسمارہ سے ابھی تک والہانہ محبت ہے ۔ حالانکہ ان کی شادی کو تقریباً دس سال ہو چکے ہیں ۔

مسز کٹلے سے پوچھئے کہ تمہیں مسٹر کٹلے سے کیسے محبت ہوئی تو وہ مسکرا دیگی ۔ اور پھر ہنس کر کہے گی ۔ ساری بات یوں آناً فاناً ہوگئی کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا ۔ کٹلے نے آکر وہ شور مچایا اور چیخ چلّا کر ایسی گڑ بڑ ڈالی کہ میں کیا کہوں ۔ بس ان کی شورا شوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بات کو سمجھنے سے پہلے ہی بات پکی ہوگئی ۔ اور پھر جو ہوش آیا تو شادی ہو چکی تھی ۔"

بات یوں ہوئی کہ ان دنوں اسمارہ کو ایک نوجوان سے دلچسپی تھی ۔ اس کا نام فاروق تھا ۔ فاروق سارا سارا دن آکر اسمارہ کے پاس بیٹھا رہتا تھا ۔ اسمارہ فاروق کی خاموش نگاہوں میں ایک دبا دبا اضطراب محسوس کیا کرتی تھی ۔ اس کی خواہش تھی کہ فاروق سلگنا چھوڑ کر بھڑک کر جلنا شروع کر دے ۔ لیکن فاروق اپنی طبیعت سے مجبور تھا ۔

پھر دفعتاً کپتان کٹلے اسمارہ کے گھر میں آ دھمکے ۔ وہ اسمارہ کے چچا کو اپنے دوست کا کوئی پیغام دینے آئے تھے ۔ پیغام دینے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھے رہے ۔ پھر اسمارہ کی والدہ سے معذرت کرنے کے بعد اُٹھے ۔ "مجھے اب جانا

ہے ۔ ضروری کام ہے بہت ہی ضروری "

اسمارہ کی ماں نے اخلاقاً چائے کے لئے اصرار کیا ۔ لیکن مسٹر کٹلے بالکل مجبور تھے ۔ وہ رخصت ہونے کے لئے تیار تھے کہ اسمارہ آگئی ۔ مسٹر کٹلے نے ایک نظر اسمارہ کی طرف دیکھا ۔ "مائی گاڈ" انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ۔

پھر جانے کیا ہوا ۔ ایک گھنٹہ گزر گیا، دو گھنٹے گزر گئے ۔ شام ہوگئی ۔ لیکن مسٹر کٹلے وہیں صوفے پر بیٹھے تھے ۔ وہ اسمارہ کو مختلف ممالک کے حالات سنا رہے تھے اور اسمارہ ان کے جوش بیان سے محظوظ ہو رہی تھی ۔ اور مسٹر کٹلے کا وہ ضروری کام تو گویا اب ناپید ہو چکا تھا ۔ جلد ہی مسٹر کٹلے نے محسوس کر لیا کہ اسمارہ فاروق میں دلچسپی لے رہی ہے ۔ فاروق اور اسمارہ کو تنہائی میں بیٹھے دیکھ کر ان کا شوق اور بھڑکا ۔ اور وہ زیادہ جوش میں آگئے ۔

اس کے بعد اسمارہ کے کمرے میں منتوں ، چیخ پکار اور دھمکیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور بیچاری اسمارہ کے ہوش جواب دے گئے ۔ اسے مسٹر کٹلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ وہ کیپٹن تھے ۔ اور بے چارا فاروق محض فاروق تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ان کی شادی ہوگئی ۔

ہاں تو مسٹر کٹلے کی کہانی کو کہانی نہیں کہا جا سکتا ۔ ان کی زندگی میں کوئی خاص بات ظہور پذیر نہیں ہوئی ۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر کٹلے کو دیکھ کر آپ محسوس کریں گے ۔ جیسے وہ بذات خود اک کہانی ہیں ۔ اُن کا دُبلا پتلا جسم ، چھوٹا قد ، دھنسی ہوئی نیلی آنکھیں ۔ جن میں عمر کی جھلک واضح ہوتی ہے ۔ لیکن مسٹر کٹلے کی شخصیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ۔ جیسے اسمارہ کی "اُس بات" کا اظہار ممکن نہیں ۔ جسے مسٹر کٹلے نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا ۔

اگر آپ کو کبھی تھیا گلی جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے مسٹر کٹلے کو ضرور دیکھا ہوگا ۔ سڑک پر چھڑی جُھلاتے ہوئے یا پوسٹ آفس میں احتیاط سے خطوط سپردِ ڈاک کرتے ہوئے یا ڈاکٹر دانیا کی دوکان پر "نَردِگر" خریدتے ہوئے ۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے بھی اکثر "نَردِگر" خریدا کرتے ہیں ۔

آپ کو دیکھ کر وہ معاً آپ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے ۔ "آئیے آئیے

چائے کا ایک پیالہ کیسا رہے گا ۔ تکلف نہیں کیجیے ۔ آپ کٹلے کو تو جانتے ہوں گے ۔ میں مسز کٹلے کا خاوند ہوں ۔ جی ہاں ۔ ۔ ۔ آپ کی تعریف ۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔"

زیری کا ارادہ تو یہ تھا کہ ایبٹ آباد جا کر چھٹیاں بسر کرے ۔ وہ تو محض اتفاق تھا کہ ایبٹ آباد کے راستے میں اُنہیں ہاشمی مل گیا "بھئی واہ" وہ چلانے لگا ۔ "زیر ایبٹ آباد میں کیا دھرا ہے ، جانا ہے تو نتھیا گلی جاؤ ۔ میرا کاٹیج وہاں خالی پڑا ہے ۔"

ہاشمی کی وجہ سے زیر کا پروگرام بدل گیا ۔ اور وہ ایبٹ آباد کے بجائے نتھیا گلی آپہنچے ہاشمی کا کاٹیج پہاڑ کی ایک ویران چوٹی پر واقع تھا ۔ جس کے اردگرد اونچے درخت کھڑے تھے ۔ ایک طرف برساتی نالہ بہہ رہا تھا ۔ درمیان میں لکڑی کا چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کے قریب ہی پتھر کا بنا ہوا ایک اور مکان تھا ۔ ان دو مکانوں کے علاوہ اُس چوٹی پر اور کوئی آبادی نہیں تھی ۔

پہلے دو ایک دن تو زیری ضروری انتظامات میں مصروف رہے ۔ تیسرے یا چوتھے دن گردونواح کے متعلق جاننے کے لئے انہوں نے اس ویران چوٹی کا ایک چکر لگایا ۔

پتھر کے پختہ مکان کے مختصر سے برآمدے میں چند بچے کھیل رہے تھے ۔ ایک ننھی سی بچی سہمی ہوئی بیٹھی تھی ۔ ایک بچہ کھڑا درختوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس سرسبز مرغزار میں کھو گیا ہے ۔ جیسے وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہے ۔ ایک بارہ سال کا لڑکا سیڑھیوں پر ہاتھوں میں ٹھوڑی تھامے بیٹھا تھا جیسے زندگی کے کسی مسئلے پر بڑے انہماک سے غور کر رہا ہے ۔

ساتھ والی کھڑکی سے ایک دم قہقہہ سنائی دیا ۔ کوئی عورت اندر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی ۔ اس قہقہے میں نسائی نمائش قطعی مفقود تھی ۔ وہ قہقہہ کسی کو لبھانے یا متوجہ کرنے کے لئے نہ تھا ۔ زیری نے اس عجیب قہقہے کو سنا اور محسوس کیا جیسے کوئی زندگی کی جملہ لذتوں سے مدہوش ہو کر ہنس رہا ہے ۔ نسائی ہونے کے باوجود اس میں مردانہ جھلک تھی ۔

پتھر کے مکان کے آگے وہ گھومتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر گیا ۔ لمبے لمبے

درخت چاروں طرف کھڑے تھے ۔ چاروں طرف سنسان ٹیلے پھیلے ہوئے تھے اس گھومتے ہوئے راستے پر زیبری سوچتا جا رہا تھا ۔ دفعتاً ایک موڑ پر وہ چونکا ۔ اس کے روبرو ایک دُبلا پتلا شخص کھڑا تھا ۔ ہاتھ میں چھڑی تھی ۔ اُس کی گہری نیلی آنکھیں اَن کہے غم سے بھری ہوئی تھیں اُس کے ہونٹوں پر مبہم سا تبسم تھا جیسے وہ کھل کر کچھ چھپانے کی ناکام کوشش میں لگے ہیں ۔

"آپ آپ ۔" وہ رُک گیا ۔ "میرا مطلب ہے آپ یعنی" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی "ادھر ۔ اس طرف ۔ کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں ؟"

"معاف کیجئے ۔" زیبری نے گھبرا کر کہا ۔ "میں ۔ یعنی آپ کی تعریف ۔"

"میں میں" وہ بولا ۔ "میں مسز کٹلے کا خاوند ہوں ۔ جی ہاں ۔"

"میں نہیں سمجھتا ۔" زیبری نے حیرانی س اُس کی طرف دیکھا ۔

وہ ہنسنے لگا ۔ "آپ مسز کٹلے کو نہیں جانتے ؟" اس کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے مسز کٹلے کو نہ جانتا جرم ہے ۔ "معاف کیجئے آپ ادھر سے آرہے ہیں ؛ میں سمجھا شاید ہم سے ملنے آئے ہیں ۔ معاف کیجئے ۔"

"جی میں اپنے کاٹیج سے آرہا ہوں ۔ ذرا گھومنے نکلا ہوں ۔"

"اپنے کاٹیج سے ۔" مسٹر کٹلے نے سر کھجلایا ۔

"میں ہاشمی کاٹیج میں رہتا ہوں ۔" زیبری نے کہا ۔ "یہ قریب ہی جو لکڑی کا ڈبہ سا بنا ہے ۔"

"اوہو" مسٹر کٹلے نے قہقہہ لگایا ۔ "حد ہوگئی ۔ لیکن خیر خیر ۔ تو وہ لکڑی کا ڈبہ آباد ہوگیا آخر بڑی خوشی کی بات ہے ۔ بڑی خوشی کی بات ہے ۔"

"میرا نام زیبری ہے ۔"

"بہت خوب پھر تو صاحب روز ملاقات ہوگی ۔ میں آپ کا پڑوسی ہوں ۔ سو لانگ سولانگ" اور وہ ہنستا ہوا پتھر کے مکان کی طرف چل پڑا ۔

"میں ابھی حاضر ہوں گا ۔ آپ ذرا گھوم آئیے ۔ ہاہاہاہا ۔ گھوم آئیے آپ ۔" وہ بڑبڑاتا ہوا نکل گیا ۔

یہ پہلا دن تھاجب زیبری مسٹر کٹلے سے ملا جانے کیوں ۔ لیکن زیبری اس

ملاقات سے بے حد محظوظ ہوا تھا ۔ مسز کٹلے کا خاوند ۔ ۔ ۔ وہ دیر تک ہنستا رہا ۔ کٹلے ۔ مسٹر کٹلے ۔ خوب آدمی ہے ۔ زیری نے دل ہی دل میں سوچا ۔

شام کے وقت جب زیری لیٹے ہوئے مطالعے میں مشغول تھا ۔ مسٹر کٹلے آدھمکا "ہیلو ہیلو کیا نام ہے آپ کا ۔ معاف کیجئے ۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ۔ ابھی سے لیٹ بھی گئے آپ ۔ نہیں صاحب یہ تھیا گلی ہے ۔ یہاں یہ بات نہیں چلے گی کہ شام ہی سے پڑ کر سو گئے ۔ ذرا موسم تو دیکھئے ۔ اس موسم میں نیند آتی ہے کیا ؟ اونہوں جی چاہتا ہے انسان آہیں بھرے اور پہلو بدلتا رہے ۔ کیوں کیا خیال ہے ۔"

"آئیے آئیے تشریف رکھئے ۔" زیری اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔

"اونہوں" وہ ہنسنے لگا ۔ "ان تکلفات سے گذارہ نہ ہوگا ۔ ہوں ۔ تو یہ لکڑی کا ڈبہ بھی آباد ہو ہی گیا آخر کار ۔" اُس نے آہ بھری ۔ "بہت اچھا ہوا ۔ بہت اچھا ہوا ۔ خیر خیر دیکھا جائیگا ۔ تو آپ ہاشمی صاحب کے دوست ہیں ۔ بے کار ہے ہاشمی صاحب کی دوستی بالکل بیکار ہے ۔ یقین کیجئے ۔ وہ کبھی یہاں آکر رہے ہی نہیں ۔ کبھی کبھار یہاں آتے ہیں ، دو دن کے لئے ۔ اب بتائیے دو دن میں کیا ہو سکتا ہے ۔ لیکن صاحب معلوم ہوتا ہے آپ یہاں ہوٹل بازی کررہے ہیں ۔ یہ نہیں چلے گا یہاں ۔ مسز کٹلے کو معلوم ہوگیا تو ہم دونوں پٹ جائیں گے ۔ وہ آپ ہی کا گھر ہے ۔ وہ سامنے والا سمجھے۔آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آواز دے دیجئے ۔ ہمارے ملازم کا نام علیا ہے ۔ چھوٹا سا لڑکا ہے ۔ لیکن کام کرنے میں بڑا تیز ہے ۔ اور مسز کٹلے ! بڑی اچھی ہے بے حد اچھی ۔ اب میں کیا عرض کروں کتنی اچھی ہے ۔ بس آپ ایک بار دیکھئے صرف ایک بار ۔ آپ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوگی ۔ یقین جانئے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسی اچھی بیوی ملی ہے بس یوں سمجھ لیجئے آپ کہ اُس مکان میں صرف ایک میں ہی ہوں ۔ جس کا کوئی مقصد نہیں ۔ جو بیکار ہے ۔ گھر کی بلی اور طوطے تک ہر فرد اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیتا ہے اور مسز کٹلے ۔ اُس کی تو کوئی بات نہ پوچھئے ۔ تو کل چائے وہیں رہے گی ۔"

وہ اُٹھا۔ "اب آپ آرام کیجئے۔ لیکن ہاں، مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ چائے کے متعلق مسز کٹلے کہا کرتی ہے، بس جناب چائے لپٹن کی۔لپٹن کی۔ ہاہا ہاہا۔" وہ قہقہے لگاتا چلا گیا۔ اس کی آواز کچھ دیر تک زیبری کے کانوں میں گونجتی رہی۔

اگلے روز جب زیبری پتھر کے مکان میں چائے پینے کے لئے گیا تو اس نے پہلی مرتبہ مسز کٹلے کو دیکھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے لٹک رہے تھے۔ اعضا بھاری اور بھدے تھے۔

السلام و علیکم، زیبری نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مسز کٹلے نے ایک ساعت کے لئے سر اٹھایا۔ زیبری نے محسوس کیا کہ گویا وہ نگاہیں اُسے پرکھ رہی ہیں۔ پھر وہ آنکھیں جھک گئیں۔ مسز کٹلے کچھ بننے میں مشغول ہوگئی۔ مسٹر کٹلے حسبِ عادت مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا۔

"کیوں مسز کٹلے یہ چائے لپٹن کی ہے؟" وہ چلا رہا تھا۔ لیکن مسز کٹلے چپ چاپ کام میں مشغول تھی۔ اُس کے چہرے پر گویا بیزاری سی چھائی ہوئی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں تینوں بچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ تھا فرش پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ لڑکی گڑیاں سامنے رکھے کھوئی ہوئی نگاہوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لڑکا کرسی پر بیٹھے کھڑکی سے باہر متواتر دیکھے جا رہا تھا۔

باہر بادل کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ جو چاروں طرف سے اس پتھر کے مکان کی طرف گویا یورش کر رہا تھا۔

"مسز کٹلے" کٹلے چلا رہا تھا۔ "کھانا پکانے میں مسز کٹلے کا کوئی جواب نہیں۔ کل قاسم کہہ رہا تھا کہ مسز کٹلے کے ہاتھ کا پکا ہوا گوشت کھا کر خاوند کا جی چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔

مسز کٹلے کا گونگا چہرہ جذبات کے اظہار سے بیگانہ تھا۔

بادل کی "دھوڑی" پتھر کے مکان کے گرد گھیرا ڈالتی جا رہی تھی۔

اس کے بعد دو چار دن مسٹر کٹلے دکھائی نہ دیا۔ پانچویں روز صبح سویرے

ہی آموجود ہوا ۔ اس کے بال پریشان تھے غالباً رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور اس کی صورت اشک زدہ دکھائی دیتی تھی ۔

"معاف کیجئے پروفیسر" وہ چلایا ۔ "معاف کیجئے ۔ آپ سوچتے ہوں گے ۔ کٹلے بے حد واہیات آدمی ہے ۔ پروفیسر صاحب واقعی میں واہیات آدمی ہوں ۔ خواہ مخواہ رات کو میں نے چلا چلاکر آپ کی نیند خراب کی ۔ مجھے بے حد افسوس ہے ۔ بے حد ۔ لوجی کیا یہ حماقت نہیں ۔ خواہ مخواہ دوسروں کو بُرا بھلا کہنا اور اُس شریف عورت کو ۔ ۔ ۔ مجھے تو شرم آتی ہے اپنے آپ پر ۔"

زیری حیرانی سے کٹلے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس بات کی وجہ سے یوں معذرت کئے جا رہے ہے ۔

"مسٹر کٹلے" پروفیسر تنگ آکر بولا ۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ ۔ خواہ مخواہ معذرت کرنیکا مطلب ؟"

"میں جانتا ہوں ۔" کٹلے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ۔ "آپ نے میرا شور تو ضرور سُنا ہوگا ویسے اخلاقاً ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں ۔"

"نہیں مسٹر کٹلے رات میں دوسرے شو پر گیا ہوا تھا ۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں اور ویسے بھی میں سو جاؤں تو ڈھول پیٹنے پر بھی نہیں جاگتا ۔"

"سچ !" کٹلے کی آنکھوں میں شکر گذاری کا جذبہ واضح طور پر جھلکنے لگا ۔

"یہ تو بہت اچھا ہے ۔ بہت اچھا ۔ شکر ہے پروفیسر آپ ہمارے پڑوس میں آبسے ہیں ۔ لیکن میری حماقت دیکھئے نا میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں اور خواہ مخواہ چلانا شروع کر دیتا ہوں ۔ حالانکہ یقین جانئے اُس کی شرافت کا کوئی جواب نہیں ۔ اتنی اچھی اور نیک ہے کہ میں کیا عرض کروں ۔ اگر وہ نہ ہو تو جانے میرا کیا حشر ہو ۔ لیکن میں نے اس کی زندگی حرام کر رکھی ہے ۔ پروفیسر آپ نہیں جانتے وہ کتنی اچھی ہے ۔ آپ نہیں جانتے ۔ خیر خیر ، شکر ہے ۔ آپ گھر پر نہ تھے ۔ ورنہ آپ مجھے بری طرح کوستے ۔ مجھ سے نفرت کرتے ۔ مگر وہ ایسی اچھی ہے کہ میری حماقتوں اور زیادتیوں کو شکوہ کئے بغیر برداشت کرتی ہے یقین جانئے اُس نے کبھی طعنہ تک نہیں دیا مجھے ۔ خیر خیر ، وہ تو شکر ہے

آپ تھے نہیں گھر پر ۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی ۔ خدا حافظ ۔" اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ۔

اُس کے جانے کے بعد دیر تک زیبری سوچتا رہا ۔ جانے مسٹر کٹلے کا مطلب کیا تھا ۔ شاید بیوی سے جھگڑ پڑا ہو ۔ لیکن گھروں میں یہ تو ایک عام سی بات ہے ۔ اس بات پر پڑوسی سے معذرت کرنے کا مطلب اس روز باہر جاتے ہوئے وہ کٹلے کے مکان کے قریب سے ہو کر گزرا ۔ مگر وہاں اُسے کوئی خاص بات دکھائی نہ دی ۔ مسٹر کٹلے اندر کمبل لپیٹے پڑا تھا ۔ باہر دھوپ میں مسز کٹلے بڑے انہماک سے کچھ بن رہی تھی ۔ اس سے دور تنہا برتنوں سے کھیل رہا تھا ۔ لڑکی حسبِ دستور کھوئی کھوئی نگاہوں سے درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور بڑا لڑکا گیند ہاتھ میں پکڑے اس پر غور کر رہا تھا ۔

زیبری سوچ رہا تھا ۔ جانے یہ بچے اس قدر کھوئے ہوئے کیوں رہتے ہیں ۔ اور مسز کٹلے کی آنکھیں ہر گزرنے والے کو پرکھا کیوں کرتی ہیں ۔ جیسے جانچ رہی ہیں ۔ شبہات سے بھری جانچ ۔

دو ایک دن مسٹر کٹلے دکھائی نہ دیا ۔ جب زیبری کو معلوم ہوا کہ وہ اسی روز سے بیمار پڑا ہے تو زیبری رسماً اس کی عیادت کے لئے گیا ۔ بستر پر رومال سر پر باندھے ہوئے مسٹر کٹلے پڑا تھا ۔ دیوار سے سر ٹیک رکھا تھا ۔ فرش پر مسز کٹلے سویٹر بننے میں مصروف تھی ۔ اور اس کے سامنے آرام کرسی پر ایک اجنبی جوان بیٹھا تھا ۔

"اخاہ پروفیسر صاحب ہیں" کٹلے نے نحیف آواز میں کہا ۔ "آیئے پروفیسران سے ملئے ۔ آپ میرے دوست مسٹر قاسم ہیں ۔"

قاسم نے زیبری کی طرف نقادانہ نظر سے دیکھا اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا ۔

"یہ ہمارے پڑوسی پروفیسر زیبری ہیں ۔ اور پروفیسر صاحب یوں سمجھ لیجئے کہ قاسم صاحب میرے واحد دوست ہیں ، واحد دوست ۔ میرے سچے غمخوار اور بہی خواہ ۔"

ایک ساعت کے لئے مسز کٹلے کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم جھلکا ۔ اور دفعتاً غائب ہوگیا ۔

"چائے پئیں گے نا پروفیسر صاحب ۔" مسٹر کٹلے چلانے لگا ۔ مسز کٹلے خاموشی سے اُٹھی اور کیتلی چولہے پر رکھ کر پھر سے بیٹھ کر اُسی انہماک سے سویٹر بننے لگی ۔

"اخاہ پروفیسر صاحب مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ۔" مسٹر کٹلے نے بات چھیڑی ۔ قاسم نے کوئی توجہ نہ دی مسز کٹلے نے جمائی لے کر ایک اکتاہٹ بھرے انداز میں دیوار سے ٹیک لگالی ۔

کچھ دنوں کے بعد علی الصبح جب پروفیسر بیدار ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مسٹر کٹلے کھڑکی کے پاس کھڑا ہے ۔ منہ زرد ہو رہا تھا ۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پھر بیمار پڑگیا ہے ۔ پروفیسر نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا ۔ "آئیے آئیے ۔ اندر آئیے ۔"

"اندر کیا آؤں پروفیسر میں بے حد شرمندہ ہوں ۔" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا ۔ "توبہ حماقت کی بھی انتہا ہوتی ہے پروفیسر لیکن اب تم سے کیا پردہ ہے ۔ رات میں نے اتنا شور مچایا اور اس قدر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا رہا لعنت ہے مجھ پر ۔ جانے کیا ہے ۔ خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ بنا لیتا ہوں ۔ رات تو تم نے مجھے جی بھر کر کوسا ہوگا ۔"

"ہاں رات کو آوازیں آرہی تھیں ۔" پروفیسر نے بات چلانے کے خیال سے کہا ۔

"آوازیں" ۔ ۔ ۔ رات تو چیخوں تک نوبت آپہنچی ۔ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے اب اپنے ذہن کا علاج کروانا پڑے گا ۔ میری نظر دھندلا جاتی ہے ۔ اپنے بہترین دوست کے متعلق ایسی باتیں سوچنا ۔ اف پروفیسر میں تو پاگل ہوں پاگل ۔ اور بات کس قدر معمولی تھی جب میں سینما دیکھ کر گھر لوٹا ۔ تو قاسم بیٹھا تھا ۔ مسز کٹلے کے ساتھ ۔ میں نے ان دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر خواہ مخواہ غصے میں چلانا شروع کر دیا ۔ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے انہیں اکٹھے دیکھ کر ۔ میں نے سمجھا ۔۔۔۔۔ تف ہے مجھ پر ۔ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں پروفیسر مگر آپ سے کیا پردہ ہے اب ۔ بات ساری یوں تھی کہ کل رات قاسم جو اندھیرے میں ہمارے گھر کی طرف آرہا تھا ۔ اس خیال سے کہ میں گھر پر ہی

ہوں گا اور ذرا گپ شپ رہے گی ۔ وہ اکثر رات کو آجایا کرتا ہے ۔ اگرچہ بد قسمتی سے میں بسا اوقات باہر ہوتا ہوں ۔ خیر اندھیرے میں جو وہ آیا تو بے چارہ گر پڑا ۔ کپڑے سارے کیچڑ میں لت پت ہو گئے ۔ بیچاری مسز کٹلے نے دوڑ کر اُسے اٹھایا اور اندر لے گئی اور میرا سلیپنگ سوٹ پہنا دیا ۔ ابھی قمیض کے بٹن بھی نہ لگانے تھے کہ میں آپہنچا ۔ اس کے بٹنوں کا بیچاری کو کیا خیال رہتا ۔ آخر افراتفری میں اس کے اپنے بٹن بھی کھل گئے تھے ۔ بے چاری اکیلی قاسم کی اتنی بڑی لاش کو اندھیرے میں اٹھا کر گھر لائی تھی ۔"

"آپ ہی سوچئے پروفیسر ایک گھبرو جوان کو گود میں اٹھا کے لانا یہ کچھ مسز کٹلے ہی کا کام ہے ۔ اگر مجھے اٹھانا پڑ جاتا تو ۔ ۔ ۔ توبہ توبہ ۔ لیکن میری حماقت دیکھئے میں سمجھا کہ اُس نے اپنے بازو اس کے گلے میں ڈال رکھے ہیں ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جب کسی کو اٹھایا جائے تو بازو گلے میں ڈالنے ہی پڑتے ہیں ۔ دراصل بات یہ تھی قاسم نے مسز کٹلے کا سہارا لے رکھا تھا اور مسز کٹلے نے جو منہ قاسم پر جھکا رکھا تھا ۔ صرف اس لئے تھا کہ وہ اس وقت اُس سے پوچھ رہی تھی ۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔ اور میں سمجھا اُس کے منہ سے منہ ملا رہی ہے ۔ پاگل پنا اور کیا ۔ اف"

اُس نے اپنا سر ہاتھوں سے تھام لیا ۔ "مجھے تو کسی ہسپتال میں ہونا چاہئے ۔ یقین جانئے یہ میرا شک مجھے کسی روز پاگل خانے میں لے جائیگا ۔ پروفیسر مجھے بچاؤ ۔"

"وہ بے چاری اُس کے زخموں پر دوا مل رہی تھی ۔ اور میں کیا سمجھا ؟ اب میں تمہیں کیا بتاؤں پروفیسر اگر مسز کٹلے کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاتی ۔ یہ اسی کی ہمت ہے کہ میری ایسی بے ہودہ باتیں برداشت کرتی ہے ۔ بڑی اچھی ہے پروفیسر آئے دن میری اس قسم کی واہیات باتیں برداشت کرتی ہے ۔ آئے دن ہر مرتبہ میں یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ اس پر ایسے الزامات نہ لگاؤں گا ۔ لیکن جانے مجھ پر کیوں جنوں طاری ہو جاتا ہے ۔ اور میں سب وعدے بھول جاتا ہوں ۔ لیکن وہ ہر بار مجھے معاف کر دیتی ہے ۔ سچے دل سے معاف کر دیتی ہے ۔"

"لیکن مسز کٹلے" زبیری نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"میں جانتا ہوں" کٹلے نے اُسے خاموش کر دیا۔ "میں جانتا ہوں تم مجھے لعنت ملامت کرو گے۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں اپنے آپے میں نہیں رہتا۔ ایسے موقعے پر چلانے لگتا ہوں۔ میرے منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے۔ میرا سر گھومنے لگتا ہے۔ میری آنکھوں میں خوف اتر آتا ہے اور جب وہ وقت بیت جاتا ہے تو اپنے وجود پر شرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

یہ کہہ کر مسٹر کٹلے خاموش ہوگیا اور دیر تک چپ چاپ خیالات میں کھویا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے اپنا سر اٹھایا۔ "اچھا پروفیسر اب میں جاتا ہوں۔" لیکن وہ رُک گیا۔ "اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں، میرا مطلب ہے۔ ویسے تو مسز کٹلے نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی تم جانتے ہو دل میں ناراضگی تو رہتی ہے۔ سو اگر تم کسی وقت اسے سمجھا دو تو یہ رہی سہی خلش بھی نکل جائے۔ کسی وقت بر سبیلِ تذکرہ بات کر دینا۔ اور ہاں ویسے تو مجھے مکمل اعتماد ہے۔ پھر بھی ذرا احتیاط رہے۔ مطلب ہے یہ بات باہر نہ نکلے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"فکر نہ کرو مسٹر کٹلے۔" زبیری نے جواب دیا اور کٹلے "شکریہ شکریہ" چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اُسی رات زبیری نے سوچا کہ مسٹر کٹلے کے گھر سے ہو آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر کی دلچسپی اُس سے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ اس پتھر کے مکان سے کوئی اسرار وابستہ ہے۔

زبیری نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "آئیے" مسز کٹلے کی آواز سنائی دی۔

"سلام علیکم" پروفیسر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

کمرے میں چارپائی پر مسز کٹلے پڑی تھی۔ اور پاس ہی آرام کرسی پر قاسم بیٹھا تھا۔

"اوہ" پروفیسر بولا۔ "معاف کیجئے۔ مسٹر کٹلے کہاں ہیں؟"

قاسم نے جواب دیا۔ "ابھی باہر گئے ہیں۔"

"اوہ۔۔ اوہ آپ آپ مسز کٹلے۔" پروفیسر نے جانے کیا کہنے کی کوشش کی۔ "میرا مطلب ہے۔۔۔"

قاسم نے جواب دیا ۔ "اُن کی طبیعت اچھی نہیں ۔"

"اچھا تو میں پھر حاضر ہوں گا ۔" پروفیسر باہر نکل آیا ۔ ساتھ والے کمرے میں ایک لالٹین جل رہی تھی ۔ جس کے قریب پنگوڑے میں ننھا سو رہا تھا ۔ اس کے قریب چارپائی پر لڑکی بیٹھی لالٹین کے شعلے کو گھور رہی تھی ۔ کمرے کے دوسرے کونے میں بڑا لڑکا کونے کی طرف منہ موڑے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا ۔

اگلے روز صبح سویرے مسٹر کٹلے پھر آموجود ہوا ۔ "پروفیسر" وہ اُسے دیکھتے ہی چلایا ۔ "وہ میرا واحد دوست تھا ۔ ساری تتھیا گلی میں ۔ اس نے ہمیشہ میری خیر خواہی کی ۔ لیکن وہ بھی چلا گیا ہے ۔ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے ۔ میرا عزیز دوست قاسم !"

زبیری نے پوچھا ۔ "وہ کب ۔"

"آج صبح ۔ مجھے بتاؤ پروفیسر مجھ سے ناراض ہو کر تو نہیں گیا ۔ کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ کل اسے تار آگیا اور اُسے جانا پڑا ۔ تار وصول کرتے ہی وہ مجھے اطلاع دینے کے لئے گھر آیا ۔ لیکن میں باہر تھا ۔ دوسرے شو کے بعد گھر پہنچا ۔ رات کے دو بجے تک وہ بیچارا بیٹھا میرا انتظار کرتا رہا ۔ کتنا لگاؤ تھا اُس کو مجھ سے ۔ میری حماقتوں کے باوجود میری بدحواسیوں کے باوجود ۔ ایسا دوست مجھے کبھی نہیں ملے گا ۔ لیکن پروفیسر دوستوں کے معاملے میں مَیں بڑا خوش قسمت ہوں ۔ مجھے ایک نا ایک دوست مل ہی جاتا ہے ۔ مگر افسوس کہ میں اُن سے اچھا سلوک نہیں کرتا ۔ آج میں بڑا دکھی ہوں پروفیسر ۔ اگر ناگوار نہ ہو تو آؤ ہم اکٹھے چائے پئیں ۔ مسز کٹلے ہمارا انتظار کر رہی ہے ۔"

مسز کٹلے نے میز پر چائے کے برتن پہلے ہی سے چن رکھے تھے ۔ "آئیے" وہ مسکرا کر بولی ۔ ۔ ۔ ایک مبہم سی پُراسرار مسکراہٹ ۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا پروفیسر کہ مسز کٹلے انتظار کر رہی ہے ۔ دیکھ لیا نا ۔ تشریف رکھئے صوفے پر ۔ بیٹھئے نا ۔ ذرا ان کی تواضع کرو نا مسز کٹلے ۔ اب قاسم کے جانے کے بعد پروفیسر زبیری کے سوا ہمارا کون ہے ۔"

مسز کٹلے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ۔

کٹلے نے پریشانی سے پوچھا ۔ "کیوں کیا بات ہے ۔"

"وہی سر درد" وہ سر اٹھائے بغیر بولی ۔ "سخت درد ہے ۔"

کٹلے نے جواب دیا ۔ "تو اسپرو کی گولی لے لونا ۔"

"سب ختم ہوگئیں ۔" وہ بولی ۔ "ایک بھی نہیں ۔"

"اچھا اچھا" مسٹر کٹلے اٹھا "میں لاتا ہوں ۔ ابھی لایا یہ پاس ہی تو دوکان ہے ۔ پندرہ منٹ میں آیا ۔"

"ٹھہریئے مسٹر کٹلے" زبیری نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔ "میں بھی ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں" کٹلے چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ پروفیسر مجبوراً پھر صوفے پر بیٹھ گیا ۔

کٹلے کے بڑے لڑکے نے باپ کو باہر جاتے دیکھا تو ایک نظر اُس نے اپنی ماں کی طرف ڈالی جو اسی طرح سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی ۔ پھر اُس نے پروفیسر زبیری کی طرف دیکھا اور چپکے سے اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا ۔ اُس کو جاتے دیکھ کر اُس کی چھوٹی بہن نے اپنی گڑیاں اُٹھا لیں اور چپکے سے ملحقہ کمرے کی طرف چل پڑی ۔ یہ دیکھ کر ننھا گھسٹ گھسٹ کر ملحقہ کمرے کی دہلیز پر چڑھنے لگا ۔

زبیری نے ایک نظر کمرے پر ڈالی ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے کمرے میں لٹکی ہوئی تصویریں اُلٹی ہوگئی ہیں

ٹھک ۔ ۔ ۔ ملحقہ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا ۔

مسز کٹلے نے سر اٹھایا ۔ اُس کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ تھیں ۔ وہ اُٹھی ۔ "میرا سر" وہ چلائی ۔ "میرا سر اور پھر دھڑام سے صوفے پر گر پڑی ۔ ۔ ۔ زبیری کے منہ سے اِک چیخ نکل گئی ۔

"آہاہا ۔" ساتھ والے کمرے سے لڑکی کی مدھم آواز آئی ۔ "چپ" لڑکے نے کہا ۔ "چپ ، امی ۔ ۔ ۔"

. . . .O.... ....

خدا بخش

"چپ" یوسف نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے ربڑ کی نالی میرے ہاتھ سے چھین کر اس پر ایک بڑی سی کتاب رکھ دی ۔
"سپرنٹنڈنٹ" اس نے میرے کان میں کہا ۔ ہم دونوں نے کتابیں ہاتھ میں پکڑ لیں اور یوں بیٹھ گئے جیسے پڑھنے میں شدت سے مصروف ہوں اور پاؤں کی چاپ کو غور سے سننے لگے جو صاف طور پر بورڈنگ کے برآمدہ سے سنائی دے رہی تھی ۔ بورڈنگ میں حقہ پینا قطعی طور پر منع تھا ۔ مگر خدا بخش ۔ ۔ ۔ وہ تو چاہتا تھا کہ کلاس روم میں بھی حقہ پیا جائے ۔ خدا بخش کو تین چیزوں کا خبط تھا ۔ حقہ پینا تہبند باندھنا اور مذاق کرنا ۔ خیر اس وقت تو وہ گنوار مسخرہ گاؤں گیا ہوا تھا ۔ پھر بھی ہم بورڈنگ کے کمرے میں حقہ پی رہے تھے ۔ حقہ حسبِ معمول میز کے نیچے چھپا ہوا تھا جس پر اتنا بڑا میز پوش پڑا تھا کہ وہ میز سے لے کر فرش تک لٹک رہا تھا ۔ حقے کی ربڑ کی نے کمرے میں بچھی ہوئی دری کے نیچے نیچے چلی آتی تھی ۔ اور درمیان میں جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے ۔ ایک سوراخ سے بالشت بھر باہر نکلی ہوئی تھی ۔
"بارہ بجے ۔ سپرنٹنڈنٹ ؟" میں نے حیرانی سے کہا ۔
"اس قلندر کا کیا ہے ۔" یوسف مسکرایا ۔ "سالے کو وقت بے وقت کی بھی تمیز نہیں ۔" کھٹ کھٹ کھٹ ۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔
یوسف نے ربڑ کی نے کو مزید احتیاط سے ڈھانپا اور پھر دروازہ کھول دیا ۔
"چپ" منہ پر انگلی رکھے ہوئے خدا بخش داخل ہوا ۔
"ارے تم ؟" یوسف چلایا ۔
"چپ" خدا بخش نے پھر اشارہ کیا ۔
"کیوں پیچھے پولیس لگی ہے کیا ؟" یوسف نے ازراہِ مذاق پوچھا ۔

"ایسی لگی ہے ۔" وہ بولا ۔ "کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ۔ ذرا ٹھہرو ابھی آیا ۔"

خدا بخش کے اس پراسرار انداز کو دیکھ کر ہم دونوں دو ایک ساعت خاموش رہے ۔ "نہ جانے کیا نیا مذاق لے کر آیا ہے" یوسف نے کہا ۔

"مذاق" ۔ ۔ ۔ "دہقان کہیں کا ! اُسے کیا پتہ مذاق کسے کہتے ہیں ۔"

چار ایک منٹ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ پھر وہ واپس آیا ۔ اس کے سر پر ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا ۔

"ارے" یوسف چلایا ۔ "چوری کی ہے کیا ؟"

نہیں نہیں ۔ وہ ٹرنک رکھ کر بولا ۔ "چوری کی نہیں ۔ اپنی ہے اپنی ۔"

"اپنی کیا" مجھے اس کی اُلٹی سیدھی باتوں پر غصہ آجاتا تھا ۔

"آؤ بھی نا اب" خدا بخش نے دروازے سے باہر کسی سے کہا ۔ اور پھر ہاتھ باہر نکال کر ایک رنگین سی گٹھڑی کو اندر گھسیٹ لیا ۔ گٹھڑی کے اوپر لے سرے سے چوٹی لٹک رہی تھی ۔

"ہائیں !" میرے ہاتھ کی کتاب زمین پر گر گئی ۔

یوسف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔ "لڑکی !"

"چپ" خدا بخش بولا ۔ "قلندر نہ سن لے ۔"

"لیکن" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔

لڑکی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں ۔ گندمی رنگ پر جوانی کا نکھار ۔

ویسے تو ہم تینوں کی تمنا تھی کہ اللہ کرے چھت پھٹ جائے اور ایک لڑکی نازل ہو جائے لیکن اس وقت ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے ۔ رگوں میں خون خشک ہوا جا رہا تھا اور حلق میں کانٹا سا کھڑا ہوگیا تھا ۔ کبھی ہم خدا بخش کی طرف دیکھتے اور کبھی اس رنگدار کپڑوں میں لپٹی ہوئی گٹھڑی کی طرف ۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

سمجھ میں آتا بھی کیسے ۔ خدا بخش کی ہر بات انوکھی تھی ۔ گاؤں کو جانے

سے پہلے جو اس نے بدتمیزی کی تھی ۔ ابھی تک میرے دل سے اس کے خلاف غصہ نہ گیا تھا ۔ دوپہر کے وقت بھاگا بھاگا آیا ۔ "لو بھئی" اس نے گپ ہانکی ۔ "پیسے آئے ہیں آج ۔ منی آرڈر پانچ روپیہ۔"

"کیا واقعی" میں خوشی سے چلایا ۔

"رئیسی" ۔ ۔ ۔ ۔ خدا بخش نے منہ بنایا ۔ "آج چائے ہوگی ۔ بالائی کی قلفیاں اور سیر رہے گی ۔ کمپنی باغ کی سیر ۔"

ہم بے وقوف تھے ۔ جو اس کی بات مان جاتے تھے ۔ بھلا اسے کہاں سے منی آرڈر آتا ۔ جب کہ نہ اس کا گھر تھا نہ گھاٹ ۔ نہ اپنے نہ بیگانے ۔ ساری عمر اسکول کے وظیفے پر تعلیم پائی تھی اُس نے ۔ کرکٹ کا بہترین کھلاڑی تھا نا ۔ اس لئے کالج والے کھانا بھی دیتے تھے اور جیب خرچ بھی ۔

اس کے پاس صرف ایک پتلون تھی جسے وہ ہر چوتھے دن خود دھو کر استری کر لیتا تھا ۔ اور جہاں بھی جاتا اُسے کاغذ میں لپیٹے اٹھائے پھرتا کالج میں بھی تہبند باندھ کر جاتا تھا ۔ جب کلاس روم میں جانا ہوتا تو پھٹ سے پتلون چڑھا لیتا اور تہبند لپیٹ لیتا ۔ کالج ختم ہوتے ہی پتلون سے نکل کر تہبند میں لپٹ جاتا ۔ ارے یار یہ سارنگی کا غلاف پہن کر چلا نہیں جاتا ۔" پتلون کے متعلق وہ یوں اظہارِ خیال کیا کرتا تھا ۔

ہاں تو اس روز رات کے وقت اس نے تانگہ لیا ۔ آؤ یار وہ چلایا ۔ تمہیں سیر کرائیں ۔ کیا یاد کرو گے ۔

دو گھنٹے ہم کمپنی باغ میں گھومتے رہے ۔ پھر خدا بخش تانگے کو ویران سڑک پر لے گیا ۔ ذرا ٹھہرو ۔ وہ بولا ۔ اور اتر کر پیشاب کرنے بیٹھ گیا ۔ دفعتاً وہ اٹھ کر چلایا ۔ پیسہ ایک بھی نہیں ہے ۔ اور پھر بھاگا ۔ دو ایک ساعت کے لئے تو ہم حیران بیٹھے رہے ۔ پھر یوسف نے چھلانگ ماری اور بھاگ اُٹھا ۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر جست بھری ۔ ہم کھیتوں میں بھاگ رہے تھے ۔ پیچھے پیچھے تانگے والا گالیاں دیتا ہوا آرہا تھا ۔ اگرچہ میں پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا ۔ لیکن تانگہ والا ہر ساعت میرے قریب آتا جاتا تھا ۔ دفعتاً سڑک سے خدا بخش کی آواز آئی ۔ "او تانگہ والے سنبھال اپنا تانگہ ۔" اس نے زور سے گھوڑے کی پیٹھ

پر ایک دی اور گھوڑا فراٹے بھرتا ہوا بھاگا ۔ کوچوان رُک گیا اور گالیاں دیتا ہوا تانگہ کی طرف بھاگا ۔

عجیب قسم کے مذاق سوجھتے تھے اسے ۔ اس کی اسی عادت کی وجہ سے سزا کے طور پر اُسے ڈیڑھ مہینے کے لئے پرنسپل نے گاؤں بھیج دیا تھا اور آج وہ بیس دن کے بعد اس ڈرامائی انداز سے اس رنگین گٹھڑی کو ساتھ لئے آدھمکا تھا ۔ وہ رنگین گٹھڑی جس کے سر سے اتنی لمبی چوٹی لٹک رہی تھی ۔ ناک میں اتنی بڑی نتھ پڑی ہوئی تھی اور سر پر اتنا بڑا جھومر لگا تھا ۔

تمام تر قصور خدا بخش کا تھا ۔ اگر وہ مسخرا حامد سے چار ایک بھونڈے مذاق نہ کرتا تو سب کو اتنی خفت نہ اٹھانی پڑتی ۔ آپ جانتے ہیں حامد کو ۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کی مثال کا موجد اگر کچھ وقت حامد کے ساتھ بسر نہ کرتا تو اسے اتنی بڑی حقیقت کبھی نہ سوجھتی ۔ ہماری بد قسمتی سمجھ لیجئے کہ حامد کا ابا جوتوں کی دوکان کے علاوہ ایک سینما ہال کا مالک بھی تھا ۔

ان ہی دنوں اس ہال میں ایک تھیٹریکل کمپنی بھی آگئی ۔ اور جیسا کہ امتحان کی بری عادت ہے ۔ کہ نہایت غیر مناسب موقعہ پر سر پر آ سوار ہوتا ہے ۔ وہ بھی تھیٹر کمپنی کے ساتھ ہی آپہنچا ۔

انہی دنوں حامد ایک روز ہمارے کمرے میں آیا ۔ اس کے ہاتھ میں تہ کیا ہواگتہ سا تھا ۔ بڑے فیاضانہ انداز سے کہنے لگا ۔ "یار میرے تھیٹر کا پاس ہے ۔ ہمارا اپنا ہال ہے نا ۔ اور اصول کے مطابق پروپرائٹر بکس کا پاس ہمارے پاس ہی رہتا ہے ۔ لیکن ! ۔ ۔ ۔ اس نے آہ بھری ۔ "ہم تو تھیٹر جا ہی نہیں سکتے ۔ نہ تم نہ میں ۔ یونیورسٹی کا امتحان سر پر آگیا ہے ۔ میرا تو کوئی دوست نہیں ۔ تم لے لو ۔ یہ پاس کسی دوست کو دے دینا ۔ تاکہ کام آئے ۔" یہ کہہ کر اُس نے وہ تہہ کیا ہواگتہ میز پر رکھ دیا ۔ اور بڑی بے نیازی سے کمرہ سے باہر نکل گیا ۔

حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم تینوں فطرتاً سرہانے بالائی کا پیالہ رکھ کر سو نہیں سکتے اور پھر تھیٹریکل کمپنی ' وہ تھیٹریکل کمپنی جس میں بالو ، نجو اور ثریا کام کرتی تھیں ۔

"صرف ایک بار تھیٹر دیکھیں گے صرف ایک بار" خدا بخش کچھ دیر تک بھی صبر نہ کر سکا ۔ "لیکن ایک شرط ہے ۔" وہ خفت مٹانے کے لئے بولا ۔ "اگرچہ یہ پاس روز کام میں لایا جا سکتا ہے ۔ مگر کل سے اسے استعمال کرنا ہم پر حرام ہوگا ۔ خدا کی قسم !" وہ چلانے لگا ۔ "جو اسے کل استعمال کرے گا ۔ حرامی ہوگا ۔ ہاں البتہ ۔ آج ۔ آج ۔ کیا حرج ہے ؟"

لیکن بورڈنگ سے چل کر تھیٹر ہال تک پہنچنا کچھ آسان کام نہ تھا ۔ وہ بورڈنگ نہیں تھا ۔ وہ تو شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے پر ایک ویران کوٹھی تھی جسے زبردستی بورڈنگ بنا رکھا تھا ۔ وہاں زمین پر رات بھر سانپ رینگتے ، درختوں پر اُلو بولتا ۔ اور کمروں میں چیونٹیوں کی قطاریں چلتیں ۔ ہم میں سے کسی کے پاس سائیکل بھی نہ تھا ان سب باتوں کے علاوہ روز شام کو پرنسپل وزٹ پر آیا کرتا تھا ۔ کیونکہ دو دن پیشتر ہی اُس نے ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا تھا جس میں تاکید کی تھی ۔ کہ اب ہم امتحان کے لئے تیاری شروع کر دیں اور وہ بلاناغہ یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں روزانہ وزٹ کیا کرتا تھا ۔

"آہا" خدا بخش نے بیٹھے بیٹھے چٹکی ماری ۔ "بس بن گیا کام ۔"

"کیا ؟" یوسف نے پوچھا۔

"جب پرنسپل واپس جائے تو ہم اس کی لینڈو میں بیٹھ جائیں ۔"

"کھی کھی ای ۔" میری ہنسی نکل گئی ۔ اس میں میرا قصور نہ تھا ۔ خدا بخش کی بات چاہے کتنی معقول کیوں نہ ہو وہ اسے اس انداز سے ادا کرتا ہے کہ بے اختیار ہنسی نکل جاتی ہے ۔ "وہ کیا تمہیں گاڑی میں بٹھائے گا ۔" یوسف نے ہنس کر پوچھا ۔

"گاڑی میں نہیں بٹھائے گا تو لینڈو کے پیچھے جو سیٹ بنی ہوتی ہے وہ ۔"

اس بات پر مجھے بے حد غصہ آیا ۔ جب بھی وہ معقول بات کرتا تو مجھے غصہ آجاتا ۔ ایک غیر معقول آدمی کو معقول بات کرنے کا کیا حق ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تینوں کوٹ بوٹ پہن رضائیوں میں لپٹ کر کتابیں سامنے

رکھے یوں پڑ گئے ۔ جیسے شدت سے مطالعہ میں مصروف ہوں ۔

"خوب خوب" پرنسپل نے دروازے سے جھانک کر کہا ۔ "شاباش ۔ اونہوں ، کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ۔ لگے رہو کام میں ۔"

جب اس کی لینڈو چلنے لگی تو ہم درختوں کی آڑ سے نکل کر چپکے سے لینڈو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔

اس کے بعد ہمارا دستور ہوگیا کہ سارا دن چادر تان کر سوتے ۔ شام کو بیدار ہو کر مل کر تھیٹر والوں کو ، حامد کے باپ کو ، جس نے وہ ہال بنایا تھا اور حامد کو جس نے ہمیں وہ پاس دیا تھا گالیاں دیتے ۔ "یا اللہ" خدا بخش ہاتھ جوڑ کر دعا مانگتا ۔ "ان تھیٹر والوں کا بیڑا غرق ہو جائے ، اس ہال کو آگ لگ جائے ۔ اللہ کرے کوئی نواب بالو ، نجو اور ثریا تینوں سے نکاح کر کے انہیں گھر میں ڈال لے ۔" پھر وہ قسمیں کھانے لگتا ۔ "بھئی اب جو تھیٹر دیکھے وہ اپنے باپ کا نہیں ۔ یعنی میرا مطلب ہے کل سے ۔ آج تو شیریں فرہاد ہے نا ۔ بھئی شیریں بنتی ہے نجو کمبخت تو مزا آجاتا ہے اور وہ دشت کا نظارا ۔ اور پہاڑوں سے ندی کا نکلنا ۔"

وہ شتر کینہ حامد بھی بڑا چوکنا رہنے والا شخص تھا ۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم بلا ناغہ تھیٹر دیکھتے ہیں تو ایک روز اُس نے پرنسپل کو بھی اسی بکس میں مدعو کر لیا ۔ اس روز شیریں فرہاد کا کھیل تھا ۔ بکس میں پہنچ کر ابھی ہم تینوں ٹانگیں پھیلا کر راستے کی کوفت دور کرنے بھی نہ پائے تھے کہ حامد بھاگا بھاگا آیا ۔ "ارے یار" وہ بولا ۔ "تم آئے ہوئے ہو ۔ اب کیا ہوگا ۔ یہاں تو پرنسپل صاحب آرہے ہیں ، سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں وہ تو ۔" اُس نے جھٹ ہم کو اٹھا کر بکس کے کنارے نیچے فرش پر بٹھا دیا ۔ اور تین بوریاں اٹھا کر ہمارے سر پر یوں ڈال دیں ۔ جیسے ہم کارخانے کے مزدور تھے ۔

کچھ دیر کے بعد پرنسپل صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور وہ آکر ہمارے پاس والی کرسی پر دراز ہوگئے ۔ میری رگوں میں خون خشک ہوگیا ۔ یوسف بھی یوں پڑا تھا ۔ جیسے کب کا مرا ہوا ہو ۔ لیکن خدا بخش ہر دو منٹ کے بعد دبی آواز سے کہتا ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ۔

جیسے ہنسی دبا رہا ہو ۔ کمبخت کو اس وقت بھی مذاق سوجھ رہا تھا ۔

کھیل شروع ہوا تو خدا بخش قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ کون تھا اور کہاں بیٹھا تھا ۔ اور اس کے قریب والی کرسی سے لٹکتی ہوئی ٹانگیں کس کی تھیں ۔ ورنہ اگر اسے یہ سب باتیں یاد ہوتیں تو چاہے سٹیج پر شیریں کیسی ہی بے دردی سے فرہاد کو پیٹتی وہ کبھی بآواز بلند چلا کر نہ کہتا ۔ "اری مارتی کیوں ہے تو اُسے ۔"

اس کا یہ کہنا ہی تھا کہ تمام تماشائیوں کی نگاہیں ہماری طرف اُٹھ گئیں ۔ پرنسپل نے اُٹھ کر ہمارے سر سے بوریاں اتار دیں ۔ اور ہم تینوں شرم سے زمین میں گڑ گئے ۔

اس کے بعد وہ ہنگامہ بپا ہوا کہ توبہ ہے ! پرنسپل نے فیصلہ کر لیا کہ ہمارے نام امتحان کے لئے نہیں بھیجے جائیں گے ۔ ہم تینوں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی ہے کہ پرنسپل اپنا ارادہ بدل دے ۔ لیکن بے کار ۔ اگر پرنسپل اس معمے کو صرف سمجھ ہی لیتا تو شاید اسے اس قدر غصہ نہ آتا ۔ وہ جانتا تھا کہ ہم تینوں کے پاس سائیکل نہیں تھے ۔ اور آموں والی کوٹھی کے قرب وجوار سے کرائے کا تانگہ ملنا ممکن نہیں تھا ۔ اس کے علاوہ جب وہ بورڈنگ میں "وزٹ" پر آیا تھا تو ہم تینوں رضائیوں میں لیٹے پڑھنے میں مصروف تھے ۔ پھر ہم اس سے پہلے تھیٹر میں کیسے پہنچ گئے ۔ یہ تھا وہ معمہ جسے حل کرنے سے وہ قاصر تھا ۔ اور اسی وجہ سے وہ غصے سے بھوت بنا ہوا تھا ۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم اس کی لینڈو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر تھیٹر میں پہنچے تھے ۔ تو بے اختیار اس کی ہنسی نکل گئی ۔ اُسے ہنستے دیکھ کر خدا بخش رونی سی شکل سے بولا ۔ "کم از کم آپ ہماری ذہانت کی داد تو دیجئے ۔" اس پر پرنسپل بہت ہنسا ۔ اس نے ہمارے نام تو امتحان میں بھیج دئے ۔ لیکن خدا بخش پر یہ بندش لگا دی کہ وہ ڈیڑھ ماہ کے لئے اپنے گاؤں چلا جائے تاکہ وہاں تیاری کر سکے ۔

"جی کون سے گاؤں چلا جاؤں ۔" وہ بولا ۔

"تمہارا اپنا گاؤں نہیں کوئی ۔"

وہ مسکرا دیا ۔ "ہر گاؤں میرا اپنا ہی ہے جی ۔"

"تمہارے عزیز و اقارب نہیں کیا ۔" ؟ پرنسپل نے پوچھا ۔

"آپ جو ہیں" وہ بولا ۔ "یہ یوسف ہے اور یہ ہیں ۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا ۔

"اچھا" پرنسپل مسکرایا ۔ "تو تم میرے گاؤں میں چلے جاؤ ۔ وہاں ہماری حویلی خالی ہے ۔ میرا ملازم وہیں ہے ۔ وہ تمہیں دو وقت کی روٹی پکا دیا کرے گا ۔ باقی وقت تم پڑھ سکتے ہو ۔"

اور خدا بخش چلا گیا ۔ اور آج بیس دن کے بعد اس رنگین گٹھڑی کو اٹھائے واپس چلا آیا ۔

میں نے ایک نظر اس سرخ گٹھڑی کی طرف دیکھا میرا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ اٹکا ۔ یوسف جو لڑکیوں کے معاملے میں اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتا تھا ، اس وقت دبک کر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا ۔ اس کی نگاہیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کر رہی تھیں ۔

کمرے پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہمارے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے سوال منڈلا رہے تھے ۔ نہ جانے وہ لڑکی کون تھی ؟ ۔ ۔ ۔ وہ چپ چاپ کیوں بیٹھی تھی ۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا ۔

دفعتاً برآمدے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی ۔

میں نے ڈرے ہوئے کبوتر کی طرح یوسف کی طرف دیکھا ۔

یوسف اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہا تھا ۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔

"نہ جانے یہ نئی آفت کون ہے ۔" خدا بخش مسکرا دیا ۔ اور پھر اس نے بھاگ کر اس گٹھڑی کو چوٹی سمیت گھسیٹ کر بڑی میز کے نیچے پھینک دیا ۔ جس کے تلے ہمارا حقہ چھپا ہوا تھا ۔

کھٹ کھٹ کھٹ ۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔

یوسف اُٹھ بیٹھا ۔ لیکن اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ۔

آج ساری رات پڑھتے رہو گے کیا ۔" سپرنٹنڈنٹ قلندر علی خاں نے

مسکراتے ہوئے اندر جھانک کر کہا ۔ دفعتاً خدا بخش کو دیکھ کر وہ رُک گیا ۔ "ہائیں ۔ خدا بخش ہے ۔"

"جی نہیں" وہ بولا ۔ "میں خدا بخش ہوں ۔"

"تم آبھی گئے ؟" اس نے خدا بخش کے مذاق پر توجہ نہ دی ۔

"اور کیا کرتا جناب" وہ بولا ۔

"لیکن ہم تمہیں بورڈنگ میں نہیں رکھ سکتے ۔ پرنسپل صاحب کا حکم ہے ۔"

"لیکن خان صاحب مجھے گاؤں والوں نے گاؤں سے نکال دیا ہے ۔ میں کیا کروں اور یہی نہیں ۔"

"نکال دیا ہے ۔" اُس نے حیرانی سے پوچھا ۔

"اور ساتھ ہی سر پر ایک گٹھڑی رکھ دی ۔ اور پیچھے ایک دم لگا دی ۔" وہ لمبی آہ بھر کر بولا ۔

"گٹھڑی ! دم ! یہ سب کیا ہے ۔"

"کچھ پتہ بھی چلے صاحب ۔"

"آخر کیا بات ہوئی ۔" قلندر علی کرسی پر بیٹھ گیا ۔

مجھے خدا بخش پر بے حد غصہ آرہا تھا ۔ بدتمیز خواہ مخواہ اس قلندر کو باتیں سنا سنا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ۔ اگر اُسے میز کے نیچے پڑی گٹھڑی کا راز معلوم ہو جائے تو ۔ ۔ ۔ ؟ زبردستی گٹھڑی اور دم کا قصہ لے بیٹھنا ۔ نہ جانے اِس کا مطلب کیا تھا ۔

"بات تو اتنی سی تھی ۔" خدا بخش نے کہا ۔ "لیکن اتنی سی بات کو اتنا بڑھا دینا ۔ ۔ ۔ آپ جانتے ہیں ۔ جوان لڑکے لڑکیوں کی طرف دیکھا ہی کرتے ہیں ۔ "کیوں جی ؟"

"کیا مطلب" ؟ قلندر علی نے تلخی سے کہا ۔

لیکن خدا بخش نے اس کی تلخی کی طرف توجہ نہ دی ۔ "اور پھر اگر لڑکی واقعی حسین ہو ۔ پھر تو اس کی طرف دیکھنا فرض ہو جاتا ہے ۔ لیکن دیکھنے کا مطلب تو صرف دیکھنا ہوتا ہے نا ۔ اور بس ۔ کیوں جی ؟ لیکن گاؤں کی لڑکیوں کو یہ

چھوٹی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی وہ سمجھتی ہیں کہ دیکھا دل سے جاتا ہے آنکھوں سے نہیں ۔"

وہ قلندر بھی صحیح معنوں میں قلندر ہی تھا ۔ خدا بخش کی اُلٹی سیدھی باتیں سُن کر بُوکھلا گیا ۔ لیکن خدا بخش کی باتوں میں یہ عجیب خصوصیت تھی ۔ کہ ان کے اوٹ پٹانگ ہونے کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے آپ انہیں سننے پر مجبور ہو جاتے ۔ آپ کا جی چاہتا کہ اس کی بات کاٹ دیں اور پھر اُٹھ کر چلے جائیں ۔ لیکن نہ جانے کیوں آپ کے لئے اس کی بات کاٹنا مشکل ہو جاتا ۔ اور آپ اُٹھ کر چلے جانے کا ارادہ کر لینے کے باوجود بیٹھے رہتے ۔

سپرنٹنڈنٹ نے بھی دو ایک مرتبہ کرسی میں پہلو بدلا جیسے وہ بات کاٹ کر واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر چکا ہو ۔ مگر اس کے باوجود وہ بیٹھا ہی رہا ۔ اور خدا بخش بلا سوچے سمجھے نہ جانے کیا کیا بکتا رہا ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں دیکھتا تھا ہی نہیں ۔ میں تو کتاب پڑھتے پڑھتے تھک کر نگاہیں اُٹھاتا تھا ۔ اور وہ سمجھتی تھی میں دیکھ رہا ہوں ۔ اور پھر لچک لچک کر کنوئیں سے ڈول نکالنے لگ جاتی ۔ وہاں گاؤں کا کنواں تھا نا ۔ جہاں وہ سب پانی بھرنے آتی تھیں ۔ اب اگر پرنسپل صاحب گاؤں کے کنوئیں کے سامنے حویلی بنا لیں اور مجھے وہاں ایف اے کے امتحان کی تیاری کے لئے زبردستی بھیج دیں تو اس میں میرا کیا قصور ؟

چلو مان لیا کہ میں ان کو دیکھتا تھا ۔ پر میں تو سب ہی لڑکیوں کی طرف دیکھتا تھا ۔ لیکن ہر لڑکی یہ ہی سمجھتی کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں ۔ لو ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ ایسی ہوتی ہیں گاؤں والیاں ۔ اللہ بچائے ۔ شکر ہے میرا اپنا گاؤں کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ لیکن اب کیا فائدہ ؟" اس نے آہ بھر کر کہا ۔ اور میز کی طرف دزدیدہ نگاہ ڈالی ۔

"پھر ایک روز صبح سویرے جب میں گلی سے گزر رہا تھا تو دفعتاً وہ اپنے گھر سے باہر نکلی اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی ۔ اس وقت ساری گلی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا ۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی ۔ اور دیوار سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ۔ "ماں میری شادی پٹواری سے کر رہی ہے ۔

پر میں تو نہیں کروں گی یہ شادی ۔"

یہ سن کر مجھے ہنسی آگئی ۔ بات ہی ایسی تھی ۔ میں نے دوسری دیوار کی طرف منہ کر کے کہا ۔ "کیوں نہ کرو گی تم شادی ، شادی سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے ۔"

"میں پٹواری سے بیاہ نہیں کروں گی ۔"

"پٹواری سے نہ کرو گی بیاہ" ؟ میں نے کہا ۔ "اتنے بڑے عہدے دار سے نہ کرو گی ۔ پٹواری تو شہر کے ڈپٹی کمشنر سے بھی بڑا ہوتا ہے ۔"

یہ سن کر اس نے میری طرف منہ موڑ لیا اور میرے قریب آکر غصے سے بولی ۔ "دیکھو جی ۔ میں تو زہر کھالوں گی ۔ پر پٹواری سے بیاہ نہیں کروں گی ۔" اس وقت بڑے غصے میں تھی وہ ۔ جیسے تمامتر قصور میرا ہو ۔ بہرحال یہ کہہ کر وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی ۔ اور میں حیران وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ خدا بخش اس لڑکی کے متعلق قصہ سُنا رہا ہے ۔ جو میز کے نیچے چھپی ہوئی ہے ۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ فطری طور وہ بے حِس واقع ہوا ہے ۔ وہ جوش میں آکر نتائج کے متعلق سوچنے کا عادی نہیں ۔ اگر اس قلندر کو معلوم ہوگیا تو بات پرنسپل تک جا پہنچے گی ۔ پھر کیا ہوگا ۔ میرا دل بیٹھنے لگا ۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ۔ کہ کسی طریقے سے خدا بخش کی توجہ کسی اور طرف مبذول کر دوں یا اشارہ کی مدد سے اسے سمجھا دوں ۔ کہ سپرنٹنڈنٹ سے وہ واقعہ بیان کرنا ہمارے لئے مصیبت کا باعث تھا ۔ ادھر یوسف کا رنگ بھی زرد پڑ رہا تھا ۔ شاید اُس نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ حالات بگڑ رہے تھے ۔ لیکن خدا بخش بات سنانے کے جنون میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا ۔

مصیبت یہ تھی کہ اس کی بات اس قدر دلچسپ تھی کہ جلد ہم اُسے سننے میں اس قدر کھو گئے کہ ہمیں یاد ہی نہ رہا کہ ہمیں اُسے بات کرنے سے روکنا ہے ۔

دیکھئے نا اُس نے گال میں زبان دے کر آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا ۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ زہر کھالینے کی دھمکی ۔ درحقیقت دھمکی نہیں بلکہ محبت جتانے کا ایک طریقہ ہے ۔ میں کیا جانوں اس عشق و محبت کے قصے کو' میرے دماغ میں

عشق کا خانہ سرے سے خالی ہے ۔ بلکہ اگر وہ زہر کھانے کی بات نہ کرتی تو میں سمجھتا کہ وہ اپنی شادی کی خوشخبری ایک انوکھے انداز سے سنا رہی ہے ۔ ان لڑکیوں کے متعلق کوئی بات یقینی بھی ہو ۔ کبھی محبت جتانے کے لئے نفرت کا ڈھونگ رچالیتی ہیں اور کبھی نفرت چھپانے کے لئے محبت کا سوانگ بھر لیتی ہیں ۔ البتہ میں اس بات پر حیران ضرور تھا کہ یہ اللہ کی بندی مجھے کیوں زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دے رہی ہے ۔ بیاہ کرنے والے ماں باپ ۔ ہونا ہے پٹواری سے میں کون ہوں ؟ جسے یہ واقعہ سنایا جا رہا ہے اور وہ بھی اِس انداز سے کہ مخاطب دیوار کو کیا جا رہا ہے ۔

اگر اسی روز میں پٹواری کو نہ دیکھتا تو شاید آج تک میں یہی سمجھتا کہ وہ لڑکی مجھ سے مذاق کر رہی تھی ۔ اور وہ زہر کھانے کا قصہ شادی کی خوشی کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ تھا ۔

اس روز اتفاق سے پٹواری علیے سے ملنے آگیا ۔ دونوں اندر بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کہ میرا دھیان کتاب سے ہٹ کر اُن کی باتوں کی طرف لگ گیا ۔

"اب تم سے کیا چھپانا ہے علیہ ، وہ بولا ۔ "جب تک ہماری فاطاں کا بیاہ نہ ہو جائے میں کس منہ سے اپنا بیاہ رچاؤں ۔ لڑکی کی ماں کا بھی یہی خیال ہے ۔ اور وہ لڑکی ! کیا بتاؤں علیہ لاکھوں میں ایک ہے ۔ دیکھنے میں چاند کا ٹکڑا ہے ۔ طبیعت بھی اچھی ہے ۔ اور نام چانتاں بالکل چاندنی ہے ۔ تم جانتے ہو فاطاں کی ماں کو مرے ہوئے آج پورے پندرہ سال ہو چکے ہیں ۔ اور میں نے صرف اس لئے بیاہ نہ کیا کہ لڑکی سوتیلی کے ہاتھ پڑ کر دُکھی رہے گی ۔ رشتے تو ملتے تھے ۔ لیکن اولاد پہلے ۔ ہاں اب لڑکی جوان ہوگئی ہے ۔ اپنا گھر بسا لے گی ۔ پھر میرا رشتہ ہو جائے تو اُسے تکلیف تو نہ ہوگی ۔ کیوں علیہ ؟ پھر یہ لڑکی بھی مہاجر ہے ۔ ان کا بھی بھلا ہو جائے گا ۔ بے چارے دربدر پھر رہے ہیں ۔ ویسے ہے بڑی شریف ۔ اور خاندان بھی اونچا ہے "ہاں" "پٹواری صاحب ہمیں تو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی ۔" علیہ کے یہ کہنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ پٹواری ہے ۔ اور اُس زہر کھانے کی دھمکی دینے والی گوری کا نام چانتاں ہے ۔ "لیکن مصیبت یہ ہے علیہ ۔ اب تم سے کیا چھپا ہے ۔ اپنی فاطاں کی آنکھ کا نقص ایسا

ہے کہ اس کی بات بنتی نہیں کہیں ۔ پھر نقش بھی تو ایسے ہی ہیں ۔ مگر مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی انتظام ہو جائے گا ۔"

پھر جب پٹواری صاحب کمرے سے باہر نکلے تو ان کی ایک آنکھ دیکھ کر مجھ پر تمام بات واضح ہوگئی ۔

بیچاری زہر نہ کھائے گی تو کرے گی کیا ۔ پٹواری صاحب کی کمر جھکی ہوئی تھی ۔ سامنے دانت غائب اور بال سارے کھچڑی ہو رہے تھے ۔ اُنہیں دیکھ کرمیرے دل میں چاتنا کیلئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا ۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا ۔

وہ تو محض اتفاق کی وجہ سے اگلے دن مجھ سے منشی جی کی ملاقات ہوگئی ۔ ورنہ میں چاتنا کی بد قسمتی پر چار ایک ٹھنڈی آہیں بھر کر خاموش ہو رہتا ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔

اُس روز میں حویلی سے نکل کر تکئے والے باغ میں جا بیٹھا تا کہ پڑھنے میں توجہ نہ بٹے ۔ وہ گاؤں کا کنواں تو میرے لئے مصیبت بنا ہوا تھا ۔ خواہ مخواہ توجہ بٹی رہتی تھی ۔ تو صاحب میں کتابیں بغل میں دبائے باغ میں جا پہنچا ۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ منشی صاحب باغ کے کنوئیں پر پانی پینے آ پہنچے ۔ ساتھ اُن کی بیوی بھی تھی ۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو جھجکے پھر سلام علیکم کہہ کر پاس آبیٹھے ۔ اور باتوں ہی باتوں میں پٹواری کے متعلق مجھ سے پوچھنے لگے ۔

پٹواری کا نام سن کر میں ٹھٹھکا اور میں نے اُن کی باتوں میں دل چسپی لینی شروع کر دی ۔

ہر چند انہوں نے اِدھر اُدھر کے سوال کئے ۔ لیکن میں فریب میں کب آنے والا تھا ۔ میں نے صاف کہہ دیا ۔ "منشی جی پہلے یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے ۔ تا کہ میں تمہیں اچھا مشورہ دے سکوں ۔ یوں بات چھپا کر رکھنا تو مسلمانوں کا کام نہیں ۔"

اس پر اس کی بیوی کا اسلام جوش میں آگیا ۔ بولی ۔ "لو بیٹا تم بالکل اپنے ہی ہو ۔ تم سے کیا پردہ ہے ۔ اصل میں اس گاؤں کے حجام نے ہمیں اتا پتا دیا

ہے ۔ اللہ رکھے میرا جوان بیٹا ہے ۔ اس کے رشتے کے لئے ۔ پٹواری کے گھر میں ۔ اور اب ہم دونوں پٹواری اور اس کی لڑکی کا اتا پتہ لینے کے لئے آئے ہیں ۔"

"اوہ تو یہ بات ہے ۔" میں نے کہا اور خود گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ کوئی ایسی بات کروں کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے ۔ تاکہ نہ پٹواری کی لڑکی کا بیاہ ہو اور نہ ہی پٹواری کی باری آئے ۔

میں نے کہا ۔ "منشی جی ! اب تم ہوئے میرے والد کی بجائے ۔ تم سے کیا چھپانا ۔ لڑکی تو اچھی نہیں ۔"

"اچھی نہیں ۔" بڑھیا بولی ۔ "آخر کیا برائی ہے اِس میں ؟"

"شکل و صورت بس اللہ کا فضل ہے ۔"

"لو اس میں کیا ہے ۔" وہ بولی ۔ "شکل و صورت میں کیا رکھا ہے ۔ ایسی ہی ہوتی ہیں گھر کی لڑکیاں ۔ اب ہم کیا میم بیاہنے آئے ہیں ۔"

یہ دیکھ کر میں نے فوراً پینترہ بدلا ۔ "شکل تو خیر ٹھیک ہے ۔ لیکن ویسے بھی لڑکی اچھی نہیں ہے ۔ ۔ ہاں ۔"

"ویسے کیا ۔" منشی جی نے پوچھا ۔

"میرا مطلب ہے ۔ تیز لڑکی ہے ۔ تیز ۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے ۔" بڑھیا بولی ۔ "آج کل کے لڑکے تو تیز لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں ۔ ہمارا بخشو بھی تو نئے کھیال کا ہے ۔ اب تم سے کیا پردہ ہے ۔ اپنا بخشو شکل کا سیدھا سادہ ہے ۔"

"لڑکوں کی شکل بھی دیکھی ہے کبھی کسی نے ۔" منشی جی بولے ۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں ۔" بڑھیا نے کہا ۔ "لڑکے کی آنکھ میں پھولا ہے اور ۔ اور اگلے دانت ذرا بڑے ہیں ۔ پر پڑھنے میں بڑا تیج ہے ۔"

بڑھیا کی یہ بات سن کر میں نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں پٹواری کی لڑکی کو بیاہنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ اس لئے میں نے ایک بار پھر پینترا بدلا ۔ میں نے کہا ۔ "سبحان اللہ تم دونوں بہت ہی شریف دکھتے ہو ۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری آزمائش کر رہا تھا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم اپنی بات کے پکے ہو ۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے ۔" وہ بولی ۔

"لڑکی تو بڑی خوبصورت ہے ۔" میں نے کہا ۔ "اور ویسے بھی بڑی اچھی ہے ۔ لیکن پٹواری چاہتا ہے کہ اس کا داماد شکل کا اچھا ہو ۔ آج پٹواری کے ہاں ظفر وال کا زمیندار آنے والا ہے ۔ اپنے لڑکے کا پیغام لے کر آرہا ہے وہ ۔"

"ہائیں پھر کیا ہوگا ؟"

"میں بتاتا ہوں ۔" منشی بولا ۔ "ہم اس سے پہلے مل کر بات پکی کر لیتے ہیں ۔"

"ہاں" میں نے کہا ۔ "ابھی ابھی مِل لو" ۔ ۔ ۔ لیکن لڑکے کو دیکھے بنا پٹواری کِس طرح مانے گا ؟"

"لو ۔ لڑکے کو دکھا دیا تو کہیں بات ٹوٹ ہی نہ جائے ۔" منشی نے کہا ۔ "کوئی اور لڑکا لے آؤ دکھانے کو ۔ اس میں کیا ہرج ہے ۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

"ہائیں ۔" بڑھیا کلیجہ تھام کر رہ گئی ۔

"لیکن کونسا مانگے کا لڑکا لائیں ہم ۔" منشی نے کہا ۔ "سکول کھلا ہوتا تو کوئی لڑکا لے آتا میں مگر سکول میں تو چھٹیاں ہیں ۔"

"میں کہتی ہوں ۔ بیٹا تم ہی چلے چلو ہمارے ساتھ ۔" بڑھیا نے مجھ سے کہا ۔

"میں تو پہلے ہی اس دعوت کا منتظر تھا ۔ دو ایک مرتبہ ہچکچاہٹ دکھانے کے بعد ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا ۔ انہیں وہیں بٹھا کر میں گھر بھاگا بھاگا گیا ۔ اگرچہ پٹواری نے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے کپڑے بدل لئے ۔ منہ ڈھانپنے کو رومال لیا اور واپس لوٹ آیا ۔

پٹواری کے گھر پہنچنے سے پہلے میں نے اُنہیں اس بات پر پکا کر لیا کہ جو کچھ کہوں میری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں ۔ بڑھیا تو قدم قدم پر مجھے دعائیں دیتی تھی ۔ لیکن سکول کا منشی اکثر تیور بدلنے کی کوشش کرتا اور اسے رام کرنے کے لئے میں اس کی تعریف میں کچھ کہہ دیتا اور وہ خاموش ہو کر مسکرانے

لگتا ۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب یقین کیجئے ۔ ان کے ساتھ ان کا لڑکا بن کر جانے سے میرا کوئی ذاتی مطلب نہ تھا ۔ میں تو صرف چاتنا پر ترس کھا کر اس کی مدد کرنا چاہتا تھا ۔ میں نے سوچا کوئی ایسی تدبیر کروں کہ وہ اس بڈھے کھوسٹ کے چنگل سے بچ جائے ۔ یا کم از کم اتنا ہو کہ وہ منحوس شادی کچھ دیر کے لئے ٹل جائے ۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں جا کر ایسا جھگڑا ڈالوں کہ معاملہ فسق ہو جائے ۔ پر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں معاملہ اور بھی بگڑ جائے گا ۔ اور میں خود دھر لیا جاؤں گا ۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ اُسی وقت پٹواری نے کسی بہانے چاتنا اور اس کی ماں کو اپنے گھر بلایا ہوا ہے ۔ تا کہ لڑکی کو کپڑا لتا اور زیور دکھا کر شادی پر اکسائے اور اسی لئے اُس نے اپنی بیٹی فاطاں کو قریب کے گاؤں میں کسی رشتے دار سے ملنے کے بہانے بھیج رکھا ہے ۔

ہمیں دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گئے ۔ چاتتاں کی ماں پٹواری کو دوسری کوٹھڑی میں لے گئی ۔ اور دیر تک وہ باتیں کرتے رہے ۔ پھر وہ ہماری خاطر مدارات میں لگ گئے ۔ دودھ کے گلاس ، اتنے بڑے بڑے گلاس ، مکھن اور لڈو ۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے ہمارے آنے کا مقصد بھانپ لیا تھا ۔ ہمارا آنا ان کے نزدیک بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کی مصداق تھا ۔ وہ تو چاہتے تھے کہ ایک بار کوئی آکر بیاہ کی بات کرے ۔ پوچھ گچھ یا تحقیقات کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ وہ بڈھا پٹواری تو اپنے بیاہ کی فکر میں تھا کہ کب بیٹی کے بیاہ کی مصیبت سر سے ٹلے اور وہ چاتتاں سی نوجوان لڑکی کو قابو میں کرے ۔ بیٹی کی شادی کے متعلق سوچ بچار کرنے کی اُسے فرصت کہاں تھی ۔ لیکن منشی جی کی بیوی تو لڑکی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی ۔ باتوں ہی باتوں میں بولی ۔ "اللہ رکھے لڑکی کہاں ہے ۔ میں تو اسے ہی دیکھنے آئی تھی ۔ سنا ہے اس جیسی لڑکی تو سارے گاؤں میں نہیں ہے ۔ عقل اور شکل دونوں میں بڑھ چڑھ کر ہے ۔ ہاں بہن ۔ بڑی تعریفیں سنی ہیں ہم نے !"

اس بات پر تمام گھر کا نقشہ پھر سے بدل گیا ۔ چاتتاں کی ماں جسے منشی جی ، اس کی بیوی اور میں سب فاطاں کی خالہ سمجھتے تھے ۔ لڑکی کو بلانے باہر چلی

گئی ۔ پھر جلد ہی اُس نے باہر سے پٹواری کو آواز دی ۔ پھر وہ دیر تک آپس میں کانا پھوسی کرتے رہے ۔ اس پر ہم سب حیران تھے ۔ حیران ہونے کے علاوہ میں پریشان بھی تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ مجھے پیشاب کی حاجت ہو رہی تھی ۔ پہلے تو میں ضبط کئے بیٹھا رہا ۔ پھر مجھ سے نہ رہا گیا ۔ بڑی مصیبت سے میں نے منشی جی کو منایا ۔ اور میں ڈیوڑھی میں جا کر پیشاب کرنے لگا ۔ فارغ ہوا تو میں حیران رہ گیا ۔ ساتھ والی کوٹھڑی کے دروازے میں چاتاں کھڑی میری طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی ۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی ۔ جبھی تو بھاگ کر میرے پاس آگئی اور بولی ۔ "تم ۔ تم یہاں کہاں ؟"

"ہم" میں نے تن کر کہا ۔ "ہم دولہا میاں ہیں ۔"

"ہائیں" وہ چلائی ۔ "تم ۔ تم فاطاں کو بیاہنے آئے ہو ۔" ایک ساعت کے لئے اُس کے چہرے پر نفرت کی لہر دوڑ گئی اور پھر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔

"اونہوں" میں نے اُسے بگڑتے دیکھ کر کہا "میں تو تماشہ دیکھنے آیا ہوں ۔"

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی ۔ "اور وہ تو مجھے کہہ رہے ہیں کہ فاطاں کی جگہ دُلہن بن کر بیٹھ جاؤں ۔ صرف دکھانے کے لئے ۔ ۔ ۔ مگر میں نہ مانتی تھی اور ۔ ۔ ۔ ۔"

ابھی وہ یہ کہنے ہی پائی تھی کہ اس کی ماں نے اُسے آواز دی اور میں وہاں سے دوڑ کر چلا آیا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ عورت لپٹی لپٹائی لڑکی کو سہارا دیئے اندر داخل ہوئی ۔ اور کوٹھڑی کے پرلے کونے میں پلنگ پر اُسے بٹھا دیا۔منشی جی کی بیوی بسم اللہ بسم اللہ کرتی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھی ۔ اور اُس کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بولی ۔

"سبحان اللہ ۔ سبحان اللہ ۔ دھن بھاگ ہیں ہمارے" پھر دونوں عورتیں رسمی باتوں میں کھو گئیں ۔ وہ منشی کی بیوی کو لڑکی کے کپڑے اور زیور دکھانے لگی ۔ اُنہیں مشغول دیکھ کر لڑکی نے میری طرف سے گھونگھٹ سرکایا اور مجھ سے آنکھیں ملا کر ہنس پڑی ۔

ارے میں تو اچھل پڑا ۔ وہ تو چانتاں تھی ۔ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی ۔ بیحد خوبصورت ۔ عین اُس وقت پٹواری صاحب ایک مُلا کو ساتھ لئے اندر داخل ہوئے ۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ مُلا کوئی قریبی رشتہ دار ہے ۔ لیکن جب اُس نے حلق سے "ق" کی آواز نکالنا شروع کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا ۔

آتے ہی مُلا صاحب نے دو ایک گرما گرم مسئلے سنائے اور پھر بولے ۔ "دیکھئے صاحبان بڑی خوشی کی بات ہے کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہے ۔ اب میری رائے یہ ہے کہ اس کارخیر کو اسی وقت سرانجام دیا جائے ۔

اس پر منشی جی بد کے بولے "حضرت یہ بیاہ شادی کا معاملہ ہے ۔ گڑیوں کا کھیل نہیں"

مُلا جی کہنے لگے ۔ "یہ تو ٹھیک ہے ۔ شادی جب جی چاہے کرنا ۔ لیکن نکاح کی رسم ابھی ادا ہو جائے تو اس میں تم سب کو رسول اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی ۔"

"سبحان اللہ ۔" پٹواری بولا ۔

"لڑکی کو جب جی چاہے وداع کرنا ۔ کیوں جی اب یہ پاکستان ہے اللہ کے فضل سے اب تو وہی ہونا چاہیئے جو رسول اللہ کی سنت ہے ۔"

یہ کہتے ہی اُنہوں نے کسی کا مشورہ لئے بغیر کلمے پڑھنے شروع کر دیئے ۔

منشی جی تو حیرانی سے بیوی کا منہ دیکھ رہے تھے اور وہ بے چاری ناک پر انگلی رکھے خاموش بیٹھی تھی ۔ میں بھی خاموش تھا ۔ دفعتاً مُلا جی بولے ۔ "وہ زمانہ پرانا تھا ۔ جب دولہا اور دلہن کو کلمے پڑھایا کرتے تھے ۔ ہم نے تو نکاح کرنا ہے ۔ لڑکی اور لڑکے کو مسلمان نہیں کرنا ۔ کیوں جی" وہ مسکرائے ۔ "اصلی بات تو ایجاب وقبول ہے ۔ یہ کلمے میں نے صرف اس لئے پڑھے ہیں کہ پاک کلام کو پڑھنا باعثِ برکت ہوتا ہے ۔ کیوں جی چودھری جی ۔" وہ منشی صاحب سے مخاطب ہوئے ۔ "لڑکے کا کیا نام ہے ؟"

"خدا بخش" منشی نے جواب دیا ۔

"ہائیں" میں حیران رہ گیا ۔ "خدا بخش ۔"

"سبحان اللہ" مُلا نے کہا۔

"ویسے ہم سب بخشو کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"وہ تو پیار کا نام ہوا نا۔"

اس وقت مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی تو وہ اپنے بیٹے کو بخشو کہہ کر پکار رہے تھے۔ اس پر میں نے جانا کہ واقعی اُن کا بیٹا میرا ہم نام تھا۔

"اور لڑکی کا کیا نام ہے؟" مُلا نے پٹواری سے پوچھا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ جواب دیتا چاتتاں آپ بول پڑی۔ "چاتتاں۔"

"نہیں نہیں جی۔" پٹواری چلّایا۔ "لڑکی کو تو ہم سب فاطاں کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ پیار سے چاہے کچھ بلاؤ۔ مجھے کیا معلوم نہیں۔ میں تو خود اُسے فاطاں ڈائن کہا کرتا ہوں۔ مگر نکاح میں اصلی نام ہونا چاہئے۔" پیشتر اس کے کہ وہ اُسے روکتے۔ اس نے مجھ سے تین مرتبہ قبول کرا لیا تھا۔ پٹواری نے پہلے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر وہ خاموش ہوگیا۔ آخر ملا سب کچھ زبانی ہی کر رہا تھا نا۔ گاؤں میں تحریری نکاح کہاں ہوتے ہیں۔

نکاح ہو جانے پر مجھے صرف اِس لئے خوشی محسوس ہوئی کہ چاتتاں کی جان اُس بڈھے سے تو چھوٹی، چاہے منشی کا لڑکا بدصورت تھا۔ لیکن تھا تو جوان۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ درحقیقت میرا اپنا نکاح ہو رہا ہے۔ اور چاتتاں میری ہوگئی ہے۔ مجھے کیسے معلوم ہو سکتی تھی یہ بات۔ اور اگر چاتتاں شرارت نہ کرتی تو معاملہ بالکل ٹھیک رہتا۔ وہ تو اس بڈھے پٹواری کی حماقت سمجھئے کہ وہ غلطی سے چاتتا کو مخاطب کر کے بولا۔ "بیٹی اب تو اندر جا اپنی خالہ کے ساتھ۔"

اس پر وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ سر کا دوپٹہ ادھر پھینک دیا اور سب کے سامنے کھڑی ہو کر بولی۔ "سُن لو لوگو اس نے مجھے بیٹی کہا ہے۔ آج سے میں اس کی بیٹی ہوں اور یہ میرا باپ۔"

اس کی اس بے حجابی پر سب حیران ہوگئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی بات۔

"اب میں اس کی بیوی ہوں ۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا ۔ "پٹواری نے اپنے ہاتھوں سے مجھے اس کو سونپا ہے ۔" اور دیکھو مُلا جی" وہ چلائی ۔ آپ نے میرا نکاح پڑھا ہے ۔"

"ہاں ۔ ہاں ۔" مُلا گھبرا گیا ۔

"تو میں اپنے خاوند کے ساتھ جاؤں گی ۔ ابھی ۔"

"ہائیں ۔" وہ سب حیران رہ گئے ۔

"اُٹھو ۔" اُس نے مجھ سے کہا ۔ "اب میری عزت تمہاری عزت ہے ۔ تمہارا فرض ہے کہ مجھے اس بڈھے پٹواری سے بچاؤ جو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔"

حیرانی سے منشی جی کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔ "اپنی بیٹی سے ۔"

"مجھے لے چلو ۔ خدا کے لئے ۔" اُس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے ۔

اگر اس وقت وہ بڈھا جلال میں نہ آجاتا تو بھی شاید حالات ٹھیک ہو جاتے ۔

"خبردار" پٹواری چلّایا ۔" چل اندر ۔ اصل میں اسے پاگل پنے کا دورہ پڑتا ہے جی ۔" یہ کہہ کر پٹواری اور چاتتاں کی ماں نے اُسے پکڑ لیا ۔ جانے اُس وقت مجھے کیا ہوا ۔ ایک طوفان سا کہیں سے اُٹھا اور میرے بدن کا بند بند غصے سے کانپنے لگا ۔

"خبردار جو میری بیوی کو ہاتھ لگایا" میں نے کہا ۔ اور کونے میں پڑا لٹھ اُٹھا لیا ۔

یہ دیکھ کر پٹواری بھاگ گیا اور منشی اور اس کی بیوی چلّانے لگے ۔ "ہم سے دھوکا ہوا ۔ ہم سے دھوکا ہوا ۔"

میں تو شاید چاتتاں کو ہی لیکر گھر سے نکل آتا ۔ لیکن آخر وہ عورت تھی ۔ بولی ۔ "یہ زیور اور کپڑے ۔" میں نے بڑھ کر صندوق اٹھایا اور ہم دونوں باہر نکل آئے ۔

اگر گاؤں والوں کو پٹواری سے ہمدردی ہوتی تو اس روز میری جگہ وہاں سے

میری لاش نکلتی ۔ لیکن وہ تو پہلے ہی اس بات پر جلے ہوئے تھے کہ پچاس سال کا بڈھا ہو کر وہ سولہ سال کی لڑکی پر ڈورے ڈال رہا تھا ۔ انہوں نے جب قصہ سُنا تو ہنستے ہنستے لوٹ ہوگئے اور میری پیٹھ ٹھونکنے لگے ۔ لیکن سب نے مجھ سے یہی کہا ۔ گاؤں سے چلے جاؤ ۔ ورنہ اگر پٹواری حوالدار کو لے آیا تو مشکل پڑ جائیگی ۔ اُنہوں نے زبردستی ہم دونوں کو موٹر لاری میں ٹھونس دیا اور ، اور....

دفعتاً وہ رُک گیا اور اُس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے عجیب و غریب بیاہ کا تمام قصہ سنا چکا ہے ۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قصے کو کیسے ختم کرے ۔

"اور پھر" ۔ ۔ ؟ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ۔

"جی پھر میری آنکھ کھل گئی ۔" خدا بخش نے مسکرا کر جواب دیا ۔

عین اُس وقت گڑ ۔ گڑام کی آواز آئی ۔ سب کی نگاہیں دیوار کی طرف اُٹھ گئیں ۔

میز نیچے گری ہوئی تھی ۔ اور وہ رنگین گٹھڑی نیند سے چونکی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی ۔

.......○..........

گھور اندھیرا

امر سنگھ نے آنکھیں کھول دیں ۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا ۔ اندھیرے کے تہ در تہ انباروں تلے اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا ۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا جیسے اسے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو ۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں ۔

نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ بوجھل اندھیرے کے بادل اس کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے ۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمگادڑوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے ۔ اور گدھوں کی طرح اس کے ارد گرد اکٹھے ہوتے جا رہے تھے ۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں ۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلہاڑا سا اُس کی طرف بڑھا ۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹھیس لگی ۔ درد سے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔

بائیں وہ حیران رہ گیا ۔ بوجھ کے اس بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ۔ جیسے اسے سپرنگ لگے ہوں ۔ اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا ۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا ۔ سیال متحرک ٹکڑا ۔ یہ بات اس کے لئے حیران کن تھی ۔ اس کا نچلا دھڑ یوں لہرا رہا تھا جیسے الگنی پر لٹکا ہوا کپڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے ۔ امر سنگھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ اندھیرا دھندلا ہوا جا رہا تھا ۔ اس دھندلکے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے ۔ جن کے سرے پر زرد سے گولے ٹنگے ہوئے تھے ۔ جن سے زرد زرد سا دھواں نکل رہا تھا ۔ ستونوں کے پیچھے دھندلے دھندلے پردے لٹک رہے تھے ۔ جن پر مکانات کے مبہم نقوش دکھائی دے رہے تھے ۔

اُسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس تھی ۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ

کونسی جگہ ہے ۔ اور وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے ۔ دفعتاً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی لیکن میں ؟ میں کون ہوں ؟ وہ سوچنے لگا ۔ اسے خیال نہیں پڑتا تھا کہ وہ کون ہے ۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ تھا ۔

پاوم ۔ پاوم ۔ دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی ۔

پاوم ۔ وہ پھر اٹھ بیٹھا ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس سی تھی ۔ دفعتاً اس کے ذہن میں حرکت ہوئی ۔ ریڈیو ۔ ہاں ۔ ہاں وہ خوشی سے چلّایا ۔ وہ ریڈیو کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اس روز جلد ہی گھر سے آگیا تھا ۔ ٹفن کیریر میں اُس کا کھانا تھا ۔ ہائیں وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا ۔ روٹی کا ڈبہ کہاں گیا ، وہ لپک کر اٹھ بیٹھا ۔ اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کئے یوں تیرنے لگا ۔ جیسے اندھیرے کے سمندر میں وہ ایک ناؤ ہو ۔

دور تک ٹفن کیریر کا نشان نہ تھا ۔

گھوں ۔ گھوں ۔۔۔۔ دور سے کوئی چیز چیختی ہوئی آرہی تھی ۔ سیاہ ڈراؤنی چیز ۔ "اُوہ ملٹری کی لاری" ۔ اور سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا ۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اسے محتاط رہنا چاہئے ۔ اس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے ۔ اس نے بایاں پہلو ٹٹولا ۔ کرپان ؟ اس کی کرپان کہاں تھی ۔ روٹی کا ڈبہ اور کرپان ۔ اب وہ کرپان کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھا ۔

دفعتاً وہ رکا ۔ سامنے سرخ توپ زمین میں گڑی تھی ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا ۔ "اوہ یہ تو پٹرول پمپ ہے"۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا ۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا ۔ کچھ بھی یاد نہ پڑتا تھا ۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں ۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اسے ان چیزوں سے دور کا تعلق نہ ہو ۔

اس پٹرول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا ۔ روز ۔ کھانے کا ڈبہ اور کرپان اٹھائے ۔ لیکن پھر کیا ہوا ؟ کیا ہوا تھا ۔۔۔ ؟ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے ۔ بھاگ رہے تھے اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا ۔ کھڑا گھور

رھا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ میں مزدور سے پوچھوں ۔ اس کی طبیعت کیسی ہے ! لیکن اس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی ؟ دفعتاً وہ سب مجھے گھورنے لگے ۔ اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل لپکی اور ۔۔۔ میرے پہلو میں بجلی سی چمکی ۔ معاً اس نے پہلو میں دردناک ٹیس محسوس کی ۔

"پھر کیا ہوا" ۔ اس نے بصد مشکل سوچنے کی کوشش کی ۔ دھندلکا دھندلکا ۔ اندھیرا وہ سب دور بھاگ رہے تھے ۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا ۔ بھوت ۔ اور میں انہیں پاس بلانا چاہتا تھا ۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا ۔ اور چاروں طرف سے بوجھل اندھیرا میرے گرد جمع ہوا جارہا تھا ۔

وہ چھاپے خانے کا مزدور مجھ سے دور کیوں بھاگ رہا تھا ۔ حالانکہ اس روز جب چھاپے خانے پر بم پڑا تھا تو میں نے مزدوروں سے کس طرح ہمدردی محسوس کی تھی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر ان سے خیریت پوچھوں ۔ پھر پھر میں ڈر کیوں گیا تھا ، کیوں ؟ شاید وہ بھی مجھ سے ڈر گیا ہو ۔ میری کرپان سے ڈر گیا ہو ۔ لیکن وہ تو میرے مزدور بھائی تھے ۔ پھر ڈر کیسا ۔ کیوں ۔ اور کرپان وہ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لئے پکڑ رکھی تھی ۔ کرتار سنگھ کی بات میرے جی لگی تھی ۔ جب میں نے پوچھا کرتار تم کرپان کیوں نہیں رکھتے تو وہ بولا تھا مجھے شرم آتی ہے ۔ نہتے لوگوں میں کرپان لئے پھرتے شرم آتی ہے ۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ڈر مجھ پر حاوی ہو ۔ اس کے بعد مجھے شرم آنے لگی تھی ۔ لیکن میں کرپان اٹھا لیا کرتا تھا ۔ محض عادت کے طور پر ۔

نہیں نہیں وہ میری کرپان سے نہیں ڈرا تھا ۔ پھر اس نے وہ بجلی سی کیوں گرائی تھی ۔ اور وہ ٹیس ۔ اور پھر سارے جسم میں بند بند میں درد ہو رہا تھا ۔

ایک بار پھر امر سنگھ نے پہلو میں ٹیس محسوس کی اور درد کی شدت سے وہ ایک تاریک ستون تلے گر کر ڈھیر ہو گیا ۔ چاروں طرف سے بوجھل اندھیرے کے انبار تہ در تہ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو گئے ۔ بڑی بڑی چمگادڑیں پر پھڑپھڑاتی ہوئی اترنے لگیں ۔ گدھ ۔۔۔

اس کا جسم منوں بوجھل ہو گیا اور اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے جسم پر

قدرت نہیں رہی۔

نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا۔

گھنگھرو کی آواز سن کر وہ چونکا۔ سامنے سے ایک تانگا آرہا تھا۔ تانگہ ؟ اس وقت ؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر نہ جانے کس خیال پر اس نے جست بھری اور پھسل کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

"نہیں نہیں" کوچوان نے لپکتا ہوا سایہ دیکھ کر چلانا شروع کر دیا۔ "نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں میں تو کوچوان ہوں۔ کوچوان۔"

"کوچوان؟" امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "پھر" ؟

"پھر" کوچوان بولا۔ "پھر کیا۔ میں تو کہہ رہا ہوں۔ میں میں تو کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ اوہ" امر سنگھ کھو سا گیا۔ "اور میں۔میں۔۔"

"تم۔ تم"۔ اُس نے اُس کے کیسوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گھبرا کر چلانے لگا "نہیں نہیں میں کرشن نگر نہیں جاؤں گا۔ اس دن بھی میں وہاں جانے کے لئے تیار نہ تھا" کوچوان نے یوں بیان کرنا شروع کیا جیسے وہ دبی دبی ہچکیاں لے رہا ہو" تیار نہیں تھا۔ حالانکہ وہ دس دس روپے دینے کو تیار تھے۔ لیکن روپے کا کیا ہے جی۔ چلتی پھرتی چھاؤں۔ میں وہاں کبھی نہ جاتا۔ مگر وہ بڑھیا اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے ماں یاد آگئی۔ ماں" امر سنگھ کے ہاتھ پر نہ جانے کہاں سے پانی کے قطرے گرے "انہوں نے اسے امرتسر میں۔"

"پھر" امر سنگھ نے اپنے گیلے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ؟" کوچوان چونکا "پھر کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی دکانیں۔ اونچے محل، کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن ماں" امر سنگھ گنگنایا۔

"ماں۔ وہ بڑھیا۔ آنسوؤں والی بڑھیا۔ میں نے کہا میں لئے چلتا ہوں تمہیں ماں۔ اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس طرح میری ماں دعائیں دیا کرتی تھی"

"پھر" امر سنگھ نے آہ بھری ۔
"پھر پھر وہ بہت سے تھے ۔ بہت سے ۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا ۔ وہ بڑھیا انہیں کوس رہی تھی ۔ پھر وہ ان کی منتیں کرنے لگی ، اور آخر رونے لگی ۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا ۔ ان پر اثر کیوں نہ ہوا ؟ لیکن مجھ پر اس کے آنسوؤں کا اثر کیوں ہوا تھا ؟ کیوں ؟ کیا وہ ان کی ماں نہ تھی ۔ بولو ۔ تم کرشن نگر کے ہو ۔ بولو"
"میں" امر سنگھ چونکا "میں" اس کے گلے میں گویا آنسو ٹپک رہے تھے ۔
"انہوں نے گھسیٹ کر بڑھیا کو اتار لیا اور وہ میرے ارد گرد جمع ہو گئے"
کوچوان نے آہ بھری اور گھوڑا رک گیا ۔ اس نے مظلوم نگاہوں سے کوچوان کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی چیخ ماری "مجھے مار دیتے تو کوئی حرج نہ تھا" کوچوان بڑبڑایا "لیکن موتی بے زبان موتی پر ہاتھ اٹھانا"۔ اُس نے گھوڑے کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "موتی تو مسلمان نہ تھا ۔"
موتی نے ایک اور چیخ ماری ۔ ڈراؤنی لمبی چیخ ۔ اور پھر بدک کر چل پڑا ۔
"وہ سب" کوچوان اپنی ہی دھن میں بولتا گیا ۔ "وہ سب جیو ہتیہ کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھا کرتے تھے ۔ میں جانتا ہوں ۔ عمر بھر کرشن نگر کے اڈے پر رہا ہوں ۔ پھر انہوں نے موتی پر بھالے کرپان ۔۔ دفعتاً وہ چپ ہو گیا۔
چاروں طرف فضا سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں ۔ موتی کراہتا ہوا دوڑ رہا تھا ۔ امر سنگھ آہیں بھر رہا تھا ۔ اور کوچوان دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ جیسے افق میں کھو گیا ہو ۔ دفعتاً اس نے اپنے ہی آپ گنگنانا شروع کر دیا "پھر ۔ اندھیرا ۔ چاروں طرف سے اندھیرا گھپ اندھیرا ۔"
"ٹھہرو" سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا ۔ "ٹھہرو"
کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنی شروع کر دی ۔ لیکن ٹانگہ رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر چڑھ آیا ۔
"تم کہاں جا رہے ہو" سپاہی نے تحکمانہ انداز میں پوچھا ۔
"میں" کوچوان بولا "میں کہاں جا رہا ہوں ۔ کیوں بابو جی" اس نے امر سنگھ سے پوچھا۔

امر سنگھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے ۔ "میں میں یعنی ہم" ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔" سپاہی آپ ہی آپ گنگنانے لگا "لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہیئے ۔ ورنہ وہ سب بھوک سے مر جائیں گے ۔ اوہ" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "مجھے جانا ہے مجھے انہیں بچانا ہے ۔ مگر ۔ مگر کہاں جانا ہے ۔ کہاں جانا ہے مجھے" ۔ "تھانے جانا ہو گا۔" کوچوان بولا۔

"نہیں نہیں" وہ بولا "وہاں سے تو میں آرہا ہوں۔"

"ہاں ہاں ۔" امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

"مجھے کہاں جانا ہے" سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔ "بولو ورنہ وہ سب بھوکے مر جائیں گے"

"کیا فرق پڑتا ہے" کوچوان نے آہ بھری "کیا فرق پڑتا ہے"

"نہیں نہیں" سنتری چلایا "بکو نہیں ۔ وہاں گیہوں نہیں ہے ۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں"۔

میں تھانے میں رپورٹ کرنے آرہا تھا ۔ ادھر سے نہ جاؤ وہ بولے ۔ وہ تمہیں مار دیں گے ۔ بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی ۔ ورنہ وہ سب بھوکے مر جاتے ۔"

"پھر" امر سنگھ بولا ۔

"پھر چھتوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی ۔ اور پھر اندھیرا ۔ گھپ اندھیرا ۔ اور وہ ہنس رہے تھے ۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے ۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے ۔ میں اُن کو سمجھوں گا ۔ مل لیں ۔ بغیر وارنٹ کے ہتھکڑی نہ لگائی تو میرا نام ۔ میرا نام ۔۔۔۔۔ لیکن میرا نام کیا ہے میرا نام ۔ بتاؤ ۔ بولو ۔ کہاں جانا ہے مجھے ۔ اور میرا نام ۔ کیا نام ہے میرا ۔ کون ہوں میں بولو ۔ نہیں بتاتے ۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا ۔ یہ کہتے ہوئے وہ تانگے سے اتر گیا اور چلانے لگا "ٹھہرو ۔ ٹھہرو۔"

موتی نے ایک چیخ ماری اور بدک کر بھاگا ۔

"نہیں نہیں" کوچوان چلایا "ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے بیٹے ۔ ہم تو شاہ عالمی جارہے ہیں شاہ عالمی"۔

"شاہ عالمی نہ جانا ۔ شاہ عالمی نہ جانا ۔ کسی نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

"شاہ عالمی" نوجوان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی "اف آگ ۔ آگ"

"آگ" امر سنگھ چلایا۔

"بھگوان" نوجوان غصے سے بولا "نہیں نہیں بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ۔ اب تو یہاں شیطان بستے ہیں ۔ شیطان۔بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے"۔

"ہاں" امر سنگھ گنگنایا "یہ شیطان کی دنیا ہے بھاگ چلو ۔ بھاگ چلو ۔"

نوجوان قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ حتےٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے ۔ رام لال بھاگا تھا ۔ وہ بھاگ کر کھڑکی سے اترنے لگا ۔ اف گولیوں کی بوچھاڑ ۔ پٹاخ پٹاخ اور تتھا مادھو ۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ وہ سمجھتا تھا کہ آتش بازی چل رہی ہے ۔ اور پھر وہ خود انار کی طرح چلنے لگا ۔ دھڑا دھڑ ۔ بھگوان"

"پھر" کوچوان نے کہا ۔

"پھر" وہ چونکا ۔ "پھر دیواریں مل گئیں ۔ آسمان گر گیا ۔ زمین ۔ زمین ۔ اندھیرا ۔ گھپ اندھیرا ۔ ٹھہرو ۔ ٹھہرو دفعتاً وہ چلایا "دینا مجھے دینے کو بچانا ہے ۔ دینا ۔ دینا"۔ وہ چلاتا ہوا چلا گیا ۔ دور سے اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔ "دینا ۔ دینا۔"

کوچوان ہاتھ میں باگ پکڑے بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا ۔ امر سنگھ ہونٹوں میں کچھ گنگنا رہا تھا موتی منہ اٹھائے افق کی طرف گھور رہا تھا ۔ وہ سب یوں ساکت تھے ۔ جیسے کپڑے پر تصویر کھینچی ہو ۔

"ونو! ۔۔۔" کس نے ونو کو پکارا ۔ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے آگئی "کہاں ہے میرا ونو" ۔ وہ ٹانگے کے پاس آکر رک گئی ۔ اور پھر امر سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی "تمہیں نے ونو کو مارا ہے ، تم اس کے قاتل ہو تم ۔ مارو ۔

مجھے بھی مارو ۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی ۔"

"نہیں نہیں" امر سنگھ گنگنانے لگا۔

"پکڑلو" وہ کوچوان کی طرف لپکی "پکڑ لو یہ قاتل ہے" ۔

کوچوان چپ چاپ بیٹھا اس کا منہ تکتا رہا ۔

"کوئی نہیں سنتا کوئی نہیں" وہ چلانے لگی "انہوں نے بھی کچھ نہیں سنا تھا ۔۔۔ ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں ۔ خاکی وردیاں ۔ انہوں نے پولیس کے بھیس میں ہمیں گھیر لیا ۔ اور وہ سب اللہ دتہ ۔ غفورا ۔ رحیم ۔ سبھی گئے ۔ کہ اُن کے پاس شکایت کریں ۔ میرے اللہ اور ۔ اور وہ سب بھون دئے گئے ۔ جیسے مکی کے دانے ہوں ۔ پھر وہ سب ہمارے پاس آ گئے ۔ اور ہمیں گھیر لیا ۔"

"۔۔۔۔۔ اور دینا مجھے بھی مارو وہ پھر چلائی ۔ دینے کے بغیر میں جی کر کیا کروں گی مجھے بھی مارو" دفعتاً اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ۔ ہائے وہ چلائی میرا سر ہائے میرا سر ۔ اُف ، وہ بیٹھ گئی "میرا سر ۔ میرا سر ۔"

موتی نے مڑ کر کوچوان کی طرف دیکھا ۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے ۔ کوچوان نے آسمان کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری ۔ امر سنگھ مدہم آواز میں کراہنے لگا ۔ فضا میں اس کی کراہ گونجی گردو پیش سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ۔

"دینا ۔ دینا" ۔ دور بہت دور سے آواز آئی ۔

"دینا" بڑھیا چونکی ۔ کہاں ہے میرا دینا ۔ کس نے پکارا میرے دینے کو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔

"دینا" ۔ بہت دور سے پھر آواز آئی ۔

"آئی" بڑھیا چلائی ۔ میں آرہی ہوں آرہی ہوں ۔ اور وہ دیوانہ وار اندھیرے میں کود کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ۔

دفعتاً موتی نے چیخ ماری اور اٹھ بھاگا ۔

ارد گرد اڈتا ہوا ۔ بل کھاتا ہوا بوجھل اندھیرا گویا کراہ رہا تھا ۔ ستونوں کے

اوپر ٹنگی ہوئی بتیاں دم توڑ رہی تھیں نیچے سیاہ سڑک سسکیاں بھر رہی تھی ۔

"اسے رکھ لو" بڈھا گڑگڑا رہا تھا ۔ "اسے رکھ لو بھگوان کے لئے لیکن مجھے چھوڑ دو ۔ میری جان بخش دو ۔ میں تو بوڑھا ہوں ۔ مجھے مار کر کیا لو گے ۔"

اس کی حسین پتری حیرانی سے بوڑھے باپ کی باتیں سن رہی تھی ۔

"نہیں نہیں ۔ یہ میرا بچہ نہیں" بڑھیا چلائی "نہیں بہن میں سچ کہتی ہوں یہ بچہ میرا نہیں"

"مَیں مَیں اسے کہاں تک اٹھائے پھروں ۔ میں تو اس کی دیکھ بھال کرتے ہار گئی ۔"

بچہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ ماں ! اس کے ہونٹ یوں کھلے تھے جیسے "ماں" کہنے کی کوشش کر رہا ہو ۔

"سردار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔ نہیں نہیں میرا نام تو کوشلیا ہے ۔ یہ دیکھ لو ۔ یہ کلائی پر ہندی میں نام ۔ کوشلیا ۔"

"ہا ہا ہا ہا ہا ۔۔۔" مرد ہنسا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے" سردار جی کا منہ ہوس سے سوجا ہوا تھا ۔ اس کے جونک سے ہونٹ خون چوسنے کے لئے کوشلیا کی طرف بڑھے ۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ نہیں نہیں" کوشلیا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی ۔

"میں سکھ نہیں" وہ ہنسا "مسلمان ہوں ۔ یہ کیس تو دھوکا ہیں ۔"

میں انہیں بتاؤں گی ۔ مجھے اپنوں نے ۔۔۔" اس کی آواز مدہم ہو گئی ۔ دب گئی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو ۔ اور ایک سیاہ فام برہنہ جسم نے اُسے اپنے چنگل میں لے لیا ۔

تانگہ رک گیا ۔

سامنے مٹیالے اندھیرے میں ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا ۔ جس میں سائے متحرک تھے پاس ہی چند قلی بیٹھے تھے ۔ دفعتاً ایک ریڑھی والا آنکلا ۔ اور بے تکلف قلیوں کی طرف بڑھا ۔ ہائیں ۔ امر سنگھ نے کلیجہ تھام لیا ۔ "وہ سب کچلے جائیں گے" لیکن ریڑھی گزر گئی ۔ اور وہ قلی جوں کے توں بیٹھے تھے ۔ امر

سنگھ حیران رہ گیا ۔ نہ جانے کیا بات تھی ۔ کتنے بلا تکلف دیوار میں سے پھاند کر ادھر سے ادھر نکل آتے ۔ کوے اڑتے اڑتے موتی کے پیٹ میں سے نکل جاتے جیسے وہاں کوئی کھڑکی کھلتی ہو ۔ عجیب بات تھی ۔ وہ سوچنے لگا ۔

سوچتا سوچتا وہ قلیوں کے پاس جا کھڑا ہوا ۔

اُسے دیکھ کر بڈھا قلی چلایا "نہیں بھئی تم جانو تمہارا کام ہم سامان نہیں اُٹھائیں گے ۔"

وہ بھی میری منتیں کرتی تھی ۔ منتیں اور مجھے اس پر ترس آگیا ۔ اور وہ صندوق کتنا بھاری تھا وہ صندوق ۔وہ میرے کندھے سے پھسل گیا ۔ پھر ۔۔۔۔۔۔۔ نہ جانے ہؤا کیا ۔ بادل کڑکا اور بجلی پھر " قلی کا چہرہ بھیانک ہوگیا اور پھر ہوا میں ٹکڑے سے اڑے اور جیسے سب ہوائی جہاز بن گئے ہوں ۔ سبھی ۔۔۔ چاروں طرف ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مدہم آوازیں ۔ نہیں نہیں ۔ نہیں نہیں ۔ اور پھر ۔ پھر اندھیرا اندھیرا ۔"

کو ۔۔۔ کوکو ۔ گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی ۔

"میں جاؤں گا میں جاؤں گا" امر سنگھ چلایا میں یہاں نہیں رہوں گا" وہ ہوا میں تیرنے لگا اور آہنی پل کے درمیان سے گزرتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا "امرتسر امرتسر" وہ خوشی سے چلایا۔

"امرتسر" ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی "امرتسر ۔۔۔۔۔۔"

امر سنگھ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس پڑا کٹا ہؤا سر دانت نکال رہا تھا ۔

امر سنگھ گھبرا گیا ۔

گاڑی سے ایک عورت نے سر نکالا ۔اس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں ۔ جس سے ایک بچہ لٹکا ہوا تھا ۔ عورت نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "امرتسر۔۔۔۔۔۔۔"

امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا "امرتسر" اور پھر ڈر کر ایک ڈبے میں گھس گیا ۔

ڈبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ نیچے لہو کی چھپڑیوں

میں گوشت کی گٹھڑیاں رکھی تھیں ۔۔ امر سنگھ سہم کر ایک طرف ہو گیا ۔
سیٹ پر پڑے کٹے ہوئے سر نے آنکھیں کھول دیں ۔ امر سنگھ کو کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں اور بھی اُبل آئیں ۔ "نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں ۔ رسول اللہ کی قسم"

سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے گرا اور پائدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا ۔
"الحمد للہ" بائیں طرف کے ڈھیر سے ایک بزرگانہ آواز آئی "الحمد للہ ۔ اَشہَدُ اَن لَا ۔ ۔ ۔ ۔"

دفعتاً ایک شور بلند ہوا ۔ گوشت کی گٹھڑیاں حرکت کرنے لگیں ۔ اعضاء میں جنبش ہوئی ۔

"میری ٹانگ ۔ میری ٹانگ"

"خدا کے لئے مجھے مار دو ، مجھے مار دو!!"

"پاکستان!!"

"پاکستان" باہر پلیٹ فارم سے آواز گونجی ۔ امر سنگھ سہم کر باہر کی طرف بھاگا ۔

پلیٹ فارم پر انسانی اعضاء رینگ رہے تھے ۔ کٹے ہوئے سر ربڑ کے گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے ۔

"پاکستان" کٹا ہوا سر گردن کے بل کھڑا ہو کر چلایا "ہاہاہا" یہ بھیانک قہقہہ چاروں طرف گونجنے لگا ۔ کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے ۔

کٹے ہوئے بازوؤں والا بڈھا مسکرادیا ۔ "پاکستان" اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی ۔

"الحمد للہ" قریب ہی کوئی زیر لب بولا "الحمد للہ ہم پہنچ گئے"

"پہنچ گئے؟" جوان عورت ہنسی "پہنچ گئے" اس کے قہقہے میں طنز گونج رہی تھی ۔

شکر ہے بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل رینگ رہی تھی ۔ اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی ۔

امر سنگھ نے منہ موڑ لیا ۔ ارے اس کے ساتھ کوچوان کھڑا تھا۔ "کوچوان"

وہ بولا ۔ لیکن کوچوان بڑھیا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا ۔

کوچوان بڑھیا کی طرف بڑھا ۔ اور اسے سہارا دیتے ہوئے بولا "اُٹھو ۔ اُٹھو"

اسے اُٹھاؤ اس نے ساتھ والی جوان عورت کی طرف اشارہ کیا ۔ جس کا نچلا دھڑ لٹک رہا تھا ۔ کوچوان نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا اُسے اُٹھانے کے لئے کافی نہیں ۔ "تمہارے ساتھی"

اُس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ساتھی" جوان عورت نے نفرت سے کہا "ساتھی وہیں تھے وہیں ـــــــــ"

"وہیں" کوچوان نے حیرانی سے دہرایا۔

"وہ سامنے کھڑے تھے میرے سامنے" اس کی آواز میں نفرت کی شدت تھی ۔ "وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے ۔ اُن کی آنکھیں پھٹ نہ گئیں ۔ ایمان ! جرأت !! جھوٹ سب جھوٹ۔ اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ اور عزت" وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی ۔

"پانی پانی" وہ اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے بولی ۔

امرسنگھ نے چاروں طرف دیکھا ۔ سامنے کمرے پر پانی والا لکھا دیکھ کر وہ لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا ۔ کمرا خالی پڑا تھا۔

نہیں نہیں کونے میں دبکا ہوا بچہ چلایا ۔ مجھے پیاس نہیں لگی ۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا ۔ وہ رونے لگا "مجھے نہ مارو ۔ مجھے نہ مارو ۔ میں پانی نہیں مانگوں گا ۔ نہیں مانگوں گا ۔ مجھے پیاس نہیں لگی ۔"

"پانی نہیں مانگوں گا" امرسنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں" وہ چلایا اس کے سوکھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں ۔ لکڑی سی زبان باہر آئی "۔ پا ۔ پا ۔ پا" اُس کی آنکھیں پتھرانے لگیں ۔

"پا۔پا۔پا۔پا۔پا۔" سیٹوں تلے سے آوازیں آنے لگیں ۔ امرسنگھ نے جھک کر سیٹوں تلے نگاہ دوڑائی "پا۔پا۔پا۔" بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹ حرکت کر رہے تھے ، زبانیں لٹک رہی تھیں ۔ "پا۔پا"

"نہیں نہیں میں مسلمان نہیں ہوں" پلیٹ فارم پر کوئی چیخنے لگا۔

"ساتھی ۔۔ہاہاہا۔" عورت نے قہقہہ لگایا۔

"الحمد للہ ہم پہنچ گئے ۔"

اَشْہَدُ اَن لَا اِلٰہَ ۔۔۔۔۔۔"

امر سنگھ نے ایک جست بھری اور فضا میں تیرنے لگا ۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا ۔ دور دور جہاں شاہ عالمی نہ ہو ۔ امرت سر نہ ہو ۔ کچھ بھی نہ ہو ۔ دور ۔ دور ۔ جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں ۔ وہ آوازیں مدہم پڑتی گئیں ۔ مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی ۔

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی ۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں ۔ دور افق کے قریب بجلی چمکتی ۔ اور پھر گہرا اندھیرا چھا جاتا ۔ نیچے زمین گویا سنسان پڑی تھی ۔ کبھی کبھی مدہم سی آوازیں سنائی دیتیں ۔ جو کبھی تیز ہوتی جاتیں ۔ پھر ایک چیخ پھر خاموشی چھا جاتی ۔ اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں ۔ اور پھر وہی چیخ ۔ اور پھر آوازیں اور سرگوشیاں ۔

"دینا ۔ دینا"

"آگ ۔ آگ"

"میں مسلمان ہوں ۔ دھرم کی قسم میں مسلمان ہوں ۔

"پاکستان !! ہاہاہاہا"

"راولپنڈی ! امرت سر !! شاہ عالمی !!!"

"مجھے پیاس نہیں لگی ۔ نہیں نہیں ۔ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لکڑی سی زبانیں لٹک پڑیں "پاپا ۔ پاپا۔"

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا ۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں ۔ جیسے اتفاقاً اس کا پیچھا کر رہی ہوں ۔ ہار کر امر سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آگرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے ۔ جن میں مویشی کھڑے چر رہے تھے ۔ جن کے پاس ہی بیسیوں مویشی زمین پر پڑے ہوئے تھے ۔ ان کے پیٹ

پھولے ہوئے تھے ۔ جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں ۔ ادہر دھندلکے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا ۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا شیڈ تھا ۔ جس میں دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ دور کہیں کتے رو رہے تھے ۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلیں پر پھڑپھڑا رہے تھے ۔ اتنے گدھ !!! اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے ۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے تھے ۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ لیکن گدھ جوں کے توں بیٹھے رہے ۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں ۔ وہ پر پھڑپھڑاتا مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا ۔ ان کے پاؤں میں گلابی گٹھڑیاں سی پڑی تھیں ۔ ان کی چونچیں رنگی ہوئی تھیں ۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی ، یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلانے لگی ۔ اور وہ شیڈ کی طرف چل دیا ۔

اس نے شیڈ کا دروازہ کھولا ۔ تاک پر دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ دیئے کی مدہم روشنی چاروں طرف پڑ رہی تھی ۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی ۔ ایسی ویرانی جو ہنگامے کے عقب میں آتی ہے ۔ اور ہیبت ناک خاموشی کو جنم دیتی ہے ۔ ایسی خاموشی جس میں سے چیخوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے ۔

امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا ۔ "وہ چھو رہی ہے" بچے نے تتلا کر کہا ۔ "چھو رہی ہے ۔ جاگی نہیں ۔ جاگتی نہیں ۔"

"سو رہی ہے" امر سنگھ نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں" وہ بولی "وہ" اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پر وہ پڑی تھی بازو اور ٹانگیں پھیلائے "لیکن کپڑے" امر سنگھ نے آنکھیں ملیں ۔ سفید جسم سنہرے بال ۔ سرخ رنگ جیسے ہولی کھیل کر سو گئی ہے ۔ اس کی نیلی سوجی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی تھیں ۔

چھو رہی ہے بچی چلائی "دیکھا" پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی "امی امی دیکھا وہ چھو رہی ہے ۔ بیمال ہے امی ۔ ہاں"

"بیمار" امر سنگھ نے آہ بھری۔

ہاں وہ بولی "ڈاکو آئے تھے۔ لیکن انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ ہاں وہ بڑے اچھے تھے وہ کہتے تھے امی ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے امی کو مالس کی۔"

"مالش؟" اس نے ایک بار پھر غور سے عورت کی طرف دیکھا۔

"وہ سب امی کے پنڈے پر مالس کرتے رہے" وہ بولی "وہ کہتے تھے امی اچھی ہو کر سو گئی ہے۔ وہ بہت اچھے تھے۔"

امر سنگھ نے محسوس کیا گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آرہا ہے۔ طنز بھرا تبسم۔ "وہ داکتل کو لینے گئے ہیں۔" بچی نے کہا۔

"اوہ" امر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ اس اجالے سے تو باہر کا اندھیرا ہی اچھا تھا۔ اور اس معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گِدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی۔ امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

"امی۔ امی" اندر سے بچی کی آواز آرہی تھی۔ لیکن وہ دور بھاگا جارہا تھا۔ دور۔ دور۔

ہائیں وہ حیران رہ گیا سامنے سڑک پر موتی دوڑا جارہا تھا۔ تانگے میں کوچوان سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔

"موتی۔ موتی" وہ چلایا۔ اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا۔ اُسے امر سنگھ کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ البتہ موتی مسرت سے ہنہنایا اور پھر نہ جانے کیوں سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں ہو لیا۔

کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گیہوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس کے باوجود گویا وہ کھانے سے گریز کر رہے تھے۔ جیسے کھا کھا کر اکتا گئے ہوں۔ میدانوں میں کتے موتی کو دیکھ کر بھونکنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی۔ مرغیاں زمین پر بچھی ہوئی آنتوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں۔ بستیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دفعتاً موتی رک گیا ۔ اس کے رکنے سے امر سنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا ۔

کوچوان نے چونک کر سر اٹھایا "نہیں نہیں بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے ۔ نہیں جائینگے" لیکن موتی کھڑا رہا ۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا ۔

امر سنگھ تیرتا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے صدر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا ۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا ۔ اور امر سنگھ سے کہنے لگا "تمہیں شک ہے کیا ؟ شک ہے تو آکر دیکھ لو آؤ" اُس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا "میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں' میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی' سنا تم نے ۔ جاؤ دوڑ جاؤ یہاں سے ۔ بدمعاش ۔ کمینے ۔ دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور پھٹ سے دروازہ بند کر لیا ۔

"آہ ۔ آہ" اندر سے آواز آئی "میرا سر ۔ میرا سر ۔ مجھ کو پکڑو ۔ نہیں نہیں ۔ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں ۔"

"کوئی مچھلمان نہیں" بچے کی آواز آئی ۔ وہ چھیدہ کے ابا ہیں ۔ مچھلمان تو نہیں ۔ وہ بڑے اچھے ہیں ۔ چھیدہ میری چھہیلی کے ابا" پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی ۔ اور پھر مکان پر سناٹا چھا گیا ۔

دفعتاً امر سنگھ کو خیال سا آیا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ "بھاگ جاؤ" وہ بولا "تم کرشن نگر آگئے ہو۔"

موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

"موتی موتی" کوچوان چلایا مگر موتی جا چکا تھا ۔ کوچوان نے قمیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں ۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو" امر سنگھ چلایا "چلے جاؤ ۔ بھاگ جاؤ ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ"۔

"کہاں" کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پاکستان۔"

"پاکستان ! ہا!ہا!ہا!ہاہا۔" فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا "موتی" وہ زیر لب گنگنایا "میرا ساتھی" ۔

"ساتھی!" اندھیرے سے آواز آئی ۔ اور سوجے ہوئے جسم والی عورت رینگتی ہوئی سامنے آگئی ۔ "ساتھی" وہ ہنسی "جھوٹ جھوٹ !! ۔۔ وہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے جیسے جیسے وہ تماشا ہو ساتھی"۔ وہ منہ کے بل گر پڑی ۔ اُس کے بازو اکڑ گئے گردن مڑ گئی ۔

"چھیدہ چھیدہ" ۔ حویلی سے معصوم بچہ نکل آیا "تمہارے ابا یہاں ہیں یہاں ۔۔۔" دفعتاً اس کی نگاہ امرسنگھ پر پڑی"

"نہیں نہیں وہ مسلمان نہیں وہ تو چھیدہ کے ابا ہیں"۔

"چپ" ۔۔ وہ بولی "چپ ۔ امی چھو رہی ہے ۔ چھو رہی ہے ۔ وہ بڑے اچھے تھے ۔ انہوں نے امی کو مالس کی اور امی اچھی ہو کر چھو گئی"

"کوچوان کوچوان !" امرسنگھ نے اسے گھسیٹا "آؤ آؤ بھاگ چلیں" ۔ اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

"لیکن کہاں ؟ کہاں" کوچوان نے بھاگتے ہوئے امرسنگھ کی طرف دیکھا ۔

"کہاں" امرسنگھ نے دہرایا اور دفعتاً رک گیا ۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی ۔ راستہ روکے کھڑی تھی وہ ۔

"مجھے ماردو" وہ چلائی "ماردو مجھے" ۔ اس نے امرسنگھ سے کہا ۔ "میں مسلمان ہوں ، مجھے مار دو"۔

اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے ۔

"تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی" امرسنگھ چلایا۔

"نہیں ، نہیں ، وہ بولی میں پاکستان نہیں جاؤں گی ۔ مجھے قتل کردو لیکن میں پاکستان نہ جاؤں گی ۔ نہیں جاؤں گی ۔ تمہیں اپنے گرو کی قسم ۔ مجھے قتل کردو ۔ مار دو ۔ میرا جینا بیکار ہے ۔ بیکار ۔"

"وہ کہاں ہیں، وہ دونوں ؟" وہ بکنے لگی "میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی

تھی ۔ اس کھیت میں وہ دونوں کرپانوں سے لڑ رہے تھے ۔ بھائی بھائی لڑ رہے تھے ۔ میرے لئے ۔" وہ خاموش ہو گئی اور ایک فخر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ۔

"وہ کون ؟" امر سنگھ نے پوچھا ۔

"وہی جو ہمارے گھر آئے تھے" جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے نہ جانتے پر شکایت کر رہی ہو ۔

"انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیئے ، اور پھر اماں کی طرف بڑھے ، نہ جانے مجھے کیا ہوا ۔ میں نے دوپٹہ اتار پھینکا ۔ اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ مجھے مارو ، مجھے ، میں مسلمان ہوں ۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں ۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا ۔ وہ رک گئے ۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا ۔ یہ سب مال تمہارا ہے ۔ سب ۔ اور ۔ یہ ، اس نے میری کلائی پکڑ لی ۔ یہ میرا حصہ ہے ۔ یہ کہہ کر وہ گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا ۔ اور مجھے اس کھیت تک لے آیا ۔ یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا پیچھے آرہا تھا ۔

"ٹھیرو" سجن سنگھ بولا۔

"اسے مجھے دے دو"

بے وقوف ، بڑا چلایا۔

"جوڑ میرا ہے" وہ بولا۔

"لیکن وہ مال" بڑے نے کہا ۔

"تھو" چھوٹے نے تھوک دیا "میں اس پر تھوکتا ہوں"۔

بڑے نے گھونسہ مارا چھوٹے نے کرپان نکال لیا ۔ اور وہ دونوں کرپانوں سے لڑنے لگے ۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی ۔ اور وہ لڑتے رہے میری خاطر۔"

"پھر" امر سنگھ بولا۔

"پھر سڑک پر موٹر رکی اور میں اٹھ بھاگی ۔ اور وہ لڑتے رہے میرے لئے لڑتے رہے ۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیئے ۔ گھر تباہ کر دیا ۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا ۔ اور ۔اور ، وہ اف وہ پاکستان کا قریبی اس

نے کہا تھا آؤ میں تمھیں کیمپ پہنچا دوں ۔ اور ۔ اور ، میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی ۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی ۔ نہیں نہیں ، میں پاکستان نہیں جاؤں گی نہیں جاؤں گی مار دو مجھے ۔"

کھیت میں دو کٹی ہوئی سریاں لڑھکنے لگیں ۔

وہ میری ہے ۔ چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا ۔

میری ، بڑا چلایا ۔ اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے ۔

"بھاگو ، بھاگو" امر سنگھ چلایا۔

"کہاں ؟" کوچوان نے اپنے ارد گرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی" حسین عورت چلائی "پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مر جانا بہتر ہے"

"نہیں ۔ نہیں ، جھوٹ ہے ۔ یہاں نہ ٹھہرو یہاں نہ رکو" نہ جانے مٹیار عورت کہاں سے آکر شور مچانے لگی "یہ دیکھو ، میری کلائی پر ، ہندی ، شکنتلا میرا نام ، یہ دیکھو۔ اُس نے امر سنگھ کی طرف کلائی بڑھا دی ۔ اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی ۔ وہ مجھے جانتا تھا ۔ وہ میرا پڑوسی تھا ۔ لیکن وہ کہنے لگا میں مسلمان ہوں ۔ کیسوں والا مسلمان۔ ہاہاہا مسلمان ! ہاہاہا"۔

وہ ہنسی ، زہر خند ہنسی ـــــ۔ "سب جھوٹ کوئی مسلمان نہیں ، کوئی ہندو نہیں ، سکھ نہیں ، یہاں درندے بستے ہیں ۔ درندے"

"پاگل نہ بنو" امر سنگھ چلایا "بھاگ چلو ، بھاگ چلو"

"کہاں" کوچوان نے سر اٹھایا۔

"جہاں انسان بستے ہوں" وہ بولا ۔

"انسان" دوسری عورت ہنسی "انسان کہاں ہیں ؟ کہاں ۔ کہیں بھی نہیں"۔

"اوہ" کوچوان نے پھر سر تھام لیا۔

"میں بھاگوں گی نہیں، مٹیار عورت چلائی "نہیں! مجھے جنم دینا ہے ۔ انسان کو جنم دینا ہے ۔ میں جنم دوں گی" اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"جنم دینا ہے" دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں ! میں نے ، تم نے ، ہم نے"

"خدا کرے" کوچوان بولا۔

"خدا" دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی "کاش کہ وہ کچھ کرسکتا ۔ کاش"

"میں کروں گی ۔ میں" مٹیار چلائی "انسان ۔ انسان"

"کس نے پکارا ، کون ہے اس گھور اندھیرے میں ؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے نہ جانے کہاں سے آگیا ۔ "کون؟"

"انسان!" لنگوٹی والے نے آہ بھری ۔

"تم کون ہو؟" مٹیار نے پوچھا۔

"میں کوئی بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں" وہ بولا

"کوئی بھی نہیں؟" کوچوان نے حیرانی سے دیکھا۔

"شانتی شانتی" بڈھے نے مدھم آواز میں کہا "بھگوان ۔۔۔۔۔"

"بھگوان" عورت نے اس کی طرف دیکھا "نہیں نہیں بھگوان نہیں ۔ انسان" وہ چلائی "میں جنم دے رہی ہوں"

"تم ! دھن ہو ماتا" بڈھا بولا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پرنام کیا ۔

"میں تمہاری مدد کروں گی" دوسری عورت بولی اور وہ دونوں کھیت میں گھس گئیں ۔

انسان ۔ انسان ۔ دور سے آوازیں بلند ہوئیں ۔

"انسان ، انسان" گدھ ڈر کر چیخنے لگے ۔

"انسان" گویا لاکھوں بھنورے بھنبھنانے لگے ۔ اور وہ آواز تیز ہوتی گئی ۔ تیز ہوتی گئی ۔

"انسان ، انسان ، انسان، انسان"

..........○..........

ریت کی لہریں

باقر کی آنکھ کھل گئی ۔ صبح کی ہلکی ہلکی سفیدی روشندانوں اور کھڑکیوں کی درزوں سے کمرے میں آرہی تھی ۔ "ہوں تو صبح ہو گئی" اُس نے ٹٹول کر سرہانے تلے سے بیڈ سوئچ دبایا ۔ کمرے میں روشنی ہو گئی ۔ اس نے لحاف کو ازسرنو اپنے گرد لپیٹا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

انگڑائی لیتے ہوئے باقر نے محسوس کیا ۔ جیسے وہ تھکا ہوا ہو ۔ صبح سویرے تو تازہ دم ہونا چاہیئے ۔ صبح سویرے تھکاوٹ۔اس نے اپنے جسم کو جھنجھوڑا ۔ اس کی پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں ۔ کمر میں ہلکا سا درد تھا ۔ اور شانے بوجھل محسوس ہو رہے تھے ۔ اتفاقاً اس کی نگاہ کلنڈر پر جا پڑی ۔ "٦ جنوری ۔ آج وہ اپنی زندگی کے پینتالیس سال ختم کر چکا تھا ۔ پینتالیس سال ۔ کتنی جلدی ختم ہو گئے تھے ۔ پینتالیس سال ایک دھندلا خواب چند مبہم یادیں ، چند موہوم تصاویر پینتالیس سال ۔ اس کے شانے اور بھی بوجھل ہو گئے ۔ کمر اور بھی دکھنے لگی ۔ اور تھکاوٹ بند بند میں رینگنے لگی ۔

گھبرا کر اس نے کلنڈر سے نظر ہٹا لی ۔ اور آنکھیں بند کر کے تکئے کی نرمی اور لحاف کی گرمی کو محسوس کرنے لگا ۔ کتنی آسودگی ہے ۔ اطمینان آسودگی اور ایک شانِ استغنٰی ۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ۔

ملحقہ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں ۔ تمام کرسیاں آتش دان کے گرد جمع ہو رہی تھیں ۔ بائیں ہاتھ کھانے کی میز پر برتن گڈ مڈ پڑے تھے ۔ رات کی پارٹی کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ رات اس نے اپنی سالگرہ کی پارٹی کا اہتمام کیا تھا ۔ جس میں ان گزرے ہوئے پینتالیس برس کی ستائش میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھا تھا ۔ اور جمیل نے اس کے چھیالیسویں سال کی ابتدا کی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے پلاؤ کی دو بڑی رکابیاں اپنے پیٹ

میں ٹھونس لی تھیں ۔ اور مسٹر ڈیوڈ نے چار گلاس بیر کے اپنے حلق میں انڈیلے تھے اور عظمت نے سکھوں کے بیسیوں لطیفے سنائے تھے ۔ اور مسٹر احمد نے فرنی کے ہر چمچے کے ساتھ اسے ہیپی ریٹرن آف دی ڈے وِش کیا تھا ۔ اور ان تمام تفاصیل پر وہ بے حد خوش ہوا ۔ کس قدر حماقت ہے ۔ وہ سوچنے لگا ۔ پینتالیس سال گزرنے پر تو اظہارِ افسوس کرنا چاہیئے ۔ سالگرہ کی بجائے سال گیا منانا زیادہ موزوں ہوتا ۔ پینتالیس سال گئے ۔ چلے گئے ۔ نہیں نہیں اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے زندگی کے پینتالیس برس گزار دیئے تھے ۔ نہیں میں بوڑھا تو نہیں اس نے جھک کر آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا ۔ بوڑھا تو نہیں ہوا ۔ نہیں تو ۔ بال تو زکام کی وجہ سے بھی سفید ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ جھریاں تو نہیں ۔ میرے چہرے پر تو شروع ہی سے لکیریں پڑتی تھیں ۔ اور یہ سنجیدگی ۔۔۔ نہیں سنجیدگی اور بڑھاپا تو مختلف چیزیں ہیں ۔ سنجیدگی تو ہر باوقار شخص میں ہوتی ہے ۔ اُس نے بشاشت پیدا کرتے ہوئے سوچا ۔ معلوم نہیں ہوتا کہ میں پینتالیس برس کا ہو چکا ہوں ۔ بتی آپ ہی آپ بجھ گئی ۔ اور آہستہ آہستہ کھڑکی کی درز سے سورج کی ایک کرن اس کے چہرے پر پڑی ۔ زندگی میں کس قدر اطمینان حاصل ہے ۔ کتنی آسودگی ہے ۔

وہ ویسے ہی آئینے کے سامنے جھکا جھکا سوچنے لگا ۔ اتفاقاً اُس نے نظر اُٹھائی ۔ آئینے میں ایک پژمردہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا ۔ جس پر سنجیدگی کی مردنی چھائی ہوئی تھی ۔ گال اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے ۔ اور گالوں تلے دو موٹی موٹی دراڑیں پڑی تھیں ۔ کلوں کی ہڈیوں تلے آنکھیں ڈوبتی جا رہی تھیں اور بال کھچڑی ہو رہے تھے ۔ گھبرا کر وہ چونک پڑا ۔ بڈھا ۔ بڈھا ۔ اس نے محسوس کیا ۔ جیسے کوئی اس کا منہ چڑا رہا ہو ۔ اس نے ایک ٹھیس سی محسوس کی ۔ کوئی تیز چیز چیرتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی ۔ باقر نے مسکرانے کی کوشش کی اور یوں شانے جھنجھوڑے جیسے ان پر پڑے ہوئے بوجھ کو گرانا چاہتا ہو ۔ لپک کر اس نے ریڈیو کا بٹن کھول دیا ۔ اور پھر سے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔

بھیرویں کے الاپ سے کمرہ بھر گیا ۔ کوئی شخص مزے میں گا رہا تھا ۔ باقر

نے اپنی تمام تر توجہ راگ کی طرف مبذول کر دی اور اسی میں کھو گیا ۔

آہستہ آہستہ اس نے محسوس کیا جیسے بھیروں نے اس کے گرد ایک وسیع ویرانہ پھیلا دیا ہو ۔ ایک اطمینان اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا ۔ ایک پژمردگی چھائے جا رہی تھی ۔ ایک لا متناہی سکوت ۔ ایک مردنی ۔ جیسے آہستہ آہستہ زندگی اُس کے رگ و پے سے خارج ہوئی جا رہی ہو ۔ زندگی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا ۔ زندگی کی لہریں ۔ دور ہٹی جا رہی تھیں ۔ اور ریتلے کنارے پر صرف ریت کی لہریں اس کے گرد و پیش پھیلی جا رہی تھیں ۔ ریت کی لہریں باقر نے چاہا کہ اٹھ کر ریڈیو بند کر دے ۔ اور اس بڑھتی ہوئی بے حسی اور پژمردی سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے ۔ لیکن اُس میں اتنی ہمت باقی نہ رہی تھی ۔ جیسے اس کا جسم جنبش کا اہل نہ رہا ہو ۔ جیسے اس کا عزم قوت کھو چکا ہو ۔ "ہائے کیا کرتی ہے تو رفیہ" پڑوس سے بشرہ کی آواز آئی ۔

باقر چونکا ۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے بشرہ کی آواز کو وضاحت سے سنا تھا ۔ اُسے ایسے محسوس ہوا ۔ جیسے اس پھیلے ہوئے دشت میں کارواں کی گھنٹیاں بج رہی ہوں ۔ جیسے گھور اندھیرے میں سورج کی کرن آنکلی ہو ۔ پھر وہ آواز دور ہوتی گئی ۔ دور ہوتی گئی ۔ کارواں دور جا رہا تھا ۔ دور۔ زندگی سے اس کا تعلق ٹوٹتا جا رہا تھا ۔ وہی بے حسی اور پژمردنی چاروں طرف سے محیط و مسلط ہوئی جا رہی تھی ۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا ۔ "نذیر ۔ نذیر ۔ وہ چلایا ۔ چائے لاؤ چائے" اور یوں چیخ کر ایک ہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔

سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

ریڈیو پر بھیروں کی جگہ غالب کی غزل کا شعر سن کر وہ از سر نو چونکا ۔ اُس کی نگاہوں تلے اسد منزل کا بالائی حصہ ابھرنے لگا ۔ جہاں عالم جوانی میں کھڑے ہو کر وہ ریحانہ کو دیکھتا کرتا تھا ۔ جو دور اپنے کوٹھے پر یوں خراماں ٹہلا کرتی تھی ۔ جیسے وہ تفریح گاہ ہو ۔ اور پھر تھک جاتی تو آرام کرسی پر بیٹھ کر یوں کتاب سامنے رکھ لیتی ۔ جیسے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ کر رکھ دے گی ۔ اور پھر بات بات پر سر اٹھاتی اور اپنی چھوٹی بہن جمیلہ پر برس پڑتی ۔ جیسے وہ اس کا وقت ضائع کر رہی ہو ۔ اس کی توجہ کو بھٹکا رہی ہو ۔ اور پھر کنکھیوں سے

باقر کی طرف دیکھ کر مسکراتی ، کس قدر شوخ تھی ریحانہ ، ایک ساعت کے لئے بھی نچلی نہ بیٹھتی تھی ۔ اب لبِ بام ٹہل رہی ہے ۔ ابھی باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکنے لگی ۔ اور پھر ایک ساعت کے بعد اُس کا سفید سفید بازو برآمدے کی چق سے باہر نکل کر بجلی کی طرح لہرا گیا ۔ اور باقر بھی گھر میں بیتاب گھوما کرتا ۔ اب چوبارے میں کھڑا ہے ۔ ہائیں کہاں چلی گئی ریحانہ اور وہ شڑاپ شڑاپ نیچے اُترا اور غسلخانے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا شاید یہاں سے دکھائی دے ۔ پھر ملاقاتی کمرے کی طرف بھاگا ۔ اور پردوں پر ریحانہ کی چوٹی لہراتے دیکھ کر ازسرنو اوپر بھاگا ۔ اور سیڑھیوں میں روشندانوں سے دیکھنے لگا ۔ اُن دنوں باقر سیماب کی طرح مضطرب رہتا تھا ۔ کتنی زندگی تھی اُس میں ۔ "رضیہ رضیہ" پڑوس سے وہ بشرہ کی آواز سن کر چونکا ۔ کتنا لوچ تھا اس کی آواز میں کتنی زندگی تھی ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بشرہ کو دیکھے ۔ کیا اس کی آنکھیں بھی ریحانہ کی طرح کونوں میں آ آکر مسکراتی ہیں ۔ کیا اس کی لٹ بھی بار بار اُلجھتی ہے ۔ کیا اس کا ریشمی پلو بھی ہر آن اُڑتا رہتا ہے ۔ رضیہ رضیہ آواز دور جارہی تھی دور ۔ اس نے محسوس کیا ۔ جیسے زندگی اس سے دور جارہی ہو ۔ جیسے زندگی اس کی رگ و پے سے خارج ہوئی جارہی ہو ۔ پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکا ثریا چائے کا ٹرے لئے کھڑی تھی ۔ ثریا کو دیکھکر وہ بھونچکارہ گیا ۔ کتنی جوان ہوگئی ہے ۔ اس نے گویا پہلی مرتبہ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھا ۔ خم و پیچ کتنے نمایاں ہوگئے تھے ۔ کتنی لمبی پلکیں تھیں ۔ اور ہونٹ جیسے مسکراہٹ دبائے ہوئے ہوں ۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہو جیسے وہ مجرم ہو ۔ اسے غصہ آگیا ۔ تم مردانے میں کیوں آئی ہو بیٹی اس نے تنک کر کہا ۔ نوکر کہاں ہے "بابر گیا ہے امی نے کہا تھا تم لے جاؤ چائے ۔" ثریا نے جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیا ۔ اُس کی آواز سن کر باقر ریڈیو کی طرف گھورنے لگا جیسے وہ ریڈیو کا نغمہ سننے میں منہمک ہو ۔ دیر تک وہ ریڈیو سننے میں منہمک رہا ۔ جیسے وہ اس سریلی آواز سے ڈرتا ہو جو ثریا کے چلے جانے کے باوجود کمرے میں ابھی تک گونج رہی تھی ۔ پھر وہ تھک کر لیٹ گیا ۔ اس کے شانوں پر وہی بوجھ محسوس ہونے لگا ۔ جسم میں پژمردگی کی چیونٹیاں رینگنے لگیں ۔

باہر گلی میں زرّی کی آواز سنائی دی ۔ جو کسی سے کچھ کہہ رہی تھی ۔ ”لو بہن یہ بھی کوئی بات ہے ۔“ وہ بولی ۔ ”بی بی تو خواہ مخواہ آنکھیں دکھاتی ہے ۔ بڑی آئی امیر جادی کہیں کی ۔“ باقر کو زرّی سے نفرت تھی ۔ اُسے ایسے محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے زرّی ایک عام قسم کی چالاک عورت ہو ۔ جیسے اس کی ہر جنبش ایک عریاں اشارہ ہو ۔ لیکن اس وقت اُس کی آواز سن کر باقر چونکا ۔ عجیب سی آواز تھی ۔ جیسے حلق کی بجائے اُس کی چھاتی سے نکل رہی ہو ۔ کتنی گول تھی وہ آواز ۔ گولائیوں بھری جس میں سے تنکے پنڈے کی بو آرہی تھی ۔

”میں کسی سے دبنے والی نہیں“ ۔ بہن زرّی نے کہا ۔ نواب جادی ہو گی تو گھر بیٹھے ، میں کیا جانتی ہوں نواب جادیوں کو ۔

باقر کا جی چاہتا تھا ۔ کہ چپکے سے کھڑکی کی درز سے باہر جھانک کر دیکھے کہ زری کیسے آنکھیں مٹکاتی ہے ۔ اسے احساس ہو رہا تھا ۔ کہ اگرچہ اس کے انداز میں عریانی تھی ۔ مگر عریانی کے باوجود اس میں زندگی تھی ۔ بھرپور زندگی ۔ نہ جانے آج اسے زندگی میں اتنی جاذبیت کیوں محسوس ہو رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر زندگی کے منجدھار میں چھلانگ لگا دے اور ڈبکیاں لگائے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے چھلانگ لگائے ۔ اور وہ منجدھار کہاں تھی ۔ زندگی کی منجدھار اس سے دور کیوں ہٹے جارہی تھی ۔ اور اس کے اپنے گرد ریتلا ساحل کیوں تھا ۔ ریت ۔ ریت ۔ ریت سے بنی ہوئی لہریں جن میں حرکت تو دکھائی دیتی تھی لیکن زندگی نہ تھی ۔

”بشرہ کی ماں بشرہ کی ماں“ گلی سے سعیدہ کی آواز سنائی دی ۔ یہ وہی سعیدہ تھی جس سے ملنے سے باقر نے ثریا کی ماں کو منع کر رکھا تھا ۔ ان دنوں جب وہ ان کے گھر آیا کرتی تھی اُسے وہ دن یاد آگئے ۔ اس روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی باقر کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی تھی ۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد برقعہ اوڑھے باقر کے گھر آگئی تھی ۔ اور آتے ہی ثریا کی ماں سے کہنے لگی ۔ ”لو اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ثریا کے ابا آج گھر ہی ہیں تو میں کیوں آتی“ ۔ اور باقر نے یہ سن کر گھن سی محسوس کی تھی ۔ اور اسی شام ثریا کی ماں کو سعیدہ سے ملنے سے منع کر دیا تھا ۔ اور اس کے بعد اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا ۔ گویا سعیدہ کی ہر

مسکراہٹ میں اثبات کی جھلک ہو ۔التفات کا اشارہ ہو ۔ کھڑکی میں وہ اسے مسکراتا دیکھ کر منہ موڑ لیا کرتا تھا ۔

"بشرہ کی ماں" سعیدہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی ۔ ہائے میں تو کبھی نہ رکھوں جوان نوکر گھر میں ۔ جب وہ گھر سے چلے جاتے ہیں تو کیا میں اس جوان نوکر کے ساتھ اکیلی رہوں ۔ نہ بھئی میری تو ہمت نہیں پڑتی ۔ نہ جانے لوگ کیسے گھر میں جوان نوکر رکھ لیتے ہیں"

باقر نے کھڑکی سے دیکھا سعیدہ کے چٹے سفید منہ پر لکیریں سی پڑی ہوئی تھیں ۔ عجیب سی لکیریں ۔ جیسے وہ کسی مخصوص بات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں ۔ لیکن بھرپور ہونے کے باوجود اس کا جسم لٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا معاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ بھی ریت کی لہروں سے بنی ہو ۔ جیسے وہ بھی زندگی کی منجدھار کی تلاش میں سرگرداں ہو ۔ اسے سعیدہ پر ترس آنے لگا ۔ پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپاہج تھی ۔ ریت کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ایک بھکارن ۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھا ۔ کوٹ پہنا ۔ اور باہر مردانے کے صحن میں جا کر ٹہلنے لگا وہ زندگی کی منجدھار کا متلاشی تھا ۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں ۔ گلی سے برتن بجنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے ان آوازوں میں جوانی کی کھنک ہو ۔ اس کی نگاہوں تلے سڈول مخروطی بازو جنبش کرنے لگے ۔ چقوں کی تیلیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ حنائی انگلیوں کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں ۔ پازیب کی مدہم جھنکاروں میں چھوٹے چھوٹے پاؤں رقص کرنے لگے ۔ آج ان مبہم آوازوں کے ساتھ نئے مفہوم ابھر رہے تھے ۔ زندگی سمٹ کر آواز بن چکی تھی ۔ اور اس کے کان پھیلتے جا رہے تھے ۔ ان میں انوکھی حس پیدا ہو رہی تھی ۔

جیسے تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہوں ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے قریب ہی کہیں زندگی کا دھارا رواں دواں ہو ۔ وہ دیر تک بیٹھا اس دھارے کی آوازیں سنتا رہا ۔ پھر وہ مضطربانہ انداز سے اٹھ بیٹھا ۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی ۔ مگر مردانے کے بند صحن سے اسے کچھ دکھائی نہ دیا ۔ صرف آوازیں خالی آوازیں ۔ پھر وہ بے تابانہ کوٹھے پر چڑھ گیا ۔ کوٹھے پر روپہلی دھوپ پھیلی

ہوئی تھی ۔ اور ارد گرد چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی ۔ مکانات دکھائی دے رہے تھے ۔ جیسے دیواروں ۔ چھتوں ۔ چقوں اور پردوں سے ڈھکے چھپے مکانات دفعتاً ننگے ہو گئے ہوں ۔

اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور ان جانے میں خوشی کی ایک لہر ، دبی دبی لہر محسوس کی جیسے وہ زندگی کے دھارے کے عین درمیان میں آن پہنچا ہے ۔ اطمینان سے وہ کرسی پر بیٹھ گیا ۔

سامنے مکان کے صحن میں بچے کھیل رہے تھے ۔ قریب ہی ایک بڑھیا چارپائی پر بیٹھی تھی ۔ دفعتاً سیڑھیوں کے دروازے سے ایک لڑکی بال کھولے بھاگی بھاگی داخل ہوئی ۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور تھی ۔ وہ بھاگ رہی تھیں ۔ ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھیں ۔ بڑھیا نے غضبناک نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور چلانے لگی ۔ لیکن وہ اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے میں مشغول ہو چکی تھیں ۔ بڑھیا نہ جانے کیا کہہ رہی تھی ۔ انہیں بڑھیا کی بات سننے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ بلکہ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ بڑھیا کچھ کہہ رہی ہے ۔

پہلی لڑکی نے ہنستے ہنستے باقر کی طرف دیکھا اور مسکرائی جیسے اس کی موجودگی کا اعتراف کر رہی ہو ۔ "ہمیں معلوم ہے تم دیکھ رہے ہو" کی سی نگاہیں ۔ دوسری نے دیکھے بغیر اس کی موجودگی کے احساس کو جتایا ۔ اور چھت پر پہنچ کر دونوں ٹہلنے لگیں ۔ کوٹھے پر دوڑتیں اور پھر باقر کی طرف نگاہ غلط انداز ڈال کر مسکراتیں اور باقر کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور اسے محسوس ہوتا جیسے ریت کی لہریں پانی کی لہروں میں تبدیل ہوئی جا رہی ہوں ۔

عین اس وقت سورج بادل تلے آگیا ۔ اور دوسری لڑکی نے باقر کی طرف منہ کر کے بال لٹکا دیئے اور جب سورج بدلی سے باہر نکلا تو اس نے بال منہ سے سرکا دیئے اور ساتھ ہی ایک بھرپور مسکراہٹ سے باقر کی طرف دیکھا ۔ باقر کا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا ۔ جوش میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہائیں ۔۔۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں چھت کے پردوں تلے چھپ گئیں۔

باقر کو سمجھ میں نہیں آتا تھا ۔ کہ یوں دفعتاً چھپنے سے ان کا مطلب کیا تھا ۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف نگاہ دوڑائی پچھلے کوٹھے پر ایک نوجوان کتاب

ہاتھ میں لئے ٹہل رہا تھا اور ان دونوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اشارے کر رہا تھا۔ اوہ تو وہ تمام شوخیاں ان صاحب کے لئے تھیں ۔ اس کے دل پر ٹھیس لگی ۔ اور ریت کی لہریں بالکل ہی ریت کی ہو کر رہ گئیں ۔ وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا ۔ آخر اسے دیکھ کر یوں چھپنے کی کیا وجہ تھی ۔ کیوں ۔ کیا وہ احساسِ حسن سے کورا تھا ۔ کیا وہ حسین اشارات کا معترف نہ تھا ۔ وہ سوچتا رہا ۔ دیر تک انہیں خیالات میں کھویا رہا ۔ اَن جانے میں اس نے کرسی کا رخ بدل دیا ۔ اور پھر سر اٹھا کر دیکھنے لگا ۔ سامنے سبز جنگلے میں ایک نوجوان لڑکی کرسی پر بیٹھی کچھ بننے میں مصروف تھی ۔ گندمی رنگ ۔ کتابی چہرہ اور لانبی پلکیں ۔ اس کے چہرے میں ایک تازگی تھی ۔ ایک بشاشت اگرچہ خدوخال اس قدر حسین نہ تھے مگر بلا کی جاذبیت تھی ۔ وہ غور سے اسے دیکھتا رہا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے اور مسکرا دے ۔ بس صرف ایک مسکراہٹ ۔ جیسے اس کی مسکراہٹ اس یخ کو پگھلا دینے کے لئے کافی تھی ۔ جو اس کے گرد جما ہوا تھا ۔ صرف ایک نگاہ ایک مسکراہٹ ۔ اہم ۔ اہم ۔ ان جانے میں وہ کھانسنے لگا ۔ بجلی کی طرح وہ لٹکی ہوئی مژگان اٹھیں اور بیشتر اس کے کہ وہ اسے دیکھ سکتا ۔ کھڑکی کا ایک پٹ بند ہو گیا ۔ اور وہ نظر سے اوجھل ہو گئی ۔

اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں ۔ اس نے غصے سے دوسری طرف منہ موڑ لیا ۔ ادھر کوٹھے پر زری سعیدہ سے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہی تھی ۔ دفعتاً اسے خیال آیا سعیدہ ، لیکن یاد آیا کہ وہ تو آپ ریت میں پھنسی ہوئی ایک ٹوٹی ہوئی ناؤ تھی ۔ عین اس وقت زری کی نگاہ باقر پر پڑی سرگوشیاں ختم ہو گئیں ۔ "چپ وہ" وہ بولی اور پھر دوپٹہ سر پر سنبھال کر منہ موڑ کر بیٹھ گئی ۔

باقر نے پہلو بدل لیا ۔ اور بشرہ کے مکان کی چھت کی طرف دیکھنے لگا ۔ بشرہ کی آواز میں کس قدر معصومیت تھی اور بات کرتے ہوئے جب وہ آخری لفظ کو جھلاتی تھی تو ایسے محسوس ہوتا جیسے آبِ زمزم لہریں لے رہا ہو ۔ پاکیزگی میں سے شرماتی ہوئی زندگی جھانکتی تھی ۔۔۔ ہائیں وہ بھونچکا رہ گیا ۔ بشرہ پردے کے اوپر کھڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی طاقت نہ رہی ہو ۔ اس کی مژگان پھول کی پتیوں کی

طرح پھیلی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہاتھ سینے سے یوں چمٹے تھے جیسے اپنا آپ تھام رہی ہو ۔

ایک ساعت کے لئے وہ کھڑی رہی جیسے اسے سمجھ میں نہ آتا ہو کہ وہ کیا کرے ۔ پھر ہلکی سی آواز آئی اور بجلی سی گری اور بشرہ نگاہ سے اوجھل ہو گئی ۔

باقر کچھ دیر تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر دیکھتا رہا پھر وہ اُٹھ کر زخمی شیر کی طرح دیوانہ وار کوٹھے پر ادھر اُدھر گھومنے لگا۔

ایک نگاہ ، محبت بھری نگاہ ! اس نے سامنے کوٹھے کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا دونوں بہنیں پردوں کے پیچھے بیٹھ کر حنائی انگلیوں سے نہ جانے کس طرف اشارے کر رہی تھیں ۔ سبز جنگلے کی کھڑی کا وہ پٹ اسی طرح بند تھا ۔ ریشمیں کپڑے پر صرف دو چوٹیاں جھولتی دکھائی دے رہی تھیں ۔

ایک نگاہ صرف ایک نگاہ ، محبت بھری نہ سہی دلچسپی کی نگاہ ۔ جو اسے یقین دلا سکے کہ وہ ابھی زندہ ہے ۔ جو اس میں زندگی کی لہر دوڑا دے ۔ کسی پردے سے ایک سر جھانکے ۔ ایک نگاہ جو اس کے لئے مخصوص ہو یا کوئی اس کے سامنے سے یوں گزر جائے جیسے اسے اپنا آپ دکھا رہی ہو ۔ ایک بار پاؤں اس کی خاطر ٹھمکیں ۔ پلو سر کے اور سنبھال لیا جائے ، ایک بار کھڑکی کا پٹ کھلے اور اوئی اللہ کہہ کر کوئی مسکرا کر پٹ بند کر دے ۔ لیکن چاروں طرف گویا ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا ہر کوئی اپنی دھن میں لگا تھا گویا باقر کی موجودگی کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔

کیا وہ واقعی بوڑھا ہو چکا تھا ۔ کیا بڑھاپے کی وجہ سے اب اس کی حیثیت سرخ جھنڈی کی سی ہو چکی تھی ۔ نہیں نہیں ابھی تو اس کا دل حسیات کی دولت سے مالا مال تھا اس میں جذبات کی فراوانی تھی ۔ پھر لوگ اسے دیکھ کر یخ بستہ کیوں ہو جاتے تھے ۔ اس کی وجہ اس کی سنجیدگی تھی ۔ سنجیدگی بڑھاپا نہیں ۔ اس خیال پر اس کے چہرے پر امید کی ایک کرن جھلکنے لگی ۔ اس کے شانوں سے وہ بوجھ اتر گیا ۔ انداز میں لطافت پیدا ہو گئی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑے ، بھاگے ، ہنسے کھیلے اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر دیکھے ، اشارے کرے آخر انہیں بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جوانی کا کھیل کھیلنے کا متمنی ہے ۔

اِن دنوں بھی تو وہ ریحانہ کو اشارے کیا کرتا تھا ۔ ان دنوں اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ریشمی رومال پکڑا ہوتا تھا ۔ اور پھر ماتھا کھجانے کے بہانے جب اس نے پہلی مرتبہ ریحانہ کو سلام کیا تھا۔

دفعتاً سامنے کوٹھے پر دونوں بہنیں پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئیں ۔ سلام کرو سلام ۔ اس کے ذہن سے آواز آئی ۔ کوئی دیکھتا نہ ہو ۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے چاروں طرف دیکھا ۔ لیکن ان دونوں نے منہ موڑ لیا تھا ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ جیسے ان سب کو معلوم تھا کہ وہ ماتھا کھجانے کے بہانے سلام کرنے والا ہے ۔

سعیدہ کے کوٹھے پر زری مسکرا رہی تھی جیسے وہ باقر کی چالاکی سے واقف ہو ۔ بائیں ہاتھ دو عورتیں اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں ۔ سامنے گھر میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بڑھیا اسے گھور رہی تھی۔

نہیں نہیں باقر نے شانے جھنجھوڑ کر کہا میں کسی سے نہیں ڈرتا ۔ کسی سے نہیں ، دیکھتے ہیں تو پڑے دیکھیں ، اس نے بے باکانہ سامنے گھر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ وہ ادھر دیکھ رہی ہیں ۔ باقر یہ محسوس کر کے گھبرا گیا ۔ ماتھا کھجاؤ ماتھا ۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ منوں بوجھل ہو چکا تھا ۔ جیسے اس کے شانوں کا بوجھ اتر کر اس کے بازوؤں پر گر چکا ہو ۔

شرم سے اس کی نگاہیں دھندلا گئیں ۔ اس نے محسوس کیا جیسے گردوپیش کی گہما گہمی کے درمیان وہ ایک گڑا ہوا کھمبا ہو ۔ جیسے زندگی کے سمندر میں وہ ایک ڈوبا ہوا جہاز ہو ۔

غصے سے اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگیں ۔ وہ نیچے اترنے لگا ۔ زندگی کے سمندر میں ڈبکیاں لینے سے تنہائی کی پژمردنی کہیں بہتر تھی ۔ اگرچہ زندگی کی لہر کی تمنا ابھی تک اس کے دل میں لہر۔یں لے رہی تھی ۔

سیڑھیاں اترتے وقت وہ چونکا ۔ سیڑھیوں میں زری تھی ۔ وہ اوپر آ رہی تھی ۔ باقر کو دیکھ کر وہ رک گئی ۔ اس کے رکنے میں بھی زندگی کی تڑپ تھی ۔ اتنی جو اس کی تڑپ میں بھی نہ تھی ۔

زری کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے جیون ساگر اس کے قریب ہی بہہ رہا ہو ۔ اس قدر قریب ۔ صرف ایک جست ، ایک لڑکھڑاہٹ ، ایک لغزش ۔

اِن گھومتی سیڑھیوں کی تنہائی میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا ، کوئی طنز سے مسکرانے والا نہ تھا ۔ زری قریب آتی جا رہی تھی اور قریب ۔ صرف ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زری تم ـــــ !

دفعتاً گرم پنڈے کی بو نے اس کی طرف یورش کی ۔ اہم ، اہم خواہ مخواہ اس کے منہ سے کھانسنے کی آواز نکلی "زری "اس نے ہمت کر کے کہا ۔ لیکن نگاہوں نے ساتھ نہ دیا ۔ زری نے ڈر کر سر کا دوپٹہ سنبھال لیا اور آنکھیں جھکا کر کھڑی ہو گئی ۔

دفعتاً وہ لہر ریت میں تبدیل ہو گئی ۔ ریت ریت ریت اور وہ اس میں دھنسا جا رہا تھا ۔ دھنسا جا رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ دھڑام سے چار پائی پر گر پڑا۔

آہستہ آہستہ اس پر پژمردگی چھاتی گئی ۔ جسم میں ازسرِنو چیونٹیاں چلنے لگیں ۔ جیسے زندگی آہستہ آہستہ اس کے بند بند سے خارج ہوتی جا رہی ہو ۔ زندگی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹتا جا رہا تھا۔

باہر سے آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی جو اس کمرے کے سکوت کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی ۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ قبر کی لحد میں پڑا ہو ۔ جیسے وہ سب اسے دفنا کر چلے گئے ہوں ۔ اور اب دُور اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے ہوں ۔

دوسرے کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کس قدر سست اور دھیمی سنائی دے رہی تھی ۔ ٹِک ٹِک پینتالیس سال ، ٹک ٹک پینتالیس سال وہ چونک پڑا ۔ اوہ ۔ آج اس کی سالگرہ تھی ۔ پینتالیس سال بیت گئے ۔ وہ مسکرا دیا ۔ بے بسی بھری مسکراہٹ پھر وہ بے بسی غصے میں تبدیل ہوتی گئی ۔ احساس کمتری ابھرنے لگا اور اس نے احساسِ عظمت کا روپ دھار لیا ۔ آئینے میں دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک بزرگ ہو ۔ بوڑھا بزرگ ۔ وہ مسکرا پڑا "اہم ۔ اہم ۔ اس کی آواز میں عظمت کی گونج تھی ۔ کون ہے اس نے باہر آہٹ سن کر

کہا۔

"بیگم ہے" اس کی آواز میں رعونت پیدا ہو گئی ۔ جیسے دفعتاً اسے سہارا مل گیا ہو "کیا ہے"

"کچھ نہیں" بیگم گھبرا کر بولی "اس وقت آپ آرام کر رہے ہیں تو پھر سہی کبھی ۔"

"کیا بات ہے" اس نے بے پرواہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وہ گھبرا کر بولی "وہی بات تھی پرانی" اس نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"کونسی"

"سعیدہ کی والدہ آئی ہوئی ہیں۔"

"تو پھر"

"اپنے بابر کے لئے رشتے کے پیغام کا جواب مانگ رہی ہیں ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔"

"ہوں"

"تو کیا میں اسے ٹال دوں"۔

"کیوں ؟"

"تو کیا ہاں کہدوں" وہ مسکرا کر بولی۔

"بابر کے لئے سعیدہ اچھی بیوی رہے گی ۔"

"لو سعیدہ کی کیا بات ہے اس میں ہر خوبی ہے ۔"

"تمہیں پسند ہے یہ رشتہ۔"

"میری پسند کا کیا ہے" البتہ وہ اور قریب ہو گئی اور رازدارانہ انداز سے کہنے لگی "خود بابر کو یہ رشتہ پسند ہے ۔ وہ تو سعیدہ کو دل سے چاہتا ہے۔"

"کیا کہا" ۔ باقر کے چہرے کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں ۔

"اپنے بابر کو سعیدہ سے محبت ہے ۔" وہ بولی

"محبت" وہ رک گیا اور محسوس کرنے لگا جیسے زندگی کے سمندر میں وہ کھمبے کی طرح گڑا ہوا ہو "محبت" اس نے دہرایا۔

"تو پھر آپ کا کیا فیصلہ ہے؟" وہ بولی

دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا ہوتا جا رہا ہو ۔ پھولتا جا رہا ہو۔ عظیم تر ہوتا جا رہا ہو ۔ جیسے اس کے پاؤں میں زندگی کا دھارا بہہ رہا ہو ۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر ریت کا ایک تودا اس دھارے میں گرا دیا ۔

"نہیں میگم یہ رشتہ نہیں ہو گا۔"

○

سمنہ

سمنہ ایک عام سی بچی تھی ۔ اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو اسے دوسرے بچوں سے ممتاز کرتی ۔ البتہ ایک بات پر گھر کے سبھی لوگ حیران تھے ۔ ہر کوئی سمنہ کی طرف دیکھ کر محسوس کرتا جیسے وہ بچہ نہ ہو ۔ اس کی زیادہ تر وجہ سمنہ کے خدوخال تھے ۔ لیکن نہیں ۔۔۔ اس کے خدوخال میں اگر جاذبیت نہ تھی ۔ تو ان میں کوئی ایسی بات بھی نہ تھی جسے دیکھ کر منفی جذبہ پیدا ہوتا ۔ اس کے خدوخال عام سے تھے ۔ جیسے عام بچوں کے ہوتے ہیں ؟ لیکن اس کے چہرے پر معصومیت نہ تھی ۔ اسے بیٹھے دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی بچے کے جسم پر ایک بالغ سر لگا دیا گیا ہو ۔

کئی مرتبہ ہم اسے دیکھ کر چونک پڑتے اور محسوس کرتے جیسے وہ خاموشی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی ہو یا حالات کا مطالعہ کر رہی ہو یا کسی مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی ہو ۔ اس کی ماں چونک کر میری طرف دیکھتی ۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ ہم دونوں کے احساسات ایک سے ہیں ۔ اگرچہ ہم نے اس موضوع پر آپس میں کبھی بات نہ کی تھی ۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کئی ایک احساسات بتائے بغیر خاموشی سے دوسرے تک پہنچا دیئے جاتے ہیں اور اس طرح وضاحت سے ان کا اظہار کر دیا جاتا ہے کہ پھر زبان سے کہنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

کئی مرتبہ جب ہم دونوں گھر کے متعلقہ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہوتے اور دفعتاً ہماری توجہ سمنہ کی طرف منعطف ہو جاتی جو کونے میں بیٹھی بڑی سنجیدگی سے ہماری باتیں سن رہی ہوتی تو معاً مجھے احساس ہوتا کہ ابھی وہ اٹھ کھڑی ہو گی اور کہے گی تم دونوں ہی بے وقوف ہو جو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو ۔

میرے اس ان کہے خیال کو محسوس کر کے سمنہ کی ماں بھی خاموش ہو جاتی

اور ہم دونوں بحث کو ادھورا چھوڑنے پر اظہار خیال کئے بغیر خاموش ہو جاتے ۔ اور پھر ہمارے دلوں میں سمنہ کی موجودگی کا احساس بڑھتا ۔ بڑھے جاتا ۔ حتٰی کہ تمام کمرا سمنہ سے بھر جاتا ۔ پھر نہ جانے کیوں سمنہ ہماری خاموشی پر مضطرب ہو جاتی تھی ۔ شاید وہ یہ محسوس کرتی ہو کہ ہماری خاموشی اس کی وجہ سے ہے ۔ بہر حال وہ رونے لگتی ؟ اور اس کی آواز سن کر ہمیں تسلی ہو جاتی کہ وہ محض بچی ہے ۔ پھر ہمیں اطمینان ہو جاتا ۔

دو سال کے عرصہ میں سمنہ نے صرف چار ایک باتیں سیکھی تھیں ۔ ممکن ہے وہ اس کے علاوہ اور باتیں بھی کرنا جانتی ہو ۔ مگر چونکہ فطری طور پر وہ تنہائی پسند اور کم گو واقع ہوئی تھی ۔ اس لئے شاید اس کی اور باتیں ہم نے سنی ہی نہ ہوں ؟

جب میں دفتر سے آتا تو دروازے میں داخل ہوتے ہی سمنہ کی آواز سنائی دیتی ابا کہتے وقت اس کا روئے سخن میری طرف نہیں بلکہ ماں بہن یا بھائی کی طرف ہوتا تھا ۔ جیسے وہ انہیں میری آمد کی اطلاع دے رہی ہو ۔ ابا کہنے کے بعد وہ دیوار کی طرف منہ موڑ کر مسکراتی اور مسکرائے جاتی ۔

یا جب کبھی میں گھر پر کام میں اس قدر مصروف ہوتا کہ سمنہ کی موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ ہو جاتا تو آہستہ آہستہ اُس کی آواز ابھرتی "ابا، ابا، ابا، ابا" اور وہ مسلسل طور پر ابا ابا کہے جاتی ۔ تا وقتیکہ میں اس کی طرف نہ دیکھتا یا اسے جواب نہ دیتا ۔ لیکن جونہی میں اس کی طرف دیکھتا وہ شرما جاتی اور منہ موڑ لیتی ۔ اگر اس کی ماں یا میں سمنہ کی طرف غور سے یا ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے تو وہ چڑ جاتی اور غصے میں چلاتی ۔ "نہ کر"۔

ثریا اور جاجی کی نگاہوں سے وہ قطعی طور پر نہ گھبراتی تھی ۔ اس لئے انہیں دیکھنے سے منع کرنے کی اسے ضرورت نہ پڑتی تھی ۔ لیکن اپنی امی اور میری نگاہوں کو گویا وہ برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ اور اس بات پر اکثر چڑ کر روٹھ جاتی تھی ۔ بہر حال اس کے سوا اس نے کبھی کوئی اور بات نہ کی تھی ۔

ہاں ! ان باتوں کے علاوہ وہ اکثر بسکٹ مانگا کرتی تھی ۔ اور اگر اسے کسی وقت بسکٹ کا خیال آ جاتا تو وہ حسب عادت "بچھی، بچھی، بچھی" کہے جاتی اور

اس وقت تک ببچھی کی رٹ بند نہ کرتی جب تک اسے بسکٹ نہ مل جاتا ۔ لیکن جب تک وہ ایک بسکٹ اپنے بھائی اور بہن کو نہ دے لیتی خود نہ کھاتی ۔

سمنہ کی پرورش پر ہم نے خصوصی توجہ نہ دی تھی ۔ خصوصی توجہ کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ کیونکہ ہمارا گھر عام سے اوسط درجے کا گھرانہ ہے ۔ جہاں بچوں کی پرورش نہیں کی جاتی ؟ بلکہ جہاں بچے پل جاتے ہیں ۔ جہاں بچوں کو کپڑے نہیں پہنائے جاتے ؟ بلکہ ان کا تن ڈھانپا جاتا ہے ۔

سمنہ بھی ہمارے گھر میں پل رہی تھی ۔ اور اسی طرح دو سال کی ہو چکی تھی ۔ اس کی ماں کسی وقت حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی اور مجھے کہتی "دیکھو تو ذرا سمنہ کی طرف ، یہ تو پل گئی ہے" اور پھر ہم دونوں اس کی طرف دیکھتے اور وہ چلانے لگتی ۔ "نہ کر ۔ نہ کر"۔

ہمارے ہاں چار ایک بچے ہوئے تھے اور وہ سب یونہی گھر میں پل گئے تھے ۔ ایک دو فوت بھی ہو چکے تھے ۔ چار ایک دن ان کی ماں نے آنسو بھی بہائے ، ان کے کپڑے جوتے اور کھلونے سامنے رکھ کر وہ روتی بھی رہی تھی ۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ خاموش ہو گئی تھی ۔ اور پھر نئے بچوں کو کلوٹ باندھنے اور اُن کے لئے دودھ کی بوتل تیار کرنے میں مصروف ہو گئی تھی ۔

گھر میں سمنہ کی کوئی خصوصی حیثیت نہ تھی ۔ اس کے منہ پر بھی باقی بچوں کی طرح مَیل لگا رہتا تھا ۔ اس کے گرد بھی موٹے اور بھدے کپڑے لپٹے رہتے تھے ۔ اور وہ بھی کونے میں بیٹھ کر روتی رہتی اور یا توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لئے امی امی امی ۔۔۔ کی مسلسل رٹ لگائے رہتی اور یونہی وہ پلتی گئی ۔۔۔ اور پھر وہ ایک دن دفعتاً مر گئی ۔

اس کی موت کی تفصیلات معمولی اور مختصر تھیں ۔

موسم سرما میں وہ ایک رات دفعتاً رونے لگی "ببچھی ببچھی ببچھی" ۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی بسکٹ نہ تھا ۔ پہلے تو ہم نے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ بسکٹ لائے بغیر چارہ نہیں ۔ کافی رات جا چکی تھی پھر بھی مجھے امید تھی کہ بسکٹ کہیں نہ کہیں سے مل جائیں گے ۔ میں اُٹھ بیٹھا ۔ "میں جاؤں گا"۔

جب میں باہر جانے لگا سمنہ چلائی "ابا" میں رک گیا ۔ میں نے کہا بیٹی میں بسکٹ لانے جا رہا ہوں ۔ دوبارہ میں دروازے کی طرف بڑھا تو وہ پھر چلائی ۔۔۔ "ابا" نہ جانے کیوں ۔ میں پھر رک گیا میں سمجھا وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے ۔ حالانکہ میں عام طور پر چھوٹے بچے کو بازار نہیں لے کر جاتا ۔ میں نے اسے اٹھا لیا ۔ وہ خاموش ہو گئی ۔ اور ہم دونوں بسکٹ لینے کے لئے چلے گئے ، ٹرنکوں والا بازار بند تھا ۔ اردو بازار بند تھا ؟ بوہڑ بازار بند تھا ؟ راجہ بازار میں دو دو کانیں کھلی تھیں اور وہاں سے بسکٹ مل گئے ۔ سمنہ اور میں واپس آگئے ۔

اگلے روز وہ بیمار پڑ گئی ۔ ڈاکٹر نے کہا نمونیہ ہے ۔ اس کی ہدایات کے مطابق دوائی دی گئی ۔ رات کو برانڈی کی خاطر ہم نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے ۔ ایک شیشی مل گئی ۔ رات کو سمنہ کی سانس اکھڑ گئی ۔ اس کی ماں اور میں دونوں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہے اور صبح چار بجے اس نے آخری ہچکی لی ۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ۔ اس کی ماں نے میری طرف دیکھا ۔ میں نے سر جھکا لیا ۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر بہہ گئے اگلے روز دس بجے تک ہم اسے دفنا آئے ۔

واپس آئے تو اس کی ماں رو رہی تھی ۔ میں نے کہا سعیدہ روؤ نہیں ۔ اس نے سر اٹھایا "تو کیا کروں" میں نے جواب دینا چاہا مگر کیا جواب دیتا ۔

اگلے روز وہ پھر رو رہی تھی میں نے کہا کب تک روؤ گی ؟

اُس نے آہ بھری اور کہا جب تک ، جب تک ۔۔۔ اور خاموش ہو گئی جیسے اسے معلوم نہ ہو کہ کب تک ۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی ۔ بوجھل خاموشی ۔

پھر وہ کہنے لگی "مجھے یقین نہیں پڑتا ہے کہ وہ مر گئی ہے ۔"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ میں نے کہا اور خود دفتر کام کرنے کے لئے چلا گیا ۔ اور دفتر سے واپس آیا تو دروازے میں داخل ہوتے ہی میں رک گیا ۔ گویا اپنی آمد کا اعلان سننا چاہتا تھا ۔ لا حول ولا قوۃ ۔ میں نے چپکے سے اپنی جذبات پرستی کو کوسا ۔

رات کو پھر سے ہماری بحث شروع ہو گئی ۔ میں نے سعیدہ سے کہا بے وقوف نہ بنو یہ صبح و شام کا رونا اچھا نہیں ۔ "بے وقوف نہ بنو" مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ مشورہ میں اپنے آپ کو دے رہا تھا ۔ اس کے باوجود میں اسے مشورے دیئے جا رہا تھا ۔ اسے سمجھا رہا تھا ۔ بحث کے دوران ہم دونوں نے بیک وقت اس کونے کی طرف غور سے دیکھا جہاں سمنہ بیٹھی ہوتی تھی اور دونوں چپ ہو گئے ۔

دو ایک ساعت کے لئے میں خاموش رہا پھر میں نے شدت سے اپنی حماقت کو محسوس کیا اور لا حول پڑھ کر پھر سے بحث چھیڑنے کی کوشش کی ۔ لیکن میرے دل میں خواہ مخواہ یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ کونہ خالی ہے ۔ وہاں ایک خلا ہے ۔ وہ خلا بڑھنے لگا ۔ وہ خلا چھائے جا رہا تھا ۔ ہم سب کو اپنی آغوش میں لئے جا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے ہمیں یہ احساس دلانے والا کوئی نہیں کہ ہم دونوں بے وقوف ہیں جو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں ۔ میں لکچر دیئے جا رہا تھا ؟ وہ میرے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ جیسے میرے زبانی جمع خرچ کے باوجود سمجھ رہی ہو ۔ یک لخت مجھے احساس ہوا کہ وہ میری بات نہیں سن رہی بلکہ مجھے عجیب نگاہوں سے گھور رہی ہے ۔ میرا جی چاہا کہ میں چلّا کر کہوں ۔ نہ کر ۔ اچھا۔ میں نے کھسیانے ہو کر کہا "نہیں مانتی تو نہ سہی ۔ رو ۔ رو ۔ روتی رہ ۔ ہم جا رہے ہیں ۔ گھومنے پھرنے کے لئے ۔ اور میں باہر چلا گیا اور سڑکوں پر گھومتے ہوئے سوچنے لگا ۔ اب میں کیا کروں ۔ کہاں جاؤں ۔

سمنہ کے مرنے کے بعد جلد ہی ہم نے وہ مکان بدل لیا تاکہ اس کونے سے مخلصی ملے اور نئے مکان میں جا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ وہاں وہ کونہ نہ تھا ۔

سمنہ کو مرے ہوئے پندرہ دن گذر گئے ۔ ایک مہینہ گذر گیا اور گھر کے کونوں کے خلا آہستہ آہستہ پر ہوتے گئے ۔ دفتر سے واپسی پر میں اپنی آمد کے اعلان کی ضرورت سے بے نیاز ہوتا گیا ۔ اور آپس میں بحث کرتے ہوئے دفعتاً چپ ہونے کی عادت سے ہم مخلصی پاتے گئے ۔ یوں آہستہ آہستہ سمنہ ہمارے گھر سے خارج ہوتی گئی ۔ خارج ہو گئی ۔ اب سمنہ کی صرف ایک یادگار باقی رہ گئی

تھی ۔ ہر جمعرات کے دن ثریا اور جاجی بسکٹوں کا ایک پیکٹ بغل میں دبا لیتے ۔ ہاتھ میں دودھ کی گڑوی اٹھا لیتے اور باہر نکل جاتے ان کی ماں صحن میں چوکی پر بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرتی اور وہ واپس آ کر غصے میں چلاتے "امی کوئی بچہ بھی تو دودھ نہیں پیتا ۔ بسکٹ وہ کھا لیتے ہیں مگر دودھ نہیں پیتے ۔ امی وہ سمنہ کا دودھ کیوں نہیں پیتے ۔ امی وہ بسکٹ لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں ؟ جیسے جیسے اِن بسکٹوں میں کچھ پڑا ہو ۔ اور امی کی آنکھیں بھیگ جاتیں ۔ اور وہ انہیں گڑوی دے کر پھر سے باہر بھیج دیتیں "تم جاؤ تو شاید کوئی بچہ پی لے" اور خود رونے لگتی ۔

سمنہ کا چالیسواں بھی ہو گیا اور وہ بسکٹ اور دودھ کی بات بھی ختم ہو گئی ۔

دو ماہ گزر گئے اور ہمارے ذہن سے سمنہ کا خیال قطعی طور پر نکل گیا۔

ایک روز میں کسی معمولی شکایت کی وجہ سے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے چلا گیا ۔ ڈاکٹر حسب معمول بڑی بشاشت سے مریضوں کی دکھ بھری آپ بیتیاں سن رہا تھا ۔ جیسے وہ کہانیاں بے پناہ دلچسپی کا باعث ہوں ۔ میں نے اخبار اٹھا لیا ۔ اور پڑھی ہوئی خبروں کو ازسرنو دیکھنے لگا ۔

نمونیہ ہے تو کیا ہوا ۔ گھبراؤ نہیں ابھی پنسلین کا ٹیکہ لگا دیتا ہوں ۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا نمونیہ کا کیا ہے"۔

ڈاکٹر کی بات سنتے ہی میری نگاہوں تلے اخبار کے الفاظ گڈ مڈ ہو گئے ۔ میں نے سر اٹھایا کمرے میں سب اشکال دھندلی پڑتی جا رہی تھیں ۔ میں اٹھ بیٹھا ۔ ہسپتال سے باہر نکل گیا ۔ بازار اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا ۔ سیاہ پانی پر بھدی اشکال تیر رہی تھیں ۔

کوئی بھیانک ہنسی ہنسا "نمونیہ کا کیا ہے" میری آنکھوں میں گویا خون اتر آیا ۔ اور میں بھاگا سامنے سے تانگا چلا آتا تھا ۔ گھوڑا یوں مجھے دیکھ رہا تھا ۔ جیسے میں ہی اس کا مطمح نظر تھا ۔ میں لپک کر ایک طرف ہو گیا ۔ اور لیٹر بکس کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔ دیوار پر سینما کا پوسٹر لگا تھا ۔ خونی کپتان ۔ خونی ۔ خونی ۔ سُرخ حروف پھیلتے جا رہے تھے ۔ میں نے گھبرا کر نیچے دیکھا ۔ تصویر میں کپتان تلوار سنبھالے کھڑا تھا ۔ میں نے محسوس کیا گویا تلوار سے خون کے

قطرے گر رہے ہوں ۔ ٹپ ٹپ ٹپ میں نے گھبرا کر نیچے دیکھا لیٹر بکس خون آلود ہو رہا تھا ۔ میں بھاگا۔

"ابا ۔۔۔" بچے کی آواز سن کر میں رک گیا "آؤ آؤ میں نے دونوں ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیئے "کہاں ہے تمہارا ابا" بچہ رونے لگا ۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ سب میری طرف گھور رہے تھے ۔ سبھی بوڑھے جوان جیسے میں مجرم تھا ۔ میں اٹھ کر بھاگا ۔۔ "خونی خونی" وہ لاؤڈ سپیکر لئے ڈھونڈ رہے تھے اور میں بھاگا جا رہا تھا۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میرے کپڑے لت پت ہو رہے تھے عجیب سی بو آ رہی تھی ۔۔۔ خون کی بو۔

سعیدہ صحن میں چوکی پر بیٹھی ہاتھ مل رہی تھی ۔ اماں کھڑکی کے پاس دیوار سے سہارا لگائے کھڑی تھی ۔ جاجی اور ثریا چپ چاپ سن رہے تھے ۔ "آ گئے" سعیدہ نے میری طرف دیکھ کر کہا ۔ "مجھے سب پتہ چل گیا ہے" یہ سن کر میرے کپڑے اور بھی گیلے ہو گئے ۔ بو اور بھی تیز ہو گئی۔

"پتہ چل گیا ہے؟" میں نے دہرایا ۔ میری نگاہوں میں وہ سب دھندلے پڑنے لگے "ہاں" وہ بولی ۔۔ وہ مری نہیں ۔ بھلا یوں بھی مرتا ہے کوئی ، رات کی رات میں مر جانا ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ مری نہیں ۔ اور پھر بچوں نے سمنہ کے بسکٹوں کو منہ نہیں لگایا ۔ اور دودھ تو کوئی پیتا ہی نہ تھا ۔ صاف تو ہے لوگ اس کی چیز کیسے لیں جو مری نہ ہو ۔۔۔ دیکھتے کیا ہو ۔۔" وہ مجھے کھوئے ہوئے دیکھ کر بولی ۔۔۔ "وہ مجھ سے آپ کہہ کر گئی ہے آپ سمنہ "۔

میں نے گھبرا کر اماں کی طرف دیکھا ۔ اماں سہمی ہوئی کھڑی تھی ۔ بولی "ذرا آنکھ لگ گئی تھی سعیدہ کی ۔ ابھی آدھ گھنٹے کی بات ہے پھر یہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی"۔

"میں نے خود دیکھا ہے ان آنکھوں سے ۔ سوئی ہوئی تو نہ تھی میں ۔ اُس کونے میں بیٹھی تھی وہ ۔ وہاں" سعیدہ رونے لگی ۔

"ابا ۔۔۔" جاجی کی آواز سن کر میں چونکا "امی کہتی ہیں ہم سمنہ کی قبر پر

جائیں گے ۔

"ہاں میں تو جاؤں گی ابھی" وہ اٹھ بیٹھی ۔ چاہے میرے ساتھ کوئی چلے نہ چلے ۔ اماں چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لی ۔ جاجی اور ثریا خاموشی سے چل پڑے ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ میں چلا کر کہوں تم پاگل ہو ۔ لیکن میرے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا اور وہ قافلہ چپ چاپ باہر نکل گیا ۔

پاگل ۔ میرے منہ سے چیخ سی نکلی ۔ پڑوسی کا کتا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔

'پاگل پاگل'

دیواریں میری طرف دیکھ رہی تھیں ۔ کھڑکیاں منہ چڑا رہی تھیں ۔ گھر بھر کے کونے کمروں سے نکل کر باہر آ گئے تھے ۔ خالی کونے ؟ خلا ؟ دروازے نے اپنے جبڑے کھول دیئے ۔ پانی کی مٹکی پھولنے لگی "پاگل پاگل" ۔میں نے اپنے آپ سے کہا ۔ اب کی بار کتے نے قہقہہ لگایا۔

"ابا ابا ابا ابا ۔۔۔۔" چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں اور میں گھبرا کر قبرستان کی طرف بھاگا۔

سعیدہ سمنہ کی قبر کے سرہانے بیٹھی تھی ۔ جاجی جھک کر آوازیں دے رہا تھا "سمنہ سمنہ" اماں بڑی سنجیدگی سے کھڑی سمنہ کا جواب سننے کی کوشش کر رہی تھی ۔ ثریا چپ چاپ کھڑی تھی ۔

"وہ ضرور جواب دے گی" سعیدہ نے کہا ۔ "اماں تم آواز دو جاجی کی آواز سمنہ تک نہیں پہنچتی ۔" اماں جھکی "سمنہ" اس نے پکارا۔

غصے سے میں بھوت بن گیا۔آگے بڑھ کر میں نے اُن کی طرف دیکھا "تم سب پاگل ہو" ۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا ۔ لیکن غصے میں دیکھنے کے علاوہ اور میں کچھ نہ کر سکا ۔ پھر میں نے خاموشی سے بازو اٹھایا اور ان کے روبرو جا کھڑا ہوا اور پھر غصے میں میری آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ۔ اور گھر کی طرف انگلی کر کے میں نے انہیں واپس جانے کے لئے اشارہ کیا۔

وہ سب مجھے دیکھ کر ڈر گئے اور چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑے ۔ اماں نے سعیدہ کو سہارا دے رکھا تھا ۔ جاجی اور ثریا ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چپ چپ جا رہے تھے ۔

دفعتاً میں بیٹھ گیا ۔ سمنہ کی قبر کے سرہانے بیٹھ گیا ۔ جھکا اور میں نے بے ساختہ آواز دی ۔ سمنہ ۔ سمنہ ۔ اور پھر خاموش ہو کر اس کا جواب سننے لگا۔

..........O..........

گوبر کے ڈھیر

اسے دیکھ کر سڑک کے موڑ پر سائیکل سوار نوجوان رک گیا ۔ اس نے دونوں پاؤں زمین پر ٹیک دیئے اور پھر اتر کر یوں سائیکل کی طرف دیکھنے لگے جیسے چلتی چلتی بگڑ گئی ہو ۔ ۔ وہ نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔ اور پھر حسب معمول گہناں سے بات کر کے ہنسنے لگی ۔ یہ کوئی پہلا موقعہ نہ تھا ۔ اکثر نوجوانوں کی سائیکلیں چلتے چلتے بگڑ جایا کرتی تھیں ۔ پیدل چلنے والے یا تو دفعتاً وہاں رک جاتے یا ان کی چال مدہم پڑ جاتی ۔ وہاں پہنچ کر کوئی مونچھ مروڑنے لگتا کوئی آنکھیں چمکاتا ۔ کوئی گھبرا کر اپنے ساتھی کو کہنی مارتا ۔ کوئی بآواز بلند گانے لگتا ۔

"ہمیں چھوڑ کے چلے تو نہیں جاؤ گے ؟ دل توڑ کے" اور سروری ایک انداز بے نیازی سے گہناں سے باتیں کرتے ہوئے ہنسے جاتی ۔

اس وقت سروری کے احساسات عجیب سے ہوتے تھے ۔ جیسے وہ قوس وقزح کے رنگین جھولے پر بیٹھی ہو ۔ جیسے وہ کسی پہاڑی ندی کی طرح رقص کئے جا رہی ہو اور ڈھلان پر اگے ہوئے درخت جھک جھک کر اس کی طرف دیکھ رہے ہوں ۔

پھول مسکرا رہے ہوں ۔ ٹہنیاں اشارے کر رہی ہوں ۔ جھاڑیاں سر جوڑ کر اس کے متعلق باتیں کر رہی ہوں ۔ اور کائنات اس کے مبہم اشارے کی منتظر ہو ۔

ان مبہم احساسات پر اس کی آنکھیں مستی سے ڈولتیں ۔ ہونٹوں کے خم میں سے تبسّم جھانکنے لگتا ۔ اور باہیں پھولدار شاخوں کی طرح جھولتیں ۔

"سروری ۔ سروری ۔"

ماں کی آواز سن کر وہ چونکی ۔

"بیٹی کپڑے پہن لو"۔ نیچے صحن سے آواز آئی ۔ "سنا تم نے"
اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کافور ہو گئی ۔ اور اس نے گوبر کی بو کا ایک ریلا محسوس کیا ۔ سڑک اس کی نظر میں دھندلی پڑ گئی۔

رنگوں کا وہ جھولا ٹوٹ کر لٹکنے لگا ۔

اس نے ہاتھ سے اپنا سینہ تھام لیا ۔

"جواب نہیں دیتی" ماں کی آواز ملائمت سے خالی ہو چکی تھی ۔

"سن لیا ہے"۔ گہناں نے سروری کو خاموش دیکھ کر جواب دیا۔

"کہاں گئی ہے" اماں غرائی ۔

"اوپر گئی ہے" گہناں بولی ""جواب تو دے دیا کر" سروری سے مخاطب ہو کر اس نے مدہم آواز میں کہا ۔

"سن تو لیا ہے" ۔ وہ چڑ کر چلائی ۔ اور پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر گہناں کے پاس بیٹھ گئی ۔

گہناں تیوری چڑھا کر بولی "کیا ہو جاتا ہے تجھے ؟ مری کیوں جاتی ہے ؟"

"روز کی مصیبت" سروری نے منہ بنایا۔

گہناں بولی ۔ "یہیں تو جانا ہے محلے میں۔"

سروری نے یوں ہونٹ بسورے جیسے کوئی جونک منہ پھاڑ رہی ہو ۔

"ہونہہ نخرو ۔" گہناں نے ناک چڑھائی ۔

نہ جانے اماں کے منہ سے "کپڑے پہن" سن کر سروری کو کیا ہو جاتا تھا ۔ دفعتاً اس کی تمام رنگینی اور لطافت ختم ہو جاتی ۔ اس کے دل پر کسی بے نام خوف کا بوجھ پڑ جاتا ۔ اور اس کا جی چاہتا کہ کپڑے پہننے کی بجائے کسی کونے میں چھپ کر رو دے ۔ اس وقت اس کے دل میں ماں کے خلاف شدید جذبہ بیدار ہو جاتا ۔ اماں ! نفرت سے اس کا دل کھولنے لگتا ۔ اور اس کی نظر میں ماں یوں دکھائی دیتی جیسے کوئی ڈائن ہو ۔ اس وقت اس میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے ۔ اماں سے دور ۔ جہاں کوئی ٹانگے والا آ کر دروازہ نہ کھٹکھٹا سکے ۔ اور جہاں اماں کی وہ جونک سی ملائم آواز "کپڑے پہن لے" سنائی نہ دے ۔ اس وقت اس کی نگاہ سامنے مکان کی ڈیوڑھی پر مرکوز ہو جاتی ۔ جہاں

وہ داڑھی والا معزز آدمی رہتا تھا ۔ جو روز رات گئے سر جھکائے ہوئے گلی میں سے گزرتا تھا ۔ اور پھر اپنے دروازے پر پہنچکر گہری آواز میں پکارتا ۔ سرور ۔ اس کی آواز سن کر سروری کا دل ڈوب جاتا ۔ لیکن جلد ہی وہ اس "ابھرتی لہر" سے چمٹ کر تیرنے لگتی ۔ اور محسوس کرتی جیسے وہ کنارے سے جا لگی ہے محفوظ ہو گئی ہے ۔ اماں کا وہ مکان اس کی نگاہ میں ایک طوفانی بھنور نظر آنے لگتا ۔ جس کے سامنے اس پڑوسی کی ڈیوڑھی ساحل کی طرح پھیل جاتی اور وہ ساحل اس کی طرف رینگنے لگتا ۔ قریب اور قریب اور قریب ۔ سروری کا جی چاہتا کہ وہ اس رینگتے ہوئے ساحل سے چمٹ جائے ۔ اور اس "کپڑے پہن لو" کے طوفان سے محفوظ ہو جائے ۔ اس معزز پڑوسی کو دیکھ کر سروری کے دل میں گذشتہ واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ۔

مادھو پور کے قریب پہاڑی کی سرسبز ڈھلوان پر وہ چھوٹا سا گاؤں اور گارے سے لپا ہوا وہ وسیع مکان ۔ جس میں ایک طرف بیل بندھے ہوتے اور صحن میں اس کی اپنی بکری ، جس کے ارد گرد مرغیاں دانے دُنکے کریدنے میں لگی رہتیں ۔ ادھر دو کوٹھڑیوں میں وہ خود رہتے تھے ۔ ابا، اماں ، بھائی اور وہ خود ۔ باہر دور تک سر سبز کھیت پھیلے ہوئے تھے ۔ جن میں دھارا بہتا ہوا چلا جاتا تھا ۔ اُدھر ٹیلے پر پکی سڑک سفید فیتے کی طرح دور تک بل کھاتی ہوئی چلی جاتی تھی ۔ جس پر سائیکل سوار آتے جاتے رہتے تھے لیکن اس موڑ پر ان کی سائیکل ذرا نہ بگڑتی تھی ۔ نہ وہ پاؤں زمین پر ٹیکتے اور نہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ۔ راہگیر رکے بغیر اپنی راہ چلتے رہتے اور وہ دور تک انہیں جاتے دیکھتی رہتی اور پھر اکتا کر صحن میں اپنی بکری کے پاس جا کھڑی ہوتی اور مرغیوں کو بکری سے دور ہٹانے میں مشغول ہو جاتی ۔

"سروراں" اس کے باپ کی گہری بھرپور آواز سنائی دیتی ۔ اس کا دل کسی نامعلوم ڈر سے ڈوب جاتا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ بے حس و حرکت کھڑی رہتی اور پھر سر جھکائے چپ چاپ باپ کے پاس جا کھڑی ہوتی ۔ اور پھر باپ کی بات سننے کے بعد واپس اسی جگہ آ کر سڑک پر چلتے ہوئے راہ گیروں کو دیکھنے میں کھو جاتی ۔

"سروراں" ماں کی آواز سن کر یوں بے پروائی سے کھڑی رہتی جیسے کسی نے بلایا ہی نہیں ۔ "سروراں ۔ اب تو تنور میں اپلے ڈالے گی یا نہیں" ماں دور بیٹھی چیختی رہتی ۔ لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا ۔ حتیٰ کہ وہ آکر اسے بازو سے پکڑ لیتی ۔ "کام بھی کرے گی یا سارا دن یہیں کھڑی رہے گی ۔"

"ماں میں کپڑے پہنوں گی" ۔ وہ بسورنے لگتی ۔

"کپڑے پہنے گی ۔ ذرا شکل تو دیکھ اپنی ۔ چل" ماں اس کی کمر میں ایک لات دیتی اور وہ بسورتی ہوئی چلی جاتی ۔

"کیوں روتی ہے" اندر سے ابا کی آواز آتی ۔

"کہتی ہے نیا کرتہ پہنوں گی ۔ صورت تو دیکھ ذرا ۔ کام نہ کاج ۔۔۔ کپڑے پہنوں گی" ماں چلانا شروع کر دیتی ۔

ابا داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آجاتے ۔ "اب تو چھوڑ بھی اسے" اور سروری بھاگ کر ابا کے مضبوط بازوؤں میں لٹک کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ۔ اس زمانے میں اسے کپڑے پہننے کا کس قدر شوق تھا ۔ جی چاہتا تھا روز نئے کپڑے پہنے لیکن اس کی اپنی ماں اس بات پر اسے پیٹتی رہتی تھی ۔ اس زمانے میں اسے معلوم نہ تھا کہ کپڑے پہننے کا کیا مطلب ہوتا ہے ۔ لیکن اب وہ جانتی تھی ۔ وہ ماں کتنی اچھی تھی ۔ اسے اب معلوم ہوا تھا ۔ اس وقت تو وہ اسے کوستی رہا کرتی ۔ اب یہ اماں ۔ یہ ڈائن "کپڑے پہن لے بیٹی" ۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں بجنے لگتیں ۔ دور گلی میں وہ داڑھی والا معزز آدمی ۔ چوڑے سینے پر سیاہ نوک دار داڑھی تھامے آہستہ آہستہ چلا آتا ۔ کس قدر آہستہ رفتار سے آتا تھا ۔ سروری کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اس کی باہوں میں لٹک جائے ۔ اور اپنے آپ کو کپڑے پہننے سے محفوظ کر لے ۔

پھر ماں نے کہنا شروع کیا تھا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے ۔

"جوان ہو گئی ہے اپنی سروری" ۔

"اے ہے تمہیں اپنی سروری کا بھی فکر ہے کچھ"

"لو گھر میں بیٹی جوان ہو رہی ہے اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں"

"میں کہتی ہوں کہ لڑکی کے کپڑے لتے کی فکر کرو کچھ" ۔

پہلے تو ابا کھنکار کر چپ ہو جاتے ۔ پھر وہ "اہم" کہہ کر داڑھی کو ہاتھ میں لے کر سوچنے لگتے اور بالآخر مدہم آواز میں ماں سے باتیں کرنے لگتے ۔ سروری حیران تھی کہ آخر اسے کیا ہوا تھا ۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا ۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی تنور میں اپلے ڈالتی تھی ۔ مرغیوں کو روٹی کھلاتی تھی ۔ اور منڈیر پر کھڑی ہو کر سڑک پر چلتے راہ گیروں کو تکتی رہتی تھی ۔ جوان کہاں ہوئی تھی ۔ خواہ مخواہ ماں نے پاکھنڈ مچا رکھا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ماں سے یہ بات سن کر اس کے دل میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ۔ ابا کے سامنے جاتی تو بے سوچے سمجھے ایڑیاں اٹھا کر چلتی ۔ اور ماں کے سامنے اس کا سینہ آپ ہی آپ ابھر جاتا ۔ نہ جانے کیوں ۔

اُسے معلوم نہ تھا کہ جوان ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔ لیکن اسے جوان ہونے کی بڑی خواہش تھی ۔ جوان ہو کر سبھی لڑکیاں ایسے اچھے اچھے کپڑے پہنا کرتی تھیں ۔ ہاتھوں پر مہندی لگایا کرتی تھیں ۔ گاؤں کے لڑکے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا کرتے اور وہ شرما کر چھپ جایا کرتیں ۔

سروری کا بھی جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کی طرف یوں مسکرا کر دیکھے اور وہ شرما کر چھپ جائے لیکن اس کی طرف کوئی نہ دیکھتا تھا ۔ حالانکہ وہ بار بار شرما کر چھپ جاتی تھی ۔ لیکن ایسے شرمانے سے فائدہ جب کوئی دیکھنے والا ہی نہ ہو ؟ ماں نے تو خواہ مخواہ شور مچا رکھا تھا "جوان ہو رہی ہے ہونہہ!" اپنی کنیزاں کتنی جوان تھی ۔ سبھی اس کی گلی سے گزر کر کھیتوں کو جاتے تھے ۔ اور کنیزاں کے پاس پہنچکر رک جاتے ۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس زمانے میں ان کے اپنے مکان کے ساتھ چلتی سڑک کے موڑ پر ہر کوئی رک جاتا تھا۔

اس زمانے میں اسے کس قدر شوق تھا کہ چلتے پھرتے لوگ اس کی طرف دیکھ کر رک جائیں ۔ اب بھی اسے اس بات پر کس قدر مسرت ہوتی تھی ۔ اگرچہ وہ اب شرمانے کی بجائے مسکرایا کرتی تھی ہنس ہنس کی باتیں کیا کرتی تھی ۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی طرح کھڑکی میں کھڑی رہے اور راہ چلتے لوگ اس کی طرف دیکھ کر ٹھوکریں کھاتے رہیں ۔ ان کا منہ حیرانی سے کھل جائے ۔ آنکھوں سے مسکراہٹ ٹپکے ۔ ہونٹ ہلیں ۔ سائیکل رک جائے ۔ اور پھر یہاں

تو شہر کے لوگ ٹھوکریں کھاتے تھے ۔ سوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے کالج کے لڑکے ۔ سفید پتلون پہنے بابو ۔ اچکن میں ملبوس پھرتیلے نوجوان ، جانے یہ لوگ ٹھوکریں کھانے کے سوا اور کچھ کر بھی سکتے تھے یا نہیں ۔ ہر مرتبہ جب وہ کپڑے پہن کر ٹانگے میں سوار ہو کر جاتی تو اس کو ایسا لگتا کہ ٹھوکریں کھانے والوں میں سے کسی ایک کو ملنے جا رہی ہے ۔ اس کا دل شوق سے دھڑکتا ۔ مگر یہ اس زمانے کی بات تھی جب وہ نئی نئی اماں کے گھر آئی تھی ۔ اب تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ منزل پر پہنچ کر اس سے کون ملے گا ۔ جونک کی طرح لٹکے ہوئے ہونٹ ، سرخ آنکھیں اور پھیلا ہوا گوبر کا ڈھیر اور بو. اف اس خیال کے آتے ہی اسے وہ دن یاد آجاتا جب بیٹھے بیٹھے گاؤں میں دفعتاً شور مچ گیا تھا ۔ وہ آ گئے وہ آگئے ۔ اور فضا میں پٹاخے پھٹنے کے ساتھ چیخ و پکار کی ایک قیامت بپا ہو گئی ۔ اور وہ اٹھ بھاگی تھی ۔ ننگے پاؤں کھیتوں میں ۔ اس پکی سڑک سے دور ۔ بہت دور ۔ پھر وہ اس گوبر بھرے گڑھے میں چھپی رہی تھی ۔ جس پر پھوس کی چھت پڑی تھی ۔

پہلے چار ایک گھنٹے تو وہ گوبر کے ڈھیر کے پیچھے چھپی رہی اور فضا میں چیخوں اور پٹاخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں ۔ پھر بھاری قدموں کی آواز سے ڈر کر وہ ایک ڈھیر میں گھس گئی ۔ پاؤں کی چاپ اس کے قریب آ پہنچی ۔ اور پھر آہستہ آہستہ مدہم ہو گئی ۔ لیکن وہ گوبر میں گھسی رہی ۔ صرف منہ کا ایک حصہ باہر تھا ۔ اس کے گرد چاروں طرف گوبر کا آسمان پھیلا ہوا تھا اور بُو بھری کائنات جس پر موت کا سا سکوت طاری تھا ۔ اگرچہ کبھی کبھار پٹاخوں کی آوازیں آتیں اور پھر ایک چیخ ۔ اور پھر وہی سکوت ۔ گوبر کا آسمان ، گوبر کی دیواریں ، گوبر کا دریا ، اور بُو میٹھی مدہم بو ۔

پھر وہ اس گوبر کے ڈھیر سے نکل آئی تھی ۔ اور گوبر کے ڈھیر کی دوسری جانب سے ایک ٹانگ نکل آئی تھی ۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا ۔ لیکن اس میں بھاگنے کی سکت بھی تو نہ تھی وہ دیوار سے چمٹ گئی ۔ گوبر کا وہ تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک واضح صورت اختیار کر گیا۔

"کالا" وہ چلائی ۔

کالا اسے دیکھے بغیر دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور کراہنے لگا ۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا

"پانی ۔ پانی۔" اس نے چلانا شروع کیا۔

سروری نے گاؤں کے بھنگی کالے کی طرف دیکھا ۔ اور پھر بے بسی میں ادھر ادھر پانی تلاش کرنے لگی ۔ اس کی بے تاب آنکھیں ۔ آہستہ آہستہ مایوس ہو کر بے حس ہو گئیں ۔ اور کالے کی اضطراب بھری کراہ ۔ مدہم گنگناہٹ میں بدل کر معدوم ہو گئی ۔ سکوت ۔ موت ۔ اندھیرا۔

چیخوں کی آواز سن کر وہ جاگ پڑی ۔ پاس ہی کوئی چیخ رہا تھا ۔ لوہے کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے ۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ "آگئے ۔ آگئے" کالے کی بھیانک آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں ۔ وہ گھسٹ کر اس کے قریب آگیا تھا ۔اور قریب اور بالآخر اس سے چمٹ گیا تھا ۔ پہلے تو اس نے کالے سے پرے سرکنے کی کوشش کی ۔ لیکن آخر وہ پتھر بن کر بیٹھ گئی ۔ آوازیں مدہم ہوتے ہوتے پھر بند ہو گئیں ۔

وہ جاگ پڑی ۔ دو کالے ہاتھ اس سے چمٹے ہوئے تھے ۔ جیسے دو سنپولیاں ۔ جسم کو جونک سی لگی ہوئی تھی ۔ دور بہت دور موت کراہ رہی تھی ۔ زندگی چلاّ رہی تھی ۔

سروری نے ایک خفیف سی جھرجھری لی ۔ اس کے علاوہ اس میں حرکت کرنے کی ہمت ہی نہ تھی ۔ کالا قریب تر ہوا جا رہا تھا ۔ نہ جانے ان ڈراؤنی آوازوں کو بھولنے کے لئے یا ٹانگ کے زخم کی شدید تکلیف سے بچنے کے لئے اور پھر دفعتاً اس کے اوپر ایک سیاہ سائبان سا تن گیا اور ایک آبنوسی کلہاڑا سا لپکا ۔ سروری کا دل خوف سے ساکت سا ہو گیا۔

پھر کیمپ میں وہ بوڑھا فوجی جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا ۔ جو کیمپ سے اس کے لئے راشن لاتا ۔ وہی بڈھا رات کے سناٹے میں خاموش زبان سے سروری سے تسلی اور ہمدردی کی بھیک مانگ رہا تھا ۔ حقارت سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ ایک اور کالا اپنے کسی چھپے ہوئے زخم کی تکلیف کو فراموش کرنے کے لئے ضد کر رہا تھا ۔ ایڑیاں رگڑ رہا تھا ۔ ایک

ساعت کے لئے گزشتہ یاد اس کے دل میں تازہ ہو گئی ۔ وہ کالا سیاہ تنا ہوا سائبان اور اس میں وہ آبنوسی ۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اس کا جسم یخ بستہ ہو گیا۔

پھر دو ایک بار وہی سائبان اور وہی جونک ، سنپولیاں اور گوبر کی بُو ۔ لیکن اب وہ اس بات سے قطعی بے نیاز ہو چکی تھی ۔ اب وہ اپنے پاکستان میں تھی ۔ جہاں پٹاخوں کی آواز آتی تھی نہ زندگی اور موت کی چیخ و پکار ۔ ہر کوئی اس سے ہمدردی جتاتا تھا ۔ ہر کوئی اس کی مدد کرنے کا خواہاں تھا ۔ اور پھر رات کے دھندلکے میں تاروں کی چھاؤں تلے کسی گوبر کے ڈھیر کے پاس اس سے ہمدردی کی بھیک مانگا کرتا تھا ۔ اور اپنے کسی دکھ کو مٹانے کی کوشش میں کسی جونک کا مُنہ اسے تلاش کرتا تھا ۔ اس وقت وہ گویا لکڑی کا ایک تختہ بن جاتی تھی ۔

کمپ کی نفسا نفسی میں صرف ایک بڑھیا تھی جو اس سے پیار کرتی تھی اور شہر سے اس کے کھانے کی چیزیں لایا کرتی تھی ۔ وہ بڑھیا اس سے کبھی ہمدردی کی طالب نہ ہوئی تھی ۔ اور سروری سمجھنے لگی تھی ۔ جیسے اس کی ماں پھر سے جی اُٹھی ہے ۔ اسی لئے وہ اسے اماں کہا کرتی تھی ۔۔۔۔ جبھی تو ایک دن اماں کے اصرار پر وہ ہمیشہ سے اس کی بیٹی بن کر اس کے ساتھ رہنے پر رضامند ہو گئی تھی ۔ جب وہ نئی نئی اماں کے پاس آئی تو اماں کی محبت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی ۔ اماں نے اس کے لئے کیسے اچھے اچھے کپڑے سلوائے تھے ۔اس کی حیرانی پر گہناں مسکراتی "واہ جیسے جانتی ہی نہیں" اور سروری کی سمجھ میں نہ آتا کہ گہناں کا مطلب کیا ہے ۔

پھر ایک روز ماں نے اسے نئے کپڑے پہنائے ،عطر لگایا ، بال بنائے اور پاؤڈر سرخی لگا کر تانگے میں بٹھا کر لے گئی ۔ وہی گوبر کا ڈھیر۔ میٹھی مدہم بُو ۔ اس روز اسے معلوم ہوا تھا کہ ماں بھی درحقیقت ایک جونک تھی ۔ ایک بوڑھی خرانٹ جونک ۔

اس روز جب وہ ڈری ہوئی لوٹی ۔ تو گہناں نے کہا بس اب چھوڑو بھی نخرے ۔ جیسے جانتی ہی نہ تھی ۔ بھولی بنتی ہے"۔

اس واقعہ کے بعد اس کا خواب ٹوٹ گیا ۔ اور وہ سوچنے لگی ۔ چاروں طرف کوئی بھی ایسا نہیں جو اسے گوبر کی بو سے بچا سکے ۔ ایسا کوئی بھی نہ تھا ۔ اسے ہر جگہ گوبر کا ڈھیر دکھائی دیتا ۔ جس میں سے کوئی نہ کوئی سیاہ جونک منہ نکالے اس کی طرف لپک رہی تھی۔

وہ اٹھی ۔ آسمان پر چاند ڈول رہا تھا ۔ یہاں وہاں افق کے قریب کالے بادلوں کے ٹکڑے عجیب لپکتی ہوئی شکلوں میں لٹک رہے تھے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے تمام عمر اسے یہیں رہنا ہے ۔ اسی مکان میں اماں کے پاس ۔ گوبر کے اس ڈھیر تلے ۔ وہ منڈیر کے قریب جا کھڑی ہوئی ۔ اس نے گلی میں دیکھا ۔ "کوئی ہے جو مجھے اس گوبر کے ڈھیر سے بچا سکے"۔

سامنے کوئی آرہا تھا ۔ مضبوط کشادہ جسم ۔ تراشی ہوئی داڑھی اور جھکاہوا سر ۔ جیسے مسجد سے آرہا ہے ۔ اس کے دل میں امید کی کرن چمکی "سرور" معزز پڑوسی نے اپنے دروازے پر دستک دی ۔

اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا جیسے اس نے آواز پہچان لی ہو لیکن چند ہی دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ اس کا پڑوسی تک پہنچنا بے حد مشکل ہے ۔

ان کا مکان محلے کے کونے پر بالکل تنہا تھا ۔ جس کے قرب و جوار میں کوئی مکان نہ تھا ۔ نزدیک ترین مکان اسی شخص کا تھا ۔ جو اس کے مکان کے متصل چار مکانوں کی جگہ چھوڑ کر مغرب کی طرف تھا ۔ ڈیوڑھی سے نکل کر وہاں تک پہنچنا تو ممکن ہی نہ تھا ۔ کیونکہ بڑی اماں یا تو ڈیوڑھی کو مقفل رکھتی ۔ اور یا خود وہاں چارپائی ڈال کر پڑ رہتی۔

پھر آہستہ آہستہ ریشمی کپڑوں ۔ پھولوں کے ہاروں ، عطر ، سفیدے اور سرخی نے اسے بھرما لیا اور راہ گیروں نے سڑک کے موڑ پر اسے دیکھتے ہوئے ٹھوکر کھا کر یا ساتھی کو کہنی مار کر یا سائیکل کو جھوٹ موٹ بگاڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔ اور اس کے دل میں نئی خواہشیں بیدار ہو گئیں ۔ اس کی مسکراہٹ رسیلی ہو گئی ۔ آنکھوں سے کنکھیوں سے باتیں کرنا سیکھ لیا ۔ اور چتونوں کے فن سے آشنا ہو گئی ۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی اماں کے حکم

سے وہ ٹانگے پر جاتی تو دفعتاً وہ تمام خوشبوئیں تمام کی تمام گوبر کا ڈھیر بن کر رہ جاتیں اور وہ جونک نما سائبان اور وہ بھیانک لپکتی ہوئی سنپولیاں ۔ اس کے بند بند میں کراہت اور درد کی لہریں اٹھنے لگتیں ۔

اس روز کپڑے پہنتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ایک خوفناک عزم جھلک رہا تھا ۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔

امّاں چلّائی "تو اب جلدی بھی کرے گی یا نہیں ۔ دیکھو تو کافی رات جا چکی ہے"۔

"ہو تو رہی ہوں تیار" ۔ وہ دانت پیس کر بولی ۔

"کب سے ہو رہی ہے تیار تو؟" پھر وہ گہناں سے بولی ۔ "گہناں ، پھولوں کے گجرے دیدیئے ہیں نا اسے ۔ وہ بابو پھول بہت پسند کرتے ہیں ۔ تو پہنا دے اسے ۔ اور دیکھ میں جاتے ہوئے باہر تالا لگا جاؤں گی ۔ یہاں پاس ہی تو جانا ہے ۔ابھی لوٹ آؤں گی ۔ سمجھی ۔"

جب اماں دروازہ بند کر کے تالہ لگانے میں مصروف تھی تو دفعتاً سروری کو محسوس ہوا کہ اس سے بہتر موقع نہ ملے گا ۔ اللہ کرے وہ معزز شخص آ نکلے ۔ اللہ کرے ۔ مگر گلی ویران پڑی تھی ۔ جانے وہ کہاں تھا ۔ اس کا دل سینے میں اچھلا ۔ سامنے اس کی ڈیوڑھی کھلی تھی۔

"اے ہے اس تالے کو کیا ہو گیا ؟" اماں بڑبڑا رہی تھی۔

وہ دبے پاؤں چل پڑی ۔ اور ایک جست لگا کر ڈیوڑھی میں جا پہنچی۔ ڈیوڑھی میں ایک طرف چارپائی کھڑی دیکھ کر وہ اس کے پیچھے چھپ گئی "شکر ہے میرے اللہ" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے ہے کہاں ہے تو" بڑھیا چلائی ۔ سروری سروری کہاں چلی گئی" بڑھیا کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔

سروری نے سانس بند کر لیا ۔"یا اللہ یا اللہ" اس نے چھت کی طرف دیکھا ۔ اماں کی آواز مدہم پڑتی گئی ۔ "ایک مرتبہ اس بڑھیا سے بچا لے مجھے" اس نے دعا مانگی "صرف ایک بار یا اللہ"

اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے اسے وہاں بیٹھے مہینوں گزر گئے ہیں ۔ ٹک ٹک

تک اندر سے گھڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی ۔ دھک دھک ۔ اس کا دل بج رہا تھا ۔

"اے ہے حد ہو گئی" ۔ بڑھیا کی آواز پھر سنائی دی ۔ سروری نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے ۔ بڑھیا کے پاؤں کی چاپ قریب آتی گئی ۔ قریب اور قریب ۔ دھک سے دروازہ بجا اور وہ دروازے میں آگئی ۔ "بابو جی ۔ اے بابو جی" سروری کا بدن تختہ بن چکا تھا۔

"کیا ہے" داڑھی والا معزز پڑوسی باہر نکل آیا ۔ "کیا ہے؟"

"لڑکی یہاں تو نہیں آئی؟"

"نہیں تو" ۔ وہ بولا۔

"عجیب بات ہے ۔ ابھی میرے ساتھ تیار ہوئی تھی ۔ جانے غلطی سے کونسی گلی میں مڑ گئی ۔

"یہاں تو نہیں آئی" ۔ وہ بولا۔

"میں سمجھی شاید ۔ پر تم فکر نہ کرو" بڑھیا نے اُس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ دیا ۔ اور مسکرانے لگی۔

"ابھی مل جائے گی ۔ جانا کہاں ہے اسے ۔ بڑی پیاری بچی ہے ۔ جانا کہاں ہے"۔

وہ ہنسا "ہاں بڑی پیاری"۔

"ابھی لاتی ہوں میں اسے ۔ دروازہ کھلا رکھنا۔"

"اچھا"۔

دفعتہً سروری نے محسوس کیا جیسے اس کا وہ تختہ سا جسم موم بن کر پگھل گیا ہے اور دھارے کی طرح بہہ رہا ہے ۔

گوبر کی بو کا ایک تیز ریلا آیا ۔ اُس نے دیکھا چارپائی کے پیچھے پاس ہی اپلوں کا ایک ڈھیر لگا ہے اور گوبر میں سے ایک آبنوسی جونک نکل رہی ہے ۔ ایک ساعت کے لئے وہ رک گئی ۔

پھر دیوانہ وار بڑھ کر اس نے گوبر کے ڈھیر کو آغوش میں لے لیا۔

ایک چیخ ابھری اور پھر قہقہہ ۔ ہی ہی ہی ہی ہی۔

"اے ہے تو یہاں ہے" ۔ بڑھیا اس کی طرف لپکی ۔ "یہ اچھا مذاق ہے"۔

"مذاق" پڑوسی اپنی داڑھی ہاتھ میں پکڑ کر مسکرایا۔

"مذاق ۔ ہی ہی ہی ہی" ۔ وہ دیوانہ وار ہنسی۔

اور پھر دھم سے پڑوسی کے چوڑے اور مضبوط جسم پر گر پڑی ۔ اس کے سر پر کالے سیاہ سائبان کی بجائے تارے چٹک رہے تھے ۔

اور گوبر کے بجائے فضا چنبیلی کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی ۔

............O...............

گڑیا گھر

گڑیا گھر

فہرست

گُڑیا گھر

سفید بنگلے پر ہُو کا عالم طاری ہے بنگلے کے نفیس سازوسامان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ۔ ریشمیں پردے جوں کے توں لٹکے ہوئے ہیں ۔ غالیچے ویسے ہی شوخ رنگ ہیں بنگلے کے افراد حسبِ معمول اس شو کیس میں کلدار گڑیوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی حرکات میں وہ روانی نہیں رہی ان کی مسکراہٹوں میں وہ نمائشی چمک نہیں رہی ۔ ان کے جملے تو وہی ہیں وہی چمکدار جملے لیکن ان میں وہ شوخی نہیں رہی ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کوئی افتاد آپڑی ہو جیسے سفید بنگلہ شیش محل کے محرابوں سے لڑھک کر غلام گردش میں آگرا ہو ۔

شام ہوتے ہی سفید بنگلے کے مکینوں پر تشویش کا عالم چھا جاتا ہے ۔ رات کو وہ ہر آہٹ پر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں ۔ اور ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں ۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھئے تو وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا اور بس ۔

فوضیہ سے پوچھئے تو اس کی آنکھیں دھندلا جائیں گی اور وہ دیوانوں کی طرح آپ کی طرف دیکھنے لگے گی ۔ فوضیہ بیچاری بتائے بھی کیا ۔ اسے کچھ معلوم بھی ہو ۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو نوبت اس حد تک نہ پہنچتی ۔ اسے تو ابتدا ہی سے ایسے ریشمیں ماحول میں پالا گیا تھا جہاں بات معلوم ہی نہیں ہو سکتی ۔ اس ۔۔ کیا پوچھنا اور پھر وہ بے چاری تو بستر پر پڑی رہتی ہے نقاہت کی وجہ سے رنگ زرد ہو چکا ہے ۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں اور گویا وہ اپنے آپ سے جا چکی ہے ۔

نوازش سے پوچھئے تو وہ مونچھ مروڑنے لگے گا۔ اس کی آنکھ میں میلی سی چمک لہرائے گی ۔ دفعتاً اپنی حیثیت بھول کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے

لگے گا ۔ لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے گا اور جواب میں کچھ کہے گا بھی تو اسے اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہوگا ۔ ’’پھر کیا ہوا‘‘ وہ مسکرائے گا ’رات کو جاگنا پڑتا ہے تو کیا ہوا ۔ اپنے لئے کچھ مشکل نہیں ۔ ہم نے تو راتیں آنکھوں میں گزاردی ہیں ۔ ہاں کیا پوچھتے ہو اپنی بات ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ ہُنہ‘‘

فوضیہ کی ماں بڑی بیگم سے پوچھئے تو وہ یوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی جیسے کوئی گرا ہوا شخص فوراً اٹھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ پائے ۔ ’بات کیا ہے‘ بڑی بیگم درشتی سے کہے گی ’شکر ہے اس کی جان بچ گئی‘ ۔

ڈاکٹر سے پُوچھئے تو وہ جواب دے گا ’وِل وِل شی از آل رائٹ معمولی شاک کا کیس ہے ، ٹھیک ہو جائے گا‘ ۔ اور سفید بنگلے کے نوکروں سے پوچھئے ۔ مگر ان سے کیا پوچھنا وہ تو نوکر ٹھہرے ۔ بیچارے خواہ مخواہ سہمے ہوئے ہیں ۔ خواہ مخواہ ۔

آدھی رات کے وقت سفید بنگلے کا وہ پُروقار سکوت ٹُوٹ جاتا ہے اور بیگم کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں ۔ ننگی چیخیں ۔ جیسے ریشم میں ملبوس گڑیا کپڑے پھاڑ کر مخملی کیس سے باہر نکل آئی ہو ۔ اوّل تو شریف گھرانے کی بیگم کی خواب گاہ سے آدھی رات کے وقت چیخوں کا سنائی دینا اور پھر بیگم کا نوازش کو پکارنا ۔ نوازش ایک معمولی موٹر ڈرائیور ۔ نوازش ، بیگم کی آواز بنگلے میں یوں گونجتی ہے جیسے وہ پکار رہی ہو ، منتیں کر رہی ہو ۔

فوضیہ کی چیخیں سن کر بڑی بیگم جاگ پڑی ہے ’آج پھر‘ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے نوازش سامنے کھڑا مونچھ مروڑ رہا ہو ۔ نوازش ایک معمولی خدمت گزار اس کے روبرو کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے ۔ اف آپا کی چیخوں کی آواز سن کر آسیہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ گھبرا کر پھر سے آنکھیں بند کرکے پڑ جاتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ۔ جیسے کوئی چیخ

ہی نہ رہا ہو ۔

نرس بیگم کی چیخ سن کر ایک نظر اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر احتیاط سے کاغذ کی سلپ کی نشانی رکھ کر ناول کو بند کر دیتی ہے ۔ پھر پنجوں کے بل چل کر خوابگاہ کے دروازے کی چٹخنی کھول کر واپس کرسی پر آبیٹھتی ہے اور یوں مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے جیسے بیگم کی چیخ بھری پکار ایک معمولی سی بات ہو ۔

بیگم کی چیخوں کی آواز سن کر نوازش پہلے تو گھبرا کر جاگ پڑتا ہے ۔ پھر آنکھیں ملے بغیر مسکرانا شروع کر دیتا ہے ۔ پھر وہ اپنا اوورکوٹ کھونٹی سے اتار کر اپنے چوڑے شانوں پر ڈال لیتا ہے اور مونچھ مروڑتا ہوا بیگم کی خواب گاہ کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑتا ہے ۔

خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ شانِ استغنا سے بیگم کی چار پائی کے قریب کھڑا ہو کر کھرج آواز میں کہتا ہے "بیگم صاحبہ کچھ فکر نہ کرو ۔ نوازش تمہارے پاس ہے' یہ کہتے ہوئے وہ مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے ہیں ۔ نوازش کی آواز سن کر بیگم کی چیخیں بند ہو جاتی ہیں ۔ آواز بیٹھ جاتی ہے اور وہ زیر لب کہتی ہے ۔ "نوازش وہ آرہے ہیں ۔ وہ نوازش وہ" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے "پڑی رہو بیگم پڑی رہو" نوازش تحکمانہ انداز سے کہتا ہے 'جب نوازش یہاں موجود ہے کوئی تمھیں کچھ نہیں کہہ سکتا'۔ "نوازش نوازش' بیگم کی آواز مدہم پڑ جاتی ہے جیسے کوئی پرائیویٹ بات کہہ رہی ہو ۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سفید بنگلے پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے ۔

نوازش ایک نظر بیگم کی طرف دیکھتا ہے اس وقت اس کی آنکھوں میں دو شعلے روشن ہوتے ہیں ۔ پھر وہ پر وقار انداز سے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے اور نرس چٹخنی بند کرکے پھر سے "فار ایور ایمبر" کے مطالعے میں کھو جاتی ہے ۔

ساتھ والے کمرے میں آسیہ زور سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پہلو بدلنے لگتی ہے اور بڑی بیگم ایک لمبی آہ بھر کر نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتی ہے ۔ اور دور کتے رونے لگتے ہیں جیسے وہ واقعہ کی اہمیت سے واقف ہوں ۔ اور نوازش

اپنے کمرے میں پہنچ کر لحاف میں بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا ہے اور اسے مٹھی میں دبا کر حقّے کی طرح کش بھرنے لگتا ہے بار بار چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے ان جانے میں گنگناتا ہے۔ 'اب کون تجھے سمجھائے'۔

نوازش نے کبھی نہیں سوچا کہ بیگم صاحبہ رات کو ڈر کر چیخیں کیوں مارتی ہے اور خاص طور پر اس کا نام لے کر کیوں پکارتی ہے اور پھر جب وہ بیگم صاحبہ کی خواب گاہ میں جاکر اسے تسلی دیتا ہے تو اسکی آواز سن کر کیوں مطمئن ہو کر سو جاتی ہے۔ وہ اس واقعہ کو خصوصی اہمیّت نہیں دیتا بلکہ اب تو وہ اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھنے لگا ہے اگر چہ اس کھیل میں وہ اپنے پارٹ کو بے حد اہم سمجھتا ہے۔ اہم تو سمجھنا ہی ہوا کیونکہ بیگم صاحبہ پر کسی اور کی آواز کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دیوانگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ جب پہلی مرتبہ رات کو بیگم نے چیخیں ماری تھیں تو وہ گھبرا گیا تھا اور یوں بے تحاشا خواب گاہ کی طرف بھاگا تھا جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ لیکن اب اسے معلوم ہے کہ اس کی آواز سن کر بیگم کا ڈر دور ہو جائے گا۔ جبھی تو بیگم کے سامنے جا کر اس کی آواز میں تحکمانہ لہجہ پیدا ہو جاتا ہے اور خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ان جانے میں مونچھ مروڑنے لگتا ہے۔

اس بات کے متعلق سفید بنگلے کے کسی فرد نے بھی نہیں سوچا۔ وہ سب تو گھبرائے ہوئے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر نے اس بات پر بہت غور کیا تھا۔ اور غور خوض کرنے کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ اس سانحہ سے بیگم کے ذہن کو جھٹکا لگا ہے اور ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ آپ جانتے ہیں ایک بار ڈاکٹر کچھ سوچ لے تو اس کے لئے مزید سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ آکر مریضہ کو دیکھتے ہیں۔ اس کی نبض ٹٹولتے ہیں زبان کا رنگ دیکھتے ہیں۔ ٹوٹیاں لگاتے ہیں۔ وہ ایک سوال پوچھتے ہیں اور پھر ٹیکہ لگا کر نرس کو ہدایات دینے کے بعد اپنا بکس اٹھا کر باہر نکل جاتے ہیں۔

باہر برآمدے میں بڑی بیگم، آسیہ اور امجد ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں 'ڈاکٹر صاحب' بڑی بیگم انہیں دیکھ کر کہتی ہیں "آج پھر ڈاکٹر صاحب" اور آسیہ

خوف سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہے ۔

'ہوں' ڈاکٹر صاحب یوں سوچ میں پڑ جاتے ہیں جیسے اس واقعہ کا پھر سے جائزہ لے رہے ہوں ۔ ایک ساعت کے بعد وہ سر اٹھاتے ہیں ۔ 'ٹھیک ہو جائیگا ۔ ٹھیک ہو جائے گا ۔ گھبرائیے نہیں ۔ ابھی شاک کا اثر نہیں گیا ۔ میں کل پھر آؤں گا۔ خدا حافظ'۔

صرف تین کردار اس واقعہ سے متعلق اہم تھے ۔ پاؤڈر سے تھپی ہوئی ایک معصوم گڑیا ایک بے جان کلدار گنڈا اور بالآخر ایک جیتا جاگتا نوکیلی مونچھ والا میلا سا ڈرائیور ۔

گڑیا بالکل ویسی ہی تھی جیسے مال روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی پائی جاتی ہیں ۔ وہ پاؤڈر سے اس حد تک تھپی ہوئی تھی جیسے مال روڈ کی گڑیاں ہوتی ہیں ۔ اس کے ہونٹوں پر بھی سرخی کی ایک تہ چڑھی رہتی تاکہ آتے جاتے لوگ انہیں نظر انداز نہ کر سکیں اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہونٹوں کو سرخ کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے اور راہ چلتے لوگ کیوں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں ۔ وہ چپ چاپ موٹر سے باہر نکلتی ۔ ایک وقار بھرے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھتی راہ چلتوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ناک نفرت سے سکڑتی اور پھر وہ چپ چاپ شاپنگ میں مصروف ہو جاتی اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ سفید چہرے کے پس منظر پر اس کے ہونٹ خطرے کا سرخ نشان بنے ہوئے ہیں اور راہ گیروں کو عورت اور خطرہ دونوں سے دلچسپی ہوتی ہے ۔ وہ سوچتی بھی کیوں ۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔شوہر ، صاحبِ جائداد تھے ۔ بنگلہ تھا ۔ سازوسامان تھا ۔ موٹر تھی ۔ میز پر کھانا خود بخود لگ جاتا تھا ۔ پرس یوں روپے اگلتا جیسے الہ دین کا جن تابع فرمان ہو ۔ اسے تو صرف یہی تکلیف تھی کہ راہ چلتے لوگ اور وہ بھی عام سے لوگ اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ پاؤڈر تو وہ صرف اس لئے لگاتی تھی کہ جلد نرم رہے ۔ کاجل کی دھار اس لئے کھینچتی تھی کہ بینائی تیز ہو ۔ اور ہونٹوں پر سُرخی ۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کی وجہ بیان کی جائے ۔ چاہے کسی وجہ سے لگاتی تھی ۔ بس لگاتی تھی ۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ

تھا ۔ جس میں دوسروں کو دخل دینے کا حق نہ تھا ۔ مال روڈ کی اس گڑیا کے دل میں کسی کے خلاف بغض یا نفرت نہیں تھی ۔ الٹا اسے تو ان پر ترس آتا تھا ۔ اور بازاروں میں گھومنے والے عوام کی حالت پر اسے سچے دل سے افسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے کے علاوہ انہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ۔ کپڑے پہننے کا ڈھنگ نہیں اور چلنے پھرنے میں ان کی حرکات کس قدر بھدی ہوتی ہیں ۔

سماجی گڑیا ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ایک گڑیا تھی ۔ سماجی زندگی نے تو اس پر صرف رنگ و روغن کیا تھا اور جیتے جاگتے میلے عوام سے محفوظ رکھا تھا ۔ وہ خوبصورت تھی جیسے کہ فطری گڑیاں ہوتی ہیں ۔ مگر وہ خوبصورتی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی ۔ گڑیا خانے نے اس کے جذبات منجمد کر رکھے تھے ۔ اور اسے ایسی حسین ساکن جھیل بنا دیا تھا جس میں سطحی لہروں کے علاوہ کوئی مدوجزر پیدا نہیں ہوتی ۔

وہ ایک ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں بہت سی گڑیاں مخملی کیسوں میں رہتی تھیں ۔ وہ سب مقررہ وقت پر چلتی پھرتیں ۔ مقررہ وقت پر موزوں باتیں کرتیں مقررہ وقت پر باہر جاتیں ۔ اور مقررہ وقت پر اپنے اپنے کیسوں میں پڑ کر سو جاتی تھیں ان کی ہر بات مناسب طور پر عمل میں آتی تھی ۔ مناسب اور موزوں فقرے انہیں ازبر کرا دیئے جاتے تھے ۔ اور مناسب اور موزوں حالات میں وہ انہیں دہرا دیتی تھیں۔

اس گڑیا گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر جیتے جاگتے انسان بھی رہتے تھے ۔ مگر اصول کے مطابق ان کی طرف غور سے دیکھنا مناسب نہ تھا ۔ بیرا لوگ ۔ چوکیدار لوگ اور خدمت گار کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا جائے ۔ ان سے تو صرف خدمت کروائی جا سکتی ہے ۔ نوکروں کو چھوڑیئے وہاں تو عزیز و اقارب کو بھی غور سے دیکھنا گناہ تھا ۔ غور سے دیکھنا تو ایک غیر مہذبانہ فعل ہے جو دخل در معقولات کے مترادف ہے ۔ گڑیا گھر میں تو دیکھنے کی بجائے دکھائی دینے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ سب اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ اچھے اور پیارے نظر آئیں ۔

بچپن ہی سے فوضیہ کو گڑیا گھر کے اصولوں کی پوری تعلیم دی گئی تھی ۔ صبح سویرے ہی اسے نہلایا دھلایا جاتا ۔ اور اس کے بال بنا کر ربن لگا کر منہ پر پاؤڈر سرخی جما کر تیار کر دیا جاتا ۔ پھر وہ اپنے جیسی ایک گلابی گڑیا بغل میں دبا کر باغ میں جا بیٹھتی ۔ زمین پر نہیں بچہ گاڑی میں ۔ یا بیدکی اس کرسی پر جو اس کے لئے بنائی گئی تھی ۔ زمین پر تو خدمت گاروں کے بچے کھیلا کرتے تھے ۔ پھر اس زمین پر وہ کیسے بیٹھ سکتی تھی ۔ البتہ تیتری کی طرح وہ باغ میں اِدھر اُدھر دوڑ سکتی تھی ۔ یا مہمانوں کے آنے پر ڈرائینگ روم میں مور کی طرح چل پھر سکتی تھی ۔

ڈرائینگ روم کے لئے اسے چند ایک خوبصورت جملے سکھادئے گئے تھے مزاج اچھے ہیں ۔ تھینکیو ۔ آپ کو نظم سناؤں ۔ کیسے اچھے ہیں آپ ۔ ڈیڈی ۔ ممی اور شب بخیر ۔ جیسے خوبصورت جملے ۔ ڈرائینگ روم پر ہی کیا موقوف تھا ۔ ان کا تو سارا گھر ایک ڈرائینگ روم تھا ۔ سارا دن وہ ڈرائنگ روم میں رہتی اور پھر رات پڑتی تو وہیں ایک کونے میں اسے ایک ریشمیں کیس میں احتیاط سے رکھ دیا جاتا ۔

پھر وہ جوان ہو گئی ۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہ ہوا ۔ اگرچہ جسم میں عجیب و غریب قسم کے اضافے ہو گئے ۔ سیدھے خطوط گھوم کر گولائیاں اختیار کر گئے ۔ اعضا پھول گئے ۔ گندمی رنگ پر سفیدی نے یورش کردی اور سفیدی میں سرخی کی جھلک پیدا ہو گئی ۔ بال بنانے کا سٹائل بدل گیا ۔ کپڑوں کی قطع وضع بالکل تبدیل ہو گئی ۔ ان سکہ بند جملوں میں اضافہ ہو گیا جو گفتگو میں استعمال کئے جاتے تھے ۔ وہ ڈرائینگ روم بہت وسیع ہو گیا اور اس میں بہت سے اور گھرانے بھی شامل ہو گئے اور بہت سے نئے اُجلے گڈے اس کے حلقے میں داخل ہو گئے اس کی مسکراہٹوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ۔ اس کی حرکات میں لَے پیدا ہوگئی ۔ لیکن ان تمام فروعی باتوں کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی ۔ خوشنما کنول کے پھولوں کے علاوہ جو اس نیلی جھیل میں اُگ آئے تھے اس کی زندگی وہی ساکن

جھیل ہی رہی ۔ گویا وہ کسی رنگدار کلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہو ۔

پھر جلد ہی ایک نیا کلدار گڈا ان کے ڈرائینگ روم میں آپہنچا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا ۔ اس کی نگاہوں سے فوضیہ کو ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت بھی محسوس ہوتی ۔ پھر اس گڈے نے تنہائی میں اس سے عجیب باتیں کرنی شروع کیں ۔ ایسے جملے فوضیہ نے ڈرائینگ روم میں کبھی نہ سنے تھے ۔ اور اُس نے محسوس کیا جیسے اس کلدار گڈے کے آنے سے ایک نئی انوکھی کھڑکی کھل گئی ہو جس سے ایک انوکھی دنیا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں ۔

اگر چند ماہ کے اندر اندر فوضیہ کی فرخ سے شادی نہ ہو جاتی اور اسے مزید کلدار گڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نہ تو فرخ کی باتوں میں کوئی انوکھی خصوصیت تھی اور نہ اس کی نگاہوں میں کوئی انفرادیت ۔ اس کے وہ جملے بظاہر نئے ہونے کے باوجود بے حد پرانے اور سکہ بند تھے اور اس کی نگاہیں بھی صرف دکھانے کی تھیں ۔ دیکھنے کی نہیں ۔ جنہیں فرخ نے مسلسل مشق سے اپنا رکھا تھا ۔ لیکن فوضیہ کو ان تفصیلات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا ۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انوکھے پن کا وہ سراب درحقیقت اس لیے تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی ۔ لہروں کی سی وہ حرکت جو وہ محسوس کرنے لگی تھی ۔ محض سطحی تھی ۔ اگر فرخ کی جگہ کوئی اور گڈا ان دنوں اس سے آملتا تو بھی فوضیہ کے احساسات وہی ہوتے ۔

شادی کے بعد بھی فوضیہ کی زندگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ ایک گڑیا گھر سے نکل کر دوسرے میں چلی گئی ۔ جہاں ویسے ہی ریشمیں پردے لٹک رہے تھے ۔ ویسے ہی شوکیس رکھے ہوئے تھے ۔ ویسا ہی باغیچہ تھا اور ویسے ہی لوگ تھے بلکہ شادی کے بعد تو وہ بالکل ہی گڑیا بن کر رہ گئی ۔ اس کے رکھوالوں میں فرخ کا اضافہ ہو گیا جو صبح شام اس کے لئے دروازے کھولتا ۔ کرسیاں کھینچتا ۔ جگہ بناتا ، کوٹ پہناتا ، اس کا پرس اٹھاتا ۔ اور مسکرا کر ڈارلنگ کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ۔ اس کے علاوہ اب وہ بیگم فوضیہ بن گئی تھی ۔ گو فرخ اُسے فِزی کہا کرتا تھا اور وہ اپنی فِزی کو یوں رکھتا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی

ہو اور اگر احتیاط نہ کی تو ٹوٹ جائے گی ۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زیادہ احتیاط سے ٹوٹنے کی صلاحیت اور بڑھ جاتی ہے ۔

فرخ کے گھر میں پہلی مرتبہ فوضیہ نے نوازش کو دیکھا ۔ لیکن اس کے لئے تو وہ محض شوفر تھا نوازش نہیں ۔ اس نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور اسے اس بات کا علم نہ ہوا تھا کہ وہ جسم کا دبلا پتلا ہے اس کا قد بے حد موزوں ہے ، چھاتی چوڑی ہے اور اس کی نوکیلی مونچھیں اور متبسّم آنکھیں بے حد شریر ہیں ۔

عام طور پر فوضیہ کو نوازش سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی ۔ کیونکہ ہر وقت فرخ خود وہاں موجود ہوتا تھا البتہ جب کبھی اسے جائداد کے انتظامات کے سلسلے میں کراچی جانا پڑتا اور فوضیہ سفید بنگلے میں اکیلی رہ جاتی تو اسے نوازش کو بلانا پڑتا تھا ۔ باہر 'پورچ' میں پنجوں کے بل کھڑے اسے چلّاتے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی پالتو کوئل توہو توہو کی رٹ لگا رہی ہو ۔

نوازش اس کی آواز سن کر اطمینان سے سگریٹ کے چند آخری کش لگاتا اور پھر اوور کوٹ شانوں پر ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا بیگم صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گیراج کی طرف چل دیتا ۔ اس نے کبھی بیگم سے پوچھنے کی تکلیف نہ کی تھی ۔ "کیا حکم ہے حضور" نہ ہی کبھی اس نے اسے حضور کہا تھا ۔ گیراج سے گاڑی نکال کر وہ 'پورچ' میں لاکھڑا کرتا اور پھر چپ چاپ سگریٹ پیتے ہوئے انتظار کرتا ۔

نوازش فطری طور پر موٹر ڈرائیور تھا اس کے کردار میں استغنا کا عنصر حاوی تھا ۔ چلتا یوں تھا جیسے بادلوں کا دیوتا زمین پر آگیا ہو یوں موٹر چلاتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے حرکت اور رفتار کے سلسلے میں اس کی ذہنیت خانہ بدوش کی سی تھی ۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ وہ بیگم یا صاحب کا ڈرائیور ہے اس کے بر عکس وہ سمجھتا تھا کہ وہ موٹر کا ڈرائیور ہے جو اس کے اشاروں پر چلتی ہے ۔

جبھی تو نوازش کی شخصیت میں "جی حضور" کی جھلک تک نہ تھی ۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت چمک لہراتی ۔ ہونٹوں پر ایک فلمی دھن کھیلتی ۔ اور گردن کے زاویے سے لاپروائی نمایاں رہتی ۔ اس نے کبھی بیگم کو غور سے نہ دیکھا تھا

اور نہ اسے اہمیت دی تھی ۔ اس کے نزدیک وہ عورت نہیں بلکہ صرف صاحبہ تھی ۔ اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی وہ مسکراہٹ نہ چمکی تھی جو عورتوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں جھلک آتی تھی ۔

ممکن ہے فوضیہ نے دل میں شعوری طور پر اس کا اعتراف کئے بغیر نوازش کی بے پروائی کو محسوس کیا ہو ۔ مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا ۔ ایک نوکر کے متعلق سوچنا اس کے نزدیک مناسب نہ تھا ۔ صرف ایک بار اس نے نوازش کے خلاف غصہ محسوس کیا تھا ۔ اس روز اس کے احساسات مجروح ہو گئے تھے ۔ جیسے اس کی توہین ہو گئی ہو اور وہ آدھ گھنٹے تک بیٹھی بل کھاتی رہی تھی ۔

ان دنوں فوضیہ نے موٹر چلانے کی مشق شروع کر رکھی تھی ۔ اس روز ایک ویران سڑک پر خود موٹر چلا رہی تھی ۔ ساتھ والی سیٹ پر نوازش بیٹھا اپنی ہی دھن میں مونچھ مروڑ رہا تھا ۔ موڑ پر ایک تانگے کے آ جانے سے دفعتاً فوضیہ کے ہاتھ کانپے موٹر نے جھٹکا کھایا ۔ فوراً دو بھورے بھدے بازو اس کے گرد حائل ہو گئے اور اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر نوازش کے بازوؤں کا بوجھ پڑ گیا اور اس کا جسم گرفت میں آ گیا ۔ "بیگم صاحبہ" نوازش نے اسے ڈانٹا ۔ اور دھکا دے کر فوضیہ کو پرے دروازے میں دھکیل دیا اور خود اس کی جگہ لے لی اور بات کئے بغیر موٹر چلانا شروع کر دیا ۔ پھر یہی نہیں وہ یوں بے پروائی سے ایک فلمی دھن گنگنانے لگا ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہ ہو ۔

وہ پہلا روز تھا جب فوضیہ نے محسوس کیا کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھی بلکہ ایک گڑیا تھی جسے ایک بد تمیز نوکر نے زمین پر پھینک دیا تھا ۔

اس کے بعد فوضیہ نے پہلی مرتبہ غور سے نوازش کی طرف دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ وہ نوازش تھا شوفر نہیں "کتنا بد تہذیب ہے" اس نے دل میں کہا تھا اس کے بعد فوضیہ اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش میں کھو گئی تھی ۔

انہیں دنوں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے ۔ ہجوم جلوس کی صورت میں سڑکوں پر گشت لگاتا تھا اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف نعرے لگائے جاتے

تھے رات کے وقت دفعتاً شوروغل بلند ہوتا ۔ اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آتیں اور پھر پکڑ لو پکڑ لو کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ۔ اگرچہ نہ تو فرخ اس مخصوص فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور نہ فوضیہ اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خدشہ نہ تھا ۔ پھر بھی ان دونوں کو عوام کی اس بدتمیزی پر غصہ آتا تھا ۔ فرخ شوروغل سن کر غصّے سے بھوت بن جاتا "جنگلی" وہ دانت بھینچ کر کہتا "انہیں گولی سے ختم کر دینا چاہیئے ۔ بدتمیز دیوانے ۔" لیکن رات کے وقت جب کبھی آوازیں بہت قریب آجاتیں تو وہ غصّے کا اظہار کرنا بھول جاتا اور خوف سے کانپنے لگتا ۔ "یہ کیا حماقت ہے ۔ فِزی ادھر آجاؤ ، اور ادھر دیکھو اگر یہ لوگ بنگلے کی طرف آجائیں تو ہم ادھر سے نوکروں کے کوارٹرز میں چلے جائیں گے ۔ وہ جگہ محفوظ ہے سمجھیں بیگم ۔ ان فسادیوں کا کوئی اعتبار نہیں ۔ ان کا مطلب تو لوٹنا ہے لوٹنا ۔ مذہب تو محض دکھلاوا ہے ۔ کمینے"وہ زیرِ لب کہتا کہ کوئی سُن نہ لے فوضیہ حیران ہوتی تھی کہ صبح کے وقت تو فرخ اس قدر غصہ دکھاتا ہے لیکن رات کو چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتا ہے ۔ بہر حال وہ معمولی سی حیرانی محسوس کرتی اور اسے بھول جاتی ۔ کیونکہ اسے خود فسادیوں کے خلاف غصہ آتا تھا ۔ اس لئے کہ وہ ان اصولوں سے منحرف ہو رہے تھے جن کے تحت فوضیہ کو تربیّت دی گئی تھی ۔

پھر فرخ کو کراچی سے ایک ضروری بلاوا آگیا ۔ جانے سے پہلے اس نے فوضیہ کو ہدایات دیں "فِزی ان شر پسندوں کی قطعی پروا نہ کرنا ۔ یہ ذلیل لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ سمجھیں ۔ اگر ضرورت پڑے تو پولیس کو فون کر دینا اور اگر وہ بنگلے میں آداخل ہوں ۔ اوّل تو ان کی جرأت نہیں ہو سکتی ۔ لیکن ایسا ہو ہی جائے تو تم نوکروں کے کوارٹروں میں چلی جانا ۔ میں انہیں ہدایات دے جاؤں گا اور چوکیدار اور شوفر یہیں بنگلے میں کونے والے کمرے میں سوئیں گے ۔ سمجھیں ڈارلنگ"۔

فرخ کے جانے کے بعد اسی رات ہجوم کا شوروغوغا سن کر فوضیہ جاگ پڑی اور گھبرا کر اس نے چلّانا شروع کر دیا ۔ 'چوکیدار ، چوکیدار' ہجوم کا شور قریب آتا جا رہا تھا ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اس حد تک گھبرا گئی کہ وہ تمام اصول بھول گئی نوازش ،

نوازش' اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لے کر اسے پکارا ۔

شانوں پر بے پروائی سے کوٹ ڈالے نوازش ایک شانِ استغنا سے اس کی خوابگاہ میں داخل ہوا ۔ "نوازش ، نوازش" وہ چلّانے لگی "وہ ۔ وہ ۔ وہ آرہے ہیں ۔ وہ" "چلاؤ نہیں بیگم صاحبہ" اس نے درشتی سے اسے ڈانٹا "اگر انہوں نے آواز سن لی تو' اس کی ڈانٹ سے وہ بوکھلا گئی لیکن ہجوم کا شور قریب تر آچکا تھا ۔ اس لئے اس کا غصہ ڈر میں تبدیل ہوگیا ۔ "وہ آرہے ہیں ۔ وہ آرہے ہیں" ۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ۔ "میں پولیس کو فون کرتی ہوں"۔ وہ ٹیلیفون کی طرف بھاگی ۔ نوازش اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا ۔ کوئی ضرورت نہیں ۔ فون کرنے کی ۔ "لیکن ۔" فوضیہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "چپ کرو بیگم صاحبہ وہ سن لیں گے" ۔ وہ غرّایا ۔ اس ساکن نیلی جھیل میں پہلی مرتبہ ایک طوفان ابل آیا ۔ گویا ایک بہت بڑی بلونی ساکن نیلے پانی کو بلونے لگی تھی ۔

غصّے میں اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑالئے ۔ اورساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی ۔ نوازش نے ایک شانِ استغنا سے سگریٹ سلگایا ۔ اسے مٹھی میں تھام کر حقّے کی طرح دو کش لگائے اور پھر کھلے دروازے میں جا کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

ہجوم سفید بنگلے میں داخل ہوگیا ۔ ان کے نعروں سے خواب گاہ میں رکھی ہوئی چیزیں لرزنے لگیں ۔ نوازش کو دروازے میں بے خبری سے کھڑے دیکھ کر بیگم نے ایک جست عقبی دروازے کی طرف بھری "میں نوکروں کے کوارٹروں میں" ۔ ابھی اس کے منہ سے پورا جملہ نہ نکلا تھا کہ نوازش نے لپک کر اسے بچّے کی طرح اٹھالیا اور دھم سے بستر پر دے مارا ۔ "چپکے سے پڑی رہو بیگم" وہ غصّے میں بولا کہا جو ہے جب تک نوازش موجود ہے کسی میں جرأت نہیں ہے کہ ۔ ۔ ۔"

نوازش کی اس گرفت نے نہ جانے کیا کر دیا ۔ کسی انجانے شعلے سے بھڑک کر انگارے اڑے اور پھر سون کر کے پانی میں جا گرے ۔

بستر پر گرتے ہی وہ نقاہت محسوس کرنے لگی جیسے صدیوں کی بیمار ہو ۔

نیلی جھیل کا وہ طوفان ختم ہو چکا تھا اور گویا ایک لاش کنارے پر آلگی تھی ۔ اب اسے خوف و خطر کا کوئی احساس نہیں رہا تھا ۔ باہر ہجوم چلا رہا تھا ۔ لیکن وہ یوں نوازش کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہجوم سینما کے پردے کا ہجوم ہو ۔ نوازش اطمینان سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا ۔ پھر دفعتاً وہ چلایا ۔ "اب او بنگلے سے باہر نکل جاؤ ۔ میں کہتا ہوں نکل جاؤ ۔ کوئی نہیں ہے یہاں ۔ جاؤ"۔

ہجوم باہر نکل گیا ۔ بنگلے پر موت کی سی خاموشی چھا گئی ۔ نوازش نے ایک نیا سگریٹ سلگایا ۔ اور پھر فوضیہ کی طرف دیکھے بغیر بولا ۔ "تم سے جو کہا ہے بیگم کہ جب تک میں یہاں ہوں کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا بے فکر ہو کر سو جاؤ ۔ ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا ۔ کنڈی لگا لو ۔" اس کی آواز میں تحکم تھا ۔ انداز میں استغنا تھا ۔ فوضیہ اس کی بات سن کر یوں کنڈی لگانے کے لئے اٹھی جیسے دفعتاً بیگم سے باندی بن گئی ہو ۔ پھر دیر تک وہ چارپائی پر پڑی رہی ۔ جیسے پتوار کے بغیر ناؤ ساکن سمندر پر بہے جا رہی ہو ۔ بہے جا رہی ہو۔

صبح سویرے جب وہ بیدار ہوئی تو اس کے اردگرد ایک عجیب لٹا پٹا جہان بکھرا پڑا تھا ۔ نیلی جھیل میں ادھر اُدھر گڑیا گھر کے ٹکڑے بہہ رہے تھے ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بُت بے جان پڑے تھے ۔ تہذیب وتمدّن کے دیوتا اوندھے منہ پڑے تھے دیر تک وہ اس ویرانی کو دیکھتی رہی محسوس کرتی رہی ۔ پھر دفعتاً اسے یاد آیا کہ وہ فوضیہ ہے ۔ اور ایک تہذیب یافتہ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے ۔ خوفناک عزم سے وہ اٹھ بیٹھی ۔ ایک شدید کوشش سے اس نے اپنے ذہن سے اس ویرانے کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ۔ اور اس شب کے واقعات کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ۔ اور معاً وہی گڑیا گھر اس کے اردگرد معلّق ہو گیا ۔ اصولوں کے بت پھر سے قائم ہو گئے ۔ تہذیب و تمدّن کے دیوتا مسکرانے لگے ۔

فرخ کی واپسی پر فوضیہ کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ اس شب کیا واقعہ ہوا تھا ۔ اس لئے فرخ کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ باقی رہا نوازش ۔ لیکن وہ

کسی نوازش کو نہیں جانتی تھی ۔ البتہ وہ شوفر ؟ مگر اب اسے موٹر میں بیٹھنے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی ۔ پھر شوفر کون ۔ کیسا شوفر ۔

چھ ماہ گذر گئے ۔ اصول اور قاعدوں کے بت اپنی اپنی جگہوں پر براجمان رہے جیسے کبھی گرے ہی نہ ہوں ۔ تمدن کے دیوتا کی روغنی مسکراہٹیں اور بھی دل آویز ہو گئیں ۔ جیسے وہ کبھی دھندلی پڑی ہی نہ ہوں ۔ کلدار گڈا دروازے کھولتا رہا معصوم گڑیا خوبصورت اور ساکن نیلی جھیل میں رنگدار مچھلی کی طرح تیرتی رہی ۔ چھ ماہ گزر گئے ۔

پھر ایک روز فرخ نے آکر فوضیہ سے کہا "ہم کراچی جا رہے ہیں ۔ تم ساتھ چلو گی ڈارلنگ ہم کل میل میں روانہ ہوں گے شوفر کو ساتھ لے جائیں گے"۔ فرخ کا آخری جملہ فوضیہ نے نہ سنا۔ وہ اسے سننا چاہتی ہی نہ تھی ۔

اگلے روز وہ اس میل میں سوار ہو گئے جسے جھمپیر پر اس تباہ کن حادثے سے دو چار ہونا تھا ۔ سیکنڈ کلاس کے چھوٹے ڈبے میں سارا دن کلدار گڈے کی نگاہیں گڑیا کے گرد گھومتی رہیں ۔ اور روغنی گڑیا کا تبسم چلتا رہا ۔ پھر وہ لیٹ گئے سیکنڈ کلاس کے سپرنگ انہیں تھپکنے لگے ۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکا ہوا وہ جاگ پڑی ۔ سامنے سرخ شعلے لپک رہے تھے ۔ ان شعلوں نے فرخ کو لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔ اس کا چہرہ موت کی گرفت میں بھیانک ہو رہا تھا ۔ فوضیہ نے کوشش کی کہ وہ چیخ مار کر جاگ پڑے ۔ وہ اسے خواب سمجھتی تھی ۔ مگر اس کے حلق میں گویا آواز نہ تھی ۔ شعلے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے پھر دفعتاً دھڑام سے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوازش اس کی طرف لپکا ۔ 'نوازش' اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی ۔

چھ ماہ بعد وہ پہلا دن تھا جب اُس نے نوازش کو دیکھا تھا ۔ نوازش نے اُسے اٹھا لیا اور دیوانہ وار بھاگا ۔ جب اسے ہوش آیا تو نوازش مونچھ مروڑتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا "تم فکر نہ کرو بیگم ، جب تک میں تمہارے پاس ہوں" ۔ وہ پھر بے ہوش ہو گئی ۔ دوسری دفعہ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی اور نوازش دروازے میں نرس کے پاس کھڑا مونچھ مروڑ رہا تھا ۔

ماں ، بھائی ، بہن اور نرس کی موجودگی کے باوجود اب وہ اکیلی اس سفید بنگلے میں سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے ۔ سارا دن وہ گڑیا گھر اس کے گرد قائم رہتا ہے ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے بسی سے اس کی طرف یوں دیکھتے ہیں گویا منتیں کر رہے ہوں ۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا انگلیاں اٹھائے اسے خبردار کرتے رہتے ہیں ۔ مگر جب رات پڑتی ہے تو وہ چیخ کر جاگ اٹھتی ہے ۔ اس کی نگاہوں تلے ایک لٹا پٹا جہاں بکھرا ہوتا ہے ۔ گڑیا گھر کے ٹکڑے نیلی جھیل کے خوفناک طوفان میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجتے ہیں ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت اوندھے پڑے ہوتے ہیں ۔ اور تہذیب و تمدن کے دیوتا شرم سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں ۔ اور وہ چیخ کر پکارتی ہے ۔ "نوازش ، نوازش" اس کی پکار سن کر بڑی بیگم کا دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے سفید بنگلہ محل کے محرابوں سے گر کر غلام گردش میں آپڑا ہو اور آسیہ گھبرا کر آنکھ بند کر لیتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ جیسے گڑیا گھر جوں کا توں قائم ہو ۔

............○............

کھونٹ والا بابا

روز بلاناغہ وہ اسی راستے سے آتا ہے ہر روز ۔ اس کی شلوار سفید اور مکلف اور سیاہ اچکن سلوٹ یا گرد سے پاک ہوتی ہے ۔ اس کے کلین شیو چہرے سے سنجیدگی اور سکون و اطمینان کا اظہار ہوتا ہے جیسے اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو ۔ ہاتھ کی سیاہ چمکیلی چھڑی اس نے بڑے وقار سے تھامی ہوتی ہے اور چھڑی کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت سے ضبط و بُردباری کا احساس ہوتا ہے ۔ اس کے چہرے کی جھریوں سے جوانی کی لغزشوں یا ادھیڑ عمر کی عیش پرستی ظاہر نہیں ہوتی اور اس کی چال سے معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے کبھی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بیسن بازار میں پہنچنے کے لئے وہ اتنا لمبا چکّر کیوں کاٹتا ہے ۔

کون نہیں جانتا کہ ایڈورڈ روڈ سے کالنج منڈی کو سیدھا راستہ بھنڈی بازار سے جاتا ہے ۔ پھر وہ ایڈورڈ روڈ سے جارج سکوئر اور وہاں سے ملتانی مسجد اور ملتانی مسجد سے سرکلر روڈ پر گھوم کر واٹر ورکس کے ٹینک سے گوٹا بازار ہوتا ہوا کالنج منڈی کیوں پہنچتا ہے ۔ اتنا لمبا چکّر لگانے سے آخر اس کا مقصد کیا ہے ۔ اگر اسے شام کے وقت سیر کرنے سے دلچسپی ہے تو وہ سول لائن کے پر فضا علاقے کو چھوڑ کر شہر کی طرف کیوں جاتا ہے ۔ اگر اس کا مقصد شہر کی زندگی سے محظوظ ہونا ہے تو ۔ نہیں اس بوڑھے زاہد خشک مزاج کو رنگینی سے کیا واسطہ ۔

کالنج منڈی کے بڑے چوک میں پہنچکر ایک ساعت کے لئے وہ رک جائیگا اور گھبرائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھے گا ۔ سوٹی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی ۔ پھر اس کے چہرے کی جھریوں میں ایک تناؤ سا جھلکے گا ۔ اور ایک خفیف سی لغزش کے بعد وہ ایک عزم سے بیسن بازار کی طرف مڑ جائے گا ۔ اگرچہ

بیسن بازار کے ڈولا حلوائی کے سموسے شہر بھر میں مشہور تھے ۔ پھر بھی کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اس بازار کو بیسن سے کوئی تعلق ہے ۔ درحقیقت اس بازار کا نام بے سِن بازار تھا جو بگڑ کر بیسن بازار بن گیا ۔

بیسن بازار کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ سرگرم خرید و فروخت کے باوجود جو وہاں شام کے وقت دیکھنے میں آتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار کو خرید سے دلچسپی نہیں اور دوکاندار فروخت کی تگ و دو سے بے نیاز ہے ۔ وہاں کے دوکانداروں کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذات خود خریدار ہوں اور گاہک کی توجہ اس طرف مرکوز نہیں ہوتی جسے وہ خرید رہا ہوتا ہے ۔ وہاں کے بھکاریوں میں بھی ایک احساسِ فراغت ہوتا ہے ۔ وہاں کے مزدور کی پھٹی ہوئی ٹوپی سر پر اس انداز سے دھری ہوتی ہے جیسے کسی نواب کا کلاہ ہو ۔ وہاں کے کمسن آوارہ لڑکوں کی آنکھ میں بلوغت کی چمک ہوتی ہے ۔ چلتے پھرتے سپاہیوں کی چال ڈھال سے فرائض نہیں بلکہ حقوق کی جھلک مترشح ہوتی ہے ۔ وہاں نوجوان آرزو کرتے ہیں کہ وہ پختہ کار ہوتے اور پختہ کار خواہش کرتے ہیں کہ وہ جوان ہوتے ۔ بوڑھے وہاں لاحول پڑھنے کے لئے آتے ہیں ۔۔۔۔ وہ بیسن بازار ۔

بیسن بازار میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر وہ یوں اپنی ہی دھن میں چلا جاتا ہے جیسے وہ بیسن بازار نہیں بلکہ صراطِ مستقیم ہو ۔ اسے مطلقاً اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ دوکاندار اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ آوارہ بچے اس پر آوازے کس رہے ہیں ۔ اور دوکانوں سے باہر کرسیوں پر بیٹھے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ۔

ڈولا حلوائی اور اجو کبابیے کی دوکان کے سامنے پہنچکر اس کے چہرے کی جھریوں میں تناؤ کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ہاتھ کی سوٹی پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ۔ ڈولا حلوائی اور اجو کبابیے کی دوکانیں بیسن بازار کے عین درمیان میں واقعہ ہیں جہاں بازار پُر ہجوم رہتا ہے ۔

ڈولا حلوائی ایک احساسِ فراغت سے تخت پوش پر بیٹھا رہتا ہے اس کی نگاہیں اپنے سموسوں اور مٹھائیوں سے بے نیاز رہتی ہیں ۔ سالہا سال کی مشق

سے وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر سودا اٹھاتا ہے اور تولتے ہوئے ترازو کی ڈنڈی کی طرف نہیں دیکھتا ۔

اجو کبابیے کے کباب تکّے اور چانپ شہر میں اپنی لذّت کے باعث مشہور ہیں ۔ بشرطیکہ وہ دوکان پر کھڑے ہو کر کھائے جائیں اس کے باوجود اجو کو سیخوں کو احتیاط سے پلٹنے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ جل بھی جائیں تو بھی ان کی لذّت میں کچھ فرق نہیں پڑتا ۔

ڈولا حلوائی اور اجو کبابیے کی دوکانوں کے قریب پہنچکر وہ ایک ساعت کے لئے رک جاتا ہے ۔ اسے فضا سے ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیتا ہے ۔ جس میں کھرج آوازوں کے علاوہ پنچم اور کومل سرُوں کی بھی آمیزش ہوتی ہے ۔ اس قہقہے کو سن کر اس کا منہ سرخ ہو جاتا ہے ۔ اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگتی ہیں ۔ اور وہ غصّے بھری نگاہ اس ہجوم پر ڈالتا ہے ۔ جو ان دوکانوں پر جمع ہوتا ہے اور پھر ایک نفرت بھرے انداز سے ناک چڑھا کر آگے نکل جاتا ہے حتّی کہ وہ اس موڑ پر پہنچ جاتا ہے ۔ جہاں سے ایک ویران سڑک بائیں ہاتھ کو نکل گئی ہے اور جہاں نکڑ پر وہ ننگا مست بابا بیٹھا رہتا ہے ۔ جسے سب بابا کھونٹ والا کہتے ہیں ۔

اسے دور سے آتا دیکھ کر بابا کی نگاہیں قہر آلود ہو جاتی ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا کھونٹ سنبھال کر غصّے میں کانپتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر بار بار اپنا عصا اوپر کو اٹھاتا ہے جیسے پیٹنے کی دھمکی دے رہا ہو ۔

وہ کھونٹ والے بابا کو اس عالم میں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور پھر قدم تیز کر دیتا ہے ۔ اس کے گزر جانے کے بعد بابا کا غصہ کافور ہو جاتا ہے ۔ اس کا کھونٹ نیچے کی طرف گر جاتا ہے ۔ پھر بابا قہقہے لگاتا ہے ۔ مسرّت بھرے قہقہے جیسے اسے ایک ساتھی مل گیا ہو ۔ اس کا قہقہہ بازار میں گونجتا ہے ۔ ڈولا حلوائی سودا دیتے ہوئے رک جاتا ہے ۔ اجو کبابیہ سر اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے بازار کے آوارہ لڑکے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں اور سبز کھڑکیوں کے چوبارے میں سازوں کی لَے چڑھنے لگتی ہے ۔ گیت کے بول چاروں طرف سے بازار کے اس ویران

حصے کو گھیر کر اس پر مسلط ہو جاتے ہیں ۔

اب کون تجھے سمجھائے ۔ بلماں جا ۔۔۔ آخری جست بھر کر وہ سبز کھڑکیوں والے چوبارے میں جانے کی بجائے جہاں بائی میراثیوں اور سامعین کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے ۔ وہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں چلاتا ہے "اے اِدھر آؤ ۔ اے میاں" کچھ دیر کے بعد ایک میراثی اس کے قریب آکر پوچھتا ہے "جی کیا ہے؟" جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو ۔

"بائی کو بلاؤ" وہ چیختا ہے ۔

"وہ کام کر رہی ہیں آپ اِدھر آجائیں"۔

"نہیں بائی کو یہاں بلاؤ"۔

میراثی چلا جاتا ہے ۔ گیت کی لَے اور بھی تیز ہو جاتی ہے ۔ اور تیز ۔۔ اور تیز اور پھر دفعتاً خاموشی چھا جاتی ہے ۔ اوراس خاموشی کے پس منظر پر ننھے ننھے گھنگرو بجتے ہیں اور پھر بائی اس کے قریب آکر پوچھتی ہے "اے صاحب مجھے بلایا آپ نے جی ؟"

"ہاں" وہ تحکمانہ انداز سے کہتا ہے اور چھڑی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جُھلاتا ہے ۔

"جی" زرد ہونٹوں کے معصوم خم پر دو آنکھیں طلوع ہو جاتی ہیں "کہیئے"۔

"میں پوچھتا ہوں" ۔۔ وہ کھرج میں بولتا ہے ۔ "تم اس سے قطع تعلق کرو گی یا نہیں"۔

"کس سے" وہ معصومانہ انداز میں پوچھتی ہے ۔

"خالد سے"۔

"خالد" وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے ۔ "کون خالد ؟"

وہ غصے میں چلّاتا ہے "بہتر ہوگا کہ تم اس سے قطع تعلق کرلو"۔

"اے کیوں" وہ معصوم سیاہ آنکھیں پھر طلوع ہو جاتی ہیں ۔

"میں کہتا ہوں ۔۔ میں ۔۔" اس کے ہاتھ کی چھڑی یوں بلند ہو جاتی ہے جیسے وہ ایک دھمکی ہو ۔ "میں"

"اوہ ۔ آپ ،، آپ کہتے ہیں" وہ یوں زیرِ لب گنگناتی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو ۔

"تو تم اس سے قطع تعلق کر لو گی؟"

"ہاں" کالی شوخ آنکھیں ترچھی شعائیں ڈال کر غروب ہو جاتی ہیں ۔

"اگر تم نے نہ کیا تو ۔" وہ پوچھتا ہے ۔

"کیوں" کالی آنکھیں نصف النہار سے چمکتی ہیں ۔

"نہ کیا تو تم مجھے جانتی ہو"۔ ہاتھ کی چھڑی ابھرتی ہے ۔

"جی" بائی کا سر جھک جاتا ہے ۔

"اچھا" ایک دم وہ گھبرا جاتا ہے "یہ لو" وہ چند دس دس کے نوٹ حقارت سے اس کی طرف پھینکتا ہے ۔

وہ ان نوٹوں کی طرف دیکھ کر ناک سکیڑ لیتی ہے ۔ اور دروازے سے سہارا لگا کر یوں کھڑی ہو جاتی ہے جیسے انتہائی دکھی ہو ۔ اور وہ ایک جست بھر کر دروازے سے نکل جاتا ہے ۔

روز بلاناغہ وہ اتنا لمبا چکّر کاٹ کر بیسن بازار سے ہوتا ہوا بائی کے مکان پر پہنچتا ہے ۔۔ روز بلاناغہ ۔۔ اور بلاناغہ ملحقہ کمرے سے وہ بائی کو بلاتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے ۔ "تم اس سے قطع تعلق کروگی یا نہیں" ۔ اور وہ معصومانہ انداز سے پوچھتی ہے "کس سے" اور وہ جلال میں چلّاتا ہے "خالد سے" ۔ "جی" کہہ کر وہ آنکھیں جھکا لیتی ہے ۔ "اگر نہ کیا تو" وہ غرّاتا ہے ۔ "اے کیوں" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی ہے ۔ "کیوں نہ کروں گی"۔ "نہ کیا تو" وہ اپنی چھڑی معنی خیز انداز سے اٹھاتا ہے ۔ روز بلاناغہ وہ چار ایک دس دس کے نوٹ بائی کی طرف پھینکتا ہے ۔ بائی کے چہرے پر حقارت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ چھڑی اُٹھا کر باہر نکل جاتا ہے ۔ اور پھر چند ساعت کے بعد نکڑ سے کھونٹ والے بابا کا مسرت بھرا قہقہہ گونجتا ہے اور محلے کی سارنگیاں سرگوشیاں کرتی ہیں ، ڈھولکیں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہیں ، گھنگرو زیرِ لب گنگناتے ہیں ، رقاصائیں خوشی سے رقص کرتی ہیں ، دُولا حلوائی کے سموسے بِکتے ہیں ، اجّو کبابیے کے

کباب لذیذ ہو جاتے ہیں اور بیسن بازار کی نبض دُرت لَے پر دھڑکتی ہے ۔۔ روز بلاناغہ ۔

خالد کو بیسن بازار سے گزرنے کا اتفاق کبھی کبھار ہوتا تھا ۔ کبھی کبھار جب اسے اپنے دوست نسیم کے ہاں فوری طور پر جانا ہوتا کیونکہ نسیم اس کا واحد دوست تھا جو بیسن بازار کے پرے سٹی روڈ پر رہا کرتا تھا ۔ عام طور پر خالد اس سے ملنے کے لئے سرکلر روڈ سے جایا کرتا تھا جو چکّر کاٹ کر سٹی روڈ کی طرف جاتی ہے ۔ لیکن جب کبھی وقت تنگ ہوتا تو وہ اپنی اوپل بھنڈی بازار کی طرف موڑلیتا اور بیسن بازار سے شارٹ کٹ کر کے سٹی روڈ پہنچ جاتا ۔ بیسن بازار میں راہ چلتے اس نے پنچم سُریں بھی سنی تھیں اور رنگین کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے متبسّم چہرے بھی دیکھے تھے اور انہیں دیکھ کر مسکرا کر آگے چل دیا تھا ۔ اس نے اس بازار کو کبھی خاص اہمیّت نہ دی تھی ۔

پھر ایک روز جب وہ بیسن بازار کے اس موڑ سے مڑا جہاں بابا کھونٹ والا بیٹھا رہتا تھا تو بائی کے چوبارے کے عین مقابل میں پہنچ کر اوپل رک گئی ۔ خالد نے بہت کوشش کی کہ اسے چلا کر لے جائے ۔ مگر بے سُود ۔ بالآخر اسے موٹر سے اترنا ہی پڑا ۔ موٹر سے اتر کر وہ سر کھجاتے ہوئے سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے کہ عقب سے بائی کی آواز سنائی دی "اے حمید ذرا ان کی مدد کرنا" ۔ اس نے مڑ کر دیکھا ۔ ہائیں ۔ بائی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا ۔ آپ ۔ آپ جیتی جاگتی ہیں یا مجسمہ ہیں ۔

بائی مسکرادی ۔

"آپ" وہ بولا ۔ "آپ بیسن کی بنی ہوئی ہیں یا ہلدی کی" ۔

بائی نے منہ پتّا کر لیا ۔ "اونہوں" اس نے آنکھیں گھما کر کہا "زعفران کی"

"ارے آپ تو بولتی بھی ہیں"۔ خالد سر کھجانے لگا ۔ "بھئی حد ہو گئی"۔

"ابھی سے" وہ ایک انداز سے بولی ۔ "ابھی تو ابتدا ہے" یہ کہہ کر وہ پُھدک کر مکان میں داخل ہوگئی ۔

اس روز اوپل میں بیٹھے نسیم کی طرف جاتے ہوئے وہ آپ ہی گنگناتا رہا

''بھئی حد ہو گئی'' اسے کھوئے کھوئے دیکھ کر نسیم فوراً تاڑ گیا کہ کوئی بات ہے اور پوچھنے لگا ''بھئی آج کونسی حد توڑ کر آئے ہو'' ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بائی کو دیکھ کر خالد حیران ہوا تھا اور بائی نے اس پر خاصہ اثر ڈالا تھا ۔ مگر اس اثر کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ بات چھپا لیتا اور اسے راز بنا کر ہمیشہ کیلئے خود پر مسلّط کر لیتا کیونکہ وہ بائی کے حُسن سے اس قدر متاثر نہیں ہوا تھا ۔ وہ حُسن اور محبّت کی لازم و ملزومیّت کا قائل نہیں تھا ۔ اس کے نزدیک بائی ایک جاذبِ نظر عورت تھی ۔ جو عورت ہونے کے باوجود لڑکی دکھائی دیتی تھی جیسے کہ بیسیوں عورتیں ہوتی ہیں ۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حسین عورت کو دیکھ کر ''بھئی واہ'' کہہ کر آگے کو چل پڑتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد اس بھئی واہ کو قطعی طور پر بھول جاتے ہیں اور اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں اگر اس روز بائی کو دیکھ کر بھئی واہ کی بجائے حد ہوگئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بائی کے جسم کی ریشمیں زردی دیکھ کر اس نے محسوس کیا تھا جیسے لیمن کرش کا گلاس بھرا ہُوا ہو اس قدر گہرے زرد رنگ کا جسم اس نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ اس نے گورے بدن دیکھے تھے ، سانولے جسم دیکھے تھے ۔ ملیح رنگ دیکھا تھا ۔ مگر سرسوں کے پھول کا سا رنگ ۔۔ اس کے لئے یہ انوکھی چیز تھی ۔

''ارے یار'' وہ ہنس کر کہنے لگا ''آج تو سمجھ لو حادثہ ہی ہو گیا ۔ ایک ایسی لڑکی سے مڈبھیڑ ہو گئی جو پاؤڈر کی بجائے پسی ہوئی ہلدی سے میک اپ کرتی ہے'' ۔ اور وہ ہنسنے لگا ۔ ''کہتی ہے زعفران کی بنی ہوئی ہوں''۔

''اچھا'' نسیم ہنسا ۔ '' دلچسپ قصہ ہے ۔ کون تھی وہ''؟

''لو'' خالد نے منہ بنالیا ۔ ''یہ معلوم ہوتا تو حد کیوں ہوتی'' ۔

''کہاں ملی تھی'' نسیم نے سرسری طور پر پوچھا ۔

''بھئی یہیں اس بیسن بازار کی ہے''۔

''ارے'' نسیم چلّایا ۔ ''کہیں ہیلی بائی کی تو بات نہیں کر رہے ہو تم''

''ہیلی بائی'' خالد چلّایا ۔ ''وہ کیا شے ہے حضور''

"ہائیں" نسیم نے اس کی طرف غور سے یوں دیکھا جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہو۔ "میلی بائی کو نہیں جانتے ـ۔ وہ تو زرد ناگن ہے"۔ نسیم ہنسنے لگا "اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیسن بازار میں رہ کر بھی گھریلو انداز سے رہتی ہے اور لوگ اسی بات پر مرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے" وہ چلّایا" کہ گھر سے چل کر اتنی دور اس گھریلو انداز کو دیکھنے جاتے ہیں ـ۔ کون نہیں جانتا اُسے"۔

"اچھا" خالد ہنسنے لگا "تو پھر ہمیں بھی لے چلو یار کبھی۔ ہم بھی جان لیں اسے"

ہیسن بازار کے علاقہ میں کون تھا جو میلی بائی کو نہ جانتا ہو۔ حتّٰی کہ سول لائنز کے خاندانی نواب تک یا تو اس سے واقف تھے یا واقفیت پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ اگرچہ اسے ہیسن بازار میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

یہی کوئی چھ مہینے کی بات ہوگی جبکہ ایک روز ناگاہ اس جگمگاتے ہوئے بازار میں مہینے کی آخری تاریخوں کے چاند کی طرح وہ طلوع ہو گئی تھی۔ ہوا یہ کہ دُولا حلوائی نے چانن بائی کے اصرار پر اس نکڑ پر یہ زمین خرید کر مکان تعمیر کرانا شروع کردیا۔ کسی زمانے میں دُولا حلوائی کے دل میں چانن بائی کے لئے جگہ تھی جسے مٹھائی کی دوکان نے عرصۂ دراز سے پُر کر دیا تھا اور چانن بائی بھی اپنی سیلانی طبیعت کی وجہ سے لاہور چھوڑ کر کراچی جا بیٹھی تھی۔ اب وہ لاہور واپس آنا چاہتی تھی۔ مگر کوئی مناسب چوبارہ نہیں ملتا تھا۔ اس نے دُولا کے پرانے جذبہ سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے متواتر کئی ایک خط لکھے۔ دُولا حلوائی کے مکان بنوانے کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ اس گزرے ہوئے سانپ کی لکیر کو پھر سے پیٹے۔ اس نے یہ سوچا کہ چلو کرایہ تو آئے گا اور تعلق مفت ـ۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

جب اس چوبارے پر آخری پلستر ہو رہے تھے تو ایک روز صبح سویرے ایک لڑکا دوڑا دوڑا حلوائی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "چاچا ہمارے مکان میں کوئی آگیا ہے"۔ دولا نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور موتی چُور کے لڈو بناتے ہوئے بولا۔ "کس مکان میں ـ۔ کون آیا ہے؟"

"نئے مکان میں چاچا"۔

"نئے مکان میں ۔۔ نہیں ۔ نہیں"۔ وہ چلایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ یہاں کسے جرأت ہو سکتی ہے ۔ کہ دُولا کے مکان پر قبضہ کرے ۔

"سچ کہتا ہوں چاچا" لڑکے نے سنجیدگی سے کہا "اللہ کی قسم ۔

"ہائیں" دولا نے غصّے میں ہاتھ جھاڑے اور تنکوں کی ٹوپی سر پر رکھ کر جوتا پہننے لگا ۔ "چل تو دیکھوں کون ہے وہ لاٹ کا بچّہ جس میں اتنی جرأت ہے کہ ہمارے مکان پر قبضہ جمائے"۔ اس نے لاٹھی اٹھاتے ہوئے کہا ۔

جب وہ نئے چوبارے کے کمرے میں داخل ہوا تو پیلی بائی تار کول کے ڈرم پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی زرد چڑیا کسی حبشی کی انگلی پر بیٹھی ہو اور آس پاس اس کا سلمان پڑا تھا ۔

"کون ہے تو؟" وہ چلایا ۔

"میں" وہ بولی 'اے میں تو کوئی بھی نہیں'۔

"کیا مطبل" وہ چلایا ۔

"اے بس" اس نے ہاتھ کو یوں چلا کر کھول دیا جیسے کبوتر اڑا رہی ہو ۔ "کوئی بھی نہیں"۔

"یہاں کیا کر رہی ہو"۔ وہ غرایا۔

"اے کچھ بھی نہیں"۔ اس نے سیاہ آنکھیں گھمائیں ۔

"یہ گھر ہمارا ہے"۔ دُولا نے دھمکی دی ۔

"لو میں کب کہتی ہوں کہ میرا ہے"۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی ۔

"تو نکل یہاں سے دوڑ جا"۔ وہ چلّایا ۔

"اے تانگہ تو لادے"۔ اس نے پانچ روپے کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"میں تمہارا نوکر ہوں کیا"۔ دُولا غرایا ۔

"نہیں تو" وہ مسکرائی ۔

"تو پھر"

"اے گھر والے تو ہو" سیاہ معصوم آنکھیں نصف النہار سے چمکیں ۔

وہ ہنس پڑا "عجیب ہو تم "۔

"اچھا دیکھو" وہ بولی "اب تانگہ جو لائیگا تو کچھ کھانے کو بھی لادے کچھ نہیں کھایا صبح سے "۔ اور پھر بالکل بے تکلفانہ منہ پھاڑ دیا اور کہنے لگی "دیکھ لو بالکل خالی ہے "۔

پھر دس منٹ کے بعد وہ میٹھی پوریاں کھا رہی تھی اور ڈولا پانی کا گلاس لئے کھڑا تھا اور انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اسے وہاں آباد کرنے آیا ہو نکالنے کے لئے نہیں اور شام کو دوکان پر بیٹھے ہوئے دولا ہنس ہنس کر دوستوں کو بتا رہا تھا کہ اس کا رنگ اس قدر گہرا پیلا ہے جیسے بوندی کا لڈو ہو ۔ بالکل ایسا ۔ اوراس کی باتیں عجیب ہیں جیسے اسکول کی تویں جماعت سے بھاگ کر آئی ہو ۔ چلو بھائی اپنا کیا ہے کرایہ ہی لینا ہے نا ۔ اور وہ چانن بائی ۔ اُسے ٹرخا دیں گے ۔ اس کا کیا ہے ۔ وہ ہنس رہا تھا ۔ بچّوں جیسی معصوم ہنسی ۔

دولا کی باتیں سن کر دوکان پر بیٹھنے والے حیران رہ گئے ۔ دولا اس قدر بڑی بات کو یوں ہنس کر برداشت کرے ۔ حیرانی کی بات تو تھی ہی ۔ ایک تو وہ ضد میں مشہور تھا اور دوسرے وہ ان بائیوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو ۔

اس کے منہ سے اس نو وارد کی باتیں سن کر سارے بیسن بازار میں نو وارد کی دھوم مچ گئی اور اس کے ریشمیں زرد رنگ کا اس قدر چرچا ہوا کہ بیسن بازار والوں نے اسے ہیلی بائی کے نام سے موسوم کردیا ۔

ڈولا حلوائی کے علاوہ ہیلی بائی کی شہرت کو کھونٹ والے بابا نے بھی ہوا دی ۔ نہ جانے وہ بات محض اتفاق پر مبنی تھی یا واقعی وہ ہیلی بائی کا اعجاز تھا ۔

بابا کھونٹ والا کوئی معمولی فقیر نہیں ہے ۔ وہ بیسن بازار کی اہم شخصیت ہے ۔ ایک ایسی شخصیت جسے سب جانتے ہیں اور جس کی موجودگی اور غیر حاضری کا سب کو احساس رہتا ہے ۔ اس علاقہ میں بابا کھونٹ والا کہیں بھی چلا جائے ، کسی دروازے پر کھڑا ہو کر سوال کردے کوئی اس کے سوال کو رد نہیں کرے گا ۔ ڈولا حلوائی اس کے سامنے تازہ ترین مٹھائی رکھ دے گا ۔ اجو کبابوں اور

تکوں کی پلیٹ بھر کر پیش کرے گا ۔ رائل ٹاکی کے گیٹ کیپر اُسے آتا دیکھ کر دروازے کھول دیں گے تاکہ اگر وہ اندر جانا چاہے تو جس کلاس میں جی چاہے جا بیٹھے ۔ دوکانداروں کی بات چھوڑیئے وہ ان دروازوں سے بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا جہاں سے بھری جیبوں والے بھی خالی ہاتھ لوٹتے ہیں ۔ ببلی بائی کے آنے سے پہلے وہ بازار کی عین وسط میں دولا حلوائی کی دوکان کے قریب بیٹھا کرتا تھا ۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا وہ وہیں بیٹھا تھا ۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس لئے وہاں بیٹھے بیٹھے وہ بیسن بازار کا جزو اعظم بن چکا تھا اور کسی نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ کیوں وہاں بیٹھا ہے ۔ بلکہ جب کبھی وہ اپنی جگہ پر نہ ہوتا تو سبھی سوچتے اور دوسروں سے پوچھتے کہ بھئی کھونٹ والا بابا کہاں گیا ۔

وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا ۔ اور اگر کرتا بھی تو صرف اپنے اس کھونٹ سے جو ہر وقت اپنے ہاتھوں میں تھامے رہتا تھا ۔ یہ کھونٹ ایک بھاری اور بھدی ہاتھ کی چھڑی تھی ۔ اس کا دستہ موٹا تھا اور پہلوؤں پر وہ یوں ابھری ہوئی سی تھی جیسے دوسانپ اس کے گرد لپٹے ہوئے ہوں ۔ اور وہ سالہا سال کے میل سے سیاہ ہوچکی تھی ۔ بابا ہر وقت اس کھونٹ کو سینے سے لگائے رکھتا اور ہر چند منٹ کے بعد دونوں ہاتھوں سے اسے اوپر کو اٹھاتا اور یوں لہراتا جیسے کسی کو پیٹنے کی دھمکی دے رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے عجیب سی چیخیں نکلتیں اور کف جاری ہو جاتے ۔ مگر ان آوازوں نے کبھی الفاظ کی شکل اختیار نہ کی تھی ۔ وہ ایک منٹ کھونٹ لہرانے کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا اور چند ایک لمحوں کے بعد پھر سے اپنے کھونٹ کو ابھارتا اور لہراتا اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتا اور اس کا قہقہہ بازار میں گونجتا جیسے وہ کسی غصے آمیز دھمکی اور تمسخر آمیز قہقہے کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا ہو ۔

ببلی بائی کی آمد کے دوسرے ہی روز بازار کے لڑکوں نے شور مچا دیا کہ کھونٹ والا بابا نہیں ہے ۔ کھونٹ والا بابا چلا گیا ۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ موجود نہیں ہے ۔ یہ واقعہ حیران کن بات تھی ۔ کیونکہ سالہا سال سے وہ اسی جگہ بیٹھتا تھا اور کبھی وہاں سے نہ ہلا تھا ۔

اس بات پر چاروں طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں ۔ پھر خبر آئی کہ وہ ہیلی بائی کے چوبارے کی نکڑ پر آبیٹھا ہے اور لوگ سمجھنے لگے کہ بابا کی نقل مکانی کو ہیلی بائی سے تعلق ہے اور اس طرح ہیلی بائی آتے ہی سارے بازار میں مشہور ہو گئی ۔ اور آتے جاتے لوگ چوبارے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے ۔

ہاں تو ہیلی بائی کو دیکھنے کی ہوس جو خالد کو وہاں لے گئی تھی ۔ اس میں عیش پرستی تماش بینی یا عشق و محبّت کا عنصر نام کو نہ تھا ۔ خالد ایک صحت مند نوجوان تھا ۔ جس کے ذہن میں چیزوں کی اقدار کی مناسبت میں گڈمڈ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اگر وہ ہفتے میں ایک دو بار ہیلی بائی کے ہاں چلا جایا کرتا تھا تو اس کا مقصد محض ذہنی تفریح تھا ۔

پہلی مرتبہ جب ان کی آمد پر بائی نے "ہیابن تائیں پڑت موہے چین" کی ٹھمری شروع کی تو وہ ہنس کر بولا "مولانا کوئی بات کیجئے ۔ یہاں اس کے لئے دماغ کا خانہ سراسر خالی ہے" اور وہ مسکرا کر اس کے پاس آبیٹھی تھی اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی تھی ۔ "اے حضرت رمضانِ مبارک کے بعد عیدالفطر کا فطرانہ کس حساب سے دیا جائے ۔ ذرا یہ مسئلہ سمجھا کر ہماری مشکل حل کر دیجئے "لو اور سن لو" وہ ہنسا "یہ بھی خوب رہی"۔ "ہم سے پوچھا بھی تو کیا حضور نے"۔

"تو کیا یہ خانہ بھی خالی ہے" بائی نے سنجیدگی سے پوچھا ۔

"یہ بتاؤ کہ زعفران آج کل زوروں پر کیوں ہے ؟"

بائی نے برا سامنہ بنا لیا "چھوڑیئے" وہ بولی "کسی ٹھنڈی چیز کی بات کیجئے ۔ "زعفران تو بے حد گرم ہوتا ہے"۔

"ارے تو کیا آپ طبیب بھی ہیں" وہ ہنسنے لگا۔

"طبیب تو ہیں لیکن آج کل مریض نہیں ملتے ۔"

اسی طرح وہ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے ۔ وہ بناتی رہی وہ بنتا رہا اور بس ۔ خالد نے تو اس نئی واقفیت کو چنداں اہمیت نہ دی تھی اور نہ ہی اُسے راز بنایا تھا ۔ مگر اس کے باوجود اپنی طبیعت کے خلاف اسے معمولی سی بات کو چھپانا پڑتا تھا ۔ مثلاً جب وہ کارخانے پہنچتا تو اس کے والد پوچھتے "کیوں میاں کہاں

رہے تم" تو اسے اِدھر اُدھر کا کوئی بہانہ کرنا پڑتا ۔ کیونکہ اس کے والد آغا عظیم اللہ پرانے رنگ کے وضعدار بزرگ تھے اور انہوں نے کاروبار اور سرمایہ مسلسل محنت اور مشقت سے کمایا تھا وہ صراطِ مستقیم کے قائل تھے اور صراطِ مستقیم ان کی نگاہ میں ایک متعیّن شدہ تنگ راستہ تھا ۔ افراد برطرف انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی اوپل وہاں سے گزرے ۔

خالد کے متعلق آغا عظیم کی توقعات بے حد بلند تھیں ۔ ان کی تمام تر امیدیں خالد سے وابستہ تھیں ۔ اور خالد نے اپنے باپ کو کسی بات میں مایوس نہیں کیا تھا وہ ان کے روبرو ادب سے کھڑا ہو جاتا اور ہر بات پر جی ہاں کہہ کر انہیں خوش کر دیتا ۔ حتیٰ کہ وہ ایسی ایسی باتوں پر بھی ماتھے پر بل نہ ڈالتا جو اس کے خیالات و جذبات کے منافی ہوتیں ۔ شاید اسی لئے انہیں خالد سے والہانہ محبت تھی ۔

آغا عظیم کی سب سے بڑی کمزوری ان کی طبعی فقیر پرستی تھی ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عقیدے کے مطابق کاروبار میں ان کی تمام تر کامیابی ایک فقیر کی دعا کی وجہ سے ہُوئی تھی ۔ اگرچہ اب انہیں مزید دعا کی تو ضرورت نہ تھی اور نہ ہوس تھی ۔ پھر بھی وہ فقیروں سے احتراماً ملتے تھے ۔ انہیں سلام کرتے ۔ ان کے حضور میں با ادب بیٹھے رہتے اور پھر اجازت لے کر لوٹ آتے ۔

بابا کھونٹ والے کی کرامات کے متعلق انہوں نے سب سے پہلے اپنے موٹر ڈرائیور سے سنا تھا ۔ لیکن بیسن بازار کی تفصیل نے انہیں پریشان کر دیا تھا ۔ اس لئے انہوں نے بابا کھونٹ والے کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں ایک کھٹک سی لگ گئی تھی ۔

کارخانے میں کام کرتے ہوئے یا گھر بیٹھے ہوئے انہیں دفعتاً بابا کھونٹ واے کی یاد آ جاتی ہے ۔ اور وہ مضطرب ہو جاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں جیسے التزاماً بابا کی خدمت میں حاضر نہ ہونا بے ادبی کی علامت تھا ۔

پھر ایک روز بعد از دوپہر نیند سے بیدار ہوتے ہی انہوں نے ڈرائیور کو بلایا

اور کہنے لگے ۔ "محمد علی ہمیں جانا ہی پڑے گا ۔ چاہے وہ کہیں بھی ہوں ہمیں جانا ہی پڑے گا ۔ انہوں نے آپ بلایا ہے ۔ خواب میں وہ آئے اور مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہنے لگے ۔ ڈرتا ہے ، وہاں جانے سے ڈرتا ہے آخر ہم بھی تو وہیں بیٹھے ہیں ۔ جاؤ محمد علی گاڑی تیار کرو ہم ابھی جائیں گے" ۔

"گاڑی تو نہیں ہے صاحب" ڈرائیور نے جواب دیا ۔ "وہ چھوٹے صاحب لے گئے" ۔

" کہاں گیا ہے ؟" انہوں نے پوچھا ۔

"معلوم نہیں صاحب" وہ بولا ۔

اچھا تو ہم تانگہ سے چلیں گے محمد علی لیکن ایسے راستے سے لے چلنا کہ اس بازار سے نہ گزرنا پڑے ۔

محمد علی انہیں سرکلر روڈ سے گھما کر سیدھا سٹی روڈ سے لے گیا اور پھر وہاں سے تانگہ واپس کردیا تاکہ بیسن بازار کا وہ ٹکڑا راہ میں نہ پڑے جہاں لوگوں کا ہجوم رہتا ہے ۔

ہیلی بائی کے چوبارے کے سامنے اپنی اوپل کھڑی دیکھ کر آغا عظیم اللہ سکتے میں رہ گئے ۔ "محمد علی" ۔۔ انہوں نے اوپل کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی ۔ محمد علی اس راز سے واقف تھا ۔ کیونکہ ایک بار وہ خود خالد کو وہاں لاچکا تھا۔ اس کا رنگ فق ہوگیا ۔ عین اس وقت ہیلی بائی کی بیٹھک سے خالد کا قہقہہ بلند ہوا۔

آغا عظیم اللہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھڑی سنبھالی اور ایک خوفناک عزم سے چوبارے میں داخل ہوئے ۔ بیٹھک میں پہنچکر انہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھڑی کو بلند کیا ۔ "تم ۔ تم"۔ وہ خالد کی طرف دیکھ چلّائے ، منہ سے کف جاری ہو گئے ۔ ہیلی بائی پُھدک کر ان کے درمیان آکھڑی ہوئی ۔ اور یوں مسکرانے لگی جیسے وہاں تفریحی ڈرامہ کھیلا جارہا ہو ۔

وہ بائی کو دیکھ کر گھبرائے ۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اُن کی چھڑی نیچے

گر گئی ۔ ایک ساعت کے لئے وہ یوں کھڑے کے کھڑے رہ گئے جیسے مٹی کے بنے ہوئے ہوں اور خالد چپکے سے سرک کر باہر نکل گیا ۔ پھر دفعتاً ان کو ہوش آیا اور وہ سوئی اٹھا کر باہر کی طرف بھاگے لیکن خالد کی اوپل جا چکی تھی ۔

آغا عظیم اللہ دیر تک سڑک کے درمیان کھڑے دونوں ہاتھوں میں چھڑی اٹھائے اسے لہراتے رہے ۔ ان کے منہ سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں لیکن ان بے معنی آوازوں نے الفاظ کی شکل اختیار نہ کی تھی ۔ پھر کھونٹ والے بابا کا بھیانک قہقہہ گونجا ۔ اگرچہ اس میں خوشی کی شدت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ۔ لیکن وہ قہقہہ اس قدر بھیانک تھا کہ ہیسن بازار والے بھی چونک پڑے ۔ لوگ اکٹھے ہو گئے ۔ لڑکے نعرے لگانے لگے ۔ چوباروں کی بند کھڑکیاں کھل گئیں ۔ کھونٹ والا بابا اپنا کھونٹ سنبھالے قہقہے لگاتا ہوا عظیم اللہ کے قریب آ کھڑا ہوا ۔ مگر عظیم اللہ اپنی ہی دُھن میں کھڑا چھڑی ہلاتا رہا ۔ وحشت میں وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا منہ سے کف جاری تھے ۔ اور بابا کھونٹ والا ان کی طرف دیکھ دیکھ کر یوں ہنس رہا تھا جیسے بہت دیر کے بعد ایک ساتھی آ ملا ہو۔

اب بھی اتنا لمبا چکّر کاٹ کر عظیم اللہ روز بلاناغہ بائی کے مکان پر پہنچتا ہے ۔ اور بلاناغہ جب بتیوں کی روشنی میں چمک پیدا ہو جاتی ہے وہ ملحقہ کمرے میں داخل ہو کر غصّے میں چلّاتا ہے "بائی کو بلاؤ ۔" اور پھر بائی کو دیکھ کر کئی ایک ساعت کے لیے یوں سکتے میں رہ جاتا ہے جیسے کھو گیا ہو ۔ وہ کچھ کہنے کی شدید کوشش کرتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا ۔ اس کی چھڑی ہوا میں اُٹھتی ہے اور گر پڑتی ہے پھر اُٹھتی ہے پھر گر پڑتی ہے ۔ اور بائی سر جھکائے سامنے کھڑی انتظار کرتی ہے جیسے کوئی مجرم منصف کے روبرو کھڑا فیصلے کا انتظار کرتا ہو ۔ دیر تک وہ یونہی ایک دوسرے کے رُوبرو کھڑے رہتے ہیں ۔

پھر دُور سے کھونٹ والے کا قہقہہ عظیم اللہ کو چونکا دیتا ہے ۔ اور وہ لرزتی ہوئی آواز سے پوچھتا ہے "تم اس سے قطع تعلق کرو گی یا نہیں ؟"

"اُسے کس سے" دو معصوم آنکھیں نصف النہار سے چمکتی ہیں۔

"خالد سے" وہ بڑبڑاتا ہے ۔

"اے کیوں" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوچھتی ہے ۔ کون خالد ۔
"میرا بیٹا" وہ آہ بھر کر کہتا ہے ۔ اور پھر دفعتہً غصہ میں آ کر چلاتا ہے ۔
"میں کہتا ہوں تم اس سے قطع تعلق کر لو ۔ میں کہتا ہوں ۔ میں"
"اوہ ۔ آپ کہتے ہیں" ۔ وہ سر جھکا کر یوں گنگناتی ہے جیسے سبب کچھ سمجھ گئی ہو ۔
"اگر تم نے نہ کیا تو؟" وہ چھڑی لہرا کر پوچھتا ہے ۔
"کیوں نہ کروں گی؟" سیاہ آنکھیں ترچھی شعائیں ڈال کر غروب ہو جاتیں ۔

"نہ کیا تو تم مجھے جانتی ہو" وہ چلاتا ہے اور جیب سے چار ایک دس دس روپے کے نوٹ نکال کر پھینکتا ہے ۔ نوٹوں کو دیکھ کر بائی کے چہرے پر حقارت کی ایک شدید لہر دوڑ جاتی ہے ۔ اور وہ دروازے سے سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ پھر عظیم اللہ یوں باہر کی طرف دوڑتا ہے جیسے اندر کھڑا رہنے سے ڈرتا ہو ۔ دروازے پر کھونٹ والا بابا اسے دیکھ کر مسرت بھرا قہقہہ لگاتا ہے جیسے اسے دیر کے بعد ایک ساتھی مل گیا ہو ۔ بازار کی سارنگیاں بغلیں بجاتی ہیں ۔ ڈھولکیں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہیں اور رقاصائیں خوشی سے رقص کرتی ہیں ۔ اور دولا حلوائی کے سموسے بکتے ہیں ۔ اجو کے کباب لذیذ ہو جاتے ہیں ۔ بے سن بازار کی نبض درت کی لے پر دھڑکتی ہے اور دادرے کے ٹھیکے پر ہیلی بائی کا گیت بازار میں گونجتا ہے ۔
"اب کون تجھے سمجھائے ـــــ"
روز بلاناغہ ۔۔

.........○.........

چارگوٹ

اعظم آباد میں چارگوٹ سے کون واقف نہیں ۔ سول لائنز کے صاحب ، دفتروں کے بابو ، بستی کے مزدور ، چھابڑی والے ، پانسفروش شہر کے سیٹھ بنگالی بابو دلال اور کٹنے سبھی چارگوٹ کو جانتے ہیں ۔ چارگوٹ اعظم آباد کا وہ واحد مقام ہے جہاں مشرق اور مغرب کچھ دور تک شانہ بشانہ چلتے ہیں ۔ جہاں ادائیگی کے لئے پرس سبز نوٹ اگلتے ہیں اور ساتھ ہی گرہ سے کھولے ہوئے میلے سکے کھنکتے ہیں ۔ جہاں کاروں کے ہارن بجتے ہیں ۔ رکشا والوں کی بڈیاں چٹختی سنائی دیتی ہیں ۔ پھیری والوں کے آوازے ، فقیروں کی صدائیں ، دفتر کے بابوؤں کی دبی دبی آہیں ، صاحبوں کے "اے ہٹ جاؤ آگے سے" اور مزدوروں کے ننگے بے تکلف قہقہے گونجتے ہیں ۔

چارگوٹ وہ چوک ہے جہاں چار بازار ملتے ہیں ۔ جنوب میں میکلوڈ روڈ کی خوبصورت سہ منزلہ عمارتیں ہیں ۔ جن میں سو سے دو سو روپے ماہوار کرایہ کی فلیٹوں تلے جنرل مرچنٹس کی دوکانیں ہیں ۔ سول لائنز کا یہ آخری ٹکڑا نہ جانے کس اصول کے تحت چارگوٹ سے نکل کر شمال کو شہر کے عوامی علاقے میں جا گھسا ہے یہ حصہ زینت بازار کے نام سے مشہور ہے ۔ جہاں ہر قسم کی زینت کا سامان ملتا ہے ۔ سنگار فرنیچر لباس آرٹ سے متعلقہ نوادر تصاویر اور مجسمے سب زینت بازار میں گڈمڈ ہوئے پڑے ہیں اور اس دلچسپ گڈمڈ سے چیزیں ڈھونڈھنے کے لئے سول لائنز کے بانکے زینت بازار میں جانے پر مجبور ہیں ۔ پاؤڈر سرخی سے تھپی ہوئی بانکیاں برقعوں میں لپٹی ہوئی عریاں بیگمات فیشن کے دلدادہ صاحب سبھی چارگوٹ کی سرحد کو عبور کر کے زینت بازار میں آتے ہیں ۔ انہیں آرٹ سے دلچسپی نہیں ۔ وہ خالی زینت کے متوالے ہیں ۔ اس کے باوجود

انہیں یہ گوارا نہیں کہ لوگ انہیں آرٹ سے بے بہرہ سمجھیں ۔

چارگوٹ کے مغرب کی طرف بابو باڑہ میں دفتروں کے بابو مقیم ہیں جو سائیکلوں پر چلتے ہیں ۔ فلمی دھنیں گنگناتے ہیں ۔ ہوٹلوں میں چائے کے پیالے پر ادب پر بحث کرنے پر گزر اوقات کرتے ہیں اور سڑکوں اور گھروں میں صاحب کی باتیں کرکے وقت کاٹتے ہیں ۔ مشرق میں مزدوروں کے گھروندے ہیں ۔ اس علاقے کو بستی کہتے ہیں ۔ اور بستی سے پرے کالا پل ہے اور پل کے پرلی طرف لال کھوئی سرخ لالٹینوں کی وہ بستی ہے جس میں بابو اپنے صاحب اور مدقوق بیگم کو بھولنے کے لئے ڈبکیاں کھاتے ہیں ۔ اور مزدور عیش و عشرت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں ۔

معلوم نہیں اس چوک کا نام چارگوٹ کیسے پڑگیا ۔ شاید اس کی وجہ وہ چارگوٹ نما گولے ہوں جو چوک کے مرکزی چبوترے کے گرد سیمنٹ سے بنے ہوئے ہیں ۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چارگوٹ در اصل چارکھونٹ تھا جو بعد میں بگڑ کر چارگوٹ بن گیا ۔

چارگوٹ پر بابو باڑہ اور بستی کا قبضہ ہے ۔ چوک سے شمال اور جنوب دونوں جانب دفعتاً سول لائنز کے اثرات معدوم ہو جاتے ہیں اور بستی کا رنگ ابھر آتا ہے پھر شمال میں زینت بازار میں مغربیت گویا پھر سسکیاں بھرتی ہوئی ابھرتی ہے چارگوٹ کا یہ ٹکڑا گویا سول لائنز کے غالیچے پر ٹاٹ کا ایک پیوند ہے ۔ یا جیسے بلوری مرتبان پر ٹین کا جوڑ لگا ہو ۔

اگر آپ میکلوڈ روڈ سے زینت بازار کی طرف جائیں تو چارگوٹ کے قریب دفعتاً سول لائنز کا وہ صاف خوبصورت اور خوابیدہ منظر ختم ہو جائے گا اور آپ محسوس کریں گے جیسے آپ گورا قبرستان سے نکل کر دفعتاً زندگی کے جھرمٹ میں آگئے ہوں میلی پُر شور عریاں زندگی ۔

چارگوٹ میں زندگی کے شرارے اڑتے ہیں جنہیں دیکھ کر سول لائنز کی مبتدی گڑیاں آنچل سنبھالتی ہیں اور مشاق بیگمیں چوری چوری آرزو کرتی ہیں کہ وہ مڑ کر زندگی کی اس بھیڑ میں جا داخل ہوں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے ،

جہاں مرد اور عورت کے ازلی فرق کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں رہتا ۔ سول لائنز کی ان بلوری پتلیوں کے ساتھی چارکوٹ کے قریب پہنچ کر آستین چڑھا لیتے ہیں جیسے زندگی کے اس بے تکلف ریلے کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ لیکن چارکوٹ کے عوام نہ تو ان لوگوں کو دیکھ کر نفرت سے ناک چڑھاتے ہیں اور نہ ہی حسرت سے ان کی طرف دیکھ کر ان سا ہونے کی آرزو کرتے ہیں ۔ انہیں دیکھ کران کے ہونٹوں پر یوں مسکراہٹ آجاتی ہے جیسے وہ کلدار گڑیوں کا تماشہ دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں ۔

چارکوٹ کے ایک جانب دینا کبابئیے اور لالو چانپ والے کی دوکان ہے دوسری جانب پہلوان دودھ والا اور کریم مٹھائی والا ہے جن کے درمیان میں صوبہ پان والے کی الماری ہے ۔ تیسری جانب چچا حلوہ پوری ہے ۔ حلوہ پوری والے کے ساتھ ڈاکٹر ڈیوڈ کا مطب ہے اور چوتھی جانب کریم جراح کے ساتھ نورا گجرے والا اور امام دین فروٹ والا ہے اِن دوکانوں کے علاوہ چارکوٹ کے چکّر میں چار ریڑی والوں نے مستقل طور پر اپنے اڈے بنائے ہوئے ہیں ۔ ان میں اجمل کلفی والا ۔ توفیق پکوڑے والا ۔ صوبہ سری پائے والا اور بھیا پلاؤ والا ہے ۔ پولیس نے ان ریڑی والوں کے خلاف بارہا کاروائی کی ہے ۔ ابھی پچھلے ہفتے ٹریفک ویک کے دوران میں پولیس کے ایک دستے نے وہاں چھاپہ مارا تھا اور تمام ریڑیاں بنچیں اور کرسیاں وہاں سے اٹھوادی تھیں ۔ پھر نہ جانے کیسے اس واقعہ کے صرف ایک گھنٹے بعد کئی ایک سپاہی انہیں بنچوں پر بیٹھ کر انہیں ریڑیوں سے سری پائے ، پلاؤ اور کباب کھا رہے تھے ۔

ویسے بھی تو بستی کی پولیس چوکی والے جب بھی چارکوٹ سے گزرتے ہیں تو وہ پہلے دینا کبابئیے کو باقاعدہ سلام کرتے ہیں ۔ اور توفیق پکوڑے والے سے ہاتھ ملاتے ہیں ۔ "کیوں بھئی حوالدار" دینا کبابیہ ایک شانِ انسپکٹریت سے انہیں مخاطب کرتا ہے " فضلو کا پیچھا چھوڑو گے بھی یا نہیں" ۔ سپاہی جواب میں دانت نکالتا ہے "کیسا ہے وہ تمہارا سرونٹ" توفیق دور سے چلّاتا ہے ۔ "ہمیں

بھی دکھا دو کسی دن حوالدار" ۔ "چھ کباب چار تکے" ۔ لڑکا چلاتا ہے اور دینا کبابیہ کے ہاتھ آپ ہی آپ سیخوں سے کھیلنے لگتے ہیں ۔ اس کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ جوں کی توں قائم رہتی ہے ۔ "سوا تین روپے" لڑکا چلاتا ہے اور گاہک کی طرف دیکھے بغیر اس کے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ لے کر دینا بے پروائی سے اس ڈھیر میں پھینک دیتا ہے اور پھر روغن سے لتھڑے ہوئے سکوں کی مٹھی بھر کر ایک روپیہ بارہ آنے گاہک کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے چلاتا ہے ۔ "بارہ سیخیں اور بنا دے گامے"۔

چارکوٹ گویا اعظم آباد کا مطبخ ہے ۔ شہر والے وہاں کھلے بندوں کباب ، چانپ ، کلفا اور حلوہ پوری کھانے کے لئے آتے ہیں ۔ سول لائنز والے چھپ چھپ کر وہاں پہنچتے ہیں ۔ اور بند کاروں میں بیٹھ کر کھاتے ہیں ۔ وہ مٹن چانپ اور پڈنگ چھوڑ کر دینا کے کباب اور چچا کا حلوہ کھانے آتے ہیں ۔ اور جو ایک مرتبہ پہلوان کا کلفا کھا لیتا ہے اس پر آئس کریم حرام ہو جاتی ہے ۔

پہلوان روز پانچ پانچ سیر کے بارہ برتن کلفے کے بناتا ہے اور شام کے پانچ سات بجے تک اس کا سودا ختم ہو جاتا ہے اور کئی محروم گاہک خالی برتن اٹھا کر لوٹتے ہیں اور پہلوان سودا ختم کرنے کے بعد اک شانِ استغنٰی سے حقّہ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے "اوودلے" وہ چلاتا ہے "حرامی آج سودا نرم رہا ہے ۔ ٹھیک طور پر آگ نہیں دی تو نے ۔ تیری ہڈیاں توڑدوں گا نا تو عقل آئے گی تجھے "۔

"اچھا بھلا سودا تھا اب تُو خواہ مخواہ لڑکے پر برس رہا اے" کریم حلوائی چلاتا ہے "کھانے والے ہونٹ چاٹ رہے تھے پر پہلوان کو پسند ہی نہیں ۔ واہ "۔

"تو چپ بیٹھا رہ کریم" پہلوان ہنستا ہے ۔

"وہ جو کالی والی بڑی کار میں آئے تھے مالم ہے کیا کہہ رہے تھے" ۔ کریم بولے جاتا ہے ۔

"کیا کہہ رہے تھے"۔

"کہہ رہا تھا وہ فوجی وردی والا جیادہ کھایا نہیں جاتا ور نہ جی چاہتا ہے کھا کھا

کر یہیں ڈھیر ہو جائیں"۔
پہلوان ہنستا ہے "یہ کاروں والے کھانا کیا جانیں ، انہیں سودے کی سمجھ بھی ہو کچھ ۔ یہ تو چینی کی پلیٹیں کھڑکانا ہی جانتے ہیں"۔

صبح سویرے ہی لوگ چچا حلوہ پوری والے کی دوکان پر یورش کر دیتے ہیں دوپہر کو اجمل کلفی والے کے گرد بھیڑ لگ جاتی ہے اور پھر شام کے وقت کلفا چانپ کباب اور سری پائے کا دور چلتا ہے .... اور پھر نورا کے گجرے بکتے ہیں اور بستی کے مزدور گلے میں گجرے ڈالے منہ میں پان دبائے سگریٹ پیتے ہوئے کالے پُل کی طرف چل پڑتے ہیں ۔

شام کے وقت چارگوٹ میں چہل پہل ہو جاتی ہے میکلوڈ روڈ کی فلیٹوں کے مکین دور سے ترچھی نگاہوں سے ادھر دیکھتے ہیں ۔ زینت بازار کے بالاخانوں کی کھڑکیوں کے پردوں تلے سے سیاہ رسیلی آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی ہیں ۔ بابو باڑے کے جنگلوں میں تنگے بچے بھوکی نگاہوں سے چارگوٹ کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ان کے پیچھے زرد زرد نسائی ڈھانچے حسرت بھری اداس نگاہوں سے چوک کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے تھکا ہارا مسافر کسی ویرانے سے اس نخلستان کو دیکھتا ہے ۔ جہاں اسے پہنچنے کی کوئی امید نہ ہو ۔
صمدو حجام چچا کی دوکان پر کھڑا ہو کر چلاتا ہے "وہ سُن لیا چچا تم نے ۔ اے چچا میں کیا کہہ رہا ہوں"۔

سودا دیتے ہوئے چچا ایک نظر صمدو کی طرف دیکھتا ہے چچا کی نگاہوں میں پھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں اس کی شرعی داڑھی کو جھٹلا دیتی ہیں ۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے گھونگھٹ تلے کسی دوشیزہ نے دہکتے ہوئے کوئلے چھپا رکھے ہوں ۔ جوانی چچا نے علانیہ پھولجھڑیاں چلانے میں بسر کر دی لیکن پھر ایک روز دفعتاً گھر میں رکھے ہوئے بلوری گلاس توڑ دیے اور آنکھوں سے چلتی ہوئی عورتوں کے کپڑے نوچنے سے توبہ کر لی ۔ اسے تائب ہوئے دو سال ہو چکے ہیں ۔ لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک ٹھنڈی نہیں پڑ سکیں ۔ ان میں اب تک شرارے اڑتے ہیں ۔ اگرچہ اب اس کی نگاہیں کھلاڑی کی سی نہیں بلکہ تماش بین کی سی ہیں، وہ

دیکھتا ہے ۔ مسکراتا ہے "میں جانتا ہوں" کی سی مسکراہٹ اور پھر آنکھیں جھکالیتا ہے اوراس کی جھکی جھکی آنکھوں میں دیر تک رنگین بلبلے پھوٹتے رہتے ہیں "وہ سن لیا چچا تم نے" صمدو حجام چلّایا ہے "گھی سات روپے سیر ہو گیا ۔ سات روپے ۔ سنا تم نے ۔ سات روپے"۔

"تو تجھے کیا غم ہے" چچا ہنستا ہے ۔

"لو بھئی کرلو بات" صمدو ہاتھ چلا چلا کر لوگوں کو مخاطب کرتا ہے ۔

لمبے بالوں والا کمیونسٹ شاعر حلوہ کھاتے ہوئے جوش میں اُٹھ بیٹھتا ہے ۔ "یہ مہنگائی حکومت کا قصور ہے" ۔ وہ تقریر شروع کرتا ہے لیکن چچا بیچ میں بول اٹھتا ہے ۔ "تُو کیا گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ صمدو" سب اس پر ہنس پڑتے ہیں ۔ لمبے بالوں والے کی بات کوئی نہیں سُنتا اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر حلوہ کھانے لگتا ہے ۔ "لو ۔ کرلو بات ۔ چچا یہاں یہ حالت ہے کہ کھانا تو درکنار رہا ۔ ہفتے میں ایک بار گھی کی مالش نہ کروں تو بدن اینٹھ جاتا ہے"۔

اینٹھنے دے سالے کو ۔ کھاتا پیتا اینٹھتا ہے تو پڑا اینٹھے" چچا کو صمدو کو چھیڑنے میں مزا آتا ہے ۔

"لو کر لو بات ۔ اس مہنگائی میں ہم تو مر گئے ، تباہ ہو گئے ۔ اور یہ چچا ہماری مسخری اڑا رہا ہے" ۔

"تم مر گئے ہو تو بولو چچا کیا کرے ۔ میاں جس نے مرنا ہے اس نے مرنا ہے ۔ جس نے جینا ہے اس نے جینا ہے ۔ یہ تو مولا کے رنگ ہیں" ۔ چچا کی پھولجھڑیاں اڑتی ہیں ۔

"ہاں یہ تو سولہ آنے کھری کہی" صمدو سر جھکالیتا ہے ۔

"تو بول نا چچا کیا کرے"۔

"چچا کیا کرے" صمدو جیب ٹٹولتے ہوئے کہتا ہے ۔ "چچا یہ کرے کہ آدھ پاؤ حلوہ پوری تول دے ۔ صمدو کے لئے" ۔

"ہوئی نا بات" چچا کی آنکھوں میں رنگین بلبلے اڑتے ہیں ۔ اور وہ سودا تولنے لگتا ہے اور صمدو ٹین کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے

کہتا ہے بس ہمیں تو اس مہنگائی نے مار دیا ۔ جیسے مہنگائی سے مر جانا ایک بڑی خوش قسمتی ہو ۔ دوکان پر کھڑے سبھی گاہک صمدو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں ۔ وہ سب گھی کی مہنگائی پر اظہارِ پریشانی کرتے ہوئے یوں حلوہ پوری کھائے جاتے ہیں جیسے حلوہ پوری کھانا مہنگائی کا واحد علاج ہو ۔

چارگوٹ کے اس موڑ پر جو بستی کی طرف جاتا ہے ۔ سبز رنگ کی کھڑکیوں والے بوسیدہ چوبارے سے سیاہ فام اجو کا چہرا یوں چمکتا ہے ۔ جیسے اس کے پیچھے بیسیوں ننھے ننھے بلب جل رہے ہوں ۔ جیسے کسی تاریک روشنی کی لہریں اس کے خدوخال میں مسلسل طور پر رواں دواں ہوں ۔ سیاہ فام ہونے کے باوجود وہ انگارے کی طرح دہکتی ہے ۔ قمیض سینے پر پھٹی جارہی ہے ۔ باریک قمیض تلے پیٹ کے خطوط میں حوالگی کے واضح اشارے ہیں ۔ وہ ہر راہ چلتے کو ٹٹولتی ہے پرکھتی ہے اور ننگی دعوت دیتی ہے ۔ اسے رفیق کا ذرا خوف نہیں ۔ وہ پکوڑے والا رفیق جس سے ساری بستی ڈرتی ہے ۔ اجو کے سامنے آکر گھٹنے ٹیک دیتا ہے ۔ مانا کہ وہ بستی کا بدمعاش ہے ۔ لیکن وہ اجو کے لئے بدمعاش نہیں ۔ اجو کے لئے وہ ایک ضدی بچے کے سوا کچھ نہیں ۔ وہ اجو کے خاوند سے زبردستی اسے چھین لایا ہے اور اسے علانیہ اس چوبارے میں رکھا ہوا ہے ۔

بستی کی مسجد کا ملّا اور بازار کے دوکان دار سبھی اس عورت پر لعنتیں بھیجتے ہیں لیکن رفیق کے ڈر کے علاوہ اجّو کے جسم کی ان شعاعوں کی وجہ سے خاموش ہیں ۔ جن کا لشکارہ دیکھنے کے لئے وہ چوبارے تلے رُک جاتے ہیں ۔

مسجد کا ملّا وضو کرتے ہوئے اجّو کی طرف دیکھتا ہے ۔ لاحول پڑھتا ہے اور پھر دیکھتا ہے ۔ اس کی آرزو ہے کہ اجّو صراطِ مستقیم پر آجائے ۔ دل ہی دل میں وہ جانتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے اس کا حجرہ قریب تر ہے بہت قریب ۔

صمدو حجام بھورا دھوبی ڈیوڑھی کے باہر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے اجّو کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ان کے ہونٹ اَن جانے میں لٹک جاتے ہیں ۔ "بس اس جمانے میں ایک یہی چیج سستی ہے" صمدو اجّو کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ۔

لمبے بالوں والا اشتراکی رک جاتا ہے ۔ "ہاں" وہ اجو کی طرف دیکھے بغیر چلّاتا

ہے ۔ "یہ سب حکومت کا قصور ہے" ۔ بھورا دھوبی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا ہے ۔ "حکومت کی نہیں ہم اجو کی بات کر رہے ہیں" ۔ لمبے بالوں والا اجو کی طرف دیکھتا ہے اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے اور وہ بُھول جاتا ہے کہ حکومت کیا چیز ہے ۔ اور اس کا کیا قصور ہے ۔ وہ دونوں لمبے بالوں والے کی موجودگی کو بھول جاتے ہیں ۔

"ہاتھ سے اشارہ نہ کر صمدو ۔ جو رفیقے نے دیکھ لیا تو ۔۔۔۔۔" بھورے کا جھری دار ہاتھ کانپتا ہے ۔

"لو سن لو اس کی بات میرا کیا بگاڑلے گا ۔ میری کون لوکائی گھر ماں بیٹھی ہے"۔

صمدو چمک کر کہتا ہے ۔

"بس تو جوش میں نہ آ"۔ بھورا اسے سمجھاتا ہے ۔

"میں تو کہہ رہ تھا اس مہنگائی کے جمانے میں ایک یہی چیج سستی ہو رہی ہے"۔

"کہاں ہو رہی ہے سستی" فیضو پنواڑی کتھے بھرے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہتا ہے ۔ "ٹکے لگتے ہیں ٹکے ۔ ہاں ۔ کبھی خریدی ہو تو جانو" ۔ وہ دونوں فیضو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔

"ہم سے پوچھو تو ۔ صرف گھی ہی نہیں مہنگا ہو رہا" ۔ فیضو مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے یوں اجو کی طرف دیکھ رہا ہے جیسے اس کی ریشمیں کرتی کو چیر کر اس کے جسم کو ٹٹول رہا ہو ۔ پیٹ پر گدگدی کر رہا ہو ۔

"لڑکے ہوش کی بات کر" ۔ بھورا دھوبی چلاتا ہے ۔ لیکن فیضو اس کی بات نہیں سنتا ۔ اور گرانی کے اس شکوے کے باوجود ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اسے خریدنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لئے تیار ہے ۔

"پاگل ہو رہا ہے" دھوبی کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے ہیں ۔

"تیری رگوں میں بھی خون ہو تو میں پوچھوں" پنواڑی قہقہہ لگاتا ہے ۔

"اسے معلوم نہیں" ۔ بھورا حجام سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔ "لونڈا ہے

نا اسے معلوم نہیں سب ایک سی ہوتی ہیں ۔ سب"۔

اجو کی سیاہ چنگاریاں فیضو کی شربتی آنکھوں سے کھیلتی ہیں ۔ اس کے سفید دانت چمکتے ہیں ۔ جیسے وہ بھورے دھوبی کی بات پر ہنس رہی ہو ۔ اور فیضو سے کہہ رہی ہو "اس کی بات نہ سنو ۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں ۔ مجھ میں کیا فرق ہے" ۔

اجو کی مسکراہٹ کی روشنی کا عکس صمدو حجام کی آنکھوں میں جھلکتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ صرف ایک ہی چیز سستی ہے ۔

اجو کے دانتوں کی بجلی سے سیلون کار کے دوازے کے قریب کھڑا کلفا کھاتا ہوا صاحب چونکتا ہے اور حریص نگاہوں سے اس سیاہ فام عورت کی طرف چوری چوری دیکھتا ہے تاکہ کار میں بیٹھی ہوئی گوری چٹی خاتون کو پتہ نہ چل جائے ۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بستی ہے اور بستی کے رہنے والے بد تمیز جانگلو ہوتے ہیں ۔ وہ اس جنگلی شیرنی کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے اس لئے کہ وہ پاؤڈر سرخی سے تھپی ہوئی غالیچے کی بے جان شیرنیوں سے مختلف ہے ۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بستی کے چوک میں کھڑا ہے ۔ رفیق کے پاس کھڑا بالا کہنی مار کر رفیق کو ادھر متوجہ کرتا ہے ۔ "دیکھ لے" وہ دبی آواز میں کہتا ہے "ادھر"۔

رفیق قہقہہ مار کر ہنس دیتا ہے "دیکھنے دو" وہ بے پرواہی سے کہتا ہے ۔ "یہ بیچارے دیکھنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں اور وہ چٹی گوری عورتیں جو یہ ساتھ لئے پھرتے ہیں وہ صرف دِکھنا جانتی ہیں" ۔

رفیق کی بات سن کر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے ۔ اور بستی کے سیاہ فام مزدوروں کے دانت چمکتے ہیں ۔

پہلوان کی دوکان پر بھیڑ لگی ہے ۔ گاہک کلفے کے لئے تکرار کر رہے ہیں ۔ اور پہلوان یوں خاموش بیٹھا سودا تول رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔

"اے میاں دھکے تو نہ دو" ادھیڑ عمر کا دُبلا آدمی چلاتا ہے ۔ "واہ پہلوان اچھی دکان ہے ۔۔ یہاں آؤ اور کپڑے پھڑوا کر جاؤ ۔۔ بھئی واہ" ۔

"کپڑا پہلے ہی نہیں ملتا" ۔ بھورا ہاتھ چلاتا ہے ۔

"اب تو اور چڑھ گیا ہے" ۔۔ ادھیڑ عمر والا کہتا ہے ۔

"کون سی چیز ہے جو چڑھ نہیں رہی سب حکومت کا قصور ہے" ۔ لمبے بالوں والا شاعر موقعہ پاکر اپنی ہانکتا ہے ۔ "حکومت کیوں ان کو معلوم ہی کیا ہے کہ دال چڑھ گئی ہے ۔ چار آنے بڑھ گئی ہے ۔ یہ تو ان دوکانداروں کی لگائی ہوئی آگ ہے میاں ۔ بھورا کھانستا ہے ۔ لمبے بالوں والا خاموش ہو جاتا ہے کوئی اس کی بات نہیں سنتا ۔ "دال بھی چڑھ گئی ہے تو بولو کوئی کیا کھائے پئے"۔ ادھیڑ عمر والا یوں آنکھیں چمکاتا ہے جیسے کھائے پئے بغیر رہنا نعمت ہو ۔ جیسے کلفے کو کھانے پینے سے دور کا واسطہ نہ ہو ۔

"ہم غریبوں کے لئے مصیبت کے دن ہیں" ۔ بھورا آہ بھرتا ہے پھر پہلوان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "پہلوان مجھے تو ایک پاؤ بھر دے دے نا پہلے"۔

ڈاکٹر ڈیوڈ پہلوان کی دوکان پر لگی ہوئی بھیڑ کی طرف حسرت بھری نگاہ سے تکتا ہے ۔ اور پھر اپنے مطب کی ویرانی کو محسوس کر کے آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے "سارا دن کھاتا ہے ۔ یہ بستی والا لوگ سارا دن دانت نکالتا رہتا ہے ۔ قہقہے لگاتا ہے ۔ اتنا نہیں کہ ان لوگ کو کالرا ہی ہو جائے ۔ ڈیم اٹ" ۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ چارکوٹ میں ہاسپٹل کرو" ہنری چلاتا ہے "ہم نے منع نہیں کیا تھا ۔ یہ کیا ہاسپٹل کی جگہ ہے یہاں تو کھانے پینے کا شاپ چلتا ہے ہاسپٹل نہیں" ۔

"نانسنس" ڈیوڈ تیوری چڑھا کر کہتا ہے ۔ "کھانے پینے کی جگہ ہاسپٹل نہیں چلے گا تو کہاں چلے گا ۔ وہ دیکھو" وہ بھیا کے پلاؤ کے تھال کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں ۔ "یہ چاول خالص انفکشن ہے اور وہ سری پائے ۔ آج سنڈے ہے ۔ دو دن سے یہی "سیٹل" سری پایا بک رہا ہے ۔ اور کسی کو وامٹ تک نہیں ہوتا ۔ پھر وہ چانپ ہے ۔ اور وہ ڈیم کلفا ۔ یہ لوگ زہر اور پتھر سب ڈائجسٹ کر لیتا ہے ۔ سارا دن مہنگائی کی شکایت کرتا ہے اور ساتھ ہی بکری کی طرح جگالی کرتا رہتا ہے اور پھر ہنستا ہے ۔ ایڈیٹ اور پھر شام

کو ہار پہن کر پان سے منہ رنگتا ہے ۔ اور کالے پل کی طرف چلا جاتا ہے ۔ لال کھوئی میں ڈپ لگانے کے واسطے ۔ اور پھر اس ڈسیزڈ ایریا سے قہقہے مارتا ہوا واپس آتا ہے ۔ یہ لوگ ، ڈیم اٹ مجھے میڈیکل سائنس پر کوئی فیتھ نہیں رہا ۔" ہنری مسکراتا ہے ۔ "میڈیکل فیتھ کو چھوڑو ۔ اکنومکس کے اصول گڈمڈ ہو رہے ہیں"۔

"اکنومکس' ڈیوڈ قہقہہ لگاتا ہے ڈیم اکنومکس جتنی مہنگائی بڑھتی ہے یہ لوگ اتنا زیادہ کھاتا ہے اور ہنستا ہے ۔ اور یہ میڈیسن فلسفہ اور اکنومکس" ڈیوڈ نے کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "لائرز آل لائز ۔ جھوٹ ، بکواس بائی گاڈ اگر بابو باڑہ نہ ہو تو ہم لوگ بھوکا مر جائے اور یہ بابو لوگ ۔ ہونہہ ، یہ بھی ایڈیٹ ہے ۔ یہ بابو بوگ سمجھتا ہے کہ وائف نے بد پرہیزی کر لی ہے ۔ ہی ہی ہی ۔ اڈیٹس ۔ کھانے کو ملتا نہیں اور بدپرہیزی ۔ اور پھر یہ بابو لوگ رات کو صاحب کا غصہ بیوی پر اتارتا ہے اور اسے لَو سمجھتا ہے ۔ ڈیم اٹ" ۔

"ڈاکٹر صاحب" زرد رو بابو دوکان میں جھانکتا ہے ۔ "ڈاکٹر صاحب" "ول ول کم ان" ڈیوڈ کہتا ہے "آجاؤ ۔ آجاؤ ۔ ہیو اے سیٹ" ۔ "ڈاکٹر صاحب پھر تکلیف ہو گئی رات کو" ۔ بابو دبی آواز میں گنگناتا ہے "مسز کے بارے میں ؟"

"ڈاکٹر صاحب میں جمعہ کو آیا تھا نا آپ کے پاس" ۔

"آیا تھا ۔ آیا تھا ۔ او بس بس ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ کیا نام ہے" ۔ ڈاکٹر سرخ رنگ سے شیشی بھرتا ہے ۔

"تھری ڈیز ۔ ٹوائس ڈیلی" ۔

بابو مبہم سی آہ بھرتا ہے اور جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے ۔ ڈاکٹر سے دوائی لے کر وہ باہر نکلتا ہے اور حسرت سے چوک کی طرف دیکھتا ہے ۔ کباب اور چانپ کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ "چار آنے پاؤ ۔ چار آنے پاؤ" ۔ بھیا پلاؤ والا چلاتا ہے ۔ سری پائے کھاتے ہوئے دو لڑکے چٹخارے لے رہے ہیں ۔ صمدو حجام کلفا کھاتے ہوئے کپڑے کی گرانی پر تقریر جھاڑ رہا ہے ۔ چچا کے حلوے سے عجیب سی میٹھی خوشبو آ رہی ہے اور اس کی جھکی جھکی آنکھوں سے فوارے

چھوٹ رہے ہیں ۔ دفعتاً بابو کی نظر پہلوان کی دوکان پر کھڑی ہوئی موٹروں پر پڑتی ہے ۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا ہے ۔ آنکھوں میں حرص جھلکتی ہے اور وہ پہلوان کی دوکان پر پہنچ کر چوری چوری موٹروں میں جھانکتا ہے ۔ موٹروں میں سرخ ہونٹوں ، سیاہ بالوں ، سڈول بازوؤں کی جھلکیاں دیکھ کر اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے ۔ پنواڑی کی دوکان پر کھڑا ہو کر وہ جیب سے آخری روپیہ نکالتا ہے ۔

دفعتاً بابو کی نگاہ دوائی کی بوتل پر پڑتی ہے اور اس کے سامنے ایک مدقوق عورت اور تین ننگے دھڑنگے بچے آ جاتے ہیں ۔ پھر وہ کیپسٹن کے پیکٹ کی طرف دیکھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے ۔ جیسے اس نے جرم کیا ہو ۔ گناہ کیا ہو ۔ سگرٹ نکال کر جھٹ سے وہ پیکٹ جیب میں ڈال لیتا ہے یہ احساسِ گناہ اس کی زندگی کی واحد دلچسپی ہے ۔ واحد سہارا ۔

دفعتاً اس کی نگاہ اجو پر پڑتی ہے ۔ اس کا خون منجمد ہو جاتا ہے ۔ "یہ کون ہے" وہ چلّاتا ہے ۔

پنواڑی جھک کر اجو کی طرف دیکھتا ہے "بس دیکھ لو" وہ کھجاتے ہوئے ہنستا ہے ۔

"بڑی بنی سنوری ہوئی ہے" ۔

"اونہوں" پنواڑی مسکراتا ہے ۔ "بنی سنوری ہوئی موٹروں میں ہوتی ہیں ۔ یہ سالی تو ننگی ہے" ۔

"سچ مچ تو وہ ہے" ۔

"جان ہے جان ۔ خالی جان ۔ لہو ہے لہو اور یہ موٹروں میں تو بس چونے گچی ہے" ۔

"یہ موٹروں کا امتیاز حکومت نے پیدا کر رکھا ہے" لمبے بالوں والا رک کر کہتا ہے ۔

"پر یہ ہے کون" ۔ وہ دونوں اجو میں اس قدر کھو چکے ہیں کہ وہ راہ چلتے شاعر کی بات سنتے ہی نہیں ۔

"تم نے کیا لینا ہے بابو صاحب ۔ تم اپنا سگریٹ پیو" ۔ پنواڑی کہتا ہے "اور یہ دوائی کس کے لئے ہے" بابو دوائی کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کی نگاہوں میں ایک زرد ڈھانچہ ابھرتا ہے ۔ تنکے بچے روتے ہیں ۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ دوائی کو دور پھینک دے ۔ لیکن ڈیڑھ روپیہ ، وہ جھٹ سے اسے جیب میں ڈال لیتا ہے ۔

"بھئی بڑی بانکی عورت ہے یہ" وہ حسرت بھری نظروں سے اجو کی طرف دیکھتا ہے ۔

"چھوڑو بابو صاحب" پنواڑی ہنستا ہے ۔ "تمہارے بس کا روگ نہیں ۔ یہ دوائی پینے والی عورت نہیں " ۔

"دیکھانا" صمدو قریب آکر کہتا ہے ۔ "لو دیکھ لو ہوئی نا بات میں کہوں ہوں سارے چوک کو کھا جائے اور ڈکار نہ لے ۔ عورت ہوئی نا اور ایمان سے بھئی جب سے رفیق اسے لایا ہے اس چوبارے ماں مسجد کا ملّا تب سے سارا دن وضو کرتا رہتا ہے ۔ سالے کا وضو بیس مرتبہ ٹوٹتا ہے دن ماں" ۔

پنواڑی قہقہہ مارتا ہے ۔

"وہ تو علانیہ اوپر بلا رہی ہے ۔ حد ہوگئی" ۔ بابو کھجاتے ہوئے گنگناتا ہے ۔

"جمانہ ہی ایسا آیا ہے ۔ سبھی بُلاتی ہیں ۔ یہ دیکھ لو وہ" صمدو موٹروں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ "سرخیاں لگا لگا کر ہونٹوں کو لشکاتی ہیں ۔ ننگا پنڈا دکھا دکھا کر روکتی ہیں" ۔

"اور پھر ذرا ہاتھ لگا دو تو بدکتی ہیں اور وہ اجو ابے صمدو ان کا اس سے کیا مقابلہ ۔ وہ عورت ہے اور یہ گڑیاں ! ۔۔۔ اس کے چوبارے پر چڑھ کر دیکھ لو بابو صاحب ۔ اگر دو گھڑی مین بازار میں چاروں شانے چت نہ کرو تو میرا ذمہ اور ۔۔۔"

"ابے ابے" صمدو کی ڈر سے گھگھی بندھ جاتی ہے ۔ "رفیق رفیق" ۔ وہ رفیق کی طرف اشارہ کرکے پنواڑی کو خبردار کرتا ہے ۔

"بیڑی دینا بھئی ایک" رفیق آکر پنواڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ۔

"یہ کیا کیا ہے تُو نے رفیق جو چوک میں شیرنی لا باندھی ہے" ۔ پنواڑی ہنس کر پوچھتا ہے ۔ رفیق کی آنکھوں میں گویا سوڈے کی بوتلیں کھل جاتی ہیں اور وہ فخر سے اجو کے چوبارے کی طرف دیکھتا ہے ۔

بابو پان کی دوکان سے چل پڑتا ہے ۔ دینے کبابیے کی دوکان کے سامنے جیجا کوچوان کو کھڑا دیکھ کر اس کا جی چاہتا ہے کہ اس سے بات کرے مگر اس میں ہمت نہیں پڑتی ۔

جیجا تانگے والا چارکوٹ کا مشہور بھڑوا ہے مشہور ہے کہ اس کے پاس بیسیوں لڑکیاں ہیں ۔ گاؤں کی موٹر والوں کی ۔ کالج کی ۔ کئی بار بابو کا جی چاہتا ہے کہ وہ جیجے سے بات کرے ۔ مگر اس میں کبھی ہمت نہیں پڑی ۔

حاجی عمر اپنی عظیم الشان دوکان پر بیٹھا دن کی کمائی گن رہا ہے ۔ تین سو پینسٹھ ستر اس کے چہرے پر اکتاہٹ ہے اور انداز میں بے حسی ۔ سیٹھ علم الدین بلند آواز میں کہتا ہے "مندا بڑھ رہا ہے" ۔

حاجی اس کی طرف دیکھے بغیر کہتا ہے ۔ "مال ہی نہیں آتا ۔ آٹھ میں سے دو سٹور خالی پڑے ہیں اور اور یہ دیکھو آج کی بِکری صرف تین سو بہتّر" ۔

ان کے چہروں پر بے حسی اور نحوست ٹپک رہی ہے ۔ سامنے میز پر نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور دوکان پر مجرمانہ خاموشی چھائی ہوئی ہے ۔ چوک میں مزدوروں کے قہقہے گونج رہے ہیں ۔

"چار آنے پاؤ" بھیا چلّاتا ہے ۔ "چار آنے پاؤ ۔"

"چار تکے چھ سیخیں" ۔

"پانچ روپے چھ آنے" ۔

"ایک پاؤ حلوہ ۔ ذرا جلدی کرنا ۔ چچا اِس مہنگائی سے ہم تو مر گئے تیری قسم" ۔ "میاں جس نے مرنا ہے وہ مر جاتا ہے ۔ جس نے جینا ہے وہ جیتا ہے" ۔ چچا چلا کر کہتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں اس کا ماضی یوں جیتا ہے ۔ جیسے زمانۂ حال میں تبدیل ہو گیا ہو ۔

"لا حول ولا قوۃ" اجو کی باریک قمیض سے اس کے پیٹ کی لکیر دیکھ کر ملّا وضو کرتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے۔

"موج لینے دے" رفیق موٹر والوں پر ہنستا ہے" دیکھنے دے یہ بیچارے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں"۔

پہلوان حقے کا کش لگا کر کہتا ہے "تو چپ رہ کریم انہیں کیا معلوم کیسے کھاتے ہیں کیا کھاتے ہیں۔ یہ تو بس چینی کی پلیٹیں کھڑکانا ہی جانتے ہیں"۔

"ہی ہی ہی ہی"۔ پنواڑی کھجاتے ہوئے ہنستا ہے "بنی سنوری ہوئی نہیں۔ اس میں جان ہے جان۔ لہو ہے لہو"۔

"کیپسٹن کا پیکٹ" بابو ایک روپیہ پنواڑی کی طرف پھینکتا ہے اور دفعتاً محسوس کرتا جیسے اس نے ان ننگے بچّوں کے جسموں کو ایک اور کپڑے سے محروم کر دیا ہو۔ زرد مدقوق عورت کی کھانسی کی آواز گونجتی ہے۔

"چچا گھی سات روپے سیر ہو گیا" صمدو یوں آنکھیں چمکا کر چلّاتا ہے جیسے گھی کا مہنگا ہونا بہترین خوشخبری ہو۔

"ڈیم اٹ" ڈیوڈ غصّے سے کتابوں کو گھورتے ہوئے کہتا ہے۔ "ان لوگ کو کالرا بھی نہیں ہوتا۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ الٹا قہقہے لگاتا ہے۔ شیم فیسڈ"۔

"چار آنے پاؤ چار آنے" بھیّا گویا اس کا منہ چڑاتا ہے۔

"تانگی وچ آماہیا" فیضو پنواڑی گلے میں ہار ڈال کر اجو کی خالی کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا ماہیا گاتا ہے۔ اور کالے پُل کی طرف چلے جاتا ہے۔

"ڈیم اٹ" ڈیوڈ چلّاتا ہے۔ "انہیں ڈیسینٹر بھی نہیں ہوتا"۔

"ہی ہی ہی ہی ـــــ" چارگوٹ میں چاروں طرف سے قہقہے گونجتے ہیں۔ "ہی ہی ہی ہی ـــــ"

.........○.........

ذاتی معاملہ

نہ جانے پاک تارپین فیکٹری پر کیا افتاد آپڑی تھی کہ فیکٹری پر سکوت طاری تھا ملازمین سہمے ہوئے تھے ۔ ان کی بیویوں کی پیشانیوں پر شکن پڑ گئے تھے اور اپنے گھروں میں کھوئی کھوئی بیٹھی تھیں ۔ بچے حیران تھے ۔ عمارتیں ویران دکھائی دیتی تھیں مشینیں چلنے کی بجائے کراہ رہی تھیں ۔

فیکٹری سے تین میل کے فاصلے پر وار نکل کے گاؤں کے کنوئیں پر گھڑے رکھے گندمی بھرپور دوشیزائیں اداس کھڑی تھیں ۔ جن کے قریب گاؤں کی چکی آہیں بھر رہی تھی ۔

ایک ہفتہ قبل فیکٹری میں اس قدر چہل پہل تھی جیسے میلا لگا ہو ۔ کوارٹروں میں مزدوروں کی بیویاں اپنا کام لے کر مل بیٹھتیں ۔ کام کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی بات چھڑ جاتی اور پھر ہاتھ چلتے ، آنکھیں اشارے کرتیں اور قہقہے گونجتے ۔ باہر فیکٹری کے سکول میں بچے کھیلتے اور شور مچاتے ۔ مشینوں پر کام کرتے ہوئے مزدور اور کلرک ان آوازوں کو سنتے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل جاتیں ۔ اور ان کے قہقہے گونجتے ۔

پھر جب چھٹی کا وقت آتا تو مزدوروں اور کلرکوں کا ایک ریلا فیکٹری سے نکل کر کوارٹروں کی طرف چل دیتا ۔ وہ ہاتھوں میں ٹفن کیریر جھلاتے ہوئے ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے اپنے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھتے ۔ پھر ان کی آوازیں کوارٹروں میں گونجتیں ۔ اور پھر جلد ہی گھروں سے نکل کر وہ کھیتوں یا بازار اور یا وار نکل میں جا پہنچتے ۔ بازار میں خرید و فروخت کی گہما گہمی شروع ہو جاتی ۔ کھیتوں میں ماہیا کی تانیں گونجتیں وار نکل کی دوشیزاؤں کی آنکھوں میں مسکراہٹیں جھلکنے لگتیں ۔ کوئیں کا رہٹ گانے لگتا اور گاؤں کی چکی ناچتی ۔

لیکن اب فیکٹری پر سکوت طاری تھا۔

بچے باغیچے کے پاس چُپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے ان کا جی چاہتا تھا کہ باغیچہ میں جاکر کھیلیں جیسے وہ پہلے کھیلا کرتے تھے۔ مگر انہیں مالی سے ڈر لگتا تھا۔ حالانکہ مالی نے انہیں کبھی گھاس پر کھیلنے سے منع نہ کیا تھا۔

مالی خاموشی سے کھڑا ایک جھاڑی کو بہت بڑی قینچی سے کاٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں اداسی تھی۔ اس کے باوجود بچے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھریوں سے ڈرے ہوئے تھے۔ بچوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یک دم حالات کیوں بدل گئے تھے۔ سکول میں استادوں نے کیوں گھورنا شروع کر دیا تھا۔ گھروں میں مائیں انہیں کیوں ڈانٹنے لگیں تھیں۔ اور ابا یوں چُپ کیوں ہو گئے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی۔

سکول کے ماسٹروں کا کیا قصور وہ بیچارے تو خود یوں دکھائی دیتے تھے جیسے مظلوم ہوں۔

پھر اس روز جب فیکٹری کے جنرل مینجر پہلی مرتبہ سکول میں آئے تھے تو پہلی مرتبہ بچے حیران رہ گئے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ اسی لئے وہ حسب معمول شور مچاتے رہے۔ پھر جنرل مینجر نے ہیڈماسٹر کے کمرے میں استادوں کو اکٹھا کیا تھا اور دیر تک نہ جانے وہ سب کیا باتیں کرتے رہے تھے۔

اگلے روز سکول کا ہیڈماسٹر ہمیشہ کے لئے سکول چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور سکول میں شور مچ گیا کہ بڑے ماسٹر کو جنرل مینجر نے نکال دیا ہے۔ اس بات پر بچے سہم گئے تھے۔ اور ماسٹروں کی دھمکیاں شدید ہو گئیں۔

سکول سے نکل کر بچے خوشی خوشی گھر پہنچتے کہ شاید وہاں حالات بہتر ہوں لیکن جونہی وہ گھر میں داخل ہوتے مائیں گھور کر ان کی طرف دیکھتیں۔ "آگئے ہو تم" وہ طنزاً کہتیں جیسے وہ ان کے اپنے بچے ہی نہ ہوں۔

ماؤں کی مامتا کم نہیں ہوئی تھی ۔ نہ ہی ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا تھا ۔ ان کے دلوں میں بچوں کی محبّت اب بھی ویسے ہی تھی ۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی ۔ وہ بے چاریاں کیا کرتیں ۔ ان کے دل تو خود کسی ان جانے خوف سے دھک دھک کر رہے تھے ۔ وہ یوں محسوس کرتی تھیں ۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو ۔ ان کا یہ ڈر ان کے خاوندوں کی پریشانی کی وجہ سے تھا ۔ جب بھی وہ کام کاج سے فارغ ہو کر گھر میں داخل ہوتے تو بیویاں ان پر امید بھری نگاہ ڈالتیں ۔ ان کے انداز اور حرکات کا جائزہ لیتیں کہ شاید حالات بدل گئے ہوں اور گھر میں پھر وہی پہلی سی چہل پہل ہو جائے ۔ لیکن ان کے داخل ہونے کا انداز دیکھ کر ان پر اداسی کا ایک گہرا پردہ پڑ جاتا ۔ وہ گھروں میں یوں داخل ہوتے تھے جیسے تھک کر چُور ہو چکے ہوں ۔ جیسے زندگی ایک بوجھ ہو ۔

بیچارے خاوند بھی مجبور تھے ۔ ان کے ماتھے کی تیوریاں غصّے کی مظہر نہ تھیں یہ تو ان کے اپنے دل کا خوف تھا جو ان کے اعضا میں بے چینی بن کر بل کھاتا تھا اور بالآخر شکنیں بن کر پیشانی پر اکٹھا ہو جاتا ۔ جیسے ابال کھانے کے بعد دودھ کی کڑاہی پر بالائی جم جاتی ہے ۔ انہیں خود معلوم نہ تھا کہ فیکٹری کے حالات دفعتاً یوں بدل کیوں گئے تھے ۔ پہلے بھی تو وہ اسی فیکٹری میں ہنس ہنس کر کام کیا کرتے تھے اور کام کرنے کے دوران میں ایک دوسرے پر فقرے بھی چست کرتے رہتے تھے ۔ کام کے دوران میں چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی ۔ بلکہ اس طرح تو کام اور بھی آسان ہو جایا کرتا تھا ۔ اور جب چھٹی ہوتی تو ذرا سی تھکن بھی محسوس نہ ہوتی تھی ۔ ایک ہفتے سے ان کے سپروائزروں نے حکم نافذ کر دیا تھا کہ کام کے دوران میں باتیں کرنا منع ہے ۔ کیونکہ اس طرح کام میں حرج ہوتا ہے ۔ اس نئے حکم کو سن کر پہلے تو وہ حیران ہو گئے تھے پھر ہنس پڑے تھے ”لو یہ بھی کیا حکم ہے“ ۔ معراج نے بروزے کے مواد کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا ۔ ”کام کیا زبان سے کیا جاتا ہے“ ۔ معراج کی اس بات پر خود سپروائزر نے بھی دبا دبا قہقہہ لگایا تھا ۔ اور بھٹی کے قریب کھڑا کلن تو کھلکھلا کر ہنسنے لگا تھا ۔ اس روز دوپہر کے وقفے کے بعد سپروائزر کو بڑے صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا اور اس کے بعد یہ خبر فیکٹری میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ سپروائزر

کو بڑے صاحب نے برطرف کردیا ہے اور وہ خزانچی سے حساب کتاب کر کے رخصت ہو چکا ہے ۔

اس پر بھی مزدوروں کو یقین نہ آیا تھا ۔ وہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ خبر کسی نے ویسے ہی چلادی ہے ۔ بھلا کوئی ہنسنے پر بھی برطرف ہوا ہے ۔ اب مسکراہٹوں اور قہقہوں پر بھی کنٹرول ہو گیا کیا ۔ معراج اور کلن اس بات پر ہنستے رہے تھے ۔ کلن بار بار کہتا ۔ "لو میرے یار ہمیں بتاتے ہیں ۔ میاں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ۔ جگہ جگہ کی دھول پھانکی ہے ۔ ہمیں کون بتائے گا ۔ ہاں میاں" ۔ اس کے باوجود آہٹ پر وہ دروازے کی طرف اس امید پر دیکھتے تھے کہ ابھی سپروائزر ہنستے ہوئے داخل ہوگا ۔ اور سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ مگر شام ہوگئی چھٹی کا وقت آپہنچا لیکن سپروائزر داخل نہ ہوا ۔ اس پر اُن کے دلوں میں ان جانا ہراس پیدا ہو گیا ۔ ان کی مسکراہٹیں پھیکی پڑتی گئیں ۔ قہقہے کھوکھلے ہوتے گئے حتّٰی کہ چھٹی ہو گئی ۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ سپروائزر کی برطرفی کی خبر صحیح ہے تو وہ حیران رہ گئے ۔ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔"

"نہیں نہیں اس کی کوئی اور وجہ ہو گی" ۔

"لو صاحب اتنی سی بات پر نوکری سے نکال دیا ۔ اچھا مجاق ہے یہ" ۔

"کہتے ہیں بڑے صاحب بڑے غصے میں ہیں بھئی" ۔

"لو میاں غصے میں کون نہیں ہوتا ۔ کسی نا کسی وخت ہر کوئی ہوتا ہے" ۔

"بھئی کہہ جو رہا ہوں میں کوئی اور بات ہوگی دراصل" ۔

اس شام وہ سب چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر سرگوشیاں کرتے رہے اور دیر تک بازار میں سکول کے پرے گراؤنڈ میں ، باغ میں اور کوارٹروں میں باتیں ہوتی رہیں ۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی معاملے کی اصلیت کو نہ پا سکا ۔

اس برطرفی کے بعد باقی ماندہ سپروائزروں نے پنجے نکال لئے ۔ بات بات پر جواب طلبی ہونے لگی ۔ معمولی تساہلی پر جرمانے ہونے شروع ہو گئے ۔

سپروائزروں کے چہرے منجمد ہو گئے ۔ اور ان کی حرکات و سکنات سے معلوم ہونے لگا ۔ جیسے وہ لوہے سے بنے ہوئے ہوں ۔ معمولی سی بات پر سپروائزر دانت بھینچ کر صاحب کے سامنے پیش کرنے کی دھمکی دیتے ۔ اور بڑے صاحب کا نام سنتے ہی مزدوروں کے اوسان خطا ہو جاتے کیونکہ بڑے صاحب کے سامنے جو شخص بھی پیش کیا جاتا اسے فوری برطرفی کا پروانہ مل جاتا ۔

فیکٹری کے سبھی لوگ حیران تھے کہ صاحب کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے ۔ اس سے پہلے تو صاحب نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی ۔ اسے اس فیکٹری میں جنرل مینجری کرتے چھ سال ہو چکے تھے ۔ فیکٹری کے معاملات میں وہ دخل تو دیتا تھا ۔ لیکن اس کی نوعیّت صرف کاغذی ہوتی تھی ۔ اس نے کبھی فیکٹری کا چکر نہ لگایا تھا ۔ مزدوروں سے براہِ راست وہ کبھی نہ ملا تھا ۔ اور نہ ہی اس نے معمولی کوتاہیوں کو درخور اعتنا سمجھا تھا ۔ الٹا وہ تو فیکٹری کے کارندوں سے اظہارِ ہمدردی کیا کرتا تھا ۔ مثلاً جب سپرنٹنڈنٹ حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہوگیا تھا تو اس نے اس کے کم سن بچّوں کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں ۔ سٹور کیپر فضل الٰہی کی ناگہانی وفات پر اس نے اس کی جگہ اس کے بڑے لڑکے کی تقرری کردی تھی ۔ حالانکہ وہ بچّہ پورے طور پر بالغ بھی نہ ہوا تھا ۔ اور فیکٹری کے قانون کے مطابق اسے ملازمت دی ہی نہ جا سکتی تھی ۔ پھر اچھا کام کرنے والوں کے لئے صاحب نے انعامات دینے کی رسم ڈالی تھی اور فیکٹری کے ملازمین کے بچّوں کو مفت تعلیم دلانے کی خاطر حکومت کو مجبور کرکے وہیں ایک انگریزی سکول کھلوا دیا تھا ۔ اور ملازمین کی تفریح کے لئے کھیلیں شروع کردی تھیں ۔

لیکن اب سبھی سمجھنے لگے تھے کہ تمام قصور جنرل مینجر کا ہے ۔ فیکٹری کے مزدوروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ۔ جنہیں اکبر علی اور کلن نے ہوا دی ۔ مزدوروں نے دو ایک جلسے کئے ۔

مزدوروں کے حقوق پر تقریریں کی گئیں اور طے پایا کہ مزدوروں کا ایک وفد بڑے صاحب سے ملے ۔ لیکن صاحب کا رویہ دیکھ کر وفد

کے لیڈر نے پینترہ بدل لیا اور پھر جب چند روز کے بعد اکبر علی کی برطرفی کا حکم سنایا گیا تو فیکٹری پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا اور مزدوروں کے سر جھک گئے ۔ مزدور یہ سمجھتے تھے کہ اس تبدیلی کی تمام تر ذمہ داری جنرل مینجر پر ہے ۔ یہ بات ان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ جنرل مینجر سے بڑا کوئی اور شخص بھی ہے ۔ جس کی بات جنرل مینجر پر حاوی ہے ۔ وہ اس بات کو کیسے سمجھ سکتے بھلا ۔ ان کے خیال میں تو فیکٹری کے معاملات میں جنرل مینجر کا حکم حرفِ آخر تھا ۔ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں ۔ جو جنرل مینجر کو مینیج کریں ۔ اور جن کے روبرو جنرل مینجر کی حیثیت ایسی ہو جیسے مزدوروں کی سپروائزر کے سامنے ہوتی ہے ۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ جنرل مینجر کو مینیج کرنے والی کا نام انوری تھا ۔ جسے وہ پیار سے انّو کہا کرتے تھے ۔ لیکن وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ ان کی دوسری بیوی ہے ۔ اور ان کے خیال کے مطابق تو بیوی وہ ہوتی ہے جو میاں کی ہر بات مانے اور اس کے اشاروں پر چلے ۔ ویسے شادی سے پہلے انوری نے صمد کو یہی اعتبار دلایا تھا کہ وہ ان کے اشاروں کی طالب ہے اور صمد کو انوری کی یہ بات ایسی پیاری لگی تھی کہ اسی وجہ سے اسے انوری سے عشق ہو گیا تھا اور اس نے انوری کو شادی کا پیغام دے دیا تھا ۔ لیکن جلد ہی اس کے اشاروں کا تسلسل ٹوٹ گیا یا شائد اس لئے کہ انوری اشاروں پر کچھ زیادہ ہی چلنے کی متوالی تھی ۔

صمد کو آپ نے شاید کبھی نہ دیکھا ہو ۔ کیونکہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سماجی تقاریب پر شامل ہونے کا دلدادہ نہیں ۔ اگر آپ نے اسے دیکھا بھی ہے تو بھی وہ اس قسم کا فرد ہے جسے دیکھ کر بھی آپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے ۔ کیونکہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی وجہ سے آپ اس کی طرف غور سے دیکھیں۔نہ ہی وہ اس قدر خوبصورت ہے کہ نگاہ پر چڑھ جائے اور نہ ہی ایسا بدصورت کہ آپ اسے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں ۔ وہ ایک عام سا جوان ہے ۔ کالج میں بھی وہ زیادہ میل جول کا شوقین نہ تھا ۔ اگرچہ اس کی طبیعت میں جھجک نام کو نہ تھی ۔ نہ ہی وہ احساسِ کمتری کا شکار تھا ۔ لیکن وہ فضول وقت ضائع کرنا

پسند نہ کرتا تھا اور نہ ہی اسے یہ شوق تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے ۔

صمد کو پڑھنے کا شوق تھا اور حالانکہ سائنس کا طالب علم تھا مگر وہ مغربی لٹریچر کے ایک بڑے حصّے کا مطالعہ کر چکا تھا ۔

اس کے والدین اوسط حیثیت کے مالک تھے اور بڑی مشکل سے اسے تعلیم دلا رہے تھے ۔ اس لئے وہ فارغ البالی کے احساس سے نا واقف تھا ۔ اس کے پاس نہ تو تفریح کے لئے روپیہ تھا اور نہ ہی وقت ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وقت کا زیادہ تر حصّہ کمرے میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے میں صَرف کرتا رہا ۔ اور ایم۔ایس۔ سی میں ایسی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ ٹرپنٹائن فیکٹری کے شعبۂ تحقیق میں اسے تارپین کی متعلقہ مصنوعات کی تحقیق کرنے کی ایک آسامی مل گئی ۔

ان دنوں صمد ابھی عبدالصمد ہی تھا ۔ ابھی وہ اے صمد نہیں ہوا تھا ۔ ایک تو اسے ان رقموں کے ادا کرنے کی فکر تھی ۔ جو اس کی تعلیم کے لئے اس کے والد کو قرض لینی پڑی تھیں ۔ دوسرے والدین کی خدمت کا خیال اس کے پیش پیش تھا ۔ جنہوں نے اتنی بڑی قربانیاں دے کر اسے اعلٰی تعلیم دلائی تھی ۔ اور بالآخر اسے اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی تعلیم کا فریضہ ادا کرنا تھا ۔ لہٰذا اس کے ذہن میں تفریح یا مشاغل کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا ۔ آپ جانتے ہیں عشق و محبت بے فکری اور فرصت کی پیداوار ہیں ۔ حالانکہ جس مکان میں صمد رہتا تھا اس کے قرب و جوار میں بھی مکانات تھے ۔ چوبارے اور کوٹھے تھے ۔ ان مکانوں میں کھڑکیاں تھیں ۔ جن میں سفید بازو حرکت کرتے تھے ۔ سرمگیں آنکھیں جھانکتیں تھیں ۔ لٹیں اڑتی تھیں اور رنگین آنچل لہراتے تھے ۔ چھتوں پر رنگین بوتلیں سی چلتی پھرتی تھیں ۔ خود ان کے گھر میں عزیز و اقارب کی جوان لڑکیاں آتی جاتی تھیں اور وہ اندر بیٹھ کر جان بوجھ کر سریلی ہنسی ہنسا کرتی تھیں جیسے کہ نوجوان لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے ۔ یہ آوازیں صمد کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں ۔ جنہیں سن کر اس کا دل بھی دھک سے رہ جاتا تھا اور چند ساعت کے لئے کیمسٹری کی کتاب کے فارمولے گڈمڈ ہو جاتے تھے اور وہ چند ایک منٹ

کے لئے کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ۔ لیکن جلد ہی حقائق اسے اپنی طرف متوجہ کرلیتے اور فارمولے پھر سے ترتیب میں آجاتے اور مطالعہ شروع ہو جاتا ۔

تارپین فیکٹری میں آسامی مِلتے ہی بیاہ کی بات شروع ہو گئی اور جلد ہی سرگوشیوں سے ابھر کر گھر میں باآوازِ بلند اس موضوع پر باتیں ہونے لگیں ۔ صمد نے پہلی مرتبہ سنا تو اس نے شانے جھٹک کر منہ سا بنا لیا ۔ کیونکہ اُسے شادی کی بات پسند نہ تھی ۔ لیکن اس کی بات کو کون پوچھتا تھا وہاں ۔ اور خالی شانے جھٹک کر منہ بنانے سے کیا ہوتا ہے ۔ صمد کے والدین سوسائٹی کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں شادی کے بارے میں بڑے سے بڑا اور واضح احتجاج بھی والد کی ایک "اہم" سے فرو کردیا جاتا ہے اور یہی ہوا ۔ ایک روز اس کے والد عبدالرحیم اپنا بڑا سا مخصوص کھونٹ اٹھائے اس کے پاس آبیٹھے اور کہنے لگے ۔ "بیٹا اب یہ نیک کام جلد از جلد سر انجام ہو جانا چاہئے ۔ تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہوا ہے بیٹا سمجھے" ۔ اس وقت صمد کو شانے جھٹک کر منہ بنانا بھی یاد نہ رہا تھا ۔ نہ ہی اس زمانے میں اسے احساس تھا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی اور کو دخل دینے کا حق نہیں ۔ صمد نے والد کی بات کے جواب میں سر جھکا لیا تھا اور بات طے ہوگئی تھی ۔ یہ تو اس کے والد کی شرافت تھی کہ انہوں نے اس سے اس موضوع پر بات کی تھی ۔ ورنہ اگر وہ اس سے بات کئے بغیر ہی تاریخ مقرر کر دیتے تو ۔ بہر حال دو ماہ کے اندر اندر صمد کی شادی اس کے چچا کی بیٹی سلمیٰ سے ہوگئی ۔ اور سلمیٰ صمد کی جرابیں دھونے نکٹائیوں پر کلف کرنے ، پتلونیں رفو کرنے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کا خیال رکھنے لگی ۔ سلمیٰ کی آمد صرف صمد کے آرام کا باعث ہی نہ تھی ۔ بلکہ سبھی لوگ اس سے بے حد خوش تھے ۔ صمد کے والد اور والدہ تو پہلے سے ہی اس کی آمد کے متمنی تھے ۔ انہوں نے تو خوش ہونا ہی تھا ۔ صمد کا بڑا بھائی امجد جو اس رشتے سے خوش نہ تھا ۔ اسے بھی سلمیٰ نے چند ہی دنوں میں رام کر لیا تھا ۔ صمد کی چھوٹی بہن اور بھائی تو سلمیٰ پر جان دینے لگے تھے اور پڑوسی اور عزیز و اقارب اس کے مداح ہو گئے تھے ۔ وہ خالی صمد کی بیوی ہی نہ تھی ۔ بلکہ ایک اچھی بہو اور بھابی اور اچھی پڑوسن بھی تھی ۔

ایک سال کے اندر اندر اچھے کام کی وجہ سے صمد کو شعبۂ تحقیق کا صدر بنا دیاگیا اور ابھی اس نے دوسال کی نوکری مکمل نہ کی تھی ۔ کہ اسے تحقیق کے شعبہ سے نکال کر اسسٹنٹ مینجر بنا دیاگیا اور تقسیم کے بعد جب فیکٹری کا نام پاک تارپین فیکٹری رکھاگیا تو ساتھ ہی اسے جنرل مینجر کے عہدے پر فائز کر دیاگیا اور سلمیٰ اور صمد اپناکوارٹر چھوڑ کر بنگلے میں منتقل ہو گئے ۔ بنگلے کے ساتھ ہی انہیں ایک چھ سلنڈر کی بیوک کار اور بیرہ ، خانسلماں ، شوفر اور دیگر مراعات حاصل ہوگئیں جو جنرل مینجر کے عہدے کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی تھیں ۔

اس تبدیلی کے باوجود سلمیٰ کی زندگی میں چنداں فرق پیدا نہ ہوا ۔ نوکر چاکر کے باوجود وہ صمد کی جرابیں دھوتی رہی اور اس کی نکٹائیوں پر کلف چڑھاتی رہی اور اس کی جملہ ضروریات کا خود خیال رکھتی رہی ۔

اس تبدیلی کے بعد صمد محسوس کرنے لگا کہ اتنے بڑے منصب پر پہنچنے کے باوجود اس کی زندگی گھریلو قسم کی ہے ۔ اور اس کی بیوی میں وہ شوخی نہیں جو کہ متمدن بیویوں میں ہوتی ہے ۔ بلکہ اسے تو یہ بھی گلہ تھا کہ وہ خالی بیوی ہی رہی بیوی سے ابھر کر بیگم نہ بن سکی ۔ دراصل اب صمد کے راستے میں مالی مشکلات نہ تھیں ۔ پرانے قرض وہ عرصہ ہوا اتار چکا تھا ۔ چھوٹا بھائی اور بہن دونوں فارغ التحصیل ہو چکے تھے ۔ بڑا بھائی تو خیر پہلے سے زمینداری کے کام میں مصروف تھا ۔ والد اور والدہ انتقال کر چکے تھے ۔ اور محنت کا سوال تو اب پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ۔ آپ جانتے ہیں کہ جنرل مینجر ہو جانے کے بعد اگر محنت کی جائے تو وہ محنت نہیں بلکہ تفریح محسوس ہوتی ہے ۔ کیونکہ اس میں اقتدار کے نشے کا عنصر شامل ہوتا ہے ۔

اب وہ عبدالصمد نہ رہا تھا بلکہ اے صمد ہو چکا تھا ۔ اب ایسی باتیں سوچنے کے لیے اس کے پاس بہت وقت تھا ۔ بلکہ اپنی عظمت کے احساس کی پرورش کرنے کے سوا اب اس کا ذہن کسی اور بات کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا ۔

لیکن اس کے باوجود صمد فطری طور پر ایک اچھا خاوند تھا ۔ وہ سلمیٰ کے نقائص کو دل ہی دل میں محسوس کرتا ۔ لیکن اس کے باوجود اسے کبھی خیال نہ

آیا تھا کہ وہ اس سے قطع تعلق کر سکتا ہے ۔ حالانکہ قطع تعلق کے لئے اس کے پاس ایک موزوں بہانہ بھی تھا کہ سلمٰی کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی ۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی زندگی اطمینان سے گزار رہا تھا ۔

آہستہ آہستہ اسے سلمٰی کے خلاف کئی شکایات پیدا ہوتی گئیں ۔ اول تو یہ کہ اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہ تھا ۔ اچھے کپڑے تو وہ اس کے کہنے پر پہن لیتی تھی ۔ مگر ان میں یوں مقید ہو جاتی ۔ جیسے وہ ریشم کے تاروں سے نہیں بلکہ لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے ہوں ۔ پھر وہ سنگار کے فن سے قطعی نا واقف تھی ۔ منہ پر پاؤڈر لگانا تو وہ گناہ سمجھتی تھی اور لپ سٹک پر لاحول پڑھتی تھی ۔ سلمٰی کو بال بنانے کے ڈھنگ سکھانے کے لئے صمد نے کئی ایک تصاویر مہیا کی تھیں اور اسے کئی ایک لیکچر پلائے تھے مگر سب بے سود ۔ صمد کا حکم مانتے کے بعد وہ ہنس کر کہتی ۔ "توبہ اس طرح تو سر میں درد ہونے لگتا ہے" ۔ اور پھر جلد ہی بالوں کو کھول کر رسمی طریقے سے چوٹی گوندھ لیتی ۔ البتہ وہ آنکھوں میں کاجل ضرور لگاتی تھی ۔ مگر خالی کاجل لگانے سے کیا ہوتا ہے ۔ پھر اسے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ لوگوں سے ملتی نہیں ۔ اور اگر عورتیں آ بھی جاتیں تو بات کرتے ہوئے صرف دو جملے دہراتی رہتی تھی ۔ "اچھا جی؟" "ہاں جی" اور بس جیسے وہ بیگم نہیں بلکہ باندی ہو ۔

سلمٰی خوبصورت تھی ۔ اس کا جسم متناسب تھا اور خدوخال تیکھے تھے رنگ تو بہت ہی گورا تھا ۔ مگر اس کی حرکات میں نہ لَے تھی اور نہ آواز میں لوچ اور سب سے بڑی شکایت جو اَب صمد کو اس کے خلاف تھی ۔ کہ اس کا چناؤ اس نے خود نہیں کیا تھا ۔ اگرچہ اس شکایت کا اظہار اس نے کبھی نہ کیا تھا ۔ لیکن یہ شکایت اس کے دل میں روز بروز تقویت پکڑتی جا رہی تھی ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آرزو ابھرتی آ رہی تھی کہ کاش وہ اپنے چناؤ کی لڑکی سے بیاہ کرتا ۔

پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے سلمٰی کی حرکتِ قلب بند ہو گئی اور صمد تنہا رہ گیا ۔ وہ بھاگا بھاگا فیکٹری سے گھر پہنچا ۔ ڈاکٹر بلوائے ۔ معائنے کروائے ۔ لیکن اس کی یہ کوششیں سلمٰی کو واپس نہ لا سکیں ۔

کچھ دیر وہ اس کی چارپائی کے پاس بیٹھا رہا ۔ پھر اضطراب میں ٹہلنے لگا ۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ سلمیٰ فوت ہو چکی ہے ۔ وہ چارپائی پر یوں چُپ چاپ پڑی تھی جیسے سو رہی ہو ۔ اس کے نقوش اور بھی تیکھے ہو گئے تھے ۔ اس کے ہونٹ حسبِ دستور بھینچے ہوئے تھے ۔ اور ہونٹوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے نشانات تھے ۔ جیسے کام کرتے کرتے تھک کر لیٹ گئی ہو ۔

سلمیٰ کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ صمد گھر میں ایک خلا محسوس کرنے لگا اور غم اس کے دل میں بوند بوند گرنے لگا ۔ حالانکہ وہ کہا کرتا تھا ۔ ”سلمیٰ تمہیں خود کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اتنے نوکر چاکر ہیں پھر بھی تم خود کام کرتی ہو ۔ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا“ ۔ لیکن اس کی موت کے بعد اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے کام کاج کے لئے نوکر کافی نہ تھے ۔ اس کی جرابیں تو دھل ہی جاتی تھیں ۔ نکٹائیوں پر کلف بھی ہو جاتا تھا ۔ مگر نہ جانے وہ دھلی ہوئی جرابیں کیوں دھلی ہوئی محسوس نہ ہوتی تھیں ۔ اور نکٹائیوں کے کلف میں نہ جانے کیا خامی رہ جاتی تھی ۔

کچھ عرصے تک تو وہ پریشاں حالی میں گھر میں گھومتا رہا پھر وہ باہر نکل گیا اور میل ملاقات کے شغل میں گھر کو بھولنے کی کوشش شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس کے بنگلے میں بیگم اطہر ، مسز دوبے ، مسز سہگل ، نعیمہ ، حامدہ اور رفیقہ کے قہقہے گونجنے لگے اور چارپائی پر سوئی ہوئی سلمیٰ کے نقوش مدھم پڑتے گئے ۔

ایک سال کے اندر اندر صمد ، اے صمد سے مسٹر صمڈ بن گیا اور اسے جرابیں دھونے اور نکٹائیوں پر کلف کرنے والی بیوی کے خیال پر ندامت محسوس ہونے لگی ۔ اوراس کی وہ خواہش جو سلمیٰ کے انتقال پر دب کر رہ گئی تھی ۔ پھر شدت سے عود کر آئی کہ اس کے گھر میں اس کے اپنے چناؤ کی بیوی ہو ۔ ایک ایسی بیوی جو گھر کی بیگم بن سکے جو اعلےٰ طبقے کے لوگوں سے میل جول کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ جو ڈنر، لنچ اور کافی پارٹیوں کا انتظام کر سکے اور پھر ان پارٹیوں میں اپنے سنگار ، لباس اور حرکات سے توجہ کا مرکز بن سکے ۔

ابھی وہ یہ خواب دیکھنے میں مصروف ہی تھا کہ مس انوری ہوائی کی طرح "شوں ۔۔" سے اس کے حلقے میں آ داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا ۔ اس قدر دنگ رہ گیا کہ اسے سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی ۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ اسے اپنی سکیم بنانے کے خیال کو جانچتا اور انوری کی روشنی میں اپنے مستقبل کا جائزہ لیتا وہ اس کے روبرو گھٹنوں پر گر کر اظہارِ محبّت کر چکا تھا ۔ جس کے جواب میں انوری نے ایک رنگین قہقہہ لگایا تھا اور ترچھی نظروں سے التفات کا وعدہ کرنے کے باوجود بے نیازی سے بات کو ٹال دیا تھا ۔ اس سے صمد کے دل کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی اور وہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو عورت اس قدر شدت سے اثر پذیر ہو کہ آپ میں سوچنے کا ملکہ نہ رہے ۔ اس سے محبت ہو جانا مرد کے لئے قدرتی امر ہے تو مختصر یہ کہ انوری کے اثر سے صمد پر یہ قدرتی امر مسلط ہو گیا ۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ماہ میں دونوں کی شادی ہو گئی ۔

شادی سے چند روز پہلے اس کا بڑا بھائی امجد آگیا ۔ اس نے صمد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے عزیزوں میں سے کسی کی لڑکی منتخب کرلے لیکن صمد ہنس پڑا اور کہنے لگا ۔ "نہیں بھائی جان یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ۔ اس میں دخل دینے کا کسی کو حق نہیں" اور امجد خاموش ہو گیا ۔ افسر بھائی کے سامنے چپ ہونے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتا تھا ۔

شادی کے بعد چھ مہینے تک صمد حواس باختہ رہا ۔ اس کی زندگی ورت کے پر ناچتی رہی ۔ گھر قہقہوں سے گونجتا رہا ۔ اس کے روبرو اکسانے والی سیاہ آنکھیں اسے مشتعل کرتی رہیں ۔ سرخ ہونٹ اس کے اعصاب پر بیر بہوٹیاں بن کر رینگتے رہے ۔ سفید بازو اسے یوں جھلاتے رہے جیسے وہ روتا ہوا ایک بچہ ہو ۔ خوشبوئیں کونوں سے نکل کر اسے گھیر لیتیں اور پھر انوری کی طرف اشارے کر کے مسکراتیں ۔

وہ یوں حواس باختہ رہا جیسے کوئی جاٹ میلے میں جا پہنچا ہو یا جیسے بچہ مٹھائیوں کے ڈھیر تلے دب گیا ہو ۔

صرف وہی نہیں سارا ماحول اس کے ساتھ اس رقص میں مصروف تھا ۔ فیکٹری کی مشینیں انوری کے گیت گاتی تھیں ۔ گاؤں کی چکی چلّاتی "انوری انوری" مزدور قہقہے لگاتے تھے ۔ اور پھر کام کاج سے فارغ ہو کر سرسوں کے کھیتوں میں انوری صمد کے ماہئے الاپتے تھے ۔ اور بچے سکول میں تالیاں پیٹتے تھے ۔ بچوں مشینوں اور مزدوروں کو اپنی خوشی میں شریک محسوس کرکے صمد کا جی چاہتا کہ وہ ان سب کو اتنی بخشیش دے کہ وہ خوش ہو جائیں ۔ پھر وہ احکامات جاری کرتا ۔ ان کے بچّوں کو مفت تعلیم دینے کے لئے سکول کھول دیا جائے ۔ اور ان کے کوارٹر فراخ کردیئے جائیں ۔ ان کی تفریح کے لئے کلب کھول دیا جائے ۔ اور ان احکامات پر بچوں کی تالیاں اور تیز ہو جاتیں ۔ مزدوروں کے قہقہے اور گونجتے اور ان کے گیت اور سریلے سنائی دیتے ۔

پھر دفعتاً ایک روز صمد پر انکشاف ہوا کہ وہ سوچ رہا ہے ۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ تھک گیا ہے اس مٹھاس کی شدّت سے اکتا گیا ہے اس نے محسوس کیا کہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے ۔ انوری تو اس کی ہو چکی تھی ۔ زندگی کی مسرت تو اُسے حاصل ہی تھی ۔

دراصل وہ چاہتا تھا کہ وہ مسرت پیش منظر سے نکل کر پس منظر میں چلی جائے ۔ اور اس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے ۔ اس خیال پر دفعتاً اس چارپائی کے دھندلکے نقوش ابھرنے لگے ۔ جس پر کسی زمانے میں سلمٰی لیٹی ہوئی تھی ۔ جیسے سو رہی ہو ۔ سلمٰی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں ہلکی سی طنز دیکھ کر وہ چونک گیا ۔ اور گہری سوچ میں پڑگیا ۔

لیکن سوچ بچار انوری کے لئے قابل قبول نہ تھی ۔ وہ سوچنے کی مہلت دینے کے خلاف تھی ۔ اس کے لئے زندگی ایک مسلسل تموّج تھا ۔ اس کی روح میں پیام حیات سلگتا نہ تھا ۔ بلکہ شعلہ جوالا کی طرح بھڑکتا تھا۔

انوری صمد کو اس لئے محبوب تھی کہ اس میں شوخی تھی ۔ شوخ تو وہ تھی مگر وہ اس حد تک شوخ تھی کہ شوخی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا ۔ اس کی شوخی سکون کے پس منظر پر ایک لہر نہ تھی بلکہ وہ شوخی پیش منظر پر ایک طوفان

تھی ۔

جب انوری نے محسوس کیا کہ صمد بیٹھ کر سوچنے لگا ہے تو اسے دھچکا سا لگا ۔ یہ اس کے سحر کی توہین تھی ۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں کا تکلم کم ہو رہا ہے جیسے اس کی مسکراہٹ کی دل کشی میں فرق آگیا ہے اور اس کے حسن کی روشنی مدھم پڑتی جارہی ہے ۔ یہ محسوس کر کے انوری نے زندگی کی موم بتی کو دونوں طرف سے جلا دیا ۔ اور رقص کی لے کو اور تیز کر دیا ۔ اور تیز ۔

صمد کچھ دیر تک تو اس کے ساتھ گھسٹتا رہا ۔ جیسے بچہ جوان کے ساتھ ساتھ چلتا تو ہے مگر پھر تھک جاتا ہے ۔ اسی طرح صمد ایک روز تھک کر گر پڑا لیکن انوری ازلی طور پر رقاصہ تھی ۔ اس کے لئے رقص ہی زندگی تھا ۔ اور تھکنا یا رکنا اس کے لئے ممکن ہی نہ تھا ۔ اس نے صمد کو رکتے ہوئے دیکھا ۔ ممکن ہے اس نے یہ چاہا ہو کہ وہ صمد کے ساتھ رک جائے ۔ مگر فطری طور پر وہ مجبور تھی ۔ اس لئے وہ رک نہ سکی ۔

صمد کے اشاروں پر چلنے والی انوری کو اشاروں پر چلتے رہنے کا جنوں تھا ۔ اب اگر اشارے کرنے والا ہی تھک جائے تو ایک نیا کھلاڑی میدان میں آکر اشارے کرنے لگے تو ۔۔ ؟ بھلا وہ بے چاری کر ہی کیا سکتی تھی ۔

مسٹر زیڈ احمد کے آنے پر یک دم منظر بدل گیا اور انوری کی توجہ صمد سے ہٹ کر احمد پر مرکوز ہو گئی اور صمد سوچنے لگا ۔ لیکن سوچنے سے زندگی کا دھارا رکتا نہیں ۔

تنہا بنگلے میں بیٹھ کر صمد سوچتا رہتا ۔ اور پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور دیوانہ وار ٹہلنے لگتا ۔ حتٰی کہ انوری پارٹی سے واپس آکر حسین انداز میں کہتی ۔ "ڈارلنگ آج پارٹی میں بڑا لطف رہا ۔ احمد نے تو حد کر دی" ۔ احمد کا نام سن کر صمد کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوتا اور پھر ایک خلا پھیل جاتا اور وہ انوری کی بات سنے بغیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے سنگار کو دیکھتا جو روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور چارپائی پر پڑی ہوئی لاش کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں طنز واضح ہوتا جاتا ۔

پھر لوگ انوری اور احمد کی باتیں کرنے لگے یہ باتیں پہلے سرگوشیوں میں شروع ہوئیں اور پھر جلد ہی بلند ہوگئیں ۔ اتنی بلند کہ صمد کے کانوں تک آپہنچیں اور ایک روز وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھ بیٹھا ۔ اور دفتر سے نکل کر گھر جا پہنچا ۔ اسے داخل ہوتے دیکھ کر انوری ایک ادا سے اس کی طرف بڑھی ۔ "ڈارلنگ کل پارٹی میں ــ"

"بڑا لطف رہا" ۔ "وہ غصّے میں چلّایا ۔ "اور مسٹر احمد نے حد کر دی یہی تا ــ"

"صمد" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی ۔

"دیکھو انوری" وہ غصّے میں چلّایا ۔ "آج سے تم احمد سے نہیں ملو گی" ۔

"کیا مطلب" پہلی مرتبہ وہ تنک کر بولی ۔

"مطلب وطلب نہیں ۔ میں کہتا ہوں تم احمد سے نہیں مل سکتی" ۔

"لیکن کیوں" ۔ وہ چلّائی ۔ "کسی سے ملوں یا نہ ملوں ۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں ۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" ۔

"ذاتی معاملہ" صمد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔

چارپائی پر پڑی ہوئی لاش اُٹھ بیٹھی ۔ "ذاتی معاملہ ؟" اس نے حیرانی سے انوری کی طرف دیکھا ۔ پھر وہ مڑی اور صمد کی طرف دیکھنے لگی ۔ اور پھر ایک مدھم مگر بھیانک قہقہہ سنائی دیا ۔

"ذاتی معاملہ، ذاتی معاملہ" فیکٹری کی مشینوں نے شور مچا دیا ۔

سکول کے بچے تالیاں پیٹنے لگے ۔

مزدوروں نے ایک قہقہہ بلند کیا ۔

"ذاتی معاملہ" گاؤں کی چکی قہقہہ مار کر ہنسی ۔

صمد آگ بھبھوکا ہو کر گھر سے باہر نکل آیا ۔ "سپروائزر ــ بند کرو اس شور کو بند کرو ۔ یہ لوگ کام وام کچھ نہیں کرتے ۔ سارا دن قہقہے لگاتے رہتے ہیں ۔ حکم کر دو کہ کام کاج کے وقت کوئی کسی سے بات نہ کرے" ۔

لمبے لمبے ڈگ بھر کر صمد دفتر میں داخل ہوگیا اور اس نے دروازہ اور کھڑکی

بند کردی ۔

"ذا ۔۔۔ تی" "ذا ۔۔۔ تی" دفتر کی گھڑی زیر لب بولی ۔ صمد نے دیوانہ وار اس کے پنڈولم کو نوچ کر فرش پر پھینک دیا ۔

فیکٹری پر ہو کا عالم طاری ہو گیا ۔

مزدور سہم گئے ان کی بیویوں کی پیشانیوں پر شکن پڑ گئے ۔ بچے گھبرا کر خاموش ہو گئے ۔ مشینیں کراہنے لگیں ۔ گاؤں کی چکی آہیں بھرنے لگی اور رہٹ نے بین کرنے شروع کر دیے ۔

○

مینا کے پاؤں

مینا میں دو خصوصیات تھیں ۔ ایک تو اس کے پاؤں جلتے رہتے تھے ، دوسرے اس کی ناک سونگھنے کے معاملے میں بے حد حساس تھی ۔ پھولوں کی خوشبو کی بات نہیں نہ ہی چنے اور سیاہی کی سی خصوصی چیزوں کی بُو باس کی بات ہے ۔ وہ تو ڈھکنا اٹھائے بغیر ہنڈیا میں پڑی ہوئی چیز کو بھانپ لیتی تھی ۔ اسی سے تو اسے گھر میں سبھی بڑی ناک والی کہتے تھے ۔ اور اس کے جلتے پاؤں کو مذاق سے مکی کے بُھٹے کہتے تھے اپنے جلتے پاؤں سے وہ عاجز آچکی تھی ۔

اس واقعہ کی تمام تر ذمہ داری مینا کے پاؤں اور ناک پر عائد ہوتی ہے ۔ ایک تو اس کے خم دار گلابی پاؤں جلتے تھے خصوصاً گرمیوں میں جبھی وہ ننگے پاؤں فرش پر چلنے میں بے حد تسکین محسوس کیا کرتی تھی ۔ سکول سے آتے ہی گُرگابی اتار کر پھینک دیتی اور پھر فرش پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گھومتی پھرتی اور خواہ مخواہ ہنستی ہنسے جاتی جیسے صرف جوتا اتارنے سے وہ جنّت میں آپہنچی ہو ۔

مینا کے پاؤں فرش کی ٹائیلوں سے چھوتے تو وہ انوکھی پُر لطف ٹھنڈک محسوس کرتی ۔ عجیب سی لذّت ۔ پھر وہ فرش پر پانی چھڑک کر اسے اور ٹھنڈا کرتی اور پھر گیلے فرش پر چلتی ۔

حالات اگر اسی پر اکتفا کرتے تو بھی بات طول نہ کھینچتی اور جلتے پاؤں کو ٹھنڈا کرنے کی معصوم عادت ایسے خطرناک نتائج پیدا نہ کرتی ۔ نہ مجھے اس کو بیان کرنے کی کوفت ہوتی اور نہ آپ کو سننے کی مصیبت ۔ مگر حالات کو آپ جانتے ہی ہیں ۔ حالات کو کون نہیں جانتا ۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے مینا پر انکشاف ہوا کہ پاؤں کو گیلا کرکے پنکھی سے ہوا

دی جائے تو وہ لذت کئی گنا بڑھ جاتی ہے ۔ اس کے بعد مینا کا یہ معمول ہو گیا کہ سکول سے آئی ۔ جوتا اُتارا ۔ ننگے پاؤں اِس کمرے سے اُس کمرے میں گئی ۔ اُس کمرے سے اِس کمرے میں آئی ۔ اِدھر گھومی اُدھر گئی ۔ اور پھر کھانا کھا کے کتابیں لے کر چارپائی پر جا بیٹھی اور چارپائی کے پاس پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھ لی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ کا پنکھا بھی ۔ پھر منہ میں پنسل ڈال حساب کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی ۔ اور ایک آدمی ایک کام کو چار دن میں کرتا ہے ۔ گنگناتے ہوئے اَن جانے میں پانی کی ایک کٹوری بالٹی سے نکال پیروں پر ڈالی اور پنکھے سے پاؤں کو ہوا کرتے ہوئے منہ میں پنسل ڈالے سوچنے لگی ۔ کہ پانچ آدمی اُس کام کو کتنے دنوں میں کریں گے ۔

اسے یوں بے خبری میں پاؤں کو پنکھا جھلتے ہوئے دیکھ کر گھر والے ہنستے بڑا بھائی سرور قہقہے لگاتا اور پھر یوں چلّاتا جیسے سبق یاد کر رہا ہو ۔ "بھٹیارن بھٹے بھون رہی ہے' ۔ دور چھوٹا غذن چیختا "کہاں ہیں بھٹے" ۔ اور ماں مسکرا کر کہتی ۔ "اونہہ بھٹے نہیں سیخ کباب"۔

اس پر مینا اضطراب بھری کروٹ لیتی ۔ پنکھا ہاتھ سے گر جاتا ۔ 'فضول" وہ ہونٹ نکال کر کہتی ۔ "میرا سارا سوال بُھلا دیا ۔ سب تباہ کر دیا ۔ یہ بھائی جان تو خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہیں' ۔ "اونہوں" سرور جواب دیتا "رنگ تو جوں کا توں قائم ہے ۔ بلکہ اور بھی نکھر آیا ہے" دیکھ لو وہ مینا کے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ۔ "ایسے سُرخ ہو رہے ہیں جیسے جلتے کوئلے ہوں' ۔

ان جلتے ہوئے کوئلوں پر سبھی ہنستے تھے ۔ سرور ۔ غذن اور اس کی ماں اور ان کے علاوہ مینا کا چچا بھی جو سفید داڑھی سمیت ہنسا کرتا ۔ مگر گھر میں کبھی سنجیدگی سے کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہ کوئلے جلتے کیوں ہیں اور وہ بھٹیارن پنکھے سے اس بھٹی کی تپش کو فرو کرتی ہے ۔ یا اسے ہوا دیتی ہے ۔

جب مینا گھر والوں کے مذاق پر جھنجھلاتی تو سرور شور مچا دیتا "لو ہو گئی کباب ، اماں سچ کہتی ہے ۔ بھٹے نہیں ۔ سیخ کباب ہیں"۔ اور غذن ہونٹ چوستے ہوئے پوچھتا "بھائی جان کہاں ہیں کباب" اس وقت سرور کو یہ خیال نہ آتا

کہ وہ کباب گلابی کیوں تھے اور جب ان کا ذکر چھڑ جاتا تو مینا ہنس مکھ ہونے کے باوجود کباب کیوں ہو جاتی تھی اور اس کے گالوں پر دو گلابی بھنور سے کیوں پڑ جاتے تھے ۔

اس کی ماں بھی مینا کی اس معصوم عادت پر مسکرا دیا کرتی ۔ جیسے پاؤں کو پنکھا کرنا ایک دلچسپ عادت کے سوا کچھ نہ ہو ۔ اور اس کے چچا تو یوں بے اختیار ہنستے کہ ان کی لمبی سفید داڑھی تھوک سے بھر جاتی ۔

اگر مینا اپنے پاؤں کو پنکھے سے ہوا کرنے ہی پر اکتفا کرتی تو بھی حالات نہ بگڑتے اوراس بھٹی سے اڑی ہوئی چنگاریاں یوں آگ نہ لگاتیں ۔ لیکن مشکل تو یہ ہوئی کہ مینا ایک دو گھنٹے سوال نکالنے کے بعد تھک کر لیٹ جانے کی بھی تو عادی تھی ۔ گرمیوں میں دوپہر کو سونے کی عادت کسے نہیں ہوتی ۔ اور سوئے ہوئے پاؤں کو پنکھا نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن پاؤں کو ہوا میں رکھے بغیر وہ سو بھی تو نہ سکتی تھی ۔

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے ۔ مینا نے بھی ایک طریقہ ایجاد کر رکھا تھا ۔ اس نیم چھتی کمرے کی کھڑکی کی اونچائی جہاں وہ سکول کا کام کیا کرتی تھی ۔ عین چارپائی کی اونچائی کے برابر تھی ۔ وہ ان گلابی انگاروں کو کھڑکی سے باہر نکال دیا کرتی تاکہ انہیں ہوا لگتی رہے اور وہ کچھ دیر کے لئے آرام کر سکے ۔

یہ کھڑکی عین اس چبوترے پر کھلتی تھی جو بیٹھک کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا ۔ گھر میں اس نیم چھتی کے علاوہ صرف دو کمرے تھے ۔ جو گھر کی ضروریات کے لئے ناکافی تھے ۔ اس لئے مکان کے ملحقہ چبوترے کو سرور کے دوستوں کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا ۔ سرور کے دوست اس چبوترے تک بے تکلف چلے آتے اور پھر چبوترے پر پہنچ کر یا تو دستک دیتے اور یا آواز دے کر سرور کو بلا لیتے ۔

اطہر سرور کا دوست نہیں تھا ۔ لیکن وہ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے ۔ اطہر کا عہدہ سرور سے بڑا تھا ۔ کیونکہ وہ اسسٹنٹ تھا ۔ گریجویٹ ہونے کی وجہ سے اسے ابتدا ہی سے اسسٹنٹ کی جگہ مل گئی تھی ۔ اطہر شاید سرور

کے گھر کبھی نہ آتا ۔ مگر اسے ایک فائل کی شدید ضرورت پڑ گئی جو سرور کے پاس تھی ۔ اس لئے وہ زینہ پر چڑھ کر چبوترے پر آپہنچا اور پھر جب دستک دینے لگا تو دفعتاً اس نے چق کے سِرکنے کی آواز سنی ۔ انجانے میں اس نے سر اٹھا کر نیم چھتی کی کھڑکی کی طرف دیکھا ۔ کھڑکی کے ایک کونے میں چق کے باہر دو خم دار گلابی پاؤں تہ کئے ہوئے ایک دوسرے کے اوپر یوں رکھے تھے جیسے امریکی پینٹ کا اشتہار ہو ۔

اطہر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر اوپر دیکھا لیکن دھندلانے کی بجائے وہ پیر بہوٹیاں اور بھی چمکنے لگیں ۔ پھر وہ بھول گیا کہ اسے دروازے پر دستک دینی تھی ۔ یا وہ فائل حاصل کرنی تھی جس کا صاحب کو خبط لگا ہوا تھا ۔

اطہر کو گلابی پاؤں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خم دار پاؤں مغرب میں بے حد خوبصورت سمجھے جاتے ہیں ۔ اور وہاں ٹخنوں کی ساخت کو چہرے کے خدوخال کی سی اہمیت حاصل ہے ۔ اسے ان باتوں کا علم ہی نہ تھا ۔ پیروں سے اس کی دلچسپی صرف اس حد تک تھی جیسے عام پاکستانی نوجوانوں کو ہوتی ہے مثلاً جیسی آپ کو ہے ۔

آپ سیاہ نقاب پوش کر دیکھتے ہیں ۔ دور سے دیکھ کر آپ نقاب سے اندازہ لگاتے ہیں کپڑا ریشمیں ہے ۔ سلوٹیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ "فال" اچھا ہے ۔ قد خاصہ ہے ۔ حرکات جمالی ہیں ۔ آپ مزید معلومات حاصل کرنے کی شدید کوشش کرتے ہیں کہ پس پردہ کی ایک جھلک نامکمل سہی ۔ مبہم سہی ۔ لیکن ایک جھلک نظر آجائے ۔ اِدھر اُدھر کی ناکام جستجو کے بعد دفعتاً آپ کو یاد آتا ہے اور آپ نیچے نگاہ دوڑاتے ہیں اور چپلی میں دو سفید سفید پیروں پر آپ کی نگاہ جم جاتی ہے اور پھر ان پیروں کی نوعیت کے مطابق ایک چہرہ آپ کی قوتِ متخیلہ کے پردہ پر نمودار ہونے لگتا ہے ۔

اطہر کے نزدیک پاؤں کی اہمیّت صرف اسی حد تک تھی ۔ اس سے زیادہ نہیں ۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا ان پیر بہوٹیوں کو دیکھ کر اس کی قوت متخیلہ

شل ہو گئی ۔ حتی کہ ان خم دار گلابی پاؤں میں اسے کوئی چہرہ دکھائی نہ دیا ۔ بلکہ وہ ان پاؤں کو دیکھ کر یوں بوکھلا گیا کہ اسے چہرہ بازو یا لمٹ دیکھنے کا اشتیاق نہ رہا ۔

چند ایک منٹ تو وہ وہاں کھڑا رہا پھر اضطراب کی شدت سے گھبرا کر چپکے سے سرور سے ملے بغیر ہی سیڑھیاں اتر کر لوٹ گیا ۔

اس کے بعد دفتر سے آتے ہوئے جب بھی وہ سرور کے گھر کے پاس پہنچتا تو ان گلابی پاؤں کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں نہ جانے کہاں سے ابھر آتی جسے محسوس کر کے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آتے اور پھر گھبراہٹ اور ندامت محسوس کرنے کے باوجود محراب دار دروازے سے جھانکتا اور اس کی نگاہیں چق کے کونے میں کچھ تلاش کرتیں اور پھر محرومیت سے بوجھل ہو کر لوٹ جاتیں ۔

پھر جب وہ گھر پہنچ کر ستانے کے لئے چارپائی پر لیٹتا تو چھت سے دو گلابی پاؤں لٹک آتے آرام کرسی پر بیٹھتا تو سامنے ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر خم دار بیر بہوٹیاں چلنے لگتیں ۔ دفتر کی فائل کھولتا تو وہ مخملی پاؤں رقص کرنے لگتے جیسے وہ فائل نہ ہو باٹا کا اشتہار ہو ۔ حتّٰی کہ ایک روز مجبور ہو کر وہ پھر سرور کے چبوترے پر جا چڑھا ۔ یہ مجبوری روز بروز بڑھتی گئی نتیجہ کے طور پر سرور اور اطہر میں رسمی سے تعلقات پیدا ہو گئے ۔

اس کے باوجود سرور کو معلوم نہ ہوا کہ اطہر کی آمدورفت کی غائت کیا ہے ۔ اسے معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا کیونکہ اطہر نے کبھی ان خم دار پاؤں والی کو دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی ۔ اسے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس گلابی جوڑے کے پیچھے دو شربتی آنکھوں ۔ ایک ستواں ناک ۔ دو متکلم ہونٹ اور ایک مسکراتی ہوئی ٹھوڑی والی خوابیدہ لڑکی بھی ہے ۔ جس کی لٹ اس کے رخساروں پر گری ہوئی ہے اور بازو انگڑائی کی صورت پھیلے ہوئے ہیں ۔ جن کے سامنے حساب کی کتاب ادھ کھلی پڑی ہے اور ابھی تک ہاتھ میں پنسل تھمی ہوئی ہے اور اُلٹی ہوئی کاپی پر ادھورا سوال کیا ہوا ہے جس میں چار آدمی اور پانچ لڑکے مل کر ایک کام کو کرتے ہیں اور جو سمجھ میں آنے سے ایک دم منکر ہے ۔

ایک مرتبہ اطہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے سرور نے بھی مینا کے پاؤں دیکھ لئے تھے اور اس بات پر وہ اندر آکر خلافِ معمول مینا سے لڑا تھا "کیا حماقت ہے" ۔ وہ سوئی ہوئی مینا کے سر پر کھڑا ہو کر چلّانے لگا ۔ "یہ کھُر باہر کیوں لٹکا رکھے ہیں ۔ مینا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی ۔ اور اس کی آنکھوں میں سرخ چیونٹیاں کام کو کرتے ہیں اور جو سمجھ میں آنے سے ایک دم منکر ہے ۔

ایک مرتبہ اطہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے سرور نے بھی مینا کے پاؤں دیکھ لئے تھے اور اس بات پر وہ اندر آکر خلافِ معمول مینا سے لڑا تھا "کیا حماقت ہے" ۔ وہ سوئی ہوئی مینا کے سر پر کھڑا ہو کر چلّانے لگا ۔ "یہ کھُر باہر کیوں لٹکا رکھے ہیں" ۔ اور مینا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی ۔ اور اس کی آنکھوں میں سرخ چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں ۔ مینا کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر سرور نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی نامحرم کی خلوت گاہ میں جا گھسا ہو ۔

سرور کی اس بات پر مینا کی ماں بھی طیش میں آگئی تھی ۔ "لو سُن لو پاؤں باہر نکل گئے تو کیا ہوا ۔ تم تو پاگل ہوگئے ہو"۔ اور چچا سفید داڑھی کو ہاتھ میں لے کر بولے تھے ۔ "حد ہو گئی میاں ۔ لڑکی نے منہ باہر نکال کر جھانکا ہوتا تو بھی کوئی بات تھی ۔ پاؤں چق سے باہر نکل گئے تو کیا ہوا ۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے تو چہرہ ہی سب سے زیادہ خطرناک عضو تھا ۔ جس سے یا تو پھُول یا انگارے جھڑ سکتے تھے ۔ پاؤں ـــ باہر نکلنے سے کیا ہوتا ہے ۔ ہنستے ہنستے ان کی داڑھی تھوک سے تر ہو گئی تھی ۔

لیکن تجربہ کار سفید ریشوں کے اس خیال کے باوجود بھی وہ گلابی پاؤں دیکھ کر اطہر کو وہ سب کچھ ہو گیا تھا جو ایک نوجوان کو ہو سکتا ہے ۔ حتّٰی کہ اس سے بھی زیادہ ۔ یہاں تک کہ جب بھی اسے کوئی ـــ پھُول برساتا یا انگارے اڑاتا چہرہ دکھائی دیتا تو وہ بے پروائی سے منہ موڑ لیتا یا فضا میں لٹکتا ہوا ایک گلابی پاؤں ٹھوکر مار کر اُس چہرے کو مسخ کر دیتا ۔

پھر اطہر کی نگاہیں جھک گئیں اور پیروں پر مرکوز ہوگئیں اور وہ دیوانہ وار ہر راہگذر کے پاؤں کو دیکھنے لگا ۔ گرگابیوں ، سینڈلوں اور سلیپروں سے جھانکتے

ہوئے پاؤں ۔ ننگے بے ڈول پاؤں ۔ بڑے بڑے بے حس مردہ پاؤں ۔ گدگدے گرم پاؤں ۔ گول گول گیلے پاؤں ۔ چھوٹے چھوٹے حسّاس پاؤں ۔ چڑھی ہوئی چتون سے غصیل پاؤں ۔ اس نے محسوس کیا جیسے پاؤں کا ایک دریا رواں ہو اور اس دریا میں دو گلابی خم دار بادبانوں کی واحد کشتی دھارے کے خلاف چل رہی ہو ۔

مینا کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان چلتے ہوئے پاؤں نے اطہر کی زندگی میں ایک طوفان برپا کردیا ہے ۔ اسے یہ معلوم بھی کیسے ہوتا ۔ اسے تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ چلتے کیوں تھے ۔ اور وہ جلن کس طوفان کی آمد کا نشان تھی ۔ جو آہستہ آہستہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جارہا تھا ۔

مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے خدوخال خوبصورت نہ بھی ہوں تو بھی وہ حسین سمجھی جاتی ہیں ۔ جن کا رنگ جاذب نہ بھی ہو تو بھی لوگ انہیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جنہیں توجہ حاصل کرنے کے لئے اپنا چرچا کرنا پڑتا ہے ۔ سنگار کرنا پڑتا ہے ۔ یا چلتے ہوئے شوخی بھری حرکات کو کام میں لانا پڑتا ہے ۔ یا اثر پیدا کرنے کے لئے کسی کے آنے پر جھٹ منہ چھپانا پڑتا ہے ۔ یا سیاہ نقاب سے موٹی سی آنکھ طلوع کرنی پڑتی ہے ۔ یا مسکرا کر دوسرے کو لبھانا پڑتا ہے یا گھور کر ناک سکیڑ کر منہ موڑنا پڑتا ہے ۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ازلی طور پر خوبصورت ہوتی ہیں ۔ جو جانتی ہیں ۔ کہ وہ خوبصورت ہیں اور ان کی ہر حرکت جاذبِ نظر ہے ۔ جن کا حجاب ایسا ہی پُر اثر ہے جیسے نمائشی حرکات ۔ مینا کی جاذبیّت کا تمام تر راز اُس بے پناہ اعتماد پر استوار تھا جو اپنی جاذبیّت کے متعلق اس کے دل میں جاگزیں تھا اور جس کے وجود نے اسکی شخصیت کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا ۔ اس لئے اس نے یہ ضرورت کبھی محسوس نہ کی تھی کہ کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھے یا بھائی جان کے دوستوں پر الجھی ہوئی لٹ یا نیم خوابیدہ آنکھ سے اثر ڈالے ۔ اس لئے وہ اطہر کے وجود ہی سے بے خبر رہی ۔

ادھر اطہر بھی کسی سے ملنے ملانے کا شوقین نہ تھا ۔ بلکہ اس کے برعکس وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا تھا ۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ جب بھی وہ دوستوں کے درمیان بیٹھتا تو کوئی نہ کوئی اس کے جسم کی بُو کا تذکرہ چھیڑ دیتا ۔ اگر کوئی اس کا ذکر نہ بھی کرتا تو بھی وہ محسوس کرتا جیسے وہ اسے محسوس کرکے ناک چڑھا رہے ہوں ۔ اسی وجہ سے زیادہ تر وہ کسی سے ملتا ہی نہ تھا ۔ اور لوگوں سے دور بیٹھتا تھا ۔ دفتر میں بھی اس نے اپنی سیٹ ایک کونے میں لگا رکھی تھی ۔ کہ کسی کو اس کے جسم کی بُو کا علم نہ ہونے پائے ۔ بچپن میں تو اس کے جسم میں کوئی خصوصی بُو نہ تھی ۔ پھر ایک روز عنفوان شباب میں بھیگتی ہوئی مسوں کے ساتھ نہ جانے وہ کہاں سے آگئی ۔ اور اس کے اقربا ہنس ہنس کر ناک بھوں چڑھانے لگے ۔ اور اُپلے لانے والی عمر رسیدہ گجری جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکایا کرتی تھی پرے پرے رہنے لگی ۔ حتّٰی کہ ایک روز جب اس نے اتنا بڑا منہ کھول کر اطہر سے کہہ دیا ۔ "یہ تو نے بدن پر کیسی بُو مل رکھی ہے" ۔ اس روز کے بعد اس نے کبھی کسی عورت کے قریب جانے کی جرأت نہ کی تھی ۔

اس کے جسم کی بُو کی نوعیّت کچھ عجیب سی تھی ۔ جیسے پرانے گڑ میں آئیوڈین ملی ہوئی ہو ۔ تلخ اور تیز بو ۔ اور یہی بُو اطہر اور مینا کے درمیان حائل ہوگئی ۔

اس روز جب وہ شام کے وقت سرور کے چبوترے پر بیٹھا سرور کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے اپنی بنیان میں سرسراہٹ سی محسوس کی اور گھبرا کر اس نے اپنی قمیض اور بنیان اتار دی اور پھر جلدی میں تاکہ سرور واپس نہ آجائے ، بنیان کو ایک کونے میں پھینک کر قمیض پہن لی ۔ لیکن گھر جاتے ہوئے وہ اپنی بنیان اٹھا کر لے جانا بُھول گیا ۔

اطہر کے جانے کے بعد رات کے اندھیرے میں اتفاق سے مینا ادھر آنکلی ۔ چبوترے پر پہنچتے ہی وہ گھبرا کر رُکی "ہائے یہ کیا" وہ چلّائی ۔ اور یوں ناک چڑھائی جیسے چبوترے پر مرے ہوئے چوہوں کا ڈھیر لگ رہا ہو ۔ "ہائے ای" وہ اندر بھاگی ۔

گھر میں مینا بڑی ناک والی مشہور تھی ۔ اسے ہر جگہ سے بُو آتی تھی ۔ "ہائے کیا ہے تجھے لڑکی" ۔ اس کی ماں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی ۔ "کیسے وقت گزرے گا تیرا پرائے گھر میں ۔ تجھے تو ہر جگہ سے بُو آتی ہے" ۔

مینا کو ہر جگہ سے بُو نہیں آتی تھی ۔ مگر اس کی بُو کی حس بے حد تیز تھی ۔ گھر میں آکر باورچی خانے کے قریب پہنچکر وہ چلاتی ۔ "بڑی اچھی ہے امی تو ۔ ہائے میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ مغز پکے" یا وہ ناک چڑھا کر کہتی ۔ "آج پھر ہنڈیا جلا دی نا" ۔ اور ماں حیرانی سے ناک پر ہاتھ رکھ لیتی ۔ "ہائے تجھے کیسے پتہ چل جاتا ہے ۔ لڑکی حد ہو گئی" ۔

یا چچا ملنے آتے تو وہ مسکرا کر کہتی ۔ "یہ بسکٹ جو آپ لائے ہیں مجھے دے دیجئے" ۔ اور چچا گھبرا کر پوچھتے ۔ "کونسے بسکٹ بیٹی" اور وہ ہنستی "یہ جو آپ نے جیب میں چھپا رکھے ہیں" ماں چچا کو احساس شرمساری سے بچانے کے لئے بول اٹھتی ۔ "توبہ اس لڑکی کی ناک بھی تو گز بھر لمبی ہے ۔ نہ جانے کہاں کہاں کی چیز سونگھ لیتی ہے" ۔

پر اس روز جب سرور نے چوری چوری اپنے دوست کو بیئر پلا کر خالی بوتل الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا اور اماں کے پوچھنے پر بہانہ بنا دیا تھا ۔ "اماں اس میں میرے دوست کے چینی کے برتن رکھے ہیں ۔ اس لئے تالا لگایا ہے ۔ جب وہ لے جائے گا تو کھول دوں گا اور اماں اس کی بات پر مطمئن ہو گئی تھی ۔ تو مینا چپکے سے سرور کے پاس جاکر بولی تھی ۔ "بھائی جان وہ صندل کی بوتل جو آپ نے الماری میں رکھی ہوئی ہے ۔ اس میں سے ایک چُسکی شربت تو چکھا دیجئے ۔ صرف ایک چُسکی" ۔

اس روز سے گھر میں جب بھی مینا کی لمبی ناک کا تذکرہ ہوتا تو نہ جانے کیوں سرور کو غصہ آ جاتا ۔ اور وہ طنزاً چلاتا ۔ "اماں یہ کیسی بُو آرہی ہے" ۔ اور اماں انجانے میں پوچھتی "کیسی بُو بیٹا" تو وہ مینا کے روبرو تن کر کھڑا ہو جاتا اور پھر جھوٹ موٹ سوچ کر کہتا "جیسے باسی ٹکڑے پر سڑا ہوا کباب پڑا ہو" ۔

اس روز جب مینا نے اطہر کی بنیان کی بُو پر شور مچایا تو گھر والوں کے لئے

وہ کوئی عجیب بات نہ تھی ۔ لیکن مینا کے لئے وہ عجیب بات تھی ۔ وہ بُو مینا کے بند بند میں دھنس گئی اور اس نے ایسے محسوس کیا جیسے وفعتاً اسکے اَنا کی گھڑی دائیں سے بائیں کو چلنے لگی ہو ۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ۔ رنگ زرد پڑگیا ۔ اور وفعتاً نہ جانے کیا محسوس کر کے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نیم چھتی کی طرف بھاگی اور اپنی چارپائی پر نیم جان ہو کر گر گئی ۔

اس رات مینا کو نیند نہ آئی ۔ کچھ دیر وہ چارپائی پر لیٹتی ۔ پھر بُو کا ایک ہلکا سا بھبھکا آتا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی اور چپکے سے نیچے اُتر جاتی اور اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد چبوترے پر کھلنے والا دروازہ کھولتی اور پھر گھبرا کر اسے بند کر کے واپس چلی جاتی اور بے جان ہو کر چارپائی پر پڑ جاتی ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد بُو کا وہی بادل پھر اس کے گِرد گھیرا ڈال لیتا اور وہ پھر نیچے اُتر جاتی ۔

چوتھی مرتبہ جب اُس نے چبوترے کا دروازہ کھولا تو وہ جرأت کر کے باہر نکل گئی اور اس بنیان کی طرف یوں دیکھنے لگی ۔ جیسے وہ کوئی ناگ ہو ۔ اور وہ اس سے ڈرنے کے باوجود اس کی طرف تکنے پر مجبور ہو ۔

اس کے جسم کا بند بند ٹوٹ رہا تھا ۔ جیسے سبھی کچھ باہر نکلنے لگا ہو ۔ جسم میں ان جانی تاریں لرز رہی تھیں ۔ ایک خوفناک بھیانک لرزش ۔ پھر وفعتاً اس نے ایک جست بھری اور اس ناگ کو دو انگلیوں سے تھام لیا اور ایک دیوانہ وار جنبش سے اُسے اپنے منہ پر ڈال لیا ۔

وفعتاً اس کے پاؤں سے سُرخ شعلے اُٹھے اوراس کے جسم کو یوں چاٹنے لگے جیسے وہ آتشیں ہولی کھیل رہی ہو ۔۔۔ پھر ایک شعلہ اوراس سے اڑتے ہوئے رنگین شرارے اور پھر وفعتاً وہ گلابی انگارے یوں ٹھنڈے ہو گئے ۔ جیسے برف کی رنگین ڈلیاں بن گئے ہوں ۔ مینا نے چاروں طرف حیرانی سے دیکھا ۔ اس کی نگاہ میں حیرانی کے علاوہ ایک انوکھا اطمینان تھا ۔ پھر وہ چُپکے سے اٹھی اور اس بنیان کو اٹھا کر اپنے صندوق میں رکھ کر مقفل کر دیا ۔

اگلے روز برسبیلِ تذکرہ جب دفتر میں اطہر نے سرور سے اس بنیان کے بارے میں استفسار کیا اور سرور نے ایک لمبا قہقہہ لگا کر مینا کی کھولتی ہوئی نفرت

کا سرسری بیان سنایا تو اطہر شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا اور پھر نہ جانے کس خیال سے بولا ۔ "وہ بنیان میرے ایک دوست کی تھی جسے میں دھلانے کے لئے لے جا رہا تھا ۔ خیر کوئی بات نہیں"۔

وہ آخری دن تھا ۔ جب اطہر سرور کے ہاں گیا ۔ اس کے بعد اس کا لاکھ جی چاہتا کہ وہ گلابی پاؤں ایک نظر دیکھ لے ۔ مگر وہ اس خواہش کو زبردستی دبا لیتا حتّٰی کہ اس نے دفتر آنے جانے کے لئے وہ راستہ بھی چھوڑ دیا ۔

ہسپتال کے طویل وارڈ میں مریض چُپ چاپ لیٹا ہوا تھا ۔ اس کے پاس ہی سٹول پر ایک دُبلا پتلا سفید ریش شخص خاموش بیٹھا تھا ۔ مریض چُپ چاپ چھت کو گھورے جارہا تھا ۔ کھویا ہوا سفید ریش بزرگ بے خبری میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا ۔ دور کمرے کے وسط میں ایک زرد رُو نرس ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے دیوار کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوسوں دور ہو ۔ وارڈ میں جملہ مریض اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔

بُڈھے نے اضطراب سے کروٹ لی ۔ "تو تقسیم کے وقت تم جالندھر میں تھے"۔ اس نے گویا دوائی کی شیشی سے سوال کیا ۔ جو مریض کے سرہانے رکھی تھی ۔

مریض نے اسے دیکھے بغیر اثبات میں سرہلا دیا ۔۔۔ "اور تم سیدھے یہاں چلے آئے"۔۔ "ہاں" مریض نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا ۔

"اور گاؤں والے سب ۔۔۔"

"سب" مریض نے دونوں ہاتھوں کو کھول کر جیسے خالی کر دیا ۔ اور وہ دونوں خاموش ہو گئے ۔

کچھ دیر کے بعد مریض چونکا ۔ مگر چھت کی طرف سے نگاہ ہٹائے بغیر بولا ۔ "جو ڈاکٹر غدودوں کے بارے میں ٹریننگ لے کر آیا ہے امریکہ سے ۔ کیا نام ہے اس کا"۔

"ڈاکٹر ریاض ۔۔" بڈھے نے جواب دیا ۔

"کتنی دیر ہوئی اُسے آئے"۔

"کوئی چھ ماہ"۔

"ہوں ۔۔" اس نے بڈھے کی طرف پہلی مرتبہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا واقعی جسم کی بُو کا علاج ممکن ہے"۔

"جسم کی بُو ۔۔۔" بڈھے نے کھوئے انداز سے اس کی طرف دیکھا

"مطلب ہے کچھ لوگوں کے جسم سے بُو آتی ہے نا ۔۔"

"ہاں ۔۔ بغل گند ۔۔۔ لیکن وہ کوئی بیماری نہیں ۔"

"سچ"

"ہاں ۔۔۔ ایسے کیس معمولی ہوتے ہیں"۔

"معمولی ہوتے ہیں ؟"

"میرا مطلب ہے جان کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ویسے بہت مہنگے پڑتے ہیں ایسے اپریشن ہسپتال کی طرف سے کرنے کی اجازت نہیں ہے نا۔ پرائیویٹ ہوتے ہیں۔ اس لئے خرچ بہت اُٹھتا ہے"۔

"لیکن ۔۔۔ کیا بُو لازماً دور ہو جاتی ہے"۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ مگر ایسا آپریشن کروانا نہیں چاہئے"۔

"کیوں ؟ ۔۔۔" مریض اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مرد کی قوت پر اثر پڑتا ہے"۔

"اوہ ۔۔۔" مریض آہ بھر کر لیٹ گیا۔

اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

بڈھے نے اپنی انگلیوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کروانا چاہتے ہو آپریشن ؟"

"میں ۔۔ میں ۔۔" مریض چونکا ۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں"۔ وہ گنگنانے لگا "میں نہیں ۔۔ لیکن اب کیا فائدہ ۔ بے کار ہے۔ بالکل بے کار۔" وہ پھر چھت کی طرف گھورنے لگا اور اسکائی لائٹ سے لٹکتے ہوئے گلابی خم دار غیر مرئی پاؤں میں کھو گیا۔

نرس کے بوٹ کی چاپ سن کر مریض پھر چونکا ۔ مقابل کے بیڈ پر وہ رک گئی اور مریض کے لئے دوا گلاس میں انڈیلنے لگی ۔

مریض نے سرسری طور پر اس کی طرف دیکھا اور گویا اپنے آپ سے گنگنانے لگا ۔ "نئی نرس معلوم ہوتی ہے" ۔

"نہیں تو" ۔ بڈھے نے آہستہ سے کہا ۔ "اس وارڈ میں اس کی ڈیوٹی ہفتے کے روز لگتی ہے" ۔

"ہوں ہفتے کے روز ۔۔" مریض خاموش ہوگیا ۔

"اسے جانتے ہو اطہر" بڈھے نے زیرِ لب پوچھا ۔ "جالندھر سے آئی ہے" ۔

"اچھا" اطہر نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "ہو گی" ۔

"بے چاری یہاں اکیلی ہی پہنچی ہے" بڈھے نے حسرت بھری نظروں سے نرس کی طرف دیکھا ۔ "اور باقی سب ۔۔"

"سب" اطہر نے غور کئے بغیر دہرایا ۔

"ہاں ۔ سب" ایک ساعت کے لئے بڈھا خاموش ہوگیا ۔

"وہ تو شکر ہے کہ دسویں پاس تھی ورنہ ۔۔۔"

"ورنہ کیا ۔۔۔"

"ورنہ نوکری بھی نہ کر سکتی ۔۔ آخر پیٹ جو پالنا ہوا" ۔

"ہوں ۔۔۔" اطہر نے ایک آہ بھری ۔

پھر وہ دونوں دیر تک خاموش رہے ۔ بڈھا بار بار اطہر کی طرف دیکھتا ، پھر جھجک کر سر جھکا لیتا اور انگلیاں چٹخانے لگتا ۔ آخر جرأت کر کے بڈھے نے وہ سوال کر ہی دیا ۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی" ۔

"شادی ۔۔" اطہر گھبرا گیا ۔ "شادی" اس نے زیرِ لب دہرایا اور ہنسنے کی کوشش کی ۔ نہ جانے کوشش کی شدت سے یا اس زہر خند کی وجہ سے اس کے گال پر ایک قطرہ بہنے لگا اور اس کی نگاہ میں سبھی کچھ دھندلا گیا ۔ گلابی پاؤں گم

ہوگئے ۔ جیسے کسی نے انہیں سکائی لائٹ سے اوپر کھینچ لیا ہو ۔

"وہ ڈاکٹر صاحب ۔ ڈاکٹر ریاض" بوڑھے نے اطہر کو بازو سے ہلایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا ۔ "ادھر آرہے ہیں وہ" ۔

"ریاض" وہ چونکا اور اُٹھ بیٹھا ۔ "یہی ہیں وہ کلینڈ ایکسپرٹ ؟"

"ہاں ۔ ہاں" بڈھے نے جواب دیا ۔ "یہی" ۔

ڈاکٹر ریاض سیدھا اطہر کے بیڈ کی طرف چلا آیا ۔ اور نرس بھی اسے آتا دیکھ کر اطہر کے بیڈ کی طرف آگئی ۔

"یہی ہے نمبر ۷ ؟" ڈاکٹر نے نرس سے پوچھا ۔

"یس ڈاکٹر" وہ بولی ۔

"کلر فینٹیسی کا کیس ہے" ۔

"یس ڈاکٹر" ۔

"کیا اب بھی آپ کو رنگ نظر آتے ہیں ۔" ڈاکٹر نے اطہر سے پوچھا ۔

"جی ہاں" بڈھے نے جواب دیا ۔ "اب بھی"

"اوہ ۔ آپ کمپاؤنڈر احمد شاہ ہیں کیا ۔" ڈاکٹر نے بڈھے کو پہچانتے ہوئے کہا۔

بڈھے نے سر اثبات میں ہلا دیا ۔

"یہ آپ کے عزیز ہیں کیا ؟"

"ان کے والد میرے دوست تھے ۔" بڈھے نے جواب دیا ۔

"ہوں ۔"

عین اُس وقت نرس نے ایک چیخ ماری ۔ "اوہ ڈاکٹر سم ریٹائل" اور اس نے دیوانہ وار دائیں پاؤں کا جوتا اتارنے کی کوشش کی ۔ اُسے یوں بے چین دیکھ کر بڈھا اور اطہر دونوں اس کی طرف لپکے ۔ بڈھے نے اسے تھام لیا ۔ اطہر نے ایک ہی جھٹکے میں اس کا بوٹ اتار دیا اور جراب اتار کر پرے پھینک دی ۔ وہ زرد سے خم دار پاؤں دیکھ کر اطہر کی سانس رُک گئی ۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کو دیکھنے لگا ۔

وہ تو شکر ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ اس سانپ کی طرف مبذول ہوگئی تھی جو نرس کے بوٹ سے باہر نکل کر فرش پر ادھ مؤا پڑا تھا ورنہ نہ جانے لوگ اطہر کے اس رویہ پر کیا سمجھتے ۔

پھر وہ نرس کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور اطہر دیوانہ وار ڈاکٹر ریاض کے پیچھے بھاگا ۔ "ڈاکٹر ڈاکٹر ۔ میرا آپریشن کر دیجئے ۔ خدا کے لئے ۔ میں آپ کو پوری فیس ادا کر دوں گا ۔ ڈاکٹر خدا کے لئے ڈاکٹر" ۔

ایک ہفتے بعد اطہر خوشی خوشی اس گلی میں داخل ہوا اور ایک راہ گیر سے پوچھنے لگا ۔ "مس عظمت یہیں رہتی ہیں کیا ؟" ۔

"وہ نرس" اس نے جواب دیا ۔ "وہ سامنے سبز کواڑوں والا مکان ہے ۔ وہ دائیں ہاتھ پر چوتھا" ۔

"کم ان" دستک کی آواز سن کر مس عظمت نے جواب دیا ۔ لیکن اجنبی کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی ۔ آپ آپ ۔۔۔ ۔"

"جی ۔ جی معاف کیجئے"۔ وہ بولا ۔ "لیکن مجھے آپ سے ایک ضروری بات ۔ میرا مطلب ہے"۔۔۔ وہ رُک گیا "یعنی ۔۔۔۔۔"

"بیٹھیے" وہ سویٹر بنتے ہوئے بے پروائی سے بولی ۔ "شاید آپ کو غلطی ہوئی ہے ۔ میں پریکٹس نہیں کرتی" ۔

"نہیں ۔ نہیں"۔ وہ چلّایا ۔ "میں تو ویسے ہی یعنی ایک ضروری بات میں ۔۔ میں سرور صاحب کا دوست ہوں" ۔

نرس نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا ۔ "اوہ" ۔ وہ بولی ۔

"میں وہاں گھر آیا جایا کرتا تھا ۔ سرور صاحب سے ملنے" ۔

سرور کا نام سُن کر اس کا سر جھک گیا اور ہاتھ بھی چستی سے چلنے لگا ۔

"سرور صاحب تو ۔۔" وہ رُک گیا ۔ "لیکن میں بھی یہاں اکیلا ہی پہنچا ہوں ۔ میرا اب کوئی نہیں ۔ کوئی بھی نہیں ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ ورنہ میں خود یہ بات کہنے کے لئے حاضر نہ ہوتا ۔ میرا مطلب ہے ایسی بات خود کہنا مناسب نہیں

سمجھا جاتا مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ لیکن آپ ۔۔۔ اگر برا نہ مانیں تو میں وہ بات عرض کروں"۔

مس عظمت کے چہرے پر شکن سی پڑ گئی ۔ اُس کے ہاتھ رک گئے ۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھی"۔

"جی" وہ بولا ۔ "اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں ۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو ۔۔۔ اور اگر آپ کو منظور نہ ہو تو تو ۔۔۔۔ یعنی آپ میری اس جسارت کو معاف کر دیں"۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟" اس کے منہ پر سُرخی سی جھلک گئی ۔

"میری مدّت سے یہ آرزو تھی ۔ ایک مدت سے ۔ اور شاید آپ اسے تسلیم نہ کریں ۔ لیکن ۔۔۔ لیکن زندگی میں میری صرف ایک آرزو ہی ہے ۔ صرف ایک ۔ اور میں نے آپ کے پاؤں صرف پاؤں دیکھے تھے ۔ نیم چھتی کی کھڑکی سے لٹکتے ہوئے صرف پاؤں ۔ جیسے ۔۔۔ جیسے ۔۔۔ " وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن ۔۔۔ لیکن وہ بد قسمتی سے ۔۔۔ بد قسمتی سے" وہ بغیر سوچے نہ جانے کس ترنگ میں بکے گیا ۔ "اس روز ۔ کیا منحوس دن تھا وہ ۔ جب میری بنیان ۔ وہاں اس چبوترے پر"۔

"بنیان" مس عظمت نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ۔

"ہاں ، ہاں وہ میری بنیان"۔ وہ گھبرا کر بولا ۔

"آپ کی" مس عظمت کی آنکھوں میں گویا تھے سے دیے روشن ہو گئے اس کا منہ سرخ ہو گیا ۔

"آپ کی بنیان تھی وہ" نرس نے چیخ کر پوچھا ۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں" وہ گھبرا کر بولا ۔ "اب ۔۔۔ اب وہ نہیں رہی ۔ میرا مطلب ہے اب وہ بُو نہیں رہی ۔ میں نے آپریشن کروا لیا ہے ۔ آپ کے لئے صرف آپ کے لیے"۔

دئے بجھ گئے ۔ چہرے کی سُرخی زردی میں بدل گئی ۔ "آپریشن" وہ زیرِ

لب چلائی ۔۔ "میں ۔۔۔ میں آپ کے لئے چائے" ۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی ۔

..............O..............

ڈُودھیا سویرا

شہر سے دُور گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا ۔ اس میں صرف بیس پچیس قبریں تھیں ۔ جن میں بیشتر کچی تھیں ۔ پختہ قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں ، اور ان میں سے ایک سفید ٹائیلوں کی بنی ہوئی تھی اس مختصر سے قبرستان کے غربی کنارے پر ایک مسجد تھی جس کے باہر چبوترا سا بنا ہوا تھا مشرقی کنارے کی سڑک کے پاس بس سٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا ۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا سٹال تھا ۔

قبروں پر درختوں کے سُوکھے پتّے بکھرے پڑے تھے ۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے ۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور ہے شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا ۔ ان ٹُنڈ مُنڈ درختوں تلے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔

پتلا دُبلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا ۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا ۔ پائپ اوور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جا ٹکتا ۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز سے ٹہلنے لگتا ۔

مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی بڑی بڑی جاذب آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انہیں کھولا تو اسکا راز فاش ہو جائے گا ۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند

ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آ گیا ہو ۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدّت جذبات سے جھرجھری سی لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اور اس کے گالوں پر ایک آنسو ڈھلک آتا جسے چھپانے کے لئے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ۔

گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان کھدّر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتّھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا ۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا ۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں ۔ چھاتی تنی ہوئی تھی جیسے اسے سانس لینے سے بھی لذّت محسوس ہو رہی ہو ۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی ۔ ایک بے نام سی انبساط ۔ اور وہ چُپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آجاتی ، اور اس کے چہرے پر دودھیا سویرا پھیل جاتا ۔

مسجد کے چبوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمّر آدمی دوزانو بیٹھا زیرِ لب بڑے خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا ۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دُور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اور اس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا ۔

دفعتاً سارے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں ، اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس سٹینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے ۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا ۔ جس میں صرف ایک لمبا بنچ ، ایک کُرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی ۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر مُونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پتلے دُبلے نوجوان سے کہا ۔ ”معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے ۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب !“

”مضطرب !“ پتلے دُبلے نوجوان نے دہرایا ”نہیں نہیں“ ۔ وہ اضطراب بھرے انداز میں چلّایا ۔ ”میں مضطرب تو نہیں ۔ میری روئیداد سن کر کیا کریں

گے آپ" ۔ وہ بولا ۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اپنی کتھا سنانے لگا ۔ "مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانمرگی کا شکار ہو گئی ، اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے ۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے ، میں خوش ہوں ۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں ۔ اُف کس قیامت کا سحر تھا جیسے کسی نے جادُو کر رکھا ہو ۔ ہاں وہ جادوگرنی تھی" ۔ وہ خاموش ہوگیا ، اور ان جانے میں بجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا ۔

کھدر پوش نے مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب بولا ۔ "آپ کو اس سے محبت ہوگی" ۔

"محبّت" پتلا دُبلا نوجوان چلّایا ۔ "مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی ۔ نہیں نہیں وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے" پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے ۔ "اور یہ ـــ یہ تو ایک بیماری تھی ، ہاں بیماری ۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو ۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ مرض بڑھتا جائے ، دوا کرنے کے باوجود بڑھتا جائے" ۔

"عجیب بات ہے" اچکن پوش بزرگ نے سر اٹھا کر پہلی مرتبہ دُبلے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

بس سٹینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی ۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی ۔ چیخ رہی تھی

"ہاں" دبلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ، جیسے اسے دوسرے اصحاب کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو ۔ "ہاں عجیب ۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ ۔ کس قدر جاذبیت تھی اس میں ۔ توبہ ہے!" اس نے جھرجھری لی ۔ اس میں نمائش نہیں تھی ۔ نخرا نہیں تھا ۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹ بٹوے کی طرح کھلتے ملتے نہیں تھے ، اسکی آنکھیں ڈولتی نہیں تھیں ، اس کی بھویں تنتی سمٹتی نہیں تھیں ، اس کی آنکھوں میں متبسم اشارے نہیں جھلکتے تھے ۔ اسے دیکھ کر پیار کرنے کی

خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی ۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں میں گر کر رو پڑیں ۔ وہ لڑکی نہیں تھی ، مٹیار عورت تھی ، مٹیار عورت ۔ اس پر لڑکی پن کبھی نہیں آیا تھا ، کبھی نہیں ۔ وہ پیدائشی مٹیار تھی ۔ اس میں ایک عجیب سی آن تھی ۔ عجیب سی تمکنت ایک ایسا احساس جیسے کہ وہ تمام کائنات کا محور ہو ، مرکز ہو ، اُف پتلے دبلے نوجوان نے یوں لمبی سانس لی جیسے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں "اس کے روبرو اپنی شخصیت شل ہو جاتی تھی ۔ اپنی آرزوئیں گویا مفقود ہو جاتی تھیں ۔ جی چاہتا تھا وہی کریں جو وہ چاہتی ہے ۔ جی چاہتا تھا وہ احکام جاری کرے اور ہم تعمیل کریں ۔ عجیب عورت تھی وہ عجیب" وہ پھر اپنے خیالات میں کھو کر چپ ہو گیا ۔

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو ۔ دور جاتی ندی بین کر رہی تھی ۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا ۔ کھدر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا ۔

"ہاں جادو" دبلا پتلا نوجوان بولا ۔ 'اُسنے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا ۔ اور ، اور جب میں نے ہوش سنبھالا میں اس کے پیچھے پیچھے گود کے کتے کی طرح پھرتا رہتا تھا ۔ جہاں بھی وہ جاتی ، میں اس کے پیچھے جاتا ۔ وہ کسی سے ملنے کے لئے گھر کے اندر چلی جاتی تو میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں ۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سوئٹر بُنتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا ۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو رہتا ۔ وہ سکول جاتی تو میں سکول کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے جاتا ۔ پھر سکول میں داخل ہوتے وقت وہ مڑکر میری طرف دیکھتی اوراس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ چمکتی ، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی شرارت میں مَیں اس کے ساتھ شریک ہوں ۔ سوئٹر بُنتے ہوئے تاگا توڑتے وقت یا سلائی پر دھاگے سمیٹتے

وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ مسکراتی ۔ وہی مسکراہٹ جیسے ہم دونوں کسی پوشیدہ شرارت میں اکٹھے شریک ہوں ۔ بس وہی مسکراہٹ مجھے اس بات پر اکساتی تھی کہ میں گود کے کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھروں ۔"

"گھر کے سب لوگ اسے اس بات پر چھیڑا کرتے تھے ۔ میری ماں بھی ہنس کر اس سے پوچھا کرتی ۔ "اے ہے تم نے تو لڑکے پر جادو کر رکھا ہے کیا ۔" کوئی کہتا توبہ ہے اس لڑکے کو کیا ہے پلّے کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے ۔ کوئی کہتا یہ لڑکا تو اپنی ماں کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا لیکن ان دنوں میں ابھی بچہ ہی تھا ۔ اس لئے لوگ بات کرکے ہنس پڑتے تھے اور بس ، وہ خود بھی ہنسا کرتی ۔ اور کبھی کبھی میرے قریب آکر میرے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ۔ "کیوں رے تجھے میرے پیچھے پھرنے میں مزہ آتا ہے کیا ؟" اور پھر ایک عجیب سی نگاہ میری طرف ڈال کر دہراتی "مزہ آتا ہے ۔" اس کے کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ میں ایک مزے بھری جھرجھری محسوس کرتا اور اس کی نگاہ کی شرارت کی چمک کی وجہ سے میں محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو اونہوں کسی کو بتانا نہیں کہ اِس مزے بھری شرارت میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں ۔ برابر کے ۔ چُپ ۔"

دُبلے پتلے نوجوان نے ایک شدید جھرجھری لی ، اور پھر جیبوں کو ٹٹول کر دیا سلائی نکالی اور ماچس جلاکر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے شروع کردیے ۔ اچکن پوش بزرگ اپنا وِرد بُھول چکے تھے ۔ اور منہ کھولے دُبلے پتلے نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا ۔ کھدّر پوش ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں پڑا تھا ۔ باہر ٹین کی چھت پر بوندیاں گویا یوں جلترنگ بجا رہی تھیں جیسے کوئی مغنّی مزے میں آیا ہوا ہو ۔

"اس مزے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے پہلے ہی جوان ہوگیا" ۔ پتلا دبلا نوجوان بولا "میرا مطلب ہے بچپن ہی میں جوانی کی شرارت گویا مجھ پر مسلّط ہوگئی ۔ اسے بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ اس بات پر ہنسا کرتی تھی ۔

اس کی ہنسی میں طنز نہیں ہوتی تھی ۔ اونہوں ! جیسے مصوّر اپنے نقش کو دیکھ کر مسکراتا ہے ۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی ۔ لیکن اس کی اس رازدارانہ مسکراہٹ نے گویا مجھ میں بلوغت کا خمیر پیدا کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگا تھا" ۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا ۔ "پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ رازدارانہ رنگ گویا اس کی آنکھوں سے رس رس کر بہنے لگا حتّٰی کہ اس کی ہر حرکت اسی رنگ میں شرابور ہوگئی اور ۔۔۔ اور میری نظر میں اس کے جسم کے پیچ و خم یوں عریاں دکھائی دینے لگے جیسے وہ ہولی کھیل کر آئی ہو اور ہر نگاہ کے ساتھ جو میں اس کے اوپر ڈالتا میری آنکھوں میں اسی رنگ کی پھوار پڑتی اور میرے جسم میں ایک ہوائی سی چل جاتی توبہ ہے"۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے یوں بھیگے بھیگے انداز سے کہا جیسے وہ رنگ میں شرابور ہو گیا ہو ۔ پھر دفعتاً سر اٹھا کر بولا ۔ "پھر اس نے وہ شرارت سازش میں بدل دی اور ۔۔ اور ایک معصوم لڑکے کو جس نے عنفوانِ شباب کے عالم میں ابھی قدم رکھا ہی تھا ، گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا ، توبہ ہے" ۔ وہ پھر چلّایا "جو گناہ سے آشنا نہ تھا ۔ جس نے گناہ کی آرزو تک نہ کی تھی اسے گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا اور شناسا ہی نہیں بلکہ شرابور کر کے بھیگے کبوتر کی طرح اس کی قوّتِ پرواز ختم کر دی اور یہ سب ایک جملے ایک کنایہ سے چُپ کوئی آرہا ہے" ۔ کس قدر معصوم جملہ ہے ۔ لیکن ایک خوبصورت مٹیار کے مُنہ سے رازدارانہ انداز سے نکلے تو ، توبہ ہے" ۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا ۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا ۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے دُور بیٹھے ہوتے وہ اپنے کام کاج میں منہمک ہوتی ، اور میں چپ چاپ نگاہوں سے اس کے پاؤں کی انگلیوں سے کھیل رہا ہوتا پاؤں کی چاپ سن کر دفعتاً وہ میری طرف دیکھتی اور خاموشی سے اشارہ کرتی "چپ کوئی آرہا ہے" اور میرا دل اچھلتا اور میں اپنے آپ کو یوں سنبھالتا جیسے کوئی پکڑا گیا ہو اور پھر میں محسوس کرتا جیسے آنے والا ہمارے راز سے واقف ہو"۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "عجیب بات تھی ۔ راز کی نوعیت جانے بغیر میں اس کے کھل جانے سے ڈرتا تھا ۔ مجھے

معلوم نہیں تھا کہ راز کے کھلنے کا ڈر پیدا کر کے دراصل وہ مجھے راز کی نوعیت کی عملی تحقیق کرنے پر اکسا رہی تھی ۔"

"پھر ایک روز شام کے وقت جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے اگرچہ دُور دُور بیٹھے تھے تو اس کے والد صاحب کی کھنکھار سُنائی دی ، وہ دیوانہ وار اٹھی اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں لے گئی اور مجھے الماری کے پیچھے ٹھونس دیا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب اس معصوم شرارت پر سازش کی مہر لگ گئی" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ اور دروازے کے باہر گرتی ہوئی بوندیوں کو غور سے دیکھنے میں کھو گیا ۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی ۔ اچکن پوش بزرگ پھر سے سر جھکا کر ورد کرنے میں مصروف ہو گیا ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد اضطراب بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے میں مصروف ہو جاتا ۔ آخر وہ بے اختیار ہو کر بولا ۔ "پھر ۔۔۔ پھر کیا ہوا" ۔

"پھر ـــ ؟" پتلا دُبلا نوجوان چونکا ۔ "پھر ۔۔ ؟" اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصہ بیان کر رہا تھا ۔ "اوہ ۔ ہاں" ۔ وہ چلّایا ۔ "پھر کیا ہونا تھا ۔ پھر وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتی تھی ۔ اور کیا ہو سکتا تھا اور میں ۔ میرا عزم تو یوں شل ہو چکا تھا ۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا ۔ پھر اسی روز اس نے مجھ سے کہہ دیا ۔ کہنے لگی ۔ "اب تم نہ آیا کرو میاں جب تک میں خود نہ بلاؤں ۔" پھر دفعتاً نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے میری جانب دیکھا ۔ وہی سازشی نگاہ ، وہی چپ کا سا انداز ۔ "میں بلایا کروں گی ۔ وہ بولی "ہاں" اس ہاں نے وہ منفی احساس جو اس کے منع کرنے کی وجہ سے مجھ پر مسلّط ہو گیا تھا ۔ قطعی طور پر رفع کر دیا ۔ اور میں نے پہلی مرتبہ اسکی ہاں کا مثبت اثر محسوس کیا اس وقت گویا ساری کائنات سمٹ کر میری جھولی میں آگری ۔ آتشدان پر شانت آسن میں بیٹھا ہوا دیوتا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور آتش دان پر بچھے ہوئے کپڑے پر کاڑھے ہوئے پھولوں میں سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور سارا کمرہ خوشبو سے بھر گیا ۔" وہ ہنسنے لگا ۔ "عجیب عمر تھی وہ بھی ۔

کاش کہ میں اس جادوگرنی کے سحر میں نہ آتا"۔ اس کی ہنسی زہرخند میں تبدیل ہو گئی ۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دروازے میں کھڑے ہو کر درختوں کے جُھنڈ تلے بکھری ہوئی قبروں کی طرف دیکھنے لگا ۔

"عجیب واقعہ ہے" ۔ اچکن پوش بزرگ نے زیرِ لب کہہ کرآہ بھری ۔ "تو کیا اس نے تمہیں بلایا" ۔ مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد نے پوچھا ۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "کئی بار ، لیکن بے کار ۔ ہر بار جب بھی بلاتی تو کوئی نہ کوئی آجاتا اور مجھے پردے یا الماری کے پیچھے چھپا دیا جاتا ۔ جہاں میرا دل دھک دھک کرتا ۔ میرے جسم کا بند بند سمٹتا پھیلتا ، میرا حلق بند ہو جاتا اور چاروں طرف سے ایک ان جانا بوجھ مجھ پر پڑجاتا ۔ توبہ ہے" ۔ وہ چلّایا "جیسے جیسے ڈر اور خوف مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتے ۔ لیکن اس کے باوجود میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ بلائے اور میں جاؤں ۔۔۔ "پھر" وہ آہ بھر کر بولا" پھر اس کی شادی ہو گئی ۔ اور ۔۔۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اس بات پر دکھ نہ ہوا کہ وہ کسی اور کی ہو رہی ہے بلکہ صرف اس بات پر کہ اس سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا ۔ حالانکہ ہمارے ملنے کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی ۔ عجیب بات ہے نا" ۔ وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے بولا ۔ اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو اکیلے میں مجھ سے کہنے لگی ۔ تم فکر نہ کرنا ۔ میں تمہیں بلاؤں گی ۔ میں بلاؤں تو آنا ضرور ۔ ضرور آنا ۔ اس کی اتنی سی بات پر مجھے اطمینان سا ہو گیا اور میری تمام شکایات یوں ختم ہو گئیں جیسے پیدا ہی نہ ہوئی ہوں اور ایک بار پھر میں انتظار کی لذّت میں کھو گیا۔

"چھ مہینے گزر گئے" ۔ اس نے مختصر سے وقفے کے بعد کہا ۔ "لیکن مجھے اس کا بلاوا نہ آیا ۔ اس کے رنگین وعدے کا سحر ٹوٹنے لگا اور ۔" اور وہ زہرخند کے ساتھ بولا ۔ "ایک روز میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جا پہنچا ۔ جہاں وہ رہتی تھی ۔ اور پھر ایک رات جب اس کا خاوند گھر پر نہ تھا ۔ میں ناگہاں اس کے روبرو جا کھڑا ہوا ۔"

"مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گئی ، لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی ، "شکر ہے

تم آگئے ۔ آؤ آؤ لیکن ادھر اس کونے میں کوئی نوکر نہ دیکھ لے" ۔ اس نے مجھے اسی نگاہ سے دیکھا ۔ وہی سازش وہی شوخی ، وہی نیم مدہوشی ۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ کام کاج میں مصروف ہوگئی ۔ اور رنگین تتلی کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگی ۔ ہر چند منٹ کے بعد چپکے سے وہ اس کونے میں آجاتی جہاں میں بیٹھا تھا ۔ اور پھر وہی نگاہ ، وہی تبسّم ۔۔ کام کاج سے فارغ ہو کر جب ہم اکٹھے ہوئے تو وہی بات وقوع میں آئی جو ایسے موقعہ پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی ۔ بیٹھے بٹھائے آہٹ کی آواز سن کر وہ زیرِ لب چلّائی ۔ "وہ ۔ وہ آگئے اور پھر اپنی بانہوں میں تھام کر گھسیٹتے ہوئے وہ مجھے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئی ۔ اور مجھے وہاں بٹھا دیا ۔ "چپ" وہ بولی اور دروازے کے پٹ بند کر کے خود باہر نکل گئی ۔ اور میں اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلا رہ گیا ۔ توبہ ہے، اس رات میرا کیا حال ہوا ۔ توبہ ہے" ۔ پتلے دُبلے نوجوان نے لمبی آہ بھر کر کہا ۔ "خوف کا ایک آرہ تھا جو مجھے کاٹ رہا تھا ۔ وہی بوجھ ۔ وہی گھٹن ۔ وہی تناؤ ۔ توبہ ہے" ۔

"دو گھنٹے وہاں دبک کر بیٹھنے کے بعد میرے لئے وہ تکلیف نا قابلِ برداشت ہوگئی اور خطرے سے بے پروا ہو کر میں نے باہر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ۔ جب میں دبے پاؤں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں توبہ ہے" وہ چلّایا "توبہ ہے" ۔

"کیا" مونچھوں والا بولا ۔

"وہ اکیلی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ۔ ایک بازو سر تلے دبایا ہوا تھا ۔ اور اس کے چہرے پر اتنی مسرت اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی جیسے خوشی سے سرشار ہو اور سارے گھر میں اس کے اور اس کی نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا ۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تمام تر خوشی اسی بات پر موقوف تھی کہ کسی کو الماری یا پردے کے پیچھے چھپا دے ۔ جہاں وہ تڑپ تڑپ کر اپنا آپ اس کے لئے ہلکان کرتا رہے اور خود اطمینان سے سو جائے ۔ غصّے سے میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتی میں ہمیشہ کے لئے اس کے سحر سے نکل آیا ۔ بھاگ آیا ۔"

"گھر آتے ہی میں نے امّاں سے کہا ۔ امّاں میری شادی کر دو ۔ چاہے کسی سے کردو ۔ اماں کردو ۔۔۔ اور جب میری شادی ہو گئی اور میری حسین و جمیل بیوی میرے پاس آگئی تو ۔۔" تو وہ رُک گیا "توبہ ہے" ۔ وہ بولا ۔ "حد ہو گئی حد" ۔

"کیا" ۔ مونچھوں والے نے بے تابی سے پوچھا ۔

"جب میں اپنی نئی دلہن کے پاس بیٹھا تھا تو دفعتاً میرا جی چاہنے لگا کہ کوئی آجائے اور میری بیوی مجھے گھسیٹ کر لے جائے اور کہیں چھپاتے ہوئے وہ آگئے ۔ چُپ کہے ۔ میری اپنی بیوی" ۔ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا ۔ "اور آج تک ۔ آج تک میری یہی حالت ہے" وہ بولا ۔ "مگر کوئی نہیں آتا اور کوئی آبھی جائے تو وہ ایسا نہیں کرتی ۔ یہ نہیں کہتی وہ آگئے وہ ۔ وہ ۔ توبہ ہے ۔ توبہ ہے" وہ چلّایا "میں کتنا کمینہ ہوں ، کتنا کمینہ ہوں میں مگر یہ سب کچھ اس کے سحر کا نتیجہ ہے ۔ ہاں اسی کا ۔ اور آج ابھی جب میں اس کی قبر کے پاس بیٹھا تھا ۔ تو خدا کی قسم میں منتظر تھا کہ وہ باہر نکل کر کہے وہ آگئے وہ ۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا ۔

باہر ہوا درختوں کی ٹہنیوں میں رو رہی تھی ۔ جانی ندی بین کر رہی تھی ۔ بوندیاں چھم چھم گر رہی تھیں ۔ اور اس کی دیوانگی بھری ہنسی کس قدر خوفناک تھی ۔ پھر دفعتاً اُس کی ہنسی ایک کراہ کے ساتھ ختم ہوگئی ۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا ۔ اور کمرے میں کرب ناک خاموشی چھا گئی ۔

"چائے بابوجی" ۔ چھوٹا لڑکا ٹرے پر چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے داخل ہوا اور ایک ایک پیالہ ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا ۔

چائے آجانے سے کمرے کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی ہو گئی ۔ "زندگی کس قدر عجیب ہے" کھدر پوش نے کہا ۔۔ "ان دکھوں اور غموں کے باوجود جو ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں" ۔ اچکن پوش نے لمبی آہ بھری ۔ "بجا ہے" ۔ وہ بولے ۔ "لیکن صاحب انجامِ کار سب نے یہیں آجانا ہے" ۔ کھدّر پوش نے

مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد کی طرف دیکھا ۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بڑے دکھی ہیں" ۔ وہ بولا ۔ "کوئی عزیز داغ مفارقت دے گئے ہیں کیا" ۔

"میرے عزیز" مونچھوں والے نے سر اٹھایا ۔ نہیں عزیز تو نہیں ۔ اس کی مجھ سے رشتہ داری نہ تھی ۔ "تو" کھدر پوش مسکرایا "محبت" وہ فقرہ مکمل کئے بغیر چپ ہوگیا ۔

"محبت" مونچھوں والے نے آہ بھر کر دہرایا ۔ "کاش میں اس کی محبت کی قدر کرتا ۔ میں نے قدر نہ کی" ۔ اس کی آواز بھر آئی ۔ "وہ میری محسن تھی صاحب محسن" ۔

"محسن تھی" ۔ اچکن والے بزرگ نے "تھی" پر زور دیتے ہوئے کہا ۔

"ہاں" مونچھوں والا بولا ۔ "وہ بھی عورت تھی ۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے بھائی صاحب" ۔ اُس نے کہا ۔ "اس بات کو تو سب ہی جانتے ہیں ۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل رہا ہمیشہ ۔ اپنا کاروبار ہے ۔ کام کرنے کے لئے کارندے ہیں ۔ مجھے صرف دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور باقی سارا وقت اپنے شغلوں میں صرف ہو جاتا ہے ۔ بے فکری ہے ۔ پیسہ عام ہے ۔ ساری عمر اپنی کھانے پینے اور عیش کرنے میں صرف ہوئی ہے ۔ جو چاہا مل گیا ۔ جس کی آرزو کی وہ حاصل ہوگئی ۔ محبّت کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ۔ البتہ کبھی کبھار کسی پر طبیعت آگئی اور طبیعت اپنی ایسی کمبخت ہے کہ جب کسی پر آجائے تو" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "میں اندھا ہو جاتا ہوں ۔ تمہاری قسم پھر کچھ نہیں سوجھتا ۔ جی چاہتا ہے چاہے ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑے اسے حاصل کرلوں ، اور پھر جب حاصل ہو جائے تو چند ایک روز میں چاؤ اتر جاتا ہے اور پھر اپنی توجہ کسی اور طرف لگ جاتی ہے ۔ اللہ کا فضل ہے ۔ آج تک کبھی ناکامی نہیں ہوئی جو چاہا ملا ۔ جسے چاہا حاصل کرکے چھوڑا" وہ ہنسنے لگا ۔

"کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے ۔ جب اتفاق سے اپنی نظر ایک کالج کی لڑکی پر پڑگئی تھی ۔ اور کیا بتاؤں تمہیں ایسی بری طرح مچل گئی طبیعت کہ میں پاگل ہوگیا ۔ بس بھائی صاحب ہر جتن کرکے دیکھ لیا ، اس کی منّتیں کیں ، لالچ

دیا ، کہلوا بھیجا میں دولت لنڈھا دوں گا ۔ صرف ایک بار مجھ سے مل جا ۔ بیسیوں کٹنیوں اور دلّالوں کو بیچ میں ڈالا ۔ مگر اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ پھر اُٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں ۔ سب بے کار ۔ اور جوں جوں مجھ میں ناکامی کا احساس بڑھتا توں ، توں میرا جنون اور بڑھتا ۔ حتیٰ کہ یہ حالت ہو گئی ۔ کہ مجھے وہ عیش و عشرت کھٹکنے لگا جس کا میں عادی تھا ۔"

"ان دنوں اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی عین اس کے گھر کے سامنے ایک مکان جو خالی ہوا تو میں نے جھٹ اُسے سرے سے خرید ہی لیا ۔ اور اس مکان کو اپنی بیٹھک بنا لیا کہ دیکھو شاید داؤ چل ہی جائے ۔ لیکن میری کوئی پیش نہ گئی ۔ وہ لڑکی نہ جانے کیا نام تھا اس کا ۔ عجیب سا نام تھا ۔ لیکن ہم چاریاری میں اُسے شہزادی کہا کرتے تھے ۔ وہ بالکل قابو میں نہ آئی ۔

"اسی محلّے میں ہمارے ساتھ والے مکان میں یہ عورت رہا کرتی تھی جس کی قبر پر میں آج یہاں آیا ہوں ۔

اس نے دو چار بار مجھے اپنی نوکرانی کے ہاتھ بلوا بھیجا عجیب عجیب بہانوں سے بلایا کرتی تھی ۔ پہلی مرتبہ نوکرانی نے کہا ۔ "ذرا ادھر آؤ تو ۔ بی بی بُلا رہی ہیں ان سے بات کر لیجئے ۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں ۔" دوسری بار تھوڑی سی برانڈی منگوا بھیجی ۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے پر اکسایا گیا ۔ لیکن اپنی طبیعت تو ان دنوں شہزادی پر مائل تھی ۔ اور سچ پوچھو تو بیاہی ہوئی عورت سے اپنے کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی طبیعت ہی ایسی ہے ۔

"پھر ایک روز جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے تو اس کی نوکرانی پرچی لے کر آگئی ۔ لکھا تھا ۔ "شہزادی سے ملنا ہو تو رات کے ایک بجے آؤ ۔" میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا مجھے یقین نہیں آتا تھا ۔ ڈر تھا کہ انتقام لینے کے لئے چال نہ چلی گئی ہو ۔ جس عورت کو آپ دھتکار دیں" ۔ وہ کھدر پوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔ "وہ انتقام لینے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے ۔ بہر صورت چاریاری میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں

آزمانا ضرور چاہئے ۔ تو بھائی صاحب ہم نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھاوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلا گیا ۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا ۔ وہ بے حد خوبصورت تھی شہزادی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی ۔ لیکن خوبصورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب سارا کھیل تو طبیعت کا ہے ۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کر کے آپ چلی گئی ۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام ۔ پھر ہم وہاں اکثر ملنے لگے ۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تقاضہ شروع کر دے گی ۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے اس کی نگاہوں اور انداز میں بلا کی آن تھی ۔ آن اور بے تعلقی ۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کیلئے ٹھہرتی تھی ، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی تم آ گئے تم جا رہے ۔ پھر کب آؤ گے ، وہ ہمیشہ مجھے تم کہا کرتی تھی ۔ عجیب عورت تھی وہ ۔ ہاں بھائی صاحب وہ آہ بھر کر بولا چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے ۔ لیکن پھر اپنی طبیعت اکتا گئی ۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے ۔" وہ ہنسا "اور پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا ۔"

"کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں مَیں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے مرا بھید فاش کر دیا ۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آ گئے اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں ۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے ، لڑکی کو اِدھر اُدھر بھی نہیں کر سکتا ۔ سارے محلّے دار اپنے دشمن تھے ۔ کرتا کیا عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوٹھا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی تم چلے جاؤ جی وہاں اُس کمرے میں ، مَیں سنبھال لوں گی ۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی ۔ ساری اور بنڈی اور نہ جانے کیا کیا ۔ حالانکہ وہ ساری نہیں باندھتی تھی ۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے ۔ پہچانی ہی نہیں جاتی ۔ غالباً وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی ۔

"اُف" اس نے آہ بھری بڑی دلیر عورت تھی وہ ۔ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ "کیا ہے" وہ بولی ۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں ۔ مَیں ان کی بیگم ہوں" ۔ اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا ۔ صاف ۔

"اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لئے میرے دل میں شدید جذبہ تھا ۔ میں نے اس سے کہا اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہوگیا تو ۔ بڑی دلیری کی ہے تم نے ۔ "تم میری فکر نہ کرو"، وہ بڑی آن سے بولی ۔ اپنی بات کرو تم ، اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا ۔ میرے دل میں اس کے لئے محبت کا ایک طوفان سا چل رہا تھا ۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا ، لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی ۔ میرا احسان اتار رہے ہو ۔ وہ بولی ، اونہوں ! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی ۔

"پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگاہ سنا کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہوگیا ۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری واحد محبوب تھی ۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی ۔ "تم ، تم میرا فکر نہ کرو ، جاؤ گھر جاؤ" ۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا ۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی ۔ پتلا دُبلا نوجوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجا رہا تھا ۔ اور اچکن پوش معمّر آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا ۔ اور ۔ اور آپ پتلا دُبلا نوجوان چونک کر بولا "آپ کیسے آئے ہیں ۔ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہوگیا ہے" ۔ وہ اچکن پوش اور کھدّر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا ۔

کھدّر پوش مسکرایا ۔ "میرا گرو" ۔ وہ بولا "میرا پیر سمجھ لو میرا سبھی کچھ ۔

وہ اس قبرستان میں دفن ہے ۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج میں بھی عام نوجوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں ، سیاہ بالوں ، متبسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوتا ۔ جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں ۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے ، جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدت سے مصروفِ کار ہے ۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کردے ، اسے زندگی سے بیگانہ بنادے ۔ اُف کتنا عظیم پردہ ہے ۔" وہ شانے ہلاتے ہوئے بولا ۔ ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں ۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے ۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی ، تو آج میری حسیات پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا ۔ میرے بھی پَر کٹے ہوتے تمہاری طرح" ۔

اچکن پوش معتر نے سر اٹھاکر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کردیا ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دُبلے پتلے نوجوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی ۔

"ہاں" کھدرپوش بولا ۔ "یقین کیجئے ، یہ سب اسی کی دین ہے اسی کی ۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی ، صرف ایک مرتبہ" ۔

"ملی تھی" اچکن پوش کی دونوں آنکھیں گویا باہر نکل آئیں ۔ مونچھوں والوں کے کھلے ہونٹوں پر تبسّم دوڑگیا ۔ دبلے پتلے نوجوان نے دفعتاً اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دئے ۔

کھدر پوش مسکرایا ۔ "ہاں" وہ بولا ۔ "میری گرُو بھی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت ۔ ایک رنگیں ترین بھنور ۔ ایک ایسی ناگن جس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا" ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ کمرے پر گہری خاموشی چھاگئی ۔ باہر درختوں میں گویا بھوتنیاں ناچ رہی تھیں ۔ دور جاتی ندی سر ٹپک ٹپک کر رو رہی تھی ۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں ۔ اور چولھے پر رکھی

ہوئی چائے کی کیتلی ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی ۔

"میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں"، کھدر پوش بولا ۔ "ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے ۔ سمجھ لو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ۔ بچپنے سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور بہت اونچے نکل جایا کرتے تھے ۔ ہمارے گاؤں سے اوپر کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید زیادہ ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے ۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے ۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف ۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تالاب سا بن جاتا ہے اور پھر نہ جانے اس کا پانی کدھر کو بہ نکلتا ہے گویا نیچے ہی نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتے تھے ۔ پھر موسمِ سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا ۔ عجیب" ۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا لیکن موسمِ سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا ۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو ۔ اور ہی جہان ہو ۔

"جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسمِ سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں ۔ اکیلے نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی ۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں ۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی ۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں ۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ بات بڑی مشکل تھی ۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا ۔ تو قصہ مختصر میں اکثر شہر جانے لگا ۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے اور ان کے ساتھ وہ بیر بہوٹیاں ہوتی تھیں ۔ جن کے

ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خبط تھا ۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلالوں سے راہ و رسم بڑھائی ، لیکن میری بات سن کر وہ ہنس دیتے ۔ "جی ایک دو دن کی بات کرو ۔ اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں میں اور پھر جناب اتنی دُور غار میں جانے کو کون تیار ہو گی" ۔

"پھر ایک دن جب میں شہر ہی میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی تو ایک دلالہ بھاگی بھاگی آئی ۔ "کام بن گیا" وہ بولی ، "لیکن پیسہ بہت خرچ ہوگا ، نہ جانے کون ہے وہ ، یہاں اکیلی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے ۔ برف دیکھنے آئی ہے ۔ ساتھ نوکرانی ہے ۔ کوئی ایسی ویسی نہیں ۔ بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے ۔ مگر اس کی نوکرانی کی جھولی بھر دو تو وہ کہتی ہے کہ میں منالوں گی اُسے ۔"

"اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا ۔ روپے کی تو مجھے پروا ہی نہیں تھی ۔ میں نے کہا غار میں جائے گی ، ہاں وہ بولی اس کی نوکرانی کہتی ہے میں لے چلوں گی ۔ پر یہی دو تین دن کے لئے زیادہ نہیں تو خیر صاحب بات پکی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے ۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ اس کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں ۔ اسکی آنکھیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں ۔ اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھیگے ہوئے تھے ۔ جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ۔ جیسے وہ زمین سے نہیں آکاش سے اتری ہوئی ہو"۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ پتلا دُبلا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا ۔ اچکن پوش کی آنکھیں ابلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی ڈاڑھی اُگ آئی ہو ۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اُٹھانے آیا تھا ۔ چُپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا ۔ جیسے کھو گیا ہو ۔

"تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے ۔ تین دن" ۔ کھدرپوش نے بات شروع کی ۔ "وہ غار نہیں رہا تھا ۔ اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا ۔ وہ عورت نہیں تھی ۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کار نہیں تھا ۔ وہ

مجھ سے بہت قریب ۔ بہت قریب ۔۔۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی دُور ۔۔ بہت دُور ۔ مَیں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا ۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چُھو رہے تھے ۔ لیکن وہ گوشت پوست کی پنڈلیاں نہیں تھیں ۔ وہ نور کی بنی ہوئی تھیں ، اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا چاروں طرف اور پھر نیچے سے اُوپر تک چوٹیوں سے اُوپر ۔ بادلوں سے اُوپر ۔ نیلے بادلوں سے اُوپر ۔ نیلے آسمان سے اُوپر" ۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہوگیا ۔ پھر بولا ۔ "ان تین دنوں میں میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حِصّے پر سجدے کئے ۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں ۔ اسکے روبرو بیٹھ کر بھجن گائے ۔ سب کچھ کیا ۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا ۔ ہمارے جسم گویا فنا ہو چکے تھے ۔ ہماری آرزوئیں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا ڈھل چکی تھیں ۔ اس لطیف فضا میں محبّت اور تحیّر کے سوا کچھ نہ تھا ۔ بے غرض محبّت ۔ بے نام تحیّر ۔ لیکن آپ نہیں جانتے ۔ آپ نہیں سمجھ سکتے ۔" وہ بولا ۔ "آپ کبھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہونگے ۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے ۔ کیسے جان سکتے ہیں آپ" ایک ساعت کیلئے وہ خاموش ہوگیا ۔

"تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھگھی بندھ گئی ۔ مَیں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا ۔ میں ہمیشہ کے لئے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا ۔ میں نے منّتیں کیں ۔ ہاتھ جوڑے ۔ سبھی جتن کئے ۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی ، بالکل خاموش جیسے گونگی ہو ۔

"عمر بھر کے لئے ہونا منظور نہیں" میں نے کہا "تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار ایک مہینہ ۔ ایک ہفتہ ۔ ایک دن" ۔

"آخر میری مسلسل منّتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ایک بار پھر ملنے کا عدہ کر لیا ۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کرلی ۔ اور پھر وہ چلی گئی ۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال مَیں نے کیسے گزارا ۔ یوں سمجھ لیجئیے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لئے

فیصلہ کا دن ہوتا ہے میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی ۔ ضرور آئے گی اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا چاہے وہ ایک دن کے لئے آئے یا ایک ہفتہ کے لئے میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا ۔ اور ہم موسمِ سرما وہیں گزاریں گے ۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے ہی سے پہنچا دی تھیں اور بالآخر وہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا"۔

مونچھوں والے نے ڈھیلے ہونٹوں سے کہا "پھر ؟"

"لیکن وہ نہ آئی" ۔ وہ بولا "نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور مَیں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لئے اِس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں ۔ پہلے دو تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسمے کے سامنے کتے کی طرح پڑا روتا رہا ۔ پھر جب وہ دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ وہ وہیں کھڑی تھی ۔ جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہؤا کرتی تھی ۔ اس کی بھویں اٹھی ہوئی تھیں ۔ اس کی آنکھیں باہر اُوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ یوں مسکرا رہی تھی ۔ جیسے مجھے بھی باہر اُوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو ۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا ۔ لیکن آپ" ۔ وہ بولا ۔ "آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لاسکتے ۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں گئے کبھی"۔

"دس ہزار فٹ کی بلندی سے اُوپر اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا ۔ "فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دُودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے ۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دُودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے ۔ اس دُودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں ۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہو ۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کی پیٹھ سے اتر گیا ہو ۔ اس کی آرزوؤں میں شدّت کی وہ دھار نہیں رہتی ، اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کے بغض ، دشمنیاں ، نفرتیں سب یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں ، جیسے مشین سے دَبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر

صاف کر دیا گیا ہو ۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے ۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا ۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا ۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا ۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں ۔ حتّٰی کہ اس وقت محبوبہ کے لئے برہا کا راگ بھی گایا نہیں جاسکتا ۔ صرف حمد و ثنا صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے ۔ اس دُودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اپنی انا اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرّے ذرّے پر بکھر جاتی ہے ۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف ، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور ۔ اور وہ سکوت ۔ گہرا بے اتھاہ سکوت" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا چھا گیا ۔

"تین مہینے کی اِس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی انا سے نکال کر ساری کائنات پر مسلّط کر دیا" ۔ اس نے سلسلۂ کلام از سرِنو جاری کیا ۔ "اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا ۔ اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کایا پلٹ گئی ۔ پھر جب میں نیچے اترا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا ۔ اس کا جنون ۔ مَیں نے جگہ جگہ خاک چھانی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں ۔ لیکن بے سُود ۔ وہ نہ ملی ۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا ۔"

"پھر جب موسمِ سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہوگئی ۔ وہ نورانی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا ۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا ۔ وہی نور کی چادر ۔ وہی اطمینان وہی گہری خاموشی ۔ یہ وحشت اِس حد تک میرے سر پر سوار ہوگئی کہ میں پھر موسمِ سرما کاٹنے وہیں جا پہنچا ۔ اور اب میں ہر سال موسمِ سرما وہیں گزارتا ہوں" ۔

"اور وہ وہ" پتلا دُبلا نوجوان چلّایا ۔ "وہ پھر نہ ملی" ۔

"وہ" کھدّر پوش ہنسنے لگا "اس نورانی سویرے نے مجھے نکھار نکھار کر بذاتِ خود دیوتا بنا دیا اور دیوی کے نقوش میرے دل سے دھو ڈالے ۔ اور چھ سال میں مَیں نے اس راز کو پالیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے ۔

ایک پردہ ہے ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے ۔ مَیں نے شدّت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے ۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں ۔ میری طرف دیکھئے" وہ چلّایا ۔ "سردی ہو یا گرمی میں صرف اس کھدّر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقین جانو میرے بدن میں اس قدر قوّتِ دفاع پیدا ہو چکی ہے کہ میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذّت محسوس ہوتی ہے ، ایسی لذّت جو عورت کے رنگین قرب سے بھی میتسر نہیں ہو سکتی ۔"

"لیکن وہ ۔۔" پتلے دُبلے نوجوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی ۔

وہ مسکرایا ۔ "جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً وہ مجھے مل گئی ۔ اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی" ۔

"مل گئی !" مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا ۔ "واقعی"۔

"ہاں" ۔ وہ بولا ۔ "اس نے مجھے پہچان لیا ۔ میں نے ہنس کر کہا دیوی تم پھر نہ آئیں ۔ اس نے جھرجھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے ۔ میں نے ازراہِ شرارت کہا کہ پھر پُجاری ہی کو بُلا لیا ہوتا ۔ وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی ۔ اِس مندر کا پجاری کسی کے بلائے سے نہیں آتا ۔ میں خود ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہوں ۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اجالا چمک رہا تھا" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا ۔ "ہاں وہ میری گُرو تھی ۔ میرا پیر تھی ۔ میرا سبھی کچھ تھی ۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا ۔ لیکن" اس نے مسکرا کر کہا ۔ "اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی ۔ اب وہ پردہ نہیں رہا ۔ پردے سے نکل چکی ہے ۔ وہ یقیناً ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہے ۔ ابھی تک" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔

دفعتاً ہوٹل کا لڑکا چلّایا ۔ "بابوجی بادل چھٹ گئے ہیں ۔ اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں" ۔

اور اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "اور صاحب آپ کا کون عزیز فوت ہوا ہے ۔۔" اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں ۔

وہ گھبرا گیا ۔ پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا ۔ "میں تو کسی عورت کے لئے یہاں نہیں آیا میں تو تقریباً ہر روز ہی آتا ہوں یہاں ۔ جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے روز فاتحہ کے لئے آتا ہوں" ۔

"بیوی" پتلے دُبلے نوجوان نے دہرایا۔

"اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو" ۔ وہ بولا ۔ "حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی ۔ لیکن سبحان اللہ ، وہ گویا صرف میری خدمت کرنے کے لئے جیتی تھی" ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ "جنّتی روح تھی جنّتی" بھرّائی ہوئی آواز میں اس نے کہا اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے ۔

بادل واقعی چھٹ گئے تھے ۔ سورج مغرب میں تانبے کے تھال کی طرح ٹنگا ہوا تھا ۔ اس کی سنہری شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں ۔

"وقت بہت کم ہے" کھدر پوش بولا ۔ "شہر کے لئے یہ آخری بس ہے" ۔

پتلے دُبلے نوجوان نے کہا ۔ "لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہیئے کم از کم" ۔

"ہاں ۔ ہاں" مونچھ والا بولا ۔ اور وہ تینوں سفید قبر کی طرف لپکے ۔ اور جب تینوں نے بیک وقت ایک ہی تربت کے طاق کی طرف ہاتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے ۔

"ہائیں" وہ تینوں بہ یک وقت چلّائے اور انہوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی دی ۔ "میاں تم کدھر آنکلے ہو" ۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو" ۔

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے ۔ پتلے دُبلے اضطرابی نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔ لیکن کھدر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیرِ لب کہا "اونہوں' دوسروں کو ننگا نہ کرو ۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے ۔ اپنی عقل سے" ۔

"کتنا رنگین پردہ ہے"۔ مونچھوں والے نے آہ بھری ۔

"کتنی بڑی رکاوٹ ہے" ۔ کھدرپوش نے کہا ۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا ۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے ۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نُور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں ۔ جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف دودھیا سویرا پھیلا تھا ۔

..........○..........

سکارلٹ روڈ

عالیہ کے صرف دو مشاغل تھے ۔ وہ ہنستی تھی اور وہ روتی تھی ۔ معصومیت اور حسن کے علاوہ اسکی شخصیت کے یہ دونوں ہی پہلو بے حد جاذب تھے ۔ وہ بظاہر بے وجہ ہنستی تھی اور پھر دفعتاً بظاہر بے وجہ بیٹھ کر رونے لگتی ۔ اس وقت اسکی آنکھیں گہری جھیلیں بن جاتیں گویا دو سوتے بہہ نکلتے ۔ ناک اور بھی ستواں ہو جاتی اور ہونٹ یوں متکلم ہو جاتے جیسے کتھا کلی کی کسی فنکار کے ہاتھ ہوں ۔ جن کی مدد سے وہ غم کا فسانہ کہہ رہی ہو ۔ جب وہ روتی تو گرد و پیش کی ہر چیز بھیگ جاتی ۔ پھر دفعتاً بادل چھٹ جاتے اور سورج نکل آتا اور عالیہ یوں ہنسنے لگتی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو ۔ اسکا ہنسنا اور رونا پہاڑ کے موسم کی طرح تھے جہاں دفعتاً بادل یوں برسنا شروع کر دیتے ہیں جیسے کبھی دھوپ نکلے گی ہی نہیں اور پھر دفعتاً یوں چھٹ جاتے ہیں جیسے کبھی برسے ہی نہ ہوں ، لیکن چاہے وہ ہنستی ہو یا روتی ہو ۔ ہر صورت میں وہ پیاری لگتی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہنستے ہوئے وہ زیادہ پیاری لگتی تھی یا روتے ہوئے ۔

بوٹا سا قد ۔ موزوں اور ستواں ناک نقشہ ۔ کتابی چہرہ اسکی یہ خصوصیات معصومیت کے نیلے آسمان پر تاروں کی طرح چمکتی تھیں ۔ مگر اسکے باوجود معصومیت کی نیلاہٹ چھائے رہتی ۔ وہ خلوص سے بلا وجہ ہنستی اور خلوص سے بلا وجہ روتی تھی ۔

اس زمانے میں عالیہ عنفوانِ شباب میں تھی ۔ ابھی بیداری کی پہلی کرن تک نہیں پھوٹی تھی اور نہ ہی اسکی زندگی کا کوئی مقصد متعین ہوا تھا ۔ ابھی اسکی زندگی بلا وجہ حسین تھی ۔ سحر اس لئے سہانی تھی کہ وہ سحر تھی ۔ شام اس لئے خوبصورت تھی کہ وہ شام تھی ۔ شہر اسلئے پیارا تھا کہ وہ بسا ہوا تھا ۔ ویرانہ

اسلئے دلکش تھا کہ وہ پھیلا ہوا تھا اور سہیلیاں ۔۔۔ سہیلیاں تو عنفوانِ شباب میں عزیز ہوتی ہی ہیں ۔ عالیہ کی بھی سہیلیاں تھیں مثلاً فرحت تھی جوجی تھی اور پھر وہ اسمارہ تھی وہ فرحت ہی تھی نا جو اس روز اسے سیسل ہوٹل میں لے جانے کی ذمہ دار تھی ۔

عمر میں تو فرحت عالیہ کے برابر تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ پہلے ہی بیدار ہوگئی تھی ۔ یا شاید کر دی گئی ہو ۔ لیکن گویا اس نے بیدار ہونے کے بعد پھر سے آنکھیں موند لیں تھیں جیسے کچھ معلوم ہی نہ ہو ۔ مگر اسکا راز اسکی آنکھوں کے کونوں سے جھانکتا تھا ۔

اس روز کاف روڈ پر سیسل ہوٹل کے قریب ٹہلتے ہوئے دفعتاً وہ بولی ۔ "ہائے عالی سنا ہے یہاں ایک بڑا مشہور جوتشی ٹھہرا ہوا ہے ۔ سنا ہے بڑے پتے کی باتیں بتاتا ہے" ۔ یہ بات اس نے یوں بر سبیلِ تذکرہ کہی ۔ جیسے وہ جان بوجھ کر سیسل ہوٹل کی طرف آئی ہی نہ ہو ۔

عالیہ اسکی بات سنکر چونک کر بولی ۔ "پر اس سے پوچھیں گے کیا"۔
"لو" ۔ فرحت بولی ۔ "وہاں کیا پوچھنا پڑتا ہے وہ تو آپ ہی آپ بتاتا ہے سب کچھ" ۔
"سچ" عالیہ کا شوق ابھر آیا ۔ "کیا بتاتا ہے ۔"
"مجھے کیا معلوم "فرحت بولی جیسے اسے واقعی معلوم نہ ہو "ہئے چلو تو" ۔ وہ بولی "میرے پاس دس کا نوٹ ہے ۔ چلو نا ۔"

ڈی ۔ میرا حقیقت میں جیجووال کا مہردین تھا جسے گاؤں کے لوگ مہرا کہہ کر بلایا کرتے تھے ۔ وہ ان ہونہار بچوں میں سے تھا جو کمیٹی کی لالٹینوں تلے پڑھ کر وظیفے حاصل کر لیتے ہیں ۔ مہرے نے بھی وظیفہ حاصل کیا تھا اور اکمل پور کے سکول میں نویں جماعت تک تعلیم پائی تھی ۔ پھر اسکا باپ فوت ہوگیا اور اسے مجبوراً پنڈت وشواناتھ کے ہاں نوکری کرنا پڑی ۔ پنڈت جی مشہور نجومی تھے ۔ چوری چوری انکی کتابیں پڑھ پڑھ کر ۔ زائچے دیکھ دیکھ کر اور باتیں سن سن کر مہرے نے علمِ نجوم میں کچھ دسترس حاصل کر لی تھی اور پھر تقسیم کے

بعد بمبئی سے آکر وہ مہر دین سے ڈی ۔ میرا بن گیا ۔ اس نے سیسل ہوٹل میں دو کمرے کرایہ پر لے لئے اور نجوم کی پریکٹس شروع کر دی ۔

ممکن ہے کہ ڈی ۔ میرا کے علم کو ستاروں سے بھی تعلق ہو لیکن بسا اوقات وہ لوگوں کی قسمت کا حال انہیں کی پیشانی آنکھوں اور پلکوں سے بھانپ لیا کرتا تھا ۔ اسکے پاس زیادہ تر عورتیں آتی تھیں کبھی کبھار کالج کے لڑکے بھی آتے محض تفریح کیلئے انہیں تو مستقبل کی نسبت حال سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ لیکن عورتیں وہ تو حال سے بیگانہ رہتی ہیں اور زمانہ حال میں بھی مستقبل کے خوابوں کے سہارے جیتی ہیں ۔ لڑکیاں ڈی ۔ میرا کے پاس یوں اثر سے بھیگی ہوئی پہنچتیں جیسے اک ذرا چھیڑنے کی کسر باقی ہو ۔ انکی پلکیں خوابوں کے بوجھ سے جھکی ہوتیں جن کے تلے سیاہ پیالے چھلکے جاتے ۔ ڈی ۔ میرا انکی چھلکی ہوئی آنکھوں کے رنگ سے انکے زائچے کے نقوش تیار کیا کرتا اُن سے باتیں کیا کرتا اُن سے باتیں کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا تھا ۔ اسکے ہاتھوں میں وہ کمہار کے چکر کی مٹی کی طرح ہوتی تھیں ۔ البتہ مٹیار عورتوں کے روبرو وہ مشکل میں پڑ جاتا ۔ کیونکہ اثر سے بھیگے ہونے کی بجائے انکی آنکھیں اثر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی تھیں ۔

بہر صورت ممکن ہے کہ ڈی ۔ میرا کے علم کو ستاورں سے بھی تعلق ہو ۔ لیکن اسے یہ قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ نجومی کی زبان سے نکلی ہوئی بات نوجوان لڑکیوں پر کس حد تک اثر رکھ سکتی ہے ۔ ورنہ عالیہ کا مستقبل بتاتے ہوئے وہ اسمیں وہ ڈرامائی تفصیل ٹانکنے سے گریز کرتا ۔

ڈی میرا نے اپنا معمل ملاقاتی کمرے سے الگ بنا رکھا تھا تاکہ کسی کے مستقبل کی بات مشتہر نہ ہو ۔ اصولی طور پر وہ معمل میں صرف متعلقہ فرد کو بلاتا تھا ۔ فرحت کو اس تفصیل کا علم تھا ۔ ورنہ شاید وہ عالی کو ساتھ لیکر نہ جاتی ۔

معمل میں ڈی ۔ میرا کے دو ایک رسمی سوالات کے جواب دینے کے بعد جب ڈی ۔ میرا کاغذ کے ٹکڑے پر آڑے ترچھے خطوط کھینچنے میں مشغول تھا ۔۔ عالی خالی الذہن بیٹھی کمرے کے عجیب و غریب سامان کی طرف غور

سے دیکھ رہی تھی ۔ اسکا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ جلد وہاں سے مخلصی پا کر بھاگ جائے ۔ دفعتاً ڈی میرا نے سر اٹھایا ۔ "آپ کیا جاننا چاہتی ہیں" ۔ وہ بولا ۔ "میں ۔ میں" وہ گھبرا گئی ۔ "میں تو یعنی ۔۔۔" ڈی میرا کے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم کھیلنے لگا ۔ "میرا مطلب ہے" وہ بولا ۔ "کوئی ایسی بات جسکے بارے میں آپ جاننا چاہتی ہوں ۔"

"خاص بات" عالی نے دہرایا ۔ "کون سی خاص بات"

وہ ہنس پڑا ۔ خیر اس نے ضبط کر کے پھر کاروباری لہجہ اختیار کر لیا ۔

"آپ کی شادی کا آپ کی مرضی کے مطابق ہونا حساب میں پایا جاتا ہے" وہ زائچے کی طرف دیکھ کر بولا ۔

عالی کا چہرہ گلابی ہو گیا ۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں ۔

"حساب کے مطابق آپ اسکی پہلی محبت ہونگی" ۔ میرا نے کہا "وہ قبول صورت ہو گا ۔ حساب کے مطابق اسکی شکل ایسی ہو گی ۔ جیسے عورتیں پسند کرتی ہیں ۔ مثلاً جیسے فوجی افسر ہوتے ہیں ۔

عالی کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں ۔ آنکھیں ان جانے خمار سے لبریز محسوس ہو رہی تھیں ۔ گرد و پیش دھندلائے جا رہے تھے ۔

"لیکن" میرا نے کہا "اگر میرا وچار غلط نہیں تو وہ صرف آپ کا ہو کر جئے گا صرف آپ کا کیونکہ آپ کا ستارہ بہت روشن ہے ۔ محبت میں آپ کا بہت خوش قسمت ہونا حساب میں پایا جاتا ہے" ۔ عالیہ نے محسوس کیا گویا ایک ہوائی سی اسکے بدن میں چھوٹ گئی ہو پھر اسے معلوم نہیں ۔ نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا ۔ ستاروں کے برجوں میں داخل ہونے اور نکلنے کی بات ۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی کی تاریخوں کے متعلق تفصیلات ۔ سفر کی بات ۔ احتیاطوں کی بات ۔ دولت کی بات ۔ پھر دفعتاً وہ خاموش ہو گیا ۔

وہ چونک پڑی ۔ وہ خلا جس میں وہ کھوئی ہوئی تھی ۔ سمٹ کر ناپید ہو گیا تھا ۔ کمرے کی چیزیں اس سنہرے دھندلکے سے نکل کر پھر سے تناسب میں آ چکی تھیں ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ "ایک بات ہے" ۔ ڈی ۔ میرا نے ہچکچاہٹ بھرے انداز سے کہا ۔ وہ رک گئی ۔ اسکی ہچکچاہٹ کی وجہ سے گویا وہ بالکل بیدار ہو

گئی ۔

"میرا مطلب ہے" وہ ایک ساعت کے لئے گھبرایا لیکن پھر کاروباری انداز سے بولا ۔ "اگر آپ کا ستارہ زحل برج میں پھنس گیا جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے تو شادی کے دو سال کے اندر اندر دونوں کا علیحدہ ہونا عمل میں آسکتا ہے ۔ میرا مطلب ہے اسکی بے وفائی کی وجہ سے نہیں" ۔ میرا نے گویا اسے تسلی دینے کے لئے کہا ۔ "ممکن ہے کہ کوئی حادثہ ہو یا زندگی وفا نہ کرے ۔ یا پھر سینکڑوں باتیں ہو سکتی ہیں" ۔

گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے عالیہ اور فرحت دونوں خاموش تھیں ۔ اگرچہ دونوں کی خاموشی کی نوعیت ایک ہی تھی لیکن دونوں کے خیالات یکسر مختلف تھے ۔ عالی کی نگاہوں کے سامنے فوجی وردی میں ملبوس ایک اونچا لمبا حسین نوجوان کھڑا تھا ۔ وہ اسکی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ پھر دفعتاً ایک شور ۔۔۔ کے درمیان وہ گرا پڑا تھا ۔ چاروں طرف لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا اور پھر خون ۔ سرخ خون کی دھاریاں ۔۔۔

کیپٹن نین کی شخصیت کی دلکشی زیادہ تر اسکی مسکراتی آنکھوں میں مضمر تھی ۔ اسکی مسکراہٹ میں بلا کی کشش تھی لیکن ساتھ ہی اسمیں اجتناب کی جھلک بھی تھی ۔ وہ دوسرے کو اپنی جانب کھینچے جاتا اور خود گویا ایک بے نیازی سے پیچھے ہٹ جاتا ۔ اسکا قد اونچا لمبا تھا لیکن پیشانی پر خلوص کا ایسا ہار سا بنا ہوا تھا کہ آپ محسوس کرتے تھے جیسے وہ آپ کے بے حد قریب ہو ۔ آپکے برابر کا ساتھی ہو جیسے اسکا اونچا لمبا قد درمیان میں حائل نہ ہو ۔

وہ پیدائشی طور پر سپاہی تھا ۔ بچپن ہی سے اُسے سپاہیوں کی طرح مارچ کرنے اور سلیوٹ مارنے کا شوق تھا ۔ دسویں جماعت میں "تھری مسکیٹرز" کا مطالعہ کرنے کے بعد اسکے ذہن پر ڈارٹگنین" کا کردار اس قدر چھا گیا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو "ڈارٹگنین" سمجھنے لگا تھا ۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسکے پیش نظر کوئی ایسی حسینہ نہ تھی جسے اسے بدمعاشوں کی حراست سے بچانا ہوتا ۔ گھر والے اسے "نین" کہہ کر پکارتے تھے ۔ "ذوالقرنین" اتنا لمبا نام کون لے ۔

اس سے اسے اپنے آپ کو "ڈارٹگنین" سمجھنے میں اور بھی آسانی ہو گئی تھی ۔ پھر اسکے دو بڑے بھائی تھے مضبوط اور قوی ہیکل قسم کے جوان ۔ لہذا وہ ایتھاس پور تھاس تھے اور اسے ان سے بے حد محبت اور عقیدت تھی اور وہ ہر وقت انکے احکامات کا منتظر رہتا تھا ۔

فوج میں کمیشن ملنے کے بعد اسکی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسے توپ خانے میں متعین کیا جائے ۔ صرف اس لئے کہ توپ خانے کے افسروں کی وردی نہایت خوبصورت ہوتی ہے ۔

شام کے وقت لان میں بیٹھے ہوئے عالی کے والد نے بلند قہقہہ لگایا ۔ اگرچہ وہ قہقہہ کچھ زیادہ ہی بلند تھا پھر بھی ملحقہ گراؤنڈ میں عالی اور فرحت انکی طرف متوجہ ہوئے بغیر بیڈمنٹن کھیلنے میں مصروف رہیں ۔ کیونکہ عالی کے والد ۔ والد ہونے کے باوجود بے تحاشہ قہقہے لگانے ۔ کھلی کھلی باتیں کرنے ۔ تیوری چڑھائے بغیر گھر میں داخل ہونے اور یہاں تک کہ بچوں کا ساتھی بن کر ان کے ساتھ کھیلنے کے عادی تھے ۔ انکی نفسیئت مستند باپ سے قطعاً مختلف تھی ۔ "ارے" وہ بچوں کی طرح تالی بجا کر چلائے ۔ "بھئی حد ہو گئی ۔ بیگم ذرا سنئے انکی بات ۔ بیگم ۔ بیگم" وہ چلانے لگے ۔ وہ ہر بات پر بیگم کو بلانے کے عادی تھے ۔ بیگم کو بات بتائے بغیر انکی بات نہ بنتی تھی ۔

"سنئے بیگم کیپٹن کیا کہہ رہے ہیں ۔ ہاہاہا" ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسے ۔ "کہتے ہیں شادی نہیں کرینگے ۔ کبھی نہیں ۔ کیونکہ پامسٹ نے انکا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے کہ شادی کے بعد دو سال کے اندر ایکسی ڈنٹ ہو گا ۔ جان کا خطرہ ہے ۔ ہاہاہا کہتے ہیں نہ شادی کروائیں گے نہ ایکسیڈنٹ ہو گا ۔ لہٰذا خطرے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا"

"شادی کے بعد دو سال کے اندر اندر ایکسی ڈنٹ ہو گا" ۔ عالی نے مڑ کر دیکھا ۔ فوجی وردی میں ملبوس لمبا کپتان مسکرا رہا تھا ۔ ایک ہوائی سی چھوٹ گئی ۔ گردوپیش پر دھندلکا سا چھا گیا ۔ اس دھندلکے میں اونچے لمبے قد پر ایک مسکراہٹ روشن تھی اور گہری شربتی آنکھیں تمام دنیا کو جذب کیے جا رہی تھیں ۔

عالیہ بھاگی ۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور پُھوٹ کر رونے لگی ۔

گھر والے حیران تھے ۔ عالی کو کیا ہوا ۔ اگرچہ پہلے بھی وہ رویا کرتی تھی لیکن اس دن کے بعد تو وہ کئی کئی بار رونے لگی اور وہ رونا بھی کس قدر شدت کا حامل تھا ۔ ماں نے کئی بار پوچھا ۔ ابا نے پوچھا ۔ بار بار پوچھا ۔ بات کیا ہے ۔ مگر اسے تو خود بھی معلوم نہ تھا کہ بات ہے کیا ۔ بیٹھے بیٹھے اسکے سامنے اونچے لمبے قد پر ایک مسکراہٹ روشن ہو جاتی اور کوئی چپکے سے اس سے کہتا شادی کے دو سال بعد ۔ اسکا دل بھر آتا اور خوامخواہ آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے ۔ اب وہ کیا بتاتی انہیں ۔ پھر دفعتاً وہ سیلاب تھم جاتا ۔ دھلی دھلائی آنکھیں کٹورہ سی کھل جاتیں اور وہ مسکرا کر اُٹھ بیٹھتی اور پھر ہنسنے لگتی ۔ ہنسے چلی جاتی جیسے کوئی انمول خزانہ مل گیا ہو ۔

کیپٹن نین پہلے بھی کبھی کبھار انکے ہاں آیا کرتا تھا لیکن عالی نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی تھی ۔ شاید اس لئے کہ وہ اسقدر خوبصورت اور اسقدر اونچا لمبا تھا کہ اسکی اُمید دل میں رچاتے ہوئے ڈر لگتا تھا ۔ اسکی وجہ کچھ بھی ہو عالی کے لئے تو وہ ابا کے ایک دوست تھے اور اس روز اگر وہ ڈی ۔ میرا سے نہ ملی ہوتی یا اسکے بابا پامسٹ کی پیشنگوئی کا ذکر نہ کرتے تو شاید وہ ہمیشہ کے لئے ابا کے دوست ہی رہتے ۔ لیکن اب تو بات ہی اور تھی ۔ اب وہ سمجھتی تھی کہ کیپٹن نین صرف اسکے لئے وہاں آتے تھے ۔ اسکے لئے مسکراتے تھے صرف اسکے لئے جیتے تھے ۔ جینے کا خیال آتے ہی دفعتاً اسکے دل کو ٹھیس لگتی اور نہ جانے کہاں سے ایک طوفان اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے کمرے کی طرف بھاگتی ۔

اسکے باوجود جب بھی کیپٹن نین وہاں آتے تو اسمیں آنکھ اٹھا کر انہیں دیکھنے تک کی ہمت نہ پڑتی ۔ الٹا ایک بے نام اثر کے تحت وہ خود مسحور سی ہو کر رہ جاتی تھی ۔ جیسے کسی پنچھی کے پر بھیگ گئے ہوں ۔

فطرتاً عالیہ اثر ڈالنے والی لڑکی نہ تھی ۔ الٹا وہ تو اثر قبول کرنے والی تھی اس لئے اس نے کبھی بڑھ کر کیپٹن نین سے آنکھیں ملا کر اسے ٹٹولنے کی کوشش نہ کی

تھی ۔ یہ بات نین کے لئے انوکھی سی تھی ۔ کیونکہ ہر عورت اسکے ساتھ آنکھیں لڑانے کی مشتاق تھی ۔ ہر عورت اسے جانچنے کی کوشش کرتی تھی ۔ اسپر اثر ڈالنے کی سعی کرتی تھی ۔ اسے وہ رنگین تتلیاں بے حد پسند تھیں ۔ جو اسکے سامنے اپنے پر پھڑپھڑایا کرتی تھیں ۔ اپنی رنگینی اور اڑان کا مظاہرہ کرتی تھیں ۔ لیکن وہ اسے صرف پسند تھیں ۔ وہ ان سے اثر قبول نہ کرتا تھا ۔ انہیں دیکھ کر اسکی مسکراہٹ اور رنگین ہو جاتی اور آنکھوں کی شربتی جاذبیت اور گاڑھی ہو جاتی لیکن ساتھ ہی اجتناب کی وہ جھلک بھی نمایاں ہو جاتی تھی ۔ اثر ڈالنے کی بجائے اسے اثر سے بھیگنے والی لڑکیاں زیادہ محبوب تھیں ۔ شاید اس لئے کہ نین مغربی ساخت کا ایسا ساغر تھا جس میں مشرقی شراب بھری ہوئی تھی ۔

عالیہ کے اثر سے بھیگ جانے کی وجہ سے نین کو اسکے وجود کا احساس ہونے لگا اور جلد ہی یہ احساس اسقدر شدت اختیار کر گیا کہ اسکا تبسم مخصوص اور اسکی نگاہیں متلاشی ہو کر رہ گئیں ۔ اسکی آنکھیں اس خواہش کو جذب نہ کر سکیں اور چھلک پڑیں ۔ پھر نین اسے تلاش کرنے میں سرگرداں ہو گیا اور روز بلا ناغہ عالی کے گھر آتا اور ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر اسکا انتظار کرنے کی بجائے براہ راست عالیہ کی جستجو میں گھر میں چاروں طرف گھومتا پھرتا ۔ پھر ایک روز بات اسکے ہونٹوں تک آگئی ۔ "عالی" بغیر کسی تمہید کے وہ بولا "مجھ سے شادی کرو گی ۔" عالیہ کا رنگ فق ہو گیا ۔ اس نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی ۔

ڈاکٹر نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہسٹریا ہے ۔

اگلے روز نین آیا تو وہ صوفے پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی ۔ دیر تک وہ اسکے پاس چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ پھر جب اس نے کہنے کے لئے منہ کھولا تو پہلی مرتبہ عالی نے بڑھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی "اونہوں ایسا نہ کہیئے"۔ وہ بولی "کیوں" وہ مسکرا دیا۔

"بس کہہ جو دیا" ۔ وہ آنکھیں جھپکا کر بولی ۔ اسکی جھکی جھکی آنکھیں خود اپنی بات جھٹلا رہی تھیں ۔

"اوہ" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر سنجیدگی سے بولا "عالی تمہارے ساتھ دو

سال کے ساتھ کے لئے میں بخوشی اپنی زندگی قربان کر سکتا ہوں" ۔

زندگی قربان کر سکتا ہوں ! زندگی قربان کر سکتا ہوں ! عالیہ کے جسم کے روئیں روئیں میں ایک لہر دوڑ گئی ۔ فضا پر ایک دھندلکا نشہ بن کر چھا گیا ۔ ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ کیف آور بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خوبرو جوان اس کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار ہو جائے ۔

شادی کے بعد وہ نشہ عالیہ کی روح کی گہرائیوں سے نکل کر جسم کے انگ انگ میں رچ گیا اور اسکے اعضا گویا کیفیت سے سرشار ہو گئے ۔ جب بھی وہ اکیلے میں بیٹھتے ۔ عالیہ دیوانہ وار نین کی طرف دیکھتی اور پھر اسکی آنکھیں بھر آتیں اور نین قہقہے مار کر اسکے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارنے لگتا ۔ "پھر وہی بات" ۔ وہ کہتا "فضول وہم" پھر دفعتاً وہ سنجیدہ ہو جاتا " تمہارے لیے میں کیا نہیں دے سکتا ۔ عالی زندگی تو ایک معمولی چیز ہے ۔ یہ جملہ سن کر عالیہ پر پھر وہی نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ وہی ریشمی دھندلکا چاروں طرف سے اسے لپیٹ لیتا اُسے اس دھندلکے سے خوف آتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت محسوس ہوتی ۔ چوری چوری اسکا دل چاہتا کہ اسکے کان نین کی زبان سے پھر وہی فقرا سنیں ۔ وہی دھندلکا اسے اپنی آغوش میں لے لے اور وہی نشیلی کیفیت اسکے انگ انگ سے چھلکے ۔

شادی کے بعد عالیہ کا ہنسنا اور رونا بھی شدت اختیار کر گئے ۔ سارا دن وہ دونوں بچوں کی طرح ہنستے لیکن ہنستے ہنستے دفعتاً عالیہ ٹکٹکی باندھ کر اسکی طرف دیکھنے لگتی پھر وہی بات وہی جذباتی تناؤ ۔ وہی گہری شدید لذت ۔

جلد ہی عالی کے لئے وہ جملہ ایسا ہی ضروری ہو گیا جیسا کہ سر درد کے مریض کیلئے اسپرین کی ٹکیا وہ نشیلی کیفیت پیدا کرنے کیلئے اسے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہ تھی آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی آنکھیں اور بس اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا ۔

لیکن ڈیڑھ سال کے بعد حالات نے یکایک پلٹا کھایا ۔ کیپٹن نین کو محاذ پر جانے کا حکم مل گیا ۔ عالیہ نے جو سنا تو سر پیٹ لیا ۔ اسے ہسٹریا کے

دورے پڑنے لگے ۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مریضہ سے ہمدردی جتانے سے احتراز کیا جائے ۔ اس لئے عالیہ اپنے کمرے میں پڑی روتی رہی اور نین تیاری میں مصروف رہا ۔

رخصت کے وقت عالیہ یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بھیڑ اپنے ریوڑ سے جدا ہو گئی ہو ۔ نین اسکی ڈھارس بندھانے کیلئے قہقہے لگا رہا تھا ۔ ''پھر وہی بات'' ۔ وہ چلّا رہا تھا ۔ ''فضول وہم پگلی تم سمجھتی ہو میں لوٹ کر نہیں آؤں گا ۔ ہاہاہا ! لو سن لو میں آؤں گا عالی ۔ ایسے نہیں بلکہ یہاں ستاروں کی جگہ سٹریپس لگی ہونگی ۔ ہاتھوں میں فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا گیت گاتا ہوا دیکھ لینا تم ۔ اور دو اکتوبر کو ہماری شادی ہوئے پورے دو سال ہو جائیں گے نا ۔ دو اکتوبر کو تمہیں میرا پیغام ملے گا ۔ تمہارا نین بالکل خیریت سے ہے ۔ ایسے''۔ اس نے اسے اکڑ کر سلیوٹ مارا اور پھر مارچ پاسٹ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا ۔

عالیہ حیران بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ۔ صبح سویرے سے دوپہر ہو گئی ۔ دوپہر سے شام ۔ حتی کہ چراغ روشن ہو گئے ۔ لیکن وہ جوں کی توں بیٹھی رہی ۔

نین کے جانے کے بعد عالیہ کی دنیا ویران ہو گئی ۔ وہ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہتی ۔ اسکے سامنے کرسی پر وہ آ بیٹھتا ۔ وہی روشن مسکراہٹ شریر نگاہیں ، عالی میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا۔ ہاہاہا اسکے جسم میں وہی رنگین جھرجھری پیدا ہوتی وہی تناؤ وہی دھندلکا اسے گھیر لیتا لیکن یہ کیفیت روز بروز اپنی شدت کھوئے جا رہی تھی ۔

پھر ایک روز عالی میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا ہاہاہا ۔ اس فقرے کو سن کر اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ اسکا تمسخر اڑا رہا ہو ۔ دفعتاً نین اٹھ بیٹھا ۔ میں لوٹ کر آؤں گا ۔ وہ بولا ۔ دو اکتوبر کو تمہیں میرا پیغام ملے گا تمہارا نین خیریت سے ہے خیریت سے ہاہاہا ۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا مارچ پاسٹ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ تنہا رہ گئی ۔ ویران اور تنہا ۔ خیریت سے ہے ۔ خیریت سے ۔ عالیہ پر اس جملے کا نیا مفہوم واضح ہونے لگا ۔ یکسر وہ

دھندلکا ختم ہوگیا ۔ مایوسی نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا ۔ مایوسی ویرانی تنہائی ۔

اس تنہائی اور ویرانی سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے وہ باہر نکل گئی اور لوگوں سے میل ملاپ میں تسکین ڈھونڈنے لگی ۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ زندگی کا دامن اسکے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے لیکن لوگوں سے میل ملاپ بھی اسے تسکین نہ دے سکا ۔ وہ مایوس ہو کر تھک گئی ۔

ایک رات جب عالم مایوسی میں وہ اکیلی ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھی تو دروازے پر دستک ہوئی ۔ "اِسوقت" اس نے سوچا ۔ "آ جائیے" ۔ وہ بولی اور ہارون اندر آگیا ۔

ہارون کیپٹن نین کا دوست تھا ۔ وہ ایک مالدار تاجر تھا اور سکارلٹ روڈ پر اسکی ایک شاندار کوٹھی تھی ۔ شادی کے بعد وہ چار ایک مرتبہ انکے ہاں آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں عالیہ اسے دیکھکر خوف محسوس کرتی تھی ۔ اسکی نگاہوں سے وحشت برستی تھی اور اسکا انداز بے حد بے باک تھا ۔

"آپ ۔۔۔" اس نے حیرانی سے ہارون کی طرف دیکھا ۔

"ہاں" وہ بولا "میں ہندوستان گیا ہوا تھا ۔ آج ہی لوٹا ہوں ۔ کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا ۔ صرف دو ماہ کیلئے ۔ لیکن پانچ ماہ رکا رہا ۔ مجبوری ۔۔۔" وہ بیٹھ گیا ۔

"وہ تو یہاں نہیں ۔ انہیں گئے ہوئے تو چار مہینے ہو گئے" ۔ عالیہ اسے بیٹھتے دیکھکر گھبرا گئی ۔

"مجھے معلوم ہے" وہ بولا ۔ "خیال تھا نین کے جانے سے پہلے اسے ملوں گا مجھے وہاں اسکے جانے کی خبر مل گئی تھی ۔ لیکن کاروباری مجبوری" ۔

"اوہ" عالیہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی ۔ چند منٹ وہ دونوں خاموش رہے ۔ عالیہ نے محسوس کیا ۔ جیسے وہ خاموشی ایک بوجھ ہو ۔ جس کے تلے اسکا دم گھٹ رہا ہو ۔ کیا وقت ہو گا" عالیہ کچھ کہنے کی غرض سے بولی ۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں" ۔ ہارون نے کہا "لیکن یہاں میں ایک خاص مقصد کیلئے آیا ہوں" ۔

"خاص مقصد کیلئے ۔۔۔" وہ گھبرا گئی ۔

"ہاں مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" ۔ وہ بولا۔

"کہیئے" ۔

"مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ تم کیا کروگی ۔۔ اب نہیں" وہ بولا ۔ دفعتاً اسکی بھونڈی آواز میں ایک خوفناک عنصر پیدا ہوگیا ۔ "میں نے بارہا تم سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ ناکام رہا" ۔

ہارون نے کہا ۔ "تم کیپٹن نین میں اسقدر کھوئی ہوئی تھیں کہ میرے واضح اشارے بھی تم نے نظر انداز کر دیئے" ۔ عالیہ کے جسم پر ایک عجیب سی کپکپی طاری ہوگئی ۔

"مجھے افسوس ہے" ۔ وہ بولا ۔" کہ جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تو تمہاری شادی ہو چکی تھی ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔۔۔" وہ خاموش رہا

عالیہ کی نگاہ دھندلا گئی وہ گھٹن اور بھی شدت اختیار کر گئی ۔ "افسوس ہے" وہ بولا "کہ نین میرا دوست ہے ورنہ ابتک وہ ۔۔۔۔" عالیہ کے منہ سے چیخ نکل گئی ۔

"میں تمہیں پانے کیلئے کیا نہیں کر سکتا عالی" ۔ ہارون بولا ۔ "قتل کر سکتا ہوں اور یاد رکھو ۔۔۔" وہ اٹھ بیٹھا "اگر میں تمہیں حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اپنی زندگی ختم کر دونگا ۔ میری طرف دیکھو عالیہ ۔ یہ دھمکی نہیں ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور ہارون آجتک قدم بڑھا کر پیچھے نہیں ہٹا" ۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی ۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ وہ ایک کھولتے ہوئے خونیں خلا میں ڈوبے جا رہی تھی ۔ ٹھک دروازہ بند ہوگیا ۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹا ۔ اسکے کپڑے شرابور ہو گئے ۔ وہ شب خوابی کے کمرے کی طرف بھاگی اور چارپائی پر گر پڑی ۔ لیکن سامنے کرسی پر وہ بیٹھا تھا ۔ وہی

خونخوار انداز اس نے آنکھیں ہٹا لیں ۔ "میری طرف دیکھو" وہ بولا ۔ "میں قتل بھی کر سکتا ہوں ۔ ورنہ اپنی زندگی ختم کر لونگا" ۔ پھر وہی فوارہ وہی لذت وہی تناؤ ۔۔ اور ہسٹریا کا دورہ ۔

اس روز کے بعد بیٹھے بٹھائے عالیہ کو خیال آتا توبہ کس قدر خونخوار آدمی ہے ۔ قتل کر دونگا ۔ "ہونہہ" ۔ غصے سے وہ بھوت بن جاتی اور پھر وہ غصہ گویا خون کے فوارے میں تبدیل ہو جاتا اور وہ شرابور ہو جاتی ۔ دو اور تین اکتوبر کے دن وہ بے حد مضطرب رہی ۔ وہ انتظار کرتی رہی ۔ ہر آہٹ پر وہ چونک پڑتی ۔ تار تو نہیں آیا ۔ وہ اپنی خادمہ سے پوچھتی ۔ "جا دیکھ تو ۔ جا" آخر چار تاریخ کو شام کے وقت نین کا تار موصول ہوا ۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے تار کھولا ۔ لکھا تھا ۔ میں خیریت سے ہوں ۔ نین ۔"

تار پڑھتے ہی اسپر مردنی سی چھا گئی ۔ اس نے بڑھ کر کرسی کا سہارا لیا ۔ اس کا سر چکرا رہا تھا ۔ دل ڈوب رہا تھا ۔ جیسے کسی حادثے کی خبر موصول ہوئی ہو ۔ پھر وہ لیٹ گئی اور تنہائی اور مایوسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ۔

اگلے روز اسکے خیالات ایک نئی رَو میں بہہ رہے تھے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو ۔ اگرچہ وہ خوشی محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسکی کوشش کا اثر متضاد تھا ۔ اس پر مایوسی چھائی جا رہی تھی ۔ غم حاوی ہوئے جا رہا تھا جیسے اس نے سب کچھ کھو دیا ہو ۔ جیسے نین کو اس سے قطعی محبت نہ ہو ۔ جیسے وہ وعدہ ۔۔۔ کہ میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا ۔ محض ایک فریب ہو ۔

وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی ۔ سوچ رہی تھی ۔ گویا ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکے تلاش کر رہی ہو ۔ دفعتاً اس کی نگاہوں کے سامنے ایک خوفناک چہرہ آکھڑا ہوا ۔ "ہاں میں قتل بھی کر سکتا ہوں" ۔ کسی نے بھدی آواز میں کہا ۔ وہ رک گئی ۔" اور یاد رکھو" ۔ وہ بولا ۔۔ ہارون نے انگلی دبائی ۔۔۔ ڈز ۔۔۔ ایک خوفناک آواز آئی ۔ خونیں فوارہ چھوٹ پڑا۔

"ٹیکسی آپ نے منگوائی ہے کیا" ۔ خادمہ نے آکر عالیہ سے پوچھا ۔

"ہاں" عالیہ نے جواب دیا۔
کہیں جا رہی ہیں آپ ؟"
"ہاں" وہ بولی ۔
"اکیلی جائینگی" ۔
"ہوں" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا ۔
"بازار جانا ہے کیا" خادمہ نے حیرانی سے پوچھا۔
"نہیں" وہ بولی ۔
"آپ نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا ابھی" ۔
"ہاں" اس نے جواب دیا ۔ اور باہر کیطرف چل پڑی ۔
"کھانا کس وقت کھائیں گی آپ "خادمہ نے پوچھا ۔
"کھانا" وہ چونکی ۔ "پتہ نہیں "۔
وہ موٹر میں بیٹھ گئی "تم اندر چلو" ۔ اس نے خادمہ سے کہا ۔
"کہاں بیگم صاحب " ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا ۔
ایک ساعت کیلئے وہ ہچکچائی پھر ۔۔۔۔ مدھم اور بھیانک آواز میں بولی ۔
"سکارلٹ روڈ ہاں سکارلٹ روڈ" ۔

..........○..........

نیلی رگ

اسوقت شام کے پانچ یا چھ ہونگے ۔ میں ، صفیہ ، ارجمند اور ثریا انگیٹھی کے گرد خاموش بیٹھے تھے ۔ باہر شفق کیوجہ سے مطلع سُرخی آلود ہو رہا تھا ۔ کیونکہ سرخ بادلوں کا عکس زمین پر بچھی ہوئی برف پر پڑ رہا تھا ۔ نیچے سواں کی وادی میں اندھیرا چھا چکا تھا ۔ اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھتا آ رہا تھا ۔ وادی میں ڈھلانوں پر بنے ہوئے مٹی کے گھروندوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ یوں دکھائی دے رہے تھے ۔ جیسے سسکیاں بھر رہے ہوں ۔ کتنی اداس تھی وہ شام !

وہ ٹیلا چاروں طرف سے برف سے ڈھکا ہوا تھا ۔ جس پر وہ مختصر سا ہوٹل "وی اوکس" واقع تھا ۔ اسوقت اس ہوٹل میں چند ایک لوگ مقیم تھے ۔ غالباً ہماری طرح سب برف کا منظر دیکھنے کیلئے مری آئے ہوئے تھے ۔ نمبر ۳۲ میں مَیں ، ثریا اور ارجمند بیگم مقیم تھیں ۔ نمبر ۱٦ میں مسٹر حیدر اور اُنکی بیگم تھیں ۔ انکے ساتھ والے کمرے میں وہ نووارد جوڑا تھا جو اسی روز وہاں آکر ٹھہرا تھا ۔ اور جس سے ابھی تک ہماری ملاقات بھی نہ ہوئی تھی اور مغربی کونے کے کمرے میں ایک بوڑھا تھا ، اسے آئے صرف چند ایک گھنٹے ہوئے تھے ۔

ہم تینوں چپ چاپ بیٹھی تھیں ۔ ثریا کی آنکھیں حسب معمول خواب آلود تھیں ۔ اسکی تو عادت ہے ۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے خواب دیکھتی رہتی ہے ۔ اسکی موٹی سیاہ آنکھیں گویا بنی ہی خواب دیکھنے کے لئے ہیں ۔ وہ تو حقیقت کو بھی خواب کے سانچے میں ڈھال کر دیکھنے کی عادی ہے ۔

ان دنوں وہ حقیقت جسے وہ خواب کے سانچے میں ڈھال کر دیکھ رہی تھی ۔ مسٹر ریاض تھے ۔ مسٹر ریاض ایک تاجر تھے ۔ دو اور دو چار قسم کے تاجر ۔ پھر وہ پیاری بیگم ارجمند تھی جسے میں صفیہ کہکر پکارتی تھی اُسے ماضی

سے عشق تھا اور مستقبل کا ڈر اور حال کو تو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتی تھی ۔ صفیہ مستقبل کے متعلق ایک نہ ایک شکایت پالتو کتے کی طرح پالے رکھتی تھی ۔ ان دنوں اسکی پالتو شکایت یہ تھی ۔ "ہائے ! کہیں میرا پیٹ نہ بڑھ جائے" ۔ میں نے اسے بارہا سمجھایا تھا ۔ بنّو کل کی مصیبت پر آج ہی آنسو بہانے سے فائدہ اور پھر وہ بھی محض خیالی جس کا کوئی وجود نہیں ۔ امکان نہیں ۔ لیکن کوئی نہ سمجھنے پر مصر ہو تو ۔۔۔ وہ عادت سے مجبور ہے ۔ پہلے تو موہوم خطرے پر روتی رہتی اور پھر جب وہ ظہور میں نہ آتا تو اس بات پر ہاتھ ملتی ۔ "ہائے ! میں نے اتنی دیر خوامخواہ فکر کیا ۔ اب کیا ہو گا ؟ نجمہ میری صحت پر اثر تو نہ پڑے گا اسکا" ؟ اس لحاظ سے بیگم ارجمند ایک مصیبت تھی لیکن اسے مجھ سے کتنی محبت تھی ۔ جان چھڑکتی تھی مجھ پر ۔ ان دونوں کی موجودگی نے شام کو اور بھی اداس کر رکھا تھا ۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے ۔ وہاں میری بیگم حیدر سے ملاقات ہو گئی ورنہ وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ۔

بیگم حیدر تو ہنسی کا گول گپا تھی ۔ اگرچہ اسکے نقوش ستواں تھے اور گولائیاں خاصی مختصر تھیں لیکن اسکی ہنسی تو چشمے کی طرح اُبلتی رہتی تھی ۔ مسکراہٹ ہر وقت ہونٹوں میں دبی رہتی اور پھر بات بات پر "ہی ہی ہی ہی" مجھ سے کہتی ، "نجمہ ! کتنی اداس شام ہے آج !! اور پھر یوں بے ساختہ ہنستی جیسے شام کی اداسی ایک فرحت بخش چیز ہو ۔ "توبہ کیا مصیبت ہے اس برف پر چلنا"! ۔ اور پھر پھسل کر گرتے ہی "ہی ہی ہی" کرنے لگتی ۔ جیسے برف پر گرنا ایک عشرت ہو ۔ ہنسی کے علاوہ اسے "کچھ سنا تم نے؟" سے عشق تھا ۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہتی ۔ "کچھ سنا تم نے نجمہ" ؟ اور پھر ہوٹل کی خبروں کا ضمیمہ شروع ہو جاتا ۔

اس شام بھی وہ آتے ہی بولی ۔ "کچھ خبر بھی ہے یا یوں ہی گم سم بیٹھی چائے ہی پیتی رہو گی ؟ آج میاں لیلیٰ مجنوں بنفس نفیس آئے ہوئے ہیں ۔ اسی ہوٹل میں" ۔ وہی ! وہ چلائی ۔ "جو دوپہر کے قریب آئے تھے ۔ جب ہم برآمدے میں بیٹھی تھیں ۔ مسٹر وحید اور بیگم" ۔

"نام بھی پوچھ لیا تم نے "! میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا ۔

"لو نام تو بیرے سے پوچھا تھا ۔ ویسے میں تو دو بار مل بھی آئی ہوں" ۔

"سچ" ؟ ثریا نے خواب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ۔

"ہائے ! کیا بتاؤں ثریّا ۔" وہ بولی "بالکل لیلیٰ مجنوں ہیں ۔ توبہ اتنا بھی کیا ۔ سارا دن بیگم کا بازو تھام کر کمرے میں بیٹھا رہا ۔ یوں بازو کو الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا جیسے کوئی انوکھی چیز ہو اور وہ بھی بازو ہاتھ میں تھمائے مسرور بیٹھی تھی جیسے اسے ایک نعمتِ عظمیٰ بخش رکھی ہو ۔ حالانکہ عمر میں کافی بڑی ہے ۔ مگر سکول کی لڑکی کی طرح ہنستی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میاں بالکل نوجوان ہے ۔ جیسے کسی کالج سے پکڑ کر لائی ہو ۔ زبردستی ۔ "میاں متوالی" قسم کی مٹیار عورت ہے ۔ ہاں پر نجمہ ! وہ ہنس کر بولی" ہے بڑی پیاری خوش خلق ہے ، ملنسار ہے اور لگ لگاؤ نہیں جانتی ۔ بنتی ذرا نہیں ، ابھی آئے گی یہاں میں نے بلایا ہے اُسے ۔"

"یہاں آنے دینگے کیا" ؟ صفیہ بولی ۔

"ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگی ۔ "مذاق نہیں ۔ یوں شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے سکول کے بچے مدرسے سے بھاگ کر آئے ہوں ۔"

چائے پیتے ہوئے بیگم حیدر پھر چلانے لگی "ہائے ! میں تو بھول ہی گئی ۔ معلوم ہے آج یہاں کون آیا ہے ــــــ مسٹر مارووالا !"

"مارووالا؟" ثریا نے حیرانی سے دہرایا۔

"مارووالا کو نہیں جانتی ؟" وہ ہنسنے لگی ۔ "وہ تو پاکستان کا مانا ہوا پامسٹ ہے ۔" ثریا کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکیں۔

پامسٹ کا نام سن کر صفیہ نے پُرامید انداز سے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا جیسے پامسٹ کسی حکیم کا نام ہو ۔

میں نے انہیں چھیڑنے کیلئے پامسٹری پر بحث شروع کر دی "تو کیا تمہارا خیال ہے کہ ہاتھوں کی لکیروں میں انسان کا مستقبل چھپا ہوتا ہے" میں نے پوچھا ۔

ابھی بحث شروع ہی ہوئی تھی کہ بیگم وحید آ گئی ۔

"آیئے آیئے"، بیگم حیدر اسے دیکھکر اچک کر اٹھی ۔ "آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا ۔ تعارف کرا دوں پہلے ۔ یہ میری سہیلی نجمہ ہیں ۔ یہ ہیں ثریا اور آپ بیگم ارجمند ہیں ۔ آپ کے بارے میں تو سبھی جانتی ہیں ۔ چائے پیئں گی آپ یا کافی ؟"

نووارد ادھیڑ عمر کی ہو گی ۔ اسکے انداز میں وقار اور تمکنت تھی ۔ آنکھوں میں دکھ کا عنصر واضح تھا مگر جب وہ بات کرتی تو گویا خلوص کا دھارا بہنے لگتا ۔ شخصیت میں عجیب چمک اور جاذبیت تھی ۔

بیگم وحید نے آتے ہی بے تکلف انداز اختیار کر لیا ۔ ۔ "پریشان نہ ہوں آپ ۔" وہ بولی "چائے کا پیالہ میں خود بنا لوں گی ۔ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ میں مخل ہوئی ۔"

بحث پھر شروع ہو گئی میں نے ہاتھ کی لکیروں کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا ۔ اس پر بیگم ارجمند پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی اور بیگم حیدر نے بات بدلنے کے لئے بیگم وحید سے پوچھا ۔ "آپ کا کیا خیال ہے ۔ بیگم وحید ؟ کیا ہاتھ کی لکیروں میں انسان کا کردار اور مستقبل کندہ ہوتے ہیں ؟"

اس سوال پر بیگم وحید جھجک کر پیچھے ہٹ گئی ۔ اسکا رنگ زرد ہو گیا ۔ ایک ساعت کے لئے اسکے ہونٹ کانپے لیکن اس نے منہ سے کچھ جواب نہ دیا ۔

"تو کیا آپ ہمارے ساتھ مارو والا کو ہاتھ دکھانے نہ جائیں گی ؟" بیگم ارجمند بات کئے بغیر نہ رہ سکیں ۔

"مجھے مستقبل سے ڈر لگتا ہے ۔" بیگم وحید کانپتے ہوئے بولی ۔ "میں مستقبل کے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتی ۔ نہیں نہیں"، دفعتاً اسکے جذبات یوں برانگیختہ ہو گئے جیسے بھس میں آگ لگ گئی ہو ۔" نہیں نہیں، میں نے مستقبل کے متعلق جان کر بہت دکھ سہا ہے ! بہت دکھ سہا ہے !!"

"بیگم وحید !" میں نے پھر وہی بنیادی اعتراض پیش کرنے کی کوشش کی ۔ "کیا آپ بھی یہ سمجھتی ہیں کہ ہاتھ کی لکیروں میں انسان کا مستقبل کندہ

ہوتا ہے ؟"

"ہاتھ ۔۔۔ ہاتھ کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن" ایک ساعت کے لئے وہ جھجکی ، پھر اس نے جوش میں اپنا بازو ننگا کر کے بڑھا دیا ۔ یہ دیکھئے ، یہ میری لوح تقدیر !"

"لوح تقدیر ؟" ہم سب نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا ۔

"ہاں" وہ بولی ۔ "میری قسمت کا ایک ورق میرے بازو پر کندہ ہے !"

ہم سب کی نگاہیں اس کے بازو پر مرکوز ہو گئیں ۔ بھرے ہوئے سڈول بازو پر ایک نیلی رگ اُبھری ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔ نہ جانے جسم کی مرمریں سفیدی کی وجہ سے یا ویسے ہی ابھری ہوئی رگ کا رنگ بے حد شوخ تھا ۔

بیگم وحید کی بات سن کر ہم سب بوکھلا گئیں ۔ ثریا کی آنکھیں خوابوں کی دنیا کو چھوڑ کر حقائق کو دیکھنے کے لئے گویا اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں ۔ بیگم ارجمند کو اپنے پیٹ کی سدھ بدھ نہ رہی تھی اور بیگم حیدر کی مخصوص مسکراہٹ کافور ہو چکی تھی ۔

"یہ نیلی رگ نہیں ہے ۔" بیگم وحید نے لمبے وقفے کے بعد کہا ۔ غور سے دیکھئے یہ واؤ ہے واؤ ۔ میرے خاوند کے نام کا پہلا حرف واؤ ۔"

"ہائے اللہ !" ثریا نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا ۔

بیگم ارجمند نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیگم وحید کی طرف دیکھا ۔

بیگم حیدر کے ہونٹوں پر ایک تمسخر آمیز ہنسی جھلکی جیسے الف لیلیٰ کا قصہ سن رہی ہو ۔

بیگم وحید کے دودھیا بازو پر وہ نیلی واؤ یوں واضح تھی جیسے چکنے کاغذ پر کاتب نے نیلی سیاہی سے نسخ میں لکھی ہو ۔

"یہ بازو میری تقدیر کا ایک ورق ہے ۔ صرف ایک ورق !" یہ کہتے ہوئے بیگم وحید کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے یوں آہ بھری جیسے دہکتے ہوئے انگارے کو پانی میں ڈالنے سے آواز پیدا ہوتی ہے ۔" ایک ماہ پہلے تقریباً ایک ماہ ۔" بیگم وحید نے کہا ۔ "میرے ہونے والے شوہر کے نام کا پہلا حرف آہستہ آہستہ

اس بازو پر ابھرتا ہے اور پھر علیحدگی سے کچھ دیر پہلے یوں مٹ جاتا ہے جیسے کبھی ابھرا ہی نہ ہو ۔ جیسے میرے بازو میں کوئی نیلی رگ ہی نہ ہو ۔"

"علیحدگی ۔۔۔" ثریا نے زیرِ لب دہرایا ۔

"ہاں ۔۔۔" بیگم وحید نے حسرت بھری نگاہ ثریا پر ڈالی ۔ کتنی بے بسی تھی اسکی نظر میں ۔ "یہ میرا چھٹا شوہر ہے ۔" وہ بولی ۔

محفل پر گویا سکتہ طاری ہو گیا ۔

باہر شفق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو چکی تھی ۔ دور ننھے ننھے چراغ سسکیاں بھر رہے تھے ۔ نیچے وادی کے جنگل میں گیدڑ چیخیں مار رہے تھے ۔

دیر تک بیگم وحید آگ کے شعلوں کو گھورتی رہی ۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی ۔ "بارہ سال ہوئے" اس نے ایک لمبی آہ بھری ۔ "بارہ سال جب میری پہلی شادی ہوئی تھی ۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی ۔ میرے والدین نے مجھے نواب زادہ ظاہر بیگ سے بیاہ دیا ۔ لیکن دو سال کے اندر اندر وہ تباہ کن حادثہ واقعہ ہوا ۔"

"ایک رات ایک خوفناک زلزلہ آیا ۔ ہماری قدیم حویلی گر گئی اور وہ سب ہلاک ہو گئے ۔ میری والدہ ، والد ، بھائی ، اور میرے شوہر ، نہ جانے میں کیسے بچ گئی ۔ مگر میں بچ گئی ۔ بلکہ مجھے خراش تک نہ آئی ۔ اف کس قدر قیامت خیز منظر تھا !" اس نے گہری آہ بھری اور پھر آگ کے شعلوں کو گھورنے لگی ۔

بیگم حیدر منہ پر انگلی رکھے حیرت سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی ۔ ثریا نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام رکھا تھا اور بیگم ارجمند کا منہ یوں کھلا تھا جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھی ہو ۔

"اس سانحہ کے بعد میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ۔" بیگم وحید نے پھر بات شروع کی ۔ "والد صاحب کی جائداد کافی تھی ۔ گزر اوقات کے متعلق فکر نہ تھا لیکن ایک دکھ تھا کہ میرے سر پر کسی کا سایہ نہ تھا ۔ کوئی مشورہ دینے والا نہ تھا ۔ دل کا حال کسی سے نہ کہہ سکتی تھی ۔ اسوقت مجھے اس لوحِ تقدیر کا احساس نہ تھا ۔ مجھے معلوم نہیں ۔ ممکن ہے ان دنوں بھی میرے بازو پر کوئی

نیلا حرف کندہ ہو ۔ ممکن ہے ۔"

"اس سانحہ کے چھ مہینے بعد میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ میرے بائیں بازو پر نیلی رگ ابھری ہوئی ہے ۔ اسے دیکھ کر میں ڈر گئی ۔ بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس گئی ۔ چار ایک ڈاکٹروں کو دکھایا ، انہوں نے کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ۔ ویسے ہی رگ ابھر آئی ہے ۔ ان دنوں میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اسکی شکل کیسی ہے ۔ آیا وہ کسی حرف سے ملتی جلتی ہے یا ویسے ہی مڑی ہوئی ہے ۔"

"اسکے دو ماہ بعد میرے دوسرے شوہر کیپٹن رفیع نے ایک روز میرا بازو دیکھکر قہقہہ لگایا ۔ "ارے !" وہ بولے ! ۔۔۔۔۔ یہ تو صاف طور پر رے لکھا ہے ۔ بالکل ایسے جیسے میں اپنے دستخط میں رے لکھتا ہوں ۔ ثروی ۔" وہ مجھ سے کہنے لگے ۔ تم پر تو ازلی طور پر ہماری چھاپ لگی ہوئی ہے ۔"

"کیپٹن رفیع ایک خوش باش فوجی افسر تھے ۔ وہ طبعاً ہر بات پر قہقہہ لگایا کرتے تھے ۔ لیکن" اس نے ایک آہ بھری ۔ "ہم صرف چھ ماہ اکٹھے رہے ! مجھے یاد ہے جب ایک روز میں غسل کر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ نیلی رگ غائب ہو چکی ہے ! چونکہ ابھی تک مجھے یہ شعور نہ تھا کہ اس کے مٹ جانے کا مطلب کیا ہے ، میں خوشی خوشی رفیع صاحب کے پاس گئی اور بازو دکھا کر بولی ۔ "دیکھ لو جی ! ہم پر کسی کی چھاپ نہیں لگی ۔" انہوں نے از راہِ مذاق بُرا سا منہ بنا لیا ۔ کہنے لگے "ثروی ! یہ تو بہت بُرا ہو ، ہماری املاک ہم سے چھن گئی ۔ اب ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہماری ہو ۔"

"چند ہی روز کے بعد انہیں محاذ پر جانے کا حکم مل گیا ۔ جانے سے پہلے وہ مجھے تسلیاں دیتے رہے لیکن الوداع کہتے وقت انکا ضبط ٹوٹ گیا ۔ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے "ثروی اب کیا ہے جبکہ ہماری چھاپ ہی نہ رہی ۔ بہر حال چاہے کسی کی بنو خوش رہو ۔ خداحافظ!" پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتی وہ جا چکے تھے ۔"

"ایک مہینے کے اندر اندر خبر آ گئی کہ رفیع مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں ۔ اسوقت دفعتاً مجھے یہ خیال آیا کہ نیلی رگ کا غائب ہونا ایک اشارہ تھا ۔

اس روز سے مجھے اپنے بازو سے ڈر آنے لگا اور میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میری زندگی سحرزدہ تھی اور کوئی انجانا ہاتھ اسے بنا اور بگاڑ رہا تھا۔ لیکن خوف کے باوجود میں بار بار اپنے بازو کو دیکھتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو ننگا کر کے اسے گھورنا شروع کیا۔

ثریا چپکے سے اٹھی اور بیگم وحید کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو کر یوں اس نیلی واؤ کو دیکھنے لگی جیسے ہپناٹزم کے زیر اثر ہو۔ صرف ثریا ہی کیا ہم سب گویا اسے دیکھنے پر مجبور تھیں۔ اور وہ نیلی واؤ پھیل رہی تھی اور ہم پر مسلط و محیط ہوتی جا رہی تھی۔

باہر ستارے سسکیاں بھر رہے تھے۔ ہوا کراہ رہی تھی۔ گیدڑ رو رہے تھے دفعتاً بیگم وحید نے سر اٹھایا اور بولی۔ "پھر نیلی رگ پھر سے ابھرنے لگی۔ اسے دیکھکر میرا دل تشویش سے دھڑکنے لگا۔ چند ہی دنوں میں اس نے واضح شکل اختیار کر لی۔ میم۔ اس میم کو دیکھکر میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہوں جس کا نام میم سے شروع ہوتا ہے۔ اس خیال سے ہی مجھے وحشت ہوتی اور میں ہر اس شخص سے دور بھاگنے لگی جس کا نام میم سے شروع ہوتا تھا۔ نہیں نہیں میں آپ ہی آپ چلاتی "نہیں نہیں میں کٹ پتلی نہ بنوں گی۔ میں اپنی زندگی کی آپ مالک ہوں۔"

"ان دنوں ایک اور فوجی مجھ سے شادی کرنے کا متمنی تھا لیکن میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی ایسے شخص سے شادی نہ کروں گی جس کے نام میں میم کا حرف موجود ہو۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ اس نیلی تحریر کے سحر سے آزاد ہو جاؤں۔"

" پھر میں نے ایک ادیب سے شادی کر لی انکا نام کیف ناصری تھا۔ لیکن میری خوشی صرف چند روزہ تھی۔ کیونکہ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ انکا اصلی نام منظور تھا اور کیف ناصری محض ادبی نام تھا جو انہوں نے اپنا رکھا تھا۔ اس نئے انکشاف کے بعد مجھ پر مایوسی چھا گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ نیلی تحریر سے فرار ممکن نہ تھا۔"

"کیپٹن رفیع کی وفات کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نیلی رگ کے راز سے اپنے شوہر کو کبھی آگاہ نہ کرونگی ۔ اسلئے میں نے کبھی اپنے بازو کے اسرار کے متعلق اپنے شوہر سے بات نہ کی تھی ۔"

"دو سال کے بعد وہ میم بھی میرے بازو سے مٹ گئی اور اس ڈر سے کہ وہ مجھ سے الگ نہ ہو جائیں ، میں نے ان سے والہانہ محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ میں ان سے یوں چمٹ گئی جیسے گرتا ہوا شخص چمٹتا ہے لیکن ۔۔۔" بیگم وحید نے زہرخند آواز میں کہا "وہی والہانہ محبت ہماری علیحدگی کا باعث بن گئی ۔ وہ اکتا گئے اور انہوں نے ایک گری ہوئی عورت سے تعلق پیدا کر لیا اور انجام کار ہم الگ ہو گئے ۔ اس کے بعد لوح تقدیر پر ڈاکٹر اجمل اور میں نے تین سال اکٹھی زندگی بسر کی ۔ اَب کی بار جب الف مٹا تو میں نے والہانہ محبت کے اظہار سے احتراز کیا ۔ میں نے بڑے جبر سے بے پروائی کا روپ دھارے رکھا ۔ لیکن اس مرتبہ میری یہی ظاہری بے پروائی ہماری جدائی کا باعث ہوئی ۔ ڈاکٹر اجمل نے اپنی نرس سے شادی کر لی ۔"

"پہلے تو مجھے ان تبدیلیوں پر بڑا دکھ ہوتا تھا ۔ لیکن یہ دیکھکر کہ حالات پر میری کوششوں کا کچھ اثر نہیں ۔ اپنی بے بسی کو محسوس کر کے میں حالات پر قانع ہو گئی ۔ اور اپنی زندگی کے واقعات کو یوں بے تعلقی سے دیکھنے لگی جیسے پردۂ سیمیں پر کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہو ۔ جسے دیکھنے پر گویا میں مجبور تھی ۔ ہر ایک یا دو سال کے بعد کسی انجانے پروجیکٹر سے ایک نیلے حرف کی تصویر میرے بازو پر ابھرتی اور پھر دو ایک سال کے اندر اندر آپ ہی آپ مٹ جاتی ۔ اور پھر خارجی واقعات اس محور کے گرد گھومتے ۔ میں خود ہی تماشہ تھی اور خود ہی تماشبین ۔ میرے اللہ ! اس نے دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام لیا ۔ محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا ۔ ثریا بیگم وحید کی کرسی کے پیچھے بت بنی کھڑی تھی ۔ صفیہ پاگلوں کی طرح بیگم وحید کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

باہر دھوڑی نے منظر کو چھپا لیا تھا اور ایک گہرا سکوت طاری تھا ۔ دفعتاً

ایک خوفناک گرج سے ہم سب چونک پڑے ہیں ۔

"میرا پانچواں خاوند" وہ اپنی ہی دھن میں بولی "داؤد ایک اوباش آدمی تھا ۔ مجھ سے عقد کرنے سے اسکا مقصد میری جائداد پر قبضہ کرنا تھا ۔ اس نے دو بار جعلی دستخط کر کے بینک سے روپیہ بھی نکلوایا تھا ۔ یہ باتیں مجھے مینجر سے معلوم ہوئی تھیں ۔ اپنی جائداد کے تحفظ کے لئے میں نے ایک مینجر مقرر کر لیا تھا ۔ وہی مینجر اب میرا شوہر ہے ۔"

"مسٹر وحید ؟" بیگم حیدر نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں" اس نے سر اثبات میں ہلا کر کہا ۔ "داؤد صاحب وحید کی تقرری پر بہت برہم ہوئے تھے ۔ پہلے روز ہی وہ وحید کے خلاف ہو گئے تھے ۔ چونکہ انکا مقصد ہی روپیہ بٹورنا تھا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انکے سوا کوئی اور میرے مالی معاملات کی دیکھ بھال کرے" ۔

"حالانکہ میں جانتی تھی انکا مقصد مجھے لوٹنا ہے پھر بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ جان بوجھ کر ان سے قطع تعلق کروں ۔ یقین کرنا میں نے کبھی نہ چاہا تھا کہ علیحدگی ہو جائے سچ کہہ رہی ہوں ۔" اس نے اپیل بھری نگاہ ہماری طرف ڈالی ۔ ویسے داؤد نے وحید کے خلاف بغض رکھنے کا جواز پیدا کر لیا تھا ۔ خیالی جواز ۔ وہ ہم دونوں پر شک کرتے تھے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وحید کی طرف سے کبھی ایسی حرکت سرزد ہوئی تھی اور نہ انکے ذہن میں کوئی ایسی بات تھی ۔ مجھے تو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ ایسی بات ممکن ہو سکتی ہے ۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وحید صاحب مجھے داؤد سے ہوشیار رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔ اور وہ بھی صرف مالی معاملات کے متعلق ۔"

"پھر ایک دن وہی ہؤا ۔ میرے بازو سے دال کا حرف مٹ گیا اور اسکی جگہ آہستہ آہستہ واؤ ابھر آئی ۔ اسے دیکھکر میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ لیکن میں نے یہ راز اپنے دل ہی دل میں دفن رکھا ۔ سچ پوچھو تو اب مجھ میں ایک عجیب سی سپردگی پیدا ہو چکی تھی میں سوچتی تھی دیکھوں اب حالات کیسے بدلتے ہیں ۔ میں سوچنے لگی ۔ داؤد مجھ سے علیحدگی پر آمادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے تو دولت

سے پیار ہے ۔ اس لئے وہ آسانی سے مجھے ہاتھ سے جانے نہ دے گا ۔"

"پھر ایک روز جب داؤد صاحب سینما دیکھنے گئے ہوئے تھے ۔ میں اور وحید ڈرائینگ روم میں بیٹھے حساب کی پڑتال کر رہے تھے تو واقعات نے عجیب پلٹا کھایا ۔ عجیب ۔۔۔ !" اس نے آہ بھر کر ہماری طرف دیکھا "حالات کو بدلتے دیر نہیں لگتی ۔" وہ مسکرائی ، وہ مسکراہٹ گویا آنسوؤں میں دھلی ہوئی تھی ۔

"اسوقت رات کے بارہ بجے ہونگے ۔ ہم التزاماً داؤد کا انتظار کرنے کیلئے حساب میں لگے ہوئے تھے ۔۔۔ دفعتاً تمام بتیاں بجھ گئیں ۔ اور کمرے میں اندھیرا چھاگیا" "کیا ہوا" میں نے گھبرا کر وحید سے پوچھا ۔

"شاید فیوز اڑگیا ہے ۔" وہ بولے "میں ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں ۔"

"اس وقت میں صوفے پر بیٹھی تھی اور اس سے کچھ دور ایک تپائی پر وحید کام کر رہے تھے ۔ دروازہ پرلی جانب تھا ۔ وحید اٹھے اور دروازے کی جانب بڑھے ۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا ۔ وحید صاحب کا بیان ہے کہ وہ واقعی دروازے کی جانب گئے تھے ۔ جو کوچ سے برعکس سمت میں تھا ۔ انھوں نے چکر سا محسوس کیا اور پھر گویا ان کو اٹھا کر کسی نے پھینک دیا اور وہ دھڑام سے مجھ پر آ گرے اور میں ڈر گئی ۔ عین اسوقت بتیاں روشن ہوگئیں اور داؤد صاحب اندر داخل ہوئے ۔ توبہ کس قدر فتنہ و فساد برپا کیا داؤد نے ۔ ہم نے لاکھ سمجھایا مگر بے سود ۔ انہیں تو بہانہ ہاتھ آگیا اور وہ اس بات پر اڑ گئے کہ وحید کو فوراً موقوف کر دیا جائے ۔ پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتی وحید صاحب بولے "میں خود ہی جانا چاہتا ہوں بیگم صاحبہ مجھ سے حساب لے لیجئے ۔ میں اسی وقت جا رہا ہوں ۔ مجھے دے دو حساب" داؤد بولے لیکن وحید نے انہیں حساب دینے سے انکار کر دیا ۔ بیگم صاحبہ چاہے آپ ہی کو دے دیں وہ بولے لیکن میں آپکو حساب نہ دونگا ۔ مجھے معلوم ہے آپ کا مقصد کیا ہے ۔"

"اِس پر پھر بات بگڑ گئی ۔ داؤد نے غصے میں وحید پر ہاتھ اٹھایا ۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دھکا دیکر گرا دیا ۔ اس پر مجھے بھی طیش آگیا ۔ میں نے کہا کہ داؤد صاحب ابھی میرے گھر سے نکل جائیے ابھی !

داؤد نے نکلنے سے انکار کر دیا اور خطرناک عزائم سے میری طرف بڑھے ۔ اسپر وحید نے فوراً ٹیلیفون اٹھا لیا اور داؤد کو پولیس کی دھمکی دی ۔ اگر آپ فوراً باہر نہ نکلے تو جعلی چیکوں کا کیس پولیس کو دیا جائے گا ۔ داؤد صاحب گھبرا گئے اور مصالحت کی کوشش کرنے لگے لیکن وحید اڑ گئے ۔ جب داؤد کو معلوم ہو گیا کہ انکا بھید کھل چکا ہے تو وہ چپکے سے باہر نکل گئے اور پھر جلد ہی تنسیخِ نکاح کا فیصلہ ہو گیا ۔ اسکے بعد معلوم نہیں کیسے ، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہنا تھا ۔ وحید صاحب کی مجھ سے شادی ہو گئی !"

وہ خاموش ہو گئی ۔ اسکی آنکھوں میں ایک مسرت بھری چمک تھی ۔ اگرچہ اس کے پس منظر میں اب بھی بے بسی اور ہراس کی جھلک تھی ۔ لیکن وہ مسرّت بے حد پیاری تھی جیسے ندی میں کنول کا پُھول بہے جا رہا ہو ۔

"وحید کو مجھ سے بے حد محبت ہو چکی ہے ۔ وہ بار بار کہتے ہیں ثروی ! میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہو نگا ۔ انکی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے بات کر رہے ہیں ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مَیں نے جانا ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں ، مسرّت کیا چیز ہے ۔"

ثریا کی آنکھوں میں پھر سے خوابوں کی "دھوڑی" چھا گئی ۔ صفیہ مسکرانے لگی اور بیگم حیدر کا چہرہ فرطِ انبساط سے کِھل گیا ۔ "جبھی وہ تمہارا بازو تھامے بیٹھے رہتے ہیں ۔" وہ چلائی ۔

"ہاں ـ۔۔" بیگم وحید نے فخریہ انداز سے کہا ۔ "انہیں مجھ سے والہانہ محبت ہے ۔ اور میں کوئی بات ان سے چھپا نہیں سکتی ۔ اسلئے میں نے نیلی رگ کا راز ان سے کہہ دیا ہے ۔ صبح و شام اُٹھتے بیٹھتے وہ مجھ سے کہتے ہیں ثروی ذرا دکھانا تو میری قسمت کا نوشتہ ، کہیں اسکی آب و تاب میں فرق تو نہیں آ گیا اور میں ہنس کر کہتی ہوں اگر آ گیا ہو تو؟ ۔۔۔ اسپر وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں ۔ "ثروی ! تم مجھے زندہ نہ پاؤ گی اس روز ۔ تمہاری قسم ! وہ جیب سے پستول نکال کر یوں قسمیں کھانے لگتے ہیں جیسے وہ کوئی صحیفہ ہو ۔" بیگم وحید ہنسنے لگی ۔ "بڑے وہمی ہیں وہ ۔ انہیں بیٹھے بٹھائے وہم ہو جاتا ہے کہ واؤ مٹ

تو نہیں گئی اور پھر میری طرف بھاگتے ہیں ۔ بیگم ذرا ایک منٹ معاف کرنا میں مخل ہوا آدھی رات کو جگا جگا کر ٹارچ جلا جلا کر میرا بازو دیکھتے ہیں ۔ باہر کام پر جاتے جاتے لوٹ آتے ہیں اور پھر ملتجیانہ انداز سے کہتے ہیں کہ بیگم معاف کرنا مجھے ، ذرا بازو ادھر کرنا اور وہ میرا بازو تکا کر کے دیکھتے ہیں ۔" یہ کہتے ہوئے بیگم وحید ہنسنے لگی ۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنا بازو آگے نکالا ۔۔ دفعتاً اس کی ہنسی رک گئی اور وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی ۔ نیلی واؤ نے شنگرفی رنگ اختیار کر لیا تھا اور وہ یوں چمک رہی تھی جیسے جلتا ہوا انگارہ ہو ۔

ثریا کی آنکھیں ابل آئیں ۔ بیگم ارجمند ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں اور بیگم حیدر اضطراب میں اُٹھ بیٹھی ۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔" بیگم وحید دیوانوں کی طرح بڑبڑانے لگی ۔ دفعتاً ایک مہیب گرج کی آواز آئی ۔ اسکے ساتھ ہی مسٹر وحید دروازہ کھول کر اندر آ گئے ۔ ۔ "معاف کرنا ۔ معاف کرنا" ، وہ گھبراہٹ سے بولے ایک منٹ بیگم صرف ایک منٹ مجھے افسوس ہے کہ میں مخل ہوا ۔"

بیگم وحید نے انہیں دیکھکر جھٹ بازو چھپا لیا اور خاموش کھڑی رہی ۔

کچھ دیر تک وہ بیگم وحید کی طرف ملتجیانہ نگاہ سے دیکھتے رہے ۔ پھر دفعتاً گھبرا کر بولے ۔ "اوہ ! تو تو یعنی ۔۔۔ ختم ہوگیا !" یہ کہہ کر وہ مڑے ۔

انہیں واپس جاتے ہوئے دیکھکر بیگم وحید اضطراب میں چلائی ۔ "نہیں نہیں کچھ بھی تو نہیں ہوا ۔ کچھ بھی نہیں ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو آگے کو بڑھا دیا ۔ وہ رک گئے ۔ انہوں نے مڑکر بیگم کے بازو کی طرف دیکھا ۔ دفعتاً انکا رنگ فق ہوگیا ۔ لپک کر انہوں نے بازو کو ہاتھ میں پکڑ لیا پھر انکے منہ سے ایک چیخ نکلی جیسے کوئی زخمی پرندہ دم توڑ رہا ہو ۔ پھر وہ دیوانہ وار باہر نکل گئے ۔

ہم سب نے حیرانی سے بیگم وحید کے بازو کی طرف دیکھا ۔ اسپر نیلے رنگ کے نشان کا وجود تک نہیں تھا ۔ صرف بیگم وحید ہی اس حقیقت سے بے خبر تھی کیونکہ وہ حیرانی سے وحید کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

دفعتاً باہر گولی چلنے کی آواز آئی ۔ ہم سب دیوانہ وار باہر نکلیں ۔ برآمدے میں وحید ڈھیر ہو رہے تھے ۔ ہاتھ میں ابھی تک پستول پکڑا ہوا تھا۔ کنپٹی سے خون کا فوارہ جاری تھا ، شنگرفی خون !

........O.........

عطیہ

شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ اسکا نام عطیہ تھا اور اسلئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ اللہ نے اسے بنی نوع انسان پر نعمت بنا کر اتارا ہے یا شاید اس لئے کہ اسکے چہرے کے خطوط عام چہروں سے مختلف تھے ۔ جیسے وہ مکعبوں سے بنا ہو جسے دیکھکر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو ۔ "حواس کیوں باختہ ہو گئے جناب کے" ۔ اسکے جسم کے خطوط میں بھی قوسوں کی بھرمار تھی ۔ اسکے حسن میں حجاب غم یا اداسی کی جھلک نہ تھی ۔ اگر وہ آنکھیں جھکا بھی لیتی تو احساس نہ ہوتا تھا کہ اس نے آنکھیں جھکا لی ہیں بلکہ ایسے محسوس ہوتا کہ اسکی ہنسی میں تمسخر کی جھلک ہو ۔

اسکا چہرہ کتابی نہ تھا ۔ وہ سوچنے یا آہیں بھرنے کی بجائے عمل پر مائل کرتا تھا ۔ جی چاہتا کہ اسکی کلائی تھام لیں ۔ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں یا اسے پکڑ کر پیٹیں یا اسکے ہاتھوں پٹ جائیں تو بڑا مزا رہے ۔ اور یہ سب کچھ اسکے چہرے کی ہڈیوں کے زاویوں کی وجہ سے تھا ۔ اسکی پیشانی ابھری ہوئی تھی جیسے اسمیں ہوا بھری ہو ۔ اُسکے گال گول نہیں تھے ۔ چھوٹے چھوٹے مکعبوں کے بنے ہوئے تھے اور اسکے جبڑے تلے عزم دبا ہوا تھا جیسے کلے میں پان دبایا ہوتا ہے اور اسکی ٹھوڑی یوں معلق تھی جیسے مغلوں کے باغ میں سنگ مرمر کی بارہ دری معلق ہوتی ہے ۔ اور ان انوکھے زاویوں کے درمیان دو حساس ہونٹ دو ہنستی ہوئی شریر آنکھیں اور ایک ستواں ناک جو نسائیت سے بھیگی بھیگی تھیں ۔

یا شاید اسکی وجہ اُس ماحول سے تعلق رکھتی ہو جسمیں وہ پل کر جوان ہوئی تھی اسکا والد ایوب ریلوے کے سفری سٹاف میں تھا اور چونکہ اُسے مسلسل حرکت سے تعلق تھا ۔ اس لئے ایوب کو رسم و رواج سے یکسر نفرت تھی اور اسکی تمام تر زندگی روایت سے خالی تھی ۔

ایوب کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر بات پر بیوی کے شانوں پر سر رکھ کر رو دیتا تھا ۔ بیوی کے شانوں پر سر رکھ کر رو دینا اُسکے لئے سب سے بڑی نعمت تھی ۔ سب سے بڑی تسکین تھی اور اسکی دانست میں وہ ہر مشکل کا حل تھا ۔ وہ اسٹیشن پر صاحب سے لڑ پڑتا ۔ چند ایک ساعت کے لئے غصے کی وجہ سے اسکا جسم کانپتا ۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے دوڑتے ۔ لیکن جلد ہی وہ وہاں سے گھر کی طرف بھاگتا اور پھر بیوی کے شانے پر سر رکھ کر روتا ۔ حتیٰ کہ وہ تلخی کافور ہو جاتی اور پھر وہ یوں سو جاتا جیسے اسے لوری دی گئی ہو ۔ لیکن اسکے اس رویے کی وجہ سے اسکی بیوی کی زندگی تلخ ہو چکی تھی ۔ کیونکہ اسکا شوہر نہ تو اس قابل تھا کہ بیوی کو ڈانٹے ڈپٹے اور نہ ہی بیوی کے لئے یہ ممکن رہا تھا کہ میاں کو آنکھیں دکھائے ۔ جو پہلے ہی شانے پر سر رکھ کر رو رہا ہو ۔ اُسے ڈانٹنا آسان کام نہیں ہوتا ۔

شادی کے بعد دو ایک سال تو دلہن اسے تسلیاں دیتی رہی ۔ لیکن کوئی کب تک اس شغل میں دلچسپی لے سکتا ہے ۔ تسلی دینے کے خشک شغل سے ایک روز وہ اکتا گئی ۔ اسے یہ گلہ پیدا ہو گیا کہ میاں کو ایسا وطیرہ اختیار کرنا چاہیے تھا کہ جس میں بیوی کے لئے کچھ کرنے یا کہنے کی گنجائش باقی رہے ۔ صرف رونے کے بل بوتے پر پہاڑ سی زندگی کیسے بسر کی جا سکتی ہے ۔ بہر حال بیوی کے دل میں اس شانے پر سر رکھ کر رونے والے میاں سے نفرت ہو گئی ۔ وہ اسے کمتر سمجھنے لگی اور احساس برتری سے اس کی پیشانی بلند ہو گئی اور اسکے ہونٹوں میں تمسخر بھری مسکراہٹ ہمیشہ کیلئے دب کے رہ گئی ۔ اور عطیہ نے ماں کا یہ اندازِ برتری سلب کر لیا اور اسکے چہرے کے خطوط ابھرے اور تحکمانہ زاویے قائم کر لئے اور عطیہ کی ٹھوڑی یوں معلق ہو گئی جیسے سنگ مرمر کی بارہ دری ہو اور عطیہ یہ سمجھنے لگی کہ مرد صرف اسلئے بنے ہیں کہ عورتوں کے شانوں پر سر رکھ کر رو دیں اور عورت کا یہ فرض ہے کہ مرد کے لئے شانے پر سر رکھ کر رو دینے کی عشرت کے سامان مہیا کرے ۔

بہر صورت چاہے اسکی کوئی بھی وجہ ہو ، یہ ایک حقیقت تھی کہ عطیہ اپنے

آپ کو ایک نعمت سمجھتی تھی جو بنی نوع انسان پر اتاری گئی ہو جیسے کہ ہر نوجوان لڑکی آجکل سمجھتی ہے ۔

عطیہ کو یہ احساس دینے کی ذمہ داری زیادہ تر سکول کے چوکیدار پر عاید ہوتی ہے کیونکہ سب سے پہلے چوکیدار کی نگاہوں نے اپنی زبان میں اس راز کا عطیہ پر انکشاف کیا ۔ جب بھی وہ سکول کے دروازے میں داخل ہوتی تو دور کھڑے چوکیدار کریم داد کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چلنے لگتیں وہ اک جوش سے آگے بڑھتا ۔ وہ محسوس کرتی جیسے کریم داد کی نگاہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر اٹھا لیا ہو ۔ پھر وہ اسکے قریب آ جاتا ۔ بہت قریب اور عطیہ انجانے میں ادھر اُدھر کسی اور چیز کی طرف دیکھکر مسکراتی ۔ اسکی ایڑیاں اوپر کو اٹھ جاتیں اور شانے ہوا میں معلق ہو جاتے اور چہرے کے خطوط تن جاتے ۔ پھر دور پہنچ کر وہ کسی نہ کسی بہانے منہ موڑ کر پیچھے ضرور دیکھتی ۔ دور دروازے کے پاس کریم داد مغموم کھڑا ہوتا ۔ اس پر عطیہ کے شانے اور ابھرتے شاید اس لئے کہ کریم داد کو ان پر سر رکھنے کے لئے زیادہ جھکنا نہ پڑے اور عطیہ کی بے نیاز مسکراہٹ اور کھلتی ۔ پھر انکے گھر میں ایک نیا نوکر دتا آگیا ۔ اور عطیہ نے اسے دیکھکر محسوس کیا جیسے کریم داد روپ بدل کر انکے گھر آ پہنچا ہو ۔ دتّے نے عطیہ کو دیکھا اور آنکھیں جھپکنے لگا اور اسکا نچلا ہونٹ لٹکتا گیا ۔ حتیٰ کہ اس میں سے رال ٹپکنے لگی ۔ عطیہ یہ دیکھ کر جھوٹ موٹ غصّے میں چلانے لگی ۔ ”کیا دیکھتا ہے تو میری طرف“ ۔ اس پر دتّے کی آنکھیں بالکل ہی چندھیا گئیں اور ہونٹ سمٹ کر بٹوا بن گئے ۔ ”جی بی بی جی“ وہ یوں گنگنایا جیسے اُسکی تعریف کی گئی ہو ۔

اسکے بعد جب بھی عطیہ دتّے کے سامنے آتی تو اسکی نگاہوں کی دوربین کا فوکس گڈ مڈ ہو جاتا اور وہ گھبرا کر آنکھیں جھپکنے لگتا ۔ اور اُسکا ہونٹ لٹک جاتا اور اس میں سے رال ٹپکتی جیسے عطیہ میٹھی چیز ہو ۔ یہ دیکھکر اس میٹھی سی چیز میں تلخی پیدا ہو جاتی اور وہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی جسے سن کر بے چارہ دتا جامے میں پھولا نہ سماتا ۔ عطیہ کی تلخی اسے اور بھی شیریں بنا دیتی اور وہ ہونٹوں کی رال چاٹنے لگتا اور عطیہ خوش ہو کر اسے گھورتی ۔ ”پاگل تو نہیں تُو“ ۔ اور دتّے کی آنکھیں

جھپک جھپک کر اسے کہتیں ۔ "یہی میں سوچ رہا ہوں بی بی جی" ۔ اور عطیہ بظاہر جل کر کہتی ۔ "تُو تو بالکل پاگل ہے" اور دتّے کے ہونٹ فرطِ مسرّت سے کھل جاتے جیسے بی بی نے یہ بات تسلیم کر کے اسے بڑا اعزاز بخش دیا ہو ۔

دتّے کی آمد عظیم نتائج کی حامل تھی ۔ اس کی جھپکنے والی آنکھوں نے عطیہ کی آنکھوں میں اک شانِ استغنا پیدا کر دی ۔ اسکے لٹکتے ہوئے ہونٹ نے عطیہ کے خوبصورت ہونٹوں میں بے نیازی بھری مسکراہٹ دبا دی ۔ دتّے کے وجود نے عطیہ کی ایڑیاں اور اونچی کر دیں ۔ شانے ابھار دیے ۔ اور بالآخر دتّے کی دوربین کے بگڑتے بنتے فوکس نے عطیہ کے شفاف جسم کو یوں الٹ پلٹ کر رکھدیا کہ مختلف مقامات پر قوسیں ابھرنے لگیں ۔ واضح خطوط دھندلا گئے ۔ اعضا پُھولنے لگے ۔ جلد پھیلنے لگی اور زاویے سمٹنے لگے ۔

ان تبدیلیوں پر پہلے تو وہ ڈر گئی پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہوتا گیا کہ وہ نشانات دراصل اس کی جاذبیت کے نشان تھے ۔

اب سکول اور گھر کے درمیانی راستے پر نئے نئے دتّے اور کریم داد پیدا ہونے لگے ۔ جیسے جیکسن کی کہانی میں جناتی دانتوں کو بونے سے سورما پیدا ہوئے تھے ۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ راہ چلتے چلتے سورما تلوار سنبھال کر لڑنے کی بجائے ہتھیار ڈالکر آنکھیں جھپکاتے تھے ۔ یا انکی آنکھیں حیرت سے یوں کھلی کی کھلی رہ جاتیں جیسے ابھی اپنے خانوں سے نکل کر عطیہ کے پاؤں میں گر پڑیں گی ۔

راہ چلتے لوگوں کی عینی دوربین بگڑتے دیکھنے میں ایک عجیب راحت تھی ۔ مگر اس راحت کے حصول کے لئے وہ ہوا کے چلنے کی محتاج تھی ۔ جو اسکے برقعے کے پردے کو ایک ساعت کے لئے ہٹا دیتی تھی ۔

پھر آہستہ آہستہ اس نے ہوا کی عدم موجودگی میں پردے کو اڑانے کا فن سیکھ لیا اور بائیسکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کے لئے راہ چلنا مشکل ہو گیا اور لوگوں کی نظروں پر چڑھ کر عطیہ کے پاؤں میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی ۔ اور وہ شوقیہ طور پر رقص کی مشق کرنے لگی ۔

گھر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ، چھت پر ٹہلتے ہوئے صحن میں گھر کا کام

کرتے ہوئے رقص کا شغل خوب چلتا تھا ۔ غالباً اسی شغل کی وجہ سے اڑوس پڑوس کی چھتوں پر کئی ایک دتّے آ پہنچے ۔ حتّٰی کہ نگاہوں کا ایک تخت بن گیا جس پر عطیہ تاج پہن کر بیٹھ گئی اور اسکے قدموں میں ساری دنیا ایستادہ ہو گئی اور نگاہوں نے طلب کے دامن پھیلا دئے ۔

جوانی کی آمد کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئے اور عجیب سے احساس سے واقف ہوئی تھی یہ نیا احساس چنداں خوش کن نہیں تھا اور اسکے اس تفریحی رقص میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتا تھا ۔ ویسے بھی تو اسکی نوعیّت مبہم سی تھی ۔ بیٹھے بٹھائے وہ دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ، نہ جانے کہاں سے ایک میٹھا سا درد چپکے سے ابھرتا ۔ پھر وہ چیونٹی کی طرح رینگتا ۔ ایک اداسی چاروں طرف سے اسے گھیرنے کی کوشش کرتی ۔ پتہ نہیں وہ درد کیوں ہوتا تھا ۔ کہاں ہوتا تھا اور وہ اداسی کیوں بوند بوند اسکے دل کی گہرائیوں میں ٹپکتی تھی ۔ دُکھ کی دھنکی کیوں بجتی تھی اور ان سارے دتّوں کی نگاہوں کی بچھی ہوئی مسند کے باوجود وہ اُداسی کیوں بوند بوند گرتی رہتی تھی ۔ جیسے گلاب کے پھول پر اوس کے قطرے گر رہے ہوں ۔ مگر عطیہ نے اس بڑھتے ہوئے احساس کا واضح طور پر کبھی اعتراف نہ کیا تھا ۔ بلکہ ایسے وقت اسکے رقص میں اور بھی شدّت پیدا ہو جاتی ۔ اسکی بے نیاز مسکراہٹوں میں ایک نئی چمک ابھر آتی ۔ اس طرح اسکے جسم کا بند بند اس دکھ کے مبہم احساس سے آزاد ہونے کی کوشش میں لگ جاتا ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ منڈیروں پر دتّے حیرانی سے اسکی طرف دیکھتے ، بازاروں میں دتّوں کی آنکھیں ہلتیں اور وہ سائیکلوں سے گرگر کر اسکے قدموں میں آ پڑتے اور پھر یوں مظلوم نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتے جیسے سڑک کا کتّا کار تلے آ کر چیختا ہے ۔

پھر ایک واقعہ رونما ہوا ۔

ایک روز عطیہ کا والد ایوب بھاگا بھاگا گھر آیا ۔ اسکے ہاتھ میں ایک تار تھا ۔ "یہ سن لیا آپ نے جی" ۔ وہ چلّانے لگا ۔ "جاہ ڈھاکے سے یہاں تبدیل ہو گیا ہے وہ آج کی گاڑی سے یہاں پہنچ رہا ہے" ۔ ہائیں عطیہ کی ماں نے فرط خوشی سے سینہ پیٹ لیا ۔ "جاہ یہاں آ رہا ہے !"

عطیہ کے لئے جاہ محض ایک نام تھا کیونکہ اس نے اپنے اس خالہ زاد کو کبھی نہ دیکھا تھا ۔ چند ایک ابن عم سے تو واقف تھی ۔ جب وہ ماموں سرور کے ہاں دس روز کے لئے گئے تھے ۔ وہ دس دن بھی عجیب دن تھے ۔ ماموں سرور نیل کوٹ میں رہتے تھے ۔ ان دنوں ۔۔ نیل کوٹ ایک قصبہ تھا ۔ جونہی عطیہ نے نیل کوٹ کی گلیوں میں قدم رکھا چاروں طرف سے حیرت زدہ نگاہیں اس پر پڑنے لگیں ۔ عورتوں نے اسے دیکھکر ناک پر انگلیاں رکھ لیں ۔ بوڑھوں نے ہاتھوں سے سینے سنبھالے "بوا کون ہے یہ لڑکی ۔"

"کیا کہا اپنی نوراں کی ہے ! توبہ ان شہر والیوں نے تو حد کر دی" ۔ ممانی نے دیکھا ۔ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں ۔ ہائے یہ میری عطی ہے کیا ۔ ہائے میں قربان جاؤں ۔"

ایوب کی آمد کی خبر سن کر عطیہ کے ماموں زاد بھاگے بھاگے آئے ۔ رحمت علی دفعتاً عطیہ کو دیکھکر رک گیا ۔ سہم کر پیچھے ہٹا اور پھر سر کھجاتا ہوا واپس چلا گیا ۔ امانت علی نے باہر ہی سے جھانک کر دیکھا اور پھر وہیں چارپائی پر بیٹھ کر آنکھیں جھپکنے لگا ۔ اور عطیہ نے محسوس کیا جیسے نیل کوٹ میں دتّے ہی دتّے آباد ہوں ۔ اسکے ہونٹوں پر تمسخر بھری مسکراہٹ آگئی ۔ اور پھر وہ بے تکلف اپنے رقص کی نمائش کرنے لگی ۔

ہاں ابنِ عم سے وہ اچھی طرح واقف تھی ، اسلئے جاہ کا نام سنکر اس نے محسوس کیا جیسے دور ریل گاڑی میں ایک نیا دتا آنکھیں جھپکتا آ رہا ہو ۔ بہر حال ان دتوں میں ایک خوبی ضرور تھی ۔ پس منظر میں ان کے وجود سے عطیہ کے رقص میں ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا تھا ۔ اسکی حرکات میں ایک تازگی عود کر آتی ۔ اور چہرے کے سبھی زاویے ابھر ابھر کر نمایاں ہو جاتے اور یہ احساس شدّت سے تقویت حاصل کر لیتا کہ وہ بنی نوع انسان پر عطیہ کے طور پر اتاری گئی ہے ۔

اگلے روز جب وہ سو کر اٹھی تو اسے معلوم ہوا کہ جاہ انکے گھر آ پہنچا ہے اور اسکی والدہ کے ساتھ باتوں میں مشغول ہے ۔ یہ خبر پانے کے بعد عطیہ نے بے

پرواہی سے غسل کیا ۔ چہرے کے زاویے ابھارے وائل کے پھولوں میں قوسوں کو ابھارا اور پھر دونوں چوٹیاں اِدھر اُدھر لٹکا کر یوں باہر نکلی جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ کوئی آیا ہے ۔

صحن میں جا کر اس نے ایک غلط انداز نگاہ سے ملاقاتی کمرے کے کھلے دروازے کیطرف دیکھا ۔ جہاں جاہ اور اسکی والدہ باتوں میں مشغول تھے ۔ اور پھر وہ پڑوسیوں کی بچی عصمہ سے جو اتفاق سے اسوقت انکے صحن میں موجود تھی ۔ کھیلنے کے بہانے اپنے کلاسیکی رقص میں مشغول ہو گئی ۔ بے نیازی کے باوجود اس نے اپنی ماں کی آواز سنی ۔ "اے ہے اپنی عطی ہے" ۔ جاہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر عطیہ کی ماں سے یوں باتوں میں مشغول ہو گیا ۔ جیسے کچھ ہؤا ہی نہ ہو ۔ جیسے عطی عطیہ ہی نہ ہو ۔

عطیہ کے دل پر ٹھیس لگی ۔ لیکن وہ اور بھی شدت سے عصمہ کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو گئی ۔ اسکی حرکات میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی ۔ اسکے چہرے کے خطوط اور بھی مکعبی ہو گئے ۔ اسکی ہنسی میں رنگینی اور بھی بڑھ گئی ۔ لیکن اسکے باوجود جاہ اسکی ماں سے باتیں کرنے میں یوں مصروف رہا جیسے اسے اس رنگینی ، ان خطوط ، اور اس رقص سے کوئی دلچسپی نہ ہو ۔ پھر آہستہ آہستہ عطیہ کی نظر دھندلانے لگی ۔ مکان کی دیواریں چاروں طرف سے اسکی طرف بڑھنے لگیں ۔ جیسے اسے گھیر لینے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں ۔ پاؤں ٹھوکریں کھانے لگے ۔ پھر گھبرا کر وہ بھاگی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دوپٹہ دور پھینک کر اوندھے منہ بستر پر گر گئی ۔ اس کی مژگان کانٹوں کی طرح چُبھ رہی تھی ۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں ۔ دل دھک دھک کر رہا تھا ۔ اسکا تاج سر سے گر چکا تھا اور تخت ٹوٹ چکا تھا ۔ جاہ میں اتنی جرأت کہ وہ اسے خاطر میں نہ لائے اور جاہ کی آنکھیں اسے دیکھنے کے باوجود اپنے خانوں میں قائم رہیں ۔ اور اسکے ہونٹ ویسے ہی بند رہیں ۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ وہ تو عطیہ تھی عطیہ ۔ جسے بنی نوع انسان پر اتارا گیا تھا ۔ کیا جاہ بنی نوع انسان نہ تھا ۔

وہ پہلا دن تھا جب عطیہ کی آنکھوں میں نمی سی چھلک رہی تھی ۔ نہ جانے

کہاں سے نکل کر دکھ اس کی روح میں رینگنے لگا تھا ۔ وہی دکھ جسے وہ اپنے رقص سے دبا دیا کرتی تھی ۔ وہی دکھ جسے دتّوں کی نگاہیں چھلنی کی طرح چھان کر باہر نکال دیا کرتی تھی ۔

پھر غصے کی لہر اسکے تن بدن میں لہرائی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ اسے جھکنا ہی ہو گا ، قدموں میں نہ سہی شانوں پر سہی ۔ میں عطیہ ہوں عطیہ ۔ اسے سمجھنا ہی ہو گا ۔

جاہ ایک جرنلسٹ تھا ۔ جسے نئی خبروں اور پرانی قدروں سے دلچسپی تھی ۔ اسے نئی شراب اور پرانے جاموں سے کوفت ہوتی تھی ۔ اسکے چہرے پر ایک اطمینان کی سی کیفیت طاری رہتی تھی ۔ طنز اور تجسس ہونٹوں میں دبے دبے رہتے اور مزاح کی حِس آنکھوں کے کونوں سے جھانکتی ۔ لیکن عام نگاہیں اسکے چہرے پر اطمینان کے غلاف کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں ۔

ممکن ہے عطیہ کو دیکھکر جاہ کے ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی ہو لیکن وہ جنبش دبی دبی رہی اور اطمینان کا غلاف چھایا رہا ۔

اِدھر عطیہ کی نگاہوں میں گھر کی دیواریں دھندلائی رہیں ۔ اب تو اسے رقص میں بھی دلچسپی نہ رہی تھی ۔ بلکہ بسا اوقات جاہ کے کمرے کے سامنے چلتے ہوئے وہ ٹھوکر کھا جاتی جیسے وہ اسمِ اعظم اسکے ہاتھ سے کھو چکا ہو جو اسکی حرکات کی روانی اور رقص کی رنگینی کا ضامن تھا لیکن اسکے باوجود عطیہ ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی ۔

جب ماں نے جاہ سے اسکا تعارف کروایا تو عطیہ بے نیازی کا ایک عجیب سا پوز بنا کر کھڑی ہو گئی ۔ لیکن جاہ نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالکر کہا ۔ "ہوں تو یہ ہے عطی" ۔ عطیہ کے لئے جاہ کا یہ انداز قطعی طور پر ناقابلِ قبول تھا لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی : اسلام علیکم جاہ صاحب ۔ اس نے جان بوجھ کر اسے جاہ صاحب کہکر اپنی بلوغت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی لیکن جاہ پھر سے ممانی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو چکا تھا ۔

"شادی کے متعلق" وہ بولا "ممانی صاحبہ میں نے آج تک اس بارے میں

سوچا ہی نہیں" ۔ "آخر سوچنا ہی پڑے گا اسکے متعلق" ۔ وہ بولی ۔ "کب تک بے نیاز رہو گے تم" ۔ "سوچنا کیا ہے" ۔ وہ ہنسا ۔ "جب ہو جائیگی ہو جائیگی ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔"

"آخر اپنی پسند کی کرو گے نا ۔"

"میری پسند" اُس نے قہقہہ لگایا ۔ "میری پسند کا کیا ہے ۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کوئی عورت ہو ۔ بس ۔"

"عورت ہو" ؟ ۔ نوراں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی ۔ "تو کیا لڑکی سے بیاہ نہ کرو گے عورت سے کرو گے" ۔ نہ جانے کیوں وہ شرما گئی ۔

"نہیں نہیں" ۔ وہ گھبرا کر بولا ۔ "مطلب ہے کہ ہو گی تو لڑکی سے ۔ مگر لڑکی ایسی ہو جسمیں نسائیت ہو ۔ آجکل کی لڑکیاں تو عورت بننے اور کہلانے سے شرماتی ہیں ۔"

"کوئی بہت ہی پڑھی لکھی کرو گے ۔"

"کیوں" ۔ وہ چونکا ۔ "ضروری ہے کیا ؟"

"آخر آجکل کے لڑکے یہی تو چاہتے ہیں کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہو ۔"

"لیکن ممانی" ۔ وہ ہنسا ۔ "تعلیم لڑکیوں کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتی ۔"

"نہ جانے کیا کہہ رہا ہے تُو" ۔ نوراں سٹپٹا گئی ۔

عطیہ غصّے سے کھول رہی تھی ۔ "ہونہہ عورت" ۔ اور وہ یوں کھڑی دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے میں محو تھی جیسے اسے عورت ہونے سے قطعی دلچسپی نہ ہو ۔ لیکن اسکے دل کی گہرائیوں میں غصہ کھول رہا تھا ۔ "ہونہہ عورت" ! پھر وہاں کھڑے رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا اور وہ باہر نکل گئی اور پھر صحن میں جا کر ربڑ کے گیند کو بچیوں کیطرح اچھال اچھال کر ہنسنے لگی ۔ "ہونہہ عورت ۔۔۔۔"

اس روز سارا دن عطیہ یوں ناچتی رہی جیسے "ککلی کلیر دی" کھیل رہی ہو ۔ ہونہہ عورت ! ہونہہ عورت ۔

پتہ نہیں کیوں عطیہ کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا ۔ سکول سے آتے

ہوئے اب وہ برقعے کا پردہ اڑانے میں بھی دلچسپی نہ لیتی تھی اور جب کوئی سائیکل سوار دھم سے اسکے قدموں میں آگرتا تو جیسے وہ چونک جاتی اور حسبِ دستور مسکرانے کی بجائے اسکی پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ۔ سکول میں جب کبھی استانیاں اسے رقص کرنے کو کہہ دیتیں تو وہ صاف انکار کر دیتی ۔

ایک روز جب جاہ گھر پر نہیں تھا تو عطیہ کی ماں کو نہ جانے کیا سوجھی ۔ کہنے لگی "عطی آج تو ذرا ناچ کے دکھا دے ۔ بہت دن ہو گئے ۔"

"واہ اماں" وہ چڑ گئی ۔ "میں کیا ناچی ہوں ۔"

"ارے" اسکے ابا دوسرے کمرے سے بولے ۔ "یہ عطی کو کیا ہو گیا ہے جو ایسی باتیں کر رہی ہے ۔ اس نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی ۔ واہ بیٹا ناچنا تو فن ہے فن ۔"

اسکے بعد وہ دونوں عطی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے اور بالآخر اسے ناچ کرنا ہی پڑا جیسے کہ اکثر وہ ماں باپ کے سامنے کیا کرتی تھی ۔ اسکے بازو بل کھاتے ہوئے لہرائے ۔ چتون کمان کی طرح تن گئی ۔ مژگان ڈھلک گئیں اور پاؤں چلنے لگے ۔ اس روز اسکے ناچ میں شوخی نہ تھی اسکی حرکات میں جمال کی نسبت درد کا عنصر حاوی تھا ۔ جیسے وہ کسی کو دکھانے کی بجائے اپنے دکھ کا اظہار کرنے کیلئے ناچ رہی ہو ۔ یا جیسے وہ پہلی مرتبہ کسی دیوتا کو منانے کے لئے رقص کر رہی ہو ۔

جاہ نے اُسے رقص کرتے ہوئے دیکھا تو وہ دروازے ہی میں رُک گیا ۔ عطیہ کی ماں نے جاہ کو دیکھکر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور ایوب نے مسکرا کر منہ موڑ لیا ۔ صرف عطی کو جاہ کی آمد کا پتہ نہ چلا ۔

جب اُس نے رقص ختم کیا تو باپ نے کہا ۔ "اب تو میری بیٹی کو واقعی رقص کرنا آگیا ۔ کتنی ترقی کی ہے اس نے ۔ کیوں جاہ تم نے دیکھا ؟"

جاہ کا نام سنکر وہ چونکی ۔ اور گھبرا کر مڑی ۔ اسکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی پھر وہ دانتوں میں اُنگلی رکھ کر بھاگی ۔

"ہا ہا ہا" ۔ ایوب نے قہقہہ لگایا ۔ عطی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جاہ بھی

دیکھ رہا ہے ۔ ماں زیرِ لب بولی ۔ "لو یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے" ۔ ایوب دفعتاً خاموش ہو گیا جیسے واقعی وہ ہنسنے کی بات نہ ہو اور پھر کچھ کہنے کے لئے بولا ۔ "عطی کا رقص سارے سکول میں بہترین قرار دیا گیا ہے ۔ انعام لیا ہے اس نے ۔"

"اوہ ؟ ۔۔۔" جاہ نے تعجب کا اظہار کرنے کی کوشش کی ۔

"پسند آیا تمہیں ۔"

"ہاں اچھا ہے" ۔ جاہ نے سرسری طور پر کہا ۔ "لیکن ابھی تو محض جمالی حرکات ہیں ۔ ابھی ان میں دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ہوئیں ۔"

"ہائیں ۔۔۔" ایوب جاہ کی طرف جوش میں لپکا ۔ "واہ واہ واہ کیا بات کہی ہے ۔ ابھی دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ہوئیں ۔ بڑے فن شناس ہو جاہ ۔ واہ واہ واہ ۔"

"لیکن ابھی عطی ہے بھی تو بچّی" ۔ ماں بولی ۔

"ہاں" ایوب نے قہقہہ لگایا ۔ "ابھی سے دل کی دھڑکنیں کیسے شامل ہو جائیں ۔"

"جی !" جاہ نے زیرِ لب کہا ۔ "رقص وہ پھول ہے جو جب تک نسائیت کی شبنم سے نہ بھیگے خوشبو نہیں دیتا ۔"

"اونہہ نسائیت " اندر عطیہ غصّے میں کھول رہی تھی ۔ اسے ماں باپ پر غصہ تھا ۔ انہوں نے جاہ کو اسکا رقص دیکھنے کا موقع ہی کیوں دیا ۔ بڑا نسائیت کا متوالا تو دیکھو ۔ دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ۔ ہونہہ ۔

آخر ہار کر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی اور مطالعہ کی میز پر بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسکی آنکھوں میں لفظ دھندلا گئے اور اس نے اپنا سر کتاب پر رکھ دیا ۔

عطیہ کے دل میں جاہ کے لئے نفرت سی پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ اُسے دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی ۔ جاہ کو گھر سے نکالنا اسکے بس میں نہ تھا ۔ اور جاہ کے وہاں ہوتے ہوئے عطیہ کا اسکے وجود سے بے پروا رہنا ممکن

نہ تھا ۔ نہ ہی اب وہ اپنے پرانے مشاغل کو اپنا سکتی تھی ۔ کوشش تو اس نے کئی بار کی تھی ۔ لیکن نہ جانے کہاں سے ایک آواز سی آتی ۔ "اونہہ" اور وہ محسوس کرتی جیسے وہ ٹکاہوں پر چڑھنے اور رقص کرنے کا کھیل ایک عام سا مشغلہ ہو ۔ اور وہ دستے ! دتوں سے تو اب اسے نفرت ہوئی جا رہی تھی ۔

پھر ایک روز جرأت کر کے وہ جاہ کے کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ اُس نے ہاتھ میں کتاب پکڑی ہوئی تھی اور چہرہ یوں سنجیدہ بنا رکھا تھا جیسے واقعی کسی کتابی مسئلے میں کھوئی ہو اور اس انداز کو تقویت دینے کے لئے اس نے پنسل منہ میں ڈال رکھی تھی ۔ جاہ نے اسے دیکھا ایک ساعت کے لئے اسکی آنکھوں کے کونوں میں ننھے سے دئے روشن ہوئے اور پھر بُجھ گئے ۔

چند ایک باتیں کرنے کے بعد جلد ہی عطیہ اسے اس مسئلے پر لے آئی جس پر جاہ سے بات کرنے کے لئے وہ عرصہ دراز سے بے تاب تھی ۔ "دیکھئے نا جاہ صاحب" ۔ اس نے معصومیّت بھرے انداز سے کہا ۔ "ایک عورت کی حیثیت سے جہاں تک میں سمجھتی ہوں ۔۔۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔

"تو کیا میں عورت نہیں ہوں ۔" عطیہ نے معصومیّت سے مسکرا کر پوچھا ۔

"شاید ہو جاؤ کسی روز" ۔ وہ ہنسا ۔ "فی الحال تو ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے تم پک نِک پہ آئی ہو ۔"

"اچھا تو مجھے بتائیے" ۔ اس نے بھوؤں کو تان کر کہا ۔ "وہ کیا چیز ہوتی ہے جسے آپ عورت کہتے ہیں ۔"

"اوہ ۔" وہ سنجیدہ ہو گیا ۔ "یہ بتایا نہیں جا سکتا ۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے" ۔ "یعنی" وہ ایک ساعت رک کر بولی ۔ "آپ کا خیال ہے کہ آجکل کی لڑکیاں سبھی پک نِک پر آئی ہوئی ہیں ۔"

"نہیں" جاہ نے ہاتھ کی کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی ۔ "سبھی تو نہیں لیکن یہ پک نِک کی روش تحریک بنتی جا رہی ہے ۔"

عطیہ کو غصہ آنا شروع ہو گیا ۔ تو کیا جاہ کے خیال میں وہ میلے پر آئی ہوئی تھی ۔ بہت بنتا ہے ۔۔ دفعتاً اسکی ایڑیاں اٹھیں اور اک شان بے نیازی سے گھوم کر وہ باہر نکل گئی ۔

اس روز سارا دن عطیہ یوں رقص کرتی رہی جیسے واقعی پک نِک پر آئی ہو ۔ سکول کے راستے میں اس نے کئی ایک سائیکل سواروں کو اپنے قدموں میں گرنے پر مجبور کر دیا ۔ واپس گھر پہنچ کر وہ کوٹھے پر گھومتی پھری ۔ صرف یہی نہیں اس روز اس نے انتقامی جذبے کے تحت چھت پر کھڑے ہو کر رسہ کھیلنا شروع کر دیا ۔

جاہ اس دوران میں دو ایک مرتبہ کمرے سے باہر نکلا ۔ لیکن اس نے عطیہ کی طرف توجہ نہ دی اور نہ ہی اس نے چھت کی طرف سر اٹھا کر دیکھا ۔ اس روز اسکے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت مصروف ہو ۔ جیسے اسے ادھر ادھر کی تفریحی باتوں کا جائزہ لینے کی فرصت نہ ہو ۔

جاہ کی عدم توجہی محسوس کر کے عطیہ کو ایک دھچکا لگا اور وہ چاروں طرف لگا ہوا دتوں کا میلہ اسکی نگاہ میں دھندلا گیا ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے وہ گڑیوں کا کھیل ہو اور وہ منڈیروں پر لٹکے ہوئے گڈے بے معنی بے مصرف اپنی آنکھیں پھاڑنے میں اور دانت نکالنے میں مصروف ہوں ۔ اُس نے رسہ پرے پھینک دیا اور بھاگ کر نیچے اتر آئی ۔ اور پھر غسل خانے میں جا کر پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگی ۔

دفعتاً غسل خانے کا دروازہ کُھلا ۔ اسے ایک بھاری مگر دبی دبی آواز سُنائی دی ۔ ”تم ۔۔۔ عطیہ ۔۔۔۔“

عطیہ نے پُرنم نگاہیں اوپر اٹھائیں ۔

”تم ۔۔۔ عطیہ“ ۔ جاہ کی آواز جذبات سے بھیگی ہوئی تھی ۔

.............○.............

نومان اور منیرہ

رات کے وقت جب وال کلاک بارہ بجاتا ہے تو ملحقہ کمرے سے اسکی آواز آتی ہے ۔ "منیرہ ، منیرہ" ۔ اور ایک ساعت کے بعد نومان کمرے کے دروازے میں آکھڑا ہوتا ہے اور اس کونے کی طرف خالی نگاہوں سے دیکھتا ہے جہاں ریشمیں بستر پر ایک ہی لحاف میں ، میں اور منیرہ لیٹے ہوتے ہیں ۔ اسے سامنے کھڑے دیکھکر میں چونک کر منیرہ کیطرف دیکھتا ہوں ۔ اسکا منہ سرخ ہو جاتا ہے ۔ مژگاں جھک جاتی ہیں ۔ جیسے وہ اپنی نمناک آنکھوں کو چھپانا چاہتی ہو ۔

"سو گئی منیرہ" وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگتا ہے ۔ "سو گئی !" وہ کمرے میں داخل ہو کر کھوئے ہوئے الفاظ میں اپنے آپ سے کہتا ہے ۔ "ابھی سے سو گئی ۔ کتنی جلدی سو جاتی ہے ۔ بے چاری تھک جاتی ہے نا ۔ سو جاتی ہے ۔ اچھا ہوا سو گئی ، سوئی رہو ۔ سوئی رہو منیرہ ، سوئی رہو ۔ میں تو ویسے ہی آگیا تھا ویسے ہی چلو صبح سہی ۔ صبح ، سوئی رہو" ۔ چند ساعت کے لئے وہ برآمدے میں ٹٹول ٹٹول کر اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا رہتا ہے ۔

اسکی آواز جذبہ محبت سے لرز رہی ہوتی ہے ۔ اسکا انداز دیکھکر میرے دل میں ترس پیدا ہوتا ہے ۔ اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے کسی اندھے اپاہج بھکاری کے کاسہ سے نقدی چرائی ہو ۔ اسوقت میرا جی چاہتا ہے کہ میں چیخ کر کہوں نہیں نہیں تمہاری بیوی سو نہیں رہی وہ میرے پاس بیٹھی ہے ۔ میرے پاس ۔ میں گھبرا کر منیرہ کی طرف دیکھتا ہوں ۔ اسوقت اسکے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت اور پاکیزگی چھا جاتی ہے اور اسکے سر کے گرد ایک نورانی حلقہ بن جاتا ہے ۔ جیسے ہوس کاری سے اسکا دور کا واسطہ نہ ہو ۔ جیسے بیچنے کے لئے اسکے پاس جسم ہی نہ ہو ۔ اسکی آنکھوں میں نمناک منت بھری ہوتی ہے اور

اسکے گال پر ڈھلکا ہوا آنسو اس خاموش منّت کو پکاروں میں بدل دیتا ہے ۔

"سو گئی ! سو گئی ! منیرہ سو گئی" ! اسکا خاوند یوں گنگناتا ہوا باہر نکل جاتا ہے جیسے لوری گا رہا ہو ۔ منیرہ کا سر جھک جاتا ہے اور پھر ایک ہلکی سی آواز جیسے کوئی تار ٹوٹ گیا ہو ۔ معاً میری نگاہ آتشدان پر رکھی ہوئی تصویر "امید" پر جا پڑتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسکے رباب کا آخری تار ٹوٹ گیا ہو اور اسکا سر اور بھی جھک گیا ہو ۔ اسوقت کمرے کی ہر چیز سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ میں دلّالہ حشمت کو ادا کی ہوئی رقم کا مطالبہ کئے بغیر دودھ کیلئے دو روپے منیرہ کے سامنے پھینک کر دیوانہ وار باہر نکل جاؤں اور گلی میں پہنچ کر چلّا چلّا کر یہ کہوں ۔ "میں الو کا پٹھا ہوں ۔ پاگل ہوں کہ بیس تیس روپے خرچ کر کے اس گھر میں عیش کرنے کے لئے آتا ہوں ۔ اس گھر میں جہاں ہر چیز سسکیاں بھرتی ہے ۔ جہاں گھڑی ٹک ٹک کرنے کی بجائے کراہتی ہے ۔ اور کسبی کے سر پر یوں نور کا ہالہ دکھائی دیتا ہے جیسے وہ راہبہ ہو ۔"

ہر ہفتے کی رات یہی واقعہ دہرایا جاتا ہے ۔ حشمت دلّالہ روپے لیتے ہوئے مجھ سے کہتی ہے تم اسکی پرواہ نہ کرنا وہ تو اندھا ہے ۔ ہر ہفتے کی رات کو وہ میرے کمرے میں آکر ہماری طرف دیکھتا ہے ۔ لیکن نہیں دیکھتا ۔ منیرہ اپنے خاوند کو دیکھکر ڈرتی نہیں ۔ اسکے چہرے پر نفرت نہیں جھلکتی بلکہ اسکی نمناک آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلک آتا ہے اور چیخ چیخ کر اپنی حماقت کا اعلان کرنے کی شدید خواہش کے باوجود میں چپ چاپ بیٹھا منیرہ کا منہ تکتا رہتا ہوں ۔ اور عیش و نشاط کی محفل سجانے کی جگہ ہم دونوں غم کھاتے ہیں ۔ منیرہ اپنے اندھے خاوند کا غم کھاتی ہے اور میں منیرہ کا ۔ ہر ہفتے کی رات کو ۔

آپ جانتے ہیں میں افسانہ نویس ہوں ۔ آج تک میں افسانوں کی دنیا میں رہا ہوں ۔ نہ جانے وہ کتنا منحوس لمحہ تھا جب میرے ایک دوست نے مجھے افسانوں کی دنیا میں رہنے کا طعنہ دیا تھا اور حقائق سے روشناس ہونے پر اکسایا تھا۔ اور آج میں نومان اور منیرہ کا واقعہ قلمبند کر رہا ہوں ۔ لیکن یقین جانئے

یہ پہلا اور آخری واقعہ ہے ۔ جسے میں قلمبند کروں گا ۔ واقعات سے تو افسانے ہی بہتر ہیں ۔

واقعات کی دنیا کو قریب سے دیکھنے کے لئے مجھے کئی ایک مقامات پر جانا پڑا ۔ ممکن ہے اسمیں ہوس کاری کا عنصر بھی شامل ہو ۔ لیکن جب آپ دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں تو آپ کے احساسات ایک ایسی پگڈنڈی پر چل نکلتے ہیں جو عیش و نشاط کی شاہراہ سے ہٹ کر جاتی ہے ۔

واقعات کی جستجو میں پہلی "پرائیویٹ" جسے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ایک کم عمر زرد ڈری ہوئی بچّی تھی ۔ جس وقت اسکی گرگ طبیعت دلّالہ اسکے دام ٹھہرا رہی تھی تو وہ سردی کی شدت سے کانپ رہی تھی کیونکہ اسکے جسم پر ایک قمیض تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اپنا سویٹر اتار کر اسکے کندھے پر رکھدیا اور خود بات کئے بغیر باہر نکل آیا ۔

دوسری پرائیویٹ ، ایک غلیظ گھسی ہوئی کسبی تھی جو اسقدر چل چکی تھی کہ اسمیں روح کا عنصر ختم ہو چکا تھا اور صرف بھدا بھونڈا غلیظ جسم باقی رہ گیا تھا ۔ ایک جونک میری طرف رینگ رہی تھی ۔

تیسری مرتبہ جب دلّالہ حشمت پُر پیچ گلیوں میں میرے آگے آگے آ رہی تھی ، تو میں سوچ رہا تھا نہ جانے اس بار کیا سامنے آئیگا ۔

دفعتاً وہ رکی اور ایک مکان میں داخل ہو گئی ۔ کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلی اور مجھے اشارہ کیا آ جاؤ ۔ میں اندر چلا گیا ۔

پہلی مرتبہ شریفانہ گھر کو دیکھکر میں گھبرا گیا ۔ شاید ہم غلط مکان میں آ گئے ہیں ۔ میں نے سوچا ۔ لیکن جب منیرہ میرے سامنے آئی تو میں حیرانی سے اسکا منہ تکنے لگا ۔ اسکی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں ۔ ناک سرخ ہو رہی تھی ۔ بازو لٹک رہے تھے ۔

"تیس روپے ہونگے" ۔ حشمت بولی ۔

اور اُس نے ہاتھ پھیلا دیا ۔ منیرہ بت بنی کھڑی تھی جیسے اسے اس سودے

سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ اسکا جسم ابھر کر مجھے اپنی پلیٹ میں لینے کی بجائے سمٹ رہا تھا جیسے معدوم ہونے کی کوشش کر رہا ہو ۔

اسکے منہ پر ایک مایوس مسکراہٹ جھلکتی اور مجھے محسوس ہوتا جیسے اگر وہ مسکرا نہ دے تو یقیناً اسکی چیخیں نکل جائیں گی ۔ جیسے وہ مسکراہٹ چیخوں کو روکنے کا ایک انوکھا طریقہ ہو ۔ مسکرا کر وہ پھر چھت کی طرف دیکھنے لگتی تھی ۔ اسکے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف سے تحریک کی منتظر تھی اور مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر اسکی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی ۔ اور پھر دفعتاً دروازے میں وہ آ کھڑا ہوا ۔ اسکا خاوند نومان ۔ اور میری گھبراہٹ دیکھ کر منیرہ کی مسکراہٹ منّت میں بدل گئی ۔ نمناک منّت ، ایک خاموش پکار ۔ اور پھر جب وہ اپنی پوری لوری گنگنا کر چلا گیا تو منیرہ کے چہرے کا تناؤ ٹوٹ گیا ۔

منیرہ میں عجیب سی لطافت تھی ، جیسے فضا میں ایک رنگین سا جالا تنا ہوا ہو ۔ جیسے نسائیت سے روح کشید کر کے پھوک پھینک دیا گیا ہو ۔ اسکی تمام تر کشش اسکی شخصیت سے وابستہ تھی اور اسکی شخصیت میں کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو اسکے جسم کی طرف اشارہ کرتا ہو ۔ بلکہ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے اسے ہاتھ لگایا تو وہ میلی ہو جائیگی ۔ یہی نہیں اسے دیکھ کر اپنے ہاتھ میلے محسوس ہوتے تھے اور بڑھانے کی بجائے اُنہیں سمیٹ کر چھپا لینے کو جی چاہتا ۔

شادی سے پہلے دو ایک نوجوانوں نے اُسے اشارے بھی کئے تھے ۔ ایسے اشارے جو عنفوان شباب میں کیے جاتے ہیں اور جو مفہوم سے لبریز ہوتے ہیں ۔ جنہیں دیکھ کر لڑکیوں میں اور کچھ نہیں تو شوخی کا ایک چشمہ ابل پڑتا ہے اور سنجیدگی سے اسے خاطر میں لائے بغیر وہ یوں خوش ہو جاتی ہیں جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو ۔

لیکن منیرہ ان کی طرف یوں حیرانی سے دیکھتی رہی تھی جیسے ان اشاروں میں خوش ہونے یا بگڑنے کی کوئی بات ہی نہ ہو ۔ اور یہ دیکھ کر اشارہ کرنے والوں میں بات بڑھانے کی ہمت ہی نہ پڑی تھی ۔ پھر اسکی شادی نومان سے ہو گئی تھی اور شادی کے فوراً بعد اس ۔۔۔ کی والدہ انتقال کر گئی اور وہ تنہا رہ گئی

تھی کیونکہ نہ تو اسکا کوئی بھائی تھا نہ بہن ۔

نومان ایک مہاجر لڑکا تھا ۔ جس کے عزیز و اقارب پیچھے رہ گئے تھے ۔ وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ وہ انکے گاؤں میں جا نکلا تھا اور بڑھیا اسکی کم گوئی سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ اسکے ساتھ کرنا منظور کر لیا تھا ۔

نومان کا قد چھوٹا تھا ۔ جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا ۔ مزاج بلغمی تھا ۔ ہونٹ موٹے تھے اور طبیعت میں نہ تو تیزی تھی اور نہ تلخی ۔ بہر حال وہ ایک غریب لڑکا تھا اور اپنی غربت پر گویا مطمئن تھا ۔ منیرہ کے گھر آنے کے بعد اسکے اطمینان میں مسرّت کا عنصر پیدا ہوگیا تھا ۔

نومان دفتر میں ٹائپسٹ تھا ۔ اسکی تنخواہ سوا سو سے زیادہ نہ تھی ۔ لیکن اسے اس بات کا کوئی ملال نہ تھا ۔ تنخواہ لیکر وہ سیدھا گھر آتا تھا اور ساری تنخواہ منیرہ کے ہاتھ میں دیدیتا۔ پھر ہنس کر کہتا لو اب تم جانو اور تمہارا کام اور منیرہ اسے بار بار گنتی جیسے قارون کی دولت ہاتھ آگئی ہو ۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ اسکے خاوند کی تنخواہ بہت کم ہے ۔ الٹا وہ تو تنخواہ وصول کر کے بے حد خوشی محسوس کرتی تھی ۔ پھر جب نومان کو بس میں بیٹھ کر کہیں جانا ہوتا یا بازار سے پان کھانے کے لئے ایک آنہ مانگنا ہوتا یا بلیڈوں کے پیکٹ کے لئے پانچ آنے طلب کرنے ہوتے تو وہ کہتا ۔ "خزانچی صاحبہ ذرا خزانے کا منہ ڈھیلا کرو نا ۔ ایک آنہ پان کیلئے چھ پیسے بس کے اور پانچ آنے بلیڈوں کے نکالو نا ساڑھے سات آنے" ۔ "صرف ساڑھے سات آنے" ۔ وہ مسکرا کر کہتی ۔

اور صندوقچی سے سگریٹ کا ڈبہ نکالتے ہوئے جس میں وہ اپنا خزانہ رکھا کرتی تھی ، یوں اسکی طرف دیکھتی جیسے اس نے بہت کم پیسے مانگے ہوں ۔ صرف ساڑھے سات آنے ۔ وہ ہنستی ۔ مانگنا ہی تھا تو کچھ اور مانگا ہوتا ۔

"اچھا" وہ کہتا "تو ساڑھے آٹھ آنے دے دو ۔ ایک آنے کا عشق کریں گے" ۔ اس پر وہ ہنستی ۔ "اونہوں اب نہیں اجابت کا لمحہ ختم ہوگیا" ۔ اس پر وہ دونوں ہنستے ۔ حساب کتاب پر عام طور پر میاں بیوی لڑا کرتے ہیں لیکن

وہ اس بات پر ہنسا کرتے تھے ۔ صرف حساب کتاب کی ہی بات نہیں وہ تو ہر بات پر ہنسا کرتے تھے ۔ حتی کہ اس بات پر بھی کہ شادی کے بعد پہلے پہل جب وہ اس محلے میں آکر رہے تھے تو محلے کے نوجوانوں کی نگاہیں منیرہ کی جانب اٹھیں اور وہ حیران رہ گئے ۔ اوّل تو منیرہ کا حسن ہی ایسا تھا کہ ایک لطیف اور خوشگوار سا اثر چھوڑ جاتا تھا جیسے جلتی ہوئی اگربتی پاس سے گزر گئی ہو یا جیسے بلیک میجک چاکلیٹ کا اشتہار ہو ۔ جس پر جلی حروف میں "عام سے ہٹ کر" لکھا ہوتا ہے ۔ دوسرے وہ سوچتے تھے اِس بھدے بھونڈے اور چمک سے عاری مہاجر لڑکے کو ایسی لڑکی کہاں سے مل گئی ۔ دو ایک نے تو یہاںتک جسارت کر دی کہ انکے روبرو گنگنانے لگے ۔ زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت ۔ پھر محلے میں شور مچ گیا ۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے ۔ عورتیں بہانے بہانے آکر اُسے دیکھنے لگیں ۔ نوجوان کوٹھوں پر چڑھ کر اسے دیکھنے لگے ۔ شوقین مزاج دھوپ میں کھڑے ہو کر مونچھیں مروڑنے لگے اور بوڑھے چھپ چھپ کر اُدھر جھانکنے لگے ۔ اِس پر عورتوں نے ہنگامہ مچا دیا ۔ گھروں میں بات بات پر لڑائیاں ہونے لگیں ۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں خوفناک حد تک بڑھ گئیں ۔ وہ تو منیرہ کی طبیعت کا خدا بھلا کرے کہ بات بڑھنے نہ پائی ۔ ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا محلے میں ۔

عورتیں غصے سے بھری ہوئی منیرہ کے ہاں آتیں لیکن منیرہ کی سادگی اور عجز کو دیکھکر ٹھنڈی ہو جاتیں اور لاشعوری طور پر انکے دل میں یقین ہو جاتا کہ اسمیں شعلہ بھڑکانے کی صلاحیت نہیں ہے ۔ کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھکر محلے والوں کو دکھتی ضرور تھی مگر اس میں دکھانے یا دیکھنے کی خواہش نہ تھی ۔ "بیچاری !" منیرہ کو دیکھ کر وہ زیرِلب کہتیں اور چلی جاتیں ۔

عورتوں کے مطمئن ہونے کے بعد وہ ہنگامہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا اور محلہ معمول پر لوٹ آیا ۔ لیکن عورت کے متعلق بات ہو تو مرد کو بڑی دیر کے بعد سمجھ میں آتی ہے اور بسا اوقات آتی ہی نہیں ۔ اسکے علاوہ عورتیں خوب جانتی ہیں کہ جس عورت میں دکھانے اور دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں وہ تو محض بے

جاری ہے ۔ لیکن مرد صلاحیتوں پر نہیں جاتے وہ اُمید پر جیتے ہیں ۔ لہذا انہوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں ۔

منیرہ نے ان سرگرمیوں کو محسوس ضرور کیا تھا اور ممکن ہے سوچا بھی ہو کہ اس ہنگامے کا مطلب کیا ہے لیکن سرسری توجہ کے بعد وہ مسکرا کے پھر سے اپنی دنیا میں کھو گئی ۔ البتہ اِس موضوع پر نومان اور منیرہ میں بات ضرور ہوا کرتی تھی ۔

جب وہ دونوں کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے منیرہ سینے پرونے کے کام میں مصروف ہوتی اور نومان اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا ہوتا تو دفعتاً وہ اخبار ایک طرف رکھ کر "تت تت" کرنے لگتا ۔ "کیا ہے" وہ سر اٹھائے بغیر پوچھتی ۔ "بے چارہ" ۔ وہ آہ بھر کر کہتا ۔ "کون بے چارہ" ۔ وہ پوچھتی "تمہاری جانے بلا" وہ ہنستا ۔ "آخر بات کیا ہے" ۔ وہ کام الگ رکھ کر اسکی طرف دیکھتی اور مسکراتی "کچھ بھی نہیں" ۔ وہ آہ بھر کر کہتا ۔ "بے چارہ فیل ہو جائیگا ۔"

"کون فیل ہو جائیگا ۔"

"یہ چودھری صاحب کا بیٹا اور کون" ۔ وہ ملحقہ گھر کی طرف اشارہ کرتا ۔ "بے چارہ پردوں کے پیچھے بیٹھ کر کتاب سامنے کھول کر تمہیں دیکھتا رہتا ہے" ۔ وہ زیر لب ہنسا ۔

"خواہ مخواہ" ۔ وہ ہنسکر چلائی ۔ "آپ بھی حد کرتے ہیں ۔"

دیکھ لو چاہے" ۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کہتا ۔ "لیکن خیال رکھنا اسے معلوم نہ ہو۔ دیکھو جھروکے کے پیچھے وہ سایہ سا جو ہے ۔ دیکھا ۔"

"آپ تو خوامخواہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں اس بات کے" وہ کہتی ۔ "پیچھے تو وہ پڑا ہوا ہے ۔" وہ جواب دیتا ۔ "میں تو کچھ کہتا ہی نہیں ۔"

"تو کہیئے نا" ۔ وہ ہنستی ۔ "اسے کہیئے نا ۔"

"چلو دیکھنے دو ہمارا کیا لیتا ہے ۔" وہ زیر لب کہتا ۔ "بیچارہ دیکھ ہی لیتا ہے نا ۔ اور کیا ۔ اور یہی اکیلا تو نہیں سبھی دیکھتے ہیں ۔ جسکا داؤ چلتا ہے وہی دیکھتا ہے ۔ کیا کیا جائے ۔"

اس پر وہ چڑ جاتی ، "توبہ آپ تو حد ہیں ۔"
"میں حد ہوتا تو وہ مجھے دیکھتے" ۔ وہ چپکے سے کہتا ۔
"تو کیا میں ہوں حد ۔"
اس پر وہ ہنستے رہتے ۔

پھر مونچھوں والا پنواڑی کوٹھے پر آکر یوں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگتا جیسے کسی گھڑی کا پنڈولم ہو اور وہ یوں مونچھیں مروڑتا اور مسکراتا جیسے اپنے مرد ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہو اور اس حقیقت پر نازاں ہو ۔ پھر دُور سفید منزل کا لکھ پتی تاجر دور سے آنکھیں مٹکاتا ماتھے پر ہاتھ رکھکر سلام پہنچاتا اور پھر سر کھجانے لگتا جیسے ماتھے پر ہاتھ رکھنا بھی سر کھجانے کے عمل کا ایک حصّہ ہو ۔

لکھ پتی شیخ دُور سے منیرہ کو سبز نوٹ بھی دکھایا کرتا تھا ۔ منیرہ کو تو بات سمجھ میں نہ آئی تھی پھر ایک روز جب اس نے نومان سے بات کی تو وہ ہنسنے لگا ۔ بولا "حد ہو گئی ۔ وہ نیلا کاغذ نہیں ۔ وہ تمہیں سو کا نوٹ دکھاتا ہے ۔"
"نوٹ ۔" وہ چلائی ۔
"ہاں ہاں نوٹ ۔" وہ بولا ۔ "اور وہ بھی پانچ دس کا نہیں سو کا ۔ دیکھا کتنی قیمت ڈالتا ہے وہ تمہاری ۔"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ" وہ نیم تبسّم نیم غصّے سے بولی ۔
"بے چارہ بڑی تکلیف میں ہے ۔" نومان نے کہا ۔
"خدا کے لئے اب بس کیجئے ۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی ۔
"اچھا تمھاری مرضی ۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا ۔ "ویسے بات تو بس کرنے والی نہیں ۔ اچھا تو اسی بات پر سینما دکھا دو مجھے ۔"
"اونہہ سینما نہیں ۔" وہ ہنسنے لگی ۔ "خزانہ خالی ہو رہا ہے ۔"
"اچھا" ۔ اس نے آہ بھری "تو ہم باہر لگی ہوئی تصویروں پر گزارہ کر لینگے ۔"

اس طرح وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہتے ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی

اور وہ اپنی عادت کے مطابق ہونٹ ڈھیلے کر کے دانت نکالتا ۔ یوں وہ دونوں خوش و خرم رہتے اور انہوں نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ انکی آمدنی کافی نہیں ۔ انہوں نے اپنے اخراجات یوں حساب سے قائم کر رکھے تھے کہ انہیں مالی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کبھی ۔

پھر ایک نیا واقعہ پیش آیا ۔ بظاہر وہ واقعہ انکے لئے اتنا اہم نہیں تھا اس لئے کسی کو خیال ہی پیدا نہ ہوا کہ وہ خوشگوار سا واقعہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا ۔

ایک روز نومان حسب عادت ہونٹ سمیٹ کر کہنے لگا ۔۔ "منیرہ میری تبدیلی ہو گئی ہے ۔" تبدیلی کا نام سُن کر منیرہ گھبرا گئی "بولی ۔ تو کیا ہمیں یہاں سے جانا ہو گا ۔" "گھبراؤ نہیں" ۔ اس نے جواب دیا ۔ "جانا وانا کہیں نہیں صرف اتنا ہوا ہے کہ عام دفتر سے نکال کر مجھے صاحب کے ساتھ لگا دیا گیا ہے ۔ یعنی صاحب کا پی ۔ اے یعنی پرسنل اسٹنٹ"

"اس سے کیا فرق پڑے گا ۔" منیرہ نے پوچھا ۔

"فرق کیا پڑنا ہے ۔" وہ بولا ۔ "صرف یہی ہو گا کہ یہاں سے اڑایا وہاں جا بیٹھا ۔ البتہ کہتے ہیں معلوم نہیں سچ ہے یا جھوٹ کہتے ہیں ۔ وہاں بالائی آمدنی ہو جاتی ہے کچھ ۔"

"بالائی آمدنی" منیرہ نے دہرایا ۔ "وہ کیا ہوتی ہے جی ۔"

"یعنی" نومان نے کہا "حاجتمند لوگ اب ہمیں بھی رنگدار کاغذ دکھایا کریں گے ۔ سبز نہ سہی ۔ پھر بھی رنگدار تو ہونگے ۔"

اسوقت تو بات مذاق میں ٹل گئی لیکن جلد ہی نومان و منیرہ کے حالات تیزی سے بدلنے لگے ۔

تبدیلی کے چند ایک روز بعد جب وہ دفتر سے واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں پیکٹ تھا ۔ منیرہ نے جب اسے کھولا تو وہ حیران رہ گئی ۔ اسمیں کریپ کی ایک خوبصورت قمیض تھی ۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوپٹہ آ گیا ۔ پھر ایک لفٹی اور بالآخر ایک سنگھار دان جس میں پاوڈر سُرخی ، ناخون پالش کی بوتل اور جانے کیا کیا تھا ۔

سنگھاردان منیرہ کو دیتے ہوئے وہ مسکرا کر زیرِ لب مسکرا کر بولا ۔ "سمجھ لو ۔ بے چارے اب بالکل تباہ ہو گئے ۔"

"کون تباہ ہو گئے" ۔ منیرہ نے ہنستے ہوئے پوچھا ۔

"وہ کالج کا لڑکا، مونچھوں والا پنواڑی اور سبز نوٹ دکھانے والا سبھی تباہ ہو گئے ۔ پہلے ہی بیچاروں کی جان پر بنی تھی ۔ اب تو رہی سہی کسر بھی نکل جائے گی ۔ ذرا چل جائے نا پاوڈر سُرخی کا ایک دَور کل ۔ کیا یاد کرینگے سالے ۔" وہ زیرِ لب ہنسنے لگا ۔

پھر ایک روز زبردستی منیرہ کے منہ پر پاوڈر سرخی تھوپ کر وہ اسے سینما لے گیا ۔ اور وہاں اسکا برقعہ اتار کر ایک طرف رکھدیا ۔ منیرہ نے اسپر بہت احتجاج کیا ۔ لیکن نومان نے بات ہنسی میں ٹال دی ۔ "چلو انکا بھی بھلا ہو جائے کیا یاد کرینگے ۔" وہ زیر لب ہنستا رہا ۔

چند ہی دنوں میں نومان نے منیرہ کو بیر بہوٹی بنا کر رکھدیا لیکن اسکے باوجود وہ اسکی روح کو نہ بدل سکا ۔ شاید اسی لئے یا شاید اسکی کوئی اور وجہ ہو بہر صورت نومان منیرہ سے ناامید ہو کر گھر سے غیر حاضر رہنے لگا ۔ شام کو یا تو وہ سینما چلا جاتا یا سیر و تفریح میں وقت گزارتا اور بہت رات گئے گھر آتا ۔ اور منیرہ سارا دن اکیلی بیٹھی رہتی ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ رات کے وقت بھی غیر حاضر رہنے لگا ۔ حتی کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اسکے گھر موجود ہونے کے باوجود بھی منیرہ تنہا رہنے لگی ۔ چونکہ نومان کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ منیرہ کے پاس آ کر بیٹھے یا اس سے بات کرے ۔

اس تبدیلی پر پہلے تو منیرہ حیران ہوئی ۔ پھر سنبھل گئی اور سوچنے لگی کوئی مجبوری ہو گی ۔ چلو پھر کیا ہوا سب ٹھیک ہو جائیگا اور نومان بھی تو کبھی کبھار کہا کرتا تھا ۔ "بھئی میں کیا کروں نوکری کروں یا تمہارے پاس بیٹھوں ۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے ۔" اسکا لہجہ بھی خشک ہو چکا تھا اور وہ راز دارانہ انداز سے زیرِ لب باتیں کرنے کا سلسلہ تو بالکل منقطع ہو گیا تھا ۔

پھر اس روز جب اس نے اپنی چارپائی منیرہ کے کمرے سے اٹھوا کر بیٹھک

میں لگوا دی تو منیرہ کا ماتھا ٹھنکا اور منیرہ نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بستر کی وہ تبدیلی معمولی اور چند روزہ نہ تھی ۔

پھر انکے گھر میں ایک نوکرانی آگئی اور منیرہ کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہو گئی ۔ اسکا نام حشمت تھا مگر انداز شہزادیوں کا سا تھا ۔ وہ بلا ناغہ دانتوں پر اخروٹ کا چھلکا ملتی تھی ۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی تھی ۔ دن میں بار بار صابن سے منہ دھوتی تھی اور بال کھلے رکھتی تھی ۔

پہلے چار ایک دن تو وہ بی بی کے احکامات پر عمل کرتی رہی پھر اس نے احکامات پر عمل کرنے کے بجائے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے ۔ چلو بی بی چل کر ہنڈیا دیکھ لو ۔ چلو بی بی اب تم کوٹھے پر جا کر بیٹھو ۔ چلو بی بی میں بابو جی کو کھلا کر لے آؤنگی تمہارا کھانا ۔ تم چلو اپنے کمرے میں ۔

حالات کو اتنی تیزی سے بدلتے دیکھکر منیرہ سہم گئی ۔ اسقدر سہم گئی کہ نوکرانی سے بھی ڈرنے لگی ۔ اس لئے اسکے احکام بجا لانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا ۔

پھر جب ایک روز آدھی رات کے وقت اس نے حشمت کی آواز نومان کے کمرے میں سنی تو اسکی سمجھ میں آیا کہ اسکا انداز تحکمانہ کیوں تھا اور وہ اخروٹ کا چھلکا کیوں ملتی تھی ۔

اسکے بعد گھر کے تمام کام کاج کے لئے نومان حشمت ہی کو بلانے لگا اور گھر کا خرچ بھی اسی کے ذریعے ہونے لگا ۔ ایک دن نومان چوری چوری اسے سو سو کے دو نوٹ دے رہا تھا تو منیرہ نے دیکھ لیا اور وہ نیلے کاغذ اسکی آنکھوں سے آنسو بن کر ڈھلک آئے ۔

اس روز وہ موقع پا کر نومان کے کمرے میں چلی گئی اور روتے ہوئے حالِ دل کہہ دیا ۔ پہلے تو نومان نے بات ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی ۔ پھر دفعتاً حشمت کو صحن میں کھڑے دیکھ کر وہ طیش میں آگیا ۔ بولا ۔ "لوگ تمہیں سو سو کے نوٹ دکھائیں تو کوئی بات نہیں ۔ میں کسی کو دکھاؤں تو تمہارے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ۔ یہ میری کمائی ہے میری اور میں جسے چاہوں دوں ۔

اگر روپے لینے کی خواہش ہے تو لو جاکر اس سے جو دکھایا کرتا ہے تمہیں سو سو کے نوٹ ۔ جاؤ میں نے روکا ہے تمہیں ۔"

سامنے حشمت کا سینہ ابھرا ہوا تھا ۔ سیاہ گھنے بالوں میں اسکا شہوانی چہرہ سوجا ہوا تھا ۔ اور اخروٹ کے رنگ میں سے سفید دانت نکلے ہوئے تھے ۔ حشمت کی وہ مسکراہٹ دیکھ کر منیرہ نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسکے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو ۔ وہ زخمی پرندے کی طرح بھاگی ۔ اسکے عقب میں نومان اور حشمت کی ہنسی کا زہر سے بجھا ہوا تیر گویا اسکا پیچھا کر رہا تھا ۔

پھر وہ خاموش ہو گئی ۔ گویا اسکی زبان گنگ ہو گئی تھی ۔ اسکی قوتِ سماعت دھندلا گئی تھی ۔ صرف دو حیران آنکھیں اور آنسوؤں کی ایک مسلسل لڑی ۔ لیکن ان سب حالات کی وجہ اسکی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ ایک معمولی تبدیلی اتنے بڑے بڑے نتائج کیسے پیدا کر سکتی تھی ۔ کاش کہ بالائی آمدنی کی وہ سفید دانتوں والی چڑیل اسکے گھر قدم نہ رکھتی ۔

پھر دفعتاً نہ جانے کیا ہوا ۔ نومان نے دفتر جانا چھوڑ دیا ۔ سارا دن وہ کمرے میں لیٹا رہتا ۔ اور حشمت اسکے پاؤں دباتی رہتی اور شوخ باتیں کرتی رہتی ۔ پھر ان شوخ باتوں کا انداز بدل گیا ۔ جیسے وہ اسے ڈانٹ رہی ہو ۔ چلے جانے کی دھمکیاں دے رہی ہو ۔

ایک روز اس نے حشمت سے پوچھا ۔ "وہ بیمار ہیں کیا ؟"

"مجھے کیا معلوم ۔" حشمت ناک چڑھا کر بولی ۔

"کیا تکلیف ہے انہیں ؟"

"میں کیا جانوں ۔" وہ بولی ۔ "اپنے گھر والے کے متعلق مجھ سے پوچھتی ہو ۔"

منیرہ خاموش ہو گئی تو وہ آپ ہی آپ بولنے لگی ۔ "کہتا ہے کہ میری نظر خراب ہو گئی ہے اور رات کے وقت تو بالکل ہی نہیں دِکھتا ۔" "نظر خراب ہو گئی ہے ۔" منیرہ نے دہرایا۔

وہ اخروٹی رنگ میں سفید دانت چمکا کر بولی ۔ ”تمہارے لئے تو اچھا ہی ہے ۔ شوق سے رات کے وقت اپنے خریداروں اور یاروں کو بلاؤ ۔ اس اندھے کو کیا پتہ چلے گا ۔ عیش کرو تم ۔ تمہیں کیا پروا ۔ منیرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک گئیں ۔

اُدھر گھر کے حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے ۔ اب وہ عیش و عشرت کے خرچ ختم ہو چکے تھے ۔ گھر میں نہ تو پھل آتے تھے نہ مٹھائیاں حتّٰی کہ گوشت کی جگہ بھی دال پکنے لگی تھی اور یار دوستوں نے آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا ۔

پھر ایک روز نہ جانے کس بات پر حشمت چلّا کر کہنے لگی ۔ ”کب تک میں بیوی میاں کو پکا کر کھلاؤں گی ۔ نہ بھئی مجھ سے نہیں ہوتا ۔ میں کیا پیشہ کرواتی ہوں کہ اپنی کمائی تمہیں کھلاؤں ۔“

منیرہ اسکی بات نہ سمجھی لیکن خاموش رہی ۔

”خاوند تمہارا دو مہینے سے معطل بیٹھا ہے ۔ دفتر سے جواب مل چکا ہے ۔“

منیرہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ معطل ہو گئے ہیں ؟

”نہ بھائی میں باز آئی ایسی نوکری سے ۔“ وہ بولی ”تم جانو اور تمہارے میاں جانیں“۔ اور اس نے یہ بات اس قدر چلّا کر کہی کہ نومان سُن کر اندر آگیا ۔ اسے سامنے کھڑے دیکھکر وہ اور بھپھری ۔ بولی ”اسکے میاں کی خدمت کروں اور پھر اسی کے طعنے سہوں ۔ دراصل اسکا مطلب یہ ہے کہ میں چلی جاؤں اور یہ رانی گلچھرے اڑائے اپنے یاروں کے ساتھ جو اسے سبز نوٹ دکھاتے ہیں کوٹھے پر سے اور یہ میاں آپ اپنے منہ سے کہتے ہیں ۔ مجھے دِکھتا نہیں کچھ بھی رات کے وقت پھر ڈر کس کا ۔“

دفعتاً نومان نے محسوس کیا جیسے اُسکی نگاہ کی روشنی گُل ہو گئی ہو ۔

در حقیقت نظر کی کمزوری تو اس نے لوگوں سے اپنی معطلی کی حقیقت کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ بنا رکھا تھا ۔ لیکن اسوقت اس نے محسوس کیا جیسے وہ

واقعی اندھا ہو ۔ اسکے باوجود اسوقت ان اندھی آنکھوں میں ایک شعاع سی لپکی جیسے اندھے کو راستہ مل گیا ہو ۔

اسے خاموش دیکھکر حشمت اور غصے میں چلانے لگی ۔ "دیکھو تو میاں کی مصیبت پر اس عورت کا دل نہیں پسیجتا ۔ اتنی دیر میاں کی کمائی کھائی ہے تو نے اب میاں پر مصیبت آئی ہے تو ۔۔۔۔۔۔"

وہ خاموش ہو گئی ۔ وہ خاموشی حشمت اور نومان کے لئے مفہوم سے لبریز تھی ۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ انکی نگاہیں ملیں ۔ انکی مسکراہٹیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۔ بھوس رمزیہ انداز سے ابھریں اور دفعتاً نومان نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور وہ ٹٹولتا ہو آگے بڑھا ۔ "اوہ ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ۔ کچھ نظر نہیں آتا ۔ پھر دورہ پڑ گیا ہے پھر ۔ منیرہ کہاں ہے ۔ منیرہ کہاں ہے ۔۔۔" وہ چلانے لگا ۔

حشمت مسکرائی اور بڑھ کر اسے سنبھالنے لگی ۔

عین اسی وقت دروازہ بجا اور ایک عورت پھلوں کا ایک ٹوکرا اٹھائے اندر داخل ہوئی ۔ بی بی جی ۔ وہ بولی ۔ "یہ پھل شیخ صاحب نے بھیجے ہیں ۔"

"نہیں نہیں" منیرہ کہنے لگی ۔ لیکن حشمت نے اس کی بات کاٹ کر پھلوں کا ٹوکرا پکڑ لیا اور بولی ۔ "جا کر کہنا بی بی جی کہتی تھیں بڑی مہربانی ہے آپ کی ۔ اور ہاں" ، وہ اس کے قریب جا کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگی ۔ "ان سے کہنا بی بی جی کہتی تھیں ۔ پھر اس کی آواز مدھم پڑ گئی ۔ اور وہ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی ۔

جب شیخ صاحب کی نوکرانی جانے لگی تو حشمت نے گویا پھر اسے تاکید کی ۔ "کہنا فوری ضرورت پڑ گئی ہے ۔ قرضہ کے طور پر چاہیئں ۔ ہم جلد ادا کر دیں گے ۔"

منیرہ نے سنا تو اس کا دل ڈوب گیا ۔ اس نے منت بھری نگاہوں سے نومان کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنی بانہوں سے فضا کو یوں ٹٹول رہا تھا جیسے آنکھوں

سے علاوہ اس کے کان بھی بیکار ہو چکے ہوں ۔

"نہیں نہیں" منیرہ چلائی ۔ "نہیں نہیں ۔ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

حشمت منیرہ کی طرف دیکھکر مسکرائی ۔ اچھا تو ٹھہر میں تیرے ساتھ چلتی ہوں ۔" وہ شیخ صاحب کی نوکرانی سے بولی ۔ "میں خود سمجھا دونگی انہیں ۔" اور وہ خود شیخ صاحب کی نوکرانی کے ساتھ چل پڑی ۔ اور منیرہ کی دبی دبی کراہ حشمت کی باتوں میں دب کر رہ گئی ۔

اس رات جب بستر میں منہ چھپائے منیرہ رو رہی تھی تو اس نے قریب ہی اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنی اور پھر چپکے سے کوئی اس کے بستر میں گھس آیا ۔ وہ تڑپ کر بولی "آپ ہیں ۔"

دو اجنبی بازوؤں نے اسے تھام لیا ۔ منیرہ کی چیخ نکل گئی ۔

منیرہ کی چیخ پر شور مچ گیا ۔ "کون ہے ۔ کون ہے" ۔ نوسان بآواز بلند بولا ۔

"کوئی بھی تو نہیں ۔" حشمت کے دانت صحن کے اندھیرے میں چمکے ۔ "تم تو خوامخواہ چلانے لگتے ہو ۔"

"منیرہ سو گئی ہے کیا"

"دیر ہوئی ۔" حشمت بولی ۔

"اچھا ہوا سو گئی ۔" وہ بولا ۔ "بہت اچھا ہوا ۔" وہ گنگنانے لگا ۔

"سوئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی ۔" حشمت کی آواز میں بلا کی طنز تھی ۔ اور پھر ہنسنے لگی ۔

"اچھا ہوا کہ سو گئی ۔" منیرہ کے کانوں میں وہ الفاظ گونجتے رہے ۔ اسکے ہونٹ بند ہو گئے ۔ اجنبی اسکے قریب تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اور قریب اور قریب ۔

ہاں ہر بجتے رات کے بارہ بجے ۔ میں اسکے اور قریب ہو جاتا ہوں اور قریب اور وہ اندھا آکر اپنی لوری سے اُسے تھپکتا ہے ۔

سو گئی منیرہ ۔ اچھا کیا سو گئی ۔ سو جاؤ اور حشمت کے سفید دانت اخروٹی اندھیرے میں چمکتے ہیں اور وہ میرے دئے ہوئے نوٹوں کو گنتی ہے ۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں دودھ کے پیسے اس کسبی کے منہ پر مار کر بھاگ جاؤں ۔ لیکن اس شدید خواہش کے باوجود میں اسکا منہ تکتا رہتا ہوں اور عیش و نشاط کی محفل سجانے کی بجائے ہم دونوں غم کھاتے ہیں ۔ منیرہ اپنے اندھے خاوند کا اور میں منیرہ کا ۔

ہاں میں پھر کبھی واقعات قلمبند نہیں کرونگا ۔ واقعات سے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں ۔

..........○..........

گھر کی عزت

اس رات تو وقت گویا بالکل ہی تھم گیا تھا ۔

وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی چھت کو گھور رہی تھی ۔ پاس ہی میز پر اخبار میں لپٹا ہوا ایک پارسل پڑا تھا ۔ جسمیں اسکی سفید پھولوں والی چکن ساٹن کی سرخ قمیض اور خط ملفوف تھے ۔ اسے وہ قمیض بے حد پیاری تھی اور وہ خطوط تو اس نے صرف اس لئے رکھ لئے تھے کہ وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی ۔ اس نے ان خطوط کو جلانے کی کوشش بھی کی مگر آگ میں ڈالنے کی ہمت نہ پڑی ۔ اسلئے اس نے انہیں پارسل میں لپیٹ لیا تھا ۔ اس بات کو اپنے آپ سے تسلیم کیے بغیر اس پر سوچنے کے بغیر کہ وہ جا رہی ہے ۔ اس نے وہ مختصر سی تیاری کرنی تھی ۔ اور پھر چپ چاپ لیٹ گئی تھی ۔

نہ جانے کیوں غیر از معمول اس روز اس نے تمام کھڑکیاں سرشام ہی بند کر لی تھیں ۔ اسے باہر دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ۔ سوچنے سے بھی تو ڈر لگتا تھا اسے اس روز ۔ لیکن یہ حقیقت بار بار اسکے ذہن میں گھس آتی ۔ اور وہ پھر سے چھت کی شہتیریوں کو گننے میں مصروف ہو جاتی ۔

اس روز اسکی نگاہیں دھندلائی ہوئی تھیں ۔ مگر قوتِ سامعہ بے حد تیز ہو رہی تھی ۔ شام کے وقت بازار میں بھیڑ کا شور تھا ۔ پھر جب اندھیرا ہو گیا تو آمدورفت کم ہوتی گئی ۔ پھر دوکانیں بند ہو رہی تھیں ، گھروں کے صدر دروازے بند ہو رہے تھے ۔ پھر کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور دُور رات کے چوکیدار کی آواز گونجنے لگی ۔ اسکے باوجود گھڑی صرف گیارہ بجا رہی تھی ۔ وقت گویا رینگ رہا تھا ۔ چھت سے بھٹک کر اسکی نگاہ میز پر پڑے ہوئے پارسل پر جا رکتی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ۔ اس پارسل کی طرف دیکھنا اسکے لئے بے حد تکلیف دہ تھا ۔

وہ یہ سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہے ۔ اسمیں اس قدر جرأت نہ تھی کہ حقیقت سے آنکھ ملا سکے ۔ وہ پارسل بھی تو اُس نے یوں بنایا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔ جیسے وہ اخبار میں چیزیں لپیٹنے کی مشق کر رہی ہو ۔ جبھی تو اس پارسل کو دیکھکر وہ گھبرا جاتی تھی ۔ پارسل سے نگاہ چراتی تو اسکی نگاہ دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر جا پڑتی ۔ جسمیں ایک گلیکسو بے بی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا ۔ اسے دیکھکر وہ محسوس کرتی جیسے وہ بچہ منتیں کر رہا ہو ۔ "مجھے بچا لو" ۔

اس احساس پر انجانے میں اسکے بازو بچے کو گود میں لینے کے لئے اٹھتے ۔ پھر وہ آپ ہی آپ شرما جاتی اور از سر نو لیٹ کر چھت کو گھورنا شروع کر دیتی ۔

واقعی اس رات وقت کٹنے میں نہ آ رہا تھا ۔

کہاوت ہے زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وقت کٹنے میں نہیں آتا ۔ مرزا عبداللہ کے گھر میں یہ کہاوت اور حقیقت دونوں بیک وقت ظہور پذیر ہوئیں ۔ نیچے دالان میں مرزا عبداللہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے ۔ "بیگم زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی" ۔ اور پھر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ۔ اور بیگم ہاتھ مل کر کہتی ۔ "ہائے کیسے معلوم تھا کہ زمانہ یوں بدل جائے گا" ۔

اسی مکان کے چوبارے میں انکی اکلوتی بیٹی ریحانہ جسے پیار سے گھر میں ہے نا کہا جاتا تھا ۔ اکتا کر ناول کو بند کر دیتی ۔ "ہائے وقت نہیں کٹتا" کہہ کر خطرناک انداز سے کھڑکی کی طرف بڑھتی تاکہ وقت کاٹنے کی کوشش کرے ۔

ہے نا کو تانک جھانک سے خصوصی دلچسپی تھی مگر اس نے وقت کاٹنے کے لئے جملہ چیزوں کو آزما دیکھا تھا ۔ پہلے ناول پڑھنے میں وقت کاٹنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ تو الٹا اکساتے تھے ۔ پھر اس نے پڑوسنوں سے خوش گپیوں کو آزمایا ۔ مگر جلد ہی وہ خوش گپیاں محض گپیاں رہ جاتیں ۔ اور گول گپوں کی طرح کھوکھلی محسوس ہوتیں ۔ پھر اس نے سوئی کے کام میں وقت کاٹنے کی کوشش کی لیکن وقت کی بجائے سوئی انگلی کاٹ دیتی ۔ اور پھر اس پر پانی ڈالنے کے لئے اسے کھڑکی میں رکھی ہوئی صراحی کی طرف بھاگنا پڑتا ۔ یوں بار

بار کھڑکی کیطرف بھاگنے سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ کھڑکی میں ہی کھڑی رہے ۔ انہی وجوہات کی بنا پر اس نے وقت کاٹنے کے لئے کھڑکی کو اپنا لیا تھا ۔

اور کھڑکی میں رکھا ہی کیا تھا ۔ بس یہی نا کہ نیچے بازار چلتا تھا اور راہ گیر اسے دیکھکر ٹھٹھکتے اور اپنی چال بھول جاتے اور چلنے کی بجائے ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتے ۔ جیسے کہ اپنی چال بھولنے سے ہو جاتا ہے ۔ اُن کی اچھی بھلی شکلیں بدل جاتیں ۔ جیسے کارٹون ہوں ۔ آنکھیں ابل آتیں ۔ گال پھول جاتے ۔ باچھیں کھل جاتیں ۔ کسی کو احساس ہوتا کہ اسکی مونچھیں گری ہوئی ہیں اور وہ انہیں مروڑنے لگتا ۔ کسی کو محسوس ہوتا کہ اسکی چھاتی اندر کو دھنسی ہوئی ہے ۔ اور وہ لقا کبوتر بن جاتا ۔ کوئی ٹائی سنوارتا ۔ کوئی کانپنے لگتا ۔ مختصر یہ کہ اسکے صرف کھڑکی میں جا کھڑے ہونے سے گویا نظامِ عالم ہی درہم برہم ہو جاتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ جب نظامِ عالم ہی درہم برہم ہو جائے تو وقت کے نہ کٹنے کا سوال ہی نہیں رہتا ۔ یہ احساس کہ کھڑکی میں صرف کھڑی ہو کر وہ نظامِ عالم درہم برہم کر سکتی ہے اور اتنی بڑی ٹریفک کو کنٹرول کر سکتی ہے انسان کو زمان و مکان پر حاوی کر دیتا ہے ۔

نیچے دالان میں مرزا عبداللہ اور انکی بیگم کے بار بار "توبہ زمانہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے" کہنے کے باوجود انکا وقت کٹنے میں نہیں آتا تھا ۔ وقت کاٹنے کے لئے انکے پاس کوئی کھڑکی بھی تو نہ تھی ۔ اور ہوتی بھی تو نظامِ عالم بدلنے کی ہر کسی میں طاقت تو نہیں ہوتی ۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر الٹا وہ جھینپ جاتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے ۔ اِس لئے انھوں نے ایک خیالی کھڑکی بنا رکھی تھی ۔ جو انکے ماضی میں کھلتی تھی اور جس سے انکے "جب" کی روشنی اور دھوپ آتی اور انہیں گرم رکھتی ۔ لیکن جب بھی انکی توجہ "اب" کے سرد ویرانے کی طرف منعطف ہو جاتی تو انہیں دکھ ہوتا اور وہ ہاتھ مل کر کہتے "توبہ زمانہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے" درحقیقت انہیں وقت کے متعلق شکایت نہ تھی ۔ انہیں تو شکوہ تھا کہ وہ سنہرا "جب" یوں آناً فاناً بدل گیا ۔ بات بھی صحیح تھی ۔ جب وہ کانپور کے ایک بہت بڑے سوداگر تھے ۔ انکی موٹر پارٹس کی دوکان شہر بھر میں مشہور

تھی ۔ برادری میں انکی حیثیت ایسی تھی کہ کوئی بھی کسی معاملے میں انہیں نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ۔ چاہے بات شادی بیاہ کے متعلق ہو یا لین دین کے قضیے کے متعلق ۔ فیصلے کے لئے لوگ چپ چاپ مرزا عبداللہ کے سر کی طرف دیکھتے کہ وہ اثبات میں ہلتا ہے یا نفی میں ۔ کیونکہ مرزا صاحب کو زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہ تھی ۔ مختصر یہ کہ جب انکے سر ہلانے میں وہی طاقت تھی جو اب ہے نا کے کھڑکی میں کھڑے ہونے میں تھی ۔

مرزا عبداللہ کا "اب" حقیقتاً ایک سرد ویرانے سے کم نہ تھا ۔ انہیں تقسیم کے ایک سال بعد اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا ۔ اس لئے نہیں کہ اُنہیں ترکِ وطن سے دلچسپی تھی بلکہ اس لئے کہ شورش پسندوں نے انکی دوکان کو آگ لگا دی ۔ اسطرح انکی تمام تر پونجی ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ گئی تھی ۔ اسکے علاوہ انکا گھر لوٹ لیا گیا تھا ۔ اسطرح وہ پاکستان آنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے ۔

پاکستان میں پہنچ کر انہوں نے اپنی گذشتہ عظمت کے سارٹیفکیٹ پیش کئے ۔ اپنی جائداد کی فہرستیں مرتب کیں ۔ درآمد برآمد کے نقشے دکھائے لیکن بات نہ بنی اور وہ ایک معمولی سے رہائشی مکان کے علاوہ کوئی خصوصی الاٹ منٹ حاصل نہ کر سکے ۔ حتیٰ کہ جو کچھ تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور گھر کی چیزیں فروخت کرنا پڑیں آخر وہ مایوس ہو گئے اور مجبوراً انہیں ایک موٹر سٹور میں ایک معمولی سی آسامی پر کام کرنا پڑا ۔

میاں کی نسبت بیگم کے لئے یہ تبدیلی زیادہ ناقابل برداشت تھی ۔ میاں تو جب بھی لکھ پتی ہونے کے باوجود موٹے کپڑے پہنا کرتے تھے اور پانچوں وقت کی نماز ادا کیا کرتے تھے اور چلتے تو گردن جھکا کر ۔ انکی امارت اور عظمت کا اظہار صرف انکی کھنکار سے ہوتا تھا ۔

"اہم اہم" وہ دوکان میں داخل ہوتے وقت کھنکارتے ۔ انکی کھنکار سن کر جملہ ملازمین اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کھڑے ہو جاتے ۔ اور پھر دن بھر کام یوں آپ ہی آپ چلتا جیسے کسی نے مشین کو گریز لگا دی ہو ۔ گھر میں بھی انکی کھنکار فوری نتائج پیدا کیا کرتی تھی ۔ اگرچہ اسکا بیگم اور بیٹی پر

مختلف اثر ہوتا تھا ۔

میاں کی آمد کا اعلان سُن کر بیگم کے مُنہ پر خوشی کی ایک کرن طلوع ہو جاتی ۔ گالوں پر دو بیر بہوٹیاں رینگنے لگتیں ۔ اور دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر گر جاتا اور گردن کا ہار اور قمیض کا فیتوں والا کالر تنگے ہو جاتے تھے ۔ اسکے برعکس باپ کی کھنکار سُن کر ہے نا کے منہ پر کھیلتی ہوئی خوشی کی کرن غروب ہو جاتی ۔ گالوں پر بیٹھی ہوئی بیر بہوٹیاں نہ جانے کہاں چھپ جاتیں ۔ اور وہ شانوں پر ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو سر اور پیشانی پر لپیٹ کر یوں بیٹھ جاتی جیسے مصالحے کی بنی ہوئی گڑیا ہو ۔

ان دنوں میاں کے برعکس بیگم نہ تو نماز پڑھتی تھی اور نہ گردن جھکا کر چلتی تھی ۔ گردن تو بلکہ کچھ زیادہ ہی اکڑی رہتی تھی اور کپڑوں کے متعلق تو کچھ پوچھئے ہی نہیں جتنے میاں کے سادے ہوتے تھے اتنے ہی بیگم کے بھڑکیلے ۔ جس قدر میاں کم گو تھے اسی قدر بیگم متکلم تھیں ۔ بات بھی ٹھیک تھی ۔ میاں کی حکومت تو صرف ملازمین اور برادری والوں پر چلتی تھی ۔ میاں کا وہی سر جس کی جنبش پر باہر فیصلے ہوتے تھے گھر میں آکر بیگم کے سامنے جھک جاتا تھا ۔

ترک وطن کے بعد کچھ دیر تک تو بیگم اسی امید میں رہی کہ ابھی کوئی معجزہ رونما ہو گا اور اسکی گذشتہ عظمت لوٹ آئیگی ۔ پھر مایوس ہو کر اسکی گردن جھک گئی اور وہ ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر جائے نماز پر جا بیٹھی ۔

زمانہ بدلنے کی وجہ سے سب سے زیادہ تبدیلی ہے نا کے متعلق رونما ہوئی ۔ اگرچہ ہے نا کو احساس نہیں ہوا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے ۔ کیونکہ اسکے لئے تو زندگی اب بھی بے حد دلچسپ تھی ۔

چھ سال پہلے کانپور میں وہ ایک لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک لکھ پتی کے گھر کی عزت تھی ۔ یعنی گھر کی عزت کا تمام تر دارومدار اسکی حرکات و سکنات پر تھا ۔ اگر اسکے سر سے دوپٹہ سرک جاتا تو گھر کی عزت خطرے میں پڑ جاتی اور

ماں سر سے ڈھلکے ہوئے دوپٹے سمیت اس پر جھپٹتی ۔ "اے ہے بیٹی کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا ۔ گھر کی عزت کا کچھ خیال کر" ۔ اگر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی تو گھر کی عزت کو خطرہ لاحق ہو جاتا اور باپ کی "اہم ۔۔۔" سے میز پر پڑا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگتا ۔ اگر وہ بازار یا گلی میں برقع اٹھا لیتی تو گھر کی عزت تباہ ہو جاتی ۔ بیچاری کو گھر کی عزت سے جان بچانی مشکل ہو گئی تھی ۔

گھر کی عزت تو وہ واقعی تھی ۔ ان دنوں بڑے بڑے معزز خاندانوں میں لوگ زیرِ لب اسکا نام لیا کرتے تھے ۔ ہر کسی کی آرزو تھی کہ مرزا صاحب کی بیٹی اسکی بہو بنے ۔ اگرچہ پیغام بھیجنے کی کسی کو جرأت نہ پڑتی تھی ۔ ادھر اپنے گھر میں اسکے بیاہ کا کبھی تذکرہ ہی نہیں ہوا تھا ۔ اتنی جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ جب بہت سے امیدوار ہوں تو جلدی کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

گھر کی عزت ہونے کا احساس اگرچہ بڑی اہمیت کا باعث ہوتا ہے ۔ لیکن اسکے ساتھ اتنی پابندیاں تھیں جو اسکی جان کا روگ بنی ہوئی تھیں ۔ یہ درست تھا کہ ان دنوں ریحانہ کو پہننے کے لئے خوبصورت کپڑے دستیاب تھے اور کھانے کو لذیذ کھانے ملتے تھے ۔ مگر کھانے کا کیا ہے کھا لیا جائے تو اچھے اور برے میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا ۔ البتہ خوبصورت کپڑے اسے بڑے اچھے لگتے تھے ۔ مگر انہیں پہن کر اندر بیٹھ رہنا ۔ ایسے کپڑوں کا کیا فائدہ ۔ اور دوپٹہ اگر سر پر ماتھے تک لپیٹ لیا جائے تو پھر چاہے وہ ریشمی ہوں یا سادہ دونوں میں چنداں فرق نہیں رہتا ۔ اس نے کئی بار آزما دیکھا تھا کہ سادہ کپڑے بھی اثر پیدا کرنے میں کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے ۔ وہ تو جینا چاہتی تھی ۔ اور عنفوانِ شباب میں جینا اچھے کھانوں اور کپڑوں کا محتاج نہیں ہوتا ۔ ہے نا کو تو سانس لینے میں بھی لذت حاصل ہوتی تھی ۔ چلنے میں لطف آتا تھا ۔ دوپٹہ گرانے اور اسے سنبھالنے میں راحت محسوس ہوتی تھی اور آنکھوں میں مسکرانے سے تو نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ اس لئے اسے ان بندشوں پر غصہ آتا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ گھر کی عزت نہ ہوتی تو کتنا مزا ہوتا ۔

پاکستان میں پہنچنے کے بعد جب تک ریحانہ کے ماں باپ کو اس معجزے

کے رونما ہونے کی امید رہی ۔ اسپر وہ پرانی پابندیاں عائد رہیں ۔ اگرچہ اب وہ لکھ پتی کی بیٹی نہ تھی ۔ اب لوگ مرزا عبداللہ کے سر کی جنبش کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ چاہے وہ اثبات میں ہلتا یا نفی میں ۔ بلکہ اب تو لوگ انہیں عبداللہ کہتے تھے ۔ خالی عبداللہ ۔

پھر جب وہ امید کی کرن گل ہو گئی تو ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو ماں حسب معمول آگ بگولہ ہو کر اس پر جھپٹی ۔ "بیٹی تجھے گھر کی ــــــ" دفعتاً وہ رک گئی ۔ نہ جانے گھر کی کس مہرسی نے چاروں کونوں سے نکل کر اس سے کیا کہا ۔ گھبرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر اسکی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک آیا اور وہ سر جھکائے جائے نماز کی طرف بھاگی ۔ اسکے بعد ماں نے کبھی اسے کچھ کہنے کی کوشش نہ کی ۔ ایسے موقع پر کچھ کہنے کی بجائے وہ منہ موڑ لیتی ۔

انہی دنوں دونوں میاں بیوی اکثر اکیلے بیٹھ کر ریحانہ کی باتیں کیا کرتے ۔ ریحانہ نے انکی باتیں نہ سنی تھیں۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی کی باتیں کرتے ہیں ۔ وہ بار بار اس کی طرف دیکھتے اور پھر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور جب کبھی وہ قریب جاتی تو وہ خاموش ہو جاتے اور پھر یوں پاؤں سے سر تک اُسے دیکھتے جیسے بہت ہی بڑی ہو گئی ہو ۔ بڑی تو واقعی ہو چکی تھی مگر ایسا بھی کیا کہ اس بات پر لمبی آہیں بھری جائیں ۔ آخر سبھی لڑکیاں بڑی ہو جایا کرتی ہیں ۔ اسمیں اچنبھے کی کیا بات تھی ۔ اسکی طرف دیکھکر یوں مظلوم صورت بنا لینا اور آہیں بھرنا جیسے وہ بڑی مصیبت ہو جو ان کے سر آ پڑی ہو ۔

پھر میاں کے بعد اس روز باپ اُسے کھڑکی میں کھڑی دیکھکر نہ جانے کیا کہنے والا تھا کہ بیگم جائے نماز سے چیل کی طرح ان پر جھپٹی اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر دالان میں لے گئی اور دیر تک اُسکی غصے بھری آواز سنائی دیتی رہی تھی ۔ وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی ۔ اب اسے کیوں تنگ کر رہے ہو کس برتے پر ۔ اب کیا کوئی صورت ہے کوئی امید ہے ۔ پھر کیوں اُسے ستا رہے ہو ۔ دیر تک وہ یوں ہی بولتی رہی تھی ۔ لیکن ریحانہ کو اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا تھا وہ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں ۔ اس روز کے بعد اسکے ابا کی گردن بالکل ہی لٹک گئی ۔ انکی وہ

کھنکار تو عرصہ دراز سے ختم ہو چکی تھی ۔

پھر ایک روز ماں نے اُسے بلا کر برسبیل تذکرہ کہا ۔ بیٹی تم چوبارے کو اپنا کمرہ بنا لو ۔ یہاں کوٹھڑی میں رستہ ہے اور تم نے پڑھنا بھی ہوا ۔ یہاں تمہاری پڑھائی میں حرج ہوتا ہے ۔ ہے نا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ۔ چوبارے میں تو ایک نہیں چار کھڑکیاں تھیں اور وہ چاروں بازار میں کھلتی تھیں اور پھر پڑھائی میں حرج ۔ اتی تو ہمیشہ سے پڑھائی کے خلاف رہی تھی ۔ ان دنوں بھی وہ اسکے پڑھنے کے خلاف تھی ۔ جب وہ باقاعدہ سکول میں پڑھتی تھی ۔ اور اب ۔ اب تو اسکی پڑھائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ دسویں کا پرائیویٹ امتحان دینا تو اب ایک بہانہ ہی رہ گیا تھا ۔ وہ کتابیں تو پرانی ہو چکی تھیں ۔ اور نئی کتابیں خریدنے کی استطاعت ہی کسے تھی ۔

چوبارے میں ٹھکانہ کر لینے کے بعد اسکے شکوک از سر نو عود کر آئے ۔ آخر اسے چوبارے میں بھیجنے سے اُن کا مقصد کیا تھا ۔ کئی ایک دن انہی شکوک کی وجہ سے وہ کھڑکی میں بھی کھڑی نہ ہوئی تھی ۔ بلکہ اسی بات کی وجہ سے اُسے کھڑکی میں کھڑے ہونے کے خلاف بغض ہو گیا تھا ۔ اُسے غصہ آتا ۔ کیوں جی کیا اب میں گھر کی عزت نہیں رہی ۔ کیا لکھ پتی کی بیٹی ہی گھر کی عزت ہوتی ہے ۔ کیا غربت میں گھر کی عزّت نہیں رہتی ۔ تو پھر اب وہ مجھے کیوں نہیں کچھ کہتے ۔ اب یہ آزادی کیوں ۔ لیکن آخر وہ لڑکی تھی اور جوان لڑکیوں کا کھڑکیوں کے خلاف غصہ دیر تک نہیں رہتا ۔ آپ جانتے ہیں کھڑکیاں اپنا وجود منوائے بغیر نہیں رہتیں ۔ اور عنفوانِ شباب میں ان سے سرکشی نہیں ہو سکتی ۔ تو مختصر یہ کہ چند ہی دنوں کے بعد ان کھڑکیوں نے اسے رام کر لیا ۔

ویسے ان کھڑکیوں میں رکھا ہی کیا تھا ان دنوں ۔ ٹریفک کو کنٹرول کرنا تو اس نے کافی دیر کے بعد سیکھا تھا ۔ ان دنوں تو راہ گیروں کے قافلے کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ کھڑکی میں کھڑے ہونے سے اسکا مقصد کیا ہے ۔ اسے خیال بھی نہ تھا کہ جلد ہی وہ وہاں کھڑی ہو کر ٹریفک کو کنٹرول کرنا سیکھ جائیگی ۔ ان دنوں تو اسکا مطلب صرف وقت کاٹنا تھا ۔ اب

اگر لوگ چلنے کی بجائے ٹھوکریں کھانے کو ترجیح دیتے ہوں تو اسمیں اسکا کیا قصور ۔ اور جب لوگ خوامخواہ ٹھوکریں کھانے لگیں تو انہیں دیکھکر کوئی مسکرائے نہ تو کیا رو دے ۔ وہ ٹھوکریں کھانے والے تو خیر ٹھوکریں کھا کر چلے جاتے تھے مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ پاس ہی ملحقہ چوبارے میں جو بازار میں کچھ بڑھ کر بنا ہوا تھا ۔ کوئی بیچارہ بیٹھ کر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے ۔

وہ لڑکا اونچا لمبا اور بھرے جسم کا ہونے کے باوجود یوں معصوم اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا اور وہ یوں چھپ چھپ کر اُسے دیکھا کرتا تھا کہ جب ریحانہ نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو ایک ساعت کے لئے وہ سمجھی کہ گلیکسو فوڈ کا اشتہار لگا ہے ۔ چار ایک دن کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ واقعی وہ گلیکسو بے بی ہے ۔ اسی لئے تو اس پر ابھی تک کھڑکی میں آنے کی بندش عائد ہے ۔ جس سے وہ خود آزاد ہو چکی تھی ۔ اسی لئے ہے نا نے اسے کبھی درخوراعتنا نہ سمجھا تھا ۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یوں چھپ چھپ کر دیکھنے والے معصوم صورت بڑے خطرناک ہوتے ہیں ۔ کیونکہ وہ لسوڑیوں کی طرح چپک جاتے ہیں اور پھر انہیں جھٹک کر دامن سے اتارنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

پھر وہ بھی اسکی طرف دیکھنے لگی ۔ لیکن یہ دیکھنا درحقیقت دیکھنا نہ تھا کیونکہ وہ اسے دیکھے بغیر دکھائی دئے جاتا تھا ۔ وہ اسے یوں دیکھتی تھی جیسے آپ راہ چلتے ہوئے دائیں بائیں کی طرف دیکھے بغیر چلے جاتے ہیں ۔ مگر دائیں بائیں کی دوکانیں مبہم طور پر آپ کو دکھائی دیتی رہتی ہیں ۔

ہے نا کو اس گلیکسو بے بی کو دیکھنے سے چنداں دلچسپی نہ تھی ۔ ہوتی بھی کیسے وہ تو اسے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے مصالحے سے بنا ہوا گڈا ہو ۔

لیکن جب کوئی گلیکسو بے بی صبح و شام بے بسی سے آپکی طرف دیکھے تو ترس آنے لگتا ہے ۔ ریحانہ کی اس بے بی سے دلچسپی درحقیقت محض ترس کے احساس پر مبنی تھی ۔

پھر ایک روز جب رات کے وقت وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی تو دھم سے ایک پتھر کھڑکی کی راہ سے اندر آگیا ۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ بتی جلائی ۔ روشنی

میں اس نے دیکھا کہ کاغذ کا ایک بڑا سا گولا فرش پر پڑا ہے ۔ پہلے تو اس نے پاؤں سے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا ۔ پھر تاگا توڑ کر اُسے کھولا ۔ وہ پہلا محبت نامہ تھا جو اُس نے موصول کیا تھا ۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ خط ایک موٹا سا گیلا آنسو ہو ۔ خط پڑھکر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ نیچے بازار میں کوئی نہ تھا ۔ پنواڑی کی دوکان پر صرف ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا ۔ پھر دفعتاً اسکی نگاہ ملحقہ چوبارے پر جا پڑی ۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں گلیکسو بے بی یوں دانت نکال رہا تھا جیسے اس نے دودھ پینا چھوڑ کر کھانا شروع کر دیا ہو اور دانت دکھا کر وہ اس تبدیلی کا ثبوت دے رہا ہو ۔

پہلی مرتبہ خط پڑھ کر وہ ہنس پڑی تھی ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اسکا پھر جی چاہا کہ ان مضحکہ خیز باتوں پر ہنسے اور اُس نے وہ خط پھر سے پڑھا ۔ محبت بھرے خطوں کو آپ جانتے ہی ہیں ۔ چاہے کوئی ان پر ہنسے یا غصے سے آگ بھبھوکا ہو جائے انکے سحر سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے ۔ محبت بھرے خطوط مکڑی کی طرح جال بُنتے رہتے ہیں ۔ چاہے اُن پر کوئی ہنستا ہی رہے ۔ پھر جب ان کا جال مضبوط ہو جاتا ہے تو وہ رسی کھینچ لیتے ہیں اور ہنسی آنسوؤں میں بدل جاتی ہے ۔ ریحانہ ان محبت ناموں پر ہنستی رہی لیکن ساتھ ہی رات کے وقت ہر آہٹ پر چونک کر فرش پر کاغذ کے گولوں کی تلاش بھی کرتی رہی ۔

ہر تازہ خط پڑھنے کے بعد اسکی ہنسی میں تمسخر کا عنصر کم تر ہو جاتا تھا اور خالص ہنسی ہونٹوں سے نکل کر جسم کے بند بند میں بھر جاتی اور اسکا جی چاہتا کہ سارے گھر میں ناچتی پھرے ۔

ایک روز جب وہ ایک تازہ خط کے زیرِ اثر ناچتے ناچتے دالان سے ملحقہ کمرے میں پہنچی تو امی کی بات سُن کر اسکے اوسان خطا ہو گئے ۔ "دیکھنے میں تو لڑکا شریف معلوم ہوتا ہے مگر ۔۔۔۔" وہ خاموش ہو گئی ۔ "کالج میں پڑھتا ہے ۔ باپ زمیندار ہے" ۔ اسکے ابا کہہ رہے تھے ۔

"کھاتے پیتے ہیں نا" ۔

"ہاں جائداد والے ہیں" ۔

"اچھا ۔۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔۔"

"ہے نا کی ماں" اسکے ابا نے پوچھا ۔ "آخر بات کیا ہے" ۔

"بات کیا ہونی تھی ویسے ہی پوچھا تھا ۔ پڑوسیوں کے متعلق معلوم کر لینا اچھا ہی ہوتا ہے" ۔

وہ خاموش ہو گئے ۔ ریحانہ سوچ میں پڑ گئی ۔ وہ کس کی بات کر رہے تھے ۔ وہ شریف پڑوسی کون تھا ۔ اس روز دیر تک وہ اسی ادھیڑبن میں لگی رہی لیکن اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔

پھر اسے خوامخواہ شک پڑنے لگے ۔ رات کو لیٹے لیٹے وہ محسوس کرتی جیسے کوئی دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا ہو ۔ کسی وقت دروازے کے شیشے کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا دکھائی دیتا ۔ شاید امی چھپ کر اُسے دیکھ رہی ہے ۔ اُسے خیال آتا ۔ دو ایک مرتبہ تو اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا بھی تھا مگر وہاں کوئی نہ تھا اور وہ اپنے شکوک پر ہنس پڑی تھی ۔

اسے اس قسم کے شکوک کی طرف پوری توجہ دینے کی فرصت ہی کب تھی ۔ چاہے وہ اس کاغذ کے گولوں کے کھیل پر ہنسا ہی کرتی تھی ۔ پھر بھی وہ کھیل اسے رات دن مصروف رکھتا تھا ۔

پہلے تو اپنے خطوط میں گلیکسو بے بی رو رو کر بازو اٹھاتا رہا ۔ پھر دفعتاً اس نے رونا چھوڑ کر دھمکیاں دینا شروع کر دیا ۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا" ۔ اس دھمکی پر وہ اور بھی ہنسی ۔ زندہ نہیں رہ سکتے تو میں کیا کروں ۔ اسکے بعد جلد ہی معاملہ سنگین ہو گیا اور وہ ڈر گئی ۔ لکھا تھا ۔ "میں کچھ کھا کر مر جاؤں گا" ۔ ریحانہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر مر جانے کی بات ہی کیا تھی ۔ خواہ مخواہ مرنے پر مچل جانا ۔

پھر اس نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی ایک تاریخ مقرر کر دی ۔ "اگر تم آج رات میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہو گی تو کل مجھے زندہ نہ پاؤ گی ۔ میں رات کے دو بجے تک تمہارے گھر کے دروازے پر تمہارا انتظار کرونگا" ۔

خط پڑھتے ہی اسکے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

کیا کرے ۔ کوئی سہیلی بھی تو نہ تھی ۔ جس سے وہ دل کی بات کہتی ۔ کیا وہ چلی جائے گھر چھوڑ کر چلی جائے ۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ ایک اجنبی کے ساتھ چلے جاناماں باپ کو چھوڑ کر چلے جانا ۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسے خیال آتا کہ کل وہ مرا پڑا ہو گا ۔ اور اسکے سامنے اسکی لاش آ جاتی ۔ "بیچارا" ۔ اسکے منہ سے نکل جاتا ۔ نہیں نہیں وہ نہیں مرے گا ۔ خواہ مخواہ ۔ میں اسے مرنے نہ دوں گی ۔ لیکن لیکن اُسے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ کس جھمیلے میں ڈالدیا تھا اُس نے خواہ مخواہ ۔

سارا دن وہ مضطرب رہی تھی ۔ شام کے وقت اس نے صندوق کھولا اور اپنی ایک ایک چیز نکال کر دیکھی تھی ------------------------------اُس میں تھا ہی کیا ۔ صرف چکن ساٹن کی سُرخ قمیض اور وہ خطوط جو اس نے ریشمیں رومال میں باندھ کر رکھے ہوئے تھے ۔ اُس نے ان جانے میں وہ خطوط اور قمیض نکال کر ایک اخبار میں لپیٹ لئے تھے اور پھر چارپائی پر لیٹ گئی تھی ۔

ٹن ------ گھڑی نے ساڑھے گیارہ بجائے ۔

وہ چونک پڑی ۔ ساڑھے گیارہ ۔ پارسل کی طرف دیکھکر وہ گھبرا گئی ۔ معاً اسے خیال آیا کہ کوئی نیچے صدر دروازے پر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا ہے ۔ اس خیال پر وہ از سرِ نو گھبرا گئی ۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا ۔ کچھ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی ۔ ہونا کیا ہے ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اور وہ لیٹ گئی ۔ اسکی آنکھوں کے سامنے عجیب تصویریں متحرک تھیں ۔ ایک طرف ماں کھڑی پیار سے اسے دیکھ رہی تھی ۔ بیٹی تم جا رہی ہو ۔ دوسری طرف ایک لاش پڑی تھی اور مردہ اسے کہہ رہا تھا میں نے کہا نہ تھا تم مجھے زندہ نہ پاؤ گی ۔

وہ گھبرا کر اٹھی ۔ کیا کروں میں ۔ وہ سوچنے لگی ۔ کیا کروں ۔ دفعتاً اُسے خیال آیا نیچے چل کر دیکھوں تو کیا امی سو رہی ہے ۔ نہ جانے کیوں اس نے محسوس کیا جیسے وہ امی کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو ۔

دالان سے ملحقہ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ درمیانی دروازہ کھلا ہے ۔ ماں جائے نماز پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے ۔ نہ جانے امّی کیا پڑھتی رہتی ہے ۔ نہ جانے کیا دعائیں مانگتی رہتی ہے ۔ وہ سوچنے لگی ۔

عین اسوقت ماں نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک دعا مانگتی رہی ۔ ریحانہ واپس آنے کے لئے تیار تھی ۔ جب ماں آپ ہی بآواز بلند بولنے لگی ۔ یااللہ تو ہی اسکا محافظ ہے ۔ یا اللہ تیرے سوا اب کوئی آسرا نہیں ۔ کوئی امید نہیں ۔ تو ہی میری بچّی کے مستقبل کو سنوارنے والا ہے ۔ یااللہ میری اور کوئی خواہش نہیں ۔ میری بچّی ۔ میری بچّی" ۔ ماں کی ہچکی نکل گئی ۔

ریحانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ ماں کو اُس سے اِس قدر محبت تھی ۔ اس قدر ۔ وہ اندھادھند ماں کی طرف بھاگی اور اسکی گود میں گر کر رونے لگی ۔ امّی ۔ امّی ۔ مجھے معاف کر دو امّی ۔ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی ۔ کبھی نہ جاؤں گی ۔

"ہائیں" ۔ بڑھیا نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا ۔ "کیا کہا تُو نے" ۔

بڑھیا کا چہرا حیرانی اور دُکھ سے بھیانک ہو رہا تھا ۔

..........○..........

جادو گرنی

موسم سرما کی کہر بار صبح کے دھندلکے میں گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی ۔ پٹڑی کی دونوں جانب سر سبز کھیت دھند کی چادر اوڑھے پڑے تھے ۔ ریل کے ڈبے میں چند ایک مسافر لحافوں اور کمبلوں میں گٹھڑیوں کی طرح لپٹے چپ چاپ اونگھ رہے تھے ۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھا اپنے خیالات میں کھویا ہؤا تھا ۔ ساجد کا وہ تار جس کی وجہ سے میں لاہور جا رہا تھا ۔ ابھی تک میری واسکٹ کی جیب میں تھا۔ تار کا مضمون کس قدر مختصر اور مبہم تھا ۔ "فوراً پہنچو ، معاملہ اہم ہے ۔ " اِس پیغام کے ابہام اور اختصار کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جانے ساجد پر کیا افتاد آ پڑی ہے ۔

سام پور کے مختصر سے گاؤں میں ساجد کے تار نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا جب بوڑھا ڈاکیہ اپنے جُھریوں دار ہاتھ میں تار تھامے ہوئے بڑے بازار میں پہنچا تو سب کی نگاہیں اس بادامی لفافے پر جم کر رہ گئیں ۔ اور تمام چوک میں سناٹا سا چھا گیا ۔ پھر چودھری وڈھیرا چلّا کر بولا ۔ "بابا رحیما اللہ ہم سب پر رحم کرے ۔ یہ کیا مصیبت ہے ۔ کون مر گیا ہے ۔ یہ بم کس کے سر پر گراؤ گے ۔ " چودھری وڈھیرا نے ایک ہی سانس میں کئی ایک سوالات کر دیئے اور بابا رحیما چُپ چاپ لفافے کو گھورتا رہا مگر منہ سے کچھ نہ بولا ۔

چودھری وڈھیرا کے مہر سکوت توڑنے پر سبھی کچھ نہ کچھ بولنے لگے اور تار کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی ۔ عورتیں گھروں سے باہر نکل کر دہلیزوں پر آکھڑی ہوئیں ۔ بہن سنا تُو نے تار آیا ہے ۔ ہائے میں مر گئی تار آیا ہے ؟ محلے کی چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا اور پھر دوپٹہ سنبھال کر چل پڑی ۔ اے سُنا تم نے ۔

اِس طرح یہ خبر رحیما کے آنے سے پہلے ہی ہمارے گھر پہنچ گئی اور جب بابا رحیما ہماری گلی میں داخل ہُوا تو میں پہلے ہی دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا ۔

بابا رحیما کے ساتھ گاؤں کے بہت سے لوگ تھے ۔ تار کھولنے پر جب انہیں معلوم ہُوا کہ کوئی بھی نہیں مرا تو وہ مایوس ہو کر چلے گئے ۔ لیکن تار کے مضمون کو پڑھ کر میں فکر میں پڑ گیا کسی کی بیماری یا موت کی خبر مجھے اِس قدر پریشان نہ کر سکتی تھی ۔ جس قدر انجانے خطرے کا احساس اور پھر خطرہ بھی وہ جس کی نوعیت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو ۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ آخر کیا ہو سکتا ہے جسے ساجد نے اس قدر اہم سمجھا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ بیمار نہیں ۔ صحت کے متعلق کچھ ہوتا تو وہ اس کی وضاحت کر دیتا ۔ کسی جھمیلے میں نہ پڑ گیا ہو ۔ لیکن نہیں ساجد سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ طبعاً اِس بات کا اہل نہیں ۔ پھر ؟ جوں جوں میں سوچتا بات اور بھی پُراسرار ہوتی جاتی ۔ حتّٰی کہ میں گھبرا گیا اور پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے میں نے بات کا رُخ بدل دیا ۔ کالج میں کوئی چھوٹا موٹا واقعہ ہو گیا ہو گا ۔ جس کی وجہ سے ساجد نے گھبرا کر تار دیدیا ہے ۔ اِس خیال سے مجھے قدرے اطمینان ہوا اور مَیں نے بڑھ کر ساجد کے والدین کو تسلی دینی شروع کی ۔ جو مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تھے ۔ ساجد کے والد عجیب قسم کے وہم کھا رہے تھے ۔ اور اس کی والدہ رو رہی تھی جیسے جیسے مَیں ان کو تسلی دیتا ۔ ویسے ویسے خود میرے دل میں نئے نئے خدشات پیدا ہو جاتے اور مجھے بے چین کر دیتے ۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی میں اسی سوچ میں کھویا ہُوا تھا ۔ لیکن جتنا بھی میں سوچتا بات اُلجھتی جاتی ۔ اِن دنوں ساجد تھرڈایر میں تھا ۔ اس کی عمر انیس کے لگ بھگ ہو گی ۔ اگرچہ اس کے بھرے ہُوئے جسم کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے وہ عمر میں بڑا ہو ۔ وہ طبعاً شرمیلا اور ڈرپوک تھا اِس لئے اس کا کالج کے لڑکوں کے ساتھ مل کر کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا امکان قرین قیاس نہ تھا ۔

گاڑی سے اُتر کر میں ٹانگے میں سوار ہو گیا اور پیرروڈ پر کالج کے گردو نواح

میں فرنڈز لاج تلاش کرنے لگا ۔ جہاں ساجد اپنے چند ایک دوستوں کے ساتھ رہتا تھا ۔

فرنڈز لاج کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی ۔ چونکہ اس کی عمارت کالج کی گراؤنڈ ہی میں واقع تھی ۔ ۹ بجے کے قریب میں لاج میں پہنچ گیا ۔ لاج ایک مختصر سی چار منزلہ عمارت تھی ۔ جس کی زیریں منزل میں دوکانیں اور سٹور تھے ۔ دوسری اور تیسری منزل میں لڑکے رہتے تھے ۔ ایک تنگ سے زینے سے ہوتے ہُوئے میں باورچی خانے میں پہنچ گیا ۔ جہاں ایک بوڑھانوکر چولھے کے سامنے بیٹھا اونگھ رہا تھا ۔ اس نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ راکھ کے ڈھیر میں چند سلگتی ہوئی چنگاریوں پر پھیلا رکھے تھے ۔

"السلام علیکم ۔" میں نے چلّا کر کہا ۔ "بابا ساجد کہاں ملیں گے ۔"

بوڑھے نے سر اُٹھایا اور آنکھیں جھپکانے لگا ۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں سمٹیں موٹے موٹے لٹکتے ہوئے ہونٹوں پر ایک احمقانہ مسکراہٹ نمودار ہونے لگی ۔ "ج ۔ ج ، جناب" وہ گھبرا کر بولا "بابو جی تو خالج گئے ہیں ۔"

"کب آئیں گے ؟"

آتے جاتے ہی رہتے ہیں ، وہ سب ، یہ پاس ہی خالج ہے ۔ ابھی آجائیں یا گھنٹے دو گھنٹے کے بعد کیا معلوم ۔"

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر کہنے لگا ۔ "بیٹھ جائیں آپ میں کرسی لائے دیتا ہوں ۔" لیکن اس کے باوجود اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہ کی ۔ بلکہ ویسے ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا ۔ "یہاں نہیں تو کوٹھے پر جا بیٹھئے دھوپ میں ۔ سب بابو کوٹھے پر جا کر ہی بیٹھتے ہیں ۔"

"لاج میں کوئی ہے بھی اِس وقت ۔"

"معلوم نہیں" ۔ اس نے نہایت بے تعلقی سے کہا اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر یوں بیٹھ گیا جیسے کچھ اور کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ ہو ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بوڑھے سے ساجد کے متعلق جملہ معلومات حاصل کروں ۔ وہ بیمار تو

نہیں ۔ پریشان تو نہیں ۔ لیکن اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بے حسی اور اس کے یوں آنکھیں جھپکانے اور کھوئی کھوئی نظروں سے گھورنے سے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ۔ اس سے پوچھنے کا کیا فائدہ ۔ مَیں نے سوچا وہ بیچارا تو خُود کھویا ہوا نظر آتا ہے ۔ وہ میری تسلی کیا کر سکے گا ۔ مَیں نے باورچیخانے سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔ کمروں کے تمام دروازے مقفّل تھے اور لاج سنسان پڑا تھا ۔ یہ دیکھ کر بادلِ ناخواستہ میں زینے پر چڑھنے لگا اور چھت پر جا پہنچا ۔

کوٹھے پر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پردے تھے ۔ شمال کی طرف ایک مختصر سی برساتی بنی تھی ۔ جس کی تین دیوارىں تھیں ۔ اور گلی کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی ۔

کوٹھے پر کوئی نہ تھا فقط دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور ایک پُرانی میز پڑی تھی ۔ کرسیوں کو دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا ۔ ظاہر تھا کہ لاج والے آکر دھوپ میں بیٹھنے کے عادی تھے ۔ وہ بڈھا ٹھیک ہی کہتا تھا ۔ مَیں نے سوچا ۔

وقت کاٹنے کے خیال سے میں نے گردونواح کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔ لاج کی عمارت کا عقبی حِصہ کالج کی گراؤنڈ کے عین ملحق تھا ۔ چھت سے کالج کی وسیع عمارات اور میدان کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا ۔ میدان اور برآمدوں میں لڑکوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں ۔ اُن کے قہقہوں اور نعروں کی آوازىں صاف سنائی دیتی تھیں ۔ برآمدے کی پرلی جانب زینے کے پاس لڑکے قطار بنائے کھڑے تھے ۔ کالج کی عمارت سے پرے بورڈنگ کے برآمدے میں چند لڑکے احساسِ فراغت سے یُوں کھڑے تھے جیسے زندگی کی تگ و دو سے اُنہیں کوئی تعلق نہ ہو ۔ قریب ہی جمنیزیم میں چند ایک جھولا جھول رہے تھے ۔ کالج کے منظر سے اکتا کر مَیں برساتی میں داخل ہو گیا ۔ اور شمالی دیوار کی کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا ۔

اُس طرف منظر قطعی طور پر مختلف تھا ۔ چھوٹے بڑے اُونچے نیچے مکانات یہاں وہاں کھڑے تھے ۔ چھتیں عورتوں اور بچّوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ کوئی بال سکھا رہی تھی ۔ کوئی کپڑے دھو رہی تھی اور کوئی چپ چاپ دُھوپ میں بیٹھی

تھی ۔ دفعتاً سامنے کھڑکی میں ایک لڑکی کا سُتا ہوا پژمردہ چہرا اُبھرا ۔ لیکن اس کے خدوخال میں بلا کی دلکشی تھی ۔ اس کو دیکھتے ہی مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل میں چُٹکی لے لی ہو ۔ مَیں بے چین سا ہو گیا ۔ میرے دل میں اس پر جان نثار کرنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی ۔ درحقیقت یہ میرا قصور نہ تھا ۔ اس کے چہرے پر کچھ اسی قسم کے تاثرات تھے کہ خواہ مخواہ اس کی مدد کو اُٹھ دوڑنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی ۔ اس کے چہرے پر بے انتہا مایوسی ملال اور بے کسی چھائی ہوئی تھی ۔ اس کی جُھکی جھکی پُرنم آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ سے رحم کی اپیل کر رہی ہوں کہ میں بے کس ہوں لاچار ہوں ۔ اس ماحول میں گھٹ گھٹ کر مری جا رہی ہوں ۔ مجھے چھڑا لو اس مصیبت سے ۔ مجھے بھگا کے لے جاؤ ۔ کہیں لے جاؤ ۔ مگر لے ضرور جاؤ ۔

اسے دیکھ کر خود بخود اسے بچانے کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا ۔

اس نازنین نے پہلے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور مسکرا دی ۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب جادو تھا ۔ اُس کی نگاہوں کو دیکھ کر تو اس کی خاطر جان قربان کرنے کو دل چاہتا تھا ۔ لیکن مسکراہٹ کو دیکھ کر دل میں امنگوں کا دریا امنڈ آتا تھا اور اس کی خاطر زندہ رہنے اور زندگی کا لطف اٹھانے کی خواہش بیدار ہو جاتی تھی ۔

مسکرا کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی اور چھت پر جا کر اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی ۔ لیکن اس کے انداز میں بے نیازی نہیں بلکہ نمائش اور بناوٹ کی جھلک تھی ۔ وہ اِس چھوٹی سی لڑکی کے پیچھے بھاگتی ۔ جھپٹ کر اُسے پکڑ لیتی ۔ اس کے لمبے لمبے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھر جاتے پھر وہ کھڑی ہو کر انہیں ٹھیک کرتی ۔ سر پر دوپٹہ ڈال لیتی ۔ اور مڑ کر میری طرف دیکھتی اور اسی انداز سے مسکرا دیتی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ مجھے لبھانے کے لئے کر رہی ہو ۔ اس لئے کہ وہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا جو اس کی ادائیں دیکھ رہا ہو ۔

مَیں حیرت سے اُس کی طرف تکے جا رہا تھا ۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ایک منٹ قبل اس قدر سنجیدہ اور غمگین نظر آ رہی تھی ۔ اور جس کی نگاہوں میں اِس قدر مظلومیّت تھی کہ اس کی مدد کو اُٹھ دوڑنے کو دل چاہتا تھا ۔ میں نے اس پر ایک بار پھر نظر ڈالی ۔ ہاں یہ وہی لڑکی تھی بالکل وہی ۔ فریبِ نظر نہ تھا ۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا اس کی اداؤں کو دیکھتا رہا ۔ نہ معلوم کتنی دیر تک ۔ پھر زینے سے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر جلدی سے کھڑکی بند کر دی ۔ اور کرسی وہاں سے ہٹا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے مجھے اس کھڑکی سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو ۔

ایک لمبا چوڑا خوبرو نوجوان کنجیوں کی زنجیر کو گھماتا اور کوئی فلمی گانا گنگناتا ہوا کوٹھے پر آ گیا ۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکا ۔ پھر آگے بڑھ کر کہنے لگا ۔

"نووارد معلوم ہوتے ہیں آپ ۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا ۔

"کون سے ایر میں داخل ہوئے ہیں ۔" اُس نے اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا ۔

میں تو ساجد کا چچا زاد بھائی ہوں ۔ اس سے ملنے آیا ہوں ۔" میں نے جوابدیا ۔

"اچھا ۔ اچھا ۔" اس نے گردن کو جھٹکا دے کر کہا ۔ "میں سمجھ گیا ۔ تم اس کے گاؤں سے آئے ہو ۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا ۔ "ساجد کا کیا حال ہے ۔"

"تمہارا مطلب" اس نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا ۔

"نہیں" میں نے گھبرا کر کہا ۔ "میرا مقصد تھا کہ اس پر کوئی مصیبت تو نازل نہیں ہوئی ۔"

"مصیبت" اُس نے طنزاً دہرایا ۔ "اس پر کیا نازل ہو سکتی ہے ۔ وہ تو سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے ۔ بھلا ایسے لڑکوں پر کیا مصیبت نازل ہو گی ۔ جو

راہ راست سے انحراف ہی نہیں کرتے۔"

"اچھا اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو دوسری کُرسی پر تشریف لے جائیے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"بہتر جناب۔" میں نے جواب دیا۔

"جناب نہیں۔ آپ مجھے فدا کہہ کر پکار سکتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"اچھا فدا صاحب ساجد کی طبیعت تو خراب نہیں۔"

"طبیعت" اس نے اسی انداز سے دہرایا۔ "اس کی طبیعت کیا خراب ہو گی۔ وہ بد پرہیزی کرنی تو جانتا ہی نہیں۔ اسکا کھانے اور پڑھنے سونے کے علاوہ کوئی دوسرا شغل ہی نہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے کھڑکی کھول لی اور وہاں کھڑا ہو کر سیٹیاں بجانے لگا۔ پھر اس نے مکّہ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا مصیبت ہے۔ آج کیا ہو گیا۔"

"کیا ہو گیا۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم کیا ہوا۔ اس نے برہم ہو کر کہا۔ لیکن یکایک اسے خیال آگیا۔ کہ ایک اجنبی کو برہمی دکھانے کا کیا فائدہ۔ چنانچہ اس نے ذرا سنبھل کر کہا۔ "وہ۔ وہ ہے نا۔ خدا کی قسم وہ جادوگرنی ہے۔"

"جادوگرنی" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"وہ میری معشوقہ ہے۔" وہ میری بات سنے بغیر ہی کہتا چلا گیا۔ "سامنے والے مکان میں رہتی ہے۔ خدا جانتا ہے بلا کی حسین ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس خاکسار کو دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"سچ کہتا ہوں مرتی ہے وہ تو مجھ پر۔ بہت ہی وفا شعار ہے۔ مگر نہ معلوم کیا ہو گیا ہے آج ـ۔ آج وہ آئی کیوں نہیں۔"

وہ عالمِ اضطراب میں چھت پر ٹہلنے لگا اور دل کی دھڑکنوں کو روکنے کی خاطر پھر سے فلمی نغمہ الاپنا شروع کر دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ

اسی لڑکی کا ذکر کر رہا تھا ۔
"مگر وہ کسی اور شخص کے سامنے نہیں آتی ۔ اسی لئے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ دوسری کرسی پر چلے جاؤ ۔" وہ ٹہلتا ہوا پھر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا ۔ یقین نہیں تو دیکھ لو اس کی کھڑکی آج بند ہے ۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ اس کے انداز میں فخر اور مسرّت کا امتزاج تھا ۔

غالباً یہ سب میرا قصور ہے ۔ "میں نے ندامت سے کہا ۔
"نہیں ۔ نہیں اس میں قصور کا کیا سوال" اس نے نہایت فیاضانہ لہجہ میں کہا ۔
"مگر اس کا حُسن ۔ خدا کی قسم ایمان شکن ہے ۔ مگر اس سے فائدہ ؟ وہ مجھ سے کس قدر دور ہے ۔ وہ میرے قریب تک نہیں آ سکتی ۔ میں اُس کے قریب نہیں جا سکتا ۔"
"آہا وہ آگئی ۔" اس نے ایک دم چلّا کر رومال ہوا میں لہرایا ۔ "میری جان مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی ۔ بھلا تم میرے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہو ۔" اُس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہنا شروع کیا ۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ پر مرتی ہو ۔" اُس نے اس طرح رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا ۔ جیسے وہ سن رہی ہو ۔ "میری جان میں بھی تو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔"

دیر تک وہ وہاں کھڑا اسی طرح عجیب و غریب حرکات کرتا رہا رومال لہراتا اور فلمی گیت گاتا رہا اور میں ہمہ تن حیرت بنا اس کو دیکھتا رہا کچھ دیر بعد کالج کی گھنٹی بجی اور وہ کھڑکی بند کر کے بڑبڑاتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا ۔" یہ بدبخت بوڑھا جب دل چاہتا ہے گھنٹی بجا دیتا ہے۔کسی روز میں اس کی گردن اڑا دوں گا ۔"
"دیکھا تم نے ۔ اس نے پھر کھڑکی بند کر لی ۔" اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔
"خدا کی قسم وہ میری ہے اور صرف میری ۔ وہ میرے علاوہ کسی کے لئے کھڑکی نہیں کھولتی ۔" یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف چل دیا اور پھر رستے ہی میں مڑ

کر کہنے لگا۔ یہ وہ امریکہ ہے جس کا کولمبس میں ہوں۔ سمجھے۔ کچھ نہیں سمجھے۔ مگر یہ میرا راز ہے۔ یہ کسی سے بتانا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ زینے سے نیچے اترنے لگا دو تین سیڑھیاں اُتر کر پھر رُک گیا بولا "ہاں اگر ساجد ملا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

اس کے جاتے ہی میں جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اس کے طلسمی چہرے کو دیکھنے کی خواہش میں جسے دیکھتے ہی میں اپنی تمام پریشانیاں بھول گیا تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میں وہاں کس لئے آیا تھا۔ مگر کھڑکی بند تھی۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ میں اس بند کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں قدموں کی آہٹ پھر سنائی دی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کی اور دوسری دیوار کی طرف آ کھڑا ہوا۔ جس میں ایک چھوٹی سی درز تھی۔ جس میں سے باہر کی ہر چیز نظر آجاتی تھی۔ لیکن باہر والے مجھے نہ دیکھ سکتے تھے۔ میں وہاں بیٹھ کر نووارد کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے قد کا پتلا دُبلا سا شخص بغل میں بہت سی کتابیں دبائے ہوئے داخل ہوا اُس نے جلدی سے کتابیں میز پر پھینکیں۔ جیب سے رومال نکال کر اپنی عینک کے آئینے صاف کئے اور مسکرا کر کھڑکی کھولنے لگا۔

"او اوہ۔" اُس نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا اور دو تین بار جلدی جلدی تھوک نگل کر اپنا کالر ڈھیلا کرنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے۔" اُس نے بہت دیر کے بعد گلا صاف کر کے کہا۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ افسوس کی کیا بات ہے۔ میں ساجد کا چچا زاد بھائی ہوں۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور ایک دزدیدہ نگاہ کھڑکی کی طرف ڈالی۔ کھڑکی کی جانب دیکھنے کے بعد اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار اور بھی نمایاں ہو گئے۔

"اُف اللہ۔" اُس نے زیرِ لب کہا۔

مَیں دیوار کی درز میں سے دیکھنے لگا ۔ وہ لڑکی اسی مظلومانہ انداز سے کھڑکی میں کھڑی تھی اور وہ غریب نوجوان اُسے دیکھ دیکھ کر مضطرب ہوا جا رہا تھا غالباً وہ اپنا راز ایک اجنبی پر افشا کرنے سے ڈرتا تھا ۔ بہر حال وہ بے حد بے چین تھا ہر لمحہ کے بعد اُس پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈال دیتا تھا ۔ مجھے اس بے چارے پر بے انتہا رحم آنے لگا ۔ میرا دل چاہا کہ اس کے رستے سے ہٹ جاؤں ۔ مگر جاتا کہاں ۔ پھر میں نے کہا ۔" کیا خوبصورت لڑکی ہے اچھا مشغلہ ہے کیوں تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہا ۔

"نہیں ۔ نہیں تمہارا خیال غلط ہے ۔ وہ ایسی نہیں ہے ۔ میں تو خود ایسی لڑکیوں سے نفرت کرتا ہوں ۔ یہ مشغلہ نہیں ۔

"پھر کیا ہے"

میں نے پوچھا ۔

"اب چونکہ تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہے ۔" اُس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر ہی کہنا شروع کر دیا ۔ "تو تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ۔ وہ تو ایسی پاکباز لڑکی ہے کہ میں اس کی خاطر جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوں آوارہ لڑکی نہیں شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننا نہیں چاہتی ۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور صرف مجھ سے ۔ اسی لئے تو میں نے آج تک یہ راز کسی کو نہیں بتایا ۔" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا ۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا ۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اُسے کھلونا سمجھ کر کھیلنے لگیں گے ۔ اُسے آوارہ لڑکی سمجھیں گے ۔ خدا کے واسطے یہ میرا راز ہے ۔ اس کو راز ہی سمجھنا ۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا ۔

"نہیں ۔ نہیں فکر نہ کرو ۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گا ۔" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا ۔

"بہت مہربانی ۔ یہ کہہ کر اس نے میز پر سے کتابیں اٹھائیں ۔" اچھا اب

میں جاتا ہوں" اس نے آخری بار کھڑکی کی طرف دیکھا ۔ جھک کر سلام کیا اور نیچے اُتر گیا ۔

ابھی وہ نیچے اُترا ہی تھا کہ زینے سے قدموں کی آواز سنائی دی ۔ نیچے کوئی چلا کر بولا جلدی جاؤ ساجد کوئی شخص اوپر تمہارا انتظار کر رہا ہے ۔"

ساجد کا نام سنتے ہی میں اس لڑکی کو بُھول گیا ۔ جس نے اتنی دیر تک میرے ذہن سے ساجد کے خیال کو دور رکھا تھا ۔ ساجد سے ملنے کے لئے میں زینے کی جانب بڑھا ۔

"ہیلو ساجد ۔" میں اسے دیکھ کر چلّایا ۔

"اچھا تم آگئے ۔" اُس نے جوب دیا ۔ "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے ۔"

"تم اچھے تو ہو ۔" میں نے بے تابی سے پوچھا ۔

"ہاں بظاہر تو ۔" اُس نے آہ بھر کر جواب دیا ۔

"مگر بات کیا تھی ۔ ہماری تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی تار دیکھ کر" میں نے پریشانی سے کہا

"بتاتا ہوں ۔ تم بیٹھو تو سہی ۔" ساجد نے جواب دیا ۔

مَیں غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا ۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا ۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں ۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں ۔

"اچھا ہوا تم آگئے ۔" اُس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ۔ "اور سب سے اچھا یہ ہوا کہ تم وقت پر پہنچ گئے ۔"

"مگر بات کیا ہے ۔" میرا اضطراب بڑھ رہا تھا ۔

"بہت ہی خطرناک معاملہ ہے ۔ اس کا اثر میری تمام زندگی پر پڑے گا ۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں مجھے جیل خانے کا منہ دیکھنا پڑے ۔" اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا ۔

"ساجد" میں نے چلّا کر کہا ۔ "کیا باتیں کر رہے ہو ۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔" اُس نے اسی انداز سے جواب دیا ۔
"ممکن ہے مجھے کوئی قتل کر دے ۔"
"مگر ہوا کیا ۔" میں نے زور سے چلّا کر کہا ۔
"ناراض نہ ہو ۔ میری فریاد غور سے سنو ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک بہت بڑا جرم کرنے والا ہوں ۔" اُس کے لہجہ میں فریاد کا انداز تھا ۔
"جرم" میں نے حیرت زدہ ہو کر دہرایا ۔
"ہاں لوگ تو اس کو جرم ہی کہیں گے ۔" اس نے مظلومیت بھرے انداز میں کہا ۔
"مگر قصہ تو بتاؤ میں نے برہم ہو کر کہا ۔
"ناراض مت ہو ۔" اُس نے آہ بھری ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے ۔ جنہیں وہ پینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ ناراض نہ ہو باقر ۔ اب تمہارے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ۔"
"لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ۔" مَیں نے پوچھا ۔
"اُس نے میرے شانوں پر سر رکھ دیا اور پُھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا ۔
"اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر آج رات کو میں اُسے نہ لے گیا تو وہ زہر کھالے گی ۔"
"کون زہر کھالے گی ۔" مَیں نے پوچھا ۔
"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں ۔ وہ ضرور زہر کھالے گی ۔ وہ میری خاطر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گی ۔" اُس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھی ۔
"نہیں ۔ نہیں ۔" اُس نے ایک دم میرے شانوں پر سے اپنا سر اُٹھا کر کہا ۔ "میں اُسے زہر نہیں کھانے دوں گا ۔ آج رات کو میں ضرور اُسے لے جاؤں گا باقر سچ کہتا ہوں وہ بہت ہی وفا شعار اور پاکباز لڑکی ہے ۔"
"باقر مجھے اس سے محبت ہے ۔" اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "وہ گھر کے قید خانے میں میری خاطر اپنی زندگی برباد کر رہی ہے وہ سامنے گھر میں"

اسنے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"ہنسو نہیں۔" اُس نے کہا۔ "یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

.........O.........

میرا گھر

کاش کہ میں اِسے کہانی کے روپ میں ڈھال سکتا۔ لیکن کوئی بات بھی ہو جس کی کہانی بن سکے۔ ایک عام سا واقعہ، جسے غالباً آپ واقعہ تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس واقعہ نے مجھ پر اس قدر اثر کیوں کیا۔

یہ واقعہ میرے گھر سے متعلق ہے۔ وہ گھر جو میری دوسری شادی سے پہلے مجھ پر محیط و مسلط تھا۔ آپ جانتے ہیں دوسری شادی ایک عام سی بات ہوتی ہے جس قدر پہلی شادی اہم ہوتی ہے اُسی قدر دوسری شادی غیر اہم ہوتی ہے۔ جس میں نہ تو والدین کو اشتیاق ہوتا ہے۔ نہ محلے والوں کو دلچسپی ہوتی ہے اور میری اِس دوسری شادی کی مزید خصوصیت یہ تھی کہ مجھے خود بھی نہ تو شادی سے دلچسپی تھی نہ آبادی کا شوق تھا۔ اور نہ ہی بیوی کا انتظار۔ اس شادی کا مقصد اس مسلّط و محیط ویرانی سے فرار تھا۔ جس کے بوجھ تلے تین افراد سسک رہے تھے۔ پانچ سال کا ایک بچّہ ضیا، ساٹھ سال کی بوڑھی امّاں اور اُس کا اکلوتا بیٹا ـــ میں

یہ ایک چھوٹا سا عام سا گھر تھا۔ جس کے افراد ماضی کے اذیت دہ اثرات سے مخلصی پانے کی ناکام جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان افراد کی کیفیت اُن سمندری پرندوں کی سی تھی جو طوفان کے گزر جانے کے بعد دیر تک پہاڑوں کی ویران کھوہوں میں ڈر کے مارے دبکے رہتے ہیں۔

طوفان گزر چکا تھا اور ڈھیر پور کی اس کھوہ میں ہم تین لٹے پٹے افراد اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف تھے۔ ننھا ضیا ہاتھوں میں اپنی ٹھوڑی تھامے اس کچی اور میلی دیوار کو تکتا رہتا اور بوڑھی ماں چولھے پر مٹی کی ہنڈیا رکھے

دھوئیں کو گھورتی رہتی اور پھر دفعتاً پڑوسی کی کالی بلّی کو دیکھ کر ڈر کر جاگ پڑتی اور اس چھائی ہوئی دہشتناک خاموشی سے چھٹکارا پانے کیلئے اپنے آپ سے کہتی ۔ "ابھی اجمل نہیں آیا ۔ ابھی اجمل نہیں آیا ۔" اور ننھا ضیا اُس کی بات سنے اور سمجھے بغیر سر ہلاتا ۔ "اونہوں ۔" اور پھر سے وہ دونوں خاموش ہو جاتے ۔ بوڑھی ماں دیوار کو گھورنا شروع کر دیتی ۔ اور ضیا چولھے میں بل کھاتے ہوئے دھوئیں کو دیکھنے میں کھو جاتا اور پھر نہ جانے کیوں دفعتاً گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ۔ "اماں ابا نہیں آیا ۔" اور بوڑھی ماں اُس کی بات سمجھے بغیر نفی میں سر ہلاتی اور وہ پھر خاموش ہو جاتے ۔

ننھا ضیا ایک کھویا ہوا بچہ تھا ۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چیزیں یوں بدل کیوں جاتی ہیں ۔ پہلے وہ امی اور ابا کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔ پھر دفعتاً اس کا ابا گم ہو گیا اور وہ امی کے ساتھ رہنے لگا ۔ اب اس کی امی نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی ۔ ابا جانے کہاں سے آگیا تھا اور اب وہ ابا کے ساتھ رہتا تھا ۔ اب وہ ڈرتا تھا ۔ کہیں ابا گم نہ ہو جائے اُسے چیزوں پر بھروسہ نہیں رہا تھا ۔ اگر پڑوسی کی سیاہ بلّی دفعتاً سفید روپ بدل لیتی تو بھی وہ حیران نہ ہوتا ۔ اس کے لئے اس دنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہ تھی ۔ ننھے ضیا کی آنکھوں پر ہمیشہ کے لئے حیرانی کا خول چڑھ چکا تھا ۔

بوڑھی ماں اِس طوفان سے بالکل ہی سٹھیا گئی تھی ۔ اُس نے اپنی تمام تر زندگی ویرانے میں گزاری تھی ۔ اِس لئے اس کی امیدیں مجھ پر استوار تھیں ۔ چونکہ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ مگر اس طوفان نے اُس کی امیدوں کی کشتی کو ڈبو دیا تھا اور اب اس کی کیفیت اُس بڈھے ملاّح کی سی تھی جو بیتے ہُوئے طوفانوں کی یاد سے ڈر کر چونکتا رہتا ہے ۔

اُس کھوئے ہوئے بچّے کو دیکھ کر اس سہمی ہوئی بڑھیا کے دُکھ کو محسوس کر کے اُس مسلّط و محیط ویرانی کے بوجھ سے اکتا کر جو اس گزرے ہوئے طوفان کی بپتا کو ہر دم دہراتی رہتی تھی ۔ میں اُٹھ کر بھاگ لیتا اور بے مصرف اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا یا قریشی کے گھر میں جا کر ستار بجانے کی ناکام کوشش کرتا ۔

حتیٰ کہ ستار کے تار وہی داستان دہرانا شروع کر دیتے جو تھے ضیا کی آنکھوں میں کندہ تھی ۔ جو بوڑھی ماں کے ہاتھوں کی لرزش میں آشکار تھی ۔ پھر میں اپنے گھر کی طرف اُٹھ بھاگتا مجھے دیکھ کر تھے ضیا کو یقین نہ پڑتا کہ میں آگیا ہوں ۔ بوڑھی ماں کا ہاتھ شدت سے کانپتا اور پھر ساکت ہو جاتا ۔ ضیا چپکے سے میرے قریب آکر کھڑا ہو جاتا اور پھر میری طرف دیکھتا ۔ حتیٰ کہ میں اسے آواز دیتا "ضیا" اور وہ بھاگ کر میری گود میں آ جاتا اور کہتا ۔ "تم ہو ابا" جیسے اُسے میرے ہونے کا یقین نہ ہو ۔

وہ طوفان ، میرا خود ساختہ طوفان تھا ، جس کے تحت مَیں نے پہلی شادی کی تھی میں اور میری پہلی بیوی نے اقربا سوسائٹی اور رسم و قواعد کے خلاف جنگ کی تھی ۔ اور سوسائٹی نے ہم سے انتقام لیا تھا اور اُسے میرے روبرو حریف بنا کر لا کھڑا کیا تھا ۔ جس کے حصول کے لئے میں تمام دُنیا سے بر سرِ پیکار ہوا تھا ۔ "تم مر جانہ" مَیں نے اسے کچہری میں مدعی کے کٹہرے میں دیکھ کر کہا تھا ۔ "تم "؟ اور پھر میں نے محسوس کیا تھا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو ۔

"ہاں میں ۔" وہ جواب میں للکار کر بولی تھی ۔ "مجھ میں جرأت ہے ۔" لیکن اُس کی اِس آخری جرأت کی شدت نے خود اس کا بند بند توڑ دیا ۔ اور اس کے بعد چند ہی دنوں میں اُس نے اپنے آپ کو ایک مختصر سی ہچکی سے موت کے حوالے کر دیا ۔

ہاں وہ طوفان گزر چکا تھا اور اپنے عقب میں وہ بھیانک تاثرات چھوڑ گیا تھا ۔ جو بذاتِ خود اس طوفان سے کہیں زیادہ خوفناک تھے ۔ ایک گھٹن ، ایک ذہنی ناسور ایک یاس بھری منقلبت اور ایک خوفناک عالمِ ہراس مہیب چٹانوں کے ایک ویران کنارے پر مر جانا اور میری شادی کی کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پڑی تھی ۔ سمندر کی تھکی ہاری لہروں کے منہ سے اب بھی جھاگ نکل رہا تھا ۔ چٹانوں کے نیچے اس ڈراؤنی کھڈ میں تین زخمی پسماندگان سسک رہے تھے اور اوپر گہرے نیلے اُداس آسمان پر گدھ منڈلا رہے تھے ۔

کیچڑ کی تھپی ہوئی وہ دیوار تھے ضیا کو گھورتی تھی ۔ گیلی لکڑیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں بوڑھی ماں کے سامنے ڈراؤنے روپ بدلتا تھا ۔ اور گھر پر مسلط و محیط ویرانی خوفناک آواز میں مجھ سے کہتی ۔ "میں ہوں اجل میں ۔ ہاں مجھ میں جرأت ہے ۔"

اس وقت میرا جی چاہتا کہ بھاگ جاؤں کسی اور گھر میں بھاگ جاؤں جہاں وہ کچی دیوار نہ ہو ۔ وہ دھواں نہ ہو اور وہ خوفناک آواز نہ ہو جسے سن کر میرا دل بیٹھ جاتا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ایسی جگہ بھاگ جاؤں ۔ جہاں تھے ضیا کی نگاہیں پھر سے لوٹ آئیں ۔ جہاں وہ میرا بلاوا سُن کر یہ نہ کہے "تم ہو ابا" جہاں بوڑھی ماں کے ہاتھ نہ کانپیں اور اس کے سر کی وہ دائمی جنبش نہ ہو جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا گویا وہ کہہ رہی ہو ۔ "نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔

اسی اُمید پر مَیں نے ڈھیر پور میں تین مکان بدلے تھے ۔ مگر ہر جگہ وہ کچی دیوار آ کھڑی ہوتی تھی ۔ وہ دھواں آ کر بل کھانے لگتا ۔ اور وہ سیاہ بلّی نہ جانے کہاں سے آ موجود ہوتی تھی ۔ جو مجھ سے زیرلب کہتی ۔ "میں ہوں اجل میں ۔" اور اُس کی آواز سُن کر میری ریڑھ کی ہڈی چٹاخ سے ٹوٹ جاتی اور سر لٹک جاتا ۔

ہم تینوں اس گھر سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے رہتے مگر وہ گھر ہم پر آسمان کی طرح مسلط تھا ۔

چائے کے برتن میز پر رکھ کر بوڑھی ماں میری طرف دیکھتی ۔ "اجمل" وہ ملتجیانہ انداز میں اس کے پاس جا بیٹھا اور ان جانے میں کچھ کہنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا ۔

"اماں" مَیں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا ۔

اماں نے سر اُٹھایا ۔ مَیں خاموش ہوگیا ۔ دیر تک ہم غیر ازمعمول ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے میں نے پھر کچھ کہنا چاہا... اماں

اماں نے سر اٹھائے بغیر کہا ۔ "ہاں ۔" میں پھر خاموش ہوگیا اور وہ اپنے

کام کاج میں مصروف ہو گئی ۔ حتیٰ کہ سائے لمبے ہو گئے ۔ شام پڑ گئی اور اماں کی ہنڈیا تیار ہو کر چولہے سے اتار دی گئی ۔ اُس کی جگہ توے نے لے لی ۔

"کیوں اماں ؟" مَیں نے کہا ۔

"ہاں بیٹا ہاں ۔" وہ بولی ۔ اس کی ہاں میں سوالیہ انداز نہ تھا ۔ بلکہ اُس چھوٹے سے جملے کی حیثیت گویا ایک قطعی فیصلے کی تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو ہاں بیٹا اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔

اس روز مَیں نے محسوس کیا جیسے اُس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو ۔ مگر کس کے سوا چارہ نہ تھا اسے الفاظ میں ہم دونوں میں سے کسی نے نہ کہا تھا ۔ اُس روز میں نے محسوس کیا جیسے بوڑھی اماں کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ ہو ۔

لیکن دوسری شادی کے لئے یہ باہمی مبہم رضا مندی ہی کافی نہ تھی ۔ سوال تو یہ تھا کہ کیسے ہو کس سے ہو ۔

ہاں تو اس دوسری شادی کے کوائف عجیب سے تھے ۔ اس کے لئے کوئی خواہش مند نہ تھا ۔ کوئی بے تاب نہ تھا ۔ اور عملی طور پر اسے ممکن بنانے کے لئے کوئی کوشش کرنے والا نہ تھا ۔ بوڑھی اماں تو اس معاملے میں بالکل معذور تھیں ۔ وہ کس منہ سے جا کر کسی سے سوال کرتیں ۔ اس علاقے میں کون تھا جو اس طوفانی واقعہ سے واقف نہ تھا ۔ جو ماضی سے شناسا نہ تھا ۔ رہا میں تو میں تو صرف یہی کر سکتا تھا کہ کسی نا عاقبت اندیش آزاد طبیعت کی لڑکی کو بہلا پھسلا کر آمادہ کر لیتا ۔ مگر دقت یہ تھی کہ مجھے اپنے چناؤ پر بھروسہ نہ رہا تھا اور اب مجھے آزادی پسند طبیعت سے ڈر آتا تھا ۔ جب بھی کسی آزاد عورت کو دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ کہہ رہی ہو ۔ ہاں مَیں ہوں ۔ مجھ میں جرأت ہے ۔ اور پھر ایک طوفان اٹھتا اور میں اس میں تنکے کی طرح ڈولتا ۔

مختصر یہ کہ میرے گھر کی کیفیت اُس کشتی کی طرح تھی جس کے بادبان تار تار ہو چکے ہوں ۔ اور چپو سمندر میں گر چکے ہوں اور لہریں ساکت ہو چکی ہوں ۔ اور اِس میں ایک بڑھیا اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ بڑھیا کی نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں اور مرد سر جھکائے ساکت پانی کی طرف دیکھ

رہا تھا ۔ اور ایک ننھا بچہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ یوں خاموش کیوں تھے ۔

یونہی دن گزرتے گئے ۔ مگر وقت گزرنے کا نام نہ لیتا تھا ۔

ایک دن جب میں چائے پی رہا تھا تو اماں چپکے سے میرے پاس آئی ۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا ۔ اماں کے ہاتھ میں اخبار ۔ یہ بات غیر از معمول تھی ۔ مگر اس گھر میں مزید حیران ہونے کی اب گنجائش ہی نہ رہی تھی ۔ وہاں سبھی ایک عالمِ حیرانی میں وقت کاٹنے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ "اجمل" اماں اخبار آگے بڑھاتے ہوئے بولی ۔
"یہ لو ۔" اخبار مجھے دے کر وہ چلی گئی ۔ لیکن وہ تو پرانا اخبار تھا ایک ماہ پرانا پھر دفعتاً میری نگاہ اُس بکس پر پڑ گئی جو صفحے کے درمیان میں بنا تھا ۔ "ضرورت رشتہ ، میرا دل ڈوب گیا ۔

گھنٹے گزر گئے صدیاں گزر گئیں اور میں وہ اخبار سامنے رکھے ہوئے بیٹھا رہا ۔ حتّٰی کہ اماں کی آواز نے مجھے چونکا دیا ۔ وہ وہیں باورچیخانے میں بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی ۔ "اجمل بیٹے ٹھیک ہے نا۔"
"ہاں ماں ۔" میں نے سمجھے بغیر کہہ دیا ۔ "ٹھیک ہے ۔" اور پھر چونک کر اُس بکس کی عبارت پڑھنے لگا ۔

چند ایک دنوں کے بعد دوسرا اخبار آگیا ۔ جس میں ایک اور بکس تھا ۔ جس میں ضرورت کے بغیر خالی رشتہ لکھا تھا ۔ بوڑھی اماں نے اُس پرچے کو اُٹھا لیا اور اُسے اپنی آنکھوں کے قریب لے جا کر یوں سر گھمانے لگی ۔ جیسے وہ کوئی چابی کی گڑیا ہو پھر وہ اُسے اُٹھا کر باورچیخانے میں لے گئی ۔ ہر بار روٹی کو توے پر ڈال کر وہ پرچہ اٹھا لیتی اور ان لکیروں پر نگاہ دوڑاتی اور پھر اُسے چوکی پر رکھ کر روٹی الٹ کر پھر سے پرچے کو اُٹھا لیتی ۔

ایک دن گزر گیا ۔ ایک ہفتہ گزر گیا ۔ لیکن اماں گویا ابھی تک اس مختصر سے بکس کی عبارت کو ختم نہ کر سکی تھی ۔ حسب معمول وہ پرچہ اُس کے دائیں ہاتھ چوکی پر پڑا رہتا تھا ۔ ہنڈیا میں مصالحہ ڈال کر وہ اُسے چولہے پر رکھ دیتی اور

پھر پرچہ اٹھا کر بیٹھ جاتی ۔

دروازے کی ہلکی سی آہٹ سُن کر بھی وہ چلاتی ۔ "آئی" اور پھر دروازہ کھولتے وقت اُس کا ہاتھ کانپتا ۔ اور وہ دیر تک دروازے کے خلا کو گھورتی رہتی ۔ "خط آئیگا ضرور آئے گا ۔" وہ زیرِلب کہتی یوں اپنے آپ کو تسلیاں دیتی ۔ مجھے تو اب اس بکس کی عبارت مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی تھی ۔ جب میں آخری لائن پڑھتا ۔ "شکل و صورت اور ذات پات کی کوئی قید نہیں ۔ لڑکی کی عمر بڑی ہو تو بہتر ہو گا ۔" تو مجھے افسوس ہوتا ۔ جیسے وہ ایک مذاق ہو ۔ جیسے کسی مسخرے نے وہ عبارت لکھی ہو ۔

ایک مہینے کے بعد ایک دن دروازے پر دستک ہوئی ۔ اور ایک نیلا سا لفافہ اندر آگرا ۔ اماں نے دوڑ کر لفافہ اٹھا لیا اور مجھے دیدیا ۔ اور میں نے اُسے کھولے بغیر میز پر رکھ دیا ۔ ایک گھنٹہ گزر گیا ۔ دو گھنٹے گزر گئے ۔ مگر وہ میز پر ہی پڑا رہا ۔ میں اُسے گھورتا رہا ۔ مجھے اُسے کھولنے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی ۔ اِدھر باورچیخانے میں اماں بڑی شدت سے اس میلے پرچے پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی ۔ اور تنھا ضیا کچی دیوار کی جگہ اس نیلے لفافے کی طرف گھور رہا تھا ۔ پھر دفعتاً اماں کی آواز گونجی ۔ "بیٹے اجمل" اس روز اماں کی آواز میں غصّے کی جھلک تھی ۔
"ہاں اماں ۔" میں چونک کر بولا اور لپک کر میں نے لفافہ اُٹھا لیا ۔ اُسے کھولا ۔ لکھا تھا ۔ مکرمی آپ کا اشتہار نظر سے گزرا ۔ کیا آپ اس مسئلہ کو مناسب طور پر سنجیدہ سمجھتے ہیں یا تفریحاً آپ نے اشتہار دے رکھا ہے ۔ ازراہِ کرم مندرجہ ذیل پتہ پر جواب دیجیے ۔ خیر اندیش ۔

مَیں نے خط پڑھ کر میز پر رکھ دیا اور ازسرِ نو چائے کی کیتلی کو گھورنے لگا ۔
"بیٹے اجمل" اماں کی آواز پھر آئی ۔
مَیں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی ۔ میں نے سر نفی میں ہلا دیا ۔ وہ چپکے سے آگے بڑھی اور کھلا لفافہ اٹھا کر باورچیخانے میں چلی گئی ۔

شام کو جب میں باورچیخانے میں گیا تو دیکھا کہ اماں گھٹنوں کو بازوؤں میں

سمیٹے چوکی پر گٹھڑی بنی ہوئی سیاہ چھت کو گھور رہی ہے اور اس کے پاؤں میں اخبار کا وہ پرچہ جلا پڑا ہے ۔

دفعتاً پڑوس میں قریشی صاحب کی ستار رونے لگی ۔ گویا چلّا چلّا کر مجھے بلا رہی ہو ۔

میں چپ چاپ باہر نکل گیا ۔

دیر تک قریشی ستار بجاتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا ستار اپنا دکھڑا کہتی رہی اور فضا پر ایک پُراسرار سکوت طاری رہا ۔ پھر دفعتاً قریشی نے اپنا ہاتھ روک لیا اور مجھ سے کہنے لگا ۔ "اجمل صاحب آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ۔"

"اچھا" میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا ار سر جھکا لیا ۔

"تو ہم کر دیں انتظام ۔" چق کے پیچھے سے آواز آئی ۔ میں نے حیرانی سے چق کی طرف دیکھا ۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس آواز میں جرأت کی جھلک ہو ۔

"تمہاری کوئی شرط ہے اِس معاملے میں ۔" قریشی نے پوچھا ۔

"میری" مَیں گھبرا گیا "نہیں تو ۔"

"کوئی بھی نہیں ؟" اُس نے پھر پوچھا ۔

"اونہوں" میں نے سر ہلا دیا ۔

"پھر سوچ لیجئے" اندر سے آواز آئی ۔

"ہاں" میں چونک کر بولا "ایک بات ہے ۔"

"ہے نا ایک بات" اس آواز میں تمسخر کی جھلک تھی ۔ "خوبصورت ہو ۔ ہے نا ۔" آواز آئی ۔

"نہیں" میں نے بمشکل جواب دیا ۔

"جوان ہو" وہ بولی ۔

"نہیں" مَیں نے جواب دیا ۔

مکان پر خاموشی طاری ہو گئی ۔

"اچھا" قریشی بولا "کیا شرط ہے تمہاری"

"وہ مجھے میرے گھر سے بچا لے ۔ میرے اپنے گھر سے ۔"
"آپ کے گھر سے" آواز آئی "آپ کا تو گھر ہی نہیں فی الحال"
"میرا مطلب ہے وہ مجھے مجھ سے بچا لے"
چق کے پیچھے ایک تمسخر بھرا قہقہہ گونجا ۔
"یعنی یعنی" میں نے وضاحت کرنے کی پھر کوشش کی "وہ میرے گھر میں نہ رہے بلکہ ہمیں اپنے گھر میں لے جائے ۔ وہ اسے اپنا گھر بنا لے ۔ میرا مطلب ہے ۔
یہ بھی کوئی بات ہے وہ ہنسنے لگی ۔
"ہاں ہاں" میں نے کہا ۔ "نہیں نہیں میرا مطلب ہے ۔" گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ گھر آ کر میں بستر پر چپ چاپ لیٹ گیا ۔ بیگم قریشی کیا کہتی ہو گی ۔ مخبوط الحواس شخص ہے ۔ اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے وہ طوفان اور اس کے اثرات وہ کچی دیوار ، وہ بل کھاتا ہوا دھواں ۔ سب خیالی چیزیں تھیں ۔ مضحکہ خیز باتیں جنہیں بیان تک نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ وہ بھلا حقیقی کیسے ہو سکتی تھیں ۔

میں دیوانہ وار اُٹھ بیٹھا "ہی ہی ہی ہی" میں نے قہقہہ لگایا ۔ اس مکان میں وہ قہقہہ یوں گونجا جیسے کسی مندر میں اذان کی آواز ہو "اجمل" اماں چلّائی "ابا" ضیا رونے لگا ۔

مَیں نے ضیا کو جھڑک دیا اور بوڑھی ماں کو دھکیل کر باہر نکل گیا ۔ معمار کو ساتھ لے کر میں پھر سے گھر میں داخل ہوا ۔

"یہ کچی دیوار گرا دو" میں نے کہا "اس کی جگہ پختہ دیوار چن دو ۔ باورچی خانے کی دیواریں سفید کر دو ۔ چٹی سفید ۔ اور یہ کمرہ اس میں ڈس ٹمپر ہو جائے سمجھے سارا گھر گویا یکسر بدل جائے"

سارا گھر یکسر بدل گیا ۔ مگر ننھے ضیا کی نگاہیں اِس سفیدی کی وجہ سے اور بھی دھندلا گئیں ۔ اور بوڑھی اماں کا ہاتھ اور بھی کانپنے لگا ۔ اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میرے شانوں کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہو ۔ اور وہ سفید دیوار مجھے

یوں دکھائی دینے لگی جیسے پردۂ سیمیں ہو ۔ پھر گزشتہ پانچ سال کے واقعات اس پر ناچنے لگے ۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اک شان استغنےٰ سے انگڑائی لے کر دیوار پر مسلّط ہو جاتی ۔ ہاں میں ۔ مجھ میں جرأت ہے ۔ پھر اس دیوار سے بچنے کے لئے میں قریشی کی طرف اُٹھ بھاگتا ۔ لیکن وہاں بھی قریشی کی ستار مجھ پر ہنستی ۔ خوبصورت ہو ؟ جوان ہو ؟ پھر سوچ لو ۔

ایک روز جب میں قریشی کے پاس بیٹھا ستار سُن رہا تھا تو دفعتاً قریشی نے ستار کو زمین پر رکھ دیا مسکرا کر بولا "اجمل صاحب آپ کی وہ شرط بہت کڑی ہے معلوم ہے اُس نے آپ کی شرط سُن کر کیا کہا"

"کس نے کہا" مَیں نے حیرانی سے پوچھا ۔

قریشی نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی "پہلے تو وہ غور سے بات سنتی رہی ۔ پھر دفعتاً گھبرا کر چلّائی "نہیں نہیں" اور پھر خاموش ہو کر سر جھکا لیا" قریشی قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔

"سوچ لیجئے ، اجمل صاحب ۔" اندر سے آواز آئی ۔ "سوچ لیجئے ۔"

اس شام مَیں نے محسوس کیا جیسے کوئی طوفان از سرِ نو جمع ہو رہا ہو ۔ چاروں طرف بادل اکٹھے ہو رہے تھے سیاہ ڈراؤنے بادل ۔ گھر کی دیواریں حسبِ معمول پردۂ سیمیں بنی ہوئی تھی ۔ اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کا فلم چل رہا تھا ۔

اماں جب وہاں سے واپس آئی تو میں چُپ چاپ اُس کے پاس جا بیٹھا ۔ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

پھر میں گھبرا گیا میں نے کہا "اماں" وہ خاموش بیٹھی دھوئیں کی طرف گھورتی رہی ۔ پھر دفعتاً بولی "بے کار ہے بے کار ۔ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں"۔

"کیوں اماں" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا ۔

بوڑھی اماں نے ایک لمبی آہ بھری اور بولی "تم نے پہلے بھی تو دیکھا تھا ۔"

"لیکن اماں تو" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا ۔

"نہیں" وہ ہنسی جیسے اپنا مضحکہ اڑا رہی ہو ۔

"تو پھر اماں ۔"

"پھر" وہ بولی ، اس کا ہاتھ شدّت سے کانپا اور ساکت ہو گیا ۔ "پھر جو ہونا ہے ، ہو جاتا ہے ۔" وہ خاموش ہو گئی اور ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ دفعتاً مجھے پھر جوش آیا "لیکن اماں یہ کام کسی کو کرنا ہی ہو گا ۔"

اماں کا سر کانپنے لگا "نہیں" وہ بولی ۔ "یہ کام کئے نہیں جاتے ہو جاتے ہیں ۔ پہلے بھی ہو گیا تھا اب بھی ہو جائے گا ۔"

"لیکن اماں" میں نے بڑھ کر دونوں شانوں سے اُسے پکڑ لیا ۔ "اماں اگر اب کی بار" میرا گلا خشک ہو گیا ۔

اماں نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر ملتجیانہ انداز سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی ۔

اسی طرح دن گزر گئے ، ہفتے گزر گئے ، مہینے گزر گئے ۔ اور پھر ایک دن اماں مریم کو دونوں بازوؤں سے تھامے ہوئے اندر لے آئی اور چوکی پر بٹھا دیا ۔

مریم کی عمر ابھی چھوٹی ہی تھی ۔ مگر اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہاتھوں پر نیلی رگیں اُبھری ہوئی تھیں ۔ اُس کا رنگ سانولا تھا ۔ چہرے پر ایک عجیب سی سختی تھی اور آنکھیں یوں کھلی تھیں ۔ جیسے ان میں بند ہونے کی طاقت باقی نہ رہی ہو ۔

وہ چوکی پر یوں بیٹھ رہتی تھی جیسے لکڑی کی بنی ہوئی ہو ۔ اور یوں دیکھا کرتی جیسے آنکھیں بند کرنے کی طاقت کھو دینے پر حیران ہو ۔

مریم کے آنے کے بعد ایک دن گزر گیا ۔ دو دن گزر گئے ۔ ایک ہفتہ گزر گیا ۔ لیکن اس کی آنکھیں اُسی طرح کھلی رہیں ۔ ہونٹ ویسے ہی بند رہے جیسے سلے ہوئے ہوں ۔ اور وہ اُسی طرح چوکی پر بیٹھی رہی ۔

جب میں باہر جانے لگتا تو وہ چوری چوری میری طرف دیکھتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں واپس ہی نہ آؤں ۔ اس وقت اُس کی آنکھیں اور بھی

کھل جاتیں ۔

مریم کے آنے پر گویا ہمارے گھر کے پرانے کوائف کو اور بھی تقویت مل گئی ۔ وہ چھائی ہوئی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی ۔ بے نام سا بوجھ اور بھی بھاری ہو گیا ۔ اُس کی آمد پر میں نے محسوس کیا جیسے میرے کفن میں آخری کیل ٹھونک دیا گیا ہو ۔ "امّاں" میں نے امّاں کے پاس بیٹھ کر دبی آواز میں کہا ۔ "اماں" میرا جی چاہتا تھا کہ اماں سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر رو دوں ۔

اماں کا سر کانپنے لگا ۔ اور وہ آسمان پر نگاہیں گاڑے چپ چاپ بیٹھی رہی ۔

اُسے اب بھی آسمان کی طرف تکتے دیکھ کر غصے سے میرا دماغ گھوم گیا ۔ میں دیوانہ وار اُٹھ بیٹھا اور دروازہ کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا ۔

مجھے غصے سے باہر جاتے دیکھ کر مریم کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں ۔ لیکن مجھے اِن گونگی آنکھوں پر غصہ آ رہا تھا ۔

سارا دن نہ جانے میں کہاں کہاں گھومتا پھرا ۔ عین اُسی طرح جس طرح دو سال پہلے مرجانہ کے گھر سے نکل کر میں گھومتا پھرا تھا ۔

اشرف مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا "تم" وہ بولا ۔ "تم تو یار نظر ہی نہیں آتے ۔ وہ بولا ۔ "بالکل بدل گئے ہو ۔ کیا بات ہے" نہیں نہیں" میں چلایا ۔ اشرف میں میں ہوں ۔ اور مجھے مجھ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے ، کوئی نہیں ۔ مجھے میرے گھر سے بچاؤ اشرف ۔" میری آنکھوں سے ایک آنسو گر کر اُس کی ہتھیلی پر جا پڑا ۔

"اجمل" وہ چلایا ۔ "تم اجمل ۔" اور میں شرمندہ ہو کر وہاں سے بھاگا ۔ پھر میں اسلم کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا ۔ "میری تمام اُمیدیں اسلم تھا ۔" میری آواز خشک ہو گئی ۔ "وہ میری بیوی وہ تو ایسے معلوم ہوتی ہے میرے اُجڑے ویران گھر میں جیسے بطخ تالاب میں آ گئی ہو ۔"

پھر میں بازاروں میں بھاگتا پھرا اور میرے اردگرد بازار گھومتے رہے ۔ پھر

دفعتاً میں قریشی صاحب کے دروازے پر رُک گیا ۔ مَیں نے غصّے کو دبانے کی کوشش کی ۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں اُسے دبا سکتا ۔ میں نے اپنا سر زور سے قریشی کے دروازے پر دے مارا ۔

"تم ہو اجمل ، آؤ ، آؤ ۔" قریشی نے مجھے اندر گھسیٹ لیا ۔ "کیوں خیریت ہے ۔"

"خیریت مَیں نے کہا ۔ وہ میرے گھر کو کیا بدلے گی ۔" میری آواز میں طنز کی دھار تھی ۔ وہ تو گویا میرے ہی گھر کی ایک فرد ہے ۔"

"اجمل" وہ چلایا ۔ "اجمل تم اس حد تک خود پرست ہو مجھے یہ معلوم نہ تھا ۔"

"خود پرست ؟ میں نے غصّے میں دہرایا ۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "تم اتنے خود پسند ہو کہ تمہیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ اپنے گھر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ مریم کا بھی ایک گھر ہے اور وہ اپنا گھر اپنے ساتھ لائی ہے ۔"

"اُس کا گھر" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں" وہ خاموش ہو گیا ۔ جیسے کسی خیال میں کھو گیا ہو ۔ سات سال گزرے سات سال ..... جب اعظم آباد میں ایک دھوم کی شادی ہو رہی تھی باجے گاجے ، زیور ، سامان اور رونق ۔ مجھے آج تک وہ دھوم یاد ہے ۔ پھر وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور دولہے کی انتظار میں بیٹھی تھی ۔ رات گزر گئی دن چڑھ آیا ۔ دن گزر گیا اور پھر رات پڑ گئی ایک ہفتہ گزر گیا مگر دولہا نہ آیا ۔ پھر وہ منہ چھپا کر اپنے ماں باپ کے گھر میں جا بیٹھی ۔ سات سال وہاں بیٹھی انتظار کرتی رہی یہ ہے مریم کا گھر ۔

"مریم کا گھر ، مریم کا گھر" میرے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی ۔ پھر میں دیوانوں کی طرح بھاگا ۔ اور چپکے سے دروازہ کھول کر اپنے گھر میں داخل ہو گیا ۔

مریم نے چوری چوری دروازے کی طرف دیکھا ۔ مجھے آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھر سے اپنے حلقوں میں داخل ہو گیئں ۔

اس روز مَیں نے اُسے پوچھا ۔ "مریم اگر آج سے میں تمہارے گھر میں

رہوں تو ۔" وہ سر جھکا کر بولی ۔ "لیکن میں تو آپ کے گھر میں رہوں گی ۔"

"لیکن مریم" میں نے کہا ۔ "میرا گھر کس قدر ویران ہے ۔"

"نہیں تو" وہ بولی ۔ "آپ جو ہیں ۔" اچھا میں نے کہا ۔" اگر میں بھی تمہارے گھر رہوں ۔ اگر میں تمہارے گھر سے کبھی نہ جاؤں تو ۔"

اُس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا تبسم جھلکا ۔ جیسے دور بہت دُور مشرق میں سورج کی ہلکی دودھیا سفیدی انگڑائی لینے لگی ۔ اندھیرے میں ایک کرن لرزی اور مَیں نے محسوس کیا جیسے میں مریم کے گھر میں داخل ہو گیا ہوں ۔ وہ بوجھ میرے شانوں سے اُترنے لگا ۔

"اماں" میں نے بوڑھی ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا اماں مجھے دیکھ کر مصلے پر جا کھڑی ہوئی ۔

..............○..............

پردۂ سیمیں

وہ اب بھی وہیں بیٹھا ہے ۔ نیشاپور ملز کے بی بلاک کے کوارٹروں کے سامنے باغیچے میں ۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے ہیں ۔ بال بٹی ہوئی رسّی کے گچھے کی طرح ہو چکے ہیں ۔ آنکھیں پُھول کر بے نور ہو چکی ہیں لیکن وہ دیوار کی طرف یوں دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ پردۂ سیمیں ہو ۔ اور پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے

"وہ ہیرو ۔ آ گیا وہ ناچ رہی ہے ۔ ناچ رہی ہے ۔ ناچ رہی ہے"

"داؤ لگا لے ۔ داؤ ۔ ہی ، ہی ، ہی ، ۔" اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے اور پھر آپ ہی ہنس دیتا ہے یا رو پڑتا ہے ۔

کسی کو یاد نہیں رہا کہ وہ کب سے وہاں بیٹھا ہے ، کیوں بیٹھا ہے اور وہ اس دیوار کو سینما کی چادر سمجھنے پر کیوں مصر ہے ۔

پہلے پہل اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر لوگوں میں چرچا ہوا ۔ بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر گھر چلا جائے ۔ لیکن کوئی بھی اُسے وہاں سے اُٹھا نہ سکا ۔ اور اب وہ سب اس واقعہ کو بُھول چکے ہیں ۔ اب تو وہ یہ بھی بُھول چکے ہیں کہ اس کا نام صمد تھا ۔ البتہ بی بلاک سے جنوب کی طرف دُور ایک چوبارے میں ایک مٹیار عورت جب کبھی کھڑکی میں آ کر بال بناتے ہوئے راہ گیروں کی طرف دیکھ کر آنکھیں مٹکاتی ہے اور اُس کی نگاہ اس دیوانے پر پڑتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ آ جاتی ہے ۔

صمد کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کے والد نبی بخش پانچ وقت کے نمازی ہونے کے علاوہ تہجد گزار بھی تھے ۔

صمد کو ان کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ نئی تہذیب سے قطعی طور پر بیگانہ تھے اور سر سے پاؤں تک دقیانوسیت میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اسے اپنے والد

کے خیالات ، برتاؤ ، لباس ۔ حتیٰ کہ چال ڈھال پر بھی نہ جانے کیوں شرم سی محسوس ہوتی تھی ۔ حالانکہ اڑوسی پڑوسی ، محلے والے اور برادری کے سبھی لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے ۔ بلکہ ان کی شرافت کے گن گاتے تھے ۔

ممکن ہے کہ نفرت کا یہ جذبہ اُس نے اپنی والدہ سے اخذ کیا ہو ۔ کیونکہ صمد کے علاوہ ایک اُس کی ماں تھی ۔ جسے نبی بخش کی نمازوں پر شکوہ تھا ۔ "بس تمہیں تو صرف نماز پڑھنا ہی آتا ہے ۔" کبھی کبھار غصے میں اس کے مُنہ سے نکل جاتا ۔ جس کے جواب میں نبی بخش گھبرا جاتے اور استغفراللہ پڑھ کر کہتے ۔ "مگر نیک بختے تو میری بات تو سُن ۔" مگر صمد کی ماں نے میاں کی بات کبھی نہ سُنی تھی ۔ اُلٹا وہ کوئی اپنی بات چھیڑ دیتی ۔ اس کا یہ رویہ دیکھ کر نبی بخش اور بھی گھبرا جاتے اور پھر مسلسل استغفراللہ پڑھتے ہوئے مصلّے پر جا کھڑے ہوتے اور چار رکعت نماز میں صمد کی ماں کی باتیں بُھولنے کی کوشش میں کھو جاتے ۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ صمد کی ماں کی باتوں کی وجہ سے نبی بخش کی نمازیں اور وظیفے طول پکڑتے گئے تھے یا ان کی نمازوں اور وظیفوں کی وجہ سے صمد کی ماں کی باتوں کی دھار تیز ہوتی گئی تھی ۔ بہرحال صمد کی ماں کو یہ غصہ تھا کہ اس کی جوانی میاں کی نمازوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے ۔ چار ایک بار تو اس نے صاف الفاظ میں یہ بات جتا بھی دی تھی ۔ ویسے کنایتہً تو روز ہی وہ کسی نہ کسی بہانے سے یہ بات سمجھایا کرتی تھی انہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے بار بار استغفراللہ پڑھنے پر تو وہ غصّے سے چلّانے لگتی ۔ "بس میں سامنے آ جاؤں تو توبہ کا ورد شروع کر دیتے ہیں کوئی آ جائے تو سبحان اللہ کہتے منہ سوکھتا ہے ۔ پھر میرے سامنے استغفراللہ کیوں ؟ آخر میں بیوی ہوں تمہاری ۔ بیوی کے بھی حقوق ہوتے ہیں کچھ یہ نہیں کہ جب سامنے آئے توبہ کا ورد شروع کر دو ۔ انسان کو دین و دنیا دونوں کا خیال رکھنا چاہئے ۔ لیکن میاں نے تو صرف نمازوں پر زور دے رکھا ہے ۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا ۔"

شائد ماں کی باتوں نے صمد پر اثر کیا ہو ۔ لیکن بلند اقبال نے بھی تو آخر اسی گھر میں صمد کے ساتھ پرورش پائی تھی ۔ وہ بچپن ہی سے ماں کی باتیں سنتی

رہتی تھی ۔ پھر ان باتوں نے اس پر اثر کیوں نہ کیا ؟ الٹا بلند اقبال کے دل میں تو باپ کی محبت جاگزیں تھی ۔ وہ کوئی بچّی نہ تھی ۔ دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی ۔ تہذیب سے بھی واقف تھی اور فیشن کی بھی دلدادہ تھی ۔ لیکن اس نے کبھی ابا کے رویہ یا بات پر شرم محسوس نہ کی تھی ۔

نہ جانے باپ بیٹوں میں خواہ مخواہ کا بُعد کیوں پیدا ہو جاتا ہے وہ اَن جانے میں ایک دوسرے سے دُور کیوں ہٹتے جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف گونگی شکایات کیوں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ باپ کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ بیٹا سمجھتا نہیں اور بیٹے کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ باپ غلط سمجھتا ہے ۔

نبی بخش بھی صمد کے بارے میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ کم عقل ہے ۔ اور سمجھتا نہیں کبھی کبھار جب بھی وہ اسے ڈانٹتے تو کہتے ۔ "بے وقوفا ۔ نا معقولا ۔"

اِدھر صمدان کی ہر بات کو غیر معقول سمجھتا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ ابا کو کچھ پتہ ہی نہیں وہ تو کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں گھوم رہے ہیں ۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کے علاوہ باقی تمام دنیا ترقی کے راستے پر چل رہی ہے ۔ اِس لئے وہ روش جو ابا کی ڈگر سے ہٹ کر تھی ۔ ترقی کی راہ پر گامزن تھی ۔ باپ بیٹے کی اس باہمی کشمکش کی وجہ کے متعلق یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ مثلاً تہذیب نو کی برکتوں میں صمد کے خیال میں سب سے بڑی برکت سینما تھی ۔ اس کے برعکس نبی بخش کے خیال کے مطابق تہذیبِ نو کی جُملہ لعنتوں میں سینما سب سے بڑی لعنت تھی ۔ کون جانے کہ صمد کا سینما سے والہانہ شوق نبی بخش کی نفرت کی وجہ سے تھا ۔ یا ان کی نفرت صمد کے والہانہ شوق کا نتیجہ تھی ۔ بہرحال یہ حقیقت تھی کہ صمد کو سینما سے بے حد لگاؤ تھا ۔

اگر اسے ایک مقامی کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کر دیا جاتا ۔ اور گھر سے دُور جا کر اسے سینما دیکھنے کی آزادی مل جاتی تو ممکن ہے کہ یہ چنگاری بڑھ کر شعلہ جوالہ نہ بنتی اور حالات کا دھارا کسی اور رُخ بہتا ۔

اپنے اِس شوق کو پورا کرنے کے لئے ابتدا میں تو صمد نے کالج کی خصوصی میٹنگ ایجاد کر لی ۔ جو عین میٹنی شو کے وقت ہوا کرتی تھی ۔ لیکن میٹنی شو دیکھنا بیکار تھا میٹنی شو میں اگرچہ ریٹا ہیورتھ اسی انداز سے رقص کرتے ہوئے باری باری ملبوسات اتارتی تھی ۔ وہی گیتا بالی اسی انداز سے کمر پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں مٹکاتی ۔ اور وہی ہکلی "گوری لاکھ چلے ۔" گاتے ہوئے اشارے کرتی تھی ۔ لیکن صمد کو ایسے محسوس ہوتا جیسے یہ سب دُور پردے پر ہو رہا ہے ۔ گیتا بالی آنکھیں تو مٹکاتی تھی ۔ مگر اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ۔ اس کے برعکس رات کے شو میں وہ سب قریب تر آ جاتی تھیں ۔ اِس قدر قریب کہ جب گیتا بالی کہنی چلاتی تو وہ اس کے پہلو میں لگتی ۔ ریٹا تو ہال میں اتر کر ناچتی اور ناچتے ہوئے جان بوجھ کر صمد کے گرد گھومتی اور ہکلی یوں اس کی طرف اشارے کرتی جیسے اسی کے انتظار میں دیوانی ہو رہی ہو ۔

صمد نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وقت کو جذبات سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے ۔ اسے اِس سلسلے میں اب تک کوئی تجربہ نہ تھا ۔ اس کی زندگی میں کوئی لڑکی ابھی داخل نہ ہوئی تھی ۔ کالج میں صرف چار ایک لڑکیاں تھیں ۔ وہ سب ایم ۔ اے کی طالبات تھیں اور اس سے اِس قدر دور رہتی تھیں جیسے میٹنی شو کی چادر پر چل پھر رہی ہوں ۔ لبِ بام رومان کا ابھی اُسے موقعہ نہ ملا تھا ۔ اور موقعہ ملتا بھی کیسے ۔ بھلا جس کے والد نمازیں پڑھتے ہوں اور جن کے اڑوس پڑوس والے گن گاتے ہوں ۔ اس کو بھلا کیسے موقعہ ملے ۔ محلے بھر میں اس کی اپنی حیثیت تو تھی ہی نہیں ۔ کیونکہ لوگ اسے صرف ایک شریف باپ کا بیٹا سمجھتے تھے ۔ اس کے بعد لبِ بام رومان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ صمد تو بلکہ یہ سمجھتا تھا کہ محلے کی لڑکیاں اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتی ہیں ۔ صرف اس لئے کہ وہ نبی بخش کا بیٹا تھا ۔ اس نے کئی ایک بار آزما دیکھا تھا ۔ رومان سے محرومیت کی وجہ سے اس کا سینما کا شوق اور بھی بڑھ گیا تھا ۔ لب بام نہ سہی ۔ پردۂ سیمیں پر ہی سہی الٹا پردۂ سیمیں پر تو اور بھی فائدہ تھا ۔ لب بام تو وہ منہ چھپا لیتی ہیں ۔ اور دیکھتی بھی ہیں تو چتون چڑھا کر لیکن پردۂ

سیمیں پر تو وہ اردگرد ناچتی ہیں ۔ اور ناچتے ہُوئے "اک داؤ لگانے" کی دعوت دیتی ہیں ۔

دقت یہ تھی کہ شام کے شو کے لئے جانا صمد کے لئے بے حد مشکل تھا ۔ نبی بخش کو یہ پسند نہ تھا کہ بچے رات کو آوارہ پھریں ۔ بہانے تو وہ بنا لیتا ۔ مگر بہانے روز تو نہیں چلتے اور اس کا جی تو روز اس رقاصہ کو دیکھنے کو چاہتا تھا جو اسے "داؤ لگانے" کی دعوت دے ۔ اس سلسلے میں صمد کو سب سے زیادہ غصہ اس مکان کی بناوٹ پر آتا تھا ۔ جس میں وہ مقیم تھے ۔ اس مکان میں کوئی عقبی دروازہ ہی نہ تھا ۔ جو پچھلی گلی میں کھلتا ہو اور نہ ہی کوئی کھڑکی تھی ۔ جس سے بوقتِ ضرورت کوئی آجا سکے ۔ رہا صدر دروازہ تو وہ بالکل بیکار تھا ۔ اس کے عین اوپر نیم چھتی تھی ۔ جس میں نبی بخش نمازیں اور وظیفے پڑھا کرتے کیونکہ سوتے تو وہ غالباً تھے ہی نہیں ۔

اس تکلیف کی وجہ سے صمد دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ پھر ایک روز ماں کے سامنے پُھوٹ کر رو پڑا ۔ "ماں" وہ چلّایا ۔ "میں قید خانے میں نہیں رہ سکتا ۔ اگر یونہی مجھ پر بندشیں لگی رہیں تو میں کسی روز نکل جاؤں گا ۔"

"پاگل تو نہیں ہو گیا تو ۔" ماں بولی ۔ "گھروں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔ یہی کہتے ہیں نا وہ کہ رات کو دیر تک باہر نہ رہا کرو ۔"

"کیوں ۔ میں کیا بچہ ہوں ۔" وہ غصہ میں بولا ۔

"بچہ نہیں ہے تو اور کیا ہے تو ہماری نظر میں تو تُو ساری عمر ہی بچہ رہے گا ۔"

"تو تم اپنی نظر کا علاج کرو ۔" وہ اُسے گھورنے لگا ۔

"اے ہے ۔" ماں بولی ۔ "تُو تو بس فلاسفہ ہی جھاڑتا رہتا ہے ۔ نہ جانے کالجوں میں فلاسفہ کیوں پڑھاتے ہیں ۔ جس کے پڑھنے سے کوئی گھر کا رہے نہ باہر کا ۔ اچھا علم ہے یہ ۔"

ماں کی بات سُن کر صمد کی ہنسی نکل گئی ۔ "تم تو بالکل فضول ہو ماں ۔" وہ بولا اور پھر پینترہ بدل کر اُس کی منّتیں کرنے لگا ۔ "دیکھو نا ماں ساری دنیا

سینما دیکھتی ہے ۔ کالج کے سارے لڑکے سینما دیکھتے ہیں ان کے والدین تو اُلٹا انہیں ساتھ لے جاکر سینما دکھاتے ہیں ۔ ایک میں ہی بدنصیب ہوں ۔"

"تو دوپہر کو دیکھ لیا کر ۔" اُس کی ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

اب وہ اُسے کیسے سمجھاتا کہ دوپہر کے وقت ریٹا ہیورتھ کپڑے اتارتی تو ہے مگر وہ اُترتے نہیں ۔

"وہ تو بس یہی کہتے ہیں نا ۔" ماں بولی ۔ "کہ رات کو گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ۔"

"انہیں سمجھ ہی کیا ہے ۔" وہ پھر جلال میں آگیا ۔ "نمازیں پڑھنے کے علاوہ وہ جانتے ہی کیا ہیں ۔ انہیں کسی کے جذبات کا پتہ بھی ہو ۔"

دفعتاً صمد کی ماں کے کچلے ہوئے جذبات اُبھر آئے ۔ وہ جوانی جو نمازوں کی بھینٹ چڑھ چکی تھی ۔ اس کے روبرو آکھڑی ہوئی ۔ اور اُس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ دونوں مظلوم تھے ۔ اس روز سے اس نے عملی طور پر صمد کی امداد کرنی شروع کر دی ۔

اب صمد خاموشی سے دوسرا شو دیکھ کر اپنی پڑوسن رحمت گوالن کے گھر سے داخل ہو کر ان کی چھت سے پھاند کر اپنے کوٹھے پر پہنچ جاتا ۔ اور چپکے سے اپنی چارپائی پر آلیٹتا اور نبی بخش کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ گھر سے باہر گیا تھا ۔

صمد کی ماں کو سینما سے چنداں ہمدردی نہ تھی ۔ لیکن نمازوں کے خلاف اُس کے دل میں ایک ڈھکا چھپا بغض تھا ۔ صمد کو سینما دیکھنے میں مدد دے کر دراصل وہ نمازوں کے خلاف انتقام لے رہی تھی ۔

پھر ایک روز سینما ہال میں جب انٹرول میں بتیاں جلیں تو صمد نے دیکھا کہ ریٹا ہیورتھ اس کے پاس بیٹھی ہے ۔ وہ اُسے دیکھ کر ڈر گیا پردۂ سیمیں کی ریٹا ہیورتھ اور چیز تھی ۔ چاہے وہ پردے سے اُتر آتی تھی ۔ مگر پھر بھی وہ پردۂ سیمیں کی ریٹا تھی ۔ اور پردۂ سیمیں کی ریٹاؤں سے اب وہ مانوس ہو چکا تھا ۔ لیکن ہال کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ریٹا ۔ اور کرسی بھی وہ جس کا ایک بازو اس کی اپنی کرسی کے بازو سے مشترک تھا ۔

یہ جیتی جاگتی ریٹا پردۂ سیمیں کی ریٹا کی طرح نہ تھی ۔ اس کا جسم ویسا خوبصورت نہ تھا ۔ لیکن وہ کسی قدر گرم تھا ۔ وہ اس کی حدّت کو دُور سے محسوس کر رہا تھا ۔ نہ تو ہال کی یہ ریٹا رقص کر رہی تھی ۔ اور نہ کپڑے اتار رہی تھی ۔ مگر اُس نے محسوس کیا ۔ گویا اُن کپڑوں کے باوجود وہ ننگی تھی ۔ اس قدر ننگی جس قدر ریٹا کپڑے اتارنے کے باوجود نہ ہوتی تھی ۔ صمد کو پسینہ آگیا ۔ گھبرا کر اُس نے منہ موڑ لیا اور یوں بے تعلق ہونے کی کوشش کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ لیکن اس بے تعلقی کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے ایک ڈھکی چھپی آنکھ کے کونے سے ایک تاریک شعاع اس کو کرید رہی ہے ۔

انٹرول کے اختتام پر صمد نے اطمینان کا سانس لیا ۔ لیکن جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس اندھیرے کی نوعیّت کچھ اور ہی تھی ۔ انٹرول سے پہلے کے اندھیرے کی طرح وہ گرم اور بوجھل ہو گیا تھا ۔ سارے ہال میں ایک بوجھل موجودگی چھا رہی تھی ۔ اور وہ تاریک کرن اسے "داؤ لگانے" پر اکسا رہی تھی ۔ اِس اندھیرے سے تو انٹرول کی روشنی ہی اچھی تھی ۔

فلم ختم ہونے پر جب وہ ہال سے نکلا تو وہ اس کے قریب آکر رُک گئی ۔ "مہربانی سے مجھے ایک تانگا تو لا دیں ۔" وہ بولی ۔ "مجھے کِلٹر روڈ جانا ہے" اس کی آواز سن کر وہ چونکا اور اُسے اِس قدر قریب دیکھ کر گھبرا گیا ۔ "اوہ اوہ" وہ بولا ۔ "میرا مطلب ہے ضرور ۔ کیوں نہیں ابھی لایا میں تانگا ۔" اور اس قرب سے بچنے کے لئے بھاگا ۔ صمد کی اس گھبراہٹ پر وہ مسکرا رہی تھی ۔ اس مسکراہٹ میں عزم تھا ۔

جب وہ تانگا لے آیا تو وہ بولی ۔ "آئیے نا آپ بھی تو ادھر ہی جائیں گے ۔ آئی وِل گوِ یُو اے لفٹ ۔" اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر کے بھاگ جائے ۔ لیکن اس کے "پلی ۔ ای ۔ ای ۔ ای ۔ ز ۔" میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ اسے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔

مسز ڈیوڈ کے گھر پہنچ کر وہ حیران رہ گیا ۔ وہ سب یوں ہنس کھیل رہے تھے جیسے پکنک پر آئے ہوئے ہوں ۔ صمد نے محسوس کیا جیسے ایک رنگین منظر

پردۂ سیمیں سے اتر کر اس برآمدے میں آگیا ہو ۔ گھر کے تمام کردار وہی تھے جو وہ سینما کی چادر پر دیکھا کرتا تھا ۔ لڑکیاں اِسی طرح سینے تانے آنکھیں مٹکا رہی تھیں ۔ نوجوان نے ان پر یوں آنکھیں گاڑ رکھی تھیں جیسے مکھی گڑ پر پنجے گاڑ دیتی ہے ۔ بوڑھا اُنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور ان سب کے درمیان مسز ڈیوڈ کھڑی گویا اپنا آپ اس کے حوالے کئے جا رہی تھی ۔ اس کے قدموں میں ایک اونچا لمبا کتا اس سے لاڈ پیار کر رہا تھا ۔ سامنے اونچی لمبی کتابی چہرے والی حسینہ تصویر بنی کھڑی تھی ۔ باغیچے میں پُھول لہلہا رہے تھے ۔ دودکش کے اوپر دھواں ناچ رہا تھا ا نگیٹھی پر کیتلی گا رہی تھی ۔

جلد ہی وہ خود اس رنگین منظر کا ایک حِصّہ بن گیا ۔ وہ سب اس کے ساتھ یوں گُھل مِل گئے جیسے برسوں کے پُرانے ساتھی ہوں ۔ لڑکیاں ایسی نگاہوں سے صمد کی طرف دیکھنے لگیں جیسے وہ اس سے بے حد مانوس ہوں ۔ جیسے وہ عرصۂ دراز سے اُسے جانتی ہوں ۔ وہ پورے طور صورتِ حالات سے واقف معلوم ہوتی تھیں ۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ جب ممی کو کوئی شخص تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑنے آئے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور اس سے کس انداز سے پیش آنا چاہئیے ۔ یہاں تک کہ صمد نے خود محسوس کیا کہ وہ پہلا اجنبی نہ تھا جو مسز ڈیوڈ کو تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑنے آیا ہو ۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا کیرم کھیلتا رہا ۔ پھر سب کافی پیتے ہوئے لطیفے سناتے رہے ۔ جب وہ گھر جانے لگا تو مسز ڈیوڈ قریب آگئی ۔ "چلئے آپ کو سڑک تک چھوڑ آؤں ۔" وہ بولی ۔

جب وہ سڑک پر پہنچے اور مسز ڈیوڈ نے "گڈنائٹ" کہا تو دفعتاً اس کی آنکھیں صمد کی آنکھوں میں گھس گئیں اور ہونٹ بٹوہ سے بن گئے اور صمد نے دیکھا کہ وہ ننگی ہے اور اس کے منہ سے بھبھاکے اٹھ رہے ہیں ۔ اس گونگے تقاضے سے گھبرا کر وہ بھاگا ۔

اس روز سے اس کا شوق پردۂ سیمیں سے ہٹ کر اس زندہ تماشے پر منتقل ہوگیا ۔ جو روز اس الف لیلائی کوارٹر کے فراخ برآمدے میں کھیلا جاتا تھا ۔ جب بھی وہ وہاں جاتا تو اس کے گرد اِک بھیڑ لگ جاتی ۔ لڑکیاں ہنس ہنس کر اس کی

توجہ اپنانے کی کوشش کرتیں ۔ ڈالی کے گالوں کے گڑھے بھنور بن جاتے ۔ نزی ہاتھ چلا چلا کر اپنے سڈول بازوؤں کی نمائش کرتی ۔ سمیرا خاموش مسکراہٹ اور نیلگوں آنکھوں سے اسے جذب کر لیتی ۔ جانی اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ۔ جیک اس کے قدموں میں بیٹھ کر دم ہلاتا اور مسز ڈیوڈ کی وہ ننگی نگاہ ، وہ بھبھاکا ، جو روز بہ روز اُسے قریب کھنچے آنے پر مجبور کئے جا رہا تھا ۔

صمد کو اس پر اسرار قرب کے احساس سے دلچسپی نہ تھی ۔ اُلٹا وہ تو کشش محسوس کرنے کے باوجود اس سے خائف تھا ۔ اس کے باوجود اگر وہ وہاں جاتا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ڈیوڈ خاندان سے واقفیت کے بعد اس نے محسوس کیا تھا جیسے وہ دفعتاً ویرانے سے نکل کر آبادی میں آگیا ہو ۔ فرشتوں کی نگری سے نکل کر انسانوں کی بستی میں آ پہنچا ہو ۔ جہاں نہ کوئی باپ تھا اور نہ بیٹا ۔ نہ کوئی بزرگ تھا اور نہ چھوٹا ۔ جہاں سب انسان تھے ۔ دوست ۔ فرد تھے ۔ جہاں باپ بیٹے کا سگرٹ سلگاتا تھا ۔ بیٹی ماں کے حسن کا تذکرہ کرتی تھی ۔ جوان کزن ماں کے پاس کھڑا ہو کر حریصانہ نگاہوں سے اس کی بیٹی کو دیکھتا تھا ۔ کتنی آزادی تھی وہاں ۔ کتنی رنگین اور حسین تھی زندگی ۔

آزادی کے اس دھارے نے صمد کو کھینچ لیا ۔ اُس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس انوکھی لذت سے مدہوش ہو کر بہنے لگا ۔ اور بہتے بہتے اس دلدل میں جا پھنسا جو آزادی کے دھارے کا واحد خطرہ ہے ۔ فاصلے کو ردّ کرنے والی وہ تاریک کرن اس کے قریب ہوتی گئی ۔ اور قریب اور قریب ۔ حتٰی کہ ایک روز وہ اس کے پہلو سے طلوع ہو گئی اور پھر چاروں طرف شنگرفی چھینٹے اڑنے لگے اور ایک خونیں دھندلکے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ۔

مسز ڈیوڈ کا قرب حاصل کرنے کے بعد وہ نمازیں پڑھنے والا بوڑھا بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ گیا ۔ یہی نہیں ۔ وہ بڑھیا جس نے اپنی جوانی نمازوں کی بھینٹ چڑھا دی تھی ۔ وہ بھی اس کے ذہن سے اُتر گئی ۔ اور وہ گھر جس میں اُس نے پرورش پائی تھی بالکل ویرانہ ہو کر رہ گیا ۔

مانا کہ حقائق کا احاطہ عام طور پر مشاہدے اور مطالعہ سے ہوتا ہے لیکن

کاہے کاہے وہ "انا" کی عمیق ترین گہرائیوں سے چنگاری کی طرح بھی اڑتا ہے ذہن میں ایک روشنی سے جھلکتی ہے ۔ جس کے زیر اثر انسان جزیرے کے گرد گھومے بغیر محسوس کرتا ہے کہ وہ خطۂ زمین میں جزیرہ ہے ۔

نبی بخش نے بھی مصلے پر کھڑے کھڑے محسوس کیا کہ صمد دُور چلا گیا ہے ۔ ان کا یہ احساس شدید تر ہوتا گیا ۔ اس کے بعد انہیں نے نیم چھتی سے اترنا چھوڑ دیا تاکہ صمد کے سامنے جانے کا موقعہ ہی نہ مِلے اور اگر کبھی کبھار باپ بیٹے کا آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ جھکا لیتے جیسے اس سے شرمسار ہوں ۔ پھر یہ احساسِ شرمساری گویا ان کی چھاتی پر بیٹھ گیا اور ان کی چھاتی کھانسی سے بجنے لگی ۔ ان کی ٹانگیں لرزنے لگیں ۔ کمر دوہری ہو گئی گویا ٹوٹ گئی ہو ۔

اِدھر صمد کی ماں نے محسوس کیا کہ صمد زندگی کی شاہراہ پر جا نکلا ہے ۔ اس روز جب وہ آزادی کے دھارے میں بہتا پہلی مرتبہ اس جزیرے سے ٹکرایا تھا ۔ اس روز ماں نے اس کی طرف دیکھا اور بولی ۔ "صمد تو" اور پھر وہ دانتوں میں انگلی دبا کر بیٹھ گئی ۔

اسے دانتوں میں انگلی دبائے بیٹھا دیکھ کر نبی بخش ہنس پڑے اور کھانستے ہوئے بولے "اب انگلیاں کاٹنے سے کیا فائدہ ۔" وہ پہلا روز تھا کہ صمد کی ماں میاں کی بات سُن کر خاموش بیٹھی رہی تھی ۔ صمد کی ماں "وہ بولے ۔ اب صمد کی شادی کر دو چاہے کچھ بھی ہو ۔ ہمارے سر سے یہ فرض اتر جائے ۔ تم اس سے بات تو کرو ۔"

انہیں دنوں حالات نے پھر پلٹا کھایا اور تار کے ذریعہ مسٹر ڈیوڈ کی تبدیلی ہو گئی اور دو دن کے اندر اندر ڈیوڈ خاندان وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا ۔ صمد کا خیال تھا کہ مسز ڈیوڈ اس سے جدا ہوتے آبدیدہ ہو جائے گی ۔ مگر آبدیدہ ہونا ڈیوڈ فیملی کا مسلک نہ تھا ۔ وہ سب جینے اور ہنسنے کے شیدائی تھے ۔ وہ ہر بات پر ہنسنے کے عادی تھے ۔ اس کے علاوہ اس دوران میں ایک اور اجنبی نوجوان مسٹر سعید مسز ڈیوڈ کو سینما سے گھر تک لا چکا تھا ۔

صمد ان کے جانے پر پہلے تو بہت سٹ پٹایا پھر وہ مسز ڈیوڈ کے قدموں

پر سر رکھ کر دیر تک پُھوٹ پھوٹ کر روتا رہا ۔ اور وہ اسے تھپک تھپک کر یوں دلاسا دیتی رہی ۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو ۔ ان کے جانے کے بعد ایک بار پھر منظر بدلا اور زندہ تصاویر سے محروم ہو کر اسے پھر سے پردۂ سیمیں کا سہارا لینا پڑا ۔ لیکن اب وہ تصویریں اسے بے معنی دکھائی دیتی تھیں ۔ اگر ان میں کوئی جاذبیت تھی تو صرف اس لئے کہ وہ اسے بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی تھیں ۔

ایک دن ماں نے صمد سے بیاہ کی بات چھیڑ دی ۔ "اب تمہارا امتحان بھی ہو چکا صمد ۔" وہ بولی ۔ "اب تیری شادی کا فرض ہمارے سر سے اُتر جائے ہماری زندگی کا کیا بھروسہ ہے بیٹا ۔"

جواب میں صمد نے غصے بھری نگاہ ماں پر ڈالی مگر منہ سے کچھ نہ بولا ۔

اس کے دو روز کے بعد ماں کی چیخ سُن کر جب وہ دوڑا دوڑا نیم چھتی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے والد بیہوش پڑے ہیں اور ماں پلنگ کا پایہ پکڑے دیوانوں کی طرح انکی طرف دیکھ رہی ہے ۔

نبی بخش کی اس ناگاہ بیماری پر محلے کے لوگ جمع ہو گئے ۔ ڈاکٹر حکیم بلائے گئے ۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد سر جھکا لیا ۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے بعد مرض کی بات کرنے کی بجائے اعمال حسنہ کے متعلق مسائل چھیڑ دیئے ۔ دو گھنٹے کے بعد نبی بخش نے آنکھ کھولی ۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے صمد کو بلا کر پاس بٹھا لیا پھر قدیر علی کو جلدی کرنے کا اشارہ کیا اور وہ روتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

جب وہ واپس لوٹے تو ان کے ساتھ برقعہ میں لپٹی ہوئی ان کی بیٹی فرحت تھی ۔ انہیں دیکھ کر نبی بخش نے اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئے ۔

"بیٹا" انہوں نے رُک رُک کر بڑی تکلیف سے کہا ۔ "میری آخری خواہش ہے ۔" نقاہت کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئے اور مولوی تمیزالدین کو اشارہ کیا ۔ پیشتر اس کے کہ صمد کی سمجھ میں کوئی بات آتی یا وہ کوئی جواب دیتا ۔ مولوی صاحب نے نکاح خوانی شروع کر دی ۔

نکاح کی مختصر رسم کے بعد نبی بخش کی حالت اور بھی بگڑ گئی اور شام سے

پہلے ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں ۔

میاں کے انتقال پر صمد کی ماں پُھوٹ پُھوٹ کر روئی ۔ جوانی تو شوہر کی نمازوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی ۔ اب رہی سہی زندگی ان کی موت کی وجہ سے تباہ ہو گئی ۔

باپ کی موت کے بعد صمد کی تمام تر توجہ تلاشِ معاش پر مرکوز ہو کر رہ گئی اور وہ نوکری کے لئے مارا مارا پھرنے لگا ۔ ماں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی ۔ لیکن صمد کے اسرار پر وہ چند روز کے لئے نیشاپور جانے پر رضا مند ہو گئی ۔ اور وہ سب نیشاپور پہنچ گئے ۔ یہاں اسے مل کے بی کلاس کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر مل گیا ۔

اس کی ماں اور بہنوں نے صرف چند روز صمد کے پاس قیام کیا ۔ پھر وہ واپس آگئیں ۔ "نیشاپور کیا دور ہے بیٹا ۔" ماں نے الوداع کہتے ہوئے اُسے تسلی دی ۔ "جب جی چاہے گا آکر تجھ سے مل جایا کریں گی تو گھبرا نہیں ۔"

ماں کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ صمد نے محسوس کیا کہ وہ اس کا اپنا گھر تھا اور فرحت اس کی اپنی بیوی اور اس کے دل میں اپنے گھر کو سنوارنے اور سجانے کا جذبہ جو اب تک دل میں دبا پڑا تھا عود کر آیا ۔

صمد کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا گھر پردۂ سیمیں کے گھروں کا سا ہو اور اس کے گھر میں وہی زندگی اور ہما ہمی رہے ۔ جو مسز ڈیوڈ کے برآمدے میں ہوتی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی اپنی بیوی ہنس ہنس کر آنکھیں مٹکائے اور دو چوٹیاں سارے گھر میں اڑتی رہیں ۔ اس کے گالوں میں بھی لڑا کے سے گڑھے پڑے رہیں اور وہ بھی اس نگاہ سے دیکھے جو فاصلے کو رد کر دیتی ہے اور پہلی تنخواہ مِلتے ہی صمد نے پاؤڈر ، سُرخی ، صابون ، کاجل ، سکارا اور جانے کن کن چیزوں کا فرحت کے سامنے لاکر ڈھیر لگا دیا ۔ فرحت یہ سکارا ہے ۔ مژگاں پر لگانے کا لوشن ، یہ بلیک سٹک بھوئیں بنانے کے لئے ہے ۔ اس شانپو سے بال دھوئے جاتے ہیں ۔ یہ کریم ۔ چہرے پر نہیں ملا کرتے ۔ یہ سلیپر نہ پہنو اِس طرح پاؤں فلیٹ ہو جائیں گے اور یہ برقعہ لاحول ولاقوت ۔

چھوڑو اس حماقت کو اور یہ قمیض بالکل بیکار ہے ۔ مَیں تمہیں فراک پہناؤں گا اور غرارہ تو تمہیں بہت اچھا لگے گا ۔ اب دیکھو میری طرف ۔ اونہوں ڈارلنگ یوں نہیں "مجھے نہیں آتا ۔" فرحت ہنس کر کہتی ۔

دراصل فرحت کو سبھی کچھ آتا تھا ۔ اسے ہنسنا بھی آتا تھا ۔ آنکھیں مٹکانا بھی آتا تھا اور وہ نگاہ وہ اس نگاہ کو بھی جانتی تھی ۔ اگرچہ وہ گاؤں میں پلی تھی ۔ اگرچہ وہ قدیر علی زمیندار کی بیٹی تھی ۔ لیکن ازلی طور پر اس میں وہ چنگاری موجود تھی جو آگ لگا سکتی ہے ازلی طور پر اس کی نسائیت میں دہار موجود تھی ۔ لیکن ماحول ، حیا اور احساسِ ناموس نے اس پر ایک دبیز پردہ ڈال رکھا تھا ۔ وہ سمجھتی تھی کہ خاوند حیا کو سب سے بڑا وصف سمجھتے ہیں ۔ اِس لئے وہ اِس چنگاری کو دبائے بیٹھی رہتی اور اس کی دھار سے خود زخمی ہونے کے باوجود اُف کئے بغیر آنکھیں جھکا لیتی ۔ دراصل اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ صمد سچ کہہ رہا ہے وہ اُسے مذاق سمجھتی رہی ۔ بلکہ اُلٹا اس کی جھجک اور بڑھ گئی ۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کا خاوند پردۂ سیمیں پر پل کر جوان ہوا ہے ۔

صمد نے سب سے پہلے فرحت کا پردہ اتروایا ۔ پھر اُس نے اپنے دوستوں کو باری باری گھر بلایا تا کہ ان کا اپنی بیوی سے تعارف کروائے ۔ پھر وہ اُسے بازار شاپنگ کے لئے لے گیا ۔ شام کو وہ دونوں اکٹھے سیر کرنے کے لئے جاتے اور واپسی پر کسی نہ کسی دوست کو وزٹ کرتے یا سینما چلے جاتے ۔

ہال میں بیٹھے ہوئے صمد کا جی چاہتا کہ فرحت کی آنکھ کے کونے سے وہی تاریک شعاع نکل کر اسے کریدے اور اندھیرے میں اس کا گرم ہاتھ بڑھ کر صمد کا ہاتھ پکڑ لے اور گونگی زبان میں وہی باتیں دہرائے جو مسز ڈیوڈ کا ہاتھ کیا کرتا تھا ۔ دراصل صمد اس جائز تعلق سے ناجائز تعلق کی لذّت حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن فرحت اس اہم تفصیل سے واقف نہ ہوئی ۔ اِس لئے وہ برقعہ اتارنے کے باوجود آنکھیں جھکا کے چلتی رہی اور صمد کے دوستوں سے ملنے کے باوجود اس نے انہیں قرب کا احساس نہ دیا ۔ اور سینما ہال میں بیٹھنے کے باوجود اس کا انداز گھریلو ہی رہا ۔ اس کے دل میں تحریک تو ہوتی مگر وہ اسے دبا دیتی اور اپنی آگ میں

آپ ہی جلتی رہتی ۔

کچھ مدت تو صمد کو امید رہی کہ فرحت وہی بن جائے گی جو وہ اسے بنانا چاہتا تھا لیکن پھر وہ مایوس ہونے لگا ۔ اور ایک روز مایوسی اس قدر مسلّط ہو گئی کہ وہ گھر سے نکل بھاگا ۔ اور اپنی مایوسی بھولنے کے لئے اکیلا سینما ہال میں جا بیٹھا ۔ اتفاق سے اس روز مسز جوزف بھی اپنے خاوند کی بے وفائی بھولنے وہاں آئی ہوئی تھیں ۔ اگرچہ مسز جوزف کا رنگ سانولا اور نقوش عامیانہ تھے ۔ لیکن وہ ابھی جوان تھی ۔ اُس کی آنکھ کی سیاہ کرن دھنس جانے والی تھی ۔ اس کی مسکراہٹ اثبات آلود تھی ۔ اور اُس کے ہاتھ بے حد گرم تھے ۔

صمد کو ایک بار پھر گویا مسز ڈیوڈ مل گئی ۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسز جوزف گھر میں اکیلی رہتی تھیں اور مسٹر جوزف اپنے مشاغل کے باوجود بیگم کو اکیلے میں کسی سے مِلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے ۔ یہ اور بھی خوب تھا کیونکہ اس طرح ان کے تعلق میں چوری چھپے کی کلی لگنے سے مذید دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ رات کے اندھیرے میں ملنے لگے ۔

مسٹر جوزف بھی صمد کی طرح اس مِل میں سپروائزر تھے اور اسی بلاک میں ان کا مکان دوسرے سِرے پر واقع تھا ۔ اِس بلاک کے تمام فلیٹ بالکل ایک سے بنے ہوئے تھے اور چونکہ کمپنی نے انہیں فرنش کیا تھا اِس لئے ان مکانات کا سازوسامان بھی بالکل ایک سا تھا ۔ یہ فلیٹ دوسری منزل پر تھے ۔ پہلی منزل میں مِل کے سٹور تھے جو ہمیشہ بند رہتے تھے ۔ فلیٹ کی سیڑھیاں باغیچے کے سامنے سے اوپر کو جاتی تھیں ۔ اور اوپر ہر فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم ، بیڈ روم ، کچن ، صحن ، برآمدہ ، باتھ روم اور ایک چھوٹا سا گسٹ روم تھا ۔ اِس چھوٹے کمرے سے براہِ راست بغلی سیڑھیاں نیچے اُترتی تھیں ۔ جو ایک مختصر سی ڈیوڑھی کے باہر باغیچے کی طرف کُھلتی تھی ۔ تاکہ مہمانوں کی آمدورفت گھر والوں کے لئے باعث دقت نہ ہو ۔ جب مسٹر جوزف کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی تو صمد کو مسز جوزف کا پیغام مِل جاتا ۔ گسٹ روم کی بغلی سیڑھیوں کا نچلا دروازہ کھلا رکھا جاتا تاکہ صمد چپکے سے ادھر سے داخل ہو کر اپنی محبوبہ سے جا ملے جو آدھی رات تک

اس کے انتظار میں بیٹھی نٹنگ کرتی رہتی تھی ۔

ملاقات کا یہ انتظام نہایت تسلّی بخش تھا ۔ اگر کبھی مسٹر جوزف ناگاہ آبھی جاتے تو کال بیل بجتے ہی صمد چپکے سے دبے پاؤں بغلی راستے سے نیچے اُتر آتا اور بیگم گھبراہٹ کے بغیر دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر استقبال کرتی ۔

پھر کچھ دیر کے بعد وہ اس قدر نڈر ہو گئے کہ ملاقات کے بعد وہ دونوں اسی بستر پر سو جاتے ۔ حتّٰی کہ صبح سویرے جوزف کال بیل بجاتا ۔ مسز جوزف گھنٹی سُن کر اُٹھ بیٹھتی ۔ "وہ مل سے آگئے ۔" وہ کہتی اور صمد جلدی سے پھدک کر اُٹھ بیٹھتا اور چپکے سے بغلی زینے سے نیچے اتر جاتا اور مسز جوزف میاں کے لئے دروازہ کھول دیتی ۔

فرحت کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ صمد اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے مگر وہ خاموش رہی جب خاوند راتیں گھر سے باہر گذارنی شروع کر دے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور جب بات واضح ہو جائے تو پھر بات کرنے کا فائدہ ۔

صمد کو بھی مل میں نائٹ ڈیوٹی دینی پڑتی تھی ۔ نائٹ ڈیوٹی کے دوران میں اسے راتیں مل میں گذارنی پڑتیں ۔ لیکن اب دن کی ڈیوٹی کے دوران میں بھی وہ راتیں باہر ہی کاٹتا اور ڈبل ڈیوٹی یا سینما کا بہانہ بنا دیتا ۔ مگر فرحت عورت تھی ۔ اور اس قسم کے بہانے عورت سے نہیں چلتے ۔

صمد کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر فرحت نے پہلی مرتبہ شدّت سے محسوس کیا کہ اس کا اپنا ضبط جسے وہ وصف سمجھی تھی ۔ اس کی تباہی کا باعث ہوا ہے ۔ یہ محسوس کر کے دفعتاً وہ چھلکنے لگی ۔ اور اس نے وہ دبا ہوا شعلہ عریاں کر دیا ۔ لیکن بات ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ فرحت نے سنگار، لباس اور عریانی سب آزما دیکھا ۔ لیکن وہ صمد کو واپس نہ لا سکی پھر اس کے دل میں ایک خوفناک عزم پیدا ہو گیا ۔ چھ مہینے گزر گئے ۔

کال بیل زور سے بجی ۔ وہ دونوں جاگ پڑے ۔ اندھیرے میں قریب سے وہ بولی ۔ "وہ دفتر سے آگئے ۔" حسبِ معمول صمد پھدک کر اٹھا ۔ چمٹ کر الوداعی بوسہ لیا ۔ اور پھر چپکے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہو گیا ۔ اور حسب

معمول اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا بغلی زینے سے نیچے پہنچا ۔ بیرونی دروازہ آہستہ سے کھولا اور باہر نکل گیا ۔

ٹارچ کی روشنی صمد پر پڑی ۔ دو سائے اس کی طرف بڑھے ۔ گھبرا کر وہ پیچھے ہٹا ۔

"اے ہے" اس کی ماں چلّائی ۔ کب سے ہم اللہ ماری یہ تمہاری گھنٹی بجا رہی ہیں ۔ تم دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہو ۔ "اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہا ہے ۔ چل نا اوپر ۔ ہمیں تو ریل کے سفر نے چُور کر دیا چل ۔"

ٹارچ کی روشنی صدر دروازے پر پڑی ۔

اپنی نیم پلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں ۔ گھپ اندھیرا اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ۔ پھر ایک بھیانک خاموشی ۔ وہ اب وہیں بیٹھا ہے ۔

کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے ۔ کیوں وہاں بیٹھا ہے اور اس فلیٹ کو پردۂ سیمیں سمجھنے پر کیوں مصر ہے ۔ البتہ دور ۔ اس بدنام چوبارے کی کھڑکی سے وہ مٹیار عورت اس دیوانے کی طرف دیکھ کر یوں تحقیر سے ہونٹ نکال دیتی ہے جیسے وہ اس کے راز سے واقف ہو ۔

..............○.... ....

روغنی پتلے

روغنی پتلے

فہرست

بسندرتا کا راکشس

شام دبے پاؤں رینگ رہی تھی ۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی تھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی ۔

سوامی جی کی کُٹیا کا دروازہ صبح سے بند تھا ۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے ۔ ہر چند ساعت بعد وہ سر اُٹھا کر سوامی جی کی کُٹیا کے دروازے کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ کب دروازہ کھلے اور درشن کے بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کُھلا تھا ۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پروس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا تھا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی ۔ نہ دروازہ کُھلا نہ سوامی جی نے بھوجن اُٹھایا ۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا ۔

پاس ہی بالکا مُنجھ کے بنے ہوئے جوتے کی مرمت کر رہا تھا ۔

دُور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اوپر دھری ہوں ۔ شہر کے لوبھی بھنورے کی مدہم بھن بھن صاف سُنائی دے رہی تھی ۔

دفعتہً داس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی ۔ 'ہے رام!' اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا ۔

'ہات کٹ گیا کیا' ۔ بالکے نے سر اُٹھا کر پوچھا ۔

'نا ہیں مہاراج ، وہ دیکھو ۔۔۔ اُدھر'۔

بالکے نے اُدھر دیکھا ، اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں ۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں اُن کی طرف آ رہی تھیں ۔ چُست لباس پہنے ، بال پُھلائے ، مُکھ سجائے ، پرس جھلاتی ہوئی ، یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں

بلکہ پِک نِک سپاٹ ہو ۔
'یہ تو کالج کی دکھتی ہیں مہاراج' داس نے کہا ۔
' آج کل تو سبھی کالج کی دکھتی ہیں' بالکے نے جواب دیا 'کیا ماتا کیا پتری' بالکا اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور گھبراہٹ میں ٹہلنے لگا ۔
داس چھلے ہوئے آلوؤں کو پھر سے چھیلنے میں لگ گیا ۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے ۔
وقت تھم گیا ۔
پھر ایک لوچدار آواز نے تتلی کی طرح پر پھڑ پھڑائے ۔ 'ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے' ۔
بالکے نے سر اُٹھایا ۔
شیلا اور بملا کی کٹورا سی کُھلی کُھلی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا 'سوامی جی کی کُٹیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں دیوی ۔ انہوں نے صبح کا بھوجن بھی نہیں اُٹھایا' ۔
'تو دوار کے پٹ کھول دو'۔ شیلا بولی ۔
'ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی'۔
'سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں' ۔ بِملا غصے میں چلّائی ۔ 'اگر پرماتما کا دوار بھی بند ہوگیا تو منگتوں کا کیا ہوگا؟'
یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ سُدھ بُدھ ماری گئی ۔ اب کیا جواب دے کوئی ہو تو دے ٹیلے پر خاموشی طاری ہوگئی ۔
پھر داس اُٹھا، اس نے لپک کر چٹائی اُٹھائی اور کنّیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا ۔ 'بیٹھو شریمتی بیٹھو' ۔
'ہمارے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں'۔ شیلا نے کہا ۔
'سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے' ۔ داس نے پوچھا
'مانگ بھی ، پوچھنا بھی' شیلا نے کہا ۔
'ہم تمہارا سندیس پہنچا دیں گے دیوی'۔ بالکا بولا ۔
'اونہوں' ۔ شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا 'ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے'۔

'پر دیوی جی، سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے' بالکے نے کہا۔
'کیا کہا؟' شیلا اور بملا دونوں چلّائیں۔
'کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟' شیلا نے تلخی سے پوچھا۔
بالکے نے سر لٹکا لیا اور چُپ سادھ لی، اب وہ کیا کہے کیا جواب دے۔
ٹیلے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اُس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔ 'بیکار ہے بملا، استری کے لئے پر ماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ ویش بھی پرش کا ویش نکلا'۔

بملا کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ چلّا کر بولی۔ 'سوامی جی پرش سے ملتے ہیں استری سے نہیں۔ کیا سوامی جی استری سے ڈرتے ہیں'۔

بالکے نے جواب دیا 'استری سے سوامی جی نہیں ان کے اندر کا پُرش ڈرتا ہے اور پُرش استری سے نہیں خود سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی شکتی نہیں دیوی کہ وہ اندر کے مرد کو روک میں رکھ سکے'

یہ سُن کر کنّیائیں سوچ میں پڑ گئیں۔

اس سمے داس نے دو پیالے چائے کی تھالی میں دھرے اور کنّیاؤں کے سامنے رکھ کر بولا
'دیوی چاء پیو تم تھک گئی ہو گی۔ بڑی کٹھن چڑھائی ہے اس ٹیلے کی'۔
'مجھے دیوی نہ کہو' شیلا غصے میں بولی 'میں دیوی نہیں استری ہوں، استری'
"بی بی یہ تو ہمارا اندر کا کھوٹ ہے"۔ بالکے نے کہا "کہ استری سے بچنے کے لئے ہم اسے دیوی بنا لیتے ہیں"۔
"تمہارے اندر بھی کھوٹ ہے کیا؟ تم جو دن رات رام نام کی دُھنکی سے دل کو پوتر کرنے میں وقت گزارتے ہو" بملا نے پوچھا۔
"دیوی" بالکا بولا "من کا کھوٹ کنوئیں کے پانی کی طرح ہوتا ہے جتنا نکالو اتنا ہی بھیتر سے رس کر باہر آ جاتا ہے"۔

یہ سُن کر وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ دفعتہ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں۔ اس لئے چٹائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

"ہاں" شیلا سوچ میں گم بڑبڑائی "میرے پتی نے بھی مُجھے دیوی بنا رکھا تھا ۔ اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ پوجا لگتی تھی ۔ میں کہتی پر کاش مجھے دیوی نہ بناؤ، متر بناؤ ۔ ساتھی جانو، برابر کا ساتھی ...."

"اونہوں" بملا نے آہ بھری "وہ برابر کا نہیں جانتے ساتھی نہیں مانتے ۔ یا تو دیوی بنا کر پوجا کرتے ہیں اور یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں"۔

"ایسا کیوں ہے بالکا جی"۔ بملا نے پوچھا ۔

"کیا سوامی جی سے یہی پوچھنے آئی ہو دیوی" ۔ بالکے نے کہا ۔

"ہاں" شیلا بولی "جب پرش اور استری ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں تو پھر بڑا چھوٹا کیوں" ۔

"سچ کہتی ہو شریمتی سچ کہتی ہو" ۔ بالکے نے آہ بھری "یہ تو استری کی جنم جنم کی پُکار ہے ۔ اس دن سے استری برابری کی بھیک مانگتی پھرے ہے جس دن رانی وجے وتی نے راج پاٹ کو تیاگ کر برابری کے کھوج میں راج بھون سے پاؤں باہر دھرا تھا" ۔ یہ کہہ کر بالکا چُپ ہوگیا ۔

"وجے وتی کون تھی بالکے جی" بملا نے پوچھا ۔

"تمہیں نہیں پتہ کیا" بالکا بولا "آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت رانی وجے وتی کی آواجیں سُنائی دیتی ہیں"۔

"آج بھی" بملا نے پُوچھا ۔

"ہاں آج بھی ۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے" ۔

یہ سُن کر شیلا بملا کو چپ لگ گئی ۔

سائے اور بھی لمبے ہوگئے ۔

درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں ۔ سورج کے لہو نے رِس رِس کر بادلوں کو رنگ دیا ۔

وقت رُک گیا ۔

پھر شیلا کی مدھم آواز آئی "بالکا جی، وجے وتی کون تھی؟"

اور پھر بالکے نے وجے وتی کی کہانی سُنانی شروع کی ۔ بالکا بولا ۔ وجے وتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی ۔ مہاراج کا سنگھاسن اس

کے چرنوں میں دھرا تھا ۔ مہاراج اسے آنکھوں پر بٹھاتے ۔ وارے نیارے جاتے ۔۔۔ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے ۔ اُلٹا پلّے باندھ لیتے انہیں وجے سب رانیوں سے پیاری تھی ۔ کیسے نہ ہوتی ۔ سُندر تا میں وہ سب سے اتم تھی ۔ صرف ناک نکسہ ہی نہیں ۔ اس کی چال ڈھال ، رنگ روپ سبھاؤ سبھی کچھ سندرتا میں بھیگا ہوا تھا ۔ پلکیں اُٹھاتی تو دیئے جل جاتے ۔ ہونٹ کھولتی تو پھول کِھل اُٹھتے ۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے ۔ بھرپور نجر سے دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی ۔ مہارانی راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی ۔

بالکا رُک گیا ۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا ۔ پھر ایک روز آدھی رات کے سمے مہارانی کا دوار بجا وہ سمجھی مہاراج آئے ہیں ۔ اُٹھ کر دوار کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے ۔

کون ہے تو ؟ وہ غصے سے چلائی ۔

اس کی آواج سُن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اُٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آگئی ۔ اس کی اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا دوار کھٹکھٹائے ۔ رانی نے شوشی سے کہا ۔ کون ہے تو؟ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی ۔

میں شوبالا ہوں ۔ بڑھیا نے جواب دیا ۔ میرا دارو کھتم ہوگیا ہے ۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی ۔ میں نے سوچا کہ رانی کے آگے جھولی پھیلاؤں جو کرپا کرے تو میری رات کٹ جائے ۔

تو استری ہو کے دارو پیتی ہے ۔ رانی نے گھن کھا کر جھرجھری لی ۔

نہ مہارانی، جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی ۔ جب میں استری تھی تو دارو پیتی نہیں تھی ۔ پلایا کرتی تھی ۔ لیکن اب ۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لئے دارو پیتی ہوں

یہ کیا بول رہی ہے شوشی ۔ وجے نے کہا کہتی ہے میں استری نہیں ۔

شوبالا بولی ۔ استری ایک سوگند ہوتی ہے جو کچھ دِناں رہتی ہے پھر اُڑ جاتی ہے اور پھر پھول کی جگوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے ۔

تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟ شوشی نے پوچھا ۔

نہیں شوبالا نے کہا ۔ میں باندی نہیں ہوں ۔ آج سے تیس ورش پہلے

میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی ۔ اسی دالان میں جس میں تو رہتی ہے ۔ اسی سیج پر سوتی تھی جب مہاراج ماتری راج کے پتا راج سنگھاسن پر براجمان تھے ۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر بٹھاتے تھے جیسے تجھے آج بٹھاتے ہیں ۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی ۔ یہ سب چونچلے سُندرتا کے کارن تھے ۔ جیسے آج تیرے چاؤ چونچلے ہیں ۔ پھر ایک دن آئے گا، جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لئے دارو کا سہارا لے گی ۔

یہ سُن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا ۔ وہ سوچ میں پڑ گئی ۔ تو کیا یہ ساری چاہتیں روپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟

کچھ بھی نہیں ۔ شوبالا نے جواب دیا ۔ جب تک دُکان سجی ہے ۔ گاہکوں کی بھیڑ ہے ۔ جب دکان لُٹ جائے تو استری کو کون جانے ہے مہارانی ۔

تو بکتی ہے یہ سب جھوٹ ہے ۔ وجے نے چیخ کر کہا ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ نہیں ہو سکتا ۔

بالکا رُک گیا ۔

داس نے چونک کر دیکھا ۔ توے پر پڑا ہوا پھلکا جل کر کالا ہوگیا تھا ۔

بملا سر جھکائے چٹائی کو کُرید رہی تھی ۔

شیلا کی نگاہیں چلتے بادلوں پر ٹکی ہوئی تھی ۔

"پھر کیا ہوا بالک مہاراج"۔ داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے ۔

بالکے نے بات چلا دی ۔ بولا ۔

شوبالا کے جانے کے بعد وجے رانی بے کل ہوگئی ۔ کیا یہ سچ ہے کہ سندرتا ہی سبھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ۔ یہ جھوٹ ہے ۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا ۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا ۔ سچ کوئی میٹھا پھل نہیں ۔ وہ جھوٹ جو شانت کر دے اس سچ سے اچھا ہے ۔ جو اندر بھٹی سُلگا دے ہے ۔ پر تتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تاپ چڑھا تھا ۔ بولی منش کی رتھ میں دو پہیئے لگے ہیں ۔ پرش اور استری ۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد توڑی دونوں پہیئے برابر نہ ہوں ۔

نہیں رانی ۔ شوشی نے کہا ۔ یہ پہیئے برابر نہیں ۔ کارن یہ کہ پرش کا پہیہ چلے ہے ۔ استری کا کھالی سجاوٹ کے لئے ہے ۔ چلتا نہیں ۔

باندی نے وجے کو بہت سمجھایا پر وہ نہ مانی ۔ بالکا رُک گیا ۔ پھر اس نے سر اُٹھا کر بملا شیلا کی طرف دیکھا ۔ بولا ۔ ”کنیّاؤ! جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیڑا لگ جائے پھر جیون بھر اُسے نہ سُکھ ملتا ہے نہ شانتی“۔

”یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج“۔ داس بولا ۔

دوارکا داس بالک نے کہا ”سچ بولو سچ کو اپناؤ سچ جیو پرنتو سچ کی ڈھونڈ میں نہ نکلنا سدا چلتے رہو گے ۔ چلنے کے پھیر میں آجاؤ گے ۔ نہ رستہ ہو گا ۔ نہ ڈنڈی نہ اور ۔ نہ کہیں پہنچو گے ۔ صرف چلنا چلتے رہنا“۔ بالکے نے آہ بھری اور کہانی سنانے لگا ۔ بولا ۔ لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی ۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانیں ہیں کہ نہیں ۔ اس کے من میں چنتا کا کانٹا لگ گیا ۔ جوں جوں اس کی چنتا بڑھتی گئی توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مچ کی دیوی ہو ۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی ۔ مہاراج مجھے مورتی نہ بنائیے ، مندر میں نہ بٹھائیے ۔ اپنے پاس بٹھائیے ۔ اپنے برابر جانئے ۔

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں ، جسے دھیان دیا جائے، مان دیا جائے، اونچا بٹھایا جائے، وہ برابری کیوں چاہے ۔ جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے ۔

وجے رانی کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سمان بنا سکتے ہیں ، مہارانی بنا سکتے ہیں چہیتی سمجھ سکتے ہیں ، ساتھی نہیں بنا سکتے ۔

یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی ۔ رانی نہیں بلکہ استری بن کر جئیے گی ۔ سُندرتا کے جور پر نہیں، جئیو کے جور پر بھبھوت مل کر سُندرتا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے ۔ ساتھی نہ جانے ۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار

کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی ۔

چلتے چلتے وہ راج نگری سے دُور ایک شہر میں رُکیں ۔ وجے گجارے کے لئے پُھلکاریاں بناتی ۔ شوشی اُنہیں باجار جا کر بیچ دیتی ۔

کچھ دنوں میں وجے کی پُھلکاریوں کی مانگ بڑھ گئی اتنی صاف سُتھری پھلکاریاں کون بناوے ہے ۔ منڈی میں باتیں ہونے لگیں ۔ پھر بدیش سے ایک گبھرو بیوپاری آنند آنکلا پُھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا ۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا ۔ بولا یہ پُھلکاریاں کون کاڑھتی ہے مجھے اس کے پاس لے چل ۔ شوشی اسے گھر لے آئی ۔ وجے کو دیکھ کر وہ پُھلکاریاں بھول گیا ۔ وجے پُھلکاریاں دکھاتی رہی ۔ آنند وجے کو دیکھتا رہا ۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھبھوت سندرتا کو ڈھانپ لیتی ہے ۔ آنند سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اُچھالتی ہے یہ شریمتی اسے چُھپارہی ہے ۔ اوش کوئی بھید ہے ۔

آنند بہت سیانا تھا ۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا ۔ اس نے سوچا پاؤں دھیرے دھیرے دھرو ۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گرا تو یہاں سہارا دے کر اُٹھانے والا کوئی نہیں ۔ پہلے تیل دیکھ ، تیل کی دھار دیکھ ۔ پھر پاؤں دھرنا ۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لئے پُھلکاریوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا ۔

دوچار پھیروں میں اُسے پتہ چل گیا کہ سُندرتا کی بات نہیں چلے گی ۔ پریم کی بات نہیں چلے گی ۔ ملائم بات نہیں چلے گی ۔ لگاؤ کی نہیں ، بے لاگ ، کُھردری ، گنوار ۔

وہ بولا ۔ بی کاڑھن تُو تو چیونٹی کی چال چلے ہے پر مُجھے تو بہت سی پُھلکاریاں چاہئیں تاکہ اُنہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں ۔

پھر چار ایک دن کے بعد آنند ، وجے سے بُہت بگڑا ۔ سب جھوٹ موٹ ۔ بولا ۔ تو کام چور ہے ری ۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا ۔ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا ، اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا ۔

پھر ایک دن آنند نے اس کی بانہہ پکڑلی ۔ بولا ۔ بی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں ۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے ۔ تو جیون سُکھی ہو جائے ۔ تو پُھلکاریاں کاڑھے میں انہیں بیچوں ۔ کام تیرا دوڑ دھوپ میری ۔

وجے اس کی چال میں آگئی ۔ اس کی ممتا جاگ اُٹھی ۔ بولی ، میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو پتنی کو برابر کا سمجھے ، نہ اُسے دیوی بنائے نہ باندی ۔ اپنا ساتھی جانے دُکھ سُکھ کا ساتھی ۔

ٹھیک ہے ، آنند بولا ۔ تو میری ساتھن ہے ۔ ساتھن رہے گی ۔

جب وجے دُلہن بنی تو بھبھوت کا پردہ بھی اُٹھ گیا ۔ اندر سے رانی نکل آئی ۔ آنند تو دھک سے رہ گیا ۔ ہے پربھو ایسی مورتی! بالکا رُک گیا ۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا ۔ چولہا جل رہا تھا ۔ توا جو کھالی پڑا تھا ، تپ تپ کر کالا ہوگیا تھا ۔ پیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کِھدو ہو ۔

شیلا کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں ۔ بملا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اب روئی کہ اب روئی ۔

ٹیلے پر سایے منڈلا رہے تھے ۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی ۔

شام دبے پاؤں جا رہی تھی ۔ رات اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھی ۔

"پھر کیا ہوا بالک جی؟" داس نے جیسے ہچکی لی ۔

بالک بولا ۔ آنند بہت بڑا سوداگر تھا ۔ حویلیاں تھیں ، نوکر چاکر تھے ۔ دھن دولت تھی ۔ کس بات کی کمی تھی اسے ۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لئے اس نے نردھن کا سوانگ رچایا تھا ۔ بس ایک بات سچ تھی ۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا ۔

اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا پر کیا کرتا ۔ اتنا بڑا بیوپار تھا ۔ اس کی دیکھ بال تو کرنی ہی تھی ۔ اسے جانا ہی پڑتا ۔ پُھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا ۔ دنوں باہر رہتا چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو ۔ آجاتا تو جیسے جانے سے ہول کھاتا ہو ۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پُھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا۔ پتنی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پُھلکاری بنا دیا کر، ایسی جو راجا رانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہو گئی۔

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ رے تو مُجھ سے اپنے بیوپار کی بات کیوں نہیں کرتا۔

آنند نے جواب دیا۔ ساتھن بیوپار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیوپار کی بات سُن کر کیا کرے گی۔

وجے بولی دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سُکھ کا نہیں ہوتا۔ دُکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیوپار کی ساری بات بتا۔ اپنے دُکھ گِنوا۔

اس پر آنند نے اُسے ایک لمبی چوڑی طوطا مینا کہانی سُنادی کہ کس طرح وہ نگر نگر پھرا۔ راجاؤں رانیوں سے ملا۔ اُنہیں پُھلکاری دکھائی۔ اور انت میں اک راج نرتکی پُھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہو گئی۔ بولی۔ بول بیوپاری منہ مانگے دام دوں گی۔

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لئے کہانی سُنا رہا ہو سُلانے کے لئے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھو گئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی بولی شوشو یہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے وہ ساتھی کیا بنے گا۔

دیکھ رانی۔ شوشی بولی۔ وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں کھوٹ نہیں۔ پرش پتنی کو اپنے بیوپار کا بھید کبھی نہیں دیتا وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا جرور ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔

تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہوا، برابری نہ ہوئی۔ جا شوشو منڈی میں جاکر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔

شوشی نے پوچھ گچھ کی۔ تو پتہ چلا کہ آنند تو ایک راج بیوپاری ہے۔ اسے نے بیجا نگری کی مہارانی کے لئے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سُنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا تو پُھلکاریاں بیچ کر گجارہ کرنے کی بات اک بہانہ تھی ۔ کیوں شوشی ، تو کیا کہتی ہے؟

شوشی نے وجے کو بُہت سمجھایا بجھایا کہ دیکھ دئیا! اس سے اچھا جیون ساتھی تُجھے نہیں ملے گا ۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا ۔ لیکن وجے نہ مانی ۔ شوشو اتنے پردے اوپر کچھ ، بھیتر کچھ ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں ، جھوٹ ہو ، دکھاوا ہو وہاں برابری کیسی ۔ چل شوشی کسی ایسی جگہوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو ، اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے ۔ بالکا رُک گیا ۔

"تو کیا وجے آنند کو چھوڑ کر چلی گئی؟" شیلا نے پوچھا

"ہاں ، چلی گئی"۔ بالکا بولا ۔

بملا نے ایک لمبی آہ بھری ۔

"پھر وہ کہاں گئی ؟" داس نے پوچھا ۔

پہلے وہ ایک پُجاری کے پھندے میں پھنس گئی ۔ پُجاری نے اسے داسی بنا لیا ، پربھو کی داسی ، پھر آپ پربھو بن بیٹھا ۔

وہاں سے بھاگی تو ایک نرتکی کے جال میں جا پھنسی ۔ اس نے اسے اپنے چوبارے میں سجالیا ۔ چوبارے سے اسے ایک راج گائیک لے اُڑا وہاں بھی اسے برابری نہ ملی ۔ گائیک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا ۔ پھر تھک کر ماندگی اُتارنے کے لئے وہ وجے سے دل بہلاتا ۔

چل شوشی ، ایک دن وجے نے کہا ۔ یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے ۔ شوبی بولی ۔ دئیا جو تو چاہے ہے وہ ادہر نہیں ملے گا جہاں دھنوان بستے ہیں وہ ادہر ملے گا ۔ جہاں نردھن بستے ہیں ۔ کامی بستے ہیں ۔ جہاں پرش پتنی کے سہارا لئے بغیر کچھ کر نہیں سکتا ۔ جہاں پتنی نہ موہ ہوتی ہے نہ مایا ۔ بس اک باجو ہوتی ہے ۔ پہلے سہارا ہوتی ہے پھر کچھ اور ۔ جہاں دوجے کے بِنا گجارا نہیں ہوتا ۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے ۔

وہ کون سی جگہوں ہے ، کہاں ہے شوشی ۔ وجے نے پوچھا ۔

وہ جگہ وہاں ہے ۔ جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا کام کا ہوتا ہے ۔ دیکھو دئیا تو مان نہ مان پرنتو استری جیو کی دھرتی ہے جس کے دم سے جیو کونپل بھری

رہتی ہے ۔ استری کی سار وہی جانے ہے ۔ جو دھرتی کی سار جانے ہے ۔ جو بوٹا لگانا جانے ہے جو کھیتی اگائے ہے ۔ جس کا گجارا دھرتی کی پیدا پر ہے بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے ۔ اپنے سا جانے ہے ۔

وجے کے دل میں بات اُتر گئی ۔

اک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں ۔ شہر سے دور گاؤں کی اور ۔

شوشی نے وجے کو موٹے کپڑے پہنا دیئے ۔ منہ پر ہلدی ، کالک کا ابٹن مل دیا ۔ بولی یہاں استری، استری ہوتی ہے ۔ گن کے جور پر نہیں ۔ جیو کے جور پر ۔ یہاں سندرتا شوبھا نہیں رستے کی روک ہے ۔ تو اپنی سندرتا کو چھپا رکھنا ۔ جو نجر آگئی تو گڑ بڑ ہوگی ۔

شوشی ۔ وجے بولی ۔ میں اس سندرتا کے کارن بڑا دکھی ہوں ۔ کوئی بِس بھری بوٹی ڈھونڈلا کہ میں مُکھ پر مل لوں جو سندرتا کی کاٹ کردے ۔

شوشی ہنسی ۔ بولی ، بھولی رانی سُندرتا مکھ پر نہیں ہوتی ۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے ۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہے ۔ بات ہلانے میں ہوتی ہے ۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے ۔ آنکھ اُٹھانے میں ہوتی ہے ۔ ہونٹ کھولنے میں ہوتی ہے ۔ تو اسے اپنے سبھاؤ سے کیسے نچوڑ پھینکے گی ۔

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چُننے لگیں ۔

ایک دن لاکھا کسان نے وجے سے کہا تو کیسی جنانی ہے ری ۔ تیری انگلیاں تو قینچی سی چلتی ہیں ۔ اس نے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ انگلیاں دیکھیں تو سٹپٹا گیا ۔ ری یہ کیسی انگلیاں ہیں ۔ انگلیاں ہیں کہ رس بھری پھلیاں ۔ اتنی لمبی اتنی پتلی ۔

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا ۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا ۔ ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی ۔ میں اکیلا ہوں ۔ پتا جی پرماتما کو پیارے ہو گئے ۔ ماتا بہت بوڑھی ہے میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتی ۔ بھائی بہن ہیں نہیں اکیلا ہوں تو میرا باجو بن جا ری ۔ میں ہل چلاؤں تو بیج ڈال ۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چُن ۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال ۔ پھر ہم

کسی سے ہیٹے نہیں رہیں گے ۔ میں جو آدھا ہوں پورن ہو جاؤں گا ۔ اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا ۔ نہ لوبھ ۔

وجے کو اپنی شرط بھی بھول گئی ۔ اس نے ہاں کردی ۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جُت گئے ۔ لاکھا نہ اسے نرمل سمجھتا تھا نہ ماڑی ۔ نہ سندر نہ دیوی ۔ وہ تو اس کا باجو تھی ۔ پھر کوئی بات اس سے چُھپاتا بھی تو نہ تھا ۔ کیسے چھپاتا ۔ ہر سمے وہ دونوں اکٹھے رہتے ۔ کھیت میں ۔ گھر میں ۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا ۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا ۔

وجے نہال ہوگئی ۔ سمجھی جیسے جل ککڑی جوہڑ میں آگئی ہو ۔

لاکھے کسان کو وجے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی ۔ کہتا ۔ ری توگندی کیوں رہتی ہے نہاتی دھوتی کیوں نہیں ۔ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے ۔ الّیاں بلّیاں لگی رہتی ہیں ۔ بال چکٹ ، آنکھوں میں کیچ ۔ وجے یہ سُن کر گردن لٹکا لیتی ۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھا نے تاؤ کھا کر بالٹی اُٹھائی اور وجے پر انڈیل دی ۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا ۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مانجھنے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو ۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا ۔ سنہرے لانبے بال ۔ مورسی گردن ، کٹورہ سی آنکھیں ، دھار سی ناک ، پھول سے ہونٹ ، چھوئی موئی سا بدن تو کون ہے ری ۔ وہ گھگھیا کر بولا ۔ تو استری نہیں تُو تو پری ہے ری پری ۔

بالکا کچھ دیر کے لئے چُپ ہوگیا ۔ سبھی چپ ہوگئے تھے کسی کو بات کرنے کی سُدھ نہ رہی تھی ۔

بالکا دیر تک چُپ رہا ۔ پھر بولا ۔ بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجک بیٹھ گئی اور وہ وجے سے دُور ہٹتا گیا ۔ وجے نے باربار اسے سمجھایا ۔ دیکھ لاکھے میں پری نہیں استری ہوں ، استری ۔

پر اس کی جھجک نہ گئی ۔ بولا تو پری نہیں تو استری بھی نہیں ۔ تو مور ہے میں کاگ ہوں ۔ تیرا میرا کیا سمبندھ ۔ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے

ناہیں ۔

کچھ دناں وجے اس کا منہ دیکھتی رہی ۔ پھر نراش ہو گئی ۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی چل شوشی یہاں ہمارا دانا پانی کھتم ہوگیا ۔

شوشی نے سر جُھکا لیا ۔ اور جوں کی توں بیٹھی رہی ۔ جیسے بات سُنی ہی نہ ہو ۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی ۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی ۔ شوشی اب لاکھے کی ہوچکی تھی ۔

وجے کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ چُپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی ۔

بالکا چپ ہوگیا سبھی چپ ہوگئے تھے ۔

کسی کو ، پھر کیا ہوا پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا ۔

پھر بالکے نے کہا:

پھر پتہ نہیں ۔۔۔ ، کہتے ہیں وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے ۔

آج بھی آدھی رات کے سمے راج گڑھی سے آواجیں آتی ہیں ۔۔۔ پربھو باہر کی سُندرتا کو بھیتر میں رچا دے کہ استری ، استری بن جائے ۔۔۔ پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے ۔

بالکا چپ ہوگیا ۔ ٹیلے پر گہری خاموشی چھاگئی ۔

پھر کوئی دُور سے بولا ۔ وجے رانی نے سچ کو پا لیا ۔ جو اپنی سُندرتا کو اُچھالتی ہیں ۔ بناؤ سنگھار کا راکشس کھڑا کر لیتی ہیں انہیں برابری مانگنے کا کوئی ادھیکار نہیں ۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے ۔

○

بُش اور بُشرہ

آج میں آپ کو ایک لوسٹوری سُناتا ہوں اس کہانی میں تین کردار پیش پیش ہیں ۔ محبت کی تکون ایک لڑکا ، ایک لڑکی اور ایک ۲۵۰ طاقت کا موٹر سائیکل ۔

آپ کہیں گے کہ لڑکا لڑکی تو خیر ہوئے موٹر سائیکل کو بیچ میں کیوں لے آئے ۔ جنابِ والا ! میں مجبور ہوں ۔ موٹر سائیکل کو میں نہیں لایا ۔ وہ خود بخود آگیا ہے ۔ آج کل جدید گھرانوں میں موٹر سائیکل بہت ایکٹو ہے ۔ جہاں محبت کی بات سُنی شڑاپ سے بیچ میں آگھستا ہے ۔ موٹر سائیکل عصری تقاضا ہے جس طرح پُرانے زمانے میں وفا ہوتی تھی ، جہاں محبت کی بھنک پاتی ' یوں دھرنا مار کر بیٹھ جاتی ۔ جس طرح قرض خواہ کے دروازے پر مہاجن آ بیٹھا ہو ۔ تو جناب اس کہانی میں محبت کو چلانے کی ساری ذمہ داری موٹر سائیکل پر ہے بلکہ یوں کہئیے کہ اگر موٹر سائیکل نہ ہوتا تو لڑکا لڑکی جتنا زور چاہے لگا لیتے محبت پیدا ہی نہ ہوتی ۔

آج کل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل ہے پُرانے زمانے میں بہلی میں بیٹھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی ۔ آج کل موٹر میں زناٹے سے ۔۔ نکل جاتی ہے ۔۔۔ فٹاک سے منزل کو جالیتی ہے ۔۔۔ بس ایک ہی مشکل ہے کہ منزل پر پہنچ کر بھی نہیں رُکتی ۔

ہاں تو صاحبو کہانی یوں ہے کہ

ایک تھی لڑکی بش اور ایک تھا لڑکا ذولف ۔ بش کو ذولف سے محبت تھی ۔

معافی چاہتا ہوں محبت ایک پُرانا لفظ ہے یہاں بیٹھتا نہیں ۔ لیکن کیا کیا جائے کوئی اور لفظ میسر نہیں مطلب ہے کہ بش کو ذولف سے والہانہ لگاؤ تھا انفیچویشن تھی ۔ بلکہ یوں کہئیے کہ ان فیچویشن اپنی شدت کی وجہ سے مجبوری بن

چکی تھی یہ مجبوری بش کے گلے میں خواہ مخواہ پڑگئی تھی ، ساری شرارت موٹر سائیکل کی تھی ۔

ہوا یوں کہ ایک دن جب وہ گھر کی ٹیریس پر کھڑی تھی تو دفعتاً ایک شور اُٹھا بھونچال سا آگیا الماریوں میں رکھے ہوئے برتن بجنے لگے ۔۔۔ میزوں پر گلدان جھومے ۔ ٹی وی کا ایریل تھرایا اسلام آباد کی سڑک نما گلی گڑگڑاہٹ سے بھر گئی اور آخر کوئی چیز زوں ۔۔۔ سے گلی سے یوں گزر گئی جیسے ہوائی چل گئی ہو ۔

یہ ہوائی ذولفی کا موٹر سائیکل تھا ۔

بش دیکھتی ۔۔۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئی ۔

دل اُچھل کر باہر نکل آیا ۔ جسم گویا سکتے میں رہ گیا ۔

ہائے اتنی تیزی ۔۔ اتنی تڑپ جیسے بجلی گری ہو ۔ پھر اسے پتہ چلا کہ یہ بجلی ہر روز شام کے پانچ بجے گلی پر گرتی ہے اس لئے وہ روز پانچ بجے اس کا انتظار کھینچنے لگی ۔

جب ذولفی گلی میں زوں سے نکل جاتا تو بش کو دکھتا دکھاتا کچھ نہ تھا ۔ صرف موٹر سائیکل کی ایک سرخ سی لکیر اور ہیلمٹ کا ایک سلیٹی دھبہ ۔

تو جناب بش کو اس سُرخ اور سلیٹی دھبے سے محبت ہو گئی ۔ جب بھی سُرخ لکیر اور سلیٹی دھبہ زناٹے سے گزرتے ۔ اس کا دل اُچھل کر باہر آجاتا اور جسم میں سوئیاں چبھنے لگتیں ۔

در اصل بش کو رفتار سے عشق تھا ۔ پتہ نہیں کیوں شائد عصری تقاضا ہو یا شائد ذہن میں کوئی غدود زائد لگ گیا ہو ۔ جیسے پائلٹوں میں یا موٹر ریسیوں میں ہوتا ہے ۔ شاید اسی وجہ سے بش میں ایک بے نام اضطراب بھی تھا ۔ جو اس کے بند بند کو جھلاتا رہتا تھا ۔

اول تو وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی ۔ ابھی یہاں بیٹھی تھی ۔ اب وہاں کھڑی گنگنا رہی ہے لو وہ تو ٹیرس پر ٹہلنے لگی ۔ یہاں سے وہاں جا بیٹھنے کے لئے اسے اُڑانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی تھی ۔ بیٹھتی تو جسم کا رواں رواں دھنکی کی طرح بجتا ۔ اور کچھ نہیں تو پاؤں چلتا ۔ چلے جاتا اتنی تیزی سے جیسے انڈہ پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے مختصر یہ کہ بش بڑی ہی بے تاب روح تھی ۔

جو کام ذہن میں آتا ، چاہتی کہ ابھی ہو جائے ۔ ابھی اسی وقت جھٹ پٹ ، خیال ذہن میں اس قدر تیزی سے آتے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے جیسے تصویر ملٹی ایکسپوژرز کی وجہ سے دھندلی ہو جائے ۔

مثلاً نام ہی کو لیجئے ۔

اس کا نام بُشرہ تھا ۔۔۔ جو اسے پسند نہ تھا ۔

توبہ اتنا لمبا نام ۔۔۔بش ۔۔۔ را ۔۔۔ اونہوں ، نام ایسا ہو جو چھوٹا ہو ترت ہو خستہ ہو کڑاکے دار ہو ۔۔۔ اسی وجہ سے اس نے نام کو کاٹ کر بش رکھ لیا تھا ۔ بش کے صوتی اثر میں تیزی تھی اور پھر جھٹکا بھی اور معنوی طور پر بھی وہ ۔۔۔ لیکن چھوڑیئے بش کو معنوی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔

اس نے ذوالفقار کو بھی ذولف کہنا شروع کر دیا تھا اتنا لمبا نام ذوالفقار توبہ ڈریگ کرتا ہے ۔

اگرچہ بش روز ذولف کا انتظار کرتی تھی تاکہ گزرتے ہوئے اسے دیکھے ۔ لیکن اس نے ذولف کو کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ کیسے دیکھتی ۔ قیام کے عالم میں ہوتا تو دیکھتی اور اگر ذولف قیام کے عالم میں ہوتا تو وہ ایک عام سا لڑکا بن کر رہ جاتا ۔۔۔ سارا رومینس تو سپیڈ نے پیدا کر رکھا تھا ۔

بش کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ذولف کے خدوخال کیسے ہیں ۔۔ لیکن ہٹائیے محبت میں آج کل خدوخال کون دیکھتا ہے ۔

بش کو ذولف سے اس لئے محبت نہ تھی کہ وہ ذولف تھا بلکہ اس لئے کہ وہ جدیدیت کا سمبل تھا ۔ اور جدیدیت سے اسے عشق تھا عشق ۔ اس کی نظر میں ہر چیز ہر بات جو دورِ جدید کی نشاندہی کرتی تھی ۔ اس قابل تھی کہ خود کو اس پر نثار کر دیا جائے اور ذولف میں جدیدیت کی ایک نہیں تین باتیں تھیں ۔ ایک تو وہ رفتار کا دیوانہ تھا ۔۔۔ حرکت اس کے لئے زندگی تھی اور قیام موت پھر وہ اضطراب کا بادشاہ تھا ۔ اضطراب بھی تو حرکت ہی ہوتی ہے ۔ گرداب زدہ حرکت ۔ بس ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ نتائج سے بے پروا تھا ۔ بے نیاز تھا ۔ یوں کیا تو یہ ہو جائے گا کہیں وہ نہ ہو جائے ۔ پڑا ہو ۔ جو ہو سو ہو ۔ ٹو ہل وداِٹ ۔

ذولف ایک کھاتے پیتے بنے سجے گھر کا فرزند تھا ۔ باپ ایک اعلیٰ افسر تھا ۔ ماں سوشل سرکلز کی جان تھی ۔ گھر کی فضا لِولٹ لِو کے جذبے سے اس حد تک بھری ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی ۔ وہ گھر نہیں بلکہ بے تعلقی کی جنت تھا ۔

پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے ملاقات ہو ہی جاتی ۔ اور انہیں احساس ہوتا کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں ۔ سوشل ماں کے لئے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ خصوصاً جب بچے جوان ہو جائیں تو ۔ وہ ماں کی عمر کی گواہی جو دینے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ سوشل ماں کے لئے عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے ، بہر صورت ذولف کی ماں اس بات پر بہت خوش تھی کہ بیٹے نے موٹر سائیکل رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا رکھا ہے اور شامیں گھر میں نہیں بلکہ سڑک پر گزارتا ہے باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں ڈیش ہے اور جب وہ کیریر کے سائیکل پر چڑھے گا تو کچھ کر دکھائے گا ۔

دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال تھے اور اپنے لبریٹڈ ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے ان کے دلوں میں صرف دو بندھن باقی رہ گئے تھے ۔ سٹیٹس اور کیریر ۔ شاید یہ بندھن لبریٹڈ ہونے کے لئے ازبس ضروری ہوتے ہیں ۔

ذولف کو بچپن ہی سے رفتار سے عشق تھا اور یہ عشق اتنا شدید تھا کہ مزید کسی عشق کی گنجائش نہ رہی تھی ۔

وہ صبح انسٹیٹیوٹ میں حاضری دیتا جہاں وہ مینجمنٹ کورس کے آخری دور میں تھا ۔ پھر شام کو پانچ بجے موٹر سائیکل رائیڈنگ پر نکل جاتا ۔ ایکسلریٹر دباتا اور دباتا ۔ حتیٰ کہ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگتا ۔ بس یہی اس کی جنت تھی ۔

سات آٹھ روز تو بش ٹیرس پر کھڑی ہوکر ذولف کی زوں سُنتی رہی ، دیکھتی رہی ۔ سُن سُن کر نہال ہوتی رہی ۔ پھر وہ مضطرب ہو گئی ۔ یوں جیسے شیر پنجرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل لگاتا ہے ۔ مقصد نہ ادھر آنا ہوتا ہے نہ اُدھر جانا ذولف کی زوں ۔۔۔ بش کے دل میں اک زوں چلا دیتی وہ زوں اس کے بند بند میں گونجتی ۔

بش کے دل میں وصال کے لئے تڑپ پیدا نہ ہوتی تھی ۔ جس طرح پرانے زمانے کے عشق میں پیدا ہوا کرتی تھی ۔ سچی بات یہ ہے کہ بش کے ذہن میں وصال کا تخیّل سرے سے وجود ہی نہ رکھتا تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے ۔ کوئی کیفیت ہے یا منزل ۔۔ اس کے دل میں یہ آرزو بھی نہیں تھی کہ ذولف آنکھوں کے سامنے رہے اور میں اسے دیکھتی رہوں ۔ نگاہوں کے سامنے رہنے یا اسے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چونکہ سامنے رہنا تو قیام کی صورت ہے اور قیام تو اس کے نزدیک بوریت تھا ۔ رہا دیکھنے کا سوال تو اگر آپ کے سر پر ہیلمٹ سوار ہو منہ پر پلاسٹک کا چھجہ چڑھا ہو جسم پر چمڑے کا جیکٹ ہو ہاتھوں پر دستانے ہوں تو دیکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔

ذولف کی زوں دیکھ کر بش کے دل میں صرف ایک آرزو پیدا ہوتی تھی کہ اس لال لکیر اور سلیٹی دھبّے کے ساتھ اس کے اپنے بال بھی ہوا میں لہرائیں وہ بھی اس متحرک تصویر کا ایک حصہ بن جائے اگر وہ پُرانے دور کی یا پابند گھرانے کی لڑکی ہوتی تو بیٹھ کر آہیں بھرتی یا دل بہلانے کے لئے فلمی گانے سُنتی لیکن بش تو جدید گھرانے کی پیداوار تھی ۔ گھر والے لڑکی پر نظر رکھنے کے قابل نہ تھے اڑوس پڑوس والے ذاتی معاملے کو کچھ زیادہ ہی ذاتی سمجھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے ۔

ان حالات میں بات چُھپانے کی کیا ضرورت تھی اس لئے بش نے شام کے پانچ بجے کی اس لذت میں چھوٹی بہن کو بھی شریک کر لیا ۔ چھوٹی بہن سے بات ممّی تک پہنچی ۔ ممّی نے بھلا کیا کہنا تھا مُسکرا کر چپ ہو رہی ۔

لہٰذا ایک شام بش ٹیرس کی بجائے گلی میں جا کھڑی ہوئی ۔ ذولف آیا تو اس نے انگڑائی کی صورت دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے ۔ رُکنے کا اشارہ کیا ۔

ذولف نے موٹر سائیکل روک لیا ۔

اے لفٹ پلیز وہ بولی ۔

او کے جمپ آن ۔

وہ اُچھل کر بیک سیٹ پر جا بیٹھی ۔ موٹر سائیکل چل پڑا ۔ اگر وہ روایتی ماحول میں پلے ہوتے اور وہ کسی نوجوان کے موٹر سائیکل کی بیک سیٹ پر بیٹھ

جاتی تو مشکل پڑ جاتی ۔ نوجوان کے لئے سورج سوا نیزے پر آٹکتا ۔ پھر پسینہ ہی پسینہ کنفیوژن ہی کنفیوژن ، ذہن میں بریک اور ایکسلریٹر گڈمڈ ہو جاتے ۔ لیکن ذولف کو کچھ بھی نہ ہوا ۔ جیسے پیچھے بُھس کی بوری دھری ہو ۔

البتہ اس نے سپیڈ سلو کردی کہ بوری گر نہ جائے ۔

سلو کیوں ہو گئے ، وہ چلائی ۔

سڑک بمپی ہے وہ بولا ۔

پڑی ہو ۔

گر جائے گی ۔

سوواٹ

ذولف کو بات سمجھ میں آگئی کہ اُسے کہیں جانا نہیں پہنچنا نہیں ۔۔۔ صرف جاے رائیڈ ہے ۔ ذولف نے اکسلریٹر کھول دیا ۔ موٹر سائیکل ہوا میں تیرنے لگا ۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا ۔ ذولف آکر رُک جاتا ٹوٹ بجاتا بش دوڑ کر آتی اُچھل کر بیک سیٹ پر چڑھ جاتی ۔ ذولف ایکسلریٹر کھولتا کھولے جاتا اور موٹر سائیکل ہوا میں اڑنے جاتا ۔

ٹریفک پولیس ذولف سے واقف تھی ۔ جب ذولف گُزرتا تو چوک کا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت ۔

ابتدائی ایام میں جب وہ ذولف سے آشنا نہ تھے تو سپاہی لپک کر آگے بڑھا تھا ۔ سیٹی بجا کر اسے روکا تھا پھر تحکمانہ شان سے جیب سے کاپی پنسل نکالے تھے اور حسبِ دستور فرعونی لہجے میں پوچھا تھا کیا نام ہے تیرا ۔ باپ کا نام ۔ کیا کرتے ہیں وہ جواب سُن کر سپاہی کا کلف اُتر گیا تھا ۔ گردن جُھک گئی تھی ۔ اور کاپی پنسل دوبارہ جیب میں جا چُھپی تھی اس روز کے بعد وہ ذولف کو پہچانتے لگے تھے ۔ یوں کہ جب بھی وہ گُزرتا سپاہی منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ۔ ہم نہیں دیکھ رہے کی صورت ۔

چار ایک دن تو بش بیک سیٹ پر سٹریپ سے چمٹی رہی پھر جو ایک زور دار بمپ لگا تو اس نے چیخ مار کر اپنی باہیں ذولف کے گرد حمائل کر دیں ۔۔

ذولف کو پھر بھی کچھ نہ ہوا البتہ بش کو ہوا ۔۔۔ کچھ کچھ ۔۔ اور اس کی باہیں ذولف کا سہارا لینے کی عادی ہوگئیں ۔

پھر وہ باہیں گھسیٹ کر اُسے اپنے گھر میں لے گئی ۔ ممی ڈیڈی سے تعارف ہوا ۔ یوں دونوں کُنبے ایک دوسرے سے ملنے لگے ۔

جدید گھرانوں میں یہ عیب ہے کہ وہاں لوسٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پھلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں یہ عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو وہ چلتی نہیں ۔ ختم ہو جاتی ہے صرف سٹوری باقی رہ جاتی ہے اور یا وہ افئیر بن کر اپنی عظمت کھو دیتی ہے محبت میں انسان کے لئے محرومی لازم ہے محرومی شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے ۔ عشق انسان کو مادی دنیا کی گرفت سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اُڑتا ہے ۔

بش اور ذولف کی دُنیا میں پابندیاں نہیں تھیں رکاوٹوں کا وجود نہ تھا دونوں گھرانوں کے ہاں سٹیٹس بھی تھا اور کیریر کے مواقع بھی ۔ لہذا بش نے ممی کے ذریعے بات چلائی ذولف کے گھر والوں نے پیغام بھجوا دیا جو منظور کر لیا گیا اور وہ ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے ۔

منگنی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑا ۔ نہ خوشی کا احساس تھا نہ پالینے کا ۔ پالینے کی خوشی تو جبھی ہوتی ہے جب پالینے میں دشواریاں حائل ہوں ، یہ عشق بھی عجیب عشق تھا ۔ ذولف حرکت کا دیوانہ تھا اور بش متحرک کی مدّاح تھی ۔ وہ تماشہ تھا یہ تماشائی تھی ۔ تماشے کو تماشائی سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔

اگر ان تینوں کرداروں تک محدود رہتی تو یہ کہانی شادی پر شہنائی کے ساتھ ختم ہو جاتی ۔ اور اس کے بعد دونوں روٹین زندگی بسر کرنے لگتے ۔ اور کہانی سُننے والے ناک چڑھا کر کہتے یہ کہانی تو بالکل سطحی ہے ۔ کھوکھلی بے لذت ، بے جان ۔ اس میں تو زندگی کا زیر و بم ہی نہیں ۔ صرف زیر ہی زیر ، بم کا نشان نہیں ملتا ۔

وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ چوتھے کردار نے غیر متوقع طور پر آ سر نکالا اور اسے کہانی بنا دیا ۔۔ !

ہوا یوں کہ ایک شام جب وہ گول چوک کے قریب پہنچے تو وہ رُک گیا ۔ بش

اُتر گئی ذولف نے موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر کھڑا کر دیا ۔ اور پھر گول چوک سے ملحقہ پارک کی طرف چل پڑا بش حیران تھی کہ بات کیا ہے ۔

دفعتاً ذولف بولا "بش وی آر ڈوئنگ اِٹ"۔

"ڈوئنگ واٹ" وہ چلّائی ۔

کراچی گلگت نان سٹاپ ریس اس نے جواب دیا ۔

جب بش کو بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے اس کے بدن پر چیونٹے دوڑنے لگے ۔

کیا میں بھی ساتھ ہوں گی ۔ بش نے پوچھا

سیکنڈ مین کے بغیر یہ ریس ہو ہی نہیں سکتی ۔

بش کی باچھیں کِھل گئیں ۔

تمہیں پریکٹس کرنی پڑے گی ۔

پریکٹس ۔۔ کیسی پریکٹس ۔

سیکنڈ مین بننے کی پریکٹس ۔۔ موٹر سائیکل کی پوری مکینکی سیکھنی پڑے گی ۔ پہیہ بدلنا پنکچر لگانا ، چلتے چلتے تیل بھرنا ۔ الیکٹرک وائرنگ کو سمجھنا ، پلگ صاف کرنا بدلنا سیکنڈ مین کا کام بہت رف ہوتا ہے ۔

بش تن کر کھڑی ہو گئی بولی "آئی ول"

"شور" اس نے پوچھا ۔

"شور ایز دی سن شائینز ۔

"اٹ از اے چیلنج"۔

"آئی ٹیک اٹ" ۔ وہ دانت بھینچ کر بولی ۔

یہ سلک سٹف نہیں چلے گا ۔ ذولف نے اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا "اے ورک مین کٹ ۔ سپکس ہیلمٹ گلوز"۔

سبھی کچھ ۔

اوکے ۔

ٹھیک وہ اُٹھ کھڑا ہوا کل سے ٹریننگ شروع ۔

ابھی وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تھے کہ گول چوک سے ایک شور سُنائی

دیا ۔

ایک ٹرک راہگیر کو کُچل کر بھاگا آرہا تھا چوک کا سپاہی روکنے کے لئے سیٹیاں مار رہا تھا آس پاس کے لوگ چلا رہے تھے ۔

روکو، روکو ، پکڑو ۔

یہ منظر دیکھ کر ذولف پر وحشت سوار ہوگئی ۔ ایک ہی جست میں وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا اور ٹرک کے پیچھے ہوا ہوگیا ۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان ریس ہوتی رہی لیکن ذولف بجلی کی طرح آگے نکل گیا اور ٹرک کا رستہ روک کر کھڑا ہوگیا ۔ پھر ایک دھماکہ ہوا اور ٹرک درخت سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا نچان میں جا گرا ۔ بش نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔

ذولف کو اُٹھا کر ہسپتال لے گئے ۔ دو دن اُمید و بیم کا آرا چلتا رہا ۔ آخر اُمید غالب آئی ۔ ذولف بچ گیا لیکن اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں ۔

اس پر چند ایک روز تو بش یوں ادھ موئی پڑی رہی جیسے اس کی دنیا ہی لُٹ گئی ہو ۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اندر کا سوواٹ بیدار ہوا ۔۔۔ !

سہیلیوں نے اسے سمجھایا ۔

ایک بولی زوں ۔۔ سے لگن لگاؤ گی تو زناٹا تو ہوگا ۔

دوسری بولی ، مری کیوں جاتی ہے ۔ زوں تو ختم نہیں ہوا ۔۔ سڑک پر بڑا بڑا زوں ۔۔ پڑا ہے ابھی ۔

تیسری نے کہا ۔۔ منگیتر کا غم کھاتی ہے کیا ۔ منگنی کو بھول جا ۔ تیرے گھر والے اب کوئی اور منگیتر ڈھونڈیں گے ۔

چوتھی بولی ۔۔ لفٹ کا کیا ہے جس سے مرضی ہے مانگ لے ، جس سے مانگے گی وہ پھولے نہیں سمائے گا ۔

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی دو مہینے گزر گئے ۔ اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر ممی ڈیڈی گھبرا گئے ایک روز ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو ممی نے اسے آواز دی ۔۔ بش ذرا اِدھر آنا ۔

جب ممی کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے پائپ پی رہے

ہیں ۔ بش ممی نے کہا ۔۔۔ تو کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے ؟

میں نہیں سمجھی ممی ۔ وہ بولی ۔

بھئی ہسپتال کی فضا بڑی ڈپریسنگ ہوتی ہے ۔ ذہن پر بُرا اثر کرتی ہے ۔ ڈیڈی نے کہا ۔

اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دفعہ ہو آیا کر ۔ ممی بولی ۔

بش ۔۔ ڈیڈی نے کہا ۔ اب اس اٹیچمنٹ کو ختم کر دینا چاہئیے ۔ تو ایک سمجھدار لڑکی ہے ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہو سکتی ۔

وہ تو اب ، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ممی بولی ۔

ہاں فارگٹ اٹ ۔۔۔ ڈیڈی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا ۔

تو کیا کہتی ہے بش ۔

ٹھیک ہے وہ بولی ۔۔ ساری عمر میں وہیل چئیر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی ۔ بش کا حلق بند ہوگیا ۔ آنکھوں میں آنسو آگئے ۔

سمجھدار لڑکی ہے ۔ ڈیڈی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا ۔

ڈیڈی آج تو مجھے جانا ہی ہو گا ۔ البتہ کل ۔ بش رُک گئی ۔

ضرور ضرور ۔ ڈیڈی نے جواب دیا ۔

بلکہ اچھا ہے ۔ ممی بولی ، آج خدا حافظ کر آؤ ۔

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ برآمدے کے سامنے پلاٹ میں وہ وہیل چئیر پر بیٹھا تھا ۔

ہیلو، وہ بولی ۔

ذولف چونکا اس نے نگاہ اُٹھائی ۔۔۔ اوہ بش

آج اکیلے بیٹھے ہو ۔

ہوں ۔

گھر والے نہیں آئے ۔

کوئی انگیجمنٹ ہو گی ۔۔۔ صرف تم ہی روزانہ آتی ہو ۔

اچھا اس نے حیرت سے کہا ۔

کل سے شاید تم بھی نہ آؤ ۔۔۔ وہ بولا ۔

کیوں ۔

کل میں گھر جا رہا ہوں ۔

کیا واقعی

ہاں بیساکھیاں آگئی ہیں

کہاں ہیں

اندر پڑی ہیں

ہوں ۔۔۔ وہ چپ ہوگئی ۔ دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے ۔

ذولف بش بولی ۔۔ آرٹیفیشل لمبز نہیں لگتے کیا۔

لگتے ہیں ۔ اس نے جواب دیا ۔ صرف دکھنے دکھانے کے لئے لگتے ہیں ۔ ویسے نہیں ۔

اوہ ۔۔ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی ۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی ۔ ٹانگیں تو ٹھیک ہو گئی نا ۔

ہاں ٹانگیں تو ٹھیک ہیں لیکن ۔۔۔

لیکن کیا ۔ اس نے پوچھا ۔

دی لگز آر آل رائٹ ۔ وہ بولا ۔ بٹ ایوری تھنگ اباؤٹ دم شل نیور بی آل رائٹ وہ پھر خاموش ہو گئی ۔ دل پر بوجھ پڑ گیا ۔ اس نے خود کو جھنجھوڑا ۔ مجھے اب جانا چاہئیے ۔

ہاں وہ بولا ۔۔ تمہیں جانا ہی پڑے گا ۔ کب تک اپاہج کے ساتھ بندھی رہوگی ۔

بش کو ایک چکر سا آیا ۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا ۔ خدا حافظ وہ بولی ۔

راستے میں وہ سوچتی رہی ۔ سچ کہتا تھا اپاہج سے کون بندھا رہے ۔ ڈیڈی بھی ٹھیک کہتے ہیں اس دلدل سے بچ نکلنا لازم ہے ۔

میری سہیلیاں نوم ، بیدہ ، پوپو سب میرا مذاق اُڑاتی ہیں ۔

چلو اچھا ہوا ۔۔ آج خدا حافظ کہہ دیا ۔

جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی ۔
گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا ۔
اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی لیکن پتہ نہیں آدھی رات کو کیا ہوا گویا کسی نے اسے جگادیا ۔ وہ اُٹھ بیٹھی ۔ کمرہ کسی موجودگی سے بھرا ہوا تھا ۔ اور وہ موجودگی گویا بہت ہی مانوس موجودگی تھی ۔
اس کے ذہن میں ایک احساس اُبھرا ۔۔۔ یوں جیسے ہفتوں بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں اُبھر آتی ہے ۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولف کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہو ۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہا تھا ۔ پھر وہ گھاؤں گھاؤں مدہم پڑتی گئی ۔ حتٰی کہ خاموشی چھا گئی ۔ وہ دونوں ہوا میں تیرتے ہوئے جارہے تھے ۔ موٹر سائیکل کا نشان باقی نہ رہا تھا ۔
پتہ نہیں کیا ہوا ۔ ذولف کی ذات اُبھری اُبھرتی چلی گئی ۔۔ سارا کمرہ ذولف کے پسینے کی خوشبو سے بھر گیا ۔
بش گھبرا گئی ۔ اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی ۔ وہ موجودگی اس کے اندر سے یوں نکل رہی تھی جیسے اس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو ۔ جیسے سُنڈی تتلی بنی جا رہی ہو ۔ جیسے لڑکی عورت میں بدل رہی ہو ۔
بش پھیل رہی تھی ۔ بھاری درخت بنتی جا رہی تھی ۔ اس کے دل میں وسعتیں اُبھر رہی تھیں ۔ اتھاہ گہرائیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں جسم حسّیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا ۔۔۔ حسّیات میں رشتوں کے بندھن اُبھر رہے تھے ۔ اس کی باہیں ذولف کے گرد یوں پیوست ہوگئی تھیں جیسے بیل بوٹے کے ارد گرد بل کھا کر لپٹ جاتی ہے ذولف کا ہیلمٹ سر سے گر گیا تھا ۔ جیکٹ تار تار ہو گیا تھا ۔ آنکھوں پر چڑھے ہوئے پلاسٹک کے چھجے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے ۔ اس کی ذات ننگی ہوگئی تھی اور ذات کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اُٹھا تھا ۔
اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی بولی ڈیڈی میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں ذولف سے اپنی انگیجمنٹ نہیں توڑوں گی ۔
باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ۔
میں ذولف سے شادی کروں گی ۔ وہ بولی ۔

لیکن بیٹی باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔
"ہی نیڈز می ڈیڈ" ۔ وہ بولی۔
"بٹ ڈو یو نیڈ ہِم" ۔ باپ نے پوچھا ۔
اس نے جواب دیا ۔ "آئی ڈو آئی ایم ہز تھرو اینڈ تھرو اٹ از اے لینڈ آف نو ریٹرن"۔
ڈیڈی نے چونک کر بش کی طرف دیکھا ۔ اس کے سامنے بش نہیں بشرہ کھڑی تھی ۔

○

وہ

یہ کون آگھسا ہے میرے گھر میں ۔ بن بلائے بن پُوچھے ۔ بن بتائے ۔ کیوں ۔

یہ کیسی موجودگی ہے ۔ میرا سارا گھر اس سے بھرا ہوا ہے ۔ وہ ہر کمرے میں بیٹھا ہے ۔ سیڑھیوں میں صحن میں برآمدوں میں باورچی خانے میں ۔ ہر جگہ ۔ ہر وقت دن ہو یا رات صبح ہو یا شام ۔ میرا گھر مجھ سے اس قدر بھرا ہوا نہیں جس قدر اُس سے بھرا ہوا ہے ۔

کیا مصیبت ہے ۔ زندگی میں پہلی بار میں دوکیلا ہوا ہوں ۔۔۔ میں جو ازلی طور پر اکیلا تھا ۔

بچپن میں بھرے گھر میں اکیلا تھا ۔ چلا جاتا تو کسی کو پتہ نہ چلتا کہ چلا گیا ہوں ۔ آجاتا تو کوئی محسوس نہ کرتا کہ آگیا ہوں ۔

جوانی میں اپنا اکیلا پن دُور کرنے کے لئے میں نے ایک عورت سے محبت لگالی ۔ اپنا سبھی کچھ دے کر خود اُس کی دہلیز پر بیٹھ گیا ۔ لُٹ پُٹ گیا تو پتہ چلا کہ اکیلا پن اور بھی گہرا ہو گیا ہے جُرأت ہوتی تو دہلیز سے اُٹھ جاتا ۔ لیکن ایک بار بیٹھ کر اُٹھ جانا ۔ میری سرشت میں نہ تھا ۔ نہیں ہے ۔۔۔ لہٰذا اُٹھنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ اس لئے بیٹھا رہا بیٹھا رہا سولہ سال بیت گئے حتٰی کہ لُٹے پٹے اور اکیلے رہنے کی لت پڑ گئی ۔ پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آگئی ۔ میری ہوگئی اور میں اپنے گھر کی دہلیز پر آبیٹھا ۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی بولی "اب میں تیری ہوں"۔

"ہاں" ۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا ۔ کتنی خوشی کی بات ہے ۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی دیکھتی رہی ۔ میں خوشی کے نشے میں چور اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا ۔

"تُو مجھے دیکھ رہا ہے" وہ بولی۔

"اور میرا کام ہی کیا ہے"۔

"میں یہاں ہوں یہاں تیرے پاس"۔

"ہاں تُو میرے سامنے ہے"۔

"لیکن تُو تو اب بھی دہلیز پر بیٹھا ہے"۔

"اور کہاں بیٹھوں؟"

"قریب آجا"

"قریب آگیا تو تُو مجھے نظر کیسے آئے گی"۔

"پتہ ہے تیری جگہ کونسی ہے"۔ اُس نے اپنی گود پھیلا دی۔

"وہی جہاں میں بیٹھا ہوں"۔ میں نے سر اُٹھائے بغیر کہا۔

حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بند ہوتی گئیں۔ بند ہوتی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں ـــ اور میں پھر سے اکیلا رہ گیا۔

پھر لوگوں نے "زبردستی" پکڑ کر میری شادی کردی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بیوی کو دیکھا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بھی مجھ ایسی ہے۔ لُٹی پٹی اکیلی۔ اُس نے سات سال اپنے پہلے دولہا کی انتظار میں دہلیز پر بیٹھ کر گزار دیئے تھے۔

ہمارا آپس میں اَن کہا سمجھوتہ ہوگیا۔ اور ہم دونوں دو کیلے میں اکیلے اکیلے رہنے لگے۔

ہاں میں تو ازلی طور پر اکیلا ہوں۔ اب یہ کون آگیا ہے میرے گھر میں کیوں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ یہاں آخر ـــ وجہ ـــ مطلب

ویسے دیکھنے میں آج بھی میں اکیلا دکھتا ہوں ـــ کسی کو خبر نہیں کہ گھر میں کوئی آگیا ہے۔ میری بیوی کو بھی پتہ نہیں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں رہا ـــ وہ آگیا ہے۔ اور میرا گھر اس سے یوں بھر گیا ہے جیسے ماں کا سارا وجود ہونے والے بچے سے بھر جاتا ہے۔

صاحبو مجھے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہے۔ کیوں۔

کس لئے اُس نے میرے اکیلے پن کی مسند کو یوں تار تار کر دیا ہے ۔ مجھے علم نہیں ۔ صرف دُکھ ہے ۔ اپنے اکیلے پن کو کھو دینے کا دُکھ ۔

زندگی میں مَیں نے ایک ہی امتیاز حاصل کیا تھا ۔

زندگی کرنے کا ایک ہی طریقہ سیکھا تھا ۔

اکیلے پن نے مجھے بڑا اعزاز بخشا تھا ، مقام بخشا تھا ۔

مجھے بت بنا دیا تھا ۔۔۔ بہت بڑا بُت ۔

صاحبو ۔ اکیلا پن بہت بڑا بت گر ہے ۔

زندگی بھر میں بُت بنا رہا ۔

بُت کا مطالبہ ہے کہ کوئی پُجاری ہو ۔ نہ ملے تو وہ خود اپنا پُجاری بن جاتا ہے ۔ زندگی بھر میں خود کی پُوجا کرتا رہا ۔ اس لئے نہیں کہ جُھکنا سیکھوں ۔ بلکہ اس لئے کہ بُت کی شان قائم رہے لیکن جب سے وہ آیا ہے ۔ بُت تڑخ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے ریزہ ریزہ ہوا جا رہا ہے ۔ میری ساری زندگی کی کمائی میری آنکھوں کے سامنے لُٹی جارہی ہے ۔

سمجھ میں نہیں آرہا کہ بے نام موجودگی نے اتنے بڑے بت کو کیسے توڑ دیا ۔ اس کے ہاتھوں میں تیشہ نہیں کلہاڑا نہیں کدال نہیں ۔ کچھ بھی تو نہیں اس کے انداز میں تشدّد نہیں طیش نہیں غصہ نہیں پھر یہ کیسے ہوا ۔

بُتوں کو توڑنے کے لئے تو غزنوی پیدا ہوتے ہیں ۔ حملے کئے جاتے ہیں ۔ ایک دو نہیں ۔ سولہ سترہ ۔ فوجیں چڑھائی کرتی ہیں ۔ تہس نہس کرتی ہیں یوں تو کبھی نہیں ہوتا کہ ایک بے نام آن جانا وہ چُپکے سے آئے دھرنا مار کر بیٹھ جائے اور اس کی موجودگی سے بُت خود بخود تڑخنے لگے ۔

کبھی کبھی مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی تو نہیں جس کا نام لے لے کر بچپنے میں بڑے بوڑھے مجھے ڈرایا کرتے تھے ۔ جس سے ڈر ڈر کر میں جوان ہوا تھا ۔ پھر جوانی میں دانشوروں سے ملا تو ہم مل کر اس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ۔ دراصل بچپن میں اس سے ڈر ڈر کر اب ہم اس سے انتقام لے رہے تھے ۔

پھر اُدھیڑ عمر میں مَیں اس سے بے نیاز ہوگیا تھا ۔۔۔ ہے تو پڑا ہو ۔۔۔ نہیں ہے تو نہ سہی کیا فرق پڑتا ہے لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ تو بہت

ڈراؤنا تھا ۔ اُس نے آگ کی ایک بہت بڑی بھٹی جلا رکھی تھی ہاتھ میں سوٹنا تھا ۔ سوٹنا چلاتا ۔ لوگوں کو دھڑا دھڑا آگ میں ڈالتا جاتا ۔ بس یہی اس کا کام تھا ۔

پھر جوانی میں علم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت اُجاگر ہوئی ۔ عظمت ہی عظمت ، عظمت ہی عظمت ۔ ڈر اور خوف کی جگہ حیرت نے جنم لیا ۔ نہیں یہ وہ بھی نہیں ۔ یہ موجودگی نہ تو ڈراؤنی ہے نہ حیرت کا جذبہ طاری کرتی ہے ۔ یہ تو ایسے ہے جیسے لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی اِک فضا ہو ۔ یوں لگتا ہے جیسے ماں کی کوکھ نے پھیل کر میرے گھر کو سمیٹ لیا ہو ۔ ایک "نِگ" ہے جو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔ ایک عجیب سا سکوں ۔ لطافت کا ایک ٹھہراؤ ۔

مجھ پر خواہ مخواہ ایک احساس مسلط ہوا جا رہا ہے ۔ جیسے میں نے پا لیا ہے ۔ کیا پا لیا ہے ۔ اونہوں اس کا پتہ نہیں چلتا ۔ بس پالیا ہے ۔ جیسے سب کچھ پالیا ہے ۔ میں نے کبھی اس کی آرزو نہیں کی تھی ۔ اس کے لئے ڈھونڈ نہیں کی تھی ۔ اسے پانے کی آرزو نہ کی تھی ۔ کبھی اُسے چاہا نہ تھا کتنی عجیب بات ہے کہ ڈھونڈے بغیر پالو ۔ جانے بغیر جان لو ۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو میں ہکا بکا رہ گیا تھا ۔ ان دنوں میں سخت فکر مند تھا ۔ بے چین تھا ۔ میرے افسر نے مجھ پر دو جُھوٹے کیسز بنا رکھے تھے جو بڑی سنگین نوعیت کے تھے ۔ وہ اس دھوم دھڑکے سے بار بار ان کا ذکر کیا کرتا تھا کہ مجھے خود شک پڑنے لگا تھا کہ وہ مجھ پر الزام نہیں دھر رہا بلکہ سچ بول رہا ہے ۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا ۔ مجھ پر احساسِ جُرم چھائے جا رہا تھا ۔

اُس روز شام کا وقت تھا بڑی اُداس شام تھی وہ ۔ لُٹی پُٹی ۔ اس روز دفتر میں میری بہت تذلیل ہوئی تھی ۔ انکوائری کمیشن نے میرے بیان کا مضحکہ اُڑایا تھا۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے اُنہوں نے بھی میرے حق میں گواہی نہ دی تھی ۔

دُکھ فکر او اندیشوں کی بوجھل گٹھڑی کندھوں پر اُٹھائے میں گھر پہنچا ۔ پہنچتے ہی دھڑام سے کھاٹ پر گر پڑا ۔ وہاں پڑا رہا پڑا رہا ۔ پتہ نہیں کتنی دیر

تک پڑا رہا ۔۔۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے سر پر کوئی بوجھ نہ ہو ۔۔۔ ارے وہ گٹھڑی کیا ہوئی میں اُٹھ بیٹھا ۔

میرے گرد ایک عجیب سی فضا معلق تھی ۔ جیسے جیسے ایک لوری ہوا میں تیر رہی تھی ۔ جیسے کمرے میں ایک سمپتھی کنڈیشنر لگا ہو ۔ جیسے کمرے میں کوئی ہو ۔ لگن اور لگاؤ سے بھیگی ہوئی موجودگی ۔ یہ کون ہے ۔ میرے گھر میں کون گھس آیا ہے میں نے سارے گھر کا چکّر لگایا کہ شاید کوئی ہو ۔ کوئی بھی نہ تھا ۔ پھر بھی کوئی ضرور تھا ۔ اس بے نام موجودگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا ۔

باورچی خانے میں میری بیوی گھٹنوں میں سر دیئے پیاز چیر رہی تھی ۔ میں نے اسے دیکھا دیکھتا رہا وہ اکیلی بیٹھی تھی ۔۔ اکیلی ۔۔۔ لقادق تنہا ۔۔۔ اسے دیکھ کر مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی نہیں ہے ۔ کوئی بھی نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر کی موجودگی ایک کو متاثر کرے دوسرے کو خبر ہی نہ ہو ۔

سونے سے پہلے میں پڑھنے کا عادی ہوں ۔ اس لئے نہیں کہ مجھے پڑھنے سے دلچسپی ہے ۔ ایک تو اس لئے کہ کتاب سامنے ہو تو نیند آنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے اس لئے کہ تلخ حقائق سے بچنے کے لئے مطالعہ ایک نعمت ہے ۔

ان دنوں تو مطالعہ میرے لئے از بس ضروری تھا دفتری حقائق سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا ۔ پھر بھی مَیں زبردستی کتاب پڑھتا تھا ۔ بار بار دفتری حالات سامنے آکھڑے ہوتے ۔ مطالعے کا عمل رُک جاتا دل پر ایک ٹھیس سی لگتی پھر اندیشوں کی لہریں رینگنے لگتیں ۔ سُرخ چیونٹے میری طرف یورش کرتے پھر سارے جسم میں خوف کی دھنکی بجتی ۔

اُس روز پتہ نہیں کیا ہوا ۔ کتاب ہاتھ میں اُٹھائے میں بیٹھا رہا ۔ سوچتا رہا ۔ حالانکہ عام طور پر میں سوچنے سے گریز کرتا ہوں ۔ کیونکہ سوچ مجھے دِل خراش وسوسوں کی طرف بہا کر لے جاتی ہے ۔۔۔ پھر وہی ٹھیس ۔۔۔ وہی چیونٹے ۔۔۔ وہی دھنکی ۔ اس روز میں سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں کوئی بات نہ تھی جیسے ذہن کلفتوں رنجشوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو چکا ہو ۔ ماؤف ہو چکا ہو ۔

ذہن خیالات سے خالی تھا۔ کوئی تلخی نہ تھی ٹھیس نہ تھی چیونٹے نہ تھے دھنکی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں خلا میں لٹکا ہوا ہوں اور یہ خلا بے نام سکون سے بھرا ہوا ہے۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب کوئی خوف ہی نہ ہو تو فرار کیسا نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ ایسی خوشگوار فضا کو چھوڑ کر کون سوئے۔

اگلے روز جب نیند سے بیدار ہوا تو ۔۔۔ ارے میں چونکا ۔۔۔ عام طور سے جب میں جاگا کرتا ہوں تو یوں تھکا ٹوٹا ہارا ہوا اُٹھتا ہوں جیسے کوئی مار کھا کر اُٹھا ہو۔ اُس روز میری کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پھُول کمرے میں آگھسے ہوں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور سورج کھڑکی میں کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ ارے یہ کیا ۔۔۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا یہ کیسی صبح ہے۔ کیا میں، میں ہی ہوں یا کوئی اور ہے۔ ساتھ ہی مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کون ہے جو میری شخصیت کو بدل رہا ہے۔ کیوں۔

پھر کوئی اَن جانا ہاتھ بڑھا اور اُس نے مجھے تھپکنا شروع کر دیا۔ جیسے تھپک تھپک کر مجھے وسوسوں سے دُور لے جا رہا ہو۔ سارا کمرہ اس تھپک سے بھر گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ ہاتھ ماں کا ہاتھ ہو۔ وہ مجھے تھپک رہی ہے۔ سوجانے کے لئے نہیں بلکہ جینے کے لئے۔ سارا کمرہ جینے کی لذّت سے بھرا ہوا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔

پھر دفتر گیا وہاں بھی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ تذلیل و تضحیک کی باتیں یوں سُنائی دے رہی تھیں جیسے دور سے آرہی ہوں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ باتیں میرے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں تھیں۔ ذہن میں ایک اطمینان سا تھا۔ میری میز کے گرد ایک تبسم گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

آج بھی میرا سارا گھر اسی تبسم سے بھرا ہوا ہے۔ رات کو سوتا ہوں تو وہ میری چارپائی پر بیٹھا مجھے تھپک رہا ہوتا ہے۔ جاگتا ہوں تو وہ میرے سرہانے کھڑا مُسکرا رہا ہوتا ہے، کام کرتا ہوں تو وہ میرے پاس بیٹھا اپنی گڈول کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو وہ مجھے دروازے پر چھوڑنے آتا ہے۔ واپس آتا ہوں تو دہلیز پر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال

آتا ہے کہ اُس نے میری ذاتی زندگی کو کیوں تہس نہس کر رکھا ہے ۔ غصے میں میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں ۔ یہ سب کیا ہے تُم کون ہو ۔ کیوں ہو ۔ بولو ۔ جواب دو ۔

اس نے زبان سے مجھے کبھی جواب نہیں دیا ۔ وہ گونگا ہے ۔ اس کے وجود سے شعاعیں سی نکلتی ہیں ۔ ایک لطیف سی لرزش میرے بند بند سے ٹکراتی ہے ۔ جسم میں ایک ٹک ٹک بجنے لگتی ہے ۔ پھر احساسات کا ایک دھواں سا اُڑتا ہے میرے سوال کی ساری تلخی نچڑ جاتی ہے ۔ مٹھاس کی اِک پھوار پڑتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے میرے سوال کا جواب مل گیا ہو ۔

اُس نے کبھی میری مَیں ، میں ردو بدل کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ میری غلاظت پر کبھی ناک نہیں چڑھائی ۔ میری کج فہمیوں اور کج رویوں کا نوٹس نہیں لیا ۔ لیکن میری انا کے غلیظ گوشوں پر جب اس کی روپہلی روشنی پڑتی ہے میں ان گوشوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل کراہت سے بھر جاتا ہے ۔ سر احساس ندامت سے جُھک جاتا ہے ۔

پھر میری اَنا کا تڑخا ہوا بُت سر اُٹھاتا ہے نہیں نہیں میں ان گوشوں کو صاف نہیں کروں گا نہیں کروں گا ۔ میں جیسا بھی ہوں ۔ ہوں ۔ مجھے خود پر کوئی ندامت نہیں ہے ۔ میں ایسے ہی جینا چاہتا ہوں ۔ مجھے اپنی مَیں سے پیار ہے میں اپنی میں کو نہیں بدلوں گا ۔ کسی کو مجھے بدلنے کا حق نہیں ۔

ٹھیک ہے ٹھیک ہے فضا سے ایک سرگوشی اُبھرتی ہے ۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں ۔۔اردگرد کی فضا مجھے تھپکتی ہے ۔

تُو کیوں میری ہر بات مانے جا رہا ہے ۔ کیوں ۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ ضرور اس میں کوئی چالاکی ہے ۔ جواب میں سارا کمرہ ایک بے نام لطیف تبسّم سے بھر جاتا ہے ۔ بے شک اس نے مجھے اپنا رکھا ہے لیکن میں ۔ میں اسے کبھی نہیں اپناؤں گا ۔ کیوں اپناؤں ۔ کیوں کہ مجھے پتہ ہے وہ اپنی رواداری سے ۔ ہمدردی سے محبت سے میری مَیں کو توڑ دے گا ۔ پھر میرے پلے کیا رہ جائے گا ۔

آج تک اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا ۔ صرف ایک مطالبہ ۔ وہ

بھی مطالبہ نہیں چونکہ اس میں طلب نہیں منّت ہی منّت ہے ۔

اُس کا کہنا ہے اپنے دُکھوں وسوسوں پریشانیوں غموں اور تکلیفوں کی گٹھڑی خود نہ اُٹھا ۔ مجھے سونپ دے ۔ مجھ پر بھروسہ کر ۔ خود کو میرے بھروسے پر چھوڑ دے ۔

جب میں اپنے فکروں کی گٹھڑی سر پر اُٹھائے گھر پہنچتا ہوں تو گھر کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے ۔ میرے گرد چاروں طرف سے منّت بھرے ہاتھ لپکتے ہیں ۔ یہ گٹھڑی مجھ پر لاد دے مجھے دے دے ۔ خود نہ اُٹھا ۔ فضا سر گوشیوں سے بھر جاتی ہے ۔ منتوں کا اِک طوفان اُمڈ آتا ہے ۔ مجھ پر بھروسہ کر ۔

نہیں نہیں ۔ گٹھڑی مَیں اُس کے حوالے کیوں کروں ۔ یہ میری گٹھڑی ہے ۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہے ۔ مجھے اپنی مشکلات سے عشق ہے اپنی فکرمندیوں سے محبّت ہے ۔ میں بڑی محنت سے اپنے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہوں ۔ بڑے شوق سے اپنے راستوں پر خار دار پودے اُگاتا ہوں تاکہ اپنی آبلہ پائی پر بیٹھ کر روسکوں یہی میری سب سے بڑی عشرت ہے ۔

یہی میری سب سے بڑی لذّت ہے ۔۔۔ مَیں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی کیسے اُسے تھما دوں ۔

مَیں تو شک کا دیوانہ ہوں ۔
مَیں کس طرح اس پر بھروسہ کر لوں ۔
چاروں طرف سے میری جانب ہاتھ لپکتے ہیں ۔
منتوں سے سارا کمرہ بھر جاتا ہے ۔
کب سے یہی ہوتا آرہا ہے ۔
وہ منّتیں کر کر نہیں ہارا ۔
مَیں دھمکیاں دے دے کر ہارتا جا رہا ہوں ۔

مجھے ڈر ہے کہ مَیں اپنے دُکھوں کی گٹھڑی اُس کے حوالے نہ کر دوں ۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اُس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤں ۔

صاحبو کیا وہ کبھی مجھ سے مایوس نہ ہو گا ۔ ....○............

اَن پورنی

پتہ نہیں :

یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی ۔ لیکن کایا پلٹ جب بھی ہوتی ہے ایسے ہی ہوتی ہے کچھ پتہ نہیں دیتی کہ کیوں ہوئی کب ہوئی ۔ اس گوری کی طرح دبے پاؤں آتی ہے جو پائل کی جھنکار کو بیرن سمجھتی ہو ۔

اس کایا پلٹ کے تحت آنند کمار نہ کمار رہا نہ آنند رہا ۔ پہلے وہ کمار بھی تھا آنند بھی ۔ اس لئے کہ ریاست اتگاہ کے مہاراج کا پُتر تھا ۔ آنند اس لئے کہ کوئی چاہ نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو ۔ اِدھر چاہ کی اُدھر پوری ہوئی ۔ یہی آنند ہے نا کہ ہر آرزو پوری ہو جائے ۔ نہ انتظار نہ محرومی نہ بے چینی ۔ آنند کو پتہ ہی نہ تھا کہ ایسی آرزو بھی ہو سکتی ہے جو پوری نہ ہو ۔

زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہوئی تھی جس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی یہ آرزو کوئی ایسی مشکل بھی نہ تھی پتلی ، دبلی ، سوئی سوئی کھوئی کھوئی ، ڈولتی چھوئی موئی خود سے دور لے جانے والی ایک گائیک تھی ۔ اَن پورنی ۔

ان پورنی جب سے راجدھانی میں آئی تھی اک دھوم مچی ہوئی تھی اس کا چرچا نہ تو رنگ روپ کی وجہ سے تھا نہ گائیکی کی وجہ سے ۔ رنگ روپ میں کئی گانے والیاں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں ۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں ۔ الٹا وہ تو سنانے کے لئے گاتی ہی نہ تھی ۔ نرت لبھانے کے لئے نہ کرتی ۔ اپنے قریب لانے کے لئے نہیں ۔ الٹا دور لے جاتی ۔ گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی ۔ جسے خود کی سدھ بدھ نہ رہے وہ دُوجے کی سُدھ بُدھ کیا مارے گی ۔ ان سب باتوں کے باوجود اَن پُورنی کی دھوم مچی تھی ۔

شاید بھید یہ تھا کہ ان پورنی میں لوبھ نہ تھا ۔ نہ کمانے کا نہ خود کو اچھالنے کا ۔ نہ آپ چھلکتی تھی نہ دوجوں پر چھینٹے اڑاتی ۔ جلتی ضرور تھی پر مدھم مدھم ۔ نما نما گاتی ۔ نما نما جیتی ۔ جیون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نی نیاں بھڑک کر جلنے والوں کو ماند کر دیتی ہیں ۔ تشنگی کا ایسا دریا بہا دیتی ہیں کہ بڑے بڑے تیراک ڈوب جاتے ہیں ۔ آنند بہت بڑا تیراک تھا ۔ ڈوبنا نہیں جانتا تھا ۔ جسے دھن دولت اور مرتبہ مان کے مشکیزے حاصل ہوں وہ بھلا کیوں ڈوبے ۔

آنند نے ان پورنی کی دھوم سنی تو شوق چرایا کہ چلو چل کر دیکھیں جس کی اتنی دھوم ہے وہ ہے کیسی ۔ یار دوستوں کی سنگت میں وہ چوبارے میں پہنچا تو اسے دیکھ کر ان پورنی کی نائیکہ کنول نینی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ بکی بکی رہ گئی ہوش آیا تو سواگت میں بچھ بچھ گئی ۔ اتنی آؤ بھگت کی کہ وہ اُمید بس رچا کے بیٹھ گیا ۔ پھر ان پورنی آئی ۔ ہاتھ جوڑ نمسکار کیا ۔ مُسکائی لجیائی اور بیٹھ گئی ۔ پھر وہ سازوں کی دُھن میں کھو گئی ۔ جے جے وتنی کی دُھن تھی ۔ پیاں پڑوں کی پلنگاہ نہ چڑھوں گی ۔

ایک وہ جسم کی ادھ کلی تھی دوجے آنکھ ادھ کھلی تھی ۔ دیکھنے والی نہیں دکھنے والی ۔ وہ بھی آدھی اوٹ میں ۔ یوں جان لو کہ سامنے ایک ٹمٹمانے والا دیا جل رہا تھا ۔

ان پورنی اس کے پاس بیٹھی تھی ۔ پر پاس نہ تھی آدھی نہ جانے کہاں ۔ گانے میں اتنا گداز جیسے واقعی پیاں پڑی ہو ۔ قربت میں اتنی دوری جیسے پلنگاہ چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو ۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ۔ پر ایسا ہوتا ہے جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں ۔ وہ صرف جسم کا جھنجھنا بجا دیتی ہیں جو پاس ہو کر بھی آدھی نہ جانے کہاں ہوتی ہیں ۔ وہ وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیتی ہیں ۔ ان پورنی نے آنند کے وجود کی سُرتیاں چھیڑ دیں ۔ ایک انجانا نغمہ ابھرا جس سے وہ واقف نہ تھا ۔ کیسے واقف ہوتا ۔ وہ تو ایسیوں کا شیدائی تھا جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں وہ سمجھتا تھا پالینا ہی دولت ہے ۔ نہ پانے کی عظمت سے واقف نہ تھا ۔

اس رات آنند راج بھون واپس پہنچا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ ان جانے میں ان پورنی کو ساتھ لے آیا تھا۔ خود پر بڑا برہم تھا۔ یہ مجھے کیا ہوا بکھرا بکھرا کیوں ہوا۔ اس نے وہ رات ٹہل ٹہل کر کاٹی۔

پھر کئی ایک راتیں ٹہل ٹہل کر کٹیں۔ پہلے خود سے لڑتا جھگڑتا رہا۔ نہیں نہیں کوئی بات ہے کہ چوبارے بیٹھی دو ٹکے کی چھوکری راج کمار کو التھ پلتھ کر رکھدے۔ لیکن خود سے کوئی کب تک لڑے گا۔ آخر ایک رات اپنے خاص نوکر سیوک ناتھ کو بلایا۔ سیوک ناتھ جا۔ ابھی جا گاڑی جوت کر ساتھ لے جا۔ موتی بازار سے ورے ورے گاڑی کھڑی کر دیجیو۔ پیدل ان پورنی کے چوبارے میں جائیو۔ نائیکہ کنول نینی سے کہئیو راج کمار ان پورنی کی راہ دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ اور دیکھئیو گاڑی محل کے صدر دروازے پر نہ آئے۔ بات نہ نکلے کنول نینی کو پتہ چلا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگی بھاگی ان پورنی کے پاس گئی۔ دھن بھاگ پُتری جو تو آج کی رات جاگی جاگی کاٹے سوئی سوئی نہ رہے تو کیا پتہ کل رانی بن جائے۔ بیچاری کنول نینی کو کیا پتہ تھا کہ جاگی نے نہیں ادھ سوئی نے جوت جگائی ہے جوانی میں کنول نینی خود کٹورہ سی کھلی آنکھ والی تھی۔ مدھ بھری ادھ کھلی کے چمتکار سے واقف نہ تھی۔

ان پورنی راج بھون میں یوں داخل ہوئی جیسے سپنا دیکھ رہی ہو سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی۔ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ اس نے ارد گرد کی جانب نہ دیکھا۔ محل کی سج دھج پر دھیان نہ دیا۔ کمار کی آنکھوں میں کھبنے کے بجائے اپنی آنکھیں چُرائے رکھیں۔ ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ کمار بولا آؤ ان پورنی بیٹھو۔ یہ سن کر وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ کمار بھی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

کمار بولا ان پورنی تُو نیچے کیوں بیٹھ گئی۔

بولی مہاراج جہاں میری جگہ ہے وہیں بیٹھتی نا۔ آپ کے چرنوں میں۔

ہم نے تجھے پلنگاہ پر بیٹھنے کو بلایا ہے۔

بڑی کر پا ہے مہاراج پر میں اس جوگی نہیں۔

جوگی نہیں کہ پلنگاہ چڑھنے کو ایمان جانتی ہے۔ کمار نے طعنہ دیا۔

نہ مہاراج وہ بولی جدمان ہی نہیں تو ایمان کیسے ہوگا۔ پلنگاہ چڑھنا تو ویشیا

کا دھندہ ہے مہاراج ۔

دھندا ہے تو گھبراہٹ کیوں ۔

اس دھندے جوگی نہیں مہاراج ۔

کچھ کمی ہے کیا ۔

پتہ نہیں مہاراج بت چڑھتا ہے ۔ چت نہیں چڑھتا ۔

کمار یہ سن کر ٹھٹھکا پھر بولا چت کہیں لگا ہے کیا ۔

نہ مہاراج

یہ کیسے ہو سکتا ہے ان پورنی

پتہ نہیں مہاراج کہ ایسے کیوں ہے ۔ پر ایسے ہی ہے ۔ میں نام کی ان پورنی نہیں جیو کی بھی ان پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن نہیں ہوں ۔

کیا مطلب آنند نے پوچھا ۔

ادھوری ہوں مہاراج ، آدھی ہوں آدھی نہیں ہوں ۔

میں نہیں سمجھا وہ گنگنایا ۔

میں آپ نہیں سمجھی مہاراج آپ کو کیسے سمجھا دوں ۔

وہ چپ ہو گیا ۔

یوں سمجھ لیجئے مہاراج وہ گنگنائی کہ چھٹی کے چاند اسمان ہوں آدھی ادھر ہوں آدھی پتہ نہیں کدھر ہوں ۔ پلنگاہ پر وہ براجمان ہوتی ہیں مہاراج جو پورن ماشی کے چندا کی طرح پورن ہوتی ہیں ۔ ان پورنی بیچاری پلنگاہ پر کیا چڑھے گی ۔ چڑھی نہ چڑھی برابر ۔ وہ چپ ہو گئی ۔ سیس نوائے نین جھکائے بیٹھ رہی ۔

اس کی باتیں کمار کے ہردے پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ گئیں ۔ دل میں دھنس گئیں ۔ اتنا پسیجا کہ جواب دینا بھول گیا ۔ پتہ نہیں کس بات پر ۔ لاج پر جو اَن پورنی کے مکھ پر گھٹا بن کر چھائی تھی بھولپن پر یا سچ کی باس پر جو اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں میں یوں رچی مچی تھی جیسے پیاز میں آنسو رچے ہوتے ہیں ۔

آنند کو چپ لگ جائے تو اتنی دور لے جاتی ہے کہ واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ پھر پورن بندہ بھی ان پورن ہو جاتا ہے ۔

کمار اور ان پورنی دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ بیٹھے رہے ۔ سیوک ناتھ نے کئی بار باہر سے جھانکا ۔ بیچارہ حیران ۔ اندر دو بت بیٹھے تھے ۔ ایک دوجے کے پاس ۔ ایک دوجے سے دور ۔ بہت دور جیسے ایک دوجے کی خبر نہ ہو ۔

سیوک ناتھ سمجھتا تھا کہ راج کمار جو کئی دنوں سے کھویا کھویا نظر آرہا تھا ۔ ان پورنی کے آنے پر پورا ہو جائے گا اسے اپنا کھویا آدھا پھر سے مل جائے گا ۔

پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا ۔ راج کمار پر بے چینی کے بادل چھائے تھے ۔ پھر کوئی چتر نینی آئی پلنگاہ چڑھی ۔ پھلجھڑیاں چلیں ہوائیاں چھوٹیں رنگدار چکر گھومے جھولے پھر سارا کمرہ جگ مگ جگ مگ ہو گیا تھا ۔ پر آج یہ کیا ہو رہا ہے ۔ دونوں ہی بت بیٹھے ہیں ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ جد توڑی پجاری نہ ہو بت بت کیسے بنے ۔ پھر یہ دو بت کیسے بن گئے ۔ بھگوان تیری لیلا تو ہی جانے ۔

جب آنند کمار واپس اپنے آپ میں آیا تو وہ نہ رہا تھا جو چپ ساگر میں ڈوبنے سے پہلے تھا اور اس کی نظر میں ان پورنی ، وہ ان پورنی نہ رہی تھی جو پلنگاہ چڑھانے کو بلائی گئی تھی ۔ ان پورنی آنند بولا ۔ سہمی سہمی کیوں بیٹھی ہے ۔ چنتا نہ کر جو تو چاہے گی وہی ہو گا ۔

ان پورنی چاہے ادھوری تھی پر استری تھی ۔ اس نے دیکھا کہ مانگ اتر گئی ہے نظر ڈھل گئی ہے ۔ آواز نچلے سروں پر گر گئی ہے ۔ لے بلمپت ہو گئی ہے ۔ سُر میں کامنا کی جگہ براہ کی مینڈھ لگ گئی ہے ۔

ان پورنی وہ بولا جو میں تجھے اپنا بنانا چاہوں تو ۔ ۔ ۔

مہاراج میں ودھوا ہوں ۔

ودھوا ۔ وہ چونکا ۔

ویاہ ہوا تھا ۔ مہاراج وہ بولی ۔ پھیرے ہوئے تھے خوشی میں ٹھاہ ٹھاہ بندوقیں چلیں ۔ اک گولی چوک کر پران پتی کو لگی ۔ بھاگیہ کا لکھا پورا ہوا ۔ میں ان پورن رہ گئی ۔

اوہ ۔۔۔ کمار کو ٹھیس لگی ۔ پھر ۔۔۔ اس نے پوچھا ۔ اگرچہ اس کے حلق میں آواز نہ رہی تھی ۔ پھر ۔۔۔ کلموہی بنی ۔ ابھاگن بنی ۔ نحس گنی گئی ۔ اتنی تندا ہوئی کہ سہار نہ سکی ۔ گھر چھوڑ کر چلی آئی ۔

کمار کو پھر چپ لگ گئی ۔ پھر دو بت بن گئے ۔ رات بیت گئی ۔ بھور سمے ہوگیا تو آنند جاگا ۔ اسے جاگا دیکھ کر وہ بولی مہاراج بھور سمے ہوگیا ہے ۔ لوگ جاگن لگے ۔

وہ اٹھ بیٹھا ۔ ہاں جانے سے پہلے اک بات بتاتی جا ۔ جی مہاراج وہ بولی ۔

جیون میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی تجھے چاہ ہے ڈھونڈ ہے لگن ہے ۔

ہاں مہاراج وہ بولی ۔ اک سُر ہے مہاراج جس کی مجھے چاہ ہے ڈھونڈ ہے جو مجھے ان پورنی سے پورنی کر دیتی ہے ۔ ٹوٹ جوڑ دیتی ہے ۔ اسی سر کے کارن میں چوبارے چڑھی دھندا اپنایا ۔

سُر کیا ہوتی ہے کہاں ہوتی ہے کیسے حاصل ہوتی ہے ۔

اس دن سے آنند کمار کو ڈھونڈ پڑ گئی ۔ سُر کی ڈھونڈ ۔

ڈھونڈ کتنی بڑی دھن ہے جو جوہڑ کو ندی بنا دیتی ہے جو گڑی کشتی کو پتوار دے دیتی ہے جو زندگی کو سمت بخش دیتی ہے ۔

کسی نے کہا مہاراج کانتا وتی سے پوچھو ۔ شہر میں وہی سُر کی رانی ہے ۔

کانتا وتی ہنسی بولی ۔ راج کمار کو کس نے کہا کہ میں سُر کی رانی ہوں ۔ نہ مہاراج میں تو سر کی داسی بھی نہیں ہوں ۔ میں تو جیون بھر سُر انجان رہی ۔ بول کے بندھن میں پھنسی رہی ۔ مہاراج چوبارے کی گائیک سُر کو کیا جانے گی ۔ سننے والے تو بول کے متوالے ہیں سُر کی سار نہیں جانتے ۔ وہ تو لفظ کے پجاری ہیں ۔ ایسے لفظ ہوں جو تن کو چنگاری دکھا دیں ۔ ہر دیئے کو پھلجھڑی بنا دیں اور خود شہر کی رنگ پچکاری میں بھیگ جائیں ۔ بس یہی ان کی چاہ ہے ۔ مہاراج وہ آنکھ نہیں دیکھتے اسکا مٹکنا دیکھتے ہیں ۔ شیشہ نہیں دیکھتے اپنی مورت دیکھتے ہیں ۔

تو پھر شہر میں کون ہے جو سُر کا پتہ دے سکے آنند کمار نے پوچھا ۔

نہ مہاراج کانتا بولی ۔ شہر میں نہیں ۔ شہر تو مہاراج تن کا پن گھٹ ہے ۔ جہاں ہردے کی جھجھریاں بھری جاتی ہیں ۔ شہر تو تن کا بیوپاری ہے ۔ تن کا پجاری ہے اور سُر مہاراج وہ تو جمگھٹ کی چیز نہیں ۔ اکیلے کی چیز ہے ۔ بن کا کوئی جھنڈ ہو ۔ پہاڑ کی کوئی کھوہ ہو ۔ ویرانے میں کوئی مندر ہو وہاں کوئی

سُر کا پجاری مل جائے تو دھن بھاگ ۔
کانتا سے ملنے کے بعد آنند کی سُر لگن اور بڑھ گئی ۔
اتفاق سے سوامی ہیش چندر شہر آگئے ۔ ان سے جا ملا ۔ سوامی بولے پُتر یہ تو کس جھنجھٹ میں پڑ گیا ۔ سُر کا تو کوئی انت نہیں یہ ساری رام لیلا جو ہے یہ سُر کا ہی چمتکار تو ہے ۔ کرشن مہاراج بانسری بجا رہے ہیں اور ہمارے سامنے یہ تماشا ہو رہا ہے ۔ سُر کی رچنا جاننا چاہتے ہو پتر تو گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندروا جاؤ اگر تمہارے من کا کان بند نہیں تو سارا بھید کھل جائے گا ۔
آنند کمار سوچتا رہا پھر اسنے فیصلہ کر لیا ۔ پھر وہ مہاراج سے جا ملا ۔ بولا پتا جی مہاراج میں یاترا جانا چاہتا ہوں آگیا دیجئے ۔
یاترا ۔ کیسا یاترا مہاراج نے پوچھا ۔
مہاراج میں گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندروا کے درشن کرنا چاہتا ہوں ۔
مہاراج کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی ۔ انکاہ کے راج کمار کو تلسی مہاراج کی لگن کیسے لگ گئی ۔ اچھا وہ بولے ۔ ہم وچار کر کے بتائیں گے ۔
راج کمار کے یاترا جانے کی بات سارے محل میں گونجی ۔ باتیں ہوئیں ۔ ہاتھ چلے سینے تھام لئے گئے ۔ انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں ۔ راج رانی نے کہا ۔ مہاراج ضرور اس میں کوئی بھید ہے ۔ کمار کے بھیدی نوکر کو بلایا گیا ۔ بھید کھلنے کے بجائے اور الجھ گیا ۔ سیوک ناتھ بولا مہاراج ساری شرارت اَن پورنی کی ہے اس نے راج کمار کو بت بنا دیا ہے ۔ ان پورنی کو حاضر کیا گیا ۔ وہ بولی مہاراج میں نے تو کچھ نہیں کیا ۔ مہارانی بولی ۔ بس تو نے غضب کیا کہ کچھ نہ کیا ۔ کچھ نہ کر کے تو نے کمار کا دل اچاٹ کر دیا ۔ اب جا کچھ کر کوئی جتن کہ ویرانے سے ہٹ کر آبادی کی طرف دھیان لگے ۔ یاترا کی لگن ٹوٹ جائے ۔
اسی رات ان پورنی راج کمار کے چرنوں میں جا بیٹھی ۔ آپ میرے کارن جا رہے ہیں نا راج کمار اس نے پوچھا ۔
ہاں تیرے کارن ۔
تو نہ جائیے ۔ میں داسی بن کر آپ کے ساتھ رہوں گی ۔

مجھے داسی نہیں چاہئیے ۔
ان پورنی آپ کی سنگ ساتھن بن کر رہے گی ۔
جاؤ لڑکی مجھے ان پورنی چاہئیے وہ پورنی جسے میں خود سُر سے پورن کروں ۔
ان پورنی نے بڑے جتن کئے پر آخر جان لیا کہ بات اس کے بس سے نکل چکی ہے ۔

مہاراج کو پتہ چل گیا کہ راج کمار نہیں رُکے گا ۔ روکا گیا تو ٹوٹ جائے گا ۔ پھر لوٹ آنے کی صورت بھی نہ رہے گی ۔ اس لئے انہوں نے آگیا دے دی ۔ ساتھ چھ ایک نوکر کر دیئے انہیں تاکید کردی کہ ساتھ ساتھ رہیں نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں ۔

ان پورنی راج کمار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی ۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو دفعتاً اس نے جانا کہ وہ تو پورن ہوگئی ہے ۔ اس نے محسوس کیا کہ کمار راج پاٹھ چھوڑ کر سُر کی نہیں بلکہ اس کی ڈھونڈ پر نکلا ہو ۔ اس خیال پر وہ اتنی خوش ہوئی کہ پورن ہوگئی ۔ پر یہ خوشی شانت کرنے والی خوشی نہ تھی بلکہ بے کل کرنے والی تھی ۔ سو وہ بے کل ہوگئی ۔

ایک سال بیت گیا اس کی بے کلی بڑھتی گئی ۔

پھر ایک دن راج کمار کے ساتھ گئے ہوئے پانچ نوکر واپس آگئے ۔ بولے مہاراج ہم نے تو کمار کا بڑا دھیان رکھا پر ایک رات راج کمار سیوک ناتھ کو ساتھ لے کر چلے گئے ۔ ہم سوتے ہی رہ گئے پھر ہم نے ڈھونڈ کی ۔ آس پاس کو چھان مارا پر کوئی بھولا ہوتا تو گھر آتا ۔

ان پورنی نے سنا تو اسکا دل دھک سے رہ گیا ۔ چار ایک دن ٹھنڈی برف پڑی رہی پھر اُٹھی ۔ اب میں یہاں کس لئے بیٹھی ہوں ۔ اب یہاں کون آئے گا ۔ جس ڈھونڈ پر میں خود نہ نکلی تھی دوجے کو اس ڈھونڈ پر لگانے کا مجھے کیا ادھیکار تھا ۔ سارا دوش میرا ہی ہے اس نے دھندے کو سمیٹا اور چل نکلی ۔ جگہ جگہ گھومی مندر مندر ٹھکانا کیا ۔

میگھ مندر میں شری ہمیش چندر مل گئے ۔

بولے پتری تو یہاں میگھ مندر کے ویرانے میں کیا کررہی ہے ۔

ان پورنی بولی ۔ مہاراج سُر کی ڈھونڈ میں نکلی ہوں ۔
نہ پتری وہ بولے ۔ تو سُر کی ڈھونڈ کیسے کرے گی تُو تو صرف دکھ سے واقف ہے ۔ سُر کی ڈھونڈ تو وہ کر سکے ہے جو دکھ کے ساتھ سکھ سے بھی واقف ہو ۔ جو لوبھ لگن بیت چکا ہو ۔ رنگ رلیاں منا چکا ہو ۔ جیون کی موم بتی دونوں سروں پر جلا کر دیکھ چکا ہو ۔

مہاراج ۔ وہ بولی میں نے بھی تو رنگ رلیاں منائی تھیں ۔ میں تو ویشیا تھی ۔ پلنگاہ چڑھتی رہی ۔

اونہوں وہ مسکائے ویشیا خالی تن کی نہیں ہوتی ۔ تن من دونوں کی ہوتی ہے ۔ تیرا چت تو بت میں نہیں ہے ۔ تو کیسے ویشیا بنتی ۔ نہ نہ پتری پہلے اپنے آپ کو جانو پھر ڈھونڈ پر نکلو اور پھر اپنا آپ تیاگ کر سب کچھ پالو ۔ یہی ڈھونڈ کا بھید ہے اور پتری تو استری ہے ۔ استری سُر کی ڈھونڈ پر نہیں نکلتی ۔ سُر والے کی ڈھونڈ پر نکلتی ہے ۔ ان پورنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے گردن لٹک گئی ۔ یہ دیکھ کر سوامی بولے تو ریاست انگاہ کی ہے کیا ۔ ہاں مہاراج پورنی گنگنائی ۔ وہ بولے تو نے ہی راج کمار کو سُر کی ڈھونڈ پر لگایا تھا ۔ وہ چپ ہوگئی ۔ وہ مسکائے بولے جا پتری اس کی ڈھونڈ کر جس کی ڈھونڈ پر نکلی ہے ۔ خود کو دھوکا نہ دے ۔ خود ساتھ نہ دے تو ڈھونڈ کبھی پورن نہیں ہوتی ۔

اس رات پورنی سوچوں میں پڑی رہی ۔ رو رو کر بے حال ہوگئی ۔ ہے بھگوان میں کیا کروں ۔ کس کی ڈھونڈ کروں ۔

پھر وہ مندر مندر پھری ۔ دیوی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی ۔ ہاہا کار کی ہے دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو ۔ نہ سُر رہے نہ سُر والا رہے ۔ نہ بانس رہے نہ بانسری ۔ لیکن سیس نوا کر جب وہ سر اٹھاتی تو دیوتا کے جسم پر آنند کمار کا مکھ سجا ہوتا ۔

وہ جگہ جگہ پھری ۔ استھان استھان گھومی ۔

بھگوان کی لگن کے لئے بھجنوں کے بہانے روئی پیٹی لیکن ہر دیوی دیوتا کے بت پر آنند کمار کا مکھ لگا رہا ۔

آخر وہ ہار گئی ۔ ڈھونڈ چھوڑ مادھوری کے ویران مندر میں اک کوٹھڑی میں

پڑ رہی ۔

ہے بھگوان جو تو چاہے دے نہ چاہے نہ دے پر میرے راستے کا پتھر تو ہٹا دے پاؤں کی بیڑی تو کاٹ دے ۔ ایک روز مادھوری مندر کی بوڑھی پجارن دوڑی دوڑی آئی ۔ بولی پتری دو سوامی آرہے ہیں ۔ تو دو بڑی کوٹھڑیاں صاف کردے وہ کچھ دناں یہاں ٹکیں گے ۔

کون آرہے ہیں پجارن ۔ ان پورنی نے پوچھا ۔

ایک تو سوامی آنند کمار ہیں جو اوپر تلسی مہاراج سے آئے ہیں ۔ یہ سن کر ان پورنی کا دل دھک سے رہ گیا ہاجو کانپا جھاڑو گر گیا ۔

پجارن نے دیکھا ۔ ہے بھگوان ۔ ہر دے میں اتنی بھیڑ ۔ وہ دیکھ نہ سکی ۔ منہ پھیر لیا ۔ ان دیکھا کر دیا ۔ بات جاری رکھی تاکہ دیکھن کا بھید نہ کھلے ۔ بولی دوجے سوامی ہمیش چندر ہیں نیچے نارائین نگر سے پدھارہیں گے ۔

جب سوامی آنند کمار پہنچے تو مندر کی ساری پجارنوں نے باہر نکل کر ان کا سواگت کیا ۔ لیکن ان پورنی اپنی کوٹھڑی سے نہ نکلی ۔ وہ کواڑ کی درز سے دیکھتی رہی ۔۔۔ ہاں ، وہی ۔ وہی ناک نقشہ ، وہی روپ سروپ لیکن جیسے ہوا بدلی بدلی ہو ۔۔۔ ان کے پیچھے پیچھے وہی ان کا نوکر سیوک ناتھ تھا ۔

جب شام پڑی تو وہ سیوک ناتھ کے پاس گئی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا ۔ سیوک ناتھ نے پرنام کا جواب دیا ۔ بولی تو نے مجھے پہچانا ۔۔۔ میں ان پورنی ہوں ۔ مجھے سوامی سے ملا دے ۔

سیوک ناتھ بولا ۔ ان پورنی کوئی اور مانگ مانگ یہ مانگ میرے بس کی نہیں ۔ سوامی راہ چلتے مل لیں ویسے کسی سے نہیں ملتے ۔

تُو اکبار کہہ کر تو دیکھ کہ ان پورنی آئی ہے ۔

جرور کہوں گا ۔ وہ بولا ۔

سیوک ناتھ نے ایک بار کہا دو بار کہا تین بار کہا پر کچھ نہ ہوا

کچھ نہیں ہوا ۔ ان پورنی نے پوچھا ۔

اونہوں سیوک ناتھ نے سر ہلا دیا ۔

سوامی جی نے سنا نہیں وہ بولی ۔ ٹھہر میں اپنا نام پتر پر موٹا موٹا لکھ کر

لاتی ہوں ۔ تو سوامی جی کے ہاتھ میں پتر تھما دیجیئو ۔ سیوک ناتھ پتر اندر لے گیا ۔ باہر نکلا تو ان پورنی نے پوچھا ۔ کیوں کچھ ہوا ۔

ہاں ہوا ۔ وہ بولا ۔ ان پورنی کا مکھ کِھل گیا ۔ سیوک بولا ۔ سوامی جی نے پتر کو دیکھا ۔ بولے کون ان پورنی ۔

ان پورنی سن کر وہیں گھاس پر ڈھیر ہو گئی ۔

اگلے روز وہ پھر سیوک ناتھ کے پاس آئی ۔ بولی بس ایک بار اور سیوک ناتھ ایک بار ۔

آخری بار سوامی سے جاکر کہو ۔ وہ ان پورنی جسے تم نے چلتے سمے کہا تھا ۔ ان پورنی میں تجھے آپ سُر سے پورن کروں گا ۔

ان پورنی نے بات پوری کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ سیوک ناتھ کے پیچھے سوامی ہمیش چندر کھڑے مسکارہے ہیں ۔ سوامی بولے ۔ ان پورنی اب بیکار ہے پتری ۔ اب تیرے لئے وہاں کچھ نہیں دھرا ۔ پہلے وہ پورن تھا ۔ پر تو نے اسے سُر کی ڈھونڈ دے دی ۔ وہ تیری خاطر سُر ڈھونڈتا رہا ۔ جو سُر پانے سے پہلے تو اسے اپنا لیتی تو اپنا لیتی ۔ پرنتو اس نے سُر کا بھید پالیا اور سُر نے اسے ان پورن کر کے بھگوان کی ڈھونڈ پر لگا دیا ۔ اب وہ تیری خاطر نہیں اپنی خاطر ڈھونڈ میں لگا ہے اب وہ کیا جانے کہ ان پورنی کون ہے ۔

ان پورنی کی چیخ نکل گئی ۔

مندر کی پجارن باہر نکل آئی ۔ کیا ہوا ۔ یہ آواج کیسی تھی ۔

کچھ نہیں سوامی ہمیش بولے اس پتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا ۔ اسے رستہ مل گیا ۔ یہ جارہی ہے پجارن اسے وداع کرو ۔ لیکن پجارن نے ان پورنی کی طرف دیکھ کر کہا ۔ یہ آنسو ۔ سوامی ہمیش مسکرائے ۔ بولے یہ خوشی کے آنسو ہیں ۔ جاؤ پتری ۔ اب تم آزاد ہو ۔ پاؤں کی بیڑی کٹ گئی ۔ دھن بھاگ تمہارے ۔

○

پکنک

مائی گاڈ ۔ اتنی سجاوٹ ۔ اتنی سجاوٹ دیکھ کر دل دق ہو جاتا ہے آئی فیل سک الرجک ہو رہی ہوں ۔ سجاوٹ تو ان سپاٹس اچھی لگتی ہے ۔ یہاں ہو ۔ وہاں نہ ہو ۔ اِدھر سادہ سادہ اُدھر سجا سجا ۔ یہ نہیں کہ سارا گھر سجاوٹ سے یوں تھوپ دیا جیسے دیہاتی دیوار پر اُپلے تھوپ دیتے ہیں ۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ گھر افلونس زدہ ہے ۔ افلونس تو خیر ٹھیک ہے ۔ لیکن اسے خواہ مخواہ اُچھالنا ۔ اور پھر اتنی گاڑھی نمائش ۔ بھئی ہلکی ہلکی رکھو ۔ نمی نمی ۔ مدھم مدھم ۔ سیٹھ گھر نہ لگے ۔

پتہ نہیں افلونس کو زندگی سے بیر کیوں ہے ۔ ادھر افلونس آئی ادھر زندگی رخصت ۔ نہ انفرادیت رہی نہ چمک صرف ٹریڈیشن ۔ دیکھ لو یہاں سب مردے ہیں ۔ ٹریڈیشن کی چادر میں کفنائے ہوئے مردے بائی گاڈ ۔ مشک کافور کی بو آتی ہے ۔ سوچتے یوں ہیں جیسے برسوں سے سوچا جارہا ہے ۔ کرتے وہ ہیں جو برسوں سے کیا جارہا ہے آنسٹ ٹروتھ یہاں تو کمیونٹی ٹریڈیشن کی ریلز بچھی ہیں ۔ سوچ کی گاڑی چلے تو ریلز پر ۔ نہیں تو ڈہی ریل ۔ ختم ۔

مانتی ہوں میں کہ پیسہ بڑی چیز ہے ۔ چھوٹے چھوٹے آرام آسائشیں خریدو ۔ سجاوٹیں کرلو ۔ گوٹے کناریاں لگا لو ۔ سب ٹھیک لیکن آسائشیں آرام تو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں ۔ نہ زندگی کی چمک رہتی ہے ۔ نہ تڑپ نہ جدوجہد ۔ بس آرام اور آسائش کی لحد میں پڑے رہو ۔ پڑے رہو ۔ اور یہ سب اسے کہتے ہیں ۔ لو ان کمفرٹ ۔ لیکن آرام جینے بھی دے ۔ کہتا ہے جیو مگر جیو نہیں زندگی میں کوئی ہلکی ہلکی بے آرامی ہو ۔ بے اطمینانی ہو ۔ تھوڑی تھوڑی تکلیف ۔ پریشانی ۔ کشمکش ۔ جدوجہد ۔

مائی گاڈ یہ آرام تو مجھے چاٹے جارہا ہے ۔ جو میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو

سمجھو ختم ۔ دی اینڈ ۔ گھر والے سب مجھ سے ناراض ہیں ۔ ڈیڈی ممی بھائی بھابھی سب ۔ ڈیڈی کہتے ہیں ۔ انجنا تو ورکنگ وومن نہیں بن سکتی ۔ کیوں نہیں بن سکتی بھلا ۔ کہتے ہیں ورکنگ وومن وہ ہوتی ہے جس کا کام کرنے کے بغیر گزارہ نہ ہو ۔ جو کیپ دی پاٹ بائلنگ کے لئے کام کرنے پر مجبور ہو ۔ تم سیٹھانی ہو کام کرنے پر مجبور نہیں ہو اس لئے ورکنگ وومن نہیں بن سکتی ۔ لو یہ کوئی آرگیومنٹ ہے بھلا ۔ کیا ضروری ہے کہ نیڈی ہو ۔ بھئی ورکنگ وومن تو ایک اٹی ٹیوڈ ہے ۔ زندگی کا اٹی ٹیوڈ ۔ چاہے امیر ہو غریب ہو ۔ سلف سفیشنٹ ہو ۔ محتاج ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

ممی کہتی ہیں ورکنگ وومن بننا تو آج کل کا فیشن ہے ۔ لڑکیاں کام نہیں اپنا رہی فیشن اپنا رہی ہیں ۔ اک چاؤ ہے ۔ مردوں کے نام چیلنج ہے کہ لو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گی ۔ کندھے سے کندھا جوڑ کر قدم سے قدم ملا کر ۔ چار چھ سال یہ چاؤ چلتا ہے ۔ پھر شادی ہو جاتی ہے ۔ بچے ہو جاتے ہیں ۔ بس ورکنگ وومن سوکھ کر جھڑ جاتی ہے ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔

بھائی کہتے ہیں انجنا یہ تو ایک لائف پیٹرن ہے ٹپ ٹپ چلنا ۔ پھنسے ہوئے لباس پہننا ۔ آدھے زنانہ آدھے مردانہ ۔ کندھے پر تھیلا لٹکانا ۔ پٹاخ پٹاخ باتیں کرنا ۔ فرفر انگریزی بولنا ۔ بٹربٹر دھوئی دھائی آنکھوں سے دیکھنا ۔ اسے کام سے کوئی تعلق نہیں ورکنگ ہو یا نہ ہو ۔ پیٹرن ایسا ہو ۔ گھڑی چلے نہ چلے پر رسٹ پر بندھی ہو ۔

بھابھی کچھ نہیں کہتی صرف مسکرا دیتی ہے وہ تو پیدائشی سیٹھانی ہے لڑکی پن کبھی آیا ہی نہیں ۔ ہماری کمیونٹی کی ٹریڈیشن میں پلی ہے نا ۔ ہٹاؤ ۔ اس کا کیا ذکر ۔ بے چاری بنی سجی ڈال ہے ۔

ممی کہتی ہے انجنا یہ تو کیسا لباس پہنتی ہے ۔ ذرا بھی ڈگنٹی نہیں ہوتی ۔ بیٹھتی مرسیڈیز میں ہے اور کندھے پر تھیلا لٹکاتی ہے ۔ کوئی بات ہے بھلا ۔ پتہ نہیں ممی ڈگنٹی کسے سمجھتی ہے ۔ بن سنور کر بیٹھ جاؤ یوں کہ زندگی کی ذرا سی رمق باقی نہ رہے ۔ بالکل مردہ ۔ بنی سجی ڈال جیسے بھابھی ہے ۔

ممی تو خود ڈیڈ باڈی ہے ۔ چلتی پھرتی ڈیڈ باڈی ۔ بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ

رہتی ہے ۔ سارا دن حکم چلاتی ہے یہ کرو وہ نہ کرو ۔ ایسے کرو ویسے نہ کرو ۔ یوں کیوں کیا ۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا ۔ بن سج کر پتھر کی طرح بیٹھ رہنا ۔ بس منہ کی ایک ٹکڑی ہے اسے دیکھ لو باقی سارا جسم کپے کی طرح پھولا ہوا ہے ۔ کبھی چلے تو جیسے پیپا لڑھک رہا ہو ۔ لیکن چلنے کی ضرورت بھی پڑے ۔ بیٹھے بٹھائے جو سب کچھ مل جاتا ہے ۔ پُور ممی ۔

بیٹھے بیٹھے سب کچھ مل جانا کتنی بڑی لعنت ہے ۔ مائی گاڈ حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ہے ۔ یہ سب پیسے کا اثر ہے ۔ کہتے ہیں پیسہ بنا دیتا ہے ۔ جھوٹ ۔ یہ بناؤ ہے یا بگاڑ ۔ پیسے کا بگاڑ دیکھنا ہو تو اس گھر کو دیکھ لو ۔ یہ سجا سجایا مردہ خانہ اور اس میں کفنائی ہوئی لاشیں ۔

ہائیں یہ کس نے گھنٹی بجائی ۔ اس وقت بھلا کون آئے گا ۔۔ اچھا ارسلان ہے ۔ بے چارا ۔ اس گھر کے پھیرے لیتا رہتا ہے ۔ اچھا لڑکا ہے اونچا لمبا ۔ پتلا دبلا ۔ فئیر ہے سمارٹ ہے ۔ افیکشنیٹ ہے ۔ ٹنڈر ہے ۔ سب کچھ ہے لیکن تڑپ نہیں ۔ چمک نہیں ارج نہیں میٹھا میٹھا ہے ۔ ٹھنڈا میٹھا جیسے صندل کا شربت ہو ۔ برف والا ۔

ارسلان میرا منگیتر ہے ۔ منگنی نہیں ہوئی ۔ ویسے نامزد ہوں ۔ اس عمر میں اپنا سٹور چلا رہا ہے ۔ ڈیڈی کہتے ہیں بڑا ٹیلنٹڈ ہے ۔ ہو گا ۔ پر میں سٹور نہیں ہوں۔ جسے چلا سکے۔ ساتھی نہیں بن سکے گا۔ کوٹ اُٹھا اُٹھا کر پیچھے چلنے والا ہے۔ قدم ملا کر نہیں ۔ اونہوں

در اصل اس کے اندر کا بچہ مر چکا ہے ۔ اونہوں مرا نہیں ۔ وہ تو تھا ہی نہیں ۔ مرتا کیسے اندر پلے نہیں ساری بات ہی پلے کی ہے ۔ میاں بیوی کھیلیں نہیں تو بات نہیں بنتی ۔ ارسلان کے گھر میں تو میں ساری عمر ایک ہاتھ سے تالی بجاتی رہوں گی ۔

ہئے میرا جی چاہتا ہے کوئی مرچیلا جوان ہو ۔ کڑاکے دار دونوں مل کر زندگی کا کھیل کھیلیں ۔ کبھی میں اسے جیتنے میں لگی رہوں ۔ کبھی اسے کہوں ۔ لُک ڈارلنگ ڈونٹ ٹیک می فار گرانٹڈ ۔ یو ہیو ٹو وِن می اوور ایوری ٹائم ۔ پر ایسا ملے بھی ۔۔۔ ویسے تو کئی ایک ملتے ہیں ۔ بھوکی نظریں ڈالتے ہیں ۔ چیپ

باتیں کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں اثر ڈالنے کا نہ۔

وہ جو کل ملا تھا۔ بس سٹاپ پر۔ میں جو ذرا رُکی تو کھڑکی میں منہ ڈال کر بولا ہمیں بھی لے چلو ساتھ۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن اس نے ایسی نگاہ ڈالی کہ میں جھنجھنے کی طرح بجنے لگی۔ اس کی نگاہ میں سرخ چیونٹے تھے۔ تھا بڑا نڈر۔ سووہاٹ ٹائپ۔

لیکن جو ایسا مل بھی جائے تو گھر والے مانیں گے کیا۔ اونہوں ـــ۔ یہاں تو باہر والے کے لئے گنجائش ہی نہیں۔ نہ میل ملارا نہ کچھ اور۔ اپنی سیٹھ کمیونٹی میں کرلو جو کرنا ہے۔ رومانس ہو افئیر ہو کچھ ہو۔ سب ٹھیک۔ چاہے کتنی دور نکل جاؤ سب چلتا ـــ۔ لیکن باہر والا۔ اونہوں۔

کمیونٹی میں سب سوسو ہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ نہ کراراپن نہ کڑاکا۔ نہ سووہاٹ۔ پتہ نہیں پیسہ کڑاکے کا دشمن کیوں ہے۔ رسی کا بل کیوں نکال دیتا ہے۔ پُھس کرکے رکھ دیتا ہے۔ لیکن انجنا ـ۔ انجنا کا بل کون نکالے گا۔ جل جاؤں گی پر بل نہیں نکلے گا ـــ۔ یہی بل تو زندگی ہے۔ انفرادیت ہے ـــ۔ نو ٹریڈیشن انجنا کیئرز ٹوہوٹس فار کمیونٹی۔ سب توڑ دوں گی۔ چُور چور کر دوں گی ـــ۔ مگر کوئی ملے بھی۔

توبہ کسی وقت تو میں اس لڑکی کے تیور دیکھ کر ڈر جاتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے گھر میں اجنبی آگھسا ہو ـــ۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ افلسنیٹ ہے۔ ہوم اٹیچڈ ہے۔ ڈیڈی ممی کا خیال رکھتی ہے۔ ول بیہوڈ ہے۔ مینرز کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ سب ٹھیک ہے بس وہ ایک نگاہ۔ ظالم نگاہ۔ اس وقت ایسے لگتا ہے جیسے اڑنے کے لئے پر تول رہی ہو۔ اس نگاہ میں نفرت نہیں ہوتی۔ اکتاہٹ ہوتی ہے۔ جیسے ہم سب سے بیزار ہو۔ سک ـ۔ ایسے لگتا ہے مجھے جیسے کچھ کر گزرے گی ـــ۔ یہ طوفان چل کے رہے گا ـ۔ توبہ کوئی طوفان سا طوفان ہے جبھی تو ڈر جاتی ہوں۔ سہم جاتی ہوں۔

انجنا کے ڈیڈی سے بھی بات کر دیکھی۔ میں سمجھتی تھی سُن کر چونک

جائیں گے لیکن کچھ بھی نہ ہوا ۔ جیسے بات سمجھی ہی نہ ہو ۔ کہنے لگے مریم تو انجنا کا فکر نہ کر ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ یہ عمر ہی ایسی ہے ۔ لڑکیاں بُلبلے مارتی ہیں ۔ شوں شوں کرتی ہیں ۔ پھر شانت ہو جاتی ہیں ۔

ہنئے اتنے بے خبر ہیں آپ میں نے کہا ۔

وہ مسکرا دیئے جیسے کہ ان کی عادت ہے ۔ بولے مریم تو نے اس گھر کو نہیں جانا ۔ اس گھر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے ۔ یہ گھر ساری شوخی جذب کر لے گا ۔ ساری تڑپ کو ٹرانکولائیز کر دے گا ۔ سیٹھ کے گھر میں کبھی انقلاب نہیں آتا ۔ اس طرز زندگی کے تحت اڑان نہیں چلتی پَر کٹ جاتے ہیں ۔ یہ ہماری کمیونٹی کی ریت ہے ۔ سب بل نکل جاتے ہیں ۔ سانپ رسی بن جاتے ہیں ۔ یہاں کوئی بغاوت نہیں کر سکتا ۔ تم بالکل نہ گھبراؤ مریم ساری بات مجھ پر چھوڑ دو ۔۔۔ انجنا سے کچھ نہ کہنا ۔ اس کی ضد کو نہ چھیڑنا جو کرتی ہے کرنے دو ۔ رکاوٹ نہ کھڑی کرنا ۔ رکاوٹ بات بناتی نہیں بگاڑ دیتی ہے ۔ شبہ دیتی ہے ۔ بس دیکھتی جاؤ ۔ یوں جیسے دیکھا ہی نہیں ۔ جیسے دیکھنے کی کوئی بات ہی نہیں ۔ سب اچھا ۔۔۔ سب اچھا ۔

اتنا اوور کانفی ڈنس بھی اچھا نہیں ۔ ایک دن ایسا دھچکا لگے گا کہ سمجھ آ جائے گی ۔۔ چلو مجھے کیا ہے میں نے ہر بات کی ذمہ داری تو نہیں لے رکھی ۔ وہ جو کہتے ہیں سب مجھ پر چھوڑ دو تو ٹھیک ہے ۔ جو ہو پڑا ہو ۔ میں کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہوں ۔۔۔ خواہ مخواہ

آج وہ کار والی پھر مل گئی ۔ میں نے پہچان لیا ۔

مجھے تو وہ یاد ہی نہ رہی تھی ۔ ایسیاں تو کئی ملتی ہیں ۔ روز کے روز ۔ آج کل بڑا چاؤ ہے انہیں گاڑی چلانے کا ۔ سڑک پر دس گاڑیاں گزریں تو چار چلانے والے ہوں گے ۔ چھ چلانے والیاں ۔ میں سٹاپ پر کھڑا تھا ۔ وہ آئی ذرا رُکی ۔ لڑکی ہو کار والی ہو اکیلی ہو ۔ رُکے ۔ تو بات کرنے سے کون چوکے ۔ فدا پر تو عائد ہو جاتا ہے کہ کچھ کہے ۔ سو میں نے کھڑکی میں منہ ڈالا اور سنجیدگی

سے کہا ۔ ہمیں بھی لے چلو ۔ ساتھ بھرپور نگاہ ڈال دی تھی ۔ بڑی تیکھی تھی ۔ ایٹریکٹو ۔ آج کل ساری ہی سمارٹ ہوتی ہیں ۔ ایٹریکٹو ہوتی ہیں ۔۔ لیکن اس نے تو حد کر دی ۔ ایسی غصے بھری نگاہ ڈالی جیسے بھڑ بُھن بُھن کر رہا ہو ۔ واہ ۔۔ مزا آگیا ۔ کریلا ہو تو ایسا نیم چڑھا ہو ۔ کدو ٹینڈے تو بہت ہیں ۔ جبھی یاد نہیں رہتے ۔

ہاں تو وہ کار والی آج پھر مل گئی ۔ اتفاق سے میرے پاس مانگے کا موٹر سائیکل تھا ۔ لگا دیا پیچھے ۔ اتنے فاصلے پر کہ کار کے بیک ویور پر چہرا نظر آئے پھر بھرپور نگاہ جمائی ۔ مسکراہٹ لشکائی ۔ وہ رک گئی ۔ ہم بھی رک گئے ۔ کھڑکی میں منہ ڈال کر کہا ۔ آپ کے مزاج اچھے ہیں ۔ اس نے تلوار نگاہ سے دیکھا بولی ۔ پولیس کو رپورٹ کر دوں ۔ میں نے کہا بصد شوق جو چاہیں کریں ۔ بولی میں نے آپ کے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کر لیا ہے ۔ میں نے کہا نہ نہ ۔۔۔ یہ تو مانگے کا ہے اپنے پاس موٹر سائیکل کہاں ۔ بولی آپ بیہودہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ دیکھنا تو بیہودہ حرکت نہیں ۔ بولی جائیے کسی اور کو دیکھئے میں نے کہا ۔ اور کوئی ہو بھی اس لائق ۔ اس پر اس نے گاڑی چلا دی ۔ ہم نے موٹر سائیکل چلا دی ۔ اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے بڑے چکر دیئے ۔ بڑے چکر دیئے ۔ پھر وہ ہار گئی ۔ میں بھی اسے گھر پہنچا کر آیا اور ایسا سلوٹ مارا کہ مسکرا دی ۔ اس کے پاس کار ہے تو اپنے پاس بھی ایک نگاہ ہے ۔ اونہوں ۔ کوئی مقصد نہیں تھا ۔ آرٹ فار آرٹ سیک ۔

اوہ ۔ واٹ اے بوائے ۔ بڑے گٹس ہیں ۔ اور پھر تڑپ ہی تڑپ ۔ خالی شوخی ہی نہیں ۔ متبسّم شوخی ۔ ذرا چیپ نہیں ۔ اور حاضر جوابی ایسی کہ جواب نہیں ۔ مجھے تو اس کی نگاہ کھا گئی ۔ بھرپور نگاہ ڈالتا ہے تو جھن جھن چھڑ جاتی ہوں ۔ اب تو روز ملتا ہے ۔ روز جھنجھناتا ہے ۔ بڑا بولتا ہے ۔ بولے جاتا ہے ہنسے جاتا ہے ۔ لیکن کیا مجال کوئی ایسی ویسی بات کرے ۔ نگاہ سے چھیڑ دیتا ہے ۔ پھر دیر تک چھڑی رہتی ہوں ۔

بس دو دن اور رہ گئے ہیں پھر اس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو لاہور چلا جائے گا ۔ وہاں کلرک ہے بے چارہ ۔ ماں ہے بہن ہے سارے گھر کا بوجھ سر پر

پڑا ہے ۔ پھر بھی خوش خوش ۔ قہقہے شور شرابا ۔ سوکھی زندگی کی لذت میں یوں لت پت ہے جیسے رس گلا شیرے میں پڑا ہو ۔

لو وہی ہوا نا جس کا مجھے ڈر تھا ۔ انجنا اس لڑکے کے پیچھے لاہور چلی گئی ۔ جس روز سے وہ لاہور گیا تھا ڈانواں ڈول پھرتی تھی ۔ بے چین تھی ۔ میں نے انجنا کے ڈیڈی سے کہا بھی ۔ میں نے کہا انجنا کی سُدھ بُدھ ماری گئی ہے یہ ضرور اس کے پیچھے جائے گی ۔ اجازت نہ دینا ۔ لیکن میری بات کب مانتے ہیں ۔ لڑکی نے ذرا سی ضد کی تو فٹ اجازت دے دی ۔ بہانہ یہ کیا کہ میں نوکری کروں گی ۔ یہاں نہیں لاہور ۔ ایک تو اجازت دے دی دوسرے لاہور میں فلیٹ کا انتظام کر دیا ۔ بولے تم آزاد ہو بیٹا بے شک لاہور میں نوکری کرو جب تک جی چاہے کرو ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ۔ ساتھ نوکرانی شادو کی بیٹی رضیہ کو بھیج دیا ۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ساتھ شادو کو بھیجئیے وہ کم از کم خیال تو رکھے گی ۔ لیکن میری کون سنتا ہے ـــ۔ بس لڑکی ہاتھ سے گئی اب وہ کہاں واپس آئے گی ۔

آ ۔ واٹ اے لائف ۔ اسے کہتے ہیں زندگی ۔ آئی ام آن مائی اون ۔ جاب ہے ۔ فلیٹ ہے ۔ نوکر ہے ۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ہے ۔ فدا ۔ وہ تو بالکل فدا ہو رہا ہے مجھ پر ۔ میرے بغیر قرار نہیں آتا ۔ کہتا ہے انجنا میں تو لُٹ گیا ۔ چاروں شانے چت ۔ اب کیا ہوگا ۔ یار میں تو مارا گیا ۔ تم مخمل کی میں ٹاٹ کا ۔ تم کار والی میں پیدل ۔ کہاں رانی انجنا کہاں گنگو تیلی ۔ بھئی اپنا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا ۔ ذرا مجھے چٹکی بھرونا ۔ دیکھوں سویا ہوں کہ جاگتا ۔ بولتا جاتا ہے بولتا جاتا ہے ۔ ہنستا جاتا ہے ۔ میری طرف ٹکر ٹکر تکتا جاتا ہے حتٰی کہ آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں واہ کیا ساتھی ہے کہتا ہے ۔ نہ نہ انجی تُو تو مجھے بادلوں میں لے آئی اور اُوپر نہ لے جا ۔ کہ میرے لئے گرنا مشکل ہو جائے ۔ آخر تو گر کر ہڈی پسلی ٹوٹنی ہی ہے ۔ ابھی سوچ لے نباہ سکے گی ـــ۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے چاہے کچھ ہو جائے ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے ۔ میں تو کب

سے اس کی ہوچکی ہوں ۔ اسی کی رہوں گی ۔ گھر والے زیادہ سے زیادہ عاق کر دیں گے نا ۔ کردیں ۔ فدا سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

پتہ نہیں لاہور سے کیوں نہیں آئے اب تک انجنا کے ڈیڈی ۔ اب تک تو آجانا چاہئیے تھا ۔ اللہ کرے خیر کی خبر لائیں ۔

توبہ بڑی منتوں سے میں نے انہیں لاہور بھیجا ۔ میں نے کہا لڑکی کو لاہور گئے چھ مہینے ہوگئے ۔ جاکر اس کی خبر لیجئیے ۔ جواب میں کہتے چلو انجنا کچھ دیر اور پک نک منالے ۔ لو یہ کیا پکنک ہے ۔ لڑکی ہاتھوں سے نکل گئی اور آپ اسے پکنک کہہ رہے ہیں ۔ بولے پک نک ہی تو ہے ۔ آجائے گی آجائے گی ۔ گھبراؤ نہیں مریم ۔ اس گھر سے کوئی جا نہیں سکتا ۔ یہ ہماری ریت ہے ۔ لو اب اس کا میں کیا جواب دوں ۔

ہائیں ۔ شاید دروازہ بجا ہے ۔ کون ہے ۔ اوہ آگئے کیوں کیا خبر لائے انجنا سے ملے ۔

نہیں ۔ سیٹھ نے جواب دیا ۔

تو گئے کس لئے تھے مریم نے پوچھا ۔

کام سے گیا تھا ۔

اور لڑکی کو ملے بغیر ہی آگئے ۔

میں اس لڑکے سے ملا تھا ۔ اچھا لڑکا ہے ۔ بات سمجھ گیا ۔

کیا مطلب مریم بولی ۔

لڑکے سے بات کی سب ٹھیک ہوگیا بے فکر رہو انجنا ایک ہفتے کے اندر اندر گھر آجائے گی ۔

خود سے آجائے گی کیا

ہاں انجنا آئے گی تو خود سے آئے گی ورنہ نہیں آئے گی ۔

لیکن کیسے مریم چلّائی ۔

لڑکے کو افسر گریڈ کی نوکری مل گئی ہے ۔ بات طے ہو گئی ہے ۔

مریم نے مُنہ میں اُنگلی ڈال لی ۔

میں نے جو تمہیں کہا تھا ۔ اس گھر سے اس ماحول سے کوئی نہیں جا سکتا مریم ۔ یہ ہماری کمیونٹی کی ریت ہے ۔ کوئی جائے بھی تو چند ماہ کی پک نک پر جائے گا ۔ پھر از خود واپس آ جائے گا ۔ از خود ۔ اس گھر کا جادو اٹل ہے ۔

مریم ۔ یہ سیٹھ کا گھر ہے ۔ فکر نہ کرو تم مریم سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ چھ مہینے کی پک نک سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

یہ پک نک تھی کیا مریم غصے میں چلائی ۔

تم بھی تو شادی سے پہلے پک نک پر گئی تھی ۔ مریم بھول گئی کیا ۔

مریم نے منہ میں اُنگلی ڈال لی ۔ نگاہیں جھکالیں۔آپ کو پتہ تھا کیا ۔

سیٹھ نے سر ہلا دیا ۔ ہاں پتہ تھا ۔ اب چائے تو منگواؤ مریم ڈارلنگ ۔

.... O ....

باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے مجھے ۔ کچھ ہوگیا ہے ۔ نجر دُھندلا گئی ہے ۔ جاگتے ماں سپنے دکھیں ہیں ۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے ۔ ڈاکدار کہے ہے دل ماں کانٹا لگ گیا ہے ۔ لو اس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کانٹا اور پھر اس گھر ماں ۔ یہاں تو آرام ہی آرام ہے ۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی مُندری مکھمل کی ڈبی ماں پڑی ہووے ہے۔

یہ کمرا جہاں رہتا ہوں ماں انڈے کی طرحیوں چکے ہے نیچے گلیچہ بچھا ہے ۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے ۔ ایمان سے ۔ کھانسلماں وخت پر روٹی لاوے ہے وخت پر نشتہ وخت پر چاہ وخت پر دُودھ۔نہ نہ ڈیننگ رُم ماں جانا نہیں پڑے ہے ۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھانسلماں سے بول دیا تھا ۔ دیکھو کھانسلماں بڑے چودھری صیب کا نشتہ لنچ ادھر لگے گا بڑے صیب کے کمرے ماں اور ڈیننگ روم میں لگنے سے ادھ گھنٹہ پہلے لگے گا ۔ بعد ماں نہیں ، ساتھ نہیں ۔ پہلے ۔ سمجھے ۔

شیدا بڑا کھیال رکھے ہے روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں ۔ پچھن کے لئے بہووی کدی کدی آجاوے ہے نجر آتے جاتے بڑی اچھی ہے ۔ سلام کرے ہے ۔ پچھے ہے بابا اچھے ہیں آپ مُسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے ۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے ۔ بہوءں رُکتی نہیں بچاری کیا کرءں ۔ رُکنے کا ٹیم نہیں ہوتا اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رُکنے نہیں دیتی ۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی ۔ گھروالی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی ۔ پر وہ ٹھنڈی جان ہووے تھی ۔ اب تو تتی ہووے ہے ۔ بڑی تتی ۔ اتنی تتی کہ بھڑاس

نکلے ہے پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی ۔ پروے نکلے نہیں تھی ۔ جلی پاتھی کی طرحیوں اوپر سے کالی سوا ۔ نیچے لال انگارہ ۔ اب تو لال انگارہ اوپر ہووے ہے ۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی کدی مال بھیتر چُھپا کر رکھیں ہیں ۔ کدی باہر سجا کر رکھیں ہیں ۔

سارا دن ماں اپنے بنے سجے کمرے ماں ارام سے پڑا رہوں ہوں ۔ بس ایک تکلیف ہے ۔ اسمان نہیں دکھتا بچپنے سے اک عادت پڑی وی ہے کہ اسمان دکھتا رہے جو اسمان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے پتہ نہیں کیوں ۔ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے دوجے جندگانی بند بند نہیں لگے ہے ۔ پھر یہ بھی کہ اسمان دکھے ہے تو اسمان والا بھی دُور نہیں لگے ہے ۔ جیسے نیڑے نیڑے ہو ۔ پاس ہو ، ساتھ ہو ۔ اک تسلی سی رہے ہے ۔ جندگی میں کیا چئیے ۔ بس اک تسلی ۔ اور کیا ۔

اس کمرے ماں اسمان نہیں دکھے ہے ۔ بس یہی ایک تکلیف ہے ۔ بڑی تکلیف ہے پھر دروجے ہیں ۔ ساری عُمر کھلے دروجوں ماں بتائی ۔ پر اس کمرے کے دروجے بند ہی رہیں ہیں کھلتے تو ہیں پر کُھل کے نہیں دیتے ۔ پھٹ سے بند ہو جائیں ہیں آپ ہی آپ پھر دروجوں پر پردے پڑے رہیں ہیں ۔ یہ سیسے کا ہے یہ جالی کا یہ گرّل کا یہ کپڑے کا ۔ پردے ہی پردے ، پردے ہی پردے ۔ بھلا اسمان کیسے نجر آئے ۔ بس جمین ہی جمین دکھے ہے وہ بھی بنی سجی گلیچے والی ۔ مٹی والی دھرتی نہیں دکھتی ، بوٹے نہیں دکھتے ۔ ویسے بوٹے تو بہت ہیں بنگلے ماں ۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے ۔ پر سبھی سجاوٹی ۔ گملوں والے ۔ دھرتی والے نہیں ۔

چلو اسمان نہیں دکھتا تو نہ سہی اتنی سی بات سے کانٹا تو نہیں لگتا ناول ماں ۔ پھر ڈاکدار کیوں کہے ہے کانٹا لگ گیا ہے ۔ بھیا ، کانٹا تو دکھ میں لگے ہے سکھ ماں تو نہیں لگے ماں تو یہاں سکھ میں پڑا ہوں ۔ سمجھ کر لو جس طرحیوں گری بدام میں پڑی ہووے ہے ۔ پھر کانٹا کیسا ۔

ہاں ایک بات جرور ہے ۔ نجر دھندلا گئی ہے ۔ منے یہ بات ڈاکدار کو نہیں بتائی ۔ جو بتا دیتا تو وہ پچھتا پتہ نہیں کیا کیا پچھتا ۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات

جو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا ۔ ماں تو کھد نہیں سمجھ پایا باجوؤں کی بات کو ۔ پھر بھلا وے کیسے سمجھاتا ۔ منے تو اپنے پتر شیدے سے نہیں کری یہ بات ۔ بھلا بتاؤ جس بات کا نہ سر ہو نہ پیر وے کون سمجھائے ۔ کون سمجھے ۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات ۔ باجوؤں کا تو جمانہ ہی نہیں رہا ۔ وہ تو کدے کھتم ہو گیا ۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے ۔ وہ تو گلے کا ہار بنے وے ہیں ۔ اب وہ پُرانے جمانے کے باجو کہاں ۔ اب تو کھالی جسم رہ گیا ہے ۔ تیکھا ۔ تنڑاوا ۔ یوں جیسے تیر کمان پہ چڑھا ہو ۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا ۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا سدا کا ہے بھائی ۔ ہمیش جب جب رہا اور اب اب ۔ نہ کدی جب اب ہوا نہ اب جب ۔ دونوں ماں پھاصلا ای رہا ۔ اب تو یہ پھاصلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے ۔ دناں ماں صدیاں کا پھرق پڑتا جاوے ہے ۔

ہاں تو نجر کی بات کر ریا تھا ماں ۔ اپنی نجر دھندلائے کچھ جیادہ دیر بھی نہیں ہوئی یہی چار ایک مہینے ہوئے ہوں گے ۔ نہیں بھئی دکھنے ماں تو پھرق نہیں آیا ۔ سب کچھ دکھے ہے ۔ ٹھیک ٹھاک دکھے ہے ۔ کمرے کی تانکیاں دکھیں ہیں ۔ دروجے دکھیں ہیں پردے دکھے ہیں ۔ کونچ دکھے ہے ۔ کمرے کی تانکیاں دکھیں ہیں ۔ دروجے دکھیں ہیں پردے دکھے ہیں ۔ کونچ دکھے ہے ۔ میج دکھے ہے ۔ سب چیجیں دکھیں ہیں ۔ صاف دکھیں ہیں ۔ کوئی چیج نہیں دھندلائی ۔ صرپھ نجر دھندلائی ہے ۔ یوں کہ کھوامکھواہ کی چیجیں دکھنے لگی ہیں ۔ وہ بھی بہتی نہیں ۔ صرپھ دو باجو ۔

دو باجو میرے کمرے ماں گھس آئے ہیں ۔ وہ میرے آسے پاسے یوں گھومیں پھریں ہیں جیسے سربت کی بوتل کے گرد مکھیاں ۔

پہلے دنا جد مینے باجوؤں کو دیکھا تو ماں تو گھبرا گیا ۔ ایمان سے رات کا وخت تھا ۔ بشیرا کھانساماں آیا ۔ وسنے روٹی میج پر رکھ دی ۔ اس وخت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا ۔ منے سوچا چلو کھا لو چودھری فضلے دو بُرکیاں پھر ارام سے حقہ پیوں گا ۔

حقہ مُجھے بہت پیارا ہے ۔ سمجھ کر لو یہی اک ساتھی رہ گیا ہے پُرانے دناں کا ۔ میرے پاس بیٹھ کر رات گے توڑی مجھ سے باتاں کرتا رہے ہے ۔ اپنی کہے ہے میری سنے ہے ۔ گھر ماں کسی کو میرا حقہ پسند نہیں کھانساماں اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے ۔ ماں کُھد ہی تاجا کروں ہوں کھد ہی چلم بھروں ہوں ۔ بہو تو کہے ہے ۔ ہئے بو ، بو ، بو لے جاؤ اسے یہاں سے مجھے نجر نہ آئے ۔ شیدے نے منہ کھول کر کدی نہیں کہا کچھ ۔ آنے بہانے بہت کچھ کہا کہنے لگا بابا سگرٹ کا بڑا ڈبہ منگوا دوں کدی حقہ نہ بھرا سگرٹ پی لیا ۔ اک روج وہ لے بھی آیا بڑا ڈبہ جس ماں ڈبیاں تھیں میرے کمرے میں چھوڑ گیا وے ۔ مہینہ بھر پڑا رہا یہاں جوں کا توں بند کا بند ۔ منے منہ نہ لگایا ۔ کیسے لگاتا ۔ بھائی کہاں گونگا چرٹ کہاں باتاں کرنے والا حقہ ۔ ماں اپنے دکھ سکھ کے ساتھی کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا ۔ ایک ہی تو ساتھی ہے اپنا اس بھرے گھر ماں ۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر ریا تھا ۔ منے سوچا چودہری فضلے کھالے دو برکیاں پھر ارام سے بیٹھ کر حقہ پیئیں گے ۔ لو جی ماں میج پر جا بیٹھا ۔ روٹی والا رمال کھو لیا پتہ نہیں دوباجو کہاں سے تیرتے وے آئے ۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وس نے پلیٹاں سے روٹی اُٹھا کر میرے ہتھ ماں تھما دی ۔ ماں تو دیکھتا ہی رہ گیا ۔ حریان ۔ پھر وہ باجو میرے آسے پاسے ہی رہے ۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں نے پکڑ کر سامنے رکھ دی ۔ پانی پینے لگا تو گلاس ہتھ ماں پکڑا دیا ۔ ماں تو حریان ۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔

بس اس روج سے آج توڑی یہی ہو ریا ہے ۔ دن رات اندھیرے سویرے ۔ سر بھارا بھارا ہو تو انگلیاں پٹپٹیاں سہلاوےس ہیں ۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دباوےس ہیں ۔ اُٹھتا ہوں تو باجو سہارا دیوےس ہیں ۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جوتا سامنے رکھ دیوےس ہیں دروجہ کھولیں ہیں ۔ قدم قدم پر سنبھالا دیوےس ہیں ۔

پہلے تو ماں سمجھیا سٹھیا گیا ہوں ۔ جہن گڈ مڈ ہو گیا ہے نجر تماسے کھیل رہی ہے پھر سوچ سوچ کر ماں نے کہا چودھری فضلے یو بات نہیں نہ تو جہن ڈھنڈلایا ہے نہ نجر یہ کچھ اور ہی بات ہے ۔ سوچتا ریا دیکھتا ریا ۔ باجو چنے

نہیں گورے نہیں بدامی ہیں ۔ بھرے بھرے ۔ سوکھے نہیں ۔ بنے سجے نہیں جیسے آج کل ہووہ‌س ہیں نہ رنگ دار نہ ریسمیں نہ ملیم ۔ پر ہیں صاف ستھرے ورسنی نہیں کامی ہیں ۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں ۔ بھنڈیوں کی طرحیوں نہیں ۔ نہ کولیاں نہ پتلی پتنگ ، نخون بڑھے وے نہیں چھریوں کی طرحیوں ۔ کٹے وے ہیں ۔ رنگ دار نہیں ساد مرادے ہیں ۔ یو باجو آج کل کے باجو نہیں ۔ چھیڑتے نہیں سنبھالتے ہیں ۔ ڈولتے نہیں سہارا دیوہ‌س ہیں ۔ دکھنے والے نہیں کامی ہیں ۔ تو بھائی ماں دیکھتا رہا دیکھتا رہا ۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پچھانے ہوں ۔ دیکھن ماں تنے پرورتن ماں جانے پچھانے میرے آسے پاسے ہوا ماں تیرہ‌س ہیں تو ان جانے دکھیں ہیں ۔ سروباوہ‌س ہیں ۔ سہارا دیوہ‌س ہیں تو جانے لگیں ہیں ۔

پھر اک دنا بھید کھل گیا ۔

میری نجر باجو کی کنی پر جاپڑی ۔ پھوڑے کا اتنا بڑا نسان ۔۔ ارے یو تو سکو کے باجو ہیں ۔

پھر ماں سوچن لگا ۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سکو کے باجو دکھنے لگے ہیں ۔ کیا تجھے وس سے موحوبت تو نہیں ہوگئی ۔۔۔ پھر ماں کھد ہی ہنس پڑا ۔ یہ موحوبت کی بات بھی ایک رہی ۔ چودہری فضلے جندگی کے تیہہ ورے تو نے سکو کے ساتھ گجار دئے ۔ تیہہ ورے ، پر تجھے وس سے موحوبت نہ ہوئی اور اب جدا سے مرے وے پنج ورے ہوگئے ہیں اب کیا تجھے وس سے موحوبت ہوگئی ہے اس پر ماں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ آنکھوں ماں آنسو آگئے ۔

اور پھر سکو سے موحوبت ۔ سکو سے کیسے موحوبت ہو سکے ہے بھلا ۔ سکو تو باجو ہی باجو تھی ۔ خالی باجوؤں سے کون موحوبت کر سکے ہے بھلا ۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی ٹکڑی سجائی نہ لشکائی نہ ہی سامنے دھری ۔ منے بھی کدی منہ کی طرپھ دھیان نہ دیا ۔

ویسے سکو کا منہ بھی تھا متھا بھی تھا اور جو بنا تو بڑے جور کا تھا ۔ تیکھا ۔ کانٹے کی طرحیوں چبھنے والا ۔ چھیل دیوے تھا ۔ پر وسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا ۔ ہمیش یوں جیسے چوری کی چیج ہو ۔ وسنے تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا ۔

سب کچھ ۔ بس اک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے ۔

سارا گھر وسکے باجوؤں سے بھرا رہے تھا ۔ ادہر وہ کپڑے دھورہے ہیں ادہر بھانڈے مانج رہے ہیں پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں ۔ چاٹی کے گرد گھوم رہے ہیں ۔ آٹا گوندھ رہے ہیں ۔ بلوہنی سے چمٹے وے ہیں ۔ مُجھ دوھ رہے ہیں کتاوا کر رہے ہیں ۔ سبجی بنا رہے ہیں ۔ ماں کھیت ماں بیٹھا روٹی کھاریا ہوں وے پنکھا کررہے ہیں ۔ ماں حُقہ پی رہا ہوں وے ٹوپی ماں تاجہ انگارے رکھ رہے ہیں ۔ ماں تھک گیا ہوں وے مٹھیاں بھر رہے ہیں ۔

تیہہ ورے میرا گھر ان باجوؤں سے بھرا رہا ۔ اور صرپھ گھر ہی نہیں میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے ۔

سگو ماں جنائی بھی تھی یو نہیں کہ کھالی باہاں ای باہاں تھیں ۔ یوں سمجھ کر لو کہ وہ آلو کا بوٹا تھی ۔

جنائی بھیتر تھی ۔ باہر باہیں لہلہائیں تھیں ۔ آج کل کی جنائی تو دھنیا ہووے ہے سب باہر ہی باہر ۔ اور پھر دُور دور تک مشک مارے ہے ۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی ۔ کدی مُشک لکونے کا جانہ کدی مُشک مارنے کا ۔

کدی کدی سگو کی جنائی بولا بھی کرے تھی ۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں ۔ جُھکی نجر سے چلتے چلتے ۔ کہتی رے بہت بھارا ہوگیا ہے میرا پنڈا اسے ہولا کردے ۔

کدی کدے کہے تھے یو بات ۔ دوچار مہینوں ماں اک ادھ واری ۔ کدی ماں کہہ دیتا ہنس کر ۔ ری تو تو بھاری ہو رہی دکھے ہے اور وہ مسکا کر نجر نیچی کر لیتی ۔

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے ماں بھی لٹا پٹا اکیلا پُلاں والے پہنچا تھا ۔ وہ بھی روئی رلی وی بے سہارا پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی تقدیر نے جوڑ ملا دیا ۔ گاؤں کے چودہری نے تھوڑی سی جمین دے دی اک ٹوٹا پھوٹا گھر دے دیا پھر ماں ہل پر جُت گیا ۔ وس نے باجونکال لیئے ۔ جتنی ویہڑے کی دھریک نے ٹہنیاں نکالیں وتنی سگو نے باہیں نکالیں ۔ دھریک نے ویہڑے پر چھاؤں کردی گھر میں سگو کے باجوؤں نے لہر بہر کردی ۔ کھیت ماں

پیدا بڑھی تو مجھ لے لی گھر ماں دودھ دہی کی دہاراں چلنے لگیں ۔ وسنے صرپھ ایک پتر دیا شیدا ۔ وہ بھی اتنا لیق فیق کہ جس مدرسے ماں گیا وجیفہ لیا ۔ ماشٹر نے کہا چودہری تیرا پتر بڑا صیب بنے گا ۔ سو بن گیا ۔

پھر بھی وہ پہلے پہل کے دن بہت کٹھن تھے ۔ جو سکو کے باجو پتوار نہ بنتے تو ناؤ ڈولتی ہی رہتی پار نہ لگتی ۔ بڑی اونچ نیچ دیکھی اِن دِناں ۔ بڑی جورا جوری کرنی پڑی ۔ پر اب ماں سوچوں ہوں کہ مسکل کے دن ارام کے دناں سے اچھے ہووےس ہیں ۔ اونچ نیچ کی لہریں چلتی رہیں تو جندگی ماں حرکت برکت رہے ہے ۔ کھالی ارام تو لوہے کو بھی جنگ لگا دے ہے ۔

ان دناں جد ماں سام کے وخت اسمان تلے بیٹھ کر حقہ پیتے وے کھیت کو دیکھتا تو جی کھش ہو جاتا ۔ گھر کو تو سکو کے باجوؤں نے میرے لئیے تخت بنا رکھا تھا ۔ اور میری پگڑی پر طرہ لہرا رکھا تھا ۔ اتنی عجت تھی گاؤں ماں ۔

کدی کدی اسمان تلے بیٹھے وے اوپر سے اک اواج سی آتی ۔ چودہری فضلے کچھ اور چئیے تو مانگ لے اور ماں ہنستا ۔ کیوں مکھول کرے ہے رے ۔ باجوؤں کے تخت پر بٹھا دیا ۔ پگ پر طرہ لہرا دیا ۔ پتر کو بڑا صیب بنا دیا ۔ اب اور کیا مانگوں ۔

پھر ایک دنا بیٹھے بٹھائے سکو پھوت ہو گئی ۔ کلیجے ماں پیڑ اُٹھی ۔ باہیں اُٹھا کر بولی رے پکڑ لے رے مجھے ۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دئیے کھلے بندوں ۔ پھر اک ہچکی لی اور ٹھنڈی ہو گئی ۔

پھر شیدا گاؤں آیا ماں کو وہیں ٹِلاں والے ماں دفنا دیا اور مجھے جبر دستی اِدھر لے آیا ۔ اپنے بنگلے ماں ۔

ہائیں یہ دروجہ کیوں بجا ۔ کون ہے رے دروجے پر

میں ہوں بڑے چودہری جی بشیرا ۔ خانساماں نے جواب دیا ۔

تو اندر آجانا ۔۔۔ بول کیا بات ہے ۔

صاحب کا فون آیا ہے جی دفتر سے ۔ بشیرے نے جواب دیا ۔

کیا کہے ہے وہ تیرا صیب ۔

صاحب کہتے ہیں بڑے چودہری صاحب سے بولو کہ تیار ہو جائیں ۔ بستر

باندھ لیں سوٹ کیس میں کپڑے رکھ لیں ۔ ابھی ابھی صاحب کے ساتھ گاڑی میں جانا ہے ۔

کہاں جانا ہے رے ۔ چودہری فضلے نے پوچھا ۔

جی پُلاں والے جانا ہے ۔

پُلاں والے ۔

جی صاحب بولتے ہیں شاید وہاں ایک دو مہینے رہنا پڑے اس لئے مالی رحیماں ساتھ جائے گا ۔

پر کس لئے ۔ یو بھی تو بتانا ۔

پُلاں والے سے خبر آئی ہے کہ وہاں سیلاب آیا تھا چودہرانی کی قبر بہہ گئی ہے میت باہر نکل آئی ہے ۔

ہائیں میت باہر نکل آئی ہے ۔

میت کے دونوں بازو کٹ کر بہہ گئے ہیں ۔ ان کی ڈھونڈ کرنی ہوگی ۔ قبر پھر سے بنوانی پڑے گی ۔

باجوؤں کی ڈھونڈ کرنی ہوگی چودہری نے دہرایا پر باجو تو ۔۔ چودہری نے کُچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر دفعتاً وہ یوں چُپ ہو گیا جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو ۔

.......○.......

سیوا کارن مسکرائی بولی بھگوان کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے بانورے ۔

سیوا کارن جانے لگی تو مائی بھاگی دوڑی آئی بولی دیوی کے چاتری پُہنچتے ہیں اور مندر کی کوٹھڑیاں کم ۔ انہیں کیسے ٹھکانہ دوں ۔

جیسے کیسے پورن کردے بھاگی ۔ سیوا کارن نے جواب دیا ۔ بس ایک بات کا دھیان رکھیو کہ مندر میں کوئی نہ سوئے اور تپسّنی مہلمان کی کوٹھڑی میں کوئی پاؤں نہ دھرے ۔

وہاں کون پاؤں دھر سکتا ہے بھلا ۔ بانورہ بولا ۔ مہلمان کی کوٹھڑی تو سدا بند رہتی ہے ۔ اندر سے کُنڈی لگی رہتی ہے ۔

سیوا کارن پھر سوچ میں پڑگئی ۔۔ اسے چُپ لگ گئی دیر تک مائی بھاگی اس کا منہ تکتی رہی ۔ پھر سیوا کارن گویا اپنے آپ سے بولی ہاں کنڈی کا بھید نہ جانے کب تک رہے گا ۔ جیون بھر تپسّنی مہلمان نے اندر سے کنڈی لگائے رکھی ۔ پھر جب مرن بعد اس کی ارتھی اُٹھانے گئے تو دیکھا کہ پھر اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے ۔

کیاکہا مرن کے بعد اندر سے کُنڈی کس نے لگائی ۔ بانورہ بولا ۔

کون جانے ۔ سیوا کارن نے مدہم آواز میں خود سے کہا ۔ گرو دیو کا کہنا ہے کہ تپسّنی مہلمان کے مرن جیون کا بھید آج تک نہیں کُھلا ۔

ہے بھگوان ۔ بھاگی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے ۔

سیوا کارن نے کہا پرنتو جوتش والوں کا کہنا ہے کہ کلجگ میں کسی پورن ماشی کو یہ بھید ضرور کُھلے گا ۔ کُھل کر رہے گا ۔ گرودیو کہتے ہیں ۔ ہاں مہلمان کے ابھاگ کا چکر اک دن ضرور ٹوٹے گا پھر اسے شانتی مل جائے گی ۔

سچ ہے سیوا کارن جی ۔ بھاگی بولی ۔ اب بھی کئی بار آدھی رات کے سمے مندر سے مہلمان کے بھجن کی آواز آتی ہے ۔

کُھل بندھنا ۔ بندھ دے ۔ کُھل بندھنا'۔

ہائیں یہ کیسے بول ہیں ۔ بانورہ بولا جو دیوی بندھن کھولے ہے ۔ اس کے چرنوں میں بیٹھ کر بندھ دے کی پرارتھنا کرنا ۔ ہرے رام، ہرے رام، ہرے رام، ۔

سیوا کارن کو پھر چُپ لگ گئی ۔

اس وقت سورج مغرب میں یوں غروب ہو رہا تھا جیسے مندر پر رنگ پچکاریاں چلا رہا ہو ۔

مندر کے پرلے سرے پر گھنے بوھڑ کے درخت کے لمبے سائے میں بیٹھا شام مراری بانسری پر کلیان بجا رہا تھا ۔ بادلوں میں آگ لگی ہوئی تھی دُور ان پورنا کے گاؤں میں کوئی چکی کراہ کراہ کر تال دے رہی تھی ۔

عین اس سمے مندر سے کھڑ کھڑ ہنسی کی آواز سُنائی دی ۔

وہ سب چونک اُٹھے ہائیں یہ کیا ۔

یہ کیسی آواز ہے ۔ سیوا کارن نے پوچھا ۔

یہ چاتری ہیں ۔ دیوی بھاگی بولی ۔ دیوی کُھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں ۔

بانورہ ہنسا کہنے لگا ان آج کل کی چھوکریوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے بندھن کیا ہووے ہے ۔ جیون کیا ہووے ہے ۔

مندر سے ہنسی کا ایک اور ریلا اُٹھا ۔

کانتا کا منہ غصّے سے لال ہو رہا تھا ۔ بولی یہ ہنسنے کی بات نہیں رونے کی ہے ۔ یہ سارے شبد دیوی ، رانی ، استری، شریمتی ، عورت وومن سب جھوٹے ہیں ۔

تو پھر سچا لفظ کون سا ہے ۔ کوشلیا نے پوچھا ۔

کانتا بولی میری طرف دیکھو ۔ میں نہ دیوی ہوں نہ شریمتی ہوں نہ وومن ہوں ۔ میں اک باندی ہوں باندی اے سلیو صرف میں ہی نہیں تم ہم سب وی آر آل سلیوز ۔ سلیوز!

سچ کہتی ہے کنول بولی ۔ ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں ۔ ہم اپنے مالکوں کو خوش وقتی دیتی ہیں ۔ اے مومنٹ آف جائے ۔ اے مومنٹ آف اکسائیٹمنٹ ۔ ایک لذّت کا لمحہ ۔ وقتی چٹخارہ اور بس ۔

نہ ابلا ایسا نہ کہو ، دیہاتن بولی ۔ ناری داسی نہیں مالکن ہوتی ہے ۔
کھی کھی کھی ۔ کنول تمسخر سے ہنسی ۔
مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو داسی نہیں بلکہ مالکن ہے ۔ کانتا نے پوچھا ۔
میں ہوں میں ، دیہاتن نے فخر سے سر اُٹھاکر کہا ۔ میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں مُسکا کر دیکھوں تو وہ لہلہا اُٹھے ہے ۔ گھوری دکھاؤں تو مُرجھا کر گر پڑے ہے سوکھ جائے ہے ۔
جو ایسا ہے کانتا نے غصّے میں کہا 'تو تُو کھل بندھنا دیوی کی پورن ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟'
یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں ۔ کوشلیا نے وضاحت کی ۔ تو کون سا بندھن کھلوانے آئی ہے ۔
سچ کہو ہو ابلا ، سچ کہو ہو ۔ دیہاتن نے جواب دیا ۔ میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں پڑی ۔ ساس کے من میں پڑی ہے ۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھاوے ہے جتنا پتی چاہے ہے اتنا ہی ساس جلے ہے ۔ بِس گھولے ہے ۔ اپنے پُتر کو مجھے راسن کرکے دیوے ہے ۔
اُدھر وہ تڑپے ہے ادہر میں تڑپوں ہوں ۔ بیچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے ہے بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے ۔ کیا پتہ اس پورن ماشی میں دیوی کُھل بندھنا میرا یہ بندھن کھول دے ۔ وہ ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ جے ہو دیوی کُھل بندھنا کی ۔
کھی کھی کھی ۔ کنول ہنسی ۔ بھولی عورت یہ جو ساس نند ہیں یہ تو پتی کے ویہڑے کے چاند ہیں ۔ ان کی اپنی روشنی نہیں ۔ مانگے کی ہے ۔ پتی مہاراج کی دین ہے ۔ سارا چمتکار سورج مہاراج کا ہے ۔ چاہے تو ساس کا چاند چمکا کر بہو کے سر پر لٹکادے ۔ چاہے تو نند کا ہانڈا جلا کر بھاوج کی آنکھیں چُندھیا دے ۔
سچ کہتی ہو ۔ سُندری بولی ۔ سب کھیل مداری کا ہے ۔ چاہے تو بندریا نچاوے چاہے تو مینا سے ٹیں ٹیں کرا دے ۔

کانتا سنجیدہ ہو کر بولی ۔ پگلی ساس تند تو پُتلیاں ہیں ۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ڈوری ہے جیسے چاہے نچادے ۔ بچارے مات پتا کا کیا دوش ۔

مات پتا سیتے کے ماتھے پر گھوری تن گئی ۔ سکھیو عورت کا کوئی بھی اپنا نہیں ، نہ بھائی بہن نہ مات پتا ۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کا کوئی پتوار نہیں ۔ بس ڈولن ہی ڈولن ہے جیون بھر کا ڈولن ۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ پھر ایک ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی ۔

تیری پپتا کیا ہے ری ۔ سُندری نے پوچھا ۔

مت پوچھ ۔ شکنتلے چیخی ۔ دُکھیا کو نہ چھیڑ ۔ پھوڑے کو ہاتھ نہ لگا ۔

میری پپتا ۔ سیتے گنگنائی ۔ میں اک بکاؤ مال ہوں ۔ مات پتا مجھے دوبار بیچ چکے اب تیجی بار کے داؤ میں بیٹھے ہیں ۔ پہلے بیچتے ہیں ۔ پھر بسنے نہیں دیتے کہ پھر سے بیچ سکیں ۔

سیتے اُٹھ بیٹھی ۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر دیوی کی مُورتی کے سامنے کھڑی ہوگئی بولی ہے کُھل بندھنا دیوی ۔ بتا ۔ کیا میرے بھاگیہ میں بِکنا ہی لکھا ہے ۔ بول جو ایسا ہی ہے تو بتا کہ میں خود اپنے کو بیچوں ۔ کھلے بندوں بیچوں ۔ روج کے روج بیچوں ۔ مجھے یہ دُکھ تو نہ رہے کہ مات پِتا اپنی پیٹ جائی کو بکاؤ مال بنائے بیٹھے ہیں ۔

کنول اُٹھی اس نے سیتے کو کلاوے میں بھر لیا ۔ بولی جی بُرا نہ کر بہنا ۔ اک تو ہی نہیں ۔ ہم سب بکاؤ مال ہیں ۔ کوئی خود کو اک ہی مرد کے ہاتھ روز کے روز بیچتی ہے ۔ کوئی رنگ رنگ کے پرش کے ہاتھ بکتی ہے ۔

کیا فرق پڑتا ہے کانتا نے کہا ۔ ایک کے ہاتھ بار بار بکو یا ہر رات نئے گاہک کے ہاتھ بِکو بِکنا ہمارا بھاگیہ ہے ۔ کتنا بڑا بندھن ہے ۔

صرف ایک نہیں ۔ بندھن ہی بندھن ہیں ۔ کنول غصے میں چلائی ۔

اُٹھو بہنا سب بندھن توڑ دو ۔ اپنی ہمت سے توڑو ۔ شکنتلے چلائی ۔ ایک بھی باقی نہ رہے ۔ یہ پتھر کی دیوی کُھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی ۔

ہوش کرو لڑکیو ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ۔ مائی بھاگی بات کئے بغیر نہ رہ سکی ۔ مندر میں کُھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک

رات پہلے دیوی کے خِلاف اپنے من میں بِس گھول رہی ہو ۔

کیوں نہ بس گھولیں ۔ کانتا بولی ۔ ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لئے آئی ہیں کہ پروٹسٹ کریں کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ بندھنوں نے عورت کا بند بند لہولہان کر رکھا ہے ۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی ۔

نہ نہ نہ نہ ۔ بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں ۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑگیا ۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں ۔ نہ نہ نہ نہ وہ بولی ۔ دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منت کرو ۔ کوئی ایک بندھن ۔ پرنتو وہ باہر کا بندھن ہو بھیتر کا نہیں ۔ جو تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرارتھنا کی تو ۔۔ نہ نہ نہ نہ ایسا نہ کرو ۔ جو دیوی نے تمہاری سُن لی تو ۔۔ تو کیا ہو گا ۔

ایک ساعت کے لئے سب ڈر گئیں ۔

کیا مطلب ، کنول نے ہمت کر کے پوچھا ۔

جو باہر بھیتر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو ۔۔ بھاگی نے خوف زدہ ہوکر کہا ۔

ٹوٹ گئے تو ۔۔۔ سبھی بوکھلا سی گئیں تو کیا ۔

تو تم بھی مہلمان کے سمان ہو جاؤ گی ۔۔ بھاگی رُک گئی جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو ۔

مہلمان کے سمان ۔ سب نے دُہرایا ۔

عین اس وقت سیوا کارن کی آواز سنائی دی ۔ بھاگی ۔

آواز سُن کر بھاگی جیسے جاگ اُٹھی ۔ طلسم ٹوٹ گیا ۔ شرمندہ سی ہوگئی ۔ دانتوں میں زبان دیئے بھاگی ۔

اس کے جانے کے بعد کُچھ دیر خاموشی طاری رہی ۔ پھر کنول بولی ۔ یہ کون تھی ۔

کوئی مندر کی ہے ۔

کیا کہہ رہی تھی ۔

پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی ۔

بے جوڑ باتیں کر رہی تھی ۔

دیہاتن بولی ۔ کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کردی ۔ سارے بندھن کھول دیئے پھر کیا کرو گی ۔

نانسنس ۔ کانتا نے ناک چڑھائی ۔

مجھے یہ مندر وندر دیوی دیوی ۔ سب پاکھنڈ معلوم ہوتا ہے ۔ پیلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی ۔

جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو ۔ کنول نے پوچھا ۔

چاندی کے رسے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں ۔ پیلی ساڑھی والی نے کہا ۔

کیا واقعی رسہ کھلتا ہے ۔

کہتے ہیں یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھو کر سوکھنے کے بعد بال کھلتے ہیں ۔

پیلی ساڑھی والی اُٹھی ۔ بولی سب پاکھنڈ ہے نہ پرارتھنا سے کچھ ہوگا نہ ماتھا ٹیکنے سے ، نہ منتوں ترلوں سے اگر اس سدا کی غلامی سے نجات پانا ہے تو اُٹھو جدوجہد کرو ۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں ۔

بالکل بالکل چاروں طرف سے شور مچ گیا ۔

شہر سے دُور شاہراہ سے دُور ، شوالک پہاڑیوں میں الجھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے ۔ ان پورنا ۔ اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پُرانا مندر ہے جسے کُھل بندھنا کا مندر کہتے ہیں ۔ یہ مندر اتنا پُرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا ۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں ۔ نہ مندر کا مخروطی گُنبد نہ کلس ۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے ہال کمرے کے درمیان میں ایک چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قدِ آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدوخال وقت کی خردبرد کی وجہ سے گِھسے پِٹے ہوئے ہیں صرف آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور ترچھی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس

ہوتی ہیں جیسے کشتیاں ہوں ۔ دیوی کے قریب ہی ایک موٹا سا چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو بٹ کر بنایا گیا ہے ۔

ہال کمرے کے اردگرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن کے اردگرد ایک چھوٹا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا ہے دیکھنے میں ایسے لگتا ہے جیسے وہ مندر نہیں بُدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو ۔

پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارات دیوی کُھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے ۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصلی نام کیا ہے ۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے ۔

ہر سال بیساکھ کی پورن ماشی کے دن اردگرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کے آگے سیس نوانے کے لئے آتی ہیں ۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لئے پرارتھنا کرتی ہے ۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہاہا کار مچاتی ہے ۔ کوئی ساس تند کے کرودھ کھولنے کی بنتی کرتی ہے ۔ کوئی اولاد کی روک کا رونا روتی ہے ۔

پورن ماشی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے ۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے ۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ یاتری ورت لے شروع ہوتی ہے ۔

'دیوی ، کُھل بندھنا'

اس پر سارے یاتری اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ دل پر وجدان طاری ہوجائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں ۔ کوئی برملا ۔ کوئی گپت ۔ جب یہ رقص اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے ۔ یوں جیسے آکاش سے گھنگھرو گرے ہوں ۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھمک ٹھمک گھنگھرو بندھے پاؤں قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آکر رُک جاتے ہیں ۔

عین اس وقت مندر کا مہامنتری سنکھ بجاتا ہے ۔ سنکھ کی آواز سُن کر پھر

سے کُھل بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے ۔ سنکھ روتا ہے ڈھولک سر پیٹتی ہے
اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ وزاری کرتے ہیں ۔
عین اس وقت سیوا کارن جوگیا دھوتی میں ملبوس موتیے کے ہار لپیٹے دیوی
کے گرد گھومنے لگتی ہے ۔ تیز ۔ تیز ۔ اور تیز ۔ ۔ ۔ ساتھ ہی چھت سے لٹکا
ہوا چاندی کا رسّہ جھومنے لگتا ہے ۔ اس جھولن جھومن میں رسّے کے بل کُھلنے
لگتے ہیں ۔ کُھلتے جاتے ہیں ۔ حتّٰی کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے
لگتی ہیں جیسے کسی مٹیار نے سکھانے کے لئے بال کھول رکھے ہوں ۔
یہی دیوی کا معجزہ ہے ۔ اسی لئے دیوی کا نام کُھل بندھنا مشہور ہے ۔

ساری جاتریاں ایک ایک کرکے مندر سے جا چکی تھیں ۔ صرف کانتا، کنول
اور سیتے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں بندھی بیٹھی تھیں کہ مندر
کی گھنٹی بجی ۔ وہ تینوں چونکیں ان کے سامنے سیوا کارن کھڑی تھی ۔ بولی مندر
کے دوار بند کرنے کا سمے ہوگیا ۔ اب تم اپنا ٹھکانہ کر لو ۔
کہاں ہے ہمارا ٹھکانہ ۔ کنول نے پوچھا ۔
جس کوٹھڑی میں بھی جگہ ملے ۔
اور جو کوٹھڑیوں کے دروازے بند ہوئے تو ۔۔ کانتا نے پوچھا ۔
تو کھٹکھٹاؤ ۔۔ مندر میں کوئی رات بھر نہیں رہ سکتا ۔ دیوی کی یہی آگیا
ہے ۔
جب وہ مندر سے باہر نکلیں اور ایک نظر لمبے برآمدے پر ڈالی تو سیتے
بولی ۔ سب کوٹھڑیوں کے کواڑ بند ہیں ۔ کیسے کھٹکھٹائیں ۔
باری باری سب کو بجا دو ۔ کنول نے کہا ۔
عین اس وقت برآمدے کے درمیان کی کوٹھڑی کا دروازہ چوں کرکے آپ
ہی آپ کُھل گیا ۔ اندر سے دیئے کی مدہم روشنی باہر آنے لگی ۔
اُنہوں نے کُھلے کواڑ سے اندر جھانکا ۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی ۔ فرش پر
سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی ۔ دیوار کے آلے میں اک دیا ٹمٹما رہا تھا ۔
جب وہ لیٹنے لگیں تو سیتے نے ڈر کر چیخ سی ماری ۔ وہ دیکھو ۔ وہ ۔

محراب کے پیچھے کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر کوئی کالی چادر لپیٹے سو رہا تھا۔

کون ہے یہ۔ سیتے نے پوچھا۔

کوئی ہوگی۔ کانتا نے بے پرواہی سے کہا۔

آج تو ساری کوٹھڑیاں بھری ہوئی ہیں۔ کنول بولی۔

کنول۔ کانتا نے کہا۔ یہ مہلمان کون تھی جس کا ذکر مندر والے کر رہے تھے۔

وہی جس کے سارے بندھن کھل گئے تھے۔

یہ طوطا مینا کہانی تم مان گئیں کیا۔ سیتے نے کہا۔ سب جھوٹ ہے جھوٹ!

اوں ہوں۔ جھوٹ نہیں۔ کوٹھڑی کے پچھلے حصے سے بھاری بھر کم آواز آئی۔

وہ تینوں چونک اُٹھیں۔

تو کون ہے۔ سیتے نے بلند آواز سے پوچھا۔

میں ہی ہوں۔

اس کی آواز کو کیا ہے۔ کنول نے زیرِ لب پوچھا۔ عورت کی سی نہیں۔

رو رو کے میرا گلا رُندھ گیا ہے۔ کالی چادر والی نے کہا۔

تو مہلمان کو جانتی ہے کیا۔ کانتے نے پوچھا۔

جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔ کالی چادر والی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔

مہلمان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟

مہلمان کون تھی ؟

اس پر کیا بیتی ؟

کوئی کچھ نہ کچھ پوچھ رہی تھی۔

پھر کوٹھڑی پر خاموشی چھا گئی۔

دفعتاً کالی چادر والی بولی۔

مہلمان کے مات پتا نندر کوٹ کی ریاست میں رہتے تھے ۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا ۔ جب مہلمان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں اُمید کا دیا ٹمٹمایا کہ پُتری بڑی ہوگی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھینٹ کریں گے چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی ۔ جیون سُکھی ہو جاوے گا ۔

مہاراجہ کی بھینٹ ۔ کنول نے حیرت سے دُہرایا ۔

ہاں مہاراجہ کی بھینٹ ۔ ان دِنوں یہ رواج تھا ۔

ماں باپ سندر پُتریاں مہاراجہ کی بھینٹ کردیتے تھے ۔ مہاراج چار ایک روج کلی کارس چوستے ۔ پھر اسے پُرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراج کے نوکر چاکر پُھول کی پنکھڑیاں نوچتے اور پھر جب وہ ڈنٹھل بن جاتی تو کال کوٹھڑی میں دھکیل دیتے ۔ یہی ان دنوں کی رِیت تھی ۔

پُتری سُندر تھی ۔ مات پِتا نے اس کا نام شوبھا رکھ دیا ۔ کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا ۔

شوبھا کون ۔ سیتے گنگنائی ۔

وہی کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا جو مندر میں آکر تپسیا کرتے کرتے مہلمان بن گئی ۔ وہ تینوں چُپ چاپ بُت بنے بیٹھی تھیں ۔

مات پِتا نے شوبھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے گال چکنے ہو جائیں ۔ سینے پر سمندر جھاگ ملی کہ اُبل کر اُبھرے ۔ منہ پر دودھ کے چھینٹے دیئے کہ رس بھر جائے ۔ رانوں پر گھی کی مالشیں کیں کہ لچک بڑھے ۔ کمر پر کمربند کس دیا کہ ربٹ کے گیند کی طرحیوں اُبھر اُبھر کر جھٹکے ۔

توبہ ہے سیتے نے آہ بھری ۔

جب شوبھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پِتا نے چاہا تھا ۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑن تھی ۔

اڑن کیوں ، کنول نے پوچھا ۔

جب شوبھے کو پتہ چلا کہ اسے بھینٹ بنایا جارہا ہے تو اس کے من نے کہا میں سب کچھ بنوں گی ۔ پر بھینٹ نہ بنوں گی ۔ مجھے تھالی میں پروسن کر دو جے

کے سامنے نہ دھرا جائے میں کنیا ہوں ، کھاجا نہیں ہوں ۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اُسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں ۔ پھر وہ اسے مہاراج کی سیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراج ابھی آتے ہیں ۔

وہ وہاں سے اُٹھ بھاگی ۔ کھڑکی سے باہر نکلی ۔ پر نصیبے کا لکھا کون مٹا سکے ہے ۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیتر کے کواڑ میں سے ہوکر پُرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراج کے نوکر تاک میں بیٹھے تھے ۔

پتہ نہیں کتنے روج بھیڑیئے اسے بھنبھوڑتے رہے ۔ پر ایک دن وہ وہاں سے بھی نکل بھاگی ۔

پریم کا گریا جگہہ جگہہ سے ترخ چکی تھی ۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی اس لئے وہ سیدھی شارجا نائیکہ کے پاس پہنچی ۔ بولی لے نائیکہ مجھے بیچ اور کھا ۔ اپنی جھولی بھر ۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی ۔ کالی چادر والی خاموش ہوگئی ۔

دیر تک کوٹھڑی گم سُم رہی جیسے اوپر چُپ کا تنبو تنا ہو ۔ صرف دل دھک دھک کررہے تھے ۔ گردنیں باہر نکلی ہوئی تھیں ۔ سینوں کی نوکیں اُبھر کر کانٹے بن گئی تھیں ۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری ۔ بولی پھر شوبھا کا وہ چرچا ہوا وہ چرچا ہوا کہ مہاراج کے درباری بھی اس کے دوار پر کھڑے ہو کر انتجار کرنے لگے یہاں تک کہ اک دن مہاراج خود چوبارے پر آ پہنچے ۔

شوبھا کے پاس کیا نہ تھا ۔ پوشاکیں ، جیور، ہیرے جواہرات اور دھن ۔ دھن ہی دھن ۔ اوپر سے وہ پھول سمان کھلی تھی پر بھیتر میں ایک کانٹا لگا تھا ۔ سوچتی کتنی اپرادھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بوٹیاں تڑوائیں ، بکی پر مات پتا کو جاگیر نہ لینے دی ۔ ان کا سودا کھوٹا کر دیا ۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں ۔

اس کانٹے نے اس کے بھیتر کو لہولہان کردیا ۔ خود کو اپرادھن جانتے لگی تو پھر رہا نہ گیا ۔ گہنے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چوبارے سے نکل گئی ۔

مات پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لئے گاؤں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئے ۔ کالی چادر والی پھر رک گئی ۔

تینوں چھوکریاں یوں بیٹھی تھیں ۔ جیسے مایا اُتر گئی ہو ۔ استری ٹوٹ گئی ہو ۔ جیسے پاپڑ سے کڑاکا نکل گیا ہو ۔

شوبھا کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہوگئی ۔ کالی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھیگ گئی ہو ۔ دو سُریں اور گر گئی ہو ۔ کالی چادر والی پھر رک گئی ۔

پھر ۔۔ سیتے گھگیائی ۔

پھر ۔۔ کالی چادر والی نے دُہرایا ۔ پھر شوبھا کی نظر میں جیسے سب کچھ ۔ کچھ بھی نہیں ہو گیا ۔ دھن دولت بانٹ دی اور کُھل بندھنا کے دوار پر آمبیٹھی ۔ دیوی باہر کے بندھن تو ٹوٹ گئے ۔ بھیتر کے بھی کھول دے ۔ کالی چادر والی آہ بھر کر بولی ۔

بھیتر کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے ۔ اک یہ کہ اس نے مات پِتا کا اَپمان کیا تھا ۔

اور دوجا ۔۔۔ کانتا کے ہونٹ ہلے پر کالی چادر والی چُپ رہی ۔

پھر ۔۔ کنول کی آواز سنائی دی ۔ پر وہ بُت بنی بیٹھی رہی ۔ بیٹھی رہی ۔

پھر دُور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چونکی ۔ بولی سُنو سُنو دوجا بندھن آپ ہی بول پڑا ۔۔ اس کے من میں اک بالک روتا تھا، ممتا سر پیٹتی تھی ۔ چھاتیاں سر اُٹھا اُٹھا کر بین کرتی تھی ۔ وہ تھیلی تڑپتی تھی جہاں بالک آنا چاہے تھا ۔ من لہو کے آنسو روتا تھا ۔ جوں جوں بالک روتا ، توں توں شوبھا دیوی کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر بِنتی کرتی ۔ آدھی آدھی رات کے سمے دیوی کے بھجن گاتا ۔ دیوی ۔۔۔ کھل بندھنا ۔

اس نے اتنی تپسیا کی ۔ اتنی تپسیا کی کہ مہمان بن گئی ۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چرنوں میں سیس نوائے بیٹھی تھی تو مندر میں اک ہلکی آواز اُبھری 'چپ' اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور سارا مندر چُپ چُپ گنگنا رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر اس نے اُلٹا اپنی

مانگ کو دُہرانا شروع کردیا ۔ پھر ایک کرودھ بھری آواز اُبھری ۔ اندھی منگتی اپنی مانگ کو جان ۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی تو دیوی بولی استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے ۔ جو بھیتر کے بندھن بھی کُھل گئے تو استری استری نہ رہے گی ۔ یہ سُن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں ۔

دیوی بولی ۔ استری لیروں کے کھدو سمان ہوتی ہے ۔ لیریں نکال دو تو کھدو کہاں رہے گا ۔

وہ پھر بھی نہ سمجھی اُلٹی پھر سے بھجن رٹنے لگی ۔۔ دیوی کُھل بندھنا ۔ ناچ ناچ کر دیوی کو منانے لگی ۔

پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی "جا تیرے بھیتر کے بندھن کھل گئے"۔

اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آگیا ہو اور مہلمان گر پڑی ۔ کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اُٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی ۔

جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیتے بولی ، پھر کیا ہوا ۔

وہ رُک گئی ۔ پھر کیا ہوا ۔

ہاں ہاں پھر کیا ہوا ۔

پھر ۔۔۔ کالی چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اُٹھادی ۔۔۔ پھر یہ ہوا ۔۔۔ یہ

انہوں نے سر اُٹھاکر اس کی طرف دیکھا ۔ دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں ۔ ان کے سامنے پتہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی ۔ نہ وہ عورت تھی نہ مرد ۔

تینوں لڑکیوں نے خوف زدہ ہوکر منہ چھپالئے ۔

بھاگی نے سیوا کارن کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا ۔ سُن رہی ہو سیوا کارن سُن رہی ہو ۔ وہ دیوی کے چرنوں میں بھجن بھینٹ کر رہی ہے ۔

سیوا کارن بھاگی بھاگی باہر نکلی ۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں مہلمان کی کوٹھڑی کی کنڈی کھل گئی مجھے پتہ تھا کہ اک دن ابھاگنی کا چکر ٹوٹ جائے گا ۔ سیوا کارن تو سُن تو سہی ۔ بھاگی چلائی ۔

وہ سب سُننے لگیں ۔

کُھل بندھنا ۔ بندھ دے ۔

سُنا تو نے ۔ بھاگی چیخی ۔ مہامان نے بول بدل دیئے ۔ ہاں سیوا کارن بولی ۔ مہاجوگی کہتے تھے ایک دن آئے گا جد چاندی کا رستہ نہیں کھلے گا ۔

اے دیوی تیری جے ہو ۔

سیوا کارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے ۔ اندر کوئی گائے جا رہی تھی ۔

کُھل بندھنا ۔ بندھ دے ۔ کُھل بندھنا ۔

○

روغنی پتلے

شہر کا الیٹ شاپنگ سنٹر ۔۔۔۔ جس کی دیواریں شلف الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں جس کا بنا سجا فیکیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائینز سے مزین ہے ۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلو کلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں ! جو ان کے اردگرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں ۔ ۔ ۔ ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں ۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں ۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے ۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اَپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں ۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں ۔ غنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں لڑکیاں اپنی نمائش کے لئے آتی ہیں ۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں ۔ کھاک بیگمات گریس یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں ۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے ۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا ۔ زربفت سے گاڑھے تک ۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک ۔ سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک سب کچھ وہاں موجود ہے لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں ۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید و فروخت کرنی

ہو تو انہیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے ۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے ۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے ۔ ہونٹوں پر رضا مندی بھرا تبسّم کھدا ہے ۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لئے بے تاب ہوں ۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں ۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی ۔ "ہٹے مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں"۔ اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا ۔ "ہولڈ آن ڈارلنگ ، میری گود میں گرنا"۔

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں ۔ منی سکرٹ والی ، ساڑھی والی ، بیدنگ کاسٹیوم والی ، میکسی والی ، سی تھرو لباس والی ، لٹکتے بالوں والی ، پتلون والی ، ننگے پاؤں والی ، ہپن ، ٹوکرا بالوں والی ، انگلی سے لگے بچے والی ۔

ان کے ساتھ ساتھ پُتلے کھڑے ہیں شکاری جیکٹ والا ، دانشور ، موٹر سائیکل والا ، بلیک سوٹ ، اچکن ، ہپی ، کُرتے پاجامے والا ، سٹوڈنٹ ، ڈُنڈی ، مصوّر ۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے پرانی میزیں کُرسیاں شلف اور پتلے جن کا رنگ روغن اڑ چکا ہے

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں ۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے ۔

گھڑی نے دو بجائے ۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ پُتلوں نے آنکھیں کھول دیں ۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے

پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانکا۔ عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اُڑنے لگے۔

"مائی گاڈ" سی تھرو چلائی یہ دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔

کیوں نہ ہو بلیو بلڈ ہے۔ بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی۔ "ساغر کو مرے ہاتھ سے لیناکہ چلی میں"۔ سب کوک بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

"تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر"۔ کُرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

"اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تجھے"۔ جین والا ہنسا۔

"میں تو بور ہو گئی"۔ منی سکرٹ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

"کیوں مذاق کرتی ہو"۔ موٹر سائیکل نے گلیڈ آئی چمکائی۔

"تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے تم کیسے بور ہو سکتی ہو"۔

"کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے"۔ دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

"ہاں"۔ پہلوان نما کُرتے والے نے سراثبات میں ہلایا۔ "وہ تو مٹیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی اب تو کاٹھ ہی کاٹھ رہ گیا ہے"۔

"شٹ اَپ"۔ جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ "اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو"۔

"ابے مسٹر اچکن" اسٹوڈنٹ چلایا۔ "ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو۔ جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو"۔

"یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری ۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیئے"۔

"اینٹیکس میوزیم میں"۔ جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا ۔

"بالکل ۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں"۔

"یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں"۔

"ہپوکرٹس" ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ۔

"اگنور ہم، ہٹاؤ ۔ کوئی اور بات کرو"۔ سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی ۔

"ہاؤ کین وی اگنور ہم ۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں"۔

"نان سنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا ۔ وی آر آل فار پروگرس موومنٹ"۔ جیکٹ والا چلاّ کر بولا ۔

"ہیر ہیر"۔ تالیوں سے ہال گونجنے لگا ۔

"ہا ہا ہا ہا ہا"۔ اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا ۔ اس کی آواز کھرج تھی انداز والہانہ تھا تالیاں رک گئیں ۔ ہال میں خاموشی چھا گئی ۔ پھر سرگوشیاں اُبھریں ۔

"کون ہے یہ"۔

"کون ہنس رہا ہے"۔

"پتا نہیں اوپر سے آواز آ رہی ہے"۔

"ہئے میں تو ڈر گئی کتنی ہورس آواز ہے"۔

قہقہہ رُک گیا ۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ۔

"کوئی چل رہا ہے اوپر"۔

"ہئے میری تو جان نکلی جا رہی ہے"۔

"پتا نہیں کون ہے"۔ مِنی سکرٹ بولی ۔

"ڈونٹ فیئر ڈارلنگ ۔ آئی ایم ہیر بائی یور سائیڈ"۔

"وہ دیکھو وہ"۔ ٹوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا ۔

"اوپر ۔ ۔ ۔ گیلری کے جنگلے پر"۔ ساڑھی والی ڈر کر بولی ۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اٹھ گئیں ۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرہ جھانک رہا تھا۔

"توبہ ہے"۔ "اُف"۔ "ہائے"۔ پتلیوں نے شور مچا دیا۔

"کون ہے تو"۔ موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔

"میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تو کھڑا ہے"۔

"اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے"۔ سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

"کہاں سے بول رہا ہے یہ"۔ پتلون والی نے پوچھا۔

"میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو"۔ لنگی والا کہنے لگا

پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں۔ "نو نو۔ نو نو"۔ نیور، مائی گاڈ ہیئے اللہ"۔ وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ"۔ جین والا بولا۔ "یہ تو پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا"۔

"ڈیٹس اِٹ ڈیٹس اِٹ دے بلانگ ٹو دی پاسٹ"۔

"یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں"۔ جیکٹ والا حقارت سے بولا۔

"بڑے میاں سلام"۔ جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ "ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ حضت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ "احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا"۔

"یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے"۔ مشہدی لنگی نے قہقہہ لگایا۔ "ہر دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا"۔

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ "ان کباڑ خانے والوں کی باتیں نہ سنو یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو"۔

"جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل جائیں گے یہی ہے نا تیری جدیدیت"۔ رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔

"ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو"۔ لنگی والا بولا۔ "نیلی پتلون پر سرخ ٹلّی لگی ہوئی ہے ہاہا۔ ہاہا"۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"احمق یہ ٹلّی نہیں۔ پیچ ہے پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے تجھے کچھ پتا بھی ہو"۔

"پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوہڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو"۔ مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ "تم عجب تماشہ ہو"۔

رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔ "دورِ جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی"۔

"سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے"۔ ہپن نے سر اُٹھا کر کہا۔

"ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہے"۔ پتلون والی نے پوچھا

"لو" سی تھرو زیرِ لب گنگنائی۔ "چھلنی بھی بولی"۔

"ہاں"۔ ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے"۔

"تعفّن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کونسا"۔ بیدنگ کاسٹیوم بولی۔

ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔ "جدیدیت کے ذہنی تعفّن کو دُور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بت توڑنے کا کریڈٹ۔ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا"۔

سپورٹس گرل نے بیڈ منٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

"ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو"۔ ہپی ہنسا۔ ہم نے دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے بُتِ دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔

"یہ بے چارے کیا جانیں"۔ بپن بولی ۔ "ظاہریت کے متوالے ۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں ہم وہ مجاہد ہیں"۔

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی"۔ رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا

"بالکل درست"۔ لنگی والا چلّایا ۔ "یہ ٹرانزیشنل دور ہے ۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعدار آجاتے ہیں ۔ یہ دور جمعداروں کا دور ہے"۔

"سِلّی فول" سی تھرو ہنسی ۔ "یہ تو رومانس کا دور ہے"۔

"رومانس"۔ گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پر آکھڑا ہوا ۔ "تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے ۔۔۔ تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا ۔ عاشق کو غنڈا بنا کر رکھ دیا ۔ محبوب سے سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا ۔ عُریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی"۔

"بالڈر ڈیش"۔

"نانسنس"۔

رومی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری ۔ "دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا ۔ تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی ۔ لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حِس کو کند کر دیا ہے ۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے"۔

جیکٹ والا آگے بڑھا ۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری ۔ "ہم جنس کے متوالے نہیں ہم جنس کی لذت کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں ۔ دورِ حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے ۔ تم حالاتِ حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو ۔ ہم تمہاری طرح حالاتِ حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے ۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں"۔

"حالاتِ حاضرہ"۔ رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا ۔ تمہارے نزدیک حالاتِ حاضرہ روٹی کپڑا اور مکان ہیں ۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ اَنا کا ہے ۔

سلف کا ۔ ''میں'' کا ۔

''روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو''۔ ہپن چلائی ۔ ''جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے ۔ جو بستر آتا ہے پہن لیتے ہیں ۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنہیں تم اہرامِ مصر بنائے بیٹھے ہو''۔

''اونہوں انہیں کچھ نہ کہو یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا''۔ رومی ٹوپی والا بولا ۔

''کل جب روٹی ، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیارہ جائے گا بتاؤ''۔ ہپن بولی ۔

''یہ تو حرکت کے متوالے ہیں منزل کے نہیں ۔ انہیں صرف چلنے کا شوق ہے پہنچنے کا نہیں''۔ مشہدی لنگی نے منہ بنایا ۔

''بکو نہیں ۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا''۔

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا ''سوواٹ ، ہم ہپیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ بے شک لگاؤ ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں ۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں''۔

''صرف یہی کہ طریقِ کار مختلف ہے''۔ ہپن نے لقمہ دیا ۔

ہال پر سناٹا چھا گیا ۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی ۔ ساڑھی اپنا پلو سنبھال رہی تھی ۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی ۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا ۔ جیکٹ والا سر کھجاتے ہوئے گنگنا رہا تھا ۔ ''کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گذری''۔

مجنوں نُما نے قہقہہ لگایا ۔ ''خود کو زندگی کے متوالے گرداننے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے ۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحبِ حال سے پوچھو''۔

''جو قیل و قال کے دیوانے ہیں انہیں حال کا کیا پتا''۔ لنگی والا بولا ۔

"انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا ۔ حال کو رد نہیں کیا جا سکتا ۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے"

ہال پر خاموشی چھا گئی ۔

پھر دُور سے ایک سرگوشی اُبھری ۔ ۔ ۔ "میں کہاں آپھنسی ہوں" ۔ ۔ ۔ بچے کو اُنگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی ۔ "یہ دور ماں کا دور نہیں ۔ یہ تو عورت کا دور ہے ۔ میں کہاں آپھنسی ہوں"۔

"عورت کا نہیں بی بی"۔ پہلوان کُرتے والے نے سر ہلا کر کہا ۔ "یہ تو لڑکی کا دور ہے انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں ۔ بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں"۔

"خاموش" آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی ۔ "سُنو سُنو یہ کیسی آواز ہے"۔

"کون سی آواز"۔

"کدھر ہے آواز"۔

"چپ"۔ ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی ۔

سب کان لگا کر سُننے لگے ۔

"ارے"۔ موٹر سائیکل چلایا ۔ "یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے"۔

"یہ آواز تو باہر سے آرہی ہے"۔ منی سکرٹ نے کہا ۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا ۔

"ہئے اللہ"۔ سی تھرو بولی ۔ "یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آرہی ہے ۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے"۔

"خاموش"۔ شکاری ڈانٹ کر بولا ۔ "سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ وہ آرہا ہے"

"کون آرہا ہے"۔ سی تھرو نے زیرِ لب پوچھا ۔

"چوکیدار"۔

"چوکیدار"۔ پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں ۔ پتلے باہر جھانکنے لگے ۔ سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں

سوٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آرہا تھا ۔

"بالکل اُجڈ نظر آتا ہے"۔ پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے ۔

"ہکاکی ، کروڈ ، ان کوتھ"۔ ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی ۔

"میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر"۔ سی تھرو نے کہا

چوکیدار نے سوٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہوگیا ۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا ۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی ۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا ۔

"ضرور کوئی ایمرجنسی ہے"۔ شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا ۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا ۔ "ایمرجنسی ۔ ۔ ۔ یہ دور تو بذاتِ خود ایک سٹیٹ آف ایمرجنسی ہے"۔

"ایک اُبال ہے ۔ بے مقصد اُبال"۔ لنگی والے نے قہقہہ لگایا ۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا ۔

"اِگنور ہم مائی ڈیئر"۔ موٹر سائیکل نے سائیلنسر فٹ کر کے کہا ۔

"میں کہتا ہوں ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے"۔

سٹوڈنٹ زیرِ لب بولا ۔

"چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خُشک ہو جاتی ہے"۔ سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا ۔ "بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے ہوتی تو تُو سی تھرو نہ ہوتی ۔

"کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی" ۔ پتلون والی ، لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لئے بولی ۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا ۔ "کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم

جاتی ہیں ۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں"۔

"شٹ اپ"۔ پتلون والی ڈانٹ کر بولی ۔۔۔ "یو ۔۔۔ اَن کلچرڈ ۔۔۔ اَن کوتھ ۔۔۔ سیوج"۔

"ول سیڈ"۔ بلیک سوٹ نے کہا ۔ "ہئیر ہئیر ۔ ۔ ۔ جنٹلمن چیرز"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا ہمارے دور میں ان سویلائزڈ ۔ ان ایجوکیٹڈ ۔ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی"۔ جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا ۔

"تمہارا دور"۔ مجنوں نما ہنسا ۔ "نقالوں کا دور ، چربہ دور ۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی ۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو ان کے خیال کو اپناؤ ۔ اپنوں سے لگتوں سے نفرت کرو یہی نا"۔

"مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے ۔ چاند غروب ہو چکا ہے ۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ دکھا رہی ہیں"۔ ہپی مسکرایا ۔

"اور ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں کہتی ہوں"۔ بہن نے اس کی بات کاٹی ۔ "اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے ۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو اُبھر رہی ہے ۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوج رہے ہو"۔

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا عینک کو سنبھالا ۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آکر بولا ۔ "کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں اُبھر رہی ہیں"۔

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو"۔

"کیا یہ منی سکرٹ ، یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو کیا تمہارا دور جس پر تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے"۔ رومی ٹوپی والا جوش میں بولا ۔

"ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں"۔ سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا ۔

مجنوں نما ہنسا ۔ "ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں ۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا اُن کی آنکھوں میں سُرمے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو ۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ۔ ایمان سے ۔۔۔

ہال پر خاموشی طاری ہوگئی ۔

سب چُپ ہوگئے رومی ٹوپی ہنسنے لگا ۔

کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا ۔

"وہ دن کب آئے گا"۔ دُور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو ۔

"کون سا دن بی بی"۔ کُرتے پاجامے نے پوچھا ۔

"جب مجھے مامتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہوگی"۔ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی "جب اس آرکیڈ میں سر اُٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی"۔

"سچ کہتی ہو بی بی آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں"۔ رومی ٹوپی نے کہا ۔

"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں"۔ کُرتے پاجامے والا بولا ۔ "بچوں سے کہتی ہیں ۔ مجھے باجی کہہ کر بلاؤ"۔

"آج کی عورت ، عورت بن کر جینا چاہتی ہے ، ماں بن کر نہیں"۔ لنگی والا بولا ۔

"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں ۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا ۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے"۔ بلیک سوٹ نے کہا ۔

"تمہیں کچھ پتا بھی ہو"۔ رومی ٹوپی ہنس کر بولا ۔ "وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے مامتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا ۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے"۔

"پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے ، جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی ۔ اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے"۔

"بالکل بالکل"۔ بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی ۔

"بچے کم خوشحال گھرانا"۔ موٹر سائیکل گنگنانے لگا ۔

"سبحان اللہ"۔ مشہدی لنگی بولا ۔ "سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں"۔

"بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی ۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدہم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے"۔ رومی ٹوپی نے کہا ۔

"مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں"۔ مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔

پتلیاں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں ۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ"۔

"کاڈ نوز"۔

"ہنئے ۔ چلڈرن آرا ے نو ے سنس"۔

"سیانوں نے کہا تھا"۔ کرتا پاجامہ کہنے لگا کہ ۔ ۔ ۔

"کون سیانے"۔ جیکٹ والے نے پوچھا ۔

"ہمارے لگتے لوگ"۔ کرتا پاجامہ نے وضاحت کی کوشش کی ۔

"تم اپنے ۔ لگتوں کی کیا بات کر رہے ہو"۔ لنگی والے نے اسے ٹوکا ۔ انہیں سمجھ میں نہیں آئے گی ۔ ان کے لگتے تو مغرب میں رہتے ہیں ۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں"۔

"وہ دن دور نہیں"۔ اچکن والے نے کہا ۔ "جب انہیں اپنے لگتوں کو اپنانا پڑے گا"

"بھول جاؤ وہ دن"۔ جیکٹ والا جلال میں بولا ۔ "وہ دن کبھی نہیں آئے

گا“۔

”ہم ترقی کی جانب قدم اُٹھا رہے ہیں ۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں ۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے“۔

موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا ۔ ”کیوں ڈارلنگ“۔

”فارگٹ دیٹ ڈے ۔ اٹ ول نیور کم“۔ لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چُغہ پہن رکھا تھا سر پر کلاہ تھا ۔ ”کون نہیں مانتا اس دن کو ۔ کیا تمہیں نظر نہیں آرہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے“۔

”اچھا بدل رہا ہے کیا“۔ شکاری نے طنزاً کہا ۔

سب پتلے ہنسنے لگے ۔

”دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی ۔ سارے سیٹرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں“۔ چغے والا چلّایا ۔

عیسائی مسلمان یہودی ہندو سبھی مانتے ہیں ۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں“۔ رومی ٹوپی نے کہا ۔

”وہ گولڈن ایج“۔ چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا ۔ ”جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا ۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی ۔ جب امن ہوگا ۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا“۔

موٹر سائیکل نے طنز بھرا قہقہہ مارا ۔

جیکٹ والے نے چلّا کر کہا ۔ ”ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ“۔

”اچھا“۔ ماں بولی ۔ ”کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ“۔

”نشاۃ ثانیہ“۔ چغے والا چلّا کر بولا ۔

”نشاۃ ثانیہ“۔ ہال کی دیواریں گونجنے لگیں ۔

”دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے ۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج

تک نہیں ہوا تھا"۔

چغے والا بولا ۔

"اس کے اثرات ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے"۔

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی "سچ"۔

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا ۔

سی تھرو کا رنگ اڑ گیا ۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی ۔ "وہ دیکھو وہ"۔ اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا ۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے ۔

"کیا ہوا"۔ دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا ۔

"کیا بات ہے"۔

"پتا نہیں"۔

"کون ہے"۔

دُور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں ۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائیلنسر فٹ کر کے کہا ۔ "وہ آرہے ہیں ، خاموش"۔ اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا ۔ "وہ آرہے ہیں ۔ ادھر آرہے ہیں"۔

"ہاں ہاں"۔ لٹکے بالوں والی بولی ۔ "انتظامیہ کے لوگ آرہے ہیں"۔

"بالکل"۔ ساڑھی والی نے کہا ۔ "وہ ضرور اندر آئیں گے"۔

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی ۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا "سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمر جنسی ہے"۔ موٹر سائیکل والا بولا ۔ "ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا ۔۔۔۔"

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے دوڑے ۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہوگئے ۔

ہال پر سناٹا طاری ہوگیا ۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا ۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا ۔

نائب کے پیچھے دس بارہ کاری گر تھے ۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے ۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا ۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔
"دیکھو اس وقت تین بجے ہیں"۔ ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں ۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آرہے ہیں ۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیئے سمجھے"۔ ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا ۔

"یس سر"۔ نائب نے جواب دیا ۔ "اٹ شیل بی ڈن"۔

"ہوں"۔ ناظم نے کہا ۔ "ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہوگا اور پاکستانی زندگی ، دستکاری اور فن کا مظہر ہوگا ۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو ۔ سمجھے"۔

"آپ فکر نہ کریں ـــ سر" ـــ نائب نے کہا ۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا ۔ "دیکھو بھئی اتنے تھوڑے وقت میں ، اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے ۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گذارہ کرنا ہوگا"۔

"جی صاحب"۔ کاریگروں نے جواب دیا ۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا ۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا ۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا ۔ قریب ہی بچے کو اُنگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے پرے کُرتے پاجامے والا چھاتی پُھلائے استادہ تھا ۔

ساڑھی والی لمبا چغہ لٹکائے نگاہیں جھکائے لجھا رہی تھی ۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی

تھی ۔

سکرٹ والی چُست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اُٹھائے مسکرا رہی تھی ۔

..............○..............

ڈائری

۱۲ ستمبر

توبہ کتنی بوریت ہے اس گھر میں ۔ کچھ ہوتا ہی نہیں یہاں بس روٹین ہی روٹین ہے ۔ سامنے بنی سجی تصویر ٹنگی ہے ۔ ڈیکوریشن پیس کو کوئی کب تک دیکھتا رہے ۔

وہ تو شکر ہے سنبل نے مجھے لونِ لب دکھا دی جہاں سے مِڈل مَن کی بُکس مل جاتی ہیں ہئے کتنی رومانٹک سیریز ہے ۔ لفظ بدن کے بند بند میں گھس جاتے ہیں ۔ جگہ جگہ ٹکس بجتی ہیں پھرکیاں چلتی ہیں سکرو گھومتے ہیں مینڈک پھدکتے ہیں ۔ مزا تو آتا ہے پر فائدہ ساتھ ہی پینز شروع ہو جاتی ہیں ۔ میں تو کتاب ایک طرف رکھ دیتی ہوں پڑھوں کہ بیتوں ۔

بھائی کہتے ہیں ، بُکس ذہن کو روشن کرتی ہیں ۔ جھوٹ میرے جسم کو تو جھنجھوڑتی ہیں ۔

لو ممی آگئی ۔ توبہ کتنی بنی ٹھنی ہے ۔ جیسے فرنی کی پلیٹ پر ورق لگے ہوں ۔ ہر وقت خود کو سجاتی رہتی ہے ۔ ورق لگاتی رہتی ہے ۔ چاہے جتنے ورق لگالے ۔ اندر سے تو وہی ہے نا پچ پچ ، ایسے لگتا ہے جیسے ممی کا جسم انتقام لے رہا ہے ۔ جتنا سمیٹتی ہے ۔ اتنا پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے ۔ پتہ نہیں کس وجہ سے انتقام لے رہا ہے ۔ زیادتیاں کی ہوں گی ۔ ہوں گی کا مطلب ، اب بھی کر رہی ہے ۔ ورق جو لگ رہے ہیں ۔ ہٹاؤ ۔ مجھے کیا لینا دینا ۔

لو فون بجنے لگا ۔

کہیں میرا لیٹسٹ رانگ نمبر تو نہیں ۔

رانگ نمبر بھی کیا چیز ہے ۔ مزے کی ہابی ہے وقت اچھا کٹتا ہے ۔ جب میں رانگ نمبر کو چھیڑتی ہوں تو وہ جھنجھنے کی طرح بجتا ہے ۔ لائن پر آواز آتی

ہے ۔ جُھن جُھن جُھن ، مزے کی بات یہ ہے کہ رانگ نمبر کو جو چاہے کہہ دو چاہے رعب جھاڑو چاہے گھورو چاہے پیار کی بات کہہ دو ، نہ گھبراہٹ نہ جھجک بس کچھ لوگ چیپ باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ پھر میں بند کر دیتی ہوں ۔

لو یہ تو ممی بول رہی ہے فون پر ، ڈارلنگ کئے جا رہی ہے ۔ ڈیڈ کا ہوگا ۔

ڈیڈی بے چارے تو اس گھر میں پے انگ گیسٹ ہیں ۔ گھر والی لینڈ لیڈی تو ممی ہے ۔

ممی ڈیڈی جتنا ایک دوسرے کو ڈارلنگ ڈارلنگ کرتے ہیں سمجھ لو اتنا ہی ایک دوسرے سے دُور ہوئے جاتے ہیں ۔ ڈیڈی تو ریٹائر ہوئے بیٹھے ہیں ۔ ممی نہیں ہوتی ریٹائر ۔ کبھی نہیں ہوگی ۔ پستے بادام ہی لگتے رہیں گے ۔

۱۴ ستمبر

اونہوں اپنا کوئی چانس نہیں ۔

پتہ نہیں کیا بات ہے ۔ قریب جاتا ہوں تو سب چُپ ہو جاتی ہیں ۔ قلفی جم جاتی ہے ۔ دوسروں سے گپیں مارتی ہیں ۔ ہنستی ہیں ، کھیلتی ہیں ۔ ساتھ گھومتی پھرتی ہیں ۔

بس کلاس کے سات آٹھ لڑکے ہیں جن کے ساتھ میل جول ہے ۔ پتہ نہیں ان میں کیا ہے ۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں دکھتا ۔ ذرا بنے سجے ہوتے ہیں ۔ انداز مخملی ، روغنی پتلے لگتے ہیں ۔ کلاس میں لڑکیاں ہیں تو سات پر مجھے تو دو اچھی لگتی ہیں ۔ ایک تو نک چڑھی سُنبل ہے اور دوسری ٹِپ ٹِپ موی ،

نک چڑھی تو بالکل فیوڈل لگتی ہے ۔ ڈگنٹی ہی ڈگنٹی ۔ ڈگنٹی کے تھال نیچے اوپر رکھے ہیں ۔ جیسے حلوائی کی دوکان پر لگے ہوتے ہیں ۔

نک چڑھی سے تو بات کرنی مشکل ہے کسی سے لِفتی ہی نہیں ۔ ہر وقت تیوری چڑھائے رہتی ہے ۔ لیکن جب مسکراہٹ پھوٹے تو پھلجھڑیاں چلتی ہیں ۔ ہاں ۔

پھر وہ ٹپ ٹپ ہے کیا نام رکھا ہے لڑکوں نے ۔ ٹپ ٹپ ، نام رکھنے میں تو لڑکوں کا جواب نہیں ۔ نک چڑھی ، ٹپ ٹپ ، دلہن ، چٹکی ، لونڈا ،

نخرہ ، ڈول ، ٹپ ٹپ تو ٹپاٹپ چلتی ہے ۔ لٹکے بال ، موٹی جبین یہ جادہ جا ، دوڑتی زیادہ ہے چلتی کم کم ، بات میٹر آف فیکٹ ۔

پروفیسر نے مذاق سے کہا آج تو غضب کی لگ رہی ہو ۔ بولی روز ہی لگتی ہوں ۔ کوئی نئی بات کیجئے سر ، اوریجنل ۔

بس ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ دوستی ہو جائے اپنی حیثیت بن جائے اور پھر گڈ ٹائم مزا آجائے ۔

ارے یہ تو چاچی آگئی ۔ سلام کہتا ہوں چاچی ۔

ایک تو محلے بازی نے زچ کر رکھا ہے ۔ یہ چاچا ہے وہ ملما ہے ۔ یہ پھوپھی ہے ۔ وہ تائی ہے ۔ سلام کرتے کرتے بور ہو جاتا ہوں ۔

پھر یہ گھر ۔ اُف یہ گھر ، یہ نہ کرو ۔ اُدہر نہ جاؤ ، ادھر نہ جاؤ ، سب محلہ داری کے جھمیلے ، ہٹاؤ اب اس جھوٹی وضعداری کو ، بہت ہولی ۔ ای طرف داری نہ کرے تو اپنا بھانڈا پھوٹ جائے ۔ ابا کے تو اصول ہی دم لینے نہیں دیتے گھر میں رہنا اک عذاب ہے ۔

چھٹی کا دن بھی نہ آئے ۔۔۔ بوریت ، بوریت ، بوریت

۲۰ ستمبر

توبہ یہ سر تو جونک کی طرح چپک جاتا ہے ۔ پاس آئے تو لیس نکلنی شروع ہو جاتی ہے تار۔بن ہی تار۔بس ۔

پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو، تربوز سا سر ہے ٹانٹ چمکتی ہے ۔ جیسے تیل چُپڑ رکھا ہو اِدہر اُدہر بالوں کے گچھے لٹکتے ہیں ۔ کارٹون لگتا ہے ۔

ہمارے سر جو ہیں ، بس چار ایک پریذیڈنٹ اسپل ہیں باقی سب لنڈے سے آئے ہیں ۔ وہ جو اکنامکس کا ہے نا وہ تو بالکل فلمی ہیرو لگتا ہے میک اَپ کر کے آتا ہے ۔ جیسے بیوٹیک سے نکلا ہو ۔

مجھے نہیں اچھے لگتے بنے ٹھنے لوگ ، وہ لڑکے جو لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرتے ہیں وہ تو سارے روغنی ہیں ، گھسی پٹی باتیں کرتے ہیں ؟ ہاؤ ڈی سنبل پلیز مس ثریا بیسٹلی ویدر ۔

ہمارے اسکارٹ بنے پھرتے ہیں ۔ دروازے کھولتے ہیں ۔ کوٹ اٹھاتے

ہیں ۔ رومال پھلاتے ہیں ۔ کیئر اور کنسرن سے بھیگے رہتے ہیں ۔ ہم کیا موتی چور کے لڈو ہیں یا کریم پفس ۔

باقی لڑکے تو کراوڈ ہیں ۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا ۔ اکٹھے ہوں تو مانسٹر بن جاتے ہیں ۔ اکیلے وکیلے سر لٹکائے پھرتے ہیں ۔ آنکھ ملانے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ پرانے زمانے کی لڑکیوں کی طرح بلش کرتے ہیں ۔ ویسے جی چاہتا ہے ۔ حوصلہ نہیں پڑتا ۔

بھڑک کر جلنے والے بھی ہیں ۔ اُنگلیوں پر گن لو ۔ بس اتنے ہی ۔ گلیڈ آئی چمکاتے ہیں ۔ سمائل پھینکتے ہیں ۔ بات بھی کر لیتے ہیں ۔ اُکھڑی اُکھڑی ، سر کو کہیں دیکھا ہے ۔ پیریڈ شروع ہوگیا ۔ کل چھٹی ہے کیا ، سب بہانے ، بات کرتے وقت نگاہوں کی پھلجھڑی بھی چلاتے ہیں ۔ لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔

لو کراوڈ ہڑبونگ مچانے لگا ۔ جب ہڑ بونگ مچاتا ہے تو جوبن پر آجاتا ہے ۔ لٹکی گردنیں جیک ان دی باکس کی طرح ڈبے سے نکلتی ہیں ۔ سینے تن جاتے ہیں ۔ بے زبانوں کو زبان مل جاتی ہے ۔ ۔ ۔ مجھے اچھا لگتا ہے ۔ شور شرابا ہو ۔ ہنگامہ ہو ۔ کچھ ہو ۔ ہوتا رہے ۔

ارے یہ تو کسی سیاسی اِشو پر ہنگامہ ہے ۔ انہیں تو ہنگامے سے دلچسپی ہے ۔ اِشو کی سمجھ نہیں ۔ سیاست تو بہانہ ہے ۔ شورا شوری پر مرتے ہیں ۔ یہی ان کی پالیٹکس ہے ۔

وہ سامنے جو نعرہ بازی کر رہا ہے ۔ کتنی رَف نس ہے اس میں رَف ہے ۔ باتمیٹ ہے ذرا بھی ڈرائینگ رومش نہیں اس میں ۔ مجھے رفنس پسند ہے ۔ بولڈ ہو رف ہو ، بائش ہو ۔

لو اب نعرے گونجنے لگے ۔ سب تماشہ ہے تماش مٹنی ہے ۔ اور بس ،

یونیورسٹی انہیں سیریس لے لیتی ہے ۔ امپارٹنس دیتی ہے خواہ مخواہ وہ سمجھتی ہے یہ پالیٹکس ہے ۔ ان کا جلوس دیکھ کر تھر تھر کانپتی ہے ۔ پتہ نہیں کیا ہوگا ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا ۔ بس ہلا گُلا ہوگا ۔ دس ایک شیشے ٹوٹیں گے ۔ چار ایک کُرسیاں ، پھر ٹھنڈے پڑ جائیں گے ۔ جتنی جلدی گرم ہوتے

ہیں ۔ اتنی جلدی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں ۔

میں تو کہتی ہوں سب سرز کو کراؤڈ سائیکالوجی پڑھ کر آنا چاہیئے یونیورسٹی میں ۔ ارے یہ تو اینڈی آرہا ہے ۔

آتے ہی کہے گا چلو ٹک شاپ چلیں ۔ ام سو ہنگری ، بھوک ووکھ کوئی نہیں ہوتی ۔ مطلب ہے بہانے بہانے لڑکیوں کو ٹریٹ کرے ۔ پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے یہ کہ کوک پلا پلا کر پھنسا لے گا ۔ ایڈیٹ ۔ چلو جو مرضی ہے سمجھے میں تو کوک پینے چلی ۔ مفت کی کون چھوڑے ۔

۲۴ ستمبر

کیا کر رہی ہے یہ خالہ کی بیٹی فرحتو ، خواہ مخواہ آنکھیں مٹکائے جا رہی ہے ۔ ہنستی ہی چلی جا رہی ہے ۔ ویسے تو چھوٹے اجی سے کھیل رہی ہے ۔ پر اجی تو بہانہ ہے ۔ سب کچھ میرے لئے ہو رہا ہے ۔ اٹریکٹ کرنے کے کیا کیا گُر ہوتے ہیں ۔ بات اجی سے کرتی ہے سُناتی مجھے ہے آنکھیں اس سے لڑاتی ہے ۔ دکھاتی مجھے ہے ۔ منہ اس کا چومتی ہے ۔ سُجھاتی مجھے ہے یہ ڈھنگ پُرانے ہوگئے ۔ اب نہیں چلتے ۔ اپیل نہیں رہی ۔ یونیورسٹی میں جانے سے پہلے یہی نخرے کتنے اچھے لگتے تھے مجھے ۔ ان دنوں پھوپھی کی بیٹی رضو یہی کچھ کیا کرتی تھی ۔ پڑوسی کے بچے کو آجا ، آجا کرتی پھر میری طرف دیکھتی سمجھے کیا سمجھے ۔

میرا تو بُرا حال ہو جاتا تھا ۔ شوربا چو جاتا تھا اپنا ۔۔۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ فرحتو پر ترس ضرور آتا ہے ۔

آج کل یہ سب کچھ نہیں چلتا ۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے ۔ جین چڑھا لیتی ہے ۔ بیگ لٹکا لیتی ہے ۔ اور پھر ٹپ ٹپاٹپ ، یہ جاوہ جا ، ایسی سمارٹنس کی اپیل دیتی ہے کہ دل دھک سے ۔ جاتا ہے جو بال نہ لٹک رہے ہوں تو پتہ ہی نہ چلے کہ لڑکی ہے ۔

اپنی کلاس کی ٹپ ٹپ جو ہے ۔ واہ کیا ٹپ ٹپ ہے ۔ یہ آئی وہ گئی ۔ ہے بڑے گھر کی پر عوامی بنی پھرتی ہے ۔ کچھ بھی کر لو سالی نوٹس ہی نہیں لیتی ۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالو پڑے ڈالو ۔ رجسٹر ہی نہیں کرتی ۔ سمائیل

پھینکو پہنچتی ہی نہیں ۔ کیسے پہنچے پہنچتی ہے تو وہ چھ قدم آگے جا چکی ہوتی ہے ۔ کر لو بات ۔

بات بھی کر دیکھی ۔ چار ایک بار ، پر بات بنی نہیں میٹر آف فیکٹ جواب دیا اور وہ گئی ، نہ جھینپتی ہے ۔ نہ بنتی ہے نہ جھجھکتی ہے ۔

بھئی بات تو ایک بہانہ ہوتی ہے کہ بات سے بات نکلے ۔ اس لئے تو نہیں کی جاتی کہ جواب مل جائے ۔ انفرمیشن حاصل ہو ۔

اور وہ نک چڑھی سُنبل وہ تو کار والوں کی کلہک ہے ہم بات کریں تو ناک پکوڑا بن جاتی ہے ۔

آج کل ساری لڑکیاں ہی سٹیٹس سیکرز ہیں پہلے لڑکے کو تولتی ہیں بنگلہ ہے ؟ کار ہے ؟ انٹر کان لے جائے گا ۔ پھر بات کرتی ہیں ۔ رومان کا دور گیا ۔ اب نہیں چلتے رومانس اب تو افیئرز چلتے ہیں ۔ بڑی کیلکو لیٹنگ ہو گئی ہیں لڑکیاں ظفر میاں ۔۔۔ اپنا کوئی چانس نہیں کیا مصیبت ہے ۔ جہاں چانس ہی چانس ہے وہاں دل نہیں مانتا جہاں نہیں وہاں مچل جاتا ہے ۔

یہ فرحتو ہی دیکھ لو ۔ سجی سجائی پلیٹ دھری ہے ۔ سامنے اور میں ۔ میں بھی ایڈیٹ ہوں ، ایڈیٹ ۔

یکم اکتوبر

آج تو حد ہو گئی ۔

وہ رانگ نمبر بول پڑا ۔

ایک مہینے سے چپ چپ تھا ۔

میں ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہتی تھی تو آگے سے بولتا ہی نہ تھا ۔ بس فون کان سے لگائے رہتا ۔ میں سمجھتی رہی ۔ میری آواز سننا چاہتا ہے ایک دن میں نے کہا پتہ لکھوا دو تو اپنی آواز ریکارڈ کر کے ٹیپ بھیج دوں ۔ یوں کب تک بولتی جاؤں ۔

کتاب اُٹھا کر کوئی ریسی ٹیشن سناؤں ۔ غزل سنو گے یا نظم ، انگریزی یا اُردو ، پھر میں نے اسے ایک نظم سنائی بھی تھی ۔ 'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' آرام سے سُنتا رہا ۔ کمبخت ہنستا بھی تو نہیں ۔ میں نے بیسیوں باتیں

کیں ۔ گونگے ہو ۔ ڈرتے ہو ۔ بات کرنی نہیں آتی ۔ عشق تو نہیں ہو گیا ۔ سنک آگئی ۔ میں چھوڑ دیتی پر کیوریاسٹی دیمک کی طرح لگی تھی کہ ہے کون ۔ اتنا پیشنس ، چپ کیوں لگی ہے ۔ چپ دل لگی تو ہو نہیں سکتی ۔ پردہ ہو سکتی ہے کس بات کا پردہ ،

آج بولا تو پتہ چل گیا ۔ اپنی عمر پر پردہ ڈال رہا تھا ۔ کتنا مس انفارمڈ ہے ۔ بھلا آج کل عمر شرمانے کی چیز ہے کیا ، اولڈ ایج تو فیشن میں ہے ۔

لڑکیاں تاک میں بیٹھی ہیں کہ ایجڈ مل جائے ۔ بنگلہ ہوگا ۔ کار ہو گی سٹیٹس ہوگا ۔ اور پھر سپائل تو ایجڈ ہی کرتے ہیں ۔ راج تو ایجڈ پر ہی کیا جا سکتا ہے ۔ دل ایسٹیبلشڈ ہوتے ہیں نا ۔

رہی کمپینین شپ ، جی تو چاہتا ہے کہ کمپینین شپ ہو ۔ ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر آوارہ گردی کروں ۔ پر خالی خولی کمپینین شپ کو کوئی چاٹے کیا ۔ وہ یوسف زلیخا کا زمانہ گیا ۔ دل کے پیچھے چل کر کھجل ہونے والی بات ہے ۔ ایجڈ ساتھ سب کچھ لاتا ہے ۔ کمفرٹس ، بے فکری ، کپڑا لتا لگژری ، کیا نہیں لاتا ۔

بس ایک خطرہ ہوتا ہے ۔

ایجڈ ذرا شکی مزاج کے ہوتے ہیں ۔ بات بات پر جیلس ہو جاتے ہیں ۔ یا اتنے لیسدار ہوتے ہیں کہ ہر وقت ساتھ چپکے رہتے ہیں ۔ ایسوں سے اللہ بچائے ۔

کلچرڈ ہو تو سب اچھا آئی مین لارج ہارٹڈ ۔

تھوڑی سی سکولنگ کرنی پڑتی ہے ۔ پھر چاہے ساتھ افیئر بھی چلا لو ۔ جو یہ سہہ جائے تو موج ہوگئی ۔ پھر سب کچھ سہہ جائے گا ۔

سٹمبل تو مرتی ہے کہ ایجڈ پھنس جائے ۔ ہے سلی گوز ، بات کہہ دیتی ہے ۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ لڑکیوں میں بڑا ہارڈ کمپیٹیشن ہے ۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح ساری ایک ہیں ، اندر سے سب چھریاں نکالے بیٹھی ہیں ۔

پرانے دور میں مردوں میں کمپیٹیشن ہوا کرتا تھا ۔ لڑکیاں زیادہ نہیں ہوتی تھیں نا ۔ اب ایجوکیٹڈ لڑکیاں زیادہ ہیں ۔ سٹیٹس والے لڑکے کم کم ، جبھی تو

چھینا جھپٹی لگی رہتی ہے اپنے بوائے فرینڈ کو ہوا نہیں لگنے دیتیں ۔ سمجھ لو ایک میڈریس چل رہی ہے ۔

وہ سنبل سمجھتی ہے میں ایک ورکنگ وومن ہوں اس لئے کمپیٹیشن میں شامل نہیں ۔ رَن کم پوپ ۔

مجھے تو سنبل پر ترس آتا ہے ۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ بیگمات کا زمانہ گیا ۔ فیوڈل میں اپیل نہیں رہی ۔ آج کل تو ورکنگ وومن چلتی ہے ۔ بھئی عوامی دور ہے ۔ پر یہ مطلب نہیں کہ دل سے عوامی بن جاؤ ، اونہوں صرف دِکھو ۔

میں بھی تو عوامی دِکھتی ہوں ۔ تھیلا لٹکا لیتی ہوں ۔ ٹپ ٹپ چلتی ہوں ۔ عوامی بن جاؤ تو ایکشن کی رینج بڑھ جاتی ہے ۔ وائڈ رِی ایکشن ہوتا ہے ۔ عام بھی متوجہ ہوتے ہیں خواص بھی ۔ کراؤڈ تو منہ اُٹھا کر دیکھتا ہے ۔

بس ایک ہی کاشن ہے ۔ دوسرے دیکھیں ۔ خود نہ دیکھو ۔ بے شک دکھاؤ پر پتہ نہ چلے کہ دکھا رہی ہو ۔ دوسرے مسکرائیں خود سیریس رہو ۔ دوسرے آوازے کسیں ۔ نوٹس نہ لو ، کوئی بات کرے ، چیپ ہو ، کروڈ ہو ، رومانٹک ہو ، آبسین ہو ، شاکنگ ہو ۔ کیسی بھی ہو ۔ پڑا کرے ۔ میٹر آف فیکٹ جواب دو ۔ یوں جیسے رجسٹر ہی نہ کی ہو ۔ بس شروع شروع میں دقت ہوتی ہے ۔ پھر چل نکلتی ہے ۔

لو رانگ نمبر پھر بولا ۔

کوئی ایسی بات کروں کہ انوائٹ کرلے ۔ دیکھوں تو کیسا ہے ۔ کیسا بھی ہو ۔ مائینڈ نہیں کرتی ۔ پر دیکھوں ، سہہ جانے والا ہے کہ نہیں ۔

۱۸ اکتوبر

کل تو حد ہوگئی ۔ کمال کر دیا پنچھی نے ۔ یقین نہیں آتا ۔ ابھی تک نہیں آیا ۔

خالد سے بازی لگی تھی ۔ شرط بدھی تھی ۔ جو ہارے کارن سوپ کھلائے ۔ کارن سوپ بہت پسند ہے مجھے بڑا مہنگا بیچتے ہیں ۔ ورنہ روز کھاؤں خالد ہار گیا ۔ بولا آج شام کو چھ بجے وانگ چو ، میں نے کہا اوکے ،

مگر غنچہ دے گیا ۔ پہنچا نہیں ۔ اچھا ہی ہوا کہ غنچہ دے گیا ۔ پہلے تو میں

باہر انتظار کرتا رہا پھر سوچا چلو آیا ہوں تو ایک کوک ہی پیتا چلوں ۔

اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹپ ٹپ بیٹھی ہے ۔ ساتھ کوئی تھا ۔ انکل قسم کی چیز ، سوچا چلو میز کے پاس سے گذرو ۔ ہلکی سی وش کرتے چلو ۔

وش کی تو بولی ، ہیلو

میرا خیال تھا منہ پھیر لے گی یا زیادہ سے زیادہ ہلکی سی مسکراہٹ ،

مومی نے ہیلو کہا تو انکل اٹھ بیٹھا ہاتھ بڑھا دیا ۔ فاروقی ہم نے بھی دبا کر ہاتھ ملایا ۔ ظفر ۔ وہ بولی ۔ مائی کلاس فیلو ۔

اس پر انکل بولا ۔ اِف یو لائیک ٹو جائن اَس ۔ اندھے کو کیا چاہیے ۔ ڈٹ کر بیٹھ گیا ۔

پھر کیا تھا وہ اس سے باتیں کرتی رہی وہ مجھ سے بات کرتا رہا اور کارن سوپ مفت کارن سوپ کیا ۔ سویٹ اینڈ ساور ، بیف اینڈ چلیز اور پتہ نہیں کیا کیا ۔ کبھی کھائے ہوں تو نام جانوں ،

بس بھئی آج کچھ اور سوجھتا ہی نہیں ۔

یوں بیٹھا ہوں جیسے چوہے نے بھنگ پی رکھی ہو ۔

۱۰ دسمبر

حد ہوگئی ۔ یہ فاروقی دِکھتا کیا تھا نکلا کیا ۔ اوپر سے اتنا ڈرائینگ رومش تھا ۔ گڈ ٹائمز دکھتا تھا ۔ اندر سے اتنا سیریس مائینڈڈ ، اتنا سنگل ٹریک ، وہ تو مرمٹا ہے کہتا ہے ایک سال سے پیچھا کر رہا تھا ۔ کہتا ہے شادی کر لو ابھی ابھی اسی وقت ، جلدی ،

صاف دکھتا ہے ۔ جو کہوں گی مانے گا ۔ سب کچھ سہہ جائے گا ۔ سب کچھ ،

اونہوں ، جیلس ٹائپ نہیں ، الٹا ٹالرینٹ ہے عجیب کمبی نیشن ہے ۔ خوش مزاج ہے افکشنیٹ ہے ۔ ایج کامپلکس ہے ۔ یہ بات تو اپنے حق میں ہے نا ۔ قائم ہی رہے تو اچھا۔ لے کے رہیں گے والی ضد ہے ۔ آوے ہی آوے قسم کا کانفی ڈنس بھی ہے ۔ تھوڑی سی توجہ ضرور مانگتا ہے ۔ ساری نہیں تھوڑی سی ۔

میں بھی کیسی احمق ہوں ۔ سوچ رہی تھی جو سوٹ نہ کیا تو پلیٹ پر رکھ کر سنبل کو پیش کر دوں گی ۔

یہاں تو بات ہی اور نکلی ۔ یہ تو میرا دیوانہ نکلا ، پرسنل ۔ سوٹ تو کرتا ہے ۔ پتہ نہیں گھبراہٹ سی کیوں محسوس ہو رہی ہے ۔ ڈیسیین نہیں کر پائی اور وہ ظفر ۔ ۔ ۔ بالکل ہی گرین یوتھ نکلا اتنا کچا ۔ پہلے تو فارو کو انکل سمجھتا رہا ۔ ایڈیٹ اسے سر سر کرتا رہا ۔ فارو کو تو پسینہ آ جاتا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ عمر کی دیوار ٹوٹے یہ سر سر کر کے کھڑی کئے جا رہا تھا ۔ پہلی ملاقاتوں میں تو بڑی رڈیکولس پوزیشن رہی پھر سمجھ گیا ۔ ہے تیز ، بڑا بولڈ ہے ۔ اب اسے یار یار کرنے لگا ہے ۔ فارو بڑا خوش ہے اس پر ، سچ مچ ظفر کو یار بنا بیٹھا ہے ۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ ظفر اتنا کلر فل ہے ۔ میں سمجھتی تھی اکھڑا اکھڑا رہے گا ۔ وہ تو کھل مل گیا ۔ ۔ ۔ کیا نہیں اس میں سبھی کچھ ہے ۔ رف نس ہے ۔ بے تکلفی ہے ۔ ڈیرنگ ہے ۔ گڈ ٹاکر ہے انٹیلیجنٹ ہے ۔ آنکھیں بڑی مرچیلی ہیں ۔ تین سیکنڈ دیکھ لے تو سی سی کرنے لگو ۔ ساتھی تو بہت ہی اچھا ہے ۔ انگلی پکڑے پھرو ۔ لیکن ہے جذباتی ڈر لگا رہتا ہے کہ دھرنا مار کر نہ بیٹھ جائے ۔

کل سینما ہال میں فاروقی میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا رہا ۔ کتنی چائلڈش بات ہے ۔ خالی ہاتھ پکڑ کر بیٹھے رہنا اور پھر یوں جیسے خزانہ مل گیا ہو ۔

میں سمجھی کچھ کرے گا دبائے گا ۔ جھٹکے گا ۔ مروڑے گا یا شاید ۔ ۔ ۔ لیکن خالی پکڑ کر بیٹھا رہا ۔ میرا جی چاہا دوسرا ہاتھ ظفر کو تھما دوں ۔ شکر ہے میں نے پکڑایا نہیں ۔ ورنہ دو دن کے لئے نکور کرنی پڑتی ۔ نہ نہ نہ ظفر کو اینکریج نہیں کرنا ۔ ۔ ابھی نہیں ۔ مس انڈر سٹینڈ کر لے گا ۔ پتہ نہیں کیا سمجھ لے سب گڑ بڑ ہو جائے گا ۔

ویسے ساتھی کتنا اچھا ہے ۔ اچھا کیا ، اعلیٰ ، ہاتھ پکڑا دو ملکو ملک گھومو پھرو ، زمین پر سوؤ ، کھنڈروں میں رہو ۔ ایڈونچر ہی ایڈونچر ۔

اب اپنی پرابلم تو صرف یہ ہے کہ کیا کروں ۔ کیا فاروقی کا پروپوزل مان لوں ۔ ابھی سے آباد ہو جاؤں یا کچھ دیر اور ٹپا ٹپ نہ کر لوں ۔

بس صرف ڈیسی ژن کرنے کی بات ہے ۔ پھر تو پرابلم ، انی تو سن کر خوشی سے ناچے گی ۔ اسے تو بس ایک ہی ڈر لگا ہے ۔ کہیں میں دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جاؤں رومانٹک رشتہ کرنے پر نہ مچل جاؤں ۔ جانتی ہے نا کہ میں ضدی ہوں اڑ گئی تو اڑ گئی ۔

ممی کو فاروقی کا پتہ چلا تو ناچنے لگے گی خوشی سے ۔ کیوں نہ ناچے ۔ ممی کو مذید سٹیٹس مل جائے گا ۔

ملاقات کا حلقہ وسیع ہو جائے گا ۔ نئے کانٹیکٹ ۔ رہے ڈیڈی تو وہ میٹر ہی نہیں کرتے ۔ حیرت سے سر اٹھائیں گے ۔ ممی کے تیور دیکھیں گے اور پھر جُھکا لیں گے ۔

مجھے ایسے لگتا ہے جیسے ڈیڈی اب سوشل لائف کو فیوٹائل سمجھنے لگے ہیں ۔ فرسٹریشن محسوس کرتے ہیں ۔ سارا قصور ممی کا ہے ممّی تھوڑی توجہ دے تو ٹھیک ہو جائیں ۔ ممی توجہ کیسے دے وہ تو خود توجہ طلبی کا شکار ہے ۔ پستے بادام ایسے تو نہیں لگتے رہتے ۔

لو ممّی آگئی ۔

ارے یہ کیا سیدھی میری طرف کیوں آرہی ہے ۔ آج بات کیا ہے ۔ روز تو ۔۔۔ سیدھی میک اَپ ٹیبل کی طرف جایا کرتی ہے ۔

ہائیں ۔ ۔ ۔ اتنی بیمنگ نگاہ سے دیکھ رہی ہے مجھے ۔ ضرور کوئی بات ہے ۔۔۔ اوہو ضرور اسے فاروقی کا پتہ چل گیا ہے ۔ اوں ہوں ۔

بات نکل گئی ۔

چلو اچھا ہی ہوا ۔ فیصلہ کرنے کی مصیبت سے جان چھوٹی چل مومی ، برائیڈ بننے کی تیاری کر ، جوان لڑکیاں گھر سے وداع ہوں تو ممّیاں خوش ہوتی ہیں ۔ ممّی کی خوشی تو دوہری ہے نا ۔

جی ممّی ۔۔۔ آئی ۔

۲۱ جولائی

چلو جی چھٹی ہوئی ۔ مومی مسز فاروقی بن گئی ۔

ہم نے ولیمہ بھی اُڑا لیا ۔ قصہ ختم ہوا ۔

پہلے تو میں اسے انکل سمجھتا رہا ۔ مجھے کیا پتہ ، اس روز سینما ہال میں ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے ۔ بات سمجھ میں آگئی ۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے کیوں انوائیٹ کیا جا رہا ہے ۔ کبھی فلم پر کبھی انٹر کان کبھی کہیں کبھی کہیں ۔

مجھے کیا پتہ کہ وہ تو مجھے استعمال میں لا رہی ہے ۔ وہ تو جلدی پتہ چل گیا ورنہ اپنا کباڑہ ہو جاتا ۔۔۔ خیر اس نے مجھے استعمال کیا ہے تو میں فاروقی کو کروں گا ۔ میں کب بخشنے والا ہوں ۔

ویسے آدمی بہت اچھا ہے ۔ بڑا افسر ہونے کے باوجود ہے سنسیر ۔ یار باش ہے ۔ محبت سے ملتا ہے ۔ دوج نہیں رکھتا ۔ میں نے بھی وہ بے تکلفی چلا رکھی ہے کہ کبھی نکلنے نہ پائے گا ۔ جاب دلائے گا ۔ اچھا گریڈ ، اونچا سا ، ریکوئسٹ کرنے کی ضرورت نہیں دیکھنا آپ ہی آپ کرے گا ۔

شادی سے پہلے مجھ سے پوچھ رہا تھا ۔ کیوں ظفر میں شادی کر لوں کیا خیال ہے ادھیڑ سے کروں یا نوجوان سے موی کیسی رہے گی ۔ مان جائے گی کیا ۔ تم تو اس کے دوست ہو ذرا اندازہ لگاؤ ۔

شادی ہوگئی تو میں نے پوچھا ۔ فاروقی کیسی رہی بولا ۔ فی الحال تو مزے کی ہے ۔

پہلے تو میں موی کے دوست کی حیثیت سے ملتا تھا ۔ اب فاروقی کے دوست کی حیثیت سے موی کے گھر جاتا ہوں ۔

اونہوں اب موی وہ موی نہیں رہی ۔ وہ بیگم بن گئی ہے ۔ جھلمل ساڑھیاں ، ریشمی سوٹ بندے ، ہار ، چوڑیاں یہ ٹوکرا بال ۔ نہ وہ جین رہی نہ لٹکتے بال نہ تھیلا نہ ٹپ ٹپ نہ یہ جا وہ جا نہ میٹر آف فیکٹ بات ، اب تو لُبھا لُبھا کر بات کرتی ہے ۔ آنکھیں مٹکاتی ہے گھورتی نہیں مُسکاتی ہے ۔

اب اپنے کو کوئی انٹرسٹ نہیں رہا ۔ جو افیئر ہی چلانا ہے ۔ تو وہ رہی سامنے فرحتو ، کب سے ایک بھرپور نگاہ کی منتظر بیٹھی ہے ۔ اک نگاہ ڈالوں تو دو دن دھواں دیتی رہے ۔

میاں ظفر اب گھر آجاؤ ۔ کوئی سنبل موی نہیں ملے گی تجھے ، کوئی فرحتو ہی

آئے گی ۔ تیرا گھر آباد کرنے کے لئے ۔ باورچن کی باورچن ، بیوی کی بیوی ، ٹھیک ہے چلتا ہے رہا جاب اور گریڈ کا مسئلہ ۔ وہ فاروقی جو ہے ۔ نو پرابلم مائی ڈیر ۔

٦ فروری

میں تو خواہ مخواہ ڈرتی تھی ۔ سوچتی ، پتہ نہیں ۔ میرڈ لائف کیسی ہوگی ۔ خواہ مخواہ جان ڈولتی رہتی ۔ یہ تو کچھ مشکل نہیں نو پرابلم ایٹ آل ۔

بس میاں کو تھوڑی سی توجہ دینی پڑتی ہے ۔ ایک اِلوژن کھڑی کر دو ۔ بہلا دو ۔ جیسے بچے کو سویٹ سے بہلا دیا بس پھر سب اچھا ۔ اچھا کیا اعلیٰ پھر پرولیجز ہی پرولیجز ، ڈریسز ، کمفرٹس ، لکثرری ، سب کچھ ، کتنی خوش ہوں میں ۔

نو بادر نو وری نو پرابلم ۔ یوں ہوں ۔ جیسے گلدستہ سجا ہو فلاور پاٹ میں ۔۔۔ جب بھی جی چاہے سو جاؤ ۔ جب جی چاہے جاگو ۔ لیپز آل دی ڈے یا گو اباؤٹ ، کہیں چلے جاؤ ۔ جہاں جی چاہے ۔ سوشل وزٹ ، کلب ، سینما ، انٹر کان ، ڈرائیو ، وانگ چو ، تماشہ ، چاہے اکیلی چاہے فارو کو ساتھ لے جاؤں ۔ بس ایک پیار بھری نگاہ اک بھرپور اٹینشن ، امپلسٹ کنسرن ، پھر وہ خود بخود پیچھے پیچھے چل پڑتا ہے ۔ بڑا ٹنڈر ہے ۔ افکشنیٹ لیپ ڈاگ بنا لو ۔ جب جی چاہے آ ۔ ۔ ۔ واٹ ہیپی نس ۔

کبھی کبھی تو میں اس فلاور ان دی واز زندگی سے گھبرا جاتی ہوں ۔ جی چاہتا ہے ۔ کوئی پرابلم ہو ، کوئی مشکل ہو ، سٹرگل ہو ۔ پھر سے جین چڑھا کر تھیلا لٹکا کر سڑکوں پر مارا ماری کرتی پھروں ساتھ کوئی ساتھی ہو ۔ لیپ ڈاگ نہیں ۔ یس ڈارلنگ نہیں ۔ رف ہو ۔ اُجلا نہ ہو ۔ جان ہو اُدھ ہو ، ڈرائینگ روم نہیں ۔ گرین یوتھ ہو ۔ روغنی پتلا نہ ہو آگے پیچھے پھرنے والا نہیں ، پھرانے والا ۔

کتنا احمق نکلا وہ ظفر میدان چھوڑ گیا نہیں تو ۔ ۔ ۔ چلو چھوڑو ہٹاؤ

نہیں نہیں میں خوش ہوں ۔ بہت خوش ، بہت ہی ۔

مجھے کیا میتسر نہیں ، کس چیز کی کمی ہے ۔ افلوائینس ہی افلوائینس ، آرام ،

اقتدار ، نہیں نہیں میں کیا بے وقوف ہوں کہ کسی کے آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کروں ۔ جسے خود آگے پیچھے پھرنے والا میسر ہو وہ ۔۔۔ وہ کیوں آگے پیچھے پھرنے کی خواہش کرے بھلا ۔

اونہوں ۔ کچی یوتھ کو کیا کرنا ہے ۔ خواہ مخواہ خود کو کانٹوں میں گھسیٹنا ۔۔۔ کوئی بات ہے بھلا ۔ اور پیشن ۔۔۔ پیشن تو تیز دھار ہوتی ہے ۔۔۔ اللہ بچائے ۔

میں تو اتنی خوش ہوں اتنی خوش ہوں ، کہ میرا جی چاہتا ہے رو دوں ۔

اپسرا حویلی

ٹل بجنے پر پریم دیوتا چونکے ۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے بھلا ۔
شش سیوک بولا ۔ کوئی فریادی ہوگا مہاراج ۔
اس سمے فریادی ۔ پریم دیوتا ماتھے پر تیوری چڑھا کر بولے ۔
مہاراج ۔ شش سیوک نے کہا ۔ فریاد کا کوئی سمے نہیں ہوتا ۔
اچھا تو فریادی کو حاضر کرو ۔ دیوتا خشمگیں لہجے میں بولے ۔
نہ مہاراج ۔ شش نے سر لٹکا لیا ۔ جد ماتھے پر بل ہوں اور من میں کرودھ ہو وہ سمے فریاد سننے کا نہیں ہوتا ۔
دیوتا چونکے ۔ مسکرا کر بولے تو کون سمے ہوتا ہے ۔ سیوک شش بولا مہاراج جد من شانت ہو ۔ جد کڑوی کسیلی بے سواد نہ کرے ۔ جد ردھے کان ہی کان بن جائے ۔ جد سُننے والا خود فریادی بن جائے ۔ دونوں میں دوج نہ رہے ۔ وہ سمے فریاد سُننے کا ہوتا ہے ۔ مہاراج ۔
پریم دیوتا نے جواب دینے کے لئے سر اٹھایا ۔ دیکھا کہ سامنے دروازے میں ایک عورت سر جھکائے چھوئی موئی کھڑی ہے ۔
تُم کون ہو ؟ دیوتا نے پوچھا ۔
میں فریادن ہوں مہاراج ۔ عورت نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔
بول کیا مانگتی ہے فریادن ؟
کچھ بھی نہیں مانگتی مہاراج ۔
آپ ہی کہتی ہے ۔ فریادن ہوں ۔
میری فریاد میں مانگ نہیں مہاراج ۔
شش سیوک یہ کیا کہہ رہی ہے ۔ دیوتا نے پوچھا ۔
مہاراج شش نے جواب دیا ۔ فریاد میں مانگ ہوتی ہے پر ضروری نہیں

کہ ہو۔

دیوتا نے سر جُھکا لیا ۔ بولے اچھا تو بول فریادن تو کیا کہنا چاہتی ہے ۔

فریادن نے کہا مہاراج میں استری ہوں ۔ میں للج ہوں ۔ سیوا ہوں ۔ پتی بھگتی ہوں ۔ ممتا ہوں ۔ آپ نے میرے ہاتھ میں عورت کی بانہہ پکڑائی تھی اور کہا تھا اس کے انگ انگ میں رچی رہنا ۔ اس کی ہر سانس میں اپنی مہک گھولنا ۔ ہر آن اسے تھامے رکھنا جس طرح گھوڑی کو لگام تھامے ہے ۔

ہاں ہاں پھر دیوتا نے پوچھا ۔

مہاراج میں نے ویسے ہی کیا جیسے آپ نے کہا تھا ۔ پر آج عورت نے مجھے دھتکار دیا ہے ۔ کہتی ہے میں نے سارے بندھن توڑ دیئے ہیں ۔ میں آزاد ہوگئی ہوں ۔ مجھے کوئی سنگ سہارا نہیں چاہیئے ۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔ دیوتا بولے ۔ ہم نے تو استری کے روحے کے بند بند میں تجھے رچا بسا دیا تھا ۔ پھر وہ تجھے کیسے نکال پھینک سکتی ہے ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔

ایسا ہو گیا ہے مہاراج ۔ فریادن نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔

لیکن پُھول سے مہک کیسے الگ ہو سکتی ہے ۔

مہاراج پُھول نے مہک کو تیاگ کر رنگ کو اپنا لیا ہے ۔ مدھم کو چھوڑ کر بھڑک کو اٹھا لیا ہے ۔

ششش سیوک سُن رہے ہو ۔ یہ کیا کہہ رہی ہے ۔

سُن رہا ہوں مہاراج ۔ ششش بولا ۔

جو استری میں للج ، ممتا نہ رہی تو وہ استری کیسے رہے گی ۔ استری نہ رہے تو کیا بن پائے گی ۔ دیوتا گویا اپنے آپ سے بولے

مہاراج فریادن نے کہا ۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیا بن گئی ہے ۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس نے مجھے تیاگ کر بن باسی بنا دیا ہے ۔ میں دُکھڑا نہیں روتی مہاراج ۔ مجھے اس سے لاگ نہیں ۔ لگاؤ نہیں ۔ مَیں تو صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اب میرے لئے کیا آ گیا ہے ۔

تو نہیں سمجھتی فریادن ۔ دیوتا نے کہا ۔ اگر استری نے تجھے تیاگ دیا

ہے ۔ اگر اس میں استری پن نہیں رہا تو سمجھ لو وہ استری نہیں رہی ۔ اگر استری ، استری نہ رہے گی تو پھر پرش بھی پرش نہیں رہے گا اور پرمیشور نے جو استری اور پرش کے بیچ پریم بندھن کا ناطہ بنا رکھا ہے ۔ وہ ٹوٹ جائے گا ۔

مہاراج شش بولا ۔ پریم بندھن تو پرمیشور کی اک چال ہے ۔ اک چلتر ہے جس کے زور پر جیون کی جھجری بھری رہتی ہے ۔ موت کی ٹپکن اسے خالی نہیں کر پاتی ۔

چال ہی سہی پرنتو ۔ دیوتا نے کہا اگر ایسا ہو گیا تو سنسار میں جیون کی ندی سُوکھ جائے گی ۔

ایسا ہونے کو ہے مہاراج ۔ فریادن چلّائی ۔

فریادن تُم اب جاؤ ، یہاں پاٹ شالا میں رُکی رہو ۔ ہم پتہ کرتے ہیں ۔ پھر تم سے بات کریں گے ۔

فریادن کے جانے کے بعد وہ شش سیوک سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔ شش تُم دھرتی پر اُترو ۔ راج نائکہ سے مِلو ۔ اس سے بھید لو ۔ اس کے پاس بھانت بھانت کا پرش آتا ہے اور جو اچھا وہ لے کر آتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گھر گھر ستّی کس حال میں ہے ۔ راج نائکہ مرد اور عورت دونوں کے بھید جانتی ہے ۔

جب شش سیوک راج نائکہ سے ملنے اپسرا حویلی میں پہنچا تو ابھی شام نہیں پڑی تھی ۔ اُس نے دیکھا کہ بہت سی نوجوان طوائفیں اپنی اپنی چوکی پر بیٹھی ہار سنگھار میں مصروف ہیں ۔ ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں ۔ چہلیں کر رہی ہیں ۔

اس وقت شش نے ایک بوڑھے رئیس عیاش کا بھیس بدل رکھا تھا ۔

اسے داخل ہوتے دیکھ کر ایک طوائف نے منہ موڑ لیا ۔ دوسری نے ناک چڑھائی ۔ تیسری کی بھویں سکڑ کر کمان بن گئیں ۔ چوتھی منہ پر ہاتھ رکھ کر تحقیر سے ہنس دی ۔

یہ دیکھ کر شش کا ماتھا ٹھنکا ۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں ۔ یہ تو اپسرا حویلی نہیں دِکھتی ۔ یہاں تو رنگ ہی کچھ اور ہے ۔

رنڈی کا کام تو گاہک کا سواگت کرنا ہوتا ہے ۔ پرش کو لبھانا ہوتا ہے ۔ اسے مائل کرنا ہوتا ہے ۔ اس کے اندر کے بالک کو جگانا ہوتا ہے ۔ اسے کھیلنے پر اکسانا ہوتا ہے ۔ چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا ۔ بوڑھے کو تو بوہتا دھیان دیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ دھن کے زور پر آتا ہے اور بوڑھے میں لُبھ زیادہ ہوتا ہے ۔ رنڈی کا تو کام ہی یہی ہے کہ منش میں لُبھ جگائے اور پھر روپیہ بٹورے ۔

ہے بھگوان یہ مَیں کیا دیکھ رہا ہوں ۔ رنڈی گاہک کو دیکھ کر ناک چڑھا رہی ہے ۔ منہ موڑ رہی ہے ۔ ششش مڑ کر باہر نکلنے کو ہی تھا کہ ایک کونے سے اُدھیڑ عمر کی نائکہ شرنو اس کے پاس آئی ۔ بولی آئیے جناب آئیے تشریف لائیے مَیں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں ۔

دیوی یہ اپسرا حویلی ہے کیا ششش نے پوچھا ۔

شرنو نے نووارد کی بات سنی تو اپنا طرزِ کلام بدل کر بولی ۔

ہاں مہاراج پدھاریئے پدھاریئے ۔ جی آیاں نوں ۔ آؤ مہاراج بیٹھ کے بات کرو ۔ کس لئے یہاں آکر ہماری شوبھا بڑھائی ۔ سُر سنگیت کے رسیا ہو تو بتاؤ ۔ ناچ نرت چاہو ہو تو ، جوبنا کے پُجاری ہو تو بانکپن کے گاہک ہو تو ۔ مہاراج حویلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود ہے ۔ جو چاہو جیسی چاہو بس اک بار حکم دو ۔ یہ سن کر ششش سیوک بیٹھ گیا ۔ شرنو وہ بولا جب میں نے حویلی میں پاؤں دھرا اور میں نے دیکھا کہ ان الھڑ رنڈیوں نے منہ موڑ لیا ہے تو مجھے وسواس ہوا کہ مَیں بھول سے کسی اور جگہ آگیا ہوں ۔

شرنو مسکرا کر بولی ۔ مہاراج حویلی کے وہ پرانے طور طریقے بیت گئے ۔ اب طوائف وہ طوائف نہیں رہی ۔ اس نے کینچلی بدل لی ہے ۔ روپ بھگت سچ کہتی تھی کہ جب طوائف میں "مَیں" جاگے گی تو سمجھ لینا کہ کلجگ آگیا ۔

رُوپ بھگت کون تھی ۔ ششش نے پوچھا ۔

مہاراج ، وہ راجہ عندلیب راؤ کی پُتری تھی ۔ جب جوان ہوئی تو پتہ نہیں من میں کیا سمایا کہ راج محل کو چھوڑ کر بھگتی کے لئے چل نکلی ۔ سولہ سال بھگتی میں گذارے ۔ پھر گرو آتما دیو کے پاس پہنچی ۔ بولی مہاراج سولہ سال کی بھگتی

کے بعد مجھے پتہ چلا ہے کہ جب تک من مندر پر "میں" کا کلس چڑھا ہے بھگتی اندھی گلی کی سمان کسی اور نہیں لے جائے گی ۔ اب بولو مہاراج "میں" مارن کے لئے میں کیا کروں ۔ کہاں جاؤں ۔

گرودیو بولے ۔ روپ تو راجہ کی پُتری ہے ۔ محل میں پلی ہے ۔ خود کو دوجوں سے اونچا سمجھنا تیری ہڈی میں رچا ہے ۔ تیری "میں" ایسے کیسے نہیں جائے گی ۔ بھگت بولی جو میں راجہ کی پُتری ہوں تو اس میں میرا کیا دوش ہے ۔ گرودیو جس بات پر میرا بس نہیں وہ میرے راستے کا پتھر کیوں بنے مہاراج ۔

گرودیو سوچ میں پڑ گئے ۔ پھر سر اٹھا کر بولے تیرے لئے دھرتی پر "میں" کو نچوڑ نکالن کی صرف ایک جگہ ہے ۔ وہاں جائے گی کیا ۔

روپ بولی جاؤں گی مہاراج چاہے وہ پاتال ہی کیوں نہ ہو ۔ گرو مسکائے کہنے لگے ۔ وہاں نیچ بن کر رہنا ہوگا ۔

رہوں گی مہاراج ۔ روپ نے جواب دیا ۔

اچھا تو اپسرا حویلی میں چلی جا اور رنڈی بن جا ۔

روپ نے گھبرا کر گرودیو کی طرف دیکھا ۔ کیا کہا مہاراج گرودیو ہنسے ۔ گھبرا گئی نا ۔ تُو رنڈی کے ظاہر پر نہ جا ۔ ظاہر میں وہ ترلج ہے ۔ ہوس کی ماری ہوئی دِکھتی ہے ۔ پر اس کا ایک اندر کا روپ بھی ہے ۔ رنڈی خود کے لئے نہیں دوجوں کے لئے جیتی ہے ۔ دوجوں کو خوش کرنا اس کا دھرم ہے ۔ دُوجا چاہے اُجلا ہو یا میلا ۔ لڑاکا ہو یا پریمی ۔ دھن وان ہو یا اُچکّا ۔ سڑی ہو یا ہنسوڑ ۔ اس گھاٹ کا متوالا ہو یا اس گھاٹ کا ۔ کوئی بھی ہو ۔ کیسا ہی ہو وہ اسے خوش کرتی ہے ۔ چاہے اپنا من جل جائے ۔ چاہے اپنی پریم جھجری پُھوٹ جائے ۔ وہ اپنی "میں" کو تیاگ دیتی ہے ۔ بس وہی ایک جگہ ہے جہاں تیری "میں" کا پھوڑا پُھوٹ سکتا ہے ۔ پرنتو ایک بات یاد رکھنا ۔ اوش ۔ اپنے گاہکوں سے جتنا پیسہ بٹور سکے بٹورنا ۔ پر اسے اپنے پاس نہ رکھنا ۔ اسے اپنا نہ جاننا ۔ اسے ہاتھ نہ لگانا اور جو ہاتھ لگائے تو صرف دوجوں میں بانٹنے کے لئے وہ تھی روپ بھگت مہاراج ۔ شرنو نے کہا ۔ وہ یہاں آئی ۔ پورا ایک سال یہاں رہی اور جاتے سمے کہنے لگی ۔ شرنو ۔ اب سمے بدل رہا ہے ۔ رنڈی میں "میں"

اُبھر رہی ہے ۔ اور تُو جان لے جب رنڈی میں "میں" اُبھر آئی ۔ جد وہ اپنی مرضی سوچنے لگی تو سمجھ لینا کلجگ آگیا۔

سچ کہتی تھی ۔ روپ بھگت ۔ ششں نے ہنکارا بھرا ۔

مہاراج ، شرنو بولی ، رنڈی تو پانی سمان ہووے ہے چاہے اسے پیالے میں ڈال لو چاہے کٹوری میں ، ہر روپ میں ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے ۔ وہ بن جاتی ہے جو دوجا چاہے ہے ۔ دوجا میٹھے کا رسیا ہو تو مٹھاس بن جاتی ہے ۔ دوجا سی سی کرنے کا متوالہ ہو تو مرچ بن جاتی ہے ۔ اس کا اپنا کوئی سواد نہیں ہوتا مہاراج ۔

شرنو اب تو رنڈی کا وہ رنگ نہیں رہا جس کی تو بات کر رہی ہے ۔ ششں نے نوجوان رنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا ۔ بولا تیرے پاس سے اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ پر مجھے راج نائکہ سے ملنا ہے ۔

یہ سن کر شرنو پھر اُٹھ بیٹھی ۔ پدھاریئے مہاراج کہہ کر وہ راج نائکہ کی طرف چل پڑی ۔

راج نائکہ کے منہ پر جُھریاں پڑی ہوئی تھیں ۔ بال کھچڑی ہو رہے تھے ۔ پھر بھی وہ ریشمی کپڑے پہنے زیور لگائے بیٹھی اپنے بال سُکھا رہی تھی ۔

ششں کو آتے دیکھ کر اس نے جلدی جلدی کھلے بالوں کا جوڑا بنایا اور اٹھ کر ششں کا سواگت کیا ۔ جب شرنو چلی گئی تو ششں نے اپنی جیب سے سونے کا کڑا نکالا ۔ بولا یہ تمہاری بھینٹ ہے دیوی ۔ سونے کو دیکھ کر راج نائکہ کا چہرہ کِھل اُٹھا ۔ بولی ۔ اس کی کیا ضرورت تھی مہاراج میں تو ویسے ہی باندی ہوں ۔ حکم کرو کیا چاہتے ہو ۔ میں تو آپ کی سیوا کے لئے یہاں بیٹھی ہوں ۔ بلکہ آپ نے خود آنے کی تکلیف کیوں کی ۔ مجھے بلوا بھیجتے ۔ ششں کو پتہ چل گیا کہ سونا کام کر گیا ۔ بولا ۔ دیوی ۔ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس آتا ہے ۔

راج نائکہ مسکرائی کہنے لگی تو بولو مہاراج کو کیسی پیاس ہے کس کی پیاس ہے ۔ کسی پر من ریجھ گیا ہے یا کسی کو گھر ڈالنے کا دھیان ہے ۔

ششں نے جواب دیا میری پیاس کچھ اور ہے دیوی ۔ میں تو تیرے پاس اس طرح آیا ہوں جیسے بالکا گرو کے پاس جاتا ہے ۔ میں تو تیرے دوار بُدھی کی

تلاش میں آیا ہوں ۔ سچ کی ڈھونڈ کرنے آیا ہوں

راج نائکہ کے ماتھے پر سوچ کی تیوری پڑ گئی ۔ دیر تک وہ سر نوائے بیٹھی رہی ۔ پھر سر اُٹھا کر بولی ۔

مہاراج جو سچ کی ڈھونڈ میں ہو تو کسی رشی منی کے پاس جاؤ ۔ نائکہ تو سچ سے مُنہ موڑ کر بیٹھی ہے ۔ جو بُدھی کی تلاش ہے تو کِسی ودھوان کے پاس جاؤ کسی عالم کو ڈھونڈو ۔ ششش بولا ۔ نہ دیوی مجھے پڑھی پڑھائی ، سُنی سنائی بُدھی نہیں چاہیئے ۔ اس لئے میں تیرے پاس آیا ہوں ۔ تیرے پاس بیتی بُدھی ہے ۔ تُو نے جیون کو بیت کر دیکھا ہے ۔

مہاراج کئی قسم کی دانائی ہوتی ہے ۔ آپ کو کون سی دانائی کی تلاش ہے ۔ نائکہ نے پوچھا ۔

مجھے مرد اور عورت کے آپس کے ناطے کا بھید جانتا ہے ۔ ششش نے جواب دیا ۔

راج نائکہ پھر سوچ میں پڑ گئی ۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسا مرد ہے جو پُھول کی خوشبو سے محظوظ ہونے کی نہیں سوچ رہا ۔ اس کا بھید پانے کی خواہش لئے بیٹھا ہے ۔ مرد کا کام تو عورت سے خوشی حاصل کرنا ہے ۔ اس کا بھید پانا نہیں ۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور کہنے لگی ۔ نائکہ بھلا عورت کا بھید کیسے پا سکتی ہے مہاراج ۔

نائکہ بھی تو عورت ہی ہوتی ہے ۔ ششش نے کہا ۔

بڑا فرق ہوتا ہے مہاراج ۔

وہ کیسے ۔ ششش نے پوچھا ۔

ذرا سوچو مہاراج مرد گھر کی استری کو چھوڑ کر طوائف کے پاس کیوں آتا ہے ۔ نائکہ نے کہا ۔ اگر عورت اور طوائف میں فرق نہ ہو تو کیوں آئے سچ کہتی ہو ۔ ششش نے سر ہلا دیا ۔ ششش کا مقصد تو یہی تھا کہ راج نائکہ باتیں کئے جائے کئے جائے اور پھر ان میں سے وہ اپنے مطلب کی باتیں چُن لے بڑا فرق ہے مہاراج ۔ راج نائکہ نے کہا ۔ گھر کی عورت سہتی زیادہ ہے کہتی کم کم ہے ۔ پریم لگن بیتے زیادہ ہے جتاوے کم کم ہے ۔ جلے تو ہے پر بھڑک کر نہیں جلے

ہے ۔ مدھم مدھم ۔ اندر اندر بھیڑ لگی ہووے ہے اوپر شانت دِکھے ہے ۔ اپنی خواہشوں کو لاج کی اوڑھنی تلے چھپائے رکھے ہے ۔

اور رنڈی ششں نے پوچھا ۔

رنڈی میں لاج نہیں ہوتی ۔ وہ سہتی نہیں صرف کہتی ہی کہتی ہے ۔ پریم لگن بیتے نہیں ہے صرف جتاوے ہی جتاوے ہے ۔ جلے نہیں پر یُوں نظر آوے ہے جیسے بھڑک کر جل رہی ہو ۔ اندر سے خالی ہووے ہے پر باہر بھیڑ لگاوے ہے ۔ لگائے رکھے ہے ۔

سچ کہتی ہو ششں نے ہنکارا بھرا ۔

جب مرد گھر والی کی ایک رنگی سے اُکتا جاتا ہے تو وہ حویلی کا رُخ کرتا ہے ۔ نائکہ نے بات جاری کی ۔ اِسے گھر والی کی کٹوری اوندی نظر آتی ہے ۔ اس لئے وہ بھری ہوئی اُچھلتی ہوئی بلوری پیالی کی طرف آتا ہے ۔ مہاراج میں تو صرف اُچھلتی پیالیوں کو جانتی ہوں ۔ میں گھر کی عورت کو کیا جانوں ۔ نائکہ خاموش ہوگئی ۔

ششں سوچ میں پڑگیا ۔ کون سی چال چلوں کہ راج نائکہ بولنے پر مائل ہو ۔

اُدھر راج نائکہ سوچ میں پڑی تھی کہ یہ شخص کون ہے ۔ کیوں بھید لے رہا ہے ۔ کس کے لئے بھید لے رہا ہے ۔ وہ اور بھی محتاط ہوئی جا رہی تھی ۔

دیکھ دیوی ۔ ششں بولا ۔ اندر سے تو استری ہی ہے نا ۔ نائکہ تو ایک بہروپ ہے جو تُو نے دھار رکھا ہے تاکہ کاروبار چلتا رہے ۔

یہ سچ ہے مہاراج کہ نائکہ میں بھی عورت ہوتی ہے جسے وہ اپنی من کے پلّو میں یُوں باندھے رکھتی ہے جیسے گاؤں والی اپنی چُنّی کی کنّی میں پیسے باندھ رکھتی ہے ۔ لیکن مہاراج یہ بات تو گھر والی پر بھی ایسے ہی بیٹھتی ہے جیسے نائکہ پر ۔

میں سمجھا نہیں دیوی ششں نے کہا ۔

مہاراج نائکہ بولی ۔ جس طرح طوائف کے من میں عورت کی پوٹلی بندھی ہوتی ہے اسی طرح عورت کے دل میں طوائف کی پوٹلی بندھی رہتی ہے ۔

وہ کیسے دیوی ششں نے پوچھا ۔

نائکہ نے کہا مہاراج سیدھی بات ہے ۔ انسان اس کی قدر نہیں کرتا جو اسے حاصل ہو ۔ جو نہ حاصل ہو اس کے سپنے دیکھتا ہے نائکہ کو گھر گھرستی حاصل نہیں اس لئے وہ گھر کے سپنے دیکھتی ہے ۔ گھر گھرستی کو طوائف کی کشش حاصل نہیں اس لئے وہ طوائف کے سپنے دیکھتی ہے ۔

دیوی ۔ ششش نے کہا ۔ تیری حویلی میں رنگ رنگ کے پرش آتے ہیں تو ان کو دیکھتی ہے ۔ ان کی اکشاؤں کو جانتی ہے وہ گھر میں پوری نہیں ہو پاتیں جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ یہاں آتے ہیں اور یوں تجھے پتہ چل جاتا ہے کہ گھر گھرستی میں کیا ہے ، کیا نہیں ۔ تُو آنے والوں کے روپ سے گھر کی عورت کے رنگ ڈھنگ کو خوب جانتی ہے ۔

راج نائکہ یہ سن کر گہری سوچ میں پڑ گئی ۔ اور دیر تک سر جُھکائے بیٹھی رہی ۔ پھر اُس نے سر اُٹھایا ۔ بولی مہاراج ایک بات پوچھوں ۔

ہاں ہاں پوچھو ۔ ایک کیا دس پوچھو ۔ ششش مُسکرایا ۔

یہ بتاؤ مہاراج کہ آپ یہاں خود آئے ہیں کیا ؟

میں نہیں سمجھا ۔ ششش نے سوچنے کے لئے وقت حاصل کرنے کے لئے کہا ۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا بھید رکھے رہے یا کھول دے ۔

نائکہ مسکرائی ۔ بولی مہاراج جو یہاں خود آتا ہے وہ ایسی باتیں نہیں پوچھتا جیسی آپ پوچھ رہے ہیں ۔

اب بات چُھپانا بے کار تھا اس لئے ششش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نائکہ سے ساری بات کہہ دے گا ۔

تو نے میرا بھید کیسے جان لیا دیوی ، ششش ہنس کر بولا ۔

نائکہ کہنے لگی مہاراج اپسرا حویلی تو بھید حویلی ہوتی ہے ۔ یہاں ہر کوئی اپنا بھید رکھنے کے لئے پورا زور لگاتا ہے ۔ نائکہ اپنا بھید چھپاتی ہے ۔ گاہک اپنا بھید چھپاتا ہے اور بھید کی یہ عادت ہے مہاراج کہ جتنا چھپاؤ اتنا کُھل کُھل جاتا ہے ۔ پھوٹ پھوٹ نکلتا ہے تو مہاراج اس حویلی میں سارے ہی پردوں سے ڈھکے ہوتے ہیں ۔ پرنتو سارے ہی ننگے ہوتے ہیں ۔

کتنی سیانی ہے تُو دیوی ، ششش نے کہا ۔

وہ تو مہاراج میں پہلے ہی جان گئی تھی کہ آپ یہاں خود نہیں آئے ۔ پر بھیجن والے کا پتہ ابھی تک نہیں چلا ۔ چلئے تو معلوم ہو کہ کس خیال سے بھیجا ہے ۔ صرف جانتے کے لئے کہ جان کر جانی بات کو برتنے کے لئے ۔

یہ سُن کر ششش نے نائکہ کو ساری بات کہہ سُنائی ۔ جسے سُنکر نائکہ نے اطمینان کا سانس لیا ۔ بولی مہاراج پہلے ہی بتا دیتے تو میں بات ٹالن میں نہ لگی رہتی ۔

ششش ہنسنے لگا ۔

نائکہ بولی ۔ مہاراج فریادن سچی ہے ۔ عورت نے نسائیت کو تیاگ دیا ہے ۔

تمہیں کیسے پتہ ہے جو اتنے بھروسے سے کہہ رہی ہے ۔ ششش نے پوچھا ۔

مہاراج مجھے پتہ ہے ۔ یہ سُنی سنائی نہیں بیتی کہہ رہی ہوں ۔

وہ کیسے ؟ ششش نے پوچھا ۔

نائکہ نے جواب دیا مہاراج حویلی ویران ہوتی جا رہی ہے ۔ حویلی میں اب وہ بھیڑ نہیں رہی ۔ بہت کم لوگ آتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے وہ کچھ جس کے لئے وہ یہاں آتے تھے ۔ اب انہیں گھروں میں مل جاتا ہے ۔

کیا عورت میں رنڈی کا رنگ پیدا ہوگیا ہے ۔ ششش نے پوچھا ۔

مہاراج ۔ نائکہ نے جواب دیا ۔ گھر گھرستتی نے لاج کی اوڑھنی کو سر سے اُتار دیا ہے ۔ اس نے نسائیت کی خشبو کو تیاگ کر رنگ اپنا لیا ہے ۔ بھڑکیلا رنگ ۔ پہلے وہ مرد کے ہاتھ کا کھلونا بننے میں خوشی محسوس کرتی تھی ۔ اب اس نے مرد کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانے کا فن جان لیا ہے ۔ ہاں مہاراج ۔ عورت میں طوائف کا رنگ اُبھرتا آرہا ہے ۔ اسی وجہ سے حویلی ویران ہوتی جا رہی ہے ۔

اچھا تو اب ہوگا کیا ۔ ششش گویا خود سے بڑے فکر مندانہ انداز میں بولا ۔

اگر استری نہ رہی تو مرد مرد نہ رہے گا ۔

ہاں مہاراج ۔ مرد مرد نہیں رہا ۔ نائکہ نے جواب دیا ۔ دونوں کے لباس

ایک جیسے ہوگئے ہیں ۔ چال ڈھال ایک جیسی ہوگئی ہے ۔ رنگ روپ ایک جیسا ۔ کوئی فرق نہیں رہا مہاراج ۔

کیا انہیں الگ الگ ہونا چاہیئے اس بارے میں تو کیا کہتی ہے ۔ ششی نے پوچھا ۔

ضرور الگ ہونا چاہیئے مہاراج۔ ایک سی چیزیں ایک دوجے کو لبھاتی نہیں ۔ اِک دوجے کو چھیڑتی نہیں ۔ کھینچتی نہیں ۔ جو مرد عورت میں چھیڑ نہ رہے لبھاوٹ نہ رہے تو پھر رہا کیا ۔ مہاراج اگر مرد عورت اک دوجے کے اُلٹ ہوں تو ایک دوجے کو کھینچیں گے ۔ جو ٹھنڈی اور گرم تاریں ملیں تو شعلہ نکلتا ہے ۔ ایک سی تاریں ہوں تو کچھ بھی نہ ہو ۔

ششی گھبرا گیا اور اضطراب میں بولا تو پھر ہوگا کیا ۔

کچھ نہیں ہوگا مہاراج ۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو دیوی ششی بولا ۔

سچ کہہ رہی ہوں مہاراج ۔

جو استری بدل گئی تو ۔

نہیں بدلے گی ۔ نائکہ مُسکرائی ۔

تو خود ہی تو کہہ رہی ہے دیوی کہ وہ بدل رہی ہے ۔

مہاراج جب وہ نمک کھا کھا کر اکتا جاتی ہے تو پھر میٹھا کھانے لگتی ہے صرف مُنہ کا سواد بدلنے کے لئے چار دن میٹھا کھا کر مُنہ پھر جائے گا اور وہ پھر سے لون کو اپنا لے گی ۔

کیا یہ سچ ہے ؟ ششی نے چونک کر پوچھا ۔

راج نائکہ مُسکرائی ۔ بولی مہاراج بیتے سمے میں کئی بار عورت اپنی ڈگر سے ہٹ کے چلی تھی ۔ پرنتو صرف اس لئے کہ پھر سے اپنی ڈگر کو اپنا لے ۔ وہ اپنا آپ صرف اس لئے کھو دیتی ہے کہ اسے پھر سے پالے ۔ پھر سے خود کو جانے ۔

تو پھر میں جا کر دیوتا مہاراج سے کیا کہوں ۔

انہیں داسی کا پرنام دینا مہاراج ۔ ان سے کہنا چنتا نہ کریں ۔ جو آج

عورت میں اُبال آیا ہے اس کی چنتا نہ کریں ۔ اُبال کا کام آنا اور آکر چلے جانا ہوتا ہے ۔ جھگڑ کا کام چلتے رہنا نہیں بلکہ چل کر تھم جانا ہوتا ہے ۔ وہ اس لئے آتا ہے کہ لوگ خاموشی اور سکون کی قدر جانیں ۔

لیکن دیوی یہ جھگڑ تو پتہ نہیں کب تک چلے ۔

نائکہ بولی ۔ دھیرج دھرو مہاراج اسے چلنے دو ۔ روکو نہیں ۔ جو روکو گے تو دب جائے گا ۔ دلوں میں بیٹھ جائے گا ۔ پھر اسے نکالنا مشکل ہو جائے گا ۔

لیکن دیوی ہم فریادن کو کیا جواب دیں ۔ ششش نے پوچھا ۔

مہاراج فریادن کو ہماری حویلی میں بھیج دو ۔

ششش گھبرا گیا ۔ بولا دیوی کیا لاج اور ممتا کو یہاں بھیج دیں ۔ لاج ممتا کا حویلی سے کیا ناطہ ۔ کیا رنڈی لاج کو اپنا لے گی ۔

مہاراج نائکہ مسکرائی ۔ بولی بے شک لاج میں بڑی پوترتا ہے ۔ پر یہ نہ بھولو مہاراج کہ اصل میں لاج بھی اِک سنگار ہے ۔ گالوں پر لالی چاہے ڈبیہ سے نکال کر لگا لو چاہے شرما کر لگا لو ۔

شرما کر لالی کیسے لگاؤ گی دیوی ۔ ششش نے ٹوکا

مہاراج شرمانے کی لالی خون کی سُرخی ہے ۔ لاج خون کو رگوں میں دوڑا کر گالوں میں لے جاتی ہے ۔ چاہے کیسے بھی لے جاتی ہے مہاراج پر یہ سچ ہے کہ لاج اِک سنگار ہے ۔ مطلب ہے دوجے کے دھیان کو اپنی طرف کرنا دوجے کو لُبھانا ۔ مائل کرنا ۔

ہوں ۔ ششش مُسکرایا ۔

مہاراج مرد نرلج پنے سے جلد اُکتا جائے گا ۔ پھر وہ طوائف کی طرف آئے گا ۔ طوائف کی لاج اسے بھرما لے گی ۔ پھر گھر گرستن دیکھے گی کہ گھر والا لاج کے لئے حویلی میں جاتا ہے تو وہ اسے گھر رکھنے کے لئے پھر سے لاج کو اپنا لے گی اور رنڈی پھر سے نرلج ہو جائے گی ۔ یوں چکر پورا ہو جائے گا ۔ اس لئے مہاراج ۔ فریادن کو حویلی میں بھیج دو ۔

○ . . .

آغا اور اسمارائیں

اگر آپ سیاحت سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ سفید آباد ضرور گئے ہوں گے ۔ چک نارو سے جو برانچ لائن شمبھیر کو جاتی ہے سفید آباد اسی لائن پر واقع ہے پہلے سفید آباد کو چٹّی ڈھیری کہا کرتے تھے ۔ مدفون شہروں کو ہمارے ہاں ڈھیری ہی کہتے ہیں ۔ اب کھدائی کے بعد پتہ چلا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال پہلے وہاں رانگاہ قوم آباد تھی ان دنوں سفید آباد کا نام امرت پورن تھا ۔

سفید آباد کی اہمیت صرف آثارِ قدیمہ کی وجہ سے ہی نہیں ویسے بھی یہ علاقہ بے حد انوکھا اور خوبصورت ہے سفید آباد سے بیس میل دور چٹّا پہاڑ شروع ہو جاتا ہے ۔ ایک دم دودھ سی چٹّی سفید زمین ابھر آتی ہے ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آپ کثیف زمین کو چھوڑ کر کسی منور سیارے پر آپہنچے ہوں ۔

اگر آپ کبھی سفید آباد گئے ہیں تو یقیناً آپ نے آغا کو دیکھا ہوگا ۔ جب گاڑی سٹیشن میں داخل ہوتی ہے تو وہ پلیٹ فارم پر لالٹین کے نیچے پتھر کے بنچ پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے ۔ جب گاڑی رُک جاتی ہے تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے بڑے وقار سے آنے والے ٹورسٹوں کا جائزہ لیتا ہے ۔

وہ ایک درمیانے قد کا پُر وقار بوڑھا ہے اس کی عمر ٦٥ سال سے کچھ زیادہ ہوگی ۔ بڑا ول ڈرسڈ آدمی ہے اگرچہ اس کا سوٹ پرانے فیشن کا ہوتا ہے لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلینر سے آیا ہو ۔ اس کا کالر سفید اور سٹف ہوتا ہے ۔ نکٹائی کی جگہ ایک صاف ستھری بولگی ہوتی ہے اور ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے ۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی ، امید اور بشاشت نمایاں ہوتے ہیں بشرطیکہ آپ اس سے مخاطب ہوں اگر وہ اکیلا بیٹھا ہو تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی جھریاں یوں رینگتی ہیں جیسے دکھ کے اتھاہ سمندر میں تنکے جھول رہے ہوں یا ریت کے

گھروندے میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں ۔

آنے والے سیاحوں کا جائزہ لے کر وہ نوجوان نووارد کی طرف بڑھتا ہے گڈ مارننگ سر کتنا اچھا دن ہے آج آپ امرت پورن دیکھنے آئے ہیں نا ۔ آئیے آئیے میں آپ کو لے چلتا ہوں میں امرت پورن کی اینٹ اینٹ سے واقف ہوں ۔ بلّی مندر ۔ پارا کھوہ ۔ رانگانا مانک سب جگہوں سے واقف ہوں ۔ آئیے آئیے میں آپ کو سب کچھ دکھاؤں گا ۔ یس یس آئی ایم گائیڈ بٹ نو نو نو بخشیش ۔ تھنک ۔

۱۹۷۳ء میں جب میں پہلی مرتبہ سفید آباد گیا تھا تو اسے مل کر حیران ہوا تھا خصوصاً جب اس نے کہا یس یس آئی ایم گائیڈ بٹ نو نو نو فی نو بخشیش تھنک ۔ اس کی اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا ۔ آپ سے کیا پردہ میں اس پر شک کرنے لگا تھا ۔ دور حاضرہ میں ہمیں عادت پڑ گئی ہے کہ ہر بات میں مقصد اور مفاد تلاش کریں اور مقصد اور مفاد دکھائی نہ دے تو بے نام شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں ۔ یہ کیسا گائیڈ ہے میں نے سوچا جو نہ تو فیس لیتا ہے اور نہ بخشیش ۔

امرت پورن سفید آباد سے دو میل کے فاصلے پر ہے ہم دونوں تانگے پر سوار ہوگئے ۔

میرے لئے یہ ایک عجیب و غریب سفر تھا ۔ چاروں طرف دودھیا پہاڑ پھیلا ہوا تھا چٹا سفید براق سا پہاڑ ۔ اگرچہ سفید پہاڑ چاک کا پہاڑ نہیں پتھر کا ہے لیکن یہ پتھر سخت نہیں بلکہ ملائم ہے ۔ دیکھنے میں پتھر لگتا ہی نہیں ۔ نہ تو اس میں تہیں ہیں نہ ریشے ۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ سفید پتھر سورج کی شعاعوں کو ریفلکٹ نہیں کرتا بلکہ انہیں جذب کر لیتا ہے اور جذب کرنے کے باوجود گرم نہیں ہوتا ۔ میں ان خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ آغا بولا ۔ اس سفید پتھر کی نوعیت کے متعلق میری معلومات مکمل نہیں ہاں اسماء جانتی ہے اسماء نے پوری تحقیق کی ہے جب ہم سفید آباد آکر آباد ہوئے تھے تو سب سے پہلے اسماء نے اس سفید پتھر پر تحقیق کی تھی کہ یہ دھوپ میں تپتا کیوں نہیں ۔ اتنا ملائم کیوں ہے اس میں لیئرز کیوں نہیں ہیں اور پھر یہاں کاشت کیوں نہیں ہو سکتی ۔

اسماء نے ان سب باتوں پر تحقیق کی تھی وہ آپ کو یہ سب باتیں بتا سکتی ہے ۔

پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ میں اسماء سے متعارف نہیں ہوں وہ ہنس پڑا ۔ بولا اسماء میری بیٹی ہے وہ ایم ایس سی ہے میں اور اسماء اکٹھے رہتے ہیں اس کی والدہ فوت ہو چکی ہے نا ۔ اس لئے میں نے دوسری شادی نہیں کی ۔ کیسے کرتا ؟ کر لیتا تو اسماء کی تربیت کون کرتا ؟ وہ بڑی پیاری بچی ہے آپ اسے مل کر بے حد خوش ہوں گے آغا نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا ۔

اس وقت ہم موڑ پر پہنچ چکے تھے ۔ موڑ مڑتے ہی میری توجہ امرت پورن کی طرف منعطف ہوگئی ۔ ہمارے سامنے پہاڑ کی ایک چوٹی پر سفید پتھر کے گھروندے سے بنے ہوئے نظر آرہے تھے جن میں کالی دھاریوں کے بارڈر دوڑ رہے تھے ۔

ارے ! میں نے پوچھا یہی امرت پورن ہے کیا ؟

آغا نے چھڑی اٹھائی اور اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ چوٹی کے اوپر جو عمارتیں نظر آرہی ہیں یہ امرت پورن کے محلات ہیں اس سے پرے نچان میں امرت پورن کا شہر ہے ۔ شہر تو سب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے لیکن محلات ابھی تک اچھی حالت میں ہیں ۔ شہر کے پاس پارا کھوہ ہے یہ غاروں کا ایک سلسلہ ہے ۔

سب سے بڑا غار رانگانا مانگ ہے جس میں رانگاہ قوم کا اکٹھ ہوا کرتا تھا اس کے ایک کونے میں بَلی مندر ہے ۔ بَلی مندر دراصل ایک قربان گاہ ہے جہاں دیوتاؤں کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی لیکن میں ساری تفصیلات سے واقف نہیں ہوں ۔ ہاں اسماء نے تحقیق کر کے امرت پورن پر ایک کتاب لکھی ہے لیکن اسماء ابھی اسے چھپوانے کے لئے تیار نہیں ۔ وہ ہنسنے لگا کہتی ہے یہ تحقیق ابھی خام ہے جب تک امرت رس کا کھوج نہ لگے کتاب مکمل نہیں ہو سکتی ۔ پھر وہ ہنسنے لگا ۔ اسماء میں تکمیل کا جذبہ بہت شدید ہے وہ پرفیکشن کی دیوانی ہے ۔ امرت رس ایک چشمہ تھا جو بُوند بُوند گرتا تھا ۔ جسے رانگاہ فرٹیلیٹی کا چشمہ سمجھتے تھے ۔ آج کل اسماء امرت رس کا کھوج لگا رہی ہے ۔ اُدھورے کام سے اسے قطعی دلچسپی نہیں لیکن جب آپ اسماء کو دیکھیں گے تو آپ حیران رہ جائیں گے اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس قدر عالمانہ خیالات کی مالک ہے ۔

آپ جانتے ہیں علم کا خبط عورت کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی پیدا کر دیتا ہے جیسے ہارڈ بوائلڈ ایگ ہو لیکن نہیں اسماء کے چہرے پر بڑی معصومیت ہے ۔ معصومیت اور شگفتگی دیکھیں تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ مشکل سے دس جماعتیں پاس ہو ۔ کتنی حیران کن بات ہے لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے آج ہی ۔

عین اس وقت تانگے والے نے پوچھا ۔ آپ پہلے کھوہ کی طرف جائیں گے یا محل دیکھیں گے پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتا آغا بولا پہلے کھوہ کی طرف چلو ۔ تانگہ بان نے دائیں طرف تانگہ موڑ دیا ۔

آپ ہمیشہ سے یہیں مقیم ہیں کیا ۔ میں نے آغا سے پوچھا ۔

نہیں نہیں وہ بولا ۔ میرا نام آغا ثناء اللہ ہے میں نے ساری زندگی گورنمنٹ سروس میں گذاری ہے پھر ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد اتفاق سے اسماء اور میں سفید پور آئے اسماء کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ۔ ایک چھوٹا سا مکان بنوا لیا ہے بڑا مکان بنوانے کی کیا ضرورت تھی ۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں ۔ اسماء کی شادی ہو جائے گی تو میں اکیلا رہ جاؤں گا ۔ بڑا مکان کیا کرنا ہے ۔

آپ نے اتنا پڑھا لکھا کر اپنی بیٹی کو گھر بٹھا رکھا ہے آغا صاحب ۔ میں نے ویسے ہی کچھ کہنے کے خیال سے کہا ۔

نہیں نہیں وہ بولا بیٹی سے ملازمت کرانے کا مجھے کوئی حق نہیں اور پھر شاید اس کا ہونے والا خاوند اسے پسند نہ کرے ۔ ہاں اگر شادی کے بعد اس کا ہونے والا خاوند چاہے تو بیشک نوکری کرے ۔ آپ کسی بیٹی کے باپ نہیں ہیں نا ؟ وہ ہنسنے لگا ۔

ابھی تو نہیں میں نے جواب دیا ۔

آپ باپ کی ذمہ داری کو نہیں جانتے صاحب ! میں نے اپنی بیٹی کو آئیڈیل بیوی بنانے کی کوشش کی ہے اس کا ذہن مغربی ہے اور روح مشرقی ۔ سینا پرونا سلائی کڑھائی اور خانہ داری میں اسماء کو بڑی دسترس حاصل ہے صرف پاکستانی ہی نہیں اسے کانٹیننٹل کھانے پکانے بھی آتے ہیں اور یہ سب ٹریننگ میں نے

اسے بڑی کاوش سے دی ہے ۔ اس کا ہونے والا خاوند سُکھ بھری زندگی بسر کرے گا ۔

کیا آج کا خاوند سُکھ بھری زندگی چاہتا ہے ۔ میرے جی میں آیا کہ آغا سے پوچھوں لیکن اس وقت آغا اسماء کے دھیان میں کھویا ہوا تھا ۔ اس کے چہرے کے ویرانے میں فکر بھری جھریاں یوں سمٹ کر پھیل رہی تھیں جیسے ریت کے گھروندے پر چیونٹے حرکت میں ہوں اس کے چہرے کو دیکھنے کے بعد مجھے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی ۔

کھوہ کو دیکھنے میں ہمیں پورے دو گھنٹے لگ گئے اس دوران وہ مجھ سے امرت پورن کی باتیں کرتا رہا لیکن ہر چیز کی تفصیل سمجھاتے ہوئے بات اسماء کی طرف مڑ جاتی اور وہ اسماء کے کوائف بیان کرنے لگتا ۔

ان دو گھنٹوں میں مجھے امرت پورن کی بجائے اسماء کے کوائف سے زیادہ واقفیت ہو چکی تھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ امرت پورن کا نہیں اسماء کا گائیڈ ہو ۔

اس کی باتیں سُن سُن کر میرے دل میں اسماء کے لئے عجیب سی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی ۔ کیسے نہ ہوتی آغا نے اسماء کے متعلق تفصیلات بیان کر کے میری آنکھوں کے سامنے اسماء کی تصویر کھڑی کر دی تھی ۔ وہ کیسے اٹھتی ہے کیسے بیٹھتی ہے کیسے مسکراتی ہے کیسے سوچتی ہے کیسے گفتگو کرتی ہے اس کی آنکھوں میں کتنی شرم و حیا ہے ۔ پلکوں میں کتنی معصومیت ہے ٹھوڑی کتنی کتابی ہے ۔

پھر جب ہم کھوہ سے واپس آئے اور ہمارا تانگہ محل کی طرف مڑنے لگا تو میں نے تانگے والے کو منع کر دیا کہ محل کی طرف نہ مڑے محل پھر سہی تو آغا کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی بالکل ٹھیک وہ بولا ۔ آپ ہوٹل میں نہ ٹھہریں یہاں صرف ایک ہوٹل ہے امرت پورن ہوٹل لیکن وہاں نہ امرت ہے نہ پورن ہے وہ تو سیاحوں کی کھال تک اتار لیتے ہیں ۔ مہنگ فروشی کی انتہا ہے ۔ چائے کا پیالہ ایک روپے میں ۔ ذرا اندازہ لگائیے ۔ آپ ہمارے ہاں ٹھہریئے ہم نے گھر کا ایک کمرہ مہمان کے لئے وقف کر رکھا ہے چھوٹا سہی مگر آرام دہ ہے اور پھر اسماء

خود سروس کرے گی ۔ اس نے مہمان نوازی کی خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہے ۔ دفعتاً وہ رکا ۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور گھبرا کر بولا نو نو نو ہم پیئنگ گیسٹ نہیں رکھتے ، نو چارج ، نو پے منٹ ، تھنگ پلیز ۔

آغا کے چہرے پر بے بسی ، لجاجت اور فکر مندی دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا ۔ اس وقت مجھے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے ۔

جب ہم سٹیشن کے قریب پہنچے تو میں نے ہمت کر کے کہہ دیا کہ مجھے آج ہی واپس جانا ہے ۔ اس پر آغا کے چہرے کی ساری جھریاں اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں پر اکٹھی ہو گئیں اور اس کا چہرہ یوں نظر آنے لگا جیسے دکھ کا اتھاہ سمندر موجیں مار رہا ہو ۔

یہ دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی ۔ میں نے کہا میں جلدی واپس آؤں گا بہت جلد واپس آؤں گا ۔ بہت جلد اِس پر اس کے چہرے پر پھر امید کی کرن طلوع ہوگئی ۔

جب میں گاڑی میں سوار ہو رہا تھا تو آغا مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا ۔ جلد آئیے گا ۔ اسماء اور میں آپ کا انتظار کریں گے ۔

جب گاڑی چلنے لگی تو پتہ نہیں کیوں میرے منہ سے نکلا آغا صاحب اسماء کو گائیڈ بنا کر اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے ۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی گردن لٹک گئی غالباً وہ سوچ میں پڑ گیا تھا ۔

دور تک گاڑی کے دروازے میں کھڑا میں اسے دیکھتا رہا وہ واپس جا رہا تھا گردن یوں لٹکی ہوئی تھی جیسے ٹوٹ گئی ہو واپس جاتے ہوئے اس کی چال میں وقار نہیں تھا ۔ کمر جھکی ہوئی تھی ۔ ٹانگیں جیسے گھسٹتی جا رہی ہوں اور چھڑی جیسے گر جانے سے بچنے کا واحد سہارا ہو ۔

شہر واپس آکر میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور امرت پورن کے اس بوڑھے پنشنر کو بالکل بھول گیا پھر ایک دن جمیل نے بات چھیڑی تو چٹا پہاڑ میرے سامنے آکھڑا ہوا اور پہاڑ کے سامنے آغا یوں کھڑا ہوگیا جیسے سینما کے پوسٹروں پر ہیرو ایستادہ ہوتے ہیں اس کے شانے کے پیچھے سے اسماء جھانک

رہی تھی ۔

تمہارا امرت پورن کا ٹرپ کیسا رہا ۔ جمیل نے پوچھا ۔

میں نے کہا امرت پورن تو میں نے غور سے دیکھا ہی نہیں ۔

کیوں جمیل نے پوچھا ۔

وہاں ایک بوڑھا پنشنر آغا مل گیا تھا وہ اتنا عظیم کردار تھا کہ اس نے امرت پورن کو ڈھانپ لیا ۔

اچھا جمیل ہنسا ۔

ہاں ! میں نے جواب دیا وہ بڈھا آغا اور اس کی بیٹی اسماء دونوں ہی ۔

اسماء جمیل نے دہرایا ۔ کہیں وہ آغا ثناء اللہ تو نہیں ۔

کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا اس نے ۔ میں نے جواب دیا ۔

جمیل بولا میں اسے جانتا ہوں وہ ابا جان کا کولیگ تھا ۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی رہتا تھا ۔

اچھا تو تم اسماء کو بھی جانتے ہو ۔

اسماء سے تو میری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی ۔ جمیل نے کہا ۔

ارے میں چلّایا مجھے پوری بات بتاؤ یار ۔

اس پر جمیل نے سگریٹ سلگایا کرسی پر ٹیک لگائی ۔ دو ایک کش لئے اور کہنے لگا ۔

آغا کی کہانی بڑی مختصر ہے ۔ یہ ایک المیہ ہے ان لوگوں کا المیہ جو اپنی بیٹیوں کی تربیت قدروں کے مطابق کرتے ہیں اپنے نقطۂ نظر سے انہیں مثالی بیویاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ہونے والے خاوند کیا چاہتے ہیں اور ۔۔۔

فلسفہ نہ بگھارو میں نے اس کی بات کاٹی ۔

وہ ہنس پڑا کہنے لگا آغا ایک بلند کردار آدمی تھا اسے اپنی بیوی سے محبت تھی لیکن وہ ایک حادثے میں فوت ہوگئی اس کی صرف ایک ہی بیٹی ہے اسماء ۔ آغا نے اپنی تمام تر محبت اسماء پر مرکوز کر دی لوگوں نے بہت سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو ۔ لیکن آغا نہ مانا اس نے اپنی تمام تر توجہ اس بات پر لگا دی کہ اسماء

کو ایک آئیڈیل بیوی بنائے ۔

اور وہ کامیاب ہوگیا کیا ؟ میں نے پوچھا ۔

بڑی حد تک جمیل نے کہا لڑکی کو ایم ایس سی کرایا گھر پر آرٹس کی تعلیم دی ۔ موسیقی ۔ مصوری ۔ ابتدائی تعلیم پھر خانہ داری ۔ سینا پرونا ۔ اس نے اسماء کو سب کچھ سکھایا ۔ لیکن جمیل نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہوگیا ۔

لیکن کیا ؟ میں نے پوچھا ۔

محلے میں اور جوان لڑکیاں بھی تھیں لیکن آغا انہیں پسند نہیں کرتا تھا اس لئے کہ ان میں دکھاوا تھا ۔ شوخی تھی ۔ فیشن تھا سب ملمع ہی ملمع وہ کہا کرتا تھا ۔ جمیل ہنسنے لگا ۔ سارے محلے میں اسماء کے سگھڑپنے اور کردار کی دھوم تھی ۔ محلے والے اسماء کی مثال دیا کرتے تھے ۔

ہوں یہ بات ہے میں نے کہا ۔

لیکن جمیل نے سلسلۂ کلام جاری کیا اسماء کے لئے کوئی پیغام نہ آیا اس کے برعکس محلے کی دوسری لڑکیاں باری باری سب لگ گئیں سب کی شادیاں ہو گئیں صرف اسماء رہ گئی ۔

لیکن کیوں ! میں نے پوچھا ۔

پتہ نہیں کیوں ؟ بڑے سب اسماء کے حق میں تھے اور نوجوان اگرچہ اس کے معترف تھے لیکن اس سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھے اسلم نے تو صاف انکار کر دیا تھا ۔ اس نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ تو نمازیں پڑھتی ہے پھر یہ بات سارے محلے میں مشہور ہوگئی تھی حتیٰ کے آغا نے اسماء کو نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا ۔ جمیل خاموش ہوگیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا ۔

لیکن تم تو کہتے تھے میں نے پوچھا تمہاری شادی اسماء سے ہوتے ہوتے رہ گئی ۔

ہاں وہ بولا ۔ امی ۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ میری شادی اسماء سے ہو جائے ۔

اور تمہاری اپنی خواہش نہ تھی کیا ؟ میں نے پوچھا ۔

میری خواہش بھی تھی اس میں بڑے گن تھے اس میں مٹھاس تھی ۔

ساتھی بننے کی صلاحیت تھی ۔ خدمت کا جذبہ تھا ۔ بڑی معصومیت تھی اس میں ہر وہ گن موجود تھا جو جیون ساتھی میں ہونا چاہیئے ۔

پھر بات ٹوٹ کیوں گئی ؟ میں نے پوچھا ۔

انہی دنوں مجھے شہناز مل گئی اس میں اتنی بھڑک تھی کہ میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور میں شہناز کا ہو کر رہ گیا ۔ جمیل خاموش ہوگیا ۔ کافی دیر تک خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا ۔ پھر بولا دراصل اسماء ایک دیا تھی جو مدھم لو سے جلتا تھا ۔ اس میں بھڑک نہیں تھی اور ہم بھڑک کے دلدادہ ہیں وہ پھر خاموش ہوگیا ۔ پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ کاش میں شہناز سے نہ ملتا ۔

اسی سال مجھے پھر امرت پورن جانے کا اتفاق ہوا جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آغا اپنی مخصوص بنچ پر موجود نہ تھا اس کی جگہ ہپیوں کا ایک جوڑا بیٹھا تھا ۔

خیر میں گاڑی سے نیچے اترا جب میں پلیٹ فارم کے دروازے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہپیوں کا جوڑا میرے سامنے کھڑا ہے ۔ ہپی نے سر پر ہیٹ پہنا ہوا تھا ہپن کے بال کھلے تھے اور جسم پر ایک لمبا چغا تھا ۔

ہپی نے ایک چھپا ہوا کارڈ میرے سامنے کر دیا اس پر لکھا تھا مسٹر آرتھر جیک اور مس "آئی ۔ وی" امرت پورن کے مستند گائیڈ ہیں ۔ کارڈ پڑھ کر ہپی کو واپس کرتے ہوئے میں نے پہلی بار غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ ارے آغا ۔۔۔۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ۔ ساتھ ہی میری نگاہ اسماء پر پڑی جو اس وقت کارٹون لگ رہی تھی ۔ یہ آپ کی بیٹی اسماء اور آپ آغا ہیں نا ۔

نہیں آغا نے جواب دیا ۔ میں آغا نہیں ہوں میں آرتھر جیک ہوں اور یہ میری بیٹی مس آئی وی ہے ہم کنورٹ ہوگئے ہیں سر ۔

یہ کہتے ہوئے آغا کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو ڈھلک کر اس کے چہرے کی جھریوں میں اٹک گئے ۔

ہانٹڈ ہاؤس

ڈاکٹر نے پوچھا مونا ڈر تو نہیں گئی ۔
میں جواب دینے ہی والی تھی کہ ڈیڈ بولے نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے ۔
یہ سن کر میں تو چپ ہی ہو گئی میں کیا بولتی بھلا ۔
ڈیڈی کو کیا پتہ کہ یہ گھر ہانٹڈ ہے ۔ کسی کو بھی تو نہیں پتہ ۔ کوئی بیک یارڈ میں گیا ہو تو پتہ چلے نا ۔ کوئی بھی تو نہیں جاتا اُدھر ۔ ممی جو کہتی ہے سرونٹ کوارٹرز کی طرف نہیں جانا ۔ اِٹ از ناٹ ڈن ۔
حسنے کے کوارٹر کے سامنے جو امرود کا پیڑ ہے اور پیڑ کے عین نیچے جو ٹوٹی ہوئی کرسی رکھی ہوئی ہے نا وہ اس پر بیٹھا رہتا ہے ۔ میں نے تو کئی بار دیکھا ہے اسے ۔ ایک بار نہیں کئی بار ۔
اُس نے سفید جوڑا پہن رکھا ہوتا ہے ۔ چِٹّا سفید اس کا اتنا بڑا فیس ہے چوڑا لمبا ۔ سارا کا سارا جھریوں سے بھرا ہوا ۔ جھریاں ہی جھریاں نیچے سے اوپر تک تہیں لگی ہوئی ہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے ان میں جان ہو ۔ پھیلتی سمٹتی رہتی ہیں نا ۔ رینگتی ہیں جس طرح تالاب میں پتھر مارو تو لہریں رینگتی ہیں ۔۔۔ اور پھر اس کی اتنی لمبی داڑھی ۔ اوپر سے چل کر نیچے چھاتی تک داڑھی ہی داڑھی چِٹّی سفید داڑھی ۔
کُرسی میں بیٹھے ہوئے وہ اُونگھتا رہتا ہے ۔ ذرا آہٹ ہو تو آنکھیں کھول دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اتنی افیکشن ہے اتنی افیکشن ہے جتنی رضیہ کی آنکھوں میں چمکتی ہے جب وہ اپنی بیٹی نامو کی طرف دیکھتی ہے ۔ رضیہ ہمارے پڑوسی کی میڈ سرونٹ ہے نا ۔
میں تو اس سے کبھی نہ ڈری تھی ۔۔۔ ایسے چِٹّے سفید روئی کے گالے بابے سے بھلا کون ڈرتا ہے ۔ اُلٹا وہ مجھے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے ۔ کرسی سے اٹھ

کھڑا ہوتا ہے ۔ مدھم آواز میں پوچھتا ہے مس صاحبہ ۔ صاحب نے بُلایا ہے کیا ۔ میں آؤں ۔

جب مَیں نہ میں سر ہلا دیتی ہوں تو اس کی روشن آنکھیں بُجھ جاتی ہیں ۔ اچھا نہیں بُلایا ۔

وہ تو وہاں صرف اس اُمید پر بیٹھا ہے کہ صاحب بُلا لے ۔ ایسے بابے سے بھلا کون ڈرے ۔

مصیبت یوں آئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی ۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا ۔ نہ میں ڈرتی نہ مجھے بخار آتا ۔ نہ ڈاکٹر کی کڑوی دوائیں کھانی پڑتیں ۔ اور حسنے سے میں نے پوچھا بھی تو بائی دی وے تھا ۔

میں نے کہا حسنے ۔ تیرے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ کے نیچے جو بابا بیٹھا رہتا ہے وہ تیرا کچھ لگتا ہے کیا ۔

حسنے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا ۔ کون سا بابا مس صاحبہ ۔

وہی جو سفید کپڑے پہنے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا رہتا ہے ۔

نہیں مس صاحبہ اس نے جواب دیا ۔ میں نے تو وہاں کبھی کسی بابے کو بیٹھے نہیں دیکھا ۔

یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی ۔

بس اس روز سے مجھ پر خوف طاری ہوگیا ۔ اسی شام جب میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی تو میں نے سوچا ایک بار پھر دیکھوں تو ۔

میرے باتھ روم کا روشندان بیک یارڈ میں کھلتا ہے ۔ میں نے اٹھ کر روشندان سے جھانکا ۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بابا کرسی پر جوں کا توں بیٹھا ہے ۔۔۔ اور اس کے پاس ہی جائے نماز بچھا ہوا ہے ۔

یہ دیکھ کر میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں اور پھر پھونک کر بخار چڑھ گیا ۔

اس روز کے بعد میں کبھی بیک یارڈ میں نہیں گئی ۔ نہ ہی میں نے کبھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکا ہے ۔ لیکن رات کو جب میں بیڈ پر لیٹتی ہوں تو میرے دل میں خوف اٹھتا ہے کہ وہ ابھی باتھ روم کے روشندان سے جھانکے گا ۔ اس پر میں لپک کر اٹھتی ہوں اور روشندان کا دروازہ بند کر دیتی ہوں ۔

پھر آہستہ آہستہ میرے کمرے کی وہ دیوار جو بیک یارڈ کی طرف ہے یوں کھل جاتی ہے جیسے بتاشہ ہو اور بیک یارڈ میرے سامنے آجاتا ہے ۔ پھر دفعتاً وہ مڑ کر میری طرف دیکھتا ہے ۔ مس صاحبہ صاحب نے بُلایا ہے کیا ۔ میں آؤں ۔

میں چیخ کر اُٹھ بیٹھتی ہوں ۔

آپ ہمارے گھر کو نہیں جانتے ۔

ہمارا گھر اصولی گھر ہے ۔ یہاں اصول چلتے ہیں ۔ کیا کہتے ہیں اسے ۔۔۔ ہاں صراطِ مستقیم ۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارا گھر صراطِ مستقیم ہے مذہب والا نہیں، سوشل والا صراطِ مستقیم ۔ ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسنا رونا سب سوشل رنگ میں رنگا ہوا ہے ۔

یوں سمجھ لو کہ سوشل سڑک پر ہمارا گھر دو پہیوں پر چلتا ہے ۔۔۔ ڈن ۔۔۔ ناٹ ڈن جو فیشن میں ہے وہ ڈن ہے اس لئے کرو ۔ فوراً کرو ۔ بھول چوک کی اجازت نہیں ۔ جو ناٹ ڈن ہے ۔ وہ نہیں ہوگا ۔ نہیں ہو سکتا اس لئے مت کرو ۔ وہ ٹیبو ہے ۔ ٹیبو ۔

اس بات میں ممی نے ہمیں بہت ٹرین کیا ہے ۔ بات بات پر وہ ہمیں یاد دلاتی رہتی ہیں ۔ بچو مت کرو تز ناٹ ڈن ۔

ہم چار بھائی بہن ہیں ۔ میں ہوں سنبھ ہے ۔ ٹونی ہے اور بڑے بھائی جان آصف ہیں ۔ بچپن سے ہی ہم ہر بات پر سوچتے ہیں کہ کہیں یہ ناٹ ڈن تو نہیں ۔ ناٹ ڈن پر تو ممی ڈیڈ کو بھی ڈانٹ دیتی ہیں اور ڈیڈ نے کبھی برا نہیں مانا ۔ بس پی جاتے ہیں ۔ ایک دفعہ ڈیڈ اپنے کسی دوست کو اپنے بیڈ روم میں لے گئے تھے ۔ توبہ ڈیڈی کو ممی سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی تھی ۔

دراصل ممی چاہتی ہے کہ وہ سوشل سیڑھیوں پر چڑھتی جائے ذرا دم نہ لے ۔ جبھی تو پچھلے پانچ سال میں ہم کہاں سے کہاں آپہنچے ہیں ۔ ورنہ ہیں تو دونوں ہی گاؤں کے ڈیڈ بھی ممی بھی جبھی تو وہ پاسٹ کو بھول جانا چاہتی ہے ۔ سب ریلیشنز کو چھوڑ دیا ۔ نہ میل نہ ملاپ نہ آنا جانا نہ لینا دینا ۔ جبھی تو ہمارے گھر نہ کبھی کوئی کزن آیا ہے نہ انکل نہ آنٹی ۔

ہمارا گھر تو ٹک ٹک قسم کا گھر ہے آپ ہی آپ چلتا ہے جیسے گھڑی چلتی ہے ۔ چیزیں اپنی اپنی جگہ یوں قائم رہتی ہیں جیسے کیل ٹھکے ہوئے ہوں ۔ کیا مجال جو اِدھر کی چیز اُدھر ہو جائے ۔ کیا مجال جو کوئی نوکر کو آواز دے کر بُلائے ۔ نو ۔ نو ۔ گھنٹی بجاؤ ۔ کیا مجال جو ہمارا کوئی فرینڈ ہمارے بیڈ روم میں چلا جائے ۔ نو ۔ نیور ۔

ساری غلطی ڈیڈ کی تھی ۔ وہی اس بڈھے بابے کو اُنگلی لگا کر گھر میں لے آئے تھے ۔

اس روز حسنا چھٹی پر تھا ۔ ڈوربل جو ہوا تو خود میں نے جا کر دروازہ کھولا ۔ ویسے تو یہ ناٹ ڈن بات تھی ۔ میں نے دروازہ کھولا تو ڈیڈ اندر آگئے ۔

ارے یہ ڈیڈ نے بڈھے بابے کو کیوں انگلی لگا رکھا ہے ۔ میں حیران مائی گاڈ واٹ از دس تھنگ ۔ چٹی سفید داڑھی ۔ کھڑکھڑ کرتی شلوار قمیض ۔

میں سوچنے لگی ۔ رشتے دار تو ہو نہیں سکتا ۔ سوشل وزیٹر بھی نہیں ۔ ۔ ۔ پھر یہ ہے کون مائی گاڈ یہ کیا ؟

ڈیڈ بڈھے کو بیڈ روم کی طرف لے جا رہے تھے ۔ نو نو نو ۔ ۔ ۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا ۔ اِٹ از ناٹ ڈن ۔

لیکن اس روز سبھی ابنارمل ہو رہے تھے ۔

یہ اس روز کی بات ہے جس روز پی آئی اے کا طیارہ ہائی جیک ہوا تھا اور فضائی ڈاکو اسے پشاور کی جگہ کابل لے گئے تھے ۔

جب ہم نے خبر سُنی تھی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی ۔ ممی کا تو بہت برا حال تھا ۔ ڈیڈی اسے حوصلہ دیتے لیکن ممی کی حالت غیر ہوتی جاتی ۔

ویسے تو اس واقعہ پر ہر کسی کا دل دھک سے رہ گیا تھا ۔ ہر کوئی ان غنڈوں کے خلاف دانت پیس رہا تھا ۔ اس روز تو ہر کوئی ریڈیو ٹیلی ویژن پر خبروں کا انتظار کر رہا تھا ۔ بھئی یہ ایک قومی حادثہ تھا نا ۔

لیکن ہم پر یہ خبر بجلی بن کر اس لئے گری تھی کہ میرا بڑا بھائی آصف اسی جہاز پر سوار تھا نا ۔

ممی کا تو رو رو کر بُرا حال ہوگیا تھا ۔ آنکھیں سوج گئیں ۔ آواز بیٹھ گئی اور وہ لونج سے اُٹھ کر بستر پر جا پڑیں ۔ جب ڈیڈ بڈھے بابے کو بیڈ روم میں لے گئے تو میں نے سوچا ۔ ممی بُری طرح سے جھاڑ جھپٹ کریں گی ۔ ڈر کے مارے مَیں تھر تھر کانپتی رہی ۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا ۔ ممی کی آواز تک نہ آئی ۔ ڈیڈ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی ۔

کچھ دیر کے بعد ممی کی آوازیں آنے لگیں ۔ آہستہ آہستہ مدھم جیسے کوئی زیرِ لب منتیں کر رہا ہو ۔ میں بہت حیران ہوئی ممی کس کی منتیں کر رہی ہے ۔ ممی اور منت ۔ اونہوں ممی نے تو کبھی کسی کی منت نہیں کی ۔ اس کی گردن تو ہمیشہ اکڑی رہتی ہے ۔ وہ تو ڈیڈی کے سامنے بھی نہیں جھکتیں یہ جاننے کے لئے کہ بات کیا ہے میں نے ٹونی کو پٹی پڑھائی کہ اندر جا کر دیکھے ۔

ٹونی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ ڈیڈی نے دروازہ کھولا لیکن ٹونی کو اندر داخل ہونے نہ دیا ۔ بولے اس وقت نہیں ٹونی تمہاری ممی کی طبیعت اچھی نہیں ۔ ٹونی نے کہا باجی میں نے ادھ کھلے پٹ سے دیکھ لیا ۔ درمیان میں بڈھا بابا بیٹھا ہے ۔ اِدھر ممی اُدھر ڈیڈی ۔

اس رات دیر تک ممی کی سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں ۔

اگلے روز ایک عجیب بات ہوئی ۔ حسنا بازار سے سودا لایا تو اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے دو لوٹے تھے ۔

میں نے حیرت سے پوچھا ۔ حسنے یہ لوٹے کس کے ہیں ۔ بولا مس صاحبہ بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں ۔ ممی لوٹا منگائے ۔ اونہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ مین نے سوچا ۔

مجھے یاد ہے ایک سال پہلے جب ہم نے یہ والا مکان کرائے پر لیا تھا تو گھر میں پہلے سے ہی پلاسٹک کا کورا لوٹا پڑا تھا ۔

ممی نے کہا یہ لوٹا حسنے کو دے دو اس کے کام آئے گا ۔

میں نے کہا ممی رہنے دو ۔ ہمارے کام کا ہے ۔

اس پر ممی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی ۔ نو ناٹ لوٹا ۔ جگ منگوالو مگ منگوالو ۔ ناٹ لوٹا ٹز ناٹ ڈن ۔

اور ۔ ۔ ۔ آج ممی نے خود لوٹے منگوائے ہیں ۔ ایک نہیں دو ۔ یہ ناٹ ڈن کیسے ڈن ہوگیا بھلا ۔

پھر اُسی شام ہمارے پڑوسی کی میڈ سرونٹ رضیہ دو چھوٹے چھوٹے غالیچے دے گئی ۔

یہ کیا چیز ہے۔میں نے پوچھا۔

بولی یہ جاء نماز ہیں ۔ بیگم صاحبہ نے منگوائے ہیں ۔

اسی رات میں نے ممی کے دروازے کے کی ہول سے جھانکا ممی غالیچے پر کھڑی تھی اور وہ بڈھا بابا آنکھیں موندھے کُرسی پر بیٹھا تھا ۔ بڈھے کی بے بسی دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ممی ڈیڈ نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے ۔

ممی کو نماز پڑھتے دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا ۔ یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے ۔ سارے ہی ناٹ ڈن ۔ ڈن ہوگئے ۔ ممی کی تو سمجھو دنیا ہی بدل گئی ۔ یوں ساد مرادی ہوگئی کہ کچھ حد نہیں نہ پاؤڈر نہ سُرخی نہ لپ سٹک ۔ نہ میک اپ نہ ہیرڈو نہ زیور نہ کچھ ۔ ڈریس بدل گیا ۔ دوپٹہ ماتھے پر لٹکنے لگا ۔ سارے سوشل وزٹ منسوخ ہوگئے ۔ کوئی آتا تو ریگریٹ کر دیتے ۔ ممی بیڈ ریسٹ پر ہیں ڈیڈی گھر پر نہیں ۔ حالانکہ دونوں اندر ہوتے ۔ ہر وقت اندر ہی گھسے رہتے ۔

جس روز ہائی جیکرز نے نوجوان اہلکار کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا ۔ اُس روز تو ممی کے کمرے سے خوفناک آوازیں آتی رہی تھیں ۔ ہچکیاں ، سسکیاں اور دبی دبی چیخیں ۔ توبہ ہے ۔ دو دن ہمارے گھر کی حالت غیر رہی ۔

پھر دفعتاً خبر آئی کہ ہائی جیکرز نے مسافروں کو آزاد کر دیا ہے ۔ یہ خبر سن کر ممی ڈیڈ کمرے سے باہر نکل آئے اور ٹی وی کے سرہانے بیٹھ گئے ۔ بیٹھے رہے حتٰی کہ خبر کی تصدیق ہوگئی ۔

اُسی شام ڈیڈ ممی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بھائی کو ریسیو کرنے کراچی چلے گئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا ۔ پتہ نہیں وہ بڈھا بابا کب بیڈ روم سے باہر نکلا ۔ میں نے اسے نکلتے دیکھا نہیں ۔

چار ایک دن کے بعد ممی ڈیڈی آصف بھائی کو ساتھ لے کر آگئے ۔ ہم تو بھائی کو دیکھ کر کھل گئے ۔ پورے چار دن بھائی یہاں رہے ۔ توبہ بھائی کی گپتیں

اور چھیڑ خانیاں اور لطیفے اور اُلٹی سیدھی باتیں ۔ اتنا ہنگامہ رہا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا ۔ اتنی رونق رہی کہ کچھ حد نہیں ۔ پھر وہ چلے گئے اور گھر پھر سے وہی گھر بن گیا ۔

ممی پھر سے وہی ممی بن گئیں اور ڈن اور ناٹ پھر سے قائم ہوگئے ۔ لوٹے غائب ہوگئے ۔ چھوٹے غالیچے صندوق میں بند ہوگئے ۔ قرآن الماری میں رکھ دیا گیا ۔ ممی کا بیڈ روم پھر سے پراپر بیڈ روم بن گیا ۔ میک اپ کا سامان باہر نکل آیا ۔ شلوار قمیض غائب ۔ دوپٹہ پتہ نہیں کیا ہوا ۔ سوشل وزٹس پھر سے چالو ہوگئے ۔ اور ہمارا گھر پھر سے گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگا ۔ اور وہ بابا ہمارے ذہن سے بالکل ہی خارج ہوگیا ۔

پھر ایک دن ٹونی میرے پاس آیا کہنے لگا باجی ہماری شٹل کاک بیک یارڈ کے روشندان میں پھنس گئی ہے ذرا نکال دیجئے ۔

بیک یارڈ میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ حسنے کے کوارٹر کے سامنے امرود کے پیڑ تلے وہی بابا ایک ٹوٹی ہوئی کُرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا ہے ۔

مائی گاڈ یہ یہاں کیوں بیٹھا ہے ۔

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں ۔ مؤدبانہ اُٹھ کھڑا ہوا ۔ بولا مس صاحبہ کیا صاحب نے بُلایا ہے ۔ میں آؤں ۔

اس پر میں بکّی بکّی رہ گئی ۔ لو صاحب اسے کیوں بُلائیں گے بھلا خواہ مخواہ ۔

اس کے بعد جب بھی میں بیک یارڈ میں گئی تو میں نے اسے وہیں بیٹھے دیکھا ۔ اس پر میں سمجھتی کہ یہ بابا ضرور حسنے کا کچھ لگتا ہوگا ۔

ہمارا نوکر حسنا بھی تو پرانی وضع کا آدمی ہے ۔ بس سارا دن یا تو وضو کرتا رہتا ہے یا نمازیں پڑھتا رہتا ہے ۔ پینڈو ہے نا اس لئے ۔

وہ تو مجھ سے غلطی ہوگئی کہ میں حسنے سے پوچھ بیٹھی ۔ نہ پوچھتی تو کچھ بھی نہ ہوتا ۔ نہ میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپتی نہ مجھے بخار آتا ۔

میں کہتی ہوں وہ اب بھی وہاں بیٹھا ہے ۔

وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتا ہے ۔ صاحب نے بُلایا ہے کیا ۔۔۔ میں

آؤں ۔

مائی گاڈ وہ اتنا بے چین کیوں ہے کہ صاحب اسے بُلا لے ۔۔۔ کیا وہ یونہی ہمارے گھر کو بانٹ کرتا رہے گا ۔

..... ○ ....

ایک تھا بادشاہ

ایک تھا بادشاہ ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ۔ بادشاہ کا نام اسادا تھا ۔

جب اسادا بوڑھا ہوگیا تو اسے یہ فکر دامنگیر ہوئی جیسے کہ ہر بادشاہ کو ہوتی ہے کہ کہیں راج پاٹ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے ۔

شاہ اسادا سوچ سوچ کر ہار گیا کہ کون سا طریق کار اختیار کرے ۔ چونکہ بادشاہ تھا لہذا کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ دل کی بات کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا ۔ بادشاہ ، لقمان کے اس کوے کا مصداق ہوتا ہے جو منہ میں پنیر کا ٹکڑا پکڑے درخت پر بیٹھا ہو ۔ درخت کے نیچے مشیر وزیر کھڑے یک زبان ہو کر کہہ رہے ہوں "شاہ عالم آپ کتنے خوش گفتار ہیں ۔ بولتے ہیں تو پُھول جھڑتے ہیں" ۔ پھول جھڑیں یا نہ جھڑیں پنیر کا ٹکڑا منہ میں ہو تو کیسے بات کرے ۔

شاہ اسادا کا وزیر بڑا با تدبیر تھا ۔ جیسے وزیر ہمیشہ ہوتا ہے ۔ اس حد تک با تدبیر تھا کہ بادشاہ خود اس کی با تدبیری سے خوف زدہ تھا ۔

وزیر بادشاہ کی فکر مندی کو بھانپ گیا ۔ ایک روز موقع پا کر تخلیے میں بولا : "عالی جاہ ! میری گردن کاٹنے کا حکم صادر فرمائیے" ۔ بادشاہ یہ سن کر بہت حیران ہوا ۔ بولا "تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ میں ایسا حکم صادر کروں" ۔

وزیر بولا "شاہ عالم ، اگر بادشاہ سلامت کی پیشانی پر فکر مندی کی سلوٹیں موجود ہوں تو بے شک وزیر گردن زدنی ہوتا ہے ۔ عالی جاہ سیانے کہتے ہیں ۔ اگر کوئی بات چھپانی مقصود ہو تو اسے ایسے چھپاؤ کہ برتاؤ کے کسی دریچے سے جھانکنے نہ پائے ۔ اور اگر جھانکے تو پھر چھپانا سعی لا حاصل ہے ۔ اور عالم پناہ ! بادشاہ سلامت کو سعی لا حاصل زیب نہیں دیتی" ۔

اب بادشاہ کے لئے کوئی چارہ نہ رہا ۔ بولا "وزیر با تدبیر ہم چاہتے ہیں کہ جیتے جی راج پاٹ اپنے بڑے بیٹے کو سونپ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو

جائیں"۔

وزیر نے جواب دیا "عالی جاہ ! اس میں فکر مندی کی کیا بات ہے ۔ "حکم دیجئیے تعمیلِ ارشاد ہوگی"۔

بادشاہ نے کہا "وزیر با تدبیر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے"۔

وزیر بولا "شاہ عالم ! ویسے تو حکم پر سرِ تسلیم خم ہے ۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ بادشاہ کا بیٹا نہیں ہوتا، شہزادہ ہوتا ہے ۔ اور شہزادے کا باپ نہیں ہوتا بادشاہ ہوتا ہے ۔ آگے آپ مالک ہیں"۔

یہ سُن کر بادشاہ گھبرا گیا ۔ لیکن خاموش رہا ۔

وزیر نے اپنی بات جاری رکھی ۔ کہنے لگا "عالی جاہ ! شہزادہ ساجھانا گذشتہ آٹھ سال سے یورپ میں یونیورسٹی آف ویسٹرن آرٹس اینڈ سائنس میں زیرِ تعلیم ہے ۔ شہزادے کی تاجپوشی کا اعلان کرنے سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کرنا مناسب رہے گا ۔ حکم ہو تو شہزادہ سلامت کو بلانے کے لئے ایلچی روانہ کر دیا جائے"۔

شہزادے کی آمد کے بعد بادشاہ اور وزیر یہ جان کر حیران رہ گئے کہ ساجھانا کسی صورت بادشاہ بننے پر رضا مند نہ تھا ۔

اس میں شہزادے کا کوئی قصور نہ تھا ۔ سالہا سال مغربی یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد وہ بادشاہ کے نام سے ہی الرجک ہو چکا تھا ۔

وزیر بولا "شہزادہ سلامت ! آپ کتاب و شنید کے چکر میں آچکے ہیں ۔ یہ کتابی علم جو درس گاہوں میں رائج ہے عملی زندگی میں نہیں چلتا ۔

شہزادے نے جواب دیا "محترم وزیر ! بادشاہ پرانے زمانے کی چیز ہے ۔ وہ مدت سے مر چکا ہے ۔ آپ مجھے بادشاہ بنا کر مرحوم و مغفور نہ کریں ۔ میں زندہ رہ کر زندگی کرنا چاہتا ہوں"

وزیر بولا "شہزادہ عالی ! یہ کہنا کہ بادشاہ مر چکا ہے ایک کتابی خوش فہمی ہے ۔ عملی زندگی میں وہ آج بھی جُوں کا تُوں زندہ و پائندہ ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ بادشاہ نے بھیس بدل لیا ہے خود کو کیما فلاج کر لیا ہے ۔ کہیں وہ سفید کپڑوں

میں چھپا بیٹھا ہے کہیں خاص قسم کے لباس میں ۔ کہیں نمائندے کا سوانگ رچائے بیٹھا ہے کہیں سامراجی طاقتوں کے خلاف نعرے لگا رہا ہے ۔ کہیں عوام کی محبت کی بھبھوت ملے بیٹھا ہے ۔ کہیں خدمتِ خلق کا روپ دھارے ہوئے ہے ۔ شہزادہ سلامت ! یاد رکھیئے کہ بھیس بدلنے سے کردار نہیں بدلتا"۔

"یہ بھیس بدلنے کی رسم بھی نئی نہیں" بادشاہ نے کہا "بلکہ صدیوں پرانی ہے ۔ پرانے زمانوں میں بھی بادشاہ بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتے تھے کہ عوام سے رابطہ قائم ہو"۔

وزیر نے بادشاہ کی بات کاٹی ۔ بولا "گستاخی معاف عالم پناہ ! لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ بادشاہ عوام سے رابطہ پیدا نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسا طرزِ عمل اپنائیں کہ عوام سمجھیں کہ وہ ان سے رابطہ پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں"۔

بادشاہ نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا "شہزادہ ساجھانا ! تم اپنے چچا آدورا کی مثال سامنے رکھو"۔

"چچا تو بادشاہ نہ تھے"۔ ساجھانا بولا "وہ تو عوام کے منتخب نمائندے تھے"۔

"بے شک بے شک آپ درست فرماتے ہیں شہزادہ سلامت !" وزیر با تدبیر نے حامی بھری "عوام آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ شاہ آدورا بادشاہ نہ تھے اور وہ کوئی کام عوام کی مرضی پوچھے بغیر نہ کرتے تھے ۔ عالی جاہ ! بادشاہ کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ بادشاہ تو ہو لیکن عوام اسے بادشاہ نہ سمجھیں"۔

"بے شک بے شک"۔ شاہ نے وزیر پر تحسین بھری نظر ڈالی ۔

وزیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا ۔ بولا "شاہ آدورا عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کی نظر میں ایسا جادو تھا کہ وہ محبت سے بھری ہوئی نظر آتی تھی ۔ جب وہ زبان کی لاٹھی چلاتے تو عوام فرطِ محبت سے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتے"۔

شہزادہ اپنے چچا کا پرستار تھا ، وزیر کی بات سُن کر اسے دھچکا لگا ، بولا : بادشاہ سلامت ! "سفر کی کوفت کی وجہ سے میں بہت تھک گیا ہوں اجازت ہو تو

ذرا آرام کر لوں"۔

ظاہر ہے کہ شہزادے پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا تھا ۔ وہ مغربی رنگ میں رنگا ہوا ایک نوجوان تھا ۔

اسی رات جب بادشاہ ، ملکہ اکلیمہ کے پاس پہنچا تو وہ ایک ہی نظر میں تاڑ گئی کہ سارنگی کے تار ڈھیلے پڑے ہوئے ہیں ۔

ملکہ اکلیمہ بڑی سیانی تھی ۔ ویسے تو ہر عورت سیانی ہوتی ہے ۔ چونکہ اسے ایک ڈھکے چھپے ظلِ الٰہی کے ساتھ رہنا سہنا پڑتا ہے ۔ رہنا کم سہنا زیادہ ۔ لیکن ملکہ تو ایک تنگ دھڑنگ ظل الٰہی کے زیرِ سایہ رہتی تھی ۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی سیانی تھی ۔ اس کے لئے زندگی گویا شطرنج کی بساط تھی ۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ۔ پر ایسا ہوتا ضرور ہے ۔ کششِ ثقل کی روک نہ ہو تو بوٹا اگ نہیں سکتا ۔ بندشوں کے کانٹے نہ ہوں تو گلاب پھول نہیں سکتا ۔

خیر بادشاہ کو دیکھتے ہی ملکہ سمجھ گئی کہ پیشانی کی سلوٹوں میں دبی ہوئی بات ہونٹوں پر اترنے والی ہے ۔ لہٰذا وہ رنگ روپ ناز نخرے کے پیادے چلانے میں مصروف ہوگئی ۔

جس طرح عورت کا کام یہ ہوتا ہے کہ مرد سے معتبری کا چھلکا اتار کر اندر سے کھلنڈرا بچّہ نکال لے ۔ اسی طرح ملکہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ظلّ الٰہی کا پتھر توڑ کر اندر کا انسان باہر نکالے ۔ انسان باہر نکلا تو اس نے ساری بات ملکہ سے کہہ دی ۔

شاہ کی بات سن کر ملکہ بولی : "عالی جاہ ! بادشاہت ایک میوہ ہے ، ایک بار اس کا سواد چکھ لو تو منہ کو لگ جاتا ہے ۔ پھر چھوڑنے سے نہیں چھوٹتا ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ شہزادہ بادشاہ بننا قبول کر لے تو پہلے اس میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا کیجئے ۔ پھل کا سواد چکھائیے ۔ چاٹ لگائیے"۔

"سواد کیسے چکھائیں" ؟ بادشاہ نے پوچھا ۔

پہلے اسے جلسے جلوسوں میں لے جائیں ۔ محل سے نکلے تو طوطیاں بجیں ۔ بازاروں سے گذرے تو سیکوریٹی کی موٹریں ، چلاؤں چلاؤں کرتی ہوئی آگے دوڑیں ۔ ٹریفک بند ہو جائے ۔ پولیس والے راستے روک کر کھڑے ہو

جائیں ۔ راہ چلتوں کو روک کر زبردستی دو رویہ کھڑے کر دیں جیسے وہ خیر مقدم کے لئے گھر سے نکلے ہوں تا کہ شہزادہ سمجھے کہ وہ لوگ نہیں پروانے ہیں ۔ جلسوں میں پُرجوش استقبال ہوں ۔ زندہ باد کے نعرے لگیں ۔ پُھول برسائے جائیں ۔ فوٹو گرافر تصویریں کھینچیں ۔ اخبار شہ سرخیاں سجائیں ، تصویریں لگائیں ۔ ریڈیو اور ٹی وی والے ان مصوّر خبروں کو دُہرا دُہرا کر ناظرین و سامعین کو مفرّح کریں ۔ لیکن ٹھہریئے ۔ شاہ عالم" ملکہ رک گئی ۔ "پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیئے کیا شہزادے کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ مناسب ہے ؟"

اس پر بادشاہ کے پیشانی پر بل پڑ گئے بولا "کیا مطلب ہے تمہارا ملکہ اکلیمہ ؟"

ملکہ بولی : "عالی جاہ ! اگر شہزادے کے منہ کو بادشاہت کا سواد لگ گیا تو وہ بادشاہ بننے کے لئے اتنا بے صبرا ہو جائے گا کہ آپ نہ بنائیں گے تو بھی بننے کے خواب دیکھے گا ۔ اور بن گیا تو وہ بیٹا بن کر نہیں جیے گا ۔ ظلِ الٰہی سیانے کہتے ہیں ، "شیر اس وقت تک شیر نہیں بنتا جب تک اس کے منہ کو خون نہ لگ جائے"۔ اس پر بادشاہ چپ ہوگیا ۔ سوچ میں پڑ گیا ۔

بہر صورت بادشاہ نے حکم صادر کر دیا کہ شہزادے کو جلسے جلوسوں میں گھمایا پھرایا جائے ۔ وزیر با تدبیر بولا "عالی جاہ ! اگر نشر و تشہیر مقصود ہے تو بہتر ہو گا کہ آپ ذرائع ابلاغ کے محکمے والوں سے مل کر اپنا عندیہ بیان کریں ۔

ذرائع ابلاغ کا سربراہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے بر سبیل تذکرہ پوچھا آپ کا محکمہ کیا کام کرتا ہے؟" اس پر سربراہ گھبرا گیا ۔ بولا "شاہ عالم جان کی امان پاؤں تو عرض کروں"

شاہ نے امان دے دی تو وہ بولا "عالی جاہ ! ہمارے دو کام ہیں ، ایک یہ کہ بادشاہ کو حقیقتِ حال کی خبر نہ ہونے پائے ۔ دوسرے یہ کہ عوام میں یہ گمان پیدا کیا جائے کہ انہیں صورت حال سے با خبر رکھا جا رہا ہے ۔

بادشاہ کی سمجھ میں بات نہ آئی ، بولا "بات ہمارے پلّے نہیں پڑی"۔

اس پر سربراہ کی باچھیں کھل گئیں ۔ بولا : "عالی جاہ ! یہی ہمارا کام ہے کہ بات کہ دی جائے لیکن پلّے نہ پڑے ۔ عالی جاہ ! ہم پر اعتماد کیجیئے ۔ ہم ٹیکنیکل

اکسپرٹ ہیں ۔ کام خوش اسلوبی سے سر انجام دیں گے ۔ صرف یہ فرما دیجیئے کہ مقصود کیا ہے ۔

بادشاہ نے جواب دیا : ''ہم چاہتے ہیں کہ شہزادے کے دل میں بادشاہ بننے کی آرزو پیدا ہو جائے ۔

سربراہ یہ سن کر گھبرا گیا ، بولا : ''شاہ عالم ! یہ تو ایک خطرناک بات ہوگی ۔ اس کے علاوہ یہ طریقِ کار پرانا ہے ۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ عوام پُر زور مطالبہ کریں کہ شہزادہ گدی سنبھال لے ۔ ان کے اس پُر زور مطالبے سے مجبور ہو کر شہزادہ تخت نشینی پر رضا مند ہو جائے''۔

''آپ عوام کو رضا مند کیسے کریں گے''؟ شاہ نے پوچھا

''عالی جاہ''! سربراہ بولا ''عوام رضا مند ہوں یا نہ ہوں ۔ ہم بار بار اعلان کریں گے کہ عوام کا یہ مطالبہ ہے ۔ اس بات کو اتنی بار دہرائیں گے کہ عوام سمجھنے لگیں گے کہ واقعی یہ ہمارا مطالبہ ہے اور یہ گمان کہ شہزادے نے ان کی خواہشات پر سرِ تسلیم خم کر دیا ہے ، ان کے لئے کتنی تسکین کا باعث ہوگا''۔

تو جناب دفتر پہنچ کر سربراہ نے احکامات جاری کر دیئے کہ فی الفور ایسے اقدامات کئے جائیں کہ شہزادہ عوام کی آنکھوں کا تارا بن جائے ۔ اس پر محکمے کے کارکن فوراً حرکت میں آ گئے ۔ شہزادے کی تصاویر کھینچی گئیں ۔ آرٹسٹوں نے ان تصاویر میں رنگ بھرے ، آنکھوں میں سیکس اپیل پیدا کی ۔ ساجھانا کی سپاٹ آنکھوں میں گلیڈ آئی چمکنے لگی ، کھلی اور خالی پیشانی پر مردانہ گھوری آ بیٹھی ۔ سیدھے ہونٹ خم آلود ہو گئے ۔

اس کے بعد اخباروں اور رسائل کے نام ایک سرکلر آرڈر روانہ کیا جس میں ان تصویروں کی کاپیاں ملفوف تھیں تاکہ ان تصاویر کے علاوہ شہزادے کی کوئی اور تصویر اخباروں میں نہ چھپے ۔ اخباروں میں ان تصاویر کو جو بھی لڑکی دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے شہزادہ اُس کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے لئے ایک خاص الخاص پیغام ہے ۔

اس کے فوراً بعد شہزادے کا ایک انٹرویو چھپا جسے محکمے والوں نے مرتب کیا تھا ۔ ایک سوال کے جواب میں شہزادے نے کہا کہ میں شاہی خاندان کی

لڑکی سے نہیں بلکہ عوامی ورکنگ وومن سے شادی کروں گا ۔ میں ذات پات ، عہدے ، مرتبے کا قائل نہیں البتہ لڑکی سمارٹ ہو ، ذہین ہو ، کلچرڈ ہو ۔ ضروری نہیں کہ خدوخالی یا گوری ہو ۔

اس اعلان کے بعد شہزادے کے جلسوں اور جلوسوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ مینا بازار کا شبہ پڑنے لگا ۔

اُدھر وزیر با تدبیر نے شاہ کی خدمت میں گذارش کی کہ "عالی جاہ ! جلسے جلوسوں کا پروگرام لانگ رینج پروگرام ہے فوری نتائج کے لئے مناسب ہوگا کہ شہزادے کو سمجھانے بجھانے کے لئے ایک ٹیوٹر مقرر کر دیا جائے جسے عرفِ عام میں کمپینئن کہا جائے تاکہ شہزادہ بدظن نہ ہو ۔ میری رائے میں یہ کمپینئن مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہو تاکہ شہزادے پر اثر انداز ہو سکے"۔

اس مقصد کے لئے محکمہ تعلقاتِ عامہ نے یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں سے انٹرویو کئے اور آخر میں ایک ادھیڑ عمر کی ڈپلو میٹک ریلیشنز کی ڈاکٹر مادام زبوری کو منتخب کر لیا گیا ۔ فائنل اپروول کے لئے مادام کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا ۔

بادشاہ نے پوچھا "محترمہ ! آج کل بادشاہ کے لئے سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے"؟

مادام بولی "عالی جاہ ! آج کے دور میں شاہوں کے لئے صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے پاور پالیٹکس کا مسئلہ"۔

شاہ نے کہا "بی بی بندھے ٹکے الفاظ میں بات نہ کر ۔ یہ بتا کہ پاور پالیٹکس سے تیری کیا مراد ہے"؟

مادام بولی "عالی جاہ ! دنیا میں بادشاہوں کے لئے صرف ایک ہی مسئلہ ہے جو باوا آدم سے آج تک جُوں کا تُوں قائم و دائم ہے اور وہ ہے لاٹھی اور بھینس کا مسئلہ ۔ پہلے یہ مسئلہ افراد تک محدود تھا پھر قبیلوں تک جا پہنچا اور آج کل اقوام پر حاوی ہو چکا ہے"۔

"وہ کس طرح"؟ شاہ نے مذید کریدا ۔

مادام نے جواب دیا "شاہ عالم ! آج کی دنیا میں کچھ قومیں لاٹھی قومیں ہیں

باقی بھینس قومیں ہیں ۔ لاٹھی قوموں کی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بھینسوں کو ہانک کر اپنے گلے میں لے جائیں ، ان کا دودھ پئیں ، کھال سے اپنے لئے جوتے بنائیں ۔ عالی جاہ ! ہر بھینس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے کسی لاٹھی قوم کو اپنا لے ۔ لیکن درپردہ ہر بھینس قوم چاہتی ہے کہ وہ بھی لاٹھی قوم بن جائے"۔

"وہ کیوں"؟ بادشاہ نے پوچھا ۔

مادام نے جواب دیا "عالی جاہ ! قدرت کا اصول ہے کہ ایٹ آر بی ایٹن اگر تم لاٹھی نہیں بنو گے تو یقیناً بھینس بنا لئے جاؤ گے"۔

وزیر باتدبیر جو اس دوران میں خاموشی سے مادام کی باتیں سنتا رہا تھا بولا "مادام ! بتائیے کہ بادشاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"؟

مادام بولی "محترم ! بادشاہ خود ایک لاٹھی ہے جو بظاہر عوام کو سہارا دیتی ہے لیکن درپردہ انہیں ہانکتی ہے"۔

بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے مادام کو شہزادے کا کمپینیئن مقرر کر دیا ۔

جب بادشاہ کی والدہ راج ملکہ کو مادام کی تعیناتی کا علم ہوا تو اس نے احتجاج کیا ۔ بولی "بیٹے ! تم نے مادام کو شہزادے کا ساتھی بنا کر اچھا نہیں کیا"۔

بادشاہ نے جواب دیا "والدہ محترمہ ! ہم نے مادام کو اس لئے متعین کیا ہے کہ وہ شہزادے کو سمجھائے بجھائے"۔

"ٹھیک ہے" راج ملکہ بولی "لیکن میں ڈرتی ہوں کہ وہ شہزادے کو زیادہ ہی نہ سمجھا دے"۔

شاہ راج ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا بولا "والدہ محترمہ ! مادام ادھیڑ عمر کی عورت ہے ۔ شہزادے کی ماں بجا ہے"۔

"یہی تو ڈر ہے" راج ملکہ بولی "اگر وہ نوجوان ہوتی تو کوئی اندیشہ نہ تھا ۔ ماں بجا عورت گود میں ڈالنے کا گر جانتی ہے ۔ شہزادے کو راہِ راست پر لانا کچھ مشکل نہ تھا ۔ اس کا بیاہ کر دیتے ، شہزادہ چاہے بادشاہ بننے پر رضا مند نہیں لیکن اس کی بیوی ملکہ بننے پر مچل جاتی پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا"۔

بادشاہ نے کہا "آپ بجا فرماتی ہیں ، ہم جلد از جلد شہزادے کے بیاہ کے انتظامات کر دیں گے"۔ اس پر راج ملکہ مطمئن ہوگئی ۔

اُدھر شہزادے کو علم تھا کہ مادام اس کی اتالیق مقرر کی گئی ہے تاکہ اسے سمجھائے بجھائے ۔ اس لئے اس نے مادام سے سرد مہری اختیار کر لی ۔ مادام نے اس کی سرد مہری کو درخوراعتنا نہ سمجھا اور ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔

شہزادہ آخر نوجوان تھا ، کچا تھا ، ایک روز پُھوٹ پڑا ۔ مادام سے کہنے لگا "مجھے پتا ہے آپ مجھے سمجھانے بُجھانے پر مامور کی گئی ہیں"۔

"ہاں"۔ مادام نے اثبات میں سر ہلایا "شاہ عالم یہی سمجھتے ہیں کہ میں شہزادہ سلامت کو سمجھانے بُجھانے پر مامور ہوں"۔

یہ سُن کر شہزادہ بوکھلا گیا ۔ بولا "اور آپ کیا سمجھتی ہیں "۔

مادام بولی "میں نہیں چاہتی کہ آپ بادشاہ بننے پر رضامند ہوں"۔

شہزادے نے حیرت سے مادام کی طرف دیکھا ۔ مادام نے اپنی بات جاری رکھی ۔ بولی "شہزادہ سلامت ! یہ بڑے بوڑھے ہم نوجوانوں کے راستے کی رکاوٹ ہیں ۔ شہزادہ سلامت ! میں جدید تعلیم سے آراستہ ہوں ۔ مروجہ رسمی خیالات سے باغی ہوں"۔

حیرت سے شہزادے کی آنکھیں ابل آئیں ۔ بولا "پھر آپ نے میری اتالیق بننا کیوں منظور کیا"۔

مادام نے جواب دیا "پیارے شہزادے ! مجھے آپ سے بے پناہ ہمدردی ہے ۔ آپ کو بڑے بُوڑھوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ میں آپ کی اتالیق بن جاؤں"۔

شہزادے کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ تحسین جھلکی اور وہ سرک کر مادام کے قریب تر ہو گیا ۔۔۔ اس کے اردگرد ایک ممتا بھری گود پھیل گئی ۔۔۔ پھیلتی گئی پھیلتی گئی ۔ حتٰی کہ مسلط و محیط ہو گئی ۔

تین مہینے کے بعد اخبارات کے پہلے صفحے پر سیاہ حاشیے کے اندر جلی حروف میں خبر چھپی کہ شاہ اسادا ، شہزادہ ساجھانا اور ان کی اتالیق کے ہمراہ سیر و تفریح

کے لئے بل سٹیشن کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اتفاقاً کار کا دروازہ کھل گیا ۔ شاہ کار سے نیچے پھسل کر گھاٹی میں گر گئے ۔ شاہ اسادا کی آخری وصیّت کے مطابق اور عوام کے پُرزور مطالبے پر شہزادہ ساجھانا اور ملکہ مادام زبوری کی تاجپوشی کی رسم سات دن کے سوگ کے بعد ادا کی جائے گی ۔

....O... ....

ایلینز

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے ۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں ۔ سند باد کے سفر ، الف لیلوی سفر ، گلیور کے سفر ، بالشتیوں میں ، دیوقامتوں میں ۔

لیکن صائم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا ۔ وہ کبھی عازمِ سفر نہ ہوئی تھی ۔ نہ ہی رختِ سفر باندھا تھا ۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا ۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا لگی تھی ۔ پھر پتہ نہیں کیسے ۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بے کانی مخلوق اس کے گرد بھیڑ لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو ۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی ۔ بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے اردگرد آ کھڑا ہوا تھا ۔

وہ سوچنے لگی ۔۔۔ یا اللہ یہ میں کہاں گئی ہوں ۔ یہ کون لوگ ہیں ۔ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ۔

ان ایلینز میں بہت سے چہرے مانوس سے دکھتے تھے لگتا تھا جیسے وہ انہیں جانتی ہو جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے ۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں ۔ ایلینز

پھر اماں کو اپنے پر شک پڑنے لگا ۔۔۔ میں کون ہوں ۔۔۔ کہاں ہوں ۔۔۔ میرا مصرف کیا ہے ۔۔۔ کس لئے ہوں ۔۔۔ کیوں ہوں ۔۔۔

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔۔۔ وہ سوچتی رہی ، محسوس کرتی رہی ، سوچتی رہی ، حتیٰ کہ وہ بیمار پڑ گئی ۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا ۔

ڈاکٹر تو صرف ڈائی گنوسز کرتے ہیں انہیں بیماری سے دلچسپی ہے ۔ انسان

سے نہیں انہیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے ۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا ، بولا مریضہ کو کوئی بیماری نہیں ، صرف کمزوری ہے بڑھاپا ہے ۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی اُمنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں ۔

اماں میں جینے کی اُمنگ نہ رہی تھی ۔

جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش کوئی خیال کوئی امید کوئی فرد کوئی مطمحِ نظر کوئی سراب آپ کو انگلی پکڑ کر چلائے ۔ جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو ۔ اہمیت ہو ۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے ۔

کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا ۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے ۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی ۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا ۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا ۔ نگاہیں صائم سے پار ہوگئیں ۔ اگر اماں کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً نگاہ صائم پر رک جاتی ۔۔۔ آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصۂ دراز سے اس کے لئے ایلین بن چکا تھا ۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چار پائی کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا ۔

آٹھ دن سے وہ اس کی پائنتی پر بیٹھا تھا ۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی ۔

دفعتاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی ۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی اب کیا دیر ہے ۔ اب کس کا انتظار ہے ۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں ۔ اس نے ارد گرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا ۔ آسیہ کے بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے ۔ شاید روح ہوں ، ہیولے ہوں ، فرشتے ہوں ۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے ۔ آٹھ دن سے وہ انہیں

ڈانٹ رہی تھی میرا منہ کیا تک رہے ہو ۔ مجھے لے جاتے کیوں نہیں ۔ اب کیا دیر ہے ۔

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنی چھوڑ رکھی تھی ۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے ۔ صائم اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلمٰی ستارہ ایک بیٹا سمیع، بہو اسما اور صائم کی بیوی سمینہ ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی ۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی ۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں ۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے اردگرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا ۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا ۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا ۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا ۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے ۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی ۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے ۔

لیکن صائم کے لئے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے ۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا ۔

آسیہ اور صائم نے سال ہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے ۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے ۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا ۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی ۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے ۔ اسے اہمیت دیتے تھے جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا، مفہوم تھا ۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی ۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرانی کی حیثیت دے دی گئی تھی ۔

جس باورچی خانے میں اسے دن رات کام کرنا پڑتا تھا ۔ وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا ۔ اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا تھا ۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی پکتی تو آسیہ بھنڈیوں سے اُتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا ۔ نوکرانی کے بیٹے کے لئے بور کریلے تھا ۔ ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں ۔ چھلکے سبزیاں تھیں ۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرانی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی ۔ کھانا کھلا کر جب وہ آوٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سو چکا ہوتا ۔ پھر وہ چولہا جھونکتی چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی ۔ اسے کھانا کھلاتی ۔

بیٹا کھا تو لیتا تھا ۔ مگر جاگتا نہ تھا ۔ اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو ۔

پھر مالک کا سٹیٹس اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہوگیا ۔ اس لئے آسیہ کو نکال دیا گیا ۔ اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے ۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا الاؤنس بہت قلیل تھا ضروریات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں ۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی انہوں نے مل کر چارپائیاں بنیں ۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں ۔ کاغذ کے پھول بنائے پتنگ بنائے ۔ دھاگا خرید کر اس پر مانجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں ۔ بچوں کے کھلونے بنائے آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے ۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے ۔ پھر کسی مخیر نے قرض کے طور پر ایک پرانی گھسی پٹی مشین

خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی ۔

آسیہ ہرفن مولا عورت تھی ۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی ۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانک دیا کرتی تھی ۔ انوکھے کام سوچا کرتی انوکھی چیزیں بنایا کرتی ۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی قیمت نہ تھی ۔

ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا ۔ اس تعلق کے کئی رُخ تھے ۔ ماں بیٹے کا تعلق ۔ مظلومیت کا تعلق ۔ غربت کا تعلق ۔ مزدوری کا تعلق ۔ دُکھ کا تعلق ۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا ۔ اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے ، محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا ۔ لیکن علم قینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پُرزے اُڑا دیئے ۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پُرزے اُڑا دے وہ علم دوست نہیں ہو سکتا ۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے ۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رُخ ہوتا ہے ۔

آسیہ کے دور میں ایمان لانا تھا ۔۔۔ صائم کے دور میں شک کرنا ۔ ۔۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رُخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا ہے صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دَور تھا ۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں توں توں جذبہ مضحکہ خیز ہوتا گیا ۔ تعلقات کٹتے گئے ۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہوگئیں ۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضا مند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی ۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا ۔ اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی ۔ اماں نے اندھی وفا شعاری کو کیوں اپنائے رکھا شاید اماں غم خور ہو شاید اماں ایذا پسند

ہو ۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی ۔ دکھی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی ۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹتا گیا ۔ دکھ کا تعلق ٹوٹتا گیا ۔ مزدوری کا تعلق ٹوٹتا گیا ۔ ایذا پسند کے لئے محنت جدوجہد نہیں ہوتی ۔ دُکھ دُکھ نہیں ہوتا ۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے ۔ بلخ کے لئے جوہڑ ہوتا ہے ۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا ۔ بیٹے اور ماں کا تعلق ۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے ۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا ۔ صرف برائے نام باقی تھا اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں ۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پائنتی پہ بیٹھا تھا ۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی ۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا ۔ کوئی جنبش نہ ہوئی ۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا شاید ۔۔۔ اس نے پھر سے غور سے اماں کی طرف دیکھا ۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ اُمید کی جھلک تھی ۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو ۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا ۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ ماں کا دل کہاں ہوگا ۔ پھر وہ اس مقام کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا ۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں ۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا ۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ہو پھر ایک سرگوشی سی اٹھی ۔ اچھا ہوا بیچاری اس عذاب سے مخلصی پا گئی ۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی ۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی ۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساسِ گناہ سے بھیگی بھیگی ہو ۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی ۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی ۔ کسی سے ڈرتی تھی ۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی ۔ شرمسار ہو جاتی ۔ ندامت سے بھیگ جاتی اس کی آواز زیرِ لبی ہو کر رہ جاتی ۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا ۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا ۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے ادراکی نکتے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں ۔

محفلوں کی بات چھوڑیئے ۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا اماں جب تم مرو گی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا ۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا ۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقعہ عطا کیا ۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے ۔ کوئی بین نہ کرے ۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے ۔

آسیہ کی عمر ۹۵ سال کی تھی ۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے ۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا خود اس کے اپنے اردگرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا اس کی اپنی بیٹیاں سلمیٰ اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا ۔

اماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی ۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی ۔

لیکن سلمیٰ ستارا کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا ۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر

تھی ۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا تھا ۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے ۔۔۔ پھر بھی وہ پیچھے رہ گیا تھا ۔ کیوں ؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا ۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا ۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا ۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو ۔ شاید نئی نسل علم و دانش چھوڑ کر پھر سے جذبے کی طرف چل پڑی تھی ۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں منزل کیسی ۔۔۔ ان کے جذبے کا تو کوئی رُخ ہی نہ تھا ۔ صرف شدت ہی شدت تھی ، ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا ۔

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ۔

مثلاً سلمیٰ کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا ۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی ۔ فوٹوگرافی شاندار ہو جاتی ۔ مکالمے چُست ہو جاتے ۔

ستارہ کو ٹی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی ۔

سلمیٰ سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے کتنی پیاری ہے وہ ۔ سلمیٰ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بد شکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے ۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سرکلز میں اس کا ذکر رہتا ہے اور فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں ۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا ۔ دروازے میں سلمیٰ کھڑی تھی ۔ بال لٹک رہے تھے ۔ چہرا ستا ہوا تھا ۔ سر دروازے کی چوکھٹ سے لگا

ہوا تھا ۔ ٹکٹکی باندھے وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔
سلمٰی حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی ۔
گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے ۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا ۔
اس لئے نہیں کہ ماں یا دادی اماں مر رہی تھی ۔
بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے ۔
ان جانے میں گھر کا ہر فرد آرزو مند تھا کہ وہ بوجھ اُٹھ جائے ۔ بوجھل بوردم دور ہوجائے ۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے ۔ چاہے بوڑھی اماں پر کچھ بیت جائے ۔

سلمٰی نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے ۔
صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا ۔
سلمٰی کی اداسی اور گہری ہوگئی ۔ سر ڈھلک گیا بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں اُمید کی کرن ناچنے لگی ۔
سلمٰی ایک جذباتی لڑکی تھی ۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی ، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی ۔ اس کی چہیتی سہیلی شافی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے ۔ اس نے شافی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی ۔
وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن اس کے ملتان جانے میں رخنہ نہ پڑے اور اگر اماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جا سکے گی ۔
پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمٰی کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی ۔ مثلاً فون ہی لیجئے ۔
فون اس برآمدے میں لگا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا ۔ اماں کی وجہ سے سلمٰی فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی ۔
پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی ۔

ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی ۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اُڑا دیتی ۔ خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمیٰ کو کسی خاص رائٹ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی ۔ لیکن رانگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزا آتا تھا ۔ واٹ فن ۔۔۔ اظہارِ لگاؤ کے جواب میں اظہارِ بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے ۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی ۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی ۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی ۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا ۔

فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی رہتی ۔ اچھا ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ بور ۔۔۔ موڈ نہیں وہ کیسے ، ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی ۔ چھوٹی ہنسی ، لمبی ہنسی ، مہذب ہنسی جس میں ہنسی نہ ہوتی البتہ آواز کے زیروبم میں جاذبیت ضرور ہوتی ۔

سلمیٰ کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے ۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روز مرہ بحال ہو جائے ۔

ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی ۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا ۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا ۔ وہ اس کی پڑھائی میں مخل ہو رہا تھا ۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن ہتھیا نہ لے ۔

رابعہ وہ بدصورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے ۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا ۔ ہئے اللہ ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے ۔ اس مصیبت سے کب جان چھٹے گی اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی ۔

ستارہ کی بات سچی تھی ۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی ۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا ۔

اب کیا حال ہے ۔ صائم کی بیوی سمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا ۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا ۔

سمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی ۔ وہ حزن و ملال سے نچڑ رہی تھی ۔

سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا ۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی مذہب اس کے لئے صرف خوفِ خدا تھا ۔ وہ بیچاری خود اس گھر میں اکیلی تھی ۔ وہ خود ایلینز میں گھری ہوئی تھی ۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی ۔

اگرچہ آسیہ اور سمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا ۔ سارا قصور آسیہ کا تھا ۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی ۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجا لانا جانتی تھی ۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا ۔ اس لئے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکی تھی ۔ کیسے ہوتی خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا ۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا اماں تم نہیں سمجھتی ۔۔۔۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا ۔

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی ۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی ۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی ۔ پردے رنگ کر نئے بنا دیتی ۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی ۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر ڈی کوزیاں بناتی رضائی کے ابرے تیار کرتی ۔ میز پوش تکیے کے غلاف اور کیا کیا ۔

آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے ۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا اسی واسطے سمینہ اسے عزیز رکھتی تھی ۔

کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں یہ تو مفاد ہے ۔ بہر طور سمینہ کا حزن و ملال دلی تھا ۔ کیونکہ وہ خدا ترس عورت تھی ۔

کیوں ابا ۔ سمیع نے داخل ہو کر پوچھا کیا حال ہے اماں کا ۔

ویسا ہی ہے صائم نے کہا ۔

اوہ ۔۔ سمیع خاموش ہوگیا!

کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی ۔

اماں کو ضرور دوا کھانی چاہیئے ۔ سمیع بولا ۔

ہاں ۔۔ صائم نے کہا ۔ لیکن اماں ماتے بھی ۔

ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لئے کچھ نہیں کر رہے سمیع نے کہا ۔

ہاں ۔

ایک فیلنگ آف گلٹ ہے ۔ سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ۔

سمیع ازلی طور پر مشنری کارکن تھا ، اس کے لئے دفتر دفتر نہ تھا بلکہ مقصدِ حیات تھا ۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا ۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ سمٹا کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوورلوڈڈ بس میں مسافر پائیدان پر لٹکے ہوتے ہیں ۔

اوہ سمیع چونکا مجھے تو جانا ہے دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہو گا ۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر لے آؤں اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا ۔ سنس آف گلٹ دور ہو جائے گا ۔

اماں سے پوچھ لو ۔ صائم نے کہا ۔

اماں ۔ اماں جی سمیع نے آواز دی ۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا ۔

پھر سمیع گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا ۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اُتار دی ۔

اوہ ۔ ۔ وہ زیرِلب چلایا ۔ ۔ اماں تو ۔ ۔ اماں تو ۔ ۔

کیا کہا ۔۔ کئی ایک چیخیں گونجیں ۔

اماں گزر گئیں کیا ۔

ہائے اللہ ۔ ۔ اماں چلی گئیں ۔

پڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں ۔

کچھ لوگ کہتے ہیں نہیں چیخیں نہیں وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی

آوازیں تھیں ۔

میں نے وہ آوازیں نہیں سُنیں ۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آبیٹھی ہے ۔ جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے شاید تمہاری ماں کی ہو ۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے اور اس کے اردگرد لیفٹینینٹوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بَلی کے اردگرد ناچتے ہیں ۔

○

پُرانی شراب ، نئی بوتل

ہائی کی آواز سُن کر نمی نے آنکھیں کھول دیں ۔ سامنے ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ لٹکائے اس کی سہیلی صفو کھڑی تھی ۔

"ہائیں اس وقت بستر میں"۔ صفو نے پوچھا ۔

جسٹ لیزنگ ۔ ان بیڈ

میں تو تجھے لینے آئی ہوں ۔

کہاں ۔

پکچر پر ۔

کیوں ۔

بڑی چارمنگ پکچر لگی ہے ۔ بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے ۔

مشکل سے کیوں ۔

بھئی فائینل ایئر ہے ۔ چھٹی کیسے دیں ۔ چلو اُٹھو ۔

اونہوں ۔۔ موڈ نہیں ۔۔

آج آخری دن ہے ۔ پکچر اتر جائے گی ۔

اُتر جائے ۔

پتہ ہے لی میجر ہے اس میں ۔

اونہوں آج لی میجر بھی اِن نہیں ۔

کون اِن ہے آج ۔ صفو مسکرائی ۔

آج تو صرف نمی ان ہے ۔

ویسے لگتی تو اوٹ ہو ۔ ناکڈ اوٹ ۔

نانسنس ۔ نمی نے صفو کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر کھینچ لیا ۔ بیٹھو باتیں کرتے ہیں ۔ ایوننگ شو دیکھیں گے آنسٹ ۔

گھر والے کہاں ہیں ۔ صفو نے پوچھا ۔
وہ شہزادی آئی تھی ۔ پتہ نہیں کہاں لے گئی ہے ۔
کون شہزادی ۔
تم نہیں جانتی اسے کیا ۔
اُونہوں ۔
سبھی جانتے ہیں اسے ۔ بڑی لاؤڈ وومن ہے ۔ اتنی بھڑکیلی ہے کہ دیکھ کر جھرجھری آتی ہے ۔ ست رنگا لباس پہنتی ہے ۔ جھلمل ٹائپ ۔
وہی تو نہیں جو کٹ ٹوگیدر سنیک بار پر ملی تھی ہمیں ۔ جب تو ، میں اور انور وہاں بیف برگر کھا رہے تھے ۔ یاد نہیں انور نے اسے دیکھ کر کہا تھا ۔
یہ تو نری لپس ہی لپس اور پس ہی پس ہے ۔
ہاں وہی ۔ نی چلائی ۔ وہی تو ہے ۔
تمہارے گھر کیسے آپہنچی ۔
ڈیڈی ایک روز اُنگلی لگا کر لے آئے تھے ۔ پھر خود آنے لگی ۔
اچھا تو ڈیڈی نے انگلی لگا رکھا ہے ۔
اونہوں ۔ اب تو وہ ڈیڈی کو اُنگلی لگائے پھرتی ہے ۔
تیرے ڈیڈی بھی سمجھ میں نہیں آتے صفو مُسکرائی ۔
خواہ مخواہ بالکل ٹرانسپیرنٹ ہیں ۔ اندر جھانکے بغیر دیکھ لو ۔
ان کا ایک نہ ایک افیئر تو چلتا ہی رہتا ہے ۔
اونہوں ۔ افیئر نہیں ۔ انہیں صرف اس بات کا شوق ہے کہ کوئی انگلی لگائے پھرے ۔ صرف اتنا ۔
آگے کچھ نہیں ۔
چاہے کوئی لگا لے ۔
کوئی ہو یک رنگی ہو ست رنگی ہو بد رنگی ہو ۔ ڈیڈی بڑے سنٹیمینٹل ہیں ۔ جذبے میں لت پت رہتے ہیں ۔ بس ذرا چھیڑ دو ۔ فوارہ کُھل گیا ۔
تمہاری ممی بھی ساتھ گئی ہیں کیا ۔
ہاں ۔ وہ ہمیشہ ساتھ جاتی ہیں ۔ سپر ویژن کے لئے ۔

کیا مطلب ۔ صفو نے پوچھا ۔

ممی اس ڈر کے مارے ساتھ چل پڑتی ہیں کہ کچھ ہو نہ جائے ۔

صفو نے قہقہہ مارا ۔ جیسے روک ہی لیں گی ۔

ہاں ۔ اپنی طرف سے تو پورا زور لگاتی ہیں ۔ پوئر ممی ۔

مطلب یہ کہ بات نہیں بنتی ۔

بات کیسے بنے ۔ ڈیڈی تازہ کے قائل ہیں سیٹل کے نہیں اور ممی کو باسی ہو جانے میں کمال حاصل ہے ۔ دراصل ممی کو ڈیڈی سے عشق ہے ۔ اپنا سب کچھ ان کے چرنوں پر ڈال رکھا ہے ۔ سب کچھ چرنوں میں ڈال دو تو دوسرا بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ پھر آہیں بھرو ۔ انتظار کرو ۔

آئی ہیٹ سچ ساب سٹف ۔ یہ بات تو پُرانے زمانے میں چلتی تھی ۔ اب نہیں چلتی ۔

اور جو انور سے بات چل رہی تھی تمہاری وہ ۔

آئی لایکڈ انور ۔ آل رائٹ ۔ بہت اچھا کم پینین تھا ۔ بڑا اگری ایبل ۔

لکس بھی تو تھے ۔

لکس کی کون پروا کرتا ہے آج کل ۔ دے ڈونٹ میٹر ۔ پُرانے زمانے میں لوگ پری چہرہ ڈھونڈا کرتے تھے ۔ سوہنی پر جان دیتے تھے ۔ یوسف کی طرف دیکھ کر انگلیاں چیر لیتے تھے ۔ اب وہ باتیں گئیں ۔

عظمیٰ تو کہتی تھی نمی از سٹرکن ود لو فار انور ۔

گُڈ لارڈ ۔ ناٹ می ۔ بھئی مجھ سے یہ نہیں ہوتا کہ اپنے جذبات کی بھٹی کو ہوا دوں ۔ دیتی رہوں اور جب بھانبڑ مچ جائے تو بیٹھ کر روؤں ۔ نونو ۔ آئی ایم ناٹ دی سابنگ اینڈ سائنگ ٹائپ ۔ میں ہر حد توڑ سکتی ہوں صفو ۔ دور جا سکتی ہوں لیکن اتنی دور نہیں کہ واپسی ناممکن ہو جائے ۔ لو تو لینڈ آف نوریٹرن میں لے جاتی ہے ۔ ہیو گڈ ٹائم ۔ ۔ ۔ بٹ لو ۔ ۔ ۔ نونو ۔ ۔ ۔ نیور ۔

بھئی اس لحاظ سے میں تو ماڈرن نہیں صفو نے کہا ۔ پھر وہ نمی کے قریب تر ہوگئی ۔ کچھ پتہ ہے وہ آنکھیں مٹکا کر بولی تیرے پڑوس میں ڈاکٹر نجمی کے

ہاں کون آیا ہوا ہے ۔

کون ہے ؟

لگتا ہے جیسے گلیکسو بے بی ہو ۔ گہرے بھورے بالوں کا اتنا بڑا تاج گول چہرا ۔ نکھرا رنگ اور آنکھوں میں لال ڈورے ۔ صفو نے یوں سینہ تھام کر کہا جیسے اندر ہلچل مچی ہو ۔

امی کی بات کر رہی ہو صفو نے پوچھا۔

تُو اسے جانتی ہے

ہاں دو ایک مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے ۔

ملنے مِلانے کے لئے آیا ہے کیا ۔

اونہوں پوسٹنگ ہوئی ہے ۔ الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے اِدھر ۔

کوئی ریلیٹو ہے ڈاکٹر نجمی کا ۔

نیفیو قسم کی چیز ہے ۔

کیسا لگا تمہیں ۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا ۔

اچھا خاصہ ہے ۔ نمی نے بے پروائی سے کہا ۔

اب بنو نہیں ۔ نمی ۔

میں تو نہیں بنتی ۔ وہ بنتا ہے پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے ۔

ہئے نمی ۔ صفو نے پھر سینہ سنبھالا ۔ پنک چیک شرٹ ۔ اورنج سٹرائپڈ کوٹ اور شاکنگ ۔ ۔۔۔ گرین ٹائی ۔ میں تو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی ۔ سٹنںڈ ۔

ہاں چارمنگ تو ہے نمی نے کہا ۔

سِلی ۔ چارمنگ از نو ورڈ فاراٹ ۔ کبھی ملی ہو اس سے ۔

روز آجاتا ہے ۔ ممی نے سر چڑھا رکھا ہے ۔

اور تم نے ۔۔

اونہوں ۔۔

تم سے بھی ملتا ہے کیا ۔

ہاں ۔

پھر ---- صفو کا تنفس تیز ہوگیا ۔
پھر ---- نمی آنکھیں بند کر کے پڑ گئی ۔
سارا جھگڑا اس پھر ---- کا تھا ۔

اسی پھر ---- کی وجہ سے نمی اس روز بستر پر پڑی تھی لیز کر رہی تھی ۔ لیز تو خیر بہانہ تھا لیز تو اس وقت ہوتا ہے جب امن ہو ۔ اندر جھگڑے کی ہنڈیا پک رہی ہو تو امن کیسا ۔ اور امن نہ ہو تو لیز کیسا ۔ مانا کہ جھگڑا دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا جہاں کے شورو غوغا کی آواز ذہن تک نہیں پہنچتی ۔ مشکل یہ ہے کہ ذہن تک آواز نہ پہنچے تو بات اور الجھ جاتی ہے ۔ خود کو تسلّیاں دینا بھی ممکن نہیں رہتا ۔ بہر حال سارا جھگڑا اس پھر ---- کا تھا ۔

نمی کا دل پوچھ رہا تھا ۔ پھر ؟

اس کی نحیف آواز سن کر ذہن کہہ رہا تھا پھر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جب سرے سے کوئی بات ہی نہیں تو پھر کیسا ۔

نمی ایک ماڈرن لڑکی تھی ۔ ماڈرن گھر میں پرورش پائی تھی ماڈرن ماحول میں جوان ہوئی تھی ۔ اسے اپنے ماڈرن ازم سے عشق تھا عشق ۔ چاہے کچھ ہو جائے ماڈرن ازم ہاتھ سے نہ جائے ۔ اس کا دل پھر ---- پھر ---- کر رہا تھا ۔ کراہ رہا تھا ۔ سسکیاں بھر رہا تھا ۔ اس وقت نمی کی زندگی کی ایک واحد پرابلم تھی کہ دل کی آواز نہ سُنے ۔ سنائی دے تو اَن سُنی کر دے ۔ اس کا صرف ایک حل تھا کہ ذہن سے چمٹ جائے اور قریب اور قریب جس طرح جونک خُون کی رگ سے چمٹ جاتی ہے ۔

نمی میں ذہن اور دل کی کش مکش پہلے کبھی اس شدّت سے نہیں ابھری تھی ۔ نمی نے زندگی میں چند ایک افیئر چلائے تھے ۔

سب سے پہلے سعید تھا ۔ ان دنوں وہ بی اے میں پڑھتی تھی ۔ وہ ایک دُبلا پتلا معنک لڑکا تھا ۔ جب بھی کالج میں نمی اس کے سامنے آتی تو اس کی آنکھیں پھٹ جاتیں منہ کُھلا کا کُھلا رہ جاتا اور وہ گویا پتّھر کا بن جاتا ۔ پھر حواس گم قیاس گم بِٹر بِٹر نمی کو دیکھتا رہتا ۔ دیکھتا رہتا ۔ حتیٰ کہ سب کو پتہ چل جاتا کہ وہ دیکھ رہا ہے ۔ لڑکے پھبتیاں کستے مذاق اُڑاتے لیکن اُسے خبر ہی نہ ہوتی ۔

پہلے تو نی کو سعید پر بڑا طیش آتا رہا کہ یہ کیا ڈرامہ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ پھر اسے ترس آنے لگا ۔ نن کم پوپ دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا ۔۔۔ بے شک دیکھے ۔ کون منع کرتا ہے لیکن پہلے دیکھنے کا انداز تو سیکھے ۔

دوسرا جی اے اویس تھا ۔ اُدھیڑ عمر ۔ ڈیڈی کا ہم کار ۔ اسے دیکھنے کا سلیقہ تھا ۔ اتنا سلیقہ تھا کہ نظر بھر کر دیکھتا ہی نہ تھا ۔ بات ہوئی نا ۔ بھلا دیکھنا مقصود ہوتا ہے کیا ۔ لورز بھی کتنے احمق ہوتے ہیں یوں ہِٹر ہِٹر دیکھنے لگتے ہیں جیسے دیکھنا مقصود ہو ۔ یا شاید اتنا دیکھتے ہیں اتنا دیکھتے ہیں کہ بُھول جاتے ہیں کہ مقصد کیا تھا ۔ دیکھنا خود راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے ۔ چلو مان لیا کہ دیکھنا تعارف کے لئے ضروری ہے لیکن انٹی میسی مقصود ہو تو ۔۔

پھر وہ انور تھا ۔ کتنا اچھا کمپینین تھا لیکن اکیلے میں کبوتر سی آنکھیں بنا کر بیٹھ جاتا ۔ بھئی کوئی بات کرو جو چھیڑ دے ۔ کوئی جوک جو گدگدا دے ، ہنسا دے ۔ کوئی منتر پھونکو کہ کلی کھل کر گلاب بن جائے ۔ بھلا گھٹنے ٹیکنے سے کیا ہوتا ہے خواہ مخواہ کا سکینڈل ۔ محبت میں یہی تو عیب ہے شور و غوغا مچا دیتی ہے ۔ دھول اڑا دیتی ہے ۔ راستے مسدود کر دیتی ہے ۔ مواقع تباہ کر دیتی ہے ۔

نی کے افیئرز تو بہت تھے ۔ اب انہیں گِنوانے کا فائدہ ۔ بس تھے ۔ دو ایک تو خاصی دور لے گئے تھے ۔ ان تتلیوں نے نی کو کلی سے پھول بنا دیا تھا ۔ ایسا پھول جو بھنوروں کو بیٹھنے نہیں دیتا لیکن اڑاتا بھی نہیں ۔ تیتریوں کی اور بات تھی ۔ وہ بھن بھن کر کے شور نہیں مچاتی تھیں ۔ دھول نہیں اڑاتی تھیں ۔ لیکن اس گلیکسو بے بی امجی نے آکر مشکل پیدا کر دی تھی ۔

پہلے دن تو باؤنڈری وال سے ہیلو ہیلو ہو گیا ۔ امجی نے اپنا تعارف کرا دیا ۔ دوسرے دن وہ بڑی بے تکلفی سے گھر آ گیا اور نی کے چھوٹے بھائی عمران سے چڑی کھیلنے لگا ۔ ممی آگئیں تو ان سے گپیں ہانکنے لگا ۔ ممی کو وہ لفٹ دی وہ لفٹ دی کہ انہیں کبھی ملی نہ تھی وہ تو بوکھلا گئیں پھر نی کے پاس آ بیٹھا ۔ بات چھیڑ دی ۔ باتیں تو خیر کلچرڈ تھیں لیکن نگاہیں بالکل ہی کروڈ چونکا دینے والی ۔ چھپنے والی ۔ بڑی آن یو بوال ۔۔۔ بھلا پاس بیٹھ کر کبوتر سی آنکھیں

بنانے کا مطلب ایڈیٹ ۔

کلیڈ آئی تو خیر ہوا ہی کرتی ہے ۔ وہ تو یوں ہے کہ دُور بیٹھ کر روٹین ٹاک کرتے کرتے ایک دم کلیڈ آئی کے زور پر جمپ لگایا اور گود میں آبیٹھے ذرا سی گدگدی کی اور پھر واپس اپنی سیٹ پر دُور جا بیٹھے یہ تو جدید انداز ہے نا ۔ اپنی توجہ جتائی ۔ گڈ ٹائم کی خواہش کو آنکھوں میں سجایا اور پھر ایز یوور ہوکر ایٹ ایز بیٹھ گئے ۔ لیکن مسلسل آڑی ترچھی آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا ۔۔ نان سنس ۔

کلیڈ آئی تو گڈ ٹائم کی دعوت ہوتی ہے نا ۔ اور آنکھیں بنا کر بیٹھے رہنا تو گویا اس بات کی رٹ لگائے رکھنا ہوا کہ دیکھ میں تیرے بنا کتنا دُکھی ہوں ۔

وہ مثبت بات ۔۔۔ اور یہ خالص نیگیٹو ۔

ہاں تو امجی ویسے تو بڑا پیارا آدمی تھا ۔ آدمی کہاں آدمی نما لڑکا ۔۔۔ اُٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ۔ بولنا سب کلچرڈ تھے بس اک ذرا آنکھیں بنانے کی بیماری لگی ہوئی تھی ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نمی پہلے روز ہی امجی کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی ۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا آئیڈیل کپڑے پہن کر سامنے آکھڑا ہوا ہو ۔۔ وہ تو اچنبھے میں رہ گئی تھی ۔ اب اس اچنبھے کا اظہار خود سے کیسے کرتی ۔ جو دل کی آواز پر کان دھرتی تو محبّت کی راہ پر گامزن ہو جاتی ۔ اس کا انتظار کرتی ۔ آہیں بھرتی ۔ گھڑیاں گِنتی ۔ اولڈ فیشن غیر مہذب دقیانوسی باتیں ۔

ایک پیاری سی سمارٹ سی خوب صورت لڑکی ماڈرن ازم کو چھوڑ کر دقیانوسی کیوں بنے ۔ اس لئے نمی سب کچھ پی گئی اور یوں تن کر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

بہر طور امجی اپنا چکر چلا گیا تھا ۔ اگر اس میں آنکھیں بنانے کی بیماری نہ ہوتی تو یقیناً افیئر چل جاتا ۔ افیئر تو خیر اب بھی چل پڑا تھا لیکن وہ خالصتاً تفریحی نہ بن سکا ۔ اور خالص تفریحی نہ ہو تو افیئر کیسا ۔

اس کے بعد امجی نے ایک اور قیامت ڈھائی ۔ فسٹ فلور پر اس کا کمرا نمی کی کھڑکی کے عین سامنے کھلتا تھا کمبخت نے اپنی کرسی دروازے میں بچھالی اور

نمی کی کھڑکی پر نگاہوں کی چاند ماری شروع کر دی ۔

اس پر نمی اور بھی چڑ گئی ۔ لو بھلا نگاہوں کی چاند ماری کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ اَن نیسے سری میٹرزز اور کیا ۔ بھئی جو ناک کو ہاتھ لگانا ہو تو سیدھا لگا لو ہاتھ کو سر کے پیچھے سے گھما کر لانے کی کیا ضرورت ہے ۔

دو ایک مرتبہ اس نے کھڑکی سے جھانکا اور اَن جانے میں جھینپ گئی اس پر اُسے غصہ آگیا ۔ بھلا جھینپنے کی کیا بات ہے اس میں ۔ دیکھ ہی رہا ہے نا ۔ احمق کو اتنا نہیں پتہ کہ یوں دیکھنے سے بات بنتی نہیں بگڑتی ہے ۔۔۔ چلو دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے ۔ وہ اطمینان سے سرہانے سے ٹیک لگا کر کتاب پڑھنے لگی ۔ لیکن ہر چند ساعت کے بعد کتاب کے صفحے سے دو آنکھیں اُبھرتیں ۔۔۔ دل پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ کرنے لگتا اور وہ پھر سے جھینپ جاتی ۔

پھر ایک روز امجی اسے فلم پر لے گیا ۔

شاید وہ انکار کر دیتی لیکن نمی کا چھوٹا بھائی عمران ضد کرنے لگا ممی بھی ان کی طرفدار ہوگئی ۔ ہو آ کیا حرج ہے ۔

فلم دیکھنے میں واقعی کوئی حرج نہ تھا ۔ سارا فساد تو نگاہوں کا تھا نا ۔ سینما ہال کے اندھیرے میں نگاہیں تو چلتی ہی نہیں ۔ رہا قرب کا سوال تو قرب پر تو اُسے کوئی اعتراض نہ تھا ۔

جب امجی نے اندھیرے میں اس کا ہاتھ پکڑا تو نمی ذرا نہ جھینپی ۔ یہ تو یوبوال بات تھی ۔ بارہا وہ اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی ۔ وہ اس خوشبودار اندھیرے سے واقف تھی ۔ اور اندھیرا خوشبودار ہو تو ہاتھ پکڑنا تو ہوتا ہی ہے ۔ امجی نے پکڑا تو نمی نے حسبِ دستور بازو ڈھیلا کر دیا ۔

جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ امجی کا دباؤ یوبوال نہیں ہے یوبوال دباؤ تو موقع کی مناسبت پر عمل میں آتا ہے نا فلم میں اظہارِ محبت ہو تو ۔۔۔ گڈ ٹائم کا اشارہ ہو تو ۔ لیکن یہ دباؤ تو مسلسل تھا ۔ دباؤ ختم ہوتا تو امجی کی ہتھیلی نمی کے ہاتھ پر چلنے لگتی جیسے ہاتھ کے بند بند کا جائزہ لے رہی ہو ۔ جیسے ہاتھ پر کوئی امریکہ دریافت کرنے میں لگا ہو ۔

نمی کی ہتھیلی پر پسینہ آگیا ۔ ہاتھ کے اس لمس نے پتہ نہیں کیا کر دیا ۔

اک اَن یو یوال رابطہ قائم ہوگیا ۔۔۔ دل سے رابطہ ۔۔۔ دل پھر ۔ ۔ ۔ پھر کرنے لگا ۔ یہ کیا مصیبت ہے اُس نے ہاتھ چھڑا لیا ۔

جب بھی دل پھر ۔۔ پھر ۔۔ کرنے لگتا تو وہ ہاتھ چھڑا لیتی ۔۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ان جانے میں اس کا بازو پھر اُدھر ہو جاتا ۔ ہاتھ کرسی کے بائیں ہتھے پر ٹک جاتا ۔۔ اور پھر وہی دباؤ ۔

بیچاری عجب مشکل میں تھی ۔ دباؤ ہوتا تو جی چاہتا کہ یو یوال ہو جائے ۔ نہ ہوتا تو جی چاہتا کہ ہو ۔

گھر میں وہ روز ہی ملتے تھے ۔ وہ روز آ جاتا تھا ۔ نہ آتا تو عمران پکڑ کے لے آتا ۔ می آواز دے کر بُلا لیتی ۔ می کے لئے تو وہ گھر کا فرد بن چکا تھا ۔ می پہلے روز ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ نمی میں انٹرسٹڈ ہے نرا گڈ ٹائم نہیں ۔ وہ تو خوش تھی پڑھا لکھا لڑکا اور پھر چھوٹتے ہی افسر ۔ کیریئر ۔ رہت بہت بالکل جدید طرز کی ۔ اور پھر انڈی پنڈنٹ ۔ چچا کے گھر میں صرف الاٹ منٹ کے انتظار میں بیٹھا ہے ۔ پتہ نہیں کس روز مل جائے ۔ دُور چلا گیا تو شاید توجہ بٹ جائے ، ہٹ جائے اس لئے وہ چاہتی تھی کہ جلد کچھ ہو جائے ۔ آخر نمی کی شادی تو ہونی ہی تھی ۔ ایم اے کر چکی تھی ۔ رشتے تو آئے تھے لیکن وہ تو سبھی سوشل قِسم کے تھے یہ تو جوڑ کا تھا ۔

ڈیڈی بھی خوش تھا اس نے پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ لڑکا سیریس ہے ۔ بیماری لگا بیٹھا ہے ان کی ساری ہمدردیاں امجی کے ساتھ تھیں ۔ کیسے نہ ہوتیں وہ خود سیریس نس کی بیماری میں مبتلا تھا ۔ بہر طور وہ بے نیاز قسم کا آدمی تھا بات بن گئی تو او کے نہیں تو او کے ، جی او ایس تو ہے ہی ۔ بڑا افسر ہے پیچھے مربعے ہیں ۔ صرف یہی نا کہ ادھیڑ عمر کا ہے ۔ بال جھڑ چکے ہیں لیکن نمی کو اپنانے کے لئے کتنا بے تاب ہے ۔ حکومت کرے گی عیش کرے گی ۔ بیاہ اسی لئے تو کیا جاتا ہے ۔

اس کے بعد امجی اور نمی کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں ۔ ہوٹلوں میں پارکوں میں سینما گھروں میں ۔ انہوں نے شاپنگ کیں ۔ ڈرائیونگ پر گئے ۔ پکنک سپاٹ دیکھے ۔ ان ملاقاتوں میں امجی نے طرح طرح کے حربے آزمائے کہ نمی اس

سے اظہار محبت کرے ۔ نمی اس ضد پر اڑی رہی کہ امجی کے سر سے عشق کا بُھوت اُتر جائے ۔ اور وہ سیدھا سیدھا بوائے فرینڈ بن جائے ۔

جب وہ شاپنگ پر جاتے تو امجی کوئی نہ کوئی تحفہ نمی کے لئے خرید لیتا ۔ ایک دن اس کی ممی نے کہا نمی تو نے اُسے کوئی تحفہ نہیں دیا ۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا ۔

نمی نے سوچا کوئی ایسا تحفہ دوں کہ جل کر راکھ ہو جائے ۔

مطلب جلانا نہیں تھا بلکہ اشارتاً سمجھانا تھا کہ مرد بنو ۔ آہیں بھرنا چھوڑو ۔ آنکھیں بنانا بے کار ہے ۔ بھکاری نہ بنو ۔ چھین کر لینا سیکھو ۔ اس نے سوچ سوچ کر ایک چارم خریدا ۔ ایک روپہلا بریسلٹ جو کلائی پر چُوڑی کی طرح پہنا جاتا ہے ۔

امجی اس چارم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا سمجھا شاید نمی کے دل میں اس کے لئے جذبہ پیدا ہوگیا ہے اسے قطعاً خیال نہ آیا کہ کیپ سیک کے پردے میں نمی اسے چُوڑی پہنا رہی تھی ۔ بہر حال اس نے بڑی خوشی سے وہ چوڑی پہن لی ۔

اُسی شام وہ دونوں ڈرائیونگ کے لئے جا رہے تھے دفعتاً ایک ویران جگہ پر امجی نے گاڑی روک لی ۔ نمی کا دل خوشی سے اُچھلا ۔

اس سے پہلے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار اسے خیال آیا تھا کہ امجی گاڑی روک لے گا ۔ ویران جگہ گاڑی روکنے کی بات تو فیشن تھی ۔ کریز تھا ۔ یویوال تھا ۔

اس یویوال سے وہ اچھی طرح واقف تھی ۔۔۔ لیکن امجی نے کبھی گاڑی نہ روکی تھی ۔ اس کی تو ساری توجہ نمی کے چہرے پر مرکوز رہتی یا وہ نمی کے ہاتھ کو تھامے رکھتا یوں جیسے بلور کا بنا ہو ۔

اس روز گاڑی رکی تو نمی خوشی سے اچھل پڑی ۔ پھر آنکھیں بند کر کے خواب دیکھنے لگی ۔ گہرے بُھورے بال اس کی طرف لپکے اس کے منہ سے ٹکرائے پھر سارے چہرے کو ڈھانپ لیا ۔ بریسلٹ والا بازو اس کی کمر میں حائل ہوگیا ۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا آج سب نارمل ہو جائے گا ۔ کبوتر سی

آنکھیں بنانے اور خالی خولی ہاتھ تھامنے کی بیماری ختم ہو جائے گی ۔ اور پھر وہی یو یوال ، گولڈن یو یوال ۔

دیر تک وہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی ۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں ساتھ والی سیٹ پر امجی بیٹھا دیوانہ وار اس کا ہاتھ چُوم رہا تھا ---- ایڈیٹ وہ ملائی کی برف کی کلفی کی طرح جم کر رہ گئی ۔

آخر امجی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا بولا ۔ نمی آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے ۔

اچھا تو بات کرنے کے لئے گاڑی روکی ہے اُسے غصہ آگیا ۔ ان حالات میں مُنہ زبانی بات کی کیا ضرورت ہے ۔ خواہ مخواہ باتوں کی جلیبیاں تلنا۔ سلی فول ۔

نمی ۔ امجی بولا ۔ کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی محبت نہیں ۔

محبت محبت محبت وہ چِڑ کر بولی ۔ ڈونٹ ٹاک لایک لین انکل امجی ۔ بھئی ہم ریشنل دَور میں رہتے ہیں ۔ بی ریزن ایبل ۔ ذرا سوچو ۔ لو کیا ہے ایک مِتھ ۔ ویسے آئی لایک یو آل رائٹ ۔

ٹھیک ہے اُس نے جواب دیا ۔ لیکن میں اپنے سوال کا ڈاریکٹ جواب مانگتا ہوں ۔ ڈو یو لو می ۔

وہاٹ از لو وہ بولی ۔ ایک خود فریبی ایک خود پیدا کی ہوئی فرنزی ۔ ہے نا ۔ کیا تم لو کے جُھوٹے سُنہرے جال سے آزاد نہیں ہو سکتے ۔

نہیں وہ بولا ۔ مجھے تُم سے محبت ہے آئی لو یو میڈ ۔

اوہ ۔ اٹ از اے پٹی ۔ نمی کے مُنہ سے نکل گیا ۔

دیر تک وہ خاموش رہے پھر امجی بولا ۔ نمی میں ایک ایسا جیون ساتھی تلاش کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتا ہو ۔

وہ ہنسی ۔ پھر تُم والڈ سٹی کا رُخ کرو ۔ یہاں کلچرڈ ماحول میں تمہیں کوئی سوہنی نہیں ملے گی ۔

یہ ان کی آخری گفتگو تھی ۔

اگلے روز نمی کو پتہ چلا کہ امجی شفٹ کر گیا ہے اسے گھر مِل گیا ہے ۔

یہ جان کر نمی کا دل ڈوب گیا ۔

لیکن خود کو سنبھالا ۔ اچھا ہوا چلا گیا ہے ۔ سو واٹ ، اٹز آل رایٹ ۔

دل کو سمجھانے کے باوجود کئی ایک مہینے بار بار سوتے جاگتے ان جانے میں گہرے بھورے بال اُڑتے اس کے چہرے پر ڈھیر ہو جاتے ۔ پھر بریسلٹ والا ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لیتا ۔ بار بار وہ خود کو جھنجھوڑتی ۔۔۔ چلا گیا ہے تو کیا ۔ سو وہاٹ اٹ از آل رائٹ ۔

ایک سال بعد نمی کی کے جی اویس سے شادی ہو گئی ۔ اور اسے سب کچھ مل گیا ۔ سجا سجایا گھر نوکر چاکر ۔ سازوسلمان ۔ کاریں ۔ سب کچھ اس کا خاوند اویس بڑا کلچرڈ آدمی تھا ۔ اور چونکہ اُدھیڑ عمر کا تھا ۔ اس کی زندگی کا تمام تر مقصد نوجوان بیوی کو خوش رکھنا تھا ۔ بلکہ سپائیل کرنا تھا ۔

اویس میں بڑی خوبیاں تھیں صرف عمر ڈھلی ہوئی تھی بال گر چکے تھے ۔ ثانت رنکل آئی تھی بہر حال نمی خوش تھی بہت خوش ۔

شادی کے دو سال بعد ایک روز اویس برسبیلِ تذکرہ کہنے لگا ۔ ڈارلنگ وہ تیری ایک ڈاکٹر سہیلی تھی ۔ کیا نام تھا اس کا ۔

صفو کی بات کر رہے ہو ۔

کہاں ہوتی ہے وہ آجکل ۔

پہلے تو پنڈی میں اس کا کلینک تھا ۔ اب پتہ نہیں دو سال سے نہیں ملی وہ ۔۔۔

پنڈی میں کس جگہ کلینک تھا ۔

شاید لال کرتی کے چوک میں ۔ کیوں کوئی کام ہے صفو سے ۔

نہیں تو ۔ اویس بولا ۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا ۔

دس پندرہ روز کے بعد اچانک صفو آگئی ۔

ارے تو صفو ۔ نمی خوشی سے چلّائی ۔

کیسی ہے تُو ۔ صفو نے پوچھا ۔

فسٹ ریٹ

آر یو ہیپی

شی از نو ورڈ فار اٹ نمی آنکھیں چمکا کر بولی ۔
اچھا صفو سوچ میں پڑ گئی ۔
بات کیا ہے ۔ نمی نے پوچھا ۔ کیا اویس ملا تھا تجھے ۔
ہاں ! ملا تھا ۔ صفو نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کہا ۔ تیرے فکر میں گھلا جا رہا ہے
وہ میرے فکر میں ۔
ہاں ہی از ویری مچ کنسرنڈ ۔۔ وریڈ
مذاق نہ کرو صفو ۔
آئی ایم ڈیڈ سیریس ۔ اویس کہتا ہے تمہیں ہیلوسی نیشن ہوتے ہیں ۔
مجھے ۔
ہاں ۔
مثلاً ۔
کہتا تھا جب اکیلے میں میرے ساتھ ہوتی ہے تو کہتی ہے ڈارلنگ تم بال کیوں نہیں سنبھالتے میرے مُنہ پر پڑتے ہیں اور صفو رُک گئی ۔
نمی چُپ ہوگئی ۔
اور جانو تم بریسلٹ تو اُتار لیا کرو ۔
نانسنس نمی چیخی ۔ ایسی بے معنی باتیں میں کرتی ہوں کیا ۔
بے معنی تو نہیں صفو بولی میں خود اپنے میاں سے یہی کہا کرتی ہوں ۔
کیا
کہ بال سنبھال لیا کرو میرے مُنہ پر پڑتے ہیں اور
اور ۔ اپنا بریسلٹ تو اُتار لیا کرو ۔
مذاق نہ کر نمی چلّائی ۔
تمہیں پتہ نہیں کیا ۔ صفو سنجیدگی سے بولی ۔ میری شادی ہو چکی ہے ۔
ابھی سے ۔

.......○..............

حلوائی کی دکان

کتنی عجیب بات ہے ۔

زندگی بھر میری تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی بات کرے اور میں اسے سیدھا اور صاف جواب دوں ۔ لیکن اب جب انور نے مجھ سے دوٹوک کھلی بات کی ہے ۔ تو مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا جواب دوں ۔ صبح سے سوچوں میں پڑی ہوں ۔ سوچ سوچ کر ہار گئی ۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ۔

میری کیفیت اس پنچھی کی سی ہے جو سالہا سال رکھ رکھاؤ کے پنجرے میں آزادی کی تمنا میں تڑپتا رہے ۔ لیکن جب پنجرے کا دروازہ کھل جائے تو خود میں اُڑان کی طاقت نہ پائے

دراصل انور کی سیدھی بات سن کر میرے ذہن کا فیوز اُڑ گیا ہے ۔ کیسے نہ اُڑتا ۔ زندگی بھر کبھی سیدھی بات نہ سنی تھی ۔ گھر والے ہمیشہ جلیبیاں تلتے رہے ۔ جوانی راستہ تلاش کرو کی بھول بھلیاں میں بیت گئی ۔ ہر بات سن کر سوچتی پتہ نہیں بات کا دوسرا رُخ کیا ہے ۔ ہر بات میرے لئے جادو کا پٹارہ ہوتی ۔ پہلے خالی پٹارہ دکھا دیا جاتا پھر جب بات کھلتی تو اس میں سے پھُرر سے کبوتر اُڑ کر باہر آ جاتا ۔

خالی پٹاروں سے اتنے کبوتر اُڑ کر باہر نکلتے دیکھے ۔ اتنے کبوتر کہ میں سمجھنے لگی جب تک اندر کبوتر نہ ہو پٹارہ خالی ہو ہی نہیں سکتا ۔

مجھے پتہ ہے کہ انور کی بات میں کوئی چھل بل نہیں ۔ پھر بھی میں کبوتر کی منتظر بیٹھی ہوں کتنی بدنصیبی ہے ۔

میری کہانی بڑی عام سی ہے ۔ صرف میری ہی نہیں ۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہر جوان لڑکی کی ہے ۔

میرا نام ثانیہ ہے میں کوئی خدوخالی لڑکی نہیں ہوں ۔ مطلب یہ کہ دہن چھوٹا ہے ٹھوڑی نکلتے ہی ختم ہو جاتی ہے ۔ آنکھیں کشتیاں نہیں ۔ بنٹوں کی طرح گول ہیں ۔ ناک چھوٹی ہونٹ لٹکا ہوا ۔ پیڑ اونچا اور رنگ سفید کیا گندمی بھی نہیں شدھ سانولا ۔۔۔ لیکن خدوخالی حُسن کا دَور گیا ۔ خدوخال کون دیکھتا ہے آج کل ۔۔۔ خداداد حُسن کے دن ختم ہوئے ، اب تو خود پیدا کردہ حسن چلتا ہے ۔ انگ انگ میں شوخی ہو حرکت میں تڑپ ہو جسم میں پارہ بھرا ہو ۔ بس مار لیا میدان ۔۔۔ اور اگر بات میں بے تکلفی بھی ہو ، جھجھک نہ ہو تو کیا بات ہے ۔

جس گھر میں میں نے پرورش پائی وہ صرف کھاتا پیتا ہی نہ تھا ۔ بلکہ کمفرٹس ہی کمفرٹس ۔ بس جھیل میں کنول اُگے ہوئے تھے ۔ سازوسامان کی کوئی حد نہ تھی ۔ کام کاج کی مصیبت سے چھٹی نوکروں کی ایک ٹیم تھی ۔ بس ایک ہی بندش تھی ۔ رکھ رکھاؤ کی بندش وہ بھی اکیلے میں نہیں ۔ بھئی نو دولتیے جو تھے ۔ کوئی آ جاتا تو بندش ہی بندش ۔ یوں ہیلو کرو ۔ یوں بیٹھو ۔ یوں دیکھو ۔ یوں بات کرو ۔ مطلب یہ کہ خود کو پریزنٹ کرو ۔ چینی کی پلیٹ میں رکھ کر دوسرے کے سامنے پیش کرو ۔

چینی کی پلیٹ میں رکھ کر خود کو پیش کرنے کے فن میں امی کو کمال حاصل تھا ۔ وہ باتوں کی ایسی ایسی جلیبیاں تلتیں کہ حد نہیں ۔ بالکل ہی حلوائن تھیں ۔ باتوں کے ہار پروتے ہوئے ایسی ایسی کلیاں ٹانک جاتیں کہ میں ششدر رہ جاتی ۔ دو ایک منٹ خود کو سنبھالنے میں لگتے ۔

امی کو ملکیتیں گنوانے کا بڑا شوق تھا ۔ انہیں یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ دوسرا بڑھ چڑھ کر بات کرے ۔

زمیندارے کی بات چل نکلتی تو امی جھٹ سے کسی دور دراز مقام پر اپنے چار مربعے ایجاد کر لیتی ۔ ہاں بہنے زمیندارے کی مصیبتوں کی حد ہے کوئی ۔ اپنے چار مربعے جو خیر پور کے قریب ہیں ہمارے لئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں ۔ کون ہر مہینے اتنی دُور جا کر ان کی دیکھ بھال کرے ۔

ولائت میں اونچے عہدوں پر فائز رشتہ داروں کی بات چھڑ جاتی تو امی جھٹ

سے ایک آئیل انجینئر کزن اختراع کر لیتیں جسے تیل کمپنی نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر امریکہ میں روکا ہوا تھا ۔ اس ڈر کے مارے کہ اگر واپس وطن چلاگیا تو کمپنی کا بھٹہ بیٹھ جائے گا نہلے پر دہلا مارنا امی کا من بھاتا مشغلہ تھا ۔

لیکن وہ خالی جلیبیاں ہی نہیں تلتی تھیں ۔ اس بات کا بھی خیال رکھتیں کہ ان میں کڑاکا ہو ۔ ایسا جیسا ریوڑی میں ہوتا ہے ۔ ابا کا طریقہ ذرا مختلف تھا ۔ وہ بڑ نہیں ہانکتے تھے ۔ ملکیت نہیں جتاتے تھے ۔ ان کی بات میں عجیب قسم کا عجز ہوتا ۔ "میں تو کچھ بھی نہیں" وہ اس انداز سے ادا کرتے ۔۔۔ کہ سننے والوں کو لگتا جیسے سبھی کچھ ہوں لیکن طبعی عجز کی وجہ سے ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہوں ۔

املاک کی بات ہوتی تو مسکرا کر کہتے ۔ "جناب املاک تو شانوں پر پڑے بوجھ کی مصداق ہے ۔ جو آن پڑا ہے ۔ وہی نہیں اُٹھایا جاتا ۔ مزید کی تمنا کون کرے ۔"

خالی عجز ہی نہیں ۔ ابا میں اسلام کا رنگ بھی نمایاں تھا ۔ کوئی آ جاتا تو ان کا اسلام شدت سے اُبھرتا ۔ یوں جیسے آنچ تیز ہو جائے تو دودھ میں اُبال آ جاتا ہے ۔

وہ مسئلے نہیں کرتے تھے ۔ بحث نہیں چھیڑتے تھے ۔ نہ ہی تلقین کرتے ۔ اوّل تو بات میں جگہ جگہ مناسب مقام پر الحمدللہ ، انشاءاللہ ، بسم اللہ کی کلیاں ٹانکتے رہتے' سننے والوں کو گمان ہوتا کہ صراطِ مستقیمئے ہیں ۔ مگر ہیں گپت برملا اظہار گوارہ نہیں ۔ یادِ حق دل میں رہے کی مصداق ۔

بہر صورت امی ابا ۔ دونوں ہی حلوائی تھے ۔ جلیبیاں تلنے میں تاک ۔ باتوں کے دھنی اثر ڈالنے میں مشاق ۔ امی بات بڑھا چڑھا کر اثر پیدا کرتی ۔ ابا عجز کا پردہ ڈال کر اپنی عظمت کا جادو جگاتے ۔ بات کے پس پشت صراطِ مستقیم کا ایسا دادرا بجاتے کہ توجہ بول سے ہٹ کر تال پر مرکوز ہو جاتی ۔ بچپن میں تو یہ جلیبیاں تلنے کا شغل مجھے بہت ہی اچھا لگا ۔ سوچتی کہ میں بھی کوئی اپنا منفرد انداز اپناؤں اور لوگوں کی توجہ لُوٹ کر لے جاؤں ۔ لیکن جلد ہی ، جب میں جوان ہو گئی تو حلوائی کی دوکان میں ایک نیا رنگ اُبھرا ۔

ویسے تو گھر میں مجھے مکمل آزادی تھی ۔ لیکن اگر میں کسی کلاس فیلو کی بات کرتی تو امی کے کان کھڑے ہو جاتے جھٹ پوچھتیں کس کا بیٹا ہے وہ ۔ باپ کیا کام کرتا ہے ۔ اس پر میں بہت حیران ہوتی ۔

اس روز انور مجھے نوٹس کی کاپی دینے ہمارے گھر آیا ۔ تو امی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی ۔ یوں اسے دیکھنے لگی جیسے لیبارٹری میں کیڑے کو خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھتے ہیں ۔ پھر اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔

"تیرے ابا کیا کام کرتے ہیں ۔ افسر ہیں یا زمیندارہ ہے" ۔

انور بیچارہ بوکھلا گیا ۔ وہ تو ایک بیوہ کا بیٹا تھا ۔ جو محنت مزدوری کر کے اسے تعلیم دلوا رہی تھی ۔ امی کی باتوں کا کیا جواب دیتا ۔ بے چارہ بوکھلا گیا ۔ ادہر میں حیران کہ وہ تو میری ریکوسٹ پر نوٹس کی کاپی دینے آیا ہے ۔ یہ امی اس کا حسب نسب کیوں پوچھنے لگی ۔

جب وہ چلا گیا تو امی نے مجھے پاس بٹھا لیا ۔ بولی ، ایسے لڑکوں کو منہ نہ لگایا کرو ۔

مجھے غصہ آگیا ۔ میں نے کہا ۔ امی وہ تو ہماری کلاس کا فسٹ ڈویژنر فسٹ ہے ۔

پڑا ہو ۔ امی نے جواب دیا ۔ تم نے کیا مقابلے کا امتحان دینا ہے ۔

اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی ۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ۔

ہوا یوں کہ ہمارے ساتھ والے بنگلے کی گرین کاٹیج میں نئے کرایہ دار آ گئے ۔ کسی تیل کمپنی کے ڈائریکٹر تھے ۔ ان کے آتے ہی گرین کاٹیج کا حلیہ بدل گیا ۔ سارے گھر میں یہ موٹا کارپٹ بچھ گیا ۔ کمروں میں ، گیلریز میں ، سیڑھیوں پر جگہ جگہ ڈیکوریشن پیسز رکھ دیئے گئے ۔ سٹنگ روم کی ایک دیوار

بہر قد دیوار سوئٹزر لینڈ کا ایک منظر پیسٹ کر دیا گیا ۔ ڈرائنگ روم میں انوکھے پودوں کے گملے رکھ دیئے گئے ۔

گھر میں صرف تین افراد تھے مسٹر ابن عنایت ان کی بیگم آمنہ عنایت اور ان کا اکلوتا بیٹا عین ۔

نئے پڑوسیوں کے آتے ہی گویا ہمارے گھر میں بھی انقلاب آگیا ۔ امی ابا جو کبھی ایک ساتھ نہ بیٹھے تھے ۔ کان سے منہ لگا لگا کر باتیں کرنے لگے ۔ ان کی سرگوشیوں کا انداز ایسا تھا جیسے لوبرڈز ہوں ۔ یااللہ یہ کیا ہوا ۔ میں تو حیران رہ گئی ۔ کیا وقت کا دھارا الٹا بہنے لگا ۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سا موضوع ہے جس پر دونوں ہینڈ اینڈ گلو بنے بیٹھے ہیں ۔

کئی ایک بار میں اچانک ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی ۔ مگر بے کار میری آہٹ سن کر وہ چپ ہو جاتے اور پھر بات بدل دیتے صرف یہی نہیں ہمارے گھر میں کئی ایک اور تبدیلیاں بھی عمل میں آئیں ۔ نئی سجاوٹیں ۔ نئے قالین ، نئے پردے ۔

امی تو گویا آمنہ عنایت پر بک گئیں ۔ ہر وقت آمنہ کے تذکرے ، اس کی تعریفیں ہئے کتنی خوش اخلاق خاتون ہے ۔ سلیقہ تو اس پر ختم ہے ۔ پھر وہ دفعتاً آنٹی بن گئی ۔ امی نے گرین کاٹیج کے پھیرے لینے شروع کر دیئے ۔ اتنے تعلقات بڑھائے کہ تکلفات سمٹتے گئے ۔ گھر میں کوئی چیز آتی آنٹی کا حصہ الگ کر دیا جاتا ۔ اچھی چیز پکتی تو پہلے آنٹی کو چکھائی جاتی ہر مہینے آنٹی کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا ۔ خیر امی کی تو عادت تھی کہ جس پر ریجھ گئی ۔ اسے ماتھے پر لٹکا لیا ۔ جہاں تک امیّ کا سوال تھا وہ تو خیر ٹھیک تھا ۔ دقّت یہ ہوئی کہ امی نے بار بار مجھے آنٹی کے ہاں بھیجنا شروع کر دیا ۔ ثانیہ ذرا آنٹی سے یہ پوچھ آؤ ، ثانیہ ذرا آنٹی کو یہ دے آؤ ثانیہ ذرا دیکھو تو آنٹی فارغ ہیں ۔ ہائیں ثانیہ ۔۔۔ تو صبح سے آنٹی کی طرف نہیں گئی ۔ میں حیران کہ مجھے بار بار آنٹی کے پاس کیوں بھیجا جا رہا ہے ۔ بات سمجھ میں نہ آئی ۔ پھر ایک روز بلّی پُھدک کر تھیلے سے باہر نکل آئی ۔

اس روز میں اور امی دونوں باہر پلاٹ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ امی کچھ بُن رہی تھی میں پڑھ رہی تھی ۔ گرین کاٹیج کی طرف سے موٹر سٹارٹ کرنے کی آواز آئی ۔ میں نے اُدھر دیکھا آنٹی اور انکل موٹر میں کہیں باہر جا رہے تھے ۔

کچھ دیر کے بعد امی نے سر اٹھایا بولی "ثانیہ ذرا آنٹی سے کنفرم کر آؤ کہ آج شام فلم کا پروگرام قائم ہے نا" ۔

میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا ۔ میں نے کہا امی آنٹی اور انکل تو ابھی ابھی باہر گئے ہیں

اچھا ، وہ بولی ۔ تو پھر کیا ہے ۔ عین تو گھر پر ہی ہے نا اس سے کنفرم کر لو ۔

دفعتاً کڑاہی میں جلیبی شوں شوں کرنے لگی ۔

اچھا تو مجھے گلاب جامن بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر عین کی خدمتِ عالیہ میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ دفعتاً میری آنکھوں سے پردے ہٹ گئے ۔

بلی تھیلے سے باہر نکلی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کڑاہی جلیبیوں سے بھری ہوئی ہے ۔

ثانیہ آنٹی کے ہاں انہی کپڑوں میں جائے گی کیا ۔ اچھا وہ نئی شال ہی اوڑھ لے ۔

ثانیہ تو ذرا عین کے پاس بیٹھ میں ابھی آئی ۔

بیٹی پڑھائی میں کوئی مشکل ہو تو عین سے جا کر پوچھ لیا کر ۔ ایم اے ہے وہ ۔ تیری آنٹی کہتی ہے ہمیشہ جماعت میں فسٹ ڈویژن لیا کرتا تھا ۔

بیتی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے سامنے آ کھڑی ہوئیں ۔

ارے تو کیا یہ سب نئے ڈیکوریشنز غالیچے پردے میری ہی وجہ سے بدلے گئے تھے ۔ یہ سارا ارینجمنٹ مجھے عین کی جھولی میں ڈالنے کے لئے ہے اور پھر امی ابا کی سرگوشیاں ۔

اس روز حلوائی میری نگاہ میں بالکل تنکے ہو گئے ۔

اگر میں خدوخالی لڑکی ہوتی تو چپکے سے گلاب جامن بن کر پلیٹ میں سج جاتی ۔ مشکل یہ ہے کہ میں سیلف میڈ گرل ہوں ۔ خداداد حُسن پر تکیہ نہیں کیا ۔ بڑی محنت سے خود میں جاذبیت پیدا کی ہے ۔ جو زورِ بازو سے بنی ہو وہ گلاب جامن نہیں بن سکتی وہ جھولی پھیلانے کی قائل نہیں ہوتی ۔ اپنے ہاتھ سے توڑ کر کھانا پسند کرتی ہے ۔

اگر میں چاہتی تو عین بے چارے کی کیا حیثیت تھی ۔ ایسا لشکارہ مارتی کہ سُدھ بُدھ ماری جاتی ۔ ایسی جلیبی بنتی جسے دیکھ کر عمر بھر منہ سے رال ٹپکتی

رہتی ۔ لیکن مجھے عین پسند نہ تھا ۔ بھدا سا جسم ۔ میڈیاکر ذہن ۔ افلوانس زدہ بے حسی ۔ بالکل ہی "بڈاوا" نظر آتا تھا اسے تو ایک گوری چٹی خدوخالی لڑکی چاہیئے تھی ۔ جو ہر وقت رضامندی بھری مسکراہٹ مسکاتی رہے ۔ بن سج کر بیٹھی میاں کا انتظار کرتی رہے ۔

وہ تو شکر ہے چند ہی دنوں میں عین کا بھید کھُل گیا کہ وہ روزی کے گھر آتا جاتا ہے روزی کے گھر کو امی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہاں جو جاتا ہے پھر لوٹ کر نہیں آتا ۔ روزی کی ایک نہیں چار جوان بیٹیاں تھیں ۔ چینی کی پلیٹ میں چار گلاب جامن ۔ یوں عین کا قضیہ ختم ہوا

پھر دفعتاً منظر بدلا ۔ پڑوس میں چودھری صاحب آ بسے

بیٹھے بٹھائے ابا کو شکار کا شوق چُرایا ۔ انہوں نے ایک بندوق خرید لی اور چودہری صاحب کے ساتھ باقاعدہ شکار پر جانے لگے ۔ گھر میں شکار کا گوشت آنے لگا ۔ پھر ڈرائنگ روم میں ہرن کے سینگ آویزاں ہو گئے ۔ ایک اونچے سٹول پر بُھس بھرا عقاب آ بیٹھا ۔ نیچے کارپٹ پر شیر کی کھال بچھ گئی ۔ میں تو حیران رہ گئی ۔ یہ کیا ہوا ۔

باورچی خانے کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتی ہوں کہ چولہے پر مٹی کی اتنی بڑی ہانڈی پڑی ہے ۔ کونے میں دہی بلوہنے کی چاٹی رکھی ہوئی ہے ۔ اور امی نوکر سے بھینس خریدنے کے منصوبے باندھ رہی ہے ۔ لو یک نہ شُد دو شُد ۔

پھر اس کایا پلٹ کا بھید کھل کر سامنے آگیا ۔ چودہری صاحب اور چودہرائن ہمارے گھر کھانے پر آ گئے ۔ میز پر ثابت ماش ، گوشت کی کڑاہی ، پائے ، رس کی کھیر اور سرسوں کا ساگ ۔ مکھن کے پیڑے کے ساتھ سامنے آ گئے ۔

کھانے کے بعد امی نے اپنی کڑاہی چڑھا دی ، کڑچھا چلنے لگا ۔ امی پہلے تو جگہ جگہ اپنے مربعے قائم کرتی رہیں ۔ پھر بات کا رُخ میری طرف مڑ گیا ۔

ثانیہ اتنی سُگھڑ ہے کہ حد نہیں ۔

باورچی خانہ کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے ۔

مربعوں کا حساب کتاب بس ثانیہ ہی جانے ۔

جب ثانیہ چاٹی کو ہاتھ لگاتی ہے تو مکھن آپ ہی آپ پیڑا بن کر اُبھر آتا

ہے ۔ اوہو ۔۔۔ تو یہ بات ہے ۔۔۔ ثانیہ کو مکھن کا پیڑا بنا کر چینی کی پلیٹ میں رکھ کر چودہرائن کو پیش کیا جا رہا ہے لیکن کس کے لئے یہ بھید بھی جلد کھُل گیا ۔

ایک روز چودہری کا بیٹا علی احمد مونچھیں لٹکائے سامنے آ بیٹھا ۔ اور امی اس کے سامنے بیٹھ کر ثانیہ کی گردان پڑھنے لگی ۔ علی احمد تو بالکل ہی پینڈو تھا ۔ امی کی ہر بات پر بے تکلفانہ بھونڈا قہقہہ لگاتا اور پھر کھجانے لگتا ۔ اسے دیکھ کر میں تو لرز گئی ۔ یااللہ کیا میرا مستقبل کڑچھا اور کڑاہی کے زور پر ہی بنے گا ۔

شاید اللہ نے میری سُن لی ۔ کچھ زیادہ ہی سُن لی ۔

ابا پر انکوائری انسٹیٹیوٹ ہو گئی ۔ اور ان کی ساری پراپرٹی ضبط کر لی گئی ۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے ۔ لہٰذا ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گئے ۔

امی بیچاری چار ہی دن میں مُرجھا کر رہ گئیں ۔ سارا رنگ و روغن اُڑ گیا ۔ نیچے سے ایک گھوسٹ بڑھیا نکل آئی ۔ نہ وہ کڑاہی رہی نہ کڑچھا نہ جلیبیاں ۔

امی کو سہارا دینے کے لئے میں نے ایک دفتر میں نوکری کر لی ۔ میں بھلا نوکری کے لئے کہاں ماری ماری پھرتی وہ تو اتفاق سے انور مل گیا کہنے لگا ہمارے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے اگر چاہو تو آکر جائن کر لو ۔ یوں گھر بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ بور ہو رہی ہو ۔ اسے ہمارے حالات کی خبر تھی نا ۔ یوں مجھے اس کے توسط سے نوکری مل گئی ۔

چار سال گزر گئے ۔

شروع شروع میں دفتر میں مشکلات پیش آئیں ۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اکیلی لڑکی ہے چلو قسمت آزمائیں ۔ کچھ نے آگے بڑھ کر جلیبیاں تلنی شروع کیں ۔ کچھ نے پھلجڑیاں چلائیں ۔ کچھ نے کبوتر سی آنکھیں بنا بنا کر دیکھنا شروع کیا ۔ کچھ نے گلاب جامن کی امید پر رال ٹپکائی ۔۔۔ پھر انہیں بات سمجھ میں آگئی کہ ادھر خوش وقتی نہیں چلے گی ۔ لہٰذا سب نارمل ہو گئے ۔ انور دور سے ہی دیکھتا رہا ۔ نہ شوراشوری نہ سردمہری یوں جیسے میں لڑکی تھی ہی نہیں ۔ لیکن کبھار کبھار مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھے دیکھ نہیں رہا بلکہ نگاہوں سے تول رہا ہے ۔

کل شام کی بات ہے کہ انور میرے پاس آیا بولا ۔ ثانیہ فارغ ہو گیا ؟

کیوں ؟ میں نے پوچھا ۔

بولا ۔ ذرا میرے ساتھ چلو ۔

کہاں ؟

ایک کام ہے ۔

وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی ۔

دفتر کے پچھواڑے کے پلاٹ میں وہ رُک گیا ۔

میں حیران یااللہ یہاں کیا کام ہو سکتا ہے بھلا ۔

بیٹھ جاؤ ۔ وہ بولا ۔

میں پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئی ۔ وہ نگاہیں جھکائے میرے سامنے کھڑا رہا ۔ دیر تک وہ خاموش رہا ۔ یوں جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پاتا ہو ۔

آخر وہ بولا ۔ دیکھو ثانیہ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے ۔ کچھ بھی نہیں ۔ ایک پرانا بوسیدہ گھر ہے اور ایک بوڑھی ماں ہے ۔ وہ اتنی بوڑھی ہو چکی ہیں کہ کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہیں ۔ وہ رُک گیا ۔ دیر تک رُکا رہا ۔ پھر بصد مشکل بولا ۔ ثانیہ تم میرے ساتھ شادی کرو گی ، میں تو بکی بکی رہ گئی ۔۔۔ میرے گرد و پیش دُھندلکا چھا گیا ۔ پھر اس دھندلکے میں سے انور کی آواز آئی ۔

سوچ لو ثانیہ سوچ لو ۔ اگر تمہیں گوارہ ہو تو مجھے بتا دینا ۔ میں انتظار کروں گا ۔

پھر اس دھندلکے میں سے ایک دیا اُبھرا ۔۔۔ اُبھرتا چلا گیا

مجھے نہیں پتہ میں وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی ۔ بس بیٹھی رہی ۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ انور شادی کا پیغام دے گا ۔

کل سے میں ڈور کے گچھے کی طرح اُلجھی بیٹھی ہوں کوئی سرا نہیں ملتا ۔

زندگی بھر مجھے تمنا رہی کہ کوئی مجھ سے سیدھی اور صاف بات کرے ۔ سچی بات کرے ۔ سچی بات ہونٹوں سے نہیں ۔۔۔ زندگی بھر میری خواہش رہی کہ

مجھے چینی کی پلیٹ میں رکھا ہوا گلاب جامن نہ سمجھا جائے ---۔ لیکن اب انور کی بات سننے کے بعد مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں ۔ دھندلکا بڑھتا جا رہا ہے ---۔ لیکن وہ مدہم سا دیا ۔

امی سے بات کروں ۔ وہ تو کرنی ہی پڑے گی ۔ کروں گی ۔ امی بیچاری کا کیا ہے ۔ وہ امی تو رہی ہی نہیں ۔ نہ تاج رہا نہ تخت ۔بیچاری سارا دن دھوپ میں کھاٹ پر بیٹھ رہتی ہے ۔ کسی بات میں دخل نہیں دیتی ۔ منہ پر یوں جُھریاں پڑ گئی ہیں ۔ جیسے کوئی بلوری گلدان ریزہ ریزہ ہو جائے لیکن ریزے الگ نہ ہوں چمٹے رہیں ۔ اور ایسا لگے کہ ہاتھ لگایا تو گر کر ڈھیر ہو جائیں گے ۔

میں اٹھ کر امی کے پاس جاتی ہوں ---۔ امی جان ---۔ امی جان چونکتی ہیں میری طرف دیکھتی ہیں ۔

امی ہمارے دفتر کا ایک لڑکا آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔

امی یہ سُن کر بالکل ہی دھندلا جاتی ہے ۔ مجھ سے ۔ ۔ ۔ !

"جی امّی" ۔

امی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہیں ۔

امی اس کا باپ فوت ہو چکا ہے ۔ ماں بہت بوڑھی ہے آ نہیں سکتی ۔ اس لئے وہ لڑکا خود ہی آئے گا ۔

دفعتاً امی کی آنکھ میں چمک لہراتی ہے ۔ اچھا ۔

میں کوشش کرتی ہوں کہ شرماؤں نہیں ۔ امی وہ لڑکا پیغام دینا چاہتا ہے ۔

امی کا سارا چہرہ دمک اُٹھتا ہے ۔ چہرے کی سلوٹیں سمٹ کر ناپید ہو جاتی ہیں ۔ گردن کھٹک سے اُبھرتی ہے اور وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے جیسے آج سے چار سال پہلے کی امی ہوں ۔

کون ہے وہ ، امی پوچھتی ہے ۔ پھر قریب ہو کر زیرِ لب کہتی ہے کتنے مربعے ہیں

میں بکی بکی رہ جاتی ہوں ۔ نہیں امی ، میرے منہ سے نکل جاتا ہے

تو کیا کوئی بڑا افسر ہے ؟ وہ پوچھتی ہیں ۔

اب میں کیا جواب دوں ۔

افسر نہیں تو کیا کاروبار ہے ۔ کارخانے دار ہے ۔

میں یوں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہوں جیسے پتھر کی بن گئی ہوں ۔ مجھے خاموش دیکھ کر امی کہتی ہیں ، اسے کہنا کل کسی وقت مجھ سے مل لے ۔ میں کر لوں گی اس سے بات۔

جب سے میں نے امی سے بات کی ہے اس کی تو کایا پلٹ گئی ہے ۔ بیٹھی سوچ رہی ہے ۔ اپنی پُرانی زنگ آلود کڑاہی اور کڑچھا صاف کر رہی ہے ۔ حالانکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ چولہے تلے آگ نہیں کڑاہی میں تیل نہیں لیکن وہ یوں بیٹھی ہے جیسے جلیبیاں تلنے کی مشق کر رہی ہو ۔ اسے دیکھ کر میرے ارد گرد کا دھندلکا بڑھتا جا رہا ہے بڑھتا جا رہا ہے ۔ اور وہ دیا ۔ یوں جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو ۔۔۔ مجھے اس دیئے پر ترس آ جاتا ہے اور میں خود پھونک مار کر اسے بُجھا دیتی ہوں ۔ تاکہ خود کو محفوظ کر لوں ۔

○

وقار محل کا سایہ

وقار محل کی چھتیں گر چکی ہیں ۔ لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں ۔ جنہیں توڑنے کے لئے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں ۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے ۔ نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھیئے ۔ کھڑکی سے سر نکالئے ، روشن دان سے جھانکئے ۔ ٹیرس سے نظر دوڑایئے ۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ۔ مضبوط ویران بوجھل رعب دار ، ڈراؤنا ، سر بلند کھوکھلا عظیم ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نیو کالونی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو ۔

نوجوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ اُبھرتا ہے ۔ نیو کالونی کے چہرے کا پھوڑا ۔ رستی بستی کالونی میں آثارِ قدیمہ ۔ چہرے نفرت سے بگڑ جاتے ہیں ۔ ہٹاؤ اسے ۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتے ۔

بچے دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں ۔ ڈیڈی یہ کیسی بلڈنگ ہے ، بھدی ، بے ڈھب موٹی موٹی دیواریں ۔ اُونچی اُونچی چھتیں ، تنگ تنگ کھڑکیاں ۔ اور ڈیڈی کیا یہ لوہے کی بنی ہے ۔ اتنے سارے مزدوروں سے بھی نہیں ٹوٹ رہی ۔

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو ۔۔۔ لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں ۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے ۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے ۔

کالج کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیرِ سایہ پل کر جوان ہوئے ہیں ۔ وقار محل کا مذاق اُڑاتے ہیں اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں ۔ کچھ دنوں کی بات

اور ہے ۔ لیکن ان کے دلوں سے آواز اُبھرتی ہے اور وہ تالیاں پیٹنے لگتے ہیں قہقہے لگانے لگتے ہیں تاکہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے ۔ بہر حال نیو کالونی کا ہر نوجوان وقار محل سے ایک پُراسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے ۔ اگرچہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے ۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ تو لگاؤ کا ایک رُوپ ہے ۔ ڈھکا چھپا شدّت بھرا لگاؤ ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے ۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا ۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا ۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے پھر نئی پود نے مذاق اُڑانا شروع کر دیا ۔ پھر کسی منچلے نے بات اُڑا دی کہ محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں ۔ چھتیں بیٹھ رہی ہیں ۔ وہ نیو کالونی کے لئے خطرہ ہے اس پر کمیٹی والے آ گئے ۔ انہوں نے چاروں طرف سے محل کی ناکہ بندی کر دی ۔ اور جگہ جگہ بورڈ لگا دیے ۔ خبردار ۔ دُور رہیئے عمارت گرنے کا خطرہ ہے ۔ پھر بیسیوں مزدور کدال پکڑے آ پہنچے اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو توڑ توڑ کر گرانے لگے ۔

پتہ نہیں بات کیا ہے کہ سالہا سال سے اتنے سارے لوگ کدال چلا رہے ہیں اسے توڑنے میں لگے ہیں لیکن پھر بھی محل کا کچھ نہیں بگڑا وہ جُوں کا تُوں کھڑا ہے ۔ پتہ نہیں وہ کسی مصالحے سے بنا ہے کہ اسے منہدم کرنا آسان نہیں ۔

بہر حال ۔ سارا دن مزدور کدال چلاتے رہتے ہیں ۔ نیو کالونی میں آوازیں گونجتی رہتی ہیں ۔ ٹھک ٹھکا ٹھک ، ٹھک ٹھکا ٹھک ۔

یہ ٹھک ٹھک جِفّی کی رانوں میں گونجتی ہے اس کی لرزش سے کوئی پوشیدہ سپرنگ کھلتا ہے کوئی پُراسرار گھڑی چلنے لگتی ہے ۔ اس کی ٹِک ٹِک دل میں پہنچتی ہے دل میں لگا ہوا ایپلی فائر اسے سارے جسم میں اُچھال دیتا ہے ۔ ایک بھونچال آ جاتا ہے چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگتا ہے ، ہونٹ لمس کی آرزو سے بوجھل ہو کر لٹک جاتے ہیں ، نسیں تن جاتی ہیں اور سارا جسم یوں بجنے لگتا ہے جیسے سارنگی ہو ۔

اس پر جِفّی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے اور وقار محل کی طرف یوں

دیکھنے لگتی ہے جیسے اس سے پوچھ رہی ہو اب میں کیا کروں ؟

والدین نے جفّی کا نام یاسمین رکھا تھا ۔ بچپن میں سب اسے یاسمین کہتے تھے ۔ پھر جب وہ ہائی سکول میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ یاسمین دقیانوسی نام ہے ۔ اس سے پرانے زمانے کی بُو آتی ہے یہ نام ہے بھی تو سلو ٹمپو ۔ یاسمین ۔ ڈھیلا ڈھالا جیسے چولیں ڈھیلی ہوں ۔ لہٰذا اس نے یاسمین کی چولیں ٹھونک کر اسے جِس من کر دیا ۔ پھر جب وہ کالج میں پہنچی تو اسے پھر سے اپنے نام پر غصہ آنے لگا ۔ لو میں کیا پھول ہوں کہ جِسمن کہلاؤں ۔ میں کیا آرائش کی چیز ہوں ۔ میں تو ایک ماڈرن گرل ہوں اور ماڈرن گرل پھول نہیں ہوتی آرائش نہیں ہوتی ۔ خوشبو نہیں ہوتی ۔ یہ سب تو دقیانوسی چیزیں ہیں ۔ ماڈرن گرل تو ایکٹو ہوتی ہے سمارٹ ہوتی ہے ۔ جیتی جاگتی چلتی پھرتی جس پر زندگی بیتتی نہیں بلکہ جو خود زندگی بیتتی ہے ۔ لہٰذا اس نے اپنا نام جِس مِن سے جفّی کر لیا ۔ جِفّی ۔ فٹ ۔ فٹافٹ ۔ فوراً ۔ یہ نام کتنا فعال تھا ۔ کتنا سمارٹ ۔ اس میں زندگی کی تڑپ تھی ۔ پھر اس نام کے زیرِ اثر جلد ہی اس میں یہ خواہش اُبھری کہ کچھ ہو جائے ۔ ابھی ہو جائے ۔ ابھی ہو جائے فوراً۔ تو ابتدا تھی ۔ بالآخر جفّی چاہنے لگی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو ہونے سے رہ جائے ۔

لیکن اس روز جب کہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہو گیا تھا یہاں تک ہو گیا تھا جس کی اسے توقع نہ تھی ۔ لیکن وہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی ۔ الٹا وہ تو ہاتھ مل رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا ۔ پتہ نہیں اس روز جفّی کو کیا ہو گیا تھا ۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں ۔ وہ حسرت آلود نگاہوں سے وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں جا پناہ لے اس روز جیسے جفّی پھر سے یاسمین بن گئی تھی ۔

اگرچہ شعوری طور پر جفّی کو وقار محل سے سخت چڑ تھی اور وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی

جذبات پر مسلط تھا ۔ آن جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کئے ہوا تھا ، جیسے بڑ کا بوڑھا درخت کسی گلاب کی جھاڑی پر سایہ کئے ہوئے ہو ۔

جفّی وقار محل کے زیرِ سایہ پیدا ہوئی تھی ۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی ۔ اس کی کوٹھی ایور گرین وقار محل کے عقب میں تھی ۔ اس کی تمام کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں ۔ دونوں ٹیریسیں اُدھر کو نکلی ہوئی تھیں ۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لئے جاذبِ نظر اور قابل فخر چیز تھی پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی ۔ اس کے دل میں یہ گماں بڑھتا گیا کہ وقار محل نوجوانوں کی آزادی کچلنے کے لئے تعمیر ہوا تھا ۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا ۔

مثلاً جب اس میں جوانی کی اولیں بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا ۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا ۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جس مِن تھی جفّی نہیں بنی تھی ۔ اگرچہ اس کی باجی عفت مدت سے عفت سے اِف اور پھر اِف سے اِفعی بن چکی تھی ۔ چونکہ اِف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا ۔

ان دنوں باجی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اُوندھے منہ پڑی رہتی تھی ۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا ۔ افعی باجی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی ۔ اس کی تو بوٹی بوٹی تھرکتی تھی ۔ ابھی یہاں کھڑی ہے ۔ ابھی باغیچے میں جا پہنچی ۔ لو وہ تو ٹیرس پر ٹہل رہی ہے ۔ ہائیں وہ تو چلی بھی گئی ۔ کسی گٹ ٹوگیدر میں ۔ کسی فنکشن میں ۔ کسی پارٹی میں ۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا افعی باجی کا شیوہ نہ تھا ۔ پھر پتہ نہیں ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گٹھڑی بن کر پڑی رہتی تھی ۔ جس مِن سمجھتی تھی کہ افعی باجی میں واسکوڈے گاما کی روح ہے ۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈی گاما نے امریکہ دریافت کر لی ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے ۔

ان دنوں ممی بار بار افعی کے بیڈ کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باجی کی طرف دیکھتی رہتی ۔ وہ باجی سے پوچھ نہیں سکتی تھی ۔ پوچھنا الگ رہا ممّی تو باجی سے بات نہیں کر سکتی تھی ۔ کیسے کرتی بات ، بات کرتی تو باجی تنک کر کہتی ۔ ممّی ڈارلنگ آپ نہیں سمجھتیں آپ نہ بولیں ۔ واقعی ممّی نہیں سمجھتی تھی ۔ کیسے سمجھتی وہ تو بیچاری سیدھی سادی اک تھی جسے حالات نے زبردستی ممی بنا دیا تھا ۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسسٹنٹ تھے پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ مینجر ہو گئے اور اب جنرل مینجر تھے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوثمان ہو گئے تھے ۔ لیکن فاطمہ بیگم فاطمہ بیگم ہی رہی تھی ۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم کم۔ تعلیم سرسری تھی ۔ سوشل سٹیٹس کی بھاری بھرکم گٹھڑی سر پر آپڑی پھر بھی جُوں تُوں کر کے اس نے رہن سہن کی تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا ۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکی تھی ۔

اس پر ایم اوثمان اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تواس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا ۔ پھر جو انہوں نے گھر سے ناطہ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا ۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا ۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رابنسن کروسو ہو ۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا ۔

لڑکیوں نے زبردستی اسے ممی بنا لیا ۔ ممی کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی ۔ کتنا تیکا لفظ تھا ۔ اس لفظ سے تیکے پنڈے کی بھڑاس آتی تھی ۔ لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتی تھی ۔ جب اپنی پیٹ جائیاں بار بار کہیں ممی ڈارلنگ آپ کو نہیں پتہ آپ نہ بولیں پلیز تو ماں کی زبان پر مہر نہ لگے تو کیا ہو ۔ پہلے تو فاطمہ کو شک پڑنے لگا کہ شاید واقعی اسے پتہ نہیں ۔ پھر اسے یقین آگیا کہ اسے پتہ نہیں ۔ وہ نہیں جانتی ۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ جانے سمجھے ۔ بولے یا نہ بولے پر کم از کم جان تو لے ۔

ان دنوں اسی خواہش کے زیرِ اثر فاطمہ اِفّی کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہتی تھی ۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اِفّی اوندھے منہ بستر پر پڑی رہے ۔ یوں پڑی رہے جیسے مصالحے کے بنے ہوئے مُنّے کے اعضاء کو جوڑنے والا دھاگا ٹوٹ گیا ہو ۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا ۔ شاید فاطمہ کو بات سمجھ میں آگئی وہ دیوانہ وار بھاگی ۔ غیراز معمول وہ سیدھی اِفّی کے ڈیڈی کے پاس پہنچی پھر غیراز معمول میاں بیوی آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے ۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں میاں اہم اہم کرتے سنے گئے ۔ اہم اہم کرنا تو انہوں نے مدّت سے چھوڑ رکھا تھا ۔ ان کے اہم اہم کرنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں پھر سے محمد عثمان آگیا ہو ۔

کچھ دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا محمد عثمان باہر نکلے ۔ ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھڑی پیچھے پیچھے فاطمہ تھی ۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے ۔ افّی کے بیڈ روم میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی ۔

جِس مِن یہ سب تفصیلات کانی آنکھ سے دیکھ رہی تھی ۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ ڈیڈی اور اہم اہم کر کے بات کریں ۔ پھر انہوں نے ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ میں چھڑی کیوں تھی ۔

پھر باجی کے کمرے سے محمد عثمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا ۔ یا شاید منت تھی ۔ یا شاید دونوں ملے جلے تھے ۔ منت بھرا تحکم یا تحکم بھری منّت ۔

پھر باجی کی غصے بھری آواز سارے گھر میں گونجی ۔ بچہ میرا ہے ۔ میں اسے اپناؤں گی ۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے ۔

جِس مِن سوچنے لگی یااللہ باجی کس بچے کی بات کر رہی ہے ۔ کمرے میں تو صرف باجی ، ممی اور ڈیڈی تھے ۔ بچہ کہاں تھا ۔

پھر اوپر کوئی کسی کو زدو کوب کر رہا تھا ۔ چھڑی چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں ساتھ ہی باجی چیخ رہی تھی رو رہی تھی کراہ رہی تھی ۔

ہئے بیچاری باجی ۔ جِس مِن کے دل میں ڈیڈی کے خلاف غصہ کھولنے

لگا ۔

پھر شاخ سے دروازہ کُھلا اور ڈیڈی اور امی سیڑھیاں اتر رہے تھے ۔ لیکن وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں تھے ۔۔۔ اوفو ۔۔۔ ڈیڈی کا چہرا لہولہان ہو رہا تھا ۔ ارے ڈیڈی نے سٹک سے پیٹا تو باجی کو تھا پھر ڈیڈی کا اپنا چہرا کیوں سوجا ہوا تھا ۔ جگہ جگہ سے خون کیوں رس رہا تھا اور وہ اس قدر کھوئے ہوئے کیوں تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کی بجائے سیدھے کوٹھی سے باہر نکل گئے تھے ۔ جِس مِن ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی ۔

دھڑا دڑا ڑام ۔۔۔

ایک زبردست دھماکا ہوا ۔

چاروں طرف سے شور اٹھا ۔

وقار محل کی چھت گر گئی وقار محل کی چھت گر گئی ۔

گردوغبار کا ایک بادل اٹھا اور اس نے نیو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔

اسی شام کو باجی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئی ۔

ہاں جِسمن کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا ۔

اس حادثہ کے بعد وہ روز کھڑکی میں کھڑی ہو کر سوچتی رہی کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی اور اس روز وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی ۔ اور ڈیڈی کا منہ لہولہان کیوں تھا اور وقار محل کی چھت کیوں گری تھی ۔ وہ وقار محل کی طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی ۔ دیکھتی اور سوچتی رہتی ۔ غالباً وہ محسوس کرتی تھی کہ وقار محل اس راز سے واقف تھا ۔

پھر ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو کسی نے چلّا کر کہا ۔ ہائی ۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی ۔

اگلے دن پھر ہائی کی آواز آئی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ پھر چاروں طرف دیکھا ۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا ۔

تیسرے دن وہ ہائی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی ۔ دو چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کو لٹک رہی تھیں ۔ جس میں سے چٹے سفید دانت چمک رہے تھے ۔ اوپر

دو چندھیائی سی آنکھوں میں سے گلیڈ آئی چاند ماری کر رہی تھی ۔ اور اس کے اوپر بال ہی بال ، بال ہی بال ۔

پہلی مرتبہ ہائی کو دیکھ کو وہ سخت گھبرا گئی اس کا جی چاہا کہ شرما کر منہ موڑ لے ۔ جس طرح ماہ رو شرما کر منہ موڑ لیا کرتی تھی ۔

ماہ رو گوری چٹی پٹھانی تھی ۔ جو اپنے باپ کے ساتھ وقار محل سے ملحقہ آوٹ ہاؤس میں رہتی تھی ۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے ملبے کی رکھوالی کیا کرتا تھا ۔ ماں مر چکی تھی صرف ایک چھوٹا بھائی تھا ۔ سارا دن ماہ رو روٹی ہانڈی میں مصروف رہتی ۔ دوپہر کو فراغت ہوتی تو باہر دھوپ میں آ بیٹھتی ۔ ماہ اتنی گوری تھی ۔ اتنی گوری تھی کہ ہر راہ رو اُسے دیکھ کر رک جاتا ۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ گلابی ہو جاتا ۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو ۔ پتہ نہیں حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے ۔ جِس مِن نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا ۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی حیا کے غازے کو اپنا لے ۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی ۔ ماہ رو کی طرح گنوار نہ تھی ۔ اور ماڈرن گرل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرما کر منہ موڑ لے ۔ اُلٹا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہیئے ۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جِس مِن کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور شرما کر منہ نہ موڑا ۔ لیکن اس میں اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی ۔

دراصل جِس مِن بڑی مخلص سچی اور شرمیلی لڑکی تھی ۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں ۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمیاں رچی بسی ہوتی ہیں ۔ مثلاً اسے کچھ پتہ نہ تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے ۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہیئے ۔ چاہئے اور ہے میں جو فرق ہے اسے اس کا احساس نہ تھا ۔ شعور نہ تھا ۔

اس کا دل بہت سے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا ۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے ۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہو ۔ بغضوں سے آزاد ۔ لگاؤ

سے آزاد ۔ رسمی قیدوبند سے آزاد ۔

اگرچہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑ تھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہیئے لیکن دلی طور پر اسے اپنے ماں باپ سے لگاؤ تھا ۔ اگرچہ اسے اس کا شعور نہ تھا ۔ شعور کیسے ہوتا جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی ۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برتاؤ کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں ۔

ان دنوں اسے یہی ایک فکر دامن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے منافی ہو ۔ اس ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا ۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے ۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے ۔ لہٰذا وہ درہم برہم نہیں تھی ۔ بالکل نہیں تھی ۔

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا ۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی ۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹینڈ سے سر نکالتی ۔ جب جِس مِن کالج کی گراؤنڈ میں ٹہل لگاتی تو وہ پردۂ دیوار سے جھانکتی ۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی ۔

ہاں صورتِ حال بہت ہی خراب ہوئی جا رہی تھی پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی ۔

ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیوارئیں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا ۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیو کالونی میں گونجتی رہتی تھی ۔

ایک دن جب جِس مِن کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً وہ حادثہ عمل میں آ گیا ۔

ساری شرارت مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی روز تو وہ ٹھک ٹھک جِس مِن کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی اس روز نہ جانے کیا ہوا وہ ٹھک ٹھک سیدھی جِسمِن کی رانوں سے آ ٹکرائی ۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی ۔

جِس مِن کے جسم میں ایک عجیب سی لرزش جاگی ۔ کسی پوشیدہ سپرنگ

میں حرکت ہوئی ۔ ایک تناؤ سا اٹھا ۔ اس نے دل پر دباؤ ڈالا ۔ دل کے ایمپلی فائر نے اسے اُچھالا ۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آگیا۔ نسیں تن گئیں ۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا ۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے ۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بجنے لگا ۔

اس لمحے میں اسے سب پتہ چل گیا ۔ سب کچھ کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا ۔ سب کچھ اس روز وہ جس مِن سے جفّی بن گئی تھی ۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی ۔ ابھی اسی وقت ۔ فٹافٹ ۔ جلدی کچھ ہو جائے ۔ اور واقعی کچھ ہو گیا ۔

اسی رات جفّی کے بیڈ روم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیرِ لبی آواز آئی ۔۔۔ ہائی

جِفّی تڑپ کر مڑی ۔

دو لٹکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے ۔

اگلے روز گینی لٹکتی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت نکالے ۔ چندھیائی ہوئی مگر چڑھ جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لئے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اُٹھائے صدر دروازے کے راستے سے ایور گرین میں آ داخل ہوا ۔

جب گینی پیدا ہوا تھا تو وہ لڑکا تھا ۔ اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائیں تھیں ۔

انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا ۔ لیکن جب وہ نوجوانی اور دورِ جدید میں داخل ہوا تو بہت سی تبدیلیاں عمل میں آگئیں ۔ بال بڑھ کر ٹوکرا بن گئے ۔ مُونچھیں لٹک گئیں ۔ منہ پر پاؤڈر سرخی کی تہ چڑھ گئی ۔ رنگ دار قمیض چمکیلی صدریاں منکوں کی مالائیں اور جانے کیا کیا ۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا ۔

ایور گرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی ۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افی نے بڑی کارکردگی کر دکھائی تھی ۔ اس کے بوائے فرینڈز ایور گرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کرایا کرتی تھی ۔ ممی سے نہیں چونکہ ممی ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی اور اسے سمجھانا بہت مشکل تھا ۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تھام کر رہ گئی ۔ افعی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے ۔ اس کے دل میں ازسرِنو خدشات نے سر اٹھایا ۔ لیکن وہ بولی نہیں ۔ کیسے بولتی ۔ رہے ڈیڈی ۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوثمان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر ۔

ان کی تعلیم ۔ سٹیٹس اور پوزیشن اس بات کے مقتضی تھے کہ وہ ایم اوثمان بن کر زندگی گذاریں اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوثمان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان ان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دوکان میں آگھسا ہو ۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا غصیل تھا منہ پھٹ تھا کنڑ تھا ۔ ایم اوثمان اسے سمجھاتے ۔ دلیلیں دیتے ۔ بھئی زمانہ دیکھو ۔ زمانے کا رنگ دیکھو ۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو اب یہ پرانی باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا ۔ اس لحاظ سے ایم اوثمان بھی گویا ماڈرن گرل تھے ۔ ان کی شخصیت کی اوپرلی سطح پر ایم اوثمان کی جھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھا ۔

جب گینی کا تعارف ایم اوثمان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا ۔ دھیان کرنا کہیں پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھ ہاتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے ۔ ایم اوثمان کو اس بات پر غصہ آیا ۔ ہٹ جاؤ اس نے چلّا کر کہا ۔ میرا دل پراگندہ نہ کرو ۔

پھر وہ گینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ۔ آیا کرو ۔ مسٹر گینی جب بھی فرصت ملے آجایا کرو ۔

گینی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا اس کے لئے تو صرف عقبی دروازہ ہی موزوں تھا ۔ لیکن جِفّی کو یہ گوارا نہیں تھا ۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل "سلائی" تعلق رکھنے سے نفرت کرتی ہے ۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا ہے ۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے ۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں ۔ جو پابندیوں میں جیتی ہیں جِفّی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھا ۔ جِفّی کو اس بات کا علم

نہ تھا کہ گینی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔

گینی تو گڈ ٹائم اور اڈونچر کا متلاشی تھا۔ جب وہ جگی کے مجبور کرنے پر ایور گرین میں صدر دروازے سے داخل ہوا تو ایڈونچر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ اڈونچر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی رہا گڈ ٹائم تو آپ جانتے ہیں گڈ ٹائم میں تنوع کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک ہی سُر دبائے رکھنے سے نغمہ نہیں بنتا۔

اس لئے جوں جوں دن گذرتے گئے ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے اکتا کر گینی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

گینی کی روپوشی پر جگی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہیئے۔ لہذا وہ بکی بکی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

پھر وقار محل کی ٹھکا ٹھک نے اسے گھیر لیا وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنس گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ اسے اکسانے لگی۔ اُٹھو۔ کچھ کرو۔ اُٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کرو ٹھک ٹھک۔ اٹھو کرو ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جگی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گینی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ جسم کا تقاضہ پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گینی کو جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ اسے گینی سے محبت ہو چکی تھی۔

جب گینی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جبھی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آ گیا اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

حسنی ان کا نیا بوائے سرونٹ تھا چھٹپنے سے ہی وہ کوٹھیوں میں کام کرتا

رہا تھا ۔ وہیں جوان ہوا تھا ۔ ماڈرن بیگمات کے انداز دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا ۔ حسنی خاصہ اپ ٹو ڈیٹ تھا ۔ کلین شیو ۔ سمارٹ لک ۔ لمبے بال ۔

جِفّی نے حسنی کی آمد کا نوٹس نہ لیا ۔

نوکر تو گھر میں آتے جاتے ہی رہتے تھے ۔ کبھی خانساماں چلا گیا کبھی بوائے سرونٹ آگیا ۔ گینی کی روپوشی کے بعد ان دنوں جِفّی کی طبیعت ناساز سی رہتی تھی ۔ اس روز اس نے چائے اپنے کمرے میں منگوا لی ۔

حسنی پیالی بنا کر کمرے میں لے گیا ۔ جب وہ جِفّی کو پیالی دینے کے لئے جھکا تو اتفاقاً جفّی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ پتہ نہیں کیا ہوا ۔ حسنی کے کلین چہرے پر دو مونچھیں ابھر آئیں وہ لٹکنے لگیں ۔ گھبراہٹ میں جِفّی کے منہ سے نہ جانے کیا نکلا ۔ حسنی اسے سمجھ نہ سکا ۔ بولا ۔ جی ؟ جِفّی کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ہائے کہا ہو ۔ اس کا سر سرہانے پر گر پڑا ۔ حسنی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی ۔ لیکن چائے تو بستر پر گری تھی ۔ جفّی کیوں شرابور ہو گئی تھی ۔

پھر یہ مشکل روز کی مشکل بن گئی ۔

جب بھی حسنی جفّی کے کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہتا ۔ جی تو اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے ہائے کہا ہو ۔ وہ چونک کر مڑ کر دیکھتی ۔ اس وقت حسنی کے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لٹک جاتیں اور چٹے سفید دانت چمکتے ۔ صورتِ حال یہاں تک آ پہنچی کہ جفّی حسنی سے ڈرنے لگی ۔

اوّل تو جِفّیؔ اپنے آپ سے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ حسنی سے ڈرتی ہے اسے علم نہ تھا کہ وہ خود سے ڈر رہی ہے ۔ حسنی کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرتی ہے حسنی کوٹھیوں میں کام کرتے کرتے جوان ہوا تھا ۔ وہ ماڈرن گرل سے اچھی طرح واقف تھا ۔ وہ انہیں سمجھتا نہیں تھا لیکن جانتا تھا اور سمجھے بغیر جاننا ۔ جانے بغیر سمجھنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے ۔ بہرحال حسنی کو پتہ تھا کہ جب مس صاحبہ ڈرنے لگے تو وہ ڈر صرف سٹیٹس کا ڈر ہوتا ہے ۔ اور سٹیٹس کا ڈر ایسی بیل ہوتی ہے جس کی جڑ نہیں ہوتی ۔ اس لئے وہ انتظار کرتا رہا ۔ حسنی بار

بار بہانے بہانے جِفّی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتا اور پھر مدہم مگر پُر لے آواز میں کہتا ۔ جی ۔ ۔۔۔ آپ نے بلایا مس صاحبہ ۔

ایک روز جب جِفّی آئینے کے سامنے کھڑی تھی تو حسنی نے وہی حرکت دہرائی ۔ جفّی گھبرا کر پیچھے ہٹی ۔ اس کے قدم لڑکھڑائے ۔ وہ گری ۔ دو مضبوط بانہوں نے اسے سنبھال لیا ۔ جِفّی نے اوپر کی طرف دیکھا ۔ دو لٹکی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے ۔ جِفّی نے آنکھیں بند کر لیں اس ڈر کے مارے کہ کہیں مونچھیں اُڑ نہ جائیں نیچے سے کلین شیو چہرہ نہ نکل آئے ۔ پھر ۔ پھر اسے یاد نہیں ۔

ٹھک ٹھک ٹھک وقار محل کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں ۔ سنہرا گردوغبار اڑ رہا تھا ۔

اگرچہ جِفّی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لئے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگا لیں تھیں ۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا ۔ لیکن جسم کو وہ کیسے سمجھاتی ۔ جسم تو ایک بے سمجھ کہہ دینے والا دہقان ہے ۔ وہ ذہن کی سیاست دانیوں کو نہیں سمجھتا ۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا ۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا ۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکّار نہیں ۔ وہ صاف بات کرتا ہے ۔ دو ٹوک بات ۔ سیدھی بات ۔

جسم نے جِفّی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھرل صرف گینی سے ہی وابستہ نہیں ۔ مونچھیں لگانے کے تکلف کے بغیر بھی تھرل حاصل ہو سکتی ہے ۔ جسم کی یہ زیر لبی جِفّی کو بہت ناگوار گذری ۔

اگلی صبح جب دھندلکا دور ہوا اور سٹیٹس کی دنیا پھر سے آباد ہوئی تو جِفّی کی انا کو بڑا صدمہ ہوا ۔ یہ میں نے کیا کر دیا ۔ یہ کیسے ہو گیا ۔ ایک معمولی نوکر ۔

سارا دن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی ۔ گرتی ہی چلی گئی ۔ سارا دن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے ۔ لیکن اس روز گویا یاسمین اس کے دل میں آ گھسی تھی ۔ جفّی اور یاسمین برسر تکرار تھیں ۔

جِفّی بار بار کہتی ۔ چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا ۔ اتنی چھوٹی سی بات پلے

نہ باندھو ۔

یاسمین کہتی اونہوں بات پلے باندھی نہیں جاتی وہ تو بن پوچھے بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلے بندھ جاتی ہے ۔

جِنّی کہتی ۔ دل میلا نہ کرو ۔ تم تو ایک ماڈرن گرل ہو جنس تو ایک ذاتی معاملہ ہے اسے روگ نہ بناؤ ۔

یاسمین کہتی ۔ تم ماڈرن گرل نہیں ہو ۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے ۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں ۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے ۔

اس روز سارا دن جِنّی اور یاسمین میں کشمکش ہوتی رہی ۔ سارا دن اس کے دل کی ہنڈیا میں جِنّی اور یاسمین کی کھچڑی پکتی رہی ۔

جِنّی اور یاسمین کے جھگڑے کو سُن سُن کر اس کے کان پک گئے ۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو ۔

دفعتاً اس کے ذہن میں خیال ابھرا ۔ پھر میں کون ہوں کیا میں یاسمین ہوں ۔ نہیں میں یاسمین نہیں کیا میں جِنّی ہوں ۔ نہیں میں جِنّی بھی نہیں ۔ تو پھر میں کون ہوں ۔

صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں ۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان ہیں ۔ نہیں ۔ کیا وہ ایم اوثمان ہیں نہیں تو پھر ڈیڈی کون ہیں ۔

اس گھر میں صرف ایک فرد ممی تھیں ۔ جو فاطمہ بیگم تھیں خالی فاطمہ بیگم ۔ جنہیں سب ممی کہتے تھے نہ جانے کب سے کہہ رہے تھے ۔ جنہیں برسوں سے ممی بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں ۔ لیکن وہ امی تھیں اور امی ہی رہی تھیں ۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم تھا کہ وہ کون ہیں ۔

میں کون ہوں یہ ایک بڑا ٹیڑھا سوال تھا پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے ۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ جسمن ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جِنّی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں ۔ آج اس کے دل میں جِنّی اور یاسمین کی کھچڑی پک رہی تھی ۔

کیا میں جِنّی اور یاسمین کی کھچڑی ہوں ۔ نہیں ، نہیں یہ نہیں ہو سکتا ۔

میں کھچڑی نہیں ہوں ۔ میں کبھی کھچڑی نہیں بنوں گی ۔ میری ایک شخصیت ہے ۔ میرا ایک سلف ہے ۔ میں یاسمین بن سکتی ہوں جفی بن سکتی ہوں لیکن کھچڑی نہیں کبھی نہیں ۔ کبھی نہیں ۔

اس کے سامنے افعی آکھڑی ہوئی ۔ میں افعی ہوں وہ سینہ اُبھار کر بولی ۔ خالص افعی نہیں یہ جھوٹ بولتی ہے ۔ یاسمین نے کہا اگر یہ افعی ہوتی تو کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی ۔

اس چخ چخ سے گھبرا کر جِفّی اُٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی سامنے وقار محل کھڑا مسکرا رہا تھا ۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی ۔

جِفّی نے محسوس کیا جیسے محل سب کچھ جانتا ہو ۔ ٹھک ٹھک کچ ۔ ڑی ٹھک ٹھک ۔ کچ ڑی محل کی دیواریں چلّا رہی تھیں ۔

نہیں تم جِفّی ہو ۔ جفّی ۔ اس کے دل سے آواز آئی ۔ اس واقعہ کو بھول جاؤ ۔

نہیں نہیں یاسمین بولی ۔ بُھولنا کافی نہیں ۔ تمہیں اس داغ کو اپنے دامن سے دھونا ہوگا ۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹوٹتے ہوئے محل کی آوازیں جِفّی کے کمرے میں گونج رہی تھیں ۔ ٹک ٹک ٹک ٹک ایک لرزش اس کے اندر رینگ رہی تھی ۔

نہیں نہیں جِفّی گھبرا کر بولی تم ایک ماڈرن گرل ہو نہیں نہیں یاسمین چلّائی تم وقار محل کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو ۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹوٹتا ہوا محل کراہ رہا تھا ۔ دفعتاً اس کا منہ سرخ ہو گیا ۔ حسنی اس نے یوں آواز دی جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی میں سے کوئی مدد کے لئے چلّا رہا ہو ۔ حسنی ۔

جفّی اور یاسمین دونوں ششدر رہ گئیں ۔ یہ آواز کس نے دی کس نے ؟

حسنی ۔ وہ پھر چلّائی ۔

وہ آواز منہ سے نہیں بلکہ جسم سے نکل رہی تھی ۔

بُت ، دیوتا اور سنّاٹا

تراخ ۔۔۔ ایک دھچکا لگا ۔۔۔ جیسے کچھ ٹوٹ گیا ۔۔۔ گردوپیش کی آوازیں مدہم پڑتی گئیں ۔ مدہم پڑتی گئیں ۔۔۔ ارے میں تیر رہا تھا ۔ بے لہر سمندر میں تیر رہا تھا ۔ تیرتا رہا ۔ تیرتا رہا ۔۔۔ ایک گرداب مجھے کھینچ رہا تھا ۔ مٹیالی سپیدی ختم ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔ کالا بولا اندھیرا ۔۔۔ میں ایک کنوئیں میں گر رہا تھا ۔ گرا جا رہا تھا ۔ گرتا رہا ۔ گرتا رہا ۔۔۔ صدیاں بیت گئیں ۔ وقت تھم چکا تھا ۔ میں لاوقت ہو چکا تھا ۔

ہوش آیا تو میں ایک وسیع نیلگون دھندلکے میں ڈھیر ہوا پڑا تھا ۔ حرکت کی سکت نہ تھی ۔۔۔ پھر جیسے روشنی کی ایک کرن مجھ پر پڑی ۔ اس میں نمو تھی ۔ زندگی تھی ۔ کرن قریب آتی گئی ۔ اور قریب ۔ اور قریب ۔ میں نے آنکھ کھولی ۔ میرے رُوبرو ایک چہرا تھا ۔ منوّر چہرا ۔ ۔ میں اُٹھ بیٹھا ۔ پھر سے بے لہر سمندر میں تیرنے لگا ۔

وہ ایک دھندلا دھندلا وسیع میدان تھا ۔ سامنے ایک عظیم ہیبت ناک قلعے کے دو ڈراؤنے بُرج نظر آ رہے تھے ۔ میدان میں بہت بڑا ہجوم تھا ۔ یہ کون سی جگہ ہے میں نے خود سے بات کی ۔ کچہری ہے ۔ ایک مدہم سی آواز آئی ۔

میں نے تو کسی پر مقدمہ نہیں کیا ۔

کسی نے بھی نہیں کیا ۔

پھر یہ سب یہاں کیوں آئے ہیں ۔

یہاں آنا ہی پڑتا ہے ۔

میں تو یہاں رُکنا نہیں چاہتا ۔

نہ رکو ۔ چلے جاؤ ۔

کوئی پوچھے گا تو نہیں ۔

اونہوں ۔ کوئی نہیں پوچھے گا ۔ لیکن ۔۔۔

لیکن کیا

لیکن تمہیں اک دن آنا ہی پڑے گا ۔

وہ پکڑ کر لے آئیں گے کیا ؟

نہیں ۔ تم از خود آؤ گے ۔ اپنی مرضی سے ۔

اپنی مرضی سے ۔۔۔؟

ہاں ۔ آکر کہو گے میں حاضر ہوں ۔ میرا حساب چکایا جائے ۔

دفعتاً بُرج پر لگا ہوا لاؤڈ سپیکر بولا ۔ توجہ توجہ

سب کے کان کھڑے ہو گئے ۔ سناٹا چھا گیا ۔

جہانگیر فرزند خاتون بیگم ۔ لاؤڈ سپیکر غرایا ۔

میں چونکا یہ تو میرا نام ہے ۔

تم بڑے خوش قسمت ہو ۔ چار ایک آوازیں آئیں ۔ یہاں تو لوگ نہ جانے کب سے گوش بر آواز بیٹھے ہیں ۔ کہ کب آواز پڑے ۔

پھر دفعتاً منظر بدل گیا ۔ میں ایک اور چوگان میں تھا جہاں چاروں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے ۔ اور دودھیا سویرا چھایا ہوا تھا ۔ وسیع و عریض میدان میں مَیں اکیلا تھا ۔ سامنے وہی بُرج ایستادہ تھے ہیبت ناک وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگا ۔ میں کہاں آگیا ہوں ۔ کیا یہ دوسری زندگی ہے ۔

اونہوں پیچھے سے آواز آئی ۔

میں نے مڑ کر دیکھا ۔ میرے پیچھے ایک روشن مدبر چہرہ تھا ۔

زندگی نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ ایک تسلسل ہے ۔

کیا یہ دوسرا جہان نہیں میں نے پوچھا

نہیں وہ بولا ۔ بہت سے آسمان ہیں زمینیں ہیں لیکن جہاں ایک ہی ہے ۔

مجھے آواز پڑی تھی نا ۔

ہاں پڑی تھی ۔

لیکن یہاں کوئی پوچھتا نہیں ۔ ۔ ۔ کیوں ؟

پوچھنے والے کی مرضی ۔

یہ میدان خالی کیوں ہے ؟

خالی تو نہیں ۔

بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں اور بس ۔

پتھر نہیں ہیں ۔

پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ پتھر نہیں تھے ۔ بت تھے ۔ اتنے سارے بت ۔ بت ہی بت ۔ بت ہی بت ۔ کچہری میں بتوں کا کیا کام ۔ کیوں ۔ کس لئے ۔

یہاں کیوں کس لئے نہیں پوچھا جاتا ۔ یہ گستاخی ہے ۔

میں نے مڑ کر دیکھا ۔ آپ ہیں کون ؟

میں ٹرائل اسسٹنٹ ہوں ۔

کیسا ٹرائل ۔

تمہارا ٹرائل ۔

میرا ٹرائل ہو گا ۔ کس بات کا ؟

ہر بات کا ۔

آپ جج ہیں کیا ۔

نہیں وہ بولا میں رابطہ افسر ہوں ۔

میں نے تو زندگی میں کچھ نہیں کیا ۔ کچھ نہیں ۔ کسی کا برا نہیں چاہا ۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا ۔ کسی کا حق نہیں مارا ۔ ۔

نہ کرنا عمل نہیں ۔ یہاں صرف عمل جانچتے ہیں ۔ کہ کیا کیا ۔ کیا یہ نہیں کہ کیا نہیں کیا

میں نے محبتیں ضرور کی تھیں ۔ چار ایک ۔ ان میں ناجائز بھی تھیں ۔

محبت کرنا جُرم نہیں ۔

سچ ۔ لیکن ان میں ناجائز جو تھیں ۔

محبت محبت ہوتی ہے ۔ نہ جائز ہوتی ہے نہ ناجائز ۔

لیکن میری خواہشات پاکیزہ نہ تھیں ۔

خواہشات عمل نہیں ہوتیں ۔

تم یقین سے کہہ رہے ہو ۔

ہاں یہی یہاں کا قانون ہے ۔

جج کہاں ہے میں نے پوچھا ۔

جج تم خود ہو ۔

میں ؟

ہاں تم ۔

میں جج بھی ہوں مجرم بھی ۔

ہاں تم مجرم بھی ہو ۔ گواہ بھی اور جج بھی ۔

میں حیرت میں ڈوب گیا ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ دیر تک خاموشی طاری رہی ۔ میں سوچتا رہا ۔ سوچتا رہا ۔

دفعتاً میرے رُوبرو ایک حسین جاذب نظر متبسّم چہرہ اُبھرا ۔ وہ چہرہ بہت مانوس تھا ۔ بے حد مانوس ۔

ارے یہ تو سفینہ ہے ۔

پہچان لیا تم نے رابطہ افسر بولا ۔

ہاں ۔ ۔ ۔ یہ میری سفینہ ہے ۔ میری پہلی محبت ۔ میری نوجوانی کے ویرانے میں پہلا نخلستان ۔

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا ۔ سفینہ کو دیکھ کر بیتے ہوئے جذبات پھر سے اُبھر آئے ۔ جذبات کا وہی طوفان جس سے میں پچاس سال پہلے سرشار تھا میں بھول گیا کہ کہاں ہوں کس کے حضور کھڑا ہوں ۔ جوش میں مَیں بولے گیا بولے گیا ۔

یہ وہ سفینہ ہے جس کے ساتھ میں نے ٹوٹ کر محبت کی ۔ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکائے رکھا جھکائے رکھا ۔۔۔ ۱۶ سال ۔ اس کے پاؤں پر اب بھی میرے سجدوں کے نشان موجود ہیں ۔ سولہ سال میرے جسم کا انگ انگ ۔ روح کا ذرہ ذرہ اس کی طرف متوجہ رہا ۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر آن ہر لمحہ میں اس پر نثار ہوتا رہا ۔ میں نے اپنی ذات کو اس میں فنا

کر دیا ۔ یہ بت تھی اور میں بت پرست تھا ۔ پجاری تھا ۔ یہ چلتی تو اس کی چال میں لے نظر آتی ۔ بیٹھتی تو اس کی پوز میں حسن ہی حسن محسوس ہوتا ۔ بولتی تو چاندی کی گھنٹیاں بجتیں ۔

سولہ سال میں نے اس دیوی کو منا منا کر گذار دیئے ۔ میری ہر نگاہ میں آرتی کے پھول ہوتے ۔ میری سوچ کا ہر زاویہ اس کی سمت لے جاتا ۔

دفعتاً میں رُک گیا ۔ رابطہ افسر سر جھکائے کھڑا تھا ۔ سفینہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا ۔

میری محبت میں صرف ایک خامی تھی ۔ میں نے کہا ۔ میری محبت جائز نہ تھی ۔ مجھے اس سے محبت کرنے کا کوئی حق نہ تھا ۔ یہ کسی اور کی ہو چکی تھی ۔ میں نے پہلی بار اسے اس وقت دیکھا جب یہ دلہن بن کر ہمارے محلے میں آئی تھی ۔ ڈولی سے باہر نکلی تھی ۔ اس کا پور پور زندگی سے منور تھا ۔ محلے کی لڑکیوں میں یہ یوں تھی جیسے کیکر کے پھولوں میں چنبے کی بُوٹی ہو ۔ اسے دیکھ کر محلے کے نوجوانوں کے دیدے پھٹ گئے ۔ اسے نگاہوں نے گھیر لیا ۔ نگاہوں پر ایسی چڑھی ۔ اس قدر جُھلائی گئی کہ نگاہوں پر جھولنا اس کا مقدر بن گیا ۔ دفعتاً مجھے ہوش آیا کہ میں کہاں کھڑا ہوں ۔

اس سے پوچھ لیجیئے میں نے رابطہ افسر سے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا ۔

ہاں سفینہ بولی یہ سچ ہے کہ میں نگاہوں پر چڑھی ۔ جُھلائی گئی ۔ آرزوؤں کا مرکز بنی ۔ میرے اردگرد بت پرست ہی بت پرست تھے ۔ انہوں نے مجھے بت بنا لیا ۔

واقعی اس شخص نے ٹوٹ کر محبت کی ۔ سجدے بچھائے ۔ اس شخص کو توجہ کی ایسی صلاحیت ملی ہے جو عورت کو پاگل کر دیتی ہے ۔ رنگین توجہ ۔ اٹوٹ توجہ ۔ خوفناک توجہ ۔ اس نے میرے اردگرد توجہ کا ایک سنہرا جال بُن دیا ۔

بے شک اس نے ٹوٹ کر محبت کی لیکن اس کی محبت دینے والی محبت نہ تھی لینے والی محبت تھی ۔ خود کو معدوم کرنے والی محبت نہ تھی ۔ دوسرے کو زیر اثر کرنے والی محبت تھی ۔ اس کی محبت میں تیاگ نہ تھا ۔ شوکتِ نفس

تھی ۔

کیا کیا کیا غصّے سے میں چلّایا ۔ یہ تم کہہ رہی ہو ۔

شوکتِ نفس محبت نہیں ہوتی ۔ رابطہ افسر گنگنایا ۔

بولو میں جھوٹ کہتی ہوں کیا سفینہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چلّا چلّا کر کہوں بالکل جھوٹ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مجھ میں سے وہ نکل کر میرے روبرو آکھڑا ہوا ۔ اسے دیکھ کر میں ہکّا بکّا رہ گیا ۔ وہ میں ہی تھا میں خود ۔

اس شخص نے بلاشبہ ٹوٹ کر محبت کی ۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ۔ لیکن اس نے سفینہ سے محبت نہیں کی ۔

کیا کیا کیا ۔۔۔ میرے حلق میں آواز نہ رہی تھی ۔

سفینہ وہ بولا ایک حوالہ تھی ۔ ایک بہانہ تھی ۔ ایک پردہ تھی دراصل اسے اپنی بھابھی سے محبت تھی ۔ اس کی بھابھی حسین تھی شوخ تھی طرحدار تھی ۔ جس کے گھر میں یہ پرورش پاتا رہا تھا بھابھی سے محبت کا اظہار ممنوع تھا ۔ ناجائز تھا ۔ یہ خود سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا ۔۔۔ پھر منظر پر سفینہ آگئی ۔ اور یہ شخص :۔ غیر کے پاؤں پڑ گیا بے خودی نیاز میں ۔ بھابھی دیوی تھی سفینہ بت تھی ۔ اس نے خود کو دھوکا دیا ۔ سفینہ کو دھوکا دیا ۔ بھابھی کو دھوکا دیا ۔ سولہ سال کا مسلسل دھوکا ۔

جھوٹ سراسر جھوٹ میں چلّایا ۔ تم کون ہو ۔ جو میری ہی شکل میرے ہی روپ میں میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہو ۔

یہ گواہ ہے رابطہ افسر بولا ۔ یہ تمہارے اندر کا سچ ہے ۔ میں وہ ہوں ۔ گواہ بولا ۔ جسے تم نے ساری زندگی بولنے نہ دیا ۔ اس لئے کہ سچ کا سامنا کرنے کی تم میں ہمت نہ تھی ۔ تم نے خود کو رنگین فریبوں میں مبتلا رکھا ۔ کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا پھر بولا ۔ تم نے خود کو کبھی ایسے نہیں دیکھا جیسے کہ تم ہو بلکہ ہمیشہ ایسے دیکھا جیسے تم خود کو دیکھنا چاہتے تھے ۔

لیکن لیکن میں چلّایا سفینہ اور میری محبت تو رسوائے عالم تھی اور ۔۔۔

ہاں سفینہ بولی ہم دونوں رسوائے عالم تھے ۔ تمہاری پاگل کر دینے والی توجہ

نے میرا سب کچھ چھین لیا ۔ میرا خاوند ۔ میرے بچے ۔ محلے والوں کی خوشنودی ۔ یہاں تک کہ خود مجھے مجھ سے چھین لیا ۔

کیا تم معصوم ہو ۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہ تھا میں نے غصے میں پوچھا

میں ایک عورت ہوں وہ بولی مجھ میں ہر بات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے لیکن میں محبت بھری توجہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ مرد کی توجہ ۔ چاہے وہ سچی ہو جھوٹی ہو ۔ پردہ ہو یا دکھاوا ۔ پاکیزہ ہو یا ہوس بھری اس کے زیرِ اثر میں یوں پگھل جاتی ہوں جیسے مکھن چولہے کی حدت میں پانی ہو جاتا ہے ۔ پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی ۔ اس شخص کے پاس خوفناک قسم کی توجہ ہے ۔ جو بند بند میں اتر جاتی ہے چیونٹوں کی طرح چڑھ جاتی ہے ۔ کھا جاتی ہے ۔ اس کی توجہ نے مجھے کھا لیا ۔ کھوکھلا کر دیا ۔

گواہ آگے بڑھ کے بولا ۔ اس کے پاس توجہ کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں ۔ توجہ کا یہ گلدان محبت کے گلدستے سے خالی ہے ۔ محبت دینے کا عمل ہے ۔ اس شخص میں دینے کی صلاحیت مفقود ہے ۔ یہ توجہ کا جال اس لئے بچھاتا ہے کہ پھانس لے جکڑ لے ۔ اپنا بنا لے ۔ حکمرانی کرے ۔ یہ شخص کسی کی پوجا کیا کرے گا ۔ یہ تو خود بت ہے شوکتِ نفس نے اسے بت بنا رکھا ہے ۔

گردوپیش میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ مسلسل حرکت ۔ مجھے ایسا لگا جیسے چوگان میں پڑے ہوئے بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا ۔ ان کے ہونٹ ہلے سارے چوگان میں ایک سرگوشی گونجی ۔ بت بت ۔ میں نے شرم سے گردن جھکا لی ۔ پتہ نہیں کتنی دیر ویسے ہی بیٹھا رہا ۔ بیٹھا رہا ۔ پھر قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سر اٹھایا ۔ میرے روبرو سعدیہ کھڑی تھی سعدیہ میری محبوبہ ۔ وہی متبسم آنکھیں ۔ شرارت سے ادھ کھلے ہونٹ ۔ وہی شوخی ۔ بے چینی ۔ اضطراب ۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی ۔ چہرہ تمتما گیا ۔ نہیں نہیں ۔ وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہو کر بولی ۔ میں اس شخص کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی ۔ اس نے مجھ سے خوفناک قسم کا انتقام لیا تھا ۔

نہیں نہیں میں چلایا میں نے تو تم سے محبت کی تھی ۔
میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو ۔ پھر دفعتاً پردہ ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ تم محبت کی اوٹ میں مجھ سے انتقام لے رہے ہو ۔ کتنا خوفناک انتقام تھا ۔

پھر وہ رابطہ افسر سے مخاطب ہوکر بولی مجھے ایک خوبصورت اونچے لمبے شخص سے محبت تھی ۔ اس کا نام جاہ تھا ۔ یہ شخص جاہ کا رازدان تھا ۔ جب جاہ اسے پہلی بار ہمارے سامنے لایا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا نہیں نہیں ۔ ہمیں اس کالے کلوٹے ٹھگنے شخص سے کوئی سروکار نہیں لے جاؤ اسے لے جاؤ ۔ لیکن جاہ کا اس کے بغیر گزارہ نہ تھا ۔ اس لئے وہ اسے اپنے ساتھ لانے لگا ۔ پھر اس نے اپنی باتوں کا جال پھیلایا ۔ اُف اس کی باتیں ۔ اتنی رنگین اتنی رس بھری اتنی حاضر جوابی ۔ باتوں سے موہ لینے کے بعد اس نے اپنی توجہ مجھ پر مرکوز کر دی میں اس کی توجہ سے پاگل ہو گئی ۔ جاہ کو بھول گئی ۔ گھر والوں کو بھول گئی ۔ سبھی کچھ بھول گئی ۔ یہ بت بن گیا اور میں پجاری ۔ پھر دفعتاً پردہ سرک گیا ۔ اور ۔ اور میں نے دیکھا کہ محبت کے پردے میں یہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے چونکہ میں نے اسے کالا کلوٹا کہہ کر رد کیا تھا ۔ مجھے ایک دھچکا لگا ۔ خوفناک دھچکا ۔ سب اتھل پتھل ہوگیا ۔۔۔ پھر وہ مجھے پاگل خانے لے گئے اور میں پاگل رہی مہینوں پاگل رہی ۔ نہیں نہیں میں اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں اسے دیکھ کر مجھ پر وہی وحشت سوار ہو جاتی ہے ۔ نہیں نہیں نہیں نہیں کہتی ہوئی وہ الٹے پاؤں چلنے لگی ۔

میں نے محسوس کیا جیسے تمام بتوں نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا ۔ ان کے ہونٹ ہلے اور چوکان میں وہی سرگوشی گونجی ۔ بت ۔ بت ۔ بت ۔ شرمسار ہو کر میں نے سر جھکا لیا ۔ جھکائے رکھا جھکائے رکھا ۔ پھر جو میں نے سر اُٹھایا تو میرے سامنے آصفہ کھڑی تھی ۔ اس کی محبت بھری نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں ۔ اس کے حزن و ملال بھرے چہرے پر خوشی بھرا تبسّم تھا ۔

ہاں وہ بولی انہوں نے مجھ سے سچی محبت کی اتنی والہانہ محبت کی کہ میرے اندر شمعیں روشن ہوگئیں ۔ ان کی محبت نے مجھے زندگی سے آشنا کر دیا ۔ میرا

تن من منور کر دیا ۔ وہ رک گئی ۔ جذبات کی شدت نے اس کی آواز بند کر دی ۔

اگرچہ ، آصفہ نے کہا حالات ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور ہم مل نہ سکے ۔ لیکن میں نے ان کے خیال میں ساری زندگی تنہائی میں گزار دی ساری زندگی ۔ پھر بھی کوئی بات نہیں ۔ کوئی بات نہیں محبت کے وہ روشن لمحے جو انہوں نے مجھے عطا کئے انمول تھے ۔ میں نے ساری زندگی ان کی روشنی میں گزاری ہے ۔

یہ صاحب وہ بولی بڑے عظیم ہیں ۔ انہیں محبت میں خود کو دینا آتا ہے ۔ میں نے ساری زندگی ان کی پوجا کی ہے ۔

مجھ میں سے نکل کر گواہ پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا ۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا ۔ تحقیر بھرے قہقہے ۔ تم کتنی معصوم ہو آصفہ

نہیں نہیں آصفہ چلّائی ۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی ۔

اس شخص نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا دیا گواہ بولا ۔ اس کی محبت جھوٹ تھی فریب تھا ۔

آصفہ نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ۔ مت کہو مت کہو وہ چلّائی ۔ اس قدر ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص فریبی نہیں ہو سکتا ۔ جھوٹا نہیں ہو سکتا ۔ پجاری کے سامنے دیوتا کی نندا نہ کرو ۔ نہ کرو ۔ میں نہیں سن سکتی ۔ یہ کہتے ہوئے وہ پچھلے پیروں چلنے لگی اور چند ساعت میں نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔

اسے کہتے ہیں محبت گواہ بولا ۔ اور تم ۔۔۔ تم اس نے میری طرف دیکھا ۔ یاد ہے تمہیں ۔۔ ۔ جب تم آصفہ سے ملے تھے ۔ اس وقت وہ عالمِ شباب میں تھی اور تمہاری عمر ڈھل چکی تھی ۔ اس وقت تمہارے دوستوں نے تم سے کہا تھا جناب آصفہ پر ڈورے نہ ڈالئے بے کار ہے ۔ اب تمہارے تلوں میں تیل نہیں ہے اس بات پر تم ضد میں آ گئے تھے اور اپنا مان ثابت کرنے کے لئے تم نے اپنی توجہ سے آصفہ کی زندگی تباہ کر دی ۔ کیا اسے محبت کہتے ہیں ۔ تف ہے تم پر ۔

میں نے شرم سے گردن جھکا لی ۔

اس وقت ایک عجیب بات عمل میں آئی ۔ میرے حلق سے ایک گمبھیر آواز بلند ہوئی پُروقار، پُر ہیبت ۔ بت

چوگان میں پڑے ہوئے تمام بتوں کی گردنوں میں حرکت ہوئی ۔ ایک مدہم سی سرگوشی گونجی ۔ بلند ہوتی گئی ۔ اور بلند اور بلند حتٰی کہ تمام گردوپیش گونجنے لگا ۔ بت بت ۔ بت بت

میں نے محسوس کیا کہ میرا نچلا دھڑ پتھر کا بنا جا رہا ہے ۔ آہستہ آہستہ پتھر اوپر کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا ۔

یہ کیا ہو رہا ہے میں نے گھبرا کر رابطہ افسر سے پوچھا ۔

وہ مسکرایا ۔ بولا ۔ تم نے خود فیصلہ سُنا دیا ہے ۔ تمہارے فیصلے پر عمل درآمد ہو رہا ہے ۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا ۔ کوئی نہیں روک سکتا ۔

عین اس وقت ایک مہیب آواز آئی جیسے بادل کڑکتا ہے ۔ سرگوشی بند ہو گئی ۔ سناٹا چھا گیا ۔ چھائے رہا چھائے رہا ۔ صدیاں بیت گئیں ۔ سارا ماحول سہما ہوا تھا بے حس و حرکت تھا ۔ خاموش ۔ منتظر ۔

پھر ایک پُرہیبت آواز آئی ۔

ہم نے بندے تخلیق کئے تھے ۔ لیکن وہ دیوتا بن بیٹھے

کیا ہمارے بندوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندہ بن کر جیا ہو ۔ ۔ ۔ بولو ۔ جواب دو ۔

جواب میں ایک گمبھیر سناٹا چھا گیا جو کائنات پر مسلّط و محیط ہو گیا ۔

....○. ....

سمے کا بندھن

سمے کا بندھن

فہرست

سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی : سنہرے ، سمے سمے کی بات ہوتی ہے ۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے ، اپنا اثر ہوتا ہے ۔ اپنا سمے پہچان ، سنہرے اپنے سمے سے باہر نہ نکل ۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی ۔

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات ۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی ، آلنے سے نہ گرتی ۔ سمجھ تو گئی ۔ پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی ۔ کہتی تھی : تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی ، کٹھالی میں پڑے بنا ۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی ۔

پتا نہیں میرا نام کیا تھا ۔ پتا نہیں میں کس کی تھی ، کہاں سے آئی تھی کوئی لایا تھا ۔ بالپن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا ۔ اسی کی گود میں پلی ۔ اسی کی سُر تال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی ۔ پھر سنہرا لڈ اُمڈ آیا چھپائے نہ چھپتا تھا آپی بولی : نہ دھیے ، چھپا نہ ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا ۔

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہے بیٹی ؟ سیانے کہتے ہیں ، جس کا کام اسی کو ساجھے ۔ تیرا کام دیکھنا نہیں ۔ دکھنا ہے ۔ تو نظر نہ بن ، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو تُو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ پھر سمے دیکھ سنہرے ابھی تو شام ہے یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے دکھ کا سمے ہے ۔ شام بھئی گھنشام نہ آئے ۔" آپی گنگنانے لگی "یاد ہے نا یہ بول ؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے تیرا آنے کا سمے ہے پگلی ذرا رک جا ۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے ۔ پھر تیرا ہی سمے ہو گا ۔ پچھلے پہر تک ۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا مجھے بلایا ۔ گئی ۔ لیٹی ہوئی تھی ۔ سرہانے

تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی ۔ ساتھ نمک دانی تھی ۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ٹھاکر کے کھلتا تھا ۔

بولی ”سنہرے ، بوتل کھول ، گلاس میں ڈال ۔ چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے ۔“ میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا بلبلے ہی بلبلے ۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑلیا ۔ بولی ”دیکھ لڑکی ، یہ ہمارا سمے ہے ۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اٹھے ۔ ہم میں نہیں دوجے میں اٹھے دوجے میں جھاگ اٹھانا یہی ہمارا کام ہے خود شانت، دوجا بلبلے ہی بلبلے ۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے ، ہمارا سمے ۔ جب کدوجا شانت ہو جائے ، سمجھ لے ہمارا سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا ٹھمک نہ کرنا ٹھمک کا سمے گیا ۔ چمک نہ مارنا ۔ چمک کا سمے گیا پایل نہ جھنکارنا ۔ پاپل جھنکار بیرن بھئی ۔

پھر وہ لیٹ گئی ۔ بولی ”سنہرے ، میری باتیں پھینک نہ دینا ۔ دل میں رکھنا یہ بھیتر کی باتیں ہیں ، اوپر کی نہیں ، سنی سنائی نہیں ، پڑھی پڑھائی نہیں ۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں ، بادام نہیں ہوتیں جان لے بیٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو گری ہو ۔ چھلکا نہ ہو ۔ جو بیتی ہو جگ بیتی نہیں ۔ آپ بیتی ہو ۔ ہڈ بیتی ۔ باقی سب جھوٹ ۔ دکھلاوا ۔ بہلاوا ۔“

آج مجھے باتیں یاد آرہی ہیں بیتی باتیں ۔ بسری باتیں ۔ سانپ گزر گئے ۔ لکیریں رہ گئیں ۔ لکیریں ہی لکیریں سانپ تو صرف ڈراتے ہیں پھنکارتے ہیں لکیریں کاٹتی ہیں ڈستی ہیں پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے چلتی ہیں چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے ۔ ایک ختم ہوتی ہے دوجی شروع ہو جاتی ہے ۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں: ہیلی ، رُوپہ اور میں ہیلی بڑی ، روپہ منجھلی اور میں چھوٹی ہیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا اس آن میں چھب تھی سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا یوں رعب سے بھری رہتی جیسے مٹیار رس سے بھری رہتی ہے گردن اٹھی رہتی مورتی سمان ۔

رُوپہ سُر ہی سُر تھی ۔ شدھ سُر تاروں سے بنی تھی اس کے بند بند میں

تار لگے تھے سرتیاں سمرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تبھی میں تھی آپی کہتی تھی : سنہرے ، تجھ میں دکھ کی بھیک ہے تو بھگو دیتی ہے ۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے پگلی دوجے کو ڈبویا کر ، خود نہ ڈوبا کر مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے ۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے ۔

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اٹھایا اور چلا آیا بیٹھک پر دَھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے ۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر ۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دَھن دولت کا زور نہ چلتا تھا ۔ نو دولتیے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں ۔ لڑکیو نہ اچھلنا جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی وہ سمجھ لو ، نظروں سے گر گئی پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی ۔

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے آواز چلتی تھی ۔ دل دھڑکتے تھے ۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین ۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی ۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا ۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی ۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا ۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ ۔ طاقت سے بھرا ہوا اندر جھانکو تو بچہ ۔ نرم نرم ، گرم گرم ۔ ویسے تھا آن بھرا مان بھرا ۔ سنگیت کا رسیا یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو ۔ دھونی رمی ہو ۔ آرتی سجی ہو ۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی ۔ آپی عزت کرتی تھی ۔ بھروسا کرتی تھی ۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی جھکائے رکھتا پیتا ضرور تھا ، پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا الٹا مدھم پڑتا جاتا ۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی آواز کی کڑک بھیگ جاتی ۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا ۔ جیسے بوتل کا نہ ہو ، بھیتر کا ہو بوتل اک

بہانہ ہو بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی ۔

"ڈرو سکھیوڈرو ۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو ۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ یوں ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو نیچ کھڑا ہو ۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے ۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے ۔ ڈرو سکھیو ڈرو بھیتر کے نشے سے ڈرو بوتل کا تو کام کاج جوگا نہیں چھوڑتا ۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا ۔ خود جوگا بھی نہیں مجھے کیا پتا تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا ۔"

ہاں تو اُس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی ۔ بول تھے "کانٹھری میں کون جتن کر کھولوں ۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی ری ۔" گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا ۔ پھر کہو ، پھر بولو کا جاپ کیے جا رہا تھا نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی ۔ اپنے من یا محبوب کے من کی سمے بیتا جا رہا تھا سمے کی سُدھ بُدھ نہ رہی تھی ۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں ۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا ۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے ۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی ۔ بولی "شما کرو ٹھاکر جی ۔ معافی مانگتی ہوں ۔ ہمارا سمے بیت گیا ۔ اب بیٹھک ختم کرو ۔"

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا ۔ "نہ آپی" وہ بولا "ابھی تو رات بھیگی ہے آپی بولی ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں ۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی ۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی رہا کیا ؟" ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں ۔ آپی نہ مانی ۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں ۔ "آپی یہ سمے کا گورکھ دھندا کیا ہے ؟"

آپی بولی "لڑکیوں سمے بڑی چیز ہے ۔ ہر کام کا الگ سمے بنا ہے ۔ رات کو گاؤ بجاؤ ۔ پیو پلاؤ ۔ ملو ملاؤ ۔ موج اڑاؤ ۔ تین بجے تک پھر بھور سمے اس کا سمے ہے اس کا نام جپو ۔ اسے پکارو فریاد کرو دعائیں مانگو سجدے کرو اس سمے میں تم عیش نہیں کر سکتے گناہ نہیں کر سکتے قتل نہیں کر سکتے یہ دھندا جو

ہمارا ہے اس کے سمے میں نہیں چل سکتا ۔ اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا ۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤگی ۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤگی اور دیکھو اس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے بھجن نہ چھیڑنا ۔ ڈرتے رہنا کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے ۔

پھر وہ دن آگیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا ۔ اُس روز ٹھاکر آئے ۔ آپی سے بولے "بائی کل خواجہ کا دن ہے ۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا ۔ آج رات خواجہ کی محفل ہوگی اُدھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ تجھے لینے آیا ہوں چل میرے ساتھ میرے گاؤں ۔

آپی سوچ میں پڑ گئی ۔ بولی "رُوپہ ماندی ہے وہ تو نہیں جا سکے گی ۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز ۔"

"خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں ۔" وہ بولا

"تو کسی اور منڈلی کو لے جا ۔"

"اونہوں ٹھاکر نے منہ بنا لیا "خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا ۔ ان کا نام لینے کے لائق مکھ تو ہو ۔"

"میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں ۔"

"بس اک تیری بیٹھک ہے بائی جہاں پوتر تا ہے ۔ جسم کا نہیں من کا ٹھکانا ہے ۔"

آپی مجبور ہوگئی۔ اس نے رُوپہ کا دھیان رکھنے کے لیے مہیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر وہاں حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں ، بہوئیں ، بیٹیاں ، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے ۔ وہ تو سمجھ لو بھجن منڈلی تھی "خواجہ میں تو آن کھڑی تو رے دوار" سے شروع ہوئی تھی ۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں ، دل ڈولے ۔ آپی کا ڈوب ہی گیا ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا، شربت شیرا پلانے کو پھر وہیں لٹا دیا ۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی ۔ آنکھیں پھر بھر آئیں ۔

میں حیران میں تو کچھ مانگ نہیں رہی میں تو التجا نہیں کر رہی میں تو اک تاجر ہوں پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں ۔ میری آنکھیں کیوں بھر بھر آئیں خواہ مخواہ ۔ سو میں بِنا سوچے سمجھے گائے چلی گئی ۔ آنکھیں بھر بھر آتی رہیں ۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا ۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی ۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں ۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی ۔

اور پھر مجھے کیا پتا تھا کہ خواجہ کون ہے ۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا ۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے ۔ میں تو غریب نہ تھی مجھے کیا پتا تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا ۔ خواہ مخواہ ، زبردستی ۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے ۔ کون گا رہا ہے کون منگتا ہے ۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے ۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں ، پر کوئی سنتا نہیں مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دیالو ہے اتنا نیڑے ہے اتنے کان کھڑے رکھتا ہے ۔

پھر ٹھاکر بولا "سنہری بائی ، بس اک آخری فرمائش : خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا ۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا ۔"

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی ایسی رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں محفل رنگ رنگ ہو گئی ۔ انگ انگ بھیگا ۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا ۔

گھر پہنچی تو گویا میں مَیں نہ تھی ۔ دل رویا رویا ۔ دھیان کھویا کھویا کسی بات میں چت نہ لگتا بیٹھک بے کانہ دِکھتی ۔ ساز میں طرب نہ رہا سارنگی روئے جاتی ۔ استاد نکو خاں بجاتے پر وہ روئے جاتی ۔ طبلہ پیٹتا ۔ گھنگرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بَن کو نکل جا وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے ۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ کہہ بھیں بھیں کر کے روتی ۔ پھر حال کھیلنے لگتی ۔ ہیلی حیران ، رُوپہ کا مُنہ کھلا ، آپی چپ یہ کیا ہو رہا

ہے جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی : بس پُتر، تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا ۔ دانا پانی ختم ہو گیا ۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا ۔ اس نے تجھے رنگ دیا ۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی ۔

"پر کہاں جاؤں آپی ؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے ۔"

"جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا" روپ بولی ۔

"اس بھیڑ میں جائے" آپی بولی "یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے ۔ نہیں ، یہ کہیں نہیں جائے گی ۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی ۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا ۔ رقت ختم ہو گئی ۔ دل میں اک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں ۔ ہو رہوں ۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں پنکھا کروں ۔ پاؤں دابوں سر میں تیل مالش کروں اس کے لیے پکاؤں ۔ میز لگاؤں ۔ برتن رکھوں اس کی بنیانیں دھوؤں کپڑے استری کروں آرسی کا کول بناؤں پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے کب پانی مانگے ۔

ایک دن آپی بولی "اب کیا حال ہے دھیے ؟" میں رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا ۔

بولی "وہ کون ہے ؟ کوئی نظر میں ہے کیا ؟"

"اونہوں ۔ کوئی نظر میں نہیں"

"ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی"

"نہیں آپی"

"کوئی بات نہیں" وہ بولی "جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا ۔"

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا ۔ آپی داخل ہوئی بولی "خواجہ نے کھونٹی بھیج دی ۔ اب بول کیا کہتی ہے ؟"

"کون ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"کوئی زمیندار ہے ۔ ادھیڑ عمر کا ہے کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا سنہری بائی کو سنا تھا جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے ۔ دل کو بہت سمجھایا ۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے ۔ کوئی پیش نہیں گئی ۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں ۔ بول تو کیا کہتی ہے منہ مانگا دوں گا ۔ چاہے ایک مہینے کے لیے دیدے ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے بخش دے جیسے تیری مرضی" آپی ہنسنے لگی ۔ بولی "چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر ۔"

"اونہوں" میں نے سر ہلا دیا "نہیں آپی انھوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے دیکھنے کا مطلب ؟"

"کتنی دیر کے لیے مانوں ؟"

"جیون بھر کے لیے ۔"

"سوچ لے ۔ جو اوباش نکلا تو ؟"

"پڑا نکلے ۔ کیسا بھی ہے جیسا بھی نکلے ۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہوگیا ۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا ۔ آپی نے رد کر دیا لوٹا دیا بولی "سودا نہیں کر رہی دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے سنبھال کر رکھیو ۔"

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو ۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا ۔ سازو سامان تھا ۔ آرائش تھی ۔ قالین بچھے ہوئے تھے صوفے لگے ہوئے تھے ۔ قد آدم آئنے جھاڑ فانوس سبھی کچھ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی ۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی ۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے ۔ اُسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے ، کہاں ہے ، کیوں ہے ۔

اوپر سے شام آ رہی تھی ۔ کونے کونے سے ٹکراتی ۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی ۔ یادوں کے دیے جلاتی بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی دبے پاؤں ۔

مدھم یوں جیسے پایل کی جھنکار پرنیا ہو۔

دُور اس کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نگاہیں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی، جو چھوٹی چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمین چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دُوجوں کا محتاج بنا لیا تھا کیوں؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی بڑی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھ رہتی ہے سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور پھر ٹوٹتی رات سمے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انھیں پیار ضرور آتا تھا۔ پَر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی

تھیں ۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے ۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی ۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی ۔ بول تیرا جیون کس کام آیا ؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی ، پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا ابجھے ابجھے خیال الجھاتے مجھے چمن سے اُکھیڑا بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اب اس درخت کو اُکھیڑ پھینکا ۔ بیل مٹی میں مل گئی ۔ اب یہ کس کے گرد گھومے ؟ بول میرا جیون کس کام آیا ؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے رُو برو کھڑا ہے ۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا ۔

"کیا ہے ؟" وہ بولی ۔

"میں ہوں پٹواری ، چھوٹی چودھرانی جی ۔"

"تُو جا ، جا کر بڑی چودھرانی سے مل مجھ سے تیرا کیا کام ؟"

"آپ ہی سے کام ہے" وہ بولا ۔

"تو بول کیا کہتا ہے ؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں ۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انھیں چند دن یہاں روکا جائے ۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں ۔"

"ٹھہرا دو" وہ بولی ۔

"تو کر جا کر بندوبست" وہ رک گیا ۔

"سب ہو جائے گا ۔"

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اسنے سرسری طور پر پوچھا "کہاں سے آئے ہیں ؟"

پٹواری بولا "اجمیر شریف سے آئے ہیں ۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں ۔" اک دھماکا ہوا چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں ۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا ۔ "جنت ، یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا ؟"

جنت بولی "لو چھوٹی چودھرانی وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا

ہے ۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں ۔ جو منھ سے کہتے ہیں ہو جاتا ہے ۔"

"تُو تیار ہو جا جنت ہم بھی جائیں گے ۔ تو اور میں ۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے ۔"

"تُو چل تو سہی" ۔ چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا "اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا ۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا کون ہے ؟ اندر سے آواز آئی ۔ جنت نے پھر دستک دی سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا ۔ جنت زبردستی اندر داخل ہوگئی پیچھے پیچھے چودھرانی تھی سفید ریش گھبرا گیا بولا "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے وہ اس کمرے میں مشغول ہیں ۔"

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے" چھوٹی چودھرانی بولی ۔

"تو پھر ؟" سفید ریش گھبرا گیا ۔

"ایک سوال پوچھنا ہے ۔" چودھرانی نے کہا ۔

"سائیں بابا اس سمے سوال کا جواب نہیں دیں گے ۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا انھوں نے پوچھنا ہے" وہ بولی ۔

"کس سے پوچھنا ہے ؟" خادم بولا

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں ۔" یہ سن کر سفید ریش خادم سن ہو کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔

"ان سے پوچھو" چھوٹی چودھرانی نے کہا "ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے : بے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا ؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہوگئی ۔

چھوٹی چودھرانی بولی "کہو وہ عورت پوچھتی ہے: تُو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا ۔ اسے بیل بنا کر ایک درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ ۔" وہ رک گئی کمرے کی خاموشی اور گہری ہوگئی "اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے بیل مٹی میں رل گئی ۔ وہ بیل پوچھتی ہے : بول میرا

جیون کس کام آیا ؟" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی ۔

"تیرا جیون کس کام آیا ۔ تیرا جیون کس کام آیا ۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے ۔ "تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا ؟" وہ رک گیا ۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہوگئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی ۔

"میری طرف دیکھ" سفید خادم نے کہا "سنہری بائی ، میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا مجھے نہیں پہچانتی ؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا ۔ میں کیا تھا کیا ہوگیا ۔"

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی "استاد جی ، آپ !" وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی ۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا ۔

"سنہری بی بی" وہ بولا "مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا۔"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا ۔ ٹھاکر" وہ چلائی ۔

ٹھاکر بولا "اب ہمیں پتا چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا ۔" اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا بولا "بی بی ، ہمیں آشیرباد دے ۔"

............○............

ساری بات

نہیں ، یہ ڈاکٹر نہیں سمجھے گا ۔ بات کرتی ہوں تو بڑ بڑ میری طرف دیکھتا رہتا ہے ۔ میری بات اسکی سمجھ میں نہیں آتی بار بار کہتی ہوں : ڈاکٹر مجھ پر خوف طاری ہے ۔ کوئی ایسی دوا دیجیے کہ یہ دور ہو جائے یا ٹینشن میں کمی آ جائے ۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتا ادھر میرے خوف کی طنابیں تو کستی ہی جا رہی ہیں ۔ روز بروز ایک ٹینشن ہے جکڑن جو بڑھتی ہی جا رہی ہے ۔ ڈاکٹر پوچھتا ہے : کوئی اِرریشنل فیئر ہے کیا ؟ لو! وہ تو لازماً اِرریشنل ہوگا ۔ ریشنل ہو تو کوئی بات ہی نہ ہو ۔ سانپ کو دیکھ کر ڈر جاؤں تو ٹھیک ہے ۔ ڈرنا ہی چاہیے ۔ لکیر کو دیکھ کر ڈروں تو ظاہر ہے کوئی گھنڈی ہے کہیں گرہ لگی ہے ۔ کوئی گم پھوڑا ہے تبھی تو مشورے کے لیے آئی ہوں ۔

مجھ سے پوچھتا ہے: کس بات کا خوف ہے ؟ کہتی ہوں : اس بات کا کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں ۔ اس پر وہ پوچھتا ہے : کیا بھول نہ جاؤ ؟ کہتی ہوں : یہ بھول نہ جاؤں کہ میں کون ہوں گھر میں میری کیا حیثیت ہے ۔ کیا مقام ہے اس پر وہ بالکل ہی کنفیوز ہو جاتا ہے ۔ کچھ دیر چپ رہتا ہے ، پھر کہتا ہے : ساری بات بتائیے ، بیگم صاحبہ ۔

اب میں اسے ساری بات کیسے بتاؤں ۔ چاہوں بھی تو نہیں بتا سکتی ۔ ساری بھلا کسی نے بتائی ہے کبھی ماں باپ نہیں بتاتے ۔ باپ تو خیر بالکل نہیں بتاتا ۔ ماں بھی آدھی بتاتی ہے سہیلیاں چاہے ساری بتا دیں ۔ پر وہ ساری نہیں ہوتی ۔ بتاتے ہوئے دو ایک گھنڈیاں بند کر لیتی ہیں ۔ دوسروں سے کہہ دینے کی بات چھوڑیے ساری بات تو ہم خود سے بھی نہیں کرتے پھر میں کیسے بتاؤں ، ڈاکٹر کو ساری بات ؟

حیران ہوں کہ ڈاکٹروں کے پاس خوف کی دوا بھی نہیں ہے ۔ آج کل

تو ساری بیماریاں ذہنی ہوتی ہیں ۔ خوف ہے انگزائٹی ہے ۔ بے چینی ہے ۔ کم خوابی ہے ۔

امی کو ڈوڈنیل السر ہوا تھا ۔ ڈاکٹر کہتا تھا : انگزائٹی کی وجہ سے ہے پھر اس نے علاج السر کا کیا ، انگزائٹی کا نہیں ۔ وہی بات ہوئی ، پیٹ میں درد ہو ، آنکھ میں سلائی لگا دی ۔

میرا یہ خوف سوہانِ رُوح ہو رہا ہے ۔ حال ہی کی پیداوار ہے ۔ شادی ہوئے دو سال تو ہوئے ہیں ۔ شادی سے پہلے کوئی خوف نہ تھا سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کے بعد خوف نے مجھے کیوں آجکڑا !

ڈاکٹر کہتا : یہ ماحول کی وجہ سے ہے ۔

شادی کے بعد تو میرا ماحول بالکل کشادہ ہوگیا ہے ۔ کوئی فکر نہیں ، کوئی پریشانی نہیں ، تنگی نہیں ، ترشی نہیں ۔ اتنا آرام تو کبھی مجھے نصیب نہ ہوا تھا ۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہ رہی ہوں ۔ میاں جان چھڑکتے ہیں ۔ دیکھے بغیر دم نکلتا ہے ۔ ہر وقت ہیرے پھیرے لیتے رہتے ہیں ۔ جو مانگوں ، حاضر ۔ جو چاہوں موجود ۔ میں تو یوں زندگی گزار رہی ہوں جیسے شیشے کے مرتبان میں اگا ہوا کنول ہو ۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں جو چاہوں کروں جیسے چاہوں جیوں ۔ سر پر نہ ساس ہے ، نہ سسر نہ بڑا ، نہ بزرگ ۔ گھر میں بس نوکر ہی نوکر ہیں ۔ مالی ہے چوکیدار ہے ۔ خانساماں ہے میڈ ہے اور ہم چاروں ہیں ملک فاروق ہیں میں ہوں اماں ہے ۔ جہاں آرا ہے ۔ اب آپ ہی بتائیے ، اتنے کیئر فری ماحول میں ڈر خوف کی گنجائش ہے کیا ؟ شادی سے پہلے البتہ کچھ کچھ انگزائٹی تھی ۔ امی کو زیادہ ، مجھے کم کم ۔ میں تو جب سے جوان ہوئی ہوں ، بے فکری میں ہی گزری ہے امی ابا کے یہاں میری حیثیت پھول مالا کی تھی ۔ ہر دم تازہ ، ہر وقت خوشبو امی ایک ایک پھول بڑی محنت سے پروتی تھی ۔ بڑے خیال سے پانی کے چھینٹے لگاتی تاکہ تازگی میں فرق نہ آئے ۔

امی کی بس ایک ہی خواہش تھی ۔ ایک ہی فکر میں گھلی جاتی تھی کہ کب کوئی سر نوائے اور پھول مالا اس کی گردن میں ڈال دے ۔ نہیں ، کوئی سا سر نہیں ۔۔۔۔۔ ایسا سر جس پر پہلے سے ہی دولت یا سٹیٹس کا تاج دھرا ہو ۔

کسی ایک سر کی بات ہوتی تو اتنا لمبا چکر نہ پڑتا ۔ پتا نہیں ان حالات میں کیا ہوتا ۔ بہر حال یہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا ۔

ساری عمر مجھے بنی سجی پلیٹ بن کر جینا پڑا ۔ امی کا یہی مطالبہ تھا کہ ہر وقت بنی سجی پلیٹ بن کر رہوں اور موقع آنے پر اس کے اشارے کی منتظر رہوں ۔ جوں ہی وہ اشارہ کرے ، خود کو پیش کردوں ۔ امی ہر وقت مجھے بناتی سجاتی رہتی پلیٹ پر پستے بادام لگاتی رہتی ۔ چاندی کے ورق سجاتی رہتی میری ہر بات پر کڑی نظر رکھتی یہ پہنو ، وہ نہ پہنو ۔ یوں پہنو ، یوں نہیں ۔ یوں اٹھو ، یوں بیٹھو ۔ یوں مسکراؤ ، یوں بات کرو ۔ یوں ڈرنکس سرو کرو ۔ یوں چائے بناؤ ۔ یوں پان پیش کرو یوں دیکھو ۔ یوں مسکاؤ ۔

ہم دو بہنیں تھیں ۔ میں اور رمنا ۔ میں بڑی تھی ۔ لہذا ساری توجہ مجھ پر مرکوز تھی ۔ دقت یہ تھی کہ ہم دونوں بہنوں میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ نظروں پر چڑھ جاتیں ، چونکاتیں یا توجہ طلب کرتیں ۔ عام سے خدو خال ، عام سا رنگ ، عام سے جسم ۔ جوانی آئی تو وہ بھی مدھم مدھم ۔ پتا ہی نہ چلا کہ آئی ہے ۔

جوانی کا بھی کسی نے بھید نہیں پایا کسی کو باہر کرتی ہے ، کسی کو اندر وہ میری سہیلی آئمہ تھی سوکھی چرمکھ یوں جوانی ٹوٹ کر آئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میلہ لگ گیا ۔ اتنی پھول پتیاں نکلیں کہ بوٹے سے چمن بن گئی ساری جوانی باہر ہی ڈھیر ہو گئی ۔ ایسی شہنائیاں بجیں کہ دور سے پتا لگتا تھا کہ جوانی آئی ہے ۔

پھر وہ نادرہ تھی ۔ باہر کچھ بھی نہ ہوا ، اندر ایسی چکریاں کہ ٹک کر بیٹھنا مشکل ہوگیا ۔ ایک بے چینی تھی کہ جینے نہیں دیتی تھی ۔ بے چاری کو قرار نہیں آتا تھا ۔ کچھ ایسی بھی ہیں جن کا اندر اور باہر دونوں رنگے جاتے ہیں ۔ باہر پھول کھل جاتے ہیں اندر لڈو پھوٹتے ہیں ۔

مجھے تو کچھ بھی نہ ہوا نہ باہر پھول کھلے ، نہ اندر لڈو پھوٹے ۔ اندر پھوار سی ضرور پڑی تھی ۔ باہر سوکھی کی سوکھی ہی رہی ۔ اس پر بے چاری امی کو السر کیوں نہ ہوتا بھلا ۔ انگزائٹی کی چکری کیوں نہ چلتی میرے متعلق جو منصوبے امی ابا نے بنائے تھے ، انہیں ذرا بھی تو بڑھاوا نہ ملا ۔

میرے ابا امی بڑے باخبر تھے ۔ پتا رکھتے تھے کہ اونچے حلقوں میں کون آیا ، کون گیا شرط یہ تھی کہ اونچے گریڈ کا ہو یا کاروباری ہو ۔ ہر نئے آنے والے کے کوائف کا انہیں علم ہوتا تھا ، خصوصاً جن کے گھر نوجوان بیٹے ہوں ۔ وہ بڑے اہتمام سے ہر نو وارد کے گھر سوشل وزٹ کرتے ۔ پہلی مرتبہ اکیلے جاتے دوسری بار مجھے ساتھ لے جاتے حالات ساز گار ہوتے تو کسی نہ کسی بہانے نوجوان بیٹے کو اپنے ہاں بلاتے اس روز امی کی خاص توجہ مجھ پر مرکوز ہوتی پلیٹ پر نئے پستے بادام لگائے جاتے ۔

کچھ دیر تو ڈرائنگ روم میں ہنس ہنس کر باتیں ہوتیں ، پھر دفعتاً امی ابو کو ایک ضروری کام یاد آ جاتا مجھ سے کہا جاتا "امنا ، ہم ابھی آئے تم ذرا آصف کے ساتھ کیرم بورڈ لگاؤ بھئی آصف کا دل لگائے رکھنا جب تک ہم لوٹیں ۔"

مجھے یاد ہے ، سب سے پہلے پیرزادہ کے گھر کنڈی ڈالی گئی ۔ کنڈی ڈال کر مسلسل ایک سال بیٹھے انتظار کرتے رہے ان کا بیٹا امجد اس قدر کتابی تھا کہ کھیل کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ جیتی جاگتی کتاب امی کاغذی کتاب سے زیادہ جاذب ہوتی ہے ، لیکن امجد کی ماں کے رشتہ داروں میں بہت سی لڑکیاں تھیں ۔ چند بہت ہی منظورِ نظر اِس لیے بات نہ بنی ۔

پھر خان صاحب سے رسم وراہ بڑھائی ۔ ان کا بیٹا سعید چل نکلا بڑا ملنسار تھا امی کی امیدیں بندھ گئیں لیکن جلد ہی والدین چوکنے ہوگئے بیٹے کو لگام ڈال دی بات واضح ہوگئی کہ وہ اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں ۔

پھر بٹ صاحب کو آزمایا لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ ان کا بیٹا منسوب ہے اور شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔

کنڈی ڈالنے کی جگہیں بار بار بدلی گئیں ۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے گئے بیڈ روم میں ان ڈور گیمز کی بازیاں لگیں ۔ کتابوں پر تبصرے کیے گئے ۔ سنیکس چلے چائے اور کافی کے پیالے چلے ۔ پاپ میوزک چلی پکنک کے پروگرام بنائے گئے کیا کچھ نہ ہُوا ، مگر کچھ بھی نہ ہوا بات جہاں دھری تھی ، وہیں دھری رہی صرف وقت ہاتھ سے نکلتا گیا عمر گزرتی گئی امی کی انگزائٹی بڑھتی گئی السر ابھرتا گیا یوں چھ سال گزر گئے گھر پر مایوسی کی فضا مسلط ہوتی گئی پھر دفعتاً

اندھیرے میں ایک نئی کرن پھوٹی ۔ ملک فاروق سے تعارف ہوگیا ۔ وہ خود ہمارے ہاں آگئے ۔

ملک فاروق بہت ہی خوش مزاج آدمی تھے اونچے ، لمبے ، گورے ، چٹے ، ملنسار ۔ اگرچہ پچاس کے ہوں گے ، لیکن طبیعت ایسی رنگین جیسے تیس کے ہوں ۔ گھر کا ماحول بھی بہت سازگار تھا ۔ بیوی فوت ہوچکی تھی ۔ بڑا بیٹا انجنیئرنگ کے آخری سال میں تھا ۔ اس کی چھوٹی بہن ۔ جہاں آرا بی ۔ اے میں تھی ۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا ملاپ اس قدر بڑھا کہ چھٹی کا دن یا تو ملک فیملی ہمارے ہاں گزارتی ، یا ہم ان کے ہاں چلے جاتے یا پکنک کے لیے کہیں باہر جا ڈیرا لگاتے ۔

ملک صاحب کا بیٹا امان بہت ہی پیارا ساتھی تھا ۔ اونچا لمبا ، خوش شکل اس کی بات میں مردانہ جھلک تھی ایک عجب شانِ بے نیازی ۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے آئیڈئل میں جان پڑگئی ہو سچی بات یہ ہے کہ امان کو دیکھ کر میرے تو پر بھیگ گئے ۔ امی کے اشاروں پر میں نے کئی ایک نوجوانوں سے رابطہ پیدا کیا تھا ، لیکن خود کبھی انوالو نہیں ہوئی تھی ۔ کنڈی ضرور ڈالی تھی ، لیکن خود کیچوا نہ بنی تھی ۔

امان میں بیک وقت بے تکلفی بھی تھی ، بے نیازی بھی ۔ وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا ، بحثیں کرتا ، گیم کھیلتا ، پاپ میوزک سنتا ، چائے پیتا ، لیکن اسے کبھی احساس نہ ہوا تھا کہ پاس ایک لڑکی بیٹھی ہے یہ بات مجھے بہت کھلتی تھی ۔

اس کے برعکس بڑے ملک صاحب بڑے ہی رنگیلے تھے ۔ مجھ سے بہت مانوس تھے زبردستی پاس بیٹھا لیتے ۔ اپنے پرانے قصے سناتے ۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ۔ آنکھ میں چمک لہراتی ، بڑی زوردار ، بڑی متکلم ۔ میں تو گھبرا جاتی ۔ ملک فیملی سے میل جول کے بعد امی کی نگاہ میں امید کی کرن روشن ہوگئی ۔ ان کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں ۔ ان میں منت تھی ، بے بسی بھری منت ، التجا "اب اس کشتی کی تو ہی کھویا ہے ۔ پتوار تیرے ہاتھ میں ہے ۔"

امی کی نگاہوں میں اتنی التجا تھی کہ میں نے وہ قدم اٹھا لیا جو شاید کبھی نہ اٹھاتی ۔ اس رات ہم امان کے بیڈ روم میں بیٹھے مناپلی کھیل رہے تھے ، امان ، جہاں آرا اور میں ۔ گھڑی نے نو بجا دیے میں چونکی "بہت دیر ہو گئی ۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی ۔ جہاں آرا ، ذرا امی کو فون تو کر دے کہ ڈرائیور کو بھیج دیں ۔" جہاں آرا اٹھ کر چلی گئی ۔ میں اور امان اکیلے رہ گئے اور میں نے وہ قدم اٹھا لیا ۔ بھرپور انگڑائی لی ۔ میں تو تھک گئی ، کہہ کر اپنا سر امان کی گود میں رکھ دیا ۔

اس نے میرا سر نیچے پٹخ دیا تڑپ کر اٹھا "میں کیا سرہانہ ہوں ؟ اس کی آواز میں غصہ تھا پھر وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا مجھے مخاطب کر کے بولا "آئینہ دیکھا ہے کبھی ؟"

اس کے اس فقرے نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا جیسے میرے منہ پر تھوک دیا ہو ۔ اندر بھڑوں کا ایک چھتا چھڑ گیا دیوانہ وار میں کمرے سے باہر نکل آئی ۔ فون کی طرف بھاگی میرا جی چاہتا تھا کہ توڑ پھوڑ کر رکھ دوں ۔ انتقام ، انتقام ۔ دفعتاً میں رک گئی سامنے بڑے ملک فاروق کا بیڈ روم تھا میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی ۔

نہیں ڈاکٹر میری بات نہیں سمجھے گا ۔

پوچھتا ہے : کیسا خوف ؟ کہتی ہوں : اس بات کا کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں کہ میں کون ہوں گھر میں میری کیا حیثیت ہے ، کیا مقام ہے اس پر وہ کنفیوز ہو جاتا ہے پھر کہتا ہے : بیگم فاروق ، ساری بات بتائیے اب میں اسے ساری بات کیسے بتاؤں ؟

............○............

چِٹ کپڑی

دو سال کے بعد فرید آباد آیا تھا ۔ ائیر پورٹ پر اترتے ہی میں نے محسوس کیاکہ فرید آباد میں بہت تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں ٹیکسی والے کو میں نے ایلیٹ ہوٹل میں جانے کو کہا ۔ دو سال پہلے بھی میں ایلیٹ ہوٹل میں ٹھہرا تھا مجھے کسی اور ہوٹل کا علم نہ تھا ۔

اتفاق سے ایلیٹ ہوٹل میں وہی کمرا مل گیا جہاں میں پہلے ٹھہرا تھا ۔ پرانی یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں مجھے راحیل راؤ یاد آگیا ۔

راحیل راؤ میرا پہلا پیشنٹ تھا ۔ اس زمانے میں مَیں امریکہ سے تحصیل علم کرنے کے بعد وطن واپس آیا تھا ۔ ابھی باقاعدہ پریکٹس شروع نہیں کی تھی کلینک کی تیاریوں میں مصروف تھا ۔ اسی سلسلے میں فرید آباد آنا ہوا تھا ۔

ہوٹل میں جب مجھے راؤ کا فون آیا تھا تو میں بہت حیران ہوا تھا کوئی شخص کہہ رہا تھا : ڈاکٹر صاحب میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں ۔ کیس بے حد اہم ہے ۔ فوری توجہ نہ ملی تو پتا نہیں ، کیا ہوگا ۔

اس فون پر میں حیران ہوا کہ اسے کیسے پتا چل گیا کہ میں تحلیلِ نفسی کا ڈاکٹر ہوں اور ایلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہوں ۔

بہرحال ، میں نے مسٹر راؤ کو بلا لیا تھا ۔

مسٹر راؤ ماڈ قسم کا نوجوان تھا ۔ تیس پنتیس کے درمیان ۔ پڑھا لکھا ۔ کھاتا پیتا کلچرڈ گھرانا رکھ رکھاؤ کا دلدادہ ۔ ایک بات عجیب تھی ۔ حرکت کا دلدادہ ہونے کے باوجود اس میں توازن کی اہلیت نمایاں تھی ۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ ، تفکر یا پریشانی کا عنصر مفقود تھا ۔

کرسی پر بیٹھتے ہی وہ بولا "ڈاکٹر ، میں سخت ڈسٹرس میں ہوں مجھے اس مشکل سے نجات دلائیے ۔ ورنہ ۔۔۔۔۔ ورنہ پتا نہیں کیا کر بیٹھوں ۔"

"کیس کیا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔
"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ محبت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟"
محبت کانام سن کر میرا ذہنی تناؤ ختم ہوگیا ۔ "محبت تو کوئی بڑی مشکل نہیں ۔ مغرب میں تو محبت کامفہوم جنسی ملاپ ہوتا ہے ، یا توجہ طلبی کا جنون ، اور بس ۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے کہا ۔
"میرا مطلب ہے ، کیا آپ محبت کو صحت مند جذبہ سمجھتے ہیں یا بیماری ؟"

"کچھ کہ نہیں سکتا ، جب تک آپ کوائف بیان نہ کریں ۔"
"ڈاکٹر صاحب ، میری پرابلم محبت نہیں" وہ بولا "محبت کو ہم لوگ پرابلم نہیں سمجھتے ۔ میری مشکل یہ ہے کہ مجھے بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت ہے ۔"

میرے دل میں کیس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہوگئی ۔ مغرب میں تو بیک وقت چا چار افئیرز چلتے ہیں ۔ کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی ۔ پھر دفعتاً مجھے خیال آیاکہ شاید سنس آف گلٹ نے گڑ بڑ کر رکھی ہو ۔ مشرق میں ایک لڑکی سے محبت کرنا قابل تحسین فعل سمجھا جاتا ہے ، لیکن بیک وقت دو لڑکیوں سے محبت کرنا قابل نفرین بات ہے ۔

"ہاں ہاں" میں نے مسٹر راؤ سے کہا "آپ پورے کوائف بیان کرتے جائیے رکیے نہیں"۔

"اور وہ دونوں لڑکیاں ایک دوسری کی ضد ہیں ، ڈاکٹر" وہ بولا "ایک مدھم ، نمی نمی ۔ دوسری شوخ بھڑک کر جلنے والی ۔ ایک سحر ، دوسری دوپہر ۔ ایک گونگی ، دوسری قینچی ۔ ایک سکون ، دوسری ہلچل ۔ ایک میٹھی ، دوسری مرچیلی" وہ جذباتی ہوگیا ۔

"ہوں ۔۔۔۔۔۔ ان دونوں کا آپ کی طرف رد عمل کیا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"پازٹیو ، ڈاکٹر" وہ بولا "دونوں ہی مجھے میسر ہیں ۔"
"اچھا ! وہ کیسے ؟" میں نے پوچھا ۔

"ایک میری بیوی ہے" وہ بولا "دوسری میری سیکرٹری ہے۔"

"اوہ!" میں چونکا "پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔"

"ہے ڈاکٹر، ہے" وہ بولا "ہے"۔

"سنس آف گلٹ ہی ہو سکتی ہے۔"

"وہ بھی ہے، ڈاکٹر۔ مجھے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ انھیں میری ذہنی کیفیت کا علم نہ ہو جائے۔ اگر ہو گیا تو مشکل پڑ جائے گی۔ دونوں ہی خود دار لڑکیاں ہیں۔"

"کیا انہیں ایک دوسری کے بارے میں علم نہیں؟"

"نہیں ڈاکٹر۔ میری بیوی امنا کو شک ہے، اور سیکرٹری مونا سمجھتی ہے کہ بیوی سے میرا رسمی رشتہ ہے۔ محبت صرف اسی سے ہے پھر بھی کبھی کبھار مونا کو بھی شک پڑ جاتا ہے۔"

"وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"وجہ میں خود ہوں" وہ بولا "ڈاکٹر، اپنی زندگی کی سب سے بڑی مشکل میں خود ہوں۔"

"حیرت ہے!" میں نے کہا "کیا آپ بات چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتے؟"

"بہت، ڈاکٹر بہت اہلیت رکھتا ہوں۔ لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں خود اپنا راز اچھال دیتا ہوں۔ میں سمجھاتا ہوں آپ کو" وہ جوش میں بولا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ جب میں مونا کے پاس ہوتا ہوں تو میرے دل میں امنا کی آرزو اُبھرتی ہے۔ ابھرے جاتی ہے اس قدر مسلط ہو جاتی ہے کہ مونا پورے طور پر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ امنا آموجود ہوتی ہے۔ اسی طرح جب میں امنا کے ساتھ ہوتا ہوں تو امنا فیڈ ہو جاتی ہے اور مونا آموجود ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، یہ اتنا بڑا آپٹیکل الیوژن ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جیسے سراب ہوتا ہے آپ اسے نہیں سمجھ سکتے، ڈاکٹر، نہیں سمجھ سکتے" وہ جوش میں بولا" اس سے بڑی مشکلات پیدا ہوتی ہیں، بڑی مشکلات۔ ذرا سوچیے ڈاکٹر تکلیے میں امنا کے ساتھ ہوتا ہوں تو میرے رو برو مونا ہوتی ہے اور میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہ

فریب خیال ہے مثلاً امنا کے بال لمبے ہیں ، سیدھے ہیں ، سنہرے ہیں ۔ مونا کے گھنگھریالے ہیں ، بھور کالے ہیں ، کٹے ہوئے ہیں ۔ کئی بار میں امنا سے کہتے کہتے رک جاتا ہوں : ڈارلنگ اب کی بار تمہارا ہیئر کٹ بڑا سٹائلش رہا ۔"

مجھے راؤ کی مشکل کا احساس ہونے لگا لیکن وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہا تھا:

"مثلاً امنا چٹ کپڑی ہے ۔ چٹ کپڑی آپ جانتے ہیں ، ڈاکٹر ؟ اونہوں ! آپ نہیں جانتے ۔ چٹ کپڑی سے اللہ محفوظ رکھے ، ڈاکٹر ۔ وہ سفید کپڑے پہنتی ہے بظاہر سادہ سجاوٹ سے بے نیاز میک اپ سے بے نیاز ویسے میک اپ ہوتا ہے دکھتا نہیں اہتمام ہوتا ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے سجاوٹ کا شعور ہی نہ ہو معصومیت ہی معصومیت ۔ مائی گاڈ !" اس نے جھرجھری لی "ڈاکٹر صاحب" وہ بولا "میری بیوی امنا چٹ کپڑی ہے اور مونا رنگیلی ہے رنگ رنگیلی ۔ رنگ اس کی کمزوری ہے ۔ گالوں پر رنگ ، ہونٹوں پر رنگ ، ناخنوں پر رنگ ۔ کپڑے تو رنگ میں یوں یوں ڈوبے ہوتے ہیں جیسے للاری کی دکان ہو اگرچہ ان میں غضب کی ہم رنگی ہوتی ہے ۔ یوں رنگ سے رنگ نکلتا ہے جیسے محفل میں بات سے بات نکلتی ہے ۔ مونا کو سبز رنگ بہت پیارا ہے ۔ ڈاکٹر ، ایک روز جب میں امنا کے پاس تھا ، لیکن تخیل میں نیچے سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا ، میں نے کہا : ڈارلنگ ، آج ساون میں پپیہا نہیں بول رہا ۔" یہ سن کر وہ دیر تک خاموش رہی پھر بولی : ہاں ، ساون کے اندھے کو ہرا ہی دکھتا ہے ۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔

"اسی طرح ایک روز جب تخلیہ سرسبز تھا ، لیکن تخیل دودھیا تو میں نے کہا : پیاری تم تو بھور سے ہو ۔ اس پر سبزے کی بساط الٹ گئی ۔ مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ سامنے مونا کھڑی ہے منہ سوجا ہوا ، آنکھیں شعلہ بار ۔ بولی : چٹ کپڑی اس حد تک مسلط ہے ؟

"حالانکہ میں بہت احتیاط کرتا ہوں ، ڈاکٹر ، لیکن ایسی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں ۔ پھر شکوک پھن اٹھاتے ہیں ۔ تخیل کو قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہیں ، ڈاکٹر ۔ اکثر شراب سیخ پر اور کباب شیشے میں ٹھونستا رہتا ہوں ۔ مجھے ڈر

ہے کہ کسی روز دونوں بساطیں اُلٹ جائیں گی ۔ نہ سبزہ رہے گا نہ بھور سے ۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوگا ، ڈاکٹر ؟ میرے لیے تو جینا بھی مشکل ہو جائے گا ۔"

عجیب کیس تھا راحیل راؤ کا !

اب کی بار میں فرید آباد پروفیشنل دورے پر آیا تھا ۔ میری آمد کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی تھی ۔ میرے پاس صرف ڈیڑھ ایک گھنٹہ تھا اس کے بعد وہی اپوائنٹمنٹس اور مریضوں کے ساتھ سٹنگز ۔ مریضوں کے آنے سے پہلے میں تیاری میں مصروف تھا ۔ لیکن دقت یہ تھی کہ پرانی یادیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں ۔ راؤ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنی رام کہانی سنائے جا رہا تھا ۔

پرانی یادوں سے جان چھڑانے کے لیے میں باتھ روم میں گھس گیا ، خود کو جھنجھوڑا ، منہ ہاتھ دھویا ، کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا ۔

عین اس وقت دروازہ کھلا اور راؤ اندر داخل ہوا ۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ وہ وہیں دروازے میں رک گیا ، اور بڑے غمناک لہجے میں بولا "ڈاکٹر ، دی گیم از اوور جس کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا ۔"

"کیا ہوا ؟" میں نے پوچھا ۔

"بتانا بے کار ہے ، ڈاکٹر اب کچھ نہیں ہوسکتا ، کچھ نہیں ۔ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں ۔"

"لیکن کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔

"پردہ اٹھ گیا ۔ بات کھل کر سامنے آگئی ۔" یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگا۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا ۔

"کچھ تو بتاؤ" میں نے کہا ۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری ۔ بولا "تقریباً پندرہ دن ہوئے ہیں ، میرا برتھ ڈے تھا ۔ میں نے دونوں کے لیے تحفے خریدے ۔ امنا کے لیے سفید آویزے ہیرے کے ، مونا کے لیے سبز زمرد کے لیکن وہی غلطی کر بیٹھا ۔ ہیرا مونا کو دے دیا ، زمرد امنا کو ۔"

"پھر ؟" میں نے پوچھا ۔

"دفتر گیا تو میز پر مونا کا استعفیٰ پڑا تھا ۔ گھر گیا تو امنا کا رقعہ دھرا تھا : میں میکے جا رہی ہوں ۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں ۔" یہ کہہ کر راؤ بولا "ڈاکٹر صاحب اس وقت میری حالت اچھی نہیں ۔ میں پھر آؤں گا ۔"

راؤ کے جانے کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ میں نے چونکا اٹھایا ۔ کوئی خاتون بول رہی تھی "ڈاکٹر ، میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں ۔ ابھی آجاؤں کیا ؟"

"آجائیے" میں نے کہا ۔

کچھ دیر بعد خاتون کمرے میں داخل ہوئی میں اسے دیکھ کر بھونچکارہ گیا ۔ وہ بڑی حسین و جمیل عورت تھی ۔ اس کا حسن منفرد تھا ۔ اس میں شوخی نہیں تھی ۔ بے چینی نہیں تھی ۔ وہ حسن جو قیام میں پیدا ہوتا ہے ، حرکت میں نہیں ۔ ہر حرکت کے دوران وہ چند ایک قیام پیدا کرتی جیسے متحرک تصویر میں اچانک ایک سٹل آجائے ۔ اس کا ہر قیام پوز پیدا کرتا ۔ ایک تصویر بن جاتی ۔ نئے قیام ۔ انوکھے فریم ۔ ایسے لگتا جیسے اسے اپنے ہر قیام کی جاذبیت کا شعور ہو ، لیکن اس کے انداز میں نمائشی عنصر نہ تھا ۔ سادہ ، نیچرل ، ٹھہراؤ سے بھرپور ۔

"تشریف رکھیے" میں نے کیس ہسٹری رجسٹر کھولتے ہوئے کہا ۔

وہ بیٹھ گئی ۔

"آپ کا نام؟" میں نے کیس کے کوائف لکھنے کے لیے پوچھا ۔

"مسز راؤ" وہ بولی ۔

"راؤ!" میں چونکا ۔

"راحیل راؤ" وہ بولی ۔

میں نے اس کا ازسرِ نو جائزہ لیا ۔ اس کے بال لمبے تھے ۔ سیدھے تھے اور وہ واقعی چٹ کپڑی تھی ۔

"کیا پرابلم ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"میں اپنے محبوب کی توجہ سے محروم ہو چکی ہوں ، ڈاکٹر ۔۔۔۔"

"کون محبوب ہے ، آپ کا ؟"

"میرا شوہر" وہ بولی

"شادی کب ہوئی تھی ؟"

"تقریباً پانچ سال ہوئے ۔"

"پہلے توجہ حاصل تھی کیا ؟"

"بہت" وہ بولی "پانچ برس شوہر نے مجھے آنکھوں پر بٹھائے رکھا ۔ اتنی توجہ دی کہ کسی مرد نے کسی عورت کو نہ دی ہوگی ۔"

"اب کیا کوئی اور عورت ۔۔۔۔۔؟"

اس نے سر نفی میں ہلا دیا "راؤ کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آئی ، بلکہ ایک عورت جو پہلے اس کی توجہ میں تھی ، اب نہیں رہی ۔"

"جب وہ تھی تو توجہ آپ پر مرکوز تھی ۔ اب وہ نہیں رہی تو آپ توجہ سے محروم ہوگئی ہیں عجیب بات ہے ۔"

"جی" وہ بولی ۔

"الٹی سی بات ہے ۔"

"بالکل الٹی" وہ مسکرائی ۔

"جب وہ تھی تو اس کے وجود کا آپ کو علم تھا ؟"

"شک سا تھا ۔ یقین نہیں آتا تھا ۔"

"کوائف کیا ہیں ؟"

"عجیب سے کوائف تھے ، ڈاکٹر" وہ بولی "سارا دن راؤ مجھے آنکھوں پر بٹھائے رہتے ۔ میری ہر حرکت پر یوں حیرت سے میری طرف دیکھتے جیسے مجھ میں کوئی نیا گن دریافت کیا ہو ۔ اکثر مجھ سے کہتے : امنا ، یہ پوز جو تم نے ابھی ابھی بنایا تھا ، پھر بناؤ نا" وہ مسکرائی کچھ دیر کے لیے رکی ۔ اس کی آنکھوں میں تارے پھوٹ رہے تھے ۔ پھر وہ بولی "جب وہ میرے ساتھ تخلیے میں ہوتے تو رنگ ہی بدل جاتا ۔ وہ کھو جاتے ۔ حتیٰ کہ انھیں شعور ہی نہ رہتا کہ وہ میرے پاس ہیں ۔ اس قدر بیگانہ ہو جاتے جیسے جیسے" ۔ اس کی آواز بھرا گئی ۔

"عجیب سا کیس ہے !" میں نے مدھم آواز میں کہا ۔

"ڈاکٹر" وہ بولی "میرے لیے محبت ایک ماحول ہے ، توجہ بھرا ماحول ایک ساتھ ہے ۔ قرب ہے لیکن اس میں تخلیہ اہم نہیں تخلیے کی آرزو نہیں صرف گوارا ہے ۔"

"میں سمجھتا ہوں" میں نے کہا "کیا آپ کے شوہر کے لئے تخلیہ اہم ہے ؟"

"ہاں" وہ سوچ کر بولی "خاصا اہم ہے ۔"

"کیا اسی وجہ سے آپ کے خاوند نے دوسری خاتون سے تعلقات پیدا کیے تھے ؟ میرا مطلب ہے شاید انھوں نے سوچا ہو کہ توجہ آپ کی ، تخلیہ اُس کا ۔"

"شاید" وہ مسکرائی "وہ عورت یقیناً تخلیہ پسند تھی ۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ راؤ کے تعلقات ایک اور خاتون سے بھی ہیں ؟"

"مجھے ڈاکٹر شوکت نے بتایا تھا ۔ دراصل میرے شوہر سے ایک ایسی بات سرزد ہوگئی جس سے میرا شک بہت تقویت پکڑ گیا اور میں اس سے روٹھ کر ماں باپ کے گھر چلی گئی ایک رقعہ چھوڑ آئی ۔ لکھا تھا : مجھے پتا چل گیا ہے ۔ میں واپس نہیں آؤں گی ۔ آپ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کریں ۔"

"اس کے بعد راؤ نے ڈاکٹر شوکت کو سب کچھ بتا دیا ؟" میں نے پوچھا ۔

"ڈاکٹر شوکت مجھ سے ملے ۔ انھوں نے راؤ کا بھید مجھے بتا دیا اور کہا کہ راؤ کی حالت اچھی نہیں ۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ ممکن ہے خودکشی کی کوشش کرے یہ سن کر میں ڈر گئی اور واپس آگئی ۔ چونکہ مجھے راؤ سے بے پناہ محبت ہے ، میرے لیے ان سے دور رہنا بے حد مشکل ہے ۔ ڈاکٹر میں یہاں آئی تو پتا چلا کہ راؤ کی سیکرٹری بھی استعفیٰ دے کر جاچکی ہے ۔"

"اس بات پر آپ کو بہت خوشی ہوئی ہوگی ؟"

"بالکل نہیں ، ڈاکٹر" وہ بولی "بالکل نہیں ۔ الٹا میں سخت گھبرا گئی ۔ راؤ کا بھید جاننے کے بعد میں مونا کی اہمیت کو پورے طور پر سمجھ چکی تھی ۔"

"راؤ کا کیا بھید تھا ؟" میں نے انجان بن کر پوچھا ۔

وہ جھینپ گئی ۔ چند ایک ساعت بعد بولی "جب راؤ تخلیے میں پاس ہوتے تو وہ تخیل میں سمجھتے کہ مونا کے پاس ہیں ۔ جب مونا کے پاس ہوتے تو تخیل میں مجھے دیکھتے ۔۔۔۔۔ یہ جان کر میں نے سمجھا کہ مونا کا ہونا سخت ضروری ہے میں نے مونا کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی ۔ سارا گلبرگ چھان مارا ۔"

"لیکن کیوں ؟" میں پوچھا ۔

"اس لیے کہ مونا کے چلے جانے کے بعد راؤ کے تخیل میں مونا ہی مونا رہ گئی تھی ۔ میں معدوم ہوچکی تھی ۔ اس لیے خود کو پھر سے قائم کرنے کے لیے مونا کو واپس لانا ضروری تھا ۔"

"تو کیا مونا مل گئی ؟"

"ہاں ، مل گئی گلبرگ کے ایک ایسے گھر میں ملی جس کی ریپوٹیشن اچھی نہ تھی میں نے بڑی مشکل سے اسے واپس آنے پر رضامند کر لیا ، لیکن بد قسمتی سے جب وہ کار میں یہاں آرہی تھی تو ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ جانبر نہ ہو سکی ۔"

"کیا راؤ کو اس کا علم ہے ؟"

"ہاں ، علم ہے" وہ بولی "لیکن اس کے باوجود مونا اس کے تخیل پر سوار ہے وہ مر کر راؤ کے تخیل پر چھا چکی ہے اور میں ان کی توجہ سے معدوم ہو چکی ہوں ، محروم ہو چکی ہوں ۔"

"ہوں !" میں نے کہا "لیکن اب آپ چاہتی کیا ہیں ؟"

"میں جینا چاہتی ہوں ، ڈاکٹر ۔ ان کی توجہ میرے لیے زندگی ہے" وہ بولی "راؤ کی توجہ کے بغیر میں جی نہیں سکتی ۔ کیا آپ راؤ کا علاج کریں گے ؟ ان کی توجہ لوٹ آئے ۔ ہم سٹنگز کے لیے لاہور آجائیں گے ۔" کچھ دیر وہ میری طرف دیکھتی رہی ۔

"اس کی ضرورت نہیں" میں نے کہا ۔

"کیا آپ کچھ نہیں کر سکتے ؟" اس نے حسرت بھرے انداز میں مجھ سے اپیل کی ۔

"میں نہیں، آپ کر سکتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں، آپ" میں نے جواب دیا "راؤ کے لیے آپ ایک نئی سیکرٹری نہیں ڈھونڈ سکتی کیا؟"

"نئی سیکرٹری؟" اس نے دہرایا۔

"جو تخلیے کی شوقین ہو" میں نے کہا "گلبرگ کے اسی گھر کی کوئی لڑکی جہاں مونا ملی تھی۔ راؤ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یہی ایک طریقہ ہے۔"

"کوئی ایک مونا؟" وہ چیخی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا "ہاں، کوئی ایک مونا۔"

وہ ایک جاذب نگاہ پوز میں کھڑی تھی۔ چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں مدھ بھری پھوار اڑ رہی تھی!

............○............

چِلکٹ گاڑی ، ہونکتا ہُوٹر اور موم بتّی

لاحول ولا قوۃ ۔ کتنی بے معنی خبر ہے ۔ میں نے غصے میں اخبار اٹھا کر پرے پھینک دیا ۔ بھلا ماننے کی بات ہے کیا کہ کہانی اس قدر پُراثر ہو کہ سننے والوں کو فساد پر آمادہ کر دے ۔ میں نہیں مانتا میں نے چلّا کر کہا ۔

ایسے ہی من گھڑت خبریں چھاپ دیتے ہیں ۔ بھئی میں خود کہانیاں لکھتا ہوں ۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزاری ہے ۔ ادبی انجمنیں شاہد ہیں کہ میری کوئی کہانی کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ۔ ایمان سے ، لوگ سنتے ہیں ، اوئے اوئے کرکے خاموش ہو جاتے ہیں ۔ کبھی کبھار انجانے میں واہ بھی کر دیتے ہیں ۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آکر تنقید کی چمٹیاں ، قینچیاں ، چھریاں نکال لیتے ہیں اور پھر چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں ، کہانی کو کم ، لکھنے والے کو زیادہ ۔

اس روز صبح سویرے سے میں اخبار لیے بیٹھا تھا ۔ سب سے پہلے یہی خبر نظر آئی تھی کہ مزدور شٹل میں کسی بڑے میاں نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر سبھی مشتعل ہو گئے ۔ فساد برپا ہوگیا ۔ دو مارے گئے ، پانچ زخمی ہو گئے ۔ آپ کہیں گے اتنی غیر اہم خبر میری نگاہ پر کیسے چڑھی ۔ آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں صرف غیر اہم خبریں پڑھا کرتا ہوں ۔ اخبار پڑھنا بھی مجھے میرے دوست ابنِ انشا نے سکھایا تھا ۔ کہنے لگا ”مفتی ، سچی اور عوامی خبریں پڑھنا چاہتے ہو تو غیر اہم خبریں پڑھو ۔ اس لیے اخبار کو الٹی طرف سے کھولو جہاں غیر اہم خبریں ہوتی ہیں ۔ اہم خبریں کبھی سچی نہیں ہوتیں جن مسائل سے بڑوں کی غرض و غایت وابستہ ہو ، نہ وہ سچی ہو سکتی ہیں نہ عوامی لہٰذا عوام سے متعلق خبریں پڑھو جو اخبار میں غیر اہم صفحات پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں ۔ مثلاً فلاں خاتون کے گھر دو سروں والا بچہ پیدا ہوا ۔ فلاں گھر میں جنات کی خشت باری ابھی تک جاری ہے ۔ راہ چلتے نوجوان نے خاتون کو آنکھ ماری اور پکڑا گیا ۔ ایسی

خبریں ۔"

اس روز اخبار میں خبر پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا ۔ ممکن ہے یہ درست ہو ۔ بھلا غیر سیاسی خبر میں جھوٹ ملانے کی کیا ضرورت تھی ۔ جوں جوں میں سوچتا گیا توں توں شکوک پیدا ہوتے گئے ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کہانی اس قدر پُراثر ہو کہ فساد پر آمادہ کر دے ۔

پھر خیال آتا ، آخر ادبی محفل میں بھی تو کہانی سننے والے آستین چڑھا کر بات کرتے ہیں اور میز پر مکے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ اس لحاظ سے تو خبر درست ہو سکتی ہے پھر خیال آتا ، نہیں ، یہ نہیں ہو سکتا ۔ ادبی محفل میں تو پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں ۔ ہر کسی نے تنقید پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رکھی ہوتی ہے ، لہذا وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور علم کا مظاہرہ دوسرے کی بات رد کرنے میں ہی ہوتا ہے ، سپورٹ کرنے میں نہیں پھر یہ بھی ہے کہ ادبی محفل کا بال واحد جگہ ہے جہاں ادیب کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے ۔ باہر سیاستیے بولنے نہیں دیتے ، گھر میں بیوی ۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ معترض کا مقصد کہانی پر بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی ادبی صلاحیتیں چھانٹنا ہوتا ہے ۔ مزدور نقاد تھوڑا ہی ہوتے ہیں ۔ وہ ایک معصوم سی کہانی پر کیسے مشتعل ہو سکتے ہیں !

"خبر من گھڑت ہے" میں نے چیخ کر کہا اور غصے میں اخبار کو پھینک دیا ۔ عین اس وقت سجاد آگیا ۔ سجاد میرا دوست ہے ۔ یقیناً آپ اسے جانتے ہوں گے بھئی ، مشہور جرنلسٹ ہے ۔ وہ آتے ہی بولا "کونسی خبر من گھڑت ہے ؟"

"خبر ہے کہ چلتی گاڑی میں ایک مزدور نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ فساد برپا ہو گیا ۔ دو مارے گئے ، پانچ زخمی ہو گئے" لیکن میں نہیں مانتا کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو سکتی ہے ۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی ؟" وہ بولا ۔

"بھئی ، میں خود افسانہ نویس ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا ۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟" سجاد تن کر کھڑا ہو گیا۔

"بھئی، ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے، بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے، اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آگیا ہو۔"

سجاد نے نفی میں سر ہلایا۔ بولا "یہ کہانی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی۔"

"تمہیں پتا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پتا ہے" اس نے جواب دیا۔

"کیسی کہانی تھی وہ؟" میں نے اسے کریدا۔

"عام سی تھی، جیسے فیبلز ہوتی ہیں۔ مثلاً چڑی کاں کی کہانی۔"

"نہیں یار، مذاق نہ کر" میں ہنس پڑا "اوّل تو کہانی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فساد برپا کر سکے، پھر چڑی کاں جیسی کہانی۔ اونہوں! یہ خبر سرے سے ہی غلط معلوم پڑتی ہے۔"

"خبر تو بھئی سولہ آنے مصدقہ ہے" سجاد نے تن کر کہا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مصدقہ؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی، میں خود وہاں موجود تھا" سجاد نے جواب دیا۔

"موقع پر؟"

"ہاں، موقع پر۔"

"تم نے وہ کہانی خود سنی تھی کیا؟"

"بالکل بھئی، میں کہانی سنانے والے کے قریب کھڑا تھا۔"

"تو یار، مجھے سناؤ وہ کہانی" میں نے پینترا بدلا۔

"بھئی، وہ ایک عام سی کہانی تھی، جیسے ہوتی ہیں پرانی کہانیاں۔ اور سنانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ ایک معمر مزدور اور کہانی سنانے سے اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔"

"تو پھر اس نے کہانی سنائی کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یار، بڑے بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں بیٹھتے ہیں کوئی اصلاحی بات یا نصیحت چھیڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کی سپورٹ میں کوئی فوک وزڈم کی

کہانی سنا دیتے ہیں یا سعدی کی یا مولانا روم کی کوئی حکائت ۔ بہر حال وہ اپنی نوعیت کی کہانی تھی" سجاد نے کہا ۔

"تم سناؤ تو سہی" میں نے سجاد کی منت کی ۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا ، جیب سے سگریٹ نکالا ، سلگایا ، ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا پھر جیسے کہانی سنانے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا ، لیکن جلد ہی پھر ، ہچکچا کر بولا "اس وقت وہ کہانی شاید پھسپھسی لگے ۔ دراصل کہانی کا ماحول سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔"

"تو ماحول بھی بیان کر دو ۔ اس میں کیا مشکل ہے ؟" میں نے کہا ۔

کچھ دیر کے لیے سجاد سوچتا رہا ۔ پھر بولا تم فیکٹری شٹل کو جانتے ہو کیا جس میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا ؟"

"بھئی ، ظاہر ہے وہ کوئی گاڑی ہو گی" میں نے جواب دیا ۔

"گاڑی تو ہے" سجاد بولا "لیکن ایک خصوصی گاڑی ہے یہ گاڑی روز صبح شہر سے مزدوروں کو لاد کر تارپین آئل فیکٹری تک پہنچاتی ہے اور شام کو فیکٹری سے انہیں لاد کر شہر لے آتی ہے ۔ یہ فاصلہ تقریباً چالیس میل کا ہے ۔ اس لائن پر کوئی سٹیشن نہیں ۔ صرف فلیگ سٹاپ ہیں ۔ جب یہ شٹل شہر پہنچتی ہے تو اسے باقاعدہ پلیٹ فارم پر نہیں لاتے بلکہ سٹیشن سے باہر سائڈنگ پر کھڑا کر دیتے ہیں ۔"

"وہ کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔

"بھئی اس لیے کہ یہ گاڑی اس قابل نہیں کہ اسے منظر عام پر لایا جائے" سجاد نے جواب دیا "دراصل یہ گاڑی نہیں تیلی کی دوکان ہے کل کوئی چھ بوگیاں ہوں گی ۔ سب تیل سے چکٹ ۔ سیٹیں ، فرش ، پہیے ، پائدان سب کالے دھت نہ تو بوگیوں میں دروازوں کے پٹ ہیں نہ کھڑکیوں کے شٹر ۔ سامان رکھنے کے تختے بھی اکھاڑ لیے گئے ہیں ۔ کھڑکیوں کو بند کرنے والے شیشے اور تختے ٹوٹ چکے ہیں ۔ باتھ روم کے دروازے بھی غائب ہیں ۔ ان بوگیوں میں نہ بتیاں ہیں نہ پنکھے صرف یہی نہیں ، بوگیوں کا ہر پیچ ڈھیلا ہے ۔ پہیے چلنے کے ساتھ جھولتے جھومتے بھی ہیں ۔ ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے جوڑنے والے

کنڈے تو ہیں مگر بفرز کے شاک آبزاربرز کب کے دم توڑ چکے ہیں ۔ چلتے ہوئے دھکے لگتے ہیں اور ساتھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں ۔ یوں جیسے پُراسرار فلم میں بیک گراؤنڈ میوزک چل رہی ہو" سجاد ہنسنے لگا "وہ گاڑی نہیں اونٹ ہے ۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ۔ البتہ ایک ہوٹر ہے جو بہت جاندار ہے ۔ نہایت بھدی اور ڈراؤنی آواز میں بجتا ہے ۔ اور تقریباً سارا راستہ بجتا ہی رہتا ہے ۔" کچھ دیر کے لیے وہ رک گیا ۔

"ہوا یوں کہ چار ایک دن پہلے تارپین آئل فیکٹری کے متعلق ایک خبر چھپی تھی کہ بیروزہ کے پھوگ سے ہم ایک ایسی چیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی ۔" وہ پھر رک گیا ۔

"اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا ، بھئی ، یہ کیا چیز ہے جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی ؟ اس کی تفصیلات کا پتہ لگاؤ ۔ اور اگر واقعی یہ چیز اہم ہے تو اس پر ایک فیچر لکھ دو ۔ اس پر میں نے فیکٹری کے پی آر کو فون کرکے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے ۔ وہ بولا ، چیز بتانے کی نہیں ، دیکھنے کی ہے ۔ یہاں آجاؤ ۔ اسی وجہ سے مجھے کل تارپین آئل فیکٹری جانا پڑا ۔ وہاں دن بھر ریسرچ میں مصروف رہا ۔ پھر شام کو اسی گاڑی سے لوٹا جس میں یہ حادثہ پیش آیا ۔" سجاد خاموش ہوگیا ۔ پھر بولا "چائے پلاؤ گے ؟"

میں نے چڑ کر کہا "پہلے ساری بات بتا مجھے ، پھر پلاؤں گا ۔"

وہ ہنسنے لگا ، سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا ۔ بولا "واپسی پر جب سٹاپ پر پہنچا تو گاڑی حرکت میں آچکی تھی ۔ خیر ، میں دوڑ کر سوار ہوگیا ۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا ۔ اندھیرا پھیل رہا تھا ۔ گاڑی مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۔ دراصل اس روز ان کا پے ڈے تھا ۔ اس لیے حاضری فل تھی ۔ گاڑی میں تیل ، پسینے اور فکر مندی کی بو کے بھبھکے اٹھ رہے تھے وہ سب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے ۔ ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا ۔ ایک دوسرے سے کوسوں دور ۔ نہ جانے کہاں ۔"

"تُو تو کہتا ہے ، وہ پے ڈے تھا" میں نے اسے ٹوکا ۔

"بالکل ، پے ڈے تھا" سجاد نے جواب دیا ۔

"مزدور تو پے ڈے پر خوش ہوتے ہیں" میں نے کہا۔
"یہ غلط فہمی ہے" سجاد بولا "مہینے بھر مزدور لوگ پے حاصل کرنے کی امید رچائے رکھتے ہیں۔ خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ پے ڈے کو انہیں احساس ہوتا ہے کہ حصول کتنا عبث ہے کتنا بے معنی۔ کتنی عجیب بات ہے" سجاد مسکرایا "کہ زندگی کا المیہ حاصل نہ ہونے میں نہیں بلکہ حاصل ہو جانے کے بعد اس احساس میں ہے کہ کیا اسی کے لیے اتنی شورا شوری تھی۔ نٹشے کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا عظیم ترین لمحہ وہ ہے جب ہماری بڑی سے بڑی آرزو، بڑی سے بڑی کامیابی ہماری نگاہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔"
"ہٹا یار" میں چڑ کر کہا "نٹشے بازی چھوڑ۔ مجھے وہ کہانی سنا۔"
وہ میری بے قراری پر ہنسنے لگا "ایک معمولی سی کہانی کے لیے تم خود کو رسی کی طرح بل دے رہے ہو" یہ کہکر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بات شروع کی' بولا "اتفاق سے مجھے کھڑے ہونے کے لیے وہیں جگہ ملی جہاں وہ بڈھا مزدور داستان گو بیٹھا تھا۔ ایک دبلا پتلا مزدور میرے پاس کھڑا تھا۔ بولا: میاں جی، آپ کہانی سنانے لگے تھے۔ ہاں، ہاں، بڈھا بولا یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب غلام رکھنے کی رسم عام تھی۔ بازار میں ہر اٹھوارے منڈی لگا کرتی تھی جس میں غلام کھلم کھلا بکتے تھے۔ سوداگر بکنے والے کو تھڑے پر کھڑا کر کے اس کی خوبیاں گنواتے کہ دیکھ لو مضبوط آدمی ہے، جوان ہے، طاقت ور ہے، کام کرسکتا ہے، بے داغ ہے۔ جس طرح گھوڑے کو بیچتے وقت اس کے دانت دکھاتے ہیں۔ پھر بولی شروع ہو جاتی۔ جو سب سے اونچی بولی دیتا، غلام ہمیشہ کے لیے اس کی ملکیت ہو جاتا اور مالک اس سے زندگی بھر جو کام چاہتا، لیتا۔"
"گاڑی چیختی چلاتی کراہتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ گرد و پیش کا ویران علاقہ دھندلا ہو چکا تھا۔ رات کا اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گاڑی کے اندر فکر مندی اور اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مزدوروں کی شکلیں دھندلائے جارہی تھیں۔ ہوٹر اپنی بھدی آواز میں کراہ رہا تھا۔"
"کچھ دیر کے بعد میاں جی بولے: پھر جو بندے کو غلام بنانے کے خلاف آوازے لگنے لگے تو ملک کے قانون میں بدلی کر دی گئی۔ ملک میں ڈھنڈورہ

پیٹ کر اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنے غلام کو منڈی میں لاکر بیچ سکتا ہے ، اس طرح آیندہ سے غلام کو بھی حق حاصل ہو گا وہ جب چاہے خود کو بکنے کے لیے پیش کر دے مطلب یہ کہ جس غلام کو اپنا آقا پسند نہ ہو وہ شہر کے قاضی کے پاس جائے ۔ اگر قاضی اسے بکنے کی اجازت دے دے تو منڈی میں خود کو بکنے کے لیے پیش کر دے ۔ بولی میں جو قیمت ملے وہ اپنے پہلے مالک کو دے دے اور خود کو نئے مالک کے حوالے کر دے ۔

میاں جی پھر خاموش ہو گئے ۔

"گاڑی میں بیٹھے ہوئے مزدور جوں کے توں چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہانی نہیں سن رہا تھا ۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا ۔ صرف وہی دبلا پتلا مزدور ہنکارا بھر رہا تھا : جی میاں جی پھر ؟

"میاں جی نے سر اٹھایا ایک لمبی آہ بھری اور بولے : شہر میں ایک غلام تھا ، زبیر ۔ نوجوانی کا عالم تھا ۔ مسیں بھیگ رہی تھیں ۔ جسم میں جان تھی ۔ ناک نقشے میں جاذبیت تھی ۔ وہ ہر چوتھے دن شور مچا دیتا: میں بکوں گا ۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا ۔ اس مالک میں کیا عیب ہے جو تو اس کے پاس نہیں رہے گا ؟ قاضی نے پوچھا ۔ زبیر بولا : جناب ، یہ مالک مجھ سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا ۔ میں سارا دن اس کے کاموں میں جتا رہتا ہوں لیکن یہ خود تو تازی روٹی کھاتا ہے اور مجھے کھانے کو باسی دیتا ہے ۔ قاضی نے زبیر کو بہت سمجھایا بجھایا کہ اتنی سی بات کو دل پر نہیں لگاتے لیکن زبیر نہ مانا قاضی نے اسے بکنے کی اجازت دے دی اور وہ پھر سے بک گیا ۔"

"اپنے نئے مالک کے گھر چند ہی روز رہنے کے بعد زبیر نے پھر شور مچا دیا: میں بکوں گا ، میں بکوں گا ۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا ۔ اس لیے کہ یہ خود گیہوں کی کھاتا ہے اور مجھے جَو کی دیتا ہے ۔ قاضی نے پھر اسے بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا اور پھر بک گیا ۔

"تیسرے مالک کے گھر پہنچتے ہی زبیر نے پھر سے چیخ پکار شروع کر دی کہ اس سے بہتر تو میرا پہلا مالک ہی تھا جو اگرچہ جو کی دیتا تھا لیکن دو وقت تو دیتا تھا ۔ یہ تو صرف ایک وقت روٹی دیتا ہے اور وہ بھی روٹی نہیں بلکہ پانی

میں بھگوئے ہوئے سوکھے ٹکڑے ۔ یہ مجھے انسان نہیں ، جانور سمجھتا ہے ۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گا ۔ قاضی بولا: زبیر ، میں نے تجھے پہلے ہی خبر دار کر دیا تھا کہ مالک ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ اب میں تجھے کیا سمجھاؤں ۔

گاڑی کے ہوٹر نے زور سے لمبی چیخ ماری ۔ بوڑھا رک گیا ۔

"گاڑی ہونک رہی تھی ، یوں جیسے سسکیاں بھر رہی ہو ۔ کُل پرزے کڑکڑا رہے تھے ۔ انجن یوں چیخ رہا تھا جیسے چلا چلا کر کہہ رہا ہو : بکوں گا ، میں بکوں گا ، گاڑی کے اندر خاموشی کا تنبو تنا ہوا تھا ۔ گھپ اندھیرے میں سے دبی دبی آہوں کراہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔

"پھر میاں جی؟" دبلے پتلے واحد سامع کی آواز سنائی دی ، پھر کیا ہوا ؟ میاں جی بولے : زبیر کی آوازیں آتی رہیں ، آتی رہیں : میں بکوں گا ، میں بکوں گا ۔ پہلے ان آوازوں میں غصے کا رنگ تھا ۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں دکھ کا پہلو ابھرتا گیا ۔ پکاریں کراہوں میں بدلتی گئیں اور وہ بکتا گیا بکتا گیا ۔ پھر دفعتاً اس کی آواز خاموش ہوگئی ۔ زبیر چپ ہوگیا ۔ زبیر کو یوں چپ دیکھ کر لوگ چونکے: یہ کیا ہوا ؟ زبیر چپ کیوں ہوگیا ؟

"سارے مزدوروں اور غلاموں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ۔ ایک بولا: زبیر کو آخر کار آقا مل گیا ہے ۔ وہ خوشی کی وجہ سے چپ ہوگیا ہے ۔ دوسرے نے کہا: چلو ، مان لیا کہ وہ خوش ہے پھر وہ خوش دکھتا کیوں نہیں ؟ پہلے اس کا چہرہ کتنا صاف تھا ۔ اس پر بشاشت کی جھلک تھی ۔ مگر اب ماتھے پر تیوری چڑھ بیٹھی ہے ۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں ۔"

"ایک بوڑھے غلام نے کہا: وہ اس لیے چپ ہوگیا ہے کہ اب وہ جان گیا ہے ۔"

"اس کے بعد جب بھی زبیر بازار میں نکلتا تو لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں: دیکھو دیکھو ، وہ قاضی کی طرف جا رہا ہے ضرور وہ بکنا چاہتا ہے ، لیکن جب وہ دیکھتے کہ اس کا رخ کسی اور طرف ہے تو وہ مایوس ہو جاتے پھر وہ آوازے کستے: زبیر ، تو قاضی کے پاس کیوں نہیں جاتا ؟ کیا تو بکنا نہیں چاہتا ؟ کیا تو خوش ہے ؟ لیکن زبیر ان آوازوں کو ان سنی کر کے گردن جھکائے چلا جاتا ۔

"لوگوں کی آپس میں شرطیں بندھ گئیں ۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ زبیر خوش ہے ، کچھ کہتے تھے وہ خوش نہیں ۔ شرط پر فیصلہ سننے کے لیے لوگوں نے اپنے آوازے تیز تر کر دیے ۔ آخر ایک روز ان آوازوں سے اکتا کر زبیر رُک گیا ۔ اس نے منہ موڑ کر آواز لگانے والے کی طرف دیکھا اور چلّا کر بولا : میں نہیں بکوں گا ۔ میں نہیں بکوں گا ۔ میں خوش ہوں بہت خوش ۔ آوازے لگانے والوں پر خاموشی طاری ہوگئی ۔ ابھی زبیر نے جانے کے لیے رخ بدلا ہی تھا کہ مجمعے سے ایک آواز آئی: تو کیوں نہیں بکے گا ؟ وجہ ؟

"زبیر پھر رک گیا ۔ بولا: میرا آقا علم کا رسیا ہے ۔ مطالعے کا شوقین ہے ، مگر اتنا کنجوس ہے کہ چراغ دان نہیں خریدتا ۔ رات کو جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو چراغ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے ۔ یوں میں آدھی آدھی رات تک چراغ اٹھائے رہتا ہوں ۔ نہیں ، میں نہیں بکوں گا ۔ وہ چیخ کر بولا : میں ڈرتا ہوں کہ میرا اگلا مالک مجھے تیل پلا دے گا اور میرے منہ سے بتی نکال کر مجھے دیا بنا لے گا ۔ نہیں ، میں نہیں بکوں گا ۔ میں نہیں بکوں گا ۔

"بڈھا خاموش ہوگیا ۔ گاڑی پر سکوت طاری ہوگیا ۔ اندھیرا اس قدر گاڑھا تھا کہ محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمیں کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو ۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا ۔ یونہی صدیاں بیت گئیں ۔ پھر دفعتاً گاڑی کا ہوٹر کراہنے لگا: میں نہیں بکوں گا ۔ میں نہیں بکوں گا ۔ اس پر گاڑی میں ایک حرکت پیدا ہوئی ۔ ایک آواز آئی: میاں جی ، تُو مجھے طعنہ دے رہا ہے ۔ میں خوب سمجھتا ہوں ۔ پھر ایک مزدور کھڑا ہو گیا ۔ بولا : یہ تجھے طعنے نہیں دے رہا عبداللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے ۔ مجھے پتا ہے" اس کی آواز میں تشدُّد تھا ۔

"نہیں ، نہیں ، پتلا دبلا مزدور بولا: میاں جی تو کہانی سنا رہے تھے ۔ ٹھہر جا تو ۔ تشدد بھری آواز پھر آئی: اس بڈھے کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔ میں اسے سمجھ لوں گا ۔"

"پھر اس ہنگامے سے ایک دھونس سنائی دی اور ایک اونچا لمبا آدمی چھلانگ لگا کر کونے سے باہر نکل آیا ۔ تو رہنے دے ، لمبا تڑنگا بولا ، اس بڈھے نے تجھے نہیں ، مجھے چھیڑا ہے ، مجھے' میرا نام زبیر ہے ۔ میں اسے بتاؤں گا کہ

میں کیوں بکنا نہیں چاہتا ۔ ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ ۔ جس نے اس کی حمایت کی ، اس سے میں سمجھ لوں گا ۔"

"پھر بوگی میں چاروں طرف سے تشدد بھری آوازیں آنے لگیں" سجاد نے کہا "یہ عالم دیکھ کر میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے ۔ گاڑی کے پہیے بونک رہے تھے ۔ بفر ٹکرا ٹکرا کر دھکے دے رہے تھے ۔ ہوٹر چلا رہا تھا : میں نہیں بکوں گا ، میں نہیں بکوں گا ۔"

سجاد خاموش ہو گیا ــــــ دیر تک خاموش بیٹھا رہا جیسے گہری سوچ میں پڑا ہو ۔ پھر اس نے ایک لمبی آہ بھری "سچی بات یہ ہے ، مفتی" وہ بولا "میرا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس بڈھے کی ناک پر گھونسا ماروں ۔"

"وہ کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔

"پتا نہیں" سجاد ہنسا "مجھے ایسے لگا جیسے اس بڈھے نے میرا راز مجھ پر کھول دیا ہو ۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے ایڈیٹر نے مجھے موم بتی بنا کر دونوں سروں پر جلا رکھا ہو تاکہ اس کا اپنا نام روشن رہے ۔"

............○............

ایک ہاتھ کی تالی

چلتے چلتے میں رک گیا: ہائیں ! یہ کیا ؟

میرے سامنے چھوٹی چار دیواری کے درمیان ایک درخت کھڑا تھا ، جس کی شاخیں ایک جانب کیکر کی تھیں اور دوسری جانب بیری کی ۔

میں نے حیرت سے اس کا جائزہ لیا ۔ بظاہر تنا ایک ہی تھا ۔ قریب سے دیکھنے کے لیے میں چاردیواری کے اندر داخل ہو گیا ۔

چاردیواری کے اندر کھلی زمین تھی ، جس میں دو پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں ۔ دونوں قبروں کے درمیان میں وہ درخت استادہ تھا میں نے درخت کے گرد گھوم پھر کر دیکھا ۔ وہ ایک ہی درخت تھا ، لیکن اوپر دائیں ہاتھ کی ٹہنیاں کیکر کی تھیں اور بائیں ہاتھ کی بیری کی ۔ کیکر کی ٹہنیوں پر جا بجا زرد رنگ کی ٹلیاں بندھی ہوئی تھیں ، اور بیری کی ٹہنیوں پر لال رنگ کی میں حیرت سے بت بنا اسے دیکھتا رہا ۔

دفعتاً چاردیواری کے قریب حرکت سی ہوئی ۔ میں چونکا ۔ دیکھا ایک بوڑھی ضعیف عورت گٹھڑی بنی ، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے ۔ مجھے متوجہ دیکھ کر وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "کیا دیکھ رہا ہے تو ؟"

میں نے کہا "مائی جی ، اس درخت کو دیکھ رہا ہوں ۔ عجب درخت ہے یہ ۔ آدھا کیکر ، آدھا بیری ۔"

بڑھیا مسکرائی ، بولی "یہ ان بابا لوگوں کا معجزہ ہے ۔"

"کون بابا لوگ ؟" میں نے پوچھا ۔

اس نے ہاتھ ہلا کر دونوں قبروں کی طرف اشارہ کیا ، لیکن منہ سے کچھ نہ کہا ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان قبروں کو دیکھتی رہی ۔ عین اس وقت ایک عمر رسیدہ آدمی داخل ہوا ۔ بولا "یہ دائیں ہاتھ والا بابا کمال کا مزار ہے اور بائیں ہاتھ والا

بابا جمال کا ۔ یہ دونوں عشق و محبت کے باب ہیں ، بابو جی ۔ یہاں محبت کے مارے لوگ آتے ہیں ، منتیں مانتے ہیں ۔ ٹہنیوں پر جو ٹلیاں بندھی ہوئی ہیں ، یہ سب محبت کی منتیں ہیں ۔ بابا کمال کے دوار پر عورتیں آتی ہیں اور پیلی ٹلی باندھتی ہیں ۔ بابا جمال کی خدمت میں مرد آتے ہیں اور لال ٹلی باندھتے ہیں ۔"

مجھے بابوں والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ نہ ہی میں منتیں ماننے کو اہمیت دیتا ہوں ۔ لیکن وہ آدھا کیکر ، آدھا بیری کا درخت ! ۔ ۔ میں تحقیق پر مجبور ہو گیا ۔۔۔۔۔ ورنہ یہ کہانی ان کہی رہ جاتی ۔

سردار بائی باہر نہیں بھیتر میں جیتی تھی ۔ اس کی ہر بات میں رمز ہوتی ۔ بھید اچھلتا ضرور تھا ، پر ہونٹوں پر نہیں آتا تھا گالوں پر سرخی بن کر جھلکتا ۔ آنکھوں میں پھوار بن کر اڑتا لیکن کیا مجال کہ زبان میں جنبش پیدا کرے ۔

ایک روز جب چاروں ناچیاں فراغت سے بیٹھی تھیں تو سردار بائی نے برسبیل تذکرہ کہا "لڑکیو، ہم یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں ۔"

یہ سن کر تینوں چونکیں ۔

بینی کی بھویں کمان بن گئیں ۔ ماتھے پر وہ مخصوص گھوری پڑ گئی جو گھورتی بھی تھی ، ساتھ پچکاری بھی تھی بینی بولی "کیا کہا؟ یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں ؟"

سردار بائی نے سر اثبات میں ہلا دیا ۔

چمکی کی ناک دھار بن گئی ۔ آنکھوں میں پھر کی سی چلی ۔ بولی "کیوں جا رہے ہیں ہم ؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں تبسم کی پھوار اڑی لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا ۔

مینا چونکی ۔ پھر خود کو سنبھال کر بولی "کہاں جا رہے ہیں ہم ؟"

سردار بائی کی آنکھوں میں پھر سے پھلجھڑی چلی ، لیکن خاموشی چھائی رہی ۔

لڑکیوں کو پتا تھا کہ جب سردار بائی کی آنکھوں میں پھر پھلجھڑی چلے تو

سمجھ لو کہ کوئی بات ہے ضرور ہے ۔ پر وہ بھید ہے ۔ زبان پر نہیں آئے گی ۔ لاکھ پوچھو ، کریدو ۔۔۔۔۔۔ بے کار ۔

ایک ہفتے کے بعد جب ان کا ڈیرہ دور کسی ریاست کے صدر مقام انگولا میں پہنچا تو انہیں پتا چلا کہ یہاں قیام ہو گا ۔ "یہاں" کا جواب تو مل گیا ۔ "کیوں" بھید ہی رہا ۔

نئی رہائش گاہ دیکھی تو وہ حیران رہ گئیں ۔ وہ چوبارہ نہیں تھی بنگلہ تھی ۔ تھی تو رقص و سرود کے علاقے میں ، پر ذرا ہٹ کر ، ایک طرف بنگلے کے دروازے پر "آساوری" کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی ۔

چوبارے کی شوونڈو سے نکل کر بنگلے کی چاردیواری میں آگئیں تو انہیں وقار مل گیا سٹیٹس حاصل ہوگیا ۔ یوں ان کے ڈیرے کی ریاست میں دھوم مچ گئی ۔

سردار بائی کے ڈیرے میں تین لڑکیاں تھیں : مینی ، چمکی اور مینا تینوں گوناگوں تھیں ۔ ہر ایک اپنے ہی رنگ میں رنگی تھی ۔ چھب اپنی اپنی انداز اپنا اپنا سبھاؤ اپنا اپنا ۔

مینی جسم ہی جسم تھی ، بلوری ، روغنی ، ریشمی جسم ۔ سنہرا ، روشن ، تناسب کا نمونہ ۔ سارے گھر پر جسم نے قبضہ جما رکھا تھا ۔ بے چاری گھر والی مینی باہر دہلیز پر پڑی تھی ۔

مشکل یہ تھی کہ جسم چھپائے سے چھپتا نہیں تھا کپڑوں سے باہر نکل نکل آتا ۔ جو اس پر چھا جاتا ۔ گردوپیش کو سنہرا ، ریشمی کر دیتا ، حالانکہ ناچ اور گانے میں بڑی دسترس رکھتی تھی ۔ گنی تھی ۔ لیکن جسم گُن کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا تھا ۔

چمکی چمک کی لہر تھی ۔ اتنی تیز تھی ، اتنی ترت پھرت کہ یوں پھر جاتی جیسے خربوزے میں چھری ۔ آنکھوں میں دھار تھی ۔ ہونٹوں پر طنز ، لیکن دبی دبی ہاتھ نزہت سے بھرے ہوئے تھے ۔ پاؤں میں گھنگرو پہنتی تو حرکت کے بغیر ہی چھن چھن کرتے جسم میں حرکت مقید تھی ، یوں جیسے بوتل میں جنّ اب نکلا کہ اب نکلا جیسے کمان میں تیر پھنسا ہو ۔ اب چُھوٹا کہ اب چھوٹا ۔

پھر مینا تھی ۔ اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا ۔ بالکل ماورائی ، جیسے مندر میں جائے نماز بچھی ہو ۔ شخصیت میں دو عنصر نمایاں تھے ۔ ایک طرف گریس کا دھارا چل رہا تھا ، دوسری طرف تمکین کے پہاڑ تنے کھڑے تھے ۔

جنبش میں ربط تھا ۔ روانی ایسی کہ کہیں دھکا نہ لگتا تھا ۔ بُت اور چت میں کوئی ربط نہ تھا بُت بیٹھا رہتا ، چت گم نہ جانے کہاں منڈلاتا ۔ دیکھنے والا ان جانے میں ڈھونڈ میں مبتلا ہو جاتا ۔

سردار بائی کے انگولا میں آتے ہی ریاست کے امرا اور اہل کاروں کے نوجوان بیٹوں نے ڈیرے کو اپنا لیا ۔

نوجوان مل کر شامیں مخصوص کرالیتے راگ رنگ کی محفلیں ہوتیں ۔ گفتگو ہوتی ہنسی مذاق ہوتا ۔ کھانا پینا ہوتا نہ تو بد مستی ہوتی نہ ہی تخلیہ ۔ سردار بائی نے آنے والوں پر واضح کر رکھا تھا یہاں تفریح ہو گی تماش بینی نہیں ۔ اگر کوئی تخلیے کا خواہش مند ہو تو گھر بلا لے ۔

ریاست کے نواب رحم اللہ بیگ تو ماڈرن خیالات کے حامی تھے وسیع القلب تھے ، لیکن رکھ رکھاؤ کے شدت سے قائل تھے ۔ ذرا سا وقار میں فرق آ جاتا تو ان کے لیے نا قابلِ برداشت ہو جاتا ۔

انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کمال اللہ بیگ پر بار ہا واضح کر رکھا تھا بیٹے جو چاہو کرو ، ہم کوئی پابندی عائد نہیں کرتے ۔ مگر وقار کو کسی صورت ہاتھ سے جانے نہ دینا ۔ بیٹے ، چینی کے برتن میں ایک بار بال آ جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے مضروب ہو جاتا ہے ۔

وقار بھرے ماحول میں تیس سال گزار کر کمال میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا ۔ اس میں جذب کر لینے کی صلاحیت بیدار ہو چکی تھی ۔

کمال کے دوست اسے بار بار مجبور کرتے رہے کہ چلو ، بائی کے ڈیرے پر چلیں ۔ پہلے تو وہ ٹالتا رہا ، لیکن پھر مجبور ہو گیا ۔ روپ بدل کر جانے کے لیے تیار ہو گیا اور انہیں تاکید کر دی کہ بھید نہ کھلے ۔

گیا تو تفریح کے لیے تھا ، لیکن مینا کے ماورائی وقار نے پتا نہیں کیا کر دیا ۔ دوستوں کے روبرو خود کو سنبھالا ۔ بڑی مشکل سے محفل میں حاضر

رہا ، پر بظاہر اندر سے حاضر نہ تھا ۔ ادھر مینا بھی حاضر نہ تھی بت تھا ۔ اس کا تو خیر یہ معمول تھا کمال مینا کے چت کی ڈھونڈ میں کھو گیا تھا ۔ اگلے روز رات کو خواب گاہ میں مینا کا بت پھر سامنے آبیٹھا ۔ بولا "چِت کو ڈھونڈ ۔" ساری رات ڈھونڈ میں بیت گئی ۔

جب تین چار راتیں یونہی گزریں تو وہ گھبرا گیا ۔ ایسا تو کبھی نہ ہُوا تھا ۔

دوسری بار جب وہ دوستوں کے ہمراہ ڈیرے پر گیا تو ساتھی بینی اور چمکی کی طرف متوجہ رہے اور کمال کو مینا سے بات کرنے کا موقع مل گیا ۔

زیرِ لب بولا "آپ کہاں ہیں ؟"

مینا نے چونک کر دیکھا لیکن منہ سے نہ بولی ۔

کمال نے کہا "ایک لمحے کے لیے یہاں آ جائیے نا ۔"

"کہاں آجاؤں ؟" اس نے پوچھا ۔

"جہاں آپ بیٹھی ہیں ، وہاں ۔"

وہ مسکائی ۔ بولی "میں تو یہیں ہوں ۔"

"یہاں تو خالی بت ہے ۔"

وہ پھر مسکرائی "بت ہی تو ہوں ۔"

"کتنا اچھا ہوتا" کمال نے کہا "اگر خالی بت ہی ہوتیں ۔"

"کیوں ؟" اس کی بھویں کمان بن گئیں ۔

"خالی بت ہوتیں تو میں ڈھونڈ میں نہ پڑتا ۔"

اس کے ہونٹوں پر ادھوری مسکان آٹکی ۔ بولی "سامنے دھری کی ڈھونڈ کیسی ؟"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر کمال نے زیرِ لب پوچھا "اگر گھر پر بلاؤں تو آ جائیں گی ؟"

"میں آنے جانے والی کون ہوں" وہ بولی "بھیجنے والی سے پوچھیے ۔" اس نے سردار بائی کی طرف اشارہ کیا ۔

چار ایک دن بعد محل سے دور ، پائیں باغ کے دیوان خانے کے سامنے

ایک بگھی رکی۔سیاہ نقاب میں ملفوف خاتون نکلی ۔ برآمدے میں نوابزادہ کمال منتظر کھڑا تھا ۔

نوابزادہ نے کہا "ہمارا نام کمال ہے ۔"

"مجھے پتا ہے" وہ بولی "پہلے آپ رئیس زادے تھے ، اب نواب زادے ہیں ۔"

وہ اسے کمرے میں لے گیا ۔ چائے آگئی ، اور وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے چائے پیتے رہے ۔

پھر وہ بولا "ہم نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ ہمارے لیے آپ سے دور رہنا مشکل ہو گیا ہے ۔"

"میری خوش قسمتی ہے" وہ بولی ۔

"اونہوں" وہ بولا "رسمی باتیں نہ کیجئے ۔ بھول جائیے کہ آپ کون ہیں ، ہم کون ہیں ۔"

وہ شرارت سے مسکرائی ۔ بولی "بھول گئی ۔"

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا ۔ بولا "آپ کو علم نہیں ہم بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں ۔"

"کیوں ؟ خیریت ؟" مینا نے پوچھا ۔

وہ رک گیا ۔ بولا "خاتون ، ہمیں آپ سے محبت ہو گئی ہے ۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ نظریں جھکائے ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے ۔ محبت کا اظہار تو اس سے زندگی میں کئی ایک نے کیا تھا ، مگر نواب زادے کے اظہار کی سرتال مختلف تھی ۔

"آپ سن رہی ہیں ؟" وہ بولا ۔

"سن رہی ہوں ۔"

"خدارا جواب میں کچھ تو کہیے" وہ بولا ۔

اس نے سر اٹھایا ۔ کہنے لگی "نواب صاحب ، جو خریدی جاسکتی ہے اس سے محبت کیسی ؟"

"ہمیں بت نہیں چاہیے" وہ بولا ۔

"نواب زادہ صاحب ۔ چت کسی کے بس میں نہیں ہوتا ۔"

"سچ کہتی ہیں آپ" وہ بولا "چت بس میں نہیں ہوتا ۔ ہم خود بے بس ہو رہے ہیں ۔"

"بُت سے دل بہلائیے ، نواب زادہ صاحب ، بہلاتے رہیے ، حتیٰ کہ دل بھر جائے ۔ چت کی ڈھونڈ نہ رہے ۔"

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا ۔ پھر قریب آکر مینا کا ہاتھ تھام کر بولا "ہم نے آپ کو دل بہلانے کے لیے نہیں بلایا ہم آپ کو دل بہلاوا نہیں سمجھتے ۔"

اس کے ہاتھ میں عجیب سانگ تھا ۔ مدھم گرمی اس کے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی ۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ پھر بولی "ایک بات پوچھوں ؟"

"پوچھیے ۔"

"برا تو نہیں مانیں گے ، آپ ؟"

"نہیں ۔"

"آپ کو پتا ہے ، محبت کسے کہتے ہیں ؟"

اس سوال نے اسے ڈنک مارا ۔ دیر تک خود کو سنبھالتا رہا ۔ پھر بولا "پتا نہیں ۔ ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ آپ کو تو پتا ہوگا کہ محبت کیا ہوتی ہے ۔"

"ہاں" وہ بولی "پتا ہے ۔ محبت سے جس قدر بائی واقف ہوتی ہے ، شاید کوئی اور نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ بائی ہوس کی بدرو کو لت پت ہو کر پاٹ چکی ہوتی ہے ۔ کامنا سے بے زار ہو چکی ہوتی ہے ۔ جسم کے بندھن سے بے نیاز ہو چکی ہے ؟"

"آپ کا مطلب ہے ، ہماری محبت جسم سے بندھی ہے ؟"

"پتا نہیں" وہ بولی "لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ہوس میں لت پت نہیں ہوئے ۔ جسم سے بے نیاز نہیں ہوئے ۔"

وہ سوچ میں کھو گیا ۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔
پھر وہ بولا "ایک بات پوچھوں ؟"
وہ مسکرائی "نہیں ۔ میں برا نہیں مانوں گی ۔ پوچھیے ۔"
"آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہے کیا ؟"
"ہاں" وہ بولی "ہوئی ہے ۔ ہے ۔ رہے گی ۔"
وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا "میں نے ناحق آپ کو زحمت دی" وہ بولا ۔
"خدارا ناراض نہ ہوں" وہ بولی مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے ۔ آپ پہلے مرد ہیں جو مجھ سے دل کی بات کہہ رہے ہیں ۔ آپ پہلے مرد ہیں جس سے میں دل کی بات کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر رہی ۔ آپ نے مجھے عورت کی حیثیت دی ہے ورنہ بائی کو فرد کی حیثیت کون دیتا ہے ۔ جو بھی ملتا ہے ، ہوس کی ڈگڈگی بجانا شروع کر دیتا ہے ۔ ہوس کی ڈگڈگی کی لے پر ناچنا یہی ہمارا دھندا ہے ۔"
وہ پھر سوچ میں کھو گیا ۔ دراصل وہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا ۔ مینا ایک ساعت کے لیے ہچکچائی ، پھر بولی "پہلے ایک بات کا فیصلہ کر لیجیے ۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے یا درپردہ آپ کی خواہش ہے کہ میں آپ سے محبت کروں ؟ میرا مطلب ہے کیا توجہ طلبی مقصود ہے ؟"
اسے شدید دھچکا لگا ۔
وہ اپنی ہی دھن میں کہے گئی "میری دانست میں محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی ۔ محبت صرف کی جاتی ہے ۔ چاہے دوسرا کرے نہ کرے ۔ محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے ۔ اس میں نہ شکوے کی گنجائش ہے ، نہ شکایت کی ۔ نہ وفا کی شرط ، نہ بے وفائی کا گلہ ۔" وہ رک گئی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولی "محبت لین دین نہیں ، صرف دین ہی دین ہے ۔" ان جانے میں اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی ، جیسے دم رک رہا ہو ۔
اگلے روز کمال رہ رہ کر مینا کی باتوں پر سوچتا رہا ، سوچتا رہا ۔ عجیب زاویۂ نظر تھا ۔ اس نے ایسے کبھی نہیں سوچا تھا ۔ مینا کی وہ بات اسے کھا گئی تھی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ، یا میری توجہ کے طالب ہیں ۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ توجہ کا طالب ہے ۔ اس کی محبت صرف دین ہی دین نہیں ، لین دین ہے ۔

اس خیال سے اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی ۔ دفعتاً اس کے اندر جذبات کا ایک ریلا ابھرا ۔ زیر لب بولا "نہیں ۔ میری محبت توجہ طلبی سے ملوث نہیں ہوگی ۔ کبھی نہیں ۔"

شام کو اس کا دوست جاہ آگیا ۔ آتے ہی بولا "جی چاہتا ہے ایک بار پھر آساوری چلیں ۔ کیا خیال ہے ؟"

"بے کار ہے" نواب زادے نے کہا ۔

"بے کار ؟" جاہ چلایا "اتنی رنگین محفل ہوتی ہے کہ نشہ آ جاتا ہے ۔" "کہیں دل تو نہیں لگ گیا تمہارا ؟"

جاہ ہنسا "اونہوں ۔ دل لگی کی چیز ہیں ، دل لگانے کی نہیں" پھر دفعتاً اسے یاد آگیا ۔ بولا "پتا ہے ، جمال آیا ہوا ہے ۔"

جمال ان کا ایک ساتھی تھا ۔ بڑا ہی رنگین مزاج تھا ۔ محفل میں جان ڈال دیتا تھا ، لیکن طبیعت اوباشی کی طرف مائل تھی ۔ چونکہ تاجر تھا ، اس لیے ذہنیت پر تاجرانہ رنگ غالب تھا ۔ کمال کو جمال کا کردار پسند نہ تھا ۔ اگرچہ اس نے اپنی ناپسندیدگی کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا ۔ لیکن دل ہی دل میں جمال کے نام پر ہی منفرت کی دھار چل جاتی تھی ۔

"مجھے ملا تھا" جاہ نے کہا "آپ سے بہت متاثر ہے بڑا احترام کرتا ہے آپ کا۔دراصل آپ کو اپنا آئیڈیل مانتا ہے ۔ پجاری سمجھ لیجیے ۔ اب کی بار آساوری جائیں تو اسے ساتھ لے جائیں ۔"

"ہوں" کہہ کر کمال نے بات ٹال دی اور پھر بات کا رخ بدل دیا ۔

اُدھر آساوری میں اسی روز جب مینا فراغت کے دوران بیٹھی کمال کی باتوں پر سوچ رہی تھی تو سردار بائی آگئی ۔ بولی "میں نے ، رات نواب زادے نے کوئی بات کی ؟"

"کیسی بات ؟" مینا نے پوچھا ۔

بائی بولی "وہ تماش بین نہیں دکھتا ۔ ضرور کچھ کہنے کے لیے تمہیں بلایا

ہو گا۔"

"بس وہی باتیں جو مرد کیا کرتے ہیں" مینا نے بائی کو ٹالنا چاہا۔

سردار بائی مسکرائی۔ بولی "می نے، اس بات کو کیا چھپانا جو ماتھے پر لکھی ہو۔ بند بند میں ناچ رہی ہو۔ تُو تو اس بات سے چھلک رہی ہے جو نواب زادے نے رات تجھ سے کی تھی۔"

مینا خاموش بیٹھی رہی۔

بائی بولی "مجھے پتا ہے تو نے اپنے دل کا دوار بند کر رکھا ہے، اس لیے کہ تجھے محبت کا روگ لگا ہوا ہے۔ ہم نے قاسم پور صرف اس لیے چھوڑا تھا می نے، کہ تیرا محبوب وہاں رہتا تھا اور میں ڈرتی تھی کہ تُو کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لے کہ واپسی ناممکن ہو جائے۔ اس لیے ہم قاسم پور چھوڑ کر یہاں آگئے تھے۔"

مینا نے حیرت سے بائی کی طرف دیکھا: اچھا، تو نقل مکانی کی وجہ یہی تھی۔

"دیکھ، می نے" بائی نے کہا "تجھے دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آجاتی ہے میں بھی تیری ہی طرح تھی۔ بے پروا، بے نیاز، نڈر۔ مجھے بھی محبت ہو گئی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ میری محبت ایک ہاتھ کی تالی ہے، پھر بھی میں سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس آگئی تھی اور پتا ہے، می نے، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے مجھے دھندے پر لگا دیا اور میری کمائی سے اپنی محبوبہ کو عیاشی کرانے لگا۔"

"سردار بائی" مینا بولی "مجھے پتا ہے، میرا بھی یہی انجام ہو گا، لیکن میں بہت دور نکل آئی ہوں میں نے واپسی کی کشتیاں جلادی ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ اوباش ہے، ہرجائی ہے۔ لیکن سردار بائی، عورت جب بھی کرتی ہے ذات سے محبت کرتی ہے، صفات سے نہیں۔"

"پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے" سردار بائی نے لمبی آہ بھری "پر ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کل ہی میں نے تیرے محبوب کو یہاں دیکھا ہے۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ وہ تو اسی شہر کا رہنے

والا ہے ۔ کیا اتفاق ہے آگ سے بچنے کے لیے بھاگے ، چولہے میں آگرے ۔"

مینا نے تڑپ کر بائی کی طرف دیکھا ۔

"فکر نہ کر" وہ بولی "آج نہیں تو کل تجھ سے ملنے آئے گا ۔ ضرور آئے گا ۔ ڈیرے پر ۔۔۔۔۔ ضرور آئے گا ۔ پر تیرے لیے نہیں تفریح کے لیے دل لگی کے لیے ۔"

کمال نے بہت کوشش کی کہ وہ مینا کی محبت سے بے نیاز ہو جائے ، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا ، اور جلد ہی مینا کو گھر بلانے پر مجبور ہو گیا ۔

اس کے بعد وہ دو چار بار ملے ۔ جب بھی ملتے کُتر کُتر باتوں کے ڈھیر لگا دیتے تھک جاتے تو تاش کھیلتے ۔ مینا کمال سے شطرنج کھیلنا سیکھتی ۔ بار بار چائے پیتے سگریٹ پھونکتے اور پھر سے باتوں میں لگ جاتے ۔ یونہی رات گزر جاتی ۔ اس دوران میں مینا بار بار کمال سے پوچھتی کہ آپ ڈیرے پر کیوں نہیں آتے اور کمال ہنس کر جواب دیتا "می نے ، میں نے تمہاری خاطر بہت کچھ چھوڑ دیا ۔ احساسات ، جذبات ، خیالات ۔ اب ایک جھوٹا وقار باقی رہ گیا ہے ۔ وہ تو مجھ سے نہ چھینو ۔"

پھر ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ کام میں مصروف تھا ، تو اس کے خاص ملازم الٰہی بخش نے اسے ایک بند لفافہ دیا ۔ کہنے لگا "یہ خط ان کے ڈیرے سے آیا ہے ۔" خط میں لکھا تھا :

میری خاطر ایک کام کیجیے بڑی بائی سے کہہ کر مجھے اپنے ہاں بلوائیے ۔ آج ہی لیکن بگھی نہ بھیجیے اور میرا انتظار بھی نہ کرنا ۔ میں آؤں گی نہیں ۔

نیچے نام کی جگہ خالی "م" لکھا ہوا تھا ۔

یہ ایک عجیب خط تھا ۔ مجھے بلوائیے ، لیکن میں آؤں گی نہیں ۔ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ اس کا مطلب کیا ہے ۔ پھر سینے پر چھری سی چل گئی ۔ وہ تڑپ کر رہ گیا ۔ نسیں دھنکی کی طرح بجنے لگیں اچھا ، تو میری محبت کو استعمال کیا جا رہا ہے ۔ میرے پردے میں کسی سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا ہے ۔

اس کی ذات کے وقار کو بری طرح ٹھیس لگی ۔ سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا : ٹھیک تو ہے ۔ یہ تو ایک ہاتھ کی تالی ہے ۔ نہ شکوہ نہ شکایت ۔ نہ امید نہ

توقع لیکن اندر ایک آگ سلگتی رہی ۔ ایک شعلۂ دل چاٹتا رہا ۔ "جو مزاج یار میں آئے" کا بھرم ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا ۔

سارا دن وہ خود کو سمجھاتا رہا : نہیں نہیں ، ایسا نہیں ہونا چاہیے ۔ ایسا نہیں ہو گا ، لیکن ایسا ہوتا رہا ۔ ایک بے چینی اسے کھائے جارہی تھی ۔

شام پڑی تو وہ اور بھی مضطرب ہوگیا ۔ اضطراب سے اس قدر چھلکنے لگا کہ چھینٹے اڑنے لگے ۔ وہ خوف زدہ ہوگیا ۔ کوئی یہ کیفیت دیکھ نہ لے ۔ اگر ابا حضور نے بلالیا تو ؟ اگر ای جان آگئیں تو ؟

اس نے خود کو ایک چُغے میں لپیٹا ، سر پر کنٹوپ پہنا اور بڑے سے رین کوٹ میں چھپ چھپا کر باہر نکل گیا ۔ اسے پتا نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے ۔

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ۔ کبھی رک جاتی ، کبھی پڑنے لگتی ۔ گلیوں میں کیچڑ ہو رہا تھا ۔ وہ کیچڑ اور بارش سے بے نیاز چلا جا رہا تھا ۔ اس کا احساسِ وقار بری طرح مجروح ہوا تھا ۔ اندر سے وہ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا ۔

گلیاں ویران پڑی تھیں ۔ لوگ سر شام ہی گھروں میں دروازے بند کرکے بیٹھ گئے تھے ۔

دفعتاً وہ رک گیا ۔ گلی میں ایک چھجے کے نیچے ، سیاہ نقاب میں لپٹی ، ایک خاتون دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی ۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے کھڑے ہونے کا انداز مانوس سا ہو ۔

"کیا میں آپ کی کوئی خدمت ...... ؟"

"ارے!" وہ چلائی "آپ ہیں ! آپ ادھر کہاں ؟"

اس نے مینا کو پہچان لیا "آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں ؟"

"بارش ہو رہی ہے" وہ بولی ۔

"بارش بند کرا دوں کیا ؟"

وہ ہنسی "مجھے سامنے والی گلی میں جانا ہے ۔"

"تو چلیے ۔ میں چھوڑ آؤں ۔"

"میں پھسل جاؤں گی" وہ بولی "میرا جوتا خراب ہو جائے گا ۔"

"تو چلیے ، میں اٹھا کر چھوڑ آؤں ۔"

اس نے بڑھ کر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا ۔

وہ گھبرا گئی ۔ کہنے لگی "لوگ دیکھ کر کیا سمجھیں گے ؟"

" سمجھیں گے کہ خاتون بیمار ہے ۔ معالج کے پاس لے جا رہے ہیں ؟"

کچھ دیر کے بعد وہ بولی "رک جائیے ۔"

وہ رک گیا ۔

مینا اس کے بازوؤں سے پھسل کر کھڑی ہوگئی پھر جھک کر آداب بجا لائی "بہت بہت شکریہ ۔ خدا حافظ !" یہ کہہ کر وہ دروازے سے مکان میں داخل ہو گئی ۔

اتفاقاً کمال کی نگاہ مکان پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پر پڑی : صاحبزادہ جمال ۔ اس کے سینے میں گویا کسی نے خنجر گھونپ دیا ۔ بری طرح سے لڑکھڑایا ۔ پھر شرمندگی اور خجالت کے پسینے سے شرابور ہو گیا ۔ یہ ذلت کی انتہا تھی ۔

کوئی اور ہوتا تو شاید اسے اس قدر اذیت نہ ہوتی ، لیکن جمال ایک خود غرض ، اوباش مطلب پرست ، چھوٹا آدمی ۔ اس کا رہا سہا وقار خجالت کے پسینے میں بہہ گیا اور اس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اُسے اندھیرے کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو ۔ گرد و پیش معدوم ہو گئے ۔ ایک مٹیالے دشت نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ۔ پھر اسے کچھ پتا نہ رہا نہ سمت رہی ، نہ رخ رہا نہ مینا رہی ۔

مینا کمرے میں داخل ہوئی تو جمال حیرت سے چلّایا "تم آگئیں ! اس بارش میں ! میں سمجھا تھا تم نہیں آسکو گی ۔"

"دیکھ لو" وہ مسکرا کر بولی "آ ہی گئی ۔"

کمال کر دیا تم نے !"

"آنے والے ، آ ہی جاتے ہیں" وہ بولی ۔

دفعتاً جمال کی نگاہ اس کے جوتے پر پڑی "ارے !" وہ بولا "تمہارے جوتے تو سوکھے ہیں یہ کیسے ہوا ؟

"مجھے وہ چھوڑ گئے ہیں نا" اس نے جواب دیا ۔

"وہ چھوڑ گئے ہیں ؟ گاڑی میں چھوڑ گئے ہیں کیا ؟"

"نہیں" مینا نے جواب دیا "گاڑی میں نہیں، بانہوں پر اٹھا کر چھوڑ گئے ہیں۔"

"بانہوں پر اٹھا کر؟ لیکن کون چھوڑ گئے ہیں؟"

"نواب زادہ کمال" وہ بولی۔

نواب زادہ کمال"! جمال کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"نواب زادہ کمال"! اسے دھچکا سا لگا "تمہیں چھوڑ گئے ہیں! میرے گھر! بانہوں میں اٹھا کر! نواب زادہ خود!" گرد و پیش اس کی نظروں میں دھندلانے لگے۔ دھندلاتے گئے "نواب زادہ کمال!" وہ دیوانہ وار دہراتا رہا "میرے گھر!" پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ مینا کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ میں مینا دھندلائے جارہی تھی۔

دفعتاً ایک دھچکا سا لگا، اور مینا معدوم ہوگئی۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا "نواب زادہ کمال!" منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور وہ دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گیا۔

انگولا سے رخصت ہوتے وقت جب میں دوبارہ مزاروں پر گیا تو میری توجہ کا مرکز دو رنگا درخت نہ تھا۔ میری نگاہ دونوں مزاروں پر مرکوز تھی۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی درخت کی ٹہنی پر ایک ٹلی باندھ دوں۔

بوڑھی عورت بدستور چاردیواری سے ٹیک لگائے گٹھڑی بنی، اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ دیر تک میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پھر دفعتاً میرے ذہن میں ایک کرن سی پھوٹی۔ میں نے مدھم آواز میں کہا:

"می نے۔"

وہ یوں تڑپ کر مڑی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "مینا، کیا تم ابھی تک ایک ہاتھ کی تالی بجائے جارہی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک طوفان ابھر آیا، جیسے سمندر کوزوں میں سما گیا ہو لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

مانا نمانہ

نمانہ کی والدہ خانم پر گھبراہٹ طاری تھی کہ کس طرح بیٹی سے رشتے کی بات کرے ۔ ڈرتی تھی کہیں انکار نہ کر دے ۔ وہ اپنی بیٹی کے ادلتے بدلتے موڈ سے خائف تھی ۔ اس انتظار میں تھی کہ اچھے موڈ میں ہو تو بات کرے ۔ بار بار چھوٹی انجنا کو بھیجتی "جا ، جاکر دیکھ تو ۔ تیری باجی کیا کر رہی ہے ؟"

خانم کی خالہ زاد عنبرین نے جو عرصۂ دراز سے نیروبی میں مقیم تھی اور جہاں ان کا کاروبار تھا ، اپنے بیٹے سلمان کے لیے نمانہ کا رشتہ مانگا تھا ۔ خط میں سلمان کی تصویر بھی بھیجی تھی ۔ یہ بھی لکھا تھا کہ دو ماہ پہلے سلمان پاکستان آیا تھا تلاش کے باوجود آپ کا گھر نہ ملا ورنہ مل کر آتا ۔

خانم بار بار سلمان کی تصویر دیکھتی ، دعائیں مانگتی : اللہ کرے نمانہ کو پسند آجائے ۔ پھر انجنا سے کہتی "انجنا ، تیری باجی کا موڈ کیسا ہے ؟ جاکر دیکھ تو ۔"

نمانہ کرسی پر بیٹھی میز پر پڑے ہوئے چائے کے پیالے کو گھور رہی تھی ۔ دایاں پاؤں چل رہا تھا ، جیسے انڈا پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے ۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں ۔ پیشانی پر تیر کُھدا ہوا تھا ۔ آنکھیں کھلی تھیں پر دیکھ نہیں رہی تھیں پتا نہیں وہ کہاں تھی شاید کہیں بھی نہیں تھی ۔

انجنا نے ایک نظر دیکھا اور لوٹ گئی ظاہر تھا کہ نمانہ پر موڈ طاری ہے ۔ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔

نمانہ کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود سے کیا کرے ۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ کرے ۔ سیدھی سادی بات نہیں ، کوئی انوکھی بات ، جو پٹاخے کی طرح بھک سے اڑ جائے ، اڑا دے ، چونکا دے ۔ کسی کو بھی ، چاہے دوسروں کو ، چاہے خود کو ۔

یہ نہیں کہ نمانہ نے خود سے کچھ کیا نہ تھا ۔ بہت کچھ کیا تھا ۔ انوکھا اَن

ہونا حیران کُن کئی ایک پٹاخے چلائے تھے ۔ پٹاخے سے اسے شکایت تھی کہ ایک بار چل کر ٹھس ہو جاتا ہے چلے نہیں جاتا جیسے پہیا چلے جاتا ہے ۔

ثمانہ کی والدہ خانم پرانے زمانے کی خاتون تھی ۔ سمجھ دار تھی ۔ سیانی تھی لیکن جب سے بچے جوان ہوئے تھے ، بے چاری کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی ۔ جب بھی کوئی بات کرتی تو لڑکیاں بڑے پیار سے اسے بغل میں دبالیتیں ۔ کہتیں "امی ، آپ اس بات میں دخل نہ دیں ۔ آپ نہیں سمجھتیں ۔" اس کے باوجود امی بات جاری رکھتیں تو ثمانہ کانوں پر ہتھیلیاں رکھ لیتی "امی ، بور نہ کرو نا ۔ پلیز امی ۔" خانم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نوجوان بات بات پر بور کیوں ہو جاتے ہیں ۔

انجنا کے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔ کہتی "بیٹی ، یہ بور ہونا کیا ہے ؟ ہمارے زمانے میں تو کوئی بور نہیں ہوتا تھا ۔ نہ موڈ ہوتے تھے ۔ آجکل تو ہر نوجوان کو ، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ، بور ہونے کا خدشہ لگا رہتا ہے ۔ ہر وقت ایسا کیوں ہوتا ہے ؟"

انجنا سمجھانے لگتی تو ثمانہ اسے اشارہ کرکے منع کر دیتی "ہٹاؤ ، انجنا امی نہیں سمجھیں گی ۔ جو لوگ جینے کی تڑپ سے محروم ہوں ، بھڑک کر جلنے سے خائف ہوں ، وہ بور کیسے ہوں گے بھلا ۔ جو بور ہونے کی صلاحیت سے محروم ہوں ، وہ بوریت کو کیسے سمجھیں گے ۔"

ثمانہ میں بور ہونے کی کیفیت اس زمانے سے شروع ہوئی تھی جب اس کے ذہن میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کچھ کروں ۔ کر دکھاؤں کوئی نئی بات ۔ ان سنی ۔ جو چونکا دے ۔ اور کچھ نہیں تو موم بتی کو دونوں سروں پر جلا کر بیٹھ جاؤں ۔

ثمانہ ایک کھاتے پیتے گھر کی عام سی لڑکی تھی ۔ شکل و صورت اچھی تھی ۔ ایسی نہیں جسے خوبصورت کہا جاسکے ۔ خدو خال خاصے چست تھے ۔ بدن چھریرا آنکھ میں چمک ابھی اس چمک نے خصوصی رنگ اختیار نہیں کیا تھا کبھی ذہانت ، کبھی شرارت ۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سکول میں پڑھتی تھی ۔ ابھی خود پر

فیتے کناریاں نہیں لگاتی تھی ۔ اس زمانے میں صرف ایک جذبہ طاری تھا کہ ہر وقت رومانی گیتوں کی گود میں بیٹھ کر جھولتی رہے ۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی ۔ ہمارے ہاں ہر لڑکی ، جوانی کی اولین بیداری سے بھرپور انگڑائی تک ، فلمی گیتوں کے جھولنے میں جھول جھول کر بڑی ہوتی ہے ۔ شاید کھٹائی چاٹنے کی طرح عنفوان شباب کا یہ بھی ایک تقاضا ہو ۔

مشکل یہ ہے کہ والدین نے کبھی عنفوان شباب کے حادثے کی طرف توجہ نہیں دی ۔ اسے حادثہ نہیں سمجھا اس آتش فشاں کے جاگنے کی طرف دھیان نہیں دیا ۔ اس کایا پلٹ کو کایا پلٹ نہیں سمجھا ، جس کے تحت ایک رینگتی ہوئی سنڈی تتلی بن جاتی ہے ۔

نمانہ ان دنوں رینگتی ہوئی سنڈی تھی ۔ تتلی بننے تک کئی مرحلوں سے گزری ۔ سب سے پہلے رومانی گیتوں کی مدھم آنچ پر پکتی رہی ۔ پکتی رہی اور پکنے سے پہلے ہی پک گئی ۔ ان دنوں اس کے پاس دو ٹرانسسٹر تھے ایک سرہانے دھرا رہتا ، دوسرا جیبی۔ لیٹتی تو سرہانے دھرا لوریاں دیتا یہ لوریاں بھی کیا لوریاں ہوتی ہیں ۔ نہ سونے دیتی ہیں ، نہ جاگنے دیتی ہیں ۔ سوئے سوئے جاگنا جاگے جاگے سوئے رہنا ۔ باتھ میں جاتی تو سامنے دھرا ہوتا سکول میں جاتی تو جیب سے گیتوں کے بول تھپتھپاتے ۔

کتاب پڑھتے ہوئے بھی "وحشتوں کا ساتھی ہو" کی آرزو ارد گرد منڈلاتی ۔ اس پر ایک نئی مشکل پیدا ہو جاتی ۔ وحشتیں ہوں تو ان کے ساتھی کی آرزو کرو پہلے وحشتیں پیدا کرو اور وحشتیں پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ۔

جب ہر وقت آپ بلما کو آ آ کرتے رہیں ۔ اُس کے انتظار میں بتی بال کے بنیرے اوتے رکھیں ۔ اس کی خیالی چٹھی کو گھٹ گھٹ جپھیاں پاتے رہیں ۔ تصور میں مل جائے تو آپ کو زندگی مل جائے ۔ اور پھر آپ اس پر "ہو ہو گئی قربان" ہوتے رہیں ۔ اسے اٹھنے نہ دیں ۔ یونہی پہلو میں بیٹھے رہو ۔ اور ظالم سماج کو کوستے رہیں جو وہڑے میں ویری بن کر دسدے ہیں اور پایل کی جھنکار کو بیرن بنا دیتے ہیں ۔ ان حالات میں بے چارہ پھل پکنے سے پہلے رسنے نہ لگے تو کیا کرے ۔

پھر وہ کالج میں چلی گئی ، اور خود پر گوٹے کناریاں سجانے لگی ۔

اس رومانی دور میں چار ایک لڑکے نمانہ کے قریب آئے ۔ دو کزن تھے ، جو دور کھڑے ہو کر کبوتر سی آنکھیں بنا کر دیکھتے رہتے ۔ قریب آتے تو جی جی کرنے لگتے ۔ بھلا جی جی کرنے والے بھی کسی گنتی شمار میں آتے ہیں کیا ۔ دو ایک چمکیلے تھے ، مرچیلے تھے ۔ لیکن جرأت سے خالی تھے یہ کھیل تو جرأت کا ہے ۔ نمک مرچ بھلا کیا کر سکتے ہیں ۔ البتہ پڑوسی جاندار تھا ۔ اس میں گٹس تھے آنکھ سے شرارے اڑتے تھے ۔ آنکھیں دیکھتیں کم کم تھیں ، چھیڑتی زیادہ تھیں ۔ چیونٹیوں کی طرح چمٹ جاتیں ۔ پنجے گاڑ دیتیں ۔

مشکل یہ تھی کہ پڑوسی سامنے آتا ، متبسم نگاہوں کی پھلجھڑی چلاتا اور چلا جاتا ۔ رکتا نہ تھا لڑکی کا المیہ یہ ہے کہ جو رک جائے وہ توجہ کے لائق نہیں رہتا ۔ جو شرارہ چھوڑ کر چلا جائے ۔ وہ ذہن میں اٹک جاتا ہے ۔ سنجیدہ اور مخلص جھڑ جاتا ہے ۔ تفریحی کانٹے کی طرح چبھ جاتا ہے ۔ اگر پڑوسی کچھ دیر اور قائم رہ جاتا تو شاید وہ نمانہ سے مانا بن جاتی ۔ لیکن ایسا نہ ہوا پڑوسی گھر چھوڑ کر چلا گیا ۔ نمانہ کو مرکز نہ ملا ۔

مرکز نہ ملے تو خود مرکز بننے کی آرزو ابھرتی ہے ۔

کالج جاتے ہوئے وہ اس امید پر حرکت کی چنگاریاں چھوڑتی رہی کہ راہگیر دیکھیں ، چونکیں ۔ لوگ دیکھتے ، چونکتے ۔ نمانہ کے دل میں خوشی کی رو دوڑ جاتی ۔ اطمینان سا ہو جاتا کہ سب اچھا ہے ۔ چونکانا اس کا مشغلہ بن گیا ۔

کالج میں نمانہ نے چار ایک شوخ لڑکیوں کا ایک ٹولا بنا لیا جس کا مسلک چونکانا تھا استانیوں کو ، سہیلیوں کو ، کلاس فیلوز کو ۔ یہ ٹولا سارے کالج میں مشہور تھا ۔ ان کی جرأت پر لڑکیاں تالیاں بجاتیں ۔ چپ چپیتیوں کے دلوں میں لڈو پھوٹتے ۔ استانیاں ان کی باتوں کو ان سنا کرنے کی آڑ میں غور سے سنتیں ، سراہتیں ، پرانی یادوں میں کھو جاتیں ۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ، لیکن ایسا ہوتا ہے ۔ جس کا مقصد چونکانا بن جائے وہ خود اثر سے بھیگنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے ۔ جو محروم ہو جائے وہ سوکھ کر کاٹھ بن جاتی ہے ۔ دقت یہ ہے کہ عورت کی غایت بھیگنا ہے ، بھگو دینا ہے ، سوکھنا نہیں ۔

سرو کی طرح تن کر کھڑے رہنا نہیں ۔ بیل کی طرح خود کو حوالے کر دینا ہے ۔

نمانہ آہستہ آہستہ کاٹھ بنتی گئی ۔ جوں جوں بنتی گئی توں توں رومان کا شغل بے معنی ہوتا گیا حتٰی کہ بالکل دل سے اتر گیا ۔ خوابوں کا دولہا پس پشت پڑ گیا ۔ بنگلہ اور کار آگے آکھڑے ہوئے ۔

یونیورسٹی میں چونکانے کے کوائف بدل گئے ۔ وہاں نہ تو رنگین حرکات کام آتی تھیں نہ کیوٹ ہیرڈو ۔ نہ گریس فل پوز ، نہ نخرانہ بات لوگ ان باتوں کو اپریشیٹ ضرور کرتے تھے، چونکتے نہ تھے ۔ چونکتے بھی تو چونک کو جذب کر لیتے ۔ پی جاتے کہ اظہار نہ ہو پائے ۔

نمانہ کی نظر میں یونیورسٹی کے بیشتر لڑکے کراؤڈ کی حیثیت رکھتے تھے ۔ صرف چند ایک وِد اِن کوئسچن تھے ۔ دو ایک تو خالص ڈرائنگ رومرز تھے ، جیسے بینڈ باکس سے سیدھے یونیورسٹی آگئے ہوں ۔ ان کے پاس یا تو لباس تھے اور یامینرز ۔ دونوں مخملی تھے شخصیت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ ہے بھی یا نہیں ۔

چار ایک بھڑکیلے تھے ۔ شو مارنے کے دلدادہ ۔ شو روم بنا سجا ۔ اندر دکان خالی ۔ چار ایک کتابی تھے ۔ رٹے رٹائے جملے بولتے ۔ حوالے دیتے امتحانوں میں پوزیشن کے دلدادہ ۔ ایک انٹلکچول تھا ۔ سارا دن لائبریری میں گھسا رہتا بات کرتا تو کتاب کی بو آتی لڑکیوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی دیتا بھی تو تحقیقی قسم کی انہیں شخصیت کے لحاظ سے کلاسی فائی کرتا رہتا ۔ اس نے کلاس کی ہر لڑکی کو لیبل کر رکھا تھا ۔ رعنا کلو پیڑا تھی جمیلہ پینگوئین ۔ روزی گنگلنگ ڈال ۔ عاصمہ امیزن ۔ پیڑا فلمی ہیروئن اور نمانہ کوبرا ۔

نمانہ کو پتا چلا کہ اسے کوبرا کا نام دیا گیا ہے تو اس کا ہُڈ اور بھی تن گیا ۔ گردن کاٹھ بن گئی ۔ اس پر رضا نے اسے طعنہ دیا ۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا "ہم نے کئی ایک کوبروں کو رام کر کے بین پر لپیٹ لیا ۔"

"پلاسٹک کے ہوں گے ۔" نمانہ بولی ۔

"زہر کی پوٹلی نکالنا جانتے ہیں ہم ۔"

"پھر آنکھ کھل جاتی ہے" وہ ہنسی ۔

رضا کو غصہ آگیا ، اس لیے کہ بہت سے لڑکے سن رہے تھے ، ہنس

رہے تھے ۔ لاجواب ہو جاؤ تو غصہ تو آتا ہی ہے ۔

"ہم سے بچ کر رہو محترمہ" اس نے گویا نعرہ لگایا ۔

"رضا صاحب" وہ بولی "آپ تو صرف نعرے لگانا جانتے ہیں ، یا بسوں کو آگ لگانا ۔ میں بس نہیں ہوں ۔"

تمام لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

رضا سٹوڈنٹ لیڈر تھا ۔ اس کے ساتھ آٹھ دس حواری تھے ۔ سب کے سب شوشے۔پروفیسروں کے سامنے التزاماً مونچھ مروڑ کر بات کرتے ۔ رضا گروپ سے سبھی ڈرتے تھے ، لیکن نمانہ نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا ۔

یونیورسٹی کے دور میں صرف ایک واقعہ ہوا تھا ، جس نے نمانہ کو الٹھ پلتھ کر کے رکھ دیا تھا ۔ کوشش کے باوجود وہ اسے بھول نہ سکی تھی ۔ جب بھی یاد آجاتا تو اس کی انا کو ازسر نو ٹھیس لگتی ۔ اس یاد میں لذت کا عنصر بھی تھا ، جسے وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی ۔ بظاہر وہ ایک معمولی سا واقعہ تھا لیکن جو زندگی بھر دوسروں کو چونکاتی رہی ہو ، اسے کوئی چونکا دے ، اس کی انا کو تہس نہس کر کے رکھ دے ، تو بھولنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

دو ایک ماہ ہوئے ہوں گے ، اس روز وہ لائبریری میں بیٹھی نوٹس لیتی رہی ۔ شام پڑگئی تو اٹھی ۔ بس کی روانگی میں چالیس منٹ باقی تھے سوچا چلو کینٹین سے ایک پیالی چائے پیتی چلوں ۔

کینٹین خالی پڑی تھی ۔ کوئی موجود نہ تھا ۔ ایک میز پر چائے کا سیٹ دھرا تھا ۔ پلیٹ میں چار ایک بسکٹ تھے ۔ اس نے ٹی پاٹ کو ہاتھ لگایا ۔ بھری ہوئی اور گرم تھی ۔

عین اس وقت ایک تیکھا سا ، تیز سا ، نوجوان داخل ہوا ۔ بے تکلفی سے بولا "بہت اچھا ہوا آپ آگئیں میرے لیے اکیلے چائے پینا مشکل ہو رہا تھا ۔ اکیلے چائے پینے کی عادت نہیں ۔ بیٹھیے ، چائے بنائیے ۔ ایک پیالی میرے لیے بھی بنا دیجیے ۔"

نمانہ کو اس بے تکلفی پر بڑا غصہ آیا ۔ بات ان سنی کر کے مڑی اور

کینٹین کے لڑکے کو آوازیں دینے لگی "چھوٹے ۔"

"لڑکا پیٹیز لینے گیا ہے ۔ ابھی آجائے گا" نوجوان بولا "جب تک آپ چائے بنائیے نا۔"

نمانہ نے غصے بھری نگاہ نوجوان پر ڈالی اور جانے کے لیے مڑی ۔

نوجوان نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا ۔ بولا دیکھیے ، اگر آپ یوں نہیں مانیں گی تو میں بانہوں میں اٹھا کر کرسی پر بٹھا دوں گا ۔"

نمانہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے "گٹ اسائیڈ" وہ چلائی ۔ نوجوان نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دے کر کرسی پر بٹھا دیا ۔ نمانہ چیخی چلائی تو وہ بولا یہاں آپ کی مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا ۔ چپ چاپ چائے بنائیے ۔" یہ کہہ کر وہ اس کے مقابل کی کرسی پر جا بیٹھا ۔ نمانہ چپ چاپ غصے میں ابلتی ہوئی چائے بنانے لگی ۔

"آپ ڈرتی کیوں ہیں ؟" وہ بولا "آپ لڈو نہیں کہ کوئی کھا جائے گا اور مجھے لڈو کھانے کا شوق نہیں میں نے صرف یہ ریکوسٹ کی تھی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک پیالہ چائے پی لیں ۔ اس سے میرا کوئی مقصد نہ تھا معمولی سی کرٹسی ۔ تھینک یو" اس نے چائے کا پیالہ پکڑ کر کہا ۔

کچھ دیر دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے ۔

"آپ کا غصہ ابھی تک نہیں اترا" وہ بولا "میری زیادتی پر آپ خود کو سزا کیوں دے رہی ہیں ؟ شاید آپ سوچ رہی ہیں کہ اتھارٹیز سے میری شکایت کریں گی ۔ بے کار ہے ۔ میں یونیورسٹی کا نہیں ہوں ۔ باہر سے آیا ہوں ۔ یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا ۔ وہ ملا نہیں تو یہاں چائے پینے آگیا ۔" وہ رک گیا ۔

"پتا نہیں کیوں" وہ بولا "یہاں ہر لڑکی خود کو ہر وقت لڑکی سمجھتی ہے ۔ کبھی بھول بھی جایا کریں کہ آپ لڑکی ہیں ۔ اس قدر سیکس کانشس ہونا اچھا نہیں" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اب آپ جاسکتی ہیں ۔ تھینک یو سو مچ ۔ خدا حافظ ۔"

نمانہ گھر پہنچی تو یوں تنی ہوئی تھی جیسے سارنگی کے تار ۔ تناؤ ذرا کم ہوتا

تو لذت کی ایک رو جسم میں دوڑ جاتی ۔ اس پر احتجاج پیدا ہوتا اور وہ پھر سے تن جاتی تنے جاتی تھی کنپٹیاں پھر سے بجنے لگتیں ۔ اس وقت اس کے دل میں ایک خواہش تھی : انتقام ، انتقام ۔ پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا ۔ شدت کم ہوتی گئی لیکن جب بھی چائے کا پیالہ سامنے آتا تو یاد تازہ ہو جاتی۔

نمانہ کی والدہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی ۔ ایک نظر نمانہ کی طرف دیکھا ۔ وہ بیٹھی چائے کے پیالے کو گھور رہی تھی ۔ نگاہیں چڑھی ہوئی تھیں ۔ پاؤں چل رہا تھا ۔

"بیٹی" وہ بولی "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے ۔" نمانہ سنبھل کر بیٹھ گئی ۔ ماں نے کہا "بیٹی تیرے لیے ایک رشتہ آیا ہے ۔ تُو منظور کر یا نہ کر ، تیری مرضی ۔ ہم دخل نہیں دیں گے ۔ یہ لڑکے کی تصویر ہے ۔" اس نے تصویر نمانہ کے سامنے رکھ دی ۔

تصویر دیکھ کر نمانہ چونکی ۔ آنکھیں غصے میں ابل آئیں ۔ ان جانے میں پیر چلایا یا شاید انگڑائی لی ہو ۔ چائے کی پیالی گر کر چُور چُور ہوگئی ۔

نوٹ :

قارئین کرام ! نمانہ کے کردار اور واقعات کی روشنی میں آپ فیصلہ کریں کہ نمانہ نے کیا فیصلہ کیا ؟ ہاں یا نہ ؟ ـــــ کیا جذبۂ انتقام جیت گیا ، یا وہ دبی دبی خوشی جسے اس نے کبھی ابھرنے نہ دیا تھا ؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بظاہر انتقام در پردہ خوشی ۔ مصنف

..........○..........

ڈیوی

اونہوں ! رانگ نمبر بہت آزما دیکھے بے کار ۔ سب ایک ہی بولی بولتے ہیں ۔ آئی لو یو ڈارلنگ ۔۔۔۔۔ ہنہہ ۔ نہ دیکھا ۔ نہ جانا ، اور آئی لو یو ڈارلنگ ۔ بھلا کوئی بات ہوئی ۔۔۔۔۔ سب کو محبت کا بخار چڑھا ہوا ہے ۔ میں تو اکتا گئی ۔ بور ۔

آج صبح ایک رانگ نمبر کہہ رہا تھا "فالِنگ اِن لوو وِد یُو ۔ وہاٹ ام آئی ٹو ڈو ؟ آئی کانٹ ہلپ اٹ ۔" بے چارا ہلپ لِس سبھی ہلپ لِس ہو جاتے ہیں ، لڑکی کی آواز سن کر اور پھر ملنے کا تقاضا ۔۔۔۔۔ ملو ، ملو ، ملو ، پلیز ۔ ڈارلنگ یومسٹ ۔

پرسوں ایک اولڈش بول رہا تھا ۔ میں نے سوچا ہٹ کر بات کرے گا ۔۔۔۔۔ اونہوں ! ۔ وہی ایک رٹ ، جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو ۔

سوچتی ہوں یہ لو کیا چیز ہے ۔ ہر جگہ اسی کا ذکر ہے ۔ قصوں میں ، کہانیوں میں ، شعروں میں ، گیتوں میں اور یہ رانگ نمبر کا لو جو ہے وہ تو خالی گڈ ٹائم ہے ۔ ہلّا گلّا ۔ ممی تو مجھے گڑیا سمجھتی ہے کہتی ہے : ڈالی ، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں ۔ کیوں نہیں سمجھتی بھلا ؟ سب سمجھتی ہوں ۔ چودھویں سال میں ہوں ۔ اور پھر جس ماحول میں رہتی ہوں اس کا تو کام ہی یہی ہے ۔ سمجھانا ۔ معلومات بہم پہنچانا ۔ اشاروں کنایوں سے نہیں ، کھل کر بات کرنا بھرے منہ سے کہہ دینا لاگ لپٹ نہیں ۔ ہیرا پھیری نہیں ۔ رکھ رکھاؤ نہیں ۔ سپاٹ بات کہہ دینا ۔ یوں جیسے غصے میں گالی بک دو ۔۔۔۔۔ اشتہار میں ، اخبار میں ، فلمی گیت میں ، چیپ ناول میں ، ڈائجسٹ میں ، ایک طوفان آیا ہوا ہے اس میڈیا کا سمجھانے کا ۔ انفرمیشن بہم پہنچانے کا ۔

ابھی پرسوں کی بات ہے ، خالو کہہ رہے تھے کہ آج چھ سال کا بچہ جتنا کچھ

جانتا ہے ، پرانے زمانے میں اتنا پچیس سال کا جوان بھی نہیں جانتا تھا ۔
پھر بھی ممی مجھے ڈال سمجھتی ہے ۔ ڈالی کہہ کر بلاتی ہے ، مجھے کبھی اشتا کہہ کر نہیں بلایا ۔ وہ سمجھتی ہے ، میں کچھ نہیں سمجھتی۔ سمجھتی تو میں سب کچھ ہوں ۔ بس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لو کیا چیز ہے ۔

ویسے لو سے تو ہمارا اپنا گھر بھرا ہوا ہے ۔ یوں پچ پچ کرتا ہے جیسے گلا ہوا آم ہو ۔

ممی اور ڈیڈی اگرچہ اکٹھے رہتے ہیں ، مگر اکٹھے نہیں رہتے ، بڑے امینسی پینڈ ہیں وہ ۔ آپس میں انڈر سٹینڈنگ پیدا کر رکھی ہے : ڈارلنگ ، تم اپنے رستے پر چلو ، میں اپنے رستے پر ۔ دونوں اپنے اپنے رستے پر چل رہے ہیں ۔ کبھی کبھار ملاپ ہو جاتا ہے شاید ہو جاتا ہو ہم تو صرف ہیلو ہیلو سنتے ہیں ۔

ممی کی مشکل یہ ہے کہ اسے علم نہیں کہ وہ پینتالیس سال کی ہو چکی ہے ۔ پتا نہیں خود کو بیس کی سمجھتی ہے یا بائیس کی ۔ ویسے تو اکثر آئینہ دیکھتی رہتی ہے ، پر آئینے میں کبھی خود کو نہیں دیکھا ۔ آئینے میں کوئی بھی خود کو نہیں دیکھتا ، ورنہ بہت سی مشکلات حل ہو جائیں آئینے میں ہر کوئی وہ دیکھتا ہے جو دیکھنا چاہتا ہے ۔ وہ نہیں جو سامنے ہوتا ہے ۔

بس ممی خود کو بنانے سنوارنے میں لگی رہتی ہے ۔ میک اپ ہو رہا ہے بال کٹوائے جا رہے ہیں گھنگھر بنائے جا رہے ہیں ۔ سلمنگ کا بخار چڑھا ہوا ہے ۔ شام کو یوگا ، صبح کو ورزشی سائیکل اور پھر دن بھر ڈائٹنگ ۔ پیٹ بھر کر نہ کھاؤ ۔ گھنٹے گھنٹے بعد کوئی سنیک ، کوئی فروٹ ، کوئی سلائس ۔ میٹھا ؟ اونہوں ! گھی ؟ بالکل نہیں ۔ اناج ؟ کم کم ۔ بیچاری ممی ۔۔۔ بھوکی مر رہی ہے پھر بھی پنڈا تھل تھل کرتا ہے ۔ ہئے ! وِد ان کوئسچن رہنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ۔

پھر بھی ممی کامیاب ہے ۔۔۔۔ ایک نا ایک فرنڈ ساتھ لیے پھرتی ہے پہلے ڈیوڈ تھا ، پھر افضل تھا اب توقیر ہے ۔ ڈیڈی تو اس معاملے میں پاسٹ ماسٹر ہیں ۔ ہر وقت ارد گرد کالج والیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔

ڈیڈی بنتے سنورتے نہیں ۔ اپنی ایج کیما فلاج نہیں کرتے ۔ بناوٹ ،

سجاوٹ ، ڈریس ، ڈیپورٹمنٹ سے بے نیاز ہیں ۔ ڈیڈی کو ان باتوں کی کیا پروا ۔ انہیں باتیں جو کرنی آتی ہیں ۔ مائی گاڈ ! کیا باتیں کرتے ہیں سننے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے ۔ کیسی کیسی بات ذہن سے نکالتے ہیں کہ مداری کا چھو منتر شرما کر رہ جائے ۔

ڈیڈی بہت پڑھے لکھے ہیں ، لیکن کیا مجال کہ بات میں سے کتاب کی بو آئے یا فلسفے کا پتھر نکلے ۔ بالکل نہیں ۔ ہلکی پھلکی شگفتہ باتیں سادہ بنی سجی نہیں لفظ نہیں ۔ باتیں ۔ بات سے بات نکلتی ہے اور پھر بات جیسے پھلجھڑی چل گئی ہو ۔ پھر یہ بھی کہ چھوٹے چھوٹے عام سے لفظوں میں بڑی بات کہہ دیتے ہیں ۔ اتنی بڑی کہ غوطے لگاتے رہو ۔ ویسے نہ لگاؤ تو بے شک خالی اوپر ہی اوپر تیرتے رہو ۔

میں جانوں بات میں بڑی کشش ہوتی ہے ۔ خدوخال کی بناوٹ سجاوٹ سے کہیں زیادہ۔ نتیجہ یہ کہ ڈیڈی کے گرد جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔ یونیورسٹی میں بھی ، گھر پر بھی نوجوان کھچے چلے آتے ہیں لڑکے کم کم ، لڑکیاں زیادہ۔لڑکوں میں ذہنی لگاؤ پیدا ہوتا ہے ، لڑکیوں میں جذباتی ۔ ڈیڈی راجا اِندر بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ممی کہتی ہیں : ان کے افیئرز چلتے ہیں ۔ پتا نہیں شاید چلتے ہوں لیکن جسے اتنی واہ واملے ، سننے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں ، وہ پھر افیئر سے بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ بہرحال ، یہ تو ہے کہ لڑکیاں ڈیڈی پر مرتی ہیں۔محبت کے بھبھا کے ضرور اٹھتے ہیں ۔ منظر بھیگا بھیگا ہوتا ہے اوس چاہے پڑے نہ پڑے اور پڑ بھی جائے تو کیا مضائقہ ۔ ڈیڈی بھی تو بڑے امینفسی پینٹڈ ہیں ۔

یہ امینفسی پینٹڈ محبت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی ۔ یوں ہے جیسے کائے بھینسوں جیسی ہو ۔ یہ محبت تو کی جاتی ہے ، ہوتی نہیں ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے محبت ہو جائے کروں نہیں ، ہو جائے ۔ ایسی ہو جائے کہ جی چاہے اس بندھن سے چھوٹ جاؤں لیکن چھٹنا محال ہو جائے ۔ جان عذاب میں پڑ جائے ۔ پتا نہیں میرا جی ایسا کیوں چاہتا ہے ؟

میرے گھر والے ، ممی ، ڈیڈی ، میرا سارا ماحول ، سکول ، سہیلیاں ، کزن ، مجھے ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ محبت کر ۔ کرنے والی محبت کر ، اور

جی ۔

ساری مغربی تہذیب عورتوں کو اسی بات پر مائل کرتی رہتی ہے کہ اٹھ ، محبت کر ، اور جی ۔ یہی زندگی ہے ۔ یہی خوشی ہے ۔ یہی سب کچھ ہے اہل مغرب سبھی اسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں ۔ کرنے والی محبت میں لت پت ہو رہے ہیں ۔ محبوبوں کے کیو لگے ہوئے ہیں ۔ کسی کا دسواں محبوب ہے ، کسی کا پندھرواں ۔ محبوب یوں بدلتے ہیں جیسے جرابیں ہوں ۔ پرانی ہوگئیں تو پھینک کر نئی لے آئے ۔ کہتے ہیں ، یہ آزادی ہے ۔ آزادی تو ہے ، پر محبت نہیں محبت تو خود ایک بندھن ہے ۔ ایسا بندھن جس سے آزاد ہونے کو جی نہیں چاہتا ۔ اور جی چاہے بھی تو آزاد ہونا ممکن نہیں ہوتا ۔

دیکھ لو ، کرنے والی محبت اور آزادی نے مغرب کو کیا کر دیا ہے ۔ نہ محبت کی توقیر رہی ہے ، نہ عورت کی ، نہ رشتوں کی بندھن ٹوٹ گئے ہیں ۔ زندگی سے دل اچاٹ ہوگئے ہیں ۔ آوارہ گھومو ۔ نشہ کرو خوش وقتی تفریح ۔

تفریح تو وقتی چیز ہے ۔ جو لوگ تفریح کے پیچھے دوڑتے ہیں ، وہ خود وقتی بن جاتے ہیں ۔ پھر یہ بھی کہ تفریح میں ادل بدل کے بغیر بات نہیں بنتی تفریح کی سڑک پر چہل قدمی کرو تو پھر بور ہو کر سڑک چھوڑ کر ، پگڈنڈیوں پر چڑھنا ضروری ہو جاتا ہے ۔ کرنے والی محبت ایسی ہی اک تفریح ہے ۔

بیٹے ! ہو جانے والی محبت کی کیا بات ہے ۔ ادھر نکڑ پر جو پھلوں کی ریڑھی لگاتا ہے نا ۔ کیا نام ہے اس کا حمیدا ۔ ہوگا تیس پنتیس کا ۔ جب گیارہ بجتے ہیں تو وہ اپنی ریڑھی چھوڑ کر ہمارے گھر کے دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے ۔ چاہے کڑکتی دھوپ ہو یا بارش ہو رہی ہو دروازے پر کھڑا رہتا ہے ۔ کھڑا رہتا ہے ۔ اس وقت اسے نہ گاہک کی پرواہ ہوتی ، نہ بکری کی ہمارے گیٹ کے مقابل جو گلی ہے اسے دیکھتا رہتا ہے دیکھتا رہتا ہے پھر وہ خاتون گلی سے باہر نکلتی ہے بس بت بنا اسے دیکھتا رہتا ہے اسے بلاتا نہیں کھنگورا نہیں مارتا ، کہ ادھر دیکھ ، میں تیری راہوں میں کھڑا ہوں ۔ نہ نہ ۔ بالکل نہیں ۔ اس کا پیچھا نہیں کرتا ۔ بس چپ چاپ اداس نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے ۔

وہ اللہ کی بندی بھی چپ چاپ سمٹی سمٹائی گزر جاتی ہے ۔ نگاہ اوپر نہیں

اٹھاتی ۔ اس کی چال میں ٹھمک تک پیدا نہیں ہوتی ۔ شاید اسے احساس ہی نہیں کہ کوئی روز بلاناغہ اسے دیکھنے کے لیے راہ میں کھڑا رہتا ہے ۔ لیکن نہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے اور عورت کو پتا ہی نہ چلے ۔ ضرور اسے پتا ہو گا ۔ پھر بھی وہ لپٹی لپٹائی یوں گزر جاتی ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔ ہوتا ہو گا ۔ ضرور ہوتا ہو گا ۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہو گا ۔ میں جانوں ، بھری ہوتی ہے پر چھلکتی نہیں ۔ وہ تو کرنے والی محبت ہوتی ہے جو چھلکتی ہے ۔ بھری نہیں خالی چھلکتی ہے ۔ صرف چھلکن ہی چھلکن پھر وہ غلام علی کی بات ۔

بٹے ! کیا بات تھی غلام علی کی بات کی ۔ سن کر میں دو دن سُن رہی تھی ۔

غلام علی کی بات چچا شیر محمد نے سنائی تھی ۔ جب ورلڈ وار ختم ہوئی تھی تب کی بات ہے ۔ ان دنوں ہندوستانی رجمنٹ کا ایک یونٹ فرانس کے ایک گاؤں کے قریب مقیم تھا ۔ اس یونٹ میں سارے جوان جہلمی تھے ۔ ان میں غلام علی بھی تھا ۔ اونچا لمبا شیں جوان ۔

غلام علی کو گاؤں کی ایک فرانسیسی دوشیزہ سے محبت ہو گئی ۔ پھر غلام علی کا معمول ہو گیا کہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کے وقت اس لڑکی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا ۔ کھڑا رہتا ، کھڑا رہتا ۔ چاہے بوندا باندی ہو رہی ہوتی یا موسلا دھار بارش پڑ رہی ہوتی ۔ وہ وہاں کھڑا رہتا طوفان آتے ، برف باری ہوتی ، لیکن غلام علی وہاں کھڑا رہتا ۔

غلام علی تب تک وہاں کھڑا رہتا جب تک اتفاق سے دوشیزہ کھڑکی میں نہ آکھڑی ہوتی ۔ اسے دیکھ کر غلام علی اٹینشن ہو کر اسے سلوٹ مارتا ۔ جب وہ سامنے کھڑی رہتی ، سلوٹ کیے کھڑا رہتا ۔ چلی جاتی تو وہ اپنے یونٹ کی طرف چل پڑتا ۔

گاؤں والے غلام علی کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران ہوتے کہ یہ جوان یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے ۔ گاؤں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں ۔ پھر جب انہیں پتا چلا کہ اسے فرانس کی بیٹی ماریانہ سے محبت ہے تو وہ اور بھی حیران ہوئے ۔ یہ

کیسی محبت ہے کہ مکان کے سامنے کھڑے رہے کہ محبوبہ سامنے آئے تو اسے سلوٹ مارے! جو محبت ہے تو محبوبہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ ۔ اندر جاؤ اس کا ہاتھ چومو ۔ پاس بیٹھو ۔ فرانس والوں کو بھلا کیا پتا تھا کہ ہو جانے والی محبت کیا ہوتی ہے ۔ وہ تو بس کرنے والی محبت کو جانتے تھے ۔

جب ماریانہ کے باپ کو پتا چلا تو وہ غصہ کھا گیا ۔ بولا "یہ کیا بدتمیزی ہے ۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اسے اندر بلاؤ اس کی خاطر تواضع کرو ۔ پاس بٹھاؤ ۔ اس کی دل جوئی کرو ۔"

اس پر ماریانہ کا بھائی دوڑا دوڑا غلام علی کے پاس گیا ۔ "آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں ؟ اندر آئیے ۔ ماریانہ کے پاس بیٹھیے ۔"

اس پر غلام علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ بولا "میں اندر جاؤں ؟ ماریانہ کے پاس بیٹھوں ؟ ------ میں ؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا ؟" یہ جان کر گاؤں والے بے حد حیران ہوئے ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی ۔

ماریانہ تو یہ سن کر حیرت سے تصویر بن کر رہ گئی ۔ مائی گاڈ! یہ کیسی محبت ہے ، جس کا مقصد مجھے دیوی بنا کر پوجا کرنا ہے اور بس اس کے اندر ایک طوفان اٹھا ۔ ایسا طوفان جو پہلے کبھی نہ اٹھا تھا ۔ چھم چھم آنسو بہنے لگے ۔ وہ آنسو خوشی کے آنسو تھے ۔ اس کے دل میں ایک اَن جانا مان بیدار ہوا ، جو اس کے انگ انگ میں رچ گیا ۔ اور اس مان نے اسے گاڈس بنا دیا ۔

پھر جب غلام علی کے یونٹ نے وہاں سے کوچ کیا تو غلام علی سب سے پیچھے تھا ۔ اس کا منہ گاؤں کی طرف تھا اور وہ الٹے پاؤں چل رہا تھا ، جیسے کسی درگاہ سے باہر نکلتے ہیں اور اس کا ہاتھ مسلسل سلوٹ میں تھا ۔ ادھر ماریانہ سڑک پر نکل آئی تھی اور مسلسل ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ رہی تھی ۔ اس کے پیچھے سارے گاؤں والے آنسو بہار ہے تھے ۔ گاؤں کی گوریاں ہچکیاں لے رہی تھیں کہ کاش! ہماری زندگی میں بھی کوئی غلام علی آتا ۔

بیٹے! میں بھی سوچتی ہوں کہ میری زندگی میں بھی ------ ہائیں! یہ کیسی آواز ہے ------ ذرا ٹھہرو ------ ہاں ، وہی ہے ، وہی ------ اس کے سائیکل کی آواز سن کر پتا نہیں کیا ہوتا ہے ۔ میں چونک جاتی ہوں ۔

ویسے سامنے کی سڑک پر بیسیوں سائیکل گزرتے ہیں ۔ کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ پتا نہیں اس کے سائیکل کی آواز میں کیا بات ہے کہ میں چونک جاتی ہوں ۔ ہمارے مالی کا بیٹا ہے ۔ پڑھ رہا ہے ۔ ویسے کبھی کبھی اس کا ابا اسے ہمارے گھر میں کام کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے ۔ عام سے خدو خال ہیں ، جیسے ہوتے ہیں لڑکوں کے ہاں ، ہونٹ ــــــ ہونٹوں نے ایسی چٹکی سی بھر رکھی ہے یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی لطیفہ سنا ہو ۔ اس کے ہاتھ ذرا بھی آرٹسٹک نہیں ۔ موٹے بھدے پتا نہیں کیوں وہ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں ۔ جب وہ کٹائی کا کام کر رہا ہوتا ہے تو میں چوری چوری اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہتی ہوں ۔

بہانے بہانے میں اسے اپنے کمرے میں بلا لیا کرتی ہوں ۔ اسی لیے تو میں نے اپنے کمرے میں تین گملے سجا رکھے ہیں ۔ ایک پام کا ، ایک کیکٹس کا اور ایک مشروم کا ۔ جب وہ اندر آتا ہے تو سارا کمرا اسکی خوشبو سے بھر جاتا ہے ۔

جب میں اس سے بات کرتی ہوں تو وہ نظریں جھکائے رکھتا ہے ۔ جب میں کسی اور طرف دیکھتی ہوں تو وہ مجھے دیکھتا ہے ۔ دیکھتا رہتا ہے ۔ دیکھتا رہتا ہے ۔ میں جان بوجھ کر ، جھوٹ موٹ ، دوسری طرف دیکھتی رہتی ہوں ۔

مائی گاڈ ! جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے غلام علی سلوٹ مارے کھڑا ہو ۔

اس وقت میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے ۔ وہ کچھ کچھ طوفان بن کر میرے انگ انگ میں رچ جاتا ہے ۔ ایک مان انگڑائی لیتا ہے ۔ ایک تفاخر ــــــ ایک پھلجھڑی سی چل جاتی ہے اور مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے اس کی نگاہوں نے مجھے دیوی بنا دیا ہو ۔

…… ○ ……

گرین ما

یا اللہ ! تو نے مجھے کتنے بھاگ لگائے ہیں ۔ کتنا سوہنا گھر ہے یہ ۔ کتنا سجا ہوا ہے ۔ ایسا ایسا سامان لگا ہے ۔ کیسے کیسے غالیچے ہیں ۔ صوفے ہیں کرسیاں ہیں کیسی کیسی سجاوٹیں لگی ہوئی ہیں ۔ دیواریں ہی دیکھو ، روغن سے لشک رہی ہیں ۔

ہاتھ لگانے سے میلا ہوتا ہے یہ گھر نہ میں تو ہاتھ نہیں لگاتی ۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتی میں کیوں چیزوں کو میلا کروں ۔ خواہ مخواہ بس چیزوں کو دیکھتی ہوں سامان کو دیکھتی ہوں ۔ اللہ کی شان ہے !

کل ممی کہہ رہا تھا "گرینی ، اس ٹیپ رکاٹ کو ہاتھ نہ لگانا ۔ نہ نہ ۔ جو ہاتھ لگاؤ تو یہ خراب ہو جاتا ہے ۔ سمجھی گرین ما ؟" وہ مجھے سمجھاتا رہتا ہے : گرینی یہ نہیں کرنا ، وہ نہیں کرنا یوں کرو تو یوں ہو جاتا ہے ووں کرو تو ووں ہو جاتا ہے ۔ وہ سارا دن ٹیپ رکاٹ سے کھیلتا رہتا ہے اسے پتا ہے نا اسے سب چیزوں کا پتا ہے یہ بٹن دباؤ تو ٹیپ رکاٹ بولتا ہے ۔ یہ دباؤ تو چپ ہو جاتا ہے اور مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں میں کیوں لگاؤں ہاتھ ؟

پھر امی کہا کرتی ہے "گرین ما ، تیرے ہاتھ کیسے ہیں ، جیسے ہڈیوں پر ڈھیلا غلاف چڑھا ہو" ۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔ اب تو ہڈیاں رہ گئی ہیں ۔ ہڈیاں اور میلی میلی جھریاں ۔ اتنے میلے ہیں میرے ہاتھ کہ میں انہیں چھپائے پھرتی ہوں پتا نہیں اتنے میلے کیوں لگتے ہیں ۔ اللہ کے حکم سے پانچ دفعہ دھوتی ہوں ۔ پاک کرتی ہوں پاک تو ہو جاتے ہیں پر رہتے میلے ہی ہیں ۔

امی کہتی ہے "گرینی ، کسی کھانے والی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا کرتے ، ہاں گلاس نیچے سے اٹھاتے ہیں ، اوپر سے نہیں چینی چمچے سے ڈالتے ہیں ، انگلی سے نہیں سمجھی گرینی ؟"

اس روز جب میں کچن میں پیڑھی پر بیٹھی روٹی کھا رہی تھی تو اسی کتنی ناراض ہوئی تھی ۔ "ہئے! گرینی ۔ روٹی پر سالن ؟ ایسا نہیں کیا کرتے ۔ روٹی پر سالن نہیں ڈالا کرتے ۔ سالن پلیٹ میں ڈالو ۔ روٹی دوسری پلیٹ میں رکھو ۔ ڈائننگ میز پر بیٹھو پھر کھاؤ ۔ ہاں ۔"

اب میں کیا کروں ؟ روٹی پر سالن ڈالنے کی پرانی عادت جو ہوئی اور پھر میز پر بیٹھ کر کھانے کی مجھے عادت نہیں نا ۔ مجھے اوپرا اوپرا لگتا ہے ۔ نہ ، میں نہیں میز پر بیٹھتی جبھی تو چوری چوری روٹی کھاتی ہوں ، کچن میں بیٹھ کر ، کہ کوئی دیکھ نہ لے ۔ پر کبھی کبھی پکڑی جاتی ہوں نا ۔ پھر بچے مجھ سے لڑتے ہیں "گرینی ، تو چور ہے کیا ؟ پھر چھپ چھپ کر کیوں کھاتی ہے روٹی ؟" لو ، میں کیا چور ہوں ۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے ۔ میرا پیٹ جایا میرا اپنا صفی میرے جگر کا ٹکڑا ۔

اللہ اسے اور مرتبہ دے ۔ اور بڑا بنگلہ دے اور سامان دے ، لشک لشک کرتا سامان مجھے کتنی خوشی ہے ۔ اللہ نے میرے صفی کو کتنے بھاگ لگائے ہیں ۔ جم جم جیوے جوانیاں مانے ۔

پھر وہ بڑی لڑکی ہے ، سیما یوں توری کی طرح نکلی ہے کہ حد نہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گئی ہے ۔ بوٹا سا قد ، اور ایسی چھب کہ دیکھتے ہی رہ جاؤ یوں پتلی پتنگ اونچی لمبی جیسے تر ہو تر ۔ ٹپ ٹپ چلتی ہے جیسے میم ہو میم ۔ بس منہ پر ماس نہیں آیا پتا نہیں آجکل منہ پر ماس کیوں نہیں آتا ! ہمارے زمانے میں نوجوان لڑکی بیٹھتی تھی تو پیڑھی لبالب بھر جایا کرتی تھی ۔ منہ کی طرف دیکھتے تو گال ابھرے ابھرے ہوتے اور پھر لال لال جیسے سیب ہوں ۔ آجکل تو پچکے ہوتے ہیں اور اللہ ماری زردی ہی زردی ، جیسے منہ پر سرسوں کا کھیت اگا ہو ۔ سیما بیٹھتی ہے تو کرسی بھی نہیں بھرتی ۔ خالی رہ جاتی ہے ۔ اونہوں ! ــــــ بیٹھے نہیں سیما کو تو چلتے دیکھو ، یا جب ڈانس کر رہی ہو ۔ میرا تو جی خوش ہو جاتا ہے دیکھ کر اتنی جان ہے اس میں کوئی حد نہیں ۔ جیسے بجلی بھری ہوئی ہو ۔ اللہ عمر دراز کرے ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ بیٹھ کر اس سے باتاں کروں پر وہ بیٹھے بھی ۔ جو بیٹھ بھی جائے تو ٹانگ چلتی رہتی ہے ۔ ٹانگ نہیں تو پاؤں

ہی چلتا ہے ۔ یوں جیسے انڈا پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے ۔

چلو ، اگر سیما بیٹھ بھی جائے تو میں بات کیسے کروں ؟ کوئی بات بھی کروں تو پتا ہے کیا کہتی ہے ؟ کہتی ہے "گرین ما ، آپ سمجھتی نہیں ۔" چاہے موسم کی بات کروں ، گاڑی کی بات کروں یا مکھن کی ، بس یہی کہتی ہے "گرین ما ، آپ نہیں سمجھتیں ۔" پھر بے چاری مجھے سمجھاتی رہتی ہے ۔ مجھے نہیں آتی سمجھ ۔ آجکل کوئی بات بھی سیدھی نہیں ہوتی ۔ ہر بات میں بَل ۔ ہر بات کنڈلی مارے بیٹھی ہے میری سمجھ میں کیسے آئے بھلا !

ایک وہ زمانہ تھا جب میں سب کچھ سمجھتی تھی ۔ گاؤں میں کوئی بات بھی ہوتی ، عورتیں کہتیں "بیٹے ! اب کیا کریں ؟ پتا نہیں یہ بات کیسے کی جاتی ہے ؟ مناسب کیا ہے ؟"

پھر کوئی نا کوئی بول اٹھتی "چلو ، ماسی مہراں سے پوچھ لیں ۔" پھر وہ سب میرے گھر آجاتیں ۔ کہتیں "ماسی ، یہ بتا کہ یہ بات کیسے کی جاتی ہے ؟ مثلاً منگنی کے لیے سوالی بن کر جانا ہو تو ساتھ کس کس کو لے جائیں یا جب پنچایت لگے تو گڑ کا شربت پلائیں یا دودھ ؟"

ان دنوں گاؤں والیاں سمجھتی تھیں کہ میں سب کچھ سمجھتی ہوں ۔ اب صفی کے گھر میں ہر کوئی کہتا ہے "گرین ما ، تو نہیں سمجھتی ۔" ٹمی بھی یہی کہتا ہے ، اشی بھی یہی کہتی ہی ، سیما بھی ، بہو بھی ۔ خود صفی کہتا ہے "اماں نہیں سمجھے گی ، اس بات کو ۔"

ٹھیک ہی تو کہتا ہے ساری چیزیں ہی بدل گئی ہیں ۔ باتیں بدل گئی ہیں ۔ سبھی کچھ بدل گیا ہے ۔ پرانی باتیں تو رہی ہی نہیں ۔ اماں بھلا کیسے سمجھے ۔

کل سیما کہہ رہی تھی "گرین ما ، ڈور بل بجا کرے تو آپ نہ جایا کریں ، دروازے پر وزیٹر گھبرا جاتے ہیں ، دیکھ کر ۔ اس میں ہماری بدنامی ہے گرین ما ، آپ سمجھتی کیوں نہیں ؟ یہ تو نوکر کا کام ہے ۔ نوکر خود جائے گا ، دیکھنے ۔"

وہ تو مجھے پتا ہے کہ یہ نوکر کا کام ہے پر کسی وقت صوبہ ہانڈی بھون

رہا ہوتا ہے بے چارہ دروازے پر کیسے جائے پھر میں اسے کہتی ہوں "صوبے پتر، تو کام کر میں دیکھ لیتی ہوں کہ کون ہے۔" چلی تو جاتی ہوں میں دیکھنے، پر سیما کہتی سچ ہے مہمان مجھے دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔

پھر سیما یہ بھی تو کہتی ہے۔ کہتی ہے "گرین ما، نوکروں کے ساتھ اس طرح نہیں بولا کرتے۔ صوبہ تو نوکر ہے، پتر نہیں۔ گرین ما، آپ کیوں نہیں سمجھتیں؟ اس طرح نوکر بگڑ جاتے ہیں" شاید سچ کہتی ہو سیما۔ پر بات میری سمجھ میں نہیں آتی لو بھلا، کسی کو پتر کہنے سے وہ بگڑ جاتا ہے کیا؟

گاؤں میں تو میں سب کو پتر کہا کرتی تھی۔ کوئی بھی نہ بگڑا تھا۔ اُلٹا سارے ہی جی جی کرتے پھرتے تھے۔ پر وہ گاؤں تھا نا۔ یہ شہر ہُوا۔ گاؤں کی بات اور ہوتی ہے، شہر کی اور ہوتی ہے مجھے کیا پتا شہر کی بات کیا ہوتی ہے۔ ضرور سیما سچ کہتی ہوگی۔ اسے کیا پڑی کہ جھوٹ بولے۔ سیما ہی نہیں، بہو خود کہتی ہے "اماں جی، آپ نوکروں کے ساتھ گھل مل کر نہ بیٹھا کریں۔"

میں گھل مل کر تو نہیں بیٹھتی۔ ویسے کبھی ویہڑے میں اکیلی پڑے پڑے گھبرا جاتی ہوں تو بیرچی خانے چلی جاتی ہوں۔ بیرچی خانے جاؤں تو وہاں صوبہ ہوتا ہے۔ پھر بات تو کرنی ہی پڑتی ہے، کوئی نہ کوئی۔ اب یہ تو نہیں ہوتا نا کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ رہو۔

صوبہ بے چارا بڑا ہی اچھا ہے میری بڑی عزت کرتا ہے پہلے پہل مجھے بڑی بیگم صاحبہ کہا کرتا تھا۔ لو، میں بیگم ہوں کیا؟ خواہ مخواہ بیگم تو وہ ہوتی ہے جو بیگم ہوتی ہے میں بھلا کدھر سے بیگم ہوئی۔ خواہ مخواہ بہو تو ہوئی نا بیگم۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، بولنا سب بیگم کا سا ہے جب وہ آواز دیتی ہے "صاؤبا" تو آواز سے ہی پتا چلتا ہے کہ بیگم بول رہی ہے۔ کہتی ہے "صاؤبا، لنچ پر شامی بنالو، ساتھ دال اور کریلے گوشت اور ڈنر پر چکن ہو، چاول ہوں، کوئی سا میٹھا اور دیکھو، کریلے پہلے ابال لینا کسیلے نہ ہوں۔ "بہت اچھا بیگم صاحبہ" وہ بولتا ہے پھر بیگم رکتی نہیں۔ یہ جا وہ جا۔ صوبے سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ کام بتایا اور گئی، جیسے بیگم کو کرنا چاہیے۔

اے، روز تو دیکھتی ہوں بیگمیں۔ بنی سجی ہوئی آتی ہیں منہ گول

کر کے بولتی ہیں ۔ بولتی اردو میں ہیں ، پر یوں لگتا ہے جیسے انگریزی بول رہی ہوں ۔

تو میں نے کہا "صوبے ، مجھے بیگم نہ کہا کرو ۔ میں کدھر سے بیگم ہوں بھلا ؟"

"تو پھر کیا کہا کروں ، بڑی بیگم صاحبہ" اس نے پوچھا ۔

میں نے کہا "تو مجھے بی بی کہہ لیا کر ۔"

اب وہ مجھے بڑی بی بی کہتا ہے ۔ بڑا اچھا ہے ، بے چارہ میری ساری باتیں سنتا ہے ۔ کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ نہیں سمجھتیں ، بڑی بی بی ۔ وہ سمجھتا ہے ، میں سب سمجھتی ہوں ۔ اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں پھر سے گاؤں آگئی ہوں ۔

اس نے کبھی نہیں کہا کہ بڑی بی بی سالن روٹی پر نہ ڈالیں ۔ کبھی نہیں کہا کہ بی بی ، روٹی پلیٹ میں رکھ لیں یا پیڑھی پر نہ بیٹھیں ، میز پر بیٹھیں ۔ اس نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ بڑی بی بی ، آپ کچن میں نہ بیٹھا کریں ۔

حالانکہ بیگم نے کئی بار صوبے سے کہا ہے "صاؤبا بڑی بیگم صاحبہ کو اپنے پاس مت بٹھایا کر ۔ بری بات ہے ۔" پر اس نے مجھے کبھی نہیں جتایا ۔ وہ تو میں نے آپ بیگم کو کہتے ہوئے سن لیا تھا ، اس لیے مجھے پتا ہے ۔

میں تو کبھی باورچی خانے نہ جاؤں ۔ میں بھلا صوبے کو بیگم کی نظروں میں کیوں بُرا بناؤں پر کیا کروں ، کسی وقت جی چاہتا ہے کہ کسی سے بات کروں ، کسی کے پاس بیٹھوں کس کے پاس بیٹھوں ؟ سارے ہی اپنے اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں ۔ پتا نہیں یہ آج کل کے لوگ کمروں میں بند کیوں رہتے ہیں ؟ مل کر ایک جگہ بیٹھتے ہی نہیں ۔

میں تو سارا دن پچھلے وہڑے میں منجی پر پڑی رہتی ہوں ۔ پڑے پڑے تھک جاتی ہوں تو صوبے کے پاس جا بیٹھتی ہوں ۔ کیا کروں ؟

سارے گھر میں تین ہی بیڈ روم ہیں نا ایک میں صفی اور بیگم سوتے ہیں ۔ دوسرے میں ٹمی اور اسمی اور تیسری میں اکیلی سیما ۔

جب میں نئی نئی آئی تھی تو صفی نے کہا تھا "اماں کا پلنگ سیما کے

کمرے میں لگا دو ۔" دو دن تو میں سیما کے ساتھ سوتی رہی ، پھر تیسرے دن بڑی دیر تک صفی ، بیگم اور سیما ایک کمرے میں بیٹھے باتاں کرتے رہے ۔ پھر صفی آیا ، کہنے لگا "بھئی اماں تو اس کمرے میں گھٹی گھٹی سی رہتی ہے ۔ اس کی عادت تو کھلی جگہ میں رہنے کی ہے ۔ بھئی ، اس کی چار پائی تو ریسپشن میں لگا دو ۔ کیوں ، اماں ؟"

لو ، میں بھلا کیا کہتی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا صفی ۔ مجھے تو کھلی جگہ میں رہنا پسند ہے ۔

تو انہوں نے میری منجی ریسپشن میں لگا دی ۔ اے ، وہی جو دلان سا ہے ، کمروں سے باہر ۔

دوسرے دن ہی بیگم نے کہا "صاؤبا ، جب بڑی بیگم صبح اٹھ کر نماز پڑھیں نا ، تو تم ان کی منجی اٹھا دیا کرو ۔ اور جب رات کو یہ عشا کی نماز پڑھ لیا کریں تو بچھا دیا کرو ۔"

ہاں بھئی ٹھیک تو ہے سارا دن منجی ریسپشن میں بچھی رہے تو اچھی نہیں لگتی نا ۔ اورمیرا کیا ہے ، میں سارا دن پچھلے وہڑے میں ہتھ پنکھی لے کر پڑی رہتی ہوں ۔ کھلی جگہ ہے بڑی سوہنی ہوا آتی رہتی ہے اور جو اکیلی پڑی گھبرائی تو صوبے کے پاس جا بیٹھی ۔ ٹمی ، اسمی کے پاس جا بیٹھی دن گزر ہی جاتا ہے ۔

شکر ہے اللہ کا بڑا سوہنا وقت گزرتا ہے ۔ اے ، اتنا بھرا بھرا گھر ہے اللہ رکھے پوتے ہیں ، پوتیاں ہیں ۔ بہو ہے ، بیٹا ہے ۔ اور پھر گھر اتنا سوہنا ہے ، اتنا صاف ستھرا ، کہ ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے ۔ مجھے اور کیا چاہیے ۔ اللہ نے اتنے بھاگ لگائے ہیں مجھے ۔ اللہ رکھے میرا پتر صاب بنا ہوا ہے ، صاب ۔ سبھی صاب کہہ کر بلاتے ہیں ۔ اللہ نے اتنا مرتبہ دے رکھا ہے ۔ اللہ اس سے بھی بڑا مرتبہ دے ۔

اور پھر وہ میرا اتنا خیال رکھتا ہے کہ ہر دوسرے تیسرے دن خود آتا ہے ، میرے پاس کہتا ہے "اماں ، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے ۔ تجھے کوئی تکلیف تو نہیں ، اماں ؟" اتنا خیال رکھتا ہے میرا پُتر ۔ میں کتنی خوش نصیب

ہوں ۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی کیا ہو گی بھلا ۔ اللہ نے اتنے بھاگ لگائے ہیں مجھے ۔ پھر میں کیوں نہ خوش ہوں ؟" ۔۔۔۔۔

میں کوئی ناشکری ہوں کہ ۔۔۔۔۔ نہیں نہیں میں بہت خوش ہوں ۔ بہت خوش ۔

عینی اور عفریت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ ، چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سر دریا بن کر آپ کی شخصیت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

وہ اچانک رونما ہوتا ، ایسے وقت جبکہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو ، نہ امید نہ توقع ۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں ۔ اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا ۔ جب آپ بھر پور زندگی بتا چکے ہوتے ہیں ، خود سے مطمئن ، تکمیل کے احساس سے سرشار ۔

اس وقت وہ اچانک نمودار ہوتا ہے اور آپکی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے آپ نے سال ہا سال ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا ، ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتا ہے ۔

اور پھر جو آپ دیکھتے ہیں تو ۔۔۔۔۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔

میں نے بڑی بھر پور زندگی گزاری تھی ۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ لگائے رکھی ۔ میلہ لگائے رکھا ۔ پٹاخے چھوڑے ، پھلجھڑیاں چلائیں ، ہولیاں کھیلیں ، رنگ پچکاریاں چلائیں ، ابیر گلال کے تھال بھرے ۔

میں جذباتی تھا ، شدت پسند تھا ۔ جذبات اور شدت میری دانست میں خلوص کے مظہر تھے ۔ میرا رخ مثبت تھا ، خلوص بھرا ، ہمدردی بھرا ، حقارت اور نفرت سے پاک میں کہہ دینے والا تھا گونگے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے ۔

میں نے علم حاصل کیا تھا ۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی ۔ تحلیلِ

نفسی میں خاصی اہلیت تھی ۔ دوست مانتے تھے ۔ اچھا جانتے تھے ۔ قدر کرتے تھے ۔

اپنے ماضی پر مجھے پشیمانی نہ تھی ۔ نہ احساسِ گناہ ، نہ کمتری ۔

میں نے عشق کیے ، محبتیں کیں ۔ افئیرز نہیں ۔ یارانے نہیں ۔ توجہ کا مرکز بنا رہا ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں ۔ فراق و وصال سبھی کچھ ۔ جبھی تو اب خود مطمئن تھا ۔ احساسِ تکمیل سے سرشار ۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے : بول کیا مانگتا ہے ؟ جو مانگے کا ملے گا ۔ تو یقیناً میں سوچ میں پڑ جاؤں گا ۔ کیا مانگوں ؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں ۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں ۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے ، بہت پیچھے ۔

جس راستے پر میں گامزن ہوں ، وہ اطمینان سے لبریز ہے ۔

سڑک خاموش ہے ۔

راستہ ہموار ہے نہ اوچان نہ نچان ۔ سیدھا ، صاف ۔ دونوں جانب پیڑ اگے ہوئے ہیں سرسبز نہیں ، پیلے پیلے اونچے لمبے نہیں ، بیٹھے بیٹھے ، جھکے جھکے ، گرد آلود ۔

پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں ۔ کھڑ کھڑ کر رہے ہیں ۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے ۔

دور دور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹمٹما رہی ہیں ۔

ان کی زرد ٹم ٹم زمین تک نہیں پہنچ پاتی ۔

شام کا کھسپھسہ بڑھتا جا رہا ہے ۔

سڑک پر اِکا دُکا راہ گیر چل رہے ہیں ۔

چپ چاپ تھکے ہارے گرد سے اٹے ہوئے ۔

ایک دوسرے سے دور دور ۔ اکیلے اکیلے تنہا تنہا ۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تنا ہوا ہے بے چینی کی مہانی مدت سے زنگ آلود ہو چکی ہے ۔ میرے دل میں کوئی مدوجزر نہیں ۔ ذہن سوچ بچار کی گھاٹیوں سے نکل چکا ہے ۔ کیوں ، کیسے ، کس لیے کے بِھڑ بُھن بُھن کرنا بھول چکے

ہیں ۔

میرے سامنے آسمان پر چاند ٹنگا ہوا ہے ۔ چاندنی والا چاند نہیں ۔ چاندنی تو چھیڑ دیتی ہے ۔ ایک بڑا سا مدھم مدھم چاند ۔ جیسے تانبے کا ایک تھال لٹک رہا ہو ۔ میں چلے جا رہا ہوں ، چلے جا رہا ہوں ۔

دفعتاً پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے ، قریب اور قریب ۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے ؟

میں مڑ کر دیکھتا ہوں : کون ہو تم ؟

وہ سر اٹھاتی ہے مجھے دیکھ کر ٹھٹھکتی ہے رکتی ہے پھر سر جھکا لیتی ہے جواب نہیں دیتی ۔

اس کے جسم میں چمک ہے ، تازگی ہے ، شگفتگی ہے ، لیکن منہ لٹکا ہوا ہے ۔ خدوخال پر بے تعلقی کی دھول جمی ہے ۔ تھکا ہارا مردہ چہرا ۔ گردن جھکی ہوئی نگاہیں ہیں اکتائی ہوئی ، جیسے بہت کچھ دیکھا ہو ، دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں ، جھک گئی ہوں ۔ نہ دیکھنے کی چاہ نہ دکھانے کا شوق ۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا ؟ کون ہو تم ؟"

"میں بھی ہوں" وہ سر اٹھائے بغیر جواب دیتی ہے ۔

جواب میں تلخی ہے ، لیکن آواز مدھم ، پھٹی پھٹی ، تھکی تھکی ۔ اس میں چمک نہیں تان نہیں لے نہیں لوچ نہیں ۔ جیسے ریوڑی بھیگ گئی ہو ۔ کڑاکا نہ رہا ہو ۔

"لیکن یہ سڑک تو تمہارے لیے نہیں ہے ۔ تمہیں تو شاہراہ پر چلنا چاہیئے ، جہاں رونق ہے ، زندگی ہے ۔"

"وہیں سے آئی ہوں" وہ جواب دیتی ہے ۔

"لیکن کیوں ؟" ناگاہ میرے منہ سے نکل جاتا ہے ۔

وہ سر اٹھاتی ہے ۔ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے "میری مرضی ۔"

میں چپ ہو جاتا ہوں ۔ چلنے لگتا ہوں ۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔ لیکن دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے ۔ پتا نہیں غصہ ہے یا کیا ۔

پاؤں کی چاپ پھر قریب آ جاتی ہے ۔ اور قریب ۔

"تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی ہو ؟" ان جانے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے ۔

"ساتھ نہیں ۔ میں چل رہی ہوں" وہ باآواز بلند کہتی ہے ۔ پھر زیر لبی سنائی دیتی ہے "کوئی کسی کے ساتھ نہیں چلتا ۔" اس کی آواز میں حسرت نہیں ، آرزو نہیں ، بے تعلقی ہی بے تعلقی ہے ۔

میں رک جاتا ہوں "دیکھو پاؤں دھیرے دھرو ۔ ہم ساتھ ساتھ نہ رہیں ۔"

"ہاں" وہ کہتی ہے "دھیرے دھرے تھے ۔ لیکن ۔"

"لیکن کیا ؟" میں پوچھتا ہوں ۔

"پھر تم بھی پاؤں دھیرے دَھرنے لگے ۔ رک گئے ۔"

"میں رک گیا تھا ؟" مجھے غصہ آنے لگا ۔

"ہاں ، تم" وہ جواب دیتی ہے ۔ اس کی آواز برف کی سل کی طرح گرتی ہے ۔

"تمہیں اپنے متعلق خوش فہمی ہے کیا ؟"

"تمہیں ہے ، مجھے نہیں ۔ میں خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں ۔"

میں رک جاتا ہوں "میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا ۔"

"تھینک یو" وہ جواب دیتی ہے ، اور تیز چلنے لگتی ہے ۔

"تھینک یو ؟ کس بات پر ؟" میں چلاتا ہوں ۔

"میں تمہارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی" وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے ۔

غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں ۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں "میرے ساتھ چلنے میں کیا ہے ؟ بولو ۔"

"تم ساتھی نہیں ہو ۔"

"لیکن کیوں ؟" میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں ۔

"تم اپنی مَیں سے بھرے ہوئے ہو ۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے

کی گنجائش نہیں ۔ تم توجہ دے نہیں سکتے ۔ خود توجہ طلب ہو ۔"

"تم مجھے جانتی ہو کیا ؟"

"جانتی نہیں" وہ جواب دیتی ہے "تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے ۔"

"تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا ؟" میں طنزاً پوچھتا ہوں ۔

"ہاں" وہ سر اٹھا کر جواب دیتی ہے "میں عورت جو ہوں ۔"

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سُن کر دیا ہو میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اٹھا لیتا ہوں ۔ میری گردن لٹک جاتی ہے ۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویہ بدل جاتا ہے ۔ کہتی ہے "میں تمہیں دکھانا نہیں چاہتی دل میلا نہ کرو سچ سننے کی ہمت پیدا کرو ۔"

اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھائی ہیں ۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مسکرا دی ہے ۔

دفعتاً نہ جانے کیا ہوگیا ہے کچھ ہو گیا ہے رنگ پچکاری چل گئی ہے ۔ پیڑ تن گئے ہیں ۔ پتے ہرے ہو گئے ہیں بتیاں روشن ہو گئی ہیں ۔

چاند کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے ۔

میرے ارد گرد اک بھیڑ لگ گئی ہے ۔

وہ چل پڑتی ہے ۔

"رک جاؤ رک جاؤ ۔" میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں ۔

پیچھے پیچھے چلنے کا میرا یہ پہلا موقع نہیں ہے ۔ زندگی میں مَیں بارہا پیچھے پیچھے چلا ہوں ۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی کو پیچھے لگا سکوں ۔ دراصل میں ازلی طور پر پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں ۔

میرا عشق پیچھے چلنا ہے ۔

جو میرے پیچھے چلتی ہے ، وہ دل سے اتر جاتی ہے ۔

جب تک میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں ، جنون قائم رہتا ہے ۔

جب ساتھ ساتھ چلنے کا موقع آتا ہے ، قدم اکھڑ جاتے ہیں ۔

سالہا سال پہلے یہی بات مجھے اماں نے بتائی تھی ۔ لیکن اماں کی بات میں نے کبھی نہ سنی تھی ۔ اماں کی بات پر میں کیسے سوچتا میں تو بات بات پر

اماں سے کہا کرتا تھا "اماں تم نہیں سمجھتیں" جو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، اس کی بات پر سوچنا کیسا ۔ اماں کی بات کو میں نے کبھی نہ جانا تھا ۔ اور جانا ہی نہیں تھا تو مانتا کیسا ۔

دوپہر کا وقت تھا ۔ بدلتے موسم کی ہوا چل رہی تھی ۔ گرتے پتے کھڑ کھڑ کر رہے تھے ۔ اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم تین رہتے تھے ۔ تنہا منیر دیوار سے لگا، بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا ۔ میں ٹین کی کرسی پر بیٹھا، دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے، فضا کو گھور رہا تھا ۔ بوڑھی اماں دیوار سے ٹیک لگائے آلو چھیل رہی تھی ۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی ۔

دفعتاً اماں بولی "ایسے کیسے چلے گا، بیٹے؟"

میں نے سر اٹھایا "ایسے کیسے کیا، اماں؟"

"کب تک وہ دیوار سے لگا کھڑا رہے گا؟" اس نے منیر کی طرف اشارہ کیا ۔ تُو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین کو گھورتا رہے گا، اور میں" وہ رک گئی ۔۔۔۔۔ "مجھ سے اب یہ کچھ نہیں ہوتا، بیٹے ۔"

"کیا کریں، اماں؟"

"کوئی گھر والی لے آنا ۔"

"کیسے لے آؤں؟ ملے تو لاؤں ۔ ڈھونڈ رہا ہوں ۔"

"نہ نہ نہ" وہ بولی ۔ اس کا چہرہ یوں پھوٹ گیا جیسے شیشہ تڑخ جاتا ہے ۔ آواز میں منت بھری ٹوٹ جھلکی "نہ بیٹے، نہ ۔ اللہ کے واسطے ڈھونڈ میں نہ پڑنا ۔"

"کیوں، اماں؟" میں نے پوچھا ۔

"کوئی پسند آگئی تو تُو اس کے پیچھے بھاگے گا ۔" وہ رک گئی انگلی سے آنسو پونچھا "پہلے بھی یہی ہوا تھا ۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا تھا ۔ پھر جب وہ مل گئی تو ساتھ ساتھ نہ چل سکا ۔" وہ رک گئی ۔

"جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں، بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ

جائے ۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے" وہ چپ ہو گئی ۔ میں سوچنے لگا ۔ بات سامنے دھری تھی ۔ پر میرے پلے نہ پڑی ۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دکھتی ۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہو ، اسے سامنے دھری کیسے دکھے ۔

دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے ۔

پھر اماں اٹھی ، میرے پاس آئی ، ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا ، تھپک کر بولی "بیٹے ، تو سب کچھ جانتا ہے ۔ پر خود کو نہیں جانتا ۔ میں تجھے جانتی ہوں ۔ مجھے پتا ہے ۔"

"تو مجھے کیسے جانتی ہے ، اماں ؟"

"تو اپنے ابا پر گیا ہے نا ۔ ہو بہو وہی ہے ہو بہو اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے ۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے ۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا ، زندگی بھر ۔"

وہ خاموش ہو گئی ۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا ۔

"اماں" میں نے خاموشی توڑی "محبت کیا ہوتی ہے ؟"

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہی ، پھر بولی "بیٹے محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی ۔ طوفان نہیں ہوتی ، سکون ہوتی ہے ۔ دریا نہیں ہوتی ، جھیل ہوتی ہے ۔ دوپہر نہیں ہوتی ۔ بھور سمے ہوتی ہے ۔ آگ نہیں ہوتی ، اجالا ہوتی ہے ۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے وہ بتانے کی چیز نہیں ، بیتنے کی چیز ہے ۔ سمجھنے کی چیز نہیں ، جاننے کی چیز ہے ۔"

اماں کی بات میرا راستہ روک لیتی ہے ۔ میں رک جاتا ہوں ، لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں ۔ دیکھتا رہتا ہوں ۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے ۔ پھر مسکرائے پھر پھلجھڑی چل جائے ۔ پھر کُن کہہ دیا جائے ۔

لیکن وہ چلے جاتی ہے یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو ۔ جیسے کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو ۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رک گئے ہیں لیکن میں نہیں رکا ہوں میں اس کے پیچھے چلے جا رہا ہوں ۔

چلے جا رہا ہوں ۔

دن گزر جاتے ہیں ۔ ہفتے گزر جاتے ہیں لیکن میں چل رہا ہوں ۔ چلے جا رہا ہوں ۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں ۔

پتا نہیں میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں ۔

کوئی خواہش نہیں ، آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اکسائے ۔ حصول کی خواہش نہیں ۔ مطلب نہیں ۔ مانگ نہیں ۔

اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔

پوجا کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں ۔

آرتی کی تھالی خالی پڑی ہے ۔

بھینٹ چڑھانے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے ۔

پھر بھی میں چلے جا رہا ہوں ۔

نہ مقصد نہ منزل

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آ جاتی ہے ۔

مجھے یقین نہیں آتا ۔ آنکھیں ملتا ہوں ۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے ۔ آتی رہتی ہے ۔ وہ مسکراہٹ ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے کُن کہہ دیا ہو ۔ نہیں نہیں ۔ ۔ فریب نگاہ نہیں ۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں ، درخت کے مقابل ، زمین پر اکڑوں بیٹھی ہے ۔ ہاتھ میں برش ہے ۔ پہلو میں بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں ۔ رُوبرو ایک بڑی سی کینوس فریم پر لگی ہوئی ، درخت کے سہارے کھڑی ہے ۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں ۔

ارے ! یہ کینوس پر کیا بنا ہوا ہے ؟ اس قدر خوفناک چہرہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں ۔ کوئی عفریت ہے ۔ یہ کیا بنا رہی ہے ؟ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں ۔

دیر تک وہاں کھڑا رہتا ہوں ۔ کھڑا رہتا ہوں ۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے ۔ ایک نظر غلط انداز ـــــ سرسری ـــــ اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے ، جیسے پیچھے کوئی کھڑا ہی نہ ہو ۔

انداز میں نہ تعجب ہے نہ لگاؤ، نہ لاگ۔

"یہ کیا بنا رہی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

"پورٹریٹ" وہ منہ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

"کس کی ہے"

"ہے کسی کی۔"

"کوئی عفریت ہے کیا؟"

"نہیں۔ عفریت نہیں۔"

"کسی کے لیے بنا رہی ہو؟"

"میری اسائنمنٹ ہے" وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دیے جا رہی ہے۔

"کانٹوں سے بھری شبیہہ ہے۔"

"ہاں۔ تناؤ ہے۔ تلخی ہے۔ شدت ہے۔ مٹھاس نہیں۔ محبت نہیں۔"

"محبت تو شدت کے بغیر ممکن نہیں" میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

"نہیں، محبت شدت کی نفی ہے" وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ وہی رنگ پچکاری۔ فرحت سے بھری ایک پھوار سی اڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دھل جاتی ہے۔

"تم شدت کو برا جانتی ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ میری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے "محبت ایک پرسکون کیفیت ہے۔ وجدان ہے۔ نہیں" وہ زیر لب گویا خود سے کہتی ہے "بتائی نہیں جا سکتی۔ صرف بیتی جا سکتی ہے۔"

دفعتاً وہ میری طرف دیکھ کر چونکتی ہے "رک جاؤ! رک جاؤ!" وہ اٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی ہے پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف انگلی رکھ کر پوچھتی ہے "یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا تِل ہے؟"

"تِل ہے" میں جواب دیتا ہوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مڑتی ہے، برش اٹھاتی ہے اور شبیہہ کی ٹھوڑی کے

بائیں طرف کالا نقطہ لگا دیتی ہے ۔

غصے سے میرا منہ سرخ ہو جاتا ہے ۔ "کیا مطلب ؟ تمھارا مطلب ہے ، یہ میری ۔ ۔ ؟" میں پورٹریٹ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہوں ۔ لیکن میرا گلا خشک ہو جاتا ہے ۔

وہ میری طرف منت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے "سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو ۔"

دفعتاً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں ۔ شعلے اٹھتے ہیں ۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں ۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے ۔ میں اٹھ کر بھاگتا ہوں ۔ بھاگتا رہتا ہوں ۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں ۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہوں تو دفعتاً لیٹے لیٹے میرے اندر کوئی کہتا ہے : تم خود سے بھاگ رہے ہو ۔ میں چوکنا ہو جاتا ہوں ۔ یہ کیا ہوا ؟ کیا میری مَیں کا ایک حصہ باغی ہو گیا ہے ؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے ۔ میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں ۔

نہیں ۔ میں خود سے نہیں بھاگ رہا ۔ جھوٹ ہے غصے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے ۔ میری بیوی یہ سن کر گھبرا گئی ہے ۔ پوچھتی ہے : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ اسے کیا جواب دوں ؟

اگلے روز صبح باتھ روم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں ۔ ۔ ارے ! یہ کیا ؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہا ہے ۔ نہیں ، نہیں یہ میں نہیں۔میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں ۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں ۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے ہاتھ میں برش پکڑے ، وہ ہنس رہی ہے۔ کہتی ہے "تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو ۔ وہ نہیں جو تم ہو ۔ وہ ، جو تم سمجھتے ہو کہ ہو ۔"

میں آئینے پر پتھر مارتا ہوں ۔ تڑاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں ۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے

ہاتھوں میں تھما دیتی ہے کہتی ہے "ایک خاتون دے گئی ہے ۔" پیکٹ کاغذ میں لپٹا ہوا ہے ۔

میں کاغذ پھاڑتا ہوں ۔۔۔۔۔ ارے! وہی پورٹریٹ! پورٹریٹ کے کونے میں "عینی" لکھا ہوا ہے ۔

تصویر کو دیکھ کر میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے ۔ "ہئے یہ تو کوئی بُھوت ہے ۔"

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا ۔ تصویر کو الٹا کرکے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں ۔

کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں ادھر دیکھتا ہوں تو سُن ہو کر رہ جاتا ہوں ۔ تصویر کینوس کی پشت پر ابھر آتی ہے ۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اٹھالیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں ۔ سوچتا ہوں : میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے ۔

سڑک پر اکا دکا موٹریں چل رہی ہیں ۔ ایک ویگن آکر رک گئی ہے ۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے ۔۔۔۔۔ ارے ! یہ کیا ؟ ۔۔۔۔۔ ویگن کی پشت پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے گھبرا کر میں منہ موڑ لیتا ہوں ۔ سامنے دیوار پر بھی وہی تصویر ۔۔۔۔۔ ارے' میں بھاگ لیتا ہوں ۔ جگہ جگہ ٹریفک سائنیز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے ۔

میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں ۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیع میرا انتظار کر رہا ہے میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں ۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے ۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں ۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے "حاجی صاحب میرا دوست آجکل بہت پریشان رہتا ہے اس کے لیے دعا کریں ۔"

"کیا پریشانی ہے ؟" حاجی پوچھتا ہے ۔

"میں ایک الجھن میں پھنسا ہوں" میں جواب دیتا ہوں "وہ یہ کہ میں

کون ہوں ؟"

حاجی مسکرا دیتا ہے ۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں ۔ کہتا ہوں "میرا مطلب ہے ، کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں ، یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں ؟"

حاجی پھر مسکراتا ہے ۔ کہتا ہے "چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں ، آپ جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں ؟ اپنی میں کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں ، خوا مخواہ ؟"

دفعتاً میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے ۔ عین اس وقت شفیع چلا کر کہتا ہے "ارے ! یہ کینوس تو خالی ہے ۔"

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں ۔ کینوس واقعی خالی ہے ۔

...........○.........

گُرداس ۔ داس گُرو

سنگلدیپ کے مہاراج رانی شکنتلے دیوی کے پاس بیٹھے تھے ۔ دفعتاً انہوں نے سر اٹھایا ۔ بولے "مہارانی ، کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے پاس ہوتے ہوئے بھی ہمارے پاس نہیں ہوتیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے تم بٹ گئی ہو ۔ ایک نہیں رہیں ۔ تمہیں کس بات کی چنتا ہے ؟"

مہارانی بولی "ہاں ، مہاراج ۔ یہ سچ ہے کہ مجھے چنتا لگی ہے ۔ پر مہاراج ، بات اتنی چھوٹی ہے کہ آپ سن کر ہنس دیں گے ۔"

مہاراج مسکرائے ، بولے "شکنتلے ، سیانے کہتے ہیں ، بڑی چنتائیں گھن گرج کر آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں ۔ بے شک جھنجھوڑتی ہیں ، پر کچھ زیادہ نہیں بگاڑتیں ، لیکن چھوٹی چنتائیں جونک کی طرح لگ جاتی ہیں ۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ لگی ہوئی ہیں ۔ سوامی داسدیو کا کہنا ہے کہ چھوٹی چنتاؤں سے ڈرو ۔ انہیں بھیتر میں نہ پالو ۔ باہر نکالو ۔ انہیں جانو ۔ مانو ۔ اپناؤ اپنا لو تو دور ہو جاتی ہیں ۔ نہ اپناؤ تو چمٹی رہتی ہیں ۔"

"آپ سچ کہتے ہیں ، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "پر بات میری اپنی نہیں راج کماری کی ہے ۔"

"راج کماری کی ؟" مہاراج نے دہرایا ۔

"ہاں مہاراج" مہارانی نے جواب دیا "کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ راج کماری کا پاؤں چلے ہے ۔ یوں چلے ہے مہاراج جیسے انڈا پھینٹتے ہوئے چمچہ چلتا ہے ۔"

"بے وجہ ؟" مہاراج نے پوچھا ۔

"بے وجہ" مہارانی نے کہا "جب راج کماری بیٹھی پڑھ رہی ہوتی ہے یا آرام سے لیٹی ہوتی ہے تو اس کا دایاں پاؤں آپ ہی آپ چلتا رہتا ہے اور

مہاراج ، اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ پاؤں چل رہا ہے ۔"

یہ سن کر مہاراج کا ماتھا ٹھنکا ۔ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچ میں پڑے رہے ۔ پھر بولے "اس لیے تو نہیں کہ راج کماری جوان ہو گئی ہے ؟"

"پتا نہیں ، مہاراج" مہارانی نے جواب دیا" آجکل کے نوجوانوں کے ڈھنگ کچھ اور ہی ہیں ۔ سُر اور ہے ، تال اور ہے ، رنگ اور ہے ۔"

"ہوں" مہاراج پھر سوچ میں پڑ گئے ۔ پھر بولے "کہیں ایسا تو نہیں کہ راج کماری پریم کے بندھن میں بندھ گئی ہو ؟"

"نہیں ، مہاراج ۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔"

"وشواس سے کہہ رہی ہو ، شکنتلے ؟"

"ہاں ، مہاراج ۔ پریم ایک ایسا بندھن ہے ، مہاراج ، جو چھپائے نہیں چھپتا ۔ پھر یہ بھی ہے ، مہاراج کہ نئی پوچ کو بندھن سے چڑ ہے ۔ کوئی بندھن ہو ، کیسا بھی ہو ، بابر کا ہو یا بھیتر کا ، انہیں گوارہ نہیں ۔"

مہاراج کے دل میں اک پھانس لگ گئی ۔ سوچ میں پڑ گئے ۔ کس سے پوچھیں ؟ ایسے سمے انہیں سوامی داسدیو یاد آیا کرتے تھے ۔ وہ مہاراج کے گرو تھے ۔ ہر بات میں سہارا دیتے ۔ ہر الجھن میں راستہ دکھاتے ۔ کڑی دھوپ میں سایہ بن جاتے ۔ گھور اندھیرے میں دیئے سمان ٹمٹماتے ، لیکن آٹھ برس ہوئے وہ سنگلدیپ چھوڑ کر جا چکے تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ساری دنیا کے پوتر استھانوں کے درشن کر لیں ۔ سوامی بہت بوڑھے تھے ۔ چلنا مشکل تھا ۔ اس لیے ان کے چیلے گرداس نے انہیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر یاترا کرانے کا عہد کیا تھا ۔ آٹھ سال سے وہ لاپتہ تھے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں ۔

ایک روز مہاراج نے اپنے وزیر مسٹر منگل رائے سے برسبیل تذکرہ پوچھا "رائے جی ، یہ بتائیے کیا یہ ممکن ہے کہ جسم کا ایک حصہ تو مسلسل حرکت میں رہے لیکن ذہن کو پتا ہی نہ ہو ، خبر ہی نہ ہو ؟"

رائے ، مہاراج کے منہ سے یہ بات سن کر ٹھٹھکے ۔ بولے "مہاراج ، پوری بات کہیے ۔ ادھوری سے آپ نے مجھے کنفیوز کر دیا ہے ۔"

مہاراج نے کہا "رائے جی ، ایک لڑکی کا پاؤں چلتا ہے ۔ یوں چلے جاتا ہے جیسے نیلی چڑیا کی دم ہلتی ہے یا جیسے انجن کا پسٹن چلتا ہے اور لڑکی کو خبر ہی نہیں ہوتی ۔"

رائے یہ سن کر گھبرا گیا ۔ بولا "مہاراج ، آپ نے یہ بات کس سے سنی ؟" آپ کو کیسے پتہ چلا ۔

اس سوال پر مہاراج خود حیران رہ گئے ، لیکن خاندانی راجا تھے ۔ جانتے تھے کہ راجا کو سننا زیادہ چاہیے ، بولنا کم اس لیے چپ رہے ۔

رائے بولا "مہاراج ، ایک برس ہوا کہ میں نے کالج کی ایک لڑکی سے بیاہ کیا تھا ۔ بیاہ کے دو مہینے بعد میں نے اتفاقاً دیکھا کہ میری بیوی کا پاؤں چلتا رہتا ہے ۔ ان جانے میں چلتا رہتا ہے ۔ اس پر میں گھبرا گیا ۔ سوچا ، شاید وہ ناخوش ہے اور پاؤں کا چلنا ناخوشی کا اظہار ہے ۔ میں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ویدوں سے پوچھا ۔ وہ بولے : شاید یہ گھومنے پھرنے کی دبی دبی خواہش کا اظہار ہو ۔ تو مہاراج میں نے اپنی بیوی کو باہر بھجوا دیا کہ اسے خوب گھماؤ پھراؤ ۔"

"ہوں" مہاراج کی دلچسپی بڑھی "پھر ؟"

"چھ مہینے دنیا میں گھومنے پھرنے کے بعد وہ گھر لوٹی تو اس کا پاؤں پہلے سے بھی زیادہ چل رہا تھا ۔

وزیر کی بپتی سن کر مہاراج بالکل کنفیوز ہو گئے وہ سوچتے ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کا ایک حصہ یوں اضطراب میں شدت سے چلے اور ذہن کو خبر ہی نہ ہو بھگوان نے یہ کل جسے انسان کا جسم کہتے ہیں ، ایسی بنائی ہے جس کا جواب نہیں اس کا ہی حصہ دوسرے حصے سے جڑا ہے ۔ پھر اگر پاؤں چلے تو ضرور نسیں بھی چلتی ہوں گی ۔ آنتیں بھی چلتی ہوں گی ۔ اندر ایک جھکڑ چل رہا ہوگا ۔ ایسے میں خبر نہ ہو ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے !

اسی رات راج بھون میں ایک سادھو آ گئے ۔ مہاراج نے راج بھون کے ساتھ ہی پھوس کی چار ایک کٹیائیں بنا رکھی تھیں ، جن میں وہ بھگتوں ، سادھوؤں اور یوگیوں کو مہمان رکھا کرتے تھے ۔ نوکروں کو حکم تھا کہ ان کی سیوا میں ذرا فرق نہ آئے ۔

مہاراج خود ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے ۔ حسب دستور اس رات وہ سادھو کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ہاتھ جوڑ کر جی آئیاں نوں کیا ۔ سادھو نے پاس بٹھالیا ۔ سادھو نے چھوٹتے ہی کہا "راجا جی ، یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ؟ مکھ پر چنتا نے جالا بن رکھا ہے ۔ اگر یہ چنتا پر جا کی ہے تو ٹھیک ہے ۔ جو اپنی ہے تو ٹھیک نہیں ۔ راجا تو سیوا کار ہوتا ہے ۔ راج پاٹ تو ایک اوٹ ہے ۔"

"ہاں ، مہاراج ، چنتا ہے اور وہ اپنی ہے" مہاراج نے جواب دیا "میری پتری جوان ہے ۔ اس کا پاؤں چلتا ہے ۔ چنتا کی کوئی بات نہیں ۔ پھر بھی چلتا ہے ۔"

سادھو ہنسنے لگا "ہاں ، نئی پوچ کا یہی حال ہے ۔ چنتا کی کوئی بات نہیں ، پھر بھی چنتا ہے ۔ جلدی کی کوئی جرورت نہیں ، پھر بھی جلدی ہے ۔ ہلچل کی لوڑ نہیں ، پھر بھی ہلچل ہے ۔"

"ایسا کیوں ، مہاراج ؟" راجا نے پوچھا ۔

سادھو نے اپنی ٹھوڑی ٹیک پر رکھ لی اور نگاہیں دور گاڑ دیں ۔ بولا "سب سمے کا چمتکار ہے ، مہاراج ۔ سب سمے کی لیلا ۔ اک سمے آتا ہے جب لوگ عقل کے پروانے بن جاتے ہیں ۔ دلیل کو مانتے ہیں ۔ سدھ بدھ کو اُتم جانتے ہیں ۔ اس سدھ بدھ کو جو وشواس کو نہیں ، پرنتو شک شبہے کو ابھارتی ہے ۔ وہ کیوں ، کیسے ، کس لیے سوچتے ہیں ۔

"دوجا سمے آتا ہے جب عقل کا بت ٹوٹ جاتا ہے ۔ دل کی دھڑکنیں ابھر آتی ہیں ۔ وشواس جاگتا ہے ۔ شک شبہے جھاگ بن کر اڑ جاتے ہیں ۔ راجا جی ، اب وہ سمے نہیں جب تم پل کر جوان ہوئے تھے ۔ وہ سمے بیت گیا ۔۔۔۔۔ نیا انکور سمے آیا ہے پرنتو تم راجا ہو ۔ تمہیں کیا خبر کہ کیسا سمے آیا ہے ۔"

راجا بولا "سادھو مہاراج ، میں اتنا بے خبر تو نہیں ہوں ۔"

"گھسہ نہ کھاؤ ، مہاراج" سادھو بولا "ہر بادشاہ ، ہر راجا بے خبر ہوتا ہے ۔ اسے خبر اوش پہنچتی ہے ، مگر وہ چھلنی میں چھانی ہوئی خبر ہووے

ہے ۔"

"چھلنی کیسی ، سادھو مہاراج ؟" راجا نے پوچھا ۔

"دیکھو مہاراج" سادھو نے کہا "ہر راجا کے گرد جی حضوریوں کا گھیرا ہوتا ہے ۔ ان کا کام راجا کو پرَسن رکھنا ہوتا ہے یوں کہ جو راجا سننا چاہے ، وہی اسے سنایا جائے ۔ جو دیکھنا چاہے ، وہی اسے دکھایا جائے ۔ جو نہ دیکھنا چاہے ، نہ سننا چاہے ، وہ چھان کر پھینک دیا جائے اس پر پردہ ڈال دیا جائے ۔

"ویسے بھی ، مہاراج ، راجا کو پرجا کی خبر نہیں ہوتی ۔ کارن یہ کہ پرجا پہیے سمان ہوتی ہے ۔ وہ گھومن میں پڑی رہتی ہے ۔ راجا اس پہیے کا دُھرا ہوتا ہے بیچ کا نقطہ ۔ وہ گھومتا نہیں ۔ قائم رہتا ہے اسی کارن پرانے راجا اور بادشاہ رات کے سمے بھیس بدل کر گھوما پھرا کرتے تھے یہ جانتے کے لیے کہ پرجا کس حال میں ہے ، کس رنگ میں رنگی ہے ، کس چال چلے ہے۔"

راجا نے سادھو جی سے کہا "مہاراج ، ہمارے گھرانے میں پرانی ریت ہے کہ بچے جوان ہو جائیں تو انہیں کچھ دنوں کے لیے آشرم میں بھیج دیتے ہیں تاکہ کس بل نکل جائیں ۔ آپ کہیں تو میں اپنی پتری کو ۔ ۔ ۔

سادھو نے مہاراج کی بات کاٹی ۔ بولا "نہ نہ نہ ۔ آشرم میں ان کو بھیجتے ہیں جن میں پیچھے چلنے کی شکتی ہو ۔ جو گرو کو جانتے ہوں ۔ گرو نیتا کو مانتے ہوں ۔ نئی پوچ میں پیچھے چلنے کا حوصلہ نہیں ۔ وہ خود کو دوجے کے حوالے نہیں کر سکتے ۔ وہ آگے چلنے کی اکشا لیے ہوئے ہیں ۔ پر کوئی بات نہیں جس نے یہ سمے بھیجا ہے ، وہ آگے چلنے والی بھیڑوں کا رکھوالا بھی بھیجے گا ۔" یہ کہہ کر سادھو خاموش ہو گیا کچھ دیر کے لیے آسمان کی طرف تکتا رہا ۔ پھر کہنے لگا "نراش نہ ہوں مہاراج ۔ تیرے گرد سوامی داس دیو اپنی یاترا پوری کر چکے ہیں ۔ وہ پہنچنے والے ہیں ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

مہاراج کو سادھو کی باتیں بہت دل لگیں ۔ ان کے دل میں پرجا کے متعلق اپنی بے خبری کا احساس ابھرا ۔ ان کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی بھیس بدل کر نگر میں گھوموں پھروں اور لوگوں کا حال چال جانوں ۔ وقت

یہ تھی کہ مہاراج میں اکیلے گھومنے پھرنے کا حوصلہ نہ تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ساتھی ہو ۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انہیں انجنا یاد آگئی ۔ انجنا سنگلدیپ کی اونچی نائیکا تھی ۔

مہاراج اسے ان دنوں سے جانتے تھے جب وہ خود راج کمار تھے ، اور انجنا کی جوانی کی بوتل نئی نئی کھلی تھی ۔ شوں کا عالم تھا بلبلے اٹھتے تھے ۔ پھوار اڑتی تھی ۔ چوبارے میں آنے والے تو کیا سارے شہر والے بھیگے ہوئے تھے ۔ اس زمانے میں انجنا کی ناؤ سمان ڈولتے والی آنکھوں سے مہاراج مدھ کے پیالے پیا کرتے تھے ۔

تعلق بھی کیا چیز ہے ۔ پہاڑی چشمے کی طرح کہاں سے پھوٹتا ہے ، اور پھر ندی نالہ بن کر کدھر کو بہہ نکلتا ہے ۔ انجنا سے مہاراج کا ناتا دل لگی اور خوش وقتی کے لیے جڑا تھا ، جو چلتے چلتے جیون ساتھ بن گیا ۔ اب انجنا ان کی دوست تھی ، ساتھی تھی ، سب کچھ تھی ۔ جو بات وہ کسی اور کے منہ سے نہیں سن سکتے تھے ، انجنا کے منہ سے سنتے ، سر دھنتے ۔

وہ بوڑھی ہو کر نائیکا بن گئی تھی ۔ یہ عمر رسیدہ ہو کر ، مہاراج دونوں جوں جوں عمر رسیدہ ہوتے گئے تھے ، تعلق توں توں بڑ کے درخت کی چھاؤں بنتا گیا تھا ۔ گھنی ٹھنڈی چھاؤں ۔

بائی بھی عجب مخلوق ہوتی ہے ۔ اسے محبوبہ بنالو تو وہ تم سے کھیلے گی ۔ تگنی کا ناچ نچائے گی ۔ جلتی پر تیل چھڑکے گی ۔ سانس لینے نہ دے گی ۔ ماں بنالو تو تمہاری پاکیزگی کی ضامن ہو جائے گی ۔ تمہیں بچا بچا کر رکھے گی ۔ اس فکر میں گھلتی رہے گی کہ داغ نہ پڑ جائے ۔ دھبہ نہ آجائے ۔ ساتھی بنالو تو تمہارے سر پر بڑ کا درخت بن کر تن جائے گی ۔ چھاؤں ہی چھاؤں ۔ گھنی چھاؤں ۔ خوشبودار چھاؤں ۔

رات پڑی تو مہاراج نے بھیس بدلا ۔ وہ جب بھی انجنا کے ہاں جاتے بھیس بدل کر جاتے بائی کے چوبارے میں صدر دروازے سے نہیں ، بغلی دروازے سے داخل ہوتے ۔

بائی نے جب مہاراج کی آمد کا سنا تو اس نے تتھی، گڈی اور گلابی کو ہدایات دیں کہ محفل جاری رہے، رقص کی لے بڑھتی جائے اور نرت میں آنکھیں یوں کنکھیوں سے نکل نکل کر باتیں کریں کہ تماش بینوں کے لیے سانس لینا دشوار ہو جائے اور خود پچھلے دالان میں مہاراج کے پاس آ بیٹھتی۔

مہاراج پہلے بائی سے ادھر ادھر کی پوچھتے رہے۔ اصلی بات کھولنے سے پہلے رسمی فیتے کناریاں ٹانکتے رہے۔ بائی کائیاں تھی اتنے سارے دلوں سے کھیل چکی تھی۔ جانتی تھی کہ باہر کی بات کیا ہوتی ہے، بھیتر کی کیا ہوتی ہے۔ بولی "اے حضور، اب اصلی بات پر آئیے۔ کیسی چنتا لگی ہے؟"

مہاراج ہنس کر بولے "چنتا ہی کو دور کرنے کے لیے تمہارے دوار آئے ہیں۔"

بائی مسکائی "اے حضور، ہم بائیاں چنتائیں دور نہیں کرتیں۔ پیدا کرتی ہیں۔ ابھارتی ہیں۔ یوں کہ ان کا تار بندھا رہے۔"

مہاراج نے کہا "انجنا، یہ چنتا ہماری نہیں، ہماری پتری کی ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی "کیا ہوا، راجکاری کو؟"

"اس کا پاؤں چلتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"پاؤں چلتا ہے! یہ تو چنتا کی بات نہیں۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ جوان لڑکیوں کے پاؤں یوں چلتے ہیں جیسے گھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔"

"انجنا، ان جانے میں چلتا ہے" مہاراج نے کہا۔

"جانے میں تو اتنی تیزی سے چل ہی نہیں سکتا، حضور۔"

"سیانے کہتے ہیں، گھٹن کی وجہ سے چلتا ہے۔"

"نہیں حضور، ایسا نہیں۔ اب میرا ہی گھر لیجئے یہاں کیا گھٹن ہو گی۔ پر میری سب سے چھوٹی نوچی جو ہے، اس کا پاؤں چلتا ہے۔ میں نے نچوا نچوا کر اس کا پلیتھن نکال دیا پھر بھی چلتا ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا: باجی، میں داس آشرم ہو آؤں؟"

"داس آشرم؟" مہاراج نے دہرایا "یہ کیسا آشرم ہے؟"

وہ نوجوانوں کا آشرم ہے۔ وہاں جو تپسوی بیٹھا ہے، وہ بھی نوجوان

ہے وہ خود کو گرو نہیں بلکہ داس کہتا ہے وہاں وہ نوجوان جاتے ہیں جن کے پاؤں چلتے ہیں نسیں چلتی ہیں ۔ دل چلتے ہیں ۔ وہاں کوئی روک ٹوک نہیں ۔ نوجوان جو جی چاہے ، کرتے ہیں ناچتے ہیں گاتے ہیں دارو پیتے ہیں تاش کھیلتے ہیں جب گرو ہی کوئی نہیں تو حضور ، بندش کیسی نوجوان وہاں رہنا چاہیں تو ٹیلے پر کھلے میدان میں پھوس کا جھونپڑا بنا لیتے ہیں ۔ بس داس کا ایک مطالبہ ہے کہ رات کے وقت لڑکیاں لڑکوں میں نہ رہیں ۔ الگ جھونپڑے میں چلی جائیں ۔"

مہاراج بولے "انجنا ، چلو ، ہم بھی وہاں چلیں ۔"

"حضور ، میرا خود جی چاہتا ہے کہ جاکر دیکھوں ۔"

"پھر سوچتی کیا ہو ؟"

وہ ہمیں وہاں گھسنے نہیں دیں گے ۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لئے داس آشرم کے دوار بند ہیں ۔"

"نہ گھسنے دیں" مہاراج نے کہا "چلو ، ایک نظر ہی دیکھ لیں گے ۔ ایک سادھو مہاراج راج بھون آئے تھے کہتے تھے : راجا کو پرجا کے حال کا پتا نہیں ہوتا ۔ جو خبر ملتی ہے وہ چھلنی میں چھانی ہوئی ہوتی ہے ۔ اس لیے راجا پر لازم ہے کہ بھیس بدل کر باہر نکلے ۔ پرجا کے رنگ ڈھنگ ، دکھ درد اپنی آنکھوں سے دیکھے ۔ انجنا ، تم میری ساتھی بنوگی ؟"

انجنا ہنسی ۔ بولی "اے حضور ، بائی صرف دو کام جانتی ہے ایک تو لوگوں کو لوٹنا انہیں بے وقوف بنانا مونڈنا نچوڑنا اور دوجے ساتھ دینا تن من دھن سے ساتھ دینا ۔ حضور ، یہاں بس لوٹنے کا ہی کام ہے میں تو ترسی ہوئی ہوں کہ کوئی ہو جس کا ساتھ دے سکوں ۔"

انجنا اور مہاراج دونوں نے گیروے کپڑے پہنے ، سادھو سادھنی کا رنگ جمایا اور داس آشرم کو چل پڑے ۔

داس آشرم مایا نگر کے پاس ڈنگے ٹبے کی چوٹی پر واقع تھا ۔ جب وہ ڈنگے ٹبے کے اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت کھلا میدان ہے ، جس میں یہاں وہاں بہت سی گھنی چھاؤں کے درخت لگے ہوئے ہیں ۔ درختوں کی چھاؤں میں بیس پچیس پھوس کے جھونپڑے بنے ہوئے ہیں ۔ جھونپڑوں

کے سامنے ، میدان میں ، نوجوان ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ ایک ٹولی گانے میں مصروف ہے ، دوسری ناچ رہی ہے ۔ ایک ٹولی سردائی گھوٹنے میں مصروف ہے ۔

سادھو سادھنی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سب متوجہ ہو گئے ۔ گانا بجانا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے ۔ یہ دیکھ کر داس کا بالکا دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا ۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا بولا "سادھو ، سادھنی جی ، جی آیاں نوں ۔ پر ستو کوئی بھول ہے ۔ یہ استھان سادھوؤں کے لیے نہیں ۔"

سادھنی بولی "مہاراج ، ہم بھول سے ادھر نہیں آئے ۔ ہمیں آشرم کے گرو سے ملنا ہے ۔"

"نہ ، مہاراج" بالکے نے جواب دیا "یہاں کوئی گرو نہیں ۔ یہ آشرم نہیں ، چھوٹوں کی منڈلی ہے ۔ چھوٹوں کے داس ادھر اس کٹیا میں بیٹھے ہیں ۔"

"بس ہمیں انہیں سے ملنا ہے ۔ گھبراؤ نہیں، ہم یہاں ٹکیں گے نہیں ۔ داس سے ملنے کی آگیا دو ۔"

"نہ ، سادھنی جی ۔ یہاں کوئی آگیا نہیں دی جاتی ۔ یہاں کوئی روک نہیں ، ٹوک نہیں جب گرو ہی نہیں تو روک ٹوک کیسی ۔ یہاں کوئی دوار بند نہیں ۔ سب کھلے ہیں ۔ وہ سامنے رہا ، داس جی کا دوار پدھاریے ، سادھو ، سادھنی جی ۔"

داس ایک خوش شکل نوجوان تھا ۔ بال لٹ پٹ داڑھی گھنی ، بھور کالی ، گیروے رنگ کی جین اور قمیض ۔ آنکھیں مدھ سے مخمور سادھو سادھنی کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا ۔ انہیں چٹائی پر بٹھایا ۔

سادھنی بولی "یہ کیسا آشرم ہے ، مہاراج ۔"

اس نے جواب دیا "یہ آشرم نہیں ، سادھنی جی ، منڈلی ہے ۔"

"آشرم نہیں منڈلی ہے ۔ گرو نہیں داس ہے یہ کیسا بھید ہے ، مہاراج ؟"

داس بولا "بس یہی ایک بھید ہے کہ کوئی بھید نہیں اس سنسار کی طرح سادھنی جی ، بھید سامنے دھرا ہے لوگ سامنے دھرے کو نہیں دیکھتے ۔ کہتے ہیں ،

بھید ضرور چھپا ہوتا ہے ۔ اس لیے وہ ڈھونڈ میں لگے ہیں ۔ پرَ بھونے سامنے دھر کر بھید کو چھپا لیا ہے ۔"

"سچ کہتے ہو ، داس جی" سادھو گنگنایا ۔

سادھنی بولی "بات کھلی نہیں ، داس جی مہاراج ۔ آپ نے یہ روپ کیوں بدل دئے؟ آشرم کو منڈلی بنا دیا ۔ گرو کو داس بنا دیا ۔ مہاراج، مدھ تو ایک ہی ہے ۔ یہ پیالہ کیوں بدل دیا ؟"

"سچ ہے ، سادھنی ، مدھ تو ایک ہی ہے ۔ پر ٹھوٹھے بدلتے رہتے ہیں جیسا سمے ویسا ٹھوٹھا ۔ پرانے سمے میں لوگ کہتے تھے : کوئی آگے چلے راستہ دکھائے گرو بنے اب سمے بدل گیا ہے پیچھے چلنے والے لوگ نہیں رہے اب ایسا گرو چاہیے جو پیچھے چلے ۔"

"داس جی" سادھو بولا "ایسا کیوں ہے کہ آج کے لوگ پیچھے چلنے والے نہیں۔ ؟"

داس مسکرایا ۔ بولا "سادھو جی مہاراج ، آگے پیچھے کو بھول جاؤ ۔ آگے پیچھے کا وشواس ہم نے خود باندھ رکھا ہے سچ یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی آگے ہے ، نہ پیچھے ہے ۔ یہ دیکھو کہ وہ چلنے والے ہیں ۔ ان میں چلنے کی لگن ہے ان میں ڈھونڈ ہے" وہ رک گیا ۔ پھر بولا "مہاراج ، جب پرانی راہیں پٹ جاتی ہیں تو پربھو ڈھونڈ کی جوت جگاتے ہیں اور مہاراج ، ڈھونڈ اندھی ہوتی ہے ۔ آگا پیچھا نہیں دیکھتی برا بھلا نہیں دیکھتی ۔ انہوں نے کیا نہیں آزمایا ۔ دیس تیاگا ۔ دولت تیاگی ۔ آرام تیاگا ۔ ڈگر ڈگر گھومے ۔ نشہ اپنایا ۔ اب یہ حرکت کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں ۔ جلدی کے چکر میں پڑے ہیں ۔ ان کی راہ نہ روکو ۔ جنہیں نئی راہ ڈھونڈنا ہوتی ہے انہیں روکتے نہیں ۔ روکو گے تو ان کے دل چلیں گے ، نسیں چلیں گی ، پاؤں چلیں گے ، وچار چلیں گے ۔" داس خاموش ہو گیا کٹیا میں گہری خاموشی چھا گئی ۔

"ایک بات پوچھوں ، داس مہاراج ؟" سادھنی نے خاموشی کو توڑا ۔

داس نے سر اٹھایا ۔

سادھنی بولی "آپ کا گرو کون ہے ؟"

"میرے پتاجی" داس نے کہا ۔

"وہ کہاں ہیں ؟"

"پتا نہیں" داس بولا "جب میں سترہ سال کا تھا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے انہوں نے پرتگیا کی تھی کہ اپنے گرو سوامی واسدیو کو اپنی پیٹھ پر لاد کر دنیا بھر کے پوِتراستھانوں کی یاترا کرائیں گے ۔"

"تم ــــــ تم ــــــ !" سادھو حیرت سے بولا "تم گرداس کے پتر ہو ؟"

"جی ، مہاراج" داس نے جواب دیا "میرے پتا بہت بڑے داس تھے ۔ انہوں نے مجھے داس بننا سکھایا ۔ وہ گرو کے داس تھے میں چیلوں کا داس بنوں گا ۔ راہ تو ایک ہی ہے چاہے آگے چل کر راہ دکھاؤ ۔ چاہے پیچھے چل کر راہ پر لاؤ ۔"

"دھن ہو ، مہاراج" سادھو ہاتھ جوڑے فرطِ جذبات سے اٹھ بیٹھا ۔

عین اس وقت باہر میدان سے اک شور بلند ہوا ۔ کٹیا میں خاموشی چھا گئی ۔ سب کی توجہ شور پر لگی تھی ۔ پھر مالک دوار پر آکر چلایا "مہاراج ، آپ کے پتاجی پدھارے ہیں ۔"

"میرے پتاجی !" داس نے دہرایا اور وہ کٹیا سے باہر نکل گیا پیچھے پیچھے سادھو اور سادھنی تھے ۔

سامنے بڑ کے درخت تلے ایک شخص بیٹھا تھا ۔ اس نے اپنے بڈھے گرو کو پیٹھ پر اٹھایا ہوا تھا ۔ درخت کے قریب پہنچ کر سادھو نے ہاتھ جوڑے "سوامی واسدیو جی مہاراج ۔"

سادھنی نے چیخ ماری ۔ "وہ دیکھو! وہ دیکھو !" وہ چلّائی "گرو کا دھڑ سُوکھ کر چیلے کے گرد لٹکا ہوا ہے اور چیلے کا سر سُوکھ کر گرو کی چھاتی پر ڈھلکا ہوا ہے ۔"

"بھگوان کی لیلا ہے" داس بولا "جس چیز کی لوڑ نہ تھی وہ سوکھ کر جھڑ گئی ۔ داس کا سر ، گرو کا دھڑ ، دو جسم ایک بن گئے ۔"

بالکا چلایا "مہاراج ، آج گُرو اور چیلے کا بھید کھل گیا ۔"

"ابھی نہیں" سادھنی بولی "اس بھید نے چولا بدل لیا ہے ۔ گرو چیلوں کا داس بن گیا ہے ۔"

..............○..............

دو مُونہی

سوچتی ہوں کہ میں تیاگ کلینک میں گئی ہی کیوں ؟ کیا فائدہ ہوا بھلا ؟ اپنی بیماری دور کرانے کے لئے گئی تھی ۔ ساری مخلوق کو بیمار کر کے آ گئی ۔ وہی بات ہوئی نا : بُڑھیا بُڑھیا تیرا کبڑ دُور ہو جائے یا ساری دنیا کُبڑی ہو جائے ۔

لیکن تیاگ بیتی سنانے سے پہلے میں اپنا تعارف تو کرالوں ۔ میں سانوری ہوں ۔ تیس سال کی ۔ سلمان سے میرج ہوئے دو سال ہوئے ہیں ۔ لو میرج تھی ۔ میرے خدوخال عام سے ہیں ۔ یعنی ایوریج سے کچھ بہتر ۔ ہاں ذہن کی تیکھی ہوں ۔ کاٹھی مضبوط ہے ۔ جسم تنا تنا ۔۔۔ لیکن نہیں ۔ میں غلط بیانی کر رہی ہوں ۔ کسر نفسی سے کام لے رہی ہوں ۔ میرے خدوخال ایوریج سہی لیکن مجھ میں بڑا چارم ہے ۔ راہ چلتے سر اٹھا اٹھا کر ، گردن موڑ موڑ کر دیکھتے ہیں ۔ دیکھتے ہیں تو یوں دِکھتے ہیں جیسے سر سے پاؤں تک الّو کے پٹھے بن گئے ہوں ۔ بس میں نہیں رہتے ۔ کنٹرولز ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں ۔ ڈولتے ہیں ۔ پتوار چھوٹ جائے تو کشتی ڈولتی ہے نا ۔

میں لڑکی پن سے نکل آئی ہوں ۔ لیکن ابھی لڑکی ہی ہوں ۔ عورت نہیں بنی ۔ اللہ نہ کرے کہ بنوں ۔

عجیب سا عالم ہے ۔ جیسے شام کو ڈسک ہوتی ہے ۔ رات نہیں پڑی ۔ دن بھی نہیں رہا لیکن دن دن سا لگتا ہے ۔

لو ایک بات تو میں بھول ہی گئی ۔ مجھ میں ایک عجیب سی بات ہے ۔ جیتی ہوں بھرپور جیتی ہوں ۔ تھری ڈائمنشنل زندگی سے عشق ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو جیتے ہوئے دیکھتی بھی ہوں ۔ پرکھتی رہتی ہوں ۔ سیانے کہتے ہیں یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں ۔ نہیں ہو سکتیں ۔ یا تو جیو یا خود کو جیتے دیکھو ۔ وہی ایٹ دی کیک اینڈ ہیو اِٹ والی بات ہے ۔ پتا نہیں میری بات

کیوں الگ ہے ۔ کیک کھاتی بھی ہوں ، پاس بھی رکھے رہتا ہے ۔

بٹے ! مصیبت ہے ۔ بڑی مصیبت ہے ۔ اپنے برتاؤ کی تفصیلات پر نظر رکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے ۔ مثلاً میں جھوٹ بولتی ہوں ۔ ساری دنیا بولتی ہے ۔ میں کس شمار قطار میں ہوں بھلا ۔ لوگوں کے لیے جھوٹ ایک معصوم سی چمکیلی سی آرام دہ بات ہے ۔ بٹے ایسا ہے مجھے تو پتا نہ تھا ۔۔۔ لو میں نے خط لکھا تھا ، پتہ نہیں کیوں نہیں ملا ۔ نہیں نہیں مجھے تو اس لڑکے سے جذباتی لگاؤ نہیں ۔ ایسے ایسے آرام دہ جھوٹ ۔ لیکن ایسے جھوٹ میرے لیے آرام دہ نہیں ہوتے ۔ کانفلکٹ کا باعث بن جاتے ہیں ۔ اِدھر جھوٹ بولا اُدھر اندر سے آوازے اُٹھے ۔ جھوٹ ، جھوٹ ، جھوٹ ۔

نہیں ، یہ مثال غلط ہے مجھے یہ مثال نہیں دینی چاہیے تھی ۔ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ۔ کیوں بولوں ؟ جھوٹ وہ بولتے ہیں جنہیں ڈر ہوتا ہے کہ سننے والے کو سچ کڑوا لگے گا اور وہ تھو تھو کرے گا ۔ میں تو ان لڑکیوں میں سے ہوں جن کے منہ سے کڑوا سچ سن کر بھی سننے والا بدمزہ نہیں ہوتا ۔ پھر جھوٹ بولنے کا فائدہ؟ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ مجھ میں بڑا چارم ہے ۔ راہ چلتے کوئی بانکا اچھا لگے تو ایسی چھلکی چھلکی بھرپور نگاہ ڈالتی ہوں کہ اس کا سارا کلف اتر جاتا ہے ۔ "گویا" ہو کر گر پڑتا ہے ۔ پھر میرے اندر سے آواز آتی ہے : تت تت ۔ بیچارہ ۔ اپنے آپ سے بھی گیا ۔

مجھے پتہ ہے کہ میں بڑی طاقت ور نگاہ رکھتی ہوں ۔ اتنی سادگی سے نخرہ کرتی ہوں کہ کوئی اسے نخرہ مان ہی نہیں سکتا ۔ سمجھتا ہے انوسنس ہی انوسنس ہوں ۔ میک اپ کرتی ہوں لیکن کیا مجال کوئی سمجھے کہ میڈ اَپ ہے ۔ سمجھتے ہیں میک اپ سے بے نیاز ہوں ۔ لو ، وہ میک اپ ہی کیا ہوا جو میک اپ نظر آئے ۔ پھٹے منہ ایسے میک اپ کا ۔

بس میری ایک ہی مشکل ہے ۔ میرے اندر کچھ ہے ۔ پتہ نہیں کیا ہے ۔ پر ہے ۔ جس طرح مدفون خزانے پر سانپ ہوتا ہے ۔ جس طرح اہرام مصر کے اندر جادو ٹونا کیلا ہوا ہے ۔ ویسا ہی کچھ ہے ۔

اونہوں ! غلط کہہ گئی ۔ میرے اندر ایک نہیں دو ہیں ۔ دو روحیں ہیں ۔

کبھی ایک کنٹرول پر بیٹھ جاتی ہے کبھی دوسری ۔ میں دومونہی سانپ کی طرح ہوں ۔ کبھی دومونہی دیکھی ہے ؟ اس کے دو سر ہوتے ہیں ایک سر کی جانب ، دوسرا دم کی جانب ۔ سر اٹھایا چل پڑی ۔ پھر رک گئی سر زمیں پر رکھدیا پھر دم والا سر اٹھایا اور اس جانب چلنے لگی ، کبھی اس جانب کبھی اس جانب ۔ پتہ نہیں چلتا کہ کب کس جانب چلنے لگوں گی ۔ پیش خبری سے عاری ہوں مطلب کہ Unpredictable ہوں ۔ بس یہی میری مشکل ہے یہی میری بیماری ہے ۔

لیکن ٹھہریئے شروع شروع میں مجھے پتہ نہ تھا کہ (Unpredictability) بری چیز ہے ۔ الٹا میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بڑی پیاری خصوصیت ہے ۔ آپ کو کیا پتا جوان لڑکی ہو ۔ چھیڑ دینے والی نگاہ ہو ۔ بے نیازی سے مخمور ہو ۔ اوپر سے برتاؤ Unpredictable ہو ۔ پھر تو وہ تلوار بن جاتی ہے ۔

بچپن سے ہی میں دو دلی تھی ۔ کبھی تو اپنی مِس اتنی اچھی لگتی اتنی اچھی لگتی کہ میں اس کے وارے نیارے جاتی ۔ کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو ایسے دکھتی جیسے اکتائی تھکی ہاری بے جان عورت ہو ۔ کبھی ماں باپ بڑے پیارے لگتے کبھی ایسا لگتا جیسے قصائی ہوں ۔

دو ایک محبتیں بھی ہوئیں ۔ کبھی محبت کے جذبات سے چھلکتی ، چھلکے جاتی ، کبھی سوکھی کاٹھ ہو کر رہ جاتی ۔

یہ دو دھاری پن بچپن ہی سے موجود تھا ۔ دو سوادی تھی ، کھٹ مٹھی ، گنگا جمنی ، گرم ٹھنڈی ، الٹی سیدھی ، سبھی کچھ تھی لیکن ان دنوں میں اس بات کو اہمیت نہ دیتی تھی ۔ جوان ہوئی تو دو مونہی ابھرتی آئی ابھرتی آئی ۔۔ چھا گئی ۔ پھر دفعتاً مجھے احساس ہوا ۔ ڈر گئی ۔ بُری طرح سے ڈر گئی ۔

ان دنوں میں سلمان کی محبت میں چور تھی ۔ اتنی لت پت تھی کہ دوسرا سر اٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا ۔ اس دیوانگی میں ڈیڑھ سال گزر گیا ۔ پھر ایک روز میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سلمان نہ تھا ۔ پتا نہیں کون تھا ۔ نہ وہ رنگ نہ وہ روپ نہ وہ تازگی نہ چمک ۔ عمومیت اور بے بسی سے لدا پھندا ایک انسان ، پژمردہ ، بے جان ، جس سے مشک کافور کی بو آتی تھی ۔ میں ڈر گئی ۔ اپنی دنیا تباہ ہونے کے خوف سے ڈر گئی ۔ خود کو بچانے کے لیے میں

نے جھٹ پٹ سلمان سے شادی کر لی ۔ شادی کی ہماہمی میں بات پھر چل نکلی ۔
بہر حال ، مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بیماری ہے ۔ میں مینٹل ہوں ۔ میں نے اس احساس کو بہت دبایا ۔ جتنا دباتی اُتنا ابھرتا ۔ میں نے بڑے جتن کیے ۔ ڈاکٹروں سے ملی ۔ ہسپتالوں میں اس قدر گھومی پھری کہ لوگ مجھے ہاسپیٹل واکر سمجھنے لگے ۔ سپیشلسٹ دوا کیا دیتے ۔ انھوں نے میری بیماری کو سمجھا ہی نہیں ۔ میں نے بہت سمجھایا لیکن سمجھانا آسان ہوتا ہے سمجھنا بہت مشکل ۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گئی ۔

شادی سے پہلے تو سلمان میری Unpredictability پر اس قدر مسحور ہوتا تھا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے ۔ میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد بھی یوں ہی پھن پھیلا کر میرے ہیرے پھیرے لیتا رہے گا ۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ، اس کا پیش خبری کا مطالبہ بڑھتا گیا ۔ اسے میرے دومونہی پن پر غصہ آنے لگا ۔ میں گھبرا گئی ۔ سوچتی رہی سوچتی رہی ۔ ادھر میں بھی تو ایک نہ تھی ۔ میرے اندر کی دوسری میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی ۔ ہٹاؤ سلمان کو ۔ کوئی اور سہی جو تیرے دومونہی پن پر مسحور ہو جائے ۔ اپنے گرد کوئی اور پھن پھلا دیکھو ۔ دنیا میں نوجوان سبھی ادلتی بدلتیوں پر جان چھڑکتے ہیں ۔ یہ سر زمین پر رکھدو ۔ دوسرا اٹھاؤ ۔"

دوسرا سر اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھتی تو وہ سپاٹ نظر آتا ۔ روکھا پھیکا ، ہنئے ! کیا میں اس پر جان دیتی رہی ؟

پھر وہ واقعہ پیش آ گیا اور میں لرز کر رہ گئی ۔

ایک روز سلمان کا ایک نیا دوست گھر آ گیا ۔ اس وقت سلمان موجود نہ تھا ۔ میں تو اسے دیکھکر ششدر رہ گئی ۔ وہی ۔۔۔ وہی دو سال پہلے کا سلمان جسے دیکھکر خود کو میں نے اس کے قدموں میں ڈالدیا تھا ۔ وہی رنگ ، وہی روپ ، وہی شوخی ، وہی تازگی ۔ میں نے انجانے میں ایک بھرپور چھیڑنے والی نگاہ ڈال دی ۔ اس نے پھن پھلایا ، اور بین کے ہیرے پھیرے لینے لگا ۔ عین اسوقت سلمان آ گیا ۔ میں جاگ پڑی ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میری "میں" الٹھ پلتھ ہو رہی ہے ۔ ڈر گئی ۔ بُری طرح سے ڈر گئی ۔ اس روز میں نے فیصلہ کر

لیا کہ تیاگ کلینک جاؤنگی ۔ ضرور جاؤنگی ۔ چاہے کچھ ہو جائے ۔

چھ مہینے پہلے تیاگ کلینک کے متعلق میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا ۔ وہ خود ذہنی بیماری میں مبتلا تھی ۔ ایک مہینہ تیاگ کلینک میں زیر علاج رہی ۔ صحت مند ہو کر لوٹی ۔

دور پہاڑوں میں تیاگ ایک قصبہ ہے ۔ وہاں ڈاکٹر داؤد نے ذہنی بیماروں کے لیے ایک ہسپتال کھول رکھا ہے ۔ ڈاکٹر داؤد ایک زمیندار ہے ۔ ولایت سے ایم ڈی کر کے آیا ہے ۔ مقصد پریکٹس کرنا نہیں بلکہ علاقے کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے ۔ عمر بھر کے تجربے اور تحقیق کے بعد اس نے ایک اپنا طریق علاج ڈسکور کیا ہے ۔ جڑی بوٹیوں اور مش رومز سے علاج کرتا ہے ۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔ دور دور سے مریض آتے ہیں ۔ ان کی رہائش کے لیے ڈاکٹر نے ایک ہوسٹل تعمیر کر رکھا ہے ۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن میری سہیلی نے بتایا کہ علاج شروع کرنے سے پہلے وہ مریضوں سے زبانی اور تحریری حلف لیتا ہے کہ علاج کے دوران میں بغیر چون و چرا ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کرونگا ۔ اس دوران میں ذاتی سوچ بچار کو عمل میں نہیں لاؤں گا ۔ میں سچے دل سے اپنی ول سرنڈر کرتا ہوں ۔ یہ سن کر میں ڈر گئی ۔ نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو گا ۔ میں سبھی کچھ تیاگ سکتی ہوں اپنی ول نہیں تیاگ سکتی ۔ میرے پاس لے دے کر اک " میں " ہی تو ہے ۔ اسے میں کیسے تیاگ دوں ؟ کیسے کسی دوسرے شخص کے تابع کر دوں ؟ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا ۔ میری سہیلی نے مجھے بہت سمجھایا کہ ذہنی بیماری کے علاج میں سب سے بڑی رکاوٹ "میں" ہی تو ہوتی ہے ۔ اس نے بڑی دلیلیں دیں ، لیکن میں نہ مانی ۔

اس سے کچھ دیر پہلے میرے چچا نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ انھوں نے کہا کہ سانوری بیٹی تیری ساری مشکلات دور ہو جائیں گی ۔

بزرگ کی خدمت میں پہنچی ، انہیں تفصیل سے اپنی ذہنی کیفیت سنائی ۔ سن کر بولے "بیٹی " سب ٹھیک ہو جائیگا ۔ ہماری بیعت کر لو ۔ "

"بیعت کیا ہوتی ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

بولے "بیعت کا مطلب ہے ' حوالگی ، سپردگی ، خود کو ہمارے سپرد کر دو ۔"

"کیسے سپرد کر دوں ؟" میں نے پوچھا ۔

بولے اپنی مَیں تیاگ دو ۔ سارا شر تمہاری مَیں کا ہے ۔ وہ خودسر ہو گئی ہے ۔ بٹ کر دو ہو گئی ہے ۔ جیسے سانپ کی زبان بٹ کر دو ہو جاتی ہے ۔

غصے میں مَیں کھولنے لگی اور جواب دیے بغیر بھاگ آئی ۔

ہاں تو اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤنگی ، لیکن حلف نہیں اٹھاؤنگی ۔

اس رات میں نے سلمان سے کہا "سلمان میں ایک مہینے کے لیے ہل اسٹیشن جانا چاہتی ہوں ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے اکیلی رہوں ۔ کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں بھیڑ بھڑکا نہ ہو ۔ کراؤڈ نہ ہو ۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ پھر بولا کہ دیکھو اگر واقعی تم تن تنہا رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے ۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔

تیاگ کا سفر خاصہ دشوار تھا ۔ پہلے تو کلیات کی طرف جانا پڑا ۔ رات وہاں ٹھہری ۔ پھر پھول گلی سے تیاگ جانے والی سوزوکی مل گئی ۔ سڑک بہت تنگ اور نیم پختہ تھی ۔ ساٹھ میل کا سفر سات گھنٹوں میں طے ہوا ۔ شکر ہے کلینک سے ملحقہ ہوسٹل میں جگہ مل گئی ۔ رات گویا گھوڑے بیچ کر سوئی ۔ اگلے دن نو بجے کے قریب کلینک پہنچی ۔ ایک گھنٹہ ریسپشن میں انتظار کرنا پڑا ۔ پھر ڈاکٹر نے اندر بلا لیا ۔

اپنے روبرو ایک نوجوان ڈاکٹر کو دیکھکر میں حیران ہوئی ۔ سہیلی کی باتیں سن کر میں سمجھی تھی کہ ڈاکٹر داؤد معمر آدمی ہو گا ۔

"آپ ڈاکٹر داؤد ہیں ؟" میں نے پوچھا ۔

"میں ان کا بیٹا ڈاکٹر خالد ہوں" وہ بولا ۔ والد صاحب انتقال کر گئے ہیں ۔ اب میں ان کی جگہ کام کر رہا ہوں ۔ یہ کہتے ہوئے خالد نے ایک لمبا سا کاغذ اٹھا لیا ۔ بولا " سب سے پہلے آپ اپنی کیس ہسٹری لکھوا دیجئے ۔ ہر وہ تفصیل بتائیے

جسے آپ اہم سمجھتی ہیں ۔"

دو گھنٹے میں کیس ہسٹری کی تکمیل ہوئی ہے۔میں نے ہر بات بتا دی ۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب آپ آرام کیجئے ۔ رات کو میں آپ کا کیس سٹڈی کروں گا ۔

کل سے آپکا علاج شروع ہو جائے گا ۔

پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی ۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں ۔ یہ بتائیے مجھے کہ اس گاؤں کا نام تیاگ کیوں ہے ؟

وہ مسکرایا ۔ کہنے لگا "بس نام ہے ۔ جس طرح آپ کا نام سانوری ہے ۔ حالانکہ آپ گوری ہیں ۔" تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر سے بات شروع کی ۔ کہنے لگا ۔"والد صاحب کا اس کے متعلق ایک نظریہ تھا ۔ مفروضہ کہہ لیجیے ۔"

میں پھر سے بیٹھ گئی ۔ ڈاکٹر خالد میں مجھے ایک بے نام سی کشش محسوس ہونے لگی تھی ۔

بتائیے نا" میں نے کہا" وہ مفروضہ کیا تھا ؟ لیکن پہلے تو یہ بتائیے کہ تیاگ کا مطلب کیا ہے ؟"

کہنے لگا "تیاگ ہندی کا لفظ ہے ۔ مطلب ہے : چھوڑ دینا ۔ ترک کر دینا ۔ یہ قصبہ ہندوؤں نے آباد کیا ۔ اوپر ٹیلے پر ایک مندر بنا ہوا ہے ۔ مندر کے ساتھ ایک عمارت ہے ۔ غالباً اس عمارت کا نام تیاگ بھون تھا ۔" وہ رک گیا ۔

والد صاحب کا نظریہ بھی تو بتائیے نا ؟ میں نے پوچھا ۔

مسکرا کر بولا "والد صاحب کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کی بلندی کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہے ۔ جوں جوں نیچے اترو ، جذبات کی شدت بڑھتی جاتی ہے ۔ وہ گاڑھے ہو جاتے ہیں ، بوجھل بھاری جوں جوں اوپر جاؤ ، جذبات میں لطافت پیدا ہوتی ہے ۔ مٹھاس پیدا ہوتی ہے ۔ نیچے لاگ لگاؤ بڑھتے ہیں ۔ اوپر بے نیازی کا سماں پیدا ہوتا ہے ۔ والد صاحب کہا کرتے تھے : دس ہزار کی بلندی پر بھورسمے کا عالم ہوتا ہے ۔"

"بھو سے کیا ؟"

"جس طرح صبح سویرے ڈان کے وقت سپیدی سی ہوتی ہے ۔ ایک عجب سا سکون، اطمینان ، نروان ، دس ہزار کی بلندی پر جذبات کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے ۔ نیچے کے لوگ زندگی کے تالاب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اوپر کے لوگ ڈوبتے نہیں تیرتے ہیں ۔ نیچے خواہش میں ڈنک ہوتا ہے ۔ اوپر خواہش تو ہوتی ہے ۔ پر اسمیں ڈنک نہیں ہوتا ۔ نیچے انسان کی "میں" میں اتنا ملبہ ہوتا ہے کہ وہ پتھر بن جاتی ہے ۔ اوپر روئی کے گالے جیسی ہلکی پھلکی رہتی ہے ۔ نیچے محبت و نفرت دونوں میں دھار ہوتی ہے ۔ اوپر نفرت بھی ہوتی ہے ، محبت بھی ، لیکن دھار نہیں ہوتی ۔"

اوپر سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ میں نے پوچھا ۔

"آٹھ دس ہزار کی بلندی" اس نے جواب دیا ۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہاں تیاگ میں کوئی ذہنی بیماری نہیں ہوتی ۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں ۔ وادیوں میں ، میدانوں میں ۔ ایک بات یقینی ہے ، ذہنی بیماری "میں" سے پھوٹتی ہے ۔ "میں" میں گرہیں لگ جاتی ہیں ۔ آپ ایک سال یہاں قیام کریں ۔ ساری گرہیں کھل جائینگی ۔ آپ ہی آپ ڈنک نکل جائیں گے ۔ دھاریں کند ہو جائیں گی ۔

میں خالد کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی ۔ اس میں سے ایک عجیب سا اطمینان چھن چھن کر کمرے کی فضا کو منور کیے جا رہا تھا ۔ اس کی باتیں میرے لیے بہت انوکھی تھیں ۔ میری "میں" پلپلی ہوئی جا رہی تھی ۔ میں نے ایک شدید کوشش کی ۔ اٹھ بیٹھی ۔ تھینک یو ڈاکٹر ۔"

اس رات میں اپنے کمرے کی ٹیرس پر بیٹھی رہی بیٹھی رہی ۔ پتا نہیں کب تک بیٹھی رہی ۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا وزن کم ہوتا جا رہا ہو ۔ میرا تعلق دھرتی سے کٹتا جا رہا ہو ۔

اگلے روز ڈاکٹر خالد نے کہا "میں نے آپ کا کیس سٹڈی کر لیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ آپ دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گی ۔ آج سے آپ کا علاج شروع ہو جائیگا ۔ علاج شروع کرنے سے پہلے آپ کو ایک فارمیلٹی ادا کرنی ہوگی ۔ یہ

ایک حلف ہے ۔ اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔ ایک تو ہاتھ اٹھا کر یہ حلف پڑھیئے اور دوسرے اس فارم پر دستخط کر دیجیے ۔"

نہیں ڈاکٹر صاحب ، میں نے کہا ۔ میں اپنی مَیں کسی کے حوالے نہیں کر سکتی ۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ۔ اس حیرت میں ستائش بھی شامل تھی ۔ میں نے جواب میں ایک بھرپور نگاہ چھلکائی ، لیکن خالد پر کلف تھا ہی نہیں جو ٹوٹتا ۔ ہاں ذرا سا لڑکھڑایا ضرور تھا ۔

کہنے لگا "مسز سلمان ، تمام ذہنی بیماریاں 'میں' سے پھوٹتی ہیں ۔ یا تو مَیں میں گرہیں لگ جاتی ہیں یا وائرس پڑ جاتی ہیں ، یا کانٹے اگ آتے ہیں اس لئے مَیں کو تیاگے بغیر شفا نہیں ہوتی ۔

"نہ ہو شفا" میں نے جواب دیا ۔

وہ مجھے سمجھانے لگا ۔ بولا "سائیکی ایٹری میں بھی ڈاکٹر مریض کی توجہ ذات کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مریض لڑکیوں کو ڈاکٹر سے محبت ہو جاتی ہے ۔"

مجھے اس پر غصہ آگیا ۔ میں نے کہا ڈاکٹر خالد ۔ میں اتنی دور چل کر آپ سے محبت رچانے نہیں آئی ۔ پھر میں نے ایک ایسی نظر اس پر ڈالی جس کا مطلب تھا ، آپ بے شک مجھ سے محبت رچائیں ۔

وہ گھبرا گیا ۔ کہنے لگا ۔ اچھا آپ یوں کریں کہ آٹھ دس روز یہاں قیام کریں اور اس مسئلہ پر سوچیں ۔ شاید ۔۔۔ وہ رک گیا ۔

کیا آپ حلف لیے بغیر علاج شروع نہیں کر سکتے ؟ میں نے پوچھا ۔

حلف علاج کا ایک حصہ ہے ، اہم ترین حصہ ، وہ چڑ کر بولا ۔

"خدا حافظ" میں اٹھ بیٹھی ۔

شام کے وقت جب میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی تو دروازہ بجا ۔ میں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا : کم ان ۔ میرے سامنے ڈاکٹر خالد کھڑا تھا ۔

"بیٹھیے" میں نے کہا ۔ میرا خیال تھا کہ وہ پوچھے گا : کہیے آپ نے کیا

فیصلہ کیا ۔ لیکن اس نے آتے ہی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا ۔ بولا وہ سامنے ٹیلے پر جو جنگل ہے ، اس جنگل میں عجیب و غریب قسم کے مشروم اگتے ہیں ۔ مثلاً ایک مشروم ہے جو ٹہلتا ہے ۔"

کیا مطلب ؟ میں نے پوچھا ۔

"ایک فٹ کے دائرے میں ٹہلتا ہے ۔ صبح یہاں ہے دوپہر کو آدھ فٹ سرکا ہوا ، شام کو پورا ایک فٹ ۔"

میں ہنسی "اب مجھے الف لیلوی کہانیاں نہ سنائیے ۔

وہ مسکرایا بولا "حقیقت ، رئیلٹی ، آدھی سے زیادہ الف لیلوی ہے ۔ آپ خود الف لیلوی برتاؤ برت رہی ہیں ۔

کون سا برتاؤ؟

دو رخی برتاؤ ، اس نے جواب دیا ۔ اس کے بعد دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر وہ مجھے عجیب و غریب قسم کے مشرومز کے متعلق بتاتا رہا ۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا آپ مشرومز سے علاج کرتے ہیں ۔

کہنے لگا ، ہاں ۔ بیشتر ۔

میں نے پوچھا ، مشروم کیسا اثر رکھتا ہے ۔

کہنے لگا کہ سب سے پہلے مریض کو ہم وہ مشروم دیتے ہیں جو مریض کی مَیں سے پھونک نکال دے ۔ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا ۔

اسی رات خانساماں کھانا لیکر آیا تو کہنے لگا ۔ بیگم صاحبہ ڈاکٹر خالد کبھی ہوسٹل میں نہیں آئے تھے ۔ آج پہلی مرتبہ انہیں ہوسٹل میں دیکھکر میں تو حیران رہ گیا ۔ خانساماں کی بات سن کر میری مَیں میں پھونک اور بڑھ گئی ۔

اگلے روز شام کو وہ پھر آگیا ۔

میں نے پوچھا ڈاکٹر آپ شادی شدہ ہیں کیا ؟

اس نے نفی میں سر ہلا دیا ۔ کہنے لگا کہ میں لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرونگا ۔ جو ہمارے طریق علاج کو اپنا لے ۔

میں نے اسے چھیڑا "اور اپنی مَیں" چاندی کی پلیٹ میں رکھکر آپ کو بھینٹ کر دے ۔

نہیں وہ مسکرایا ۔ میں اپنی میں چاندی کی پلیٹ میں رکھکر اسے پیش کروں وہ اسے قبول کر لے محترمہ ۔ وہ بولا محبت کیا ہے ؟ اپنی دِل سرنڈر کر دینا ۔ اپنی مَیں دوسرے کے تابع کر دینا ۔

"ساری دنیا محبت کرتی ہے" میں نے طنزاً کہا "لیکن ۔۔۔۔"

اونہوں ! وہ محبت نہیں ہوتی خواہش ہوتی ہے ، حرص ہوتی ہے ، اور زیادہ تر محبوب سے نہیں بلکہ اپنی انا سے محبت ہوتی ہے ۔ محبوب تو ایک بہانہ ہوتا ہے ۔ ایک پردہ ہوتا ہے ، ایک ڈیلوژن ۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے سلمان سے محبت کی ہے ۔ اگر آپ سچے دل سے سلمان سے محبت کرتیں تو دوزخی مدت سے ختم ہو چکی ہوتی ۔ آپ کو تیاگ میں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی ۔

پھر دفعتاً اس نے موضوع بدلا ۔ کہنے لگا کہ "صبح کے وقت آپ کیا کرتی ہیں ؟ کلینک میں آ جایا کیجیے ۔ مریضوں کی کیس ہسٹریاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں ۔ دلچسپ اور بصیرت افروز "۔

اگلے روز میں کلینک میں جا بیٹھی ۔ ڈاکٹر خالد مجھے دیکھکر بہت خوش ہوا ۔ لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا ۔ کہنے لگا ۔ "آج ایک ہی مریض ہے ۔ بہت دور سے آیا ہے ۔ بہت بڑا عابد ہے ۔"

"کیا تکلیف ہے اسے ۔" میں نے پوچھا ۔

"پتا نہیں ۔" وہ بولا ۔ "ابھی آکر آپکے سامنے بیان کرے گا ۔"

عین اسی وقت ایک باریش نورانی شخص کمرے میں داخل ہوا ۔ "السلام علیکم ۔"

"وعلیکم السلام" ڈاکٹر نے جواب دیا ۔ تشریف رکھیے ۔ فرمائیے آپ کس لیے تشریف لائے ہیں۔

بوڑھے نے بامعنی نگاہوں سے میری جانب دیکھا ۔

"یہ میری اسسٹنٹ ہیں" ڈاکٹر خالد نے کہا ۔

یہ سن کر بوڑھا مطمئن ہو گیا ۔

"فرمائیے ؟" ڈاکٹر نے کہا ۔

بوڑھے نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ "میری آپ بیتی بہت مختصر ہے۔"

"جی فرمائیے۔" خالد بولا۔

"میں نے گذشتہ بیس سال تکیے میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی ہے، بیس سال۔" اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپی۔ وہ رک گیا۔ کمرے میں گہری بوجھل خاموشی چھا گئی "صدیاں گزر گئیں ۔۔۔ لیکن" اس کی آواز پھر گونجی ۔۔۔ "لیکن ۔۔ میں آج تک اللہ کو نہیں مان پایا۔ کوشش کے باوجود نہیں مان پایا۔ میں اسکے وجود کو دل سے قبول نہیں کر سکا۔" کمرے میں پھر سے بوجھل خاموشی چھا گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پتھر دے مارا ہو۔ میری آنکھوں میں تارے ناچے اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ بوڑھا جا چکا ہے اور خالد سر جھکائے بیٹھا ہے۔

"ڈاکٹر خالد" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ بولا۔ "فرمائیے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا؟" وہ بولا۔

"میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔"

"میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔" ڈاکٹر خالد نے کہا۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم حلف لیے بغیر آپ کا علاج کرینگے۔"

میں اٹھ بیٹھی۔ "شکریہ، ڈاکٹر۔ اب اسکی ضرورت نہیں رہی۔"

"تو کیا آپ علاج نہیں کرائیں گی؟"

"نہیں" میں دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی، "اگر اپنی وِل ہی سرنڈر کرنا ہے تو میں اسکی بھینٹ کیوں نہ کروں جس کے پردے میں مَیں نے دو سال ٹوٹ کر اپنی انا سے محبت کی ہے۔ خدا حافظ، ڈاکٹر۔"

.... ○ ......

رُکاوٹ

باؤڈل اینڈ ڈریب!

دن چڑھتا ہے تو سوچتی ہوں کہ کیسے ختم ہو گا، اتنا لمبا پہاڑ سا دن ۔ وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے ۔ زندگی میں وہ چارم نہیں رہا ۔ بچ ایڈاباؤٹ تھنک ۔ دراصل کسی بات کا چاؤ نہیں رہا ۔ کیوراسٹی نہیں رہی ۔ اندر کا وہ بچہ نہیں رہا ۔ جو بات بات پر حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا ۔ دی چائلڈ ہوسٹڈ اِن ہر شوز اینڈ ونڈرڈ ۔

پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے! کیوں؟ ایسے لگتا ہے جیسے خوشبو اور رنگ اڑ گئے ہوں اور خالی پھول کی پتیاں رہ گئی ہوں ۔ جیسے سانس میں بائیٹ نہ رہی ہو ۔

سوچتی ہوں کہ ابھی تو ابتدا ہی تھی ۔ زندگی میں داخل ہوئے تین چار سال ہی ہوئے تھے ۔ ابھی سے ایسا کیوں ہو گیا ۔

ایک وہ دن تھے جب بڑے چاؤ سے زندگی میں قدم رکھا تھا ۔ مائی گاڈ! کیا دن تھے وہ! ارد گرد چاروں طرف مینا بازار لگا ہوا تھا ۔ ۔ رونقیں، دلچسپیاں، رنگینیاں، ایکسائٹمینٹ ۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ اس رنگ رنگیلے میلے میں آزادی سے گھوموں ۔ ایکسائٹمینٹ سے چھن چھن کرتی پھروں ۔ کوئی روک نہ ہو ۔ ٹوک نہ ہو ۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو ۔ جو چاہوں کروں ۔ رنگیلی بتیوں سے جھولی بھر لوں ۔ خود کی موم بتی کو دونوں سروں پر جلائے رکھوں، اک تماشہ لگائے رکھوں، راہ چلتوں کو ٹٹولوں، آنکھوں میں جھانک جھانک کر دیکھوں ۔ کیا یہ وہی تو نہیں؟ میرا ساتھی، ہمراہی جو میرے بغیر آدھا ہے ۔ جسے میں پورا کرنے کے لیے آئی ہوں ۔

ان دنوں بس ایک ہی خواہش تھی ۔ ایک آرزو ۔۔ آزادی ۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی تمام تر رنگینیاں میری منتظر تھیں ۔ بس رکاوٹ ختم ہونے کی دیر

تھی ۔ اور میرا گھر رکاوٹ ہی رکاوٹ تھا ۔

ممّی اور ڈیڈی بھی عجیب جوڑا تھے ۔ ممّی پھسلن ہی پھسلن ڈیڈی روک ہی روک ۔ ممی موومینٹ کی دیوانی ، ڈیڈی سٹیبیلٹی کے رسیا ۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے ، پر دور دور جیتے تھے ۔

بیچاری ممی ۔۔ اس نے ڈوئلٹی پال رکھی تھی ۔ میاں کے بوردم سے بچنے کا کوئی راستہ بھی ہوتا ۔ یہ ڈوئلٹی تربوز ایسی تھی ۔ اوپر سے ہری ہری اندر سے لال لال ۔۔۔ ڈیڈی بہت ہی سٹریٹ فارورڈ تھے ۔ باہر اندر کا کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ باہر ہرا ہرا اور اندر لال ۔ انہیں پتہ ہی نہ تھا کہ ممی دھوپ چھاؤں جی رہی ہے ۔ مجھے ڈیڈی سخت ناپسند تھے ۔ خواہ مخواہ کی رکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے ۔ دوسروں کے لیے بھی ۔ اپنے لئے بھی ۔

مجھے ممی بھی پسند نہ تھی ۔ اونہوں! یہ کیا ہوا کہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ۔ جو جینا ہے تو کھل کر جیو ۔ علانیہ جیو ۔ اپنی کنوکشنز پر شرمانا کیوں ؟ پردے کیوں ؟ وہ تو ہیپو کریسی ہوئی نا ۔ اونہوں! مجھے پردے اچھے نہیں لگتے ۔ ملفوف کرداروں سے مجھے چڑ ہے ۔ میں کہتی ہوں یا تو بھڑک کر جیو اور اگر جرأت نہیں تو پھر بجھے رہو ۔

پتا نہیں کیوں ۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ میرا بچپن پابندیوں اور رکاوٹوں میں گزرا ۔ دل میں پابندیوں کے خلاف لاوا اُبلتا رہا ۔ ریوولٹ کا جذبہ پلتا رہا ۔ مجھے بڑی ہو لینے دو پھر دیکھونگی کون میرا راستہ روکتا ہے ۔ ان دنوں زندگی میں صرف ایک آرزو تھی ، ایک خواہش ایک جنون ۔۔۔ آزادی ۔

پھر ۔۔۔ دفعتاً آزادی مل گئی ۔

یوں جیسے کسی نے کھل جا سم سم کہہ دیا ہو ۔ میرے سامنے ہیرے جواہرات سے جگ مگ کرتا غار کھلا پڑا تھا ۔ میں تو بکی بکی رہ گئی !

ہوا یہ کہ بیٹھے بٹھائے ڈیڈی کی طبیعت خراب ہو گئی ۔ ہم نے ہسپتال کی طرف رش کیا ۔ لیکن وہ ہسپتال تک نہ پہنچ سکے ۔

اس کے بعد کئی دنوں تک کانڈولینسز کا سلسلہ جاری رہا ۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے ۔ دکھاوے کے لگاؤ ۔ جھوٹے آنسو ۔ رسمی ہنگامہ ۔ پھر خاموشی چھا

گئی ۔ گھر میں ہم دو اکیلے رہ گئے ۔ ممی اور میں ۔ چند روز تو ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے ۔ پھر ممی نے آنسو پونچھے ۔ نیا ہیر اسٹائل بنوایا ۔ میک اپ کیا اور باہر نکل گئیں۔ ان کے سوشل کالز کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے ، اور کلچرل ایکٹیویٹیز میں کلچر کم اور ایکٹیویٹی کا عنصر بڑھ گیا ۔

زندگی بھر دل میں سلگتی آرزو دفعتاً پوری ہو جائے تو انسان نان پلسنڈ ہو کر رہ جاتا ہے میں بھی کئی ایک دن نان پلسنڈ بیٹھی رہی ۔

پھر ہوش آیا تو میں نے زندگی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ ایکسائٹمینٹ کے ایک طوفان نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا ۔ تھپیڑے جھولنے بن گئے ۔ بند بند جھن جھن کرنے لگا ۔ میری گراؤنڈ کچھ زیادہ ہی میری ہو گیا ۔

حسین تو خیر میں تھی نہیں ۔ نہ ہی خواہش تھی ۔ میری دو ایک سہیلیاں تھیں جو بنی سجی گڑیوں کی طرح بے جان تھیں ۔ ہاں مجھ میں ایک چارم تھا ۔ پتہ نہیں کہاں تھا ۔ خدوخال میں ، چال ڈھال میں ، یا بیرنگ میں ۔ بس مجھے تو یہی پتہ تھا کہ تھا۔

سرراہ جو بھی دیکھتا چونکتا ۔ دو ایک قدم چلتا، پھر مڑ کر دیکھتا ۔ محفل میں لوگ آنے بہانے گرد بھیڑ لگا لیتے ۔ گفتگو میں مَیں نے چونکا دینے کا طریقِ واردات اپنا رکھا تھا ۔ بات بات پر خود پر الزام دھرتی ۔ اپنی کمیاں کجیاں نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ۔ وہ وہ باتیں جو نہیں کہی جاتیں ، بڑی معصومیت سے کہہ دیتی ۔

اک بات بتا دوں ۔ مجھے چیپ نس سے چڑ تھی ۔ چیپ باتیں ، حرکتیں ، چیپ لوگ بُرے لگتے ۔ چیپ ریلیشنز بالکل گوارہ نہ تھے ۔ پر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایکسائٹمینٹ تو خود چیپ نس ہے ۔ یہ تو ایک پُرکیف لرزش ہے ۔ پلیزنٹ وائبریشن ۔ باہر کے مضراب سے پیدا نہیں ہوتی ۔ اندر کے تاروں کے تناؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اندر کا تناؤ حوالگی سے نہیں بلکہ رُک جانے سے بڑھتا ہے ، قائم رہتا ہے ۔ ایکسائٹمینٹ کے پیچھے بھاگو تو اندر کا تناؤ ڈھیلا پڑ جاتا ہے ۔ جُھن جُھن میں وہ لذت نہیں رہتی ۔ دور بھاگو تو بڑھتا ہے ۔ جھن جھن میں ترنگ پیدا ہوتی ہے ۔

ایکسائٹمینٹ چاہے معصوم باتوں سے اخذ کرو ، چاہے سرسری ملاپ سے ۔ وہ ہر پھر کر اسی نقطۂ عروج پر لے جاتی ہے ۔ انگ انگ میں ایک پھلجھڑی چل جاتی ہے ۔ پھر ایک ہوائی زوں سے چھوٹ جاتی ہے اور پھر رنگین بادلوں سے دھڑام سے زمین پر آگرتی ہے ۔ لاش کی طرح ۔

ایکسائٹمینٹ کی تلاش میں بار بار میرے اندر پھلجھڑیاں چلیں ، ہوائیاں چھوٹیں ، رنگین بادلوں میں جھولتے جھولی ۔ اور پھر زمین پر آگری ۔ گرتی رہی ۔ گرتی رہی ۔

ساتھی کی ڈھونڈ میں مَیں نے کئی ایک آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ۔ دو ایک ملاپ بھی ہوئے ۔ وہ تو ہوتے ہی ہیں ۔ کھرا کھوٹا جاننے کے لیے سکہ بجانا ہی پڑتا ہے اور بجاؤ تو ساتھ خود بھی بجنا پڑتا ہے ۔

خیر ۔۔ پھر ایک ساتھی بھی مل گیا جیسا کہ میں چاہتی تھی ۔ امان کے راستے میں بھی کوئی روک نہ تھی ۔ باپ کویت میں ملازمت کرتا تھا ۔ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے جی رہی تھی ۔ اسے امان کی ہر بات پسند تھی ۔ اسے مکمل آزادی دے رکھی تھی ۔

بہر حال وہ امان تھا ، میں آمن تھی ۔ نام بھی ایک سے ، طبیعتیں بھی ایک سی ۔ ویسے میرا اصلی نام تو آمنہ تھا ، پر مجھے یہ نام پسند نہ تھا ۔ اس میں سے مذہب کی بو آتی تھی ۔ مجھے مذہب پسند نہ تھا ۔ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ۔ یہ کرو وہ نہ کرو ۔ یوں کرو ووں نہ کرو ۔

جسے آزادی کی دھن لگی ہو وہ بھلا مذہب کو کیسے اچھا جانے ۔ اچھا جانتا تو اور بات ہے ۔ میں تو الٹا مذہب پر شرمندہ شرمندہ رہتی تھی ۔ میں سمجھتی تھی کہ مذہب تو ایک پرسنل میٹر ہے ۔ میں جانوں ، میرا خدا جانے ۔ دوسروں کو بیچ میں دخل دینے کا مطلب ؟

پھر یہ بھی تھا کہ آمنہ ایک متبرک نام تھا ۔ بچپن میں ہی جب لوگ مجھے آمنہ کہہ کر بلاتے تو میں محسوس کرتی جیسے میں تبرک ہوں اور تبرک تو خانقاہوں میں بٹتے ہیں ۔ مجھے خود سے مشک کافور کی بو آنے لگتی ۔ جب بڑی ہوئی تو میں نے آمنہ کی جگہ اپنا نام آمن رکھ لیا ۔ اس چھوٹی سی تبدیلی سے کتنا فرق پڑ

گیا ۔ نہ تبرک رہا نہ خانقاہ رہی ، نہ مشک کافور کی بو ۔ بالکل ہی سیکلر بن گئی ۔
ہاں ۔ تو اماں بھی میری طرح رکاوٹوں کا بیری تھا ۔ قد بت اچھا رنگ کھلا کھلا اور آنکھیں ۔۔۔۔ آنکھیں جیسے جھولنے ہوں ۔ ایک نگاہ ڈالے تو جھولن لگو اور پھر آنکھوں سے ایک پھوار سی اُڑتی جو بھگو دیتی ۔ اتنی بھیگ اتنی بھیگ کہ ڈوب جاؤ ۔

اماں سے ملی تو ایسی بھیگی کہ پروں میں اڑان نہ رہی ۔ اس پر مجھے بہت غصہ آیا ۔ نہیں میں کسی کو اپنی آزادی سلب کرنے کی اجازت نہیں دونگی ۔ ٹھیک ہے وہ بڑا اٹریکٹو ہے ، چارمنگ ہے ، اچھا ساتھی ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میری اڑان کو سلب کر لے ۔ مجھے ڈی سلف کر دے ۔

میں نے اسے ایک چیلنج مان لیا ۔

لیکن جلد ہی اس کی مسکان بھری نگاہوں نے مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیا اور پھر اس پھینٹ سے حوالگی کی خواہش کی جھاگ ابھری ، ابھرتی گئی ، ابھرتی گئی ۔ اور انجانے میں ہم ایک دوسرے سے پیوست ہوتے گئے ہوتے گئے ۔ یوں کہ ایک ہو گئے ۔ جیسے ٹچ بٹن کے دونوں حصے ٹچ کر کے ایک ہو جاتے ہیں ۔

کئی ہفتے بلکہ مہینے ایکسائٹمینٹ کے گھنگھرو بجتے رہے ۔ لے بڑھتی رہی ۔ تال بلمپت سے درت ہو گئی ۔ رقص تیز سے اور تیز اور تیز ۔

کوئی روک نہ تھی ٹوک نہ تھی ۔ ممی بُرا ماننے کی بجائے شہ دیتی تھی ۔ اماں جب چاہتا گھر آ جاتا ۔ ممی نے پوری پرائیویسی دے رکھی تھی ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ اتنی آزادی ویرانے کی طرف لے جاتی ہے ۔ ملاپ کا تواتر بیزاری پیدا کر دیتا ہے ۔

ہم اب بھی ملتے ہیں ۔ اماں بلا ناغہ آتا ہے ۔ لیکن اس کی آنکھوں کی پھوار میں وہ بھیگ نہیں رہی ۔ نظروں میں وہ جھولنے نہیں رہے ۔ اس کی ہیلو میں وہ والہانہ پن نہیں رہا ۔ وہ انبساط نہیں رہی ۔ جیسے کچھ پا لیا ہو ۔ کوئی انمول چیز ۔

قریب ہوتا ہے، لیکن جیسے سرسری ہو ۔
خوشی ہوتی ہے لیکن بلبلے نہیں اٹھتے ۔ وہ سنہرا دھندلکا پیدا نہیں ہوتا ۔
تار بلتے ہیں لیکن ان میں تناؤ نہیں رہا ۔ گھنگھرو جھن جھن نہیں کرتے ۔
تال درت سے پھر بلمپت ہو گئی ہے ۔
ہم دونوں کے ملاپ سے جو بھیڑ پیدا ہوتی تھی ، نہیں رہی ، میلہ نہیں لگتا ۔ ملاقات روٹین میں بدل گئی ہے ۔
جب امان چلا جاتا ہے تو میں بالکل ڈل اینڈ ڈرب ہو کر رہ جاتی ہوں ۔ پھر وقت پینگ کرتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی میں وہ چارم نہیں رہا ۔
ٹھہریے ! اس کے پاؤں کے چاپ سنائی دے رہی ہے ۔۔ ہاں ، وہی ہے ۔ وہی ۔۔۔ چال کچھ بدلی بدلی سی لگتی ہے ۔ ریلیکسڈ نہیں ۔
اب وہ ناک کر رہا ہے ۔۔۔ بس ، کم اِن ۔ ہاں کچھ بدلا بدلا سا ہے ۔
وہ دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گیا ہے ۔ اسے ایسے دیکھکر میں گھبرا گئی ہوں ۔
"آمن ۔ بیڈ نیوز" وہ کہتا ہے ۔
میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے اور میں متوقع نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوں ۔
"کل اچانک ابا کویت سے آ گئے ہیں ۔"
پھر میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہوں ۔
"انھوں نے آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ میں امان کی شادی کرنے کے لیے آیا ہوں ۔"
ایک ساعت کے لیے میں سُن ہو کر رہ جاتی ہوں ۔
اس کا سر لٹکا ہوا ہے جیسے سوچ میں ڈوبا ہوا ہو ۔
وقت تھم گیا ہے ۔ سارا کمرا گھومنے لگا ہے ۔
اندر ایک تناؤ بڑھتا جا رہا ہے ۔
دفعتاً وہ سر اٹھاتا ہے ۔ اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیتا ہے ۔ ایک ساعت کے لیے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی ہیں ۔ پھر وہ اٹھ بیٹھتا ہے ۔ اس

کی نگاہوں سے پھوار کا ایک طوفان اٹھتا ہے ۔ وہی پھوار جو بھگو کر رکھ دیتی ہے ۔ اڑان کو سلب کر لیتی ہے ۔

"نہیں نہیں"، وہ کہتا ہے ، "ایسا نہیں ہو سکتا ۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا ۔ آمن کبھی نہیں ۔"

میرے اندر اک بھیڑ سی لگ جاتی ہے ۔ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے ۔

مجھے خاموش دیکھکر وہ چلاتا ہے "آمن ' تم میرے ابا کو نہیں جانتیں ۔ تم نہیں سمجھو گی ۔ ہماری راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حائل ہو گئی ہے ۔ بہت بڑی رکاوٹ" وہ چیختا ہے ۔

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ دکھ کی نہیں فرطِ انبساط کی چیخ ہو ۔ اس کی نگاہوں میں فکر اور غصے کی بجائے کیف کی پھلجھڑیاں چل رہی ہوں ۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے دل کی سوکھی ہوئی پتیاں پھر سے ہری ہو رہی ہوں ۔

.... ○ ....

کس لیے ؟ کیا اس لیے ؟

ہائیں پھر ! ۔۔۔۔ پھر وہی علی کاٹیج ۔ یہ میں ادھر کیسے چلا آیا؟ یہ کیا ہو رہا ہے ؟ اسلام آباد میں گھومتے پھرتے ہر دوسرے چوتھے دن ان جانے میں میں خود کو علی کاٹیج کے سامنے کھڑا پاتا ہوں ۔ پتا نہیں کیسے انجانے میں ادھر جا نکلتا ہوں ! کھڑا ہو کر کاٹیج کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہوں ، دیکھتا رہتا ہوں ۔۔۔ پھر کسی آواز پر چونکتا ہوں ۔ خود کو وہاں پا کر حیران ہوتا ہوں ۔ یہ میں ادھر کیسے پہنچ گیا !

میرا نام امتیاز ہے ۔ میں ایک نارمل آدمی ہوں ۔ زندگی میں کوئی الجھن نہیں ۔ کوئی کشمکش نہیں ۔ شادی شدہ ہوں ۔ مجھے آنا سے پیار ہے ۔ فرزانہ میری بیوی ہے ۔ میں اسے آنا کہہ کر بلاتا ہوں ۔ گھر میں کوئی پرابلم نہیں ۔ کوئی تلخی نہیں ، کوئی دکھاوا نہیں ۔ آنا بہت ہی پیاری بیوی ہے ۔ پہلے میں فیصل آباد میں اسسٹنٹ تھا ۔ تنخواہ کم تھی لیکن گذارا ہو جاتا تھا ۔ بس آنا میں ایک نقص ہے ۔ اسے ایک لگن لگی رہتی ہے کہ ہمارے بچے اچھی تعلیم پائیں ۔ کانونٹ سکول میں پڑھیں ۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں ۔ بڑے ہو کر کچھ بنیں ۔

اس خواہش کے زیرِ اثر وہ مجھے اکساتی رہی : کچھ کرو ، امتیاز کچھ کرو ۔ اسسٹنٹ بن کر بیٹھ رہنے سے کچھ نہیں ہو گا ۔ ہم بچوں کو انگریزی سکول میں داخل نہیں کرا سکیں گے ۔ کلرکوں کی آبادی بڑھانے سے فائدہ؟

آنا مجھے اکساتی رہی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتا رہا اور کامیاب ہو گیا ۔ اب یہاں اسلام آباد میں میری تعیناتی ہو گئی ہے ۔ افسر بن گیا ہوں ۔ چارج لے لیا ہے ۔ مکان کی تلاش کر رہا ہوں ۔ مکان ملے تو آنا اور بچوں کو فیصل آباد سے لے آؤں ۔

ہاں اسلام آباد میں مکان کی بڑی مشکل ہے ۔ ملتے تو ہیں پر کرائے

بہت زیادہ ہیں ۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے اسلام آباد میں جوتے چٹخاتے ہوئے ۔

اُدھر ایف سیون میں ، علی کاٹیج دیر سے خالی پڑا ہوا ہے ۔ بہت بڑا بنگلہ ہے ۔ بنگلہ دیکھکر جرأت نہ ہوئی کہ کرایہ پوچھوں ۔ تین ہزار سے کم کیا ہو گا ۔ میری دسترس سے باہر ہے ۔

ایک روز کھڑا باہر سے بنگلے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک بوڑھے میاں آ گئے ۔ بولے : صاحب جی ، کیا دیکھ رہے ہیں آپ ؟ یہ بنگلہ رہائش کے قابل نہیں ہے ۔ آسیب زدہ مکان ہے ۔ اسے کوئی کرائے پر نہیں لے گا ۔ دو سال سے خالی پڑا ہے ۔ دو ایک کرایہ دار آئے تھے ۔ چار ایک دن ٹھہرے پھر بھاگ گئے ۔

"کیا کرایہ ہو گا اس کا بڑے میاں ؟" میں نے پوچھا ۔

"کرائے کی بات نہیں ۔ مالک مکان تو مفت دینے کے لیے تیار ہے تاکہ مکان آباد ہو جائے ۔"

بس اس دن سے یہ کیفیت ہے ۔ میں مکان کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہوں ۔ چاہے ایف ایٹ کی طرف جاؤں یا جی نائن کی طرف۔ گھومتے پھرتے دفعتاً کیا دیکھتا ہوں کہ ایف سیون میں علی کاٹیج کے سامنے کھڑا ہوں ۔ چونکتا ہوں ۔ حیران ہوتا ہوں ۔ یہ میں ادھر کیسے نکل آیا !

ایسے لگتا ہے جیسے علی کاٹیج سے میرا گہرا تعلق ہے ۔ جیسے علی کاٹیج مجھے بلا رہا ہے ۔ اسے مجھ سے کچھ کہنا ہے ۔ جیسے وہ میرا منتظر ہے ۔

پہلے تو یہ خیال میرے دل کی گہرائیوں میں دبکا بیٹھا رہا ۔ پھر ایک روز اچھل کر ذہن میں آگیا ۔ میں نے کئی بار اسے ذہن سے نکالا ۔ تالی مار اڑانے کی کوشش کی ۔ لاحول پڑھتا رہا ۔ لیکن وہ میرے ذہن میں میخ کی طرح گڑ گیا تھا ۔ کسی صورت میں ذہن سے نکال نہ سکا ۔ مجبوراً مجھے اس خیال کو اپنانا پڑا ۔ کوئی چارہ نہ تھا ۔ میں نے تسلیم کر لیا ۔ سچے دل سے تسلیم کر لیا کہ علی کاٹیج کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کرنا عبث ہے ، لاحاصل ہے ۔

اس پر میرے دل میں ایک انجانی سی جرأت پیدا ہو گئی ۔ ویسے فطری طور

پر میں ایک ڈرپوک آدمی ہوں ۔ اونہوں ! حقائق سے نہیں ڈرتا ، لیکن غیر مرئی چیزوں سے بہت ڈرتا ہوں ۔ جنات سے ڈرتا ہوں ۔ ارواح سے ڈرتا ہوں ۔ کسی ہانٹڈ ہاؤس میں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ، لیکن اس روز مجھ میں گویا انجانی قوت پیدا ہو گئی ۔ میں نے سوچا چلو چل کر علی کاٹیج کے بارے میں اتا پتا لگاؤ ۔ چوکیدار سے ملو ۔ اس سے پوچھو ۔

اس دوران میں مجھے علم ہو چکا تھا کہ علی کاٹیج میں ایک چوکیدار رہتا ہے ۔ جو دن کے وقت محنت مزدوری کرتا ہے اور رات کو بنگلے میں آکر پڑ رہتا ہے ۔ اس کا نام فضلُو ہے ۔ فضلو سے کبھی میری مڈھ بھیڑ نہ ہوئی تھی ۔ شام کو وہ گھر پر نہیں ہوتا تھا ۔ اس لیے میں نے سوچا ۔ رات کے وقت وہاں جاؤں ۔ فضلو سے ملوں ۔ بات کروں ۔ پاس بیٹھوں ۔ شاید کچھ اتا پتا چلے ۔

میں نے فضلو سے ملنے کا منصوبہ بنایا ۔ کھدر کا ایک میلا جوڑا پہنا ، ہاتھ میں ایک بیگ لیا اور علی کاٹیج کی طرف چل پڑا ۔

فضلو ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا ۔ اس کی پیشانی پر ایک مستقل گھوری تھی ۔ رنگ کالا تھا ۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوہے کا بنا ہوا ہو ۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں ۔ وہ دیکھتا نہیں تھا ۔ گھورتا تھا ۔ آواز کرخت تھی ۔ لہجہ رُہتکی تھا ۔ غالباً وہیں کا رہنے والا تھا ۔

مجھے دیکھکر اس کے ماتھے کی تیوری اور ابھر آئی ۔ آنکھیں اور دھنس گئیں ۔ "کون ہے تو ؟" اس کی آواز میں لوہے کی کھنک تھی ۔

"مسافر ہوں ۔ رات کاٹنے کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ۔" میں نے کہا ۔

اس نے لپک کر لالٹین اٹھالی اور میری طرف گھورنے لگا ۔ "تُو تو بابو ہے رے" وہ بولا ۔

"ہاں بابو ہوں ۔ میرے ایک دوست نے چٹھی لکھکر مجھے بلایا تھا ۔ یہاں آیا تو پتہ چلا کہ وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے ۔ اگر آج کی رات تک تُو مجھے ٹھکانا دے دے تو کل میں کوئی انتظام کر لوں گا "۔

"تُو رات یہاں گزارے گا ۔ اس بنگلے ماں ؟"

"ہاں ۔" میں نے جواب دیا ۔ "بس مجھے ایک چارپائی دے دے ۔ اس

پر پڑ رہوںگا۔"

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی بھیانک تھی۔ "اس بنگلے میں کوئی بابو رات نہیں گُجار سکے ہے۔" وہ بولا۔

"تُو جو رہتا ہے یہاں۔"

"میری اور بات ہے" وہ بولا۔ "دیکھ بابو۔ میری طرپھ سے نہ نہیں۔ بے سک یہاں کھاٹ پر پڑ رہ میرے ساتھ۔ پر جو آدھی رات کے بخت تجھے کچھ ہو گیا تو میری جمے داری نہیں ہوگی"۔

"نہیں تیری ذمّے داری نہیں ہوگی۔ تیری تو مہربانی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اور جو آدھی رات کے بخت تجھے ہسپتال لے جانا پڑا تو۔۔۔۔؟"

"نہیں، نہیں تو فکر نہ کر فضلو۔"

"بڑا دل گُردے والا ہے تُو بھئی۔ بیٹھ جا کھاٹ پر۔ کیا یونہی کھڑا رہے گا، رات بھر؟"

بات بن گئی، میں نے سوچا، میری سکیم چل گئی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اک بات پوچھوں، فضلو؟" میں نے کہا۔

"پوچھ" وہ بولا" "اک کیا دو پوچھ"۔

"یہاں رات کو ہوتا کیا ہے؟"

"ہوتا تو کچھ بھی نہیں" وہ بولا "بس وہ بڈھا ساری رات بنگلے میں گھومتا پھرتا رہے ہے۔ کدی بکیچے ماں کدی برمدے ماں۔ کدی ادھر۔ کدی اُدھر۔ کمروں کے دروجے بجاوے ہے۔ آواجیں دے ہے۔"

"کیسے آوازیں دے ہے؟"

"پتہ نہیں، کیسے دے ہے آواجیں۔ کدی کدی اپنی گھر والی کا ناؤں لے ہے۔ پھاطمہ پھاطمہ کرے ہے۔"

"تجھے پتہ ہے، یہ بڈھا کون ہے؟"

"ہاں" وہ بولا "علی ہے۔ اس گھر کا مالک علی احمد ہے، جس کے ناؤں پر

یہ بنگلہ ہے "۔

"اور وہ کہتا کیا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"پتہ نہیں کیا کہتا ہے ۔" وہ بولا ۔ پر جو کچھ بھی وہ کہے ہے ۔ وہ سنا نہیں جاوے ہے ۔ سہارا نہیں جاوے ہے ۔ بڑا بڑا دل گردے والا بھی ہمت ہار دیوے ہے ۔ اٹھ کر بھاگ لے ہے ۔"

"مطلب ہے کہ اس کے لفظ سمجھ میں نہیں آتے ؟"

"نہیں نہیں" وہ بولا لہجے تو سمجھ میں آوے ہیں ۔ پر یو سمجھ ماں نہیں آوے ہے کہ وہ کہتا کیا ہے ۔ رک رک کر بولے ہے ۔ پہلے تو کچھ پوچھے ہے ۔ پتا نہیں کیا پوچھے ہے ۔ اونچی آواز میں پوچھے ہے ۔ پوچھتا جائے ہے ۔ پوچھتا جائے ہے ۔ پوچھتا جائے ہے ۔۔ ساتھ گھومتا پھرتا رہے ہے ۔ ابھی آواج ادھر سے آئی ، پھر اُدھر سے آ رہی ہے ۔ پھر بڑا کمرا جو ہے نا ، اس میں گونجی ۔ پھر اوپر ٹیرس سے بول رہا ہے ۔ اَنا کسی سے بول رہا ہے ۔ پوچھ رہا ہے ، پوچھے جا رہا ہے ۔ پتا نہیں کیا پوچھتا ہے ۔ بس ایک لہجہ بولے جا رہا ہے ۔ کس لیے ؟ کس لیے ؟ کس لیے ؟ پھاطمہ کس لئے ؟ یوں جیسے سوئی رکاٹ پر اٹک جائے ہے ۔ کدی ادھر سے آواج آئے ہے ، کدی اُدھر سے آواج آئے ہے ۔ کدی بگیچے سے ، کدی بڑے کمرے سے ۔ کدی ٹیرس سے ، کدی انا کسی سے ۔ چاروں طرپھ سے آواجیں آئیں ہیں ۔ سارا گھر "کس لیے" کی آواجوں سے بھر جائے ہے ۔"

"پھر چپ کا تمبو تن جاوے ہے ۔ اتنی ڈونگی چپ کہ گھر کھوہ بن جائے ہے ۔ اور پھر وہ اس کھوہ میں سے بولے ہے : کیا اس لیے پھاطمہ ؟ کیا اس لیے ؟ جد وہ یہ کہے ہے تو دے سنا نہیں جائے ہے ، سہارا نہیں جائے ہے ۔ ساری دنیا کا دکھ اسکی آواز میں سمو جائے ہے ۔ جیسے جرب لگنے پر انڈا پھوٹ گیا ہو ۔ چنری چنری ہو گیا ہو ۔ جیسے آنکھ پھوٹ کر آنسو بن گئی ہو ۔ جیسے موٹر کا سیسہ چوٹ لگنے پر جرّوں کا ڈھیر بن جاوے ہے ۔ جیسے دل چلتا چلتا رک جاوے ، جان نُچڑ جاوے ، لوتھڑا رہ جائے ۔"

"پھر بنگلے پر موت چھا جاوے ہے ۔ کالی بولی موت ۔ کچھ ملٹ تک سب

نفی ہو جاوے ہے ۔ جھینگر بولنا بند کر دیوے ہیں ۔ مینڈھی گونگی ہو جاوے ہے ۔ گلی کے کتے سُن ہو جاویں ہیں ۔ اس آواج کو سن کر ، اس ٹوٹ کو سن کر سدھ بدھ ماری جاوے ہے ۔

میں خوف کے مارے کانپنے لگا ۔ مجھے دیکھکر وہ ہنسا ۔ "ابی نہیں بابو ، ابی نہیں ۔ ابی سے کیوں ڈرے ہے ۔ وہ تو آدھی رات کے بخت آوے ہے ۔ یہاں بنگلے ماں ۔"

"ہاں میں ڈرتا ہوں" میں نے کہا "تو میری بات چھوڑ ، یہ بتا پھر وہ بڈھا کیا کرتا ہے ؟"

وہ ہنسا "پھر وہ پھر سے پوچھنے لگے ہے : کس لیے ، پھاطمہ ، کس لیے ؟ اور وہ چکر پھر سے چل پڑے ہے ۔ ساری رات یو چکر چلتا رہے ہے ۔ یونہی چلتا رہے ہے ۔ یونہی چلتا رہے ہے ۔ تُو اسے نہیں سہار سکے گا ۔ بابو ۔ کوئی بھی نہیں سہار سکے ہے ۔ دل پہ بوجھ پڑ جاوے ہے ۔ نسیں دھنکی کی طرحیوں بجیں ہیں ۔"

"تُو کیسے سہارے ہے فضلو ؟"

"ماں نے بس چار ایک دن سہارا تھا ، پہلے پہل ، اب تو ماں افیم کی گولی کھا کر پڑ رہوں ہوں ۔ تو بھی کھا لے ایک آج کی رات ۔"

"یہ بتا فضلو کہ صرف بڈھے کی آوازیں آئیں ہیں یا کچھ نظر بھی آئے ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

تو پوچھے ہے کہ نجر بھی پڑے ہے کچھ ۔ بھئی میرے سہانے آکر کھڑا رہے ہے ۔ یہ سامنے پلاٹ میں گھومتا نجر آئے ہے ۔ سارے گھر میں گھومتا دسے ہے ۔ وہی کالی میلی اچکن ، وہی سیدھا پجامہ ، ہاتھ ماں سوٹی ، سر پر ٹوپی ۔"

"تُو نے اسے جیتے جی بھی دیکھا تھا کبھی ؟" میں نے پوچھا ۔

"ہاں" وہ بولا "صرپھ ایک بار ۔ پر اس وخت مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ علی ہے ۔ تیری طرح آیا تھا وہ میرے پاس رات گجارنے کے لیے ۔ دیکھ نا بابو وہ تو بیس سال سے ادھر کویت ماں بیٹھا تھا ۔ دھڑا دھڑ کمائے جا رہا تھا اور پیسہ گھر بھیجے جا رہا تھا ۔ یہاں گھر میں تو اس کی دو لڑکیاں ، ایک لڑکا ، ان کی ماں اور نوکر رہیں

تھے ۔ ہم تین نوکر تھے ۔ بیرچی تھا ، ایک لڑخا تھا اور میں تھا ۔

"جس رات وہ آکر تیرے پاس رہا تھا ، اس نے تجھے کچھ بتایا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ۔ سب کچھ بتایا تھا ۔ بس یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ علی ہے۔ وہ تو ہمیں اگلے دنا پتا چلا جد اس کی لاش ہسپتال سے آئی ۔ ہوا یوں تھا کہ اسکی گھر والی پر دورہ پڑگیا ۔ ایک پاسا مارا گیا ۔ جبان بند ہو گئی ۔ وسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے ۔ اس کے چار چھ روج بعد وہ آیا ۔ جس روج وہ آیا ۔ اس روج بڑی لڑخی کا جنم دن تھا ۔ گھر ماں بڑی پالٹی تھی بڑے انتجام تھے ۔ پچیس ممانوں نے آنا تھا ۔ ہم سب انتجاموں ماں لگے وے تھے ۔ جد وہ آیا تو وسے کسی نے نہ پوچھا کہ بھئی تو کون ہے ۔ کسی نے نہ پچھانا ۔ وسکے گھر والی یہاں تھی نہیں ۔ جو پچھانتی ۔ جب اس نے اپنے لڑخے لڑخیوں کو دیکھا تو وہ طور بطورا گیا ۔ ماں جانوں وس کے دل کو دھکا لگ گیا ۔"

"وہ کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔

"وہ تینوں ولیتی سکولوں کے پڑھے وے تھے ۔ سر پر بالوں کے یہ بڑے بڑے گھونسلے رکھے وے تھے ۔ منہ پر رنگ روگن تھے ۔ نیچے جانگیہ ٹھکرے ۔ باہیں بھی تنگی ، ٹانگیں بھی تنگی ۔ پتہ ہی نہیں چلے تھا کہ کون لڑخا ہے کون لڑخی ہے ۔ جد وہ میرے پاس آیا تھا تو گھبرایا وا تھا ۔ میں نے وسے کہا تو ابی سے گھبرا گیا ۔ ابی تو دیکھنا ۔ جد پالٹی ہو گی تد دیکھنا ۔ کیا کیا مکھلوک آتی ہے یہاں ۔ پالٹی ماں ۔ ایسے ایسے جلئے جو تو نے کدی دیکھے نہ ہوں ۔ ایسا ایسا پہناوا کہ توبہ ہے اور پھر جد ٹیپ بجے گا ۔ ایسے ایسے انگریجی گیت جو تو نے کدی سنے نہ ہوں ۔ گیت کم کم چیخیں جیادہ ۔ پھر ہونکن ۔ لہجت سے دم رکنے والی ہونکن ۔ دوجے کا دم روک دینے والی ۔ پھر ناچ ہو گا پاگلوں کا ناچ ۔ پتہ نہیں یہ سیٹھ لوگ اپنے بچوں کو انگریجی تلیم دے کر کیسی کیسی مکھلوک پیدا کر دیتے ہیں ۔ میں نے اس سے کہا ۔ وہ ہمارا سیٹھ علی جو ہے دھڑا دھڑ پیسے بھیج رہا ہے کویت سے اندھا دھند ۔ کس لیے ۔ کیا اس لیے کہ یہ مکھلوک بنائے ؟"

"تُو علی کو جانتا ہے ؟" وس نے مجھ سے پوچھا ۔

میں نے کہا "نہیں ۔ وہ کدی آیا بھی ہو گھر ماں ۔"

"میں وسے جانتا ہوں" اس نے کہا ۔ یہ کہہ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا ۔ بولا وہ اپنے لیے پیسے کمانے نہیں گیا ۔ وہاں کویت میں ۔ یہاں وہ راج کا کام کرے تھا ۔ ارمان سے دو وخت کی روٹی کھاوے تھا ۔ بس ایک تکلیف تھی اسے ۔ اہلکار اسے بیگار پر لے جاویں تھے ۔ اس کی بے عجتی کریں تھے ۔ ایک بار تو تھانیدار نے بے وزہ اس حوالات میں بند کر دیا تھا ۔ بس اس روج سے اسے ایک لگن لگ گئی کہ باہر جاؤں کمائی کروں اپنے بچوں کو اونچی تلیم دوں ۔ ولیتی سکولوں ماں پڑھاؤں تاکہ بڑے ہو کر وہ بڑے لوک بنیں اور کوئی ان کی بے عجتی نہ کر سکے ۔ ان سے بیگار نہ لے سکے ۔ اس لیے وہ باہر چلا گیا ۔ کویت ماں ۔ اپنے لئے نہیں اپنے بچوں کی تلیم کے لئے ۔

"آج بیس سال ہو گئے کہ وہ وطن سے باہر بیٹھا ہے ۔ دن رات ، رات دن اس کا ایک کام ہے ۔ مسالہ لگاتا ہے ۔ اینٹ پر اینٹ رکھتا ہے اور اسے ٹھونکتا ہے ۔ پھر مسالہ لگاتا ہے ۔ اینٹ پر اینٹ رکھتا ہے ۔ اینٹ پر اینٹ رکھے جاتا ہے ۔ دن رات اوور ٹیم کرتا ہے ۔ اوور ٹیم کی خاطر وہ گھر بھی نہیں آیا کدی ۔ ساری جند گانی اس نے بچوں کی تلیم کے لیے قربان کر دی ۔"

عین اس وقت باغیچے سے آواز آئی ۔

کس لیے ؟ کس لیے ؟ کس لیے ؟ فاطمہ ، کس لیے ؟"

کس لئے ؟ کس لئے ؟ بنگلے کا کونہ کونہ اس کی آواز سے گونجنے لگا ۔ وہ آواز بڑی خوفناک تھی ۔ اسے سن کر جسم کے بال کھڑے ہو جاتے تھے ۔ وہ آواز عام گلے سے نہیں نکل رہی تھی ۔ ایسے لگتا تھا جیسے آدھا گلا کٹا ہوا ہو ۔ آدھے سے آواز نکل رہی ہو ۔ جیسے بکرے کی شہ رگ کٹنے پر نکلتی ہے ۔

وہ آواز سن کر میں سن ہو گیا ۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی ۔ دل پر منوں بوجھ پڑ گیا ۔ سارے جسم میں سوئیاں چبھنے لگیں ۔ میں نے لپک کر بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف جست لگائی ۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہو ۔ کس لیے ؟ کس لیے ؟ مجھ سے پوچھ رہا ہو ۔ کس لیے ، امتیاز کس لیے ؟

جب میں گلی کی نکڑ پر پہنچا تو وہ آواز چھن سے ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گئی ۔ کیا اس لیے ؟ پھر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی جیسے سارا محلہ اندھے کنویں میں ڈوب گیا ہو ۔

○

اندھا فُٹ پاتھیا

سڑک کے کنارے سُوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کا سہارا لیے وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہے ۔۔ ہاتھ میں لاٹھی ہے ۔ آنکھوں پر بڑے بڑے کالے کالے شیشوں والی عینک لگی ہے ۔ سامنے سڑک پر دھاری دار زیبرا گلی بنی ہوئی ہے ۔

وہ یہاں سالہاسال سے کھڑا ہے ۔ کب سے کھڑا ہے ؟ یاد نہیں ۔ لگتا ہے ، صدیاں بیت گئیں ۔ شاید وہ بھول چکا ہے کہ کیوں یہاں کھڑا ہے ۔ شاید وہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی اس کی منزل ہے ۔ فٹ پاتھ پر کھڑے رہنا ۔ کھڑے کھڑے پتھرا جانا ۔

کبھی کبھی اس کے ذہن میں دھندلی دھندلی یادیں ابھرتی ہیں ۔ دل سے نحیف سی آواز اٹھتی ہے ۔ نہیں نہیں ۔ یہ میری منزل نہیں میں تو یہاں اس لیے کھڑا ہوا تھا کہ کوئی اللہ کا پیارا میری ڈنگوری پکڑ کر یہ خونیں سڑک پار کرا دے ۔ اُس سڑک کے پار جو ہرا بھرا باغیچہ ہے ، وہاں پہنچا دے ۔

یہ کالی بولی سڑک کتنی خوفناک ہے ، جہاں تہہ در تہہ اندھیرا یوں جھولتا جھومتا ہے جیسے کسی مہاراج کا ہاتھی بدمست ہو کر باہر نکل آیا ہو ۔ سڑک پر یہاں وہاں منافقت کی بتیاں ٹمٹما رہی ہوں جو اندھیرے کو اور بھی دم گھٹ بنا رہی ہیں ۔

سڑک پر آوازوں کا ایک طوفان بہے جا رہا ہے ۔ میں میں میں کی ایک مسلسل جھنجھناہٹ جیسے مکھیوں کے چھتے چھڑے ہوئے ہوں ۔ خودستائی کے اس پس منظر پر درپردہ وہ دھمکیاں ، دھونسیں ، خبرداری زیر لبیاں ، جھوٹے دعوے ، نمائشی وعدے ۔

کتوں کی طرح بھونکتی ہوئی گاڑیاں ، پٹاخے چھوڑتے ہوئے ، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے ، جھولتے جُھومتے ہوئے موٹرسائیکل ۔ ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ

چنگھتے ہوئے بدمست نوجوان سوار ۔ ۔ دھوئیں کے مرغولے اُڑاتی ہوئی ویگنیں ۔
ہر چند لمحوں کے بعد آئی آئی آئی چیختی ہوئی ایک گاڑی دوسری پر چڑھ جاتی ہے ۔ دھڑا ڑا روم ٹکر کی آواز فضا میں گونجتی ہے ۔ ملبے کا ایک انار ہوا میں چھوٹتا ہے ۔ ایک چیخ ، ایک کراہ ، پھر کوڑے کا ایک ڈھیر آ گرتا ہے اور کمیٹی کا بلڈوزر اسے کنارے لگا دیتا ہے ۔

پہیوں پر سوار رفتار کے نشے میں چور ، سڑک پر چلنے والے سنتے ہیں ، مگر سنتے نہیں ۔ دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں ۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن چلے جاتے ہیں ۔ اور تیز اور تیز ، سووہاٹ ؟ پہیے "میں" کی ہوا سے کچھ اور پھول جاتے ہیں ۔ انا کی شورا شوری کی تانیں کچھ اور چڑھ جاتی ہیں ۔ سڑک کا اژدھا جھولتا ہے جھومتا ہے ۔ منافقت کی بتیاں آنکھیں مارتی ہیں ۔ ہارن قہقہے لگاتے ہیں ۔ سڑک شرابی کی طرح لڑکھڑائے چلی جاتی ہے اور وہ چپ چاپ سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کا سہارا لیے کھڑا ہے ۔

جب وہ نیا نیا فٹ پاتھ پر آ کر کھڑا ہوا تھا ، اس وقت کتنا پرامید تھا ۔ ہر آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے تھے ۔ سنو سنو اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی ہے ۔ وہ آ رہا ہے ۔ آ رہا ہے ۔ وہی ہے وہی جو میری ڈنگوری پکڑ کر مجھے منزل تک لے جائے گا ۔ وہی جس کے انتظار میں مَیں یہاں کھڑا ہوں ۔

پاؤں کی چاپ قریب آ رہی ہے ، اور قریب ، اور قریب ۔ اس کی روح سمٹ کر کان بن جاتی ہے ۔ جسم کا ذرہ ذرہ خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے ۔ ہائیں پاؤں کی چاپ تو رکے بغیر گزر گئی ۔ مدھم اور مدھم ۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے ۔ بھیانک خاموشی ۔

پاؤں کی چاپ پھر سنائی دیتی ہے ۔

ہائیں ۔ وہ ٹھٹھکتا ہے ۔

امید کا دیا پھر روشن ہو جاتا ہے ۔

یہی ہے ۔ یہی وہ راہبر ہے ۔ پاؤں کی چاپ کہے دیتی ہے یہی وہ راستہ دکھانے والا ہے ۔ بسم اللہ آؤ آؤ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں ۔ ناامیدی مجھے پتھرائے جا رہی تھی ۔ مجھے پتھر ہونے سے بچا لو ۔ آؤ آؤ ۔

پاؤں کی چاپ پھر رک جاتی ہے ۔

اس کے چہرے پر کرب کروٹیں لینے لگتا ہے ۔

کیا مجھے راستہ دکھانے کے لئے کوئی نہیں آئے گا ۔ کیا یہاں کوئی راہبر نہیں ؟ کوئی نہیں جو آکر کہے بابا آمیں تجھے پار لنگھا دوں ۔۔۔ کوئی نہیں آتا ۔ کوئی نہیں ۔ ویسے آوازیں آتی ہیں ۔ کب سے آ رہی ہیں ۔ مسلسل خالی خولی آوازیں ۔ منہ زبانی آوازیں ۔

پتا نہیں کہاں سے آ رہی ہیں ۔ فٹ پاتھ سے ، سڑک سے ، یا کمیٹی گھر سے ۔ صاف آوازیں ، بلند آوازیں ، جیسے لاؤڈ سپیکروں سے آ رہی ہوں ۔ بھانت بھانت کی آوازیں ۔ انداز مختلف ہیں ۔ لیکن بات ایک ہی ہے ۔

ایک کہتی ہے : ٹھہرو ، میں آ رہا ہوں ۔ میں تمہیں پار لگا دوں گا ۔ میرا انتظار کرو ۔

دوسری اعلان کرتی ہے ۔ میں تمہاری مشکل کو جانتا ہوں ۔ میں تمہارے راستے کے کانٹے چنوں گا ۔ مجھ پر اعتماد کرو ۔ میں اس جگہ کو گل و گلزار بنا دوں گا ۔ میں میں ۔

پھر ایک رقص کرتی ہوئی آواز آتی ہے ۔ ادھر دیکھو ۔ میرے ایک ہاتھ میں روٹی ہے ۔ دوسرے میں مکان ہے کپڑا ہے ۔ تمہاری تمام مشکلات حل ہو گئیں ۔ سارے مسئلے طے ہو گئے ۔ اب ذرا مجھے آ لینے دو ۔ میرا انتظار کرو ۔

پھر کوئی کھانستا ہے ۔ کھانسی والا کھانسنا نہیں ۔ خبردار کرنے والا کھانسنا ۔ تم اللہ کے حکم کے پابند ہو ۔ جب تک پابندی کی تکمیل نہیں ہو گی ، کچھ نہیں ہو گا ۔ کچھ نہیں ۔ تکمیلِ پابندی کی تفصیلات ہم سے پوچھو ۔ اس راز کو ہمارے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ صرف ہم جانتے ہیں ۔ صرف ہم ۔ صرف ہم ہم ہم ۔

ان آوازوں کو سن سن کر اس میں نئے خوف جاگ رہے ہیں ۔ انوکھے خوف ، جن سے پہلے وہ واقف نہ تھا ۔ پہلے اس پر خوف طاری تھا کہ شائد کوئی نہ آئے ۔ اب اسے ڈر ہے کہ شاید کوئی آ جائے ۔ پہلے وہ سوچتا تھا کہ کوئی نہ آیا تو کیا ہو گا ۔ اب اسے ڈر ہے کہ کوئی آگیا تو کیا ہو گا ۔ پہلے مایوسی کے عالم میں وہ آسمان کی طرف دیکھا کرتا تھا ۔ آسمان کی نیلگوں روشنی کے پیچھے کوئی

مسکراتا ۔ اس کی مسکراہٹ سے امید کی کرنیں نکلتیں ۔ اس کے دل میں حوصلہ پیدا ہو جاتا ۔ لیکن اب ۔۔۔ اب وہ اوپر نہیں دیکھتا ۔ اسے اوپر والے پر بھروسہ نہیں رہا ۔ اسے محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے اوپر والا خود مجبور ہو ۔ لوگ اس کا نام برت رہے ہیں ۔ اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے ہیں ۔ اپنی شمعیں جلانے کے لیے اس کا چقماق رگڑ رہے ہیں ۔ لوگوں کو ڈرانے کے لیے اس کی رعد کڑکا رہے ہیں اور وہ چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے ۔ کیا وہ کچھ نہیں کر سکتا ؟

ان شکوک پر وہ لاحول پڑھتا ہے ۔ اس کا دل خوف سے ڈوبنے لگتا ہے ۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ خدا کے متعلق دل میں شکوک پیدا ہوں ۔ خدا تو اس کے دل میں رچا بسا ہے ۔ اس کا ایمان ذہن کی پیداوار نہیں ۔ اسے دلیل اور عقل سے کوئی تعلق نہیں ۔ شکوک اس کے ایمان کو دھندلا نہیں سکتے ۔ وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑا ہے ۔ نہیں نہیں ۔ میرا قصور نہیں ۔ یہ شبہات گرد و پیش کی دین ہیں ۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ! فٹ پاتھ سے ایک زیر لبی اٹھتی ہے ۔ یہ سب کمیٹی والوں کا قصور ہے ۔ سڑک از خود خونیں نہیں ۔ اسے خونیں بنایا جا رہا ہے ۔ حرکت کو شہ دی جا رہی ہے تاکہ قیام کے سکون کے تحت حقیقت کا راز کھل نہ جائے ۔ رفتار کے بل ڈاگ کو التزاماً کھلا چھوڑ رکھا ہے تاکہ اضطراب کا گرداب چلتا رہے ۔ یہ میں میں کا جنگل خود نہیں اُگا ۔ اسے اُگایا گیا ہے ۔ سینچا جا رہا ہے ۔ یہ سب اس لیے عمل میں لایا جا رہا ہے کہ بڑوں کا یہی حکم ہے ۔ سڑک کو خونی بناؤ اور خونی اور خونی ۔ تاکہ کوئی اسے عبور نہ کر سکے ۔ اس انا کے جنگل کو اور گھنا کرو اور گھنا تاکہ کسی کو راستہ نہ ملے ۔ لوگ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے پتھرا جائیں ۔ اس ظلمت کے اندھیرے کو اور گاڑھا کرو اور گاڑھا کرو اور گاڑھا ۔ جلتی بجھتی منافقت کی بتیوں اور ٹمٹماؤ ، اور ٹمٹماؤ ۔ سب اندھے ہو جائیں ۔ کوئی منزل کو نہ پا سکے ۔ ان "ہم ہم" کو جو راستہ دکھانے کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور شہ دو تاکہ لوگوں کا راستے پر سے ایمان اٹھ جائے ۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔

کمیٹی والے احکامات کی پیروی کر رہے ہیں، کیونکہ خود کمیٹی والوں کا مفاد اس سے وابستہ ہے ۔ کمیٹی والوں کا صرف ایک مقصد ہے کہ بد نظمی قائم رہے، بڑھے ۔ بد نظمی دور ہو جائے تو نظم و نسق والوں کی اہمیت مٹی میں مل جائے گی ۔ وہ اس بڑھتی ہوئی ظلمت پر خوش ہیں ۔ لیکن یہ ظلمت ان کی پھیلائی ہوئی نہیں ۔ وہ تو صرف اسے ہوا دیتے ہیں ۔ یہ تو دساور سے آیا ہوا مال ہے، کسی نے امپورٹ نہیں کیا، صرف ایکسپورٹ کیا گیا ہے ۔ انجن اِدھر چل رہا ہے ۔ دھواں اُدھر نکل رہا ہے، مرلی اِدھر بج رہی ہے، رادھا اُدھر ناچ رہی ہے ۔ پیشِ بین اُدھر بین بجا رہا ہے ۔ چوہے اِدھر پُھدک رہے ہیں ۔ ڈوریاں وہاں بڑوں کے ہاتھ میں ہیں ۔ کٹ پتلیاں یہاں ناچ رہی ہیں ۔

فٹ پاتھ پر بھانت بھانت کی زیر لبیاں رواں دواں ہیں ۔

فٹ پاتھ پر وہ اکیلا نہیں ہزاروں لوگ آہٹ پر کان لگائے منتظر کھڑے ہیں ۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کا انتظار ہے ۔ کوئی فرد واحد کا منتظر ہے، کوئی کسی جماعت کا۔ پھر وہاں پرچارئیے ہیں ۔ افراد کے پرچارئیے ۔ بڑوں کے پرچارئیے ۔

ان پرچاریوں کی بھنبھناہٹ سے سارا فٹ پاتھ گویا مکھیوں کا چھتا بنا ہوا ہے ۔ بھن بھن بھن مسلسل بھن بھن ۔ باری باری وہ اس کے پاس آتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ اندھے، خالی انتظار سے کچھ نہیں ہو گا ۔ ہم پر اعتماد کرو ۔ ہمارے پیچھے آؤ ہم جو دیکھ سکتے ہیں ۔

افراد اور گروہوں کے مسلسل پرچار سے وہ زچ ہو گیا ہے ۔ دفعتاً اس پر جلال طاری ہو جاتا ہے ۔

ٹنڈ منڈ درخت سے وہ اپنے سر کو اٹھاتا ہے ۔ آگے بڑھتا ہے ۔ پھر رک جاتا ہے ۔ آہستہ آہستہ اپنی کالی عینک اتارتا ہے ۔ عینک کے نیچے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی روشن آنکھیں پرچاریوں کی طرف دیکھتی ہیں ۔ بھائیو میں اندھا نہیں ہوں ۔ وہ آہ بھر کر کہتا ہے ۔ میں نے ان آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھا ہے کہ مزید دیکھنے کی ہمت نہیں رہی ۔ اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں ۔ وہ ایک لمبی آہ بھر کر گویا خود سے زیرِ لب کہتا ہے ۔ کاش میں اندھا ہوتا ۔

○

کمرا نمبر ۱۷

ارجمند کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھی ہوئی آویزہ کو دیکھ رہا تھا ۔ دیکھے جا رہا تھا ۔

اس کے روبرو آویزہ نہ تھی ۔ جسے وہ دفتر میں روز دیکھا کرتا تھا ۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آویزہ اور لڑکی تھی ، یہ آویزہ اور ۔ دونوں میں کتنا فرق تھا ۔

لیکن اس کے سامنے بیٹھی ہوئی وہی پرانی آویزہ تھی ۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ حسب معمول اس کے کٹے ہوئے بال ٹوکرہ سے پھولے ہوئے تھے اور اس بے ہنگم متوازی پھیلاؤ کے اندر ایک کیوٹ سا سہما ہوا چہرا دبکا بیٹھا تھا ۔

پہلے آویزہ کو دیکھکر ارجمند کو غصہ آ جایا کرتا تھا ۔ جسے وہ بمشکل ضبط کرتا تھا ۔ آویزہ کو دیکھ کر اسے ایسا لگتا جیسے بالوں کا وہ پھیلاؤ ایک بہت بڑا جالا ہو جسے بڑی محنت سے بن کر مکڑا اس کے مرکز میں دبک کر بیٹھ گیا ہو کہ شکار پھنسے اور وہ جھپٹے ۔ لیکن آج اسے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کالے بالوں کا وہ پھیلاؤ ایک بہت بڑی آنکھ ہو اور اس کے اندر وہ سجا بنا چمکدار چہرہ ایک ان بہا آنسو ہو ۔

ارجمند کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھی ہوئی آویزہ کو دیکھ رہا تھا ۔ دیکھے جا رہا تھا ۔

کتنی بڑی ذہنی کایا پلٹ تھی ۔

ایک چھوٹی سی بات نے اتنا فرق پیدا کر دیا تھا ۔ دنیا ہی بدل دی تھی ۔ اور وہ چھوٹی سی بات اس قدر معمولی تھی کہ ارجمند کو اس کے وقوع کا احساس ہی نہ ہوا تھا ۔ اگر وہ کوئی حادثہ ہوتی یا سانحہ ہوتی یا ڈرامائی واقعہ ہوتی تو بھی اک بات ہوتی ۔ وہ تو ارجمند کی ہمشیرہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک سرسری جملہ تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے ، بھائی جان ۔

صبیحہ کے منہ سے بناؤ سنگار کے متعلق ایسی بات نکلے ۔ صبیحہ جو بنی سجی گڈی کے سوا کچھ نہ تھی ۔ اس جملے نے ارجمند کو چونکا کر رکھ دیا ۔ اس نے مڑ کر صبیحہ کی طرف دیکھا ۔ صبیحہ کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی ۔ لباس کے رنگ مدھم پڑ گئے تھے ۔ قمیض میں چٹن نہ تھی ۔ گولائیاں تیکھا پن کھو چکی تھیں ۔ ۔ ناخون نیچرل ہو گئے تھے ۔ لپ سٹک لاؤڈ نہ تھی ۔ آنکھیں دکھنے والی نہیں بلکہ دیکھنے والی بن چکی تھیں ۔ انداز مدھم تھا ۔ آنکھوں سے مایوسی جھانک رہی تھی ۔ ارجمند کے دل سے ایک آواز اٹھی ۔ تو کیا وہ بن ٹھن ایک جدوجہد تھی ؟ وہ اہتمام ایک ساتھی کی تلاش کے لئے تھا ؟

ارجمند کو بھڑکیلے بناؤ سنگار سے سخت نفرت تھی ۔

اس کے دفتر میں چار لڑکیاں کمپیوٹر ٹریننگ کے لئے بھرتی کی گئی تھیں ۔ آویزہ ، سنبل ، ریٹا اور فاطمہ ۔ جب وہ آئی تھیں تو دفتر میں رنگ و بو اور حرکات کا ایک طوفان آگیا تھا ۔ بے شک دفتر میں ایک چہل پہل سی ہو گئی تھی ۔ سٹاف کے فائلوں پر جھکے ہوئے لمبے لمبے چہرے گول ہو گئے تھے ۔ چہروں کے ڈھلکے ہوئے خطوط اوپر ابھر آئے تھے ۔ دفتر روشن ہو گیا تھا ۔ لیکن وہ ٹھہراؤ نہ رہا تھا ۔ وہ سنجیدگی نہ رہی تھی ۔ یوں جیسے کسی نے سوڈے میں چٹکی بھر نمک ڈال کر شوں کر دیا ہو۔ ارجمند اپنی برانچ کا انچارج تھا ۔ دفتر میں رونق اور روشنی کی نسبت اس کی توجہ کام پر زیادہ مرکوز تھی ۔ لہٰذا اسے لڑکیوں کی آمد اچھی نہ لگی تھی ۔

بے شک لڑکیاں محنتی تھیں ۔ توجہ اور شوق سے کام کرتی تھیں ، لیکن انھوں نے تو فضا ہی بدل ڈالی تھی ۔ اک ارتعاش پیدا ہو گیا تھا ۔ ٹھہرے پانی میں لہریں اٹھنے لگی تھیں ۔ سٹاف کی توجہ یوں بکھر گئی تھی جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا ہو ۔ اور پھر ان کا بناؤ سنگار کتنا لاؤڈ تھا ۔ اس میں شدت تھی ، تشدد تھا ۔ ارجمند کو تو ایسے لگا تھا جیسے سکندر کی فوج کے چار جرنیلوں نے چڑھائی کر دی ہو ۔

سنبل نے شانوں پر سیاہ بال یوں بکھرا رکھے تھے ۔ جیسے مشین گن اٹھا رکھی ہو ۔ اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں یوں رول کرتی رہتی تھیں جیسے میدان

جنگ میں ٹینک چل رہے ہوں ۔

ریٹا پکے کالے رنگ میں بلڈرڈ ہونٹ نکالے پھرتی تھی ۔ حالانکہ رسمی لحاظ سے خدوخال کافی بدصورت تھے ۔ لیکن اس نے خود پر لباس ، میک اپ کی ایسی پھول پتیاں سجا رکھی تھیں کہ ہر کوئی منہ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا ۔ یوں ٹپ ٹپ کر کے چلتی کہ آواز سن کر ہی سارا دفتر پسینے پسینے ہو جاتا ۔ پاؤں کی آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے ۔ جسم ایسے خم و پیچ کھاتا کہ خوبصورت اور بدصورت کا فرق مٹ جاتا ۔ توجہ کوبرے کی طرح پھن پھلا کر کھڑی ہو جاتی اور پھر اس کالی بین پر لہراتی ۔ لہرائے جاتی ۔

پھر وہ فاطمہ تھی ۔ تھی تو گاؤں کی نودولتی ۔ دوبئی کا کپڑا پہنتی ، لیکن کسی قدر توجہ کی طالب تھی ۔ بات بات پر شرما کر آنکھیں نیچی کر لیتی ۔ مژگاں کے چھتر کھلتے بند ہوتے ۔ پنکھا کرنے لگتے ۔ چھاتیاں دھڑکتیں ۔ گال ابھر کر انار بن جاتے ۔ بالوں کی لٹیں گرتیں سنبھلتیں پھر گر جاتیں ، گویا اک طوفان آ جاتا ۔

اور وہ آویزہ ٹوکرا بالوں کے جالے تلے دبکا ہوا مکڑا کہ شکار پھنسے اور وہ جھپٹے ۔

سارا دفتر ان لڑکیوں کی زد میں آگیا تھا ۔ اس آندھی میں سبھی غبار سے اٹ گئے تھے ۔ دفتر کی وہ روانی اور سنجیدگی ختم ہو کر رہ گئی تھی ۔ جھٹکے لگنے لگے تھے ۔ ارجمند ان حالات کو دیکھکر سٹپٹا کر رہ گیا تھا ۔ لیکن بے چارہ مجبور تھا ۔ کیا کرتا ۔

صرف دفتر کی بات نہ تھی ۔ معاشرے پر مانگے کے فیشن کی یلغار سے وہ بیزار تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ دور جدید نے ہر نوجوان لڑکی کو شدت کا طمنچہ تھما رکھا ہے ۔ ان میں جذبہ تسخیر کا جنون پیدا کر رکھا ہے ۔ بے مقصد ، بے مرکز تفریحی تسخیر ۔ کوئی بھی سامنے آئے بھرماؤ ۔ چونکاؤ ، نچاؤ ، گراؤ ۔

ارجمند کی نظر میں یہ چنگیزی فوج سڑکوں پر ، بازاروں میں ، باغوں میں ہر جگہ دندناتی پھرتی تھی اور بے چارے مرد ، سہمے سہمے ڈرے ڈرے کرولٹی ٹو اینیملز کی تصویر بنے ہوئے تھے ۔ خودنمائی کا یہ جھاڑ کیوں چل رہا تھا ؟ کیوں روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ؟ دھول اڑا رہا تھا ؟

اسے اپنی چھوٹی بہن صبیحہ کو دیکھ کر غصہ آیا کرتا تھا ۔ اس قدر میڈ اپ ۔ ارجمند کو بننے سنورنے پر اعتراض نہ تھا ۔ وہ کہتا تھا : بے شک بنو سجو لیکن اچھلنے کا مطلب ؟ چھینٹے اڑانے کا مطلب ہونٹوں کو بانس پر چڑھانے کا مطلب ؟ بے شک آنکھوں کو کالا کرو بھوؤں کی کمان بناؤ ۔ مژگاں کا پنکھا چلاؤ ۔ لیکن ہونٹوں کو خون آلود کر کے لوگوں کو کس بات کی دعوت دیتی ہو ؟ اور وہ بھی یوں برسر عام صلائے عام ؟

ارجمند کے خیالات کے مطابق عورت ایک قابل عزت مخلوق تھی ۔ وہ کائنات کی ماں تھی ۔ ممتا کی رکھوالی تھی ، جس کے جھولنے میں ساری مخلوق پل کر جوان ہوئی تھی ، لیکن دور حاضرہ نے اس عظیم مخلوق کو کیا سے کیا بنا دیا تھا ۔ ایک بنی سجی گڑیا ۔ جس کا مقصد دوسروں کو لبھانا تھا ۔ ان کے ہاتھ کا کھلونا بننا تھا ۔ جو اپنے ہونٹوں پر شنگرفی رنگ سے ہاں لکھ کر اسے نشر کرتی پھرے ۔ جو خود کھلونا بن کر دوسروں کو کھلاڑی بننے کی دعوت دیتی پھرے ، وہ معاشرے میں عزت کی طالب کیسے ہو سکتی ہے ۔

ارجمند کے یہ سارے خیالات صبیحہ کے منھ سے نکلے ہوئے ایک جملے نے صابون کے جھاگ کی طرح اُڑا دیے تھے ۔ اس کی نگاہ میں گردو پیش یکسر بدل گئے تھے ۔ یہ کایا پلٹ صبیحہ کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی تھی ۔

جب صبیحہ کالج میں تعلیم پا رہی تھی تو دفعتاً اس میں خودنمائی کا طوفان جاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس حد تک بڑھ گیا کہ کالج جاتی تو اسے معلوم پڑتا جیسے کالج نہیں ، سٹیج پر جا رہی ہو ۔ اس پر ارجمند کو بہت غصہ آتا لیکن ماں باپ کی موجودگی میں وہ کیا کہہ سکتا تھا کسمسا کر رہ جاتا ۔ اس کے باوجود اس نے ماں سے کئی بار کہا تھا کہ زیبائش کے جذبے کو اس قدر شہ نہیں دینی چاہیے کہ بناوٹ کے علاوہ اور کچھ رہے ہی نہیں ۔

صبیحہ بھائی کی باتیں سنتی ۔ ناک بھوں چڑھاتی ایک کان سے سنتی دوسرے سے اڑا دیتی ۔

جوں جوں وہ درجے پاس کرتی گئی ، سجاوٹ کا جنون بڑھتا ہی گیا ۔ فیشن کی نئی نئی پھول پتیاں لگتی گئیں ۔ بہن بھائی میں فاصلہ بڑھتا گیا ۔

پہلے بال پھول بنے ۔ پھر کھل کر شانوں پر بکھر گئے ۔ پھر کٹ گئے جھاڑ فانوس کی شکل اختیار کر گئے ۔ ناخون چھریاں بن گئے لپ سٹک کے رنگ گہرے ہوتے گئے ۔ لاؤڈ ۔ آنکھیں کشتیاں بن کر ڈولنے لگیں یہاں تک کہ صبیحہ کے نام نے بھی کئی ایک کینچلیاں بدلیں ۔ صبیحہ سے صبیج ، پھر صبوحی ، پھر صبو ۔ جسم بوتل کی شکل اختیار کر گیا ۔ لباس جسم سے ایسا چمٹا کہ دونوں میں فرق نہ رہا ۔ ابھار تیکھے ہوگئے ، گولائیاں نمایاں ۔

انہی دنوں گھر میں صبیحہ کے رشتے کی بات چلی زیر لبیاں ابھریں مشورے ہوئے لڑکا ارجمند کے دفتر میں افسر تھا ۔ ارجمند نے بہت کوشش کی کہ رشتہ ہو جائے گھر والے سبھی حق میں تھے لیکن صبیحہ نے اسے رد کر دیا ۔ اسے لڑکا پسند نہ تھا ۔ کیونکہ وہ لڑکا نظر نہ آتا تھا ۔ اس میں ٹھہراؤ تھا ۔ سنجیدگی تھی ۔ وہ معزز نظر آتا تھا ۔ اگرچہ عمر زیادہ نہ تھی ۔ اس پر ارجمند کو بہت غصہ آیا ۔ بہرحال بات ٹوٹ گئی ۔ ایک سال گزر گیا ۔

پھر جب صبیحہ آخری درجے میں تھی تو ایک اور سرگوشی ابھری ۔ سلمان ۔ سلمان صبیحہ کا چناؤ تھا ۔ گھر میں دبی آواز میں سلمان کا ذکر ہونے لگا ۔ پھر ایک روز سلمان گھر آگیا ۔ گھر کے لوگ باری باری اسے دیکھنے لگے ۔ کوئی اوٹ سے ، کوئی درز سے ، کوئی برملا ۔

سلمان بالکل ہی لڑکا تھا ، اس حد تک کہ شو بوائے نظر آتا تھا دیکھنے میں گڈا ۔ بنا سجا ہوا گڈا انداز سو وہاٹ ۔ رویہ مجوکیئرز ۔ نفاست ایسی جیسے سلمان نہیں ، سلیمہ ہو ۔ جاذب نظر ایسا جیسے ڈیکوریشن پیس ہو ۔ صبیحہ نے ماں باپ پر بہت زور دیا کہ سلمان کے گھر پیغام لے کر جائیں ، لیکن وہ ہچکچاتے رہے ۔ پیغام تو لڑکی کے گھر آتا ہے ۔ بہر حال ، ارجمند نے شدت سے مخالفت کی اگرچہ کہا جاتا تھا کہ سلمان کا مستقبل درخشاں ہے ، لیکن حال تو خاصا بے حال تھا ۔ اس پر والدین نے ارجمند کی بات مان لی ، اور بات کھٹائی میں پڑ گئی ۔ شاید بات پھر سے ابھرتی لیکن جلد ہی سلمان کا ایک سکینڈل سامنے آگیا ۔ پتا چلا کہ وہ تو لیڈیز مین ہے ۔

اس کے بعد صبیحہ کی سجاوٹ میں نئے نئے پیچ و خم شامل ہو گئے ۔صبیحہ

اور چمکی ، اور چمکی جیسے بجھنے سے پہلے دیا بھڑک کر جلتا ہے ۔

تحصیل علم کرنے کے بعد لیکچرار کی حیثیت سے اس کی تعیناتی ہوگئی اور وہ ایک دور دراز شہر میں چلی گئی ۔

دو سال کے بعد جب وہ چھٹیوں پر گھر آئی تو ارجمند اسے دیکھ کر حیران رہ گیا لپ سٹک مدھم پڑچکی تھی ۔ لباس کے رنگ ہلکے ہوچکے تھے قمیض ڈھیلی پڑچکی تھی ۔ بال بندھ گئے تھے آنکھیں دکھنے والی نہ رہی تھی ۔ اور پھر سجاوٹ کے متعلق اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر "کیا فرق پڑتا ہے ، بھائی جان" وہ سُن ہو کر رہ گیا تھا ۔

کیا وہ ناامید ہوچکی تھی ؟ ہمیشہ کے لیے ناامید ؟ کیا وہ بناؤ سنگار امید کی ایک صورت تھی ؟ جیون ساتھی حاصل کرنے کے لیے ایک معصوم جدوجہد تھی ؟

اس روز شام کو جب وہ بازار گیا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا ۔ بنی سجی جوان لڑکیاں یوں نظر آرہی تھیں جیسے چراغ سحری بجھنے سے پہلے بھڑک کر جل رہے ہوں اونچی ایڑیوں کی ٹپ ٹپ یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوچ کرنے کا نقارہ بج رہا ہو ۔ اعضا کے پیچ وخم اور حرکات کی لے یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے محرومی سے بچنے کے لیے داؤ پیچ کھیلے جا رہے ہوں ۔

اس روز ارجمند نے شدت سے محسوس کیا کہ رعنائیوں کی یہ نمائش دراصل بر تلاش کرنے کی جدوجہد ہے ۔ تعلیم اور سٹیٹس نے لڑکیوں کے آئیڈیلز میں ہوا بھر دی تھی ۔ غبارے اڑنے لگے تھے ۔ اور بلند اور بلند۔توقعات نے اپنے گھونسلے اتنے اونچے بنا لئے تھے کہ زیادہ تر نوجوان بالشتئے نظر آنے لگے تھے ۔ گھر والوں کی پسند سے چڑ ہوگئی تھی ۔ اپنی پسند فروعات سے اٹ گئی تھی ۔ مواقع کم ہوتے جا رہے تھے ۔ اور کم اور کم۔ڈوبتے ہوئے تنکوں کی طرف جھپٹ رہے تھے ۔

اس رات ارجمند کو نیند نہ آئی ۔ احساس گناہ کی چبھن بڑھتی گئی ۔ بڑھتی گئی ۔ اس کے دل سے آواز آرہی تھی : صبیحہ کی محرومی کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے ۔ تم نے سلمان کے خلاف محاذ قائم کیا تھا ۔ اب وہ عمر بھر محروم رہے گی ۔ اکیلی تنہا ۔

اگلی صبح اس کی بیگم نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا "اٹھیے نا۔ صبیحہ کب سے انتظار کر رہی ہے۔" ارجمند کو یاد آیا کہ اس نے صبیحہ کے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ لاہور میں اسے ہیڈ آفس میں کام تھا۔ صبیحہ نے یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنی تھی۔

لاہور پہنچے تو دوپہر ہوچکی تھی۔ صبیحہ فنکشن کے لیے لیٹ ہوگئی تھی۔ ارجمند نے ٹیکسی لی اور صبیحہ کو سیدھا یونیورسٹی لے گیا۔ اسے سمجھا دیا کہ فارغ ہو کر بیبی ہوم ہوٹل میں آجائے، جہاں وہ ٹھہریں گے ہوٹل کے ریسپشنسٹ کے پاس وہ پیغام چھوڑ دے گا۔ کمرا نمبر بورڈ پر دیکھ لے۔

یونیورسٹی سے سیدھا ہوٹل پہنچا۔ کمرا نمبر ۱۶ بک کرایا۔ سلمان رکھوایا۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ دفعتاً ملحقہ نمبر ۱۷ کا دروازہ کھلا سلمان باہر نکلا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ ارجمند نے بیرے سے پوچھا: کمرا نمبر سترہ میں کون ٹھہرے ہوئے ہیں؟

"سلمان صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں" اس نے جواب دیا "ابھی نیچے گئے ہیں۔"

صبیحہ نے شام پانچ بجے آنا تھا۔ ساڑھے چار کے قریب ارجمند اٹھا۔ تیاری کی'ایک کاغذ پر صبیحہ کے نام میسج لکھا "مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ شاید میں رات کو لیٹ لوٹوں۔ گھبرانا نہیں۔" اس نے کاغذ تہ کیا، لفافہ بند کیا، لفافے پر لکھا: میسج برائے صبیحہ از ارجمند کمرا نمبر ۱۷۔

وہ نیچے اترا۔ ریسپشن کو لفافہ دیا۔ پھر بورڈ کی طرف بڑھا، جس پر کمروں کے نمبروں تلے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا کارڈ سولہ نمبر کے خانے سے نکال کر سترہ نمبر کے خانے میں فِٹ کر دیا۔ پھر۔۔۔ وہ عجلت سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے!

○

ماڈ ہاؤس

فردوس کالونی میں ، فن کار روڈ پر ، ایک بنگلا واقع ہے ، فوارہ چوک کی نکڑ پر ۔ اسے دیکھ کر حساس راہ گیر رک جاتا ہے ۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی مسجد براق سی سفید چادر اوڑھے درختوں کی اوٹ میں بیٹھی ہو ۔ خاموش ، پرسکون ، بے نیاز ۔

یوں لگتا ہے جیسے وہ بنگلا نروان حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو ۔ باہر تختی پر ماڈ ہاؤس لکھا دیکھ کر آپ گھبرا جاتے ہیں ۔ ماڈ تو حرکت ہے ، اضطراب ہے ، بے چینی ہے ، زندگی ہے اس بودھ کے ٹوپے کو ماڈ سے کیا تعلق ۔

اندر بیک یارڈ میں ڈیڈی سوٹ پہنے ، ٹائی لگائے ، سٹف کالر سمیت راکنگ چیئر پر جھول رہے ہیں ۔ ہاتھ میں پائپ ہے گود میں ماچس ہے بار بار پائپ سلگاتے ہیں وہ سلگتی ہے ، بجھ جاتی ہے پھر سلگتی ہے ، پھر بجھ جاتی ہے ۔ بیچاری جلتی بجھتی روشنی کی طرح ٹم ٹم کر رہی ہے وہ خود بھی جلتی بجھتی بتی کی طرح ٹم ٹم کر رہے ہیں ۔ چہرے پر کبھی سُرخ بتی جل جاتی ہے ، کبھی سبز ۔ ظاہر ہے کہ سوچوں میں پڑے ہیں ۔ جسم بھی جھول رہا ہے ، ذہن بھی ۔

ممی اندر ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھی ہیں ۔ سامنے بیسیوں شیشیاں ، بوتلیں ، قطار باندھے کھڑی ہیں ۔ بے چاری بوتلیں کیا کریں ۔ مقابلہ سخت ہے مینو پاز سر پر آکھڑا ہے جسم ڈھلنے لگا ہے وزن بڑھتا جا رہا ہے ۔ چہرے کے مسام یوں پھیل گئے ہیں جیسے برسات میں گھاس پھوس پھیلتے ہیں ۔ پھر بھی یہ بوتلیں اور شیشیاں حسبِ توفیق بازیابی کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں ۔

ممی کا یہ شغل خاصا دائمی ہے ۔ یا تو وہ گھر سے باہر رہتی ہیں ، اور جو گھر میں ہوں تو ڈریسنگ ٹیبل پر ۔ ڈیڈی تو اس تفصیل کو عرصے سے نظر انداز کر

چکے ہیں ۔ کوئی یاد دلائے تو مسکرا دیتے ہیں اور زیر لب بوڑھی گھوڑی لال لگام کہہ کر دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں ۔

بچے اس تفصیل کو معاف نہیں کر سکے خصوصاً بڑی عمیرا ہے ۔ اول تو ادھر دیکھنے کی نہیں ۔ اسے دیکھے بغیر پتا ہے کہ ممی کہاں بیٹھی ہیں ۔ کیسے بیٹھی ہیں ۔ عمیرا کو میک اپ سے بیر نہیں میک اپ کرو ، بے شک کرو ۔ ناؤ جب تک پانی میں ہے ، اسے چلاؤ جب وہ خشکی پر آ چڑھے ، پھر پتوار چلانے کا فائدہ ؟ اسے ممی کے میک اپ پر یہی شکایت ہے کہ ممی ریت پر تیرنے کی کوشش میں لگی ہیں منجھلے عمران کو گھر کے سبھی لوگوں سے شکایت ہے کوئی بھی اسے لفٹ نہیں دیتا ۔ ہر کوئی خود میں کھویا ہوا ہے ۔ ممی ویلفیئر کی دھن میں لگی ہیں ۔ ہر وقت ویلفیئر کا جھنکنا چھنکاتی ہیں ۔ آج یہاں میٹنگ ہے ، کل وہاں سب کمیٹی ہے ، پرسوں ادھر فنکشن ہے ۔

ڈیڈی بیک یارڈ میں راکنگ چیئر پر جھولتے رہتے ہیں ۔ عمیرا ورکنگ وومن بنی پھرتی ہے ۔ ٹپ ٹپ اُدھر جاتی ہے ۔ ٹپ ٹپ اِدھر آتی ہے ۔ کام کم ، ٹپ ٹپ زیادہ۔اسے سارے گھر پر غصہ ہے ۔ یہ کیا گھر ہے ! اونہوں ! سیاحوں کا اِن ہے دن چڑھا اور سیاح جگہیں دیکھنے کے لیے نکلے ۔ رات پڑی تو آکر پڑ رہے ۔ صرف چھوٹی آنسہ ہے جو سارا دن فون سے دل بہلاتی رہتی ہے ۔

عمران کو ان حالات پر غصہ آتا ہے تو وہ اپنا موٹر سائیکل لے کر باہر نکل جاتا ہے ۔ سائیلنسر پہلے ہی نکالا ہوا ہے ۔ اسی میل کی رفتار اور ساتھ غاؤں غاؤں غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو گھر لوٹ آتا ہے ۔ یا دوستوں کی منڈلی سے مل کر کوک پیتا ہے ، برگر کھاتا ہے ، ٹوبل وِد ہوم ۔

"ڈارلنگ" ڈیڈی نے آواز دی ۔

ممی چونکیں "دیکھا نا، وہی بات ہوئی مجھے پتا تھا کہ جب میرے آخری ٹچز رہ جائیں گے تو مجھے آواز دیں گے ۔ انہیں پتا ہے کہ میں پہلے ہی پانچ منٹ لیٹ ہوں ۔ بیگم شائستہ بخاری راہ دیکھ رہی ہیں ۔ یہ تو چاہتے ہی نہیں کہ میں اپنی کمٹمنٹس پوری کروں ۔ جلتے ہیں نا ، اس لیے ۔" "ڈارلنگ" ڈیڈی نے پھر آواز دی ۔ "یہ کب سنے گی ۔ اونہوں ! جب لال لگام کسی ہو اس وقت نہیں

سنتی ۔" "ڈارلنگ" انہوں نے پھر آواز دی ۔

"مجھے بلایا ہے ، جانی ؟" ممی نے یوں مٹھاس چھلکائی جیسے شہد کی بوتل ہو ۔

"اگر فرصت ہو تو میری ایک بات سن جانا" ڈیڈی بولے ۔

"ہونہہ! فرصت ہو ۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے ۔" آ رہی ہوں ، ڈارلنگ" ممی نے مسکراہٹ میں بھیگا بھیگا جواب دیا ۔

"بننا سنورنا ہی ختم نہیں ہوتا ، آئیں گی کیسے" ڈیڈی نے سوچا "اس ڈریسنگ چیئر کو تو وکٹوریہ کراس ملنا چاہیے ۔ بے چاری گھنٹوں اتنا بوجھ اٹھاتی ہے ۔" "ٹیک یور ٹائم ڈارلنگ" وہ بآواز بلند بولے ۔

ڈیڈی کی آواز سُن کر عمیرہ رک جاتی ہے ۔ وہ ٹہل رہی تھی ۔ اِدھر سے اُدھر ، اُدھر سے اِدھر اطمینان و آرام کی ٹہل نہیں ۔ وہ ٹہل جو سکندر اعظم نے دریائے اٹک پار کرنے سے پہلے اپنے خیمے میں لگائی تھی ۔ ایسی ٹہل گھر میں عام تھی ۔ ہر کوئی کسی نہ کسی وقت لگاتا رہتا ۔ کبھی ڈیڈی دفعتاً راکنگ چیئر سے اٹھ بیٹھتے اور لان میں ٹہل لگانے لگتے ۔ اس کی وجہ تو سبھی جانتے تھے ۔ جب بھی گھر کے بجٹ کا دھارا چڑھ جاتا تو اسے عبور کرنے کے لیے ٹہل لگاتے ۔ ویسے چھوٹے موٹے مالی امور کو سلجھانے کے لیے راکنگ چیئر کی ٹہل ہی کافی تھی ۔ وہ بھی تو ایک ٹہل ہی تھی نا ۔

عمران بے توجہی کے خلاف غصے سے بھر جاتا تو ٹہل لگاتا ، اور آخر موٹر سائیکل کی چیخم دہاڑ اور اسی میل کی زوں میں تسکین ڈھونڈتا ۔

چھوٹی آنسہ بھی ٹہل لگاتی تھی تنہائی اور اکیلے پن کے خلاف ٹہل ۔ اسے یہ شکایت تھی کہ گھر میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا ۔ کچھ بھی نہیں وہی روٹین ۔ ممی کی مسلسل تیاری اور پھر روانگی ۔ ڈیڈی کی مسلسل جلتی بجھتی پائپ اور پھر میٹنگ کانفرنس ۔ سوشل کالز ۔ باجی کی مسلسل ٹپ ٹپ اور پھر سہیلیوں کا جمگھٹ ۔ وہ بے چاری دعائیں مانگتی : یا اللہ ! کچھ ہو جائے ایسا کچھ جو در و دیوار ہلا دے پر رات پڑتی ، دن چڑھتا ، پھر رات پڑ جاتی اور کچھ بھی نہ ہوتا ۔ پھر وہ مایوس ہو کر رانگ نمبر ڈھونڈتی ۔ اس کی نوٹ بک میں کئی ایک دلچسپ رانگ

نمبر لکھے ہوئے تھے ۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا کہ نوجوان اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے تھے ۔ عمر رسیدہ باتوں کے تار باندھ دیتے ۔ ایسے کچھے باندھ دیتے کہ ان سے نکلنے کو جی نہ چاہتا ۔

گھر میں صرف اِی تھی جس نے کبھی ٹہل نہ لگائی تھی ۔ اسے ٹہل لگانے کی فرصت ہی نہ تھی وہ تو گھر کی محور تھی ۔ سارا گھر گرد گھومتا تھا ۔ اگرچہ سارا دن باہر رہتی پھر بھی گھر اسی کی مرضی پر چلتا ۔ حالات بگڑنے لگتے تو بچوں کو ڈانٹ دیتی اور میاں پر شہد کی بوتل کی پھوار چلا دیتی ۔ چار چھ بار ایسے پیار سے ڈارلنگ کہتی کہ ڈیڈی کی پھنکڑی پُھل ہو کر رہ جاتی ۔

ممی کی پرابلم تو ایک ہی تھی نا ، ڈیڈی وہ بھی صرف بجٹ کے حوالے سے۔ بجٹ چلتا رہے ، ہنگامی خرچے پورے ہوتے رہیں ۔ رہا میاں بیوی کا سلسلہ ، وہ تو شروع شروع میں زوروں پر ہوتا ہے شروع شروع میں میاں کڑاہی کے چنے کی طرح تڑ تڑ کرتا ہے ۔ جوں جوں عمر رسیدہ ہوتا جاتا ہے توں توں مدھم پڑتا جاتا ہے ۔ بیوی ابھرتی جاتی ہے ۔ ادھیڑ عمر میں دو چار سخت مقام آتے ہیں ۔ جب میاں کی توجہ گھر سے باہر یہاں وہاں بھٹکتی ہے ۔ لگتی ہے ، ٹوٹتی ہے ، پھر لگتی ہے ۔ اگر بیوی اسے اہمیت نہ دے تو کشتی ڈانوا ڈول نہیں ہوتی ۔ مہذب گھروں میں خالی میاں کی ہی نہیں ، بیوی کی توجہ بھی بھٹکتی ہے ۔ اس لیے گلے شکوے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ ڈولنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ۔

ممی یوں بھاگی بھاگی ڈیڈی کے پاس آئی جیسے فرمانبرداری کی ماری ہوئی ۔ "ساری ڈارلنگ" وہ بولی "ایک تو یہ سب کمیٹیاں جینے نہیں دیتیں ۔ ویلفیئر تو جان کا دشمن ہو گیا ۔ جی میں آتا ہے کہ استعفےٰ دے دوں کیوں ڈارلنگ ، دے دوں ؟"

ڈیڈی کو اچھی طرح پتا ہے کہ ویلفیئر کے پیڈسٹل پر بیگم کا بت کھڑا ہے ۔ استعفا کون دیتا ہے پھر بھی بیگم کا یہ کہنا کتنا خوش کن تھا "بالکل نہ دینا" وہ جواب دیتا ہے "میں نے تو صرف اس لیے بلایا ہے کہ یاد دہانی کرا دوں ۔ آج رات بیگم سہیل آئے گی ۔"

"اوہ ! بیگم سہیل" اندر سے نفرت کی پھوار اڑتی ہے وہ بچ بچ چمگادڑ ۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ ۔ میرے میاں کو توجہ دے کر بھر مائے بیٹھی ہے ۔ "ہائے ! بیگم سہیل" ممی نے شہد کی پھوار چلائی "میں تو کب سے ڈنر پر بلانا چاہ رہی ہوں ۔ آج آئے گی ۔ ویری نائس آف ہر ۔ اچھا کیا جو مجھے بتا دیا ۔ ڈونٹ وری ڈارلنگ ۔"

عمیرا سنتی ہے ۔ ہئے ! اتنا جھوٹ ! ان دونوں نے کبھی آپس میں سچی بات بھی کی ہے کیا دونوں ہی جھوٹے ہیں ۔ دونوں کو پتا ہے کہ منہ زبانی کے گلاب جامن تلتے ہیں ۔

"بائی ڈارلنگ میں شام سے پہلے آ جاؤں گی ۔ خدا حافظ ۔"

عمیرا اطمینان کا سانس لیتی ہے چلو اچھا ہوا ۔ اک رکاوٹ تو دور ہوئی شام تک سینو ، نومی اور میں ۔ ڈیڈی تو منتظر بیٹھے ہیں کہ کب ممی جائیں اور وہ سہیل کو فون کریں، بس فون کریں گے اور ان کے ہاں جابیٹھیں گے ۔ اس کے میاں سے شطرنج کی بازی رہے گی ۔ بازی تو بس دکھاوا ہے ۔ وہ اردگرد گھومے گی ۔ مسکرائے گی ۔ یہ کھائیے یہ آزمائیے میری طرف دیکھیے ۔

"بیٹے ، عمران" ڈیڈی نے آواز دی ۔

عمران چونکا ۔ دی اولڈ مین از اپ ۔ پتا نہیں کیا کہے کہاں بھیجے سمجھ سے کوئی واسطہ نہیں ۔ اپنے کام سے واسطہ رکھتا ہے ۔ بیٹا کہاں منہ زبانی کا بیٹا ہوں ۔

"سنتا نہیں ؟ ڈیڈی بلا رہے ہیں" آنسہ زیر لب بولی ۔

"بڑی چہیتی آئی ہے ، ڈیڈی کی" وہ غرایا ۔

"بیٹے ، عمران" ڈیڈی نے پھر آواز دی ۔

"آرہا ہوں ، ڈیڈی ۔ ۔ ۔ "عمران اطمینان سے چلتا ہوا یوں پاس آرکا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو"جی ڈیڈی ؟"

"فارغ ہو ؟"

"جی ، بالکل ۔"

"ذرا سہیل صاحب کی طرف جانا ۔"

اولڈ مین بالکل ہی لٹو ہو رہا ہے ۔ "جی ڈیڈی ۔"
"ان کا فون خراب ہے کہنا ممی آج شام کو آپ کا انتظار کریں گے ۔"
"جی ، اچھا ۔۔۔۔" ممی انتظار کریں گی ممی ۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔ ابھی جاتا ہوں ، جناب ۔

عمران نے موٹر سائیکل سٹارٹ کیا ۔ غصے سے ایکسیلیٹر کا گلا گھونٹا ، اور زور سے ، اور زور سے گھر کی دیواریں لڑکھڑائیں ۔ اور پھر غاؤں غاؤں ۔

عمران کے جانے کے بعد ڈیڈی راکنگ چیئر سے اٹھے ۔ دو ایک منٹ باتھ روم میں سیٹی بجاتے رہے ۔ پھر تیار ہو کر باہر نکل گئے ۔

ڈیڈی کے جانے کے بعد عمیرا نے فون کیا "ہیلو ، کون بول رہا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ اوہ یو ۔ گڈ ۔ ۔ کم اینڈ گٹ می ۔"

فون کرنے کے بعد وہ پورٹیکو میں ٹپ ٹپ ٹہلنے لگی ۔

عمیرا کے جانے کے بعد گھر شانت ہوگیا ۔ جیسے کوئی مسجد براق سی سفید چادر اوڑھے درختوں کی اوٹ میں پرسکون بیٹھی ہو ۔

ایسے لگتا تھا جیسے وہ گھر نروان حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو ۔

اندر ایک بھکشنی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ نروان حاصل کرنے کے لیے میں کون سا رانگ نمبر گھماؤں !

○

سیڑھی سرکار

پتا نہیں، میں سیڑھی سرکار کیسے جا پہنچا۔

مجھ میں ایک اضطراب، لہریں لے رہا تھا۔

ایسے لگتا تھا جیسے کوئی سوکھا پتا جھکڑ میں ڈول رہا ہو نہیں میں پتا نہیں تھا۔ میں تو خود جھکڑ تھا۔ منجدھار میں ناؤ نہیں تھا۔ خود منجدھار تھا۔ بیٹھتا تو لٹو کی طرح گھومتا۔ گھومے جاتا چلتا شرابی کی طرح ڈولتا، لڑکھڑاتا، جھومتا۔

ایسی حالت میں اللہ نہ کرے کسی کو موٹر سائیکل میسر ہو مجھے تھا، جو جلتی پر تیل چھڑکتا اندر بھی گھاؤں گھاؤں، باہر بھی گھاؤں گھاؤں۔ اندر کا ایکسیلیٹر بھی کھلا، باہر کا بھی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر غراتا پھرتا۔ بے معنی۔ بے مقصد۔ بے منزل۔

میں نے کئی بار سوچا تھا: الطاف، چھوڑ اس سائیکل کو کہیں پھینک آ دور بہت دور ورنہ ایک دن یہ سڑک پر لڈو بنا پڑا ہوگا، اور تیری بوندی یہاں سے وہاں تک بکھری پڑی ہوگی۔

بس سوچتا رہا۔ کچھ کرنے کی توفیق نہ ہوئی کیسے ہوتی؟ اندر چرخیاں چل رہی ہوں تو باہر گڑگڑاہٹ تو ہوگی۔

بظاہر اس اضطراب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں آزاد تھا مادر پدر آزاد۔ عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیسہ عام تھا پیچھے جاگیر تھی۔ یونیورسٹی میں بڑی ٹیں تھی۔ لڑکے مانتے تھے پروفیسر جانتے تھے لڑکیاں ریجھی ہوئی تھیں۔ دیکھتیں تو منہ سے رال ٹپکتی بس ایک نگاہ التفات کی دیر تھی۔ پھر اضطراب کیسا؟

نہیں بے وجہ نہ تھا۔ اب جو میں سوچتا ہوں تو وجہ تھی۔ وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں سامنے دھری تھی۔ لیکن میں اسے جانتا نہیں چاہتا تھا۔ مانتا نہیں

چاہتا تھا ۔ مانتا تو ٹھیس لگتی ۔ آزاد منش بھلا اندر کی چھپی ہوئی زنجیروں کو کیسے مانے ۔ ایفینسی پیشن کا دعوے دار اندر کی پھپھوندی کو کیسے مانے ۔ دراصل میں ایک نہ تھا ، دو تھا ۔ باہر کچھ تھا ، اندر کچھ اور تھا دور ہو جاؤ تو جھگڑ چلتا ہے ۔ لٹو گھومتا ہے سمت چھوٹ جاتی ہے پھر بادیہ پیمائی ، گھمن گھیری ، زوں زوں ، شوں شوں ایک روز چلتے چلتے چونکا ۔ رکا جاگا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیڑھی سرکار کے گاؤں کی جانب جا رہا ہوں ۔ کہاں شہر کی ریشمی سڑک کہاں کچا راستہ ۔ خود کو روکا یہ کیا کر رہا ہے احمق ؟ سنی سنائی پر اعتبار کر لیا ؟ خود کا تماشا بنائے گا کیا ؟

آٹھ دس دن کے بعد پھر وہی حادثہ ہوا ۔ دیکھا کہ پھر سیڑھی سرکار کی طرف جا رہا ہوں رک گیا ۔ سوچ میں پڑ گیا پھر دل میں سو وہاٹ کی لہر اٹھی ۔ چلو ، جو دل ادھر جانے پر مچلا ہوا ہے تو ٹھیک ہے کون سی قیامت آ جائے گی ۔

یہ سارا جھگڑ دراصل انطو کی وجہ سے تھا ۔ اس کا نام انطونیا تھا ۔ یونیورسٹی میں سبھی اسے انطو کہتے تھے ۔ وہ رومانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی ۔ جو بھی اسے دیکھتا ، کھڑا کا کھڑا رہ جاتا پری زاد نظر آتی تھی ۔ کیسے نہ آتی نظر ۔ بھئی کوہ قاف کی جو تھی ۔

پہلے روز تو میں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھکا ۔ پھر میں نے سنبھالا دیا ۔ اپنی ٹیں کا بھید یہ تھا کہ لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالو ۔ وہ پیچھے پھریں ، تم نہ پھرو ۔ ۔ انطو کو دیکھا ۔ پھر منہ موڑ لیا آپ آئے گی سالی ۔

اگرچہ دیر کے بعد آئی ، مگر آئی پھر ساتھ گھومنے پھرنے لگی کیوں نہ پھرتی ؟ دوسروں کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے ۔ علانیہ ریشہ خطمی ہو جاتے ۔ ہم اپنا کلف لگائے رکھتے تھے کھڑ کھڑ کر کے بات کرتے ۔

ایک روز بولی "یہ ہوسٹل تو گیلا کمبل ہے ۔"

میں نے پوچھا کیا مطلب ؟

بولی "ڈمپ اینڈ ڈپریسنگ ۔"

میں نے کہا "وہ تو ہے لڑکیاں لڑکے جدا جدا رہیں گے تو ڈمپ اینڈ ڈپریسنگ تو ہو گا ۔"

بولی "جی چاہتا ہے شہر میں کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں ۔"
میں نے کہا "لے لو ۔"
بولی "کوئی ساتھی بھی تو ہو جو میرے ساتھ رہے ۔"
میں نے کہا "مل جائے گا ۔"
بولی "اتنا آزاد خیال کون ہو گا جو میرے ساتھ رہے ؟"
میں نے کہا "ہم تمہاری پرابلم حل کر دیں گے ۔"
بولی "وہ کیسے ؟"
میں نے کہا "یہ خدمت میں سر انجام دے دوں ؟"
بولی "یو ڈونٹ مائنڈ اٹ ؟"
میں نے کہا "نو ۔ ناٹ می ۔"
بولی "اور دوسرا لوگ ؟"
"ٹوہل ود دم ۔" میں نے بے نیازی سے کہا ۔
فلیٹ میں وہ اتنی اچھی ساتھی ثابت ہوئی اتنی اچھی ۔ اتنی قریب آگئی کہ روئیں روئیں میں بس گئی ۔ تفریح سنجیدگی میں بدل گئی ۔ بات دور نکل گئی ۔ لیکن اندر ہی اندر ۔ باہر وہی کلف لگا رہا ۔ بے نیازی کا روپ دھارے رکھا ۔
پھر اور لوگ اسے ملنے فلیٹ میں آنے لگے ۔
ایک روز بڑی معصومیت سے بولی "الطی ، یو مائنڈ اٹ ۔"
میں نے کہا "او نو ۔ ناٹ می ۔"
بولی "دیٹس گڈ ۔ الطی ، جسم تو اوپر کی چیز ہے ۔ سرسری تعلق ۔ اصل تعلق تو دل کا ہوتا ہے ۔"
میں نے کہا "بالکل"
بولی "یو ایگری ؟"
میں نے کہا "ٹو ٹو"
جب اس نے پہلا سرسری تعلق پیدا کیا تو میرے دل پر ایک کرنٹ لگا ۔ میں نے دل کو سمجھایا بجھایا : "سالے ، تفریح کو روگ بنا رہا ہے؟ ہشت ۔"
دوسرا کرنٹ لگا تو میں ہشت کہنا بھی بھول گیا ۔ پھر پے بہ پے لگے تو

ساری آزاد خیالی بلبلے بن گئی ۔ اندر کا چور بھوت بن کر باہر نکلا ۔ ایٹی کیٹ دھری رہ گئی ۔ الطو کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا "الطو ، سٹاپ دس نانسنس ۔"

وہ حیران "رئیلی الطو ، یو مائنڈ اٹ ۔ دیٹ مچ ۔"

"یس ، آئی ڈو ۔"

"آئی ام سو ساری ، الطو ۔ بٹ ۔" وہ بٹ کا مفہوم بنائے بغیر رک گئی ۔

شام کو بٹ کا مفہوم واضح ہو گیا ۔ وہ فلیٹ چھوڑ کر جا چکی تھی دو چار دن تو میں چوری چوری دل ہی دل میں انتظار کرتا رہا ۔ پھر باہر والی "میں" جلال میں آگئی ۔ میں خود کو ڈانٹنے لگا "احمق ، یہ محبت تھوڑا ہی تھی ۔ یہ تو ایک ارینجمنٹ تھا ۔ تفریح تھی ۔ چلی گئی تو چلی جائے ۔ اور آجائے گی ۔ تفریح تو رنگا رنگ ہوتی ہے ۔ یک رنگی تو بوریت ہوتی ہے ۔ یہ تو سمجھ لو انٹرول ہے ۔ تماشا پھر سے شروع ہو گا ۔

لیکن وہ انٹرول جھکڑ بن گیا لٹو گھومنے لگا ۔ شرابی لڑکھڑانے لگا ۔ موٹر سائیکل نے جلتی پر تیل ڈالا ۔ سمت چھوٹ گئی پھر وہی بادیہ پیمائی ۔

سارا جھگڑا دو ہونے کی وجہ سے تھا ۔ ایک ہوتا تو سکھی ہوتا ، جھکڑ نہ ہوتا دکھ تھا ۔ بہت گہرا ۔ مگر میں اسے اپناتا نہ تھا ۔ اس لیے جھکڑ چل رہا تھا ۔

اس جھکڑ میں کئی ایک آوازیں سنائی دیتی تھیں ۔ کسی نے کہا : وہ کسی اور ساتھی کے ساتھ دوسرے فلیٹ میں چلی گئی ہے ۔ ایک روز گھومتا پھرتا اس فلیٹ تک جا پہنچا ایک لمبی سی سیڑھی اوپر تک چلی گئی تھی ۔ اوپر دروازہ تھا ۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا ۔ دن میں گھومتے پھرتے ہر دو تین گھنٹے کے بعد پھر سے وہی سیڑھی آجاتی کبھی دائیں ، کبھی بائیں ساری رات سیڑھیاں چڑھتا رہا سارا دن سیڑھیوں کو دیکھ کر جی میں آتا کہ چڑھ جاؤں چڑھ جاؤں تو سرسری تعلق صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ جائیں گے ، لیکن باہر کی "میں" ضد کیے بیٹھی رہی ۔

چڑھ جاتا تو سیڑھی کے چکر میں نہ پڑتا ۔ نہ چڑھا تو ایسا چکر چلا کہ میرے اردگرد چاروں طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں کھڑی ہو گئیں ۔

ایک روز بازار میں سیڑھی سرکار کی بات سن کر کان کھڑے ہو گئے ۔ میں

سمجھا ، لوگ باگ میری بات کر رہے ہیں ۔ حیران کہ انہیں کیسے پتا چلا کہ نیچے سیڑھی ہی سیڑھی ، اوپر سرکار ہی سرکار ۔ بعد میں پتا چلا کہ کوئی اور سیڑھی سرکار ہیں جو عاشقوں کے پیر ہیں ۔ اگرچہ میں نے یہ نہیں مانا تھا کہ یہ محبت کی کٹھن گھیری ہے پھر بھی دل میں چور تھا ۔ اس لیے ان جانے میں سیڑھی سرکار کی طرف رخ کرتا رہا اور بالآخر وہاں پہنچ گیا ۔

سیڑھی سرکار دراصل شہر کا مضاف ہے ۔ چھوٹا سا ایک گاؤں ، جس میں سیڑھی سرکار کا مزار ہے ۔ مزار بہت فراخ ہے ۔ باہر تین ملحقہ چبوترے ہیں ، جن پر لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے ۔ عورتیں زیادہ ساتھ بچے ۔ مرد کم کم ۔ پہلے چبوترے پر جو مزار سے ملحق ہے تین ٹنڈ منڈ درخت ہیں ۔ ان کی ٹہنیاں پتوں کی جگہ رنگ برنگی دھجیوں سے بھری ہوئی ہیں ۔ ایسے لگتا ہے جیسے پتوں کی جگہ دھجیاں اگی ہوئی ہوں ۔ یہ دھجیاں لوگوں کی آرزوئیں ہیں ، تمنائیں ہیں ، محبتیں ہیں ، محرومیاں ہیں ۔ سب عشق کے بکھیڑے محبوب کی بے رخی ، بے وفائی ، حالات کی ناسازگاری ، ملاپ میں رکاوٹیں ۔

سیڑھی سرکار عشق کا پیر ہے ۔

درگاہ پر جاؤ ، مزار پر سلام کرو ، فاتحہ پڑھو ، دعا مانگو : سرکار ، میری محبت کامیاب کر دے تیرے دربار پر دیگ دوں گا ۔ سیڑھی چڑھاؤں گا پھر باہر آکر کپڑے کی رنگ دار کترن پر اپنا نام لکھو ۔ اسے درخت پر باندھو پھر دعا پڑھو منت مانو ۔

چبوترے پر چار دیواری کے ساتھ ساتھ سینکڑوں سیڑھیاں لگی کھڑی ہیں ۔ حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا ۔ یہ کیسا چڑھاوا ہے ۔ پھر سامنے فلیٹ کی سیڑھیاں آکھڑی ہوئیں ۔ نیچے سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ۔ اوپر سرکار' پتا نہیں کیوں میں سیڑھی سرکار سے مماثلت سی محسوس کر رہا تھا ۔ ویسے میں دو دِلا تھا ۔ ایک دل چاہتا کہ مزار پر جاؤں ، دعا مانگوں ، کترن باندھوں ، اور پھر فلیٹ کی سیڑھی چڑھ جاؤں ۔ دوسرا دل ان ساری باتوں پر تمسخر سے ہنس رہا ہوتا ۔

اس روز سے میرے دل میں ایک لگن لگ گئی کہ سیڑھی سرکار کے بارے میں جانوں وہ کون تھے ؟ کیا کرتے تھے ؟ کہاں رہتے تھے ؟ کیسے سیڑھی سرکار بنے ۔

سیڑھی کی ان کی زندگی میں کیا اہمیت تھی؟

سارا دن میں شہر میں آوارہ گردی کرتا، گلیوں میں گھومتا تاکہ سیڑھیاں نظر آئیں۔ مجھے سیڑھی آبسیشن ہوگیا تھا۔ رات کو سیڑھی سرکار پہنچتا اور لوگوں سے پوچھتا پھرتا۔

وہاں سب لوگ سرکار کی کرامتوں سے بھرے پڑے تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ سرکار کی زندگی کے کوائف کیا تھے۔ انہیں سیڑھی سرکار کیوں کہا جاتا تھا۔

پوچھتے پوچھتے ایک مست سے جا پوچھا وہ بولا "جا، نوری کے پاس جا۔" اور پھر گاؤں کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مست سارا دن چار دیواری سے لگی ہوئی سیڑھیوں سے جان بوجھ کر گرا کرتا تھا۔ پہلے چڑھ جاتا، پھر لڑھکتا۔

نور بی بی نے میری طرف گھور کر دیکھا دیکھتی رہی۔ پھر بولی تو سرکار کی کہانی لکھنا چاہتا ہے؟ کیوں؟"

میں نے جھوٹ بول دیا۔ میں نے کہا "سرکار روز خواب میں آتے ہیں۔ کہتے ہیں: الطاف، اٹھ، لکھ ایک مہینا ہوگیا ہے۔ روز یہی ہوتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا کھونڈ کھڑکاتے ہیں: اٹھ، لکھ۔"

وہ بہت دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بولی "اچھا، جو سرکار یہی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ویسے ان کی کہانی اس جوگی نہیں کہ سنائی جائے۔ اور کہانی بھی کیا، بس نیچے وہ تھے، اوپر تارا بائی تھی، اور درمیان میں چوبارے کی اونچی لمبی سیڑھی تھی۔ پہلے دو سال وہ تارا بائی کے لیے چڑھتے رہے پھر دو سال وہ تارا بائی کی سیڑھی سے گرتے رہے۔ پھر وہ اوپر آبیٹھے تارا نیچے جا بیٹھی۔ پھر نہ تارا بائی رہی نہ وہ رہے نہ میں رہا نہ تو رہا بس سیڑھی ہی سیڑھی رہ گئی۔ بس اتنی سی تو کہانی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

نور بی بی کی بات سن کر میں بالکل ہی کنفیوز ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا میں نے کہا "میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

وہ مسکرائی۔ بولی "لڑکے، تو جا پہلے سیڑھی تو چڑھ۔ سیڑھی چڑھنا سیکھ پھر میرے پاس آنا ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔"

میں نے کہا "بی بی ، میں تو دو ہوں ، ایک نہیں ۔ ز ،لا سیڑھی کیسے چڑھے؟"

بولی "جب چڑھتے ہیں تو سبھی دو دِلے ہوتے ہیں ۔ پھر گر گر کر ایک ہو جاتے ہیں ۔ جب سرکار تارا بائی کی سیڑھیاں چڑھے تھے تو وہ بھی دو تھے ۔ تارا بائی پر اتنے ریجھے کہ ساری جاگیر بیچ کر اُسے کھلا دی ۔ تارا بائی بھی تو کٹڑے کی رانی تھی ۔ بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اس میں بلا کی بے نیازی تھی ۔ سرکار بھی اس بے نیازی کی بھینٹ چڑھ گئے ۔ سب کچھ لٹا کر تارا کے در پر جا بیٹھے ۔ ہر چار ایک دن کے بعد وہ تارا کو دیکھنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ جاتے ۔ چوبارے کی دہلیز پر پہنچتے تو بائی کے حواری انہیں دھکا دے کر گرا دیتے ۔ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں سے گرتے ۔ ہڈیاں ٹوٹتیں زخم آتے ۔ نیل پڑ جاتے کئی کئی دن زخموں کو سہلاتے رہتے بدن میں پھر سے جان آتی تو پھر سیڑھیاں چڑھنے لگتے پھر دھکے کھا کر لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرتے ۔

کٹڑے کے دکاندار بھاگے بھاگے آتے ۔ سرکار کو اٹھاتے ۔ روئی سے زخم دھوتے دوائیاں لگاتے پٹیاں باندھتے ۔

ایک روز جب سرکار سیڑھیاں چڑھ کر چوبارے کی دہلیز پر پہنچے تو اتفاق سے تارا خود دروازے کے پاس کھڑی تھی ۔

تارا نے بڑے ترس سے سرکار کی طرف دیکھا ۔ سرکار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے ۔

تارا بولی "بابا ، کیوں خوامخواہ دھکے کھاتے ہو ۔ ہڈیاں تڑواتے ہو مجھے دیکھنا ہے تو دیکھ لو ۔ یہاں بیٹھ جاؤ جی بھر کر دیکھ لو ۔"

سرکار نے کہا "تو کون ہے ؟" یہ کہہ کر نور بی بی چپ ہوگئی ۔

مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات چپ ہوگئی ہو صدیاں بیت گئیں پھر اس نے سر اٹھایا ۔ بولی "بس اس ایک جملے نے تارا کو ریزہ ریزہ کر دیا ۔"

ہوش آیا تو تارا ان کی انگلی پکڑ کر اس گاؤں میں لے آئی ۔ تارا کے سارے جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے ۔ ہڈیاں سوجی ہوئی تھیں ۔ جگہ جگہ زخم تھے ۔ سرکار دوا لگایا کرتے ۔ زخم دھوتے ۔ پٹیاں باندھتے لیکن جب بھی تارا ان سے بات کرتی تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے پوچھتے "تو کون ہے ؟"

ایمان ۔ آپ ، میں ، آپ

دور افق کے پاس غرب الہند کے حسین جزیروں کے جھرمٹ میں جھول جزیرہ اپنی آتش فشاں خصلت کی وجہ سے جھول رہا تھا ۔

جزیرے کے واحد باسی سمرت اور سانورد اپنے محل منش کنڈ میں بیٹھے تھے ۔

سمرت کا دھیان سانورد پر مرکوز تھا ۔ اس کے دل میں محبت کی لہریں اٹھ رہی تھیں ۔ سمرت جذبے کی وجہ سے بند بند جھنجھنا رہی تھی ۔ سارنگی کے تار چھڑے ہوئے تھے ۔ تاروں کی لرزش سرتیوں سمرتیوں تک جا پہنچی تھی ۔

پھر اتھاہ گہرائیوں میں کسی پُر اسرار دف پر ضرب پڑی گمک ابھر کر سمرت کے سینے میں گونجی ۔ دونوں پڑے دھاگے ترکٹ ناگے بجنے لگے وہ گری جا رہی تھی سانورد کا ہاتھ تھام لیا ملتجی پر امید نگاہیں سانورد کا طواف کرنے لگیں ۔

سانورد کو خبر ہی نہ تھی کہ سمرت جھولن میں ہے ۔ بج رہی ہے ۔

ویسے تو وہ سمرت کے پاس بیٹھا تھا لیکن پتا نہیں تھا کہ دور کہیں آکاش پر بھٹک رہا تھا ۔ سانورد کی بے خبری دیکھ کر سارنگی اونچی سروں میں بین کرنے لگی ۔ جوڑی نے توڑا مار کر سینہ پیٹ لیا ۔

پھر سمرت کے بھیتر شعلہ لپکا کایا پلٹ ہوئی استری ناری بن گئی ۔

سمرت اور سانورد دو ساتھی تھے ۔ ازلی ساتھی ۔

سمرت سارنگی سماں تھی تاریں ہی تاریں ۔ لرزشیں ہی لرزشیں ۔

سانورد مرلی سمان تھا ۔ ہوا ہی ہوا ۔ چھید ہی چھید ۔

سمرت بادِ نسیم تھی ۔

سانورد بگولہ تھا ۔

دونوں خوابوں کے متوالے تھے ۔

سمرت سپنے دیکھتی تھی ۔ حال کے سپنے ۔
سانورد خواب دیکھتا تھا ۔ فردا کے خواب ۔
دونوں جھولن کے متوالے تھے ۔
سمرت پریم جھولا تھی ۔ سانورد زلزلہ ۔

اس کے باوجود دونوں ساتھی تھے ۔ جنم جنم کے ساتھی ۔ ہاتھ میں ہاتھ دیے جزیرے میں گھومتے پھرتے ۔ سمرت کے ہاتھ میں سانورد کا ہاتھ ہوتا ۔ سمرت کی نگاہیں سانورد کا طواف کرتیں ۔ ۔ ۔ سانورد کی نگاہیں آکاش کو گھورتیں ۔

جزیرہ اس قدر حسین تھا کہ اگر وہ اس حُسنِ فراواں کو دیکھ پاتے تو تحیر بڑھ کر انہیں تھام لیتا ۔ پھر نہ جھولن رہتا نہ جزیرہ ۔ لیکن وہ جھول جزیرے کے حسن سے بیگانہ تھے ۔

مانوسیت نے سانورد کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا ۔ اس لیے جزیرہ اس کی نگاہوں میں ایک عام سا منظر تھا ۔ سمرت کی آنکھوں کو پری جھلمل نے دھندلا رکھا تھا ۔ اس لیے جزیرہ حسین تو تھا لیکن صرف اس لیے کہ وہاں سانورد تھا ۔

سانورد کا ہونا سمرت کے لیے سب کچھ تھا ۔ پھر بھی اس کا دل چاہتا کہ سانورد بھی جانے کہ سمرت ہے چاہے کہ سمرت ہو ۔

اس وقت منش کنڈ میں بیٹھے سمرت کے من میں یہ آرزو جاگی کہ سانورد جانے کہ سمرت ہے ۔ چاہے کہ سمرت ہو ۔ لیکن سانورد آکاش کے تاروں میں کھویا ہوا تھا ۔

آکاش کے تارے بڑ بڑ جھول جزیرے کو دیکھ رہے تھے ۔ ایک دوسرے کو آنکھیں مار رہے تھے ۔

جھول جزیرہ ہمیشہ سے ستاروں کی نگاہوں کا مرکز رہا تھا ۔ جزیرہ کم کم ، جھول زیادہ اس لیے وہ اس کے باسیوں کو تکتے رہتے ۔

ویسے تو دھرتی پر سینکڑوں جزیرے تھے ، لیکن جھول جزیرہ سب سے زیادہ دلفریب تھا ۔ ستارے دیکھ کر مسحور ہو جاتے ۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ آکاش کے بجائے جھول کے باسی ہوتے اور ہمیشہ پریم جھولنے میں پڑے جھولتے

رہتے ۔ ۔ ۔ لیکن انہیں یہ بھی پتا تھا کہ وہاں جانا تو ممکن ہے لیکن قیام کرنا ممکن نہیں ۔ چونکہ وہاں رومانی فضاؤں کا تسلّط ہے ۔ چاروں طرف سے ایک لے ابھرتی ہے ۔ ایک رقص بیدار ہوتا ہے ۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ ایک مستی ، ایک دیوانگی ، ایک زلزلہ ۔

پتا نہیں اس جزیرے کی تخلیق میں کیا حکمت کار فرما تھی ۔ دیکھنے میں عام سا ٹاپو تھا ۔ ایک بہت بڑا سبز پیالہ ۔ پیالے کے وسط میں نیلی جھیل جھیل کے عین بیچ میں سنہرے رنگ کی کھوکھلی چٹان آویزاں تھی جیسے کسی مندر کا کلس ہو ۔ اس چٹان کی کھوہ میں منش کنڈ کا محل تھا جس میں سانورو اور سمرت رہتے تھے ۔

سبز پیالے کے اوپر چاروں طرف ناریل کے درخت استادہ تھے ۔ درختوں کے پیچھے زمردی چٹانیں اور ان کے پیچھے نیلا سمندر ۔

رات کے وقت منقّش آسمان ، جھول کو یوں ڈھانپ لیتا جیسے دھانی طشت پر زرنگار سرپوش ڈال دیا گیا ہو ۔ آکاش کے تارے جھول جزیرے کے باسیوں کے دیوانے تھے ۔ وہ انہیں حیرت سے دیکھتے ۔

"وہ دیکھو ، وہ دیکھو" ننھا تارا تالی بجاکر کہتا "وہ اپنے ڈولتے نینوں سے رنگ پچکاری چلا رہی ہے ۔"

"ہاں" دوسرا ہنستا "چلا رہی ہے ، چلا رہی ہے ۔ پر وہ بھیگتا نہیں ۔"

"پتا نہیں کیا بھید ہے" تیسرا گنگناتا ۔

"وہ خود میں نہیں رہتی اور وہ خود میں قید پڑا ہے ۔ پھر بھی وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں" چوتھا ٹمٹماتا ۔

"دیکھو ، دیکھو" ننھا چلاتا "کایا پلٹ ہوگئی ۔ استری ناری بن گئی ۔ اب ارد اور رت باہر نکلیں گے اور پھر ۔ ۔ ۔"

"مت دیکھو ۔ مت دیکھو ۔" بڈھا ستارہ ڈانٹتا "مت دیکھو صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو جانتا ہو ۔ جو نہیں جانتا وہ دیکھتے تو راستے سے بھٹک جاتا ہے ۔ دھیان پوتر نہیں رہتا ۔"

"ہونہہ! کیوں نہ دیکھیں" ننھا چلاتا "جھول کے منظر کو دیکھ کر تو دیوتا خود

اپنا کام کاج بھول جاتے ہیں۔

"وہ دیکھو، وہ، دوسرا چلا کر بولا "اندھی رت کھوہ سے باہر نکل آئی۔"

"ہاں" تیسرے نے کہا "اس کا بدن یوں بل کھا رہا ہے جیسے آبنوسی گھمن گھیری ہو۔"

"سنو سنو۔ ارد چنگھاڑ رہا ہے۔ لو، گونگا ارد میدان میں آپہنچا۔ اب اس میں اچھل جاگے گی، اور وہ سرو سمان ابھرے گا۔ پھر رت پر جھپٹے گا۔"

"اور پھر پریم ناچ" تیھے نے تالی بجائی۔

"اونہوں۔ پریم ناچ نہیں، پتر" بوڑھا ستارہ بولا "یہ ناچ۔"

دیوتاؤں کو پتا چلتا کہ ستارے دیکھ رہے ہیں تو وہ جزیرے پر بادلوں کا پردہ ڈال دیتے۔

جھول جزیرے میں ارد اور رت کا رقص صدیوں سے جاری تھا۔ ارد اور رت سانورد اور سمرت کے زنگی غلام تھے۔

رت سمرت کی باندی تھی۔

ارد سانورد کا بردا تھا۔

سبز پیالے کے اکھاڑے میں گونگا ارد اندھی رت لڑ لڑ کر لہو لہان ہو جاتے اور پھر پریم جھیل کے کنارے پڑے سسکیاں بھرتے۔ دونوں ہی مظلوم تھے۔ ان کی دنیا تیرہ و تار تھی۔ ان کی کائنات الم وایذا سے بھری تھی۔

گونگا ارد جزبات کے کوڑوں سے استادہ ہونے پر مجبور کر دیا جاتا اس کا پایۂ ستون زنجیروں سے جکڑ کر بلویا جاتا تناؤ سے بند بند ٹوٹتا۔ ایسے معلوم دیتا جیسے اہرام مصر کا کوئی حبشی معمار ہو جو کسی فرعون کے کوڑے تلے بلبلا رہا ہو۔ یا جیسے ہمالیہ کی کسی تاریک کھوہ میں ایذا پرست یوگی تن تن کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہو۔

اندھی رت عمیق گہرائیوں میں محصور تھی۔ اس کے پاؤں میں پُر اسرار بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، جس طرح کھلے سمندر میں سطح پر بڑے بڑے ڈھول نما پیپے بظاہر آزاد تیرتے ہیں، لیکن در پردہ زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں۔ کوئی تیرہ تار دھنکی رت کا بند بند دھنکتی تھی۔ کوئی پر اسرار ضرب پڑتی

جس کی لرزش اسے گود میں لے کر جھلاتی ۔ اتنا جھلاتی کہ جھولن عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ۔

پھر کوئی خفیہ آتش زوں سے پھٹتا ۔ لاوے کا دریا بہنے لگتا ، جس کے کنارے ارد اور رت لہولہان پڑے سسکتے رہتے ۔

اور ستارے بٹر بٹر انہیں دیکھتے ۔

ہاں ، ستارے انہیں دیکھ دیکھ کر کبھی نہ اکتاتے تھے ۔ ایک کہتا "رت اور ارد کا پریم ناچ کتنا جاذب ہے ۔" دوسرا بولتا "پریم تو بہانہ ہے ۔ یہ تو یدھ ناچ ہے ۔" تیسرا کہتا "نہ پریم نہ یدھ ، یہ تو مستی کا اظہار ہے ۔" چوتھا غصے میں چلاتا "اندھے ہو ؟ تمہیں مجبوری اور لاچاری مستی نظر آتی ہے ؟ تم نہیں جانتے کہ اس سنسار کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے پریم قدرت کی ایک چال ہے ؟"

کچھ ستاروں کا خیال تھا کہ ارد اور رت سانورد اور سمرت کے ہاتھوں مظلوم ہیں کچھ کہتے ، نہیں سمرت اور سانورد رت اور ارد کے ہاتھوں مظلوم ہیں ۔

پھر بوڑھا ستارہ آہ بھر کر گنگناتا "مت دیکھو مت دیکھو دیوتاؤں کے بھید جانے بغیر تم دیکھ نہیں سکتے ۔ پھر دیکھنے کا فائدہ ؟"

کوئی اس تماشے کا بھید نہیں جانتا تھا ۔ دیوتا خود حیران تھے ۔ انہیں صرف ظاہر کا پتا تھا ۔ بھیتر کی بات صرف پرمیشور جانتے تھے ۔

دیوتاؤں کا کہنا تھا کہ جب پرمیشور نے سانورد اور سمرت کی تخلیق کی تھی توان کے پاؤں میں ارد اور رت کی بیڑیاں نہ تھیں ۔ اس وقت وہ صرف منش اور استری تھے ۔ منش میں ڈنک نہ تھا ۔ استری میں نار نہ تھی ۔ اس وقت وہ مرد اور عورت تھے ۔ مرد میں ارد نہ تھا ۔ عورت میں رت نہ تھی ۔

پرمیشور نے سمرت کے جیو میں پریم جھولنا لگا دیا ، اور سانورد کے جیو میں سوچ اڑان بھر دی سمرت کا دھیان سانورد سے جوڑ دیا اور سانورد کا آکاش کی طرف موڑ دیا ۔

سمرت کی سوچ کے ماتھے پر آج کی بندیا لگا دی ۔ سانورد کی سوچ میں آوارگی بھر دی ۔

سانورد سے کہا "جا ، تو آکاش میں آوارہ رہ ۔" سمرت سے کہا "جا ، تیرا

کام یہ ہے کہ سانورد کو گھسیٹ کر دھرتی پر لا" ۔ ۔ ۔ پھر انہیں جھول جزیرے پر اتار دیا ۔ صدیاں بیت گئیں ۔

پھر ایک دن اتفاق سے دیوتاؤں کا ادھر سے گزر ہوا ۔

کیتو مہاراج نے حیرت سے جھول جزیرے کی طرف دیکھا ۔ بولے "یہ کون سی جگہ ہے ؟"

سندھو مہاراج نے جواب دیا "یہ جھول جزیرہ ہے ۔"

"پرنتو یہاں آنند کا سماں کیوں نہیں ؟ چندر مہاراج نے پوچھا ۔

"ہاں" کیتو گنگنائے "یہاں سے دکھ کی باس آ رہی ہے ۔"

اج مہاراج ہنسے ۔ کہنے لگے "پریم جھولن میں دکھ کیوں ؟"

دیوتاؤں کو دیکھ کر سمرت اور سانورد بھاگے بھاگے آئے "جے ہو مہاراج کی ۔ دھن بھاگ ہمارے ۔"

"تم یہاں آنند سے ہونا ؟" چندر مہاراج نے پوچھا ۔

"پریم جھولن میں بیٹھے ہیں تو آنند ہی ہوگا" سندھو نے کہا ۔

سمرت ہاتھ جوڑ کر بولی "پریم تو ہے ، مہاراج ، پر نتو جھولن نہیں ۔"

"جھول جزیرے میں جھولن نہیں ؟" اج مہاراج نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں ، مہاراج" سمرت بولی "پریم چکر سمان چلتا ہے ، جھولن سمان نہیں ۔ جو چکر سمان چلے وہ کشٹ بن جاوے ہے ۔"

"جھولن سمان کیوں نہیں چلے ہے ؟" کیتو نے پوچھا ۔

"مہاراج" سمرت نے کہا "جھولن سمان تو تبھی چل سکے ہے جب بڑھے ، رکے ، مڑے اور پھر سے بڑھے ، جیسے لہر چلے ہے ، مہاراج ۔"

"سچ کہتی ہے" چندر بولے "جو چکر سمان چلتا ہی جاوے ہے ، وہ کشٹ بن جاوے ہے ۔ جو رک رک کر لہر سمان چلے ، سو آنند ۔"

"مہاراج" سمرت نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اس پریم چکر نے میری سدھ بدھ مار دی ہے اور مہاراج ، جد سدھ بدھ ہی نہ ہو تو آنند کیسا ؟"

"سچ ہے" اج مہاراج بولے "تُو تُو کہنے والے کو جب میں کی سدھ نہ رہے تو پھر جان لو کہ نہ تو رہا نہ میں رہی ۔"

"تُو نہیں بولتا ، ساورد ؟" کیتو نے پوچھا ۔
"یہ کیوں بولے گا ، مہاراج" سمرت بولی "یہ تو میرا تو" ہے ۔ اور اپنے کارن نرا میں ہی میں ہے ۔ اور مہاراج ، جو میں ہی میں ہو اسے پریم سے واسطہ ؟ مجھ پر دیا کرو ، مہاراج" سمرت گھٹنے ٹیک کر کھڑی ہوگئی ۔
اج مہاراج بولے "جا تیری اکشا پوری ہوگئی ۔ پریم چکر پریم جھولن میں بدل جائے گا۔ جب پریم ہلا رے اتنے بڑھ جائیں گے کہ دم گھٹے گا تو بھونچال آجائے گا ، لاوا بہ نکلے گا اور تو شانت ہو جائے گی ۔"
"دھن ہو ، مہاراج ، دھن ہو" سمرت پھول سمان کھل گئی ۔
اج مہاراج نے تالی بجائی ۔ ارد اور رت ہاتھ باندھے آکھڑے ہوئے ۔
یہ تمہارے بردے ہیں ۔
سمرت ، رت تیری باندی ہے ۔
سانورو ، ارد تیرا بردا ہے ۔
جب پریم کشٹ بن جائے تو ارد اور رت آجایا کریں گے ۔ یہ پریم یدھ ناچیں گے ۔ پھر کشٹ آنند میں بدل جائے گا ۔"
"دھن ہو ، مہاراج ، دھن ہو" سمرت خوشی سے چلائی ۔
"پر ایک بات کا دھیان رکھنا" اج مہاراج بولے "ان بردوں کو نیچ نہ جاننا ۔ ان کا اپمان نہ کرنا ۔ یہ سچ کے پجاری ہیں ۔ ان کی شان بڑی اونچی ہے ۔ ان میں پوترتا کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ انہیں دیوتا سمان جاننا آرتی چڑھانا ۔ جے بلانا۔انہیں لوبھ کے لیے برتو گے ، ان کا تماشا بناؤ گے تو ان کا اپمان ہو گا ۔ ۔ ایسا ہوا تو ارد میں اچھل نہ رہے گی ۔ اس کا سر نیچا ہوگیا تو پریم جھولن ٹوٹ جائے گا اور لوبھ چکر چل پڑے گا ۔ جب ایسا ہوا تو تو جان لینا وہ دھرتی کے آخری دن ہوں گے ۔
نیو یارک کی نیوڈ لیوڈ کلب میں ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ تماشائی آخری منظر دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے ۔ آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں ۔ نسیں تن تن کر بجنے لگی تھیں ۔
تماشائیوں کے جسم لٹے پٹے تھے ۔ جنس کے عفریت کے روندے ہوئے،

لتاڑے ہوئے ۔ جذبۂ محبت شہوت کے گاڑھے ملبے کی دلدل میں بدل چکا تھا ۔ خواہش جسم سے چوچو کر ذہن میں آجمع ہوئی تھی ۔ ذہن بھڑوں کے چھتے کی طرح بھن بھن کر رہے تھے ۔

آخری سین ارد اور رت کا ناچ تھا ۔

دفعتاً پردہ اٹھا ۔

سٹیج پر اندھی رت انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہی تھی ۔ اس کے بدن کی تاریں جھن جھن کر رہی تھیں ۔

سرتیاں بج رہی تھیں ۔

پھر آرکسٹرا سے دف کی آواز بھری ، آدم خور حبشیوں جیسی ۔ رت کے سینے کے دونوں پُڑے دھاگے ترکٹ ناگے بجنے لگے ۔ پھر اس کے جسم سے جنس کا خوف ناک بلاوا گونجا ۔ ۔ ۔ ہال میں اک زلزلہ آگیا ۔ سٹیج کے ونگ سے گونگے ارد کی چنگھاڑ سنائی دی ، زخمی چنگھاڑ جیسے رنگ میں داخل ہونے سے ہچکچانے والا سرکس کا شیر دھاڑتا ہے ۔ پھر کوڑوں کی آوازیں سنائی دیں ۔ دو چار ، سات ، اور آخر گونگا ارد چیختا چلاتا سٹیج پر آکھڑا ہوا ۔ اس کے آبنوسی جسم پر کوڑوں کی شنگرفی دھاریں پڑی ہوئی تھیں ، جن سے خون رس رہا تھا ۔ ارد نے رت کی طرف دیکھا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا ۔

تڑاخ! رِنگ سے ایک ہنٹر لہرایا ۔ اچھل اچھل رنگ ماسٹر کی زیر لبی گونجی ۔

ارد درد سے بلبلا کر اٹھا ، ایک جست بھری لیکن اس میں اچھل پیدا نہ ہوسکی اور وہ منہ کے بل گر گیا ۔

تماشائیوں کی غیظ وغضب بھری آواز بلند ہوئی ۔ وہ سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے ۔

"مینجر ، مینجر" رنگ ماسٹر مینجر کی طرف بھاگا "سر ، آج پھر ارد میں اچھل پیدا نہیں ہوسکی ۔ وہ سٹیج پر منہ کے بل گرا پڑا ہے ۔ شو رک گیا ہے ۔ تماشائی توڑ پھوڑ پر آمادہ ہیں ۔"

مینجر اٹھ کھڑا ہوا ۔ چلا کر بولا ، پردہ گرا دو ۔ انتظار فرمائیے کا کیپشن لگا دو تم نے شو سے پہلے پِری کاشن لیے تھے ؟" اس نے پوچھا ۔

"ہم نے کوڑے لگائے تھے، سر بجلی کے کوڑے" رنگ ماسٹر نے جواب دیا۔

"اونہوں" مینجر نے جواب دیا" اب کوڑے کام نہیں آئیں گے۔ ڈاکٹر کہاں ہے؟ اسے بلاؤ بولو، ڈبل انجکشن دے دے۔"

سٹیج پر پہنچ کر مینجر نے زخمی ارد کو جھنجھوڑا "اپ، مین، اپ" وہ بولا شو مسٹ گو آن۔"

……○……

تھرڈ مین

ہاسٹل چھوڑ کر میں اپنے کزن کے گھر اونچے محلے میں مقیم ہوا تو پہلے دن ہی محلے کا رنگ دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ وہاں تو بڑا بڑا مال پڑا تھا ۔ میرا خیال تھا کہ اس پرانے آثار قدیمہ میں میلی کچیلی ، نمانہ‌س پڑھنے والی ، آلو چھیلنے والی لڑکیاں ہوں گی ۔ پر وہاں تو گویا انڈر گراؤنڈ انٹر کان کھلا تھا ۔ وہاں تو ایک سے ایک پٹاخا تھی ۔ سب بنی سجی ہوئی ۔ تیز ۔ بے باک ۔

اس پر میرا کزن بولا "ابھی تو نے زردی کو نہیں دیکھا ۔ دیکھے گا تو مزاج ٹھکانے آجائیں گے ۔"

"وہ کیا چیز ہے ، زردی ؟"

"بس ایک چیز ہے ۔"

"کھانے کی ، پینے کی یا سونگھنے کی ؟"

"کھانے کی" وہ ہنسا "محلے کے لڑکے اسے زردہ بھی کہتے ہیں ۔ پر وہ میٹھی نہیں ۔ مرچیلی ہے ۔ سوں سوں کرو گے ۔"

جب میں نے زردی کو دیکھا تو چیخ کر بولا "ارے ! یہ تو آسیہ ہے ۔ میری ہم جماعت ۔"

"سچ ؟ تم اسے جانتے ہو ؟

"جانتا ہوں ۔ ارے بھئی ، ہمارا تو پرانا یارانہ ہے ۔"

کالج میں پہلے دن جب میں نے آسیہ کو دیکھا تھا تو میرا جی چاہا تھا کہ اس کا منہ چڑا کر آگے نکل جاؤں ۔ چھوٹا قد ۔ چوہیا سا منہ ۔ تکونی ناک اور ہلدی سا رنگ ۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پر پُرزے نکالے ۔ کتر کتر باتوں کی قینچی چلائی ۔ فقرے بازی کی تلوار لہرائی اور بالآخر کالج کے نعرہ بازوں کو میدان میں

کھڑے ہو کر للکارا ۔ اس پر وہ چلائے "ارے ! یہ تو اندر سے بھاماجھا نکلی ۔"
"اور تم" وہ بولی "تم پھوپھی تھو نکلے ۔"

اسی روز سے آسیہ کی دھاک بندھ گئی اور لڑکے اس کی عزت کرنے لگے ۔

اونچے محلے میں رنگ رنگ کی لڑکی تھی ۔ پر تھیں ساری ہی دورخی ۔ بڑوں کے سامنے "جی جی، ہاں جی ۔" لڑکوں کے سامنے "دیکھ ! ذرا ہٹ کے گریو ۔"

چند ایک خالی ہاں جی ، ہاں جی بھی تھیں ۔ نمازی نگاہیں ۔ رسمی اسلام سے بھیگے ہوئے پر ۔ ہائیں ! ایسا ہوتا ہے ! سا انداز ۔ سیدھی لکیریں سپاٹ چلتی پھرتی ڈیڈ باڈیز ۔ بیشتر دورخی تھیں ۔ گھر کچھ ، باہر کچھ ۔ باہر کھلے بال ۔ "سووہاٹ" نگاہیں ۔ ابھرا سینہ ۔ چلتی آنکھیں ۔ محلے میں داخل ہوتے ہی بکال بکل ۔ نیچی نگاہیں ۔ "ہمیں کیا خبر" سا انداز ۔

باہر بھی تو دورخ تھے ۔ دورنگ ۔ اکیلے میں "ہم نہیں جانتے" کا بہروپ ۔ بناوٹی وقار دکھاوے کا "ہٹاؤ جی ہمیں کیا لینا دینا ۔" چار ایک اکٹھی ہوتیں تو قہقہے ، اشارے۔راہ چلتے کو چھیڑتیں "کتنا بنتا ہے یہ ۔"

"اپنے کو شکیل سمجھتا ہے کہ وحید مراد ۔"

"رس گلا ہے ، پر شیرا کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے ۔"

"ہٹاؤ ۔ بے چارے کے لیے چلنا مشکل ہو رہا ہے ۔"

محلے میں زردی کا رنگ ہی اور تھا ۔ کالج میں تو صرف تیزی تھی ، یہاں دور بار بھی تھی سامنے بیٹھ کر بات کرنا بھی جانتی تھی اور محلے میں کھڑکی بازی اور منڈیر بازی کا فن بھی جانتی تھی ۔ محلے کے لڑکوں کو انگلیوں پر نچاتی تھی ۔ جو بھی اس کی کھڑکی کی زد میں آتا ، اسے ایک جھوٹا ضرور دیتی ۔ جبھی تو لڑکوں نے کہا "ارے یہ زردی تو نہیں ، یہ تو زردہ ہے زردہ ۔"

زردی کی شوخی کی وجہ اس کی امی تھی ۔ ایسی خود سر تھی وہ کہ اس نے زردی کے ابا کو ہاں جی ہاں بنا رکھا تھا ۔ خوش مزاج تھی ، بانکی تھی ، کھلاڑی تھی ۔ بس چلتا تو اب بھی قینچی سی چل جاتی اسی لیے بیٹی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی اس نے ۔

کالج میں زردی سے میری فقرے بازی چلتی تھی ۔ محلے میں آنکھ مٹکا میرا کیا، سب کا چلتا تھا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے محبت تھی ۔ محبت کا دور ختم ہوگیا ۔ اب ہم کسی کے لیے آہیں بھرنے کے لیے تیار نہیں ۔ نہ ہی ہم سے تارے گنے جاتے ہیں ۔ ہمارا کام تو چھیڑ چھاڑ ہے ۔ اس سے دل لگی کی، اس کا مذاق اڑایا ۔ اس کو چھیڑا، اس سے فقرے بازی کی ۔ محبت وحبت نہیں ہوتی ۔ ہاں ، کوئی پسند آجاتی ہے ، کوئی نہیں آتی جو پسند آجائے اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کو جی چاہتا آج کل لڑکی کو اکیلے میں لے جانے کا شوق کم کم ہوتا جا رہا ہے ۔ پرانے زمانے میں تو صرف یہی ایک بات سوجھتی تھی ۔ سوجھتی کیا ، سر کو چڑھ جاتی تھی ، جس طرح وسکی چڑھ جاتی ہے ۔

ویسے ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو اکیلے میں لے جانے کی آرزو پیدا کرتی ہیں ، لیکن ایسی لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں ۔ ایسی لڑکیاں محلے میں بھی تھیں ۔ جو خالی اکیلے میں لے جانے والی تھیں ۔ لڑکے انہیں لے بھی جاتے تھے ۔ وہ چلی بھی جاتی تھیں ۔ پر دل میں ان کی عزت پیدا نہیں ہوتی تھی ۔ نہ ہی تاثر پیدا ہوتا تھا ۔ بات وہیں اکیلے میں شروع ہوتی ، اور وہیں ختم ہو جاتی کیری ہوم قسم کا تاثر پیدا نہیں ہوتا ۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ایسی لڑکیاں باقی باتوں میں نون غنا ہی ہوتی ہیں ۔

پھر وہ "ڈیڈی لانگ لگز" بھی تو تھا ، جس کی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا پڑا ، جسے تم کہانی سمجھ کر پڑھ رہے ہو۔ وہ میرا کزن قمر تھا، جسے میں مذاق سے ڈیڈی لانگ لگز کہا کرتا تھا ۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ پندرہ سال بڑا تھا ۔ اور صرف عمر میں ہی بڑا نہیں تھا ، اندر سے سکہ بند بڑا تھا ۔ آج کل یہ فیشن چل رہا ہے ناکہ بڑے مور کے پر لگا لیتے ہیں ، اور کہتے ہیں ، ہم تو نوجوان ہیں ۔ قمر نے بھی مور کے پر لگا رکھے تھے اور برتاؤ میں نوجوان دکھتا تھا ۔

قمر تھا بڑے مزے کا آدمی ۔ نہ عقل چھانٹتا تھا نہ فلسفہ بھگارتا تھا ۔ اور نصیحت تو اس نے کبھی کی ہی نہ تھی ۔ کرتا بھی تو ایسے کہ وہ فضیحت معلوم دیتی۔ میں چلا کر بولتا تو کان پر ہاتھ رکھ کر کہتا "یار ، ذرا اونچا بولو میں سن تو سکوں ۔" ہنسنے والی بات پر قہقہہ نہ لگاتا تو وہ کہتا "یار ہنسنا نہیں جانتے تو رو ہی دو"

روز شام کو جب میں لوٹتا تو کہتا "ہاں بھئی رپٹ لکھواؤ ۔ کس کس لڑکی کا منہ چڑایا ؟ کس کس سے بے عزتی کروائی ؟ کس کس کے گلے میں بانہیں ڈالیں ؟ کس کس پر فقرے کسے ؟ کس کس سے وسپرنگ کی ؟ اور کیا کیا کیا ؟ سب تفصیلات سنسر کے بغیر ۔

چھٹی کے دن وہ مجھے زبردستی کوٹھے پر لے جاتا ۔ "بھئی ، بڑے بد اخلاق ہو ۔ تمہاری خاطر وہ سب اپنے اپنے کوٹھے پر آئی ہوئی ہیں ، اور تم نیچے بیٹھے ہو ۔ واہ !" وہ مجھے کوٹھے پر نمایاں مقام پر بٹھا دیتا اور خود اوٹ میں بیٹھ رہتا ۔ پھر دفعتاً گنگناتا : با ادب ، باملاحظہ ، ہوشیار ! ملکہ معظمہ تشریف لے آئیں ۔ کورنش بجا لاؤ ۔"

وہ وہاں اوٹ میں بیٹھا ، محلے کے کوٹھوں پر رننگ کمنٹری کرتا رہتا اور ساتھ ہی مجھے داؤ بتاتا رہتا "آگئی ، سالی جانے نہ پائے شاباش ! شاباش ! لگاؤ چھکا ۔"

مجھے کوٹھے بازی نہیں آتی میں تو سامنے بیٹھ کر بات کرنے کا قائل ہوں ۔ سچی بات یہ ہے کہ میں لڑکی کے آگے پیچھے نہیں پھر سکتا ۔ مجھے تو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے جو میرے آگے پیچھے پھرے ، مجھے منائے جیسے دیوتا کو مناتے ہیں ۔ میرے بغیر اس کا دم نکلے میں کسی کے پیچھے پھرنا پسند نہیں کرتا ۔ پھروں بھی تو خود کو دھوکا دیتا رہتا ہوں کہ پیچھے پیچھے میں نہیں پھر رہا ، وہ پھر رہی ہے ۔

لڑکی کو بھرمانے ، پھنسانے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے ۔ کوئی پیچھے پیچھے پھر کر بھرماتا ہے ۔ کوئی کلیڈ آئی چمکا کر پھنساتا ہے ۔ کوئی مجنوں سی آنکھیں بنا کر تکے جاتا ہے ۔ کوئی محبت کے ڈائیلاگ بولتا ہے ۔ کوئی میری طرح بے نیازی کا پوز بنا کر توجہ طلب کرتا ہے ۔

جبھی تو میں نے زردی کو کبھی زردہ کہہ کر نہیں بلایا تھا ۔ الٹا جب بھی کینٹین میں ہم اکٹھے بیٹھتے تو میں موقع کی تاک میں رہتا ۔ جب وہ میری طرف دیکھتی تو میں کہتا "اونہوں ! ندیدی یوں نہ دیکھ میری طرف ، جیسے میں حلوے کی پلیٹ ہوں ۔" اس پر وہ قہقہہ مار کر کہتی "سچی ، مجھے تو ابلے چاولوں کا

تھال نظر آتے ہو ۔"

زردی کو کپڑے کا بڑا شوق تھا ۔ رنگ کا بڑا سنس تھا ۔ یوں رنگ سے رنگ جوڑتی کہ مزا آجاتا ۔ اور پھر اس کے لباس میں ایک نا ایک چیز فیشن سے ہٹ کر ہوتی ۔ اور وہ چیزیوں توجہ پکڑتی جیسے چیونٹی ہو ۔ وہ چیونٹی جو کاغذوں پر لگاتے ہیں ۔

اس کے ڈریس کو دیکھ کر کوئی نا کوئی ضرور بول اٹھتا "واہ ، بھئی واہ !" اس پر زردی بڑی بے نیازی سے کہتی "مفت میں واہ وا نہ کر ، بلاک ہیڈ ۔ یہ لباس تو لنڈے کا مال ہے ۔" یا کہتی "اونہوں ! اسے چھونا نہیں ۔ یہ میکسی تو کسی مری ہوئی میم کی ہے ۔" وہ بڑے فخر سے کہا کرتی تھی "بھئی ، ہم تو لنڈا مارکہ ہیں ۔"

یہ سچ تھا کہ اس کے بیشتر لباس لنڈے کے ہوتے تھے ۔ خریدتی لنڈے سے ہی تھی لیکن انہیں اتنا بنا سجا کر پہنتی کہ لباس منفرد ہو جاتا ۔ ایک بار میں نے اس پر فقرہ کسا میں نے کہا " ہیلو ، لنڈا مارکہ ۔" جواب میں بولی "ہائی لنڈا ہیڈ کیسا جوڑا رہے گا ؟ میرا لباس لنڈے کا ، تیرا ذہن لنڈے کا ۔"

بڑی تیز تھی وہ ۔ اور پھر مزے کی بات یہ تھی کہ وہ کسی کو خصوصی توجہ نہیں دیتی تھی ۔ یا شاید ہر کسی کو خصوصی توجہ دیتی تھی ۔ ابھی تم فیڈ ان ہوئے ، ابھی فیڈ آؤٹ ۔ اور کوئی اور فیڈ ان ۔ یہ فیڈ ان فیڈ آؤٹ کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا ۔ ایک جگہ پر توجہ نہیں ٹکتی تھی اس کی ۔ سالی ہر جائی تھی ۔ عوامی تھی نہ حرامی تھی ۔

کچھ بھی تھی ، مجھے پسند تھی ۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر نوک جھونک کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا ۔ میں اکثر تاک میں کھڑا رہتا کہ آئے تو اس کے ساتھ گپ لگاؤں ۔ آتی تو اوپر اوپر سے یوں ظاہر کرتا جیسے اس نے مجھے تلاش کرکے پالیا ہو ۔ نہ آتی تو میرے اندر چرخی چلتی رہتی کہ کب آئے گی ۔ کب آئے گی ۔ آجاتی تو چھوٹتے ہی کتر کتر کرنے لگتی ۔ پھر چلاتا "لو چل پڑی چکی ۔" آسیہ کا لفظی مطلب چکی ہے نا ۔ اور وہ ہنس کر کہتی "کیوں نہ چلے ؟ تمہیں جو پسینے کا شوق ہے ۔ ابلائج کرنا ہی پڑتا ہے ۔"

صرف لڑکوں کے ساتھ ہی نہیں ، وہ پروفیسروں کو بھی نہیں بخشتی تھی ۔ کلاس میں بات کرنے سے باز نہ آتی ۔ اکنامکس پر اکثر فقرے کستی ۔ پروفیسر پوچھتا "سمجھ گئی ؟" تو وہ کہتی "ہاں ، اب سمجھی کہ اکنامکس وہ سائنس ہے جس کے اصول روز بدلتے ہیں ۔ سوال وہی رہتے ہیں ۔ جواب بدل جاتے ہیں ۔"

میں ہاسٹل چھوڑ کر کبھی نہ جاتا پر قمر نے مجھے زچ کر دیا ۔ پہلے تو منہ زبانی کہتا رہا ، پھر ایک دن وہن لے کر آگیا اور مجھ سے کہے بغیر میرا سامان اٹھا اٹھا کر وہن میں رکھنے لگا ۔ میں نے پروٹسٹ کیا تو بولا "یہ رسی دیکھتے ہو ؟ اگر تم بولے تو مشکیں کس کر لے جاؤں گا ۔" پھر منتوں پر آگیا ۔ کہنے لگا "یار میں اتنے بڑے گھر میں اکیلا رہتا ہوں ۔ بات کرنے کو زبان ترس جاتی ہے ۔ چند مہینوں کے لیے میرے پاس آرہو گے تو تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا ۔ میری بات بن جائے گی ۔"

قمر کی شادی تو دس سال پہلے ہوچکی تھی لیکن کوئی بچہ نہ ہوا تھا بیوی مسلسل بیمار رہتی تھی ، اور اسی بیماری کی وجہ سے ایک سال پہلے فوت ہوچکی تھی ۔ اب گھر میں ایک وہ خود رہتا تھا اور ایک اس کا نوکر ، تنہا ۔ اس کا گھر بھی تو ہوسٹل کی طرح چھڑیوں کا ڈیرا تھا ۔

قمر ویسے تو بزنس مین تھا ، لیکن طبیعت میں ذرا بھی بزنس کا رنگ نہ تھا ۔ نہ گنتی ، نہ حساب کتاب ، نہ پیسہ پیسہ ۔ اس کے باوجود سالا پیسے والا تھا ۔ سو پچاس کا خرچہ تو بے دریغ کر دیتا تھا ۔ رنگیں طبیعت تھا ۔ ہر لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا ۔ زردی میں تو خاص دلچسپی لیا کرتا ۔ لیکن اس کی دلچسپی عجیب رنگ کی تھی ۔ خود سامنے نہیں ہوتا تھا ۔ کسی لڑکی کے سامنے نہیں آتا تھا ۔ خود چھپ چھپ کر دیکھتا ، مجھے سامنے کھڑا کر دیتا ، اور پھر اکساتا "دیکھ ، دیکھ ، اندھے" وہ چلاتا "وہ سامنے ۔ آج تو بلیک اور یلو کا کمبینیشن مارا ہے ۔ بل بل بل بل ۔ ارے احمق ! کر اشارہ گرمادے اوہو! کھو دیا ۔ سٹوپڈ ۔"

"ارے یار تُو تو بالکل اناڑی ہے" وہ مجھ سے کہتا "یہ لڑکیاں خالی اشاروں سے قابو میں نہیں آتیں ۔ کبھی انٹر کان لے جا ، کبھی فلم دکھا ، کبھی پک نک ۔ خرچے کا فکر نہ کر ۔ بس مجھے دن اور وقت بتا دیا کر ۔ ریزرویشن میں کرا دیا

کروں گا ۔" میں نے کئی بار کہا تھا "چل ، تینوں اکٹھے چلتے ہیں ۔" "نہ نہ" وہ چلاتا "بھئی اپنا اپنا کام ہے ۔ تو اپنا کام کر ، میں اپنا۔ تو فلم دیکھ میں انتظام کروں گا ۔ جس کا کام اسی کو ساجے ۔" ایک دن میں نے بہت ضد کی تو وہ بولا "اچھا ، چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں ۔ مگر تمہارے ساتھ نہیں بیٹھوں گا ۔ تم اگلی سیٹوں پر بیٹھنا ، میں پچھلی سیٹوں پر ۔ لیکن اسے پتا نہ چلے کہ میں ساتھ ہوں ۔"

ایک روز کہنے لگا "یار اسے یہاں لے آؤ ۔"

"یہاں کہاں ؟"

"گھر میں اور کہاں ۔"

"تم بھی ہوگے ؟" میں نے پوچھا ۔

"ارے ، نہیں ، سٹوپڈ تیسرے آدمی کا کیا کام ۔"

"یار ، تمہیں پتا بھی ہے ، میری تو اس کے ساتھ خالی گپ شپ چلتی ہے ۔"

"تو وہی چلا دینا ۔"

"نانسنس ! اکیلے میں گپ شپ نہیں چلتی ۔"

"کچھ تو چلے گا نا" وہ بولا "بالکل ہی بودم ہو، یار"

واقعی میں خود کو بودم محسوس کر رہا تھا۔ بات جو پلے نہیں پڑ رہی تھی ۔ یہ کیسی دلچسپی تھی کہ خود اوٹ میں رہنا اور دوسرے کو شہ دینا ۔ آگے کرنا ۔ گرمانا ۔

انہی مشاغل میں کئی مہینے گزر گئے ۔ پھر ہمارے امتحان آگئے ۔ امتحانوں کے دوران میں نے ایک حیران کن بات سنی مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا ۔

اس روز ہمارا محلے دار علیم اور میں کینٹین میں زروی کے ساتھ چائے پی رہے تھے ۔ فائنل امتحان کے دن بھی عجیب ہوتے ہیں ۔ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کا احساس طاری ہو جاتا ہے سبھی جذباتی ہو جاتے ہیں ۔

پر اوپر سے ظاہر کرتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔

میں نے بر سبیل تذکرہ پوچھا "سنا ، آسیہ ، امتحان کے بعد کیا پروگرام ہے تیرا ؟"

علیم جھٹ بولا "وہی جو نیک بیبیوں کا ہوتا ہے ۔"

"کیا ؟" میں پوچھا ۔

"ہانڈی روٹی کرے گی ، بیڈ ڈیوٹی دے گی اور بچے پالے گی ۔"

زردی کے منہ پر سرخی کی رو دوڑ گئی ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ بولی "وہ تو ہے ۔ پیڑھی پر بیٹھوں گی، چوڑے والی بانہہ چھنکاؤں گی، اور حکم چلاؤں گی ۔ یہ کیوں جلتا ہے ؟" اس نے علیم کی طرف اشارہ کیا اور ہنس کر چلی گئی ۔

اس کے جانے کے بعد علیم بولا "اس کا بیاہ ہو رہا ہے ۔"

"سچ ؟"

"تجھے نہیں خبر ؟"

"نہیں تو ۔"

"سالے ، بنتا ہے ۔ تیرے کزن قمر سے بیاہ ہو رہا ہے ، اور تجھے پتا نہیں ۔"

میرا فلوس اڑ گیا ۔ اسی رات میں نے ڈیڈی لانگ لگز کو گلے سے پکڑ لیا ۔

میں نے کہا "ابے ! ہم سے چار سو بیسیاں کرتا ہے ۔"

"کیا ؟" اس نے پوچھا ۔

"زردی سے بیاہ کر رہا ہے ، تو ۔"

"پتا نہیں" وہ بولا ۔

"پتا نہیں کے بچے ، سارے محلے میں خبر اڑی ہوئی ہے ۔"

"شاید ہو جائے ۔ تجھے کیوں درد اٹھنے لگا ؟"

"اس عمر میں کالج کی لونڈیا سے بیاہ کرے گا ؟"

"میں نہیں کروں گا ، کالج کی لونڈیا سے ۔"

"تو پھر ؟"

"وہ کرے گی ، مجھ سے ۔"

میں نے قہقہہ لگایا ۔
پھر وہ دفعتاً سنجیدہ ہو گیا ۔ بولا "یار اگر تم خود انٹرسٹڈ ہو تو میں ابڈیکیٹ کر دوں ۔"
"نہیں ، نہیں ۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ۔"
"تو پھر تو چیختا کیوں ہے ؟"
"کوئی جوڑ بھی ہو ۔" میں چلایا ۔
"ارے ، تجھے بات کا تو پتا نہیں ۔ پیغام میں نے نہیں بھیجا ، ادھر سے آیا ہے جھولی میں گرا انگور کون چھوڑتا ہے ۔"
"جھوٹ بکتا ہے ۔"
"آنسٹ ٹروتھ" وہ سنجیدگی سے بولا ۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"
"ہونا چاہیے تو نہیں تھا ، پر ہو گیا ہے ۔"
"میں نہیں مانتا ۔"
پتا نہیں مجھے غصہ کیوں چڑھا ہوا تھا ۔ میں محسوس کر رہا تھا ، جیسے اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہو زردی کو فریب دیا ہو ۔
اسی رات جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو قمر نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی کہنے لگا "ماسی مہراں کو جانتے ہو ؟"
"کون ماسی مہراں ؟"
"محلے کی ہے ۔ دلالہ ہے ۔ رشتے کراتی ہے ۔ میں نے ماسی مہراں کو کہہ رکھا تھا کہ کوئی رشتہ تلاش کر دے ۔ میں نے لڑکی کے لیے نہیں کہا تھا ۔ میں نے تو کہا تھا کسی عمر کی ہو ، کسی گھرانے کی ہو ، چاہے بیوہ ہو ۔ جہیز نہیں لوں گا ۔ لیکن ایک شرط ہے ۔ خالی آلو چھیلنے والی نہ ہو ۔ جان دار ہو ، تیکھی ہو ، بات کرنا جانتی ہو ، شکل کی اچھی ہو ۔ مجھے کیا پتا تھا کہ جواب میں زردی کا رشتہ آجائے گا ۔"
"تمہیں تو زردی کی ماں سے بیاہ کرنا چاہیے ، زردی سے نہیں ۔"
"منظور ، بالکل منظور" وہ چلایا "وہ تو زردی سے بھی بہتر ہے ۔ پر اس

کے خاوند کو کون اغوا کرے گا ؟"

"لیکن زردی کیسے راضی ہوگئی ؟"

"یہ تم اس سے پوچھو" وہ بولا "بلکہ مجھے بھی بتانا کہ وہ کیا کہتی ہے ۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" میں نے کہا ۔

"سیدھی بات ہے" وہ بولا "اس کی ماں بڑی سیانی ہے ۔ اس نے دیکھا کہ بیٹی کو کھاتا پیتا گھر ملے گا اور وہ بھی مفت میں ۔ جہیز کا ٹنٹا نہیں ۔ مہر جتنا مرضی لکھوائے گھر میں نہ ساس نہ سسر ۔ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے ۔"

"خبیث سرمایہ دار" میں نے کہا "پیسے کے زور پر لڑکیوں کو پھنساتا ہے تو ؟"

"میں کہاں پھنساتا ہوں ۔ آج کل کی لڑکی خود سنہری کنڈی پر لگتی ہے ۔ یہ کالج والیاں جو ہیں ، سب بنگلا اور کار کے خواب دیکھتی ہیں ۔ تمہاری نسبت مجھ ایسے رشتے کی امید رچائے بیٹھی ہیں ، مسٹر سوشلسٹ ۔ زیور ہو ، کپڑا ہو ، سوشل لائف ہو جس میں وہ بیر بہوٹیاں بن کر بیٹھ رہیں ۔"

امتحان ختم ہوا تو میں گھر جانے کی تیاری کرنے لگا ۔ اس پر وہ غصے سے بھوت بن گیا ۔ بولا "گھر جا کے کیا کرے گا تو ؟ مکھیاں مارے گا نا ۔ وہ تو یہاں بھی مار سکتا ہے ۔ نوکری ووکری نہیں ملے گی ۔ وہاں جہلم جاکر کیا کرے گا ؟ وانٹڈ کالم پڑھے گا نا عرضیاں لکھے گا ۔ یہاں بیٹھ کر بھی یہ کام ہو سکتا ہے ۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں جا رہا ہوں ۔"

"وہاں تیرے منہ کو پھپھوندی لگ جائے گی ، کوئی بات کرنے کے لیے بھی نہیں ملے گی ۔"

"یہاں ملے گی کیا ؟"

"بالکل ملے گی ۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ جو آ رہی ہے اس گھر میں ۔ اس سے سارا دن باتیں کیا کرنا ؟"

"بک نہیں" میں نے غصے سے کہا ۔

"غصے کیوں ہوتا ہے ؟" وہ بولا "چل ، ہم دونوں اسے شیئر کر لیں گے ۔"

"حرامی !" میں نے کتاب اٹھا کر اس کے منھ پر دے ماری ۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک آخری کوشش کی ۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "دیکھ ، قمر ۔ وہ اس قابل نہیں کہ تو اسے بیوی بنا کر گھر لائے ۔ اس کا تو بیسیوں سے آنکھ مٹکا رہا ۔ پتا نہیں کس کس کے ساتھ اکیلے میں گئی ہو ۔"

میں جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے ، لیکن اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس رشتے کو توڑ دوں ۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا ۔ اس وقت جیسے یہ میری زندگی کا واحد مقصد تھا ۔ میں نے زردی کے متعلق سارے سکینڈل بڑھا چڑھا کر اسے سنائے ۔ دو ایک چشم دید واقعات جو میں نے خود گھڑے تھے ، اسے سنائے ۔

وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا ۔ یوں جیسے لذت لے رہا ہو ۔ جب میں سب کچھ سنا چکا تو بولا "وہ بات بھی بتاؤ نا ۔"

"کون سی بات ؟" میں نے پوچھا ۔

"وہ بات جب تم خود اسے اکیلے میں لے گئے تھے ۔"

غصے میں مَیں نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور سوٹ کیس اٹھا کر چل پڑا

"خدا حافظ !"

"جلد واپس آنا" وہ بولا ۔

"نہیں آؤں گا ۔ کبھی نہیں" میں چلایا ۔

"تیرا باپ بھی آئے گا" وہ ہنسنے لگا ۔

جہلم پہنچنے کے آٹھ دن بعد ہمیں قمر کی شادی کا دعوت نامہ ملا ۔ امی نے اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ شادی پر چلوں ، لیکن میں نے صاف انکار کر دیا ۔

چھ مہینے بعد مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا ۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ قمر کے گھر نہیں جاؤں گا ۔ جب میں مال روڈ پر رکشے کا انتظار کر رہا تھا تو ایک باوردی ڈرائیور میرے پاس آیا ، سلام کیا ، بولا "بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں ۔"

جب ہم دونوں موٹر کے قریب گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ زردی بیٹھی ہے !

وہ مجھے ایک قریبی ہوٹل میں لے گئی ۔ چائے کا آرڈر دے کر بولی "یہاں

آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے ۔"

"سنا ، شادی کیسی رہی ؟ وہ سالا ڈیڈی لانگ لگز تجھے تنگ تو نہیں کرتا ؟"

"ہئے !" وہ بولی "وہ تو خالص سونا ہے ۔ اتنا اکسلینٹ ہے ۔ اتنا ٹنڈر ہے ، اتنا جنرس ہے ۔ میں کیا بتاؤں تجھے ۔"

"تجھ سے محبت بھی کرتا ہے یا نہیں ؟"

"اتنی محبت ، اتنی محبت ۔ توبہ ہے ۔ محبت سے پاگل کر دیا ہے مجھے اور پھر اتنی آزادی دے رکھی ہے مجھے ۔ نہ روک ، نہ ٹوک نہ پوچھ نہ کچھ الٹا ہر وقت مجھے سپائل کرتا رہتا ہے ۔ یہ کھاؤ ، یہ پہنو ۔ یوں سنورو ۔ دوستوں سے ملو ۔ انہیں گھر بلاؤ ۔ فلم دکھاؤ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرو توبہ !" وہ ہنسی "اس نے تو مجھے بٹر فلائی بنا رکھا ہے ۔ زندگی کے متعلق میں نے جتنے پروگرام بنا رکھے تھے نا ، سب ختم ہو گئے" وہ قہقہہ مار کر ہنسی ۔

"کبھی جھگڑا بھی ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"اکثر" وہ ہنسی ۔

"کس بات پر ؟"

"کہتا ہے ، بدر کو بلاؤ ۔"

"مجھے ؟"

"ہاں ۔ کہتا ہے ، جہلم جاکر اسے لے آؤ ، زبردستی ۔" وہ پھر ہنسنے لگی "بس کہتا ہے گھر نہ بیٹھو ۔ گھومو پھرو ملو ملاؤ ۔ اب میں کہاں تک تیتری بنی پھروں ۔"

تقریباً ایک سال بعد ایک روز قمر خود ہمارے گھر آگیا ۔ اس کی صورت دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ لمبا چہرہ ۔ بھویں چڑھی ہوئی آنکھیں یوں کھلی ہوئی جیسے دنوں سے سویا نہ ہو ۔

"خیریت تو ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"اونہوں ۔ بالکل نہیں ۔"

"یہ کیا صورت بنائی ہے ؟"

"دیکھ لو" وہ بولا ۔

"یہ کیا زردی کی وجہ سے ہے کیا ؟"

"ہاں" وہ بولا۔

"اس نے کوئی حرمزدگی کی ہے ؟"

قمر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر جیب سے دو کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے میں نے انہیں کھولا۔ دیکھا ارے! وہ تو دونوں ہی محبت نامے تھے، جو کسی نے آسیہ کے نام لکھے تھے۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ کہا تھا نا ؟"

"ہاں" وہ بولا "تم سچ کہتے تھے۔"

"بات اتنی دور تک پہنچ گئی ہے کیا ؟"

"اگر تم نے مدد نہ کی تو پہنچ جائے گی۔"

"تم نے زردی سے بات کی ہے ؟"

قمر نے نفی میں سر ہلا دیا "میں نہیں کروں گا" وہ بولا "تم آکر اس سے بات کرو۔ تم نہ آئے تو۔۔۔"

"نہیں نہیں۔ میں ضرور آؤں گا، ضرور۔"

اگلے روز ہی میں لاہور پہنچا۔ سیدھا قمر کے گھر گیا اس وقت گھر میں زردی اکیلی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے اداس بیٹھی سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی "شکر ہے تم آگئے" وہ بولی "روز سوچتی تھی کہ تار دے کر بلالوں۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "میری طرف دیکھو" میں نے حکم چلایا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"جھوٹی مسکراہٹ نہ مسکا۔ تو اداس ہے نا ؟"

"ہاں" اس نے سر جھکا دیا "اداس ہوں۔"

"مجھے بتا، وہ کون ہے ؟"

"کون وہ ؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"جس سے تیرا افیئر چل رہا ہے۔"

زردی نے ایک غصیلی نگاہ مجھ پر ڈالی۔
"تمہیں محبت نامے موصول ہو رہے ہیں نا؛ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"
"ہاں" وہ بولی۔
"کون لکھتا ہے؟"
وہ خاموش رہی۔
"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ یقین رکھو۔"
"مجھے یقین ہے" وہ بولی۔
"مجھ سے کچھ نہ چھپا۔"
"نہیں چھپاؤں گی" وہ بولی۔
"تو بتا، کون خط لکھ رہا ہے تجھے؟"
وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اٹھ بیٹھی۔ چابیاں پرس سے نکالیں۔ ایک دراز کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔
وہ بند لفافہ تھا۔ لفافے پر آسیہ کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اوپر ڈاک کا ٹکٹ لگا ہوا تھا۔ لیکن ابھی وہ پوسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے حیرت سے زردی کی طرف دیکھا۔
"کھول لو" وہ بولی۔
میں نے لفافہ کھولا "جان سے پیاری آسیہ" ارے! وہ تو محبت نامہ تھا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "یہ تم خود پوسٹ کروگی؟ اپنے نام خود محبت نامے بھیجتی ہو؟"
"ہاں" اس نے سر ہلا دیا۔
پھر اس نے تکیے سے ٹیک لگالی۔ کہنے لگی "تمہیں پتا ہے، بدر میں نے خود تمہیں بتایا تھا نا کہ قمر میرے ساتھ بہت ہی اچھا ہے۔ بہت ہی اچھا۔" وہ رک گئی۔ "قمر نے چند ماہ مجھ سے اتنی محبت کی، اتنی محبت کی کہ میں پاگل ہوگئی اب میں اس کی محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہ سکتی۔ اس کی محبت کے بغیر مجھے یوں لگتا ہے جیسے مچھلی پانی سے باہر پھینک دی گئی ہو۔"

وہ رک گئی ۔

"پھر چند ماہ بعد قمر پر ڈیپرشن کے دورے پڑنے لگے ۔ دورہ پڑتا ہے تو وہ چپ ہو جاتا ہے ۔ کاٹھ بن جاتا ہے ۔ جب پہلا دورہ پڑا تو میں حیران رہ گئی ۔ پھر اتفاق سے بل ڈاک آگیا "

"بل ڈاک ؟"

"وہی ہمارا کلاس فیلو ، گوہر ۔"

"اچھا ، وہ" میں نے نفرت سے منہ بنایا ۔

"کالج میں وہ میرے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا نا ۔ یاد ہے ، مجھے اکیلے میں لے جانے کے لیے اس نے کیا کیا جتن کیے تھے ۔"

"بڑا چیپ آدمی ہے ، وہ ۔"

ہاں ، بڑا ۔"

"لیکن وہ یہاں پہنچا کس طرح ؟"

"مجھے بازار میں مل گیا تھا ۔ یہاں انٹرویو کے لیے آیا تھا ۔ میں اسے گھر لے آئی ۔"

"سلی گرل ۔"

"میں تو اسے کتاب دینے کے لیے لائی تھی ۔ اس کی ایک کتاب میرے پاس رہ گئی تھی نا ۔ لیکن قمر نے اسے روک لیا ۔ یہاں گھر میں ٹھہرا لیا ۔"

"ایڈیٹ" میں نے غصے سے کہا ۔

"گوہر کے یہاں آتے ہی قمر میرے پاس واپس آگیا ۔ ڈیپرشن دور ہوگیا ۔ اف ! کس شدت سے واپس آیا قمر ۔ اس پر میں نے گوہر کو یہاں سے چلتا کیا ۔ اس کے جاتے ہی قمر پھر پتھر کا بن گیا ۔ سات آٹھ دن کے بعد قمر نے مجھے خط دیا ۔ کہنے لگا: معاف کرنا میں نے غلطی سے کھول لیا تھا ۔ میں نے خط پڑھا تو شرم سے پانی پانی ہوگئی ۔ وہ خط گوہر کی طرف سے تھا ۔ ڈرٹی لولیٹر تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں قسم کا محبت نامہ ۔"

"پھر جھگڑا ہوا ؟"

"میرا خیال تھا قیامت آجائے گی ۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا ۔ الٹا قمر کے اظہار

محبت میں اک طوفان آگیا۔" وہ خاموش ہوگئی، جیسے سوچ میں کھو گئی ہو۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر جیسے بات میری سمجھ میں آگئی" وہ بولی۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کہ۔۔ کہ" وہ اداس لہجے میں بولی "قمر کی محبت جیتنے کے لیے تھرڈ مین از اے مسٹ۔"

"ارے!" میں چونکا۔

"ہاں" وہ بولی "تھرڈ مین کے بغیر چارہ نہیں۔"

"عجیب بات ہے!" میں گنگنایا۔

"پھر میں نے خود اپنے نام لو لیٹر لکھنے شروع کر دیے۔" وہ خاموش ہوگئی بڑی دیر تک سامنے خلا میں گھورتی رہی۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں، جیسے وہ آنسو پینے کی شدید کوشش کر رہی ہو۔

پھر دفعتاً وہ چونکی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "بدر" وہ بولی "تم آجاؤ، ہمارے پاس۔ پلیز بدر" اس نے نمناک پکار سے منت کی "فار مائی سیک، فار ہز سیک، فار اورز سیک۔۔ آؤ گے؟" دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

"زردی، اگر مجھے تھرڈ مین بننا گوارا نہ ہو تو۔۔۔؟"

اس نے ایک لمبی آہ بھری پھر ایک دم مشتعل ہو کر بولی "تو، تو میں گوہر کو بلالوں گی۔"

مجھے غصہ آگیا "اس حد تک گر جاؤگی تم، آسیہ؟"

"کیوں نہیں" وہ چلائی قمر کی محبت پانے کے لیے میں کیا نہیں کروں گی۔

آئی وِل ڈو اینی تھنگ، اینی تھنگ۔"

○

سرکس کا سانٹے مار

قدرت اللہ شہاب

10. 8. 1967

"اگر علی پور کا ایلی واقعی ممتاز مفتی ہے تو پھر وہ نوجوان بوڑھا کون ہے جو ننھے بچوں کا گھوڑا بن کر گھٹنوں تک گھٹنوں کے بل رینگتا رہتا ہے؟ وہ نحیف و نزار انسان کون ہے جو ایک آدمی ... ایک عورت نہیں ... ایک آدمی سے محض سرسری سی ، محض فروعی سی ملاقات کا وعدہ وفا کرنے کے لئے کڑکڑاتی ہوئی سردی اور موسلادھار بارش میں ایک ناقابلِ اعتماد پھٹیچر سے بائیسکل پر اندھیری رات میں سولہ میل جانے اور سولہ میل آنے کا تعب یوں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے جیسے آتشدان کے سامنے بیٹھا بائیں ہاتھ سے چٹکی بجا رہا ہو ... وہ عیش پسند درویش جو تمباکو والے چند پان کھا کر اور چائے کے چار پیالے پی کر زندگی کے صبح و شام بڑی تن آسانی سے گزار دیتا ہے؟ وہ ایذا طلب سنیاسی جو حج کے لئے رختِ سفر باندھتا ہے تو احرام کی مدت کے لئے تمباکو والے پانوں کی لذت کو بھی یوں ہی بلاوجہ تیاگ دیتا ہے ؟ وہ بے راہ رو حسن پرست جسے مکہ اور مدینے میں کالی آنکھوں اور سنہری بالوں والی کندن کی طرح دھکتی ، تانبے کی طرح دمکتی اور گلاب کی طرح مہکتی ، شامی ، ترکی ، مصری اور حجازی عورتوں کی قطاروں کی قطاریں ایک بار بھی نظر نہیں آئیں ؟ ... وہ اڑیل ساہٹ دھرم ضدی بندہ جو اپنے اللہ کے سامنے بے نیاز اور اپنے رسولؐ کے حضور عاجز ہے ...

دراصل یہ سوالات میں یونہی بلاوجہ اور بے ضرورت پوچھ رہا ہوں ... شاید محض زیبِ داستان کے لئے ۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جب میں پہلے پہل ممتاز مفتی سے ملا تو میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ بس یہ آدمی ضرور میرے ڈھب

کا ہے ۔ گرمجوشی وہ جیسے گندھک کا ابلتا چشمہ ، سردمہری ایسی گویا جما ہوا گلیشیر ، نرمی میں روئی کی بتی جو مدت سے مٹی کے دیئے میں سرسوں کے تیل میں گری پڑی ہو ، سختی میں نائی کا استرا ، مٹھاس کا موڈ ہو تو رس کا گھڑا ورنہ نرا پرا روکھا پھیکا کھدر سا لاتعلق انسان جو اپنے دل کی کڑوی سے کڑوی لیکن سچی بات یوں کہہ گزرتا ہے جیسے موسم کا حال بیان کر رہا ہو ۔ یہ تو بھلا ہو افسانہ نگاری کا ، کہ اس فن نے ممتاز مفتی کو بیان کا وہ اعجاز عطا کر رکھا ہے کہ اس کی ہر حقیقت پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے اور ہر افسانے پر حقیقت کا ... اگر فن کا یہ چور دروازہ ممتاز مفتی کو راہ نہ دیتا تو اب تک وہ کبھی کا جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ماخوذ ہو کر کیفرِ کردار تک پہنچ چکا ہوتا یا اکا دکا راہ گیروں کو پکڑ پکڑ کر گھیر گھار کر بڑی منت سماجت ، بڑی لجاجت سے نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتا اور اگر کوئی سادہ لوح مسافر اس کی باتوں میں آکر باقاعدہ وضو کرکے نماز کی نیت باندھ بھی لیتا تو ممتاز مفتی نہایت بے اعتنائی سے سگریٹ سلگا کر الگ تھلگ بیٹھ جاتا اور دل ہی دل میں تعجب کرتا کہ اللہ کی بھی کیا شان ہے کہ ابھی تک ایسے ایسے اچھے اچھے لوگ موجود ہیں جو ہنسی خوشی نماز تک پڑھ گزرتے ہیں!...

یہ بات نہیں کہ ممتاز مفتی کسی قسم کے عقیدے میں گرفتار ہے ۔ وہ تو ایک ایسا آزاد منش ہے جو عقیدے کا روگ پال ہی نہیں سکتا ۔ اس کے سارے وجود میں عقیدہ نہیں بلکہ عقیدت جاری و ساری ہے ۔ عقیدت کا شکار کون ہوتا ہے۔اس کا دارومدار یا حسنِ اتفاق پر ہے یا محض حادثے پر ... اگر عورت ہے تو جنس ، دوست ہے تو محبت ، دشمن ہے تو نفرت ... اور جب کسی وقت ممتاز مفتی کی عقیدت کے جال میں نہ عورت پھنسی ہوئی ہو ، نہ دوست اور نہ دشمن تو وہ اچانک راہ چلتے چلتے کسی میرے جیسے لاوارث کو آنکھ بچا کر اٹھا لیتا ہے ۔ اسے گود میں بٹھاتا ہے ، کندھوں پر اٹھاتا ہے ، کھلاتا ہے ، پلاتا ہے ، پالتا ہے ، پوستا ہے ، بال بڑھ جائیں تو کٹواتا نہیں بلکہ لانبی لانبی زلفوں پر گوٹے کناری والا سبز ململ کا صافہ باندھ دیتا ہے ۔ داڑھی نکلے تو اس پر مشک کافور کی ٹکیاں سجا دیتا ہے ، آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ لگا دیتا ہے اور پھر اسے میدان میں نکال کر بآوازِ بلند کہتا ہے کہ "ہاں بچہ جمورے تمہارا نام کیا ؟... تمہارا

کام کیا ؟... تمہارا ادام کیا؟"

بہ امرِ مجبوری بچہ جمورا صحیح جواب دیتا ہے لیکن اگر کوئی جواب ممتاز مفتی کی عقیدت کے سانچے میں پورا نہ اترے تو وہ اندر ہی اندر اسے ایسے خفیہ گھونسے مارتا ہے کہ بے چارا بچہ جمورا بس وہی کہنے لگتا ہے جو ممتاز مفتی کی عقیدت چاہتی ہے کہ وہ کہے...

عقیدت کے میدان میں ممتاز مفتی وہ خرکار ہے جو معصوم بچوں کو اغوا کر کے ان کی انگلیاں توڑتا ہے ، ان کی ہڈیاں مروڑتا ہے تاکہ وہ اس کے اور صرف اس کے سانچے میں فٹ ہو سکیں ۔ شریعت میں وہ خاموش ہے کیونکہ اسے اپنے رسولؐ سے ایسا انس ہے جو شاید ضرورت کے بغیر بھی مچھلی کو پانی سے ہونا چاہیے ... طریقت میں وہ بے شک بڑا طرحدار ہے ، اگر تصوف میں غنڈہ ایکٹ نافذ ہوتا تو ممتاز مفتی دائمی ضمانت پر زندگی گزارتا ... مرنے کے بعد اگر وہ جنت میں گیا تو شاید اسی وجہ سے جائے کہ آخر وہاں کی جیلیں بھی تو کسی نے آباد کرنی ہیں ۔

یوں روزمرہ کی زندگی میں ممتاز مفتی سرکس کا "سانٹے مار" ہے ۔ وہ ہر وقت لنگر لنگوٹ کسے ، بدن پر تیل ملے ، سدھے سدھائے ہاتھیوں اور بندھے بندھائے شیروں کو سانٹے مار مار کر مزید سدھارتا اور مزید باندھتا رہتا ہے ۔ "علی پور کا ایلی" اسی سرکس کی ایک جھلک ہے۔"

("علی پور کا ایلی" کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر ۱۰ اگست ۱۹۶۷ء کو)

خطرے کی سرخ ٹمٹماتی بتی

قدرت اللہ شہاب

2. 12. 1984

پہلی شادی کی نئی دلہن کی طرح کتاب کی رونمائی بھی اسی مصنف کو زیب دیتی ہے جس کی پہلی تصنیف اوّل بار شائع ہو رہی ہو ۔ دوسری شادی عام طور پر نظریں چرا کر اور کبھی کبھی بالکل چھپا کر رچائی جاتی ہے ۔ اس کے بعد ایلیزبتھ ٹیلر کے علاوہ باقی لوگ مزید شادیوں کا ذکر تک کرنے سے گریز فرماتے ہیں ۔ ممتاز مفتی کا یہ تیسرا یا چوتھا نہیں ، بلکہ ایک دم چھٹا مجموعہ ہے۔ 1936ء سے لے کر پچھلے اڑتالیس برس میں دنیائے ادب نے ناپ تول کر ان کا ایک اعلیٰ اور منفرد مقام متعین کر رکھا ہے ۔ اب اس طرح کا کوئی نیا مجموعہ اس مقام کو نہ بہت زیادہ بڑھا سکتا ہے ، اور نہ بہت زیادہ گھٹا سکتا ہے ۔ یہ جمود کی منزل ہے ، جس پر فائز ہونے کے بعد ادیب کے سر پر "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" والی خطرے کی سرخ بتی ٹمٹمانے لگتی ہے ۔

"روغنی پتلے" کی رونمائی کی اس تقریب میں حصہ لینے کی جرأت مجھے صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر ممتاز مفتی کے منہ پر سچی بات کہہ دی جائے تو وہ بُرا نہیں مانتے ۔

تن کی دنیا کے پیچ و خم ، من کی دنیا کی بھول بھلیاں اور تحت الشعور کی نیم تاریک غلام گردشیں ممتاز مفتی کے فن کے محبوب موضوعات ہیں ۔ وہ اپنی حد تک ان موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کر چکے ہیں ۔ اب ان کے تخلیقی جوہر کے لیے یہ موضوع بند پانی کا جوہڑ ہیں ، جن پر کائی کے سوا اور کچھ نہیں جمتا ۔ نفسِ انسانی کے شعور اور لاشعور میں اب کوئی نیا تجربہ یا مشاہدہ باقی نہیں

رہا جو عمر کے اس حصے میں ایک بار پھر ان کی ہتھیلی پر رومان اور جنسیات کی سرسوں جما سکے ۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ انسان کے ظاہری قویٰ بکھرتے اور باطنی سوچ کے دھارے نکھرتے رہتے ہیں —— یا کم از کم ایسے ہوتے رہنا چاہیئے ۔ غالباً اسی بکھرنے اور نکھرنے کے عمل سے دوچار ہو کر ممتاز مفتی کے اندر بیٹھا ہوا بے حد حساس تخلیقی فن کار اپنی جولانیوں کے لیے کسی نئے میدان کی تلاش میں مضطرب اور سرگرداں ہے ۔ "روغنی پتلے" کے صنم خانۂ آذری میں ادب کے Teenager کے لیے بہت بڑا سرمایۂ نشاط ، جنت نگاہ اور فردوس فخر و انبساط ہے ۔ لیکن ممتاز مفتی جیسے عظیم اور منجھے ہوئے تخلیق کار کو تو اب تک آتش نمرود کی بھٹی سے گذر جانا چاہیئے تھا !

خدا کرے ان کا ساتواں مجموعہ آج کے ممتاز مفتی کی تحریر ثابت ہو ۔ یہ چھٹا مجموعہ تو وہ دس یا بیس یا تیس یا چالیس برس پہلے بھی لکھ سکتے تھے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرق ہوتا کہ وہ اس کتاب کا نام "روغنی پتلے" رکھنے کی بجائے "روغنی پتلیاں" رکھ دیتے ۔ لیکن ہمیں تو آج کے ممتاز مفتی کا ادب درکار ہے ، جو 1936 ء یا 1946 ء یا 1956 ء یا 1966 ء میں پیدا نہیں ہوا تھا ، بلکہ وہ ممتاز مفتی جس کا سال پیدائش 1905 ء ہے ۔ اتنے بڑے اور بزرگ ادیب کو مشورہ دینے کا تو کسی کو حق حاصل نہیں ۔ البتہ ٹی ۔ وی پر علّامہ اقبال کے سنسرشدہ اشعار اور مصرعوں اور فقروں کی آڑ میں پند و نصیحت کا فی الحال کوئی برا نہیں مناتا ۔ اس لیے ممتاز مفتی صاحب کی خدمت میں بصد عزت و احترام یہی گزارش ہے کہ :

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

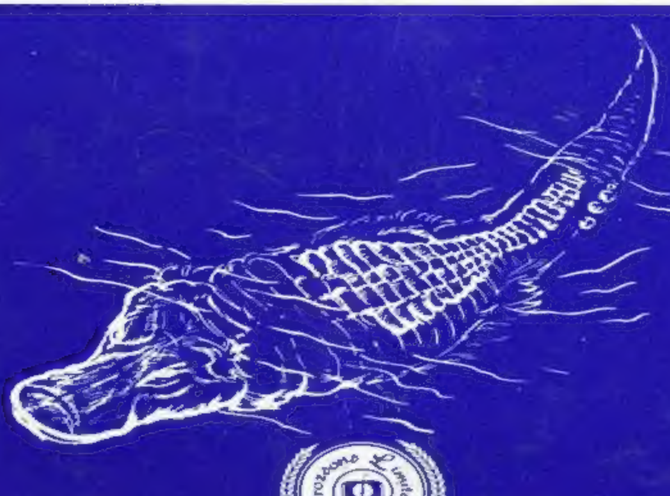
("روغنی پتلے" کی تقریبِ رونمائی 2 دسمبر 1984 ء کو پڑھا گیا)

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور ۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر

یہ کہانیاں

یہ کہانیاں نہ تو میں نے فن کے لیے لکھی ہیں
اور نہ ہی زندگی کے لیے
یہ کہانیاں میں نے اپنے لیے لکھی ہیں
دراصل یہ کہانیاں نہیں ہیں
یہ سب کچھ وہ ہے جو
میں نے زندگی میں پایا
کھویا
یہ میرے ہونٹوں پہ آیا ہوا تبسم بھی ہے
طنز سے پاک
اور میری آنکھ سے گرا ہوا آنسو بھی ہیں

ممتاز مفتی



فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور کراچی راولپنڈی
969 0 00949 4
Rs. 795.00